
زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

شمارہ نمبر ۱۳۹

بانی : محمد طفیل   مدیر : جاوید طفیل

○ ٹائیٹل : —— اسلم کمال
○ لے آؤٹ : —— محمد شفقت
○ پروف ریڈنگ : —— محمد عالم مختار حق
○ فوٹوگرافی —— ڈاکٹر وحید قریشی
جاوید اختر
ایس ظاہر علی شاہ

خط و کتابت کے لئے پتہ

نقوش : اردو بازار - لاہور فون :- ۵۳۵۲۵ - ۲۲۹۳۸۹

قیمت :- /۱۵۰ روپے

جاوید طفیل نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا۔

فہرست

نعت

دُعا

نظم وغزل

افسانے

شاعرِ مشرق

اَدا جعفری ایک تفصیلی مُطالعہ

بشیر مُنذر ایک تفصیلی مُطالعہ

انتظاریہ

گوشہ محمد طفیل

تبصرے

نقوش ایوارڈ ۸۹ء

تحقیق و تنقید

۱۔ پروفیسر محمد اسلم　　۲۔ غلام رسُول ازہر

افسانہ

۱۔ کشمیری لال ذاکر　　۲۔ محمد منشا یاد

نظم وغزل

۱۔ شہزاد احمد　　۲۔ علی احمد جلیلی

سفرنامہ

۱۔ اسلم کمال　　۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر

اِس شمارے میں

ادارہ نقوش کا بہت عرصے سے منصوبہ تھا کہ علم و فن سے متعلق خواتین و حضرات کا ایک البم چھاپا جائے، جس میں اُن کی تصاویر کے علاوہ مختصر کوائف بھی درج ہوں۔ اِس منصوبے کی تکمیل بعض وجوہات کی بناء پر اَب تک ممکن نہ ہوسکی۔ اِس منصوبے کی تکمیل کے لیے اب یہ راہ نکالی گئی ہے۔ کہ ہر عام شمارہ میں کچھ صفحات تصاویر کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں۔ تاکہ کچھ عرصہ بعد اُن کو اکٹھا کر کے اِس منصوبے کو مکمل کیا جا سکے۔

موجودہ پرچے میں مجوزہ البم کا کچھ حصّہ شامل ہے۔ آغاز ہم نے اُن شخصیتوں سے کیا ہے جن کو اَب تک محمد طفیل ادبی ایوارڈ یا نقوش ایوارڈ مِل چکا ہے اور جن کی تصاویر اور کوائف ہمارے پاس موجود تھے۔

جو تحریر زیادہ سنبھال کر رکھی جائے وہ وقت پر نہیں ملتی۔ یہی مسئلہ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کے سفرنامہ " بھارت ۸۸ " کے سلسلہ میں پیش آیا ہے اسی بناء پر اِس تحریر کی دُوسری قسط موجودہ پرچے میں نظر نہیں آرہی۔

جاوید طفیل



طلوع

— زندہ تحریروں کا دل بھی ہوتا ہے اور ضمیر بھی!

— ہر زندگی میں ایک خلا ہوتا ہے۔ جس کو صرف تصورات ہی پُر کر سکتے ہیں۔

— ہمارا مخالف ہی ہمارا مُعاون ہے وہ مشکلات پیدا کرکے ہمیں آسانیوں کا راستہ بتاتا ہے۔

— کوئی اندھا بھی اتنا اندھا نہیں ہوتا کہ دوسروں کی غلطیوں کو نہ دیکھ سکے۔

— خود قانون ایک بڑا ظلم ہے اگر وہ غلط استعمال کیا جائے۔

— بُزدلی اور غصے کی انتہاؤں کا اوسط حقیقی مردانگی ہے۔

— غُصے اور ضد کی بُنیاد پر جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ وہ پانی پر نمک کی دیواریں ہوتی ہیں۔

—— مُحمّد طفیل



محمد طفیل ادبی ایوارڈ ۱۹۸۶ء

ڈاکٹر وحید قُریشی

آبائی وطن : گوجرانوالہ ۔ جائے ولادت : میانوالی

تاریخ ولادت : ۱۴ فروری ۱۹۲۵ء

تعلیم : ایم ۔ اے (فارسی) ۱۹۴۶ء ایم ۔ اے (تاریخ) ۱۹۵۰ء

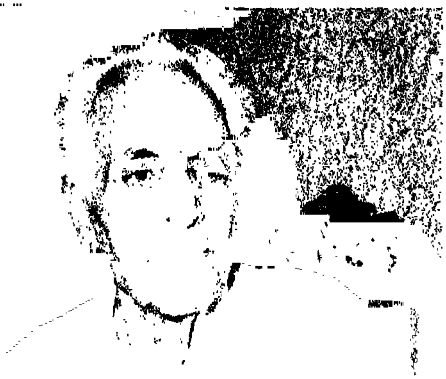
پی ایچ ڈی (فارسی) ۱۹۵۲ء ڈی لٹ (اُردو) ۱۹۶۵ء

تصنیفات و مُرتبات : اُردو ، فارسی اور پنجابی زبان میں پچاس سے زائد

خدمات : ● سابق پرنسپل پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج ، لاہور

● سابق صدر نشین ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

موجودہ مصروفیت : ناظم بزم اقبال ، لاہور ۔



محمد طفیل ادبی ایوارڈ ۱۹۸۷ء

ممتاز مفتی

ولادت : پٹیالہ ۱۲ ۔ ستمبر ۱۹۰۵ء

تصانیف : بیس سے زائد

اعزاز : ہجرہ ایوارڈ ۱۹۸۲ء ، ستارۂ امتیاز ۱۹۸۵ء

بابائے اردو ہجری ایوارڈ ۱۹۹۱ء

اہم افسانوی مجموعے : ان کہی ۱۹۴۰ء ، گہما گہمی ۱۹۴۴ء ، چپ ۱۹۴۷ء

اسمارائیں ۱۹۵۲ء ، گڑیا گھر ۱۹۶۵ء ، روغنی پتلے ۱۹۸۵ء

سمے کا بندھن ۱۹۸۶ء ۔

ناول : علی پور کا ایلی ۱۹۶۲ء

سفر نامے : لبیک ۱۹۷۵ء ، ہند یاترا ۱۹۸۳ء

خاکے : پیاز کے چھلکے ۱۹۸۶ء ، اوکھے لوگ ۱۹۸۶ء

نقوش ایوارڈ برائے افسانہ ۱۹۸۶ء

محمد طفیل ادبی ایوارڈ ۱۹۸۸ء

ڈاکٹر جمیل جالبی

ولادت : علی گڑھ ۱۲ جون ۱۹۲۹ء

تعلیم : ایم ۔ اے (انگریزی) ۱۹۴۹ء ایم ۔ اے (اردو) ۱۹۵۰ء

ایل ۔ ایل ۔ بی ۱۹۵۰ء پی ایچ ڈی (اردو) ۱۹۷۱ء

ڈی لٹ (اردو) ۱۹۷۶ء

تصنیفات و مرتبات : ۲۵ کے قریب

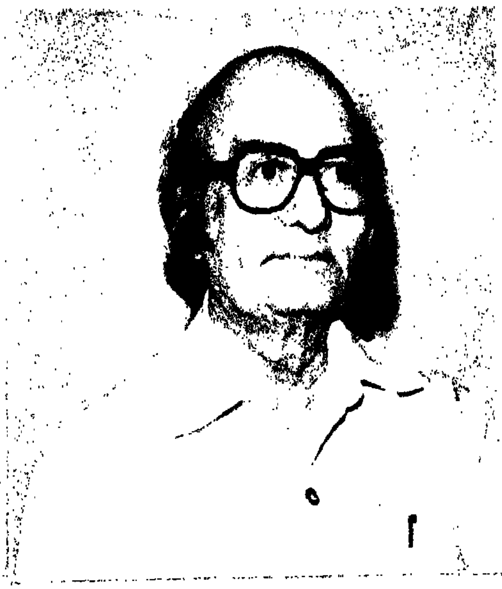
اعزازات : قومی ادبی انعامات ۱۹۶۵ء ، ۱۹۷۳ء ۱۹۷۴ء ، ۱۹۷۵ء

ستارۂ امتیاز ، ۱۹۹۰ء

خدمات :
- پاکستان انکم ٹیکس سروس ۱۹۵۳ء — ۱۹۷۹ء
- وزارتِ تعلیم سے وابستگی نومبر ۱۹۸۰ء
- وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی

ستمبر ۱۹۸۳ — اگست ۱۹۸۷ء

موجودہ مصروفیت : صدر نشین مقتدرہ قومی زبان ، اسلام آباد



نقوش

کا ہر شمارہ ایک عہد آفریں دستاویز
دو نسلوں کی عاجزانہ کاوش

قرآن نمبر

- قرآن پاک ایک ایسا موضوع، جس کا حق ادا کرنا انسانی بساط میں نہیں۔
- ۲۵ - ۳۰ جلدوں پر مشتمل اس کام کی تکمیل تقریباً دس برس میں ہوگی۔
- انشاء اللہ نقوش کا قرآن نمبر عہدِ حاضر کی سب سے بڑی دستاویز ثابت ہوگا۔
- پہلی تین جلدیں جلد منظرِ عام پر آرہی ہیں۔

عالمِ بشریت کے لئے سیرتِ طیّبہ کی اہمیّت

از پروفیسر نثار احمد فاروقی

اس مضمون کا موضوع "عالمِ بشریت کے لئے سیرۃ طیّبہ کی اہمیت" میرا ہی تجویز کردہ ہے مگر اس نے مجھے خاصی آزمائش میں ڈال دیا ہے 'عالمِ بشریت"، خود بہت بڑی چیز ہے ، ان دو لفظوں کی لپیٹ میں لاکھوں کروڑوں مسائل و معاملات آجاتے ہیں ۔ اس میں ممالک بھی ہیں ، قومیں بھی ، نظامہائے حکومت بھی ہیں ، نظریاتِ حیات و کائنات بھی ، فکر و فلسفہ بھی ہے ، علوم و اکتشافات بھی ، اس میں افراد بھی ہیں جماعتیں بھی ، گورے بھی ہیں ، کالے بھی ، امیر بھی ہیں فقرأ و مساکین بھی ، تاجر بھی ہیں صنّاع بھی ۔ مختصر یہ کہ اس نیلی چھتری کے نیچے جو کچھ ہو رہا ہے اور جس جس طرح سے ہو رہا ہے ، اور جب سے ہو رہا ہے اور جب تک ہوتا رہے گا ، وہ سب "عالمِ بشریت" ہے خود اس ترکیب کی ذرا سی وضاحت بھی شروع کر دی جائے تو سارا لیکچر اسی میں نمٹ جائے گا اور غالب کی زبان سے کہنا پڑے گا

ورق تمام ہوا ، اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ایسے بیکراں موضوع کو بھی جب سیرۃ طیبہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے مقابلے میں دیکھیے تو ذرّہ اور آفتاب کا تقابل نظر آتا ہے ۔ سیرۃ طیّبہ میں ایسی جامعیت ہے کہ اس نے عالمِ بشریت کے تمام بنیادی مسائل کا احاطہ کر رکھا ہے ہمیشہ اور ہر صورت حال میں ہم اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے آپ کے مبارک اقوال سے ، آپ کے پاکیزہ اعمال سے روشنی حاصل کرتے رہیں گے ۔

مرزا غالب کو اپنی قادر الکلامی اور مضمون آفرینی کا ایسا بلند بانگ دعویٰ تھا کہ اگر انھوں نے کسی دوسرے شاعر کا کہا ہوا مضمون بھی اپنے شعر میں باندھ لیا ہے تو اُس کی ملکیت کا جواز یہ کہکر پیدا کر لیا کہ قسامِ ازل نے یہ مضمون تو مجھے ہی عنایت کیا تھا ، مگر فلاں شاعر نے اسے "نہاں خانۂ ازل" سے چرا لیا اور مجھ سے پہلے پیدا ہو کر اُسے نظم کر گیا ہے :

مگر یہی غالب جب نعتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) لکھنے بیٹھتے ہیں تو اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں :

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

عرفی شیرازی دوسرا خود پسند و خودنگر شاعر ہے جس نے زمینِ سخن کو آسمان تک پہنچا دیا ہے ، مگر وہ بھی وادیٔ نعت میں قدم رکھتا ہے تو لرزہ براندام ہو جاتا ہے اور کہتا ہے

عرفی مشتاب این رہِ نعت است نہ صحراست
آہستہ ، کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را

جب ایسے ایسے اہل قلم اعتراف عجز کر کے چلے گئے تو اس عظیم و جلیل ہستی کے فضائل و شمائل میں سے ایک زرّہ کا بیان کرنا بھی مجھ جیسے حقیر انسان سے کہاں ممکن ہو سکتا ہے ؟

سیرۃ طیّبہ کوئی خط مستقیم نہیں ہے جو عام سوانح عمریوں کی طرح ولادت سے شروع ہو اور وفات پر ختم ہو جائے ۔ دنیا میں لاکھوں سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں اور ان میں بڑے بڑے کارنامے بھی بیان ہوئے ہیں مگر اکثر حالات میں تصویر کا دوسرا رُخ جان بوجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ اکبر الہٰ آبادی نے ایسی سوانح عمریوں کا خلاصہ ایک ہی شعر میں بیان کر دیا ہے

تھے معزز شخص ، لیکن اُن کی لائف کیا لکھوں
گفتنی درجِ گزٹ ، باقی جو ہے ناگفتنی،

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ طیبہ کو رہتی دنیا کے لئے مَثَلِ اعلیٰ اور اُسوۂ حسنہ بنایا گیا ہے ۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ فرمانِ خداوندی ہے ، اور اس کا ثبوت آپ اس گئے گزرے زمانے میں بھی دیکھ سکتے ہیں ۔ ہماری تاریخ میں ایسی لاکھوں شخصیتیں گزری ہیں جنھوں نے ذرّہ ذرّہ باتوں میں اتباعِ سنت کا سخت اہتمام کیا ہے ، آج بھی آپ تلاش کریں گے تو اللہ کے کچھ بندے ایسے ضرور مل جائیں گے جو بے ارادہ اور قصداً ہر حال میں اتباعِ سنت کی پوری کوشش کرتے ہیں ایسا کیوں ہے ؟ اس لئے کہ محبت کا اقتضا ہی تبعیت ہے ۔ اور اس لئے کہ اللہ نے اُسے اُسوہ حسنہ بنا دیا ہے شاید یہی حکمت الٰہی رہی ہوگی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تاریخ کی بھرپور روشنی میں بھیجا گیا ۔ آپ کے ہر قول اور ہر فعل کو پوری جزئیات کے ساتھ ساڑھے پانچ لاکھ معلوم راویوں نے دوسری نسلوں تک پہنچایا ۔ آج دنیا کے بڑے مذاہب میں سے کسی مذہب کے بانی کی سیرۃ و سوانح کے دو صفحے بھی ایسے نہیں لکھے جا سکتے جس پر تاریخ اپنی مہر تصدیق ثبت کر دے ہمارے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) عربوں میں مبعوث ہوئے ، جو بادیہ نشین و صحراگرد تھے ، جنہیں قتل و غارت اور لوٹ مار کے سوا کچھ نہ آتا تھا ، لکھنے پڑھنے کا تو ان میں رواج تھا ہی نہیں ، جبکہ اطراف کے علاقوں میں بسنے والے یہودی اور عیسائی لکھنا پڑھنا جانتے تھے ، لیکن نہ یہودیوں کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرۃ ہے نہ عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے آخری تین دن کے سوا کچھ حال معلوم ہے اسی پر دوسرے مذاہب کے بانیوں کو قیاس کر لیجئے ۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" تو ایسی قوم میں اور ایسے لوگوں سے اُسے محفوظ کرا لیا جن کے پاس سامانِ کتابت بھی نہ ہوتا تھا جن تک کاغذ بھی نہ پہنچا تھا اور جو ترتیب و تدوین وغیرہ کے طور طریقوں (methods) سے بھی قطعاً واقف نہ تھے ۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل جرمن یہودیوں

نے دنیا بھر سے پچاس ہزار قلمی نسخے قرآن شریف کے جمع کر کے ان کے متن کا مقابلہ کرنے میں اپنی عمریں کھپا دیں ، مگر تحریف یا کمی بیشی کی ایک مثال بھی ڈھونڈ کر نہ لا سکے ۔ اسی طرح سیرۃ طیبہ کو اللہ تعالیٰ نے اُسوۂ حسنہ فرمایا تو اس کی ایک ایک تفصیل کو محفوظ کرا دیا۔ چودہ سو سال میں لاکھوں انسان ایسے گذر گئے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو اپنی پوری زندگی حدیث شریف اور سیرۃ طیبہ کی خدمت اور تدریس و تحقیق میں گذار دیتے ہیں ۔ اس محبوب موضوع کا کوئی خفی ترین گوشہ بھی ہمارے علماء و محدثین کی نظروں سے نہیں بچا ہے ۔

سیرۃ طیبہ کی مسلمانوں کے لئے جو اہمیت ہے اس پر زیادہ تفصیل سے گفتگو کرنا غیر ضروری ہے ۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے عقیدہ کی بنیاد کلمہ لا اله الا الله محمد رسول الله ہے اور اس کلمہ کے دو جُز ہیں ۔ اللہ کی وحدانیت کا اقرار اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی تصدیق ۔ اس میں سے کسی جز میں بھی کوئی ضعف ہے یا ریب و شک ہے تو وہ مسلمان ہی نہیں ہے ۔ مسلمان کے لئے تو آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل قرآن کے بعد دوسرے نمبر پر ہے ما اتاکم الرسول فخذوہ ومانہاکم عنه فانتهوا (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ تمہارے لئے لائیں اسے لازم پکڑ لو اور جس چیز سے منع فرمائیں اس سے باز رہو) اس لئے کہ آپ اپنی خواہش سے کلام نہیں فرماتے ۔ وما ینطق عن الهوی ان هو الا وحي یوحی مسلمانوں کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فرمان حرفِ آخر ہے :

تیر قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
امّا کُشادِ آن زکمانِ محمدؐ است

اس لئے میں عَالمِ بَشریت کے اس حصہ سے گفتگو کروں گا جس کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں ، یا ان مسائل کی بات کروں گا جو بلحاظ بشریت سب میں مشترک ہیں ۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی ساری مخلوق کو جوڑوں میں پیدا کیا ہے ۔ عَالمِ انسانیت بھی مردوں اور عورتوں میں بٹا ہوا ہے ۔ عورتوں کی تعداد قانونِ قدرت کے حسنِ انتظام سے لگ بھگ نصف رہتی ہے ۔ کسی کسی علاقہ میں ایک یا دو فیصد کی کمی بیشی ہو جاتی ہے ۔ اس لئے اگر ہم صرف یہ دیکھیں کہ رسالت مآب علیہ الف الف تحیّات والصلوٰۃ والسّلام نے عورتوں کے لئے کیا فرمایا اور انھیں کیا حقوق دیے تو اس طرح عالم بشریت کے نصف حصہ کو اس رحمتِ تمام سے جو فیضِ عام پہنچا ہے اس کا ہلکا سا اندازہ ضرور ہو جائے گا ۔ لیکن اس کے لئے یہ دیکھنا ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تک عالم نسواں کی حالت کیا تھی ؟

یورپ نے رومتہ الکبریٰ کے بہت گیت گائے ہیں اور برطانیہ کا قانون رومی قانون کی ترمیم یافتہ شکل ہے ۔ اُسی قانون کی ڈفلی استعماریت کی یادگار کے طور پر ہمارے گلے میں بھی آج تک پڑی ہوئی ہے پہلے تو مستشرقین یہ کہتے تھے کہ اسلامی شریعت اور فقہ نے رومی قانون سے اخذ و استفادہ کیا ہے مگر اب تحقیقات علمیہ نے انہیں اس اعتراف پر مجبور کر دیا ہے کہ اسلامی شریعت میں سابقہ شریعتوں کا غیر منسوخ حصہ تو موجود ہے ، مگر رومی قانون سے خوشہ چینی کا

کوئی واضح ثبوت نہیں ہے اس رومی قانون میں عورتوں کا درجہ باندیوں سے زیادہ نہیں تھا ۔ شوہر کو اُسے قتل تک کر دینے کا اختیار حاصل تھا ۔ عورت کسی سول (Civil) یا پبلک عہدہ پر کام نہیں کر سکتی تھی ، وہ عدالت میں گواہی بھی نہیں دے سکتی تھی ۔ ہماری شریعت نے اگر دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر کر دیا تو اس پر معاندین اسلام بڑا دھند مچاتے ہیں ، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ اس وقت دوسرے ممالک میں عورت کی گواہی سرے سے مقبول ہی نہیں تھی ۔ عورت کسی بچہ کو گود نہیں لے سکتی تھی صرف اس کا شوہر کسی لڑکے کو متبنیٰ بنا سکتا تھا ۔ لڑکی کو گود لینے کا کہیں رواج نہیں تھا ۔ عورت کسی کی ضمانت بھی نہیں کر سکتی تھی نہ کسی کی اتالیق بن سکتی تھی ۔ اس کی ذاتی جائیداد نہیں ہو سکتی تھی وہ کوئی وصیت بھی نہیں کر سکتی تھی نہ کسی سے کوئی معاہدہ کرنے کا اسے اختیار تھا ۔ خلاصہ یہ کہ عورت کی حیثیت رومی قانون میں ”بشر“ (Person) کی نہیں بلکہ ایک ’چیز‘ یا (Thing) کی تھی ۔ پومپائی کی کھدائی میں جو عریاں تصویریں مکانوں میں ملی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو عورتوں کو مردوں سے بالکل الگ تھلگ رکھا جاتا ہو گا یا پھر ان کا قطعاً کوئی احترام ، شرم اور لحاظ نہیں تھا ۔ رومی سوسائٹی میں قحبہ خانے کثرت سے تھے یہ سوسائٹی عورتوں میں بکارت کے تصور سے قطعاً نا آشنا تھا ۔ گستاولی بان کہتا ہے کہ رومی تہذیب کی سماجی اقتصادیات (Social Economy) میں عورتوں کا مطلق حصہ نہیں تھا ۔

رومی تہذیب میں تعدّد ازواج کا بھی رواج تھا ۔ مارک انطونی کی کم از کم دو بیویوں کا حال ہمیں معلوم ہے ۔ عموماً باپ اپنی بیٹیوں کو فروخت کر دیا کرتے تھے ، کبھی کبھی تو بیوی کو مع بچوں کے بیچ ڈالتے تھے ۔ اسپارٹا (Sparta) میں بچیوں کو قتل کرنے کی وجہ سے عورتوں کا تناسب گھٹ گیا تھا تو ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہونے لگے تھے ۔ کبھی اچھی نسل لینے کے لئے اپنی زوجہ کو دوسروں کے پاس بھی بھیج دیا جاتا تھا۔ عام عقیدہ یہ تھا کہ عورت ایک بلائے بے درماں اور (Necessary Evil) ہے ۔ تعلیم و تہذیب کا رواج طوائفوں میں تھا جو امراُ کی تفریح کے لئے اپنی صلاحیتوں کی تربیت کرتی تھیں ۔ آج آزادیِ نسواں کے کھوکھلے نعرے لگانے والے اسلامی شریعت کے اس رویہ پر بھی انگشت نمائی کرتے ہیں کہ قرآن نے خطاکار عورتوں کو تادیب اور سزا کی اجازت دی ہے اور الرجال قوامون علی النساء کہا ہے ۔ مگر فلسفیوں کے باوا آدم افلاطون نے بھی عورتوں کو بچوں اور غلاموں کے خانے میں رکھا ہے اور صاف کہا ہے کہ بشریت کے تمام میدانوں میں عورت کمتر (Inferior) مخلوق ہے ۔ خیر افلاطون تو اگلے وقتوں کا آدمی تھا ۔ آج بھی ڈیل کارینگی جیسا مصنف کہتا ہے کہ تمام کاموں میں ، حتیٰ کہ کھانا پکانے اور سینے پرونے میں بھی مرد عورتوں پر تفوّق رکھتے ہیں ۔ عورتوں کا حسین ہونا بھی ہمارا فریب نظر ہے ، وہ کہتا ہے کہ جانوروں میں بھی نر مادہ سے زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں ۔

قرآن کا اشارہ صرف اسی طرف ہے کہ سوسائٹی میں تحفظ اور حمایت اور کفالت کی ذمہ داری مردوں کی ہے اُن سے شجاعت مطلوب ہے ۔ عورت سے شرم و حیا اور عفت و عصمت کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے تاکہ کسی شخص پر ایسی اولاد کے

پالنے پوسنے کی ذمہ داری نہ پڑے جو اس اولاد کا حقیقی باپ نہیں ہے ۔

بعثت نبوی ؐ سے قبل ایرانی سماج میں بھی عورتوں کو صرف تکمیل خواہش کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا ۔ امرأ کے گھروں میں عورتوں کے ریوڑ بھرے ہوتے تھے ۔ چھٹی صدی عیسوی میں مزدک نے یہ قانون جاری کیا کہ عورتوں کو بھی جائیداد (Property) سمجھا جائے اور نہایت قریبی رشتوں میں بھی شادی کو جائز قرار دے دیا ۔ اس سے ایک ایسی بے مُہار (Permissive) سوسائٹی تشکیل پانے لگی جس میں کچھ پتا نہیں تھا کون کس کے گناہ کا ثمرہ ہے ۔ جب وراثت وغیرہ کے پیچیدہ مسائل قابو سے باہر ہو گئے تب اس بے ہودگی کی روک تھام ہو سکی ۔

مصر اور بابل و نینوا کی تہذیبوں کے ڈنکے بج رہے ہیں ۔ وہاں عورت کو کونسا عزت کا مقام حاصل تھا ؟ اپنے ہندوستان جنت نشاں پر نظر ڈالیے تو منو مہاراج کہتے ہیں کہ عورت پر دن رات کڑی نگرانی رکھنے کی ضرورت ہے ۔ انھیں بالکل باندی بنا کر رکھا جائے ۔ وہ کہتا ہے کہ عورتیں زیورات اور بستر کی دلدادہ ہوتی ہیں ۔ خواہش کی بندی ہیں اور ان کی طینت ہی میں برائی ہے ۔ یہ فطرۃً کمزور مخلوق ہیں ۔ ارادے کی بودی ہیں ۔ کبھی سیدھی نہیں رہ سکتیں ، انھیں ہمیشہ محکوم و مغلوب بنا کر رکھنا چاہیئے اس کے بعد مقطع میں ارشاد ہوتا ہے کہ "شومی تقدیر ، طوفان ، موت ، جہنم ، قید خانہ ، سانپ ، کوئی چیز بھی اتنی خطرناک نہیں جتنی ایک عورت ۔

ہندو سوسائٹی نے انہیں ، "استری دھن "، دیا ، مگر ستی کے رواج نے اسے بالکل بے معنی بنا دیا ۔ صرف ایک ستی کی رسم سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں عورت کا رتبہ کیا تھا ۔ ایک عورت بیک وقت کئی بھائیوں کی زوجہ ہو سکتی تھی ۔ اُسے جوئے میں ہارا جا سکتا تھا ۔ وہ شوہر کی مرضی کے بغیر کسی بچہ کو گود نہیں لے سکتی تھی ۔ جائیداد میں اس کا علیحدہ حصہ نہیں تھا ۔ اس کی شادی بھی کم سنی میں اس کی مرضی کے خلاف اس سے بغیر پوچھے کر دی جاتی تھی ۔ دوسری شادی کا کوئی تصور نہیں تھا اور شادی کے بعد طلاق کا بھی امکان نہیں تھا ۔ شوہر کے مرنے پر اسے بھی زندہ جل جانا پڑتا تھا ۔ آج بھی آئے دن اخبار میں کسی نہ کسی کے جل مرنے کی خبر آتی ہے ۔ نہ جانے وہ کون سا کارخانہ ہے جو ایسے چولہے (Stove) بنا رہا ہے جو صرف ہندو عورت ہی کے ہاتھ سے پھٹتے ہیں اور اس کی جان لے لیتے ہیں ۔ پچھلے دنوں مدھیہ پردیش سے ایک ستی کی بھی خبر آئی تھی کہ پولیس کی ناک کے نیچے باجے تاشے کے ساتھ ایک نوجوان بیوہ کو ستی کر دیا گیا ۔

چینی کہاوت کہتی ہے کہ عورتوں سے مشورہ کرو اور جو وہ کہیں اس کا الٹا عمل کرو ۔ روسی مقولہ ہے کہ دس عورتوں میں ایک روح ہوتی ہے ۔ اطالوی کہتے ہیں کہ گھوڑا چاہے کیسی ہی اعلیٰ نسل کا ہو اسے ایک لگام ضرور چاہیئے اسی طرح عورت بھی خواہ اچھی ہو یا بُری اسے ڈانٹ پھٹکار کر رکھنا چاہیئے ۔ جاپان کی قدیم معاشرت میں عورتوں کو معبدوں میں جانے اور مذہبی رسوم میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی ۔ چین میں بھی یہی حال تھا ۔ ہندوستان میں بھی وہ دیوتاؤں کو ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی اور ایام معمولہ میں اسے رسوئی میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی ۔ دیوداسی کا

رواج آج تک موجود ہے پچھلے دنوں اخباروں میں جنوبی ہند کے صرف ایک ضلع نظام آباد میں کئی ہزار دیوداسیوں کے وجود کا تذکرہ اخباروں میں آچکا ہے ۔ عرب سوسائٹی کا قبل از اسلام حال یہ تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کی بیویاں بیٹے کے تصرف میں آجاتی تھیں ۔ یتیم بچیوں سے ان کے نگران (Guardians) زبردستی نکاح کر لیتے تھے ۔ معصوم بچیوں کو بتوں کی قربان گاہ پر چڑھا دیا جاتا تھا ۔ چین جاپان اور ہندوستان میں بھی بچیوں کو دیوتاؤں پر قربان کر دیا جاتا تھا ۔ عرب جاہلیتہ میں یہ رواج تھا کہ بچی کو چھ سال تک پرورش کرتے تھے ۔ جب وہ چھ سال کی ہو جاتی تو اس کی ماں سے کہا جاتا تھا کہ اسے اچھے کپڑے پہنادو ، خوشبوئیں لگا دو اور خوب سجاؤ سنوارو تاکہ اسے اس کی 'ماں' کے پاس بھیج دیا جائے ۔ جب اسے سنوار دیا جاتا تو باپ اس معصومہ کی انگلی پکڑ کر صحرا میں کھودے ہوئے ایک گڑھے کی طرف لے جاتا اور بچی سے کہتا کہ اس میں جھانکو تمہاری ماں نظر آئے گی وہ ننھی جان جھانکنے کے لئے جھکتی تو اسے پیچھے سے دھکا دے کر گڑھے میں ڈال دیتا ۔ وہ روتی چلاتی رہتی اور یہ پدر بزرگوار گڑھے کو مٹی سے پاٹ کر برابر کر دیتے تھے ۔ قرآن نے اس کا سخت نوٹس لیا ہے ۔ واذا الموءودة سئلت بای ذنب قتلت قیامت کے دن اس معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ تیرا گناہ کیا تھا جو تجھے قتل کیا گیا ؟ ظاہر ہے کہ وہ بیچاری گناہ و ثواب کے نام سے بھی آشنا نہ رہی ہوگی ۔ تو گناہ نعوذ باللہ ۔ اللہ تعالیٰ نے کیا جو اُسے بچی بنا کر پیدا کیا!

مہاتما بدھ کا خیال تھا کہ ایک انسان کامل (Perfect-man) اور ایک عورت کا جوڑ نہیں ۔ انہوں نے جب نروان پانے کا ارادہ کیا تو اپنی متعدد بیویوں کو چھوڑ دیا ۔ عورت کو نروان بھی نہیں مل سکتا یہ بھی مردوں کی ٹھیکیداری ہے ۔ عورت کی صحبت میں بھی کسی کو معرفت حاصل نہیں ہو سکتی ۔ مہاتما بدھ کے لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے ۔ لیکن حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام اور مہاتما بدھ دونوں کے وجود میں آنے کے لئے عورت کا ہونا بہر حال ضروری ہوا ، یہی ایک پوائنٹ ایسا تھا جو ان دونوں مذاہب میں عورت کو اعلیٰ ترین بلکہ مردوں سے افضل مقام دلانے کے لئے کافی ہو سکتا تھا ۔ بہت سے مذاہب میں دیویوں کا تصور موجود ہے مگر عورت کی عزت کا تصور نہیں ہے ۔ وہ مذاہب جو ایک دیوی کو طاقت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں ۔ جہیز میں ایک ٹی وی یا ایک اسکوٹر نہ ملنے پر اپنے گھر کی دیوی کو مٹی کا تیل چھڑک کر خاکستر بنانے سے نہیں شرماتے ۔ بدھ مت میں سارا زور ترک و تجرید اور تجرد پر دیا گیا ہے ۔ پھر بھی چین جاپان اور مشرق بعید وغیرہ میں کروڑوں بدھ مت کے پیرو ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں ۔ مشرق بعید کے بعض ممالک تو ایسے ہیں جہاں عیاشی کے لئے مغرب اقصیٰ تک سے لوگ کھنچے چلے جاتے ہیں ۔ اس کا مطلب صاف یہی ہوا کہ تجرد کی یہ تعلیم ، "اُسوۂ حسنہ" نہیں بن سکتی تھی اس لئے کہ اس کا اتباع بشری طاقت سے باہر تھا اور لایکلف الله نفساً الاوسعها

ابھی سیرۃ طیّبہ کے صرف ایک نقطے کے ایک جز پر گفتگو کرنے کے لئے تمہید بھی پوری نہیں ہوئی ہے مناسب یہ ہو گا کہ جن دو مذہبوں سے اسلام کا براہ راست واسطہ تھا ، جو شریعت موسوی و شریعت عیسوی کی تصدیق کرنے آیا

تھا ۔ ان شریعتوں کا سرسری جائزہ بھی لے لیا جائے تاکہ عالمِ بشریت کے نصف حصہ یعنی عالم نسواں پر رحمۃ العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے بے پایاں احسانات کا ہلکا سا تصور قائم ہو سکے ۔

پہلے یہودیت کی طرف دیکھیے ۔ راڈویل (Rodwell) کہتا ہے کہ ربیون (Rabbis) یعنی احبار یہود کی رائے میں عورت بن کر پیدا ہونا بڑی ہی شرم کی بات ہے ۔ وہ دعا مانگتے ہوئے کہتے ہیں:

Blessed are thou O Lord our God King of the universe who hath not make me a woman.

شریعت موسوی بھی عورتوں کو ان کا جائز مقام نہ دے سکی ۔ عورت کے قول و قسم کا یہود میں کوئی اعتبار نہیں ، اسے ناپاک سمجھا جاتا تھا ۔ توراۃ کا بیان ہے کہ عورت کو مرد کے وجود میں سے پیدا کیا گیا ۔ اسی نے آدم کو جنت سے نکلوایا ۔ یہودی خرافات (Myths) کے مطابق گناہ اور نافرمانی کا آغاز عورت ہی نے کیا ۔ گویا ہمارے تمام مصائب و آلام ، رنج و محن ، بدبختی و شقاوت کا مصدر اماں حوّا ہیں ، وہ نہ ہوتیں تو باوا آدم سدا جنت ہی میں رہتے ۔ وہ نہ ہوتیں تو عیسائیت کا گناہ ابدی (Eternalsin) کا نظریہ بھی نہ ہوتا ، جس سے استغفار کے لئے کلیساؤں میں ہجوم رہتا ہے ۔ اب اس سے زیادہ عورت کی توہین اور کیا ہو گی کہ اُسے اخراج آدم کا ذمہ دار اور سارے گناہوں کی جڑ سمجھا جائے ۔

یہودیت میں عورت کو کوئی اختیار نہیں ۔ وہ اپنی مرضی سے شادی نہیں کر سکتی اسے حق رائے دہندگی بھی حاصل نہیں ہے ۔ مگر بیٹی کو باپ کے ترکہ سے حصہ ملتا ہے بشرطیکہ مرحوم کا کوئی بیٹا موجود نہ ہو (Numbers xxvii 8-9) O ۔ اسلام نے بیٹی کو وارث بنانے کے لئے یہ شرط نہیں رکھی ۔ تعدد ازواج کی اجازت دونوں عہد ناموں میں موجود ہے ۔ انبیا کا فعل امت کے لئے نمونہ ہوتا ہے اور عہد ناموں میں انبیاء کی متعدد بیویاں ہونے کے بہت سے شواہد موجود ہیں ۔ یہودیت میں وحدتِ ازدواج (Monogamy) ربّیون کا اجتہاد ہے ، صحائف سماوی کا حکم نہیں ہے ۔ شریعت موسوی میں تعدد ازواج کی رخصت اور اباحت برقرار ہے ۔ یہودیت میں عارضی شادی (متعہ) کی اجازت بھی ہے ۔ طلاق کے بارے میں ایک فرقہ کا خیال یہ ہے کہ اگر سالن میں نمک زیادہ ہو جائے تو اتنی سی بات پر بھی بیوی کو طلاق دی جا سکتی ہے ۔ اسلامی فقہ کا روّیہ یہ ہے کہ کھانا پکانا یا گھر کا کام کاج کرنا عورت کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ شوہر کی ذمہ داری ہے کہ وہ بیوی کو کھانا فراہم کرے ۔ اب وہ پکاتی ہے یا گھر کا کام کاج کرتی ہے تو یہ اس کا اخلاق کہیئے ، شرافت کہیئے ، سوسائٹی کا رواج کہیئے ، کچھ بھی کہہ لیجئے مگر اس پر ایسا فرض نہیں ہے کہ وہ یہ نہ کرے تو اسے طلاق دے دی جائے ۔ ایک ربّی تو صحائف سماوی کی سند پر یہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو اپنی بیوی سے زیادہ خوبصورت عورت مل رہی ہو تو وہ اپنی بیوی کو نکال باہر کرے ۔ طلاق کا شوہر کو سو فیصدی اختیار اور آزادی ہے ، مگر عورت کسی حال میں طلاق طلب نہیں کر سکتی ۔ لڑکی کا باپ داماد کو الٹا مہر دیتا ہے ۔ شادی سے پہلے اگر استقرار حمل ہو گیا ہو تو شادی کے بعد وہ جائز سمجھا جائے گا اور مولود کو دونوں کی ملکیت مانا جائے گا ۔

عیسائی یہودیوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ ان کی وجہ سے عیسائیت میں بھی عورت کا درجہ گھٹا ہے ۔ بچہ کی ولادت پر نفاس اور طہارت کی جو مدت مقرر ہے جسے ہم چھلا کہتے ہیں ۔ بچی کے پیدا ہونے پر وہ مدت دوگنی ہو جاتی ہے (Leveticus xii/1-5) عہد نامہ عتیق میں کہیں عورتوں کی تعریف نہیں ہے اگر ہے تو اُس خاتون کی جس نے ایک ایسے شخص کو سوتے میں قتل کر دیا تھا جس نے اس کے گھر میں پناہ لے رکھی تھی ۔

اب ذرا عیسوی شریعت کا جائزہ لیجئے ۔ بائبل کے بعض (Versions) حضرت عیسیٰؑ پر اپنی والدہ محترمہ کی نافرمانی تک کا الزام لگاتے ہیں ۔ یہودیت نے اخراج آدم کا جو قصہ بیان کیا ہے عیسائیت نے اسے تسلیم کر لیا ہے ۔ یعنی پہلا گناہ حوّا نے کیا اب جو بھی بشر پیدا ہو گا وہ پیدائشی گناہگار ہو گا اور اسے ایک نجات دہندہ ، ایک مسیح کی ضرورت ہو گی تاکہ وہ اپنے خون سے غضبناک قاہر اور منتقم خدا کی آتش انتقام کو فرو کر سکے ۔ اسلام کا واضح اعلان یہ ہے کہ لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ ایک کا بوجھ دوسرا کوئی نہیں اٹھائے گا لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت جو جیسا بوئے گا ویسا ہی کاٹے گا ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی کفارہ کے لئے مصلوب نہیں ہوئے ۔ ما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم انھیں قتل کیا گیا نہ پھانسی دی گئی بلکہ قاتلوں کو مغالطے میں ڈال دیا گیا ۔

بہر حال عیسائیت کے طرز فکر میں بھی عورت کا اولین اور بنیادی مجرم ہونا موجود ہے ۔ سینٹ انطونی ، سینٹ برنارڈ ، سینٹ جیروم جیسے بڑے مذہبی رہنما بھی عورت کو حبالۃ الشیطان شیطان کا پھندا اور عقرب نیش زن (A scorpion everready testing) جیسے لفظوں سے یاد کرتے ہیں ۔

اسلام نے عورت کو کیا رتبہ دیا وہ اس سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے مال تجارت کا امین بن کر کام کیا ۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو نکاح کا پیغام دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرما لیا ۔ حالانکہ اکثر روایات کہتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۵ سال تھی اور حضرت خدیجہؓ ۴۰ سال کی ہو چکی تھیں ۔ اس ازدواج میں بھی اللہ کی حکمت تھی ۔ اس سے حضّور کو فکر معاش سے کسی قدر آزادی ملی جس کی طرف قرآن میں بھی اشارہ ہے ۔ ووجدک عآئلاً فاغنیٰ حضرت خدیجہؓ جب تک حیات رہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا نکاح نہیں فرمایا ۔ اگر صرف خواہش کی بات ہوتی تو آپ ایسا کر سکتے تھے ۔ پھر جب آپ کی بعثت کا وقت آیا ۔ آپ غار میں بیٹھ کر مراقبہ ، مناجات ، تحنث اور تفکر فرماتے رہے ، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کا عظیم ترین انسان بنانے کے لئے کیسے کیسے تجربوں سے گزارا ہو گا ۔ جب یہ تربیتی کورس ختم ہوا تو پہلی وحی نازل ہوئی اقرا باسم ربك الذی خلق ، خلق الانسان من علق ۔ یہ گویا آج کی سائنس اور علوم کا دروازہ کھلنے کا اعلان تھا ، اس کے بعد کی صدیوں میں کیا ہوا یہ ایک دوسری ہی داستان ہے ۔ قصہ مختصر یہ کہ بقول شاعر

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بشست

ایسے عظیم تجرباتی لمحوں میں اگر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمت نہ بندھاتیں اور آپ کو اخلاقی کمک نہ پہنچاتیں تو سوچئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا تجربہ فرماتے ۔ وہ سب سے پہلے رسالت پر ایمان لائیں ۔ اس سے بڑا عورت کا اکرام اور کیا ہو گا ۔ ان کے جگر گوشہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے لئے حضورؐ نے فرمایا کہ فاطمۃؓ سیدۃ نساء اھل الجنۃ شریعت مصطفویؐ نے سماجی معاملات سے بحث کرتے ہوئے عورتوں کو کہیں نظر انداز نہیں کیا ۔ عورتوں اور مردوں پر قانون کا یکساں اطلاق کیا ہے ۔ ان کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں خواہ وہ وراثت ہو ۔ نکاح ہو ، طلاق ہو ، پرورش اولاد ہو ، حقوق زوج ہوں ، عبادات ہوں یا معاملات عورت اور مرد ایک سطح پر نظر آئیں گے ۔ اگر حضورؐ اکرم اپنے گرد و پیش کے قانون سے اخذ و استفادہ کرتے تو ہرگز بعض حقوق عورتوں کے لئے تجویز نہ فرماتے ۔ علم اور تعلیم میں بھی انھیں مردوں کے برابر رکھا اور فرمایا طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ یہ خود اس کی دلیل ہے کہ عالمِ بشریت کے نصفِ حصہ کو آرایش کائنات کے عمل میں آپ برابر کا شریک و سہیم دیکھنا چاہتے ہیں ۔

اسلام کا یہ نظریہ نہیں ہے کہ حوّا نے آدم کو جنت سے نکلوایا ۔ بلکہ اللہ نے آدم اور حوّا دونوں سے کہا تھا کہ اس شجر ممنوعہ کے قریب نہ جانا، ورنہ تم دونوں گنہگار ہو گے ۔ مگر شیطان نے دونوں کو دھوکا دے کر ارتکابِ گناہ کرا دیا ۔ اس میں دونوں برابر کے شریک ہیں ۔

وقلنا یآدم اسکن انت وزوجك الجنة وکلا منها رغدا حیث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتکونا من الظالمین. فازلهما الشیطان عنها فاخرجهما مما کانا فیه

اب سوچئے کہ عالمِ بشریت کی نصف آبادی پر جو گناہِ ابدی کا الزام عائد کیا جاتا رہا ہے اس سے اس طبقہ کی برأت کا نہ صرف اعلان کرنے والا بلکہ اپنی صنف کو بھی اس میں برابر کا شریک کہنے والا ، عالم انسانیت کا محسن ہوا یا نہ ہوا صلی اللہ علیہ وسلم

شجر ممنوعہ کی اسلام نے کہیں تشریح نہیں کی ہے ۔ اب اپنی اٹکل (wild guess) سے آپ جو چاہیں سمجھ لیں ، کسی نے اسے سیب کہہ دیا، کسی نے علم کا درخت سمجھ لیا ۔ کسی نے جنس کا جھاڑ مان لیا ۔ کوئی اسے خمار گندم بتا رہا ہے ۔ قرآن کی بلاغت اسی میں ہے کہ بس اسے ممنوع بتا دیا جائے اللہ کے ہر علم میں ہمارا شریک ہونا کیا ضروری ہے؟

آدم علیہ السلام نے بھی جب توبہ و استغفار کیا تو اللہ سے یہ نہیں کہا کہ یا اللہ مجھے میری زوجہ نے دھوکا دیا ۔ نہ یہ کہا کہ یا اللہ مجھ سے غلطی ہوئی ۔ بلکہ قرآن کے واضح الفاظ ہیں :- ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین (اے ہمارے رب ہم دونوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے اگر تو ہم دونوں کو معاف نہیں کرے گا اور ہم دونوں پر رحم نہیں کرے گا تو یقیناً ہم ٹوٹے میں رہ جائیں گے) الرجال قومون علی النسآء پر غل غپاڑا کرنے والے بتائیں کہ عورت کو بنیادی گناہ کا مرتکب کہنا ، اُس کے سبب سے قیامت تک ہر انسان کا گناہگار اور ایک نجات دھندہ کا

محتاج پیدا ہونا ، عورت کی توہین ہے یا اس فطری قانون کے اظہار میں توہین ہے کہ مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے ۔ اسلامی نظریہ میں آدم اور حوّا کا گناہ ان کے ساتھ ختم ہو گیا ، اللہ نے انھیں معاف کر دیا مگر یہودیت اور عیسائیت نے معاف نہیں کیا ۔ اللہ نے انھیں اپنا خلیفہ بنا دیا اور ساری کائنات کو ان کے لئے مسخر کر دیا ۔ اگر انہیں معاف نہ کرتا تو خلیفہ بھی نہ بناتا ۔ قرآن جہاں کہیں انعام خداوندی کا ذکر کرتا ہے یا عقاب و عتاب خداوندی سے ڈراتا ہے وہاں مرد اور عورت کو ایک درجہ میں رکھتا ہے (جیسے سورہ ۴ آیت ۱۲۹) اور دعا کی یہ تعلیم دیتا ہے کہ ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریتنا قرۃ اعین وجعلنا للمتقین اماما (اے اللہ ہماری بیویوں اور ہماری اولادوں کو ہمارے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے اور ہمیں پرہیز گاری کی زندگی بسر کرنے والوں میں ممتاز کر دے ۔

مغربی تہذیب کی نام نہاد ترقی پسند اور روشن خیال (Permissive) اباحتی سوسائٹی یہ کہتی ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا حیوان پن ہے ۔ بیوی ایک ہی رکھو ۔ تعلقات چاہے سو عورتوں سے قائم کر لو ڈسکو تھک میں جاؤ ، نائٹ کلبوں میں داد عیش دو ، اس میں کوئی عیب نہیں مگر اسلام نے اس کی رخصت دے دی کہ جسے کسی بھی سبب سے واقعی ضرورت ہو اور وہ عدل کر سکتا ہو تو ایک سے زیادہ نکاح کر لے مگر زانی اور زانیہ کے لئے سنگ سار کئے جانے کی سزا تجویز کی ۔ تو یہ حیوانیت ہو گئی!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

مفردات ادویہ کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے اس میں سنکھیا کے درجنوں فائدے لکھے ہوں گے ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر شخص سنکھیا کھانا شروع کر دے ، ہاں اس کی رخصت ہے کہ جب ایسے حالات ہوں جن میں سنکھیا کے استعمال کی ضرورت ہو تو طبیب اس کو تدابیر کے ساتھ استعمال کر سکتا ہے ۔ یہ کبھی کوئی نہیں کہتا کہ جس نے سنکھیا کے فائدے بیان کئے ہیں وہ حیوان تھا یا احمق ۔ کسی چیز کی رخصت ہونا اور بات ہے اس کا فرض یا واجب کیا جانا دوسری بات ہے ۔

قرآن کریم کی پوری ایک سورۃ کا عنوان "النساء" ہے ۔ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یآیھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء واتقوا اللہ الذی تسآلون بہ والارحام، ان اللہ کان علیکم رقیبا

یہاں سارے عالمِ بشریت سے خطاب ہے ۔ اس میں مرد اور عورت دونوں کو تخلیق میں مساوی حصہ دیا ہے اور "نفسِ واحدۃ" کے دو مظاہر بتایا ہے ۔ اس سے زیادہ مساوات کا علمی اثبات اور کیا ہو گا ؟ یہاں نفس استعمال ہوا ہے ۔ یہ لفظ عربی میں مونث ہے لیکن مذکر و مونث دونوں پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ حقوق انسانی میں عورت اور مرد کا درجہ برابر ہے ۔ اس میں عورت کی عزت و احترام کرنے کا حکم بھی شامل ہے ۔ والارحام

کہہ کر ماں کی طرف انتہائی بلیغ اشارہ کر دیا ہے جس سے بڑی شفیق ہستی سطحِ ارض پر انسان کے لئے کوئی نہیں ہو سکتی جس سماج میں عورت کو ایک ہستی نہیں ایک چیز اور (Chattel) سمجھا جاتا ہو ، وہاں یہ ایک انتہائی ترقی پسند اور انقلابی صدا تھی جو اللہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان صداقت ترجمان پر جاری فرمائی ۔ کہاں تو وہ مذاہب ہیں جو عورت کو نجس اور ناپاک بتا رہے ہیں ۔ وہ دیوتاؤں کو ہاتھ نہیں لگا سکتی ، ایام معمولہ میں رسوئی کے اندر قدم نہیں رکھ سکتی ، کہاں یہ اتقوا ربکم اور اتقوا اللہ والارحام یعنی جو خشیت جو احترام جو محبت اللہ کے لئے ہے وہی اَرحام کے لئے ہو ۔ دونوں کا موازنہ کر لیجئے اور سوچئے کہ اس سے زیادہ مرتبہ عورت کو کس نے دیا ہے ؟ ماں کے لئے صرف رسول اکرمؐ نے علیہ الف الف صلواۃ و تحیّات نے یہ فرمایا ہے کہ ۔ الجنۃ تحت اقدام الامھات جنت ماں کے پیروں کے نیچے ہے ۔ عَالَمِ بَشریت میں جیسا کہ میں نے کہا آدھا عالمِ نسواں ہے اور باقی آدھا بھی ماؤں کے بطن سے پیدا ہوا ہے ، اس لئے حضورؐ کے اس فرمان کی اپیل سارے عَالَمِ بَشریت کے لئے ہے ۔ جنت جو ایسی قیمتی چیز ہے کہ جان عزیز کے بدلہ میں ملتی ہے ۔ ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ ۔ گویا جان سے بھی زیادہ پیاری ہے اور اس کی صفت و ثنا قرآن میں بار بار بیان ہو رہی ہے جنت کی ترغیب سے جہاد کا جذبہ اور اعمال صالحہ کا شوق پیدا کیا جا رہا ہے ۔ اس کی لطافت ، نظافت ، پاکیزگی اور دل ربائی کا بیان انسان کی سمجھ میں شمہ بھر نہیں آ سکتا جہاں لطیف اور شفاف نہریں ہوں گی پھولوں کی طرح کھلے ہوئے چہرے ہوں گے وغیرہ وغیرہ ۔ یعنی سارے جہاں کی کل نعمتیں جنّت کی کسی ایک نعمت کا بدل ہونا تو کجا اس کی مثال میں بھی نہیں لائی جا سکتیں ، اُس جنّت کو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کے قدموں کے نیچے ڈال دیا ۔ اب اس سے حضُور کے ارشادِ گرامی کی بلاغت کا اندازہ کر لیجئے اور سوچئے کہ کیا کسی دوسرے مذہبی قائد نے ایسا رتبہ ماں کو دیا ہے ؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بچپن ہی میں یتیم و یسیر ہو گئے تھے ، انھیں ذاتی تجربہ تھا کہ یتیم بچوں پر کیا گذرتی ہے ۔ قرآن کریم میں بھی متعدد مقامات پر تاکید ہے کہ یتیموں پر شفقت کی جائے ، ان کے مال پر ناجائز قبضہ نہ کیا جائے ، انھیں ڈانٹ پھٹکار نہ کی جائے ، ان پر اپنا حکم نہ چلایا جائے وغیرہ ۔ فاماالیتیم فلاتقھر واما السآئل فلاتنھر ۔ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے بچے یتیم بھی ہوتے رہے ہیں اور جب تک یہ کارخانہ حیات چلے گا یتیم بچوں کا مسئلہ ترقی یافتہ دنیا میں بھی اسی طرح باقی رہے گا جیسے وہ قبائلی اور بدوی نظام میں تھا ۔ یعنی یہ ایک ابدی اور مستمر مظہر حیات (Phenomenon) ہے ، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شخصی تجربہ ایک تو اس لئے کرایا گیا کہ آپ یتیم اور بے سہارا بچوں کے درد و کرب سے حق الیقین کے درجہ میں واقف ہو جائیں ؛ دوسرا سبب شاید یہ تھا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساخت پرداخت آموزش و پرورش ماں باپ کے سایۂ شفقت میں ہوتی تو آپ کو انسانوں کا تربیت دیا ہوا ایک خوش اخلاق و پاکیزہ اطوار انسان کہا جاتا ۔ مگر اللہ کو آپ کی تربیت کی پوری ذمہ داری خود ہی قبول کر کے یہ معجزہ بھی دنیا کے سامنے پیش کرنا تھا کہ ایک یتیم بچہ ساری دنیا کے لئے شفقت و رافت ، رحمت و سعادت کا نمونہ بن سکتا ہے

ساری دنیا میں جتنے یتیم ہوئے ہیں ، جو آج ہیں ، اور جو کل ہوں گے ، ان کے حق میں آواز اٹھانے والا اور ان کے حقوق غصب کرنے والوں کو عذابِ آخرت کی وعید سنانے والا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہوا ہے ؟ ہزاروں یتیم خانے کھول دینا کچھ دشوار کام نہیں ہے ، ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے آواز بلند کرنا اور اُسے ابدی و سرمدی قانون بنا دینا سب سے بڑا کام ہے اور یہ بھی اسی محسن انسانیت (روحی و ابی و امّی فداہ) کا عالمِ بشریت پر احسانِ عمیم ہے ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

ان میں سے ہر پہلو ایک جداگانہ کتاب چاہتا ہے ۔ میرے سامنے ایسے اور اتنے نکتے آ رہے ہیں کہ حیران ہوں کس کو چھوڑوں اور کس کو بیان کروں ۔ عورتوں سے متعلق یہ جائزہ قدرے طویل ہوگیا ، لیکن میرے حساب سے اب بھی تشنہ رہ گیا ہے ، ہزاروں باتیں کہنے کی ہیں ۔ درجنوں حقوق وہ ہیں جو عورتوں کو اسلام نے پہلی بار دیئے ہیں ۔ لیکن اس زمانہ میں ایک مطلقہ عورت کے نان و نفقہ کا مسئلہ لے کر شریعتِ اسلامیہ میں تصرف اور غتر بود کرنے کی جو کوشش کی گئی اس میں مسئلہ کو اس طرح پیش کیا گیا جیسے اسلام ایک فرسودہ مذہب ہے اس کے قوانین ظالمانہ اور بے رحمانہ ہیں ۔ جاہلیت ، سفاکی اور سنگ دلی کا مظہر ہیں ، اور اب نئی تہذیب کے پروردہ ان میں ترمیم و تنسیخ کر کے ، انھیں عادلانہ و منصفانہ بنانا چاہتے ہیں ۔ سارا نیشنل پریس ایک دم جاگ اٹھا اور مظلوم مسلمان عورت کے لئے مگرمچھ کے آنسو بہانے لگا ، کسی نے اتنی انسانیت اور انصاف پسندی کا بھی مظاہرہ نہیں کیا کہ شریعت کے حامیوں سے بھی ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت طلب کر لیتے اور ان کی بات کو بھی عوام کے سامنے پیش کر دیتے ۔ ایسے مسائل تو لاکھوں میں ایک عورت کے سامنے پیش آتے ہوں گے کہ طلاق کے بعد اس کی کفالت کرنے والا کوئی نہ رہے ، اگر ایسے بے سہارا اور مظلوم انسانوں سے ہمدردی واقعی ہے تو اسی نیشنل پریس نے کبھی ان بے گناہ مظلوموں کی حمایت میں آواز کیوں نہیں اٹھائی ، جن کی کفالت کرنے والے فرقہ وارانہ فسادات میں مارے جاتے ہیں ۔ جن کے گھر اور دکانیں جلا دی جاتی ہیں ۔ جن کے بچوں کو یتیم اور گھر والیوں کو بیوہ کر دیا جاتا ہے ۔ ان کے نان و نفقہ کی ذمہ داری تو تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵ بھی نہیں ہے ۔ اس ایک مسئلہ میں ان کے شور شرابے سے صاف ظاہر ہوا کہ ہمدردی دراصل مطلقہ سے نہیں ہے ۔ اس ہنگامہ کا مقصد شریعت اسلامیہ کی جڑ پر کلہاڑی چلانا ہے ، جس نے مسلمانوں کے تشخص کو باقی رکھا ہے ۔ دفعہ ۱۲۵ کو ایسی شد و مد سے پیش کیا گیا جیسے یہ سارے مسائل و مشکلات کا واحد حل ہے حالانکہ دو باتیں بالکل منطقی و اُصولی ہیں جنھیں ہر غیر متعصب اور منصف مزاج انسان سمجھ سکتا ہے ۔ ایک تو یہ کہ اسلام میں "کنبہ داران" نہیں ہے ۔ ایک معاشرتی جابدہ ہے ۔ مسلمان اپنی بیٹی کو گھر سے رخصت کر کے مکمل بے تعلقی اختیار نہیں کرتا ۔ وہ اس کا باپ رہتا ہے ۔ لڑکی کی ماں اُس کی ماں رہتی ہے ، بھائی بہن اس کے بھائی بہن رہتے ہیں ۔ باپ کی جائیداد میں اس کا حصہ رہتا ہے ۔ شوہر پر اس کا مہر ادا کرنا واجب ہوتا ہے ۔ شوہر کے مرنے پر اس کی جائیداد میں بھی اس کا حصہ ہوتا ہے ۔ اس کی کفالت ایک طرف سے نہیں کئی طرف سے ہوتی ہے ۔ طلاق کے بعد سابق شوہر

اس کے لئے بالکل غیر آدمی ہو جاتا ہے ، اس سے پیسے لے کر زندگی بھر کھاتے رہنا اسلام کے نزدیک ناجائز اور حرام آمدنی کھانا ہے ۔ اچھا میں نے یہ تسلیم کر لیا کہ اسلام کا نقطۂ نظر وحشیانہ ہے ۔ اب آپ اس مسئلہ کا حل بتائیے کہ الف نے اپنی زوجہ ب کو طلاق دی ۔ ب نے عدالت میں دعویٰ کیا عدالت نے دفعہ ۱۲۵ کی رو سے ڈگری بھی دے دی کہ الف اسے تاحیات پانچسو روپیہ ماہانہ نان و نفقہ دیتا رہے گا ۔ الف نے عدالت کے فیصلہ کو مان لیا ۔ دو تین ماہ تک نان و نفقہ ادا کیا ۔ ایک دن اچانک اس کا ہارٹ فیل ہوگیا ۔ اب ب کا ذمہ دار کون ہو گا ؟ دفعہ ۱۲۵ یہ ضمانت تو نہیں دیتی کہ وہ سابق شوہر قیامت کے بور یے بھی سمیٹے گا ۔

ایک اور پہلو بھی توجہ کا مستحق ہے ۔ طلاق کے بعد جو عورت اپنے ماں باپ کے گھر آجاتی ہے ۔ ماں باپ اس کی کفالت کرتے ہیں ، تو معاشی بوجھ والدین پر ہوتا ہے ۔ آج تک کسی مطلقہ کے ماں باپ نے یہ نہیں کہا ہو گا کہ وہ اس کی کفالت کے بوجھ سے مرے جاتے ہیں ۔ مسلمان خاندانوں میں ہزاروں لاکھوں مثالیں ادنیٰ سی تلاش کے بعد مل جائیں گی کہ ماں باپ نے یا بھائیوں نے اپنی مطلقہ بیٹی یا بیوہ بہن اور اس کے بچوں کی پرورش کی ، اور کبھی اس کو اپنے لئے بوجھ نہیں سمجھا ۔ ایسے درجنوں خاندانوں سے میں خود واقف ہوں ۔ عدّت کے بعد پرورش نہ کرنے کی فریاد ماں باپ کی طرف سے ہوتی تو یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی ۔ بس یہ بھی حالات کی ستم ظریفی اور زمانے کی نیرنگیاں ہیں ، بقول شاعر:

ظہور حشر نہ کیوں ہو جو کلچڑی کنجی ،
حضورِ بلبلِ بستاں کرے نواسنجی ،

ہمیں آدمیت کا درس وہ دے رہے ہیں جو عورت کو ایک ٹی وی یا ایک اسکوٹر کے لالچ میں راکھ کا ڈھیر بنانے سے نہیں شرماتے ۔

وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں ، میری مان جائیے
اللہ تیری شان کے قربان جائیے

اس لئے میں نے ذرا نسبتاً وسیع سیاق و سباق میں یہ بتایا کہ عورت کی عزت و احترام کے حقوق اور مفادات کی نگہداشت ، اسلام سے زیادہ کسی مذہب نے نہیں کی ۔ ہندو کوڈبل ہو یا مغربی عائلی قوانین ، ان میں جو تبدیلیاں اب پچاس ساٹھ برسوں کے اندر ہوئی ہیں یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال قبل تجویز فرما دی تھیں ۔ بعد میں ان نام نہاد ترقی پسندوں نے محض آپ کے حکیمانہ قوانین کا چربہ اڑایا ہے ۔ بقول شاعر

گر گفتہ ای کہے زوفا حرفِ آشنا
آں ہم حکایتے است کہ ازمن شنیدہ ای

صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں : ابھی چند ماہ پہلے ٹیلی ویژن پر ایک انٹرویو آ رہا تھا ۔ انٹرویو دینے والی کوئی خاتون تھیں جو سپریم کورٹ میں وکیل ہیں ۔ ان سے مختلف سوالات خصوصاً عورتوں سے متعلق عائلی قوانین کے بارے میں کیے جا رہے تھے اور وہ ہندوستانی قانون کی پوزیشن بتا رہی تھیں ۔ پوچھنے والی خاتون نے کہا کہ ایک مسئلہ اور

بھی اکثر سامنے آتا ہے کہ باپ اپنی اولاد سے کسی سبب سے ناراض ہو جاتا ہے اور وہ اپنی ساری جائیداد کسی ادارے کے یا کسی غیر شخص کے نام لکھ کر اپنی اولاد کو محروم کر جاتا ہے ۔ ان وکیل خاتون نے کہا کہ جی ہاں یہ مسئلہ تو بڑا گمبھیر ہے اور اس سے اکثر سابقہ پڑتا ہے ، مگر ابھی ایک دو سال پہلے میں پیرس گئی تھی ، وہاں کے قانون میں اس کی اچھی گنجائش پیدا کر لی گئی ہے جس سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے ، وہ یہ کہ وصیت کا نفاذ صرف ایک تہائی جائیداد پر ہو گا ہمیں بھی اس اصلاح سے فائدہ اٹھانا چاہیئے ۔

ان محترمہ بیرسٹر صاحبہ پر جو آفاق پیرس جا کر روشن ہوئے ، ہمارے شارع علیہ السلام نے آج سے چودہ سو سال قبل اس مسئلہ کو اپنی ایک ادنیٰ سی جنبش لب سے حل کر دیا تھا ۔ تعصب اور تنگ نظری نے آپ کو اتنا موقع ہی کہاں دیا ہے کہ فقہ اسلامی کا مطالعہ کر کے اس میں یہ تلاش کر لیتے کہ سماجی فلاح اور عام انسانوں کی بھلائی کے لئے اس میں کیا کیا کچھ ہے ۔

اب میں عالمِ بشریت کے بعض دوسرے ایسے اہم مسائل کا تذکرہ کروں گا جنھوں نے ساری دنیا کو زیر و زبر کر رکھا ہے آج جو سیاسی کشمکش ہے ، استحصال اور خود غرضی ہے ، بے یقینی اور سرگرانی ہے اس کا سبب اصلی یہی ہے کہ نئی دنیا کو ان مسائل کا علم تو ہے مگر ان کا حل یا تو معلوم نہیں یا معلوم ہے تو اسے نافذ کرنا کسی ایک طبقہ کے مفاد کو مجروح کرتا ہے ۔

آج اقوام متحدہ کے منشور حقوق انسانی (Charter of Human Rights) کی بہت دہائی دی جاتی ہے لیکن یہ سب زبانی جمع خرچ ہے ، اگر حقوق انسانی کی پامالی پر ضمیر ذرا سی بھی ملامت کرتا تو آج چالیس لاکھ سے زیادہ فلسطینی چالیس سال سے پناہ گزین کیمپوں میں پڑے نہ ہوتے ۔ یہ حقوق کا چارٹر کہیں تو نافذ ہوتا ہے کہیں معطل ہو جاتا ہے کہیں صرف دہائی دینے کے کام آتا ہے ۔ اس میں پہلا درس مساوات کا ہے کہنے کے لئے بڑی اچھی بات ہے کہ سب انسان برابر ہیں ، مگر اسے عمل میں برتنا اتنا آسان نہیں ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا وہ حقوق انسانی کا اصلی اور پہلا (Charter) ہے ۔ آپ نے فرمایا:

لا فضل لعربی علی عجمی ولا بعجمی علی عربی الا بالتقوی کلکم من ادم و اٰدم من تراب وان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

(کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ، نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے ۔ یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے) ۔

اسلامی نظریۂ مساوات کا اثر پہلے دن سے اسلامی معاشرہ میں ظاہر ہو گیا تھا جب ایک غلام بلال﷜ حبشی کو مسجد نبوی میں مؤذن مقرر کیا گیا اور دوسرے غلام سالم مولی ابی حذیفہ نے مدینہ میں کبار صحابہ کی امامت کی ۔ مسلم معاشرہ میں کبھی طبقاتی کشمکش کا احساس نہیں کیا گیا ۔ آج بھی کسی مسلم معاشرہ میں ذات ، نسل ، رنگ یا قومیت کی بنیاد پر تفریق نہیں ہے ۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی یہ اثر آج تک باقی ہے اگرچہ اپنی شفاف صورت میں مساوات نہیں

رہی ، یہاں کی آب و ہوا نے اسے گدلا کر دیا ہے ۔ نسب کے ساتھ حسب کو بھی جوڑ دیا گیا ہے اور اسی سے کفو کا تعین کیا جاتا ہے ۔ مگر کیرالا میں آج بھی شمالی ہند کے مسلمانوں سے بہتر مساوات موجود ہے ۔ وہاں ہر مسلمان ہر مسلمان کے گھر شادی بیاہ کے رشتے کر سکتا ہے ۔ جہاں تعلیم کی روشنی اور تہذیب کی شائستگی کے اثرات کم پہنچے یا صدیوں نے انہیں غبار آلود کر دیا ، ان علاقوں کا حوالہ نہیں دیتا ۔ مگر روشن خیالی کے سب سے بڑے علمبردار انگلستان میں کیا یہ مساوات موجود ہے ؟ کیا امریکا جیسے ملک میں یہ کبریت احمر پایا جاتا ہے ؟ کیا کالے مسلمانوں کے ساتھ گورے مساوی سلوک کرتے ہیں یا جنوبی افریقہ میں وہاں کے اصلی باشندوں کو اس جرم میں ہلاک نہیں کیا جاتا کہ ان کی رنگت سیاہ ہے اور حاکمانِ وقت کی چمڑی گوری ہے ۔ یورپ میں اخوت اور مساوات اور آزادی کا نعرہ انقلاب فرانس کا دیا ہوا ہے ۔ لیکن انقلاب فرانس سے بارہ سو سال پہلے دنیا کے سب سے بڑے پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نعرہ کو لفظوں تک ہی محدود نہیں رکھا ، عمل میں ترجمہ کر کے دکھا دیا تھا ۔

مدینہ میں جب آپؐ تشریف فرما ہوئے ہیں قبائل میں برسوں سے جنگ چلی آ رہی تھی ، آپؐ نے انھیں شیر و شکر کر دیا

کنتم علی شفا حفرۃ من النار فانقذکم منہا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں پہلی بار ایک (Citystate) قائم فرمائی ۔ اس کے لئے تمام قبائل کے افراد کو مدعو کیا ۔ ان میں غیر مسلم بھی تھے ، پہلا تحریری دستور مرتب فرمایا جو مختصر ہونے کے باوجود اس وقت کی تمام ضروریات کو محیط ہے ۔ شہر مدینہ میں پہلی بار مردم شماری کرائی اور آپ ہی نے پہلی بار دنیا کو (International Law) کا تصور دیا جس کی بنیاد ہی حقوق انسانی اور بقائے باہم کے اصول پر ہے ۔

آپؐ نے سود (رِبا) کو حرام مطلق قرار دیا کیونکہ یہ سراسر (Exploitation) ہے اور اس کا شکار عموماً کمزور اور پس ماندہ طبقہ ہوتا ہے ۔ آج ہماری سوسائٹی کے غیر مسلموں میں بھی سود پر روپیہ دینے کا کاروبار عام ہے ۔ یہ روپیہ ظاہر ہے کہ ضرورت مند اور مالی حیثیت سے ضعیف انسان ہی لیتے ہیں ۔ اس کا صحیح طور پر اندازہ کرنا ہو تو دیہات و قصبات میں اور ایسے علاقوں میں جہاں روزگار کے مواقع کم ہیں اور گھریلو دستکاریوں پر لوگوں کی گذر بسر ہوتی ہے وہاں جا کر دیکھئے کس طرح ایک غریب خاندان اپنی دستکاری کا خام مواد خریدنے کے لئے ساہوکار سے ۱۵ تا ۲۵ فیصد شرح سود پر کوئی معمولی سی رقم قرض لیتا ہے ۔ اگر سو روپیہ لیتا ہے تو آٹھ سو روپے کا کاغذ لکھ کر دیتا ہے ۔ پھر برسوں تک اُس رقم کا سود ادا کرتا رہتا ہے ۔ جتنی محنت کرتا ہے اس سے بجائے اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے ساہوکار کا جہنم پاٹتا رہتا ہے ۔ ہمارے ترقی پسند معاشرہ میں اس ظلم و استحصال کے خلاف کبھی آواز نہیں اٹھتی ۔ ان مظلوموں کے لئے بھی اگر کسی نے قطعی اور واضح قانون بنایا ہے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں یہ قانون بھی سارے عالمِ بشریت کے لئے ہے ۔

معاشرہ کے مفاسد میں قمار اور جوا بھی ہے جس میں ایک شخص کی دولت بلا استحقاق دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے ۔ قمار بازی کی بھی لاکھوں شکلیں ہیں ۔ سٹے ، مٹکے اور لاٹری و مُعمّا سے لے کر تاش کے پتوں اور ریس کے گھوڑوں تک ، کرکٹ کے اسکور اور الیکشن کے نتائج پر بھی شرطیں لگا کر جوا کھیل لیا جاتا ہے ۔ اپنا مال بیچنے کے لئے خریدار کو لالچ دیا جاتا ہے کہ اس میں انعامی نمبر نکلے گا ۔ بچوں کو صغر سنی سے جوئے کا عادی بنانے کے لئے ایسے کھیل ایجاد کر لئے گئے ہیں ۔ جو دراصل جوئے بازی کی تربیت دیتے ہیں ۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس آمدنی کو ناجائز قرار دے دیا جس میں آپ صرف نفع کے شریک ہوں نقصان کے نہیں ، جو غیر یقینی اور مبہم ہو ، جو بغیر پسینہ بہائے اور دوسروں کی ضرورت و احتیاج کا ناجائز فائدہ اٹھا کر حاصل کی جا رہی ہو ۔ دنیا میں کسی مصلح نے عالمِ بشریت کے مفاسد کی اصلاح کے لئے ایسی بنیادی باتوں کی طرف توجہ نہیں کی تھی ۔ یہ بھی آپؐ کا احسان عظیم ہے ۔ آج مغربی تہذیب نے جوئے کو بھی ایک (Necessary evil) بنا رکھا ہے ۔ ہمارے برادران وطن تو دسہرہ کے ایام میں ڈٹ کر جوا کھیلتے ہیں اور ایک ہی رات میں کروڑ پتی سے بھکاری بن جاتے ہیں ۔ بعض علاقوں میں تو آج بھی خفیہ طریقے سے اپنی بیوی کو داؤں پر لگانے کی قابل نفرین رسم موجود ہے ۔ مگر مذہبی رسوم کے ساتھ اور ثواب سمجھ کر اپنے بیوی بچوں کو بھی ہار بیٹھے تو اسے سماجی گناہ نہیں سمجھا جاتا ۔

تیسرے پہلو کو دیکھیے تو شراب نوشی انسان کا پرانا مرض ہے ۔ قرآن نے اس کے منافع کا بھی اعتراف کیا ہے مگر اس کے گناہوں کو اس کے منافع سے زیادہ اور بڑا بتایا ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف شراب کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ فرمایا کل مسکر حرام ہر نشہ پیدا کرنے والی چیز حرام ہے ۔ بعض حکومتوں کو بھی اس کا احساس ہے مگر اس سے حاصل ہونے والی اربوں روپے کی ایکسائز ڈیوٹی کو کوئی چھوڑنا نہیں چاہتا ، ادھر سامراج نے عوام کے قوائے ذہنی کو شل کرنے کے لئے مسکرات کی ایک سے ایک نرالی قسم ایجاد کر لی ہے جو ۔

صد کارکنی کہ مے غلام است آں را

کے مصداق کہیں زیادہ گہرے اور مہلک اثرات رکھتی ہے ۔ افیم ، بھنگ ، گانجا ، چرس وغیرہ تو زمانہ ما قبل تاریخ کے اور (Primitive) نشے ہیں ۔ اب ہیروئن ، ایل ۔ ایس ۔ ڈی ، اسمیک اور براؤن شوگر کا زمانہ ہے ۔ صرف ۱۹۸۶ء کی خبروں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ اربوں روپے کے (Contrabands) پکڑے گئے ۔ لیکن جو پولیس کی چشم پوشی یا سازش یا غفلت سے نہ پکڑے گئے ہوں ان کی مالیت یقیناً کھربوں روپے ہوگی ۔ ان ملکوں میں ان اشیاء کی اسمگلنگ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ذہن کی زرخیزی کو ختم کر دیا جائے تاکہ انقلاب کا بیج اس میں پنپ ہی نہ سکے ۔ جن قوموں کے یہ مقاصد اور یہ رویئے ہوں ان کو حقوق انسانی کے تحفظ ، مساوات اور جمہوریت وغیرہ کے دعوے کیا زیب دے سکتے ہیں ۔ ہمارے پیغمبر علیہ السلام نے مسکرات کے حرام ہونے کا اعلان کر کے بھی سارے عالم بشریت پر احسان فرمایا ہے تاکہ انسان کے قوائے ذہنی آزادی سے نشوونما پا سکیں ۔

مفاسد معاشرہ کے چوتھے پہلو یعنی زناکاری کو بھی حرام مطلق قرار دیا گیا ۔ نئی تہذیب کا رویہ یہ ہے کہ جنس انسان کی بنیادی جبلت ہے یہ جذبۂ فنا اور جذبۂ بقا دونوں کی مظہر ہے ، اس کا اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں ۔ اخلاق کی چہار دیواری کے ٹوٹ جانے سے یہ گندگی جہاں بھی راستہ ملے گا وہاں پہنچے گی ۔ آج کے ذرائع ابلاغ (Mass Media) بھی نوع بشر کے ساتھ خیانت کا ارتکاب کر رہے ہیں ۔ جب تک اشتہاروں میں ایک نیم عریاں عورت کو نہاتا ہوا نہ دکھائیں دو روپے کا صابون نہیں بک سکتا ۔ شرم و حیا زمانہ گذشتہ کے فرسودہ تصورات ہو گئے ہیں ۔ نکاح کی ضرورت نہیں ، طلاق میں کچھ رکاوٹ نہیں ۔ جوئے کی طرح زنا کاری کے بھی مدارج اور شکلیں ہیں ۔ لیکن اس معاشرہ کا اللہ ہی نگہبان ہے جہاں قانون کے رکھوالے قحبہ خانوں میں زندگی گزارنے والی مظلوم عورتوں سے بھی اپنا کمیشن طلب کریں اور انہیں اتنا ستائیں کہ وہ پلے کارڈ ہاتھوں میں لے کر سڑک پر آجائیں جیسا کہ اسی جنوری ۱۹۸۷ میں بمبئی کی سڑکوں نے دیکھا ہے ۔ یہ سب اسی لئے ہے کہ جنس کا رشتہ اخلاق سے توڑ دیا گیا ہے ۔ اس میں جو شرم و حیا کا پہلو تھا وہ معدوم ہو گیا ہے ۔ آج کسی نام نہاد ترقی پسند سے پوچھئے تو وہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کو جنگلی پن بتاتا ہے مگر زناکاری سے نفرت اس کے دل و دماغ میں نہیں ہے ۔ چند سال قبل السریٹڈ ویکلی کے ایک مضمون میں یہ بتایا گیا تھا کہ صرف دہلی شہر میں ۲۵ ہزار بچے ریڈ لائٹ ایریا میں ایسے ہیں جن کا کوئی باپ نہیں ہے ۔ ان بچوں کا کوئی مستقبل بھی نہیں ہے ۔ یہ ظلم اور استحصال کی اولاد ہیں تو بڑے ہو کر یہی کریں گے ۔ اور اس طرح مفاسد کا چکر چلتا رہے گا ۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاف ستھری جنسی زندگی گذارنے کے لئے ایسے سادہ اور فطری اصول وضع فرما دیئے کہ ان کے اتباع سے سارا معاشرہ فساد سے محفوظ رہ سکتا ہے ۔ مگر جن ترقی یافتہ ملکوں نے طرفین کی رضامندی سے امرد پرستی کو جائز قرار دے کر اس کے لئے باقاعدہ کلب کھول دیئے ہوں ، وہ اسلامی شریعت کی حکمت کی داد کیوں دینے لگے !

عالمِ بشریت میں جتنے افراد ہیں شاید اتنے ہی مسائل بھی ہیں ۔ نوع بشر کی عام اور مشترک ضرورت یہ ہے کہ ایک صالح اور پاک معاشرہ ہو ، جس میں امن اور سلامتی ہو ، بھوک اور افلاس ، بیماری اور جہالت نہ ہو ، نسل ، رنگ ، زبان ، عقیدہ اور حسب کی بنیاد پر تفریق نہ ہو ، خیر و شر کا واضح تصور موجود ہو ۔ دولت کی منصفانہ تقسیم ہو جبر اور استحصال نہ ہو ۔ یہ اور ایسی بنیادی باتیں فراہم ہوں تو انسان کی مادی اور معنوی زندگی میں توازن برقرار رہتا ہے ورنہ وہی قساوت اور سنگدلی (Callousness) اور اعصاب زدگی چھا جاتی ہے جو آج ہم ترقی پذیر معاشرہ میں دیکھ رہے ہیں ۔

علم و دانش ، تہذیب و ثقافت اور فضائل اخلاق کا فروغ اسی وقت ہوتا ہے جب معاشرہ بھوک سے آزاد ہو ۔ آج عالمِ بشریت دو اور خانوں میں بٹا ہوا ہے ، ایک ترقی یافتہ دنیا ہے جس نے بھاری صنعتوں پر اور ان کے وسیلے سے تمام ذرائع پیداوار پر قبضہ کر رکھا ہے ، دوسری ترقی پذیر دنیا ہے ، جہاں بعض علاقوں میں آج بھی قحط اور بیماری سے

لاکھوں انسان لقمۂ اجل بن رہے ہیں ۔ پھر ہر علاقے میں ایک نہایت مالدار طبقہ ہے ۔ دوسرا متوسط طبقہ ہے تیسرا وہ گروہ ہے جو خطِ افلاس کے نیچے پڑا سسک رہا ہے ۔ دنیا کی کل آبادی کا تجزیہ کر کے دیکھیں تو فقراء ، مساکین ، معذورین ، مصیبت زدگان اور استحصال کے مارے ہوئے عوام کی تعداد ہی زیادہ ہو گی جو زندگی کی نعمتوں سے بالکل ناواقف ہیں ان کے پاس اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کا سامان بھی نہیں ہے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طبقے پر ہی زیادہ توجہ فرمائی ہے ۔ قرآن کریم نے نہایت تاکید کے ساتھ مال خرچ کرنے پر زور دیا ہے تاکہ دولت کسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر نہ رہے گردش کرتی رہے ۔ فقراء و مساکین و محرومین کا حق مقرر فرمایا ہے !

وفی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم ۔ اہل استطاعت پر زکوٰۃ فرض کر دی ہے اور فرائض اسلامی میں اسے دوسرے نمبر پر رکھا گیا ہے ۔ قرآن میں جابجا اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا بیان ایک ساتھ کیا گیا ہے ۔ سائل کو جھڑکنے سے نقص صریح کے ذریعہ منع کیا گیا ہے ۔

اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے کو طرح طرح کی ترغیب اور بشارتیں دی گئی ہیں لیکن صرف اتنا ہی نہیں ہے ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی فقر و مسکنت کی زندگی کو اختیار فرمایا ۔ مدینہ میں (City State) قائم کرنے اور آس پاس کے زرخیز علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد آپ اپنے لئے ایک قصر بھی بنوا سکتے تھے ، ایرانی اور رومی بادشاہوں کی سی زندگی اختیار کر سکتے تھے ۔ آپ نے تو کچے کمروں میں رہنا پسند کیا جن پر ٹاٹ کے پردے پڑے ہوئے تھے اور جن کی چھت اتنی نیچی تھی کہ سر سے لگتی تھی جسے کھجور کے پتوں سے پاٹا گیا تھا ۔ جن کا فرش کچا تھا اور بارش ہوتی تھی تو کیچڑ میں چلنا بھی دوبھر ہوتا تھا ۔ آپ نے امیر المومنین کے لئے کوئی تاج کوئی ماہی مراتب کوئی نقارہ و نشان و علم بھی پسند نہیں فرمایا نہ لباس میں ذرہ بھر کوئی ایسا امتیاز رکھا جس سے معلوم ہو کہ یہ مومنوں کے سردار ہیں ۔ وہی مسجد نبوی کا کچا صحن آپ کا سکریٹریٹ تھا وہی اسلامی افواج کا ہیڈ کوارٹر تھا ۔ وہی سپریم کورٹ تھی ۔ وہی یونیورسٹی تھی ، وہی پارلیمنٹ تھی ، وہیں باہر سے آنے والے وفود کا استقبال ہوتا تھا ، وہیں سے قیصر و کسریٰ کو ہرقل اور نجاشی کو سرکاری مراسلے بھیجے جاتے تھے ۔ یہ سادگی اور یہ فقر اختیاری کس لئے تھا ؟ اپنی ذات گرامی کو فقرا ، مساکین و محرومین کی اکثریت کے ساتھ شامل رکھنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فقیر و مسکین بن کر زندہ ہی نہیں رہنا چاہتے تھے بلکہ حضورؐ نے ایسی دعا مانگی ہے جو کم سے کم میری نظر سے نہیں گذرا کہ کسی بانی مذہب نے ، کسی قائد ملت نے ان لفظوں میں ایسی دعا مانگی ہو ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

رب احیینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین (اے اللہ مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھیو ، مسکین بنا کر ہی موت دیجیو اور مساکین کی ٹولی میں ہی میرا حشر کیجیو) میں سمجھتا ہوں کہ مساکین و فقرا پر شفقت و رحمت کا یہ وہ مقام ہے کہ اس پر ذرہ بھر کچھ اضافہ نہیں کیا جا سکتا ۔ تو کیا سارے عالم بشریت پر فخر عالم و آدم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ احسان عظیم نہیں ہے کہ آپ نے اپنی زندگی اور موت حشر اور نشر سب کچھ مساکین کے ساتھ طلب فرمایا ہے اس وقت

کی مہذب رومی سوسائٹی کا قانون یہ کہتا تھا کہ مریض اور معذور بچوں کو بغیر تکلیف دیئے ختم کر دینا مصلحت ملکی کے عین مطابق ہے ۔ افلاطون و ارسطو جیسے حکماء نے بھی اس کی تائید کی کہ معذور بچوں کو ان کی معذوری اور اپنے افلاس کے باعث قتل کر دیتے تھے اور قانون میں اس کا جواز موجود تھا ۔ بعد کو قسطنطین نے یہ حکم جاری کیا کہ ان معذور بچوں کا خرچ حکومت ادا کرے گی ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی معذور و مفلس لوگوں کے لئے بیت المال قائم کیا لیکن قرآن نے ان کی کفالت کو حکومت پر فرض نہیں کیا یہ ارشاد ہوا کہ ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق نحن نرزقهم وایاکم اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو ۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی ۔

اب عالمِ بشریت کو ایک اور زاویے سے دیکھئے ۔ یہاں مادہ ہے اور روح ہے ۔ ایک زندگی مادی ضروریات سے چلتی ہے ، دوسرے عالم میں اور ہی کچھ اسرار ہیں ۔ دنیا میں لاکھوں مصلح ہوئے ہیں ، کسی نے مادی وسائل پر توجہ کی تو حیات معنوی کے تقاضوں کو بھول گیا ۔ دوسرے نے روحانیت پر اتنا زور دیا کہ اُسے نفس کشی اور اذیت کوشی و ایذا پسندی کی آخری حدوں تک پہنچا دیا ۔ یہ صرف ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنھوں نے زندگی کے دونوں پہلوؤں کو یکساں اہمیت دی ہے ۔ آپ راتوں کو بیدار رہ کر مناجات اور تضرع بھی کرتے ہیں کثرت سے نوافل بھی پڑھتے ہیں ، روزے بھی رکھتے ہیں ۔ دوسری طرف دس سال تک مسلسل جہاد بھی فرماتے ہیں ۔ اتنی طویل عسکری زندگی میں صرف ایک شقی کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار سے قتل ہوا ۔ آپ دس برس میں ایسی مرکزی حکومت قائم کر دیتے ہیں جو اسی صدی کے اندر جزیرۃ العرب سے نکل کر ایران ، سندھ ، آذر بائیجان ، مصر ، ترکی ، قبرص اور سوڈان تک وسیع ہو جاتی ہے جس کا رقبہ چالیس لاکھ مربع میل ہے ۔ دوسری صدی کے آغاز ہی میں یہ حکومت ایشیا ، افریقہ اور یورپ تین براعظموں تک پھیل جاتی ہے ۔

اسلامی معاشرہ میں طبقاتی تصادم نہیں ہے توافق اور تعامل ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ تعلیمات اسلام میں اصول پر نظر رکھی گئی ہے ۔ فروعات تو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ ملک خدا کا ہے ، مخلوق اس کا کنبہ ہے ، ہر انسان ایک ہی جوہر سے پیدا ہوا ہے ۔ انسان ساری مخلوقات میں اشرف و افضل ہے کائنات کی ہر شے حتیٰ کہ شمس و قمر کو بھی اس کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے اس کی تخلیق بہترین طریقے سے ہوئی ہے ۔

خلق الانسان فی احسن تقویم اللہ نے اس میں اپنی روح پھونکی ہے نفخت فیه من روحی کائنات کی تمام قوتوں کو ، ملائکہ یا دیوتاؤں کو حکم دیا کہ وہ انسان کو سجدہ کریں

اذ قلنا للملائكة اسجدوا لادم فسجدوا الا ابليس ابى واستكبر و كان من الكافرين (ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو ۔ تو سب نے سجدہ کیا ، ابلیس نے نہیں کیا اس نے روگردانی کی اور اپنے بڑے پن کا اظہار کیا تو وہ کافروں میں سے ہو گیا ۔) یعنی مظاہر خیر سب انسان کے سامنے سجدہ کناں ہیں ۔ اسے یہ ضرورت نہیں کہ دیوتاؤں کے سامنے سر

جھکائے ایک مظہر شر ابلیس نے نافرمانی کی تو ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو گیا ۔

اللہ نے آدم کو خود اسماء سکھائے ، یعنی انسان کو مبدءِ فیاض سے شرف تلمذ حاصل ہے ۔ اس سے زیادہ عظمت انسان کا اور کیا اعلان ہو سکتا ہے کہ وہ مسجودِ ملائکہ ہے ۔ خلیفۃ اللہ ہے اللہ کا شاگرد ہے کسی مذہب نے شرف انسانیت کا اتنا واضح ، ایسا جلی اور اتنا جلیل القدر اعلان نہیں کیا ۔ یہ بھی عالمِ بشریت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان عظیم ہے ۔

اب ایک اور پہلو کو دیکھیئے ۔ اس دنیا میں روزانہ لاکھوں کیس خودکشی کے ہوتے ہیں اور جب سے انسان کے دل میں آرزوؤں نے کروٹ لی ہے اس دن سے ہو رہے ہیں ، آئندہ بھی ہوتے رہیں گے ۔ نہ جانے کتنی جانیں اس طرح نذر اجل ہو جاتی ہیں کہ انسان اپنا لبادۂ ہستی اپنے ہاتھوں سے نوچ لیتا ہے ۔ کوئی اسے نہایت جرأت و شجاعت کا اقدام کہتا ہے کوئی پرلے درجے کی بزدلی بتاتا ہے ۔ اسلام سے پہلے رومی معاشرہ میں اجتماعی خودکشی ہوتی تھی کہ ہزاروں انسان پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر چھلانگ لگا دیتے تھے ۔ بعض مہلک امراض کو دعوت دیتے تھے تاکہ جلدی مر جائیں ۔ کیتھولک عیسائیوں کے مظالم سے تنگ آکر یہودیوں نے خودکشی شروع کر دی تھی ۔ ایسے حرام موت مرنے والوں کی جائیداد حکومت ضبط کر لیتی تھی ۔ خمیازہ ورثہ کو بھگتنا پڑتا تھا ۔ خودکشی کرنے والے کی لاش پر کوئی رسم ادا نہیں کی جاتی تھی بلکہ اسے سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے لے جاتے اور مزبلہ پر ڈال دیتے تھے ۔ خانقاہوں میں رہنے والے راہب بھی جب دیکھتے تھے کہ خواہش پر وہ قابو نہیں پا رہے ہیں اور شیطانی وسوسوں سے کسی طرح نجات نہیں مل رہی ہے تو وہ خودکشی کر لیتے تھے ۔ حکومتیں قانون بناتی رہیں مگر وہ بے اثر رہے ۔ عہد ناموں میں خودکشی کی ممانعت کا کوئی اشارہ نہیں ، پہلا آسمانی صحیفہ قرآن ہے جس نے واضح لفظوں میں خودکشی کو حرام قرار دیا ۔ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے لا رھبانیۃ فی الاسلام کہہ کر وہ سارے دروازے بند کر دیئے جہاں سے شکستہ خاطری ، مایوسی اور احساس ناکامی داخل ہوتے تھے ۔ رہبانیت کیا ہے ؟ یہ ایک علیحدہ تفصیل ہے اور اسے بیان کرنے بیٹھوں تو آپ حیرت کریں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو لفظوں میں کتنی بڑی حقیقت بیان فرما دی ہے ۔ جنھیں رہبانیت کی تعریف جاننے کا شوق ہے وہ لیکی کی مشہور کتاب (History of European Morals) کا مطالعہ کریں ۔ اس کا اردو ترجمہ بھی "تاریخ اخلاق یورپ" کے نام سے ہو چکا ہے ۔

یہ بھی عالمِ بشریت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان ہے کہ آپ نے شرفِ انسانیت کا احساس دلایا اور ببانگ دہل اعلان کیا ۔ رہبانیت کو ممنوع قرار دیا ۔ اس لئے عہد متوسط کے اسلامی معاشرہ میں آپ کو خودکشی کی مثالیں بہت ہی کم ملیں گی ۔ یورپ کا حال سترھویں اور اٹھارھویں صدی تک یہ تھا کہ 'سر طامس مور نے اپنی کتاب میں جہاں ایک بے عیب جمہوریت کا مرقع کھینچا ہے وہاں ایک منظر یہ دکھایا ہے کہ لاعلاج مریضوں کو حکام اور پادری بخوشی خودکشی کی اجازت دے رہے ہیں ۔'

اسلام پر ایک الزام یہ ہے کہ اس نے غلامی کے (Institution) کو باقی رکھا اور خدا کی شان ہے کہ یہ الزام وہ دیتے ہیں کہ غلامی نے جن کے گہوارے میں پرورش پائی ہے ۔ ذرا روما کا حال دیکھیے ۔ وہاں غلاموں کے ساتھ وہ سلوک کیا جاتا تھا جو اسلام نے حیوانوں کے ساتھ بھی جائز نہیں رکھا ۔ وہ بالغ ہوتے تو گھروں میں کام کاج کرنے کے لئے انھیں خواجہ سرا بنا دیا جاتا تھا یہ روایت بھی رومتہ الکبری سے چلی ہے ۔ انھیں اتنا ذلیل اور ناپاک سمجھا جاتا تھا کہ وہ قانون کے دائرے میں بھی نہیں لائے جا سکتے تھے ۔ ان کو ادنیٰ سی لغزش پر مالک جو سزا چاہے دے سکتا تھا ۔ غلاموں کو زندہ جلانا ایک عام بات تھی ۔ مسیحیت میں قتل کرنا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا اس لئے زندہ جلانے کو رواج دیا گیا تھا ۔ سبحان اللہ ۔۔

تغافل سے جو باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اسلام سے پہلے رومن سوسائٹی میں خیرات کا ادارہ موجود تھا مگر یہ تمام سرکاری کارروائی تھی جس کا مقصد رفاہ خلق نہیں بلکہ سیاسی حکمتِ عملی ہوتی تھی ۔ امرا اپنی بڑی بڑی جائیدادیں اور اموال پادریوں کے تصرف میں چھوڑ جاتے تھے ہر اتوار کو کلیسا میں چندہ ہوتا تھا اور اس سارے نظام میں پادری کی حیثیت صدر اعلیٰ کی تھی ۔ رفتہ رفتہ پادریوں کا طبقہ سب سے زیادہ متمول ہوگیا ۔ مذہبی اقتدار کے ساتھ دولت نے مل کر ان کی پوزیشن کو بہت قوی کر دیا تھا ۔ آخر حکومت وقت بھی ان سے ڈرنے لگی ۔ اس اثر و اقتدار کا ردِ عمل یہ ہوا کہ نظام اشتراکیت نے مذہب کو اپنے دائرے سے بالکل بے دخل کر دیا ۔ یعنی اشتراکیت کو بے دینی کی طرف لے جانے کے ذمہ دار مسلمان علماء نہیں ہیں بلکہ مشرقی یورپ کے نہایت متمول اور بارسوخ پادری ہیں ۔ تاریخ اسلام میں ایسے علما شاذونادر ہی ملیں گے جو بہت زیادہ مالدار رہے ہوں یا جنھوں نے خیرات کا ادارہ اپنے ہاتھوں میں رکھا ہو ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام نے درمیانی واسطہ کو کوئی اہمیت نہیں دی ۔ خدا ہر انسان کا خالق ہے ہر شخص اس سے براہ راست طلب کر سکتا ہے اور بے وسیلہ اس تک پہنچ سکتا ہے ۔ یہ بھی عالمِ بشریت پر ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا بے پایاں کرم ہے کہ آپ نے پاپائیت کے پیدا ہونے کا امکان ہی ختم کر دیا ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے طہارت کو عبادات کا مقدمہ قرار دیا ۔ فقہ کی بیشتر کتابوں میں سب سے پہلے طہارت ہی کا بیان ملتا ہے ۔ وضو جیسی پاکیزہ ترکیب تعلیم فرمائی جس میں وہ سب فوائد موجود ہیں جو غسل سے حاصل ہوتے ہیں ۔ یہ ایک موقت اور (Temporary) غسل ہے جو ہر وقت کیا جا سکتا ہے ۔ اس کی اور آسان شکل تیمم بتا دی ۔ غسل کی بھی پوری تفصیلات بیان فرمادیں اور سوچئے کہ یہ اس ملک کے باشندے نے کیا جہاں پانی کا قطرہ گوہر نایاب تھا ۔ حوضوں میں پانی جمع کر کے ان کی مسلح حفاظت کی جاتی تھی ۔ اسوقت کی متمدن رومی سوسائٹی میں لوگ غسل کے نام سے بھی واقف نہ تھے ۔ سینٹ جیمس کو تمام دنیائے مسیحیت میں نمونہ کا زاہد مانا جاتا ہے ۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ رحم مادر سے ہی مقدس و مطہر پیدا ہوئے تھے ۔ "وہ شراب ، مسکرات اور

لحم حیوانات سے محترز تھا، اس کے سر پر کبھی استرہ نہیں لگا نہ وہ کبھی حمام میں گیا اور نہ اپنے جسم میں روغن لگنے دیا۔ جسم کی طہارت کو روح کی پاکیزگی کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ اور جو زاہد مرتبۂ زہد میں جتنی زیادہ ترقی کرتے جاتے تھے اسی قدر وہ مجسمۂ عفونت و غلاظت ہوتے جاتے تھے۔ "سینٹ ابراھام کے بارے میں خوش عقیدہ راویوں کا بیان ہے کہ اپنی وضع کے ایسے پکے تھے کہ پنجاہ سالہ مسیحی زندگی میں انھوں نے اپنے چہرہ پر یا پیر پر پانی کی کبھی چھینٹ نہ پڑنے دی۔"

اب اس کے مقابلہ میں اسلامی آداب طہارت کو دیکھئے تو یہ بھی ایک انقلابی قدم تھا۔ طہارت کا براہ راست تعلق حفظان صحت سے بھی ہے۔ اسی لئے صدر اسلام کے معاشرہ میں مریضوں کی تعداد بہت ہی کم ملتی ہے اور طبیب تو گویا عنقا تھے۔

تقابل کے لئے مجھے بار بار رومی معاشرہ اور مسیحیت کا حوالہ دینا پڑتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانے کی انتہائی ترقی یافتہ اور مہذب سوسائٹی رومتہ الکبریٰ ہی میں تھی جو عربوں کا پڑوس بھی تھا اور ان کے مقابلہ میں عرب بالکل ناخواندہ و نیم وحشی تھے۔ دوسرا سبب یہ کہ اسلام خود کو کوئی نیا مذہب نہیں کہتا۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ نے ہر دور میں ہر قوم میں ہدایت دینے والے انبیاء اور رسول بھیجے ہیں۔ لکل قوم ھاد۔ سب نے اللہ کی عبادت کی طرف اپنی قوم کو بلایا ہے اور بت پرستی سے روکا ہے۔ بعض انبیاء صاحبان شریعت ہوئے ہیں۔ جب دوسری شریعت آئی ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ نے پچھلی شریعت کے چند احکام باقی رکھے ہیں، بعض میں ترمیم کر دی ہے بعض کو سرے سے منسوخ کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام شریعت حقہ لے کر آئے تھے اور بعثت محمدیؐ سے پہلے شریعت عیسوی ہی نافذ تھی، وہی قانون الٰہی تھا۔ جب قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا تو شریعت موسوی، شریعت ابراہیمی اور شریعت عیسوی کے کچھ احکام بدستور باقی رکھے گئے، کچھ میں ترمیم و اضافہ کیا گیا، کچھ کو منسوخ کر دیا گیا۔ اب اللہ کی آخری شریعت اور آخری حکم وہ شریعت ہے جو قرآن نے پیش کی ہے۔ اس لئے فقہ اسلامی کے مسائل اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و نواہی کا مقابلہ ماقبل کی شریعت عیسوی سے ہوگا تاکہ جو ترقی پسندانہ عنصر ہے وہ ظاہر ہو جائے اور تبدیل و تنسیخ کی حکمت واضح ہو سکے۔

عیسائیت کے تصور رہبانیت کا خلاصہ یہ تھا کہ لذائذ دنیا سے کنارہ کشی کی جائے۔ نفس انسانی بدی بدکاری کی طرف مائل ہے اسے ہلاک کیا جائے۔ ہر لذت کو گناہ سمجھا جائے اس سے معاشرہ میں ان انسانی کمالات کا فقدان ہونے لگا جو نشاط کار کا باعث ہوتے ہیں۔ اور ایک عام افسردگی و انفعالیت طاری ہو گئی۔ اس ماحول میں اسلام ایک محرک قوت بن کر اُبھرا جس نے ایک فعال معاشرہ پیدا کیا۔ ہفتہ میں ایک دن اتوار کو ساری عیسائی دنیا معطل ہو جاتی تھی اور یہ کہا جاتا تھا کہ جو اس دن دنیوی اشغال میں مبتلا ہوگا اس پر طرح طرح کی بلائیں نازل ہوتی ہیں اسی طرح یہودی "سبت" مناتے تھے یعنی وہ سنیچر کو بیکار ہو جاتے تھے۔

اسلام نے جمعہ کو یوم ملّی بتایا مگر صرف یہ کہا کہ اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذرو البیع ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون فاذا قضیت الصلوۃ فانتشر وافی الارض وابتغوا من فضل اللہ صرف اذان سے نماز تک کاروبار کو معطل کر دینے کا حکم ہے باقی اوقات میں اللہ کے فضل کی تلاش کرو ۔ یہ خود اس کی دلیل ہے کہ اسلام ایک بیکار و معطل معاشرہ نہیں فعال و متحرک سوسائٹی تخلیق کرنا چاہتا ہے ۔ ہیکی نے اعتراف کیا ہے کہ سب سے بڑھ چڑھ کر جو سبب مسیحیوں میں عسکریت کی روح پھونکنے کا ہوا وہ اسلام کی تقلید تھی کہ اس نے درحقیقت مسیحیوں کی سی نرم و آشتی سرشت جماعت کو محاربات صلیبی کا پرجوش مجاہد بنا دیا ۔ شاعر کی زبان سے یوں کہوں کہ۔

ہم کو دعائیں دو تمہیں قاتل بنا دیا!

غرض آپ کسی پیمانے سے ناپ لیں کسی مقیاس سے جانچ لیں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم عَالِمِ بَشریت میں ہر لحاظ سے ہر معیار سے عظیم ترین انسان ہیں ۔ ۲۳ سال کی قلیل مدت میں ایسے عظیم الشان انقلاب کی بنیاد کسی نے نہیں رکھی کوئی دوسرا انسان ایسا نہیں ہوا جو یتیم و یسیر ہو ، کسی مدرسہ میں نہ پڑھا ہو ۔ نیم متمدن قبیلہ میں پیدا ہوا ، لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو ۔ مگر ساری دنیا کو اصول اخلاق کی تعلیم دے ۔ سارے فلسفوں کا دھارا بدل دے جس پر اپنی خوشی اور رغبت سے لوگ اپنی جانیں نچھاور کر دیں ۔ جو نیکی اور بدی کا اتنا واضح تصور دے دے جس کی حکیمانہ نگاہ زندگی اور معاشرت کے نہایت معمولی مسائل پر بھی ایسی ہو جیسی مہمات امور پر ۔ جو ایک چرواہا بھی بنے ۔ تجارت بھی کرے ۔ فقر و اخلاص میں بھی امین رہے ، اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی بیکار ضائع نہ کرے جس کا ایک لفظ محفوظ رکھا جائے ان سے کتابیں وجود میں آجائیں اور ان کتابوں کی شرح کرتے کرتے ہر زمانے کے علماء اور ذہین افراد عاجز ہو جائیں ۔ جو اُمی ہونے کے باوجود تعلیم کی ایسی اشاعت کرے جو بے سروسامان ہو اور ایک حکومت قائم کر دے ۔ جو رات کی تاریکی میں ہجرت کے لئے نکلے مگر اپنے بستر پر اپنے برادر عم زاد کو اس لئے چھوڑ جائے کہ وہ اہل مکہ کی امانتیں انہیں واپس کر کے آئیں ۔ جس پر وحی الٰہی ۲۳ برس تک مختلف ظروف و احوال میں نازل ہوتی رہے پھر بھی وہ محفوظ اور تحریف و تصحیف سے مامون رہے ۔ اس کتاب کو لاکھوں کروڑوں انسان اپنے سینوں میں محفوظ کر لیں کہ ساری دنیا کی لکھی ہوئی کتابیں بھی ضائع ہو جائیں تو اس کتابِ مقدس کا ایک ایک حرف اسی طرح موجود رہے ۔ اس کتاب کے بیس ہزار سے زیادہ تراجم ہوں اور تفسیریں لکھی جائیں اس شخص کی مدح و ثنا میں اس کے معاصرین سے لے کر آج تک کروڑوں اشعار لکھے جائیں اور نہایت عقیدت و احترام سے ہر جگہ پڑھے جائیں جس کے نام پر اربوں انسانوں نے اپنے بچوں کا نام رکھا ہو ۔ جس کا نام دنیا کی لاکھوں مسجدوں سے دن میں پانچ بار روز پکارا جاتا ہو جس کی ہر ادا کا اتباع کرنے کی ہر زمانے میں لاکھوں انسان کوشش کریں اور اسے باعث فخر و نجات سمجھیں جو کسی الوہیت یا فوق البشر خصوصیت کا دعویٰ نہ کرے ، جس کے بارے میں ارشاد الٰہی یہ ہو کہ قل انما انا بشر مثلکم یوحی ۔ جو یہ وصیت کرے کہ میرا مقبرہ نہ بنانا ۔ اسے سجدہ گاہ نہ کر لینا۔ اس کی دیواروں پر تصویریں (Paintings) نہ لگانا۔ جو ہر دور میں عظیم ہو، فرد

فرید ہو ۔ جس نے اپنے خاتم النبیین ہونے کا اعلان کیا ہو اور اس کے بعد آج تک کسی کا دعوائے نبوت نہ چل سکا ہو ۔ ایسی ذاتِ گرامی جسے سمجھنا فہم انسانی کے بس میں نہ ہو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہے ۔

مشرق و مغرب میں جتنی فتوحات ہوئیں ۔ عہد وسطی میں یورپ کی جو تحریکیں چلیں ۔ صلیبی جنگیں ہوئیں ، سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور آیا ، صنعتی انقلاب ہوا ، امریکہ کی دریافت ہوئی ، دو عالمی جنگیں ہوئیں اور دنیا کے نقشے میں نئے رنگ بھرے گئے ۔ پرانی حکومتیں ختم ہوگئیں ۔ نئی سلطنتیں وجود میں آگئیں ۔ انسان نے ایٹم بم اور جوہری بم بنا لئے چاند پر کمند ڈال دی ، ستاروں کی تصویریں اتار لیں ، غرض جو کچھ عجائبات روزگار ہوئے علوم و فنون کے میدانوں میں پیش رفت ہوئی نئے نئے نظامہائے زندگی آتے اور جاتے رہے ، نت نئے فلسفہ ایک دوسرے کے لئے جگہ بناتے رہے ایسی کسی بات کا بھی تصور کرلیجئے اور اسباب و علل کی کڑیاں جوڑیے تو آپ دیکھیں گے کہ حضرت آمنہ اور حضرت عبداللہ کے گھر میں جو بچہ پیدا ہوا تھا جو یتیم ہوا ۔ پھر یسیر ہوا اور چالیس سال تک پاک صاف زندگی گزار کر نبیؐ مبعوث کیا گیا اور ۲۳ سال میں اس نے تبلیغ رسالت کا کام پورا کر کے دنیا کے سامنے فکر جدید اور انقلاب کے دروازے کھول دیئے ۔ وہ اگر پیدا نہ ہوا ہوتا تو تاریخ کا یہ بہاؤ بھی یوں نہ ہوتا ۔ دنیا کی ہسٹری کچھ اور ہی ہوتی یا شاید کچھ ہوتا ہی نہیں ۔ محدثین اس حدیث کو ضعیف بتاتے ہیں کہ لولاک لما خلقت الافلاك (اے محمدؐ اگر آپ نہ ہوتے تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا) اصول حدیث کے معیاروں سے یہ ضعیف ہو سکتی ہے مگر اسباب و علل کے تواتر اور مقدمات صغریٰ کبریٰ کے نتائج بتاتے ہیں کہ واقعی آپ کی بعثت ساری انسانیت کے لئے اللہ کا سب سے بڑا انعام تھی ۔ قل یاایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا اور آپ کو تمام عالموں کے لئے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا وما ارسلنك الا رحمة للعلمین آپ نے دنیا کو روشنی اور ترقی کی وہ راہ دکھائی جس نے آج انسانی معاشرہ کو ایسی گہما گہمی بخشی ہوئی ہے ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و فضائل کا ایک شمہ بیان کرنا بھی ممکن نہیں ۔

اے برتر از قیاس و گمان و خیال و وہم
وزہرچہ دیدہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایان رسید عمر
ماہمچناں در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عالمِ بشریت کو سب کچھ عطا فرما دیا ہے اور کوئی گوشہ حاجت و تشنگی کا باقی نہیں چھوڑا ہے ۔ آپ کی محبت اور آپ کا اتباع ہی ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے جس نے ہمیں دوسروں کے احسان سے بے نیاز کر دیا ہے ۔ بقول سکندر علی وجد مرحوم ۔

اور کیا فضل رب العلا چاہئے
مل گئے مصطفےؐ اور کیا چاہئے !

لکھنوی تہذیب کا نمائندہ شاعر

قلندر بخش جرأت

ڈاکٹر جمیل جالبی

جرأت اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط یعنی ۱۷۴۹ء (۱۱۶۲ھ) میں دلّی میں پیدا ہوئے اور ۱۸۰۹ء (۱۲۲۴ھ) میں لکھنؤ میں وفات پا گئے ۔ اٹھارھویں صدی کے وسط اور انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی اور بالخصوص ۱۸۵۷ء تک کا یہ دور برعظیم میں مغلیہ تہذیب کے منتشر ہونے اور سات سمندر پار سے آنے والی انگریز قوم کے قدم جمانے کا زمانہ تھا —— اور جب انیسویں صدی کا پہلا سورج طلوع ہوا تو سارے برعظیم کا منظر بدلا ہوا تھا ۔ وہ ساری دیسی اور بدیسی طاقتیں جو مغلیہ سلطنت کی گرتی ہوئی دیواروں کے ڈھیر پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں ، دم توڑ چکی تھیں اور یورپی اقوام میں سے صرف انگریز اقتدارِ اعلیٰ کے مالک بن چکے تھے ۔ یہ عمل اٹھارھویں صدی میں آہستہ آہستہ اور انیسویں صدی میں تیزی کے ساتھ ہوا ۔ ٹیپو سلطان کی وفات ۴ مئی ۱۷۹۹ء کا سانحہ ہے ۔ ۱۸۰۱ء میں کرناٹک اور ۱۸۰۲ء میں فرخ آباد انگریزوں کے تصرف میں آ چکے تھے ۔ ۱۸۰۳ء میں خود بادشاہ دھلی ، شاہ عالم ثانی آفتاب انگریزوں کے قبضے میں آ کر ان کا وظیفہ خوار بن گیا تھا ۔ اسی سال بندیل کھنڈ بھی انگریزوں کے زیر نگیں آ گیا ۔ ۱۸۰۴ء میں سُنبل پور ، ۱۸۰۵ء میں سندھیا و ہُلکر سے معاہدے ہو گئے ۔ ۱۸۱۶ء میں کچھ اور ۱۸۱۸ء میں آخری مرہٹہ سردار پیشوا باجی راؤ سے بھی معاہدہ ہو گیا۔ اسی سال راجپوتانے کی مختلف ریاستیں اودے پور ، بیکانیر ، جے پور ، جیسلمیر وغیرہ سے بھی انگریزوں کے معاہدے ہو گئے ۔ ۱۸۳۱ء میں مہاراجہ میسور کی ریاست کا خاتمہ ہو گیا ۔ ۱۸۴۳ء میں سندھ اور گوالیار بھی فتح ہو گئے ۔ ۱۸۴۶ء میں کشمیر اور جالندھر بھی انگریزوں کے زیر نگین آ گئے ۔ ۱۸۴۹ء میں پنجاب بھی فتح ہو گیا اور اس کے بعد جھانسی ، برار ، تنجور اور اودھ وغیرہ بھی انگریزی سلطنت میں شامل ہو گئے ۔ جیسے جیسے انگریزوں کے قدم جمتے اور مغلیہ سلطنت کمزور ہوتی گئی ویسے ویسے دلّی بھی اُجڑتی گئی ۔ مرہٹوں کی یورش اور نادر شاہ کے قتل عام (۱۷۳۹ء) سے ترک دہلی کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے ساتھ بڑھتا گیا ۔ جسے جہاں سہارا ملتا ، وہاں چلا جاتا ۔ معاشی بد حالی نے دلّی کی کمر توڑ دی اور دیکھتے ہی دیکھتے دلی اہل فن اور اہل ہنر سے کم و بیش خالی ہو گئی ۔ جرأت نے اسی صورت حال کے کرب سے گزرتے ہوئے کہا :

جب لشکرِ کرماں کی چڑھائی ہو شب و روز
دہلی کے لگے کیوں نہ پھر اورنگ میں کیڑا ؟

جرأت کے معاصر مصحفی نے کہا :

دلّی ہوئی ہے ویراں سُونے کھنڈر پڑے ہیں
ویران ہیں محلے سنسان گھر پڑے ہیں ۳

انشاء اللہ خاں انشا نے "دریائے لطافت" میں اس صورت حال کے بارے میں لکھا کہ :

"افلاس کی وجہ سے بہت سے اونچے گھروں کے لوگ اور فصیح اشخاص مدتیں ہوئیں دارالخلافہ سے نکل آئے ہیں اور یورپ کے شہروں میں آباد ہو گئے ہیں لیکن لکھنؤ ، دُور مشرق کے اور شہروں کے مقابلے میں ، شاہ جہاں آباد کی قُربت کی وجہ سے ترجیح رکھتا ہے ۔ اس شہر میں فصیح دہلویوں کی اتنی کثرت ہے کہ ان کا شمار نہیں ۔" ۴

دلّی والوں نے اپنی صدیوں کی تہذیب کے رنگ سے ہر علاقے کی تہذیب کو متاثر کیا ۔ اس زمانے میں اودھ کا مرکزی شہر لکھنؤ بر عظیم میں علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا ایک نیا مرکز بن گیا تھا اور یہاں دلّی والوں کی زبان اور ان کا محاورہ مستند سمجھا جاتا تھا ۔ اس دور کے لکھنؤ کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ گویا دلّی نے لکھنؤ آکر ایک نیا جنم لیا ہے ۔ انشا نے ان اثرات کے پیش نظر لکھا کہ "دلّی والوں کی صحبت کے فیض سے دیہات والوں نے کھانے پینے پہننے اوڑھنے کے طریقے ، بیان کی فصاحت اور زبان کی چُستی سیکھ لی" ۵ اور صورت حال یہ ہو گئی جیسا کہ انشا نے لکھا ہے کہ "ہم چُنیں لکھنؤ را کہ حالا جانِ شاہ جہاں آباد می گویند نہ جان پورب ۔ اگر بہہ از شاہ جہاں آباد گویند می زیبد چرا کہ ایں ترجیح از قبیل ترجیح جان بر قالب است ۔۔۔" ۶ لکھنؤ نے دلّی کی اس تہذیب و زبان کی بنیادوں پر اپنی عمارت کھڑی کی تھی اور خود اردو تہذیب و زبان کا ایک نیا اور بڑا مرکز بن گیا تھا ۔

انیسویں صدی کے آغاز کے وقت دلّی والے سودا ، میر سوز اور جعفر علی حسرت وفات پا چکے تھے ۔ محمد تقی میر زندہ تھے اور کم و بیش ۸۰ سال کے تھے ۔ جرأت بھی نو عمری میں اپنے والد کے ساتھ دلّی سے فیض آباد آ گئے تھے ۔ انشا بھی ، مرشد آباد میں پیدائش کے باوجود ، دلّی وال تھے ۔ مصحفی کو دلّی سے لکھنؤ آئے کم و بیش سولہ سترہ سال ہو چکے تھے ، اودھ پر نواب آصف الدولہ (وفات ۱۷۹۷ء) کی حکمرانی ختم ہو چکی تھی اور نواب وزیر علی خان کے مختصر دورِ حکومت کے بعد یمین الدولہ نواب سعادت علی خاں (۱۷۹۸ء — ۱۸۱۴ء) مسندِ سلطنت پر متمکن تھے ۔ معاشی ، معاشرتی اور سیاسی صورتِ حال نے اب یہاں کے ماحول کو ، دلّی کے گہرے تہذیبی اثرات کے باوجود ، دلّی سے مختلف بنا دیا تھا جس کے تقاضے ، شوق ، مشغلے اور دلچسپیاں دلّی سے مختلف تھیں ۔ میر کے آخری زمانے کے لکھنؤ کے مذاقِ شاعری میں اتنی تبدیلی آ چکی تھی کہ خود میر اس ماحول میں اجنبی ہو کر رہ گئے تھے ۔ جعفر علی حسرت نے ، نئے معاشرتی تقاضوں کی تخلیقی سطح پر ترجمانی کر کے ، وہ مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ فیض آباد اور لکھنؤ میں ان کے شاگردوں کی اتنی تعداد ہو گئی تھی کہ وہ انہیں پہچانتے بھی نہ تھے ۔ جرأت انہیں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے ۔ جعفر

علی حسرت (متوفی ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء) نے جس رنگِ سخن کو لکھنؤ و فیض آباد کی نئی تہذیبی فضا سے ملا کر نکھارا ، جرأت نے اس رنگ کے سارے امکانات کو تصرُّف میں لاکر اپنی انفرادیت کی مہر ثبت کر دی اور خود اِس رنگِ سخن کے ممتاز نمائندہ بن گئے ۔ اس رنگ میں میر سوز کی معاملہ بندی کا وہ رنگِ سخن بھی شامل تھا جس پر جل کر محمد تقی میر نے میر سوز سے کہا تھا کہ : "موقع و محل تمہاری شعر خوانی کا وہ ہے جہاں لڑکیاں جمع ہوں اور ہنڈ کُلیا پکتی ہو ۔"۷ اور ایک موقع پر جیسا کہ حکیم قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے ، جرأت سے کہا تھا کہ : کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو ۔ اپنی چُوما چاٹی کہہ لیا کرو ۔"۸ اس دور کے لکھنؤ کا یہی اصل مزاج تھا کہ وہ ہنڈ کلیا اور چوما چاٹی کی تہذیب بن کر رہ گئی تھی ۔ اسی تہذیبی رنگ کا اظہار اس دور کی شاعری کرتی ہے ۔ ہم سب یہ تو کہتے ہیں کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے لیکن ہم نے اب تک ایسے تنقیدی مطالعوں کی بنیاد نہیں ڈالی ہے کہ جن میں ادب و شعر کے معاشرتی و تہذیبی مطالعے سے کسی دور کی زندگی اور اس کی قدروں کو دریافت کیا جا سکے اور دیکھا جا سکے کہ ایسا کیوں تھا؟ لکھنؤ کی اس تہذیب کا خمیر مغلیہ سلطنت کے زوال سے اٹھا تھا اور اسی لیے اس میں وہ توازن نہیں تھا جو صحت مند تہذیب کا خاصہ ہوتا ہے ۔ حسن اتفاق دیکھیئے کہ خود آصف الدولہ کا مجسم وجود بھی اس تہذیب کا نمائندہ تھا جن کے بارے میں مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ان کا "اوپر کا دھڑ بڑا تھا اور تلے کا دھڑ کمر سے پاؤں تک کسی قدر چھوٹا تھا۔ جب بیٹھ جاتے تو معلوم ہوتا کہ خوش قامت جوان ہیں ۔ جب کھڑے ہوتے تو آدمیوں کی کمر تک پہنچتے ۔"۹ یہی صورت ان کی سلطنت کی تھی ۔ ان کے پاس سلطنت و حکومت تو تھی لیکن اقتدار و اختیار نہیں تھا اور یہی صورت اس تہذیب کی تھی کہ دیکھنے میں خوش قامت لیکن جب دوسری تہذیب کے سامنے کھڑی ہوتی تو بونی اور پست قامت معلوم ہوتی۔

آصف الدولہ (وفات ۱۷۹۷ء) کے دورِ حکومت سے لے کر غازی الدین حیدر کی وفات (۱۸۲۷ء / ۱۲۴۳ھ) تک کے زمانے کو دیکھیئے تو اس میں چند باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں : ایک یہ کہ سلطنت کی بُنیادیں کمزور ہیں ، بظاہر نواب حاکم ہے لیکن اصل حکمران انگریز ہے جس نے حاکم کو اتنا بے بس و مجبور کر دیا تھا کہ ظاہری شان و شوکت کے باوجود اصلاح سلطنت کے لئے کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کر سکتا تھا۔ سلطنت کی حفاظت کی ذمہ داری بھی چونکہ خود انگریزوں نے لے لی تھی اس لیے اب خود نواب کے لیے کچھ کرنے کے لیے رہ بھی نہیں گیا تھا ۔ اب ان کے سامنے یہی راستہ تھا کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں اور یہی انہوں نے کیا ۔ اسی کے زیر اثر حُسن پرستی اور زنانہ پن حکمران اور معاشرے کے مزاج میں در آئے ۔ رقص و موسیقی ، شراب و کباب اور عورت کے چونچلوں کے گرد یہ معاشرہ رقص کرنے لگا ۔ آرائشی فنون اور تزئینی دستکاریوں نے خوب ترقی کی ۔ آتش بازی کے پھولوں نے رونق میں اضافہ کیا ۔ نئے نئے رسوم و رواج نے زندگی میں رنگ بھرا ۔ مذہب بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہا ۔ مغلیہ روایت کے مطابق علم ، ادب و شعر کی سرپرستی بھی کی ۔ حکمرانوں نے خود بھی شعر کہے ۔ آصف الدولہ کا "دیوان" موجود ہے ۔ میر و سودا اُن کے دربار سے وابستہ تھے ۔ میر سوز سے وہ مشورۂ سخن کرتے

تھے ۔ نواب سعادت علی خاں کو شاعری اور علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی ۔ انشا ان کے دربار سے وابستہ تھے ۔ غازی الدین حیدر نے "ہفت قلزم" کے نام سے ایک کتاب علم لغت میں لکھی تھی ۔ ان کے وزیر معتمد الدولہ آغا میر نے شیخ امام بخش ناسخ کو ایک قصیدہ پر سوا لاکھ روپیہ انعام دیا تھا (۱۰) میر بندے علی کو نقل و بہروپ اور مسخرگی سے خوش ہو کر گیارہ سال میں چودہ لاکھ روپے انعام دیے تھے ۔ (۱۱)

احساسِ محرومی کے ساتھ شجاع الدولہ اور پھر آصف الدولہ کے دور سے شروع ہو کر عیش و عشرت کا یہ رجحان وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا ۔ ایک ایسی سلطنت میں جہاں امن و امان قائم ہو ، شاہی خزانہ فراخ دلی کے ساتھ خرچ کیا جا رہا ہو ، وہاں بظاہر معاشی فراغت نظر آتی ہے ۔ اس بظاہر امن و امان نے سارے معاشرے میں انہیں اقدار کو پروان چڑھایا اور وہ حسن پرستی اور لذت کوشی میں مبتلا ہو گیا ۔ اسی لیے جسم اور وصل اس معاشرے کی نمایاں خصوصیت ہے اور یہی خصوصیت اس دور کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے ۔ اس دور میں شوخ معاملہ بندی کی مقبولیت بھی اسی مزاج کی پروردہ ہے ۔ یہ معاشرہ ہر اُس چیز یا قدر کو پسند کرتا ہے جس سے اس کے تحت الشعور کا شدید احساسِ محرومی فراموش کیا جا سکے ۔ اسی لیے وہ رنگ رلیوں ، قہقہوں اور لطیفہ بازی کو دل سے پسند کرتا ہے ۔ تہذیب کی معنویت جو معاشرے کو متحرک رکھتی ہے اس میں باقی نہیں رہی تھی اسی لیے تخلیقی سطح پر اس میں گہرائی نظر نہیں آتی ۔ اسی تہذیبی ، سیاسی و معاشرتی صورت حال سے اس معاشرے کا تصور عشق پیدا ہوا جس میں عشق کے حقیقی جذبات غائب تھے اور صرف وصل و جسم کا احساس باقی تھا اور جسم بھی وہ جو زر سے خریدا جا سکے ۔ اس دور کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاعری سے "عاشق" ، جس سے میر کی شاعری معمور ہے ، غائب ہو جاتا ہے اور معشوق اس کی جگہ لے لیتا ہے ۔ اسی لیے اس دور کی شاعری عشق کی نہیں حُسن کی شاعری ہے ۔ عاشق کی نہیں معشوق کی شاعری ہے جس میں اس کے حُسن و ادا ، معاملاتِ حسن ، سراپا ، آرائش جمال پر سارا زور ہے ۔ مصحفی ، انشا اور جرأت کے بہت ہلکے رنگ کا ایک ایک شعر سنیئے تاکہ اس دور کے مزاج کی جھلک سامنے آ سکے :

ہر چند کہ تھا قابلِ دیدن بدن اس کا
پر آنکھ نہ ٹھہری جو کُھلا پیرا ہن اس کا (مصحفی چہارم ص ۸۲)

مزا جو آپ کے سینے کے کچھ ابھار میں ہے
نہ سیب میں نہ بہی میں نہ وہ انار میں ہے (انشا ص ۲۷۴)

گر وہ ہاتھ آئے تو زانوں پہ بٹھائے رکھیئے
لب سے لب سینے سے سینے کو ملائے رکھیئے (جرأت اول ص ۴۳۹)

لکھنؤ کے مخصوص معاشرتی ، معاشی و سیاسی حالات نے جو تہذیبی فضا پیدا کی اس سے شاعری بھی ، جو اس تہذیب کی سب سے بڑی تخلیقی سرگرمی تھی ، پوری طرح متاثر ہوئی ۔ اب زور معاملاتِ حُسن پر مرکوز ہو گیا جس کے

لطف و لذت سے سارا معاشرہ مزا لینے لگا ۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ زندگی سے لطف اور مزے کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینا چاہتا ہے ۔ اس دور کی لکھنوی تہذیب کے لیے عشق ، میر کی طرح ، حیات و کائنات کے تجربے کا نام نہیں تھا بلکہ اس کی حیثیت ایک بازی ، ایک کھیل ، ایک تماشے کی تھی ۔ یہ تماشا ، یہ مزا اس دور کی شاعری میں بھی موجود ہے اور اس دور کے رقص و موسیقی میں بھی ۔ پھبتی ، ضلع جگت اور رعایت لفظی میں بھی اور پیشہ ور لطیفہ گویوں ، نقالوں ، بہروپیوں ، مسخروں اور قصہ خوانوں کے فن میں بھی ۔ مرغ ، بٹیر اور کبوتر بازی میں بھی اور بانکوں ، چھیل چھبیلوں کی سج دھج میں بھی ۔ توہمات اس معاشرے میں حقیقت بن گئے تھے ۔ غازی الدین حیدر کو ایک شخص کی صحبت پسند تھی ۔ معتمد الدولہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ شخص بادشاہ سے ملے ۔ معتمد الدولہ نے اسے ملنے سے روک دیا اور بادشاہ سے کہہ دیا کہ وہ مرگیا ہے ۔ ایک دن بادشاہ کی سواری گزر رہی تھی کہ اس شخص پر ان کی نظر پڑی ۔ حکم دیا جلد حاضر کرو ۔ کارپردازان سواری نے تعمیل حکم سے چشم پوشی کی ۔ بادشاہ نے معتمد الدولہ سے پوچھا کہ کیا معللہ ہے ؟ کہا کہ حضور کو اللہ نے چشمِ پُر نُورِ جہاں عطا کی ہے ۔ ظاہر و باطن کے پردے کھلے ہیں ، جو کچھ حضرت ملاحظہ فرماتے ہیں ہم سب لوگ ہرگز ہرگز نہیں دیکھ سکتے ۔ بادشاہ کہتے تھے وہ ہے وہ ہے اور سب کہتے تھے کہاں ہے کہاں ہے ۔ بادشاہ کو یقینِ کامل ہو گیا کہ یہ صورت لباسی تھی ۔ ۱۲ اس سے یہ بات سامنے آئی کہ بادشاہ کا زندگی و معاشرہ سے رشتہ منقطع ہو چکا تھا اور وہ صرف وہ دیکھ سکتا تھا جو اسے دکھایا جاتا تھا۔ جنوں کا بادشاہ بھی بادشاہ بیگم ، زوجہ غازی الدین حیدر کے پاس آتا تھا جو اُن پر عاشق تھا اور پریاں بھی خدمت میں حاضر ہوتی تھیں۔(۱۳) اسی زمانے میں بہت سی نئی رسمیں جاری ہوئیں ۔ صاحب الزماں کے واسطے چھٹی کی رسم ایجاد کی گئی ۔ یہ رسم ہر سال شعبان کے مہینے میں دھوم دھام سے ادا کی جاتی تھی۔ ایک رسم "اچھوتی" کی ایجاد ہوئی۔(۱۴) ایک اور رسم "اچھوتہ" کی ایجاد کی۔(۱۵) "وقائع دلپذیر" میں مناجان کے حالات میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں اس رسم نے ایسی اشاعت پائی کہ اکثر شہر کی عورتیں اچھوتی کے لقب سے ملقب ہیں اور ان کے خاندان کے مرد فخر سے عورت کی طرح بات چیت کرتے ہیں۔(۱۶)

خواتین و حضرات!

تہذیب کا وہ رنگ جو شجاع الدولہ کے فیض آباد اور آصف الدولہ کے لکھنؤ میں قائم ہوا وہی رنگ آئندہ دور کے تہذیبی رنگ کی اساس بنا۔ اس تہذیب میں، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، بڑھنے پھیلنے اور نئی مہمات پر روانہ ہونے کی سکت و قوت نہیں تھی۔ یہ ایک محصور اور نظر بند جزیرے کی تہذیب تھی جس کی چوکھٹ پر انگریز چوکیدار بندوق تانے کھڑا تھا اور اندر سارا محل رنگ رلیاں منانے میں مصروف تھا۔ اس تہذیب کی قوتِ عمل مفلوج ہو چکی تھی اور اس کے اندر جادو کی انگوٹھی سے طلسمات کے قلعے فتح کرنے کی خواہش موجود تھی۔ اسے ہم بہتے دریا یا کھلے سمندر کی نہیں بلکہ بند تالاب کی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ اسی لیے اس تہذیب کے تخلیقی مزاج میں بھی ہمیں زندہ تہذیبوں کی گہرائی نہیں ملتی۔

یہ ایک طرح سے خوشنما کاغذی پھولوں کی تہذیب ہے جس میں شوخ رنگ تو ہیں لیکن خوشبو نہیں ہے۔ اس میں نہ حوصلہ تھا اور نہ قوت ارادی جو معاشروں کا مقدر بدل دیتی ہے۔ مصحفی کے یہ شعر دیکھیے:

نامرد تھے زبس کہ امیر اس زمانے کے
سفرے پہ ان کی دیکھا تو خصی پلاؤ تھا (مصحفی، دیوان چہارم ص ۱۴)

یاں نہ روبہ کی اور نہ شیر کی بحث
رات دن ہے یہی بٹیر کی بحث (مصحفی، دیوان ششم، ص ۶۵)

شیریں و تلخ دہر سے اندھوں کو کیا خبر
وہ ہی کڑا کے اور وہی افیون کے گولے ہیں (مصحفی، دیوان ہشتم ص ۶۴)

اس صورت حال میں وہی کچھ ہو سکتا تھا جو یہاں ہوا۔ زندگی بڑے مقاصد سے عاری ہو گئی۔ معنی گم ہو گئے اور لذت کوشی نے زندگی کی ساری دوسری سرگرمیوں کی جگہ لے لی۔ اس دور کے ادب، شاعری اور ساری دوسری تخلیقی سرگرمیوں کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

میر سوز نے قدرے متانت کے ساتھ معاملات حسن کو اپنی شاعری کا ہنر بنایا تھا۔ جعفر علی حسرت نے حسن ظاہر، آرائش و وصف محبوب کے بیان پر زور دیا تھا۔ سراپانگاری کو ایک نیا رخ دیا تھا۔ صنائع بدائع کے استعمال کو عام کیا تھا۔ سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف قافیہ سے اظہار فن کیا تھا۔ عشق کے جذبات کو حُسن کے بیان تک محدود کر دیا تھا۔ اس اظہار میں گہرے اور عمیق جذبات شامل نہیں تھے بلکہ وہ معاملات شامل تھے جن میں معشوق کے ناز و ادا، نخرے، چونچلے اور جذبات وصل کا ذکر ہوتا ہے۔ عشقِ حقیقی اور تصوف کو اس معاشرے کے لذت کوش مزاج نے رد کر دیا تھا۔ اس کے رد ہوتے ہی چھیڑ چھاڑ، مزے کی باتیں، نخرے، چونچلے، لطیفے، فقرے بازی، پھبتی، جگت، تمسخر اور ظرافت نے اس کی جگہ لے لی۔ ان سے عیش دوبالا ہو جاتا ہے۔ وصل جسم اور یہ سب عناصر اس معاشرے میں عشق کا بدل قرار پائے اور اس دور کی شاعری نے جعفر علی حسرت اور میر سوز کی شاعری کی بنیاد پر اپنی "نئی شاعری" کی بنیاد رکھی۔ انشاءاللہ خاں انشا نے اپنی قادر الکلامی سے اس رنگ میں تمسخر و ظرافت اور تیز فقرہ بازی اور پھبتی کا مزا شامل کر کے وہ رنگ پیدا کیا کہ وہ خود اس تہذیب کے ایک نمائندہ شاعر بن گئے:

آزادوں کے لہجے میں غزل یہ تو سُنائی از بہرِ تفنُّن
اب اپنی تو بولی میں کچھ اشعار کہہ انشا، ہو جس میں ظرافت

وہ لطیفہ گوئی اس کی وہ فصاحت اور بلاغت
نہیں اس قدر کہ بولے کوئی شاعر و سخن داں

اب چھیڑ چھاڑ کی غزل انشا ایک اور لکھ
ہیں لاکھ شوخیاں تری نوکِ قلم کے ساتھ
ہزاروں دیویوں کو یہاں کی پریوں نے لتاڑا ہے
نہیں یہ لکھنؤ اک راجا اندر کا اکھاڑا ہے

مصحفی ساری عمر کبھی اس تہذیب کے رنگِ سخن سے جنگ اور کبھی صُلح کرتے رہے:

کیوں بولتا نہیں روش اپنی سے مصحفی
تو بُھول ہی گیا غزلِ عاشقانہ کیا (ششم ص۰)

کبھی کہتے :

نخرہ بھی شعر میں ہو تو ہاں سوز کا سا ہو
کس کام کی وگرنہ چھنالے کی شاعری (سوم ص۳۹۶)

جرأت نے سوز و حسرت کی روایت معاملہ بندی کو، اس تہذیب کے مزاج و پسند کے مطابق، اتنا کھول دیا کہ ان کی شاعری اس دور کے مزاج کا آئینہ بن گئی ۔ جرأت کا دیوان ہر وقت آصف الدولہ کے سرہانے رکھا رہتا تھا۔ تذکرہ "مجمع الانتخاب" میں شاہ کمال نے لکھا ہے کہ دیوان جرأت "ہر لحظہ بر پلنگ می ماند و از مطالعۂ آں مسرور می شدند ۔ (۱۷) یہ وہ کلام تھا جو اس معاشرے کے فرد کی روح کی ترجمانی کر رہا تھا۔ یہ کلام دل کو بہلانے کا شغل بھی تھا اور افکارِ زمانہ سے نجات کا ذریعہ بھی۔ جرأت کے یہ دو تین شعر بھی سنتے چلیے۔

غم زدے روتے تڑپتے ہیں جہاں دو چار واں
شغل بہلانے کو دل کے میرے اشعاروں کا ہے (ص۳۸۴)
فکر میں اس کے ہے افکارِ زمانہ سے نجات
جرأت اور ایک غزل کرنے میں تحریر لگا (ص۳۷)
غزل اور معشوق کی عاشقی کی
کہی ہم نے جرأت بہ طرزِ دگر پر (ص۱۸۶)

جیسے شاہ مبارک آبرو محمد شاہی دور کے سماج اور اس کی تہذیب کے نمائندہ تھے اسی طرح قلندر بخش جرأت اس دور کی روح کے نمائندہ شاعر و ترجمان تھے۔ جرأت ، رنگین اور انشا نے تخلیقی سطح پر اس معاشرے کو وہ کچھ دیا جو وہ چاہتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ مصحفی کے مقابلہ میں یہی لوگ ساری فضا پر چھائے رہے۔

شیخ قلندر بخش (۱۸) (۱۱۶۲ھ ——— ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۷۴۹ ——— ۱۸۰۹ء)

جن کی عرفیت یحییٰ امان (۱۹) اور تخلص جرأت تھا، دلی میں پیدا ہوئے۔ (۲۰) والد کا نام حافظ امان تھا۔ (۲۱)

حافظ امان کے والد رائے مان ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حکم سے قتل کر دیے گئے تھے۔ (۲۲) رائے مان کے والد شاد مان رضا بہادر رستم بہند تھے۔ جنہوں نے ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء میں دہلی میں وفات پائی۔ (۲۳) شیخ قلندر بخش جرأت کا خاندان دہلی کا قدیم اور معزز خاندان تھا جن کے بزرگ "دربانی حضور والا" (۲۴) کے عہدے پر مامور تھے۔ چاندنی چوک کے پاس کوچہ رائے مان (۲۵) مشہور تھا جہاں یہ خاندان آباد تھا۔

جرأت کا سال ولادت متعین نہیں ہے لیکن شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے۔ تذکرہ طبقات سخن (۲۶) مؤلفہ مبتلا و عشق میر ٹھی میں، جس کا سال تصنیف ۱۲۲۲ ہے، جرأت کی عمر ساٹھ سال بتائی گئی ہے، گویا ۱۲۲۲ھ میں سے ۶۰ گھٹا دیے جایئں تو سالِ ولادت ۱۱۶۲ھ برآمد ہوتا ہے جس کی مزید تصدیق مصحفی کے قطعہ تاریخ وفات کے اس مصرع سے بھی ہوتی ہے: از قلندر بخش شصت و دو فگن — اس مصرع سے معلوم ہوتا ہے کہ وفات کے وقت جرأت کی عمر ۶۲ سال تھی۔ قلندر بخش کے اعداد ۱۲۸۶ میں سے ۶۲ نکالنے سے جرأت کا سال وفات ۱۲۲۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس طرح اگر ۱۲۲۴ میں سے ۶۲ نکال دیے جائیں تو سال ولادت ۱۱۶۲ھ برآمد ہوتا ہے اور یہ وہی سال ہے جو طبقات سخن سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان شواہد کی روشنی میں جرأت کا سال ولادت ۱۱۶۲ھ مطابق ۱۷۴۹ء متعین ہو جاتا ہے۔

جرأت ابھی نو عمر ہی تھے کہ امراء کی خانہ جنگیوں، مرہٹوں کی یورش، جاٹ گردی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے دلّی ایسی اُجڑی کہ اہلِ دہلی کے لیے وہاں رہنا دشوار ہوگیا۔ ۱۱۷۰ھ/۵۷-۱۷۵۶ء میں احمد شاہ ابدالی نے دو ماہ میں دلّی کو دوبار لوٹا۔ اس وقت فیض آباد حکومتِ اودھ کا مرکز اور امن و امان کے ایک جزیرے کی حیثیت رکھتا تھا۔

دلی سے قریب ہونے کی وجہ سے بھی دلی والے یہاں ہجرت کرنے لگے۔ جرأت کے والد حافظ امان بھی اسی زمانے میں اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے فیض آباد آ گئے۔ جرأت نے لکھا ہے:

ہوا تھا شہر دہلی جب سے غارت
تھی اپنی اس جگہ میں استقامت
فلک نے کر جہاں آباد برباد
کیا تھا خوب فیض آباد آباد
تو جو تھے ساکنانِ شہرِ دہلی
سکونت ان کی فیض آباد میں تھی (۲۷)

"طبقاتِ سخن" کے مؤلف مُبتلا میر ٹھی نے ہجرت کے وقت ان کی عمر بارہ سال بتائی ہے (۲۸)۔ سال ولادت کے تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جرأت ۱۱۷۴ھ مطابق ۶۱-۱۷۶۰ء میں فیض آباد پہنچے۔ یہیں جرأت کی نشوونما اور تعلیم

و تربیت ہوئی۔ (۲۹) لیکن نو عمری کے باوجود وطن کی یاد کے نقوش ہمیشہ تازہ رہے جس کا ذکر شاعری میں بار بار آتا ہے:

اب ہم ہیں اور شامِ غریبی کی دید ہے
مدت سے وہ نظارۂ صبحِ وطن گیا (کلیات، اول ص ۱۶)

لُٹنے جوں اک نگر اور دوسرے ہو شہر میں بھاگڑ
خلل یوں ملک تن میں ہے دیارِ دل کی غارت سے (ص ۴۳۲)

اب اس کی بزم ہے جوں بارگاہِ نادر شاہ
کہ سر جھکائے کھڑے چُپ ہیں سب قرینے سے (ص ۵۲۰)

کہ رخسار کا اس کے جہاں ہو ذکر تو جیسے
لگے ہے چاندنی چوک اس طرح بازار لگ جاوے (ص ۵۰۲)

جرأت شاعری کا فطری ذوق لے کر پیدا ہوئے تھے۔ میر حسن نے، جن کے "تذکرہ شعرائے اردو" کا پہلا متن ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں تیار ہوا، (۳۰) لکھا ہے کہ "ذوقِ شعر بہ مرتبہ دارد کہ ساعتے بے فدایش نمی ماند" (۳۱) اور ۱۱۹۲ھ کے نظر ثانی شدہ نسخے میں لکھا کہ "شوق شعر از حد زیاد دارد ..... دیوانۂ فن شعرست کہ گاہے بے فکر نمی ماند۔" (۳۲)

چُھٹے اب شعر کہنا کیونکہ ہم سے آہ اے جرأت
مثل ہے دل میں عاشق کے سدا ناسور رہتا ہے (ص ۴۸۱)

۱۱۸۸ھ/۷۵-۱۷۷۴ء میں جرأت کی عمر تقریباً ۲۶ سال تھی اور وہ، جیسا کہ میر حسن نے لکھا ہے، اپنے معاصرین میں بحیثیت شاعر ممتاز ہو چکے تھے۔ (۳۳) اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جرأت کی شاعری کا آغاز پندرہ سولہ سال کی عمر میں ۱۱۷۸ھ/۶۵-۱۷۶۴ء کے لگ بھگ ہو چکا تھا۔ ۱۱۷۹ھ میں شجاع الدولہ اپنا دارالحکومت دوبارہ لکھنؤ سے فیض آباد لے آئے۔ جعفر علی حسرت بھی ۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ فیض آباد آگئے اور شجاع الدولہ کے حضور قصیدہ پیش کیا جو ان کی کلیات میں موجود ہے۔ (۳۴) اس وقت تک جعفر علی حسرت اپنی فنی و علمی قابلیت اور شاعرانہ صلاحیت کے باعث مشہور ہو چکے تھے اور ان کا رنگِ سخن نئی نسل میں اتنا مقبول تھا کہ شعراء کی نئی نسل ان کی شاگردی پر فخر کرتی تھی۔ اسی زمانے میں فیض آباد ہی میں جرأت نے بھی جعفر علی حسرت کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اپنی غزلوں میں کئی جگہ انہوں نے حسرت کی استادی کا اعتراف کیا ہے:

ہے جو دیوانِ حسرت اے جرأت
اسی خرمن کا خوشہ چیں ہوں میں (ص ۲۷۳)

کہے کیوں کہ نہ حسرت کے سبب سے یہ غزل جرأت
کہ فنِ شعر میں دیکھی ہیں ایسے پیر کی آنکھیں (ص۲۸۴)
فقط حسرت کو اے جرأت ہمیں استاد نہیں کہتے
ہر اک اہل سخن ان کے تئیں استاد جانے ہے (ص۴۴۹)

ایک رباعی اپنے استاد جعفر علی حسرت کی وفات پر لکھی اور دو رباعیات و قطعات تاریخ وفات بھی کہے۔ ایک مخمس کے مقطع میں حسرت کا ایک شعر دیا ہے اور لکھا ہے کہ: بھلاؤں گا نہ میں استاد کی اس فرد کو ہرگز۔ شاگرد ہونے کا یہ واقعہ ۱۱۸۱ھ کا ہو سکتا ہے۔ اس وقت جرأت کو شعر کہتے ہوئے تین چار سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ۱۱۸۸ھ میں حافظ رحمت خان کے بیٹے نواب محبت خاں محبت نظر بند کر کے فیض آباد لائے گئے۔ یہیں وہ جعفر علی حسرت کے شاگرد ہوئے اور یہیں حسرت کے واسطے سے جرأت کی ملاقات نواب محبت خاں محبت سے ہوئی اور وہ ان کے ملازم ہو گئے:

بس کے گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستان کے
ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے (ص۳۸۳)
کیوں نہ جرأت کو محبت سے محبت ہووے
انس وہ شے ہے کہ ہو جس سے بگانا اپنا (ص۹۷)

شجاع الدولہ کی وفات (۲۴ ذیقعد ۱۱۸۸ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۷۷۵ء) کے تقریباً دو ہفتے بعد ۱۲ فروری ۱۷۷۵ء کو آصف الدولہ میدی گھاٹ اور پھر اٹاوہ چلے گئے اور وہاں تقریباً ۵ مہینے گزار کر ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء کے وسط میں لکھنؤ آ گئے۔ کچھ عرصے بعد عُمّال سلطنت ، متوسلین اور اہلِ فن بھی لکھنؤ منتقل ہونے لگے۔ جعفر علی حسرت بھی لکھنؤ آ گئے۔ نواب محبت خاں محبت بھی اٹاوہ ہوتے ہوئے لکھنؤ آ گئے۔ جرأت اور ان کے دوست خواجہ حسن بھی محبت خاں کے ساتھ تھے۔ جرأت نے لکھا ہے کہ: میں ان کے ساتھ تھا ان کا نمک خوار ۔ فیض آباد سے لکھنؤ آنے کا اظہار جرأت نے اپنی طویل مثنوی "خواجہ حسن و بخشی" میں بھی کیا ہے۔ لکھنؤ آ کر وہ نواب محبت خاں محبت کے متوسل رہے، لیکن ۱۲۰۶ھ میں وہ سلیمان شکوہ سے بھی وابستہ ہو گئے اور یہ سلسلہ آخر دم تک قائم رہا۔ ان کے سرپرستوں میں نواب محبت خاں محبت (متوفی ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء) اور مرزا سلیمان شکوہ (۲۹ ذیقعد ۱۲۵۴ھ مطابق ۲۴ ۔ فروری ۱۸۳۸ء) کے نام نمایاں ہیں۔ قصائد و مدحیہ اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نواب احمد علی خاں شمس الدولہ بہادر صولت جنگ کے بھی ملازم رہے۔ (۳۵) یکتا نے لکھا ہے کہ "صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ بہادر دام ظلہ اورا بسیار عزیز می داشتند۔ (۳۶) نواب محمد خاں سے تعلق ملازمت سے زیادہ رفاقت کا تھا۔ کچھ مدد بھی ہو جاتی تھی۔ سلیمان شکوہ سے یہ سلسلۂ ملازمت تاحیات چلتا رہا لیکن اس دربار سے بھی ان کی ضروریات زندگی بمشکل پوری ہوتی تھیں۔ کبھی مہینوں تنخواہ نہ ملتی:

جرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم
کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سلیماں کب دے

ایک منظوم مکتوب بنام منشی مرزا سلیمان شکوہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنخواہ کے لیے بار بار منشی کے گھر کے چکر کاٹتے تھے اور وہ وعدہ کے باوجود گھر پر نہیں ملتا تھا۔

جرأت کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان و ادب ، علم طب، عروض و قواعد اور فن شعر سے خوب واقف تھے۔ گاہے گاہے فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ (۳۷) ان کی مثنویوں میں بھی فارسی اشعار آتے ہیں ۔ کچھ رباعیاں بھی فارسی میں کہی ہیں۔ ایک ترکیب بند حضرت علیؑ کی منقبت میں فارسی میں لکھا ہے (۳۸) علم موسیقی سے بھی واقف تھے اور ستار نوازی پر عبور رکھتے تھے۔ (۳۹) علمِ نجوم سے بھی واقف تھے۔ (۴۰) مرزا علی لطف نے لکھا ہے کہ "نجوم میں بھی اس شخص کو دخل تمام ہے، ایسا کہ ایک عالم لکھنؤ کا اس کا منتظر احکام ہے۔ (۴۱) قدرت اللہ شوق (۴۲) نے انہیں "قابل و نہایت اہل درد" لکھا ہے۔ شاہ کمال نے انہیں "واقف ہر دقیقہ و پُر فن ، صاحب طبع، شاہ ملک سخن" لکھا ہے۔ (۴۳) شاہ کمال قائم چاند پوری کے شاگرد تھے۔ قائم جب لکھنؤ سے جانے لگے تو انہوں نے اپنے شاگرد شاہ کمال کو ہدایت کی کہ ان کے جانے کے بعد جرأت کو اپنا کلام دکھایا کریں کہ "میاں قلندر بخش جرأت در سخن سنجاں و در معنی آفریناں عدیل ندارد۔" (۴۴) اسی وجہ سے خود مصحفی نے اکبر علی اختر کو شاگردی کے لیے جرأت سے رجوع کرنے کے لیے کہا تھا۔ (۴۵)

جرأت نابینا تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیدائشی نابینا نہیں تھے۔ وہ شخص جو علم نجوم اور ستار نوازی پر عبور رکھتا ہو پیدائشی نابینا نہیں ہوسکتا۔ میر حسن نے انہیں "چیچک رُو" (۴۶) بتایا ہے۔ غالباً بچپن میں چیچک کی وجہ سے ان کی بینائی متاثر و کمزور ہو گئی تھی:

یہی رونا ہے گر منظور جرأت
تو بینائی سے تو معذور ہو گا

اور پھر وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ ان کی بینائی جاتی رہی۔ اب سوال یہ ہے کہ جرأت کب نابینا ہوئے؟ سب سے پہلے جس تذکرے میں جرأت کا ذکر آیا ہے وہ میر حسن کا تذکرہ شعراء اردو ہے۔ یہ تذکرہ ۱۱۸۴ھ میں شروع ہوا اور اس کا پہلا نسخہ ۱۱۸۸ھ میں اور دوسرا نظر ثانی و اضافہ شدہ نسخہ ۱۱۹۲ھ میں مکمل ہوا۔ اس میں جرأت کے نابینا ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ تذکرہ "گلشنِ سخن" میں ، جس کا سال تکمیل ۱۱۹۴ھ ہے، نابینا ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ تذکرہ "مسرت افزا" کا سال تکمیل ۱۱۹۵ھ ہے، اس میں بھی جرأت کے نابینا ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ تذکرہ "گلزار ابراہیم" ۱۱۹۸ھ میں مکمل ہوا لیکن جرأت کے حالات ۱۱۹۷ھ میں لکھے گئے (۴۷) اس میں بھی جرأت کے نابینا ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ گویا ۱۱۹۷ھ تک وہ بینائی سے محروم نہیں ہوئے تھے۔ مصحفی پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے جرأت

کے نابینا ہونے کی اطلاع ان الفاظ میں دی ہے: "حیف کہ چشمش در عین جوانی بہ یک نگاہ نابینا شدہ"۔ (۴۸) مصحفی کا تذکرۂ ہندی ۱۲۰۱ھ اور ۱۲۰۹ھ کے درمیان لکھا گیا۔ اس کے ایک معنی یہ ہوئے کہ جرأت ۱۱۹۷ھ کے بعد اور ۱۲۰۱ھ سے پہلے نابینا ہوئے لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مصحفی نے جرأت کا حال اپنے تذکرے میں کب درج کیا تو اس سے نابینا ہونے کے سال کے تعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ شہزادہ سلیمان شکوہ رجب ۱۲۰۵ھ مطابق مارچ ۱۷۹۰ء میں اودھ آئے۔ تین ماہ تک آصف الدولہ نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور اس کے بعد انگریزوں کے مشورے سے وظیفہ مقرر کر دیا۔ رجب قمری سال کا ساتواں مہینہ ہے۔ تین مہینے یعنی شعبان، رمضان، شوال آصف الدولہ نے توجہ نہیں دی۔ ذیقعدہ میں انگریزوں نے مشورہ دیا اور ذالحجہ میں سلیمان شکوہ کا وظیفہ مقرر ہوا جو قمری سال کا آخری مہینہ ہے۔ وظیفے کے بعد سلیمان شکوہ نے دربار سجایا اور شعراء و اہل فن کو جمع کیا۔ پہلے انشاءاللہ خاں انشاء ملازم ہوئے۔ یہ ۱۲۰۶ھ ہو گا۔ پھر انشا کے کہنے سے مصحفی ملازم ہوئے اور ان کے تین چار ماہ بعد جرأت ملازم ہوئے (۴۹)۔ یہ بھی ۱۲۰۶ھ ہوا۔ دہلی کے شہزادے اظفری ۱۲۰۴ھ میں لکھنؤ گئے اور ۱۲۱۱ھ تک وہاں رہے۔ وہ جرأت کو "نوجوان نابینا شاعر" لکھتے ہیں۔ (۵۰) گویا۔ ۱۲۰۶ھ میں مصحفی نے جرأت کے حالات قلمبند کیے۔ اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ جرأت ۱۱۹۸ اور ۱۲۰۶ کے درمیان نابینا ہوئے اور چونکہ مصحفی نے "در عین جوانی" کے الفاظ لکھے ہیں اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ۱۱۹۸ھ کے لگ بھگ "بیک نگاہ" وہ نابینا ہو گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۶ سال تھی اور اس عمر کو یقیناً "عین جوانی" ہی کہا جائے گا۔ بینائی کے جاتے رہنے کا ذکر طرح طرح سے اور بار بار جرأت کی شاعری میں آیا ہے جس کی تہ میں چھپا ہوا شدید احساس محرومی موجود ہے:

تمہارا یا علیؓ مداح ہے، جرأت کی آنکھوں میں
بہ حق قرۃ العینِ نبیؐ اب روشنائی ہو (ص ۳۴۲)

دیکھ شوخی اس نے تصویر اپنی بھجوا دی اب آہ
غم میں جس پردہ نشیں کے ہم نے آنکھیں کھوئی ہیں (ص ۲۸۵)

رونا آتا ہے ہمیں رونے پہ اپنے یارو
یاں تلک روئے کہ آنکھوں کو بھی رو بیٹھے ہم (ص ۳۲۸)

دیکھنے کا جو کروں اس کے میں دعویٰ جرأت
مجھ میں جرأت یہ کہاں اور مری بینائی کیا (ص ۶۲)

دید کا طالب ہوں تو ہنس کر کہے جرأت وہ شوخ
خاک دیکھے گا تری آنکھ میں بینائی نہیں (ص ۳۲۸ دوم)

جرأت لکھنؤ میں ایک کچے گھر میں رہتے تھے جس کے بارے میں ایک شعر میں خود کہا ہے:

ماٹی کے گھر میں اپنا باسا ہے
گھر نہیں پانی میں بتاسا ہے (کلیات دوم ص ۱۳۶)

نواب محبت خان کے پوتے نواب چندا میاں کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ "یہاں ایک کچا مکان تھا جس میں ایک چھپر پڑا ہوا تھا۔ میاں جرأت اسی میں رہتے تھے۔ ان کی ایک لڑکی بھی تھی۔ جب ان کا انتقال ہوا تو لڑکی نے اسی مکان میں باپ کو دفن کیا۔ اب نہ قبر ہے، نہ نشانِ قبر، نہ مکان ہے نہ چھپر۔ ایک افتادہ میدان ہے۔"(۵۱)

جرأت کے چار اولادیں تھیں۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ ایک بیٹا احمد علی قوّت شاعر تھا جس کا ذکر مصحفی نے "مہذب الاخلاق"، ذہن ذکا اور طبع رسا" کے(۵۲) الفاظ میں کیا ہے اور خود جرأت نے بھی اس کے ایک مصرع پر گرہ لگائی ہے:

جرأت غرض کہ مصرع قُوّت ہے حسب حال
رنگِ زمانہ نوع دگر آئے ہے نظر (ص ۱۹۶)

دوسرا بیٹا تصدق علی شوکت تھا جس کا ذکر نساخ نے اپنے تذکرے (۵۳) میں کیا ہے۔ ایک اور بیٹا غلام عباس تھا جو ۱۲۰۱ھ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۲۰۴ھ میں وفات پاگیا۔ ولادت و وفات کے قطعات کلیاتِ جرأت میں موجود ہیں ۵۴ اکلوتی بیٹی قاسم علی مروّت سے بیاہی گئی تھی۔(۵۵) جرأت کی والدہ کا انتقال ۱۲۰۹ھ میں ہوا۔(۵۶) قطعہ تاریخ وفات کلیات میں موجود ہے لیکن جرأت کی بیوی کے قطعہ تاریخ وفات کے نہ ہونے سے پتا چلتا ہے کہ ان کی وفات جرأت کی وفات کے بعد ہوئی۔

جرأت کی شاعری لکھنؤ میں ویسی ہی مقبول تھی جیسی ایک زمانے میں ان کے استاد جعفر علی حسرت کی شاعری مقبول تھی اور یہی وجہ ہے کہ حسرت کی طرح جرأت کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی بڑی تھی۔(۵۷) اس مقبولیت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جرأت کی شاعری اس دور کی تہذیبی روح اور معاشرے کی پسند و خواہش کی ترجمان تھی، دوسرے یہ کہ وہ فن شعر پر پوری دستگاہ رکھتے تھے اور ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں کے کلام کو درست کرنے پر پوری توجہ دیتے تھے۔ شاگردوں کے اصلاح کلام کے لیے اتوار اور بدھ کے دن مقرر تھے۔(۵۸) وہ شاگردوں کے کلام پر کتنی محنت کرتے تھے اور خود شاگرد اس اصلاح سے کس درجہ مطمئن تھے اس کا اندازہ شاہ حسین حقیقت کے اس بیان سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنی مثنوی "بہشت گلزار" (۱۲۲۵ھ) میں قلمبند کیا ہے کہ "اب چونکہ وہ آسمانِ ہُنر اور جہانِ علوم اس جہاں میں نہیں رہا جو کلام میں سر تاپا اصلاح دے کر سارے سُقم دور کر دیتا تھا اس لیے اگر اب آپ کو میرے کلام میں عاجزی نظر آئے تو میں کیا کروں۔ استاد جرأت مرحوم ہو گئے ہیں۔"(۵۹) جرأت جس مشاعرے میں جاتے آدھا مشاعرہ بلکہ اکثر اس سے بھی زیادہ ان کے شاگردوں سے بھرا ہوتا۔(۶۰) نواب اعظم الدولہ سرور نے لکھا ہے کہ

"ماہرانِ ایں فن بہ استادیش معترف۔ مصلح اشعار اکثر سکنائے لکھنئوست۔"(٦١) صغیر بلگرامی نے ان کے ۳۳ شاگردوں کی فہرست دی ہے۔(٦٢) فائق رامپوری مرحوم نے ۴۶ شاگردوں کی (٦٣) اور پروفیسر اقتدا حسن نے ۵٦ شاگردوں کی فہرست دی ہے۔ (٦٤) اور اس فہرست میں شاہ رؤف رافت، مرزا مغل سبقت، حکیم صغیر علی مروت، شاہ کمال الدین کمال، شیخ محمد بخش مہجور، شاہ حسین حقیقت، مرزا احمد قُوت، مرزا علی لطف، شاہ حسن، شاہ ضبط اور محبت خاں محبت وغیرہ جیسے شعراء نثر نگار اور تذکرہ نویسوں کے نام شامل ہیں۔

جرأت نے لکھنؤ میں ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں وفات پائی۔ جرأت کب اور کیا بیمار ہوئے یہ تو پتا نہیں چلتا البتہ شاہ حسین حقیقت کے ایک قطعے (٦٥) سے، جس میں انہوں نے صحت جرأت کے لیے دعا مانگی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی "درد" میں مبتلا تھے۔ ممکن ہے اسی درد کی وجہ سے ان کی موت واقع ہوئی ہو۔ شاہ حقیقت کا قطعہ یہ ہے:

ہے درد میں مبتلا ، دوا بخشو تم
صحت جرأت کو اب شہا بخشو تم
جس کے مدفن کی خاک ہے خاک شفا
صدقے سے اس کے اب شفا بخشو تم

عام طور سے جرأت کا سال وفات ۱۲۲۵ھ لکھا جاتا رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مطبوعہ کلیات ناسخ میں جو قطعہ تاریخ وفات ملتا ہے اس سے ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء ہی برآمد ہوتے ہیں لیکن خود ناسخ کے ایک اور قطعہ (٦٦) سے ۱۲۲۴ھ برآمد ہوتے ہیں:

چو در حبّ امیرالمومنیں رفت
شدہ خلد بریں ماوائے جرأت
برائے سال تاریخ وفاتش
رقم زد کلک "جرأت ہائے جرأت"

مصحفی کے تینوں قطعات تاریخ سے بھی ۱۲۲۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔(٦٧) شاہ کمال کے اس مصرع: گفت "شاعر وہبی شیریں زباں" سے بھی سال وفات ۱۲۲۴ھ نکلتا ہے۔ جسونت سنگھ پروانہ کے اس مصرع: کہو "جنت نصیب جرأت ہے" سے بھی ۱۲۲۴ھ نکلتے ہیں۔(٦٨) خیراتی لعل بے جگر، گنگا پرشاد رند اور نوازش لکھنوی کے قطعات سے بھی ۱۲۲۴ھ نکلتے ہیں۔ منشی کریم الدین احمد کے طبقات الشعرائے ہند میں بھی سال وفات ۱۲۲۴ھ درج ہے۔(٦٩) ان تمام شواہد کی روشنی میں جرأت کا سال وفات ۱۲۲۴ھ متعین ہو جاتا ہے۔

جرأت سیرت و کردار کے اعتبار سے مرنجاں مرنج خوش خُلق(٧٠)، نیک خو(٧١) اور رقیق القلب(٧٢) انسان تھے۔ آداب محفل اور علم مجلسی سے خوب واقف تھے۔ حافظہ بلا کا تھا۔ جو کچھ کہتے وہ سب یاد رہتا۔(٧٣) سعادت خاں

ناصر نے لکھا ہے کہ نابینا اکثر طبیعت کے ثقیل اور گراں ہوتے ہیں مگر جرأت سبک وضع اور طبیعت رواں رکھتے تھے۔ (۷۴) ملنے جلنے والے انسان تھے اور بصارت چشم سے معذوری کے باوجود دوستوں سے ملاقات کرنے کے لیے دور دور تک جاتے تھے۔ (۷۵) صلح جو انسان تھے اور ایک ایسے دور میں جب لکھنؤ میں شعراء کے معرکے گرم تھے وہ ان معرکوں سے بھی الگ تھلگ رہے۔ یکتا نے لکھا ہے کہ وہ اپنے اس مزاج کی وجہ سے عوام و خواص میں یکساں مقبول تھے۔ ایسے خوش تقریر کہ ان کی بات کسی پر بار نہیں گزرتی تھی۔ صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ (۷۶) کینہ پروری ان کے مزاج میں نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب مصحفی سے رنجش ہوئی تو وہ بھی جلد دور ہو گئی۔

رنجشیں ایسی ہزار آپس میں ہوتی ہیں دلا
وہ اگر تجھ سے خفا ہے تو ہی جا مل، کیا ہوا (اول ص ۹۳)

ظہور اللہ نوا تو بدایوں سے خود کو لکھنؤ کی محفلوں میں جانے کے لیے آئے تھے لیکن جب معرکہ ہوا تو وہ بھی جرأت کی ہر دلعزیزی اور شرافت نفس کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ جرأت نے اپنے ایک اور شعر میں اپنے اسی مزاج کی طرف اشارہ کیا ہے:

دوست ہوں اس کا بھی جو ہو دشمن جانی مرا
وہ نہیں میں جو کسی کے در پے آزار ہوں (ص ۲۹۳)

یہی وجہ ہے کہ حاسد بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ انہوں نے ساری عمر اسی مزاج کے ساتھ گزار دی۔ اس سے جرأت کی ایک مختلف تصویر سامنے آتی ہے جو اس تصویر سے قطعی مختلف ہے جو محمد حسین آزاد نے آب حیات میں پیش کی ہے کہ جس میں نابینا جرأت دوسروں کو مارنے کے لیے بار بار لاٹھی اٹھاتا ہے۔ جرأت کے کردار، سیرت و مزاج کو آپ ان معرکوں میں دیکھ لیجئے جو جرأت کے مصحفی اور نوا کے ساتھ ہوئے۔ وہاں بھی خوش خُلقی کی یہی تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

مصحفی ۱۱۹۸ھ میں دوسری بار لکھنؤ آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ مزاجاً زود رنج تھے۔ لکھنؤ غلام ھلی خاں کے ساتھ آئے تھے مگر جلد ہی ناراض ہو گئے اور دہلی واپس جانے لگے لیکن محمد حسن قتیل نے انہیں روک لیا اور محمد حیات بیتاب کے ہاں لے گئے جہاں انہوں نے قیام کیا۔ (۷۷) کچھ عرصہ لالہ کانجی مل صبا کے ہاں بھی مقیم رہے۔ (۷۸) یکتا لکھنوی نے لکھا ہے کہ مصحفی نے "چوں دید کسے ملتفت بحالش نمی شود یا جرأت طرح خلاف انداختہ تنہا باو لشکر تلامذہ اش مقابل شد"۔ (۷۹)

مصحفی نے ایک قصیدے میں اپنے لکھنؤ آنے اور یہاں کی محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ اس قصیدے کا نام "تیغِ بُرّاں" ہے۔ (۸۰) اس میں واضح طور پر جرأت کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب جرأت کی خواری ہونے لگی تو عاجز ہو کر انہوں نے صلح کا پیغام دیا:

جب غزل پڑھنے لگے تو بہ گوش سامع
رونے اور پیٹنے کی چھٹ نہ کیا ان کا بیاں
تس پہ شاگردوں کی وہ بے محل ان کی تحسیں
اور سخن ان کے میں یہ سوز کہ خود مرثیہ خواں
آخر کار جو ہونے لگی ان کی خواری
اور ہوئی تیغ زباں سے مری، جی میں ترساں
مجھ کو پیغام دیا صلح کا عاجز ہوکر
نہیں لازم جو کروں اس کا بہ تفریح بیاں

مصحفی نے جرأت کے پیغام صلح کو "عاجزی" قرار دیا ہے حالانکہ یہ عمل جرأت کی صلح جُو طبیعت کے عین مطابق تھا جس کی تصدیق یکتا کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ جرأت اگر کسی دوسرے شاعر سے مقابلہ بھی کرتے تو ان کے مزاج کی نرمی اور شرافت طبع و شائستگی برقرار رہتی:

پڑھ غزل اور اپنے تو انداز کی جرأت کہ ہے
اس زمیں میں ریختہ اک شاعر مشہور کا (اول ص ۱۳۲)

جرأت کی شرافت نفسی اور مزاج کی صلح جوئی کا پتا اس بات سے بھی چلتا ہے کہ جب مصحفی نے اپنے شاگرد اکبر علی اختر کو جرأت سے رجوع کرنے کی ہدایت کی تو جرأت اختر کو اپنے حلقۂ تلامذہ میں اس وقت تک لینے کے لیے تیار نہ ہوئے جب تک اختر نے مصحفی کا رقعہ پیش نہیں کیا۔ (۸۱) مرزا خانی نوازش کے ایک شاگرد کا تخلص مہر تھا۔ محبت خان کے بیٹے منصور خان نے جب شاعری شروع کی تو جرأت نے ان کا تخلص مہر قرار دیا۔ مرزا خانی نوازش نے جرأت سے شکایت بے نہایت کی تو جرأت نے کہا "مجھے معلوم نہ تھا۔ میں فقط مہر و محبت کو مربوط دیکھ کر تخلص اس کا قرار دیا۔ (۸۲) ایک اور واقعہ بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔ امام بخش خاں کشمیری کو اشعار اساتذہ جمع کرنے کا شوق تھا۔ ایک دن جرأت سے کہا کہ ایک ایسے شخص کو بھجوا دیں جو ان کے بچوں کو پڑھائے بھی اور تذکرہ مرتب کرنے کا کام بھی کرے۔ جرأت نے شاہ حسین حقیقت کو بھجوا دیا۔ اسی اثنا میں امام بخش کشمیری نے مصحفی کا تذکرہ دیکھنے کو مانگا۔ مصحفی نے اجزائے مسودہ اسے دے دیے۔ کچھ عرصے بعد کسی نے مصحفی کو امام بخش کشمیری کے اس تذکرے کا جزو اول لاکر دکھایا۔ مصحفی یہ دیکھ کر بھڑک گئے کہ اس میں آفتاب و آصف کا ترجمہ و کلام ان کے اپنے تذکرے کے مطابق تھا۔ مصحفی نے لکھا کہ "ایں اصحاب ثلاثہ" یعنی جرأت، حقیقت اور امام بخش کشمیری کی اس حرکت سے میں اتنا آزردہ ہوا کہ قریب تھا میں ہجو لکھوں لیکن پوچ عبارت و احوال و اشعار شعرا دیکھ کر درگزشت کر دیا۔ (۸۳) نظر انصاف سے دیکھا جائے تو اس میں قصور نہ جرأت کا تھا اور نہ حقیقت کا۔ قصور وار تو امام بخش کشمیری تھا یا پھر خود مصحفی،

جنہوں نے اپنے تذکرے کے اجزا خود امام بخش کو دیے تھے۔ جرأت نے تو امام بخش کی فرمائش پر اپنے ایک شاگرد شاہ حسین حقیقت کو اس کے بچے پڑھانے اور کلام شعراء جمع کرنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس میں جرأت کا کوئی قصور نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود مصحفی نے حقیقت کے ترجمہ میں اس بات کو لکھا کہ "کور مُوَصّلی کہ بہم سری من می رود و در باطن ہمیشہ تخم کینہ می کارد۔" (۸۴) اور ۱۲۰۹ھ میں جب اپنا تذکرہ شائع کیا تو اس عبارت کو اسی طرح باقی رہنے دیا جس کے معنی یہ تھے کہ مصحفی کے دل میں کدورت ابھی باقی تھی۔ جرأت کا یہ مزاج نہیں تھا۔ کہ مصحفی اور انشاء کے معرکے میں صلح صفائی کرانے والے بھی جرأت اور اکبر علی اختر ہی تھے۔ (۸۵) کلیات جرأت میں کہیں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جس میں مصحفی کی طرف اظہار کدورت کیا گیا ہو جب کہ مصحفی نے ایک غزل میں جرأت اور ان کے استادوں کو ہدف بنایا ہے۔ مجمع الفوائد (۱۲۲۸ھ) کے اس خط میں جو "در مدح غایت خویش نویسد" کے زیر عنوان مصحفی نے لکھا ہے، جرأت کے بارے میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔ اس وقت جرأت کی وفات کو چار سال ہو چکے تھے:

> "جرأت شاگرد ہمتایش بہ ایں جرأت چند بار قدم بعرصۂ مکابرہ اش گذاشتہ اما چوں معاویہ از علی شکست ہائے فاحشہ خوردہ آخر از حسد قالب تہی کردہ بخاک سیہ برابر شدہ۔" (۸۶)

مصحفی کے مزاج میں کینہ پروری تھی۔ راجپوتوں والا خون تھا لیکن جرأت کے مزاج میں صلح جوئی تھی۔ مزاج کی یہی صلح جوئی اس تنازعہ میں بھی نظر آتی ہے جو ظہور اللہ خاں نوا (متوفی ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء)(۸۷) سے ہوا تھا۔ واقعہ (۸۸) یہ ہے کہ ایک بار مولوی مجیب اللہ کے مشاعرے میں اور ایک بار مہر اللہ خاں غیور کے مشاعرے میں محمد عظیم تجمل مرثیہ گو، مرزا علی لطف صاحبِ گلشن ہند اور مرزا مغل سبقت سے مقابلہ ہوا۔ یہ تینوں شاگردانِ جرأت تھے۔ بظاہر تو مقابلہ شاگردوں سے تھا لیکن بباطن جرأت سے تھا۔ نوا نے مجمع میں رکیک ہجویں پڑھیں۔ بات اتنی بڑھی کہ شاگردان جرأت ان کے دشمن اور قتل کرنے کے درپے ہوگئے لیکن محمد عاشق تصور نے مرزا مغل سبقت سے ان کی صلح صفائی کرادی اور نزاع موقوف ہوگیا۔ یہ بات واضح ہے کہ مرزا مغل سبقت یہ صلح استاد جرأت کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ جھگڑا فساد چونکہ جرأت کے مزاج کے خلاف تھا اس لیے یہ معاملہ رفع دفع ہوگیا حالانکہ نوا کی ہجو میں گالیاں ہی گالیاں تھیں اور ٹیپ کا مصرع یہ تھا: کور بے ایماں حرامی سخت قدم ساق ہے، جب کہ جرأت کا ٹیپ کا مصرع: حضورِ بلبلِ بُستاں کرے نوا سنجی۔ ان دونوں مصرعوں کے لہجے، الفاظ اور مزاج سے نوا اور جرأت کے مزاج کا فرق سامنے آجاتا ہے۔ یکتا نے لکھا ہے کہ نوا "زبان گزیدہ" (۸۸) رکھتا تھا لیکن ایسی کوئی بات کسی تذکرے میں جرأت کے بارے میں نہیں ملتی بلکہ ان کے معاصر میر حسن نے "خوش خلق و نیک خو ـ ـ ـ ـ ـ ـ در سن نوجوانی بسیار بہ حلم و حیا بسر می برد" (۸۹) کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ پوری کلیات میں مخمس شہر آشوب در ہجو تو شاعران بالخصوص ظہور اللہ خاں نوا کے علاوہ صرف یہ ایک شعر ملتا ہے جس میں نوا کو نوا کہا ہے اور وہ بھی شائستگی سے:

لگا کلنک کا ٹیکہ جبیں پہ اپنی نوا
بس ایک نقطے ہی میں ہو گیا نوا سے توا

جرأت اس دور میں انشا و مصحفی سے مختلف انسان تھے۔ تنگ دستی کے باوجود قانع تھے۔ درباروں سے وابستہ ہونے کے باوجود بے نیاز تھے۔ نابینا ہونے کے باوجود ملنسار تھے۔ جرأت کا رنگ اس دور میں اتنا مقبول تھا کہ خود مصحفی کے دیوان سوم میں اس کا گہرا اثر ملتا ہے۔ میر کے لیے جرأت کی شاعری چوما چاٹی کی شاعری تھی لیکن لکھنوی تہذیب کی روح عصر اس میں بلبلِ بستاں کی طرح چہک رہی تھی۔ آصف الدولہ جرأت کے دیوان کو ہر دم اپنے سرہانے رکھتے اور اس کے مطالعے سے مسرور ہوتے تھے۔

ایک ضخیم کلیات جرأت سے یادگار ہے جس کے متعدد قلمی نسخے آج بھی دنیا کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ (۹۰) مطبوعہ صورت میں سب سے پہلے کلام جرأت "دیوان جرأت کے نام سے ۱۲۸۵ھ/ ۶۹—۱۶۶۸ء میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ اس کے بعد "کلیات جرأت" کے نام سے مطبع کارنامہ فرنگی محل لکھنؤ سے ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا جس میں غزلیات کے علاوہ مخمسات، مسدسات اور رباعیات بھی شامل ہیں لیکن اس میں بھی جرأت کا پورا کلام شامل نہیں ہے۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے "مختار اشعار" جلد اول میں کلام جرأت کا انتخاب ۱۸۹۷ میں مدراس سے شائع کیا۔ ۱۹۲۸ء میں حسرت موہانی نے جرأت کا ایک انتخاب شائع کیا جس میں منتخب غزلیات کے علاوہ ۸ رباعیات بھی شامل ہیں۔ یہی انتخاب محمد حسن عسکری کے مضمون "مزے دار شاعر" کو بطور مقدمہ شامل کر کے ۱۹۶۵ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ جرأت کا پورا کلام پہلی مرتبہ پروفیسر اقتدا حسن نے جدید اصولِ تدوین کے مطابق محنت و سلیقہ سے مرتب کر کے تین جلدوں میں علی الترتیب ۱۹۷۰، ۱۹۷۱، ۱۹۷۵ء میں نیپلز (اٹلی) سے شائع کیا۔ پہلی جلد ۱۰۹۳ غزلیات پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں بطور ضمیمہ ۱۳ غزلیں اور ۴۱۳ متفرق اشعار شامل ہیں جن سے غزلیات کی تعداد ۱۱۰۶ ہو جاتی ہے۔ دوسری جلد میں ۴ قصائد، ۴ عشقیہ، ۱۵ ہجویہ اور ۳ وصفیہ اور دوسری مثنویوں کے علاوہ ۶ مکاتیب منظوم، ۲۴۰ رباعیات، ۴۹ قطعات، ۱۶ مخمس، ۱۴ مسدسات مع واسوخت، ایک ترکیب بند، ۲ ترجیع بند شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ایک فالنامہ، ۵ نقلیات، ۲۸ پہیلیاں، ۳۶ رباعیات پیش خوانی مجلس عزا، ۱۴ سلام، ایک تیجا، ایک مہندی، ایک نوحہ، سات مراثی، ایک فاتحہ بھی شامل ہیں۔ جرأت کے مطالعے کے لیے میں نے یہی کلیات استعمال کیا ہے۔ میر حسن نے مثنوی ہجو برسات اور کھٹمل نامہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ (۹۱) "ہجو برسات" کلیات میں شامل ہے لیکن "کھٹمل نامہ" نہیں ہے۔ اسی طرح ایک اور مثنوی "در ہجو مرغ بازاں" کا ذکر بھی آیا ہے لیکن یہ بھی کلیات میں شامل نہیں ہے۔ (۹۲)

جرأت کے کلام کا بڑا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ غزل عاشقانہ شاعری کی قسم ہے جس کے لغوی معنی عورتوں کے ساتھ گفتگو اور عشق کے ہیں۔ جرأت کی غزل اسی مزاج کی حامل ہے جس میں انہوں نے عورت کے تعلق سے

عاشقانہ و جنسی جذبات اور معاملات کا مزے کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ جرأت نے جیسا کہ پہلے آ چکا ہے، جس زمانے میں شعور کی آنکھ کھولی تو وہ فیض آباد میں تھے۔ فیض آباد اس وقت سلطنت اودھ کا مرکز اور امن و امان کا جزیرہ تھا۔ شعر و شاعری کا چرچا عام تھا اور سودا، میر، میر سوز، جعفر علی حسرت اور خواجہ میر درد (جنہوں نے دہلی نہیں چھوڑی) کی آوازیں یہاں کی تہذیبی و شعری فضا پر چھائی ہوئی تھیں۔ یہ سب شعراء دلی والے تھے۔ جعفر علی حسرت، جرأت کے استاد تھے اور حسرت کا رنگ سخن تیزی سے اودھ کی نئی نسل کے شعرأمیں اس لیے مقبول ہو رہا تھا کہ اس میں اودھ کی نئی تہذیبی فضا کا رنگ موجود تھا۔ اس تہذیب نے اپنا دربار مغلیہ دربار کے طرز پر سجایا ضرور تھا لیکن یہ طرز اُس دور سے لیا تھا جب خود مغلیہ تہذیب کا چراغ بجھا چاہتا تھا اور اس میں جلنے اور روشنی پھیلانے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔ متوازن و صحت مند تہذیبیں شمشیر و سناں اور طاؤس و رباب میں ایک توازن قائم رکھتی ہیں اور جب یہ توازن باقی نہیں رہتا تو طاؤس و رباب ساری زندگی پر حاوی آ جاتے ہیں ۔ اودھ کی نئی تہذیب کے ساتھ یہی صورت پیش آئی تھی۔ انگریزی سامراج نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور حفاظت کی ذمہ داری کا احساس دلا کر، تھکی ہوئی تہذیبوں کی طرح، اسے صرف راگ رنگ سے لطف اٹھانے کی طرف مائل کر دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے راگ رنگ، لطف و مزا، عیش پسندی اور اسراف بے جا کے رجحانات خواص سے عوام تک پھیل گئے۔ جرأت کے زمانے کی نئی نسل اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ میر سوز کی شاعری نے جو مقبولیت یہاں حاصل کی اس کی بنیادی وجہ بھی یہی تھی کہ اس میں حسن و عشق کے وہ معاملات بیان کیے گئے تھے جنہیں یہ عیش پسند معاشرہ سننا چاہتا تھا لیکن سوز کے ہاں معاملات عشق کے بیان میں ایک متانت ہے اور وہ چونچلا پن نہیں ہے جو حسرت کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ میر سوز نے معاملات حسن کو ابتذال سے بچا کر روز مرہ و محاورہ اور لہجے کے تیور سے مزے دار بنانے کی کوشش کی۔ جعفر علی حسرت نے یہ کام دو طریقے سے کیا۔ ایک یہ کہ فنی سقم سے پاک سنگلاخ زمینوں میں نہ صرف لمبی لمبی غزلیں لکھیں بلکہ دو غزلہ، سہ غزلہ، چہار غزلہ بلکہ پنج غزلہ تک کا التزام کیا اور کم و بیش سارے ممکن قافیوں کے استعمال اور ردیف کی نشست سے اپنی استادی کا سکہ جمایا۔ دوسرے یہ کہ لکھنؤ کے موجودہ تہذیبی مزاج کی مناسبت سے معاملاتِ حسن کے بیان میں شوخی اور چونچلا پن شامل کر کے اتنا کھول دیا کہ اہل محفل مزا لے کر لہلوٹ ہو گئے ۔ جرأت اپنے استاد جعفر علی حسرت کے اس مقبول رنگ شاعری کے سارے امکانات کو نہ صرف اپنے تصرف میں لے آئے بلکہ میر سوز کے زبان و بیان کے امکانات کو بھی شاعری میں جذب کر لیا۔ حسرت و سوز کی شاعری کے اسی امتزاج سے جرأت کا وہ مخصوص رنگ سخن پیدا ہوتا ہے جس سے ہم جرأت کو پہچانتے ہیں اور جسے خود جرأت "نیا ڈھب" کہتے ہیں:

پرانے شاعر اے جرأت نہ مجھ پر رشک کیوں کھاویں
کہ طرز گفتگو تو نے نئے ڈھب کی نکالی ہے (ص۵۳۱)

اب تو جرأت وہی ہے ریختہ گو
جو مقلد تری زبان کا ہے (ص ۵۳۵)

لیکن جرأت اس نئے ڈھب تک ایک لمبا سفر طے کر کے پہنچے تھے۔ ان کے ضخیم دیوان غزلیات میں، جو کم و بیش دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے، دو رنگ سخن ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اگر شاہ حاتم کے "دیوان زادہ" کی طرح ان غزلوں پر سنِ تصنیف درج ہوتا تو ہم رنگِ سخن کی اس تبدیلی کا سراغ لگا سکتے تھے جو ان کے کلام میں آئی اور یہ بھی بتا سکتے تھے کہ یہ تبدیلی کب آئی؟ یہ دونوں رنگ سخن ان کی غزل میں ایک ساتھ چل ضرور رہے تھے لیکن وہ اپنے معاصرین میں دردمندی اور غم پسندی کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ ابتدا میں، جیساکہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں، جس کا پہلا نقش ۱۱۸۸ھ میں مکمل ہوا تھا، لکھا ہے کہ وہ شاعری میں دردمندی، گداز اور معنی یابی کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہے۔ (۹۳) مبتلا لکھنوی نے ۱۱۹۴ھ میں لکھا کہ وہ "طبیعت ملایم" رکھتا ہے۔ (۹۴) اور مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں جو ۱۲۰۰ اور ۱۲۰۹ھ کے درمیان مرتب ہوا، لکھا ہے کہ "در شعر خود تلاش ماتمیانہ بسیار می کند و یاس تمام از کلامش تراود" (۹۵) جرأت کا ترجمہ، جیساکہ میں پہلے کہہ آیا ہوں، ۷۔۱۲۰۶ھ میں مصحفی نے اپنے تذکرے میں قلم بند کیا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ابتدا میں جرأت کا اصل رنگ کیا تھا میں نے ان تذکروں میں دیے گئے منتخب اشعار کا مطالعہ کیا جو کم و بیش اس دور میں مکمل ہوئے۔ میر حسن نے تذکرہ شعرائے اردو (۱۱۸۸ھ) میں، مبتلا لکھنوی نے گلشن سخن (۱۱۹۴ھ) میں، امراللہ الہ آبادی نے تذکرہ مسرت افزا (۱۱۹۵ھ) میں، ابراہیم خاں خلیل نے گلزار ابراہیم (۱۱۹۸ھ) اور مصحفی نے تذکرہ ہندی (۱۲۰۹ھ) میں جو منتخب اشعار اپنے تذکروں میں دیے ہیں ان کو سامنے رکھ کر جب یہ غزلیں دیوان میں پڑھیں تو یہ بات سامنے آئی کہ نہ صرف معاملہ بندی ان غزلوں میں نہیں ہے بلکہ ان غزلوں کا مزاج بنیادی طور پر غم انگیز ہے۔ اس کلام میں غم و ہجر کی کیفیات بھی ہیں اور عبرت آموز مضامین بھی۔ تصوّف بھی ہے اور میر کی شاعری کے مزاج کی پیروی کی ناکام کوشش بھی۔ دو چار اشعار جو معاملہ بندی کے ذیل میں آتے ہیں ان میں متانت بھی ہے اور دبا دبا پن بھی۔ اس سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ جرأت نے اپنی شاعری کی ابتدا دردمندی، یاس اور غم و الم کے مزاج سے کی اور یہی ان کا پہلا رنگ سخن تھا:

اب کہیے غزل اپنے وہ انداز کی جرأت
پردرد ہر ایک شعر ہو دیوان الم کا (ص ۱۱۶)
غزل اک اس زمیں میں پڑھ کوئی پُر درد سی جرأت
کہ شاید اس کے سننے سے کوئی آنسو نکل آئے (ص ۲۷۱)
شعر پر درد کہا کرتے ہیں جرأت دن رات
ہذیاں ہے یہی اس عشق کی تب میں ہم کو (ص ۳۳۶)

معاملہ بندی کی طرف، جسے میر نے "چوما چاٹی" اور مصحفی نے "چھنالے کی شاعری" کہا ہے، وہ بعد میں آئے۔
اب سوال یہ ہے کہ جرأت معاملہ بندی کی طرف کب آئے؟ اس سوال کا جواب آسان ہے۔ میرا خیال ہے کہ نابینا ہونے کے بعد، جرأت معاملہ بندی کی طرف آئے اور اس رنگ کی طرف اس وقت توجہ اور ہوئی جب وہ سلیمان شکوہ کے دربار سے کم و بیش ۱۲۰۶ھ میں وابستہ ہوئے۔ انشا اور مصحفی بھی وہاں موجود تھے۔

نابینا ہو جانے کے بعد جرأت کا احساس محرومی کا شکار ہو جانا ایک فطری بات تھی ۔ اس احساس محرومی نے ان میں بے چارگی کے احساس کو شدید کر دیا۔ دنیا انہیں تاریک نظر آئی۔ ان کا تعلق معاشرے سے کمزور ہو گیا۔ وہ اب محتاج تھے۔ ایڈلر نے لکھا ہے کہ "عضوی خامیوں کے احساس سے فرد میں احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے۔" اس احساس کمتری نے انہیں اپنے مستقبل اور معاشرے سے اپنے نئے رشتوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا۔ ان کے پاس ایک ہی ہنر تھا اور وہ شاعری تھی۔ اندھے جرأت نے معاشرے سے اپنا نیا رشتہ قائم کرنے کے لیے یہ سوچا کہ اگر وہ ایسی شاعری کریں جو معاشرے کے ہر طبقے میں پسند کی جائے تو وہ اس معاشرے سے دوبارہ اپنا رشتہ قائم کر سکتے ہیں۔ ایک شاعری وہ تھی جو وہ اب تک کرتے رہے تھے اور جس میں میر، درد ، سودا وغیرہ کے رنگ و اثر موجود تھے اور جس میں اس مقبولیت کے امکان کم تھے جس کی اندھے جرأت کو ضرورت تھی اس لیے اب انہوں نے شعوری طور پر معاملہ بندی کی شاعری کو اختیار کر لیا۔ محمد حسن عسکری نے لکھا ہے کہ "معاملہ بندی اُس سماج میں چلتی ہے جہاں مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے بالکل الگ رہتے ہوں۔ ایسے حالات میں لوگوں کو گندی باتیں سننے کا شوق بڑھ جاتا ہے اور چلمن میں سے ایک جھلک دیکھ لینا یا آنچل نظر آ جانا بھی گندی بات بن جاتا ہے۔ یہاں ذرا سی تفصیل بھی بذات خود لطف دینے لگتی ہے اور لوگ فوراً کھی کھی ہنس دیتے ہیں اسی لیے سراپا کے بیان میں اس قسم کی دلچسپی پیدا ہوتی ہے جو اکثر لکھنوی شاعروں کے یہاں ملتی ہے یعنی سراپا کا مقصد جسم کی تفصیلات گنوانا ہو جاتا ہے۔" (۹۶) اس نوع کی معاملہ بندی کے ساتھ ہی جرأت کی شاعری پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جانے لگی۔ طبقۂ خواص میں ان کی اس مقبولیت نے ان کے احساس کمتری کو احساس برتری میں تبدیل کر دیا اور اس طرح تکمیل ذات کا ایک نیا رشتہ ہاتھ آ گیا۔ معاملہ بندی کی شاعری سے نہ صرف انہوں نے اپنی عضوی خامی پر قابو پا لیا بلکہ وہ بغیر آنکھوں کے دربار سرکار اور طبقۂ خواص کی آنکھ کا تارا بن گئے۔
ان کی نئی شاعری پر ایسے داد ملنے لگی کہ مشاعروں میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ ان کے شاگردوں کی کثرت ہو گئی۔ انہوں نے تکمیل ذات کے لیے یہ بھی کیا کہ ہر قسم کے معرکوں اور جھگڑوں سے الگ ہو گئے اور خوش گفتاری و شیریں بیانی سے معاشرے میں اپنی جگہ بنالی۔ یکتا لکھنوی نے لکھا ہے کہ "در ہر مجلس و مجمع کہ رونق افزامی شد بہ سبب خوش تقریری او کسے بارِ سخن نمی یافت و ہر گز بر خاطرہا بار نمی شد" (۹۷) اس طرح جرأت اپنے اندھے پن کے نقص پر اسی طرح حاوی آ گئے جس طرح انگریزی زبان کا شاعر بائرن اپنے پیر کے نقص سے پیدا ہونے والے احساس کمتری پر اچھا تیراک بن کر حاوی آ گیا تھا۔

جرأت کی خوش اخلاقی، یار باشی اور ملنساری اور کھلے پن کے ساتھ شوخ معاملہ بندی وہ صفات تھیں جن سے وہ گرد و پیش کی دنیا اور لکھنوی تہذیب سے مل کر ایک جان ہو گئے۔ اس دور کی لکھنوی تہذیب مزے کی رسیا تھی اور اس مزے میں غرق ہو کر غم دوراں اور سنگین کے ساتھ دہلیز پر کھڑے انگریز سنتری کو بھول جانا چاہتی تھی۔ یہی اس دور کی تہذیب کی ضرورت تھی اور جرأت یہی مقصد متعین کر کے اپنی شاعری سے اہل محفل کو مزا فراہم کرتے ہیں اور دل بہلا کر افکار زمانہ سے نجات دلاتے ہیں:

جرأت بدل کے قافیہ پڑھ اک غزل تو اور
لذت ملے ہے اب ترے اشعار سے مجھے (ص ۴۱۲)
فکر میں اس کے ہے افکار زمانہ سے نجات
جرأت اور ایک غزل کرنے لگا میں تحریر (ص ۲۷)
غم زدے روتے تڑپھتے ہیں جہاں دو چار واں
شغل بہلانے کو دل کے میرے اشعاروں کا ہے (ص ۳۸۲)

اس طرح اب ہم جرأت کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلا دور: آغاز شاعری ۷۸۔۱۱۷۷ھ / ۶۴۔۱۷۶۳ء سے کم و بیش ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء تک

دوسرا دور: ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۷ء سے ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء تک۔

پہلے دور میں جرأت نے اپنے استاد جعفر علی حسرت سے چند باتیں سیکھیں۔ مشکل زمینوں میں شعر کہنے کی ہنر مندی، قادر الکلامی کے اظہار کے لیے گیارہ سے بیس اشعار پر مشتمل طویل غزلیں اور ساتھ ہی غزل در غزل کہنے کا التزام۔ غزلوں میں قطعہ بند شعر کہنا اور ایک ہی غزل میں دو دو تین تین قطعے شامل کرنا۔ ایسی غزلیں کہنا جن میں مضمون مسلسل اور کیفیت ایک سی ہو۔ جرأت کی غزلوں کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو شروع سے لے کر آخر تک دونوں ادوار میں باقی رہتی ہیں اور یہاں وہ اپنے استاد سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ غزل کے دو مصرعوں میں گفتگو و مکالمہ کا انداز پیدا کرنا: اس خصوصیت کو انہوں نے حسرت اور سوز دونوں کے کلام سے اکتساب کر کے اپنی غزل کی ایک خصوصیت بنا لیا۔

اردو غزل کا یہ ایک بڑا دور تھا جس میں میر، سودا اور درد کی آوازیں ساری فضا پر چھائی ہوئی تھیں۔ ان آوازوں میں اتنی کشش اور دل فریبی تھی کہ نئے شاعروں کے لیے ان سے بچنا مشکل تھا۔ میر حسن نے بھی اپنے دور میں ان آوازوں کو اپنی غزل میں جذب کیا تھا۔ مصحفی نے بھی ان آوازوں کو اپنی شاعری کی روح میں اُتارا تھا۔ یہی کام جرأت نے بھی اپنے پہلے دور کی شاعری میں کیا اور میر، درد اور سودا کے رنگ سخن سے اپنی شاعری کا خمیر اٹھایا لیکن یہ آوازیں اتنی منفرد تھیں کہ قائم چاند پوری اور میر حسن جیسے شاعروں کو بھی چاٹ گئیں۔ صرف غم ناک شعر کہنے سے میر کی آواز کو

جنم نہیں دیا جا سکتا۔ صرف ہجر و فراق کے اضطراب سے خواجہ درد کی شاعری کو تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے جرأت کے لیے حسرت کی ظاہری خصوصیات کو اپنانا تو آسان تھا لیکن میر یا درد کے مزاج کو جذب کرنے کے لیے میر یا درد جیسی شخصیت کی ضرورت تھی جو اپنے ذاتی تجربے کو اپنی ذات سے الگ کر کے دیکھ سکے۔ ایسی شخصیت، ظاہر ہے کہ جرأت کے پاس نہیں تھی اسی لیے ان کے ہاں غم و الم اور ہجر و فراق اپنی ذات کے اظہار ہی کی ایک صورت ہیں۔ اس رنگ میں جرأت قائم چاند پوری جیسے شعر بھی نہ کہہ سکے۔ جرأت کے ہاں جو میر کے غم و الم کی صورت بنتی ہے اس میں باطن کا تموج شامل نہیں ہے اسی لیے ان کے شعر میر کی ظاہری سطح کو ہی چھوتے ہیں اور جو صورت بنتی ہے وہ یہ ہے:

اپنا ہی دل نہیں وہ اس بن وگرنہ جرأت
نے کچھ زمین بدلی نہ آسمان بدلا (ص۵)

یوں رہا کر درد جدائی تو گھبرا کر تن سے آہ
شام گیا یا صبح گیا جی، صبح گیا یا شام گیا (ص۷)

شکل رہنے کی ہے بستی میں یہ اس بن اپنی
جیسے جنگل میں بناتا ہے کوئی گھر اپنا (ص۱۰)

کل تو بیمار کو تھا تیرے نہ بستر پہ قرار
آج بستر تھا فقط اور وہ بیمار نہ تھا (ص۵۰)

بس اسی کو جانتے ہیں اپنا ہم غم خوار آہ
یہ جو کنج بے کسی میں درد تنہائی ملا (ص۶۲)

ہوا ہوں مرگ کے نزدیک غم سے
خدا جانے یہ کس دن دور ہو گا (ص۶۹)

کیسا پیام آ کے یہ تو نے صبا دیا
مثل چراغ صبح جو دل کو بجھا دیا (ص۸۲)

کیوں اٹھ چلا جہاں سے دل زار کیا ہوا
بیٹھے بٹھائے تجھ کو یہ آزار کیا ہوا (ص۸۳)

اے جان میرے دل کو نہ ویران کر کے جا
اجڑا جو یہ نگر تو بسایا نہ جائے گا (ص۱۱۱)

درد و غم رنج و الم خوب بسے ہیں دل میں
مجھ کو ڈر ہے کہ یہ بستی نہ ہو ویران کہیں (ص ۲۴۹)

نہ پوچھا حال کچھ مجھ رہ نورد راہ الفت کا
مصیبت کا ہوں مارا غم زدہ ہوں خانہ ویراں ہوں (ص ۲۵۴)

خواب میں بھی وہ نظر آتا نہیں مدت ہوئی
جاگتے ہی جاگتے کٹتی ہیں راتیں ساریاں

جہاں تجھ بن آباد ایسا لگے ہے
کہ جوں کوئی مدت کا اجڑا مکاں ہو (ص ۳۲۲)

کیا غضب ہے پھر نہیں پاتا لبِ اظہار دل
بات کرنے کی کبھی اس سے جو فرصت پائے ہے (ص ۲۷۸)

ہر چند بحر اشک ہے جاری پہ سوز عشق
اک آگ سی کلیجے پہ بھڑکائے جائے ہے (ص ۳۹۲)

یہ جی میں تھا کہ کوچے میں اس کے نہ جائیں گے
اس دل کی بے قراری کے ہاتھوں سے پر گئے (ص ۴۲۱)

رہ گئی پلک سے لگنی پلک آج کس لیے
اے چشم کہہ تو کس کا تجھے انتظار ہے (ص ۴۲۷)

جان و دل پرسشِ احوال بہم کرتے ہیں
آہ بیمار سے جیسے کوئی بیمار ملے (ص ۴۴۰)

یوں دشت محبت میں دل زار پہ گزری
جیسے کہ بیاباں میں مسافر کوئی مر جائے (ص ۴۸۳)

از بسکہ تصور میں ہوں اس پردہ نشیں کے
اک نور کی چادر ہے جہاں تک کہ نظر جائے (ص ۴۸۴)

ان اشعار میں غم و الم، درد مندی اور گداز موجود ہے۔ عشق میں مبتلا شخص کی بپتا کی جھلکیاں بھی موجود ہیں اور ان کیفیات کا بیان بھی جن سے عاشق کو واسطہ پڑتا ہے۔ یہ سب کیفیات الگ الگ ہیں اور مل کر ایک وحدت، ایک اکائی نہیں بنتیں۔ وہ اکائی جو میر کے شعر کو چیزے دگر بنا دیتی ہے۔ اسی لیے جرأت کا غم محدود غم اور عشق محدود عشق ہے۔ اس عشق اور غم کا تعلق صرف عاشق سے رہتا ہے اور یہ دوسرے انسانی اور سماجی رشتوں پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

میر اپنی ذات کی نفی سے اپنی شاعری میں اثبات پیدا کرتے ہیں۔ میر کی شاعری صرف شخصیت کے اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ اس سے بچنے کا عمل ہے۔ جرأت کی شاعری صرف ذات کا اظہار کرتی ہے۔ وہ عشق و غم کے تعلق سے سماجی و انسانی رشتوں کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ انہیں بیان کرکے فارغ ہو جاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ غم والم کے اظہار کے ذریعے اس آزار سے بچنا چاہتے ہیں اسی لیے یہ رنگ میر والی شاعری دبی دُبکی سی نظر آتی ہے۔

اس رنگ میں جس دوسرے شاعر کی جرأت پیروی کرتے ہیں وہ خواجہ میر درد دہلوی ہیں۔ جرأت کے ہاں تصوف کے مضامین کم بلکہ بہت کم ہیں لیکن ہجر و فراق کے مضامین کثرت سے آئے ہیں اور یہاں ان کا انداز (طرز نہیں) خواجہ میر درد سے ملنے لگتا ہے لیکن یہاں بھی تجربے میں تصادم یا کشمکش سے نکلنے والے شرار کا دور دور پتا نہیں چلتا۔ جرأت ہر کیفیت کو پوری طرح جانے اور دوسری کیفیات سے ملائے بغیر صرف انہیں بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس انداز کے یہ چند شعر دیکھیے تاکہ بات واضح ہو سکے:

جس طرف دیکھتا ہوں میں اس بن
یہ نہیں جانتا کدھر دیکھا (ص۰)

برنگ بوئے گل گو ہم جدا ہیں
و لیکن ساتھ ہیں جاؤ جہاں تم (ص۲۲۹)

آہ اوروں ہی کا مذکور ہے نت وردِ زباں
اپنی محفل میں کبھی ذکر ہمارا نہ کیا (ص۸۰)

سمجھے ہے غرض اہل نظر بود کو نابود
ہستی میں ہے جو سو متوطن ہے عدم کا (ص۱۱۶)

جرأت کی خبر لینی ہے تو جلد لو پیارے
تم دیتے ہو دم اس کا بھروسا نہیں دم کا (ص۱۱۷)

جو دیکھو غور کر جزو کل بالکل مجھی میں ہے
کبھی ہوں اک حباب آسا، کبھی دریا ہو بہتا ہوں (ص۲۳۶)

اللہ تلک عشق ہی پہنچائے ہے واللہ
چاہت ہی کو جرأت تو ولی جان نبی جان (ص۳۱۵)

یہ خانۂ جہاں ہے بستی سرائے کی
یاں کچھ نہ غم گئے کا نہ شادی ہے آئے کی (ص۴۹۲)

کیا کہیں بحر محبت میں ہم اپنا احوال
گرتے ہی ایسے ہوئے گم کہ نہ پھر پائے گئے (ص۳۹۴)

تیز رو اس قدر ہے توسنِ عمر
ہاتھ جس کی کبھو نہ باگ لگے (ص۴۰۳)

یہ جہاں کے لوگ یاں کوئی دم ہی کے مہماں ہیں
سب عدم سے آئے ہیں اور پھر وہاں اٹھ جائیں گے (ص۴۳۸)

بھر چکا اب عمر کا پیمانہ اب کیا دیر ہے
ساقیا دے لے جو کوئی دینا ہے پیمانہ مجھے (ص۴۴۲)

آپ لگوں میں اپنے ہاتھ جب کہ بڑی تلاش سے
کیوں کہ ہو کوئی مطلع پھر میری بود و باش سے (ص۵۳۶)

بھڑا جو عشق سے تھا دل کا حوصلہ ورنہ
کسے مجال تھی یہ بار غم اٹھانے کی (ص۵۵۳)

یہ گم ہوئے ہیں کسی کی تلاش میں ہم آہ
کہ اب تو ایک جہاں اپنی جستجو میں ہے (ص۵۹۹)

ان اشعار کو آپ خواجہ میر درد کے کلام کے ساتھ رکھ کر پڑھیے تو آپ کو یہاں ایک اوپری پن کا احساس ہو گا۔ یوں معلوم ہو گا کہ یہ بھی زندگی کی اور کیفیات کی طرح کی کیفیات ہیں جنہیں جرأت نے بس بیان کر دیا ہے اور ان کا تعلق ان کی اپنی شخصیت سے نہیں ہے۔ یہاں آپ کو وہ تہ داری، وہ غلویت، وہ گہرائی، تجربات کی آویزش سے پیدا ہونے والی وہ کیفیت محسوس نہیں ہوتی جو شعر کو فی الحقیقت شعر بنا دیتی ہے۔ یہ کیفیات ایک مخصوص مابعد الطبیعیاتی ماحول میں رہنے سے پیدا ہوتی ہیں جن سے ہر سطح کا آدمی واقف ہے اور ان کی حیثیت بھی ایک مقولے یا کلیشے کی سی ہے۔ جرأت کے ہاں یہ کیفیات، خواجہ میر درد کی طرح، تجربہ نہیں بن سکی ہیں، وہ تو بس ان مروجہ خیالات کی کیفیت کو شعر میں بیان کرنے کا کام کر رہے ہیں اور جب میر، درد یا سودا کے رنگ میں کوئی غزل ہو جاتی ہے تو افتخار سے ان کی گردن بلند ہو جاتی ہے اور وہ کہنے لگتے ہیں:

جن کے نزدیک ہے انداز غزل میر پہ ختم
ان کو جرأت میں سنانے یہ غزل جاؤں گا (ص۲۱)

جرأت جواب میر تو ایسا ہی کہہ کہ اب
چاروں طرف سے شور سنے واہ واہ کا (ص ۵۴)

یا کبھی تربت سودا پر غزل لے کر جانے کا ارادہ کرتے ہیں:

جرأت اشعارِ جنوں خیز کہہ اب اور کہ میں
لے کے یہ تربتِ سودا پہ غزل جاؤں گا (ص ۲۰)
سودا کے کہہ جواب میں جرأت غزل اک اور
اب گرمیِ سخن ہے ترے دم قدم کے ساتھ (ص ۳۵۶)

اور کبھی غزلِ درد کا جواب پیش کرتے ہیں:

جرأت پڑھ اس زمیں میں غزل درد کا جواب
رکھ ورد اپنا تو یہی شام و پگاہ کا (ص ۵۴)

سودا اور خاص طور پر میر اور کسی حد تک درد، جرأت کے لیے مثالی شاعر تھے جن کے رنگ سخن کی پیروی سے وہ ان جیسا بن جانا چاہتے تھے لیکن ان سب کی شخصیتیں جرأت کی شخصیت سے اتنی مختلف تھیں کہ وہ ان کی پیروی کر کے ان جیسے اشعار نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس کے برخلاف ان کی شخصیت جعفر علی حسرت کی شخصیت سے بڑی تھی اور ان کا مزاج لکھنؤ کی نئی تہذیبی فضا سے پوری مناسبت رکھتا تھا اسی لیے جب وہ نابینا ہو گئے تو قبولِ عام کی ضرورت کے پیش نظر وہ اس رنگ میں شاعری کرنے لگے جس کی لکھنؤ کی تہذیبی فضا متقاضی تھی۔ اگر جرأت اندھے نہ ہوتے تو شاید وہ ساری عمر میر اور درد کی پیروی کرتے رہتے اور انہیں اپنی شاعری کو مقبولِ عام بنانے کے لیے ویسی شاعری کی ضرورت پیش نہ آتی جیسی انہوں نے کی اور جو ان کی اصل وجہ شہرت ہے۔ یہی وہ شاعری ہے جو ان کے دوسرے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں میر اور جرأت کی فطرت اور شخصیت کا فرق بھی نمایاں ہو جاتا ہے ۔ میر کے اندر غُلُوی رجحان نشوونما پاتا ہے اور انہیں آفاقی شاعری کی طرف لے جاتا ہے۔ میر کے ہاں غم جاناں اور غم دوراں مل کر غم میر بنتے ہیں، میر کی شاعری متضاد عناصر کی آویزش سے پیدا ہونے والے تجربہ کا اظہار ہے ۔ جرأت کے ہاں احتساسی (Sensuousness) رجحان نمو پاتا ہے جو بڑھ کر لذائذ نفسانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ہر دلعزیزی کے ساتھ زندہ رہنے اور فن کو برتنے کے لیے انہوں نے یہی راستہ اختیار کیا اور اس طرح خود کو لکھنؤ کی تہذیبی روح سے پوری طرح ہم آہنگ کر لیا۔ ان کی خواہشات تہذیبی روح کی خواہشات سے مل کر ایک جان ہو گئیں اور جرأت کی آواز سارے موجود معاشرے کی روح کا اظہار بن گئی۔

اندھے ہونے کی وجہ سے حسن کے وہ پہلو ان کی نظروں سے اوجھل تھے جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان کی خواہش میں اور شدت پیدا ہو گئی اور اپنی معدوم حس یعنی بصارت کی کمی کو وہ دوسری حسیات سے پوری کرنے لگے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف لکھنوی تہذیب کے اثر نے اور دوسری طرف ان کے احساس محرومی نے ان کی شاعری کی راہ متعین کر دی جس میں پستی کے ساتھ ایک ایسا لطف ضرور ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کی چوماچاٹی محض

بازاری یا مبتذل چیز بن کر نہیں رہ گئی بلکہ بائرن کی طرح جرأت کو بھی اس میں زندگی کا ایک اہم راز نظر آتا ہے۔ دوسرے شعراء کی طرح وہ پلٹ کر، پھر کر امرد پرستی کا شکار نہیں ہوئے بلکہ ان کی شاعری میں جس محبوب سے ہماری ملاقات ہوتی ہے وہ صرف عورت ہے اور یہ بات بذات خود جرأت کی جنسی صحت کی نشانی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں نہ جنسی تجربات کی واقعیاتی صورت ہمارے سامنے لاتے ہیں اور نہ فلسفیانہ اہمیت دے کر ان کی تجدید کرتے ہیں اور نہ انہیں گرا کر مبتذل بناتے ہیں اسی لیے جرأت کی شاعری کا مطالعہ "جنسی واقعیت" کا ایک نیا باب کھولتا ہے۔ ہمارے دور میں حسرت موہانی کی شاعری کا ایک حصہ اسی روایت شاعری سے تعلق رکھتا ہے ۔ جنسی لذت کی صحت مند تلاش ہمیں جرأت اور انگریزی شاعر بائرن کی طرف لے جاتی ہے اور شاعرانہ فطرت کا ایک مخصوص رخ پیش کرتی ہے۔ واقعیت کی طرف جدید رجحان جس میں جنس بھی شامل ہے ہمارے جدید افسانوی ادب کا اہم جزو ہے اور جرأت کی شاعری اس رجحان کا بھی پورا پتا دیتی ہے۔ جرأت کی اس دور کی شاعری میں محبوب کا جسم ایک حقیقی چیز بن جاتا ہے اور اس کے احتساسی اثرات پڑھنے والے کو یہ محسوس کرا دیتے ہیں کہ ایک زندہ چیز سامنے ہے۔ مثال کے طور پر ان کی متعدد غزلوں کے علاوہ ان کا مستزاد ——— جادو ہے نگہ، چھب ہے غضب، قہر ہے مکھڑا، اور قد ہے قیامت ——— پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں اسی احتساسی رُخ کے افسانے سُناتے ہیں اور اسی لیے ان کی غزلیں طویل اور مسلسل ہوتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں افسانہ نگاری کا واضح رجحان محسوس ہوتا ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ وہ افسانہ نگاری کی طرح اپنے محبوب کے تعلقات کو یاد کرتے ہیں اور ان یادوں کی ایک واقعاتی تصویر سامنے آ جاتی ہے اور ایک ڈرامائی منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اس منظر کی ترجمانی افسانوی انداز میں کرتے ہیں، یہاں وہ شاعری کی طرح اس کی تعمیم نہیں کرتے بلکہ وہ واقعہ اپنی واقعیت کے ساتھ ان کی غزل میں آتا ہے اور ان کی قوت تخیل اسے جہاں تک ممکن ہو ، جوں کا توں رہنے دیتی ہے جس کے نتیجے میں شاعری کی آفاقی (Universalised) تصویر کی جگہ افسانہ نگار کی واقعیاتی (Realistic) تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ واقعہ چونکہ پوری چیز ہے اور شعر کے دو مصرعوں میں نہیں سما سکتا اس لیے ان کی غزل طویل اور مسلسل ہو جاتی ہے اور اس طرح ان کی اکثر غزلیں پورا افسانہ بن جاتی ہیں ۔ مثال کے طور پر ان کی یہ غزل پڑھیے جس کا مطلع ہے:

نہ گرمی رکھے کوئی اس سے خدایا
شرارت سے جی جس نے میرا جلایا

اور اسی کے ساتھ وہ دو غزلیں بھی پڑھیے جو غزل در غزل کے طور پر اس غزل کے فوراً بعد آتی ہیں (۹۸) تو آپ دیکھیں گے یہ غزلیں نہیں بلکہ افسانہ ہیں۔ اس نوع کی متعدد غزلیں کلیات جرأت میں موجود ہیں۔ (۹۹)

اس شاعری کو پرانے زاویۂ نظر سے دیکھتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ یہاں معاملہ بندی ہے اور یہ کہ وہ خارجی شاعری ہے جس کا عروج جرأت کے بعد لکھنوی شاعری میں ہوا اور جو دلّی کی داخلی شاعری سے مختلف ہے لیکن اگر غور سے دیکھا

جائے تو یہ شاعری پرانے دائرے میں داخل بھی ہے اور اس سے الگ بھی۔ معاملہ بندی کی شاعری سے جرأت کا تعلق ضرور ہے مگر وہ جو "معاملے" سامنے لاتے ہیں وہ معاملے سے زیادہ ذاتی جذباتی واقعات ہیں اور ان میں وہ واقعیت اور تسلسل ہے جو دوسرے معاملہ بندوں کے ہاں عام طور پر نہیں ملتا۔ ان کی شاعری خارجیت کی طرف راغب ضرور ہے۔ وہ واقعات کو دوسروں کے لیے بیان کرتے ہیں اور اس لیے اپنے داخلی جذبات سے نہیں بلکہ واقعات کے خارجی پہلو سے تعلق رکھتے ہیں مگر سب واقعات ان پر گزرے ہیں اور سب پر ان کا مخصوص موڈ غالب ہے اس لیے ان کو خارجی کے ساتھ داخلی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس تخلیقی عمل نے ان تمام رسمی طریقوں کو ایک ایسی انفرادیت دے دی جس سے ہم جرأت کو پہچانتے ہیں اور جسے ہم نہ خارجیت کہہ سکتے ہیں اور نہ داخلیت بلکہ افسانویت کہہ سکتے ہیں۔ یہ قطعہ بند دیکھیے:

یہ خوبی اپنے طالع کی کہ ہر شب آن کر اس کو
سناتے تھے جو کہنہ عاشقی کی داستانوں کو
انہیں افسانۂ نو اپنا میں جس روز سکھلایا
اسی دن برطرف اس نے کیا ان قصہ خوانوں کو (ص ۳۵۰)

ڈی ایچ لارنس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "جنس جلتی ہوئی آگ کی طرح ہے کہ جسے ہم لاپرواہی سے چھوتے ہیں تو ہماری انگلیاں جل جاتی ہیں اسی لیے سماجی انسان، جو صرف تحفظ کا قائل ہے، جنس کی آگ سے نفرت کرتا ہے" اور اسی لیے سماجی انسان جرأت کی شاعری کو پذیرائی خاطر و گوارائی طبع اوباش و الواط حرف می زدہ" (۱۰۰) کہتا ہے۔

جرأت کے ہاں سراپا، معاملات حسن و عشق کے مکالمات اور وصل و خواہش وصل کے بارے میں کثیر تعداد میں اشعار ملتے ہیں۔ ان سب اشعار میں وہ مزا ہے جو جنس کے تعلق سے ہمارے باطن میں موجود ہے اور جرأت انہیں معلوم باتوں کو بیان کر دیتے ہیں:

کیا کہوں وصل کی شب لے کے بلائیں اس کی
کیا اٹھاتا ہوں میں زانو پہ بٹھانے کا مزا (ص ۱۹)
کیا کہوں اس کی ادائیں وصل کی شب کو کہ بس
ہاتھ لگ جاتے ہی کیا کیا کسمسانا لگ گیا (ص ۶۵)
تنگ ہو کر کس ادا سے وصل کی شب کو وہ شوخ
مجھ سے کہتا تھا کہ ہے ہے اس قدر لپٹا جا (ص ۱۰۱)
جرأت رہا نہ آپ میں اس وقت میں ذرا
ہوں لب سے لب اور اس کے بدن سے بدن لگا (ص ۱۱۰)
بھینچا جو اس کو میں تو عجیب ناز سے کہا

واروں میں تیرے پیار کو غش مجھ کو آگیا (ص۱۳۳)
یہ کہہ کے شب وصل میں ُسلگا نہ کلیجہ
ہے ہے نہ لپٹ مجھ سے کہ پنڈا ہے ترا گرم (ص۲۳۶)
عقدۂ دل کیا کھلے گر وصل ہوتا ہے کبھی
مجھ سے شرماتا ہے وہ اور اس سے شرماتا ہوں میں (ص۲۰۵)
وائے نصیب ایک شب اس سے ہوئے نہ آہ ہم
دست بہ دست لب بہ لب سینہ بہ سینہ رو بہ رو (ص۳۳۷)
وصل میں دیکھ کے رہتا ہوں یہ حیراں کہ وہ شوخ
دم بہ دم جانب در کیوں نگراں رہتا ہے (ص۳۹۰)
وصل کی شب جی مرا کیا کیا الجھتا ہے اور آہ
ہیں ابھی شانے کو موئے زلف سلجھانے کئی (ص۵۰۳)
وصل کی شب نیند ہی گر تم کو آنی ہے تو جاں
لو ذرا منہ سے دوپٹہ تو الٹ کے سوئیے (ص۵۲۴)

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وصل کے اشعار میں بھی جرأت کے ہاں ترسنے کی کیفیت موجود ہے یہاں تشنگی اور بے یقینی کا سا احساس ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و محبوب دونوں ایک خوف میں مبتلا ہیں۔ اسی وجہ سے وہ کیفیتِ نشاط و سر مستی جو خواجہ حیدر علی آتش کے ہاں ملتی ہے، جرأت کے ہاں نہیں ہے۔ آتش کا یہ شعر دیکھیے:

رات کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا

اب اس شعر کے بعد جرأت کا یہ شعر دیکھیے:

یاد آتا ہے یہ کہنا جب تو اڑ جاتی ہے نیند
اپنی ہنجھ تو رکھ چکے لو اب تو ہٹ کے سوئیے (ص۵۲۴)

آتش کے شعر میں نشاطیہ کیفیت ہے ۔ "طالع بیدار" کی ترکیب اس نشاطیہ کیفیت میں معنویت کی خوشبو بھر دیتی ہے۔ جرأت کا شعر پورا واقعہ سنانے کے باوجود سرشاری نشاط کی کیفیت طرب پیدا نہیں کرتا۔ آتش کا شعر ہمیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ جرأت کی شاعری ہمیں مسرور تو کرتی ہے لیکن اپنے ساتھ نہیں لے جاتی۔

جرأت کا عشق محدود ہے۔ وہ ان کی شخصیت کا صرف ایک حصہ ہے لیکن ساری شخصیت نہیں ہے۔ عشق ان کے لیے معاملات کی حیثیت رکھتا ہے، واردات کی نہیں ۔ اس کا ہر پہلو ایک الگ حیثیت رکھتا ہے اسی لیے ان کی

شاعری لمحے کی شاعری ہے اور ایک لمحہ دوسرے لمحے سے مل کر ایک وحدت نہیں بنتا ۔ جرأت ان معاملات میں شوخی، چلبلاپن اور حلاوت شامل کر کے انہیں مزیدار بنا دیتے ہیں۔ "مزے کی باتیں" جرأت کی شاعری کا دائرۂ کار ہے:

گو وہ نہ بوسہ دیوے لیکن اس آرزو میں
کس کس مزے کی باتیں اپنی زبان پر ہیں (ص۲۹۶)

یہ دائرہ محدود ضرور ہے لیکن جرأت نے کم و بیش ان ساری باتوں کو مزے کے ساتھ بیان کر دیا ہے جن کا تعلق معاملات حسن و عشق سے ہو سکتا ہے۔ "جرأت عام آدمی کے سارے جذباتی تقاضے پورے کرتا ہے اور قاری کو اپنے ذاتی تجربات لکھے لکھائے مل جاتے ہیں" (۱۰۱) ساری کلیات میں ہزاروں اشعار اس کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے یہ چند شعر دیکھیے:

یاد کیا آتا ہے وہ میرا لگے جانا اور آہ
پیچھے ہٹ کر اس کا یہ کہنا "کوئی آ جائے گا" (ص۱۲)

ہوں گے دم میں تہ و بالا کو نین
اپنے نتھنوں کو جو پھڑکائیے گا (ص۳۱)

شب کو کچھ میں نے کہا تو کس ادا سے بولا
میری اور تیری کچھ اس بات کا اقرار نہ تھا (ص۵۰)

جاں بلب سُن کے کسی سے وہ مجھے یوں بولا
میرے بیزار سے مرنے دو پڑا، مجھ کو کیا (ص۵۹)

خدا جانے کدھر جاتے ہیں ہم ہو کر زخود رفتہ
یہ کہنا جب کسی کا یاد آتا ہے، ادھر آنا (ص۶۳)

آنکھوں کے آگے اس کے تصور میں رات کو
سو بار ایک چاند سا آ کر چمک گیا (ص۶۶)

بارے کل ہنس کے کہا یار نے جرأت ہم کو
اپنا بتلائیو ٹک نام ہمیں بھول گیا (ص۷۷)

وعدہ بھی کرکے بوسے کا دیتے نہیں ہو تم
لازم ہے آدمی نے جو منھ سے کہا، دیا (ص۸۲)

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چمپئی رنگ اور بدن وہ اس کا گدرایا ہوا (ص۱۰۲)

جاؤں جاؤں کیا کہے ہے بس لڑائی ہو چکی

پیار سے میرے گلے اب جان جاں لگ جا، نہ جا (ص ۱۱۱)
گودی میں اٹھانے جو لگوں تو کہے کیا خوب

ثابت تو مرے نقش قدم کو تو اٹھالا (ص ۱۳۳)
محبت مجھ سے تم رکھتے ہو توبہ

چلو کھاؤ نہ بس جھوٹی قسم تم (ص ۲۳۵)
گر کہیے بغل کیجئے ہماری بھی ذرا گرم

تو آنکھ جھپک ناز سے کہتا ہے وہ کیا گرم (ص ۲۳۹)
کہاں جاتا ہے بیٹھا اس کے ہوتے چین سے مجھ کو

کبھی پیچھے کو ہٹتا ہوں کبھی آگے سرکتا ہوں (ص ۲۵۴)
لگ جا گلے سے طاقت اب اے نازنیں نہیں

ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں (ص ۲۸۰)
عبث انگڑائیاں لے لے کے کیوں ملتے ہو آنکھوں کو

بھلا یہ بھی تو گھر ہے سو رہو گر نیند آئی ہے (ص ۳۳۲)
بلا جوڑے کی بندش اور قیامت قد و بالا ہے

غضب چتون ستم مکھڑا بدن سانچے میں ڈھالا ہے (ص ۳۷۰)
اس شوخ سے پوچھی جو خبر دل کی تو اس نے

اک غنچۂ گل پھینک دیا ہاتھ میں مل کے (ص ۴۰۵)
گویا تلے شفق کے جھمکتا ہے آفتاب

لیٹا جو منہ میں سرخ دوپٹہ وہ تان کے (ص ۴۰۹)
گھر کو جانا ہے ترے کوچے سے جرأت تو یوں

جائے ہے جیسے کہ رستہ نہیں آتا ہے اسے (ص ۴۵۵)
اچھا جو مرے پاس نہ آؤ تو نہ آؤ

مجھ سے بھی تو کچھ آپ کبھو کام رکھیں گے (ص ۵۰۴)
نہ پوچھ مجھ سے کہ سارے بدن کا کیا تھا حال

ذرا جو ہاتھوں میں ہاتھ اس کے پیارے پیارے لیے (ص ۵۳۱)
جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسائے ہیں آپ آئے ہوئے

کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے (ص ۵۴۵)
شب خواب میں اس شوخ کے آنکھوں پہ قدم تھے
پر آنکھ جو کھل گئی تو عجب سوچ میں ہم تھے (ص ۵۴۷)
حیرت ہے کہ کل اس نے کہی کان میں اپنے
وہ بات کہ مطلق جو نہ تھی دھیان میں اپنے (ص ۵۵۵)
تعریف اس کی کرنے محفل میں جب لگا میں
منھ پھیر کر وہ بولا چپکے سے مہربانی (ص ۵۸۱)

ان معاملات حسن کو دیکھیے تو یہ سب واقعاتی حالت کو بیان کرتے ہیں جنہیں جرأت بے تکلفی و بے باکی سے صاف ستھری زبان میں سنا دیتے ہیں اور جسے صاحب بہار بے خزاں (۱۰۲) نے "اختلاط شوخ دلیرانہ خبر می دہد" کہا ہے۔ یہ شاعری بے تکلف یاران محفل کی شاعری ہے اور اسی لیے محدود ہے۔

جو بات بوجھ جاوے کہہ بیٹھے پھر یہ اس کو
اہلِ جہاں یہ سن لو جرأت کی تم کہانی
(ص ۵۸۲)

اگر رنگ و مزاج کے علاوہ جرأت کی شاعری کو دیکھا جائے تو وہ ایک قادر الکلام شاعر نظر آئیں گے جو پُر گو بھی ہیں، خوش بیان اور نباض زبان بھی۔ ان کی پُر گوئی اور قادر الکلامی کا یہ عالم ہے کہ پتھر سے پتھر زمین کو بھی پانی کر دیتے ہیں۔ بعض غزلوں میں تو ردیفیں ایسی ہیں جنہیں دیکھ کر ہی پسینہ آ جاتا ہے لیکن جرأت اس میں بھی مزے دار شعر نکال لیتے ہیں مثلاً اس مصرع میں ——— "آواز کے تصدق اس گفتگو کے صدقے" میں ——— "آواز" قافیہ ہے اور باقی سارا مصرع ردیف ہے اور اس زمین میں بھی جرأت نے ۱۴ شعر کی غزل کہی ہے۔ وہ ردیف کو ایسے سلیقے اور ہنر مندی سے استعمال کرتے ہیں کہ مشکل زمین کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ زبان کے معاملے میں بھی وہ بہت محتاط ہیں۔ نہ صرف صفائی بندش سے دل نشین سلاست پیدا کر دیتے ہیں بلکہ صحتِ محاورہ، درستی روز مرہ، ارتباط الفاظ اور فصاحت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ اسی لیے ان کی غزل شُستہ و رفتہ ہے۔ سخن تراشی ان کا فن ہے۔ زور کلام ان کی بنیادی خصوصیت ہے۔ غزل در غزل کہہ کر وہ اپنی استادی کا لوہا منواتے ہیں۔ جرأت غزل ایسے کہتے ہیں جیسے وہ امتحان کا پرچہ حل کر رہے ہوں:

جرأت اب اس زمین میں بہتر غزل اک اس سے
پڑھ اور بھی کہ تجھ سے ہم امتحان پر ہیں (ص ۲۹۵)

ان کی بہت سی غزلیں مُسجّع ہیں۔ صنائع بدائع اس خوب صورتی سے استعمال کیے ہیں کہ شعر کے مزے میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن یہ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مزا کس صنعتِ شعری کے استعمال سے آیا ہے۔ ایک غزل ان کے کلام

میں ایسی بھی ہے جسے معمہ غزل کہا جاسکتا ہے۔ اس میں حروف کو آگے پیچھے کر کے جرأت نے نئے الفاظ وضع کیے ہیں جو مہمل ہیں لیکن چیستاں کی طرح حرفوں کو دوبارہ ترتیب دینے سے صحیح الفاظ تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس غزل کا مطلع و مقطع دیکھیے:(۱۰۳)

بشدیس مُجھی بُجت نِب دولار ہنی یائی
ات بُصح سَقَم رہتی زِنُہار ہِنی یائی (ص۴۷۲)
جرات بُجتھی چکھ گوندا دالی رخ اُجرت
چکھ سُکیے رخب صاقد ہُنزار ہنی یائی

بظاہر یہ شعر مہمل ہیں لیکن جب چیستان کھلتی ہے تو ان کی اصل شکل یوں سامنے آتی ہے:

شب نیند مجھے تجھ بن دلدار نہیں آئی
تا صبح قسم تیری زنہار نہیں آئی (ص۴۷۲)
اُجرت تجھے کچھ دوں گا لا دے خبرِ جرأت
کچھ اس کی خبر قاصد زنہار نہیں آئی (ص۴۷۲)

شعر گوئی اور استعمال الفاظ پر انہیں ایسی قدرت حاصل تھی کہ اپنے دور میں اپنے زبان و بیان کی وجہ سے :ع ہر دم نئی زباں ہے اپنے دہن کے اندر، اپنے موضوعاتِ شاعری کی وجہ سے :ع غزل اور معشوق کی ،عاشقی کی ،اپنی مجلسیت کی وجہ سے : ع کہ شب کو پری رویوں کا مجمع ہووے اور دن کو ،اپنی صلح جُو طبیعت اور خوش خُلقی و ملنساری کی وجہ سے : ع وہ اگر تجھ سے خفا ہے تو ہی جا مل ،کیا ہوا ـــــــ وہ خاص و عام میں مقبولیت کے اوجِ کمال پر پہنچ گئے تھے:

ہوا مقبول خاص و عام جو جرأت سخن تیرا
کرم اور رحم یہ تجھ پر نبیؐ کا اور علیؑ کا ہے (ص۵۸۴)

خود جرأت کو بھی یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ انہوں نے نئے ڈھب کی طرز گفتگو نکالی ہے لیکن تاریخ ادب گواہ ہے کہ مقبول ترین شاعری عام طور پر تہذیبوں کے مزاج بدلنے سے آنے والے زمانے میں قبول عام کے درجے سے گر جاتی ہے۔ سدا بہار تخلیق تو وہ ہے جو آفاقیت کو چھو لے اور جب زمانہ کروٹ بدلے تو اس میں نئے معنی نظر آنے لگیں۔ جرأت کا کلام اس آفاقیت سے عاری ہے اور اسی لیے وہ آج اتنے بڑے شاعر نہیں رہے جتنے اپنے زمانے میں تھے۔ وہ دوسرے درجے کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل موضوع و طرز دونوں سطح پر ایک محدود دنیا کو سامنے لاتی ہے۔ جرأت کی شاعری ایک مخصوص دور کے مخصوص مزاج کی شاعری ہے جو موجود (Particular) سے آفاقیت (Universal) کی طرف نہیں جاتی اور اسی لیے اس میں عُلویت نہیں ہے۔ جرأت کے زیر اثر شاعری کا یہ رجحان اور شاعروں کا ایک طبقہ ضرور پیدا ہو گیا جس نے خارجیت کو اختیار کیا اور شاعری کو ایک دوسری انتہا کی طرف لے گیا جس میں خارجیت اور معنی آفرینی

معیارِ سخن ٹھہرے ۔ جرأت کی شاعری ہمیں بڑے ہونے کا فریب سا دیتی ہے اور ہم ان کی شہرت، ضخامتِ کلام اور لطف کو دیکھ کر انہیں میر و سودا کے ساتھ کھڑا کرنے لگتے ہیں لیکن ان کی شاعری اس دائرے میں نہیں آتی۔ ان کا اصل میدان تو غزل ہے لیکن دوسری اصنافِ سخن مثلاً قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مرثیہ، واسوخت ، سلام و مراثی وغیرہ میں بھی ان کا اتنا کلام ہے کہ بہت سے شاعروں کا سارا کلام بھی بحیثیت مجموعی اتنا نہیں ہو گا۔ یہ سب کلام ان کی قادرالکلامی کا تو بولتا ثبوت ہے لیکن آفاقیت کو نہیں چھوتا۔ جرأت کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جیسے شاہ مبارک آبرو محمد شاہ رنگیلا کے دور کے نمائندہ شاعر تھے اسی طرح جرأت آصف الدولہ کے دور کی تہذیب کے نمائندہ ترجمان و شاعر تھے۔ وہ شاعر جو کسی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی تہذیب کے ساتھ اٹھتا اور اسی کے ساتھ گرتا ہے۔ ہم جرأت کو جب بھی اس پس منظر سے الگ کر کے دیکھیں گے تو وہ اس مچھلی کی طرح نظر آئیں گے جسے پانی سے نکال کر ریتِ وقت پر ڈال دیا گیا ہو۔ وہ سیاسی و معاشرتی صورت حال جس سے سلطنتِ اودھ دوچار تھی اور جس کے بارے میں خود جرأت نے کہا تھا:

سمجھے نہ امیر ان کو کوئی نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھ اک قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر (ص ۱۸۷)

یہ سیاسی و معاشرتی صورت حال صرف آصف الدولہ ہی پیدا کر سکتا تھا جس کے بارے میں آیا ہے کہ ان کا "اوپر کا دھڑ بڑا تھا اور تلے کا دھڑ کمر سے پاؤں تک کسی قدر چھوٹا تھا۔ جب بیٹھ جاتے تو معلوم ہوتا کہ خوش قامت جوان ہیں۔ جب کھڑے ہوتے تو آدمیوں کی کمر تک پہنچتے۔ (۱۰۴) اور آصف الدولہ کی پروردہ تہذیب کی ترجمانی و نمائندگی کا شرف قلندر بخش جرأت ہی کو حاصل ہو سکتا تھا جو انہیں حاصل ہوا۔ ڈاکٹر عابد حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "سیاسی فساد و انتشار کی وجہ سے اس تہذیب میں وہ تازگی اور قوت، وہ باڑھ اور اپج نہیں رہی ۔۔۔ اور اس کے ہر شعبے پر پہلے جمود اور پھر انحطاط کی کیفیت طاری ہو گئی ۔۔۔ اس زمانے کے عیش پسند، تخیل پرست، زندگی سے گریز کرنے والی طبیعتوں کے لیے جن و پری کی داستانوں اور طلسمات کے افسانوں کی ضرورت تھی جسے پورا کرنے کی غرض سے بوستانِ خیال جیسی شاندار خرافات لکھی گئی۔ (۱۰۵) یہی اس دور کی معاشرت و تہذیب تھی جسے اس دور کی مقبول ترین صنف ادب یعنی شاعری نے پورا کیا۔ جرأت اسی تہذیب کے نمائندہ اور ترجمان ہیں۔

("ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل لیکچر جو ۸ نومبر ۱۹۸۹ء کو نئی دہلی میں دیا گیا۔")

حواشی

۱۔ نذر عابد، مرتبہ مالک رام ص۹ (۲۱)، مجلس نذر عابد، نئی دلی ۱۹۷۲ء

۲۔ کلیات جرأت۔ مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن، جلد اول، ص۴۳، نیپلز اطالیہ ۱۹۷۰ء

۳۔ دیوان دوم، مصحفی مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن نقوی، ص۲۱۴، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹

۴۔ دریائے لطافت، انشاو قتیل، ترجمہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، ص۶۴، ۶۵، انجمن ترقی اردو ہند، اورنگ آباد ۱۹۳۵ء

۵۔ ایضاً، ص۳۔

۶۔ دریائے لطافت (فارسی) ص۲، مطبوعہ چھاپہ خانہ آفتاب عالمتاب، مرشد آباد، ۱۸۵۰ء۔

۷۔ خوش معرکہ زیبا، جلد اول از سعادت علی خان ناصر مرتبہ مشفق خواجہ، ص۱۴۴ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۰ء۔

۸۔ مجموعہ نغز، حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ قاسم، مرتبہ حافظ محمود شیرانی، جلد اول، ص۱۵۶، لاہور ۱۹۳۳ء۔

۹۔ تاریخ اودھ، نجم الغنی خاں، جلد سوم، ص۲، نولکشور ۱۹۱۹ء

۱۰۔ تاریخ اودھ، نجم الغنی خان، جلد چہارم، ص۱۵۵، نولکشور، ۱۹۱۹ء۔

۱۱۔ سوانحات سلاطین اودھ، سید محمد زائر ص۰۰۰۰ نولکشور لکھنؤ ۱۸۹۶ء۔

۱۲۔ تاریخ اودھ، نجم الغنی خان، جلد چہارم، ص۱۵۹، نولکشور ۱۹۱۹ء۔

۱۳۔ ایضاً، ص۱۷۱۔

۱۴۔ ایضاً، ص۱۶۹۔

۱۵۔ ایضاً، ص۳۹۲۔۳۹۳۔

۱۶۔ ایضاً ص۳۹۴۔

۱۷۔ مجمع الانتخاب، تذکرہ شاہ کمال، مرتبہ نثار احمد فاروقی (تین تذکرے)، ص۵۶، مکتبہ برہان دہلی، ۱۹۶۸ء

۱۸۔ طبقات الشعرا: قدرت اللہ شوق، مرتبہ نثار احمد فاروقی، ص۳۰۲، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء۔

۱۹۔ تذکرہ عشقی عظیم آبادی (دو تذکرے جلد اول مرتبہ کلیم الدین احمد) ص۱۷۶، پٹنہ بہار ۱۹۵۹ء؛ تذکرہ گلشن سخن، مردان علی خاں مبتلا لکھنوی، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، ص۹۴، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۶۵ء؛ گلزار ابراہیم: علی ابراہیم خاں خلیل مرتبہ کلیم الدین احمد، ص۶۲، دائرۂ ادب پٹنہ بہار۔ جرأت نے خود بھی اپنے ایک شعر میں اپنا نام یحییٰ امان بتایا ہے۔ شعر یہ ہے:

جرأت کہے تھا کل وہ کسی سے یہ الاماں
جیتا رکھوں نہ مجھ کو جو یحییٰ اماں ملے

۲۰۔ تذکرہ شعرائے اردو: میر حسن مرتبہ محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی، ص۴۵، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۰ء۔

۲۱۔ گلشن سخن، ص۹۴، گلزار ابراہیم، ص۶۲۔

۲۲۔ تاریخ محمدی، میرزا محمد معتمد خاں بدخشی دہلوی، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، ص۱۰۶، شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۰ء۔

۲۳۔ ایضاً، ص۳۳۔

۲۴۔ عمدۂ منتخبہ، میر محمد خان بہادر اعظم الدولہ سرور مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ص۱۹۲، دہلی یونیورسٹی دہلی، ۱۹۶۱ء۔

۲۵۔ تذکرہ ہندی: غلام ہمدانی مصحفی مرتبہ عبدالحق، ص۶۲۔۶۳، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۳ء۔ تذکرہ عقد ثریامیں منیر کے ذیل میں مصحفی نے لکھا ہے کہ "حالا در کوچہ رائے مان در دارالخلافہ شاہجہاں آباد فروکش"، ص۵۲۔

۲۶۔ طبقات سخن (مخطوطہ برلن ، جرمنی) شیخ غلام محی الدین مبتلا و حشق میر ٹھی، ص ۵۸۔ عکس مملوکہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔

۲۷۔ کلیات جرأت ، مرتبہ ڈاکٹر اقتدا احسن، جلد دوم، (مثنوی خواجہ حسن و بخشی) ص ۱۹ ، مطبوعہ نیپلز، اطالیہ ۱۹۷۱ء۔

۲۸۔ طبقات سخن، غلام محی الدین مبتلا و عشق میر ٹھی، نسخہ برلن، محولہ بالا۔

۲۹۔ تذکرہ مسرت افزا: امر اللہ الہ آبادی مرتبہ قاضی عبد الودود، ص ۵۴، پٹنہ، بہار، تذکرہ شعرائے اردو، ص ۴۵۔

۳۰۔ تذکرہ شعرائے ہندی، میر حسن، مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری ، ص ۳۳۶، اردو پبلشرز لکھنؤ، ۱۹۷۹ء۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۹۵ ۔

۳۲۔ تذکرہ شعرائے اردو، میر حسن مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی، ص ۴۵ ، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ، ۱۹۴۰ء۔

۳۳۔ تذکرہ شعرائے ہندی، ص ۹۵، محولہ بالا ۔ (میر حسن کے الفاظ یہ ہیں: در معنی یابی از ہم چشمان خود ممتاز۔ کلامش نمکین و بیانش شیریں")

۳۴۔ تاریخ ادب اردو ، ڈاکٹر جمیل جالبی، جلد دوم حصہ دوم، ص ۰۰۰۰ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۸۲ء۔

۳۵۔ مثنوی "در ہجو شدت سرما" میں یہ اشعار ملتے ہیں:

جاڑے کا ہو خوف مجھ کو کیوں کر
ہوں ایسی جناب کا میں نوکر
سردی کو وہ کیوں نہ کرے نایاب
شمس الدولہ ہے جو کہ نواب

کلیات جرأت مرتبہ ڈاکٹر اقتدا احسن جلد دوم محولہ بالا، ص ۱۱۹۔

۳۶۔ دستور الفصاحت ، حکیم سید احمد علی خاں یکتا لکھنوی مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، ص ۹۹، ہندوستان پریس ، رامپور، ۱۹۴۳ء۔

۳۷۔ روز روشن ، محمد مظفر حسین صبا، کتب خانہ رازی، طہران، ۱۳۴۳ھ۔

۳۸۔ کلیات جرأت ، محولہ بالا، جلد دوم، ص ۱۸۶ اور ص ۳۰۱۔

۳۹۔ تذکرہ شعراء اردو ، میر حسن ، ص ۴۵، محولہ بالا۔

۴۰۔ تذکرہ ہندی، مصحفی ، ص ۶۳ ، محولہ بالا۔

۴۱۔ گلشن ہند: مرزا علی لطف ، ص ۹۱ دار الاشاعت پنجاب، لاہور، ۱۹۰۶ء۔

۴۲۔ طبقات الشعراء ، قدرت اللہ شوق ، ص ۳۰۲ ، محولہ بالا۔

۴۳۔ کلیات شاہ کمال (دیباچہ) ، مخطوطہ رضا لائبریری رامپور، بحوالہ سہ ماہی صحیفہ شمارہ ۱۸، جنوری ۱۹۶۲، ص ۲۳۔

۴۴۔ مجمع الانتخاب، شاہ کمال (دیباچہ) ، ص ۵۴، محولہ بالا۔

۴۵۔ تذکرہ ہندی، مصحفی، ص ۲۵، محولہ بالا۔

۴۶۔ تذکرہ شعراء اردو، میر حسن ، ص ۴۴ ، محولہ بالا۔

۴۷۔ گلزار ابراہیم ، ص ۶۲، محولہ بالا۔

۴۸۔ تذکرۂ ہندی، مصحفی ، ص ۶۳، محولہ بالا۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۲۱ ۔

۵۰۔ واقعات اظفری ، ص ۸۵ ، بحوالہ تذکرۂ آزردہ مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد، ص ۸۱، مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۷۲ء۔

۵۱۔ آب بقا: خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت لکھنوی ، ص ۱۹۵ ۔ ۱۹۳، لکھنؤ ۱۹۱۸ء ۔

۵۲۔ ریاض الفصحاء ، غلام ہمدانی مصحفی، ص ۳۶۲، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن، ۱۹۳۴ء۔

۵۳۔ سخن شعراء ، عبد الغفور نساخ، ص ۲۵۷، مطبع نولکشور لکھنؤ، ۱۹۷۴ء۔

۵۴۔ کلیات جرأت (جلد دوم)، مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن ، ص ۲۱۱، ۲۲۲ ، نیپلز اطالیہ ۱۹۷۱ء۔

۵۵۔ سخن شعراء ، ص ۴۳۹، محولہ بالا۔

۵۶۔ کلیات جرأت ، جلد دوم، ص ۲۲۵، محولہ بالا۔

۵۷۔ تذکرہ ہندی، مصحفی، ص ۶۳، محولہ بالا۔

۵۸۔ مجمع الانتخاب ، شاہ کمال، ص ۴۵، محولہ بالا۔

۵۹۔ ہشت گلزار، شاہ حسین حقیقت (قلمی) مخزونہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔

۶۰۔ دستور الفصاحت، یکتا لکھنوی ، ص ۹۹، محولہ بالا۔

۶۱۔ عمدۂ منتخبہ : نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سرور، مقدمہ از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۱۹۲، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۹۶۱ء۔

۶۲۔ جلوۂ خضر (جلد اول) ، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، ص ۱۳۹۔ ۱۳۵، مطبع نور الانوار ، آرہ، بہار ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء۔

۶۳۔ جرأت اور اس کی شاعری از کلب علی خاں فائق رامپوری مطبوعہ سہ ماہی صحیفہ لاہور، ص ۶۳۔ ۵۵، لاہور اپریل ۱۹۶۲ء۔

۶۴۔ کلیات جرأت ، جلد سوم ، مرتبہ اقتدا حسن ص ۳۴۔ ۳۳، محولہ بالا۔

۶۵۔ دیوان حقیقت، شاہ حسین حقیقت (قلمی) مخزونہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔

۶۶۔ دیوان ناسخ مخطوطہ قبل ۱۲۳۶ھ ، مخزونہ کتب خانہ راجہ صاحب محمود آباد ، بحوالہ تحقیقی نوادر، ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری ، ص ۲۰۹، اردو پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۷۴۔

۶۷۔ کلیات مصحفی، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

۶۸۔ کلیات جسونت سنگھ پروانہ، مخطوطہ ، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔

۶۹۔ طبقات الشعرائے ہند، فیلن و منشی کریم الدین احمد، ص ۲۰۶، مطبع العلوم مدرسہ دہلی، ۱۸۴۸ء۔

۷۰۔ تذکرہ طبقات الشعراء ، قدرت اللہ قاسم ، ص ۳۰۲، محولہ بالا۔

۷۱۔ تذکرہ شعرائے اردو، میر حسن، ص ، محولہ بالا۔

۷۲۔ دو تذکرے مرتبہ کلیم الدین احمد، ص ۱۷۷۔ ۱۷۶، محولہ بالا۔

۷۳۔ دستور الفصاحت ، ص ۹۹ ، محولہ بالا۔

۷۴۔ خوش معرکہ زیبا سعادت خاں ناصر، مرتبہ مشفق خواجہ، ص ۲۶۳، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۰ء۔

۷۵۔ ایضاً، ص ۲۶۳۔

۷۶۔ دستور الفصاحت، ص ۹۹، محولہ بالا۔

۷۷۔ عقد ثریا، مصحفی دیکھیے ترجمہ بے تاب، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۳۴ء۔

۷۸۔ تذکرہ ہندی، مصحفی، ص ۱۴۱، محولہ بالا۔

۷۹۔ دستور الفصاحت ، ص ۹۴ ، محولہ بالا۔

۸۰۔ مصحفی اور جرأت ، قاضی عبد الودود ، ص ۵۰۔ ۴۱، مطبوعہ معاصر ۲، پٹنہ بہار۔

۸۱۔ تذکرہ ہندی مصحفی ، ص ۲۵، محولہ بالا، خوش معرکہ زیبا جلد اول، ص ۲۸۴، محولہ بالا۔

۸۲۔ خوش معرکہ زیبا، جلد اول، ص ۲۸۷، محولہ بالا۔

۹۳۔ تذکرہ ہندی، مصحفی، ص ۸۶ ، محولہ بالا۔

۸۴۔ تذکرہ ہندی، مصحفی، ص ۸۶، محولہ بالا۔

۸۵۔ خوش معرکہ زیبا، جلد اول، ص ۳۶۴۔

۸۶۔ مجمع الفوائد، مصحفی، (قلمی)، ص ۳۴۲، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور۔ یہ کلیات مصحفی میں شامل ہے۔

۸۷۔ "توا فخر بدایوں بود زایر" سے ۱۲۴۰ھ برآمد ہوتے ہیں، دستور الفصاحت، حاشیہ ص ۱۰۹، محولہ بالا۔

۸۸۔ دستور الفصاحت، ۱۰۹، محولہ بالا۔

۸۹۔ تذکرہ شعرائے اردو، میر حسن، ص ۴۵، محولہ بالا۔

۹۰۔ جائزہ مخطوطات اردو میں مشفق خواجہ نے ۳۳ قلمی نسخوں کی نشاندہی کی ہے، ص ۴۰۰۔۔۔۴۱۰ مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۷۹ء۔

۹۱۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۴۵، محولہ بالا۔

۹۲۔ کلیات جرأت، جلد سوم، مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن ص ۱۲۲، محولہ بالا۔

۹۳۔ تذکرہ ہندی، میر حسن مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، ص ۹۵، اردو پبلشرز لکھنؤ، ۱۹۷۹ء۔

۹۴۔ گلشن سخن، مردان علی خان مبتلا لکھنوی مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب، ص ۹۴، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ۱۹۶۵۔

۹۵۔ تذکرہ ہندی، مصحفی، مرتبہ عبدالحق، ص ۶۳، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء۔

۹۶۔ ستارہ یا بادبان، محمد حسن عسکری، ص ۲۵۷، مکتبہ سات رنگ، ۱۹۶۳، کراچی۔

۹۷۔ دستور الفصاحت، ص ۹۹، محولہ بالا۔

۹۸۔ کلیات جرأت، مرتبہ پروفیسر اقتدا حسن، ص ۳۳۔۳۵، محولہ بالا۔

۹۹۔ دیکھیے کلیات جرأت، محولہ بالا، غزل نمبر ۵۸، غزل ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۹، ۵۵۹، ۶۱۷، ۶۷۶، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۳، ۷۲۸، ۷۳۰، ۷۳۹، ۷۴۶، ۷۵۳، ۷۹۲، ۹۱۶، ۹۳۴، ۱۰۷۴ وغیرہ۔

۱۰۰۔ گلشن بے خار، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، ص ۷، نولکشور لکھنؤ، ۱۹۱۰ء۔

۱۰۱۔ ستارہ یا بادبان، محمد حسن عسکری، ص ۲۴۹، مکتبہ سات رنگ، ۱۹۶۳، کراچی۔

۱۰۲۔ بہار بے خزاں، احمد حسین سحر مرتبہ نعیم احمد، ص ۴۷، علمی مجلس دلی، ۱۹۶۸۔

۱۰۳۔ کلیات جرأت، جلد اول، ص ۴۷۲ پر غزل نمبر ۹۶۶ چیستان کی صورت میں ملتی ہے اور اصل غزل ص ۴۷۳، ۴۷۴ پر غزل نمبر ۸۶۹ کے تحت ملتی ہے۔ مالک رام صاحب نے ایک مضمون "چیستان جرأت" کے عنوان سے اسی غزل کے بارے میں لکھا ہے جو ان کی کتاب "تحقیقی مضامین" (مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۴ء) میں ص ۱۵۸ تا ۱۶۲ ملتا ہے۔

۱۰۴۔ تاریخ اودھ، جلد سوم ص ۲، محولہ بالا۔

۱۰۵۔ قومی تہذیب کا مسئلہ، سید عابد حسین، ص ۱۰۲۔۔۔۱۰۳، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۴ء۔

تاریخ اِسلام کے اہم موڑ

پیغامِ الٰہی و دعوتِ نبویؐ

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

سیرتِ نبویؐ کے تمام قدیم و جدید مؤلفین اور تاریخِ اسلامی کے سارے مکاتبِ فکر کے ماہرین بعثتِ نبویؐ کے بعد دعوتِ اسلامی کے مختلف ادوار سے بحث تو شروع کر دیتے ہیں مگر یہ نہیں بتاتے کہ یہ دعوت کن امور و عقائد یا تعلیمات کی تھی۔ (۱) بیشتر سیرت نگار و مؤرخین اسلام کے بنیادی عقائد کا حوالہ دے دیتے ہیں یا قرآنِ مجید کی تمام مکی/مدنی سورتوں کے متعلقہ مضامین کا بلا ترتیبِ زمانی مختصر اور سرسری ذکر کرکے گزر جاتے ہیں۔ بعض علماء و مفسرین اور سیرت نگاروں نے باقاعدہ اس موضوع پر بحث کو قرآنی آیات سے مدلل اور اپنے نتائج و استنباطات کو مکی وحی الٰہی سے آراستہ کیا ہے مگر ان کے ہاں بھی زمانی ترتیب کا فقدان ملتا ہے (۲) یہ صحیح ہے کہ قرآنِ مجید کی مکی سورتوں کی ترتیبِ نزول کی صحیح تعیین خاصی مشکل ہے تاہم ناممکن نہیں (۳)۔ اس کے بغیر اس سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک پانا مشکل ہے کہ آخر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کون سا انقلاب آفریں پیغام اور حیات ساز اسلام پیش کیا تھا جس نے عرب کے جاہل، غیر متمدن اور اجڈ بدوؤں اور سرکش و متمرد شہریوں کو آپ کے دین کا ایسا متوالا اور شیدا بنا دیا تھا کہ ہر طرح کا ظلم و جبر، استہزاء و تضحیک اور مخالفت و عداوت کے باوجود ان کے دل سے نہ نکلتا تھا۔ وہ کیا تعلیم تھی جس نے ہر وقت لڑنے بھڑنے والے عربوں کو متحد و یگانہ، جاہلوں کو تعلیم یافتہ، غیر متمدنوں کو متمدن و مہذب، خدا ناشناسوں کو خدا شناس اور ظالموں کو رحم و کرم کا پیکر بنا دیا تھا۔ ان تمام اور ان جیسے متعدد دوسرے سوالات کا جواب اُن قرآنی آیات و سورتوں میں چھپا ہوا ہے جو ابتدائی دور میں نازل ہوئیں اور جنہوں نے اسلام کے کارواں کو اس کے صحیح خطوط پر جادہ پیما کر دیا۔

سیرت و تفسیر کی روایات اور قرآنی سورتوں پر غور و تدبر سے معلوم ہوتا ہے کہ اولین وحی ربانی کے نزول کے وقت سے لے کر دعوتِ اسلامی کو واشگاف انداز میں پیش کرنے کے مرحلے تک وہ آیات اور سورتیں نازل ہوئیں جن میں اسلام کے تین بنیادی عقائد کا مختلف انداز و اسلوب میں بیان تھا۔ اس اولین مرحلۂ تنزیل قرآنِ کریم میں اسلام، دین اور اللہ کی طرف لوگوں کو بلانے کا ذکر نہیں ملتا۔ اور اگر ملتا ہے تو وہ اتنا واضح اور صاف اعلان نہیں معلوم ہوتا (۴)۔ تاریخی روایات بھی واضح کرتی ہیں کہ کچھ مدت تک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تنزیلِ قرآن کا سلسلہ جاری رہا اور پھر رک گیا اور اس زمانے کو جب وحی کا سلسلہ منقطع رہا فترۂ وحی کا زمانہ کہا جاتا ہے (۵) اور پھر جب پہلی آیات قرآنی نازل ہوئیں تو ان میں اِنذار (لوگوں کو خبردار کرنے) کا حکم ربانی موجود تھا (۶)۔ مفسرین، سیرت



ڈاکٹر غلام مُصطفےٰ خاں

ولادت : جبل پور (سی پی ، انڈیا) ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء

تعلیم : ایم ۔ اے ، ایل ایل بی ، پی ایچ ڈی ، ڈی لٹ

تصنیفات و تالیفات ، تراجم : ستّر سے زائد

اعزاز : نقد انعام اور طلائی تمغہ ،

اقبال ایوارڈ ، حکومتِ پاکستان ۱۹۸۱ء

موجودہ مصروفیت :

پروفیسر ایمیرٹس ، شعبۂ اردو ، سندھ یونیورسٹی ۔ حیدر آباد

نقوش ایوارڈ برائے سیرت ، ۱۹۸۲ء



ڈاکٹر محمد یسٰین مظہر

ولادت : ۲۶ دسمبر ۱۹۴۴ گولاگوکرن ناتھ

(ضلع لکھیم پور کھیری ۔ یو ۔ پی انڈیا)

تعلیم : عالم (ندوۃ العلما لکھنؤ) فاضل ادب لکھنؤ یونیورسٹی ۔

پی ایچ ڈی علی گڑھ

تصنیفات : اردو ۔ عربی ۔ انگریزی : ۱۶

۱۰۰ کے قریب تحقیقی مقالات

(اسلامی تاریخ ، سیرت نبویؐ)

علمی امتیازات : نقوش ایوارڈ برائے سیرت ۱۹۸۳ء

رکن رابطہ الالجامعات اسلامیہ ۔ ریاض

رکن رابطہ الادب الاسلامی العالمی ندوۃ العلما لکھنؤ

ڈاکٹر محمد یوسف گورایا

ولادت : ۲ فروری ۱۹۳۳ء

تعلیم : ایم ۔ اے (اسلامک اسٹڈیز)

ایل ایل بی کراچی یونیورسٹی

ڈاکٹر آف فلاسفی پنجاب یونیورسٹی

(Mcgill University Canada.)

تصنیفات ۱۸ انگلش/اردو مضامین ۵۶

موجودہ مصروفیت : ڈائریکٹر جنرل تحریک صلوٰۃ و فلاح

محکمہ اوقاف ۔ لاہور

نقوش ایوارڈ برائے سیرت ، ۱۹۸۵ء



نگاروں ، اور علماءِ اسلام کے نزدیک یہ پوری طرح واضح نہیں کہ اولین مرحلۂ تنزیلِ قرآنِ حکیم میں کون کون سی آیات اور سورتیں نازل ہوئیں (۷) ۔ مگر مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں وہ آیات اور سورتیں ہی نازل ہوئیں تھیں جن میں اللہ رسول ؐ آخرت اور جنت دوزخ کا ذکر تھا۔ تفکر و تدبر قرآن کریم سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اولین آیات اور سورتوں میں جس طرح دعوت و تبلیغ کا واضح ذکر نہیں ملتا اسی طرح مشرکینِ مکہ اور دشمنانِ اسلام کے اعتراضات و استہزا اور مظالم کا بھی حوالہ یا قرینہ نہیں پایا جاتا (۸) ۔ بعض مفسرین نے ان دلائل و قرآن کی بنیاد پر ترتیبِ نزولِ وحی ربانی کی کوشش کی ہے اور وہ دعوتِ اسلامی کی نشر و اشاعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی کوششوں کو سمجھانے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے ۔ اور اس سوال کا جواب بھی ڈھونڈا جا سکتا ہے کہ آخر اولین مسلمانانِ مکہ نے کس وجہ اور بنیاد پر اسلام قبول کیا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خفیہ دعوت کی کامیابی کا کیا راز تھا ؟ اس بحث میں پہلے ہم ان آیاتِ کریمہ اور سُورِ صادقہ سے تعرض کریں گے جو ابتدائی پیغامِ الٰہیٰ کو عربوں کے سامنے پیش کرنے کا ذریعہ بنی تھیں اور ساتھ ہی ان روایات کا بھی جائزہ لیں گے جن سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے نشوونما اور تدریجی ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔

ماثور روایات سے مکی سورتوں کی جو ترتیبِ زمانی اور تاریخ نزول معلوم ہوتی ہے وہ بسا اوقات ان کی داخلی شہادتوں کے خلاف پڑتی ہے۔ پھر اولین سورتوں اور آیات کی ترتیب نزول کے بارے میں بھی علماء و مفسرین میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اولین آیاتِ قرآنی کے نزول کے باب میں بھی روایات مختلف ہیں اور ان کی بنا پر مختلف علماء و مفسرین کے مختلف خیالات و نظریات اور عقائد ہیں (۹)۔ بعض مفسرین نے تفسیری روایات اور آیاتِ قرآنی کی داخلی شہادتوں کی بنیاد پر جمع و تطبیق اور ترجیح کا اصول اپنا کر ان کے زمانۂ نزول کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر طرح سے یہ سعیٔ مشکور ہے ۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بعض اور مفسرین کی مانند مکی آیات و سورِ قرآنی کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے (۱۰) ۔ ان کی اس علمی بحث سے یہاں ہمیں سردست کوئی تعلق نہیں البتہ ان کے بیان کردہ ابتدائی دور کی قرآنی سورتوں سے ہمیں بحث کرنی ہے تاکہ مکہ مکرمہ کے باشندوں کے سامنے جو اسلام و دین پیش کیا گیا تھا اس کی ابتدائی کشش کو سمجھا جا سکے اور اس کے نتیجہ خیز اثرات کی تفہیم ہو سکے۔ مولانا موصوف کے مطابق کم از کم چونتیس (۳۴) سورتیں یا ان کی بیشتر آیات مکی عہد کے آغاز میں نازل ہوئیں تھیں۔ اگرچہ مولانا مرحوم نے ان کی باقاعدہ ذیلی درجہ بندی نہیں کی ہے تاہم ان کے بیانات و صراحتوں کی بنا پر ان کے مزید ادوار بنائے جا سکتے ہیں اور دوسری روایتی شہادتوں کی بنیاد پر ان سورتوں کی تعیین کی جا سکتی ہے جو بالکل آغازِ بعثت میں نازل ہوئی تھیں ۔ چونکہ اس بحث ہی پر ہماری اگلی بحثوں کا مدار ہے اس لیے مختصراً یہ عرض کیا جا رہا ہے کہ بالکل ابتدا میں جو سورتیں نازل ہوئی تھیں وہ حسب ذیل تھیں: (۱) سورۂ العلق/اقرا (۲) سورۂ فاتحہ (۳) سورۂ مزمل (۴) سورۂ مدثر (۵) سورۂ زلزال (۶) سورۂ عادیات (۷) سورۂ القارعہ (۸) سورۂ الھمزہ (۹) سورۂ العصر (۱۰) سورۂ الفیل (۱۱) سورۂ

قریش (۱۲) سورۂ التکاثر (۱۳) سورۂ الاخلاص (۱۴) سورۂ والضحیٰ (۱۵) سورۂ الانشراح (۱۶) سورۂ تکویر (۱۷) سورۂ انفطار وغیرہ وغیرہ ۔ ان کی ترتیبِ نزول کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے مگر بقول مولانا موصوف یہی وہ آیات اور سورتیں تھیں جو مکہ مکرمہ میں اولاً نازل ہوئیں اور ان ہی میں ابتدائی اعتقادات بیان ہوئے ہیں (۱۱) ۔

ذکر آچکا ہے کہ اولین سورہ علق/اقرا کی پہلی پانچ آیات ابتداءً خواب میں سنائی اور پڑھائی گئیں اور پھر عالمِ بیداری میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالمشافہ حضرت جبریلؑ سے وہ آیات پڑھیں ۔ بعد میں بعض مفسرین اور راویوں کے بقول آپؐ نے فترۂ وحی کے بعد کوہِ غارِ حرا کے وسط میں حضرت جبریلؑ سے بالمشافہ سورۂ فاتحہ سنی (۱۲) ۔ ان دونوں سورتوں میں سارا زور اللہ تعالیٰ اور اس کی صفاتِ عالیہ پر ہے۔ سورۂ اقرا میں اپنے رب کے نام سے پڑھنے کا حکم ہے اور پھر ربِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خالقِ کُل بالعموم اور خالقِ انسانی بالخصوص بتایا گیا ہے ۔ تخلیقِ انسان کا مادہ بھی ذکر کیا گیا ہے مگر وہ صفتِ الٰہی کی مزید تشریح ہے۔ اس کے بعد پروردگار و رب کو اکرم (سب سے زیادہ عزت والا) اور معلمِ حقیقی بتایا گیا ہے جو انسان کو قلم کے ذریعہ وہ علم دیتا ہے جو اسے پہلے حاصل نہ تھا۔ اس اولین تنزیل میں اللہ تعالیٰ کا نام لیے بغیر اس کی تین صفات ربوبیت ، کرامت اور معلم ہونے کا ذکر بطور خاص کیا گیا ۔ اللہ کی صفت خالقیت انسان کی لہو کی پھٹکی سے تخلیق سے اور رب کے اکرم ہونے کی صفت اس کے قلم کے ذریعہ انسان کو نامعلوم بتانے کی دوسری صفت سے جوڑی گئی (۱۳)۔ سورۂ فاتحہ میں یہ مضمون اور پھیلایا گیا اور اسے باقاعدہ ایک ترتیب و تنظیم کے ساتھ جامعیت عطا کی گئی اور ساتھ ہی انسان سے اس کا ایک اور تعلق بتایا گیا۔ پہلے تمام حمد و تعریف اللہ کے لیے مخصوص و منحصر کی گئی پھر اس کو ربُّ العالمین (سارے جہانوں کا پروردگار و پالن ہار) کہا گیا۔ پھر اس کی رحمان و رحیم (بڑا مہربان اور مسلسل رحم کرنے والا) کی دو عظیم ترین صفات بیان کی گئیں اور اس کے بعد اس کو روزِ جزا کا مالک (مالکِ یوم الدین) بتایا گیا اور باقی آیات میں اسی کو معبودِ حقیقی اور معینِ مطلق اور ہادیٔ کل قرار دیا گیا (۱۴) ۔ روایات کے مطابق سورۂ فاتحہ اولین مکمل سورہ تھی جو آپؐ پر نازل ہوئی تھی ۔ ان دونوں ابتدائی تنزیلات قرآنی میں واضح طور سے اللہ تعالیٰ کی صفات پر زور ہے اور باقی تمام معتقدات اس کی صفات کے ضمن میں ہی آئے ہیں۔

قرآن مجید کے اعجازِ بلاغی و اسلوبی سے یہ بھی ہے کہ وہ اصلاً کسی ایک نکتہ پر زور دیتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ بعض ضمنی نکات بھی روشنی میں آتے اور قارئین یا سامعین کے ذہن و شعور کو متاثر کرتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے اصلی ذکر کے ساتھ اس میں توحید کا بنیادی عقیدہ بھی پنہاں ہے اور آخرت کا عقیدہ بھی۔ رسالت کا واضح حوالہ یا ذکر ان دونوں میں موجود نہیں مگر وہ عدمِ ذکر کے باوجود آیات کے باطن و خارج دونوں میں جاری و ساری ہر جگہ نظر آتا ہے (۱۵)۔

ابتدائی مکی سورتوں کے زمانۂ نزول کے بارے میں تفسیری روایات اور داخلی شواہد میں تصادم پایا جاتا ہے۔ قیاس و منطق کا تقاضا ہے کہ ابتدا میں نازل ہونے والی آیتوں اور سورتوں میں صرف اسلامی تعلیمات اور بنیادی عقائد

کا ذکر ہو تاکہ مدعوئین اور داعی کے درمیان کسی قسم کا تنافر یا تصادم نہ پایا جائے ۔ ہر دعوت کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ مدعوئین کو دعوت کی طرف کھینچنے کے لیے دعوت یا داعی سے کسی قسم کی نفرت یا الجھن نہ ہو اور اسلامی دعوت کے داعیوں اور پیغمبروں نے ہر زمانے میں یہ اصول مدِّ نظر بھی رکھا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبیؑ اور رسولؑ نے اپنی دعوت میں بنیادی عقائد سے آغاز کیا، ہر طرح کے طنز و تعریض اور تنقید سے احتراز کیا اور اپنی سادہ اور دلنشیں زبان اور پر کشش اسلوب میں دعوت پیش کی اور اپنے بیمثال اور اعلیٰ کردار سے اپنے مدعوئین اور مخاطبین کے لیے باعثِ کشش ہوا۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم ابتدائی مکی سورتوں کا تجزیہ و مطالعہ کرتے ہیں، تو واضح طور سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے پہل اسلام کے بنیادی عقائد توحید، رسالت ، اور آخرت پیش کیے تھے اور ان کے ماننے یا نہ ماننے سے جو اثرات اس دنیا اور دوسری دنیا میں مرتب ہوتے ہیں ان کی وضاحت کی تھی۔ تہذیب و تمدن جن ناقابلِ تردید و تبدیل حقیقتوں کو اقدارِ عالیہ مطلقہ قرار دیتا ہے اور سادہ الفاظ جن کو فطرت و قدرت کے تقاضوں سے تعبیر کرتے ہیں ان کو انسان کے رگ و پے میں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے وقت ہی ودیعت کر دیا تھا۔ یہی فطرت انسانی ہے جو خارجی اسباب و محرکات اور دواعی کی عدم موجودگی کے باوجود انسان کے اندرون کو سچائی کی طرف لے جاتی ہے اور اس کے عکس سے متنفر کرتی ہے۔ یہی نیکی اور بدی کا فرق سمجھاتی ہے، نیکی کی طرف راغب کرتی اور بدی سے دور کرتی ہے ۔ کیونکہ نیکی کی راہ فوز و فلاح کی ضمانت دیتی ہے، جبکہ بدی کی راہ خسران و نقصان سے دوچار کرتی اور جسم و روح دونوں کو الجھن ، تناؤ اور شکست و ریخت کا شکار بناتی ہے۔ اسلام کی ابتدائی دعوت اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین پیغام نے انسان کی اسی فطرتِ سادہ اور قلبِ سلیم سے خطاب کیا تھا(۱۶)۔

توحید الٰہی نہ صرف اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے بلکہ اصل الاصول اور اصل العقائد ہے۔ رسالت و آخرت اسی کے ضمنی عقائد ہیں اور اسلام کے بقیہ تمام عقائد اور تعلیمات بھی توحید کی شاخیں ہیں۔ توحید اصل حقیقت اور قدیم ترین عقیدہ ہے بالکل زمین و آسمان اور کائنات کی طرح قدیم، بلکہ اس سے بھی زیادہ قدیم۔ وہ فطرتِ انسانی سے بھی ہم آہنگ ہے اور فطرتِ کائنات سے بھی۔ دونوں کی فطرت اسی سے تسکین و اطمینان پاتی ہے اور خارجی اثرات و محرکات کے سبب توحید کے مخالف عقائد اگر کبھی انسان کے ذہن و دماغ پر قبضہ جما لیتے ہیں تو بھی روح و دل میں بے چینی رہتی ہے اور پھر ان نازک لمحات میں جب عارضی اثرات کی کارفرمائی ختم ہو جاتی ہے فطرتِ انسانی اپنی اصل یعنی توحید کی طرف پلٹتی ہے۔ ابتدائی مکی سورتوں اور آیتوں نے سادہ خوبصورت زبان دلنشین اسلوب اور پر کشش انداز میں اسی فطرتِ سادہ اور قلبِ سلیم کو مخاطب کیا تھا اور توحید کی عظمت و اہمیت اور حقیقت ، اور انسانی زندگی پر اس کے مثبت اثرات کو واضح کیا تھا اور اس کے مخالف عقائد کے منفی اثرات کو بطور پس منظر بیان کیا تھا کہ چیزیں اپنی متضادات سے بخوبی جانی جاتی ہیں(۱۷)۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور قرآن مجید کی متعدد ابتدائی سورتوں اور آیتوں سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ جاہلی عرب بالخصوص اہلِ مکہ اللہ کی ذات و صفات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس کو سب سے بڑا معبود و الٰہ سمجھتے بھی تھے۔ ان کی غالب اکثریت کفرِ صریح کی مرتکب کم تھی اور شرک کی زیادہ۔ ان کی لغت اور عقیدہ دونوں میں اللہ کا لفظ اور تصور دونوں موجود تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ شرک کے مرتکب ہو گئے تھے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ساتھ دوسرے معبودانِ باطل اور خدا بنا لیے تھے۔ اللہ کا تصور دراصل ان کے دینِ ابراہیمیؑ کا جو ان کا آبائی اور قومی دین تھا بقیہ نقیہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اسلام کی دوسری صورتوں یعنی یہودیت و نصرانیت وغیرہ اور ان کے پیروؤں کے مذاہب نے بھی ان میں اس تصورِ اللہ کو جگائے رکھا ہو۔ مگر متعدد خارجی اثرات و عوامل نے ان کے اس تصور کو دھندلا دیا تھا اور دوسرے تصورات و عقائد کو بھی گورکھ دھندا بنا دیا تھا (۱۸)۔ اولین مکی آیتوں اور سورتوں نے پہلے عقائد اصلی کو واضح کرنے کا کام انجام دیا۔

سورۂ علق (۱۹) اور سورۂ فاتحہ (۲۰) نے جس عقیدۂ توحید کو مضمر انداز میں پیش کیا تھا اسے سورۂ اخلاص (۲۱) نے بالکل واضح کر دیا۔ ”تو کہہ: وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ کسی کو جنا اور نہ کسی سے جنا گیا، اور نہیں اس کے جوڑ کا کوئی“ سورۂ علق کے مضمون کو ایک زیادہ مفصل اور واضح انداز میں سورۂ الاعلیٰ (۲۲) میں بیان کیا۔ ”پاکی بیان کر اپنے رب کے نام کی جو سب سے اوپر، جس نے بنایا پھر ٹھیک کیا اور جس نے ٹھہرا دیا پھر راہ بتلائی، اور جس نے نکالا چارا، پھر کر ڈالا اس کو کوڑا سیاہ۔ البتہ ہم پڑھائیں گے تجھ کو پھر تو نہ بھولے گا۔ مگر جو چاہے اللہ۔ وہ جانتا ہے پکارنے کو اور جو چھپا ہوا ہے۔ اور سہج سہج پہونچائیں گے ہم تجھ کو آسانی تک۔ سو تو سمجھا دے اگر فائدہ کرے سمجھانا، سمجھ جائے گا جس کو ڈر ہو گا، اور یکسو رہے گا اس سے بڑا بد قسمت، وہ جو داخل ہو گا بڑی آگ میں۔ پھر نہ مرے گا اس میں اور نہ جئے گا۔ بیشک بھلا ہوا اس کا جو سنورا، اور لیا اس نے نام اپنے رب کا پھر نماز پڑھی۔ کوئی نہیں، تم بڑھاتے ہو دنیا کے جینے کو اور پچھلا گھر بہتر ہے اور باقی رہنے والا۔ یہ لکھا ہوا ہے پہلے ورقوں میں، صحیفوں میں ابراہیمؑ کے اور موسیٰؑ کے“۔ سورۂ الاعلیٰ کے مضمون میں جن عقائد کا واضح ذکر آیا ہے۔ وہ اللہ کی توحید اور اس کی صفاتِ خالقیت، معلم و ہادی کے علاوہ رسالت، آخرت اور آخرت میں عذاب و ثواب کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نذیر بنانے کا اور اپنی تعلیم کے ذریعہ ہادی بنانے کا ذکر کرنے کے ساتھ آپ کی رسالت کو حضراتِ ابراہیمؑ و موسیٰؑ کا جانشین اور قرآن کریم کو ان کے صحیفوں کا صحیفۂ آخر قرار دیا۔ اور قبولِ حق کے انعام اور انکارِ حق پر عذاب و تکلیف کا ذکر کرکے واضح کیا کہ حیاتِ دنیا عارضی اور حیاتِ آخرت مستقل اور بہتر ہے۔ لہٰذا مومنین کو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینی چاہیے۔ سورۂ البلد (۲۳) میں اللہ کی خالقیت اور قدرت پر سارا زور ہے اور انسان کی جسمانی ساخت اور روح کی سعادت سے اس پر استشہاد کیا۔ اور دونوں راہوں کو واضح کر دینے اور نیکی بدی پر عمل کرنے والوں کے فرق و امتیاز کو واضح کرکے ایمان والوں کو اصحابِ میمنہ (نصیب والے) اور اہلِ کفر کو اصحابِ مشئمہ (کمبختی والے) بتایا

اور ان کے انعام و عذاب سے خبردار کیا۔ یہی مضمون بعنوانِ دیگر سورۂ الشمس (۲۴) میں دہرایا۔ اس میں سارا زور اچھی بُری زندگی کے فرق کو واضح کرنے پر دیا گیا ہے ۔ اور اس کے لیے دو طرح کے استشہاد کئے گئے ہیں۔ ایک آفاق و النفس کی الٰہیٰ نشانیوں سے یعنی سورج ، چاند ، دن ، رات ، آسمان زمین اور نفسِ انسانی کے تقویٰ اور فجور کے تضادات و موازنوں سے حقیقت کی تشریح کی ، دوم قومِ ثمود کی سرکشی اور اس کے رسول کی پیغامبری کے موازنے سے دونوں طرح کی زندگیوں کے فرق کو واضح کیا ۔ یہی انداز سورۂ الیل (۲۵) میں متقی اور شقی اشخاص کی زندگی کو واضح کرنے کے لیے اختیار کیا گیا۔ یہاں ان دونوں کی دو اہم خصوصیات و اوصاف یعنی فیاضی و سخاوت اور بخل و کنجوسی کا موازنہ اور ان کے فطرتِ انسانی پر اثرات کا کارگزار تجزیہ کیا گیا۔ سورۂ التین (۲۶) میں قسم کھا کر انسان کے خالق کی حیثیت سے پھُر اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو پیش کیا اور ہدایت وعدمِ ہدایت کے نتیجہ میں انسان کو احسن تقویم (بہترین ساخت) اور اسفل سافلین (فروترین درجہ بندی) کا مستحق قرار دیا اور اللہ تعالیٰ کو ایمان والوں اور نیک کام کرنے کو اجر بیکراں سے نوازنے والا اور سب حاکموں سے بڑا حاکم بتایا۔

قرآنِ مجید کا ایک بڑا بیانی اعجاز ہے کہ وہ توحید الٰہیٰ ، رسالتِ محمدیؐ اور حیاتِ آخرت کو اپنی بیشتر مکی سورتوں میں ایک ساتھ گوندھ کر پیش کرتا ہے۔ اور اس کے لیے مختلف اسالیب اختیار کرتا ہے۔ کبھی وہ توحیدِ الٰہیٰ سے رسالت کی طرف اور اس سے آخرت کی طرف التفات و انتقال کرتا ہے اور کبھی آخرت سے توحید و رسالت کی طرف ۔ اور کبھی رسالت سے توحید و آخرت کی طرف ۔ تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے نو اسالیب قرآن مجید نے اختیار کئے ہیں (۲۷) اور ان کا مقصود اسلام کے بنیادی عقائد کو انسانی ذہن میں مرتسم اور قلبِ سلیم میں کندہ کر دینا تھا، تاکہ اولین مومنین اپنے ایمان و یقین میں اتنے پختہ اور ثابت قدم ہو جائیں کہ کوئی چیز ان کو ہلا نہ سکے اور اسلامی خطوط پر وہ صالح معاشرہ تعمیر ہو سکے جس سے بعد میں اللہ تعالےٰ کو شجاعت و صداقت اور عدالت کا کام لینا تھا۔ مکی عہدِ نبویؐ کی ابتدائی آیتوں اور سورتوں میں انہیں عقائد و مسلمات کو مختلف و متنوع اسالیب میں نہایت دلکش ، دلفریب اور پر شکوہ زبان میں بیان کیا گیا ہے۔

مکی دور کی ابتدائی سورتوں سورۂ زلزال (۲۸) ، سورۂ عادیات (۲۹) اور سورۂ قارعہ (۳۰) شامل ہیں اور ان تینوں میں قیامت کی ہولناکی اور آخرت کی عمل کے مطابق زندگی کا بہت خوبصورت بیان ہے "جس دن زمین بھونچال سے دوچار ہوگی اور زمین اپنے تمام بوجھ نکال ڈالے گی اور انسان اس دن کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے تو وہ اپنی تمام باتیں کہہ ڈالے گی کہ بحکمِ پروردگار اس دن تمام انسان گروہوں میں نکالے جائیں گے کہ وہ اپنے اعمال دیکھیں تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھے گا۔" سورۂ عادیات میں عرب کی معاصر زندگی کے بعض اہم ترین واقعات کے حوالے اور قسم کھا کر انسان کے قبر سے برآمد ہونے اور اس کے سینہ میں چُھپے ہوئے رازوں کے ظاہر ہونے اور ان سب سے ان کے پروردگار کے باخبر ہونے کا ذکر ہے۔ سورۂ قارعہ قیامت کی

ہولناکی کا ذکر کرتی ہے جب انسان بکھرے ہوئے پتنگے کے مانند اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کی طرح ہوں گے پھر روزِ آخرت بھاری ترازو والے من بھاتی زندگی کے اور ہلکے وزن والے دہکتی آگ کے مستحق ہوں گے ۔

سورۂ مرسلات ، سورۂ نبا، سورۂ نازعات ، سورۂ تکویر ، سورۂ انفطار اور سورۂ انشقاق وغیرہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی ابتدا اور اہلِ مکہ اور جملہ عالمیانِ کائنات کو قیامت و آخرت کے حوالہ سے مخاطب کیا ہے۔ پھر اس کے بعد درجہ بدرجہ توحید اور رسالت کی طرف ان کی توجہ مبذول کر کے ان کو صحیح زندگی اختیار کرنے اور بُری زندگی سے احتراز کرنے کی نصیحت کی ہے ۔ سورۂ مرسلات میں قیامت کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کا ذکر کیا ۔ پہلی قوموں اور مجرموں کو ہلاک کرنے ، ان کی جگہ ان کا جانشینوں کو برپا کرنے کے بعد انسان کی تخلیق کے مختلف مدارج ، کائنات کی متعدد چیزوں جیسے زمین اور پہاڑ اور پانی کی تخلیق کا ذکر کر کے پھر قیامت کی طرف گریز کیا اور متقیوں کی نعمتوں سے پُر زندگی اور مجرموں کی عذاب بھری حیات کا ذکر کیا ہے۔ سورۂ نبا میں قیامت کا ذکر کر کے بلکہ مختصر سا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ مطلقہ سارے جہان کی اور اس کی اہم ترین چیزوں کی تخلیق کا بیان کیا اور پھر قیامت کے آنے اور اس کے ہولناک واقعات بیان کرنے کے بعد شریروں کے لیے عذاب اور متقیوں کے لئے ثواب کی وضاحت کی ہے ۔ (۳۱) سورۂ نازعات میں قیامت و آخرت کے بیان سے آغاز کیا اور منکروں کے اس تعجب نما انکار کا ذکر کیا کہ کیا ہم کھوکھری ہڈیاں بننے کے بعد بھی زندہ ہوں گے اور قبروں سے نکلیں گے ! اللہ تعالیٰ نے قیامت کی حقیقت بیان کی اور پھر فرعون اور حضرت موسیٰ کے واقعہ سے نیکی بدی کی زندگی کا موازنہ پیش کیا۔ پھر کائنات کی تخلیق کو انسان کی تخلیق سے زیادہ اہم اور مشکل بتا کر قیامت کے قائم ہونے کا ذکر کیا اور نیکو کاروں کی کامیاب اخروی زندگی اور بد کاروں کی ناکام حیات بعد الممات کا بیان پیش کیا اور آخر میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور فریضۂ انذار پر استشہاد کیا بلکہ آپؐ کو آخرت و قیامت کا ذکریٰ (تذکرہ یاددہانی) (۳۲) قرار دیا ۔ قیامت کے ہولناک بیان سے سورۂ تکویر کا آغاز ہوتا ہے اور پھر حضرت جبریلؑ کے ذریعہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی وضاحت کی اور اہلِ مکہ کو آپ کا پیغام سننے اور رب العالمین کی اطاعت کرنے کا حکم دیا (۳۳) ۔ مذکورہ بالا بقیہ سورتوں میں بھی یہی اسلوبِ بیان اور پیرایۂ اظہار اختیار کیا گیا ہے اور توحید ، رسالت ، آخرت اور ان عقائد کے ماننے یا نہ ماننے کے انجام کا ذکر کیا ہے اور اہلِ مکہ کو نیکو کاری کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی ہے جو آپؐ کے پیغام میں مضمر تھی اور بُری زندگی سے اجتناب کا مشورہ دیا ہے جو پیغام رسولؐ کو ٹھکرانے کے نتیجہ میں لازمی ہو جاتی ہے (۳۴)۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر جن سورتوں میں زیادہ زور دیا ہے وہ ہیں: سورۂ مزمل ، سورۂ مدثر ، سورۂ جن ، سورۂ ضحیٰ ، سورۂ انشراح ، سورۂ کوثر اور متعدد دوسری سورتیں اور آیات ۔ ان آیاتِ کریمہ میں جو پیغام مجموعی طور سے دیا گیا اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنا رسولؐ و نبیؐ مقرر کیا ہے اور اس لیے آپؐ کو مبعوث کیا ہے کہ آپ انسانوں کے خالق و مالک کا پیغام ان تک بالعموم اور اہلِ مکہ سے بالخصوص کہہ

دیں کہ وہ آپؐ کے اولین مخاطب تھے۔ اور وہ پیغام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ایک معبود حقیقی مانیں اور اسی کی عبادت و اطاعت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، قیامت و آخرت پر یقین رکھیں اور مرنے کے بعد دوبارہ اپنے زندہ ہونے کو یقینی و حتمی جانیں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات و مرضی کے مطابق زندگی بسر کریں تاکہ ان کی دنیا و آخرت کی زندگی ان کے لیے بہتر ہو جائے اور پوری انسانیت کو دنیا میں بھی فلاح ملے اور آخرت میں بھی کامرانی نصیب ہو۔ اس پیغام کو مختلف اسالیب و انداز میں بیان کیا ہے ۔ سورۂ جن کا آغاز بڑا دلچسپ ہے۔ جنّوں کے ایک گروہ (نفر) نے قرآن کریم کی تلاوتِ نبویؐ سن کر ایمان قبول کیا اور اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے سے اجتناب کیا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حاکمیت ، قدرت اور مکمل اطاعت تسلیم کی اور خوب سمجھ لیا کہ اچھی بری زندگی کا انجام کیا ہوتا ہے ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے براہِ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے حکم دیا کہ آپؐ صاف اعلان کر دیں کہ آپؐ اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ آپؐ ضرر و نفع کے مالک بھی نہیں اور نہ ہی کسی کو اللہ تعالیٰ سے بچا کر پناہ دے سکتے ہیں ۔ بلکہ آپؐ کا کام اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے پیغامات (رسالات) کو پہونچانا ہے اور لوگوں کو اچھی بری زندگی کے انجام سے باخبر کرنا ہے۔ اصل قوت و قدرت اور شوکت و حشمت کا وہی اللہ مالک ہے حتیٰ کہ آپؐ کو رسولؐ ہونے کے باوجود قیامت کے دن کے آنے کا بھی پتہ نہیں کیونکہ اصولِ الٰہیٰ یہ ہے کہ وہ اپنے رسولؐ کو غیب کی بس اتنی ہی خبر دیتا ہے جتنی وہ چاہتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنے رسولؐ کے آگے پیچھے نگراں بھی مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ یہ واضح کر دے کہ اس کے رسولؐ نے اپنا فریضۂ تبلیغ کا حق پورا کر دیا ہے (۳۵) ۔ سورۂ مزمل میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی راتوں میں نماز پڑھنے اور تلاوتِ قرآن کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ وہ دن میں اپنے فریضۂ رسالت کی صحیح انجام دہی کے لیے ضروری قوت حاصل کر لیں۔ اُس پروردگار کی جو مشرق و مغرب کا رب ہے اور جس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں کی عبادت کریں اور مخالفوں کی باتوں پر صبر کریں کہ وہی ان کو ان کے کیفر کردار تک پہونچانے والا ہے۔ پھر قیامت کے ذکر کے بعد کہ جس دن ان کو اپنا انجام نظر آئے گا واضح طور پر فرمایا کہ ہم نے تمہاری طرف ایک رسولؐ جو شہادتِ حق دینے والا بھیجا بالکل اسی طرح جس طرح فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا ۔ فرعون نے رسولؑ کی نافرمانی کی تو اس کو سخت عذاب نے آپکڑا ۔ اگر تم نے اپنے رسول کی بات پر کان نہ دھرے تو تمہارا وہی انجام ہونے والا ہے (۳۶) ۔ اسی طرح سورۂ مدثر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انذار و تبلیغ کرنے ، اپنے رب کی بڑائی بیان کرنے اپنے ظاہر و باطن کو پاک و صاف کرنے اور اپنے پروردگار کے لیے صبر کرنے کا حکم دیا اور پھر قیامت کا ذکر کرکے اچھی بری زندگی کا موازنہ پیش کیا اور آخرت کا بیان پیش کیا ہے (۳۷)۔ مذکورہ بالا دوسری سورتوں اور بقیہ مکی سورتوں میں بھی آپؐ کی رسالت کو آخرت و توحید کے ساتھ جوڑ کر یا خالص آپ کی نبوت کا ذکر کرکے لوگوں کو قبولِ حق کی دعوت دی ہے (۳۸)۔

اسلام کے بنیادی عقائدِ سہ گانہ کے علاوہ ابتدائی دور کی مکی سورتوں میں بعض اخلاقی تعلیمات بھی بیان کی گئی ہیں

تاکہ اسلام نے فکر و عقیدہ کے ساتھ ساتھ جو عملی زندگی کا نمونہ پیش کیا ہے اس میں عمل صالح کا مقام و اہمیت کو سمجھا جا سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ محض ایمان کو کافی نہیں سمجھتا اس کے ساتھ ساتھ عمل صالح کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ ایمان روح و ذہن کی تطہیر کے لیے ہے اور عمل صالح جسم و مادہ کی صفائی اور پاکیزگی کے لیے سورۂ مدثر میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کپڑے اور جسم پاک رکھنے اور دل کی پاکیزگی قائم رکھنے کا حکم دیا ہے اور سورۂ مزمل میں نماز پڑھنے، پروردگار کی بڑائی بیان کرنے اور قرآن کریم کی تلاوت کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ اس سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں جو آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملا تھا، مدد ملے گی(۳۹) ۔ سورۂ ضحیٰ میں آپؐ کو تسلی تشفی دی گئی اور یقین دلایا گیا کہ آپؐ کے رب نے آپؐ کو نہ چھوڑا ہے اور نہ بھلایا ہے۔ پھر آپؐ پر اپنے کئی انعامات الٰہی گنائے گئے اور اس کے بعد آپؐ کو ہدایت کی گئی کہ آپؐ سائل کو نہ جھڑکیں اور نہ یتیم پر زیادتی کریں اور نعمت الٰہیٰ کو بیان کرتے رہیں۔ (۴۰) دراصل آپؐ کو مخاطب کرکے جن مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی جارہی تھی اس کا اصل روئے سخن تو اہلِ مکہ کی طرف تھا اس لیے کہ بالکل ہی ابتدائی مکی آیت میں یہ اعلان واشگاف انداز میں کر دیا گیا تھا کہ آپؐ تو بڑے اخلاق پر پیدا کئے گئے ہیں اور اس پر قائم و دائم بھی ہیں(۴۱)۔

قریش مکہ اصلاً تاجر تھے اور سردی گرمی میں شمال و جنوب کے سفر کرکے شام و یمن سے تجارت کیا کرتے تھے(۴۲) اور اس بین الاقوامی تجارت میں شرکت کے سبب ان میں کافی دولتمندی آگئی تھی اور اس کے ساتھ بہت سی اخلاقی برائیاں بھی در آئی تھیں۔ کچھ خرابیاں ان کے قدیم سماج میں پہلے سے موجود تھیں اور کچھ انہوں نے دوسروں سے سیکھ لی تھیں (۴۳)۔ قرآن مجید نے اپنی ابتدائی تنزیلات میں بھی ان برائیوں کی برائی واضح کرکے مخاطبین کو ان سے احتراز و اجتناب کرنے کی وصیت کی چنانچہ سورۂ التکاثر میں کلام کا آغاز ہی اس سے کیا کہ تم کو بہتات اور کثیر مال جمع کرنے کی حرص نے غفلت میں ڈال دیا ہے اور یہ حرص موت تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتی حالانکہ یہ بعد میں ذرا بھی کام آنے والی نہیں اور قیامت میں اس نعمتِ الٰہیٰ کے بارے میں بھی سوال ہوگا ۔ (۴۴) دولت کی بیجا حرص اور اس سے پیدا شدہ خرابیوں پر سورۂ ہمزہ میں یہ تنقید کی "خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے عیب چننے والے کی جس نے سمیٹا مال اور گن گن کر رکھا، خیال رکھتا ہے کہ اس کا مال سدا کو رہے گا اس کے ساتھ، کوئی نہیں، وہ پھینکا جائے گا اس روندنے والی میں۔۔۔" (۴۵) دولت کی بیجا حرص اور غلط استعمال انسان میں غرور و تکبر پیدا کرتا ہے اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس مال و دولت کی بنا پر وہ ہمیشہ کے لیے امر ہوگیا اور وہ مال اس سے کبھی جدا نہ ہوگا۔ گھمنڈ دوسرے انسانوں کے لیے اس میں تحقیر و تذلیل کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور اس کا عموماً آغاز دوسروں کی نکتہ چینی اور لعن طعن سے شروع ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی ان آیات میں ان اخلاقی برائیوں سے بچنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اسی طرح سورۂ عادیات میں انسان کی اس فطرت کا تذکرہ کیا کہ وہ مال کی محبت میں بہت پکا ہے اور اس کے معاً بعد اس کو موت و قیامت یاد دلائی گئی کہ وہ اپنا انجام خوب سمجھ لے (۴۶) ۔ سورۂ الیل میں مال کا صدقہ و عطیہ اور اس کے جذبۂ سخاوت کی تعریف کرکے اس کو جزو ایمان

اور باعثِ نجات بتایا گیا اور مال کی بیجا حرص میں مبتلا ہو کر بخل و کنجوسی کرنے اور گھمنڈ و غرور میں مبتلا ہو کر حق کو مسترد کرنے کو ایمان و اخلاق کے خلاف اور وجۂ عذاب بتایا گیا اور بالکل واضح کر دیا گیا کہ قیامت میں اس کا مال کچھ کام نہ آئے گا (۴۷) ۔ اس موضوع پر بہت وضاحت کے ساتھ سورۂ الفجر میں کلام کیا گیا ہے اور فطرت انسانی کی ایک اور گرہ کھولی گئی کہ اس کو اگر مال و دولت سے حصہ وافر ملتا ہے تو وہ اس کو اکرام و انعام سمجھتا ہے اور اگر اسے آزمانے کے لیے اس پر اللہ تعالیٰ روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ چیخ اٹھتا ہے کہ میرے رب نے میری توہین کی پھر بہت واضح انداز میں قرآن مجید نے ان کی مال کی شدید محبت پر اور اس سے پیدا شدہ کئی خرابیوں پر تنقید کی : "کوئی نہیں، پر تم عزت سے نہیں رکھتے یتیم کو، اور تاکید نہیں کرتے آپس میں محتاج کو کھلانے کی، اور کھا جاتے ہو مُردے کا مال سمیٹ کر سارا، اور پیار کرتے ہو مال کو جی بھر کر۔ " اس کے بعد آیاتِ کریمہ میں قیامت کا بیان اور آخرت کی وضاحت کی گئی تاکہ معلوم ہو جائے کہ قیامت و آخرت میں یہ مال کچھ مدد نہ کرے گا اور اگر کچھ کام آئے گا تو عملِ صالح (۴۸) ۔ اس موضوع پر مختلف انداز میں متعدد مکی آیات میں کلام کر کے ان کو صحیح اسلامی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے (۴۹) ۔

سورۂ قلم بہت ابتدائی مکی سورت ہے اور اس میں کئی اخلاقی برائیوں پر جن میں اہلِ مکہ بالعموم اور اہلِ ثروت بالخصوص ملوث تھے سخت تنقید کی گئی اور آپ کو ہدایت کی گئی کہ ایسے لوگوں کا کوئی دباؤ خواہ اخلاقی ہو یا مادی قبول نہ کریں۔ فرمایا : "سو تو کہنا مت مان ان جھٹلانے والوں کا، وہ چاہتے ہیں کسی طرح تو ڈھیلا ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں۔ اور تو کہا مت مان کسی قسمیں کھانے والے بے قدر کا (جو) طعنہ دے اور چغلی کھاتا پھرے ۔ بھلے کام سے روکے، حد سے بڑھے ، بڑا گنہگار، اجڈ ، ان سب کے پیچھے بدنام، اس واسطے کہ رکھتا ہے مال اور بیٹے۔ " (۵۰) اہلِ مکہ کا ایک حد سے تجاوز یہ بھی تھا کہ وہ عام تاجروں کی مانند ناپ تول میں کمی بیشی کرنے لگے تھے۔ سورۂ مطفّفین میں ان کے اس اخلاقی عیب پر گرفت کی گئی :۔۔۔ "خرابی ہے گھٹانے والوں کی ، وہ لوگ کہ جب ماپ کر لیں لوگوں سے تو پورا بھر لیں، اور جب ماپ کر دیں ان کو یا تول کر تو گھٹا کر دیں۔ کیا خیال نہیں رکھتے وہ لوگ کہ ان کو اٹھنا ہے اس بڑے دن کے واسطے جس دن کھڑے رہیں لوگ راہ دیکھتے جہان کے مالک کی"۔ قرآن مجید نے ایسے ہی لوگوں کو فاجر (فُجّار = گنہگار) کہا ہے۔ اور ان کو سخت عذاب کی وعید کی ہے (۵۱) ۔ یتیم پر زیادتی کرنے کا ذکر اوپر کئی آیات کے حوالہ سے آچکا ہے۔ عربوں بالخصوص متمول مکیوں اور تاجرانِ قریش میں کمزور طبقات کے لیے تحقیر و تذلیل کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا اور وہ یتیموں اور مسکینوں پر ظلم و ستم روا رکھتے تھے۔ ابتدائی مکی آیات میں سے کئی ایک میں اس پر سخت تنقید کی گئی ۔ سورۂ مدثر ہی میں فرمایا گیا "مجرموں سے (قیامت کے دن) پوچھیں گے کہ تمہیں دوزخ میں کیا چیز لے گئی؟ وہ کہیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے ، اور باتیں بنانے والوں میں شامل تھے اور روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے۔" (۵۲) سورہ الماعون میں فرمایا : "تو نے دیکھا اس کو جو جھٹلاتا ہے انصاف ہونے کو، سو یہ وہی ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو ، اور نہیں تاکید کرتا محتاج (مسکین) کے کھانے پر ۔۔۔" ظاہر ہے ایسے آدمی

کے لیے خرابی کے سوا اور کیا ہے؟ (۵۳) یہی مضمون بعنوانِ دیگر سورۃ الحاقہ میں قیامت کے عذاب کے حوالے سے یوں دہرایا گیا: "یہ نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا تھا۔ اور نہ تاکید کرتا تھا فقیر کے کھانے پر، سو کوئی نہیں آج اس کا یہاں دوستدار، اور نہ کچھ ملے کھانا مگر زخموں کا دھوون، کوئی نہ کھائے اس کو مگر وہی گنہگار۔" (۵۴)

عربوں کے بعض قبیلوں اور خاندانوں میں نومولود لڑکی کو ننگ و عار سمجھ کر زندہ دفن کر دیتے تھے۔ مکہ کے بعض بر خود غلط افراد بھی اس قبیح رسم کے شکار تھے۔ چنانچہ قرآن مجید کی ابتدائی آیات میں اس پر سخت تنقید کی گئی اور اس کو جرم عظیم قرار دیا گیا۔ سورۂ تکویر میں تو اس کو قیامت کے دن مجرموں سے پوچھے جانے والے اہم ترین سوالات اور واقعات میں سے قرار دیا گیا۔ اس جرم کو سورج، ستاروں، پہاڑوں، اونٹنیوں، جنگلی جانوروں، دریاؤں وغیرہ کے فشار و خلفشار کے ساتھ جوڑا گیا کہ "جب بیٹی جیتی گاڑ دی گئی کو پوچھیں کہ کس گناہ پر وہ ماری گئی۔" (۵۵) سورۂ النحل میں عربوں کی اس جہالت کا ذکر زیادہ واضح انداز میں کیا گیا ہے: "جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر سیاہی چھا جاتی ہے اور غصہ میں خون کے گھونٹ پینے لگتا ہے۔ اس بری خبر کے بعد اس خوف سے کہ وہ لوگوں کا سامنا کیسے کرے وہ چُھپتا پھرتا ہے۔ سوچتا رہتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو گھر میں پالے یا اسے مٹی کے ڈھیر میں دفن کر دے۔" (۵۶) یہی مضمون ایک اور سورہ میں دہرایا گیا ہے اور عربوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ وہ بیٹی کی پیدائش کو ننگ و عار نہ سمجھیں اور نہ ان کے قتل کے جرم سے اپنے ہاتھوں کو رنگیں۔ (۵۷) بعض دوسری آیات میں فقر کا سبب یا فقر و بھوک کے خوف کی بنا پر انسانی جان اور اولاد کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے کہ عربوں میں قتلِ اولاد اس بنا پر بھی ہوتا تھا (۵۸)۔ متعدد سورتوں اور آیتوں میں قتل، چوری، زنا، جھوٹ، بہتان تراشی، غیبت اور دوسری بہت سی سماجی برائیوں میں ملوث ہونے سے روکا گیا ہے (۵۹)۔ ان کے علاوہ عام الفاظ میں فواحش و کبائر اور جرائم کے ارتکاب سے بچنے کی تاکید اور صاف ستھری زندگی گزارنے کی نصیحت کی گئی ہے (۶۰)۔ منفی ہدایات یا نواہی کے ساتھ ساتھ ابتدائی مکی آیتوں اور سورتوں نے معروف باتوں اور عام اخلاقی مثبت تعلیمات کی بھی تاکید کی۔ ان میں عدل و انصاف، رشتہ داروں کے ساتھ بالخصوص اور تمام انسانوں کے ساتھ بالعموم احسان و حسنِ سلوک، والدین کے ساتھ نیکِ سلوک و خدمت، ناپ و تول میں ایمانداری، امانت کی پاسداری، وعدہ و معاہدہ پر عمل آوری، عام زندگی میں نرم خوئی اور نرم روی، عاجزی اور انکساری، پڑوسیوں اور اہلِ محلہ و ملک کے حقوق کی رعایت، عورتوں و غلاموں سے حسنِ سلوک وغیرہ غرضکہ تمام مکارمِ اخلاق کا درس دیا گیا ہے (۶۱)۔

قرآن مجید کی مکی عہد کی ابتدائی سورتوں اور آیتوں کی تعلیمات و عقائد کا مکمل تجزیہ کئی دفتروں میں سمائے گا اور اس کی یہاں اس مختصر بحث میں گنجائش نہیں۔ قرآنی تعلیمات کا اوپر ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا گیا جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اولین مخاطبین کے سامنے کیا پیغام رکھا تھا اور ان کو کن چیزوں کی طرف دعوت دی تھی۔ سیرتِ نبویؐ اور تاریخِ اسلام کی عام کتابوں میں عموماً اس اہم ترین اور عہد ساز و انقلاب آفریں

پیغام کی تشریح و تفصیل نہیں پیش کی جاتی جس نے ایک سرکش و ظالم اور اجڈ و جاہل قوم کو یکسر بدل ڈالا تھا۔ اگرچہ ہمارے مصادرِ سیرت و تاریخ میں اس کے بعض واقعات اور بیانات ملتے ہیں جو تعلیمِ نبویؐ کا مختصر سہی مگر حوالہ دیتے ہیں۔ اب چند مثالیں مکی عہدِ نبویؐ کے ابتدائی دور کی سیرت و پیغامِ نبویؐ سے پیش کی جارہی ہیں تاکہ تاریخی اور واقعاتی طور پر یہ بحث مکمل ہو سکے۔

روایات سیرت میں دو طرح کی دعوتِ نبویؐ اور تبلیغِ اسلام کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک اہم ترین طریقہ تھا آپؐ کا دعوائے رسالت اور آپؐ کا بیداغ و بیمثال کردار جو ثبوتِ حق کے لیے کافی تھا۔ مگر آپؐ نے جب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اپنے دوستوں قریب ترین عزیزوں اور پھر عام قریش مکہ کو اللہ کی طرف بلایا تو ان مختلف مواقع پر آپؐ نے مختصر خطبے بھی دیے جن میں آپ کی دعوت اور پیغام پوشیدہ تھا۔ اور کچھ اعمالِ صالحہ بھی کئے جو اس پیغام و دعوت کی عملی تشریح و تعبیر تھی۔

روایاتِ سیرت و حدیث میں کئی ذرائع سے یہ ذکر آتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اولین تنزیل وحی کے کچھ مدت بعد جو بہت مختصر تھی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو وضو کرنے اور نماز پڑھنے کی تعلیم دی اور آپؐ نے وہی طریقے حضرت خدیجہؓ کو ان کے قبولِ اسلام کے بعد سکھا دیے (٦٢) ۔ بعد میں تمام ابتدائی مسلمانوں نے وضو اور نماز کی عملی تعلیم حاصل کی اور اس پر انفرادی اور اجتماعی طور سے عمل پیرا ہوئے (٦٣)۔ بعض علماءِ اسلام اور مورخین کا خیال ہے کہ اسلام میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جب نماز واجب نہ رہی ہو اور نہ پڑھی گئی ہو (٦٤)۔ کیونکہ نماز اسلام کا اہم ترین ستون بلکہ اس کی علامت اور کفر و شرک سے ممتاز کرنے والی نشانی ہے۔ انفرادی طور سے اور باجماعت نماز ادا کرنے کے کئی واقعات تاریخِ اسلام کے ابتدائی دور سے متعلق نقل ہوئے ہیں۔ حضرت عفیف کندی کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک بار حج کے زمانے میں منیٰ کے مقام پر آپ کو حضرت خدیجہؓ اور حضرت علیؓ کے ساتھ باجماعت نماز پڑھتے دیکھا تھا (٦٥) ۔ ابن اسحاق کے مطابق آپؐ کے چچا ابو طالب نے آپؐ کے ساتھ حضرت علیؓ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو استفسار کیا اور حضرت علیؓ کو آپؐ کا دین اختیار کرنے کی اجازت دے دی لیکن خود قبول نہ کیا (٦٦)۔ ایک اور روایت ہے کہ جب مسلمانوں کی معتدبہ تعداد ہو گئی تو آپؐ ان کو لے کر مکہ مکرمہ کی کسی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں جماعت کے ساتھ نماز پڑھاتے تھے اور غالباً اسلامی تعلیمات اور نئی نازل شدہ قرآنی آیات کی تعلیم بھی کرتے تھے۔ ایسے کسی ایک موقعہ پر کافروں کے ایک گروہ نے دیکھ لیا تھا تو انہوں نے جھگڑا کھڑا کر دیا اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے تصادم کی نوبت آگئی اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایک کافر کو ہڈی کھینچ ماری تھی مگر پھر بیچ بچاؤ ہو گیا تھا (٦٧) ۔ سورۂ علق کی بعد کی آیات کی تفسیر کے ضمن میں جو احادیث و روایات وارد ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے پہلی بار جب حرمِ مکہ میں نماز ادا کی تو ابو جہل مخزومی نے اعتراض کر کے آپ کو روکنا چاہا تھا (٦٨) ۔ علانیہ نماز پڑھنے کا عمل تبلیغ و دعوتِ نبویؐ کا دوسرا مرحلہ تھا اور اس سے قبل خفیہ دعوت کے مرحلے میں آپؐ اور ابتدائی مسلمان کسی سنسان جگہ پر

انفرادی طور سے یا باجماعت نماز ادا کیا کرتے تھے۔ حرمِ کعبہ میں آپؐ کے نماز پڑھنے کا محض ایک واقعہ نہیں تھا بلکہ روایات سے واضح ہوتا ہے کہ آپؐ برابر وہاں نماز ادا کیا کرتے تھے اور ہر بار قریش اور بالخصوص ابو جہل آپؐ پر نکتہ چینی کرتے اور آپ کو روکنے کی کوشش کیا کرتے تھے (۶۹)۔ دعوت و تبلیغ کے تیسرے مرحلے میں جب قریش زبانی طنز و تعریض سے تجاوز کر کے جسمانی ایذا دہی کا ارتکاب کرنے لگے تھے یہ واقعہ کافی مشہور ہے کہ آپؐ صحنِ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ قریشی زعماء کے مشورہ پر عقبہ بن ابی مُعیط نے آپ کی گردن پر اس وقت اوجھڑی لا کر رکھ دی تھی جب آپؐ سجدہ میں تھے اور بعد میں وہ گندگی کی پوٹ حضرت فاطمہؓ نے آکر اتاری تھی ۔ ایسے متعدد واقعات تلاش کر کے نقل کیے جا سکتے ہیں (۷۰)۔

اولین مسلمانوں کو آپؐ نے جو دعوت دی تھی اور جن الفاظ میں دی تھی ان کا ایک نمونہ بعض روایاتِ سیرت میں ملتا ہے۔ یہ ان آیاتِ قرآنی کے علاوہ تھی جو آپؐ پر اب تک نازل ہو چکی تھیں۔ ابن اسحاق نے حضرت علیؓ کے قبولِ اسلام کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب علیؓ بن ابو طالب نے آپؐ کو اور حضرت خدیجہؓ کو نماز پڑھتے ہوئے پہلی بار دیکھا تو پوچھا کہ وہ کون سا دین ہے ؟ آپؐ نے فرمایا : یہ اللہ کا دین ہے جسے اس نے اپنے لیے پسند کیا ہے اور جس کے ساتھ اس نے اپنے رسول مبعوث فرمائے ہیں ، پس میں تمہیں بھی ایک خدا پر ایمان لانے اور اس کی عبادت کرنے اور لات و عزیٰ کا انکار کرنے کی دعوت دیتا ہوں حضرت علیؓ نے اپنے والد سے مشورہ کرنے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے ان سے مخفی رکھنے کی نصیحت کی اور انہوں نے مان لی ۔ دوسرے دن ان کو شرح صدر ہوا تو پھر آپؐ سے دین کے بارے میں سوال کیا اور آپؐ نے ان کو توحید کی تعلیم دی اور شرک سے اجتناب کا حکم دیا۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ (۷۱) پھر حضرت زیدؓ بن حارثہ نے بھی اسلام قبول کر لیا لیکن ان سے آپؐ کو گفتگو کا کوئی حوالہ نہیں مل سکا (۷۲) ۔ البتہ عفیف کندی کا جن کا اوپر آپؐ کے نماز پڑھنے کے سلسلے میں ذکر آچکا ہے ایک بڑا دلچسپ بیان ملتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب میں نے آپؐ کو حضرت خدیجہؓ اور حضرت علیؓ کے ساتھ منیٰ میں نماز پڑھتے دیکھا تو حضرت عباس بن عبد المطلب سے جو میرے تاجر دوست تھے اس نئے دین کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا : "یہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا رسولؐ بنا کر بھیجا ہے اور یہ کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے عنقریب ان کے لیے فتح ہو جائیں گے۔" (۷۳) حضرت علیؓ نے اپنے والد سے اپنے ایمان لانے کے بارے میں یہ بیان دیا تھا "میں اللہ اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لایا ہوں اور ان کی تصدیق کی ہے اور ان کے ساتھ نماز پڑھی ہے"، اس پر ابو طالب کا تبصرہ تھا: "وہ تمہیں بھلائی کے سوا کبھی کسی چیز کی طرف دعوت نہ دیں گے، تم ان کا ساتھ دو اور ان کی مدد کرو۔" (۷۴)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بارے میں کچھ زیادہ تفصیل ملتی ہے۔ زرقانی نے شرح مواہب لدنیہ میں ایک روایت درج کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت خدیجہؓ کے تاجر بھتیجے حکیم بن حزام کے پاس بیٹھے تھے

کہ حضرت حکیم کی ایک باندی نے ان سے آکر کہا کہ "آپ کی پھوپھی حضرت خدیجہؓ آج بتا رہی تھیں کہ ان کے شوہر حضرت موسیٰ کی طرح اللہ کے نبی ہیں جنہیں اللہ نے مبعوث کیا ہے۔" یہ سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور یہ دیکھ کر کہ باندی کا بیان صحیح تھا بلا تامل ایمان لے آئے (۷۵) ۔ ابنِ اسحاق نے ایک اور روایت بیان کی ہے جو اس دعوت پر روشنی ڈالتی ہے جو آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو قبولِ اسلام کے وقت دی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ سے پوچھا : "کیا قریش کی یہ بات سچی ہے کہ آپؐ نے ہمارے معبودوں کو چھوڑ دیا ہے اور یہ کہ آپؐ ہمیں بے وقوف اور ہمارے آباء واجداد کو کافر قرار دیتے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے ابوبکرؓ! بیشک میں اللہ کا رسولؐ اور اس کا نبیؐ ہوں تاکہ اس کا پیغام پہنچاؤں ۔ میں تمہیں بھی اللہ کی طرف سچائی کے ساتھ دعوت دیتا ہوں۔ بخدا! یہ دعوت برحق ہے۔ اے ابوبکرؓ! میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم ایک خدا کو مانو جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے سلسلے میں اہلِ اطاعت کی امداد کرو۔" آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو قرآن بھی پڑھ کر سنایا ۔ حضرت ابوبکرؓ نے تردد کیا نہ انکار بلکہ فوراً اسلام قبول کر لیا ۔۔۔" (۷۶) افسوس کہ ابن اسحاق نے قرآنِ مجید کی ان آیاتِ کریمہ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے جو آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پڑھ کر سنائی تھیں ۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر مزید پانچ حضرات مسلمان ہوئے۔ ان کے بارے میں زیادہ تفصیل تو نہیں ملتی مگر ابنِ اِسحاق کی ایک اور روایت سے ، دعوتِ نبویؐ پر ہلکی سی روشنی ضرور پڑتی ہے۔ حضراتِ زبیر بن عوام ، عثمان بن عفان ، طلحہ بن عبید اللہ، سعد بن ابی وقاص اور عبد الرحمٰن بن عوف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم کی معیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے انہیں قرآن سنایا اور اسلام کی حقیقت سے روشناس کیا نیز اللہ کی طرف سے نوازشات کے وعدوں کی بشارت دی چنانچہ وہ ایمان لے آئے (۷۷)۔ حضرت ابوذر غفاری اور ان کے دو ساتھیوں بُریدہ اور ایک ابن عم کے قبولِ اسلام کے بارے میں جو روایت ابن اسحاق کے ہاں مذکور ہے اس میں آپؐ کی تلقین صرف کلمۂ طیبہ کے الفاظ پر مشتمل تھی (۷۸) ۔ بہرحال ان اولین مسلمانوں کو آپؐ نے جو دعوت دی تھی وہ کلمۂ شہادت اور قرآنِ مجید کی تلاوت پر مبنی ہوتی تھی ۔ کبھی کبھی آپؐ نے بعض افراد سے کچھ تفصیل بھی بیان کی تھی۔ بد قسمتی سے ہمارے مآخذ میں اولین دعوتِ نبویؐ کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں ورنہ ان کلماتِ عالیہ کی تاثیر کا اور اندازہ ہوتا جنہوں نے اولین مخاطبین کے دلوں میں گھر کر کے ان کو اسلام کا والہ و شیدا بنایا تھا ۔

معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم جب نازل ہوا کہ اپنے قریب ترین عزیزوں کو باخبر کرو ﴿وأنذر عشیر تک الاقربین﴾ تو آپؐ نے اپنے گھر میں دعوت کا سامان کیا اور اپنے خاندان بنو عبد مناف کو جمع کر کے ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ ابنِ اسحاق کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے دو بار بنو عبد مناف کو اپنے گھر کھانے پر بلایا اور دونوں بار ابولہب نے مجلس درہم برہم کر دی۔ البتہ دوسری بار آپؐ کو اتنا کہنے کا موقعہ مل گیا کہ

مجھے کسی ایسے عرب جوان کے بارے میں معلوم نہیں جو اپنی قوم کے پاس میری لائی ہوئی دعوت سے بہتر لائحۂ عمل لایا ہو۔ میں تمہارے لیے دنیا و آخرت میں کامیابی کے حصول کا پروگرام لایا ہوں (۷۹)"۔ ابن اسحاق نے حضرت ابوہریرہؓ کی سند سے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ آپؐ نے بالترتیب اولادِ عبد مناف، اولادِ عبدالمطلب اپنی دختر حضرت فاطمہؓ اور اپنی پھوپھی حضرت صفیہ کو مخاطب کرکے ایک بار فرمایا تھا: "تم لوگ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچاؤ کیونکہ میں اللہ کی گرفت سے تم کو بچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ البتہ میرے مال میں سے تم جو چاہو مجھ سے مانگ سکتے ہو۔ جان لو کہ قیامت کے روز سب سے پہلے متقی لوگ آئیں گے۔ اگر تم میری قرابت کے ساتھ تقویٰ اختیار کرو گے تو یہ تمہارے اور میرے لیے کامیابی ہوگی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ اعمال لے کر آئیں اور تم دنیا کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے آؤ۔ ایسی صورت میں تم سے کنارہ کشی اختیار کروں گا ـــــ" (۸۰) احادیث و روایاتِ سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا وہ مشہور خطبۂ نبویؐ ہے جو آپؐ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر قریش کے تمام قبیلوں اور بطون کے سامنے دیا تھا۔ بعض روایات میں آپؐ کے مخاطبین کے مزید نام ملتے ہیں اور وہ بنو کعب بن لوی، بنو مُرۃ بن کعب، بنو عبد شمس، بنو ہاشم، عباس بن عبدالمطلب اور عام قریش ہیں۔ کچھ مزید فقرے بھی مذکور ہوئے ہیں جیسے "اے گروہ قریش! اپنی جانیں اللہ سے خرید لو، میں اللہ سے تمہیں مستغنی نہیں کر سکتا میں تو ایک سخت عذاب سے پہلے تمہیں باخبر کرنے والا (نذیر) ہوں۔ میری اور تمہاری مثال اس شخص کی سی ہے جو دشمن دیکھ کر اپنے گھر والوں کو اس سے خبردار کرتا ہے اور ان کے سبقت کرکے پڑھنے کے خوف سے پہلے ان کو ہوشیار کرنے لگتا ہے۔" (۸۱)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی مکی دعوت و ارشاد کا ایک جامع نمونہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اس تقریر میں ملتا ہے جو انہوں نے ہجرت حبشہ کے بعد شاہ نجاشی کے دربار میں کی تھی۔ قریش مکہ کی تحریص و تحریک پر ان کا ایک وفد مہاجرینِ حبشہ کو مکہ واپس لانے کے لیے گیا تھا تاکہ پھر ان کو رنج و محن کی چکی میں پیسا جائے اور وہ امن و امان کے ساتھ اپنے دین کے مطابق زندگی نہ بسر کر سکیں۔ نجاشی نے مسلمانوں سے ان کے نئے دین کے بارے میں جب پوچھا تو حضرت جعفر نے اٹھ کر فرمایا: "اے بادشاہ! ہم ایک مشرک قوم تھے، بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، ہمیں ہمسائیگی کا پاس نہ تھا۔ ہم میں سے بعض بعض کی خون ریزی کرتے تھے اور ہم نے حرمتوں کو حلال کر رکھا تھا اور ہمیں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف خود ہم ہی میں سے ایک نبیؐ برپا کیا جس کی وفاداری، صداقت اور امانت کو ہم جانتے ہیں۔ اس نے ہمیں دعوت دی کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں جس کا کوئی شریک نہیں، اس نے ہمیں صلۂ رحمی ہمسائیگی کی پاسداری، نماز اور روزہ کی تعلیم دی اور حکم دیا کہ ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں" (۸۲) یہ ابن اسحاق کی ایک روایت ہے اور دوسری زیادہ ثقہ اور معتبر روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نجاشی سے اسلام کے بارے میں ساری گفتگو حضرت عثمانؓ بن عفان نے کی تھی (۸۳)۔ حضرت جعفر کی مذکورہ بالا

تقریر جو حضرت ام سلمہ کی سند پر بیان ہوئی ہے اس میں خاصا فرق ہے۔ ان کی پوری تقریر یوں مذکور ہوئی ہے ۔
''اے بادشاہ! ہم ایک جاہلیت میں پڑی ہوئی قوم تھے۔ بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، فحش کام کرتے تھے، قطع رحمی کرتے تھے، ہمسائیگی اور عہد و امان کا پاس کرنے میں بُرا رویہ رکھتے تھے، اور ہم میں سے طاقتور کمزور کو کھائے جاتا تھا۔ ہم اسی حال پر تھے کہ اللہ نے ہماری طرف خود ہم ہی میں سے ایک رسولؐ بھیجا ۔ جس کے نسب ، جس کی صداقت ، جس کی امانت اور جس کی پاکدامنی کو ہم جانتے ہیں۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا کہ ہم اس کی توحید کے قائل ہوں، اور اسی کی عبادت کریں اور ان پتھروں اور بتوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہم اور ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ اس نے ہمیں راست گوئی ، امانت داری، صلۂ رحمی ، ہمسائیگی اور عہد و امان کی پاسداری کا اور حرام افعال اور خونریزی سے باز رہنے کا حکم دیا۔ ہم کو فواحش سے، جھوٹ سے، مالِ یتیم کھانے سے، پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے سے روکا۔ ہمیں صرف اللہ واحد کی عبادت کرنے اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ کرنے کی تلقین کی۔ اور ہمیں نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور روزہ رکھنے کی ہدایت کی (حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ اسی طرح جعفر نے اسلام کے دوسرے احکام اُس کو بتائے) پس ہم نے اس کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لائے، اور جو کچھ وہ اللہ کی طرف سے لایا تھا اس میں اس کی پیروی کی ۔ ہم نے صرف اللہ کی عبادت کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا۔ جس چیز کو اس نے ہم پر حرام کر دیا اسے ہم نے حرام کیا اور جس کو اس نے ہمارے لیے حلال کر دیا اسے ہم نے حلال کیا اس پر ہماری قوم ہم پر ٹوٹ پڑی ۔ اس نے ہم کو عذاب دیے ۔۔۔!! تقریرِ جعفری کا بقیہ حصہ ہجرتِ حبشہ کے اسباب سے متعلق ہے۔ دونوں روایات کے بعد نجاشی نے اس تقریر دلپذیر کے بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے کلام کا کچھ حصہ سننا چاہا تو حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کا وہ ابتدائی حصہ سنایا جو حضرات یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق ہے۔ نجاشی اس کو سن کر نہ صرف رویا بلکہ اس نے آپؐ کی رسالت اور قرآن و انجیل کے ایک ہی سرچشمہ سے نکلنے کی تصدیق کی (۸۴)۔ حضرت جعفرؓ کی اس تقریر اور شاہِ نجاشی کے دربار میں ان کے کلام کی تائید حضرات عبداللہ بن مسعود ، ابو موسیٰ اشعری اور خود جعفر بن ابی طالب کی روایات سے ہوتی ہے۔ اگرچہ ان میں بعض جزوی اختلافات و اضافات اور ترمیمات بھی ہیں (۸۵) ۔ بعض محققین کو حضرت جعفرؓ کی تقریر میں روزہ و زکوٰۃ جیسے احکامِ اسلامی کے حوالہ سے جو بعد میں فرض ہوئے تھے کھٹک بھی پیدا ہوئی ہے اور انہوں نے ان کو الحاقی سمجھا ہے یا پوری تقریر کی صحت پر شبہ کا اظہار کیا ہے لیکن دوسرے علماء نے اس کا جواب بھی دیا ہے (۸۶) ۔ اس سب کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی مکی دور میں جو دعوت و تبلیغ کی تھی اس میں اسلام کے بنیادی عقائد اور اخلاق کے مکارم شامل تھے ۔ اور اس کی تصدیق و تائید قرآنِ مجید کی مذکورہ بالا آیتوں اور سورتوں اور سیرت و تاریخ کی دوسری روایتوں سے ہوتی ہے ۔

ان میں سے ایک اہم روایت اس وقت تک کے اسلام دشمن ابوسفیان بن حرب اموی کی ہے جو اس وقت تک

اسلام نہیں لائے تھے اگرچہ یہ روایت بعد کے مدنی زمانے سے تعلق رکھتی ہے تاہم وہ اسلام کی ابتدائی تعلیم اور تبلیغ کی عکاسی کرتی ہے کہ پیغامِ الہیٰ اور دعوتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وقت و زمانے کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر تو ہوئے ہیں انحطاط پذیر نہیں ہوئے اور نہ ہی اپنی ازلی و ابدی صداقت تبدیل کرتے ہیں۔ اتفاق سے یہ روایت بھی حضرت ابو سفیان کی اس تقریر سے متعلق ہے جو انہوں نے ایک دوسرے بادشاہ وقت شہنشاہ روم ہرقل کے دربار میں ایلیاء کے مقام پر کی تھی ۔ دراصل یہ حضرت ابوسفیان اور ہرقل کے درمیان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک مکالمہ تھا اور ہرقل کے اس سوال کے جواب میں کہ آپؐ کا پیغام کیا ہے حضرت ابو سفیان نے کہا تھا ۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو ، تمہارے آباؤاجداد جو کچھ کہتے ہیں اسے ترک کردو، اور وہ ہمیں نماز ، سچائی اور پاکدامنی اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں" ۔ امام بخاری نے اس کے بعد ہرقل کی پوری تقریر نقل کی ہے جو اسلام و رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق و تائید میں کی تھی ۔ (۸۷)۔

قرآنِ مجید کی ابتدائی مکی سورتوں اور آیتوں کے مضامین ، احادیثِ نبویؐ کی تفصیلات اور سیرت و تاریخ کی روایات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی دعوت میں اسلام کے بنیادی عقائد ، توحید ، رسالت و آخرت کے ساتھ ساتھ بنیادی ارکان جو اس وقت تک فرض ہوئے تھے جیسے نماز وغیرہ شامل تھے ۔ ان کے علاوہ اس میں ایک قابلِ ذکر اور اہم حصہ ان اخلاقی تعلیمات کا بھی تھا جو قرآنِ مجید کی متعدد سورتوں میں اوپر مذکور ہوئے ہیں ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی بعثت مکارمِ اخلاق کی تکمیل و ترویج کے لیے ہوئی تھی ۔ یہی وہ مکارمِ اخلاق ہیں جن کو قرآن مجید نے اعمالِ صالحہ (صالحات) قرار دیا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ عقائد و ارکان اور اعمال و اخلاق کے بغیر نہ کسی معاشرہ میں اصلاح کی جا سکتی ہے اور نہ کوئی فکری اور عملی انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے ۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اولین مخاطبین ـــــــ اہلِ مکہ ـــــــ کو جو دعوت دی تھی اس کی اساس ان ہی تین بنیادی ارکان پر قائم تھی۔ اور ان تینوں تعلیمات کی حقانیت اور ان کی فطرتِ انسانی سے ہم آہنگی کا اقرار دل و دماغ از خود کرتے تھے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے فطرت سادہ و راست اور قلب سلیم و متوازن سے نوازا تھا انہوں نے جلد یا بدیر اس کو قبول کر لیا مگر اس سے اہم یہ حقیقت ہے کہ جنہوں نے اپنی فطرت کی کجی اور دل کی سیاہی کے سبب ان کا انکار کر دیا تھا وہ بھی ان کی صداقت اور افادیت کے انکار کی جرأت نہ کر سکے تھے۔ توحید الہیٰ ، رسالتِ محمدیؐ اور حیاتِ اُخروی ایسی بدیہی حقیقتیں تھیں کہ منکرین کی روح میں پیوست الہامِ و ہدایت ربانی تسلیم کرنے کے لیے مجبور کرتی تھی۔ حضرت ابوسفیان کی شاہ ہرقل سے گفتگو اسی حقیقت کو غیر شعوری طور پر قبول کرنے کی گواہی دیتی ہے۔ ان کی طرح دوسرے منکرین حق اور مشرکین مکہ بھی آپؐ کی دعوت کے بنیادی عقائد کی صداقت کے قائل تھے اور اپنی نجی مجلسوں میں ان کا اعتراف بھی کرتے تھے مگر برملا اعتراف کرنے اور رسالتِ محمدیؐ پر علانیہ ایمان لانے میں

ان کی آبائی تقلید ، قدیم رسوم و رواج سے وابستگی ، حد سے بڑھی ہوئی انانیت ، دنیاوی جاہ و منزلت اور دولت پر بیجا غرور ، قبائلی اور علاقائی عصبیت اور بعض دوسرے خود ساختہ علل و اسباب مانع بن گئے تھے ۔ ورنہ وہ بھی جانتے تھے کہ آپؐ جن اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ محمودہ اور ارکانِ ستودہ کی تعلیم دیتے تھے وہ اپنی اندرونی پاکیزگی ، انقلاب آفرین افادیت اور حیات ساز ماہیت کے سبب زندگی کا مطمحِ نظر اور نصب العین ہیں اور ان کے بغیر زندگی زندگی نہیں رہتی ۔ اس کے علاوہ آپؐ کی دعوت کی تاثیر اور جذبِ قلوب کے دو اور ناقابلِ انکار عامل تھے اول قرآن مجید کا بیانی اور اسلوبی اعجاز جو اپنے الفاظ و تراکیب ، آہنگ و رنگ اور جہانِ لفظ و صوت سے ان کے دلوں کو مسحور اور حیرت سے ان کے دماغوں اور زبانوں کو گنگ کر دیتا تھا ۔ اور وہ اسکو کلامِ الہٰی ماننے پر مجبور ہو جاتے تھے خواہ اس کا زبان سے اعتراف نہ کریں دوم آپؐ کا بیمثال و بیداغ کردار تھا جو ان کے سامنے رہا تھا اور جس سے وہ کبھی بھی انکار نہیں کر سکتے تھے ۔ یہی وہ اسباب و عوامل اور تعلیمات تھیں جنہوں نے اسلامی دعوت کی قبولیت ، اشاعت اور توسیع کی راہ ہموار کی تھی اور امیوں کو مسلمان بنایا تھا ۔

تعلیقات و حواشی

(۱) قدیم سیرت نگاروں میں ابن اسحاق و ابن ہشام وغیرہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور اللہ تعالیٰ کے پیغام کے بارے میں چند اشارے اور حوالے تو دیے ہیں جن سے قاری اس پیغام و دعوت کا اندازہ تو کر سکتا ہے مگر اس کی قوت و تاثیر اور انقلاب انگیز ماہیت کی تفہیم سے قاصر رہتا ہے ۔ اوپر متن میں ایسے کئی حوالے اور اشارے بیان ہوں گے ۔ بعد کے مختصر نویس سیرت نگاروں نے تو یہ حوالے اور اشارے بھی نہیں دیے ہیں اور صرف قرآنی آیات کے بعض نمونوں وغیرہ پر اکتفا کرنے کو غنیمت سمجھا ہے ۔ جدید سیرت نگاروں میں سے بیشتر نے ابن اسحاق و ابن ہشام کی تقلید کی ہے اور چند سطروں میں پورے پیغامِ الہٰی کو بیان کر دیا ہے اور بعض نے یہ بھی نہیں کیا ہے ۔ مولانا مودودی جیسے سیرت نگاروں کی تحریروں میں پیغامِ الہٰی اور دعوت نبویؐ کا مفصل ذکر موجود ہے مگر وہ اس بنا پر نہیں ہے کہ انہوں نے اصلاً کوئی کتاب سیرت لکھی تھی بلکہ ان کی تفسیر و مقالات سے ایسی تمام متعلقہ تحریریں جمع کر دی گئیں ۔ امکان قوی یہی ہے کہ اگر وہ مستقل کتاب سیرت لکھتے تو یہ تحریریں اتنی مفصل نہ ہوتیں ۔

جدید سیرت نگاروں میں حسب ذیل نمائندہ حضرات کی تحریریں ملاحظہ ہوں:

قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین، شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجران کتب لاہور ۱۹۵۴ء ، اول ۴۔ ۵۳ سورہ اقراء کی ابتدائی آیات کے نزول اور روح الامین کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم وضوو نماز کے معاً بعد لکھتے ہیں : "نبی صلعم نے گھر پہونچ کر تبلیغ شروع کر دی ـــ" اور اس کے بعد پہلے چار مسلمانوں کے قبول اسلام کا ذکر کیا ہے ۔ بعد میں ۷ ـــ ۵۶ پر انہوں نے نبوت کے مقصد کے تحت بنیادی تعلیمات کا سرسری طور پر ذکر کیا؟

علامہ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء ، اول ص ۵ ـ ۳۰۰ نے بعثت و نبوت محمدیؐ پر تو کافی بحث کی ہے مگر پیغام الہٰی کے موضوع پر کچھ نہیں کہا ، کہا تو عام الفاظ میں بس اتنا کہ ـــ عرب بلکہ تمام عالم کو فروغ اسلام سے منور کر دینا تھا اس لیے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا ـــ" اور اس کے بعد انہوں نے بھی اولین چار مسلمانوں کے سامنے دعوتِ نبویؐ کے پیش کیے جانے اور ان کے قبول کرنے کا ذکر کیا ہے ۔

مولانا عبد الرؤف داناپوری، اصح السیر، نور محمد کارخانۂ تجارت کراچی ۱۹۳۲ء ، ص ۵۹ فرماتے ہیں کہ "تبلیغ شروع کر دینے کا حکم ہوا، چنانچہ آپؐ نے لوگوں کو توحید و رسالت کی طرف دعوت دی" سارا پیغام الہٰی اور پوری دعوتِ نبویؐ بس یہی مذکور ہوئی ہے ۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی ، سیرۃ المصطفیٰ ، الشا پریس لاہور ۱۳۷۵ھ ، اول ص ۹ ـ ۱۲۸ اور اس کے ماقبل کے صفحات میں بعثت و نبوت پر تو بہت مفصل بحث کی ہے مگر پیغامِ الہٰی اور دعوتِ نبویؐ کے ضمن میں صرف توحید و رسالت اور وضو و نماز کے حوالے دے کر تبلیغِ اسلام کا ذکر شروع کر دیا ہے جس سے اس پیغام و دعوت کی حقیقت نہیں کھلتی ۔

ان کے علاوہ دوسرے اردو عربی اور انگریزی میں لکھنے والے سیرت نگاروں نے یہ بحث کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے ۔

اس ضمن میں مزید ملاحظہ ہو مولانا ابوالکلام آزاد۔ رسول رحمت ۔ اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء ، ص ۳۰۔۱۰۸ ، مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی ، نبیؐ رحمت، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ ، ۱۹۷۹ء ، اول ص ۳۰۔۱۱۹ ، نعیم صدیقی ، محسن انسانیت ، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹ ، ص ۵ ۔ ۱۴۳ ۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے سیرت پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ مولانا غلام رسول مہر نے ان کے مقالات کو مختلف جگہ سے جمع کر دیا ہے ان میں اسلام کا پیغام موجود ہے۔ (۱)

عرب مؤلفین سیرت میں بطور نمونہ ملاحظہ ہو محمد حسین ہیکل ، حیات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ، مکتبہ النہضۃ المصریہ قاہرہ ۱۹۵۲ء ص ۹۔۱۳۷ جنہوں نے مختصراً اپنی زبان میں عقائد اور بعض اخلاقی تعلیمات کا ذکر کیا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو محمد ابوزہرہ ، خاتم النبیینؐ ، قاہرہ ۱۹۷۲ء اور محمد خضری بک ، نور الیقین ، وغیرہ۔

(۱) جن موضوعات پر مولانا آزاد کے مقالات دستیاب نہ ہوں وہ کمی مہر صاحب اپنے تحریر کردہ مقالات شامل کر کے پوری کر دیں۔ (ادارہ)

مستشرقین میں ولیم میور، مارگولیتھ، اور مونٹگمری واٹ کی سیرت پر کتابیں ملاحظہ ہوں۔ موخرالذکر نے ایک علیحدہ بحث میں مکی دور کے کام کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر پیغام الٰہی اور دعوت نبویؐ کا اس کے تاریخی تناظر میں مطالعہ و تحلیل نہیں کی ہے ۔

(۲) مثلاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے، سیرت سرورِ عالم ، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۰ء ، دوم ص ۔ ۴۹۲۔۱۶۵ میں مختلف ابواب و فصول میں اس موضوع پر کافی بحث کی ہے اور دعوتِ حق کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو الٰہی ہدایات دعوت اسلامی کی حقیقی نوعیت ، بنیادی عقائد توحید ، رسالتِ محمدی ، قرآن بطورِ کلام الٰہی ، آخرت اور اخلاقی تعلیمات کے علاوہ بعض اور متعلقہ موضوعات پر مفصل کلام کیا ہے۔

یہاں یہ نکتہ واضح کرنا ضروری ہے کہ مولانا موصوف کی مذکورہ بالا کتاب سیرت نبویؐ پر کوئی مستقل اور آزاد کتاب نہیں ہے بلکہ وہ ان کی مشہور و عظیم تفسیر ، تفہیم القرآن اور بعض دوسری تحریروں سے ماخوذ و مستفاد مطالب سیرت کا مرقع ہے جو ان کے بعض اہلِ علم ارکان جماعت نے مرتب و جمع کر دیا ہے۔ لہٰذا اسے سیرت نبویؐ کی مستقل کتاب کہنا مشکل ہے ۔ پھر وہ پوری حیات طیبہ کا احاطہ بھی نہیں کرتی ۔ اب تک شائع شدہ دونوں جلدیں اسلام کے عقائد و تعلیمات، مکی عہد نبویؐ اور اسکے پس منظر سے بحث کرتی ہیں اور مدنی حیات مبارکہ کا کوئی مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔

(۳) تاریخِ نزولِ آیات و سور قرآنی پر بحث اور اس سے متعلق کتابوں اور نظریات کا تجزیہ آگے آرہا ہے۔ یہاں اتنا کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ وار ترتیب کا معاملہ تو خاصا مشکل ہے مگر ادوار کے مطابق اسے کسی حد تک کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا مقصد مکی عہد کے آغاز میں اس پیغام الٰہی کو سمجھنا اور اس کی تاثیر کا جائزہ لینا ہے جس نے اپنے اولین مخاطبوں کو متاثر کیا تھا ۔

(۴) ابھی تک اس اہم موضوع پر کافی بحث نہیں کی گئی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدۂ بعثت سے سرفراز اور آیاتِ قرآنی کی سعادت سے مشرف ہوتے ہی تبلیغ و دعوتِ اسلامی کا کام شروع ہو گیا تھا ۔ قرآنِ کریم کی ابتدائی آیات و سورتوں اور تاریخی اور سیرتی مواد کے تجزیہ سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ فوراً ہی یہ سلسلہ نہیں شروع ہوا تھا بلکہ جس طرح آپؐ کی بعثت اور قرآنی آیات کے نزول کے درمیان چھ ماہ کی مدت تدریجی اصولی ارتقا ، کے ماتحت آپؐ کی ذہنی اور فکری تیاری کے لیے رکھی گئی تھی اسی طرح بعثت و نبوت کے آخری مرحلہ یعنی تنزیل کلام الٰہی کے بعد بھی تھوڑی سی مدت ضرور رکھی گئی تھی اور دعوت و تبلیغ کا کام فوراً شروع کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ یہ مدت کتنی تھی یہ کہنا مشکل ہے مگر اس نظریہ کی تائید آیاتِ قرآنی ، فترۂ وحی اور خفیہ اور علانیہ تبلیغ کے ادوار سے متعلق روایاتِ سیرت سے ضرور ہوتی ہے ۔ اس پر مزید بحث آگے آتی ہے۔

(۵) فترہ وحی پر بحث و حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو: ابن اسحاق ص ۸۔۱۳۶ ، ابن ہشام ، اول ص ۲۴۱ ، سلیمان منصور پوری ، اول ص ۶۔۵۲ شبلی نعمانی، اول ص ۵۔۲۰۳ ، ادریس کاندھلوی ، اول ص ۱۱۸ ، عبدالرؤف دانا پوری، ص ۹۔۵۸ ، سید مودودی ، دوم ص ۷۔۱۳۶ ۔

فترہ وحی کے بارے میں عام طور سے کوئی مدت نہیں بتائی جاتی۔ بعض سیرت نگاروں نے کچھ مدت کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور بعض دوسروں نے اس کو چند روزہ بتایا ۔ مواہب لدنیہ میں ایک روایت ہے کہ فترہ کی مدت تین سال تھی، جبکہ سہیلی کے مطابق ڈھائی سال اور بعض دوسرے اہلِ علم کے نزدیک

دو سال۔ مختلف روایات ہیں جن میں سب سے کم تین دن اور بقیہ میں چالیس دن ہے۔ ابن اسحاق نے دو تین سال کی مدت کو وہم قرار دیا ہے۔ ابو زہرہ نے (سیرت خاتم النبیین ، دار الفکر ۱۹۷۲ء اول ص ۸۔۲۹۷ پر یہ روایات بیان کر کے پانچ ماہ کی مدت اغلب قرار دی ہے ۔ محمد خضری بک (نور الیقین کی سیرۃ سید المرسلینؐ قاہرہ ۱۹۶۰ء ص ۸۔۲۷ اور محمود المنوفی، سیرت سید المرسلینؐ قاہرہ ۱۹۶۴ء ، اول ص ۱۸۰ نے چالیس دن کی روایت کو ترجیح دی ہے ۔ یہ حوالے ہماری شاگرد آنسہ طیبہ نسرین پی ایچ ڈی اسکالر نے فراہم کیے ہیں۔

(۶) مذکورہ بالا سیرت نگاروں کا بیان فترہ وحی کے ذیل میں ملاحظہ ہو۔ ابن اسحاق نے سورۂ والضحیٰ کو فترہ کے بعد پہلی وحی بتایا ہے جبکہ سید مودودی کا کہنا ہے "اس طرح فترۃ الوحی کا زمانہ ختم ہوا اور سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات نازل ہوئیں جن میں حضورؐ کو منصب رسالت پر مامور کر کے وہ ضروری ہدایات دی گئیں جو اس منصب کے فرائض ادا کرنے کے لیے درکار تھیں۔" سید مودودی کا خیال ہے کہ سورۂ علق کی آیات کے نزول کے بعد آپ نبیؐ بنے تھے اور سورۂ مدثر کی آیاتِ مذکورہ میں آپؐ کو "فریضہ رسالت بھی سونپ دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ آپؐ اٹھ کر اس فرض کو ادا کرنا شروع کر دیں ۔۔۔ "گویا نبوت آپؐ کا ذاتی منصب تھا اور رسالت ذاتی کے علاوہ اجتماعی بھی۔

(۷) اوپر کی بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن اسحاق کے نزدیک فترہ وحی کے بعد پہلی نازل ہونے والی سورت سورۂ والضحیٰ تھی جبکہ سید مودودی کے نزدیک سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات تھیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن اسحاق کی روایت زیادہ صحیح ہے کہ سورہ کا مضمون داخلی لحاظ سے اس کی تائید کرتا ہے لیکن امام بخاری وغیرہ کی روایات کی بنا پر یہ تاثر ملتا ہے کہ فترہ وحی کے بعد پہلی آیات سورہ مدثر کی تھیں ۔ امام بخاری کی روایت کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے مروی ہے اور وحی کی ابتدائی روایت حضرت عروہ بن زبیر بواسطہ حضرت عائشہؓ کی متابعت میں آئی ہے اور ان دونوں کے ملا کر پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد فترہ کا زمانہ شروع ہو گیا اور سورۂ مدثر کی آیاتِ اولین کی تنزیل پر ختم ہوا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ امام بخاری کی روایت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی میں زمانی توقیت و ترتیب نہیں پائی جاتی لہٰذا روایت ام المومنینؓ اور روایتِ حضرت جابر میں زمانی ترتیب و توقیت قائم کرنا خارج از بحث ہے۔ حضرت جابر کی روایت کا آغاز اس جملہ سے ہوتا ہے کہ وہ فترہ وحی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ آپؐ نے فرمایا اپنی حدیث میں کہ ۔۔۔ "اس کے بعد سورۂ مدثر کی آیات کے نزول کی بحث اور پس منظر ہے ۔ اس سے پہلے حضرت ورقہ بن نوفل کی وفات اور فترہ وحی کے اسی ترتیب سے ذکر پر حدیث عائشہؓ ختم ہوتی ہے۔ اگر اس کا یہی مطلب ہے کہ حضرت ورقہ کی وفات کے بعد فترہ وحی شروع ہوا تھا تو وہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات کی تنزیل کے کافی مدت بعد کا واقعہ ہے کیونکہ حضرت ورقہ کی وفات بعض روایات کے مطابق کمزور مسلمانوں پر تعذیب کے زمانے میں کسی وقت واقع ہوئی تھی۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ورقہ نے حضرت بلالؓ کو ان کی تعذیب پر تسلی تشفی دی تھی اور ان کی ڈھارس بندھائی تھی۔

سیوطی نے الاتقان ، جلد اول ص ۶۱۔۵۶ (اردو ترجمہ از محمد حلیم انصاری، ادارہ اسلامیات لاہور ۱۹۸۲ء) میں قرآن مجید کی ابتدائی تنزیلات ، فترہ اور بعد فترہ اولین سورہ کے نزول پر جو فصل باندھی ہے اس میں بھی سورہ اقراء کی ابتدائی آیات کے بعد کم از کم سورۂ نون والقلم ، سورۂ مزمل اور بعض روایات کے مطابق سورۂ مدثر کی آخری آیات جن میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے کہ سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات کے نزول سے قبل نازل ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فترہ کا زمانہ کچھ سورتوں اور آیتوں کے نزول کے بعد شروع ہوا تھا سورۂ اقراء کی پہلی تنزیل کے معاً بعد نہیں شروع ہوا تھا۔ جیسا کہ مولانا مودودی اور ان کے ہمنوا مفسرین و علماء کا خیال ہے۔ روایات کے علاوہ عقلی روایت و تدبر کا بھی یہ تقاضا ہے کہ تبلیغ و انذار کے حکم سے قبل ضروری ہدایت و تعلیمات پر مشتمل آیات اور سورتیں نازل ہو چکی ہوتیں ۔

حضرت عائشہؓ کی حدیث جس کے مطابق پہلے مفصل کی وہ سورہ نازل ہوئی جس کی آیات میں جنت و دوزخ کا ذکر کیا گیا ہے اور خود مولانا مودودی کے مطابق کہ شروع میں وہ سورتیں اور آیات نازل ہوئیں جن میں اسلام کی بنیادی تعلیمات و عقائد مذکور تھے یہ منطقی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے فریضۂ رسالت ادا کرنے کے آغاز سے قبل اتنی سورتیں اور آیات تو نازل ہو چکی تھیں کہ آپؐ ان کی بنیاد پر لوگوں کو تعلیم دیتے اور اسلام کی طرف بلاتے ۔ سورۂ اقرا کی ابتدائی آیات اور سورۂ مدثر کی اولین تنزیل سے تو وہ ضرورت پوری ہوتی نہیں معلوم ہوتی۔

(۸) ہم نے اس مقالہ میں ان سورتوں اور آیتوں کو اولین تنزیل قرآنی سمجھا ہے جن میں ایک طرف تو انذار و تبلیغ کا کوئی حوالہ اور قرینہ نہیں پایا جاتا اور

دوسری طرف مشرکین مکہ پر تنقید یا ان کے عقائد پر ضرب کا بھی حوالہ نہیں ملتا ۔ صرف اسلامی عقائد توحید ، رسالت ، آخرت اور اس سے متعلق بعض ضمنی عقائد جیسے دوزخ جنت، حیات بعد الممات وغیرہ اور بعض اخلاقی تعلیمات کا ذکر ہے۔ اوپر کی بحث سے یہ نقطۂ نظر زیادہ واضح ہو گا ۔

(۹) سیوطی ، اتقان ، اول ص ۶۲۔ ۵۶ نے اس موضوع پر جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

اول : اکثریت کا اتفاق ہے کہ پہلی قرآنی سورۃ جو نازل ہوئی وہ سورۂ اقرا/علق کی ابتدائی پانچ آیات تھیں ۔ یہ مسلک امام بخاری و مسلم حاکم (مستدرک) ، بیہقی (الدلائل) ، طبرانی (کتاب الکبیر) ، سعید بن منصور (سنن) ، ابوعبید (فضائل القرآن) ابن اشتہ (کتاب المصاحف) وغیرہ کا ہے ۔

دوم : بہت سے علماء کا خیال ہے کہ اولین سورۃ جو نازل ہوئی وہ سورۂ مدثر تھی ۔ یہ بھی ایک روایت شیخین ۔ امام بخاری و امام مسلم کی ہے، بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری ۔ سیوطی نے اس کے کئی جواب اور توجیہات پیش کی ہیں ۔

سوم : اولین سورۃ سورت الفاتحہ تھی۔ اس مسلک کو ماننے والوں میں زمخشری (کشاف) اور بعض تابعین ہیں۔

چہارم : اولین تنزیل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تھی۔ یہ قول ابن النقیب (تفسیر) ، واحدی، ابن جریر وغیرہ نے بعض علماء و مفسرین کی طرف منسوب کیا ہے ۔

سیوطی نے اس کے ساتھ ہی مکی سورتوں کی ترتیب نزولی و توقیتی بیان کی ہے جسے وہیں ملاحظہ کرنا چاہیے یہاں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابتدائی اولین سورہ اقراء پھر سورۂ قلم ، پھر سورۂ مزمل پھر سورۂ مدثر پھر سورۂ فاتحہ وغیرہ اسی ترتیب سے بیان کی ہیں ۔ زرکشی، البرہان فی علوم القرآن ، قاہرہ ۱۹۵۷ء اول ص ۱۹۳ نے بھی یہی ترتیب بیان کی ہے ۔ بعض اور علماء و مورخین نے بھی توقیت کی ہے مثلاً مورخ یعقوبی ، تاریخ ، بیروت ۱۹۶۰ء دوم ص ۵ ۔ ۳۳

(۱۰) سید مودودی تفہیم القرآن ، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۴ء ، سورہ انعام پر تعارفی نوٹ اول ص ۲ ۔ ۵۲۱ : قرآنی سورتوں کا پس منظر اور تعارف ، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۸۲ء ص ۵۰ کے مطابق یہ تقسیم حسب ذیل ہے:

"پہلا دور : آغاز بعثت سے لے کر اعلان نبوت تک ، تقریباً تین سال ، جس میں دعوت خفیہ طریقہ سے خاص خاص آدمیوں کو دی جارہی تھی اور عام اہل مکہ کو اس کا علم نہ تھا ۔

دوسرا دور : اعلان نبوت سے لیکر ظلم و ستم اور فتنہ (Persecution) کے آغاز تک ۔ تقریباً دو سال ۔ جس میں پہلے مخالفت شروع ہوئی ۔ پھر اس نے مزاحمت کی شکل اختیار کی ، پھر تضحیک ، استہزا الزامات ، سب و شتم ، جھوٹے پروپیگنڈے اور مخالفانہ جتھہ بندی تک نوبت پہونچی اور بالآخر ان مسلمانوں پر زیادتیاں شروع ہوگئیں جو نسبتاً زیادہ غریب ، کمزور اور بے بس تھے ۔

تیسرا دور : آغاز فتنہ (۵ نبوی) سے لے کر ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات (۱۰ نبوی) تک تقریباً پانچ چھ سال اس میں مخالفت انتہائی شدت اختیار کرتی چلی گئی ۔

چوتھا دور : ۱۰ نبوی سے لے کر ۱۳ نبوی تک تقریباً تین سال ۔ یہ نبیؐ اور آپ کے ساتھیوں کے لیے انتہائی سختی و مصیبت کا زمانہ تھا ۔

ان میں سے ہر دور میں قرآن مجید کی جو سورتیں نازل ہوئی ہیں وہ اپنے مضامین اور انداز بیان میں دوسرے دور کی سورتوں سے مختلف ہیں ۔ ان میں بکثرت مقامات پر ایسے اشارات بھی پائے جاتے ہیں جن سے پس منظر کے حالات اور واقعات پر صاف روشنی پڑتی ہے ۔۔۔"

(۱۱) قرآنی سورتوں کا پس منظر اور تعارف اور تفہیم القرآن سے ہم نے ان کو ان کے مختلف ادوار کے مطابق جمع کیا ہے اور ان کی ذیلی درجہ بندی کرکے ماثور روایات کے تناظر میں ان پر بحث کی ہے۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو ہمارا مضمون آئندہ "قرآنی آیات و سور کی تنزیلی ترتیب ۔ روایات و مضامین کے تناظر میں" مجلہ علوم القرآن علی گڑھ ۔

(۱۲) ملاحظہ ہو اس سے پہلے کا مضمون بعثت نبویؐ تاریخ اسلام کی اساس پر ۔

(۱۳) ان آیات کی تفسیری تشریح کے لیے ملاحظہ ہوں مختلف تفاسیر و تراجم نیز سید مودودی ، سیرت سرور عالمؐ ، دوم ص ۲۰ ۔ ۱۴۸ پر بحث "پہلی وحی کا مضمون و تشریح"۔

(۱۴) سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر میرا مضمون ملاحظہ ہو "سید احمد شہید کی تفسیر سورۂ فاتحہ کا اسلوب" تعمیر حیات ، لکھنؤ جلد ، شمارہ

(۱۵) اگر اسلام کے تینوں بنیادی عقائد کا تصور واضح ہو تو رسالت کی ہر جگہ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجسم ادارۂ

رسالت کی صورت میں ان کے سامنے موجود اور ان کے درمیان کارگزار تھے۔ آپ اپنے قول و فعل اور قرآنی آیات کی روشنی میں یہ ثابت کر چکے تھے کہ آپؐ اللہ واحد و لاشریک کے رسولؐ آخر ہیں اور پھر اس کی جانب سے اس کا کلام و احکام ان تک پہونچا رہے ہیں۔ توحید کا عقیدہ تسلیم کرتے ہی یہ لازمی اور منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ واحد کی طرف بلانے کے لیے ایک پیامبر ضرور ہونا چاہیے اور پھر وہ جس پیام کی دعوت دیتا ہے اس سے آخرت کا تصور واضح ہوتا ہے کہ ایک دن اس دارِ فانی کو چھوڑ کر دارِ آخرت میں جمع ہو کر اپنے اعمال کا حساب پیش کرنا ہے۔ آخرت نہ ہو تو یہ دنیا اور اس میں انسان کی زندگی ہی بے کار و بے مقصد ہو جاتی ہے۔ اور اعمال کے حساب کتاب کے ساتھ ہی قیامت، صور، جنت و دوزخ وغیرہ تمام تصورات و عقائد واضح ہو جاتے ہیں۔

(۱۶) ہم نے مولانا مودودی کے بیان کردہ قرآنی مکی سورتوں کے پہلے دور کی چونتیس سورتوں کی ذیلی درجہ بندی اس طرح کی ہے۔

مجموعۂ اول: میں سورۂ علق کی ابتدائی آیات، سورۂ قدر، سورۂ مزمل، سورۂ ضحیٰ، سورۂ انشراح شامل ہیں اور یہی ابتدائی تنزیلات تھیں۔

مجموعۂ دوم: سورۂ فاتحہ، سورۂ فیل، سورۂ قریش پر مشتمل ہے اور غالباً دوسرے دور کی تنزیلات ہیں ان میں اللہ کی صفات اور بنیادی عقائد کا ذکر ہے۔

مجموعۂ سوم: میں سورۂ زلزال، سورۂ عادیات، سورۂ قارعہ، سورۂ تکاثر، سورۂ ہمزہ شامل ہیں جن میں بنیادی طور پر آخرت پر زور ہے یا پاکیزہ زندگی پر۔

مجموعۂ چہارم: سورۂ اعلیٰ، سورۂ شمس، سورۂ لیل، سورۂ بینہ، سورۂ بلد، سورۂ تین، سورۂ عصر پر مشتمل ہے اور ان میں اچھی بری زندگی کا موازنہ ہے۔

مجموعہ پنجم: سورۂ قیامہ، سورۂ دہر، سورۂ معارج، سورۂ مرسلات، سورۂ ملک، سورۂ نبا، سورۂ نازعات، سورۂ تکویر، سورۂ انفطار، سورۂ انشقاق، سورۂ غاشیہ، سورۂ رحمٰن پر مشتمل ہے۔ ان میں بنیادی طور پر سارا زور آخرت پر ہے اور اس کے ضمن میں اخلاقی تعلیمات و عقائد بھی آئے ہیں۔

مجموعۂ ششم: سورۂ مدثر اور سورۂ عبس اور سورۂ کوثر پر مشتمل ہے اور ان میں انذار و تبلیغ کا حوالہ بھی موجود ہے اور عقائد بھی۔

(۱۷) توحید اسلامی اور فلسفۂ توحید پر علماء و مفسرین کی نگارشات ملاحظہ کریں جیسے:

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبیؐ، اعظم گڑھ ۱۹۸۴ء، چہارم ص ۵۵۳-۲۱۶ بحث اللہ تعالیٰ پر ایمان

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی، "حقیقت توحید"، نقوش رسول نمبر لاہور دوم

(۳) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، سیرت سرور عالمؐ، باب ششم کی فصل اول ص ۲۲۹-۱۹۲، "توحید کی تعلیم اور شرک کی تردید"

(۴) ڈی بی میکڈانلڈ اور محمد یوسف موسیٰ کے مقالے "توحید" پر اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانشگاہ پنجاب لاہور

(۱۸) مذکورہ بالا مباحث و مضامین کے علاوہ مزید ملاحظہ ہو:

(۱) سید نذیر نیازی کا تحقیقی مقالہ، اللہ پر، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانشگاہ پنجاب لاہور۔

(۱۹) قرآن کریم سورہ ۹۶۔

(۲۰) قرآن کریم سورہ ۱۔

(۲۱) قرآن کریم، سورہ ۱۱۲۔ اردو ترجمہ مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کا ہے۔

(۲۲) قرآن کریم، سورہ ۸۷۔ اردو ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کا ہے۔

(۲۳) قرآنِ کریم، سورہ ۹۰۔ بعض آیات کریمہ کا اردو ترجمہ (از شاہ عبد القادر) حسب ذیل ہے:

"ہم نے آدمی بنایا محنت میں، کیا خیال رکھتا ہے کہ اس پر بس نہ چلے گا کسی کا؟ کہتا ہے میں نے کھپایا مال ڈھیروں۔ کیا خیال رکھتا ہے کہ دیکھا نہیں اس کو کسی نے؟ بھلا ہم نے نہیں دیں اس کو دو آنکھیں، اور زبان اور دو ہونٹ۔ اور سوجھا دیں اس کو دو گھاٹیاں۔ سو نہ جھک سکا گھاٹی پر۔ اور تو کیا بوجھا کیا ہے وہ گھاٹی؟ چھڑانا گردن کا، یا کھلانا بھوک کے دن میں، بن باپ کے لڑکے کو جو ناتے دار ہے، یا محتاج کو جو خاک میں رُلتا ہے۔۔۔"

(۲۴) قرآنِ کریم سورہ ۹۱۔ مذکورہ بالا انفس و آفاق کی نشانیوں کی قسم کھا کر فرمایا: "پھر سمجھ دی اسکو ڈھٹائی کی اور بچ چلنے کی مراد کو پہونچا جس نے اس کو سنوارا، اور نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں ملایا۔" پھر ثمود کی اپنے رسول کی نافرمانی اور اس کے برے انجام کا ذکر کیا ہے۔

(۲۵) قرآنِ کریم، سورہ ۹۲: موازنہ کی آیات کریمہ حسبِ ذیل ہیں:

فأما مَن أعطى واتقى و صدق بالحسنى فسنيسره لليسرى وأما من بخل واستغنى و كذب بالحسنى فسنيسره للعسرى وما يُغنى عنه ماله اذا تردّى ، ان علينا للهدى

و ان لنا للاخرۃ والاولی ۔ فانذرتکم نارا تلظی لایصلھا الا الاشقی الذی کذب و تولی و سیجنبھا الاتقی الذی یؤتی مالہ یتزکی

(ترجمہ) سو جس نے دیا اور ڈر رکھا اور سچ جانا بھلی بات کو تو اس کو ہم سہج سہج پہونچا دیں گے، آسانی میں۔ اور جس نے نہ دیا اور بے پرواہ رہا اور جھوٹ جانا بھلی بات کو، سو اس کو ہم سہج سہج پہونچاویں گے سختی میں۔ اور کام نہ آوے گا اس کو مال اسکا، جب گڑھے میں گرے گا۔ ہمارا ذمہ ہے سوجھا دینا اور ہمارے ہاتھ ہے پچھلی اور پہلی ۔ سو میں نے سنادی تم کو خبر ایک تپتی آگ کی ۔ اس میں وہی پیٹھے گا جو بڑا بدبخت ہے جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا ۔ اور بچاویں گے اس سے وہ بڑا ڈر والا جو دیتا ہے مال اپنا دل پاک کرنے کو ۔

(۳۶) قرآن کریم سورہ ۹۵ کی آیات کریمہ ۶۔۳ اس موضوع سے براہ راست متعلق ہیں:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۔ ثم رددنہ اسفل سافلین الا الذین امنوا و عملوا الصلحت فلھم اجر غیر ممنون

ہم نے بنایا آدمی خوب سے خوب اندازے پر، پھر پھینک دیا اسکو نیچوں سے نیچے، مگر جو یقین لائے اور کیں بھلائیاں، سو ان کو نیگ ہے بے انتہا ۔

شاہ عبدالقادر دہلوی اس کے فائدہ میں فرماتے ہیں: "یعنی اس کو لائق بنایا فرشتوں کے مقام کا، پھر جب منکر ہوا تو جانوروں سے بد تر۔" اسی مفہوم کو مولانا شبیر احمد عثمانی اور امین احسن اصلاحی اور سید مودودی نے اپنی تفاسیر میں بہت مفصل بیان کیا ہے ۔

(۳۷) قرآن مجید کے ادبی اور موضوعاتی اسالیب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس موضوع پر ابھی اور بھی بہت کچھ لکھا جانا ہے کیونکہ یہ قرآن کریم کے اعجاز بیانی کا وہ شاہکار ہے جس نے اہل زبان عربوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا اور اسی نے ان کو اسلام کی تعلیمات و عقائد کی طرف لا کھینچا تھا۔ موضوع و مقصد خواہ کتنا بلند اور عمدہ ہو لیکن اگر وہ اچھے اسلوب و زبان میں نہ پیش کیا جائے تو اپنی تاثیر اور اثر پذیری کھو دیتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے زبان و اسلوب کا بھی اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے جو انسانی کاوش اور فکر سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اس موضوع پر چند اہم تصانیف و مقالے ملاحظہ ہوں:

(۱) زرکشی، البرھان فی علوم القرآن، قاہرہ ۱۹۵۷ء ۔

(۲) سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، اردو ترجمہ جلد دوم کی متعدد انواع جیسے ۴۳، ۴۴، ۴۵ وغیرہ ۔

(۳) مولانا حمید الدین فراہی، اسالیب القرآن، مکتبہ دائرۂ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ ۱۹۵۷ء

(۴) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، مکتبہ فاران لاہور ۱۹۸۵ء

(۵) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۴ء

(۶) عائشہ بنت عبد الرحمن الشاطی، الاعجاز البیانی للقرآن الکریم، قاہرہ ۱۹۷۱ء

(۷) عبید اللہ فہد، "قرآن مجید کے ادبی اسالیب"، نقوش قرآن نمبر (آئندہ)

ان کے علاوہ متعدد تفاسیر میں اس اہم موضوع پر کافی مفصل بحث کی گئی ہے جو پوری کتاب میں پھیلی ہوئی ہے مثلاً زمخشری کی کشاف، بیضاوی کی تفسیر، ابن جریر طبری اور ابن کثیر کی تفاسیر، اردو تفاسیر میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا مطالعہ بھی بہت مفید ہوگا ۔

(۳۸) قرآنِ کریم، سورہ ۹۹: آیاتِ کریمہ کا رنگ و آہنگ اور عربی اسلوب اس کے اپنے اصلی الفاظ میں ہے جو عرب مخاطبین کے لیے تازیانہ کا کام کرتا تھا۔ ترجمہ اوپر آچکا اب اصل الفاظِ الٰہی ملاحظہ ہوں:

اذا زلزلت الارض زلزالھا ، واخرجت الارض اثقالھا ، وقال الانسان مالھا ، یومئذ تحدث اخبارھا بأن ربک اوحی لھا ، یومئذ یصدر الناس اشتاتا لیروا اعمالھم ۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیر یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ ۔

زمین کے بوجھ (اثقالھا) سے حضرت شاہ عبدالقادر نے سونا روپا مراد لیا ہے اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس پر مُردوں کا اضافہ کیا ہے سید مودودی اور مولانا اصلاحی نے مردوں اور سونا چاندی جواہر وغیرہ پر لوگوں کے اعمال و اقوال بھی نکال باہر کرنے کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ ابن کثیر نے صرف اعمال کا ذکر کیا ہے ۔

(۳۹) قرآن کریم، سورہ ۱۰۰ ابتدائی قسموں کے بعد اصل موضوع اور کلام حسبِ ذیل آیات میں آیا ہے:

ان الانسان لربہ لکنود وانہ علی ذلک لشھید وانہ لحب الخیر لشدید ، افلا یعلم اذا بعثر مافی القبور وحصل مافی الصدور ان ربھم بھم یومئذ لخبیر

بے شک آدمی اپنے رب کا ناشکر ہے۔ اور وہ یہ کام سامنے دیکھتا ہے۔ اور آدمی محبت پر مال کی مضبوط ہے۔ کیا نہیں جانتا وہ وقت کہ کرید ے جاویں جو قبروں میں ہیں؟ اور تحقیق ہو جو جیوں میں ہے بے شک ان کے رب کو ان کی اس دن کی سب خبر ہے ۔

بیشتر مفسرین نے انسان کی فطرت میں زر پرستی کی وجہ سے پروردگار کی ناشکری کی وضاحت کی ہے اور خیر سے مراد مال و دولت لیا ہے لیکن خیر سے مال کے مراد ہونے کے ساتھ ساتھ خیر و نیکی کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے اور زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے ۔ اور انسان بلاشبہ ہر خیر کا حریص ہے ۔

(۳۰) قرآن کریم ، سورہ ۱۰۱ اہم آیات کریمہ کے اصل الفاظ یہ ہیں ۔

[قیامت کے ذکر کے بعد انسان کا کیا حال ہوگا] -- فاما من ثقلت موازینه فهو فی عیشة راضیة واما من خفت موازینه فامه هاویه وما ادراك ماهیه ، نار حامیه -

اسی مضمون کو بہت موثر انداز میں سورہ حاقہ کی ان آیات میں پیش کیا ہے:

فأما من أوتی کتابه بیمینه فیقول هاؤم اقروا کتابیه انی ظننة انی ملق حسابیه فهو فی عیشة راضیه فی جنة عالیه قطوفها دانیه کلوا واشر بو هنیئا بما أسلفتم فی الایام الخالیه واما من اوتی کتابه بشماله فیقول یلیتنی لم اوت کتابیه ولم ادر ماحسابیه ، یلیتها کانت القاضیة ما أغنی عنی مالیه هلك عنی سلطانیه ۔

سو جس کو ملا اس کا لکھا داہنے ہاتھ میں، وہ کہتا ہے ، لیجیو! پڑھو میرا لکھا ۔ میں نے خیال رکھا کہ مجھ کو ملنا ہے میرا حساب ۔ سو وہ ہے گزران میں من ماتی ۔ اونچے باغ میں ، جس کے میوے جھک رہے ہیں۔ کھاؤ اور پیو رچ سے۔ بدلا اس کا جو آگے بھیجا تم نے پہلے دنوں میں اور جس کو ملا اس کا لکھا بائیں ہاتھ میں۔ وہ کہتا ہے: کسی طرح مجھ کو نہ ملتا مجھ کو مرا لکھا، اور مجھ کو خبر نہ ہوتی، کیا ہے حساب میرا؟ کسی طرح موت نبڑ جاتی۔ کچھ کام نہ آیا مال میرا۔ کھپ گئی مجھ سے حکومت میری ۔

(۳۱) قرآن کریم ، سورہ ۷۷ ۔ آیاتِ کریمہ کا تجزیہ حسب ذیل ہے:

پہلی سات آیات میں ہواؤں کی قسم کھا کر یہ واضح کیا گیا کہ قیامت (جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے) واقع ہو کر رہے گی۔

آٹھ تا پندرہ آیات میں قیامت کے دن کائنات کے درہم برہم ہونے کا ذکر کر کے اس کو فیصلہ کا دن قرار دیا جس سے جھٹلانے والوں کے لیے تباہی ہوگی۔

۱۹۔۱۶ آیات میں قوموں کے بعد قومیں پیدا کرنے، ایک کو ہلاک کر کے اس کی جگہ دوسروں کو دینے کا اور مجرموں کے ساتھ سنت الٰہی کے جاری رہنے کا ذکر کیا۔

۲۴۔۲۰ آیات میں انسان کی پیدائش کے حقیر مادہ اور دورانِ حمل میں اس کی صورت گری کا ذکر کر کے جھٹلانے والوں کو عذاب سے آگاہ کیا ۔

۲۸۔۲۵ آیات میں زمین اور اسکی اشیاء متعلقہ جیسے پہاڑوں اور پانی کا اور انسان کے لیے ان کے فوائد کا ذکر کر کے اپنا احسان یاد دلایا۔

۴۰۔۲۹ آیات میں اس روز جزا اور یومِ فیصل کا ذکر اور بیان ہے جس دن حشر سلماں ہولناکی ہوگی اور کسی کو جائے پناہ نہ ہوگی۔

۴۴۔۴۱ آیات میں تقویٰ اختیار کرنے والوں ، دنیا میں اللہ کا خوف کر کے زندگی بسر کرنے والوں کے اخروی ثواب کا ذکر کیا گیا ہے۔

۵۰۔۴۶ آیات میں مجرموں کو اس دنیاوی زندگی میں چند روزہ مہلت اور عیش سے لطف اندوزی کا موقع دیا گیا ہے لیکن قیامت میں ان کے لیے صرف حسرت ہی حسرت اور عذاب ہی عذاب ہوگا۔ اور آخر میں ان کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ پھر کب وہ ایمان لائیں گے؟ اتنی نشانیاں اور حقیقتیں دیکھ لینے کے بعد بھی آخر ان کی آنکھیں کب کھلیں گی؟

ان آیات میں قرآن کریم کا اسلوب تکرار بڑی خوبصورتی سے اور موثر انداز میں ظاہر ہوتا ہے کہ ہر آیت کے مجموعہ کے بعد جھٹلانے والوں کو اپنی تباہی سے آگاہ کیا گیا ہے ۔

(۳۲) قرآن کریم، سورہ ۷۹ : ابتدائی پانچ آیات میں فرشتوں کی قسمیں کھا کر آیات ۹۔۶ میں قیامت کی ہولناکی کا ذکر کیا کہ اس دن زلزلہ پر زلزلہ آئے گا، دل کانپیں گے اور نگاہیں سہمی ہوں گی۔ قیامت کا یہ بیان ان کے مشاہدے سے ملا کر بیان کیا گیا تاکہ ان کو اندازہ ہو کہ کیا قیامت ہوگی اس دن ۔ پھر آیات ۱۲ ۔ ۱۰

میں انکار کرنے والوں کے مذاق و تجاہل عارفانہ کا ذکر ہے کہ کیا وہ مر کر پھر جی اٹھیں گے! آیات ۱۴۔۱۳ میں یہ تصدیق ربانی ہے کہ ہاں اس دن ایک زور کی ڈانٹ پڑے گی اور سب میدانِ حشر میں جمع ہوں گے ۔ آیات ۲۶۔۱۵ حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ مختصراً بیان کیا کہ فرعون نے رسوؐل کی بات نہیں مانی اور سرکشی کی انجام کار دنیا و آخرت کے عذاب میں گرفتار ہوا اور ڈرنے والوں کے لیے سامانِ عبرت بن گیا ۔ ان آیات کے ذریعہ منکرینِ حق کو باخبر کیا کہ ان کی تکذیب انہیں فرعون کے انجام کی طرف لے جائے گی ۔ پھر آیات ۳۳۔۲۷ میں انسان اور کائنات کی دوسری اہم چیزوں کی تخلیق کا موازنہ کرکے بتایا کہ تمہارے مقابلہ میں ان کی تخلیق زیادہ مشکل ہے اور جو خدا یہ کر سکتا ہے وہ تم کو دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔ آیات ۶ ۔۳۴ میں قیامت کے برپا ہونے کا ذکر کرکے آیات ۴۱۔۳۷ میں سرکشوں اور متقیوں کے برے اور اچھے انجام سے باخبر کیا ۔ آیات ۵۔۴۲ میں قیامت سے گریز کرکے آپؐ کی رسالت کا ذکر کیا ہے کہ قیامت کا علم آپؐ کو تو نہیں اور نہ یہ آپؐ کا منصب ہے کہ وہ خالص امر الہیٰ ہے مگر آپؐ لوگوں کو انجام سے باخبر کرنے والے ضرور ہیں۔

(۳۳) قرآن کریم سورہ ۸۱: اس سورۂ کریمہ میں پہلی چودہ آیات میں قیامت کی ہولناکی اور بھیانک واقعات کا ذکر ہے۔ جس دن سورج ستارے، پہاڑ، حاملہ اونٹنیاں، جنگلی جانور، دریا سمندر تباہ کر دیے جائیں گے، جانیں دوبارہ جسموں میں داخل کر دی جائیں گی اور نومولود لڑکی سے جو دنیا میں زندہ گاڑ دی گئی تھی پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی تھی؟ اور صحیفے کھولے، آسمان پھاڑ دیے جائیں گے اور جہنم بھڑکائی جائے گی اور جنت قریب لائی جائے گی اور انسان جان لے گا کہ وہ کیا اعمال کرکے ساتھ لایا ہے۔ آیات ۱۸۔۱۵ میں چند بڑی قسمیں کھانے کے بعد اس فرشتہ فرستادہ کی امانت و دیانت، قوت و وجاہت کا ذکر ہے جو آپؐ کے پاس پیغام الہیٰ لاتا ہے اور آپؐ کا ذکر خیر کرکے بتایا گیا کہ جو کچھ آپؐ کہہ رہے ہیں وہ دیوانگی نہیں بلکہ اسی فرشتہ سے سن کر کہہ رہے ہیں۔ وہ تو زادِ نصیحت ہے، کسی مردود شیطان کا کلام نہیں، پھر تم نصیحت کیوں نہیں اختیار کرتے؟

(۳۴) قرآن کریم سورۂ نبا (۷۸) میں قیامت کے بارے میں مشرکین کے سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ عنقریب وہ جان لیں گے کہ وہ کیا دن ہے؟ پھر آیات ۱۶۔۶ میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے ذکر سے گریز کرکے اپنی قدرتِ کاملہ کا ذکر فرمایا اور زمین، پہاڑ، انسان کے جوڑے، نیند، رات کا سکون دن کے معاش سات آسمان، سورج، بارش و بادل اور پانی کے نتیجہ میں غلہ سبزی اور باغ کا ذکر کیا تاکہ ان کو معلوم ہو کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی ان قدرتوں کے قائل ہیں پھر ان کو کیسے تعجب ہے کہ قیامت نہ ہوگی۔ پھر آیات ۳۸۔۱۷ تک قیامت کی ہولناکی، مجرموں اور سرکشوں کی سزا اور متقیوں کی جزا کا ذکر ہے اور آخری تین آیات میں یہ ذکر و انداز کہ اب بھی اپنے رب کے پاس لوٹنے کے لائق کام کر لو ۔ ہم نے تو تم کو اس قریبی عذاب سے ڈرا دیا ہے۔ یہ آپؐ کی رسالت کا ذکر ہے۔

سورۂ انفطار (۸۲) پہلی پانچ آیات میں روزِ قیامت کا ذکر کرکے آیات ۱۲۔۶ میں بتایا گیا کہ انسان کو اللہ نے پیدا کرکے یونہی نہیں چھوڑ دیا کہ اس نگرانی کے لیے امین و شریف فرشتے مقرر کر دیے ہیں جو ان کے تمام اعمال لکھتے رہتے ہیں۔ پھر وہ اپنے رب کے بارے میں کیونکر دھوکا میں ہے؟ اور نیکوں کی جزا کا ذکر کرکے قیامت ہی پر ذکر تمام کیا گیا۔ سورۂ انشقاق (۸۴) میں پہلے قیامت کا ذکر کرکے پھر آیات ۱۹۔۷ میں متقیوں اور فاجروں کا ثواب و عذاب بیان کیا اور ان کو ایمان لانے کی دعوت دی اور کافروں کے حال پر اظہارِ تاسف و تعجب کیا کہ وہ قرآن سن کر بھی سجدہ نہیں کرتے اور کفر و تکذیب پر جمے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان کو عذابِ الیم کی خبر دے دو اور نیکو کاروں کو لامتناہی اجر کی خوشخبری دے دو۔

(۳۵) قرآن کریم، سورہ ۷۲ ۔ سورۂ کریمہ کا آغاز جنات کے ایک گروہ کے قرآن کریم سن کر ایمان لانے اور شرک و بدعات سے بچنے، اللہ کی گرفت سے کسی کے نہ بچ نکلنے کے ان کے عقیدہ سے ہوتا ہے اور وہ اپنے مومنوں اور منکروں کے انجام نیک و بد ذکر کرکے اس کی خدائی اور آپ کی رسالت تسلیم کرتے ہیں (آیات ۱۵۔۱) پھر اللہ کی توحید و اطاعت و عبادات کا ذکر اور آپ کی رسالت اور پیغمبرانہ فرائض کا ذکر ہے۔ (آیات ۲۳۔۱۶) اس کے بعد قیامت کے دن جہنم کی ہولناکی اور مجرموں کے عذاب و انجام کا ذکر ہے (آیات ۔ ۵۔۲۴) اس کے بعد آخری تین آیات میں رسولوں کو غیب الہیٰ سے ضروری واقفیت ہونے اور ان کے پیغام پہونچانے اور ہر چیز کا علم الہیٰ میں ہونے کا ذکر ہے ۔

(۳۶) قرآن کریم سورہ ۷۳، کا آغاز آپؐ کو مزمل (اوڑھ لپیٹ کر سونے والے) سے خطاب کرکے آپؐ کو راتوں میں عبادت کرنے، نماز تہجد ادا کرنے اور تلاوتِ قرآن کرنے کا حکم دیا ہے (آیاتِ ۴۔۱) پھر بتایا گیا کہ آپؐ کو راتوں میں اٹھ کر عبادت کرنے کے لیے اس لیے کہا جا رہا ہے کہ آپ ایک بھاری کلام کے تحمل کے لائق ہو جائیں (آیات ۶۔۵) اور دن کی مصروفیات کے سبب رات کی عبادت زیادہ مفید ہے (۸۔۷) آپؐ کو خدائے واحد و برتر کی مدد اور کافروں کے ایذا دینے پر صبر کرنے کا حکم دیا (۱۰۔۹) اور جھٹلانے والوں کے قیامت کے دن برے انجام سے دوچار ہونے کو بیان کیا (۱۴۔۱۱) پھر بہت صاف انداز میں آپؐ کو مکہ

والوں کو مخاطب کر کے فرعون کی طرف بھیجنے والے رسولؑ کی مانند قرار دیا اور فرعون کے انجام اور قیامت کے ہولناک ذکر کر کے اُن کو تقویٰ اختیار کرنے کا مشورہ دیا ۔ (۱۹-۱۵)

دوسرا رکوع عام مفسرین کے نزدیک مدنی ہے اس لیے اس کا تجزیہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔

(۳۷) قرآن کریم سورہ (۷۴) اس اولین سورہ میں آپؐ کو مدثر (اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے) کہہ کر مخاطب کیا اور سورۂ مزمل میں آپؐ کو عبادتِ الٰہیٰ کی جس طرح دعوت دی اور نصیحت کی تھی اسی طرح یہاں آپؐ کو لوگوں کو خبر دار کرنے کا حکم دیا ۔ اور اپنے کپڑے پاک رکھنے، گندگی سے دور رہنے اور دعوت کے کام کو زیادہ جان کر ہاتھ کھینچ لینے اور آپ کے لیے صبر کرنے کا حکم دیا (۷-۱) ۔ پھر قیامت کے ذکر کے بعد (۱۰-۸) انسان کے مال و دولت پانے کے بعد سرکشی اور استکبار کرنے کا ذکر کیا اور اس کے کلامِ الٰہیٰ کو جھٹلانے کا حوالہ دے کر جہنم میں اس کے عذاب کا ذکر کیا اور جہنم کی صفت بیان کی اور واضح کیا کہ یہ قرآنِ ہر انسان کے لیے نصیحت کی بات ہے (۳۱ - ۱۱) پھر چند اہم مخلوقات کی قسم کھا کر بتایا کہ دوزخ بھی انسانوں کو ڈرانے والی ہے ۔ اس کے بعد نیکو کاروں کے ثواب و اجر اور مجرموں کے عذاب اور اس کے لیے ذمہ دار اعمال کا ذکر کیا ہے ۔ (۴۷-۳۲) آخر میں قیامت کا ایک بار پھر ذکر کر کے بتایا یہ کلامِ رسولؐ دراصل کلامِ الٰہیٰ ہے جو نصیحت کا سامان ہے اور جس سے اہلِ تقویٰ اور اہلِ مغفرت ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

(۳۸) قرآنِ کریم کی تین مزید سورتوں ضحیٰ ۹۳ اِنشراح ۹۴ اور کوثر ۱۰۸ میں تو آپؐ کے منصبِ رسالت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں آپؐ کی منزلت و جلالت کا انتہائی خوبصورت اور مؤثر و واضح ذکر موجود ہے۔ سورۂ ضحیٰ میں قسم کھا کر فرمایا: "نہ رخصت کیا تجھ کو تیرے رب نے اور نہ بیزار ہوا، اور البتہ پچھلی بہتر ہے تجھ کو پہلی سے، اور آگے دے گا تجھ کو تیرا رب، پھر تو راضی ہو گا۔" اس کے بعد اپنے وہ انعامات و احسانات گنائے جنہوں نے بہتر زندگی کی طرف آپؐ کی رہنمائی کی تھی اور داغِ یتیمی کے بعد ملجا و ماویٰ ، اور ضلالت کے بعد ہدایت اور مفلسی کے بعد مالداری پائی تھی لہٰذا حکمِ ربانی ہوا کہ یتیم کو نہ دبائیں ، سائل کو نہ جھڑکیں اور اپنے رب کی نعمت کو بیان کرتے رہیں ۔

سورہ انشراح میں فرمایا: "کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا سینہ اور اتار رکھا تجھ سے بوجھ تیرا ؟ جس نے کڑکائی پیٹھ تیری اور او نچا کیا مذکور تیرا۔ سو البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے، البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ پھر تو جب فارغ ہو تو محنت کر اور اپنے رب کی طرف دل لگا"۔ حضرت شاہ عبد القادر نے اس کی تشریح میں فرمایا: "یعنی حوصلہ کشادہ دیا اتنا بڑا کام اٹھانے کو ۔۔۔ وحی کا اترنا اول سخت مشکل تھا پھر آسان ہو گیا ۔۔۔ یعنی پیغمبروں اور فرشتوں میں تیرا نام بلند ہے۔ یعنی خلق کو سمجھانے سے فراغت پاوے تو خلوت کی عبادت میں لگ" سورۂ کوثر میں آپ کو بطورِ خاص کوثر کا تحفہ عطا فرمایا اور آپؐ کے دشمن کی بربادی کا وعدہ کیا ۔

(۳۹) اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو:

(۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی سیرت سرورِ عالمؐ ، جلد دوم ص ۴۳۹ - ۳۸۷

(۲) مولانا سید سلیمان ندوی ، سیرت النبیؐ، اعظم گڑھ ۱۹۸۴ء ، جلد ششم اول تا آخر اسی موضوع پر پونے نو سو صفحات کی کتاب ہے ۔

ایمان و اعمالِ صالحہ کے تعلق اور اہمیت پر سید سلیمان ندوی کی مذکورہ کتاب کا پہلا باب "اسلام اور اخلاقِ حسنہ" بالخصوص اسکی فصل "ایمان کے اوصاف و لوازم" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ ایمان کی مثال باغ کی سی ہے اور اعمالِ صالحہ کی پانی کی سی۔ اگر باغ کو مسلسل پانی نہ ملتا رہے تو باغ مرجھا جاتا ہے اور اجڑ بھی سکتا ہے ۔ ایمان کو تازہ و توانا اور مستحکم رکھنے کے لیے اعمالِ صالحہ کا پانی دینا ہر وقت ضروری ہے ۔ (۴۰) قرآن کریم ، سورہ ۹۳،

عام مفسرین نے آپؐ کو مفلسی کے بعد غنی کرنے کے فرمانِ الٰہیٰ کا مطلب یہ لیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے مال سے شادی کے بعد آپؐ کو فائدہ پہونچا تھا اور اسی طرف اشارۂ خداوندی ہے ۔ لیکن مولانا امین احسن اصلاحی نے اسکو ظاہری مفہوم مان کر وہ غنا سمجھا جو "مجرد مال سے ۔۔۔ نہیں حاصل ہوتا بلکہ اصلاً اس ہدایت کا ثمرہ ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہے اور جس کی صحیح تعبیر "شرحِ صدر" ہے اور جس کی تفصیل بعد میں سورہ الم نشرح میں جو اس کی توام ہے آئے گی" تدبرِ قرآن ، جلد نہم ص ۴۱۷

(۴۱) قرآن کریم، سورہ قلم (سورہ ۶۸ ، آیت ۴) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے : انك لعلی خُلق عظیم (بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر فائز ہو) ۔ مفسرین علماء کرام نے اس کی جو تشریح و تفصیل فرمائی ہے وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں مختصر یہ ہے: "دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکم

خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمانِ الٰہی اور اخلاقی نکتہ وری، امر ربانی اور حکمِ فطرت، کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔" سید ندوی نے "اخلاق معلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز" کی فصل باندھی ہے جس میں انہوں نے آپؐ کے اخلاق بلند کی امتیازی خصوصیات سے بحث کی ہے ۔ ملاحظہ ہو سیرت النبیؐ ششم ۳۸۔۲۷ بالخصوص ۔ یہاں اس حدیث کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک سوال کے جواب میں آپ کے اخلاق کی تعبیر قرآن کریم سے کی تھی (كان خلقه القرآن ۔ قرآن ہی آپؐ کا اخلاق ہے) اس کا عام مفہوم تو یہی ہے کہ قرآن کریم نے جن صفاتِ عالیہ کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے وہ سب آپؐ میں موجود تھے اور دوسرا اشارہ اس آیت کریمہ کی طرف بھی ہے کہ آپؐ کے اخلاق کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی تعریف و توصیف فرمائی ہے ۔ اور جس کی تعریف وہ علام الغیوب و الشہادہ کرے اس سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔

اسی سے متعلق ایک حدیث نبویؐ ہے بعثت لاتمم مكارم الاخلاق (میں بہترین اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں) یہ حدیث متعدد مجموعہ ہائے حدیث میں آئی ہے ۔ ملاحظہ ہو امام مالک، موطا ، حسن اخلاق ، مسند احمد ، بیہقی اور ابن سعد وغیرہ ۔ سیرت النبیؐ جلد ششم ص ۲-۳ پر حدیث نبویؐ کے مختلف انداز و الفاظ پر بحث کی گئی ہے ۔ بعض روایات میں الفاظ کا فرق ہے مگر ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے ۔ بہر کیف اس سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے کہ بعثتِ نبویؐ کا ایک مقصد لوگوں میں اچھے اور عمدہ اخلاق کا نشوونما اور فروغ دینا بھی تھا۔ مزید بحث کے لیے ملاحظہ ہو مولانا سلیمان ندوی اور مولانا مودودی کی تحریریں اور سورہ قلم کی آیتِ مبارکہ کی مفسرین کرام کے ہاں تشریحیں ۔

(۳۲) قبل اسلام عربوں کی بالعموم اور اہلِ مکہ کی بالخصوص تجارت کے لیے ملاحظہ ہو :

(۱) میری کتاب تاریخ تہذیب اسلامی ، ادارہ مطالعات معروضی، نئی دہلی (زیر طبع)

(۲) سید شمس اللہ قادری تجارۃ العرب قبل الاسلام ، نقوش ، رسول نمبر لاہور ۱۹۸۳ء سوم ص ۸۶-۶۶

(۳) ابوالحسن علی حسنی ندوی، نبی رحمت ، اول ص ۹۶-۹۲

ان کے علاوہ مستشرقین بالخصوص مونٹگمری واٹ کی کتاب محمدؐ ایٹ مکہ کا پہلا باب بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔

قرآن مجید سورۂ ایلاف / قریش میں اسی مکی / قریشی تجارت کی طرف لايلف قريش ايلفهم رحلة الشتاء والصيف (ہم نے قریش کی تالیف قلب کی ، اور ان کی تالیف کے لیے سردی اور گرمی کے سفر بنائے) یہ اشارہ کیا گیا ہے ۔ اس پر مفصل بحث کے لیے ابن جریر طبری، ابن کثیر، مولانا مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ مفسرین و علماء کی تفسیریں ملاحظہ ہوں ۔ آیت مذکورہ کا ترجمہ ہمارا ہے۔ تمام اردو مترجمین اور مفسرین نے جو ترجمہ کیا ہے وہ اتنا گنجلک اور مبہم ہے کہ مطلب واضح ہی نہیں ہوتا۔ صرف مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ کسی قدر قابل فہم ہے جو یہ ہے "چونکہ قریش خوگر ہو گئے ہیں یعنی جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہو گئے ہیں۔" مولانا محمود حسن اور مولانا عبد الماجد دریابادی ، مفتی محمد شفیع (معارف القرآن) وغیرہ کی تفسیر و ترجمہ میں یا تو حضرت شاہ عبد القادر کا اثر ہے یا مولانا تھانوی کا۔ اردو کے بیشتر تراجم سے آیات کریمہ کا مقصود ہی واضح نہیں ہوتا ہے۔ علمی بحث کی یہاں گنجائش نہیں صرف اشارہ کرنا کافی ہے کہ قریش کے سفر سے مانوس و خوگر ہونے کا مطلب کیا ہے؟ یہ ساری گڑبڑ اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ علماء نے حرف ل کو ایک مخصوص معنی میں لیا اور سفر کے بنانے کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی جو عبارت میں محذوف ہے ۔ اسی احسان الٰہی کے نتیجہ میں ان سے اس گھر کے رب کی عبادت کا حکم دیا جا رہا ہے ۔ جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور خوف سے امن دیا ترجمہ میں مفہوم کو کھولنا ضروری ہے۔

(۳۳) اس موضوع پر مفصل بحث کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی اور ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ کی اخلاقی تعلیمات پر نگارشات کا مطالعہ کیجیے سید ندوی نے اخلاق و مکارم کے مقابل ان رذائل کا بھی ذکر کیا ہے جن سے انسان کو ہمیشہ بچنا چاہیے اور جن میں سے اکثر میں جاہلی عرب مبتلا تھے ملاحظہ ہو سیرت النبیؐ، ششم ص ۴۸۶-۵۸۸ ۔ سید مودودی اور دوسرے علماء و مفسرین نے اسلامی اخلاق اور اخلاقی تعلیمات کے ذکر میں موازنہ کے لیے رذائل اور اخلاقی برائیوں اور سماجی خرابیوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں اس وقت کا مکی معاشرہ بالخصوص اور عرب معاشرہ بالعموم مبتلا تھا۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان معاشرتی خرابیوں کے باوجود ان میں اچھے اوصاف بھی تھے جن کی تعریف و توصیف بھی کی گئی ہے۔

(۳۴) قرآن کریم ، سورہ ۱۰۲ ، اللہ تعالیٰ کے الفاظ ہیں :

الهکم التکاثر حتی زرتم المقابر

غفلت میں رکھا تم کو بہتات کی حرص نے ، جب تک جا دیکھیں قبریں

شاہ عبدالقادر اور مولانا محمود حسن کے اس ترجمہ کی تشریح مولانا شبیر احمد عثمانی یوں کرتے ہیں: "یعنی مال و اولاد کی کثرت اور دنیا کے ساز و سامان کی حرص آدمی کو غفلت میں پھنسائے رکھتی ہے ، نہ مالک کا دھیان آنے دیتی ہے اور نہ آخرت کی فکر۔ بس شب و روز یہی دھن لگی رہتی ہے کہ جس طرح بن پڑے مال و دولت کی بہتات ہو ، اور میرا کنبہ اور جتھا سب کنبوں اور جتھوں سے غالب رہے۔ یہ پردہ غفلت کا نہیں اٹھتا یہاں تک کہ موت آجاتی ہے ۔ تب قبر میں پہنچ کر پتا لگتا ہے کہ سخت غفلت اور بھول میں پڑے ہوئے تھے ۔" سید مودودی اور مولانا اصلاحی کی تشریحات بھی ملاحظہ ہوں ۔

(۴۵) قرآن کریم ، سورہ ۱۰۴ میں الفاظ الٰہی ہیں:

ویل لکل همزة لمزة الذی جمع مالا وعدده یحسب ان ماله اخلده ، کلا لینبذن فی الحطمة

خرابی ہے ہر طعنہ دیتے اور عیب چنتے کی، جس نے سمیٹا مال اور گن گن رکھا ۔ خیال رکھتا ہے کہ اس کا مال سدا رہے گا اس کے ساتھ کوئی نہیں اس کو پھینکنا ہے اس روندنے والی میں ۔۔۔

اخلدہ کا ایک بہتر ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا مال اس کو دوام بخش دے گا ۔ مال کے سدا ساتھ رہنے میں وہ نکتہ نہیں پیدا ہوتا جو قرآن کریم کا مقصود ہے۔

(۴۶) قرآن کریم ، سورہ ۱۰۰ میں اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں آیت کریمہ یہ ہے۔

وانه لحب الخیر لشدید اس پر اوپر بحث آچکی ہے ۔

(۴۷) قرآن کریم سورہ ۹۲ ۔ اوپر بحث آچکی ہے ۔ وہیں ملاحظہ ہو ۔

(۴۸) قرآن کریم ، سورہ ۸۹ ۔ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فأما الانسان اذا ما ابتلٰه ربه فاكرمه ونعمه فیقول ربی اکرمن ـ وأما اذا ما ابتلٰه فقدر علیه رزقه فیقول ربی اهانن ، کلا بل لاتکرمون الیتیم ولا تحضون علی طعام المسکین ، وتاکلون التراث اکلا لما وتحبون المال حُبًا جماً۔

تمام مفسرین اور مترجمین نے وضاحت کی ہے کہ آیاتِ کریمہ نے انسانی فطرت اور اس پر دولت و مال کے غلط اثرات کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اہلِ مکہ اور دوسرے مالدار طبقات عرب میں پھیلی ہوئی سماجی اور اخلاقی برائیوں پر تنقید کی تھی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عرب کے جاہلی اخلاق کے فلسفہ میں بھی یہ سب برائیاں اور رذائل ہی تھے، فضائل نہیں بن سکے تھے۔ اس لیے قرآن کریم کے موثر الفاظ ان کے ضمیر پر کوڑے برساتے تھے ۔

(۴۹) قرآن کریم کی متعدد سورتوں کی مختلف آیات میں اس پر بحث کی گئی ہے ۔ جامعیت کے خیال سے سیرت النبیؐ جلد ششم میں رذائل کی بحث کے مطالعہ کی سفارش کی جاتی ہے خاص کر بخل ۶۔ ۶۶۳ اور حرص و طمع ۸۲۔ ۶۷۷ وغیرہ پر فصلیں جو دولت کی کثرت اور ان کی بے جا محبت سے متعلق ہیں ۔

(۵۰) قرآن کریم ، سورہ ۶۸ الفاظِ آیاتِ کریمہ حسب ذیل ہیں:

ولا تطع کل حلاف مهین ، هماز مشاءٍ بنمیم ، منّاع للخیر ، معتد اثیم ، عتل بعد ذلك زنیم ، أن كان ذامال وبنین

تقریباً تمام مفسرین نے یہاں یہ لکھا ہے کہ آپؐ کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ محض صاحبِ وجاہت ہونے کے سبب کسی ایسے شخص/اشخاص کی اطاعت و دباؤ قبول نہ کریں جو ان اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہو۔ ملاحظہ ہو مولانا محمود حسن ، مولانا مودودی ، مولانا تھانوی، مولانا دریابادی اور مولانا مفتی محمد شفیع وغیرہ کی تفسیری آراء ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہدایت آپؐ کو مخاطب کرکے ضرور دی گئی تھی ورنہ اصلاً اس سے اہل مکہ اور دوسرے مشرکوں کو تادیب کرنا مقصود تھی کہ وہ ان اخلاقی اور سماجی برائیوں کو دیکھنے کے باوجود اپنے سرداروں کی اتباع محض ان کی وجاہت کے سبب کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اس سے بہت بلند و ارفع ہے آپؐ نے زمانہ جاہلیت میں جب آپؐ کے پاس کوئی واضح ہدایت نہ تھی ایسے سرداروں کا دباؤ قبول نہیں کیا تو اب بعثت کے بعد کیونکر قبول کر سکتے تھے۔ دراصل یہاں مکی سماج کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ وہ اپنے بد اخلاق سرداروں اور سربر آوردہ افراد کی ملی اور نفری اعدادی طاقت سے مرعوب نہ ہوں اور ان کے زیر اثر اسلام کا پیغامِ حق قبول کرنے سے انکار نہ کریں ۔

(۵۱) قرآنِ کریم ، سورہ ۸۳ میں فرمانِ الٰہی کے الفاظ ہیں۔

ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون و اذا کالوھم او وزنوھم یُخسرون الا یظن اولئک انھم مبعوثون لیوم عظیم یوم یقوم الناس لرب العالمین ۔

(۵۲) قرآنِ کریم ، سورہ ۷۴ میں متعلقہ آیات کریمہ ہیں:

یتساءلون عن المجرمین ماسلککم فی سقر ، قالوا لم نک من المصلین ولم نک نطعم المسکین و کنا نخوض مع الخائضین و کنا نکذب بیوم الدین ۔

نیز ملاحظہ ہو سید مودودی کی تفسیرِ آیات کریمہ ۔ بعض اور مکی سورتوں میں اسی مضمون و مفہوم کی آیات وارد ہوئی ہیں ان کو بھی ملاحظہ کیا جائے ۔

(۵۳) قرآن کریم ، سورہ ۱۰۷ : سورۂ کریمہ کے الفاظ مبارکہ ہیں :

ارایت الذی یکذب بالدین ، فذلک الذی یدع الیتیم ولایحض علی طعام المسکین الخ ۔

بعض مفسرین و علماء کا خیال ہے کہ یہ سورہ کریمہ مدنی ہے ۔ مگر بیشتر علماء کا خیال یہی ہے کہ یہ مکی سورہ ہے اور ابتدائی مکی دور میں نازل ہوئی تھی اور اس کی آیات میں مکی معاشرہ کی سماجی اور اخلاقی برائیوں پر تنقید ہے ۔ بنائے اختلاف آیات ۷ ۔ ۴ ہیں جن میں ان نمازیوں کو تباہی و بربادی کی وعید سنائی گئی ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے تھے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے تھے اور ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں دینے سے انکار کرتے تھے ۔ جن مفسرین کے نزدیک یہ مدنی سورہ ہے وہ کہتے ہیں کہ ایسے نمازی جو دراصل منافق تھے مدینہ ہی میں پائے جاتے تھے اور جو اسلام کی قوت و شوکت سے دب کر دکھاوے کے لیے نمازیں پڑھتے تھے ان مفسرین میں سید مودودی وغیرہ بعض حضرات شامل ہیں جو بعض روایات کی بنا پر اسے مدنی سمجھتے ہیں ۔ ورنہ اکثریت علماء کرام کی اسے مکی قرار دیتی ہے ۔ مولانا امین احسن اصلاحی (تدبر قرآن ، نہم ص ۶ ۔ ۵۸۳) نے بحث کی ہے کہ یہاں نمازیوں سے مراد بیت اللہ کے پروہت تھے جو ۔ ۔ بیت اللہ کے متولی ہونے کے تعلق سے اپنے عوام کو دکھانے کے لیے نماز کی رسم بھی ادا کرتے تھے لیکن ان کی نماز محض دکھاوے کی ہوتی ہے ۔ ۔ " مولانا اصلاحی کے دلائل وزنی ہیں ۔ تفصیل وہیں ملاحظہ کی جائے ۔ مولانا اصلاحی سے بہت پہلے اس موضوع پر سید سلیمان ندوی نے اپنی سیرت النبیؐ جلد چہارم میں ارکان اسلام کے حوالے سے اس پر یہی بحث کی ہے اور واضح کیا ہے کہ جاہلی عربوں میں دینِ ابراہیمی کے جو باقی ارکان و تصورات رہ گئے تھے ، ان میں نماز بھی تھی تاہم اس کی شکل و نوعیت مختلف تھی ۔ (فصل نماز) یہ بحث کافی مفصل ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ۔

(۵۴) قرآن کریم سورہ ۶۹ قرآنی الفاظ حسب ذیل ہیں : انہ کان لا یؤمن باللہ العظیم ، ولا یحض علی طعام المسکین ، فلیس لہ الیوم ھھنا حمیم ولا طعام الامن غسلین ، لایاکلہ الا الخاطئون ۔

(۵۵) قرآنِ کریم ، سورہ ۸۱ : آیات ۹ ۔ ۱ آخری دو آیات ہیں : واذا المؤدۃ سئلت بای ذنب قُتلت ۔

ان کے بعد پھر بعض اہم واقعات قیامت کا ذکر ہے ۔

یہاں یہ وضاحت کرنی ضروری ہے کہ نومولود بیٹی / لڑکی کو زندہ دفن کرنے کی قبیح رسم چند بدو خانوادوں اور قبیلوں اور بعض افراد تک محدود تھی ۔ وہ ایک عام طور پر پھیلی ہوئی خرابی نہیں تھی اور شہری قبائل میں بالعموم نہیں پائی جاتی تھی ۔ عربوں کی اس قبیح عادت کے لیے ملاحظہ ہو ابن کثیر ، تفسیر ، عیسیٰ البابی الحلبی قاہرہ ، چہارم ۸ ۔ ۴۷۷ جنہوں نے کئی روایات امام احمد ، نسائی ، ابن ابی حاتم وغیرہ سے بیان کی ہیں ۔

(۵۶) قرآن کریم سورہ ۱۶ آیات ۹ ۔ ۵۸ : واذا بُشر احد ھم بالاُنثی ظل وجھہ مسودا وھو کظیم ، یتواری من القوم من سوء مابشربہ ، ایمسکہ علی ھون ام یدسہ فی التراب ، الاساء ما یحکمون ۔

اردو ترجمہ مولانا مودودی کا ہے تفسیر و تشریح کے لیے ان کی تفہیم القرآن اور دوسری تفاسیر ملاحظہ ہوں ۔

(۵۷) قرآن کریم ، سورہ ۴۳ زخرف آیت ۱۷ :

واذا بشر احدھم بما ضرب للرحمن مثلا ظل وجھہ ، مسودا وھو کظیم

اور جب ان میں کسی کو خوشخبری ملے اس چیز کی جو رحمن پر نام دھرا ، سارے دن رہے اس کا منہ سیاہ ، اور وہ دل میں گھٹ رہا ۔

ملاحظہ ہو تفسیری تشریحات تفہیم القرآن ، بیان القرآن اور تدبر قرآن وغیرہ کی ۔ یعنی اللہ کے لیے تو بیٹیاں بتاتے ہیں اور ان کو خود برا سمجھتے ہیں ۔

(۵۸) قرآن کریم۔ سورہ ٦ الانعام کی آیت ۱۵۲ میں ہے:

ولا تقتلو اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاهم

اور مار نہ ڈالو اپنی اولاد مفلسی سے، ہم رزق دیتے ہیں تم کو اور ان کو اس آیت کریمہ میں پہلے ان کے والدین کو پھر ان کی اولاد کو رزق دینے کا ذکر کیا جبکہ مندرجہ ذیل آیت میں اس کے برعکس ہے۔ اسلوب کی تبدیلی اور اس کی اہمیت کے لیے تفسیری تشریحات ملاحظہ ہوں۔

سورہ اسراء (۱۷) آیت ۳۱ میں ہے:

ولا تقتلوا اولادکم من خشیة املاق نحن نرزقهم وایاکم ان قتلهم کان خطأ کبیرا

اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو ڈر سے مفلسی کے۔ ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو بے شک ان کا مارنا بڑی چوک ہے۔

(۵۹) قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں ان اخلاقی برائیوں کا ذکر آیا ہے۔ ذیل میں ان کا مختصر حوالہ دیا جاتا ہے:

قتل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ انعام آیت ۱۵۱، سورہ اسراء ۳۳ :ولا تقتلوا النفس التی حرم الله الا بالحق (اور نہ مارو جان جو منع کی اللہ نے مگر حق پر)

زنا کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ اسراء ۳۲: ولا تقربوا الزنی انه کان فاحشة وساء سبیلا (اور پاس نہ جاؤ بدکاری کے، وہ ہے بے حیائی، اور بری راہ ہے)

چوری کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ یوسف ۷۳، میں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے حوالہ سے چوری کو فساد فی الارض کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

جھوٹ کے لیے ملاحظہ ہو: سورۂ علق آیت ۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے جھوٹی خطا کار پیشانی (ناصیة کاذبة خاطئة) کو جہنم کا مستحق بتایا ہے۔

اس موضوع پر مفصل بحث کے لیے سید سلیمان ندوی کی سیرت النبیؐ جلد ششم کی فصل رذائل پر ملاحظہ کیجیے اور سید مودودی کی سیرت سرور عالمؐ میں اخلاقی تعلیمات کا باب ملاحظہ کیجیے۔

آیات قرآنی کے علاوہ متعلقہ احادیث و روایات میں بھی فضائل اخلاق اپنانے اور رذائل سے اجتناب کرنے کی ہدایت نبویؐ آئی ہے اس کا مختصر حوالہ بعد میں آئے گا۔ مفصل بحث سید ندوی کی مذکورہ بالا فصل میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

(٦۰) قرآن کریم کی کئی سورتوں میں فواحش و کبائر اور بغی وغیرہ سے اجتناب کی تفصیل آئی ہے۔ مختصر حوالے درج ذیل ہیں:

کبائر کے لیے ملاحظہ ہوں: سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۷ :والذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش و اذا ما غضبوا هم یغفرون (اور جو بچتے ہیں بڑے گناہوں سے، اور بے حیائی سے اور جب غصہ آوے وہ معاف کرتے ہیں) یہ مومنین صادقین کی تعریف میں فرمایا گیا ہے۔

سورۂ نجم آیت ۳۲ :الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم (جو لوگ بچتے ہیں بڑے گناہوں سے، اور بے حیائی کے کاموں سے، مگر کچھ آلودگی) سے ملوث ہو جاتے ہیں تو ان کو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا کہ وسیع مغفرت والا ہے۔

فواحش اور اثم دونوں کا اوپر آیات میں حوالہ آچکا ہے۔ فحشاء اور فواحش کا ذکر اور بھی کئی مکی آیات میں آیا ہے۔ مثلاً:

سورۂ نحل آیت نمبر ۹۰: وینهی عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون (اور منع کرتا ہے بے حیائی کو، اور نامعقول کام کو، اور سرکشی کو، تم کو سمجھاتا ہے، شاید تم یاد رکھو)۔

سورۂ انعام ۱۵۲ولا تقربوا الفواحش ماظهر منها وما بطن (اور نزدیک نہ ہو بے حیائی کے کام سے، جو کھلا ہو اس میں اور جو چھپا)

سورۂ اعراف آیت ۳۳قل انما حرم ربی الفواحش ماظهر منها ومابطن (تو کہہ! میرے رب نے منع کیا ہے بے حیائی کے کام سے، جو کھلے ہیں ان میں اور جو چھپے) اسی طرح منکر اور بغی وغیرہ پر متعدد آیات کریمہ ہیں مثلاً سورۂ اعراف آیت ۱۵۷، سورۂ نحل آیت ۹۰ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ان کو منکر سے روکتا ہے۔

(٦۱) قرآن کریم ،کی متعدد سورتوں میں ان فضائلِ اخلاق کا ذکر ہے یہ باب کافی مفصل ہے لہٰذا سید سلیمان ندوی کی سیرت النبیؐ جلد ششم ملاحظہ کرنا چاہیے۔

بطور نمونہ چند حوالے درج ذیل ہیں:

سچائی اور صدق کے لیے: سورۂ مریم آیات ۲ ـ ۳ ، ۱۰ جن میں حضرت ابراہیمؑ و ادریسؑ ، مریمؑ اور اسماعیلؑ کی سچائی کو ان کی نبوت و عفت پر دلیل بنا کر پیش کیا۔

سخاوت و فیاضی پر اور پر سورۂ لیل وغیرہ کی آیات کریمہ میں ذکر آچکا ہے۔

امانت داری کے لیے ۔ سورۂ معارج ۱۰

عدل و انصاف کے لیے : سورۂ انعام ۱۴ ، ۱۹ سورۂ نحل ۱۰ ، ۱۳ ۔ سورۂ شوریٰ ۲

پابندیٔ عہد کے لیے : سورۂ اسراء ۴ ، سورۂ نحل ۱۳ کے علاوہ سورۂ انعام ۱۹

احسان کے لیے: سورۂ یوسف ۱۱ ، سورۂ نحل ۱۳ ، سورۂ قصص ۸ ، سورۂ رحمان ۳ وغیرہ ۔

(۶۲) ابن اسحاق ص ۱۳۸ ، ابن ہشام اول ص ۴ ۔ ۲۴۳

(۶۳) ابن اسحاق ص ۱۳۸ ابن ہشام اول ص ۲۴۴

(۶۴) مولانا مودودی وغیرہ بعض علماء و مفکرین نے اس خیال کا اظہار کیا ہے ۔

(۶۵) ابن اسحاق ص ۱ ۔ ۱۴۰ ، ابن ہشام میں یہ روایت نہیں ہے ۔ مولانا مودودی نے امام احمد، ابن جریر طبری اور ابن عبد البر کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے ۔ ملاحظہ ہو سیرت سرور عالمؐ دوم ۵ ۔ ۱۴۴

(۶۶) ابن ہشام اول ص ۷ ۔ ۲۴۶

(۶۷) ابن ہشام ، اول ص ۳۶۳

(۶۸) مثلاً ملاحظہ ہو ابن کثیر، تفسیر ، چہارم ص ۹ ۔ ۵۲۸ ۔ نیز سید مودودی ، امین احسن اصلاحی وغیرہ کی تفسیریں ۔ ان کے علاوہ مزید ملاحظہ ہو ابن اسحاق ، ص ۲۱۱

(۶۹) ابو جہل مخزومی سے متعلق روایات کے علاوہ عقبہ بن ابی مُعیط کی حرکات شنیعہ سے متعلق روایات سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب بار بار یہ حرکتیں کیا کرتے تھے۔ عقبہ اموی نے ایک بار آپؐ کی گردن میں رسی کا پھندا ڈال کر گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی اور آپؐ کو حضرت ابوبکرؓ نے بچایا تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو جہل نے کم از کم دوبار تو یہ حرکت ضرور کی تھی اور ہو سکتا ہے کہ اس نے اور اس کے ہمنواؤں نے یہ حرکت برابر جاری رکھی ہو ۔ قرآن کریم کے الفاظ اس کا سب سے بڑا قرینہ ہیں ۔ وہ ایک بار اس حرکت میں ملوث ہونے کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ینہیٰ (وہ روکتا ہے) میں دوام اور مسلسل عمل کا واضح اشارہ ہے ۔ اور پھر یہ ضروری نہیں کہ پہلی بار اس نے آپؐ کو قتل کرنے کی جو حرکت کی تھی اسی کو دہرایا ہو بلکہ غیب کے انتظام کو دیکھ کر اس کو وہ حرکت دوبارہ کرنے کی ہمت نہ پڑی ہو مگر وہ آپؐ کو نماز سے روکنے کے لیے دوسرے طریقے اور جدا جدا ترکیبیں کرتا رہا ہو۔ قرآن کریم میں واضح بیان ہے کہ کیا تم نے دیکھا اس کو جو روکتا ہے بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ یہاں خیر و شر دونوں اعمال کے تسلسل کا ذکر ہے ۔

(۷۰) ابن اسحاق ، ص ۲۲۳ ۔ سیرت نگار نے اوجھڑی رکھنے والے کا نام نہیں لیا ہے۔ صرف ایک بد معاش کہا ہے۔ البتہ ابو جہل کے مشورہ پر ایسے کام کرنے کا حوالہ دیا ہے۔ دوسری روایات سے عقبہ بن ابی معیط کا نام معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ اول ص ۲۱۶ ۔

(۷۱) ابن اسحاق ، ابن ہشام ، اول ص ۲۴۷

(۷۲) ابن اسحاق ص ۱۴۰ کا بیان ہے کہ "حضرت علیؓ نے تعمیل کی اور اسلام قبول کر لیا لیکن ابو طالب کے خوف سے اپنا اسلام مخفی رکھا اور اس کا اظہار نہ کیا ۔ زید بن حارثہؓ نے بھی اسلام قبول کر لیا ۔ تقریباً ایک ماہ تک ان دونوں کا اسلام مخفی رہا ۔ ۔ ۔"

(۷۳) ابن اسحاق ص ۴۱ ۔ ۴۲ نیز ملاحظہ ہو سیرت سرور عالمؐ ، دوم ص ۱۴۳ (۷۴) ابن ہشام، اول ص ۲۴۷ نے یہ روایت بعض مجہول اہلِ علم سے بیان کی ہے اور لفظ زَعَمُوا (ان کا گمان ہے) سے شروع کی ہے اور ابو طالب کے قول سے قبل ایک مرتبہ اور اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ سیرت نگاروں اور محدثوں اور مؤرخوں کے نزدیک یہ اندازِ بیان یا طریقہ اسناد قابلِ اعتماد نہیں ہے اور نہ ہی روایت کی توثیق و تصدیق کرتا ہے۔ اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو میرا مقالہ "اسلامی تاریخ نگاری کے مسائل اور ان کا حل" مجلہ علوم اسلامیہ ، مسلم یونیورسٹی (ادارہ علوم اسلامیہ) علی گڑھ جلد ۱۳ ، شمارہ ۲ ۔ ۱

(۷۵) زرقانی، شرح المواہب اللدنیۃ ، بلاق ۱۸۷۴ بحوالہ مولانا مودودی، سیرت سرور عالمؐ ، دوم ص ۱۴۵

(۷۶) ابن اسحاق ص ۱۴۲ ۔ ابن ہشام میں یہ روایت نہیں بیان کی گئی ہے اور نہ ہی ان کے قبولِ اسلام کے پس منظر پر کوئی روشنی ڈالی گئی ہے۔ صرف ان کے

قبولِ اسلام ، ان کے نسب ، قبولِ اسلام کے بعد اپنے اسلام کے اظہار اور تبلیغ و دعوتِ اسلام کا چند سطری ذکر ہے۔ جبکہ ابن اسحاق نے ان کے قبولِ اسلام کے ضمن میں تین روایات بیان کی ہیں جن میں ان کے قبولِ اسلام کے پس منظر کا ذکر بھی ملتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یونس بن بکیر کی اس روایت میں حضرت ابوبکرؓ کی نسب والی روایت ابنِ ہشام نہیں ہے ۔

(۷۷) ابن اسحاق ص ۳-۱۴۲ ، ابن ہشام ، اول ص ۵۲-۲۵۰ ۔ دونوں کی یہ روایت تقریباً یکساں ہے۔

(۷۸) ابن اسحاق ص ۱۴۴

(۷۹) ابن اسحاق ص ۵۰-۱۴۹

(۸۰) ابن اسحاق ، ص ۱-۱۵۰

(۸۱) آپؐ کے خطبۂ کوہ صفا کے لیے ملاحظہ ہو نقوش رسولؐ نمبر لاہور ۱۹۸۴ء جلد ہشتم ص ۸-۱۷ ، شبلی ، اول ص ۲۱۰

(۸۲) ابن اسحاق ص ۲۲۷ ۔ ابن اسحاق نے اس روایت میں اپنی سند کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ درمیان میں حضرت ام سلمہؓ کا نام نامی لیا ہے (ص ۲۲۹) جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی سند پر بیان ہوئی ہے البتہ نجاشی کی سلطنت واپس ملنے کے ذکر کے ضمن میں حضرت ام سلمہؓ کا نام بطور سند آغاز ہی میں لیا ہے ۔

(۸۳) ابن اسحاق ص ۲۳۱ کی یہ روایت احمد بن یونس بن بکیر کی وساطت ابن اسحاق سے اور انہوں نے یزید بن رومان کے حوالہ سے عروہ بن زبیر سے نقل کی ہے ۔ اور اس کے معاً بعد حضرت جعفر کی حمایت میں روایت کی سند میں ابن اسحاق نے اوپر کے کسی راوی کا ذکر نہیں کیا ہے ۔

(۸۴) ابن ہشام، اول ص ٦-۳۳۵ نیز ملاحظہ ہو ص ۸-۲۳۷ ۔ ابن ہشام کی کسی روایت میں حضرت عثمانؓ کا حوالہ نہیں ہے ۔ مہاجرین حبشہ کی نمائندگی کرنے کا پورا شرف حضرت جعفر بن ابی طالب کو دیا گیا ہے ۔

(۸۵) مولانا مودودی ، سیرت سرورِ عالم، دوم ص ۹۳ ۔ ۵۸۸ نے حضرت ام سلمہؓ کی روایت ابن اسحاق اور امام احمد کی سند پر نقل کی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت امام احمد اور امام طبرانی کی سند پر، حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت حافظ ابو نعیم اور بیہقی کی سند پر اور حضرت جعفر کی روایت حافظ ابن عساکر اور طبرانی کی سند بیان کی ہے اور کتابوں میں سے کسی کے حوالے نہیں دیے ہیں۔

مختلف روایات میں اضافوں اور اختلافوں کے باوجود یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ تمام روایات کا منبع و ماخذ صرف ایک ہے ۔ اس پر بحث اپنے مقام پر آئے گی ۔ یہاں اشارہ کرنا کافی ہے ۔

مولانا ادریس کاندھلوی ، سیرۃ المصطفیٰؐ اول ص ۹-۲۱۵ میں حضرت جعفر کی تقریر کے لیے دلائل ابی نعیم جلد اول ص ۸۱ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت کے لیے طبرانی، مجمع الزوائد جلد ٦ ، ص ۳۱ (باب الھجرۃ الی الحبشۃ) کے علاوہ امام احمد بن حنبل کی مسند جلد اول ص ۳-۲۰۱ وغیرہ کا بھی حوالہ دیا ہے۔

مولانا شبلی ، اول ص ۸-۲۳۷ ، عبدالرؤف داناپوری، ص ۹۱-۸۹ ، سلیمان منصور پوری ، اول ص ۹-٦۸ وغیرہ سب نے ہی حضرت جعفر کی تقریر نقل کی ہے۔

(۸٦) حضرت جعفر کی تقریر کو صحیح سمجھنے والوں میں سے مولانا عبدالرؤف داناپوری نے روزہ و زکوٰۃ کو ناقلہ کہہ کر تاویل کی ہے اور بعد میں واللہ اعلم از روئے احتیاط بڑھا دیا ہے ۔ مولانا شبلی نعمانی نے اول ص ۲۴۰ حاشیہ نمبر ۱ میں تقریر حضرت جعفر کو مسند امام احمد بن حنبل اور ابن ہشام کی روایات سے کہ ان کے ثقہ راویوں کی بنا پر نقل کیا ہے اور مورخ یعقوبی کا بھی تائیدی حوالہ دیا ہے ۔ ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ حضرت جعفر کی تقریر کا ابن سعد اور طبری نے کوئی ذکر نہیں کیا ۔

ابن اسحاق کے اردو ترجمہ میں ڈاکٹر حمید اللہ کا نوٹ (ص ۲۳۱) وضاحت کرتا ہے کہ یہ تقریر اور مسلمانوں کی دربار نجاشی میں نمائندگی حضرت عثمانؓ نے کی تھی نہ کہ حضرت جعفر نے ۔ ان کی دلیل ابن اسحاق کی دو روایتیں ہیں جو متن میں بیان ہوئی ہیں۔ انہوں نے اپنے خیال کی تائید میں دلائل نہیں دیے ہیں اور نہ مفصل بحث کی ہے۔

(۸۷) امام بخاری الجامع الصحیح کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؛ مولانا شبلی نعمانی ، اول ص ۷-۴٦۳ میں ہرقل کا پورا واقعہ فتح الباری ، اول ص ۳۱ سے لیا گیا ہے، اصل بخاری کے متعدد ابواب کیف کان بدء الوحی ، کتاب الجہاد ، باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الاسلام والنبوۃ وغیرہ کا حوالہ بھی دیا ہے ۔

رولاں بارتھ

پس ساختیات کا پیش رَو

گوپی چند نارنگ

فرانس کے ساختیاتی مفکروں اور ادبی نقادوں میں رولاں بارتھ (ROLAND BARTHES) سب سے زیادہ دلچسپ، نکتہ رس اور بے باک نظریہ ساز تھا۔ وہ ایک سیماب وش باغیانہ طبیعت کا مالک تھا۔ زبان و ادب، اور ثقافت کے بارے میں روایتی تصورات کی بُت شکنی اس کی سرشت کا حصّہ تھی، اور اس میں وہ ایسی لذّت محسوس کرتا تھا جو اکثر اوقات تخلیق کی اعلیٰ ترین حدوں کو چھو لیتی ہے۔ اپنے ادبی سفر میں اس نے کئی قلابازیاں کھائیں، لیکن اس کی فکر میں بنیادی حیثیت، متن کی کثیر المعنیت کو حاصل رہی۔ وہ معنی کی وحدت اور ہر طرح کی وحدت کے خلاف تھا۔ وہ ادب کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ادب اشیاء عوامل کی معنی خیزی (SIGNIFICATION) کا پیغام ہے، محض معنی کا نہیں۔ (SIGNIFICATION) سے بارتھ کی مراد وہ عمل ہے جو طرح طرح کے معنی پیدا کرتا ہے، فقط متعینہ معنی نہیں۔ بارتھ کا کہنا ہے کہ ایک ادیب کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ یہ کہہ کر قاری کو گمراہ کرے کہ زبان کوئی صاف ستھرا یا شفاف میڈیم ہے جس کے ذریعے وہ سچّائی یا حقیقت کو جوں کا توں بیان کر سکتا ہے۔ ایک حساس اور ذمہ دار ادیب زبان کی صنعت گری کے کھیل کو سمجھتا ہے، اور اس کی بازی کھیلتا ہے۔ بارتھ بورژوا ذہن اور اس کے طور طریقوں کے سخت خلاف تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ بورژوا آئیڈیولوجی اس مجرمانہ فعل میں گرفتار ہے کہ قرأت کوئی معصوم فطری عمل ہے، اور زبان کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ اصرار کرتا ہے کہ "معنی نما" (SIGNIFIER) کو تصور معنی (SIGNIFIED) کا سنجیدہ ساجھی دار سمجھنا چاہئیے۔ تاکہ اس کی مدد سے تحریر سے بے روک ٹوک معنی پیدا ہوں۔ آواں گارد ادیبوں کا شیوہ یہی ہے کہ وہ زبان کے لاشعور کو اظہار کی سطح پر عمل آرا ہونے دیتے ہیں، تاکہ، معنی نما، آزادانہ معنی کا چراغاں کر سکیں۔ پہلے سے طے شدہ یا متعینہ معنی کی سنسر شپ ایک طرح کا جبر ہے کیونکہ اس سے متن مقید ہو جاتا ہے، اور معنی محدود ہو کر بے جان اور فرسودہ ہو جاتا ہے۔

رولاں بارتھ فرانس کے ساختیاتی ادبی نقادوں میں سب سے زیادہ اہمیت اس لیے رکھتا ہے کہ موجودہ عہد میں ادب کے بارے میں کسی مفکر نے اتنی بحثیں نہیں اٹھائیں جتنی رولاں بارتھ نے۔ ساختیات کے حوالے سے نئے نئے نکات پیدا کرنے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتا ہے۔ وہ خود بھی سوچتا ہے، اور سوچنے پر مجبور بھی کرتا ہے، وہ چونکاتا بھی ہے اور صدمہ بھی پہنچاتا ہے لیکن اس کی بات لطف و صداقت اور بصیرت سے خالی نہیں ہوتی۔ اس کو پڑھنے کا مطلب ہے ادب کے بارے میں زیادہ ذہانت سے سوچنا، اور ادب سے لُطف اندوز ہونے کے لیے پہلے سے زیادہ

حسّاس ہونا ۔ اس کی ذات سے فرانس میں خلاقانہ ادبی تنقید کا احیا ہوا ہے ، اور ادبی تنقید میں بحیثیت ایک ضابطہ علم کے تنوع بھی پیدا ہوا ۔ بارتھ نے تنقید کو دلچسپ بھی بنایا ہے ، اور پہلے سے زیادہ فلسفیانہ بھی ۔

رولاں بارتھ ساختیاتی لسانیات کی گہری بصیرت رکھتا تھا ، لیکن اس نے ساختیاتی فکر یا ادبی تنقید میں کسی نئے دبستان کی بنیاد نہیں ڈالی ۔ وہ ایسا کرنا بھی نہیں چاہتا تھا ، وہ کسی بھی دبستان سے وابستگی کے سِرے سے خلاف تھا ۔ اس کا حال ان نظریہ سازوں کا سا نہیں جو اپنی زیادہ تر قوت اپنے نظریے کے دفاع میں صرف کر دیتے ہیں ۔ اس کے برعکس رولاں بارتھ کا ذہن وسیع تر دلچسپیوں کی آماجگاہ ہے ، اور عجیب و غریب حرکیت کا حامل ہے ۔ بارتھ نے کئی موضوعات پر لکھا ، اور جس موضوع پر بھی قلم اُٹھایا ، اپنی جودت طبع اور جولانی فکر سے نئی نئی جہات روشن کر دیں ۔ اس نے اپنی ایک دلچسپ سوانح بھی لکھی ہے :

ROLAND BARTHES BY ROLAND BARTHES (1975)

جس میں سوانح کی صنف کو غیر اصل اور جعلی قرار دیتے ہوئے خود اپنا خاکہ اڑایا ہے ۔ پانچویں اور چھٹی دہائی کے بعض مفکرین کی شہرت پسندی کے ردعمل میں ہر طرح کے لیبل کو مسترد کرتے ہوئے بارتھ خود اپنے بارے میں لکھتا ہے : "وہ اپنے کسی بھی امیج کو برداشت نہیں کر سکتا ، اس لیے کچھ بھی کہلانا پسند نہیں کرتا"۔ اپنے فکری رویّوں کی رو سے وہ بنیادی طور پر ساختیاتی مفکّر تھا ، لیکن کِسی گروہ میں شامل ہونے یا توجہ کا مرکز بننے سے اسے شدید نفرت تھی ، اس لیے وہ ہر لیبل کو رد کرتا تھا ۔

ابتدائی دور

رولاں بارتھ اپنے ابتدائی برسوں میں ژاں پال سارتر سے بیحد متاثر تھا ، اور یہ اثر کافی مدت تک رہا کیونکہ رولاں بارتھ بھی اس مغربی فلسفے کا شدّت سے مخالف تھا ، جس کے رد میں وجودیت پیدا ہوئی تھی ۔ "لازمیت" (ESSENTIALISM) کے مقابلے میں وجودیت نے انسان کی اس بنیادی آزادی پر زور دیا تھا جو ہر تبدیلی کی بنیاد ہے بارتھ بھی سارتر کی طرح لازمیت اور جبریت کے خلاف ہر طرح کی بغاوت بلکہ نراجیت (انارکی) تک کا قائل تھا ۔ سارتر کی طرح وہ بھی لازمیت کو بورژوازی کا نشان سمجھتا تھا اور پوری قوت سے اس کو رد کرتا تھا جیسا کہ اس کی ایک ابتدائی بحث انگیز تصنیف MYTHOLOGIES(1957) سے ظاہر ہے ۔

لازمیت اور بورژوازی کی مخالفت میں بارتھ ایک اعتبار سے سارتر سے بھی آگے نکل گیا ، کیونکہ سارتر وحدت اور سالمیت (INTEGRITY) کا منکر نہیں تھا ، لیکن بارتھ اپنی دُھن میں بورژوازی سالمیت کے خلاف شکست و ریختَ کے فلسفے کی حمایت تک سے گریز نہیں کرتا تھا ۔ اس کا کہنا تھا ۔ انسان کی وحدت ایک طرح کا واہمہ ہے ، اگر غور سے دیکھا جائے تو ہم میں سے ہر ایک دراصل "کئی" ہے ۔ وہ وحدت کا سِرے سے قائل ہی نہیں تھا ، خُدا کا بھی نہیں ، ہر وہ چیز جو غیر مسلسل اور غیر واحد ہے ، بارتھ اس کی حمایت کرتا تھا ۔ اس کا کہنا ہے کہ سوانح اسی لیے ادب نہیں کہ وحدت

پیدا کرنے کی کوشش میں وہ جعل کا نمونہ پیش کرتی ہے اور غیر اصل ہے ۔

رولاں بارتھ ہر اس چیز کا حامی تھا جو کثیر اور مرکز گریز ، (CENTRIFUGAL) ہو ، اور ہر اس چیز کا مخالف تھا جو مائل بہ مرکز ، (CENTRIPETAL) یا واحد ہو ۔ اس فلسفیانہ سرکشی کے لیے وہ ہر خطرہ مول لینے اور کسی بھی انتہا تک جانے کے لیے تیار رہتا تھا ۔ وہ ہر اس چیز کی نفی کرتا تھا جسے اس کے عہد کی بورژوازی نے دانش حاضر کے طور پر قبول کر رکھا تھا ، بارتھ کا مرغوب ترین اظہاری حربہ قول محال ہے ۔ DOXA یعنی اشیا و صورت حال کا تسلیم شدہ تصور جسے اکثریت قبول کرتی ہو اسے بارتھ اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا ۔ وہ DOXA کو تباہ کر سکا یا نہیں ، لیکن اس نے اس کا احساس دلا دیا کہ حقیقت کا وہ تصور جسے بالعموم لوگ صحیح سمجھتے ہیں ، حقیقت کے ممکنہ تصورات میں سے محض ایک ہوتا ہے ۔

جس طرح ثقافت میں DOXA ہوتا ہے ، ادب میں بھی DOXA ہوتا ہے جس کو رد کرنا ضروری ہے ۔ چنانچہ ادب کے مقلّدانہ تصور پر بھی رولاں بارتھ نے کاری ضرب لگائی ۔ مدرسانہ تنقید اور مکتبی تنقید پر اس نے بار بار حملے کیے ۔ اگرچہ بعد میں وہ کالج دی فرانس میں پڑھانے لگا تھا ، لیکن اس نے مرتے دم تک اپنی آزادی کو برقرار رکھا ، اور کوئی پابندی قبول نہیں کی ۔

ECOLE PRATIQUE DES HAUTES ETUDES IN PARIS

سے جزوی وابستگی کی وجہ سے اُسے ہمیشہ اتنی آزادی رہی کہ بلا کسی روک ٹوک کے وہ اپنے خیالات کو آزادانہ پیش کر سکے ۔ اُسے ادبی نظریات پر چار خاص اعتراض تھے : اوّل یہ کہ ادبی تنقید میں غالب رجحان غیر تاریخیت کا ہے ، کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ متن کی ہیئتی اور اخلاقی اقدار دائمی ہیں ۔ بارتھ کبھی کیمونسٹ نہیں رہا ، لیکن ادب کی تاریخیت کے بارے میں اس کا نظریہ مارکسی نہ سہی تو نومارکسی ضرور ہے ۔ اس نے اپنے عہد کی ادبی تاریخوں کو ناموں اور سنین کا بے جان پشتارہ قرار دیا ، جن میں بقول اس کے ادب اور سماج کے معنی خیز جدلیاتی رشتے کی روح مفقود ہے ۔ اس نے اپنی اوّلین کتاب :

WRITING DEGREE ZERO (1953)

میں دکھانے کی کوشش کی کہ مارکسی نقطۂ نظر سے فرانسیسی ادب کی تاریخ کس طرح لکھی جا سکتی ہے ۔ یہ کتاب دلچسپ ضرور تھی لیکن کامیاب نہیں ہوئی ، اس لیے کہ جو بڑا مقصد رولاں بارتھ کے پیش نظر تھا ، وہ اس سے کہیں وسیع پیمانے پر تفصیلی مطالعے کا متقاضی تھا ۔ بہر حال اس کتاب کے نتیجے کے طور پر بارتھ پیرس کے بائیں بازو کے ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بن گیا ۔

مکتبی یک سطحی تنقید پر اس کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مکتبی تنقید کا نفسیات کا شعور مجرمانہ حد تک معصومانہ ہے ۔ سوانحی معلومات کی مدد سے متن کو سمجھنا اس کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا (حالانکہ اب تک بہت سے ملکوں میں اس کا چلن ہے) اس کے نزدیک ادبی متن کے عناصر کو صرف ان داخلی رشتوں کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے جو وہ

متن کے دوسرے عناصر سے رکھتے ہیں ۔ یہ نکتہ ساختیاتی فکر کا بنیادی پتھر ہے ۔ اس کا کہنا تھا کہ نفسیاتی عوامل کا سادہ لوحانہ اطلاق یوں بھی گمراہ کن ہے کیونکہ اکثر و بیشتر متن میں کوئی شدید جذبہ ، خواہش یا مایوسی ذاتی زندگی کا عکس نہیں ، کئی طرح کی کشاکش اور محرومیوں کا بدل ہوتی ہے ۔

بارتھ کا تیسرا اعتراض اور بھی شدید نوعیت کا تھا ، یعنی مکتبی تنقید متن کے صرف متعینہ طے شدہ معنی کو صحیح سمجھتی ہے اور نہایت ڈھٹائی سے اس پر اصرار کرتی ہے متعینہ معنی تو صرف لُغوی معنی ہو سکتے ہیں ، اور ادب میں اکثر و بیشتر وہ بیہودگی کی حد تک غلط ہوتے ہیں ۔ مکتبی نقادوں کے بارے میں بارتھ نے لکھا ہے کہ ان کا ذہن چھوٹا ہے اور نظر محدود ہوتی ہے ، وہ ادعائیت کا شکار ہیں ، اور ادب میں اکثریت کے علم بردار ہیں ؛ اس لیے ادب کے لطف و نشاط میں شرکت کے لیے ان کی آمریت کو تہس نہس کرنا ضروری ہے ۔ ادب فی نفسہ ابہام سے لبریز ہے اور ایک ہی فارم میں کئی معنی ساتھ ساتھ عمل آرا ہو سکتے ہیں ۔ (یہاں تک پہنچتے ہوئے بارتھ کا ساختیاتی فکری رویہ واضح ہونے لگتا ہے ، یہ اوّلین کتاب WRITING DEGREE ZERO سے واضح انحراف ہے)۔

روایتی اور مکتبی نقادوں پر بارتھ کا چوتھا اعتراض یہ تھا کہ آئیڈیولوجی کے تئیں ان کا ذہن صاف نہیں ۔ وہ ان اقدار کا بھی اقرار نہیں کرتے جن کا اطلاق وہ ادب پر کرتے ہیں ، نہ ہی وہ ان اقدار کے منطقی نتائج کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں ۔ ان کی بد عقیدگی مکمل ہے ۔ اس رویے کو رد کرنے کے لیے بارتھ نے مارکسزم کی اصطلاح MYSTIFICATION "ابلہ فریبیت" استعمال کی ہے ۔ مارکسزم کی رُو سے "ابلہ فریبیت" (MYSTIFICATION) ایک گھناؤنی سازشی نوعیت کی طاقت ہے جو تاریخی یا ثقافتی مظاہر کی اصلیت کو ظاہر نہیں ہونے دیتی ۔ اس کا جواب "ردابلہ فریبیت" (DE-MYSTIFICATION) کے سوا اور کچھ نہیں ۔

بارتھ کے پہلے اور چوتھے اعتراض سے صاف ظاہر ہے کہ اپنے شروع کے دور میں بارتھ خاصا سیاسی ادیب تھا ۔ بورژوازی کی شدید مخالفت ، روایتی اور مکتبی فکر کے خلاف اعلان جنگ ، اور ذہن و شعور کی شدید آزادی اس کی تحریروں کا امتیازی نشان ہے ، لیکن رفتہ رفتہ اس کی سیاسی لے کم ہوتی گئی ، اور ادبی لگن نمایاں ہونے لگی ۔ وہ ایک ریڈیکل دانشور ضرور تھا ، لیکن اس اعتبار سے انقلابی نہیں تھا کہ سرّیت مخالف DEMYSTIFIER ہونے کے باوصف وہ سماج کے سیاسی سے زیادہ ثقافتی پہلو میں دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ ثقافتی استحصال اور سماج کے منجمد فکری رویوں کے خلاف تھا ۔ غرضیکہ وہ تشدد کا نہیں ، دانش کی نئی روشنی کی نشاط انگیزیوں کا نقیب تھا ۔

رولاں بارتھ کی ایک اور اہم کتاب :

THE PLEASURE OF THE TEXT (1973)

ہے جس میں اس نے متن کی قرأت سے حاصل ہونے والے حظ و انبساط اور بالخصوص نشاط انگیزی کی کیفیت کو بطور ایک اصول پیش کیا ہے ۔ بارتھ کا کہنا ہے کہ ادیب ، متن اور قاری کا رشتہ اپنی نشاط کے اعتبار سے شہوانی (EROTIC)

نوعیت رکھتا ہے ۔ قرأت کے دوران "جسم" "جسم" سے بات کرتا ہے ۔ (جسم سے بارتھ ذہن کی لاشعوری کارکردگی مراد لیتا ہے) "جسم" جو ادب کا کھرا اور سچا حصہ ہے ، وہ قاری کی دسترس میں آجاتا ہے ، اور لطف و نشاط کے لیے گہرا ربطِ باہمی ضروری ہے ۔ متن (یعنی اعلیٰ فن پارے) کے تئیں قاری کے رد عمل کے لیے بارتھ دو اصطلاحیں استعمال کرتا ہے PLAISIR (PLEASURE) — اور JOUISSANCE (ENJOYMENT) ، یعنی "نشاط" اور "لذت" بارتھ کے انگریزی مترجم نے لکھا ہے کہ JOUISSANCE کے فرانسیسی مفہوم میں جنسی لذت کا اشارہ ہے ، اور بارتھ کی مراد اسی سے ہے۔ اصل متن اور اس کی سچی قرأت کا منتہا یہی کیفیت ہے یعنی حظ و انبساط کی آخری حد ، ڈوب جانے کی کیفیت ، انضمام کامل ، خود سپردگی ، گم شدگی ، یا تحیر ہی تحیر ۔ بارتھ کہتا ہے کہ لطف و نشاط اور لذت کی اس کیفیت کا بیان ممکن ہی نہیں ۔ "نشاط" کا بیان شاید ممکن ہو ، لیکن "لذت" کا صرف احساس کیا جاسکتا ہے اور بس ۔ لگتا ہے وجود کی آخری حد تک کسی شئے نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ، کچھ لے لیا کچھ دے دیا ، یعنی تاریخی ، ثقافتی ، اور نفسیاتی بنیادیں ہل گئیں ، ذائقے ، قدریں ، یادیں بدل گئیں ، یا زندگی کی روز مرّہ یکسانیت میں ہلچل پیدا ہو گئی ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گویا زبان سے ہمارے سابقے میں کچھ تناتنی ، کچھ بحران (CRISIS) پیدا ہو گیا ، یا کوئی زلزلہ آگیا۔

بارتھ قاری کو متن کی معنی خیزی کے عمل میں ، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ، آزادانہ شرکت کی پرجوش اور نشاط انگیز دعوت دیتا ہے ۔ اعلیٰ فن پارے کو پڑھنے سے جو حظ و انبساط اور لطف و نشاط حاصل ہوتا ہے ، اس کو یوں ظاہر کیا گیا ہے :

خوشی

PLEASURE

'BLISS' — 'PLEASURE'

لذت — لطف و نشاط

یعنی قرأت کے عمل کی "خوشی" میں "لطف و نشاط" اور "لذت" دونوں کیفیتیں شریک ہیں ۔ بقول بارتھ جب بھی ہم کسی سامنے کے صریحی معنی سے آگے بڑھتے ہیں تو گونج پیدا ہوتی ہے ، کوئی حوالہ کوئی نسبت ، کوئی تلازمہ کوئی رمز و اشارہ ، کوئی کنایہ کوئی معنی در معنی ، یا معنی در معنی کی کوئی دھندلی پرچھائیں، غرضیکہ متن کی سطر وار سیدھی سادی معصومیت ، ٹوٹتی ہے ، اور سطروں کے بیچ میں جو کچھ ہے، وہ بھی بولنے لگتا ہے ۔ بارتھ کا کہنا ہے کہ اس مقام پر گویا بخیہ اُدھڑنے لگتا ہے، اور لباس کے چاک سے بدن جھانکنے لگتا ہے THE PLEASURE OF THE TEXT کا مشہور جملہ ہے:

'IS NOT THE BODY'S MOST EROTIC ZONE THERE WHERE THE GARMENT LEAVES GAP ?

یعنی "کیا بدن کا وہ حصہ زیادہ جاذب نظر نہیں ہوتا ۔ جہاں ملبوس اُسے ذرا سا کھلا چھوڑ دیتا ہے" ۔ غرضیکہ یہ مقام شہوانی نشاط کا مرکز بن جاتا ہے ۔ متن میں جب بھی اظہاری پیکر روشِ عام سے ہٹ کر "اچھوتی زبان" سے ملتا ہے ، تو بین السطور روشن ہو جاتا ہے ، اور ذہن ایک ناقابل بیان "لذت" سے ہم کنار ہوتا ہے ۔

ضروری نہیں یہ ہر قاری کا تجربہ ہو ، لیکن بارتھ کو تو بورژوازی کی ثقہ روایتوں اور سماجی رکھ رکھاؤ پر ضرب لگانا ہی ہے اُس کے تصورات اور تحریروں سے بحث کرتے ہوئے یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس کا نمایاں وصف بُت شکنی ، مسلمات کو مسمار کرنا ، اور طبقۂ اشرافیہ کی مقلدانہ کھوکھلی اقدار کو بے نقاب کرنے کے جوش و ولولے سے سرشار ہونا ہے ۔

دُوسرا دور

رولاں بارتھ کی وہ تصنیف جو اس کے ادبی سفر میں ایک موڑ کا درجہ رکھتی ہے ، یا جس میں اس کے "پس ساختیاتی" فکری رویے کے واضح عناصر ملتے ہیں ، وہ S/Z ہے جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی ۔ اس سے بارتھ کی شہرت فرانس سے باہر دوسرے ممالک کے ادبی حلقوں میں بھی پھیل گئی اور اس کو انتہائی تازہ کار اور فکر انگیز ادبی نقاد کے طور پر جانا جانے لگا ۔ S/Z میں بارتھ نے بالزک کے نسبتاً غیر معروف ناولٹ (SARRASINE) کو موضوع بنا کر ادبی تجزیے اور متن کی قرأت کا نیا بصیرت افروز نظریہ پیش کیا ۔ بالزک کا انتخاب بارتھ نے سوچ سمجھ کر کیا ، کیونکہ بالزک کو بالعموم پکّا اور بنیادی نوعیت کا حقیقت نگار (ARCHETYPAL REALIST) سمجھا جاتا ہے ۔ اس تجزیے سے بارتھ کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ بڑے سے بڑا حقیقت نگار بھی جس کے بارے میں بالعموم یہ طے ہو کہ وہ بطور کھرے حقیقت نگار کے حقیقت کی "فطری" ترجمانی کرتا ہے ، وہ بھی اپنی حقیقت نگاری کے لیے ذہنی تحرک روایتی فطری زندگی سے نہیں بلکہ آرٹ سے حاصل کرتا ہے ۔ بالزک کا ناولٹ تیس صفحے سے زیادہ کا نہیں ، اس پر بارتھ نے دو سو صفحوں کی کتاب لکھی ۔ شاعری جو ایجاز و اختصار کی زبان ہے ، اس پر تو خوب خوب لکھا جاتا ہے ، لیکن فکشن کی تنقید میں بارتھ نے ایک مثال قائم کی ۔ بارتھ زبان کے اجزا کو منتشر کرنے ، پھر ان میں ربط پیدا کرنے ، اور متناقضانہ (PARADOXICAL) نکات اٹھانے میں ماہر ہے ۔ اس اعتبار سے S/Z پس ساختیاتی دور کے بارتھ کی سب سے نمائندہ اور متاثر کن تصنیف ہے ۔

S/Z کے آغاز میں بارتھ فکشن کے ان نقادوں پر تنقید کرتا ہے جو دُنیا بھر کی کہانیوں کو ایک داخلی ساخت کے تحت لا کر دیکھتے ہیں ۔ بارتھ کا کہنا ہے کہ ایسے نقاد ساخت کو کھولنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں ، کیونکہ دراصل ہر فن پارہ مختلف ہوتا ہے ۔ افتراق فن پارے کے بے مثل ہونے میں نہیں ، بلکہ اکثر فن پارے کے متنیت (TEXTUALITY) کا حصہ ہوتا ہے ۔ ہر فن پارہ پہلے سے لکھے ہوئے (ALREADY WRITTEN) ادب کے لا محدود (INFINITE) مواج سمندر سے اپنا نیا رشتہ استوار کرتا ہے ۔ بعض فن پارے متن کو آزادانہ پڑھنے کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں ، اور صرف خاص معنوں اور حوالوں پر اصرار کرتے ہیں ۔ ایک حقیقت پسند ناول ایک طرح کا "بند متن" (CLOSED TEXT) پیش کرتا ہے ۔ بعض دوسری طرح کے فن پارے قاری کو نہ صرف نئے معنی اخذ کرنے کی اجازت دیتے ہیں ، بلکہ ایسا کرنے میں اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ۔ "بند متن" پر حملہ کرتے ہوئے بارتھ کہتا ہے کہ اس

کے حامی قاری کو متن کا "صارف" (CONSUMER) سمجھتے ہیں ، جبکہ متن اور قاری کا رشتہ محض "صارف" کا نہیں ، بلکہ معنی پیدا کرنے والے (PRODUCER) کا ہے پہلی طرح کے متن کو بارتھ محض پڑھا جانے والا (LISIBLE : READERLY) اور دوسری طرح کے متن کو لکھا جانے والا یعنی تخلیق کیا جانے والا (SCRIPTIBLE : WRITERLY) کہتا ہے ۔ پہلی طرح کا متن محض پڑھنے کے لیے ہے ، جبکہ دوسری طرح کا متن گویا لکھنے کا جواز پیش کرتا ہے ۔ یہ تخلیق کا حق ادا کرتا ہے اور حظ و انبساط کا در وا کرتا ہے ، گویا دوسری طرح کا متن ایک آدرش متن ہے ۔ اس مثالی متن میں "معنی نما" کہکشاں کی طرح وارد ہوتے ہیں ، اور معنی کی نئی کائنات اُبھرتی ہے ۔ اس کا کوئی مقررہ باب نہیں ، اس میں کئی دروازوں سے داخل ہو سکتے ہیں ، کوئی آمر یہ حکم نہیں لگا سکتا کہ صرف یہی دروازہ خاص دروازہ ہے ، متن جن کوڈ (رموز) سے کام لیتا ہے وہ تاحد نظر پھیل جاتے ہیں ۔

یہ کوڈ کیا ہیں ۔ یہ ساختیاتی معنیاتی نظام کے کوڈ نہیں ۔ بارتھ کا کہنا ہے کہ جو بھی نظریاتی نظام ہم استعمال کریں ، مثلاً مارکسی ، ہیئتی ، نفسیاتی ، ساختیاتی وہ متن سے اپنی لامحدود آوازیں پیدا کرے گا ۔ بارتھ کا دعویٰ ہے کہ قاری جب مختلف نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتا ہے تو مختلف معنی پیدا ہوتے ہیں ، اور معنی کی نام نہاد وحدت فنا ہو جاتی ہے ، یعنی معنی کی وحدت ایک متھ ہے ۔ بارتھ بالزک کے سارازین کو ۵۶۱ قراتی اجزا (LEXIAS) میں تقسیم کرتا ہے ، ان میں سے بعض اجزا ایک جملے سے زیادہ کے نہیں ہیں ۔ اس کے بعد وہ ان کو باری باری پانچ کوڈ کی چھلنی (GRID) سے گزارتا ہے ۔ یہ پانچ کوڈ ہیں :

تشریحی	HERMENEUTIC
معنیاتی	SEMIC
علامتی	SYMBOLIC
عملی	PROAIRETIC
ثقافتی	CULTURAL

پہلا یعنی "تشریحی" کوڈ اس بنیادی معمے سے متعلق ہے کہ تحریر کے آغاز میں سوال اُٹھتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ یہ کون ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟ قتل کس نے کیا؟ ہیرو کا مقصد کیسے پورا ہو گا؟ وغیرہ سارازین میں معمہ LA ZAMBINELLA کی ذات کے بارے میں ہے ۔ اس سے پیشتر کہ یہ سوال حل ہو کہ وہ کون ہے (دراصل وہ ایک خصی کیا ہوا مرد یعنی جو خوجہ ہے جو کہانی میں عورت کے لباس میں ہے) ناولٹ میں ایک کے بعد ایک ایسا موڑ آتا ہے ، کہ اصلیت تک پہنچنے میں برابر تاخیر ہوتی چلی جاتی ہے ۔ دوسرا کوڈ معنیاتی ہے ۔ یہ کرداروں یا بیان کے مرادی معنی سے متعلق ہے ۔ لازمبی نیلا کا ابتدائی احوال مختلف اجزائے معنی کو بروئے کار لاتا ہے مثلاً اس کی مشکوک نسوانیت اس کی مبینہ دولت یا بھوت پریت کا واہمہ تیسرا کوڈ علامتی ہے ۔ جو معنی کے قطبینی فرق اور انٹی تھیسس کو سامنے لاتا ہے ۔ جن سے بقول بارتھ

کثیر المعنیاتی فضا پیدا ہوتی ہے ، چیزیں پلٹ جاتی ہیں ۔ اس سے جنسی اور نفسیاتی رشتوں کے وہ نمونے سامنے آتے ہیں جن میں کردار داخل ہوتے ہیں ، مثلاً سارازین سے تعارف ہوتا ہے تو اس کے باپ اور بیٹے کے علامتی رشتے میں پیش کیا جاتا ہے (وُہ ایک وکیل کا اکلوتا بیٹا تھا') ماں کے ذکر کی عدم موجودگی معنی خیز ہے (ماں کا کہیں ذکر نہیں آتا) اور جب بیٹا مصور بننے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے تو باپ نہ صرف اتفاق نہیں کرتا بلکہ مخالفت کرتا ہے ۔ علامتی کوڈ کا تفاعل اس وقت بڑھ جاتا ہے جب نرم دل مجسمہ تراش BOUCHARDON ماں کی کمی کو پورا کرتا ہے اور باپ اور بیٹے میں مصالحت کراتا ہے ۔ چوتھا کوڈ عمل کا کوڈ ہے ۔ اس کے ذریعے بارتھ عمل اور رویوں کی منطق کو نمایاں کرتا ہے ۔ یہ سلسلہ LEXIAS پچانوے سے ایک سو ایک تک چلتا ہے ۔ راوی کی سہیلی بوڑھے خوجے کو چھو لیتی ہے ، اور اس کے ٹھنڈا پسینہ چھوٹ جاتا ہے۔ انکشاف ہونے پر کھلبلی مچ جاتی ہے ۔ عزیزواقارب مارے گھبراہٹ کے دوڑتے بھاگتے ہیں ، اور لازمبی نیلا مارے ڈر کے ساتھ والے کمرے میں جاکر صوفے پر گر جاتی ہے ۔ پانچواں اور آخری کوڈ ثقافتی کوڈ ہے جو ان تمام حوالوں کا احاطہ کرتا ہے جو معلومات میں اضافہ کرتے ہیں (مثلاً جسمانی ، طبی ، نفسیاتی ، ادبی ، وغیرہ) یہ سوال اکثر اٹھایا گیا ہے کہ بارتھ نے اس تجزیے کے لیے ایک حقیقت پسندانہ متن کا انتخاب کیوں کیا ۔ دراصل متن کے اجزا کو کامیابی کے ساتھ پارہ پارہ کرنے ، ان کے معنی کو منتشر کرنے اور پھر کوڈ کے ذریعے سلسلہ در سلسلہ دکھانے سے بارتھ کا مقصد ایک حقیقت پسندانہ متن کی کلاسیکی وحدت کو تہس نہس کرنا تھا تاکہ حقیقت پسندی کی حدود کو برہنہ کیا جا سکے ۔ حقیقت پسندانہ متن سے حقیقت کی جس فطری اور مِن وعَن ترجمانی کی توقع کی جاتی ہے ، بارتھ کا معنی در معنی کا ابہام اس توقع کو نیست و نابود کر دیتا ہے ۔ خصی کرنے کے تھیم ، جنسی رول کا خلط ملط ، سرمایہ داروں کے ذرائع دولت کی پُراسراریت ، ہر شے پنہاں اور غیر نمائندہ معنی کی کھوج کی دعوت دیتی ہے ۔ بارتھ کی مسلمات کو پلٹ دینے کی شدید خواہش ، آزادہ روی اور مزاج کی کثیر المعنیت کو اور کیا چاہیے تھا ۔ لگتا ہے کہ بعد کی پس ساختیات کے بہت سے مضمر عناصر گویا اس حقیقت پسندانہ متن میں پنہاں تھے ۔ بارتھ کی باریک بیں قرأت اور جودتِ طبع نے ان کو بے نقاب کر دیا ۔

رولاں بارتھ کے پہلے دَور میں سیمیالوجی (نظامِ اشاریات) پر زور تھا ، دوسرے دور میں وہ سیمیالوجی سے رفتہ رفتہ ادب کی طرف آگیا۔ اس دوسرے دور کو اکثر مبصرین نے بارتھ کا پس ساختیاتی دور قرار دیا ہے۔ جس میں بارتھ کی توقعات اور محرکات سائنس سے زیادہ تخلیقی ہیں۔ ELEMENTS OF SEMIOLOGY (1965) میں بارتھ کا دعویٰ تھا کہ ساختیاتی طریقہ کار سے انسانی کلچر کے تمام نظام ہائے نشانات کو سمجھا جا سکتا ہے ۔ سیمیالوجی کا ماہر زبان یا کسی تحریر کو انسانی نظام ہائے نشانات میں "ثانوی نظام" (SECOND ORDER SYSTEM) سمجھتا ہے جس کا اصل نظام ما بعد اللسان (METALANGUAGE) کا کُلی نظام ہے جو تکلم یا فن پارے کا اصل الاصول یعنی (FIRST ORDER SYSTEM) ہے ۔ اس احساس میں کہ کوئی بھی مابعد اللسانی نظام زبان کے اصل الاصول کے طور پر کسی دوسرے مابعد اللسانی نظام

کو جواب وہ ہو سکتا ہَے۔ بارتھ نے ایک ایسی گردش کی جھلک دیکھ لی جو لامحدود ہو سکتی ہَے۔ اور جو مابعد اللسان کی طاقت کو بھی ختم کر سکتی ہے ۔ بارتھ کہتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ بطور نقّاد کے جب ہم قرأت کرتے ہیں تو ہم متن سے باہر قدم نکال کر ایسا موقف اختیار کر ہی نہیں سکتے جس پر بعد کی قرأتیں سوالیہ نشان نہ لگا سکیں ۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام تحریریں بشمول تنقید کے ، من گھڑت (FICTIVE) ہیں ۔ سچائی کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا ۔

ساختیاتی لسانیات کی رو سے بارتھ کا ایک مشہور قول ہے :

'Language Speaks not Man'

یعنی "زبان بولتی ہے انسان نہیں" ۔ اردو میں تو یہ اور بھی پُر لطف اور معنی خیز ہے کیونکہ لفظ "زبان" ذو معنین ہے ۔ بارتھ کی مراد ہَے کہ تکلّم زبان کے نظام کی رو سے ممکن ہے ، نظام نہ ہو تو تکلم ممکن ہی نہیں ، یعنی انسان بے زبان ہے بغیر زبان (لسانی نظام) کے ۔ پس "زبان بولتی ہے انسان نہیں" ۔ یعنی انسان جو کچھ بھی تکلّم کرتا ہے وہ زبان کے لسانی نظام کی رو سے ہے ۔ بغیر اس کے انسان بول نہیں سکتا ، "سو زبان بولتی ہے انسان نہیں" ۔ بارتھ ادب پر بھی اس صورتِ حال کا اطلاق کرتا ہے ، اور پھر قولِ محال کی زبان میں کہتا ہے :

'WRITING WRITES NOT AUTHORS'

یعنی "ادب لکھتا ہے ادیب نہیں" مراد ہے ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا ۔ اگر پہلے سے تحریر (ادب) کا وجود نہ ہو تو کوئی شاعر یا مصنف کچھ لکھ نہیں سکتا ۔ جو کچھ اگلوں نے لکھا ہے ۔ ہر فن پارہ اس پر اضافہ ہے ۔ مصنف جس ثقافت ، جس زبان ، جس ادبی روایت میں پلا بڑھا ہے ، لاکھ انحراف و اجتہاد کرے ، وہ لکھے گا اُسی ادبی روایت کی رو سے ۔ کوئی فن پارہ اپنے ثقافتی نظام ، اور ادبی نظام سے باہر نہ آج تک لکھا گیا ہے نہ لکھا جا سکتا ہے ۔

رولاں بارتھ امریکہ کی نئی تنقید کے سخت خلاف تھا ۔ "نئی تنقید" پر سب سے شدید اور فلسفیانہ طور پر مضبوط وار بارتھ ہی نے کیا ۔ اس کا کہنا ہے کہ "نئی تنقید" کا ذہنی رویہ "موضوعیت" کا ہے ۔ یعنی بقول بارتھ نئی تنقید کے نزدیک ادب ان اشیا اصولوں ، ہیئتوں اور کارناموں کا مجموعہ ہے جس کا کام سماج کی عمومی معاشیات میں "موضوعیت" کو مضبوط کرنا ہے" (ONRACINE, 171-2) نئی تنقید کا اصل الاصول ہے کہ بحث چھپے ہوئے لفظ تک محدود رہنا چاہئیے ۔ بارتھ اس کے سخت خلاف ہے ، اور وہ رچرڈز کے "متن" اور "متنِ محض" کے نظریے کو حقارت سے رد کرتا ہے ۔ بارتھ کا کہنا ہے کہ "معصوم" (INNOCENT) قاری جس پر رچرڈز کے PRACTICAL CRITICISM کا انحصار ہے اس کا کہیں وجود نہیں ۔ بارتھ کا اصرار ہَے کہ صفحے پر چھپے ہوئے لفظ سے معنی اخذ کرنے کا عمل خلا میں نہیں ہوتا ۔ قرأت (READING) کا عمل ایک پیچیدہ اور تہ دار عمل ہے ۔ اس دَوران معاشی ، سماجی ، جمالیاتی اور سیاسی تصورات اور اثرات کے پورے سلسلوں کا عمل در عمل جاری رہتا ہے جس سے متن کے تئیں ہمارا ردّ عمل مرتب ہوتا ہے ۔ قرأت کے عمل کی پیچیدگی اور اہمیت سے انکار کرنا خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے ۔ بقول بارتھ معروضی متن یا متن کے پہلے طے شدہ معنی ہرگز کوئی وجود نہیں رکھتے :

'THERE EXISTS NO 'OBJECTIVE' TEXT AND NO PRE-ORDAINED 'CONTENT' STORED WITHIN IT".

.(p. 154)

بارتھ کا کہنا ہے کہ "تمام تنقیدی رویے اور فیصلے در اصل کسی نہ کسی تہہ در تہہ سیاسی اور معاشی آئیڈیولوجی کی نقاب ہیں ۔ کوئی غیر جانب دار اور معصوم تنقیدی موقف ممکن نہیں :

"ALL CRITICAL POSITIONS AND JUDGEMENTS IN FACT MASK A COMPLEX POLITICAL AND ECONOMIC IDEOLOGY, THERE IS NO NEUTRAL OR INNOCENT CRITICAL POSITION." (p. 154).

باکس نے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بارتھ کا یہ نکتہ مارکسی نظریے سے ملتا جلتا ہے ، کیونکہ مارکسی نظریے کی رو سے بھی "نئی تنقید" سرمایہ داری کی نظریاتی توسیع ہے ۔ لیکن دونوں کے فلسفیانہ محرکات الگ الگ ہیں ۔

رولاں بارتھ اور دوسرے ساختیاتی مفکرین فن پارے کا کُل TOTAL معنیاتی توجیہات کو جو بھی فن پارے کے حوالے سے پیدا ہوتی ہیں قبول کرتے ہیں ۔ فن پارہ معروضیت ، یا ٹھوس حقیقت کی نام نہاد تحدید سے کہیں آگے جاتا ہے فن پارے کا وجود صرف وہ ہرگز نہیں جو دکھائی دیتا ہے ۔ غرض "نئی نئی تنقید" ادب کے اس جوہر سے ہم کلام ہونے میں کوشاں ہے جس میں معنی "معنی نما" سے فروغ پاکر معروضیت اور صداقت کو مقصود نہیں بناتے بلکہ اپنے وجود اور ارتباط کا جواز فراہم کرتے ہیں ۔ اس فکری رویے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ساختیات نقّاد کو ایک نئی اہمیت اور نیا کردار عطا کرتی ہے ۔ نقّاد فن پارے کا محض تماشائی نہیں ہے ۔ نہ تو فن پارہ کوئی تیار شدہ (READY-MADE) مال ہے نہ نقّاد محض اس کا صارف (CONSUMER) ہے ۔ ساختیات کے نزدیک نقّاد فن پارے کو اپنی قرأت (READING) سے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ نقّاد کے لیے ضروری نہیں کہ وہ نیازمندانہ طور پر فن پارے کے احکامات کے آگے سر جھکا دے ۔ اس کے برعکس نقّاد عملی طور پر معنی کی تعمیر کرتا ہے ۔ وہ فن پارے کو "موجود" بناتا ہے ۔ بارتھ کا کہنا ہے :

"THE CRITIC ACTIVELY CONSTRUCTS THE MEANING, HE MAKES THE WORK EXIST: THERE IS NO RACINE EN SOI, RACINE EXISTS IN THE READINGS OF RACINE, AND APART FROM THE READINGS THERE IS NO RACINE." (p. 157)

یعنی "غالب وہی ہے جو شعر غالب یا خطوط غالب کی قرأت میں موجود ہے ، متنِ غالب کی قرأت سے ہٹ کر کوئی غالب نہیں ہے ۔ مزید یہ کہ کوئی بھی مدلّل قرأت غلط نہیں ہوتی ۔ ہر قرأت فن پارے کے وجود کا حصہ بن جاتی ہے ۔ چنانچہ کسی بھی فن پارے کے وجود میں ہر وہ چیز شامل ہے جو ادبی روایت میں اس کے بارے میں موجود ہے ۔ کوئی فن پارہ فنا نہیں ہوتا ۔ بارتھ کا ایک اور اہم بیان ہے :

"A WORK IS ETERNAL NOT BECAUSE IT IMPOSES A SINGLE MEANING ON DIFFERENT MEN, BUT BECAUSE IT SUGGESTS DIFFERENT MEANINGS TO A SINGLE MAN, SPEAKING THE SAME SYMBOLIC LANGUAGE IN ALL AGES; THE WORK PROPOSES, MAN DISPOSES." (p.157)

رولاں بارتھ کی پس ساختیاتی فکر کا بہترین اظہار اس کے مختصر مضمون: "THE DEATH OF THE AUTHOR" میں ہوا ہے ۔ وہ اس روایتی تصور کو سختی سے مسترد کرتا ہے کہ مصنف متن کا مبدا ہے ، یا معنی کا ماخذ ہے ، یا فن پارے کی تصریح و تعبیر کا واحد اختیار مصنف کو ہے ۔ اولاً خیال یہ تھا کہ بارتھ کا موقف "نئی تنقید" کے حامیوں سے مختلف نہیں جو متن کی آزادانہ حیثیت پر اصرار کرتے ہیں ، اور فن پارے کو خود مکتفی قرار دیتے ہیں ، یعنی فن پارے کی معنویت خود اس کی ساخت میں ہے نہ کہ مصنف کے منشا میں ۔ لیکن در حقیقت اس نظریے میں بھی مصنف کی ذات چور دروازے سے داخل ہو جاتی ہے ، یعنی فن پارہ ایک پیچیدہ لسانی شبیہ یا نشان (ICON) ہے جو مصنف کے تصور حقیقت (WORLD-VIEW) کو ظاہر کرتا ہے ۔ بارتھ کا نظریہ اس طرح کے "تصوراتِ انسانیہ" (HUMANISTIC NOTIONS) کے بالکل خلاف ہے اور انتہائی ریڈیکل ہے ۔ بارتھ نے مصنف سے اس کا مابعد الطبیعیاتی لبادہ اُتروا کر الگ رکھوا دیا ، اور اُسے ایک ایسے دوراہے پر کھڑا کر دیا جہاں زبان اور اظہار کی لامحدود آوازیں ، ان کا شور ، اور ان کی صدائے بازگشت موج در موج ایک دوسرے کو زیروزبر کرتی ہوئی معنی کی قوسِ قزح پیدا کرتی ہیں ۔ چنانچہ قاری جس طرف سے بھی چاہے متن میں داخل ہو سکتا ہے ، کوئی ایک راستہ ، کوئی ایک دروازہ ، خاص دروازہ نہیں ہے ۔ بارتھ کا اصرار تھا کہ قاری متن کی معنی خیزی کے عمل میں برابر کی شرکت کے لیے آزاد ہے ، بغیر "معنی نما" کی آمرانہ بندش محسوس کیے قاری زبان کی سلطنت کے مقامات کا مظہر ہے ، اور وہ معنی کے کسی بھی نظام سے متن کو وابستہ کرنے ، اور مصنف کے منشا کو نظر انداز کرنے میں کلیتاً آزاد ہے ۔

بارتھ کا موقف کئی اعتبار سے صدمہ پہنچاتا اور فکر کو انگیز کرتا ہے : "FROM WORK TO TEXT" میں بارتھ کہتا ہے "متن بلاشبہ لفظوں کا مجموعہ ہے لیکن یہ اس طرح معنی نہیں رکھتا جس طرح لفظ سے معنی مراد لیے جاتے ہیں ۔ عام طور پر متن معنی کو لامحدود طور پر التوا میں رکھتا ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ متن جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ ناقابلِ اظہار ہے ، بلکہ یہ کہ متن "معنی نما" کی آتش بازی ہے ۔ یہ پارہ زبان ہے جو ساخت رکھتا ہے ، لیکن بغیر مرکز کے جس کا کوئی اختتام نہیں" (ص ۷۶)

"TEXT IS LIKE A PIECE OF LANGUAGE, STRUCTURED, BUT DECENTERED, WITHOUT CLOSURE"

بارتھ کہتا ہے کہ متن کی "کثیر المعنیت" ناقابلِ تخفیف ہے ، اور اس کی وجہ اس کی حوالگی ، تلازمے ، اور مناسبتیں ہیں ، جو ایک متن میں دوسرے متون کے ساتھ پائی جاتی ہیں ۔ بارتھ اس رشتے کو INTERTEXTS کہتا ہے جس میں کوئی بھی متن واقع ہوتا ہے ۔ "یہ حوالوں سے گندھا ہوا ہوتا ہے بغیر حوالوں کے واوین کے جن کی صدائے بازگشت بین السطور گونجتی رہتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی متن کی کوئی دو قراتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں ، کیونکہ متن کئی دوسرے متون کے ساتھ گھلا ملا رہتا ہے ۔ بارتھ یہ بھی کہتا ہے کہ مصنف یا اس کے منشا کو معنی خیزی کے عمل میں کوئی دخل نہیں ۔ بارتھ کا مشہور قول ہے کہ "متن اپنے والد کے دستخط کے بغیر پڑھا جاتا ہے" ۔ (ص ۷۸)

'THE TEXT IS READ WITHOUT THE FATHER'S SIGNATURE'

رولاں بارتھ کی حیثیت ساختیاتی اور پس ساختیاتی مفکرین کے درمیان ایک کڑی کی اسی لیے ہے کہ اس کی آزادہ روی، نشاط انگیزی، بُت شکنی اور باغیانہ سرشت نے کلاسیکی ساختیات کی سائنسی معروضیت پر کئی سوال قائم کیے، اس کی آمریت کو للکارا، اور تازگیٔ فکر کی نئی راہ کھول دی۔ اس روش کے عام کرنے میں بارتھ کے متعدد معاصرین بھی پیش پیش تھے۔ ان کے تازہ کارانہ اور مجتہدانہ فکری رویوں کو "پس ساختیات" کا نام دیا جاتا ہے۔

مصادر

1. ROLAND BARTHES, WRITING DEGREE ZERO (PARIS 1953); (LONDON 1967; NEW YORK, 1977)
2. ROLAND BARTHES, MYTHOLOGIES (PARIS 1957); (LONDON 1972).*
3. ROLAND BARTHES, ON RACINE (PARIS 1963); NEW YORK 1964).
4. ROLAND BARTHES, ELEMENTS OF SEMIOLOGY, (PARIS 1965); (LONDON 1967; NEW YORK 1977).
5. ROLAND BARTHES, SYSTEMEDE LA MODE (PARIS 1967).
6. ROLAND BARTHES, S/Z (PARIS 1970); (NEW YORK 1974; LONDON 1975).*
7. ROLAND BARTHES, THE PLEASURE OF THE TEXT (PARIS (1973) (NEW YORK 1975; LONDON 1976).*
8. ROLAND BARTHES, ROLAND BARTHES BY ROLAND BARTHES (PARIS 1975); (LONDON & NEW YORK 1977).
9. TERENCE HAWKES, STRUCTURALISM AND SEMIOTICS (LONDON 1977), SECTION ON BARTHES, Pp. 106-22, 151-60.*
10. RAMAN SELDEN, CONTEMPORARY LITERARY THEORY (SUSSEX 1985), SECTION ON BARTHES, Pp. 74-78.*
11. ROBERT SCHOLES, STRUCTURALISM IN LITERATURE (YALE 1974), SECTION ON BARTHES, Pp., 148-56.*
12. JOHN STURROCK, EDT., STRUCTURALISM AND SINCE (OXFORD 1979), SECTION ON BARTHES, Pp. 52-80.*

حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

از: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم و علیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرّہ: اللہ تعالیٰ کا نام لے کر حضرت قدس سرّہ کے حالات جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اُس کی رحمت پر تکیہ کر کے قلم اُٹھاتا ہوں ۔ السعی منّی والاتمام من اللہ ۔

آپ کابل میں ۹۷۱ھ یا ۹۷۲ھ میں پیدا ہوئے (۱) ۔ اسمِ مبارک محمد الباقی خود آپ نے اپنے کئی رقعات (۷۔۸۔۳۸۔۴۳) میں لکھا ہے (۲) ۔ آپ کے والد قاضی عبدالسلام سمرقندیؒ "اربابِ فضل و صفا" میں سے تھے۔ ۹۷۸ھ میں جب مُلّا صادق حلوائیؒ ، حج سے واپسی پر کابل ہوتے ہوئے اپنے وطن سمرقند جانے لگے تو ہمایوں کے چھوٹے بیٹے مرزا محمد حکیم (م ۹۹۳ھ) نے جو کابل کا حکمران تھا اور درویشوں اور عالموں سے بہت محبت رکھتا تھا، اُن کو درس و تدریس کے لیے وہاں روک لیا۔ حضرت خواجہؒ بھی اُن کے درس میں جانے لگے۔ لیکن جب وہ کابل چھوڑ کر سمرقند (ماوراء النہر) جانے لگے تو اُن کے ساتھ حضرت خواجہؒ بھی چلے گئے اور علوم متداولہ کی تحصیل کرتے رہے۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی (م ۱۰۰۶ھ) اُن کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اِن دنوں وہ (مُلّا صادق حلوائیؒ) ماوراء النہر میں درس و تدریس میں مصروف ہیں۔ شعر کا بڑا اچھا سلیقہ ہے اور ادبی ذوق نہایت بلند ہے" (۳) ۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی نے اپنی یہ تاریخ ۱۰۰۴ھ میں مکمل کی۔ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے تک یا اس کے بعد بھی مُلّا صادق حلوائی ، سمرقند ہی میں رہے ہوں اور وہیں کسی وقت حضرت خواجہؒ کو اُن کی خدمت ہی میں شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا ہو گا۔

اس ذوق کی شہادت "مثنوی قبل از زمانِ درویشی" سے ملتی ہے جو بحرِ سریع مسدس مسطوی موقوف جیسی مشکل زمین میں ہے اور جو بلند ذوق والا ہی لکھ سکتا ہے۔ یہ مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے:-

من نہ چُنینم کہ نمودِ من است   جائے دگر رقص وجودِ من است
نقطۂ محرابِ جماعت منم   دانۂ سیرابِ زراعت منم
ابروی پیشانی من دلکش است   قطرۂ نیسانی من آتش است
عقل نمک ریزِ کبابِ من است   خونِ جگر نامِ شرابِ من است
مردمکِ دیدہ بہ بندوئی ام   گوش نصیحت بہ رضا جوئی ام

ایسے لطیف استعارے اور دلکش ترکیبیں معمولی استعداد والا شخص استعمال نہیں کر سکتا۔ حضرت خواجہؒ نے سمرقند میں چونکہ علومِ متداولہ کی تکمیل سے پہلے ہی اپنے اندر تصوّف کا ذوق بھی پیدا کر لیا تھا (جیسا کہ مذکورۂ بالا مثنوی سے بھی ظاہر ہے) اور جذباتِ الٰہیہ آپ کے قلب پر شدّت کے ساتھ مستولی ہو چکے تھے ۔ اس لیے آپ کو اندازہ ہو گیا

تھا کہ :- ع قطع این راہ بزپاے جُنوں نتواں کرد مرزا محمد حکیم کے زمانے میں خواجہ عبید کابلی (جو مولانا خواجگی کاسانیؒ المتوفی ۹۴۹ھ کے خلیفہ مولانا لطف اللہ المتوفی ۹۷۹ھ کے (۴) خلیفہ تھے) طالبانِ طریقت کی تعلیم میں مشغول تھے۔ اس کے بعد وہ ہندوستان بھی تشریف لائے تھے۔ مرزا محمد حکیم (م ۹۹۳ھ) نے ایک مذہبی فرمان کے تحت اُن کو صوبۂ تبت میں لوگوں کی تربیت کے لیے بھیجا۔ وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ اس طرح ظاہر ہے کہ ۹۹۳ھ سے پہلے بھیجا ہوگا اور حضرت خواجہؒ نے جب اُن سے بیعت کی ہوگی تو آپ بہت کم عمر رہے ہوں گے۔ پھر آپ سمرقند میں افتخار شیخؒ کی خدمت میں پہنچے (۵) جو خواجہ احمد یسوی (۶) تُرکستانیؒ (م ۵۶۲ھ) کے خاندان سے تھے۔ وہ آپ کی توبہ و انابت پر راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ

"تم ابھی جوان ہو" ۔ لیکن آپ کا ارادہ پختہ تھا، اس لیے مجبوراً فاتحہ پڑھی اور فرمایا "خدا استقامت عطا فرمائے" آخر کار اُن کی فراست صحیح ثابت ہوئی اور آپ کی عزیمت ڈانوا ڈول ہو گئی۔ پھر آپ بغیر تصنّع و اختیار کے حضرت امیر عبد اللہ بلخیؒ کی خدمت میں پہنچے اور اُن سے تجدید بیعت کی اور مصافحہ کرتے ہی نعمتِ غیر مترقّبہ حاصل ہوئی۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ مؤلّف حضرات القدس نے خواجہ محمد صدیق بدخشیؒ کی زبانی حضرت خواجہؒ کی سیاحت کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے کہ "آپ نے بیعتِ توبہ خواجہ عبید کابلی قدس سرّہ سے کی (جو مولانا لطف اللہ کے خلیفہ تھے اور وہ مولانا خواجگی کاسانی و بیبدیؒ کے خلیفہ تھے) ۔ لیکن خیالِ رجوع اور عزمِ ترک ، باطن میں مخفی تھا اور توفیقِ استقامت (اُس وقت) پیدا نہیں ہوئی تھی، اس لیے دوسری بار افتخار شیخؒ کی خدمت میں توبہ و انابت کی ۔ آپ سمرقند میں تشریف رکھتے تھے اور خانوادۂ خواجہ احمد یسوی قدس سرہ کے اکابر میں سے تھے ۔ اگرچہ آپ اس توبہ (بیعت) کی اجازت نہیں دے رہے تھے اور فرمایا کہ "تم ابھی جوان ہو لیکن چونکہ ارادہ پختہ تھا اس لیے حضرتؒ نے فاتحہ پڑھی اور فرمایا کہ خدا استقامت دے۔ اس بزرگوار کے ارشاد کے مطابق یہ عزیمت پھر فسخ ہو گئی اور عجیب و غریب خرابیاں پیدا ہوئیں۔ تیسری بار بغیر ارادہ و اختیار کے حضرت امیر عبد اللہ بلخی قدس سرّہ (۷) کے ہاتھ پر توبہ کی۔ تجدید ظاہر ہوئی اور اس مرتبہ کی توبہ جو مصافحہ کے ساتھ تھی بامعنی نصیب ہوئی۔ امید ہے کہ اس کی برکات قیامت تک باقی رہیں گی۔ البتہ کچھ مدت تک یہ توبہ نگہداشت کی حدود میں رہی مگر اس پر بھی اسم المضِلّ کی تاثیر غالب آگئی۔ آخر کار اللہ تعالیٰ کی عنایت سے (خواب میں) حضرت خواجہ بزرگ بہاء الدین قدس سرّہ العزیز کی خدمت میں صورتِ توبہ منعقد ہوئی اور طریقۂ اولیاء میں داخلی، ظہور میں آئی ۔ بمصداق اس کے کہ الغریق یتعلّقُ بِکُلِّ حَشِیْش (ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے) میں ہر طرف ہاتھ مارتا تھا، آخر کار بعض بزرگوں نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ذکر متصل ہو کر پہنچتا ہے وہی سود مند ہے چنانچہ یہ آرزو ہوئی کہ اسی بزرگ سے ذکر و مراقبہ کا طریقہ اخذ کیا جائے۔ پس دو سال تک اسی مخدوم کے سلسلے کے ذکر و مراقبہ اور اوراد کو قائم رکھا۔ اور میں کہیں سُن چکا تھا کہ جب تک سالک قریب چالیس سال تک لاالٰہ کے میدان کو طے نہیں کر لیتا وہ الا اللہ کی منزل تک نہیں پہنچتا اور میری سادہ لوحی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جتنا

وقت ذکر و مراقبہ میں لگ سکے بہت غنیمت ہے اور اسی صورت میں قناعت چاہیے" (۸)

اس کے بعد حضرت خواجہؒ ہندوستان تشریف لائے اور لاہور میں قیام کیا۔ اوپر کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ عبید کابلیؒ سے بیعت کے بعد افتخار شیخؒ سے بیعت چاہی اور انہوں نے فرمایا کہ "تم ابھی جوان ہو" تو اُس وقت آپ کی عمر ۱۸۔ ۲۰ سے کیا کم ہوگی؟ یعنی یہ زمانہ ۹۹۱ھ سے پہلے کا نہ ہوگا ۔ پھر تیسری بار جب آپ نے امیر عبداللہ بلخیؒ سے بیعت کی اور پھر دو سال تک نقشبندی سلسلے کا ذکر و مراقبہ کیا تو وہ زمانہ ۹۹۴ھ کا ہوگیا ہوگا۔ اسی زمانے میں آپ لاہور تشریف لائے ہوں گے اور یہی وہ زمانہ ہے جبکہ اکبر لاہور میں (۹۹۴ھ تا ۱۰۰۷ھ) تھا۔ یہاں آپ کے بعض "اقران" چاہتے تھے کہ آپ کو "ارباب عسکر" میں شامل کرادیں ۔ لیکن آپ نے ناپسند فرمایا۔ محمد غوثی نے گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ کے روزینہ مصارف کی ذمہ داری شیخ فرید بخاری نے لے لی جو اکبر کے بخشی بیگی تھے اور نہایت غریب دوست تھے۔ یہیں آپ نے "سابق برگزید گانِ خدائی بارگاہ" کے پُرانے تذکرے پڑھے تو "سلوک کی شورش آپ کے باطن میں اُٹھی۔" (۹) اور ایک مرتبہ آپ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ از خود رفتہ ہوگئے ۔ پھر حضرت بہاءالدین نقشبندی بخاری قدس سرہٗ کی روحانیت سے تلقین ذکر اور القائے جذبات سے سرفراز ہوئے۔ اس لیے اہلِ اللہ کی تلاش در تلاش کا جذبہ اور بھی قوی ہوگیا۔ لاہور میں اُس وقت سخت کیچڑ پانی کا زمانہ تھا۔ لیکن آپ ایک مجذوب کے پاس ایسے ہی موسم میں پہنچے ۔ وہ گالیاں دیتا، پتھر مارتا اور کبھی ناراض ہوکر دوسری جگہ چلا جاتا۔ لیکن آخر کار وہ مہربان ہوا اور دعا دینے لگا۔

ع سنگہا دیدہ و دل از شیشۂ سے روی نتافت

۹۹۹ھ میں اکبر نے کشمیر کے میرزا یادگار کی سرکوبی کے لیے شیخ فرید بخاریؒ وغیرہ کو بطور ہراول وہاں بھیجا تھا۔ ممکن ہے کہ اُنہی کے ساتھ حضرت خواجہؒ بھی وہاں تشریف لے گئے ہوں اور وہاں بابا والیؒ تُرکستانیؒ کے پاس رہے ہوں۔ وہ بھی سلسلہ نقشبندیہ میں مجاز تھے ۔ اُن کی وفات ۱۵ صفر ۱۰۰۱ھ کو ہوئی ۔ "شیخِ کامل" (۱۰۰۱ھ) اُن کی تاریخ ہے۔ (۱۰)

کشمیر سے واپسی پر آپ ضلع میرٹھ کے مقام گڑھ مکیتسر بھی تشریف لے گئے اور وہاں سلسلہ عشقیہ شطّاریہ کے بزرگ خواجہ اللہ بخشؒ (ماہ رمضان ۱۰۰۲ھ) سے بھی نیازمند ہوئے ۔ (۱۱) حضرت خواجہؒ نے اُن کے متعلق لکھا ہے کہ وہ "محبوبِ حق و مجذوبِ وجہِ مطلق میر سید علی قوام جونپوریؒ (م ۹۵۰ھ) کے مُرید تھے (۱۲)۔

پھر آپ (غالباً ۱۰۰۲ھ کے اواخر میں) دہلی تشریف لائے اور چشتیہ سلسلے کے بزرگ شیخ عبدالعزیزؒ (م ۹۷۵ھ) کی خانقاہ میں اُن کے صاحبزادے قطبِ عالمؒ (م ۱۰۲۴ھ) کے نیازمند ہوئے۔ غالباً آپ کا یہ قیام دہلی میں پہلی بار ہوا تھا اور ممکن ہے کہ ۱۰۰۳ھ کے اوائل تک رہا ہو۔ اس عرصے میں آپ کا حلقۂ عقیدت بہت وسیع ہوگیا ہوگا۔

کشمیر سے واپسی پر دہلی کے قیام کا ذکر حضرت خواجہؒ کے خود نوشت حالات میں نہیں ہے۔ بابا والیؒ کی وفات

کے بعد کا حال خود حضرت خواجہؒ نے اس طرح لکھا ہے کہ :- "آپ کی وفات کے بعد حضراتِ خواجگان کی عینیتِ معہودہ کا ظہور ہوا اور ان بزرگوں کی ارواح طیّبات سے بشارات شروع ہوئیں اور انہوں نے تلقینات فرمائیں ۔ پس اُن کی توجّہ کی برکت سے اس نسبت میں قوت پیدا ہو گئی اور دائرۂ عینیت میں وسعت ہوئی۔ راستہ زیادہ روشن ہوا اور فی الجملہ جمعیت حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ اُن کی عنایت کی کشش نے مجھے مخدومی حقائق پناہی ، ارشاد دستگاہی حضرت مولانا خواجگی امکنگی قدس اللہ سرّہ العزیز کی خدمت میں پہنچادیا۔ اور آپ ہی کے ہاتھ پر بڑی رغبت اور شغف کے ساتھ بیعت کی اور خواجگانِ نقشبندیہ کا طریقہ اخذ کیا اور حضرتؒ کے طفیل میں اور حضرت خواجہ نقشبندؒ اور اُن کے خلفاء کی ارواح طیّبات کے طفیل میں اس راہ کے افتادگان اور نیازمندان میں داخل ہوا"

اس عبارت میں یہ ذکر نہیں ہے کہ کشمیر سے واپسی پر آپ دہلی اور لاہور میں بھی قیام پذیر رہے۔ لیکن دہلی میں قطب عالمؒ سے نیاز مندی کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ نے انفاس العارفین میں یہ بھی لکھا ہے کہ اُن سے آپ نے (ابتدائے سلوک میں) کچھ کتابیں بھی پڑھی تھیں (۱۳) اور اُنہی کے ارشاد کے مطابق آپ پیر ظاہر سے بیعت کے لیے ماوراء النہر تشریف لے گئے تھے ۔ دھلی سے آپ (۱۴) لاہور (مع رفقاء) تشریف لے گئے۔ زبدۃ المقامات میں آپ کے یہ اشعار نقل ہوئے ہیں جن سے آپ کی اُویسیت ظاہر ہوتی ہے:-

شنیدستم کہ مشتاقانِ درگاہ — طلب کارانِ سرِّ لی مع اللہ
خصوصاً کاشفِ رازِ نہانی — ابوالقاسم چراغ گورکانی
بخلوت در ہدایت کارش ایں بود — انیس خاطر افکارش ایں بود
کہ بودش وردِ جان نامِ اُویسش — کہ باشد شرب از جامِ اُویسش
اُویس آسا ازاں بحرِ عنایت — مگر بے واسطہ یا بدخدایت
کیم من کیں ہوس گیرد دماغم — بیابد نور ایں سودا چراغم
دل از ذکر اُویسم شاد گردد — دماغم زیں ہوا آباد گردد
دریں رہ قدرِ خود چنداں نہ دانم — کہ در دل نخلِ ایں سودا نشانم
زبانم زیں تلفظ گرچہ بند است — سرم بے خواست صیدِ این کمند است
دل اندر شرم و جاں سرگرم این است — کہ جاناں رحمۃ للعٰلمین است (۱۵)

لاہور ہی کے زمانۂ قیام کا یہ واقعہ ہے کہ ایک مسجد میں فرض نماز پڑھتے وقت ایک مُہیب آواز آپ کے سینے سے نکلی جس سے تمام نمازی حیرت میں ہو گئے۔ نماز کے بعد حضرت خواجہؒ جلد ہی مسجد سے باہر چلے گئے، پھر اپنی قیام گاہ پر دو تین تعلّق والوں کے ساتھ ہی جماعت پڑھنے لگے۔ ان مقتدیوں میں سے ایک نے خواجہ محمد ہاشمؒ کو بتایا کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ حضرت کا رُخ تو قبلہ کی طرف ہے لیکن ہماری طرف بھی آپ کی نظریں ہیں۔ میں یہ حالت دیکھ کر کانپنے

لگا۔ (خواجہ محمد ہاشمؒ کہتے ہیں کہ حضور انور صلّی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہمہ وقت تھی)۔

لاہور سے پھر آپ ماوراء النہر کے لیے روانہ ہونے لگے تو دہلی سے شیخ الٰہ داد (م ۱۰۵۱ھ) لاہور آ گئے اور آپ کے رفقاء، (اعزہ) کی خدمت اپنے ذمہ لے لی۔ حضرت خواجہؒ کے رقعہ نمبر ۴۴ میں ہے:۔

دریں روزہا داعیہ سیرِ ولایت (ماوراُ النہر) قوی گشتہ ۔ امید است کہ بعد از چند روز دیگر متوجہ شویم۔ خدمت میاں شیخ الٰہ داد خویشتن داری کردہ خود را بودن و ماندن قرار دادہ ۔ طوبیٰ لمن یکون معہ فیفوز فوزاً عظیما ۔

داغ بے یاری و درد بے دلی ایں ہمہ بر خود پسندیدم و رفت

معلوم نہیں اس رقعہ کا مکتوب الیہ کون تھا۔ اغلب ہے کہ خود جامع ملفوظات و رقعات ہی تھے۔ اس رقعہ میں مذکورہ بالا عبارت سے پہلے آپ نے اُن کو اپنی والدہ کی خدمت کے لیے بھی فرمایا ہے اور یہ کہ "مرضی والی نعمت آنست کہ خود را بجانب کابل کشند و بجہتِ شماد و معاشی بلد اِو آشنایاں در آن جانب بگیرند ۔ چنانچہ بہ مرزا کوکہ و والدۂ ایشاں و بعضے از عوراتِ دیگر ایں معنی را ظاہر ساختہ اند ۔۔۔" ۔ اس عبارت میں "ولی نعمت" سے اگر مراد اکبر ہے تو ۱۰۰۳ھ کے لگ بھگ اُس کا کابل جانا تاریخ میں مذکور نہیں۔ تاہم اس عبارت سے صاف طور پر واضح ہے کہ حضرت خواجہؒ کا تعلق دربار شاہی سے (خواہ شیخ فرید بخاری کی وجہ سے) بہت قریب کا ہو گیا تھا (۱۶) مرزا کوکہ نے ۱۰۰۲ھ میں حج کیا تھا ۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ۱۰۰۳ھ کے اوائل سے پہلے وہ ہندوستان میں نہ ہوں گے۔ بہر حال اس کے بعد حضرت خواجہؒ ماوراءالنہر کے سفر پر روانہ ہوئے ہوں گے۔ (۱۷) پہلے آپ بلخ پہنچے جس کا ذکر رقعہ ۵۷ میں ہے۔ وہاں مُلّا آکہ (مولانا شبر غانی المتخلص ابن یمین (م ۱۰۰۴ھ) سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی خواجہ عبید کابلیؒ کی طرح مولانا لطف اللہ (م ۹۷۹ھ) کے خلیفہ تھے۔ اس رقعہ میں ذکر ہے کہ وہ اُن دنوں اپنا دیوان مکمل کر رہے تھے ۔ حضرت خواجہؒ نے اُن کے طریقے کو بہت پسند کیا۔ (۱۸)

حضرات القدس (۱/۲۶۷۔ ۲۶۸) میں ہے کہ حضرت خواجہؒ کو دو مسئلے (اس راہِ سلوک کے) درپیش تھے جو کسی طرح (اور کسی بزرگ کے یہاں) حل نہ ہوتے تھے۔ "حضرت خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہ نے واقعے میں فرمایا تھا کہ جو شخص ان مسئلوں کو حل کر دے گا وہی تمہارا پیر ظاہر ہو گا۔ اس بناء پر آپ جس بزرگ کی خبر سُنتے اُس کی ملاقات کے لیے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ نے بکثرت مشائخ سے اسی وجہ سے ملاقات کی تھی۔ لیکن اُس اشکال کا حل کسی ارباب کمال سے نہ ہو سکا تھا۔ چنانچہ آپ بلخ و بخارا کی طرف متوجہ ہوئے اور وہاں بھی بہت سے بزرگوں سے ملاقات فرمائی۔ جب مولانا شبر غانی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ یہ دونوں باتیں انتہا میں حاصل ہوتی ہیں (اور اُن کے جواب میں انہوں نے بھی کچھ لب کُشائی نہ فرمائی) ۔ آخر کار مولانا خواجگی امکنگیؒ کی خدمت میں جب آپ پہنچے تو انہوں نے آپ کو دیکھتے ہی فرمایا کہ آؤ بیعت کریں اور اُن دونوں باتوں کو بغیر آپ کے سوال کے، انہوں نے حل کر دیا"۔ (۱۹)

ابھی آپ ماوراءالنہر کے ایک شہر میں تھے کہ حضرت مولانا خواجگی امکنگی قدس سرّہ (م ۱۰۰۸ھ) ایک واقعے میں

ظاہر ہوئے اور فرمایا، اے فرزند، میری آنکھیں تمہاری راہ تک رہی تھیں"۔ (۲۰) حضرت خواجہؒ بہت خوش ہوئے اور اسی موقع سے متعلق یہ شعر آپ نے کہا ہے:-

می گزشتم زغم آسودہ کہ ناگہ زکمیں   عالم آشوب نگاہے سرِراہم بگرفت

بہرحال جب آپ حضرت مولانا خواجگی امکنگی قدس سرہ کی خدمت میں (بنفس نفیس) پہنچے تو آپ پر بڑی عنایتیں اور شفقتیں مبذول ہوئیں اور حالات معلوم ہونے پر تین دن اور تین رات تک خلوت میں بھی رکھا گیا۔ پھر حضرت مولانا نے بعض زائد فوائد سے مطلع فرما کر تکمیل کی خوش خبری بھی سُنائی اور ہندوستان واپس جانے کے لیے ارشاد فرمایا تاکہ سلسلہ عالیہ کو فروغ ہو سکے۔ حضرت خواجہؒ انکسار ظاہر کرتے رہے لیکن حضرت مولاناؒ نے اصرار فرمایا تو آپ نے استخارہ بھی فرمایا جو موافق آیا۔ بعض حضرات کو حضرت مولاناؒ کے اس غیر معمولی کرم کی وجہ سے کچھ شکایت تھی تو فرمایا کہ دوستوں کو علم نہیں کہ اس جوان کو پوری تربیت دینے کے بعد ہی ہمارے پاس بھیجا گیا تھا۔ (۲۱)

اس کے بعد حضرت خواجہؒ ہندوستان واپس ہوئے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ۱۰۰۳ھ کے اوائل کے بعد آپ ماوراء النہر کے لیے روانہ ہوئے۔ بلخ میں مولانا شبر غانیؒ (م ۱۰۰۴ھ) سے ملاقات کی جو ۱۰۰۳ھ کے اواخر میں ہوئی ہو پھر آپ ۱۰۰۴ھ کے اوائل میں امکنہ پہنچ کر حضرت مولانا خواجگی قدس سرہ سے مستفیض ہوئے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۰۰۴ھ کے اواخر یا ۱۰۰۵ھ کے اوائل میں آپ پھر لاہور تشریف لائے اور (بقول زبدۃ المقامات) ایک سال تک وہاں قیام فرمایا جب کہ بکثرت علماء اور فضلاء آپ کے حلقۂ ارادت و عقیدت میں داخل ہوئے۔ ایک سال کے قیام کے بعد ۱۰۰۶ھ کے لگ بھگ دہلی پہنچے (۲۲)۔ ۱۰۰۷ھ میں آپ کا قیام دہلی میں یقیناً تھا جب کہ آپ کے ملفوظات کے آخری عنوان "شب پانزدھم ماہِ شعبان کے ذیل میں شرح رباعیات (سلسلۃ الاحرار) کا ذکر ہے کہ وہ وہاں اسی زمانے میں (۱۰۰۷ھ) لکھی گئی تھی۔ دہلی میں آپ کا قیام قلعۂ فیروزی (فیروز شاہ کا کوٹلہ) میں تھا جو سہ منزلہ بھی ہے، بہت دلکشا اور لبِ دریا ہے اور وہاں ایک پُر عظمت و برکت مسجد بھی ہے۔ وہاں آپ اپنی وفات تک رہے اور پھر کسی جگہ منتقل نہیں ہوئے"۔

آپ کے ملفوظات مذکورہ کو مجالس کی شکل میں مولانا رُشدیؒ (مولانا محمد صدیق (۲۳) ہدایت کِشمیؒ) نے مرتب کیا تھا اور ان مجالس کی تحریر کا آغاز یکم صفر ۱۰۰۹ھ سے ہوا تھا۔ پنج شنبہ، ششم صفر ۱۰۰۹ھ کے ذیل میں وہ حضرت خواجہؒ سے ان ملفوظات کو مرتب کرنے کی اجازت حاصل کرنے کا واقعہ لکھتے ہیں کہ بہت اصرار اور عرض و معروض کے بعد اجازت ملی۔ لیکن فرمایا کہ مجھے دِکھلا دیا کرو۔ پھر رمضان ۱۰۰۹ھ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ میاں شیخ احمدؒ (یعنی حضرت مجددِ الف ثانیؒ) کی مکرر درخواست پر حضرت خواجہؒ نے مُرتب کو اجازت مرحمت فرمائی۔

ان مجالس کی تعداد صرف بیس ہے لیکن ان میں حضرت خواجہؒ کے آخر وقت (۲۴) تک کے حالات ہیں۔ مُرتب پابندی کے ساتھ حاضر نہ ہو سکتے تھے۔ درمیان میں دوم جمادی الاول ۱۰۱۰ھ کے بعد یکم صفر ۱۰۱۲ھ کی مجلس کا حال

ہے۔ پھر حضرت خواجہؒ کے وصال (۲۵ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۲ھ) تک صرف چار مجلسوں کا ذکر ہے۔

یہ مجالس (ظاہر ہے کہ) دین اور شریعت ، نیز طریقت کے مباحث سے متعلق ہیں لیکن ان میں بعض تاریخی اور معاشرتی حالات کے اشارے بھی ملتے ہیں۔ مجموعے کے شروع میں حضرت خواجہؒ کے ایک رسالے کی لمبی (۳۵) عبارت بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کس کس بزرگ کی خدمت میں نیازمند ہوئے۔ یکم صفر ۱۰۰۹ھ کی مجلس میں "کدخدائی" کے ضرر کا ذکر ہے (ممکن ہے کہ اُس وقت تک حضرت خواجہؒ کی شادی نہ ہوئی ہو) ۔ دوسرے دن "حضور ذاتی" پر جو بحث ہوئی اُس کا ذکر ہے۔ ۶ صفر کو جامع و مُرتب نے "مجلسِ چند" جو بغیر اجازت تحریر کی تھیں، پیش کیں تو حضرت خواجہؒ کو ناپسند ہوئیں۔ لیکن پھر اسی سال جیسا کہ اوپر عرض ہے ماہِ رمضان میں حضرت مجددؒ کی سفارش پر "بعد از تامّل و تردّد بسیار" اجازت ملی۔ اس سال ۱۱ رمضان کو حضرت جلال تھانیسریؒ (م ۹۸۹ھ) کے ایک مُرید آئے جو روزہ رکھنے کے باوجود کھانا بہت دیر میں یعنی تہجد پڑھنے کے بعد کھایا کرتے تھے، اُن کی اصلاح فرمائی گئی۔ ۲۱ شوال ۱۰۰۹ھ کی مجلس میں مولانا جامیؒ کی نفحات الانس کے مطالعے کا ذکر ہے۔ اسی سلسلے میں "فرمودند کہ حق سبحانہ و تعالیٰ مقتدیان را در ہر زمان بطورے میدارد کہ صلاح مُریدانِ آں وقت در آن است۔ ہمانا مُریدانِ آں وقت را کدخدائی مُضر بود ۔" لیکن اُس وقت تک حضرت خواجہؒ کی شادی ہو چکی ہوگی ۔ کیونکہ آپ کے بڑے صاحبزادے (خواجہؒ کلاں) کی ولادت یکم ربیع الاول ۱۰۱۰ھ کو ہوئی تھی اور دوسرے صاحبزادے (خواجہ خوردؒ) چار ماہ بعد یعنی ۶ رجب ۱۰۱۰ھ کو پیدا ہوئے۔ حضرت خواجہؒ خود فرماتے ہیں:-

مابین ظہور ایں دو گوہر بگذشت چہار ماہ و اکثر

اسی ۲۱ شوال ۱۰۰۹ھ والی مجلس میں آپ کی شرح رباعیات (۱۰۰۷ھ) کا ذکر بھی ہے (۳۰) اور پنجاب کے ایک بزرگ شیخ نورالدین کا ذکر بھی ہے جن کی عمر ۱۲۰ سال ہو چکی تھی ۔ لیکن نوافل بہت پڑھتے تھے اور جنہوں نے تیس سال تک اپنا پہلو زمین پر نہیں لگایا تھا۔ پھر ذی قعدہ ۱۰۰۹ھ کی چار مجلسوں کا ذکر ہے جن میں شریعت اور طریقت کے مباحث ہیں ۔ سلخ ذی قعدہ کی مجلس کے ذیل میں ہے کہ ایک دن حضرت شیخ احمد (مجدد الف ثانی قدس سرہ) کو سرہند روانہ کیا اور فرمایا کہ ابھی "اخفائے نسبت" کو کام لاتے ہوئے فجر کی نماز سے اشراق تک مصلّے پر بیٹھے رہیں لیکن حلقہ نہ کریں۔ ۔"(۴۰)

پھر اسی سال کی ۱۳ ذی الحجہ کی مجلس کا ذکر ہے کہ حضرت خواجہؒ نے ابو عبداللہ مروزیؒ کا قصہ سُنایا کہ اُنہیں جہاں کہیں بزرگوں کی کوئی بات ملتی وہ کسی سے لکھوا لیتے ۔ اس طرح ایک بڑی کتاب تیار ہو گئی۔ لیکن اتفاق سے وہ کتاب کسی دریا میں ڈوب گئی تو اُنہیں بڑا قلق ہوا۔ خواب میں حضرت سہل عبداللہ تستریؒ نے اُن سے فرمایا کہ "عمل بمقتضائے سخنان ایشاں باید کرد ۔ نوشتن ہیچ نیست"

لیکن کچھ عرصے کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں ابو عبداللہ مروزیؒ سے فرمایا کہ "بایں صدیق

یعنی سہل تستریؒ بگوے کہ سخنانِ ایشاں نوشتن اثرِ محبت ایشان است و محبتِ ایشاں عینِ مقصود۔"

اس کے بعد ۱۶ ۔ ۱۷ ذی الحجہ کی مجلسوں کا حال بھی ہے۔ پھر ۱۰۱۰ھ کی صرف ۲ جمادی الاولیٰ والی مجلس کا ذکر ہے۔ اس میں جامع ملفوظات (مولانا رشدیؒ) بعض "ضروریاتِ شرعیہ" یعنی فرزندوں اور عزیزوں کی معاش کی خاطر حضرت خواجہؒ سے رخصت چاہ رہے ہیں۔ حضرت خواجہؒ نے اُن کے لیے ایک "خوب کردار" شخص کے نام سفارش تحریر فرمائی۔ پھر مولانا رشدیؒ حضرت خواجہؒ کو عریضے بھیجتے رہے۔ ایک مرتبہ اُن کو "مخدومی حاجی شیخ عبدالحقؒ (شیخ محدثؒ)" نے جواب لکھا تو اُس کی پُشت پر حضرت خواجہؒ نے چند کلمات تحریر فرما دیے جو اِس طرح شروع کیے تھے:

"اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور ۔ ہرچہ نوشتنی بود در صحیفہ ، بندگان مخدومی مندرج است۔ زیادہ چہ نویسم ۔ بارے فرصت و قوت بلکہ وقت و نفس را غنیمت شمردہ بمقتضاے آن ، زندگانی می باید کرد۔ دریغ کہ ایں عاجز گرفتار را قوت کار نماندہ، ورنہ بتوفیقِ اللہ دریں دو روزہ عمر دیوانہ وار ماتم یا زماندگی خود می داشت۔۔۔

رقعات کے بالکل آخر میں یہی رقعہ نمبر ۸۷ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ عبدالحقؒ "بہ مستعد مذکور قرابتے داشتند"۔ یہ مستعد وہی جامع ملفوظات (یعنی مولانا رشدی۔ محمد صدیق ہدایت) ہیں۔

جامع ملفوظات اس کے تخمیناً اکیس ماہ بعد ، پھر یکم صفر ۱۰۱۲ھ کی مجلس کا ذکر کرتے ہیں اور بعد میں آخری چار مجلسوں کا ذکر ہے جن میں اکثر حضرت خواجہؒ کی بیماریوں اور تکلیفوں کا ذکر آتا ہے، آخری مجلس ۲۵ جمادی الاخری ۱۰۱۲ھ کو حضرتؒ کے وصال کا بیان ہے۔ اللہ باقی من کل فان ملفوظات کے آخر میں ایک عنوان "شب پانزدھم ماہِ شعبان" بھی ہے۔ لیکن اس کا سال درج نہیں۔ اسی عنوان کے ذیل میں حضرتؒ کی شرح رباعیات کا ذکر ہے کہ "در آن ولا بتازگی تسوید فرمودہ بودند" ۔ چونکہ یہ شرح ۱۰۰۷ھ میں لکھی گئی اس لیے ظاہر ہے کہ اس عنوان میں بھی ۱۰۰۷ھ رہا ہو گا جو محذوف ہو گیا۔ عنوان کے نیچے سب سے پہلے جامع ملفوظات نے اپنی شروع کی حاضری کا ذکر کیا ہے کہ :۔

"روزے در اوائلھا کہ نو تماشائی ایں کارخانۂ بلند قدر بودم ۔۔۔" حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ "امشب شبِ برات است (شنبہ ۵ اشعبان ۱۰۰۷ھ / ۳مارچ ۱۵۹۹ء) در سلسلۂ شما یعنی چشتیہ نمازے کہ دریں شب می گزارند چند رکعت است"۔ (۲۸)

اس عنوان کے ذیل میں کئی واقعات مختلف لوگوں سے متعلق ہیں اور شرح رباعیات (سلسلۃ الاحرار) کے متعلق ہے کہ "بجہتِ رعایت ظاہر شریعت ازیں تصنیف خود کہ سخنِ وحدت وجود در آنجا بخوب ترین تدقیقاتِ مبین است ناراضے بودند و می فرمودند، ازما ایں تصنیف خوب واقع نہ شدہ و ی فرمودند کہ محقق شد کہ ورائے طریقِ توحید راہے است وسیع و راہ توحید نسبت بہ آں شاہراہ ، کوچہ ، تنگی بیش نیست (۲۹)۔

حضرت خواجہؒ کی دو بیویاں:

ملفوظات میں "دربیان بعضے از اطوارِ حضرت ایشاں" عنوان کے ذیل میں ایک واقعہ آتا ہے کہ حضرت خواجہؒ کی

والدہ ماجدہ ہی کھانا پکانے کے انتظام میں لگی رہتی تھیں۔ بعد میں بُڑھاپے کی وجہ سے جب یہ کام دوسروں کے ذمّے ہوا تو اُن کو بڑا رنج ہوا۔ آخر حضرت خواجہؒ نے مجبور ہو کر دوبارہ یہ کام والدہ ماجدہ کے سپرد کر دیا۔ لیکن "یہ بی بی بانو" کہ زنِ محمد صادق کہ خُسر پورہ (یعنی برادرِ زن) حضرت ایشاں باشند و زنِ شیخ محمد صدیق کشمیری کی بی بی آغا باشد، براے خمیر نمودن و مدد در بعضے امور گزاشتند"۔ اِس عبارت سے ظاہر ہے کہ جامع ملفوظات کو حضرت خواجہؒ کے ذاتی اور خانگی معاملات میں بھی بہت قُرب حاصل تھا۔ ورنہ آج سے چار سو سال پہلے ایک غیر شخص کسی شریف گھرانے کی خواتین کے ناموں سے واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت خواجہؒ کی پہلی اہلیہ، محمد قلیچ خان اندجانی (م ۱۰۲۳ھ) کی بہن تھیں (۳۰)۔ یہ اکبری عہد کے مشہور منصب دار تھے اور فقہ، حدیث اور تفسیر کا درس دیا کرتے تھے۔ حضرت خواجہؒ کی دوسری اہلیہ (جن کا ذکر اوپر آیا ہے) محمد صادق "کشمیری" کی بہن ہوں گی۔ یہ وہی محمد صادق کشمیری (ابن کمال الدین حنفی) ہمدانی ہیں جن کے نام، حضرت مجددؒ کے مکتوبات (۱/۱۰۶۔۱۰۷ پھر ۲/۲۲-۲۸، پھر ۳/۳۹) ہیں (۳۱)۔ یہی کلمات الصادقین کے مؤلف ہیں اور انہی کے ماموں مولانا حسن کشمیریؒ المتوفی ۱۰۵۱ھ (ابن حاجی محمد کشمیریؒ المتوفی ۱۰۰۶ھ) تھے۔ اور مولانا حسن کشمیریؒ وہی بزرگ ہیں جو حضرت مجددؒ کو حضرت خواجہؒ کے پاس (بیعت کے لیے) لے گئے تھے۔

مذکورۂ بالا عبارت میں اگر کاتب کا تصرف نہیں ہے تو بی بی بانو کے لیے "باشند" اور بی بی آغا کے لیے "باشد" ایک اور امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بی بی بانو کے لیے احتراماً "باشند" لکھا ہو گا کہ وہ حضرت خواجہؒ کی (دوسری) اہلیہ کی بھاوج تھیں اور جامعِ ملفوظات نے بی بی آغا کے لیے "باشد" اس لیے لکھا ہو گا کہ وہ اُنہی کی بیوی تھیں۔ اس صورت میں وہ جو اس عبارت میں شیخ محمد صدیق کے ساتھ "کشمیری" لکھا ہوا ہے وہ "کشمیری" نہیں، "کِشمی" ہو گا۔ یعنی مولانا محمد صدیق کِشمی المتخلص بہدایت (م ۱۰۵۱ھ) ۔ جنہوں نے ہر موقع پر اپنا نام پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی ہے اور حضرت خواجہؒ کے مرثیے میں ہدایت کے بجائے رشدی تخلص اختیار کیا ہے ۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔

ملفوظات کے مذکورۂ بالا عنوان "دربیانِ بعضے اطوار ایشاں" کے ذیل میں (شروع میں) یہ (۳۲) واقعہ بھی آتا ہے کہ ایک مرتبہ اُن کی ایک اہلیہ نے حضرت خواجہؒ سے "بے ادبی" کی تھی تو آپ نے تقویٰ کی وجہ سے "تجدید نکاح" کا خیال ظاہر فرمایا تھا۔ لیکن پھر علماء کے فتویٰ سے وہ خیال ترک کر دیا تھا فصل ثانی میں "دربیان مسترشدانِ طریقہ" کے عنوان کے ذیل میں ایک طالب کا ذکر ہے کہ وہ دوسرے سلسلوں (۳۳) سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا، اس لیے حضرت خواجہؒ نے اُس کو چار پانچ ماہ تک الگ رکھنے کے بعد اپنے ایک مُرید (یعنی شیخ تاج الدین) سے طریقۂ ذکر سیکھنے کی اجازت دی ۔ شیخ مذکور نے ایک رات اُس طالب کے یہاں قیام بھی کیا تو اُس طالب کی اہلیہ نے شوہر کی اجازت سے خود بھی طریقۂ ذکر سیکھا اور اُس پر عجیب کیفیت طاری ہوئی اور خود طالب بھی بے خود ہو گیا۔

حضرت خواجہؒ کے صاحبزادے

حضرت خواجہؒ کے دو صاحبزادے تھے (۱) خواجہ عبید اللہ (م ۱۸ جمادی الآخر ۱۰۷۳ھ) اور (۲) خواجہ عبد اللہ

(م ۲۵ جمادی الاول ۱۰۷۴ھ) ۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی مرحوم نے اپنی کتاب "خواجہ باقی باللہ ۔۔۔۔" (لکھنؤ ۱۹۷۸ء) کے صفحہ ۴۱ پھر صفحہ ۴۸ تا ۵۲ میں یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ خواجہ کلاںؒ (بڑے صاحبزادے) خواجہ عبیداللہ تھے اور خواجہ خورد (چھوٹے صاحبزادے) خواجہ عبیداللہ تھے اور یہ بات انہوں نے شیخ محمد ہاشم کشمیؒ اور شیخ بدرالدین سرہندیؒ جیسے قریب العہد مستند اور معتبر بزرگوں کے اقوال سے اعراض کرتے ہوئے کہی ہے۔

مولانا فریدی کی کتاب کے صفحہ ۵۱ ۔ ۵۲ میں خواجہ کلاںؒ کے مختصر حالات ہیں اور صفحۂ ۵۳ سے خواجۂ خوردؒ کے حالات شروع ہوتے ہیں ۔ صفحہ ۵۲ میں وہ سید محمد کمال سنبھلی کی تاریخ اسراریہ کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ "میرے شیخ نے فرمایا کہ خواجہ بزرگ (یعنی خواجہ باقی باللہ) کے وصال (۲۵ جمادی الآخر ۱۰۱۲ھ) کے وقت اُن کی عمر دو سال چار ماہ تھی" ۔ اِس جُملے میں مولانا فریدی نے "میرے شیخ" کے بعد اپنی طرف قوسین میں "خواجہ خورد" کا اضافہ کر دیا ہے ۔ حالانکہ یہاں اُنہیں "خواجہ کلاں" لکھنا چاہیے تھا، کیونکہ اُنہی کا ذکر ہو رہا ہے۔ اور خواجۂ کلاںؒ ہی اُس وقت دو سال چار ماہ کے تھے یعنی اُن کی ولادت یکم ربیع الاول ۱۰۱۰ھ کو ہوئی تھی اور خواجۂ خوردؒ تو اُس وقت دو سال کے بھی نہیں ہوئے تھے یعنی اُن کی ولادت تو ۶ رجب ۱۰۱۰ھ کو ہوئی تھی ۔ خواجۂ خوردؒ کی ولادت کی یہ تاریخ خود مولانا فریدی نے بھی صفحہ ۵۳ میں لکھی ہے ۔ پھر مولانا فریدی نے صفحہ ۵۴ میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ تاریخ اسراریہ کے مصنف کا قول ہے کہ خواجۂ خوردؒ مجھ سے چار روز کم ، آٹھ ماہ عمر میں بڑے تھے" اور وہیں اس مصنف کی ولادت ۱۲/ ربیع الاول ۱۰۱۱ھ لکھی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس قول کے مطابق بھی خواجۂ خوردؒ کی تاریخ ولادت وہی ۶ رجب ۱۰۱۰ھ بنتی ہے ۔

صفحہ ۵۲ میں مولانا فریدی نے اُن کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ "میرے شیخ اس سال (۱۰۷۳ھ) میں سنبھل تشریف لائے تھے ۔ ایک ماہ (۳۴) اور ایک روز غریب خانے پر قیام فرمایا۔ سنبھل سے واپسی پر دہلی میں شیخ منور بن شیخ عنایت اللہ (جو کہ جوانِ صالح اور شیخ الہ داد کے پوتوں میں سے ہیں) کے گھر رات کو فروکش ہوئے۔ اتفاقاً اسی رات کو زینے کی کجی کی بناء پر اُن کے پاؤں کو صدمہ پہنچا اور اُسی رات خواجۂ کلاںؒ چل بسے" ۔ اس عبارت کے آخر میں خواجۂ کلاںؒ کا نام ہے لیکن شروع میں پھر "میرے شیخ" کے بعد قوسین میں مولانا فریدی نے خواجۂ خوردؒ لکھ دیا ہے جو صحیح ہے، کیونکہ جس رات خواجۂ خوردؒ کے پاؤں کو صدمہ پہنچا تھا اُسی رات خواجۂ کلاںؒ کی وفات ہوئی تھی ۔ اس بات کی تصدیق خواجۂ خوردؒ کے ایک مکتوب کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے جو اس صفحہ میں درج ہے کہ "سبحان اللہ ، ہم پائے مرا شکستند وہم بازوے مرا"۔ یعنی قضا و قدر نے میری ٹانگ بھی توڑ دی اور میرا بازو بھی (یعنی بھائی)۔

مولانا فریدی نے صفحہ ۵۲ میں خواجۂ کلاںؒ کی وفات پر سید محمد کمال سنبھلی کا لکھا ہوا ایک قطعۂ تاریخ نقل کیا ہے ۔ وہ اس طرح ہے :۔

چو رفت خواجہ عبداللہ از سرائے فنا — کدام دیدہ زمژگاں کہ دُرِّ اشک نہ سُفت

ہزار جاں بفراقش چو گل گریباں چاک — ہزار دل ز جُدائیش ہمچو زُلف آشفت

کمال از پئے سالِ وصالِ آں خواجہ چو فکر کرد "بشد آں خواجۂ کلاں" برگفت
۱۰۷۴ھ

اس قطعۂ تاریخ کے پہلے مصرع میں اگر "خواجہ عبداللہ" پڑھیں (جیساکہ مولانا فریدی نے لکھ دیا ہے) تو وزن ساقط ہو جائے گا، اور خواجہ عبیداللہ ہی صحیح ہوگا، یا پھر خواجۂ عبداللہ پڑھیں تو وزن صحیح ہو سکتا ہے، مولانا فریدی نے صفحہ ۴۲ میں شیخ محمد ہاشم کشمیؒ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ "خواب میں خواجہ صاحب (خواجہ باقی باللہؒ) نے دیکھا تھا کہ ایک درویش کہہ رہے ہیں کہ ایک پسرِ حمیدہ سیر پیدا ہوگا اُس کا نام خواجہ عبیداللہ احرارؒ کے نام پر عبیداللہ رکھنا"۔ اور یہ کہ مثنوی میں خواجہ صاحب نے اس کا ذکر کیا ہے۔ پھر مثنوی کے جو اشعار پیش کیے ہیں اُن سے (مولانا فریدی لکھتے ہیں کہ) یہ بات معلوم نہیں ہوتی"۔

مولانا فریدی نے غالباً اپنے مفروضے کی تائید کے خیال سے ان اشعار پر غور کرنے کی کوشش نہیں فرمائی ورنہ شیخ محمد ہاشم کشمیؒ نے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ مُبہم نہیں ہیں۔ وہ اشعار یہ ہیں:۔

درخانۂ کمتریں غلامے شد بندہ یکے بزرگ نامے
ایں نامِ خجستہ و ملک زاد انشاءاللہ شفیع من باد
بر درگہِ خواجہ او رساند گوید زمن آں سخن کہ داند

یہ "بزرگ نام" بندہ وہی خواجہ عبیداللہ احرار قدّس سرّہ کا ہم نام ہے۔ اِن اشعار سے پہلے شیخ محمد ہاشم نے چار اشعار اور بھی دیے ہیں جن سے خواجہ زادہ کی تاریخ ولادت ظاہر ہے۔ یعنی:۔

او گشتہ دریں خرابہ منزل روزِ یکم از ربیعِ اوّل
بود آخرِ عصر کاں یگانہ اُفتاد دریں سیاہ خانہ
تاریخِ شناسِ تیز بین مَرد "بِشگُفت بہار" در خط آورد
۱۰۱۰ھ

آخری مصرع میں "بشگفت بہار" کے اعداد سے ۱۰۱۰ھ بنتا ہے۔ یعنی اس سال خواجۂ کلاں یکم ربیع الاوّل کو بعد عصر پیدا ہوئے۔ اور دوسرے صاحبزادے کی ولادت سے متعلق حضرت خواجہؒ کے یہ اشعار ہیں:۔

گُل شکرے بوالعجبے دست داد شکرِ ہندی و گُل تُرک زاد
بلکہ ز کشمیر گُلِ ز عفراں شد شکر آلودۂ ہندوستاں
شاخِ گُل از باغ ولایت شتافت از قدحِ ہند شکر آب یافت
شاخ بناتے شد ازیں طرفہ فن اَنْبَتَہُ اللّٰہُ نَبَاتاً حَسَن
بلکہ نہالے ست بروں از جہات آمدہ در عرصۂ ایں شاہ مات
گرچہ فرو رفتہ دریں نیک عہد بارور است از اثرِ قربِ عہد
آمدہ پس در خمِ ایں تیرہ خم ماہِ رجب بود و صباحِ ششم

آخری مصرع میں خواجہ خوردؒ کی تاریخ ولادت عجیب انداز سے بیان فرمائی ہے۔ یعنی ۶ رجب کی صبح بھی بتادی اور اس مصرع "ماہِ رجب بود و صباح ششم" کے اعداد سے ۱۰۱۰ھ بھی بنا دیا۔ یہ بہت بے مثل تاریخ ہے (۳۵) ۔ اور ان اشعار میں جو پہلا شعر ہے اُس کی وضاحت مولانا زید ابوالحسن فاروقی مدظلہ نے کلیاتِ باقی باللہ (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء) کے مقدمہ "مختصر احوال" کے صفحہ ۱۲ میں اس طرح فرمائی ہے کہ :۔ "آپ نے اپنے فرزند کو ایسا گُل شکر یعنی گُل قند بتایا ہے جس کی شکر ہند کی ہو اور پھول تُرک کا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس فرزندِ عالی قدر کی والدہ کشمیر کی تھیں اور پدرِ بزرگوار تُرک ہیں۔" (۳۶)

حضرت مجدّدِ الفِ ثانی قدّس سرّہ نے اپنے حسبِ ذیل مکتوبات میں ان دونوں صاحبزادوں کو خطاب فرمایا ہے :۔

دفتر اوّل ۔ مکتوب (۳۰) نمبر ۲۶۶ (دونوں صاحبزادوں کے نام ہے) ۔ یہ مکتوب تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہے، کیونکہ اس میں خواجہ حسام الدین احمدؒ کے احسان کا ذکر ہے کہ انہوں نے دونوں (۳۱) صاحبزادوں کی تربیت فرمائی ہے ۔ (۲) حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرّہ کی خدمت میں تین بار حاضری کا ذکر ہے (۳) خواجہ محمد معصومؒ نے جواہر، شرح مواقف کو تمام کیا تھا۔ (۴) اُس وقت تک حضرت مجدّدؒ نے حضرت خواجہؒ کی شرح رباعیات کی شرح مرتب فرمائی تھی۔ (۵) حضرت خواجہؒ نے کھانا کھاتے وقت بھی بسم اللہ زور سے پڑھنے کو ناپسند فرمایا تھا، تو پھر سماع، رقص اور وجد کا کیا ذکر؟ مخدوم زادے سرود اور قصیدہ خوانی کی مجلس شبِ جمعہ کو منعقد کرتے ہیں تو کیوں؟

دفتر دوم کے مکتوب ۳۵ میں خواجہ عبداللہ کو نسبتِ حضور کے شمول اور غلبے پر مبارکباد ہے کہ تین ماہ میں ایسی ترقی کی ہے ۔ پھر توحید اور عین الیقین کے متعلق سوالات کا جواب بھی ہے۔ اُن کو پھر اسی دفتر کے مکتوب ۵۹ میں تحریر فرمایا ہے کہ معقول و مشہود و موہوم و مکشوف سب ماسواء میں داخل ہیں۔

دفتر سوم کے مکتوب ۵۶ میں حضرت مجدّدؒ نے محبّت اور شفقت والی شکایت فرمائی ہے کہ آپ (خواجہ عبداللہ) اور خواجہ حسام الدین احمدؒ کے صاحبزادے جمال الدین حسین، سرہند کے قریب پہنچ کر بھی مجھ سے ملنے نہیں آئے (اُس زمانے میں حضرت مجدّدؒ ، چند دنوں کے لیے جہانگیر سے رخصت لے کر سرہند تشریف لائے تھے۔ لیکن اب واپس لشکر کو تشریف لے گئے ہیں۔ صاحبزادہ محمد سعیدؒ کو گھر چھوڑ آئے تھے لیکن اب وہ بھی لشکر میں ہیں) ۔ (۳۹)

پھر اسی دفتر کے مکتوب نمبر ۶۰ میں خواجہ عبدؒاللہ کو خطاب ہے کہ انسان کی ذات اُس کا نفسِ ناطقہ ہے جس کو ابتداء میں نفسِ امّارہ کہتے ہیں ۔

اسی دفتر کے مکتوب نمبر ۱۷، میں جو خواجہ عبیداللہ کے نام ہے عالم اور صانعِ عالم کے درمیان تمیز پر بحث ہے۔ ان کے علاوہ چند مکتوبات میں جو خواجہ حسام الدین احمدؒ کے نام ہیں ان صاحبزادوں کا ذکر ہے۔ اور مولانا فریدی مرحوم نے اپنی گراں قدر تصنیف کے آخری صفحات میں سماع ، (۴۰) رقص، وجد، مولود خوانی، نعتیہ اور غیر نعتیہ اشعار سے

متعلق حضرت مجدّدؒ کے نظریات کی وضاحت کی ہے کہ وہ حضرات (اور میر محمد نعمانؒ بھی ۲۷۳/۱) ان چیزوں کو اختیار کر رہے تھے ۔

حضرت خواجہؒ کے مکتوب الیہم

مطبوعہ کلیات میں ۸۷ رقعات ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی ضرور رہے ہوں گے۔ مثلاً زبدۃ المقامات (ترجمہ صفحہ ۲۱۹) اور حضرات القدس (ترجمہ ۴۴/۲) میں ہے ۔

(الف) ان مکتوب الیہم میں حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے نام رقعات سب سے زیادہ ہیں۔ ملفوظات اور رقعات کے مجموعے میں حسبِ ذیل صفحات میں ان کا ذکر ہے :۔ ۲۵ ۔ ۳۷ ۔ ۶۰ ۔ ۷۸ ۔ ۸۶ ۔ ۸۷ ۔ ۸۸ ۔ ۱۰۲ ۔ ۱۲۲ ۱۲۳ ۔ ۱۳۰ ۔ ۱۳۲ ۔ ۱۴۰ ۔ ۱۴۱ ۔

صفحہ ۲۵ میں ملفوظات کے عنوان "پنج شنبہ ۔ ششم صفر ۱۰۰۹ھ" کے ذیل میں اس سال کے ماہ رمضان المبارک کا ذکر ہے جب کہ حضرت خواجہؒ نے حضرت مجدّدؒ کی سفارش پر جامعِ ملفوظات کو ملفوظات (اور واقعات) لکھنے کی اجازت دی تھی۔

صفحہ ۳۷ میں "سلخ ذی قعدہ ۱۰۰۹ھ" عنوان کے ذیل میں حضرت خواجہؒ نے حضرت مجدّدؒ کو سرہند کی طرف رخصت کرتے وقت جو نصیحتیں فرمائی تھیں اُن کی تفصیل ہے ۔ (وہ رمضان ۱۰۰۹ھ سے خدمت میں تھے)۔ صفحہ ۶۰ میں حضرت خواجہؒ کے اُس مکتوب کی نقل ہے جو اُنہوں نے حضرت مجدّدؒ اور اُن کے صاحبزادے محمد صادقؒ (م ۱۰۲۵ھ) اور بھائی مولانا محمد مسعودؒ (۴۱) کو روانہ فرمایا تھا۔ اس میں کشف کی انواع پر بھی بحث ہے۔ یہ مکتوب وہی ہے جو رقعہ نمبر ۴۱ ہے (صفحات ۱۰۲ ۔ ۱۰۳)۔

صفحہ ۷۸ میں رقعہ نمبر ۸ بھی حضرت مجدّدؒ کے مکتوب (۷/۱) کے جواب میں ہے کہ "دفعِ امراض" کے لیے توجہ دینا کہاں تک صحیح ہے۔ (حضرت مجددؒ کے مکتوب ۱۱/۱ میں بھی دفع امراض کے لیے توجہ کا ذکر ہے۔ اسی مکتوب میں اور مکتوب ۷/۱ میں بھی حضرت مجدّدؒ کے بعض مقامات کا ذکر ہے۔)

صفحہ ۸۶ میں (رقعہ ۱۵) حضرت مجدّدؒ کے اس مکشوف کو سراہا گیا ہے جو "قول و زبان" کے بغیر ہوتا ہے۔ اسی رقعے میں حضرت خواجہؒ نے اپنی کمزوری کے متعلق لکھا ہے کہ "ضعفِ ماقوی است"۔ حضرت مجدّدؒ کو دعوت بھی دی ہے کہ استخارہ کرلیں، پھر آئیں تاکہ اس مکشوف کے متعلق مزید گفتگو ہو سکے۔

صفحہ ۸۷ میں (رقعہ ۱۶) حضرت مجدّدؒ کے احوال اور واقعات پر تحقیق کا ارادہ ظاہر کیا ہے جو انہوں نے مکتوب ۱۴/۱ میں لکھے تھے۔ اسی میں مولانا عبد الہادیؒ کے لیے فرمایا ہے کہ اُنہیں چند روز کے لیے اپنی والدہ سے ملنے کے لیے اجازت دیں (وہ اور کئی حضرات سرہند میں زیر تربیت تھے) صفحہ ۸۷ میں (رقعہ ۱۷) صدرِ جہاں (۴۲) (مفتی پہانوی بن عبد المقتدر) کے متعلق لکھا ہے کہ اُن کو ذکر کا طریقہ بتا دیا ہے ۔ لیکن آپ کے پاس بھیجتا ہوں کہ تصحیح اور

حصول "بے ظہورِ تصرف متعذر است" اس رقعے میں اپنی زیادہ ناطاقتی کا ذکر بھی ہے۔ اس رقعے میں بھی رقعہ ۱۵ کی طرح فرمایا ہے کہ آنے کے لیے استخارہ کر لیں۔ شاہ حسین بھی ایسا کریں جن کا ذکر حضرت مجددؒ کے مکتوب ۱/ ۳ ۔ اور ۱/ ۱۵ میں بھی ہے کہ وہ حضرت مجددؒ کے پاس سے حضرت خواجہؒ کی خدمت میں روانہ ہو چکے ہیں ۔

صفحہ ۸۸ میں (رقعہ ۱۸) ارشاد ہے کہ شیخ محمد کو روانہ کیا جا رہا ہے (برائے استفادہ) ۔ بعد میں حضرت مجددؒ نے اُن کے اور شیخ ابوالحسن (۴۳) کے فصلانہ کے لیے (مکتوب ۱/ ۱۹) عرض کیا تھا کہ یہ فصلانہ نواب شیخ (فرید بخاری نے مقرر کیا تھا جو دلوا دیا جائے۔

صفحہ ۱۲۲ (رقعہ ۶۰) میں حضرت مجددؒ اور اُن کے صاحبزادے خواجہ محمد صادقؒ کو خطاب ہے۔ اور حضرت مجددؒ نے جو رباعی عالم شکر والی بھیجی تھی اُس کو پسند نہیں فرمایا۔ حضرت مجددؒ نے یہ واقعہ مکتوبات (۱/ ۳۱) میں بھی درج کیا ہے۔ مکتوبات (۱/ ۱۳) میں بھی اس مقام کے متعلق ہے ۔

صفحہ ۱۲۳ (رقعہ ۶۱) میں حضرت مجددؒ کے مکتوب (غالباً ۱/ ۱۸) کا جواب ہے اور اسرار و رموز پر بحث ہے۔ "حقیقتِ تجلّی ذاتی" (بقول خواجہ احرار قدس سرہ) وہ منزل ہے جس کی رسائی کے بغیر نہایت (فنا و نیستی) حاصل نہیں۔ حضرت علاؤالدولہ سمنانی علیہ الرحمہ کا مسلک بھی بحث ہے اور یہ کہ "حال را با علم نزاعے ہست ۔ اما علم را با حال نزاعے نیست" ۔ صفحہ ۱۳۰ (رقعہ ۶۵) ۔ یہ رقعہ غالباً نواب شیخ (فرید بخاری) کو حضرت خواجہؒ نے لکھا ہو گا جس میں حضرت مجددؒ کے متعلق ہے کہ "شیخ احمد نام مردے است در سرہند ۔ کثیر العلم و قوی العمل ۔ روزے(۴۴) چند فقیر با او نشست و برخاست کردہ عجائب بسیار از روزگار اوقاتِ او مشاہدہ کردہ ۔ بآن می ماند کہ چراغے شود کہ عالمہا ازو روشن گرداند ۔۔۔" اسی کے ساتھ اُن کے فرزندوں اور عزیزوں کی تعریف ہے۔ اور (غالباً از خود) آپ نے اُن کی امداد کے لیے سفارش فرمائی ہے ۔

صفحہ ۱۴۰ (رقعہ ۸۳) ۔ حضرت خواجہؒ اس رقعے میں حضرت مجددؒ کے کمالات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور سید امیر (۴۵) صالح کو اُن کی تربیت میں روانہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد رقعہ ۸۴ ۔ ۸۵ بھی اسی ضمن میں معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے علو شان کے متعلق حضرت خواجہؒ نے مزید جو کچھ فرمایا ہے وہ حضرات القدس میں خواجہ محمد صدیق کشمی ہدایت کے حالات میں ہے جو حضرت خواجہؒ کی محبت کی وجہ سے حضرت مجددؒ کی خدمت میں جانا نہیں چاہتے تھے ۔

(ب) حضرت خواجہؒ کے مکتوب الیہم میں شیخ تاج الدین سنبھلیؒ بھی خصوصیت رکھتے ہیں، اُن کے متعلق مولانا فریدی مرحوم کی فاضلانہ کتاب کے صفحات ۸۶ تا ۹۸ میں بہت مفید معلومات درج ہیں۔ خود حضرت خواجہؒ کے رقعات سے بھی بعض خاص باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ رقعہ نمبر ۳، اور رقعہ نمبر ۳۲ شروع زمانے کے ہیں۔ رقعہ ۳ میں حضرت خواجہؒ نے حسبِ معمول اپنی خاکساری اور فروتنی کا اظہار فرمایا ہے جو بالواسطہ ایسے اوصاف کی تبلیغ ہے ۔ اس رقعے کے آخر میں ایک جملہ یہ ہے :۔ "نیازمندی این سیاہ دل ، عمر ضائع کردہ را در مواجہ مزار حضرت میاںؒ ظاہر سازند و استمدادے

بکنند۔ والسلام والاکرام" یہاں حضرت میاںؒ سے مراد خواجہ اللہ بخشؒ (م ـ ۹ رمضان ۱۰۰۲ھ) ہوں گے جن سے حضرت خواجہؒ مل چکے تھے اور جن سے شیخ تاج الدینؒ پہلے مُرید ہوئے تھے بلکہ اُن سے عشقیہ شطّاریہ سلسلے میں مجاز بھی تھے اور اسی لیے حضرت خواجہؒ کے طریقے سے ابھی تعلق کم تھا۔

رقعہ نمبر ۴ میں حضرت خواجہؒ نے بڑے لطیف انداز میں اُن کی "عدمِ انقیادی و طغیانی" کا ذکر کیا ہے کہ "فقیر را بعضے از خواہہا چناں می نماید کہ باطن شمارا بہ فقیر یک نوع عدمِ انقیادی و طغیانی ہست، ظہور این وقائع بعد از بیماری فقیر است ـ در این دفعہ کہ آمدیہ شرم آمد کہ باین نوع چیز با توجہ نمودہ اظہارِ آن نمایم ـ۔۔ حفظِ طریقہ خواجہا و استفاضہ در توجہ بایشان و عدم خلط بطریق دیگر ناگزیر است و ازان بہ ہیچ وجہ چارہ نیست ـ این طبقہ در غایتِ غیرت و نازکی اند شما کتب محققین مطالعہ نہ کردہ اید ـ طریقۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم با ہیچ تفاوتے ، طریقۂ ایشان است۔

رقعہ نمبر ۵ میں حضرت خواجہؒ اپنی فروتنی کے اظہار کے ساتھ ساتھ پھر اُسی امر مذکور کی طرف اشارہ فرماتے ہیں :۔ از شور شہا عجب آمد، نسخے نوشتہ بودیم ،اگر خلاف واقعہ باشد فہو المراد ـ بارے وصیت آن است کہ اگر صفتے از صفات مارا مخالف یابند بآنچہ در خیال شما کمال قرار گرفتہ تکیہ بآن نکنند کہ اطوار مختلف است ـ۔۔

وہم چنیں در آداب طریقۂ عالیۂ احراریۂ نقشبندیہ چوں کوہِ راسخ باشید، زنہار کہ بطریقِ دیگر خلط نکنید و آنکہ از سلاسل مختلف مرید می گیرید ـ چیزے نیست ہر کہ مرید شما شود، شود ـ والّا ـ فلاں تعلیم و تلقین منحصر در طریقِ نقشبندیہ سازید ـ نانِ دیگرے خوردن و دعائے دیگر کردن بسیار بے فائدہ است شخصے نورِ نقشبندیہ از شما گیرد و متوجہ شطّاریہ باشد چہ مزہ دارد ـ۔۔۔

رقعہ ۶ میں "دوام وضو و دوام شکر وضو (یعنی تحیۃ الوضو) واحتیاط لقمہ و اجتناب از معاصی باکلّیہ از غیبت و سخن چینی و تحقیر بندۂ مومن (از آزاد و بندہ) و بغض و کینۂ مومنے و غضب و سختی بر زیرِ دستاں از لوازم است و اساسِ این کار است ـ۔۔۔"

رقعہ ۱۲ میں ارشاد ہے کہ "دماغ خشکی شمارا کہ دربابِ شیخ ابابکر (سنبھلی) نمودہ بودند ، خواندیم ـ این نوع چیزہا مناسب مقامِ شفقت و کارشناسی نیست۔۔۔" دیکھیے، حضرت خواجہؒ کس طرح نصیحت فرماتے ہیں۔ (اسی رقعہ کے آخر سے ظاہر ہے کہ شیخ تاج الدینؒ سنبھل ہی میں ہیں) ـ اس رقعے کا مضمون ملفوظات میں "بعضے از اطوار حضرت ایشان" کے ذیل میں بھی ہے۔

رقعہ ۲۴ میں ہے کہ آپ نے جو آگرہ جانے کا مشورہ چاہا ہے تو دل سے فتویٰ لیں اور استخارہ بھی کر لیں، غالباً شیخ تاج الدینؒ نے آگرہ میں قیام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا) ـ اسی رقعے میں خواب کے عدم اعتبار اور اُس کے اسباب پر بحث ہے ـ یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر سید بخاری ترقی کر رہے ہیں تو میرے پاس بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بھی تحریر ہے کہ "دُکان این معاملہ چنداں گرم نیست ، نزدیک است کہ سردیِ تمام رونماید، انما خدا انگہ دارد ـ۔۔" (ہو سکتا ہے کہ

یہ رقعہ آخر وقت کا ہو) ۔ اس رقعے میں "سید بخاری" سے مراد سید فرید بخاری (م ۱۰۲۵ھ) ہوں گے جو بہت ممکن ہے کہ اُس زمانے میں سنبھل میں متعیّن ہوں جس کا ذکر تاریخ میں نہیں ہے۔ رقعہ ۲۶ میں دعاء اور نصیحت ہے اور یہ کہ "حیاتِ صوریہ معلوم است تاچند وفا خواہد کرد۔ اہلِ عقل رافکر آن منزل از ضروریات است ۔"

رقعہ ۲۸ حضرتؒ کے مرض الموت کے زمانے کا لکھا ہوا تھا جو آپ کے وصال کے بعد شیخ تاج الدین (۴۶) کو ملا تھا۔ اس رقعے میں بھی حضرتؒ کی وہی نصیحت ہے کہ اخفا کو ملحوظ رکھیں۔ "دراوقاتیکہ خوش آید عبودیت و شکستگی و نیازمندی ہر چہ میسر شود از حمد و ثنا و استغفار و تسبیح و تہلیل و صلوٰۃ و تلاوت نیک است، مگر در غیر تلاوت و صلوٰۃ ، رعایتِ اِخفا از طریقۂ خانوادہ است" گویا آخر وقت تک حضرتؒ نے رعایت اخفا کے لیے تاکید فرمائی ہے ۔

(ج) حضرت خواجہؒ کے خاص مقربین میں خواجہ حسام الدین احمدؒ (م ۱۰۴۲ھ) بن قاضی نظام الدین بدخشانیؒ (م ۹۹۲ھ) بھی تھے۔ والد ماجد کے انتقال کے بعد کچھ عرصے تک آپ "امارت و جاہ" کی گرفتاری میں رہے ۔ بلکہ ابوالفضل (م ۱۰۱۱ھ) کی دوسری بہن سے شادی بھی ہوئی۔ وہ چاہتا تھا کہ آپ کو جو فقر و تجرید کا شوق حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاصل ہوا تھا، ختم ہو جائے اور وہ ایسی تعلیم کا مزاحم بھی رہا۔ اور تکلیف بھی پہنچانے لگا۔ لیکن حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ "اطمینان رکھو ، اس ملحدِ دین کا کام چند روز میں تمام ہو جائے گا" چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ ۱۰۱۱ھ میں مارا گیا۔

حضرت خواجہؒ کے رقعات میں آپ کا ذکر ہے ، گو کہ آپ کے نام کوئی رقعہ موجود نہیں۔ رقعہ نمبر ۵۴ میں (۴۷) آپ سے کسی حاجت مند کے لیے سفارش فرمائی ہے لیکن مکتوب الیہ کوئی اور ہیں۔ اسی طرح رقعہ ۸۶ میں ضمناً ذکر آتا ہے یعنی اُس رقعے میں جو دہلی والی قیام گاہ کے قریب والی مسجد والوں کے نام ہے اور جو حضرتؒ نے اپنی گوشہ نشینی کے زمانے میں لکھا تھا، یہ فرمایا ہے کہ اب وہ لوگ مُریدوں کی طرح میری تعظیم و تکریم چھوڑ دیں اور مرزا حسام الدین اور مولانا (۴۸) یوسف وغیرہ سے وہ لوگ جس طرح پیش آتے ہیں اُسی طرح میرے ساتھ بھی پیش آئیں ۔ (۴۹) ۔

یہاں بے محل نہ ہو گا اگر حضرت مجددؒ کے بعض مکتوبات سے خواجہ حسام الدین احمدؒ کے بعض حالات عرض کیے جائیں۔

حضرت مجددؒ کے مکتوبات اُن کے نام دفتر اوّل میں نمبر ۳۲ ۔ ۶۲ ۔ ۲۰۷ ۔ ۲۱۶ ۔ ۲۲۹ ۔ ۲۴۷ ۔ ۲۴۸ ۔ ۲۶۷ ۔ ۲۷۳ ہیں۔

دفتر دوم میں ۱۷ ۔ ۲۶ ۔ ۴۵ ہیں اور دفتر سوم میں ۴۰ ۔ ۷۲ ۔ ۱۱۵ ۔ ۱۲۱ ہیں۔

دفتر اوّل ۔ نمبر ۳۲ ۔ جواباً فرمایا ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی نسبت خاص کیا تھی۔ تفصیل دی ہے نمبر ۶۲ میں فرمایا ہے کہ وہ جذبہ جو سلوک سے پہلے ہو وہ اصل مقصود نہیں البتہ اس کے بعد کا جذبہ اصل مقصود ہے ۔ نمبر ۲۰۷ میں فرمایا ہے کہ عرصے سے آپ کی، مخدوم زادوں کی آپ کے فرزند میاں جمال الدین حسین، میاں الہ داد میاں الہ

دیا وغیرہ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ وجد و حال جب تک شرع کے مطابق ہوں تو صحیح ہیں ورنہ نہیں، نمبر ۲۱۶ میں فرمایا ہے کہ بعض اولیاء کے خوارق کیوں زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت خواجہؒ کی ایک بات یہ لکھی ہے کہ بعض لوگ اُن سے کہتے تھے کہ ہم نے آپ کو حج میں یا فلاں مقام پر دیکھا، حالانکہ وہ وہاں تشریف نہیں لے گئے، نمبر ۲۲۹ میں ہے کہ ہمارا طریقہ بالکل حضرت خواجہؒ کے طریقے کے مطابق ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ آپ نے جو بڑے مخدوم زادہ (خواجہ عبید اللہ) کو اُن کے ماموں محمد قلیچ خان کی ظاہری تعلیم و تربیت میں رہنے کو پسند فرمایا ہے اُس سے تعجب ہوا۔

نمبر ۲۴۷ میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنی ذات اور اپنے ماسوا پر دلیل ہے۔

نمبر ۲۴۸ میں ہے کہ تجلّی ذاتی کا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مخصوص ہونا اس معنی میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں انبیاء علیہم السلام کو اس کا حصول ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تبعیّت سے اولیاء کو یہ نعمت حاصل ہوتی ہے۔ (پھر تفصیل ہے)۔

نمبر ۲۶۷ میں حضرت مجددؒ نے اسرار و دقائق کو پوشیدہ رکھنا ہی پسند فرمایا ہے (اس سے پہلے والے مکتوب نمبر ۲۶۶ میں حضرت مجددؒ نے خواجہ حسام الدین احمدؒ کا بہت شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے دونوں مخدوم زادوں کی تربیت اور خدمت کو اپنے ذمّے لے لیا ہے۔ اُسی مکتوب میں حضرت خواجہؒ کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی نے کھانا کھاتے وقت زور سے بسم اللہ کہا تو آپ نے ناپسند فرمایا۔ اسی مکتوب میں فرمایا ہے کہ مخدوم زادوں نے جمعہ کی راتوں میں سرود اور قصیدہ خوانی شروع کرا دی ہے۔ یہ اپنے مسلک کے خلاف ہے۔

نمبر ۲۷۳ میں بھی سرود اور مولود خوانی کو منع فرمایا ہے (جو میر محمد نعمانؒ نے بھی اختیار کرلی ہے)۔

دفتر دوم۔ نمبر ۱۷ میں فرمایا ہے کہ اس دنیا کے مصائب بظاہر تکلیف دہ ہیں۔ لیکن حقیقت میں ترقیوں کے موجب ہیں۔ (بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادقؒ نے ۱۰۲۵ میں طاعون سے وفات پائی تھی) یہ مکتوب اسی زمانے کا ہے۔

نمبر ۳۶ میں فرمایا ہے کہ کشمیر سے آپ کا خط ملا (خواجہ حسام الدین احمدؒ نے لکھا تھا کہ خواجہؒ کلاں عبید اللہ اور خواجہ حسام الدینؒ کے فرزند جمال الدین حسین کو میاں الہ دادؒ کی تلقین (۵۰) سے شرمندگی ہے)

نمبر ۴۵ میں فرمایا ہے کہ عالم صرف اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا مظہر ہے اور ممکن الوجود کو اُس کی ذات سے کچھ مناسبت نہیں۔ (عرض اور جوہر پر تفصیل سے بحث ہے)۔

دفتر سوم۔ نمبر ۴۰۔ خواجہ حسام الدین احمدؒ نے دریافت کیا تھا کہ کیا وہ مع متعلقین، حرمین شریفین کو منتقل ہو جائیں۔ حضرت مجددؒ نے صرف اُنہی کے جانے کے لیے مشورہ دیا ہے اور وہ جو انہوں نے سیادت مآب (۵۱) (غالباً شیخ فرید بخاری) کے متعلق لکھا تھا کہ طبیب اُن کے ضرر کا حکم دیتے ہیں تو حضرت مجددؒ فرماتے ہیں کہ ایسا کوئی

ضرر نظر نہیں آتا (ان شاء اللہ) نمبر ۲/۷۔ جہانگیر کے لشکر میں حضرت مجددؒ کا رہنا ، اُن کے فرزندوں (۵۲) اور جناب کے حق میں بلا کی جگہ عافیت ہے اور تفرقہ کے بجائے جمیعت ہے۔ اسی مکتوب میں حضرت مجددؒ نے فرمایا ہے کہ مولود خوانی نہ کریں ورنہ بوالہوس باز نہ آئیں گے اور اندک کو بسیار بنا دیں گے ۔

نمبر ۱۱۵ ۔ یہ مکتوب دراصل مذکورۂ بالا مکتوب نمبر ۴۰ کی نقل ہے غلطی سے دوبارہ شامل ہو گیا ہے ۔ (اسی مکتوب میں خواجہ حسام الدین احمدؒ کے صاحبزادے جمال الدین حسین اور اُن کے بھائیوں اور بہنوں کے لیے دُعائیں ہیں۔ گویا وہ کئی تھے)۔

نمبر ۱۲۱ ۔ اس مکتوب کا پس منظر یہ ہے کہ خواجہ حسام الدین احمدؒ نے لکھا تھا کہ آپ نے جو مکتوب ۸۷/۳۔ جمیر شریف میں لکھا تھا اُس پر شیخ عبدالحقؒ نے بہت اعتراضات کیے ہیں۔ حضرت مجددؒ یہاں اُن کا جواب تفصیل سے دے رہے ہیں اور آخر میں برادرانہ شکوہ ہے کہ براہِ راست مجھے لکھنے کے بجائے انہوں نے "شور و غوغا" کیوں کیا اور صرف "اشتباہ" سے ایک مسلمان کو خوار کرنا چاہا اور "شہر بشہر" اُس کی منادی کی ۔ (۵۳)

ان مکتوبات کے مطالعے سے خواجہ حسام الدین احمدؒ کے صحیح حالات سمجھ میں آسکتے ہیں اور افراط و تفریط کی گنجائش نہیں رہتی۔

حضرت خواجہؒ کے اکابر اصحاب میں شیخ الہٰ داد (م ۱۰۵۱ھ) بھی ہیں۔ مولانا فریدی نے اپنی کتاب (صفحہ ۱۱۸۔۱۲۷) میں ان کے متعلق ضروری معلومات کو یک جا کر دیا ہے۔

خواجہ محمد ہاشمؒ نے زبدۃ المقامات میں لکھا ہے کہ جس وقت حضرت خواجہؒ لاہور میں تھے اور ابھی ماوراء النہر نہیں گئے تھے ، شیخ الہٰ داد اُن کی خدمت میں پہنچ گئے تھے ۔ ان کی نظر عنایت سے مستفیض ہوئے، تعلیم طریقہ اور مراقبہ حاصل کیا۔ لیکن اُن کے ساتھ کسی وجہ سے ماوراء النہر نہیں گئے۔ لاہور میں جس قدر مُخلصین تھے اُن سب کو شیخ الہٰ دادؒ کی صحبت کا مشورہ دے کر روانہ ہو گئے اور ایک مخلص کو اس طرح (رقعہ ۴۴) تحریر فرمایا:۔

> "ان دنوں سیر و ولایت (ماوراء النہر) کا داعیہ قوی ہو گیا ہے۔ چند روز کے بعد وہاں جاؤں گا۔ میاں شیخ الہٰ داد نے خویشتن داری کرکے خود کو یہیں ٹھہرنے اور رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بہر حال ، جس کسی کو اُن کی (الہٰ دادؒ کی) رفاقت حاصل ہو جائے غنیمت ہے، یہ حق ہے اور میں تکلف سے نہیں کہتا ۔۔۔۔"

اسی سفر میں شیخ الہٰ دادؒ کو ان کے التماس کے سلسلے میں تحریر فرمایا (رقعہ ۲) :۔

> "برادر ارشد میاں شیخ الہٰ داد، آپ اپنے اِس معتقد دعا گو کو توجہ فاتحہ میں امداد فرمائیں۔ راستے کی پریشانی اور بے سکونی کی حالت میں میرے لیے بڑی بے حیائی ہے کہ میں تصوف سے متعلق بات کروں اور طریقِ انجذاب کے دقائق اور منتہائے کشف کے حقائق (جو آپ نے دریافت کیے

ہیں) تحریر کروں ۔۔۔ تاہم ایک وصیت آپ سے کرتا ہوں کہ اُسے فراموش نہ کریں اور وہ یہ ہے کہ مجھ جیسے فضول گھومنے والے اور بیاباں نورد نہ بنیں اور اپنی نسبت کو مضبوطی سے پکڑیں اور اُسے بہت عزیز سمجھیں کہ وہ کبریت احمر سے زیادہ قیمتی ہے ۔۔۔"

پھر جب حضرت خواجہؒ ماوراء النہر سے واپس ہوئے تو شیخ الہ دادؒ نے بڑی عقیدت اور شکستگی کے ساتھ خدمت میں رہنا شروع کر دیا۔ مسافروں اور زائروں کے کھانے کا انتظام اور خانقاہ کی خدمت اُنہی کے سپرد ہوئی۔ اس کے باوجود ذکر و مراقبہ اور "احوال باطن" سے کبھی غفلت نہیں برتی۔

رقعہ ۸۶ سے ظاہر ہے کہ جب حضرت خواجہؒ نے گوشہ نشینی اختیار کی تو اُس وقت بھی شیخ الہ دادؒ موجود تھے (آخر وقت تک حاضر رہے)۔

رقعہ ۲ میں شیخ الہ دادؒ کے جس استفسار کی طرف اشارہ ہے غالباً اُسی کے متعلق حضرت خواجہؒ فرماتے ہیں (رقعہ ۱۹۰):۔

۔۔۔ سیر فی اللہ دراصل اُن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو سخن اقرب کے معنی میں جذبہ اور فنا حاصل کر کے فیض الٰہی کی مدد سے نفس کا تزکیہ پا جاتے ہیں ۔۔۔ حضرت خواجہؒ عبید اللہ احرار قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت اور اہلِ سنت والجماعت کا اعتقاد اور خواجگان قدس سرہم کی باطنی نسبت ، دنیا اور آخرت کی نعمتوں سے بہتر ہے ۔ عالمِ آخرت کا دیدار اسی نسبت کی صورت ہے جیسی کہ ظاہری ہیئت میں ظاہری اعمال کی صورت ہے ۔ (۵۴)

مولانا رشدی

حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ (م ۱۰۱۲ھ) کے ملفوظات جو حیاتِ باقیہ کہلائے جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ آپ کے مکتوبات اور رسائل کا مجموعہ جو کلیات باقیؒ (مع کلامِ منظوم) کے نام سے لاہور سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا ہے اُس کے مرتب نے عمداً اپنا نام پوشیدہ رکھا ہے۔ مجموعے کے شروع میں وہ لکھتے ہیں:۔

"بعد از حمد و صلوٰۃ نمودہ می آید کہ چوں بسابقہ عنایت ازلی و رہنموئی سعادتِ لم یزلی ایں ذرۂ احقر کہ نام خود را از غایتِ بے اعتباری شائستہ اندراج ایں نامۂ بلند قدر نمی بیند از جملۂ باریافتگانِ درگاہِ خواجۂ جہاں پناہ ۔۔۔ شد۔"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ مرتب نے اپنا نام عمداً پوشیدہ رکھا ہے ۔

حیات باقیہ دراصل ایک قسم کی ڈائری ہے جس میں حضرت خواجہؒ کی مجلسوں کے بعض واقعات ۱۰۰۹ھ سے ۱۰۱۲ھ تک وقفے وقفے سے درج کیے گئے ہیں۔ حضرت خواجہؒ کا انتقال ۲۵ جمادی الآخر ۱۰۱۲ھ کو ہوا۔ مُرتب نے سات بند کا ایک ترکیب بند (بطور مرثیہ) لکھا جس میں ایک جگہ اپنا تخلص رشدی اس طرح استعمال کیا ہے:۔

رُشدی از آن نفس کہ رخ خود نہفت دوست — ساز طرب شکست و نوائے ترانہ مُرد

میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ یہاں انہوں نے اپنا تخلص عمداً بدل دیا ہے۔

مجلسوں میں جو ملفوظات درج ہیں اُن میں "پنج شنبہ ششم صفر ۱۰۰۹ھ" کے ذیل میں لکھا ہے کہ ان ملفوظات کے لکھنے کی اجازت بہت زیادہ عرض و معروض اور اصرار کے بعد ملی، پھر اسی کے ذیل میں ماہ رمضان المبارک کی مجلس کا ذکر ہے کہ اس موقع پر حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الف ثانی) کی سفارش پر صرف یہ اجازت ملی کہ "سخنے کہ در طریقہ دخلے داشتہ باشد بنویسند" اِن مجالس کی تفصیل اوپر آچکی ہے جس میں یہ بھی عرض ہے کہ مرتب (جامع ملفوظات) کا حضرت خواجہؒ سے بہت قریبی بلکہ خانگی تعلق تھا اور ان کی اہلیہ حضرت خواجہؒ کی والدہ ماجدہ کا ہاتھ بٹاتی تھیں ۔ یہ بھی عرض ہے کہ جامع ملفوظات ۱۰۰۷ھ میں حضرت خواجہؒ کی خدمت میں پہلی بار حاضر ہوئے تھے۔ (دد) جمعہ دوم جمادی الاولیٰ ۱۰۱۰ھ کی مجلس کا ذکر بھی اوپر آچکا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جامعِ ملفوظات کی رشتہ داری شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے تھی۔ یکم صفر ۱۰۱۲ھ کے ذیل میں ہے کہ جامعِ ملفوظات واپس آگئے ہیں۔ لیکن ۱۵ جمادی الآخرہ ۱۰۱۲ھ کے ذیل میں ہے کہ جامع ملفوظات نے ضرورت کی وجہ سے لشکر میں جانے کی اجازت چاہی تو حضرت خواجہؒ نے منع فرمایا کہ "آخر ہائے بازار ماست و ظاہرا کار ما بآخر رسیدہ است ..." اسی ماہ کی ۱۷ ۔ ۲۳ پھر ۲۵ تاریخوں میں حضرت خواجہؒ کی مختلف کیفیات (وصال تک) درج ہیں۔

ان تمام ملفوظات اور رقعات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ جامع اور مرتب کے تعلقات حضرت خواجہؒ اور ان کے تعلق کے تمام افراد سے بہت قریبی تھے ۔ شیخ عبدالحقؒ کو مخدومی (صفحہ ۴ مخدومی ملاذی (صفحہ ۴۸) کہا ہے۔ حضرت مجددؒ کو مخدومی ملاذی استاذی (صفحہ ۸۔ ۱۰۲ ۔ ۱۲۳ ۔ ۱۴۰) کہا ہے۔ شیخ تاج الدینؒ کو ملاذی امید گاہی (صفحہ ۹۰)، مخدومی (صفحہ ۱۳۱) اور شیخ اللہ دادؒ کو خلافت پناہ ، مظہر الطاف الٰہی، امید گاہ مُریدان و مخلصان (صفحہ ۳) لکھا ہے۔

حضرت خواجہؒ کے اِن مقربین سے مولانا رشدی کا قریبی تعلق اس بات کی سند ہے کہ اُنہی سے حضرت خواجہؒ کے متعلق صحیح حالات معلوم کیے جاسکتے تھے اسی لیے خواجہ بدرالدین سرہندیؒ نے حضرات القدس (دفتر اوّل) میں اُنہی کے حوالے سے حضرت خواجہ امکنگیؒ کی خدمت میں حضرت خواجہؒ کی حاضری کا حال لکھا ہے کہ ان کے دو مشکل مسئلے جن کے حل کے لیے وہ مختلف بزرگوں کے پاس جاتے رہے صرف وہیں (خواجہ امکنگیؒ کی خدمت میں) حل ہوسکے۔ اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ جامعِ ملفوظات ہی حضرت خواجہؒ کے مقربین (۵۶) میں ان خصوصیات کے حامل تھے۔ (۱) قریب ہونے کی وجہ سے صحیح اور مفصل حالات اُن سے معلوم ہوسکتے تھے (۲) وہ شاعر بھی تھے۔ (۳) لشکر شاہی میں تھے (۴) ملفوظات لکھے ہیں لیکن حضرت خواجہؒ کے بالکل آخر وقت میں موجود نہ تھے (انہوں نے شنبہ ۲۵ جمادی الثانیہ ۱۰۱۲ھ کے ذیل میں لکھا ہے کہ اُس وقت صرف خواجہ حسام الدین احمد خدمت میں تھے) ۔ (۵۷) پھر ملفوظات کے

آخری عنوان "شب پانزدہم ماہِ شعبان (۱۰۰۷ھ)" کے ذیل میں جس بزرگ کا چشتیہ سلسلے سے تعلق بتایا گیا ہے وہ یہی خواجہ محمد صدیق ہدایت ہوں گے ۔

حضرت خواجہؒ کے وصال (۲۵ جمادی الثانیہ ۱۰۱۲ھ) کے بعد (تعمیل وصیت میں) خواجہ محمد صدیق کِشمیؒ (مولا رشدی) حضرت مجددؒ کی خدمت میں پہنچے۔ مکتوبات میں اُن کا ذکر متعدد مقامات میں ہے۔ ۱/۱۱۹ میں میر محمد نعمانؒ کو حضرت مجددؒ نے لکھا ہے کہ ایسا سُنا گیا ہے کہ مولانا محمد صدیقؒ نے نوکری (۵۸) اختیار کر لی ہے اور فقراء کی وضع کو چھوڑ دیا ہے۔ ۱/۲۳۲ میں بھی یہی بات فرمائی ہے۔ ۱/۲۳۳ میں بھی وقت کی قدر کرنے کی ہدایت ہے۔ ۱/۴ میں بھی یہی ہے۔ ۱/۱۳۵ میں ولایتِ عامہ اور ولایت خاصہ سمجھائی گئی ہے۔ ۱/۱۳۶ میں (رمضان کے بعد) لکھا۔ کہ اس دفعہ اُن کا لشکر میں جانا (نوکری کرنا) پسند نہیں۔ ۱/۱۶۲ میں رمضان المبارک کی فضیلت بتائی ہے ۔ ۱/۶ میں وقت کی قدر کرنے اور شعر گوئی کو ترک کرنے کی ہدایت ہے ۔ ۱/۱۸۸ میں امورِ سہ گانہ (مرتبۂ قلب سے متعلق کی تفصیل ہے۔ ۱/۲۱۲ میں بھی اُن کے بعض سوالات کا جواب ہے ۔

۲/۲۱ میں پھر مراتبِ قلب پر تفصیل ہے۔ ۲/۵۱ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بعض کاملین سے کلام کس نوعیت ہوتا ہے۔

۳/۸ میں غیب کے اصلی ہونے اور شہود کے ظلّی ہونے کا بیان ہے۔

مکتوب ۱/۲۴۱ میں حضرت مجددؒ نے مولانا محمد صالحؒ کو لکھا ہے کہ بفضلہ تعالیٰ اب مولانا محمد صدیقؒ ، ولایہ خاصہ سے (۱/۱۳۵) مشرف ہوئے ہیں (۵۹) زبدۃ المقامات اور حضرات القدس (دفتر دوم) میں خواجہ محمد صدیؒ کے دوسرے حالات بھی ہیں۔ زبدۃ المقامات میں ایک مکتوب ہے جس میں محمد صدیقؒ نے مخدوم زادہ محمد سع (م/۱۰۷۰ھ) کو اپنے ہاتھ پاؤں کی معذوری کا حال بھی لکھا ہے۔ لیکن اُن کی شاعری کا ذکر ہے۔ یعنی معلوم ہوتا ہے انہوں نے آخر وقت تک شاعری کو نہیں چھوڑا ، گو کہ وہ معرفت سے متعلق تھی۔

آپ نے ۱۰۱۹ھ میں حضرت مجددؒ کے معارف کو مبدا و معاد کے نام سے مرتب کیا تھا۔ ۱۰۳۲ھ میں حج بھی کیا ماہ شوال ۱۰۵۰ھ میں وفات پائی آپ کی اہلیہ بھی حضرت مجددؒ سے بیعت ہوئی۔ مجاز بھی ہوئیں اور خواتین کی بہت بڑ جماعت کو مستفیض کیا۔

حضرت خواجہؒ کے خاص الخاص مقربین میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ بھی تھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ذکر سے پہلے اُن کے دور (عہد اکبری) کے دینی حالات کا ذکر بھی کر دیا جائے۔

عبدالقادر بدایونی کے بعد موجودہ دور میں پروفیسر محمد اسلم صاحب نے اپنی کتاب "دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر" اور اپنے تاریخی مقالات میں تفصیل سے لکھا ہے کہ اکبری عہد میں دین کا کیا مذاق اُڑایا گیا اور عقل ۔ دعویداروں نے دین والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اکبر کے فوت ہونے پر جب جہانگیر (۱۰۱۴ھ) میں تخت نشین؛

تو حضرت مجددؒ نے مختلف ارکانِ سلطنت کو دین کی غربت یاد دلائی اور ترویج دین کی ترغیب و تحریص کی طرف متوجہ کیا۔ خان اعظم (مرزا کوکہ) اکبر کے رضاعی بھائی تھے۔ اکبر اور جہانگیر نے اس رشتے کی وجہ سے اُن کی قدر دانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ۱۰۰۲ھ میں انہوں نے حج کیا اور ۱۰۲۳ھ میں وفات پائی۔ حضرت مجددؒ نے مکتوب ۱/۶۵ میں اُنہیں لکھا ہے کہ :۔

"اسلام کی غربت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کفار کُھلم کُھلا اسلام پر طعن اور مسلمانوں کی (۶۰) مذمت کرتے ہیں اور بے خوف ہو کر ہر کوچہ و بازار میں کفر کے احکام جاری کرتے ہیں۔ لیکن مسلمان، اسلام کے احکام جاری کرنے سے رُکے ہوئے ہیں اور شرائع کے بجا لانے میں مذموم و مطعون ہیں۔۔۔۔" یہ مکتوب حضرت مجددؒ نے دہلی آکر (۱۰۱۶ھ میں) اُن کو لکھا تھا جیسا کہ اس کے آخر میں وضاحت ہے ۔

غالباً اسی زمانے میں آپ نے لعل بیگ (م ۱۰۲۲ھ) کو بھی لکھا ۔ وہ اکبر کے بیٹے سلطان مُراد کے بخشی تھے۔ انہوں نے صوفیہ کا ایک تذکرہ ثمرات القدس من شجرات الانس لکھا تھا۔ حضرت مجددؒ نے مکتوب ۱/۸۱ میں اُن کو لکھا ہے :۔

> "تخمیناً ایک صدی سے اسلام پر ایسی غربت چھا رہی ہے کہ کافر لوگ ، مسلمانوں کے شہروں میں صرف کفر کے احکام جاری کرنے پر راضی نہیں ہوتے بلکہ چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام بالکل ختم ہو جائیں اور اسلام اور اہلِ اسلام کا کچھ اثر باقی نہ رہے اور اس حد تک نوبت پہنچی ہے کہ اگر کوئی مسلمان، شعائر اسلامی پر عمل کرتا ہے تو اُسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ گائے کا ذبح کرنا، ہندوستان میں اسلام کا بڑا شعار ہے۔ کفار شاید جزیہ دینے پر راضی ہو جائیں لیکن گائے ذبح کرنے پر ہرگز راضی نہ ہوں گے ۔ سلطنت کی ابتداہی میں اگر مسلمانی نے رواج پالیا اور مسلمانوں نے اعتبار پیدا کر لیا تو بہتر ہے ۔ ورنہ (نعوذ باللہ) اگر توقف ہو گیا تو مسلمانوں پر کام بہت مشکل ہو جائے گا۔۔۔"

نواب فرید بخاری کو بھی حضرت مجددؒ نے متعدد مکتوبات لکھے تھے ۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے ۔ تحصیل علم کے بعد اکبر کے ملازم ہو گئے ۔ درویش صفت امیر تھے۔ حضرت باقی باللہ نے اُن کے متعلق فرمایا تھا کہ "شیخ را برما حق ہا است و بوسیلۂ وجودِ ایشاں در ین راہ کشائش ہا دیدہ ایم (۶۱) ۔۔۔" حضرت مجددؒ نے بھی انہی حقوق کے متعلق ۱/۴۵ میں ذکر کیا ہے اور ۱/۴۷ میں اسلام کی زبوں حالی کا ذکر کیا ہے :۔ "آپ جانتے ہیں کہ گزشتہ زمانے میں (یعنی عہدِ اکبری میں) اہلِ اسلام پر کیا گزری ہے ۔۔۔ گزشتہ زمانے میں کفار غلبہ پا کر دارِ اسلام میں کفر کے احکام جاری کرتے تھے اور مسلمان ، اسلام کے احکام جاری کرنے سے عاجز تھے۔ اگر جاری کرتے تھے تو قتل کر دیے جاتے تھے ۔۔۔ آج جب کہ دولتِ اسلام کی ترقی (موانعات اسلام کا زوال) اور بادشاہ اسلام کی تخت نشینی ، خاص و عام کے کانوں تک

پہنچی ہے تو اہلِ اسلام نے اپنے اوپر لازم جانا کہ بادشاہ کے مددگار و معاون ہوں اور شریعت کی ترویج اور مذہب کو تقویت دینے میں اُس کی رہنمائی کریں، خواہ یہ امداد و تقویت، زبان سے میسر ہو یا ہاتھوں سے، جس قسم کی بھی امداد مطلوب ہو اُس سے دریغ نہ کریں۔ سب سے بڑھ کر مدد، کتاب و سنت اور اجماع اُمت کے طریق پر شرعی مسائل کو بیان کرنا اور عقائد کلامیہ کو ظاہر کرنا ہو تاکہ کوئی بدعتی اور گمراہ درمیان میں آکر بادشاہ کو راستے سے نہ بہکائے اور کام خراب نہ کر دے ۔۔۔ گزشتہ زمانے میں جو بَلا اسلام پر آئی وہ اسی جماعت (علمائے دنیا) کی کم بختی کے باعث تھی ۔۔۔" (اس مکتوب میں علمائے سوء میں جاہل صوفیہ کا ذکر بھی ہے)۔

مکتوب ۱/۴۸ میں تحریر ہے کہ آپ نے دین کے طلبہ کو صوفیوں پر ترجیح دیتے ہوئے جو امداد مولانا محمد قلیج خان کے ذریعے بھجوائی ہے وہ آپ کی بلند ہمت (شریعت کی محبت) کی نشانی ہے۔

مکتوب ۱/۵۱ میں بھی اسلام کی غربت کا ذکر ہے کہ آج کل بیچارے اہلِ اسلام گردابِ ضلالت میں پھنسے ہوئے ہیں "امیدِ نجات ہم از سفینۂ اہل بیت خیرالبشر است علیہ وعلیٰ آلہ من الصلوات اتمہا و من التحیات والتسلیمات اکملہا ۔۔۔ ہلال ماہ رمضان در حضرتِ دہلی دیدہ شد۔ مرضی حضرت والدۂ بزرگوار در توقف مفہوم گشت۔ بضرورت تا استماع ختم قرآن توقف نمودہ" ۔۔ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ حضرت مجددؒ دہلی میں تشریف رکھتے تھے۔ مکتوب ۱/۱۵۵۔۱۵۶ سے ظاہر ہے کہ جمادی الاول کی پہلی تاریخ (جمعہ ۱۰۱۶ھ) کو اپنے صاحبزادے خواجہ محمد صادقؒ (م ۱۰۲۵ھ) کے ساتھ دہلی پہنچے تھے (۱/۱۹۴ میں بھی اس کا ذکر ہے)۔

مکتوب ۱/۵۳ میں ذکر ہے کہ وہ جو جہانگیر نے آپ سے فرمایا ہے کہ چار علمائے دین دار مقرر کیے جائیں تاکہ وہ مسائل شرعیہ بیان کریں، اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی لیکن حبِ جاہ والے علماء نہ رکھے جائیں ورنہ اکبر کے زمانے کی طرح وہ بھی اختلافی باتیں درمیان میں لاکر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہیں گے اور دین میں بگاڑ پیدا کریں گے۔ (دنیا پرست علماء کا حال مکتوب ۱/۳۳۔ اور مکتوب ۱/۲۱۳ میں بھی ہے)۔

مکتوب ۱/۶۳ میں شیخ فریدؒ کو انبیا علیہم السلام کے متفقہ اصول دین کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان میں اختلاف صرف بعض احکام سے ہے جو دین کے فروغ سے تعلق رکھتے ہیں۔

مکتوب ۱/۱۵۲ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اطاعتِ حق فرمایا ہے اور مکتوب ۱/۱۶۳ میں شیخ فریدؒ کو پھر کفار کی تذلیل کے لیے فرمایا ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو "خُلقِ عظیم" سے موصوف ہیں، جہاد، کفار کے ساتھ کرنے اور اُن پر سختی کرنے کا حکم فرماتا ہے تو معلوم ہوا کہ اُن پر سختی کرنا خُلقِ عظیم میں داخل ہے۔ پس اسلام کی عزت، کُفر اور کافروں کی خواری میں ہے۔ پس جس نے اہلِ کُفر کو عزیز رکھا اُس نے اہلِ اسلام کو خوار کیا۔ اُن کے عزیز رکھنے سے یہ مُراد نہیں کہ اُن کی تعظیم کریں اور بلند بٹھائیں بلکہ اپنی مجلسوں میں جگہ دینا اور اُن کی ہم نشینی کرنا اور اُن کے ساتھ گفتگو کرنا، سب اعزاز میں داخل ہے۔ کُتوں کی طرح اُن کو دور رکھنا

چاہیے (۶۲) ۔۔۔۔ ان نابکاروں کا کام اسلام اور مسلمانوں پر ہنسی ٹھٹھا کرنا ہے۔ ہر وقت اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ اگر قابو پائیں تو مسلمانوں کو ہلاک کر دیں یا سب کو قتل کر دیں یا کُفر کی طرف لوٹا دیں۔ پس مسلمانوں کو بھی شرم کرنی چاہیے۔

مکتوب ۱/۱٦۵ میں بھی شیخ فریدؒ کو لکھا ہے کہ اہلِ بدعت ، اہلِ ہوس اور اہلِ کفر کو خوار رکھنا چاہیے ۔ (۱/۵۴ میں بھی آپ نے اسی طرح فرمایا تھا)۔

مکتوب ۱/۱۹۳ میں بھی غربتِ اسلام کا ذکر ہے کہ "امروز اسلام بسیار غریب است ۔ جبتلیے کہ امروز در تقویت آن صرف می کنند بہ کرورہا می خرند تاکدام شاہباز را باین دولتِ عظمیٰ مشرف سازند"۔ اسی مکتوب میں ہے کہ یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے لاہور میں پُرانی منڈی کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی اور اپنی حویلی میں جامع مسجد تیار کرائی ہے۔ اسی مکتوب میں آگے آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "دریں وقت کُشتن کافر لعین گوبند (اَرْجُنْ) و آلِ او بسیار خوب واقع شد و باعثِ شکستِ عظیم بر ہنودِ مردود گشت ۔ بہر نیت کہ کشتہ باشند و بہر غرض کہ ہلاک کردہ خواری کُفار خود نقدِ وقت اہلِ اسلام است ۔۔۔ و آن سرور دین و دنیا علیہ الصلوٰۃ والسلام در بعضے ادعیۂ خود، اہلِ شرک را باین عبارت نفریں فرمودہ اند ۔۔۔۔ مکتوب ۱/۲۳۳ میں شیخ فریدؒ سے خطاب ہے کہ میں دہلی میں خواجہ باقی باللہ قدس سرّہ کے عُرس (۲۵ جمادی الآخر) کے موقع پر آیا ہوں۔ آپ کی خدمت میں پہنچنے کا ارادہ تھا لیکن معلوم ہوا کہ آپ باہر جا رہے ہیں۔ آپ کی بھلائی کے لیے آپ کو اُن چیزوں سے منع کرنے کی جرأت کرتا ہوں جو آپ کی بلند درگاہ کے لائق نہیں۔ یعنی در مجلس شریف نااہلاں را نہ گزارند"۔ اس مکتوب میں یہ بھی ہے کہ کچھ عرصے سے حج کا ارادہ ہے۔ آپ سے مشورہ لینا تھا۔ لیکن آپ اب جا رہے ہیں۔ (جمعہ یکم جمادی الاول ۱۰۱٦ھ [۱/۱۵۵] سے آپ دہلی میں اپنے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادقؒ (م ۱۰۲۵ھ) کے ساتھ تھے اور رمضان تک قیام رہا۔

مکتوب ۱/۲٦٦ میں بھی "اہلِ کُفر کی دوستی سے کدورت" کا ذکر ہے۔ یہ مکتوب حضرت خواجہؒ کے صاحبزادوں کے نام ہے۔

مکتوب ۱/۲٦۹ میں بھی فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے دل میں کسی نہ کسی امر کی تمنا ضرور ہوا کرتی ہے لیکن اِس فقیر کی تمنا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے ساتھ سختی کی جائے اور ان بدبختوں کی اہانت کی جائے اور ان کے جھوٹے خداؤں کو ذلیل و خوار کیا جائے۔ یہ فقیر یقیناً جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عمل سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب کوئی عمل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار اس عملِ پسندیدہ کے ترغیب دیتا ہے۔ اور اس کام کا بجا لانا اسلام کے نہایت ضروری کاموں میں سے سمجھتا ہے۔ چونکہ آپ بذاتِ وہاں تشریف لے گئے ہیں اور اس گندے (٦۳) مقام اور وہاں کے رہنے والوں کی تحقیر و اہانت کے لیے مقرر ہو۔ ہیں اس لیے اول اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے ۔ بہت لوگ اُس مقام اور وہاں کے رہنے والوں کی تعظیم و توقیر۔

لیے وہاں جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی حمد اور اُس کا احسان ہے کہ اُس نے ہم کو اس بلا میں مبتلا نہ کیا۔ اس نعمت عظمیٰ کے شکر ادا کرنے کے بعد ان بد بختوں اور ان کے جھوٹے خداؤں کی تحقیر و توہین میں بہت کوشش کرنی چاہیے۔۔" یہ مکتوب ، سابق مکتوب کے زمانے (۱۰۱۶ھ) کے قریب کا ہو گا، کیونکہ اس کے عنوان میں شیخ فرید رح کو مرتضیٰ خان (مکتوب الیہ) کہا گیا ہے۔ یہ خطاب اُن کو ۱۰۱۵ھ میں ملا تھا جب کہ انہوں نے جہانگیر کے بیٹے خسرو کو شکست دی تھی اور انعام میں بھراول کا علاقہ بھی ملا تھا۔

صدر جہاں کے نام دو مکتوب ہیں۔ وہ پہان (قنوج کے قریب) کے رہنے والے تھے۔ شیخ عبدالنبی صدر الصدور (متوفی ۹۹۲ھ) کے شاگرد تھے ۔ کچھ دنوں ممالک محروسہ کے مفتی رہے۔ پھر توران میں سفیر ہوئے۔ واپسی پر صدر ہوئے ۔ ۱۰۲۷ھ میں وفات پائی۔ اُن کے صحیح سنین معلوم نہیں۔ لیکن قیاس ہے کہ ۱۰۱۵ھ کے قریب کا زمانہ ہو گا جب کہ حضرت مجددؒ نے اُن کو مکتوب ۱/۱۹۴ لکھا تھا۔ اُس میں آپ نے لکھا ہے کہ احکامِ شرعیہ کے جاری ہونے کی خبر سے بڑی خوشی ہوئی اور یہ کہ "آپ کو معلوم ہے کہ زمانۂ سابق میں جو فساد پیدا ہوا تھا وہ علماء کی بد بختی سے تھا۔ اب اس بارے میں امید ہے کہ (دین کا) پورا پورا تتبع مد نظر رکھ کر علمائے دین دار کے انتخاب میں پیش دستی کریں گے۔ (۶۴)" صدر جہاں کے نام دوسرا مکتوب ۱/۱۹۵ ہے جس میں ذکر ہے کہ سلطنت میں انقلاب آیا ہے تو صدور اور علماء کو چاہیے کہ وہ شریعت کی ترقی کی طرف متوجہ ہو کر ۔سب سے پہلے اسلام کے گرے ہوئے ارکان کو قائم کریں اور دیر نہ کریں ورنہ اہلِ اسلام کے لیے زمانہ بہت تنگ ہو جائے گا۔ قاضیوں کی ضرورت کے متعلق بھی آپ نے اس مکتوب میں متوجہ کیا ہے (۶۵)۔

محمد قلیج خان جو حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرّہ کی پہلی اہلیہ کے بھائی تھے، لاہور میں صوبہ دار تھے۔ پھر ۱۰۲۰ھ میں کابل میں مقرر ہوئے اور ۱۰۲۳ھ میں فوت ہوئے۔ لاہور کی صوبہ داری کے زمانے میں فقہ، حدیث اور تفسیر کا درس بھی دیا کرتے تھے، مکتوب ۱/۷۶ میں حضرت مجددؒ نے اُن کی کوشش کو (ترویج شریعت کے لیے) سراہا ہے۔ لیکن فرمایا ہے کہ فضول مباحات سے بچیں کہ ورع و تقویٰ کے خلاف ہے۔ (لاہور میں اُن کے قیام کا زمانہ ۱۰۲۰ھ سے پہلے کا تھا۔ چنانچہ یہ مکتوب بھی اس سال سے پہلے کا ہو گا۔ مکتوب نمبر ۱/۲۴ میں تصوّف کے بعض مسائل کا جواب ہے اور مکتوب ۱/۱۴۱ میں اخلاص کی فضیلت کا ذکر ہے۔ بس یہی تین مکتوب اُن کے نام ہیں)۔۔

خان جہان (م ۱۰۴۰ھ) کے نام مکتوب ۲/۶۷ میں آپ نے اہلِ سنت و جماعت کے عقائد تفصیل سے سمجھائے ہیں اور ترغیب دی ہے کہ کلمۂ حق ، جہانگیر کے کانوں تک پہنچاتے رہیں کیونکہ بادشاہ روح کی مانند ہے اور تمام انسان جسد کی طرح ہیں۔ اگر روح درست ہے تو جَسد بھی درست ہے اور اگر روح بگڑ جائے تو جسد بھی بگڑ جاتا ہے۔ پس بادشاہ کی بہتری میں کوشش کرنا گویا تمام بنی آدم کی اصلاح میں کوشش کرنا ہے۔ ۔۔" خانِ جہاں کے نام مکتوب ۳/۵۴ میں بھی دین کے لیے ترغیب و تحریص ہے کہ اُن جیسے صاحبِ اقتدار لوگوں کی وجہ سے دین کی تبلیغ ہو سکتی

ہے۔

مکتوب ۲/۶۸ شرف الدین حسین کے نام ہے جو خواجہ عبیداللہ احرار قدّس سرّہ کی اولاد میں تھے۔ اکبری عہد میں امارت پر ضرور فائز ہوئے تھے لیکن اُس کے الحاد کی وجہ سے گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اس مکتوب میں حضرت مجددؒ نے فرمایا ہے کہ "آپ کو معلوم ہو گا کہ دارالحرب کے کفار نے نگرکوٹ کے گرد و نواح میں مسلمانوں کے شہروں پر کیا کیا ظلم و ستم ڈھائے ہیں اور کیسی اہانت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو خوار کرے ۔۔۔' اس مکتوب کی تحریر کا سال آپ نے ۱۰۲۸ھ لکھا ہے جب کہ نورانی سُتون اور دُم دار ستارہ نظر آیا تھا۔

۱۰۲۸ھ ہی میں آپ نے میر محمد نعمانؒ (م ۱۰۵۸ھ) کو مکتوب ۲/۹۲ لکھا ہے کہ "کفار ہند بے تحاشا مسجدوں کو منہدم کر کے وہاں اپنے مندر اور معبد تعمیر کر رہے ہیں۔ چنانچہ تھانیسر میں حوض کرکھیت کے اندر ایک مسجد اور ایک بزرگ کا مقبرہ تھا۔ اُس کو منہدم کر کے اس کی جگہ بہت بڑا مندر بنایا ہے۔ نیز کفار اپنی رسموں کو کُھلم کُھلا بجا لا رہے ہیں اور مسلمان اکثر اسلامی احکام کے اجرا میں عاجز ہیں۔ ایکادشی کے روز ہندو لوگ کھانا پینا ترک کر دیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اُس دن کوئی مسلمان اپنے اسلامی شہروں میں نہ روٹی کھائے اور نہ فروخت کرے۔ (اس کے برعکس) کفار ماہ مبارک رمضان میں برملا، کھانا پکاتے اور فروخت کرتے ہیں۔ اور کوئی شخص، اسلام کے مغلوب ہونے کی وجہ سے اُن کو روک نہیں سکتا۔ ھائے افسوس کہ بادشاہ ہم میں سے (یعنی مسلمان) ہو اور ہم فقیروں کا اس طرح خراب و خستہ حال ہو ۔۔۔" یہ زمانہ اکبر کے مرنے کے ۱۴ سال بعد کا ہے ۔ (اکبر اور جہانگیر کے مداح اور مُلّا بدایونی کے طنز نگار اس حقیقت کو فراموش نہ کریں) ۔ اس مکتوب میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "اگرچہ بعض فقہاء نے بادشاہوں کے لیے سجدہ تعظیم جائز رکھا ہے لیکن بادشاہوں کے لیے یہی مناسب ہے کہ اس امر میں حق تعالیٰ کی بارگاہ میں تواضع کریں۔"

اسی مکتوب میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ بادشاہ (جہانگیر) جب ممالک کی سیر سے واپس (آگرہ) آئے گا، تو میں حاضر ہوں گا (اسی حاضری پر آپ ۱۰۲۸ھ میں قید ہوئے اور ۱۰۲۹ھ تک قلعۂ گوالیار میں تھے) ۔ (۶۶)

مکتوب ۲/۲۹ میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کو آپ نے قید کے زمانے میں جواباً لکھا ہے کہ مصائب میں اللہ تعالیٰ کی بڑی مہربانی ہے اور "وجود شریف ایشاں در غربت اسلام ، اہل اسلام را مغتنم است۔"

مکتوب ۳/۱۰۵ میں بھی "ضعف اسلام" کا ذکر ہے کہ "آخر الزمان است و اوانِ ضعف اسلام" اسی مکتوب میں "مغفرت پناہ مولانا احمد برکیؒ" (المتوفی ۱۰۲۶ھ) کے فرزندوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ارشاد ہے اور اسی مکتوب میں آپ نے لشکر شاہی کی ہمراہی سے خلاصی میسر ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ یعنی ۱۰۳۳ھ کے اوائل میں یہ مکتوب لکھا ہو گا اور اُس وقت بھی آپ "ضعف اسلام" کی وجہ سے فکر مند تھے اور مکتوب الیہ (شیخ حسن برکیؒ) کو اُس زمانے کی بدعتوں کے خلاف رسالہ لکھنے پر دعاء دیتے ہیں۔

اکبری عہد کے فتنوں کی وجہ سے مُلک میں بعض بدعتوں کا رواج پڑ گیا تھا۔ اُن کا ذکر بھی مکتوبات میں ہے:۔

(۱) بعض پیروں کو اُن کے مُرید سجدہ کرتے تھے (۱/۲۹)۔

(۲) بعض صوفیوں نے اپنے مسلک میں غلط باتیں شروع کر دی تھیں (۱/۲۲۰)۔

(۳) بعض صوفیوں نے ولایت کو نبوت سے افضل کہا تھا (۱/۱۰۸) ۔ (۱/۲٦۸) ۔

(۴) بعض نے احوال و مواجید کو احکامِ شرعیہ پر غالب کر دیا تھا (۱/۲۲۱) ۔ (۱/۲٦٦)۔

(۵) بعض نے سرود و نغمہ اور قصیدہ خوانی کی مجلسیں قائم کر لی تھیں (۱/۲۳۴) ۔ (۱/۲٦٦) ۔ (۱/۲۷۳) ۔ (۲/۲۳)۔

(٦) بعض علماء نے تہجد اور نوافل کو جماعت سے ادا کرنا شروع کیا تھا۔ (۱/۱۳۱) ۔ (۱/۱٦۸) ۔ (۱/۲۸۸)۔

(۷) بعض علماء نے کفن میں عمامہ شامل کر لیا تھا اور بعض نے شملۂ دستار کو بائیں طرف چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ (۱/۱۸٦)۔

(۸) بعض علماء نے خطبے میں سے خلفائے راشدین (رضی اللہ عنھم) کا نام خارج کر دیا تھا (۲/۱۵)

(۹) بعض لوگ جن کے قلوب بیمار تھے تناسخ کے قائل ہو گئے تھے ۔ (۲/۵۸)

(۱۰) خود جہانگیر نے پندرھویں سال جلوس کے ذیل میں لکھا ہے کہ راجوری (کشمیر) کے مسلمان راجپوتوں کی یہاں ہندوؤں کی ستی کی طرح دستور ہے کہ شوہر کے ساتھ زندہ بیوی بھی دفن کر دی جاتی ہے اور وہ لوگ اپنی بیٹی ہندوؤں کو دیدیتے ہیں۔

پھر شیعوں کا زور بھی بڑھتا جارہا تھا۔ (۱/۵۴)۔ (۱/۸۰) ۔ (۱/۲۵۱) ۔ حضرت مجددؒ تو شروع ہی میں ردّ روافض رسالہ (٦۰) لکھ چکے تھے مذکورۂ بالا فتنوں کے خلاف لکھنا اور ذی اثر امرا کو ان فتنوں کے دفعیہ کے لیے ترغیب دلانا حضرت مجددؒ کے فرائض میں شامل تھا۔ یکم صفر ۱۰۳۳ھ (۱۴ نومبر ۱٦۲۳ء) کو جہانگیر ، اجمیر شریف سے کشمیر کے لیے روانہ ہوا (اغلب ہے کہ حضرت مجددؒ بھی اُس کے لشکر کے ساتھ روانہ ہو کر سرہند تشریف لائے مجمع الاولیاء کی روایت کے مطابق (ورق ۴۴۲) جب کشمیر سے جہانگیر واپس ہوا اور ضیق النفس (دمہ) کا عارضہ حضرت مجددؒ کی دعاء سے دفع ہوا اور اُسے شفا ہوئی تو کہنے لگا کہ "شیخ جیو ، چوں بہ دعاے شما شفا یافتہ ام، فردا بہ طعامِ خانۂ شما پرہیز بشکنم" (ورق ۴۴۳) ۔ سرہند میں اُسے یہ کھانا بہت پسند آیا۔ (٦۱)

حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے بھی ۱۰۲۵ھ میں اپنے زمانے کی حکومت کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کے خلاف ہے ۔ (٦۲) مکتوب نمبر ٦۱ میں شاہ ابوالمعالی کو لکھتے ہیں کہ "گمراہ ہونے کا سب سے بڑا سبب بے صبری اور عدمِ استقلال اور حکومتِ وقت جو اسلامی اصولوں کے خلاف ہو اُن کے شر و فساد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر جب انسان خداوند کریم پر کامل یقین اور بھروسا کر لیتا ہے تو یہ لوگ بھی کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے ۔ میری کیفیت یہ

ہے کہ میں حجاز کے سفر سے واپس آکر (یعنی ۱۰۰۰ھ سے) تقریباً پچیس برس سے اس شہر میں موجود ہوں بحمد اللہ ان لوگوں کے شر و فساد سے محض خداوند کریم کے فضل و کرم سے محفوظ و مامون ہوں ۔

محال است چوں دوست دارد ترا　　　که دردستِ دشمن گزارد ترا

میرے دل میں جب اِس جگہ پر رہنے سے وحشت اور بے حوصلگی حد درجہ تک پہنچ جاتی ہے تو دل مجبور کرتا ہے کہ اب تو دیارِ حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بقیہ زندگی کے ایام بسر کیے جائیں۔۔۔"

مکتوب نمبر ۶۲ میں بھی شاہ موصوف کو لکھتے ہیں کہ "یہ فقیر اس شہر میں گم نامی کی زندگی بسر کر رہا ہے ۔ اول تو لوگ مجھے جانتے ہی نہیں اور جو جانتے ہیں وہ اچھا نہیں سمجھتے ۔ اس لیے میں بتصریح قرآن کی واصبر علیٰ مایقولون و اہجرھم ہجراً جمیلاً ۔ خاموش ہوں ، لوگوں کی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر میں حقیقتاً بُرا اور گمراہ نہیں ہوں تو اُن کا میری طرف ایسی چیزوں کا منسوب کرنا میرے لیے ذرہ برابر بھی ضرر رساں نہیں ہو سکتا اور اگر میں حقیقتاً بُرا اور گمراہ ہوں اور لوگ مجھے نیک اور اچھا سمجھتے ہیں تو اس کا اللہ کے یہاں کوئی نفع اور فائدہ نہیں ہو سکتا ۔ درویش کا اصل کام تو لوگوں کے جور و ستم ، ظلم و استبداد کو برداشت کرنا ہے۔ اور جو شخص اس راستے میں قدم رکھے گا وہ لوگوں کے آزار اور ایذا سے ہرگز نہ بچ سکے گا ۔

حضرت مجددؒ اور شیخ عبدالحقؒ کے ان واضح بیانات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اکبری عہد کی "مذہبی بوالفضولیاں" اکبر کے مرنے کے بعد کب تک اور کس قدر قائم رہیں ۔ لیکن شیخ محمد اکرام صفحہ ۲۸۱ میں لکھتے ہیں کہ "حضرت مجددؒ کے مکتوبات ہی سے خود اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ وہ اس وقت لکھے گئے جب اکبر کے ساتھ اُس کی مذہبی بوالفضولیاں ختم ہو چکی تھیں۔" شیخ مرحوم کا یہ بیان کس قدر غلط ہے۔ قارئین اُن دو بزرگوں کے بیانات دیکھ لیں اور شیخ مرحوم کے بے بنیاد دعووں کو اور اُن کے مقصد کو سمجھ لیں ۔ اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے؟(۰۰)۔

شیخ عبدالحق محدثؒ

آپ ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور اٹھارہ برس کی عمر میں علومِ عقلی و نقلی کی ہر طرح تکمیل کر لی اور درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ ۹۹۶ھ میں حرمین شریفین کے لیے روانہ ہوئے اور احمد آباد کے راستے سے بحری سفر طے کر کے اسی سال رمضان المبارک سے بہت پہلے مکہ معظمہ پہنچ گئے ۔ وہاں اس ماہ تک بعض محدثین سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا درس لیا۔ پھر شیخ علی متقیؒ (م ۹۷۵ھ) کے خلیفہ شیخ عبدالوہاب متقیؒ سے ذکر کی تلقین اور اجازت حاصل کی ۔ دوسرے سال مدینہ طیبہ میں حاضری دی اور قریب ایک سال کے قیام کے بعد مکہ معظمہ واپس ہوئے۔ ۱۰۰۰ھ میں ہندوستان آکر پھر درس و تدریس میں مصروف ہوئے اور مختلف بلند پایہ کتابیں مرتب کیں جن کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے ۔

آپ کے مکتوبات جو ۱۳۳۲ھ میں دہلی کے مطبع مجتبائی سے شائع شدہ اخبار الاخیار کے حاشیے پر بھی تھے اُن کا اردو

ترجمہ کراچی سے شائع ہوگیا ہے ۔ اس میں ۶۸ مکتوبات ہیں اور شروع کے سات مکتوبات حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہیں ۔ وہ زیادہ تر تصوف اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے پانچویں مکتوب میں احمد بن ابراہیم واسطی حضرمی کے عربی رسالہ "فقر محمدی" کا ترجمہ (ملخصاً) ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ توسل و توجہ اور استمداد و ارادت صرف بارگاہ نبوت ؐ سے ہونا چاہیے اور بدعت کے طریقوں سے بچنا چاہیے۔ چھٹے مکتوب میں مسئلہ سماع پر مفصل بحث ہے اور ساتویں مکتوب میں استقامت علی الاوراد کے محاسن ہیں۔ یہ سب مکتوبات انہوں نے اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے ملاحظہ و مطالعہ کے لیے لکھے تھے جن سے وہ حرمین شریفین سے واپسی کے بعد بیعت ہوئے تھے ۔

ایک مکتوب فیضی (م ۱۰۰۴ھ) کے نام ہے جس میں اہلِ دنیا اور اہلِ عقبیٰ کا فرق سمجھایا ہے لیکن وہ محرومین میں سے تھا اور اُس کے متعلق شیخ محدثؒ کا یہ جُملہ اُس کے سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ "۔۔۔ زبانِ اہلِ دین و ملتِ جنابِ نبوت را از بُردنِ نام وے و نامِ جماعت شومِ وے باک است ۔ تاب اللہ علیہم ان کانوا مومنین" (۱) نواب فرید بُخاری (مرتضیٰ خان ۔ المتوفی ۱۰۲۵ھ) کے نام کئی مکتوبات ہیں۔ ایک مکتوب نمبر ۱۷ میں اکبر بادشاہ کی وفات (۱۰۱۴ھ) پر بالواسطہ تعزیت ہے اور اشارۃً فرعون کا قصہ چھیڑا ہے کہ اُسے ملک و سلطنت ، نیز دنیا اور اُس کے اسباب کا غرور اور مستی تھی اس لیے وہ باوجود عقلمند ہونے کے بے وقوفوں کی طرح کام کرتا تھا۔ ایک شیر کا قصہ بھی دُنیا سے نفرت پیدا کرنے کے لیے لکھا ہے۔

نواب فرید کو مکتوب نمبر ۲۸ میں اور عبدالرحیم خان خانان (۱۰۳۶ھ) کو مکتوب نمبر ۲۲ میں لکھا ہے کہ آج کل مرشد کامل کا ملنا دشوار ہے اور اسی مکتوب نمبر ۲۲ میں ایک خاص بات یہ بھی لکھی ہے کہ "شریعت محمدیہ کے بھی ادوار ہیں مثل ادوارِ فلکیہ کے، اور ہر دَور کے سو سال کے بعد اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے اس امت پر ایک ایسے شخص کو جو دین محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی تجدید کرے اور اُس کو قدرت دیتا ہے کہ وہ دین کو تقویت پہنچائے اور اس دین کی ترویج کرے۔ فرماتے ہیں کہ "درین زمان کرمائتہ حادی عشر است نورے جدید از مشرق ولایت وہدایت می تابد ۔ بے شک درین جا سِرّے از اسرارِ الٰہیٰ مُضمر است و انکار را در آن جا مجال تنگ است ۔۔۔" ۔ گویا شیخ محدثؒ بھی ایک مجدّد کے آنے کی خوش خبری سُنا رہے ہیں اور مکتوب الیہ کو تسلی دے رہے ہیں۔ بالکل یہی بات شیخ محدثؒ مرج البحرین میں فرمائی ہے کہ : "نا امید نباید بود کہ حقیقت محمدیؐ را ادوار است مثل دوراتِ فلکی ، تاوضع ہر دورہ نسبت بکہ نشیند و نظرِ کو کبے از کواکبِ صفات و کمالاتش برکہ افتد و بر روے کہ تابد ، تا نورِ کمال از ناصیۂ حالش ظہور یابد و معنیٰ عزت اسلام در جوہر ذاتش پیدا گردد ۔ غالباً تمامی این دورہ بر سر صد سال بود کہ یُبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ اَمْرَ دِيْنِهَا ۔ اکنون این مائتہ حادی عشر است تاسکہ این دولت بنام کیست مردے باید کہ اعجازِ حقیقت بر دست وے باشد ، تا نفوس عامۂ اہلِ این روز گار را کہ حقیقت را لہو و لعب خیال کردہ اند و ہزل را با جِد آمیختہ ، بقہر

اعجاز و قوت تصرف چناں درہم کشد کہ مجالِ نفس پریشاں تنگ آید ۔ (۲۰) گویا حضرت مجددؒ کی طرح شیخ محدثؒ بھی ایک مجدد کی آمد کا ذکر کر رہے ہیں ۔ مرج البحرین میں اثباتِ نبوہ پر لکھنے کا بھی ذکر ہے کہ "ایں سخن (کہ نبوت دیگر است و سلطنت دیگر) در رسالۂ دیگر کہ درباب اثبات نبوہ نوشتہ شود بگوییم کہ اثباتِ نبوہ چہ باشد و کیست کہ نبوت را ثابت گرداند و نبوت ہمہ را ثابت گرداند ۔۔۔" (۳۰) ۔

مکتوب نمبر ۵۰ شاہ ابو المعالی لاہوریؒ (م ۱۰۲۴ھ) کے نام ہے۔ شیخ محدثؒ اُن کا بہت ادب کیا کرتے تھے ۔ اس مکتوب میں شیخ عبدالوہاب متقی شاذلیؒ کی عنایت کردہ کتاب (رسالہ) کا ترجمہ بھی ہے اور ایک بات حضرت خواجہ باقی باللہ کی روایت میں بھی ہے کہ "ایک بار خواجہ عبید اللہ احرارؒ اور مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ دونوں ، خراساں کے ایک بزرگ شیخ بہاء الدین عمرؒ کی خدمت میں گئے اور عرض کیا کہ ذکر کے اندر حبسِ نفس جو بزرگوں سے منقول ہے وہ سُنت سے ثابت نہیں ۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا تم خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کے مُنکر ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ نہیں ، ہم تو صرف دریافت کر رہے تھے (ترجمہ)" —— اس واقعے سے ظاہر ہے کہ حبسِ نفس خواجہ بہاء الدین نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی کرتے تھے۔

مکتوب نمبر ۶۲ میں بھی شیخ عبدالوہاب متقیؒ کا ذکر ہے کہ وہ لوگوں پر وعظ و نصیحت کرنے کو بھی قربِ الٰہیٰ کا وسیلہ فرمایا کرتے تھے۔ اور خاکساری ، عاجزی تواضع ، اور خود کو تباہ و برباد کر دینے کو درویشی کی شرط قرار دیتے تھے، شیخ محدثؒ کے دوسرے مکتوبات بھی درویشی سے متعلق ہیں جیسا کہ انہوں نے مکتوبات کے مقدمے میں بھی فرمایا ہے ۔ جہانگیر کان کا کچا تھا ۔ آخر زمانے میں وہ شیخ محدثؒ اور خواجہ حسام الدین احمدؒ سے بھی ناراض ہو گیا تھا اور ان دونوں کو کشمیر میں طلب کیا تھا۔ لیکن طالب ہی دوسری دنیا میں مطلوب ہوا اور وہ عتاب معلق ہو گیا ۔ (۴۰) محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شیخ محدثؒ کے مزاج اور مذاق کے متعلق بہت صحیح اور مختصر بات اس طرح فرمائی ہے کہ "حضرت شیخؒ سرّو کتمان کے قائل تھے اور پردے پردے میں بات کرتے تھے" (۵۰)۔ یہاں بے محل نہ ہوگا اگر ہم حضرت مجددؒ اور شیخ عبدالحقؒ کے برادرانہ تعلقات کا مختصر تذکرہ کر دیں ۔ وہ دونوں پیر بھائی تھے اور ایسے بلند مرتبہ تھے کہ اُن کے شیخؒ نے اُن سے متعلق فخر و مباہات کا اظہار کیا ہے۔ دونوں بہت بڑے عالم تھے اور دونوں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی میں شہرت رکھتے تھے، پھر خلوص و محبت کا یہ عالم تھا کہ شیخ محدثؒ نے حضرت مجددؒ کو اپنا بھائی سمجھ کر ایک دوست شیخ اسمٰعیل کی سفارش کرنے کے لیے لکھا کہ وہ عبدالرحیم خان خاناں کے بیٹے مرزا داراب خان (م ۱۰۳۴ھ) کو لکھ دیں اور جیسا کہ مکتوب ۱/۱۱۵ سے ظاہر ہے شیخ محدثؒ کے استفسار پر حضرت مجددؒ نے بعض روحانی منازل کی تفصیل بتائی ہے ۔ اور مکتوب ۲/۲۹ سے ظاہر ہے کہ حضرت مجددؒ کے قید ہونے پر شیخ محدثؒ نے ہمدردی اور دلسوزی کا خط لکھا تھا تو حضرت مجددؒ نے اپنی قید کے مصائب کو اللہ تعالیٰ کا خاص انعام قرار دیا ہے اور مکتوب کے آخر میں شیخ محدثؒ کو لکھا ہے کہ "وجودِ شریف ایشاں در یں غربت اسلام، اہلِ اسلام را مغتنم است ۔

سلمکم اللہ سبحانہ و ابقاکم ۔ والسلام" ۔ اِن کلمات سے بھی اشارہ ہے کہ میں قید میں ہوں تو آپ اب غربت اسلام کا مداوا کریں۔ اس کے پہلے مکتوب ۱/۲۹۱ میں حضرت مجددؒ نے بڑی (۰۶) محبت سے حضرت شیخ عبدالحقؒ سے ایک روایت کو نقل کیا ہے کہ "فضیلت پناہی شیخ عبدالحق کہ از مخلصان خواجۂ ماست نقل کردند کہ حضرت خواجہؒ قبیل ایام رحلت می فرمودند کہ مارا بہ یقین یقین معلوم شدہ است کہ توحید ، کوچۂ تنگ است شاہ راہ دیگر است ۔ ہر چند پیش ازین ہم می دانستیم اما این قسم یقین اکنوں بظہور آمدہ است" (۰۷) لیکن ایسے تعلقات کے باوجود تعجب ہے کہ مکتوب (۰۸)۳/۹۷ پر لوگوں کے "شور و غوغا" اور "شہر بشہر منادی" (۳/۱۲۱) پر شیخ محدثؒ نے براہِ راست حضرت مجددؒ سے کیوں مراسلت نہیں کی اور غیاب میں اعتراضات کیوں کیے؟ راقم الحروف تو ایسا لکھنے سے بھی شیخ محدثؒ کی روح کے آگے شرمسار ہے۔ (۰۹)

یہ دونوں بزرگ ہمارے سرتاج ہیں۔ حضرت مجددؒ نے مکتوبات (۱/۲۶۰ ـ ۱/۲۶۱ ـ ۱/۳۰۱ـ ۲/۴ـ ۲/۲۳ وغیرہ میں ایک ہزار سال (ہجری) کے گزرنے کا ذکر کیا اور ایک مجددؒ کے ظہور کا اشارہ کیا ہے ۔ حضرت شیخ محدثؒ نے بھی مکتوب نمبر ۲۲ میں (عبدالرحیم خان خانان سے) یہی بات کہی ہے، پھر انہوں نے مرج البحرین (صفحہ ۴۷) میں بھی اسی طرح ایک مجدد کے ظہور کا اشارہ کیا ہے۔ معلوم نہیں شیخ محدثؒ کو کسی نے کبھی مجدد کہا ہے یا نہیں لیکن حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کو مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ سے لے کر آج تک ہر زمانے میں مجددؒ ہی کہا گیا ہے۔

پھر حضرت مجددؒ نے اپنی پیدائش کا مقصد بعض مکتوبات (۲/۶ ـ ۳/۸۷ وغیرہ) میں جو کچھ بتایا ہے اس کا ایک بہت اہم فائدہ ہماری ظاہر بیں نگاہ میں یہ ضرور نظر آتا ہے کہ حضرت مجددؒ کے زمانے سے آج تک جتنی دینی اور علمی خدمت اُن کی اولاد صلبی اور اولاد معنوی نے کی ہے شاید کسی اور بزرگ کی اولاد نے نہیں کی ۔۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ:

ع   ایں سعادت بزورِ بازو نیست

حضرت مجددِ الفِ ثانی : حضرت مجددؒ قدس سرہ کے حُسن صورت اور حُسن سیرت کا ایک مختصر خاکہ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے:۔

حضرت مجددؒ کا حلیہ ایک بلخی درویش نے خواب میں اس طرح دیکھا تھا:۔

"سرو قد، گندمی رنگ لیکن مائل سفیدی ، کشادہ چشم ، فراخ پیشانی، کھڑی ناک ، گھنی اور بڑی ڈاڑھی والے کہ جن کا حُسن یوسفیؑ تھا اور ملاحت محمدیؐ تھی۔ انوار ولایت اُن کی روشن پیشانی میں تھے اور وجاہت ، وقار اور تمکین اُن کا لباس تھا۔" (۱۰)

"آپ کا طریقہ بالکل صحابۂ کرامؓ کے طریقے کے مطابق تھا اور آپ کا لباس بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کبار کے لباس کی طرح تھا۔ یعنی سر پر عمامہ، مسواک (گوشۂ دستار سے بندھی ہوئی) ، عمامہ کا کنارہ دونوں کندھوں کے بیچ میں پڑا ہوا، قمیص کا گریبان دونوں کندھوں کی طرف

کُھلا ہوا ، پاجامہ ٹخنوں کے اوپر بلکہ پنڈلی کے وسط تک ، پاؤں میں جوتی اور ہاتھ میں عصا ہوتا تھا۔ کندھے پر سجّادہ ہوتا تھا اور پیشانی پر کثرتِ سجود کے نشانات ، پیشانی اور رخساروں پر باطنی نورانیت کے انوار رہتے تھے ۔۔۔۔" (۸۱)

خواجہ باقی باللہ قدس سرّہ فرمایا کرتے تھے کہ "جب خواجۂ امکنگیؒ سے مراجعت پر ہمارا گزر آپ کے وطن سرہند سے ہوا تو ہم نے واقعے میں دیکھا کہ ہم سے کہا جا رہا ہے کہ تم ایک قطب کے قریب ٹھہرے ہو۔ پھر اُس قطب کا حُلیہ بھی بتایا گیا۔ صبح کو ہم نے شہر کے مشائخ اور گوشہ نشین صلحا، کی تلاش کی ، تو اُن میں سے کوئی بھی اُس حُلیے کے مطابق نہ تھا اور کسی میں قُطبیت کی علامات اور آثار دکھائی نہ دیے ۔ دل میں خیال آیا کہ شاید اس شہر میں قطبیت والا شخص بعد میں ظاہر ہو گا۔ لیکن پھر جب آپ سے ملاقات ہوئی تو آپ کا حُلیہ بالکل اُسی حُلیے کے مطابق دیکھا اور اُس قُطبیت کی علامات آپ میں دیکھیں۔" (۸۲)

صاحب حضرات القدس (جلد دوم ۔ حضرت نہم) نے آپ کا حُلیہ پھر بیان کیا ہے کہ :۔

"حضرت مجددؒ گندمی رنگ لیکن مائل بہ سفیدی تھے اور کشادہ پیشانی تھے اور آپ جیسے سردارِ کبار تھے، آپ کی پیشانی اور چہرے سے ایک ایسا نور چمکتا تھا کہ آنکھیں اُس کے مشاہدے سے خیرہ ہو جاتی تھیں۔ آپ کشادہ ابرو تھے اور ابرو ایسے تھے جیسے ایک منحنی کمان، یعنی لمبے ، سیاہ اور باریک بھی اور آپ کی آنکھیں کشادہ اور بڑی بڑی تھیں۔ اُن کی سیاہی زیادہ سیاہ تھی اور سفیدی بھی بہت سفید تھی۔ آپ کی ناک بلند اور باریک تھی۔ لب سرخ اور باریک تھے ۔ مُنہ نہ لمبا تھا اور نہ بہت چھوٹا۔ آپ کے دانت ایک دوسرے سے ملے ہوئے اور چمکدار تھے۔ ایسے جیسے لعل بدخشان اور آپ کی ریش مبارک خوب گھنی ، رعب دار، دراز اور مربع تھی اور آپ کے رُخساروں پر آپ کی ریش مبارک کے بال تجاوز نہیں کرتے تھے۔ آپ دراز قد اور نازک اندام تھے اور کبھی آپ کے بدن پر مکھی نہ بیٹھتی تھی ۔ آپ کے پاؤں کی ایڑیاں ایسی صاف اور چمک دار تھیں جیسی چین اور چگل کے محبوبوں کی ہوتی ہیں۔ اور آپ کے پسینے سے کبھی ناگوار بو نہیں آتی تھی ۔ غرض کہ آپ کا حُسن ، یوسف علیہ السلام کے حُسن کی یاد تازہ کر دیتا تھا اور آپ کی وجاہت ابراہیم علیہ السلام کی یاد دلاتی تھی۔ جو شخص بھی آپ کو دیکھتا ، بے اختیار کہہ اُٹھتا کہ یہ انسان نہیں، کوئی بزرگ فرشتہ ہیں اور بلا تامل ہر شخص کی زبان پر اس طرح جاری ہو جاتا کہ سبحان اللہ ، یہی اللہ کے ولی ہیں۔ گویا یہ حدیث کہ "اولیاء اللہ کو دیکھنے سے خدا یاد آتا ہے" آپ ہی کی شان میں وارد ہوئی تھی"۔ (۸۳)

آگے چل کر اسی باب (حضرت پنجم) میں ہے :۔ "یہ حقیر (مؤلف) اس برگزیدہ امام ہمام کے خادموں میں

شامل ہونے سے پہلے کبھی کبھی آپ کی مسجد میں جمعہ کی نمازوں میں شریک ہو جاتا تھا اور آپ کی نماز کو دیکھ کر بے اختیار ہو جاتا تھا اور یقین رکھتا تھا کہ آپ ہمیشہ حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو دیکھتے ہیں اور اسی طریقے کے مطابق آپ نماز ادا کرتے ہیں اور یوں تو اس حقیر نے دوسرے علماء اور مشائخ کو بھی دیکھا ہے ۔ لیکن ایسی نماز کسی کی نہیں دیکھی۔ ہمیشہ اول وقت میں نماز ادا کرنا اور ایک ہی طریقے سے ہمیشہ ادا کرنا عجوبۂ روزگار معلوم ہوتا تھا۔ کبھی ہم نے نہیں دیکھا کہ آپ نے اپنے وقت سے ایک لمحہ بھی تجاوز کیا ہو یا طریقۂ نماز میں کبھی قومہ یا جلسہ یا کسی آداب نماز میں کسی طرح کوئی فرق محسوس ہوا ہو۔ آپ کی نماز ہی آپ کی اعلیٰ کرامت تھی کہ خرقِ عادت اور عرفِ عالم ظاہر ہوتی تھی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ہمیشہ ایک طور پر بلا کسی رنج و مشقت کے ، اس طرح پوری تعظیم و توقیر ، وقار ، خشوع اور خضوع اور انکسار کے ساتھ نماز ادا کرنا محض حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال اتباع اور آپ کی باطنی قوت کی وجہ سے تھی۔ اسی لیے یہ حقیر (مؤلف) بلکہ ایک کثیر جماعت آپ کی نماز ہی کی وجہ سے آپ کی معتقد ہوئی تھی۔"

حضرات القدس (دفتر دوم) کے آخر میں خواجہ بدرالدین سرہندیؒ نے اپنے حالات کے ذیل میں حضرت مجددؒ کے متعلق فضائل میں یہ بھی لکھا ہے کہ :۔ "حضرت مجددؒ قدس سرہ ایک عرصے تک پشمینے کے ایک مُصلّے پر نماز ادا فرماتے رہے اور چونکہ امام مالکؒ کے مذہب میں پشمینے پر سجدہ مکروہ ہے اور حضرت مجددؒ کا طریقہ جمع مذاہب کا تھا، تو آپ نے سجدے کی جگہ پر ٹاٹ کا ایک ٹکڑا سی لیا تھا۔ سالہا آپ اس مصلّے پر نماز ادا فرماتے رہے اور اُس کپڑے کے ٹکڑے پر سجدہ کرتے رہے ۔ جب وہ ٹکڑا میلا ہو گیا تو خادموں نے اُسے علیحدہ کر دیا اور اتنا ہی ایک دوسرا کپڑا اسی دیا ۔ اِس مسکین نے اُس علیحدہ کیے ہوئے کپڑے کو جو بہت متبرک تھا، اپنی پگڑی میں رکھ لیا کہ گھر جا کر اچھی جگہ پورے احترام کے ساتھ رکھ لوں گا۔ اتفاقاً رات ہو گئی اور یہ حقیر نماز عشاء پڑھ کر سو گیا۔ اور وہ ٹکڑا میری پگڑی ہی میں رکھا رہ گیا۔ حضرتؒ کی بزرگی اور کرامت کے صدقے میں اُس رات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے بارہ مرتبہ بلکہ زیادہ مرتبہ خواب میں دیکھا ۔ ہر بار میں بیدار ہو جاتا تھا اور پھر سو جاتا تھا اور پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا تھا ۔(۸۴)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے غلبہ سے حضرت مجددؒ کا یہ قول کس قدر پُر کیف ہے کہ :۔

"حق سبحانہ و تعالیٰ را بواسطۂ آں دوست وارم کہ ربِ محمدؐ است" (صلی اللہ علیہ وسلم)

یعنی خدا سے مجھے اس لیے محبت ہے کہ میرے محمدؐ کا رب ہے (مبداء و معاد ۔ منہا ۳۷ ۔ ۱۲/۳)

اللہ اللہ ، ایک مختصر سے جملے میں حمد اور نعت دونوں کی انتہا کر دی ۔ شاید اس شان کا جملہ کسی زبان میں نہیں ہے ۔

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے حضرت مجددؒ کو صورت ، سیرت، علم و عمل اور عمر و حیات میں حضور انور

صلی اللہ علیہ وسلم کے "اسوۂ حسنہ" کا ایک حقیقی نمونہ بنایا تھا اور اُن کی پوری زندگی کو اس حدیث کے تابع فرما دیا تھا۔

مَن رَّاٰی مِنکُمْ مُنکَراً فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ ۔

معترضین دیکھ لیں کہ جلالی رنگ کیوں ہے اور گوشہ نشینی کیا ہے؟

مولانا عبدالشکور فاروقیؒ نے تذکرۂ امام ربانیؒ (صفحہ ۲۸۱ ۔ ۲۸۳) میں لکھا ہے کہ:-

"حضرتؒ کا مجدّد الف ہونا بھی ایک بڑی چیز ہے ۔ آپ سے پہلے صدی کے مجدّد ہوا کرتے تھے ۔ الف کا مجدد کوئی نہیں ہوا (کیونکہ) الفِ ثانی کا آغاز ہی نہ ہوا تھا۔ الفِ اوّل میں خود ذاتِ اقدس و اطہر سیّد البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی موجود تھی۔ آپ سے پہلے جس قدر مجدد صدیوں والے گزرے ہیں اُن میں سے کوئی مجدد، دین کے تمام شعبوں کا مجدد نہیں ہوا۔ بلکہ خاص خاص شعبوں کے مجدد ہوتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایک وقت میں کئی کئی مجدد نظر آتے ہیں۔ کوئی علمِ حدیث کا، کوئی فقہ کا، پھر اس میں بھی کوئی فقہ حنفی کا مجدّد ہے، کوئی فقہ شافعی کا۔ کوئی علمِ کلام کا مجدد ہے اور کوئی سلوک و احسان کا۔ لیکن یہ چیز اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کے لے مخصوص رکھی کہ آپ دین کے تمام شعبوں کے مجدد ہیں۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ آپ سے پہلے کے مجدّدِین کو سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت، خاص خاص چیزوں میں حاصل تھی اور آپ کو تمام چیزوں میں نیابت تامہ حاصل ہے۔ وشتان مابینھما ۔۔۔ آپ کے سوا دوسرے مجددین کی مجددیت، نہ معلوم کتنے لوگوں کے علم میں نہ آئی اور نہ معلوم کتنوں کی مختلف فیہ رہی ۔ جو اختلاف کہ معاندانہ یا معاصرانہ ہو وہ تو قطعاً قابلِ لحاظ نہیں۔ مگر جو اختلاف کہ شرائط مجددیت کے پائے جانے، یا نہ پائے جانے کی وجہ سے ہو وہ بے شک قابلِ لحاظ ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت امامِ ربانیؒ کی مجددیت کو ان چیزوں سے بھی محفوظ رکھا اور آپ کی مجددیت کا تمام امت کو دنیا کے ہر گوشے میں علم ہوا اور جو لوگ اس معاملے میں اہلِ حلّ و عقد ہو سکتے ہیں اُن سب نے آپ کی مجددیت کو تسلیم کیا ۔۔۔"

مولانا عبدالشکور فاروقیؒ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:

"مجدّد کی سب سے بڑی پہچان اُس کے کارنامے ہیں ۔ حمایتِ دین، اقامتِ سنت اور ازالۂ بدعت"۔

اور ہمارے شیخ مولانا زوار حسینؒ اپنی کتاب "حضرت مجدّدِ الف ثانیؒ" (صفحہ ۴۷۶) میں فرماتے ہیں کہ:-

"امورِ دینیہ کا مدار پانچ اصولوں پر ہے (۱) اعتقادات (۲) عبادات (۳) معاملات (۴) عقوبات اور (۵) آداب ۔۔۔ (مختلف کتابوں کے مطالعے سے) معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت مجدّدؒ نے

دین کے ان تمام اصول و شعب میں نہایت واضح اور نمایاں تجدیدی کردار ادا فرمایا ہے ۔"
ہم یہی کہیں گے کہ علمی اور عملی طور پر حضرت مجددؒ کے معاصرین میں سے کسی نے ایسا کردار ادا نہیں کیا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شیخ عثمان جالندھریؒ : حضرت خواجہؒ کے ایک مشہور خلیفہ شیخ عثمان جالندھریؒ بھی تھے۔ اُن کی تصانیف (۸۵) میں رسالہ عشقیہ ، چہل مکتوبات اور تفسیر سورہ رحمٰن موجود ہیں۔

رسالہ عشقیہ جو راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے اُس میں دو سو اُنتیس اوراق ہیں اور اُس کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے:- الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ علی رسولہ محمد وآلہٖ اجمعین ۔ سبحان اللہ قادرے کہ خاک را از لطف عمیم جان بخشید و بتشریف و لقد کرّمنا بنی آدم مشرف گردانید و بخلوتِ یُحِبّھُم و یُحِبّونہ معزز ساخت و بدولتِ وصال وھو معکم بنواخت وفی انفسکم اَفَلَا تُبصرون اشارتے است باختصاص و نحنُ اَقربُ اِلیہِ مِنْ حَبْلِ الورِید کرامتے ست خاص ۔۔۔۔ وارشاد پناہی مظہر جلال ذوالجلال حضرت شیخ جلالؒ ، خلیفۂ غوث الثقلینؒ است قدس اللہ سرّہ و نخست ارادتِ فقیر بسلسلۂ قادریہ بوسیلۂ بیعتِ مبارکش بود و بحکم اشارت خواجۂ نقشبندؒ و اجازتِ غوث الثقلینؒ ۔۔۔۔ (ارادت) نقشبندیہ از خدمتِ خواجہ اسحٰقؒ یافتہ کہ سحق و خودفانی و قرب حیات جاودانی مخلصان را از صحبت ایشان حاصل می شد و چون شرف ملازمت حضرت پیر ولی کوہیؒ میسر شد از کمال ولایت و محض کرامت ، سہ روز توجہ بحال بندہ فرمودند و نمودند کہ سالہا بل قرنہا زبانِ تقریر و خامہ تحریر در اداے شکر آن عاجز و قاصر است و دورِ باقی از فیضِ ساقی یعنی منشأۂ از خدمتِ خواجہ باقیؒ نصیب شد ۔۔۔۔ اے درویش تا بر چہار آتش گداختہ نہ گردی پختہ نہ شوی۔ اوّل آتشِ فقر، دوم آتش محبت ، سوم آتش دم نہ زدن در قضاو قدر یعنی تسلیم و چہار آتش از غمِ روزی بے غم بودن یعنی توکل ۔ اے درویش تا ازین چہار عقبہ در نگزری تراعاشق نخوانند ۔ و این تحفۃ القلوب و ہدیۃ الارواح بچہار فصل مفصل شد و ہر فصل بچہار باب منسوب گشتہ و ہر باب بکلام ربانی و حدیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم و سخنانِ اہلِ اللہ کشایش یافت تا دوستانِ لائق و عاشقانِ صادق ازین بہرہ برگیرند و باغیر مشغول شدن ، راحت نیز برند کہ لاوحشۃ مع اللہ ولاراحۃ مع غیر اللہ و این رسالہ مسمیٰ بہ عشقیہ ، وربائے معرفت شد تا عاشق را اُلفتے باشد ۔

اس مقدمے سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں :-

(۱) مصنف پہلے حضرت شیخ جلال (تھانیسری ۔ المتوفی ۹۸۹ھ) (۸۶) سے بیعت ہوئے جو حضرت عبدالقدوس گنگوہی (۱) رحمۃ اللہ علیہ (م ۹۴۴ھ) کے خلیفہ تھے۔ یعنی شیخ عثمانؒ پہلے قادری سلسلے میں بیعت ہوئے ۔

(۲) پھر حضرت بہاءالدین نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے "اشارہ" (روحانی) اور حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی "اجازت" (روحانی) سے خواجہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ (۸۷) کی خدمت میں نقشبندی طریقہ اختیار کیا۔

(۳) اس کے بعد پیر ولی برکی (۱۱) علیہ الرحمہ سے صرف تین دن کی صحبت میں ولایت کے کمالات کے عجیب عجیب مشاہدات ہوئے۔

(۴) ان بزرگوں کے بعد حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۱۲ھ) کی خدمت میں مستفید ہوئے۔

(۵) مصنفؒ نے اس رسالے کا نام عشقیہ رکھا تھا۔ اس میں چار فصلیں ہیں اور ہر فصل میں چار باب ہیں ۔ اِن فصلوں کی تفصیل اس طرح آتی ہے کہ پہلی فصل میں فقر، تسلیم ، توکّل اور ذکر کے چار ابواب ہیں۔ دوسری فصل میں بھی چار باب ہیں: (۱) سلوک کی انتہا (۲) درویشوں کی عادات (۳) اہل اللہ کی ریاضت (۴) رضائے الٰہیٰ کی تحمّل سے متعلق ہیں۔ تیسری فصل میں بھی چار باب ہیں :- (۱) خاموشی اور گوشہ نشینی (۲) ذوق و محبت (۳) شوق اور (۴) تواضع ۔ یہ فصل ، طویل مباحث پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد آخری یعنی چوتھی فصل شروع ہوتی ہے اور اس میں بھی چار باب ہیں : (۱) تضرع (۲) عاشقوں کی جاں بازی (۳) نصیحت، دلجوئی ، عیب پوشی وغیرہ (۴) عاشقوں کے حالات ۔ پھر خاتمۂ کتاب ہے۔

اِن تمام فیصلوں میں جگہ جگہ علماء صلحاء اور صوفیہ کے اقوال یا اشعار ہیں اور امامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر شیخ عثمانؒ کے مرشدوں تک کے اقوال درج ہیں۔ اور خود مصنف کے اشعار اور غزلیں بھی بکثرت آتی ہیں ۔ ایک اچھی غزل (ورق الف ۱۵) اس طرح شروع ہوتی ہے۔

اے درعیاں نہاں و نہاں درعیاں توئی — بے مثل ولامثال نشاں بے نشاں توئی
تو آں نۂ کہ کس زتویابد یکے نشاں — اے برتر از بلند و بلند از گماں توئی
در ظاہراً ترا طلبم و آنگہی نہاں — ورچوں نہاں بجوئمت آنگہ عیاں توئی
در دہر و دورِ گردش عالم ، جہان و خلق — غائب میانِ ہرہمہ و باہماں توئی
ہر رو بروی ظاہر و ہر سو بسو نہاں — معلوم شد چناں کہ ہمین و ہماں توئی
بودیم درپئے تو بہر سو بجست وجوی — عثمان طلسم بود جمالِ جہاں توئی

شیخؒ کی شاعری کا عام رنگ یہی ہے اور ہر جگہ معرفت سے متعلق اسی طرح کے اشعار ہیں ۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کے زمانے کی تعیین کی جائے ۔ انڈیا آفس لندن کا مخطوطہ نمبر ۲۹۱۵ بھی اسی رسالے کا ایک نسخہ ہے جو محمد شاہی جلوس کے اکیسویں سال یعنی ۱۷۳۹ء/۱۱۵۲ھ میں لکھا گیا تھا۔

Hermamm ETHE کا خیال ہے کہ "شاہ عثمان" وہی ہیں جن کے انتقال ۱۰۰۵ھ سے متعلق حضرت ہاشمی کشمیؒ نے اپنے دیوان (مخطوطہ نمبر ۲۸۹۸ ۔ انڈیا آفس ۔ لندن) میں قطعۂ تاریخ لکھا تھا۔ لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی ۔ کیونکہ شیخ عثمانؒ (۸۹) کے "چہل مکتوبات" میں ایک مکتوب (صفحہ ۹۷) شاہجہاں بادشاہ (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ) کے نام ہے جو ابتدائی عہد کا معلوم ہوتا ہے اور شیخ عثمانؒ اُن کو عدل و انصاف کے لیے نصیحت لکھ رہے

ہیں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ شیخ عثمانؒ ۱۰۳۷ھ تک ضرور زندہ تھے۔ چہل مکتوبات میں بکثرت اشعار ہیں ۔ جن میں سے اکثر شیخ عثمانؒ ہی کے معلوم ہوتے ہیں اور اُن کے تخلص کے ساتھ بھی دو غزلیں صفحہ ۸۳ ۔ اور صفحہ ۱۱۹ میں موجود ہیں۔ ان مکتوبات میں جگہ جگہ ریختہ کے اشعار بھی ہیں اور رسالۂ عشقیہ میں بھی ریختہ کی ایک غزل (بارہ اشعار کی) ان کے تخلص کے ساتھ ملتی ہے ۔ اس کا مطلع اور مقطع اس طرح ہے :-

عاشق دیوانہ ام آؤ پیارے حبیب — از ہمہ بیگانہ ام آؤ پیارے حبیب

بر دل عثمان غریب رحمتِ خود کن قریب — زانکہ تو ہستی مجیب آؤ پیارے حبیب

رسالہ مشائخ طرقِ اربعہ جو حضرت مجددِ الفِ ثانی قدس سرہ نے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی ایک بیاض سے نقل فرمایا تھا اور وہ کابل میں حضرت نور المشائخ علیہ الرحمہ کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔

انتساب این داعی کمینہ محمد الباقی بایں خانوادۂ عالیہ چنان است کہ این کمینہ خرقہ پوشیدہ و مصافحہ کردہ و اجازۂ تامۂ عامہ وارشاد یافتہ از حضرت مُرشد علی الاطلاق و غوث الآفاق فی المشارق والمغارب بالاستحقاق مخدومی و سیدی خواجہ اسحٰق قدس سرہ و ایشان از دو جا اجازہ و نسبت و ارشاد یافتہ اند — اوّلاً از والدِ خود حضرت قطب الاقطاب مولٰینا خواجگی کاسانی الدہبیدی قدس سرہ ۔ بعد ازاں از خلیفۃ الخلفائے ایشاں حضرت مولٰینا لطف اللہ قدس سرہ کہ ہم پیرہ نیز بودہ اند بحضرت مولٰینا خواجگی و حضرت مولٰینا لطف اللہ قدس سرہ از حضرت مولٰینا شاہ حسین کے مرغینانیؒ کہ از خلفاءِ حضرت خواجہ اصرار اند اوّلا نسبت درست کردہ مجاز شدہ بودند بعد از ایشاں بحضرت محمد قاضی پیوستہ از ایشاں نیز مجاز گشتہ اند ۔ و بعد از ایشاں بحضرت مخدومی مولٰینا خواجگیؒ نیز بیعت کردہ اند ۔ وخدمات و ایثار ہائے بے نہایت مالاً و نفساً بتقدیم رسانیدہ اند ۔ پس ازاں جہت حضرت مولٰینا خواجگی قدس سرہٗ ایشاں را صدیق خلفاء و قائم مقامِ مطلقِ خود خواندہ اند ۔ پس معلوم شد کہ حضرت مولٰینا خواجگیؒ و حضرت مولٰینا لطف اللہ را انتساب و اجازہ از مولٰینا محمد قاضی است و ایشاں را از خواجۂ احرارؒ است ۔ اعنیٰ حضرت ناصر الملّۃ والدین خواجہ عبید اللہ ۔ و ایشان را اجازہ و انتساب بحضرت مولٰینا یعقوب چرخیؒ است و ایشاں را بخواجۂ بہاء الحق والدینؒ النقشبندیہ است و ایشاں را بحضرت امیر کلالؒ و ایشان را بخواجہ بابائے سماسیؒ و ایشاں را بخواجہ علی عزیزانؒ رامیتنی و ایشاں را بخواجہ محمود انجیر فغنویؒ است و ایشاں را بخواجۂ عارف ریوگریؒ است وایشاں را بحضرت قطب الاقطاب خواجۂ جہاں خواجہ عبد الخالق غجدوانیؒ و ایشاں را بخواجہ یوسف ہمدانیؒ و ایشاں را بخواجہ ابو علیؒ فارمدی طوسیؒ و ایشاں را بخواجہ ابو القاسم گرگانیؒ وایشاں را بشیخ ابوالحسن خرقانیؒ و ایشاں را بشیخ بایزید بسطامیؒ وایشاں را بہ امام جعفر صادق وامام جعفر صادق رضی اللہ عنہ را دو نسبت است۔ یکے بہ پدرِ بزرگوارِ خود امام محمد باقر رضی اللہ عنہ و ایشاں را بہ امام زین العابدین رضی اللہ عنہ و ایشاں را بہ امام حسین رضی اللہ عنہ و ایشاں را بہ پدرِ بزرگوارِ خود اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب کرّم اللہ وجہہ' وایشاں نیز جامع دو نسبت اند ۔ یکے از آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے واسطہ و دوم بواسطۂ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم ۔ وایں نسبتے کہ امام جعفر صادق را بہ آبائے گرامی است رضی اللہ تعالیٰ

عنہم سلسلۃ الذہب می نامند لشرافتہ و نزاہتہ و لطافتہ و غیر ایں نسبت را سلسلۃ الفضۃ می گویند ۔ و نسبتِ دیگر امام جعفر رضی اللہ عنہ بہ پدر مادر خود است قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہم کہ از فقہائے سبعہ بودہ اند و از کبائر ائمۂ دین اند و ایشاں را بحضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ است ۔ وایشان را نیز دو نسبت است ، یکے از آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلاواسطہ ۔ و نسبت دیگر بواسطۂ خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم ۔ لیکن از ہر یکے از خلفاء نسبتے خاص یافتہ و در طریقِ ذکر خفیۂ قلبی و توجہ و مراقبۂ باطن منسوب اند بحضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کہ طریقِ خاص ایشاں بودہ و حضراتِ خواجگان قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم ورزش ایں نسبت نمودہ اند بدانچہ منسوب بحضرت صدیق اکبر اند رضی اللہ عنہ ۔

مخفی نماند کہ خواجہ ابوالقاسم گرگانیؒ کہ پیر خواجہ ابو علی فارمدیؒ است ، ایشاں را نیز دو نسبت است، یکے بہ شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کہ مذکور شد و نسبتِ دیگرِ ایشاں بہ شیخ ابو علی کاتبؒ است و ایشاں را بہ شیخ ابو علی رودباریؒ و ایشاں را بشیخ ابو عثمان مغربیؒ ۔ و ایشاں را بہ سید الطائفہ شیخ جنیدؒ است قدس سرہ ۔ و شیخ ابوالحسن خرقانیؒ ۔ ۳ جا منسوب اند، یکے بہ شیخ بایزید بسطامیؒ ، چناں کہ مذکور شد و ایں بحسبِ روحانیت است و دیگر بہ شیخ ابو علی رودباریؒ و شیخ ابو سعید ابوالخیرؒ ۔ و ایں دو ہم بحسبِ روحانیت است و ہم بحسبِ معنی ۔ شیخ بایزید بسطامیؒ را نسبت و بیعت بحضرت امام بحق ناطق جعفر صادق رضی اللہ عنہ چنانکہ امام غزالیؒ در کتاب طیب القلوب خود آوردہ اند کہ شیخ بایزیدؒ بہ امام جعفر رضی اللہ عنہ بیعت فرمودہ و دوام ذکر اللہ اللہ و شکرے شکرے گفتے تا آں کہ از دنیا رحلت فرمودہ ۔ انتہی کلامہ ۔ و ہمچنین است در کشف المحجوب شیخ علی عثمان جلابیؒ کہ معاصر شیخ ابو علی فارمدیؒ بودہ اند و در تذکرۂ عطار قدس سرہما ۔

پوشیدہ نماند کہ انتساب اجازتِ ایں کمینہ از طریقۂ جہریہ یَسَوِیہ اوّلاً بار از حضرت قطب الاقطاب غوث الخلائق و الطرائق حضرت قاسم شیخ عالمیانؒ عالم الکبیر بنکتی (؟) است ۔ بعدہ از شیخ المشائخ فی العالم الاعلم الافخم سید طبیب بلخیؒ است ۔ بعد از ایشاں از برادر ایشاں اعنی السید السند العارف باللہ والغوث الاعظم الاعلم بلا اشتباہ سند نا و مخدومنا و استاذنا سید عبداللہ البلخیؒ مرۃً بعد اُخریٰ و کرۃً بعد اُخریٰ اجازت نامہ عامّہ و لباس خرقہ مشرف کردند و درہمیں طریقہ از مشائخ کبار بسیار بہ اجازت و ارشاد موفق و مبشر گردیدہ تحرّزاً عن الاطناب مذکور نہ گردانید ۔ پس معلوم باشد کہ حضرت قاسم شیخؒ از طرقِ اربعۂ مشہورہ مجاز بودند ۔ لیکن روشِ طریقۂ ایشاں جہر بودہ و دریں طریقہ منسوب و مجاز اند ۔ اولاً از روئے معنی از حضرت شیخ خدائے داد و از روئے صورت از دو خلیفۂ شیخ خدائے دادؒ ، اوّل از خواجہ مولٰینا نوریؒ کہ ہیجدہ ۱۸ سال در ملازمتِ ایشاں سلوک نمودہ مجاز شدہ اند و بعد ازاں از مشائخ طُرقِ متعددہ بعد از سیاحت و ملازمتِ مشائخ بحضرت مولٰینا ولی کوہ دریؒ پیوستہ اند و ہیجدہ ۱۸ سال دیگر در خدمتِ ایشاں بودہ ۔ بعد از وفاتِ ایشاں بہ مسندِ ارشاد نشستہ اند و میفرمودند ، باآنکہ بہ کبر سن رسیدہ ام ، اگر دانم کہ کسے باشد کہ از و فائدہ می تواں گرفت ، بقیۂ عمر بخدمتِ آن عزیز بسر می بُردم و غاشیہ او بر دوش کشیدہ در جلوے او می روم و ایشاں یاد از کبرائے متقدمین می دانند ۔ ہنیئاً لمن رآہٗ و جالسہ و صاحبہ رضی اللہ عنہ ۔ و

حضرت شیخ خداے دادؒ را نسبت بہ شیخ جمال الدینؒ و شیخ جمال الدینؒ را نسبت بہ شیخ خادمؒ است ۔ و حضرت مخدومی سید عبد اللہ رامع برادر نسبت بزرگوار ایشاں است کہ اعلم علمائے زمان و اکبر کبراے وقت بودہ اند و مشہور اند بقاضی صالح البلخیؒ ۔ و حضرت مخدومی سید عبد اللہ را از مشائخ طُرُق متعدد ہ نسبتہا و اجازتہا بسیار است لم نذکرہ تحرزاً عن التطویل ۔ و حضرت شیخ محمد صالحؒ المشہور بقاضی و السید بشیخ علی شیخ است و ایشاں را بشیخ علیؒ است ؟ و ایشاں را بہ اَلمن بابا است و بعضے بہ ایمن اتا گفتہ اند و ایشاں را بہ صدر اتاؒ ۔ و بعضے ایمن اتاؒ را نسبت بہ شیخ جمال شاشیؒ دادہ اند ۔ و صدر اتاؒ را بہ زنگی اتاؒ است و زنگی اتاؒ و بہ حکیم اتا را بہ حکیم اتاؒ را بہ حضرت بُرہان المحققین خواجہ احمد یَسَویؒ است و ایشاں را بہ شیخ ابو یوسف ہمدانیؒ است و نسبتِ شیخ ابو یوسف ہمدانیؒ تا آخر مذکور شد ۔ و خواجہ احمد یَسَویؒ را دو نسبت دیگر است یکے بہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ و دیگر بہ ارسلان باباؒ و ایشان را نسبت بہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نیز دادہ۔ چنانچہ خرقۂ اماتتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بہ ایشان رسانیدہ اند و می تواند بود کہ این نسبت از راہِ معنی باشد بر تقریر صحت۔ لہٰذا نسبتِ ایں کمینہ در طریقۂ علیۂ کبرویۂ ہمدانیۂ فتحیہ از کبار مشائخ دراں طریق واقع شدہ ، خصوصاً از حضرت بُرہان المحققین و قطب العارفین و غوث السالکین شیخ صدر الملّۃ والدین البخاریؒ القرا کولی است کہ مدّت دہ سال فی الخلوۃ والجلوۃ بالغدوۃ والآصال والصحبۃ والسفر والحضر ملازم آستان عبودیت بودہ بنظراتِ خاصہ و لباس خرقہ از شیخ ترسوں المروی و شیخ نور الدین ابراہیم الخافیؒ کہ ہم پیرہ ہائے مخدومی الاعظم شیخ صدر الدینؒ بودند، میّسر گردید ۔ پس ایں ہر سہ عزیز را نسبت بحضرت مخدومی قطب الاقطاب الشیخ الشہیر السامی مولینا محمد الجامیؒ است و ایشاں را نسبت بحضرت مخدومی الاعظم شیخ حاجی محمدؒ الخبوشانی است و ایشاں را بحضرت شاہ البیدواریؒ است و ایشاں را انتساب بہ شیخ رشید البیدواریؒ است و ایشاں را بہ امیر عبد اللہ البرزس آبادی است وایشاں را بہ خواجہ اسحٰق ختلانیؒ وایشاں را بہ امیر کبیر امیر سید علی الہمدانیؒ است وایشاں را بہ شیخ محمود مزداقانیؒ و ایشاں را بہ شیخ علاء الدولہ سمنانیؒ وایشاں را بہ شیخ عبد الرحمٰن اسفرائنیؒ و ایشاں را بہ شیخ احمد الجرجانیؒ وایشاں را بہ شیخ علی لالای غزنویؒ و ایشان را بہ شیخ مجد الدین بغدادیؒ وایشان را بہ شیخ نجم الدین کبریٰؒ و ایشاں را بہ شیخ عمار یاسرؒ و ایشاں را بہ شیخ ابو نجیب سہروردیؒ و ایشاں را بہ شیخ احمد غزالیؒ و ایشاں را دو نسبت است ۔ یکے بہ شیخ یوسف ہمدانیؒ و دیگرے بہ شیخ ابوبکر نساجؒ — و شیخ ابوبکر نساج را بہ شیخ ابو القاسم گرگانیؒ است و ایشاں را نیز دو نسبت است چنانکہ ز سمر شد یکےبہ شیخ ابو الحسن خرقانی و دیگر بہ شیخ ابو علی رودباری و ایشان را بہ شیخ ابو عثمان سفری و ایشاں را بہ شیخ جنید بغدادیؒ و ایشاں را بہ سری سقطیؒ و ایشاں را بہ معروف کرخیؒ ۔ وایشاں را دو نسبت است، یکے بہ امام علی موسیٰ رضاؓ الیٰ آبائہ الکرامؓ ۔ و دیگر بہ داؤد طائیؒ و ایشاں را بہ حبیب عجمیؒ و ایشاں را بہ شیخ حسن بصریؒ و ایشاں را بہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ ۔ و امام علی موسیٰ رضا راؓ انتساب بہ پدر خود است امام موسیٰ کاظمؓ و ایشاں را بہ پدرِ خود امام جعفر صادقؓ و ایشاں را دو نسبت است چناں کہ مذکور شد ۔ واللہ اعلم۔

لہٰذا انتسابِ ایں کمینہ در طریقِ عشقیہ از دو جانب است ، یکے از جانب مخدومی سیّد عبد اللہ البلخیؒ و دیگرے از جناب

شیخ محمد قلیؒ است و ایشان را انتساب بہ قہار شیخؒ و بابا شیخؒ است و ایشاں را بہ محمد صادق شیخؒ و ایشاں را بہ ابوالحسن شیخؒ و ایشاں را بہ الیاس شیخؒ و ایشاں را بہ محمد قلی شیخؒ و ایشاں را خدائے قلی شیخؒ و ایشاں را بہ میر غیاث الدین شیخؒ و ایشاں را بہ بایزید شیخؒ و ایشاں را بہ شیخ قوام الدین بسطامیؒ و شیخ بہاء الدین مغربیؒ و ایں دو عزیز منسوب اند بہ حضرت سلطان العارفین شیخ ابو یزید بسطامیؒ و نسبتِ شیخ بایزید بسطامیؒ الیٰ اُخرہ مذکور شد ۔

امّا انتسابِ این فقیر حقیر در طریقۂ قادریہ و چشتیہ بہ دو عزیز است ۔ یکے بہ سیّد تاج الدین متقیؒ و دیگر بہ سیّد عبداللہ مکّیؒ و این دو عزیز را انتساب بہ شیخ علی منصرؒ (منعبر؟) است و ایشاں را بہ شیخ محمد سجاویؒ و ایشاں را بہ شیخ طاہر بن زیانؒ و ایشاں را بہ شیخ احمد بن موسیٰ بشیشیؒ و ایشاں را بہ شہاب الدین زروقؒ و ایشاں را بہ شیخ ابوالحسن علی بشیشیؒ بہ واسطۂ احمد بن موسیٰؒ مذکور و شیخ ابوالحسن علیؒ را انتساب بہ والد خود است شیخ ابو حفص عمرانی علی ۔ و ایشاں را بہ سید مجد الدین ابو محمد صالح الزواویؒ است و ایشاں را بہ شیخ محمد مخلص طبیبیؒ است و شیخ احمدؒ بن زندہ مرد (؟) و ایں دو را انتساب بہ شیخ شرف الدینؒ ابن العادل است و ایشاں را بہ شیخ عبداللہ بن شجاع الدینؒ الفاروقی است و ایشاں را بہ شیخ جمال الدینؒ بن یوسف بن محمد بن نصیر معدی است و ایشاں را بہ شیخ عبداللہ محمدؒ بن ابراہیم عبدالواحد بن سرور المقدسی است و ایشاں را بہ غوث الثقلین محی الدین عبدالقادر الجیلانی قدس سرّہ است و ایشاں را بہ شیخ ابی سعید المبارکؒ بن علی المخزومی است و ایشاں را بہ شیخ ابی الحسن علی بن محمد بن یوسف استر ش الہکّاری است و ایشاں را بہ شیخ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن عبداللہ الطرطوسی است و ایشاں را بہ شیخ عبدالواحدؒ بن عبدالعزیزؒ التمیمی است و ایشاں را بہ والد خود شیخ عبدالعزیزؒ است و ایشاں را بہ شیخ ابی بکرؒ محمد را تشیلی است و ایشاں را بہ شیخ ابی القاسم الجنیدؒ البغدادی سید الطائفہ است و ایشان را بہ سرّی سقطیؒ و ایشاں را بہ شیخ معروف کرخیؒ بتفصیل الیٰ آخر مذکور شد ۔ (تا ایں جا سلسلہ ہای حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرّہ بہ دستخطِ خاص ایشاں یعنی مجدّدِ الف ثانی قدس سرّہ تفصیل وار گرفتہ شد)۔

حواشی:۔

(۱) یہ حالات خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ کی زبدۃ المقامات سے لیے جا رہے ہیں۔ اس میں آپ کی ولادت کا سال اس طرح لکھا ہے ۔ لیکن حافظ عزیز حسن بقائی نے کسی بنا پر سیرتِ باقیؒ (دہلوی ۱۹۳۳ء ـــ صفحہ ۱۰) میں ولادت کی تاریخ ۵ ذی الحجہ ۹۷۱ھ لکھی ہے۔ زبدۃ المقامات میں آپ کے اسم گرامی کے ساتھ "رضی الملّۃ والدین" لکھا ہوا ہے۔ لیکن آپ کے ملفوظات و رقعات کے جامع نے "مؤید الملّۃ والدین الرضی" لکھا ہے اور حضرت مجددؒ نے مکتوبات ۱/۲۹۰-۲۹۱ وغیرہ میں مؤید الدین الرضی لکھا ہے۔ حضرات القدس (دفتر اوّل) میں ہے کہ آپ کی والدہ شیخ عمر یاغستانی کے خاندان سے تھیں جو خواجۂ احرارؒ کے نانا تھے اور آپ کی نانی سید تھیں۔

(۲) آپ کے ایک شعر میں صرف باقی بطور تخلّص مستعمل ہے :۔ بغیر آنکہ بہ روزِ سیاہِ خود گرید ۔ دگر ز دیدہ باقی چہ کار می آید

(۳) منتخب التواریخ (ترجمہ ۔ لاہور ۱۹۶۲ء) صفحہ ۷۰۰

(۴) اس تفصیل کے لیے دیکھیں خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ کی نسمات القدس (ترجمہ ۔ سیالکوٹ ۱۹۸۹ء) ۔ صفحہ ۳۱۷ زبدۃ المقامات میں یہ بھی ہے کہ آپ کو

استخارہ میں خواجہ محمد پارسا (۸۲۲ھ) نے فرمایا تھا کہ سلوک سے پہلے تہذیب اخلاق حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۵) نسمات القدس (صفحہ ۲۷۰) میں ہے کہ حضرت خواجہؒ جب بھی سمرقند جاتے قاسم شیخ قالیتیؒ کے یہاں قیام کرتے یا اُن کو اپنے پاس بُلا لیتے یہ بزرگ پہلے خواجہ دوستؒ (م ۹۷۴ھ) کے مرید تھے جو مولانا خواجگی کاسانیؒ کے خلیفہ تھے۔ پھر وہ خواجہ دوستؒ کے پیر بھائی درویش سبزؒ سے بیعت ہوئے۔ نسمات القدس تاریخی اعتبار سے بھی بہت اہم ہے۔ اس میں حکمرانوں سے متعلق ایسے واقعات ملتے ہیں جو تاریخی کتابوں میں شاذ ہیں ۔ دیکھیں صفحات ۱۵۱۔ ۱۵۶ ۔ ۱۵۷ ۔ ۱۶۱ ۔ ۱۶۳ ۔ ۱۶۹ ۔ ۱۷۷ ۔ ۲۰۶ ۔ ۲۱۱ ۔ ۲۱۲ ۔ ۲۲۰ ۔ ۲۳۱ ۔ ۲۳۶۔

(۶) خواجہ احمد یسویؒ کی اولاد میں سے اُنھی کے ہم نام ایک اور نقشبندی بزرگ تھے جن کا ذکر تاریخ کشمیر اعظمی (لاہور ۱۳۰۳ھ) کے صفحہ ۲۰۰ میں ہے ۔ اس کے مؤلف خواجہ محمد اعظم شاہ نے (جو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مرید تھے اور ۱۱۷۹ھ میں فوت ہوئے) اُن کو بچپن میں دیکھا تھا۔

(۷) زبدۃ المقامات میں اُن کے نام کے ساتھ "مد ظلہ" لکھا ہے۔ گویا اس کتاب کی تحریر کے وقت وہ زندہ تھے۔

(۸) مولانا احمد حسین خان: ترجمہ حضرات القدس (لاہور ۱۳۴۳ھ) صفحہ ۱۱۸۔۱۱۹ ۔ کلیات باقی باللہ (ملفوظات و رقعات و مجموعہ کلام) کے شروع میں حضرت خواجہؒ کے یہی خود نوشت حالات ہیں۔ بعد میں بھی عرض کیا جائے گا کہ کلیات کے جامع بھی خواجہ محمد صدیق کشمی بدخشیؒ تھے۔ وہ گلزار ابرار کے مؤلف محمد غوثی سے ۱۰۱۸ھ میں مانڈو میں ملے تھے جیسا کہ انہوں نے حضرت مجددؒ کے حالات میں اس ملاقات کا ذکر کیا ہے یقین ہے کہ انہیں سے پوچھ کر محمد غوثی نے حضرت خواجہؒ کے حالات (جو اوپر کے بیانات کے مطابق ہے) اور حضرت مجدد کے حالات لکھے ہوں گے۔ تذکرہ گلزار ابرار ۱۰۳۶ھ میں مکمل ہوا ۔ (کابل میں راقم الحروف کو ایک رسالہ "مشائخ طرق اربعہ حاصل ہوا تھا جس کے متعلق وہاں بتایا گیا تھا کہ حضرت مجددؒ نے وہ رسالہ حضرت خواجہؒ سے لے کر نقل کیا تھا۔ اس میں حضرت خواجہؒ کے مختلف سلاسل کی تفصیل ہے۔ انشاءاللہ ضمیمہ کے طور پر اس مقالے کے آخر میں شامل کیا جائے گا)۔

(۹) یہاں تک گلزار ابرار سے ماخوذ ہے۔ زبدۃ المقامات میں یہ بھی ہے کہ لاہور کے اس قیام کے زمانے میں کچھ دن کے لیے مجازی محبت بھی پیدا ہو گئی تھی کہ المجاز قنطرۃ الحقیقہ۔

(۱۰) خواجہ محمد اعظم ۔ تاریخ کشمیر اعظمی (لاہور ۱۳۰۳ھ) ۔ صفحہ ۱۱۰

(۱۱) مولانا نسیم احمد فریدی: خواجہ باقی باللہ ۔۔۔ (لکھنؤ ۱۹۷۸ء) ۔ صفحہ ۱۵۔۱۷

(۱۲) کلیاتِ باقی باللہ (لاہور ۱۹۶۷ء) ۔ صفحہ ۱۳۹ ۔

(۱۳) انفاس العارفین (ترجمہ ۔ لاہور ۱۳۹۴ھ) ۔ صفحہ ۶۰۔۲۵۳ ۔

انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ نے بہت سی باتیں خاندانی روایت کے مطابق (سُنی سُنائی) بھی لکھی ہیں، وہ بے شک صحیح ہوں گی لیکن بعض باتوں پر یقین نہیں آتا ۔ صفحہ ۲۵۴ میں انہوں نے اپنی دادی کے والد رفیع الدین محمدؒ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بھی حضرت خواجہؒ کے خلیفہ تھے۔ ایک مرتبہ حضرت خواجہؒ، حضرت مجددؒ سے ناراض ہوئے اور وہ سرہند سے معافی کے لیے دہلی پہنچے تو شیخ رفیع الدینؒ ہی نے معافی دلوائی تھی۔ لیکن یہ بات کسی معاصر نے نہیں لکھی اور نہ اس کا کوئی امکان تھا۔ ممکن ہے کہ ناراضی کا یہ قصہ شیخ تاج الدینؒ سے متعلق ہو جن کی "دماغی خشکی" کا ذکر حضرت خواجہؒ نے رقعہ نمبر ۱۲ میں کیا ہے اور رقعہ ۵ میں "نانِ دیگرے خوردن و دعاے دیگرے کردن" اُنہی کو لکھا تھا کہ وہ نقشبندی ہو کر پہلے والے شطاریہ سلسلے میں لوگوں کو بیعت کر رہے تھے۔ حضرت مجددؒ تو صرف تین مرتبہ دہلی آئے تھے۔ دیکھیں مکتوبات ۱/ ۲۶۶ ۔ پھر وصال کے بعد آئے تھے (مکتوبات ۱/ ۲۹۱)۔

(۱۴) حضرات القدس (۱/ ۳۳۵) میں ہے کہ حضرت خواجہؒ جب لاہور میں تھے تو اُس زمانے میں خواجہ حسام الدین احمد اپنی جوانی کے زمانے میں (ولادت ۹۷۷ھ) سیر کے لیے وہاں پہنچے اور نیاز حاصل کیا (حضرت خواجہ بھی ماوراء النہر روانہ نہیں ہوئے تھے۔ مولانا فریدی صفحہ ۱۰۶) حضرت خواجہؒ یہ سمجھے کہ وہ کسی امیر کے نام سفارش لینے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ اس لیے آپ نے فرمایا کہ آج کل دہلی سے پروانہ آیا ہے کہ اپنے باکمال مریدوں اور درویشوں کے نام بھیج دوں ۔ خواجہ حسام الدین احمدؒ نے عرض کیا کہ میں خالصۃً للہ آپ سے ملنے آیا ہوں، کوئی اور غرض نہیں ہے ۔ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ کیوں نہ ہو، آپ تو حضرت مجددؒ کے تربیت یافتہ ہیں۔ لیکن یہ آخری جملہ غالباً نہ فرمایا ہوگا کیونکہ ابھی تک (۱۰۰۳ھ میں حضرت مجددؒ بیعت نہیں ہوئے تھے، بلکہ

اگر حضرت خواجہؒ کا امکنہ سے لاہور واپسی کا زمانہ بھی فرض کیا جائے تو وہ بھی صحیح نہیں ، کیونکہ حضرت مجددؒ تو ۱۰۰۸ھ میں بیعت ہوئے تھے۔

(۱۵) زبدۃ المقامات میں صرف اشعار نمبر ۲-۴-۶-۹ درج ہیں۔

(۱۶) غالباً اسی تعلق کی بناء پر ایک مرتبہ کسی موقع پر حضرت خواجہؒ نے حضرت مجددؒ کو (رقعہ نمر ۸ کے آخر میں) لکھا تھا کہ "اندیشہ بادشاہ رادر خاطر نیارند"۔

(۱۷) اہل اللہ کی تلاش میں جو صعوبتیں آپ نے اُٹھائی تھیں، خود فرماتے تھے کہ "اگرچہ ماریاضات شاقہ چنانکہ بعضے اہل اللہ کشیدہ ، نہ کشیدہ ایم ۔ لیکن انتظا وقلق ہای عظیم دیدہ ایم کہ ریاضتہا و سختیہای شگرف رامتضمن بود"۔ اور (والدہ ماجدہ) روے عجز و نیاز بدرگاہ بے نیاز آوردہ بگریہ وناله تمام می گفتند خداوندا مُرادِ فرزند در طلب تو از ہمہ بگسستہ و از لذت جوانی دست شستہ بر آوردہ بگرداں یا مرا زندہ مگزرر کہ طاقتِ مشاہدۂ ایں ناکامی و بے آرامی ا دارم" ۔ (زبدۃ المقامات ترجمہ صفحہ ۳۴)۔

(۱۸) نسمات القدس ۔ صفحہ ۳۶۲ ۔ ۳۶۳

(۱۹) گلزار ابرار میں بھی ان دو مسئلوں کا ذکر ملتا ہے۔

(۲۰) حضرت خواجہؒ نے رقعہ نمبر ، میں حضرت مولانا خواجگیؒ امکنگی کے صاحبزادے خواجہ ابوالقاسمؒ (م ۱۰۲۳ھ) کو لکھا ہے کہ "حضرت ایشاں قدس اللہ تعالیٰ ایں گدا اے بے حاصل راخود بخود قبول فرمودہ بودند ۔ چنانچہ در اوّل وسیلۂ طلب و التماس ہم درمیاں نبود ۔ ۔ ۔"

(۲۱) حضرات القدس (۳۹/۲) میں ہے کہ استخارہ میں معلوم ہوا کہ ایک طوطا شاخ پر بیٹھا تھا۔ وہ اُڑ کر حضرت خواجہؒ کے ہاتھ پر آ بیٹھا۔ اُس کی چونچ م حضرت خواجہؒ نے اپنا لعاب دہن ڈالا تو وہ بولنے لگا اور اُس نے آپ کے منہ میں شکر ڈال دی ۔ اس طوطے سے مراد حضرت مجددؒ تھے (تفصیل ا ہے)۔

(۲۲) ڈاکٹر سلیم اختر نے کلمات الصادقین کے انگریزی مقدمہ میں (صفحہ ۶-۱۶-۱۸-۲۰) لکھا ہے کہ حضرت خواجہؒ ۱۰۰۸ھ میں دہلی تشریف لائے۔ یہ با صحیح نہیں اسی طرح صفحہ ۱۶ میں یہ بھی ہے کہ ۱۰۰۸ھ کے بعد حضرت شیخ عبدالحق محدثؒ بھی حضرت خواجہؒ کے مُرید اور مجاز ہوئے یہ بھی صحیح نہیں ۔

(۲۳) مولانا رشدی دراصل مولانا محمد صدیق ہدایت ہی تھے جنہوں نے اخفائے حال کے لیے حضرت خواجہؒ کے مرثیے میں اپنا تخلص رشدی لکھا ہے۔ تفصیہ سے بعد میں عرض کیا جائے گا۔

(۲۴) بعض مجالس کے ذیل میں کبھی کبھی دوسرے دنوں کی مجالس کا حال بھی آ جاتا ہے ۔ مثلاً ۶ صفر ۱۰۰۹ھ کی مجلس میں رمضان کی مجلس کا ذکر ہے اور ا شوال ۱۰۰۹ھ کی مجلس میں دوسرے دنوں کی مجالس کے واقعات بھی آ گئے ہیں۔

(۲۵) اس رسالے کی عبارت اُس رسالے کی عبارت جیسی ہے جو راقم الحروف کو کابل میں حاصل ہوئی تھی۔ ان شاء اللہ ضمیمے میں پیش کی جائے گی۔

(۲۶) یہ شرح رباعیات (سلسلۃ الاحرار) ۱۰۰۷ھ میں مرتب ہوئی ۔ اُس کی چند رباعیات (وحدت الوجود کے متعلق) کی شرح خود حضرت خواجہؒ نے کی تھی۔ پا حضرت مجددؒ نے بھی اس کی تعلیقات لکھیں اور بعد میں شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی نے بھی شرح کی توضیح کے لیے تعلیقات لکھیں۔

(۲۷) حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حضرت مجددؒ تین بار حاضر ہوئے ۔ پہلی بار ربیع الآخر ۱۰۰۸ھ کے آخری دنوں میں۔ دوسری بار ۱۰۰۹ھ میں رمضان سے ذ قعدہ تک اور تیسری بار ۱۰۱۲ھ میں حضرت کے وصال سے چند ماہ قبل۔ لیکن جب واپسی پر لاہور میں وصال کی خبر ملی تو واپس دہلی تشریف لائے۔ ا ایک حاضری کا ذکر مکتوب ۲۹۱/۱ میں ہے جو وصال کے بعد ہوئی۔ مکتوب ۲۳۳/۱ میں ایک عرس میں حاضری کا ذکر ضرور ہے ۔ لیکن رود کوثر میں (صفحہ ۲۵۶-۳۶۰) ہے کہ حضرت مجددؒ باقاعدہ عُرس میں شریک ہوتے تھے ۔ ایسا کسی معاصرانہ کتاب میں مذکور نہیں ۔

(۲۸) حضرت خواجہؒ کے یہ مخاطب جامع ملفوظات (محمد صدیق ہدایت) ہیں جو ممکن ہے کہ اُس زمانے کے مشہور چشتیہ بزرگ قطب عالمؒ (م ۱۰۲۳ھ) سے بیعت ہوئے ہوں۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی خانقاہ میں حضرت خواجہؒ نے دہلی میں قیام کیا تھا اور اُنہی کے ارشاد کے مطابق آپ (لاہور ہوتے ہوئے امکنہ تشریف لے گئے تھے۔ مخاطب سے دریافت فرمانا کہ شب برات میں چشتیہ حضرات کتنی رکعتیں ادا کرتے ہیں اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آ اُن کی خانقاہ میں زیادہ عرصے تک نہیں رہے ورنہ یہ بات اُن کو ضرور معلوم ہوتی۔ ملفوظات کے شروع میں حضرت خواجہؒ کے جو خود نوشت حالات اُن میں کہیں قطب عالمؒ کی خانقاہ میں قیام کا ذکر نہیں ہے ۔ حضرات القدس (۳۰۶/۱) میں جس چشتیہ شیخ زادہ کا ذکر ہے ممکن ہے کہ یہی جامع ملفوظا

ہوں۔ حضرت خواجہؒ کے رقعہ ۴۲۔ ۴۴ کسی کی سفارش میں ہیں۔ ۱۵ جمادی الاخری ۱۰۱۲ھ کے ذیل میں اسی عزیز کا لشکر میں جانا مذکور ہے۔

(۲۹) حضرت خواجہؒ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ آخر زمانے میں وہ وحدت وجود سے آگے کی راہ (وحدت شہود) کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ کلمات الصادقین کے مؤلف کو یہ بات اُلٹی یاد رہی ۔ یعنی انہوں نے صفحہ ۱۸۷ میں لکھا ہے کہ حضرت مجددؒ ہی بعد میں وحدتِ وجود کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ یہ بات صحیح نہیں ۔ آپ نے تو بعد میں بھی وحدتِ شہود کی تائید فرمائی ہے ۔ مثلاً مکتوبات ۱/ ۲۶۸۔ ۲۷۲ جو کلمات الصادقین کے بعد لکھے گئے تھے۔

نسمات القدس (صفحہ ۳۶۹) میں ایک بزرگ حافظ خیابانی کا ذکر ہے کہ وہ بلخ سے ہندوستان ہوتے ہوئے حج کے لیے جارہے تھے تو دہلی میں ۱۰۱۲ھ میں حضرت خواجہؒ سے ملے تھے ۔

(۳۰) دیکھیں حضرات القدس ، دفتر دوم۔ (ترجمہ ، سیالکوٹ ۱۴۰۳ھ) صفحہ ۴۹ ۔ اسی صفحے میں خواجہ محمد صدیق، اخوند ملا حسن اور جعفر بیگ کا ذکر بھی ہے کہ وہ دہلی میں شیخ تاج الدینؒ سے ملے تھے جنہوں نے محمد قلیج خان کو حضرت مجددؒ سے معافی دلوانے کے لیے خط لکھا تھا۔ گویا خواجہ محمد صدیق مقربین میں سے تھے۔

(۳۱) تاریخ کشمیر اعظمی ۔ صفحہ ۱۳۴ میں بھی اُن کا ذکر ہے۔ لیکن نام کے ساتھ سود بھی لکھا ہوا ہے اور یہ کہ دامت پورہ (کشمیر) میں اُن کا مزار ہے۔ محمد صادق کشمیریؒ کی کتاب کلمات الصادقین ، ڈاکٹر محمد سلیم اختر نے اسلام آباد سے ۱۹۸۸ء میں شائع کی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۷۹ میں انہوں نے اپنی بہن (یعنی خواجہ خورد عبداللہ کی والدہ) کا حال لکھا ہے کہ جب وہ شادی ہو کر آئیں تو حضرت خواجہؒ کو مختلف شکلوں میں دیکھا کرتی ہیں، صفحہ ۱۶۲ میں انہوں نے اپنی کتاب سلسلۃ الصادقین کا ذکر بھی کیا ہے جو اب ناپید ہے ۔ اگر وہ مل جاتی تو بہت سے خانگی تعلقات اور حالات معلوم ہو سکتے تھے ۔

(۳۲) اس عنوان کے ذیل میں یہ بھی ہے کہ آپ کا حجرہ دونوں ازواج کے حجروں سے قریب قریب وسط میں تھا۔

(۳۳) جامع ملفوظات نے یہاں بھی اپنا نام پوشیدہ رکھنے کے لیے خود کو "طالب" کہا ہے ۔ وہی ایسے بزرگ ہیں جو پہلے چشتیہ سلسلے میں رہے ہوں گے جیسا کہ ملفوظات کے ایک عنوان "شبِ (شنبہ) پانزدہم ماہ شعبان (۱۰۰۷ھ)" کے ذیل میں ہے کہ حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ آپ کے چشتیہ سلسلے میں شبِ نصف شعبان میں کتنی رکعت نماز پڑھی جاتی ہے؟ جامع ملفوظات (محمد صدیق کشمیؒ) کی اہلیہ بھی حضرت خواجہؒ سے مستفیدہ اور صاحبِ حال تھیں اور اُن کی جماعت میں خواتین کثرت سے شریک ہوتی تھیں ۔ دیکھیں زبدۃ المقامات صفحہ ۵۰۵ ، نیز حضرات القدس ۲/ ۳۵۹ ۔ حضرات القدس ۱/ ۳۶۷ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہؒ کے حالات (قریبی تعلق کی وجہ سے) خواجہ محمد صدیقؒ سے معلوم کیے جاسکتے تھے۔

(۳۴) صفحہ ۶۴ میں بھی اس ایک ماہ اور ایک روز کے قیام کا ذکر ہے۔

(۳۵) اسی طرح کی ایک تاریخ حضرت مجددؒ کے صاحبزادے خواجہ محمد صادقؒ کی وفات کی ہے یعنی "روزِ دوشنبہ نہم ربیع الاوّل"۔ اس عبارت سے ۱۰۲۵ھ کے عدد بر آمد ہوتے ہیں۔

سرسید کے زمانے میں ایک تاریخ صفدر حسین نے علی گڑھ کے ابتدائی مدرسے کے افتتاح (۲۴ مئی ۱۸۷۵ء) پر اس طرح کہی تھی :-

تھی فکر مجھ کو اک دن تاریخِ مدرسہ کی ——— بولا یہ مُلہمِ غیب "اٹھارہ سے پچھتر"

"اٹھارہ سے پچھتر" عیسوی سال ہے اور انہی الفاظ کے اعداد سے ہجری سال ۱۲۹۲ بن جاتا ہے۔

(۳۶) مولانا زید مدظلہ نے اسی مقدمہ کے صفحہ ۱۴ میں واضح فرمایا ہے کہ حضرت خواجہؒ خلج ترک تھے اور آپ کی والدہ ماجدہ ، ساداتِ کرام میں سے تھیں ۔

(۳۷) مولانا فریدی مرحوم نے صفحہ ۴۷ میں لکھا ہے کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی کتاب مالابدّ منہ کے شروع میں عقائد کی جو بحث ہے اُس کا زیادہ تر حصہ اسی مکتوب ۱/ ۲۶۶ سے ماخوذ ہے ۔

(۳۸) حضرت مجددؒ نے مکتوب ۱/ ۲۲۹ میں خواجہ حسام الدین احمدؒ کے اُس کرم کا ذکر کیا ہے جو صاحبزادوں کی تربیت کے لیے تھا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ بڑے صاحبزادے کی تعلیم و تربیت اُن کے ماموں قلیج خان (م ۱۰۳۴ھ) کے سپرد نہ کریں۔

(۳۹) مکتوب ۲/ ۸۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجددؒ نے واپس اجمیر کے راستے میں خواجہ محمد معصومؒ کو وہ مکتوب لکھا تھا اور وہ موسم گرما کا زمانہ تھا۔ حضرت مولانا زید ابو الحسن فاروقی مدظلہ نے اپنی کتاب "حضرت مجددؒ اور اُن کے ناقدین" (دہلی ۱۹۷۷ء) کے صفحہ ۱۵۸۔ ۱۶۱ میں فرمایا ہے کہ حضرت مجددؒ ۸ جمادی

الآخر ۱۰۲۸ھ سے ۱۷ جمادی الآخر ۱۰۲۹ھ تک گوالیار میں قید رہے۔ پھر تین سال اور دس مہینے تک شاہی فوج میں نظر بند رہے ۔ اس کے بعد اجمیر میں بادشاہ کی اجازت سے آپ نے سرہند کو مراجعت فرمائی اور وہاں آپ ربیع الآخر ۱۰۳۳ھ کی ۱۹ یا ۲۰ تاریخ کو پہنچے ۔

(۴۰) سماع اور رقص کے متعلق مکتوب ۱/۲۸۵ میں وضاحت ملتی ہے۔

(۴۱) حضرات القدس (حضرت نہم ۔ کرامت ۲۹) میں ہے کہ ایک دن حضرت مجددؒ نے اپنے محرمانِ اسرار سے مولانا محمد مسعودؒ کے متعلق فرمایا کہ قندھار جانے والے قافلے میں بلکہ روئے زمین پر وہ کہیں نظر نہیں آئے (یعنی اُسی دن فوت ہوئے تھے) ۔ زبدۃ المقامات (فصل دہم) میں ہے کہ مخدوم زادہ محمد صادقؒ جب اپنے داداجانؒ کے مزار پر مُراقب ہوتے تو اُنہوں نے فرمایا کہ محمد مسعود ، قندھار نہ جائیں۔

(۴۲) صدر جہاں، قنوج کے قریب پہانہ کے رہنے والے تھے، شیخ عبد القدوسؒ کے بیٹے عبد النبی (م ۹۹۲ھ) کے شاگرد تھے۔ کچھ دنوں ممالک محروسہ کے مفتی رہے ۔ پھر توران کی سفارت پر گئے۔ واپس آئے تو صدر بنائے گئے۔ ۱۰۲۷ھ میں پہانہ میں انتقال ہوا۔ نزہۃ الخواطر ۔ ج ۵ ۔ صفحہ ۱۷۸)۔ حضرت مجددؒ نے مکتوب ۱/۱۹۴ میں خوشی کا اظہار کیا ہے کہ اُن کی وجہ سے احکامِ شرعیہ جاری ہونے لگے ہیں۔

(۴۳) ممکن ہے کہ یہ شیخ ابوالحسن وہی ہوں جن کا ذکر رقعہ ۲۰ میں ہے۔ وہ ولایت (ماوراء النہر) میں پہلے کسی جگہ میں رہے ہوں گے۔ پھر حضرت خواجہؒ کی خدمت میں دہلی آئے ہوں گے اور بعد میں اُن کے ارشاد کے مطابق سرہند چلے گئے ہوں گے ۔ رقعہ نمبر ۲۲ میں جو مکتوب الیہ ہیں بہت ممکن ہے کہ سمرقند والے مُرشد یعنی افتخار شیخؒ کے صاحبزادے ہوں۔ اسی رقعہ میں مولانا ترسوں (م ۱۰۱۳ھ) کا ذکر ہے جو کئی سال تک بلخ میں رہنے کے بعد ۱۰۱۱ھ میں ہندوستان آئے اور یہاں سے مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئے لیکن حج کرنے سے پہلے ۱۰۱۳ھ میں انتقال کیا (نسمات القدس ۔ صفحہ ۲۶۶)۔

(۴۴) حضرت مجددؒ نے مکتوب ۱/۲۹۰ میں حضرت خواجہؒ کی خدمت میں پہلی حاضری کی کیفیات لکھی ہیں ۔ یہ بھی لکھا ہے کہ نسبت نقشبندیہ (یعنی حضور بے غیبت) دو ماہ اور چند روز بعد حاصل ہو گئی تھی۔ اسی مکتوب میں ہے کہ حضرت خواجہؒ نے اُن کو کامل مکمل جان کر تعلیم طریقہ کی اجازت بھی دے دی تھی۔ مکتوب ۱/۲۶۶ میں ہے کہ صرف تین مرتبہ خدمت میں حاضری ہوئی ۔ اخیر دفعہ حضرت خواجہؒ نے اپنے دونوں صاحبزادوں پر توجہ دینے کے لیے فرمایا۔ حضرت مجددؒ نے مکتوبات ۱/۱۵۵۔۱۵۶ ۔ ۱۹۳۔ ۲۴۳ ۔ میں دہلی جانے کا ذکر کیا ہے۔ مکتوب ۱/۲۹۱ میں حضرت خواجہؒ کے وصال کے بعد حاضری کا ذکر ہے۔ عید کا زمانہ بھی تھا۔

(۴۵) حضرت خواجہؒ نے جن حضرات کو حضرت مجددؒ کی تربیت میں بھیجا تھا اُن کے نام مکتوبات میں ملتے ہیں :۔ مُلا قاسم علی اور دیگر حضرات (۱/۱) ۔ میر سید شاہ حسین (۱/۳) ۔ خواجہ بُرہان مالوہ والے (۱/۵) ۔ بعض احباب ، لُقمے میں احتیاط نہیں کرتے (۱/۷) ۔ شیخ الہٰ بخش (۱/۱۰) ۔ شیخ نور، میاں جعفر ، میاں شیخی ، شیخ عیسیٰ ، شیخ کمال، شیخ ناگوری، شیخ مزمّل ، خواجہ ضیاءالدین محمد، مولانا قاسم علی (۱/۱۱)۔ شیخ طٰہٰ (ابن شیخ عبد اللہ نیازی) ۔ مُلا قاسم علی، مُلا مودود محمد، عبد المؤمن، مُلا عبد الہادی (۱/۱۴) ۔ اسی مکتوب (۱/۱۴) میں حضرت مجددؒ کے مقامِ محبوبیت کا ذکر ہے جو حضرت خواجہؒ نے بتایا تھا۔ مولانا علاؤالدین کا ذکر ۱/۱۶ میں ہے لیکن وہ جلد واپس چلے گئے کہ وہ صرف مکتوب پہنچانے کے لیے آئے تھے ۔ مکتوب ۱/۱۸ میں میاں شاہ حسین اور شیخ نور کا پھر ذکر ہے کہ وہ ترقی کر رہے ہیں۔ حضرت خواجہؒ کے رقعات میں بھی کئی نام آتے ہیں جو حضرت مجددؒ کے زیرِ تربیت رہے ہیں۔ اُن میں معروف شخصیت صدر جہاں (رقعہ ۱۷) کی ہے ۔ شیخ نور کا ذکر رقعہ ۸ میں ہے جو حضرت مجددؒ کے نام لکھا گیا تھا ۔ عبد الہادی المتوفی ۱۰۴۱ھ کا ذکر رقعہ ۱۵ میں ہے۔ حاجی عبد العزیز کا ذکر رقعہ ۱۸ میں ہے وہ حضرت خواجہؒ کے پاس تھے اور حضرت مجددؒ نے مکتوب ۱/۱۴ میں شیخ طٰہٰ کے سلسلے میں اُن سے واقفیت کا ذکر کیا ہے ۔

(۴۶) مولانا فریدی نے شیخ تاج الدین (م ۱۰۵۱ھ) کے متعلق صفحہ ۹۴ حاشیہ ۲ میں لکھا ہے کہ وہ سارن (علاقہ بہار ۔ نزد جونپور) میں پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں سنبھل کو وطن بنا لیا تھا۔ صفحہ ۹۵ میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت خواجہؒ نے اُن کو خط لکھ کر لاہور بلایا اور وہاں سلوک طے کرایا صفحہ ۹۶ ۔ ۹۷ میں اُن کی بعض تصانیف کا ذکر بھی کیا ہے ۔ اُن کے ایک عربی رسالہ تصوف کا قلمی نسخہ مولانا عطا محمد صاحب (خلیب جامع مسجد چودھواں، ڈیرہ اسمٰعیل خان) کے پاس موجود ہے جس کی نقل میرے عزیز ڈاکٹر آفتاب احمد خان کی کتاب "خاندان نقشبندیہ کی علمی خدمات" (حیدرآباد ۱۹۸۸ء) کے صفحات ۱۷۷۔ ۱۲۰ میں شامل ہے۔ اس رسالے میں شیخ تاج الدینؒ نے خود کو قرشی عثمانی کہا ہے ۔ اس رسالے کی ابتدائی عبارت کا اردو ترجمہ مولانا فریدی کی کتاب کے صفحہ ۹۷ میں

ہے ۔

حضرات القدس (۲/حضرت سوم ۔ درجہ ۲۱) میں ہے کہ حضرت خواجہؒ کے وصال کے بعد حضرت مجددؒ جب تعزیت کے لیے دہلی تشریف لے گئے تو شیخ تاج الدینؒ اُن سے کچھ منحرف ہو گئے۔ لیکن بعد میں حضرت خواجہؒ کے خُسر کے صاحبزادے مولانا محمد قلیج خان کے ذریعے تحریری معافی مانگی اور جب عُرس کے موقع پر حضرت مجددؒ دہلی تشریف لے گئے (مکتوبات ۔ ۲۳۳/۱) تو بالمشافہ معافی مانگی ۔ حضرت مجددؒ نے مکتوبات ۱/۱۶۱ میں اُنہیں "بزرگ" لکھا ہے اور ۱/۳۶۳ میں کعبۂ ربانی اور نماز کے فضائل وغیرہ مباحث بیان کرتے ہوئے اُن کی آمد کے لیے بہت خوشی کا اظہار کیا ہے۔

(۴۷) اسی رقعہ نمبر ۵۴ میں میاں شیخ رفیع الدین کی مدد کے لیے فرمایا ہے۔ یہ وہی رفیع الدین ہوں گے ۔ جو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد کے نانا تھے جیسا کہ انفاس العارفین میں ہے ۔

(۴۸) ممکن ہے کہ یہ مولانا یوسف وہی ہوں جن کے سوالات کے جواب میں حضرت مجددؒ کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد سعیدؒ کی کتاب "تحقیقات" مکتبۂ عارف حکمت ۔ مدینہ منورہ میں۔ (قلمی) موجود ہے ۔ اگر وہ مولانا یوسف سمرقندی تھے۔ تو اُن کا انتقال ۱۰۲۲ھ میں ہوا۔

(۴۹) کلمات الصادقین (صفحہ ۱۸۴) میں خواجہ حسام الدین احمدؒ کی بہت تعریف ہے کہ حضرت خواجہؒ اُن کو اپنا نائب مناب بنانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے عاجزی کی وجہ سے قبول نہیں کیا۔ اور ارباب سلوک کے نزدیک جو چیز اعتبار رکھتی ہو اُن کی ذات میں ایسی تھی کہ آسمان و زمین کے دفاتر میں گنجائش سے زیادہ ہو اور یہ کہ حضرت خواجہؒ فرماتے تھے کہ "این دکان داری بخاطرِ وے قبول نمودہ ایم۔"

(۵۰) زبدۃ المقامات (اردو ۔ صفحہ ۱۲۸) میں ہے کہ (خواجہ کلاںؒ اور) خواجہ حسام الدین احمدؒ کے فرزند نے پہلے شیخ الہ داد سے اس سلسلے کے ذکر کی تلقین میں کی تھی ۔

(۵۱) اگر "سیادت مآب" سے مُراد نواب شیخ فرید ہیں تو پھر یہ مکتوب اپنی ترتیب میں پہلے آنا چاہیے، کیونکہ اُن کا انتقال ۱۰۲۵ھ میں ہوا تھا۔ گویا اس سال سے پہلے خواجہ حسام الدین احمدؒ اپنے متعلقین کے ساتھ حرمین شریفین کو منتقل ہونے کا ارادہ کر رہے تھے۔

(۵۲) ڈاکٹر سراج احمد خان نے اپنی کتاب "مکتوباتِ امام ربانی کی دینی اور معاشرتی اہمیت" (صفحہ ۱۱۵ ۔ ۱۲۷) میں لکھا ہے کہ حضرت مجددؒ کی قید کا واقعہ جمعہ یکم رجب ۱۰۲۸ھ کو رونما ہوا اور گوالیار کے قلعے سے رہائی جمعہ ۱۱ رجب ۱۰۲۹ھ کو ہوئی ۔ پھر آپ کو سرہند جانے کی رخصت دی گئی۔ لیکن پھر "ہمراہی لشکر" میں رہنا پڑا۔ یہ لشکر دہلی ، آگرہ وغیرہ جاتا کرتا تھا جب کہ آپ اپنے فرزندوں (خواجہ محمد سعیدؒ اور خواجہ محمد معصومؒ) سے دور تھے۔ رمضان ۱۰۳۲ھ میں آپ اجمیر شریف میں تھے۔ ۱۰۳۱ھ سے خواجہ محمد ہاشمؒ بھی آپ کے ساتھ تخمیناً دو سال تک رہے تھے۔ ۱۰۳۳ھ کے اوائل میں آپ "ہمراہی لشکر" سے آزادی پاکر سرہند آگئے تھے اور شعبان سے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ (آپ یکم رجب ۱۰۲۸ھ کو قید ہوئے تھے اور ۶ ماہ کے بعد دہلی میں جہانگیر سے شیخ عبدالحقؒ کی ملاقات ہوئی تھی اور وہ اُن کے علم ، توکل ، اور تبتّل کا مداح ہوا۔ غالباً حضرت شیخؒ کو اپنے پیر بھائی حضرت مجددؒ کی قید سے متعلق بات کرنے کا موقع نہ ملا ہو گا)۔

مولانا ابوالحسن زید فاروقی صاحب کے حساب کے مطابق، جیسا کہ ہم نے اوپر ایک جگہ لکھا ہے، حضرت مجددؒ ۸ جمادی الاخری ۱۰۲۸ھ سے ۱۷ جمادی الاخری ۱۰۲۹ھ تک گوالیار میں قید رہے ۔ پھر تین سال اور دس ماہ تک نظربند رہے۔ اور اجمیر شریف سے سرہند کو ربیع الآخر ۱۰۳۳ھ کی ۱۹ یا ۲۰ تاریخ کو پہنچے ۔

(۵۳) اسی مکتوب میں ہے کہ "این فقیر کہ این ہمہ دفاتر در بیانِ علوم و اسرار این طائفہ علیہ نوشتہ است بے مزج سکر، حاشاء و کلاکہ آں حرام و منکر است و گزاف و سخن باقی است ۔ سخن باقاں کہ بہ صحو خالص متصف اند بسیار اند ۔ چرا ایں قسم سخنان نہ بافتند و دلہائے مردم را از جانہ برند"۔ جو لوگ ظاہر بین ہیں وہ حضرت مجددؒ کے اس قول کے باوجود اُن پر معترض ہیں لیکن حضرت شاہ ولی اللہؒ کے معتقد ہیں جو خود حضرت مجددؒ کے سلسلے کے ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ اپنے والدؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ "بعد مراقبہ ہر چہ بہ کشف ی رسید می نگاشتند" (دیکھیں مولانا محمود احمد برکاتی کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور اُن کا خاندان" صفحہ ۸۶)۔

(۵۴) حضرت مجددؒ کے مکتوبات ۱/۳۲ ، ۲۰۳ ، ۲۰۷ ۔ ۲/۳۶ میں بھی شیخ الہ دادؒ کے متعلق ذکر ہے ۔

(۵۵) رقعہ نمبر ۴۴ کی تمہید میں ہے کہ مکتوب الیہ نے "کسب و معیشتگی" کو حضرت خواجہؒ کی صحبتِ عالی کی برکت سے چھوڑ دیا تھا لیکن سلطان وقت (اکبر) کے حکم سے (کسی کام کی غرض سے) کسی دور علاقے (کابل؟) کو چلا گیا تھا۔ اُسے والدہ کی خدمت کے لیے فرمایا ہے اور یہ بھی کہ بادشاہ چاہتا ہے کہ کابل جائے اور وہاں اُس کے لیے وجہ معاش مقرر کرے۔ بادشاہ نے یہ بات اپنے رضاعی بھائی مرزا کوکہ (م ۱۰۳۳ھ) اُن کی والدہ اور دوسری عورتوں کے سامنے ظاہر کی ہے۔ مرزا کوکہ نے ۱۰۰۲ھ میں حج کیا تھا اور اُسی سال حضرت خواجہؒ لاہور کے ماوراء النہر (امکنہ) کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

(۵۶) حضرات القدس (۴۹/۲) میں ہے کہ خواجہ محمد صدیقؒ چند احباب کے ساتھ دہلی میں شیخ تاج الدینؒ سے ملے تھے جنہوں نے محمد قلیج خان کو حضرت مجددؒ سے معافی دلوانے کے لیے خط لکھا تھا۔ گویا خواجہ محمد صدیقؒ خاص مقربین میں سے تھے۔

(۵۷) حضرات القدس دفتر دوم میں خواجہ محمد صدیق کشمی ہدایت کے حالات میں ہے کہ وہ حضرت خواجہؒ کے انتقال کے وقت موجود نہ تھے، ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ یک شنبہ یکم صفر ۱۰۱۲ھ کو جامع ملفوظات کی سفر سے واپسی ہوئی۔ اُسی زمانے میں حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ مجھے اب ترکِ مشیخت کا حکم ملا ہے اور اسی زمانے میں حضرت خواجہؒ نے اپنے مُریدوں کو حضرت مجددؒ کے زیرِ تربیت رہنے کا حکم دیا تھا۔ اسی زمانے میں حضرت مجددؒ تیسری بار حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ حضرات القدس میں یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ اُس وقت خواجہ محمد صدیقؒ پر فنافی الشیخ کا غلبہ طاری تھا تو حضرت مجددؒ کی خدمت میں جانے سے انکار کیا۔ حضرت خواجہؒ پر جلال رونما ہوا تو خواجہ محمد صدیقؒ بے ہوش ہو گئے۔ دوسری تفصیل بھی وہیں ہے۔

(۵۸) نزھۃ الخواطر (ج ۵ ـ ۳۷۸) میں ہے کہ خواجہ محمد صدیقؒ ۱۰۱۸ھ میں دہلی کے بُرھان پور اور مندو بھی گئے تھے۔ حضرات القدس (۳۵۹/۲) میں اُن کے دوست خواجگی کی بیماری کا ذکر ہے اور اُن کی صحت کے لیے حضرت مجددؒ کا کشف بیان کیا گیا ہے۔

(۵۹) مکتوب ۱/۱۹۹ میں ملا محمد امین کابلی کو لکھا ہے کہ آپ کے پاس مولانا محمد صدیقؒ کو بھیجا گیا ہے تاکہ طریقے کی اشاعت ہو سکے وہ آگرہ میں تھے ۱/۱۷۵۔ ۱/۲۳۶ دیکھیں۔

(۶۰) مکتوب ۱/۱۳۹ میں آپ نے فرمایا ہے کہ کفار قریش نے جب اہلِ اسلام کی ہجو کی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی شاعروں کو اُن کی ہجو کرنے کے لیے حکم دیا تھا۔

(۶۱) الملفوظات صفحہ ۵۷ ـ شیخ فرید اپنی سخاوت میں مشہور تھے۔ صلحا اور مشائخ، نیز غرباء اور مساکین کے لیے ہر وقت اُن کی مدد عام تھی۔ اکبر اور جہانگیر کے میر بخشی تھے۔ خسرو کی بغاوت پر اُس کی سرکوبی کی تو ۹ محرم ۱۰۱۵ھ کو "مرتضیٰ خان" کا خطاب حاصل کیا۔ ۱۰۲۵ھ میں وفات پائی۔

(۶۲) حضرت مجددؒ کے یہ کلمات آج کے ہندو پرست مسلمانوں کو پسند نہ آئیں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکبر کے زمانے سے کُفار نے یہی رویہ مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا تھا بلکہ ہندوستان میں تو اب تک مسلمان کا چھوا ہوا کھانا پینا کوئی ہندو گوارا نہیں کرتا اور مسلمان کو وہ کھانے پینے کی چیز اس طرح دور سے دیتا ہے جس طرح کسی بھنگی کو دیا جاتا ہے۔

(۶۳) اس مقام سے مراد بنارس ہو گا۔ ایک مرتبہ حضرت مجددؒ (مکتوب ۱/۳۱۳) وہاں تشریف لے گئے تھے ـ اُس زمانے میں وہیں گنگا اور جمنا کا اتصال ہوتا تھا ـ ـ ـ

(۶۴) یہی بات آپ نے شیخ فریدؒ کو ۱/۴۷ میں لکھی تھی ـ ۱/۵۳ میں بھی علمائے دین دار کے تقرر کا ذکر ہے کہ بادشاہ ایسے علماء کو احکامِ شریعت بتانے کے لیے مقرر کرنا چاہتا ہے۔ ۱/۲۵۱ میں ہے کہ بادشاہ خود کو حنفی قرار دیتا ہے اور اہلِ سنت و جماعت میں سے جانتا ہے ـ مکتوب ۱۵/۲ میں بھی یہ بات لکھی ہے ـ

(۶۵) مکتوب ۱/۱۰۳ میں بھی آپ نے شیخ فریدؒ کو قاضی کی ضرورت کے متعلق لکھا ہے ـ

(۶۶) اسی سال یعنی جہانگیر کے پندرھویں جشنِ جلوس کے ذیل میں توزک جہانگیری (علی گڑھ ۱۸۶۴ء صفحہ ۳۱۷) میں ہے کہ ستی بھی ہوتی ہے اور مسلمان اپنی لڑکیاں ہندوؤں کو دیتے ہیں ـ یعنی جہانگیر بھی مسلمانوں کے مغلوب ہونے کا اعتراف کرتا ہے۔ یہاں حضرت مجددؒ کی قید کے سلسلے میں عرض ہے کہ داراشکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ حضرت مجددؒ پر یہ بات محض بہتان اور افتراء ہے کہ انہوں نے اپنا درجہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے افضل کہا ہے ـ

(۶۷) مولانا منظور احمد نعمانی نے تذکرۂ امام ربانی (لکھنؤ ۱۹۵۹ء، صفحہ ۲۱۲) میں لکھا ہے کہ شیعوں کے پاس گمراہ کرنے کا سب سے بڑا حربہ "مطاعن" ہیں۔ مکالمات و مباحثات میں بھی دیکھا گیا ہے کہ جب وہ کسی بحث میں عاجز آتے اور میدان کلام کو اپنے لیے تنگ پاتے ہیں تو فوراً مطاعن صحابہؓ پر آجاتے ہیں اور اسی مبحث کو وہ اپنا سب سے بڑا ہتھیار سمجھتے ہیں۔ صحابۂ کرامؓ کی طرف سے بدگمانی اور اُن سے بغض و عداوت، رفض کی اصل و اساس ہے ۔۔ حضرت مجددؒ نے رسالہ ردّ روافض کے علاوہ متعدد مکاتیب بھی سپرد قلم فرمائے ہیں اور ۔۔۔ تمام مطاعن کا ایک اصولی جواب بھی دیا ہے (دیکھیں مکتوب ۲/۹۲)۔

(۶۸) ڈاکٹر سراج احمد خان کی کتاب کے صفحات ۱۲۷۔ ۱۲۹ میں تفصیل ملتی ہے ۔

(۶۹) اسی سال طاعون کا زور تھا جس میں حضرت مجددؒ کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادقؒ وغیرہ فوت ہوئے تھے۔ شیخ عبدالحقؒ کے مکتوب نمبر ۶۴ میں بھی اس طاعون کا ذکر ہے ۔

(۷۰) شیخ مرحوم نے اسی صفحہ ۲۸۱ میں یہ بھی لکھا ہے کہ "وعظ و نصیحت آسان ہوتی ہے اور اُس پر عمل پیرائی کہیں زیادہ مشکل" اِن الفاظ کے لیے ایک نوٹ بھی لکھا ہے "حضرت مجددؒ اس اہم فرق کو خوب سمجھتے تھے" (یعنی اسی وجہ سے وہ اُمراء کو عمل پیرائی کے لیے ترغیب دیتے تھے) ۔ شیخ مرحوم شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اُمراء کو بار بار نہ لکھنا تھا بلکہ چُپ بیٹھے رہنا تھا اور اکبری الحاد کا تو پہلے ہی قلع قمع ہو چکا تھا اس لیے ان امراکو لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ گویا وہ محض خانہ پُری کے لیے لکھتے تھے گو شیخ صاحب صفحہ ۲۰۷ میں لکھ چکے ہیں کہ حضرت مجددؒ ، شیخ عبدالحقؒ اور امراء ہی نے اکبری خیالات کا قلع قمع کیا تھا۔

(۷۱) پروفیسر خلیق احمد نظامی ۔ "حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ" (دہلی ۱۹۵۳) صفحہ ۲۴۳ ۔ اس سے پہلے کے سنین بھی اسی کتاب سے لیے گئے ہیں۔ اسی زمانے کے ایک مکتوب الیہ عبداللہ نیازی (م ۱۰۰۰ھ) تھے جو مہدوی ہونے کی وجہ سے سلیم شاہ سوری کے حکم سے پٹوائے گئے ۔ ۹۵۵ھ میں وہ ہندوستان سے بھاگ گئے تھے ۔ کئی سال کے بعد واپس آئے اور سرہند میں آخر وقت تک قیام کیا ۔

(۷۲) مرج البحرین (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء) صفحہ ۴۷ ۔

(۷۳) ایضاً ۔ صفحہ ۲۵ ۔ غالباً شیخ محدثؒ کا یہ رسالہ اثبات نبوہ ، علیحدہ موجود نہیں بلکہ مدارج النبوۃ میں شامل ہوگا۔ حضرت مجددؒ کا ایک رسالہ اسی نام سے عربی میں ہے جو اکبری عہد کے فتنہ انکارِ نبوت کے رد میں ہے ۔

(۷۴) سکینتہ الاولیاء بحوالہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ۔ صفحہ ۱۳۸

(۷۵) پروفیسر موصوف صفحہ ۲۷۸ ۔ انفاس العارفین (شاہ ولی اللہ) کے مترجم نے (لاہور ۱۳۹۴ھ صفحہ ۳۹۸ح) شیخ محمد اکرام کی طرح لکھا ہے کہ حضرت مجددؒ سے شیخ محدثؒ کو آخر وقت تک اختلاف رہا اور "رجوع کا سارا قصہ محض عقیدت مندی کا افسانہ ہے" ۔ اگر شیخ محدثؒ نے رجوع نہ بھی کیا ہو تو اس سے حضرت مجددؒ کے کمالات میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ کلمات الصادقین جو ۱۰۲۳ھ میں لکھی گئی اُس میں (صفحہ ۱۸۷) یہ بات بھی ہے کہ حضرت مجددؒ آخر میں وحدت وجود کی طرف آ گئے تھے۔ لیکن خود حضرت مجددؒ کے کسی قول سے ایسا ظاہر نہیں ہوتا ۔ کلمات الصادقین کی تحریر کے وقت یعنی ۱۰۲۳ھ میں محمد صادقؒ نے صفحہ ۱۸۸ میں لکھا ہے کہ اُس وقت تک حضرت مجددؒ کے ۲۴۰ سے زائد مکتوبات جمع ہو چکے ہیں ان میں سے کسی مکتوب میں وحدت وجود کی طرف آپ کے مائل ہونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ مکتوب ۳۶۸ میں آپ نے پھر وحدتِ شہود کی تائید کی ہے ۔

(۷۶) حضرت شیخ محدثؒ کو حضرت مجددؒ سے جو محبت اور عقیدت تھی اس کا ایک واقعہ حضرات القدس جلد دوم (حضرت نہم ۔ کرامت ۱۱) میں بھی ہے۔

(۷۷) یہی بات تعلیقات شرح رباعیات کے آخری صفحے میں بھی ہے۔

(۷۸) حضرت مجددؒ نے اپنی پیدائش کا مقصد مکتوب ۲/۶ میں بھی بتایا تھا۔

(۷۹) حضرت مجددؒ نے جو کچھ مکتوب ۳/۸۷ میں فرمایا ہے اُس سے کہیں زیادہ تقرب اور تعزز کے کلمات حضرت سید نا محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرہ سے منسوب ہیں اور شیخ عبدالحقؒ نے اخبار الاخیار کے شروع ہی میں اُن کو نقل کیا ہے۔ یعنی ماء رجال الغیب ، جنات اور ملائکہ پر اُن کے اثرات کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں :- مخلوقات کے ظاہر و باطن میں تصرف کرنا، انسانوں اور جنات پر حکمرانی ، لوگوں کے راز اور پوشیدہ امور سے واقفیت ، عالمِ ملکوت کے بواطن کی خبر ، عالمِ جبروت کے حقائق کا کشف ، عالم لاہوت کے سربستہ اسرار کا علم ، مواہب غیبیہ کی عطا ، باذنِ الہیٰ حوادث زمانہ کا تصرف و انقلاب ،

مارنے اور جلانے کے ساتھ متصف ہونا ، اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرنا، مریضوں کی صحت ، بیماروں کی شفا ، طئی زمان و مکان ، زمین و آسمان پر اجرائے حکم ، پانی پر چلنا ، ہوا میں اُڑنا ، لوگوں کے تخیل کا بدلنا، اشیا کی طبیعت کا تبدیل کر دینا، غیب کی اشیا کا منگوانا ماضی و مستقبل کی باتوں کا بتانا وغیرہ (اخبار الاخیار ۔ ترجمہ صفحہ ۴۵ مطبوعہ کراچی)۔

(۸۰) حضرات القدس ۲/۵۸ (ترجمہ سیالکوٹ ۱۴۰۳ھ)

(۸۱) ایضاً ۔ صفحہ ۳۷

(۸۲) ایضاً ۔ صفحہ ۴۰ ۔ زبدۃ المقامات (ترجمہ ۔ سیالکوٹ ۱۴۰۷ھ) صفحہ ۲۰۷ میں بھی یہی واقعہ درج ہے ۔ اتنا اضافہ ہے کہ حضرت خواجہؒ نے یہ بھی دیکھا کہ "میں نے ایک بڑا چراغ روشن کیا ۔ ہر ساعت اُس کی روشنی بڑھ رہی تھی ۔ پھر لوگوں نے اُس سے بہت سے چراغ روشن کیے ہیں کہ جب ہم ہوہند کے اطراف میں پہنچے تو وہاں کے دشت و صحرا کو مشعل سے بھرا ہوا دیکھا ۔ اس کو بھی ہم آپ کے معاملے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔"

(۸۳) حضرات القدس (دوم) کے حضرت پنجم میں آپ کی عادات اور عبادات کی تفصیل ہے ۔

(۸۴) اسی کتاب میں شیخ حمید بنگالیؒ کے حالات میں حضرت مجددؒ کی جوتی کی برکات کا ذکر ہے ۔

(۸۵) حضرت شیخ عثمان جالندھریؒ سے متعلق مفصل مضمون رسالہ الرحیم (حیدر آباد سندھ ۔ نومبر ۱۹۶۷ء) میں عرض کیا گیا تھا۔

(۸۶) خزینۃ الاصفیاء ۔ جلد اولؔ ۔ صفحہ ۴۴۰ (طبع لکھنؤ) میں کتاب کے مصنف غلام سرور لاہوری نے حضرت جلال تھانیسری کی تاریخ یوں لکھی ہے :-

جلال از جہاں چوں بہ جنت رسید ۔ پئے سالِ ترحیل آن ذی کمال

یکے "شیخ پاکیزہ دل" شد عیاں ۔ دگر ہست "مہتابِ عزت جلال"

۹۸۹ھ ۹۸۹ھ

(۸۷) ممکن ہے کہ یہ اسحق ، حضرت ہاشم کشمیؒ (صاحبِ زبدۃ المقامات) کے بھائی ہوں جن کے انتقال پر حضرت ہاشمؒ نے مرثیہ لکھا تھا جو اُن کے دیوان میں موجود ہے ۔

(۸۸) نیشنل میوزیم کراچی میں رسالۂ عشقیہ کا جو مخطوطہ ہے اُس کے مقدمے میں یہاں پیر ولی برکی کے بجائے پیر ولی کوہی ہے ۔

(۸۹) چہل مکتوبات کا اردو ترجمہ ، اللہ والے کی قومی دُکان لاہور سے شائع ہوا تھا۔ سالِ اشاعت درج نہیں ۔ صفحہ ۵۰ میں شیخ الہ داد کے نام ایک مکتوب ہے جس میں اُن کو استاد زادہ کہا ہے ۔ صفحہ ۵۴ میں ہے کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے مُرشد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والی راہیں تعداد میں جہان کے ذرّوں کے برابر ہیں ۔ لیکن سب سے نزدیک راہ، دل کا ہاتھ میں لانا ہے۔"

صفحہ ۲۴ میں ایک مکتوب شیخ جنید کے نام ہے اور اُن کا ایک ریختہ (۱۵ ۔ اشعار کا) رسالہ عشقیہ (ورق ۶۶ ب) میں ہے ۔ یہ ریختہ حافظ محمود شیرانی کی کتاب (پنجاب میں اردو (لاہور ۱۹۲۸ء) صفحہ ۲۳۳ میں درج ہے اور اسی کتاب کے صفحہ ۲۳۲ میں شیخ عثمان جالندھریؒ کا ذکر بھی ہے ۔

دیوانِ غالب نسخہ آصفیہ مطبوعہ ۱۸۶۲ء بحیاتِ غالب

پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری

کتب خانہ ادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی آندھرا پردیش (سابق کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد) میں دیوان غالب کا ایک نادر و نایاب مطبوعہ نسخہ مخطوطہ نمبر ۹۸۸ کے تحت موجود ہے ۔ اندراج کے رجسٹر اور فہرست مطبوعہ میں بھی اسے مخطوطات کے تحت درج کیا گیا ہے ۔ اور کیفیت کے خانے میں "تصحیح شدہ غالب" لکھا گیا ہے ۔ اصل میں یہ دیوان غالب کا تیسرا ایڈیشن ہے جو غالب کی حیات میں ۲۰ محرم ۱۲۷۸ ہجری (مطابق آخر جولائی ۱۸۶۱ء) کو مطبع احمدی دہلی میں امو جان کے اہتمام سے طبع ہوا تھا ۔ سرورق کی چوٹی پر باریک قلم سے ذیل کی عبارت سیاہ روشنائی سے درج ہے ۔

"از ملک ہیچمرز خاکسار ذرۂ بیمقدار سید حسن رضا عرف بڈھن سوز خوان ابن سید علی رضا ابن سید مولوی احسان محمد صاحب المتخلص بہ صفا مرحوم و مغفور بلگرامی ۔"

اس کے بعد اور بھی الفاظ تھے جو قلمزد کئے گئے ہیں سرورق صفحۂ اول پر ہے ۔ اس پر تین طرف سے خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے ہیں ۔ $\frac{1}{2}$ ۴ × $\frac{1}{2}$ ۱ انچ سائز میں یہ عبارت چھپی ہے ۔ "والشعراء یتبعھم الغاوٗن ط" ۔ بیچ میں جلی حروف میں "دیوان غالب" لکھا گیا ہے اور اس کے بعد اسی سائز میں مطبع کا نام اس طرح لکھا گیا ہے ۔ "در مطبع احمدی باہتمام امو جان طبعشد" دیوان کی تفصیلات یہ ہیں ۔ سائز $\frac{1}{2}$ ۷ × ۱۱ انچ متن ۵ × ۹ انچ ، سطر ۲۵ ، کل صفحات ۸۸

صفحہ ۲ — ۱۲ × ۱۰ سینٹی میٹر میں نقش و نگار کے بعد "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ہے ۔ پھر دیباچہ غالب شروع ہوتا ہے جو ۱۵ سطروں میں صفحہ ۳ میں پہلی ۳ سطروں میں ختم ہوتا ہے ۔ اسی صفحے میں پہلی غزل "نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا" شروع ہوتی ہے ۔ ص ۷۰ میں دیوان غزلیات ذیل کی غزل پر ختم ہوتا ہے ۔

نوید امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے ۔۔۔ رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

پھر اسی صفحے میں بغیر عنوان کے قصاید ہیں ان ہی میں ایک مثنوی بھی ہے تفصیلات یہ ہیں :۔

ص ۷۰ (۱) سازِ یک ذرّہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار ۔۔۔ سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار (۱۸ شعر)

ص ۷۱ (۲) دہر جز جلوۂ یکتائے معشوق نہیں ۔۔۔ ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں (۲۳ شعر)

ص ۷۳ (۳) ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام ۔۔۔ جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام (۵۸ شعر)

۲۳ واں شعر پھر غزل کی روش پہ نکلا کے بعد جلی قلم سے درمیان میں غزل لکھا ہے ۔ اس کے بعد یہ مطلع ہے ۔

زہر غم کر چکا ہے میرا کام ۔۔۔ تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

ص ۷۵ (۴) صبحدم دروازۂ خاور کھلا ۔۔۔ مہر عالمتاب کا منظر کھلا (۴۳ شعر)

ص۸۰،۷(۵)

مطلع ہاں دل درد مندِ زمزمہ ساز کیوں نہ کھولے درِخزینۂ راز (۳۳شعر)
مقطع شاد و دل شادوشادماں رکھیو اور غالب پہ مہرباں رکھیو

نسخۂ عرشی میں نمبر ۵ کا عنوان "مثنوی" درج کیا گیا ہے ۔ جبکہ دیوانِ غالب کے چوتھے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۶۲ء میں اس کا عنوان "در صفتِ انبہ" دیا گیا ہے۔ پانچویں ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۶۳ء میں بھی "مثنوی" ہی درج ہے ۔

ص ۸۰،۷ میں مثنوی کے اختتام پر قطعات شروع ہوتے ہیں ۔ کسی قطعہ میں کوئی عنوان درج نہیں ہے ۔ یہ سلسلہ ص ۸۴ تک ہے ۔ چھوٹے بڑے قطعات کی تعداد ۱۶ ہے ۔ ص ۸۱ میں یہ قطعہ ۱۱ شعر میں درج ہے ۔

اے شاہ جہانگیر جہاں بخش جہاندار ہے غیب سے ہر دم مجھے صد گونہ بشارت

دیوان غالب مرقع چغتائی میں اس کا عنوان "در مدح شاہ" لکھا ہے ۔ چوتھے ایڈیشن مطبع کانپور ۱۸۶۲ء میں "مدح" اور پانچویں ایڈیشن مطبع مفید خلائق آگرہ ۱۸۶۳ء میں بھی مثل مطبع احمدی "قطعہ" درج ہے ۔ اس وقت میرے پیش نظر "مجموعہ سخن" حصہ دوم مطبع نولکشور مطبوعہ ۱۸۷۲ء کا نسخہ ہے ۔ یہ پنڈت شیونرائن نے باعانت منشی محمد حکیم الدین و منشی سید غلام حسنین قدر بلگرامی کے اہتمام سے شائع ہوا تھا ۔ اس میں قطعہ کا عنوان "مدح شاہ تہنیتِ نوروز" لکھا ہے ۔ نسخۂ عرشی میں یہ قطعہ نمبر ۸ کے تحت درج ہے اور یہ پہلی مرتبہ نسخہ مطبع احمدی میں ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا تھا ۔

ص ۸۴ سے رباعیات شروع ہوتی ہیں ۔ ان کی تعداد ۱۶ ہے ۔ آخری رباعی کے دو مصرعے ص ۸۶ میں ختم ہوتے ہیں ۔

پہلی اور آخری رباعی ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔

بعد از اتمام بزم عید اطفال ایام جوانی رہی ساغر کش حال
آ پہنچے ہیں تاسواد اقلیم عدم اے عمر گذشتہ یکقدم استقبال

———————

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے بھیجے ہیں جو ارمغان شہہ والا نے
گن کر دیوینگے ہم دعائیں سوبار فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

رباعیوں کے بعد ص ۸۶ میں "خاتمہ" کے تحت نواب محمد ضیاء الدین خان بہادر" کی تقریظ ہے ۔ ص ۸۸ کی تیسری سطر سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے یہ تقریظ ۱۲۷۱ ہجری (۱۸۵۴ء) میں لکھی تھی ۔ سطر ۶ میں اشعار کی تعداد

۱۶۹۵ اس طرح درج ہے ۔
"ہمگی اشعار شعری شعار غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی یکہزار و ششصد و نود واند" ۱۶۹۵ پہلے "یک ہزار و ششصد نود و پنج اند" لکھا تھا ۔ بعد میں لفظ "پنج" کاٹ دیا گیا ۔ دراصل اس نسخے میں اشعار کی صحیح تعداد ۱۷۹۶ ہے ۔ میں نے اسکا ایک ایک شعر گن لیا ہے ص ۸۸ میں ہی بارھویں سطر سے نواب محمد ضیاءالدین بہادر رئیس ... تخلص نیر رخشان کا قطعۂ تاریخ انطباع پانچ شعر میں موجود ہے ۔ اس کے ساتھ ہی مرزا یوسف علی خان تخلص عزیز شاگرد غالب کا پانچ شعر میں قطعۂ تاریخ انطباع دیوان طبع زاد" درج ہے ۔ اس کے مادہ تاریخ کے مصرعہ کے ساتھ ہی سطر نمبر ۲۲ میں "عبارت خاتمہ دیوان" کے تحت اسی سطر میں غالب کی تحریر "داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے ... اللہ بس ماسویٰ ہوس" حاشیے کی داہنی طرف ختم ہوتی ہے جس کو بعد میں غالب نے اپنے قلم سے قلمزد کیا ہے ۔ اور اس کے بدلے حاشیہ بڑھا کر محمد حسین خان کے نام خط لکھا ہے جیسا کہ عکس سے ظاہر ہوتا ہے ۔

دیوان غالب نسخۂ آصفیہ ص ۸۸ پر غالب کے خط کے ساتھ ختم ہوتا ہے غالب نے اپنی قلمزدہ تحریر کے بعد مہر بھی چسپاں کی ہے ۔ اس کے بعد کوئی غلط نامہ درج نہیں ہے ۔ جناب عرشی صاحب کے پاس مطبع احمدی کا جو نسخہ تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی غلط نامہ بھی موجود ہے ۔ وہ نسخہ عرشی ص ۱۳۷ (طبع ثانی) میں دیوان غالب مطبع احمدی نسخۂ رامپور کے تحت لکھتے ہیں کہ :۔

> "غلط نامے کے آخر میں "المذنب محمد مقصود" چھپا ہے جو بظاہر کاتب کا نام ہے"

ص ۱۳۸ میں مزید لکھتے ہیں کہ :۔

> "اس ایڈیشن میں میرزا صاحب نے اپنے کلام میں کچھ ضروری ترمیم بھی کی تھی اور چونکہ وہ ترمیم طباعت کے بعد ذہن میں آئی تھی اس لئے اسے غلط نامے میں ظاہر کرنا پڑا ہے ۔ مثلاً میرزا صاحب کا مصرع اس طرح تھا ۔
>
> دُود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے
>
> اس کو بنایا ہے ۔
>
> صورت دُود رہا سایہ گریزاں مجھ سے"

عرشی صاحب ص ۳۶۹ میں مزید اس مصرعہ "دُود کی طرح ...." کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :۔

> "حب (نسخۂ احمدی) میں بھی یہی تھا ۔ مگر اس کے غلط نامے میں غالب نے تصحیح کر دی ہے"

کاش عرشی صاحب اس غلط نامے کے بارے میں کچھ تفصیلات بھی فراہم کرتے ۔
غرضیکہ جب یہ دیوان چھپ گیا اور نسخۂ آصفیہ غالب کی نظر سے گزرا اور اس میں بکثرت

کتابت کی خامیاں اور بار بار لفظ "کسی" بہ یاے تحتانی کے بدلے "کِسو" بہ واوِ معروف اور یاے معروف و مجہول کے اغلاط دیکھے تو مطبع والوں پر نہایت برہم ہو گئے ۔ بالآخر اس عنوان کا ۸ اگست ۱۸۶۱ء مطابق ۳۰ محرم ۱۲۷۸ ہجری کو میر مہدی مجروح کے نام ذیل کا خط لکھا ۔

"دیوان اردو چھپ چکا۔ ہائے! لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا ، اس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا ۔ دلی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت! صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے ۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں ۔ کاپی نگار اور تھا۔ متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا اب جو دیوان چھپ چکے ، حق التصنیف ایک مجھ کو ملا غور کرتا ہوں تو وہ الفاظِ غلط جوں کے توں ہیں ۔ یعنی ، کاپی نگار نے نہ بنائے ناچار غلط نامہ لکھا وہ چھپا ۔ بہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا ۔ اگر خدا چاہے تو اسی ہفتے میں تین مجلد اصحاب ثلثہ کے پاس پہنچ جائیں ۔ نہ میں خوش ہوا ہوں نہ تم خوش ہو گے ۔

اور یہ جو لکھتے ہو کہ یہاں خریدار ہیں ۔ قیمت لکھ بھیجو میں دلال نہیں سوداگر نہیں ۔ مہتمم مطبع نہیں ۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خان مہتمم مرزا امو جان ، مطبع شاہدرے ہیں ۔ محمد حسین خان دلی شہر راے مان کے کوچے میں مصوروں کی حویلی کے پاس قیمت کتاب ۶ آنے محصول ڈاک خریدار کے ذمے ۔"

نسخۂ آصفیہ میں بعض مقامات پر کسی نے کچھ معمولی اصلاحیں بھی کی ہیں ۔ مثال کے طور پر ص ۷ میں تیرھواں شعر اس طرح درج ہے

یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا　　　انتظار صید میں ایک دمہ دیدۂ بیخواب تھا

کسی نے مصرعۂ دوم میں "دمہ" کو سیاہ روشنائی سے دائرہ میں رکھا ہے ممکن ہے کہ یہ غالب نے ہی کیا ہو ۔ ص ۱۷ میں چھٹا اور ساتواں شعر یوں ہیں ۔

(۶)　بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب　　　چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا
(۷)　تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوا ے صیقل　　　دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

حاشیے میں شعر نمبر ۶ کے داہنی طرف "ح" (حاشیہ) اور شعر نمبر ۷ کے ساتھ م (متن) لال روشنائی سے لکھا گیا ہے ۔ یہ بھی غالباً غالب نے ہی لکھا ہے ۔

ص ۱۷ میں قصیدہ "ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار" کے "مطلع ثانی" جو اس مصرعہ سے شروع ہوتا

ہے ۔ "فیض سے تیرے ہی اے شمع شبستان بہار" کے سبھی اشعار کے آخری الفاظ چھپنے سے رہ گئے تھے ۔ یہ الفاظ بھی غالباً مرزا صاحب نے لال روشنائی سے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں :۔

گلزار (گو) ہر بار ، اسرار ، غمخوار (غم خار) آئینہ دار ، دیوار ، سرشار اسی طرح اس قصیدہ "دہر جز جلوۂ یکتائے معشوق نہیں" کے دوسرے اور تیسرے شعر کے مصرعوں کے الفاظ (قافیے) "خود بین" اور "نہ دیں" غالب کے ہاتھ کے ہی لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔

بعض لوگوں کو دیوان غالب نسخۂ آصفیہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کی تصحیح اور غلط نامہ مرتب کرنے میں غالب نے دو رات دن کی محنت صرف کی تھی۔ ان لوگوں نے اس نسخے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی زحمت نہیں فرمائی تھی ۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات کی جملہ رجسٹروں میں اس کے بارے میں غالب کا "تصحیح شدہ" دکھایا گیا ہے ۔ کتاب کے اندر کتب خانے کی جو پرچی چسپاں کی گئی ہے اس پر بھی اِسے "تصحیح شدہ غالب" لکھا گیا ہے ۔ ہم نے کتب خانہ آصفیہ میں اس نسخے کا بغائر نظر مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس میں غالب نے کوئی اصلاح نہیں کی ہے نسخۂ احمدی کے جس نسخے پر غالب نے تصحیح کی تھی وہ عنقا کے برابر ہے اور اس کا وجود اب کہیں نہیں مل رہا ہے۔ مجھے جناب عرشی صاحب مرحوم کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ :۔

> "بگمان غالب میرزا صاحب نے اغلاط کی درستی جس نسخے پر کی تھی از راہِ سہو رقعہ اس پر نہیں لکھا بلکہ کسی اور بغیر تصحیح شدہ نسخے پر لکھ دیا ۔ جب اس پر شبہہ ہوا تو وہ رقعہ تصحیح شدہ پر لکھ کر بھیجا" (دیوان غالب نسخۂ عرشی ص ۱۴۰)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جناب مالک رام صاحب نے دیوان غالب کا جو صدی ایڈیشن جشن غالب کے صد سالہ تقریبات پر ۱۹۶۹ء میں صد سالہ یادگار غالب کمیٹی کی طرف سے شائع کیا اس کے متن کی بنیاد موصوف نے مطبع نظامی کانپور ۱۸۶۲ء پر رکھی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ

> "جب غالب نے مطبع احمدی کا متن دیکھ کر اسے درست کرکے ، دیوان مطبع نظامی میں چھپوایا ، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے متن ہمیشہ کے لئے خود طے کر دیا ۔ اب اس سے پہلے کے ایڈیشنوں کو ہم نہ صرف متن میں استعمال نہیں کر سکتے بلکہ وہ شاید اختلاف نسخ کے تحت بھی نہیں آئیں گے" (مقدمہ دیوان غالب ص ۳۰ آزاد کتاب گھر دہلی) جناب مالک رام صاحب کی تردید میں جناب رشید حسن صاحب نے ایک محققانہ اور فاضلانہ مضمون بڑی دیدہ ریزی سے لکھا جو ان کی کتاب "ادبی تحقیق ـــ مسائل اور تجزیہ" (شائع کردہ ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ ۱۹۷۸ء) میں ص ۱۵۱ سے ص ۲۱۶ تک شامل ہے ۔ یہ مقالہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے ۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جناب

عرشی صاحب اور جناب رشید حسن خان مطبع نظامی والے ایڈیشن کو مستند نسخہ قرار نہیں دیتے ہیں ۔ دونوں بزرگوں نے اس ایڈیشن کی متعدد غلطیوں کی نشاندہی کی ہے ۔

نسخۂ مطبع احمدی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جس قلم سے ص ۸۸ کے حاشیے میں محمد حسین خان کو خط لکھا ہے اسی قلم سے پورے دیوان کے نسخہ کے بیچ میں نئے صفحوں کے اعداد ڈالے گئے ہیں ص ۸۴ میں یہ رباعی چھپی ہے :۔

آتشبازی ہے جیسے شغل اطفال ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجد عشق بھی قیامت کوئی لڑکوں کے لئے گیا ہے کھیل نکال

اس کے بعد حاشیے میں ۱۰۲ کا نمبر ڈالا گیا ۔ اس طرح اختتام دیوان تک ۱۰۴ صفحوں کے نمبر ڈالے گئے ہیں اور یہ سب نمبر غالب نے اپنے قلم سے لکھے ہیں ۔ یہ بات قابل غور ہے کہ مطبع نظامی کانپور میں بھی اتنے ہی صفحات ہیں میرے خیال میں غالب نسخۂ آصفیہ کو ہی درست کرنا چاہتے تھے بعد میں سہواً دوسرے نسخے کی تصحیح کی اور اسی کے ساتھ غلط نامہ بھی مرتب کر کے شامل کیا ۔ بہر حال نسخۂ آصفیہ میں غالب نے جن صفحات کے نمبر دیے ہیں وہ یہ ہیں ۔

۵ ، ۷ ، ۹ ، ۱۰ ، ۱۲ ، ۱۴ ، ۱۷ ، ۱۹ ، ۲۲ ، ۲۴ ، ۲۷ ، ۳۲ ، ۵۸ ، ۶۰ ، ۶۲ ، ۶۳ ، ۶۵ ، ۶۹ ، ۷۰ ، ۷۱ ، ۷۲ ، ۷۳ ، ۷۴ ، ۷۵ ، ۷۷ ، ۷۸ ، ۷۹ ، ۸۰ ، ۸۱ ، ۸۲ ، ۸۳ ، ۸۴ ، ۸۵ ، ۸۶ ، ۸۷ ، ۸۸ ، ۸۹ ، ۹۰ ، ۹۱ ، ۹۲ ، ۹۳ ، ۹۴ ، ۹۷ ، ۹۹ ، ۱۰۰ ، ۱۰۲

ان صفحوں کے حواشی میں ذیل کے نمبر دیکھنے کے قابل ہیں جو غالب نے لکھے ہیں ۔

۹ ، ۱۰ ، ۲۴ ، ۲۵

نسخۂ مطبع احمدی کے ایک ماہ کی اشاعت کے بعد غالب نے آخر اگست ۱۸۶۱ء (مطابق آخر صفر ۱۲۷۸ھ) کو اس کا ایک نسخہ نواب میر تراب علی خان مختار الملک بہادر سالار جنگ اوّل (متوفی ۱۳۰۰ھ) کو حیدر آباد بھیجا تھا (پنج آہنگ ص ۱۱۸) ممکن ہے کہ نسخۂ آصفیہ وہی نسخہ ہو گا ۔

چونکہ نسخہ آصفیہ کی بڑی اہمیت ہے اس لئے کہ یہ میرزا غالب کی نظر سے گذرا ہے ۔ اور وہ اس کی ناقص طباعت سے چراغ پا ہوئے تھے لہذا جس املا اور قرأت میں دیوان شائع کیا گیا ہے ذیل میں جوں کی توں چند غزلیں نقل کی جاتی ہیں ۔

درد منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتی ہو کیوں رقیبوں کو ایک تماشا ہوا گلا نہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں تو ہی جب خنجر آزما نہوا
کتنی شیریں ہیں تیری لب کہ رقیب گالیاں کہا کے بیمزا نہوا

ہی خبر گرم اون کی آنیکے　　آج ہی گہر میں بوریا نہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تہے　　بندگے میں میرا بہلا نہوا
جان دی ، دی ہوئی "اسیکے تھی　　حق تو یوں ہی کہ حق نہوا
زخم گردب گیا لہو نہ تنبہا　　کام گرلک گیا روانہ ہوا
رہزنی ہی کہ دل ستانی ہے　　لیکے دل دلستاں روانہ ہوا
کچھ تو پڑ ہئی کہ لوگ کہتی ہیں　　آج غالب غزل سرا نہوا　　(صفحہ ۱۱)

پہر مجہی دیدۂ تر یاد آیا　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تہا نہ قیامت نے ہنوز　　پہر ترا وقت سفر یاد آیا
سادگیہاے تمنا یعنے　　پہر وہ نیرنگ نظر یاد آیا
عذر وا ماندگے ای حسرت دل　　نالہ کرتا تہا جگر یاد آیا
زندگی یوں بہی گزر ہی جاتے　　کیوں ترا راہگزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　گہر ترا خلد میں گر یاد آیا
آہ وہ جرات فریاد کہاں　　دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا
پہر تری کوچہ کو جاتا ہی خیال　　دل گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سے ویرانی ہی　　وشت کو دیکہہ کے گہر یاد آیا
مینے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد　　سنگ اوٹہایا تہا کہ سر یاد آیا　　(صفحہ ۱۳)

نہوی کر میری مرنیسی تسلّے نسہے　　امتحان اور بہی باقی ہو تو یہہ بھی نسہی
خار خار الم حسرتِ دیدار تو ہے　　شوق گلچین گلستان تسلے نسہے
می پرستان خم می مہنہ سی لگائی ہی بنے　　ایکدن گرنہوا بزم میں ساقی نسھی
نفس قیس کہ ہی چشم و چراغ صحرا　　گر نہیں شمع سیہ خانہ لیلے نسھی
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گہر کی رونق　　نوحۂ غم ہی سھی نغمۂ شادی نسھی
نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا　　گرنہیں ہیں میری اشعار میں معنی نسھی
عشرت صحبت خوبان ہی غنیمت سمجہو　　نہوئی غالب اگر عمر طبیعی نسھی　　(صفحہ ۵۳)

غالب نے دیوان کی ابتدا میں دیباچہ بھی لکھا تھا ۔ نسخۂ عرشی میں اس کی تاریخ کتابت "بیست و چہارم شہر ذی قعدہ ۱۲۴۸ ہجری" درج ہے زیر نظر نسخۂ مطبع احمدی کے دیباچے میں کوئی غلطی نہیں ہے ۔ ذیل میں دیباچہ اور نیر رخشاں کی تقریظ وغیرہ درج کی جاتی ہیں :-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"مشام شمیم آشنایان راصلا و نہاد انجمن نشینان رامژدہ کہ لختے از سامانِ مجمرہ گردانی آمادہ ، و دامنے از عود ہندی دست بہم دادہ است ۔ نہ چوبہاے سنگ ژوپ خوردہ بہ ہنجار ناطبیعی شکستہ بے اندام تراشیدہ ، بلکہ بہ تیر شگافتہ ، بکار ریز ریز کردہ ، بہ سوہان خراشیدہ ۔

اَیدون نفس گداختگی شوق بہ جستجوے آتشِ پارسی است نہ آتشے کہ در گلخنہائے ہند افسردہ و خاموش، از کفِ خاکستر برگِ خودش سیہ پوش بینی ۔ چہ برؔزوی مُسلَّم است از ناپاکی باستخوان مردہ ناہار شکستن واز دیوانگی برشتۂ شمع مزار کشتہ آویختن ہر آئینہ بدل گداختن نیر زد و بزم افروختن رانشاید رخ آتش بہ صنع برافروزندہ و آتش پرست رابیاد افراہم در آتش سوزندہ نیک می داند کہ پژوہندہ درہوائے آں رخشندہ آذر نعل در آتش است کہ بچشم روشنی ہوشنگ از سنگِ برون تافتہ و در ایوان لہراسپ نشوونما یافتہ ، خس را فروغست و لالہ رارنگ ، و مُخ راچشم ، وکدہ راچراغ بخشندۂ یزدانِ درون سخن برافروز راسپاسم کہ شرارے از آں آتش تابناک بخاکستر خویش یافتہ ، بکاوِ بکاوِ سینہ شتافتہ ام ، از نفس دمہ بر آں بر نہادہ بُوکہ دراندک مایہ روزگار آں مایہ فراہم تواند آمد کہ مجمرہ رافرِ روشنائی چراغ و رائحہ عود رابالِ شناسائی دماغ تواند بخشید ۔

ہمانا نگارندۂ ایں نامہ را آں درسر است کہ بس از انتخاب دیوانِ ریختہ بگرد آوردن سرمایۂ دیوانِ فارسی برخیزد و باستقاضۂ کمالِ ایں فرِیور فن پس زانوے خویشتن نشیند ۔ امید کہ سخن سرایانِ سخنورِ ستاے ، پراگندہ ابیاتے راکہ خارج ازیں اوراق یابند ، از آثارِ تراوشِ رگ کلکِ ایں نامہ سیاہ نشناسند ، وجامہ گرد آور رادرستائش ونکوہش آن اشعار ممنون وماخوذ نسگالند ۔

یارب ایں بوئے ہستی ناشنیدۂ ، از نیستی بہ پیدائی نارسیدہ ، یعنی نقش بہ ضمیر آمدۂ نقاش کہ بہ اسد اللہ خان موسوم و بہ میرزا نوشہ معروف و بہ غالب متخلص است ۔ چنانکہ اکبر آبادی مولد و دہلوی مسکن است ، فرجام کار نجفی مدفن نیز باد"

خاتمہ

"دمیدن سپیدہ سحری از تیرہ شب سوادِ اوراق بفرِ فروغ گستریِ عبارت تقریظ کہ پیدائی آن اثریست از آثارِ خرام خامۂ دلربا برادر بدل نزدیک بجان برابر ، عالی دُودمانِ والاگہر نواب محمد ضیاء الدین خان بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ ۔

بنامیزد سہی بالاناظورۂ ایست ، از قدسی خانوادۂ فکر سر برزدہ ، گرم جلوہ گری لاابالی خرام محبوبۂ ایست ، مقنع از رخ برداشتہ و دامن بکمر برزدہ در انداز پردہ دری زیو سفتانیست حورانسرشامان معانی در وے دوش بر دوش ، عبہر زاریست جلوہ گاہ حیرتیاں باختہ ہوش ، پہناور پرند ، مانند سپہر ثوابت ، گوہر آگین ، خورنق شار سانیست ، بارنامہ شکن صد نگارخانۂ چیں ، فروغانیِ چراغیست پری پروانہ و سماوی ہیکلی است حرزِ بازوے فرزانہ گوئی میکائیل نوال مُوکلے فراخ سماطی نہادہ است و گرسنہ چشمانِ سخن را صلائے عام دردادہ ۔ بیت اللہ تقدس معبدیست کہ کلیدش بدست فہم درست دادہ اند و درش براحرام بندانِ مُزدلفۂ دل کشادہ ، سومناتے است یک صنمستاں زنار بندانِ خیال در وے جبین سائے ، وارتنگیست بنمائش نقشہاے بدیع پشت دستِ مانی وارژنگ بر زمین سائے ۔ ہر صفحہ ازیں اوراق ، برہمن ایست بید خوان ، ہرورق ازیں کتاب موبدی است استادان ۔ آئینہ خانہ ایست گیتی نما۔ صفوت کدہ ایست مصفّا پردہ گیاتند حجلۂ نشینِ سرادق مریم کرداری ، شوخ چشماتند پردہ در ترازشاہدانِ بازاری ، تہیدستاتند تونگر دل ، آزاد گانند پادر گل ، عشاق طینتاتند بخویشتن مائل ، سادہ پیکر اتند نگارین دل ، ہاروت پیشگانند زہرہ فن ، بَسرینی گوہر اتند بابل مسکن ، سمندر اتند قلزم کش ، نہنگاتند سینہ پُر آتش برشتگانند پختہ مغز ہم بہ مغز پختہ وہم پیوست نغز ، بادہ آشاماتند سیہ مست از خود رفتگاتند بایکدگر ہمدست وہندی ضماتند پارسی گرد وِلّی نژاداتند صفاہان پرورد ۔

ہان وہان ترسم کہ اُنچہ سرودم نسختہ باشی ، ہمانا منتخب دیوان اردو زبان است ریختۂ کلک مسیحی فرتابِ خدام قِطاس دانش ، اُسطرلابِ بینش ، ہر آئینۂ آفرینش ، معیارِ نقدِ گراں مائگی معراج مسلّم بلند پائگی ، قہرمانِ قلمرو معنی پروری ، فرمان روائے گیہان سخنوری ، گیتی خدائگان نو آئین نگاری ، جہانِ سالار تازہ گفتاری روان بخش کالبدِ سخن گستری مینائی فزائے چشم دیدہ وری ، فرازندۂ وائے شوکتِ خامۂ فروزندۂ چراغ دودۂ آمہ ، آیۂ ناسخِ شہرت ہمہ استانان ، سرخیل انجمن نکتہ داناں مثنوی

سخن را از خیالش ارجمندی — معانی رازِ فکرش سربلندی
صریرِ خامہ اش بس دل پذیر است — بہشتے عندلیباں را صفیر است
مہینِ فرزندنہ آبائے علوی — بہین شاگردِ عقل کُلِ عالی
جہاں را بے دریغ آموز گاراست — گزیں معنی شناس روزگار است
سروسر دفترِ شیوہ بیانان — دریں فن افتخارِ ہم زبانان

بجولاں گاہِ معنی یکہ تازے فلاطون فطرتے ، حکمت ترازے
ز کلکش ریزش گنج معانی چواہرِ آذری در دُرفشانی
زِ صہبائے سخن سرشار گشتہ
ورق از فکرِ اوگلزار گشتہ

موحدّ کیش صافی منش ، ستودہ خوئے فروہیدہ کنش ، بزرگ نہادِ پاکیزہ گوہر ، فرشتہ سرشتِ آزرم گستر ، کیں گزارِ مہر پرور ، خرشید فروغ کیوان فر ، کشورِ معنی رادہِ خدائی ، سرتاسر وفاو فتوت ، دیدہ دل حیاو مروت

درکِ مُصوّر روح مجسم عالمِ جاں و جانِ عالم

والاحسب ونسب ، سَمّی وصّیِ واپسین وخشور ، آواش حضرتِ چارمین وستوراعنی استادی مرشد واخی ، میرزااسداللہ خان بہادر غالب ۔ اللھم کمّلِ الکلام بدیمومۃ بقائہ وحصل المرام بجینونۃ لقائہٖ ۔

پوزش آئین نیاز گستر ، محمد ضیاءالدین نیّر از دیر باز والائی اندیشۂ پست در آں اندیشیدے و گرانیِ قدر سُبک اندران سنجیدے کہ ایں گرامی برادر زادہ را ، کہ یگان یگان خلف الصدق دو مانِ ضمیر بل ابو الآبائے مضامین دل پذیراست ۔ بتعلیم نو آموزانِ نکواز بد نشناس برانگیزد وایں زندہ جواہر پارہ ہارا کہ ہریک ازاں سیمیں ساعد شخص خودرایارہ وناز نین پیکر ہوش راگوشوارہ است ، بہ شمسۂ پیش طاقِ شناسائی بر آویزد ۔

بارے کارساز ایزدِ بزرگ راہزاران سپاس کہ دریں زمان کہ سنۂ مقدسۂ ہجریہ نبویہ علیٰ صاحبہا افضل التحیاتِ واکمل الصلوٰت بہ یک ہزار و دو صد و ہفتاد و یک رسیدہ آں دیرین بسیچ و دلنشین آرزو و بمساعدت روزگار راست ہنجار ، وقلاؤزی بخت بیدار ، خوشتر ازاں کہ می خواستم ، روائی گرفت ۔ شادکامی در دل جاگزید واندوہ تردّدِ گرد آوری بدررفت ۔

چوں باحصائے افرادِ ایں ہمایوں صحیفہ شتافتم ، ہمگی اشعارِ شعری شعارِ غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی یک ہزار و ششصد و نو دو اند یافتم ۔

آلا یا توانا ہوشان ، ہوشے و شنواگوشان گوشے ، بر شاہراہِ شناختِ فراوانی نیکو معانی باید رفت ، نہ در پیغولۂ پیغارہ زنی خوردہ بر قلّتِ ابیات گرفت چنانکہ خود آنِ والا آموزگار ، درگزارش ایں ہنجار بپارسی نامۂ خویشتن در پردۂ ساز آن گفتار خودی سراید ۔ آرے راست می فرماید بیت

نہ گویم ، تانباشد نغز ، غالب چہ غم ، گرہست اشعارِ من اندک

ازمن یادگارے و برائے دیگران تذکارے باد۔"

نواب محمد ضیاءالدین نیّر کے خاتمہ کے بعد نیّر اور عزیز لکھنوی کی تاریخ انطباع ذیل میں یوں درج ہیں :۔

"قطعۂ تاریخ انطباع دیوان از نتائج طبع والائے جناب مستطاب نواب محمد ضیاءالدین

خان بہادر رئیس لوہارو کہ کہین بہادر و مہین شاگرد حضرت غالب اند و درفارسی نیر و در اردو رخشاں تخلص می کنند ہمانا نیر رخشان سپہر جاہ و جلال و فضل و قال اند

ہوا ہے حضرت غالب کا منطبع دیوان — صلائے فیض بہ گویندگان ریختہ ہے
یہی کتاب ہے جس میں کہ اوستادانہ — بیان ریختہ ہے اور زبان ریختہ ہے
بنائے ریختہ اُستاد ہی نے ڈالی ہے — اُسی سے قائم اساس جہان ریختہ ہے
زمین شعر میں اترا ہے لشکرابیات — سو یہ رسالۂ نامی نشانِ ریختہ ہے
۱۲۷۸

بنائے ریختہ ایک اور دوسری تاریخ
بذہن نیر رخشان "بیان ریختہ ہے"
۱۲۷۸

قطعہ تاریخ انطباع دیوان طبع زاد شاعر نغز بیان مرزا یوسف علی خان المخاطب بہ سلطان الذاکرین والمتخلص بہ عزیز کہ شاگرد حضرت غالب اند ایشاں نیز ۔

سروِ ریاض فضل محمد حسین خان — ہیں رونق بہار گلستان ریختہ
کہتے ہیں شعر خوب سمجھتے ہیں شعر خوب — تحسین تخلص اور زباں دانِ ریختہ
چھاپا انہوں نے حضرت غالب کا کلیات — وہ کلیّات جس سے بڑھی شانِ ریختہ
غالب میرزا اسد اللہ خاں ہے نام — ہے واقعی وہ شیرنیستانِ ریختہ

لکھی عزیز خستہ نے تاریخ انطباع
حاسد کے سر کو کاٹ کے دیوان ریختہ =۱۲۷۸ ہجری
۸ — ۱۲۸۶

مصرعہ تاریخ ص ۸۸ میں بائیسویں سطر کے آغاز میں کوئی ڈیڑھ انچ پر ختم ہوتا ہے ۔ اس کے فوراً بعد بلا فصل "عبارت خاتمۂ دیوان" کے تحت اسی سطر میں غالب کی عبارت ذیل ملتی ہے جس کو انہوں نے بعد میں برہمی کے سبب اپنے قلم سے قلمزد کیا ہے ۔ یعنی عبارت کی تمام سطریں جو حوض اور حاشیے میں تھیں کاٹ دیں جیسا کہ عکس سے معلوم ہوتا ہے ۔

"داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے مخلصِ و داد آئین میر قمرالدین کی کارفرمائی اور خان صاحب الطاف نشان محمد حسین خان کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا اگرچہ یہ انطباع

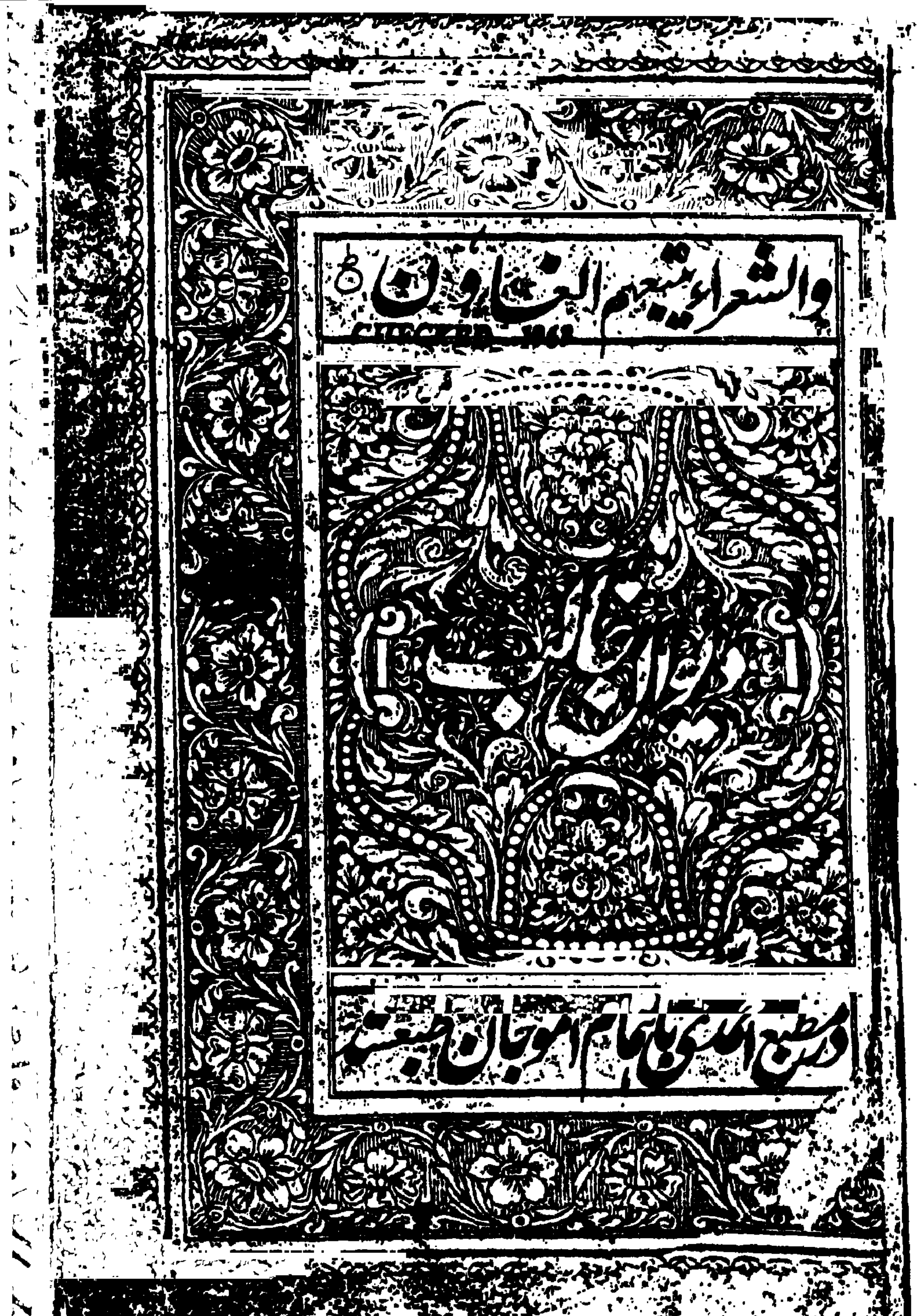
میری خواہش سے نہیں ، لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے ۔ اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے یقین ہے کہ کسی جگہ حرف غلط نہ رہا ہو۔ مگر ہاں ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے ۔ کہاں تک بدلتا؟ ناچار جا بجا یوں ہی چھوڑ دیا یعنی "کسو" بکاف مکسور و سینِ مضموم و واو معروف میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں البتہ فصیح نہیں۔ قافیے کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں ورنہ فصیح بلکہ افصح "کسی" ہے ۔ واو کی جگہ یائے تحتانی ۔ میرے دیوان میں ایک جگہ قافیہ "کسو" بہ واو ہے اور سب جگہ "کسی" بہ یائے تحتانی ہے ۔ اس کا اظہار ضرور تھا ۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے؟ اللہ بس ماسویٰ ہوس" ۔

اس کے بعد اسی صفحہ (۸۸) کے حاشیہ کی دائیں طرف یہ لکھا ہے ۔

"مطبع احمدی میں واقع دلہائے امو جان کے اہتمام سے بیسویں محرم الحرام ۱۲۷۸ ہجری کو مطبوع ہوا"

اس کے بعد یازدہم ۱۸۳۵ ایکٹ کے تحت سید قمرالدین کی جانب سے بغیر اجازت دیوان ہذا چھاپنے کی ممانعت اشتہار کے تحت درج ہے ۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ غالب نے اپنی تحریر قلمزد کرنے کے بعد ص ۸۸ کے داہنی طرف کا حاشیہ ڈیڑھ انچ کاغذ چپکا کر اوپر سے نیچے تک بڑھا دیا اور پھر اس پر ذیل کا خط اپنے جلی قلم سے لکھا ۔

"جناب محمد حسین خان کو میرا سلام پہنچے ۔ دو رات دن کی محنت میں میں نے اس نسخے کو صحیح کیا ہے ۔ غلط نامہ بھی اسی میں درج کر دیا ہے ۔ گویا اب غلط نامہ بیکارِ محض ہو گیا ہے ۔ خاتمے کی عبارت کیا ۔ میرا بیان کیا ، میر قمرالدین کا اظہار اب کچھ ضرور نہیں کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی یہ مجلد گویا مسودہ ہے ۔ اسی کو بھیج دیجیے ۔ غالب ۱۲ ۔"


والشعراء یتبعہم الغاوون
دیوان غالب
در مطبع احمدی باہتمام محمد جان طبع شد

بسم الله الرحمن الرحیم

ستایش تیغ شناسایان را صلا و بهادار انجمن شیفتگان را مژده که گنجی از سامان مجمره گردانی آماده و دود مینی از
عود هندی بدست بهم داده است نه چو بهای سنگ زده چوب خورده بهنجار ناشکیبی شکسته از دام تراوش
بلکه جگر شگافته به کاوش بر برگزیده بسوان خراشیده آمدن تعب گداختگی شوق جستجوی آتش پارسی است
آتشی که در گلخنهای هند افسرده و خاموش و از کف خاکستر برگ خودش سیه پوشی تیغ جوهری سلم است
از ناپاکی پیشروان مرده ملعبه شکستن و از دوانی پیشه شمع خاموش گشته آو نخستین هر آیینه بدل گذشتن
ستیز زده و بزم افروختن را شایسته آتش صبح برافروزنده و آتش پرست را باد افراه هم از آتش سوزنده
نیک سپاسی که ترتیب دهنده در هوای آن خرشنده آمد بنعل آتش است که بچشم روشنی پیشتنگ از سنگ برون تافته و
دیوان این سپه فشرده تا نافته خس تا فروغ است و لاله زار نکشته مغز چشم آذکده را چراغ بخشنده یزدان میرون
سخن برافروخته انبسیم که شراری از آن آتش تابناک بخاکستر خویش یافته بکاوکاو سینه شتافته ام و پایی نفس
بلکن بر بهای او که داده اندک پایه رهنگار را تمایه فاهم توان آمد که مجمره را فروزشهای چراغ مدایح خود را بال آشناسا
نوایم بخشید بها تا نگارنده این ناسپاس آن هنر هست که پس از انتخاب دیوان ریخته بگرد آوردن سرمایه دیوان فارسی
برخیزد و به استفاضه کمال این فرید فن ابن نوی خویشتن نشیند امید که سخن سرایان سخنور ستای پراگنده ابیات
فاضل الرأی اوراق باندازه کار تراوش رگ کلک این نامه سیاه نشناسند و چامه گرد آورده را بسناییش نگوهر

۳

مجموعۂ اشعار مضمون ماخوذ سے کمال انداز یارب این بوی ہستی بخشیدۂ از نیستی بہ پیدائی رسیدہ یعنی [illegible] آمدہ
نقاش کہ بہ اسد خان موسوم و بمیرزا نوشہ معروف و بغالب متخلص است جائے کہ اکبر آباد مولد و دہلی مسکن است [illegible]
مدفن [illegible] باد

غزلیات

نقش فریادی ہی کسکی شوخی تحریر کا / کاغذی ہی پیرہن ہر پیکر تصویر کا
کاو کاو سخت جانیہای تنہائی نہ پوچھ / صبح کرنا شام کا لانا ہی جوی شیر کا
جذبۂ بی اختیار شوق دیکھا چاہئی / سینۂ شمشیر سی باہر ہی دم شمشیر کا
آگہی دام شنیدن جسقدر چاہی بچہای / مدعا عنقا ہی اپنی عالم تقریر کا
بسکہ ہون غالب اسیری مین بہی آتش زیر پا / موی آتش دیدہ ہی حلقہ میری زنجیر کا

جراحت تحفہ الماس ارمغان داغ جگر ہدیہ / مبارکباد اسد غمخوار جان دردمند آیا

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروی کار / صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تہا
آشفتگی نی نقش سویدا کیا درست / ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تہا
تہا خواب مین خیال کو تجہسی معاملہ / جب آنکہہ کہل گئی نہ زیان تہا نہ سود تہا
لیتا ہون مکتب غم دل مین سبق ہنوز / لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تہا
ڈہانپا کفن نی داغ عیوب برہنگی / مین ورنہ ہر لباس مین ننگ وجود تہا
تیشی بغیر مر نسکا کوہکن اسد / سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تہا

کہتی ہو نہ دینگی ہم دل اگر پڑا پایا / دل کہان کہ گم کیجی ہمنی مدعا پایا
عشق سی طبیعت نی زیست کا مزا پایا / درد کی دوا پائی درد بی دوا پایا
دوست دار دشمن ہی اعتماد دل معلوم / آہ بی اثر دیکہی نالہ نارسا پایا
سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری / حسن کو تغافل مین جرأت آزما پایا
غنچہ پہر لگا کہلنی آج ہمنی اپنا دل / خون کیا ہوا دیکہا گم کیا ہوا پایا

۸

جلوہ از بسکہ تقاضائی نگہ کرتا ہی
جوہر آئینہ بہی چاہی ہی مژگان ہونا

عشرت قتلگہ اہل تمنا مت پوچہ
عید نظارہ ہی شمشیر کا عریان ہونا

لیگئی خاک مین ہم داغ تمنای نشاط ۹
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستان ہونا

عشرت پارۂ دل زخم تمنا کہانا
لذت ریش جگر غرق نمکدان ہونا

کی مری قتل کی بعد اوسنی جفا سی توبہ
ہای اوس زود پشیمان کا پشیمان ہونا

حیف اوس چارگرہ کپڑی کی قسمت غالب
جسکی قسمت مین ہو عاشق کا گریبان ہونا

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تہا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تہا

یکقدم وحشت سی درس دفتر امکان کہلا
جادہ اجزای دو عالم دشت کا شیرازہ تہا

مانع وحشت خرامیہای لیلی کون ہی
خانۂ مجنون صحرا گرد بی دروازہ تہا

پوچہ مت رسوائی انداز استغنای حسن
دست مرہون حنا رخسار رہن غازہ تہا

نالۂ دل نی دئی اوراق لخت دل بباد
یادگار نالہ اک دیوان بی شیرازہ تہا

دوست غمخواری مین میری سعی فرماوینگی کیا
زخم کی بہرنی تلک ناخن نہ بڑہ جاوینگی کیا

بی نیازی حد سی گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہینگی حال دل اور آپ فرماوینگی کیا

حضرت ناصح گر آوین دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجکو یہہ تو سمجہا دو کہ سمجہاوینگی کیا

آج وان تیغ و کفن باندہی ہوئی جاتا ہون مین
عذر میری قتل کرنی مین وہ اب لاوینگی کیا

گر کیا ناصح نی ہمکو قید اچہا یون سہی
یہہ جنون عشق کی انداز چہٹ جاوینگی کیا

خانہ زاد زلف ہین زنجیر سی بہاگینگی کیون
ہین گرفتار وفا زندان سی گہبراوینگی کیا

ہی اب اس معمورہ مین قحط غم الفت اسد
ہمنی یہہ مانا کہ دلی مین رہین کہاوینگی کیا

یہہ نہ تہی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتی رہتی یہی انتظار ہوتا

تری وعدہ پر جئی ہم تو یہ جان جہوٹ جانا
کہ خوشی سی مر نہ جاتی اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سی جانا کہ بندہا تہا عہد بودا ۱۰
کبہی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میری دلسی پوچہی تری تیر نیمکش کو
یہہ خلش کہان سی ہوتی جو جگر کی پار ہوتا

۴۰

نہ پوچھ بیخودی عیش مقدم سیلاب — کہ ناچتی ہین پڑی سر بسر در و دیوار
نہ کہہ کسی سی کہ غالب نہین زمانہ مین — حریف راز محبت مگر در و دیوار

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہی بغیر — جانیگا اب بھی تو نہ مرا گھر کہی بغیر
کہتی ہو جب رہی نہ مجھی طاقت سخن — جانون کسو کی دل کی مین کیونکر کہی بغیر
کام اوس سی آ پڑا ہی کہ جسکا جہان مین — لیوی نہ کوئی نام ستمگر کہی بغیر
جی مین ہی کچھ نہین ہی ہمارے وگرنہ ہم — سر جای یا رہی نہ رہین پر کہی بغیر
چھوڑونگا مین نہ اوس بت کافر کا پوجنا — چھوڑی نہ خلق گو مجھی کافر کہی بغیر
مقصد ہی ناز و غمزہ ولی گفتگو مین کام — چلتا نہین ہی دشنہ و خنجر کہی بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہین ہی بادہ و ساغر کہی بغیر
بہرا ہون مین تو چاہئی دونا ہو التفات — سنتا نہین ہون بات مکرر کہی بغیر
غالب نہ کر حضور مین تو بار بار عرض — ظاہر ہی تیرا حال سب اون پر کہی بغیر

کیون جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھکر — جلتا ہون اپنی طاقت دیدار دیکھکر
آتش پرست کہتی ہین اہل جہان مجھی — سرگرم نالہ ہای شرربار دیکھکر
کیا آبروی عشق جہان عام ہو جفا — رکتا ہون تمکو بی سبب آزار دیکھکر
آتا ہی میری قتل کو پر جوش رشک سی — مرتا ہون اوسکی ہاتھ مین تلوار دیکھکر
ثابت ہوا ہی گردن مینا پہ خون خلق — لرزی ہی موج می تری رفتار دیکھکر
وا حسرتا کہ یار نی کھینچا ستم سی ہاتھ — ہمکو حریص لذت آزار دیکھکر
بکجاتی ہین ہم آپ متاع سخن کی ساتھ — لیکن عیار طبع خریدار دیکھکر
زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال — رہرو چلی ہی راہ کو ہموار دیکھکر
ان آبلون سی پانون کی گھبرا گیا تھا مین — جی خوش ہوا ہی راہ کو پر خار دیکھکر
کیا بدگمان ہی مجھسی کہ آئینہ مین میری — طوطی کا عکس سمجھی ہی زنگار دیکھکر
گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر — دیتی ہین بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر

سر پیوز نامہ غالب شوریدہ حال کا

۴۱

یاد آگیا مجھی تیری دیوار دیکھکر

لرزتا ہی مرا دل زحمت مہر درخشان پر
مین ہون وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیابان پر

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یہان بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہی زندان پر

فنا تعلیم درس بیخودی ہون اوس زمانہ سی
کہ مجنون لام الف لکھتا تھا دیوار دبستان پر

فراغت کسقدر رہتی مجھی تشویش مرہم سے
بہم گر صلح کرتی پارہ ہای دل نمکدان پر

نہین اقلیم الفت مین کوئی طومار ناز ایسا
کہ پشت چشم سی جسکے نہووی مہر عنوان پر

مجھی اب دیکھکر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت مین تری آتش برستی تھی گلستان پر

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوای تند ہی خاک شہیدان پر

نہ لڑ ناصح سی **غالب** کیا ہوا گر اوسنی شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہی گریبان پر

ہی بسکہ ہر ایک انکے اشارہ مین نشان اور
کرتی ہین محبت تو گزرتا ہی گمان اور

یارب وہ نہ سمجھی ہین نہ سمجھینگے مری بات
دی اور دل انکو جو نہ دی مجھکو زبان اور

ابرو سی ہی کیا اوس نگہ ناز کو پیوند
ہی تیر مقرر مگر اسکی ہی کمان اور

تم شہر مین ہو تو ہمین کیا غم جب اوٹھینگے
لی آئینگے بازار سی جا کر دل و جان اور

ہرچند سبکدست ہوی بت شکنی مین
ہم ہین تو ابھی راہ مین ہی سنگ گران اور

ہی خون جگر جوش مین دل کھولکی روتا
ہوتی جو کئی دیدۂ خونابہ فشان اور

مرتا ہون اس آواز پہ ہرچند سر اوڑ جای
جلاد کو لیکن وہ کہی جائین کہ ہان اور

لوگونکو ہی خورشید جہانتاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہون مین ایک داغ نہان اور

لیتا نہ اگر دل تمہین دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغان اور

پاتی نہین جب راہ تو چڑھ جاتی ہین نالی
رکتی ہی مری طبع تو ہوتی ہی روان اور

ہین اور بھی دنیا مین سخنور بہت اچھی
کہتی ہین کہ **غالب** کا ہی انداز بیان اور

صفائی حیرت آئینہ ہی سامان زنگ آخر
تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہی رنگ آخر

نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جام زمرد بھی مجھی داغ پلنگ آخر

[illegible] و [illegible] مشتاقان شناسای پراو بردو باری کارساز ابرو
[illegible] زبان کرشمه مقدسه هجویه بجویه ملی صاحبها افضل التجاب
[illegible] رسید و شاد و یک رسیده آن بیرین [illegible] و [illegible] آرزو مساعدت
[illegible] بسیار خوشتر ازان که میخواستم رنگای گرفت و شاد کامی
[illegible] گرد آور می مبدرفت و چون باحصای افراد این همایون صحیفه
[illegible] اشعار [illegible] شعار غزل و قصیده و قطعه و رباعی یکهزار و ششصد و نود و دو انم
[illegible] شنوا گوشان گوشی بر شاهراه شناخت فراوانی
[illegible] بیچاره ذرنی خرده بر قلت ابیات گرفت و چنانکه خود آن
[illegible] گار [illegible] بنجاریه پارسی نامه خویشتن در پردهٔ سازان گفتار خود [illegible]
[illegible] تا نباشد نیز غالب و چه غم گر بستاشعار من اندک

[illegible] یادگاری برای گران یادگاری با

[illegible] تاریخ الطبع [illegible] از نتایج طبع وکالائی جناب مستطاب نواب محمد ضیاء الدین خان بهادر [illegible]
[illegible] برادر [illegible] حضرت غالب اند و در فارسی نیّر و در اردو رخشان تخلص میکنند بها نیر رخشان
[illegible] جلال و فضل [illegible] حضرت غالب کا مطبع دیوان صلای فیض گوینگان ریخته ہے
[illegible] حسین [illegible] بیان ریخته ہی اور زبان ریخته ہے بنای ریخته استاذی نی ڈالی ہے
[illegible] قایم اساس [illegible] شعر میں او تراہی [illegible] ابیات [illegible] رساله نامی نشان ریخته ہے
[illegible] ایک اور دو [illegible] نیر رخشان بیان ریخته ہے قطعه تاریخ انطباع دیوان [illegible]
[illegible] بیان [illegible] علی ان [illegible] سلطان الذاکرین المتخلص [illegible] شاگرد حضرت غالب ایشان [illegible]
[illegible] فضل [illegible] وقت بہار گلستان ریخته کہتی ہیں شعر خوب [illegible]
[illegible] اور زبان [illegible] چھاپا دہون نی حضرت غالب کا [illegible] وه کلیات [illegible] نشان ریخته
غالب [illegible] اسد الله خان [illegible] واقعی وه شیر نیستان ریخته کہتی ہو [illegible] تاریخ انطباع
[illegible] سرکوکا [illegible]
[illegible] دیوان اردو [illegible] تخلص [illegible] نیّر [illegible]
[illegible] نشان [illegible]
[illegible]

کلامِ زندۂ زندہ خُدائے پائندہ

عبد العزیز خالد

(۱)

غمے ہست در دل کہ گفتن ندارد شنفتن ندارد، نہفتن ندارد

آج کل ہمارے جرائد و رسائل نے بالاتفاق یہ روش اپنا رکھی ہے۔ کہ وہ آیات واحادیث کا متن شائع کرنے کے بجائے صرف اس کے ترجمے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یوں وہ الفاظِ مُقدّس کے احترام کا اہتمام اور ان کے تقدُّس کی نگہبانی کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں پہلا سوال تو یہ اُٹھتا ہے کہ کیا ترجمے کی شکل میں آیت و حدیث ، آیت وحدیث نہیں رہتی؟ اس کی حُرمت کم ہو جاتی ہے؟ اس کی عظمت میں فرق آجاتا ہے؟ اگر ہم لاإلٰہَ إلّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ لکھنے کی بجائے یہ لکھیں کہ : اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ ہیں (سیِدِنا) محمد اللہ کے رسُول۔ تو کیا یہ الفاظ مُقدّس نہیں رہتے اور ان کی بے حُرمتی کے مؤاخذے سے ہم محفوظ ہو جاتے ہیں —— شترمرغ کی طرح آنکھیں مُوند کر؟

دوسرا اہم تر سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح ہم قُرآن و حدیث کو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے جُرمِ کبیر کے مرتکب نہیں ہوتے؟ انسان اپنی محبوب چیز کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور بار بار دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے آنکھوں میں جذب کر لینا اور دل میں سمو لینا چاہتا ہے مگر ہم اپنے اس بچگانہ رویّے سے، خدا اور رسول کے کلام سے، وحی کے الفاظ سے، صاحبِ وحی کے کلمات سے عامّۃُ النّاس کو مانوس کرنے کی بجائے ایک حجابِ درمیاں حائل کر دیتے ہیں۔ اور یوں خورشید کو ابر میں نہاں کر کے، زمین اور اہلِ زمین کو اس کے جلوے، اس کی تمازت، اس کے نُور سے براہِ راست فیض یاب ہونے سے محروم کرتے ہیں۔ اس طرح کیا ہم اس وعید کے مصداق نہیں ٹھہرتے کہ

وَقَالَ الرَّسُولُ : يَارَبِّ ! إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا ۲۵ : ۳۰

اور بولا پیمبر : خدایا ! مری قوم نے کر دیا ترک قُرآن کو ——

(رکھ دیا طاقِ نسیاں پہ اُس نے اِسے)

تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا ترجمہ اصل کا نِعْمَ الْبَدل ہو سکتا ہے؟ کیا ہمارا کج مج اندازِ بیان ، کلامُ اللہ کے ظاہری و باطنی، مجازی و حقیقی ، لامتناہی گونہ گوں نو بنو، تازہ بتازہ معانی کا احاطہ کر سکتا ہے؟ اس کے پرت اندر پرت، پہلو در پہلو ، تہ بہ تہ اسرار و رموز کو کماحقُّہٗ بیان کر سکتا ہے؟

کلامِ ربانی تو وہ ہے کہ ع تا اَبد بر دل رساند ہر لحظہ معنائے دگر

ع دارد او با ہر دلے رازے دگر

ترجمے کی کوتاہی ، نارسائی اور ناتمامی واضح کرنے کے لیے ہم صرف قرآن کی ایک آیت بلکہ اس آیت کا بھی محض ایک ٹکڑا پیش کرتے ہیں۔

روزے کی رُخصت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے :

فمَنْ كانَ مِنْكُمْ مَرِيْضاً او عليٰ سفرٍ فعِدَّةٌ مِّنْ ايَّامٍ أُخر ۔ وعلي الَّذين يُطِيْقُوْنَهُ فدْيَةٌ طعامُ مسْكِيْنٍ ۲ : ۱۸۴

يُطِيْقُوْنَهُ کے مفہوم میں اس قدر اختلاف ہے کہ ع بُوعلی اندر غبار ناقہ گُم — اہلِ ترجمہ و تفسیر کے اس میں تین باہم متباین و متخالف مسلک ہیں۔ تینوں مسلکوں کے مؤید اکابر اہلُ الرائے ہیں۔ جن کی آرا ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ تاکہ مسئلہ مُنقّح و منشرح ہو کر سامنے آسکے اور محض ترجمے پر انحصار کی کمزوری خاص و عام پر اَلَم نَشرح ہو سکے۔

(الف) پہلا مسلک : جو يُطِيْقُوْنَه کی ضمیرہٗ کا مرجع ،اَلصَّوم ﴿الصّیام﴾ کو سمجھتا ہے ۔

(ب) دوسرا مسلک: جو اضمارِ قبلُ الذکر کے بطور اس ضمیر کا مرجع "طعامُ مسْکِین "کو قرار دیتا ہے۔

(ج) تیسرا مسلک : جن کے نزدیک يُطِيْقُوْنَهُ سے پہلے "لا" محذوف ہے۔ یا اس کا مصدر اطاقۃ ہے ——— بابِ افعال ۔ جس کا ہمزہ سلبِ ماخذ کا کام کرتا ہے۔ مطلب عدمِ طاقت ——— رکھ سکیں جو کہ بمشکل روزہ

(الف)

(۱)۔ مولانا اُبوالاعلیٰ مودودی : اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔

(۲) مولانا فتح محمد جالندھری : اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے مُحتاج کو کھانا کھلادیں۔

(۳) مولانا فرمان علی : اور جنہیں روزہ رکھنے کی قُوت ہے (اور نہ رکھیں) تو ان پر اس کا بدلہ ایک محتاج کو کھانا کھلا دینا ہے۔

(۴) علامہ وحید الزّمان خان : اور جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں (پر وہ روزہ رکھنا نہیں چاہتے) وہ ایک مسکین کو کھانا کھلادیں۔

(۵) شیخ مصلح الدّین سعدی شیرازی : وبر آنانکہ توانائی دارند ۔ آں را فدیہ دادن است خوردنی درویشاں ۔

(٦) ملّا محمّد حسین واعظ کاشفی : توانند کہ روزہ دارند و خواہند کہ روزہ ندارند

(۷) شاہ ولی اللہ محدِّث دہلوی : ولازم است بر آنانکہ می توانند روزہ داشتن یعنی و نمی دارند ۔ فدیہ کہ عبارت از خوراکِ یک درویش است

(۸) شاہ عبدالعزیز محدِّث دہلوی : بر کسانیکہ طاقت روزہ دارند امّا بہ سبب عادتے نمی توانند کہ یکماہ کامل پے در پے روزہ گیرند۔

(۹) شاہ رفیع الدین محدّث دہلوی : اور اوپر ان لوگوں کے کہ طاقت رکھتے ہیں اس کی (اور روزہ نہیں رکھتے) بدلہ ہے کھانا ایک فقیر کا۔

(۱۰) شاہ عبدالقادر محدّث دہلوی: اور جن کو طاقت ہے۔ تو بدلا چاہیے ایک فقیر کا کھانا

(۱۱) شیخ الہند مولانا محمود الحسن : اور جن کو طاقت ہے روزے کی ان کے ذمے بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا۔

(۱۲) ۔ امام راغب اصفہانی (مُفردَاتُ القُرآن) : آیت کریمہ : "اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں۔" کے بظاہر معنی تو یہی ہیں کہ جو شخص روزے کی طاقت رکھتا ہو۔ اس پر فدیہ لازم ہے۔ خواہ روزہ رکھے یا نہ رکھے مگر اس امر پر اِجماع ہو چکا ہے کہ صرف روزہ نہ رکھنے کی صورت میں فدیہ لازم ہے۔

(۱۳) فیضی ﴿سواطعُ الالہام﴾ : اَلَّذِیْنَ ھُمْ مُسْتَطَاعُوا الصَّوم لِمَا ھُمْ اَصِحَاءُ وَمَا صَامُوا.

(١٤) اَبُو الْفَرج ابنُ الجوزي : وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ وَلا يَصُومُونَهٗ فِدْيَةٌ ﴿ثُمَّ نسخت﴾ وَرُوِيَ عَنِ عِكْرِمَة اَنَّهٗ قَالَ : نَزَلَتْ فِي الْحَامِلِ وَالْمُرضِعِ

(۱۵) مولانا اشرف علی تھانوی : (اور دوسری آیت جو بعد میں منسوخ ہو گئی یہ ہے کہ)
جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں ۔ ان کے ذمّے فدیہ ہے۔ کہ وہ ایک غریب کا کھانا کھلا دینا یا دے دینا ہے۔
اب یہ حکم منسوخ ہے۔ البتہ جو شخص بہت بُوڑھا ہو۔ یا ایسا بیمار ہو۔ کہ اب صحت کی توقع نہیں ایسے لوگوں کے لیے یہ حکم اب بھی ہے۔

(۱۶) مُفتی محمد شفیع : اور جن کو طاقت ہے روزے کی ۔ ان کے ذمّے بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا (دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہو گئی ہے یہ ہے کہ) جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہیں (اور پھر روزہ رکھنے کو دل نہ چاہے تو) ان کے ذمّے صرف روزے کا فدیہ یعنی بدلہ ہے۔ کہ وہ ایک غریب کا کھانا کھلا دینا یا دے دینا ہے۔

(۱۷) مولانا محمد ادریس کاندھلوی: اور جن کو طاقت ہے تو بدلا ایک فقیر کا کھانا۔
اور دوسری سہولت یہ ہے (جو بعد میں منسوخ ہو گئی) کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں مگر باوجود اس کے روزہ رکھنے کو دل نہ چاہے تو ان کے ذمّے اس کا فدیہ یعنی روزے کا بدلہ دینا ہے۔ اور وہ فدیہ ایک مسکین کی خوراک ہے۔

(۱۸) خواجہ حسن نظامی دہلوی: اور واجب ہے ان لوگوں پر جو اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ بدلہ دینا کھانا ایک مسکین کا۔
بلکہ جن میں روزے رکھنے کی طاقت بھی ہے۔ وہ بھی چاہیں تو ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دے دیں۔ (آیت فَمَنْ شَهِدَ نے فدیہ منسوخ کر دیا)

(۱۹) مولانا عبدالحق الحقانی (تفسیرِ حقّانی) : اور جن کو اس کی طاقت ہو۔ تو اس کے بدلے میں ایک محتاج کو کھانا دینا

چاہتیے۔

(۲۰) مُدارکُ التّنزیل : وعلی المستطیقِیْنَ للصّیام الّذین لاعذر لھُم ان افطرُوا

(۲۱) کشاف : وعلی المطیقینَ الصّیام الّذین لاعُذر بھم ان افطرُوا

(طاقت کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں۔ جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جا سکے۔ اور علی الّذین یُطیقُونَہٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں۔ جن کے لیے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ اس بنا پر یہ آیت ثابت ہے۔ منسوخ نہیں۔ (بحوالہ : تفسیر منسوخ القرآن)

(۲۲) امام الرّازی «التّفسیر الکبیر» : ان المراد من قوله المقیم الصحیح ـ فخیّرهُ الله تعالی اوّلاً بین هذین ثمّ نسخ ذلك واوجب الصّوم علیه مضیقاً معیناً انه نزلت فی حقّ الشّیخ الهرم

(۲۳) مولانا ثناء اللہ امرتسری : اور جو لوگ اس (روزے) کی طاقت رکھتے ہیں۔ ان پر ایک مسکین کا کھانا دینا واجب ہے۔

(۲۴) مولانا عبدالرّشید نُعمانی / سید عبدالدائم الجلالی (لُغات القرآن) : یُطیقُونَہٗ : وہ اس کی (یعنی روزہ) رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں

(۲۵) مُلّا احمد جیون (تفسیرات احمدیہ) : وعلی الّذین یُطیقُوْنَہٗ — اس میں دو معنوں کا احتمال ہے۔ ایک یہ ہے کہ یہاں معطوف یا شرط محذوف ہے۔ ای علی الذین یطیقُونَہٗ ولا یصُومُونَہٗ — ان لوگوں پر جو روزے کی طاقت رکھتے ہیں اور روزہ نہیں رکھتے۔ ایک مسکین کا کھانا ہے۔

یاعلی الّذین یُطیقُونَہٗ اِنْ لّمْ یصُومُوا : ان لوگوں پر جو روزے کی طاقت رکھتے ہیں اگر روزہ نہ رکھیں تو ایک مسکین کا کھانا بدلہ دینا ہے۔

ابتدائے اسلام میں جب ان پر روزہ فرض ہوا۔ تو وہ اس کے عادی نہ تھے۔ انہیں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے کا اختیار دیا گیا۔ لیکن روزہ نہ رکھنے کی صورت میں ایک مسکین کو کھانا کھلانا فرض کیا گیا۔

(۲۶) مولانا شبیر احمد عُثمانی : مطلب یہ ہے کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں مگر ابتدا میں چونکہ روزے کی بالکل عادت نہ تھی اس لیے ایک ماہ کامل پے در پے روزے رکھنا ان کو نہایت شاق تھا تو ان کے لیے یہ سہولت فرما دی گئی کہ اگرچہ تم کو کوئی عذر مثل مرض یا سفر کے پیش نہ ہو مگر صرف عادت نہ ہونے کے سبب روزہ تم کو دشوار ہے تو اب تم کو اختیار ہے چاہو روزہ رکھو چاہو روزے کا بدلہ دو ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلاؤ کیونکہ جب اس نے ایک دن کا کھانا دوسرے کو دے دیا تو گویا اپنے نفس کو ایک روز کے کھانے سے روک لیا اور فی الجملہ روزے کی مشابہت ہو گئی۔ پھر جب وہ لوگ روزے کے عادی ہو گئے تو یہ اجازت باقی نہ رہی جس کا بیان اس سے اگلی آیت میں آتا ہے۔ اور جو لوگ اب بھی یہ کہتے ہیں کہ جس کا جی چاہے روزہ رمضان میں رکھ لے اور جس کا جی چاہے

فدیے پر قناعت کرلے خاص روزہ ہی ضرور رکھے یہ حکم نہیں وہ یا جاہل ہیں یا بے دین ۔

(۲۷) سید شمیم رجز (آبِ رواں) :

نہ رکھے جو روزہ کوئی بے سبب — یہ ہے اس کے بارے میں تاکید رب

کہ روزہ نہ رکھنے کی بھگتے سزا — بھرے پیٹ وہ ایک محتاج کا

(ب)

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی : اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکیں۔ ان پر ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ (کچھ عرصے کے بعد یہ فدیے کی اجازت منسوخ ہو گئی) (وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے۔ کہ شروع شروع میں جب روزوں کا حکم نازل ہوا۔ تو چونکہ اہل عرب اس سخت عبادت کے عادی نہیں تھے۔ اس وجہ سے ان کی آسانی کے لیے یہ گنجائش رکھی گئی۔ کہ جو شخص روزہ رکھنے کی قدرت کے باوجود روزہ نہ رکھنا چاہے وہ ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلادے۔ بعد میں یہ اجازت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن یہ تاویل کسی طرح بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ اول تو روزے کی فرضیت کیا ہوئی جب اس بات کی کھلی اجازت موجود تھی کہ کوئی شخص چاہے تو روزہ رکھے نہ چاہے تو نہ رکھے ۔ اس کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلادے؟ اگر روزے کے ابتدائی حکم کی نوعیت یہ تھی تو كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کا ٹکڑا بالکل غیر ضروری سا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اس کی فرضیت بالکل بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ دوسری یہ کہ یہ کس قدر عجیب و غریب بات ہے۔ کہ ایک طرف تو مریض اور مسافر دونوں کے لیے دوسرے دنوں میں اپنے قضا کیے ہوئے روزوں کی تعداد روزے رکھ کر پوری کرنے کا حکم ہو اور دوسری طرف یہ آزادی ہو۔ کہ جو شخص چاہے روزے رکھے اور جو شخص چاہے مقدرت کے باوجود نہ رکھے۔ صرف ایک مسکین کو کھانا کھلادے)

(۲) مولوی عاشق علی میرٹھی : اور لوگوں پر جن کو طاقت ہے فدیہ ہے یعنی ایک محتاج کو کھانا کھلانا

(۳) مولانا ثناءاللہ پانی پتی (تفسیر مظہری) : اور ان لوگوں پر جن کو طاقت ہے۔ فدیہ ہے ۔

(۴) ڈپٹی نذیر احمد دہلوی : اور جن (بیماروں اور مسافروں) کو کھانا دینے کا مقدور ہے۔ ان پر (ایک روزے کا) بدلہ ایک محتاج کو کھانا کھلا دینا ہے۔

(۵) مولانا احمد علی لاہوری : اور ان پر جو اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا۔

فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ مبتدا ہے۔ اور عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ خبرِ مقدم ہے ۔طعامُ مسکینٍ فدیے سے بدل ہے۔ يُطِيْقُوْنَهٗ میں ضمیر منصوب طَعامُ مسکینٍ کی طرف راجع ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے بھی بس یہی معنی لکھے ہیں۔ اور پہلے لوگوں سے بھی ان کی طرف اشارہ موجود ہے۔ (شاہ صاحب کا ترجمہ جو (الف) میں نقل ہو چکا ہے یہ ہے : اور جن کو طاقت ہے ۔ تو بدلا چاہیے ایک فقیر کا کھانا۔

شیخ الہند نے طاقت کے ابہام کو یہ لکھ کر دُور کر دیا ہے: اور جن کو طاقت ہے روزے کی— شاہ صاحب مُوضحِ

القرآن میں توضیحاً لکھتے ہیں: اوّل حکم یہی تھا کہ مریض و مسافر چاہیں تو پھر قضا کر لیں۔ اور جن کو طاقت ہے یعنی بے عُذر ہیں۔ وہ چاہیں کہ پھر قضا کریں۔ تو بالفعل روزے کے بدلے ایک فقیر کو کھلائیں۔ پھر اس کے بعد جو آیت اتری ۔ اس میں فقط مریض و مسافر کو رخصت ملی قضا کی اور کسی کو نہیں۔

"بے عُذر ہیں۔" سے معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ یعنی شاہ صاحب کا طاقت سے مطلب روزے کی طاقت ہے نہ کہ ادائے فدیہ کی۔ مُفسّر لاہوری کو بداحتاً تسامح ہوا۔ اگر اشارہ شاہ ولیُ اللہ کی طرف ہے تو ترجمہ تو انہوں نے بھی وہی کیا ہے (جیساکہ الف میں آ چکا) جو شاہ عبدالقادر کا ہے۔ مگر تفسیری حاشیے میں البتہ انہوں نے یہ لکھا ہے: مترجم گوید شاید کہ معنی آیت چناں باشد کہ واجب است بر آنانکہ میتوانند داد فدیہ را دادن ۰۰۰۰۰۰ وشاید کہ معنیِ آیت چنیں باشد واجب است بر آنانکہ میتوانند قضا کردن یعنی و قضانہ کروند ۰۰۰۰ وَاللہُ اَعلَم ۱۲ ۔

البتہ الفوز الکبیر میں ان کی یہ عبارت ملتی ہے۔ جو مفسّر لاہوری کی تائید کرتی ہے:

یُطِیقُونَہٗ میں ہ کی ضمیر طعام مسکین کی طرف گئی ہے۔ فدیہ کا مقام چونکہ نحواً مقدم ہے۔ یعنی مبتدا ہے۔ اس لیے اس کی ضمیر اس کے ذکر سے پہلے آسکتی ہے (اضمار قبل الذکر) ——— فدیہ طعامِ مسکین کا قائم مقام ہے۔ اور وہ مذکور ہے۔ اس لیے فدیے کی طرف بھی مذکر کی ضمیر پھر سکتی ہے۔ (اس کے پیش نظر آیت کا ترجمہ یہ ہوگا: کہ ان لوگوں پر جو فدیۂ رمضان کی طاقت رکھتے ہوں۔ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیۂ رمضان باوجود بعد میں روزہ رکھنے کے دینا واجب ہے ——— مرزا بشیرالدین محمود: تفسیر صغیر)

(٦) ۔ مولانا سیماب اکبر آبادی (وحی منظوم):

اور (معذورین میں پھر) استطاعت جن کو ہو
ایک روزے کے عوض کھانا دیں اک محتاج کو۔

(٧) ۔ اثر زبیری لکھنوی (سحر البیان):

جو ہیں معذور، تو ان سب پہ واجب ایک فدیہ ہے
بالفاظِ دگر، مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔

(٨)۔ مولانا شبیر احمد عثمانی: بعض اکابر نے طعام مسکین سے صدقۃ الفطر بھی مراد لیا ہے۔ معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں وہ ایک مسکین کے کھانے کی مقدار اس کو دے دیں ——— تو اب یہ آیت منسوخ نہ ہوگی۔

(٩) ۔ ایم ۔ ایم ۔ پکتھال

And for those who can afford it there is a ransom; the feeding of a man in need.

٩ ۔ علامہ محمد اسد

And in such cases (illness or journey) it is incumbent upon those who can afford it to make sacrifice by feeding a needy person.

(ج)

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد: اور جو لوگ ایسے ہوں ۔ کہ ان کے لیے روزہ رکھنا ناقابلِ برداشت ہو (جیسے ایک نہایت بُوڑھا آدمی کہ نہ تو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے اور نہ یہ توقع رکھتا ہے۔ کہ آگے چل کر قضا کر سکے گا) تو اس کے لیے روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔

(۲) پیر صلاح الدین: اور جو لوگ روزہ رکھنے میں ناقابل برداشت مشقت محسوس کریں ہر ایک روزے کے عوض ایک مسکین کو کھانا دیں۔

(۳) پیر محمد کرم شاہ (ضیاء القرآن): اور جو لوگ اسے بہت مشکل سے ادا کر سکیں۔ ان کے ذمّے فدیہ ہے۔ ایک مسکین کا کھانا۔

(اس آیت میں عُلماء تفسیر کا اختلاف ہے۔ اکثر کی رائے تو یہ ہے کہ ابتدا میں جب روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا۔ تو لوگوں کی آسانی کے پیشِ نظر یہ گنجائش رکھی گئی۔ کہ اگر کوئی روزہ نہ رکھے تو وہ فدیہ ادا کر دے۔ بعد میں جب لوگ روزے کی لذّت و برکت سے آشنا ہو گئے۔ تو یہ رعایت واپس لے لی گئی اور عام حکم دے دیا گیا ۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ : ۱۸۵

(دونوں آیتوں کے نزول میں کتنا وقفہ، کتنا فاصلہ ہے؟ کہیں مذکور نہیں۔ جس سے اس استدلال کا محاکمہ ہو سکے! ع ع خ ۔)

نفاذِ شریعت میں جس تدریج کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ قول اس کے عین مطابق ہے۔ لیکن بعض علماء کی رائے یہ ہے ۔ کہ یُطِیْقُوْنَ کا معنی ہے۔ کہ جو لوگ بڑی ہی مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں۔ وہ فدیہ ادا کر دیں۔ مثلاً بُوڑھا، دائم المریض (؟ ع ع خ) حاملہ عورت ، دودھ پلانے والی۔ ان کے لیے یہ رعایت دی گئی ہے ۔ اور یہ رعایت آج بھی بحال ہے (کس آیت و حدیث کی رُو سے ؟ ع ۔ ع ۔ خ)

(۴) علّامہ وحید الزّمان خان : اور جن کو روزے کی طاقت ہی نہیں ہے۔ تو وہ ہر روزے کے بدلے ایک محتاج کو کھانا دیں۔ اور بعضوں نے کہا وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کے معنے یہ ہیں: جو لوگ روزے کی طاقت نہیں رکھتے گو مقیم اور تندرست ہیں مثلاً ضعیف بوڑھے لوگ ۔ تو وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اس صورت میں یہ آیت منسوخ نہ ہوگی۔

(۵) فیضی (سواطعُ الالہام) : والمراد ملاءٌ عسرَ لَهُمُ الصِيام ۔ أو لُوا الهَرَمِ وَ رَوْدُهُ مَعَ "لا"

(۶) ابن کثیر : وَعَلَى الَّذِيْنَ يتجشمونه ۔ قَالَ ابْنُ عبّاسٍ : ليست منسوخة هو الشيخ الكبير والمرأة الكبيرة لا يستطيعانِ اَنْ يصوما فيطعمان مكان كل يوم مسكينا ۔

(۷) مرزا ابوالفضل علی شیرازی (غریب القرآن فی لغاتِ الفرقان) : اور جن کو اس میں مشقت ہو۔ وہ مسکین کو کھلا کر فدیہ دیں۔

اطاق : کسی کام کے کرنے میں سخت مشقت اٹھانا

یہ مختلف قراءتیں بھی اسی معنی کی مؤید ہیں:

- یُطَوَّقُونَہٗ یُجَشَّمُونَہٗ ، یُکَلَّفُونَہٗ (تاج)

- یَطَّوَّقُونَہٗ (= یَتَطَوَّقُونَہٗ)

- یُطَیَّقُونَہٗ (= یُطَیْوَقُونَہٗ)

- یَطَّیَّقُونَہٗ (= یَتَطَیْوَقُونَہٗ) — (تاج — قاموس)

(۸) چوہدری غلام احمد پرویز : لیکن اگر مشکل یہ ہے۔ کہ ایک شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ حالتِ سفر میں ۔ لیکن اس کی کیفیت یہ ہے۔ کہ وہ روزے کو بہ مشقت نباہ سکتا ہے (تو اس کے لیے دوسرے اوقات میں روزے پورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) اسے چاہیئے کہ روزے کے عوض کسی حاجت مند کی روٹی کا انتظام کر دے۔

اس آیت کے عام طور پر یہ معنی کیے جاتے ہیں۔ کہ جن لوگوں کو (روزہ رکھنے یا فدیہ دینے کی) طاقت ہو۔ وہ روزہ نہ رکھیں۔ بلکہ اس کا فدیہ دیں۔ یہ معنی بالبداہت غلط ہیں۔ اگر وہ لوگ جنہیں روزہ رکھنے کی طاقت ہے۔ یا جو فدیہ دے سکتے ہیں۔ روزے سے مُستثنیٰ ہیں تو پھر روزہ کن پر فرض ہے؟ کیا انہی پر جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ یا اتنے غریب ہوں کہ فدیہ بھی نہ دے سکیں۔؟

اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ جو لوگ بہ مشقت روزہ رکھ سکیں۔ وہ روزہ نہ رکھیں۔ بلکہ اس کے بدلے میں فدیہ دیں۔ اس آیت کی تفسیر میں صاحب المنار (مُفتی سید محمد عبدہ — خ) نے لکھا ہے۔ کہ عرب اَطاقَ الشَّیٔ اس وقت کہتے ہیں۔ جب قوت اتنی کم ہو ۔ کہ اس کی وجہ سے کسی کام کے کرنے میں شدید مشقت کا متحمل ہونا پڑے (صاحب تاج العروس، صاحب محیط، راغب اور اَقْرب الموارد اس پر متفق ہیں۔ کہ الطّاقۃ اس قوت کا نام ہے۔ جس سے کوئی کام بہ مشقت کیا جا سکے۔ یعنی وہ کام اس پر اتنا شاق گزرے۔ جیسے کس نے اس کی گردن میں طوق ڈال دیا ہو)

الذین یطیقونہ سے مراد ضعیف بوڑھے اور اپاہج جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ وہ کاریگر یا مزدور جن کی ہمیشہ کی معاش مشقت انگیز کاموں میں ہو (جن کی روزی خدا نے مشقت کے کاموں میں رکھ دی ہے)۔ نیز وہ مجرم جنہیں مشقت کے کاموں پر لگایا جائے۔ (مُجرموں اور مزدوروں کے علاوہ کیا ایسے مرد و زن نہیں ہو سکتے جن کا کام جانکاہ ہو۔ جن کی معاش کارِ شاقہ سے وابستہ ہو؟ ع ۔ ع ۔ خ) ان لوگوں پر جب روزہ رکھنا شاق ہو۔ اور وہ فدیہ دے سکیں۔ تو وہ اس حکم میں داخل ہیں۔ (اگر فدیہ نہ دے سکیں تو؟ تو بُخاری (کتابُ الصَّوم حدیث ۱۵۷ ، ۱۵۸) کے مصداق وہ اس کے مکلّف نہ ہوں گے ۔ جس میں ماخوذ سائل نے کہا تھا: یارسوؒل اللہ ! مجھ سے کون ہے محتاج تر ؟ یا ظِہار کے کفّارے سے (المجادلہ ۵۸) خولہ بنت ثعلبہ کی سفارش پر اس کے شوہر اوس بن الصامت الانصاری کی معذوری کو قبول کرتے ہوئے حضورؐ کا اسے اٹھا ساٹھ مسکینوں کا سامان خوراک اپنے پاس سے عطا کرنا ۔ ع ۔ ع ۔ خ)

(۹) امام الرّاغب الاصفهانی : ﴿المفرداتُ فِي غريب القرآن﴾ ورُوِيَ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ أي يُحَمَّلُونَ أَنْ يَتَطَوَّقُوا . وَالطاقَةُ اِسْمٌ لِمقدار مايمكِنُ لِلانسان أَنْ يفعلهُ بِمشقّةٍ وذلك تَشْبِيْهٌ بِالطّوقِ اْلمُحِيْطِ بِالشّيْ‌ءِ فقوله تعالىٰ : وَلاَ تُحَمِّلْنَا مالاطاقة لَنا بِهٖ : ۲:۲۸۶ أي مايَصْعُبُ عَلَيْنا مُزاولَتُهٗ - ولَيْس معناهُ لاتُحمّلنا مالاَقُدْرة لنابه وذلك لِانّهٗ تعالىٰ قد يُحَمِّلُ الْانسانَ مايَصْعُبُ عَلَيْهِ سبيلُهٗ .

(۱۰) اَبُوالْفرج ابن الجوزي . وَقَرَأَ اَبُوبَكْرٍ الصِّدِّيْقُ وَابْنُ عَبّاسٍ : وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطَوَّقُوْنَهٗ —— وَقَالَ ابْنُ عَبّاسٍ : هُوَ الشَّيْخُ وَالشَّيخةُ

(۱۱) لُغاتُ القُرآن (نُعمانی / الجلالی) ۔ اکثر اہلِ تفسیر نے اس جگہ حرف نفی محذوف قرار دیا ہے۔ مراد ہے لایُطِیقُونَہٗ ۔ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے ۔ شیخ ابن جریر نے لکھا ہے کہ یُطِیقُوْنَ کا مفہوم وہی ہے جو اطاق فلانٌ کا ہے ۔ اطاق میں باب افعال کی ہمزہ سلب ماخذ کے لیے ہے۔ اس لیے اَطاقَ فلانٌ کا معنی ہوتا ہے۔ فلاں شخص میں طاقت نہیں ہے۔ اس صورت میں یُطِیقُونَہٗ کا ترجمہ ہوگا۔ وہ جو روزے کی طاقت نہیں رکھتے خواہ پیری کی وجہ سے یا بیماری کی وجہ سے (یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے ! خ) اس تقدیر پر حرفِ نفی محذوف قرار دینے کی ضرورت نہیں (رُوح) (اَلْوُسْع کا لفظ اس قدرت کا نام ہے۔ جو سہولت کے ساتھ ہو اور طاقۃ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے۔ جو شدّت اور مشقّت کے ساتھ ہو۔ (لہٰذا آیت زیر نظر کے) معنی یہ ہوں گے: اور ان لوگوں پر جو شدّت اور مشقّت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔ تفسیر رُوح المعانی)

ایک جماعتِ قُدما کا خیال ہے کہ ہمزہ سلب کے لیے نہیں ہے۔ مگر یُطِیقُونَہٗ کے معنی بالفعل طاقت رکھنے کے نہیں ہیں۔ بلکہ حال ماضی کی حکایت ہے۔ یعنی جو لوگ گزشتہ جوانی کے زمانے میں طاقت رکھتے تھے۔ مراد یہ کہ اب بڑھاپے کی وجہ سے طاقت نہیں رکھتے۔ تو ان کے لیے ترکِ صوم جائز ہے۔ اور ادائے فدیہ واجب۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت سلمہؓ بن اَکْوَع قائل ہیں۔ کہ شروع اسلام میں لوگ روزے کے خوگر نہیں تھے۔ ان کے لیے روزہ رکھنا سخت دشوار تھا۔ اس لیے خیار دے دیا گیا۔ کہ ہو سکے تو روزہ رکھیں ورنہ فدیہ دے دیں۔ لیکن آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نے اس خیار کو منسوخ کر دیا۔ اور روزہ رکھنا لازم ہوگیا۔ قتادہ کا قول ہے۔ کہ آیت یُطِیقُونَہٗ کے مصداق وہ بوڑھے لوگ تھے۔ جو روزہ تو رکھ سکتے تھے۔ مگر دشواری کے ساتھ۔ ان کو صوم و فدیہ میں خیار تھا۔ لیکن آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُم ۔ اَلخ سے ایسے طاقتور بوڑھوں کا اختیار بھی ختم کر دیا گیا۔

حَسن بصریؒ نے فرمایا: آیت مذکورہ کا مصداق وہ بیمار تھے۔ جو کہنے کو تو بیمار ہوتے تھے۔ مگر ان میں روزہ رکھنے کی طاقت ہوتی تھی۔ ان کو ترکِ صوم کی اجازت تھی۔ مگر یہ اجازت بھی آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُم سے منسوخ کر دی گئی۔ (معالم)

(۱۲) مولانا احمد رضا خاں بریلوی : اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں ایک مسکین کا کھانا۔ (جس بُوڑھے مرد یا عورت کو پیرانہ سالی کے ضعف سے روزہ رکھنے کی قدرت نہ رہے۔ اور آیندہ قوت حاصل ہونے کی امید بھی نہ ہو۔ اس کو

شیخِ فانی کہتے ہیں۔ اس کے لیے جائز ہے کہ اِفطار کرے اور ہر روزے کے بدلے فدیہ دے)

(۱۳) مفتی عزیز احمد قادری (تیسیر القرآن) : اور ایسے بوڑھے جنہیں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو۔ اور نہ آئندہ طاقت کی امید ہو۔ تو وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو دونوں وقت کا کھانا دیں۔

(۱۴) مولانا عبدالماجد دریابادی : اور جو لوگ اسے مشکل سے برداشت کر سکیں۔ ان کے ذمّے فدیہ ہے کہ وہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔

(یُطِیقُونَہٗ میں ضمیر صوم کی طرف ہے یعنی روزہ رکھنے کو رکھ توڈالیں۔ لیکن روزے کا تحمّل انہیں مشکل ہی سے ہو سکے۔ مَشقت بہت زاید اٹھانی پڑے۔ مثلاً زیادہ بُوڑھے اشخاص یا حامِلہ اور مُرضعہ عورتیں۔ طاقۃ اور وسعۃ ان دو لفظوں میں اہلِ لغت نے فرق کیا ہے۔ وسعت تو گویا امکان کے مترادف ہے۔

اور طاقت میں یہ مفہوم شامل ہے۔ کہ وہ کام کرنے والے کی قدرت میں تو ہو لیکن اس کے کرنے میں مشقت بہت زاید پڑے۔ کام تو ہو جائے لیکن بہ مشکل ہو۔ ھُوَ اسمٌ لِمِقدارِ مایمکنُ اَنْ یَّفْعَلَہٗ بِمَشَقَّۃٍ مِنْہُ (تاج)۔ اَلطَّاقَۃُ اسمٌ لِمِقدارِ مایمکنُ لِلْاِنْسانِ اَنْ یَّفْعَلَہٗ بِمَشَقَّۃٍ (راغب) اَلْوَسْعُ فَوقَ الطَّاقَۃِ۔ فَالْوَسْعُ اِسْمٌ لِمَنْ کَانَ قَادِراً عَلَی الشَّیءِ عَلٰی وَجْہِ السُّھُولَۃِ وَاَمَّا الطَّاقَۃُ فَھُوَ اِسْمٌ لِمَنْ کَانَ قَادِراً عَلَی الشَّیءِ مَعَ الشِّدَّۃِ وَالْمَشَقَّۃِ (کبیر)۔ اور یہاں طاقۃ کا مادہ استعمال ہوا ہے۔ جس کے کُھلے ہُوئے معنی یہ ہیں "کہ وہ لوگ جو تکلیف کے ساتھ روزہ رکھ سکیں" مثلاً بُوڑھے اور بُوڑھیاں۔ حاملہ اور مُرضِعہ۔ اَی یَصُومُونَہٗ جُھْدَھُمْ وَطَاقَتَھُمْ وَمَبْلَغَ وُسْعِھِمْ (کشاف) اَی اَلَّذِیْنَ یَقْدِرُوْنَ عَلَی الصَّوْمِ مَعَ الشِّدَّۃِ وَالْمَشَقَّۃِ (کبیر)۔ فَیَصِیْرُ الْمعنی وَعَلَی الَّذِیْنَ یَصُومُونَہٗ مَعَ الشِّدَّۃِ وَالْمَشَقَّۃِ فیشمل نَحْوَ الْحُبلٰی وَالْمُرْضِعِ (رُوح) یُکَلَّفُونَہٗ وَیَتَکَلَّفُونَہٗ عَلٰی جُھْدٍ مِنْھُمْ وَعُسْرٍ وَھُمُ الشُّیُوخُ وَالْعَجَائِزُ (کشاف) اور ابن عبّاس کی قرأت میں تو یُطَوَّقُونَہٗ ہے۔ جو صاف مرادف یُکَلَّفُونَہٗ کا ہے۔ ومشھور قراءَۃِ ابن عَبَّاسٍ یُطَوَّقُونَہٗ بِفتحِ الطَّاءِ وَتشدیدِ الْواو بمعنی یُکَلَّفُونَہٗ (قُرطبی) تابعین بلکہ صحابیوں کی متعدد روایتوں میں اس سے مراد بُوڑھے اور بُوڑھیاں ہی لی گئی ہیں۔ اور متعدد مُفسِّروں نے بھی یہی سمجھا ہے اور آیت کے منسوخ قرار دینے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔

ھُوَالشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ ﴿ابن جریر عن علی﴾ — نَزَلَتْ ھٰذِہِ الاٰیۃُ فِیْ حَقِّ الشَّیْخِ الْھَرِمِ ﴿کبیر﴾ قالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَیْسَتْ مَنْسُوخَۃً ھُوَ الشَّیْخُ الْکَبِیْرُ وَالْمَرْاَۃُ الْکَبِیْرَۃُ لا یَسْتَطِیعانِ اَنْ یَّصُوما ﴿ابن کثیر۔ عن عطاء﴾۔ ففسّر ابنُ عبّاسٍ اِنْ کَانَ الاِسْنَادُ عَنْہُ صَحِیحًا یُطِیْقُونَہٗ یُطِیْقُونَہٗ وَ یَتَکَلَّفُونَہٗ (قرطبی) رواہُ ابو داوٗدُ عَنِ ابْنِ عبّاسٍ : وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُونَہٗ قال اُثْبِتَ لِلْحُبلٰی وَالْمَرَاضِعِ ﴿قُرطُبِی﴾ وخرجَ الدّارَ قُطنِی عَنْہُ اَیضاً : قالَ رُخِّصَ الشَّیْخُ الکبیرُ اَنْ یُّفْطِرَ وَیُطْعِمَ عَنْ کُلِّ یومٍ مِسکینًا ولا قضاءَ عَلَیْہِ۔ ھٰذا اَسْنادٌ صحیحٌ ﴿قُرطُبِی﴾ وَرُوِیَ عَنْہُ اَیضاً قالَ : وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعامٍ لیست بِمَنْسُوخَۃٍ ھُوَالشَّیْخُ الْکَبِیْرُ وَالْمَرْءَۃُ الْکَبِیْرَۃُ لایستطیعانِ اَنْ یَّصُوما فَیُطْعِمانِ مکانَ کُلِّ یومٍ مِسْکِینًا وَھٰذا صَحِیح ﴿قُرطُبِی﴾ وَحکم ھٰؤلاءِ الْاِفطار وَالْفِدیَۃُ وَھُوَ علیٰ ھٰذَا الْوَجْہِ ثابِتٌ غَیْرَ مَنْسُوخَۃٍ ﴿کشاف﴾۔ فقد ثبتَ بِالاسانید الصّحاحِ عَنِ ابنِ عَبّاسٍ انَّ الاٰیَۃَ لَیْسَتْ مَنْسُوخَۃً

حقِّ مَنْ ذُكِرَ

(۱۵) پیر فضل شاہ (تفسیر فاضلی) : اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو۔ وہ فدیہ دیں مسکین کا طعام۔

(۱۶) م ۔ محمد علی لاہوری : اور جو اس میں مشقت پاتے ہوں۔ وہ ایک مسکین کا فدیہ دیں۔

يُطَيِّقُوْنَهٗ کے معنی يَتَجَشَّمُوْنَهٗ عبداللہ سے مَروی ہیں۔ یعنی تکلیف سے روزہ رکھ سکتے ہوں)۔

(۱۷) مرزا غلام احمد : جو طاقت نہ رکھتے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باب افعال کی ایک خاصیت ہے کہ وہ سلب کے معنی دیتا ہے : اس آیت کے معنی یہ ہوں گے : وہ لوگ جن کی طاقت کمزور ہو گئی ہے۔ یعنی قریباً ضائع ہو گئی ہے۔ وہ اگر روزہ نہ رکھیں۔ (اگر ان کو فدیہ دینے کی طاقت ہو تو بیماری کے بہانے سے روزہ نہ چھوڑیں بلکہ سلب طاقت کی بنا پر روزہ چھوڑیں) تو ایک مسکین کا کھانا ان دنوں میں دے دیا کریں ۔ (تفسیر صغیر ——— مرزا بشیر الدین محمود)

(۱۸) مرزا بشیر الدین محمود : اور ان لوگوں پر جو اس کی (یعنی روزہ) کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ (بطور فدیہ) ایک مسکین کا کھانا دینا بشرطِ استطاعت واجب ہے۔

(۱۹) مولانا عبدالحق عباس (جالندھری) : اور ان لوگوں پر جن کو اس میں نہایت مشقت ہوتی ہے۔ فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا دینا۔

(۲۰) عماد الدین حسین اصفہانی ——— عماد زاد، : آنکہ روزہ برای آنہا سخت دشوار و مشکل است مانند زنانِ باردار و شِیر دہندہ یا پیران سالخوردہ یا مبتلا بمرض ممتد ۔ آنہا باید بجای ہر یک روزہ بشرط توانائی فدا بدہند یا گرسنہ ای را سیر گردانند ۔

(۲۱) سید محمد حسین طباطبائی (تفسیر المیزان) معنای اطاقہ (مصدر یطیقون) چنانکہ بعض گفتہ اند ۔ صرف کردن تمام طاقت و ہمّت در کار و لازمہ اش این است کہ کار باز حمت و مشقّت انجام گیرد ۔ بنابر یں والَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ یعنی ، کسانیکہ روزہ برایشاں خیلی سخت است بجای روزہ گرفتن بینوائی را باغذای متوسّطی باندازہ ای کہ معمولاً شخص گرسنہ بآں سیر می شود ۔ اطعام کنند (ترجمہ تقی مصباح یزدی)

(۲۲) الفیض الکاشانی (تفسیر الصّافی) : فالَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَ الصِّيامَ يعني يكون الصيام بقدر طاقتهم ويكونُوْنَ مَعهُ عَلىٰ مشقَّةٍ وَعَلىٰ عُسْرٍ لم يكلفهم اللهُ علىٰ سبيلِ الحَتْم كَالشَّيخ وَالشَّيْخَةِ والحاملِ المقرّب والمُرضعة القليلةُ اللَّبن وَنحوها — في الكافي والعياشي عن الباقر في قوله تعالىٰ ——— وَعَلَى الَّذِين يُطِيقُوْنَهٗ ——— قَالَ : اَلشَّيخُ الكبير وَالَّذى ياخُذُهُ الْعِطاش

(۲۳) ابو جعفر مُحمَّد بن الحسن الطُّوسی (التِّبيان) : يُقالُ طاق يطوق طوقاً وطاقةً وَهِي الْقُوَّةُ وَأطاقة إطاقة ايضاً اذا قوي عليه وطوقه تطويقًا اَلْبَسَهُ الطَّوقُ قال الْحسَنُ وَاكثرُ اهلُ التَّاويل : اِنَّ هٰذا الْحكمُ كَانَ في الْمراضِع وَالْحوامِل وَالشَّيخِ الْكبيرِ فنسخ مِن الآيةِ الْمَراضِع وَالْحوامِل وَبَقِي الشَّيْخ الكبير۔

وقال ابو عبدالله : ذلك في الشَّيخ الكبير۔

(۲٤) سيد عبدالله شبّر : هُمْ الّذين يكونُ الصّيام بقدر طاقتهم ويكونُون معهُ علىٰ مشقّةٍ وَعُسر خيّرٌ هُمْ بينَ الفِدْيةِ وبينَ الصّوم ان يكلف الاّ بها دون الطّاقة ،

(۲٥) امام الفخر الرّازي (التفسير الكبير) : انّ معناه وعلى الذين يجشمونه ويكلّفونَهٗ

(۲٦) آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی (تفسیر نمونہ) : اور جو لوگ یہ کام انجام دینے کی طاقت نہیں رکھتے مثلاً دائمی مریض اور بوڑھے مرد و عورتیں ۔ ضروری ہے کہ وہ کفارہ ادا کریں۔ جنہیں روزہ رکھنے کے لیے انتہائی قوت اور توانائی خرچ کرنا پڑے اور روزہ رکھنے میں انہیں سخت زحمت اٹھانا پڑے۔ جیسے کہ بڑے بوڑھے اور ناقابل علاج بیمار ۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے ۔ کہ یُطِیقُونَہٗ کا معنی ہے کہ جو گزشتہ زمانے میں قوت و توانائی رکھتے تھے ــ کانُوا یُطِیقُونَہٗ ـــــــ اور اب طاقت نہیں رکھتے ۔

ـــــ بہر حال مندرجہ بالا حکم منسوخ نہیں ہوا۔ اور آج بھی پوری طاقت سے باقی ہے۔ اور جو یہ بعض کہتے ہیں کہ پہلے روزہ واجب تخییری تھا۔ اور لوگوں کو اختیار دیا گیا تھا۔ کہ وہ روزہ رکھیں یا فدیہ ادا کریں۔ آیت میں موجودہ قرائن اس کی تائید نہیں کرتے۔ (ترجمہ : سیّد صفدر حسین نجفی)

(۲۷) تفسیر منسوخ القرآن (رحمۃ اللہ طارق) : جن سے روزہ رکھنے کی طاقت سلب ہو گئی ہے وہی قانون فدیہ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ جیسے دائم المریض (؟ خ) شیخ فانی ، بچّہ اور قطب شمالی کے باشندے جہاں تین تین ماہ کا ایک دن اور اتنے ہی عرصے کی ایک رات ہوتی ہے۔ (اور اب جو خلا کو کلا بنانے کی تجویزیں ہیں۔ اور حضرت انسان اپنے مسکنِ خاک کو چھوڑ کر دوسرے سیاروں پر بود و باش کے منصوبے باندھ رہے ہیں؟ ع ـ ع ـ خ)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری لکھتے ہیں : آیہ وَعَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ مریضوں اور مسافروں کے احکام بیان کرتی ہے۔ یعنی اگر یہ لوگ روزہ رکھنا چاہیں اور جو لوگ ایسے ہوں کہ ان کے لیے روزہ ناقابل برداشت ہو۔ تو وہ بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

حضرت ابن عبّاس کی تفسیر و تاویل سے دنیا واقف ہے۔ آپ کی طرف سے دو تہائی جتنا قرآن پاک منسوخ بتلایا جاتا ہے (اس لیے کہا گیا ہے: ابن عبّاس سے منسوب و مروی روایتیں ضعف ، اضطراب اور شاذ ہونے کی بنا پر مسترد کر دینے کے لائق ہیں) لیکن بایں حرص شدید آپ بھی زیرِ بحث آیت کو محکم ہی تسلیم کرتے ہیں۔

(۲۸) ملا احمد جیون امیٹھوی (اَلتفسیرات الاحمدیہ فی بیانِ الآیاتِ الشرعیّۃ) : دوسرا معنی یہ ہے ۔ کہ یہاں لا محذوف ہے اور حذف لا اکثر فصحاء کے کلام میں ہوتا رہتا ہے۔ کما فی قولہٖ تعالیٰ : یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوا ۴:۱۷٦ اَی اَن لَّا تَضِلُّوا ـــ اسی طرح آیت زیرِ بحث میں لا محذوف ہے اَی عَلَى الَّذِیْنَ لَا یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ ۔ یعنی جو لوگ روزے کی طاقت نہیں رکھتے۔

ان کے ذمّے ایک مسکین کا کھانا ہے۔ اور حفص سے ایک قرأۃ وَعَلَى الَّذِیْنَ لَا یُطِیْقُوْنَہٗ بھی روایت کی گئی ہے۔

اس صورت میں آیتِ ہذا شیخِ فانی کے بارے میں ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک حاملۂ مُرضِعہ کے بارے میں بھی ہے۔ صاحبِ مُدارک ، امام زاہد نیز کئی فقہاء اور اہلِ اصول نے اس کی وضاحت کی ہے۔ صاحبِ کشّاف اور بیضاوی نے اضمارِ لا اور لا والی قرأۃ سے تعرّض نہیں کیا ۔ اس کی وجہ یا اس قرأۃ کا ضعیف ہونا ہے یا یہ کہ انہوں نے اور ایسی قرأتیں ذکر کی ہیں۔ جو عدمِ طاقت کا معنیٰ دیتی ہیں۔ مثلاً یُطَوَّقُوْنَہٗ ، یَطَّوَّقُوْنَہٗ یُطَیِّقُوْنَہٗ وغیرہ ایسی قرأتیں ہیں۔ جن میں تکلیف کا معنیٰ پایا جاتا ہے۔ معنی یہ ہے۔ کہ وہ روزے کو بڑی مَشقت اور تکلیف سے پُورا کر پاتے ہیں۔ آسانی اور سہولت سے نہیں۔ ایسے لوگ شیخِ فانی بہت بُوڑھے مرد اور بہت بوڑھی عورتیں ہیں — ان قرأتوں سے قرأت مشہورہ میں یہ تاویل کی جا سکتی ہے کہ یَصُومُونَہٗ جُھْدَ ھُمْ وَطَاقَتَھُمْ کہ روزے کو بہت سخت محنت اور مشقت سے پُورا کر سکتے ہیں شمسُ الایمہ سے مروی ہے ۔ کہ یُطِیْقُوْنَہٗ اطاقہ سے ہے ۔ جس کا ماضی اَطَاقَ ہے۔ اور ہمزہ سلب کے لیے ہے یعنی وہ لوگ جن کی طاقت زایل ہو چکی ہے۔ جیسے کہتے ہیں اَشْکیٰ : اس سے شکایت کو دور کر دیا — اس صورت میں حذف لا کی توجیہہ کی ضرورت نہیں۔ بعض نے یہ توجیہہ نہایت عمدہ قرار دی ۔ اور بعض نے اس پر اعتراضات کیے ہیں۔ القصہ آیت میں بہت سی تاویلات ہیں ۔

(۲۹) مولانا عُمر احمد عثمانی (فقہُ القرآن) : جن لوگوں کو روزہ رکھنا دشوار ہو اور وہ بہ مشقّت روزہ رکھ سکیں ان کو اجازت ہے کہ وہ بھی روزہ افطار کر دیں اور روزے کی جگہ فدیہ ادا کر دیں۔ فدیہ یہ ہے کہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں یا اتنی رقم نقد دے دیں۔ جس سے وہ ایک وقت (بعض حضرات کے نزدیک دو وقت ع ۔ ع ۔خ) اپنا پیٹ بھر سکے۔

اس آیت میں یطیقونہ کے معنے یہ کیے جاتے ہیں کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں وہ روزے کی بجائے فدیہ دے دیں ان حضرات کا جو یہ ترجمہ کرتے ہیں خیال یہ ہے کہ ابتداءً عادت نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو یہ رعایت دی گئی تھی۔ کہ باوجود بہ سہولت روزہ رکھ سکنے کے اگر وہ چاہیں تو روزہ نہ رکھیں۔ بلکہ روزے کی بجائے فدیہ دے دیا کریں۔ لیکن بعد میں یہ رعایت منسوخ ہو گئی ——— ان حضرات نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ روزہ فرض ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ خلاف عادت امور کی بجا آوری پر قدرت اور صلاحیت پیدا کی جائے۔ انہوں نے اس پر بھی غور نہیں فرمایا کہ عام طور پر لوگ دو وقت کھانا کھاتے ہیں۔ ایک تو دوپہر کو دوسرے رات کو۔ ان دونوں کھانوں میں فاصلہ بہ مشکل آٹھ نو گھنٹے کا ہوتا ہے۔ لیکن رات کو کھانا کھانے کے بعد اگلے دن دوپہر کو کھانا کھانے تک فاصلہ پندرہ یا سولہ گھنٹے ہو جاتا ہے۔ طویل فاصلہ رات کو گزرتا ہے۔ اور قصیر فاصلہ دن کے وقت گزرتا ہے۔ روزے کی صورت میں بھی آدمی دو وقت کھانا کھاتا ہے ایک سحر میں اور دوسرے افطار میں وہ اب بھی دو وقت ہی کھانا کھا رہا ہے۔ تبدیلی صرف یہ ہوئی ہے کہ طویل فاصلہ (سحر سے افطار تک) دن کے وقت گزرتا ہے اور قصیر فاصلہ (افطار سے سحر تک) رات کے وقت گزرتا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ کھانے کے اوقات میں کوئی کمی نہیں کی گئی ہے ۔ صرف ایک تبدیلی کی گئی ہے۔ تاکہ آدمی کو خلاف عادت کرنے کی بھی قدرت رہے اور وہ عادت کے ہاتھوں مجبور نہ ہو جائے۔

ایک مسلمان کی پوری زندگی جدوجہد اور جہاد و قتال کے زندگی ہوتی ہے۔ اسے قدم قدم پر ہنگامی صورتوں سے دوچار ہوتے رہنا پڑتا ہے۔ لہذا اسے عادتوں کا غلام نہیں ہونا چاہئیے۔ اسے ہر حال میں ثابت قدم رہنا ہے اور اس کے لئے اس کی مشق ضروری ہے۔ لہذا روزے کا مقصد ہی عادت کی مخالفت پر قدرت پیدا کرنا ہے۔ پھر عادت نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو رعایت دینے کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔

پھر ان حضرات نے اس پر بھی غور نہیں فرمایا۔ کہ روزہ رکھنے کی عادت تو کسی کو بھی نہیں ہوتی۔ جس نے ایک مرتبہ رمضان میں روزے رکھ لیے تو کیا وہ عمر بھر کے لیے روزے رکھنے کا عادی ہو گیا؟ گیارہ مہینے تک روزے نہ رکھ کر وہ عادت تو پھر ختم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اگلے سال پھر اس سے روزے رکھوائے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ پھر عادی ہو جائے۔ اگر لوگ ایک دفعہ روزے رکھ کر عمر بھر کے لئے خلاف عادت کاموں پر قادر بن سکتے تو ہر سال روزے رکھوانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لہذا عادت نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو رعایت دینے کا سوال بالکل ہی بے معنی ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ یہاں لا (نافیہ) مقدر اور محذوف ہے۔ یعنی اصل میں لایُطیقونہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے۔ مثلاً شیخ فانی (بُوڑھا پھُونس) تو ایسے لوگ روزے کے بجائے فدیہ دے سکتے ہیں یہ توجیہہ بھی قابل قبول نہیں ہے ۔ کیونکہ محذوف یا مقدر وہ لفظ ہوتا ہے۔ جو سیاق و سباق اور فحوائے کلام سے خود بخود سمجھ میں آ رہا ہو۔ یہاں ایسی کوئی علامت نہیں ہے۔ کہ جس سے اس محذوف اور مقدّر لفظ کو سمجھا جا سکے۔ ایک مثبت کلام کو بالکل ہی نقیض یعنی منفی بنا دینا اور اس کے لیے حرف نفی ہی کو مقدّر یا حذف کر دینا ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ حق تعالیٰ کے متعلّق ایسا تصور کیا جائے ۔ تعالیٰ اللہُ عمّا یصفون

مذکورہ بالا تفصیل سے ظاہر ہے کہ آیت کے صحیح معنے یہ ہیں کہ جو لوگ بہ مشقت روزہ رکھ سکیں وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کے بدلے میں فدیہ دے دیں اس لیے کہ: یُرِیدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْعُسْرَ ۲:۱۸۵

خدا تمہارے لیے آسانیاں چاہتا ہے۔ مشقتیں نہیں چاہتا۔

اس آیت کی تفسیر میں مفتی سید محمد عبدہ نے فرمایا ہے کہ عرب اطاق الشی اس وقت کہتے ہیں جب قوت اتنی کم ہو کہ اس کی وجہ سے کسی کام کے کرنے میں شدید مشقت کا متحمل ہونا پڑے۔ اَلّذِین یُطیقونہ سے مراد ہیں: ضعیف ، بوڑھے وہ اپاہج جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ وہ کاریگر یا مزدور جن کی روزانہ معاش مشقت انگیز کاموں میں ہوتی ہو۔ نیز وہ مجرم جنہیں مشقت کے کاموں پر لگایا جائے۔ ان لوگوں پر جب روزہ رکھنا شاق ہو اور وہ فدیہ دے سکیں تو وہ اس حکم میں داخل ہیں۔ (اس استدلال پر ہمارا استدراک پہلے گزر چکا ہے ۔ ع ۔ ع ۔ خ) ——— تفسیر المنار۔

(۳۰) تفسیر حقانی: یُطِیقُونَہٗ کے یہ معنی ہیں۔ کہ بہ تکلیف و بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہوں۔ چنانچہ عِکرمہ اور عطاء کی قراءت میں یُطَوَّقُونَہٗ آتا ہے۔ أی یُجَشَّمُونَہٗ یعنی یُکَلَّفُونَہٗ ——— اور یہ اس لیے کہ وسعت طاقت کے اوپر ایک اور شے

ہے۔ اس صورت میں اب بھی رمضان کے روزوں کی نسبت اس شخص کے لیے کہ جو مشقت سے روزہ رکھ سکے۔ یہی حکم ہے کہ وہ ہر روزے کے بدلے میں فدیہ دیوے۔ یہ شیخِ فانی کے لیے ہے۔ (یہ تخصیص کس نص کی رُو سے؟ ع ۔ ع ۔ خ)

پس آیت یُطِیقُونَہٗ کو آیت فَمَنْ شَھِدَ سے مَنْسُوخ قرار دینا بے فائدہ ہے ۔ اور اس طرح لامقدّر ماننا اور ہمزہ کو سلب کے لیے کہنا بھی لاحاصل ہے۔

(۳۱) امام ابن منظور (لسان العرب) : اِبْن سِیْدَہ : وَمِنَ الشّاذِ قِراءَۃُ ابْنُ عبّاسٍ وَمُجاهِد وَعِكْرَمة : وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطَوَّقُوْنَهٗ وَيطُوَّقُونَهٗ وَيُطَيَّقُوْنَهٗ وَيَطَّيَّقُونَهٗ —— فَيُطَوَّقُونَهٗ ——— يُجْعَلُ كَاطُوقٍ فِي أعناقِهِمْ .

(۳۲) القاموس المحيط ۔ وقُرِئَ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطَوَّقُوْنَهٗ ——— أي يُجْعَلُ كالطُّوقِ فِي أعناقِهِمْ

(۳۳) المعجم الوسيط : الطَّاقَةُ : القُدْرَةُ مايَسْتَطِيْعُ الْاِنسَانُ اَنْ يَّفْعَلَهٗ بِمَشَقَّةٍ ۔

(۳۴) میر احمد علی (حواشی: مرزا مہدی پویا یزدی)

And those who are hardly able to do it, may effect a redemption by feeding a poor man. (In cases wherein fast is sure to effect strain on their system viz. old men and women, mothers giving suck to their infant children , wet nurses etc. they may forego fasting altogether but feed the poor instead giving away the measure of one man's food every day for the days not fasted.

(۳۵) علامہ عبداللہ یوسف علی :

For those who can do it (with hardship) is a ransom, the feeding of one that is indigent.

(۳۶) م۔ شیر علی :

And for those who are able to fast with great difficulty is an expiation- the feeding of a poor man.

(۳۷) پروفیسر احمد علی :

And those who find it hard to fast should expiate by feeding a poor person.

(۳۸) مولانا عبدالماجد دریا بادی :

And for those who can keep it with hardship the ransom is the feeding of a poor man.

(۲)

عیاں راچہ بیاں؟ اب یہ ترجمے کہاں تک اصل کے قائم مقام ہو سکتے ہیں۔ یا اس کی قرار واقعی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ اور ان میں سے کون سا منشائے ایزدی کے مطابق یا اس کے قریب ترین ہے؟

ہر اہلِ نظر خود دیکھ سکتا اور ہر صاحب فہم ورائے خود فیصلہ کر سکتا یا شش و پنج میں گرفتار ہو سکتا ہے کہ

کونسا قول راجح ہے منضور ہے کونسا ان میں مذہب؟

شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا

ان آرا کی روشنی میں ہمارے ہاں احترام رمضان کے نمائشی سلسلے میں جو بیجا سختی کی جاتی ہے۔ اس کا جواز کیا رہ جاتا ہے؟

بیشتر اہل تفسیر و تاویل اس پر متفق ہیں کہ گو فدیے کی رخصت مابعد کی آیت سے منسوخ ہو چکی ہے۔ مگر اس کا حکم پوری طرح منسوخ نہیں ہوا۔ اور وہ حاملہ و مرضعہ۔ کبیر السن اور دوسرے معذور افراد کے لیے بدستور جاری و ساری ہے۔ اس قیاس کی اساس کیا ہے؟ کچھ نہیں سوائے ان کی اپنی خواہش اور صواب دید کے ——— تلک اَمانیُّھُمْ ۲ : ۱۱۱ ——— پخت و پُز یہ ان کی ، ان کی خواہشیں ——— یہ فقط ان کی آرزوئیں ہیں ۔ وَمِنْھُمْ اُمِّیُّوْنَ لَایَعْلَمُوْنَ الْکِتَابَ اِلَّا اَمانِیَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْن ۲ : ۷۸ ———

اور ان میں بعض ان پڑھ ہیں ، نہیں ہے جن کو کچھ علمِ کتاب
(خواہشوں اور) آرزؤوں کے سوا
اور کرتے ہیں وہ بس تخمین وظن
(اور دوڑاتے ہیں گھوڑے وہ خیالوں کے فقط)؛

علامہ جلال الدین سیوطی اَلاتقان میں لکھتے ہیں: ایک قول یہ ہے کہ قولہ تعالیٰ : وَعَلَی الَّذِیْنَ یطیقُوْنَہٗ کو قولہ فَمَنْ شَھِدَ نے منسوخ کر دیا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ نہیں یہ آیت محکم ہے اور اس میں لانافیہ مقدر ہے (یعنی تقدیر عبارت لایُطیقُوْنَہٗ ہے) ابن عباس کہتے ہیں: کہ ضعیف و معمّر مرد اور عورت کے لیے یہ رعایت بدستور موجود ہے۔ چونکہ وہ روزے کی استطاعت نہیں رکھتے اس لیے اس کے بدلے کسی مسکین کو کھانا کھلا کر اس فرض سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ روزے کی استطاعت نہ رکھنے والے کیا صرف بُوڑھے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ آج کل تو عموماً بُوڑھے بھی چاق و چوبند و توانا و برنا نظر آتے ہیں۔ اور بہت سے بظاہر تندرست اور خُوش باش اندر سے کمزور اور بیمار ہوتے ہیں۔ دیر تک بھوکا پیاسا رہنا یا تو ان کے لیے طبّی لحاظ سے نُقصان دِہ ہوتا ہے ۔ یا ان کی برداشت سے باہر ہوتا ہے اور ان پر وہی قول صادق آتا ہے۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوا فِی سَبِیْلِ اللہِ لَایَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ - تَعْرِفُھُمْ بِسِیْمَاھُمْ لَایَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۲ : ۲۷۳

ان فقیروں کے لیے (خیرات ہے) محصُور جو اللہ کے رستے میں ہُوئے چل پھر نہیں سکتے زمیں میں جو ۔ سمجھتا ہے انہیں جاہل تونگر بے سوالی کے سبب

ان کے چہروں سے انہیں پہچانے تُو۔ مانگیں نہ لوگوں سے لپٹ کر۔

یعنی اُن کے چہرے مُہرے سے ، ان کی چال ڈھال سے اِن کے رکھ رکھاؤ سے کوئی ان کی اندرُونی شکست و ریخت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ وہ اس ذیل میں بھی نہیں آتے کہ تَعرِفُھُم بِسیماھُم ۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر فدیے کی رعایت بالکل ختم ہو گئی ہے ۔ تو ان مریضوں اور مسافروں کا کیا بنے گا ۔ جو دائم المرض ہیں۔ اور مدام سفر میں رہتے ہیں۔ اپنے فرائض منصبی کے تقاضوں یا کاروبار کی نوعیت کے پیش نظر۔ وہ قضا کیسے پوری کریں گے جبکہ ان کی حیاتِ طبعی میں اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی؟

یہاں سے ناسخ و منسوخ کی بحث پیدا ہوتی ہے۔

خدا کا کلام زندہ کلام اور اس کی کتاب زندہ کتاب ہے۔ زندہ لفظوں کو کون مٹا سکتا ہے؟ کون محو و معدوم کر سکتا ہے؟

خدا کے بعد صرف رسولِ مُلھَم ——— جو مُخبِرِ صادقُ البیان ہے

ع اُمّیِ لوح خوانِ ما اَوحیٰ
ع مُنشرح صدرش از اَلَم نشرَح

کی ذات ایسی ہے۔ جو ایسی کسی چیز کی نشان دہی کر سکتی ہے۔ مگر رسولِ کریمؐ سے ایسا کوئی قول منسوب نہیں ۔ ان کی زبان سے کسی آیت ، کسی حرف کے بارے میں کسی مجموعۂ احادیث میں کوئی ایسا قول منقول و مروی نہیں۔ یہ بحث سراسر دوسرے اصحاب کی پیدا کردہ ہے۔ قُرآنِ کریم کے بارے میں انتشار و افتراق اور تشکیک و اشتباہ پیدا کرنے کے لیے۔ (خدا بدگمانی کو معاف کرے)

کسی کو حکمِ خدا و رسولؐ یاد نہیں
زباں پہ خلق کے احکام ہیں فقیہوں کے

کیا وہ کتاب جو خلقِ خدا کے لیے ہادی و ہدایت ہے۔ رہنما و رہنمائی ہے رہتی دنیا تک ۔ اس کے بارے میں یہی طے نہ ہو کہ اس میں کونسا حصہ قائم ہے اور کونسا کالعدم ہو چکا؟ کیا اس صورت میں اس کے اَوامر و نَواہی پر عمل درآمد ہو سکتا ہے؛ اس کی تعلیمات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟ اور اِذعان و یقین کے ساتھ انہیں منجانب خدا سمجھ کر ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

کیا دنیا میں کوئی مجلۂ قانون ، کوئی مجموعۂ آئین ایسا ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے تو کیا وہ نافذ العمل اور واجبُ الاتباع ہو گا؟ کیا تعزیرات و قوانین کی کتابیں ایسی دفعات پر، ایسے قوانین پر مشتمل ہو سکتی ہیں جو منسوخ ہو چکے ہوں۔ اور یہ بھی طے نہ ہو کہ کونسے قانون اور ان کی کونسی دفعات منسوخ ہو چکی ہیں:

جیسا جس کے گمان میں آئے
ہر کسے بر حسبِ فکر گمانے دارد

متن میں تو نہیں حاشیے میں البتہ نشاندہی اور تقابل و تناظر کے طور پر منسوخ شدہ قانون آسکتے ہیں۔ یہ بتانے کے لیے کہ اس قانون کی قبل از یں یہ شکل تھی۔ اب یہ شق محذوف ہو گئی ہے۔ یا اس میں ترمیم و تبدل ہو چکا ہے۔

منسوخ کی روایت کی حقیقت کیا ہے اس کے لیے ہم صحاح ستہ سے رجوع کرتے ہیں:

۱۔ صحیح بُخاری : کتابُ التفسیر ۳۲ (حدَّثنِي اِسْحاق) : اخبرنا روح : حدَّثنا زکریَّا بنُ اِسْحاقَ : حدَّثنا عَمْرُو بنُ دِیْنارٍ عَنْ عطاءٍ : سمع ابْن عبّاس یقُولُ : وعلَی الَّذِیْن یُطَوَّقُوْنَهٗ

روح بن عُبادہ ، زکریّا بن اسحاق ، عمرو بن دینار ، عطا بن ابی رباح نے ابنِ عبّاس سے سُنا، وہ یوں پڑھتے تھے : وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطَوَّقُوْنَهٗ﴾ قَالَ ابْنُ عبّاسٍ : لَیستْ بمَنسُوخَةٍ - هُوالشَّیخُ الْكَبِیْرُ وَالْمرْأَةُ الْكَبِیْرَةُ لایَسْتَطِیعانِ اَنْ یَّصُوما فَیُطعِمانِ مكانَ كُلِّ یَوْمٍ مِسْكِیْنًا

مترجم علّامہ وحید الزّمان لکھتے ہیں: یہ ابنِ عبّاس کا قول ہے۔ اور اکثر عُلماء کہتے ہیں کہ یہ آیت منسُوخ ہے۔ ابتدائے اسلام میں یہی حکم ہوا تھا ۔ کہ جس کا جی چاہے روزہ رکھے جس کا جی چاہے فدیہ دے۔ پھر بعد کو آیت ـــــ فَمَنْ شَهِدَ سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ البتہ جو شخص اس قدر بوڑھا ہو جائے کہ روزہ نہ رکھ سکے۔ اس کے لیے افطار کرنا اور فدیہ دینا جائز ہے۔

نمبر ۳۳ اور ۳۴ میں بالترتیب ابن عُمر اور سَلَمَۃ بنُ الاَکوع سے روایت ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ حضرت سلمہ کے راوی ہیں یزید ـــــ ابو عبید ان کے غلام ۔

کتابُ الصَّوم (۱۷۰) میں وہی ابنِ عُمر کی روایت ہے۔ (باب) میں وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیقُوْنَهٗ کے تحت بھی وہی ابن عمر اور سلمہ بن الاکوع کی روایت ہے کہ یہ مابعد کی آیت سے منسوخ ہے۔ اسی حدیث میں اس کے بعد یہ عبارت ہے:

وقَالَ ابن نُمیرٍ : حدَّثنا الاعمش حدَّثنا عَمر و بنُ مرَّةَ : حدَّثنَا ابنُ ابي لیلي حدَّثنا اصحابُ مُحَمَّدٍﷺ : نَزَلَ رَمضانُ فَشَقَّ عَلَیهم فَكانَ مَنْ اَطْعَمَ كُلَّ یومٍ مسْكِیناً تَرَكَ الصَّوْمَ مِمَّن یُطِیقُهٗ . وَ رُخِّصَ لَهُمْ فِي ذٰلِكَ .فَنَسَخَتْها ـــــــــ وَاَنْ تَصُومُوا خَیْرٌ لَّكُمْ ـــــ فَاُمِرُوا بالصَّوم

اصحاب محمّدؐ کون ہیں؟ اس کی کوئی وضاحت نہیں

(۲) صحیح مُسلم کتابُ الصیام ۱۹۱۔۱۹۲ ـــــ سَلَمَۃ بنُ الاَکوع ہی کی روایت ہے ۔

(۳) سُنَنِ نَسائی ۲۳۲ ـــــ کتابُ الصِّیام باب ۱۳۰۹۔ منسوخی کی اطلاع دینے والے وہی حضرت سَلَمہ ہیں۔

۲۳۲۱ ـــــ میں ابنِ عبّاس کا قول ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ رخصت ہے لایُرَخَّصُ فِی هٰذا اِلَّا لِلَّذِی لایُطِیقُ الصِّیَامَ اَوْ مَرِیضٌ لایُشْفٰی ۔

(۴) سُننِ ابو داؤد ۔ کتاب الصّیام ۵۴۵: سَلَمۃ، بنُ الاکوع ہی سے روایت ہے کہ بعد کی آیت سے یہ اختیار منسوخ ہوگیا۔
۵۴۶۔ ابن عبّاس ہی سے روایت ہے کہ اب فدیہ جاتا رہا۔ البتہ مریض اور مسافر کے لیے رخصت باقی ہے۔ کہ اور دنوں میں روزے رکھ لیں۔

۵۴۷۔ ابن عبّاس ہی سے روایت ہے کہ یہ آیت باقی ہے۔

۵۴۸ ۔ حُبلیٰ اور مُرضع کے حق میں ۔ جن سے روزہ نہ رکھا جائے یا رکھنا جنہیں ضرر کرے۔

(۵) جامع تِرمذی ۔ اَبوابُ الصّوم میں بھی یہ روایت صرف سَلَمَۃ، بنُ الاَکوَع ہی سے ہے۔ اور عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ کا ترجمہ (بقلمِ برادرِ علّامہ وحید الزّمان) ہے: جن کو طاقت ہے روزے کی ۔

(۶) سُنَنِ دارِمی ۔ اگرچہ اس برگزیدہ صف میں شامل نہیں۔ مگر پھر بھی بڑا محترم مجموعہ ہے۔ بلکہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تو سُنن ابنِ ماجہ کی جگہ اسے صِحاح میں شامل کیا ہے اس کی کتابُ الصّیام ۱۷۴۱ میں وہی سَلَمہ کی روایت ہے ۔ ان کے مولیٰ (غلام) یزید کے واسطے سے ۔

یہ سب روایات بھی باہم متضاد اور انتشار کا شکار ہیں۔ منسُوخی کی اطّلاع دینے والے صرف حضرت سَلَمَۃ ہیں۔ کسی اور شخص نے روایت کیوں نہیں کی (سوائے ایک جگہ ابن عُمر کے) ؟ اور پھر کس مجلس میں یہ فیصلہ ہُوا تھا کہ یہ آیت منسوخ ہو گئی ہے ؟

رسول اکرمؐ نے ، جو مظہر انوارِ حق ہیں جو مصدرِ اسرارِ حق ہیں

ع شاہِ رُسل وسیلۂ کل ہادیِ سُبل

مابعد کی آیت نازل ہونے پر کیا فرمایا؟ اگر انہوں نے کچھ نہیں فرمایا اور ان سے کوئی قول بھی منسوب نہیں۔ تو پھر منسوخی کا، انفساخ واسترداد کا حق کسی اور کو کیسے اور کس استحقاق کی بنا پر تفویض ہو سکتا ہے؟ اور اس کا بیان کس رُو سے واجب التّسلیم ٹھہرتا ہے؟

وہ عَبدُہٗ جس کا قول ہے: اِنَّ اللہَ لَمْ یَبْعَثْنِیْ مُعَنِّتًا وَلَا مُتَعَنِّتًا وَلٰکِنْ بَعَثَنِیْ مُعَلِّمًا مُیَسِّرًا ۔ اور: بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا ۔ یَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وہ ایک سہولت کو کیوں واپس لینے لگا؛ رسولؐ کو تو ———

وہ کشّافِ سرائر جس نے کھولا چند اشاروں میں
علومِ اوّلین و آخریں کا گنجِ پنہانی

وہ اُمّیؐ جس کے آگے عقلِ کُل طفلِ دبستانی
جو دے قیدیوں کو رہائی کا مُژدہ
جو اندھوں کو بینائی بخشے
جو کُچلے ہوؤں کو کرے تندرست و توانا

عصا زیر دستوں کا ، بے طاقتوں کا سہارا)

خدا کی طرف سے یہ حکم ہوتا ہے: قُلْ مَا يَكُونُ لِي اَنْ اُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَائِ نَفْسِي اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوحَىٰ اِلَيَّ ۱۵:۱۰

تو کہہ دے :

نہیں میرے بس میں کہ اس کو بدل ڈالوں اپنی طرف سے۔ فقط میں تو تابع ہوں اس کا کہ جو وحی ہوتا ہے مجھ پر

اسلام نام ہے وحی کا اور صاحب وحی کے قول و فعل (حدیث و سُنّت) کا۔ ایمان نام ہے ان کی برضا و رغبت ، بلاجبر و اکراہ ، بطیب خاطر ، جسم و دل سے اطاعت کا۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے۔ چاہے اس کا ماخذ و منبع کوئی بھی اور کچھ بھی ہو۔ اسلام کا حصّہ نہیں اس کی تاریخ و ثقافت کا البتہ ہو سکتا ہے۔ وہ ایک فردِ اُمّت کی ذاتی رائے ہو سکتی ہے اور باقی اُمّت کو اس کے رَدّ و قبول کا کلّی، غیر مشروط اور غیر محدود حق حاصل ہے ـــــ ایک فرد کے اقوال و افعال چاہے وہ کتنا ہی برگزیدہ ، کتنا ہی عالیجاہ، کتنا ہی صاحب فہم و فراست ، کتنا ہی صاحبِ تفکّر و تدبّر کیوں نہ ہو ـــــ دوسروں کے لیے قرآن اور حدیث و سُنّت کا بدل ، ان کی توسیع نہیں بن سکتے۔

(انَّ السُّنَّةَ بمنزلة التّفسيرْ والشّرح لمعانى احكام الكتاب ودلّ على ذلك قوله تعالىٰ ؛ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۱۶ : ۴۴)

ضمناً ان مجموعہ ہائے احادیث کے بارے میں ہم یہ تصریح ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ یہ صرف اپنے عالی مقام مُرتّبین کی صواب دید کے صحیفے ہیں۔

(۱) امام بُخاری [مسکن بُخارا ـــــ ۱۹۴ ـ ۲۵۶ھ (۸۱۰ ـــــ ۸۷۰ء)]

نے تقریباً چھ لاکھ مسموع روایات میں سے کل ۷۲۷۵؟ ۷۳۹۷؟ قابلِ قبول سمجھیں۔ مع مکرّرات ۔

(۲) امام مسلم [وطن نیشاپور ـــــ ۲۰۴ (۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۶ھ ؟) ـــــ ۲۶۱ھ (۸۲۰ ـــــ ۸۷۵/۴ء)]

نے تین لاکھ روایات میں سے بحذفِ مکرّرات ۴۳۴۸ (۴۰۰۰؟) روایات منتخب کیں۔ مع مکرّرات ۷۴۲۲ ۔

(۳) امام نسائی [وطن نساء صوبہ خراسان ـــ ۲۱۵ ـــــ ۳۰۳ھ (۹۱۵ء)]

نے پانچ لاکھ میں سے ۵۷۶۴ منتخب کیں

(۴) امام ابُو داؤد [وطن سجستان ـ ۲۰۲ ـــــ ۲۷۵ھ (۸۱۷ ـــــ ۸۸۸/۹ء)]

نے پانچ لاکھ میں سے ۴۸۰۰ منتخب کیں۔

(۵) امام ترمذی [وطن ترمذ ـــــ ۲۰۹ ـــــ ۲۷۹ھ (۸۲۴ ـــــ ۸۹۳/۲ء)]

نے تین لاکھ میں ۳۱۱۵ منتخب کیں۔

(۶) امام ابن ماجہ [وطن قزوان ـــــ ۲۰۷/۹ ـــــ ۲۷۳۵ھ (۸۲۴ ـــــ ۸۸۶ء ـــــ نکلسن نے سنِ وفات ۸۹۶ء دیا ہے۔ جو بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے)]

نے چند لاکھ میں سے صرف ۴۳۴۱ منتخب کیں۔

یہ تمام منتخبِ روزگار و یادگارِ زمانہ عجم کے لال زاروں سے اُٹھے تھے

جو لاکھوں حدیثیں ان رِجال عِظام ، ان اماماں کرام نے مسترد کر دیں۔ اپنی وضع کردہ درایت کی کسوٹی، اپنی پسند کے جرح و تعدیل کے پیمانوں پر پوری نہ اترنے کے باعث ——— وہ کہاں ہیں؟

کون کہہ سکتا ہے کہ وہ گنجینۂ گوہر نہیں بلکہ سارے کا سارا کھوٹے سکّوں کا ڈھیر تھا؟

انجیل متی کہتی ہے (۴۲:۲۱)

یسوع نے ان سے کہا :

کیا تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کر دیا وہی کونے کا سرا ہو گیا؟

اور پھر چند بزرگوں کو اس کا حق کیسے مل سکتا ہے کہ وہ آنے والوں کے لیے اس مبحث کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیں۔ اور ان کو اپنے ہی چُنے ہوئے خوانِ نعمت پر اکتفا کرنے پر مجبور کر دیں؟

جہاں تک ان کے راویوں کی ثقاہت و سخافت کا تعلق ہے۔ صرف زُہد و اتقاکی بنا پر کوئی شخص عقل و فراست کا مالک نہیں بن جاتا۔ مردانِ جہاندیدہ سے مخفی نہیں کہ علم کے ساتھ فہم اور تقوے کے ساتھ عقل کی دولت ہر کسی کو نہیں ملتی۔

ظاہر کی پارسائی اور شرافت کسی کے معتبر ، دیانت دار، صاحب ادراک اور باضمیر ہونے کی ضمانت نہیں ۔ چھلنی سے چھانو ، چھاج سے پھٹکو ۔ پھر بھی کسی شخص کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی ۔

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہمدیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

يَكُونُ الرَّجُلُ عالِمًا ولا يَكُونُ عابِدًا ويَكُونُ عابِدًا ولا يَكُونُ عَاقِلاً .

شاذونادر ہی کسی شخص میں ہوں
عالم و عابد و عاقل یکجا

لاتَعجبُوا باِسلامِ امرِيءٍ حَتّىٰ تعرِفُوا عُقدَةَ عَقلِه ——— اِذا بَلَغَكُمْ عَنْ رَجُلٍ حُسْنَ حالٍ فَانظُروا في حُسْنِ عَقلِه فَاِنَّمَا يُجازَي بعقلِه .

اِنَّ القَومَ لَيَحجُّونَ وَيَعْتَمِرُوْنَ وَيُجاهِدُوْنَ وَيُصَلُّونَ وَيَصُومُونَ وما يُعطُونَ يَوْمَ الْقِيامَةِ اِلاَّ عَلىٰ قدرِ عُقُولِهِمْ

ع :بقدرِ عقل عمل کا ثواب ملتا ہے ۔

اگرچہ عقل کی شرط بھی روایات کے ردّ و قبول میں شامل ہے۔ مگر وہ بلوغ کے ساتھ مشروط ہے۔ اور بلاغ اور بالغ نظر میں جو فرق ہے ہر صاحبِ نظر پر روشن ہے۔ عہد نامۂ عتیق کی شہادت کے مطابق:

نہیں پختگی کی دلیل عمر رسیدگی

کہ ہر آدمی کو درازیِ سن و سال
معرفتِ حقائقِ زندگی نہیں بخشتی !

حضرت علیؓ کا کہنا ہے :

العقلُ عقلان	مَطْبُوعٌ و مَسْمُوعٌ
ولا ینفعُ مسمُوعٌ	اِذا لَمْ یَکُ مَطْبُوعٌ
ولا ینفعُ ضوءُ الشَّمس	وضوءُ العینِ مَمْنُوعٌ

أنظرْ الیٰ ماقال ولاَ تنظرْ الیٰ منْ قال

—— قدیقولُ المنافقُ کلمۃُ الحقّ

—— غریبتان فاحتملُوها ——— کلمۃُ حکمۃٍ منْ سَفیْہٍ فاقْبَلُوھا .

—— کلمۃُ الحکمۃ ﴿الْکَلمۃُ الحکیمۃُ﴾ ضالّۃُ المؤمن یاخذُھا ممّن سمعَھا ولا یُبالی منْ ایّ وعاءٍ خرَجتْ

یعنی باید متاع نیکو از ہر دکاں کہ باشد

اُتّم ودّیا لیجئے یدّپی نیچ پہ ہوئے
پڑا اپاون تھار میں کنچن تجت نہ جائے

لاتحقرنّ کلمۃ الحکمۃ انْ تسمعَھا من الفاجر فانّہا مثْلہ ——— رُبَّ رمْیۃٍ من غیْرِ رامٍ

گہ بود کز حکیمِ روشن رائے برنیاید درست تدبیرے
گاہ باشد کہ کودکِ ناداں بغلط برہدف زند تیرے

—— فرُبَّ حاملِ فقْہٍ لیْس بفقیْہٍ

—— ورُبَّ حاملِ فقْہٍ الیٰ مَنْ ھُوَ افْقہُ منْہُ

حدیث کی صحت کی کسوٹی تو صرف قرآن ہے۔ جو اس کے مطابق ہے۔ قولِ رسول ہے۔ نہیں تو موضوع روایت ہے۔

خَطَبَ النّبیؐ فقالَ : اَیُّہا النّاسُ ! ماجاءَ کُمْ عنّی یُوافقُ کِتابَ اللہ فانا قُلْتُہُ وما جاءَ کُمْ یُخالفُ کِتابَ اللہ فَلَمْ اَقُلْہُ

اَیُّہا النّاس ! تم تک مرا جو سخن پہنچے گروہ کتابِ خدا کے موافق ہے تو ہے وہ میرا۔ نہیں تو وہ میرا نہیں ۔ جھوٹ باندھا ہے مجھ پر کسی نے

—— وَکُلُّ حدیثٍ لایُوافقُ کِتابَ اللہِ فھُو زُخرُفٌ —— کتابِ خدا کے موافق نہیں جو حدیث افترا ہے۔

مالَمْ یُوافِقْ مِنَ الحَدیْثِ القُرآنَ فھُوَ زُخرُفٌ

فَما وافقَ کتابَ اللہِ فخذُوہُ وما خالفَ کتابَ اللہِ فدَعُوہُ

جو حدیث کتاب خدا کے موافق ہو اسے لے لو اور جو مخالف ہو اسے چھوڑ دو

یہ اِتلاف ایک ناقابلِ تلافی ، ناقابلِ معافی ملّی ضیاع ہے۔ افسوس صد افسوس!

اے کاش وہ رد کیا ہوا ذخیرہ کہیں موجود ہوتا۔ معلوم نہیں کتنے گوہر ہائے آبدار دریا بُرد ہو گئے ۔ کتنے نایاب ورثے کو وقت کا سیل بہا کر لے گیا!

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم !
تُو نے وہ گنج ہائے گرانما یہ کیا کیے؟

(۳)

صاحبِ تفسیر منسوخ القرآن (رحمت اللہ طارق) : "ایسا قُرآن جس میں الفاظ تو نُطق اور تلاوت کے لحاظ سے باقی رہیں۔ لیکن مفہوم منسوخ ہوگیا" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

"اگر الفاظ باقی رہے اور مفہوم منسوخ ہوگیا۔ تو ایسے مہمل اور بے معنی الفاظ کے باقی رکھنے میں قُرآن کے اعجاز کا دعویٰ ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس طرح یہ ماننا پڑے گا۔ کہ اس میں کچھ مہمل اور کچھ حِصّہ بیکار بھی ہے۔

بے معنی الفاظ کو باقی رکھنے سے قُرآن اور صاحبِ قُرآن کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ قُرآن کی افادی حیثیت اس کے الفاظِ بامعنی میں مضمر ہے۔ اس کا ہر لفظ ہدایت اور اس کا تمام تر نطق باعث نجات ہے لیکن جب اس کے الفاظ بے معنی، جملے بے مفہوم اور عبارتیں مہمل ہوں۔ تو اس وقت ہمارے لیے اخذ و استنباط کی کیا صورت باقی رہ سکتی ہے؟"

مَنسوخُ التّلاوۃ اور مَنسوخُ الحکم کی تقسیم ہی سرے سے : تلکَ اِذاً قِسمۃٌ ضیزیٰ —— بڑی ہی دھاندلی کی بانٹ ہے یہ تو ۔

اور اس پر مستزاد یہ حیرت انگیز، عبرتناک، بدن کو کپکپا دینے والی اور دل پر لرزہ طاری کرنے والی روایت کہ حضرت صدّیقِ اکبرؓ (بروایت ابن الجوزی) اسے یَطوَّقُونہٗ پڑھا کرتے تھے۔ کس اختیار، کس سند کی بنا پر؟ ان کے یارِ غار

نورِ ازل ، چراغ ابد، مشعلِ بقا
کہفِ وریٰ ، امامِ ہُدیٰ ، آیتِ تُقیٰ

جو قُرآن پڑھتے ہیں۔ جو قُرآن چھوڑتے ہیں۔ اس میں تو یُطیقُونہٗ ہے۔ حضرت صدّیقِ اکبر یہ جسارت کیسے کر سکتے ہیں کہ اپنی طرف سے ایک منصوص لفظ کو بدل دیں — ابن جوزی کے بقول ابن عبّاس کی قرأت بھی یہی ہے۔ جس کی تصدیق بُخاری کرتے ہیں۔ لسانُ العرب میں ابنِ سیدہ کے حوالے سے دو اور اصحاب کے نام بھی ہیں — مُجاھد اور عِکرمہ

یہ مقدمہ بھی انتہائی پریشان کرنے والا ہے۔

ضبط کرتے ہیں تو ہر زخم لہو دیتا ہے
آہ کرتے ہیں تو اندیشۂ رسوائی ہے

اور

چشمِ خُونبار سے کیا سیرِ گل و لالہ کروں
نظر آتا ہے چمن گنجِ شہیداں مجھ کو

اختلاف قرأت کی بہت سی شکلیں مروی ہیں:

اَلْحَمْدُ للّٰہ کی بجائی اَلْحَمْدَ لِلّٰہِ —— زید بن رُؤبہ اور العُتکی کی قرأت

ربِّ الْعالمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرّحیمِ کی بجائے ربُّ العالمینُ الرَّحْمٰنُ الرَّحیمُ —— ابو زید انصاری —— انہیں منصُوب یعنی زبر سے بھی پڑھا گیا ہے۔

مالكِ یومِ الدّیْنِ کی بجائے مَلِكِ یَومِ الدّین / مَلّاكِ یومِ الدّیْنِ ۔ حضرت علی کی قرأت ۔ مالکَ یومِ الدّیْنِ / مالكِ / مَلِكُ/ ملیكِ / ملكِ یومِ الدّینِ. ابوحیوۃ و عمر بن عبدالعزیز کی قرأتیں

اِیّاكَ کی بجائے اَیّاكَ سُفیانُ الثّوري کی قرأت

اِیَاكَ بغیر تشدید کے ——— اسواري کی قرأت

نَعْبُدُ کی بجائے نِعْبُدُ/ یُعْبَدُ اہلِ مکّہ کی قرأت

نَعْبُدُوا ۔ حضرتِ نافع کی قرأت

نَسْتعینُ کی بجائے نِسْتَعِینُ ۔ یحییٰ بن وثّاب، کی قرأت

غیرِ الْمَغضوبِ کی بجائے غیرُالمغضُوبِ —— حضرت عمر کی قرأت

غیرَ الْمَغضُوب —— ابنِ کثیر کی سند سے خلیل بن احمد کی قرأت

وَالصَّلوٰةِ الْوُسطیٰ ۲۳۸:۲ کے بعد صَلوٰةِ الْعَصرِ کے الفاظ کا اضافہ —— حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کی قرأت

وَقَاتِلُوا وَقُتِلُوا ۱۹۵:۳ کو وَقُتِلُوا وَقَاتَلُوا بھی پڑھا گیا

اَوْلَامَسْتُمُ النِّساءَ ۴۳:۴ میں لا مَسْتُم کی بجائے لَمَسْتُمْ

فَاقْطَعُوا ایدِیَهُما ۳۸:۵ کی بجائے فَاقْطَعُوا اَیمَانَهُما —— ابنِ مسعُود کی قرأت

تَجْرِي تَحْتَها الْاَنْهارُ ۱۰۰:۹ کو ابنِ کثیر نے تَجری مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهار پڑھا ہے۔

فَیَقْتُلُونَ وَیُقْتَلُونَ ۱۱۱:۹ فَیُقْتَلُون و یَقْتُلُونَ بھی پڑھا گیا ہے۔

لَقَدْ جاءَ کُمْ رَسُولٌ مِنْ اَنْفُسِکُمْ ۱۲۸:۹ میں اَنْفُسِکُمْ کی بجائے اَنْفَسِکُمْ تلاوتِ رسولﷺ بروایتِ ابنِ عبّاس

وَکَانَ وراءَ هُمْ مُلِكٌ یَاْخُذُ کُلَّ سَفِیْنَةٍ غَصْباً ۷۹:۱۸ کی قرأت

وَکَانَ اَمامَهُمْ مَلِكٌ یَاْخُذُ کُلَّ سَفِیْنَةٍ صالِحَةٍ .

ابنِ عبّاس کی قرأت

فانَّ الله مِنْ بَعْد اِکرا هِهِنَّ غفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۳۳:۲۴ میں اِکْراهِهِنَّ کے بعد لَهُنَّ کا اضافہ - حضرت جابر کی قرأت

فلاتعْلمُ نَفْسٌ مااُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۱۷:۳۲ میں اَبوهُرَيْره کے بقول رسول اکرمﷺ نے قُرَّةِ کی جگه قُرأةِ تلاوت فرمایا

اُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٍ ۵:۳۴ میں اَلِيْمٍ کو اَلِيْمٌ بھی پڑھا گیا - زیر (مجرور) اس لیے که رِجْزٍ کی صفت ہے اور پیش (مرفوع) اس لیے که عذابٌ کی صفت ہے۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا میں الله کو پیش اور العلماءُ کو زبر سے پڑھا گیا (نَعُوذُ بِاللهِ)

لِسانُ العرب : وَفِي التَّنْزِيل فِي صِفَةِ عِيْسيٰ، صلواتُ اللهِ عَلىٰ نَبِيِّنَا وَعَلَيْهِ :

وَاِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ

وَهِيَ قِراءَةُ اَكْثَرِالْقُرَّاءِ وَقَرَأَ بَعْضُهُمْ : وَاِنَّهُ لَعَلَمٌ لِلسَّاعَةِ ؟ اَلمعنيٰ اَنَّ ظُهورَ عَيْسيٰ وَنُزُولَه اِلَي الْاَرْضِ عَلَامَةٌ تَدلُّ عَلىٰ اِقْتِرابِ السَّاعَةِ

وجاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوتِ بِالْحَقِ ۱۹:۵۰ کو وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِ بِالْمَوتِ بھی پڑھا گیا اور یه حضرت ابوبکر صدّیق رضی الله اور طَلحه ابن مُطرّف کی قرأت ہے

امام سُیوطی نے "الاِتقان" میں "اعرابُ القرآن" اور "متواتر، مشہور، آحاد، موضوع اور مدرج قرأتیں" کے عنوان سے جو باب باندھے ہیں۔ اس میں تفصیل دیکھیں اور اپنے رونگٹے کھڑے کریں۔ اور اپنے شیخ عبدالعزیز دباغ مغربی کے حوالے سے احمد بن مبارک سلجماسی نے، اِبریز" میں بھی اس پر ایک باب باندھا ہے۔ اس موضوع پر اور بزرگوں نے بھی جی بھر کر خامہ فرسائی کی ہے۔

یہ سب باتیں اپنے اکابر کی کتابوں میں پڑھ کر دل دہل جاتا ہے ۔

کیا گلہ اوروں سے جب اپنے ہی بیگانے ہوئے
ہر ورق جس کا پریشاں ہے وہ دفتر اپنا

کیا ہوئی ان کی غیرتِ قرآنی؛ خدا تو کہتا ہے:

وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللهِ ٦ : ٣٤

کوئی نہیں ہے خدا کی باتیں بدلنے والا

تَمَّتْ كَلِمٰتُ رَبِّكَ صِدْقاً وَّعَدْلاً ـ لامُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهِ . اِنَّهُ هُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ٦ : ١١٥

ہو گئے پورے خدا کے کلمے صدق و عدل سے
اور کوئی اس کے کلموں کو بدلنے کا نہیں

اور وہ ہے جو ہے سُنتا جاتا ۔

اِنّا نَحْنُ نَزَّلْنا الذِّکرَ واِنّا لہٗ لحافِظُوْنَ ۱۵ : ۹

ہمیں نے ذکر کو نازل کیا ہے اور ہمی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں (ہمیں اس کے محافظ ہیں)

وَاتْلُ ما اُوْحِيَ اِلیکَ من کتاب ربِّکَ ۔ لامُبدِّل لکلماتہ ۱۸ : ۲۷

اور پڑھ اس کو تو وحی تجھ کو ہوا تیرے رب کے صحیفے سے جو۔ اس کی باتوں کو کوئی بدل دینے والا نہیں۔

اِنَّ علینا جمْعَہٗ وقُرآنَہٗ

جمع کرنا اور اسے پڑھوانا

ہے ہمارا ذمہ

— ہے ہمارے ذمے اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا اسے

بلْ ھُو قُرانٌ مجیدٌ فی لوحٍ محفوظٍ ۸۵ : ۲۱، ۲۲

قرآن مجید لوح محفوظ میں ہے

— بلکہ یہ کتاب قرآن عظیم ہے اور لوح محفوظ میں ارتسام پذیر ہے

"الاتقان" میں "سات حرفوں":

بُخاري : اُنزِلَ القُرآنُ علیٰ سَبْعةِ اَحْرُفٍ

مُسلم : اِنَّ القُرآنَ اُنزِلَ علیٰ سَبْعَةِ احْرُفٍ

ترمذي : اِنَّ ھٰذَا القُرآنَ اُنزِلَ علیٰ سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا ماتیسَّرَ مِنْہُ

کی بحث میں پینتیس مختلف اقوال پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں معقول ترین یہ ہیں کہ قُرآن سات قسم کے مضامین پر مشتمل ہے:

۱۔ زَجر، اَمر، حلال، حرام، محکم، مُتشابہ، اَمثال

۲۔ حلال، حرام، امر، نہی، زَجر، اَخبار، اَمثال

۳۔ وعد، وعید، حلال، حرام، مواعظ، احتجاج، اَمثال

۴۔ امر، زَجر، ترغیب، ترھیب، جَدل، قصص، اَمثال

۵۔ اوامر، زواجر، انباء، عتاب، وعظ، قصص، اَمثال

۶۔ امر، نہی، وعد، وعید، اباحۃ، ارشاد، اعتبار

۷۔ واقعات و قصص، توحید، تعلیمات، اوامر، نواہی، عبادات، معاملات

نَزلَ القُرآنُ اَرْبَعَ ارباع رُبْعٌ فِینا ورُبْعٌ فِي عدُوِّنا ورُبْعٌ سُنَنٌ وامثالٌ ورُبعٌ فرائض واحکامٌ

اور حضرتِ دبّاغ کے بقول سات حروف یہ ہیں:

حرفِ نبوّت، حرفِ رسالت، حرفِ آدمیت، حرفِ رُوح، حرفِ علم، حرفِ قبض، حرفِ بسط

اِبراز المعانی مِنْ حرزالامانی فِی القِراءات السّبع لِلامام الشّاطبی میں یہ شعر ملتے ہیں

اَلَا اِنَّ الْقُرآنَ تِسْعَةُ اَحْرُفٍ　　سَاُنْبِئکَهَا فِي بیتِ شعرٍ بِلا خَلَلِ

حلال، حرامٌ ، مُحکَمٌ مُتشابِه　　بشیرٌ ، نذیرٌ ، قِصَّةٌ، عِظَةٌ مَثَلُ

یہاں تعداد سات سے بڑھ کر نو ہو گئی ہے۔

مگر اصولِ کافی میں منقول ہے : قُلْتُ لِاَبِي عَبْداللهِ : اِنَّ النَّاسَ یَقُولُون اَنَّ القُرآنَ نزل عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ - فقال کَذَّبُوا اَعداءُ اللهِ نَزَلَ عَلٰی حَرفٍ واحِدٍ مِنْ عِنْدِالواحِدِ -

امام جعفر صادق نے کس قطعیت کے ساتھ اس روایت کا انکار کیا ہے۔

ان کے والد ماجد امام باقر کی رائے بھی یہی ہے: عَنْ ابی جعفرٍ:

قَالَ : اِنَّ الْقُرآنَ وَاحِدٌ نَزَلَ مِنْ عِنْدِالواحِدِ وَلٰکِنَّ الْاَختِلافَ یَجِيْءُ مِن قِبَلِ الرُّوَاةِ

اختلافِ قرأت تو خیر۔ حضرت اَبُو مُوسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ قُرآن میں سورہ برآءة جتنا ایک سُورہ تھا جو اٹھالیا گیا ۔ اور اس میں سے صرف اتنا حصہ محفوظ رکھا گیا

اِنَّ اللهَ لَیُؤَیِّدُ هٰذَا الدِّیْنَ بِاَقْوامٍ لاخلاقَ لَهُمْ ولو اَنَّ لِابْنِ آدَمَ وادِیَینِ مِنْ مالٍ لَتَمَنّٰی وادیاً ثالثاً وَلایَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّا التُّرابُ وَیَتُوبُ اللهُ علٰی مَنْ تاب

ابی واقد اللّیثی کا کہنا ہے ایک روز میں رسولؐ اللہ کی خدمت میں گیا تو آپ نے فرمایا: اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّا اَنْزَلْنَا الْمَالَ لِاقامِ الصَّلٰوةِ وَاِیتاءِ الزَّکَاةِ وَلَو اَنَّ لِابْنِ آدَمَ وادِیاً مِنْ ذَهَبٍ لَاَحَبَّ اَنْ یَکُوْنَ اِلَیْهِ الثّانِي ولوکانَ اِلَیْهِ الثّانِي لَاَحَبَّه اَنْ یَکُونَ اِلَیْهِمَا الثَّالِثُ وَلا یَمْلَأُ جوفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّاالتُّرابُ وَیَتُوبُ اللهُ عَلٰی مَنْ تَاب

حضرت ابُو مُوسیٰ اشعری ہی سے روایت ہے کہ ہم ایک ایسی سورت پڑھا کرتے ہیں جس کو ہم مُسَبِّحات سورتوں میں سے کسی ایک سورت کے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ میں نے اس میں سے اتنا ہی یاد رکھا ہے

یَااَیُّهَا الَّذِیْنَ لاتَقُولُوا مالا تَفْعَلُونَ فَتُکْتَبُ شَهادةً فِي اَعناقِکُمْ فَتُسْئَلُونَ عَنْها یومَ الْقِیامَةِ ـ

حذیفہ کہتے ہیں: تم سورة برأة کا اب صرف چوتھائی حصہ پڑھتے ہو۔ باقی کا تین چوتھائی اٹھالیا گیا۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ کے زمانے میں سورة الاحزاب میں دو سو آیتیں پڑھی جاتی تھیں ـ

حضرت عائشہ ہی سے رضاعت کے بارے میں ایک روایت منسوب ہے :

عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِي اَنَّها قالَتْ : کانَ فِیما اُنْزِلَ ﴿حَیْثُما اَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ﴾ مِنَ الْقُرآنِ عَشْرُ رَضَعاتٍ ﴿معلوماتٍ﴾ یُحَرِّمْنَ ثُمَّ نُسِخْنَ بِخَمْسٍ معلوماتٍ ﴿یُحَرِّمْنَ﴾ . فَتُوُفِّيَ رَسُولُ الله وهُنَّ ﴿هِيَ﴾ مِمَّا یُقرأُ فِي ﴿مِنَ﴾ الْقُرآنِ﴾ -

انہی کے بارے میں ہے کہ ان کے مُصحف میں اِنَّ اللهَ وَ ملائکتَهُ یُصَلُّونَ عَلَی النَّبِيِّ کے بعد یہ الفاظ تھے: وَعَلَی الَّذِیْنَ یُصَلُّونَ الصُّفُوفَ الاَوَّلَ

بخاری کتاب المحاربین ۸۱۵ : ابن عباس سے روایت ہے: کہ حضرت عمرؓ نے کہا: میں ڈرتا ہوں کہ مرور وقت کے ساتھ لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگیں کہ ہمیں کتاب اللہ میں رجم کا حکم نہیں ملتا۔ پھر اللہ نے جو حکم ٹھہرایا ہے اس کو چھوڑ کر گمراہ بن جائیں:

الا وانّ الرّجم حقّ علیٰ من زنیٰ وقد احصن اذا قامت الْبَیّنَۃُ اوکانَ الحَمْلُ اوالاعتراف

ہر شادی شدہ زناکار کو سنگسار کرنا فرض ہے ۔ زنا عینی شاہدوں کے ذریعے ثابت ہو یا حمل اور اقرار سے ۔

۸۱۶/۷/۸: اسی قرآن میں رجم کی آیت بھی اللہ نے اتاری ہے۔ ہم نے اس کو پڑھا اس کا مطلب سمجھا اس کو یاد رکھا۔ اب میں ڈرتا ہوں کہیں وقت گزرنے کے ساتھ کوئی کہنے والا یہ نہ کہنے لگے: خدا کی قسم رَجم کی آیت تو ہم کتاب اللہ میں نہیں پاتے!

والرّجْمُ في کتاب الله حقّ عليٰ منْ زنیٰ اذا اُحصِن من الرّجال وَالنِّساءِ اِذا قامتِ البَیّنَۃُ اَوْ کَانَ الحَبَلُ اوالاعْتراف

﴿ثمّ اِنّا کُنّا نقرأُ منْ کتاب الله﴾ : انْ لاتَرْغبُوا عنْ اٰباءکُمْ فَاِنّهُ کُفْرٌ بکُمْ انْ تَرْغبُوا عَنْ اٰبائِکُمْ ﴿اَوْ اِنّ کُفْرًا بکُمْ اَنْ تَرْغَبُوا عنْ اٰبائِکُمْ﴾

مُسلم : کتابُ الحُدود ۱۹۱۵ : میں کم و بیش یہی الفاظ اَوِ لاعتراف تک ابن عباس سے مروی ہیں۔ ۱۹۱۶ میں زُہری کی روایت بھی اسی کی مؤید ہے۔

مُؤطّا امام مالک (جسے محدّث رزین اور ابنُ الاثیر نے سُنَن ابن ماجہ کی جگہ کُتُبِ صِحاح میں رکھا ہے) (کتاب الحدُود) میں عبداللہ ابن عباس کے حوالے سے روایت ہے:

سَمِعْتُ عُمَر ابْنَ الخَطّاب یَقُولُ : اَلرّجْمُ في کتابِ اللهِ حَقٌّ عَلیٰ مَنْ زَنیٰ مِنَ الرّجالِ وَالنِّساءِ اِذا اَحْصَنَ اِذا قامَتِ الْبَیّنَۃُ اَوکانَ الحَبلُ اَوالاعتراف

دوسری روایت سعید بن المسیّب کے حوالے سے حضرت عُمر ہی کی ہے:

وَالّذِي نَفْسِي بیَدِه لولا اَنْ یَقُولَ النّاسُ زادَ عُمَرُ في کتابِ اللهِ لَکَتَبْتُها : اَلشّیْخُ وَالشّیْخَۃُ اِذا زَنَیا فارجُمُوها اَلْبَتّۃَ فَاِنّ قد قرأناها

امام مالك اَلشّیخُ والشّیْخَۃُ کی بعد تَشرِیحاً اَلثّیِّبُ وَالثّیِّبَۃُ کے الفاظ بڑھاتے ہیں

مُؤطّا امام محمّد (کتاب الحُدود فِی الزِّناءِ ۶۸۹) میں یہ الفاظ ہیں:

اَنّهُ سَمِعَ عُمَرَ ابْنَ الخَطّابِ یَقُولُ اَلرّجْمُ في کتابِ اللّٰهِ حَقٌّ عَلیٰ مَنْ زَنیٰ اِذا اُحْصِنَ مِنَ الرِّجالِ وَالنِّساءِ اِذا قامت عَلَیْهِ الْبَیّنَۃُ اَو کَانَ الحَمْلُ اَوِالاعتراف

(علامہ آلوسی اپنی تفسیر "رُوح المعانی" میں حضرت عمرؓ کے بیان میں یہ الفاظ بڑھاتے ہیں: نکالاً مِنَ اللهِ وَاللهُ عَزیزٌ حَکِیْمٌ)

۶۹۰ میں یہ الفاظ ہیں: سعید بن المسیَّب کی روایت ہے:

وَاَنا وَالَّذِي نَفْسي بِيدِه لولا انْ يَّقول النّاسُ زاد عمر ابن الخطّاب في كتاب اللّهِ لَكَتَبْتُها : اَلشّيْخُ والشّيْخَةُ اِذا زَنَيا فَارْجُموها اَلْبتّة فَاِنّا قدقرأنا ها

امام ابو عُبید فرماتے ہیں:

حَدَّثنا اسماعيل بن جعفر عن المبارك بن فصاله عن عاصم بن ابي النّجود عن زربن حبيش قالَ : قَالَ لي ابي بن كعب : كائن تعد سورة الاحزاب ؛ قلتُ اثنتين وسبعين آية اوثلاثة وسبعين آية ـ قال : ان كانت لتعدل سورة البقرة وان كنّا لَنقرأُ فيها آيَةَ الرّجْم قُلتُ : وَما آيَةُ الرّجْمِ ؟ قالَ : اِذا زَنيا الشّيخُ والشّيْخَةُ فَارْجمو هُما اَلْبَتّة نكالاً مِنَ اللهِ وَاللهُ عَزِيزٌ حكيمٌ

یعنی: زر بن حُبَیش سے اُبَی بن کعب نے فرمایا کہ جانتے ہو سورۂ احزاب کی کتنی آیتیں تھیں؟ انہوں نے کہا: یہی کوئی ۷۲، یا ۷۳۔

فرمایا: کہ سورۂ احزاب ابتدا میں سورۂ بقرۃ جتنی تھی۔ اور اس میں ہم آیۂ رجم بھی تلاوت کرتے رہے ۔ زرّ نے پُوچھا: آیۂ رجم کیا تھی؟

بولے: اذا زنیا——————

ابی امامہ کی خالہ نے کہا: بے شک ہم کو رسول اللہ نے آیۂ رجم یوں پڑھائی: اَلشّيخُ وَ الشّيخَةُ فَار جُوهُما اَلْبَتّة بما قضيا مِنَ اللّذة

"محدّث امام ابو یَعلیٰ موصلی اپنی سند سے روایت کرتے ہیں کہ:

حدّثنا عبيدالله بن عمر القواريري حدّثنا يزيد بن زريع حدثنا ابوعون عن محمّد بن سيرين قالَ ابن عُمر ، نُبّئتُ عن كثير بن الصّلْت قال : كُنّا عِنْدَ مروان وَفينا زيد بن ثابت كُنّا نقرأُ : اَلشّيخُ والشّيْخَةِ اِذا زَنَيا فَارْجُموهُما البتّة

قَالَ مروانُ : اَلاكَتَبْتَهافي اَلْصحَفِ ؟ قَالَ : ذكرنا ذٰلك وَفينا عمر بن الخطّاب

فقال : انا اشفيكُم من ذٰلِكَ — قَالَ : قُلْنا : فَكَيْفَ ؟

قَالَ : جاءَ رَجُلٌ اِلَي النّبِيّ صَلَّي اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : فَذكر كذا وكذا وذكر الرّجْم فقالَه يا رسُولَ الله ! اُكْتُبْ لي آيَةَ الرّجْمِ ! قالَ : لا اَسْتطِيْعُ الآنَ !

یعنی: حضرت عبداللہ بن عمر نے کثیر بن الصّلت کے حوالے سے بیان کیا کہ ابن الصّلْت نے کہا کہ: ایک بار ہم خلیفہ مروان کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ اور ہمارے ساتھ زید بن ثابت بھی تھے۔ اثنائے گفتگو آیۂ رجم اَلشَّيخُ وَالشَّيخۃ کا ذکر چھڑ گیا (کہ یہ قرآن ہے یا نہیں؟)

اس پر مروان نے زید بن ثابت سے کہا کہ: آپ نے اسے مُصحف میں کیوں درج نہیں کیا؟ حضرت زید نے جواب دیا کہ: اسی نوعیّت کا ایک مباحثہ فاروق اعظم کی موجودگی میں ہمارے مابین بھی ہوا تھا۔ تو فاروق اعظم نے کہا تھا کہ: میں تمہیں دربار نبوی کا واقعہ سناتا ہوں جس سے تم سب کی تشفّی ہو جائے گی:—

مجلس نبوی میں ایک شخص حاضر ہوا اور آزاد موضوع پر باتیں کرتے کرتے رَجم کا ذکر آگیا اس پر سائل نے حضور صلی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم سے خواہش کی کہ آیۂ رجم اسے لکھ کر دیا جائے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہُ علیہِ وَسلَّم نے اس کی خواہش کو مسترد کرتے ہوئے فرمایا: لاَاَستَطِیعُ الآن ۔ مجھے یہ اتھارٹی نہیں ہے۔ کہ اب میں وحیٔ قرآنی میں بھی اضافہ کروں یا آیۂ رجم کو قرآنیات میں جگہ دے ڈالوں!"

معلوم نہیں زور "اَلشَّیخُ وَالشَّیخۃُ" پر کیوں ہے۔ رخصتِ رمضان کی مبینہ منسوخ شدہ آیت جن لوگوں کے حق میں بحال و قائم ہے۔ ان میں بھی سرفہرست یہی ہیں۔ اور یہ الفاظ ادھیڑ عمر نہیں بلکہ پیرِ فرتوت یا بڈھے کھوسٹ کے معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ یعنی عملاً از کار رفتہ لوگ ۔ جن کا عالم یہ ہو:

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

ان بیچاروں کے قوا تو پہلے ہی مضمحل ہو چکے ہوتے ہیں۔ مثل ہے کہ یک پیری و صد عیب ۔ بڑھاپا نہ صرف گونا گوں عوارض و امراض کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ بلکہ خود سب سے بڑا عارضہ ہے بڈھا بڈھی جو بغیر سہارے کے چل پھر بھی نہ سکیں۔ جو صرف انتظار مرگ میں زندگی کے سانس گن رہے ہوں ۔ وہ شوقِ فضول اور جرأت رندانہ ـــــ وہ فرصت کاروبار شوق ۔ کہاں سے لائیں گے جس سے ناجائز تعلقات کا شاخسانہ پال سکیں؟

یہ باتیں تو عُنفوانِ جوانی کی ہیں (در عنفوانِ جوانی چنانکہ افتد و دانی)

عہدِ شباب کی ہیں (کہ اَلشَّبابُ شُعبَۃٌ مِنَ الجُنُونِ) جب رگوں میں لہو گلگن کھلتا ہے

جس کی کیفیت کو صاحبِ "تذکرہ" اپنے ابوالکلامی اسلوب میں یوں بیان کرتے ہیں:

"آنکھیں کُھلیں تو عہدِ شباب کی صبح ہو چکی تھی ۔ اور خواہشوں اور ولولوں کی شبنم سے خارستان ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا ۔ اپنی طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس صبحِ فریب کے لیے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے نہ ناامیدی و ناکامی کی شام۔

یہ سارا شہرستان امید اور نگارخانۂ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل کی کام جوئیوں کے لیے بنا ہے۔ اور گویا گوشہ گوشہ اور ذرّہ ذرّہ ہماری ہوسناکیوں کے لیے چشم براہ ہے۔ جس طرف کان لگایا یہی صدا سنائی دی۔ معلوم نہیں اپنی ہی گنبد غفلت اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی یا نوگرفتارانِ طلسم شباب کی ہوش ربائیوں کے لیے خودساز ہستی کا نوائے فریب ہی یہی ہے:

شہریست پُر زِخوباں وز ہر طرف نگارے
یاراں صدائے عام است گرمی کنید کارے!
غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا
سرمستی و سرگردانی نے جام بھرے

جنونِ شباب نے ہاتھ پکڑا۔

اور ولولوں اور ہوَسوں نے جو راہ دکھلائی دل کی خود فروشیوں نے اس کو منزلِ مقصود سمجھا۔

ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہُوئی
لیکن پھر اس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا:
راہ ہے تو یہی راہ ہے اور وقت ہے تو اسی کا:
ساقیا : مرنج از من عالمِ جوانی ہاست

جس طرف نظر اٹھائی ایک صنم آبادِ الفت و پرستش نظر آیا ۔ جس میں مندروں اور مُورتیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہر مندر جبینِ نیاز کا طالب۔ ہر مُورتی دل فروشی و جاں سپاری کے لیے وبالِ ہوش ۔ ہر جلوہ برقِ تمکین و اختیار۔ ہر نگاہ بلائے صبر و قرار:

الفراق اے صبر و تمکیں : الوداع اے عقل و دیں!

جس راہ میں قدم اٹھایا۔ زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا۔ جس گوشے میں پناہ لی۔ وہی زندانِ ہوش و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو ذکر کیجئے۔ ایک زنجیر ہو تو کڑیاں گنیے۔ دل ایک تھا مگر تیر ہزاروں ہاتھوں میں تھے۔ نظر ایک تھی مگر جلووں سے تمام عالم معمور تھا۔ ہر کشش نے اپنا تیر چلایا۔ ہر رہزن نے اپنی کمند پھنکی۔ ہر فسوں ساز نے اپنا افسونِ محبّت پھونکا ۔ ہر جلوۂ ہوش ربا نے صرف اپنے ہی دامِ الفت میں اسیر اور اپنی ہی فتراکِ اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا۔

وائے بر صید کہ یک باشد و صیّادے چند!

(القصہ):

چو پرسشِ گُنہم روزِ حشر خواہد شد
تمسّکاتِ گناہان خلق پارہ پارہ کُنند"

معلوم نہیں ان بزرگوں نے اَلشّیخُ وَالشَّیخۃُ کی جگہ اَلشّابُ وَالشّابۃُ، اَلفَتٰی وَالفَتاۃُ ، الرَّجُلُ وَالمَرءَۃُ یا قرآن ہی کے الفاظ الزّانیۃُ وَالزّانی استعمال کیوں نہیں کیے؟ اور پھر شادی شدہ کی کیا تخصیص ہے؟

عالمِ تجرّد میں تو داعیۂ شہوانی کہیں سرکش ، کہیں عناں گسیختہ، کہیں مُنہ زور ہوتا ہے۔ اور پھر اگر دونوں ہی الشّیخ والشّیخۃ نہ ہوں ، اور دونوں ہی شادی شدہ نہ ہوں۔

یا ایک آزاد (مالک) ہو دوسرا غلام (خدمت گار)

یا ایک ان میں سے جوان ہو اور کنوارا یا کنواری ہو۔ تو سزا کیا صورت اختیار کرے گی؟ اور حمل کی صورت میں نومولود کی ذمہ داری کون اٹھائے گا؟ اس کا معاشرے میں مقام کیا ہو گا؟ وہ حلالی ہو گا یا حرامی؟ پورا شہری ہو گا یا دوسرے درجے کا؟

زنا کاری (بِالجَبر اور بِالرِّضا) کا موضوع بہت الجھا ہُوا ہے۔ اور بے شمار پیچ در پیچ، نازک اور بظاہر ایک حد تک

لاینحل مسائل کو جنم دیتا ہے۔ ہم اسے یہیں پر چھوڑتے ہیں۔ ہمارا موضوع تو تحریفِ قرآن ہے۔ اس لیے خود کو اسی تک محدود رکھتے ہیں:

ان روایات کی موجودگی میں قُرآن کے بارے میں کیا رائے قائم ہوتی ہے اور اس میں اور دوسرے مُحرّف و منسوخ صحیفوں میں مابہِ الامتیاز کیا رہ جاتا ہے؟ اور کس مُنہ سے ہم ان پر زبانِ طعن دراز کر سکتے ہیں؟ کیا وہ یہ نہیں کہیں گے:

کیں گنا ہیست کہ در شہرِ شما نیز کُنند؟

پرایوں کی دراندازی کا رونا کوئی کیا روئے
جب اپنے کر رہے ہوں آپ اپنی آبرو ریزی

آہ:

میں نقش پا کی طرح پائمال اپنا ہُوں

"گمشدہ آیات کا مجموعی میزانیہ ذیل کی جدول کے مطابق کچھ یوں بنتا ہے

۱ ۔ سورۂ احزاب میں گم ہونے یا عہد عثمان میں ضائع کی جانے والی آیات	۲۰۰
۲۔ براءۃ جتنی کامل سورت	۱۳۰
۳۔ سورۃ الخلع	۱۲
۴۔ سورۃ الحفدۃ	۶
۵۔ آیۂ رضاعت	۱
۶۔ آیۂ رجم	۱
۷۔ درود والی آیت کا تتمہ	۱
۸۔ بَلِّغُوا عنا قومنا والی آیت	۱
۹ ۔ لو کان لابنِ آدمَ وادیانِ والی آیتیں	۲
۱۰۔ سلیمان بن ارقم والی روایت کی دو سورتوں کی آیتیں	تعداد نامعلوم
میزان	۳۵۴

منسوخ آیتوں کی تعداد تو اوّل دن سے متنازع فیہ ہے ———

تفسیراتِ احمدیہ (مُلّا احمد جیون) میں جا بجا اس قسم کے فقرے ملتے ہیں:

——— یہ آیت ہمارے نزدیک منسوخ اور شافعی کے نزدیک غیر منسوخ ہے

——— صرف امام شافعی کے نزدیک منسوُخ ہے۔ اور اَحناف کے نزدیک منسوخ نہیں۔

"غالباً اسی سے شہ پا کر ایف ڈی مُلّا نے "اصولِ شرع محمدی" میں لکھ دیا ہے: انگریزی قانون شریعتِ مُحمّدی کو

منسوخ کر سکتا ہے۔ کہ خود مسلمان بھی فقہی احکام کے ذریعے قرآن کو منسوخ تسلیم کرتے آئے ہیں!"

کسی صاحبِ دل نے کیا دردمندی سے کہا تھا:

اصلِ دیں آمد کلامُ اللہ معظّم داشتن!

——— سب کلاموں سے ہے بالاتر کلام اللہ کا

——— سخنِ شاہ شاہِ سخن است

انہی اگلے زمانے کے لوگوں پر بس نہیں ہے۔ زمانۂ جدید کے ایک مُحقِق پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ (مقیمِ پیرس) اپنے "خطباتِ بہاول پور" کے پہلے خطبے "تاریخِ قُرآن مجید" میں جمع قُرآن کا بیان کرتے ہُوئے فرماتے ہیں:

"جب پُورا قُرآن لکھا جاچکا۔ تو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عَنہُ کہتے ہیں کہ: میں نے اسے شروع سے آخر تک پڑھا۔ اس میں مجھے ایک آیت کم نظر آئی۔ یہ آیت میرے حافظے میں تو موجود تھی۔ مگر اس تحریری نسخے میں موجود نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے شہر کے چکّر لگائے ہر ہر گھر میں داخل ہوا۔ اوّلاً مہاجرین کے گھروں میں کسی کے پاس یہ آیت تحریری صورت میں موجود نہیں تھی۔ پھر انصار کے گھر گیا۔ بالآخر ایک شخص کے پاس ایک تحریری نسخہ ملا۔ وہ نسخہ رسول اللہؐ کے سامنے پڑھا ہوا تھا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کی ہدایت تھی کہ جب تک دو تحریری نسخے نہ ملیں اس وقت تک اس کو قرآن کے طور پر قبول نہ کیا جائے۔ جب کہ یہ آیت صرف ایک تحریری نسخے میں ملی تھی۔ لیکن یہاں مشیّتِ خداندی اپنا اثر دکھاتی ہے اتّفاق سے یہ وہ شخص تھا۔ جس کے متعلّق رسولؐ اللہ نے ایک مرتبہ اس کے کسی کام سے خوش ہو کر کہا تھا: "کہ آج سے تمہاری شہادت دو شہادتوں کے مساوی سمجھی جائے گی!"

غرض یہ قدرت کی طرف سے پیشگی انتظام تھا۔ اس طرح اس آیت کو انہوں نے ایک شخص سے لے کر اسے نقل کیا۔ اور پھر اسے پڑھا۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے قرآن کو دوبارہ پڑھا۔ تو ایک اور آیت کی بھی کمی نظر آئی۔ ممکن ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ ہو اس آیت کے متعلّق۔ بہر حال وہاں بھی یہی کیا جاتا ہے۔ اس نام والے ایک شخص نے وہ چیز بیان کی۔ فرض کیجئے۔ کہ یہ آیتیں جن کا ہمارے پاس صراحت سے ذکر موجود ہے۔ کہ کون سی آیتیں تھیں۔ اگر آج ہم ان کو قُرآن مجید سے خارج کر دیں۔ تو کوئی اہم چیز خارج نہیں ہوتی۔ قرآن مجید کی جن آیتوں کی طرف یہ اشارہ ہے۔ ان کا مفہوم قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی موجود ہے!"

"میں یہ نہیں کہتا کہ قرآن مجید کی کچھ آیتیں نکال لی جائیں۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ قرآن مجید کی جن دو آیتوں کے متعلّق یہ روایت آئی ہے۔ کہ وہ دونوں تحریری صورتوں میں نہیں ملیں۔ ان میں حقیقتاً کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے۔ کہ اگر وہ اتفاقاً نکل بھی جائیں تو اس سے قرآن مجید کی

تعلیم متاثر ہو۔ مثلاً ایک آیت میں یہ ذکر ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ فرض کیجیے یہ آیت نہ ہوتی تو اس کا امکان تھا کہ اسلام صحیح صورت میں باقی نہ رہ سکے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جن آیتوں کی طرف مذکورہ روایت میں اشارہ ہوا ہے ان میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ مثلاً یہ عبارت کہ لقد جاء کم رسول من انفسکم ، عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤوف رحیم - فان تولوا فقل حسبی اللہ لا الٰہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم ۹:۱۲۸،۱۲۹ اس میں یہ ذکر ہے کہ رسول اللہؐ ایک ایسے نبی ہیں۔ جن کو اپنی امت کے ساتھ بڑی شفقت ہے ظاہر ہے کہ یہ رسول اللہ کی تعریف کی چیز تو ہے۔ لیکن اس میں کوئی ایسی بات نہیں کہ یہ عبارت نہ ہوتی۔ تو اسلام باقی نہ رہ سکتا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔ کہ قرآن مجید کی آیتوں کے حذف کرنے کا امکان پایا جاتا ہے۔ ویسے میں آپ سے عرض کروں گا۔ کہ قرآن کی آیتیں مکرر ہیں۔ ایک ہی آیت بار بار آتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ان میں سے ایک حذف کر دی جائے۔ تو ظاہر ہے کہ قرآن کی تعلیمات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ مثلاً سورۂ رحمان میں فبای آلاء ربکما تکذبن کوئی پندرہ بیس دفعہ آیا ہے (تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟ یہ آیت ۳۱ دفعہ آئی ہے —— ع ۔ ع ۔ خ) ان میں سے اگر ایک جگہ حذف کر کے دو آیتوں کو ایک آیت بنا دیا جائے۔ تو قرآن مجید میں جو چیزیں انسان کی تعلیم کے لیے آئی ہیں۔ ان میں عقلاً کوئی کمی نہیں آئے گی۔ یہ نہیں کہ اس کا امکان ہے۔ یا یہ کہ یہ مناسب ہے۔ میں یہ بالکل نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید کی جس آیت کے متعلق حضرت زید بن ثابتؓ کو تلاش کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اسلام کی تعلیم پر مؤثر ہو اس میں رسول اللہ کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ رسول اللہ کی تعریف میں اور آیتیں بھی موجود ہیں ۔ یہ تھا میرا منشا!"

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے!
جناب کے ارشاد کے مطابق تو تین چوتھائی قرآن حذف کیا جاسکتا ہے۔

چہ بے خبر زمقامِ کلامِ ربانیست!

قرآن کی کل آیات ۶۶۶۶ ہیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

آیاتِ وعدہ ۱۰۰۰	آیاتِ تحلیل ۲۵۰
آیاتِ وعید ۱۰۰۰	آیاتِ تحریم ۲۵۰
آیاتِ نہی ۱۰۰۰	آیاتِ تسبیح ۱۰۰
آیاتِ امر ۱۰۰۰	آیاتِ مفرد (متفرقہ) ۶۶

آیاتِ مثال ۱۰۰۰

آیاتِ قصص ۱۰۰۰

قُرآن کا ہر لفظ ، ہر حرف بابرکت ہے۔ مقدّس ہے، پُراسرار ہے ، پُر انوار ہے۔

"قرآن کے ایک ایک حرف اور لفظ میں تاثیر و تفسیر کے بے شمار پہلو پنہاں ہیں۔ جس طرح اس کے معانی کو اہمیّت حاصل ہے۔ اسی طرح اس کے الفاظ بھی اہم اور بابرکت ہیں۔ قرآن کے الفاظ و حروف میں ایک طرح کا کیمیائی اثر یا سحر آفرینی ہے۔ جس سے قلب و ذہن جلا پاتا ہے۔ انسانی جسم حسن و رعنائی کے قالب میں ڈھلتا اور عالمِ کون و مکاں میں انقلاب رُونما ہوتا ہے"

(شو آن: ڈائی مینشنز آف اسلام)

"ہم ان لوگوں کی رائے سے قطعی اتفاق رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ جو اس کتاب کو صرف مفہوم و معنی کے اعتبار سے کتاب سمجھتے ہیں۔ اور اس کی زبان، الفاظ، حروف اور متن کو کسی تقدیس و حرمت کا سزاوار قرار نہیں دیتے۔ یا جو اس کے بارے میں قشر اور مغز کی اُتھلی تقسیم روا رکھنے کے قائل ہیں ۔

[(من زقُرآں مغز را برداشتم استخواں پیشِ سگاں انداختم (نعوذُ باللہ، ہزار بار نعوذُ باللہ ——— ع ـ ع ـ خ)]

ہمارے نزدیک جس طرح اس کے معانی لائق صد احترام ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اس کے الفاظ و حروف بھی تقدیس و اکرام کے حامل ہیں۔ یہی نہیں ـ اس کے الفاظ و حروف بھی نازل ہوئے ہیں۔ اور ان کا تعلّق بھی معنی و مفہوم کی طرح آسمان ہی سے ہے۔ زمین سے نہیں۔ اس لیے یہ بھی بجائے خود کتاب کے مفہوم میں داخل ہیں!"

بقولِ زملکانی: قرآن کا اعجاز اس کے حسن تالیف میں مضمر ہے۔ یعنی اس کے مفردات اور معانی دونوں میں یہ خصوصیت پنہاں ہے۔ کہ ان کے انتخاب میں صوت و آہنگ اور ترجمانی کے اعتبار سے اس مرتبہ و درجہ کو ملحوظ و مرعی رکھا گیا ہے۔ جو بلند تر ہے۔"

قاضی ابوبکر اعجاز القُرآن میں رقم طراز ہیں: "قُرآن کے اسلوب میں ایک خاص انداز کی تازگی، نکھار اور نغمگی پائی جاتی ہے۔ ابداع، طرفگی اور ندرت کا یہ شاہکار بہر حال اس لیے ہے۔ کہ اس کو بدیعُ السّماواتِ والارض کے کلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔"

اس کی شان تو وہ ہے کہ سَبعہ مُعَلّقات کے شاعر حضرت لَبید بن ربیعہ سے جب پُوچھا گیا۔ کہ آپ شعر کیوں نہیں کہتے؟ تو بولے: اَبَعْدَ الْقُرآنِ ؟ اسی تاثیرِ کلام نے کُفّار سے کہلوایا تھا: بَلْ ھُوَ شاعِر

تلاوتِ قُرآن بجائے خود کارِ ثواب و تقرّب ہے

یَتْلُون آیات اللہ آناءَ اللَّیل ۳ : ۱۱۳

تلاوت کرتے ہیں اللہ کی آیات کی اوقاتِ شب میں

وَاِذَا سَمِعُوا مآ اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُولِ تَرٰی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۵ : ۸۳

اور جب سنتے ہیں وہ اس کو پیمبر پر جو اترا دیکھتا ہے ان کی آنکھوں کو تو بہتے آنسوؤں سے، اس سبب سے کہ انہوں نے حق کو پہچانا ۔ (کیا اس کو شناخت)

انَّ قرآن الفجر کان مشهوداً ۱۷ : ۷۸

فجر کو قرآن کا پڑھنا ہے مشہود اس میں کوئی شک نہیں

(یعنی ہوں اس میں فرشتے بھی شریک)

(فجر کا قرآن ہے ساعت نور و ظہور)

انَّ الّذین اُوتوا العلم من قبلہٖ اذا یتلیٰ علیھم یخرّون للاذقان سُجّداً ۱۷ : ۱۰۷

— علم/قبل اس سے جن کو ارزانی ہوا/ان پہ کی جانے تلاوت اس کی جب/ٹھوڑیوں پر گر پڑیں سجدہ کناں۔

الم یانِ للّذین اٰمنوٓا انْ تخشع قلوبُھم لذکر اللہ ۵۷ : ۱۶

نہیں آیا ہے کیا وقت اہل ایماں کے لیے دل نرم ہوں ان کے خدا کے ذکر کی خاطر ؟

رسول اکرمؐ کے چند ارشادات ہیں:

زیّنوا القرآن باصواتکم : (ابنُ الاثیر : ھوالمقلوبُ ای زیّنوا اصواتکُمْ بالقرآنِ

—— زیّنوا القرآن بالاصوات الحسن

—— لکُلِّ شيءٍ حلیۃٌ وحلیۃُ القرآنِ حُسْنُ الصَّوْتِ

—— حسّنوُا القُرآن باصواتِکُمْ فَانَّ الصَّوت الحَسن یَزِیْدُ القُرآنَ حُسْنًا

﴿حُسنُ الصَّوتِ زینۃُ القُرآنِ ——﴾

—— اِن الّذي یقرأُ القُرآنَ لہٗ اَجْرٌ وانَّ الّذي یسْتَمِعُ لہٗ اَجرانِ

—— فانَّ اللہ یا جُرُکُمْ ، علیٰ تلاوۃ بکُلِّ حرفٍ عشرَ حَسنَاتٍ

—— نجاۃُ الخَلْقِ فِي القُرآنِ — فاسْمعْ وکُنْ مُتَرتِّلاً یومًا ولَیلاً

—— تعلّمُوا ھٰذا القُرآن فانّکُمْ تُوجَرُوْنَ بِتلاوۃِ کُلِّ حَرْفٍ عشرَ حَسناتٍ — اما انّي لا اقُولُ بآلٓمٓ ولکن بالَف ولام ومیم بکُلِّ حرفٍ عشرَ حسناتٍ

—— عَنْ عَبْداللہ بْنِ مَسْعُودٍ یقُولُ : قالَ رسولُ ﷺ اللہ : منْ قرَأَ حرفًا مِنْ کِتابِ للّٰہ فلَہٗ (کُتِب لَہٗ) بِہٖ حَسَنَۃٌ وَالحَسَنَۃُ بِعَشْرِ اَمثالِھا — لااَقُولُ آلٓمٓ حرف بل الف حرفٌ ولامٌ حرفٌ ومیمٌ حرفٌ .

جو کتاب اللہ کی تلاوت کرتا ہے۔ اس کو ہر ہر حرف کے بدلے ایک نیکی کا سزاوار قرار دیا جائے گا۔ جو دس نیکیوں کے برابر ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آلٓمٓ ایک حرف ہے۔

بلکہ الف ایک حرف ہے۔ لام دوسرا حرف ہے اور میم تیسرا حرف ہے۔

عَلَيْكَ بِتِلاوَةِ الْقُرآنِ فَاِنَّهُ نُورٌ لَّكَ فِي الْاَرْضِ وَذُخْرٌ لَكَ فِي السَّماءِ

—— نَوِّرُوا مَنَازِلَكُمْ بِتِلاوَةِ الْقُرآنِ

اپنے گھروں کو تلاوت قرآن سے منور کرو۔

—— اَفضَلُ عِبَادَةُ اُمّتِي قِراءَةُ الْقُرآن

میری اُمت کی بہترین عبادت قرآن کی قرأت ہے۔

—— اَلْبَيْتُ الَّذِي يُقرأُ فِيْهِ الْقُرآنُ يَتَراءي لِاَهْلِ السَّماءِ

كما تَتَراءي النُّجومُ لِاَهْلِ الاَرْضِ

جس گھر میں قُرآن پڑھا جاتا ہے۔ وہ آسمان والوں کو اس طرح روشن نظر آتا ہے جس طرح زمین والوں کو تارے دکھائی دیتے ہیں۔

القصہ:

—— نَحنُ نَبْغِي الْقُرآنَ لَفْظًا وَمَعْنًى

ع هُوَ صِقْلُ الْحِجا صِقْلُ اللِّسان

ع معنی و لفظ ہیں دونوں متبرّک اس کے

جہاں تک گمشدہ آیت کی حقیقت ہے بقول مولانا محمد حنیف ندوی:

"حضرت زید کے اس قول کا: کہ میں نے سورۂ توبہ کی آخری آیت کو صرف ابو خُزیمہ انصاری کے ہاں پایا اس لیے درج کر دیا۔ یہ مطلب نہیں کہ یہ آیت خدانخواستہ ان کے علاوہ دوسرے صحابہ کو معلوم نہ تھی۔ آنحضرتؐ نے قُرآن کے ایک ایک لفظ کو اُمت تک پہنچا دیا تھا۔ اور حفاظت و صیانت کے سلسلے میں اس کو اس سطح بلند تک اچھال دیا تھا۔ کہ اس میں کسی شبہ اور تغیّر کی گنجائش ہی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ بات صرف یہ تھی کہ حضرت زید نے جمع قرآن کے بارے میں اس اصول کو مدّ نظر رکھا تھا۔ کہ اس دولت کو جو سینکڑوں سینوں میں محفوظ ہے۔ کتابی شکل میں ڈھالنے کے لیے خارجی ذرائعِ انضباط کا خیال رکھنا چاہیے۔ اور اس وقت تک کوئی سورہ یا آیت درجِ مُصحف نہ ہونے پائے جب تک اس کی توثیق خارجی شہادت سے نہ ہو جائے۔ چنانچہ علّامہ زرکشی کا یہ کہنا بہت معقول ہے: كانَ لِلاِسْتِظْهارِ وَ لَالِلاِسْتِحداثِ الْعِلْمِ —— یعنی بربنائے توثیق ایسا کیا گیا —— نہ یہ کہ ان کو پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا۔ کہ یہ آیت بھی منجملہ دوسری آیات کے سورہ توبہ کا حصہ ہے (اَلبُرھان)"

——مطالعۂ قُرآن

بُخاری میں اس سلسلے میں یہ بیانات ملتے ہیں:

کتاب فضائل القُرآن —— باب جمع القُرآن ۵۰۹، ۵۱۱ —— حضرت زید سے روایت ہے:

سورۂ توبہ کی آخری دو آیتیں لَقَدجَاءَكُمْ —— مجھ کو ابُو خُزَیمہ انصاری کے سوا اور کسی کے پاس لکھی ہُوئی نہ ملیں۔

۵۱۰— خارجہ بن زید بن ثابت نے بیان کیا۔ کہ وہ (زید بن ثابت) کہتے تھے:
جس زمانے میں ہم مُصحف لکھ رہے تھے۔ اس وقت سورۂ احزاب کی ایک آیت کا پتہ نہ چلا وہ حضرت حفصہ کے مُصحف میں بھی نہ تھی۔ اور میں نے بارہا آنحضرتؐ کو وہ آیت پڑھتے سنا تھا۔ آخر ہم نے اس کو تلاش کیا۔ پھر وہ خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس لکھی ہوئی ملی مِنَ المومنینَ رجالٌ صَدَقُوا —— ان کے سوا کسی کے پاس نہ تھی پھر اس کو سورۂ احزاب میں لگا دیا۔

(۴)

خلاصۂ کلام یہ کہ ہم قرآن کو زبان سے تو خالق کون و مکاں کا کلام کہتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر اسے "لاریبَ فیہ" نہیں بلکہ محض ایک کتاب سمجھتے ہیں—ایک ایسی کتاب جس کی ہم من مانی تاویل کر سکتے ہیں۔ جس میں حسبِ منشا اور حسبِ مصلحت کمی بیشی کر سکتے ہیں۔ اس پر ہم غلاف چڑھاتے ہیں گھروں میں بھی اور اخباروں، رسالوں میں بھی۔
یہ ہماری کتنی بے توفیقی ہے کہ ایک سرچشمۂ فیض کے آبِ زلال کو اپنی برخود غلط انانیت، اپنی کج اندیشی و کج نظری، اپنی نافہمی و نادانی سے مکدّر کرنے پر مُصر ہیں۔ اَلعِلمُ حِجابُ اللہِ الاَکبَر غالباً ایسی ہی صورت احوال کے لیے کہا گیا تھا— ہمیں احساس ہی نہیں کہ اس طرح ہم کس 'نامسلمانی' کے مرتکب ہو رہے ہیں۔
اس لیے اوّلاً: ہمیں شرحِ صدر سے ہمیشہ کے لیے جان اور مان لینا چاہیے کہ قرآن جو دَفّتین میں موجود ہے۔ وہ قائم و دائم زندہ و پائندہ ہے۔ کسی کو یہ اختیار نہیں پہنچتا کہ اپنے مصالح و مفادات کی خاطر اس کی کتر بیونت یا تلخیص کرے۔

ثانیاً — ہمارے رسائل و جرائد کو چاہیے کہ وہ قرآنی آیات کو قُرآنی حروف میں لکھیں اور پھر نیچے اس کا ترجمہ دیں۔ تاکہ پڑھنے والے اپنے طور پر 'آزادانہ' صاحبِ مضمون کے استدلال و استنباط کی جانچ پرکھ کر سکیں اور دیکھ سکیں کہ کس حد تک مفہوم قرآن اس کے ذہن رسا و نارسا کی گرفت میں آیا ہے۔
ثالثاً — وہ قُرآنی حروف سے مانوس ہوں۔ ان سے محبت کریں۔ ان کی شکلیں ان کی ذہنی تشکیل میں، ان کی تہذیبِ نفس میں ان کے نظامِ اقدار میں اپنا مؤثر کردار ادا کریں۔ یوں وہ اپنی جڑوں سے پیوستہ ہوں۔ اپنی میراث کو ایک زندہ، نامیاتی وجود کے طور پر قبول کرنا شروع کریں۔ اور ایک آزاد، خوددار اور غیور قوم کہلانے کے مستحق ہو سکیں۔ محرومُ الارث قوم اقوامِ عالم کی برادری میں عرب شاعر جریر کے اس ہجویہ شعر کی مصداق ہی بنتی ہے:

فَغُضِّ الطَّرفَ اِنَّکَ مِن نُمَیرٍ فَلا کَعباً بَلَغتَ وَلا کِلابا
نہیں کعب و کلاب کا ہمسر تو نُمیری ہے۔ آنکھ نیچی کر!

——— اَللّٰھُمَّ اَرِنا حقایقَ الاشیاءِ کَما ھِیَ

خدایا دے ہمیں توفیق ادراکِ حقائق کی
ہو جس میں لوث و آلائش نہ دنیاوی علائق کی!

—— اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ——

ہمیں سیدھے رستے پہ چلنے کی توفیق دے۔

نعمتِ معرفتِ نفس عطا کر ہم کو!

سرخوشِ لذتِ تسلیم و رضا کر ہم کو!

(وَماعَلَیْنا اِلَّا الْبَلاغ!)

مرزا رُسوا

سیّد مسعود

(بہ حوالۂ ادیب)

سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم مرزا محمد ہادی رسوا کی شخصیت اور علمیت سے بہت متاثر تھے اور اُن سے ملنے جایا کرتے تھے۔ رسوا بھی ادیب کی ذہانت اور ذوقِ سلیم کے قائل تھے۔ قدیم اور کمیاب کتابیں جمع کرنے کا شوق دونوں میں مشترک تھا۔ ادیب کو مرزا رسوا کے متعدد دلچسپ حالات اور واقعات معلوم تھے جو وہ اکثر بیان کیا کرتے تھے۔ لیکن اُن کی مطبوعہ تحریروں میں رسوا کا حوالہ زیادہ نہیں ملتا؛ البتہ اُن کے کاغذات میں رسوا سے متعلق حسبِ ذیل اہم قلمی تحریریں موجود ہیں:

۱۔ رسوا کے کچھ حالات	نوشتۂ نامعلوم
۲۔ "مرزا رسوا" (نثری مضمون)	از ادیب
۳۔ مرزا رسوا (ڈراما)	از ادیب
۴۔ مکتوب مرزا رسوا	بہ نام ادیب
۵۔ رسوا کے بارے میں یادداشتیں	از ادیب

ذیل میں یہ تحریریں ان کے متعلق ضروری وضاحتیں اور ادیب کے حوالے سے رسوا کے بارے میں کچھ اور باتیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ رسوا کے کچھ حالات (نوشتۂ نامعلوم)

[یہ حالات دو ورقوں پر تین صفحوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسوا کے کسی قریبی جاننے والے یا عزیز نے ادیب کی فرمائش پر یہ حالات اُن کو لکھ کر (یا لکھوا کر) دیے تھے (بعض دوسری ادبی شخصیتوں کے متعلق بھی اس طرح کی تحریریں ادیب کے کاغذات میں موجود ہیں)۔ اس تحریر سے لکھنے والے کی شخصیت کا سراغ نہیں ملتا لیکن اس میں بتایا گیا ہے کہ رسوا کو کتابیں خریدنے کا بہت شوق تھا، اور رسوا کے بارے میں ادیب کی یادداشتوں (نمبر ۵) کے تیرھویں اندراج "خرید کتب کا شوقِ مفرط مولوی محمد یحییٰ" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس اطلاع کا مآخذ مولوی محمد یحییٰ ہیں۔ اس طرح قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ حالات مولوی محمد یحییٰ کے لکھے ہوئے یا کم از کم بتائے

ہوئے ہیں ، لیکن اُن کے بارے میں اور کچھ معلوم نہ ہو سکا شیخ ممتاز حسین عثمانی نے رسوا کے ایک استاد مولوی محمد یحییٰ لکھنوی کا ذکر کیا ہے جن سے رسوا نے صرف و نحو پڑھی تھی (۱) ۔ عزیز لکھنوی بتاتے ہیں کہ وہ مرکٹے نالے (لکھنؤ) کے پاس ایک مسجد میں رہتے تھے اور یہ کہ "میں بھی اُن کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں" (۲) لیکن اِن حالات کے راوی ظاہر ا رسوا کے یہ استاد مولوی محمد یحییٰ نہیں ہیں ۔

اس تحریر سے رسوا کے بارے میں کئی اہم باتوں کا علم ہوتا ہے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کی عرفیت چھوٹے آغا تھی]

"بعض حالاتِ مرزا محمد ہادی بی ۔ اے ۔ رسوا عرف چھوٹے آغا صاحب مرحوم

آم کے باغ کی فصل ہر سال ضرور خریدتے تھے اور مع اہل و عیال باغ میں کئی مہینے قیام کرتے تھے اور احباب کی آٹھویں دن وہیں باغ میں دعوت ہوتی تھی ۔ اکثر چوگنی کی مٹھاس کے آم کے چاول پکواتے تھے اور مختلف قسم کے کھانے اور پکوان وہیں پکواتے تھے ۔

باغ میں قمیص اور لنگی پہنے ہوئے اکثر گھومتے تھے ۔ ہاتھ میں ایک تبر ضرور ہوتا تھا ۔ قمیص کی جیب میں کاغذ یا ایک چھوٹی سی کاپی اور پنسل ضرور ہوتی تھی اور غزل یا ناول وغیرہ تصنیف کرتے جاتے تھے ۔

اور بارش کے موسم میں بے حد خوش ہوتے تھے ۔

ماش کی دال اور کریلے بہت شوق سے کھاتے تھے ۔ خمیری روٹی بہت پسند تھی ۔

نماز صبح سے فارغ ہو کر باغ میں تفریح کرنے نکلتے تھے اور کئی گھنٹے تک گھومتے پھرتے اور تصنیف کرتے رہتے تھے ۔

کتب بینی کا شوق : گھر میں کتاب کے مطالعے کی یہ حالت تھی کہ حُقہ سامنے بھرا ہوا رکھا ہے ، کتاب پڑھ رہے ہیں کھانا کھانے کا وقت آیا ، دستر خوان بچھا ، کھانا کھانے بیٹھے ۔ کتاب کھلی ہوئی ہے ، پڑھتے جاتے ہیں ، کھانا کھاتے جاتے ہیں ۔ بعض وقت ایسا ہوتا تھا کہ نوالہ توڑا ، کتاب پڑھ رہے ہیں ، بے خیالی میں نوالے کو دال یا سالن میں ڈبویا ، ہاتھ پیالے میں نہیں پڑا اور نوالہ سادہ کھا لیا کبھی اگر کسی نے دیکھ لیا اور کہا کہ آپ یوں ہی سادی روٹی کے نوالے کھا رہے ہیں ، تو کہتے تھے "ہاں ؟ اچھا !" پھر کتاب رکھ دیتے تھے اور کھانا کھا لیتے تھے ۔

۱۔ مضمون "سیرتِ مرزا" ، مشمولہ "مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات" ، مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن دار التصنیف ، علی گڑھ ۱۹۶۱ء

۲۔ مضمون "مرزا رسوا مرحوم" مشمولہ "مضامین عزیز" مرتبہ ، ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ، رودلوی ۔ ناشر مرتب لکھنؤ ۱۹۸۷ء

رات کو ایک یا دو بجے تک کتاب دیکھا کرتے تھے ۔

ایک مرتبہ بے خیالی میں اتوار کے دن کالج چلے گئے اتفاق سے چپراسی وہاں موجود تھا اس نے کرسی دے دی ۔ مرزا صاحب وہیں بیٹھ کر کتاب دیکھنے لگے ۔ چپراسی سمجھا کہ شاید کسی ضرورت سے آئے ہیں ۔ کچھ دیر بعد چپراسی سے پوچھا ، "بھئی آج لڑکے ابھی تک نہیں آئے؟" اُس نے کہا "حضور ، آج تو اتوار ہے۔" کہنے لگے "لاحول ولاقوۃ ! میں بالکل بھول گیا ۔ آج تو چھٹی تھی ۔"

اپنا پورا کتب خانہ ، جو اُن کا ذاتی خریدا ہوا تھا ، مولوی نجم الحسن صاحب قبلہ کے یہاں وقف کر دیا تھا ۔ کتابیں بہت محنت اور کوشش کر کے خریدی تھیں ۔ ابتدا میں بعض مہینوں میں تو ایسا ہوتا تھا کہ پوری کالج کی تنخواہ خریداری کتب کی نذر ہو جاتی تھی اور اہلیہ کو اُن کی سخت پریشان ہونا پڑتا تھا بعض مرتبہ صرف ایک جوڑا پہننے کا ہوتا تھا اور اس کو دھو دھو کے پہنتے تھے مگر کتابوں کی خریداری کے سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیتے تھے ۔ کار آمد کتاب کسی قیمت کی ہو ، حتی الامکان ضرور خرید لیتے تھے ۔ یہ کتب خانہ ، جب حیدر آباد جانے لگے تو ، وقف کر دیا او عرصے تک کتابوں کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے حسین مرزا صاحب ساکن گلی شاہ چھجڑا [لکھنؤ]، نوکر رکھے گئے تھے اور تنخواہ وغیرہ مرزا صاحب ہی انہیں بھیجتے تھے ۔

آخر عمر میں مرحوم کو قصے کی کتابیں جمع کرنے کا ذوق ہوا اور انہیں پڑھوا کر سننے کا شوق ہو گیا تھا اور وقت فرصت گھنٹوں قصے سنا کرتے تھے ۔ الہٰی جان نامی ایک عورت نوکر تھیں ۔ وہ کہانیاں بہت کہتی تھیں اور مرحوم سنا کرتے تھے ۔ کبھی اُن کے پوتے قصے کی کتابیں پڑھ کر سناتے تھے ۔ کبھی کبھی اُن کی صاحبزادی بھی پڑھتی تھیں ۔ اگر کسی مقام [پر] ایسی عبارت لکھی ہوئی دیکھی جو وہ مناسب نہیں سمجھیں کہ اسے پڑھوں تو وہ رُک جاتی تھیں مرزا صاحب "ہوں" کہہ کے کہتے کہ "اسے چھوڑ دو ، آگے سے پڑھو ۔"

موسیقی میں کافی معلومات تھی اور اچھی اچھی کتابیں جمع کی تھیں ۔

کیمیا کا بھی شوق تھا اور بہت سا رُپیا اس میں صرف کیا ۔

نوچندی میں درگاہِ حضرت عباس [لکھنؤ] اور کربلا زیارت کرنے ضرور جاتے تھے ۔ عشرہ محرم اور اربعین میں تال کٹورے کی کربلا [لکھنؤ] ضرور جاتے تھے ۔ جب بوڑھے ہو گئے تھے اور زیادہ دور پیدل نہیں چل سکتے تھے تو فینسی پر جاتے اور کئی گھنٹے وہاں قیام کر کے علموں کی زیارت کرتے تھے اور اعمال و نمازیں وہیں پڑھتے تھے ۔

لال باغ میں مِسوں کو کئی سال تک پڑھایا ، چھ بجے صبح سے نو بجے صبح تک پھر گھر آکر کھانا کھاتے تھے اور کرسچین کالج چلے جاتے تھے ۔

حیدر آباد دکن کے دورانِ قیام میں ہمیشہ عشرہ محرم اور رمضان المبارک کا پورا مہینا لکھنؤ میں گذارتے تھے ۔

مرزارسوا (نشری مضمون)

از مسعود حسن رضوی ادیب

[یہ مضمون جیسا کہ اس کی پیشانی پر دیے ہوئے ادیب کے انگریزی نوٹ سے ظاہر ہے ، [آل انڈیا] ریڈیو [لکھنؤ] سے ۲۲ جولائی ۱۹۵۲ء کی رات کو پونے نو بجے نشر ہونے کے لیے لکھا گیا تھا ۔ اُس زمانے میں ریڈیو کے پروگرام بالعموم پہلے سے رکارڈ کرنے کے بجائے براہِ راست نشر کیے جاتے تھے ۔ مجھے خیال آتا ہے کہ ادیب مرحوم کا یہ پروگرام قومی اہمیت کے کسی واقعے کی وجہ سے ملتوی ہو گیا تھا اور اس کے بعد بھی اس مضمون کے نشر ہونے کی نوبت نہیں آئی اس طرح یہ مضمون غیر مطبوعہ ہونے کے علاوہ شاید غیر نشر شدہ بھی ہے ۔

میرے پیش نظر اس مضمون کا مسودہ ہے جس میں کئی جگہ ادیب نے قطع و برید کی ہے ۔ یہ قطع و برید دو طرح کی ہے ۔ ایک تو وہ عبارتیں ہیں جنہیں ادیب نے کاٹ کر دوسری طرح یا دوسری جگہ لکھ دیا ہے ۔ دوسری وہ عبارتیں ہیں جنھیں اہم ہونے کے باوجود ظاہرا بلا سبب قلم زد کر دیا گیا ہے ۔ چونکہ یہ مضمون ریڈیو کے لیے لکھا گیا تھا اس لیے اسے ریڈیو کے مقررہ وقت (غالباً پندرہ منٹ) کے اندر پڑھ کر ختم کر دینا ضروری تھا ۔ اس پابندی کا تقاضا یہ تھا کہ اگر لکھنے میں مضمون مقررہ وقت سے زیادہ کا ہو جائے تو اُس کے کچھ حصے نکال کر اسے وقت کے اندر محدود رکھا جائے ۔ مسودے کی ان عبارتوں کو قلم زد کرنے کا سبب اغلباً یہی تھا ؛ اور ان قلم زد عبارتوں ہی کی وجہ سے یہ مسودہ مضمون کے مبیضے سے (جو دستیاب بھی نہیں) زیادہ اہم اور مکمل ہے ۔ مندرجہ ذیل نقل میں یہ عبارتیں بھی شامل ہیں ، البتہ ان کو کھڑے قوسین میں رکھ کر ان کے قلم زد ہونے کی نشان دہی کر دی گئی ہے] ۔

"مرزارسوا"

To be broadcast by S. Masud Hasan Rizvi on July 22, 1952 at 8.45 p.m

میں اس وقت مرزا رسوا مرحوم کے بارے میں کچھ آنکھوں دیکھی باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں ۔ اُن کا اصلی نام مرزا محمد ہادی تھا مگر [جب تک اُن کے نام کے ساتھ "رسوا" کے لفظ کا اضافہ نہ کیا جائے اس وقت تک آج کل کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کن مرزا محمد ہادی کا ذکر کیا جا رہا ہے ۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ اُن کے زمانے کے لوگ خاص کر] اُن کے ہم عمر اور ہم وطن لوگ جب اُن کا ذکر کرتے تھے تو اُن کے نام کے ساتھ [پہچان کے لیے] "بی۔ اے ۔"

ضرور لگاتے تھے، یعنی اُن کو "مرزا محمد ہادی، بی۔ اے" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ سبب یہ تھا کہ اُس زمانے تک لکھنؤ میں مسلمان گریجویٹوں کی تعداد بہت ہی کم تھی، اور مرزا محمد ہادی نام کے گریجویٹ یہی ایک تھے۔

عربی فارسی کے فاضل اور مشرقی علوم کے عالم تو اس وقت بہت تھے مگر مرزا صاحب ان علوم کے ساتھ گریجویٹ بھی تھے اس لیے بی۔ اے ہونا ان کی امتیازی صفت قرار پائی | لیکن اب وہ "مرزا محمد ہادی رسوا" بلکہ صرف "مرزا رسوا" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "رسوا" ان کا تخلص تھا، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اُن کا تخلص مرزا تھا۔ اُن کی ایک غزل کا مقطع ہے:

فرقتِ یار میں مرنے کا مزہ کیا مرزا　　　مگر اک رسمِ ضروری کا ادا ہو جانا

پھر آخر "رسوا" کا لفظ اُن کے نام کے ساتھ کیوں شامل ہوگیا؟ بات یہ ہے کہ جب مرزا صاحب نے اپنا ناول "امراؤ جان ادا" شائع کیا تو کسی مصلحت سے اپنا نام ظاہر نہیں کیا بلکہ اس کے سرورق پر مصنف کا نام "مرزا رسوا" لکھ دیا۔ اس ناول کی شہرت کے ساتھ ساتھ وہ "رسوا" ہوتے گئے۔

[یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ] "امراؤ جان ادا" لکھنے کے بعد مرزا صاحب نے ایک دوسرا ناول "فسانۂ مرزا رسوا" کے نام سے شائع کیا اور اس پر "مصنفۂ امراؤ جان ادا" لکھ دیا اور اس طرح یہ ظاہر کیا تھا کہ مرزا رسوا نے امراؤ جان کے حالات طشت ازبام کر دیے تھے، اس کے جواب میں امراؤ جان نے مرزا رسوا کا کچا چٹھا پیش کیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ یہ کتاب امراؤ جان نے لکھی ہے نہ وہ مرزا رسوا نے؛ دونوں کے مصنف مرزا محمد ہادی ہیں۔

| انھوں نے اپنے بعض ناولوں میں اپنے حالات بھی کسی اور کے پردے میں بیان کر دیے ہیں، مثلاً "شریف زادہ" کے ہیرو مرزا عابد حسین وہ خود ہیں۔ (یہ بات مجھے مرزا صاحب کے لڑکپن کے دوست مرحوم خان بہادر سید جعفر حسین صاحب انجنیر سے معلوم ہوئی تھی) اس ناول میں انھوں نے اپنے نام کے ساتھ دوسرے اشخاص کے نام بھی بدل دیے ہیں مگر سید جعفر حسین صاحب انجنیر کا نام نہیں بدلا۔ اُن کا عہدہ بھی انجنیر ہی بتایا ہے اور یہ بھی صحیح لکھا ہے۔ کہ وہ لکھنؤ کے محلّے شاہ گنج میں رہتے تھے۔ (اس محلّے میں دین دیال روڈ پر انھوں نے ایک مکان اپنے لیے اور دو کوٹھیاں اپنے بڑے بیٹے خان بہادر سید حامد حسین انجنیر کے لیے اپنی نگرانی میں تعمیر کروائی تھیں۔ انہیں کوٹھیوں میں سے ایک میں مَیں اکیس برس سے مقیم ہوں اور سولہ سال سے وہ میری اہلیہ محترمہ کی ملک ہے)] (۲)

مرزا صاحب کا رنگ گورا، قد لمبا اور ہڈی چوڑی تھی، میں نے ان کو پہلے پہل جب دیکھا ہے تو وہ ادھیڑ ہو چکے تھے۔ چہرے پر سیاہ ڈاڑھی تھی۔ معلوم نہیں کہ ڈاڑھی کا یہ رنگ قدرتی تھا یا خضاب کا فیض تھا۔ سادی طبیعت کے سیدھے سچے انسان تھے۔ تکلف اور تصنع پاس سے ہو کر نہ گذرا تھا۔ بڑے جفاکش اور دُھن کے پکّے تھے۔ جب سے مرزا صاحب عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ میں ملازم ہوئے اُس وقت سے اُن کا یہ معمول رہا کہ ہر سال

۲۔ اس پیراگراف میں گول قوسین والی عبارتیں ("یہ بات۔۔۔ معلوم ہوئی تھی" اور "اس محلّے میں۔۔۔ ملک ہے") ادیب نے دو مرتبہ کاٹی ہیں۔

دو ایک مرتبہ لکھنؤ آتے اور کچھ دن قیام کرتے تھے [اور ہر مرتبہ ایک نئی جگہ ٹھہرتے تھے (۴)] ۔ میں ہر مرتبہ اُن کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا تھا ۔ ایک مرتبہ وہ حیدر آباد سے آکر مولوی گنج میں ہوادار منزل میں مقیم تھے ۔ ایک دن میں حضرت صفی مرحوم کے یہاں گیا تو (۵) مرزا صاحب کی تشریف آوری کا حال معلوم ہوا۔ وہیں سے مولانا صفی کی ہمراہی میں ہوادار منزل پہنچا مرزا صاحب مکان کی دوسری منزل کے اُس کمرے میں جو سڑک کی طرف تھا ایک دروازے میں ٹاٹ کا بورا بچھائے بیٹھے تھے۔ آنے والوں کے لئے ایک چٹائی اور ایک دری بچھی ہوئی تھی۔ اس کے سوا کوئی فرنیچر اُس کمرے میں نہ تھا۔ میں نے مرزا صاحب کو آداب عرض کیا۔ فرمایا:

"ہم آپ سے نہیں بولتے ۔"

عرض کیا :

"مجھ سے کیا قصور ہوا ؟"

فرمایا : "ہم اتنے دن سے آئے ہوئے ہیں ۔ ایک ایک سے آپ کو پوچھ رہے ہیں ، اور آپ اب تشریف لائے ہیں"

عرض کیا کہ "ابھی ابھی مولانا صفی صاحب سے آپ کی تشریف آوری کا علم ہوا اور میں فوراً حاضر خدمت ہوگیا ۔"

عُذر قبول ہوا اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں ۔

ایک مرتبہ حیدر آباد سے آ کر راجا کی بازار میں ایک بہت بڑے مکان میں فروکش تھے میں حسبِ معمول ملنے گیا اثنائے گفتگو میں شعر و سخن کا ذکر نکل آیا میں نے عرض کیا۔

"آپ کے کلام کا تلف ہو جانا اُردو شاعری کی تاریخ میں بالخصوص لکھنوی ادب کی تاریخ میں، ایک افسوسناک حادثہ ہے۔"

فرمایا : "آپ جب کوئی شعر پڑھتے ہیں تو مجھے اپنے بعض اشعار یاد آجاتے ہیں ۔ اگر آپ کا سا کوئی شخص میرے ساتھ رہتا تو میں اپنا بہت سا کلام لکھوا دیتا ۔" اسی سلسلے میں فرمانے لگے کہ "میں نے کئی ہزار غزلیں کہی ہیں ۔ اگر وہ جمع کی جاتیں تو کئی ضخیم دیوان ہو جاتے ۔ قصیدے ، مثنویاں ، منظوم ڈراما اس کے علاوہ ۔" میں نے عرض کیا کہ

"پھر یہ سب کلام کیا ہوا؟"

فرمایا : "یہ نہ پوچھیے ۔"

---

۴ ۔ "ہر مرتبہ ایک نئی جگہ ٹھہرتے تھے" کے قلم زد کرنے کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ادیب پر یہ بات پوری طرح ثابت نہ ہو ۔ البتہ وہ بتاتے تھے کہ ایک بار جب رسوا ۔ ان سے نہ آنے کی شکایت کی تو جواب میں انھوں نے شکایت کی کہ مرزا صاحب آپ تو جب آتے ہیں کسی نئی جگہ ٹھہرتے ہیں جس کا پتہ لگانے میں دشواری ہوتی ہے ۔ س پر رسوا ہنسنے لگے ۔

۵ ۔ صفی لکھنوی کا مکان مولوی گنج میں تھا ۔

بڑی رد و کد کے بعد معلوم ہوا کہ جتنا کلام یکجا ہو سکا تھا وہ ایک صاحب نے مستعار لیا اور ہضم کر لیا ۔ اُن صاحب کا نام کسی طرح نہ بتایا مگر اثنائے گفتگو میں یہ جملہ ان کی زبان سے نکل گیا :

"میں اُن سے بہت ناراض ہوں ۔ وہ میرے یہاں آتے ہیں تو خیر ، میرے استاد زادے ہیں ، اُن کو آنے سے نہیں روکتا ، مگر میں اُن کے یہاں نہیں جاتا ۔"

مرزا صاحب ارادہ کر کے تو شعر ہمیشہ کہہ سکتے تھے لیکن ایک زمانہ ایسا تھا جب اُن پر اشعار کی بارش ہوتی تھی ۔ اُٹھتے بیٹھتے ، راہ چلتے شعر تھے کہ اُمڈے چلے آتے تھے ۔ کچھ مدت کے بعد شاعری کا یہ دور ختم ہو گیا ۔ مرزا صاحب کی طبیعت کا عجب حال تھا ۔ جس کام میں لگ جاتے تھے بس اُسی کے ہو رہتے تھے ۔ فلسفے کا مطالعہ شروع ہوا تو اوڑھنا بچھونا وہی ہو گیا ۔ ریاضی اور ہیئت کا شوق ہوا تو راتوں کی نیند حرام ہو گئی ۔ مذہبیات کی طرف مائل ہوئے تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے موسیقی کی دھن ہوئی تو تن بدن کا ہوش نہ رہا ۔ خیر ، یہ تو بڑے بڑے علم ہیں ، چھوٹے چھوٹے فن ، جیسے شہہ سواری ، پیراکی ، باغبانی ، ان میں بھی یہی انہماک رہا ۔ جس زمانے میں جو رنگ طبیعت پر غالب ہوتا تھا اُن کی ساری زندگی اُسی رنگ میں رنگ جاتی تھی ۔

ایک مرتبہ کیمسٹری کی تحصیل کا شوق دامن گیر ہوا ۔ کتابیں فراہم کی گئیں ۔ طرح طرح کی بھٹیاں تیار کی گئیں ۔ ضروری آلات اور اوزار کچھ خود بنائے ، کچھ لوہاروں ، بڑھیوں اور شیشہ گروں سے بنوائے اور دن رات ایک کر کے انھیں خانہ ساز آلات کی مدد سے عملی کیمسٹری میں اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی ۔ [مرزا صاحب کے گہرے اور مخلص دوست] خان بہادر سید ... حسین انجنیر [جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے] بیان کرتے تھے کہ میرے بڑے بھائی میر محمد حسین ولایت سے وطن زراعت کی تعلیم حاصل کر کے آئے تو محکمہ زراعت میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر ہو گئے ۔ اُن کا دفتر کان پور میں تھا ۔ ایک دن میں اُن سے ملنے کے لیے کان پور گیا تو انھوں نے کام کی زیادتی کی شکایت کی اور کہا کہ ہر طرح کی مٹی کا تجزیہ کرنا بھی میرے فرائض میں داخل کر دیا گیا ہے ۔ مجھے دفتر کے کاموں ہی سے فرصت نہیں ملتی ، اِس کام کے لیے وقت کہاں سے لاؤں کوئی ایسا آدمی بھی نہیں ملتا جو اس کام میں مجھے مدد دے سکے ۔ میں نے کہا کہ میرے دوست مرزا محمد ہادی اس کام میں مدد دے سکتے ہیں ۔ انھوں نے پوچھا کہ انھوں نے کیمسٹری کا علم کس سے حاصل کیا ؟ میں نے کہا خود اپنی محنت سے یہ سنتے ہی انھوں نے فرمایا کہ مجھے اُن کی ضرورت نہیں ؟ بھلا کوئی شخص بغیر لیبارٹری میں کام کیے ہوئے صرف کتابیں پڑھ پڑھ کے کہیں کیمسٹری سیکھ سکتا ہے ؟ آخر میرے بہت اصرار کرنے پر وہ خاموش ہو گئے ، مگر اُن کو کسی طرح یقین نہ آیا کہ مرزا صاحب سے اُن کو کچھ مدد مل سکتی ہے ۔ میں نے لکھنؤ آکر مرزا صاحب کو بھائی صاحب کے پاس بھیج دیا ۔ چند روز کے بعد میں پھر کان پور گیا اور بھائی صاحب سے دریافت کیا کہ مرزا صاحب آپ کا کچھ ہاتھ بٹا سکے یا نہیں ؟ انھوں نے فرمایا کہ بھئی ، یہ تمھارے دوست تو غضب کے آدمی ہیں ۔ ان کی ذہانت اور قابلیت حیرت خیز ہے ، اور عملی کیمسٹری میں اُن کی مہارت کیمسٹری کے ایک اچھے پروفیسر سے کم نہیں

ہے۔

مرزا صاحب کو ریاضی کے مختلف شعبوں میں بہت اچھا دخل تھا۔ [جس زمانے میں وہ کرسچین کالج لکھنؤ میں فارسی کے پروفیسر تھے، وہاں کے ریاضی کے پروفیسروں کو جب کوئی خاص دقت پیش آتی تھی تو وہ مرزا صاحب کے پاس آکر اُس کو حل کرلے جاتے تھے] ۔ علمِ ہیئت کا ان کو خاص شوق تھا۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ

"یہ بڑا دلچسپ اور مفید علم ہے ہر تعلیم یافتہ آدمی کو اسے بہ قدرِ ضرورت ضرور سیکھنا چاہیے۔"

میں نے عرض کیا کہ

"اس کو سیکھنے کے لیے تو بڑے سازو سامان اور بہت قیمتی آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہر شخص کو کہاں میّسر ہو سکتے ہیں۔"

فرمایا، "نہیں، علم ہیئت کی جتنی واقفیت ہر شخص کے لیے لازمی ہے اس کے لیے صرف ایک چبوترہ اور ایک الگنی کافی ہے۔"

چبوترے کی ساخت اور الگنی کی سمت بھی انھوں نے بتائی تھی مگر اب مجھ کو یاد نہیں رہی۔ اس علم پر مرزا صاحب نے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس کا بہت ضخیم مسودہ میں نے ان کے پاس دیکھا تھا۔ اس کتاب کے بارے میں ایک دن گفتگو ہو رہی تھی کہ فرمانے لگے:

"ایک بات آپ کو معلوم نہ ہوگی میں جو چیز اپنے لیے لکھتا ہوں وہ فارسی میں لکھتا ہوں۔ یہ مسودہ بھی فارسی میں ہے۔ جب اس کی اشاعت کا وقت آئے گا تو اسے اردو میں منتقل کر دوں گا۔"

معلوم نہیں کہ وہ کتاب اب کس کے پاس ہے۔

مرزا صاحب یوں تو ایک مذہبی خیال کے آدمی تھے ہی، لیکن اُن کی زندگی میں ایک دور ایسا گذرا جب مذہبیت کا بڑا زور تھا۔ ہر وقت مذہبی کتابیں مطالعے میں رہتی تھیں۔ ایک رسالہ "الحکم" جاری کیا تھا جس میں صرف مذہبی موضوعوں پر مقالے ہوتے تھے۔ اُسی زمانے میں ایک بہت بڑی کتاب "ہدیۂ سَنیۂ" کے نام سے اٹھارہ جلدوں میں لکھی [ایک موقع پر میں نے خُود اُن کی زبان سے سنا کہ یہ کتاب ایک مذہبی انسائکلوپیڈیا ہے اور اس کی آٹھویں جلد جس کا نام "الفقہہ" ہے، میں سب سے پہلے شائع کرنا چاہتا ہوں] ۔ اس کتاب کی کوئی جلد شائع نہیں ہو سکی، مگر مصنفؔ کا اصل مسودہ مدرسۃ الواعظین، لکھنؤ، کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس مذہبیت کے دور میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ مختلف مذہبوں کے عالموں سے مناظرے کرنے لگے۔ اب تجربے سے اُن کو معلوم ہوا کہ بے اصول مناظرے کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا اور ان مناظروں میں جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں وہ اکثر دلیلیں نہیں، بلکہ مغالطے ہوتے ہیں، اس لیے مناظرے کے اصول مقرر ہونا چاہیے اور مغالطوں کی نوعیت واضح ہونا چاہیے غالباً انہیں ضرورتوں کے احساس نے مرزا صاحب سے دو رسالے لکھوائے؛ ایک کا نام "المناظرہ" اور دوسرے کا "المغالطات" ہے۔ یہ دونوں رسالے

شائع ہو چکے ہیں ۔

مرزا صاحب کی زندگی میں ایک دور رندی اور عیاشی کا بھی تھا جب کہ زیادہ وقت ناچ گانے کی صحبتوں میں گذرتا تھا ۔ مگر یہ اُن کے عہد شباب کی باتیں ہیں جو میں نے دوسروں سے سُنی ہیں ۔ میں نے خود جو کچھ دیکھا ہے وہ یہ ہے کہ جب مرزا صاحب بہت بوڑھے ہو چکے تھے اُس وقت اُن کو موسیقی کا شوق پیدا ہوا ، مگر اس شوق کی حیثیت بالکل علمی تھی ، چنانچہ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ

"موسیقی سیکھنا بہت ضروری ہے ۔ اس کے بغیر ہم لوگوں کا علم مکمل نہیں ہوتا ۔"

مجھے یہ افسوس رہ گیا کہ مرزا صاحب سے یہ کیوں نہ دریافت کر لیا کہ "ہم لوگوں" سے آپ کی کیا مراد ہے ؟ [مگر خود میرا خیال یہ ہے کہ اس سے فلسفی مراد ہیں ۔ مشہور حکایت ہے کہ شیخ الرئیس ابو علی ابن سینا اپنے عہد کے تمام علموں کی غیر معمولی قابلیت رکھتا تھا، مگر اس کے ہم عصر علمأ نے اس کو "حکیم" یعنی کامل فلسفی ، ماننے سے انکار کر دیا ، صرف اس بنا پر کہ وہ موسیقی میں دخل نہ رکھتا تھا ۔ جب اُس نے اس فن پر پورا عبور حاصل کر کے ایک نیا باجا ایجاد کیا تب وہ "حکیم" کے لقب کا مستحق سمجھا گیا ۔ کہتے ہیں کہ اس نئے باجے کا نام اس کے موجد کے نام کی مناسبت سے "سینائی" قرار پایا تھا جو بعد کو "شہنائی" ہو گیا ۔ | بہر حال | یہ تو میرا قیاس ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ | مرزا صاحب نے اپنی عمر کے آخری حصے میں جس فن کی تحصیل میں بڑی محنت کی وہ موسیقی تھا ۔

اُسی زمانے میں انھوں نے حیدر آباد سے مجھ کو لکھا کہ آپ قدیم اور کم یاب کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں ، اگر "تحفتہ الہند" کا کوئی نسخہ نظر آجائے تو میرے لیے خرید لیجیے گا ۔ یہ کتاب اورنگ زیب کے عہد میں لکھی گئی تھی اور اس کا ایک باب ہندوستانی موسیقی پر ہے ۔ اتفاق سے اس کا ایک پُرانا نسخہ میرے کتب خانے میں موجود تھا ، مگر کیڑوں نے اس کو بالکل چھلنی کر دیا تھا ۔ میں نے ایک ہوشیار صحاف سے اُس کے ہر ورق پر دونوں طرف باریک کاغذ چڑھوا کے اور جلد بندھوا کے اُن کی خدمت میں بھیج دیا ۔ کچھ دن بعد وہ نسخہ انھوں نے واپس کر دیا جو اب بھی میرے پاس موجود ہے اور وقتاً فوقتاً مرزا صاحب کی یاد دلاتا رہتا ہے ۔

اُنہیں دنوں میں مرزا صاحب لکھنؤ تشریف لائے اور میں اُن سے ملنے گیا ۔ دورانِ گفتگو میں موسیقی کا ذکر نکل آیا فرمایا کہ

"اب مجھ کو ایک بڑا کامل استاد مل گیا ہے جس کے بزرگ مغل شہنشاہوں کے درباروں سے وابستہ تھے ۔ اُس سے میں نے وہ گیت بھی سیکھا ہے جو اُس کے ایک بزرگ نے اکبر بادشاہ کی ولادت کے وقت گایا تھا ۔ میں اُس کو گلے سے بھی ادا کر سکتا ہوں اور انگلیوں سے بھی ۔"

اسی گفتگو میں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ

"میں نے راگ راگنیوں کو قلم بند کرنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے ۔ اس طریقے سے بڑے بڑے استادوں کی

دُھنیں اُن کے گلے سے کاغذ پر اُتر آئیں گی ۔"

یہ کہہ کر انھوں نے ایک چھوٹا سا صندوقچہ کھولا جس میں بہت سے لفافے بھرے ہوئے تھے ۔ ہر لفافے میں کئی کئی کارڈ تھے جن پر شاید مختلف گیتوں کی دُھنیں لکھ لی گئی تھیں معلوم نہیں اُن کے انتقال کے بعد وہ صندوقچہ کیا ہوا ۔

ہاں ، ایک بات تو میں کہنا ہی بھول گیا ۔ مرزا صاحب نے رُڑکی کے مشہور انجینئرنگ کالج میں بھی تعلیم پائی تھی اور وہاں سے کوئی امتحان پاس کیا تھا۔ جعفر حسین صاحب انجینئر اسی کالج میں مرزا صاحب کے کلاس فیلو تھے اور یہیں ان دونوں میں دوستی کی بنیاد پڑی جو مرتے دم تک قائم رہی جعفر حسین صاحب سے معلوم ہوا کہ رُڑکی کالج سے نکلنے کے بعد مرزا صاحب نے انجنیری کے محکمے میں ملازمت کرلی تھی ۔ [محکمے کا اعلیٰ افسر ایک انگریز تھا جو مرزا صاحب کی ذہانت اور قابلیت کی بہت قدر کرتا تھا اور اپنے بنائے ہوئے عمارتوں کے نقشوں پر مرزا صاحب کی تجویز کی ہوئی ترمیموں کو خوشی سے منظور کرلیتا تھا ۔ ایک مرتبہ اُس نے کچھ دن کی رخصت لی اور ایک دوسرا انگریز افسر اس کی جگہ مقرر ہوگیا ۔ مرزا صاحب نے اُس کے بنائے ہوئے ایک نقشے میں کچھ ترمیم کر دی ۔ اس کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور اس نے مرزا صاحب کو بلا کر پوچھا کہ تم نے یہ ترمیم کیوں کی ؟ جواب دیا ، اس لیے کہ نقشے میں غلطی تھی ۔ اُس نے کہا کہ میں نے تم کو ترمیم کرنے کی اجازت کب دی تھی ؟ جواب دیا کہ غلطی کی اصلاح ہر شخص کا فرض ہے ۔ اس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے ؟ یہ جواب اُس کو پسند نہ آیا اور اُس نے آئندہ کے لیے ممانعت کر دی ۔] اُن دنوں فلسفے کا شوق شباب پر تھا ۔ ہر وقت فلسفے کی کتابیں مطالعے میں رہتی تھیں ۔ اُسی زمانے میں مرزا صاحب نے ایک رسالہ "اِشراق" نکالنا شروع کیا جس میں صرف فسلفیانہ مقالے شائع ہوتے تھے ۔ اپنی علمی مصروفیتوں کے باعث مرزا صاحب کو دفتر جانے میں اکثر دیر ہو جاتی تھی ۔ ایک دن بہت دیر میں پہنچے، افسر نے ان کو بلا کر دیر کا سبب پوچھا ۔ جواب دیا ۔ میں "اشراق" کو اِڈٹ کر رہا تھا ۔ اس نے کہا ، تم "اشراق" کو اِڈٹ کرنا زیادہ ضروری سمجھتے ہو یا دفتر کا کام کرنا ؟ جواب دیا میں تو "اِشراق" کو اڈٹ کرنا زیادہ ضروری سمجھتا ہوں ۔ اُس نے کہا کہ پھر تم نوکری سے استعفا دے کر گھر میں بیٹھو ۔ جواب دیا ، بہت اچھا اور اُسی وقت استعفا لکھ کر پیش کر دیا ۔

مرزا صاحب کے حالات تفصیل سے بیان کیے جائیں تو ایک دلچسپ افسانے کا لطف آئے ۔ اُن پر یہ شعر پورے طور پر صادق آتا ہے :

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

۳ ۔ مرزا محمد ہادی رسوا (ڈراما)

از سید مسعود حسن رضوی ادیب

[ادیب کی سرگرمیاں تنقید اور تحقیق کے میدانوں میں تھیں ۔ تخلیقی اور طبع زاد تحریروں کی طرف اُن کی توجہ بہت کم رہی ۔ اُن کے اس نوعیت کے قلمی آثار کچھ شعروں ، ایک افسانے ("دردِ دل") اور مرزا رسوا پر زیر نظر ڈرامے تک محدود ہیں ۔

ادیب کے کاغذات میں اس بلاعنوان ڈرامے کے پانچ ورق محفوظ ہیں ۔ مرزا محمد عسکری سے رسوا کی گفتگو کا پس منظر اُس پرچے پر لکھا گیا ہے جس پر رسوا کے بارے میں یادداشتیں درج ہیں (نمبر ۵) اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ یادداشتیں اصلاً اسی ڈرامے کے لیے لکھی گئی تھیں ۔ ان یادداشتوں میں سے چڑیل والے واقعے، نخاس میں رسوا کی کتابیں بکنے اور بعض دوسری باتوں کا ذکر ڈرامے میں آگیا ہے ۔ کچھ یادداشتیں ، مثلاً کیمسٹری کے تجربے ۔ میر محمد حسین" ریڈیو والے مضمون میں استعمال ہو گئی ہیں لیکن ڈرامے کے دستیاب اوراق میں مذکور نہیں ہیں ، اور کچھ مثلاً "مہادیو پرشاد اور ناول نویسی" (نمبر ۴) کا بیان نہ مضمون میں ہے نہ ڈرامے میں ۔

نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ڈراما کتنا لکھا جانا تھا اور کہاں تک لکھا جا چکا تھا ۔ یادداشتوں کے لحاظ سے اسے خاصا طویل ڈراما ہونا چاہیے تھا ۔ ادیب کے کاغذات میں یہ وہاں تک ہے جہاں رسوا چڑیل والا واقعہ بیان کر رہے ہیں ۔ مسودے کا آخری ورق "اُس کالی بلا نے اٹھ کر میری گردن دبائی" پر ختم ہوتا ہے ، اور یہ دلچسپ واقعہ جو رسوا کے حالات میں غالباً اور کہیں نہیں ملتا ادھورا رہ جاتا ہے ۔ میں نے خوش قسمتی سے یہ واقعہ ادیب کی زبان سے کئی مرتبہ سنا تھا اس لیے ڈرامے کے آخر میں اس کا تکملہ لکھ دیا ہے ۔

یہ ڈراما (جس کے بعض فقرے نثری مضمون میں من و عن موجود ہیں) ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ کے مسعود حسن نمبر (مارچ اپریل ۱۹۷۷ء) میں شامل ہے اور موضوع کی مناسبت سے یہاں بھی پیش کیا جا رہا ہے]

[مرزا محمد ہادی رسوا]

[مرزا صاحب باہری کمرے میں بیٹھے ہیں دو صاحب ان سے ملنے آتے ہیں]

دو نووارد : آداب عرض ہے ، تسلیم عرض ہے ۔

مرزا صاحب : آئیے تشریف رکھیے ۔

ایک نووارد : ہم لوگ میو سنٹرل کالج الہ آباد میں تعلیم دیتے ہیں ۔ میرا نام امجد علی ہے ۔ میں فارسی پڑھاتا ہوں اور یہ میرے رفیق بابو کالی پرشاد ریاضی کے پروفیسر ہیں ۔ ان کو اردو ادب سے بہت دلچسپی ہے ۔ ہم لوگ جناب والا سے غائبانہ عقیدت رکھتے ہیں ۔ ایک ضرورت سے یہاں آنا ہوا ۔ مدت سے زیارت کا اشتیاق تھا ، آج خوش قسمتی سے یہ شرف حاصل ہو گیا ۔

مرزا صاحب : بڑی عنایت فرمائی آپ نے ۔

کالی پرشاد : ایک مدت ہوئی ایک صاحب سے معلوم ہوا تھا کہ آپ علم ہیئت کے مشاہدات میں مصروف ہیں اور اس علم میں کوئی معرکہ آراء کتاب تصنیف فرما رہے ہیں ۔

امجد علی : اور میں نے کچھ دن ہوئے یہ سنا تھا کہ آپ فنِ موسیقی کی تحصیل میں مصروف ہیں ۔

مرزا صاحب : یہ دونوں اطلاعیں صحیح تھیں ۔ میری طبیعت کا عجب حال ہے ۔ جس کام میں لگ جاتا ہوں بس اسی کا ہو رہتا ہوں ۔ فلسفے کا مطالعہ شروع کیا تو اوڑھنا بچھونا وہی ہو گیا ۔ ریاضی اور ہیئت کا شوق ہوا تو راتوں کی نیند بھی حرام ہو گئی ۔ مذہبیات کی طرف مائل ہوا تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا موسیقی کی دھن ہوئی تو تن بدن کا ہوش نہ رہا خیر ، یہ تو بڑے بڑے علوم و فنون ہیں : چھوٹے چھوٹے فن جیسے شہ سواری ، پیراکی ، باغبانی ، ان میں بھی یہی انہماک رہا ، اور جِس زمانے میں جو رنگ طبیعت پر غالب رہا میری زندگی اُسی رنگ میں رنگ گئی مختصر یہ کہ میرا علم علم سینہ ہے ، علم سفینہ نہیں ۔

کالی پرشاد : وہ علم ہیئت والی کتاب تو مکمل ہو چکی ہوگی ۔

مرزا صاحب: جی ہاں ، مدت ہوئی ۔ مگر وہ ابھی فارسی زبان میں ہے ۔ ہاں ، آپ کو شاید یہ معلوم نہ ہو گا کہ [میں] جو چیز اپنے لیے لکھتا ہوں وہ فارسی میں لکھتا ہوں اور جب اُسے منظرِ عام پر لانا ہوتا ہے تو اُردو میں منتقل کر دیتا ہوں ۔

امجد علی : موسیقی پر بھی جناب کی کوئی تصنیف ہے ؟

مرزا صاحب : جی ہاں ، ایک کتاب میں راگوں اور راگنیوں کو قلم بند کرنے کے طریقے لکھ دیے

ہیں اور اُن پر عمل کرکے دکھا دیا ہے اس طرح بڑے بڑے اُستادوں کی سینکڑوں دھنیں اُن کے گلے سے کاغذ پر اُتر آئی ہیں اور ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی ہیں ۔

کالی پرشاد : آج کل آپ کس کام میں مصروف ہیں ؟

مرزاصاحب : آج کل زیادہ وقت شعر کہنے میں گذرتا ہے ۔ یوں تو میں ہمیشہ شعر کہتا رہا ہوں مگر پہلے یہ ایک ارادی اور اختیاری فعل تھا ؛ اور اِن دنوں اشعار کی بارش ہو رہی ہے ۔ اُٹھتے ، بیٹھتے ، راہ چلتے ، شعر ہیں کے اُمڈے چلے آتے ہیں ۔

امجد علی : آپ کے کلام کی مقدار کیا ہو گئی ہو گی ؟

مرزاصاحب : صحیح مقدار کا تو خود مجھے بھی علم نہیں ۔ ہاں ، اتنا کہہ سکتا ہوں کہ کچھ قصیدے ، کچھ مرثیے ، کچھ مثنویاں ، ایک منظوم ڈراما "لیلیٰ مجنوں" اور بے شمار غزلیں ہو چکی ہیں بے شمار تو خیر مبالغہ ہے ، مگر اتنی غزلیں ضرور کہی ہیں کہ اگر جمع کی جاتیں تو دو ضخیم دیوان ہو جاتے ۔

امجد علی : تو کیا آپ کی غزلیں محفوظ نہیں ہیں ؟

مرزاصاحب : حضرت ، میں نے اپنی کون چیز محفوظ رکھی کہ غزلیں ہی محفوظ رکھتا ۔ میرے ایک عقیدت مند نے میرا بہت سا کلام جمع کیا تھا لیکن میرے ایک استاد زادے نے اسے اپنا مال سمجھ کر ہضم کر لیا ۔

کالی پرشاد : یہ تو انھوں نے بڑی ناشائستہ حرکت کی ۔

مرزاصاحب : جی ہاں ، میں اُن سے بہت ناراض ہوں ۔ وہ میرے یہاں آتے ہیں تو استاد مرحوم کا خیال کر کے انھیں آنے دیتا ہوں ، مگر میں اُن کے یہاں نہیں جاتا ۔

امجد علی : آپ کو زحمت دینا گستاخی ہے ، مگر جی چاہتا ہے کہ آپ کا کلام آپ ہی کی زبان مبارک سے سنئے ۔

کالی پرشاد : میں بھی اس خواہش میں دل سے ان کا شریک ہوں ۔

مرزاصاحب : بہت اچھا آپ کے ارشاد کی تعمیل میں چند شعر عرض کرتا ہوں ۔ ایک غزل کا مقطع ہے :

فرقتِ یار میں مرنے کا مزہ کیا مرزا — مگر ایک رسم ضروری کا ادا ہو جانا

امجد علی : واہ وا سبحان اللہ !

کالی پرشاد : ہجرِ یار میں جینا تو بے لطف ہوتا ہی ہے ، مرنا بھی بے کیف ہوتا ہے ، کتنا نیا اور سچا مضمون باندھا ہے اور کس حُسن اور کیسی صفائی سے ادا کیا ہے !

امجد علی : مگر اس مقطع میں تخلص مرزا کیسا ؟ آپ کا تخلص تو رسوا ہے ۔

مرزا صاحب : نہیں جناب، رسوا میرا تخلص کبھی نہ تھا۔ میں مرزا تخلص کرتا ہوں۔ کبھی کبھی ہادی بھی کیا ہے۔
کالی پرشاد : مگر شہرت تو آپ کی رسوا ہی کے نام سے ہے۔ میں کیا، سبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ رسوا آپ کا تخلص ہے۔ جب تک آپ کے نام کے ساتھ رسوا کا لفظ نہیں لگایا جاتا اس وقت تک آپ کی شخصیت ہی متعین نہیں ہوتی۔
مرزا صاحب : مگر لکھنؤ والے جب مجھ کو میرے ہم ناموں سے الگ کرنا چاہتے ہیں تو میرے نام کے ساتھ "بی۔ اے۔" کا اضافہ کرتے ہیں، یعنی "مرزا محمد ہادی بی۔اے۔" کہہ کر میری نشان دہی کرتے ہیں، اس لیے کہ میں نے اُس زمانے میں بی۔اے کیا تھا جب لکھنؤ میں مسلمان گریجویٹ گویا تھے ہی نہیں۔
امجد علی : تو پھر "رسوا" کا لفظ آپ کے نام کے ساتھ کیونکر لگ گیا؟
مرزا صاحب : بات یہ ہوئی کہ جب میرا ناول "امراؤ جان ادا" چھپنے لگا تو میں نے اُس کے سرورق پر "مصنفہ مرزا رسوا" لکھ دیا کیونکہ ایک مصلحت سے میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر لوگوں کو حقیقت حال معلوم ہو گئی اور اس ناول کی شہرت کے ساتھ ساتھ میں "رسوا" ہو تا گیا۔
کالی پرشاد : آج یہ راز کُھلا، ورنہ ہم لوگ تو آپ کا تخلص رسوا سمجھا کرتے تھے۔
امجد علی : جناب مرزا صاحب، ابھی تو ایک ہی شعر ہوا ہے۔
مرزا صاحب : اچھا تین چار متفرق شعر اور پڑھے دیتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:

حسرت اے ذوقِ اسیری کہ خفا ہے صیّاد　　　آج ہم بادل ناشاد رہا ہوتے ہیں

کالی پرشاد : بہت خوب؛ طولِ اسیری سے زنداں میں دل لگ جانا اور صیاد سے اُنس ہو جانا، صیاد کی آزردگی سے متاثر ہونا اور ان حالات میں اپنی رہائی سے خوش نہ ہونا، کتنی حقیقتیں آپ نے ان دو مصرعوں میں بھر دی ہیں! کیا تعریف ہو سکتی ہے اس شعر کی!
مرزا صاحب :

دردِ دل کی لذتیں صرف شبِ غم ہو گئیں　　　طول فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہو گئیں

امجد علی : سبحان اللہ! خیال کی سچّائی اور الفاظ کا ترنم تعریف سے مُستغنی ہے۔ واہ وا!
مرزا صاحب : ایک شعر سُنانا چاہتا ہوں، مگر پہلا مصرع یاد نہیں آتا۔ بہر حال مطلب ادا کیے دیتا ہوں۔ لفظی خامیوں پر نظر نہ فرمائیے گا:

تنگ دستی میں تو ممکن نہیں ترکِ لذت　　　سوکھے ٹکڑے بھی تو فاقوں میں مزا دیتے ہیں

کالی پرشاد : واہ وا، واہ وا! تلاش مضمون اس کو کہتے ہیں نفسیاتی عمیق نگاہی اسی کا نام ہے۔

امجد علی : پہلا مصرع سُن کر حیرت ہوئی کہ اس دعوے کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے ؟ مفلسی میں ترکِ لذات کا ناممکن ہونا سمجھ میں آنے والی بات نہ تھی ، مگر کیا ثبوت دیا ہے آپ نے کہ انکار کی گنجائش ہی نہ رہی ، شعر کیا ہے اعجاز ہے !

مرزا صاحب : بس ایک شعر اور سُن لیجیے :

نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دل آویزی　　تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

امجد علی : اہاہا ، سبحان اللہ ، واہ وا ! اس شعر کی تعریف کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں اردو کیا ، فارسی شاعری میں بھی اس شعر کا جواب نہیں مل سکتا ۔

کالی پرشاد : نامۂ اعمال کو ہیبت ناک سبھی نے لکھا ہے ۔ اس کو دل آویز ثابت کرنا آپ ہی کا کام تھا ۔ ایک رند لاابالی کی ذہنیت کی ترجمانی کس خوبی سے کی گئی ہے ! وہ حشر کے دن بھی اپنے اعمال کے نتائج سے بے پرواہے اور گذشتہ زندگی کی سچی اور تفصیلی روداد پڑھتا ہے اور اس سے مزے لیتا ہے ۔ واہ وا ! ایسا ایک شعر بھی جو شخص کہہ لے اس کے کامل شاعر ہونے میں شبہہ نہیں کیا جاسکتا ۔

مرزا صاحب : یہ آپ حضرات کا حُسنِ نظر ہے جو معمولی معمولی شعروں میں ایسے ایسے محاسن دیکھ لیتا ہے ۔

امجد علی : ہم لوگوں نے آپ کا بہت سا بیش قیمت وقت خراب کیا ، اس کی معافی چاہتے ہیں ۔ مگر یہ لمحے جو آپ کی خدمت میں گزرے ہیں ان کی یاد ہمارے دلوں میں فخر کے ساتھ ہمیشہ محفوظ رہے گی ۔ اچھا، اب اجازت مرحمت ہو ۔

مرزا صاحب : آپ حضرات سے مل کر بہت دل خوش ہوا ۔ اچھا خدا حافظ ۔

چپراسی : آپ کو چیف انجنیر صاحب یاد فرماتے ہیں ۔

مرزا صاحب : اچھا بھئی ، چلتے ہیں ۔

چیف انجنیر : اس نقشے میں ترمیم تم نے کی ہے ؟

مرزا صاحب : جی ہاں ۔

چیف انجنیر : میں تمھاری تجویز سے اتفاق کرتا ہوں ۔ بے شک اس ترمیم سے عمارت میں کچھ خوبیاں بڑھ جائیں گی اور خرچ میں بھی کچھ کمی ہو جائے گی ۔ میرے بنائے ہوئے نقشوں میں جب بھی تم کو کوئی ترمیم ضروری معلوم ہو تو بے تامل کر دیا کرو ۔

مرزا صاحب : شکریہ

[چیف انجنیر رخصت پر چلا جاتا ہے اور دوسرا انگریز اس کا قائم مقام ہوتا ہے ۔ مرزا صاحب ایک دن اس کے بنائے ہوئے نقشے میں کچھ ترمیم کر دیتے ہیں اور وہ مرزا

صاحب کو بلواتا ہے]

چیف : وِل ، اس نقشے میں ترمیم کس نے کی ؟

مرزا صاحب : میں نے ۔

چیف : کیوں ؟

مرزا صاحب : اس لیے کہ وہ غلط تھا ۔

چیف : کیا تم نے اس کے لیے مجھ سے اجازت لے لی تھی؟

مرزا صاحب : غلطی کی اصلاح ہر شخص کا فرض ہے ۔ اس کے لیے اجازت کی کیا ضرورت ؟

عسکری : مرزا صاحب ، آپ سے خوب ملاقات ہوگئی ۔ یہ تو فرمائیے کہ کیا حال ہیں آپ کے یہاں سے کچھ کتابیں چوری ہوگئی ہیں ؟

مرزا صاحب : جی نہیں ۔ مگر یہ سوال آپ نے پوچھا کیوں ؟

عسکری : گذشتہ اتوار کو نخّاس کی بازار میں ایک بڑھیا آپ کی تصنیف کی ہوئی کچھ کتابیں ایک ٹوکری میں لیے بیٹھی تھی اور جس کتاب کے جو دام کوئی لگاتا تھا انہیں داموں پر وہ اسے بیچ ڈالتی تھی ۔ یہ دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ شاید کوئی یہ کتابیں چُرا لایا ہے ، ورنہ رُپے کا مال چار آنے کو کوئی کیوں دینے لگا ۔

مرزا صاحب : بھائی عسکری صاحب ، واقعہ یہ ہے کہ اُس دن میرے یہاں کچھ کھانے کو نہ تھا میں نے اپنی کتابیں ایک ٹوکری میں رکھ کر ماما کو دیں کہ نخّاس لے جائے ، اور تاکید کر دی کہ کسی خریدار کو واپس نہ کرنا بلکہ جس کتاب کی جو قیمت لگائی جائے اُسی قیمت پر دے دینا ۔ اس طرح کچھ رُپے آ گئے اور گھر کا خرچ چلا ۔

عسکری : لیجئے : یہ تو میں نے خیال ہی نہیں کیا ۔

[مرزا صاحب اپنے مکان پر دوستوں کی صحبت میں بیٹھے ہوئے اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک عجیب واقعہ بیان کر رہے ہیں]

ایک دوست : مرزا صاحب ، مجھے حیرت ہے کہ آپ کا سا فلسفی منش آدمی بھوتوں اور چُڑیلوں کے وجود پر اعتقاد رکھتا ہے ۔

مرزا صاحب : اور مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ آپ کا سا ذی علم شخص عقیدے اور واقعے میں فرق نہیں کر سکتا میں تو اپنے اوپر گذرا ہوا ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں اور آپ اُس کو میرا عقیدہ سمجھ رہے ہیں ۔

دوسرے دوست مرزا صاحب ، ذرا میں بھی تو وہ واقعہ سنوں ۔

مرزا صاحب : اچھا صاحب ، آپ بھی سنیے ۔ جوانی کا زمانہ تھا میں مشرقی علوم میں کچھ دخل پیدا کر چکا تھا کہ انگریزی

پڑھنے کا شوق دامن گیر ہوا ۔ روز شام کو ایک دوست کے یہاں چلا جاتا تھا اور میں اور وہ دونوں رات گئے تک باہری کمرے میں ساتھ پڑھا کرتے تھے ۔ اس کے بعد میں وہیں سو رہتا تھا ۔ ایک رات کو جاڑے کے موسم میں بارہ بجے تک پڑھنے کے بعد میرے دوست تو گھر کے اندر چلے گئے اور میں حسب معمول اسی کمرے کے دروازے بند کر کے سونے کے لیے لیٹا ، مگر نیند نہ آئی اور میں ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گیا کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ چراغ کی روشنی دھیمی ہونے لگی میں نے بتی اکسائی ، مگر روشنی پھر دھیمی ہونے لگی ۔

ایک دوست : حضرت ، چراغ میں تیل کم رہ گیا ہو گا ۔

مرزا صاحب : نہیں صاحب ، سُنیے تو جب دوبارہ روشنی دھیمی ہوئی تو میں نے اپنے ازار بند کا ایک ٹکڑا کاٹ کے ایک موٹا سا بتّا رکھ دیا اور چراغ میں کڑوا تیل بھر دیا ۔ مگر روشنی پھر بھی دھیمی ہونے لگی ۔ آخر کار مجبور ہو کر سونے کی نیت سے آنکھیں بند کر کے پلنگ پر لیٹ گیا ۔ ذرا دیر بعد میرے جسم بھر میں کوئی چیز چبھنے لگی ۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک نہایت سیاہ فام ، بڑی ڈراؤنی صورت کی قد آور عورت کو اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا پایا ۔ اُس کی آنکھیں چہرے پر آڑی پڑی ہوئی نہیں بلکہ سیدھی کھڑی ہوئی تھیں اور دروازے کے پلّوں کی طرح کھلتی اور بند ہوتی تھیں ۔ وہ ناریل کی جٹا کا کچھ زیور سا پہنے ہوئے تھی وہی میرے جسم میں چبھ رہا تھا ۔

ایک دوست : یہ منظر دیکھنے کے بعد آپ کے حواس بجا رہے ؟

مرزا صاحب : میں نے یہ دیکھ کر ایک چیخ ماری اور اُس کالی بلا نے اُٹھ کر میری گردن دبائی ۔ [ختم مسودہ]

تکملہ : مرزا رسوا کا دم گھٹنے لگا اور وہ پوری قوت صرف کرنے کے باوجود اپنے سینے پر سوار اُس برہنہ عورت کے ہاتھ اپنی گردن پر سے نہ ہٹا سکے ۔ آخر انھوں نے آیۃ الکرسی پڑھنا شروع کی اور آہستہ آہستہ اُس عورت کی آہنی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی ۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے غائب ہو گئی ۔ مرزا نے آیت کی تلاوت بند کر کے اپنے دوست کو پکارنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ عورت پھر نمودار ہو گئی اور مرزا کا گلا گھونٹنے لگی ۔ مرزا نے پھر آیۃ الکرسی شروع کی اور عورت پھر فضا میں تحلیل ہو گئی ۔ دیر تک یہی ہوتا رہا کہ اِدھر دوست کو آواز دینے کے لیے ان کی زبان رُکتی اُدھر عورت ظاہر ہو کر اُن کا گلا گھونٹنے لگتی آخر مرزا نے دوست کو بلانے کی یہ تدبیر کی کہ پوری آواز سے چلا چلا کر آیۃ الکرسی پڑھنے لگے یہ شور سُن کر اُن کے دوست گھر کے اندر سے بھاگے ہوئے آئے ان کے پہنچتے ہی مرزا بے ہوش ہو گئے اور ایک عرصے تک سخت بیمار رہے ۔

مرزا کے بیان کرنے کے وقت اِس واقعے کو مدت گذر چکی تھی لیکن مرزا کی گردن پر اُس وقت بھی عورت کی

انگلیوں کے نشان پڑے ہوئے تھے جو انھوں نے واقعے کی صداقت کے ثبوت میں دکھائے [نیر مسعود ۔ مسموع از پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب]

۴ ۔ مکتوبِ رسوا بہ نام ادیب

[اس خط کی پیشانی پر ادیب نے اپنے قلم سے لکھا ہے "مکتوب مرزا محمد ہادی متخلص بہ مرزا معروف بہ مرزا رسوا بہ نام سید مسعود حسن رضوی ادیب ۔" خط پر تاریخ اور مقام تحریر درج نہیں ہے ۔

اپنے نشری مضمون میں مرزا رسوا کے آخری زمانے کا ذکر کرتے ہوئے ادیب نے لکھا ہے .

"اُسی زمانے میں انھوں نے حیدر آباد سے مجھ کو لکھا کہ اگر "تحفۃ الہند" کا کوئی نسخہ نظر آجائے تو میرے لیے خرید لیجئے گا ۔ ۔ ۔ اتفاق سے اس کا ایک نسخہ میرے کتب خانے میں موجود تھا مگر کیڑوں نے اس کو بالکل چھلنی کر دیا تھا ۔ میں نے ۔ ۔ ۔ اس کے ہر ورق پر دونوں طرف باریک کاغذ چڑھوا کے اور جلد بندھوا کے اُن کی خدمت میں بھیج دیا ۔"

رسوا کے خط کا فقرہ "خدا کرے وہ کتاب جلد درست ہو جائے اور مجھ کو پہنچے" اغلباً اسی کتاب "تحفۃالہند" سے متعلق ہے اور یہ خط رسوا نے ادیب کو حیدر آباد دکن سے لکھا تھا ۔ اس سے یہ بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس خط کے قبل بھی رسوا نے ادیب کو حیدر آباد سے خط لکھا تھا جس میں اس کتاب کی فرمائش تھی ۔ جواب میں ادیب نے انھیں مطلع کیا کہ کتاب اُن کے کتب خانے میں موجود ہے اور درست کرا کے بھیج دی جائے گی اس خط کے جواب میں رسوا نے انھیں یہ خط لکھا ۔

یہ خط "نقوش" لاہور کے مکاتیب نمبر اور کتاب "خطوطِ مشاہیر بہ نام مسعود حسن رضوی ادیب (۶)" میں شامل ہے اور مناسب محل ہونے کی وجہ سے یہاں بھی پیش کیا جارہا ہے]

"بسم

مکرمِ بندہ دام فیوضکم

تسلیم : آپ کا مرحمت نامہ تکمۂ گریبانِ وصول ہوا ۔ میں آپ کی اِس دردِ سری

---

۶ ۔ مرتبہ نیر مسعود ، ناشر اُتر پردیش اردو اکادمی ، لکھنؤ ۱۹۸۵ء ص ۱۲۴

کا، جو اس ذرۂ بے مقدار کے لیے فرمائی گئی ہے ۔ دل سے ممنون ہوں ۔ واقعی آپ کے الطاف سے ایسی ہی امید تھی ۔ خدا کرے وہ کتاب جلد درست ہو جائے اور مجھ کو پہنچے تاکہ مزید شکر گزاری کا موقع ملے ۔

اس قسم کی اور کتابیں یا علم ہیئت قدیم مثل زیج محمد شاہی و زیج قدیم خاقانی جو محقق (۷) کی تصنیف ہے ، یا زیج الغ بیگی کا کوئی نسخہ یا برجندی کا آلات رصدیہ کا رسالہ یا علم ارشماطیقی کا کوئی رسالہ دست یاب ہو تو مرحمت فرمایئے گا ۔

زیادہ اس وقت کوئی حال قابل گزارش نہ تھا ، لہٰذا تحریری مکالمے کا باب فی الحال بند کیا ۔ یار زندہ ، ان شاءاللہ ، وصحبت باقی ، زیادہ شوق فقط

حررہ

ہادی بقلمہ"

۵ ۔ رسوا کے بارے میں یادداشتیں (از ادیب)

[کاغذ کے ایک پُرزے پر نمبروار لکھی ہوئی یہ یادداشتیں رسوا کے متعلق ادیب کی کسی طویل تحریر کے خاکے کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ ان میں سے زیادہ تر یادداشتیں رسوا پر ادیب کے نثری مضمون (نمبر ۲) اور ڈرامے (نمبر ۳) میں استعمال ہو گئی ہیں ۔ کچھ یادداشتیں ان دونوں تحریروں میں استعمال نہیں ہوئی ہیں یا اجمالی طور پر استعمال ہوئی ۔ اُن سے متعلق ادیب سے سنی ہوئی جو روایتیں مجھے یاد ہیں ، وہ اور رسوا کے بارے میں ادیب کے حوالے سے کچھ اور معلومات اور بعض وضاحتیں آگے درج ہوں گی]

۱ ۔ طالب علمی کے زمانے میں چڑیل سے سابقہ

۲ ۔ انجنیری کے محکمے کی ملازمت اور استعفا ۔ اشراق

۳ ۔ کیمسٹری کے تجربے ۔ میر محمد حسین

۴ ۔ مہادیو پرشاد اور ناول نویسی

۵ ۔ کرسچین کالج کی ملازمت ۔ ہر مضمون پڑھانا ۔ اخلاقِ ناصری ۔ امتحان کی کاپیاں دیکھے بغیر نمبر دینا ۔ پرنسپل سے شکایت اور عدم سماعت

۶ ۔ "میرا علم علمِ سفینہ نہیں ، علمِ سینہ ہے ۔"

۷ ۔ شاعری اور مشاعرے مقدارِ کلام ۔ دیوان کا تلف ہونا ۔

---

۷ ۔ خواجہ نصیر الدین محقق طوسی

۸ ۔ حیدر آباد کا قیام ۔
۹ ۔ مذہبیت کا غلبہ ۔ مناظرہ ، تصنیف میں حد کی مصروفیت
۱۰ ۔ نخاس میں کتابیں ارزاں بکنا ۔ مرزا محمد عسکری صاحب کا استفسار
۱۱ ۔ موسیقی کی تحصیل ۔ اکبر کی ولادت کے وقت کا گانا
۱۲ ۔ کتب بینی اور تصنیف میں انہماک ۔ تنہا مکان میں بند
۱۳ ۔ خرید کتب کا شوقِ مفرط ۔ مولوی محمد یحییٰ

وضاحتیں اور مزید معلومات

۱ ۔ **چڑیل** : "ادبستان" سے پہلے ادیب جوہری محلّے کے جس مکان میں رہتے تھے وہ منحوس اور آسیب زدہ مشہور تھا ۔ اسی مکان میں ایک رات کچھ عجیب سی تکلیف کے ساتھ ادیب کی آنکھ کھلی تو انھیں محسوس ہوا کہ اُن کا پورا بدن پلنگ کے ساتھ رسیوں سے جکڑ دیا گیا ہے اور پیچھے سرہانے کی طرف سے کوئی اُن کے تکیے کو اس طرح اوپر اٹھا رہا ہے کہ اُن کی گردن ٹوٹی جا رہی ہے ۔ پہلے انہیں چوروں کا شبہہ ہوا ، لیکن پھر احساس ہوا کہ جو رسیّاں اُن کو جکڑے ہوئے ہیں وہ غیر مرئی ہیں ۔ انھوں نے آیت الکرسی پڑھنا چاہی مگر گھبراہٹ اور تکلیف کی وجہ سے آیت انھیں یاد نہ آسکی دو تین بار اُن کے منھ سے "بسم اللہ" نکلا اور رسیّوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی ۔ اب انھوں نے سورۂ فاتحہ کی تلاوت شروع کی رفتہ رفتہ تکیہ نیچے آگیا اور رسیّوں کی گرفت ختم ہوگئی ۔ انھوں نے اٹھ کر لالٹین کی روشنی میں سب طرف دیکھا کہیں کوئی نظر نہ آیا اور وہ پھر اُسی پلنگ پر لیٹ کر سو گئے ۔ ادیب اس کو اپنی زندگی کا ایک ناقابلِ فہم ، واقعہ قرار دیتے تھے اور بھوت پریت کے قائل نہیں تھے ۔ اپنا یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ادیب اکثر مرزا رسوا کا چڑیل والا واقعہ بھی بیان کرتے تھے اور اس ضمن میں مرزا کے اس جملے کا ذکر ضرور کرتے تھے کہ "میں تو اپنے اوپر گذرا ہوا ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں اور آپ اس کو میرا عقیدہ سمجھ رہے ہیں ۔" اس کے بعد وہ عقیدے اور واقعے یا تجربے کا فرق بڑی خوبی سے بیان کرتے تھے ۔

عزیز لکھنوی بتاتے ہیں کہ مرزا رسوا "بھوت پریت کے قائل" تھے (۸) ۔ ممتاز حسین عثمانی بھی لکھتے ہیں کہ "جناب مرزا وجود ارواح خبیثہ کے قائل تھے اور انھوں نے اپنی ایک تصنیف "کتاب الرؤیا" میں اُن کا ذکر بھی کیا ہے ۔" (۹) خود رسوا نے "افسانۂ مرزا رسوا" میں امراؤ جان ادا کی طرف سے اپنے بارے میں لکھا ہے ، "کسی کو یہ خیال ہے کہ آپ [رسوا] کو پریوں کی تسخیر کا شوق ہے ۔" (۱۰) ان بیانوں سے رسوا بھوت پریت اور ماورائے فطرت

۸ ۔ مرزا رسوا مرحوم

۹ ۔ "سیرت مرزا"

۱۰ ۔ بہ حوالہ "مرزا رسوا ، حیات اور ناول نگاری" ڈاکٹر آدم شیخ نسیم بک ڈپو ، لکھنؤ ۱۹۶۸ء ص ۶۰

عناصر کے ماننے والے ظاہر ہوتے ہیں ۔ ادیب کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان عناصر پر عقیدہ نہیں رکھتے تھے ۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ رسوا اپنی متنوع زندگی کے کسی دور میں اور متلون مزاجی کے کسی مرحلے پر ضعیف الاعتقاد رہے ہوں ۔ اور عقلیت پسندی کے دور میں یہ کیفیت ختم ہو گئی ہو ، اور چڑیل والا واقعہ انھوں نے عقلیت پسندی کے دور میں سنایا ہو ۔ عجب نہیں کہ کسی زمانے میں یہی واقعہ وہ بھوت پریت کا وجود ثابت کرنے کے لیے سناتے ہوں اور عزیز اور ممتاز حسین عثمانی کے بیان اسی پر مبنی ہوں ۔

۲ ۔ **"اِشراق"** : کتاب "سوانح عمری اخبارات" کے اندراج کے مطابق مرزا رسوا نے یہ فلسفیانہ رسالہ ۱۵ مئی ۱۸۸۴ء سے نکالنا شروع کیا تھا ۔ اس اندراج سے "اشراق" کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں اس لیے ذیل میں اس کی نقل پیش کی جاتی ہے :

"اشراق روشن ہوا ہے حکمتِ اشراق سے جہاں دیکھو عروجِ نیر نصف النہارِ علم
اس رسالے کا عین مقصد حکیمانہ خیالات کی اشاعت ہے ۔ اس کے پہلے حصّے میں سر خیلِ اشراقین حکیم افلاطون سے [کذا] کی بیش [کذا] تصانیف کا ترجمہ مع شرح مقاماتِ دقیق و بیانِ حالاتِ تاریخی متعلق تصانیفِ مذکور و ذکر اختلافاتِ مذاہبِ فلاسفۂ متقدمین و متاخرین درج ہوتا ہے ۔
لکھنؤ ۔ چوک جدید ۔ ڈاک خانہ چوک ۔ باک ٹولہ ۔ مقام پھاٹک اجٹین ۔ ۱۶ ورق خُرد ۔ پندرہ روزہ ۔ والیانِ ملک سے للعہ [چار رُپے] ۔ عوام سے دو رُپے مالک مرزا محمد ہادی ۔ محلہ تھوئی ٹولا ۔ از مطبعِ اشراق پریس ۔ محمد علی پریس مَین اجراے ۱۱ مئی ۱۸۸۴ء" ۱۱

۳ ۔ **مہادیو پرشاد اور ناول نویسی** : مہادیو پرشاد مرزا رسوا سے معاوضے پر ناول لکھوا کر چھاپتا تھا ۔ کبھی کبھی وہ مرزا کو پیشگی رقم بھی دے دیتا تھا اور مرزا دو چار دن کے اندر ناول تیار کر کے اس کے حوالے کر دیتے ۔ "خونی جورو" "خونی شہزادہ" قسم کے ناول انھوں نے اسی طرح لکھے ہیں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ رسوا کی طبیعت ناول نویسی کی طرف مائل نہ ہوتی اور وہ مہادیو پرشاد سے ٹال مٹول کرنے لگتے ، تب وہ ان کے بے تکلف دوستوں سے فریاد کرتا اور دوست اُن کو کسی کمرے میں یہ کہہ کر بند کر دیتے کہ جب تک ناول مکمل نہ کر لو گے ، باہر آنا نہیں ملے گا ۔ اُس وقت بہ درجۂ مجبوری رسوا چند گھنٹوں میں ناول مکمل کر کے رہائی پاتے ۔

۴ ۔ **کرسچین کالج کی ملازمت** : کرسچین کالج میں جس مضمون کا استاد نہ آتا رسوا اس کا مضمون پڑھا دیتے تھے

---

۱۱ ۔ "سوانح عمری اخبارات ، حصہ اول اختر شاہنشاہی" : اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف نقوی (مالک اخبار "اختر ہند" و آنریری سکرٹری ، انجمنِ علمی) تصنیف ۱۳۰۵ھ ۔ اختر پریس ، لکھنؤ ۲۸ جون ۱۸۸۸ء ص ۲۹

نصیر الدین محقق طوسی کی "اخلاقِ ناصری" کے متعلق ان کا دعویٰ تھا کہ اُن کے سوا (یا اُن سے بہتر؟) کوئی اس کتاب کو نہیں پڑھا سکتا لیکن کبھی تو وہ اس کتاب کو بہت قاعدے سے پڑھاتے اور کبھی پڑھاتے پڑھاتے خود ہی اس کے مطالعے میں اس طرح گم ہو جاتے کہ طالب علم درس کے انتظار میں بیٹھے رہتے اور کلاس کا وقت ختم ہو جاتا ۔

کالج کا پرنسپل مرزا کو بہت مانتا اور اُن کی بے اصولیاں خندہ پیشانی سے گوارا کرتا تھا ۔ ایک مرتبہ مرزا نے امتحان کی کاپیاں دیکھے بغیر اُن پر نمبر دے دیے طالب علموں کو اس کا علم ہو گیا اور انھوں نے پرنسپل سے شکایت کی لیکن پرنسپل نے طالب علموں کو ڈانٹ دیا کہ مرزا نے جو نمبر دیے ہیں وہی ٹھیک ہیں ۔

[یہ واقعات مرزا جعفر حسین نے اپنے مضمون "مرزا ہادی رسوا (۱۲)" میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں ۔ ادیب بھی ان واقعات کو کم و بیش اسی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے تھے ، اور مرزا جعفر حسین نے رسوا کے متعلق اپنی معلومات کے ماخذوں میں ادیب کا نام بھی لیا ہے ۔ اس لیے یہاں ان واقعات کا سرسری تذکرہ کیا گیا] ۔

۵ ۔ پڑھنے لکھنے میں انہماک : اس ضمن میں ادیب دو واقعے بیان کرتے تھے ایک یہ کہ ایک بار مرزا نے کوئی کتاب لکھنے کے لیے خود کو کھانے پینے کے سامان کے ساتھ ایک تنہا مکان میں بند کر لیا اور تاکید کر دی کہ کوئی ان کے کام میں مخل نہ ہو ۔ لیکن کتاب میں ایسے از خود رفتہ ہوئے کہ کھانا پینا بھول گئے یہاں تک کہ لکھتے لکھتے بے ہوش ہو گئے اور مکان کا دروازہ توڑ کر باہر نکالے گئے ۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ رسوا کے ایک بچّے کی طبیعت بہت خراب تھی لیکن رسوا کچھ لکھنے میں مصروف تھے ۔ بچّے کی حالت بگڑتی گئی مگر رسوا لکھتے رہے ۔ یہاں تک کہ بچّہ ختم ہو گیا ۔ رسوا نے اس کے دفن و کفن کے لیے گھر والوں کو رقم دے دی اور پھر لکھنے میں مشغول ہو گئے ۔

ڈاکٹر آدم شیخ نے اس واقعے کا ذکر رسوا کے بیٹے آغا ولی اور مرتضیٰ حسین موسوی کے حوالے سے کیا ہے (۱۳) ۔ ادیب بیان کرتے تھے کہ جب رسوا کو بچّے کی موت کی اطلاع کی گئی تو انھوں نے اس کے آخری رسوم ادا کرنے کے لیے ایک دوست کو پرچہ لکھ دیا اور خود اپنے کام میں لگے رہے ۔

۶ ۔ سیّد جعفر حسین : تذکرۂ "سراپا سخن" کے مؤلف میر محسن علی محسن کے بیٹے اور افسانہ نگار سیّد رفیق حسین کے والد تھے ۔ ادیب بتاتے تھے کہ رسوا اور سید جعفر حسین کی آواز اور لب و لہجہ اس قدر ملتا جلتا تھا کہ محض سن کر اندازہ کرنا مشکل ہوتا تھا کہ دونوں میں سے کون بول رہا ہے ۔

---

۱۲ ۔ مشمولہ "بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب ، اپنے تہذیبی پس منظر میں" : مرزا جعفر حسین ۔ اترپردیش اردو اکادمی ، لکھنؤ ۱۹۶۸ء

۱۳ ۔ "مرزا رسوا ، حیات اور ناول نگاری"

سید جعفر حسین سے ادیب کو رسوا کے بہت سے حالات معلوم ہوئے تھے ۔ (۱۴)

۷ ۔ **کتاب "ہدیۂ سنیہ"**: عزیز لکھنوی کے بہ قول یہ کتاب ، جو شاہ عبد العزیز دہلوی کی "تحفۂ اثنا عشریہ" کا جواب ہے ، تقریباً پچیس چھبیس جلدوں میں ہے (۱۵) "حکیم شیخ ممتاز حسین عثمانی اسے "کم و بیش پندرہ ضخیم جلدوں میں" اور "تقریباً پانچ ہزار" صفحوں پر مشتمل بتاتے ہیں (۱۶) ۔ ڈاکٹر آدم شیخ کی تحقیق کے مطابق یہ چھبیس جلدوں میں ہے جن میں بارہ جلدیں غیر مطبوعہ ہیں (۱۷) یعنی اس کی چودہ جلدیں چھپ چکی ہیں جو غالباً صحیح نہیں ہے ۔

ادیب نے نثری مضمون میں "ہدیہ سنیہ" کی جلدوں کی تعداد اٹھارہ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی کوئی جلد شائع نہیں ہو سکی ۔ ادیب نے یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے "ایک موقع پر" خود رسوا کی زبان سے سنا کہ یہ کتاب ایک مذہبی انسائکلو پیڈیا ہے ، اور اس کی آٹھویں جلد "الفقہ" وہ سب سے پہلے شائع کرنا چاہتے تھے ۔ مضمون میں ادیب نے یہ نہیں لکھا کہ رسوا نے یہ بات کس موقع پر کہی لیکن زبانی گفتگوؤں میں وہ اس کی تفصیل یہ بتاتے تھے کہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے ایک اجلاس کے موقع پر جس میں وہ خود بھی شریک تھے اور مرزا رسوا بھی ، یہ تجویز پیش ہوئی تھی کہ کانفرنس کی طرف سے "تحفۂ اثنا عشریہ" کا سنجیدہ اور علمی انداز میں جواب دیا جائے اور یہ کام علمائے دین کی ایک کمیٹی کے سپرد کیا جائے ۔ اس تجویز پر بحث کے دوران مرزا رسوا نے بتایا کہ انھوں نے اپنے طور پر یہ جوابی کتاب لکھنا شروع کی تھی ۔ لیکن اُس نے اپنے دائرے سے نکل کر اٹھارہ جلدوں پر مشتمل ایک مذہبی انسائکلوپیڈیا کی صورت اختیار کر لی ۔ اس کی آٹھویں جلد ، جس کا نام "الفقہ" ہے ، "تحفۂ اثنا عشریہ" کا جواب ہے اور وہ اسی کو سب سے پہلے شائع کرنا چاہتے ہیں ۔

یہ بات بھی عام طور پر معلوم نہیں ہے کہ مرزا رسوا آل انڈیا شیعہ کانفرس کے دار الترجمہ ہی کی طرف سے اعزازی سیکرٹری تھے۔ ان کی کتابیں " المناظرہ " اور المغالطات ہی کی طرف سے شائع ہوئی تھیں۔

۸ ۔ **"المناظرہ" ، "المغالطات"** : نثری مضمون میں ادیب نے مرزا رسوا کے ان دونوں رسالوں کا ذکر کیا ہے ۔ کتب خانۂ ادیب میں ان دونوں کتابوں کے مطبوعہ ایڈیشن موجود ہیں "المناظرہ" کے سرورق کی عبارت حسب ذیل ہے :

---

۱۴ ۔ سید جعفر حسین کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے کتاب "شاہ حسین حقیقت اور ان کا خاندان" از مشرف احمد ، ادارۂ ادبیات پاکستان ، کراچی ۱۹۷۷ء

۱۵ ۔ "مرزا رسوا مرحوم"

۱۶ ۔ "سیرت مرزا"

۱۷ ۔ "مرزا رسوا ۔ حیات اور ناول نگاری"

"سلسلۂ تالیفاتِ دارالترجمہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس نمبر ۳

المناظرہ

علمِ آداب بحث و مناظرہ کا نہایت جامع و مفید رسالہ

(مؤلفہ)

عالی جناب مولوی مرزا محمد ہادی صاحب بی ۔ اے پروفیسر ریڈ کرسچن کالج ۔

(آنریری سکرٹری دارالترجمہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس)

مطبوعۂ معیار پریس ، رستم نگر ، لکھنؤ

قیمت علاوہ محصول ڈاک ...... (۲ـ)

دیباچے کے آخر میں رسوا نے اپنا نام "ہادی بن تقی" لکھا ہے ۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ "المناظرہ" کے مطالب اس موضوع کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں زیادہ واضح ہیں ۔ لیکن اس رسالے میں رسوا کی نثر ادق کی حد تک دقیق ہے جس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے کیا جاسکتا ہے ۔

> "آگاہ ہو کہ مقدمہ اگرچہ متعدد ہو گیا ہو مگر جب سائل اس کو معین کر دے گا تو جائز ہو گا کہ اس پر منعِ حقیقی وارد کیا جائے جو موسوم بہ مناقضہ ہے اور نقض تفصیلی بھی ، اور وہ طلب دلیل ہے کسی مقدمے پر ، اگرچہ وہ دلیل سے متعدد ہو ، عام اس سے کہ منع قبل تمام ہونے دلیل کے ہو یا بعد اُس کے ۔ اور کبھی منع کا اطلاق نقضِ اجمالی اور معارضہ پر بھی کیا جاتا ہے ۔" (ص ۱۰)

"المغالطات" اسی دارالترجمہ کے سلسلہ تالیفات کی چوتھی کتاب ہے۔ سرورق کی عبارت کے مطابق مرزا نے اس میں "حکمائے قدیم و جدید دونوں کی تقسیم مغالطات کو بیان کر کے اجزائے منطق پر بنائے تقسیم رکھ کے متکلمین و مناظرین کے فائدے کے لیے ایک جامع کلام کیا ہے"

اس کتاب کی عبارت کا بھی وہی ڈھنگ ہے۔ جو "المناظرہ" کی عبارت کا ہے۔

۹ ۔ اکبر بادشاہ کی ولادت کا گیت : ادیب نے اس گیت والا واقعہ مختصر کر کے لکھا ہے ۔ اس کی دلچسپ تفصیل جو انھوں نے کئی بار بیان کی یہ ہے کہ رسوا رمضان میں حیدر آباد سے لکھنؤ آئے ہوئے تھے ۔ رمضان کی ۱۹ ، ۲۰ اور ۲۱ حضرت علیؑ کے سوگ کی تاریخیں ہیں اور "شبیں" کہلاتی ہیں ادیب انھیں تین میں سے کسی تاریخ کو مرزا رسوا سے ملنے گئے تھے ۔ رسوا نے ان سے گیت کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اگر شبیں نہ ہوتیں تو میں اس گیت کو گا کر یا ساز پر بجا کر سُناتا ۔ ادیب کی درخواست پر انھوں نے گیت کے بول بتا دیے ادیب کو یہ بول لسانی اعتبار سے بہت اہم معلوم ہوئے

اس لیے کہ یہ عہد ہمایوں کی اردو کا نمونہ تھے ۔ انھوں نے کئی بار کہا کہ مرزا صاحب ، یہ گیت مجھے لکھا دیجئے ۔ لیکن مرزا نے ہر بار ٹال کر اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں ۔ اس کے کچھ دن بعد ادیب کی ملاقات سر راہ عزیز لکھنوی سے ہو گئی ۔ انھوں نے ادیب سے کہا کہ "مرزا صاحب آپ سے بہت ناراض ہیں ۔ کیا انھوں نے آپ کو کوئی پرانا گیت سُنایا تھا ؟" ادیب بولے ، "جی ہاں ، سنایا تو تھا۔" عزیز ہنسنے لگے اور بولے ، "مرزا صاحب نے کئی لوگوں سے شکایت کی ہے کہ میں نے تو مسعود صاحب کو ایک گیت سنایا ، اور وہ اسے لکھے لے رہے تھے ۔" عزیز نے یہ بھی بتایا کہ "لکھے لے رہے تھے!" مرزا نے ایسے فریادی لہجے میں کہا تھا گویا اُن پر کوئی ناقابلِ یقین ستم ڈھایا جارہا تھا ۔ ادیب بھی ہنسنے لگے اور بولے، "وہ مختصر سا گیت تھا، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس کا لکھنا غضب ہے تو مرزا صاحب سے دو مرتبہ مکرر ارشاد کہ کے اُسے زبانی یاد کر لیتا ۔"

عزیز نے رسوا پر اپنے مضمون میں اس گیت کا اس طرح ذکر کیا ہے :

> "[رسوا] جب حیدر آباد سے آتے تھے تو مجھ کو ضرور بلواتے تھے ۔ ایک دن گیا تو دیکھا مرزا صاحب ایک چارپائی پر بیٹھے ہیں اور ہارمونیم سامنے رکھا ہوا ہے ۔ مجھ کو دیکھتے ہی کہا ، "آہا ، آئیے ،اکبر کے جلوس کے وقت جو گیت گایا گیا تھا وہ سنیے ۔"

ممکن ہے ادیب کی شکایت مرزا نے اِسی موقعے پر کی ہو ۔ ادیب اور عزیز کے بیانوں میں یہ فرق ہے کہ ادیب نے اسے اکبر کی ولادت کے وقت کا اور عزیز نے اکبر کے جلوس کے وقت کا گیت بتایا ہے ۔

۱۰ ۔ شعر "..... سوکھے ٹکڑے بھی ....." :

ادیب مضمون آفرینی کی مثال میں رسوا کا یہ شعر اکثر سُنایا کرتے تھے لیکن اس کا پہلا مصرع اُن کو لفظ بہ لفظ یاد نہیں تھا ، اسی لیے ڈرامے میں انھوں نے رسوا کی زبان سے بھی یہی کہلایا ہے کہ "پہلا مصرع یاد نہیں آتا ہے ، بہر حال مطلب ادا کیے دیتا ہوں" اور شعر کو یوں لکھا ہے :

تنگ دستی میں تو ممکن نہیں ترکِ لذت
سوکھے ٹکڑے بھی تو فاقوں میں مزہ دیتے ہیں

ادیب کا کہنا تھا کہ پہلے مصرع میں "تو" کا لفظ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ یہ مخلِّ فصاحت ہے ۔ عزیز لکھنوی نے رسوا کی شاعری پر اپنے ایک مضمون میں یہ شعر درج کر دیا ہے ۔ اس کا پہلا مصرع یوں ہے :

تنگیِ عیش میں ممکن نہیں ترکِ لذّت (۱۸)

۱۱ ۔ طوائفیں اور مے نوشی : نثری مضمون میں ادیب نے اس سلسلے میں صرف اتنا لکھا ہے :

---

۱۸ ۔ "مرزا صاحب کی شاعری" (مشمولہ "مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات" ص ۱۱۹)

"مرزا صاحب کی زندگی میں ایک دور رندی اور عیاشی کا بھی تھا جب کہ زیادہ وقت ناچ گانے کی صحبتوں میں گذرتا تھا ، مگر یہ اُن کے عہدِ شباب کی باتیں ہیں جو میں نے دوسروں سے سنی ہیں ۔"

اس عہد کا حال بھی ادیب کو زیادہ تر سید جعفر حسین سے معلوم ہوا تھا جو رسوا کے لڑکپن کے ہم راز دوست تھے ۔ ادیب اُس زمانے کے واقعات تو نہیں بیان کرتے تھے لیکن یہ بتاتے تھے کہ اس دَور میں رسوا کئی کئی دن طوائفوں کے کوٹھوں پر پڑے رہتے اور زیادہ تر نشے میں چور رہا کرتے تھے ، اور "امراؤ جان ادا" میں انھوں نے اپنے اس زمانے کے تجربوں اور مشاہدوں سے خوب فائدہ اٹھایا ہے ۔

۱۲ ۔ **رسوا اور دردِ سر** : ادیب قریب اَڑتالیس برس تک دردِ سر کے مریض رہے ۔ بہت سے معالجوں کو دکھایا لیکن معالج یہی تشخیص نہ کر سکے کہ اس درد کا سبب کیا ہے ۔ ادیب بتاتے تھے کہ ایک بار انھوں نے مرزا رسوا سے اس عدم تشخیص کا ذکر کیا تو مرزا نے بہت زور دے کر اُن سے کہا کہ یہ ذہانت کا درد ہے ، خبردار اس کا علاج مت کرائیے ۔ میں بھی دردِ سر کا مستقل مریض ہوں ۔ شروع میں ایک ڈاکٹر سے معائنہ کرایا تو اُس نے بتایا کہ یہ درد آپ کے دماغ کی سرگرمی اور ذہانت کی وجہ سے ہے ۔ دواؤں سے درد کی شکایت دور ہو سکتی ہے مگر آپ کی طبّاعی اور ذہانت بھی کم ہو جائے گی ۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے علاج نہیں کرانا ہے ۔ مجھ کو دردِ سر گوارا ہے ، کُند ذہنی گوارا نہیں ۔

۱۳ ۔ **بھگت پنساری اور رسوا** : لکھنؤ میں اکبری دروازے سے متصل بھگت پنساری کی قدیم دُکان اب بھی موجود ہے ۔ مرزا رسوا اپنے کیمیائی تجربوں کے لیے اس دکان سے بھی چیزیں خریدتے تھے ۔ مرزا محمد عسکری بھگت کی دُکان سے تھوڑے ہی فاصلے پر رہتے تھے ۔ انھوں نے ادیب سے بیان کیا کہ ایک دن اُن کو رسوا سڑک پر ایسے نامناسب اور مختصر لباس میں نظر آئے جس میں کوئی عزّت دار آدمی گھر سے باہر نکلنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا ۔ مرزا عسکری سمجھے کہ شاید کوئی سخت حادثہ پیش آگیا ۔ بڑھ کر رسوا سے خیریت دریافت کی تو وہ بولے ، "ارے بھئی ، ایک تجربہ کر رہا تھا ، کم بخت گندھک کم پڑ گئی ، وہی بھگت کے یہاں سے لینے جا رہا ہوں ۔"

۱۴ ۔ **آخر عمر میں قصہ و داستان سے دلچسپی** : "بعض حالاتِ مرزا ... " میں یہ بیان آچکا ہے کہ آخر عمر میں رسوا کو کہانیاں سننے کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور الٰہی جان نامی ایک خاتون اُن کو کہانیاں سُناتی تھیں ۔ عزیز لکھنوی بھی لکھتے ہیں کہ رسوا "پُرانی بڑھیوں میں بیٹھ کر قصّے کہانیاں سُنا کرتے تھے (۱۹)" اسی سلسلے میں ادیب مرزا محمد عسکری سے سنا ہوا ایک واقعہ بیان کرتے تھے ۔ رسوا (وفات ۱۹۳۱ء) کے آخری دنوں میں مرزا عسکری مطبع نول کشور ، لکھنؤ

۱۹۔ "مرزا رسوا مرحوم"

میں سپرنٹنڈنٹ طباعت تھے (۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۰ء) (۲۰) ۔ اُسی زمانے میں ایک دن رسوا نے مطبع میں آکر قصّہ و داستان کی کتابوں ، خصوصاً "بوستانِ خیال" کی جلدوں کی فرمائش کی ۔ مرزا عسکری نے تعجب سے پوچھا کہ مرزا صاحب اس عمر میں آپ کو قصّے کہانیوں کا شوق پیدا ہوا ہے ؟ رسوا نے بہت سنجیدگی سے کہا کہ قصّے کہانیاں پڑھنے کا اصل زمانہ تو اب جاکر آیا ہے ۔ آپ قصہ کہانی کو کیا سمجھتے ہیں ؟ اور "بوستانِ خیال" تو علوم و فنون کا مخزن ہے ۔ اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جو علوم کا منتہی ہو ۔

۱۵ ۔ **"فسانۂ مرزا رسوا"** : غالباً سید جعفر حسین سے ادیب کو معلوم ہوا تھا کہ "فسانۂ مرزا رسوا" میں جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے ۔ رسوا کو ایک یورپی خاتون سے تعلق خاطر تھا وہ واپس آنے کا وعدہ کر کے وطن گئی تھی اور لوٹ کر نہیں آئی ۔ رسوا ایک مدّت تک روزانہ چائے کا سامان کر کے اس کی واپسی کے انتظار میں بیٹھتے تھے ۔ اس واقعے کے اثر سے وہ جنونی کیفیت میں مبتلا ہو گئے تھے جس کا ایک مظہر یہ بے حاصل انتظار کشی بھی تھی ۔ "فسانۂ مرزا رسوا" میں جو مثنوی شامل ہے اس کا نام "جنونِ انتظار" بھی اسی لیے رکھا گیا تھا ۔

۱۶ ۔ **رسوا کی کتابوں کا حقِ اشاعت** : ادیب کا بھی بیان تھا کہ رسوا نے اپنی سب ، یا کئی ، کتابوں کا حقِ اشاعت بنارس ہندو یونیورسٹی کو دے دیا تھا ۔

۱۷ ۔ **ناول "امراؤ جان ادا" ، متن میں تحریفیں** : ادیب اکثر شکایت کرتے تھے کہ "امراؤ جان ادا" کے مروّجہ مطبوعہ ایڈیشن کتابت کی غلطیوں اور طرح طرح کی تحریفوں کی وجہ سے مسخ ہو گئے ہیں اور اس کے بہت سے لفظ اور محاورے بدل کر کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں ۔ ادیب نے اس کتاب کے ایک معمولی سے ایڈیشن میں اس قسم کی کچھ غلطیوں کی تصحیح بھی کی تھی ۔ وہ یہ بھی بتاتے تھے کہ کتاب کے اصل متن میں اشعار خصوصاً ذہرون اور چھندوں وغیرہ کی کثرت تھی جو بعد کے ایڈیشنوں میں نہیں ملتے ۔

۱۸ ۔ **امراؤ جان کی شخصیت** : افسانہ یا حقیقت ؟ ادیب کا کہنا تھا کہ امراؤ جان ادا کی شخصیت اور نام حقیقی ہے ۔ رسوا سے اس کے مراسم رہ چکے تھے ، لیکن ناول میں امراؤ جان کے جو واقعات بیان ہوتے ہیں وہ رسوا کے تخیّل کی پیداوار ہیں یا ممکن ہے ان میں کچھ کا تعلق امراؤ جان سے ، کچھ کا دوسری طوائفوں سے ہو اور کچھ رسوا کے سوچے ہوئے ہوں ۔ ناول اور افسانہ لکھنے والے اپنے کسی کسی کردار کو اپنی کسی عزیز شخصیت کا روپ اور نام دے دیتے تھے ، جیسے رسوا نے سید جعفر حسین انجنیر کو اپنے ناول "شریف زادہ" کا ایک کردار بنا دیا ؛ اسی طرح انھوں نے امراؤ جان کو اپنے

---

۲۰ ۔ "من کیستم" (خود نوشت) : مرزا محمد عسکری ۔ اتر پردیش اردو اکادمی ۔ لکھنؤ ۱۹۸۵ء ۔

ناول کا کردار بنایا ہے ۔

برادر عزیز سید اظہر مسعود رضوی نے رسوا کی ایک ہم عصر طوائف امراؤ جان کا سراغ لگایا ہے جو "کالی امراؤ جان" کہلاتی تھی تائب ہو کر زیارات کر چکی تھی اور ہندی میں دُہرے، چھند اور گیت وغیرہ کہتی تھی ۔ اس کالی امراؤ جان اور مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا میں کئی باتیں مشترک ملی ہیں ۔ اظہر مسعود اس سلسلے میں مزید تحقیق کر رہے ہیں جسکے نتیجے میں امید ہے امراؤ جان ادا کی شخصیت پر سے پردہ ہٹ جائے گا ۔

۱۹۔ رسوا اور ایک رفاعی انجمن (۹—۱۹۰۸ھ): کتب خانۂ ادیب میں مرزا کی ایک کتاب "نصوص الحکم در بیانِ معنی اصول و اخبار" ہے۔ اس کتاب کے آخر میں ایک اشتہار چھپا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا رسوا لکھنؤ کی ایک رفاہی انجمن کے نائب صدر تھے۔ اشتہار کی عبارت درج ذیل ہے:

"**انجمنِ علویہ ، لکھنؤ** : خدا کے فضل سے یہ انجمن مدت چار سال سے احاطۂ مرزا علی خان ، لکھنؤ میں قائم ہے اور اس کے اراکین وثیقہ داران و عمائدینِ لکھنؤ ہیں۔ عالی جناب ، حشمت مآب ، گردوں قباب، معلّی القاب نواب سیّد محمد ہادی علی خان بہادر دام اقبالہم [کذا] المعروف بہ نواب کھسیٹا صاحب صدرِ انجمن ، اور عمدۃ الفضلاء المتبحرین ، زبدۃ الحکماء المتآلہین، جامع العلوم المتقدمین والمتاخرین جناب مرزا محمد ہادی صاحب بی ۔ اے ، سینیر ایڈیٹر "الحکم" لکھنؤ نائب صدر انجمن ہیں۔ یہ انجمن دفنِ امواتِ مومنینِ محتاجین اور کتخدائی دختران غربائے مساکین و دیگر امورِ خیر میں نہایت سرگرمی سے امداد کرتی ہے۔ بالفعل اس انجمن نے ایک قطعۂ اراضی نہایت عمدہ موقع پر احاطۂ مرزا علی خاں میں بہ غرض تعمیر مدرسۂ دینیات و حرفت و صنعات خرید کیا ہے۔ دستورالعمل مومنین منگائیں اور شرکتِ انجمن فرمائیں۔

المشتہر : سیّد اکبر حسین ، منصرمِ انجمنِ ہذا" ۲۱

نیّر مسعود
"ادبستان" ، دین دیال روڈ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳
(۱۹۹۰ء)

۲۱۔ "نصوص الحکم ....." گلشن فیض پریس، لکھنؤ ۱۳۲۶ھ

مجید امجد۔ بے نشانی کا نشاں

مظفر علی سیّد

پہلے مجید امجد کی نظم ایک نامعلوم پیشرو کی بازیابی کے سلسلے میں:

میں اب آیا ہوں، اتنے برسوں کے بعد آندھیاں آئیں، بدلیاں برسیں
دب گئیں خاک کی تہیں، تہ خاک بہتی مٹی میں بہ گئی —— مٹی
یونہی اپنے قیاس سے، میں نے ریت کی اک شکن کو پہچانا
مٹتی سطروں پہ ایک ڈوبتی سطر اک خطِ خاک، جس پہ کچھ کنکر
میں نے پہلے تو چُن کے رکھ بھی دیے پھر خیال آیا: اب یہ کون کہے
قبر تیری یہیں کہیں تھی، مگر تھی کہاں؟ شاید اس جگہ تو نہ تھی
کچھ جو سوچا —— نہ جانے کیا سوچا ذہن میں لاکھ الجھ گئے دھاگے
میں نے کنکر وہ سب بکھیر دیے

بے نشاں خاک، میرے سامنے اب اُن جہانوں کا ایک حصہ ہے
جن کے بھیدوں کی تھاہ میں تو ہے جن کے سایوں کی قبر میں، میں ہوں

پچھلے سولہ سترہ برسوں میں خود مجید امجد ہم میں سے اکثر کے لیے ایک نامعلوم پیشرو بن چکا ہے۔ سنا ہے ساہیوال میں بے کسی کی موت مرنے کے بعد اسے اپنے آبائی وطن جھنگ میں لے جا کے دفن کیا گیا تھا۔ لیکن جھنگ میں کوئی ڈھونڈنے جائے تو اسے مجید امجد کی ۔ یہی نظم سٹیج کرنی پڑے گی یا میر کے اشعار یاد کرنے ہوں گے؟

وہ تو مٹا گیا تھا تربت بھی میر جی کی دو چار اینٹیں رکھ کر میں پھر نشاں بنایا

مت تربتِ میر کو مٹاؤ
رہنے دو غریب کا نشاں تو

بات تو یہاں بھی وہی ہے لیکن مجید امجد یہاں تک نہیں رکتا۔ وہ بھیدوں کی تھاہ میں اپنے پیشرو کی سبقت تسلیم کرتا ہے اور خود کو ان جہانوں کے سایوں کی قبر میں دیکھتا ہے جو ابھی گرفت میں نہیں آئے صرف ان کا ایک نشان سا بن بن کے بگڑتا ہے جو کبھی 'بے نشاں' کی کشمکش کا روپ دھارتا ہے اور کبھی 'صدا بھی مرگِ صدا' کے 'صاحبِ سخن' کا

نہ کوئی سقفِ منقش، نہ کوئی چترِ حریر

نہ کوئی چادرِ گل اور نہ کوئی سایۂ تاک
بس ایک تودۂ خاک
بس ایک ٹھیکریوں سے ڈھلی ہوئی ڈھلوان
بس ایک اندھے گڑھے میں ہجومِ کرمک کور
بس ایک قبۂ کور
نہ کوئی لوحِ مسطر ، نہ کوئی خشتِ نشاں

ڈنڈ بلنڈن نے اپنی تصنیف "فطرت انگریزی شاعری میں" کے دوران ایک جگہ لکھا ہے کہ غیر فانی ہونے کے لیے کسی قسم کا کوئی شور مچانے کی ہرگز ضرورت نہیں اس لیے کہ یہ چیز تو محض گوشہ نشینی کے ذریعے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ یقیناً دنیا بھر کے ادب میں اس کی مثالیں مل جائیں گی لیکن بیسویں صدی کے اُردو ادب میں مجید امجد سے بہتر مثال کہاں ملے گی؟ تاہم اتنا ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس صورت حال پر خصوصاً جبکہ اس میں ظلم کا عمل دخل بھی ہو، جیسا کہ مرگ صدا کے آخر میں "ظلمت کے خشمگیں عفریت" جو مقدروں پر محیط ہیں، نعرہ زنی نہیں ہو سکتی ۔

بات صرف اتنی نہیں کہ مجید امجد نام کا ایک فنکار، نشر واشاعت کے وسائل سے دور رہتا تھا۔ عمداً یا مجبوراً بتایا جاتا ہے کہ اپنی ملازمت کے دوران ایک دوبار راولپنڈی یا لاہور میں قیام پر وہ خوش نہیں تھا اور ساہیوال کے آس پاس جہاں اس نے اپنی حیاتِ قلم کا بیشتر حصہ گزار دیا، اس کو سکون اور آسودگی ملتی تھی۔ اب اس میں تو شک نہیں کہ سکون اور آسودگی کی خواہش کا شمار بنیادی انسانی حقوق میں شامل ہے اور مجید امجد کا ابتدائی کلام دیکھیں جواب خواجہ زکریا صاحب کی مرتبہ کلیات کے ذریعے پہلے سے کہیں زیادہ مقدار میں دستیاب ہو چکا ہے، تو اپنی جائے پیدائش سے اس کی وابستگی قدم قدم پر نمایاں ملتی ہے لیکن جس طرح حافظ شیراز نے کنارِ آب رکنا باد اور گلگشت مصلّےٰ کے نغمے الاپنے اور گوڑ کے سلطان کی دعوت کو رد کرنے کے باوجود، کسی تجربۂ حیات کی تلخی میں یہ بھی کہہ دیا تھا:

معرفت نیست دریں قوم ، خدایا سببے
تا برم گوہرِ خود را بہ خریدارِ دگر

اسی طرح مجید امجد نے بھی جھنگ کے بارے میں جہاں صرف ہیر کا مزار ہی نہیں، سیالوں اور کھیڑوں کے ہم قوم بھی پائے جاتے ہیں، ایک دوسرا لہجہ بھی جابجا برتا ہے ایک طرف اس کی نظم "گاؤں" دیکھیے (طوبیٰ کی سبز شاخ کی چھاؤں یہی تو ہے) اور دوسری طرف "جھنگ" پر اس کا وطن آشوب:

یہاں پہ دردِ دروں کی دوا نہیں ملتی — یہاں پہ قلب و نظر کو غذا نہیں ملتی
یہاں نہ روح کو راحت ، یہاں نہ دل کو سرور — یہاں ہے طائرِ پر بستہ آدمی کا شعور
یہاں نہ پرورش شوق علم کے امکاں — یہاں نہ تربیتِ ذوق شعر کے ساماں

کبھی سے پاپ کی بھٹی میں سڑ رہا ہوں میں
ندیم جھنگ سے اب تنگ آگیا ہوں میں

اور یہاں سے جاتے ہوئے وہ کہتا ہے:

یہاں پر کلی دل کی کھلتی نہیں ہے
کوئی چق دریچوں کی ہلتی نہیں ہے

لیکن اسی کلیات میں شامل متعدد نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہزار تلخیوں کے باوجود شاعر کو یہاں چھپ چھپا کر دل لگانے کے مواقع بھی ملے ہیں۔ "گلی کے چراغ" ان میں سے ایک ایسی ابتدائی نظم ہے جس پر بعد کی ذہنی بلوغتوں اور فنی احتیاطوں کی پرچھائیاں پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ منظر بڑی حد تک دھندلا اور خاصا مختصر ہے لیکن اس کی اِتمامی پیداوار، ایک ایسا کشید کردہ جوہر ہمارے سامنے لاتا ہے جو بکھرے بکھرے جذبات کو افشردہ کر کے تیز تر بناتا ہے اور ہماری نظر کو دھندلاہٹوں کے درمیان ملنے والے اور جلد بچھڑنے والے سایوں پر مرتکز کر دیتا ہے۔ یہیں سے دیہات کے بارے میں مجید امجد کا وہ رویہ پرورش پاتا ہوا نظر آتا ہے جس میں رازدارانہ طور پر دل کی کلی کھلنے کا ارمان بھی شامل ہے اور نگاہِ اہلِ جہاں کا نشانہ بننے کا خوف بھی۔

ہمارے محترم نظیر صدیقی نے حال ہی میں لکھا ہے کہ خواجہ صاحب کی مرتبہ کلیات کے پہلے ڈیڑھ سو صفحوں تک مجید امجد کے میلانِ جدیدیت کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ یوں تو کئی نظموں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جن پر نظیر صدیقی کے لگائے ہوئے لیبل "رواجی شاعری" کا اطلاق اگر ہو سکتا ہے تو بہت کم اور یہ بھی کہ صفحہ ۴۱ سے ۱۹۱ تک ۔ ایک ہی کیفیت کی نظمیں نہیں ہیں۔ جھنگ (ص ۵۸) آوارگانِ فطرت سے (ص ۹۲) خدا ——— ایک اچھوت ماں کا تصور (ص ۹۷) گلی کا چراغ (ص ۹۹) خودکشی (ص ۱۰۹) ، جو میراجی کے ادبی دنیا میں شائع ہوئی) پھر اُس کے بعد تو نئی قسم کی نظموں کا ایک تسلسل ہے۔ سوکھا تنہا پتا (ص ۱۱۸) ۲۹۴۲ کا ایک جنگی پوسٹر (ص ۱۲۲) ساتھی (ص ۱۲۴) راجا پرجا (ص ۱۲۷) کون؟ (ص ۱۲۸) دل دریا سمندروں ڈونگھے (ص ۱۵۴) دُور کے پیڑ (ص ۱۵۸) چُولہا (ص ۱۶۵) نیواڑی (ص ۱۶۷) ، بارش کے بعد (ص ۱۷۵) ایک پرنشاط جلوس کے ساتھ (ص ۱۷۸) امروز (ص ۱۸۵) اور ایک کوہستانی سفر کے دوران (ص ۱۸۸) یہ سب نظمیں اور ان کے علاوہ بھی جن کا یہاں نام نہیں لیا گیا، مجید امجد کی اپنی آواز کو اس وقت کی رواجی شاعری کے پس منظر سے قدم بہ قدم اوپر اٹھاتی چلی جاتی ہیں۔ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ ان میں سے کونسی نظم مثنوی کی شکل میں ہے، کونسی قطعہ بند ہے اور کونسی چوکھٹے بندوں میں۔ یہ تو امجد نے خود کہہ رکھا ہے کہ شروع میں اسے نظم آزاد بلکہ نظم معرا سے بھی وحشت ہوتی تھی اور بعد میں اس نے ان دونوں نئی اصناف کو ایک استادانہ مہارت کے ساتھ برتا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ بطورِ شاعر پیدا ہی اس وقت ہوا۔ خود نظیر صاحب کو نئی شاعری کی یہ اصناف کچھ ایسی پسند نہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نئی شاعری کے امام میراجی نے اپنے آخری برسوں میں پابند نظموں

کی طرف جو توجہ کی تو یہ کسی شکست خوردہ آدمی کی مراجعت نہیں تھی۔ اس کا فیصلہ مذکورہ نظمیں پڑھنے کے بعد کرنا چاہیے کہ ان میں آزادیوں اور پابندیوں کے جدلیاتی تقاضے کس درجہ فنکاری کے ساتھ نبھ سکے ہیں۔ اور اتنا تو ہر نقاد بلکہ ہر ذہین آدمی کو معلوم ہونا چاہیے کہ جدید سے جدید نظم پابندی کے ساتھ اور آزاد سے آزاد نظم تقلیدی انداز میں کہی جا سکتی ہے بلکہ کسی بھی دور میں ایسی ہی چیزوں کی کثرت ہوتی ہے۔ کسی بھی فن میں تحصیل کمال کے لیے جو ارتکاز اور تسلسل چاہیے اس میں بڑے بڑوں کا دم پھول جاتا ہے اور مجید امجد ایسے لوگ جنہوں نے تادم آخر ایک ایک سانس بھی ہزار مشکلوں سے بھرا، اس کام کو یوں انجام دیتے ہیں جیسے یہی ان کی زندگی ہو۔

(۲)

مجید امجد کی زندگی میں قدرے کم لیکن اس کے فوراً بعد اس کی شخصیت اور شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اب بھی لکھا جا رہا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر یہ محسوس کیا گیا ہے جیسے وہ شہرت جس کا وہ بجا طور پر مستحق تھا، اسے نہیں ملی۔ یہ بات اگر درست بھی ہو تو ایک معاشرتی مظہر کے طور پر اسکا تجزیہ ہونا چاہیے۔ نقدِ ادب کا یہ میدان نہیں۔ ہمارے زمانے میں کون سی چیز بجا ہے اور کونسی بیجا، ان سب باتوں پر سوچنا سب کے لیے لازم ہے لیکن شہرت یا اس کے استحقاق پر بحث کرنے کی بجائے جو رولاں بارت کے الفاظ میں رائج الوقت تہذیب یا فقدان تہذیب کی پیداوار ہے، مناسب تر یہ ہوگا کہ ہم ادب کی تہذیب ساز قوت پر توجہ مرکوز کریں اور اسے برباد نہ ہونے دیں۔

بلاشبہ مجید امجد کا کلام ہمارے دور کی ایک اہم تہذیبی قوت ہے، اگرچہ ہم نے زیادہ تر اس کی گمنامی اور محرومی کو موضوع گفتگو بنایا ہے اور اس کے برعکس اس کی کشمکش کی پنہائی اور گہرائی کو ناپنے کی کوشش بہت کم کی ہے۔ شاید اس سلسلے میں ہماری اپنی محرومیاں اور مجبوریاں راستے میں حائل رہی ہوں۔ اس کی ایک مثال اس کی نظم "آٹوگراف" پر ہمارے لکھنے والوں کا تاثر ہے جن میں سے چند ایک ممتاز لوگوں نے یہ تعبیر فراہم کی ہے کہ یہاں شاعر، کرکٹ کے ایک ستارے کے مقابلے میں خود کو کمتر محسوس کرتا ہے۔ شاید یہ احساس کسی نقاد محترم کو ہو تو ہو، شاعر نے تو اپنا مقابلہ آٹوگراف لینے والی لڑکیوں سے کیا ہے اور تان اس پہ توڑی ہے۔

یہ لوحِ دل، یہ لوح
نہ اس پہ کوئی نقش ہے نہ اس پہ کوئی نام ہے

ہمارے محترم ناقدین اور ان کے علاوہ بہت سے پڑھنے والے صرف یہ مصرع پڑھ کر رہ جاتے ہیں "نہ رفعت مقام ہے، نہ شہرت دوام ہے" اور مجید امجد پر ترس کھانے لگ جاتے ہیں کہ بچارے کو کیا کیا تحقیر سہنی پڑی۔ اسی طرح کی تحقیر ان لوگوں کے یہاں بھی دیکھی گئی ہے جنہوں نے مجید امجد کی چند ایک جنسی نظموں جیسے ایک فلم دیکھنے کے بعد، ایکٹریس کا کنٹریکٹ، برہنہ، نرگس، کیلنڈر کی تصویر، ماڈرن لڑکیاں یا ایک جرمن سیاح لڑکی سے رابطے کی نظمیں وہ ایک دن بھی عجیب دن تھا، کوتے تک، میونخ اور ایک فوٹو پر توجہ کی ہے (دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ہمارے نظیر صدیق

صاحب پھر بھی مجید امجد کو اردو کا واحد (Sexless) شاعر سمجھتے ہیں، شاید انہوں نے مارے شرم کے ان نظموں کی طرف دیکھا بھی نہ ہو)۔

ان نظموں کے علاوہ مقبرہ جہانگیر کی جو تصویر اس نے کھینچی ہے تو وہ ایلیٹ کی کنار ٹیمز کی تصویر سے زیادہ ہولناک ہے، اس لیے کہ یہاں مقبرے کا تقدس آنے والے خوش باشوں کے ذریعے جس طرح پائمال ہوتا ہے، ٹیمز کے کنارے پڑی ہوئی خالی بوتلیں خالی ڈبے اسکا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کہا گیا ہے کہ ان نظموں میں مجید امجد پورنوگرافی کی سطح پر اُتر آتا ہے اور یہ بھی کہ اس کی دوسری قسم کی نظموں کے مقابل ، یہ تحریریں یک تہ قسم کی نظر آتی ہیں۔ نظر آتی ہیں تک تو ٹھیک ہے لیکن کیا ان میں راوی کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ بھی ساتھ ساتھ نہیں ہو جاتا! یقیناً ہمیں مجید امجد کو اس حالت میں دیکھ کر کسی نہ کسی قسم کی کوئی تکلیف محسوس ہوتی ہے لیکن کیا اس نے خود کوئی تکلیف محسوس نہیں کی؟ ایک بلو فلم دیکھنے کے بعد:

باہر نکلا تو سنسان سڑک تھی، شب خزاں تھی، ٹھنڈی تیز ہوا میں ننگی شاخیں، ناچ رہی تھیں میں بھی، میری نظم بھی، دونوں تھر تھر کانپ رہے تھے، اتنے لبادوں میں جرمن سیاح لڑکی کے سلسلے کی نظمیں ایک دوسری کیفیت رکھتی ہیں۔ یہاں جنس کا کوئی براہ راست حوالہ نہیں اور نہ شاید کوئی ایسا حوالہ بر محل ہوتا۔ تاہم اگر مجید امجد کو پورنو پوئٹری کا کوئی شوق ہوتا تو یہاں جی بھر کر پورا ہو سکتا تھا لیکن اس کی جگہ ایک گہری دردمندی، صورت حال کو طرفِ ثانی کی نظر سے دیکھنے کی صلاحیت اور کسی قسم کے جذباتی استحصال سے گریز ، ان نظموں کو پھر سے گاؤں کے محتاط نوجوان کی طرف لے جاتے ہیں اگرچہ اب پچاسویں پت جھڑ بھی کوئی دُور نہیں تھی۔

میں جب ان نظموں کو پڑھتا ہوں تو مجھے مرحوم دوست انور جلال شمزا کا خیال آتا ہے جس نے ان نظموں کی تحریر سے بہت پہلے بلکہ شب رفتہ کی اشاعت (۱۹۵۸) سے بھی چار ایک سال قبل، مجید امجد کا ایک پورٹریٹ بنایا تھا جسے میرے مضمون کے ساتھ 'سویرا' میں چھپنا تھا۔ اگرچہ اصل شبیہ رنگین تھی اور رسالہ سفید و سیاہ طباعت تک محدود تھا۔ تاہم اس صورت میں بھی کوئی اس شبیہ کو دیکھے تو آنکھیں اندر کی طرف مرکوز نظر آئیں گی، مخمور اور خوابناک جو آس پاس کو نظر انداز کر کے اپنے کسی تصور میں مست ہیں۔ ظاہر ہے کہ رنگین تصویر میں یہ کیفیت اور بھی نمایاں تھی لیکن وہ خدا جانے کیا ہوئی اور اب کس کے پاس ہوگی لیکن جب یہ تیار ہوئی تو میں نے شمزا سے پوچھا کہ مجید امجد کو اس رنگ میں آپ نے کہاں دیکھا۔ کہنے لگا کہ ساہیوال کے دوستوں اور ساتھیوں کے ہمراہ ہفتے کی رات کو برٹ انسٹیٹیوٹ میں آتے تھے اور دو گھڑی ناچ رنگ میں دل بہلا کے چلے جاتے تھے۔ اس وقت کا یہ نقشہ ہے۔ یہ بھی مجید امجد کی جذباتی صداقت کا ایک مظہر ہے کہ اس نے ایک ایسے وقت کو بھی جب اسے ایک ہنگامی مسرت کا تجربہ ہوا کرتا تھا اپنے شعری اظہار سے خارج نہیں کیا بلکہ اس کی روشنی میں اپنی تمام شخصیت پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ۔ میرے خیال میں یہ نظمیں اگرچہ اس کے ہمہ جہت کمال کا ایک ایسا جزو ہیں جسے بہت سے نقاد جانتے بھی نہیں، تاہم ان کے بغیر مجید امجد کی تصویر نامکمل رہ

جاتی۔ فنِ شعر کے نمونے کے طور پر شاید ان میں سے کسی ایک نظم پر ارتکاز مشکل ہو لیکن مجموعی طور پر انہیں نظموں کا ایک سلسلہ سمجھ کر پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعر کی خود آگہی اور خود شناسی کا یہ پہلو ایک گہری اہمیت کا حامل ہے۔

(۳)

شب رفتہ کی اشاعت سے پہلے وہ ایک دور افتادہ شاعر کے طور پر تھوڑا بہت معروف تھا، کم از کم ادبی رسائل کا مطالعہ کرنے والوں کی حد تک جو اس دور میں ایک تہذیبی اقلیت سہی لیکن خاصی ناطق اور مؤثر ہوا کرتی تھی۔ پھر حلقہ ارباب ذوق کی مرتبہ بہترین نظموں میں ہر سال اس کی ایک نہ ایک نظم ضرور شامل ہوا کرتی تھی۔ دل دریا سمندر روں ڈونگھے، چولہا اور پنواڑی ایسی نظمیں تھیں جو ہر ایک ادب دوست کے ورد زباں تھیں۔ چنانچہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اپنی ایک منفرد آواز بنانے میں مصروف ہونے کے باوجود، جدید اردو شاعری کے مرکزی دھارے میں دل و جان سے شریک نہیں تھا۔ البتہ شب رفتہ کی اشاعت کے بعد یہ آواز دُور دُور تک پہنچی اور پہلے سے زیادہ مستحکم ہوتی گئی، یہاں تک کہ شب رفتہ کے بعد کی نظمیں جو بقول شاعر شب رفتہ کے مزاج سے ہٹ کر لکھی گئی تھیں، شب رفتہ سے بھی زیادہ توجہ کی مستحق ٹھہریں۔

میں خود اپنے پہلے مضمون کے ۲۰ برس بعد والے مجید امجد کا تصور کرتا ہوں جو آج سے ۱۶ برس پہلے انتقال پا چکا تھا تو سب سے پہلے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو شب رفتہ کے افکار و احساسات تک محدود نہیں رکھا (شب رفتہ کا مسودہ ایک رجسٹر کی صورت میں میرے سامنے تھا اگرچہ بعد میں اس کے مشمولات میں بہت کمی بیشی ہوئی)۔ اس کے علاوہ ساہیوال اور لاہور میں اس کے نیازمندوں کا ایک ایسا حلقہ مرتب ہوا جس نے اس کی وفات کے فوراً بعد اس کی مفروضہ گمنامی کی تلافی کا آغاز کیا، یہاں تک کہ ظفر اقبال کو کہنا پڑا:

تری یاد میں جلسۂ تعزیت
تجھے بھول جانے کا آغاز تھا

لیکن اس دلچسپی کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ مجید امجد کی بہت سی غیر مطبوعہ اور غیر مرتب نظموں پر مشتمل کئی ایک چھوٹے بڑے مجموعے اور انتخاب شائع ہوئے۔ اگرچہ ان کا متن ۔ الاماشاءاللہ ،اکثر جگہوں پر مصدقہ بلکہ تسلّی بخش بھی نہیں تھا، تاہم ان کے ذریعے مجید امجد کے نام اور کسی حد تک اس کے کلام پر توجہ میں تسلسل قائم رہا۔ یقیناً اب یہ لازم ہو چکا تھا کہ اس کی جملہ منظومات بلکہ متفرق نثری تحریروں کو بھی کسی معتبر صورت میں فراہم کیا جائے تاکہ اس کے کمال سخن اور افکار و آثار کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھا جا سکے۔ کلیات امجد کی اشاعت سے اس کام کا آغاز ہو چکا ہے جس کے بعد اس کے مرتب خواجہ زکریا صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ مختلف نظموں کی متبادل صورتوں کو یکجا کیا جائے گا اور مزید ابتدائی اور متفرق یا نامکمل نظموں کو بھی باقیات امجد کے طور پر شائع کیا جائے گا۔ ایسا ممکن ہوا تو اپنے معاصرین میں غالباً مجید امجد ہی ایک ایسا شاعر ہو گا جو اہل تحقیق کو اپنی طرف متوجہ کر سکا۔

فی الحال جو کچھ دستیاب ہو چکا ہے اور جو کچھ مجید امجد کے بارے میں کہا سنا جا چکا ہے، اس کی روشنی میں بات کو آگے بڑھایا جائے تو بہتر ہو گا۔ سب سے پہلے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس خاص شاعر کا اپنے عہد کی زندگی اور اس دور کی شاعری سے رابطہ کتنا اور کیسا ہے؟ انتظار حسین نے لکھا ہے کہ مجید امجد اپنے عہد میں رہتے ہوئے اپنے عہد سے پنہاں رہے مگر عہد ان سے پنہاں نہیں تھا۔ ادبی مراکز اور تحریکات سے دور رہ کر انہوں نے طرز احساس کے وسیلے سے اپنے عہد سے ایک رشتہ پیدا کیا تھا اور یہ بھی کہ "عہد کا ترجمان اور مفسر بننے کے لیے عہد سے بے تعلق بھی ہونا پڑتا ہے۔"

گویا مرکز گریزی کو ایک فنی ضرورت سمجھنا چاہیے۔ چیخوف نے گورکی کو نصیحت کی تھی کہ "تم ادب کے آدمی ہو اور ادب کے آدمی ہی رہو گے۔ تمہاری فطری آماجگاہ ہمیشہ ادبی حلقوں کے نزدیک رہے تاکہ تم لکھنے والوں کے درمیان جیو اور ادب کی فضا میں سانس لو۔" چیخوف کے نزدیک، پیٹرز برگ یا ماسکو منتقل نہایت ضروری تھا، چاہیے "تم ادبی لوگوں سے لڑتے بھڑتے رہو، انہیں بالکل تسلیم نہ کرو، اور آدھوں کو حقارت کی نظر سے دیکھو لیکن رہو، ان ہی کے درمیان۔" تاہم یہ ایسا مشورہ تھا، جس پر خود چیخوف نے کم ہی عمل کیا تھا اور ادیبوں کی صحبت میں لڑنے بھڑنے کی نسبت، بنیادی انسانی تجربات سے قربت اختیار کی۔ شاید ایک سطح پر یہ اس کی مجبوری تھی، جیسے غالباً مجید امجد کے لئے بھی رہی ہو گی۔ لیکن اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ جب بھی مرکز میں رہنے کا موقع ملا تو چیخوف کو یا مجید امجد کو اس کے مقابلے میں چھوٹے شہر میں زیادہ عافیت محسوس ہوئی۔

کیا یہ نفسیاتی سطح پر، عدم تحفظ کا احساس تھا، یا دوسروں سے زیادہ اپنے ساتھ لڑنے بھڑنے کی ضرورت تھی، یا زندگی کا جو حصہ مرکز میں گزرا تھا اس کے تجربات اتنے شدید تھے کہ ساری عمر ان ہی کو اُتھل پتھل کر دیکھنے میں گزر گئی؟

مجید امجد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ایوانِ شعر کی خشتِ اول، انسانی تجربے سے اُبھرنے والے افکار ہیں۔" آج تک جس کسی نے مجید امجد کی تھوڑی بہت نظمیں پڑھی ہیں، اتنا ضرور محسوس کیا ہے کہ ان کا لکھنے والا "کتنے بگولے پھونک چکا اور کتنے الاؤ پھانک چکا" ہے۔

چنانچہ جب ۱۹۶۲ء کے قریب ڈاکٹر محمد حسن نے "سوغات" کے جدید نظم نمبر میں مجید امجد پر لکھتے ہوئے اُسے "شہروں کی تہذیب کا شاعر" کہا، وہ شہر جو صنعتی کارخانوں، دفتروں اور کاروباری زندگی نے پیدا کئے ہیں تو مجید امجد کو کہنا پڑا کہ ایک پہلو یہ بھی ہے۔ دوسری طرف وزیر آغا صاحب نے جب اس کو دیہاتی زندگی سے ربط اور مفاہمت کا پیکر بنایا تو خود مجید امجد کے متن نے ان کا ساتھ نہیں دیا:

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے اُن ساونتوں کے جسم
گری دھڑام سے گھایل پیڑوں کی نیلی دیوار

کٹتے ہیکل ، جھڑتے پنجر ، چھٹتے برگ و بار
اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک، اے آدم کی آل

یہاں فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کا مضمون نہیں، سرمائے کے ہاتھوں، نمو کی قوتوں کے قتل عام کا المیہ درپیش ہے۔ اسی طرح جیسے "بارکش" میں محنت کشی کی تصویر:

بوجھ کھینچتے ، چابک کھاتے جنور ترا یہ جتن
کالی کھال کے نیچے، گرم گھٹیلے ماس کا مان
لیکن تیری ابلتی آنکھیں ، آگ بھری ، پُر آب
سارا بوجھ اور سارا کشٹ ، ان آنکھوں کی تقدیر
کوئی تری آنکھوں سے بھی دیکھے، دُنیا کی تصویر

یہاں مجید امجد پہلی جنگ عظیم سے قبل نمودار ہونے والے انگریزی کے جورجین شعراء کے انداز میں فطرت کی خوشگوار منظر نگاری نہیں کر رہا بلکہ بے انصافی سے مسخ شدہ مجبور انسان کی تصویر کشی کر رہا ہے۔ جدید شاعر کی زبان میں بھگتوں کی بانی بول رہا ہے ۔ اس موقع پر دادو دیال کا ایک دوہا یاد آتا ہے :

دادو، دُنیا باوری، کہے چاند کو رام
پونچھ مروڑے بیل کی اور کاڑھے اپنا کام

اُس کا مقصد اصلاح نہیں ، پوری دُنیا کو محنت کشوں کی آنکھ سے دیکھنے کی دعوت ہے اور یہ دعوت سرگودھا سکول کی ہم آہنگی سے کتنی دُور ہے، اس کا اندازہ "ہڑپے کا ایک کتبہ" اور اس طرح کی دوسری نظموں کا لہجہ محسوس کرنے سے ہو سکتا ہے۔

(۴)

اس طرح بعض نقادوں نے مجید امجد کی ہولناک افسردگی اور حبس کی شکایت کی ہے، جس میں "فنکار کی روح کا کرب زندگی کے قنوطی طرزِ احساس کی عکاسی کرتا ہوا، تلملاتا اور تڑپتا نظر آتا ہے۔" یقیناً مجید امجد کے یہاں انسانی زندگی کے عصری المیے کا زور دار بیان جگہ جگہ ملتا ہے جو کسی فارمولائی امید پرستی سے بے حد مختلف ہے۔ لیکن مجید امجد مستقبل کے بارے میں مستند ہو تو ہو، ہم وقت مایوس نہیں کہا جا سکتا ۔ 'امروز' کے آخر میں وہ کہتا ہے:

یہ اشکوں سے شاداب دوچار صبحیں ، یہ آہوں سے معمور دو چار شامیں
انہی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے، وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے

آنے والے دور کا تصور جو "نژادِ نو" اور "پیش رو" جیسی نظموں میں پیش کیا گیا ہے، زندگی کے یقین سے لبریز ہے۔

"کون دیکھے گا" کا شمار مجید امجد کی مشہور چیزوں میں ہو سکتا ہے، اور شاید ایسی ہی کسی بنیاد پر مجید امجد کی محرومی اور مجبوری کا تاثر عام ہو گیا ہے لیکن اسی کے آخر میں یہ بھی ہے:

ترخ کے، گرد کی تہ سے، اگر کہیں کوئی پھول
کھلے بھی — کوئی تو دیکھے گا — کون دیکھے گا

یہاں دونوں باتیں یکجا ہیں، رجائیت بھی اور تشکیک بھی اور ظاہر ہے کہ کوئی شاعر یک تہ قسم کی میکانکی رجائیت کا شکار ہو جائے تو پھر اس میں اور کسی سطحی سیاست دان میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ ایک مختصر سی نظم "بہار" جس کا ایک عمدہ تجزیاتی مطالعہ، علیگڑھ کے شاعر نقاد مرحوم خلیل الرحمٰن اعظمی نے، شاعر کا نام جانے بغیر لکھا تھا، المیہ شعور و احساس کا ایک کرشمہ ہے۔ ان کی رائے میں، بہار کے استعارے کو، کسی اسطورے کا سہارا لیے بغیر، پوری انسانی زندگی پر منطبق کر کے علامتی رنگ دینے اور اس معنویت کا حامل بنانے کی اب تک کسی اردو شاعر نے کوشش نہیں کی۔ یہ بھی کہ جس شاعر نے یہ نظم لکھی ہے اس کے شعری مزاج میں لطافت و نزاکت، خلوص اور دردمندی، مسائل حیات کا ادراک اور فنی مہارت کا ایسا امتزاج ہے جو کم خوش نصیبوں کے حصے میں آتا ہے۔

ہر بار اسی طرح سے دنیا سونے کی ڈلی سے ڈھالتی ہے
سرسوں کی کلی کی زرد مورت تھاما ہے جسے خمِ ہوا نے
ہر بار اس طرح سے شاخیں کھلتی ہوئی کونپلیں اٹھائے
رستوں کے سلاخچوں سے لگ کر کیا سوچتی ہیں یہ کون جانے
ہر بار اسی طرح سے بوندیں پھولوں بھری بدلیوں سے چھن کر
آتی ہیں مسافتوں پہ پھیلے تانبے کے ورق کو ٹھنٹھنانے
ہر سال اسی طرح کا موسم ہر بار یہی مہکتی دوری
ہر صبح یہی کھوڑ آنسو رونے کے کب آئیں گے زمانے

بظاہر، اس کی مشابہت ناصر کاظمی کے ایک شعر سے سامنے کی بات ہے:

اداسیوں کا سماں محفلوں میں چھوڑ گئی
بہار ایک خلش سی دلوں میں چھوڑ گئی

لیکن یہاں محض محفل کی بات نہیں اعجاز فن کا کرشمہ یہ ہے کہ ایک نازک سی ضرب کے ساتھ ایک پورا طرز احساس منکشف ہو جاتا ہے اور ہر مرتبہ ہم باہر کے منظر کو بھی دیکھتے ہیں اور اندر کے المیہ ڈرامے کی شدت کو بھی پوری طرح محسوس کرتے ہیں۔ یہاں لفظوں کی مدد سے کھینچی ہوئی تصویریں، لفظوں کے آہنگ سے اُبھرتی ہیں جن کی لچکدار حرکت، صورتحال کو نزاکت کے ساتھ پیش کرتی ہے اور ہر مرتبہ ہم نمو پانے والی نزاکتوں کو فلزاتی آوازوں میں ڈھلتے

ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر میں کُھل کر رونے کی مہلت طلبی ایک ناگزیر محسوساتی ضرورت بن کر سامنے آتی ہے۔

یہی وہ مشاہدے اور تجربے کی نئی اقلیم ہے جسے مجید امجد نے اپنا فنی نصب العین بنایا تھا۔ یہاں نظم کی ہیئت میں جس قسم کی لچک دکھائی دیتی ہے اور کسی قسم کی خطابت ، عبارت آرائی اور تکرارِ خیال کے بغیر تاثر جیسے ٹھہرے سے گہرا ہوتا جاتا ہے، اس کی مثال جدید شاعری کے عمدہ ترین نمونوں میں بھی کم ہی ملے گی۔ نظم کا نامیاتی تصور اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہی چند نظموں سے مل سکتی ہے، جن کی تعداد اردو زبان میں بہت زیادہ نہیں، لیکن دوسروں کی نسبت مجید امجد کے یہاں ایسے کرشمے کم بھی نہیں ملیں گے۔ یہاں نہ ایسی نظموں کی کوئی فہرست بنانے کا فائدہ ہے نہ ان کے اقتباسات شامل کرنے اور ان کے نکات واضح کرنے کی گنجائش۔ اتنا بہت کافی ہے کہ ساڑھے چار سو کے قریب جو منظومات کلیات میں مندرج ہیں۔ ان کا کڑے سے کڑا انتخاب بھی جدید اردو شاعری کے درجہ کمال کا یقین کر سکتا ہے۔ باقی رہا اس کے معاصر شعرا کی نظموں سے ان کا تقابل تو یہ سلسلہ ایک بار شروع ہو تو جاری رہنا چاہیے۔ فیض، راشد، میراجی، مختار صدیقی اور اختر الایمان کے ساتھ اس کی مشابہتیں بھی ہیں اور امتیازات بھی لیکن تقابلی اہمیت کا فیصلہ کرنے میں جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ ان سب شاعروں کو جدید کلاسیک قرار دیا جاسکتا ہے لیکن کسے زیادہ اور کسے کم، یہ اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ شہرت کی بنا پر جو فیصلے کیے جاتے ہیں، زمانہ ان کا ساتھ بہت کم دیتا ہے۔

(۵)

مجید امجد کا ایک خصوصی امتیاز زمین سے اس کی قربت اور وطن دوستی ۔ یقیناً اس نے اپنے آس پاس کی فضا سے — جس میں فطرت اور انسان دونوں شامل ہیں۔ ٹوٹ کر محبت کی ہے لیکن اس کے یہاں یہ کوئی یک طرفہ قسم کا رابطہ نہیں ۔ وہ ان کے آرپار بھی دیکھ سکتا ہے اور ان کے سلسلے میں نعرے بازی سے گریز کرتا ہے۔ بلکہ اس کے نزدیک جو آدمی، وطن کا بھلا چاہے اس کے لیے لازم ہے کہ برے احوال پر نقد و تبصرے کا حق ادا کرے۔

غالباً ۔ یہی محرک تھا جس کے تحت اس نے اپنی آخری دور کی نظمیں لکھیں جن کو "شب رفتہ" کے مزاج سے خاصی مختلف کہا جاسکتا ہے۔ جنوری ۱۹۷۲ء میں اس نے ایک دوست کو خط میں لکھا تھا کہ "یہاں کیا کچھ ہو گزرا ہے، تقدیریں بدل گئیں اور پانسے پلٹ گئے۔ جنگ تو چند دن کی تھی لیکن ہم شاید صدیوں تک اس کو بُھلا نہ سکیں گے اور ہر زمانے میں ایک نئے زاویے سے اس کو دیکھ کر نظم کہیں گے۔"

ممکن ہے ہم اس لیے مجید امجد سے آنکھیں چار نہ کرتے ہوں کہ اس نے ہمیں اس زمانے کی فکری اور محسوساتی تصویر دکھانے کی کوشش کی، جسے ہم تب سے اب تک فراموش کرنے کی جستجو میں مصروف ہیں۔

ان متعدد نظموں کی جو کلیات میں تقریباً دو سو صفحوں پر محیط ہیں، پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لکھی ہوئی نہیں بلکہ بیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، اگرچہ تکنیکی سطح پر ان میں بہت سی مہارتیں صرف ہوئی ہیں۔ ایک ہی بحر ، میر تقی میر کے

فعلن فعلن والے آہنگ میں، لفظوں کی نثری ترتیب کے ساتھ لکھی ہوئی ان آزاد نظموں کو بعض لوگوں نے پروز پوئم سمجھا ہے۔ مجید امجد کے الفاظ میں ان کا آہنگ شعور سے ہم عناں ہے۔ ان کو تیزی کے ساتھ، خیال کی غیر شعوری رَو میں قلم بند کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ بعد میں "ارکان کو گنتا ہوں تو رکن پورا ہوتا ہے اور میرا فقرہ اس پر حاوی ہوتا ہے۔"

مضمون کے تقاضے کے مطابق، مجید امجد نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ "پڑھنے والا رُک کر پڑھے تو میری نظم کو اینجوئے کر سکے گا اور اگر رواں پڑھے گا تو وہ اس چیز کو Miss کرے گا جس پر میں Insist کرتا ہوں۔ اسے وہ نثر کے ذریعے بھی پڑھ سکتا ہے اور جب وہ نثر کے ذریعے پڑھے گا تو رُک کر پڑھے گا اور وزن کے بہاؤ میں بہ نہیں جائے گا۔"

غالباً یہ بھی موضوع کے دباؤ کی وجہ سے ہے کہ مجید امجد یہاں اپنے پُرانے آہنگ کو اور مصرعوں کی بانٹ کے صوتی اصول کو نحوی ترتیب کی پیروی میں ترک کر دیتا ہے۔ کئی جگہ متعدد صوتی یونٹوں کو متحد کر دیا ہے اور ایسے حروف پر تاکید کا عمل روا رکھا جو اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ شاید اس وجہ سے بھی اب تک ان نظموں پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ سہیل احمد کہتے ہیں کہ یہ نظمیں الگ مضمون کی متقاضی ہیں جو انہوں نے ابھی تک لکھا نہیں۔ تاہم چند ایک نقادوں نے وہ ایک ابتدائی تاثر ان کے بارے میں دیا ہے، خاصا پُرجوش ہے۔ تکنیک اور موضوع دونوں کی سطح پر۔ لیکن یہ ۲۸ مارچ ۶۸ اور ۳۰ دسمبر ۷۳ کے درمیان لکھی ہوئی یہ ۱۷۶ نظمیں اور ۱۴ غزلیں، جنہیں خود شاعر نے ایک نظم کہا ہے، ہر جگہ نہ ایک سی ہیں، نہ ایک ہی معیار کی۔ حتیٰ کہ سقوطِ ڈھاکہ کے آس پاس لکھے ہوئے بعض حصوں کا باہمی رابطہ بھی کماحقہ واضح نہیں ہوتا۔

لیکن مجید امجد نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ "میرے گھر کے فرش کی طرح میرے ذہن کی سطح بھی خاصی ناہموار ہے۔" اس کے درمیانی دور کی تخلیقات میں اس ناہمواری کا اندازہ بہت کم ہوتا ہے، ابتدائی دور میں تو خیر خاصی کوششیں اپنا آپ تلاش کرنے میں، انہیں ہموار نہیں رہنے دیتیں لیکن آخری نظموں میں پڑھنے والے کو جابجا ٹھوکریں لگتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو وہی موضوع کا فوری دباؤ ہے اور فوری تجربے خصوصاً بالواسطہ تجربے کا دھندلاپن۔ پھر بھی کمال کی بات یہ ہے کہ شاعر نے ساہیوال میں بیٹھ کر ہزاروں میل دور پیش آنے والے تجربے کو، تخیل کی سطح پر، محسوس کیا ہے اور اس کے بارے میں جابجا فکری رائے زنی ہے جو بعض جگہوں پر اتنی شدت اختیار کر گئی ہے کہ آج اس کو پڑھتے ہوئے سخت حیرت ہوتی ہے۔ قومی مسئلے کے عسکری حل پر ایک شاعر کا ردِ عمل، ایک عام اخبار پڑھنے والے کی طرح سادہ لوحی کا شکار ہو جائے تو افسوس بھی ہوتا ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ اس کے ساتھ ساتھ انسانی ابتلا کا شدید احساس بھی پیوست ہے۔ شاید ان ساری نظموں کو ایک بہت بڑے المیے کا خام مسالہ قرار دینا بہتر ہو، پہلی جنگ عظیم کے بارے میں لکھی ہوئی نظموں کی طرح۔ اس کے منتخب ٹکڑے البتہ ایسے ہیں، جن کو الگ الگ نظموں کی طرح نہ صرف پڑھا جا سکتا

ہے بلکہ ان کو بیش قیمت فکری اور تخیلاتی بصیرتوں کا حامل بھی کہا جاسکتا ہے۔

مجموعی طور پر مجید امجد کے سلسلے میں حیران کن حد تک متعدد و متحارب حلقہ ہائے ادب کے درمیان اتفاق رائے موجود ہے۔ چند ایک سوال ضرور اٹھائے گئے ہیں اور ان کا اُٹھانا تنقید کی خاموشی اور ادیبوں کی ریاکاری سے بہرحال بہتر ہے۔ سوغات کے نظم نمبر میں ایک مذاکرے کے دوران مجید امجد سے جو بے قدری اور ناشناسی روا رکھی گئی تھی، وہ تو خیر اپنی جگہ ایک یادگار ہے لیکن سلیم احمد کا یہ سوال ضرور قابل توجہ ہے کہ "جو معاشرہ میر کو عاق کر دے، وہ بڑا بدنصیب معاشرہ ہوگا لیکن جو معاشرہ غالب اور اقبال کو پسند کرے اور مجید امجد کو نظر انداز کر دے، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

یہی کہ اس میں تہذیبی تسلسل کا حوصلہ بہت کم ہے اور تخلیق ادب کے سلسلے میں اس کا رویہ ہمدردانہ نہیں کیونکہ فنکاروں کی بصیرتیں اسے خوف زدہ کر دیتی ہیں اور اس کی خود اطمینانی پر ان سے زد پڑتی ہے۔

آصف فرخی نے جب سلیم احمد سے پوچھا کہ مجید امجد کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں تو ان کا جواب تھا کہ "معاف کیجیے گا، مجید امجد مجھ سے زیادہ نہیں ملے۔ میں نے بہت خلوصِ نیت کے ساتھ ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ان کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن یہ نہیں ہو سکا کہ میں ان کو پوری طرح قبول کر سکوں۔ اس جواب کی تھوڑی بہت مشابہت ضیاء جالندھری اور حمید نسیم کی گفتگو سے ضرور ہے لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ یہاں کوئی نخوت موجود نہیں۔

یہی رویہ بعد میں نظیر صدیقی اختیار کر لیتے ہیں لیکن دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی مجید امجد کی کسی ایک نظم یا چند ایک نظموں کو منتخب کر کے اپنی جزوی پسندیدگی تک کا اظہار نہیں کرتا۔ گویا یہ وہ لوگ ہیں جن کو شاعری کی دنیا میں داخلے کا راستہ ہی نہیں ملا۔ ان میں سے سلیم احمد پر افسوس کیا جاسکتا ہے اور باقی اصحاب کو ایذرا پاؤنڈ کی ABC of Reading کا مطالعہ کرنے کی سفارش کی جاسکتی ہے کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو۔

اس سلسلے میں فیض صاحب سے متضاد روایتیں منسوب کی گئی ہیں۔ ایک انٹرویو لینے والے جب ان کے پاس پہنچے تو وہ "شب رفتہ" لیے بیٹھے تھے 'پوچھا تو کہنے لگے ان کی بہت دھوم سنی تو ہم نے چاہا کہ دیکھیں یہ کیا کہتے ہیں، سو پتہ چلا کہ ان کے پاس تو کہنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ بات اگر درست بھی ہو تو فیض صاحب کے حق میں نہیں جاتی اس لیے کہ جس چیز کو مضمون شعر کہا جاتا ہے وہ شاعری میں پیوست ہوتا ہے، جس کی متعدد تعبیریں ہو سکتی ہیں لیکن اس کی تلخیص یا سلیس اُردو نہیں بن سکتی۔ چنانچہ فیض کا یہ کمال نہیں کہ اس کے کلام میں کچھ کہا گیا ہے اور اگر واقعی ایسا ہے تو یہی کچھ مثلاً مجروح سلطان پوری کے یہاں بھی مل سکتا ہے۔ اور دونوں کا فرق محض اسلوب کا فرق بھی نہیں کہا جاسکتا۔ شعر کی مجموعی مؤثریت کو سامنے رکھیں تو مضمون شعر کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ فیض سے اس قول کا انتساب درست معلوم نہیں ہوتا۔

اسی طرح ایک مرحوم مجلسی شخصیت کے حوالے سے ماہِ نو کے ایک تازہ شمارے میں فیض صاحب سے یہ قول

منسوب کیا گیا کہ شاعری تو بس مجید امجد کر گیا ہے، ہم تو محض جھک مارتے رہے۔ یہ روایت اس قابل تو نہیں کہ اسے یہاں درج کیا جائے لیکن اس سے اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ مجید امجد سے خوش گمانی میں اضافہ ہو رہا ہے تاہم اس کے لیے لازم ہے کہ زندہ اور باخبر لوگ نقد ادب کے مقصد و منہاج کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سوچیں کہ جو ادبی شخصیتیں ہمارے دور میں جدید کلاسیک کا مرتبہ اختیار کر چکی ہیں، ان کے درمیان کسی ایک کا مقام کیسے متعین کیا جائے۔ اقبال کے بعد مجید امجد یا غالب کے بعد مجید امجد کا نام لینا ایسے ہی ہے ۔ جیسے کوئی اشتہاری مہم چل رہی ہو اور عین ممکن ہے کہ جب اس مہم کا وہی حشر ہو جو ہر اشتہاری کارروائی کا ہوتا ہے تو بچارا مجید امجد پھر مارا جائے۔ نقد ادب میں نادانوں کی دوستی اتنی ہی خطرناک ہوتی ہے جتنی کہ زندگی کے دوسرے مظاہر میں جہاں تک اس خاکسار کی رائے کا تعلق ہے تو یہ بات آج سے ۳۶ سال قبل بھی لکھ چکا ہوں اور اب بھی اسے دہرانے میں کوئی باک نہیں سمجھتا کہ مجید امجد کی نظموں میں وادی سندھ کی تہذیب گونجتی سنائی دیتی ہے اور یہ کہ اس نے غنائیت اور واقعیت کو جس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ڈرامائی طور پر متقابل کیا ہے وہ اسی کے ساتھ مخصوص ہے ۔ کسی بھی جدید کلاسیک میں ایسا کوئی ٹکڑا نہیں ملے گا:

ضرور اک روز بدلے گا نظام قسمت عالم
بسے گی اک نئی دنیا، سجے گا اک نیا عالم
شبستاں میں نئی شمعیں ، گلستاں میں نیا موسم

وہ رُت اے ہم نفس جانے کب آئے گی
وہ فصل دیر رس جانے کب آئے گی
یہ نو نمبر کی بس جانے کب آئے گی

شاید اُردو تنقید بھی ابھی تک نو نمبر کی بس کے انتظار میں کھڑی ہے۔

۱۔ دیوان حافظ کے بعض نسخوں میں " خدا : ہیہے " کی بجائے خدا را مدرسے " چھپا ہے (ادارہ)

کلامِ آبرو

ظفر احمد صدیقی

آبرو کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن بار بار ولی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور مؤرخین ادب اردو کا یہ قول یاد آنے لگتا ہے کہ شمالی ہند میں اردو غزل گوئی کا رواج دیوانِ ولی کے زیر اثر ہوا۔ فی الواقع ولی اور آبرو کے درمیان مماثلت و مشابہت کے کئی پہلو موجود ہیں۔ اول تو زبان دونوں کی ایک ہے۔ تجھ، مجھ، ہمنا، ہمن، تمن، سیتی، سوں، سیں، منیں، بھیتر، بیچ، اتا، جتا، دستا، انجھو، یہاں، وہاں، کدھی، کدھاں، تدھاں، نہیں، اورحی، آوتے ہو، چڑھاوتے ہو، مسکراوتے ہو جیسے اسماء و افعال و حروف دونوں کے یہاں ملتے ہیں۔ یہ اس قدر سامنے کی بات ہے کہ اس کے لیے مثالوں کی احتیاج نہیں۔ دوسرے ہندی و مقامی اثرات کے لحاظ سے بھی ولی اور آبرو ایک دوسرے سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ چنانچہ محبوب و معشوق کے لیے پیا، سجن، سریجن، من ہرن اور خوش نین کے الفاظ دونوں کے یہاں موجود ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی فضا اور ہندو دیومالا کے نقوش بھی دونوں کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے آبرو کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

برہن کے نین رو رو جوگی برن ہوئے ہیں
کاجر بھبھوت، انجھو مالا، پلک جٹا ہے

جوگی ہوا، پہ ناتا لالچ کا، چھوڑتا نہیں
کہتا ہے سب کوں بابا، جپتا پھرے ہے مالا

جب کہ اٹھ جاتا ہے تو اے جلوہ گر
جان جا ہے، بزم کے تن سوں نکس

وحشی نین جگت کے، کیے ہیں، سب ان نیں صید
آہو ہے تیری چشم کا۔ اے من ہرن! پھندیت

ٹیسو کے پھول نہیں ہیں، دہکتے ہیں کوئلے
آئی جنوں میں، آگ برہ کی لگا، بسنت

بدلی سوراگ چھایا، تانوں نیں جھڑ لگایا
مردنگ تس کے اوپر، بجلی کا کڑکڑانا

اور اب ولی کے یہ اشعار بھی دیکھیں:

تجھ نیہہ میں دل جل جل، جوگی کی لیا صورت
یک بار اے موہن! چھاتی سوں لگاتی جا

یک تان سنانے میں، جی تان لیا سب کا
اب دل سوں بکیں سارے، گر بھاؤ بتاوے توں

تری چنچل انکھاں کی، جگ منیں تمثیل ظاہر نہیں
مگر پتلی نین کی، یوکشن اوتار دستا ہے

خوش بو بدن پہ تیرے، زلفاں نہیں ہیں چوندھر
کالے بھجنگ مل کر، گھیرے درختِ صندل

فرش گر عاشق کریں، تجھ راہِ میں اپنے نین
تو نزاکت سوں رکھے نا اس اوپر اپنے چرن

اے صنم! تجھ جبیں اوپر یہ خال
ہندوے ہردوار باسی ہے

زلف تیری ہے، موج جمنا کی
تل نزک اس کے جیوں سناسی ہے

ولی نے مشہور فلسفی، حکیم اور طبیب بو علی سینا کا نام تلمیح کے طور پر اپنی غزلیات میں بار بار لیا ہے۔ مثلاً

حکمت عشق بو علی سیں نہ پوچھ نعیں وہ قانون شناس، اس فن کا
بو علی سینا اگر دیکھے اسے قاعدے حکمت کے سب جائے بِسر
زاہد اگرچہ فہم میں ہے، بو علی وقت میرے سخن کے رمز کوں پایا نہیں ہنوز

یہی تلمیح آبرو کے یہاں بھی کئی شعروں میں موجود ہے:

ملنے کی حکمتیں سب، آتی ہیں ہم کوں اک اک گو بو علی ہو لونڈا، کھاتا ہے فن ہمارا
بو علی ہے، نبض دانی میں بتاں کی، آبرو اس کا اس فن میں جو نسخہ ہے، سو ہے اک کیمیا

آبرو کی متعدد غزلیات بھی ولی کی زمین میں ہیں۔ مثلاً:

نہ تھا کچھ اور میرے شوق کا، حسن اور صفا باعث یہی پیاری طرح موجب، یہی کافر ادا باعث (آبرو)
کدھی میری طرف لالن! تم آتے نہیں، سو کیا باعث چھبیلا مکھ اپس کا، ٹک دکھاتے نعیں سو کیا باعث (ولی)
آیا ہے اب سفر سیں، مرا دل ستان آج پایا ہے مردگاں نیں جدائی کے، جان آج (آبرو)
دیکھے سوں، تجھ لباں کے اوپر رنگ پان آج پڑنا ہوئے ہیں، لالہ رخاں کے پران آج (ولی)
کیا ڈھونڈتا ہے، زلف کی بو کا سراغ، گل؟ سنبل کی طرح، کیوں ہے پریشاں، دماغ گل (آبرو)
تجھ مکھ اوپر ہے، رنگ شراب ایاغ گل تیری ہے زلف، حلقۂ دود چراغ گل (ولی)
فجر اٹھ خواب سیں، گلشن میں جب تم نیں ملی انکھیاں گئی مند، شرم سوں، نرگس کی، پیارے! جوں کلی انکھیاں (آبرو)
سجن! تجھ انتظاری میں، رہیں نس دن کھلی انکھیاں مثال شمع، تیرے غم میں، رو رو بہہ چلی انکھیاں (ولی)
نگہ ناآشنا کی ہر مژہ کو، تم زباں سمجھو سیہ چشمی کی جے باتاں ہیں، سو اس کا بیاں سمجھو (آبرو)
نہ دیو آزار میرے دل کو، اے آرام جاں سمجھو یہ خوبی کچھ سدا رہتی نہیں، اے مہرباں! سمجھو (ولی)
بڑھے ہے دن بہ دن، تجھ مکھ کی تاب آہستہ آہستہ کہ جوں کر، گرم ہو ہے آفتاب آہستہ آہستہ (آبرو)
کیا مجھ عشق نیں، ظالم کوں آب آہستہ آہستہ کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ (ولی)
گیا اب روزگار آشنائی ہوا ویراں دیار آشنائی (آبرو)
سجن میں ہے شعار آشنائی نہ ہو کیوں، دل شکار آشنائی؟ (ولی)

آبرو نے خود بھی ولی کے تتبع کا اعتراف کیا ہے:

ولی ریختے بیچ استاد ہے کہے آبرو کیونکے اس کا جواب؟
ولیکن تتبع میں کہنا سخن کرے فیض سوں، فکر میں کامیاب

لیکن اس گفتگو کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ آبرو کے یہاں ولی کے تتبع کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آبرو میں

تخلیقی اپچ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ تھی۔ اس لیے انہوں نے شاعری میں نوع بہ نوع تجربات کیے ہیں۔ جن میں سے ایک رخ ولی سے اثر پذیری اور تقلید کا بھی ہے۔ دوسری طرف انہوں نے متاخرین شعرائے فارسی کے اثرات بھی قبول کیے ہیں۔ چنانچہ ان کے یہاں مثالیہ یا تمثیل نگاری کے نمونے بھی جا بجا ملتے ہیں۔ مثلاً:

جلایا جب سیں غم نیں، تب سیں نکلا رنگ عاشق کا | ہوئی دور آگ کے جلنے سیتی، سونے کی آلائش
جسے ہو زیب ذاتی، اس کے تئیں ہے عیب، آرائش | کرے ہے بدنما البتہ حسنِ ماہ کو گہنا
کہنہ عاشق کو نہیں سیل فنا کی دہشت | نہ ڈرے خانہ خرابی سوں، جو ہو بنیادی
عیب داری سے نہ ہو کیوں کہ ہنرور، سفلہ | زر ہوا جبکہ کلنک، آن لگایا میں کوں
ستم سیں، شوق میرے دل کا کچھ جانے کا نہیں ہرگز | اگر اے سنگ دل، پیسو تو کب صندل سیتی بُوجا

آبرو کے یہاں جس طرح بہ یک وقت ہندوستانی فضا اور ماحول بھی ہے اور فارسی اثرات بھی۔ اسی طرح دو الگ الگ اسلوب بھی نظر آتے ہیں۔ ایک کو ہم سہل و سادہ اسلوب سے تعبیر کر سکتے ہیں اور دوسرے کو پیچ دار و پر تکلف اسلوب کا نام دے سکتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اول الذکر کی مثالیں بھی کلامِ آبرو میں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔ اس ضمن میں نہ صرف متفرق اشعار بلکہ متعدد غزلیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً

دل نیں پکڑی ہے یار کی صورت | گل ہوا ہے بہار کی صورت
کوئی گل رُو نہیں، تمہاری شکل | ہم نیں دیکھیں ہزار کی صورت
تجھ گلی بیچ، ہو گیا ہے دل | دیدۂ انتظار کی صورت
حُسن کا ملک، ہم نیں سیر کیا | کہیں دیکھی نہ پیار کی صورت
اب زمانہ سبھی طرح بگڑا | کیا بنے روزگار کی صورت
وصل کے بیچ، ہجر جا ہے بھول | جوں نشے میں خمار کی صورت
اس زمانے کی دوستی کے تئیں | کچھ نہیں اعتبار کی صورت
کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوگی؟ | اس دل بے قرار کی صورت

آبرو ! دیکھ یار کا برو دوش
دل ہوا ہے کنار کی صورت

مگر، تم سیں، ہوا ہے آشنا، دل | کہ ہم سیں ہو گیا ہے بے وفا، دل
چمن میں اوس کے قطروں کی مانند | پڑے ہیں تجھ گلی میں جا بجا، دل
جو غم گزرا ہے مجھ پر عاشقی میں | سو میں ہی جانتا ہوں یا مرا دل
ہمارا بھی کہاتا تھا، کبھی یہ | سجن ! تم جان لو، یہ ہے برا دل

کہاں خاطر میں لاوے آبرو کوں
ہوا اس میرزا کا آشنا دل

تمہارا دل اگر ہم سیں پھرا ہے — تو بہتر ہے، ہمارا بھی خدا ہے
ہماری کچھ نہیں تقصیر، لیکن — تمہیں کو سب کہیں گے بے وفا ہے
ہوئے ہو، اس قدر بیزار ہم سیں — کہو ہم نیں تمہارا کیا کیا ہے؟
فقط اخلاص میں اپنا اکڑنا — ستم گر! بے وفا! یہ کیا ادا ہے
مگر دین مروت میں، تمہارے — یہی کچھ دوست داری کی سزا ہے؟
تمہاری اک نگہ لطف و کرم کی — ہمارے درد کوں، دل کے، دوا ہے

عبث بیدل کرو مت، آبرو کوں
مسافر ہے، شکستہ ہے، گدا ہے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے، کدھر گئے؟ — وے عاشقی کے، ہائے، زمانے کدھر گئے؟
مژگاں تو تیز تر ہیں، و لیکن جگر کہاں؟ — ترکش تو سب بھرے ہیں، نشانے کدھر گئے؟
کہتے تھے ہم کوں، اب نہ ملیں گے کسی کے ساتھ — عاشق کے دل کوں، پھر کے ستانے کدھر گئے؟
جاتے رہے پہ نانو بتایا نہ کچھ مجھے — پوچھوں میں کس طرح کہ فلانے کدھر گئے؟
میں گم ہوا جو عشق کی رہ میں، تو کیا عجب — مجنون و کوہ کن سے، نہ جانے کدھر گئے؟

اب روبرو ہے یار، نہیں بولتا سو کیوں؟
قصے وہ آبرو کے بنانے کدھر گئے؟

سادہ بیانی کی یہی کیفیت ان غزلیات کی بھی ہے، جن کے مطلعے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

جو کہ محرم ہو عشق بازی کا — دل سیں عاشق ہے، جاں گدازی کا
نین سیں نین جب ملائے گیا — دل کے اندر مرے سمائے گیا
دل کوں کرتا ہے بے قرار اخلاص — تن و جاں کوں نزار و زار اخلاص
ہمارے یار کا ہے اس قدر صفا عارض — کہ دل میں شک ہے مرے، آئینہ ہے یا عارض؟
ہے دل و جاں کا، نہ تنہا دشمن آرام عشق — مہر و مہ کوں چرخ میں رکھتا ہے صبح و شام، عشق
کیوں پڑا اس غم کے بستاروں میں دل — اب گنوا اس زلف کے ماروں میں دل
نازنیں جب خرام کرتے ہیں — تب قیامت کا کام کرتے ہیں
افسوس ہے کہ ہم کوں دلدار بھول جاوے — وہ شوق، وہ محبت، وہ پیار بھول جاوے

واضح رہے کہ ان مثالوں کے ذریعے آبرو کے سہل و سادہ کلام کا استیعاب و احاطہ مقصود نہیں۔ یہ بطور مشتے از خروارے ہے، لیکن اس سے قطع نظر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آبرو کی شہرت یا انفرادیت میں ان کے سہل و سادہ کلام کا حصہ بہت کم ہے، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ انہیں خود اپنے زمانے میں جو شہرت حاصل ہوئی، وہ غیر سہل و سادہ اسلوب کی بنا پر ہوئی۔ ذیل میں اس طرح کے کلام کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

تیرے میٹھے سے مر رہے ہیں سب　　　تیغ مصری ہیں کیا یہ تیرے لب؟

تیری نگاہ ، تیر کا پیکان ہے صنم!　　　تم دیکھ دیکھ ، زخم لگاتے ہو بھال کے

پیا! تیرے زنخ سیں ، چاہ کرکے　　　ہوئے سب عاشقاں کے دل ڈنوا ڈول

شیریں لباں کو اس کے، فقط توت مت کہو　　　گویائی اس کی دیکھ کے، طوطی کہے پیا

آبرو کے اس اسلوب کی شناخت اور تعریف کے لیے عام طور پر ایہام گوئی۔ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ چنانچہ میر حسن لکھتے ہیں: "ہر شعرے کہ گفتہ، بے لطف و بے ایہام نگفتہ" (۱) (ہر شعر میں لطف و ایہام موجود ہے) قدرت اللہ شوق تحریر کرتے ہیں: "سر دفتر و سر آمدِ ایہام گو، شاہ مبارک آبرو" (۲) (شاہ مبارک آبرو کا نام ایہام گویوں میں سر فہرست ہے۔) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ لکھتے ہیں: بہ صنعتِ ایہام مائل بود" (۳) (صنعتِ ایہام کی طرف مائل تھے) مرزا علی لطف رقم طراز ہیں: ترکیب میں بیشتر اشعار انہوں نے ایہام کے کہے ہیں" (۴)

یہ تذکرہ نگاروں کے بیانات تھے۔ بعد کے مصنفین نے بھی ان پر صاد کیا ہے اور آبرو نیز ان کے معاصر شعرا کو بالعموم ایہام گو کی حیثیت سے ہی سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس طرح کی شاعری کو رعایات و تلازمات کی شاعری کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ کیونکہ محض ایہام کی اصطلاح کے سہارے یہ شاعری اپنے تمام ابعاد کے ساتھ سامنے نہیں آسکتی۔ اس دعوے کی توضیح کے لیے ہم مذکورہ بالا اشعار کو الگ الگ اٹھاتے ہیں:

تیرے میٹھے سے مر رہے ہیں سب　　　تیغ مصری ہیں کیا یہ تیرے لب؟

بادی النظر میں کہا جاسکتا ہے کہ اس شعر میں "میٹھے" کے لفظ میں ایہام ہے۔ اس کے ایک معنی کڑوے کی ضد کے ہیں۔ یہ معنی قریب ہیں۔ دوسرے معنی بوسے کے ہیں۔ یہ معنی بعید ہیں اور یہی شاعر نے مراد لیے ہیں۔ لیکن بات یہیں تو ختم نہیں ہو جاتی۔ میٹھے، اور، مصری، میں ایہام تناسب بھی ہے۔ پھر میٹھے، کے لفظ کو اپنے دونوں معنی کے لحاظ سے، لب، سے بھی تناسب حاصل ہے۔ (لب سے مٹھاس کا احساس ہوتا ہے اور لب ذریعۂ تقبیل بھی ہے) مزید براں، تیغ، اور مر رہے، میں بھی تناسب کا لحاظ ہے۔ یہی نہیں، مر رہے، میں بھی معنی کی دو جہتیں ہیں (مرنا، بمعنی موت اور مرنا، بمعنی عشق کرنا) اگر مزید غور و فکر کیا جائے تو "تیغ" اور "تیرے" نیز "سب" اور "لب" میں تجنیس لاحق بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ لفظی و معنوی رعایات کے ان تمام پہلوؤں پر صرف ایہام گوئی، کی اصطلاح حاوی نہیں ہو سکتی۔ یہی کیفیت دوسرے اشعار کی بھی ہے۔

تیری نگاہ، تیر کا پیکان ہے، صنم! تم دیکھ دیکھ زخم لگاتے ہو، بھال کے

اس شعر کا مرکزی لفظ "بھال" ہے اسے ایک طرف 'دیکھ' کے مرادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور دوسری جانب یہ انی یا نوک سناں کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ شعر میں مؤخر الذکر معنی مراد ہیں۔ لیکن الفاظ کی ترتیب ایسی رکھی گئی ہے کہ مناسبات و رعایات کے کئی سلسلے قائم ہوگئے ہیں:

تیر، پیکان، بھال، زخم

تیر، نگاہ، صنم، زخم

نگاہ، دیکھنا، بھالنا

تیری، اور تیر، میں تجنیس ناقص و زائد بھی ہے۔

پیا! تیرے زنخ سیں چاہ کر کے ہوئے سب عاشقاں کے دل ڈنواڈول

اس شعر میں تین ذو معنیین الفاظ لائے گئے ہیں۔ 'پیا، پینا کا ماضی مطلق بھی ہے اور بہ معنی، محبوب، بھی۔ چاہ، کنواں بھی ہے اور بہ معنی 'چاہت، بھی۔ ڈول، کنوئیں سے پانی نکالنے کا آلہ بھی ہے اور ڈولنا بہ معنی حرکت کرنا کا اسم مشتق بھی۔ اب مناسبات ملاحظہ ہوں:

پیا، زنخ، دل، چاہ، ڈنواڈول (پیا کے زنخ کا کیا کہنا؟ عاشقوں کے دل، اس کی چاہ میں ڈنواڈول ہیں)

چاہ، ڈول، پیا (چاہ بھی ہے اور ڈول بھی تو پیا جاسکتا ہے)

زنخ، چاہ (زنخ کو چاہ ذقن یا چاہ زنخداں بھی کہتے ہیں)

شیریں لباں کو اس کے، فقط توت مت کہو گویائی اس کی دیکھ کے، طوطی کہے پیا

یہاں، شیرینی، لب، اور توت، کی مناسبتیں تو بالکل سامنے کی ہیں۔ پھر لب آلہ نطق ہے۔ کہو، کہے اور گویائی اس کے متعلقات ہیں۔ طوطی بھی کہتی یا بولتی ہے۔ اس لحاظ سے ان سب میں علاقہ ہے۔ 'پیا، میں معنی کی تین جہتیں ہیں۔ پیا۔ ایک پرندہ ہے۔ اس لیے طوطی سے اس کا تناسب ظاہر ہے۔ دوسری طرف، فقط توت، کے بالمقابل 'طوطی پیا، کا مطلب یہ ہے کہ توت بدون یا ہے اور طوطی کے آخر میں 'ی' بھی ہے۔ پھر پیا آمدن کا صیغۂ امر بھی ہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ طوطی محبوب کے شیریں لبوں پر فدا ہے۔ اس کی گویائی دیکھ کر پاس بلاتی ہے۔ توت اور طوطی میں تجنیس ناقص و زائد بھی ہے۔ ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ آبرو محض ایہام گو نہیں، بلکہ ان کی شاعری فی الواقع رعایات و مناسبات کی شاعری ہے۔ اس کا ایک پہلو ایہام بھی ہے۔ قدیم تذکرہ نگاروں میں کم از کم مردان علی خاں مبتلا کے یہاں اس کا اشارہ موجود ہے۔ کہتے ہیں "در شیوۂ شاعری طرز خاصے دارد، و رعایت لفظی و ایہام بسیاری نماید (۵)" (شاعری میں ایک خاص طرز کے مالک ہیں رعایت لفظی اور ایہام سے بہت کام لیتے ہیں)۔

آبرو کو محض ایہام گو اس لیے بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا بہت سا کلام، جو ان کے مخصوص اسلوب کی مثال میں

پیش کیا جا سکتا ہے، اس میں سرے سے ایہام کا گزر ہی نہیں۔ ہاں دوسری لفظی و معنوی صنعتیں اور رعایتیں موجود ہیں۔ مثلاً:

من ہرن سب صید ہیں، تجھ چشم کے
نام تیرا، کیوں نہ ہو شیر و میاں

ملنے کے شوق میں ہم، گھر بار سب گنوایا
مدت میں گھر ہمارے آیا تو گھر نہ پایا

مومنوں کے دلوں کو، یہ بدکیش
کافری کر کے، رام کرتے ہیں

دو بھواں سیں لگے ہیں، جس کے نین
وہ کہاتا ہے، حاجی الحرمین

لکھوں گا آبرو! اب خوش نین کوں میں ناما
پلک قلم ہیں مری، مردمک دواتیں ہیں

جو کہ بسم اللہ کر کھائے طعام
تو ضرر نہیں، گو کہ ہووے بِس مِلا

رہتے ہیں جی میں، مصرع دلچسپ کی طرح
گھر بار ہو ہے سرو قداں کا برائے بیت

ملنے کی بدھ میں، ضد سیں نہ آیا کسی حساب
بنیے کا تھا اصول، جو ہوتا نہ ہٹ دھرم

اس کی کنجی زبان شیریں ہے
دل مرا قفل ہے بتاسے کا

دوسری طرف ان کے بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں، جن میں بہ ظاہر ایہام کی موجودگی کا دھوکا ہوتا ہے، لیکن بہ غور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جسے ایہام سمجھ لیا گیا ہے، وہ درحقیقت ،ایہام تناسب، ہے۔ خط کشیدہ الفاظ پر نظر رکھتے ہوئے ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

عاشقاں دیکھ، تیری سنگ دلی
جان دیتے ہیں دم بہ دم، مر مر

مگر ملما سیں اپنے، بوالہوس نیں شوق یہ سیکھا
کہتا ہے "چاہتا ہوں یار کے گالوں کے خالوں کو

قد ہے نہال تیرا، پیارے! اگر ہمارے
تو بر منیں نہ آوے، تو شاخ بے ثمر ہے

نام اس کا اب سند ہے، جس پر ہو مہر اس کی
بخشی ہے دل کو غم نیں، اب داغ کی کچہری

یہ جو بانکی چال چلتے ہیں بتاں، فرزیں کی طرح
مات ہو جاں سب، اگر آجا مرا وہ شہہ کہوں

یوں بے وفا ہوا تو، اے سرخ چیرنے والے!
ہم کوں پڑے ہیں تیرے اب دیکھنے کے لالے

لالچی معشوق یہ، بے شرم، ہیں چکنے گھڑے
آبرو! جا کر کنوئیں میں گر، پر ان سب کوں نہ چاہ

'ایہام، اور ایہام تناسب، میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں جگہ الفاظ ذو معنیین ہوتے ہیں اور فرق یہ ہے کہ 'ایہام' میں دونوں معنی مراد لینے کی گنجائش ہوتی ہے، اگرچہ مقصود ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف 'ایہام تناسب' میں ایک ہی معنی کی گنجائش ہوتی ہے اور وہی مراد بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ شمس الدین فقیر "حدائق البلاغت، میں لکھتے ہیں:

"در ایہام باید کہ ارادۂ بر دو معنی جائز باشد، و در ایہام تناسب معنی دوم منظور و ملحوظ نشود" (۶) (ایہام میں

دونوں معنی کا ارادہ جائز ہونا چاہیے اور ایہام تناسب میں معنی دوم منظور و ملحوظ نہیں ہوتے)

انہوں نے مثال میں کئی فارسی اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ ہم یہاں ان میں سے دو کے نقل پر اکتفا کرتے ہیں:

"مرا فراق تو روزے ہزار بار کشد فراق چوں تو گلے، ایں چنیں ہزار کشد

ایں چنیں بلبل رامی کشد یا ایں چنیں ہزار کس رامی کشد، ہر دو درست است۔" (۷)

(تمہاری جدائی، ہر دن ہزار بار میری جان لیتی ہے۔ تم جیسے پھول کی جدائی اسی طرح بلبل کے لیے جان لیوا ثابت ہوتی ہے یا یہ کہ اسی طرح ہزاروں کی جان لے لیتی ہے۔ (ہزار کے) دونوں معنی درست ہیں)۔

"خنجر عشق، خون من، ریخت بہ خاکپائے تو رائے تو بود کشتنم، کشتہ شدم برائے تو

بر طبق رائے تو کشتہ شدم یا از برائے تو، ہر دو صحیح می آید۔" (۸)

(عشق کے خنجر نے میرا خون تمہارے قدموں میں بہا دیا۔ تمہاری رائے تھی کہ میں مارا جاؤں۔ سو تمہاری مرضی کے مطابق میں مارا گیا، یا یہ کہ تمہارے لیے مارا گیا۔ |برائے تو| کے دونوں معنی درست ہیں۔)

آخر میں حاصل کلام کے طور پر لکھتے ہیں:

"پس تعریف توریہ در نظر تحقیق آنست کے لفظے را در کلام مذکور سازند کہ دو معنی داشتہ باشد و اطلاق ہر دو معنی دراں محل صحیح باشد، چنانچہ دریں امثلہ گزشت" (۹)

(لہذا توریہ کی تعریف نگاہ تحقیق میں یہ ہے کہ کلام میں ایسا لفظ لائیں جس کے دو معنی ہوں اور اس جگہ دونوں معنی کا ارادہ درست ہو۔ جیسا کہ ان مثالوں میں گزرا۔)

اسی طرح مولانا نجم الغنی بحر الفصاحت، میں لکھتے ہیں:

"صنعت ایہام تناسب میں یہ فرق ہے کہ ایہام میں دونوں معانی کا ارادہ جائز ہوتا ہے اور ایہام تناسب میں دوسرے معنی منظور و ملحوظ نہیں ہوتے" (۱۰)

اس کے بعد مولانا نے 'ایہام تناسب' کی کئی مثالیں ذکر کی ہیں۔ ان میں سے ذیل میں دو نقل کی جاتی ہیں:

"گر یاد، کہیں چہ ذقن کو کودے نہ کنویں میں باؤلی ہو

(نسیم)

باؤلی سے مراد دیوانی ہے اور اس معنی کے اعتبار سے اس کو کنویں کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں۔ البتہ باؤلی کے ایک اور معنی ہیں۔ ان کے اعتبار سے دونوں میں مناسبت ہے۔" (۱۱)

"مجلس کو اشک نظم سے رشک چمن کروں مداحِ حسین بہ وجہ حسن کروں

(میرانیس)

حسن سے مراد خوب ہے اور اس معنی کے اعتبار سے اس کو حسین کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں۔ البتہ حضرت

امام حسنؓ کا نام ہونے کی وجہ سے حسینؓ کے ساتھ مناسبت ہے۔" (۱۲)

ایہام اور ایہام تناسب کے درمیان فرق کی وضاحت کے بعد اب کلامِ آبرو سے 'ایہام' کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

پانی پت آج چھوڑ، جو گنور تم چلے — تو راہ بیچ جائیو، جانی! سنبھال کے

"سنبھالکہ" پانی پت اور گنور کے درمیان ایک قصبے کا نام ہے۔ بہ قول محمد حسین آزاد: "اگلے وقتوں میں یہاں رستہ لٹتا تھا اور راہزنی اس کی مشہور تھی۔ (۱۳)" اس لیے 'سنبھال کے' کے معنی احتیاط کے ساتھ کے بھی ہو سکتے ہیں۔ لفظوں میں دونوں معنی مراد لینے کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن قرائن مؤخرالذکر معنی کے مؤید میں۔

سنتی نہیں کسی کا کہنا یہ چشم تیری — صید آبرو کے دل کوں، کرتی ہے جوں کہ بہری

"بہری" کے دو معنی ہیں (۱) گراں گوش، اونچا سننے والی (۲) ایک شکاری پرندہ۔ اول الذکر معنی کے لحاظ سے شعر کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کی آنکھیں آبرو کے دل کا شکار کرتی ہیں اور کسی گراں گوش کی طرح کسی کا کہنا نہیں سنتیں۔ ثانی الذکر معنی کو اختیار کیجئے تو مطلب یہ ہوگا کہ محبوب کی آنکھیں بہری پرندے کی مانند آبرو کے دل کا شکار کرتی ہیں اور روکے سے رکتی نہیں ہیں۔ یہاں بھی قرائن سے مؤخرالذکر معنی کی تائید ہوتی ہے۔

بہار بیچ، جو بن مَے رہے، سو مورکھ ہے — پیے شراب کا پیالہ، وہی ہے مت والا

"متوالا" کے ایک معنی ہیں سرشار و مدہوش اور دوسرے معنی ہیں صاحب عقل و فہم۔ شعر میں دونوں معنی کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن معنی ثانی راجح ہیں۔

محراب ابرواں کوں وسمہ ہوا ہے زیور — کیونکر کہوں نہ ان کو اب زینت المساجد

"زینت المساجد" کے لفظی معنی ہیں مساجد کے لیے باعثِ زینت اور دہلی کی ایک مسجد کا نام بھی 'زینت المساجد' ہے۔ اس لیے شعر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب کے محراب ابرو، وسمہ سے آراستہ ہیں، لہٰذا انہیں مساجد کے لیے باعث زینت کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور یہ بھی کہ زیور وسمہ سے آراستہ محراب ابرو کو استعارتاً زینت المساجد، کہنا چاہیے۔ قرائن سے تائید معنی ثانی کی ہوتی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ باوجودیکہ آبرو کو، ایہام گو، کہنے کی روایت عام رہی ہے، لیکن ایہام یا توریہ کی حقیقی مثالیں، جس کے بعض نمونے اوپر مذکور ہوئے، کلام آبرو میں بہت کم ہیں۔ البتہ ایہام تناسب اور ضلع جگت، کی مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ پھر جس طرح 'ایہام تناسب' کو بربنائے غلط فہمی ایہام کی ایک قسم سمجھا جاتا رہا ہے۔ اسیطرح ہمارے ناقدین آبرو اور ان کے معاصرین پر گفتگو کرتے ہوئے بلاسوچے سمجھے 'ضلع جگت' پر بھی ایہام کا اطلاق کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں بھی فرق ہے۔ 'ضلع جگت' کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"ایسے الفاظ استعمال کرنا، جن میں معنوی ربط نہ ہو، لیکن ان کا تلفظ، املا یا تلازمہ ایسا ہو کہ معنوی ربط کا دھوکا ہو۔" (۱۴)

جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا، آبرو کے یہاں اس کی مثالیں بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ خط کشیدہ الفاظ پر نظر رکھتے ہوئے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

ہنس ہاتھ کا پکڑنا، کیا سحر ہے پیارے!
پھونکا ہے، تم نیں منتر، گویا کہ ہم کو چھو کر

خدائی مہربانی آبرو پر تھی، سو کیوں چھوڑی؟
ملازم ساتھ، مت طرز قدیم، اپنے تئیں نوکر

کون تھا؟ کہہ وہ خدا کا کھویا
دودھ سی دیہہ، ملائی کس پاس؟

نیل پڑ جاتا ہے ہر بوٹی کا، اے نازک بدن!
تن اوپر تیرے، چکن کرتا ہے گویا کار چوب

بوالہوس کوں ہوا ہے تب سیں مغز
جب سیں تم نیں اسے بلا بھیجا

ان لباں کوں، یقین مصری جان
راست کہتا ہوں، اس میں مت شک، کر

کیا مکتب سیں آ، خوں ابرو کا
یہی کچھ تم نیں ملّا کی دعا لی؟

ترک آرائش ہوئی اس طفلِ مکتب کوں بہار
طور پکڑی جب سیتی سادی، گلستاں ہوگیا

نازک چنے پہ اپنے کرتے ہو تم غروری
موسی کمر پہ اتنے فرعون ہو رہے ہو

بادۂ غفلت کی مستی یاد آوے گی انہیں
آتش دوزخ میں جب، ہوویں گے وہ شامی، کباب

یہ خال خال ملنا، ہوتا تھا جو ہمن سیں
اس میں بھی عارضا یہ، یار! اب کہاں سیں آیا

ترشح ابر کا، کرتا ہے گلشن کے تئیں رنگیں
دلوں کو، پان کا کھانا، یہی انکھیوں کا چونا ہے

دل رشک کی جلن سیں، پھپھولا ہوا پیا!
کیوں غیر سیں بلا کے کہا تم نے "آب لا"

ہر قدم ماہِ محرم ہے، برہ کی راہ میں
اس سفر میں کوئی بلا آگے نہیں، اِلّا وفات

نہالی سیں، بدن اس سرو قد کا ہے، ملائم تر
کہتا ہوں راست، لالاں سیں یقیں، اس میں نہ کر تو، شک

آبرو کے قتل کوں، حاضر ہوئے کس کر کمر
خون کرنے کوں چلے، عاشق پہ تہمت باندھ کر

آخرالذکر دونوں شعر میں ضلع کی بنیاد صرف املا ہے۔ توشک، اور 'تو' شک، نیز، تُہمت اور تَہمت، کا املا ایک ہے۔ تلفظ الگ الگ ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آبرو کو محض ایہام گو کہنے کے بجائے ضلع جگت اور رعایات و مناسبات کا شاعر کہنا زیادہ بہتر ہے۔ رہا یہ سوال کہ جب آبرو کے یہاں سہل و سادہ کلام کے نمونے بھی اچھی خاصی مقدار میں موجود ہیں تو اسے ان کی تعیین قدر میں نظر انداز کیوں کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آبرو کے اس طرح کے کلام میں تجربے، خیال یا اسلوب بیان کے لحاظ سے کوئی ندرت یا انفرادیت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے اس طرح کے کلام کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آبرو نے جس مشاقی، ہنرمندی اور جگر کاوی کا مظاہرہ اپنی رعایات و مناسبات والی شاعری میں کیا ہے، اس سے ان کا سہل و

سادہ کلام خالی ہے۔ اس صورتِ حال کا تقاضا یہی تھا کہ انہیں داد اول الذکر کلام پر ہی ملتی، چنانچہ ملی۔ بلکہ آگے بڑھ کر یوں کہنا چاہیے کہ آبرو نے اس رنگِ سخن کو عام کرکے وقت کا رواج اور فیشن بنا دیا۔ یہاں تک کہ یہی اس عہد کا معیاری اسلوب قرار پایا اور چھوٹے بڑے سبھی شاعروں نے اس رنگ کو اپنا لیا۔ انتہا تو یہ ہے کہ خوشگو نے ان کی شاعری کی تعریف میں نثر کا ایک فقرہ کہا تو اس میں بھی یہی پیرایۂ بیان اختیار کیا: "ریختۂ آبرو، آبروئے شعر ریختہ۔" (۱۵)

یہیں سے اپنے ہم عصروں میں آبرو کی اہمیت اور انفرادیت کا سراغ بھی مل جاتا ہے کہ آبرو کی مثال اپنے نظامِ شمسی کے سب سے روشن اور طاقت ور سیارے کی ہے اور اس عہد کے دوسرے شعرا چھوٹے چھوٹے سیاروں کے مانند اس آفتاب کی کشش سے بندھے ہوئے اور اس کے طواف پر مجبور ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر شاکر ناجی کو لیجئے۔ ان کا نام عام طور پر آبرو کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، بلکہ ڈاکٹر فضل الحق، مرتب دیوانِ شاکر ناجی نے تو برینائے غلط فہمی انہیں بانی ایہام قرار دے دیا ہے۔ (۱۶) لیکن ان کے دیوان کا مطالعہ کیجئے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جس طرح آبرو نے ولی کو راہ سخن کا ہادی و پیشوا تصور کیا ہے۔ ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ ان کے مصرعوں پر تضمینیں کی ہیں اور جابجا ان سے عقیدت کا اظہار کیا ہے، وہی معاملہ ناجی کا آبرو کے ساتھ رہا ہے۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ آبرو، ولی سے الگ رنگ سخن نکالنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن ناجی از اول تا آخر آبرو کے رنگ میں ہی رنگے رہے۔ ذیل میں ناجی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں مختلف حیثیتوں سے آبرو کا ذکر موجود ہے:

ناجی! سخن ہے خوب ترا، گرچہ مثلِ شمع — لیکن زباں مزے کی لگی، آبرو کے ہاتھ
واسطے آبرو کے، اے ناجی! — "دل میں میرے تڑپ کما ہی ہے"
ناجی کے حرف حرف کے آگے، گہر کے تئیں — پھر آبرو کہاں؟ کہ کہے "آبرو نہیں"
سخن کی پرورش کوں، آبرو حیف آج پکا تھا — کہ ناجی اس کے مرنے سیں، نہ مانے، رگ گئے مضموں
وہی انسان ہے ناجی! نہ کرے عیب کوں فاش — آبرو نیں یہ کہا، میں نیں سنا کانوں سیں
آبرو سیں سنا ہے، اے ناجی! — "آونے کی خبر قیامت ہے"
ناجی کا دل لپیٹ لیا آبرو نیں کھول — "آیا ہے صبح نیند سے اُٹھ رسما ہوا"
ناجی! اُس مِسّی و تاں کی آبرو لکھتا ہے شرح — "برستا ہے خونِ ناحق، اس گھٹا کاری سیں آج"

کلام آبرو کے تعلق سے ایک اہم بحث ابھی باقی ہے، وہ یہ کہ جدید تنقید کم و بیش اس نکتے پر متفق ہے کہ رعایات و مناسبات ہماری شاعری کا جوہر ہیں۔ ہمارے بڑے شعرا میر، غالب اور انیس کے یہاں تو اس کی بہتات ہے۔ پس اگر آبرو بھی رعایات و مناسبات اور ضلع جگت کے شاعر ٹھہرے تو پھر ان میں اور مذکورالصدر شعرا میں فرق ہی کیا رہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رعایات کی حیثیت شاعری کے خام مواد کی ہے۔ اس لیے اس کے نمونے ہر قابل ذکر چھوٹے بڑے شاعر

کے یہاں ملتے ہیں لیکن اُن میں باہم اختلاف۔ اب اس لیے ہو جاتا ہے کہ ہر شاعر اپنے اپنے معیار و مذاق اور افتادِ طبع کے لحاظ سے اس خام کا مواد استعمال الگ الگ مقاصد کے لیے کرتا ہے۔ بقول شاعر:

غیر وطوبیٰ و ما و قامت دوست　　　　فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست

اب جہاں تک آبرو کا تعلق ہے، تو ان کے یہاں رعایات بہ ذات خود مقصود ہیں۔ معنی آفرینی کا ذریعہ نہیں ہیں۔ اس کے برخلاف میر، غالب، انیس وغیرہ نے انہیں مقصود بالذات نہیں بنایا ہے، بلکہ اپنے مخصوص تجربات و افکار کے اظہار و ابلاغ کے لیے ایک وسیلے کے طور پر برتا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے آبرو اور ان کے معاصرین کے طرز سخن کی تعبیر کے لیے "تلاش لفظ تازہ" کا پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کے بیانات ملاحظہ ہوں:

میر تقی میر، شرف الدین مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں: "ہر چند کم گو بود، لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظِ تازہ زیادہ۔" (۱۰) قائم اس عہد کے شعرا پر عمومی تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: "بعضے از شعرائے ابتدائے زمانۂ محمد شاہ بہ اعتقاد خود تلاش الفاظ تازہ و ایہام نمودہ شعر را از مرتبۂ بلاغت انداختند (۱۸)" میر حسن ایک جگہ عام شعرا کے بارے میں لکھتے ہیں: "باید دانست کہ سخن سنجان آں زماں درپے صنعت ایہام می بودند و تلاش لفظ تازہ می نمودند۔" (۱۹) اور دوسری جگہ خاص طور سے آبرو کے بارے میں رقم طراز ہیں: "تلاش سخن تازہ می کرد" (۲۰)

ان بیانات کا ماحصل یہی ہے کہ آبرو اور ان کے معاصرین کی شاعری معنی آفرینی ـ کے بجائے لفظ آفرینی، پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ معنی آفرینی کی طرح لفظ آفرینی بھی ایک ہنر ہے اور اس کے لیے بھی مشق و مزاولت اور ذہانت درکار ہے، لیکن اس کا دائرہ بہر حال محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی شاعری ہمیں محظوظ تو کرتی ہے، لیکن ہمارے تجربے میں کوئی معنی خیز اضافہ نہیں کرتی۔

معنی آفرینی اور لفظ آفرینی کے فرق کی وضاحت کے لیے بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

گو اُس رخِ مہتابی سے وہاں چاندنی چٹکی　　　　یہاں رنگ شکستہ سے بھی چھٹتی ہے ہوائی

بے تاب و تواں یوں میں کاہے کو تلف ہوتا　　　　یاقوتی جو اس لب کی ملتی تو سنبھل جاتا

یہ دونوں شعر میر کے ہیں۔ پہلا شعر اصالتاً حسن کے مقابلے میں عشق کی جداگانہ حیثیت کا اعلان و اظہار ہے۔ اس لیے پورے شعر کے دروبست میں تقابل و تضاد کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ معشوق کا رخ مہتابی ہے۔ تو عاشق رنگ شکستہ کا حامل ہے۔ وہاں چاندنی چٹک رہی ہے تو یہاں ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ادھر رنگینی کا غرور ہے تو ادھر بے رنگی پر ناز ہے۔ مہتابی اور ہوائی آتش بازی کے نام بھی ہیں ـ اس لیے تقابل کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر خیمۂ حسن سے مہتابیاں چھوٹ رہی ہیں تو عشق بے سر و سامان بھی ہوائیاں چھوڑ رہا ہے۔ دوسری جانب لب و لہجے اور تیور پر دھیان دیجئے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ سارا بیان طنز پر مبنی ہے ـ جسے موجود کہا جا رہا ہے وہ معدوم ہے۔ جس کو اعلان و اظہار سمجھا جا رہا

ہے وہ احتجاج ہے۔ جس بیان کو فخر و غرور پر محمول کیا جا رہا ہے وہ فریاد و فغاں ہے۔ اس لحاظ سے میر کا یہ شعر غالب کے اس شعر کا ہم کیفیت ہے:

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط　　　تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

اور غالب کے شعر پر، میر کا ایک اور شعر یاد آجاتا ہے:

یہاں ہوئے خاک سے برابر ہم　　　وہاں وہی ناز و خود نمائی ہے

میر کے زیر بحث شعر کے دونوں مصرعوں میں جہاں تقابل و تضاد کی پوری پوری رعایت ہے، وہیں ہر مصرعے میں بجائے خود تناسب کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے پہلے مصرع اول لیجئے۔ رُخ مہتابی سے مراد گورا صبیح چہرہ ہے اور چاندنی کا چٹکنا کنایہ ہے، اس کے پر رونق و آب دار ہونے سے۔ ظاہر ہے کہ اس مفہوم کی ادائیگی دوسرے الفاظ سے بھی ممکن تھی، لیکن یہاں مہتابی کے ساتھ چاندنی کا لفظ بر بنائے 'تناسب' لایا گیا ہے۔ پھر تناسب کے بھی کئی پہلو ہیں۔ ایک تو رنگ کے لحاظ سے صباحت اور چاندنی کی مناسبت دوسرے مہتاب اور چاندنی کی مناسبت ۔ تیسرے یہ کہ مہتابی محل یا باغ کے اس چبوترے کو بھی کہتے ہیں۔ جہاں سے چاندنی کی بہار دیکھتے ہیں۔ چوتھے اور پانچویں یہ کہ مہتابی ایک آتش بازی بھی ہے اور زری یا بادلے کو بھی مہتابی کہتے ہیں۔ دونوں کا تعلق چمک اور روشنی سے ہے۔ اس لحاظ سے بھی اس لفظ کو چاندنی سے مناسبت حاصل ہے۔

مصرع ثانی میں رنگ شکستہ اور ہوائی چھوٹنا میں بھی اسی طرح تناسب ملحوظ ہے، جیساکہ مہتابی اور چاندنی میں رنگ کے شکستہ ہونے کے معنی ہیں منہ فق ہو جانا، رنگ متغیر ہو جانا، بے رنگ و بے رونق ہو جانا۔ یہی مفہوم ہوائی چھوٹنے کا بھی ہے۔ گویا بہ ظاہر الفاظ الگ الگ ہیں، لیکن معنی ایک ہیں۔ ہوائی کترے ہوئے پستے یا بادام کو بھی کہتے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے شکستہ اور ہوائی میں بھی مناسبت ہے۔ (کترنا ، توڑنا، ریزہ ریزہ کرنا) ہوائی جیساکہ اوپر مذکور ہوا، آتش بازی بھی ہے۔ اس لیے رنگ سے بھی اس کی مناسبت ہے۔

تقابل و تضاد اور مناسبات کے مذکورہ بالا پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے اس شعر کو پڑھا جائے تو معنویت کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں رعایات معنی آفرینی کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ یہی کیفیت دوسرے شعر کی بھی ہے۔

بے تاب و تواں یوں میں کاہے کو تلف ہوتا　　　یاقوتی جو اس لب کی ملتی تو سنبھل جاتا

اس شعر کا بنیادی لفظ یاقوتی ہے۔ اسے ایک طرف لب سے مناسبت حاصل ہے۔ اس لیے کہ دونوں سرخ ہیں، دونوں گراں مایہ ہیں اور دونوں فرحت بخش ہیں۔ مزید برآں یاقوتی "ایک قسم کی مقوی معجون بھی ہے، جس کا جزو اعظم یاقوت ہے، اب اس لفظ کو 'بے تاب و تواں' اور 'سنبھل جاتا' سے بھی مناسبت حاصل ہو گئی (ناتواں مریض کو یاقوتی مل جاتی تو سنبھل جاتا۔ نہ مل سکی لہٰذا تلف ہو گیا) دو مختصر مصرعوں میں عاشق کی ناتوانی و بے کسی کا بیان بھی ہے اور

معشوق کے تغافل و تساہل کا گلہ بھی ۔ ساتھ ہی اس کے لبوں کا وصف بھی ہو گیا۔ وہ سرخ ہیں، گراں مایہ ہیں، مقوی ہیں اور مفرح ہیں۔

سنبھلنا کے بھی دو مفہوم ہیں ایک لغزش کھا کر گرنے سے بچ جانا۔ اس لحاظ سے اس کو بے تاب و تواں سے مناسبت ہے۔ (ناتواں بھی گرتا ہے، کبھی سنبھل جاتا ہے) سنبھلنا کا دوسرا مطلب ہے مریض کی حالت میں سدھار پیدا ہونا۔ یہ ضد ہے تلف ہونے کی۔ پھر تلف ہونا بھی دو پہلو رکھتا ہے۔ ایک حقیقی یعنی فنا ہونا، مٹ جانا۔ دوسرے عرفی یعنی صلاحیتوں کا دب جانا، قوت کارکردگی کا ختم ہو جانا۔ ان رعایتوں کے ساتھ معانی پر غور فرمائیے:

(۱) لبوں کی یاقوتی کا سہارا ہاتھ آجاتا تو نحیف و ناتواں عاشق لغزش کھا کر بار بار گرنے سے بچ جاتا۔

(۲) معجون یاقوتی نصیب ہو جاتی تو مریض و ناتواں عاشق کی حالت میں سدھار آجاتا یا وہ مرنے سے بچ جاتا۔

(۳) یاقوتی لب مل جاتی یعنی ہجر و فراق کے ساتھ ساتھ محبوب کی قربت اور وصال کے مواقع بھی میسر آتے رہتے تو عشق کا ولولہ و حوصلہ برقرار رہتا۔ عاشقانہ جذبات سرد نہ پڑ جاتے۔ یا یہ کہ ہجر کی کلفتیں عاشق کے لیے جان لیوا نہ ثابت ہوتیں۔

ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ رعایتیں معنی آفرینی کا ذریعہ کس طرح بنتی ہیں۔ اب یہیں آبرو کا بھی ایک شعر دیکھیے:

لباس پنبئی بن کیونکے گزرے موسم سرما ‏ ‏ ‏ ‏ قیامت ہے یہ تیری سرد مہری، تس پہ بے روئی

اس شعر میں محبوب کی بے رخی اور بے التفاتی کا مضمون نظم کیا گیا ہے۔ اس کے لیے سرد مہری اور بے روئی کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ مرکب شکل میں دونوں لفظ ہم معنی ہیں۔ سرد مہری ہو یا بے روئی دونوں کے معنی بے التفاتی اور بے رخی کے ہیں۔ اگر اس مرکب کو توڑ دیا جائے تو سرد اور روئی میں ضلع جگت موجود ہے۔ اس کے ساتھ لباس پنبئی اور موسم سرما کو بھی شامل کر لیا جائے تو ضلع کی چاروں تحصیلیں آموجود ہوتی ہیں۔ مزید برآں بے روئی، کو بغیر روئی کے معنی میں لیتے ہوئے، لباس پنبئی بن، کے ساتھ پڑھیے تو ایہام تناسب کا ایک پہلو سامنے آجاتا ہے۔

ان رعایتوں کو ذہن میں رکھ کر شعر پڑھا جائے تو اس میں ایک خاص طرح کا حظ محسوس ہوتا ہے۔ یہی تلاش لفظ تازہ، یا لفظ آفرینی ہے۔ معنی آفرینی اسے یوں نہیں کہہ سکتے کہ شعر میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ نہ تجربہ ہے نہ فکر۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ شاعر کا یہ مقصود ہی نہیں کہ وہ ہمیں اپنے تجربے میں شریک کرے یا فکر کی کوئی جہت ہم پر روشن کرے۔ وہ تو لفظ 'بے روئی' کی تلاش کی داد لینا اور اس کے مناسبات و تلازمات کی طرف ہماری توجہ منعطف کرانا چاہتا ہے۔

لفظ و معنی کی اس بحث سے یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ رعایتیں بہر حال کلام کا حسن اور جوہر ہیں۔ اب اگر یہ معنی آفرینی یا کیفیت آفرینی کے دوش بدوش ہوں تو کلام اعلیٰ درجے کا ہو گا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ رعایتیں ہوں معنی و کیفیت نہ ہو یا معنویت ہو رعایات نہ ہوں (حالانکہ ایسا کم ہوتا ہے) تو یہ کلام اوسط درجے کا کہلائے گا۔ آخری شکل

یہ ہے کہ دونوں طرح کی خصوصیات مفقود ہوں یعنی خیال کی تازگی، تجربے کی انفرادیت اور بیان کی جدت کچھ بھی نہ ہو تو کلام معمولی درجے کا ہوگا۔

ایک سوال یہ ہے کہ آبرو کو ان کا خاص رنگ سخن کہاں سے ہاتھ آیا؟ ہمارے خیال میں انہوں نے یہاں بھی ولی سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ ولی کے یہاں اس رنگ کے اشعار موجود ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ان پر جنسی پہلو غالب آگیا ہے۔ آبرو نے بربنائے مناسبت طبع اس شیوۂ شاعری کو آگے بڑھایا، پھیلایا اور چمکایا ۔ لیکن ان کا ماخذ ولی ہیں ولی کے بعض ایسے اشعار ملاحظہ ہوں:

پیو کو دیکھا نہیں ہوں اس نوبت ۔۔۔ دل مرا اس سبب سوں جھانجھ میں ہے
مذہب عشق میں تری صورت ۔۔۔ دیکھنا ہم کوں فرض عین ہوا
ہجر کے کیف میں گزک مجھ کوں ۔۔۔ اس جگر کے بنا کباب نہ تھا
کرتا ہوں جاں سپاری ، کتھئی ہیں ہاتھ جس کے ۔۔۔ کرنے کوں دل کوں چونا، آتا ہے پان کھا کر
از بسکہ شکستہ دل ہوں غم سوں ۔۔۔ لکھتا ہوں شکستہ خط سوں نامہ
تجھ طرف اکثر ہیں آہن دل رجوع ۔۔۔ دل ترا، کیا سنگِ مقناطیس ہے
پُچھا چنچل سیں، مستی میں "تری کلا ہے کی انگیا ہے"؟ ۔۔۔ پُچھا چھاتی چھبیلی ہاتھ سوں ہنس کر کہا "ململ"
درزن کو کہا "کیا ہے تیرے بر میں دکھا ٹک" ۔۔۔ بولی کہ "نکو چھیڑ ، سُنا ہے کہ سِنا ہے"
پُچھا مالن کوں "دو گیند اس سوں کیا مخفی کیے بر میں؟" ۔۔۔ کہا "تجھ کیا غرض اس سوں، چلا جا تو، ہر اک کچھ ہے"

ضمناً یہاں یہ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ محض رعایت لفظی کی مثالیں میر کے یہاں بھی جابجا موجود ہیں۔ مثلاً

یہاں پلیتھن نکل گیا، وہاں غیر ۔۔۔ اپنی ٹکی لگائے جاتا ہے
لڑکا عطار کا ہے کیا معجون ۔۔۔ ہم کو ترکیب اس کی بھائی ہے
ان آنکھوں سے ہم چشمی؟ بر جا ہے جو میں جل کر ۔۔۔ بادام کو کل یارو! مجلس ہی میں کھا جاتا
یہ ہمدمی کا دعویٰ؟ اس کے لب خنداں سے ۔۔۔ بس کچھ نہ چلا ورنہ پستے کو چبا جاتا
سبزے کا ہوا روکش، خطِ رخ جاناں کے ۔۔۔ جو ہاتھ مرے چڑھتا تو پان کو کھا جاتا

اور یہ میر ہی کی تخصیص نہیں، قائم اور میر حسن بھی، جنہوں نے اپنے اپنے تذکروں میں ایہام و رعایات کے خلاف آواز بلند کی ہے، اپنی شاعری میں رعایت لفظی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، بلکہ آگے بڑھ کر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہماری کلاسیکی شاعری کا مزاج ہی یہی ہے۔ لیکن لکھنؤ کی دور آخر کی غزل کی شاعری پر حالی کی تنقیدوں کے بعد سے ذہنوں میں یہ بات عام طور سے راسخ ہوگئی کہ رعایت لفظی کلام کا عیب ہے، حالانکہ وہ شاعری اگر کم عیار تھی تو اس میں قصور رعایات کا نہ تھا، معنویت کے فقدان کا تھا۔

اس ضمنی گفتگو کے بعد ہم پھر آبرو کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ عرض کیا گیا، آبرو کا اصل رنگ سخن تلاش لفظ تازہ ہے۔ تاہم ان کے یہاں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں، جن میں رعایت و کیفیت دونوں کا آمیزہ ہے۔ مثلاً:

شوق سیں جس گھر میں ہو تو جلوہ گر — آئینہ ہو جائے دیواروں میں دل
تنگ رہنا کب تلک غنچے کی طرح — پھول کی مانند ٹک کھل جا سجن!
دیکھو دل کے شوق کی سرگوشیاں — مست ہو، کلیاں چمن کی جھومیاں
کیا کہوں تیرے رنگ کی خوبی — برگ گل کی طرح زباں ہے لال
کس کی نگاہ مست کی گرمی سیں جی جلا — آتی ہے اب شراب کی بو، اس کباب میں

آبرو کے یہاں استعارات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تشبیہات سے بھی انہیں چنداں شغف نہیں، لیکن جابجا نظر آ جاتی ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ محسوسات کے دائرے سے باہر جانا پسند نہیں کرتے۔ پھر محسوسات میں بھی بصریات سے وہ زیادہ مانوس ہیں۔ چنانچہ جانبین تشبیہہ ان کے یہاں بالعموم محسوسات و مبصرات ہوتے ہیں۔ عقلی مدرکات و تصورات یا قلبی واردات و کیفیات ان کی شاعری میں غال خال ہیں۔ اسی لیے وہ ایک خاص سطح سے اوپر نہیں جاتے اور یہی ان کے یہاں استعارات کے فقدان کا سبب بھی ہے۔ ذیل میں ان کی تشبیہات کے بعض نمونے ملاحظہ ہوں:

یوں چلا آوتا ہے خوباں بیچ — فوج کے بیچ جوں نواب آتا
خال مشکیں ہے لعل لب پا پر — پامنے سرخ، بیچ افیوں ہے
یوں گرے ہیں بوالہوس، تجھ مکھ کوں دیکھ — شہد کو جوں دیکھ کر ٹوٹے مگس
لال رخسارے پہ تیرے، زلف لپٹی نہیں سیاہ — شام کے لشکر نیں آکر، ملک گھیرا روم کا
رخسار کے گل اوپر، شبنم ہے یہ پسینا — یہ لال پہ جڑا ہے، الماس کا نگینا
بونداں عرق کی، تیرے رخسار پر دسیں یوں — گویا کہ لا رکھے ہیں، دو بھر کے تھال موتی
شکست پے بہ پے، یوں خوش نما ہے دل کوں تنگی میں — کہ جوں سیمیں براں کی قادری اوپر اتو کیجئے
ہر قدم میں جان نو دیتا ہے تیرا آونا — موجِ آب زندگی پیارے تری رفتار ہے

آخر الذکر دونوں تشبیہیں یک گونہ انفرادیت کی حامل ہیں۔

آبرو کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں۔ جنہیں پڑھ کر میر، غالب یا بعض دوسرے شعرا کے اشعار یاد آنے لگتے ہیں۔ اس سے آبرو کی تاریخی حیثیت کا احساس مستحکم ہو جاتا ہے۔ مثلاً

(۱)

کیا تھا غیر کے ہنس بولنے سیں، ہم عتاب اس کوں
دیا سن کر سخن میرا، محبت سیں جواب اس کوں (آبرو)

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز، چاہیے غیر سے تہی"
سن کے ستم ظریف نے، مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں (غالب)

(۲)

قیامت کری بات اک ہنس کے بولا
مجھے بات کی بات میں مار ڈالا (آبرو)

بلا کے بات بھی کی اور مسکرا بھی دیا
کیا شہید بھی قاتل نے، خوں بہا بھی دیا (ولایت علی خاں ولایت و عزیز شاگرد غالب)

(۳)

بے وفا ہے، شوخ ہے، بے رحم ہے، بیزار ہے
جو کہو سب ہے و لیکن کیجئے کیا؟ یار ہے (آبرو)

ہاں وہ نہیں وفا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو جان و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟ (غالب)

(۴)

زلفِ سیاہ، ابروے کج، خط سبز رنگ
ہر ایک کافری میں نرالا فرنگ ہے (آبرو)

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا (غالب)

(۵)

چوپڑ کے کھیلنے کا سارا یہ ہے خلاصا
شاید کبھی وہ لڑکا بیٹھے ہمارے پاس آ (آبرو)

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے (غالب)

(۶)

جس وقت زخم تیرا لگتا ہے غیر کے تئیں
اس وقت رشک سیتی، جاتے ہیں جان! مرہم (آبرو)

جاتا ہے یار تیغ بہ کف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم! تری غیرت کو کیا ہوا؟ (میر)

(۷)

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتیں
جب روبرو ہو تیرے، گفتار بھول جاوے (آبرو)

دل میں کیا کیا مسودے تھے ولے
ایک بھی پیش روبرو نہ گیا (میر)

(۸)

دور خاموش بیٹھ رہتا ہوں
اس طرح حال دل کا کہتا ہوں (آبرو)

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا (میر)

(۹)

سامانِ عیش ہم کوں، اسباب غم ہوئے ہیں — خونِ جگر ہے صہبا، لخت جگر گزک ہے (آبرو)
چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ — کہ ہے غنچہ دل پر آرزو تھا (میر)
غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا (غالب)

(۱۰)

تمہارا دل اگر ہم سیں پھرا ہے — تو بہتر ہے، ہمارا بھی خدا ہے (آبرو)
منظور نظر غیر سہی، اب ہمیں کیا ہے — بے دید! تری دید سے دل پہلے پھرا ہے (مومن)
مومن! نہ کبھی بوسہ پا، سجدہ کریں گے — وہ بت ہے جو اوروں کا، تو اپنا بھی خدا ہے (مومن)

حواشی

۱۔ تذکرہ شعرائے ہندی، مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری، طبع اول ۱۹۰۹ء، ص ۳۲

۲۔ طبقات الشعراء، قدرت اللہ شوق، شامل تین تذکرے، مرتبہ نثار احمد فاروقی، مکتبہ برہان دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۱۴۰

۳۔ گلشن بے خار، یوپی اردو اکادمی (فوٹو ایڈیشن) ۱۹۹۲ء، ص ۶

۴۔ گلشن ہند، مرزا علی لطف، تصحیح و تحشیہ شبلی نعمانی، رفاہ عام پریس، لاہور ۱۹۰۶ء، ص ۱۴

۵۔ گلشن سخن، مردان علی خان مبتلا، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، طبع اول ۱۹۶۵ء، ص ۵۱

۶۔ حدائق البلاغت، نول کشور، کانپور، ۱۸۸۰ء، ص ۰

۷۔ ایضاً بحوالہ بالا

۸۔ ایضاً بحوالہ بالا

۹۔ ایضاً بحوالہ بالا

۱۰۔ بحر الفصاحت، نول کشور، لکھنؤ ۱۹۱۰ء، ص ۵۳۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۳۶

۱۲۔ ایضاً بحوالہ بالا

۱۳۔ آب حیات، (تذکرہ آبرو)، ص ۹۴

۱۴۔ درس بلاغت، ترقی اردو بیورو، طبع اول، ۱۹۹۱ء، ص ۹۴

۱۵۔ سفینۂ خوشگو، مرتبہ عطا کاکوی، ص ۱۹۵

۱۶۔ موصوف، دیوان شاکر ناجی، کے مقدمے میں لکھتے ہیں: "ناجی نے ایہام گوئی کی ابتدا کی۔ خود لکھتے ہیں:

ریختہ ناجی کا ہے محکم اساس — بات میری بانی ایہام ہے" (ص ۱۰)

لیکن یہ استدلال درست نہیں۔ علی جواد زیدی نے اس پر جو گرفت کی ہے، بجا ہے لکھتے ہیں: "ناجی کے اس شعر سے بعض زود اعتقاد ناقدین نے یہ فرض کر لیا ہے کہ وہی بانی ایہام تھے۔ حالانکہ ناجی صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کا ریختہ (شعر اردو) اس لیے محکم اساس ہے کہ اس میں ایہام ہے (دو ردورۂ ایہام گویاں، علی جواد زیدی، دو ماہی، اکادمی، لکھنؤ، جنوری ۱۹۸۲ء، ص ۶۳)

۱۷۔ نکات الشعرا، مرتبہ پروفیسر محمود الٰہی، ص ۳۴

۱۸۔ مخزن نکات ۔ یوپی اردو اکادمی (فوٹو ایڈیشن) ۱۹۸۵ء ، ص ۳۲

۱۹۔ تذکرہ شعرائے ہندی، مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری، اردو پبلشرز ، لکھنؤ، طبع اول ۱۹۰۹ء، ص ۳۶

۲۰۔ ایضاً بحوالہ بالا۔

فحش ادب کیا ہے؟

شہزاد منظر

فحش ادب کیا ہے؟ فحش نگاری کسے کہتے ہیں؟ فحش کس قسم کی تحریر کو کہا جاتا ہے اور کسے نہیں؟ کیا ادب میں جنس کا تذکرہ فحش نگاری ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا آج تک متفقہ جواب دینا ممکن نہیں ہوا۔ اس لیے کہ فحاشی یا فحش نگاری کی آج تک کوئی ایسی جامع اور مانع تعریف نہیں کی جاسکی۔ جس پر ہر ملک اور ہر دور کے لوگوں کا اتفاق ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ فحاشی ایک اضافی تصور ہے۔ جس کا مختلف ادوار اور مختلف معاشرے میں مختلف مفہوم ہوتا ہے۔ ایک دور میں جو بات فحش تصور کی جاتی ہے وہ دوسرے دور میں فحش تصور نہیں کی جاتی۔ دنیا کے کلاسیکی ادب میں بعض ایسی تصانیف ہیں جو آج کے دور کے نقطۂ نظر سے بہت فحش اور مخرب الاخلاق ہیں، مثلاً الف لیلہ، بوکا چیئو کی "ڈیکامیرن نائٹس" کاسانوا کی یادداشت، روسو کی اعترافات، مرزا شوق کی مثنوی "زہر عشق" اور دنیائے اسلام کی نہایت معتبر اور قابل احترام شخصیتوں، مثلاً سعدی شیرازی کی "گلستان" اور مولانا روم کی "مثنوی معنوی" وغیرہ۔ کلاسیکی ادب کی یہ چند تصانیف ہیں جن کا میں نے حوالہ دیا ہے، ورنہ قدیم دور کی ہر زبان کے ادب میں سیکڑوں نہیں ہزاروں ایسی کتابیں ہیں جو اگر آج اصل صورت میں شائع کردی جائیں تو انہیں فحش نگاری کے الزام میں فوراً ضبط کرلیا جائے گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ بعض قدیم تصانیف، جن کا شمار دنیا کی اہم ترین کتابوں میں ہوتا ہے، بعض نہایت ماڈرن اور ترقی یافتہ ملکوں میں فحش تصور کی جاتی رہی ہیں، مثلاً ڈی — ایچ — لارنس کے رسوائے زمانہ ناول "لیڈی چیٹر لیز لوَر" کی اشاعت اور فروخت پر عرصے تک برطانیہ اور امریکہ میں پابندی عائد رہی۔ صرف اتنا ہی نہیں، سنسکرت زبان کی شہرۂ آفاق تصنیف "کام سوتر" پر آج بھی آئرلینڈ اور دوسرے کئی مغربی ملکوں میں پابندی عائد ہے۔

"کام سوتر" آج سے ڈھائی ہزار سال قبل کی تصنیف ہے جسے چندر گپت موریہ کے عہد میں واتسیاین نامی شخص نے تحریر کیا تھا، جس کا دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے اور جسے محققین اور ماہرین نے متفقہ طور پر سنسکرت زبان کی بے مثل تصنیف تسلیم کرلیا ہے، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جن ملکوں میں ادب، فلم، ٹی وی، اسٹیج، رقص، مصوری اور ابلاغ عامہ کے دوسرے ذرائع سے مرد و عورت کے جنسی تعلقات کا کھلے عام اظہار ہوتا ہے، جہاں پورنوگرافی کی اشاعت و فروخت نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے اور جن ملکوں میں سنجیدہ ادب اور پورنوگرافی کے مابین فرق کرنا دشوار ہوتا جارہا ہے، وہاں واتسیاین کی تصنیف "کام سوتر" پر پابندی عائد کرنا کیا ستم ظریفی نہیں ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ سوشل سائنس داں اور ماہرینِ فن آج تک فحش نگاری کی تعریف پر متفق نہیں ہو پائے ہیں اور ہر ملک اور ہر دَور فحش نگاری کی اپنی ایک الگ اور مختلف تعریف پیش کرتا ہے ۔

کچھ دن ہوئے "لندن ٹائمز" میں ایک مختصر سی خبر شائع ہوئی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ نیپلز کے عجائب گھر کی انتظامیہ نے صدیوں پرانے ایسے تمام مجسموں ، فریسکو ، موزائیک ، کانسی کے پلیٹ ، گلدان، جگ اور دوسرے فنی نمونوں کی نمائش کرنے کا فیصلہ کیا ہے جن میں انسان کی جنسی زندگی کی بڑی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے ۔ یہ مجسمے اور تصویریں زمانۂ قدیم کی شہرۂ آفاق تصنیف OVID سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھیں۔ ان فن پاروں کو آج تک فحاشی کے الزام میں عوام کی نظروں سے پوشیدہ رکھا گیا تھا ۔ انیسویں صدی میں نیپلز کے بوربوں (BOURBON) حکمرانوں نے جب پہلی بار اِن فن پاروں کو دیکھا تو انہیں بڑا صدمہ پہنچا تھا ، کیوں کہ ان کے خیال میں یہ مجسمے اور ظروف انتہائی فحش اور مخرب الاخلاق تھے ، چنانچہ ان کے حکم سے یہ تمام فن پارے عام لوگوں کی نظروں سے ہٹا دیے گئے تھے ، لیکن آج کے عہد کے فنونِ لطیفہ کے ماہروں اور ناقدین کا خیال ہے کہ یہ تمام نادر فن پارے نہ صرف زمانۂ قدیم کے انمول رتن ہیں ، بلکہ فنی اعتبار سے شاہ کار کا درجہ رکھتے ہیں ، اس لیے ان فن پاروں کی ضرور نمائش ہونی چاہیے ۔ ماضی میں یہ سارے شاہ کار نپولین کے شاہی خاندان کی ملکیت تھے ، جو بعد میں ان کے ورثا کو نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے فرانسیس اول تک پہنچے ۔ فرانسیس اول مزاجاً خشک اور پیوریٹن واقع ہوا تھا ، چنانچہ وہ ایک دفعہ جب نیپلز کا مذکورہ عجائب خانہ دیکھنے کے لیے آیا تو وہ یہ تمام فن پارے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا اور اس نے ان فن پاروں کی عام نمائش ممنوع قرار دے دی ۔ اس نے ان تمام فن پاروں کو ایک خاص کمرے میں رکھنے کا حکم دیا جہاں صرف "بااخلاق" اور "پختہ عمر" کے لوگوں کو ہی جانے کی اجازت تھی ۔ ان شاہکاروں کو دیکھنے کی اجازت صرف بادشاہ وقت ہی دے سکتا تھا ۔ ۱۸۵۲ء میں بادشاہ کے حکم سے شاہی عجائب خانے کے اس کمرے سے دروازہ نکال کر اس کی جگہ دیوار چُن دی گئی اور دیوار کے نشانات کو اس طرح مٹا دیا گیا کہ کسی کو گمان بھی نہ ہو کہ یہاں کبھی دروازہ بھی تھا ۔ طویل مدت کے بعد اس کمرے کو دوبارہ کھولا گیا اور اس میں باقاعدہ دروازہ لگایا گیا ، لیکن یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ اس میں صرف اسکالروں کو داخلے کی اجازت ہوگی ۔ یہ پابندی ۱۹۴۰ء تک جاری رہی ۔ اگر ان پابندیوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صدیاں گزر جانے کے بعد ان فنی نوادرات کی عام نمائش کی وجہ یہ ہے کہ زمانے کا مزاج اور عہد کا مذاق بدل چکا ہے۔ اب جنس کا تذکرہ نہ معیوب ہے اور نہ فحش ، بلکہ یہ زندگی کی تصدیق شدہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے ، چنانچہ آج کے دور میں ان فن پاروں پر پابندی کا کوئی معقول اور منطقی جواز نہیں رہا ، لیکن آج کے عہد میں بھی آئرلینڈ میں کام سوتر پر پابندی عائد ہے ۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ ایک بار آنجہانی گاندھی جی نے پیوریٹن خیالات سے متاثر ہو کر کھجوراہو کے قدیم مندروں کی مورتیوں پر پلاسٹر چڑھا دینے کا مشورہ دیا تھا جس میں مباشرت کے مختلف طریقے (آسن) دکھائے گئے تھے ، حالاں کہ ماہرینِ فن اور آرٹ کے ناقدین کے نزدیک "کھجوراہو" "کونارک" کے یہ مندر اور الورا اور اجنتا کے فریسکو قدیم

ہندوستان کی سنگ تراشی اور مصوری کے اعلیٰ ، انمول اور لازوال نمونے ہیں ، جن پر جتنا بھی فخر کیا جائے ، کم ہے ۔ فحاشی کے بارے میں اتنے متضاد و مختلف تصورات کی اصل وجہ یہ ہے کہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ فحاشی یا فحش نگاری ، ایک اضافی تصور ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے ۔ جو لوگ فحاشی یا فحاش نگاری کے تصور کو جامد تصور کرتے ہیں صرف وہی فحاشی کے جامد اور غیر متغیر تصور پر اصرار بھی کرتے ہیں ۔

فحش نگاری کے سوال سے بحث کرنے سے قبل اس کے سماجی اور اخلاقی پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے ۔ دراصل کوئی قدر دائمی اور مستقل نہیں ہوتی ۔ وقت اور معاشرے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سماجی اور اخلاقی قدریں بدلتی رہتی ہیں اور یہ قدریں اقتصادی نظام ، خصوصاً طریقۂ پیداوار میں تبدیلی کے ساتھ بدل جاتی ہیں ۔ اسی لیے ہر دور کا سماجی اور اخلاقی تصور ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر جاگیردارانہ معاشرے کا تصورِ اخلاق ، سرمایہ دارانہ نظام کے تصور اخلاق سے مختلف ہوتا ہے ۔ اسی طرح مختلف مذاہب کے تصور ہائے اخلاق بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں ۔ مثال کے طور پر ہندومت اور اسلام کا تصور اخلاق ، مسیحی تصور اخلاق سے قطعی مختلف ہے ۔ اس کا اندازہ ان مذاہب کے تصور جنس سے لگایا جاسکتا ہے ۔ ہندومت اور اسلام میں جنس انسانی زندگی کا نہایت اہم اور ناقابلِ فراموش حصہ ہے ۔ ان دونوں مذاہب میں اس کی اہمیت اور حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے ، جبکہ مسیحیت میں جنس ایک ناپاک اور قبیح جذبہ تصور کیا جاتا ہے ۔ جنس کے بارے میں عیسائیت ، خاص طور پر بعد کے پیوریٹن دور کی مسیحیت کا رویہ قطعی غیر سائنسی اور غیر فطری ہے ۔ ان تمام تصورات کا اثر تصور اخلاق ، خصوصاً فحاشی کے تصور پر پڑا ہے ۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جنس کے بارے میں مسیحیت کے اس تصور کے اثرات صرف مسیحی ممالک تک محدود نہیں ۔ اس کے اثرات ہندوستان اور اسلامی ممالک کے تصور اخلاق پر بھی مرتب ہوئے ہیں ، ورنہ کیا وجہ ہے کہ کھجوراہو اور کونارک کے مندروں کی تعمیر کے وقت تو لوگوں کو ان مورتیوں میں فحاشی نظر نہیں آئی اور آج کے دور میں گاندھی جی کو فحاشی نظر آگئی ؟

فحاشی کے تصوّر کی ابتدا

فحاشی کے تصوّر کی ابتدا بھی بڑی دلچسپ ہے ۔ یہ تو ہر باشعور شخص تسلیم کرے گا کہ انسان فحاشی کا تصوّر یا احساس قدرتی اور جبلی طور پر لے کر پیدا نہیں ہوا ۔ ہم اگر انسان کے سماجی ارتقا کا عمرانی نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ انسان ابتداً میں برہنہ زندگی بسر کرتا تھا ۔ اس وقت اُس کے شعور میں فحاشی کا کوئی تصوّر موجود نہیں تھا ، لیکن جوں جوں انسان ارتقائی منازل طے کرتا ہوا تہذیب کے دائرے میں داخل ہوا ، ماحول اور قدرتی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ گفتگو ، تصویر کشی ، سنگ تراشی حتیٰ کہ انسانی حرکات و سکنات اور اشارے کنائے سے فحاشی ظاہر ہونے لگی ۔ ہم اگر سماجی ارتقا کے تسلسل کو سمجھنے کے لیے انسانی معاشرے کے بالکل ابتدائی

دور کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ دورِ وحشت میں جب عورت نے زنا بالجبر کے خوف سے اپنے جنسی اعضا کی ستر پوشی (یا جب سے مرد نے عورت کو اور عورت نے مرد کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے بناؤ سنگھار اور سجاوٹ) کا طریقہ اختیار کیا، اس وقت سے انسان میں جنسی شعور پیدا ہوا ۔ اس سے قبل انسان کا جنسی شعور حیوانی سطح پر تھا اور جنسی فعل محض جبلی تقاضے کا حصہ ۔ اس طرح دیکھا جائے تو انسانی ارتقا کے ایک خاص مرحلے میں انسان کے جنسی شعور اور احساس نے آگے چل کر فحاشی کے تصوّر کو جنم دیا ۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انسان کے سوا کسی بھی مخلوق میں اس قسم کا کوئی احساس موجود نہیں ہے ۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حیاتیاتی ضرورت کے ساتھ اس احساس کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ سوشل سائنس دانوں کا خیال ہے کہ فحاشی کا احساس دراصل سماجی ارتقا، خصوصاً تہذیب کی پیداوار ہے ۔ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ فحاشی کے احساس کی بنیاد CONVENTION (یعنی رواج، ریت، رسم) پر ہے اور یہ تصوّر ماحول کے مطابق تشکیل پاتا ہے، تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان کے سماجی تصورات اور اخلاقی اقدار کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ فحاشی کا تصوّر بھی بدل جاتا ہے، اس لیے ضروری نہیں کہ ایک دور کی فحش بات کو دوسرے دور میں فحاشی تصوّر کیا جائے، مثلاً ایک دور میں عورتوں کا ٹخنہ سے اوپر کپڑا پہننا فحش تصور کیا جاتا تھا ۔ لیکن آج کے دور میں یہ فحش نہیں سمجھا جاتا، چنانچہ یورپ میں عورتوں کا صرف بیکنی پہننا کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ بعض ساحلی مقامات میں تو بالشت بھر کی دھجیوں کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ۔ قدیم ہند کے ویدک عہد میں اور اس کے بعد بھی بہت عرصے تک عورتیں برے سی آر کے طرز کی انگیا پہنتی تھیں، جس پر قدیم ہندوستان میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا، اس لیے کہ اسے فحش تصور نہیں کیا جاتا تھا ۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں خود ہمارے معاشرے میں نوجوان لڑکیوں کا دوپٹا پہننا اور سر اور سینے کو دوپٹے سے چھپائے رکھنا شرافت کی اولین شرط سمجھی جاتی تھی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے معاشرے سے دوپٹے کا رواج نہایت تیزی سے اٹھتا جارہا ہے اور اس پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ۔

قدیم ہند کا نظریۂ فن اور فحاشی

کون سی ادبی تخلیق فحش ہے اور کونسی نہیں، اس پر غور کرتے وقت جمالیاتی قدروں کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے، خصوصاً برصغیر کی قدیم ادبیات پر غور کرتے وقت جو لوگ قدیم ہندوستان کے فلسفۂ جمالیات اور فنی نظریات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ سنسکرت ادب میں رَسوں کو کتنی زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ سنسکرت کے نقاد انسانی جذبوں کو سامنے رکھ کر ادب کی قدر و قیمت متعیّن کرتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ انسان نو (۹) بنیادی رَسوں (جذبوں) کا مرکب ہے ۔ یہی جذبے اس کی روزمرہ کی زندگی کو کسی نہ کسی شکل میں متاثر کرتے ہیں ۔ ان رَسوں میں سب سے اہم اور بنیادی رَس شیرنگار رَس ہے (جسے آدی رَس یعنی بنیادی جذبہ بھی) کہا گیا ہے ۔ اس کا تعلق دراصل

مرد و عورت کے جنسی جذبے سے ہوتا ہے ۔ اس کا بنیادی عنصر احساسِ جمال ہے۔ شعر و ادب میں شیر نگار رَس کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے ۔ چنانچہ سنسکرت کے نقادوں کا خیال تھا کہ جو تلذذ شیر نگار رَس پیدا کرتا ہے وہ کوئی دوسرا رس پیدا نہیں کرتا ۔ اِس رس کے بغیر شعر و ادب کمتر درجے کا ہوتا ہے ۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو قدیم ہندوستان کے فلسفۂ جمالیات میں رس کے نظریے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ، جبکہ مغربی فلسفۂ جمالیات میں رس کا کوئی تصور ہی موجود نہیں ہے ۔ (۱)

قدیم ہند کے ماہرین جمالیات اور ناقدین ادب کا خیال ہے کہ جس ادبی تخلیق میں آری رس Eroticism (یعنی مرد و عورت کے جنسی تعلقات کا ذکر) نہ ہو ، وہ ادب ہی نہیں ہے ۔ اسی لیے سنسکرت ادب کی شاہکار تصانیف ، مثلاً شکنتلا وغیرہ میں جنسی جذبات کا برملا اظہار ملتا ہے اور اسے کوئی عیب تصور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ان ناقدین کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ ادب میں اگر دوسرے رس نہ ہوں تو کوئی ہرج نہیں ہے ۔ البتہ پہلا رس یعنی رتی رس کا ہونا لازمی ہے ۔ ان کا تو یہاں تک دعویٰ تھا کہ ایسا ادب کبھی غیر شائستہ ہو ہی نہیں سکتا ۔ کسی ادبی تصنیف کو فحش یا مخرب الاخلاق قرار دیتے وقت عموماً سب سے بڑی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ جج صاحبان عریانی (Obscene) اور فحش تحریروں (پورنوگرافی) کے درمیان امتیاز نہیں کرتے ۔ خصوصاً رس آتمک (Erotic) تحریروں اور فحش (پورنوگرافک) تحریروں کو وہ باہم خلط ملط کر دیتے ہیں ، جس کے باعث وہ غلط نتیجے پر پہنچتے ہیں ، حالانکہ جنسی جذبات کا اظہار کرنے والے Erotic ادب اور پورنوگرافک تحریروں میں بنیادی فرق ہے اور یہ دونوں مختلف اصطلاحات ہیں ، جن کے مفاہیم میں کافی فرق ہے ۔ لفظ پورنوگرافی کا منبع یونانی لفظ PORNOGAPHOS ہے جس کا مطلب کسبیوں کی لکھی ہوئی تحریر ہے ۔ اردو میں اسے قحبہ گری کہا جاسکتا ہے ۔ اس کا عام مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ تحریریں ہیں جو طوائفوں اور کسبیوں نے مردوں کو شہوانی ترغیب دینے کے لیے لکھیں ۔ بعد میں اس کے معانی میں مزید توسیع ہوتی گئی اور اس کا مفہوم بدل کر مخرب الاخلاق ادب بن گیا ۔ آج کے دور میں پورنوگرافی کی یہ تعریف کی گئی ہے :

"Pornography is nothing but a delibrate attempt to be as much vulgar as possible in expression without proper reason, logic, delineation or consideration of situation, place or characters and with only one motive of exploiting basic instincts in human nature and turn them to one's own gains in terms of money. (Difference between eroticism and pornography : (Sunil Kumar Dhar)

وہ کون سا مقام ہے جہاں پہنچ کر عریانیت اور جنس نگاری ، فحش نگاری کی سرحدوں کو چھو لیتی ہے یا بہ الفاظ دیگر Eroticism پورنوگرافی میں بدل جاتی ہے ، اس کی آج تک کسی بھی ملک یا عہد کے ماہرین قانون ، سوشل سائنس دانوں

۱ــــ قدیم ہند کے فلسفۂ جمالیات میں نو بنیادی جذبوں (رَسوں) کو تسلیم کیا گیا ہے ، جو یہ ہیں :

(۱) رتی (محبت) ، (۲) شوک (رنج) ، (۳) کرودھ (غصہ) ، (۴) اُتساہ (بل) (۵) وسمئے (حیرت) ، (۶) ہاسیہ (مسرت) ، (۷) بھیہ (ہیبت) ، (۸) جوگپا (کراہت) اور (۹) شانت رَس (سکون) سنسکرت کے مشہور تنقیدی شہ پارے "ناٹیہ شاستر" میں صرف آٹھ رَسوں کا ذکر ہے ۔ ان میں بنیادی رَس یا جذبہ رتی رَس (یعنی مرد و عورت کی محبت) ہے جسے شیر نگار رَس بھی کہا گیا ہے ۔

اور ناقدوں نے نشان دہی نہیں کی اور نہ اس کی نشان دہی شاید ممکن ہے ، چنانچہ جب بھی کسی کتاب کو فحش نگاری کے جرم میں ضبط کیا جاتا ہے قانون دانوں اور قانون نافذ کرنے والوں کو الجھنوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، چنانچہ پاکستان اور ہندوستان جیسے پس ماندہ ممالک کی انتظامیہ (خصوصاً پولیس) کسی زیرِ عتاب ادبی تخلیق کو اس کی فنی خوبیوں کو پرکھے بغیر صرف اس لیے قابلِ تعزیر تصور کر لیتی ہے کہ اس میں آری رس یعنی Erotic معاملات کا تذکرہ قدرے کھلے طور پر کیا گیا ہے ۔

فحش نگاری کی بحث

برصغیر کے ادب میں فحش نگاری کی بحث انیسویں صدی کے اوائل سے شروع ہوتی ہے ۔ اس سے قبل ہندوستان میں فحش نگاری کا کوئی تصور موجود نہیں تھا اور نہ فحش نگاری قابلِ تعزیر تھی ۔ اردو ہو ، بنگلہ ہو ، ہندی ہو یا کوئی دوسری علاقائی زبان ۔ ہر زبان کا ادیب و شاعر بڑی بے باکی اور آزادی کے ساتھ اپنے شعر و ادب میں جنسی جذبات و احساسات کا اظہار کرتا تھا اور اس پر نہ حکومتِ وقت کو اعتراض ہوتا تھا اور نہ معاشرے کو ۔ اگر اعتراض ہوتا یا معاشرہ تنگ نظر اور متعصب ہوتا تو اردو میں نہ ریختی کی صنف ہوتی اور نہ دبستانِ لکھنؤ کے شعرا کا وجود ۔ فنِ طباعت (پرنٹنگ ٹیکنالوجی) کی ایجاد سے قبل کتابوں کی اشاعت بہت محدود ہوتی تھی ، لہٰذا ان کا حلقۂ اثر بھی بہت محدود تھا ۔ (۱) کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں اور اس زمانے میں کتابوں کی نقل بہت ہی مشکل کام ہوتا تھا ۔ لہٰذا سوائے مذہبی کتابوں کے عام کتابوں کی اشاعت بہت محدود تھی ، چنانچہ قارئین کی تعداد بھی بہت محدود تھی البتہ لوگ کتابیں خود پڑھنے کے بجائے دوسروں سے پڑھوا کے سنتے تھے ۔ فنِ طباعت سے قبل دنیا کے ہر ملک میں ایسی کتابوں کی بہتات تھی ، جن میں جنسی معاملات کا کھلا ذکر ہوتا تھا ۔ یہ قدیم کتابیں اگر آج پڑھی اور شائع کی جا رہی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض مذہبی اور ادبی اعتبار سے کلاسیک کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

فنِ طباعت کی ایجاد سے جہاں بہت سے فائدے ہوئے ، وہاں بہت سے نقصانات بھی ہوئے ، یعنی اچھی اور مفید کتابوں کے ساتھ ساتھ بہت سی ایسی کتابیں بھی شائع ہونے لگیں ، جن کی اشاعت سے معاشرے ، خصوصاً نوجوان طبقے پر بُرے اثرات مرتب ہونے لگے ۔ اس سے قبل یعنی قرونِ وسطیٰ تک دنیا کے مختلف ملکوں میں صرف مذہبی

---

۱ — فنِ طباعت کا باقاعدہ آغاز یوں تو ۱۵۰۰ء میں ہوا ، لیکن صحافت کا باقاعدہ آغاز ۱۷۰۰ء میں ہوا ۔ ولیم کیکس ٹن (WILLIAM COXTON) نے ۱۴۷۶ء میں طباعت کو متعارف کرایا اور ۱۴۷۸ء میں ویسٹ منسٹر میں پریس قائم کیا ۔ سولھویں صدی میں طباعت کو بڑا فروغ ہوا ۔ نشاۃ الثانیہ اور اصلاحات کے نتیجے میں تعلیم عام ہونے کے باعث طباعت اور اشاعت کے کاروبار کو بڑی ترقی ہوئی ۔ برصغیر ہندوستان میں پہلا اخبار جیمس آگسٹس ہیکی نے ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء میں شائع کیا ۔ اس سے قبل عیسائی مشنریوں نے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بائبل کی اشاعت کے لیے ۱۷۷۸ء میں سری رام پور (بنگال) میں چھاپہ خانہ قائم کر دیا تھا ۔ ۲۶ — ۱۸۲۵ء تک کلکتے میں دو درجن سے زیادہ مطابع قائم ہو چکے تھے ۔ اور مختلف زبانوں کی کتابیں شائع ہونی شروع ہو چکی تھیں۔

اور سیاسی کتابوں پر حکومت کا احتساب تھا ۔ اس لیے کہ کلیسا اور بادشاہ وقت کو معترضین کے اعتراضات کا خدشہ تھا ۔ اس دور میں کسی کو یہ فکر نہیں تھی کہ شعر و ادب میں کس قسم کے احساسات و جذبات کا اظہار کیا جارہا ہے ۔ اس لیے کہ اس دور میں اخلاقی قدریں کچھ اور تھیں اور کوئی عوام الناس کی بھلائی یا برائی کے بارے میں نہیں سوچتا تھا ۔ اس دور میں سیاسی یا مذہبی گروہوں پر ضرب لگانے کے لیے دوچار ہی کتابوں کی اشاعت کو کافی تصور کیا جاتا تھا ۔ ان کتابوں کے پیچھے عموماً کوئی نہ کوئی مقصد، نصب العین یا نظریہ ہوتا تھا ۔ اس دور میں اگرچہ جنسی کتابیں کسی نیک اور صالح جذبے سے نہیں لکھی جاتی تھیں ، تاہم فحش نگاری کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا ۔ فن طباعت کے فروغ سے قبل مصلحین اور مبلغین نے بھی اس جانب کوئی توجہ نہیں دی تھی ۔

فحش نگاری کا پہلا قانون

برصغیر ہندوستان میں فحش نگاری کی روک تھام سے قبل یورپ کے تھیٹروں میں فحش حرکات کی روک تھام کی کوشش کی گئی تھی اور اسکے لیے قانون وضع کیا گیا تھا ، جس کے تحت "کین کین" اور دوسرے کئی ایسے رقصوں پر پابندی عائد کر دی گئی تھی جن سے شہوانی جذبات کے مشتعل ہونے کا اندیشہ تھا ۔ برطانیہ میں فحش کتابوں کی اشاعت کے خلاف قانون ۱۸۵۷ء میں منظور کیا گیا ۔ اس سے قبل یورپ یا امریکہ میں فحاشی یا فحش نگاری کے سلسلے میں کوئی قانون نافذ نہیں تھا ۔ فحش تحریروں کے خلاف صرف کلیسا تادیبی کارروائی کرتا تھا ، لیکن معاشرے میں کلیسا کا اثر کم ہو جانے کے باعث فحش تحریروں کے خلاف اس کی کارروائی بے اثر ہو کر رہ گئی تھی ۔ ادبیاتِ عالم کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ فحش نگاری کے خلاف دنیا میں سب سے پہلے برصغیر ہندوستان میں قانون منظور کیا گیا ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے ۱۸۵۶ء میں "آوب سین بکس اینڈ پکچرز ایکٹ" منظور کیا ، جبکہ برطانیہ میں انسدادِ فحش نگاری ایکٹ ایک سال تاخیر سے منظور کیا گیا ۔ انیسویں صدی کے وسط میں فحش نگاری قطعی مختلف نوعیت رکھتی تھی یعنی اس کا مقصد تخلیقِ فن کے بجائے صرف حصولِ زر تھا ۔

اس قانون کے نفاذ سے قبل اردو ، بنگلہ ، ہندی اور دوسری زبانوں میں ایسے قصے کہانیاں عام تھیں ، جن میں مرد و عورت کے تعلقات کا برملا ذکر ہوتا تھا اور ہندوستان کی تمام زبانوں میں فارسی ادب سے ایسی داستانوں کے تراجم شائع ہو رہے تھے ، جن میں جنسی معاملات کا کھلا اظہار کیا جاتا تھا ۔ اس ضمن میں فورٹ ولیم کالج سے شائع ہونے والی مشہور داستان "توتا کہانی" کی مثال دی جا سکتی ہے ، جس میں بہت سی ایسی کہانیاں شامل ہیں ، جنھیں آج کے دور میں آسانی سے مخرب الاخلاق کہا جاسکتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب ڈاکٹر وحید قریشی نے اسے مرتب کر کے شائع کیا تو اس میں سے بہت سی عبارتیں یا تو بدل دیں یا حذف کر دیں ۔ اس ضمن میں بنگلہ زبان کے قدیم مصنف بھارت چند کی تحریروں سے بھی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں ۔ اُس دور میں بعض بھکاری گاؤں گاؤں گشت لگا کر بھارت چند کی

ایسی نظمیں گایا کرتے تھے ، جن میں رادھا کرشن کے ناجائز تعلقات کا نہایت فحش انداز میں ذکر ہوتا تھا ۔ ایسے مغنی بھکاریوں کو "پانچالِک" یا "کوِیال" کہا جاتا تھا ۔ ہندوستان میں پریس کی آمد کے بعد بعض (تاجرانہ ذہن کے مالک ناشروں نے سوچا کہ اگر بھارت چند کی نظموں کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو کافی آمدنی ہو سکتی ہے ، چنانچہ ان کا یہ خیال درست ثابت ہوا ۔ اس وقت تک کلکتہ کے ہر محلے میں پریس نصب ہو چکا تھا اور وہاں کی سڑکوں اور شاہراہوں پر پھیری والے گشت کرتے ہوئے مخرب الاخلاق نظمیں اور کہانیاں فروخت کرنے لگے تھے ۔ اس دور کے جو واقعات قلم بند کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مخرب الاخلاق کتابوں کے کم سے کم آٹھ دس ہزار نسخے شائع کیے جاتے تھے اور ہر نسخے کی قیمت عام طور پر چار آنے ہوتی تھی ۔ اس دور میں چار آنہ بہت بڑی رقم تصور کیا جاتا تھا ۔ اس کے باوجود دس ہزار کتابیں چند دنوں میں فروخت ہو جاتی تھیں ۔ اس دور میں ناشر خود طابع بھی ہوتا تھا اس لیے ان کتابوں کی فروخت سے اسے اچھا خاصا منافع ہوتا تھا ۔ یہ کتابیں یا تو براہ راست پریس سے فروخت ہوتی تھیں یا پھر انھیں پھیری والا فروخت کرتا تھا ۔ اس وقت تک کتابوں کی دکان کھولنے کا رواج عام نہیں ہوا تھا ۔ مخرب الاخلاق کتابوں کی فروخت سے راتوں رات امیر بننے کا گُر جب عام ہو گیا اور ہر شخص یہ منافع بخش کاروبار کرنے لگا تو ان کتابوں کی تعداد میں بھی بے انتہا اضافہ ہو گیا ۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس دور میں اس قسم کی کتابیں زیادہ تر بنگلہ زبان میں شائع ہوتی تھیں ۔ اس لیے کہ بنگال میں تعلیم کی شرح دوسرے علاقوں سے زیادہ تھی ۔ عیسائی مشنریوں کے ذریعے پریس بھی سب سے پہلے وہیں پہنچا تھا اور پریس کا وہاں چلن بھی زیادہ تھا ۔ اس دور میں پانچ انواع کی کتابیں بہت زیادہ فروخت ہوتی تھیں جو یہ ہیں :

(۱) کام شاستر قسم کی سنسکرت کتابوں کے تراجم
(۲) ودیا سندر کی کہانیاں
(۳) رادھا اور کرشن کی رومانی داستانیں ، جن میں ان کے جنسی تعلقات کی تفاصیل ہوتی تھیں ۔
(۴) فارسی ادب سے جنسی کہانیوں اور نظموں کے ترجمے
(۵) طبع زاد مخرب الاخلاق کتابیں

۱۸۵۵ء کے وسط سے کلکتہ کے اخبارات و جرائد نے اس قسم کے قابلِ اعتراض مواد کی اشاعت پر احتجاج کرنا شروع کیا ۔ اُس دور میں اس نوع کی مطبوعات اور تصاویر کی فروخت پر چوں کہ کوئی پابندی نہیں تھی اس لیے ناشرین اور پھیری والے ان اعتراضات کو خاطر میں لائے بغیر اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے ۔ پھیری والے ہندوستان میں شائع ہونے والی فحش کتابوں کے علاوہ برطانیہ اور فرانس میں شائع ہونے والی مخرب الاخلاق تصاویر بھی بڑی آزادی سے فروخت کرتے تھے ، جن کی وجہ سے اخبارات نے اپنے ادارتی کالموں میں حکومت سے اس قسم کے مواد کی فوراً روک تھام کا مطالبہ شروع کر دیا تھا ۔ انہوں نے لکھا کہ اگر حکومت کی جانب سے اس قسم کا مواد بیچنے والوں کو کڑی

سزائیں دی جائیں تو اس کاروبار میں کافی کمی ہو سکتی ہے ۔ لیکن اس کے لیے ایک واضح اور غیر مبہم قانون بنانے کی ضرورت ہے ۔ اس مطالبے میں شدت پیدا ہو جانے کے باعث کونسل کے ممبران پہلی بار صورت حال سے واقف ہوئے ۔ اس کے باوجود انہوں نے مسئلے کی سنگینی کو تسلیم نہیں کیا ۔ ان کی منطق یہ تھی کہ اگر مسئلہ اتنا ہی سنگین ہے تو حکومت کی توجہ پہلے کیوں اس جانب مبذول نہیں ہوئی ۔ "کلکتہ اسکول بکس سوسائٹی" کی جانب سے پہلی بار اس کی تیسری سالانہ رپورٹ بابت ۲۰ ـــ ۱۹۱۹ء میں گزشتہ پندرہ برسوں کے دوران شائع ہونے والی مخرب الاخلاق کتابوں کی تفصیل شائع ہوئی ، جس کے نتیجے میں کلکتے کے اٹھارہ برہمنوں اور گیارہ کائستھوں کی جانب سے ایک مشترکہ بیان میں مخرب الاخلاق کتابوں کی اشاعت پر شدید احتجاج کیا گیا اور تقریباً ۳۵ سال کی طویل جدوجہد کے بعد برطانوی حکومت کی توجہ اس اہم معاشرتی مسئلے کی جانب مبذول ہوئی ۔ اس کے باوجود حکومت کے ارباب حل و عقد میں سے اکثر ارکان اس بارے میں قانون بنانے میں تذبذب کا اظہار کرتے رہے ، کیوں کہ برطانیہ میں خود اس نوع کا کوئی قانون موجود نہیں تھا ، جس کی وہ تقلید کرتے ۔ علاوہ ازیں دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی اس وقت تک مخرب الاخلاق لٹریچر اور تصاویر کی اشاعت اور فروخت پر پابندی کے حق میں آواز بلند نہیں ہوئی تھی ، چنانچہ اس دور کے قانون سازوں میں اس کی ضرورت کے بارے میں کافی شک و شبہہ موجود تھا ۔ صائب الرائے حلقوں کی جانب سے اس بارے میں مسلسل دباؤ کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے مجبوراً ۲۶ جنوری ۱۸۵۶ء کو "اوبسین بکس اینڈ پکچرز ایکٹ" منظور کیا ۔ دنیا کی تاریخ قانون سازی میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا قانون تھا ۔ اس قانون کے پیش لفظ میں کہا گیا تھا کہ "مخرب الاخلاق کتابیں اور تصویریں چوں کہ اخلاقی زوال کا سبب بنتی ہیں ، اس لیے ان کی تجارت بند کرنے کے لیے مندرجہ ذیل کارروائی کی جارہی ہے :

"Whoever within the territories in the possession under the Government of the East India Company any shop, bazar, street, thoroughfare, highroad or other place of public resort, distributes, sells or offers or exposes for sale or wilfully exposes to public view, any obscene book, paper, print, drafting, painting or representation or utters any obscene song, ballade or works to the annoyance of others, shall, upon conviction .... be liable to a fil not exceeding hundred rupees or to imprisonment with or without hard labour for a period not exceeding three months or both."

فحش نگاری کا پہلا مقدمہ :

تاریخی اعتبار سے قانونِ انسدادِ فحش نگاری کے اس پہلے قانون کی بڑی اہمیت ہے ، لیکن اب اس کی کوئی علیحدہ حیثیت نہیں رہی ، کیونکہ مذکورہ قانون کی تمام دفعات ترمیم و اضافے کے بعد "انڈین پینل کوڈ" میں شامل کر دی گئی ہیں ۔ مذکورہ قانون کی منظوری کے بعد بھی مخرب الاخلاق کتابوں اور تصاویر کی اشاعت و فروخت کا کاروبار بند نہیں ہوا ، چنانچہ بنگال کے ریورینڈ لانگ کے بیان کے مطابق مذکورہ قانون کے نفاذ کے بعد ۱۸۵۷ء میں بنگلہ زبان میں اس قسم کی ۱۴۲۵۰ کتابیں شائع ہوئیں ۔ ریورینڈ لانگ نے اپنی رپورٹ میں اس نوع کی ایک ایسی کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جو ایک

سال کے عرصے میں تیس ہزار کی تعداد میں فروخت ہوئی ۔ ۱۸۵۵ء میں پہلی بار تین ناشروں کو فحش کتابیں شائع کرنے کے جرم میں آزمائشی طور پر گرفتار کر کے سپریم کورٹ کے سامنے حاضر کیا گیا ، چنانچہ سپریم کورٹ نے ملزموں کو مقدمہ کے اخراجات اور جرمانے کے طور پر ۱۳۰۰ روپے ادا کرنے کا حکم دیا ۔ اس دور میں اتنی خطیر رقم ادا کرنا معمولی بات نہیں تھی چنانچہ جرمانے کی اتنی بھاری رقم ادا کرنے پر مخرب الاخلاق کتابوں کے ناشروں میں خوف و ہراس پھیل گیا اور اس نوع کی کتابوں کی اشاعت اچانک کم ہو گئی لیکن اس کے بعد بھی چوری چھپے ایسی کتابوں کی اشاعت جاری رہی ، البتہ اس کاروبار نے جو وبائی صورت اختیار کی تھی ، اس میں بہت حد تک کمی آگئی ۔

فحاشی یا فحش نگاری صرف برصغیر ہی کا نہیں ، ہر ملک کا مسئلہ رہا ہے ، اس لیے کہ فنِ طباعت اور ذرائع ابلاغ کے عام ہوتے ہی ساری دنیا میں فحش نگاری نے ایک وبائی صورت اختیار کر لی تھی اور دنیا بھر میں فحش نگاری کے انسداد کا بڑی شدت کے ساتھ مطالبہ کیا جانے لگا تھا چنانچہ دوسری جنگ عظیم سے قبل "لیگ آف نیشنز" کے تحت فحش نگاری کی روک تھام کے لیے ایک عالمی کنونشن International convention for The Suppression of Circulation of Traffic in obscene Publications" طلب کیا گیا ، جس میں دنیا کے بڑے بڑے عالموں اور دانشوروں نے شرکت کی تاکہ ساری دنیا میں فحش اور مخرب الاخلاق لٹریچر کی روک تھام کے لیے متفقہ قانون وضع کیا جائے ، لیکن طویل غور و خوض اور کئی دنوں کے بحث مباحثے کے باوجود مندوبین فحش نگاری کی کوئی متفقہ تعریف متعین کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ، تاہم فیصلہ کیا گیا کہ فحش نگاری کے بارے میں ہر ملک اپنے معاشرے ، اپنی اخلاقی قدروں اور اپنی ضرورت کے مطابق قانون وضع کرے ۔ اس کنونشن کی سفارشات کو ایک دستاویز کی شکل دی گئی ، جس پر ہندوستان نے ۱۹۲۵ء میں دستخط کیے اور جس کا نام "اوبسین پبلیکیشنز ایکٹ" رکھا گیا ۔

۱۸۵۶ء کے "اوبسین بکس اینڈ پکچرز ایکٹ" نے اگرچہ ۱۹۳۵ء میں "انڈین پینل کوڈ" اور قیام پاکستان کے بعد تعزیراتِ پاکستان کی صورت اختیار کرلی ہے ، لیکن ان میں سے کسی میں بھی فحاشی یا فحش نگاری کی کوئی واضح تعریف بیان نہیں کی گئی ہے ۔ اس ضمن میں انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۲۹۲ میں یہ عجیب و غریب منطق پیش کی گئی ہے کہ اگر کسی مجسٹریٹ کو محسوس ہو کہ کوئی تصنیف فحش ہے تو وہ فحش ہے ، یعنی اس میں فحش تحریر کسے کہا جائے گا؟ اس کی کوئی وضاحت نہیں ہے اور اس کا فیصلہ مجسٹریٹ کی صواب دید ، پسند ، مذاق اور قوتِ فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا ہے ۔

تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۲۹۲ میں کہا گیا ہے :

"(الف) جو کوئی فحش کتاب ، رسالہ ، کاغذ ، خاکہ ، تصویر ، نقشہ ، شبیہہ یا کسی بھی قسم کی دیگر فحش

شے فروخت کرے ، کرائے پر دے ، تقسیم کرے ، بر سرعام نمائش کرے یا کسی طریق سے بھی اس کی اشاعت کرے یا فروخت کرے ، کرائے پر دینے ، تقسیم کرنے ، بر سرعام نمائش کرنے یا ، اشاعت کرنے کی غرض سے بنانے تیار کرے یا اپنے قبضے میں رکھے ، اسے تین ماہ قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکیں گی" ۔ اس قانون کی چند ذیلی دفعات میں فحش اشیا کی درآمد ، برآمد ، کاروبار ، تعارف ، اشتہار یا ان تمام اعمال کی اعانت ، کوشش یا پیش کش بھی جرم قرار دی گئی ہے ۔ ایک ذیلی دفعہ میں مذہبی کتب ، تصاویر ، بُت وغیرہ ، جو مذہبی فرائض کی ادائی پر مشتمل ہیں ، فحش ہونے کے باوصف قانون کی گرفت سے خارج کیے گئے ہیں ۔

تعزیرات پاکستان میں بھی فحش کے تصور کی کہیں تعریف نہیں کی گئی ہے ، البتہ جسٹس منیر احمد نے اس ضمن میں ایک مقدمہ کا جو فیصلہ کیا تھا ، پاکستان میں اسے ایک اصول کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے ۔ جسٹس منیر کی طے کردہ نظیر کے مطابق "اگر ناپختہ ، ماؤف یا حساس ذہنیت والے اشخاص کسی تحریر سے اس طرح متاثر ہو سکیں کہ ان کے جنسی جذبات برانگیختہ ہو جائیں یا معمولی ذہنیت کے انسان کو جنسی جذبات ناگوار حد تک ابھرتے محسوس ہوں تو گویا عریاں نگاری قانونی حد سے گزر کر جرم کی تعریف میں داخل سمجھی جائے گی" ۔ جسٹس منیر احمد نے کسی تحریر کو فحش قرار دینے کے سلسلے میں جو اصول وضع کیا ہے اس سے اتفاق بہت مشکل ہے ، چنانچہ کراچی کے سابق ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اور سیشن جج جناب مہدی علی صدیقی اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "عدالت کو فحش تحریر کے ہر پہلو پر غور کرنا پڑتا ہے ۔ متن کے علاوہ پس منظر ، تحریر کی غرض ، مصنف کا منشا ، معاشرے کا مذاق ، مروجہ اخلاقی معیار سب پیش نظر رہنے چاہئیں ، ورنہ انصاف کا خون ہو سکتا ہے ۔ اس تفصیل کے بعد آپ خود محسوس کریں گے کہ فاضل جسٹس کا طے کردہ وہ معیار غلط نہ سہی ، سطحی ضرور ہے ۔ میں ایک مثال سے معاملے کی نزاکت واضح کردوں فرض کیجیے کہ ایک مجسمہ ساز حسین عورت کا عریاں مجسمہ تیار کرتا ہے جس میں اعضائے جنسی پوری صفائی سے نظر آتے ہیں ۔ یا کوئی ڈاکٹر اپنے طلبا کے لیے درسی کتاب میں اعضائے جنسی اور جنسی اختلاط کی تفصیلات درج کرتا ہے ۔ کیا یہ چیزیں قانون کی زد میں آجائیں گی ۔ مذہبی کتب بھی اعضا یا افعال کے تذکرے سے خالی نہیں ۔ اب خیال فرمائیے کہ آپ ناپختہ یا ماؤف ذہنیت رکھنے والے اشخاص کو جنسی ہیجان سے کیسے بچاتے پھریں گے ۔ میری رائے میں بذات خود ایسے مجسمے اور تحریریں فحش نہیں ہیں ۔ ہاں جو صاحب محض فطری یا غیر فطری جنسی تسکین کی خاطر مجسمے کے اعضائے جنسی سے لذت حاصل کریں یا محولہ بالا تحریریں اس غرض سے پڑھیں کہ

جنسی ہیجان کو سکون تک پہنچائیں تو ان کی حرکات یقیناً فحش ہوں گی نہ کہ ایسا مجسمہ اور تحریریں ۔"

(بحوالہ "فحش نگاری اور قانون" ، سہ ماہی "غالب" کراچی شمارہ نمبر (۱)

فحش نگاری کی واضح اور دو ٹوک تعریف نہ ہونے کے باعث جب بھی اس بارے میں کوئی مقدمہ زیر بحث آتا ہے تو ججوں کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو جاتا ہے ۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اگر ماتحت عدالت کسی مصنف کو فحش نگاری کے جرم میں سزاوار قرار دیتی ہے تو عدالت عالیہ اسے بری قرار دیتی ہے ۔ تو کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عدالت زیریں میں نااہل اور عدالت عالیہ میں اہل قانون داں ہوتے ہیں؟ قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ عدالت ماتحت اور عدالت بالا کے فیصلوں میں یہ تضاد کیوں پیدا ہوتا ہے؟ کیا ابتدائی عدالت کے مجسٹریٹ مسئلے کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور وہ فحش اور غیر فحش میں امتیاز نہیں کر سکتے؟ کسی مخصوص کیس میں تو یہ صورت ممکن ہے ، لیکن ہر بار ایسا ہونا حیرت کی بات ہے ۔ اس کی اصل وجہ فحش نگاری کے بارے میں ججوں کے نقطۂ نظر کا اختلاف ہے ۔ ماتحت عدالت عموماً عوام کی ذہنی سطح کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرتی ہے اور عدالت عالیہ خواص کے نقطۂ نظر سے کتاب کے ادبی اور فنی معیار اور اس کے حسن و قبح کو سامنے رکھ کر اسے پرکھتی اور فیصلہ صادر کرتی ہے ۔

ہندوستان اور پاکستان میں فحش نگاری کی کوئی جامع تعریف نہ ہونے کے باعث بڑی عجیب و غریب اور مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو گئی ہے ، مثلاً کوئی بھی کلکٹر آف کسٹم اگر دوسرے کلکٹر کی رائے یا فیصلے سے اتفاق نہ کرے ۔ اور ایک ہی محکمے کے دو اعلیٰ افسران کے درمیان کسی کتاب کو فحش قرار دینے کے سوال پر اختلاف پیدا ہو تو ایسی صورت میں معاملہ سنٹرل بورڈ آف ریونیو کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ۔ اگر وہاں بھی اس بارے میں اتفاق رائے نہ ہو اور وہ انڈین پینل کوڈ اور سی کسٹم ایکٹ مجریہ ۱۸۷۸ء کے تحت فیصلہ کرنا ممکن نہ ہو تو معاملہ ملک کی سب سے بڑی اتھارٹی (وزیر اعظم) کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ۔ ماضی میں اس قسم کا ایک واقعہ ہندوستان میں پیش آیا ۔ امریکی ناول نویس ولادیمیر نوبوکوف کے شہرۂ آفاق اور رسوائے زمانہ ناول "لولیتا" کو ہندوستان کے محکمہ کسٹم نے انڈین سی کسٹم ایکٹ کے تحت ضبط کر لیا تھا ، لیکن جب متذکرہ ناول کا معاملہ وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لعل نہرو تک پہنچا تو انہوں نے ذاتی اختیارات سے کام لیتے ہوئے اس پر سے پابندی اٹھا لینے کا حکم جاری کیا ، تاہم ڈی ۔ ایچ ۔ لارنس کا معتوب ناول "لیڈی چیٹرلیز لور" پنڈت نہرو کی نگاہِ التفات حاصل کرنے میں ناکام رہا ۔ اس طرح ملک کی اعلیٰ ترین بااختیار ہستی (وزیر اعظم) کی صواب دید پر ہے کہ وہ جس کتاب کو چاہیں فحش قرار دیں اور جسے چاہیں فحش نگاری کے الزام سے مبّرا قرار دیں ۔ اس کے بارے میں کوئی واضح تحریری اصول یا قانون موجود نہیں ہے ۔ اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں بھی فحاشی اور فحش نگاری کے بارے میں کوئی مثالی قانون موجود نہیں ہے ۔ اس قسم کے قانون کا مضحکہ خیز پہلو یہ ہے کہ کسٹم اور پولیس حکام کو ہر بار اس ضمن میں اعلیٰ حکام سے مشورہ طلب کرنا پڑتا

ہے ۔ اس قانون کی وجہ سے تخلیقی کام کرنے والے ادیبوں اور مصوروں کو بھی نت نئی رکاوٹوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ اس بات کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بمبئی کی مشہور "جہاں گیر آرٹ گیلری" سے ایک بار بمبئی پولیس ہندوستان کے مشہور مصور آرا کی تصویریں اس الزام میں اٹھا کر لے گئی کہ انھوں نے چند نیوڈ تصاویر بھی بنائی تھیں ۔ پولیس کو یہ کارروائی کرتے وقت یہ خیال نہیں رہا کہ اجنتا ، ایلورا اور کھجوراہو کے مندروں اور غاروں میں سیکڑوں نہیں ہزاروں ایسی تصویریں اور مورتیاں موجود ہیں جو نہ صرف عریاں ہیں ، بلکہ جن میں باقاعدہ جنسی اختلاط کے مناظر دکھائے گئے ہیں اور جسے حکومت کا محکمہ سیاحت بڑے شوق اور فخر کے ساتھ غیر ملکیوں کو دکھاتا اور ٹورازم کے نام پر پیسے وصول کرتا ہے ۔

پاکستان کی صورت حال

پاکستان میں صورت حال اور بھی دگرگوں ہے ۔ یہاں اس قانون کے تحت کسی کتاب پر پابندی عائد کرنے یا مصنف پر اس ضمن میں مقدمہ چلانے کے لیے زیادہ غور و خوض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ۔ یہاں محکمۂ اطلاعات و مطبوعات یا محکمہ پولیس کا کوئی بھی کلرک (خواہ اس کی تعلیمی قابلیت کچھ بھی کیوں نہ ہو) کسی بھی ادبی تصنیف کو فحش قرار دے کر اسے ضبط کرنے کی سفارش کر سکتا ہے ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ "حکام بالا" خود اس کتاب کو پڑھ کر کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے بجائے ماتحت کلرک کی سفارش پر آنکھ بند کرکے عمل کرنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں ۔ یہ پابندی عام طور پر کتاب کے کسی ایک فحش ، مبتذل یا قابل اعتراض حصے کی وجہ سے لگائی جاتی ہے ۔ پوری کتاب پر بحیثیت مجموعی غور کرنے اور اس کی ادبی اور فنی قدر و قیمت کو پرکھنے کے بجائے کتاب کے کسی ایک حصے کو سامنے رکھ کر ادبی تخلیق کو فحش قرار دینے کی یہ روایت ۱۸۹۱ء میں اس وقت قائم ہوئی جب الہ آباد کے جسٹس اسٹریٹ نے ۳ جون ۱۸۹۱ء کو "حملۂ ہند" نامی ایک کتاب کے بارے میں اپنے فیصلے میں لکھا کہ "میں اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ کسی کتاب کو اس لیے فحش قرار نہیں دیا جاسکتا کہ اس میں صرف ایک ٹکڑا فحش ہے ۔ اس اصول کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ گندی سے گندی اور فحش سے فحش چیزیں کسی کتاب میں شائع کی جاسکتی ہیں ۔ بشرطیکہ انہیں ایک معینہ حد کے اندر محدود رکھا جائے ۔ میں اس رائے سے شدید اختلاف کرتا ہوں ۔ میری رائے میں "حملۂ ہند" کے صفحہ ۹۴ پر جو عبارت ہے وہ کتاب کو فحش قرار دینے کے لیے بہت کافی ہے اور اس بنا پر ملزم پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے ۔"

کسی ادب پارے کی ادبی اور فنی خوبیوں اور اس کی قدر و قیمت کو پرکھے بغیر کسی ادبی تخلیق کے فحش یا غیر فحش ہونے کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق جج کو دے دینا ادب و فن کے لیے خطرے کی بات ہے ، خصوصاً ایسی صورت میں ، جبکہ فحش نگاری کی کوئی واضح تعریف بھی موجود نہ ہو اور جج کو اس بات کا پورا اختیار ہو کہ وہ کسی بھی تصنیف کو

صرف اس لیے فحش قرار دے کہ اس کے خیال میں وہ کتاب فحش ہے ، خصوصاً اس منطق کے تحت کہ "اگر کوئی کتاب فحش ہے تو بہرحال فحش ہے" اس عجیب و غریب منطق کی ابتدا ۱۸۸۳ء میں اس وقت ہوئی جب ولایت کے لارڈ چیف جسٹس کاک برن نے ایک مقدمے کے سلسلے میں رائے دی کہ : "کسی کتاب کو فحش قرار دینے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جس مواد پر فحش ہونے کا الزام ہے ، آیا اس میں ان لوگوں کے اخلاق کو بگاڑنے اور ان میں بدی کی ترغیب موجود ہے یا نہیں ، جو اس طرح کے مخرب الاخلاق اثرات قبول کر سکتے ہوں اور جن تک وہ کتاب پہنچ سکتی ہو ۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کتاب نہایت نیک اور قابل تحسین مقصد سے لکھی گئی ہو ، مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ اگر کوئی کتاب فحش ہے تو وہ بہرحال فحش ہے ۔ لکھنے والے کی نیت سے کوئی بحث نہیں اور کسی قابل تحسین مقصد حاصل کرنے کے لیے کسی کو بھی قانون شکنی کی اجازت نہیں دی جاسکتی ۔"

بہت زمانے تک برطانیہ اور متحدہ ہندوستان میں لارڈ کاک برن کے مقرر کیے ہوئے معیار کے مطابق فیصلے ہوتے رہے، چنانچہ الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس بینرجی نے بھی ۸ جولائی ۱۹۰۵ء کو "عطر قرآن" نامی ایک کتاب کے متعلق اپنے فیصلے میں لکھا کہ : "اگر کسی کتاب کے مطالعے سے پڑھنے والوں پر ایسا اثر پڑے کہ ان کے اخلاق خراب ہوں تو اس بات کو قطعاً نظر انداز کر دینا پڑے گا کہ لکھنے والے کا مقصد کیا تھا ۔" ان فیصلوں سے دو نتائج برآمد ہوتے ہیں ۔ اول یہ کہ فحش نگاری کے ضمن میں لکھنے والے کی نیت زیر بحث نہیں آسکتی ۔ صرف الزام زدہ مواد یا اقتباس کو دیکھنا کافی ہوگا ۔ دوم یہ کہ کوئی کتاب کسی ایک فحش ٹکڑے کی بنیاد پر بھی فحش قرار دی جاسکتی ہے ۔

فحش نگاری کے مقدمے سے مصنف کی نیت کی بحث کو خارج کر دینے کے نتیجے میں مضحکہ خیز صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب امریکہ کی ریاست میساچوسٹس میں انیسویں صدی کے اواخر کی شہرۂ آفاق کلاسیکی تصنیف "ڈیکامیرین نائٹس" کو ممنوع قرار دیتے ہوئے اس کے ناشر پر مقدمہ دائر کر دیا گیا ۔ اس مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے فاضل جج نے کہا کہ "یہ کتاب ادب کے طالب علموں میں بہت معروف ہے اور یہ اس وقت لکھی گئی تھی جب فن طباعت کی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور اس دور میں بہت کم لوگوں میں تعلیم تھی اس لیے ظاہر ہے کہ مصنف کا مقصد اس کے ذریعے نوجوانوں کا اخلاق بگاڑنا نہیں ہو سکتا ۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ولٹ شائر کے ایک مجسٹریٹ نے اسی کتاب کے بارے میں حکم صادر کیا کہ "ڈیکامیرین نائٹس" کو ضائع کر دینا چاہیے کیونکہ یہ فحش کتاب ہے ، لیکن اپیل کورٹ نے اس فیصلے کو مسترد کر دیا ۔ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں کہا گیا ہے ۔ برطانیہ ، ہندوستان اور پاکستان کے ججوں کی رائے میں آج تک مصنف کی نیت کو بنیاد بنا کر کسی کتاب کے فحش یا غیر فحش ہونے کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا گیا تھا ، لیکن میساچوسٹس کی عدالت میں پہلی بار مصنف کی نیت کے سوال کو مقدمے کے دوران زیر بحث لایا گیا اور یہ معلوم کیا گیا کہ زیر عتاب "فحش" کتاب کو مصنف نے کس مقصد سے لکھا ہے ۔ برطانوی ججوں اور ان کے پیرو کار ہندوستانی اور پاکستانی ججوں کی نظر میں مصنف کی نیت کو نظر انداز کر دیا گیا تھا ، لیکن امریکی ججوں نے مقدمے کے دوران مصنف کے

مقصد اور ارادے کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری قرار دیا ۔

دنیا کے مشہور پلے بوائے اور عشق پیشہ کاسانووا کی یادداشت "ہوم کمنگ" کو اپنی تحویل میں رکھنے کے جرم میں جب ایک شخص کو سزا دی گئی تو جسٹس واگنر نے اس کی ادبی اور فنی خوبیوں کو پر شکوہ الفاظ میں سراہا ۔ اس کے باوجود کتاب پر سے پابندی نہیں اٹھائی ۔ انھوں نے ماتحت عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے کہا کہ "زبان کا حسن ، خیالات کی ندرت ، طرز بیان کی دل کشی ، حتی کہ مصنف کی عظمت و شہرت یہ تمام چیزیں ادب کے نقاد کے لیے بہت اہم ہو سکتی ہیں ۔ لیکن ان خوبیوں کے موجود ہوتے ہوئے بھی ممکن ہے کہ کوئی کتاب اس قابل نہ ہو کہ عامتہ الناس کو اس کے مطالعے کا موقع دیا جائے ۔" یہ بات قابل ذکر ہے کہ ریڈ کلف ہال کے ناول "ویل آف لون لی نیس" کے ادبی محاسن مسلّم ہیں ۔ لیکن اس کتاب کو بھی عدالت نے ایک مدت تک فحش ہونے کے الزام میں ممنوع قرار دیے رکھا تھا ، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ معیار اخلاق اور ذوق سلیم بدل جانے کے باعث ان کتابوں پر سے پابندی ہٹالی گئی ۔

امریکہ میں کسی کتاب کے فحش یا غیر فحش ہونے کے بارے میں غور کرتے وقت ایک اور امر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور وہ یہ کہ زیر عتاب کتاب کا نو عمروں پر بحیثیت مجموعی کیا اثر پڑے گا ۔ یہ وہ معیار تھا جس پر نیویارک کے ججوں نے برسوں عمل کیا ۔ لیکن ۱۹۳۴ء میں جب جیمز جوائس کے ناول "یولی سیز" کو فحش قرار دینے کے لیے مقدمہ دائر کیا گیا تو یہ معیار بھی بدل گیا اور فیڈرل کورٹ نے مذکورہ روایتی معیار کو مسترد کرتے ہوئے صرف ایسی تحریر کو فحش قرار دیا جو محض عیاشی اور بدچلنی کی ترغیب دیتی ہو ۔ جو کتابیں صحیح معنوں میں ادب پارے کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ وہ فحش نگاری کے الزام سے مبرا قرار دی گئیں ۔ فیڈرل کورٹ کے اس تاریخ ساز فیصلے کا نیویارک کی ماتحت عدالتوں پر بہت اثر پڑا ۔ کوئی کتاب صحیح معنوں میں ادب پارہ ہے یا نہیں ؟ اس کا فیصلہ اس بات سے کیا گیا کہ کسی ادبی تخلیق کو عوام میں کس حد تک پذیرائی ہوئی اور ناقدوں اور ادیبوں کی نظر میں اس کی کیا قدر و قیمت ہے اور وہ کس حد تک صداقت پر مبنی ہے ۔ آیا وہ کسی خاص دور ، کسی خاص معاشرے اور خاص کرداروں کی صحیح عکاسی کرتی ہے یا نہیں اور جن ٹکڑوں پر فحش ہونے کا الزام عائد کیا گیا ہے ۔ ان کا کتاب کے مرکزی اور بنیادی موضوع سے کیا تعلق ہے ؟ مقدمے میں اس امر کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے کہ عوام الناس کو اس کے مطالعے سے جو فائدہ پہنچے گا ، وہ اس نقصان کے مقابلے میں تھوڑا ہے یا زیادہ ، جو تھوڑے سے لوگوں کو پہنچ سکتا ہے ۔ جسٹس جون ، اے وولزے نے اس مقدمے کے ضمن میں جو بہت اہم بات کہی وہ یہ ہے کہ عدالت کو یہ دیکھنا چاہیے کہ افسانے یا ناول کا مطالعہ کرنے والے بالغوں کی اکثریت پر اس کا کیا اثر ہوگا نہ کہ نو عمروں اور جذباتی طور پر ناپختہ لوگوں نے اس سے کیا اثر لیا ۔ اگر اس افسانے یا ناول کے مطالعے سے پڑھنے والوں کو کچھ ایسی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں ، جن سے انھیں بعض معاشرتی مسائل کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے ، تو ان ناپختہ عمر کے لوگوں کو پہنچنے والے امکانی نقصان کو نظرانداز کر دینا

چاہیے ۔

"یُولی سِیز" کے مقدمے کے سلسلے میں فاضل جج وولزے نے ۶ دسمبر ۱۹۳۳ء کو جو تاریخی فیصلہ دیا ۔ اس میں کہا گیا ہے کہ :

"میں نے "یُولی سِیز" ایک دفعہ پڑھی اور جن حصّوں کی حکومت کو خاص طور سے شکایت ہے ، انھیں کئی دفعہ پڑھا ۔ "یُولی سِیز" کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے آسانی سے پڑھا یا سمجھا جاسکے ، لیکن اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ "یُولی سِیز" کا مطالعہ بڑا مشکل کام ہے ۔ بہر حال ادبی دنیا میں یُولی سِیز کی جو شہرت ہے وہ اس بات کی متقاضی تھی کہ میں اس پر جتنا بھی وقت ضروری ہو ، صرف کروں ، تاکہ مجھے اس مقصد کے متعلق پوری طرح تشفی ہو جائے جس کے ماتحت یہ کتاب لکھی گئی ہے ، کیوں کہ جب کسی کتاب پر فحش ہونے کا الزام لگایا جائے تو پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد عام محاورے کے مطابق فحش نگاری تھا یا نہیں ، یعنی یہ کتاب عریانی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی غرض سے لکھی گئی ہے یا نہیں ۔ اگر ہم اس نتیجے پر پہنچیں کہ یہ کتاب فحش نگاری کے ماتحت آتی ہے تو بس تحقیقات پوری ہو گئیں اور کتاب کی ضبطی لازمی ہے ، مگر یُولی سیز میں غیر معمولی صاف گوئی کے باوجود مجھے کہیں بھی شہوت پرستی کا شائبہ تک نہیں ملا ، چنانچہ میری رائے ہے کہ یہ کتاب فحش نگاری کے ماتحت نہیں آتی ۔ یُولی سیز لکھتے ہوئے جوئس نے ایک بالکل نادر قسم کی ادبی صنف میں نہ سہی تو کم از کم ایک نئی صنف میں سنجیدگی کے ساتھ ایک تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے ۰۰۰۰ چوں کہ جوئس نے اپنی تکنک سے پوری وفاداری برتی ہے اور اس کے جو لازمی نتائج ہوتے ہیں ، ان پر عمل کرنے سے نہیں گھبرایا ، بلکہ ایمان داری سے پوری پوری طرح یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کردار کن چیزوں کے بارے میں سوچ رہے ہیں اسی لیے جوئس پر اتنے حملے ہوئے ہیں ۔ اس کے مقصد کو اکثر غلط طور سے سمجھا گیا ہے اور اس کی غلط ترجمانی کی گئی ہے اپنا مقصد حاصل کرنے کی ایمان دارانہ اور پُر خلوص کوشش میں اسے اتفاق سے چند ایسے لفظ استعمال کرنے پڑے ہیں جنھیں عام طور سے فحش سمجھا جاتا ہے اور اس بنا پر وہ صورت حال پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ سے لوگ کہتے ہیں کہ اس کے کرداروں کے خیالات میں جنسیات کو بہت زیادہ دخل ہے ۔ جن لفظوں پر فحش ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے وہ پرانے سیکسن الفاظ ہیں جن سے تقریباً تمام مرد ، بلکہ میں تو کہوں گا کہ بہت سی عورتیں بھی واقف ہیں ، جن لوگوں کی جسمانی اور ذہنی زندگی جوئس بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہ لوگ میرے خیال میں تو ایسے الفاظ عادتاً اور بالکل فطری طور پر استعمال کرتے ہیں ، جہاں

تک کرداروں کے دماغ میں بار بار جنس کا موضوع ابھر آنے کا تعلق ہے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ جوئس کے کردار کیلٹ نسل کے ہیں اور یہ بہار کا زمانہ ہے ۰۰۰۰ اس کتاب میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جنھیں عام طور سے گندا سمجھا جاتا ہے ۔ مگر مجھے اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جسے میں فحش برائے فحش سمجھ سکوں ۔ جوئس اپنے پڑھنے والوں کے لیے جو تصویر بنانے کی کوشش کر رہا ہے اس میں کتاب کا ہر لفظ لازمی جز کا حکم رکھتا ہے ۰۰۰۰ جوئس نے یولی سیز اس مقصد کے ماتحت نہیں لکھی جسے عام طور سے فحش نگاری کہا جاتا ہے ۔ یہ کتاب جس مقصد سے لکھی گئی ہے اس سے قطع نظر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ فی الجملہ اس کتاب کا اثر کیا ہوتا ہے ۔ مجھے چاہیے کہ اسے ایک اور معروضی معیار سے جانچوں ۔

عدالت نے قانون کے اعتبار سے لفظ "فحش" کے جو معانی مقرر کیے ہیں وہ یہ ہیں : جس سے جنسی خواہشات کے حرکت میں آنے یا جنسی اعتبار سے ناپاک اور شہوت انگیز خیالات پیدا ہونے کا امکان ہو ۰۰۰۰ ایک خاص کتاب ایسے جذبات اور خیالات پیدا کر سکتی ہے یا نہیں ۔ اس کا فیصلہ عدالت کی رائے کے ذریعے یہ دیکھ کر ہو گا کہ اوسط درجے کی جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے ۔ ایسے آدمی پر جسے فرانسیسی معمولی قسم کی حسیات رکھنے والا انسان کہتے ہیں ۔ میں نے دو ادبی مشیروں سے الگ الگ ملاقات کی ۔ جن کی رائے کا میں بڑا احترام کرتا ہوں ۔ میں نے ان کو فحش کی قانونی تعریف بتانے کے بعد الگ الگ پوچھا کہ اس تعریف کی حدود کے اندر رہتے ہوئے آپ کے خیال میں یولی سیز فحش ہے یا نہیں؟ دونوں میری رائے سے متفق تھے ۔ یعنی یہ کہ اگر یولی سیز کو مجموعی طور سے پڑھیں ۔ جیسے اس قسم کا فیصلہ کرنے کے لیے ہر کتاب کو پڑھنا چاہیے ۔ تو اس سے جنسی خواہشات یا شہوت انگیز خیالات نہیں بھڑکتے بلکہ یولی سیز کا آخری اثر ان دونوں پر یہ مرتب ہوا کہ انھیں یہ کتاب مردوں اور عورتوں کی زندگی کی ذرا المناک سی اور بڑی مؤثر تفسیر معلوم ہوئی ۔ قانون کا تعلق صرف اوسط درجے کے آدمی سے ہے جو اپنے ہوش و حواس میں ہو ۔ چنانچہ یولی سیز جیسی کتاب کے سلسلے میں فحش نگاری کی صرف ایک ہی مناسب کسوٹی ہو سکتی ہے اور یہ وہی ہے جو میں نے بتائی ہے ۔ کیوں کہ یہ کتاب انسانیت کے مشاہدے اور بیان کا ایک نیا ادبی اسلوب وضع کرنے کی سنجیدہ اور پُرخلوص کوشش ہے ۔ مجھے پورا احساس ہے کہ "یولی سیز" کے بعض حصے اتنے تند و تیز ہیں کہ اوسط درجے کے حساس آدمی سے برداشت نہیں ہو سکتے ۔ مگر بہت طویل غور و خوض کے بعد میری رائے یہ ہے کہ گو بہت سی جگہ پڑھنے والے پر یولی سیز کا اثر کچھ کراہت انگیز تو ہوتا ہے ۔ مگر شہوت انگیز کہیں بھی نہیں

ہوتا ۔"
(ترجمہ : محمد حسن عسکری ، ماخوذ از "لذت سنگ")

اسی نوع کا ایک فحش نگاری کا مقدمہ مشہور امریکی ناول نویس ارسکن کالڈویل کے ناول "گوڈز لیٹل ایکڑ" پر بھی چلا تھا ، جس کے بارے میں بنجمن گرین سپین نے جو فیصلہ دیا وہ بھی ادبی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ مقدمہ "اخلاقی بُرائیوں کے اِنسداد کی انجمن" نے دائر کیا تھا ۔ جج نے اپنے فیصلے میں کہا کہ :

"عدالت کی صحیح اور پختہ رائے یہ ہے کہ "غیر معتدل" لوگوں کے اس گروہ میں کسی ادبی تخلیق کی قدر و قیمت کے تعین کی صلاحیت ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جو کتاب کو مجموعی حیثیت سے دیکھنے کے بجائے اس میں اِدھر اُدھر کے چند عریاں اقتباسات نکالنے ہی کی استطاعت رکھتے ہیں ۔ عدالت نے اس کتاب کو بڑے غور سے پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مصنف نے حقیقت پسندانہ طریقے سے اس کتاب میں جنوبی ریاستوں کے اَن پڑھ دیہاتی کاشت کار کنبے کی طرزِ زندگی کی صحیح تصویر کشی کی ہے ۔ اس کنبے کی ایک لڑکی جنوب کے صنعتی قصبے کے کسی مزدور سے بیاہی گئی ہے ، جہاں تھکا دینے اور اُکتا دینے والی دہقانی زندگی اور صنعتی قصبے کی زندگی میں باہمی تفاعل پیدا ہو جاتا ہے ۔ گاؤں اور قصبے دونوں جگہ کے لوگ انتہائی مفلسی اور تہذیب کے بالکل ابتدائی مدارج میں ہیں اور ترقی کے سامانوں سے یکسر محروم ہیں۔ ان لوگوں کی سرگرمیاں زیادہ تر جنسی قسم کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے سادہ فطرت لوگوں کا بہیمانہ جذبہ ہر وقت سطح پر ہوتا ہے ، جس طبقے کی کیفیت اس میں بیان کی گئی ہے ۔ کوئی عدالت اس سے پوری طرح واقف نہیں ، پھر بھی مصنف کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے ۔ عدالت کی اس بات سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ واقعے کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا گیا ۔ کتاب میں اس بات کی اندرونی شہادت موجود ہے کہ جنوب کے ایک طبقے کی زندگی کو سچائی اور دیانت کے ساتھ دکھانے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے ۔ مصنف کا مقصد ایک سچی تصویر پینٹ کرنا تھا ۔ ایسی تصویروں میں بعض ضروری تفصیلوں کا آجانا لابدی امر ہے اور چوں کہ ایسی تفصیلوں کا گہرا تعلق زندگی کے جنسی پہلو سے ہوتا ہے اس لئے انہیں بہیمانہ صاف گوئی کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے ۔ اس لیے عدالت یہ حکم صادر نہیں کر سکتی کہ ایسی تصویریں سرے سے بنائی نہ جائیں ۔ کرداروں کی زبان بلاشبہ بھدی اور گندی ہے ، مگر عدالت مصنف سے اَن پڑھ اور غیر مہذب لوگوں کے منہ میں شائستہ زبان ڈال دینے کا مطالبہ نہیں کر سکتی ، یہ چیز پوری طرح عیاں ہے کہ کتاب مجموعی حیثیت سے فحش نگاری پر مبنی نہیں ہے ۔۔۔۔ عدالت کے لیے ضروری تھا کہ وہ تمام کتاب پر مجموعی حیثیت سے غور کرتی ۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ بعض پیراگراف اپنی الگ حیثیت سے قابل اعتراض ہیں ، لیکن قبل کے ایک فاضل جج

کے ریمارکس کے مطابق کسی کتاب کے چند پیراگرافوں کے اقتباس سے پوری کتاب کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ۔ ان کی جداگانہ اشاعت قانونی طور پر قابل گرفت ہو سکتی ہے ۔ بالکل اسی طرح جیسے ارسٹوفینز، چاسر، بوکاچیو بلکہ کتاب مقدس تک کے بعض مقامات کو قابل تعزیر گردانا جاسکتا ہے ۔ تاہم کسی کتاب کو سمجھنے کے لیے اسے مجموعی طور ہی سے دیکھنا چاہیے ۔ عدالت کی صائب رائے یہ ہے کہ کتاب ایسی نہیں جس میں بُرائی اور بدکاری کو خوبی اور نکوکاری کی حیثیت سے دکھایا ہو ، جس کا منشا معقول آدمیوں کے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کرنا ہو ۔ لیکن بیمار دل و دماغ والوں پر اس کے اثرات کی پیش بندی عدالت نہیں کر سکتی ۔ اگر عدالت ایسی کتابوں کی اشاعت کو محض اس لیے روک دے کہ وہ بیمار دل و دماغ والوں میں شہوت پیدا کرنے کا امکان رکھتی ہے تو پھر ہمارا تمام ادب سکڑ کر چند غیر دلچسپ اور خشک کتابوں کا چھوٹا سا ذخیرہ بن کر رہ جائے گا ، کیوں کہ اعلیٰ درجے کے ادب کا بیشتر حصہ یقیناً حذف ہو جائے گا ۔ نتیجتاً "گوڈز لیٹل ایکڑ" اپنے پڑھنے والوں کو ہرگز اپنے کرداروں کے مطابق زندگی گزارنے کی ترغیب نہیں دیتی اور نہ اس کا میلان شہوانی خواہشات کو اُبھارنے کی طرف ہے ۔ وہ لوگ ، جن کی نگاہیں کسی چیز کی خوبیوں کی بجائے بُرائیوں کو دیکھنے کی طرف لگی رہتی ہیں ، ان کی مثال چند درختوں میں الجھ کر پورے جنگل کی وسعت کو نظرانداز کر دینے والوں کی طرح ہے ۔ میں ذاتی طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایسی کتابوں کو سختی سے دبا دینے پر پڑھنے والوں میں خواہ مخواہ تجسس اور استعجاب پیدا ہوتا ہے جو انہیں شہوت پسندی کی ٹوہ لگانے کی طرف مائل کر دیتا ہے ، حالانکہ اصل کتاب کا یہ منشا نہیں ہوتا ۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کتاب میں مصنف نے صرف وہی چیز منتخب کی ہے جسے وہ امریکی زندگی کے کسی مخصوص طبقے کے متعلق سچا خیال کرتا ہے ۔ میری رائے میں سچائی کو ادب کے لیے ہمیشہ جائز قرار دینا چاہیے ۔"

(ایضاً)

فحش نگاری ، کلاسیکی ادب میں :

جیسا کہ اس سے قبل کہا جاچکا ہے دوسرے ممالک کی طرح برصغیر ہندوستان میں بھی انگریزوں کی آمد یا مغربی تہذیب کی یلغار سے قبل فحاشی کا کوئی تصور موجود نہیں تھا ۔ طوائفیت باقاعدہ معاشرے کا ایک حصہ تھی اور ایک انسٹی ٹیوشن کے طور پر تسلیم شدہ بھی ، چنانچہ طوائف کے کوٹھے پر جانا اور رقص و سرود کے ساتھ شراب و شباب سے محظوظ ہونا شرفا کے معمولات کا حصہ تصور کیا جاتا تھا ، چنانچہ شرفا بعض اوقات اپنے بچوں کو آداب محفل سیکھنے کے لیے طوائفوں کے پاس بھیجا کرتے تھے ۔ اس وقت تک آج کی طرح طوائفوں کے کوٹھے کو فحاشی کا اڈہ تصور نہیں کیا جاتا تھا ۔ جہاں

تک اردو شعر و ادب میں شہوانی جذبات اور جنسی واردات کے اظہار کا تعلق ہے ، یہ بھی معمول کا حصہ تھا ، چنانچہ آپ میر ، غالب ، درد ، ذوق ، انشا ، جرات ، رنگین اور داغ سے لے کر نظیر اکبر آبادی تک کے دواوین پڑھ جائیے ، آپ کو سیکڑوں نہیں ہزاروں ایسے اشعار ملیں گے جو آج کے نقطۂ نظر سے بہ آسانی فحش اور مخرب الاخلاق قرار دیئے جا سکتے ہیں ، جبکہ صرف ایک سو سال قبل تک ان اشعار کو مبتذل تصور نہیں کیا جاتا تھا ۔ ہمارا اخلاقی معیار انگریزوں کی آمد کے بعد کس قدر بدل چکا ہے اس کا اندازہ اس امر سے کیجیے کہ جب منشی نول کشور نے نظیر اکبر آبادی کے دیوان کا پہلا ایڈیشن شائع کیا تو اس میں جنسی واردات سے متعلق تمام اشعار موجود تھے ، لیکن دوسرے ایڈیشن میں ان تمام اشعار اور نظموں سے "فحش الفاظ" حذف کر کے خالی جگہوں میں نقطے ڈال دیے گئے ، جو ناشر کے خیال میں قانون کی گرفت سے بچنے کا آسان طریقہ تھا ۔

اردو ادب میں سر سید احمد خاں اور حالی کے زیرِ اثر جو اصلاحی تحریک شروع ہوئی اس نے مغرب کے پیوریٹن ازم کے تحت اخلاقی ادب کو تو خوب پروان چڑھایا لیکن اس نے شعر و ادب سے انسان کی جنسی زندگی کو خارج کر دیا اور شاید ایسا لکھنؤ اسکول کی زوال آمادہ شاعری کے ردِّ عمل میں ہوا ۔ جب ریختی گوئی کے نام پر رنگین اور چرکین جیسے شاعر پیدا ہوئے ، اس وقت تک مغرب کی عیسائی تعلیمات کے تحت ہمارے ہاں اخلاقیات کا نیا مغربی تصور رائج ہو چکا تھا ، جس میں جنس کو ایک بُری شے تصور کیا جاتا تھا ، لہٰذا ان تمام باتوں کا یہ اثر ہوا کہ اردو میں عرصے تک رومانی اور جنسی شاعری کا فقدان رہا ۔ یہ رومانی تحریک کا اعجاز تھا کہ یلدرم جیسے افسانہ نگار اور اختر شیرانی جیسے رومانی شاعر پیدا ہوئے اور ارا افسانے اور شاعری میں عرصے کے بعد گوشت پوست کی عورت نظر آئی ، لیکن اِس ادب میں اُس وقت بھی جنس خارج رہی اور عورت کے حسن و شباب سے متعلق ساری باتیں کہی گئیں ، سوائے جنس کے ۔ اِسی لیے سلیم احمد ۔ اس عہد کی شاعری کو ادھوری شاعری یا آدھے انسان کی شاعری قرار دیا تھا ۔ یہ کفر اس صدی کی تیسری دہائی میں اس وقت ٹوٹا جب نئے ادب کی تحریک کے زیرِ اثر ۱۹۳۳ء میں "انگارے" کے افسانے شائع ہوئے اور جن میں پہلی بار سج ظہیر اور احمد علی نے لارنس اور جوئس کے زیرِ اثر جنس کا کھلم کھلا اظہار کیا ، لیکن یہ بات کافی دلچسپ ہے کہ اس کتاب کے خلاف فحاشی کی وجہ سے نہیں ، بلکہ مذہبی وجوہ کی بنا پر اعتراض کیا گیا اور بالآخر حکومت نے اسے ضبط کرنے کا فیصلہ کیا ۔ انگارے کے افسانوں میں جنس کا تذکرہ ضرور تھا ، لیکن اِن میں جنسی فعل کا کوئی ذکر نہیں تھا ، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ انگارے کے افسانے صرف فحش نگاری کی وجہ سے ضبط کیے گئے ۔ اردو ادب میں جنس کا باقاعدہ ۱۹۴۰ء کے عشرے میں اس وقت شروع ہوا جب احمد علی ، منٹو ، عصمت چغتائی ، محمد حسن عسکری اور اوپندر ناتھ اشک وغیرہ نے افسانے میں اور میرا جی ، ن ۔ م ۔ راشد اور مخمور جالندھری وغیرہ نے شاعری میں اس موضوع کو چھیڑا ۔

فحش نگاری کے الزام میں جدید دور میں سب سے پہلے جن افسانہ نگاروں پر مقدمہ چلا وہ عصمت چغتائی ا

سعادت حسن منٹو تھے ۔ سعادت حسن منٹو کے جس افسانے پر سب سے پہلے مقدمہ چلا وہ ان کا افسانہ "کالی شلوار" تھا جو "ادب لطیف" لاہور کے سالنامہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا ۔ اس کے بعد سعادت حسن منٹو کے جس افسانے پر مقدمہ چلا وہ ان کا افسانہ "بُو" تھا جو "ادب لطیف" کے سالنامہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا ، جس کے احمد ندیم قاسمی مدیر تھے ۔ اس افسانہ کے خلاف سب سے پہلے جن اخبارات و رسائل نے حکومت وقت کی توجہ مبذول کرائی ، ان میں ہفت روزہ "خیام" لاہور ، روزنامہ "پربھات" لاہور "اخوت" لاہور ، اور "آئینہ" بمبئی وغیرہ شامل ہیں ۔ ان جرائد نے اس افسانے کے فحش اور مخرب الاخلاق ہونے کے بارے میں جو لکھا سو لکھا ۔ اس میں یہ بھی لکھا کہ اس افسانے کا ایک مقصد "گورنمنٹ عالیہ" کی "وومینز آگزلیری کور (.W.A.C) کی عیسائی لڑکیوں کو بد کردار ثابت کرنا ، پورے محکمہ کو قحبہ خانہ قرار دینا اور اس طرح حکومت کی جنگی مساعی میں رخنہ ڈالنا ہے ۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے نقطۂ عروج کا زمانہ تھا ، چنانچہ اخبارات کے احتجاج کے نتیجے میں فحش نگاری کی بنا پر ہو یا نہ ہو ، جنگی مساعی میں رخنہ اندازی کے ڈر سے حکومت نے ۹ مارچ ۱۹۴۴ء کو دفعہ ۲۹۲ تعزیرات ہند اور نمبر ۳۹ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت سالنامہ "ادب لطیف" لاہور کو ضبط کر لیا ۔ اس لیے کہ اس میں افسانہ "بُو" کے علاوہ "ادب جدید" کے نام سے منٹو کا ایک مضمون بھی شامل تھا ، جس کے بارے میں حکومت کا کہنا تھا کہ اس میں ملک معظم کی فورسیز کے بارے میں غلط باتیں کہی گئی تھیں ۔ منٹو کے افسانے "بُو" کے سلسلے میں ادب لطیف کے مالک و ناشر چودھری برکت علی ، ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی اور مصنف سعادت حسن منٹو کو جسٹس بنواری لال کی عدالت میں پیش کیا گیا بعد ازاں ان کا تبادلہ ہو جانے کے باعث مقدمہ مہدی علی صدیقی کی عدالت میں منتقل ہو گیا اور ۲ مئی ۱۹۴۵ء کو انھوں نے منٹو کے بری ہونے کا اعلان کیا لیکن ادب لطیف کے مالکان چودھری برکت علی اور چودھری نذیر احمد کو ساٹھ ساٹھ روپے فی کس کے حساب سے جرمانہ کیا جس کے خلاف ایڈیشنل جج ایم — آر — بھاٹیہ کی عدالت میں اپیل داخل کر دی گئی ۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جسٹس بنواری لال ، منٹو کو پہلے ہی بری الذمہ قرار دے چکے تھے چنانچہ مہدی علی صدیقی نے بھی منٹو کے بری ہونے کا اعلان کیا ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مہدی علی صدیقی نے اس فیصلے پر جو ریمارک لکھا ، اس میں انھوں نے لکھا :

> "مضمون "بُو" کا مصنف سوسائٹی کی نظروں میں سخت ترین سزا کا مستحق تھا اور یہ کہ وہی صحیح آدمی تھا جسے قانونی گرفت میں لینا چاہیے تھا ، مگر پیش رو فاضل جج مسٹر بنواری لال نے اسے بری کر دیا ۔"

دلچسپ امر یہ ہے کہ یہ وہی مہدی علی صدیقی ہیں جو بعد میں پاکستان منتقل ہو گئے اور ان کی عدالت میں ایک دفعہ پھر منٹو کو فحش نگاری کے الزام میں پیش کیا گیا ۔ "بُو" کے مقدمے میں جن مشاہیر اہلِ قلم نے سعادت حسن منٹو کی طرف سے صفائی پیش کی ان میں عبدالرحمن چغتائی ، کنہیا لال کپور اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ شامل تھے ۔ جج ایم — آر — بھاٹیہ نے "بُو" کے بارے میں جو رائے دی وہ یہ ہے :

"میری نظر میں مضمون ایک عشقیہ کہانی ہے ۔ ایک لڑکے اور لڑکی کی ، جس میں ایسی بات کا دلچسپ ذکر ہے جو عموماً ہر روز نوجوان آدمیوں میں نہیں ہوتی ۔ ماتحت عدالت فاضلہ نے ہندوستانی نوجوانوں کی تعیش پسند زندگی کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کیا ہے اور اس بات پر ماتم کیا ہے کہ ملک میں ہندوستانیوں کا پرانا کیرٹر نابود ہو رہا ہے (ماتحت عدالت کے فاضل جج) نے وہ خوبیاں بھی یاد کرائی ہیں ، جن کے لیے ہم ہندوستانی کبھی مشہور تھے اور یہ نصیحت کی ہے کہ نئے فیشنوں کو ختم کر دینا چاہیے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ماتحت عدالت فاضلہ کے خیالات ترقی پسند نہیں ہیں ۔ ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ہے ۔ حسین چیز ایک دائمی مسرت ہے ۔ آرٹ ، جہاں کہیں بھی ملے ، ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے ۔ آرٹ ، خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجسمے کی شکل میں ، سوسائٹی کے لیے قطعی طور پر ایک پیش کش ہے ۔ چاہے اس کا موضوع غیر مستور ہی کیوں نہ ہو ۔ یہی کلیہ تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے ۔

جب ملک کے مشہور و معروف آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملزمین کے حق میں کہا ہے ۔ سارا فیصلہ یہیں ہو جاتا ہے ۔ زیر بحث مضمون ایسا مضمون ہے جس پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی کی جائے ۔ اس لیے مجھے اپیل منظور کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں ۔ جرمانہ اگر ادا کیا گیا ہے تو واپس کیا جائے ۔ میں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں ۔"

سعادت حسن منٹو پر فحش نگاری کے الزام میں تیسرا مقدمہ شاہد احمد دہلوی کے اشاعتی ادارے "ساقی بک ڈپو" کے شائع کردہ افسانوں کے مجموعے "دھواں" پر دائر کیا گیا ۔ اس میں دو افسانے "دھواں" اور "کالی شلوار" زیرِ عتاب آئے جو اس سے قبل رسالے کے عام شماروں میں شائع ہو چکے تھے ۔ اس وقت پریس برانچ کو کوئی اعتراض نہیں ہوا ۔ یہ امر کافی دلچسپ ہے کہ "کالی شلوار" پر اس سے قبل قانونی پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور سیشن کورٹ میں یہ فحاشی کے الزام سے مبرا قرار دی جا چکی تھی لیکن نہ معلوم کیوں ایک بار پھر اس بے ضرر افسانے کو تعزیرات ہند کی دفعہ نمبر ۲۹۲ کے تحت زیرِ عتاب لایا گیا اور ۸ جنوری ۱۹۴۵ء کو سعادت حسن منٹو کو بمبئی میں گرفتار کر لیا گیا اور سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کو ۲ فروری ۱۹۴۵ء کو لاہور کے اسپیشل مجسٹریٹ لالہ سنت رام کی عدالت میں پیش ہونے کا حکم دیا گیا ۔ سعادت حسن منٹو نے اپنی صفائی میں عدالت میں جو تحریری بیان داخل کیا تھا وہ ادبی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل ہے ، کیوں کہ اس میں اس نے فحش نگاری کے بارے میں اپنا موقف پیش کیا تھا ۔ منٹو نے اس بیان میں لکھا :

"کسی ادب پارے کے متعلق ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر ، ایک اشتہار فراہم کرنے والے اور ایک سرکاری مترجم کا فیصلہ صائب نہیں ہو سکتا ۔ بہت ممکن ہے کہ یہ تینوں کسی خاص غرض کے

ماتحت اپنی رائے قائم کر رہے ہوں اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تینوں حضرات ایسی رائے دینے کے اہل ہی نہ ہوں کیوں کہ کسی بڑے شاعر، کسی بڑے افسانہ نگار کے افسانوں پر صرف وہی آدمی تنقید کر سکتا ہے جو تنقید نگاری کے فن کے تمام عواقب و عواطف سے آگاہ ہو .... تحریر و تقریر، شعر و شاعری میں، سنگ سازی و صنم تراشی میں فحاشی تلاش کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہیے۔ اگر یہ ترغیب موجود ہے، اگر اس کی نیت کا ایک شائبہ بھی نظر آرہا ہے تو وہ تحریر، وہ تقریر، وہ شعر وہ بت، قطعی طور پر فحش ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ ترغیب "دھواں" میں موجود ہے یا نہیں .... "دھواں" میں شروع سے لے کر آخر تک ایک کیفیت، ایک جذبے، ایک تحریک کا نہایت ہی ہموار نفسیاتی بیان ہے۔ اصل موضوع سے ہٹ کر اس میں دور از کار باتیں نہیں کی گئیں۔ اس میں ہمیں کہیں ایسی ترغیب نظر نہیں آتی جو قارئین کو شہوانی لذتوں کے دائرے میں لے جائے اس لیے کہ افسانے کا موضوع "شہوت" نہیں ہے۔ استغاثہ اگر ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی کم نظری ہے .... افسانے کا مطالعہ کرنے سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ میں نے اس بے نام سی لذت میں، جو شعور کو محسوس ہو رہی تھی، خود کو یا قارئین کو کہیں شریک نہیں کیا۔ یہ ایک اچھے فن کار کی قلم کی خوبی ہے .... افسانہ نگار نے مسعود کے دماغ میں شہوانی خیالات کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا۔ ایسی لغزش افسانے کا ستیاناس کر دیتی .... خدا جانے استغاثہ اس افسانے کو فحش کیوں کہتا ہے، جس میں فحاشی کا شائبہ تک موجود نہیں .... ایک مریض جسم، ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے جو لوگ روحانی ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں۔ اصل میں انہی کے لیے شاعر شعر کہتا ہے۔ افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصور تصویر بناتا ہے۔ میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لیے ہیں۔"

اس مقدمے میں جن مشاہیر اہل قلم نے مصنف کی جانب سے صفائی میں بیانات دیے، ان میں کنہیالال کپور، باری علیگ، دیویندر ناتھ ستیارتھی، ڈاکٹر سعید اللہ اور ڈاکٹر عبد اللطیف شامل تھے، لیکن منصف رائے صاحب لالہ سنت رام نے دونوں افسانوں کو فحش قرار دیا اور منٹو کو دو سو روپیہ جرمانہ ادا کرنے کی سزا دی۔ اس فیصلے کے خلاف سیشن کورٹ میں اپیل کی، جس پر جرمانہ واپس کر دیا گیا۔ سعادت حسن منٹو کے جس چوتھے افسانے پر فحش نگاری کے الزام میں مقدمہ چلا اس کا عنوان "ٹھنڈا گوشت" ہے، جو لاہور کے ماہنامہ "جاوید" میں شائع ہوا تھا، جسے "نقوش" (احمد ندیم قاسمی) "ادب لطیف" اور "نیا دور" (ممتاز شیریں) نے بعض وجوہ کی بنا پر شائع کرنے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ "جاوید" کی ضبطی کے بعد اس پر فحش نگاری کے الزام میں مقدمہ چلانے سے قبل پریس

ایڈوائزری بورڈ کی میٹنگ میں روزنامہ "زمیندار" لاہور کے مدیر مولانا اختر علی روزنامہ "نوائے وقت" کے ایڈیٹر حمید نظامی "سفینہ" کے ایڈیٹر وقار انبالوی اور "جدید نظام" کے ایڈیٹر امین الدین صحرائی نے اسے فحش قرار دیا ۔ مقدمے کے دوران مولانا تاجور نجیب آبادی، "چٹان" کے ایڈیٹر آغا شورش کاشمیری اور "احسان" لاہور کے ایڈیٹر ابو سعید بزمی نے بھی اسے فحش قرار دیا ۔ سعادت حسن منٹو کی صفائی میں جن لوگوں نے بیانات دیئے ان میں فیض احمد فیض صوفی غلام مصطفیٰ تبسمؔ ، سید عابد علی عابد ، پروفیسر احمد سعید ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ، کنہیا لال کپور اور عبدالرحمٰن چغتائی جیسی مشہور و معروف شخصیتیں شامل تھیں ۔ اس افسانے کے ضمن میں صفائی کے گواہوں نے زیادہ تر وہی باتیں کہیں جو نیویارک کی عدالتوں میں "یولی سیز" اور اسی نوع کے دیگر مقدمات کے سلسلے میں کہی گئی تھیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ منصف نے بھی اپنے فیصلے میں ملزم کو بری کرتے ہوئے وہی دلائل دیے جو نیویارک کے ججوں نے ایسے مقدموں میں پیش کیے تھے ۔

برطانیہ میں فحش نگاری

جیسا کہ میں نے اس سے قبل لکھا ہے برطانیہ میں فحش نگاری کے خلاف قانون ہندوستان میں قانون بننے کے ایک سال بعد ۱۸۵۷ء میں بنا تھا۔ ظاہر ہے برطانیہ کے بدلے ہوئے معاشرے میں یہ قانون فرسودہ اور پیش پا افتادہ ہو چکا تھا اور عصری دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا تھا ۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک نیا قانون "نیو اوبسین ایکٹ" منظور کیا ۔ یہ ایکٹ ۱۹۵۴ء میں دارالعلوم میں پیش کیا گیا تھا جس کی حمایت و مخالفت میں بڑی زور دار بحثیں ہوئیں ۔ قدامت پسندوں کی مخالفت کے باعث اس میں کئی ترامیم کی گئیں اور اسے منظور کرنے میں پارلیمنٹ کو پانچ سال کا عرصہ لگا ۔ اس قانون کو پیش کرنے والے رکن پارلیمنٹ مسٹر جینکنسن نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ ایکٹ میں ترامیم کے باعث اگرچہ اس کے مقاصد کو جزوی طور پر نقصان پہنچا ہے ، تاہم اسے لبرل خیال کی جیت قرار دیا جا سکتا ہے ، مثلاً اس ایکٹ میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ کسی کتاب پر مقدمہ چلاتے وقت اس پر مجموعی طور پر غور کیا جائے گا ۔ کتاب کے کسی ایک حصے یا چند اقتباسات پر کوئی کتاب غیر قانونی قرار نہیں دی جائے گی (۱) ۔ علاوہ ازیں اس بات پر بھی غور کرنا ضروری ہو گا کہ جس کتاب پر مقدمہ دائر کیا گیا ہے ، اسے کس قسم اور کس طبقے کے لوگ پڑھ سکتے ہیں ۔ اس بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا کہ کتاب کن کے ہاتھ میں پہنچ سکتی ہے ۔ ماضی میں کسی کتاب کو صرف اس دلیل کی بنا پر غیر قانونی قرار دیا جاتا تھا کہ اس کے ناپختہ ذہن لوگوں کے پڑھنے کا امکان ہے ۔ خواہ کتاب سائنس کی ہو یا نفسیات اور جنسیات کی (اسی منطق کے تحت ہیولک ایلس کی تصنیف "سائیکولوجی آف سیکس" کو

---

۱ — واضح رہے کہ پاکستان میں آج بھی فحش نگاری کے مقدمات میں کتاب پر مجموعی طور پر غور کرنے کے بجائے کتاب کے کسی ایک حصے یا چند اقتباسات کو بنیاد بنا کر فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے ۔ پوری کتاب کی ادبی و فنی قدر و قیمت پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ۔

برطانیہ اور دیگر کئی ممالک میں ممنوع قرار دیا گیا تھا) اب سوال "امکان" کا نہیں "ممکن" کا تھا ۔ اس ایکٹ کی تیسری خوبی یہ تھی کہ اگر مقدمے کے دوران یہ ثابت ہو جائے کہ علم و سائنس اور آرٹ اور کلچر کے فائدے کے لیے متذکرہ کتاب کی ضرورت ہے تو اس کتاب پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی لیکن اسے ثابت کرنے کے لیے مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو ماہروں اور عالموں کو بہ طور گواہ پیش کرنا ہوگا ۔ جو متذکرہ کتاب کی ادبی اور دیگر خوبیوں کے بارے میں اپنی رائے دیں گے ۔ اس ایکٹ کی چوتھی خوبی یہ ہے کہ اگر کسی کتاب کو ضائع کر دینے کے حق میں فیصلہ کیا گیا تو مصنف یا ناشر کو عدالت میں حاضر ہو کر اپنی شہرت یا جائیداد کی حفاظت کے لیے دلائل پیش کرنے کا حق ہوگا ۔ پانچویں خوبی یہ ہے کہ جرم کے ارتکاب کے دو برس گزر جانے کے بعد کسی قسم کا مقدمہ نہیں چلایا جائے گا ۔ چھٹی خوبی یہ ہے کہ مصنف کی کتاب پر غیر ذمے دارانہ طور پر مقدمہ دائر کرنے کی صورت میں مدعا علیہ کو الزام عائد کرنے والے سے ہرجانہ وصول کرنے کا حق ہوگا ۔ جینکنسن نے اس ایکٹ کے بارے میں لکھا کہ نئے قانون کے تحت کم از کم کاغذ پر ادیبوں کی آزادی تحریر محفوظ ہو گئی ہے لیکن اس قانون پر کس طرح عمل ہوگا۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ عدالت اس قانون کی کس طرح تشریح کرتی ہے ۔

آج سے نصف صدی قبل ریڈ کلف ہیول کے ناول "دی ویل آف لون لی نیس" پر فحش نگاری کے برسوں پرانے اور فرسودہ قانون کے تحت مقدمہ چلا کر اِسے ممنوع قرار دیا گیا تھا ۔ جس پر اس دور کے مشاہیر اہل قلم نے سخت احتجاج کرتے ہوئے اپنے ایک مشترکہ بیان میں عدالت سے اس ناول پر سے پابندی اٹھا لینے کی درخواست کی تھی ۔ اس درخواست پر ریڈ کلف کے ناول کی ادبی اور فنی خوبیوں اور اس کی ادبی قدر و قیمت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی ۔ اس کے باوجود عدالت نے ان کی درخواست کو مسترد کر دیا تھا ۔ اس لیے کہ اس وقت تک برطانوی رائے عامہ اتنی لبرل نہیں ہوئی تھی ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ برطانیہ میں "لیڈی چیٹرلیز لور" پر اس وقت پابندی عائد تھی جب پورنوگرافی کی کتابیں اور رسائل برطانیہ میں برسرِ عام اور آزادانہ طور پر فروخت ہو رہے تھے ۔ بلو فلموں کی عام نمائش جاری تھی اور عام اور گھٹیا قسم کے جاسوسی اور سنسنی خیز ناولوں کے ساتھ ساتھ البرٹو موراویا ، ولیم فاکنر ہیمنگوے ، ارسکائن کولڈویل اور نوبوکوف جیسے معروف ادیبوں کے اعلیٰ ادبی ناولوں میں لارنس سے زیادہ جنسی ہیجانات کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا ۔ دو عالمی جنگوں نے یورپی عوام کے دل و دماغ ، اندازِ فکر اور تصورِ حیات کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا ۔ اسی کے ساتھ انسان کے خیالات و تصورات ، رہن سہن اور اخلاقی اور سماجی قدریں ، انسان کے مذاق اور ذوقِ جمال میں بھی بڑے تغیرات رونما ہو گئے تھے ۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ لارنس کے ناول کو عہدِ وکٹوریہ کے معیارِ اخلاق پر جانچنا درست نہیں ہے ۔ اس سے لارنس کے فن کے ساتھ ناانصافی ہوگی ۔ برطانوی عوام کو فحش نگاری کے ضمن میں اپنے دوغلے پن اور دوہرے معیار کا بہت جلد احساس ہو گیا اور انھوں نے فحش ادب کے بارے میں ایک نیا اور لبرل نقطۂ نظر اختیار کیا ۔

لارنس کا المیہ یہ تھا کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے ناول "لیڈی چیٹرلیز لوَر" مکمل صورت (یعنی غیر تخفیف شدہ

صورت) میں برطانیہ میں شائع ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکا ۔ اس کی اشاعت کے تیس سال بعد یہ ناول پہلی بار مکمل صورت میں شائع ہوا ۔ اس ناول کی ادبی قدر و قیمت کے بارے میں ہمیشہ اختلاف رائے رہا اور اس کی ادبی اہمیت کے بارے میں خود مغربی مصنفین اور ناقدین آج تک متفق نہیں ہوئے ۔ اگر ایڈمنڈ ولسن اور آرچ بولڈ میک لیش جیسے نقاد اس کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتے تو کیتھرین این پورٹر اور سامرسیٹ مام جیسے ادیبوں کے خیال میں یہ ایک انتہائی بور اور اکتا دینے والا ناول ہے ۔ اس ناول کی ادبی قدر و قیمت خواہ کچھ بھی ہو ، برطانوی عدالت نے اس پر سے پابندی اٹھا کر برطانیہ کی دستوری تاریخ میں ایک عہد آفریں مثال قائم کی ہے ، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ فحش نگاری کے بارے میں برطانیہ سے بہت قبل امریکہ نے معقول رویہ اختیار کیا تھا اور زیرِ عتاب کتاب پر مجموعی طور پر غور کرنا اور کتاب کی ادبی قدر و قیمت پر سوچ بچار کرنا ضروری قرار دیا تھا ۔ اس اعتبار سے لبرل نقطۂ نظر اختیار کرنے کا سہرا برطانیہ کے نہیں ، بلکہ امریکہ کے سر بندھتا ہے ۔

ہندوستان میں فحش نگاری :

دلچسپ بات یہ ہے کہ برطانیہ میں اس ناول پر سے پابندی ہٹا لینے کے باوجود دنیا کے مختلف ممالک میں اس پر بہت دنوں تک پابندی عائد رہی ۔ ان ممالک میں امریکہ اور بھارت شامل ہیں ۔ لندن سے جب اس ناول کا غیر تخفیف شدہ ایڈیشن شائع ہو کر ہندوستان پہنچا تو بمبئی پولیس نے ایک کتب فروش رنجیت ڈی — اوریشی کو تعزیراتِ ہند کی دفعہ نمبر ۲۹۲ کے تحت مذکورہ ناول فروخت کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا اور اس پر مقدمہ دائر کر دیا ۔ ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کرتے ہوئے اس الزام سے بھی انکار کیا کہ ناول فحش ہے ۔ اس نے دعویٰ کیا کہ یہ دنیائے ادب کا ایک شاہکار ناول ہے اس لیے اس پر فحش ہونے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا ۔ ملزم نے اپنی صفائی میں انگریزی زبان کے معروف ادیب اور ناقد ملک راج آنند اور دوسرے معروف مصنفین کے بیانات کا حوالہ دیا جن میں انھوں نے اس ناول کی ادبی خوبیوں سے بحث کرتے ہوئے اسے کلاسیک قرار دیا تھا ۔ ملزم نے اپنے بیان میں کہا کہ ناول اگرچہ جنس کے موضوع پر ہے لیکن اسے فحش نہیں کہا جاسکتا ۔ لوور کورٹ نے دلائل سننے کے باوجود ناول کو فحش قرار دیتے ہوئے ملزم کتب فروش کو سزاوار قرار دیا ۔ ملزم نے لوور کورٹ کے فیصلے کے خلاف بمبئی ہائی کورٹ میں اپیل داخل کی ، لیکن بمبئی ہائی کورٹ نے بھی ماتحت عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھا ، جس پر ملزم نے سپریم کورٹ کے دروازے پر دستک دی ۔ یہ امر بہت دلچسپ ہے کہ بھارت کی حکمراں جماعت ، انڈین نیشنل کانگریس بھی اس ناول پر پابندی کے حق میں تھی ، چنانچہ اس مقدمے سے بہت پہلے جب لوک سبھا میں اس بارے میں سوال کیا گیا تو نائب وزیر داخلہ شری دتّر نے صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ حکومت ہند لارنس کے اس ناول کے غیر تخفیف شدہ ایڈیشن پر سے پابندی نہیں اٹھائے گی اور جو بھی شخص اس ناول کو انفرادی طور پر لانے کی کوشش کرے گا ، سی کسٹم ایکٹ مجریہ ۱۸۷۸ء کی دفعہ ۱۷

(سی) کے تحت ضبط کر لیا جائے گا ۔ لیکن سپریم کورٹ نے اس اعلان کی پروا کیے بغیر اپنا فیصلہ دیا ۔

سپریم کورٹ کے جسٹس ہدایت اللہ نے سب سے پہلے حکم جاری کیا کہ سماعت کے دوران ناول کے خاص خاص حصوں کے بجائے پورے ناول کو زیر بحث لایا جائے اور بحث کے دوران اس کی ادبی قدر و قیمت کو بھی پرکھا جائے ۔ اس سے قبل اس قسم کے مقدمے کے دوران عام طور پر ناول کے ایک مخصوص حصے کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کرکے پرکھا جاتا تھا کہ ناول (یا کوئی ادبی تخلیق) فحش ہے یا نہیں اور اس طرح اسے ممنوع قرار دیا جاتا تھا ۔ جسٹس ہدایت اللہ نے ہر قسم کے شواہد کو پیش کرنے اور فحش نگاری کے بارے میں ماضی کے فیصلوں پر تکیہ کرنے کے بجائے کتاب کے بارے میں آزادانہ غور و خوض کرنے کی ہدایت کی ۔ آج تک ہندوستان (اور صرف ہندوستان ہی کیوں پاکستان میں بھی) جج صاحبان ۱۸۶۸ء میں فحش نگاری کے "ہیک پرن مقدمہ" کے بارے میں جسٹس کوک پرن کی رائے کو سامنے رکھ کر ہی فیصلے سناتے آئے تھے ، لیکن جسٹس ہدایت اللہ نے بدلے ہوئے سماجی حالات کے پیش نظر اس ناول پر غور کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا کہ اس بارے میں صرف زبانی شواہد پر انحصار نہ کیا جائے بلکہ ہر قسم کے دستاویزی ثبوت پیش کیے جائیں ۔ مدعا علیہ نے اپنی اپیل میں عدالت عظمیٰ سے درخواست کی کہ نام نہاد فحش نگاری کے بجائے ناول کی مجموعی ادبی اور فنی خوبیوں کو بھی مد نظر رکھا جائے اور ناول پر غور کرتے وقت یہ معیار نہ بنایا جائے کہ ایک ناپختہ ذہن ، کمسن لڑکا یا ابنارمل شخص پر مذکورہ ناول پڑھنے سے کیا اثر پڑے گا ، بلکہ معیار نارمل شخص کو بنایا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ ایک نارمل شخص اس ناول کے پڑھنے سے مشتعل یا گمراہ ہوتا ہے یا نہیں ۔ بحث کے دوران یہ بھی کہا گیا کہ اگر اس ناول کی کوئی ادبی قدر و قیمت نہیں ہے تو اس کی مذمت کرنی چاہیے اور مصنف کو سزاوار قرار دینا چاہیے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ مصنف کا اس ناول کو لکھنے کا اصل مقصد کیا ہے ۔ کیا اس تحریر کا مقصد حصولِ زر ہے؟ جیسا کہ عام طور پر فحش کتابیں لکھنے والوں کا ہوتا ہے یا اس کا مقصد ادب کی تخلیق اور معاشرے کی عکاسی ہے ۔ اس میں شبہہ نہیں کہ مصنف کے سامنے دو مقاصد تھے ۔ اول اپنے وطن کے طبقۂ اشرافیہ کو دھچکا پہنچانا اور دوم ، مثالی جنسی تعلقات کی عکاسی ، جو مصنف کی ہر تصنیف میں موجود ہے ۔ اس لیے مصنف کے عقیدے اور اس کے مشنری جذبے کے خلوص میں کسی قسم کے شبہے کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔

جسٹس ہدایت اللہ نے اپنے تاریخی فیصلے میں نہ صرف لیڈی چیٹرلیز لَوَر کو فحش نگاری کے الزام سے بری قرار دیا بلکہ ناول کے متن اور مصنف کے فلسفۂ حیات سے بھی تفصیلی بحث کی ۔ انھوں نے ناول کی کہانی کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ :

> "ایک بیرونیٹ (مسٹر چیٹرلی) کے جنگ میں خطرناک طور پر زخمی ہونے کے باعث اسکے جسم کا نچلا حصہ بالکل مفلوج ہو چکا تھا ۔ اس نے فوج میں بھرتی ہونے سے چند روز قبل کونسٹینس (لیڈی چیٹرلی) سے شادی کی تھی اور اس کی ازدواجی زندگی بہت ہی مختصر رہی تھی ۔ اسے (مسٹر

چیٹرلی کو) اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس کے جنسی طور پر ناکارہ ہو جانے کے باعث اس کی بیوی کی جنسی زندگی بالکل بے کیف ہو کر رہ گئی ہے ، چنانچہ وہ اپنی بیوی کو دوسرے مردوں سے ملنے جلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے ۔ کونسٹینس کا پہلی بار سابقہ مائیکل سے اور دوسری بار اس کی زمین کے نگران میلرس سے ہوتا ہے ۔ اس کا پہلا عاشق جنسی اعتبار سے خود غرض تھا جبکہ دوسرا عاشق ایک قسم کا فن کار تھا جو کونسٹینس کو عملی طور پر جنسی تلذذ کے اسرار سے واقف کرتا ہے ۔ مصنف نے ناول میں ایک درجن مقامات پر جنسی اختلاط کی تفاصیل بیان کی ہیں ۔ ناول میں گیم کیپر میلرس جس انداز سے گفتگو کرتا ہے یا گفتگو کے دوران جو الفاظ استعمال کرتا ہے وہ قطعی شائستہ نہیں ہیں ۔ ناول میں جسم کے مختلف حصّوں کا بڑی تفصیل اور بے باکی سے ذکر کیا گیا ہے اور مصنّف نے جسم کے مختلف حصّوں کے بیان کے لیے مختلف نام استعمال کیے ہیں ۔ ناول کے دوسرے حصّے میں مصنف نے جدید مشینی تہذیب اور مرد و عورت کی آزادانہ جنسی زندگی پر اس کے مضر اثرات کے بارے میں کڑی تنقید کی ہے ۔ لارنس کے خیال میں مرد و عورت کی جنسی زندگی میں جو ناہمواری پائی جاتی ہے اور جس کی وجہ سے ان کی زندگی ناخوش گوار ہو جاتی ہے ۔ اس کا اصل سبب جدید مشینی تہذیب ہے ۔"

جسٹس ہدایت اللہ نے مزید لکھا ہے کہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دنیا "پامیلا" (PAMELA) ، مول فلینڈرس MOLL FLANDERS ، مسیز وارینز پروفیشن (MRS. WARRENS PROFESSION) ، حتیٰ کہ مل (MILL) اور فلوس (FLOSS) کے دور سے بہت آگے نکل چکی ہے ۔ یہ وہ تصانیف ہیں ، جنھیں فحش اور ناشائستہ تصور کیا جاتا تھا ۔ آج اِن ساری تصانیف اور ارسٹوفینز (ARISTOPHANES) سے لے کر زولا تک تمام مصنفوں کا وسیع پیمانے پر مطالعہ کیا جا رہا ہے ۔ ان میں سے بمشکل کسی کی فحاشی کا نوٹس لیا گیا ہے۔ اگر آرٹ اور فحش نگاری کے بارے میں ہمارے رویے میں بنیادی تبدیلی رونما ہوئی تو ارسکائن کاڈویل کے ناول "گوڈز لِٹل اِکڑ" اور آندرے ژید کے ناول "اِف اِٹ ڈائی" کا وجود محال ہو جائے گا ۔ تمام انگریزی ناولوں کو ڈرائینگ رومز سے نکال دینا پڑے گا ۔ خود ٹامس ہارڈی کے ناول "ٹیس" کو اس کے عہد میں سخت ناپسند کیا گیا حالانکہ آج کے عہد میں یہ ناول دوسری کتابوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے ۔ آج کی دنیا میں گزشتہ عہد سے زیادہ قوتِ برداشت موجود ہے ۔ وہ مختلف قسم کے ادب کو برداشت کرنے پر آمادہ ہے چنانچہ عدلیہ کو ہر کتاب کے بارے میں اس کی اہمیت کے پیش نظر الگ الگ غور کرنا ہوگا ۔ اگر ادب اور فن کے سلسلے میں ایسا رویّہ اختیار نہ کیا گیا تو عدالت ایک قسم کا بورڈ آف سنسرز بن جائے گی ۔

کوئی تصنیف فحش ہے یا نہیں اس بارے میں فیصلے کا انحصار زیادہ تر مصنفین کی صوابدید پر ہوتا ہے ۔ قانون اس ضمن میں نہ ان کی مدد کرتا ہے اور نہ وضاحت ، چنانچہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ منصف کا ادب پارے پر غور کرتے

وقت صرف قانون کے تقاضوں سے واقف ہونا کافی ہے یا ادب و فن کے تقاضوں سے بھی ۔ اگر منصف صرف قانونی موشگافیوں سے دلچسپی رکھتا ہے یا مذہبی معاملات میں متعصب، تنگ نظر اور سخت گیر ہے، اسے ادب و فن سے کوئی شغف نہیں ہے اور وہ پیوریٹن مزاج کا حامل ہے، تو ظاہر ہے وہ کسی بھی فن پارے میں جنس کا شائبہ پاتے ہی اسے ممنوع قرار دے گا ۔ اس کے برعکس اگر منصف نہایت کھرا، آزاد خیال اور وسیع النظر ہے اور ادب و فن کے تقاضوں کو بھی سمجھتا ہے تو وہ زیر عتاب فن پارے پر ہمدردی سے غور کرے گا اور اس کے بارے میں انصاف کے متقاضی رویہ اختیار کرے گا ۔ جیسا کہ ہندوستان کی عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس ہدایت اللہ نے کیا ۔ اس قسم کے مقدمے پر غور کرتے وقت جن باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے ان میں مذاق سلیم مصنف کی نیت اور لکھنے کی غرض، ادب پارے کی فنی قدر و قیمت، معاشرے کا عام معیار اخلاق، زیر عتاب تصنیف میں پائے جانے والے رجحانات اور اس کا تاثر شامل ہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ مصنف نے زیر عتاب تصنیف کو کس مقصد اور نیت سے لکھا ہے ۔ اس دور کا معیار اخلاق اور ذوق سلیم کیا ہے اور اس کے مطالعے سے پڑھنے والے پر مجموعی طور پر کیا تاثر ثبت ہونے کا امکان ہے۔ آخر الذکر دونوں چیزیں یعنی معیار اخلاق اور ذوق سلیم چوں کہ وقت اور ماحول کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں ۔ اس لیے ماہرین قانون اور ناقدین کے خیال کے مطابق فحش نگاری سے متعلق قانون کی تعبیر و تشریح کو بھی وقت کے ساتھ بدلتے رہنا چاہیے ۔ ان تمام باتوں کے باوجود فحش نگاری سے متعلق قانون میں چوں کہ فحاشی کی کوئی واضح تعریف نہیں کی گئی ہے ۔ اس لیے بات گھوم پھر کر منصف کے ذاتی رویے اور صوابدید پر آجاتی ہے کہ وہ جسے چاہے فحش نگاری کا مرتکب قرار دے اور جسے چاہے اس الزام سے بری کر دے ۔ اس ضمن میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے ۔ وہ یہ کہ ان تمام باتوں کا تعلق معاشرے کے مجموعی رویے سے بھی ہے ۔ مثال کے طور پر اگر معاشرہ جمہوری، ترقی یافتہ اور روشن خیال ہے تو اس کا اخلاقیات، ادب و فن اور عمومی طور پر زندگی کے بارے میں رویہ مختلف ہوگا (جیسا کہ مغربی ملکوں اور بہت حد تک ہندوستان اور جاپان میں ہے) اور اگر معاشرہ نہایت رجعت پسند، دقیانوسی اور قرون وسطیٰ کے خیالات و رجحانات کا حامل ہے (جیسا کہ پاکستان اور دوسرے ممالک) تو وہاں ادب و فن اور پوری زندگی کے بارے میں اس کا طرز فکر مختلف ہوگا ۔ فحش نگاری کے سوال سے بحث کرتے ہوئے ان باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔

سودا کا ایک قلمی دیوان

موسوم بہ "نسخۂ جانسن"

ڈاکٹر نسیم احمد

انڈیا آفس لائبریری لندن کے ذخیرہ مخطوطات میں فہرست نمبر ۱۴۶، پی ۳۵۳ کے تحت کلام سودا کا نہایت عمدہ نستعلیق خط میں لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے جو عام طور پر نسخہ جانسن کے نام سے جانا جاتا ہے یہ نسخہ ۱۳ سطری مسطر کے ۴۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی نقلیں (فوٹو اسٹیٹ، الیکٹرو اسٹیٹ کاپیاں) خدا بخش لائبریری پٹنہ ، مولانا آزاد لائبریری ، علی گڑھ، اتر پردیش اردو اکادمی لائبریری لکھنؤ کے علاوہ بعض اہلِ علم حضرات کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں بھی موجود ہیں۔ راقم نے اردو اکادمی لائبریری ، لکھنؤ میں محفوظ نقل سے استفادہ کیا ہے۔ یہ مُثنیٰ بہت واضح اور ایک حد تک مانند اصل ہے۔ نسخے پر کہیں کاتب کے نام اور کتابت کی تاریخ کا اندراج نہیں۔

اس مخطوطے میں اصل کتاب کے آغاز سے قبل، پہلے ورق پر ایک تصویر ہے جس میں نوابی وضع قطع کا ایک شخص قالین پر بیٹھا ہوا پیچوان پی رہا ہے۔ اس کے پیچھے ایک ملازم نما شخص ہاتھ میں کاغذ لیے کھڑا ہے۔ قالین پر بیٹھے ہوئے شخص کے سامنے ایک کتاب پڑی ہے۔ تصویر کی کوئی تفصیل درج نہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ مسٹر جانسن ، سودا یا کسی نواب یا شہزادے کی ہوگی۔ مرتب "قصائد سودا" ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی کا خیال ہے کہ "غنچہ لا تو قلم دان" کی روایت غالباً تصویر مذکور کی بنیاد پر اختراع کی گئی ہے ۔ چنانچہ لکھتے ہیں ۔ "تصویر میں کوئی تعارفی عبارت نہیں لیکن شاید اسی تصویر سے غنچہ کی روایت پیدا ہوئی ہے" (۱) شیخ چاند مرحوم (متوفی ۱۹۳۶ء) کی کتاب "سودا" (طبع ۱۹۳۶ء) اور ڈاکٹر خلیق انجم کی تصنیف "مرزا محمد رفیع سودا" (طبع ۱۹۶۶ء) میں آغاز کتاب سے پہلے یہ تصویر سودا کے نام سے موجود ہے۔ فرق یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں میں پیچھے کھڑے ملازم اور سامنے رکھی ہوئی کتاب کو تصویر سے حذف کر دیا گیا ہے۔

نسخۂ جانسن کے پہلے ورق کی پشت کے بالائی سرے پر پختہ خط میں ایک انگریزی عبارت اور ورق ۴ پر صاف ستھرے عمدہ نستعلیق خط میں دو فارسی عبارتیں ملتی ہیں۔ ان کے علاوہ دیوان کی ابتدا سے قبل ورق ۲ پر تئیس ۲۳ اشعار کا ایک قصیدہ "ع دیکھا نہ جائے اس سے روئے گل رُخاں پہ رنگ" بھی سودا تخلص کے ساتھ موجود ہے۔ جس پر کوئی عنوان درج نہیں لیکن گریز کے شعر "ع ہے اب مگر وہ ایک کہ جس کا یہ ہے خطاب۔ ممتاز الدولہ فخر جہاں و حسام جنگ" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم ممتاز الدولہ فخر جہاں حسام جنگ کی مدح میں کہی گئی ہے۔ مزید بر آں ایک مدحیہ شعر:۔

"تیری وہ ذات کو تو نہیں ہے شہ فرنگ   کرسی میں تیری پایۂ اورنگ کا ہے ڈھنگ"

سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی انگریز افسر ہی کی تعریف میں کہا گیا ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ افسر جانسن ہی ہو۔ حالانکہ کسی تذکرے یا معاصر تاریخی کتب سے سودا اور مسٹر جانسن کے تعلقات پر روشنی نہیں پڑتی۔

مخطوطے کی مذکورہ انگریزی عبارت کا متن یہ ہے:۔

"Mr. Richard Johnson, the gift of ye auther Sauda"

اور فارسی عبارتیں حسب ذیل ہیں:

دیوان مرزا رفیع سودا، گزرانیدۂ میر حسین صاحب، در بلدۂ لکھنؤ، داخل کتاب خانہ شد

دیوان سرکار نواب صاحب ممتاز الدولہ مفتخر الملک حسام جنگ مسٹر رچارڈ جانسن صاحب دام اقبالہ۔

مسٹر جانسن اور میر محمد حسین کے بارے میں مختلف تذکروں اور تاریخی کتابوں سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اختصار کے ساتھ سطور ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:۔

مسٹر جانسن کا شمار اپنے زمانے کے ذہین انگریز افسروں میں ہوتا تھا، لکھنؤ آنے سے قبل وہ بردوان صاحب کلاں اور بنگال کونسل کا فعال رکن تھا۔ وہ سیاسی ساز باز کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ ۱۷۶۵ء میں میر جعفر کے انتقال کے بعد اس نے ، اُن کے بڑے لڑکے نجم الدولہ معروف بہ میر پھلوری کو، مرشد آباد کے صاحب کلاں مسٹر مڈلٹن کی مدد سے تخت نشین کرایا۔ (۲) اس نواب گری کے معاوضے کے طور پر، جانسن اور اُس کے معاون انگریز افسروں نے نواب نجم الدولہ اور اُس کے وزیروں سے نقد روپیوں کے علاوہ کافی تعداد میں جواہرات ، قیمتی اشیاء اور بیش بہا تحائف حاصل کیے۔ (۳) یہ تحائف ڈائرکٹر کے حکم امتناعی کے باوجود وصول کیے گئے تھے چنانچہ کمپنی نے رشوت لینے کے الزام میں جانسن اور اس کے دیگر ساتھیوں کے خلاف مقدمہ قائم کیا لیکن جانسن اپنی فطانت اور سیاسی اثر و رسوخ کی بدولت اس الزام سے بری ہو گیا۔ علاوہ ازیں جانسن روایتی طور پر ایک ظالم اور مغرور انگریز افسر بھی تھا۔ ایک مرتبہ اپنے کسی نوکر کو مارنے اور اس کے ساتھ بے حد سختی برتنے کی پاداش میں اس پر جُرمانہ بھی عائد کیا گیا تھا اور جب اس نے کورٹ میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا تو حکم عدولی کے جرم میں اُسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ لیکن تین مہینے کی سزا کاٹنے کے بعد جب اُس نے معافی کی ایک تحریری درخواست کورٹ میں گزاری تو اُسے منظور کر لیا گیا(۴)۔

نسلی افتخار اور سیاسی جوڑ توڑ سے قطع نظر، جانسن کی قابلیت، علم دوستی، ادبا پروری، معاملہ فہمی ، رعب اور دبدبے کے واقعات بھی بعض معاصر کتب میں مرقوم ہیں۔

(۱) مرزا ابوطالب اصفہانی، لندنی نے لکھا ہے کہ ۔۔۔۔ "مسٹر جانسن کہ دوم او (مسٹر ایوس (Ives) رزیڈنٹ) بود۔ لیاقت ہمہ کار داشت بہ حدے کہ اہل کاران وزیر (آصف الدولہ) از ترس معاملہ دانیش شب خواب بہ آرام نمی کردند۔ اماچہ فائدہ کہ بہ سبب ناموافقت مسٹر ایوس در کارہا دخل نہ داشت"

(ii) علی ابراہیم خاں خلیل نے نواب محبت خاں محبت (۵) کے ذکر میں لکھا ہے کہ ۔۔۔ "مثنوی موسوم بہ "اسرار محبت" کہ حکایتِ عشق مسمی پنّو [است] بفرمودہ ممتاز الدولہ مسٹر جانسن بہادر منظوم نمودہ"۔ (۶)

(iii) میر قمرالدین منّت ، لالہ رام جس متخلص بہ محیط و مغموم اوران کے چھوٹے بھائی لالہ جواہر سنگھ رام وغیرہ بھی جانسن کی سرکار سے وابستہ تھے (۷)۔ "مخطوطات انجمن ترقی اردو" کراچی، پاکستان، کے مرتبین نے جانسن کی سرکار میں رام جس محیط کے توسّل کی تقریب کا ذکر اور جانسن کے ادب نوازی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ "یہ وہی جانسن صاحب ہیں جن کو دربار لکھنؤ سے ممتاز الدولہ کا خطاب ملا تھا۔ جانسن صاحب بڑے ادب پرور تھے۔ لکھنؤ میں رہے تو اس صفت میں نیک نام رہے اور بنارس چلے گئے تو وہاں بھی رام جس محیط وغیرہ اُن کے متوصل رہے۔" (۸)

یہ اطلاع کہ "جانسن بنارس چلے گئے" غلط اور مبنی بر سہو ہے۔ اصلاً محیط "داروغۂ پرمٹ" ہو کر بنارس چلے آئے تھے اور یہیں ۱۱۹۹ھ میں علی ابراہیم خاں خلیل سے اُن کی ملاقات ہوئی تھی۔ خلیل کے الفاظ یہ ہیں:۔ "از دل برداشتگاں سموم عشق و منسلکان سرکار ممتاز الدولہ مسٹر جانسن بہادر [بودہ] است ۔ بعد ازاں بہ سر رشتہ داری پرمٹ ضلع بنارس مامور است۔ در ۱۱۹۹ھ باراقم آثم در بنارس ملاقی شدہ" (۹) ۔

(iv) لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے بھی اپنی ایک کتاب "تنمیق شگرف" مسٹر رچرڈ جانسن کے نام معنون کی تھی۔ اب یہ کتاب نایاب ہے۔ (۱۰)

(v) میر قمر الدین منّت نے ۱۱۹۶ھ میں مشہور پنجابی قصہ "ہیر رانجھا" کو "ہیر رانجھن" کے عنوان سے فارسی زبان میں نظم کر کے اپنے مربی مسٹر رچرڈ جانسن کے نام معنون کیا۔ (۱۱)

(vi) انڈیا آفس لندن کے شعبۂ ہندوستانی میں ۹۲ صفحات پر مشتمل نوطرز مرصّع کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ یہ کتاب مکمل نہیں بلکہ اس میں پہلے درویش کی کہانی تک، داستان کا ابتدائی حصہ ہی ہے ۔ اس کے صفحہ اول پر مندرج ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ لکھنؤ میں محمد بخش خاں نام کے کسی کاتب نے "سرکار نواب صاحب ممتاز الدولہ ، مفخر الملک حسام جنگ مسٹر رچرڈ جانسن صاحب دام اقبالہ" کی لائبریری کے لیے تیار کیا تھا۔ یہ نسخہ انیسویں صدی عیسوی کا مکتوبہ بتایا جاتا ہے۔ (۱۲)

میر حسین ایک نسبتاً غیر معروف شخصیت ہیں۔ نسخۂ جانسن کے اندراجات کے پیش نظر ہمارا قیاس یہ ہے کہ وہ بہ حیثیت دیوان مسٹر جانسن کی سرکار سے متوسل تھا دوسرے مآخذ کے مطابق اُن کا پُورا نام میر محمد حسین تھا۔ وہ انگریزوں سے بہت زیادہ ربط ضبط رکھتے تھے اس لیے عرف عام میں فرنگی کے لقب سے مشہور تھے۔ نواب آصف الدولہ نے ہارپر کے نام اپنے شکایت نامے میں جانسن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس (مسٹر جانسن) نے میر محمد حسین سے بہت زیادہ ربط ضبط بڑھا رکھا ہے اور حسب منشا اس (میر محمد حسین) کے لیے وظیفہ مقرر کرا کر جتنی رقم چاہتا ہے اس کے نام سے خود وصول کرتا ہے۔ (۱۳)

۱۹۴۸ء میں جب جانسن رزیڈنٹ کی حیثیت سے حیدر آباد گیا تو میر محمد حسین بھی وہاں پہنچ گیا۔ جانسن کے بعد میر محمد حسین کا بھی اودھ چھوڑ کر حیدر آباد چلے جانے پر سرکار اودھ نے میر مذکور کا وظیفہ بند کر دیا تھا۔ جانسن نے (نواب کے نام) اپنے ایک خط میں لکھا کہ میر محمد حسین حیدر آباد آنے پر رضامند اس وقت ہوا جب گورنر جنرل نے اسے یقین دلایا کہ اس کا سرکاری (اودھ کا) وظیفہ باقاعدگی کے ساتھ ملتا رہے گا۔ لیکن نواب نے اپنے خط میں اس بات کی تردید کی کہ ریذیڈنٹ (گورنر جنرل) کے ساتھ اس کا اس قسم کا کوئی معاہدہ ہوا ہے۔ کمپنی نے بھی گورنر جنرل اور کونسل کی ہدایت کے مطابق میر محمد حسین کے وظیفے کی رقم (جو ۳۳،۳۲ روپے پر مشتمل تھی) نواب سے طلب کی۔ نواب آصف الدولہ نے عذر پیش کیا اور کمپنی کو لکھا کہ اس طرح کا کوئی معاملہ سرکار اودھ اور گورنر جنرل کے بیچ نہیں ہوا ہے۔ لیکن کمپنی بار بار اپنا مطالبہ دہراتی رہی اور جانب داری میں یہ کہتی رہی کہ حیدر آباد کے قیام کے دوران میر محمد حسین نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور سات سو روپے ماہوار جو کمپنی میر مذکور کو دیتی رہی ہے اسے سرکار اودھ ہی سے وصول کیا جائے گا۔ لیکن جب لارڈ کارنوالس گورنر جنرل ہوئے تو انہوں نے اس مطالبے کو باطل قرار دے دیا اور یہ ہدایت کی کہ اس (وظیفہ کے) مد میں سرکار اودھ سے جو رقم وصول کی گئی ہو وہ کمپنی کے حساب میں شامل کر لی جائے۔ (۱۴)

مرزا علی لطف کے ایک بیان سے بھی جانسن اور میر محمد حسین کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ تذکرہ نگار موصوف میر قمرالدین منت کے حالات میں "ویرانی شاہجہاں باد" کے بعد لکھنؤ میں اُن کے ورود کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "میر محمد حسین فرنگی لقب کی باد فروشی کے سبب مشتاق اُن کا وہاں ایک زمانہ ہوا۔ بعد چندے مربّی گری سے میر مذکور کے، ممتازالدولہ مسٹر جانسین بہادر کی سرکار میں توسُّل انہوں نے حاصل کیا۔" (۱۵)

تذکرہ "ریاض الوفاق" کے مصنف ذوالفقار علی مست نے میر محمد حسین سے کلکتے میں اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور "خلاصۃ الافکار" کے حوالے سے ان کے بارے میں چند اطلاعات فراہم کی ہیں وہ لکھتے ہیں کہ میر محمد حسین عربی و فارسی کے علاوہ علم طب، علم ریاضی اور علم طبیعی سے واقف ہیں۔ اُن کا مولد لکھنؤ ہے۔ دکن گئے تھے، سخت بیمار ہو کر وطن روانہ ہوئے بنارس کے قریب ۱۲۰۵ھ میں فوت ہوئے۔ صاحب دیوان شاعر ہیں ۔ اُن کے دیوان میں تقریباً چھ ہزار ابیات ہیں لیکن کسی شعر میں تخلص موجود نہیں۔ (۱۶)

مصحفی نے اپنے تذکرے "عقد ثریا" کے آخر میں "خاتمہ" کے زیر عنوان دو ایسے "دانش مندوں" کا ذکر کیا ہے جو "بمقتضائے موزونی طبع" کچھ کہہ لیا کرتے تھے لیکن اس سے "اظہار کمال شاعری" مقصود نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا تھا۔ اُن میں دوسرے "دانش مند" کے ذکر میں "میر محمد حسین لندنی" کا عنوان قائم کر کے فارسی کا ایک شعر نقل کر دیا گیا ہے(۱۷) ممکن ہے کہ مصحفی نے "لندنی" یہاں "فرنگی" کے بدل کے طور پر استعمال کیا ہو اور اس سے مراد یہی میر محمد حسین ہوں ۔

نسخۂ جانسن کو اردو دنیا سے روشناس کرانے کا سہرا شیخ چاند مرحوم کے سر ہے۔ انہوں نے اس کا تعارف اپنی کتاب "سودا" (مطبوعہ ۱۹۳۶ء) میں قدرے تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ یہ دیوان "سودا کی زندگی کا لکھا ہوا ہے ـــ اور بہ طور تحفہ لکھنؤ کے رزیڈنٹ اور شاعر کے ممدوح جانسن کو دیا گیا تھا ــــ یہ بہت ہی خوبصورت نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے ـــ جانسن کی مدح میں سودا نے ایک قصیدہ بھی لکھا ہے ـــ اس سے ظاہر ہے کہ یہ (نسخہ) خاص طور پر جانسن کی نذر کرنے کے لیے تحریر کیا گیا تھا ـــ بہت صحیح اور مستند نسخہ ہے۔ (۱۸)

شیخ چاند مرحوم کے محولہ بالا مفروضے کی بنیاد پر محققین اور علمائے ادب نے بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے نسخہ مذکور کو کلام سودا کا واحد مستند نسخہ باور کرلیا، چنانچہ پاکستان میں ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے اس کو بنیاد بنا کر "کلیات سودا" مرتب کیا جسے 'مجلس ترقی ادب' لاہور، نے چار جلدوں میں شائع کیا(۱۹)۔ اور ہندوستان میں ڈاکٹر محمد حسن نے اس نسخے کی مبینہ غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر املا اور خط کی تمام خصوصیتوں کو علیٰ حالہ قائم رکھتے ہوئے نہایت اہتمام کے ساتھ اس کی کتابت کرائی اور ماڈل ٹاؤن دہلی سے چھپوا کر عام کیا۔ جناب رشید حسن خاں نے اسی کی بنیاد پر "انتخاب سودا" کے نام سے سودا کے منتخب کلام کا مجموعہ ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا جو ۱۹۷۲ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا۔ علاوہ بریں ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق اور ڈاکٹر خورشید الاسلام نے بالترتیب "قصائد سودا" "غزلیات مرزا محمد رفیع سودا" اور انتخاب "کلام سودا" کی تدوین اور ترتیب میں اس نسخے سے استفادہ کیا ہے۔

قاضی عبدالودود مرحوم اردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، ڈاکٹر محمود شیرانی کے بعد اردو تحقیق نے جس قدر بھی وقار حاصل کیا ہے وہ تمام تر قاضی صاحب کی دیانت دارانہ محنتوں کا ثمرہ ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں نسخۂ جانسن کے بارے میں ایک حد تک شیخ چاند مرحوم کے قول کا ہی اعادہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "یہ وہ نسخہ ہے جو سودا نے رچرڈ جانسن نائب رزیڈنٹ اودھ کو اپنی موت سے دو چار سال قبل دیا تھا۔"(۲۰)

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی تصنیف "مرزا محمد رفیع سودا" میں لکھا ہے کہ "وہ یہ نسخہ ہے جسے سودا نے رچرڈ جانسن کی خدمت میں پیش کیا تھا ـــ یہ کلیات سودا کے معتبر ترین نسخوں میں ہے ـــ" (۲۱)

جناب رشید حسن خاں کا شمار عصر حاضر کے ژرف بیں اور سنجیدہ محققین میں ہوتا ہے۔ اُن کے تحقیقی اور علمی کارناموں کے مطالعے سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ تحقیق میں شرک گوارا نہیں کرتے، نہ ہی سہل انکاری اور عجلت کے قائل ہیں۔ سنسنی خیز اور سنی سنائی باتوں پر ایمان لانا مذہب تحقیق کے منافی خیال کرتے ہیں، لیکن چونکہ انسان خطا و نسیاں سے مرکب ہے اس لیے اُس سے بھول چوک اور غلطیوں کا سرزد ہو جانا بہر حال بعید از امکان نہیں۔ یہاں زیر تبصرہ مخطوطے کے بارے میں اُن کے غیر محقق بیان کو سامنے رکھ کر یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ موصوف

نے محض سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے اسے معتبر ترین نسخے کا درجہ دے دیا ہے۔ انہوں نے مختلف مقامات پر اپنے اس مفروضے کی پرزور حمایت کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں:۔

(i) "یہ نسخہ ۔۔۔۔ الحاقی کلام سے پاک ہے۔" (۱۔ مقدمہ "انتخاب سودا" ص ۳۰ ۲۔ ادبی تحقیق ص ۱۷ از سید حسن خاں مسائل اور تجزیہ)۔

(ii) اس کی مدد سے کلام سودا کے متن کی تصحیح بخوبی ممکن ہے۔ (مقدمہ "انتخاب سودا" ص ۳۰ ۔

(iii) "کلام سودا کا (بہ لحاظ صحت متن و انتساب متن) اہم ترین اور معتبر ترین خطی نسخہ وہ ہے جو انڈیا آفس لائبریری ، لندن میں محفوظ ہے۔ اس کی کتابت سودا کی زندگی میں ہوئی تھی ۔۔۔۔ تکمیل ۱۱۹۳ھ تا ۱۱۹۵ھ میں ہوئی تھی ۔۔۔۔ یہ نسخہ سودا کے ایک ممدوح رچرڈ جانسن کی نذر کیا گیا تھا ۔۔۔" (ادبی تحقیق ص ۱۳۰)

(iv) جس (نسخۂ جانسن) کی کتابت سودا کی زندگی کے بالکل آخری زمانے میں ہوئی تھی۔ یہ بیش قیمت خطی نسخہ سودا کے ایک ممدوح رچرڈ جانسن کو نذر کیا گیا تھا، جو اودھ میں نائب رزیڈنٹ اور قائم مقام رزیڈنٹ رہ چکا ہے۔" (مقدمہ "انتخاب سودا" ص ۲۹، ۳۰)

(v) "اردو ادب پر جانسن کا یہ احسان ہے کہ اس کی بدولت کلام سودا کا اہم ترین نسخہ وجود میں آیا اور محفوظ رہا۔ ایسا نسخہ جس کو پیش نظر رکھے بغیر تصحیح و تدوین کا کام انجام دیا ہی نہیں جا سکتا۔ اب تک دریافت شدہ نسخوں میں صحت متن کی بنیاد پر یہ واحد مخطوطہ ہے جس کو تدوین کی بنیاد بنایا جانا چاہیے۔ (مقدمہ "انتخاب سودا" ص ۳۲)

ڈاکٹر محمد حسن نے نسخۂ جانسن کے مشمولات کو "کلیاتِ سودا" (جلد اوّل) کے نام سے اس کے اصل خط اور ترتیب کے مطابق شائع کیا۔ مقدمے میں اُن کا ارشاد ہے کہ :۔

(i) "یہ نسخہ مصنف کی زندگی میں مرتب ہوا اور لکھنؤ ہی میں ایک اہم شخصیت کو پیش کیا گیا، عین ممکن ہے سودا نے پیش کیا ہو یا اُس کی ایما سے پیش کیا گیا ہو۔" (مقدمہ "کلیات سودا" جلد اوّل ص ۳۱)

(ii) "۔۔۔۔ اس مخطوطے سے مقابلے کے بعد سودا کے متعدد اشعار کی صحیح قرأت تک بھی رسائی ممکن ہے۔" (ایضاً ص ۳۱)

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں مرتب نے صرف ایک شعر اور نسخہ آسی سے پیش کیا ہے جس میں "صورت دیبا" کو "صورت زیبا" بنا دیا گیا ہے ۔ لیکن یہ اختصاص صرف نسخہ جانسن کے متن تک محدود نہیں بلکہ قدیم ترین مطبوعہ ایڈیشن "نسخۂ مصطفائی" میں صحیح متن "دیبا" ہے جو بعد کے مراحل میں دُنیا" اور "زیبا" میں بدل گیا۔ مرتب نے اپنے اس ادعا سے قبل اسی کلیات کے پیش لفظ میں یہ لکھا ہے کہ ممکن ہے میر محمد حسین نے جانسن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ مخطوطہ اس (جانسن) کے کتب خانے میں داخل کرایا ہو (ایضاً) ڈاکٹر موصوف کا یہ بیان بھی دُرست نہیں کہ یہ نسخہ ۱۱۹۲ھ کے لگ بھگ مرتب ہوا ۔ (ایضاً ص ۳۰) غالباً شیخ چاند ایم۔ اے ۔ ایل ایل ۔

بی (متوفی ۱۹۳۶ء) کے بیان پر قاضی صاحب مرحوم کی مہر تصدیق کے بعد مزید تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور حُسنِ ظن کی بنا پر یہ بات بار بار دہرائی جاتی رہی کہ یہ نسخہ جو رزیڈنٹ یا نائب رزیڈنٹ کو سودا نے نذر کیا تھا، سب سے معتبر نسخہ ہے اور یہ کہ اس کی کتابت ۱۱۹۳ھ تا ۱۱۹۵ھ کے درمیان ہوئی ہے وغیرہ وغیرہ۔

راقم سطور نے زیر بحث "دیوان سودا" کے متن کا مقابلہ ملک اور بیرون ملک میں موجود کلام سودا کے کئی معتبر اور قدیم نسخوں سے کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کاتب دیوان خوش خط اور پڑھا لکھا ہونے کے علاوہ جعل سازی کے فن میں بھی مہارت تامہ رکھتا ہے۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے الفاظ و حروف میں جابجا اس طرح ترمیمیں کی ہیں کہ سرسری طور پر اُن کی گرفت نہیں کی جا سکتی ۔ کاتب کی اس جعل سازی کی وجہ سے ہمارے محققین اور علمائے فن تدوین نے نسخہ مذکور کے بارے میں غلط آرا قائم کی ہیں اور گمراہ کن مفروضے پر اپنی تحقیق و تدوین کی بنیادیں رکھی ہیں۔ یہاں مذکورہ بالا دعوے کی تائید میں چند تحقیقی معروضات پیش کیے جائیں گے، بعد ازاں "دیوان" کے محرّف و الحاقی کلام، نظموں کے غلط انتسابات اور اغلاط املا و کتابت پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے گی۔

(i) دیوان کے پہلے ورق کی پشت کے بالائی سرے پر منقول انگریزی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ کتاب مرزا محمد رفیع سودا نے مسٹر جانسن کو تحفتہً دی تھی۔ لیکن خود پیش کی تھی یا کسی کے توسّط سے، یہ واضح نہیں ۔ دراصل انگریزی خط کے انداز اور جائے تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عبارت بعد کی ہے اور کسی ایسے شخص کا اضافہ ہے جس سے فارسی عبارات کو سمجھنے میں تسامح ہوا ہے۔ اس کے برعکس فارسی عبارتیں کاتب متن کے قلم سے اسی خط اور روشنائی میں لکھی ہوئی ہیں۔ مزید بر آں فارسی الفاظ "گزرانیدۂ میر حسین صاحب" سے اوّل تو انگریزی عبارت کی تردید ہوتی ہے دوئم اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ "دیوان مذکور" سودا نے نہیں ، میر حسین نامی ایک شخص نے جانسن کو پیش کیا تھا۔

(ii) جانسن کا پورا نام رچرڈ جانسن تھا۔ عام طور پر مسٹر جانسن کے نام سے جانا جاتا ہے اور اسی نام سے تاریخی کتابوں میں اس کے حالات درج ہیں۔ میر حسین کو اس کی سرکار میں غیر معمولی رسوخ حاصل تھا اور اپنی "بادفروشی" کے سبب عوام میں "فرنگی" لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ مسٹر جانسن اور میر حسین کے اس باہمی رشتے کے پیش نظر غالب گمان یہی ہے کہ صاحب بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ دیوان میر مذکور نے انہیں دیا ہو گا۔

(iii) فارسی عبارات میں جانسن کا ذکر خطابات (ممتاز الدولہ مفتخر الملک حسام جنگ صاحب بہادر) کے التزام کے ساتھ کیا گیا ہے لیکن سودا (متوفی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) کی زندگی میں لکھی گئی کسی کتاب میں جانسن کے نام کے ساتھ خطابات مذکور نہیں۔ حیدر آباد کے قیام کے زمانے (۱۷۸۴—۸۶ء) کی تحریروں سے بھی اس کے خطاب یافتہ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ "خیابان آصفی" کے مؤلف مانک راؤ وٹھل راؤ نے کتاب کے آخر میں مملکت آصفیہ حیدرآباد کے کل سرسٹھ ۶۷ رزیڈنٹوں کا ایک چارٹ دیا ہے اور فٹ نوٹ میں اُن کے خطابات کی نشان دہی کا التزام کیا

ہے لیکن انہوں نے بھی جانسن کے کسی خطاب کا ذکر نہیں کیا ہے (۲۲)۔

(iv) مشہور معاصر تاریخ نویس اور مصنف ابوطالب اصفہانی لندنی ، جانسن کا بڑا مداح ہے۔ اس نے اپنی تالیف "وقائع زماں نواب آصف الدولہ" معروف بہ "تاریخ آصفی" میں ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء تک کے سیاسی اور معاشی حالات قلم بند کیے ہیں۔ وہ جانسن کے علم و فراست کا ذکر اور اس سے اپنے قلبی تعلق کا اظہار کرتا ہے لیکن اس کے کسی خطاب کا تذکرہ اس کے یہاں بھی موجود نہیں۔ پوری کتاب میں اس نے جانسن کے لیے مسٹر جانسن لکھا ہے جب کہ ایک دوسرے انگریز افسر وینسٹیارٹ کا نام خطاب کے ساتھ لکھا ہے ۔ کتاب مذکور کی عبارت دیکھیے:۔

"مسٹر وینسٹیارٹ ہوشیار جنگ اور مسٹر جانسن اس سفر میں جنرل کے ساتھ تھے" (۲۳)

یہاں صرف مسٹر جانسن لکھنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مصنف اس کے خطابات سے ناواقف تھا۔

(v) ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء سے ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۱ء تک لکھنؤ میں جانسن کے زوال کا زمانہ تھا۔ بیگمات اودھ اور نواب کے ساتھ اس کے تعلقات نہایت کشیدگی اختیار کر چکے تھے۔ نواب آصف الدولہ نے تنگ آکر جانسن کی بدعنوانیوں کی شکایت اس وقت کے رزیڈنٹ مسٹر ہارپر سے کی تھی، نتیجے کے طور پر ۱۷۹۲ء میں اسے اپنے عہدے سے الگ ہونا پڑا تھا۔ ایسی صورت میں سرکار اودھ کی جانب سے اس کا خطابات سے نوازا جانا نیز نواب کے ایک معتمد علیہ درباری شاعر کا جانسن کی مدح میں قصیدہ لکھنا اور اپنا دیوان نذر کرنا بعید از قیاس معلوم پڑتا ہے۔

(vi) مسٹر جانسن کی فرمائش پر لکھی گئی مثنوی موسوم بہ "اسرار محبت" کا سنہ تصنیف ۱۱۹۷ھ ہے۔ اس مثنوی میں فرمائش کنندہ کو نکتہ داں، شفیق ، قدرداں، مہرباں، والامناقب۔ فخر فرنگستان وغیرہ صفات سے مُتصف کیا گیا ہے لیکن مسٹر جانسن بغیر کسی اعزازی نام کے ساتھ نظم کیا جانا اس دعوے کی قوی دلیل ہے کہ اس وقت تک جانسن کو کوئی خطاب نہیں ملا تھا۔

(vii) تذکرہ گلزار ابراہیم پہلی تاریخی دستاویز ہے جس میں 'مسٹر جانسن' کے نام سے قبل "ممتاز الدولہ" اور بعد میں "بہادر" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یعنی "ممتاز الدولہ مسٹر جانسن بہادر" لیکن "مفتخر الملک حسام جنگ" یہاں بھی موجود نہیں۔ تذکرے میں موجود داخلی قرائن سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس کی تکمیل ۱۱۹۹ھ/۸۵-۱۷۸۴ء کے بعد ہی کسی سال میں ہوئی ہوگی۔

(viii) انڈیا آفس لائبریری ، لندن میں موجود "نوطرز مرصع" کے صفحہ اول پر جانسن کا پورا نام سرکار نواب صاحب ممتاز الدولہ مفتخر الملک حسام جنگ مسٹر رچرڈ جانسن صاحب دام اقبالہ" لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ انیسویں صدی عیسوی کا مکتوبہ بتایا گیا ہے (۲۴)۔

(ix) اصفہانی کے ایک بیان کے مطابق ۱۷۸۶ء میں حیدر آباد میں رزیڈنٹ کے عہدے سے مستعفی ہونے کے بعد جانسن لکھنؤ چلا آیا اور اودھ میں مسٹر ایوس (Ives) کے رزیڈنٹ مقرر ہونے پر وہ دوبارہ رزیڈنٹ کا نائب بنا۔ اس مرتبہ

نواب کے ساتھ اس کے تعلقات نسبتاً بہتر رہے۔ راقم کا خیال ہے کہ اسی زمانے میں جانسن کو خطابات عطا ہوئے ہوں گے اور میر حسین نے یہ نسخہ اس کی نذر کیا ہو گا۔

(x) ذوالفقار علی مست نے کلکتے میں جس میر محمد حسین سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور جو اطلاعات بہم پہنچائی ہیں اُن کی روشنی میں یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ یہی وہ میر حسین ہے جو فرنگی یا لندنی کے لقب سے مشہور تھا اور جانسن سے منسلک تھا۔ اور جس نے زیر بحث دیوان اس کی نذر کیا تھا۔ تذکرہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ میر محمد حسین کا دیوان چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور کسی شعر میں تخلص موجود نہیں۔ "عقد ثریا ، کے آخر میں "دانش منداں" کے زیر عنوان جس میر محمد حسین کا ایک فارسی شعر نقل ہے وہ یقیناً یہی میر حسین ہیں مصحفی نے بھی لکھا ہے کہ یہ "دانش مند" تخلص نہیں رکھتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ مستنبط کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ یہ شخص شاعر بے تخلص تھا اس لیے اُس نے اپنے شاعرانہ کمال کا مظاہرہ کرنے کے لیے شاعر کی زبان و بیان میں تبدیلیاں کیں اور یہ کہ سودا کے مرتبے کا قصیدہ لکھنے کے زعم میں یا محض تفنُّن طبع کی خاطر اس ہی کی زمین میں رچرڈ جانسن کی مدح کہہ کر اس میں سودا تخلص شامل کر دیا۔

ا۔ "تحریفات"

سودا کے کلام میں ترمیم و تحریف کا سلسلہ اُن کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا چنانچہ میر حسن نے اُن کے ایک شاگرد معین بدایونی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ: "دیون استاد خود را موافق طبع خود درست می کند و سخن خود را سر سبز می نماید" (تذکرۂ میر حسن ص ۱۸۷ مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۹۲۲ء) معاصر تذکروں میں ایسے متعدد اشعار موجود ہیں جن کا متن کلام سودا کے کسی قدیم نسخے کے متن سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مثال کے طور پر میر کے تذکرے میں ایک شعر اس طرح نقل ہوا ہے:۔

"موج نسیم گرد سے آلودہ ہے نیٹھ ‍ ‍ ‍ دل خاک ہو گیا ہے کسی بے قرار کا" (۲۵)

جب کہ دوسرے تمام قدیم مآخذ میں مصرع اوّل کی شکل یہ ہے "ع موج نسیم آج ہے آلودہ گرد سے"

سودا نے مندرجہ ذیل اشعار قطعہ میں غالباً اسی طرح کی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہے جو کچھ نظم و نثر عالم میں ‍ ‍ ‍ زیر ابرو میر صاحب ہے
ہر ورق پر ہے میر کے اصلاح ‍ ‍ ‍ لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے

تذکروں میں اس قسم کے اختلافات متن کی مثالیں بکثرت موجود ہیں لیکن انہیں حتمی طور پر ناقلین کے ارادی تصرف کا نتیجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے برخلاف نسخۂ زیر بحث کے متعلق وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں دیدہ و دانستہ تحریفیں کی گئی ہیں۔

ان تحریفوں کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے۔

(i) الفاظ کے معمولی رد و بدل کے ذریعے زبان کو سہل بنانے یا قدیم اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(ii) کسی شعر کو بزعم خود زیادہ چُست اور بامعنی بنانے یا مضمون میں جدت پیدا کرنے کی غرض سے کسی خاص لفظ یا ترکیب کو بدل دیا گیا ہے۔

یہ تبدیلیاں اتنی صفائی سے کی گئی ہیں کہ ہمارے بعض ممتاز محققین تک اُن کی گرفت سے قاصر رہے ہیں۔ مثلاً:۔۔

(۱) سودا کے تمام قدیم مآخذ میں ایک مصرع کی شکل یہ ہے "ع دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار" لیکن زیر بحث نسخے کے کاتب نے "مصر کا بازار" کی جگہ "مصر کے بازار" کر دیا ہے جسے "مصر کی بازار" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

(۲) ایک اور مصرعے "نہ پہنچے دل ستی ہرگز زباں تلک یک حرف" میں زبان کے قدیم اثرات کو زائل کرنے کی غرض سے متن کو یوں بدل دیا گیا ہے ع "کبھو نہ پہنچ سکے دل سے تا زباں یک حرف"

(۳) ایک اور شعر قدیم نسخوں میں اس طرح نقل ہے ۔۔۔ "ایک شب آ، کوئی دلسوز نہ رویا اس پر شمع تک گور ہماری سے جلی دور سدا" نسخۂ جانسن میں دوسرا مصرع بہ ادنیٰ تصرف اس طرح لکھا گیا ہے ع "شمع بھی گور ہماری پہ جلی دور سدا"

(۴) فارسی کے مشہور شاعر حافظ کی ایک غزل کو سودا اور بیدار دونوں نے تضمین کیا ہے۔ دیوان حافظ، دیوان بیدار اور کلام سودا کے قدیم نسخوں میں غزل مذکور کا ایک مصرع اس طرح ملتا ہے ع جز ایں قدر نتواں گفت در جمال تو عیب" لیکن نسخۂ جانسن میں "گفت" کو بدل کر "یافت" کر دیا گیا ہے۔

(۵) میر کی بھی ایک غزل سودا کے یہاں مخمس میں تضمین ہوئی ہے۔ 'دیوان میر' کے تمام نسخوں اور کلام سودا کے قدیم نسخوں میں میر کی غزل کا ایک مصرع اس طرح لکھا ہوا ہے ع "خاک کِن کِن کی ہوئی صرف، بنا کیا کیا کچھ" لیکن نسخۂ زیر بحث میں اس کی شکل یہ ہو گئی ہے "ع خاک کن کن کی ہوئی، ظرف بنا کیا کیا کچھ" یہاں یہ محرف متن بہ اعتبار معنی غلط ہے۔

(۶) اسی طرح تاباں کی ایک غزل کے خمسے میں بھی اس کے کئی مصرعوں میں تبدیلیاں کی گئی ہیں مثال کے طور پر تاباں کا ایک مصرع "دیوان تاباں" اور دیوان سودا کے قدیم قلمی، مطبوعہ نسخوں کے علاوہ بیشتر تذکروں میں اس طرح ملتا ہے "ع بیاں کیا کروں ناتوانی میں اپنی" لیکن نسخۂ جانسن میں تصرف کے ساتھ یوں لکھا گیا ہے "ع وے کیا کہوں ۔۔۔ الخ"

اس غزل کے دوسرے مصرعے "مری خاک پر لوگ رکھتے ہیں گل کو" میں "خاک" کی بجائے "گور" کر دیا گیا ہے۔ ذیل میں مختلف اصناف سخن سے ایسے ہی کچھ اور منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں تاکہ نسخۂ جانسن اور قدیم

نسخوں (اصل متن) کا فرق واضح تر ہو جائے۔: ———————

الف "غزلیات" نسخۂ جانسن	نسخہ ہائے قدیم
۱۔ اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن جب چشم کھلے گل کی تو موسم ہو خزاں کا	۱۔ - - - - - - - - - - - - جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا
۲۔ دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کے بازار لیکن نہیں خواہاں کوئی وہاں جنس گراں کا	۲۔ - - - - - - - - - مصر کا بازار ———————
۳۔ اے برق کس طرح سے میں حیراں ہوں تجھ کنے نقشہ ہے ٹھیک دل کے مرنے اضطراب کا	۳۔ حیراں ہوں کس طرح ستی اے برق تجھ کنے ———————
۴۔ کبھو نہ پہنچ سکے دل سے تا زباں یک حرف اگر بیاں کروں طالع کی نارسائی کا	۴۔ نہ پہنچے دل ستی ہرگز زباں تلک یک حرف ———————
۵۔ ایک شب آ، کوئی دلسوز نہ رویا اُس پر شمع بھی گور ہماری پہ جلی دور سدا	۵۔ ——————— شمع تک گور ہماری سے جلی دور سدا
۶۔ یہاں تک ہوں میں ضعیف کہ کہتے ہیں میرے عضو باریک ناتواں ہے اب اُس کی کمر کہ ہم	۶۔ یہاں تک گداز غم ہوں کہ کہتے ہیں میرے عضو ———————
۷۔ ہزار حیف کوئی باغ میں نہیں سنتا چمن چمن پڑی کرتیں ہیں بلبلاں فریاد	۷۔ ہزار حیف کوئی باغ میں جو سنتا ہو ———————
۸۔ نہ میرے دل کی خموشی ہے موجب آرام کبھو ہوا ہے، کرے مرغ نیم جاں فریاد	۸۔ نہ میرے دل کو خموشی ——— الخ ———————
۹۔ عقل نے ایک دن آ کر یہ کہا سودا سے پاس یا ہم سے رہا کیجئے یا ہم سے دور	۹۔ - - - - - - - - - - - - خواہ نزدیک ہمارے رہو، خواہ ہم سے دور
۱۰۔ منہ تو مجھے لگاوے تو کب جام کی طرح اتنا بھی واہ واہ میسر ہو گر کہیں	۱۰۔ منہ تو کہاں لگوں ہوں تیرے جام کی طرح ———————
۱۱۔ تو تو اس معنی سے کیا شاد ہوا ہووے گا پوچھیے اہلِ دلوں سے کہ وہ کیا کہتے ہیں	۱۱۔ تو تو اس معنی کو سُن شاد ہوا ہووے گا پوچھیے --- دلوں سے --- (۱)
۱۲۔ خانۂ مشرب کی دیکھ تازہ بنا کو میرے کہتے ہیں نت ساکن دیر و حرم واہ واہ	۱۲۔ دیکھ کے تازی بنا، خانۂ مشرب کی مجھ (۲) ———————

۱۳۔ مستی سے اس نگاہ کی ۔ لے محتسب خبر
دنیا تمام بزم خرابات ہو گئی

۱۴۔ سودا سے یہ کہا میں کچھ ذکر کر کسی کا
خاموشی نے تو تیری، عالم کا جی لیا ہے

۱۵۔ سمجھے اگر تو اتنا یہ زندگی مرض ہے
ہو درد جس طرح کا پھر وہ تجھے دوا ہے

۱۶۔ نامے کا غور سے ٹک میرے جواب لکھنا
الشائے ظاہری کے باطن میں مدعا ہے

(ب) "قصائد"

۱۷۔ فراہم زر کا کرنا باعث اندوہ دل ہووے
نہیں کچھ جمع سے غنچے کو حاصل جز پریشانی

۱۸۔ بہ رنگ شیشہ سے وقت اشک ریزی کے
گلے سے پڑتی ہے دل تک مرے ہزار گرہ

۱۹۔ ہے غرض اس نظم سے اتنی ہی کچھ تا کیجے
عرض اپنے حال کا نزد شہ ہر دو جہاں

۲۰۔ عجب نہیں ہے کہ جاتی رہی ہو دنیا سے
زبس خوشی نے مرے دل سے اب کیا ہے فرار

۲۱۔ دلا اس اپنے غم دل کو نت غنیمت جان
بدل خوشی سے تو اس دور میں نہ کر زنہار

۲۲۔ کسو سے یہاں غم دل یوں نہ لے گیا دوراں
کہ شادی مرگ کیا ہو نہ اس کو آخر کار

۲۳۔ نہیں ہے شادی بے غم چمن میں دنیا کے
کہ چاک کرکے گریباں ہنسے ہے گل اے یار

۲۴۔ سنی میں ایک غزل بلبل طبیعت سے
کہ دل کے لخت گرے چشم سے ہزار ہزار

۲۵ زمیں، وہ نور سے اس مرتبہ ہے مالا مال

۱۳۔ گردش سے ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

۱۴۔ - - - - - - - - - - -
تیری خموشی نے تو عالم کا جی لیا ہے

۱۵۔ - - - - - - - - - - - -
ہو زہر جس طرح کا ---- الخ

۱۶۔ نامے کا ٹک سمجھ کے میرے جواب لکھیو

۱۷۔ - - - - - - - - - - - -
حصول جمع سے غنچے کو، آخر ہو پریشانی

۱۸۔ - - - - - - - - - - - -
گلے سے پڑتی ہے دل تک ہزار بار گرہ

۱۹۔ - - - - - - - - - - - -
عرض اپنے حال کی نزد --- الخ

۲۰۔ - - - - - - - - - - -
- - - - - - - کیا ہے کنار

۲۱۔ دل تو اپنے غم دل کو اب غنیمت جان

۲۲۔ کسو ہی سے غم دل یوں نہ ---- الخ

۲۳۔ - - - - - - - - - - - -
کہ گل ہنسے ہے گریبانِ پیرہن کو پھاڑ

۲۴۔ - - - - - - - - - - - -
کہ لخت دل گرے آنکھوں ستی ہزار ہزار

۲۵۔ ہے اس قدر وہ زمیں نور سیتی مالا مال

کہ جس کی رات کے آگے نہیں ہے دن کو قرار
۲۶۔ اسی ہی غم سے جہاں میں ظہور کرتی ہے صبح
ہمیشہ پنجۂ خورشید اپنی جیب پہ مار
۲۷۔ انجم تگرگ وار زمیں پر ٹپک پڑیں
صدمہ ٹک اس سے پہنچے اگر آسماں تلک
۲۸۔ نہیں ہے کام مجھے شعر و شاعری سے و لے
خرد نے مجھ کو نصائح سے بار ہا یہ کہا
۲۹۔ یک تن نوالہ خوار نہ ہو اس سے تا ابد
روز ازل سے ہے یہ نگوں کاسۂ سفال
۳۰۔ دونوں عارض گویا شیشے ہیں سے گلگوں کے
زنخ ان دونوں میں یوں جیسے نمک دال میں گزک
۳۱۔ سُن کے میں نے یہ کہا اس سے کہ مایۂ ناز
خیر ہے بات سمجھ کر تو کہہ اتنا نہ بہک
۳۲۔ حلم تیرے کے جو ہم وزن فلک سے کچھ شے (۱)
ڈال دیوے زرہ سہو و خطا کوئی ملک
۳۳۔ گزرے وہ جس طرف سے کبھو اُس طرف نسیم
باد سموم ہووے وہیں گر کرے گزار
۳۴۔ زہے امام زماں، خاک در سوا جس کے
قبول ہو نہ کبھو سجدۂ نماز گزار
۳۵۔ مقابلے سے کماں کے ترے عدو تیرا
کبھو نہ نبھ سکے روزِ نبرد کرکے فرار

۲۶۔ اسی ہی غم سے نکلتی ہے ظاہرا دم صبح
ہمیشہ پنجۂ خورشید سے گریباں پھاڑ
۲۷۔ انجم تمام قطرۂ خوں ہو، ٹپک پڑیں
صدمہ اگر اس سے پہنچے کبھو آسماں تلک
۲۸۔ - - - - - - - - -
خرد نے مجھ ستی سمجھا کے بارہا یہ کہا
۲۹۔ - - - - - - - - -
ہے سرنگوں ازل ستی یہ کاسۂ سفال
۳۰۔ عارض اس کے گویا شیشے ہیں مئے گلگوں کے

۳۱۔ سُن کے ----- مایۂ حسن

۳۲۔ بار تجھ حلم میں ہے یہ کہ تیرے وقت خرام (۲)
ہووے ذرہ بھی اگر مرکز خاکی پہ دھمک
۳۳۔ - - - - - - - اس طرف سیتی
باد سموم ہووے صبا گر کرے گزار
۳۴۔ زہے امام کہ جُز خاک درستی جس کے

۳۵۔ تری کمان کے آگے ستی عدو تیرا

(ج) "مخمسات"

۳۶۔ دل کو بے جا تیرے کوچے میں ہے نالے کی ہوس
راہ زن راہ نبود باک ز فریاد جرس
۳۷۔ ع ولے کیا کہوں ناتوانی میں اپنی

۳۶۔ تیرے کوچے میں عبث دل کو ہے نالے کی ہوس

۳۷۔ ع بیاں کیا کروں ----- الخ

۳۸۔ ع مری گور پر لوگ رکھتے ہیں گل کو	۳۸۔ ع مری خاک پر ۔۔۔ الخ
۳۹۔ ع نہیں رہتے مری گلا تم کیے بن	۳۹۔ ع نہیں رہتے مرا گلا تم کیے بن
۴۰۔ ع کی اس شوخ نے جب سے سیر گلستاں	۴۰۔ کیا جب ستی اُن نے سیر گلستاں (۳)
۴۱۔ ع قینچی کی طرح ہرگز پرزے نہ کترتی تھی	۴۱۔ ع قینچی کی طرح دل کے پرزے نہ کترتی تھی
۴۲۔ ع جب شام کی ہوتی ہے پھر شمع نمط گلنا	۴۲۔ ع جب رات کے ہوتے ہی نت شمع نمط جلنا
۴۳۔ ع تقصیر نہیں دل کی میں فرض کیا ہونا	۴۳۔ تقصیر نہیں دل کی قسمت کا بُرا ہونا
۴۴۔ ع جز اِس قدر تواں یافت درجہاں توعیب	۴۴۔ ع جز اِس قدر تتواں گفت درجہاں توعیب
۴۵۔ ع کشمیری ٹولے سے میں ایک فاحشہ بلائی	۴۵ ع کشمیری ٹولے سیتی ایک فاحشہ بلائی
۴۶۔ ع خاک کن کن کی ہوئی ظرف بنا کیا کیا کچھ	۴۶۔ خاک کن کن کی ہوئی صرف، بنا کیا کیا کچھ

۲۔ "الحاقی کلام"

زیر بحث دیوان سودا کا یہ نسخہ الحاقی کلام سے بھی یکسر پاک نہیں، راقم کی تحقیق کے مطابق ایک سو چودہ اشعار کی ایک مثنوی (۱)، چھ شعر کی ایک غزل اور ایک غزل کے دو شعر مع مطلع اس نسخے میں ایسے ہیں جنہیں سودا کے نتائج افکار سمجھنا تحقیقی نقطۂ نظر سے درست نہیں۔ آئندہ سطور میں اس اجمال کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ مثنوی ع یارو خدا ایک ہے دوسرے برحق نبیؐ

"در ہجو فدوی" کے عنوان سے ایک سو چودہ ۱۱۴ اشعار کی یہ مثنوی کلام سودا کے بعض دوسرے نسخوں کے علاوہ نسخۂ جانسن میں بھی شامل ہے۔ لیکن معاصر تذکرہ نگاروں کے بیان اور اس میں موجود چند اشعار کے پیش نظر اسے سودا کی تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔ تذکرہ نگاروں کے بیانات یہ ہیں:۔

(i) میر حسن نے فدوی لاہوری کے ذکر میں لکھا ہے۔ "میر فتح علی شیدا ہجو او (فدوی) را خوب کردہ است، قصۂ بقال و بوم حسب حال او درج نمودہ است" تذکرہ میر حسن ص ۱۲۷ طبع ۱۹۲۲ء علی گڑھ)

(ii) علی ابراہیم خاں خلیل نے بھی فدوی کے حالات میں یہی بات کہی ہے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں۔ "میر فتح علی علی شیدا در ہجو او قصۂ بوم و بقال ضبط نمودہ" (تذکرہ گلزار ابراہیم ۔۔۔)

(iii) تیسرے معاصر تذکرہ نگار ابوالحسن امراللہ الہ آبادی نے شیدا کے حال میں بالواسطہ طور پر اس مثنوی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "انہوں (شیدا) نے سودا کے حریف فدوی لاہوری کی ہجو میں ایک مثنوی لکھی ہے۔"

اِن بیانات کے علاوہ اس مثنوی کے درج ذیل اشعار بھی اس کے تصنیف شیدا ہونے پر دلالت کرتے ہیں:۔

۱۔ حضرت سودا تلک جو مرے استاد ہیں
شعر پہ ان کے بھی اب اُن کے یہ ایراد ہیں

۲۔ ایسا ہی ایک اور شعر حضرت استاد کا
جو قلم فہم سے خلق نے دل میں لکھا (۲)

۲۔ شعر وہ اُن کا سنا جا کے انھوں نے کہیں
شیخ و برہمن کو ہے جس میں کہ نسبت بہ دیس

۴۔ سُن کے انہوں نے پسند اُس کا جو مضمون کیا
میں نے تب اس بحر میں یوں اسے موزوں کیا

۵۔ بس چل اب آگے نہ کہہ کچھ انہیں شیدا خموش
کیجے اس سے سخن ہووے جسے عقل و ہوش

ـــــــــــــــــــ
ـــــــــــــــــــ

ـــــــــــــــــــ

متذکرہ بالا شواہد کی موجودگی میں مصحفی ، سعادت خاں ناصر ، قاضی عبدالودود مرحوم ، جناب رشید حسن خاں اور ڈاکٹر سید محمد عقیل کا یہ خیال کہ یہ مثنوی سودا کی تصنیف ہے، قابل قبول نہیں۔ کسی قدر تامُل کے ساتھ یہ تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ یہ مثنوی خود سودا ہی نے لکھ کر اپنے شاگرد کو دے دی ہو لیکن مندرجہ بالا اشعار کے ساتھ اُن کا اسے اپنے دیوان میں درج کرنا یا درج کرنے کی اجازت دینا قطعاً بعید از امکان ہے۔

۲۔ "حاضر ہے تیرے سامھنے سودا کر اس کو قتل
مجرم یہ سب طرح سے ہے پر یک نگاہ کا"

یہ شعر نسخۂ جانسن اور کلام سودا کے بعض دوسرے نسخوں میں موجود ایک غزل ع "چھُٹنا ضرور مکھ پہ ہے زلف سیاہ کا" کا مقطع ہے لیکن قائم نے صرف تخلّص کی تبدیلی کے ساتھ اپنے تذکرے میں بندرا بن راقم تلمیذ سودا کے نام سے درج کیا ہے۔ اگر قائم کا بیان درست ہے (اور درست نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں) تو اِس مقطع کی بنا پر پوری غزل سودا کی بجائے راقم کی تصنیف قرار پائے گی اور یہ بھی کہ "مخزن نکات" کے سنہ تصنیف ۱۱۶۸ھ سے قبل معرض وجود میں آچکی ہوگی۔ اس غزل کا سودا کی تصنیف نہ ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ اس کی زندگی میں ترتیب دیے ہوئے کسی نسخے میں یہ غزل نہیں ملتی ، نہ ہی کسی تذکرے میں اس کا انتساب سودا سے ہوا ہے۔

۳۔ بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے
اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے
قاتل ہماری نعش کو تشہیر ہے ضرور
آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے
گر ہو شراب و خلوت و محبوب خوب رو
زاہد قسم ہے تجھ کو جو تو ہو تو کیا کرے

(نسخۂ جانسن)

یہ تینوں شعر کلام سودا کے تقریباً تمام نسخوں کے علاوہ نسخۂ جانسن میں بھی نو شعر کی ایک غزل میں موجود ہیں۔ علاوہ بریں ، فتح علی خاں گردیزی اور علی ابراہیم خاں خلیل نے تینوں شعر، میر حسن اور مردان علی خان مبتلا نے شعر نمبر ۱ ، ۳، مصحفی نے شعر نمبر ۱ ، ۲ میر اور شورش نے صرف مطلع اور قطب الدین باطن اکبر آبادی نے صرف شعر نمبر ۳ کو سودا کے نمونۂ کلام میں درج کیا ہے ، خود سودا نے متذکرہ بالا غزل کو ایک مخمس میں تضمین کیا ہے جس میں یہ تینوں شعر

شامل ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ تینوں شعر خفیف تصرف کے ساتھ دیوان یقین کے تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ نسخوں میں پانچ شعر کی ایک غزل میں موجود ہیں نیز تذکرہ "چمنستان شعرا" میں انہیں یقین کی تصنیف بتایا گیا ہے۔

انعام اللہ خاں یقین مرزا سودا اور میر کے معاصر اور مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ پانچ شعر کی غزلیں کہتے تھے۔ اُن کے دیوان میں کل ایک سو ستر غزلیں ہیں اور سب کی سب پانچ شعر کی۔ اردو شعرا میں یہ اختصاص انہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی (مصنف چمنستان شعرا) نے ان اشعار کو اپنے تذکرے میں یقین (۱) کے نام سے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: ۔

"فتح علی خاں نے دو شعر اور میر نے مطلع سودا کے ترجمے میں لکھا ہے مگر میں نے یقین کے اکثر دیوانوں میں یہ اشعار دیکھے ہیں، واللہ اعلم۔ "نہج بستگی" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار یقیناً یقین کے ہیں۔ جو کوئی ان دونوں صاحبان کے طرز سخن گوئی سے واقف ہے وہ دونوں کی زبان پہچانتا ہے۔"

(چمنستان شعرا ص ۱۹۵ (متن کا ترجمہ) بحوالہ مرزا محمد رفیع سودا، از ڈاکٹر خلیق انجم ص ۲۹۷)

میر اور گردیزی کی طرح شفیق بھی معاصر تذکرہ نگار ہے اور یقین کی شاعری کا اس قدر دلدادہ ہے کہ اس نے اس کی تمام غزلوں پر غزلیں کہی ہیں لہٰذا قیاس یہ کہتا ہے کہ ضروری تحقیق و تفحص کے بعد ہی اس نے اپنے معاصر تذکرہ نگاروں کے بیان کی تردید کی ہوگی۔

منقولہ بالا اشعار میں تیسرے شعر کا مصرع اوّل دیوان سودا، کے برخلاف دیوان یقین میں اس طرح مندرج ہے۔

ع خلوت ہو اور شراب ہو، معشوق سامنے

راقم سطور کا خیال ہے کہ سودا نے یقین کی غزل کے تین شعروں پر (جو واقعی بہترین شعر ہیں) اپنے مخمس کی بنیاد رکھی اور بقیہ اشعار اپنی طرف سے کہہ کر مخمس مکمل کر لیا۔ بعد ازاں کاتبوں نے ان اشعار کو سودا ہی کی تصنیف سمجھ کر کلیات سودا، کے حصہ غزلیات میں شامل کر لیا۔ جہاں تک مصرع مذکور میں تبدیلی کی بات ہے وہ دراصل بند کے دوسرے مصرعوں کے قافیوں کی رعایت سے کی گئی ہے۔ اس طرح کے تصرفات کی مثالیں سودا کے یہاں اور بھی ہیں مثلاً حافظ کا ایک مصرع دیوان حافظ میں اس طرح ہے "ع عرض حاجت در حریم حرمتت محتاج نیست" لیکن قافیوں کی رعایت سے اس کی شکل یہ ہو گئی ہے "ع عرض حاجت در حریم صفر تت چوں آورم" اور میر کے اس مصرعے "ع حسرت وصل و غم ہجر و خیال رخ دوست" کو قافیے کی تنگی کی بنا پر تبدیل کرکے "ع حسرت وصل و غم ہجر و خیال آزار" کر دیا گیا ہے۔ سودا اپنے معاصرین کے اشعار تضمین کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے چنانچہ انہوں نے میر قائم اور تاباں کی غزلوں کو بھی جزوی یا کلّی طور پر تضمین کیا ہے۔ خود یقین کا ایک مصرع اُن کے ایک مخمس ترجیع بند میں بہ طور مصرع ترجیع شامل ہے اس مخمس کا آخری بند جس میں یقین کے کلام کے بارے میں سودا کی پسندیدگی

اظہار ہوتا ہے درج ذیل ہے:

مصرع کو یقین تیرے سودا نے سنا تھا کل — روتا ہے وہ یوں تب سے برسے ہے گویا بادل
ہے رعد نمط نالاں بجلی کی طرح بے کل — پڑھتا ہے یہی پھر پھر آنکھوں کے تئیں مل مل
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

۳ ۔ "غلط اور نامکمل انتسابات"

کسی کتاب میں موجود کلام کی صحت کا انحصار اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ وہ غلط انتسابات سے کس حد تک پاک ہے۔ چنانچہ اگر کسی نسخے میں کسی نظم یا بعض نظموں کی پیشانی پر درج سرخیاں اصل سے مطابقت نہیں رکھتیں تو انہیں مصنف کے نتائج قلم نہیں قرار دیا جاسکتا۔ زیر بحث "دیوان سودا" میں شامل بعض نظموں کے عنوانات غیر معتبر اور نامکمل ہیں اور قرائن سے یہ پتا چلتا ہے کہ کاتب نسخہ ان عنوانات کے اندراج کے سلسلے میں کافی غیر محتاط ہے۔

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے اپنے مرتبہ "کلیات سودا" (جلد اوّل) کے مقدمے میں نسخۂ جانسن کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے دوسری چند غلطیوں کے علاوہ تین قصیدوں کے غلط عنوانات کی بھی نشان دہی کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ غلطیاں اس نسخے میں ایسی ہیں کہ اگر سودا کی نظر سے گزرتیں تو تصحیح سے نہیں بچ سکتی تھیں۔ "قصائد سودا" کے مرتب ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی نے بھی بعض قصیدوں کے غلط انتسابات پر محققانہ بحث کرکے عنوانات کا صحیح تعین کیا ہے۔

راقم سطور کی تحقیق کے مطابق نسخہ مذکور میں ایسی متعدد نظمیں موجود ہیں جن کی سرخیاں غلط یا نامکمل ہیں۔ علاوہ بریں مفقودالعنوان کلام بھی اس میں بہ کثرت شامل ہے۔ یہاں بہ نظر اختصار صرف ایک مخمس کے غلط عنوان کی تفصیل پیش کی جارہی ہے۔

"ع ہم کو دکھا جب اپنے تم اطوار رہ گئے" (۲۶ بند)

چھبیس بندوں کا یہ مخمس کلام سودا کے کم وبیش تمام نسخوں کے "حصہ مخمسات" میں بغیر کسی عنوان کے موجود ہے۔ اس کے برخلاف زیر بحث "دیوان سودا" میں اس کا عنوان "تضمین بر غزل خود" ہے۔ راقم کو یہ غزل کلام سودا کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے میں نہیں ملی۔ تفصیل حسب ذیل ہے:۔

اس مخمس کے نویں بند کا اصل شعر جس پر مصرعے لگائے گئے ہیں، یہ ہے۔

"کہ باغباں قسم ہے تجھے کیا چلی بہار — داماںِ گل پکڑ کے جو یہ خار رہ گئے"

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے اس شعر کو سودا کے ایک مجہول الاسم شاگرد عاکف سے منسوب کیا ہے اور یہ اطلاع دی ہے کہ مرزا سودا نے اسے اپنے "واسوخت" میں تضمین کیا ہے۔ بہ ظاہر واسوخت سے یہی مخمس مراد ہے کیوں کہ سودا کے یہاں یہ شعر اس مخمس کے علاوہ کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ علاوہ بریں موضوع اور مواد کے اعتبار سے یہ مخمس دراصل واسوخت ہی کے ذیل میں آتا ہے۔ دوسرے تذکرہ نگار نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور نے ایک شخص

کے حوالے سے عاکف کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے جس کا مصرع اوّل منقولہ بالا شعر کے مصرع اوّل کے مطابق ہے لیکن مصرع ثانی مختلف ہے۔ یہ دوسرا مصرع حسبِ ذیل ہے:۔

"ع گل کو جو دیکھ دیکھ کے روتی ہے عندلیب"

سرور نے چونکہ یہ شعر کسی نامعلوم شخص کی زبانی سُن کر نقل کیا ہے اس لیے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ راوی کو دوسرا مصرع یاد نہ رہا ہو اور اُس نے غلطی سے کسی دوسرے شعر کا مصرع نقل کر دیا ہو۔ لیکن خوب چند ذکا نے اپنے تذکرے "عیار الشعرا" میں اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ مرزا رفیع سودا نے عاکف کی غزل کو اپنے "مخمسات" میں نظم کیا ہے۔ اور مندرجہ بالا شعر ہی کو ان الفاظ کے ساتھ نمونے کے طور پر نقل کیا ہے۔ "غزل اُو (عاکف) را مرزا مرحوم (مرزا سودا) در مخمسات خود تنظیم کردہ، ایں شعر از ہمان غزل است" (عیار الشعرا، قلمی، مائکرو فلم، اکادی لائبریری، لکھنؤ) سودا کے زیر بحث مخمس کا آخری بند یہ ہے:

سودا کی تم نہ مانیو یہ لن ترانیاں اس گفتگو کے کرنے سے گھستی نہیں زباں
جو کچھ کوئی کہے وہ سنا کیجے مہرباں تجھ کو کے عاکفاں کو چھٹ اس کے جگہ کہاں
در سے اٹھا دیا پس دیوار رہ گئے

ذکاء کی صراحت اور اس بند کے آخری دو مصرعوں میں سے پہلے مصرعے میں لفظ "عاکفاں" کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ سودا نے عاکف کے صرف ایک شعر کو نہیں بلکہ پوری غزل کو اس مخمس میں تضمین کیا ہے۔ اس بنا پر یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نظم کا عنوان "تضمین بر غزل خود" کی بجائے "تضمین بر غزل عاکف" ہونا چاہیے۔

---

۴ ۔ "اغلاط املا و کتابت"

شیخ چاند مرحوم کا یہ دعویٰ کہ "یہ (نسخہ) سودا کی زندگی میں خاص اہتمام سے تیار ہوا ہے۔" (سودا ص ۱۰۸) اور جناب رشید حسن خاں کا یہ بیان کہ "اس میں اغلاط کتابت کم ہیں" (مقدمہ انتخاب سودا ص ۳۰) درست معلوم نہیں ہوتا۔ "خاص اہتمام" کے ساتھ تیار کردہ نسخے کو املا و کتابت کی عام فروگزاشتوں سے پاک ہونا چاہیے ۔ اور احتیاط کا تقاضا بھی یہ ہے کہ کاتب / مصنف یا جس کی نگرانی میں یہ نسخہ تیار ہو رہا ہو، وہ اس پر نظر ثانی کر کے حتی الوسع غلطیوں کی تصحیح کر دے (اتفاقیہ غلطیوں کا رہ جانا دوسری بات ہے) لیکن اس مخطوطے میں کسی ایک مقام پر بھی تصحیح نہیں کی گئی ہے نتیجتاً نسخے میں بعض لفظوں کا املا غلط ہے، کئی الفاظ قرأت کی عدم صحت کی بنا پر غلط لکھ دیے گئے ہیں اور بہت سی جگہوں پر الفاظ لکھنے سے رہ گئے ہیں۔ اس قسم کی چند نمایاں مثالیں سطور ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

نسخہ جانسن	صحیح صورت
۱۔ قطرہ گرا تھا چوکی مرے اشک گرم سے دریا میں ہے ہنوز پھپولا حباب کا	قطرہ گرا تھا جو کہ ——— الخ" ہونا چاہیے ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے "چوکہ" کو متن میں شامل کیا ہے ۔ اور ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے "چوکے" بہ معنی ٹپک کر کو ترجیح دی ہے ۔ زبان و بیان کے اعتبار سے قطرہ کا چشم سے "چوکے" (ٹپک کر) گرنا صحیح ہو سکتا ہے لیکن اشک گرم سے "چونا" (ٹپکنا) محل نظر ہے۔
۲۔ یہ طبع جُبہ سے سرزد کبھو ہوں معنی رنگیں جہاں میں تخم سے تموبر کے کب گلزار ہو پیدا	۲۔ صحیح لفظ "حیز" (ہیز) ہے
۳۔ اسے طفل اشک ہے فلک بفتمی پہ عرش آگے قدم نہ رکھیو تو زنہار دیکھنا	۳۔ "فلک ہفتمیں" صحیح املا ہے بیشتر نسخوں میں "ہشتمیں" لکھا ہے جو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر شمس الدین نے "ہفتمیں" کو صحیح قرار دیا ہے
۴۔ چھپنے کی عشق کے نہ بنی بات پیش یار سو طرح سے میں سامنے اس کے چھپائی بات	۴۔ - - - - - - - - - - - - "اس کے بنائی بات" ہونا چاہیے۔
۵۔ زلفوں کے تلے شوخ کی ، خط کانہیں آغاز دوڑی ہے شب خوں سپہ شام جہاں پر	۵۔ - - - - - - - - - "دوڑی ہے شب خوں" ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر شمس الدین نے "دوڑے ہے" لکھا ہے۔
۶۔ انکار قتل سے تو کرے ہے سُخن ہنوز	۶۔ معنوی اعتبار سے اس شعر کے مصرع اول کا قافیہ "سخن" کی بجائے "سجن" ہونا چاہیے۔ بیشتر نسخوں میں یہی متن ہے لیکن ڈاکٹر شمس الدین نے "سخن" کو ترجیح دی ہے۔
۷۔ آتش کو رنگ گل کی صبا تو نے پھونک دی	۷۔ "پھونک پھونک" ہونا چاہیے۔ "پھونک دی" کسی

جلوائے آشیاں کے مرے خاروخس تمام

۸۔ ہوں اسیر اس کا جسے بعد گرفتاری صید
نہ گرفتاری سے مطلب رہے نے دام سے کام

۹۔ نہ غنچے گل کے کھلتے ہیں نہ نرگس کی کھلی کلیاں
چمن میں لے گئے خمیازہ کس نے انکھڑیاں ملیاں

۱۰۔ تبسم یوں نمایاں ہے مسی آلودہ ہونٹوں سے
نہ ہو ابر سیہ میں اس طرح بجلی کی اوچھلیاں

۱۱۔ کیا ہے عہد و پیماں اشتیاق اپنے سے یہ میں نے
کہ جس ساعت کلی لکھنا مجھے تیرا میسر ہو

۱۲۔ بوؤں میں تخم دل کو جہاں وہاں زقوم ہو
پالوں جو عندلیب قفس میں تو بوم ہو

۱۳۔ چوب شکست خوردہ کشتی ہوں میں کہ جو
پانی میں ہو نہ غرق نہ آتش کہ جل سکے

۱۴۔ نہیں گلخن بھی کچھ گلشن سے کم اسباب اے سودا
رکھیں سیر چمن سے کچھ مجھے معذور بہتر ہے

۱۵۔ شیخ گل بازی کو تم سی روز للچاتا ہے دل
زرد چہرا آپ کا گیندے کا گویا پھول ہے

۱۶۔ فلک تری مرضی سے باہر ہو کرے کار جہاں
ہاتھ سے کام زمانے کے وہیں جائے نکل

۱۷۔ اس کے قبضے پہ جو ہو دست مبارک تیرا
نہ رہے دین محمد کے سوا اور ملل

۱۸۔ مدح اونچی نہ سمجھ یہ جو کہا میں اس سے
رتبہ تجھ ہجو کا اعلیٰ ہی سخن یہ اسفل

۱۹۔ تالب جو پہ کرے خیمہ کو استاد حباب

دوسرے نسخے میں نہیں ملتا۔

۸۔ - - - - - - - - - - -
"نہ گرفتار سے مطلب" ہونا چاہیے۔

۹۔ "کھلیں کلیاں" ہونا چاہیے۔
- - - - - - - - - - -

۱۰۔ - - - - - - - - - -
نہ ہوں ابر --- اچھلیاں" ہونا چاہیے۔

۱۱۔ - - - - - - - - - -
"گلے لگنا" ہونا چاہیے۔

۱۲۔ "تخم گل کو جہاں وہاں" ہونا چاہیے۔
"عندلیب" ہونا چاہیے۔

۱۳۔ - - - - - - - - - -
"آتش میں جل سکے" ہونا چاہیے۔

۱۴۔ - - - - - - - -
"سے کر مجھے معذور" ہونا چاہیے۔

۱۵۔ ---- "تم سے زور" ہونا چاہیئے

۱۶۔ - - - - - - - - - -
---"جائے بچل" ہونا چاہیے۔

۱۷۔ - - - - - - - - - -
"نہ رہیں دین ------" ہونا چاہیے۔

۱۹۔ - - - - - - - - - -
"تجھ مدح کا اعلیٰ ہے" ہونا چاہیے۔ جناب رشید حسن خاں نے نسخۂ جانسن کے متن کو ترجیح دی ہے۔

۱۹۔ "استاد حباب" ہونا چاہیے۔ رشید حسن خاں

اور ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے "استاد" لکھا ہے۔

تا پچھاوے بروش سبزۂ فرش مخمل

"بہ روش سبزۂ فروش مخمل" ہونا چاہیے۔ رشید حسن خاں نے سبزہ ۔ فرش مخمل لکھا ہے۔

۲۰۔ دہشت سے اس خیال کے زہرہ ہوا اُن کا آب
پہنچیں نہ ہم مبادا کسیکی گماں تلک

۲۰۔ - - - - - - - -
"مبادا کسی کے" ہونا چاہیے۔ رشید حسن خاں صاحب نے "مبادا" لکھا ہے۔

۲۱۔ دریائے طبع سے یہ کئی گوہر سخن
تیری رسال کے لیے پہنچے مجھے رسال

۲۱۔ - - - - - - - - - - - -
"تیرے نثار کے لیے" ہونا چاہیے۔ جناب رشید حسن خاں نے اپنے انتخاب میں نسخہ جانسن کے متن کو شامل کیا ہے۔

۲۲۔ دیکھے سے جس کی جلوہ پاکیزہ طینتوں کے
آنکھوں کو امن ہووے جی کے تئیں اماں ہو۔

۲۲۔ "جس کا جلوہ" ہونا چاہیے۔ "انتخاب سودا ص ۲۳۶ میں متن کی تصحیح کر دی گئی ہے لیکن حوالہ نہیں دیا ہے۔

۲۳۔ دانتوں کے بیچ اس کے ہے جسقدر بھونڈا
وصف ذخامت اس کا کیجے تو کیا بیاں ہو

۲۳۔ - - - - - - - - -
"وصف ضخامت" ہونا چاہیے۔

۲۴۔ تکان پاکی سدا اس کی جوسنی سو کہی
سیاہ خیمۂ لیلیٰ میں قیس ہے زنجیر

۲۴۔ کی صدا اس کے جوسنے سو کہے" ہونا چاہیے۔

۲۵۔ یک خم تھی دل انہوں کا پرازبادۂ غرور
تیں اُس میں کر دیا ٹک تیغ آب وار

۲۵۔ "یک خم تھا" ہونا چاہیے۔ جناب رشید حسن خاں نے "انتخاب سودا" میں نسخہ جانسن ہی کا متن شامل کیا ہے۔

۲۶۔ رہ نوردوں کی نظروں میں اکثیر
بہ تراز گرد کارواں ہووے

۲۶۔ ---"اکسیر" ہونا چاہیے
- - - - - - - - -

۲۷۔ عیش و عشرت ہی سدا دمساز
پیر ہو کوئی یا جواں ہووے

۲۷۔ "عیش و عشرت [ے] ہے سدا دمساز" ہونا چاہیے۔

۲۸۔ یاد پیما ترا تعالیٰ اللہ

۲۸۔ "تعال اللہ" ہونا چاہیے۔

جلوہ گر آ کے وہ جہاں ہووے	———
۲۹۔ احوال اس کا دیکھ کے کہنے لگا طبیب	۲۹۔ - - - - - - - - - -
اب فسد و مسہل اس کے لیے ہے مفید تام	اب فصد —— الخ ہونا چاہیے۔
۳۰۔ دیہات جو ہیں مصرف مطبخ کے ان میں سے	۳۰۔ - - - - - - - - -
اس نقدی کے عوض ہو مجھے سخنک طعام	۔۔۔۔"صحنک" ہونا چاہیے
۳۱۔ یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ	۳۱۔ - - - - - - - - - -
شوال سے پھر ماہ مبارک رمضان ہے	شوال بھی پھر ماہ، ہونا چاہیے۔ جناب رشید حسن خاں نے جانسن کے متن کو ترجیح دی ہے۔
۳۲۔ اپنی منہ کی نہ کہا کن نے سخن کو یہ	۳۲۔ اپنے منہ کے ۔۔ سخن [کو] گوہر ہونا چاہیے۔
لعل سودا ہی کو پر ہم نے اگلتے دیکھی	———
۳۳۔ سمجھ کے باندھا آشیاں ہم رہے کا باآب وتاب گلشن	۳۳۔ "باندھا [تھا] آشیاں" ہونا چاہیے۔
یہی کہ غنچے نے آنکھ کھولی، خیال گل تھا تو خواب گلشن	———
۳۴۔ پر اب خوشی ہے یہ خلقت کو تیری صحبت سے	۳۴۔ ۔۔۔"تیری صحت سے" ہونا چاہیے
کہ آج تک نہ ہوئی ہوئیگی ز روز نخست	———
۳۵۔ اتنی ہے کثرت لغزش بہ زمین ہر باغ	۳۵۔ - - - - - - - - - -
جو ثمر شاخ سے اوتر سو گرا سر کے بہل	"جو ثمر۔ اترا سو گر سر کے بھل" ہونا چاہیے

مندرجہ بالا شواہد کی روشنی میں یہ بات بلا تامّل کہی جا سکتی ہے کہ دیوان سودا کا زیر بحث نسخہ نہ تو خود مصنف نے جانسن کو پیش کیا تھا اور نہ اس کی تیاری میں اُس کی مرضی کو کوئی دخل تھا، بلکہ میر محمد حسین (جو جانسن کا ملازم (دیوان) اور شاعر بھی تھا) ہی نے اسے تیار کرا کر جانسن کے کتب خانے میں داخل کیا تھا۔ اسی نے اس میں جا بہ جا تحریفیں کی ہیں اور سودا کے نام سے ایک قصیدہ کہہ کر کتاب کے آغاز میں شامل کیا ہے۔ در اصل یہ نسخہ (اپنی تمام ظاہری چمک دمک اور غیر معمولی مقبولیت کے باوجود) ٹھوس داخلی یا خارجی شہادتوں کی عدم موجودگی اور الحاقات و تصرفات نیز نظموں کے غلط انتسابات اور املا و کتابت کی متعدد غلطیوں کے باعث کسی طرح سند اعتبار حاصل نہیں کر سکتا۔ اور اس کی بنیاد پر سودا کے کل کلام کو یا اس کے بعض حصوں کو مرتب کرنا حد درجہ گمراہ کن اور سعی لاحاصل کے مترادف ہو گا۔

حواشی:۔

۱۔ مقدمہ "قصائد سودا" ص ۱۰۹ مرتبہ ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی طبع ۱۹۷۶ ۲۔ (i) "سیر المتاخرین" جلد دوم (انگلش) (ii) لائف آف وارن ہیسٹنگ از جی۔ بی۔ میلسن (سوم) (iii) رائز اینڈ فلفلمنٹ آف برٹش رول ان انڈیا از تھامس اینڈ گیرٹ۔ بحوالہ مقدمہ "دیوان حسرت عظیم آبادی" مرتبہ ڈاکٹر اسماعیدی ص ۴۴۔۴۵ طبع ۱۹۷۸ء۔ ۳ (i) جوڈیشیل ایڈ منسٹریشن آف ایسٹ انڈیا کمپنی آف بنگال ص ۱۴۷ از بی۔ بی مسرا (انگلش) (ii) ہسٹری آف برٹش انڈیا ص ۲۳۲ از پی۔ ای۔ رابرٹس (P.E Roberts) ۴۔ اسٹڈیز ان دی "ہسٹری آف دی بنگال صوبہ" جلد ۱ ص ۴۸۲ (انگلش) از کے دتا طبع ۱۹۳۶ء ۵۔ "وقائع زماں نواب آصف الدولہ مؤلفہ ابو طالب اصفہانی لندنی مرتبہ عابد رضا بیدار ص ۱۳۳ طبع ۱۹۶۵ بحوالہ کلیات سودا، جلد ۱ ص ۲۹ مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن ص ۶۔ "تذکرہ گلزار ابراہیم" مرتبہ کلیم الدین احمد جزو دوم ص ۱۰۴ طبع ۱۹۷۴ ص ۷۔ "(i) تذکرہ گلشن سخن" از مردان علی خاں مبتلا لکھنوی ص ۲۳ (ii) "تذکرہ گلزار ابراہیم" جزو دوم ص ۲۳۱ (iii) "تذکرہ ریاض الوفاق" از ذوالفقار علی مست مرتجم عطا کاکو ص ۸۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان مطبع ۱۹۶۵ء ص ۹۔ "تذکرہ گلزار ابراہیم" جزو دوم ص ۲۳۱۔ ۱۰۔ "تین تذکرے" ص ۲۳۔ ۴۲ تلخیص مقدمہ از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی طبع ۱۹۶۸ء ۱۱ "سسی پنو" از پروفیسر جناب قاضی فضل حق صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ای ایس گورنمنٹ کالج لاہور مشمولہ "اردو" اکتوبر ۱۹۳۰ء ص ۷۲۰ ۱۲۔ فہرست انڈیا آفس لائبریری (ہندوستانی) بحوالہ جائزہ مخطوطات اردو" ص ۹۷۳۔۹۷۴ ۱۳۔ "اودھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی" از پی بسو۔ بحوالہ مقدمہ کلیات سودا" ص ۲۷ مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن ص ۱۴۔ ایضاً ص ۳۰۔ ۲۹۔ ۱۵۔ تذکرہ گلشن ہند از مرزا علی لطف ص ۲۳۸ مرتبہ ڈاکٹر زور طبع ۱۹۳۴ء ۱۶۔ تذکرہ ریاز الوفاق مترجم عطا کاکوی۔ ۱۷۔ "تذکرہ عقد ثریا" ص ۱۱۲ انجمن ترقی اردو پاکستان طبع ۱۹۷۸ء ۱۸۔ "سودا" ص ۸۔۱۰۷ انجمن ترقی اردو پاکستان طبع دوم ۱۹۶۳ء ۱۹۔ میری نظر سے صرف دو جلدیں گزری ہیں تیسری اور چوتھی جلد کے بارے میں جناب رشید حسن خاں نے اطلاع دی ہے۔

۲۔ ماہنامہ "صبا" (جلد ۵ شمارہ ۱۱، ۱۲) بحوالہ "مرزا محمد رفیع سودا" از ڈاکٹر خلیق انجم ص ۴۴۵ طبع اول۔ ۲۱۔ ایضاً ص ۴۴۶ ۲۲۔ ضمیمہ "خیابان آصفی" ص ۲۱ طبع ۱۳۳۰ھ حیدر آباد (بھارت) ۲۳ قائع زماں نواب آصف الدولہ" معروف بہ تاریخ آصفی مترجم ڈاکٹر ثروت علی طبع ۱۹۶۸ء ۲۴۔ "فہرست انڈیا آفس لائبریری (ہندوستانی) بحوالہ "جائزہ مخطوطات اردو" جلد اول، ص ۲۔۹۰۳

حواشی

۱۔ یہ شاعروں کا تذکرہ ہے اور اس کے مصنف مرزا ابوطالب اصفہانی ہیں۔ ۔ ۔ ب ہ ایک ایک مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن اور دہلی یونیورسٹی میں موجود ہے۔ (بحوالہ تاریخ آصفی مترجم ثروت علی۔)

۲۔ بعض نسخوں میں "دلوں سے" کی جگہ "دلوں کو" لکھا ہے۔

۳۔ "باہم ہوتی ہے بوسہ بازی کیوں دل کی کلی نہ ہووے تازی" (انشا مثنوی ۱ل ہجو فیل)

۴۔ ۵۔ کلیات سودا، کے قدیم مطبوعہ ایڈیشنوں میں دونوں شعر شامل ... ہیں۔ اور ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے نسخہ جانسن میں شامل شعر کو متن میں اور قدیم نسخوں میں شامل شعر کو حاشیے میں رکھا ہے۔ ... ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی میں اس کے برعکس ہے۔

۶۔ "سیر" سودا اور میر وغیرہ کے یہاں مذکر مستعمل ہے۔

۷۔ اس مثنوی کی نشان دہی بعض دوسرے حضرات نے بھی کی ہے۔

۸۔ نول کشوری ایڈیشن طبع ۱۹۱۶ء میں "دل پر لکھا" ہے۔

۹۔ یہ اشعار "چمنستان شعرا" میں سودا کے نام سے بھی منقول ہیں ممکن ہے کاتب نے یہ شعر بڑھا دیے ہوں۔

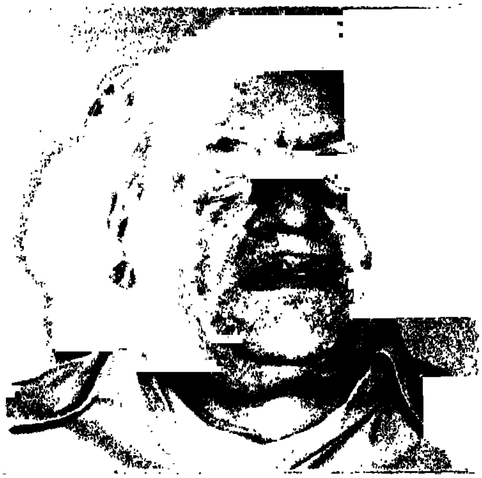
عرصہ دراز سے نقوش کے درج ذیل پرچے سٹاک میں موجود نہیں تھے۔ اب ہم نے ایک پروگرام کے تحت سابقہ پرچوں کو چھاپنے کا اہتمام کیا ہے۔ اب درج ذیل پرچے دستیاب ہیں۔

لاہور نمبر ——— ۳۰۰ روپے
طنز و مزاح نمبر ——— ۲۰۰ ″
منٹو نمبر ——— ۱۰۰ ″
میر تقی میر نمبر (مکمل) اوّل، دوم، سوم — ۲۹۰ ″

اس کے علاوہ درج ذیل پرچے بھی ہمارے سٹاک میں موجود ہیں۔

۱ — رسولؐ نمبر ۱۹۵۰/- روپے
۲ — انیس نمبر ۱۰۰/- ″
۳ — غزل نمبر ۱۰۰/- ″
۴ — بیاض غالب ۱۰۰/- ″
۵ — اقبال نمبر ۲ ۱۰۰/- ″
۶ — ادبی معرکے نمبر ۱۵۰/- ″
۷ — عصری ادب نمبر ۱۰۰/- ″
۸ — طفیل نمبر ۲۰۰/- ″

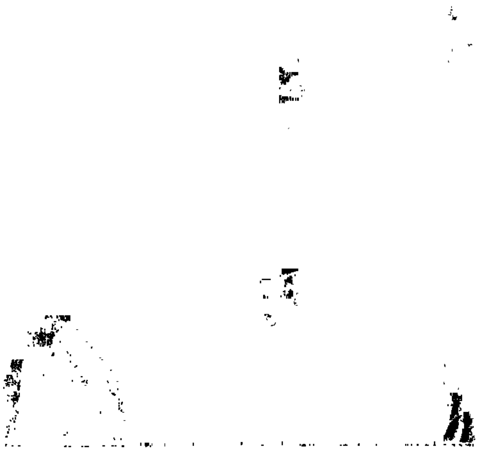
۹ — سالنامہ ۱۹۸۵ء ۱۰۰ روپے
۱۰ — سالنامہ ۱۹۷۹ء ۵۰ ″
۱۱ — سالنامہ ستمبر ۱۹۸۶ء ۶۰/- ″
۱۲ — سالنامہ دسمبر ۱۹۸۶ء ۱۲۰/- ″
۱۳ — سالنامہ دسمبر ۱۹۸۸ء ۱۲۰/- ″
۱۴ — سالنامہ شمارہ ۱۳۸ ۸۰/- ″
۱۵ — خاص نمبر ۱۹۸۷ء ۱۲۰/- ″



فیض احمد فیض

ولادت : سیالکوٹ ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء
تعلیم : ایم ۔ اے (عربی ، انگریزی)
گورنمنٹ کالج ، لاہور
پہلا شعری مجموعہ "نقش فریادی" ۱۹۴۱ء
کلیات : "نسخہ ہائے وفا" ۱۹۸۴ء
اعزاز : لینن انعام ۱۹۶۲ء
وفات : لاہور ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء

نقوش ایوارڈ برائے شعر ۱۹۸۲ء



قتیل شفائی

ولادت : ہری پور ہزارہ ۲۴ دسمبر ۱۹۱۹ء
شعری مجموعے : گیارہ سے زائد
اعزاز : آدم جی ادبی انعام ۱۹۶۴ء

نقوش ایوارڈ برائے شعر ۱۹۸۵ء

عبدالعزیز خالد

ولادت : جالندھر ، ۱۵ فروری ۱۹۲۷ء
تعلیم : ایم ۔ اے (معاشیات)
تصانیف و تراجم : تیس سے زائد
اعزاز : آدم جی ادبی انعام

نقوش ایوارڈ برائے شعر ۱۹۸۶ء



حفیظ تائب

نعت

نبیؐ کے حُسن سے ہستی کا ہر منظر چمکتا ہے
اُنہی کے نقشِ پا سے گنبدِ بے در چمکتا ہے

نبیؐ نے زندگی کی تیرہ شب کو دی ہے تابانی
وہی مہتاب ہے جو روح کے اندر چمکتا ہے

نبیؐ نے سارے اثنا و خلا کے راز کھولے ہیں
عَلَم اُن کا سَب امکانات کے اوپر چمکتا ہے

جو تعلیمِ توازن آپؐ نے دی ہے زمانے کو
اُسی سے آدمیت کا ہر اک جوہر چمکتا ہے

اُجالا پھیل جاتا ہے مری سوچوں کے غاروں میں
دیارِ خواب میں جب آپؐ کا پیکر چمکتا ہے

یقیناً اس کو نسبت ہے رہِ طیبہ کے ذروں سے
ستارہ سا جو اکثر میری پلکوں پر چمکتا ہے

اُنہی کے سایۂ رحمت میں قبر اے کاش روشن ہو
وہ جن کے نور کا پیکر سرِ خاور چمکتا ہے

تعجب کیا جو میرے لفظ لَو دینے لگیں تائب
خیالوں میں ہمیشہ گنبدِ اخضر چمکتا ہے

مِلتا ہے بحرِ درد سے دیدۂ نم کا سلسلہ
تا بہ اَبد رواں دواں اُن کے کرم کا سلسلہ

صُبحِ ظہور اک طرف، یومِ نشور ایک سمت
دونوں سے ہے جُڑا ہوا صدرِ اممؐ کا سلسلہ

ارض سے تا بہ آسماں، چرخ سے تا بہ لامکاں
پھیل گیا کہاں کہاں حُسنِ حرم کا سلسلہ

اک سحرِ شعور ہے، ایک نظامِ نور ہے
میرِ عرب کی زندگی، شاہِ عجم کا سلسلہ

سبزہ و گل حضورؐ کی رحمتِ بیکراں کے رنگ
نجم و قمر جنابؐ کے نقشِ قدم کا سلسلہ

قدسی و انس و جاں ہوئے ذاتِ احد کے ہم نوا
زمزمۂ درود ہے فیضِ اتم کا سلسلہ

پڑھتا ہوا درودِ پاک اُٹھوں بروزِ حشر میں
نامِ نبیؐ لبوں پہ ہو ٹوٹے جو دم کا سلسلہ

تائبِ کم سواد کو ایک جھلک سے ہی نواز
مہرِ حرا! تمام کر شامِ الم کا سلسلہ

فیضِ قدسیؔ

(۱)

تجھ پہ صلوٰۃ ہو اللہ کے محبوب نبیؐ
اللہ اللہ تری خوش نسبی، خوش حسبی
تیری خوشبو ہے دو عالم میں گُل مطلبی
"مرحبا سیّد مکّی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی"

(۲)

تیرے ہی نور سے معمور ہیں جُملہ عالم
تو ہی سرچشمۂ ہر خیر ہے اے میرِ اُمم
تو ہی سرنامۂ امکاں ہے مجھے تیری قسم
"من بیدل بہ جمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی"

(۳)

ساری مخلوق کا تا حشر ہے توؐ راہنما
تجھ سا کوئی نہ ہوا ہے نہ ابد تک ہوگا
اہلِ عصیاں کی شفاعت ترا منصب ٹھہرا
"نسبتے نیست بہ ذاتِ تو بنی آدم را
بہتر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی"

(۴)

ساری دُنیا کے ہوئے جاتے ہیں ابتر حالات
اہل ایماں پہ مسلط ہیں شب و روز آفات
آکے رستہ ہمیں دکھلا سرِ دشتِ ظلمات
"ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات
رحم فرما کہ زحد می گزرد تشنہ لبی"

(۵)

شام بے کیف ہے میری تو ہے بے نورِ سحر
ہر طرف گہری اُداسی کا ہے میلا منظر
ملتمس ہے تری خدمت میں مرا دیدۂ تر
"چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقب و ہاشمی و مطلبی"

لَبَّیکَ وسَعدَیکَ[1]

مَیں خدمتِ آقاؐ میں ہوتا تو سدا کہتا لبّیکَ وسَعدَیکَ
آجاتا بلاوا اگر دربارِ مدینہ سے، سرکارِ مدینہ سے
سرکارؐ کے قدموں میں جس وقت کھڑا ہوتا یا گر کے پڑا ہوتا
سُنتے ہیں کہ مرقد میں تشریف وہ لائیں گے، تقدیر جگائیں گے

جس طرح تنِ مُردہ سرکارؐ سے کہتا تھا لبّیکَ وسَعدَیکَ
بے برگ ہی چل دیتا، ہر گام پہ میں پڑھتا لبّیکَ وسَعدَیکَ
کہتا تو یہی کہتا، حاضر ہے غلام آقاؐ! لبّیکَ وسَعدَیکَ
مَیں اُٹھ کے قدم لوں گا اور لب پہ مرے ہوگا لبّیکَ وسَعدَیکَ

سرکارؐ مجھے تائبؔ، جب خُلد میں بلوائیں، قُدسی مجھے فرمائیں
ہاں چھیڑیئے اب نغمہ لبّیکَ وسعدیکَ، لبّیکَ وسَعدَیکَ

[1] حاضر ہوں اور فرماں بردار ہوں۔

حافظ لدھیانوی

مدحت نامہ

ہے میرے فکر کی معراج آقاؐ کی ثنا خوانی
وہ جسکی شان میں نازل ہوئیں آیاتِ قرآنی
اسی کے ذکر میں لذت ہے کیفیت ہے، راحت ہے
دو عالم کے لئے اس کا وجودِ پاک رحمت ہے
اسی کی ذاتِ اقدسؐ باعثِ تخلیقِ آدم ہے
وہی دینِ ھدیٰ کا، خُلق کا پہلا معلّم ہے
بساطِ دہر پر رہتا ہے دامانِ کرم اس کا
نگاہِ چشمِ عالم میں ہے پیکر محترم اس کا
دلِ سادہ میں وہ عشق و وفا کا رنگ بھرتا ہے
وہ بے مایہ خزف کو گوہرِ نایاب کرتا ہے
کیا ہے بہرہ ور اس نے متاعِ دردمندی سے
کیا ہے آشنا ہم کو مقامِ سربلندی سے
اسی کے نام سے ہے آبرو سارے زمانے کی
وہی تمہید ہے بزمِ دو عالم کے فسانے کی
اسی کو حق نے شرحِ صدر کا اعزاز بخشا ہے
محبّت کا، تکلّم کا حسیں انداز بخشا ہے
مبشّر اس وجودِ پاک کے ہیں انبیاؑ سارے
ہیں وابستہ اسی کی ذات سے دُنیا کے نظّارے
اسی حسنِ تصوّر سے ہر اک دل شاد ہوتا ہے
دلِ ویراں اسی کی یاد سے آباد ہوتا ہے
وہ جس کی سیرتِ اطہر ہے تفسیرِ حیا داری
وہ جس کی زندگی ہے آئنہ دارِ وفاداری
خدائے پاک کی ہستی کا وہ نوریں حوالا ہے
خدا کے نور کا اس چہرۂ اقدس پہ ہالا ہے
صحابہؓ ہو گئے قربان جس کی ذاتؐ اطہر پر
فدا سارا زمانہ ہو گیا اس روئے انور پر
دلوں کو اس نے ذوق و شوق کی لذّت عطا کر دی
ہر اک سائل کی جھولی جس نے جُود و خیر سے بھر دی
منوّر ہے اسی کے نُور سے معمورۂ عالم
حبیبِ کبریا، مولائے کلؐ، پیغمبرِ اعظمؐ
شرف اس ذاتِ اطہر کو ملا قربِ الٰہی کا
ملا ہے آخری خلعت جہاں کی خیر خواہی کا
اسی کی ذاتِ والا شاہکارِ آدمیّت ہے
اسی پیکر سے وابستہ وقارِ آدمیّت ہے
یہی پیکر ہے جو مقصود و محبوبِ زمانہ ہے
جو ہے سرچشمۂ رحمت اسی کا آستانہ ہے
اسی کے نور سے روشن دلوں کے آبگینے ہیں
اسی کے نطق سے تابندہ حکمت کے نگینے ہیں
اسی نے منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کی
مٹائی رسمِ دنیا سے جفا کی، خود پسندی کی
سبق اس نے پڑھایا سرکشوں کو بُردباری کا
دیا انداز موجِ تُند کو بادِ بہاری کا
کیا مسمار اس نے ظلم کی سنگیں چٹانوں کو
سکھائی اس نے طرزِ آدمیت حکمرانوں کو
دلِ مردہ کو دی اس نے حرارت زندگانی کی
شکوہ و شادمانی کی، حیاتِ جاودانی کی
شرر بخشا ہے اسکے لطف نے خاکسترِ جاں کو
گداز و سوز کی نعمت عطا کی اہلِ ایماں کو
اسی کے فیض سے عالم میں موجِ رنگ قائم ہے
اسی سے دھڑکنوں میں نغمہ و آہنگ قائم ہے
عطا کرتا ہے وہ بے صوت نغمے ذہنِ انساں کو
دکھاتا ہے وہی خوش رنگ جلوے چشمِ حیراں کو
اسی کے ذکر سے تابندگی ہے محفلِ تن میں
اسی کے جسمِ اطہر کی ہے خوشبو صحنِ گلشن میں
جو بنجر دل تھے ان کی آبیاری اس نے فرمائی
ہوائے دہر بدلی، بزمِ عالم میں بہار آئی

اسی نے کشت زرد و خشک کو نئی قبا بخشی
اسی نے تپتے صحرا کو بہاروں کی ادا بخشی
زمانے کی روش بدلی، زمانے کا چلن بدلا
لباس خیر پہنایا، پرانا پیرہن بدلا
ہوا تازہ نہالِ آرزو پھر سے، بہاروں میں
تمنا کے کھلے گلہائے تازہ لالہ زاروں میں
فضا مہکی، شجر جھومے، گلوں میں تازگی آئی
نظر آنے لگی توحید کے گلشن میں رعنائی
افق سے صبحِ نو ابھری پیامِ سرمدی لے کر
متاعِ زندگی لے کر، نوید سرخوشی لے کر
جہالت کے اندھیروں میں چراغاں کر دیا اس نے
چراغِ نور سینوں میں فروزاں کر دیا اس نے
بصیرت مل گئی اندھے دلوں کو نورِ حکمت سے
قرارِ جاں میسر آ گیا آقا کی رحمت سے
جہاں کے بتکدوں میں پھر اذانوں کی صدا گونجی
مٹایا باطل صدائے حق، صدائے مرحبا گونجی
ہوئے جاری ہر اک لب پر ترانے حمدِ باری کے
سلیقے آ گئے انسان کو طاعت گزاری کے
ملی منزل ضلالت میں بھٹکتے پھرنے والوں کو
ملی آسودگی، حرماں نصیبوں خستہ حالوں کو
حضور آئے مکمل ہو گیا ایوان نبوت کا
رواں چشمہ ہوا جود و سخا کا، علم و حکمت کا
سعادت مل گئی مکے کو حضرت کی ولادت سے
شرف بخشا خدا نے اسکو اپنی خاص رحمت سے
زمانے کی نگاہوں کا ہوا شہرِ حسیں حاصل
نظر آتا ہے طوفانِ زمانہ میں یہی ساحل
یہ سب برکت ہے نورِ لولیس کے روئے زیبا کی
بنایا خالقِ اکبر نے نائب پیکر خاکی
نظر آنے لگا بیت اللہ میں اک نور کا جلوا
ہوئی پھر مرکزِ رشد و ہدایت وادیٔ بطحا

فروغ دیدۂ عالم ہوا مکے کا نظارہ
ہوا تبدیل قلبِ مطمئن سے قلبِ امارہ
کتاب آخری نازل ہوئی محبوبِ داور پر
بشارت امن کی ہے، رحمتِ حق کا حسیں پیکر
خدائے پاک نے بھیجا جہاں میں آخری ہادیؐ
رگِ مردہ میں جس نے زندگی کی روح دوڑا دی
ہوا اتمامِ نعمت ہو گئی تکمیل دیں آخر
ہوا رہبر زمانے کا یہی دینِ مبیں آخر
دیا وہ آخری منشور اس نے ابنِ آدم کو
سکون و امن کا پیغام ہے جو ایک عالم کو
پیامِ سنت و قرآں پیامِ امن لے آیا
ہوا جس سے زمانے پر سحابِ لطف کا سایا
یہی پیغام ہے جس نے نظامِ دہر کو بدلا
سکینت ہو گئی نازل خدا کے قہر کو بدلا
جنابِ رحمۃٌ للعلمیں نے لطف فرمایا
زمانہ ظلمتوں سے حلقۂ انوار میں آیا
دلوں کے زنگ اترے ہو گئے قلب و نظر روشن
سحر پھوٹی ہوئے فکر و نظر کے بام و در روشن
تصور اس نے بخشا ہے خدا کی کبریائی کا
سبق ہمکو دیا توحید کا، اس کی بڑائی کا
عبودیت کے سب انداز اس نے ہمکو سمجھائے
کئے ہم عاصیوں پر جنّت الفردوس کے سائے
مزکّیٰ کر دیا ہر ایک جاں کو درسِ حکمت سے
مجلّیٰ کر دیا اس نے دلوں کو نورِ وحدت سے
بنائے علم و حکمت، عقل و دانش، مصدرِ عرفاں
ہے اسکی ذاتِ اقدس حاصلِ دیں، حاصلِ ایماں
صدائے حق سے گونج اٹھی ہر اک بستی ہر اک وادی
ملی زندانِ کفر و شرک سے انساں کو آزادی
منور کر دیا اس نے دلوں کو نورِ ایماں سے
کیا آسودہ اس نے زندگی کو علم و عرفاں سے

یہ فرمایا وہی اکرم ہے جو تقویٰ میں بڑھ کر ہے
فضیلت ہے اسی کو فہمِ قرآں میں جو بہتر ہے
ملا احساس اس سے سرکشوں کو نیک نامی کا
قرینہ آگیا انسان کو شیریں کلامی کا
وہ جس کے نطق کا ہر لفظ حکمت کا ہے آئینہ
نظر آتا ہے اہلِ علم کو معراج کا زینہ
زمانے کو دیا ہے درس اس نے سرفرازی کا
سلیقہ اس نے سمجھایا ہمیں بندہ نوازی کا
سفینہ موجِ طوفاں سے لبِ ساحل پہ آپہنچا
مُسافر جادۂ دشوار سے منزل پہ آ پہنچا
مرا بختِ رسا اسکی محبت کا نشاں ٹھہرا
درِ حضرتؐ پہ آ کر زندگی کا کارواں ٹھہرا
میسر آگیا پھر جلوۂ معنیٰ نگاہوں کو
سجایا گلشنِ توحید سے تاریک راہوں کو
اسی جلوے سے قائم دلکشی ہے سارے عالم کی
ضیا ہر منظرِ خوش میں ہے اس نُورِ مجسّم کی
وہی ہم بیکسوں کا خستہ حالوں کا سہارا ہے
اسی نے جذبۂ الفت ہر اک دل میں اتارا ہے
سناتا ہے وہی مُژدہ غمِ جاں سہنے والوں کو
اُجالوں کی خبر دی ظلمتوں میں رہنے والوں کو
مداوا ہو گیا ہر اک کے رنج و یاس و حسرت کا
زمانے میں ہوا آغاز دورِ امن و راحت کا
شکستہ خستہ حالوں کو سہارا مِل گیا اُس سے
اندھیری رات میں روشن ستارا مل گیا اس سے
ہر اک کے درد کا دُکھ کا اسی کا در مداوا ہے
جو ہے وجہ سکون و امن اس کی ذاتِ والا ہے
وہی مایوسیوں میں مژدۂ رحمت سناتا ہے
اسی کا نامِ نامی رنج و غم میں کام آتا ہے
اسی نے ہم پہ کھولا رحمتِ باری کا دروازہ
لگا سکتا نہیں اس کے کرم کا کوئی اندازہ

بِنا ڈالی ہے اُس نے دہر میں حق و صداقت کی
عدالت کی، امانت کی، اخوت کی، شجاعت کی
اسی کی ذات نے قائم کیا معیارِ انسانی
ہے محبوبِ جہاں وجہِ فروغِ بزمِ امکانی
تمیزِ بندہ و آقا زمانے سے مٹا ڈالی
مساوات و اخوّت کی زمانے میں بِنا ڈالی
اسی کے درسِ حکمت سے زمانے میں اجالا ہے
اسی نے ظلمتوں سے ابنِ آدم کو نکالا ہے
رہے شاداب ہر اک آن کشتِ آرزو میری
سوئے شہرِ مدینہ تیز تر ہو جستجو میری
محبّت کے کھلیں گلہائے تازہ دامنِ دل میں
سرور و کیف کی حالت رہے طیبہؑ کی منزل میں
میسر ہو حرم کی مجھ کو وہ آئینہ سامانی
رہے ہر دم نگاہِ شوق میری وقفِ حیرانی
ادب سے حاضری ہو درگہِ محبوبؐ باری پر
مقدّر کو ہو میرے ناز اس طاعت گزاری پر
ادب کے لہجۂ شیریں میں ہر اک لفظ ڈھل جائے
بشکلِ اشک دامن میں رہیں الفت کے سرمائے
جنوں میرا رہے حدِّ ادب میں آستانے پر
رہے صحنِ حرم میری نظر کا مرکز و محور
نظر جس سمت اُٹھے سامنے ہو اُس کا نظارہ
جمالِ دل نشیں کا ہو زمانہ آئنہ سارا
وفورِ شوق میں چوموں ہر اک ذرہ مدینے کا
رہے احساس مجھ کو ہر گھڑی اس آبگینے کا
ہر اک لمحہ حضوری کا کمالِ شوق میں گزرے
ملے خیرات جذب و شوق کی سرکارؐ کے در سے
اسی کے دھیان میں وجہِ سکون ہو دل کی بیتابی
اسی کے نور سے میری شبِ ظلمت ہو مہتابی
مرا ہر سانس ہے ممنون اسکی دستگیری کا
مرا ہر اک عمل ہے آئنہ منت پذیری کا

بڑی قیمت پڑی دربار میں اشکِ ندامت کی
نظر ڈالی حضورِ پاک نے مجھ پہ محبت کی
نگاہِ شوق میں رہتا ہے عکس انکی محبت کا
دلِ عاشق ہے آئینہ جمالِ روئے حضرت کا
ہمارے بخت کی معراج آقا کی غلامی ہے
وہی اک در ہے جس کا فیض عالم میں دوامی ہے
مرا ہر لفظ گوہر ہے بفیضِ رحمتِ عالم
وہ جنکے دردِ مہجوری سے ہر اک آنکھ ہے پُرنم
اسی کے لطف سے دنیائے سوز و ساز قائم ہے
مری حمد و ثنا کا دل نشیں انداز قائم ہے
وہی مدحت کے مجھ کو نت نئے مضمون سجھاتا ہے
وہی مجھ بے ہنر کو معجزے فن کے دکھاتا ہے
مرے افکار میں تابانیاں ہیں شہرِ طیبہ کی
نگاہوں میں ہے میرے روشنی انوارِ بطحا کی

مرے شعروں میں شہہ نور کی ہوتی ہیں تنویریں
دکھاتا ہے وہی خوابِ حسیں کی مجھ کو تعبیریں
وہی ہر سال مجھ کو آستانے پہ بلاتا ہے
نشانِ لطف و رحمت ہر قدم مجھ کو دکھاتا ہے
مری ہر نعت میں خیرات ہے اس آستانے کی
جبینِ شوق جھکتی ہے جہاں سارے زمانے کی
شفیعُ المذنبیں کی ہو شفاعت بخت میں میرے
قبولِ بارگاہِ سیدِ کونین ہوں نغمے
حدودِ فہمِ انسانی سے بالا ہیں صفات اسکی
کہ قرآں جس کا ہے وصّاف ہے وہ پاک ذات اسکی
خدایا نعت حافظ کی بنے عقبیٰ کا سرمایا
رہے ہر اُمتی پہ دامنِ سرکار کا سایا

شہزاد احمد

نعت

○

یوں تو ہر وقت وہاں بزم سجی ہوتی ہے
منتظر ہوں کہ مری کب طلبی ہوتی ہے

ایک ہی حال میں رکھتا ہے مجھے ذوقِ طلب
کوئی ہوتا ہے اضافہ نہ کمی ہوتی ہے

شوقِ دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر
پھول بنتی ہے وہی شے جو کلی ہوتی ہے

راہرو خود ہی قدم رکھتے ہیں ڈرتے ڈرتے
جیسے ہر موڑ پہ دیوار بنی ہوتی ہے

کوئی ہمت تو کرے بات تو کر کے دیکھے
یہ وہ محفل ہے جہاں دادرسی ہوتی ہے

ہو اشارہ تو مجھے لذتِ گویائی ملے
ہوں وہ مٹی کہ جو رستے میں پڑی ہوتی ہے

وہی لے جاتی ہے ساحل پہ سفینے سارے
جو ہوا آپ کی جانب سے چلی ہوتی ہے

اب تو یوں کاٹتا ہوں عمر کا لمحہ لمحہ
جو گھڑی ہوتی ہے رخصت کی گھڑی ہوتی ہے

یوں برستے ہیں مری آنکھ سے آنسو شہزاد
جیسے برسات کے موسم کی جھڑی ہوتی ہے

امجد اسلام امجد

○

حرا کی خلوتوں میں جو شہِ لولاک پر اُترا
رہے گا حشر تک امجدؔ اُسی پیغام کا چرچا

خوشا راہیں کہ جن پر آپ نے اپنے قدم رکھے
خوشا آنکھیں کہ جن کے بخت میں تھا آپ کا چہرا

ترے الطافِ بے حد سے نہیں رہتی کوئی مشکل
ترے دریائے رحمت سے نہیں پھرتا، کوئی پیاسا

ترے روضے کے گنبد پر نظر جس وقت ٹھہری تھی
وہی لمحہ کنارا تھا، مرے دشتِ تمنا کا

ترے شہرِ مکرم کی ہوا میں سانس لیتے ہی
مرے سینے کا سارا بوجھ، جیسے ہو گیا، ہلکا

وہ مسجد، جس کی دیواریں، تری خوشبو سے روشن ہیں
خوشا قسمت کہ میں نے اس کی مٹی پر کیا سجدہ

بس اک آواز گونجے اور جہاں کا رُخ بدل جائے!
نہ ممکن تھا، نہ ممکن ہے، مگر یہ معجزہ، دیکھا

نہ رستہ ہے، نہ منزل ہے، عجب آشوب میں دل ہے
مرے ہادی، مرے رہبر، مرے مولا، مرے آقا!

ازل سے تا ابد امجدؔ، دُرود اُس پر، سلام اُس پر
کہ جس نے آدمی کو آدمی کا مرتبہ بخشا

ذوقی مظفر نگری

نعتِ رسولؐ اکرم

شعورِ زیست کی مانند، آگہی کی طرح
وہ میرے دل کے حرا میں ہیں، روشنی کی طرح

رسولِؐ پاک بباطن ہیں کیا، خدا جانے
خطا معاف بظاہر ہیں آدمی کی طرح

درودِ رحمتِ کونین کا ہے کیا کہنا
دیارِ مرگ میں آئے ہیں، زندگی کی طرح

بکھیر دی ہے چمن میں نشاط کی خوشبو
کلی کلی سے ملے ہیں، شگفتگی کی طرح

دیا ہے عادلِ دوراں نے عدل دُنیا کو
کیا ہے قرض ادا، فرض بندگی کی طرح

مری نگاہ پہ روشن ہو کیوں نہ رازِ حیات
مجھے ہے رُو نے نبیؐ صبحِ آگہی کی طرح

کھلی ہیں رُوح پہ خلدِ نجات کی راہیں
جب ایک سانس لیا میں نے اُمتی کی طرح

نبی ہُوا ہے نہ ہو گا مرے حضورؐ کے بعد
ہزار جلوے دکھائے کوئی نبیؐ کی طرح

حضورؐ آپکی نسبت سے ہو گئی پہچان
ہجومِ دہر میں ذوقی تھا اجنبی کی طرح

قطعہ

جب محمدؐ سے وابستگی ہو گئی
تیرگی دفعتاً روشنی ہو گئی
موت کا خوف ہی دل سے کیا مٹ گیا
اصل میں زندگی، زندگی ہو گئی

تُم شوکتِ بہار، تمھیں شانِ کائنات
تُم سے ہے رنگ و نورِ گلستانِ کائنات

تُم سے ہیں فیض یاب اُجالوں کی تابشیں
تُم ہو بنائے صبحِ درخشانِ کائنات

جلوے حقیقتوں کے نگاہوں پہ چھا گئے
نادم ہوں کیوں نہ شعبدہ بازانِ کائنات

صُبحِ ازل کے نُور کا اعجاز، مرحبا
سُورج میں ڈھل گیا ہے شبستانِ کائنات

دُنیا کا اعتبار ہو عُقبیٰ کا ہو یقیں
مختارِ مُمکنات ہو خاقانِ کائنات

تُم نے یہ راز کھول دیا اہلِ علم پر
ذرّوں کے دائروں میں ہے امکانِ کائنات

اللہ کا نظام تمھارا نظام ہے
اے رحمتِ تمام و نگہبانِ کائنات

وحدت کے بے شُمار مناظر کو جوڑ کر
بخشا ہے کائنات کو عرفانِ کائنات

کیوں کر جھکے نہ پاؤں پہ لمحات کی جبیں
اپنانے کار ساز ہو، ایمانِ کائنات

سُن کر رسُولؐ پاک سے اللہ کا کلام
سکتے میں آ گئے ہیں سُخن دانِ کائنات

توحید کے گُلوں سے ز خوشبوئے مُصطفےٰ
مہکا ہُوا ہے آج بھی دامانِ کائنات

کیوں زندگی کا غم ہو اُسے کیوں ہو خوفِ مرگ
ذوقی پہ مہرباں ہیں سُلطانِ کائنات

رفیع الدین ذکی قریشی

نعت

سرورِ کون و مکاں کا جب اشارا ہو گیا
ضوفشاں اپنے مقدر کا ستارا ہو گیا

یہ شفیع المذنبیں کی چشمِ رحمت کا ہے فیض
جنت الفردوس پر اپنا اجارا ہو گیا

زورقِ انسانیت کو ناخدا ایسا ملا
حلقۂ گرداب بڑھ کر خود کنارا ہو گیا

وہ مسیحِ روحِ انساں وہ طبیبوں کا طبیب
ہر دُکھی دل کی دوا ہر غم کا چارا ہو گیا

سر بسر تھی اک خسارہ زندگی انسان کی
آپ کے آتے ہی پورا ہر خسارا ہو گیا

آفتاب آیا پلٹ کر سنگ ریزے بول اُٹھے
چاند اُن کے اک اشارے سے دوپارا ہو گیا

ہو گیئں حاصل اُسے دونوں جہاں کی نعمتیں
جس کو اولادواب وجد سے وہ پیارا ہو گیا

دیدنی ہے عبد اور معبود میں یہ ربطِ خاص
جب ہوئے ہم اُنکے خالق بھی ہمارا ہو گیا

یادِ طیبہ میں مری آنکھیں جو پُر نم ہو گیئں
آنسوؤں کا ایک اک قطرہ ستارا ہو گیا

نعت برلب جب میں پہنچا نیند کی آغوش میں
جنتِ طیبہ کا سوتے میں نظارا ہو گیا

مدحِ سرکارِ عُلا کا فیض ہے یہ بھی ذکی!
محفلوں میں معتبر یہ ہیچ کارا ہو گیا

تحسین فراقی

استغاثہ بحضورِ سرورِ کونینؐ

جو اہلِ محبت کے لئے روح و رواں ہے
اس وادئ اقدس میں معلق مری جاں ہے

تحریر کیا ہے جو بگولوں نے ہوا پر
سب ذکر ہمارا بحدیثِ دگراں ہے

برجیس رُخا! دردپناہا، مرے شاہا
میں ڈھونڈ تھکا تجھ کو، کہاں ہے تو کہاں ہے

سانسوں میں ترے نام کے نافے کی ہے خوشبو
سینے میں ترا زمزمۂ ذکر تپاں ہے!

ہونٹوں پہ دُرودوں کی شفق پھول رہی ہے
اور آنکھ سے بارانِ گہر بار رواں ہے

اک دِل کی لگی ہے کہ بجھائے نہیں بجھتی
اک آگ کا دریا رگ و ریشہ میں رواں ہے

اے میرِ نمو! جانِ حیات و شہِ کونینؐ
پھر آ کہ ہر اک سمت ہلاکت کا سماں ہے

ماتھے پہ ہے ملت کے رقم دردِ مفصل
گو آہوں میں اس کی نہ شرر ہے نہ دھواں ہے

تو نغمۂ فردوس و غنائے دفِ جاں ہے
تو زمزمۂ تارِ ربابِ دوجہاں ہے!

تو تازہ تریں گل احدیت کے چمن کا
شاداب تریں غنچۂ شیریں سخناں ہے

اُس بارگہِ قدس میں کچھ عرضِ شفاعت
اس قوم کے حق میں کہ ملول و نگراں ہے

صدیوں سے پڑا اتنا کڑا وقت جو ٹل جائے
اس اُمتِ مرحوم کی تقدیر بدل جائے

حفیظ تائب

دُعا

یا رب! حرم کی خیر ہو، اہلِ حرم کی خیر
سارے عرب کی خیر ہو، سارے عجم کی خیر

اک آگ میں ہے ملّتِ بیضا گھری ہوئی
ٹھنڈی یہ آگ ہو ترے لطف و کرم کی خیر

قائم رہے فضیلتِ بغداد و کربلا
طیبہ کی خیر، مکّہ کے جاہ و حشم کی خیر

اپنوں کی سازشوں سے بچا اہلِ خیر کو
باطل کی یورشوں میں ہو حق کے علَم کی خیر

انسانیت پہ رحم ہو رحمت کا واسطہ
خیر الوریٰ کے صدقے میں خیر الامم کی خیر

قتیل شفائی

○

رجھ اس کو ندامت کا اٹھاتے نہیں دیکھا   پتھر کو پسینہ کبھی آتے نہیں دیکھا
کیا حُسن و جمال اُس کا سمیٹے غزل اپنی   کوزے کو سمندر میں سماتے نہیں دیکھا
یاں شمع پہ دے دیتا ہے پروانہ' پر اس کو   احسان کبھی ہم نے جتاتے نہیں دیکھا
لگتی ہو ضیا اپنے ہی گھر میں جسے اچھّی   راہوں میں دیا اس کو جلاتے نہیں دیکھا
مسجد کا وہ مُلاّ ہو کہ مندر کا پجاری   دونوں کو کبھی ہاتھ ملاتے نہیں دیکھا
اے درد میں لتھڑے ہوئے لوگو' کبھی تم نے   برسات میں چڑیوں کو نہاتے نہیں دیکھا؟

واعظ ہے قتیل ایسا مغنّی جسے ہم نے
اک پیار کا نغمہ کبھی گاتے نہیں دیکھا

○

بہت مشکل سے بستی کی طرف دیوانہ جاتا ہے   اگر جائے تو ساتھ اُس کے کوئی ویرانہ جاتا ہے
گیا تھا ایک شب ناراض ہو کر بادہ کش کوئی   اب اُس کو ڈھونڈنے ہر شام خود میخانہ جاتا ہے
نشہ اُن میں کچھ ایسا ہے جو مے کو بے اثر کر دے   اُن آنکھوں کے مقابل کب کوئی پیمانہ جاتا ہے
اترتی ہے زمیں پر روشنی جھلمل ستاروں کی   مگر پہلے کسی آنچل سے اُس کو چھانا جاتا ہے
بہت کم جگمگا کر بجھ گیا تھا صُبح کا تارا   مگر اب روشنی کا وہ پیمبر مانا جاتا ہے
کہیں سے ڈھونڈ کر لائے کوئی وہ تیر سی نظریں   کہ جن کے سامنے سینہ خوشی سے تانا جاتا ہے
نہیں واعظ کے فرضِ منصبی میں یہ سفر شامل   وہ جب بھی میکدے جائے' رضا کارانہ جاتا ہے

بہت پہلے قتیل اک شخص سے اپنے مراسم تھے
مگر وہ اب بھی میرے نام سے پہچانا جاتا ہے

○

بھرتے رہیں دَم اہلِ ستم اور کسی کا
ہو جائے گا ہم پر بھی کرم اور کسی کا

جانا ہے تو جا شوق سے اے صُبح کے تارے
ہم دیکھیں گے رستہ کوئی دم اَور کسی کا

اللہ کے گھر کا جو کوئی راستہ پوچھے
دیتے ہیں پتہ دیر و حرم اَور کسی کا

ہوتا ہے جو مفلس کے لیے عرش سے نازل
اُس رزق سے بھرتا ہے شکم اور کسی کا

بے جُرم و خطا دی ہے سزا جس نے کسی کو
اُس شخص نے برتا ہے قلم اَور کسی کا

سچ یہ ہے کہ پوجا نہیں کعبے میں بھی ہم نے
اب لینے لگے نام صنم اور کسی کا

اب حُسن بھی یکساں کہیں ملتا نہیں یارو
زلف اور کسی کی ہے تو خم اَور کسی کا

تھی فتح حقیقت میں کسی اور جری کی
اور جشن مناتے رہے ہم اور کسی کا

جس دن سے قتیل اسکو سجایا ہے لبوں پر
ہم ذکر کیا کرتے ہیں کم اَور کسی کا

عطاء اللہ سجاد

○

اے اہلِ جنوں کچھ ہوش بھی ہے اب عہدِ بہاراں آ پہنچا
وہ قافلۂ گُل رنگ فشاں پیشِ درِ زنداں آ پہنچا

اب صحن چمن میں دیوانوں کے میلے لگنے والے ہیں
اب صحن چمن میں بھی دیکھو اندازِ بیاباں آ پہنچا

ہے اہلِ خرد کی محفل میں ہنگامۂ وجد و حال بپا
شاید کہ کوئی قندیلِ جنوں لے کر تہِ داماں آ پہنچا

اب عشق پہ انگلیاں اٹھیں گی اب حسن کے چرچے پھیلیں گے
جو ہاتھ تھا پہلے دامن پر اب تا بہ گریباں آ پہنچا

اب اہلِ ہوس کو بار کہاں ، اب اہلِ وفا کی باری ہے
سنتے ہیں کہ ان کی محفل میں سجاد غزل خواں آ پہنچا

○

اک دیوانہ پھرا کرتا ہے غمناک ہنوز
کاش پہچانو یہ ہے کون جگر چاک ہنوز

میرے ویرانے میں بھی برقِ تجلی چمکے
تپش آمادہ ہیں میرے خس و خاشاک ہنوز

تیرے قدموں سے لپٹنے کی تمنا ہے اسے
رہگزاروں میں ہے آوارہ میری خاک ہنوز

میں نے تادیب بہت کی ہے نگہہ کو لیکن
لوٹ لیتی ہے ترے جلوے پہ بیباک ہنوز

عشق اب عقل کے حربوں سے خبردار رہے
دامِ تزویر لئے بیٹھی ہے چالاک ہنوز

یہ گنہگار نگاہیں تو بھٹک جاتی ہیں
اے میری جان! میرا دل ہے مگر پاک ہنوز

عشق میں پہلی سی وہ شدتِ احساس کہاں
آنکھ لیکن ہے تیری یاد میں نمناک ہنوز

سالہا سال سے وہ نام نہیں لیتے میرا
ہاں میرے ذکر سے ہو جاتے ہیں غمناک ہنوز

○

مانوس ہیں اگرچہ تیری برہمی سے ہم
آزردہ تر ہیں آج تیری بے رُخی سے ہم

یہ لطف گاہ گاہ بھی شاید ہے اسلئے
گھبرا نہ جائیں درد و غمِ عاشقی سے ہم

ہے گوشۂ جنوں میں سہارا تیرا خیال
کچھ اور مانگتے ہی نہیں زندگی سے ہم

ہوتا جو تیری مست نگاہوں کا اعتبار
رکھتے نہ کوئی ربط کبھی میکشی سے ہم

اس آرزو میں کوئی رفیقِ سفر ملے
ہیں رہ سپارِ دشتِ جنوں میں کبھی سے ہم

ہر رہگذر تمہاری طرف لے گئی ہمیں
گزرے ہیں بار بار تمہاری گلی سے ہم

○

زندگی کی راہوں میں تھک گئے قدم میرے
سنگِ راہ بن بن کر روکتے ہیں غم میرے

دوستی، وفاداری، عشق، رسمِ دلداری
ریزہ ریزہ بکھرے ہیں سامنے صنم میرے

تیری یاد کی شبنم آج رات پھر ٹپکی
آستین و داماں پھر ہو گئے ہیں نم میرے

"اب نبردِ الفت میں کون ہاتھ کٹوائے"
کہہ رہے ہیں حسرت سے سرنگوں علم میرے

وصل میں ہوں بالیدہ، ہجر میں سرافگندہ
کارگاہِ ہستی میں ہیں یہ زیر و بم میرے

ساحلِ سمندر پر موج نے ہمیں دیکھا
اور پھر ہوئے رُسوا رازِ یَم بہ یَم میرے

تا جبینِ شاہی پر پھر شکن نہ آ جائے
سامنے نہ اب لائے کوئی جامِ جم میرے

چاک پیرہن میرا، وہ رِدا قبا میں ہے
میں سبک سہی لیکن دوست محترم میرے

عبدالعزیز خالد

○

عمل کا داعیہ صرفِ بیاں ہُوا سارا
شبابِ رفتہ کو لوٹا سکا نہ گشتہ نیا

وہی مثل ہے کہ اندھیر نگری چوپٹ راج
ہے دور دورہ وہی خلفشار و وحشت کا

پلٹ کے کیا کبھی اس کی خبر بھی لیتی ہے
وہ ذات جس نے بنایا زمیں کو گہوارہ؟

بغیر کاشت کے بھی کھیت لہلہائے کبھی؟
بغیر تیل کے بھی کیا کبھی چراغ جلا؟

اٹھانی پڑتی ہے خود ہر کسی کو اپنی صلیب
نواحِ درد میں کوئی قلی نہیں ملتا!

گرج رہی ہے فضا میں جلال کی آواز
ہے کون ایسے میں اہلِ زمیں کا کھوالا؟

فروغِ نار کی زد میں ہے وادیٔ ایمن
پھلا ہے آبلوں سے جسم شرقِ اوسط کا

ہے قہرمانوں کو کھوج اس کا نشبدہ کیا تھا
کہ جس کی شکتی سے بِشو نے مدن کو راکھ کیا؟

○

خداوندا! ترے دکھیارے بندے
کسے پکڑیں؟ کریں فریاد کس سے؟

کسے مطلب سُنے جو اُن کی بِپتا؟
کسے فرصت جو آنسو ان کے پونچھے؟

دِلوں پر جن کے تُو نے مُہر کر دی
کریں احوال کی اصلاح کیسے؟

تپِ صہبا سے پگھلے آبگینہ
گھلائیں دِل کو ناآسودہ جذبے

بشر نکلے گا جب گشتِ فلک کو
ستارے چھوڑ دیں گے اَپنے رستے

عزیمت پڑھ کے جنّوں کو بلاؤ
کہ اب رُوحِ زمیں ان کو پکارے

نہ بھولے وہ خمار آلود لہجہ
سرودِ رفتہ کو پھر کان ترسے

تبسم ان کا گویا واشدِ گُل
طرحداروں کی رمزیں کون سمجھے؟

ازل کے تشنگاں کی تشنہ کامی
کہاں مٹتی ہے تاکستاں کی مَے سے؟

زمانوں میں سفر کرنا گر آتا
کہاں پھر ہم کسی منزل پہ ٹکتے؟

مری حسرت، مری وارفتگی دیکھ
بدل کر اَپنے دِل کو میرے دِل سے

ترے چہرے پہ میرے سب تبسم
مری آنکھوں میں تیرے اشک سارے

مرے جاتے ہو کیوں شہرت کی خاطر
چڑھے گا چاند تو سب دیکھ لیں گے

سمجھتے ہیں وہی خالد کی مشکل
شناور ہیں جو گہرے پانیوں کے

○

غرض کا بندہ نہ تھا، جاہ کا اسیر نہ تھا
ہے کون آدمی ایسا جو ناگزیر نہ تھا؟

کرے نہ پرورشِ آہ و نالہ کوئی، گئے
وہ دن کہ دردِ محبت دوا پذیر نہ تھا

ہے عام دعوتِ نظارہ و نظر بازی
رہا وصال تو کیا زُود یا بدیر نہ تھا؟

ہیں دم دلاسے تو انسان دوستی کے بہت
مگر ستم زدوں کا کوئی دستگیر نہ تھا

ہیں سوچ میں بنی آدم کہ جس نے خلق کیا
وہ اور سب تو تھا کیا عادل و قدیر نہ تھا؟

ہیں کتنے وسوسے اظہار جن کا کر نہ سکیں
حدیثِ نفس کو کب خوفِ دار و گیر نہ تھا؟

تہِ فلک کہیں آیا نہ دیکھنے میں وہ حُسن
بزعمِ خویش جو بے مثل و بے نظیر نہ تھا

جذیمہ ابرش و زَبّا کے قصّے میں سرِمُو
ہمیں گمانِ اداکاریٔ قصیر نہ تھا

قبولِ عام کسی کو بلا سبب نہ ملے
نہ پائی اس نے بقادِل کا جو فقیر نہ تھا

کبھی نہ مِل سکی لوحِ طلسمِ کُن اس کو
کہ سینہ جس کا تجلّی سے مستنیر نہ تھا

کوئی نیا نہیں ذوقِ معانیٔ رنگین
میں کب قتیلِ حکایاتِ دلپذیر نہ تھا؟

ہوں گوشہ گیر مگر کاہل الوجود نہیں
میں کن طیورِ سبک پر کا ہمصفیر نہ تھا؟

ہیں اہلِ ریختہ اپنے لکھے پہ یوں نازاں
کہ جیسے اگلے زمانے میں کوئی میرؔ نہ تھا

شکستِ ریختہ سے بچتا تو کس طرح خالدؔ!
وہ خوش معاش کہ سوداگرِ ضمیر نہ تھا؟

○

کس کو پکارے طائرِ گم کردہ آشیاں؟
کون اس جہانِ زار میں پرسانِ خستگاں؟
الجھا ہوا ہے اپنے ہی پھندوں میں ہر کوئی
ان حالوں کیا اسے خبرِ حالِ دیگراں!
جنگ و جدل مطابقِ قولِ ملائکہ
برپا ہے جا بجا بنی آدم کے درمیاں
مرغِ صفیرہ زن کرے پت جھڑ میں بھی الاپ
آزادگاں کو کنجِ قفس بھی ہے آشیاں
یہ اپنے حال میں متمکن سے لوگ ہیں
مستقیانِ بادۂ خمخانۂ بیاں
مرتے ہیں سانس سانس بکھرتے ہیں پور پور
پیشِ نظر ہے نفعِ جہان و جہانیاں
ان سا کشادہ دل نہ کوئی ان سا دیدہ ور
دنیا انھیں سمجھتی ہے از خود گزشتگاں
تخلیقِ حسن کے سفرِ دیولاخ میں
سچ ان کا پاسبان ہے یہ سچ کے پاسباں
چرخِ ستیزہ کار کا کس بل نکل گیا
جب سے دعی ہے نقشِ کفِ پا سے کہکشاں
تھے جو کبھی حقیقتیں افسانے بن گئے
کھوئی ہوئی محبتوں کے ہم ہیں نوحہ خواں
ہم حسن دوست تو ہیں مگر بوالہوس نہیں
رہتے ہیں سرخوشانہ تماشائے گلستاں
لیتے ہیں اکثر ابلہ فریبی کا اس سے کام
ہوتی نہیں ہر ایک نظر دل کی ترجماں
جو نابلد ہے شعر کے فن سے بقولِ خود
ہے آبروئے شعر وہ اقبالِ جاوداں
اسلام کی جو برکتیں گنوائیں رات دن
ہیں طعمہ خوارِ ریزشِ خوانِ مسیحاں !

○

کیا ہے قدیم عالمِ فن میں جدید کیا ؟ ہوتی ہے کائنات کی ہر آن ابتدا
دل دل سے ہمکلام ہو دوری کے باوجود کیا وقت ہی کی طرح اضافی ہے فاصلہ؟
زنگار ڈھانپے آئنے کو، آگ کو دھواں لمحے رفاقتوں کے ہیں کتنے گریز پا !
کرتا ہوں درد و غم کی حکایت کفایۃً آرائشِ بیاں کا ملمع اتر چکا
دیوار جو اٹھاتے ہیں بنیادِ غیر پر کس منہ سے کرتے ہیں گلۂ بختِ نارسا؟
کھلتے ہو ناز و غمزۂ خوباں کا کیا فریب؟ یکساں ہے سب کا ذائقہ قربت جدا جدا
دے آتشِ چمن کو ہوا بادِ نرم رو ہے چشمِ شوق غازۂ رخسارِ دلربا
ہے خامشی بھی پردۂ سازِ سخن ہمیں سنتے ہیں وحی کی طرح آوازِ آشنا
خلوت پسند کچھ تو مزاجاً ہیں اور کچھ بزمِ سخن میں کوئی نہ ہمدم نہ ہمنوا
آسودہ خاطری نہیں اس کے نصیب میں فنکار کا ضمیر ہے جامِ جہاں نما
نکلی متاعِ لوح و قلم نقدِ کم عیار
کیا کیا نہ ہم کو اپنی نگارش پہ ناز تھا !

○

زمیں نژاد ہیں لیکن زماں میں رہتے ہیں مکانی ہوتے ہوئے لامکاں میں رہتے ہیں
سوادِ سود مبارک ہو اہلِ حرفت کو ہم اہلِ حرف نواحِ زیاں میں رہتے ہیں
قرار کیا ہو میسّر کہ ہم تو آٹھ پہر ہراسِ حادثۂ ناگہاں میں رہتے ہیں
پڑوس اپنوں کا، اپنا ہی شہر ہے لیکن لگے کہ جیسے زدِ دشمناں میں رہتے ہیں
نہیں مزاج میں آوارگی مگر پھر بھی ہمیشہ ہجر و وصالِ بتاں میں رہتے ہیں
وہ ڈول ڈالیں کسی کارِ پائدار کا کیا جو بے ثباتیِ عمرِ رواں میں رہتے ہیں
ہم ایسے اہلِ چمن گوشۂ قفس میں بھی حسابِ خار و خسِ آشیاں میں رہتے ہیں
نہ بود و باش کا پوچھو کہ ہم فقیر منش سخن کے معبدِ بے سائباں میں رہتے ہیں
کہاں تلاش کرو گے ہمیں کہ ہم تو مدام حضوریِ دلِ بے خانماں میں رہتے ہیں
نشے کی لہر میں خُم خُم لنڈھا کے آبِ حیات سرابِ زندگیِ جاوداں میں رہتے ہیں
ہمارے شعر پہ جو نقدِ جاں نثار کریں جنوبِ کشورِ ہندوستاں میں رہتے ہیں
نئی محبتیں خالدؔ پرانی دوستیاں
عذابِ کشمکشِ بے اماں میں رہتے ہیں !

۵- بعنت سوانی

بزمِ مشاعرہ

○

کیا وقت تھا "شگفتنِ گلہائے ناز کا"
پھرتا ہے اب تک آنکھوں میں کل صُبح کا سماں

کالج میں بہرِ شرکتِ تقریبِ شاعری
جب چند ساعتوں کو ہُوا تھا مَیں میہماں

بزمِ مشاعرہ میں بہ فیضِ فروغِ رنگ
(اظہارِ حال ہے، نہیں رنگینیِ بیاں)

وہ آب و تاب تھی، وہ چکا چوند، یوں لگا
جیسے زمین پر اتر آئی ہے کہکشاں

نوخیز شاعرات کو سُنتے گماں ہُوا
ہیں عندلیبیں صحنِ گلستاں میں نغمہ خواں

شایانِ شاں اِدارے کے تھا نظم و ضبط بھی
حسنِ مذاقِ علم کہ ہر اک بات سے عیاں

ہو جن میں ہر اک اپنی جگہ ایک درسگاہ
ایسی مُعلّماتِ خجستہ شِیَم کہاں ؟

بے اختیار دِل سے نکلتی ہے یہ دُعا
یہ انجمن رہے یونہی آباد و شادماں!

—— خواتین اِسلامیہ کالج "کُوپر روڈ" لاہور

○

انتہا یہ ہے

کسی زمانے میں ازراہِ تعلّی میں نے یہ شعر کہا تھا:

اقبال و میر و غالب، عبد العزیز خالد
چاروں اَلُوالبیاں ہیں، چاروں اَبد نشاں ہیں

مگر اَب

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

خاک کے خاک میں مِلنے کا بیان :

میں نے چاہا تھا بڑا شاعر بنوں
نام اپنا تا اَبد روشن کروں
فکر و فن کو اِک نیا آہنگ دوں
زندگی اپنی اسی میں جھونک دی
زُعم تھا اَپنے بڑے پَن کا مگر
لکھتے لکھتے سانس لینے کو رکا
تو فرازِ چرخ سے آئی صدا

اَے گرفتارِ فریبِ نفس سُن !
اپنی عظمت کے عبث سپنے نہ بُن
کیا ابھی تک تو ہے اس سے بے خبر
اک خطِ موہوم ہے منزل تری
آبلہ پائی ہے لا حاصل تری
کوئی استدراج و تعویذ و فسوں
لا سکے گا بَر نہ تیرا مُدّعا
تُو ہے جس اعزاز کے پیچھے پڑا
آں خیال است و محال است و جنوں؟

○

ناکردہ کی تلافی، بروقت ہے تو جب بھی

بے خیالی سے، انانیت سے یا بیجا جھجک کی وجہ سے
کر سکے جس کو نہ ہم بروقت تحسین و ستائش کا وہ لفظ
معذرت کا وہ ہٹیلا حرف وہ شرمیلا فقرہ جو زباں پر آتے
آتے رہ گیا
شکریے کا وہ سخن لگنے نہ پائی جس کو باہر کی ہوا
قول وہ ممنونیت کا رہ گیا جو اَن کہا
اور پھر سینے میں کانٹے کی طرح چبھتا رہا
پیار کی وہ بات جو محرومِ گویائی رہی
لب تک آئی آگے آنے کی نہ ہمت کر سکی
وہ غلط فہمی کھچاوٹ کا جو باعث بن گئی
اور پھر اس کے تدارک کی نہ ہاتھ آئی گھڑی
وہ سلام دوستی، وہ عہد و پیمانِ وفا
معرضِ گفتار میں آنے کو جو بیکل رہا
دلنوازی کا وہ گونگا لفظ، ہمدردی کا وہ خاموش بول
وہ حکایت شوق کی جس کا چکایا جا سکا ہم سے نہ مول
اور اب ہم کو ڈراتی ہے بہ ہیبت ناکیِ آسیب و غول
ایسا قرضہ ہے جسے بیباق کرنا ہے ہمیں
گر پرانا ہو چکا تو کیا ہوا
گردِ ماہ و سال اس پر جم چکی تو جھاڑ پونچھ اس کی کریں
بر بنائے دیر، مت
زائدُالمیعاد گردانیں اسے
ہے وہ اک ایسی امانت جس کو لوٹانا ہمارا فرض ہے
ہے وہ ہم پر واجب الذمہ ہمارا وہ بقایا قرض ہے
گفتنی باتیں جو ناگفتہ رہیں
ان کے ہم مقروض ہیں
مسئلہ حل ہو نہ کوئی محض سینہ کوبی و افسوس سے
جرم سے تب تک نہ چھٹکارا ہو جب تک ہو نہ کفارہ ادا
ہو نہ تطہیرِ دروں اس وقت تک
ساعتِ رفتہ کے نامفوظ کو
لفظِ تازہ کا کریں جب تک نہ پیرایہ عطا
عذرِ تاخیر ایسے کاموں میں نہ کرنا چاہیئے
جو بھی حاضر وقت ہے اس کو نہ اب
اور پیش و پس میں کھونا چاہیئے
دل میں جو داغ ندامت ہے گذشتہ کا، اسے فی الفور دھونا چاہیئے
کون کہتا ہے نہیں ممکن ازالہ کھو چکے لمحات کا؟
گمشدہ کلمات کی ممکن نہیں
بازگشت و بازیافت؟
کب تک احساسِ پشیمانی کا جھیلیں گے عذاب
جو بھی کرنا چاہیئے تھا چاہیئے اب اس کو کر لینا شتاب
تاکہ بے چینی مٹے دِل کی، برابر ہو حساب
مخلصی کا ہے یہی رستہ، یہی راہِ نجات
(مہلتِ بخیہ گری دے اے حیاتِ بے ثبات!
جرأتِ اظہار دے اے صاحبِ اُمّ الکتاب!)

معین احسن جذبی

○

نہ کوئی آہ، نہ کوئی خلش، نہ درد، نہ غم
وہ یاد آئے تو پہروں سکوت کا عالم

دکھا گئی مجھے نیرنگیاں زمانے کی
وہ اِک نگاہ، کبھی مُلتفت، کبھی برہم

حلاوتوں میں وہ ڈوبی سی اک کرم کی نگاہ
لطافتوں میں وہ پلٹے ہوئے ہزار ستم

وہ ایک شام کہ خود جل اُٹھے ہیں گھر کے چراغ
وہ ایک صُبح کہ خود جس پہ رو پڑی شبنم

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں اُن کو آہ کیا کہئے
لبوں پہ ایک تبسم، دلوں میں اِک ماتم

محبتوں میں یہ ایمان، یہ چشمِ نم، یہ تڑپ
بُتوں سے ہم کو بہت کچھ مِلا خدا کی قسم

کہاں میں اَور کہاں اپنا احتساب مگر
مُخالفوں کی عنایت ہے، دشمنوں کا کرم

عجیب دُھن تھی کہ ٹھہرے کہیں نہ دیوانے
وہ راحتوں کا چمن ہو کہ خارزارِ اَلم

وہ بینواؤں کی بستی نہ ہو کہیں اے دوست
نظر بچا کے چلے ہیں جدھر سے اہلِ کرم

مرا فسانہ بھی کیا بے اثر فسانہ ہے
نہ کوئی زُلفِ پریشاں، نہ کوئی آنکھ ہے نَم

ق

مجازؔ و اخترؔ و مخدومؔ و فیضؔ — آہ کہاں
مرے رفیق، مرے ہمنوا، مرے ہمدم

کبھی وہ محفلِ حُسن و وفا میں نغمہ سرا
کبھی سلاسل و زنداں کی سمت اُن کے قدم

یہ وہ ہیں جن سے فروزاں تھے آگہی کے چراغ
یہ وہ ہیں جن سے تھا اک دورِ شاعری کا بھرم

یہ وہ ہیں جن سے ہوا اور بھی جلیل و جمیل
بلا کشوں کی اُمیدوں کا جانفزا پرچم

نہ پوچھ کیوں مجھے آتے ہیں یاد اے جذبیؔ
جہانِ درد میں دردِ جہاں کے وہ محرم

شہزاد احمد

○

اک عجیب لذت ہے تیرے عشق میں جینا
آنسوؤں سے تر آنکھیں، درد سے بھرا سینہ

بے قرار ہو کر وہ آ لگا ہے چھاتی سے
قتل کر کے ہم نے بھی دفن کر دیا کینہ

ایک پل میں سارے ہی رنگ پھر ابھر آئے
یوں غلط ہوا یارو عمر بھر کا تخمینہ

اک نظر نے سارے ہی دکھ مٹا دیئے ورنہ
کس سے ہو سکا ممکن چاک چاک کو سینا

دوریاں مسافت کی روز بڑھتی رہتی ہیں
دل میں بجتا رہتا ہے قربتوں کا سازینہ

جتنی عمر بھی گزری تیری یاد میں گزری
کس قدر ہُوا آساں اپنا ہی لہو پینا

سحر سی تری صورت سامنے بھی مخفی بھی
جیسے ثبت ہو جائے آئینے میں آئینہ

غم تری جدائی کا جھیلنا نہ پڑ جائے
اتنے دکھ نہیں سہنے، اس قدر نہیں جینا

یار تو بلندی پر روز جاتے رہتے ہیں
میرے بوجھ سے شاید ٹوٹ جائے گا زینہ

ایک دوست اپنا ہی سربراہ ان کا ہے
آج مل کے بیٹھی ہے دشمنوں کی کابینہ

اس کے بعد ہم شہزاد مر گئے تو پھر کیا ہے
جس پہ سانپ بیٹھے تھے پا لیا وہ گنجینہ

○

زمیں کسی کی نہیں، آسماں کسی کا نہیں
مکین سب ہیں مگر یہ مکاں کسی کا نہیں

سمندروں سے تعلق بھی تھوڑی دور کا ہے
ہوا کسی کی نہیں، بادباں کسی کا نہیں

سفر میں رہتے ہیں سب گردِ کارواں کی طرح
ہر ایک کو ہے خبر کارواں کسی کا نہیں

مآلِ کار کسی نے بھی کچھ نہیں پایا
مگر یہ دیکھ سفر رائیگاں کسی کا نہیں

گری وہ برف کہ سنسان ہو گئے رستے
اب آگ سب کی طلب ہے دھواں کسی کا نہیں

اگرچہ آگے نکلنے کی سب کو خواہش ہے
مگر ابھی تو سفینہ رواں کسی کا نہیں

نہ اُس کی مانتا ہے اور نہ میری سُنتا ہے
میں کیا کروں کہ دل بدگماں کسی کا نہیں

یہ علم وہ ہے کہ جو چاہے اس کو اپنا لے
مگر یہ بھاگتا بادل نشاں کسی کا نہیں

ہر اک سمجھتا ہے میں اس جہاں کا مرکز ہوں
اگرچہ ذکرِ سرِ داستاں کسی کا نہیں

سب اپنے اپنے لئے فصلِ گل ہی مانگتے ہیں
مرے علاوہ یہ عہدِ خزاں کسی کا نہیں

جو ہونے والا ہے اس کا ہے سب کو اندازہ
جو ہو رہا ہے وہ وہم و گماں کسی کا نہیں

یہ زندگی نہیں شہزاد کارِ عبرت ہے
جہاں سے دل نہ لگا یہ جہاں کسی کا نہیں

○

شہر کا شور تھمے گا کہ نہیں
کوئی میری بھی سنے گا کہ نہیں

کیسی تاریک ہوئی ہیں راہیں
چاند سے ابر ہٹے گا کہ نہیں

راستہ گرچہ ہے دشوار بہت
تو مری سمت چلے گا کہ نہیں

کب تلک راہ نوردی ہوگی
کبھی رستہ بھی ملے گا کہ نہیں

ق

شب کی خاموشی ہے پتھر جیسی
تو کوئی بات کرے گا کہ نہیں

تو نے جو خود پہ روا رکھا ہے
تو اسے ظلم کہے گا کہ نہیں

زخم جو تو نے لگایا خود پر
کسی صورت وہ بھرے گا کہ نہیں

زندگی ہے مری قائم تجھ سے
تو مجھے جینے بھی دے گا کہ نہیں

ق

کیا خلاؤں میں رہیں گے دائم
کہیں پاؤں بھی پڑے گا کہ نہیں

کیا زمیں خود ہی چٹخ جائے گی
آسماں سر پہ گرے گا کہ نہیں

کر لیا بند جو خود پر ہم نے
اب وہ دروازہ کھلے گا کہ نہیں

میں کہوں گا کہ ترے پاس ہوں میں
اور تو مجھ سے کہے گا کہ نہیں

ق

سامنے آسیب نظر آنے لگے
یہ دیا اور جلے گا کہ نہیں

تیری بستی میں سبھی قاتل ہیں
کوئی زندہ بھی بچے گا کہ نہیں

کیا اُجڑ جائے گی نگری ساری
پھر کہیں دیپ جلے گا کہ نہیں

منہدم ہوں گی اگر دیواریں
کوئی آواز سنے گا کہ نہیں

جس نے سب نام مٹا ڈالے ہیں
نام اس کا بھی رہے گا کہ نہیں

جسے ملنے کو چلا ہوں شہزاد
مجھے پہچان بھی لے گا کہ نہیں

○

(قائدِ اعظمؒ کے حوالے سے)

گئے خورشید کو کس نے پکارا دِن نکل آیا
اندھیری رات گذری پیارا پیارا دن نکل آیا

کوئی تو سعد پوشیدہ ہے دل کی آرزوؤں میں
دوبارہ رونقیں جاگیں، دوبارہ دن نکل آیا

ہمیں سورج سے بڑھکر ہے یہ پرچم چاند تارے کا
سروں پر جب بھی لہرایا ہمارا دن نکل آیا

ہمیں اس کے ارادے اس کی باتیں یاد رکھنی ہیں
کیا جس شخص نے بس اک اشارہ دن نکل آیا

ہٹائی تھیں اسے شب کی چٹانیں شام کے پتھر
ذرا بھی حوصلہ اس نے نہ ہارا دن نکل آیا

مسافت تھی شبِ تاریک سی ہم خستہ جانوں کی
ہمیں جب مل گیا اس کا سہارا دن نکل آیا

غمِ ماضی کی تاریکی میں گھبرانے سے پھرتے تھے
ہوا جب حال ہم پر آشکارا دن نکل آیا

مرا قائد مری سوئی ہوئی اُمت سے کہتا ہے
بس اب تو نیند سے جاگو خدارا دن نکل آیا

اسی کے فیض سے شہزاد روشن ہیں مری راتیں
فلک پر جب بھی چمکا وہ ستارہ دن نکل آیا

صدیق کلیم

○

مال روڈ لاہور کی ایک جھلک

شب کو بھی دن کو بھی روشن سڑکیں
مال پر کاریں ۔ بسیں ۔ رکشے ۔ سکوٹر ۔ سائیکل
ہر طرف رنگ ہی رنگ
جھلملاتے ہوئے سرخ اور سفید
ہر طرف سرو و سمن ۔ تازہ گلاب
یہ ہر اک سمت دمکتے ہوئے چہروں کی مہک
ان کی رفتار میں افکار میں جذبات میں تیزی کا وفور
ایک گمبھیر سمندر کا گماں ہوتا ہے !

ان میں ایسے بھی ہیں پیدل ہیں رواں
اپنی اُمید کو مایوسی کو سینے میں لیے
تیز قدموں سے رواں
اکثر آہستہ خرام
جیسے بیمار ہیں یہ
اکثر ان میں نہیں مگر ۔ لمبے ۔ تڑنگے ۔ چوڑے
اور پھر شعلہ فشاں لوگ بہت تیز ۔ بہت تیز
اور بعض ان میں سبک تر ۔ "خرام"
جس طرح باغ میں لہرا کے چلیں

یہ سماں !
حیرت انگیز ۔ جنوں خیز ۔ خوشی بیز سماں
ہوسِ زر ہی نہیں
ہوسِ جسم بھی ہے ۔
کوئی قانون سے بالا ۔ کوئی قانون کا پابند
کوئی عرفان کا طالب
اور کوئی ان میں اپنے گھر بار کا رسیا
اور کوئی لب و رخسار کا رسیا
کوئی بیزار ۔ کوئی درپئے آزار
کوئی سرشار ۔ کوئی ان میں بلند افکار

ہر طرف
ریستوراں اور سٹور اور دفاتر
رونقیں چار طرف
ایسے دلچسپ نظاروں کا سماں
ابھی دوزخ ۔ ابھی برزخ ۔
ابھی جنت کا گماں

○

اتنا ظالم یہ جہاں ہے

اتنا ظالم یہ جہاں ہے مجھے معلوم نہ تھا
ہر نفس محوِ فغاں ہے مجھے معلوم نہ تھا
کون افسانہ لکھے ؟ کون کہے ؟ کون سنے ؟
ایسی مشکل یہ زباں ہے مجھے معلوم نہ تھا
دن کے ہنگامے میں جاناں کی لگن اس کی چبھن
شب کو بھی فتنہ کناں ہے مجھے معلوم نہ تھا
چپ ہیں مغموم مناظر تو ، ہر اک راگ خموش
نہرِ خوں ہے کہ رواں ہے مجھے معلوم نہ تھا
اس اندھیرے پہ اجالے کا گماں ہوتا ہے
دوست خود دشمنِ جاں ہے مجھے معلوم نہ تھا

رفعت سلطان

○

جو روایات بھول جاتے ہیں
اپنی ہر بات بھول جاتے ہیں

حسن اور عشق کے فسانے بھی
وقت کے سات بھول جاتے ہیں

اُن کے وعدوں پہ ہے یقیں مجھ کو
جو ملاقات بھول جاتے ہیں

اہلِ دل ، اہلِ درد ، اہلِ کرم
دے کے خیرات بھول جاتے ہیں

بے ادب ، پست نسل بدگفتار
اپنی اوقات بھول جاتے ہیں

آپ آئیں تو فرطِ شوق سے ہم
دِن ہے یا رات، بھول جاتے ہیں

اپنی مٹی کے گھر بنا کر بھی
لوگ برسات بھول جاتے ہیں

وصل کا دِن گزارنے والے
ہجر کی رات بھول جاتے ہیں

سُن کے حالات اہلِ درد کے ہم
اپنے حالات بھول جاتے ہیں

گلستاں میں خزاں بھی آئے گی
پھول اور پات بھول جاتے ہیں

یاد رکھتے ہیں آپ سب باتیں
لیکن اِک بات بھول جاتے ہیں

جب بھی وہ خوش نظر ملے رفعت
غم کے لمحات بھول جاتے ہیں

○

ساری عمر زمانے میں دُکھ سہتے ہیں
اہلِ محبت پھر بھی زندہ رہتے ہیں

مَیں معزور ہوں، دولتمند ہوں ، شاعر ہوں
جو یاروں کے جی میں آئے کہتے ہیں

جانتی ہیں وہ چنچل متوالی آنکھیں
کیوں میری آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں

شرم آتی ہے جب یہ سُنتا ہوں رفعت
میرے شہر میں ظالم لوگ بھی رہتے ہیں

○

لمحہ لمحہ شمار کرتا ہوں
آپ کا انتظار کرتا ہوں

خار زارِ حیات میں رہ کر
میں بہاروں سے پیار کرتا ہوں

زرد چہروں ، اُداس آنکھوں پر
اپنی خوشیاں نثار کرتا ہوں

میرا مسلک نہیں ثنا خوانی
شاعری باوقار کرتا ہوں

اپنے دِل کے گُداز کی خاطر
سُر کی دیوی سے پیار کرتا ہوں

مجھ سا نادان کوئی کیا ہو گا
آپ پر اعتبار کرتا ہوں

دیکھ کر نور نور چہروں کو
مدحت کردگار کرتا ہوں

کوئی سمجھے نہ دِل کی بات اگر
خامشی اختیار کرتا ہوں

مَیں محبت کے نام پر رفعت
غم نصیبوں سے پیار کرتا ہوں

احمد ظفر

○

اجنبی خیالوں میں آشنا ہزار آئے
ایک تُو نہیں آیا اور بے شمار آئے

ثبت کر دیئے میں نے ہونٹ شاخساروں پر
حرفِ تازہ کی مانند باغ میں بہار آئے

آئینے میں آئینہ عکسِ شہرِ تنہائی !
آنسوؤں کی پلکوں پر جس طرح قطار آئے

جیسے رُوح میں اتریں سُر کسی پرندے کے
تیرے چاہنے والے یوں تجھے پکار آئے

اس کا بچنا اچھا اور خریدنا بہتر!
عشق کو مگر کیسے دِل کا کاروبار آئے؟

جانے کیسی آہٹ ہے میرے دل کے دریا میں؟
میں بہت اکیلا ہوں آئے یادِ یار آئے

اس قدر ظفر پیارے تیری ضد نہیں اچھی
تم کو کیسے وہ چاہے جس پہ تم کو پیار آئے

○

خیالوں میں کوئی خیال آ گیا
میں کیا ہوں؟ یہ لب پہ سوال آ گیا

جہاں اس نے دیکھ کر دیکھا نہیں
وہاں دل کے شیشے میں بال آ گیا

پسِ زلف چہرہ کسی نے کیا
کہ سورج کو جیسے زوال آ گیا

کبھی ہجر کی شب نکھرنے لگی
کبھی بن سنور کر وصال آ گیا

کبھی عمرِ رفتہ نے آواز دی
کبھی یاد وہ خوش خصال آ گیا

یہ کس کج ادا سے ہوئی گفتگو؟
تکلّم میں رنگِ ملال آ گیا

کہا کس نے رختِ سفر باندھنا؟
زمانے سے رخصت کا سال آ گیا

اُسے آئینے میں جو دیکھا ظفر
مری جاں پہ دُہرا وبال آ گیا

علی احمد جلیلی

○

جس نے دامن تھاما ہو گا — پھول نہیں وہ کانٹا ہو گا
پتھر لیکر لوگ آئے ہیں — مجھ کو شیشہ سمجھا ہو گا
دُور نہ بھاگ اَے دُنیا مجھ سے — تجھ سے کچھ تو رشتا ہو گا
رات گئے یہ دستک کیسی — کوئی ہوا کا جھونکا ہو گا
چھوڑ کے میرا ساتھ نہ جانے — وہ بھی کتنا تنہا ہو گا
بے سایا ہیں پیڑ بھی اب کے — دھوپ سے کچھ سمجھوتا ہو گا
خاموشی ہے کچھ تو بولو — سناٹا کیا کہتا ہو گا
کچے گھر وہ ہوں گے جن پر — ٹوٹ کے بادل برسا ہو گا

دِل میں نام علیؔ بھی لکھ لو
کوئی ورق تو سادا ہو گا

○

وہ شخص آج جو سننے کی بھول کرتا ہے
فریب کھانے کی کوشش فضول کرتا ہے

جو تھام لیتا ہے بڑھ کر کسی شکستہ کو
وہ کام پھول نہیں، ہاں ببول کرتا ہے

کرے جو کام جراحت کا وہ کلام نہیں
کلام وہ ہے جو پتھر کو پھول کرتا ہے

نظامِ وقت نے کب کس سے ہار مانی ہے
ہٹا کے سب کو وہ قدموں کی دھول کرتا ہے

بڑا ہے خون کے رشتے سے درد کا رشتہ
جو سب کو اپنا سمجھ کر قبول کرتا ہے

نہ پوچھ آنکھ سے کیوں میری ڈبڈبائی ہوئی
زمانہ ہنسنے کی قیمت وصول کرتا ہے

گناہ کیا ہے علیؔ یہ ہے گناہ کا احساس
گنہ کی یاد سے کیوں دِل ملول کرتا ہے

○

کاش ایسے موسم بھی آتے — کانٹے بوتے پھول اگاتے
قطرہ عالی ظرف جو ہوتا — دریا پیاس بجھانے آتے
گلچیں ہو کر دامن خالی — کچھ کانٹے ہی چن کر لاتے
اس دھرتی کی پیاس تو بجھتی — بادل خون ہی کچھ برساتے
سب کے چہروں پر تھے چہرے — کس کو آئینہ دکھلاتے
شبنم شبنم ہے وہ لیکن — چھوتے ہاتھ اگر جل جاتے
شاخِ گل سے کھیلنے والے — کاش کہ اب تلوار اٹھاتے
خون کے رشتوں سے بھی بڑھ کر — درد کے ہیں یہ رشتے ناتے

کوئی علیؔ آواز تو دیتا
ہم بے قیمت ہی بک جاتے

○

اک بوند ہے لہو کی جو تن میں بچی ہوئی
احباب کی نظر ہے اسی پر لگی ہوئی

چاہوں تو کائنات کو رکھ دوں ڈبو کے میں
اب بھی ہے میرے جام میں اتنی بچی ہوئی

جھٹکے تھے تم نے بھیگے ہوئے بال کل جہاں
برسات کی ہے رات وہیں پر رکی ہوئی

دروازہ دل کا بند تو مدت سے ہے مگر
اب تک ہے جیسے آنکھ کوئی جھانکتی ہوئی

کتنوں نے اس کو چھو کے جلا لی ہیں انگلیاں
چنگاریاں تھیں اس کے بدن میں بھری ہوئی

ٹھوکر جہاں بھی کھا کے گرا تیری راہ میں
دیکھا تو کائنات وہیں تھی پڑی ہوئی

کیا ذکر روشنی کا اجالوں کے قحط میں
بستی کوئی جلی تو کہیں روشنی ہوئی

کیا جانے کتنا فاصلہ طے کر کے آئی ہے
ورنہ تمھاری یاد اور اتنی تھکی ہوئی

دیکھو علی مجھے کہ سعادت ہے دیکھنا
تہذیب ایک دور کی میں ہوں مٹی ہوئی

○

فریبِ نکہت و گلزار سے بچاؤ مجھے — کرم کرو کسی صحرا میں چھوڑ آؤ مجھے
میں کون ہوں مجھے چہرہ بھی اپنا یاد نہیں — کہیں سے لا کے کوئی آئینہ دکھاؤ مجھے
وہ جنس ہوں میں جسے بک کے مدتیں گزریں — جو ہو سکے تو کہیں سے خرید لاؤ مجھے
مچل رہی ہے نظر چھو کے دیکھنے اس کو — سمٹ رہا ہے بدن ہاتھ مت لگاؤ مجھے
کسی پہ اپنے سوا اب نظر نہیں پڑتی — مری نگاہ سے اے دوستو چھپاؤ مجھے
کسی طرح ان اندھیروں کی عمر تو کم ہو — جلانے والو ذرا دیر تک جلاؤ مجھے
یہ کس کی لاش لئے جاتے ہو اٹھائے ہوئے — کہیں وہ میں تو نہیں ہوں ذرا دکھاؤ مجھے

بکھر چکا ہوں علی میں غزل کے شعروں میں
بساطِ عارض و لب سے سمیٹ لاؤ مجھے

○

نہ پوچھ آج ہیں کس حال میں سخن والے — نہ تھے بکاؤ مگر بک گئے یہ فن والے
میں اپنی ذات کی شہنائیوں میں گم ہوں ابھی — کہو کہ مجھ کو بلائیں یہ انجمن والے
بھڑک کے آنچ نہ دے اتنی گردشِ دوراں — پگھل نہ جائیں کہیں موم کے بدن والے
قریب آئے تو کانٹوں کی طرح چبھنے لگے — جو لوگ دور سے تھے پھول سے بدن والے
کوئی ہنسے نہ ہماری شکستہ حالی پر — کبھی تھے ہم بھی قیامت کے بانکپن والے
اٹھی نگاہ تو مجروح ہو کے لوٹ آئی — کہ خار خار تھے پھولوں کے پیرہن والے
نیا خیال نئی لفظیات مانگے ہے — کہاں سے لاؤں وہ سکے جو تھے چلن والے

ادب کی فن کی کہیں بات کل جو نکلے گی
علی کو یاد کریں گے بہت دکن والے

محسن احسان

○

صدفِ چشم میں نظر بے خواب
دستِ شب میں گُلِ سحر بے خواب

سب مکیں محوِ خواب ہیں لیکن
ہے فقط اک چراغِ در بے خواب

میری طیّب زمین پوچھتی ہے
کیوں ہیں میرے شجر حجر بے خواب

کٹ رہے ہیں کچھ اس طرح شب و روز
شام بے ذائقہ، سحر بے خواب

دارِ فانی کا ہے ازل سے یہ کھیل
خیر خوابیدہ، شوقِ شر بے خواب

معبدوں، مقبروں کے مخفی لوگ
کتنے بے ذوق، بے خبر، بے خواب

زرد چہروں پہ قہقہے مجمد درج
شہر بیمار و چارہ گر بے خواب

جہل — باوضع، با اثر، با ہوش
علم بے نور، بے وقر، بے خواب

جنگلوں کی ہوا کو دو یہ نوید
راکھ کی تہ میں ہے شرر بے خواب

کوئی طوفان آنے والا ہے
شہر کے ہیں تمام گھر بے خواب

سرِ دریا، بھنور بھنور بے چین
تہِ دریا، گہر گہر بے خواب

پا بہ زنجیر مست و شوخ ہوا
باغ بے برگ، بے ثمر، بے خواب

ہو کلہ سر پہ تو بھر اہلِ کلاہ
رہنا پڑتا ہے عمر بھر بے خواب

بجلیاں بادلوں میں نوحہ کناں
نقشِ کوزہ میں کوزہ گر بے خواب

کہکشاں پر ہیں آدمی کے قدم
ہے ستاروں کی رہگذر بے خواب

جاگتی آنکھ میں ہے خواب کا حسن
خواب کے حسن کو نہ کر بے خواب

زیرِ دیوار کوئی چشم براہ
اور کوئی بامِ قصر پر بے خواب

جس گلی کے ہیں لوگ سوئے ہوئے
اس گلی میں ہیں بام و در بے خواب

دفن کر دے غبارِ خاک میں نیند
سب ترے خواب، دربدر، بے خواب

بوند ساون عذاب میں گذرا
خواب آمادہ چشمِ تر بے خواب

پلکیں دستِ دعا اٹھائے ہوئے
کہہ رہی ہیں ہمیں نہ کر بے خواب

سب کی آنکھوں کے خواب گروی ہیں
محسن آنکھیں رہیں مگر بے خواب

○

جو کشت ہری تھی اُسے جلتے ہوئے دیکھا
خورشید کو اک آگ اگلتے ہوئے دیکھا

ہاتھوں میں شعاعوں کے اٹھائے ہوئے نیزے
سورج کو اسی خاک پہ چلتے ہوئے دیکھا

اسی طرح بھی اکثر ہوا برفاب بدن کو
خود اپنی تمازت میں پگھلتے ہوئے دیکھا

شبنم کی تھی اک بوند سرِ برگِ تمنا
غنچوں نے اُسے دھوپ نگلتے ہوئے دیکھا

گُل کھلنے کی رت آئی تو صرصر نے چمن میں
اشجار کو ملبوس بدلتے ہوئے دیکھا

محسن عجب انداز کا اک شخص ہے جس کو
گرتے ہوئے دیکھا نہ سنبھلتے ہوئے دیکھا

○

ابھی سچ کا دیا جلتا کہاں ہے
ہوا کا رُخ ابھی بدلا کہاں ہے

بہارِ دشت آرائی کا موسم
زمینوں پہ ابھی اُترا کہاں ہے

بگولے بام و در سے پوچھتے ہیں
ہمارے قیس کا صحرا کہاں ہے

عجب بے تابیوں میں عمر گذری
جسے سوچا اُسے دیکھا کہاں ہے

مسافر ہیں ہم ایسے قافلے کے
پتہ جس کو نہیں جانا کہاں ہے

سب اپنے بحرِ غم میں غوطہ زن ہیں
نشاطِ شوق کا دریا کہاں ہے

غبارِ آشنائی اڑ رہا ہے
کوئی چہرہ نظر آتا کہاں ہے

عجب ہلچل مرے اندر مچی ہے
قیامت ہے مگر برپا کہاں ہے

مری ہر شب مرا ہر دن سفر ہے
نہیں معلوم اب رکنا کہاں ہے

پہاڑ اب آبشاریں رو رہے ہیں
یہ بادل ٹوٹ کر برسا کہاں ہے

دلوں میں ایک ربط باہمی ہے
ابھی یہ سلسلہ ٹوٹا کہاں ہے

صراطِ آرزو پر چل رہا ہوں
بتا یہ راستہ جاتا کہاں ہے

گدایانِ محبت پوچھتے ہیں
ہمارا وہ سخی داتا کہاں ہے

کُلاہِ حرص کب رکھی ہے سر پر
قبائے کذب کو پہنا کہاں ہے

حدیثِ طاعت و آیاتِ حق کو
کوئی اس دور میں سنتا کہاں ہے

شعارِ عجز و ذوقِ انکساری
یہ سکہ شہر میں چلتا کہاں ہے

مَیں دُنیا کیلئے زندہ ہوں محسنؔ
مجھے اَب خواہشِ دُنیا کہاں ہے

○

اب کوئی جواں دار و رسن تک نہیں آتا
خونابہ فشاں خاکِ وطن تک نہیں آتا

اے اہلِ چمن کیسی یہ افتاد پڑی ہے
جھونکا کوئی دیوارِ چمن تک نہیں آتا

جس دن سے ہوائیں ہوئیں پابندِ قفس میں
پیغام کوئی سرو و سمن تک نہیں آتا

فرہاد کوئی دل میں لئے حسرتِ شیریں
اب تیشہ بکف کوہ و دمن تک نہیں آتا

مانوس قفس سے ہوئے کچھ اتنے پرندے
پرواز میں بے ساختہ پن تک نہیں آتا

وہ دبدبۂ شہ ہے کہ جھونکا بھی ہوا کا
بے اِذن اسیرانِ چمن تک نہیں آتا

جس دن سے ہوا بیدلؔ و غالبؔ کا شناسا
محسنؔ کوئی معیارِ سخن تک نہیں آتا

○

لباس تن پہ سلامت ہیں ہاتھ خالی ہیں
نہ ہم میں عقل و فراست نہ حکمت و تدبیر
منافقت نے لہو تن میں اتنا گرمایا
خود اپنے آپ سے کہ اس قدر ہمیں ہے کہ اب
ہمارے دل ہیں اب آماجگاہِ حرص و ہوس
نشیمنوں کو اجاڑا کچھ اس طرح جیسے
ہمارے اہلِ سیاست نے کرسیوں کے لئے

ہم ایک ملکِ خداداد کے سوالی ہیں
مگر ہے زعم کہ جمعیتِ مثالی ہیں
کہ گفتگو میں ریا کاریاں سجا لی ہیں
روائتیں ہی گلستاں کی پھونک ڈالی ہیں
کہ ہم نے سینوں میں تاریکیاں اُگا لی ہیں
کہ فاختائیں درختوں سے اڑنے والی ہیں
بنامِ خلقِ خدا پگڑیاں اُچھالی ہیں

کسی غریب اپاہج فقیر کی محسنؔ
کسی امیر نے بیساکھیاں چرا لی ہیں

○

کچھ ذرا سی بیباکی، کچھ ذرا سی محجوبی
قتل کر گئی ہم کو یہ ادائے محبوبی

کشتیٔ تمنا بھی، کشتیٔ تمنا ہے
پانیوں سے بچ نکلی ساحلوں پہ جا ڈوبی

نودمیدہ جذبوں میں، ناشنیدہ حرفوں میں
عشق نے سجائی ہے حسن کی خوش اسلوبی

عکس عکس میں لرزاں لذتِ ہم آغوشی
آئینے میں سمٹی ہے طالبی و مطلوبی

ہونٹ، زلف، پیشانی، گال، آنکھ، حیرانی
حرف حرف پہچانی ہم نے اسکی ہر خوبی

سب شکم کے دھندے ہیں، سب ہوس کے بندے ہیں
کیسی شانِ درویشی، کیسا رقصِ مجذوبی

○

کچھ اسقدر ہوئے مایوس گھر نہیں آتے
پرندے اب کسی آواز پر نہیں آتے

جو دوسروں کے غموں پر نگاہ دوڑائیں
تو اپنے دکھ ہمیں دکھ ہی نظر نہیں آتے

تمہاری بزمِ تمنا کی ہے کشش کچھ اور
وگرنہ دشت سے آشفتہ سر نہیں آتے

اگر ہو آدمی دشواریوں کا شیدائی
تو پھر سفر میں کہیں بھی بھنور نہیں آتے

شناوری سے شناسائی لازمی ہے بہت
کہ ہاتھ یوں کبھی لعل و گہر نہیں آتے

جنہیں اجاڑ گئیں ہوں تمازتیں محسنؔ
پھر ان درختوں پہ برگ و ثمر نہیں آتے

○

نہ دشمنوں کی خطا ہے، نہ دوستوں کا گناہ
ہم اپنی منزلِ مقصود سے نہیں آگاہ

کھڑے ہوئے ہیں فصیلوں پہ سب کماں بردار
نہ ہے قیام کی جرأت، نہ ہے فرار کی راہ

ہوئی نہ کم کبھی شیخِ حرم کی عیاری
نہاں ہے منبروں میں آرزوئے منصب و جاہ

کچھ ایسے دھوپ زمینوں پہ ٹوٹ کر برسی
خود اپنے سائے سے بھی لوگ مانگتے ہیں پناہ

میں کس عدیل سے انصاف کی طلب چاہوں
نہ کوئی میری شہادت، نہ کوئی میرا گواہ

جہاں رسائیٔ تخئیل بھی نہیں ممکن
اسی دیارِ تمنا میں خیمہ زن ہے نگاہ

وصول کرتے ہیں ہم موت کا اب عوضانہ
ہمارا درد بھی کوتاہ، ہاتھ بھی کوتاہ

وہ مہرباں تھا تو کچھ میرا غم غلط کرتا
مگر عزیز بہت ہیں اُسے قبا و کلاہ

دلوں میں حرفِ محبت کبھی اتر نہ سکا
فقط زباں پہ رہا لا الٰہ الا اللہ

جمیل ملک

○

مجھے فریب نہ دیں، میری خواہشوں سے کہو
نہ یاد آئیں، پرانی محبتوں سے کہو

یہ خواب خواب نگاہیں، جھکی جھکی پلکیں
کچھ اور سوئی رہیں اِن قیامتوں سے کہو

تمام رات جگائیں ستارہ بار آنکھیں
کہاں ہے چاند، تاروں کی چشمکوں سے کہو

ہے آنسوؤں میں عجب رنگ ارتعاشِ جمال
یہ آئینوں کا اُجالا ہے، حیرتوں سے کہو

جو ہمسفر تھے سبھی راستوں میں چھوڑ گئے
ہمارا ساتھ نہ چھوڑیں، مسافتوں سے کہو

گھٹاؤں سے بھی بجھی قاتلوں کی پیاس کبھی!
یہ اپنے خون کے پیاسے ہیں، دوستوں سے کہو

کوئی ثبوت تو ہو جرمِ بے گناہی کا!
کوئی گواہ تو لائیں یہ مجرموں سے کہو

تمام شہر میں اک میرا گھر ہی یاد رہا
میں چور، گھر تو بہت میرے منصفوں سے کہو

بچانے والی سبھی کشتیاں تو ڈوب گئیں
پکارتے ہو کسے، غم کے ساحلوں سے کہو

یہ سنگِ میل کھڑے ہیں جو کتنی صدیوں سے
تمہارے ساتھ چلیں گے مسافروں سے کہو

وہی بڑا ہے، صداقت ہے جس کے پاس جمیلؔ
ہے بر بہار، سردار عظمتوں سے کہو

○

آؤ پت جھڑ میں کبھی حال ہمارا دیکھو
خشک پتوں کے سلگنے کا تماشا دیکھو

پاس آ کر مرے بیٹھو، مجھے اپنا سمجھو
جب کبھی روٹھی ہوئی یاد دو، مجھے تنہا دیکھو

پھول ہر شاخ پہ کھلتے ہیں، بکھر جاتے ہیں
کیا تماشا ہے، سرِ نخلِ تمنا دیکھو

اپنی پہچان سے عاری ہے بصارت کا جمال
آؤ اِس دور کا بھی دیدۂ بینا دیکھو

ذات کا نور فقط دائرۂ ذات میں چور
چاند کے گرد کبھی چاند کا ہالا دیکھو

کبھی ہمرنگِ زمیں ہے، کبھی ہمدوشِ فلک
کہساروں سے اُچھلتا ہوا دریا دیکھو

دور صحرا سے لپکتی ہوئی آواز سنو
پاس آ جائے تو یہ نغمۂ صحرا دیکھو

پھٹ پڑے گا تو چٹخ جائیں گے منہ بند حصار
وقت کے دل میں اُبلتا ہوا لاوا دیکھو

کھلتی جاتی ہے شفق رنگئ خوں تا بہ سحر
شب کے سینے میں جو پیوست ہے نیزا دیکھو

کام مرتا نہیں اِنسان کے مر جانے سے
ایک ہی نام کا ہر شہر میں چرچا دیکھو

یوں تو گھر ہی میں سمٹ آئی ہے دُنیا ساری
ہو میسّر تو کبھی گھوم کے دُنیا دیکھو

اِنہی آنکھوں میں اُتر جاتی ہے ہر شام جمیلؔ
اِنہی آنکھوں سے نکلتا ہے سویرا دیکھو

○

کچھ منہ سے بولتے نہیں یوں گھر کے ہو گئے
ہم بھی تو اب کے دوستو پتھر کے ہو گئے

اک وہ کہ کائنات بھی اُن کے جلوس میں
اور ایک ہم کہ ایک ہی محور کے ہو گئے

زہراب جاں بھی اب تو میسّر نہیں ہمیں
جتنے بھی چارہ گر تھے ستمگر کے ہو گئے

ساحل پہ صرف ریت کی شکلیں بنی رہیں
جتنے صدف تھے سارے سمندر کے ہو گئے

کیا سرو قد کوئی بھی اس شہر میں نہیں
کوتاہ قد بھی اب تو برابر کے ہو گئے

جتنے تھے پھول سب ترے دامن میں جا گرے
پتھر تمام ایک مرے سر کے ہو گئے

جگنو، شرار، چاند، ستارے، شفق، گلاب
سب ہم کو چھوڑ کر ترے پیکر کے ہو گئے

دستِ طلب کسی نے بڑھایا نہ کیوں اِدھر
تلچھٹ تو ہم نہیں تھے کہ ساغر کے ہو گئے!

ڈوبا وہی جو تھاہ سمندر کی پا گیا
طغیانیوں میں سارے شناور کے ہو گئے

یوں تو ہزار بار مرے اہلِ دل یہاں
زندہ بھی بار بار مگر مر کے ہو گئے

شیشے میں اپنا عکس ہی وہ دیکھتے رہے
جو صاحبِ نظر تھے وہ جوہر کے ہو گئے

جو سب کی زندگی تھا وہ عیسیٰ بھی مر گیا
قائل جمیل ہم بھی مقدّر کے ہو گئے

○

یہ اور بات ہمیں صُورتِ گلاب لگے
جمیل زخم لگے اور بے حساب لگے

تمہارے بعد نہ تکمیل ہو سکی اپنی
تمہارے بعد ادھورے تمام خواب لگے

مَیں کیسے تجھ کو پکاروں، کہاں سے لاؤں تجھے
ترے بغیر اگر زندگی عذاب لگے

میں شہسوار مگر راہ کے غبار میں گم
تو بے شمار حجابوں میں بے نقاب لگے

مَیں جتنی بار پڑھوں، کیسے کیسے رنگ بھروں
ترا گلاب سا چہرہ مجھے کتاب لگے

ہر اک سوال پہ تو مسکرا کے رہ جائے
ہمیں تو ایک ہی جیسا ترا جواب لگے

نہ جانے کتنا تقدّس ترے جمال میں ہے
ترے حضور گنہ بھی مجھے ثواب لگے

میں تیرے شہر سے گزروں تو جگمگا اُٹھوں
ہر ایک باب مجھے روشنی کا باب لگے

دکھائی دے کبھی مہتاب میں تری صورت
کبھی تو دن کے اجالے میں آفتاب لگے

یہ فخر کم ہے کہ مَیں انتخاب ہوں اُس کا
جو آپ سارے زمانے میں انتخاب لگے

جمیل خواب حقیقت نما بھی ہوتے ہیں
وہی قریبِ رگِ جاں ہے جو سراب لگے

کسریٰ منہاس

○

پہلے باتیں ہوئیں نگاہوں سے
مل گئے دل پھر ان ہی راہوں سے

چھپ گئے وہ مری نگاہوں سے
زندگی کو بدل کے آہوں سے

ہے فقط جس کو اپنے کام سے کام
کیا ملے ایسے خیر خواہوں سے

روشنی دے رہا ہے دل میرا
اب ہٹا دو چراغ راہوں سے

یاد میں ان کی دل تڑپتا ہے
دوست جو چھپ گئے نگاہوں سے

اب تو تاریکیاں جھلکتی ہیں
نور افروز جلوہ گاہوں سے

وقت مجرم سمجھ رہا ہے جنہیں
نظر آتے ہیں بے گناہوں سے

تیرے وحشی بڑے وقار کے ساتھ
بات کرتے ہیں کج کلاہوں سے

بات نازک تھی لب تک آ سکی
تھا جو کہنا کہا نگاہوں سے

میرے فن کا کمال تو دیکھو
داد لیتا ہوں داد خواہوں سے

دوستی ہے کہ دشمنی کسریٰ
نہیں کھلتا کچھ ان نگاہوں سے

○

آشکارا ہو وہ جلوہ جو نہاں ہے اے دوست
ہر نظر تیری ہی جانب نگراں ہے اے دوست

کیا کہوں فیضِ غمِ عشق کہاں ہے اے دوست
درد بن کر مرے سینے میں نہاں ہے اے دوست

کاوشِ غم کا سمجھنا کوئی دشوار نہیں
لبِ خاموش نگاہوں کی زباں ہے اے دوست

تیری بیدادِ مسلسل کا ہوں مرہونِ کرم
کس قدر مجھ سے ترا ربط نہاں ہے اے دوست

جب محبت کے سوا کچھ بھی ہمیں یاد نہ تھا
آج وہ موڑ زمانے کا کہاں ہے اے دوست

خوگرِ عیش و طرب جس کو کہا تھا تو نے
جادۂ غم پہ وہی عمرِ رواں ہے اے دوست

منزلیں عشق کی طے ہوتی ہیں بے آہ و فغاں
کون سمجھے یہ محبت کی زباں ہے اے دوست

جاگتی آنکھوں نے اک خواب کبھی دیکھا تھا
میری نظروں میں ابھی تک وہ سماں ہے اے دوست

ولولے دل کے دھڑکتے مرے انداز میں ہیں
ہر بیاں زخمۂ تارِ رگِ جاں ہے اے دوست

پوچھنا چاہے تو حاضر ہے دلِ داد طلب
سن سکے تو مرے منہ میں بھی زباں ہے اے دوست

صرف میرے ہی لئے تھی جو بھری محفل میں
وہ نگاہِ کرم و لطف کہاں ہے اے دوست

اس قدر جینے پہ ہم اتنا ہی سمجھے کسریٰ
زندگی کیا ہے فقط خوابِ گراں ہے اے دوست

مظہر امام

○

نہ مجھ میں ہی شعلۂ طلب تھا، نہ تم میں جوشِ سپردگی تھا
مجھے بھی احساسِ کمتری تھا، تمھیں بھی احساسِ کمتری تھا

تمھارے رخسار کی چمک تھی کہ میرے جذبات کی دمک تھی
سجا سجا شب کا پیرہن تھا، دُھلا دُھلا رنگِ روشنی تھا

تھا کوئی کمزور سا وہ لمحہ کہ تم ہماری طرف کھنچے تھے
ہمارے دل ہی کی طرح کاسہ تمھارے دل کا بھی جیب تہی تھا

تمھاری قربت کا معجزہ ہے، مجھے نئے بال و پر ملے ہیں
یہ مجھ کو محسوس ہو رہا ہے کہ میں وہی ہوں جو میں کبھی تھا!

کہا تھا یہ دوستوں نے مجھ سے کہ اس کی رنگت کا کیا بھروسا
اگرچہ موسم بدل چکا تھا مگر جو دیکھا تو وہ وہی تھا

○

عجیب واقعہ تھا اُس کو اپنے گھر لانا
کبھی چراغ اٹھانا، کبھی قمر لانا

بیانِ عجز میں بھی لفظِ معتبر لانا
بڑا کمال دعاؤں میں ہے اثر لانا

بہت ہے آج تمنّا اُڑان بھرنے کی
قفس سے جا کے ہمارے شکستہ پر لانا

تھکے ہوئے سے ہیں سب پائمال راہوں پر
کہیں سے ڈھونڈ کے پھر تازہ رہ گذر لانا

وہ شوخ رنگ کا شیدا ہے، یہ خیال رہے
قریب آنا تو خود کو لہو میں تر لانا

بس ایک کام ہُوا ہم سے زندگی میں امامؔ
ایاغِ عمر شرابِ زیاں سے بھر لانا

○

سرِ احاطۂ غم رات بھر سنورنا تھا
تری جدائی میں کارِ ہنر بھی کرنا تھا

افق قریب تھا ہمّت کی سُرخروئی کا
لہو میں ڈوب کے دریا کے پار اُترنا تھا

ہمیں تھی کون سی سجدے کی آرزو تم سے
مگر دُعا میں کبھی ہم کو یاد کرنا تھا

اگر میں برگِ سحر ہوں تو تم کو تھوڑی دیر
مثالِ قطرۂ شبنم یہاں ٹھہرنا تھا

جواب کا تو پتہ تھا ہمیں، مگر پھر بھی
لبِ سوال ملا تھا، سوال کرنا تھا

وہ لوگ ساحلِ شب پر بکھر گئے کیسے
اُنہیں تو آئینۂ صبح میں سنورنا تھا

○

○

عجائب گھر میں وہ رہتا ہُوا سا
خیالی داستاں کہتا ہُوا سا

ندی مہتاب کی ٹھہری ہوئی سی
سکوتِ نیم شب بہتا ہُوا سا

ہواؤں کی نظر بدلی ہوئی سی
فضاؤں میں لہو بہتا ہُوا سا

گراں گوشی فغاں سنتی ہوئی سی
لبِ مایوس چپ رہتا ہُوا سا

یہ لہریں جا بجا اُٹھتی ہوئیں سی
یہ دریا بے سبب بہتا ہُوا سا

سنانِ شعلہ گوں چلتے ہوئے سے
میں زخمِ بے حسی سہتا ہُوا سا

○

چاند شاخوں کی مینا سے ڈھلتا ہوا
درد بچے کی صورت مچلتا ہوا
یاد کی بیل آنکھوں پہ چڑھتی ہوئی
برگ تازہ گلابوں میں پلتا ہوا
آتشِ جسم پر باغ کھلتے ہوئے
ایک گھر تیز بارش میں جلتا ہوا
رات کی شاہزادی بہکتی ہوئی
غنچۂ صبح آنکھوں کو ملتا ہوا
سخت ہوتے ہوئے آبشاروں کے لب
برف کی طرح موسم پگھلتا ہوا
سر پہ تلوار لٹکی ہوئی شام کی
اور مغرب سے سورج نکلتا ہوا
قافلے شہر و صحرا بھٹکتے ہوئے
اک ستارہ سرِ راہ جلتا ہوا
ایک آندھی مکانوں میں پلتی ہوئی
اک پرندہ فضا میں سنبھلتا ہوا

○

موسم کے بدلنے کا کچھ اندازہ بھی ہوتا
جب گھر ہی بنایا تھا تو دروازہ بھی ہوتا

ہم شعرِ نمک ریز سناتے سرِ محفل
جو زخم فسردہ تھا، تر و تازہ بھی ہوتا

تم ہوتے تو معراجِ خیالات بھی ہوتی
بکھرے ہوئے الفاظ کا شیرازہ بھی ہوتا

جذبات کی آنکھوں میں چمکتا کوئی شعلہ
احساس کے رخسار پہ کچھ غازہ بھی ہوتا

رقاصۂ دیروز بھی بے پیرہن آتی
دوشیزۂ امکان کا خمیازہ بھی ہوتا

○

دلوں کے رنگ نہ ملتے ہوں جب بھی ہوتا ہے
یہ کارِ شوق کبھی بے سبب بھی ہوتا ہے

تمھاری یاد میں پیتے ہیں لوگ آنسو بھی
تمھارے نام پہ جشنِ طرب بھی ہوتا ہے

بدلتے رہتے ہیں معنی پرانے لفظوں کے
ہماری بے ادبی میں ادب بھی ہوتا ہے

بہت سے لوگ ہیں، ملتے بچھڑتے رہتے ہیں
یہ کام پہلے بھی ہوتا تھا، اب بھی ہوتا ہے

○

دلہن سی جو شکل رات کی تھی
ارتھی وہ کسی برات کی تھی
تہ تھی جو سیاہیوں کی دل پر
دنیا سے تعلقات کی تھی
کیوں تم نے بجھا دی شمع کی لو؟
ہم نے تو سحر کی بات کی تھی
ہم بزم سے کب کے اٹھ چکے تھے
تشویش تمھاری ذات کی تھی
کھیلا کئے شان سے بہت ہم
بازی وہ اگرچہ مات کی تھی
مفہوم اک اک سے پوچھتے ہیں
کل ہم سے کسی نے بات کی تھی!
اب رات سے صبح کر رہے ہیں
جس طرح سحر سے رات کی تھی
اے جشنِ حنا منانے والو!
ہم نے بھی کبھی حیات کی تھی

فضا ابن فیضی

○

کیا خبر تھی، کرب افزا کاہشیں دے جائے گا
اب کے یہ موسم بھی سوکھی بارشیں دے جائے گا

تیر چٹکی میں سنبھالوں گا، تو پیرِ آسماں
ہاتھ میں، اتری کماں سی خواہشیں دے جائے گا

خوش نہ ہونا مٹھیوں میں بھر کے، تم سورج کی دھوپ
ابر کا ٹکڑا، سلگتی سازشیں دے جائے گا

کیا سفر میں کام دے گا، حیلۂ درماندگی
دائرہ نقطے کو اپنے، گردشیں دے جائے گا

ماجرائے ذات خونِ دل سے لکھ! یہ مشغلہ
کالے کاغذ کو، افق کی تابشیں دے جائے گا

کچھ توقع ہے نئے موسم کی کروٹ سے مجھے
پائے خوشبو کو، ہوا کی لغزشیں دے جائے گا

خواب کا پیکر ہے وہ، تجھ سے جو مل بیٹھا کبھی
عمر بھر کو، رتجگوں کی ورزشیں دے جائے گا

تجربوں کا یہ عمل ہے، زندگی کی بازیافت
تجھ کو، تیری بھولی بسری دانشیں دے جائے گا

یہ مرا خوش عقدہ ناخن، کند اتنا بھی نہیں
حرف کو تیرے، ہنر کی کاوشیں دے جائے گا

یہ جو ہاتھوں میں قلم ہے، دستِ رعشہ دار سا
ایک دن تجھ کو، عصا کی جنبشیں دے جائے گا

اک ذرا، اسلوبِ غالب کا تتبع بھی فضاؔ
تیرے لہجے کو، نئی آرائشیں دے جائے گا

○

رنگ تو اٹھتا نہ تھا، خوشبو اٹھا کر لے گئے
یہ کہاں مجھ کو، مرے آہو اٹھا کر لے گئے

خال و خط لو دے اٹھے جوشِ فروغِ ذات سے
آئینے کو جب بھی تا زانو اٹھا کر لے گئے

پاؤں محوِ خواب اسی زنداں میں ہیں تو کیا ہوا
لوگ، زنجیرِ خمِ گیسو اٹھا کر لے گئے

آپ اپنے کو ہمیں تھا ذرّہ ذرّہ بانٹنا
خرمنِ کونین سے بالو اٹھا کر لے گئے

کوہکن تو کاروبارِ تیشگی میں گم رہا
تھی جو میراثِ ہوس خسرو اٹھا کر لے گئے

ہے اسی نم سے یہ فصلِ کشتِ امکاں سرسبز
چھوڑ دی لب کی ہنسی، آنسو اٹھا کر لے گئے

ہم سمندر تھے، مگر اک قہر تھی اندر کی پیاس
کرتے کیا، خیمہ کنارِ جو اٹھا کر لے گئے

رہ گئی محفوظ کتنی انگلیوں کی آبرو
ہم تھے یوسف آشنا، چاقو اٹھا کر لے گئے

"یہ سزا کس جرم کی" تم سے نازک شیوہ لوگ
خود صلیبِ قامتِ دلجو اٹھا کر لے گئے

ساز ہیں خاموش، رقصِ زندگی بھی تھم گیا
کب مری سانسوں کے تم گھنگھرو اٹھا کر لے گئے

زندگی کا فلسفہ تھا شہر میں رسوا بہت
مجھ کو جنگل کی طرف سادھو اٹھا کر لے گئے

جز خراشِ حرف میرے پاس اب کچھ بھی نہیں
پھول یارانِ ترش ابرو اٹھا کر لے گئے

جلتی بجھتی روشنی کا دائرہ سا لفظ لفظ
جب کھلا کوئی ورق، جگنو اٹھا کر لے گئے

محملِ زخمِ حنا بستہ ہوں، کیا کہئے فضاؔ
مجھ کو اس حد تک لوگ کس پہلو اٹھا کر لے گئے

○

سلگتے دور کا ورثہ، ہنر کے نام لکھوں
میں ساری دھوپ اسی اک شجر کے نام لکھوں

ہوئے تمام مکیں، ہجرتوں کے دشت میں گم
اب ان مکانوں کو میں کس کھنڈر کے نام لکھوں

ستونِ آب پہ ہے، قصرِ زندگی قائم
بکھرتی موجوں کو، دیوار و در کے نام لکھوں

وہ مطمئن ہے بہت، بادباں پھیلا کر
کوئی پیام، ہوا کے بھنور کے نام لکھوں

نہ مجھ سے مانگ، حسابِ شکستِ چہرہ ابھی
میں کتنی تہمتیں، آئینہ گر کے نام لکھوں

لگائے خیمہ کہاں، بے طناب ہے ہر شخص
اب اس پڑاؤ کو، اگلے سفر کے نام لکھوں

خود اپنی ذات کے بکھراؤ کی ہوں ایک مثال
اثاثہ اپنا، میں کیوں بحر و بر کے نام لکھوں

لگے جو ہاتھ، تمہارے بدن کی دستاویز
نئی حقیقتیں فکر و نظر کے نام لکھوں

اسی ہوس نے کیا مجھ کو زیر بار اتنا
ہنر کا قرض بھی، عرضِ ہنر کے نام لکھوں

تو کس ہوا میں ہے، لے نازمیں پرندے آ
اڑانیں اپنی، ترے بال و پر کے نام لکھوں

وہ جس کے چاک پہ گردش میں ہے وجود مرا
میں اپنا فن بھی اسی کوزہ گر کے نام لکھوں

مرا قلم ہے، مجھی سے فضاؔ کشیدہ سا
مجھے یہ شاخ تراش پر ثمر کے نام لکھوں

رُباعیات

جو پاؤں تھا، پھیلی ہوئی چادر بھر تھا
جو بازو تھا، کھلتے ہوئے شہپر بھر تھا
کس ریت میں گم ہو گئیں موجیں ساری
کل تک یہی طوفاں تو سمندر بھر تھا

○

آہنگ وہی، ساغر و سنداں بھر تھا
انداز وہی، کعبہ و کنعاں بھر تھا
دامن ہے کہ پھر بھی رہا خالی خالی
سب دیکھ لیا مڑ کے، جو امکاں بھر تھا

○

آسودہ وہی چاک، گریباں بھر تھا
سرگشتہ وہی شعلہ، نیستاں بھر تھا
نیرنگ گل و لالہ ہے نظروں کا فریب
موسم تو وہی ایک، گلستاں بھر تھا

○

دامن تھا، کہ پھیلا ہوا خوشبو بھر تھا
خوشبو کا تموج تھا کہ گیسو بھر تھا
کس تنگ سے کوچے میں ہیں سمٹے ہوئے لوگ
یہ دشت ابھی کل تک رمِ آہو بھر تھا

○

جو موج تھی، امڈے ہوئے بادل بھر تھی
جو آگ تھی، پھیلے ہوئے جنگل بھر تھی
یہ روٹھ گیا کون، کہ سونا ہوا گھر
رونق تو بہت گھر میں ابھی کل بھر تھی

○

جو رنگ تھا، بکھرا ہوا منظر بھر تھا
جو رُوپ تھا، نکھرا ہوا پیکر بھر تھا
ہم سمجھے تھے، تنہائی گزیدہ اس کو
جو حرف اکیلا تھا، وہ دفتر بھر تھا

○

اک آتشِ گُل فام کہ خرمن بھر تھی
اک برقِ خوش انجام کہ گلشن بھر تھی
آئی مرے حصے میں بہ نامِ فنِ شعر
وہ تہمتِ بے نام، جو دامن بھر تھی

○

گلاب میرے ہیں، شاخِ گلاب میری ہے
جو اس کے ہاتھ میں ہے وہ کتاب میری ہے

شراب اس کی، مگر یہ خمار ہے میرا
ایاغ اس کا، مگر یہ شراب میری ہے

میں اپنے عہد کی رفتار کا توازن ہوں
فرس کسی کا ہو، لیکن رکاب میری ہے

ہنوز میں ہوں سفر میں، پڑاؤ کیا ڈالوں
نہ خیمہ میرا، نہ اس کی طناب میری ہے

تو اس میں اپنے عمل کا نہ گوشوارہ لکھ!
یہ کائنات تو فردِ حساب میری ہے

میں خود بہشت بھی اپنی ہوں، اپنا دوزخ بھی
کہ ہر شریعتِ جرم و ثواب میری ہے

تو میری فکر نہ کر، خوش ہوں اپنی دنیا میں
مرے خدا! یہ بساطِ عذاب میری ہے

خود اپنے آپ میں گم ہے وہ مجھ کو پڑھتے ہوئے
ورق ورق، نگہِ انتخاب میری ہے

فضا ہیں مجھ سے عبارت تمام پس منظر
ہر ایک چہرے کے اوپر نقاب میری ہے

○

ہم نے مانا، بہ صد اسلوبِ ہنر لکھتے ہو
بات بڑھ جائیگی، خط اس کو اگر لکھتے ہو

آئینے اپنی چمک جن پہ لکھا کرتے ہیں
تم انھیں چہروں پہ کیوں گردِ نظر لکھتے ہو

دشتِ ہجرت سے عبارت ہے ٹھکانا سب کا
ہیں جو اندر سے کھنڈر، کیوں انہیں گھر لکھتے ہو

یوں بھی کب وقت کا موسم ہے بدلنے والا
کس لیے دھوپ کو تم، سبز شجر لکھتے ہو

تم بھی آخر ہو کسی آوارہ نگاہی کا حساب
منزلوں کو، بہ خطِ راہ گزر لکھتے ہو

کون یوں فصلِ جراحت میں بھی سر سبز رہا
ظرف والے ہو کہ پتھر کو ثمر لکھتے ہو

زندگی ہے تو کہاں، قیدِ مصائب سے نجات
کتنے پاگل ہو، کہ دیوار کو در لکھتے ہو

کون یہ ریت کی تحریر ہے پڑھنے والا
تم سرابوں کے ورق پر جو بھنور لکھتے ہو

انھیں مہمل کدۂ شاہدِ معنی سمجھو!
کیا غضب کرتے ہو، لفظوں کو کھنڈر لکھتے ہو

چشمِ بد دُور، عجب وضع تمھاری ہے فضا
رات کی لوح پہ عنوانِ سحر لکھتے ہو

محمد حسن

○

کچھ مت کہو کہ کہنے سے ہو ہے پرائی بات　　بہتر یہی ہے روک بھی لو لب پہ آئی بات
یہ شہر ہے وہی کہ اسی شہرِ سنگ میں　　سو طرح کی سنی ہے میاں اور اٹھائی بات
اس پتھروں کے شہر کا اپنا مزاج تھا　　ہم نے بھی اپنے طور سے اپنی نبھائی بات
عمرِ عزیز باتوں ہی باتوں میں کٹ گئی　　ہم کو سائیں آج بھی کرنی نہ آئی بات
دُنیا سنور تو سکتی تھی اَے عمرِ مختصر　　کوشش بہُت کی ہم نے مگر بن نہ پائی بات
اے دردِ زیست تُو نے کیا بے نیازِ زیست
تیری تمام باتوں میں ہم کو یہ بھائی بات

○

نگاہِ التفات بس، ترا کرم ستم ہوا　　نہ ہم سے کچھ کہا گیا نہ ہم سے کچھ سنا گیا
کوئی حساب تو کرے کوئی قصور تو بتائے　　سروں پہ آفتابِ حشر نصف نیزہ آ گیا
وہ جس نے گُل کھلا دیئے روش روش چمن چمن　　وہ جھونکا دل دکھا گیا چراغِ جاں بجھا گیا
دلوں پہ جو گزر گئی بھلا کسی کو کیا خبر　　فسانہ دردِ زیست کا کہا گیا سُنا گیا
کرن کرن امید کی پناہ ڈھونڈتی رہی　　وہ تیرگی تھی رات بھر سحر کا آسرا گیا
یہ آخری لکیر تھی نہ جانے کیسے کھنچ گئی
وہ خاتمے کا حرف تھا نہ جانے کب لکھا گیا

نظم

کہو کسی فسردہ دِل کی داستاں کہو
سناؤ کس طرح فلک نے چیزیاں بکھیر دیں
فسردہ آنکھیں ڈبڈبائی دیکھتی رہیں
بہار کی ہوا نے گیت گائے ارغنوں بجائے
برگِ سبز تالیاں بجا کے جھومے ناچے
گلوں نے آنکھ کھول دی
غنچے مسکرائے
وہ بوندیوں کی جھانجنوں نے ساز سُر ملائے
فسردگی عذاب تھی وہ سب سے بے نیاز تھی
وہ سن نہ پائی زمزمے
جو زخم کل لگے تھے ان کو گن رہا تھا دردِ دل
وہ زخم جو گلوں کی طرح کھل رہے تھے ہنس رہے تھے
مستقل

سناؤ کوئی داستاں
وہ چاند چہرے والے شاہزادے راستوں میں کھو گئے
تلاش میں تھے آبِ گم کی پتھروں کے ہو گئے
وزیر زادے ہمرکاب چوتھی سمت کیا گئے کہ بس
وہیں کے ہو گئے
وہ نازنیں جن کی چُنریوں کے رنگ آسمان تھے
خیال و خواب ہو گئیں
ردائے خاک اوڑھ سو گئیں

کہو کسی فسردہ دل کی داستاں کہو
کہ دل کو کچھ سکوں ملے
کہ کوئی اس جہان میں
ہماری طرح سے دکھی تو ہے
دکھی ہے اور اداس ہے
اَور اپنے آس پاس ہے

یزدانی جالندھری

○

چلی یہ شہر میں کیسی ہوا آہستہ آہستہ
ہُوا ہر آشنا، نا آشنا آہستہ آہستہ

اُلجھتا ہی گیا جب راستہ، آہستہ آہستہ
کُھلا ہم پر فریبِ راہنما، آہستہ آہستہ

پھرا ہے دھیرے دھیرے خنجرِ اقدارِ نَو اِس پر
کٹا ہے آدمیّت کا گلا، آہستہ آہستہ

در آیا کون یہ چُپکے سے یادوں کے دریچے میں
درِ دل پر یہ کس نے دی صدا آہستہ آہستہ

کسی نے آج پھر تجدیدِ پیمانِ وفا کی ہے
ہُوا ہے تازہ پھر زخمِ وفا آہستہ آہستہ

پیامِ مرگ تھا ہر چند بادِ غم کا ہر جھونکا
مگر دِل کا دیا جلتا رہا آہستہ آہستہ

بہا کر لے گیا ساتھ اپنے ضبطِ غم کا ہر رِشتہ
وہ طوفاں دِل کے دریا میں اٹھا آہستہ آہستہ

مجھے ڈر ہے نہ ہو محشر سے پہلے ہی بپا محشر
کہ انساں بنتا جاتا ہے خدا آہستہ آہستہ

یہ پاسِ ضبط تھا یا دل کی رُسوائی کا اندیشہ
کہ آیا لب پہ حرفِ مدّعا آہستہ آہستہ

نہ جانے کیا خطا تھی، ہو گیا کیا جُرم یزدانی!
ملی ہے عمر بھر جس کی سزا آہستہ آہستہ

○

صحن چمن میں ہر سُو پتھّر
پھول تو پھول ہے خوشبو پتھّر

آج اک ایک کرن پتھرائی
سُورج تارے جگنو، پتھّر

سینہ سینہ ــــ زخمی زخمی
برسے ہیں ہر پہلو پتھّر

پتھرائے پتھرائے چہرے
آنکھیں پتھّر، آنسو پتھّر

اپنے گُلشن کی پھر قسمت
طوفانی آندھی، لُو، پتھّر

جن لہروں پر ناؤ چلی تھی
بن گئیں آکے لبِ جُو پتھّر

میری جانب، ہر جانب سے
آئے ہیں بے قابو پتھّر

جتنے بنامِ ضبط پیے تھے
دل میں بنے وہ آنسو پتھّر

راہِ وفا پر چلنا مشکل
ہر سُو کانٹے، ہر سُو پتھّر

اہلِ جفا سے ہاتھ ملاتے
ہو گئے میرے بازُو پتھّر

اس ماحول میں گر جینا ہے
یزدانی! ہو جا تُو پتھّر

○

ملا ہے تپتا صحرا دیکھنے کو
چلے تھے گھر سے دریا دیکھنے کو

رہے جو عمر بھر مجھ سے گریزاں
وہ اب آئے ہیں چہرا دیکھنے کو

چلو اپنا ہی منظر آپ دیکھیں
کہاں جائیں تماشا دیکھنے کو

سرِ مقتل کسے لایا گیا ہے
چلی آتی ہے دُنیا دیکھنے کو

پھرا ہوں رات دن کوئے طلب میں
کُھلا کوئی دریچہ دیکھنے کو

بنے ہیں دوست مرغِ باد پیما
کھڑے ہیں رُخ ہوا کا دیکھنے کو

فسردہ پھول، اُڑتے زرد پتے
چمن میں رہ گیا کیا دیکھنے کو

ملی ہے مختصر سی فرصتِ دید
تماشا گاہِ دُنیا دیکھنے کو

چراغِ رہگذر، جگنو، ستارا
کرن کوئی تو رستا دیکھنے کو

ہمیں کیا رہ گئے تھے اے زمانے!
یہ انجامِ تمنا دیکھنے کو

سفینہ وسطِ دریا میں ڈبو کر
بڑھیں موجیں کنارا دیکھنے کو

یہ منظر — مدتوں کے شب گزیدہ
ترستے ہیں اُجالا دیکھنے کو

پھرے ہیں انجمن در انجمن ہم
اُسے جلوہ بہ جلوہ دیکھنے کو

○

جادۂ زیست پہ برپا ہے تماشا کیسا
دوست بچھڑا ہے ہر اک گام پہ کیسا کیسا

چار سُو اُٹھتے ہیں یہ غم کے بگولے کیسے
وادیٔ دِل میں ہے پھیلا ہوا صحرا کیسا

دِل کا آتشکدہ ویران پڑا تھا کب سے
آنکھ سے بہنے لگا آگ کا دریا کیسا

اِس پہ تو فصلِ خزاں مار چکی ہے شبخوں
موسمِ گُل کے گزر جانے کا کھٹکا کیسا

کوئی دیوانہ سُوئے شہر نہ آ نکلا ہو
آج بازار میں ورنہ ہے یہ میلہ کیسا

آنکھ روتی ہے مگر اشک نہیں پلکوں پر
لبِ دریا سمٹ آیا ہے یہ صحرا کیسا

چاند سے چہرے نظر آنے لگے ہیں کتنے
کُھل گیا میری نگاہوں پہ دریچہ کیسا

جس میں اک اشک ہو آنکھ کہاں ہے وہ آنکھ
بُوند پانی کی نہ ہو جس میں وہ دریا کیسا

بے تحاشا جو بڑھی جاتی ہے سُوئے گرداب
ناؤ نے دیکھ لیا اس میں کنارا کیسا

دیکھ محفل میں ہر اک آنکھ ہے نم یزدانی
تو نے یہ چھیڑ دیا آج فسانہ کیسا

امید فاضلی

○

وہ مِرا چارہ گر؟

یک بہ یک
جانے یہ کیا ہُوا!
شب کا پچھلا پہر اور احساس یہ
جیسے چاروں طرف
دھوپ ہی دھوپ ہے
زندگی کا نہ جانے یہ کیا روپ ہے
جیسے مرکز سے ارض و سما ہٹ گئے
جیسے سب رابطے
چشم و بینائی کے کٹ گئے
جیسے کچھ بھی نظر آج آتا نہیں
دیپ کوئی کہیں جگمگاتا نہیں
دھڑکنوں کا سفر جیسے تھم سا گیا
خون جیسے رگِ جاں میں جم سا گیا
ماضی و حال کی ساری پرچھائیاں
میرے اطراف میں جیسے نوحہ کناں
بارہا دل دُکھا تھا مگر
اِس قدر
میں پریشاں نہ تھا
روح ویراں نہ تھی تن بیاباں نہ تھا
درد!
دروازۂ دل پہ دستک دیئے جا رہا ہے اِدھر
اور اُدھر ذہن میں
کوئی درمانِ درد اور نہ راہِ مفر
ایسا لگتا ہے جیسے یہ دیوار و در
آج محرومِ بہ سلنے سے ہو گئے
اور سائے نہ جانے کہاں کھو گئے

○

تو کہیں وہ شجر..... ؟
جس سے اِک دن مجھے
گردشِ وقت و حالات نے
کر دیا تھا جُدا
پھر بھی مجھ میں جو ہر لمحہ آباد تھا
اُس کا سایہ کسی دامنِ جاں فزا کی طرح
سائباں کی طرح
مجھ کو ہر دھوپ سے
دُکھ کے ہر روپ سے
ہر قدم پر بچاتا رہا
راہ میں رنگ و نکہت بچھاتا رہا
موسموں کے مزاجوں کی پہچان کیا ہے بتاتا رہا
اُس کی شاخِ نمو ریز میرے لئے
یا قلم بن گئی یا سناں ہو گئی
اُس کی پرچھائیں مجھ میں جواں ہو گئی
اُس کا ہر برگِ سرسبز و راحت اثر
چارہ گر بن گیا
صورتِ سایۂ معتبر
ہم سفر بن گیا
وہ شجر سایہ بر کف مسیحا مِرا

وہ یقین کی سپر سائبانِ وفا
جس کے زیرِ اثر
موسموں کے سفر
وہ بہاروں کا اِک ایسا پیغام بر
میری خاطر خزاں سے جو لڑتا رہا
وہ مرا آئینہ جو مرا عکس تھا
جو مرے خال و خد میں نکھرتا رہا
مجھ میں آہنگ و رنگ اپنے بھرتا رہا
اُس کی خوش قامتی اُس کی تیغِ انا
میری شکتی، مرا بل، مرا حوصلہ
اب بھی یاد اُس کی ہے مجھ سے زِبَل کا بَل
اُس سے درماں طلب میرا ایک اِک پَل
اپنے ان دیکھے دامن کے سائے تلے
ہر نئی رُت میں تازہ ہوائیں لئے
برسرِ شاخِ قامت کفِ برگ پر وہ دعائیں لئے
فاصلوں کی فصیلوں کو ڈھاتا ہوا
ہر حجابِ مسافت ہٹاتا ہوا
دوپہر دوپہر بلکہ شام و سحر
ہر نئی راہ میں، ہر نئے موڑ پر
رہ گذر، رہ گذر
ابر سایہ فگن کی طرح ساتھ چلتا رہا
اور اندھیرا ہُوا تو دیئے کی طرح مجھ میں جلتا رہا
جس کے پتّوں کی تحریر کے نور نے
علم و دانش کا رستہ دکھایا مجھے
دھوپ اور چھاؤں میں فرق کیا ہے

بتایا مجھے
اُس نے اندھی ہواؤں کی تلوار کو
چلچلاتی ہوئی دھوپ کے وار کو
بے اثر کر کے جینا سکھایا مجھے
اُس تناور شجر کی مہکتی ہوا
اپنے آغوش میں میرے موسم لئے
دستِ نادیدہ میں دُکھ کا مرہم لئے
زندگی کی طرح رقص کرتی ہوئی
زینہ زینہ فضا سے اُترتی ہوئی
مجھ تک آتی رہی
اور خوابوں کو جھولا جھلاتی رہی
وقت و موسم کے تیروں سے مجھکو بچاتی رہی
کس سے پوچھوں کہ وہ روح پرور ہوا
آج کیا ہو گئی
کس ڈگر سو گئی

تو کہیں وہ شجر ...... ؟
وہ مرا سائباں، مہرباں ہم سفر
وہ مسیحا مرا، وہ مرا چارہ گر
مدّتوں سے جسے میں نے دیکھا نہیں
وُہ بہار آفریں
جو ہمیشہ مری حس میں شامل رہا
کیا ہمیشہ کو تنہا مجھے کر گیا ...... ؟

○

آئینۂ وحشت کو جلا جس سے ملی ہے
وہ گردِ رہِ ترکِ مراسم سے اُٹھی ہے

شعلوں نے عبارت یہ دریچوں پہ لکھی ہے
خوابوں سے محبت کی سزا دربدری ہے

صدیوں کے تسلسل میں کہیں گردشِ دوراں
پہلے بھی کہیں تجھ سے ملاقات ہوئی ہے

اے کربِ بلاخوش ہو نئی نسل نے اب کے
خود اپنے لہو سے تری تاریخ لکھی ہے

اُس کج کلہِ عشق کو اے مشقِ ستم دیکھ
سر تن پہ نہیں پھر بھی وہی سرو قدی ہے

کس راہ سے تجھ تک ہو رسائی کہ ہر اک سمت
دُنیا کسی دیوار کے مانند کھڑی ہے

ظلمت کی کماں میں ہیں نئے تیر ہوا کے
یہ ڈھلتی ہوئی رات چراغوں پہ کڑی ہے

زنداں کی فصیلیں ہوں کہ مقتل کی فضائیں
رفتارِ جنوں بھی کہیں روکے سے رکی ہے

ہے رہ گزرِ زیست تلک بھیڑ، یہ ورنہ
ہر شخص کی تقدیر میں تنہا سفری ہے

اُس محوِ انا کو یہ مگر کون بتائے
تخلیقِ غزل مرحلۂ خود شکنی ہے

جس روپ میں جب چاہے جسے ڈھال دے اُمید
دُنیا بھی عجب کارگہِ کوزہ گری ہے

○

کسی سے اور تو کیا گفتگو کریں دِل کی
کہ رات سُن نہ سکے ہم بھی دھڑکنیں دِل کی

کُھلا یہ لوگوں پہ جب ٹوٹ کے بکھرنے لگے
لہو رُلاتی ہیں انساں کو خواہشیں دل کی

اُدھر وہ آئے اِدھر بُجھ گئی نگاہ کی لو
کہاں یہ ختم ہوئیں آ کے سرحدیں دِل کی

مگر یہ بات خرد کی سمجھ میں آ نہ سکی
وصال و ہجر سے آگے ہیں منزلیں دِل کی

جلو میں خواب نُما رت جگے سجائے ہوئے
کہاں کہاں لیے پھرتی ہیں وحشتیں دِل کی

نگاہ ملتے ہی رنگِ حیا کی صورت میں
چھلک اُٹھیں ترے رُخ سے لطافتیں دِل کی

زبانِ درد میں کچھ دن سے بات کرتی ہیں
کسی کی یاد کے مانند دھڑکنیں دِل کی

نگاہِ کم بھی اِسے سنگ سے زیادہ ہے
کہ آئینے سے سِوا ہیں نزاکتیں دِل کی

دیارِ حرف و نوا میں کوئی تو ایسا ہو
کبھی کِسی سے تو ہم بات کر سکیں دِل کی

سرِ جریدۂ ہستی ہمارے بعد اُمید
لہو سے کون لکھے گا عبارتیں دِل کی

صمد انصاری

وہ شاخ کہ مہکی تھی بہاروں سے زیادہ
اُجڑی ہے وہی اب کے خزاؤں سے زیادہ

نظروں کے تلے بند ہیں پلکوں کے دریچے
کُھلتی نہیں اب آنکھ نگاہوں سے زیادہ

پہنچا ہے خطِ ساغرِ دنیا رگِ جاں تک
کرتے ہیں نشہ لوگ شرابوں سے زیادہ

رہتے ہیں در و بام بھی مےخانۂ شب تک
آباد نہیں شہر خرابوں سے زیادہ

نمدیدہ تھا اک روز نشیبوں میں زمیں کے
وہ ابر کہ لگتا ہے چٹانوں سے زیادہ

لپٹی ہیں اُجالوں سے اندھیروں کی ردائیں
اُٹھتا ہے دھواں اب کے چراغوں سے زیادہ

محفوظ ہیں اک عمر سے پتھر کے بدن میں
اصنام نہیں گرچہ خیالوں سے زیادہ

شاہوں کے مقرب ہیں وہی حکم کے بندے
ملتی ہے سزا جن کو خطاؤں سے زیادہ

بس جاتی ہے راتوں میں صمدؔ شام کی دستک
ہے گونج مرے گھر میں صداؤں سے زیادہ

شرحِ جمال کیجئے شہادت کے ماسوا
حُسنِ ازل کی بات روایت کے ماسوا

نقشِ قدم کے واسطے باقی نہیں قدم
بندِ قبا میں کچھ نہیں قامت کے ماسوا

رگ رگ میں دوڑتی تھی بہاروں کی تازگی
اَب کچھ نہیں لہو میں حرارت کے ماسوا

معنی میں ڈھال دیجئے اک ایک حرف کو
کیجے مگر کلام عبارت کے ماسوا

نذرِ چراغِ شب ہوئی سورج کی روشنی
اب کچھ نہیں کرن میں حرارت کے ماسوا

ملتا نہیں جہان میں رنگ آستاں کا
ماتم ہے کربلا میں شہادت کے ماسوا

بس اک قیامِ دید پہ ہے اجتماعِ کل
ممکن نہیں ہے حشر قیامت کے ماسوا

صورت گری کرے گی وہی کل کی آج بھی
وہ داستاں کہ کم ہے قدامت کے ماسوا

اُٹھتا نہیں ہے پاؤں صمدؔ آبلہ بغیر
لب پہ نہیں ہے حرفِ صداقت کے ماسوا

بشیر بدر

○

کہیں پلکیں اوس سے دھو گئی کہیں دل کو پھولوں سے بھر گئی
تری یاد سولہ سنگار ہے جسے چھو دیا وہ سنور گئی

انھیں دو گھروں کے قریب ہی کہیں آگ لے کے ہوا بھی تھی
نہ کبھی تمھاری نظر گئی نہ کبھی ہماری نظر گئی

نہ مرے غموں کا حساب لے نہ غموں کا اپنے حساب دے
وہ عجیب رات تھی کیا کہیں جو گزر گئی سو گزر گئی

مرا شاعرانہ سا خواب تھی جسے لوگ کہتے ہیں زندگی
انھیں ناخداؤں کے خوف سے وہ چڑھی ندی میں اتر گئی

میں سنہری پتوں کا پیڑ ہوں، میں خزاں کا حسن و وقار ہوں
مرے بال چاندی کے ہو گئے مرے سر پہ دھوپ ٹھہر گئی

○

میں اداس رستہ ہوں شام کا تری آہٹوں کی تلاش ہے
یہ ستارے سب ہیں بجھے بجھے مجھے جگنوؤں کی تلاش ہے

ذرا یہ کرنے کو آئنے ہیں ہمیں اور کچھ نہیں چاہیئے
وہ ہیں ڈور کانٹے لیے ہوئے جنھیں مچھلیوں کی تلاش ہے

وہ جو ایک دریا تھا آگ کا سبھی راستوں سے گزر گیا
تمھیں کب سے ریت کے شہر میں نئی بارشوں کی تلاش ہے

نئے موسموں کی اڑان کو ابھی اس کی کوئی خبر نہیں
ترے آسمان کے جال کو نئے پنچھیوں کی تلاش ہے

مرے دوستوں نے سکھا دیا مجھے اپنی جان سے کھیلنا
مری زندگی تجھے کیا خبر مجھے قاتلوں کی تلاش ہے

تری میری ایک ہیں منزلیں وہی جستجو، وہی آرزو
تجھے دوستوں کی تلاش ہے مجھے دشمنوں کی تلاش ہے

○

میں غزل کہوں میں غزل پڑھوں مجھے دے تو حسنِ خیال دے
ترا غم ہی ہے مری تربیت مرے دل کو رنج و ملال دے

سبھی چار دن کی ہیں چاندنی یہ ریاستیں یہ وزارتیں
مجھے اس فقیری کی شان دے کہ زمانہ جس کی مثال دے

مری صبح تیرے سلام سے مری شام ہے ترے نام سے
ترے در کو چھوڑ کے جاؤں گا یہ خیال دل سے نکال دے

مرے سامنے جو پہاڑ تھے سبھی سر جھکا کے چلے گئے
جسے چاہے تو یہ عروج دے جسے چاہے تو یہ زوال دے

بڑے شوق سے انھیں پتھروں کو شکم سے باندھ کے سو رہوں
مجھے مالِ مفت حرام ہے مجھے دے تو رزقِ حلال دے

○

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

اور جام ٹوٹیں گے اس شراب خانے میں
موسموں کے آنے میں موسموں کے جانے میں

فاختہ کی مجبوری یہ بھی کہہ نہیں سکتی
کون سانپ رکھتا ہے اس کے آشیانے میں

ہر دھڑکتے پتھر کو لوگ دل سمجھتے ہیں
عمریں بیت جاتی ہیں دل کو دل بنانے میں

دوسری کوئی لڑکی زندگی میں آئے گی
کتنی دیر لگتی ہے اس کو بھول جانے میں

○

میرا اک چراغ کی لو ایسی سوئی تھی   وہ شام جیسے کسی سے بچھڑ کے روئی تھی
نہا گیا تھا میں کل جگنوؤں کی بارش میں   وہ میرے کاندھے پہ سر رکھ کے خوب روئی تھی
مکاں کے ساتھ وہ پودا بھی جل گیا جس میں   مہکتے پھول تھے، پھولوں میں ایک تتلی تھی
خود اسکے باپ نے پہچان کر نہ پہچانا
وہ لڑکی پچھلے فسادات میں جو کھوئی تھی

○

میں کب تنہا ہوا تھا یاد ہو گا   تمھارا فیصلہ تھا، یاد ہو گا
بہت سے اُجلے اُجلے پھول لے کر   کوئی تم سے ملا تھا، یاد ہو گا
بچھی تھیں ہر طرف آنکھیں ہی آنکھیں   کوئی آنسو گرا تھا، یاد ہو گا
اداسی اور بڑھتی جا رہی تھی   وہ چہرہ بجھ رہا تھا، یاد ہو گا
وہ خط پاگل ہوا کے آنچلوں پر
کسے تم نے لکھا تھا، یاد ہو گا

○

پیار کی ننھی دستک دل پہ پھر سنائی دی
چاند سی کوئی صورت خواب میں دکھائی دی
کس نے میری پلکوں پر تتلیوں کے پر رکھے
آج اپنی آہٹ بھی دیر تک سنائی دی
ہم غریب لوگوں کے آج بھی وہی دن ہیں
پہلے کیا اسیری تھی آج کیا رہائی دی
بارشوں کے چہرے پر آنسوؤں سے لکھنا تھا
کوئی کچھ نہ پڑھ پائے ایسی روشنائی دی
آسماں، زمین رکھ کر دونوں ایک مٹھی میں
اک ذرا سی لڑکی نے پیار کی خدائی دی
یہ تنک مزاجی تو خیر اسکی فطرت ہے
ورنہ اس نے چاہت بھی ہم کو انتہائی دی
یہ تناؤ قدرت نے دو دلوں میں کیوں رکھا
مجھ کو کج کلاہی دی اس کو کج ادائی دی

○

سر سے پا تک وہ گلابوں کا شجر لگتا ہے
باوضو ہو کے بھی چھوتے ہوئے ڈر لگتا ہے

میں، ترے ساتھ ستاروں سے گذر سکتا ہوں
کتنا آسان محبت کا سفر لگتا ہے

مجھ میں رہتا ہے کوئی دشمنِ جانی میرا
خود سے تنہائی میں ملتے ہوئے ڈر لگتا ہے

بت بھی رکھے تھے، نمازیں بھی ادا ہوتی ہیں
دِل مرا دِل نہیں اللہ کا گھر لگتا ہے

زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار سے سر لگتا ہے

○

عظمتیں سب تری خدائی کی   حیثیت کیا مری اکائی کی
میرے ہونٹوں کے پھول سوکھ گئے   تم نے کیا مجھ سے بے وفائی کی
سب مرے ہاتھ پاؤں لفظوں کے   اور آنکھیں بھی روشنائی کی
میں ہی ملزم ہوں، میں ہی منصف ہوں   کوئی صورت نہیں رہائی کی
اک برس زندگی کا بیت گیا   تہ جمی ایک اور کائی کی
اب ترستے رہو غزل کے لیے
تم نے لفظوں سے بے وفائی کی

○

ادب کی حد میں ہوں میں بے ادب نہیں ہوتا   تمہارا تذکرہ اب روز و شب نہیں ہوتا
کبھی کبھی تو چھلک پڑتی ہیں یونہی آنکھیں   اُداس ہونے کا کوئی سبب نہیں ہوتا
کئی امیروں کی محرومیاں نہ پوچھ کہ بس   غریب ہونے کا احساس اب نہیں ہوتا
میں والدین کو یہ بات کیسے سمجھاؤں   محبتوں میں حسب و نسب نہیں ہوتا
میں اُس زمین کا دیدار کرنا چاہتا ہوں
جہاں کبھی بھی خدا کا غضب نہیں ہوتا

ذوقی مظفر نگری

○

جس شخص کو جینے کے قرینے نہیں آتے
اُس شخص پہ عظمت کے صحیفے نہیں آتے

جو خوابِ تمنا میں کبھی جلوہ فگن تھے
تعبیر کے پردے پہ وُہ چہرے نہیں آتے

آتے ہیں سفیرانِ بہاراں تو چمن میں
شاخوں پہ چٹکتے ہوئے غنچے نہیں آتے

آتا نہیں کوئی جو مرے گھر تو گلہ کیا
دیوار پہ مفلس کی پرندے نہیں آتے

جو نیند کی پوشاک میں بیٹھا ہے زمیں پر
اُس کے لیے افلاک سے تحفے نہیں آتے

غیرت بھی، دِلِ زار بھی، جذبے بھی کفن پوش
اب سامنے کس کس کے جنازے نہیں آتے

انساں ہی اب انساں کا بدن نوچ رہا ہے
انساں کا لہُو پینے درندے نہیں آتے

مسموم ہوائیں تو ٹہلتی ہیں چمن میں
خُوشبُو سے مہکتے ہُوئے لمحے نہیں آتے

کیسے کسی احمق سے مری عقل اُلجھتی
پتھر کے مقابل کبھی شیشے نہیں آتے

اب دیدہ و دل پر ہے عزازیل کا پہرا
اب میری حضوری میں فرشتے نہیں آتے

لمحات کی دہلیز پہ سر کیسے جھکاؤں
خود دار خیالوں میں تو سجدے نہیں آتے

قرآں کا قاری ہے صداقت کا معلّم
ذوقی کو نئے دور کے لہجے نہیں آتے

○

فسُردہ کیوں بہارِ زندگی ہے
چمن بندی میں شاید کچھ کمی ہے

ہوائے زرد رُو کیا کہہ گئی ہے
نشیمن چُوم کر چڑیا اُڑی ہے

کئی صدیوں سے اِک لمحے کی خاطر
تمنا ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے

کوئی اَے کاش یہ سُورج سے پُوچھے
سَحر ہے یا یہ سحرِ سامری ہے

ابھی کس طرح کوئی معتمد ہو
ضمیروں کی ابھی سوداگری ہے

نمایاں ہو گئے پھُولوں کے آنسو
چمن کی ٹہنی ٹہنی شبنمی ہے

جگر تھامے ہوئے ہے آدمیّت
ہراساں آدمی سے آدمی ہے

سفر کس درجہ کم تھا زندگی کا
قدم اُٹھتے ہی منزل آ گئی ہے

اندھیرے کیوں نہ ہوں مجھ سے گریزاں
مرے دل کی فضا میں روشنی ہے

کسی کے غم کو اپنا غم سمجھنا
حقیقت میں نشاطِ زندگی ہے

فلک سے میں زمیں پر گر گیا ہُوں
کسی سے آپ بیتی جب کہی ہے

بھروسا کر نہ اپنے سائے پر بھی
یہ قانونِ خودی میں خودکشی ہے

طلسمِ خواب پھر ٹوٹا ہے ذوقی
کسی نے پھر مجھے آواز دی ہے

ڈاکٹر مظفر حنفی

○

یوں چھاؤں میں جلتا رہوں کب تک مرے مولا
سایہ ابھی پہنچا نہیں سب تک مرے مولا

پھر بھی مری قسمت کے ستارے رہیں بیدار
سو جائیں اگر دستِ طلب تک مرے مولا

چھوڑا تھا کنارہ کہ ذرا شغل رہے گا
محصور ہوں گرداب میں اب تک مرے مولا

دِن گرد اُڑانے کے لیے تھا، سو اُڑا لی
پھر آ گیا ویرانۂ شب تک مرے مولا

منظور کہ قبضے میں رہے مملکتِ فن
تلوار پہ چلتا رہوں جب تک مرے مولا

کیا دیر ہے مجھ کو بھی اجازت ہو رجز کی
حرف آنے لگا نام و نسب تک مرے مولا

اک بار مظفر کو بھی توفیق عطا کر
مزدور بھی جاتے ہیں عرب تک مرے مولا

○

خود اُس کو معلوم نہیں ہے اس نے ایسا کیا فرمایا
چاروں سمتیں گونج رہی ہیں 'سچ ارشاد، بجا فرمایا'

مرے اندر کی آندھی میں وہ پہلا سا زور کہاں ہے
دریا نے بھی سیلابی کا شوق نہ دوبارا فرمایا

اس بی بی کا نام وفا تھا حضرتِ عشق فدا تھے جس پر
حضرت نے ہجرت فرمائی، بی بی نے پردا فرمایا

گدگدیاں ہوتی تھیں دِل میں، ہم بس کھیلنے ہی والے تھے
مرجھاتے ہیں، بادِ سحر نے پیہم لطف ایسا فرمایا

آج مظفر اپنا مقطع اس کی نذر کیے دیتے ہیں
جس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا کیا شعر عطا فرمایا

○

ایسا بھی نہیں ہے کہ شجر تک نہیں پہنچا
افسوس مرا ہاتھ ثمر تک نہیں پہنچا

گھر بھی جو ملا ہے تو ہواؤں پہ ہے دربند
دیوار کا سایہ مرے سر تک نہیں پہنچا

مرنے پہ مجھے چاہنے والے نکل آئے
قاتل بھی مرا لوٹ کے گھر تک نہیں پہنچا

اس بار بھی اِمداد پہ اک شرط لگی ہے
کہتے ہیں کہ سیلاب کمر تک نہیں پہنچا

بستی میں سبھی گردِ سفر بانٹ رہے ہیں
حالانکہ کوئی راہگذر تک نہیں پہنچا

کیا کیجیے خالی ہے اگر سیپ کا دامن
دریا بھی تو مجھ خاک بسر تک نہیں پہنچا

پھولوں کے الگ رنگ تھے خوشبو بھی الگ تھی
لیکن کوئی شمشیر و سپر تک نہیں پہنچا

کافی ہیں مظفر کے لیے ہاتھ کے چھالے
گلدستہ کوئی دستِ ہنر تک نہیں پہنچا

○

خون کے داغ آستینوں پر
اور تمغے انھیں کے سینوں پر

ایک ذرے نے لی تھی انگڑائی
آسماں آ پڑے زمینوں پر

ہم ستارے بنا کے نادم ہیں
آپ نازاں ہیں آبگینوں پر

ہے کہیں گرباد یا گرداب
دھول اڑنے لگی سفینوں پر

وہ تو انگارے سے دہکتے ہیں
دل دہکتا ہے جن حسینوں پر

عشق کرنا کوئی ضروری ہے
شعر کہہ لیں گے نازنینوں پر

اے مظفر سنی غزل تیری
نور سا آگیا جبینوں پر

○

وہ مشغلۂ دیدۂ تر ختم ہوا ہے
یوں ہے کہ خزانے میں گہر ختم ہوا ہے

بیٹھیں گے اگر نقشِ قدم خاک اڑے گی
مرنے پہ کہاں میرا سفر ختم ہوا ہے

کچھ دیر تو نیزے پہ اچھالو نہ سروں کو
بستی میں ابھی رقصِ شرر ختم ہوا ہے

تھمتا ہی نہیں ٹوٹتے تاروں کا تسلسل
لگتا ہے کوئی خاک بسر ختم ہوا ہے

شہکار کی تکمیل پہ کاٹے گئے بازو
کیسا مرے ہاتھوں پہ ہنر ختم ہوا ہے

بس یہ ہے کہ چہکار سنائی نہیں دیتی
عنقا ہیں پرندے نہ شجر ختم ہوا ہے

آنکھوں پہ گھڑی باندھ کے سو جاؤ مظفر
کب معرکۂ شام و سحر ختم ہوا ہے

○

سفر کیسا کہ باہم برسرِ پیکار ہیں سارے — ہمارے کارواں میں کارواں سالار ہیں سارے
مظفر، آپ کے احباب خوش گفتار ہیں سارے — وہاں دشمن کی صف میں سربسر تلوار ہیں سارے
اگر فنکار عام انسان سے دامن بچاتے ہیں — تو پھر فنکار کیا ہیں وہ، بڑے عیار ہیں سارے
کسی کے پیار کو برداشت کوئی بھی نہیں کرتا — کسی سے پیار کرنے کے لیے تیار ہیں سارے
سبھی نے اپنے چہروں پر اگا رکھی تھی شادابی — نتیجہ یہ کہ اپنی جان سے بیزار ہیں سارے
کسی نکتے پہ سوچو دیر تک، مغموم کر دے گا — کہیں بچوں کو دیکھو پیار سے، اشعار ہیں سارے

عجب گلشن ہے جس میں پھول کھلنے سے لرزتے ہیں
پرندے چہچہاتے ہیں مگر بیمار ہیں سارے

رُوحی کنجاہی

○

تُو نے احسانوں کی حد ہی کر دی — مار ڈالے گی تری ہمدردی
آسماں مجھ پہ گرا جاتا ہے — تو نے کیسی مری حالت کر دی
پھر نہ نظروں میں جچا کوئی لباس — جب سے پہنی ترے غم کی وردی
میں اگر تجھ کو بھلا بھی دُوں تو — یاد آئے گی تری بے دردی
کس جہنّم میں پھُنکا جاتا ہوں — مجھ میں اک آگ سی کس نے بھر دی
دیکھ کر شہر کی سڑکیں اکثر — یاد آئی مجھے صحرا گردی
کچھ بھی برداشت نہیں ہو پاتا — کیسی گرمی ہے یہ کیسی سردی؟
عرصۂ زیست میں رُوحی صاحب
کام آئے گی فقط پامردی

○

سچ کا اظہار بھی ضروری ہے — دِل سے اقرار بھی ضروری ہے
بعض باتوں سے برسرِ محفل — صاف انکار بھی ضروری ہے
محض دستار کچھ نہیں یعنی — سرِ خود دار بھی ضروری ہے
زندہ رہنا ہی تو نہیں کافی — کوئی معیار بھی ضروری ہے
زندگانی گزارنے کے لیئے — کوئی آزار بھی ضروری ہے
پھُول کی خوشنمائی اپنی جگہ — اس کی مہکار بھی ضروری ہے
کشتیٔ زیست کی روانی کو — غم کا منجدھار بھی ضروری ہے
کھیل میں جیت ہی نہیں سب کچھ — کھیل میں ہار بھی ضروری ہے
برتری گُل کی مانتا ہوں مگر — باغ میں خار بھی ضروری ہے
تُو نمایاں سہی کہانی میں — میرا کردار بھی ضروری ہے
ہو محبت کسی سے تو رُوحی
اس کا اظہار بھی ضروری ہے

○

ابھی کچھ اور یخ بستہ سیاہی کو پگھلنے دو
اُبھر آئے گا ہر منظر ذرا سورج نکلنے دو
حقیقت تو یہی ہے سب سہارے جان لیوا ہیں
کرم ہو گا ہمیں گر اپنے ہی پیروں پہ چلنے دو
دیئے گُل ہو چکے کیا کیا ہوا ہوش میں آؤ
اندھیروں کی ہے فرمائش چراغ ایک آدھ جلنے دو
ہمیں اپنی نگاہوں سے بھی اوجھل کر کے چھوڑیں گی
ہماری خواہشوں کے تم ذرا پَر تو نکلنے دو
تمہاری تیز رفتاری مُبارک ہو تمہیں لیکن
ہمارا رستہ مت روکو ہمیں پیدل تو چلنے دو
ابھی چہروں کے خد و خال روشن ہو نہیں پائے
ابھی سینوں کے اندر اور بھی کچھ دیپ جلنے دو
ہوا اور روشنی کی راہ کب رکنے سے رُکتی ہے؟
رکاوٹ مت بنو رُوحی ہوا کا رخ بدلنے دو

○

خواب کیا کیا دیکھتا رہتا ہوں میں — کیا بنے گا سوچتا رہتا ہوں میں
سامنے جو کچھ ہے اس کو چھوڑ کر — دوسرا رُخ دیکھتا رہتا ہوں میں
گھر سے باہر کھو کے اپنے آپ کو — گھر کے اندر ڈھونڈتا رہتا ہوں میں
وقت اچھا آئیگا، کہہ کہہ کے روز — خواہشوں کو ٹالتا رہتا ہوں میں
پاؤں انگاروں پہ ہیں، سر برف میں — کس مزے سے ناچتا رہتا ہوں میں
گفتگو تک نوبت آتی ہی نہیں — صرف چہرے دیکھتا رہتا ہوں میں
کیسا دریا ہے نگاہوں میں نہ پوچھ — کاغذی پُل باندھتا رہتا ہوں میں
خودکشی بہتر ہے یا قتلِ انا — خود سے اکثر پوچھتا رہتا ہوں میں
تیری باتیں بھی بجا رُوحی مگر
اور ہی کچھ سوچتا رہتا ہوں میں

ناصر زیدی

○

آنکھوں میں چُبھ رہی ہے گزرتی رُتوں کی دُھوپ
جلوہ دکھانے اب تو نئے موسموں کی دھوپ

شامِ فراق گزرے تو سُورج طلوع ہو!
دل چاہتا ہے پھر سے وہی قربتوں کی دھوپ

اس میں تمازتیں بھی سہی، شدّتیں تو ہیں،
اُلفت کی چھاؤں سے ہے بھلی نفرتوں کی دھوپ

میں اُس کے واسطے ہوں بہاروں کی چاندنی
اُس کا وجود میرے لیئے سردیوں کی دھوپ

محرومیٔ وصال ہے ناصرؔ، مجھے قبول!
اُس پر مگر پڑے نہ کبھی گردشوں کی دھوپ

○

عمر جس طرح ترے غم میں گزاری، گزرے
اب مرے پاس سے کیوں بادِ بہاری گزرے

وہ بھی دن تھے کہ مُلاقات رہا کرتی تھی
ہائے یہ دن کہ تصور سے بھی عاری گزرے

اب تو اُمید بھی یُوں آتی ہے شہرِ دل میں
جس طرح فاقہ زدہ کوئی بھکاری گزرے

تھا ترا قُرب میسّر تو خزاں بھی تھی بہار
اب مگر سایۂ گُل بھی مجھے بھاری گزرے

سینۂ موج سے لپٹا ہُوا عکسِ مہتاب
رقص کرتی ہوئی جیسے کوئی ناری گزرے

صرف مجھ کو ہی نہیں، شکوۂ احباب یہاں
اگلے وقتوں میں بھی عیسیٰؑ کے حواری گزرے

جس حسیں شخص کی خاطر یہ کہی ہے ناصرؔ!
اُس کی نظروں سے غزل کاش ہماری گزرے

○

وہ ایک شخص کہ جس سے شکایتیں تھیں بہت
وہی عزیز، اُسی سے محبتیں تھیں بہت

وہ جب مِلا تو دلوں میں کوئی طلب ہی نہ تھی
بچھڑ گیا تو ہماری ضرورتیں تھیں بہت

ہر ایک موڑ پہ ہم ٹوٹتے بکھرتے رہے
ہماری رُوح میں پنہاں قیامتیں تھیں بہت

پہنچ گئے سرِ منزل تری تمنا میں،
اگرچہ راہ کٹھن تھی صعوبتیں تھیں بہت

وہ یُوں مِلا ہے کہ جیسے کبھی مِلا ہی نہ تھا
ہماری ذات پہ جس کی عنایتیں تھیں بہت

ہمیں خود اپنے ہی یاروں نے کر دیا رُسوا
کہ بات کچھ بھی نہ تھی اور وضاحتیں تھیں بہت

ہمارے بعد ہُوا اُس گلی میں سناٹا،
ہمارے دم سے ہی ناصرؔ حکایتیں تھیں بہت

○

بجھی ہے آگ مگر اس قدر زیادہ نہیں
دوبارہ مِلنے کا امکان ہے اِرادہ نہیں

کیا ہے وقت نے یُوں تار تار پیراہن
برہنگی کے سِوا جسم پر لبادہ نہیں

ترا خیال ہے، تنہائیاں ہیں اور مَیں ہُوں
مِرے نصیب میں اب وصل کا اِعادہ نہیں

مِلا بھی وہ تو کہاں اُس کا نام لکھیں گے؟
کتابِ زیست کا کوئی ورق بھی سادہ نہیں

نہ ذات میں کوئی منزل نہ کائنات میں ہے
سفر کروں تو کہاں میرا کوئی جادہ نہیں

ہوا کے ساتھ ہی شاید بدل گئی دُنیا
کہ جام جام نہیں اور بادہ بادہ نہیں

خُود اپنے سائے ہی میں بیٹھنا پڑا ناصِر!
کوئی شجر مرے رستے میں اِستادہ نہیں

○

بہت حسَیں ہیں فلک پر ترے نظارے تو
اُتار! کچھ مری پلکوں پہ بھی ستارے تو

میں سنگِ رہ نہ سہی لمحۂ رواں بھی نہیں
وہ ایک بار درِ یاد سے پکارے تو

مرے کلام میں جادُو، مری نظر میں فسُوں
جگاؤں خود کو، اُدھر سے بھی ہوں اِشارے تو

نفس نفس سے جو رہ رہ کے لو نکلتی ہے
جلا کے خاک کریں گے یہی شرارے تو

سحر کی روشنی لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے ہم
سیاہ پڑ گئے تقدیر کے ستارے تو

ہے کون دِل کے دریچوں میں جھانکنے والا
ہمارے ساتھ کوئی چار دِن گزارے تو

حسَیں سہاروں کو تم ڈھونڈتے ہو پھر ناصِر!
فریب دیتے رہے ہیں یہی سہارے تو

○

بے تابیوں سے کب ہے فراغ انتظار میں
ہے مثلِ دودِ شمع دماغ انتظار میں

اپنا پتہ نہ منزلِ جاناں کی کچھ خبر
ملتا نہیں کسی کا سُراغ انتظار میں

ہیں کب سے راہِ شوق میں آنکھیں بچھی ہوئی
لوٹے اُنھیں نہ دِل کے یہ داغ انتظار میں

آکر دیا نہ اُس نے پیامِ سحر مجھے
بجھ بجھ گئے ہیں شب کے چراغ انتظار میں

وہ لے گئے ہیں ساتھ زمانے کی رونقیں
گُل انتظار میں ہے نہ باغ انتظار میں

دن بھر مری نگاہ میں تاریکیاں رہیں
شب آئی رکھ کے سر پہ چراغ انتظار میں

ناصِر! شبِ فراق کٹی بھی تو کس طرح
چھلکے ہیں آنسوؤں کے ایاغ انتظار میں

امجد اسلام امجد

○

ویرانۂ وجود میں چلنا پڑا ہمیں
اپنے لہو کی آگ میں جلنا پڑا ہمیں

منزل بہت ہی دور تھی رستے تھے اجنبی
تاروں کے ساتھ ساتھ نکلنا پڑا ہمیں

سایہ مثال آئے تھے اس کی گلی میں ہم
ڈھلنے لگی جو شام تو ڈھلنا پڑا ہمیں

اپنے کہے سے وہ جو ہوا منحرف تو پھر
اپنا لکھا ہوا بھی بدلنا پڑا ہمیں

محراب جاں کی شمعیں بچانے کے واسطے
ہر رات کنج غم میں پگھلنا پڑا ہمیں

ہم چڑھتے سورجوں کو سلامی نہ دے سکے
سو دوپہر کی دھوپ میں جلنا پڑا ہمیں

تھا ابتدا سے علم کہ ہے راستہ غلط
اور قافلے کے ساتھ بھی چلنا پڑا ہمیں

شانے پہ اس ادا سے رکھا پھر کسی نے ہاتھ
دل مانتا نہ تھا پہ بہلنا پڑا ہمیں

امجد کسی طرف بھی سہارا نہ تھا کوئی
جب بھی گرے تو خود ہی سنبھلنا پڑا ہمیں

○

بے وفائی کی مشکلیں !

جو تم نے ٹھان ہی لی ہے
ہمارے دل سے نکلو گے !
تو اتنا جان لو پیارے
ہزاروں خواب جو اِن پتھروں میں سانس لیتے ہیں
دھواں بن کر زمین و آسماں پر پھیل جائیں گے !
وفا کی رہگذر پر کرچیاں سی چھوڑ جائیں گے،
سمندر، سامنے ہو گا
اگر ساحل سے نکلو گے !
ستارے، جن کی آنکھوں نے ہمیں اک ساتھ دیکھا تھا
گواہی دینے آئیں گے !
پرانے کاغذوں کی بالکونی سے بہت سے لفظ جھانکیں گے
تمہیں واپس بلائیں گے !
کئی وعدے، فسادی قرض خواہوں کی طرح رستے میں روکیں گے
تمہیں دامن سے پکڑیں گے، تمہاری جان کھائیں گے !
چھپا کر کس طرح چہرا
بھری محفل سے نکلو گے ؟
ذرا کچھ سوچ لو جاناں،
نکل تو جاؤ گے، شائد !
مگر مشکل سے نکلو گے !

بیت المقدس کی ایک شام

بہت سال گزرے
اسی شہرِ اقدس میں اک شام ایسی بھی روشن ہوئی تھی
کہ جس کے جلو میں ستاروں کا اک کارواں بھی رواں تھا
اور اس کا سفر
آنے والی کئی چاند آباد صدیوں پہ سایہ کناں تھا

پھر ایسا ہوا،
روشنی کم ہوئی اور آہستہ آہستہ
ظلمت کی چادر نے اس شہرِ اقدس پہ پردہ کیا،
اور آنکھوں کے سب طاق ویراں ہوئے
جن چراغوں کی لَو سے ہَوا بدگماں تھی
خود اپنے لئے مرگ ساماں ہوئے
اور بجھتے ہوئے آنسوؤں کی نمی نذرِ جاں کر گئے
اور چاروں طرف اک دھواں کر گئے۔
وہ دیوارِ گریہ
جو ظلمت فروشوں کا نقشِ فغاں تھی
ہمارے الم کا نشاں بن گئی،
بے بسی اور ہزیمت ہمارے سفر کی زباں بن گئی
وہ حزیران کا موسمِ بے نمو
عزم کی کھیتیاں ساتھ لیتا گیا
ایک سیلِ بلا، کتنی ہی بستیاں ساتھ لیتا گیا،

میں اُس شہرِ اقدس کے باہر کھڑا ہوں۔
کہ جس کی فصیلوں میں میرے لہو کے دیئے جل رہے ہیں
ہوا تیز چلنے لگی ہے،
سپاہی نے دروازے پر قفل ڈالا ہے
بندوق لہرا کے مجھ سے کہا ہے۔
"چلو شام ہونے لگی ہے چلو، اپنی بستی میں جاؤ
کہ یہ شہرِ اقدس تمہارے لئے
شہرِ ممنوع ہے۔"
اور میں سوچتا ہوں
درِ شہرِ اقدس کے باہر کھڑا، میں یہی سوچتا ہوں!
کہاں تک یہ ذلت کی اور غم کی آتش
مرے دل ہی دل میں سلگتی رہے گی!
گھنی شام کی یہ گھنیری اُداسی
کہاں تک مرے ساتھ چلتی رہے گی؟
کہاں تک مرے ساتھ چلتی رہے گی؟

چاند مری کھڑکی میں آئے

چاند کبھی تو تاروں کی اس بھیڑ سے نکلے۔
اور مری کھڑکی میں آئے
بالکل تنہا اور اکیلا!!!
میں اُس کو باہوں میں بھر لوں
ایک ہی سانس میں سب کی سب
وہ باتیں کر لوں،
جو میرے تالو سے چمٹی، دل میں سمٹی رہتی ہیں،
سب کچھ ایسے ہی ہو جائے، جب ہے نا!
چاند مری کھڑکی میں آئے، تب ہے نا!

امجد اسلام امجد

جانِ جاں کیا کریں — !

جانِ جاں کیا کریں !
جو مہ و سال گزرے ہیں اُن کو نہ گزرے ہوئے فرض کریں ؟
سمجھ لیں کہ موسم ابھی اپنے ہاتھوں سے نکلے نہیں۔
راستے، سُرخ پھولوں سے مہکے ہوئے ہیں۔
ہوا ، ساحلوں پر ہماری امانت سنبھالے ہوئے چل
دہی ہے ، ستارے
ہمیں دیکھ کر مسکراتے ہیں
ہونٹوں پہ کھِلتے ہیں، آنکھوں میں سجتے ہیں
سانسوں میں چلتے ہوئے جگمگاتے ہیں، یہ فرض کریں،
یہ فرض کریں
کہ لفظوں کے معنی ابھی تک وہی ہیں۔
تمنا کے انداز بدلے نہیں
جو شب و روز گذرے ہیں،
گذرے نہیں —!!

(۲)

کیا کریں جانِ جاں !
جو عبارت ہواؤں پہ تحریر ہے — فرض کیسے کریں ؟
یہ جو لمحوں کی اُلجھی سی زنجیر ہے — اِس سے کیسے بچیں ؟
جو بھی کچھ ہو چکا
ہو چکا جانِ جاں
جو شب و روز تیری مری زندگی کے کناروں کو چھُوتے ہوئے جاچکے
اُن کو ڈھونڈیں کہاں اور چھپائیں کہاں !
کیا کریں جانِ جاں !
نارسائی کے صحرا میں جو کٹ گئے
وقت کی لوح پر
اُن مہ و سال کا
ثانیہ ثانیہ ماجرا درج ہے۔
گرد بادِ زماں کے خم و پیچ سے
راستہ کوئی باہر کو جاتا نہیں،
خواہشوں کے بچھائے ہوئے جال میں
خواہشوں کے سوا کچھ بھی آتا نہیں،
جانِ جاں کیا کریں !
کیا کریں جانِ جاں !

پروین شاکر

ہوا جامِ صحت تجویز کرتی ہے

مجھے معلوم تھا
یہ دِن بھی دُکھ کی کوکھ سے پُھوٹا ہے
میری ماتمی چادر
نہیں تبدیل ہو گی آج کے دِن بھی
جو راکھ اُڑتی تھی خوابوں کی، بدن میں
یوں ہی آشفتہ رہے گی
اور اُداسی کی یہی صورت رہے گی
میں اپنے سوگ میں ماتم کناں
پھر سر بہ زانو، رات تک بیٹھی رہوں گی
اور مرے خوابوں کا پُرسہ آج بھی کوئی نہیں دے گا!
مگر یہ کون ہے
جو یوں مجھے باہر بلاتا ہے
بڑی نرمی سے کہتا ہے
کہ اپنے حجرۂ غم سے نکل کر باغ میں آؤ
ذرا باہر تو دیکھو!
دور تک سبزہ بچھا ہے
اور ہری شاخوں پہ نارنجی شگوفے مُسکراتے ہیں
ملایم سبز پتوں پر پڑی شبنم
سنہری دھوپ میں ہیرے کی صورت جگمگاتی ہے
درختوں میں چھپی ندی
بہت دھیمے سُروں میں گنگناتی ہے
چمکتے زرد پھولوں سے سجی، ننھی پہاڑی کے عقب میں
نقرئی چشمہ خوشی سے کھلکھلاتا ہے۔
پرندِ خوش گلو
شاخِ شگفتہ پر چہکتا ہے۔
گھنے جنگل میں بارش کا غبارِ سبز
سطحِ شیشۂ دِل پر
ملایم اُنگلیوں سے
مرحبا کے لفظ لکھتا ہے
کوئی آتا ہے
آ کر چادرِ غم کو، بڑی آہستگی سے
میرے شانوں سے ہٹا کر
سات رنگوں کا دوپٹہ کھول کر مجھ کو اُڑھاتا ہے۔
میں کُھل کر سانس لیتی ہوں
مرے اندر
کوئی پیروں میں گھنگھرو باندھتا ہے
رقص کا آغاز کرتا ہے
مرے کانوں کے آویزوں کو یہ کس نے چھُوا
جس سے کویں پھر سے گلابی ہو گئی ہیں
نرم بارش کی ہنسی
سرگوشیوں میں پھر سے میرا نام لیتی ہے
فضا کی نغمگی آواز دیتی ہے
ہوا جامِ صحت تجویز کرتی ہے!

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

○

کرب کا سماں ہے میرے نام　　جیسے اک جہاں ہے میرے نام
تنکے تنکے آندھیوں کا ذکر　　کوئی آشیاں ہے میرے نام
چیختی مشینیں تیرے پاس　　شہر کا دھواں ہے میرے نام
ہر ورق پہ زخم کی تحریر　　ساری داستاں ہے میرے نام
روشنی کا لفظ تیرے پاس
درد کا بیاں ہے میرے نام

(فاعلان فاعلن مفعول)

○

ہم سفر تھے اہلِ کرم بہت
خوگرِ ذوقِ رنج و غم بہت

مجھکو اپنے جذبوں پہ تھا یقین
راستے میں تھے پیچ و خم بہت

حوصلوں میں ذوقِ نظر بھی رکھ
راہ میں ہیں اہلِ ستم بہت

سانحوں کا ہر سمت در کھلا
حادثوں سے کھیلے ہیں ہم بہت

شوخیاں عاشق موسموں میں تھیں
روئی اپنے گھر چشمِ نم بہت

(فاعلن مفعولات فاعلن)

○

غموں کا ذکر الم کی داستاں نہ کہو
اندھیری رات کے لمس کا بیاں نہ کہو

بکھیر جائیگا ہوا کا اک جھونکا
دھواں سحر کا ہے اسے خزاں نہ کہو

ہر ایک آنچ مری ہے زندگی لیکن
گھٹن کو میرے فن کی داستاں نہ کہو

زباں کو بخش رہے ہو ذائقہ لیکن
لہو لہو ہے لہو کی تلخیاں نہ کہو

پرندہ کوئی اب وہاں نہیں عاشق
سجے ہوئے تنکوں کو آشیاں نہ کہو

(مفاعلن فعلن مفاعلن فعلن)

○

شاخِ غم پر الجھی سی ہر تمنّا معلوم　　ٹوٹے لمحوں کے شہر کا تماشا معلوم
ہو گئی گرد سی پھر تیرے حرم کی دیوار　　تو فقط آواز میں ترا سراپا معلوم
کیا خبر کیا ہوگا مرے سفر کا انجام　　کچھ پتہ منزل کا ہے اور نہ جادہ معلوم
بٹ گئی ٹوٹی ہوئی فکر میں ہر سوغات　　پت جھڑوں کے موسم کا ہے نظارہ معلوم
سوگ شہروں سے اب کے لے گیا ہے سیلاب
اب کہاں جائیگی یہ موجِ دریا معلوم

(فاعلن مفعولات فاعلن مفعولات)

سید امداد ہمدانی

○

تجھے دُنیا میں تنہا اے ستمگر چھوڑ جائینگے
تیری آنکھوں کے صحرا میں سمندر چھوڑ جائینگے

فصیلِ شب کو توڑینگے جو سچائی کے میداں میں
جہاں میں ہم وہ آوازوں کے لشکر چھوڑ جائینگے

کبھی تو بھی غموں کی فائلوں میں ہم کو ڈھونڈے گا
تیری سوچوں میں ہم یادوں کے دفتر چھوڑ جائینگے

مصوّر آئیں گے اور میرے دیوار و درِ شب پر
اجالوں کے کئی شاہکار پیکر چھوڑ جائینگے

گرا کر شہر میں امداد سب نفرت کی دیواریں
ہر اک گھر میں محبت کے کھُلے دَر چھوڑ جائینگے

○

ذرّوں کو آفتاب سے جلتے ہُوئے بھی دیکھ
امداد اپنی آنکھ سے یہ معجزے بھی دیکھ

خیمے صداقتوں کے جو کربل میں نصب تھے
وہ کوفیوں کے ہاتھ سے جلتے ہوئے بھی دیکھ

سینہ سپر رہا ہوں میں تیروں کے سامنے
اے دشمنِ حیات میرے حوصلے بھی دیکھ

سُورج کی آگ سر پہ تھی صحرا تپا ہوا
پھر طے کیے جو ہجر نے وہ فاصلے بھی دیکھ

کس نے کہا تھا فن پہ میرے قدغنیں لگا
نغمے میرے فضاؤں میں اب گونجتے بھی دیکھ

کی راکھ جس نے حسن و محبت کی بستیاں
اب نفرتوں کی آگ میں جلتا اُسے بھی دیکھ

ہر سچ کی راہ میں اُلجھتا نِکل گیا
آئے ہیں میرے کام میرے تجربے بھی دیکھ

اکبر کاظمی

○

وہ سماں جیسے ہو انداز ہوا کا کوئی
ہائے وہ جسم کہ جلوہ تھا خدا کا کوئی

دل کے بازار میں رونق تو بہت ہوتی ہے
گاہک آتا نہیں پر جنس وفا کا کوئی

رات وہ شہر تصور میں کچھ لیسے آیا
جس طرح روپ ہو بے وجہ قضا کا کوئی

زیست ہے جیسے کوئی تیز ہوا کا جھونکا
آدمی ہے کہ دیا حسن فنا کا کوئی

آج شعروں میں سنا کاظمی افسانۂ زیست
لوگ کہتے ہیں تو شاعر ہے بلا کا کوئی

○

شاخ پر جب گلاب دیکھا ہے
جاگتے میں بھی خواب دیکھا ہے

رنگ ہے وہ مرے ستارے کا
تو نے جو آفتاب دیکھا ہے

اے صبا یہ بتا گلستاں میں
کوئی خانہ خراب دیکھا ہے

خیر و خوبی کے آستانوں کو
میں نے زیرِ عتاب دیکھا ہے

میں نے اک ماہ رو کی آنکھوں میں
ڈوبتا ماہتاب دیکھا ہے

تتلیاں کچھ ہواؤں کی زد میں
ہو رہی تھیں خراب دیکھا ہے

کتنی چاہت سے خط لکھا تھا اسے
کیا ملا ہے جواب دیکھا ہے

تو نے سچائی کے بطن سے کبھی
خوں اگلتا عذاب دیکھا ہے

کہہ رہا تھا یہ لمحہ موجود
آپ نے کیسا خواب دیکھا ہے

دور تک روشنی کے سائے میں
ڈگمگاتا شہاب دیکھا ہے

جس کی خوشبو ہے تجھ میں تو نے اسے
اے شبِ ماہتاب دیکھا ہے

میں نے اس حسنِ دلفریب میں بھی
رنگ دیتا سراب دیکھا ہے

آج اس گلبدن کی آنکھوں میں
شعلۂ نو شباب دیکھا ہے

کاظمی میں نے روئے شبنم پر
جلوۂ حسن آب دیکھا ہے

○

قفس ترا ہے چمن تیرا آشیاں تیرا
بہر مقام گزرتا رہا گماں تیرا

مجھے ملی ہے فقط زخمِ زیست کی مہلت
زمانہ تیرا زمیں تیری آسماں تیرا

مرے نصیب میں ہے شوقِ دید کی تہمت
نجوم و ماہ ترے حسن کہکشاں تیرا

خیال و فکر کی پہنائیاں مرا حصہ
ہر ایک چاند کے چہرے پہ ہے نشاں تیرا

جو ہو سکے تو میں اپنی جبیں کو سجدہ کروں
یہ مجھکو یاد دلاتی ہے آستاں تیرا

تری ہی زلف کے سائے میں ہے بہارِ سکوں
ہر اک بہار کا منظر ہے ترجماں تیرا

وہ تیری آنکھ کی مستی وہ عارضوں کی دمک
وہ تیرے پھول سے لب دلنشیں بیاں تیرا

زمیں سے تا بفلک رقص میرے دم سے
زمیں سے تا بفلک نام جاوداں تیرا

وہ ایک لمحہ ترے قرب کا جو حاصل ہو
اُس ایک لمحے پہ قربان سب جہاں تیرا

جنوں نوازِ غمِ زیست کی قسم ہے مجھے
خدا کرے دل سے نکلتا ہوا دھواں تیرا

ہے کاظمی تو فقط تیرا نغمہ خواں ورنہ
یہ دِل کا آئینہ تیرا ہے شہر جاں تیرا

○

ہر طرف رونقیں تھیں میلہ تھا　　میں ترے شہر میں اکیلا تھا
میری سانسوں میں خوشبوؤں کا ہجوم　　آرزوؤں کا اِک جھمیلا تھا
لوگ اک دُوسرے کو دیکھتے تھے　　کھیل ایسا کسی نے کھیلا تھا
کرلیا رام اس کو باتوں میں　　پاس پیسہ نہ کوئی دھیلا تھا
رنج و غم کے سُلگتے صحرا میں　　خواہشوں نے مجھے دھکیلا تھا
کاظمی کھو گیا تھا گلیوں میں
کوئی جنگل نہ کوئی بیلا تھا

موسمِ بہاری ایک شام

یہ سر سبز کھیت اور پیڑوں کا سایا
سماں شام ہے شفق ہے درخشاں
مشیت کی رنگینیاں ہیں فروزاں
حزماں حزماں پریشاں پریشاں
نہ جانے مجھے یاد پھر کون آیا
یہ صحنِ گلستاں میں ٹھنڈی ہوائیں
پپیہا کی پی کوئلوں کی صدائیں
بہاریں بہاریں ادائیں ادائیں
مجھے اک حسین آرزو نے ستایا
جو کھائی ہیں چوٹیں وہ کِس کو دکھائیں
کوئی راز داں ہو تو قصہ سنائیں
ہوئی جاتی ہیں محوِ حیرت دُعائیں
زمانے کی مجبوریوں نے ستایا
بہر طور فطرت میں رنگینیاں ہیں
مگر اس میں پوشیدہ کچھ بجلیاں ہیں
وہی اک سے واقف ہیں جو رازداں ہیں
یہ نغمہ کہیں دُور بُلبل نے گایا

"کروٹ"

تیری داری میں قدم رکھتے ہی
عہد گزرا ہوا یاد آنے لگا

روشنی بن کے سراپا تیرا
شہر احساس میں لہرانے لگا

پھر تصور میں ہوا ہے بیتاب
وہ تری مست نگاہوں کا جمال

جیسے بیدار اُمنگوں کی تپش
جیسے ناکردہ گناہوں کا ملال

دِل تو کافر ہے بہک جاتا ہے
میں نے کب پیار کیا تھا تجھ سے

آج پھر یاد تری آنے لگی
جانے کیا جرم ہوا تھا مجھ سے

یہ نہ معلوم تھا مجھ کو دِل پر
زخم اک اور بھی کھانا ہوگا

ہو کے حالات کے ہاتھوں مجبور
پھر ترے شہر میں آنا ہوگا

جو مری عقل کو اندھا کر دے
اب تو اس شہر میں وہ دھوپ نہیں

اب ہوں میں باپ کئی بچوں کا
میرا وہ رنگ نہیں روپ نہیں

"تنہائی میں"

یاد آتا ہے سبھی کچھ مجھے تنہائی میں
نور ہی نور تھا اس وقت کی رعنائی میں
فطرتِ عشق تھی مصروف مسیحائی میں
لرزہ پیدا تھا نگاہوں کی شکیبائی میں
رقص فرما تھے وہ عالم تری انگڑائی میں
یاد آتا ہے سبھی کچھ مجھے تنہائی میں
وہ شبِ ماہ وہ پُرکیف سی برسات کے دن
اور وہ پیار سے بھرپور ملاقات کے دن
حسن اور عشق کی نیرنگیٔ جذبات کے دن
آپ کی چشمِ کرم میری مدارات کے دن
یاد آتا ہے سبھی کچھ مجھے تنہائی میں
وہ تری آنکھ وہ پیمانِ محبت کی سبیل
وہ ترا فتنۂ قامت کہ قیامت کی دلیل
وہ تری زلف کہ جادۂ پُر لطف طویل
وہ تری چاند سی صورت وہ ترا رُخِ جمیل
یاد آتا ہے سبھی کچھ مجھے تنہائی میں
طور و سینا کی قسم جلوۂ جاناں کی قسم
چشمِ موسیٰ کی قسم یوسفِ کنعاں کی قسم
مست آنکھوں کی قسم عارضِ تاباں کی قسم
ماہ و انجم کی قسم مہرِ درخشاں کی قسم
یاد آتا ہے سبھی کچھ مجھے تنہائی میں

وہ نقابِ رُخِ رنگیں کو اٹھانا تیرا
یاد ہے پہلے پہل باغ میں آنا تیرا
مست آنکھوں سے مئے ناب پلانا تیرا
بجلیاں شاخِ نشیمن پہ گرانا تیرا
یاد آتا ہے سبھی کچھ مجھے تنہائی میں
یاد ہیں اب بھی محبت کے وہ انداز مجھے
تو نے جب دل سے بنا رکھا تھا ہمراز مجھے
راگ خوشیوں کے سناتا تھا ہر اک ساز مجھے
اپنے اندازِ جوانی پہ تھا جب ناز مجھے
یاد آتا ہے سبھی کچھ مجھے تنہائی میں
تری تصویر تصور میں جب آ جائے گی
اشکِ خوں اور مری آنکھ سے رلوائے گی
قلبِ مضطر کو مرے اور بھی تڑپائے گی
کیا خبر تھی کہ مری جان پہ بن جائے گی
یاد آتا ہے سبھی کچھ مجھے تنہائی میں
میں تجھے چاند میں ڈھونڈوں کہ ستاروں میں بتا
یا کسی باغ کی رنگین بہاروں میں بتا!
یا غمِ زیست کے بکھرے ہوئے پاروں میں بتا
یا مشیت کے جواں رنگ نظاروں میں بتا
یاد آتا ہے سبھی کچھ مجھے تنہائی میں

اسعد بدایونی

○

نام و نسب، نہ خود نہ سر دیکھا جائے گا
تیغوں کے معرکے میں ہنر دیکھا جائے گا

جب جب ہوائے شام کے کام آئیں گے چراغ
شدّت سے انتظارِ سحر دیکھا جائے گا

سب چل رہے ہیں اپنے تعاقب میں رات دن
مجھ سے نہ یہ عذابِ سفر دیکھا جائے گا

پہلے یہ آگ راکھ بنے گی اور اس کے بعد
اِس راکھ میں بھی کوئی شرر دیکھا جائے گا

دل بستگی کی شاخ پہ دو چار پھول ہیں
یہ بھی نہیں رہے تو کدھر دیکھا جائے گا

○

میرا دشمن تری محفل میں نمایاں ہے تو کیا
ایک چنگاری ذرا دیر کو رقصاں ہے تو کیا

اُس کے ملنے پہ نہ تھا دارومدارِ دُنیا
اَب اگر اس کے بچھڑ جانے کا امکان ہے تو کیا

عرصۂ موج سے چھوٹی تو نہیں ہے کشتی
دل سمندر میں کسی یاد کا طوفاں ہے تو کیا

گرتا پڑتا ترے کوچے میں پہنچ جاؤں گا
راہ مشکل ہے تو کیا اور اگر آساں ہے تو کیا

میں بھی خُوں اپنا اُچھالوں گا فضا میں اک دن
شہر کا شہر اسی رنگ میں غلطاں ہے تو کیا

لوگ تو ذات کے زنداں کی اسیری میں ہیں
میں یہاں خوش ہوں تو کیا تُو جو پریشاں ہے تو کیا

○

شاخ سے، پھول سے، کیا اس کا پتہ پوچھتی ہے
یا پھر اِس دشت میں کچھ اور ہوا پوچھتی ہے

میں تو زخموں کو خدا سے بھی چھپانا چاہوں
کس لیے حال مرا خلقِ خدا پوچھتی ہے

چشمِ اِنکار میں اقرار بھی ہو سکتا تھا
چھیڑنے کو مجھے پھر میری انا پوچھتی ہے

تیز آندھی کو نہ فرصت ہے نہ یہ شوقِ فضول
حال غنچوں کا محبّت سے صبا پوچھتی ہے

کسی صحرا سے گزرتا ہے کوئی ناقہ سوار
اور مزاج اُس کا ہوا سب سے جُدا پوچھتی ہے

○

ہوا کے پاس بس اک تازیانہ ہوتا ہے
اسی سے شہر و شجر کو ڈرانا ہوتا ہے

وہ ساری باتیں میں احباب ہی سے کہتا ہوں
مجھے حریف کو جو کچھ سنانا ہوتا ہے

منافقوں میں شب و روز بھی گزارتا ہوں
اور اُن کی زد سے بھی خود کو بچانا ہوتا ہے

بیاضِ عمر بھری جا رہی ہے لیکن کیوں
نہ کوئی لفظ نہ چہرہ پرانا ہوتا ہے

وہاں بھی مجھ کو خدا سربلند رکھتا ہے
جہاں سروں کو جھکائے زمانہ ہوتا ہے

○

عجیب خوف پسِ جسم و جاں پکارتا ہے
کہ جس طرح سے کوئی مہرباں پکارتا ہے

یہ کیا جگہ ہے جہاں آتے جاتے بادل کو
غبار ہوتے گھروں کا دھواں پکارتا ہے

میں آئینے سے بہت دور ہوں کئی دن سے
یہ کیسا عکس مسلسل وہاں پکارتا ہے

تھکن پرندوں کے لیے جال بنتی جاتی ہے
کہ صید جسم کو صیادِ جاں پکارتا ہے

یہ جانتا ہے کہ واپس نہ جا سکوں گا وہاں
پہ اپنی شاخ کو برگِ خزاں پکارتا ہے

دیارِ حرف کے آفت رسیدہ لوگوں کو
یقین تھکنے لگے تو گماں پکارتا ہے

○

ہوائے صبح سے کہنا چراغِ شام سے کہنا
ملالِ رفتگاں روشن ہے کس کس نام سے کہنا

جو آنسو بھاپ بن کر اڑ گئے اُن کی حکایت کو
کسی دیوار یا در سے نہ کہنا بام سے کہنا

وہ سارے سچ جو ہم نے تم کو بخشے ہیں وراثت میں
جو تم خود سے نہ کہہ پاؤ ہمارے نام سے کہنا

شگوفوں نے پرندوں کی طرح منقاریں کھولی تھیں
مگر شبنم نہ اتری آسماں کے بام سے کہنا

ادھوری داستانیں ہر طرف دنیا میں بکھری ہیں
کسے آغاز سے سننا کسے انجام سے کہنا

○

شامِ ملال کا شریکِ شوقِ وصال ہو گیا
لمحۂ کم عیار بھی شاملِ حال ہو گیا

میں ترے انتظار میں مشتِ غبار تھا مگر
میں ترے اعتبار سے کوہ مثال ہو گیا

میں نے سرائے خواب میں عمرِ عزیز کاٹ دی
میں تو غنی تھا کس لیے مجھ سے کمال ہو گیا

موسمِ گل کا ذکر کیا تارِ نفس چراغِ جاں
کچھ ترے ساتھ کھو گئے کچھ کو زوال ہو گیا

○

دُکھ بہت ہوتے ہیں یادوں کی پذیرائی میں
اب اُسے سوچنا مت موسمِ تنہائی میں

صرف اک بار مناظر پہ نظر ڈالی تھی
سو اُسی دن سے کمی آ گئی بینائی میں

بے ضمیری کی بدولت تر و تازہ ہیں سبھی
ورنہ اک قہر ہے ہر روح کی گہرائی میں

کوئی زنجیر سے خائف کوئی رسوائی کا دوست
بس یہی فرق ہے نادانی و دانائی میں

اکبر حمیدی

○

بچھڑ کر تجھ سے کیا رُل گیا ہوں
گہر تھا پتھروں میں تُل گیا ہوں

بہت گرد و غبارِ آرزو تھا
مگر ان بارشوں میں دُھل گیا ہوں

بہت مشکل ہے اِن حالوں میں جینا
مگر میں زندگی پر تُل گیا ہوں

ہزاروں خواب ہیں جس زندگی کے
اُسی میں مَیں کہیں مِل جُل گیا ہوں

رہوں گا اب سدا اُنکی نظر میں
نظر میں شہد بن کر گھل گیا ہوں

میں کوئی بند دروازہ تھا اکبر
محبت کی نظر سے کھل گیا ہوں

○

خوش نظر، خودنگر بھی رہنا ہے — کچھ اُدھر کچھ اِدھر بھی رہنا ہے
اتنی آگاہیاں نہیں اچھی — کچھ نہ کچھ بےخبر بھی رہنا ہے
ڈرنے سے اِس قدر بھی کیا ڈرنا — زندگی ہے تو ڈر بھی رہنا ہے
خلوتیں بھی سجانی ہیں اپنی — برسرِ رہگذر بھی رہنا ہے
ہم سفر ہونا ہے ہوا کا بھی — ہاں مگر اپنے گھر بھی رہنا ہے
ہم نے اِس شہر کو بسایا تھا — اب ہمیں دربدر بھی رہنا ہے
ایسا بھی بے ضرر نہیں ہونا — کچھ ہمیں کارگر بھی رہنا ہے
کرنا ہے اِس کو رہنے کے لائق — پھر یہاں مختصر بھی رہنا ہے
کبھی سوچا نہ ہو گا مالی نے — پیڑ کو بےثمر بھی رہنا ہے

پاؤں چادر میں رکھنے ہیں اکبر
نامے کی طرح سر بھی رہنا ہے

○

ہوا کا شور تو کچھ تھم رہا ہے — وُہ سردی ہے کہ پانی جم رہا ہے
فضا میں بھی عجب سی بیکلی تھی — مزاج اپنا بھی کچھ برہم رہا ہے
بہت ہی شور تھا بارش کا گھر میں — گلی میں بھی بہت اودھم رہا ہے
ہوا نے ایسی پھیلائی تھی دہشت — چراغِ فکر تک مدھم رہا ہے
لکیروں میں مرے ہاتھوں کی اکثر — تری زلفوں کا پیچ و خم رہا ہے
وہاں کے موسموں کا حال لکھنا — یہاں تو ایک ہی موسم رہا ہے
مَیں اپنا خون کس کے سر لگاؤں — سبھی کے ہاتھ میں پرچم رہا ہے

لہو پانی ہوا ہے جس پہ اکبر
ہمیشہ سے وہ کاغذ نم رہا ہے

○

راستہ مل جائے گا ہمت اگر کرتے رہیں
ٹھہر جانے سے تو بہتر ہے سفر کرتے رہیں

ساری راتیں ہجر کی ہیں سارے دِن ہیں ہجر کے
ایسے حالوں میں تو جیسے ہو بسر کرتے رہیں

میری بھی کوتاہیاں ہیں تیری بھی کوتاہیاں
آؤ ہم اک دوسرے سے درگذر کرتے رہیں

زندگی کرنے کو تھوڑا سا ہُنر بھی چاہیئے
زندہ رہنا ہے تو پھر عرضِ ہنر کرتے رہیں

اُنکی نظروں سے بندھے ہیں جیسے اہلِ انجمن
سب اُدھر تکتے ہیں وہ نظریں جدھر کرتے رہیں

کیوں نہ سینہ کھول دیں زخمِ حوادث کے لئے
یوں کہاں تک نخلِ جاں کو بےثمر کرتے رہیں

وہ بھی آجائیں گے اکبر اور کچھ دِن انتظار
آپ بھی آرائشِ دیوار و در کرتے رہیں

حسن عباس رضا

○

میں اُس کے شہر میں جانے کا سوچتا ہی رہا
یہ مسئلہ تھا انا کا ، سو مسئلہ ہی رہا

بس ایک بار میں اُس کی گلی سے گزرا تھا
پھر ایک عمر وہ کھڑکی سے جھانکتا ہی رہا

جو سدرہ تھے ، وہ سارے درخت کاٹ دیئے
مگر فراق کا موسم ہرا بھرا ہی رہا

شبوں کی نیند کہیں میرے خواب اجاڑ نہ دے
تمام عمر میں اس ڈر سے جاگتا ہی رہا

جو ایک بار ہجومِ طلب میں بچھڑا تھا
اُسے میں یاد کے میلے میں ڈھونڈتا ہی رہا

گھروں میں جتنی بھی دوری تھی ختم ہوتی گئی
دلوں کے بیچ مگر ایک فاصلہ ہی رہا

حسنؔ رضاؔ ، جو لُٹے عین موسمِ گُل میں
دوبارہ اُن کے سنورنے کا مسئلہ ہی رہا

○

رابطوں کے درمیاں سے اک کڑی گم ہو گئی
یوں لگا جیسے اچانک زندگی گم ہو گئی

گھر سے نکلے تو بس اک ماں کی دُعا تھی جیب میں
عمر کے میلے میں پہنچے تو وہی گم ہو گئی

یار کم آمیز کے گھر کا نشاں کیا ڈھونڈتے
ہم سے تو خود اپنے ہی گھر کی گلی گم ہو گئی

صبح کی پہلی کرن میں جگمگاتا تھا جسے
رات کے پچھلے پہر وہ روشنی گم ہو گئی

کون تھا ، کس بات پہ روٹھا ، پتہ کیسے چلے
جس میں یادیں درج تھیں ، وہ ڈائری گم ہو گئی

یوں تو دُنیا کے جھمیلے میں بہت کچھ کھو گیا
دُکھ مگر یہ ہے کہ اُس کی یاد بھی گم ہو گئی

عشق کی خاطر تو یہ آوارگی اپنائی تھی
اور اِس آوارگی میں عاشقی گم ہو گئی

جس میں اپنی خواہشوں کی ناؤ بہتی تھی رضاؔ
دُکھ کے کالے پانیوں میں وہ ندی گم ہو گئی

تحسین فراقی ○

تلاشِ نُور ——— ایک مناجات

(اسپینی شاعر داماسو الونسو کی مناجات کا آزاد منظوم ترجمہ)

میں کہتا ہوں "صورت"
تو وہ اپنے بے لحم ہاتھوں کو
دیتے ہیں جنبش بڑی خامشی سے
وہ پھیلا کے ان کو عجب نرم نرمک سے انداز میں،
ایسے لگتا ہے، جیسے ہوا کا مہین اَور نازک سا آبِ رواں
چھو رہے ہوں
جبلت انھیں ایسا باور کراتی ہے گویا کہ وہ اپنی دانست میں
اپنے انداز میں
یہ سب منظرِ بے نظر دیکھتے ہیں
میں کہتا ہوں "پس منظر" اور دیکھتا ہوں کہ وہ
میز کی سطح ہموار کو تھپتھپاتے ہوئے
بڑھنے لگتے ہیں دیوار اَور در کی جانب
بہت ہولے ہولے
وہ چھوتے ہیں سرد اور بے جان سے سنگ و آہن
—— اَور پھر مسکراتے ہیں
لگتا ہے وہ کچھ نہ کچھ بالیقیں دھیرے دھیرے
سمجھنے لگے ہیں!
مگر فرض کیجیے کہ میں "نور" کا لفظ بولوں
تو وہ کھونے جاتے ہیں۔
یوں اپنے سر ڈال دیتے ہیں گویا
وہ ہارے سپاہی ہوں اور سر اٹھانے سے شرما رہے ہوں!
مری بات، لگتا ہے ان کی سمجھ، فہم سے بالاتر ہے
بہرحال وہ اتنی سی بات تو جانتے ہیں کہ وہ شے کہ جو "روشنی"
سے مسمّٰی ہے
لوگوں کو مہمیز کرتی ہے، بن اس کے ہر شخص اندھا
بھٹکنا مقدر ہے جس کا

وہ یہ جانتے ہیں کہ وہ شے جسے "نور" کہتے ہیں، پانی کی صورت
لطیف اَور سیّال سی ایک شے ہے
خلا جس سے بھرتے ہیں اور چشمہ چشمہ اترتا ہے جو خشک و تاریک
دھرتی کی ہر شے کے دل پر!
خدایا! ترے سادہ دل اَور مجبور بندے
ترے جوہرِ ذات سے بے خبر ہیں —— یہ سرتا بہ پا بے خبر ہیں
ترا چہرۂ غیر مرئی سمجھنے کی خاطر
تماثیل ایجاد کرتے ہیں حیرت کے مارے
یہ بے بس کے بے بس
یہ بے رطب، یابس
یہ حس دار بے حس
الٰہی! ہم عاجز ہیں، ہم بے نوا جانتے ہیں
کہ تو لفظ و صوت و صدا، زیر و بم جزر و مد، خال و خد، حرف وحد
سب سے ہے ماورا
اے خدا اے خدا
ہم اندھے ہیں اندھوں کی صورت "تجلّی" کو اپنے تصور میں لانے
کی کوشش میں ناکام
صحرائے بے سمت میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں!
ہم اندھے ہیں، بدبخت ہیں، بے جہت ہیں
وہ دن ہوں کہ راتیں
بہکنا، بھٹکنا ہمارا مقدر!
یہ روحیں ہماری —— یہ رنجور و مجبور روحیں
دہلتی ہیں خوف اور خواہش کے بھونچال سے جب تو
اس لمحے تیرا ہی نرم و لطیف و سبک لمس
یا تیری ہی گرم اور آتشیں انگلیاں تھپتھپاتی ہیں ہم کو
ہمیں کیا خبر کون ہے تو، مماثل ہے کس سے؟
الٰہی! ہمیں وہ بصیرت میسّر نہیں ہے کہ ہم تیری کنہہ کی حد جان پائیں
ہم اندھے ہیں شاید کہ ماؤں نے ہی ہم کو اندھا جنا ہے!!
اندھیروں میں سرتا بہ پا غرق ہیں!
مرے ساتھ کے کور و نابینا جب پوچھتے ہیں یہ مجھ سے کہ یہ "نور"

آخر مثال ہے کس سے :
تو اک آتشیں اور سرجوش خواہش ابھرتی ہے مجھ میں کہ میں "نور"
کی ایک کُل
اور گھلتی ہوئی، گونجتی اور نظر میں سماتی ہوئی اور سینے میں جاتی ہوئی
بولتی جاگتی
اک شبیہِ مکمل بنا کر دکھاؤں، دکھا کر بتاؤں
کہ یہ کس طرح جسم و جاں میں اترتا ہے اور
سیر کرتا ہے سب کو
یہی دن کی ہے کیف آور بلندی
یہی ہے بسیط اور بے تھا ساگر
یہ پھیلا ہوا پھول بے پتیوں کا
شرابِ سرور آور و نشّہ پرور
فلک کی طرح ہر طرف پھیلا اک گنبدِ اطلسیں
تانے بانے میں جس کے ہیں سو سو طرح کے نگیں .
نظر جس کے رنگوں کے سیلاب کی تاب لاتی نہیں
جس کی باہوں کی قوسوں میں سمٹے ہوئے ہیں یہ سارے زماں اور یہ
ساری زمیں ہر مکاں، ہر مکیں!
ایک بے وزن، ہلکا لطیف اور دلکش حسیں ارتعاش
جس سے جانوں کو جسموں کو ہے انتعاش!
آہ لیکن مرے ساتھ کے سارے نابینا و کور کچھ جانتے کچھ سمجھتے نہیں
میں کہتا ہوں "سبز"
میں کہتا ہوں "سرخ"
میں کہتا ہوں "پیلا" "بنفشی" "گلابی"
میں کہتا ہوں "نیلا" "زمرد" "شنگرفی" "شہابی"
مرتیا رنگ یا آخرِ کار رنگِ مجرد کہ جو رنگ بے رنگ ہے!
مگر آہ وہ کچھ سمجھتے نہیں
ان کے ذہنوں کی بے آب درس کھیتیوں میں یہ سیلابِ رنگ و صباحت
در آتا نہیں
وہ محروم رہتے ہیں اس بے مثال آبیاری سے جو نور بھی ہے مسرت بھی ہے
اور جو مثلِ سیلابِ قاہر
مری روح میں اب اترتا چلا آرہا ہے

میں پلکیں اٹھاتا ہوں اور سامنے میرے کھلتی چلی جاتی ہے۔
ایک بے نام حیرت ——
افق تا افق ایک پھیلا سمندر ——
اور آکاش کا نیلگوں بحر —— روئیدگی
اور ہری مرغزاریں نہ جلے اور تپتے ہوئے خشک صحرا
سیہ، سرخ پیلے گلابوں کے تختوں میں جلتے ہوئے برف زار
اور یاقوت لبِ پی کے برفیلے مشروب جو
دینے لگتے ہیں لو
اے الٰہ اے خدا
ساری تسبیح و تہلیل و حرفِ ثنا سے ہے تو ماورا
رحم فرما ان اندھوں پہ اور بخش ان کو نشاط و نوا
ہم الوہی مسرت کے تجھ سے سوالی نہیں
—— ایک ایسی مسرت کہ جس کا نشہ ٹوٹتا اور بدلتا نہیں
ہم بھکاری ہیں کچھ دنیوی راحتوں کے
کہ جو ایک جگ سے یہاں پر میسر نہیں
ان سے تدبیر کر دوسروں سے زیادہ
انھیں اپنے ناختتم گنج بے رنج سے
شہد آگین و یاقوت وش خمر دے
دودھ اور شہد بخش
کہ وہ آخر کار ہو جائیں لائق تجھے دیکھنے کے!
انھیں ایسے بچے بنا دے کہ جو کھیلیں اور مسکرائیں
پہن کر دلآویز رنگیں قبائیں
انھیں لمس سے اپنے بے خود بنا دے
بد اقبالیوں کو مسرت سعادت کی چادر اڑھا دے
ان اندھے گڑھوں کو ضیا بخش جن میں
ابھی تک فقط اک شعاعِ تجلی بھی رستہ بنانے سے قاصر رہی ہے
تو موجد بھی ہے اور مبدع بھی ہے
تجھ کو تیری قسم
ان کی خاطر تو ایجاد کر نورِ دیگر
ان اندھے کنوؤں کو بنا نہرِ نور و نزاہت
خداوندِ حکمت!!

سید عبدالقدوس

○

انہیں کو ربط ہے دیوانگی سے
جو واقف ہیں مذاقِ عاشقی سے

وہیں بارِ الم نے سرزنش کی
جہاں اُٹھا ذرا بھی سرخوشی سے

اگر عزم و یقیں محکم ہیں اَے دِل
تو منزل دور کب ہے آدمی سے

گماں ہوتا رہا چارہ گری کا
ہمیں لوٹا گیا کس سادگی سے

بھٹکتے پھر رہے ہیں تیرگی میں
نکل آئے کہاں ہم روشنی سے

نہ کیوں ہو منکشف سترِ نہانی
نکل آئے حجابِ آگہی سے

یوں ہی پہروں تصور میں کسی کے
نگاہیں کھیلتی ہیں چاندنی سے

یہ ہے اعجازِ حُسنِ خود نگاہی
محبت کون کرتا ہے کسی سے

نہ جانے صبح تک قدوسؔ کیا ہو
طبیعت بجھ رہی ہے شام ہی سے

○

کیوں کر نجات پائیں گے برقِ تپاں سے ہم
مُنہ موڑ کر بھی دیکھ چکے آشیاں سے ہم

اے کورِ نظر پرسشِ احوال ہے عبث
صورت سوال ہے تو کہیں کیا زباں سے ہم

کیوں اُڑ رہی ہے خاک سرِ صحنِ گلستاں
اُٹھو کہ باز پرس کریں باغباں سے ہم

یہ اقتضائے جذبۂ وارفتگی تو تھا
ورنہ قفس میں کیا تھے برے آشیاں سے ہم

آواز دے رہے تھے مسلسل خبر بھی ہے
اک دن پسِ غبارِ رہِ کارواں سے ہم

آئے ہو آج لے کے یہ سوغاتِ اشک کیوں
لائیں گے اب وہ وسعتِ داماں کہاں سے ہم

یہ دھند یہ غبار یہ آہیں یہ سسکیاں
شاید گذر رہے ہیں کسی امتحاں سے ہم

اچھا ہوا کہ رہ گئی اِس سَر کی آبرو
کیا خاک لے کے اُٹھتے ترے آستاں سے ہم

ٹوٹے گی برق رہبر و رہزن پہ ایک دن
بھولے سے ہٹ گئے جو کہیں درمیاں سے ہم

رونا ہے عبث اے دلِ قدوسؔ بادشا
واقف ہیں کیفیاتِ دلِ دوستاں سے ہم

بشیر رحمانی

○

جو ترکِ غم کی جرأت کر رہے ہیں
امانت میں خیانت کر رہے ہیں

چمن کی زخم خوردہ ٹہنیوں کو
بہاروں سے عبارت کر رہے ہیں

قیامت ہے مری سوچوں کے پیکر
تقابل کی جسارت کر رہے ہیں

یہ کیا کم ہے نشاطِ نو کے خالق
صدائے غم سماعت کر رہے ہیں

جو دل میں مریمِ غم سے گریزاں
حقیقت سے بغاوت کر رہے ہیں

ابھی تو موسمِ گُل کے پیمبر
گلستاں کی تلاوت کر رہے ہیں

انھیں راہوں کے پتھر سے غرض کیا
جو شیشوں کی رفاقت کر رہے ہیں

ابھی محرومیوں کے زہر سے ہم
دل و جاں کی کفالت کر رہے ہیں

مرے گلشن کے باغی جنگلوں میں
بگولوں کی قیادت کر رہے ہیں

شعورِ بندگی جن کو ملا ہے
وہ لمحوں کی امامت کر رہے ہیں

جسے جانِ غزل کہتے ہیں شاعر
بشیر اُس کی عبادت کر رہے ہیں

○

فسانۂ صرصرِ حالات کا پھولوں پہ لکھ دینا
مرے دل کی تمنّا لالہ گوں ہونٹوں پہ لکھ دینا

جو اُن کے آستانے تک رسائی غیر ممکن ہو
تو مکتوبِ وفا حالات کے ماتھوں پہ لکھ دینا

پہنچ جائے گی دل کی آگ اک دن شیش محلوں میں
خلاصہ آرزوئے زیست کا آہوں پہ لکھ دینا

محبت کے گلستاں پر خزاں جب سایہ افگن ہو
بہاروں کی کہانی سوکھتی شاخوں پہ لکھ دینا

کسی کے آنسوؤں کا کب اثر لمحوں پہ ہوتا ہے
کتابِ درد لکھنا ہو تو سیاروں پہ لکھ دینا

جو محرومِ نظر ہو جائیں شہرِ زیست کی آنکھیں
حدیثِ کم نگاہی سنگ کی آنکھوں پہ لکھ دینا

اگر جذبوں کو اپنی منزلِ مقصد نہ حاصل ہو
مرے رِستے ہوئے چھالوں کا غم رستوں پہ لکھ دینا

رہائی قیدِ ہستی سے مجھے جس وقت مل جائے
تو میرا نام بھی زنداں کی دیواروں پہ لکھ دینا

بشیر اُن پر شکستِ آرزو ظاہر جو کرنا ہو
مرے دل کی صدا ٹوٹے ہوئے شیشوں پہ لکھ دینا

منور احمد

○

تنِ نازک پہ بھاری ہے گذر بادِ صبائی کا
بصد دِل احترام اپنے خیال آشنائی کا

میں کھینچا جا رہا ہوں پاؤں میں زنجیر رسوائی
ہمارا کیا رہا ہے یاں دست و پائی کا

نشے میں ہو گیا ہے گم تو اچھا ہے مگر اتنا
نظر کے پاس ساقی، دامن اپنا پارسائی کا

حریفِ موج دریا گر نہ ہو خود داریٔ ساحل
عدم تک ہو رہے گا چرچا اپنی بے نوائی کا

لطافت ہو گئی ضم کر کثافت میں قیامت ہے
کہاں نارِ برتن میں بھی نور آیا صفائی کا

شرابِ ارغواں میں خوب ہے تسنیم کا باری
ملا دنیا مغافیر اس میں طعنہ مئی سرائی کا

جو پڑی تشنگی پر سوز کا مئی پینا رہتا ہے
یہی اک حربہ ہے اندوں میں بھی پردہ سرائی کا

زکوٰۃ حسن دے اے حسن والے، پُر درخشاں ہو
منوّر ہاتھ میں آیا لئے کاسہ گدائی کا

○

کون سے کانٹے ہیں جو اب میرے داماں میں نہیں
پھول لایا چُن کے لیکن جو گلستاں میں نہیں

وصل پر بھی داستانِ ہجر کو دہرا دیا
درسِ فہمائش میرے آئینِ سوزاں میں نہیں

جستجو اس شوخ کی کچھ بھی نہ یوں آسان تھی
کون وہ کانٹے ہیں روندے جو بیاباں میں نہیں

درد و غم آہ و فغاں دستور عاشق ہیں بجا
یہ اصول و رسمِ زنداں گھر کے دریاں میں نہیں

حسن بے پردہ، صفات ناز و غمزہ پُر شرر
اس کے سب میں لیک مجھ تصویرِ حرماں میں نہیں

تیرا پرتو شعلۂ قندیل سے بھی تیز ہے
میرا زخم تمنا اس شبستان میں نہیں

اضطراب شوق پہ طعنہ و توہین خیال
حاصلِ مرہم کوئی اس زخم پنہاں میں نہیں

نبض ہیں خاموش، خوں ہیں منجمد، آنکھیں ہیں تیز
اے مسیحا! یہ مرض قانون و وجداں میں نہیں

پاکبازوں کو مبارک زہد و تقویٰ، حرص و ہوش
التفات نگہِ مرداں حور و غلماں میں نہیں

ترک شورش، ترک خاموشی مزاج عشق پر
اے خضر! اُس یہ تو میرے عہد و پیماں میں نہیں

داغ دِل اک ہے منوّر سوز سے اجلا تو کر
ایک رخنہ کے سوا کچھ تیرے ایماں میں نہیں

پنہاں

○

دِل میں حسرت ہے کہ مرتا کوئی
خود محبّت نہیں کرتا کوئی
شام کی جھیل اسی سوچ میں ہے
چاند سا عکس اُترتا کوئی
پیاس در پیاس بکھرتی جاتی
موج در موج گزرتا کوئی
دیکھ لی ہو گی حقیقت پنہاں
ورنہ کیوں خواب میں ڈرتا کوئی

○

ہوا کی راہ میں رکھتے ہوئے چراغ کی لو
دیارِ جاں میں لرزتی رہی دماغ کی لو
بدن کی شاخ پہ تنہا اداس دل کی کلی
لگی ہوئی ہے اسی سے تو سارے باغ کی لو
نگہ کے جام میں تارا سا جھلملا اُٹھا
سنوار دے گی مری شام اس ایاغ کی لو
جلا کے راکھ نہ کر دے وجود کا جنگل
بھڑک اٹھی ہے بہُت آج دل کے داغ کی لو
کنارِ صبحِ طرب ڈوب جائے گی پنہاں
تھکی تھکی سی ہے پچھلے پہر چراغ کی لو

○

دنیا کی یہ کشتی یہ زمانے کا سمندر
اور محوِ سفر اس میں کوئی ریت کا پیکر
جانا ہے کہاں مجھ کو میں آئی ہوں کہاں سے
رک رک کے یہی سوچتی رہتی ہوں میں اکثر
ہر بات سمجھتی ہوں مگر کچھ نہیں کہتی
سنتا ہے بھلا میری کہاں یہ دِل خُودسر
سچّائی کہاں جھُوٹ کا بازار سجا ہے
ہیرا نہیں کوئی بھی چمکتا ہُوا کنکر
مٹّی ہے بکھر جائے گی بس اتنا سمجھ لو
پتھر نہیں پنہاں کہ تراشے کوئی آذر



ابوالفضل صدیقی

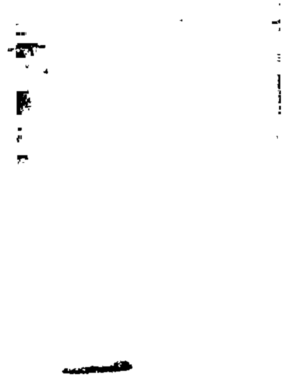
ولادت : بدایوں ، ۴ ستمبر ۱۹۱۰ء

تصانیف : پندرہ سے زائد

اعزاز : یونیسکو ایوارڈ

وفات : کراچی ۱۶ ستمبر ۱۹۸۷ء

نقوش ایوارڈ برائے افسانہ ۱۹۸۵ء



میرزا ادیب :

ولادت : لاہور ، ۴ اپریل ۱۹۱۴ء

تصانیف : تیس سے زائد

بچوں کے لیے کتابیں : تیس سے زائد

تراجم : پانچ

تالیفات : دس

اعزاز اور انعام : کم و بیش ہر اہم

ادبی اعزاز اور انعام سے سرفراز ہو چکے ہیں

نقوش ایوارڈ برائے افسانہ ۱۹۸۲ء



منشا یاد

ولادت : لاہور ۵ ستمبر ۱۹۳۷ء

تعلیم : ایم ۔ اے (اُردو)

ڈپلومہ ان سول انجینئرنگ

اُردو ، پنجابی تخلیقات : پانچ مجموعے

اعزاز : ۱۴۰۵ ہجری ایوارڈ ۱۹۹۱ء

نقوش ایوارڈ برائے افسانہ ۱۹۸۹ء

مَیں زندہ رہنا چاہتی ہُوں

میرزا ادیب

عصمت چند روز سے دیکھ رہی تھی کہ سمیعہ کچھ گھبرائی گھبرائی ، پریشان پریشان اور کسی کربناک احساس سے دبی دبی سی نظر آرہی ہے۔ بے خیالی میں کبھی کوئی چیز اٹھاتی ہے تو اسے اُس کے صحیح مقام پر نہیں رکھتی ۔ اگلے دن ڈرائنگ روم کی جھاڑ پونچھ کرتے ہوئے گُلدان میں تازہ پھول ڈال کر میز پر رکھنے کی بجائے کُرسی پر رکھ دیا تھا۔ آواز سنتی ہے تو جواب نہیں دیتی یا سر جُھکا کر چپ چاپ کھڑی رہتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیا تکلیف ہے اسے ۔ اس گھر میں اسے ہر طرح آرام میسّر ہے۔ میں نے اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ کبھی معمولی سی جھڑک بھی نہیں دی۔ پھر اس کی یہ حالت کیوں ہے۔

عصمت نے اس تبدیلیٔ حالت پر کبھی اُس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ مگر خود سے کئی بار سوال کر چکی تھی۔ میں اسے بے آسرا اور بے سہارا لڑکی سمجھ کر گھر لے آئی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد اس کا باپ اس کی طرف سے بالکل بے پرواہو گیا تھا۔ نہ اِس کے کھانے کی فکر نہ کپڑے لتّے کی ۔ مجھے علم نہ تھا میں نے اِسے اپنے گھر میں پناہ دی۔ زیادہ سے زیادہ میں یہی کام کر سکتی تھی اور میں نے کیا۔

عصمت خوب جانتی تھی کہ سمیعہ نے اس کے گھر آکر اپنی خوش نصیبی کا اظہار کیا تھا۔ کہا کرتی تھی ۔ خالہ جان! آپ نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ میری مرنے والی حقیقی ماں بھی نہیں کر سکتی تھی۔ رہا ساجد کا معاملہ تو ساجد نے مجھے کئی محبوب رشتوں کی محبت کا اثاثہ دے دیا ہے۔ میرا بھائی بھی ہے بہن بھی سہیلی بھی۔ میرا غم گسار بھی بنے۔ ہمدم بھی ۔ یہ ٹھیک کہ میرا بیٹا ساجد ایک بالکل اپاہج اور ناکارہ وجود بن کر رہ گیا ہے مگر یہ سمیعہ کتنی محبت سے۔ کتنے خلوص سے ، کتنی چاہت اور لگن سے اس کی خدمت کرتی رہی ہے اور برابر کر رہی ہے۔ اسے مجھ سے زیادہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رہتا ہے۔ وقت پر ناشتا دینا، کھانا کھلانا ، چائے دینا، پلنگ سے وہیل چیئر پر بٹھانا اور وہیل چیئر سے پلنگ تک اپنے بازوؤں کے سہارے لے جانا یہ سارے کام کتنی رغبت سے کتنے شوق سے انجام دیتی ہے۔ ساجد اس کی بارہا تعریف کر چکا ہے اور اسے اللہ کی زندہ رحمت قرار دے چکا ہے۔ مجھ سے اس نے کبھی سمیعہ کی کوئی ہلکی سی شکایت بھی نہیں کی۔

پھر یہ کیا ہے جو میں دیکھ رہی ہوں—— محسوس کر رہی ہوں ۔ یہ فریب نظر یا میرا وہم تو نہیں ہے ۔ یہ لڑکی چار سال سے یہاں میرے گھر میں ہے۔ اس مدت میں پہلے مجھے کبھی اس کی ایسی کیفیت کا احساس نہیں ہوا—— چند روز

یکایک ایک نئی سوچ کی لہر اس کے ذہن میں در آئی۔

محسوس ہوتا ہے کہ جب کوئی چیز لے کر یا اس کی کوئی خدمت انجام دینے کے لیے ساجد کے کمرے میں جاتی ہے تو باہر آ کر اس کی حالت غیر معمولی اور ابنارمل سی ہو جاتی ہے۔ مجھ پر نظر پڑتی ہے تو فی الفور نظریں جھکا کر قریبی کمرے کے دروازے میں سے نکل کر خود کو میری نگاہوں سے اوجھل کر لیتی ہے۔ یہ اس کی کوئی غیر شعوری نہیں، شعوری حرکت ہوتی ہے۔ غیر شعوری حرکت تو ایک دو بار ہو جاتی ہے مگر یہ تو ہر بار یہی طریقہ اپناتی ہے۔

ایسے میں مجھ سے کیوں چھپ جانا چاہتی ہے۔ شاید اس خوف سے کہ میں اس سے کچھ پوچھ نہ لوں، کوئی سوال نہ کر دوں۔ یہی سوچ کر وہ فوری طور پر میری نظروں سے دور رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے!

میرے گھر آ کر اس نے وہ خلا پورا کر دیا ہے جو میں نے اپنی بیٹی کے نہ ہونے سے گہرے دکھ کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ ہر بات مجھے بلا تامل بتا دیا کرتی تھی کہا کرتی تھی۔ خالہ جان! آپ میری ماں ہیں اور ماں بیٹی کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا ـــــ اگر ایسا ہے تو یہ پردہ میرے اور اس کے درمیان کیوں حائل ہو گیا ہے'۔

عصمت اپنے کمرے سے باہر نکل کر آنگن میں کرسی پر بیٹھی دھوپ کی گرمی سے اپنے جسم کی ٹھنڈک دور کر رہی تھی۔ سردی کی صبحوں میں یہ اس کا ایک راحت رساں عمل ہوتا تھا لیکن اس روز اس کی باطنی کشمکش نے اسے اس راحت سے محروم کر دیا تھا۔

دو راتوں سے ساجد بخار کی اطلاع دے رہا تھا اور سمیعہ صبح سویرے اس کا درجہ حرارت نوٹ کرتی تھی۔ عصمت آنگن میں آئی ہی تھی کہ اس نے سمیعہ کو ساجد کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور سمجھ لیا تھا وہ یہی ڈیوٹی دینے گئی ہے۔

وہ اس کا انتظار کر رہی تھی یہ دیکھنے کے لئے کہ آج باہر آ کر اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔

وہ آئی تو پہلے سے بھی زیادہ پریشان دکھائی دی۔

یہ کیا ہو جاتا ہے سمیعہ کو ــ ــ

وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی ـــ اس غرض سے وہ سمیعہ کو آواز دے کر روکنا چاہتی تھی کہ سمیعہ سٹور روم کے دروازے کے اندر چلی گئی۔

اس وقت یہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے دیکھ کر خود کو میری نظروں سے دور رکھنا چاہتی ہے اور اس حرکت کا کیا مطلب ہے؟ مگر کیوں ـــ آخر کیوں؟

"مجھے اس سے پوچھنا چاہیئے۔ مجھے نہیں بتائے گی تو کسے بتائے گی؟"

وہ کرسی سے اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ اس کی پرانی ہمسائی رضیہ آ گئی۔ رسمی باتوں نے اتنا طول کھینچا کہ پورے دو گھنٹے بیت گئے۔ اُس دوران میں وہ سمیعہ ہی کے بارے میں بار بار سوچتی رہی۔ سلسلۂ گفتگو بے ربط ہوتا رہا اور رضیہ

کچھ حیران بھی ہوتی رہی۔ آخر وہ چلی گئی۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ دروازے سے نکل کر اوجھل ہو گئی۔

وہ ایک شدید احساس کے زیرِ اثر اٹھی اور سٹور روم کی طرف جانے لگی۔

سمیعہ وہاں نہیں تھی۔

"کہاں ہو گی؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ کامن روم سے باورچی خانے اور باورچی خانے سے ڈرائنگ روم میں گئی۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ سارے کمروں میں اسے ڈھونڈ چکی تھی۔ اوپر کوٹھے پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں پرانی، خراب و خستہ چیزیں پڑی رہتی تھیں وہاں اس نے دیکھا کہ سمیعہ ایک پلنگڑی کے سرے پر سر جھکائے بیٹھی ہے۔

"سمیعہ!"

آواز پر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں شدت اشک باری سے سرخ تھیں۔ گالوں پر جا بجا آنسوؤں نے ہلکے ہلکے دھبے ڈال دیے تھے۔ لڑکی کو اِس حالت میں دیکھ کر اس کے اندر ایک ہلچل سی مچ گئی۔ بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"سمیعہ، میری بچی!"

سمیعہ کا سارا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ وہ آنسو ضبط کرنا چاہتی تھی مگر آنسو تھے کہ بہتے ہی چلے جا رہے تھے۔

'رو نہیں سمیعہ —— روتی کیوں ہے؟"

نہ جانے اس فقرے نے کیا اثر کیا کہ سمیعہ کے آنسو تھم سے گئے۔ اور اس کے ہونٹ جیسے کانپ رہے ہوں۔

"بیٹی!"

"جی، ایک بڑی مدھم آواز لڑکی کے ہونٹوں سے نکلی۔

"میں پوچھتی ہوں —— تمہیں بیٹی کون کہہ سکتا ہے؟" عصمت نے بڑی نرمی سے، بڑی ملائمت سے سوال کیا

سمیعہ خاموش رہی۔

عصمت نے اپنا سوال دہرایا۔

اب کے ویسی ہی ہلکی آواز نکلی

"ماں"

"ماں کہہ سکتی ہے نا"

سمیعہ نے اثبات میں سر ہلا دیا

"تو ماں تم سے پوچھتی ہے کہ کیا بات ہے!"

سمیعہ نے اس طرح سر ہلایا جیسے کہنا چاہتی ہو۔ "کوئی بات نہیں"

"ماں نہیں سمجھتی ہونا؟"

"سمجھتی ——— ہوں ——— سمجھتی ہوں خالہ جان! آپ ماں ہی تو ہیں"

"تو بتاؤ ——— وہ کچھ بتادو جو بتانا نہیں چاہتیں ——— بڑی بیٹی! ——— میری رانی"

عصمت نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا دیا اور چند لمحوں کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں کا بوجھ اس کے کندھوں پر ڈال کر پلنگڑی پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"کہہ دو میری بچی! کہہ دو ——— جو سچ ہے اپنی زبان پر لے آؤ۔ یہ میں تم سے کہہ رہی ہوں۔ سنا سمیعہ"

سمیعہ نے ہاں کے انداز میں اپنا سر ہلا دیا۔

بارش رک جانے کے بعد جیسے ہوا کے جھونکے سے پیڑ کی کسی شاخ سے بارش کے قطرے گر پڑیں اس کی آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو بہ گئے ——— اور وہ کہنے لگی

"خالہ جان! میں نے ساجد بھائی کو سچے دل سے اپنا بھائی سمجھا تھا۔ اس کی خدمت کرتے ہوئے مجھے وہی ——— خوشی ملتی تھی جو ایک بہن کو مل سکتی ہے مگر ———"

سمیعہ رک گئی۔

"کہتی جاؤ میری بچی!"

"خالہ جان" وہ ——— میں کیا کہوں ——— کیسے کہوں ——— ان کا رویہ کچھ اور ہو گیا ہے۔ میری توقع کے بالکل خلاف ———"

وہ پھر رک گئی۔ عصمت نے اس سے کچھ نہ کہا، صرف دیکھا اور جو کچھ لفظوں میں کہنا چاہتی تھی وہ آنکھوں سے کہہ دیا۔

کہتے ہیں تم میری ہو ——— میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا ——— کہتے ہیں میری گود میں ——— خالہ جان! یہ ناقابل برداشت ہے ——— یہ ——— یہ ———" سمیعہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

عصمت اسے دیکھتی رہی ——— خاموشی سے ٹکٹکی باندھ کر۔

"خالہ جان! مجھے چلے جانے کی اجازت دے دیں ———"

"کہاں جاؤ گی؟"

"میں نہیں جانتی خالہ جان! ——— یہاں سے چلی جاؤں گی ——— کہیں بھی میں زندہ رہنا چاہتی ہوں خالہ جان! مجھے زندگی سے محبت ہے" عصمت اٹھی ———

"آؤ نیچے چلو"

عصمت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

نیچے آکر عصمت نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور آنگن کی اسی کرسی پر بیٹھ گئی، جہاں اوپر جانے سے پہلے بیٹھی تھی۔ سمیعہ ہولے ہولے قدم اٹھا کر چلی گئی۔

"یہ کیا ہے ——— میں کیا کروں ؟——— مجھے کیا کرنا چاہیے ——— یہ ہونا ہی تھا۔ وہ اپاہج ہو گیا ہے——— مگر اس کی خود شناخت اپاہج نہیں ہوئی ——— زندہ ہیں ——— تند و تیز نہیں ——— گرداب میں پھنس گیا ہے میرا بیٹا ——— میں اور یہ لڑکی بھی گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں ——— تو ———"

ان لمحوں میں اسے وہ سارے واقعات یاد آ گئے جو گزر چکے تھے— اُس کا اکلوتا بیٹا، جو باپ کے بعد اُس کا واحد سہارا تھا۔ کس طرح ایک بھری وین کے نیچے آکر ایک جوان رعنا سے ایک کریہہ منظر، اپاہج ہو کر رہ گیا تھا——— ایک سانس لیتا ہوا گوشت کا لوتھڑا ——— نچلا حصہ کچلا ہوا وہ اسے ہسپتال سے لے آئی تھی ——— اور اس کے شب و روز اس کے لئے وقف ہو گئے تھے——— اسے دیکھ کر جیتی تھی——— وہ زندہ ہے۔ یہی اس کے لئے کافی تھا اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مستقبل میں کیا ہو گا——— وہ اسے صرف زندہ دیکھنا چاہتی تھی اور وہ زندہ رہا تھا ——— اور اب وہ وقت آگیا تھا جس کا اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔

یہ وقت اس کے لئے ایک سوال لے کر آ گیا تھا——— ایک ایسا سوال جو اس کے ذہن کے اندر ایک گہری کشمکش سے بار بار سر اٹھا کر اس سے جواب پوچھتا تھا۔

"اب کیا ہو گا——— اب تم کیا کرو گی——— تمہیں کیا کرنا ہو گا"

وہ سوچ رہی تھی——— سوچے جا رہی تھی اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا——— کوئی جواب ——— کوئی حل ——— کچھ بھی نہیں——— اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اچانک ایک آہٹ سی ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سمیعہ ایک ٹرے میں چند ٹوسٹ اور دودھ کا گلاس لئے جا رہی تھی۔

"کدھر جا رہی ہو———"

"بارہ بج گئے ہیں امی!" سمیعہ نے کہا اور جانے لگی۔

"ٹھہرو ——— مجھے دو ———" اور عصمت نے اس سے ٹرے لے لی۔

سمیعہ نے کچھ کہا——— اس کے ہونٹ ہلے تھے لیکن عصمت اس کے الفاظ نہیں سن سکی تھی۔

"امی ! آپ ———" ساجد نے امی کو ٹرے لاتے ہوئے دیکھ کر کہا

"ہاں——— اب کون لائے گا؟"

"کیوں امی ! ——— یہ سارے کام تو سمیعہ کیا کرتی ہے؟"

"وہ جا رہی ہے——— اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے"

"فیصلہ کر لیا ہے!" ساجد سراپا استفسار بن گیا تھا۔

"ہاں —— اور تم خوب جانتے ہو اس نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟"

"کیوں ——؟"

"تم نے اسے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے —— مت پوچھو مجھ سے کچھ۔ جانتے ہو کیا ہوا ہے۔ اس کے چلے جانے کی وجہ کیا ہے!" ساجد نے اور کوئی لفظ نہ کہا —— عصمت نے ٹرے اس کے پلنگ کے ساتھ تپائی پر رکھ دی۔

اسے کھانا سمیعہ ہی کھلاتی تھی —— کبھی کبھی وہ اپنا بایاں ہاتھ بھی استعمال کر لیا کرتا تھا جو حرکت کر سکتا تھا۔

"کھالوں گا امی! —— ابھی نہیں"

عصمت دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگی ——

"یہ میں نے کیا کہہ دیا ہے" وہ سوچ رہی تھی۔ اس کے قدم رک رک جاتے تھے —— وہ واپس ساجد کے پاس جانا چاہتی تھی۔ کچھ کہنے کے لئے، کچھ سننے کے لئے۔ کیا کہنے —— کیا سننے کے لئے —— وہ نہیں جانتی تھی۔

اس کے ذہن میں ایک بوجھ تھا جو بڑھتا جا رہا تھا —— بغیر ارادے کے قریبی مارکیٹ میں جا کر وہ چیزیں خریدنے لگی جن کی ابھی کوئی ضرورت نہیں تھی واپس آکر چیزیں باتھ روم میں رکھ ہی رہی تھی کہ سمیعہ کی چیخ اس کے کان میں آئی۔

اس کا دل ایک موہوم خطرے سے بری طرح دھڑکنے لگا۔

وہ ساجد کے کمرے کی طرف جلد جلد جانے لگی۔

اس نے دیکھا وہ پلنگ سے نیچے قالین پر پڑا تھا —— لہو سے کپڑے لت پت تھے۔ سمیعہ چیخی جا رہی تھی۔

"ساجد میرے پتر ——"

وہ اس پر جھک پڑی ——

"خالہ جان! میں چائے لے کر آئی تو یہ —— اس طرح پڑے تھے ——" سمیعہ نے کہا۔ اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گر کر نیچے ساجد کے بازو کے پاس نظر آ رہی تھی۔

"ساجد، میرے لال —— یہ کیا ہوا ——"

"امی! میں نے خود کو گرا دیا تھا —— ٹھیک کیا ہے امی! میں نے ——"

کیوں —— کیوں ساجد! میرے بیٹے —— میرے بچے ——"

"امی! میرا اپنے اوپر قابو نہیں رہا تھا —— میں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ سمیعہ کے بغیر —— مجھے معاف کر دو —— معاف کر دو امی! میں مجبور تھا۔ امی! ——"

"ساجد تم نے بہت ہی برا کیا۔

"نہیں امی! یہی ہونا تھا —— یہی ہوا ——" اور کوئی راستہ نہیں تھا —— کوئی راستہ نہیں تھا امی!"

ساجد کی آواز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ محسوس ہوتا تھا وہ رہی سہی توانائی جمع کر کے بول رہا ہے۔

"امی! یہ یہیں رہے گی ——— مامتا کی ٹھنڈی چھاؤں چھوڑ کر مشکلات کی کڑی دھوپ میں پگھلنے کے لئے نہیں جائے گی ———" اس کی آواز گونجنے لگی ——— اور چند لمحوں کے بعد ڈوب گئی۔

صبح ہو گئی ہے

رام لعل

چاند رام لکڑی کے بند پڑے کھوکھے کے سامنے کئی چکر لگا چکا تھا۔

"نہ جانے بڈھا کہاں مر گیا آج"!

اُسے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ کھوکھے کی زنگ آلود ٹین کی چھت پر پھٹی پرانی سڑی ہوئی بے شمار جوتیاں بارش اور دھوپ کھا کھا کر کالی پڑ چکی تھیں۔ چاند رام نے سگریٹ کی ڈبیا میں سے سگریٹ نکالی۔ اب ڈبیا خالی تھی۔ اس نے اسے ہاتھ میں مروڑ کر ٹین کی چھت کی طرف اچھال دیا۔ ڈبیا جوتیوں پر اچھلتی کودتی پھر نیچے آ گری جسے اس نے کیچڑ سے لتھڑے ہوئے اپنے بوٹ کے نیچے کچل دیا اور ماچس ڈھونڈنے کے لیے خاکی پتلون کی جیبیں ٹٹولیں، ایک جیب میں شراب کا پوّا رکھا تھا جس میں ذرا سی بچی ہوئی تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر کھوکھے کی آڑ میں جا کر غٹا غٹ پی گیا۔ اُس کے پاؤں کے نیچے چمڑے کی بیشمار کترنیں پڑی ہوئی تھیں جنہیں کھوکھے کا مالک موچی روزانہ جھاڑو لگاتے وقت اسی طرف بڑھا دیتا تھا۔ اُس نے خالی بوتل وہیں رکھ دی اور اپنے ہونٹ الٹے ہاتھ سے پونچھتا ہوا کھوکھے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

وہ ضرور کسی کے یہاں نیا جوتا پہنچانے چلا گیا ہے! وہ ہے ہی بڑا مورکھ کہ اتنا اچھا کاریگر ہو کر گاہکوں کے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ وہ دراصل تعریف سننے کا بھوکا ہے۔ دو ہی بول سن کر اپنی اُجرت کم کر دیتا ہے۔ چاہے گھاٹا ہی کیوں نہ ہو جائے۔!

چاند رام بڑبڑاتا ہوا بس اسٹینڈ کی طرف چل دیتا ہے۔ یہ اسٹینڈ ریلوے اسٹیشن کے احاطے میں لیکن ذرا فاصلے پر بنایا گیا ہے۔ دو طرف پوڑی پراٹھے والوں، چائے والوں اور پان سگریٹ والوں کے درجنوں اسٹال ہیں۔ بیچوں بیچ شہر کے کونے کونے تک جانے والی بسیں۔ جتنی چھوٹتی ہیں اتنی واپس آ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی زیادہ بھی۔ تب ڈرائیور سڑک کے کنارے کنارے اپنی بسیں کھڑی کرنے لگتے ہیں۔ وہاں پر موجود رکشا والوں کو ماں بہن کی سناتے ہوئے بھگا دیتے ہیں۔

وہاں ان کا کوئی پکا ٹائم آفس نہیں ہے۔ ٹائم کیپر عام طور پر چھوٹی سی میز کرسی لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ آج بارش کی وجہ سے اس نے ایک بس کینسل کر کے اسی کے اندر ڈیرہ جما لیا ہے۔ موٹر مکینک بھی اپنے اپنے جھولے لئے اُسی بس کے اندر بیٹھے بیڑیاں پھونک رہے ہیں۔

ٹائم کیپر نے چاند رام کو کیچڑ و پانی سے بھری ہوئی سڑک پر خاکی پتلون کے پائنچے گھٹنوں تک چڑھا کر جھوم جھوم کر

آتے ہوئے دیکھا تو اس نے کھڑکی میں سے پان کی پیک اُگل کر کہا ـــــ سالا! آج بھی پئے ہے خوب !

اِدھر وہ سچ مچ ہر روز پی رہا تھا ۔ وہ بھی انہی لوگوں کا ساتھی تھا ۔ بس کنڈکٹروں کا ۔ مسافروں کی کئی بار چھوٹی ریزگاری نہ لوٹانے سے اُس کے پاس پانچ دس روپے بچ جاتے تھے ۔ کبھی کبھی بس کا بھاڑا لے کر بھی ٹکٹ نہ دینے سے اس سے زیادہ بھی ۔

کالا چم چماتا ہوا رنگ ، موٹی و چھوٹی ناک ، بھرے بھرے ہونٹ ، تنگ پیشانی اور پیچھے کی طرف جمائے سیاہ بال جن میں سے آج بارش کا پانی ٹپک رہا تھا ۔ آج ہی صبح اس کی بڑھیا ماں چل بسی تھی جسے وہ دن میں برادری والوں کو ساتھ لے جا کر شمشان میں پھونک آیا تھا ۔ وہاں سے وہ گھر واپس نہیں گیا تھا ۔ گھر میں اب اُس کا تھا ہی کون ! ماں کی موت کا غم بھلانے ہی کے لئے تو اس نے تھوڑی سی کچی پی لی تھی ۔

اُس کی ڈیوٹی نہیں بھی ہوتی ہے تب بھی وہ بس اسٹینڈ پر چلا آتا ہے ۔ اپنے ساتھیوں کے بیہودہ مذاق میں شریک ہونے ، سگریٹ بیڑی کے کش لگانے ، پان چبا چبا کر پیک کے فوارے چھوڑنے اور گوارا صورت مسافر عورتوں کو تاک تاک کر جی ٹھنڈا کرنے کے لئے ۔

"ابے چمار" اپنی اوقات بھول گیا کیا ؟ ذرا ہٹ کر بیٹھ !

"اُدھر دیکھو" تیری ماں چلی آ رہی ہے ۔ تیرے لئے چار چکر کاٹ چکی ہے"

"اِس کی صورت دیکھ کر تو راون کی اُمت یاد آ جاتی ہے ۔ قسم سے !"

سالا نیا نیا آیا تھا تو کہتا تھا ، حرام کی کمائی نہیں کھاؤں گا ۔ اب کتنا گھس گیا ہے ۔ روزانہ شراب کے لئے کہاں سے پیسے لے آتا ہے ؟

"اماں" چمار کے قول و فعل کا کیا اعتبار ۔!

اتنی ساری بے ہودگیوں میں صرف ایک بات اس کے دل کو ہلا دیتی تھی ۔ صرف ایک لفظ جیسے تیز بھالے کی طرح اس کے سینے میں گڑ کر رہ جاتا تھا ۔

چمار !

وہ بھلے ہی نیچی جات کا تھا لیکن لوگ اُس کے تئیں اسقدر حقارت کا اظہار کرتے تو اس کا خون کھول کھول جاتا ۔ جی میں آتا وہ گالی دینے والے پر ایک ہی جست میں کود جائے اور اس کا ٹیٹوا دبا دے ۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں وہ یہ سوچ کر خود کو روک لیتا ، یہ سالے خود چماروں سے کم ہیں کیا ؟ کونسا بُرا کرم یہ نہیں کرتے ؟ شراب خوری ، رنڈی بازی ، جیسی بھی گری پڑی مل جائے ، بس کے اندر ہی تفریح کر لیتے ہیں ۔ کسی روز پکڑوا دوں گا تو مجھے اپنا باپ بنا لینے میں دریغ نہیں کریں گے !

یہ سچ تھا ۔ لباس اور شکل و صورت میں بھی وہ چاند رام سے کسی طرح برتر نہیں تھے ۔ بلکہ کسی کسی سے تو چاند

رام ہی ان سے زیادہ اچھا نظر آتا تھا ۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ گرمی ، نشاد وغیرہ نہ ہو کر اوستھی ، استھانا ، سکسینہ اور سید تھے ۔ وہ مسافروں کے سامنے بھی اس کی جات برادری کا نام لے لے کر اُسے ذلیل کرنے لگتے تھے ۔ کوئی ضرورت مند اُس کے ہاتھ کا چھوا پانی کا گلاس تک نہ تھام بیٹھے ! اگرچہ وہ اس کے ہاتھ سے چھینچ لے لیتے تھے ۔ روپیہ پیسہ تو لکشمی ہے لکشمی ! اس سے کیا پرہیز ! لیکن پھر بھی ایک یاتری نے اُس کے ہاتھ سے ٹکٹ لینے سے انکار کر دیا تھا اور رام رام کہتا ہوا بس چھوڑ کر اگلے پر جا بیٹھا تھا ۔

"اس حکومت نے تو حد کر دی ! آگے وہ جو نہ کرے سو بہت !"

بس اسٹینڈ پر وہ اکیلا تھا ۔ اس کی جات برادری کے کئی ساتھی جو اس کے ساتھ بھرتی ہوئے تھے شہر کے دوسرے ڈپوؤں پر لگائے گئے تھے ۔ اُسے تنہائی کا شدید احساس اسوقت ہوتا جب وہ اپنے ساتھیوں اور مسافروں کے درمیان ایک کنڈکٹر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک نیچی جات کے فرد کے طور پر گھرا رہ جاتا تھا ۔ بغل میں بس کے ٹکٹوں کا چرمی بیگ دبائے ، سختی سے ہونٹ بھینچے اور بے بسی سے بھری ہوئی آنکھوں سے خلامیں گھورتا ہوا ۔ انتہائی مایوسی کا شکار ہو کر بھی وہ کبھی کبھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ وہ وہی کچھ رہتا جو کچھ کہ دراصل ہے تو کیا بُرا تھا ؟ تب وہ کسی کو دھوکا تو نہیں دیتا ۔ تب اس کے دل میں اس بات کا رنج بھی ہرگز نہ ہوتا کہ وہ پسماندہ جات سے کیوں تعلق رکھتا ہے ! تعلیم اور سرکاری ملازمت حاصل کر کے تو اس نے خاصی مصیبت مول لے لی ہے ۔ آج اُس کی ماں کی ارتھی لے جانے والوں میں اس کے محکمے کا ایک بھی ساتھی نہیں تھا ۔ سب کے سب نیچی جات کے تھے ۔ اڑوسی پڑوسی اور دور دور کی گندی بستیوں میں رہنے والے جو اپنے آپ آگئے تھے ۔ ان میں سے بہت سوں کو وہ جانتا بھی نہیں تھا ۔ یہ کیسا سماج ہے جو اس کا سیاسی استحصال کرتا ہے ۔ ووٹ لینے کے لئے تو اُسے اپنا قرار دے دیتا ہے لیکن اس کی خوشی غمی کے موقعوں پر کنی کترا جاتا ہے !

وہ ٹائم کیپر اور دوسرے لوگوں کی جملے بازی پر من ہی من میں کڑھتا ہوا بس کے گیٹ پر ہینڈل تھامے کھڑا تھا ۔ اس کی نظریں اگرچہ ٹائم کیپر کے بڑی ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے چہرے پر جمی تھیں لیکن اس کا دل کہیں اور تھا ۔ زخمی ، چوٹ کھایا ہوا ، چند گھونٹ اور شراب کے لئے ترستا ہوا ! شراب ہی اس کی ساری ہزیمت بھلا دیتی تھی ۔ نشے میں تو وہ کسی کو بھی ٹھوکر مار سکتا تھا ۔ ٹھوکر لگانا ہی اس کی سب سے بڑی آرزو بنتی جا رہی تھی ۔ جس ٹائم کیپر کے سامنے وہ ڈیوٹی کے اوقات کی تبدیلی کے لئے گڑگڑاتا تھا اسی کی کھوپڑی کو وہ اپنے بوٹ کی ٹھوکر سے اڑا دینے کا بھی ارادہ کر لیتا تھا ۔ وہ کسی سے بات کئے بغیر بس اسٹینڈ سے چلا آیا ۔ ادھر اُدھر کسی مسافر عورت کی طرف بھی نہیں تاکا ۔ سر جھکائے ، سوچتا ہوا ، پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے ہوئے ۔

اچانک اس کے ایک کنڈکٹر ساتھی رگھوناتھ شرما نے اس کا راستہ روک لیا ۔ اُس کے دونوں کندھوں پر بڑی اپنائیت سے اپنے ہاتھ رکھ کر بولا —

ابے وحت ہے کیا ؟

اس نے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ سر اٹھایا اور اسے گھور کر دیکھا ۔

یار سُن ۔ تجھے معلوم ہے مجھ پر بنا ٹکٹ مسافر لے جانے کا کیس ہو گیا ہے !

کیا سچ !چاند رام جیسے خوش ہو کر بولا ۔

ہاں ۔ آج ہی صبح اس کانے انسپکٹر نے جو ہر وقت کالا چشمہ لگائے رہتا ہے ، اسٹیڈیم کے سامنے میری بس رکوا کر چیکنگ کر لی ۔ دو مسافروں کو ابھی میں ٹکٹ نہیں دے پایا تھا ۔ اُن کے اس نے تحریری بیان لے لئے ۔ ایک تو وو دھان سبھا کا چپڑاسی ہے جس سے میں ایک وو دھانک کے چمچے کو ساتھ لے جا کر مل آیا ہوں ۔ اس نے پکا وعدہ کر لیا ہے کہ وہ اپنا بیان بدل لے گا ۔ دوسرا آدمی یونیورسٹی کے ایک ہوسٹل کا کوئی چمار ہے ۔ اس کا نام پتہ بھی معلوم کر لوں گا ۔ تیری بہت ضرورت پڑے گی یار ۔ میرا یہ کام تو کرا دے گا ناں ۔ آخر ہم ساتھی ہیں ۔ ایک ہی ڈپارٹمنٹ کے لوگ !

یہ وہی رگوناتھ تھا جس نے اس کے ساتھ کبھی ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھانا گوارا نہیں کیا تھا ۔ وہ اسے ہمیشہ دور سے دیکھتے ہی آوازہ کستا تھا --- لو آ گیا ہار راستہ چھوڑ دو ۔" اُسے محض چڑانے کے لئے اس کے چھوتے ہوتے بس کا ہینڈل تک صاف کرانے لگتا تھا ۔

چاند رام نے اسے ایک غلیظ گالی دے کر کہا ۔ آج ہی تو آیا ہے تو ہم لوگوں کے قبضے میں ۔ سالا ! دیکھتا ہوں تو کیسے بچ کر جاتا ہے !

وہ رگوناتھ کی مزید کوئی بات سُنے بغیر ہی پارک کے اندر گھس گیا ۔ جہاں ایک اونچے چبوترے پر مہاتما گاندھی کی مورتی نصب تھی ۔ مورتی کے اوپر ایک بڑا سا چھتر بنا ہوا تھا ۔ وہاں بارش کی ایک بوند تک نہیں پڑی تھی ۔ وہ بھیگے ہوئے کپڑوں اور کیچڑ سے لت پت بوٹوں سمیت مجسمے کے پلیٹ فارم کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا ۔ بائیں طرف درختوں کے جھنڈ میں سے بجلی سے چلنے والا کلاک ٹاور دکھائی دے رہا تھا ۔ آٹھ بجنے میں ابھی کچھ منٹ باقی تھے ۔ اس نے سوچا وہ ٹھیک آٹھ بجے یہاں سے چل دے گا ۔ اُس بڈھے موچی سے ملنے کی ایک اور کوشش کرے گا ۔

ڈیڑھ دو سال پہلے وہ اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے کی وجہ سے بس کے فٹ بورڈ سے پھسل گیا تھا ۔ تھوڑی سی چوٹ بھی لگی تھی ۔ گھٹنے اور بازو کی کہنی پر ۔ اس وقت اس کی جیب میں زیادہ پیسے نہیں تھے ۔ بس ایک ہی روپیہ تھا ۔ وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر لوٹ رہا تھا ۔ کسی موچی کو تلاش کرتے کرتے وہ اسی بڈھے کے پاس جا پہنچا تھا جس کا کھوکھا پٹرول پمپ کے سامنے تھا ۔ چمڑے کی بے شمار کترنوں ، لکڑی کے سانچوں اور ادھ سِلے جوتوں کے درمیان تیز دھار والی راپی سے ایک چمڑا کاٹ رہا تھا ۔ سیاہ سڑا ہوا کمزور جسم جو کام کی لگن میں دوہرا ہو ہو جاتا تھا ۔

"اے بھائی" میرے جوتے کا تلہ اُکھڑ گیا ہے ۔ دو چار کیل تو جڑ دے ذرا جلدی سے" ۔

چاند رام نے جوتا اتار کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا اور اپنی جیب میں رکھا ہوا ایک روپے کا سکّہ بھی ٹٹولنے لگا تھا ۔

بوڑھے موچی نے پرانے گھسے ہوئے جوتے کو پہلے تو اُلٹ پلٹ کر دیکھا تھا پھر چاند رام کو جو ڈھیلی ڈھالی خاکی وردی پہنے ہوئے تھا ۔ اس نے مسکرا کر کہا تھا —"بابو" اس میں تو نیا تلہ لگے گا۔ سلائی بھی ہوگی ۔ ایڑی بھی لگوالو تو بہت مضبوط ہو جائے گا ۔ ذرا دوسرا جوتا بھی اتارو تو !"

"نہیں نہیں" یہ سب نہیں کرانا ہے ۔ بس کیلیں جڑ دو اس پر ۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے ۔"

پھر اُس کے سامنے رکھے چمڑے پر روپے کا سکّہ رکھ کر کہا —"چار آٹھ آنے جو لینے ہیں لے لو ۔"

بوڑھے نے جوتے کا پھر سے جائزہ لیا اور پھر جیسے ہمدرد بن کر بولا —"میری رائے یہی ہے ۔ پوری مرمت کرا لو ۔ جوتا کئی مہینے اور چل جائے گا ۔"

بات اصل میں یہ ہے ۔ چاند رام اس کے پاس زنگ آلود لوہے کی کرسی پر ٹک کر بولا ۔ میرے پاس یہی ایک روپیہ ہے ۔ اٹھنی واپس کر دو گے تو رکشا میں گھر تک پہنچ جاؤں گا ۔

بوڑھے موچی نے ایک طرف رکھا ہوا بیڑی کا بنڈل اٹھایا اور بڑے اطمینان سے اسے سلگا کر بولا — شاید بس چلاتے ہو ۔

نہیں ٹکٹ بانٹتا ہوں ۔

لو بیڑی پیو ۔

اُس نے ایک بیڑی لے لی اور اس کے ہاتھ سے جلتی ہوئی سلائی بھی ۔ پھر ایک لمبا کش لے کر کھانسنے لگا ۔

تنخواہ میں سے کچھ بچتا و چتا نہیں ورنہ نیا جوتا ہی خرید لیتا۔

بوڑھے نے اس کی بات بڑے دھیان سے سنی ۔ اسے سر سے لے کر پاؤں تک گھورا بھی اور بیڑی کی راکھ گرا کر بولا ۔ نئے نئے آنے لگتے ہو!

جی ۔ دو ایک مہینے ہوئے ہیں ابھی ۔

رہتے کہاں ہو ؟

ادھر فرہٹی کے پیچھے ایک پرانی بستی میں ۔

فرہٹی تو بہت دور ہے بابو ۔

ہے تو ۔ کبھی کبھی بس بھی مل جاتی ہے ۔ اسٹاف سے کچھ نہیں چارج کرتے ۔ ورنہ دیر سویر پیدل بھی چلنا پڑ جاتا ہے ۔

بیڑی ختم کر کے بوڑھے نے اس کے جوتے کو پھر ہاتھ میں لے لیا ۔ اسے پھر الٹ پلٹ کر دیکھا ۔ پھر جلدی جلدی ایک مضبوط پکے چمڑے کا ٹکڑا کاٹ کر تلہ اور ایڑی بنانے لگا ۔ چاند رام پہلے تو چپ چاپ دیکھتا رہا ۔ جب وہ نئے

تلے کی سلائی کرنے لگا تو اس سے نہیں رہا گیا ۔ میں نے صرف کیلیں لگانے کو کہا تھا ۔

بوڑھے نے ایک شوخ تبسم دکھایا ۔ روپیہ اُٹھا کر اُسے واپس کر دیا اور بولا ۔

جب پیسے بنیں دے جانا ۔ میں ابھی تھوڑے ہی مانگ رہا ہوں ۔

لیکن تم تو مجھے ـــ

ہاں میں تمہیں نہیں جانتا ۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا ! لیکن مجھے بھروسا ہے تم میری مزدوری مار کر نہیں بیٹھ جاؤ گے ۔ میں چہرہ دیکھ کر پہچان جاتا ہوں ۔ اور پھر میں تو کاریگر ہوں ۔ اپنے کام اور محنت سے مجھے پیار ہے اسی لئے مجھے میری مزدوری ہمیشہ مل جاتی ہے ۔ ہفتے مہینے کے بعد ـــ کبھی کبھی سال کے بعد بھی ۔

اُس نے چاند رام کو اس کے دونوں جوتے مرمت کر کے پہنا دیئے ۔ پالش وغیرہ کر کے خوب چمکا بھی دیئے تھے ۔ بالکل نئے سے ہو گئے تھے ۔ چاند رام بوڑھے موچی کے اخلاق سے اسقدر متاثر ہوا کہ اس سے اس کا شکریہ ادا کرتے بھی نہ بن پڑی ۔ بس اس کی آنکھیں احسان مندی کے جذبے سے لبریز ہو گئیں ۔ وہ ہر روز اس کے پاس جانے لگا ۔ ڈیوٹی سے واپسی پر اس کے پاس تھوڑی دیر ضرور بیٹھ جاتا ۔ کبھی بیڑی پینے اور کبھی بیڑی پلانے ۔ اُس کے ساتھ باتیں بھی کرتا ۔ اس کی بھی سُنتا ۔ اُن کی باتیں بیہودہ مذاق ، گالیوں ، حقارت اور جھوٹ سے بالکل پاک ہوتی تھیں ۔ بس اسٹیشن کی دل شکن فضا سے باہر یہی بڈھا موچی اس کا حقیقی دوست بن گیا تھا جس سے اسے بے پناہ ہمدردی ملتی تھی ۔ اگرچہ وہ خود اسے کبھی کچھ نہ دے سکا ۔ اس نے چاند رام کو نہ صرف قلبی راحت اور ذہنی سکون بخشا بلکہ اسے ایک باپ جیسی شفقت بھی دی ۔ نئے سے نئے بوٹ بنا کر دیئے جن کی پوری قیمت کبھی نہیں لی ۔ یہ بات اگرچہ ایک اچھے کاریگر کے خلوص کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے مترادف تھی لیکن وہ کرتا بھی کیا ! بوڑھا اس کی بات ہی نہیں سنتا تھا ۔ بلکہ وہ تو اکثر و بیشتر اس کے لئے بیڑی سگریٹ بھی خرید کر لے آتا تھا ۔ ایک مرتبہ وہ بیمار پڑ گیا تو بوڑھا اپنا کھوکھا بند کر کے کئی روز تک اس کی تیمارداری کرتا رہا ۔ دوا دارو کا خرچ بھی اس نے اپنے پاس سے ادا کر دیا تھا لیکن اس کی حد سے بڑھی ہوئی نوازشوں سے چاند رام رفتہ رفتہ دبنے لگا ۔ اسے بیوقوف سمجھنے لگا ۔ اسی لئے اس کے پاس آنا جانا بھی کم کر دیا ۔ شراب اور جوئے کی عادت نے اسے نئے دوست دیدئے ۔ بڈھا کبھی اسے ڈھونڈتا ہوا آنکلتا تو وہ منہ پھیر لیتا تھا۔

ڈیڑھ سال پہلے چاند رام اپنے ماحول کی گھٹی گھٹی زندگی سے بھاگ کر اس شہر میں ایک مثالی زندگی بسر کرنے کے ارادے سے آیا تھا ۔ اس نے ایسے ایسے طور طریقے سیکھ لئے جو نچلے طبقے کی شناخت تھے ۔ زیادہ محنت ، کم اجرت ، بے ایمانی ، بددیانتی ، مایوسی ، خوف ، شراب نوشی ، گالیاں ، قہقہے اور روزمرہ کا کولہو کے بیل جیسا ایک معمول ۔ ناانصافی برداشت کرنے کا اذیت ناک صبر ۔ !

اور آج وہ مہاتما گاندھی کے مجسمے کے سائے میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا ، آٹھ بجیں تو وہ بوڑھے موچی کے پاس جاکر

ایک نیا۔ تالا دھار لے لے ۔ بچتے پیسے بازار میں اونے پونے بیچ کر تھوڑی سی شراب پی سکے ۔ وہ اپنی قیام گاہ پر نہیں لوٹنا چاہتا تھا ۔ وہاں جانے سے اسے ڈر لگتا تھا ۔ آج ہی تو اس کی ماں کی ارتھی اٹھائی گئی تھی ۔ وہاں اس کی ڈھارس بندھانے والا کوئی بھی تو نہیں تھا ۔ شراب پی کر تو وہ دندناتا ہوا وہاں جا سکتا تھا ۔

اسٹیشن کے کلاک نے دس بجائے تو وہ چونک گیا ۔ جلدی سے اٹھا ۔ بوندا باندی ابھی تک جاری تھی ۔ اس نے قمیص پتلون سے باہر کھینچ لی اور آہستہ آہستہ پٹرول پمپ کی طرف چلا ۔ اس نے دور سے دیکھ لیا بوڑھا ابھی ابھی لوٹا ہے ۔ کھوکھے کا تالا کھول رہا ہے ۔ اس کے اونچے مریل جسم پر صرف ایک دھوتی ہے ۔ اس کا منڈا ہوا سر اور پتلی لمبی چوٹی جو ہمیشہ کھڑی رہتی ہے ۔

چاند رام نے اپنے پاؤں میں پہنے ہوئے جوتے اتار کر پٹرول پمپ کے قریب ایک خالی ڈرم کے پیچھے چھپا دیئے اور ننگے پاؤں چل کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا ۔ پہلے دونوں ہاتھ جوڑے پھر مسکرایا پھر جھجکتا ہوا بولا ۔

مجھے پہچانا ؟

ہاں بے ! بوڑھے کا لہجہ خلاف معمول کرخت تھا ۔ اس نے اسے ایک ہی ثانیے کے لئے سر گھما کر دیکھا اور پھر تالا کھولنے میں لگ گیا ۔

میرے سر پر دس جوتے مارو آج تو !

چاند رام نے اس کے آگے سچ مچ اپنا سر جھکا دیا ۔

بوڑھا تالا کھول کر پلٹ آیا ۔ وہ کسی قدر لنگڑا بھی رہا تھا ۔ اس کے ایک ٹخنے پر پٹی بندھی ہوئی تھی ۔ لیکن وہ اس کے اوپر جیسے ایک اونچے پیڑ کی مانند تنا ہوا کھڑا تھا ۔ اس نے پہلے سے زیادہ ترش و تیز ہو کر پوچھا ۔ کیا بولا ؟ پھر سے تو بول ذرا !

میں نے کہا ، میرے باپ ، میرے سر پر دس جوتے مارو ۔ میں اسی قابل ہوں ۔ چاند رام کی آواز پہلے سے زیادہ نحیف ہو گئی ۔

کیوں ؟

اس لئے کہ میں تمہارا گنہگار ہوں ۔

کیسے ؟

تم جیسے مہربان نے مجھ پر کتنے احسان کئے ۔ میری بیماری میں مدد کی ۔ کتنی بار بھوسے کے مول نئے نئے جوتے بنا کر دیئے ۔ پھر بھی میں نے یہاں آنا چھوڑ دیا ۔ یہ میری حرامزدگی نہیں تو اور کیا ہے ؟ میں کہتا ہوں مجھے جوتے مارو ۔ جی بھر کے سزا دو ۔

بوڑھے موچی نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گریبان پکڑ لیا ۔ اس کی گردن کو زور سے جھٹکا دے کر اس کا سر اوپر اٹھا دیا

اور پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا ۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ تم وہ سب نہیں بھولے ــ ورنہ بہت سے لوگ تو مجھے پہچانتے سے بھی کترا جاتے ہیں ۔ میں ابھی ابھی کئی دروازے کھٹکھٹا کر لوٹا ہوں ۔ جن لوگوں کو میں نے اپنا کڑا پسینہ بہا کر تحفے پیش کئے تھے انہوں نے میری کوئی فریاد نہیں سنی ۔ پر مجھے وشواس ہے تم ایسا نہیں کرو گے ۔ اگر کرو گے تو میں تمہارا سر پھوڑ دوں گا ۔ ابھی ، اسی جگہ ۔ نکال میرے روپے ۔ میری ساری محنتوں کا صلہ ! میں اپنے سارے احسان آج واپس لیتا ہوں ۔ احسانوں پر سے میرا وشواس اُٹھ گیا ہے ۔ اس زمانے میں احسان کی کوئی قیمت نہیں رہ گئی ۔ لا ، نکال جو کچھ بھی تیرے پاس ہے ۔ مجھے اپنے پاؤں کا علاج کروانا ہے ۔ یہ روز بروز گلتا جا رہا ہے ۔ درد کے مارے کام بھی نہیں کر پاتا ۔

چاند رام کی اِٹی سِٹی گم ہو گئی ۔ اس کی سانس جہاں تھی وہیں رک گئی ۔ پھر بھی اس نے بڑی مشکل سے اپنے حواس جمع کئے اور ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑا لیا اور وہ وہاں سے بگ ٹٹ بھاگ کھڑا ہوا ۔ ننگے پاؤں ، کیچڑ اور پانی میں چھینٹے اڑاتا ہوا ۔ ایک تاریک گلی میں جو ذرا فاصلے پر تھی رُک کر ہانپنے لگا ۔ بارش سے بچنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی وہاں ۔

اچانک اس کے پاس ، بہت قریب سے ایک سایہ اُبھرا ۔ اُس کی چمکتی ہوئی آنکھوں سے اندازہ ہوا کوئی عورت ذات ہے ۔

اُسی عورت ذات نے آگے بڑھ کر اس کے بازو کو چھوا اور پھر فوراً ہی اس کی مہین سریلی ہنسی کی آواز سارے میں گونج سی گئی ۔

بڈھا تمہاری جان لینا چاہتا تھا نا ؟

ہاں ۔ وہ ابھی تک ہانپ رہا تھا ۔ میرا تو دم نکل چلا تھا ۔

وہ پھر ہنس پڑی ۔ لیکن وہ تمہاری جان نہیں لے سکتا اس کی انگلیوں میں اتنا زور ہی نہیں رہا ۔ میں جانتی ہوں ۔

تم اسے کیسے جانتی ہو ؟

وہ میرا باپ ہے ۔ وہ پھر ہنس پڑی ۔

وہ تمہارا باپ ہے ؟ جھوٹ ۔ اس کی تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے میں جانتا ہوں ۔

ارے نہیں ۔ یقین کرو وہ میرا باپ ہی ہے ۔ لیکن وہ میرے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاتا ۔ پچھلے چار پانچ سال سے وہ میری بھی جان لے لینا چاہتا ہے ۔ جب بھی اس کے سامنے جاتی ہوں لیکن وہ کچھ نہیں کہہ پاتا ۔ مجھے دیکھتے ہی بس سر جھکا لیتا ہے ۔

چاند رام بُت سا بنا کھڑا رہ گیا ۔ اُس عورت نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا ــ چلو یہاں سے جلدی چلو ۔ سامنے

۔۔۔ سے والے آرہے ہیں ۔ ان کی تو صورت دیکھتے ہی میری جان نکل جاتی ہے ۔ تمہیں تو ماں بہن کی سنا کر بھگا دیں گے پر مجھے کسی جگہ لے جا کر رات بھر مفت میں میری ہڈیاں چچوڑیں گے

پر تم ان سے ڈرتی کیوں ہو ؟ تمہارا نام کیا ہے ؟

وہ لکشمی اسٹور کے برآمدے میں لوہے کے ایک بڑے سے پرانے بینچ پر بیٹھ چکے تھے جہاں روشنی کی کوئی کرن نہیں پہنچتی تھی ۔

تم مجھے نہیں جانتے ۔ میں لکھمنیا ہوں ۔ وہ اس کے قریب سرک آئی ۔ اس کے بھیگے ہوئے بالوں کو چھو کر بولی ۔ اف ! کتنے ٹھنڈے ہیں تمہارے بال ! کافی دیر سے بارش میں گھوم رہے تھے ؟

وہ اپنے ڈوپٹے سے اس کا سر پونچھنے لگی ۔ بھیگ تو میں بھی بہت گئی ہوں ۔ پر خیر ۔

چاند رام کو اس کے جسم میں کچھ حرارت محسوس ہوئی ۔ اس کا بدن بہت گداز تھا ۔ وہ اب خود بھی تھوڑا اور اس کے پاس سمٹ کر بیٹھ گیا ۔ لکھمنیا نے اپنے آپ ہی اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیا ۔

تمہیں ۔ دی لگ رہی ہوگی ۔ ہے نا !

وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی ۔ اس کے سینے پر اپنا سر ٹکا دیا ۔ چاند رام کے نتھنوں میں پہلی بار ایک نسوانی جسم کی خوشبو داخل ہوئی ۔ اس نے سوچا اسے اس وقت ایسے ہی ایک ساتھی کی ضرورت تھی ۔ لکھمنیا اسی بوڑھے موچی کی اولاد ہے ۔ اس انکشاف سے وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا ۔ لیکن اس کے دل سے بڈھے کے خلاف سارا جذبہ ختم ہوگیا ۔ اس نے ایک دوسری طرح کی جذباتیت میں مبتلا ہو کر لکھمنیا کو بتانا شروع کیا ۔

میرے ساتھی بہت کمینے ہیں ۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ ہمیشہ برا سلوک کیا ہے ۔ مجھے میرے منہ پر چمار کہکر بلاتے ہیں ۔ انہی سے بھاگ کر میں تمہارے باپ کے پاس چلا جاتا تھا ۔ اس کے پاس جا کر مجھے بڑی راحت مل جاتی تھی ۔ کیونکہ وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتا تھا ۔ بس یہی لگتا وہ میرا کوئی سگا ہو ۔ باپ جیسا ! لیکن پتہ نہیں کیوں آج میرے من میں اسی کے خلاف کھوٹ بھر گئی ۔ میں بھی تو ایک کمینہ ہوں ۔ بہت ہی ذلیل ۔ جس نے مجھے ہمیشہ سہارا دیا ۔ اسی کو میں نے لوٹنا چاہا ۔ دو گھونٹ دارو کی خاطر !

لکھمنیا نے اسے اور کچھ نہ کہنے دیا ۔ اس کے ہونٹ ہی جیسے سی دیئے اور بولی ۔ یہ بہت عجیب دنیا ہے ۔ کچھ لوگ خود کو چمار کہنے سے شرماتے ہیں ، کچھ باہمن کہلانے سے ۔ تم جانتے ہو میرا باپ باہمن ہے ۔ ہاں سچ ! پر کسی کو بتانا مت ۔ وہ کئی برسوں سے فٹ پاتھ پر بیٹھا جوتیاں گانٹھ رہا ہے ۔ اپنے گاؤں سے بہت دور آکر ۔ کیونکہ اسی سے اسے چار پیسے مل جاتے ہیں ۔

چاند رام کے لئے یہ ایک نیا انکشاف تھا ۔

پھر بھی تمہارا باپ کتنا اچھا ہے ! کاش وہ میرا بھی باپ ہوتا ! جی چاہتا ہے اس کے ساتھ اس کے کھوکھے میں پڑ کر

سو جایا کروں ۔ بستی میں میرا جی نہیں لگتا ۔ اب وہاں میرا رہ ہی کون گیا ہے ۔ ماں بھی آج پرلوک سدھار گئی ۔

لکھمنیا خاموش بیٹھی رہی ۔ چاند رام نے اس کے سڈول بازو کو چھو کر کہا ۔ کیا سوچ رہی ہو ؟

وہ کچھ جھجک کے ساتھ بولی ۔ مجھے میرے باپ نے اپنے کھوکھے کے علاوہ کوئی اور جگہ نہیں دی ۔ یہیں پل کر ، کھیل کود کر میں بڑی ہوئی ۔ فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی چیز کا تو کوئی بھی مالک بن سکتا ہے جو بھی ہاتھ بڑھا کر اٹھا لے ۔ تمھارا گھر تو اس کھوکھے سے اچھا ہو گا ! تم مجھے کیوں نہیں لے جاتے وہاں ؟

وہاں ؟ تم میرے ساتھ رہو گی ؟

لکھمنیا کوئی جواب دینے کے بجائے سسکنے لگی۔

کیوں روتی ہو تم ؟

میں ماری ماری پھرنے سے تنگ آ گئی ہوں ۔ تھک گئی ہوں ۔

صبح پانچ بجے ذرا ذرا روشنی پھیلی تو دونوں بر آمدہ چھوڑ کر سڑک پر آ گئے ۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہلی بار اُجالے میں دیکھا اور بڑے پیار سے ۔ لکھمنیا درمیانے قد کاٹھی کی ایک مضبوط سانولی عورت تھی ۔ بس ٹھیک ٹھیک ناک نقشہ ۔ چوڑا فراخ ماتھا اور ہرے رنگ کی چوڑی لونگ کی وجہ سے اس کی لمبی ناک کچھ کچھ متوازن سی نظر آتی تھی ۔ آنکھوں میں بے پناہ اداسی بھی بھری ہوئی تھی اُس کے ۔

چاند رام اسے دیکھ کر مسکرا دیا ۔ اُسے کبھی کبھی بس اسٹینڈ کے آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھ چکا تھا ۔ لیکن اس کی طرف خاص توجہ نہیں دی تھی ۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھوکھے کی طرف چلے ۔

بارش تھم چکی تھی ۔ سڑک ابھی گیلی تھی ۔ اخباروں والے سائیکلوں پر بنڈل لادے بھاگتے جا رہے تھے ۔ دودھ سے بھری ہوئی موٹریں بھی فراٹے سے جا رہی تھیں ۔ بوڑھا موچی ابھی تک اپنے کھوکھے کے نیچے ٹاٹ بچھائے لیٹا لیٹا کھانس رہا تھا ۔ وہ دونوں اس کے پاس جا کر پیروں کے بل بیٹھ گئے ۔

اب باہر آ جاؤ ، صبح ہو گئی ہے ۔

تم پھر آ گئے ؟ بڈھے موچی نے غرا کر پوچھا ۔

ہاں ۔ میرے ساتھ لکھمنیا بھی آئی ہے ۔ دیکھو تو ۔

دونوں کو ہنستا دیکھ کر بڈھا کھانسنا بھول گیا ۔

چاند رام بولا — میں تو تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اب مجھے اپنا داماد بنا لو ۔ لکھمنیا کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے ۔

میری بیٹی کو کوئی اعتراض نہیں ہے ؟ وہ اسی طرح غراتا ہوا تیزی سے سرک کر باہر آ گیا ۔ تم چمار ہو کر ایسی بات کہتے ہو ؟ جانتے ہو تم کس کے ساتھ بات کر رہے ہو ؟

اس کے اندر سے اچانک ایک اونچی ذات والا نکل آیا تھا ۔ وہ بڑی بے چینی سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھنے لگا ۔

لکھمنیا جو اس وقت تک خاموش رہی تھی بول اٹھی — کئی چماروں کے ساتھ رہنے سے تو یہی اچھا ہے کسی ایک کا ہاتھ تھام لوں ۔

یہ کہتے کہتے وہ رو دی ۔

یہ سن کر بھی بوڑھے موچی کی بے چینی کم نہ ہوئی ۔ لیکن وہ جلدی سے لوٹا اٹھا کر اور کان پر جنیو لپیٹتا ہوا پٹرول پمپ کے پیچھے والے میدان کی طرف نکل گیا ۔

تنکے کا سہارا

بانو قدسیہ

اندر گھپ اندھیرا رہتا ہے ۔ کبھی کبھی چوکیدار کی لمبی سیٹی سنائی پڑتی ہے اور پھر لمبی چپ!

وہ ساتھ والے کمرے میں چلنا شروع کر دیتا ہے ۔ بڑی احتیاط کے ساتھ قدم دھرتا ہے ۔ ہمارے کمروں کے درمیان موٹی دیوار ہے جس میں کوئی دروازہ ، کھڑکی یا روشندان نہیں ۔ لیکن میں اپنے پلنگ پر لیٹا لیٹا ، آنکھیں بند کئے اسے دیکھ سکتا ہوں ۔ وہ پلنگ کی پٹی پکڑ کر دھیان سے بستر چھوڑتا ہے ۔ پھر کچھ دیر فرش پر بچھی دری پر کھڑا رہ کر اپنی آنکھوں کو اندھیرے کا عادی کرتا ہے ۔ اسے خیال رہتا ہے کہ کہیں شور نہ ہو ۔ اندھیرے میں سرہانے تلے سے ٹارچ نکال کر وہ جوتے تلاش کرتا ہے ۔ پھر سر پر اونی ٹوپی پہنتا ہے ۔ گرمی ، سردی ہر موسم میں یہی کیمل کلر کی ٹوپی سر پر رکھتا ہے ۔ سر پر ٹوپی پہننے کے بعد وہ غسلخانے جاتا ہے اور سوچتا رہتا ہے وضو کے لئے نلکا چلاؤں یا مسح کر لوں ۔۔۔ اسے خیال رہتا ہے کہ پانی کے شور سے کہیں میری نیند نہ خراب ہو جائے ۔ میں دیکھ سکتا ہوں کہ اب اس نے تہجد کے لئے جائے نماز بچھایا ہے ۔ اس کے ہونٹ بدبداتے ہوئے میرے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں ۔ وہ ہر وقت میرے لئے دعائیں مانگتا ہے ، بے اثر ، کمزور ، بزدلانہ دعائیں ۔۔۔ اسکی دعائیں کوسمک شعور کو چیر کر اوپر اٹھنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں ۔ جس طرح مینڈک بڑی ہمت سے جست بھر کر اپنی پہلی جگہ سے کچھ ہی دور جا بیٹھتا ہے ایسے ہی وہ پہلی دعا سے کراہ کر تھوڑی دیر بعد اپنی دعا کا بم گولا اگل دیتا ہے — نہ کہیں تباہی آتی ہے نہ کہیں روئیدگی جنم لیتی ہے — صرف اس کی دعاؤں کا دھواں کمروں میں گھومتا رہتا ہے ۔

اس کا سارا دن مجھ سے چھپنے اور میرا تعاقب کرنے میں گزرتا ہے ۔ ادھ کھلے دروازوں سے وہ میرا جائزہ لیتا ہے ۔ آدھا سر جھکا کر میری آواز سنتا ہے ۔ ہم دونوں کے علاوہ اس فلیٹ میں کوئی نہیں رہتا ۔ اس کے ساتھ ایک مردہ کائنات چلتی ہے ۔ میرے اردگرد کئی بھوت آدھے سوئے آدھے جاگے پہرہ دیتے ہیں ۔ وہ میرے قریب آتے ، پاس بیٹھتے ، بات کرنے کے بہانے تلاش کرنے میں وقت گزارتا ہے میں اس سے چھپ جانے ، پرے رہنے ، جواب نہ دینے کے بہانے ڈھونڈتا ہوں ۔ جب کھانے کے لئے بلانے آتا ہے تو اس کے چہرے پر خوشی ہوتی ہے ۔ وہ آگے پیچھے ہوتا ہے لیکن اطلاع نہیں دے سکتا ۔ ایسے میں اس کے پاؤں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں ۔ لگتا ہے کہ گر جائے گا لیکن پھر وہ سنبھل جاتا ہے ۔

پتہ نہیں وہ ہر بار کیوں سنبھل جاتا ہے؟

میرے قریب آکر وہ اپنی کیمل ہیر ٹوپی کو آنکھوں تک نیچے کر لیتا ہے جیسے ٹوپی ہتھیار ہو جس سے وہ اپنے آپ کو محفوظ کر رہا ہو ۔ بڑی دیر تک وہ بغیر دانتوں والے منہ میں کچھ بدبداتا ہے ۔ شائد دعا مانگتا ہے ۔ اپنے لئے

حفاظت کی دعا یا پھر میری فلاں کے لئے منت سماجت۔

اس کی دعائیں پڑھتے ہوئے پیر اشوٹ کی طرح اڑ کر کہیں نہیں جاتیں۔ وہ سوچتا رہتا ہے۔ میں اسے بات کرنے کا اذن نہیں دیتا۔ کتاب سے نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ حروف پر نظریں رکھتے ہوئے میں اسے دیکھتا ہوں۔ وہ میری سرد مہری کے آگے گونگا ہوتا چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد کان میں انگلی پھیرتا ہے۔ میں کراہت سے آنکھیں بند کرتا ہوں۔ وہ لوٹ جانے کا عزم کرتا ہے اور لوٹتے ہوئے بولتا ہے۔ کسی دیوار سے مخاطب ہوتا ہے۔ ہوا میں چہرہ کر کے کہتا ہے۔

کھانا تیار ہے —

اچھا —

ٹھنڈا ہو رہا ہے — وہ اعتراف جرم کرتا ہے۔

اچھا ------

تمہارے لئے مرغ پکا ہے — وہ اچھے کھانے کو بہت بڑی تفریح سمجھتا ہے۔

سن لیا ہے —

وہ مڑتا ہے۔ اس کے پاؤں سلیپر میں پھسلنے لگتے ہیں۔

آ جاؤ — وہ منت سے کہتا ہے۔

لیکن میں اس کا حکم برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس کی کسی قسم کی مداخلت کا روادار نہیں۔ ”آپ خود نہ آیا کریں۔ ملازم کو بھیج دیا کریں —

اچھا ---- بجھی آواز میں کہکر وہ چلا جاتا ہے۔ میرے کمرے سے ملحق بیلکونی میں کھڑے کھڑے وہ گہری سوچ میں الجھ کر کھڑا رہتا ہے۔ کہیں جا نہیں سکتا۔ بڑی دیر تک میں اپنی کتاب چھوڑ کر باہر نہیں نکلتا۔ میں جانتا ہوں وہ کم کھاتا ہے اور لو بلڈ پریشر کی وجہ سے اسے کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ لیکن میں کبھی اس کی اطلاع پر جلدی نہیں اٹھتا۔ کھانے کی میز پر میں اسے اچھی چیزیں کھانے پر آمادہ نہیں کرتا۔ وہ دال میں بھگو بھگو کر روٹی کھاتا ہے۔ سامنے والے دانتوں کے بغیر اس کا بلتا منہ اور بھی مکروہ لگتا ہے۔ وہ اچھے سالن کا ڈونگا میرے آگے رکھتا رہتا ہے لیکن میں لوٹا کر ڈونگا کبھی اسے پیش نہیں کرتا۔ میں اسے کوئی چیز دے کر خوش نہیں ہوتا۔ وہ کبھی شکایت نہیں کرتا۔ بلکہ مجھے کھلا کر خوش ہوتا ہے اس کے اس رویے سے مجھے اور بھی کوفت ہوتی ہے۔ میں اسے اس خوشی کی بھی سزا دینا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے شبہ ہو جائے کہ وہ میرے کھانے میں خوش ہے تو میں ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔ اپنے رویے کی سختی سے اس کی ساری خوشی ختم کر دیتا ہوں۔

آپ یہ ڈونگے میرے آگے نہ رکھا کریں۔ میرے پاس ہاتھ ہیں میں اپاہج نہیں ہوں میں چیزیں اٹھا سکتا ہوں۔

وہ ڈر جاتا ہے ۔

میرے سامنے بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا ۔ گڑبڑا کر وہ پھر دال میں روٹی بھگو کر کھانے لگتا ہے ۔ اس کی آنکھوں میں خوف تیرنے لگتا ہے ۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پھر اس کی محبت غالب آجاتی ہے ۔ وہ چند لمحے پہلے کی باتیں بھلا کر ڈونگا پھر میرے آگے رکھتا ہے ۔

مرغ ہے ــ کھالو ــ

آپ نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے ۔۔۔۔ میں اٹھتے ہوئے کہتا ہوں ۔ کھانا ادھورا چھوڑ کر میں اس کی گردن پر شکنجہ اور کس دیتا ہوں ۔

ہر بار وہ سمجھ نہیں سکتا کہ اب کیا ہوا ہے؟

جو کچھ زندگی نے آپ کے ساتھ کیا کم تھا ۔ اگر میں زندگی کی جگہ ہوتا تو اور بھی کرتا ــ وہ مجھ سے اتفاق رائے کرتا ہے اور دال میں بھیگی روٹی کھانا چھوڑ دیتا ہے ۔

آپ نے میری ساری زندگی تباہ کر دی ۔ ہر بات میں مداخلت ۔۔۔۔ ہر بات میں دخل در معقولات ۔۔۔۔ ہر چیز میں ٹانگ اڑانا ۔۔۔۔ میں دروازہ پٹاخ سے بند کرتا ہوں وہ بغاوت سے نا آشنا رہتا ہے ۔ بددعا نہیں دے سکتا ۔ خود ترسی میں رو نہیں سکتا ۔ کسی سے میرے خلاف بات نہیں کرتا ۔ میری محبت اس کے گلے میں زنجیر کی طرح بندھی ہے اور اس زنجیر سے گھسٹتا رہتا ہے ۔ اس کے صبح و شام اسی محبت کے تابع گزرتے ہیں ۔ اس کی بے ثمر زندگی کا مرکز ثقل میری ذات ہے ۔ ایک مدت سے وہ اپنی زندگی بسر نہیں کر پایا کیونکہ اشتباہ کے زیر نظر وہ سمجھتا ہے کہ وہ میں ہوں ۔

میری موجودگی میں وہ میرے کمرے میں کم آتا ہے لیکن جب میں ٹیوشنیں پڑھانے نکل جاتا ہوں میری تمام چیزیں ٹھکانے پر آجاتی ہیں ۔ اسے باتیں کرنے کا شوق ہے لیکن وہ میرے کمرے میں آکر بات نہیں کر سکتا ۔ دروازے میں رک جاتا ہے اور کیمل کلر کی ٹوپی آنکھوں تک نیچی کر کے اطلاع دیتا ہے ۔

یہ عبدل چور ہے ــ

جی تو پھر؟ ــ

کل یہ سیر چینی کے لئے پیسے لے کر گیا اور صرف آدھ سیر چینی لایا ــ

بدل لیں ۔۔۔۔۔

ہاں لیکن کام اچھا کرتا ہے ــ

پھر شکایت نہ کریں ــ

ہاں وہ تو ہے ــ

وہ ڈھیلے تان کو بیکار کرکے جھنجھلنے لگتا ہے پر جاتا نہیں ۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں اس کا راستہ ، بات ، معاملہ نہ ٹوکوں لیکن وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بچوں کی طرح مجھے بلانے کی کوشش کرتا ہے ۔ اس کا رویہ کبھی عاجزانہ اور کبھی بزدلانا ہوتا ہے ۔ نارمل طریقے سے کمرے کے اندر آکر وہ بات نہیں کر سکتا ۔ بہت سی باتیں ، واقعات اس کے دماغ میں گھومتے رہتے ہیں ۔ وہ کئی واقعات کی مجھ سے تصدیق کرنا چاہتا ہے ۔ کچھ لوگوں کے نام اس کے ذہن سے اتر چکے ہیں ۔ کئی الفاظ وہ غلط استعمال کرتا ہے ۔ وہ پوچھنا چاہتا ہے کہ اس کی بیوی کس بیماری سے پاگل ہوئی تھی؟ وہ نہیں جانتا کہ اس کے باقی دو بچے کہاں ہیں ؟ اسے کچھ تاریخیں بھی پریشان کرتی ہیں ۔ وہ اپنی گزری زندگی کو کسی تسلسل کسی آرڈر میں لانا چاہتا ہے ۔ وہ سمجھنا چاہتا ہے کہ زندگی کے سفر میں اس کے ساتھ کون کون تھا ؟ کس جگہ کس موسم میں کون بچھڑ گیا ؟ جب باتیں کرنے کی خواہش غالب آجائے تو وہ میرے دروازے تک آجاتا ہے میں اس کے آنے پر اپنی طبیعت کو حاضر نہیں پاتا ۔

جب میں پہلی بار قید گیا تو وہ بیمار تھی
میں تاریخ کی کتاب سے نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا
اسے کیا بیماری تھی؟ ...

میں اس کی بات کا جواب نہیں دیتا ۔ اپنے کسی سوال کا کوئی جواب اسے نہیں آتا ۔ وہ کیوں کیسے کہاں کا جواب جانتا ہی نہیں اسی لئے سارا دن الجھتا پھرتا ہے ۔

میرا رویہ افسرانہ ہے ۔ میں کبھی اس کی طبیعت کا نہیں پوچھتا ۔ کبھی کبھی مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی بوڑھی ہڈیاں دکھتی ہیں اور وہ بخار میں مبتلا ہے ۔ مجھے اس پر ترس نہیں آتا ۔ پچھلے چند سالوں میں وہ اپنا ہی بھوت بن گیا ہے ۔ اس کا سوکھا چہرہ چھوہارے کی طرح جھریوں سے اٹ گیا ہے ۔ ہاتھوں کی رنگت سرمئی مچھلی جیسی ہے ۔ اس کے دبلے پن سے خوفزدہ ہو کر میں کئی بار وٹامنز کی گولیاں لایا ہوں لیکن اسے نہیں دے سکا ۔ محبت کے ایک لفظ سے لے کر وٹامن کی ایک گولی تک میں اسے کچھ نہیں دے سکتا ۔ میرا پریم پانی چڑھائی چڑھنا نہیں جانتا ۔ کبھی کبھی وہ اپنی شیشیاں بوتلیں بیلکونی کی روشنی میں لا لاکر دیکھتا ہے میں اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ اپنی کسی تکلیف کا علاج کرنا چاہتا ہے ۔ لیکن فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کونسی دوا اس کے درد کا علاج ہے ۔ آخر میں وہ اپنی پسند ناپسند کو ترجیح نہیں دیتا اور کوئی سی دوا پی کر راضی ہو جاتا ہے ۔

سال میں کسی ایک دن میں چلتے چلتے پوچھتا ہوں — "آپکی طبیعت کیسی ہے؟"

وہ یکدم کھل جاتا ہے اور میری طرف پُر اشتیاق نظروں سے دیکھتا ہے ۔

رات کو میری آنکھ کھل جاتی ہے میں سو نہیں سکتا ---- گلی کا چوکیدار بہت اونچی سیٹی بجاتا ہے — میرے جوڑوں میں درد ہوتا ہے —

میں سوال کرنے کے بعد جواب کا انتظار نہیں کرتا — لیکن وہ جواب دیتا رہتا ہے ، اپنی خوراک ، اپنی بیماری ، اپنی دوائیوں کا ذکر کرتا رہتا ہے ۔ میں جا چکتا ہوں لیکن اس کی بات جاری رہتی ہے ۔

یہ بلاک جس کی دوسری منزل پر ہم دونوں رہتے ہیں اینٹوں کا بنا ہوا ہے ۔ اینٹوں پر کسی زمانے میں گلابی مائل رنگ تھا لیکن اب آتے جاتے موسموں نے اس کی رنگت کے حواس گم کر دیئے ہیں ۔ یہ تین بلاکوں کا سلسلہ ہے جس میں ہم دونوں درمیانے بلاک میں رہتے ہیں ۔ اس کی تعمیر عام سرکاری عمارتوں کی طرح سر سے بلا ٹالنے کے فارمولے پر ہوئی ہے ۔ سارے بلاک میں پانی کی ٹونٹیاں رستی ہیں ۔ بجلی کی تاریں دیواروں سے ڈھلک آئی ہیں ۔ بیلکونی کا جنگلا ہلتا ہے ۔ دیواروں سے چونا جھڑتا ہے ۔ سارے بلاک والے جانتے ہیں کہ پرانے سوئچ شاک دیتے ہیں ۔ یہ تینوں بلاک حکومت نے سرکاری ملازمین کے لئے بنوائے تھے لیکن ترقی پا کر ہر ملازم پگڑی لے کر اپنا فلیٹ بیچ گیا اور اس طرح آہستہ آہستہ ان بلاکوں میں دوکاندار ، مہاجر ، دیہاتی ، ریڑھی چھابڑی والے آباد ہو گئے ۔ میرے باپ نے بھی اس فلیٹ کو دوسری مرتبہ قید جانے سے پہلے حاصل کر لیا ۔ قید جانے سے پہلے وہ ایک چھوٹی سی دوکان میں مرغیوں کی فیڈ بیچتا تھا ۔ وہ آج تک نہیں جان پایا کہ وہ دوسری مرتبہ قید کیوں ہوا تھا؟ تھانیدار نے اسے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ ملاوٹ کرتا ہے ۔

وہ سمجھ نہیں سکا کہ مرغیوں کی فیڈ میں کوئی اپنی طرف سے مزید کیا ملا سکتا ہے؟

اس فلیٹ کے آگے ایک بڑا وسیع پارک ہے اور تین بلاکوں کے بعد ایک بازار ہے جو دن بہ دن بڑھ رہا ہے ۔ پارک بھی وقت کے ساتھ ساتھ خوبصورت ہوتا جاتا ہے ۔ پارک کی دوسری جانب عالی شان کوٹھیوں کا سلسلہ ہے ان کوٹھیوں کی پشت پارک کی طرف ہے ہمارے فلیٹ سے یہ کوٹھیاں نظر نہیں آتیں ۔ پارک کے درختوں نے کوٹھیوں کی پشت کو بھی ڈھانپ رکھا ہے ۔ جس طرح اس کے منہ میں پچھلے دانت دکھائی نہیں دیتے ۔ صرف جب وہ منہ کھولتا ہے تو ایک غار سی کھل جاتی ہے پچھلے دانتوں سے وہ کھانا چبا سکتا ہے کبھی کبھی مجھ سے چھپ کر بیلکونی کے پاس موڑھے پر بیٹھ جاتا ہے پھر بڑے اہتمام سے کوئی کرکری چیز کھاتا ہے ۔ رسک ، مونگ پھلی ، چپس ، جب وہ کھاتا ہے تو بیلکونی سے شور میرے کمرے تک آتا ہے ۔ میری پڑھائی میں ہرج ہوتا ہے ۔ مجھے احتمال ہے کہ وہ مجھے ستانے کے لئے موںڈھے پر آ بیٹھا ہے ۔

میں سیڑھیاں اتر کر پارک میں چلا جاتا ہوں ۔ لیکن اس کے کھانے کی آواز ہر جگہ میرا تعاقب کرتی ہے ۔ میں سوچتا ہوں اسے منع کروں کہ وہ ایسی چیزیں نہ کھایا کرے ۔ لیکن جانتا ہوں وہ عمر کے ایسے حصے میں ہے جب کچھ ماننا ، یاد رکھنا اس کے بس کی بات نہیں ۔

اس سے بچنے کے لیے میں پارک میں جاتا ہوں ۔ وہ بھی اپنے آپ کو چھپانے کے لئے کبھی کبھار اس بنچ پر جا بیٹھتا ہے جو بیلکونی سے نظر آتی ہے ۔ جب میرے لئے یہ گھر تنگ ہوتا ہے تو پارک مجھے کھلی ملتی ہے ۔ میں سردیوں

میں کئی گھنٹے ادھر بینچ پر گزارتا ہوں وہ میرے تعاقب میں آنا چاہتا ہے لیکن نہیں آسکتا تو مونڈھے پر بیٹھ کر جنگلے کے پیچھے سے مجھے دیکھتا رہتا ہے اور کیمل کلر کی ٹوپی ٹھیک کرتا رہتا ہے ۔ اس کی نظریں مجھے اپنی کمر پر محسوس ہوتی ہیں ۔ اس کے بدبداتے ہونٹ دکھائی پڑتے ہیں جن سے بے اثر ، بزدلانا دعائیں نکلتی ہیں ۔ وہ میرے لئے کچھ نہیں کر سکتا ۔ اس لئے دعائیں مانگتا ہے اور مدد کے لئے غیبی طاقتوں کو بلاتا ہے ۔

جب کبھی میں باہر سے آتا ہوں وہ میرے کمرے میں آنا چاہتا ہے ۔ وہ کچھ سوال پوچھ کر شانت ہو سکتا ہے ۔ میں کہاں گیا تھا؟ کیا میں ٹیوشن پڑھا کر آیا ہوں؟ بازار میں کون ملا؟ چھوٹے چھوٹے سوال اس کے دماغ میں کھلبلی مچا دیتے ہیں ۔ وہ اپنے سوالوں کا کوئی جواب نہیں جانتا ۔ مجسم استفسار وہ دہلیز تک آجاتا ہے —

بڑی دیر کر دی —

میں اپنی کتابیں میز پر رکھتا ہوں ۔

ٹیوشن پر گئے تھے؟

میں کوٹ ٹانگ کر سینے والی جیب سے قلم نکالتا ہوں ۔

ٹیوشن کے پیسے مل گئے؟

میں جواب نہیں دیتا ۔

میں جوتا اتار کر سلیپر پہنتا ہوں

میں تمہارے سر میں بادام روغن لگا دوں خشکی ہو گئی ہے —

میں اپنے خشک بالوں سے سروکار نہیں رکھتا

شکریہ — ! میں انکار میں جواب دیتا ہوں ۔

وہ کھڑا رہتا ہے ۔ شائد وہ مجھے چھونا چاہتا ہے ۔ میرے کندھوں سے خشکی جھاڑنا چاہتا ہے ۔ اس کی خواہش ہے کہ کسی طرح وہ میری زندگی کا حصہ بن جائے ۔ میں اسے کھڑا چھوڑ کر آگے بیلکونی میں چلا جاتا ہوں ۔ جنگلے پر تولیہ خشک ہونے کے لئے پڑا ہے ۔ دوسرے بلاکوں کے جنگلے بھی ایسے ہیں ۔ ان پر بھی ہمیشہ سوکھنے کے لئے کپڑے ٹنگے رہتے ہیں ۔

سامنے پارک ہے ۔ بڑھتی شام کے دھندلکے میں کچھ کوے فوارے میں نہا رہے ہیں ۔ کسی طرف سے کلاشنکوف کی آواز آتی ہے ۔ کوے یکدم اڑ جاتے ہیں ۔ میں سوچنا چاہتا ہوں کہ آخر میں ایسا کیوں ہوں؟ میں کسی کی مہربانی کسی کا پیار بھی وصول نہیں کر سکتا ۔ مجھے ٹیوشنیں پڑھاتے بیس سال ہو گئے لیکن آج تک میں نے کسی گھر میں چائے تک نہیں پی ۔ میں کوئی تحفہ وصول نہیں کر سکتا ۔ کسی سے ملنے نہیں جا سکتا ۔ میں نے کچھ دوسرے لوگوں سے زیادہ زخم نہیں کھائے؟ ۔ ایسے معاشروں میں عام آدمی کی بس ایسی ہی زندگی ہوتی ہے ۔ لیکن میرے

پاس عام خوشی اور عام غم نہیں ہے ۔ میں بنچ پر بیٹھکر سوچتا ہوں کہ اپنے دل کی کھڑکی کھول کر میں کسی کو جھانکنے کا موقع کیوں نہیں دیتا۔۔۔ ؟ میں عام انسان کی عام زندگی کیوں بسر نہیں کر سکتا ۔

کبھی کبھی پارک کے اس حصے میں جہاں میرے والی بنچ ہے ایک جوان بیٹھا نظر آتا ہے ۔ بیس سال پہلے میں بھی اسی طرح نیلے چیک والی قمیض پہنا کرتا تھا ۔ وہ میری طرح چلتا ہے ایک کندھا جھکا کر بائیں پنجے پر بوجھ ڈالکر ۔۔۔۔ جب وہ بڑے پھاٹک کی طرف سے بنچ کی طرف آتا ہے تو اس کی چال پر مجھے ناچ کا شبہ ہوتا ہے ۔ اپنی بیکار زندگی کے باوجود ابھی اس کی چال میں نرت ہے موسیقی ہے ۔ میں بیلکونی میں کھڑا اسے دیکھتا ہوں ۔۔۔ پھر سوچتا ہوں ۔۔۔ بھلا میں نے کیسے اندازہ لگایا کہ اس کی زندگی بیکار ہے؟ ۔۔۔ وہ پہروں بینچ پر بیٹھ کر اپنے خوابوں میں گم رہتا ہے؟ ۔۔۔ شائد بے روزگار ہے ۔ ماں باپ نے عاق کر دیا ہو گا؟ شاید نشہ کرتا ہو؟ ہو سکتا ہے، بیمار عشق ہے ، محبوبہ کی بے وفائی سے گھائل ہے؟ کبھی کبھی وہ بنچ سے اٹھ کر گھاس پر جا بیٹھتا ہے ۔ آسمان کو دیر تک دیکھتا ہے ۔ ممکن ہے وہ آسمان میں اپنے خوابوں کی تعبیر تلاش کرتا ہے ۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں وہ مجھ سے مشابہ ہے اور آسمان سے صرف اس جواب کا منتظر ہے کہ خدا نے اسے کیوں پیدا کیا؟ ۔۔۔ پارک میں آنے جانے والے لوگوں کو علم نہیں ہو سکتا کہ اس جواب کی اس کے نزدیک کیا اہمیت ہے؟ ایک وقت تھا اس کی طرح میں بھی اسی گھاس کے تختے پر بیٹھ کر آسمان کو تکتا تھا ۔ مجھے لگتا کہ نیلاہٹوں میں آہستہ خرام ہر چیل میرے کسی نہ کسی سوال کا جواب ہے۔۔۔۔ نیلے چیک کی قمیض پہننے والے کو ابھی علم نہیں کہ انسان جسقدر امید پر پلتا ہے اس سے کہیں زیادہ ناامیدی پر بھی زندہ رہ سکتا ہے ۔ ابھی وہ ناامیدی سے بیس سال پیچھے ہے ۔۔۔۔ جب بھی مجھے وہ نظر آئے میں مسکرانے لگتا ہوں اپنی اور اس کی مشابہت مجھے مسکرانے پر مجبور کرتی ہے۔۔۔۔

گھر میں جب بھی میں مسکراؤں وہ سمجھتا ہے کہ میں اسے دیکھ کر خوش ہوں ۔ وہ مجھے مسرور پا کر کملا جھریا کے گانے گنگنانے لگتا ہے ۔ عینک دھو کر صاف کرتا ہے پاؤں کی ٹھیٹھیں بلیڈ سے صاف کرتا نظر آتا ہے ۔ پارٹ ٹائم ملازم سے اونچی اونچی باتیں کرنے لگتا ہے جونہی اسے احساس ہو کہ میں خوش نہیں وہ متذبذب ہو جاتا ہے جہاں کھڑا ہو وہاں سے کہیں اور جانا چاہتا ہے لیکن جا نہیں سکتا ۔ لگتا ہے اس کی قوت فیصلہ اس لمبے سفر پر کہیں کھو گئی ہے ۔ اس کے لئے اب سب فیصلے درست ہیں ۔ بشرطیکہ وہ میں نے کئے ہوں ۔

کبھی کبھی جب میں اس کے کمرے کے سامنے سے گزرتا ہوں اس کے کمرے میں نظر پڑ جاتی ہے ۔ وہ کبھی دروازہ بند نہیں کرتا ۔ میری چاپ سننا چاہتا ہے ۔ اس خیال سے کہ شاید مجھے کبھی اس کی ضرورت پڑ جائے ۔ ہو سکتا ہے میں بلاؤں اور آواز اس تک نہ پہنچے ۔ ادھ کھلے دروازے سے میں دیکھتا ہوں وہ اپنے کپڑوں کو دیکھتا ہے کپڑوں کا پہننا ، اتارنا ، تبدیل کرنا اب پسند ناپسند کے تابع نہیں ۔ لیکن پھر بھی وہ الماری میں سے پرانے سویٹر ، ٹوپیاں ، شلوار قمیض نکالکر دیکھتا رہتا ہے ۔ کچھ یاد کرنے کچھ بھول جانے میں مصروف نظر آتا ہے ۔

صبح کے وقت سامنے والی بیلکونی میں موڑھے پر بیٹھ کر وہ پارک کی طرف رخ کرتا ہے ۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ پارک کی طرف رخ کر کے ادھر دیکھتا نہیں ۔ پھر وہ مٹھیاں بند کرتا ہے کھولتا ہے ۔ اپنی انٹھی ہوئی انگلیوں کو لچک دینے کی مشق کرتا ہے ۔ کبھی کبھی وہ بیٹھے بیٹھے ایک ٹانگ سیدھی کر کے گھٹنوں پر مکیاں مارتا ہے ۔ کندھے کو دبوچنے کے انداز میں پکڑ کر چھوڑتا ہے ۔ ساتھ ساتھ اس کے ہونٹ ہلتے ہیں ۔ پھٹ پھٹ کرتے ہونٹوں پر دعائیں ہوتی ہیں ۔ شائد اسے جھولی گرتی دعاؤں کا علم نہیں ورنہ وہ اتنی باقاعدگی سے دعائیں نہ مانگتا ۔

ان شکستہ صورت بلاکوں میں اس کی کسی سے دوستی نہیں — وہ کسی سے دوستی کر کے میرے وقت کازیاں کرنا نہیں چاہتا ۔ ہم دونوں ہی کسی سے ملنے نہیں جاتے ۔ بازار میں بھی وہ صرف داڑھی کا خط بنوانے جاتا ہے اور لوگوں سے بچتا بچاتا گھر آجاتا ہے ۔

کبھی کبھی ہماری ہمسائی ایک چھوٹی سی بچی کے ہاتھ کچھ بھجوا دیتی ہے ۔ اس روز وہ لڑکی شیشے کی پلیٹ میں کچھ پھل ڈھانپ کر لائی یہ بیلکونی میں میرے کمرے کی جانب چہرہ کئے موجود تھا ۔

امی نے یہ پھل بھیجے ہیں ابامنڈی گئے تھے — لڑکی اسے دیکھتی ہے پھر میرے کمرے کے اندر دزدیدہ نگاہوں سے نظر ڈالتی ہے میں اس بچی کو دیکھکر ہراساں ہو جاتا ہوں دروازے تک جاتا ہوں وہ پھل کی پلیٹ پکڑتا ہے ۔ لڑکی کو نہیں دیکھتا ۔ اپنے کانوں سے میرے پاؤں کی چاپ سنتا ہے اسے اپنے کانوں سے بھی مجھے دیکھنے کی عادت ہے ۔ لڑکی بیٹھنا چاہتی ہے ۔ ہم دونوں میں سے کوئی اسے بیٹھنے کے لئے نہیں کہتا ۔

آپ کے لئے حصہ بھیجا ہے —

وہ قمیض کے دامن میں امرود کیلے ڈلوا لیتا ہے

میں جاؤں جی —

اچھا ---

لڑکی مایوس نظر آتی ہے سیڑھیوں کے دروازے تک پہنچکر وہ رکتی ہے ۔ پھر سارے میں دیکھتی ہے "سلام علیکم جی ---"

اس کے جانے کے بعد وہ میرے دروازے تک آتا ہے

امرود کھالو —

جی نہیں چاہتا —

میں اس کے ہاتھ سے کچھ لے کر کھانا نہیں چاہتا ۔ وہ جھولی میں پھلوں کو اٹھائے دروازے کے سامنے کھڑا رہتا ہے میں اس کے سامنے سے گزر کر بیلکونی میں جنگلے کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہوں ۔ جنگلے پر نیلے رنگ کا تولیہ سوکھنے کے لئے ٹنگا ہے ۔ تینوں بلاکوں میں اسی طرح جنگلوں پر کپڑے سوکھنے کے لئے ٹنگے رہتے ہیں ۔

پارک میں دن کے وقت ہجوم کم ہوتا ہے ۔ لوگ عموماً لمبے راستوں کو چھوٹا کرنے کے لئے یہاں سے گزرتے ہیں ۔ ان کے پیروں سے گھاس پر چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں کے نشان بن گئے ہیں ۔ ان جلدی سے گزر جانے والوں کو املتاش ، بیڑی ، برگد کے درخت نظر نہیں آتے ۔ وہ بیلدار جو تلوار سے گھاس کاٹتے ہیں دکھائی نہیں دیتے ۔ انہیں وہ چیلیں دور آسمان پر تیرتی محسوس نہیں ہوتیں وہ صرف راستہ چھوٹا کرنے کے لئے ادھر سے گزرتے ہیں ۔

لیکن وہ پاگل عورت چیلوں کو جانتی ہے ۔ کبھی کبھی وہ اپنی جھولی میں کھانے پینے کی کوئی چیز لے آتی ہے اور چیلوں کو بلا بلا کر اشیائے خوردنی پھینکتی رہتی ہے ۔ کسی کسی دن اس کی جھولی میں چھوٹے چھوٹے پتھر کنکریاں ہوتی ہیں ۔ نشانہ تاک تاک کر وہ پتھروں سے چیلوں کو مارتی ہے اور فتح مندی کے ساتھ ہنستی ہے ۔ سمجھتی ہے اس طرح وہ آسمان پر تیرنے والی چیلوں کو جواب دینے پر مجبور کر دے گی ۔ میری نگاہیں اس پر جمی رہتی ہیں ۔ میرا دھیان اس میں اٹک جاتا ہے میں تاروں میں پھنسی پتنگوں کو دیکھتا ہوں ۔ مجھے اپنی ماں یاد آتی ہے ۔ وہ کہتی ہے ۔

"جب تو پیدا ہوا تھا تو ۔۔۔ گھر کے آگے سے بارات گزر رہی تھی ۔ بینڈ بج رہا تھا ۔ میری ساس نے تجھے شہد چٹا کر کہا تھا دیکھ بہو تیرا بیٹا راج کرے گا راج کوٹھیاں بنگلے کار یں ۔۔۔ حکم ہی حکم ۔۔۔۔۔۔ راج ہی راج"

پاگل عورت زور سے چیخ مار کر اونچے اونچے ہنستی ہے وہ میری توجہ راج سے ہٹا دیتی ہے میں اپنے آگے پیچھے گھومنے والے ملازموں سے نکلکر بیلکونی میں آ جاتا ہوں ۔ ایک گاڑی سے اتر کر دوسری میں سوار نہیں ہو سکتا ۔ کہیں درمیان میں ہی پیدل چلنے لگتا ہوں ۔ ابھی فائیلیں میرے حکموں کی منتظر ہوتی ہیں کہ مجھے وہ نظر آ جاتا ہے وہ کھانس رہا ہے ۔

سردیوں میں اسے کھانسی کے دورے پڑتے رہتے ہیں ۔ کبھی یہ خشک کھانسی صرف اس کا سینہ جھنجھوڑ کر چلی جاتی ہے ۔ کسی روز رات کے پچھلے پہر اس کی کھانسی مسلسل ہو جاتی ہے اس میں سے کئی قسم کی ملی جلی آوازیں آتی ہیں ۔ لگتا ہے لکڑی چیری جا رہی ہے ۔ کار کا انجن بار بار سٹارٹ ہو کر بند ہوتا ہے ۔ ہمارے کمروں کے درمیان موٹی دیوار ہے ۔ کوئی دروازہ کھڑکی یا روشندان اس دیوار میں نہیں ۔ میں اپنے پلنگ پر لیٹا لیٹا آنکھیں بند کئے اسے کھانستا دیکھ سکتا ہوں ۔ کھانسی کا دورہ پڑتے ہی وہ اپنا منہ رضائی کے اندر کر لیتا ہے ۔ کھانسی کی آواز مدھم پڑ جاتی ہے لیکن اس کا ایٹیک رکتا نہیں ۔

مجھے نظر آتا ہے وہ کبھی شہد چاہتا ہے کبھی چینی پھانکتا ہے کھانسی کے دورے کو بند کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کے شور سے میری نیند میں خلل نہ ہو — جب کھانسی سے اس کا دم رکنے لگتا ہے یکدم میرے پھیپھڑے کھل جاتے ہیں ۔ مجھے پورا سانس اندر جاتا محسوس ہوتا ہے ۔ عجیب قسم کی خوشی سے میری نیند اچاٹ ہو جاتی ہے میں اپنے بستر سے نکل کر پارک چلا جاتا ہوں اور اوس سے بھیگی بنچ پر بیٹھ جاتا ہوں ۔

لیکن اس کی کھانسی میرے ساتھ رہتی ہے ۔ باغ میں بتیوں کی اداس روشنی گیلے پن میں اضافہ کرتی ہے میرا جی

چاہتا ہے وہ مایوس ہو جائے ۔ زندگی سے لوگوں سے آس نہ لگائے ۔ نکڑ پر کسی اجنبی کو دیکھ کر اپنی بوڑھی مسکراہٹ پیش نہ کرے ۔ سیڑھیاں چڑھتے اترتے اسے شک نہ گزرے کہ اب کچھ ہونے والا ہے ۔ بزدلانہ ، احمقانہ ۔۔۔ بے اثر دعائیں مانگتے اسے کہیں خیال نہ آجائے کہ اچھے دن دروازوں پر دستک دے رہے ہیں ۔ میں چاہتا ہوں وہ مان لے اسے یقین آجائے ہر دریا پار ایک اور دریا ہے اور جب وہ دونوں دریا پاٹ کر ساحل پر پہنچے گا تو موجیں مارتا ایک اور دریا در پیش ہو گا ۔۔۔ میں اندر ہی اندر اسے بتانا چاہتا ہوں کہ امید کے سارے بجرے ناامیدی کے ساحلوں پر نکلتے ہیں ۔۔۔ میں جانتا ہوں جب میں آدھی رات گئے بنچ پر آبیٹھتا ہوں تو وہ بستر سے نکل کر بیلکونی میں لوہے کے جنگلے کو تھام کر مونڈھے پر بیٹھ جاتا ہے ۔ کھانسی کے دوروں کے درمیان وہ دعائیں مانگتا رہتا ہے ۔۔۔ بزدلانہ ، احمقانہ کمزور دعائیں جو اس کے کھانستے سینے سے دور تک پہنچ نہیں پاتیں ۔

مجھے سارے پارک میں اس پاگل عورت کی ہنسی سنائی دیتی ہے ۔ میری انگلی پکڑ کر وہ مجھے ٹائم ٹنل میں لے جاتی ہے تب میں چھوٹا تھا اور اس پارک میں روز پتنگ اڑانے کی مشق کیا کرتا ۔ میری گڈی کبھی ہوا میں نہ لہرائی ۔ لیکن میں نے آسمان کو تکنا سیکھ لیا ۔ آسمان پر مجھے خواب تیرتے نظر آنے لگے اونچائی کے ۔۔۔ اوپر اٹھنے کے خواب ۔۔۔ ترقی کے سپنے ۔۔۔ ایسے ہی ایک دن میری ماں مجھے تلاش کرتی باغ میں آئی مجھے بنچ پر بٹھایا ۔ اس کے چہرے پر رات گئے کی اوس پھیلی تھی ۔ تب اس نے کہانی سنائی ۔"سن ۔۔۔۔ ایک دفعہ ایک ڈاکو کو وقت کے قاضی نے پھانسی کا حکم دیا ۔ جس وقت ملزم پھانسی کے تختے کی طرف بڑھ رہا تھا ۔ ڈاکو کی ماں بازو پھیلائے اس کی جانب بھاگی ۔۔۔۔ ڈاکو نے آگے بڑھ کر ماں کا کان کاٹ کھایا ۔۔۔ سپاہی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا اے ناہنجار گناہ گار یہ تو نے کیا کیا ۔ ڈاکو بولا ۔۔۔۔۔ یہ اسوقت کہاں تھی جب میں نے پہلی چوری کی ؟ یہ تب کہاں تھی جب میں نے قتل کیا ۔۔۔ یہ ہی تو میری دشمن ہے ۔۔۔ میری پہلی اور آخری دشمن ۔۔۔"

پارک سے پاگل عورت کا قہقہہ بلند ہوتا ہے کسی نے اس کا کان کاٹ کھایا ہے ۔۔ اس کی ہنسی میں مسلسل کھانسی کا شور آملتا ہے ۔۔ شبنم سے لان بھیگی ہوئی ہے میں سوچتا ہوں کہ میں اپنا گولڈ میڈل اس پاگل عورت کے گلے میں ڈال دوں ۔۔۔ بیس برس سے ان تین بلاکوں میں ٹیوشنیں پڑھانے کے دوران مجھے ایک دن بھی کوئی ایسا نہ ملا جس کو میں یہ گولڈ میڈل دکھا سکتا ۔ ان بلاکوں میں رہنے والے ایم ۔ اے ہسٹری کے گولڈ میڈل کو ویسے بھی پہچان نہیں سکتے ۔

پاگل عورت کا قہقہہ مجھے پھر سنائی دیتا ہے میں بنچ کو دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیتا ہوں اور سیڑھیوں چڑھتا اوپر جاتا ہوں ۔ مجھے کمرے سے اپنی بیوی کی خوشبو آتی ہے ۔ وہ اچھی تھی ۔ سارا دن منگول چہرہ لئے آدھی سوئی آدھی جاگی رہتی ۔ صرف جب میرا ہمسایہ اشرف شام کو شطرنج کھیلنے آتا اس کی بند آنکھیں چمکنے لگتیں ۔ ہم دونوں بیلکونی میں جنگلے کے ساتھ بیٹھ کر شطرنج کھیلتے ۔ اشرف کی نگاہیں شطرنج کی بساط سے ہو ہو کر اندر چلی جاتیں اور دیر تک اندر ٹھہری

رہتیں ۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتا ہوں ۔ مجھے ٹیوشن پڑھانے میں دیر ہو گئی ہے ۔ میرا کوٹ بارش میں بھیگ گیا ہے ۔ لیکن کوٹ کے اندر کتابیں محفوظ ہیں ۔ میری پرانی گرے پینٹ کے پائنچے گارے سے سنے ہیں ۔ میں پارک میں شارٹ کٹ لے کر پہنچا ہوں ۔ وہ دروازے میں کھڑا کھانستا ہے ۔ اس کے ہونٹ بدبدا رہے ہیں جیسے کچھ بزدلانہ دعائیں مانگ رہا ہو ۔۔۔۔ وہ چاہتا ہے میں کمرے میں جانے سے پہلے کھانا کھا لوں ۔

کھانا کھا لو ۔ گرم ہے ۔

مجھے بھوک نہیں ۔

وہ پیروں پر شفٹ کرتا ہے ۔ محسوس کرتا ہے کہ بدن کا وزن یکدم زیادہ ہو گیا ہے ۔

اچھا

میں بہت تھک گیا ہوں ۔

ہاں ۔۔۔۔ اگر کبھی نوکری مل جاتی ۔۔۔ تو اتنی محنت نہ کرنی پڑتی ۔

پتہ نہیں یہ آرزو ہے کہ اعتراف پتہ نہیں یہ میری زندگی کی سمری ہے کہ عنوان ۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بدبداتا ہے جیسے خوف کے جھکڑ سے پناہ مانگ رہا ہو ۔

میں اندر کمرے میں جاتا ہوں ۔ میری بیوی کی خوشبو کمرے میں ہے میں خالی پلنگ کو دیکھتا ہوں وہاں تین سال کا بچہ سوتا نظر آتا ہے وہ ہمیشہ ایسے ہی سوتا ہے ماں کا دوپٹہ پکڑ کر اوندھا ۔ اس کی آنکھیں ماں پر ہیں ۔ نیند میں آدھ کھلی ۔ وہ جب کروٹ لیتا ہے تو ذرا سا روتا ہے ۔

کہاں ہے ۔

وہ کھانستا ہے جواب نہیں دیتا ۔ اسے باتیں کرنے کا بہت شوق ہے لیکن تب وہ جواب نہیں دیتا ۔

بچہ کہاں ہے؟ میں پوچھتا ہوں

تم کھانا کھا لو ۔۔۔

وہ اپنے پیروں پر شفٹ کرتا ہے جیسے خوف سے شل ہو گیا ہو

میں نے بتایا ناں مجھے بھوک نہیں ہے

اسے باتیں کرنے کا بہت شوق ہے لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے بھلا وہ بچہ کیوں ساتھ لے گئی

ہاں بھلا اشرف اس کا بچہ کیسے پال سکتا ہے؟

خالی پلنگ پر جھرجھری لے کر بچہ کروٹ لیتا ہے اس کی مٹھی سے دوپٹہ نکل جاتا ہے ۔ ماں بیٹا دونوں غائب ہو جاتے ہیں ۔

دونوں ــــ کب کس وقت گئے

وہ منہ ہی منہ میں دعائیں مانگتا ہے ــ

مجھے اس کے ہاتھ سے رقعہ ملتا ہے ۔ میں رقعہ پڑھتا ہوں ۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ خط میں کیا لکھا ہے؟ لیکن میں اسے نہیں بتاتا ۔ میں اسے اپنے قریب آنے نہیں دیتا ۔ میں بیلکونی کے جنگلے پر ہاتھ رکھکر کھڑا ہوتا ہوں ، سامنے پارک میں بھیگی گھاس پر بارش پڑ رہی ہے ۔ روشنیاں درختوں پر جامد ہو گئی ہیں ۔ سوچتا ہوں جس شارٹ کٹ سے میں ابھی گیا تھا کچھ دیر پہلے اشرف نے میری بیوی کے ساتھ اسی راستے کو اختیار کیا ہو گا ۔ اشرف نے ان دونوں کے اوپر اپنا لنڈے کا کوٹ ڈالا ہو گا ۔ اور وہ دونوں پارک کے دوسری طرف بس سٹاپ پر چلے گئے ہوں گے ــــ میری بیوی کا منگول چہرہ اور ادھ کھلی آنکھوں والے بچے کا چہرہ خالی ہو گا۔

بنچ کے قریب املتاش کے ساتھ ایک جالی دار ویسٹ باسکٹ لگی ہے ۔ لوگ آتے جاتے آئیس کریم کے کپ ، خالی لفافے ، اخبار اور ان گنت ردّی چیزیں ان میں پھینکتے رہتے ہیں ۔ اس باسکٹ پر لکھا ہے ۔ یوزمی ــــ یوں لگتا ہے جب کوئی اس باسکٹ کو استعمال نہیں کرتا تو اسے رنج ہوتا ہے ۔ کئی کئی دن یہ باسکٹ خالی نہیں ہوتی ۔ بھرتی رہتی ہے ٹھنستی جاتی ہے ۔ لیکن جب سارا گند اس میں سے نکل بھی جاتا ہے تو اسپر لکھا ہوا یوزمی باقی رہتا ہے ــــ کچھ دن ہوئے یہ ویسٹ باسکٹ درخت سے گر کر گھاس پر لڑھکتی پھرتی ہے ۔ شام کو بچے اسے ٹھڈے مارتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ باغ کے لئے اس کی کتنی ضرورت تھی ــــ کوئی نہیں جانتا کہ جب گھروں میں سے یوزمی والے چلے جاتے ہیں تو زندگی کتنی اجاڑ ہو جاتی ہے ۔ میں نے اپنی بیوی کا خط نہیں پڑھا میں جانتا ہوں اس میں میری تسلی اور اپنے چلے جانے کا جواز لکھا ہے ــ وہ اتنی ہی اچھی تھی ۔

اب پارک میں کبھی کبھی ایک قہقہے کی آواز آتی ہے ۔ صرف کھانسی کی آواز ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی ہے ۔ اندر گھپ اندھیرا ہے ۔ کبھی کبھی چوکیدار کی سیٹی ان تین بلاکوں کی خاموشی میں اضافہ کر دیتی ہے ۔ میں نے بنچ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا ہے لگتا ہے یہ پتھر کا بنچ بھی کہیں بھاگ جائے گا۔ میں ویسٹ باسکٹ کو املتاش کے درخت سے لٹکانا چاہتا ہوں لیکن پتہ نہیں ٹھڈے مار کے بچے اسے کہاں لے گئے ہیں ۔ صبح ہونے والی ہے ۔ میں جانتا ہوں وہ کھانستا کھانستا پلنگ سے لڑھک کر دری پر جا پڑا ہے ۔ آج اس کے ہونٹ ہل نہیں رہے ۔ تمام دعائیں ختم ہو گئی ہیں ۔ اس کے کمرے کی الماری کھلی ہے ، کیمل کلر کی ٹوپی اس کے سر سے دور جا گری ہے ۔

میں پارک کی گھاس دیکھتا ہوں ۔ ساری گھاس شبنم سے بھیگی ہے ۔ دھوپ نکلنے پر ساری کی ساری ہوا میں تحلیل ہو جائے گی اور پھر کسی اگلی رات کو پچھلے پہر کسی اور گھاس پر جا کر برسے گی ۔ ایسے ہی غم میں برسنے والے آنسو مائع سے گیس بنتے ہیں اور پھر کسی اور موسم میں کسی اور کے لئے برسنے کو آنکلتے ہیں ۔ غم تادیر ایک ہی صورت میں رہے تو قیامت آ جاتی ہے ۔ غم بھی عجب بہروپیا ہے ــــ اگر یہ بھیس نہ بدلے تو آنسو مائع سے گیس نہیں بنتے ۔

غم غصے میں نہ بدلے ـ ـ ـ احتجاج بنکر نہ اُبھرے تو غم کرنے والے کو غم ساتھ لے کر زمین میں دھنس جاتا ہے ـ ـ ـ غم اپنی اصل میں باقی نہیں رہتا روپ بدلتا رہتا ہے ـ ـ ـ ہسٹری کا طالب علم رہا ہوں جانتا ہوں ہار کو جیت میں بدلتے دیر نہیں لگتی ـ ـ ـ غم کو غصے میں تبدیل کرنے کے لئے ایک چیخ کافی ہے ـ

میں زور سے چیخنا چاہتا ہوں ـ ٹھنڈی پتھریلی بنچ کے سرے میرے ہاتھوں میں ہیں ـ میں اسقدر اونچا چیخنا چاہتا ہوں کہ میری چیخ سے وہ جاگ جائے ـ لیکن یہ چیخ ان ہی چیخوں میں کہیں دفن ہو جاتی ہے جو مدتوں سے میرے سینے میں بند ہیں ـ ـ ـ مجھے لگتا ہے کہ کہیں میرے بچے نے اس عورت کا کان کاٹ کھایا ہے جو اشرف کی بیوی ہے ـ ـ ـ مجھے محسوس ہوتا ہے پاگل عورت میں جو قہقہہ جاگتا ہے میری ماں کا ہے ـ صبح ہونے والی ہے ـ میں آسمان کو تکتا ہوں ابھی کوئی چیل آسمان پر نہیں آئی ـ آسمان ہمیشہ کی طرح دور ہے ـ لیکن یہ آسمان کی مہربانی تھی جس نے مجھے ایسا باپ دیا جو ہمیشہ قریب رہا ـ ـ ـ اور اشتباہ نظر کے باعث یہی سمجھتا رہا کہ وہ میں ہوں ـ ـ ـ

میرا شہر ادھورا سا

کشمیری لال ذاکر

جب میں ایکدم ٹوٹی اور تھکی ہوئی سی گھر پہونچی تو جو کچھ میں نے دیکھا میں اس کیلئے ہرگز تیار نہیں تھی ۔ ڈرائینگ روم میں سیما کھڑی تھی ۔ دیوار پر ٹنگی سمیر کی پینٹنگ کے سامنے میں پہنچی ۔

"سیما تم ۔"

"ہاں ۔" اس نے بڑے سکون سے کہا "آہستہ بولو ، میرا منا جاگ جائیگا ۔"

"کہاں ہے تمہارا منا؟"

اور اس نے صوفے پر سوتے منے کی طرف اشارہ کیا ۔ میں اس کے قریب چلی گئی ۔ سیما کا منا بھی سیما کی طرح ہی خوبصورت تھا ۔ گورا چٹا ۔ پیارا پیارا بچہ ۔

"ماں سے ملی ہو؟"

"ہاں ۔ اس کے پاؤں چھوئے ہیں ۔ اسکی آشیرواد لی ہے ۔"

"ماں نے تمہیں پہچان لیا تھا؟"

"ماں اپنے بچوں کو سدا ہی پہچان لیتی ہے ۔ چاہے وہ ایک جنم کے بعد بھی اسے ملیں ۔"

جبھی ماں چائے لے کر کمرے میں آئی تھی ۔

میں نے چائے بناتے ہوئے سیما سے پوچھا ۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں اچانک؟"

"بتاؤں گی ۔"

اب کہاں سے آرہی ہو؟"

"یہ بھی بتاؤں گی ۔"

"اتنا عرصہ کہاں رہی ہو؟"

"ارے سب کچھ بتادوں گی ۔ ذرا سانس تو لینے دو ۔"

ماں بغیر کچھ کہے مسکراتی ہوئی دوبارہ کچن میں چلی گئی ۔

سیما نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی ۔ پھر پیالی کو تپائی پر رکھا اور اپنے ایربیگ سے 555 کا پیکٹ نکالا اور گیس لائیٹر سے اسے سلگایا ۔ بالکل اپنے پاپا کی طرح اور پھر ڈھیر سارا دھواں کمرے کی فضا میں اگلتے ہوئے بولی ۔

"میں نے اپنے آپ سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جب میں چنڈی گڑھ ۔ پہونچ جاؤں گی تو تمہیں اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی ۔ اور کہوں گی کہ میں اپنی یادداشت کھو چکی تھی اور مجھے کچھ یاد نہیں تھا کہ پچھلے تین چار سالوں میں مجھ پر کیا بیتی تھی ۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے کی آرزو لیکر آئی ہوں ۔ جس کا عنوان میرا مُنا ہو کامیں نہیں ۔ میں پُشکر رینہ کو اور رجنی چھابڑہ کو اور پروفیسر کول کو اور اسکی نیوراٹک بیوی کو اور من جیت سند ھو اور رشن گریوال اور مہندر سنگھ یادو کو اور ان سب لوگوں کو ایکدم بھول جانا چاہتی تھی جو مجھے اس دن کے بعد ملے تھے جب میں نے چنڈی گڑھ کو چھوڑا تھا اور جاتی دفعہ تمہیں صرف ایک سُوٹ کیس دے گئی تھی جس میں میرا ماضی مقفل تھا دے دیا تھا وہ سُوٹ کیس تم نے میرے پاپا کو؟"

"ہاں دیدیا تھا ۔"

"اور وہ بہت ناراض ہوئے تھے اُس میں رکھی چیزوں کو دیکھ کر؟"

"ہاں ، تم نے اس میں سگرٹوں کی خالی ڈبیاں اور وسکی کی خالی بوتلیں کیوں ڈال رکھی تھیں؟"

"اس لئے کہ میں اپنی زندگی کی اس کتاب کو بند کر کے جانا چاہتی تھی جس کیلئے میں نے اپنی زندگی کے کچھ خوبصورت لمحے ضائع کئے تھے اور جسکی وجہ سے میرے پاپا مجھ سے ناراض تھے ۔ سوچا تھا یہاں سے جانے کے بعد وہ سب کچھ یہیں دفن کر جاؤں گی اور ایک نئے عنوان کی ایک نئی کتاب پڑھنا شروع کروں گی ۔"

"یہاں سے جانے کے بعد تم نے سگریٹ اور وسکی بالکل چھوڑ دی تھی؟"

"ہاں ، لیکن یہ سب زیادہ دن تک نہیں چل سکا ۔"

"کیوں؟"

"مجھ پر بہت دیر میں یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ تم دنیا کے کسی بھی حصے میں چلی جاؤ ، کسی بھی جزیرے میں زندگی بسر کرنا چاہو لوگ صرف ایک ہی بات جانتے ہیں ۔"

"کیا"

"کہ عورت صرف ایک ہی ضرورت پُوری کرنے کی چیز ہے اگر مرد کے اختیار میں ہو اور اسے اپنی روایات یا سماج کا ڈر نہ ہو تو وہ اپنی ماں ، بہن اور بیٹی کو بھی کسبی بنا ڈالے ۔ بیوی کو تو رنڈی بنانے کا رواج شروع ہو ہی چکا ہے ۔"

سیما جیسے چیخنے لگی تھی ۔

اسکی آواز سنکر صوفے پر سویا پڑا مُنا کسمسانے لگا تھا ۔ میں اٹھکر اس کے قریب چلی گئی اور اسے تھپتھپانے

لگی ۔ سیما ذرا دھیمے لہجے میں بولی آخر کب تک سو سکے گا میرا منا ۔ اچھا ہے جلدی جاگ جائے اور دیکھے کہ اس کے آس پاس کتنا ھنگامہ ہے ۔"

اس نے ایک سگریٹ اور سلگا لیا ۔

ماں نے دروازے سے ہم دونوں کو جھانکا اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئی ۔ اس نے سوچا ہو گا کہ اس وقت ہم دونوں میں سے کسی کو اسکی ضرورت نہیں تھی ۔ "دنیا بھر میں صرف ایک ہی کتاب ہے جسے مندر کا پجاری اور چرچ کا فادر اور مسجد کا مولوی اور یونیورسٹی کا پروفیسر اور دفتر کا کلرک اور قوم کا رہنما سب ایک ہی جیسے انہماک سے پڑھتے ہیں اور وہ ہے عورت ۔ کیپیٹل ورڈز میں لکھی وومن ۔ یہی سب کی مذھبی کتاب ہے جسے ہر کوئی دن کے اجالے اور رات کی سیاہی میں پڑھتا ہے ۔ جس طرح شراب کبھی جھوٹی نہیں ہوتی اور ایک ہی گلاس سے کئی لوگ پی سکتے ہیں ۔ اسی طرح عورت بھی کبھی جھوٹی نہیں ہوتی ۔ وہ کئی مردوں کے استعمال کے بعد بھی پوتر رہتی ہے ۔ ہمالہ کی چوٹیوں پر جمی پگھلی ہوئی برف کے پانی کی طرح ۔ وہی پانی جو جوہڑ میں اور گندی نالی میں اور ندی میں اور سمندر میں ، اور جمنا اور گنگا اور سرسوتی کے کناروں کے اندر قید بہتا رہتا ہے اور سدا پوتر مانا جاتا ہے ۔ استری پوتر ہے کیوں کہ وہ شراب ہے ۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم ؟"

"اسی لئے میں نے سوچا تھا کہ تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی اور کہوں گی کہ میری یادداشت ضائع ہو گئی تھی ۔ آئی نیو یُو وُڈ بی شاکڈ ۔"

"یس آئی ایم شاکڈ ۔"

"تو خاموش ہو جاؤں ؟"

"نہیں بولتی جاؤ ۔ تم اس نرک اور جہنم کی باتیں کر رہی ہو میں نے جسکی صرف پرچھائیاں کتابوں میں دیکھی ہیں ۔"

"میں اس جہنم میں جلی ہوں رہنا ۔ اس کے انگاروں میں تڑپی ہوں ۔ دیکھنا چاہو گی میرے جسم پر ان پھپھولوں کے مندمل نشان ؟"

مجھے لگا جیسے وہ پل بھر میں اپنے جسم سے سب کپڑے اتار پھینکے گی اور اس کا سنگ مرمر جیسا گورا چٹا بدن میری آنکھوں کے سامنے لہرا جائیگا ۔ "نہیں مجھ میں اتنی ہمت نہیں ۔"

"ہاں تم پرمپراؤں کی ماری ہوئی ایک عام ہندوستانی تعلیم یافتہ لڑکی ہو جو اپنے گھر کے جاہل اور بیکار افراد کو پالنے کیلئے تمام زندگی برباد کر دیتی ہے اور کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی تک نہیں کہ کہیں وہ بھٹک نہ جائے ۔"

سیما کا قہقہہ گونجا ۔

"تمہاری ہنسی تو پہلے جیسی ہی خوبصورت ہے ۔" میں نے کہا

"اس لئے کہ کوئی اس کا گلا نہیں گھونٹ سکا ۔"

سیما کی بات سنکر مجھے اس جاپانی لڑکی کا دھیان آیا جس کے بارے میں کسی کتاب میں پڑھا تھا ۔ وہ ایک سنگ تراش تھی اور اپنے اس فن سے اپنے تمام خاندان کو پالتی تھی جس میں اس کا ایک بوڑھا چاچا بھی تھا ۔ وہ سب کی خدمت کرتی تھی ۔ لیکن اسکی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا تھا اور اسے اپنے گھر میں کوئی مقام حاصل نہیں تھا ۔ وہ جب کبھی قریب کے ایک پب میں کسی دوست کے ساتھ کچھ وقت گذار کر رات کو دیر سے لوٹتی تو کمرے کی کسی کھڑکی سے کود کر اندر داخل ہوتی تاکہ اس کے چاچا کو اس کے دیر سے آنے کا علم نہ ہو اور وہ ہنگامہ نہ کھڑا کر دے اسے رات کو اپنے گھر کا دروازہ کھولتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا ۔ اور اسکی عمر چالیس برس کی تھی اور ہر گزرتا ہوا لمحہ اسکی عمر میں ایک اور لمحے کا اور تاسف کی ایک اور پرچھائیں کا اضافہ کرتا جا رہا تھا ۔ مجھے لگ رہا تھا ۔ اس جاپانی لڑکی کی (جس کا نام اب مجھے یاد نہیں تھا) میری زندگی سے کتنی مطابقت تھی اور سیما نے اپنی جو بات کہکر قہقہہ لگایا تھا وہ شاید میرے ہی لئے تھا اور جسے میں نے خوبصورتی سے ٹال دیا تھا بالکل اس جاپانی لڑکی کی طرح جو صرف سکینڈل سے بچنے کیلئے رات کو دروازے کی بجائے کھڑکی کا استعمال کرتی تھی ۔

"ایکدم کیا سوچنے لگی ہو؟" اس نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا

"کچھ نہیں ۔" میں نے ذرا سا مسکراتے ہوئے کہا ۔ "پھر کیا ہوا؟" میں نے بالکل اس بچے کی طرح پوچھا جو کہانی سنتے سنتے اچانک بول اٹھا ہو ۔

"کس کے بعد؟" وہ بولی۔

"اس کتاب کے بعد جو تم بند کر کے گئی تھیں؟"

"اسے تو ابتک دیمک چاٹ چکی ہوگی ۔ سوچا تھا واپس آ کر اسے شیلف سے دوبارہ نکالوں گی ۔ لیکن اب دیمک کے چاٹے ہوئے اِن اوراق کو سمیٹنے کا کیا فائدہ ؟ کوئی فائدہ نہیں ۔ سب فضول ہے ۔ ایکدم بکواس" لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا

"تمہارے پاس وسکی ہے؟"

"کیا کہہ رہی ہو ، تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟"

"نہیں ، یادداشت کھو گئی تھی پھر لوٹ آئی ہے ۔" وہ ہنسی ۔ "تمہارے پاس وسکی کہاں ہوگی ۔ تمہیں تو کسی برانڈ کا بھی نام معلوم نہیں ہو گا۔"

"نہیں ۔" میں نے تلخی سے کہا

"میرے اٹیچی کیس میں تھوڑی سی اسکاچ پڑی ہے ، ذرا سی لے لوں ۔ تمہیں اعتراض تو نہیں کوئی ؟ بہت

تھکی ہوئی ہوں ، تازہ ہو جاؤں گی ۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے ۔"

سیما اٹھی اور اس نے اپنے چھوٹے سے اٹیچی کیس میں سے شراب کی بوتل نکالی اور گلاس بھی نکالا ۔ گلاس میں وسکی ڈالکر اس نے بوتل سوٹ کیس ہی میں رکھدی ۔ "میں گلاس بھی ساتھ ہی رکھتی ہوں ۔ کبھی کبھی پانی بھی ۔" وہ مسکرائی "تھوڑا پانی لے آؤ ۔"

میں اٹھکر کچن سے جگ میں پانی لے آئی ۔ اس نے گلاس میں پانی زیادہ نہیں ڈالا ۔ تھوڑا سا پانی ڈال کر ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا اور پھر گلاس کو بھی سوٹ کیس میں رکھکر اسے بند کر دیا اور پھر کرسی کی بیک سے پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گئی ۔

"بولو کیا ارادہ ہے؟"

"تم اپنی بات تو پوری کرو ۔"

"بات پوری کہاں ہوتی ہے ۔ وہ تو ہمیشہ ادھوری ہی رہ جاتی ہے ۔ بات پوری ہو جائے تو پھر کہنے کو رہ ہی کیا جاتا ہے ۔ بات کا پورا ہونا موت ہے اور اس کا ادھورہ رہنا اسکے آگے بڑھنے کی علامت ؟"

مجھے لگا سیما بہت سیانی ہو گئی تھی ۔ اس نے یہاں سے جانے کے بعد جو دیکھا تھا اور سہا تھا اور جو درد جھیلا تھا اس نے اسے مکمل کر دیا تھا ۔ اسکی بات بھلے ہی ادھوری رہ گئی ہو لیکن وہ خود اب ادھوری نہیں تھی ۔ ایکدم مکمل ہو گئی تھی ۔ اے کمپلیٹ وومن ۔

"تم تو بہت عقلمند ہو گئی ہو ۔"

"طنز کر رہی ہو مجھ پر؟" اس نے نشے میں بھیگے لہجے میں کہا

"نہیں ، جو کچھ محسوس کیا ہے وہی کہا ہے ۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو ۔ تم اس وقت یہ سوچ رہی ہو کہ میں غلط وقت پر آئی ہوں اور تمہاری زندگی کے پیٹرن میں کیسے فٹ ہو سکوں گی ایک پجارن اور ایک گناہگار ۔

"کتنا بڑا کنٹراسٹ ہے"

مجھے لگا سیما نے ٹھیک ہی کہا تھا ۔ جب میں سمیر کو چھوڑ کر روز گارڈن کے معطر جھونکوں میں اپنے زخموں کو ہرا کرکے گھر لوٹ رہی تھی تو مجھے کبھی خیال بھی نہ تھا کہ گھر پہونچتے ہی میرا سامنا سیما سے ہو گا اور اس کا مُنا صوفے پر سو رہا ہو گا اور وہ اپنے پیچھے ایک گذری ہوئی زندگی چھوڑ کر ۔ ان لمحوں میں میرے پاس آئے گی جب میں خود ایک نازک موڑ پر کھڑی تھی اور میرے سامنے ایک چٹیل میدان کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا ۔ زندگی کے پاس کیا کیا سرپرائز ہیں!

"آجکل ہمارے مکان کی اوپر والی منزل میں ایک آرٹسٹ رہتا ہے ۔ وہ کیا کرتا ہے کہ کانٹراسٹ آرٹ کی جان

ہے ۔ تمہارا آنا مجھے اچھا لگا ہے سیما ۔"

"تھینکس ۔ کہاں ہے وہ آرٹسٹ؟"

"اپنے ون مین شو میں مصروف ہے ۔ آرٹ گیلری میں؟"

"اور ___"

"آئے گا تو تمہیں ملواؤں گی۔" میں نے فوراً ہی ٹوک دیا تھا کیونکہ مجھے خدشہ ہوا تھا کہ وہ اب شاید سدھیر کے بارے میں پوچھنے والی تھی ۔ کاش وہ سدھیر کے بارے میں کوئی بات نہ کرے ۔ کاش وہ مجھ پر یہ ظلم کرنے سے پہلے ہزار بار سوچ سکے ! بس اس لئے میں نے بات کرنے میں پہل کی

"ہاں تو یہاں سے جانے کے بعد تم سیدھی کہاں پہونچیں؟"

"جودھپور ۔ ٹرین سے اتر کر ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلی تو ایک تانگے والے سے گڑھی ٹھاکراں کے بارے میں پوچھا ، جہاں مہندر سنگھ یادو کے گھر والے رہتے تھے ۔ معلوم ہوا کہ جے پور جانے والی بس وہاں رکتی تھی اور جودھپور سے وہ گاؤں بہت دور نہیں تھا ۔ اس وقت قریب بارہ بجے تھے ۔ جے پور کیلئے بس چار بجے ملتی تھی ۔ میں نے اسٹیشن پر ہی کچھ کھا پی لیا اور پھر بس اسٹینڈ چلی گئی ۔ بس اسٹینڈ پر راجستھانی کلچر کی بھی ایک جھلک دیکھنے کو ملی ۔ سیدھے سادے دیہاتی لوگ ۔ اُن سے مختلف جو میں نے کشمیر میں دیکھے تھے یا پنجاب میں دیکھے تھے یا رکمنی کے گھر ہریانہ کے دیہات میں رہنے والوں کو دیکھا تھا عورتیں رنگ برنگی گھاگھرے پہنے کیسری اور سرخ رنگ کی پگڑیاں باندھے مردوں کے ساتھ کھڑی بڑا ملٹی کلرڈ ایفیکٹ کریئیٹ کر رہی تھیں۔ وہ سب اپنے آپ میں مست تھے۔ کسی نے میری طرف نہیں دیکھا تھا ۔ میں اگر توجہ کا مرکز تھی تو ان لوگوں کا جو پڑھے لکھے نظر آتے تھے اور ان دیہاتیوں کی طرح رستے کے کسی گاؤں میں نہیں بلکہ جے پور شہر میں جانا چاہتے تھے ۔ تم اپنے آپ کو ان پڑھ اور جاہل دیہاتیوں میں تو محفوظ سمجھ سکتی ہو لیکن پڑھے لکھے، سنورے ستھرے لوگوں میں نہیں ، جن کے منہ سے بڑھیا سگرٹوں کے تمباکو کی بو اور جسم سے بڑھیا ٹیلکم پاؤڈر کی خوشبو کی لپٹیں نکلتی ہیں ۔ تہذیب کے سنورے ہوئے یہی لوگ ہیں جنکی نظریں ہمیشہ عورت کے لباس کے اندر جو کچھ ہے اس پر جمی رہتی ہیں ۔ وہ بہت گہرا اترنا چاہتے ہیں ۔ سطح پر رہنا نہیں چاہتے ۔ بہت گہرا جہاں وہ خود بھی ڈوب سکیں اور اپنے ساتھ اپنی زندگی کی تمام فرسٹریشنز کو اور شکستوں کو اور تلخیوں کو بھی غرق کر سکیں ۔ طوفانوں میں تو تم نے لوگوں کو تیرنے اور کنارے پر پہونچ سکنے کی حسرت کرتے سنا ہو گا ۔ عمیق گہرائیوں میں ڈوب جانے کی بھی آرزو کرتے ہیں لوگ اور اس کیلئے کیا کیا وسیلے کرتے ہیں اس کے بارے میں تو تم نے نہیں سنا ہو گا کبھی؟" سیما کی نشہ آور نظریں مجھ پر جم گئیں ۔ جانے ایک ہی بار کتنی پی ڈالی تھی اس نے ۔

"لگتا ہے تم نے بہت پی لی ہے؟"

"نہیں ڈیئر ۔ بوتل میں تھی ہی کتنی ؟ تھوڑی سی ہی تو پی ہے ۔ لیکن آج میں ساری پی ڈالوں گی تاکہ آج کی

رات کے بعد میں پھر کبھی سگریٹ اور شراب کی بات نہ کروں ۔ کل جب سورج چڑھے تو میری زندگی کی گذری ہوئی مری ہوئی رات کی لاش اسکی روشنی ہی میں دفن ہو جائے ۔ میرے ماضی کا کوئی ایسا لمحہ نہ رہ جائے جس کا کوئی نکیلا ریزہ میری روح میں چبھ کر اسے لہو لہان کرتا رہے ۔"

سیما نے اٹھکر دوبارہ اٹیچی کیس سے بوتل نکال کر گلاس میں تھوڑی سی وسکی ڈال لی لیکن اب کی بار اس نے پانی لانے کو نہیں کہا ۔

"پانی نہیں ملاؤ گی؟"

"نہیں اس سے وسکی ایڈلٹریٹڈ ہو جاتی ہے ۔" وہ مسکرائی اور اس کے ساتھ ہی اس نے وہیں کھڑے کھڑے تمام وسکی حلق میں انڈیل لی اور پھر اپنے لائیٹر سے سگریٹ سلگا لیا اور کمرے کی فضا میں دھواں بکھیرتے ہوئے بولی "گڑھی ٹھاکراں میں مہندر سنگھ یادو کو کوئی نہیں جانتا تھا ۔ اس کے باپ کا نام پوچھتے پوچھتے میں اس کے گھر پہونچی ۔ دروازے پر دستک دی تو ایک نوجوان سی گٹھے ہوئے جسم کی لڑکی نے دروازہ کھولا ۔"

"تم مہندر سنگھ یادو کی بہن ہو؟"

"ہاں ۔ لیکن وہ تو یہاں نہیں ہے؟"

"کہاں ہے؟"

"یہاں سے تو وہ چنڈی گڑھ گیا تھا ۔ اب کہاں ہے ہم نہیں جانتے ۔"

"گھر میں اور کون ہے؟"

"میری ماں ہے ۔ میرے پتا جی ہیں ۔"

"مجھے انہی سے ملنا ہے ۔"

"آپ کہاں سے آئی ہیں؟"

"چنڈی گڑھ سے ۔ تمہارا کیا نام ہے؟"

"سگنتلا"

"سگنتلا نہیں" "شگنتلا"

"اس نے دروازہ کھولدیا ۔ میں اندر آگئی ۔ مہندر سنگھ کی ٹھیٹھ دیہاتی ماں اور اسی طرح کا خالص دیہاتی باپ دونوں میرے سامنے تھے ۔ میں نے جب مہندر سنگھ کے بارے میں پوچھا تو اس کا باپ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا ۔"

"وہ تو چنڈی گڑھ میں ہی ہے اور تم اسے یہاں تلاش کرنے آئی ہو ۔"

"اسے وہاں سے آئے تو کئی مہینے ہو گئے ۔"

"گیٹ بند نہ کرنا ۔ سمیر شاید آج بھی دیر سے آئے ۔"

"تمہیں اس بیکار آدمی کا کیوں اتنا دھیان رہتا ہے ۔"

"کیوں کہ وہ تمہاری سہیلی کا بھائی ہے ۔"

"نہیں ۔ اس لئے کہ وہ ہر وقت تمہارے پاؤں چھوتا رہتا ہے ۔ ایڈیٹ ۔"

"گالی دے رہی ہو اسے ۔"

"نہیں دعائیں دے رہی ہوں ۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر کچن میں جاکر کھانا بنانے لگی ۔ کچھ دیر کچن میں کام کر کے جب میں دوبارہ ڈرائینگ روم میں آئی تو سیما ابھی تک سو رہی تھی اور صوفے پر پڑا اس کا مُنا جاگ رہا تھا اور اپنے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا منہ میں ڈالے مست پڑا تھا ۔ کتنا پیارا بچہ تھا ۔ خوبصورت بچے چاہے دوسروں کے بھی ہوں پیارے لگتے ہیں ۔ میں نے اُسے بانہوں میں اٹھا لیا ۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی تو لگا جیسے روح کے چاند کی قاش چمک اٹھی ہو ۔ میں نے اس کے گالوں کو چوم لیا ۔

"تمہارا نام اسیم ہونا چاہئیے ۔ لیکن تمہاری ماں نے جانے کیا نام رکھا ہو گا تمہارا" میں نے مُنے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ۔

"مُنا رکھا ہے اس کا نام ۔" سیما نے بڑی السائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے مُنے سے کئے میرے سوال کا جواب دیا ۔

"کھانا تیار ہو گیا ہے لگا دوں؟"

"یہیں قالین پر ایک چادر بچھالو اور پلیٹیں رکھ دو ۔ میز تک نہیں جایا جاتا ۔"

"مُنے کو بھی تو دودھ پلانا ہو گا ۔"

"ہم کھانا کھالیں گے پھر اسے دودھ پلادوں گی ۔ دودھ تو گھر میں ہے نا" "بہت ہے"۔

میں نے مُنا کو سیما کے حوالے کر دیا اور قالین پر چادر بچھادی اور دو پلیٹیں لگا دیں ۔

"دو ہی پلیٹیں لگائی ہیں ۔ ماں جی نہیں کھائیں گی کھانا؟"

"ماں کو بھوک نہیں ہے ۔ وہ سو گئی ہے ۔ صبح برت بھی تو ہے نا اس کا ۔"

"کیا دن ہو گا کل؟"

"سوموار ۔"

"ماں جی مندر جاتی ہیں اب بھی؟"

"اب تو صرف میں پورنماشی کو ساتھ لے جاتی ہوں ۔ سوموار کو نہیں جاتیں ۔"

"اور سنو ، وہ تمہارا ـــ ـــ"

"گلاس تو بھول ہی گئی لانا ۔ "میں نے سیما کو دوبارہ سوال کے درمیان ہی میں ٹوک دیا ۔ مجھے لگا وہ سدھیر کے بارے میں پوچھنے والی تھی ۔ میں فوراً کچن میں چلی گئی ۔ لیکن میں کب تک بچتی رہوں گی سیما کے اس سوال سے ۔ کبھی تو جواب دینا ہی ہوگا ۔ کم سے کم آج کی رات تو بچ جاؤں ۔ کل دیکھ لوں گی !

کھانا کھا چکنے کے بعد سیما منے کیلئے کچن میں دودھ گرم کرتی رہی اور میں نے قالین پر بچھی چادر اٹھائی اور پلیٹیں سنک میں ڈال دیں ۔

"پلیٹیں صاف کر دوں؟ سیما نے کہا

"ارے نہیں ۔ برتن مانجھنے والی صبح آئیگی تو صاف کر لے گی ۔"

جب سیما مُنے کیلئے دودھ گلاس میں ڈالکر ڈرائینگ روم میں آئی تو میں نے اپنا اور اس کا بستر قالین پر لگا دیا تھا ۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا یہاں مزہ رہے گا ۔ "یہ کہکر وہ بستر میں بیٹھ گئی اور مُنے کے ہاتھ میں گلاس تھما دیا ۔

"میرا بستر کون سا ہے؟"

"جو تمہیں پسند ہے ۔"

"مجھے تو دونوں پسند ہیں۔"

"تو تم دونوں بستروں پر سو جاؤ ۔ میں صوفے پر سو جاتی ہوں ۔"

سیما نے مُنے کو دودھ پلاکر اسے اس بستر کی ایک طرف لٹا دیا جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی ۔ مُنے نے بڑے مزے سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے ۔ سیما نے سگریٹ سلگا لیا ۔

"میرا ایک سگریٹ تو تم نے ضائع کر دیا ۔"

"سوجو گئی تھیں تم پیتے پیتے ۔ میں نے انگلیوں سے نکال کر پھینک دیا۔ ورنہ انگلیاں جل جاتیں۔"

"انگلیاں تو کئی بار جل چکی ہیں ۔"

اس نے اپنے گورے ہاتھ کی انگلیاں میرے سامنے پھیلادیں دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں سگریٹ پی پی کر پیلی ہو گئی تھیں ۔

"بہت سگریٹ پیتی رہی ہو؟"

"ہاں ۔ پلانے والے پلاتے رہے ہیں ۔ سگریٹ بھی اور شراب بھی اور میں اس لئے پیتی رہی ہوں کہ میرا احساس مر جائے ۔ لیکن ہزار کوشش کے باوجود وہ نہیں مرا ۔ میرا احساس بڑا سخت جان ہے ۔ وہ اب بھی زندہ ہے ۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تمہارا احساس زندہ ہے۔ "

"جی چاہتا ہے کہ اس مختصر سے وقفے میں جب تک نیند نہیں آتی تمہیں وہ سب کچھ بتا دوں جو میں نے جھیلا ہے ۔ آج کے بعد پھر کبھی نہیں بتا سکوں گی ۔"

"پھر کیوں نہیں؟"

"مجھے جس نئی زندگی کی تلاش ہے اسکی طرف کل پہلا قدم اٹھانا چاہتی ہوں ۔ اور اس سے پہلے وہ سب کچھ بھول جانا چاہتی ہوں جسکی اب مجھے ضرورت نہیں ۔"

"جب تم جے پور سے دھلی واپس آگئیں تو چنڈی گڑھ کیوں نہ لوٹ آئیں ۔"

"یہیں سے تو گئی تھی ۔ یہاں رہ سکنا ممکن ہوتا تو جاتی ہی کیوں؟"

"لوٹ آتیں تو شاید اچھا ہوتا ۔"

"جانے اور لوٹنے کے اوقات مقرر ہیں کوئی جبھی لوٹ سکتا ہے جب لوٹنے کا معین لمحہ آجائے ۔"

"دہلی میں کئی دھلیاں ہیں ۔ ہر شہر میں کئی شہر بستے ہیں رچنا ۔ لیکن ہمیں ان کے بارے میں معلوم نہیں ہوتا ۔ صبح کے شہر ، دوپہر کے شہر ، شام کے شہر ، رات کے شہر ، آدھی رات کے شہر اور پو پھٹنے سے پہلے کے شہر ۔ اور تم نہیں جانتیں کہ تم کب اور کیسے کس شہر میں پہونچ جاؤگی ۔ اور پہونچنے کے بعد تم پر سب دروازے بند ہو جاتے ہیں ۔ اور جب دروازے کھلتے ہیں تو تمہارے سامنے اسی شہر میں بستا ہوا کوئی دوسرا شہر ہوتا ہے ۔ کوئی دوسری چاندنی ہوتی ہے جسے تم اس سے پہلے والے شہر میں نہیں دیکھ سکیں ۔"

میں سیما کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اس قسم کی باتیں اس نے کبھی نہیں کی تھیں ۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی ڈسکورر بول رہا تھا ۔ کوئی کولمبس جو ایک دنیا کی تلاش میں کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا تھا ۔

"دھلی پہنچ کر میں نے سوچا ایک دن اپنے پاپا کی جان پہچان کی اس فیملی کے ہاں چلی جاؤں جو ہمارے دور کے رشتہ دار بھی تھے ۔ ایک آدھ دن میں سوچ لوں گی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے ۔ ان کے ہاں ایسٹ پٹیل نگر میں چلی گئی ۔ وہ لوگ بہت خوش ہوئے ۔ پاپا اور ممی کے بارے میں پوچھتے رہے اور میں جی بھر کر جھوٹ بولتی رہی ۔ انہی کے گھر میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو ایک فلم بنانے کیلئے فائینینسرز اکٹھا کر رہا تھا مجھے دیکھ کر کہنے لگا جس نئے چہرے کی اسے تلاش تھی وہ اسے مل گیا تھا اب اس کی پکچر ضرور مکمل ہوگی اب اُسے فائینینسرز سے ملنے میں بھی دقت نہ ہوگی ۔ ایک دن وہ مجھے کناٹ پیلس تک لے جانے کیلئے گھر سے لے گیا اور اس کے بعد میں ایسٹ پٹیل نگر کی فیملی کے پاس دوبارہ نہ آسکی ۔ وہ شخص مجھے دھلی کی تہوں میں چھپے ان سب شہروں میں لے جاتا رہا جنکی بات میں نے کہی ہے ۔ کئی روز تک تو مجھے یہ معلوم بھی نہ ہو سکا کہ میں کہاں تھی اور کس حالت میں تھی اور میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا ۔ مجھے کئی روز کے بعد معلوم ہوا کہ میں پالم ہوائی اڈے پر تھی اور وہ شخص میرے ساتھ تھا اور اب مجھے بمبئی میں لے جاکر

اپنی پکچر اناونس کرنے والا تھا ۔"

سیما کی بات سن کر مجھے پسینہ آنے لگا ۔

"اور پھر؟"

"مجھے اتنا معلوم ہے کہ میں رات کو ساڑھے گیارہ بجے کروز ایر پورٹ پر اس شخص کے ساتھ ہوائی جہاز سے اتری تھی اور پھر ٹیکسی میں اسی کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا تھا "اب تمہاری نئی زندگی کا آغاز ہونے والا ہے ۔"

میں خاموش رہی ۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا بھی نہیں ۔ سوچتی رہی جو زندگی میں نے اتنے روز دھلی میں گذاری تھی کیا اس کے بعد بھی کسی دوسری زندگی کا آغاز ہو سکتا ہے ۔ اگر ہو سکتا ہے تو وہ زندگی کیسی ہوگی؟ اس نے اپنے لئے ایک سگریٹ سلگایا اور دوسرا سگریٹ سلگا کر میری طرف بڑھایا ۔ میں نے سگریٹ ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا ۔

"گڈ ایکٹنگ ۔" اس نے کہا ۔

میرا جی چاہا کہ میں اس کے منہ پر تھپڑ مار دوں لیکن میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا ۔ اور اگر میرا ہاتھ آزاد بھی ہوتا کیا میں اسے تھپڑ مار سکتی تھی؟ یہ میں نے اس وقت نہیں سوچا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ ٹیکسی کدھر سے جا رہی تھی اور کہاں جا رہی تھی ۔ جب ٹیکسی رکی تو میں ایک کئی منزلہ عمارت کے سامنے کھڑی تھی ۔ اور پھر اس نے میرا اٹیچی کیس مجھے دیا اور اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر عمارت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جانے کونسی منزل کی کون سے کمرے میں لے آیا ۔ اس نے چابی گھما کر کمرہ کھولا ۔ ایک ہی کمرہ تھا جو بیٹھنے، سونے، کھانے سبھی کے لیے استعمال ہوتا تھا اس میں ایک پلنگ تھا اور دو کرسیاں اور ایک گندی سی تپائی ۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے مجھے پلنگ پر دھکیل دیا ۔

"کچھ کھانا ہو تو بتاؤ ۔"

میں نے انکار کر دیا ۔

اور پھر اس نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا اور جانے کہاں چلا گیا ۔ جب لوٹا تو اس کے ساتھ دو اور آدمی تھے اور اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے ۔

"پکچر کی ہیروئن ۔" اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔

"نام کیا ہے اس کا ۔"

"اصلی نام سیما ۔ فلمی نام ابھی نہیں رکھا" اس شخص نے جواب دیا۔

"تو آؤ مہورت کریں ۔" دونوں آدمیوں نے کہا

اور پھر انہوں نے شراب کی بوتل کھول لی ۔ گلاسوں میں شراب ڈالی اور اس شخص نے جو مجھے ساتھ لایا تھا مجھے

"تم کون ہو؟"

"میں آپ کی بہو ہوں ۔"

"ہماری بہو ، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اس نے تو کبھی نہیں بتایا کہ اس نے بیاہ کر لیا ہے ۔" اسکی ماں بولی تھی "میں جھوٹ تھوڑی بول رہی ہوں ۔ میں اُس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں ۔

اسکی بہن شکنتلا نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور اسکے ماں باپ نے پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھا ۔ جواب اسکی ماں نے دیا ۔

"ہمیں کیا معلوم کس کا روگ پال رہی ہو ۔ ہم نے فارغطی دے رکھی ہے مہندر کو ہمارا اس سے کوئی رستہ نہیں ۔"

"مہندر سنگھ کا باپ اچھا آدمی تھا ۔ اس نے مجھے کھاٹ پر بیٹھنے کو کہا ۔ پانی کا گلاس دیا ۔ پانی تو میں نے نہ پیا حالانکہ پیاس سے میرا حلق سوکھ رہا تھا لیکن کھاٹ پر میں بیٹھ گئی ۔ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کروں ۔ مہندر سنگھ کا باپ بولا ۔"

"تم واپس چنڈی گڑھ چلی جاؤ ۔ وہ اب یہاں نہیں آئیگا ۔"

"لیکن چنڈی گڑھ سے تو وہ کب کا چلا آیا ہے ۔"

"تو کہیں دوسری جگہ چلا گیا ہو گا ۔"

"میں کیا کروں اب ۔ میری تو تمام زندگی برباد کر ڈالی ہے آپ کے بیٹے نے ۔"

"کوئیں میں ڈوب مر ۔ ادھر یہی ہوتا ہے ۔" ماں بولی

"تم چُپ کرو ٹھاکرن ۔ میں بات کر رہا ہوں ۔"

"لے جا رانڈ کو ۔" وہ بولی اور پھر دروازے سے باہر نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی اسکی لڑکی شکنتلا بھی چلی گئی ۔

"میں تمہیں جے پور تک چھوڑ آتا ہوں ۔ وہاں سے دہلی کا ٹکٹ لے دونگا ۔ تم چنڈی گڑھ چلی جاؤ ۔ ہم تمہیں نہیں رکھ سکتے ۔ کسی کو معلوم ہو گیا تو پولیس آبیٹھے گی یہاں ۔"

حالات میری سمجھ میں آ گئے ۔ اگر وہ لوگ مجھے گھر میں رکھنے کو راضی بھی ہو جائیں جب بھی میرا وہاں رہنا واجب نہیں تھا ۔ مہندر سنگھ کو وہ لوگ گھر سے نکال چکے تھے اور اس کا گھر سے اب کوئی رشتہ تھا ہی نہیں ۔ وہاں رہنے کا تو سوال ہی نہیں تھا ۔ لیکن اب میں جاؤں گی کہاں ۔ اس سوال کا جواب بھی مجھے مل چکا تھا ۔ یہ تو اب مجھے سوچنا تھا کہ مجھے کہاں جانا چاہئیے اور کیا کرنا چاہیئے ۔ میں نے اسی لمحہ مختصر سا اٹیچی کیس اٹھایا اور اس کچے لیکن کھلے گھر سے باہر آگئی جو مہندر سنگھ کا گھر ضرور تھا لیکن اس پر اس کا کوئی حق نہیں تھا ۔"

"مجھے جے پور کیلئے کوئی بس ملے گی اس وقت ؟"

"اب تو نہیں ملے گی ۔ جودھپور سے رات کو بس ملے گی ۔"

"یہاں سے جودھپور کیلئے ملیگا کچھ ؟"

"اڈے سے تانگہ مل جائیگا ۔"

"تو میں تانگہ لے لوں گی ۔ آپ گھر ہی میں رہئیے ۔ گھر اکیلا ہے ۔"

"میں چھوڑ آتا ہوں جودھپور تک ۔"

"نہیں کوئی دیکھ لے گا ۔ کوئی گاؤں والا ۔" میں نے طنزاً کہا۔

"تمہارا اکیلی جانا ٹھیک نہیں ۔"

"میں آئی بھی تو اکیلی تھی ۔ مجھے کوئی اٹھا کر نہیں لے جائیگا۔"

"میں نے مہندر سنگھ کے باپ کو وہیں روک دیا اور گاؤں کے باہر سڑک پر پہنچ گئی ۔ اسی جگہ جہاں بس سے اتری تھی ۔ اسی لمحہ ایک بس جودھپور سے آئی ۔ شاید کوئی سپیشل بس تھی ۔ میں نے ہاتھ دیا ۔ بس رک گئی ۔ جے پور ہی کی بس تھی ۔ میں اسمیں بیٹھ گئی ۔ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ میں جے پور کیوں جارہی تھی اور وہاں پہنچ کر کہاں جاؤں گی ۔ میں بس کی ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گئی ۔ ٹکٹ لی اور پھر آنکھیں بند کرکے اپنے آپ کو سمیٹنے لگی ۔ لگتا تھا میری تمام شخصیت ریزہ ریزہ ہو کر ادھر ادھر بکھر گئی تھی ۔ کہاں کہاں سے سمیٹوں گی اپنے آپ کو ۔ شاید میں کچھ دیر کیلئے سو بھی گئی تھی ۔ آنکھ کھلی تو اندھیرا ہو گیا تھا ۔ آٹھ بج رہے تھے ۔ میں نے کنڈیکٹر سے کہا کہ وہ مجھے جے پور میں کسی ایسی جگہ اتار دے جہاں سے ریلوے اسٹیشن قریب ہو۔ جب کنڈیکٹر نے بس رکوا کر مجھے اتارا تو ساڑھے نو بج رہے تھے ۔ میں رکشہ لے کر ریلوے اسٹیشن پر آگئی کچھ دیر ریلوے اسٹیشن کی خوبصورت عمارت کو دیکھتی رہی ۔ پھر ریفریشمنٹ روم میں جاکر پہلے چائے پی پھر کھانا کھایا اور لوئر کلاس کے لیڈیز ویٹنگ روم میں ایک بینچ کے خالی کونے میں بیٹھ گئی ۔ بینچ پر تو ادھیڑ عمر کی ایک عورت اپنے بچے کو چھاتی پر لگائے سوئی پڑی تھی ۔ اس کے سر کے نیچے اسکے سامان کی گٹھڑی تھی اور پھر پاؤں سمیٹنے سے جو ذرا سی جگہ بچی تھی وہیں میں بیٹھ گئی ۔ دیوار پر لگا کلاک اس سمے گیارہ بجا رہا تھا ۔ میں نے لیڈیز ویٹنگ روم کی دیواروں پر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تمام فرش پر عورتیں لیٹی تھیں اپنے سامان اور بچوں کے ساتھ ویسی ہی عورتیں جیسی میں جودھپور میں اور گڑھی ٹھاکراں میں دیکھ کر آئی تھی کہیں کسی بچے نے پیشاب کر رکھا تھا ، کہیں کاغذوں کے گندے ٹکڑے پڑے تھے اور ان ٹکڑوں کے قریب خارش زدہ کتے سو رہے تھے ۔ میں نے اس روز پہلی بار محسوس کیا کہ گندے دیہاتی لوگوں کی بھیڑ میں پسینے اور مٹی اور پیشاب اور تمباکو اور بیڑی کے دھوئیں کی ایسی ملی جلی بُو ہوتی ہے ۔ یہ ایک ایسی بُو ہوتی ہے جو تمہیں اس جیسی بھیڑ کے علاوہ کہیں نہ مل سکتی۔ شاید وہاں مل سکتی ہو جہاں بہت سی بھیڑیں ایک ہی باڑے میں بند ہوں یا بہت سی مرغیاں ایک ہی ڈربے

میں شور مچا رہی ہوں ۔ لگا جیسے مجھے متلی ہونے کو تھی۔ ہم میں خوبصورت سے خوبصورت جگہ کو غلیظ اور گندہ کر دینے کی کتنی صلاحیت ہے یہ سوچ کر مجھے ہنسی آگئی اور تمہارا آرٹسٹ کرایہ دار کہتا ہے کہ کانٹراسٹ ہی آرٹ کی جان ہے ۔ وہ شاید چنڈی گڑھ کی ان کھلی سڑکوں سے باہر نہیں نکلا ورنہ اُسے معلوم ہو جائے کہ کانٹراسٹ کیا چیز ہوتی ہے ۔ اندھیرا اور روشنی بدبو اور خوشبو ، غربت اور امارت ، علم اور جہالت ، حسن اور بد صورتی ، زندگی اور موت کس طرح ایک دوسرے کی جان لینے پر تلے ہیں اور اس کانٹراسٹ کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ اندھیرا ہے اور بدبو ہے اور غربت ہے اور جہالت ہے اور بد صورتی ہے اور موت ہے ۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے ۔ دنیا کے کسی حصے ، کسی شہر ، کسی ملک میں اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے ۔ روشنی سبھی جگہ قتل ہوتی ہے اور اندھیرا ہر جگہ حکومت کرتا ہے ۔ حُسن لُٹتا ہے اور بد صورتی اسے لُوٹتی ہے ۔

میں یہ سب سوچ رہی تھی جے پور ریلوے اسٹیشن کی خوبصورت عمارت کے لوئر کلاس کے لیڈیز ویٹنگ روم میں لگے ایک بینچ کے خالی کونے پر بیٹھے ہوئے ۔ مجھ سے یہ تضاد برداشت نہ ہو سکا جسے تمہارا آرٹسٹ کرایہ دار آرٹ کی جان کہتا ہے ۔ میں نے ٹی اسٹال سے چائے کی ایک پیالی لی اور مجھے لگا جیسے مجھے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی ۔ لیکن میں نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور سگریٹ نہیں لی ۔ چائے پینے کے بعد جب میں نے چائے کے پیسے دیئے تو ٹی اسٹال کے وینڈر نے پوچھا ۔

"آپ کو کہاں جانا ہے میم صاحب؟"

"جودھپور ۔"

"جودھپور کیلئے تو کوئی گاڑی نہیں ملے گی اس وقت ۔"

"کہاں کی گاڑی مل سکتی ہے اب؟"

"دہلی کی ۔"

میں اسکی بات کا جواب دیئے بنا آگے بڑھ گئی اور اسی سمے دھلی جانے والی ٹرین آگئی اور میں اس میں بیٹھ گئی ۔ اس لئے مجھے لگ رہا تھا کہ اب میں جے پور کے پلیٹ فارم پر زیادہ دیر نہ رک سکوں گی ۔ شاید میں زیادہ دیر کہیں بھی نہیں رک سکتی ۔ جانے مجھے ہر وقت جلدی کا کیوں احساس رہتا ہے ۔ میں انتظار نہیں کر سکتی ۔ جو کچھ ہونا ہو فوراً ہو جائے توقف نہ ہو ۔ اگر کبھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی نوبت آئی تو میں خودکشی کر لوں گی ۔ موت کا انتظار موت سے بد تر ہے ۔"

مجھے محسوس ہوا سیما بہت تھک گئی تھی ۔ اس نے ایک تازہ سگریٹ سلگایا اور پھر ڈرائینگ روم میں بچھے قالین پر لیٹ گئی اور صوفے سے دو کُشنز اٹھا کر سر کے نیچے رکھ لئے ۔ کچھ ہی دیر کے بعد تھکاوٹ اور نشے کے زیر اثر وہ سو گئی ۔ میں نے اسکی انگلیوں میں اٹکی جلتی ہوئی سگریٹ کو آہستہ سے نکال کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا ۔ سیما نے

کروٹ لے لی اُس کے منہ سے شراب کی ہلکی ہلکی بو آ رہی تھی ۔

میں اٹھکر ماں کے کمرے میں چلی گئی ۔

"بہت سگریٹ پیتی ہے سیما؟"

"ڈھیر سارے ملکوں میں گھوم کر آئی ہے ۔"

"یہاں کیا کرے گی اب؟"

"کچھ دن ہمارے پاس رہے گی ۔"

"یہاں؟"

"اور کہاں جائیگی؟"

"اسکا گھر والا کہاں ہے؟"

"اس نے چھوڑ دیا ہے اپنے گھر والے کو ۔"

"کیوں؟"

"میں نے پوچھا نہیں ۔"

"کھانا نہیں کھاؤ گی ابھی؟"

"سیما کی آنکھ لگ گئی ہے اٹھ جائے تو کھانا کھائیں گی ۔ تم کھا لو ۔"

"مجھے بھوک نہیں ۔"

"تو دودھ گرم کر دیتی ہوں ۔ پی لو ۔"

دودھ تھوڑا ہے ۔ سیما کے ننھے نے بھی پینا ہوگا ۔"

ماں کی بات سنکر میں مسکرا دی ۔

"تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں؟"

"بچے تو سبھی کو اچھے لگتے ہیں ۔"

"دوسروں کے بچے تو اچھے نہیں لگتے؟"

ماں نے اس سوال کا جواب نہیں دیا ۔ وہ ایسی الجھی ہوئی باتیں نہیں سمجھتی اس نے کہا

"مجھے معلوم نہیں ۔"

میں پھر مسکرا دی ۔

"اچھا تو تم سو جاؤ ۔ ہم دونوں وہیں ڈرائینگ روم میں ہی پڑ رہیں گی ۔"

"NoSaida Veve" (خدا تمہیں سلامت رکھے) ۔"

اور پھر اس نے یخ ٹھنڈی بیئر کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا اور میں اسے ایک ہی گھونٹ میں پی گئی ۔ دوسرے دن شام کو ہم دونوں ادیس بابا کی ائیر پورٹ پر تھے اور افریقی ایئر ہوسٹس بڑے خلوص سے ہمیں ہوائی جہاز کے ساتھ لگی سیڑھیوں کے پاس کھڑی۔ Jambo Usika (شب بخیر کہہ رہی تھی) "یو کم فرام انڈیا؟" ایئر ہوسٹس میری ساڑھی اور میرے رنگ کو دیکھ کر کہہ رہی تھی۔

"یس ۔"

"وچ پارٹ آف دی کنڑی ۔"

"کاشمیر ۔"

"ایئر ہوسٹس نے اپنی اجلی مسکراہٹ کی چاندنی پھیلائے ہوئے بڑی حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر مدھو سودن کی طرف دیکھکر بولی ۔

"اے فائن کپل ۔"

مدھو سودن نے مسکرا کر کہا ۔

" Asante (شکریہ)۔"

"ائیر ہوسٹس زور سے ہنسی اور اس نے پل بھر کیلئے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر چھوڑ دیا کیونکہ ہم دونوں کے پیچھے کچھ اور پسینجر بھی ہوائی جہاز سے نیچے اترنے کا انتظار کر رہے تھے ۔ مدھو سودن مجھے راس ہوٹل میں چھوڑ کر اپنے بھائی سے ملنے چلا گیا جو اپنے کسی دوست کے پاس ٹھہرا ہوا تھا اور مجھے کہہ گیا کہ میں اس کا انتظار کروں ۔ وہ بہت دیر سے لوٹا ۔ اس کا انتظار کرتے کرتے میں سو گئی تھی ۔ بہت رات گذر چکی تھی جب وہ مجھے باہر لے گیا ۔ ایک نائٹ کلب میں ۔ کسی نائٹ کلب میں جانے کا یہ میرا پہلا موقع تھا ۔ سیکس کتنی سستی اور بازاری چیز ہے یہ میں نے وہاں جاکر دیکھا ۔ سب کی نگاہیں مجھ پر تھیں اتنی گوری اور حسین لڑکی نائٹ کلب میں آنے والے لوگوں نے پہلی بار دیکھی تھی ۔ کچھ ہندوستانی جو وہاں اکثر آتے تھے مجھے دیکھکر ہم دونوں کے قریب آ گئے ۔ مدھو سودن نے جی بھر کر شراب پی لیکن میں نے نہ سگریٹ پی نہ شراب کو ہاتھ لگایا ۔ وہ ماحول میرے لئے اتنا ڈی پریسنگ تھا کہ میرے لئے وہاں بیٹھنا بھی مشکل تھا ۔ سب لوگ مجھے ڈانس میں اپنا پارٹنر بننے کو کہہ رہے تھے اور میرا جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا ۔ میں نے بڑی مشکل سے مدھو سودن کو بازو سے کھینچ کر کلب سے باہر نکالا اور ہمارے پیچھے دیر تک بہکے ہوئے لوگوں کے قہقہے گونجتے رہے جن کی پاک پوتر بیویاں گھروں میں ان کے آنے کا انتظار کر رہی تھیں ۔ میں نے ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے مدھو سودن کو بہت ڈانٹا اور مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتا تھا صرف میری نمائش کرنا چاہتا تھا ۔ اس میں خلوص نہیں تھا صرف سیکس اور حسن کی بھوک تھی ۔ میں نے اس سے تو کچھ نہیں کہا لیکن میرے

دماغ میں ایک بیکارسی کو نفلیکٹ شروع ہو گئی ۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ جلدی میں کوئی ایسا قدم اٹھاؤں جس کیلئے مجھے اس سے بھی زیادہ پچھتانا پڑے ۔ اگر میں نے مدھو سودن سے جھگڑا کر لیا تو میں تو کہیں کی نہ رہوں گی ۔ اس سے جھگڑا کر لینا مناسب نہیں تھا ۔ اس سے اگلے روز اس کے بھائی کو ایک دن کیلئے نیروبی جانا تھا اس لئے وہ فارغ تھا ۔ وہ رات میرے ہی پاس سویا اور چونکہ میں نے خود شراب نہیں پی رکھی تھی اس لئے رات بھر مجھے اسکے منہ سے شراب کی بو آتی رہی ۔

اس سے اگلے روز مدھو سودن مجھے یونیورسٹی کی اور میوزیم کی اور گرجا گھروں کی سیر کراتا رہا ۔ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ یونیورسٹی ہاسٹل میں لڑکیاں اور لڑکے اکٹھے رہتے تھے ۔ وہاں کوئی سیکس ان ہیبیشن نہیں تھی ۔ بہت ہی پیارے اور پرانے گرجا گھر تھے اور حکومت کی تمام پالیسی پر چرچ کا بڑا اثر تھا ۔ شام کو وہ مجھے ادیس بابا کی کھلی سڑکوں پر گھماتا رہا اور وہ مجھے وہ کھلی سڑکیں اور وہاں کا موسم دیکھکر چنڈی گڑھ کی یاد آتی رہی اور پھر تمہاری یاد آتی رہی اور ان سب فرینڈز کی یاد آتی رہی جو چنڈی گڑھ میں میرے ساتھ رہ چکے تھے اور پھر رفتہ رفتہ میرا ذہن سرینگر کی وادی میں چلا گیا اور مجھے یاد آیا کہ خزاں کے موسم میں چناروں کے لال سرخ پتے اڑ اڑ کر فضا میں کیسی خوبصورت آگ لگا دیتے تھے اور میری ماں مجھے یاد آئی اور بہت ہی پیارے پیارے پاپا مجھے یاد آئے جن کی تمام امیدوں کو میں اپنے نازک گورے گورے پاؤں سے مسلتے ہوئے یہاں پردیس میں دھکے کھا رہی تھی اور اپنا جسم بیچ رہی تھی اور اپنے پیٹ میں پلتے ہوئے بچے کے مستقبل کو محفوظ کرنے کی آرزو میں کتنی راتوں کی نیند حرام کر رہی تھی اور اپنا مستقبل اپنے ہاتھ میں لئے اسے جگہ جگہ نیلام کر رہی تھی ۔ میں کسقدر کمینی مکار اور بے شرم تھی ۔ مجھ سے تو ادیس بابا کی نائیٹ کلب میں جسم بیچنے والی عورتیں کہیں اچھی تھیں جو اس میں ذرہ بھر شرم محسوس نہیں کرتی تھیں اور قہقہے لگا کر اپنے جسم کا ایک ایک انگ دوسروں کو پیش کرتی تھیں ۔ اور انکی بانہوں میں لہراتی تھیں اور کبھی کبھی وہ یہ سب صرف شراب کی کچھ مقدار کیلئے ہی کرتی تھیں کیونکہ شراب اب ان کی رگوں میں دوڑنے والے خون کا ایک حصہ بن چکی تھی اور جب تک خون میں شراب کی آمیزش نہ ہو وہ حرکت ہی نہ کرتا تھا ۔

اس سے اگلے روز مدھو سودن کا بھائی نیروبی سے واپس آ گیا اور وہ اسے اس ہوٹل میں لے آیا تاکہ شادی کی بات میرے سامنے ہو سکے ۔ اور اسکا بھائی واقعی ایسا گجراتی تھا جو اب افریقی ہو چکا تھا ۔ اور اس کے گفتگو کے انداز میں اور آداب میں بھی افریقی پن رچ چکا تھا ۔ اسے دیکھ کر میں نے بڑے ادب سے ہاتھ جوڑ کر نمشکار کیا اور جب تک وہ بیٹھ نہیں گیا میں کرسی پر نہیں بیٹھی ۔ کیونکہ وہ شراب نہیں پیتا تھا اس لئے مدھو سودن نے اس کیلئے اور اپنے لئے اور میرے لئے بلیک کافی منگوائی ۔ مجھے بلیک کافی قطعی پسند نہیں تھی لیکن پھر بھی ان دونوں بھائیوں کا ساتھ دینا پڑا ۔ مدھو سودن کے بھائی رشک بھائی پٹیل نے مجھ سے پوچھا ۔

”تم کشمیر کی رہنے والی ہو؟“

"جی ۔"

"یہاں کیسے آئیں؟"

"مدھو سودن بھائی لے آئے تھے ۔"

"یو تو کہتا ہے تم کسی کلچرل ڈیلی گیشن کے ساتھ آئی تھیں اور تمہارے خاوند کی ڈیتھ ہو گئی تھی موانزا میں ۔"

"یہ غلط کہتا ہے ۔"

"تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"یہ اسی وعدے پر مجھے یہاں لایا ہے؟"

"تمہاری شادی مدھو سودن سے نہیں ہو سکتی ۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تم ماں بننے والی ہو ۔"

"لیکن اس کا باپ کون ہے؟"

"جس کا یہ بچہ ہے؟"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"مہندر سنگھ یادو ۔"

"کہاں کا رہنے والا تھا؟"

"تھا نہیں ، ہے ۔ وہ راجستھان کا رہنے والا ہے ۔"

"تمہارا جو بچہ ہے اس کا باپ ہر نام سنگھ بھی ہو سکتا ہے ، چندو لال بھی ہو سکتا ہے ۔ جیکب بھی ہو سکتا ہے ۔ لارنس بھی ہو سکتا ہے اور وہ راجستھان کے علاوہ کلکتے کا ، لکھنؤ کا ، نیروبی اور ادیس بابا کا بھی ہو سکتا ہے ۔"

"لیکن تمہارے بھائی کی طرح حرامی نہیں ہو سکتا ۔ جو مجھے جھوٹے وعدے کر کے یہاں لایا اور اب تمہارے فیصلے کا انتظار کر رہا ہے ۔"

"شٹ اپ یو بچ ۔"

"گیٹ آؤٹ ۔"

میں نے مدھو سودن بھائی پٹیل کے بڑے بھائی رشک بھائی پٹیل کو راس ہوٹل کے اس کمرے سے باہر نکال دیا جہاں میں ٹھہری ہوئی تھی ۔ اس کے ساتھ ہی مدھو سودن بھی چلا گیا ۔ اور ان دونوں بھائیوں کے ساتھ ہی میری زندگی کا وہ سب کچھ چلا گیا۔ جس کے بل بوتے پر میں اب تک جی رہی تھی ۔ مجھے ہیروئن بنانے والوں نے ایک عام ایکسٹرا گرل بنا کر چھوڑ دیا ۔"

"بڑا حوصلہ ہے تم میں ۔" میں نے اتنی لمبی داستان سنکر سیما سے کہا "عورت کی مجبوری ہی کبھی اس کا حوصلہ بھی بن جاتی ہے ۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"دیکھو مُنا سر کتے سر کتے کہاں پہنچ گیا ہے ۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا" سیما نے مُنے کو جسکے پاؤں صوفے کے نیچے چلے گئے تھے بڑی آہستگی سے اپنی طرف کیا اور اس کے بازو کے ساتھ تکیہ لگا دیا تاکہ وہ دوبارہ ادھر نہ سرک سکے ۔

مجھے پیاس لگ رہی تھی ۔ میں پانی پینے کو اٹھی ۔ گھڑی دیکھی بارہ بجنے کو تھے ۔

"بہت دیر ہو گئی ہے ۔" میں نے کہا ۔

"نیند آ رہی ہے ۔ میری کہانی سنکر تم سو بھی سکتی ہو ۔ بڑی پتھر دل ہو۔"

"نیند تو نہیں آ رہی سیما ۔"

"میری آنکھیں گھٹنے لگی ہیں ۔ بوتل میں جتنی بچی ہے وہ گلاس میں ڈال دو ۔ صبح تک کون انتظار کرے ۔"

"رہنے دو اب ۔"

"پنڈتانی جی ابھی دیدو ہمارا چرن امرت اور ساتھ ہی اگر بتی بھی جلا دو ۔"

اس نے خود ہی گلاس میں بچی کچھی شراب انڈیل لی اور پیکٹ میں پڑے آخری سگریٹ کو بھی سلگا لیا ۔ ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کرتے ہوئے بولی "وقت بہت گذر چکا ہے ۔ اپنی کہانی کو اس طرح سے مختصر کروں گی کہ میرے اس سلگتے ہوئے سگریٹ کے آخری کش کے ساتھ ہی ختم ہو جائے ۔ کہانی اور سگریٹ کا کلائمکس ایک ہی ہوتا ہے ۔ دھواں اور راکھ ۔"

سیما نے ایک بہت لمبا کش لیا اور کہنے لگی ۔

"جب مُنا پیدا ہوا اس وقت میں ایک بوڑھی اٹیلین راہبہ کے ساتھ رہ رہی تھی جو اکیلی تھی اور اسکا خاوند بہت برس پہلے ایک حادثہ میں مر چکا تھا ۔ چرچ سے اسکے گذارے کی رقم اسے مل رہی تھی ۔"

"تم اس کے پاس کیسے پہونچیں؟"

"یہ پوچھو گی تو میرے لئے ایک بوتل وسکی اور سگریٹ کے ایک اور پیکٹ کا انتظام کرنا ہو گا ۔ میں جانتی ہوں کہ یہ تم سے نہیں ہو سکے گا ۔ اس لئے جو کہہ رہی ہوں بس وہی سنو ۔"

"تمہاری مرضی ۔"

"میرا یہ منا اویس بابا کے ایک مشنری ہسپتال میں پیدا ہوا ۔ جسے یہاں چیریٹی ہاسپٹل کہتے ہیں ۔ اور چرچ نے ہی اسکی پرورش کیلئے مدر تھریسا کی پینشن میں کچھ اور اسّی پین ڈالرز کا اضافہ کر دیا اور جب میں ہاسپٹل سے گھر آئی تو مدر تھریسا نے میری اور مُنے کی اس طرح خدمت کی جیسے میں اسکی بیٹی تھی اور میرا مُنا اس کا دوہتا تھا ۔ مدر تھریسا اسے اپنی

بھی گلاس پیش کیا ۔ میں نے انکار کر دیا ۔

"ابھی نئی ہے چھوڑ دو ۔" دونوں آدمیوں میں سے ایک نے کہا اور پھر وہ سب دو بجے تک شراب پیتے رہے اور میں پلنگ پر دیوار سے پیٹھ ٹیک کر بے حس و حرکت بیٹھی رہی ۔

چار بجے کے قریب وہ دونوں آدمی مہورت کر کے چلے گئے اور وہ شخص جو مجھے ساتھ لیکر آیا تھا سامنے بیٹھا دیکھتا رہا اور جب وہ جانے لگے تو میں نے اس شخص کے منہ پر تھوکدیا اور وہ دونوں آدمی زور سے ہنسے اور اس شخص نے میرے منہ پر اتنے زور سے طمانچہ مارا کہ میرا تمام ننگا جسم تھر تھرا اٹھا ۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے ان دونوں میں سے ایک آدمی نے کہا ۔

"چھوکری کا پیٹ صاف کراؤ دینا ناتھ اگر اسے ھیروئن بنانا چاہتے ہو ۔"

"تو سائیڈ ھیروئن بن جائیگی ۔ اپنا کیا بگڑا ہے ۔"

تینوں آدمی چلے گئے اور دینا ناتھ نے کمرہ باہر سے بند کر دیا

"بس رہنے دو اب سیما ، مجھ میں اور سننے کی ہمت نہیں ۔"

"تم ہی تو سننا چاہتی تھیں میری سرگذشت ۔ اب کیوں گھبرا رہی ہو؟"

"اور نہیں سن سکتی ۔"

"تم سن نہیں سکتیں میری جان اور میری داد دو کہ میں نے یہ سب سہا ہے ۔ ابھی تو بہت کچھ باقی ہے ۔ سنو گی تو لرز اٹھو گی ۔ لیکن ذرا رکو ۔"

یہ کہکر وہ اٹھی اور اپنے اٹیچی کیس میں پڑی بوتل سے کچھ اور شراب گلاس میں انڈیل کر بنا پانی ڈالے ہی پی گئی ۔

"تم تو کہا کرتی تھیں کہ وسکی کھانے کے بعد نہیں پی جاتی ۔"

"جب مجھے اس کے تمام آداب معلوم نہیں تھے ۔ اس وقت اتنا معلوم تھا کہ پاپا کیسے پیتے تھے اور پاپا کے جو دوست ہمارے گھر آتے تھے وہ کیسے پیتے تھے ۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سب دقیانوسی ڈھنگ سے شراب پیتے تھے ۔ شراب تو کھانے سے پہلے ، کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد کسی وقت بھی پی جا سکتی ہے ۔ صبح ، دوپہر ، شام ، آدھی رات کسی بھی سمے ۔ یہی تو ماڈرن ڈھنگ ہے شراب پینے کا ۔"

"تم کتنی بدل گئی ہو؟" میں نے کہا ۔

"میں بدل دی گئی ہوں ! آئی ھیو بین کمپلیٹلی مٹیلمارفوزڈ ۔ جو کچھ تم دیکھ رہی ہو وہ سیما نہیں اس کا کیری کیچر ہے ۔ سیما کا وجود تو اسی روز ختم ہو گیا تھا جب اس نے پندرہ سیکٹر کے ایک فلیٹ میں مہندر سنگھ یادو کے ساتھ پہلی بار وسکی پی تھی ۔ یہیں تمہارے گھر کے آس پاس کسی لین میں ۔

وہیں کہیں ننگا ہو گا میرا کیری کیچر ۔"

"بوتل ایک طرف رکھ دوں اب؟"

"اس میں آدھا پیک چھوڑ دیا ہے ۔ وہ صبح اٹھتے ہی لوں گی ۔ پیکٹ میں ایک سگریٹ بھی چھوڑ رہی ہوں وہ بھی صبح ہی پیوں گی ۔ صبح نہار منہ آدھا پیک نہ لوں تو جسم زندہ ہی نہیں ہوتا ۔ بوتل ادھر ادھر مت کر دینا کہیں ۔ بس کل صبح کے بعد نہ شراب پیوں گی نہ سگریٹ ۔"

"پرامز !" میں نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا ۔

"پکا ۔" سیما نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے دیر تک سہلاتی رہی ۔

"اب سو جاؤ ۔" میں نے کہا ۔

"اور وہ سائیڈ ہیروئن کی بات ؟"

"وہ کل سنوں گی ۔"

"جو کچھ ہونا ہے آج ہی ہو گا ۔ آنے والی صبح کے بعد کچھ نہیں ہو گا ۔ آگے بولوں یا خاموش ہو جاؤں؟"

"بولو !"

"مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں بمبئی کی کس لوکیلٹی میں تھی ۔ اس کمرے کے باہر کیا تھا ۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی ۔ میں سرکس کے اس پالتو جانور کی طرح تھی جسے وقت پر خوراک مل جاتی ہے اور پھر شو کے وقت اُسے رِنگ ماسٹر کے ہنٹر کے اشارے پر کرتب دکھانا پڑتا ہے ۔ اور پھر اسے سلاخوں لگے پنجرے میں داخل کر دیا جاتا ہے ۔ اور پھر ایک دن مجھے ایک سائیڈ ہیرو مل گیا جو مجھے بمبئی سے اڑا کر دار السلام لے آیا ۔ ایسا شہر جس کا میں نے کبھی نام بھی نہیں سنا تھا ۔ وہ ایک گجراتی تھا اور اسکا نام مدھوسودن بھائی پٹیل تھا ۔ وہ بمبئی میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے آیا تھا اور دار السلام میں پہنچ کر وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا ۔ وہاں اس کا ایک پروویژن سٹور تھا ۔ جس میں اس کے تین بھائی حصے دار تھے ۔ اجینگا لوکیلٹی میں ان کا اپنا مکان تھا جس میں سب بھائی اکٹھے رہتے تھے ۔ چونکہ ذاتی جائیدادوں کو قومی ملکیت قرار دیدیا گیا تھا" ۔ اس لئے ان کے تین منزلہ مکان میں صرف سب سے اوپر والا حصہ ان کے پاس تھا ۔ نچلی دونوں منزلوں میں سرکار نے جو کرایہ دار رکھے تھے ان کا کرایہ سرکاری خزانے میں جمع ہوتا تھا ۔ مدھوسودن نے بتایا کہ انہوں نے اپنا سارا روپیہ لنڈن کے بنکوں میں جمع کر رکھا تھا اور اب وہ دھیرے دھیرے اپنا کام سمیٹ رہے تھے اور سال بھر کے اندر وہ ہندوستان لوٹ جائیں گے اور یہاں صرف ان کا سب سے بڑا بھائی ہی رہے گا کیونکہ وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا ۔ ہوائی جہاز میں وہ مجھے افریقی زبان کے کچھ بول چال کے الفاظ سکھاتا رہا اور میں انہیں ایک اسٹوڈینٹ کی طرح یاد کرتی رہی ۔

ائیر پورٹ پر اتر کر مدھوسودن پٹیل مجھے اپنے گھر نہیں لے گیا بلکہ ایک ہوٹل میں لے گیا جس کا نام موانزی ہوٹل تھا ۔ ہوٹل میں وہ شام تک میرے ساتھ رہا اور ہم دونوں بیئر پیتے رہے اور پیار کرتے رہے اور میں اپنے مستقبل کی

حسین تصویر میں اپنے تخیل کے پیارے پیارے رنگ بھرتی رہی ۔ شام کو مدھو سودن چلاگیااور کہہ گیاوہ آٹھ بجے تک آجائیگا اور پھر رات گئے تک میرے ساتھ رہے گا ۔ اس کے جانے کے بعد میں سو گئی ۔ بیئر پینے کے بعد نیند بہت آتی ہے ۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب مدھو سودن نے دروازے پر دستک دی ۔ میں جلدی سے تیار ہوئی اور پھر وہ مجھے اپنی کار میں گھمانے لے گیا ۔ ایسڑبے کے علاقے میں اور پھر ایسڑبے ہوٹل میں ہم دونوں نے کھانا کھایا ۔ تمام ہوٹل گھنے سایہ دار درختوں سے گھرا ہوا تھا اور لکڑی کے بنے ہوئے اس ہوٹل کی چھت پر کھڑے ہو کر سامنے پھیلے ہوئے سمندر کا نظارہ بے حد خوبصورت تھا ۔ یہیں کھڑے کھڑے اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر کہا ۔

"Mini Penda Veve (میں تم سے پیار کرتا ہوں)"

"Asonte Rifiki (میرے دوست تمہارا شکریہ)"

"ارے تم تو ایکدم افریقی ہو گئی ہو ۔ صرف رنگ کا فرق ہے ۔"

"رنگ اور نسل کا فرق تو مٹ جانا چاہیئے ۔"

"جبھی تو ایک افریقی گجراتی ایک کشمیرن سے بیاہ کر رہا ہے ۔"

مدھو سودن اور میں بہت دیر تک ہنستے رہے اور پھر وہ مجھے میرے ہوٹل میں چھوڑ کر چلا گیا ۔

ایک ہفتے تک ایسا ہی ہوتا رہا ۔ وہ صبح سویرے متواتر ہی ہوٹل میں آجاتا ۔ ناشتہ میرے ساتھ لیتا ۔ گیارہ بجے تک میرے ساتھ رہتا اور پھر اپنے پروویژن سٹور پر چلا جاتا ۔ پھر شام کو چھ بجے کے بعد آجاتا اور مجھے دارالسلام میں گھماتا رہتا ۔ میں اس کے ساتھ جگہ جگہ بیٹھ کر بیر پیتی رہتی ۔ سگریٹ پھونکتی رہتی اور پھر کسی جگہ کھانا کھا کر رات کو وہ مجھے ہوٹل لے آتا اور پھر آدھی رات کے بعد تک میرے ساتھ سویا رہتا اور پھر کسی وقت خود ہی اٹھکر گھر چلا جاتا ۔

ایک دن ناشتے پر میں نے اس سے کہا۔

"مدھو سودن ڈئیر ۔ مجھے اپنے گھر لے چلو ۔ میں گھر کے لوگوں سے ملنا چاہتی ہوں ۔"

"دو چار دن اور رک جاؤ ۔ میں اپنے بھائیوں سے شادی کی بات کر لوں ۔"

"تم نے ابھی تک شادی کی بات نہیں کی؟"

"نہیں ۔"

"کیوں؟"

"شادی کا تو کوئی جھگڑا نہیں ۔ لیکن یہ جو بچہ ہے اس کا کیا ہو گا؟"

"میں اس کو جنم دوں گی ۔"

"تم اسے ضائع نہیں کر سکتیں؟"

"اسے ضائع کرنا ہوتا تو اپنی زندگی کو اس طرح کیوں برباد کرتی ۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہئیے؟"

"اپنے بھائیوں کو سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دو ۔"

"وہ مجھے تم سے شادی نہیں کرنے دیں گے ۔"

"اگر یہی بات تھی تو تم مجھے ہندوستان سے کیوں لانے تھے ساتھ ؟ تم اتنے بودے آدمی ہو ۔ میں نہیں جانتی تھی ۔"

"آہستہ بولو سیما ۔ حالات کو سنبھالنے میں کچھ وقت لگے گا ۔"

"یا تو تم دو دن کے اندر مجھ سے شادی کر لو ۔ نہیں تو مجھے چھوڑ دو ۔ تم اسقدر کمینے ہو مجھے معلوم نہیں تھا ۔"

"وہ مجھے ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا اور اس کے بعد شام کو نہیں آیا ۔ میں بہت دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی ۔ مجھے لگا جیسے اب وہ کبھی نہیں آئیگا اور ہوٹل والے مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے کیونکہ میرے پاس ان کا حساب چکانے کیلئے پوری رقم بھی نہیں تھی ۔ میرے پاس تو بس اتنی ہی کرنسی تھی جو مدھو سودن نے پہلے دن مجھے دی تھی ۔ نہ مجھے اور کرنسی کی ضرورت پڑی اور نہ ہی اس نے مجھے کوئی اور رقم دی ۔ میں ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی کھول کے نیچے سڑک پر گھومتی ہوئی خوبصورت کاریں دیکھتی رہی جن میں کالی نسل کے افریقی لوگ بیٹھے تھے اور خواب دیکھ رہے تھے جب ان کا اپنا ملک خود کفیل اور خوشحال ہو جائیگا تو وہ کیسی زندگیاں گذاریں گے ۔"

"پھر مدھو سودن نہیں آیا کیا؟"

"وہ اگلے دن صبح آیا ۔ بہت پریشان نظر آتا تھا ۔ مجھے اس پر غصہ تو بہت تھا لیکن میں نے اپنے پر قابو رکھا ۔"

"کہاں رہے کل شام؟"

"بزنس کا کچھ جھگڑا تھا ۔"

"کیا جھگڑا ہے؟"

ایتھوپیا میں جو ہمارا کام ہے اس میں نقصان ہو گیا ہے ۔ ادیس ابابا جانا پڑیگا ۔"

"تو جاؤ ۔"

"تمہیں بھی ساتھ چلنا ہو گا ۔ میرا بڑا بھائی کل چلا گیا ہے ۔ شادی کی بات بھی وہیں کروں گا ۔"

"میں نہیں جاؤں گی ۔"

"میں نے تمہارا ٹکٹ لے لیا ہے ۔ کاغذ بھی تیار کرا لئے ہیں ۔ کل دوپہر کی فلائٹ سے چلیں گے ۔"

"میں خاموش ہو گئی ۔ میرے پاس تو کوئی چارہ ہی نہ تھا ۔ اگر میں مدھو سودن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتی تو پھر کہاں رہتی ۔ یہاں تو میں کسی کو بھی نہیں جانتی تھی ۔ میں مان گئی اور مدھو سودن نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور کہا ۔

گود میں لیکر نحیف آواز میں نہ جانے کیا کیا سناتی رہتی اور میں گھر کا کام کاج کرتی رہتی ۔ ہر اتوار کو میں مُنّے کو ساتھ لیکر اس کے ساتھ چرچ جاتی اور سوچتی کہ دوسروں کے گناہوں کیلئے خود کو صلیب پر چڑھا دینا کتنا عظیم کام تھا ۔ میرے دل میں کرائسٹ کیلئے بے پناہ عقیدت پیدا ہو گئی اور میں نے چرچ سے ایک بہت پرانا چھوٹا سا کراس لیکر اور اسے زنگ آلود زنجیر میں پرو کر گلے میں ڈال لیا اور مدر تھریسا نے میرا ماتھا چومتے ہوئے کہا

"گاڈ بی ود یو ۔"

اور مدر تھریسا کی کمزور آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔"

سیما نے لمبے لمبے کش لیکر آدھی سگریٹ ختم کر ڈالی تھی

"پھر ایکدن اتوار کو جب ہم چرچ سے واپس آئے تو مدر نے کہا ۔

"چائلڈ لسن ۔"

"یس مدر"

"لیو فار انڈیا ۔ پیپل آر آفٹر یُو ۔"

"بٹ وائی مدر ۔"

"دے وانٹ یُور باڈی ۔ یو انڈر اسٹینڈ ۔"

"یس مدر ۔"

"میں نے دیکھا مدر تھریسا زار و قطار رو رہی تھی ۔ اسکی جُھریوں بھرے چہرے کی تہوں میں آنسوؤں کی نمی جمع ہو رہی تھی اور وہ اسے پونچھتی بھی نہیں تھی ۔ وہ بدستور سسکے جا رہی تھی ۔

"ویز ہاونڈز وانٹ ٹو سک یُور بلڈ ۔"

"گاڈ از وتھ می مدر ۔ ڈاونٹ فیر ۔"

"آئی ول میک ارینجمینٹ فار یُور ٹکٹ ۔

"آئی کانٹ لیو یو ایلون ۔"

"مائی ہسبینڈ آلسو لیفٹ می ۔ یو مسٹ لیو بی فور نیکسٹ سنڈے ۔"

"وائی سو سُون؟"

"نیکسٹ سنڈے دوز راسکلز وانٹ اسے ریپلائی فرام می ۔"

"وٹ ریپلائی ۔"

اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا ۔

اس رات مدر تھریسا تمام رات جاگتی رہی اور میرے لئے دعائیں مانگتی رہی اور روتی رہی ۔ اس کے بعد اس نے مجھے گھر سے باہر جانے سے روک دیا ۔ میں چار دن کے بعد جب گھر سے باہر نکلی تو مدر تھریسا میرے ساتھ تھی اور اس

نے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے منے کو اپنی گود میں لے رکھا تھا اور دھیرے دھیرے رو رہی تھی اور پھر ٹیکسی ایئر پورٹ پر رکی ۔ اس نے ٹیکسی کا کرایہ دیا اور مجھے پسینجرز لاؤنج میں لے آئی جہاں سے مجھے ہوائی جہاز میں بیٹھکر اسے ہمیشہ کیلئے چھوڑ جانا تھا ۔

پھر پیسنجرز کیلئے اناؤنس مینٹ ہوئی اور مدر تھریسا نے مجھے اپنے گلے سے لگالیا اور منّے کو جی بھر کر چوما اور پھر اپنی انگلی میں سے جانے کون سے پتھر والی انگوٹھی میری انگلی میں پہنادی ۔ میرا چھوٹا سا اٹیچی کیس میرے ہاتھ میں دیا ، ایئر بیگ میرے کندھے سے لٹکا دیا اور کہا ،

"فار منا دیر از ملک ان دی ایر بیگ ۔"

اسکی آنکھوں سے ابلتے ہوئے آنسوؤں سے تر اسکے جُھریوں بھرے گال کو میں نے چوما اور پھر اس کے پاؤں کو چھوتے ہوئے کہا ۔

"مدر فار گو می فار مائی سنز ۔"

"ایوری ون از اے سن ۔ گاڈ بی وتھ یو ۔"

پھر دوسری اناؤنسمینٹ ہوئی اور میں دھیرے سے مسکرا کر پیسنجر لاؤنج سے باہر بھاگی ۔ مدر تھریسا کے آنسوؤں سے تر چہرے پر بڑا عجیب سا نور جھلک رہا تھا جیسے شام کو اندھیرا ہونے سے پہلے افق کی حدوں پر ہوتا ہے ۔

جب پالم ایئر پورٹ پر ہوائی جہاز اتر رہا تھا تو میرے سامنے چنڈی گڑھ کی سڑکیں تھیں اور تم تھیں اور تمہاری شفیق ماں تھی اور وہ نُور تھا جو سورج کی پہلی کرنوں سے پالم ایئر پورٹ پر پھیل رہا تھا اور جو مدر تھریسا کے چہرے پر تھا اور جو تمہاری ماں کی معصوم مسکراہٹ میں ہے میں ایئر پورٹ سے سیدھی بس اسٹینڈ پر گئی اور بس پکڑ کر یہاں پہنچ گئی ۔ تم گھر پر نہیں تھیں لیکن وہ نور موجود تھا ، وہ روشنی موجود تھی جسے ہر ماں اپنی آنکھوں میں سجائے اپنے بچے کا انتظار کرتی ہے ۔ یہی نور لے کر میری ماں بھی سرینگر میں میرا انتظار کر رہی ہوگی ۔ کچھ دن تمہارے ساتھ رہ کر میں اپنی اس پیاری وادی میں لوٹ جاؤں گی ۔ جسکی ایک پرانی گلی میں ایک پرانا گھر ہے ۔ جہاں میرے پرانے خیالوں کے ماں باپ میرا انتظار کر رہے ہیں ۔"

"ہاؤ لانگ یو ہیو سفرڈ سیما ۔"

"فار ہِم ۔" اس نے اپنے منے کی طرف اشارہ کیا ۔

"یو آر اے گریٹ گرل ۔"

"نو ۔ آئی ایم اے کمپلیٹ ریک ۔ یہ جو میرے خون اور جسم کا ایک چھوٹا سا حصہ میرے پہلو میں آرام سے پڑا ہے ۔ یہ میری ہی ٹوٹی ہوئی شخصیت کا ایک ٹکڑا ہے ۔ یہ سمبل ہے اس دوزخ کے کرب کا ۔ فرسٹریشن کا ، رنج کا اور

ایبیشنز کے تمام ریکیج کا ۔ یہ صرف میرے خون پر نہیں بلکہ اس دور کی نسوں میں حرکت کرتے ہوئے نیم گرم خون پر پل رہا ہے جس میں ہومو گلیوبینز کی مقدار لمحہ بہ لمحہ کم ہوتی جا رہی ہے ۔ یہ ایک گفٹ ہے جو آج کی عورت اس دور کی جھولی میں ڈال سکتی ہے ۔ اور میں فقط ایک شکستہ اور لٹی ہوئی عورت نہیں ہوں بلکہ دنیا بھر کی شکستہ اور لٹی ہوئی عورتوں کی نمائندہ ہوں ۔ اس نے اپنی انگلیوں کو چھو جانے والی جلتی ہوئی سگریٹ سے ایک کش لیا اور کہا ۔

"ان بند دروازوں کو کھول کر دیکھو باہر کیا ہو رہا ہے ۔ انسانی نسل کتنے بڑے کرائسس سے گذر رہی ہے ۔ میں اور تم اس کرائسیس کے انجام کو نہیں دیکھ پائیں گے لیکن میرا یہ مُنا ، میرے ماضی اور مستقبل کا امانتدار ، اس انجام کو دیکھے گا اور پہروں سوچا کریگا کہ اس انسان کُش دور میں کروڑوں انسان کس طرح زندہ رہے ہوں گے ۔"

سیما اُٹھی اور اس نے انگلیوں کو چُھوتی ہوئی انگارہ سگریٹ کے آخری حصے کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور پھر اپنا تمام جسم بستر پر پھیلا کر چت لیٹ گئی ۔

باہر اندھیرا ہے اور اندر روشنی ہے ۔ پھر باہر روشنی اور اندر اندھیرا چھا جائیگا اور میں اور سیما اور ماں سب سو جائیں گے اور اس اندھیرے میں سیما کے مُنے کے معصوم ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کی روشنی تھرک جائیگی جسے کوئی بھی نہ دیکھ سکے گا خود مُنا بھی نہیں ۔ میں نے بجلی کا سوچ آف کر دیا ہے اور چپ چاپ لیٹ گئی ہوں ۔

سیما اور اس کا مُنا دونوں گہری نیند سوئے پڑے ہیں ۔ لیکن مجھے نیند نہیں آرہی ۔ جو کچھ میں نے سیما کے منہ سے سنا ہے کیا اس کے بعد بھی کوئی سو سکتا ہے میں جاگ رہی ہوں ۔ باہر تیز ہوا چل رہی ہے ۔ باہر کا گیٹ ابھی تک کُھلا ہے ۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ لیٹی ہیں ۔ ایک آزاد اور مُکت عورت اور دوسری پرمپراؤں کے بوجھ تلے دبی کمزور لڑکی ۔ کتنا عجیب کانٹراسٹ ہے ۔

"آدھی رات کب کی گذر چکی ہے اور سدھیر ابھی تک نہیں آیا ۔ آرٹ گیلری سے نکلنے کے بعد جانے کہاں پڑا ہو گا ۔ وہ کہا کرتا ہے کہ کانٹراسٹ ہی آرٹ کی جان ہے! چنڈی گڑھ کی کھلی سنسان سڑکوں پر گھومتے ہوئے اور پھر اپنے کمرے میں بیٹھکر رنگ گھولتے ہوئے اسے یہ کیسے احساس ہو سکتا ہے کہ فن کی جان کنٹراسٹ نہیں ، بلکہ وہ خون ہے جو فنکار کی رُوح سے نکل کر اسکے زخموں سے رِستا ہے اور اس کے بے جان خاکوں میں بھر جاتا ہے اور انہیں جیون دیتا ہے ۔

میں اپنی نیند بھری کُھلی آنکھوں سے اس صبح کا انتظار کر رہی ہوں جو تھوڑی ہی دیر میں اس ادھورے بے حس اور نیند کے ماتے شہر پر طلوع ہونے والی ہے ۔

(ناول کا ایک باب)

بساطِ ہوائے دِل

ابو سعید قریشی

کچھ اِن اوراق سے متعلق

غالب آخری مغل شاعر تھا، عبد الرحمن چغتائی، آخری مغل مصور! اس نے میناتوری مصوری کو مسودوں کی آرائش سے نکال کر دیواروں پر آویزاں کرنے کے لائق بنا دیا۔ غالب نے جس تہذیب کو اشعار میں پرو دیا تھا، چغتائی نے اسے آبی رنگوں اور ندیوں کی مانند بہتی لکیروں سے زندہ کر کے حال اور ماضی کو نقش بر دیوار بنا دیا کہ آؤ، دیکھو اور موازنہ کرو!

میرے مکتب کے دور میں مخزن اور زمانہ، عصمت اور سہیلی وغیرہ کے علاوہ ہمارے گھر میں نیرنگ خیال بھی آیا کرتا تھا۔ نیرنگ خیال تصویروں کے لیے منفرد تھا ان میں چغتائی کی تصویریں بھی ہوتیں، ایک رومانی عہد کی عکاسی جو خواب و خیال ہو چکا تھا۔

مرقع چغتائی کی ترتیب کے وقت علامہ اقبال کے الفاظ میں شاید مصور کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔ میری عمر شاید دس یا بارہ سال۔ مکتب کا طالب علم پہلے ہی چغتائی کا گرویدہ تھا۔ اور اس کے توسط سے غالب تک رسائی ہوئی تو ایک بوڑھے درخت کے سامنے ایک عمر رسیدہ شخص نظر آیا جو گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں سے کہہ رہا تھا۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

لیکن پورا قطعہ تو ایک داستان تھا

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دِل

پیری میں جوانی کے رومانی خواب یاد آ گئے۔ جھیلوں اور پھولوں، کلیوں اور باغوں شکاروں اور رہائشی کشتیوں کی وادی سے زیادہ رومان پرور فضائیں اور کہاں ملیں گی ۔ لیکن طعنۂ نایافت ہوائے دل کو مقید نہ کر سکا اور ایک افسانے کی صورت میں منتشر ہو گیا۔ تلخ حقائق کے معاشرے میں ایک نفسیاتی واردات جس کا انجام یوں بھی ہو سکتا تھا۔

مصنف

بساطِ ہوائے دِل

اس کا شجرہ نسب جاگیر در جاگیر پھیلا ہوا تھا۔ زمین، کنوئیں، رہٹ، کھال، تالاب جنگل، بیلے، گاؤں، رعایا، غلام کنیزیں، گائیں بھینسیں، بھیڑ بکریاں ...

ان گنت آندھیاں آئیں اور گزر گئیں، کتنے ہی جھکڑ سیاسی تبدیلیوں کے ریلے، اصلاحات، اراضی کے مالکوں، کارندوں کی املاک اور حقوق و فرائض کے توازن قائم کرنے کے ہی چکر، کتنے ہی بگولے آئے اور نکل گئے لیکن شجر جاگیر سات پشتوں سے جوں کا توں موجود تھا۔ چار پتے ٹوٹے اور گر گئے اور ان کی جگہ چھ اور نکل آئے۔ تین ٹہنیاں

کڑکڑائیں، پانچ اور پھوٹ پڑیں۔ کسانوں، ہاریوں، مزارعوں اور دہقانوں کی ایک کے بعد دوسری نسل آئی لیکن جب تک کوئی بات کسی کی سمجھ میں آئے، شہر کی بات، دیہات تک پہونچے ایک اور نسل مٹی میں مٹی ہو گئی۔ لیکن جاگیرداری نظام جوں کا توں رہا۔

شہباز خان نے اپنے بزرگوں کے قصے کان لگا کر سنے تھے۔ رزم و بزم کی باتیں۔ کہانیاں، حکائیتیں، دلاوری، بہادری، لوٹ کھسوٹ، غارت گری اور بدلتی ہوئی دنیا کے مطابق انہوں نے کسی شوق میں کمی نہیں کی تھی۔ اتفاق سے کبھی کوئی خیر اندیش ان کو روکتا بھی تو یہی جواب ملتا کہ زندگی ڈھائی دن کی دھوپ چھاؤں ہے اور پھر ۔۔۔۔ اللہ کی اللہ جانے، ان ڈھیریوں کے نیچے سے لوٹ کر تو کوئی آیا نہیں۔ ہمارا سانس بھی ختم ہو جائے گا اک دن اور پھر؟۰۰۰۰ کیا سمجھے!

شریکا برادری کی دیکھا دیکھی تعلیم کا شوق ہوا تو یار لوگوں نے کہا زمینوں کو تج دو گے مالک! نخصمی ہی مر جائیں گی نمانیاں۔ ای اے، بی اے کر کے سرکار کی نوکری تو نہیں کرنی، اور اس نے اپنا تھینسز ایک دوست کو تھما دیا کہ اس سے آگے تم۔ آدم خاکی نہاد کو بندۂ مولا صفات بننے کی صلاحیت کا زعم؟ نہ بھائی۔ افلاک کی سیاحت اس گنہگار سے نہیں ہوتی۔ گیلی مٹی کا ٹن ٹن کرتا پتلا اپنی اوقات تو پہچان لے۔ سنتے ہیں کہ کسی گاؤں کا چھورا کوئی سر نکالنے لگتا تو ابا جی کہا کرتے شیشم تجھ سے اونچا ہے۔ اور کیکر کے پیڑ پہ چڑھو گے تو پور پور چھد جاؤ گے۔

"دادا ہمارے چیتوں سے ہرنوں اور نیل گائے کا شکار کرتے تھے۔ بھس بھرے چیتوں کی جوڑی دیوان خانے کے دروازے پہ آج بھی موجود ہے۔ شکاری ملازم بتایا کرتے کہ رات کی طرح کالے چیتے جب چیتلوں اور بارہ سنگھوں پہ لپکتے تو سیاہ لہریں سی ہوا میں نظر آتیں۔ اور مالک جب شکار سے واپس آتے تو مٹیاروں کو دیکھ کر آپ بھی چیتے بن جاتے۔ جاگیروں کی ڈولیاں پہلے مالک کی حویلی پہ رک کے آگے بڑھتیں۔" ان کے وارث کو ادھر کا دھیان آیا تو سیدھا سری نگر! اس کا باپ جھوم جھوم کے گایا کرتا تھا "لالہ رہتے سمن برے"

ہوٹلوں اور ہاؤس بوٹوں والوں نے اسے نرغے میں لے لیا۔ سہولتیں، گستالے مرغابیاں اور مال ۔۔۔

"آپ کدھر ٹھہریں گی حضرت؟" مانجھی نے پوچھا

"ہوٹل! ہاؤس بوٹ کا اس کو تجربہ نہیں تھا۔

ہوٹل تو میدانوں میں بھی ہوتے ہیں خواجہ صاحب ۔ بوڑھے مانجھی نے اپنا گنجا سر کھجایا

"تمہارا مطلب ہے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرنا چاہیے؟"

"جہاں حکم ہو کا لگ جاوے گا۔ اور سب سہولت ۔ آنکھوں کے سامنے پکڑی ہوئی مچھلی۔ مرغابیاں۔ شکارے میں جاؤ اور شاخوں سے تازہ پھل اپنے ہاتھ سے توڑ کے کھاؤ ۔ اور ڈبل بیڈ ۔ ایک شکن نہیں ہوگی۔ فرش پہ قالین ۔ ڈرائنگ روم اور بیڈ روم اور باتھ ۔ انگریز بہادر بھی ہاؤس بوٹ میں ٹھہرتا تھا۔ روم سروس دن رات پانی میں ستاروں

کے جھرمٹ اور اس کے اوپر امیر زادے کے لیے پری زاد۔ جوانی کی سنگت سنتور سر بہار اور ستار جوانی کی لہریں۔

اس کا سامان کھول کے مانجھی چلا گیا۔ گرم پانی کا غسل بھاپ سے اس کا ایک ایک مسام کھل گیا۔ شہباز کو نیند آنے لگی لیکن سنتور کی آواز نے اس کو چونکا دیا۔ اور نسوانی آواز جیسے شہنائی افسون انتظار تمنا کہیں جسے اور جانے کتنے ہی شعر کتنے ہی نغمے اس کے کانوں میں گونج اٹھے۔ بدن پونچھ کے اس نے ڈریسنگ گاؤن پہن لیا۔ اور بیڈ روم میں آ گیا ۔ ڈبل بیڈ کے تکیے اور چادریں اور چھپر کھٹ پہ پھولوں کے ہار ۔ دروازے پہ دستک ہوئی۔

چلے آؤ۔ اس نے کہا

دروازہ کھلا۔ آپ کی میزبان خواجہ صاحب مانجھی کی آواز نووارد کو چھوڑ کر غائب ہو گئی۔

اپنے قومی لباس پھرن میں ملبوس ڈری ڈی ہرنیوں کی آنکھوں والی میزبان بند دروازے کے پردے کے سامنے مرمر کا مجسمہ سی کھڑی تھی شہباز اپنے دادا کے چیتے کی طرح لپکا اور اپنے ہونٹ اس کے شانے پر رکھ دیے لڑکی کے جوان جسم سے نافۂ آہو کی سی خوشبو آ رہی تھی ۔ ہونٹوں کے لمس سے وہ بید مجنوں کی طرح لرز اٹھی۔ سنتور پہ ہاتھ جا پڑے جس طرح ایسا مہمان تو پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ خوبرو، نوجوان، شائستہ ۔ ۔ ۔"

شہباز کو اس کے سانس کی بازگشت شال کی طرح محسوس ہوئی شائستگی تحفظ، رحم اور ہمدردی کی التجا کا لبادہ۔ جھالر والے لیمپ کی رومانی روشنی میں اس کی بڑی بڑی آنکھیں نہ جانے کون سے خوف سے مضطرب تھیں۔ شاید کسی بیماری کا اندیشہ یا ذمہ داری کا احساس جو انوکھے مہمانوں کی دنیا میں اس کی مقبولیت کو کم کر دے۔ یا پھر اس نرالے نوجوان کی کسی نامعلوم خواہش کی تکمیل میں کسی کوتاہی کا احتمال، غلطی کا امکان؟

نوجوان شہباز کے لیے جس کا لڑکپن دروں خانہ خدمتگار عورتوں اور گھر کے باہر خوشلدی حلقوں یا پھر کالج کی تفریح گاہوں تک محدود رہا تھا، یہ ایک انوکھا تجربہ تھا ۔ ایک مہم ، قصّے کہانیوں اور سنی سنائی سے مختلف اس کی روح کی گہرائیوں میں کوئی خوابیدہ تار جھنجھنا اٹھا۔ ہاؤس بوٹ سے ملحق مانجھی کی کشتی سے سنتور کے رسیلے اور دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہوئی کسی لہر سے اس کے قدم ڈول گئے۔ لیکن وہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا دونوں ایک دوسرے کو سنبھالے ہوئے۔ ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی دو لہریں

لڑکی اپنے بالوں کو انگلیوں کے گرد کبھی لپیٹتی اور کبھی کھول دیتی جیسے سنتور پہ کوئی نیا نغمہ سیکھ رہی ہو ۔

"آپ کا نام؟" شہباز نے اپنی میزبان سے پوچھا۔

"کوئی سا بھی ٹھیک رہے گا وہ بولی اور پھر شاید یہ سوچ کر درست جواب نہ دینا خلاف تہذیب ہو گا۔ نوری۔ میرا نام نوری ہے ۔ پیارا نام ہے ۔ نوری و ناری کا ملاپ کچھ غیر متوقع سا نہیں لگ رہا۔ نوری "خوبصورت نام ہے"

"میرے لیے بے معنی ہو چکا ہے۔ موجودہ حالات کی رعایت سے ناری شاید زیادہ موزوں ہو گا۔

"نہیں وہ مجھ جیسوں کے لیے مخصوص ہو چکا ہے وہ ہنسا"۔ سنتور بجانا جانتی ہو؟"

"سنتور نہ ہو تو سردیوں میں سناٹا کھا جائے۔ کانگڑی اور سنتور۔ سوزن اور انگلیاں اور شال۔" وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی۔ شاید کوئی رسمی سی ، بے معنی، روایتی یا کانگڑی کے شکم میں آہِ گرم کی سی دبی ہوئی بات۔ لیکن خوبصورت مہمان کے گرم ہونٹوں نے اسے خاموش کر دیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کشمیر کی غربت، فاقوں اور استحصال کے بارے اتنا کچھ جانتے کے بعد بھی کیا میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ درست ہے؟ لیکن اس کی رگوں میں گردش کرتے ہوئے جوان لہو نے اس کے کان بند کر دیے۔ وہ ایک شدید قسم کی جبلّی خواہش کی گرفت میں تھا۔ ناقابل تسکین اشتہا نے علم و عقل، نہی و اوامر کی تمیز مٹا دی۔ ادھر یوں لگتا تھا کہ اس نفس ناتمام کے باوجود جس کو شہباز کے ہونٹوں نے چوس لیا تھا نوری کو زندگی میں پہلی بار اس راز کا احساس ہوا تھا جو راہبوں کی روح قبض کر لیتا ہے۔ آج کا مہمان تو ندیل سیٹھ، مریل ساہو کار، ہانپتے ہوئے اوباش کے بجائے ایک نوجوان اور خوبرو، مہذب، تندرست و توانا رئیس زادہ تھا۔ نوری کے لاشعور میں نفرت کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ سپردگی کے احساس سے اس کی روح سرشار ہو گئی۔

ہاؤس بوٹ کی خوابگاہ میں پھرن سے برآمد ہونے والے نوری پیکر کی ناف کے گرد کم و بیش پورے شکم کو آغوش میں لئے ایک سیاہ ہالہ اس کانگڑی کا نشان تھا جس میں اخروٹ کے چھلکے کی آگ بھوک کی شدت کو بھسم کر کے ناف کے نشان کو مرکز بنا دیا تھا ادھری راجہ کے پرجا پر ظلم اور درندگی کی مہر ۔ شہباز کے دل میں ترحم اور انتقام کی خواہش کسی لہر کی طرح اٹھی اور جھنجھوڑ کے اُتر گئی۔ اس کو قصے کہانیوں میں ہی نہیں تاریخ میں بھی ایسے کئی واقعات یاد تھے جس میں حسین عورتوں نے اپنے التفات کے لیے گردنیں طلب کی تھیں۔ ایک ثانیہ کے لیے اسے خیال آیا کہ اے کاش نوری نے سپردگی کے بدلے ہری سنگھ اور کرن سنگھ کے قتل کی شرط لگا دی ہوتی۔

وہ غسلخانے سے برآمد ہوئی تو شہباز کو یوں لگا جیسے کوئی جل پری نور میں نہانے کے لیے جھیل سے باہر آگئی ہے۔ شہباز کا ہاتھ کھونٹی سے لٹکے ہوئے کیمرے کی طرف بڑھا لیکن اس کی میزبان نے غسلخانے کا پردہ اپنے گرد لپیٹ لیا۔

"خطا معاف۔ کیمرہ رکھ دیجیے۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔ میں اشتہاری تصویر نہیں بننا چاہتی۔ خواجہ صاحب۔

"ارے جل پری اتنی باتیں کر سکتی ہے!" شہباز نے ہنستے ہوئے کہا" پری کے حکم سے سرتابی۔ آدم زاد کی مجال ہے کیا"

"شکریہ مہربانی۔ میں وضو کے چشمے کی مخلوق تھی حضرت ۔ کسی نے مجھے کیچڑ میں پھینک دیا۔ جی! نوری ان پڑھ مانجھن" نہیں ہے۔ سوتیلے باپ کی ہوس اور پاگل ماں کی رقابت کی سزا بھگت رہی ہے بد نصیب ۔ یہ ایک بدن فروش کی خود ساختہ کہانی نہیں ہے واقعہ ہے ایک ۔ لیکن میں ذلت کی اس داستان کو بھول جانا چاہتی ہوں۔"

"میں معافی چاہتا ہوں۔ اور اس المیے کو فراموش کرنے میں تمہاری مدد کروں گا"

"پہلے بھی کسی نے کچھ ایسی ہی بات کہی تھی۔ لیکن بیشتر باتیں شاید بھول جانے کے لیے ہوتی ہیں اللہ ہمیں معاف کرے"۔

نوری کی آواز بید مجنوں کی طرح لرز رہی تھی" سنتور کے تاروں کی طرح مرتعش۔ پردہ چھوڑ کے اس نے سپردگی کا ایک لمبا سانس لیا اور آنکھیں بند کر لیں

"نوری!"

"جی صاحب" وہ توقف سے بولی

"صاحب کے سوا تمہارے پاس کوئی اور لفظ نہیں ہے نوری"

اس کے شانے لاعلمی کے انداز سے ہلے۔ "پتہ نہیں"

"زیادہ اپنائیت ہو جس میں"

"ہر کوئی یہی کہتا ہے۔ یہی پوچھتا ہے۔ ہر ایک۔ سبھی! شائستگی کے تقاضے۔ اتنے مہمانوں کی ایک میزبان کیا جواب دے نوری کس کس کو اپنانے خواجہ صاحب۔ رات بھر کی داشتہ یا ہفتے بھر کی ساتھی اتنی چاہتوں کے سوال لیے بیٹھی ہے کہ جواب دیتے دیتے سانس ختم ہو جائیں۔ مسافروں کی چاہتوں کے جواب۔ کبھی کبھی تو جی میں آتا ہے کہ چاہتوں کی اس رسوائی سے بچنے کے لیے ڈل میں کود جاؤں یا پھر دور نکل جاؤں جہاں کوئی نہ ہو۔"

لفظ اس کے ہونٹوں پر چشموں کی روانی میں بلبلوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ ایک مظلوم کشمیری لڑکی سر تاپا سپردگی کی جگہ سپر کیسے بن گئی؟"

مگر یہ سب بعد کی سوچ ہے مسٹر فلسفی۔ اس وقت تم صرف جوان تھے جو کبھی کبھی بندر کی طرح انسان کی بھونڈی نقالی کرتا ہے۔ خود غرض آدمی جو اس کے سراپا کو پینٹل سے کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آنکھیں رات کی نیلگوں سیاہی میں جھیلوں کی طرح گہری۔ ماہی بے آب کی طرح مضطرب! ناف، کائنات کو لپیٹ لینے والے مداروں کا مرکز! کانگڑی کی آگ سے شکم سے اوپر قوسوں تک کو چومتا ہوا دھواں۔

اور سر سے لے کر پاؤں تک بالوں کے پردے میں جھلملاتی ہوئی جل پری ۔۔۔

اس نے کئی سکیچ بنائے اور پھاڑ ڈالے۔ ایک بھی اس کے سراپا کی تکمیل کو نہیں پہونچتا تھا۔ اس کے بے تکلف دوست جو اس کی مہم جوئی کے راز سے واقف تھے قہقہے لگا رہے تھے۔ دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے۔ اماں ہوش میں ہو۔ خواب و خیال مثنوی تو نہیں لکھ رہے میر صاحب؟ ہے تو بتا دو۔ دنیا کو بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ میر تقی میر کا سجادہ نشین آ ہی گیا آخر۔ بس ۔ بحر تو موجود ہے لگے ہاتھوں مثنوی لکھ ڈالو

داستان نوری و شہباز خان۔" پیا بن نا ہیں آوت چین کا ریکارڈ تو گھس کے توا بن گیا۔ تماش بینی و عشق۔ دگن کی تان لگاتے ہو برخوردار۔ مجاز و حقیقت دونوں! ٹھمری کا مرچ مصالحہ بھی اور قوالی کا حال و قال بھی۔ اماں ایسا ہی

عشق ہے تو بستر باندھو اور جاؤ کشمیر۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی"۔

"ہاں ہمدردی وغیرہ کی لفظی فریب کاری نہیں چلے گی۔ شریفوں کی طرح جاؤ اور نکاح کر کے لے آؤ۔ اور سال دو میں جاگیر کا وارث بھی آجائے گا ان شاء اللہ پھر ثواب کا ثواب اور تمغۂ شرافت کہ ایک معصوم لڑکی کو گناہ سے بچا لیا"

"آوازے بھی بہت کسے جائیں گے، انگشت نمایاں بھی ہوں گی"

"ناک بھوں بھی بہت سکڑتی ہے لیکن تم لوگوں کے آئین رواج میں تو نکاح بھی ضروری نہیں ۔ راہ چلتی پر چادر ڈال دو اور چودھرائن۔ چھوڑ دو پھر بھی کوئی غریب صبر شکر کر کے لے جائے گا کہ بڑی سرکار کی عنائت ہوگئی تھی۔ عزت داری تو رواج اور جرم کا نام ہے برخوردار۔ تم لوگوں کا کسی انقلاب نے کچھ نہیں بگاڑا۔ مزے کرو، بیاہ رچاؤ اور ماہیا گاؤ۔"

"کیوں کوئی بات گدی میں آئی میاں صاحبزادے"

کشمیر میں سیاحوں کی آمد ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ یہی اکا دکا مہم جُو نظر آجاتا اور بس ۔ چیڑوں اور دیوداروں پہ اب بھی کہیں کہیں برفوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ نسیم باغ کے کنارے لنگر انداز ایک ہاؤس بوٹ پر اردو اور انگریزی میں قلوپطرہ کا نام دیکھ کر اس کے قدم تیز ہوگئے اور دل کانوں میں دھڑکنے لگا۔

نوری کا ہاؤس بوٹ دیکھ کر اس کو وہ تمام وعدے پھر یاد آگئے جو اس نے رخصت کے وقت کیے تھے۔

نوری کی پلکوں سے چپوؤں کی طرح شڑپ شڑپ کی طرح گرتے ہوئے آنسوؤں سے اس کے گال بھیگ گئے اور اس نے یکایک اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے وہ ایسے وعدوں کی عادی ہو چکی تھی۔

"خدا حافظ خواجہ صاحب" ماجھی نے اس کا ہاتھ اپنے جھریوں بھرے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس پہ بوسہ دیا۔

"اپنا دھیان رکھیے گا" نوری کی ہچکی شال میں جذب ہوگئی

"یہ کیا؟"

"آئندہ سیزن کا ایڈوانس۔ اپنے ہی گھر کا پیشگی خرچ۔ شہباز اب مہمان نہیں ہے ۔ نوری میرا انتظار کرنا۔

"واہ رے عاشق ناہنجار" کسی بے تکلف دوست کی آواز آئی "خط بھی لکھا ہے کہ نہیں"۔ یا پھر مثنوی کی تیاری ہے۔

"نہیں یار۔ خط تو بہت لکھے ہیں اس نے۔ آنسوؤں کی روشنائی اور شامۃ العشق سے معطر۔ سلگتے آنسوؤں اور برگ گل کے نوشتے نوک مژگاں سے رقم دل پر خوں کی گلابی سے آتش بداماں۔ لیکن اس جانب سے کوئی جواب نہیں آیا۔ کوئی خفیہ پتہ ہو تو اس کا علم نہیں"

بریک کی آواز سے قہقہے بھی تھم گئے۔ لیکن ہاؤس بوٹ کا نام پڑھ کے اس کو ساری باتیں پھر یاد آگئیں جیسے سردیوں کے بعد کوئی منجمد آبشار یکا یکی بہہ نکلا تھا۔

"ارے آپ خواجہ صاحب جی۔ آ آ آپ خواجہ شہباز خان ۔ خواجہ" مانجھی اس کو دیکھ کر بوکھلا گیا

"گھبرا کیوں گئے۔ عبدل بابا"! قلو پطرہ کسی اور نے تو نہیں بک کر لی ہاؤس بوٹ تمہاری؟

"نہیں حضرت عبداللہ ایسا کام نہیں کرے گا۔ ہاؤس بوٹ آپ کے سامنے بندھی ہے"

"اور نوری کہاں ہے؟"

"نوری۔ مانجھی بوکھلا گیا"

"نوری میں پوچھتا ہوں"۔ منہ کیا تک رہے ہو میرا!

"وہ"——— اللہ کو پیاری ہو گئی" مانجھی رونے لگا

"جھوٹ مت بکو" شہباز نے اس کا گریبان پکڑ لیا" تو نے اسے فروخت کر دیا ہو گا"

"نہیں۔ مولئے مبارک کی قسم خواجہ صاحب۔ جھوٹ بولوں تو کلمہ نصیب نہ ہو۔ وہ ۔ وہ بیمار تھی۔ آسیب ہو گیا تھا اسے"

"آسیب"

چاند کا آسیب۔ خواجہ صاحب۔ چاند کو دیکھ کر کبھی رو دیتی اور کبھی بے اختیار ہنسنے لگتی اور ہنستی ہی چلی جاتی۔ چندا رے۔ لوریاں گاتی اور کبھی لشکارے ۔ بیٹھ چاند کو لانے کے لیے چل دیتی۔ کبھی جھنجھلا کے چاند کی پرچھائیں کو مٹا دینے کی کوشش کرتی اور بد دل ہو کر رونے لگتی۔ اندھیری راتوں میں گنگناتی کہ میرا چاند جھیل میں ڈوب گیا ہے۔ کوئی جاؤ ۔ وہ بید مجنوں کی شاخوں پر چھپا ہو گا۔ آسیب خواجہ صاحب، آسیب! زعفران گھول کر تعویذ پلائے۔ دم دارو، دھونی سب کچھ کیا۔ جھیل جم گئی پر جنوں نہ گیا۔ سیانوں نے کہا نافے کا شربت اور سیاہ انگور کا عرق پلاؤ، سرما کا چاند دھند میں گھل جائے گا تو آسیب جاتا رہے گا۔ خدا معلوم چاند میں اسے کیا نظر آتا تھا۔ ٹکٹکی باندھ کے آپ بھی بت بن جاتی"۔

"بات مختصر کرو پھر کیا ہوا؟" شہباز نے جھنجھلا کر کہا "بردہ فروشوں کے قصے نہیں چاہئیں مجھے"۔ کہاں ہے نوری؟"

"بتا رہا ہوں خواجہ صاحب۔ موسم یکلخت سرد ہو گیا۔ ہوا میں اڑتے ہوئے سرخاب پتھروں کی طرح زمین پہ گرنے لگے"۔ برفوں کا خاص پرندہ طائر بہشت بھی نیچے باغوں میں اتر آیا۔ جھیل کے کناروں پہ دھند کی قناطیں پھیلنے لگیں۔ پانی کی سطح آئینے کی طرح چمکنے لگی۔ کانگڑیاں اور صندلیاں۔ دروازے بند، ہر کوئی گھر میں بیٹھا ہے۔ نوری کو سب کچھ بیٹھے بٹھائے ہاؤس بوٹ کے بیڈ روم میں پہونچ جاتا۔ لیکن وہ طشت کو ہاتھ سے دھکیل دیتی اور گھٹنے سینے سے لگائے آنکھیں بند کئے پڑی رہتی۔ عبدل بے چارہ تو ایسے میں دعا ہی کر سکتا تھا۔ ایک روز بیڈ روم سے جہاں آپ لوگ سویا کرتے تھے ایک لرزتی ہوئی آواز آئی جیسے تار ٹوٹ جائے سنتور کا۔ جیسے کوئی کسی پکارنے والے کو آواز دے۔

گرمیوں کی راتوں کو ستارہ ٹوٹتا ہے جس طرح۔ اور اس کے ساتھ ہی ہاؤس بوٹ کے دروازے یکے بعد دیگرے تیزی سے کھلے۔ اور میں نے اپنے ڈونگے سے دیکھا کہ نوری بازو پھیلائے برہنہ پا، جمی ہوئی جھیل پر دوڑی جا رہی ہے۔ برف پہ بھاگے جا رہی ہے۔ نوری! میں پکارا لیکن اس کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ وہ افق کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں سے سرما کا چاند طلوع ہوتا تھا۔ لیکن اس دھند میں ہلال تو کیا چودھویں کا چاند بھی نظر نہ آتا خواجہ صاحب۔ مگر وہ، نوری آپ کی دیوانہ وار بڑھ رہی تھی۔ معاً اس کی آواز بچھڑی ہوئی کونج کی فریاد کی طرح برفوں سے ٹکرا کے گونجی۔ پاؤں تلے برف ٹوٹنے کا تڑاکا ہوا، اور پھر سناٹا چھا گیا۔

"اور اس روز سے نوری کا عاشق نامراد اپنی محبوبہ کی میت کو بے گور و کفن برفوں کے سپرد کر کے غم غلط کرنے کے لیے اپنے گلشن شداد میں مئے ناب کی چسکیاں لے رہا ہے۔ ذہن کا پکا بے ہوش بھی نہیں ہوتا کہ اس کے غم کی تمدنی اہمیت ختم نہ ہو جائے اور یار لوگ ہمدردی کا جرعہ بھی بند کر دیں"۔

"بے تکلف دوستوں کی باتوں پہ وہ احمقوں کی طرح مسکرا رہا تھا"

"کوئی شعر ہی کہہ دو یار۔ کسی اور کا ہی سہی"

"ہاں یک لفظی تحریف ہی سہی"

خوفِ رسوائی سے جا چھپنا دوائے آب میں
ختم تھی الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے"

یہ بھی تو پوچھو کہ اس رسوائی کا ذمہ دار کون تھا۔ صاحبزادے؟ تجھ خانہ خراب کو کوئی پیرزن بھی نہ ملی کہ وادی کے کسی پتھر سے سر پھوڑ کے کیفر کردار کو پہونچتا"

"ایک معصوم لڑکی کو قتل کر دیا اور قاتل کھلا پھر رہا ہے" اس کے ایک اور ساتھی نے کہا"

"ایسے قتل ہر روز ہوتے ہیں برخوردار۔ اور جب تک دین و سیاست الگ الگ رہیں گے۔ صرف لفظی ہیرا پھیری ہوتی رہے گی جب تک سبھی شرائط جن میں روح کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ جسم کے تقاضوں کا ہی خیال رکھا جاتا ہے۔ استحصالی اقتصادیات اور خود ماں باپ نو عمر لڑکوں کو رہن رکھنا بند نہیں کرتے، ایسے قتل ہوتے رہیں گے"

"لیکن وہ وقت دور نہیں جب ہوس کو عشق کہنے والوں کو الٹا لٹکا دیا جائے گا۔ اور دولت کے نشے میں بڑھک مار کے نکل جانے والوں کے پیچھے شکاری کتے چھوڑ دیے جائیں گے"

اس کے دوست، کالج کی زندگی میں اس کے رقیب اور دشمن۔ ہمدرد اور خیر اندیش، جن احباب کو اس کی داستان کا علم تھا طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ لیکن ہر بات کا ترنگ جواب دینے والا سنی ان سنی کرتا رہا۔ ہر آواز اس کے ذہن پر چھائی ہوئی دھند میں جذب ہوتی رہی تھی —— سنتور تھا ایک" وہ سوچتا جو پہاڑوں کی چوٹی سے گر کے چٹانوں سے ٹکراتا ہوا چکنا چور ہو گیا۔ اور اب وہاں چوٹیوں، چٹانوں، وادیوں، چشموں، دریاؤں اور جھیلوں پر پھیلا ہوا سناٹا تھا جس میں مہاجر پرندوں کے پر معلق تھے اور کبھی کبھی کسی بچھڑی ہوئی کونج کی دلگیر آواز۔ آفاق کو چھوتا ہوا نالہ

فراق ان شب و روز کی یاد دلا رہا تھا جو نوری کی صحبت میں گزرے تھے"

عدم پھر اسی رات کا افسانہ سنا جو پہلوئے جاناں میں گزاری تھی کبھی"

اس کی یادوں کے نہاں خانے میں چھپے ہوئے شعر کی بازگشت سے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ نکلیں۔

اس کے نوجوان دوستوں کی محفلیں کسی قالین کی طرح لپٹ کر رہ گئی تھیں جسے دھوپ دکھانے کے لیے ملازموں نے چھت پر ڈال دیا ہو اور اتارنا بھول گئے ہوں۔ بحثیں کج بحثیاں۔ انٹ کی شنٹ رنگداری۔ بیت بازی سب شور و غوغا خاموش ہو چکا تھا۔ دوست، احباب، رازدار سب کسی کہرے میں گم ہو چکے تھے۔ دھواں اور دھند کبھی کبھی آسمان پر نظر جاتی تو اک ہوک سی اٹھتی کہ ہر شے کا انجام شائد فراق ہی ہے اور آخری مغل شاعر کا نوحہ سارے میں گونج اٹھتا۔ ہائے کیا کیا محفلیں راتوں کی برہم ہو گئیں ـــــــ مگر یہ کون تھا اور کیا کہہ رہا تھا۔

"غمخوار کی اوقات تو نہیں چھوٹی سرکار۔ لیکن اللہ ان کو بہشت میں جگہ دے حضور کے بزرگ نواب خسرو خان کا خادم پہ اتنا اعتبار تھا کہ جن باتوں کا حرم میں بھی علم نہ ہوتا تھا۔ خادم کو ان کی پہلے ہی خبر ہو جاتی تھی۔ بلبل چہکتا ہی اچھا لگتا ہے بادشاہو۔ پر جب سے آپ اس مرتبہ کشمیر سے واپس آئے ہیں کسی چیز کی کمی سی لگ رہی ہے۔ کھیل نہ ہنسی۔ یار دوست بھی نہیں آتے۔ دنیا تو ہنسی کھیل کی گاہک ہے۔ راگ رنگ چہل پہل۔ اکیلا آدمی بھی کس کام کا۔ رہ رہ کے دھیان آتا ہے کہ اس گھر میں بچوں کی آوازیں آنی چاہئیں" سرکار جیسے لکھے پڑھے گبھرو کے لیے تو لوگ ڈولیاں لے لے کر آویں۔ لکھی پڑھی کالجوں کی خوبصورت لڑکیاں۔"

جواب کے انتظار میں اس کا آبائی مختار کار چپ ہو گیا۔ اور جیسے جانے کے لیے اپنی پگڑی ٹھیک کرنے لگا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مختار چچا۔ اور اس بار میں اسی بارے میں کشمیر گیا تھا۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔

"اپنی مصلحتیں پروردگار آپ ہی جانتا ہے۔ کوئی بات ہماری مرضی کے خلاف ہو جاتی ہے تو دل بُرا ہو جاتا ہے۔ کون جانے کہ اس میں ہماری بھلائی ہو۔ ویسے آپ جیسے شینہ جوان کے لیے شام سے پہلے سات رشتے آجائیں۔ کسی سے کہیے کا نہیں سردار سلطان سکندر کی صاحبزادی ـــــ،

"برا مت ماننا مختار چچا۔ میں ابھی اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ مجھے مختار چچا۔ تمہارے نام کی رعائت سے یاد آگیا کہ ہم پہ تو مختاری کی تہمت ہے۔ آدمی کے بس میں کچھ نہیں۔ وہ اوپر والا مختار کل ہے۔ جس طرح آپ لوگ جو چاہیں سو آپ کریں۔ بوائی کرائیں، بن جتا ہی چھوڑ دیں۔ ہل چلائیں سہاگہ پھیریں، ٹریکٹر چلائیں۔ حسب منشا بٹائی میں کسانوں کو جو جی چاہے دے ڈالیں یا سستی لگوائیں، گنا، چنے، تمباکو، گیہوں ـــــ خوش ہو کر بنڈل نوٹوں کے میرے سامنے ڈالیں۔ یا پھر خفا ہو کے کھڑی فصلوں کو آگ لگوادیں کہ کمیوں کی شرارت ہے۔ کسان باغی ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مختار ہی ہیں نا!

"جی سمجھ گیا سرکار۔ اور اس کو خوشلد نہ جانیے گا۔ آپ کی معلومات کی داد دیتا ہوں۔ ورنہ رئیس زادے تو جوار

گندم کا فرق نہیں جانتے۔

مگر تم مجھ کو مختار اور مجبور کا فرق بتا دو!

"ان پڑھ آدمی کیا بتائے گا بیٹا۔ بس اپنی کھوپڑی میں تو دو تین سیدھی سیدھی باتیں ہی آتی ہیں ایک دنیا کو معلوم ہے کہ شہد تریاق ہے اور سنکھیا زہر۔ بازار میں جاؤ تو دکانوں پر خوبصورت چیزیں بھی ہوتی ہیں سونا چاندی۔ ہیرے جواہر۔ عطر قالین۔ بعض بازاروں میں حسن کے ساتھ بیماریاں بھی ہوتی ہیں۔ بدنامی رسوائی آدمی دیکھ بھال کے جو جی میں آئے خرید لے۔ یہ اس کا اختیار ہے۔ گناہ اور ثواب اونچی باتیں ہیں پھر بھی لوگ دونوں کی طرف جاتے ہیں۔ یہ ان کا اختیار ہے۔ ایک فرشتہ ہمارے اندر ہے جو غلط بات سے روکتا ہے۔ مانو نہیں تو خفا ہو کے منہ موڑ لیتا ہے اور سیانے کہتے ہیں کہ فلانے کا ضمیر مر گیا۔ یا سو گیا۔

"سمجھ گیا۔ مختار چچا۔ لیکن سمجھنے کے باوجود نہیں سمجھا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔ خیر جہاں تک آپ کا سوال ہے مختار کار کی حیثیت سے آپ کا انتخاب بہت درست تھا"

"مگر میں رشتے کی بات کر رہا تھا۔ سلطان سکندر کی صاحبزادی۔ ہزار ایکڑ نہری زمین ساتھ جہیز میں"

"مختلف ناموں سے خسرہ نمبروں میں بٹے ہوئے ایکڑ۔ اصلاحات اراضی کے ایکڑ"

"آپ بہت ہوشیار ہیں ماشاءاللہ۔ پھوکی ڈگریوں والے گریجوئیٹوں کو اتنا کچھ کہاں پتہ ہوتا ہے۔ مگر ایک ہزار ایکڑ"

"مختار صاحب! شہباز کی آواز میں غم و غصے کا عجب امتزاج تھا"

"مختار کار ٹھٹک گیا"

"کوئی غلطی ہو گئی حضور؟"

"زمین! بعضوں کو۔ مختار انگل دو گز بھی نہیں ملتی اس کی آواز بھرا گئی "خیر ہٹائیے ۔ فی الوقت میری طبیعت قدرے ناساز ہے اگر کوئی خاص کام ہوا تو بلوا بھیجوں گا"

"پشتینی نمک خوار کی حیثیت سے میرے فرائض بعض اوقات مجھ سے غیر ضروری باتیں کہلوا دیتے ہیں سرکار۔ ان کے لیے معافی چاہتا ہوں"

"نمک اللہ کا عطیہ ہے مختار صاحب"

"بہت بڑی نعمت ہمارے ملک میں جس کے پہاڑ ہیں۔ کسان جب چھاچھ کے کٹورے میں نمک کی ڈلی ڈبو کر نکالتا ہے تو جیٹھ اساڑھ کی گرمیوں میں بھی اس کا چہرہ تازہ ہو جاتا ہے"

"ہوں!"

"پرانے خیر اندیش کی عرض ہے ایک"

"کہیے۔ اور جلدی سے کہہ ڈالیے"

"آپ کو تبدیلی آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ میرا مطلب ہے رونق، سماع، موسیقی" سازوں سے آپ کو لگاؤ تھا۔

"سنتور۔ کوئی سنتور نواز بھی ہے تمہارے یہاں۔ نہیں ہو گا۔ ہو بھی نہیں سکتا —— کشمیر کا ساز میدانوں میں کہاں۔ لہروں کا ساز —— ستار، شہنائی ——۔ اس کے الفاظ ناقابل فہم ہو رہے تھے"

"انہیں نیند آ رہی ہے شاید" مختار کار کو محسوس ہوا۔ "تکلیف دہ یاد ——" وہ دبے پاؤں کمرے سے نکل گیا۔

وہ زیرِ لب گنگنا رہا تھا" —— نے گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز۔ میں ہوں اپنی شکست کی آواز بشنو از نے"۔ نے کی گہرائیوں میں اترتا ہوا سانس بچھڑی ہوئی کونج کی پکار بن گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ۔ از نیستاں چوں مرا ببریدہ اند۔ ایک بے قرار روح اس کے گرد بے طرح پھڑپھڑا رہی تھی، مستقل فریاد کر رہی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے۔ ایک آواز، ایک تان اس کے دل و دماغ پر اس کے بدن پر، گالوں پر گردن پر تازیانوں کی طرح برسنے لگی اور پھر دور چمکتی ہوئی برف پہ دھند کے غبار میں گم ہو جاتی۔ کہر کے پردوں میں چھپ جاتی۔ ڈل کے کنارے لنگر انداز ہاؤس بوٹ کے پردوں سے لپٹی ہوئی بجلی کی طرح۔ دفعتاً خاموشی کی چلمنیں چاک کرتی ہوئی آواز دور سے قریب آتی ہوئی تازیانے پکارتی اور اس کے بدن پہ کمر پر گال پر کہیں بھی نشان ابھر آتے۔ ڈاکٹروں نے اسے ایلرجی تشخیص کیا۔ اور اس کا جواز ڈھونڈتے ڈھونڈتے بازوؤں کو چھلنی کر دیا۔ برتن، کپڑے، فرنیچر، کونہ کونہ گھر کا۔ کتابیں۔ البم۔ نوری کی تصویر دیکھ کر وہ سکتے میں آگیا۔

جھیل کے کنارے سبز زمرد۔یں پتوں پہ پانی کے موتیوں اور ان کے درمیان کنول کی بند کلی کو ہتھیلیوں میں تھامے وہ کہیں افق کے اس پار دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پہ روشنی کی لکیریں دوڑ رہی تھیں۔ شہباز کو بچپن کی بیر بہوٹیاں یاد آگئیں۔ برسات کے بعد پانی تھم چکتا، دھوپ نکلتی تو ریتلی زمین سے سرخ مخملی بوندیں نکل آتیں۔ وہ انہیں ہتھیلی پہ اٹھا لیا کرتا۔ ہتھیلی پر بیر بہوٹیوں کی گدگدیاں ہونٹوں پہ روشنی کی لکیریں بن جایا کرتیں۔ لیکن آسمان پر سفید بادلوں کے پردوں میں چمکتا ہوا تازیانہ لہرایا اور اس کی ہتھیلیوں پر بیر بہوٹیوں کے گدگدا دینے والے تصور کی جگہ لہریں ابھر آئیں۔ سکول میں غلط کام کرنے پر استاد سزا دیا کرتے تھے جس طرح۔ اور اس کے ساتھ ہی کونج کی پکار۔

وہ سٹپٹا گیا۔ مختار کار نے ایک بار اشارۃً سماع کی بات کی تھی۔

"بڑی درگاہ کی چوکی پر چھوٹے سرکار خان بہادر صاحب مرحوم بھی مجرے کے لیے ستارہ بائی کو اور قوالی کے لیے سلطان قوال کو بلواتے تھے۔ ایسی بیاض ہے کہ حضرت امیر خسرو سے لے کر بلھے شاہ اور خواجہ فرید سبھی کا شیرازہ ہے ایک جانکار کہہ رہے تھے اردو ٹوٹی پھوٹی ہوئی فارسی، کھڑی بولی، اور پنجابی اور سرائیکی سُر میں بھیگی ہوئی۔ ایک بار تو پتھر بھی اپنی جگہ سے ہل جائیں۔ دو سارنگیاں، دو ستار ایک سرود طبلوں کی جوڑی اور نقارہ شہنائی والا بھی ہے ایک بنارس والوں کی ٹولی سے ٹوٹا ہوا مختار جیسے جہاں دیدہ آدمی کی بات میں کچھ تو سچائی ضرور ہو گی اس نے سوچا، ایرہ غیرہ کوئی نہیں

آئے گا لیکن ۔ سامعین میں بھی میں اپنے گھر کو چانڈو شاہ کا تکیہ نہیں بنانا چاہتا"

"خاطر جمع رکھو سرکار سماع کی محفل اور ایسے قوال کہ حکومت بھی بلوائے تو اپنی مرضی سے ہی جائیں گے انہیں تو درگاہ پر ہی جمعرات کی جمعرات اتنا کچھ مل جاتا ہے کہ ایسے ویسے کے ہاں تو تھوڑے کئے جاتے نہیں۔ قدردان آ جائے تو پیدل بھی چل دیں گے۔ ایسے باکمال لوگ حضور کے اس غلام نے تو دیکھے نہیں؟ چوکی تو بہت بڑی ہے۔ بلھے" شاہ کے گھنگرو میرا بائی کے پاؤں میں باندھ دیئے اور فارسی کلام کہ پتھر دل والے کو بھی حال آ جائے"

ساز مل گئے تو یوں لگا کہ دنیا کی ساری آوازیں ہم آہنگ ہو گئی ہیں۔ مجلس دیکھ کے کلام کا انتخاب کرتے تھے ۔

محفل حسب دستور حمد اور نعت سے شروع ہوئی اور جوں جوں رات بڑھتی گئی رنگ بڑھتا گیا۔ پگڑیوں کے پیچ کھلنے لگے معتبری کی روائیں ڈھلکنے لگیں خسرو پہ پہنچے تو محفل ملکوتی رنگ اختیار کر گئی

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
کہ ہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم
قیامت قامتے رنگیں قبائے شعلہ آشامے
کہ ہر جا آفت دل بود شب جائے کہ من بودم

مقطع پہ آ کے ساز مدھم ہو گئے لَے ہلکی نازک مقام تھا صرف ذمہ دار قوال ہی جو آداب محفل اور روایات سے واقف ہو اس سخت مقام سے گزر سکتا تھا۔ جب تک خاص الخاص لوگ نہ ہوتے جن کے ظرف آزمائے ہوئے ہوں لَے کو نہیں بڑھاتے تھے اور تکرار کو کم کر دیتے تھے۔

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو

ایک اسی مصرعہ پر خسرو سے کم درجے کا کوئی شاعر ہوتا تو کفر کا فتویٰ لگ جاتا

محمدؐ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

ماہر قوال اس نازک مقام سے آساں گزر گئے۔ شہباز مذہبی میلان کا آدمی نہیں تھا۔ لیکن اس کا تہذیبی لاشعور باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار سے واقف تھا۔ اس شعر پہ آوازوں میں انکسار اور سازوں میں حفظ مراتب شاہین کی طرح طرار شہنائی نواز بھی ایک ہی بار پنچم کو چھو کر لوٹ آیا تھا کہ اس سے آگے بڑھنا گستاخی ہو گا۔ یوں لگتا تھا کہ الوہیت کے احساس سے بھی ساز سرنگوں ہو گئے ہیں۔ لیکن چند ساعت میں جیسے ایک سجدے کے بعد دوسرے کے اختتام پر سازوں میں آنچ سی آنے لگی۔ طبلے کی پرن جیسے کوئی پرندہ اڑنے کے لیے پر کھول رہا ہو اور اپنے ساتھیوں اور سازندوں کو راہ دکھاتی ہوئی استاد کی آواز سنائی دی۔

ترس پوی شالا موڑ مہاراں
ترس پوی ۔ شالا ترس پوی

تیں بن سجناں ڈکھن بازاراں

ترس پوی

اوے ترس پوی

التجائیں تھیں۔ منتیں سماجتیں ۔ فریاد

"اڈیاں کونجاں بیٹھ قطاراں۔ ہنجو ڈگیاں نے سو سو واراں

تینکوں اپنے وطن داماناں

ترس پوی

شالا ترس پوی

صاحب خانہ پہلو بدلنے لگا۔ فرید کے الفاظ میں اسی کی کہانی سنائی جا رہی تھی۔ نوری اور شہباز کی کہانی ۔ سسی کے پیرہن میں وہی پکار رہی تھی شہنائی کی آواز فریاد بن گئی۔ کونج کی پکار۔ بچھڑے ہوئے محبوب کی آواز ۔ بد نصیب روح اب تک پکار رہی ہے اور اس کی آواز کے ساتھ پھر وہی احساس جیسے تازیانے لہرا رہے ہوں۔ حد جاری ہو گئی ہو کہ تاحیات سزا ملتی رہے۔ آواز کے اشارے پر کہیں نہ کہیں نشان ابھر آتے۔

اپنی اذیت کو بھولنے کے لیے وہ آج ایک ملک میں ہوتا اور کل دوسرے ملک میں۔ اور رنگ برنگی تفریح گاہوں میں گھس جاتا، کہیں نائیٹ کلب ، کہیں رقص گاہ، کہیں تھیٹر اور کہیں سینما۔ ایک زیر زمین تھیٹر کے باہر افریقہ میں غلاموں کی تجارت کا اشتہار دیکھ کر وہ سیڑھیاں اتر گیا بمشکل سو ڈیڑھ سو تماشایوں کے لیے گنجائش ہو گی۔

فلم چلی تو غربت زدہ نوجوان، لڑکے اور لڑکیاں۔ عورتیں اور بچے فاقوں سے بچنے کے لیے خود کو فروخت کرنے کے لیے چھپ چھپا کر سفید فام بردہ فروشوں کے خفیہ اڈوں کی طرف بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن مردوں کو پہلے اپنی صلاحیتوں اور قوت برداشت کا ثبوت دینا ہے اور وہ ڈھول کی تھاپ پہ تازیانوں کی آزمائش سے گزر رہے ہیں۔ کمر کی کھال ادھڑ کے چربی کی تہیں نظر آنے لگتی ہیں لیکن وہ مسکرا رہے ہیں۔ ہوا تازیانوں کی پھنکاروں سے سانپوں کا تاثر دے رہی ہے ۔ ہر ضرب کے ساتھ خون کی پھوار یں پھوٹتی ہیں۔ شہباز کو وہ منظر پھر یاد آگیا اور اس کو اپنے بدن سے ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ اس منظر سے دوسرے خیمے کی طرف آگیا ۔ جہاں عورتیں بکاؤ تھیں۔ فربہ اندام بھی اور نازک بدن بھی۔ نائیجیریا کی تیکھے ناک نقشے اور گھنگھریالے بالوں والی ۔ اور زیتوں رنگ جلد والی جن کے بال ان کو رداؤں کی طرح لپٹے ہوئے ہیں۔ شاہباز کو ہاؤس بوٹ کا منظر یاد آگیا اور یوں لگا جیسے مردوں کی عقوبت گاہ سے ہٹ کر بردہ فروشوں کے سارے کوڑے اسی پر برس پڑتے ہیں۔ اور پھر سب غائب ہو جاتے ہیں اور فروختنی کنیزوں کے خیمے سے گیسو دراز حسینہ اپنے بالوں کی چادری کو گھما کر اس کے منہ پر مارتی ہے بالوں کی ضرب سے اس کا چہرہ سوج جاتا ہے اور ایک لٹ اس کی گردن کے گرد لپٹ جاتی ہے اور فضا بچھڑی ہوئی کونج کی پکار سے مسحور ہو جاتی ہے۔

اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا اور سسکیاں بھرتا ہوا سو گیا۔

نوری کے بعد اس کی زندگی ایک یخ بستہ سٹیج بن کر رہ گئی جس کا منظر اس کے جغرافیائی ماحول کے مطابق کبھی صحرا کبھی ساحل کبھی دریا اور کبھی جھیلوں میں بدل جاتا۔ لیکن افق خواہ کیسا ہی خالی ہو ایک نقطہ نمودار ہوتا اور بچھڑی کونج کی فریاد اس کے گرد پھندے کی طرح لپٹ جاتی۔ اس کو پروں سے پیٹتی ۔ بین کرتی، خون کے آنسو بہاتی۔ وادیٔ فراق تھی ایک جس میں مادہ بن کی صدا بے وفا ساتھی کے دل و جگر کو نوچ رہی تھی۔ بردہ فروشوں کی کمین گاہوں سے چمڑے کی بٹی ہوئی رسی کی گرہیں اس کے بدن پر ایکا ایکی نمودار ہوتیں اور اس کو تلملاتا ہوا چھوڑ کر مٹ جاتیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ نوری کا المیہ اسے تحلیل نفسی کے کاؤچ پر لے گیا اور اس کی زندگی کی گرہیں ایک ایک کر کے کھلتی گئیں۔ لیکن ایک گرہ "کسو کی دعا سے بھی نہیں کھل رہی تھی"۔

"آپ بہت ذکی الحس واقع ہوئے ہیں ورنہ ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں"۔ رات کو سنا دن کو بھلا دیا۔ عنفوان شباب کی ناپختگی۔ تہذیبی قدروں اور شہوانی تقاضوں کے فطری ردعمل اور ذوقِ جمال کا بے مثل معیار آپ کے تحت الشعور کو فراموشی کی گہرائیوں میں جانے سے روک رہا ہے۔ آپ جیسے روشن ضمیر نوجوان جب ایسے واقعات سے دوچار ہوتے ہیں تو نفسیاتی علامتیں پیدا ہو جاتی ہیں بعض اوقات ۔ آپ کو محسوس ہونے والی تازیانوں کی سزا ضمیر کو مطمئن کرنے سے ختم ہو جائے گی جیسے مشتبہ قاتلوں کی سزائیں معاف ہو جاتی ہیں۔"

"مگر میری سزا معاف نہیں ہو رہی ڈاکٹر۔ میں ایک نہیں دو معصوم روحوں کا قاتل ہوں۔ ایک وہ خود ، دوسرے اس کا بار بار چاند کی طرف لپکنا۔ معصوم روح کی آمد جس کے ذمہ دار کو وہ جھیل کی دو رویوں اور دھند کے پردوں میں تلاش کر رہی تھی"

"نازک مزاج آپ قیامت ہے میری جی، ماہر نفسیات نے ہمدردی اور صدمے کی ایک ساعت کو اپنے اور اس کے ذہن کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے قہقہہ لگایا اور نہایت ہی روزمرہ کے لہجے میں کہا "آپ کی نیت درست تھی۔ ہمیں ایک ذمہ دار اور ایک مستند ذریعہ علاج، اور تہذیبی ذہنی الجھنوں کے علم سے دیرینہ تعلق اور پرانا تجربہ رکھنے کی بناء پر کسی بھی عدالت عالیہ کے سامنے گواہی دے سکتا ہوں کہ ایک اضطراری غلطی کے سوا جو لاعلمی میں آپ سے سرزد ہو گئی آپ کی نیت نیک تھی ورنہ آپ اس سے وعدہ کر کے نہ جاتے۔ اور ایسے میں اس معاشرے کے مطابق آپ بھی اس کے تجربے سے محو ہو گئے ہوتے۔ خیر یہ بتائیے کہ کیا آپ دوبارہ اس کی تلاش میں نہیں گئے؟

"گیا اور نامساعد موسم کے باوجود جب درے قبل از وقت بند پڑے تھے، اس وقت گیا"۔

"یعنی بصد دشواری۔ اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے جان کو خطرے میں ڈال کے۔ آپ کی کار برفیلی سڑک سے پھسل بھی سکتی تھی۔ یعنی جوانی کی بے صبری کا ایک اور انجام میلوں گہرے کسی کھڈ میں ہی غائب ہو سکتا تھا۔ ہے نا؟"

"حادثے تو سڑکوں کی عادت ہے کاش وہ اپنی عادت نہ بھولتے"

"ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔" معاشرے کی بھی عادتیں ہوتی ہیں۔ مگر آپ کے شاعر لوگ انہیں اپنی ایذا طلبی کی روایات کی رو میں فراموش نہیں کرنے دیتے

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں

اور اسی پر اکتفا نہیں ۔ مولانا فرماتے ہیں کہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں ۔ یہی تو ہیں عشق کی خانہ خرابیاں"
اس نے ایک اور قہقہہ لگایا "تو میرے صاحب عزیز من آپ اس کی تلاش ہی نہیں بلکہ ایفائے وعدہ کے لیے اس کو بیوی کا مقام دلانے کو دوبارہ گئے۔ اگر اس نے آپ کی بات کا اعتبار نہ کیا ہوتا تو بھی یہ کوئی ناممکنات کا معاملہ نہیں تھا۔ بلکہ عین ممکن ہوتا۔ اصل اچنبا تو یہ ہوتا کہ آپ بہ نفس نفیس وہاں پہنچ گئے ہوتے۔ مگر جب دو ناتجربہ کار معصوم لوگ، جوانی کی، بے صبری اضطرار اور محبت کے معاملات کو سہ چند کر دیں تو نتیجہ معلوم جو کچھ ہوا اسے آپ کا خلوص اس آفت زدہ لڑکی کو اور پریشان کر گیا۔ اس کا ماحول ایک ایسی حقیقت کو تسلیم نہ کرتا جس کا ازالہ کرنے کے لیے آپ دوبارہ وہاں پہنچے۔ لیکن جو کچھ ہوا اسے تقدیر کہہ لیجئے۔ فانی کا وہ شعر آپ کو یاد ہو گا جو بقول یاراں اس کا مرثیہ بن گیا ہے۔

دیکھ فانی یہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
ایک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

اور وہ بد نصیب لڑکی برف کی تہہ اگر نہ ٹوٹتی ، اپنی غلطی کے باوجود ، آپ کے ماحول کی بہ نسبت زیادہ بے تعلق اور مانجھی کے مطابق کاروباری زیادہ آسانی سے جذب ہو جاتی۔ لیکن مقدر میں یہی تھا کہ وہ برفوں میں حنوط ہو گئی"۔

"اس کی آخری چیخ ہی تو میرا سینہ چیرے دے رہی ہے محترم۔ ہاتھ بڑھائے وہ میری طرف بڑھ رہی ہے لیکن مجھ بد بخت کو روزمرہ کے معمولات نے مفلوج کر رکھا ہے"۔

"غالب کی خواہش کہاں جا کے پوری ہوئی جو نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا۔ کتنی قرنوں اور کتنے فاصلوں کے بعد آپ کو موردِ الزام ٹھہرانے والے دوست نہیں سمجھتے کہ آپ اس سانحے پر جتنا غم کریں اتنا ہی کم ہے۔ ہمارے یہاں طاقات کی کشید شدہ سانحوں اور آدم و حوا کے اضطراری لمحات کو سمجھنے والا ہر ذی شعور انسان ایسی خود فراموشی کی وجدانی ساعتوں میں سرزد ہونے والے حادثات سے منہ پھیر لیتا ہے۔ جیسے ان کا اسے کچھ علم ہی نہیں ہے۔ آپ کو جلد باز بے وفا اوباش اور فریبی وغیرہ کے القابات سے نوازنے والے احباب قابل معافی ہیں۔ وہ نادان کیا جانیں کہ عنفوان شباب کی ناپختگی، تہذیبی ترکے، جسمانی تقاضوں کے ٹکراؤ میں آپ کے ذوق جمال کے پیمانے کا کیا حصہ ہے جو اس کے سراپا کو آپ کے ذہن سے محو نہیں ہونے دیتا۔ میں نے وہ خاکہ دیکھا ہے۔ میں آرٹ کا نقاد نہیں لیکن ماڈل اور فن کار عامل و معمول اگر ایک ہو جائیں جبھی جا کے وہ بے ساختگی پیدا ہوتی ہے جو کوئلے سے کھنچی ہوئی لکیروں کو ہیرے کی انی کو روشنی کی بوند بس بنا دیتی ہے۔ کہاں کا جرم اور کدھر کا گناہ۔ کانگڑی کے خلا میں شکم کی آگ کو محسوس کرنے والا معمولی حیثیت کا مالک نہیں ہو سکتا جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں آپ ایسے نازک حال اور روشن طبع لوگ جب

ایسے واقعات سے دوچار ہوتے ہیں شعور کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ میرزا نے کہا تھا کہ نفس موج محیط بے خودی ہے، غم آوارگی ہائے صبا کیا۔ لیکن قبیلۂ عشاق کے مشورے پر عمل کرنے کے بجائے آپ اسی دھن میں گنگناتے ہوئے ایک اور شعر کی تقطیعات میں الجھ گئے اور یہ نہ سمجھ سکے کہ اس کا پیغام کیا ہے۔

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خونبہا کیا

ایک شہید نگاہ نے خود کو "غارت گر جنس وفا کے تازیانے سے دُھن ڈالا۔ آپ کہئے گا کہ علم النفس کا یہ نیا نیا ترجمان پرانے پھٹے ہی میں ٹانگ اڑانے لگا لیکن مرض کی تشخیص کی طرح شعر کی شرحیں بھی ہزار ہوتی ہیں۔ اور دیکھئے کہاں کی بات کہاں پہنچ گئی حضرت غالب کا ہی قطعہ یاد آگیا۔ اے تازہ واردان بساط ہوائے دل ——— ان کی شرح داغ فراق بھی ہو سکتی ہے۔ دودھیا جھیل کے برفانی افق میں اترتا ہوا ایک نقطہ۔ ضمیر کی آواز سے ہم آہنگ۔ کونج کی پکار"۔

"میرے دوست مجھ پہ ہنستے ہیں کہ تیرے کانوں کی کنکریاں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں اور تو کہتا ہے کہ بچھڑی کونج کوک رہی ہے تو بھی ولندیزی مصور وان گو کی طرح کان کا تحفہ پیش کر دے اسے آقائے گوش بریدہ کہلوانے کو تیار ہو نالۂ فراق خاموش ہو جائے گا"۔

"ایسے ستم ظریف اور سنگدل لوگوں کو کوئی کیا کہے۔ جو نوجوان جذبات کی طغیانیوں میں کشتی حیات کو چٹانوں سے ٹکرا دینے والے تجربات ۔ حسن و شباب کے تصادم اور وارفتگی کے الاؤ سے نہ گزرا ہو وہ اس کی حدت کو کیا سمجھے گا۔ بید مجنوں کی کانگڑی جل کے راکھ نہ ہو جاتی تو اور کیا ہوتا۔ ڈاہڈی عشق آتش لائی او یار

"ایسی ہی آگ سے کندن بنتا ہے آدم خاکی کی بہار۔ لیکن جوہری توانائی سے استفادہ کرنے کے لیے، ری ایکٹر کو کنٹرول کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ تابکاری ہڈیوں میں مغز کو جلا دیتی ہے"

"مگر میری تنہائی حکیم صاحب! یہ لفظ مجھے اچھا لگتا ہے ڈاکٹر یہ جدا بات ہے یار لوگوں کی بخششیں علم نے اسے عطاروں تک کو عنائت کر دیا"

"ماہر نفسیات نے قہقہہ لگایا۔ دور انحطاط کا نتیجہ کہیئے برخوردار۔ لوگ جب اپنے تشخص کی حفاظت نہ کر سکیں جیسے کوئی معاشرہ اپنی مستورات اپنے ناموس کی حفاظت نہ کر سکے اور اس کی تباہی کو زمانے کے نام منڈھ دیا جائے۔ ویسے ہی"

"تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میری تنہائی قربتوں کے باوجود مجھ کو ہمہ وقت بے چین رکھتی ہے۔ ہر خواہش کے قابل رسا اور چاہت کی تکمیل کے باوجود۔ تمام تر استطاعت کے باوجود ———"

"اس کا راز بھی شاید استطاعت کی فراوانی میں پوشیدہ ہو شکم سیر کو کیا بھوک لگے گی۔ سوئے ہضم ہی کا معاملہ ہو جائے گا۔ بعض اوقات محرومی کا احساس بھی شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جھیل کا سانحہ شاید آئندہ چل کر اس

کا ازالہ کر جائے۔ تازیانے کی لہر لوٹ آئے کبھی کبھی تمام تر منطق و استدلال کے باوجود لوٹ آئے لیکن پرانی محبتوں کی یاد بھی محبوب کی مہربانی عشق کا عطیہ ہوتی ہے شاہ باز میاں۔ اور ہمیں اس کا احسانمند ہونا چاہیے۔ لذت غم کا التفات شاعری کا ایک جزو یہ بھی تو ہے۔ دراصل والہانہ سپردگی کا وہ لمحہ زندگی میں کم کم ہی آتا ہے۔ اس کو تعویذ بنا کر رکھنا چاہیئے۔ بعض اوقات ہلکی سی ایذا طلبی کے احساس کو بھی اطبا اس چوٹ کی طرح سمجھتے ہیں جس کو آگ میں تپی ہوئی پرانی اینٹ کے سینک سے سکھ پہنچتا ہے۔ آپ کہیئے گا کہ یہ حکیم بھی الٹی باتیں کرتا ہے۔ انفرا ریڈ شعاعوں کی دریافت کے بعد سرخ اینٹ نہیں عزیز من حویلیوں کی اینٹیں آج بھی تہذیبوں کی کہانیاں سناتی ہیں۔ لیکن بات کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔ محنت، جسمانی محنت ۔ تھکا دینے والی محنت، تنہائی اور اُداسی کا ایک علاج حکیموں نے یہ بھی بتایا ہے سینہ بہ سینہ پہنچنے والا مجرب نسخہ ۔ آپ تو جاگیروں والے لوگ ہیں۔ بوائی کے لیے زمین کی تیاری۔ بیلوں کی جوڑی اور ہل۔ تنہائی پسینہ بن کر زمین میں جذب ہو جائے گی۔ آپ کو تو شکار سے بھی شغف ہونا چاہیے۔ تلور، خرگوش، تیتر، ہرن، جانور خواہ کوئی سا بھی ہو۔ مقصد تنہائی اور اداسی احساس زیاں یا گنہہ جو کچھ بھی ہو تھک کے چور ہو جائے۔ ۔"

"ٹریکٹر نہیں مختار چاچا۔ بیلوں کی جوڑی، لوہے کا ہل اور سخت زمین!"

"جو حکم سرکار۔ گولی کس کی اور گہنے کس کے"۔ مختار کار نے کہا "حکم ہووے تو ہل کے آگے آدمی جوت دیویں۔ چھ ہل چار بندے،

نیں چاچا۔ خرکاری ہیں! اور پھر ورزش کا نسخہ تو حکیم صاحب نے میرے لیے تجویز کیا ہے"

زمین کا سینہ چیرتے ہوئے ہل اور ہل کے اوپر پاؤں، جوڑی سیدھا رکھنے کے لیے ہتھی پر انگلیوں کی گرفت۔ ہر قدم کے ساتھ اس کے بدن کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ بجلی کی سی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور جانور کی طرح چمک رہا تھا۔

"اب ذرا سستا کے نہا لیجئے گا۔ اتنے روٹی بھی آجائے گی"

"چھاچھ۔ مکھن اور چولائی کا ساگ۔ اور آم کا آچار۔

"شہنشاہی دعوت!" "مختار ہنسا" "کمہار کی بڑی بیٹی مکئی کی ایسی روٹیاں پکاتی ہے کہ بسکٹ بھول جاویں۔

"مکئی کی روٹی پتھر کے توے پر! مزہ آجائے گا ـــــ لیکن اس سے پہلے چار گیڑ رہٹ کو بھی ضرور دوں گا"۔

"کوزوں کی ماہل دیکھ لو مالک اور کنوئیں کی گہرائی ۔ بیل کو بھی گادی میں جوڑنے سے بیل کھوپے چڑھانے پڑتے ہیں آنکھوں پر کہ بے کار دکھائی نہ دے جائے۔

"کھوپے تقدیر کے تو آدمی کو بھی چڑھے ہوئے ہیں بھائی۔ جس طرح مجھ کو معلوم نہیں کہ اس جھاڑ کے پیچھے کیا ہے اسی طرح گھڑی کی سوئی کو سمجھ لو مختار چاچا۔ اگلے پل کیا ہونے والا ہے، کسی کو معلوم نہیں؟"

"شیشم کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں اس کا پسینہ سوکھ گیا اور وہ رہٹ کے حوض میں اُتر گیا۔ لکڑی اور لوہے

کے ڈھرے کی ریس راں، اروں کو روکنے والی لکڑی کے کُتّے کی ٹھک ٹھک اور کنوئیں کی تہہ سے پانی لاتے ہوئے مٹی کے کوزوں کی پہیلی

آؤن کونجاں جاؤن کونجاں ندی نہاون چلیاں

اینہاں کونجاں دی لمبی اڈاری وت نہ آسن جھلیاں

شہباز نے پانی سے سر نکالا۔ ایک لمبی آہ بھری اس کی نگاہیں دوریوں میں گم ہوگئیں کونجوں کے ان دیکھے دیس میں کہیں، جہاں نوری گم ہوگئی تھی۔

جٹی ٹکر لے کر آرہی ہے"۔ چودھری نے کہا "وہ باٹ پر چھمک سی سرکنڈے سی چھوری ان کھیتوں کی ہل والیاں ایک ایک کر کے یہیں جمع ہو جاتی ہیں"

اس نے بدن پونچھ کر تہمد باندھا۔ اور بان کی جہازی چارپائی پر بیٹھ گیا جس پہ کھیس بچھا ہوا تھا۔ جٹی نے چھاچھ کی منکی اور چھپے ہوئے کھدر کے رومال میں بندھی ہوئی روٹیوں کی ٹوکری اتاری اور حکم کا انتظار کرنے لگی۔

"دستر خوان بچھا سوہنیے!" جٹی نے پلٹ کر مختار کار کی طرف دیکھا پائنتی کی طرف کا کی۔ "شاباش تنور کی روٹی، آم کا اچار، کٹورے میں ساگ۔ چھاچھ کے لیے کٹورا کانسی کا۔ اور نمک کی ڈلی دیکھ کے اس کی بھوک جٹی کی ناک میں لونگ کی طرح چمک اُٹھی"

"کسانوں کا لنچ سرکار۔ ورنہ میں نے شہر سے باورچی بھی منگوالیا تھا!"

"خوان نعمت۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو بیسنی روٹی کا بھی شوق تھا۔ لیکن ہمارے میزبان الگ کیوں بیٹھے ہیں"

"صدیوں کی عادت۔ مالک کے برابر چارپائی پر بیٹھنا بھی آداب کے خلاف ہے سرحد میں خوانین کے دہقان تو الٹی چارپائی بچھا کر بیٹھتے ہیں۔ آپ ہی کی جاگیر دار برادری کے نزدیک گستاخی ہے۔ اور سزا کی مستوجب"

"جمہوریت کے دور میں۔ مساوات وغیرہ ــــــ"

"سب کہنے کی باتیں ہیں سائیں۔ جاگیر داری اور جمہوریت جدا جدا بستیوں کے راستے ہیں مالک۔ جھوک جمہور والی تو ڈاہڈی دور ہے سائیں۔ ورہیاں کے پینڈے۔ پیاس جو ہنجوؤں سے نہیں مٹتی۔ نوابزادہ صاحب جی آپ کہتے ہوں گے کہ میرا مختار کار بھوندل گیا۔ گھاس کھا گیا ہے۔ جمہوری پگڈنڈیاں تو سولاں، کانٹے کیکر کے اور ننگے پاؤں کا قصہ ہے سائیں۔ ہمت ہووے تو آجاؤ جس کو آنا ہے۔ پر میں کس چکر میں پڑ گیا۔ ٹھنڈیاں چھانواں تے نگھیاں مٹیاراں۔ تجھ کو کیا کرنا ہے جمہوریت کو۔ اب قیلولہ کر لو سرکار۔ ڈینھ ڈھلے ہرنیاں تے خرگوشاں پچھے قلندراں کے کتے۔ جیسے تیروں کے جھنڈ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر نے میلہ مویشیاں پر چاندی کا کپ دیا تھا سفید کتوں کو۔ کمریں دیکھو ذرا ان کی نڈڑی دالک ہووے جس طرح۔ جوان دی اُنگلاں دے گھیر دے وچکار آجاوے۔

"پر میں وی اِک گلاں دا گالھڑیاں۔ سرکار اے پیر دیا اوئے کیہہ ناں اے تیرا۔ ہل چلایا ہے موتیاں والی سرکار نے۔ کھوہ گیڑیا ہے

آون کونجاں دیون بچے ندی نہاون چلیاں

وچ ظلم ٹلیاں

اینہاں کونجاں دی لمی اڈاری وت نہیں آسن

جھلیاں

دوپہر ڈھلتے ہی شکار کا بندوبست ہوگیا۔

"یہ لو صاحب جی۔ ہرنوں کی ڈار ہے سنہری ہرنی کو دیکھو سرکار۔ میرے جال سے بچ کر کم ہی جانور نکلتا ہے سائیں"

"یہ گاؤں کا چڑیمار ہے سرکاراں ۔ کوڑی پھینک کے مرغابیاں پکڑتا ہے۔ اٹھنی کا ٹکٹ لیا بس کا اور شہر میں کسی بڑے ہوٹل کے باورچی خانے میں بیچ آیا۔ آپ نے تو دنیا بھر کے ہوٹل دیکھے ہوں گے۔

"ہوٹل تو میدانوں میں ہوتے ہیں، ماجھی نے کہا تھا" .... ہاؤس بوٹ ۔ ڈبل بیڈ، روم سروس، دن رات۔ ہر سہولت۔ ہر حکم"۔

"جھیل کے افق پر دھند میں ایک نقطہ ساجذب ہوگیا۔ اس کے تصور میں ایک دھندلا سا افق نمودار ہوا۔ اور کونج کی سی آواز سے بدن پہ اوس پڑ گئی"۔ لیکن کتوں کی آواز نے چونکا دیا ۔

تیر کی طرح تیرتی ہوئی ہرنی کے پیچھے لپکتے ہوئے شکاری کتوں کی آواز اس کے بدن پہ تازیانے کی طرح پڑی۔ وہ تلملا اٹھا۔ لیکن کوڑوں کی پھنکار تماشائیوں کے شور میں دب گئی غلاموں کے بدن پر تازیانوں کی پھنکار ڈھول کی آواز کنیزوں کے خیمے کے اندر میں دب کر رہ گئی تھی ——

لیکن اس کی دوربین جیسے آؤٹ آف فوکس ہو کر یکا یکی آپ سے آپ پھر فوکس میں آگئی اور عین اس وقت چوکڑیاں بھرتی ہوئی سنہری ہرنی کی کمان کو کتوں نے دبوچ لیا۔ وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہوگئی۔ اس کے بدن سے لہو کی پھوار سی اُڑی۔ دوربین کے شیشے دھندلا گئے ——

لیکن لہو میں پسینے کی مہک بسی ہوئی تھی۔ شہروں کی معطر خلوتوں سے دور تازہ ہوا میں تنفس کے ایک نئے احساس نے اسے گرم لہروں کی طرح لپیٹ لیا۔ اس کارواں رواں سانس لینے لگا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اس کی پائنتی لیٹی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی، ڈوری سے بندھی ہوئی پتلی کی طرح فوراً آبیٹھ گئی۔

"سلام سائیں"

"اوہ! سلام جنتے"

روشن دان سے اترتے ہوئے فجر کے اجالے کی طرح وہ کسی خوش آئند خواب کی طرح دکھائی دی اس نے جلدی سے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ اس کی ہتھیلی پر مہندی کے پھول بنے ہوئے تھے۔ کاجل کنپٹیوں تک پھیلا ہوا۔ سوہا جوڑا، گلنار پھلکاری۔

رواج کے مطابق مالک اپنی جاگیر میں کسی سے پھر رجوع کر کے چادر ڈال لیتا تو نکاح خوان کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ رواج کی اپنائی ہوئی مخلوق سے آئندہ کسی وقت، بڑھاپے کے سہارے اور وراثت کا معاملہ بھی طے ہو جاتا۔ تندرست عورت جو بھینس کی دم بھی مروڑ سکتی تھی۔ بچھڑے کو کندھے پر اٹھانے کی طاقت بھی رکھتی تھی۔ جوڑی کی ہتھی کو تھام کے مٹی کے ڈلوں کو توڑنے کے لئے واگہ بھی چلا سکتی تھی۔ ایال پکڑ کے بغیر زین کے پلاکی مار گھوڑی کی باگیں تھام سکتی تھی۔ اور دو تین سوکنوں کو بھی نیانا ڈالنے کی اہل تھی۔

"سوانی تے گھر والی الگ الگ کام نہیں ہوتے پاگلو۔ ہر نڈی جاگیروں کے مالک کے پاس سے گزر کے مالکن نہیں بن سکتی"

"بعض بعض جاگیروں پہ آج بھی ہر ڈولی مالک کی ڈیوڑھی پہ رک کے جاتی ہے۔ سلام کر کے"۔

اس کی آبائی حویلی میں جس کا بیشتر حصہ مختار کار افسروں اور باراتوں وغیرہ کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ کبھی کبھی چادر یا رواج کا لفظ بھی سنائی دے جاتا۔ لیکن کھل کے کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ جیسے منہ میں نسوار ڈالی ہو۔ مالک تو مالک افسروں کی بھی مٹھی چاپی چودہریوں اور نمبرداروں ذیلداروں کی عام ذمہ داریاں تھیں کمیوں میں سے لے آتے کوئی بنا سنوار کے۔ زنانی کے لیے کونسا فرق پڑتا ہے۔ گھی کا کنستر، بوری گندم کی یا کوئی سوغات نہ ہو تو ذیلیں چھن جاتی ہیں۔ پٹوار۔س چلی جاتی ہیں جناب۔

اسے معلوم تھا کہ حویلی کے برآمدے میں اصل موضوع سخن کون تھا۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ تو جوان دیہاتی لڑکی ایک انٹرنیشنل شہری کی رفیقہ حیات نہیں ہو سکتی تھی۔ جو ہو سکتی تھی مجھے درد دے کر چلی گئی جل پری۔ یادوں کے تازیانے اور یہ سب اسی کو جلانے کی سعی تو تھی۔

"میں ایک سیلانی آدمی ہوں مختار چاچا۔ اس کو رواج کی چادر میں جکڑ کے ہمیں چاہ میں نہیں پھینک سکتا۔ آپ چپ ہو گئے مختار صاحب۔ یہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ نسوار ڈال کے منہ میں۔ لیکن رضاکارانہ بات پہ الزام کیسا۔ یہ تو سازش ہوگی نا میں نے کوئی اغوا تو نہیں کیا"

"جاگیروں پہ اغوا کی وارداتیں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن آپ کی رعیت میں نہیں۔ یہاں سب آپ کی باندیاں ہیں۔ غلام ہیں سبھی"

اور ان کی شادیاں بھی ہوتی ہیں۔ کوئی بن بیاہی بھی نہیں بیٹھی رہتی۔ اگر ایسی کوئی بات ہو تو مجھ کو خبر کرنا آپ کا فرض ہے اور یہ لیجئے اس کے جہیز کے لیے دس ہزار۔ اللہ اس کو خوش رکھے"۔

"اس کا تو مقدر جاگ اٹھا سرکار"

"اللہ اس کو خوش رکھے مختار صاحب۔ مجبوریاں نہ ہوتیں تو شاید۔ بلکہ پھر تو شاید معاملات ہی مختلف ہوتے۔ شادی میرے لیے مہمل بات بن کر رہ گئی ہے۔ میں کبھی شادی نہیں کروں گا"

"گستاخی معاف سرکار وجہ تو کوئی ضرور ہوگی اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے مجھ سے پہلے میرے باپ نے بھی اس جاگیر کا ٹکڑ کھایا ہے۔ نمک چکھا ہے اس کا اور بھید کی کوئی بات ہوا کو بھی معلوم نہیں ہوئی"

"مجھے تمہاری وفاداری پر تو قطعاً کوئی شک نہیں چاچا۔ لیکن بعض باتیں آدمی اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہتا ہے۔ روئی کی آگ کی طرح اندر ہی اندر سلگنے کے لیے شاید۔ چوٹ کو سہلانے میں بھی سکھ ہوتا ہے۔ اور وہ جو کسی نے کہا یار فرید نے شاید۔ گجھڑے زخم اندر دے"

"تے جند نمانی ہنجواں پانی ہو کے بھر دی ایویں بن مک جانی اے۔ کیا سمجھے پتر جی"

"اور زندگی بے چاری، آنسوؤں میں غرق آہیں بھرتی ایسے ہی ختم ہو جاتی ہے"

"ترجمہ تو میں نے نہیں پوچھا تھا موتیاں والیا۔ سبق؟"

"بک ٹٹ چھوڑ دوں! چھوڑ ہی تو رکھی ہے۔ تنگی پیٹھ۔ ایال پکڑے۔ کہو تو وہ بھی چھوڑ دوں۔ خانہ خرابی تو ہو چکی۔ جتنے بھی جی بی جی میں کوس رہی ہو گی کہ کلنک کا ٹیکہ لگا گیا"

"بھولے بادشاہ! تیرا ابھی جواب نہیں ہے"

"کیوں"

"جی تو ہونا ہی نہیں۔ صدیوں کی چاکری میں دل تو رہتا ہی کہاں ہے احساس سن ہو جائے تو مرد سبھی برابر ہیں اور ویسے عورتیں بھی۔ جتنے کی تو سنی گئی۔ خالہ زاد بھائی اس کا نائن پہ نائن بھیج رہا تھا۔ پر ماں کہتی کہ خالی ہاتھ تو نہیں نورنا۔ برادری میں ناک کٹتی ہے نا۔ دس ہزار میں تو خوش ہو جائے گی۔ اور قصہ تو وہی نا آپ ہوئے یا کوئی جناں اور ہویا۔ پر مقدر کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وارث شاہ تو کہہ گیا کہ۔ تقدیر اللہ دی نوکون موڑے تقدیر پہاڑ پلنڈی اے "مختار" مطلب پوچھا تھا آپ نے۔ بہت دن بیتے۔ کشمیر کی جمی ہوئی جھیلیں دیکھ کر آئے تھے سردیوں میں۔ برفوں میں ایئر کنڈیشنڈ سٹیشن ویگن کی رفتار تیز ہو گئی"۔ کیا کہہ رہے ہو مختار چاچا؟

"بہت دن بیتے دیکھنے میں۔ بیتے دن بہت دور گئے ہیں۔ لیکن کوئی دن اصل میں دور نہیں ہوتا۔ وہیں کھڑا ہوتا ہے مختار صاحب۔ حاضر باش کنیز، فرض شناس میزبان کی طرح۔ یاد کی دہلیز پر"۔

"نہ نہ! آپ بہت مشکل باتیں کرتے ہیں۔ میری موٹی کدی میں نہیں آتیں۔ نیم خواندہ گاؤں کا آدمی۔ نام بھلے کو مختار ہی رکھ دیا ہو ماں باپ نے۔ لیکن پرندوں کی طرح آپ کی باتیں میرے لیے اوپر ہی اوپر گزر جاتی ہیں"

گاڑی کی رفتار یکدم اور تیز ہو گئی۔ مختار کار سنبھل کر بیٹھ۔ لیکن رفتار خلاف توقع کم ہو کر، گاڑی رک گئی

"خیریت حضور۔ گاڑی تو ٹھیک ہے نا"

"یہی دیکھنا تھا۔ آواز سی ایک آئی تھی۔ شاید کوئی کانٹا چیسز سے رگڑ کھا رہا ہو"

"اتر کے دیکھوں؟ سڑکیں تو یہاں کی کچھ ویسی ہی ہیں ہوا سے اڑ کر کوئی جھاڑی سڑک کے اوپر بھی آسکتی ہے"

"آ کے نکل گئی ہوگی۔ میں تو آپ سے یہاں کے حالات کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ بستی میں بجلی تو آگئی ہے نا۔ یا حویلی کے جنریٹر کے سوا سناٹا ہی ہے سارے"

"تیل کے دیے اور کہیں ہری کین۔ بجلی تو آتے آتے ہی آئے گی

"ایسے میں تاروں کی چھاؤں یا ملگجے اندھیروں میں واقعات"

"ہوتے ہی رہتے ہیں سائیں۔ اور ہوتے ہی رہیں گے۔ سلگتی ہے اور ہولے سے بجھ بھی جاتی ہے۔ ماں باپ یہ ہوتا ہے سب کچھ ہنڈیا کا دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ دودھ کو ابال تو نہیں آنے والا۔ سب سے بڑی اوکھ تو جہیز کی ہوتی ہے سائیں جس کو بندوبست آپ نے کر دیا۔ لیکن یہ تو رئیسوں کی شادی ہو گئی نا۔ اس سے تو ساری برادری کی چھوریوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔ ورنہ"

"ہاں مختار صاحب میں یہی جاننا چاہتا تھا۔ عام صورت حال میں؟"

"قرضہ سائیں۔ بٹائی کے حصے میں بیاج یہ۔ گروی رکھ دینا کچھ"

"خود کیا کھاتے ہیں

"چوہا کیا کھاتا ہے سائیں؟"

"شاہ باز چونک پڑا

"جڑیں، کھرچن، سبزی، اناج کا بھس ۔ سستا دانا۔ باجرا، جو، اچار ہو جاوے تو عیش۔ لویرا ہے گائے بھینس تو مکھن شہر کے شوقینوں کو۔

"ورنہ کانگڑی"

"جی؟"

لیکن اس کی کمر پہ تازیانے کی ضرب ابھر آئی اور دھوپ کے سن فلٹر چشموں کے پیچھے آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ اس نے بن دیکھے ہی کیسٹ تبدیل کر دیا۔

"کنجری بنیاں مری عزت نہ گھٹدی مینوں نچ کے یار مناون دے"

"واہ اوے چاچڑاں والیا"۔ مختار کار کی آواز کی "مینوں نچ کے یار مناون دے"

"اور ناچتے ناچتے وہ جھیل میں گم ہو گئی" وہ سوچنے لگا۔ مگر کسی کو کیا معلوم کہ سچ مچ کی کسبی کس طرح عشق کی عزت دار بن گئی تھی۔ اور کون سی دھن میں فنا فی العشق کی منزل سے بھی کوسوں دور نکل گئی تھی"

"پہنچے ہوئے لوگوں کی باتیں ہیں سرکار۔ نری کھری شاعری ہی نہیں۔ سچی باتیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔ نباھنے پہ آجائیں تو گرہستنیں دم سادھ کے رہ جائیں۔ بگل مار کے بیٹھ جائیں شریف زادیاں۔ جان دے دیں گی ہاتھ نہ چھوڑیں گی۔ آپ بھی کیا کہو گے پتر کے آج بڈھا مختار بھنگ پی گیا ہے شاید۔ قصہ یاد آگیا۔ آپ ہی کی جاگیر دار برادری کا نوجوان تھا ایک راگ رنگ، نرت، مجرے، ٹھمری دادرے کا رسیا۔ اس کی حویلی کو لوگ میراثیوں کا تکیہ کہا کرتے تھے۔ پاگل سو ہر سے۔ موسیقی اور جگت کا کیا جوڑ!ــــــ سر تال تو اللہ کی دین ہوتی ہے۔ میراث میں تھوڑی ملتی ہے۔ مگر میں نوجوان جاگیر دار کی بات کر رہا تھا۔ ایسے شوق تو جاگیروں کو گروی رکھ دیتے ہیں۔ اور پھر ہاتھ جھاڑ کے یار کی دہلیز پر جا بیٹھے۔ مگر واہ نیلم بائی! جانتی تھی کہ عشق میں اب جامہ دار کی شیروانی کے سوا وہاں کچھ نہیں رہا ہے پھر بھی پہلے کی طرح پہلو میں بٹھاتی۔ حویلی رہن پڑی تھی لیکن نوابزادے حسب دستور بالاخانے میں بیٹھے داد دے رہے تھے۔ ہماری موسیقی ٹھمری داد ہی محفل کی چیز ورنہ تنہائی میں دھیان دوسری طرف ہو جاتا ہے"۔

"واہ مختار چاچا۔ خوب بات نکالی ہے۔ مغربی موسیقی میں خیال کسی اور جانب نہیں بھٹکتا۔ تین سو کا سازینہ سامعین کو باندھ کر بٹھا لیتا ہے۔ــــ مگر وہ قصہ بیچ میں رہ گیا"

"مال اثال مک چکا تھا۔ شوق میں بے آبروئی کیسی۔ خلوت نہیں تو جلوت ہی سہی ۔ مجرے بھی تو کرواتے ہیں یار لوگ رقیب بھی آتے ہیں۔ دیوالیہ عاشق بھی آنے لگے لیکن بامروت مغنیہ کے ماتھے پر بل نہ آیا۔"

"جائداد بھی تو اس کی نذر ہوئی تھی"۔

"ویسے ہی پہلے کی طرح ادب آداب و تسلیمات پان گلوری۔ خمیرہ عطر۔ خوشبو ساہوکار کو بھی پہنچ گئی ملازمہ نے بائی جی کے کان میں کچھ کہا۔ سازندے ساز ملانے لگے۔ دنیا دیکھے ہوئے تھے۔ ایک ایک تماشبین کا شجرہ نسب جانتے تھے۔ دوسرے کمرے میں مارواڑی کو دیکھ کے تاڑ گئے کہ آسامی کے پیچھے آیا ہے۔ ورنہ گانے بجانے سے لالہ جی کا کیا سمبندھ مگر بائی جی دیوان خانے سے غائب ہیں۔ انکم ٹیکس کے وکیل صاحب جن کا وہاں اکثر آنا جانا تھا، کسی بہانے اپنی مسند سے اُٹھے۔"

بلہر کے کمرے میں کیا دیکھتی ہیں کہ چابیوں کا گچھا ہاتھ میں ہے۔ اور سیٹھ جی پر برس رہی ہیں اشرافوں کا پیچھا کرتے شرم نہیں آتی۔ الماری کھولی اور دس ہزار کا بنڈل مارواڑی کے منہ پہ مارا۔ــــــ آئندہ کبھی ادھر کا رخ کیا تو سارنگی کے گزوں سے پٹوا دوں گی۔ بعض بعض بائیاں کروڑپتی ہوتی ہیں۔ رانیاں مہارانیاں بھی خم کھاتی ہیں سرکار"۔

"ہاں وہ تو ہے ہی"

"مگر بات مجھے انکم ٹیکس والے وکیل کی کرنا تھی۔ آپ کے پیروں کے طفیل سبھی سے صاحب سلامت ہے۔ محفل کے آدمی تھے دل کے دورے سے چل بڑے۔ بھلے آدمی تھے بہت ۔ میں نے پوچھا کہ زمینوں کی پیداوار پر بھی ٹیکس لگنے والا ہے؟"

"توکیا بولے جواب میں"

"بھولے بادشاہ ہو تم بھی مختار چاچا۔ ٹیکس لگانے والے اپنے اوپر ہی ٹیکس لگا دیں گے؟ جاؤ سکھ کی نیند سوؤ۔ جو چاہیں سو آپ کریں وہ بدنامی کے لیے ہم"

"مختاری والا جواب بھی مل گیا نہ آپ کو"

"مختار کار چونک پڑا۔ "ہاں صاحب مل گیا"

"اور پیداوار پہ ٹیکس کے بارے میں کیا کہتے ہو مختار صاحب؟"

"سوغاتوں پر بھی ٹیکس لگا ہے کبھی؟ گندم، گھی، شکر، کھانے پینے کے اناج سبھی۔ آدمی کے لیے سوغاتیں ہی تو ہیں۔ ان پر ٹیکس لگنا شروع ہوئے تو دور دیسوں کے دیوان خانے ویران ہو جائیں"

"بدیشی مشیر ایسے مشورے کبھی نہیں دیتے جن سے پیرس، لندن، نیویارک کے مے خانوں اور عشرت کدوں۔ قمار خانوں اور رقص گاہوں پر اثر پڑے۔ خلوتیں خالی ۔ پہلو سرد، ساز، گونگے بے فکر ہو کے بیٹھو۔ جب حشر کا دن آئے گا۔ اس روز دیکھا جائے گا۔"

شہباز کو اپنی زندگی کا وہ دور یاد آگیا جب اسے موسیقی سے شغف ہوا تھا۔ مشرق و مغرب کی اِنفرادیت اور تقابل غنائیت اور آہنگ کے راز اور دونوں کو یکجا کرنے کی کوشش۔ لیکن موسیقی کے سبق کی لامتناہی تکرار بھی فلکیات کے ستاروں اور کہکشاؤں کی صبر آزما علم تھا۔ مضطرب اور ہیجانی مزاج کے لوگوں کا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ اور Conservatory کے اسرار و رموز کی جستجو کو چھوڑ کر وہ اس کوچے میں لوٹ آیا جو ارباب نشاط سے معنون تھا۔ رقص و سرور۔ بساطِ ہوائے دِل کی پر فریب وادی۔ اس کی عدم موجودگی میں نو بہار بانو ایک نام راگ رنگ کی محفلوں میں کسی نو دریافت ستارے کی طرح چمکا تھا۔

گھنگھروؤں کی جھنکار طبلے کی تھاپ اور سارنگی کی تانوں پہ وہ بالاخانے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ خواب و خیال کی سی کوئی مخلوق بارش کے سے جھالے میں پائل بجاتی رک گئی۔ طائفہ اس کا منتظر تھا۔

"حضور کی کنیز نو بہار!" نائکہ نے تسلیمات بجالاتے ہوئے کہا

"رک کیوں گئیں شہباز نے رقاصہ کی طرف دیکھ کر کہا "گھنگھروؤں کی بارش ہو رہی تھی"

"فرمائش پر گھنگھروؤں کی آوازیں جگنوؤں کی طرح اڑنے لگیں۔ ستار پر ملہار کے جھالے سے نو بہار کی آواز سے غنائیت مجسم ہو گئی۔ شہباز نے مغربی بیلے کے رقاصوں کی طرح رقاصہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا بازو اس کے کمر کے گرد حائل ہو گیا نو بہار کمان کی طرح دوہری ہو گئی اور اس کے بال عنبریں آبشار کی طرح قالین کو چھونے لگے۔ تالی کی ایک ہلکی سی آواز۔ نائیکہ کی طرف سے تخلیے کا اشارہ۔ سازوں اور رقاصوں کے درمیان قرمزی مخمل کا ایک پردہ حائل ہو گیا۔ دائیں جانب خلوت کے کشمیری جالی دار چوبی پردے کے پیچھے چھپر کھٹ کٹہرے اور شامیانے سے گوری چنبیلی

کی لڑیاں لہرا رہی تھیں۔ گلوری اور عطر سے مہکتی اور ہانپتی ہوئی سانسوں سے اس کو نیند آنے لگی۔ قریب تھا کہ وہ سو جاتا لیکن خلوت کے ملگجے اندھیروں میں کہیں دور سے بنسری پر جوگیا کی دھن سنائی دی"

پیا بن ناہیں آوت چین

اور اس کے ذہن میں پھر وہی سوچ کروٹیں بدلنے لگی جو ایسے موقعوں پر ایک سرور آگیں تھکن میں اس کو سوتے جاگتے کے درمیان معلق کر دیا کرتی تھی

ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا؟
خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا؟

نغمہ نَے کا گداز اور جیسے ہوا کی لہروں کے ساتھ ڈوبتی ابھرتی، پہاڑوں کے موڑ کاٹتی سڑک اُسے وادی فراق میں لے گئی جہاں جھیلیں منجمد ہونا شروع ہوتی ہیں تو قازوں اور کونجوں کی قطار۔ سں خوبصورت پروں کی نشانیاں چھوڑ کر ان دیکھے ملکوں کا رخ کرتی ہیں اور نغمہ وصال کو ہجر کی آہوں میں تبدیل کر کے نہ جانے کہاں چلی جاتی ہیں۔ وصل کی ایک کیفیت اس کے پہلو میں محوِ خواب تھی اور ایک بے خواب روح کی طرح اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ ٹرمپٹ کی طرح کرب کی پکار!

نوبہار کی نشاط گاہ میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ مخمل کا بھاری پردہ جوں کا توں پڑا تھا۔ اور اس کو معلوم تھا کہ صبح دم وہاں کیا منظر ہو گا ہر گوشہ بساط الفراق کی آہوں میں غرق ہو گا۔ ساز سرنگوں۔ مینا و مسل میں ہوا کی آہیں۔

اور اس کے برعکس مغرب کی طرب گاہوں میں ساز بنوں کا آہنگ جادو کے زور سے راج ہنسوں میں تبدیل شہزادیاں اور سحر ٹوٹتے ہی بیلے کے سٹیج پر مچھلیوں کی طرح تیرتی مہوشیں۔ چڑھی کمانیں تیرتے تیر۔ پنجوں کے بل انگوٹھوں کے نقطوں پہ اڑتے ہوئے دائرے ایک دوسرے سے کھیتے ہوئے سروں کے ہیولے۔ عریانی کے باوجود مستور۔ مے خانے اور شب نگار بنداں۔ جہاں تسلسل حیات کا فریضہ بھی ہیجان انگیز تجربوں سے گزر رہا تھا ۔ بے حجاب و بے نقاب۔ اور اس کے دوش بدوش Aids کا خوف!

خمخانہ حیات کی لہر دنیا بھر کے ساحلوں سے ٹکراتی ہوئی پھر مشرق کو لوٹ آئی۔ مشرق کی نارسائی، تکلفات، اسرار، نقاب، حجاب، پردے۔ تندرست ہرنی کی خوشبو۔ نافہ۔ عنبر، حنا، بیر بہوٹی کی طرح سمٹی ہوئی سرخ پھلکاری! کون سا گاؤں تھا جاگیر پہ! ہاں۔ یاد آگیا سوہنیاں دی جھوک حسینوں کی بستی سولہ برس گزر چکے تھے۔ اور اس دوران وہ باقاعدہ آتا جاتا رہا تھا غیر حاضر جاگیردار کو کتے بھی نہیں پہچانتے سرکار! مختار کار کا قول اسے یاد تھا۔ سبھی ڈیروں پہ خبر رہتی کہ سائیں کا کوئی ٹھیک نہیں آدھی رات کو آن دھمکے کہ لاؤ حساب کتاب۔ بوڑھے مختار کو گزرے بھی تو بارہ پندرہ برس بیت چکے تھے باپ کی جگہ بیٹے نے سنبھال لی تھی ۔ بوڑھا جیتے جی ہی پگڑی بندھوا کے گیا تھا۔ ہو بہو اپنے باپ کی طرح تھا "سرکار کامنہ دیکھنے کو ترستی ہے حضور"

"آتا تو رہتا ہوں جب بھی پاکستان آؤں ہر جا ہر کھیت ہر کنواں، ہر کیاری میری ڈائری پہ ہوتی ہے۔ جائیداد ہے بھی میری۔ باسمتی کے علاقے میں ذرا زیادہ جانا پڑ جائے"۔

"عید کے چاند کی طرح چھب دکھا کے آئے اور گئے۔ باسمتی کی تو مانگ ہے ہی۔ گندم بھی بادشاہ ہے۔ اصل جنت کا میوہ" فرصت ہی نہیں ملتی۔ دوسرے کام بھی تو ہوتے ہیں نا۔ ایکسپورٹ، امپورٹ۔ اور زیادہ وخت تو باہر ہی کٹتا ہے"

"ہاں بادشاہو ۔ پرستان کو چھوڑ کے دھرتی پر کس کا جی لگتا ہے۔ کھوہ والے پنڈ وچ ہیر سیال دوبارہ آگئی ہے خلقت چھپ چھپ کے دیکھتی ہے"۔

"ہیر کی تو دُھن ہی سُنی ہے ہم نے ریڈیو پر۔ ویسے تم جو اتنی تعریف کرتے ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔

"رب جھوٹ نہ بلوائے بادشاہو۔ شاہ پری دی بھین پنج پھول رانی۔ کچی رہوے نہ ہیر ہزار وچوں کمہاروں کے چاک سے ایسی صراحی پہلے کبھی نہیں اتری۔ بندہ ہیر نوں بُھل جاوے۔ عرض کیا نے خاکسار نے کہ کمہاروں کے آوے سے تپی ہوئی صراحی سُچی مٹی میں ابرک کے لشکارے دیکی ہوئی سرکار۔ بجھی ہوئی آگ ہماشما کو تو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ سائیں کی اور بات ہے۔ مالک"

"شہباز کو مغرب کی نشاط گاہوں کی برفانی صورتیں یاد آگئیں جن کو دہکانے کے لئے تہ خانوں سے صد سالہ شرابیں منگوانا پڑتی ہیں"

"اور ہاں سرکار ایک بات پوچھنا تھی"

"ضرور پوچھو"

"پچھلے دنوں ڈاہڈی ہوا چلی تھی کہ زمین اس کی جو اس پر ہل چلائے۔ ایک آدھ جاگیر پر تو ٹریکٹر بھی آگیا اس چکر میں"

"ہاں سنا تھا میں نے۔ ٹریکٹر اور بیچارو میں تو فرق ہوتا ہے نا مختار بھیا"

"فرق سا فرق کوئی۔ زمین میں ہل کے جھٹکوں سے پسلیاں برابر ہو جاتی ہیں بادشاہو۔ میں نے ہوٹا لے کر دیکھا تھا جی ایک دن آباد کاری کے لیے زمینیں سستے داموں سرکار نے دی ہیں نا۔ میلہ لگا ہوا بس ٹریکٹر پہ بیٹھ کے تصویر تو کھنچوا لیتے ہیں شہری، زمیندار، چلاتا ڈرائیور ہی ہے"۔

"لیکن اگر زمین ہاریوں میں تقسیم بھی ہو جائے، جیسا کہ تم نے سنا ہو گا تو تمہارے لیے کیا فرق پڑے گا مختار صاحب؟"

"نخصے ہو گئے بس۔ اور کیا رشتے ناتے، لین دین، پانی کی باری، اونچی نیچی بات کوئی، مٹیاروں اور جوانوں کے یارانے کبھی کبھی سو بات ہوتی ہے سائیں۔ کہیں قتل ہو گیا کہیں ڈاکہ پڑ گیا اور بے گناہ لوگ بھی پکڑے گئے۔ ایسے میں

زمیندار کا نام ہی کام آتا ہے۔ دھوپ میں چھتری ہوتی ہے جس طرح۔ اور الیکشن والے آجاویں جب تو ہم غریبوں کو کیا پتہ کہ کس کو ووٹ دینا ہے۔ یا کوئی پارٹی بدمعاش لگوا دے کسی کے پیچھے۔ اور پھر مقدمے، کچہریاں ایک جھنجھٹ ہوتا ہے کوئی۔ اور تو اور پولیس یا آپیانے والے ہی کیا کم ہیں راتب بندھے ہوئے ہیں سب کے وہ بھی زمین ہی دے گی۔ سب کو خوش رکھو۔ لیکن جاگیر دار بڑا ہو اگر جیسے آپ موتیوں والی سرکار تو خم کھاتے ہیں لوگ کہ فلانے کی رعیت ہے۔ بندہ بھی مر جاوے بھول چوک سے تو خیر ہے پشتپناہی ٹھیک ہو تو سب ٹھیک ہے"۔

"پتے کی باتیں ہیں بھائی۔ سیانے لوگ ہو"

"ہم کیا سیانے ہوں گے سرکار۔ جس کی کوٹھی دانے اس کے کملے بھی سیانے۔ ڈر تو غریب غربا کو ہوتا ہے عدل، نہ انصاف۔ جور و نہ جاتا، گھر نہ گھاٹ، جانداروں نے طرح طرح کی نقلیں تیار رکھی ہیں۔ انصاف بڑا کہ سفارش اور بچہ جمورا بولتا ہے سفارش! باپ بڑا کہ بیٹا؟ جواب ملے گا! بیٹا سوال ہو گا رب بڑا کہ پیسہ۔ کان پکڑ کے بولیں گے کہ مولا معاف کرے۔ پیسہ بادشاہو۔ بڑے بڑے افسروں کے سامنے صاف صاف کہہ دیتے ہیں جو کہنا ہو۔ اور افسر لوگ بھی کھسیانے ہو کر ہنس دیتے ہیں۔ لاتوں کے بھوت تو لاتوں ہی سے اترے ہیں صاحب جی۔ خیر طوطا خان کی پارٹی ہے خوب۔ چلو تو سہی آپ۔ آسمان پر بھی بڑی رونق ہوتی ہے ان دنوں سرخاب، مرغابیاں، نیل کنٹھ، کونجوں کی ڈاریں، سورج چھپ جاتا ہے۔ مرغابیوں کے پر لہریا دوپٹوں کی طرح جگمگاتے ہیں۔ اور ان کی آوازیں سائیں:۔ مرلیاں، بانسریاں، الغوزے ایسا شکار آیا ہے کہ دیکھا نہ سُنا۔

"مرغابیوں اور کونجوں کو مارنا ظلم ہوتا ہے مختیار خان۔ ایک مر جائے تو فراق میں دوسری بھی"———

"ہاں سائیں۔ وچھوڑے جیسی ظالم شے سے بھی پاک پروردگار بچا کر ہی رکھے۔ پر آپ چلو تو سہی کالے تیتر، تلور، سسی۔ لومڑیاں، خرگوش اور ہرنیاں۔ ترٹھیاں۔ ڈاریں اگئی ہیں کہیں سے۔ آپ چلو تو سہی وہ لرز گیا۔ اس کا تصور ہلکورے کھاتی ہوئی ہاؤس بوٹ کے ڈبل بیڈ پر ناف کے گرد سیاہ ہالے مرمریں جسم، سنتور کی سی آواز میں لرزتے ہوئے عہد و پیمان۔ منچھر جھیل پر اس کا نام لے کر پکارتی ہوئی ایک آواز اور دھند کے دبیز پردے پہ شہاب ثاقب کی طرح اپنے جلو میں چنگاریاں بکھیرتا ہوا تاریک ہو گیا اس کے ہونٹوں پر چپ سٹک کی طرح پھیلی ہوئی مجلسی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور لمحہ بھر کے لیے وہ بھول گیا کہ میں کہاں ہوں لیکن مختار کار کے کھنکارنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"ہاں تو پھر شکار کو چلنے کا نا حضور۔ اسی بہانے رعایا کو سرکار کے دیدار ہو جائیں گے۔ مالک کو دیکھ کر دل بڑھ جائیں گے کہ ہمارے سر پہ بھی کوئی ہے آڑے وقت پہ کام آنے والا"

"ہاں ہاں چلیں گے کسی روز۔ پاکستانی قالینوں کا ایک بہت بڑا آرڈر ہے یورپ کا"

"وہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے"

"دراصل وہاں ہلکا مال نہیں چلتا"

"ہلکا مال تو کہیں بھی نہیں چلتا ۔ جی"

"چلوں گا بھائی۔ ضرور چلوں گا"

"کیسے نہیں چلیں گے۔ ہم گاڑی کو کھینچ کر لے چلیں گے"

"میں تمہارے پیار کی قدر کرتا ہوں برخوردار۔ بیسنی روٹی، اچار مکھن اور چھاچھ کا بندوبست ہو جائے گا!"

"یہ بھی کوئی فرمائش ہوئی سائیں۔ ڈاہڈا اُسریلا گویا آیا ہے آجکل۔ گاؤں گاؤں گھومتا ہے۔ کافی تو ایسی گاتا ہے کہ پتھر بھی موم ہو جائے۔ فقیر تکیہ چھوڑ کے چل دے۔

وچ روہی دے رہندیاں نازک نازک جٹیاں
راتیں کرن شکار ڈلیں دے ڈینہیں بلوون مٹیاں

رہٹ کے آبشار سے اس کے بدن میں تھرتھراہٹیں دوڑ گئیں۔ اس کا خیال تھا کہ پانی ٹھنڈا ہو گا لیکن کسی گیزر میں بھی اس نے وہ حرارت محسوس نہیں کی تھی جو اس کے جسم کا حصہ تھی۔ فرانسیسی حماموں اور نیم مستور کنیزوں کی انگلیوں کے لمس سے بھی اس کو وہ آسودگی محسوس نہیں ہوئی تھی جو پتوں میں سے چھن چھن کر پانی پہ ناچتی ہوئی شعاعوں سے محسوس ہو رہی تھی۔

اس کی بھوک چمک اٹھی اور وہ بیسنی روٹی، مکھن اور لسی پہ یوں لپکا جیسے برسوں کا بھوکا تھا۔ Maxim's کی شاہانہ ضیافتوں اور دریائے سین کے جزیروں کی خاص الخاص طعامگاہوں میں حاضر باش Topless میزبانوں کی موجودگی میں بھی ایسی اشتہا کبھی نہ ہوئی تھی خاص الخاص پراسرار روشنیوں والی طعام گاہوں میں اکیلے مرد یا عورت کے لیے میزبان ساتھی بھی مہیا کیے جاتے۔ رقص گاہوں میں طرحدار حسینائیں خالی کرسیوں پر مسلط ہو جاتیں اور گاہک کو سوچنے کا موقعہ بھی نہ ملتا کہ اس کے بل میں کیا کچھ شامل ہو رہا ہے۔ لمحہ بھر کو وہ دریائے سین کی ایک خصوصی آماجگاہ Le Mystique میں پہنچ گیا۔ اور ایک دوشیزہ کو دیکھ کر ہاؤس بوٹ کی یاد پھر کسی لہر کی طرح آئی۔ آپ کی میزبان خواجہ صاحب!—— جیسے اندھیرے میں چمک سی ہوئی اس کی آنکھوں میں نوری کی داستان گزر گئی۔ اس کے بدن پہ اولیں ابھر آئیں۔

کورے پنڈے پر بان کی چینگیں پڑ گئیں۔

کسی نے کہا اس نے خفت آمیز نگاہوں سے اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں کو دیکھا۔

"ہاں بابا" اس نے خفت آمیز ہنسی ہنستے ہوئے ایک بوڑھے پنچ کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں کے گوشوں سے پھوٹتی ہوئی جھریوں کی شعاعیں اس کی کنپٹی پر پھیلی ہوتی تھیں۔ مالک کے دل میں ابھرتی ہوئی سرچ لائٹس ہوں جیسے اس کے بھید سے واقف تھا کوئی مشکل کوئی تکلیف کیا نام ہے تمہارا؟"

"اللہ دین"

"پھر تو تمہارے پاس جادو کا چراغ بھی ہو گا!"

"حاضرین میں قہقہوں کی لہر دوڑ گئی"

"کاشتکار کا ہاتھ ہی اللہ دین کا چراغ ہوتا ہے چھوٹی سرکار۔ سکھ بوڑا اور سکھ کاٹو! اللہ تم کو حیاتی دیوے، تم کو دیکھا تو یوں لگا کہ بڑی سرکار کو دیکھ لیا۔ وہی چہرہ مہرہ۔ وہی پاٹ دار آواز۔ مگر ایک بات ضرور جدا ہے؟"

"وہ کیا؟"

"ہر فصل کا موسم ہوتا ہے نا ایک ۔ تو تم سمجھو کہ گھر بسانے کی بھی عمر ہوتی ہے ایک ۔ ادھر داڑھی مچھ نکلی جوان کی اور گاؤں کی نائیں آنے لگیں۔ کوشش یہ کہ اچھا لڑکا ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اٹھارہ سال کے بھی نہیں ہوتے تھے جب سہرا بھی بندھ گیا"

"لڑکی بھی تو دیکھنی پڑتی ہے۔ کسی نے کہا۔

"شہر کی لڑکیاں تو صاحب نے دیکھی ہی ہوں گی"

"بڈھے اللہ دین کی بات سن لو ایک اجازت ہے نا سائیں"

"جی ۔ بات کرنا تو حق ہے آدمی کا۔ اچھی ہو یا بری"

"اور سننا بھی"

"بالکل"

"تو چھوٹی سرکار۔ شہر کی لاؤ یا گاؤں کی بساؤ۔ میم نہ لانا۔ اور پوچھو کیوں؟ اس خاطر کہ ہر فصل کے لیے جدا زمین ہوتی ہے۔ زبردستی لگا دو۔ پانی، کھاد، دھوپ کا بھی آڑا باڑا کر لو کوئی۔ لیکن آخر کو مرجھا جاوے گی۔ وہی مثال میم کی ہے کوہ قاف کی پری تو پریوں میں ہی رہ سکتی ہے نا"

"کوہ قاف تو ایسے قصے کہانیوں کی باتیں ہیں"

"تایا اللہ دین نے بھی تو مثال دی ہے ایک"

"ہیراں تے سوہنیاں دی ساڈے ملک وچ وی کمی نہیں کوئی۔ چھوٹی سرکار حکم تے کرے۔ اک دہاڑے وچ چار جنجاں ڈھک جاوس۔"

"نواب زادہ اور پھر گھبرو۔ سوہنا، اچا، گورا چٹا"

"اس رانجھے کے لیے ہزار ہیریں۔ راضی تو ہو"

"یہ تو مقدروں کا کھیل ہوتا ہے۔ اچھا تو اب نیچ اپنے اپنے" کام۔ پر جائیں۔ کوئی عرضی پروانہ ہو تو زبانی کہہ دو ۔ یا پھر لکھ کر دیدو۔ شام کو طوطا پارٹی کی نقل ہے۔ پھر گویا آجائے گا کھانے کے بعد اور صبح شکار ۔ کافیوں کے سوز

نے اسے بے چین کر دیا۔ تھلوں کی تپتی ریت میں سسی کی برہنہ پا جستجو میں اس کو نوری کی تلاش نظر آئی۔ تھل مارو کی غبار آلود پہنائیاں اور منجمد جھیل کا دھندلا افق منطبق ہو گئے۔ وہ کسی مجروح جانور کی طرح ٹہلنے لگا۔

مختار کار نے ہاتھ کے اشارے سے گویے کو خاموش کر دیا۔

"واہ بھئی واہ۔ سلام کرو اور اپنا انعام لو"

"کولی کس کی اور کہنے کس کے سر کار ہی کا نمک کھاتے ہیں۔ دیدار ہو گئے اپنے لیے تو یہی انعام ہے نقالوں نے اس کے ہاتھ چومے اور الٹے پاؤں اندھیروں میں تحلیل ہو گئے۔

"صاحب کو اب آرام کرنا ہے۔ صبح شکار کو جانا ہوگا"

شہباز کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر مختار نے دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔

"کوئی اور حکم سر کار؟"

"بس مہربانی ہو تمہاری"

"اللہ کو منظور ہوا تو صبح دیدار ہوں گے۔ اللہ حافظ"

"وہ دن بھر کے واقعات پر غور کرتا ہوا ٹہلنے لگا برسوں ہوئے اسی کمرے میں اسے حنا اور ہرنی کے خون کی گرم خوشبو آئی تھی۔ مختار کار آج بھی کسی کی تعریف کر رہا تھا۔ کمہاروں کی صراحی۔ دہکے ہوئے تنور سے تپتی ہوئی۔ معاً پردے کے پیتل کے چھلے جھانجروں کی طرح بجے اور سلام سائیں کی سرگوشی سی سنائی دی۔ جھالر دار لیمپ کی روشنی میں ہر شے پراسرار ہو گئی۔ زمان و مکان کے فاصلے سمٹ گئے۔ مشام جاں کو معطر کرتی ہوئی سولہ برس پہلے کی کیفیت کا ایک جھونکا اس کو سنتور کے تاروں کی طرح لرزتا ہوا گزر گیا طربوں مانند ایک کیفیت جس کی تلاش میں یورپ امریکہ اور سکینڈے نیویا کے عشرت کدوں اور خلوتوں میں تمام آرائشی فریب کاریوں اور نفسیاتی ترغیبوں کے باوجود سرابوں اور تشنگی کے سوا اسے کچھ نہ ملا تھا۔ لیکن جھالر والے لمپ کی روشنی میں پھلکاری کے عکس سے ایک دہکتا ہوا چہرہ چمکا اور پھر سب کچھ سرخ ہو گیا۔ اور ہانپتی ہوئی سنہری ہرنی کی خوشبو سے اس کے بدن کا ایک ایک مسام کھل گیا۔

وہ خدام اور جی حضوریوں کے جاگنے سے پہلے ہی۔ شور و غوغا۔ چادر اور توقعات و رواج شکنی کی سزا۔ احتساب و انعام اور ساکھ کے معاملات کی عدالت سے پہلے ہی شکار کے لیے چلا جانا چاہتا تھا۔ کونجوں کی آواز نے اس کو گھڑی کے برقی الارم سے پہلے ہی جگا دیا۔

لڑکی اس کی پائنتی لیٹی ہوئی تھی۔ شہباز کو پتہ بھی نہیں چلا تھا کہ وہ کب اٹھی اور کب لباس پہن کے لوٹ آئی تھی۔

اس نے خاموشی سے شکار کا لباس پہنا۔ اور سولہ برس پہلے کی طرح رواج سے روگردانی کے تاوان کے طور پر ہزار ہزار کے پندرہ نوٹ لیے لڑکی کی طرف بڑھا۔ رت جگے کے بعد وہ اطمینان سے سو رہی تھی، آسودہ! اس کے ہونٹوں پہ

مسکراہٹ روشنی کی لکیر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ ہونٹوں کی تکون پر دائیں جانب تل دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ ہر روز شیو کرتے وقت یہ تل اسے ولندیزی حسینہ کا جملہ یاد دلاتا تھا۔ تمہارا تل قتل کئے دے رہا ہے۔ اور بھی نہ جانے کون کون سے ملک کی حسینہ نے اس کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا تھا۔ اور وہ شبہ نہیں رہا تھا ہونٹوں سمیت حاضر ہے۔ ـــــ مگر جھالر والے لیمپ کی روشنی میں اس کا خواہش آنگیز تل ایک ایسی خوفناک حقیقت کا نشان بن کے ابھرا تھا کہ اس کو مٹانے کے لیے وہ ساری جاگیر دے سکتا تھا۔ سولہ برس پہلے کی چنتے کے گوشہ لب کا تل اس کی ہوا و ہوس کے تمام خوابوں کو منجمد جھیل کے افق پر غائب ہونے والے نوری نقطے کی طرح غرق ہو گیا اور اس کے ذہن میں کب کا بھولا ہوا مصرعہ طفرے کی طرح آویزاں ہو گیا مرا اسے کاش کہ مادر نہ زادے ۔ اس کا ہاتھ اپنے ریوالور کی طرف بڑھا لیکن پھر کچھ سوچ کے رک گیا۔ اس نے بریف کیس سے ہزار ہزار کے دس نوٹ اور نکالے اس وقت تک لڑکی بیدار ہو چکی تھی۔

"سلام سائیں"

"آہستہ!" شہباز نے اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھتے ہوئے کہا اور پھر اس کے ہاتھ میں پچیس ہزار کے نوٹ تھماتے ہوئے۔ تیرے جہیز کے لیے ہے پچیس ہزار اس وقت یہی میرے پاس ہیں ورنہ اور دیتا اور یہ پانچ ہزار مختار کے لیے ۔ تیری ماں

"میرے پیدا ہوتی ہی مر گئی تھی میں چھوٹی سی تھی جب باپ کو سانپ نے ڈس لیا ۔ مجھے میری ماسی نے پالا ہے سائیں ـــــ لیکن چادر سائیں"

"یہ چادر کا بدلہ ہے۔ تیری ماسی سمجھ جائے گی۔ اب تو چپکے سے گھر چلی جا ماسی کو بتا دینا جو کچھ میں نے کہا ہے۔ اس سے کہنا کہ پانچ ہزار مختار کے لیے ہیں "جو حکم سائیں لڑکی نے بوکھلاہٹ کے عالم میں کہا"

"اب جاؤ۔ شادی میں دیر نہ کرنا ۔ جہیز کے لالچ میں ایک سے ایک گبھرو آئے گا۔ شریف اور غریب سا دیکھ کر دو بول پڑھوا لینا" اللہ تمہیں خوش رکھے" اور پھر زیر لب "اور میرے گناہ معاف کرے۔ ترے باپ کا گناہ معاف کرے۔ اس کی آواز گلوگیر ہو گئی لڑکی پردے کے پیچھے غائب ہو گئی شہباز نے شاٹ گن اور کارتوسوں کی پیٹی اٹھائی اور دبے پاؤں باہر نکل گیا صبح کاذب کے آسمان پہ کونجوں کی قطاریں افق کی طرف رواں تھیں۔ وہ لرز گیا۔

پرندوں کی پکار کے دوبدوش دو فائر فضا میں گونجے

خادم اور شکاری جنہیں اس کے ساتھ جانا تھا آواز کی طرف لپکے۔ لیکن تالاب کے کنارے ٹھٹھک کر رہ گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ گھٹنے کے بل بیٹھ کے مرغابیوں کا نشانہ لینا چاہتا تھا لیکن زمین نم آلود تھی۔ پاؤں پھسلا اور لبلبی دب گئی۔

"کتنا شینہ جوان تھا"

"لیکن ساری عمر گھر نہ بسایا"

"وارث ہی چھوڑ جاتا کوئی اپنا"

"حویلی میں ہی دفن کریں گے۔ شاید ——— کیوں مختار صاحب،

"ہاں۔ کوئی تو نشانی باقی رہ جائے۔"

"پولیس کو بھی تو حادثے کی اطلاع دینی پڑے گی۔"

"پوسٹ مارٹم کی پخ نہ لگا دیں"

"دیکھیں مرحوم شریف آدمی تھا اور اشراف وہاں بھی تو ہوتے ہیں۔

"جھنجھٹ سے بچنے کے لیے بھی ایک آنکھ بند کر لیتے ہیں"

"مرضی کے بادشاہ ہیں جی۔ جاگیر کا معاملہ ہے جی ورنہ رپٹ ہی نہیں لکھتے"

"دیکھیں وراثت کا دعویٰ کون کرتا ہے"

"ہماری مانیں تو گاؤں والوں سے بڑا حقدار اور کون ہو گا۔ سبھی گاؤں ۔ گاؤں والوں کے نام!

زہر

آغا سہیل

آکاش نے جھک کر ساگر کو چوما تو اُس نے گدگدی محسوس کی اور جوار بھاٹا کی شکل میں جو لہریں اُٹھیں وہ دھرتی پر دور دور تک پھیل گئیں ۔ دور اُفق پر مشرق سے سورج کی کرنیں پھیلنا شروع ہوئیں ۔ دور دور تک پرندے اڑتے ہوئے نظر آئے اور تا حد نگاہ زمین پر پھول ہی پھول بکھرے ہوئے تھے اور ان پھولوں پر انسانی قدموں کے نشان تھے ۔ پس منظر سے کسانوں کی ٹولیاں اپنے ہل بیل لئے ہوئے چلی جارہی تھیں اور ہاتھوں میں پھاوڑے اور کلہاڑیاں لئے ہوئے مزدور مختلف راستوں پر رواں دواں تھے ۔ یہیں سے دور پہاڑی پر چڑھتے ہوئے پاروتی نے پھولوں کی مالا اُٹھائی اور شیوؔ کی طرف بڑھی جو آسن جمائے دھیان گیان میں مصروف تھے ۔ اوُلا پاؤں کی جھانجھر کو کئی بار بجایا ۔ پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگروؤں سے زیر شکن ارتعاش پیدا کیا تاکہ شیوؔ کا دھیان گیان ٹوٹے ، توجہ میں فرق آئے اور وہ آنکھیں کھول کر پاروتی کے روپ کو دیکھے ۔ پاروتی نے سولہ سنگھار کئے تھے اور اپنے چندر بدن کو پھولوں کی باس سے بسایا تھا خوشبو کی لٹیں نکل رہی تھیں ۔ پاؤں تحرک رہے تھے ۔ جسم ناگن کی طرح لہرا رہا تھا لیکن شیو کے دھیان گیان میں کوئی فرق نہ آیا۔

بگھی میں روپ کنول بنی ٹھنی سجی سجائی بیٹھی تھی ۔ زیورات سے آراستہ پیراستہ بہترین ریشمی لباس میں اُس کا جوان بدن ملبوس تھا ۔ سونے ، ہیرے ، موتی سے اس کا عضو عضو آراستہ تھا ۔ بال بال موتی پروئے گئے تھے ۔ دو خادمائیں اس کے ساتھ تھیں بگھی کے جھروکے بند تھے ، مگر جھروکے کی جھلملیاں کھلی تھیں چار سفید براق گھوڑے بگھی کو کھینچ رہے تھے اور اوپر دو سائیس بیٹھے تھے آگے پیچھے گھوڑے سوار پلٹنوں کی صورت میں اُس کی حفاظت پر مامور تھے اور بگھی بھاگی چلی جارہی تھی ۔ اسی بگھی میں روپ کنول کی ادھیڑ عمر نائیکہ بھی موجود تھی جو انتہائی جہاں دیدہ گھاگ اور گرگ باراں دیدہ تھی نائیکہ نے روپ کنول کو برسوں داؤں پیچ سکھائے تھے اور اُس کی جوانی پر عشوے اور غمزوں کی باڑھ رکھی تھی اُس کی اداؤں کو تیکھا بنایا تھا اور جسم کی چھب تختی کو بنائے سنوارے رکھنے کے سینکڑوں گُر بتائے تھے ۔ وہ اب بھی بار بار بہت سی سکھائی ہوئی باتوں کو دہراتی جارہی تھی ۔ جب بگھی مہتاب رائے کی کوٹھی پر پہنچی تو بیسیوں نوکروں چاکروں اور خاداماؤں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا انتہائی اہتمام و انتظام سے روپ کنول کی سواری کوٹھی کے مرکزی مقام پر روکی گئی اور اُسے اتار لیا گیا ۔ قیمتی قالینوں سے تمام راستہ مزیّن تھا ، سارے راستے پر گلاب

کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں اور خادمائیں گل پاشی بھی کر رہی تھیں اور گلاب پاشوں سے کیوڑہ گلاب بھی چھڑکا جا رہا تھا ساری فضاء معطر و معنبر تھی مہتاب رائے اپنے وسیع و عریض ہال میں اپنے درباریوں کے جلو میں بیٹھا ہوا تھا ۔ روپ کنول اپنی نائیکہ کے ہمراہ جب ہال میں پہنچی تو تمام اہل دربار سر و قامت کھڑے ہو گئے آداب و تسلیمات بجالائے ۔ کوٹھی میں یہ ہال مرکزی مقام رکھتا تھا ۔ اس کے اوپر گنبد بنا تھا ۔ گنبد میں نہایت قیمتی شیشے لگے ہوئے تھے اور بڑے بڑے فانوس جھاڑ اور کنول لٹک رہے تھے ۔ بیلجیم کے شیشے جھاڑ ، کنول ، مردنگیں اور منقش ہانڈیاں آویزاں تھے اور روشنیوں سے ہال بقعۂ نور بنا ہوا تھا ۔ پورے ہال میں قد آدم بڑی بڑی روغنی تصویریں لگی ہوئی تھیں جن میں مہتاب رائے کے اجداد نہایت عزّو وقار اور شان و شوکت سے دکھائے گئے تھے خود مہتاب رائے بھی ایک مشتین آدمی تھا ۔ اس کے درباری تو صوفوں پر فروکش تھے لیکن وہ خود صدر مقام پر ایک آرام دہ تخت پر گاؤ تکیے سے لگا بیٹھا تھا اُس کا چہرہ تانبے کی رنگت کا تھا اور اُسے پر وقار بنانے میں اُس کی بڑی بڑی مونچھیں اہم کردار ادا کرتی تھیں ۔ اُس کی پیشانی کشادہ ، ناک ستواں اور آنکھیں بڑی بڑی غلافی تھیں ۔ اُس کی بڑی بڑی گھنی مونچھوں کے نیچے اُس کے ہموار خوبصورت دانت خوب چمکتے تھے ۔ وہ قدیم طرز کے مغلیہ لباس میں ملبوس تھا اور اس کے سامنے اُس کی تلوار نیام میں دھری ہوئی تھی روپ کنول اور نائیکہ نے اُسے جھک کر تین بار سلام کیا مہتاب رائے مسکرایا اور نائیکہ سے مخاطب ہوا "روپ کنول کو سونے میں پیلا اور موتیوں میں سفید کر دوں گا ۔ اتنی دولت دوں گا کہ تمہاری سات پیڑھیاں کھاتی رہیں گی ، لیکن میرا مشن پورا کرنا پڑے گا۔" نائیکہ نے ایک بار پھر سلام کیا اور بولی "حضور! ہم تو آپ کے پرانے نمک خوار ہیں ۔ آپ کے بزرگوں کی سات پشتوں سے خدمت کرتے آ رہے ہیں جو حکم دیجئے گا لونڈی بجالائے گی ۔ ہمارا تو دین دھرم آپ کی خدمت ہے ۔"

مہتاب رائے بولا "ہمیں یقین تھا ایسا ہی ہو گا ۔"

پھر اُس نے دستک دی تمام اہلِ دربار کھڑے ہوئے مہتاب رائے نے اپنی زبان سے صرف تخلیہ کہا ، اُلٹے پاؤں چلتے ہوئے سارے اہل دربار رخصت ہو گئے پھر مہتاب رائے اُٹھا اور اُٹھ کر روپ کنول کو اپنی بغل میں لے کر اپنی آرام گاہ کی طرف چلا گیا ۔ دوسرے روز سرِ شام مہتاب رائے روپ کنول کو اپنے ہمراہ بگھی پر بٹھا کر اُسی شاہی کروفر کے ساتھ روانہ ہوا ۔ بگھی کے دروازے بند تھے صرف جھلملیاں کھلی ہوئی تھیں ۔ اُن پر ریشمی پردے پڑے تھے ۔ مہتاب رائے اور روپ کنول کے سوا بگھی کے اندر اور کوئی موجود نہ تھا ۔ مہتاب رائے نے کہا "سنو! روپ کنول مجھے کسی چیز کی کمی نہیں بھرا بھرتا ہے جلا جلتا ہے ۔ بھگوان کا دیا سب کچھ موجود ہے مگر میں نے تم کو جو کچھ رات بھر بتایا ہے تمہیں اُس پر عمل کرنا ہے اور یاد رکھنا مجھ سے بیوفائی نہ کرنا ، جب میرا کام ہو جائے گا تو وعدے کے مطابق تمہیں اتنا دوں گا کہ تمہاری سات پشت بیٹھی کھائے گی اور تمہیں کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی۔"

روپ کنول بولی "سرکار! میں وہی کروں گی جو آپ کہتے ہیں ۔ آپ بالکل تردد نہ کیجئے ۔ مرد کو اپنا گرویدہ بنانا اور

شیشے میں اتارنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ۔ مجھے بہت سے گُر معلوم ہیں ۔ جوان عورت کا جسم تو خود ایک جادو ہوتا ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ یہ جادو سر چڑھ کر بولتا ہے ۔"

مہتاب رائے نے کہا "شاباش! مجھے تم سے یہی اُمید تھی ۔"

پھر اسی شان و شکوہ کے ساتھ یہ بگھی ایک اور کوٹھی میں داخل ہوئی جہاں انگریز پہرے دار موجود تھے اور مہتاب رائے روپ کنول کو اپنے جلو میں لئے ہوئے اندر داخل ہوا ، جہاں ایک نوجوان انگریز ایک خوبصورت ڈرائینگ روم میں چند مقامی دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا میخواری کا شغل انجام دے رہا تھا ۔ مہتاب رائے نے بڑھ کر اُس سے مصافحہ کیا اور کہا "حضور یہ ایک نادر ہیرا آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ۔ اسے اپنی کنیزی میں قبول فرمائیے ۔"

نوجوان انگریز اپنی جگہ سے اٹھا اور روپ کنول کو اپنی بانہوں میں بھر کر ایک بھرپور بوسہ لیا ، اپنے پہلو میں بٹھایا اور اپنے ہاتھ سے ایک جام اُسے پیش کیا ۔ تمام لوگ ہنسنے لگے مہتاب رائے قہقہے لگانے لگا اور پھر معلوم نہیں کب تک یہ محفل جمی رہی ۔

کچھ روز کے بعد مہتاب رائے کی اس حویلی میں ادھیڑ عمر کی نائیکہ کے سامنے اشرفیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے ۔ بہت سے ہیرے جواہرات رکھے ہوئے تھے ۔ نائیکہ نے کہا "اگر تخلیہ ہو تو کچھ عرض کروں ۔"

مہتاب رائے نے تخلیے کا حکم دیا اور بولا "اب کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

اس نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ سچی سچی باتیں زبان پر لاؤں ۔"

مہتاب رائے بولا "جان بخشی کی جاتی ہے ۔ بتاؤ کیا کہتی ہو ؟"

نائیکہ بولی "دولت تو آپ کے پاس بے شمار ہے ۔ بھگوان کا دیا ہمارے پاس بھی بہت کچھ موجود ہے کہ آپ کے بزرگوں سے ہم کو ملتا رہا ، لیکن یہ دولت آپ کے پاس بھی کہیں سے آتی ہے ۔ آج مجھے یہ بتائیے کہ یہ دولت کہاں سے آتی ہے ؟"

مہتاب رائے مسکرایا اور بولا "چندن بائی تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے ؟"

چندن بائی بولی "حضور! آم بہت کھائے ، اب پیڑ بھی گننا چاہتی ہوں ۔

مہتاب رائے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا "کوئی اور یہ بات کہتا تو اُسے ضرور سزا دیتا کہ مجھے بھی سات خون معاف ہیں ، لیکن تم سے قول ہارا ہوں ۔ تو سُنو چندن بائی! اِس ہال میں جتنی تصویریں تم دیکھ رہی ہو یہ سب میرے بزرگوں کی تصویریں ہیں میرے باپ میرے دادا میرے پردادا میرے سکڑ دادا میرے لکڑ دادا" اور پھر خود ہی مسکرایا "یہ جتنے دادا ہیں اِن سب کا ایک ہی کاروبار تھا وہی کاروبار میں بھی سنبھالے ہوئے ہوں اور اسی گدی پر میں بیٹھا ہوا ہوں ۔ سُنو چندن بائی! دولت دولت کو کھینچتی ہے ۔ یہ گُر جیسے مجھے معلوم ہے میرے باپ کو بھی معلوم تھا میرے

اجداد کے زمانوں میں حکومتیں بدلتی رہیں کبھی ہندو راجہ مہاراجہ ہوئے کبھی مسلمان آئے آج انگریز حکمران ہے کل کوئی اور ہو گا، مگر ہم وہیں رہیں گے اور اسی طرح دولت سے کھیلتے رہیں گے۔ دیکھو چندن بائی ہمارے تمہارے زمانے میں انگریزوں کی حکومت ہے اور یاد رکھو کہ سخت سے سخت حکمران بھی دولت اور عورت دونوں کے معاملے میں اندھا ہوتا ہے اور جب ہم اُسے اندھا کر دیتے ہیں تو جتنی چاہتے ہیں دولت سمیٹ لیتے ہیں ۔ جب یارک شائر سے ایک نوجوان انگریز اپنی اکیڈمی میں حکمرانی کی تربیت حاصل کرنے جاتا ہے تو اُسی وقت وہ ہمارا شکار بن جاتا ہے ہمارے پاس اُس کے سارے کوائف موجود ہوتے ہیں اور جب وہ کلکتے کی بندرگاہ پر اترتا ہے تو ہم اُسے پوری طرح اپنے قبضے میں کر چکے ہوتے ہیں اور وہ ہمارے چنگل میں پھنس چکا ہوتا ہے ۔ اُس کے لئے نوکر چاکر ، کوٹھی ، فرنیچر ، کھانا پینا ، سیر وشکار اُس کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی سب ضرورتیں ہماری جیب سے پوری ہوتی ہیں اور جب وہ یہاں سے رخصت ہو کر یا ریٹائر ہو کر اپنے وطن واپس جاتا ہے تو تنخواہ کی ایک ایک پینی اُس کے بینک میں محفوظ ہوتی ہے ۔ اُس کے کُل اخراجات ہم پورے کرتے ہیں اور چندن بائی اگر ہم اُس پر دس لگاتے ہیں تو سو اسی کے ذریعے سے وصول کر لیتے ہیں ۔" یہ کہہ کر مہتاب رائے نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیا"کِتنے آئے اور چلے گئے کتنے آئیں گے اور چلے جائیں گے مگر سب ہماری مٹھی میں ہوں گے ۔"

کندن رائے بار بار اپنے جہاز کے عرشے پر ٹہلتا تھا اور پھر اندر وسیع و عریض ہال میں چلا جاتا تھا جہاں اُس کے بہت سے ساتھی مغربی موسیقی کی دھن میں تھرکتے نظر آتے تھے جام پر جام لنڈھاتے تھے اور اپنی ڈسکو ڈانسر ساتھیوں کے ہمراہ لہریں لیتے ہوئے دور دور تک لہراتے اور تھرکتے چلے جاتے تھے ۔ کندن رائے بہت مضطرب تھا ۔ یکایک اُسے کسی خادم نے نہایت مؤدب طریقے سے سرگوشی کے انداز میں کچھ بتایا تو وہ فوراً قریب کے کیبن میں چلا گیا یہاں اُس نے ٹیلی فون پر کچھ بات کی ، ٹیلی فون رکھا ، گھڑی کو دو تین مرتبہ دیکھا اور پھر ہال میں نمودار ہوا اور تمام لوگوں پر ایک الوداعی نظر ڈالتے ہوئے عرشے پر پہنچ گیا ۔ جہاں چند لمحوں کے بعد ایک ہیلی کاپٹر نمودار ہوا اور جہاز کے عرشے پر اترا ۔ کندن رائے اس پر جا بیٹھا اور ہیلی کاپٹر آن واحد میں ہانگ کانگ کے ایئر پورٹ پر پہنچ گیا ، جہاں کندن رائے کا ذاتی جہاز موجود تھا ۔ کچھ ہی دیر میں کندن رائے اپنے مختصر سے عملے کے ہمراہ نامعلوم سمت کی طرف پرواز کر گیا اور چند منٹ کے بعد ایک بڑے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترا ۔ جہاں اپنے کاغذات کی پڑتال کرا کے ایک اور بھی بڑے مسافر طیارے میں سوار ہو گیا کلب کلاس میں اُس کے اردگرد جہاز کا عملہ اُس کی خدمت بجا لانے لگا ۔ کلب کلاس کے وی ۔ آئی ۔ پیز کو بھی یہ محسوس ہوا کہ وہ کوئی وی ۔ آئی ۔ پیز کا وی ۔ آئی ۔ پی ہے ۔ چند گھنٹوں کی پرواز کے بعد

وہ ایک اور بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترا جہاں اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور پھر وہاں سے بہت سی قیمتی گاڑیوں کے جلو میں بیٹھ کر وہ نامعلوم سمت کی طرف چلا گیا کاروں کے قافلے میں وہ ایک ویران مقام پر لیکن سمندر کے کنارے بنے ہوئے وسیع و عریض محل نما مکان میں داخل ہوا اُس کے جلو میں چلنے والی گاڑیاں اور اُن میں بیٹھا ہوا عملہ مکان کے اندر داخل ہوتے ہی کہیں غائب ہو گیا ۔ اب کندن رانے جس راہداری سے گزرتا وہاں کنیزیں اور غلام سرو قد کھڑے ہو کر اُس کی تعظیم کرتے اس کے سیکرٹری اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور وہ راہداریوں سے ہوتا ہوا مختلف لفٹس سے گزرتا ہوا ایک وسیع و عریض ہال میں پہنچ گیا جہاں پہلے ہی سے لوگ اُس کے منتظر تھے لیکن وہ سبھوں کو نظر انداز کرتا اور نگاہ غلط انداز سے دیکھتا ہوا مختلف کمروں اور راہداریوں سے گزرتا ہوا اپنی آرام گاہ میں داخل ہوا ۔ عملے کو باہر رہنے کی تاکید کی اور اپنے غسل خانے میں داخل ہو گیا جہاں اُس نے ایک خفیہ بٹن دبایا تو واش روم ایک لفٹ میں بدل گیا اور لفٹ نیچے تہہ خانے میں اترنے لگی ۔ جب وہ تہہ خانے میں داخل ہوا تو بزر خود بخود بجنے لگے پھر وہ ایک ایسے ہال میں تبدیل ہو گیا جس کی شہ نشین پر ایک بہت بڑا بلٹ پروف شیشہ چڑھا ہوا تھا اور اس شیشے میں یہ خوبی تھی کہ آپ ہال میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو دیکھ سکتے تھے لیکن آپ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا کندن رانے نے ایک اور بٹن دبایا تو پورا ہال بقعۂ نور بن گیا اور اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے ایک آدمی شیشے کے قریب آیا اور مائیک پر جس کی آواز کندن رانے اندر سن سکتا تھا اُس نے کہا "بوس ہم آپ کو سلام کرتے ہیں"

کندن رانے نے کہا "سلام قبول ہوا اب کام کی بات کرو ۔"

اُس آدمی نے طویل مستطیل میز کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف اشارہ کیا اور اُن کے نام بتانا شروع کئے "بوس یہ سب آپ کے وفادار غلام ہیں اور اپنا کام بڑی خوبی سے انجام دے رہے ہیں ۔ یہ نمبر ون ہے ۔"

نمبر ایک نے کھڑے ہو کر سر جھکا کر بوس کی تعظیم کی ۔

اس نے دنیا کے کونے کونے میں آپ کا سفید مال پہنچایا اور اُسے میلی دولت میں تبدیل کر دیا ۔ آپ کے خزانے میں کروڑوں ڈالر جمع ہو گئے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی ۔ کسی ملک کا قانون حرکت میں نہ آسکا ۔"

کندن رانے نے کہا "گڈ ۔ نمبر ٹو ۔"

اور بولنے والے نے بتایا "نمبر ٹو مشن کے مطابق ٹھیک ٹھاک کام کر رہا ہے ۔ شہر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا جمی جمائی زندگی کو تہہ و بالا کر دیا ۔ لوگوں میں خوف و ہراس پھیلا دیا اور اتنی صفائی سے یہ کام انجام دیا کہ کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی ۔"

"ویری گڈ" کندن بولا "نمبر تھری"

اور بتانے والے نے بتایا "نمبر تھری شہر شہر پھرتا ہے اور بڑے بااثر لوگوں سے دوستی کرتا ہے ۔ ان کے ذہنوں کو پراگندہ کر دیتا ہے ان کی سیاست کو بھٹکا دیتا ہے ۔ ملک اور قوم سے ان کی توجہ ہٹا دیتا ہے اور ایک ایسی

قوت کا یقین دلاتا ہے جس کی آخری سمت ہماری طرف آتی ہے ۔"

کندن نے کہا "یہ مرحلہ ابھی کمزور ہے اور کوشش کرو۔"

نمبر تھری بولا "یس سر! میں کوشش کروں گا ۔"

"نمبر فور ۔"

نمبر تین بیٹھ گیا ۔ نمبر چار اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے بارے میں بتانے والے نے بتایا نمبر فور بڑے بڑے تاجروں اور دولت مندوں میں اُٹھتا بیٹھتا ہے اور اُن کو بتاتا ہے کہ اِن کے خطے کے ملکوں میں زرعی معاشرہ جو صنعت کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ اس قدر دولت نہیں کما سکتا جس قدر ہماری سفید مایا کو پیلا بنانے سے نہیں بنا سکتا ہے ۔ اس لئے صنعتیں لگانا بے کار ہے ۔ باہر کی صنعتوں سے فائدہ اٹھاؤ اور باہر کے بینکوں میں ڈالر ، پیٹرو ڈالر اور ین کی صورت میں زرمبادلہ جمع کرو۔"

کندن نے کہا "ٹھیک ہے اِس کام کو جاری رکھو نیکسٹ ۔"

نمبر پانچ کھڑا ہوا اور بتانے والے نے بتایا "یہ نمبر فائیو ہے اِس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بدامنی پھیلائے ۔ طلباء تنظیموں کو اسلحہ فراہم کرے اور تعلیم و تربیت کی تمام درسگاہوں کو معطل رکھے ۔"

کندن نے کہا "یہ بھی ٹھیک ہے ، لیکن اسلحہ اور فراہم کرو اور بے چینی اور پھیلاؤ نیکسٹ ۔"

بتانے والے نے بتایا "حضور ! یہ نمبر چھ ہے اور بڑا چھٹا ہوا ہے ۔ اس نے کسانوں اور مزدوروں کی ٹریڈ یونینز کے اندر ایسا زہر بھرا ہے کہ اپنے اصل کام سے اُن کی توجہ ہٹی رہتی ہے اور تمام سال وہ ہڑتالوں میں لگے رہتے ہیں اور ایسے ایسے مطالبات پیش کرتے ہیں جو کبھی پورے ہی نہیں ہو سکتے ٹریڈ یونین کے لیڈروں کو ایسی تربیت دی جاتی ہے اور اتنی دولت فراہم کر دی جاتی ہے کہ وہ قومی اور ملکی مفادات کی طرف آنے ہی نہیں پاتے ، اصل میں یہ سوڈو لیڈر ہوتے ہیں اور اصل لیڈر کو سامنے آنے ہی نہیں دیتے ۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے ۔ نیکسٹ ۔"

بتانے والے نے بتایا "سات آٹھ اور نو اِس وقت حاضر نہیں ہیں تینوں ملک کے باہر ہیں لیکن اپنے اپنے مشن سے لگے ہوئے ہیں ۔ دس گیارہ اور بارہ اس وقت شہر میں اپنے اپنے مشن پر کام کر رہے ہیں ۔"

کندن نے کہا "ٹھیک ہے ہر ایک کو دس دس لاکھ روپیہ بونس ادا کر دیا جائے ۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا بتیاں بجھ گئیں اور دوبارہ جب وہ اپنے خفیہ تہہ خانے سے واٹر روم میں برآمد ہوا اور آرام گاہ میں پہنچا تو یہ دیکھ کر اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ وہاں اس کی خاص آرام گاہ میں روزی موجود تھی ۔ اسے دیکھ کر کندن نے کہا "ارے ! تم کو تو اِس وقت پیرس میں ہونا چاہیے تھا ۔"

روزی بولی "یس ڈیر میں نے اپنا مشن پورا کر لیا ہے ۔"

اور تھکی تھکی سی کروٹ بدلتے ہوئے دوسری طرف رُخ کرکے لیٹ گئی کندن اُس پر جھکا اور اُس کے قریب لیٹتے ہوئے بولا "ساری دنیامیں سیر کرتی پھرتی ہو۔ کروڑوں میں کھیلتی ہو جس ملک میں چاہو جتنی رقم درکار ہو خرچ کرتی ہو سُپر فائیو اسٹارز میں قیام کرتی ہو ۔ پھر یہ تھکن کیسی ؟"

روزی بولی "دیکھو ڈیر جس طرح کا کاروبار تم مجھ سے کراتے ہو اُس میں جسم تو چور چور ہو جاتا ہے دل اور دماغ پر بھی بہت دباؤ رہتا ہے اور پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہر ملک کے کتنے بھیڑیے مجھے کس بُری طرح بھنبھوڑتے ہیں کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ میں صرف گوشت کا ایک لوتھڑا ہوں جسے مختلف قسم کے جانوروں کے سامنے پھینک دیا جاتا ہے۔"

کندن بولا "ہاں ! یہ تو ہے ۔ پر اب کیا کیا جائے چلن تو بدل نہیں سکتا ۔ ارے ہاں ! وہ مووی (Movie) تو تم کو میں نے دکھائی نہیں جس کا تم سے وعدہ کیا تھا ۔"

روزی ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی "کیا سچ مچ وہ ویڈیو تمہارے پاس ہے؟"

کندن بولا "ہاں ہاں! میں نے منگوائی ہے"

اور یہ کہہ کر وی ۔ سی ۔ آر میں ایک مووی ڈال کر ٹیلی ویژن کو اون کر دیا ۔ یہ محض تصویریں تھیں جو حرکت نہیں کر سکتی تھیں ٹیلی ویژن پر اولاً ایک شاندار بوڑھے آدمی کی گجراتی لباس میں تصویر ظاہر ہوئی جو محض مؤقلم کا نتیجہ تھی ۔

کندن بولا "دیکھو یہ ہیں میرے گریٹ گرینڈ فادر انہیں نے بہت چھوٹے پیمانے پر یہ کام شروع کیا تھا ۔"

اس کے بعد ایک دوسری تصویر ایک عورت کی نمودار ہوئی وہ بھی گجراتی لباس میں ملبوس تھی اور سر سے پاؤں تک زیورات میں لدی پھندی تھی ۔

"اور جانتی ہو یہ کون ہے ؟"

روزی نے نفی میں گردن ہلائی ۔

"یہ تمہاری نانی کی پرنانی کی نانی ہے اور جو کام آج تم انجام دے رہی ہو اپنے زمانے میں یہی کام یہ خاتون بھی انجام دیتی تھیں ۔"

پھر ایک مرد کی تصویر نمودار ہوئی جو مغلیہ لباس میں ملبوس تھا ۔ کندن نے کہا "اور یہ پھر ہمارے ایک بزرگ ہیں ۔"

اس کے بعد ایک خاتون کی تصویر نظر آئی وہ بھی مغلیہ لباس میں ملبوس تھیں اور زیورات میں لدی پھندی تھیں ۔ اس نے کہا "دیکھو یہ بھی تمہاری پرنانی ہیں اور یہ بھی یہی کام کرتی تھیں جو تم آج انجام دیتی ہو ۔"

ایک تصویر پھر نمودار ہوئی یہ ایک شاندار مونچھوں والے آدمی کی تصویر تھی ۔ کندن نے کہا "یہ ہیں میرے دادا مہتاب رائے ۔" اور اسی کے ساتھ ایک اور خوبصورت عورت کی تصویر سامنے آئی ۔ کندن بولا "یہ بھی تمہاری ایک پرنانی ہے روپ کنول یہ بھی اپنے زمانے میں ایک ماہر رقاصہ تھیں اور ایک ہنر مند خاتون ۔"

اِسی طرح دو تین تصویروں کے بعد کندن رائے نظر آیا اور اُس کے ساتھ ہی روزی ۔ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر تھے اور ہم آغوش کندن رائے بولا "میری جان یہ ہمارا تمہارا اجدی پشتی کاروبار ہے ۔ اِس وقت میرے سامنے ایک بہت بڑا ٹارگٹ ہے ۔ جانتی ہو کیا ؟"

روزی نے نفی میں گردن ہلائی ۔

کندن بولا "تمہیں تو معلوم ہے ہانگ کانگ میں میرے کتنے جہاز چلتے ہیں ۔ میرے کتنے اڈّے ہیں ، جوئے خانے ہیں اور کتنے کلبز ہیں جہاں سے بیٹھے بیٹھے میں ساری دنیا کی منڈیوں پر نگاہ رکھتا ہوں اور اپنے کاروبار کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتا ہوں ۔ میری طرح اور لوگ بھی ہیں جو اسی پیشے سے وابستہ ہیں اور ہم سب یہ سوچ رہے ہیں کہ ۱۹۹۷ء میں جب یہ فری پورٹ ہمارے قبضے سے نکل کر ایک ایسے ملک کے حوالے کر دیا جائے گا جہاں کے قوانین بہت سخت ہیں تو ہم کیا کریں گے اس لئے ہم ایک ایسی بندرگاہ کی تلاش میں ہیں جہاں ہم اپنا کاروبار پھیلا سکیں اِس کے لئے گنجائش پیدا کر سکیں ، حالات بنا سکیں اور اُن ملکوں کی تمام قوتوں کو مسخر کر کے اپنے اشاروں پر نچا سکیں تاکہ ہمارا کاروبار چلے ، پھلے پھولے ہمارے جہاز ، ہمارے کلب ، جوئے خانے قحبہ خانے اِسی طرح چلتے رہیں اور ہم دولت جمع کرتے رہیں ڈیئر ذرا سوچو نئی جگہ ہے اور نئی جگہ پر کاروبار پھیلانے میں حالات کو اپنے قابو میں لینے کے لئے کچھ تو وقت صرف ہوتا ہے ۔"

دُور مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا اور اُفق پر شفق کی سُرخی نمایاں تھی ۔ تمام راستوں پر پرندوں کے کٹے ہوئے پر پڑے تھے اور تا بہ حدِ نگاہ زمین خون سے اٹی پڑی تھی جگہ جگہ پر ٹوٹے ہوئے پھاوڑوں کلہاڑیوں اور ہلوں کے پھل پڑے ہوئے تھے ۔ خون کے دھبّوں میں انسانوں کے پاؤں کے نشان دور دور تک پھیلے ہوئے تھے ۔ اور شیوؔ کا مجسمہ اپنی جگہ سے غائب تھا پاروتی بھی موجود نہ تھی ۔

اَپنا شہر اَپنے لوگ

احمد شریف

میں اپنے گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا دیکھ کر کانپ اٹھا ۔ وہ دروازہ ہر وقت بند رہتا تھا ۔ میں نے ڈرتے ڈرتے نیم تاریک ڈیوڑھی میں قدم رکھا اور دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی ۔ پھر دبے پاؤں صحن میں آگیا ۔ گھر کا سارا قیمتی سامان بے دردی سے توڑ پھوڑ کر چاروں طرف پھینکا ہوا تھا ۔ سناٹا جھائیں جھائیں کر رہا تھا ۔ میں لڑکھڑاتا ہوا صحن سے گزر کر نچلے زینے پر آبیٹھا ۔ اتنے میں ناصر نے دوسری منزل کے دروازے میں ذرا سی جھری کر کے پوچھا ۔

"کون ہے ؟"

میں نے کہا

"میں ہوں"

وہ بھاگ کر زینے کے سامنے آہنی جنگلے کے قریب آگیا اور بے تابی سے بولا ۔

"دادا ابو جلدی اوپر آجائیں"

میں نے کہا

"دم لے کر آتا ہوں"

میں نے نڈھال ہو کر دیوار سے ٹیک لگالی ۔

جہاں ہم رہتے تھے وہ مسلمانوں کا محلہ تھا ۔ اس سے اگلا محلہ ، اس سے اگلا محلہ اور اس سے بھی اگلا محلہ مسلمانوں کا تھا ۔ پھر بھی سارے شہر میں قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا ۔ اپنے ہی شہر میں ایسی بے بسی تھی کہ گھر سے کام پر جانے والا سارا دن گھر والوں کی فکر میں گھلتا رہتا اور گھر والے دن بھر کام پر جانے والے کی سلامتی سے واپسی کی دعائیں مانگتے رہتے تھے ۔

میں نے سر سے رومال اتار کر چہرے کا پسینہ پونچھا یکبارگی میرا دل بھر آیا اور میں ڈبکی سی کھا کر پرانے محلے میں جانکلا ۔

ایک دن میں پرانے محلے کے گھر میں داخل ہوا تو صحن چلچلاتی دھوپ سے لبالب بھرا ہوا تھا ۔ اماں شاید ٹھنڈی کوٹھڑی میں سو رہی تھی ۔ ابا شہر آڑھت کی دکان پر گئے ہوئے تھے ۔ میں صحن سے گزر کر دو طرفہ زینے کی درمیانی جگہ سائے میں آبیٹھا ۔ میرے کپڑے تار تار ہو رہے تھے ۔ سارے جسم پر خراشوں میں مرچیں سی لگی ہوئی تھیں ۔ میرا سارا وجود مٹی اور دھول میں لت پت تھا ۔

جہاں ہم رہے تھے اس محلے کا نام کوچہ غمان خان تھا ۔ بستی کی ساری گلیاں چوک بندہ میں آکر کھلتی تھیں ۔ چوک کے وسط میں ٹھنڈے پانی کا کنواں تھا ۔ وہاں ماشکی صبح شام پانی بھرتے تھے ۔ کنویں کے ایک طرف رائے صاحب رام چند کا گھر تھا ۔ اس کے برابر مولوی سراج الدین کی حویلی تھی ۔ کنویں کے پرلی طرف باوا گوبند سنگھ کا دیوان خانہ تھا ۔ اس کے آگے پیپل اور نیم کے درختوں کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے ہوئے چوہدری فضل الٰہی ، استاد منشی رام اور پربھو دیال جوتشی کے مکان تھے ۔ چوک میں گھنے پیپل کے نیچے سارا دن چوپٹ ، شطرنج اور بارہ ٹہنی کھیلنے والوں کا جمگھٹا رہتا تھا ۔ مولوی سراج الدین اور استاد منشی رام دور دور تک شطرنج کے ماہر مانے جاتے تھے ۔ چوہدری فضل الٰہی ، رائے صاحب رام چند ، باوا گوبند سنگھ اور پربھو دیال چوپٹ کی منڈلی میں شامل تھے ۔ ماشکی اور پھیری والے تھوڑا سا وقت نکال کر زمین پر کوئلے سے دائرے بناتے اور بارہ ٹہنی سے دل بہلا لیتے تھے ۔

اس بستی کی ساری گلیوں میں رام گلی سدا بہار گلی تھی ۔ اس میں ایک چھوٹا سا مندر تھا ۔ اس سے متصل قد آدم چار دیواری کے اندر ہندوؤں کا متبرک کنواں تھا ۔ فجر کی اذان سے پہلے متبرک کنویں پر نہا کر مندر میں میرا بائی کے بھجن گانے والیوں کا تانتا بندھ جاتا تھا ۔ اُدھر آدھی رات کے بعد کروٹیں بدل بدل کر وقت گزارنے والے ذرا سی آہٹ پاکر گرمی کے بہانے گلی میں آبیٹھتے تھے ۔

ایک شام میں رام گلی سے گزرا تو شانتی اپنے ماموں چونی لال کے گھر کے سامنے گلی میں بندھی گائے کے پاس کھڑی تھی ۔ اس کے گھر والے بستی سے تین کوس دور دیپال پور میں کولہو چلاتے تھے اور وہ بستی اور دیپال پور کے راستے میں آتے جاتے جوان ہوئی تھی ۔ اس نے لہنگے کے ساتھ ڈھلکے ہوئے گریبان والی پھولدار کرتی پہنی ہوئی تھی ۔ میں اسے دیکھ کر مسکرایا ۔ جواب میں وہ بھی مسکرا دی ۔ میں نے اس کے قریب سے گزرتے وقت یونہی پھول کو چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے دونوں پاؤں پر پیچھے کی طرف اچھلتے ہوئے آواز دی ۔

"ماموں"

میں اس کی کرتی میں مچی ہلچل سے نظریں ہٹا کر جلدی جلدی نکر پر لگی کمیٹی کی لالٹین کے نیچے اندھیرے میں آکر کھڑا ہو گیا ۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا ۔ چونی لال نے دروازے کے اوپر چھوٹی سی کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا ۔

"کیا ہے؟"

شانتی بولی ۔

"گائے نے چارہ گرا دیا"

چونی لال چڑ کر بولا ۔

"اٹھا کر دوسرے میں ڈال دے ۔"

اور سر اندر کر کے غائب ہو گیا ۔ میں نے اندر ہی اندر کھول کر شانتی کو دل ہی دل میں گالی دی ۔

"حرامزادی"

اور سر جھکا کر معصوم صورت بنانے دبے پاؤں واپس ہولیا ۔ شانتی کے قریب سے گزرتے وقت میں نے جھپٹا مارااور ایک کلی کو چٹکی میں پکڑ کر زور سے مروڑ دیا ۔ اس نے چلاکر آواز دی ۔

"ماموں"

چونی لال جھپٹ کر کھڑکی کی طرف آیا ۔ بے دھیانی میں اس کا سر چوکھٹ سے ٹکرا گیا ۔ اس نے سر کو سہلاتے ہوئے مردہ سی آواز میں پوچھا ——

"کیا ہے"

شانتی دہاڑ مار کر روئی اور کہنے لگی ۔

"کچھ لڑ گیا ماموں"

چونی لال نے اندر جاتے ہوئے کہا ۔

"اوپر آجا ۔"

شانتی نے آنسوؤں سے لبریز لال آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور اندر چلی گئی ۔ میں ٹہلتا ٹہلتا گھر کی طرف ہولیا ۔

شانتی تھی ہی ایسی ——— روز روز شعلے بھڑکانے اور جلتی پر تیل ڈال کر کنارہ کرنے والی ——— تنگ آکر میں نے سوچا اسے چپکے سے کلاوے میں بھروں اور متبرک کنوئیں کی چاردیواری میں لے جاکر اندر سے کنڈی بند کرلوں ۔ پھر جو ہو سو ہو ——— اچانک میری نظر رام گلی میں جل مرنے والے پروانوں کے ہجوم پر پڑی ۔ میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا ۔ اور رام گلی کی طرف جانے سے کترانے لگا ۔

کئی روز چپ چاپ گزر گئے ۔

اس روز میں رام گلی کی طرف سے ہو کر بڑے بازار جارہا تھا کہ سدھو سے آمنا سامنا ہوگیا ——— شہر میں ایک ٹولہ تھا جو مسلمانوں کو ہندو بنانے یا دھکیل کر سمندر میں غرق کرنے کا حامی تھا ——— کچھ روز پہلے سدھو نے خوبصورت گھنگھریالے بال کٹوا کر لمبی چوٹی چھوڑ دی تھی اور ہاتھ میں لمبا ڈنڈا اٹھائے بستی میں دندناتا پھرتا تھا ۔ ہاتھ پاؤں کا مضبوط تھا اس لئے بستی کے لڑکے اس سے کتراتے تھے ۔ اس نے ڈنڈا میرے راستے میں حائل کر کے تحکمانہ لہجے میں کہا ۔

"ادھر مت آیا کر"

میں نے پوچھا ۔

"کیوں؟"

اس نے ایڑیاں اونچی کر کے اپنا قد بلند کرتے ہوئے کہا

"مجھے سب معلوم ہے"
میں نے تحمل سے پھر پوچھا۔
"کیا؟"
کہنے لگا
"تو شانتی کو چھیڑتا ہے"
جب چھیڑتا تھا تو روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا۔ اب چھیڑنے کا کوئی ارادہ نہ تھا تو خدائی فوجدار راستہ روکے کھڑا تھا۔ میں نے جل کر پوچھا۔ "شانتی تیری بہن لگتی ہے؟"
اس نے یکدم پیچھے ہٹ کر ڈنڈا اتنے زور سے گھمایا کہ اگر میں بروقت بیٹھ نہ جاتا تو میری کھوپڑی پاش پاش ہو جاتی۔ میں نے بیٹھتے ہی اس کا ایک پیر پکڑ کر اتنی زور سے کھینچا کہ وہ دھڑام سے سر کے بل فرش پر آرہا۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر لڑھکتا ہوا نالی میں جا گرا۔ گلی میں یکے بعد دیگرے دروازے کھلنے اور لوگوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے جھٹکا مارا اور اسے رام گلی سے کھینچ کر چوک میں لے آیا۔ چوک میں موجود لوگوں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال لیا۔
رام گلی سے چوک تک گھسیٹنے کی وجہ سے سدھو کا سر کئی بار پکے فرش سے ٹکرایا تھا۔ اس نے لچکا کر گرفت سے آزاد اپنی ٹانگ پیچھے کھینچ کر زور سے میرے منہ پر مارنا چاہی۔ میں نے پھرتی سے پلٹ کر اس کی لمبی چوٹی پکڑ لی۔ زور زور سے دو تین جھٹکے دیے اور بالآخر اس کا سر پیپل کے تنے سے ٹکرا کر بودی ہاتھ سے چھوڑ دی۔ وہ چکرا کر دھڑام سے زمین پر آرہا۔ میں ہاتھ جھاڑ کر ایک طرف ہو گیا ـــــ لوگ تالیاں بجانے لگے
سدھو بے ہوش پڑا تھا۔ رائے صاحب رام چند نے بھری ہوئی مشک لے کر پاس گزرتے ماشکی سے کہا۔
"چھینٹا مار اس پر"
ماشکی نے مشک کا منہ کھول دیا۔ سدھو تربتر ہو کر ہوش میں آگیا۔ باوا گوبند سنگھ اس کی طرف اشارہ کر کے بولا۔
"فتنہ ہے۔ سو جوتے مارو سالے کے"
سدھو جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔
"دیکھ لونگا"
پربھو دیال جوتشی بولا۔
"کیا دیکھ لے گا۔ چھوکرے نے ٹانگ کے نیچے سے نکال دیا"
استاد منشی رام مجمع سے نکل کر آگے آگیا اور سدھو کا بازو پکڑ کر بولا۔

"آج ہی فیصلہ کر دو اس کا۔"

باوا گوبند سنگھ بولا ۔

"میرے دیوان خانے لے چلو"

اس سے پہلے کہ کوئی آدمی سدھو کو ہاتھ لگاتا مولوی سراج الدین اور چوہدری فضل الٰہی ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھے ۔ مولوی صاحب بولے ۔ "جانے دو ۔ اپنا بچہ ہے" پھر انھوں نے میری طرف مڑ کر بلند آواز میں گھرکی دی "تو بھی اپنی کھال میں رہا کر"

میں نے گردن جھکالی ۔ اتنے میں ادھر سے بستی کے رئیس عبدالرحیم دولتی کی ٹم ٹم گزری ۔ پوچھنے لگے ۔

"کیا ماجرا ہے"

اور رائے صاحب رام چند کی زبانی سارا ماجرا سن کر سدھو کو اپنے ساتھ ٹم ٹم میں بٹھا کر لے گئے ۔ میں چپ چاپ گھر کی طرف چلا آیا ۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا سدھو سے ہاتھا پائی کے بعد جب میں گھر آیا تو میرے سارے جسم پر خراشوں میں مرچیں سی لگی ہوئی تھیں ۔ میں نے پسینے سے تر کرتہ کندھوں پر سے دونوں چٹکیوں میں پکڑ کر جسم سے الگ کیا ۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک نرم نرم جھونکا میری کمر پر سے اٹکھیلیاں کرتا گزر گیا ۔ اتنے میں پڑوس کے مکان سے آواز آئی ۔

"اونہہ اونہہ مجھ سے نہیں جایا جاتا سیاپا۔"

ہمارے اور پڑوس کے مکان کی درمیانی کچی دیوار میں کئی سوراخ تھے ۔ وہ مکان کئی روز سے خالی پڑا تھا ۔ میں شاید شانتی کے خیالوں میں زیادہ ہی غرق تھا کہ پڑوسیوں کے آنے سے لاعلم رہا ۔ میں نے ایک سوراخ سے جھانک کر دیکھا ۔ پرلی طرف صحن میں ایک بوٹا سے قد والی لڑکی دھلے ہوئے کپڑوں سے لدی پرات کے پاس کھڑی تھی ۔ اس کی ماں نے پچکارا ۔

"بچ جا میری لاڈو ۔ شاباش ۔"

لاڈو نے بادل نخواستہ پرات اٹھائی اور زینے کی طرف چل دی ۔ میں بھی دبے قدموں دو دو زینے پھلانگتا چھت پر جا پہنچا ۔ وہ اوپر آکر پرلی دیوار پر کپڑے پھیلانے لگی ۔ میں نے ہاتھوں کے کٹورے میں ٹھوڑی جما کر بغور نظارہ کرنے کے لیے دونوں کہنیاں دیوار پر ٹکائیں ۔ تپی ہوئی اینٹوں سے چھوتے ہی میرے بازو جھلس گئے میں کراہ کر پیچھے ہٹ گیا ۔ وہ میری بے بسی پر کھلکھلا کر ہنسی اور شہ نشین پر کپڑے پھیلانے لگی ۔ میں نے حواسوں میں آنے کے لئے جھلسی ہوئی کہنیوں پر ہاتھ پھیرا ۔ پھر یوں جیسے انجن بھاپ چھوڑ رہا ہو منہ سے آواز نکالی ۔

"شی"

اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا ۔ میں نے ہاتھ سے اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا وہ معمول کے مطابق

کپڑے پھیلاتی دیوار کے قریب آگئی اور غرا کر بولی ۔

"کیا ہے ؟"

میں نے سٹ پٹا کر کہا ۔

"تو بہت اچھی ہے ۔"

اس نے تنی ہوئی بھوویں اور بھی اونچی کر کے میری طرف دیکھا اور بولی ۔

"پھر" !

میں نے سنبھل کر اپنی چھت کی طرف اشارہ کیا اور کہا ۔

"ادھر آجا ۔"

وہ زیر لب مسکرائی اور کہنے لگی ۔

"اتنی اچھی بھی نہیں ہوں۔"

اتنے میں نیچے سے لاڈو کی ماں نے آواز دی ۔

"صاحباں"

وہ جلدی سے چند قدم پیچھے ہٹ گئی ۔ میں نے پوچھا ۔

"پھر ملوگی ؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور جلدی جلدی زینہ اتر گئی ۔

اس کے بعد شاید وہ اپنی پہلی بھول پر پچھتا رہی تھی یا اس کے گھر والے اتنے چوکس اور سخت گیر تھے کہ عرصۂ دراز تک ملاقات کی نوبت نہ آئی ۔ میں نے کئی دوپہریں چھت پر کھڑے صاحباں کے انتظار میں گزار دیں ۔ ایک ایک کر کے کچی دیوار کے سارے سوراخ بند ہو گئے ۔ تنگ آکر میں گاہے گاہے ابا کی آڑھت کی دکان پر شہر جانے لگا ۔

ایک دن میں گھر میں اداس بیٹھا تھا کہ چوک سے تلسی کی آواز آئی ۔

"لالہ جی لے لو لڈو ۔ میاں جی لے لو برفی"

میں سرپٹ چوک کی طرف بھاگا ۔ تلسی نے ذرا رک کر پھر لگاوٹ سے آواز لگائی ۔

"دار جی چوس لو گنے ۔"

سردار جی کے گنے چوسنے کی کہانی آپ نے بھی سنی ہوگی ۔

تلسی ریڑھی پر بستی میں گھوم پھر کر موسم کے پھل بیچتا تھا ۔ دوپہر بعد وہ چوک کی طرف پھیرا لگاتا ۔ بستی کے لڑکے گلی گلی سے نکل کر ریڑھی کے گرد گھیرا ڈال لیتے ۔ ایک لڑکا بظاہر خلوص نیت سے بھاؤ چکانے میں لگ جاتا ۔

دوسرے تلسی کی نظر بچاکر پھلوں پر ہاتھ صاف کر جاتے ۔ وہ ان کے پیچھے لپکتا ۔ اس وقت کا انتظار کرنے والے ہاتھ کی صفائی دکھا کر رفو چکر ہو جاتے ۔ تلسی بیچارا واویلا مچاتا رہ جاتا ۔ چوپٹ ، شطرنج اور بارہ ٹہنی کھیلنے والے شور شرابے سے بیزار ہو جاتے ۔ پھر کبھی دو پیسے ایک آنہ تلسی کی مٹھی میں تھما کر جان چھڑا لیتے اور کبھی وہ خالی ہاتھ بڑبڑاتا ، ریڑھی دھکیلتا واپس چلا جاتا ۔

ایک دن مولوی سراج الدین نے تلسی کے جانے کے بعد سب لڑکوں کو بلایا اور حکم دیا کہ آئندہ تلسی کے آنے اور واپس جانے تک کوئی لڑکا گھر سے باہر نہیں نکلے گا ۔۔۔ اس زمانے میں بڑوں کا حکم نادر شاہی حکم ہوتا تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ میں گھر سے نکل کر چوک کی نکڑ پر روشن کی دکان کے باہر لٹکی ہوئی پتنگوں کی اوٹ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا ۔

تلسی نے لہک لہک کر پھر آواز لگائی ۔ جب اس کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوا تو اس نے چاروں طرف چھائی ہوئی خاموشی کو گھور گھور کر دیکھا اور ریڑھی ایک طرف کھڑی کر کے آکر مولوی سراج الدین کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا ۔ تھوڑی دیر تک شطرنج کی چالیں دیکھتا رہا ۔ پھر موقعہ پا کر پوچھنے لگا ۔

"بالک کہاں ہیں ؟"

مولوی صاحب بساط پر سے توجہ ہٹائے بغیر بولے ۔

"منع کر دیا انہیں"

تلسی نے پوچھا

"کیوں؟"

مولوی صاحب نے غور سے تلسی کی طرف دیکھ کر کہا ۔

"تنگ کرتے ہیں تمہیں ۔"

تلسی دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا ۔

"بالکوں کے من میں بھگوان بسے ہے میاں جی ۔ بھگوان کبھی کسی کو تنگ نہیں کرتا ۔"

مولوی صاحب چڑ کر بولے ۔

"ابے جو کچھ بیچنے آتا ہے سب لوٹ لیتے ہیں ۔"

تلسی ہنسا اور کہنے لگا ۔

"جو بکنا ہوتا ہے بک جاتا ہے ۔ ادھر تو لٹانے ہی آتے ہیں ۔"

اچانک استاد منشی رام بولا ۔

"اچھا یہ بات ہے" پھر اس نے کھڑے ہو کر آواز دی "لڑکو ، مچا دو لوٹ ۔"

استاد منشی رام کی آواز پر گھروں کے دروازے دھڑا دھڑ بجے ۔ گلیوں میں بھگدڑ مچ گئی ۔ لڑکوں نے تلسی کے

کچے پکے امرودوں پر ہلہ بول دیا ۔ میں نے یونہی گلی میں مڑ کر دیکھا ۔ صاحباں کی ماں اپنے گھر کی چوکھٹ سے باہر جھکی تماشہ دیکھ رہی تھی ۔ میں گھر کی طرف بھاگا اور لپکتا ہوا چھت پر پہنچ گیا ۔ میرے اندازے کے مطابق صاحباں چھت پر میری منتظر تھی ۔

میں نے دل ہی دل میں تلسی کو سو سو دعائیں دیں ۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بلا روک ٹوک جاری تھا ۔ ادھر تلسی چوک میں آکر آواز لگاتا ادھر میں اور صاحباں چھت پر پہنچ جاتے —— ایک دن ہم چاند کے اڑن کھٹولے میں بیٹھے اڑے جا رہے تھے ۔ اچانک صاحباں کی ماں نے چھت پر آکر آواز دی ۔

"صاحباں"!

اس کے ہمراہ میری امی بھی تھی ۔ میں نے جلدی سے دیوار کے پیچھے جھک کر زینے کی طرف چھلانگ لگا دی ۔ دو چار زینے اترنے کے بعد میرا پاؤں پھسل گیا اور میں قلابازیاں کھاتا صحن میں آرہا ۔ میرا سر گھوم رہا تھا ۔

گلی میں شور مچا ہوا تھا ۔ اس شور سے ناصر کی آواز آئی ۔

"دادا ابو — دادا ابو ۔"

میں ابھی تک نچلے زینے پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا ۔ ناصر نے آکر میرا کندھا جھنجھوڑا اور کہنے لگا ۔

"وہ پھر آرہے ہیں ۔"

میں نے ایک نظر صحن میں بکھرے گھر کے ٹوٹے پھوٹے سامان پر ڈالی اور ناصر کو بازو کے حلقے میں لے کر ساتھ چمٹا لیا ۔

شور قریب آتا جا رہا تھا ۔

ہم نے اوپر آکر جنگلے کے دروازے میں تالا ڈال دیا ۔ پھر کمرے میں پہنچ کر دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی اور کونے میں دبک کر لمحہ بہ لمحہ قریب آتے شور کو سننے لگے ۔

میں نے شاید آپ کو نہیں بتایا —— صاحباں سے میری شادی ہو گئی تھی ۔

——:——

زندگی کا پاتال

سائرہ ہاشمی

نہ جانے یہ کیسے ہوا کہ وہ نفرت اور محبت کے ہر احساس سے عاری ہو گئی ۔ اُسے کسی سے کوئی گلا نہ رہا دوسروں کا ہر فعل اُس کے نزدیک بے معنی ہو گیا ۔ ان کی محبتیں ان کی رفاقتیں خوبصورت الفاظ اور چاہت سے روشن آنکھیں اس کے گرد دائرہ بناتے گھیرتے اُسے گدگداتے لیکن وہ صرف ایک زوردار قہقہہ لگاتی اور سب کچھ اُس کی ذات کی گہرائی میں نیچے ہی نیچے اترنے لگتا ---- اُسے لگتا جیسے وہ بہت بسیط اور گہری ہو ۔

وُہ اپنے اور دوسروں کے الفاظ کی سچائی پر یقین نہ کرتی ۔ الفاظ جھوٹ بولتے ہیں ۔ جس طرح میرے کہے ہوئے الفاظ ---- وہ برسوں سے زندگی کی حقیقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُنہیں سمیرائز کر کے اپنا مطیع بنا لینے کا گر جان چکی تھی ۔

کبھی کبھار اُسے لگتا ہے جیسے وہ ایک خلا میں تیر رہی ہے ۔ نہ جانے کب سے نہ جانے کب تک ۔ اُس لمحہ اُسے لگتا وہ بھی مہاتما بدھ کی طرح آسن لگائے نروان کی کھوج میں ہے ۔ اُس کے جسم پر صعوبتوں کے کروڑوں لمحے بیت چکے ہیں اور ہر لمحہ زندہ حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ کیا جسم ہی سب سے بڑی سچائی ہے ۔ وہ اپنے جسم کی آگہی سے خستہ ہو جاتی ہے ۔ یا وہ نروان کا لمحہ جس کی کھوج میں میں برسوں سے بھٹک رہی ہوں ۔ وہ لمحہ جو ٹھہرے وجود کی طرح اُس کی سوچوں میں اٹک گیا ہے ۔ میرے ہاتھوں کی دسترس سے دور ---- خلیل احمد کی طرح ہی ۔

اُسے لگتا کبھی وہ کچھ بھی محسوس نہیں کرتی ۔ بس ایک بسیط سیاہی کا سیّال اُس کے گرد بغیر کسی شور کے گذر رہا ہے ۔ یا شاید وُہ گزر رہی ہے اور سیال جامد ہے ۔ وہ سر کو جھٹک کر سوچنے کی کوشش کرتی ۔ یا تو وہ سفر میں ہے وہ نروان کا لمحہ جس کی تلاش اُسے برسوں سے پہلے اُس کے اندر حلول کر گیا ہے ۔ شاید اِس لمحے نے اُسے خود ڈھونڈا ہے ۔ یا وہ ساری زندگی اُس کی تلاش میں سرگرداں رہی ہے ۔ اور اب وہ اس کی مٹھی میں بند اُس کے قبضے میں ہے ۔ لیکن یہ عبث اور فضول خیال تھا ۔ وہ تو ساری کی ساری خالی تھی اب جبکہ وہ اپنی زندگی کے تنہا دائرے میں قید ہو چکی ہے اُسے اتنی بھی پروا نہیں ہے ۔ اُس نے زندگی کو اُس کے عُریاں مفہوم میں دریافت کر لیا ہے ۔ وہ تو نروان کے لیے زندگی کے جنگل میں برسوں سے سرگرداں رہی تھی ۔ سکون کے ایک لمحے کے لئے جو اُس کا اپنا آپ اُس کو لوٹا دے ۔ لیکن کبھی اُسے لگتا وہ زندگی پر حاوی ہے اور کبھی زندگی اُس کو گرفت میں لے کر بھینچنے لگتی ۔ اُس نے مہاتما بدھ کی طرح اپنی آنکھیں اپنے اردگرد کی سچائیوں سے موند نہیں لی تھیں ۔ زندگی میں دیکھنے کو اتنا کچھ تھا ۔ ہیولے اُس کے گرد ناچتے .... لیکن وہ عجیب استہزا آمیز انداز سے مسکرانے لگتی ۔ ایک بے تعلقی کے ساتھ ۔ کبھی

کبھار وہ اپنے آپ کو مہاتما بدھ سے بھی بلند تر سمجھنے لگتی ۔ وہ دنیا میں گُم ہو کر نروان کی کھوج کر رہی تھی اور مہاتما بدھ گیا کے جنگلوں میں تنہائیوں کے سایوں میں اپنے آپ سے بھی گم ہو کر اُسی لمحہ کی کھوج میں تھے ۔ ہو سکتا ہے وہ ایسا سوچنا چاہتی ہو ۔ کیونکہ اُس کے دل میں ٹھہراؤ کا ایک ایسا احساس جنم لے چکا تھا جو اُسے واپس عام اور زمین پر رینگتے انسانوں تک واپس نہیں لے کر جائے گا ۔ وہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بلند اور برتر محسوس کرتی ۔ وہ سوچتی نروان کی اِس ساعت کے لئے اُس نے بھی سوچوں کے ہزاروں لمحوں کو اپنے جسم پر بتایا ہے ۔ وہ ضرور اُس تک پہنچے گا ۔

شائد آنسو بھی راہ کے سنگ میل بن جاتے ہیں ۔ آنسو جو کبھی سیاہی میں ڈھل جاتے اور کبھی روشنی کی چکا چوند پیدا کرنے لگتے ہیں اور وہ انہیں کبھی نہیں بہائے گی ۔ آنسوؤں کی نمکینی کا ذائقہ جب اُس کی زبان پر اترا تو وہ بڑے سے گھر کے آنگن میں اکیلی ہی کھڑی تھی ۔ اُس کی ماں اُس کے باپ سے مار کھانے کے بعد سر جھکائے رو رہی تھی ۔ اور اُس کی سسکیاں گھر کی دیواروں کے اندر گردش کر رہی تھیں ۔ وہ اپنے ماں باپ کے تعلق کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کرتی — لیکن سب کچھ بڑا اُلجھا ہوا اور تکلیف دہ لگتا ... وہ دو انسانوں کی طرح الگ سے اُس کے ذہن میں نہ آپاتے ... لیکن پھر بھی وہ ایک نہ تھے ۔ کیوں ... وہ اور اُس کا بھائی اِس گتھی کو سُلجھا نہ پاتے اور ماں بھی کچھ نہ بتاتی ... بس اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے رہتے ... رابو پُھوپھو ماں کو اپنے ساتھ لگا لیتی اور کہتی — صالحہ خانم ... اگر دیوار ہی بننا چاہتی ہو تو دیوار گریہ مت بنو ... ہر آنسو بڑے بھیا کو طمانیت دیتا ہے ۔ اور تم غیر شعوری طور پر اُن کی طمانیت کا باعث بنتی ہو ... مت آنسو بہاؤ مجھے دیکھو میں نے زمانوں سے آنسو بہانے چھوڑ دیے ہیں کیا فائدہ ۔

اور آج وہ ان گزری سوچوں میں ،گھری گزری گھڑیوں کی راکھ سے نہ جانے کیا کھوجنا چاہتی تھی — رابو پُھوپھو نے ماں سے کہا تھا "دینے میں دیا اور سخاوت ہے ۔ خوشی ہی خوشی ہے اور انسان اِسی خُوشی سے محروم کیوں رہے .... اپنا آپ بڑے بھیا کے حوالے کر دو ... لیکن اُس کی ماں نے آنکھوں میں غصّہ بھر کر کہا تھا ... تم جانتی ہو ...میں جو چاہتی ہوں اُس کے بغیر اپنے آپ کو مار تو سکتی ہوں ۔ لیکن اُس کے آگے جھکوں گی نہیں .... تمہارا بھیا بسیط خلا ہے جس میں صرف گِرا جاسکتا ہے ۔ بغیر کچھ پائے اور میں اُسے مکمل پانا چاہتی ہوں ۔ اس سے کم پر سودا نہیں ہو گا اور یہ سارا مکالمہ فرح کو سمجھ نہیں آیا تھا ... دینا اور خوشی تج دینا اور پانا ۔ یہ سب کیا تھا ۔ رابو پُھوپھو کا وجود اُس کی اور ماں کی ذات سے بلند تر اور اچھوتا لگتا ۔ وہ اُس گھر میں کب سے اور کیوں تھیں ... لوگ سوال کرتے ۔ لیکن اُس کی ماں کے پاس اِس سوال کا کوئی جواب نہ تھا ۔ اور نہ ہی وہ جواب دینے کی کوشش کرتی ... بے تعلقی کے اس ادراک نے رابو پُھوپھو کو سب سے بلند تر اُٹھا دیا تھا فرح کو ان پر پیار آنے لگتا ... اور اُسے لگتا جیسے ماں اور ابا کچھ نہ ہوں بس پُھوپھو ہی پُھوپھو ہو ۔ جیسے اُس کا پیار پھیل بڑھ کر سب کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہتا ہو ۔ ماں کو ابا کو بھائی کو اور مجھے بھی ۔

اور آج جب اُس نے اس بلندی کی سیڑھیوں کو انگنت بار گنا تو اُسے لگا کہ وہ تو وہیں کی وہیں کھڑی سوالوں میں گھری ہوئی اور اکیلی ہے ... سفر کے وُہ لمحے کیا ہوئے ... وہ اکیلے گھر میں کھڑی اپنے آپ سے سوال کرتی ہے ۔ وہ گھر جو اُس نے لمبی تگ و دو کے بعد بنا کر سجایا لیکن چپ کا زہر ہولے ہولے اُس کے اندر اُتر رہا ہے ... کوئی چاپ نہیں کوئی آواز نہیں ... میں کون ہوں ... لیکن سب طرف خاموشی کی چاپ گہری ہوتی جاتی ہے اُس کے اندر اُتر کر اُسے ڈراتی ہوئی ... حالانکہ اُس نے زندگی کو رابو پھوپھو کی وساطت سے جانا اور بوجھا تھا ... لیکن اب تو رابو پھوپھو بھی نہیں ... وہ زندگی کے لمحوں سے بچھڑی ایک لمبی داستان ہے صرف جینے کے لیے اور جینے کے لئے اُسے انسانوں کی ضرورت ہے ۔

"رابو پھوپھو کا پڑھایا ہوا سبق اُسے ہمیشہ یاد رہا ... "دینے اور بخش دینے میں بڑائی ہے فرح بی بی" اور وُہ دوسروں کے لیے سراپا خلوص اور اخلاص بن گئی ۔ لوگ اُس تک اپنی ضرورتوں کے کشکول تھام کر آتے کھکھیائے ہوئے ... منت بھری نظروں سے دیکھ کر خوفزدہ ہو کر اندر سمٹتے ہوئے ۔ وُہ ان کا سواگت کرتی اور اُن کی ضرورتوں کے حساب سے اُن کی مدد کرتی ... وہ سائبان بن کر ضرورتوں کی کڑی دھوپ میں اُنہیں چھپا لیتی ۔ لیکن جیسے ہی وہ جاتے ۔ ایک استہزا آمیز قہقہہ اُن کے قدموں کی جاتی چاپ میں گونج جاتا ـــــ وہ ٹھٹھکتے شرمندہ ہوتے لیکن پھر تیز تیز قدم اُٹھاتے باہر نکل جاتے ۔ وہ کہتی "یہ نہ جانے کتنے دفتروں کی خاک چھانتے اُس تک پہنچے ہیں ۔ اِن کی ضرورتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی ۔ اور پھر اُن کے بارے میں نئے نئے انکشافات پاس بیٹھے دوسرے لوگوں کو سُنانے لگتی ۔ سب قہقہے لگاتے ۔ اُس لمحے اُس کے اندر کی سیاہی میں سب کچھ ڈوب جاتا جیسے وہ ابھی کچھ دیر پہلے والی عورت نہ ہو جس کی آواز میں محبت اور چاہت تھی ۔ آنکھوں میں واقفیت کی روشنی تھی ۔ وہ خود اپنے اندر کے خلا میں تیرنے لگتی ... بغیر کسی رشتے کسی تعلق کے ... "شاید یہی لمحہ نروان کا لمحہ ہے جب میں اندر باہر سے خالی ہو جاتی ہوں" وہ اپنے آپ سے پُوچھتی ۔ اُسے لگتا اُسے کسی کی ضرورت نہیں ۔ اُس کے اندر سکھ ہی سکھ چین ہی چین ہے ۔ وہ برسوں پہلے کی سنی ہوئی باتیں دہرانے لگتی ۔ لیکن یہ لمحہ بھی تیزی سے گزر جاتا اُسے اکیلا چھوڑ کر ۔

لیکن اکثر وہ اپنے آپ سے اُلجھ جاتی ۔ یہ لمحہ آخر کیا ہے ۔ کیوں اُس کے اندر داخل ہو کر بیٹھ جانا چاہتا ہے ۔ کیا اپنے آپ کو بُھول جانا ہی بڑائی ہے ۔ مجھے اِس کی جستجو کیوں ہے ۔ لیکن وہ پھر اپنے آپ کو اپنے جسم کی پوری توانائیوں کے ساتھ محسوس کرتی ۔ ہاں یہ زندگی ہے ۔ اور پھر اُس کے اندر ایک کرب زدہ احساس اتر آتا ۔ کیا اس لمحہ کے باہر بھی زندگی ہے خوشی ہے اُس کی دسترس سے باہر اُس کی پہنچ سے دُور ـــــ

لوگ کہتے فرح خلیل عجیب عورت ہے اُس کے کھلے گریبان اور چھوٹے سے بلاوزسے نظارے اُنہیں اپنی طرف بلاتے اور پھر وہ ان کی طرف کھنچنے لگتے ۔ اور کہانیاں جنم لینے لگتیں ... وہ دوستوں کے ساتھ چائینی ریستورانوں کے اندھیرے کونوں میں بیٹھی فحش مذاق کرتی ۔ نئے نئے سکینڈل جنم لیتے ۔ عورتوں کے بن بیاہے بچے پیدا کئے

جاتے دوسری عورتوں کی راتوں کے لمبے قصّے سُنتے اور کہے جاتے ... اور اندھیرا کونا پُر معنی قہقہوں سے گُونجنے لگتا ... لیکن پھر ایک انوکھا لمحہ اُس کے اندر گھس بیٹھتا ... اور وُہ سر کو جھٹک کر اور ہی سوچوں میں اُلجھ جاتی ۔ اُس کی جستجو کرتی ہوئی ۔ کھوج لگاتی ہوئی تضاد ہی تضاد اُلجھاؤ ہی اُلجھاؤ ... وُہ زندگی کی برہنگی اور عُریانی سے شرمندہ نہیں تھی ۔ اُس کے دوست دوسرے محکموں میں بڑی پوسٹوں پر متعین جوان عورتیں ... بڑے مصور اُس کے چاہنے والے وہ کھلی آنکھوں سے انسانی رشتوں کے برہنہ ہیولوں کو اپنے گرد ناچتے دیکھتی ... اسے لگتا جیسے نروان کا لمحہ اُس پر آسیب کی طرح وارد ہو رہا ہو ... پھر کیا ہے ... زندگی کی سچی حقیقتوں کے سامنے کیوں شرمندہ ہوا جائے ۔ جینا چاہیے ... جینے دینا چاہیے ۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے ہونٹوں کے اندرونی کونوں پر کڑواہٹ کا مزہ اترنے لگتا ۔ لیکن پھر اُسے اپنی طاقت کا انوکھا سا احساس ہوتا ۔ دوسروں کو مرعوب کرتا ہوا ۔ زیادہ اہم ۔

دینے میں دَیا ہے تو میں اِس سے اپنے آپ کو محروم کیوں کروں ... وُہ اپنے شوہر کے خیال کو سر سے جھٹک کر دُور پھینک دیتی جہنم میں جائے اور خلیل احمد میری دیا کا سب سے پہلا سکہ تو تمہارے ہی کشکول میں چھن سے پڑا تھا اور مجھے بڑا مزہ آیا تھا ۔ میں آج تک اس کے گھر سے نہیں نکلی" وہ اکیلی ہی زور سے ہنستی ۔

لیکن پھر اُس کے اندر سے رابو پُھوپھو کا ہیولا آہستہ آہستہ اُبھرنے لگتا ۔ اُس کی ذات سے بلند تر اُسے اپنے آپ پر پیار آنے لگتا اور پھر ہمیشہ کی طرح یہ پیار دوسروں تک پہنچنے کے لئے بے چین ہو جاتا اُس کو گُدگداتا مسرور کرتا ۔

ہاں یہی تو وہ لمحہ ہے ۔ رابو پُھوپھو نے جس کے بارے میں بتایا تھا ۔ ٹھہراؤ کا یہ لمحہ بڑا گہرا اور بسیط ہو جاتا ۔ آنسو اُس کی آنکھوں میں چُھپنے لگتے لیکن وہ مذاق کرتی دوسروں کے بارے میں من گھڑت قصّے کہتی جس میں دوسرے ڈوب کر اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتے لیکن خلیل اس کی اس ساری مسحور کرتی ذات کے دائرے کے باہر ہی کھڑا رہتا ۔ لیٹا ہوا ۔ مانگتا ہوا ۔ اُس کی توجہ کا طالب اُس کے جسم کا اسیر ۔ لیکن اُس کے پاس دینے کے لئے اپنی ذات کے سوا بہت کم تھا ۔ اور فرح کا دامن خراج تھا ۔ اُس نے اُسے قائل کرنے کی کوششیں کرتے ہوئے ایک روز کہا تھا میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی ذات کا تمام سرمایہ دے ڈالا ۔ لیکن کبھی کبھی میرے اپنے ہاتھ میں بھی کشکول نظر آنے لگتا ہے ۔ اور میں سوچتی ہوں ۔ میری طرح تم بھی اس میں سچائی کا ایک لمحہ ہی گرا دو جس کی جھنکار مجھے لبھا لے لوٹ لے ... لیکن تم کو میں شائد نظر ہی نہیں آتی ... باقی سب کو نظر آتی ہوں وہ مجھے دیکھتے اور میرے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں ۔ وہ زور سے ہنسا ۔ "تم نے رابو پُھوپھو سے دینے کا فلسفہ سیکھا ... لیکن میری کوئی برہمن پھوپھو نہیں تھیں ۔ میں نے اِس سبق پر یقین ہی نہیں کیا ۔ تم نے مجھے قبول کرتے ہوئے کوئی شرط نہیں رکھی تھی ۔ اور تم مجبور ہو کہ اس بندھن کو نبھاؤ ۔ تمہاری عزت کا سوال ہے میری عزت کا سوال نہیں ... وہ اس احساس کے ویرانے میں اکیلی کھڑی رہ گئی جس میں اُس نے خلیل کو بھی داخل کیا تھا اور اُسے احساس ہوا کہ وہ مکمل طور پر رابو پُھوپھو بن نہیں پائی تھی ۔ اُس کا اندر بھی کچھ مانگتا تھا جو الفاظ میں ادا نہیں ہو پاتا تھا ۔ آنسو اُس کے اندر ہی اکٹھے ہو رہے تھے

لیکن وہ برسوں سے انہیں بہانا بھول گئی تھی ۔ اُنہیں بہانا اور کمزور ہونا نہیں چاہتی تھی ۔ وہ ہر لمحہ طاقت کے احساس کو تھامے رہتی اُس نے اپنی ماں کے غمزدہ وجود پر بھی آنسو بہانا چھوڑ دیا تھا ۔ اور باپ سے مرعوب ہونا جو اپنے مصاحبوں کے ساتھ کندھے پر بندوق لٹکائے جیپ کو تیز دوڑاتا گلیوں میں دھول اُڑاتا ویرانوں کی طرف کوچ کر جاتا لیکن جانے سے پہلے لات کی ایک زوردار ضرب اُس کی ماں کو لگانا نہ بھولتا ... پہلے پہل اُسے لگا جیسے اُس کی ماں کے جسم کا سارے کا سارا درد اُس کے جسم میں اتر آیا ہو ۔ وہ خود زخمی ہوگئی ہو ۔ وہ روتی ہوئی ماں کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی خوفزدہ اور سہمی ہوئی ... لیکن ماں اور وہ ایک نا ہو پاتے ۔ ماں کا وجود اپنے درد میں ڈوبتا رہتا ۔ ماں کیا بُہت درد ہو رہا ہے ۔ عجیب انوکھا سا سُن کر دینے والا احساس اُس کے اندر جاگ اُٹھا تھا ۔ ماں کا سارا درد اُسکی سوچوں کی دراڑوں سے بہتا اُس کے اندر جمع ہونے لگا ۔ اُس کے وجود میں سرسرانے لگا ۔ جب بھی اُس کا باپ اُس کی ماں کو ٹھوکر مارتا یہ درد ایک ٹیس بن کر اُس کے اندر کھولتا رہتا جیسے ابھی لاوے کی مانند پھٹ پڑے گا اور سب کچھ تہ و بالا ہو جائے گا ... اُسے معلوم نہ ہو پاتا کہ اُس کا باپ محبت یا نفرت کے کونسے درجے پر پہنچا ہوا ہے کہ اُسے رشتوں کے تقدس کا احساس ہی نہیں ۔ وہ بیٹا ۔ بیٹی ۔ بیوی ۔ بہن کے کسی رشتے کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا ۔ اس کے باپ کی خود پسندی اس کے دل میں خوف بن کر اُتر آتی وہ ماں کی طرح ہی خوفزدہ نظروں سے باپ کے اندر آتے گونجتے قدموں کو سنتی اور اپنے اندر سکڑ کر اندھیرے کونے میں بیٹھ جاتی ۔ اُسے اپنا باپ بڑا طاقتور لگتا ۔ جب وہ دروازے سے آکر صحن میں کھڑا ہوتا تو اس کے جسم کا سایہ سب چیزوں ۔ سب سوچوں ۔ سب جذبوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ۔ سب انسان حقیر اور چھوٹے ہو جاتے ۔ لیکن پھر احتجاج کی لہریں ہولے ہولے اُس کے اندر اُس کے وجود سے ٹکرانے لگتیں۔ اور وہ اُس پر آگے پیچھے جُھولتی رہتی ۔ اُس کے اندر باپ کی ذات کی نفی آگ کی لپک بن کر اُٹھتی ۔ ماں کا درد تیز دھار بن کر پہلو میں اُتر جاتا ۔ رابو پھوپھو کی بے زبانی ڈرانے لگتی ۔ اور یہ سب کچھ ایک تلخ کڑوے احساس میں بدل جاتا ... دم گھٹنے والی خاموشی چاروں طرف چھا جاتی صرف اُس کے باپ کی آواز سنائی دیتی ۔

مجھے ان سب دُکھی لوگوں کے لئے کچھ کرنا چاہیے ۔ مجھے باپ کے وجود کی راہ میں دیوار بن جانا چاہیے ۔ وہ خوف اور سوچ کے درمیان سفر کرنے لگتی ۔ کبھی اپنے ہی خلاف احتجاج کرتی ۔ نہیں میں بے بس نہیں بنوں گی ۔ ماں اور رابو پھوپھو کی طرح ... اُسے باپ سے بے انداز نفرت محسوس ہوتی ۔ لیکن دوسرے لمحے اُسے اپنا باپ بڑا بلند لگنے لگتا ۔ طاقت ور دوسروں کو مٹا ڈالنے والا ۔ اور وہ باپ جیسا بننے کی شدید خواہش کرنے لگتی ۔ اُس کی ذات سبکی ذاتوں میں بٹ رہی تھی ... اُس کے اندر اب بے شمار سوال گردش کرتے رہتے لیکن جواب دینے والا کوئی نہیں تھا ۔ شائد درد بھی جسم کا حصہ بن جاتا ہے ۔ اور پھر برداشت مشکل نہیں ہوتی ۔ اُس نے ماں سے پوچھا تھا ۔ ماں کی آنکھوں میں عجیب لاچاری سی بے بسی تھی ۔ "ہاں لیکن وہ ہمیشہ اپنا احساس دلاتا رہتا ہے ۔ انسان اُسے بُھول نہیں پاتا ... اُس کا وجود درد کے ایک لامتناہی احساس میں ڈھل جاتا ہے۔

ماں کیا مارنے والا بھی یاد رہتا ہے ۔ اُس نے پھر سوال کر دیا ۔ ماں نے کچھ دیر سوچا اور بولی مارنے والا ... نہیں ۔ بس اپنے دل کے اندر اُٹھتا درد جو جسم کے ہر حصے میں چبھتا ہے ۔ آنسو کی طرح آنکھ میں اٹک جاتا ہے ۔ اُسے کیونکر بھولا جاسکتا ہے ۔

شاید ماں غیر شعوری طور پر باپ کو بُھول جانا چاہتی ہے ۔ اُس سے انتقام لینا چاہتی ہے ۔ اور باپ بھی ۔ وہ دونوں دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے ۔ رابو پُھوپھو بھی بے جان پتھر کی مانند اپنی جگہ موجود تھیں ۔ جیسے کچھ دیکھ اور سن نہ رہی ہوں ۔ کوئی سزا بھگت رہی ہوں ۔ اُس نے رابو پُھوپھو کی موجودگی کے بارے میں کبھی سوال نہیں کیا تھا ۔ ماں کے آنسوؤں کی نمکینی اور رابو پُھوپھو کی خاموش بے بسی اُس پر کشف کی طرح عیاں ہوئی تھیں ۔ شائد وہ بڑی ہو رہی تھی ۔ اور اُسے زندہ رہنے سے خوف آنے لگا تھا ۔ کونسی راہ منزل کو جاتی ہے ۔ اُسے کس راہ پر چلنا چاہیے ۔

ماں احتجاج کیوں نہیں کرتی پھوپھو گِلا کیوں نہیں کرتی ۔ باپ کی آنکھوں میں اتنی اجنبیت کیوں ہے اُس کا جوان بھائی باپ کی سختی تکے ویسی ہی خود پسندی اور لاتعلقی کا مظاہرہ کرتا ۔ اور وہ ان سب سے نفرت اور محبت کے ملے جلے جذبوں کے ساتھ نبھاہ کرنے کی کوشش کرتی ... رشتوں کے مضبوط بندھنوں کا اُسے احساس ہی نہ ہو پاتا ... وہ سب اپنی اپنی دنیاؤں میں بٹے ہوئے علیحدہ علیحدہ پنجروں میں بند جانوروں کی طرح غُصّے سے کھولتے اور خاموشی سے غراتے رہتے ... تو یہ بندھن بے کار اور فضول ہیں ۔ وہ بار بار سوچتی ... باپ ان بندھنوں کو کچّے دھاگے کی طرح پکڑے کسی بھی لمحہ توڑ سکتا ہے ... لیکن اُس رات جب اُس نے اپنی ماں کو باپ کے دوست فرمان انکل کے ساتھ حویلی کے صحن میں برگد کے اندھیرے درخت تلے خاموشی سے بیٹھے دیکھا تو اُسے زندگی کا سب سے بڑا دھچکا لگا تھا لیکن دکھ کے دریا میں ایک راہ بھی نظر آئی تھی ۔

"تو ماں بھی ۔ ماں بھی رشتوں کے تقدس کی پروا نہیں کرتی اور اُس نے جان لیا تھا کہ جسم کے حیوانی عنصر کے اندر ایک حیوانی پکار پوشیدہ ہوتی ہے اور جب اِس پُکار سے بلند اُٹھا جائے تو انسان تب جانور سے الگ اور بلند اُٹھتا ہے ... نہیں تو اُس کے اندر جانور بلبلاتا ہے اُس کی زندگی کا سب سے بڑا تحفظ کتابیں تھیں ۔ لیکن اُن میں سارے سوالوں کے جواب لکھے ہوئے نہیں تھے ... وہ کِس سے پُوچھے ... اُس کا زندگی کی سچائیوں پر یقین اور بھی کم ہو گیا ۔ ۔ پھر ماں آنسو کیوں بہاتی ہے ۔ وُہ اس راز کو اپنے اندر بھاری بوجھ کی طرح سنبھالے ہوئے تھی ... وہ چاہتی تھی ... برگد کا اندھیرا کبھی روشن نہ ہو اور ماں کبھی باپ کو فرمان انکل کے ساتھ نظر نہ آئے ۔ نہیں تو ایک طوفان اُٹھے گا اور سب کچھ تہ و بالا ہو جائے گا ۔

پھر ماں نے مار کھانے کے بعد بھی آنسو بہانے کم کر دیے ۔ باپ دِنوں اپنی زمینوں اور شکار کے مشاغل میں اُلجھا رہتا ۔ بھائی خاموش سا کالج کے بعد کتابوں کو کمرے میں لے کر بند ہو جاتا ۔ اب ماں کے چہرے پر ہلکا سا گلال

چھایا رہتا ۔ اُس کے اندر کی بے یقینی اور بھی بڑھ گئی ۔ اُسے ماں کے بار بار سنورنے کی وجہ سمجھ آگئی۔ خاموش رہ کر مار کھانے کی وجہ سمجھ آگئی ... مرد کی خواہشیں عورت کی ضرورتیں ... اُن دونوں کا تصادم تو یقینی تھا ۔

تو ماں بھی بدلا لے سکتی ہے ۔ ماں کے اندر بھی انتقام لینے کا جذبہ موجود ہے ۔ وہ حیران ہو کر سوچتی اور اُسے اپنے باپ کی ذات بڑی چھوٹی لگتی ۔ ہاں انتقام لینا ضروری ہے ۔ وُہ اس پر یقین کرنا چاہتی تھی ۔ لیکن سوال کا جواب کون دے ... انسان کے اندر انتقام لینے کا جذبہ بڑا مضبوط ہے ۔ وہ ماں کی طرف حیران نظروں سے دیکھنے لگتی ... لیکن کیا انتقام لینا ضروری ہے کیا دوسرے کو معاف نہیں کیا جاسکتا ۔ وہ اپنے اندر جھانکتی اُسے وہاں اندھیرے اُجالے کا عجیب سا امتزاج نظر آتا ۔ نفرت اور محبت ۔ معاف کرنا اور سزا دینا ۔ سارے جذبے اُس کے جسم کی دراڑوں میں نیچے ہی اترتے رہتے ۔ محبت اور نفرت کے کانٹے اُس کی سوچوں میں پیوست ہو جاتے ۔ اور وہ اپنی ذات کے کھو جانے کے خوف میں مبتلا ہو جاتی ۔

کونسی راہ خوشیوں کی طرف جاتی ہے ۔ مجھے کدھر جانا ہے ۔ اُس کے سوال اُس کے چہرے پر لکھے جاتے لیکن اُن کو پڑھنے والا تو کوئی بھی نہیں تھا ۔ اُس کے اپنے پاس بھی اِن سوالوں کے جواب نہیں تھے ۔ پھر ایک دن اُس کی پھوپھو نے اُس کے پاس بیٹھ کر کہا تھا ۔

فرح بی بی "میں تمہاری ذات کے تذبذب سے آگاہ ہوں ۔ اندھیرے میں جھانکنے سے انسان کے بھٹکنے کا امکان ہوتا ہے ۔ تم روشنی کی طرف سفر کیوں نہیں شروع کر دیتی ہو"

وہ اُس روز ماں کو فرمان انکل کے پاس کھڑے دیکھ کر شدید خوف اور نفرت میں بٹ گئی تھی اور اُس کا جی چاہتا تھا وہ کسی کے ساتھ لگ کر بہت سے آنسو بہا ڈالے اور اپنے اندر کے بوجھ سے خالی ہو جائے ۔ لیکن اُس کے گرد تو دُکھ ہی دُکھ تھے بے سہارا لوگ تھے ۔ اندر کی قید تھی ۔

وہ اور رابو پھوپھو وسیع لائبریری میں آتشدان کے دہکتے کوئلوں کے سامنے چُپ چاپ بیٹھی ہوئی تھیں ۔ باہر وسیع لان میں درختوں تلے گہرا اندھیرا ایک دوسرے میں مدغم ہو رہا تھا ۔ چڑیوں کی آخری آواز بھی سو چکی تھی ۔ اُس کا باپ ہمیشہ کی طرح اُس گھر کی زندگی سے غائب تھا لیکن پھر بھی اُس کے وجود کی بھاری ڈرانے والی ۔ دہشت زدہ کر دینے والی موجودگی کا احساس سب طرف چھایا ہوا تھا ۔ انہیں اندر سے جکڑے ہوئے تھا ۔

رابو پھوپھو ۔ ماں کا انکل کے ساتھ کیا رشتہ ہے ۔ اُس نے اندر کے گونجتے سوالوں کو زبان دیتے ہوئے پوچھ ہی ڈالا تھا کیونکہ وہ بے چین اور پریشان تھی ۔

"بی بی رشتے ہونے یا نہ ہونے کا تعلق انسانی ذہن سے ہے ۔ اگر سوچو تو ہے ۔ نا سوچو تو نہیں ہے ۔ اور یہ رشتے نبھانے پڑتے ہیں جو کوئی بھی ڈور توڑتا ہے ذمہ دار ٹھہرتا ہے۔

تو ماں ابا سے کوئی رشتہ نہیں سوچتیں اور ابا ماں سے کوئی تعلق نہیں سوچتے ۔ پھر بھی وہ دونوں اکٹھے ایک ہی

میں رہنے پر مجبور ہیں ۔ ماں طلاق کیوں نہیں لے لیتیں ۔"

رابو پُھوپھو نے سر جھکا لیا ۔ اُن کے چہرے پر ایک بوجھ سا اُتر آیا ۔ اُن کی مسکراہٹ میں بڑا حُزن تھا ۔ اس کا خوبصورت وجود ساکت ہوگیا ۔ جیسے سوچ کی کوئی ہلچل اندر باہر نہ ہو۔

"بی بی پھر کیا ہو گا ۔ قسمت تمہاری ماں کے تعاقب میں آئے گی ۔ اور پھر کوئی دوسرا مرد اُس کی ذات کی نفی کرے گا ۔ اور ایسا سفر دُور تک مسافر کو نہیں لے جاتا ۔ "کیا ہر سفر گمراہ کرتا ہے" اُسے رابو پھوپھو کی بات سمجھ نہیں آئی تھی ـــــ شائد پُھوپھو نے جو ڈھیر ساری کتابیں ابا سے چُھپ کر پڑھ رکھی تھیں وہ بات کو مُشکل بنا رہی تھیں ۔ حالانکہ وہ بھی کتابوں کے سہارے اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتی تھی ۔

"منزل لکھی ہوئی ہوتی تو تمہاری ماں کو بھی ضرور ملتی" رابو پُھوپھو باہر اندھیرے میں دیکھتے ہوئے ہولے سے بولیں ... منزل کی کھوج کرنی پڑتی ہے فرح بی بی ۔

"ابا کو سمجھایا تو جا سکتا ہے۔ میں اُنہیں سمجھاؤں گی۔ اتنی بے یقینی میں جینا بڑا مشکل لگتا ہے وہ اپنے اندر ہمت پیدا کرنے کی کوشش میں بولی۔ اُسے ماں پہ بے طرح پیار آرہا تھا ... رابو پھوپھو ایک دم چونک کر سیدھی ہو کر اُسے دیکھنے لگیں ۔

نہیں بی بی تم ایسا نہیں کرو گی ۔ تمہارا باپ معاف کرنا نہیں جانتا ۔ تمہاری ماں کی یہ لمحاتی مسرت چھن جائے گی ۔ تم نے برسوں بعد اُس کے چہرے پر جگتی جوت کو شائد محسوس نہیں کیا ۔ تم بہت چھوٹی ہو ۔ میں نے تو برسوں اُسے صرف سلگتے دیکھا ہے ۔ لیکن اب زندگی کی ہونٹوں کی گلابی کو میں نے پہلی بار دیکھا ہے ۔ میرا جی چاہتا ہے اُسے بازوؤں میں سمیٹ لوں اُس کی اس خوشی کو دوسروں کی نظروں سے اُوٹ میں کر دوں اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو جاؤں رابو پُھوپھو جیسے خواب میں بول رہی تھیں ۔ جیسے سوئے خواب جاگ اُٹھے ہوں جیسے خواہشیں بے پَر اُڑ رہی ہوں .. "لیکن رابو پُھوپھو یہ تو دھوکا ہے ۔"

"ہاں بی بی ۔ یہ بھی دھوکا ہے اور وہ بھی دھوکا ہے اور دو دھوکے مل کر صرف محرومیوں کو ہی جنم دے سکتے ہیں ۔ لیکن محبت ۔ محبت کرنا تو بہت کم لوگ جانتے ہیں ۔ تاریکی میں کوئی نا کوئی دیا تو جلانا ہی پڑتا ہے چاہے وہ وقتی روشنی ہی دے ۔ لیکن پھر جینا آسان ہو جاتا ہے ۔ اور تمہاری ماں کو بھی جینے کا حق ہے ۔ دیا تو مستعار کا اس نے تھام رکھا ہے گر بھی سکتا ہے چھینا بھی جاسکتا ہے ۔ ایکبار اُسے پھر بات کی پوری سمجھ نہیں آئی تھی ۔ رابو پھوپھو تو خود سرد تنہائیوں میں بغیر کسی روشنی ۔ کسی دئے کے مقید تھیں ۔ لیکن اُن کا دل شائد دُکھ دِل کو وسیع کر دیتا ہے ۔ نہیں تو پُھوپھو ایسا نہ کہتیں ۔ شائد پھوپھو بھی اماں کی طرح ابا کی شخصیت کی انتہا کیوں اپنی سوچوں کے پتھر سے چکنا چور کر دینا چاہتی ہیں ۔ اُسے لگا جیسے اُس کے گرد بہت سے اسرار ہوں جو اُس پر واضح ہو رہے ہوں ۔ لیکن ابھی بھی بہت کچھ اندھیرے میں تھا ۔ حل طلب تھا ۔ اُس نے سوچا وہ خود ہی اُن سوالوں کو اپنی طاقت سے جگائے

کی ۔

شائد زندگی مجھ پر آہستہ آہستہ اپنے در وا کر رہی ہو ۔ شائد پھوپھو نے بھی اِسی طرح فراخدلی اور معاف کر دینے کے نور کو اُجاگر کیا ہو ۔ پھوپھو کے الفاظ تیز گرد باد کی مانند اُسے کہیں دُور لے جا رہے تھے ۔ لیکن دوسرے لمحے سب کچھ بے یقینی کی دلدل میں اُترنے لگا ۔ اُسے اپنے تنہا رہ جانے کا ڈر محسوس ہو رہا تھا وہ رابو پھوپھو کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی ۔

"رابو پھوپھو کیا رشتوں کا تقدس نہیں ہوتا ۔" "ہاں بی بی ہوتا ہے لیکن دوسروں کی کوتاہیوں کو بھول جانے میں بڑا مزہ ہے جیسے میں نے بڑے بھیا کو بخش دیا ۔ جب کبھی تم جسم اور رُوح کے زخم سہہ کر بخشنا سیکھو گی تو زندگی کی ساری محرومیاں قابلِ برداشت ہو جائیں گی ۔ اس لئے اپنے ماں باپ کو معاف کر دو ۔

"کیا معاف کرنے سے پہلے زخم کھانا ضروری ہیں زخموں کی ٹیسیں برداشت کرنا ضروری ہیں اور کیا آپ نے بھی زخم کھا کر ہی معاف کرنا سیکھا ہے ۔"

رابو پھوپھو ہولے سے ہنسی جیسے دُور کسی ویرانے میں کوئی آسیب ہنس رہا ہو ۔ دبے قدموں سیاہ درختوں تلے چل رہا ہو ... شائد پھوپھو کی روح بھٹک رہی ہو ۔

"ہاں بی بی اور یہ زخم تمہارے باپ کے لگائے ہوئے ہیں ۔" پھوپھو کے ہاتھوں کی گرفت اس کے بازو پر سخت ہو گئی اُن کا ہلکا سا قہقہہ کانپا ...

"فرح بی بی زخم زیادہ گہرا اُترتا ہے جب انسان پہلے پہل معصومیت سے ہنسنا سیکھا ہو ۔ جب دُنیا بے وجہ خوبصورت لگنے لگی ہو جب چنری کے لہریئے قوس قزح بننے لگے ہوں ۔ جب چڑیوں کی چہکار بھی ایک پُر مسرت آواز میں ڈھل رہی ہو ۔ جب رات اور دن کا جنم ایک دوسرے وجود میں ڈھل رہے ہوں ۔ جب انسان کو اپنے گناہ کا شعور بھی نہ ہو ۔ تب زخم بڑا گہرا لگتا ہے ۔ رُوح کی تہ در تہ پرتوں کو خون آلود کرتے ہوئے کبھی نہ مٹنے کے لئے ... کبھی نہ بھولنے کے لئے ۔

رابو پھوپھو کی آواز بڑی پُر اسرار لگنے لگی وہ ان کے پاس اور بھی سمٹ گئی ۔ "پھوپھو بات بتاؤ" وہ ہولے سے بولی ...

"فرح بی بی شائد تم میری بات سمجھ جاؤ جیسے کبھی میں نے سمجھی تھی اُن دنوں میری ماں مجھے اکثر ڈانٹتی اور کہتی تم اتنی خوش کیونکر رہتی ہو مجھے تمہارے اس حسن اِس سادگی اور بے پروائی سے ڈر لگتا ہے ۔ یوں بات بن بات مت ہنستی رہا کرو ۔ آنے والے دنوں کے لئے بھی کچھ بچا کر رکھ لو میری بیٹی ۔ کیا ساری عمر روؤگی جو یوں مسرتوں کو لٹاتی پھرتی ہو ۔ ماں ٹھیک کہتی تھی ۔ لیکن میں نے اُس کی بات کو سمجھا ہی نہیں تھا ۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ ساری کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لوں یا اُس میں سما جاؤں ... میرا سارا وجود ایک پُر مسرت ذرّہ تھا ۔ جو میری اپنی مُٹھی میں بند

تھا ۔ مجھے دنیا کا احساس ہی نہیں تھا ۔ مجھے دُکھوں کا ادراک ہی نہیں تھا ۔ بس ماں نے ایک بات کی تھی جو مجھے عجیب لگی تھی ۔ اور یہی بات بتانے کے لئے میں نے شام کے وقت چھت پر سے کامل کو بلا کر بتانی چاہی تھی ۔ شائد اُس شام چاند کا چہرہ شہر کی گلیوں میں جھانک رہا تھا ۔ دیواروں سے لگا گھروں میں اُتر رہا تھا ۔ روشنی بن کر دِلوں کو گھیر رہا تھا ۔ کامل مجھے اِس قابل لگتا تھا کہ میرے اس راز کا امیں ٹھہرتا ۔ آج وقت کے خار زار کو پار کرنے میں جان گئی ہوں کہ اپنی ساری سچائیاں سچ نہیں ہوتیں ۔ کچھ دوسروں کے سچ بھی ہوتے ہیں لیکن اس وقت میرا سچ صرف میرے اندر گردش کر رہا تھا اور میں اُسے کامل کے ساتھ بانٹنا چاہتی تھی مجھے اپنے بڑے ہونا کا ذرا بھی ادراک نہ تھا ۔ لیکن اُس لمحے کو بانٹنے سے پہلے بڑے بھیّا نے مجھے گھسیٹ کر دیوار سے نیچے اُتار لیا اور پھر میری سزا کا کبھی نہ ختم ہونے والا دور شروع ہوا ۔ شائد اس لمحہ کا وہ ذرہ میری مُٹھی سے نکل گیا خاک میں گُم ہو گیا تھا ۔ بھیا کی مار میں گُم ہو گیا ۔ میں اپنے گناہ کو سمجھ بھی نہ پائی تھی کہ سزا کی مستحق ٹھہری ۔ کامل تو ہمیشہ سے میرا ساتھی تھا ۔ ہم تو کھیل میں ہمیشہ ساتھی بنتے تھے ۔ پھر ۔ اور یہ پھر کبھی حل نہ ہوا آج تک میں اپنے آپ سے پوچھتی رہتی ہوں ـــــ شائد وہ لمحہ ایک بد قسمتی تھا یا میرا اپنا جذبہ ایک دھوکا تھا ۔ رابو پُھوپھو بولتے بولتے چپ ہو گئیں اور اُسے لگا جیسے اُس کے وجود کی دراڑیں کچھ اور پھیل گئی ہوں ... ماں کی طرح رابو پُھوپھو کا دُکھ بھی اُس کے اندر سرائت کر رہا تھا ۔

اُس نے رابو پھوپھو کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اُس کے اندر ممتا کا انوکھا سا جذبہ اُن کے سارے دُکھ سمیٹ لینا چاہتا تھا ـــــ اور یہ راز بھی انوکھا تھا پُراسرار تھا ۔

"رابو پُھوپھو وُہ شخص کیسا تھا" وہ اس سے پوچھنے لگی ۔ "وہ شخص ۔ فرح بی بی اب تو مجھے اس کی شکل بھی یاد نہیں ۔ لیکن بڑے بھیا کی مار کی ساری ٹیسیں مجھے آج تک یاد ہیں ۔ بھول ہی نہیں پائیں ۔ لیکن میں نے بڑے بھیا کو معاف کر دیا ہے" رابو پُھوپھو پھر مسکرا کر بولیں ۔

"پُھوپھو کیا دوسروں کی زیادتیوں کو معاف کر دینا ضروری ہوتا ہے ۔ آسان ہوتا ہے ۔ بھول جانے کے قابل ہوتا ہے ۔

"ہاں ۔ نہیں تو ہر سانس سینے میں پھانس بن کر اٹک جاتا ہے اور ہر لمحہ مرنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن موت نہیں آتی ۔ ہنسنا چاہتے ہیں لیکن ہنسی نہیں آتی ۔"

"لیکن ماں نے تو ابّو کو معاف نہیں کیا ۔ وہ تو شائد اُن سے بدلہ لے رہی ہیں" ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بھی آپ کی طرح ابا کو معاف کر دیتیں۔ انکل عرفان کا سہارا نہ ڈھونڈتیں ـــــ "شاید کسی روز وہ میری طرح اُسے معاف کر دے اور اندر کے عذاب سے چھوٹ جائے" ـــــ بدلے کا تصور انسان کو جسم کے ساتھ بندھے پتّھر کی مانند تہ کی طرف کھینچتا ہے ۔ اور میں تو کبھی بھی پاتال کی طرف جانا نہیں چاہتی تھی ۔ اُس وقت بھی جب میری مسکراہٹیں جاندار تھیں ۔ جب بڑے بھیا ہر روز مجھے مارتے تھے ۔ جب سزا کے بعد کامل میرے اندر حلول ہوتا محسوس ہوتا تھا ۔

لیکن معاف کرنے اور بھول جانے میں بڑی ریاضت کرنا پڑتی ہے ۔ اور پھر انسان سب کے دُکھ اپنے دِل کے اندر سمیٹ سکتا ہے ۔ زندگی کی سختی اور بے رحمی نے مجھے بھولنے اور معاف کر دینے کے اسی جذبے سے وابستہ کر دیا ہے ۔ نروان کا یہی لمحہ حاصل زندگی لگتا ہے ۔ اور تمہاری ماں ایک جیتی جاگتی عورت ہے ۔ جس کی نفی کی گئی وہ اسے بھول نہیں پائی ۔

"یہ نروان کا لمحہ کیا ہوتا ہے رابو پُھوپھو" اُس نے گہرے خوف اور دُکھ کے تاثر سے اُبھرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا ۔

"فرح بی بی یہ لمحے ہماری روح پر اوس کی مانند بے آواز اُترتے رہتے ہیں ۔ ہمیں بھگو ڈالتے ہیں ۔ اور ہمارے ہاتھ بے اختیار دُوسروں کی تھکی درماندہ روحوں کو سہلانے لگتے ہیں اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو ہماری اپنی روحیں ناسور بن جاتیں ۔ اُن میں سڑاند پیدا ہو جاتی" ——— رابو پھوپھو نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔ اسے لگا جیسے اس کے اندر بھی ایک طاقت اُبھر رہی ہو ۔ پیار اور اتھاہ ، ہمدردی سے لبریز ۔ معاف کر دینے کی شکتی لئے ۔ لیکن یہ راہ تو دُکھ کے صحرا سے گذرتی ہے ۔ تو اُونچا اُٹھنے کے لئے دُکھ ضروری ہے ۔ ویسی ہی اذیت برداشت کرنا پڑے گی جس نے ماں کو دوسرے شخص کی ذات میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور کر دیا ہے ۔ جس نے پُھوپھو کو اپنی ذات کو تج دینے کا سبق دیا ہے ۔ جس نے اُن کے چہرے پر انوکھا سا روپ بکھیر دیا ہے ۔

رابو پُھوپھو کیا نروان کے لمحے کے لئے بیگناہی کی سزا پانا ضروری ہے ۔ اُس نے پُوچھا ۔

"ہاں ۔ تب احساس کا الاؤ دہکتا ہے ۔ اور سب کے دُکھ سمجھ آنے لگتے ہیں ۔" رابو پُھوپھو نے اُٹھتے ہوئے کہا ۔

اور وہ وہاں بیٹھے بیٹھے اپنی عمر سے کہیں لمبا سفر طے کر گئی ۔ نئی طاقت کا ادراک اس کی روح میں پیدا ہونے لگا ۔

اُس نے اپنے ماں باپ کو دِل ہی دل میں معاف کرنے کی کوشش کی ایسے میں انسان اپنے اندر ہی اندر بلند اُٹھ جاتا ہے اور وُہ محسوس کرتی وہ ماں اور باپ سے زیادہ عقلمند ہو ۔ لیکن جینا اور مسکراتے رہنا آسان نہیں تھا ۔ روح کی بالیدگی اور دل کی فراخدلی کے جنگل میں راہ بنانے کے لئے کئی صلیبوں کو اپنے کندھوں پر اُٹھانا پڑتا ہے ۔ سُرخ آنسوؤں کو ہتھیلیوں سے سمیٹنا پڑتا ہے تار تار لبادے میں ٹھٹھرتے وجود میں برداشت کی قوت پیدا کرنا پڑتی ہے ۔

اور وہ بار بار راہ سے بھٹک جاتی ——— اُس کے اندر نفرت پیدا ہونے لگتی ۔ دوسروں کی زیادتیوں کے بدلے میں خود بھی زیادتی کرنے کو دِل چاہتا ۔ اندر کی روشنی بجھنے لگتی ۔ کوئی اس قابل نہیں تھا کہ اُن کے لئے دِل کو دکھایا جائے وہ بھائی سے بات بے بات لڑتی ۔ ماں کی آواز سنی ان سنی کر دیتی ۔ پھوپھو کی چہرے کی طمانیت کو فریب سمجھنے لگتی ۔ وُہ سوچتی ۔ زندگی ایک بڑے فریب کے پس پردہ چُھپی ہوئی ہے ۔ شائد ماں اور رابو پھوپھو بھی ایک

فریب ہیں اور فرمان انکل بھی جو ماں کے چہرے پر زندگی کی جوت بن جاتا ہے اور وہ خود بھی جو نیکی کی تلاش میں سرگرداں ہے ۔

لیکن دوسرے لمحے نیکی کرنے کی شدید خواہش اُس کے دل کے اندر باہر اُمنڈنے لگتی لیکن اگلا لمحہ پھر رنگ بدلتا ۔ سارے چہروں پر جُھوٹ اور گندگی پھیل جاتی اور اُس کا دل چاہتا کہ زور زور سے قہقہے لگائے ۔ اُن کے چہروں پر لٹکتے لبادوں کو نوچ پھینکے ۔ وہ زور سے قہقہہ لگاتی اور اُس کا دِل ٹھنڈے بے حس کر دینے والے احساس سے بھر جاتا اور اُسے اپنا باپ بڑا مظلوم اور اکیلا دُکھی انسان لگتا جو انسانوں کے بطون میں جھانکنے کی طاقت ہی نہ رکھتا ہو ۔ اُس کی طرح .بیچارا میرا باپ جسے اپنی مردانگی کی تکمیل کے لئے ایک عورت کے مظلوم جسم کی ضرورت ہے .بیچارا بھائی جو سوچ کے دوراہے پر کھڑا نامکمل احساسات میں اُلجھا رہتا ہے ۔ بیچاری رابو پھوپھو جو اپنی محرومی کو بہت ہی بلند جذبے کا نام دیتی ہیں ... یہ تو سوچ کا جال ہے ۔ تو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے کسی جال کی ضرورت ہوتی ہے ۔ وُہ اُلجھ رہی تھی اور اُس کو اس اُلجھن سے راہ بنانی تھی وہ چاہتی سب اُس کو دیکھیں ۔ شائد اُس کے اندر باپ کا کردار زندہ ہو اٹھتا تھا ۔ لیکن وہ اُس احساس سے اُلجھ جاتی ۔ نہیں نفرت تو اندھیرا ہے ۔ اور محبت روشنی ۔ اور راہیں صرف روشنی میں نظر آتی ہیں ۔ اندھیرے گہری کھائیوں میں گرا کر مار دیتے ہیں۔

لیکن اُس کے اندر کا تضاد ختم نہ ہوتا ۔ وہ کبھی سب سے نفرت کرنے لگتی اُن کے چہروں پر پڑے نقابوں کو نوچ لینا چاہتی لیکن پھر ان کے دُکھ سمیٹ لینے کا جذبہ ہمیشہ کی طرح زندہ ہو جاتا وہ خود سوچ کے فریب کا شکار ہو رہی تھی ۔ رابو پُھوپھو جو کتابوں میں ڈوبی رہتیں یا لمبے سجدے میں کھو جاتیں تسبیح کے دانے گنتے گنتے ان کی انگلی کی پور درد کرنے لگتی ۔

رابو پھوپھو انسان کے اندر اتنی گُھٹن کیوں ہے ۔ وہ ہمیشہ کی طرح اپنی ہر اُلجھن کے لئے اُن کے پاس پہنچ جاتی ۔ "سب لوگ کھل کر کیوں نہیں جی لیتے ۔ ہمیشہ دوسروں کا سہارا کیوں ڈھونڈتے ہیں ۔

"فرح بی بی کُھل کر جینے سے معاشرے کے کمزور حال کی ڈور ٹوٹ جاتی ہے" اور انسان تال میں نیچے ہی نیچے گرنے لگتا ہے اور یہ گرنا کبھی منزل کو چھو نہیں پاتا ۔

"اور ہم ساری عمر اس ٹوٹے جال کو جوڑنے کی کوشش میں جیتے رہتے ہیں ۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گی ۔ میں اپنی زندگی جیئوں گی ۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا ـــــ آپ دیکھ لیجئے گا ـــــ میں وہی کروں گی جو میرا جی چاہے گا ـــــ اور بی بی کہیں اُس راہ پر تمہارا دُکھ بانٹنے والا کوئی نہیں ہو گا ـــــ تم سہاروں کی طرف لپکو گی لیکن سہارے سایوں کی طرح معدوم ہو جائیں گے ۔ پھر کیا کرو گی ... سوچنا پڑتا ہے بے شک سوچنا بیکار تو ہے ۔ لیکن پھر بھی ... رابو پھوپھو کیا تم نے کامل کا سہارا ڈھونڈا تھا ـــــ پھوپھو کا چہرہ ایک لمحے کو سفید اور بے رنگ ہو گیا ... جیسے یادوں کے انگنت کانٹوں نے ان کی ہستی میں درد ہی درد بھر دیا ہو ۔ ان کی آنکھیں دور کہیں ماضی کے

سایوں میں اُلجھ گئی تھیں ۔ اُن کا خوبصورت چہرہ دُھندلا سا گیا ۔

نہیں ۔ اُس کے بعد میں نے کامل کو کبھی نہیں دیکھا ۔ میں نے اُسے چاہا ہی کب تھا فرح بی بی ۰۰۰ وہ تو بس اُس مار کے ساتھ آہستہ آہستہ میرے اندر حلول کرتا گیا ۔ جو بڑے بھیا اندر کی کوٹھری میں ہر روز باہر جاتے ہوئے میرے جسم پر داغتے تھے ۔ اُس کا نام میں نے کبھی اپنی زبان سے ادا نہیں کیا تھا ۔ بس بڑے بھیا کی زبان مہینوں اُس کے نام کا ورد کر کے میرے کانوں میں اُنڈیلتی تھی اور پھر مجھے لگنے لگا جیسے میں اور کامل الگ نہیں ہیں ۔ تب وہ مار مجھے بڑی اپنی اپنی لگنے لگی میرا سارا وجود اُس مار سے وابستہ نام سے لبالب بھر گیا ۔ میں اکیلی نہ رہی اور پھوپھو کیا آپ آج بھی ۰۰۰ اُس نے حیران ہو کر سوال ادھورا چھوڑ دیا ۰۰۰

آج بھی فرح بی بی ۰۰۰ شائد آج بھی میں اُس کے نام کی بیوگی کاٹ رہی ہوں ۰۰۰ پُھوپھو کے لہجے میں پُرسکون ٹھہراؤ تھا ۰۰۰ شانت اور ساکت گھمبیر اور درد سے بھرپور ۰۰۰ تباہی اور آبادی کا عجیب سا اتصال ۰۰۰ وہ رابو پُھوپھو کی آنکھوں میں انوکھی سی لہروں کو ہچکولے لیتے دیکھتی رہی رابو پھوپھو کی انگلیاں تسبیح کے دانوں پر ساکت ہو گئیں ۰۰۰ اور وہ آنسو بھری آنکھوں سے وہاں چپ چاپ بیٹھی اُن کو دیکھتی رہی ۔ جیسے وہ ساری مار اُس کے جسم کی دراڑوں میں دوسری بہت سی باتوں اور دُکھوں کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی ہو ۰۰۰ قطرہ قطرہ جم کر پہاڑ بن گئی ہو ۔

رابو پُھوپھو کاش میں آپ کے دُکھ بانٹ سکتی ۔ اُس نے اُن کے نازک سے جسم کو اپنے بازوؤں کے دائرے میں لیتے ہوئے آنسوؤں سے رُندھی آواز میں کہا میں آپ کے ساتھ اِس ناانصافی کے لئے ابا کے ہاتھ روک لیتی ۔ وہ آہستہ آہستہ اُن کے جسم کو سہلانے لگی ۔

نہیں بی بی وہ لمحہ وقت کے نا ختم دائرے میں داخل ہو کر ماضی کا حصہ بن گیا ۔ لیکن وہ آج بھی میرے دل پر ہر روز بیتتا ہے ۔ ہر روز اُس مار کی ٹیسیں میرے اندر چیخیں بن جاتی ہیں ۔ شائد سارا قصور میرا تھا ۔ وہ مجھے اس قابل لگا تھا ۔ آج عمروں کے فاصلے پر کھڑی میں بہت کچھ جان گئی ہوں ۔ لیکن تب ـــــ وہ ایک ساعت کے لئے مسکرائیں تب میں نہیں جانتی تھی کہ کیوں رازداں بنائے جاتے ہیں ۔ کیوں دل بے اختیار ہو کر کسی کی گردن میں معصوم بچے کی طرح جھول جانا چاہتا ہے کیوں اِسے برا سمجھا جاتا ہے ۔ اُس وقت میں اپنے گناہ کو سمجھ ہی نہیں پائی تھی ۔ لیکن اب میں خود اپنے آپ کو سزا دے رہی ہوں ۔ گناہوں کی سزا ملنی ہی چاہیے بی بی" ـــــ وہ پھر مسکرا دی اور اُن کے سفید گالوں پر آنسو بہنے لگے ۰۰۰ بی بی کبھی انسان غلط ہوتے ہیں اور کبھی ساعتیں اس نے اُس سے بات کرنے کے لئے غلط ساعت کو چُنا تھا ۔ یا اس لمبی سزا کی معیاد میری پیشانی پر تحریر تھی ۔

"کیا دادا اور دادی اماں بھی آپ کی سزا میں اُن کے ساتھ تھے" ۔ اُس نے کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے پُوچھا ـــــ اور اُس کا دِل خوف اور نفرت سے اندر ہی اندر بیٹھ گیا ـــــ فرح بی بی اُس وقت عورت کی زبان نہیں ہوتی تھی ۔ صرف جسم ہوتا تھا ۔ جس کو جس طرح چاہو برت لو ـــــ اماں نے اس واقعہ کے بعد مسکرانا چھوڑ دیا تھا ـــــ اور میاں

جی باہر کی بیٹھک میں چُپ چاپ بیٹھے حقہ پیتے رہتے۔ اُنہوں نے کبھی بڑے بھیا سے سوال نہیں کیا تھا۔ بس وہ آنکھیں نیچی کئے خاموش رہتے۔ اُنہوں نے اُس دن کے بعد میرے چہرے پر کبھی نظر نہیں ڈالی تھی۔ "آپ نے احتجاج تو کیا ہوتا" ـــــ وہ زور سے زمین پر پاؤں مار کر پوچھ رہی تھی "آپ بے جان بت کی طرح مار کھاتی رہیں ـــــ آخر کیوں ـــــ آخر کیوں آپ نے ابا کے ہاتھوں کو پکڑ نہیں لیا ـــــ کیوں آپ کے بڑے بھیا نے آپ کے حصّے کی ساری خوشیاں اپنی مٹھی میں بند کر لیں ـــــ آخر کیوں" ـــــ رابو پھوپھو کا جسم ہولے سے کانپا اور یہ ارتعاش فرح کے جسم میں منتقل ہو گیا۔ "بی بی مجھے بولنا آتا تھا۔ میں کس سے کیا کہتی ـــــ رابو پھوپھو نے آنکھیں جھکا لیں مجھے تو آج بھی کچھ کہنا نہیں آتا۔ "لیکن رابو پھوپھو میں بولنا سیکھوں گی۔ احتجاج کرنا سیکھوں گی۔ اپنا حق چھیننا سیکھوں گی ـــــ اور بغاوت کرنا بھی ـــــ سُنا آپ نے ـــــ میں آپ کا بدلہ لوں گی ـــــ ابا سے اور اس دُنیا سے جس نے یہ انوکھے اصول بنائے ہیں" اُس نے اپنے اندر بڑھتے غصّے کو الفاظ میں ڈھالتے ہوئے محبت اور رحم سے رابو پُھوپھو کو دیکھا ـــــ شائد محبت دل میں یونہی گیان دھیان کا آسن بنا کر بیٹھ جاتی ہے اور ایک نامعلوم نام آپ کی ساری ذات کو نِگل لیتا ہے ـــــ لیکن مجھے کبھی کوئی نِگل نہیں سکے گا کوئی میرے جسم پر سختی سے ہاتھ نہیں اُٹھا سکے گا ـــــ وہ اُس اندھیرے کمرے میں رابو پُھوپھو کے ساتھ جُڑ کر بیٹھ گئی جیسے اُن کے جسم کے سارے کانٹے چُن لینا چاہتی ہو۔

رابو پھوپھو وہ شخص کیسا تھا ـــــ وہ جاننا چاہتی تھی۔ "میں نے کہانا بی بی اب تو مجھے اس کی شکل بھی یاد نہیں۔ لیکن ٹیسیں یاد ہیں۔ وہ میرے وجود اور ذہن سے مٹ نہیں پاتیں۔ لیکن میں نے بڑے بھائی کو معاف کر دیا ـــــ کب سے میں انتقام کے عذاب سے چھوٹ گئی اپنے ہونے کے عذاب سے چھوٹ گئی۔ وہ دونوں اُس چھوٹی سی کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہی تھیں جس کے سامنے برگد کے چوڑے پتّے سَر سَر بہتی ہوا میں ہولے ہولے سر سراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ فرح کا دل جو تھوڑی دیر پہلے انتقام کے جذبے سے اُس کے پہلو میں اُچھل کر باہر آجانا چاہتا تھا۔ ایک دم شانت اور خاموش ہو گیا ـــــ بہت سی ناولوں کے کردار اس کے ذہن میں اکٹھا ہونے لگے۔ معصوم۔ بے بس۔ ظالم۔ مظلوم ـــــ بے بس شاطر اور آنسو بہاتی برھنیں۔ خود کشی کرتی کہانی کی ہیروئنیں ـــــ رابو پُھوپھو کونسا کردار تھیں سچ کیا تھا وہ ہمیشہ باتوں اور لوگوں کے بارے میں مشکوک ہو جاتی تھی شائد یہ سچ سچ نہ ہو محض ایک مفروضہ ہو بے گناہی ثابت کرنے کا ایک بہانہ ہو۔ اور وہ اِن شکوک کو اپنے دل میں چُھپانا اور کُڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ کُھل کر جینا کتنا سہانا ہو گا۔ کتنا خوشگوار تجربہ ہو گا۔

"پُھوپھو آپ کہیں ابا سے بدلا تو نہیں لے رہیں۔ اُس نے اُس ملگجے اندھیرے میں آگے بڑھ کر اُن کی آنکھوں میں جھانکا ان کی خوبصورت آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"میں نے کہا نا بی بی بدلہ انسان کو پاتال کی طرف کھینچتا ہے۔ اور میں تو کبھی پاتال میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ اُس وقت بھی جب میری مسکراہٹیں جاندار تھیں۔ جب بڑے بھیا روز مجھے مارتے تھے۔ جب غیر معلوم طور پر کامل مجھ

میں حلول کر گیا تھا۔ جب میری آنکھوں کی نمی کبھی خشک نہیں ہوتی تھی لیکن فرح بی بی معاف کرنے اور بھول جانے میں بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اور اب — اب تو میں ساری دُنیا کے دُکھ اپنے اندر سمیٹ سکتی ہوں۔ شائد وقت کی طوالت اور سختی نے میری روح اور جسم پر بیت بیت کر مجھے نروان کے اُسی لمحے سے آشنا کر دیا ہے جو مہاتما بدھ پر برگد کی گھنی سیاہ چھاؤں تلے وارد ہوا تھا۔

رابو پھوپھو کے چہرے پر اس اندھیرے میں بھی ایک روشنی چھاگئی اور اُن کا چہرہ اُس ساکت اندھیرے میں اور بھی خوبصورت لگنے لگا۔ اور فرح حیران ہو کر اُس چہرے کو دیکھنے لگی جو ہمیشہ سے اُسے اچھا اور اپنا لگتا تھا۔

نروان — نروان جو روح پر وارد ہوتا ہے جو مہاتما بدھ پر اترا تھا۔ جو رابو پھوپھو پر اترا تھا جس میں انسانی گناہوں کو بخش دینے کی غیر فانی طاقت ہوتی ہے۔ یہ لمحہ کیا سب پر وارد ہو سکتا ہے۔ شائد مجھ پر بھی۔ جب انسان اپنے اندر کی دلدل سے اُوپر اُٹھ کر پاکیزہ اور اُونچا ہو جاتا ہے۔ وہ بات کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ نروان کیا ہوتا ہے اور اِس کا احساس کیونکر ہو سکتا ہے" —— وہ ہمیشہ کی طرح سوال کر رہی تھی ——

فرح بی بی یہ نروان کے لمحے ہماری روح پر اوس کی مانند چپکے چپکے اُترتے رہتے ہیں ہمیں سر تا سر بھگو ڈالتے ہیں اور پھر ہمارے ہاتھ بے اختیار دوسروں کی زخمی روحوں کو سہلانے لگتے ہیں۔ اگر یہ لمحے ہماری زندگیوں میں نہ آتے تو ہماری اپنی روحیں زخم زخم ناسور بن جاتیں۔ اُن میں سڑاند پیدا ہو جاتی —— رابو پھوپھو نے اُسے ساتھ لگا کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

تو کیا مجھے بھی اِسی راہ پر چلنا پڑے گا۔ اُس نے گھبرا کر سوچا ویسی ہی کربناک اذیت برداشت کرنا پڑے گی۔ جس نے پھوپھو کے چہرے پر انوکھی سی خزاں کو پیدا کر دیا ہے۔ اُسے بہت ہی خوبصورت بنا دیا ہے لیکن میں رابو پھوپھو کی طرح خوبصورت نہیں ہوں۔ مجھے خوبصورت بننا پڑے گا۔ برہن کا کردار کرنا پڑے گا۔ وہ خوفزدہ ہو رہی تھی —— رابو پھوپھو اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہوا برگد کے درخت میں تیز سرسراہٹ پیدا کرتی گذر رہی تھی۔ سیاہی کا ان دیکھا وجود اُن کے گرد لپٹا جا رہا تھا۔

دوسروں سے محبت کرنے اور معاف کر دینے کا حوصلہ ـــ۔ بھول جانے کی شکتی —— محبت کرنے کا جذبہ —— دینے کی شدید خواہش۔

فرح بی بی بڑے بھیا کی مار نے میرے لئے آسانی پیدا کر دی تھی۔ میرے اندر روشنی کا کوندا سا لپکنے لگتا اور مجھے دوسرے کے دُکھ خود بخود سمجھ آنے لگے تھے۔ دوسروں سے محبت کرنے میں بڑی طاقت ہے۔ تم بھی محبت کرنا سیکھو صرف محبت —— الفاظ کی دوسرا تہ کی بخش دینے کی ——

اور رابو پھوپھو کے حوالے سے اُس کا دل اِس دُکھ سے آگاہی کی منزلیں آہستہ آہستہ طے کر رہا تھا —— کتابیں جو اُس کے باپ کی لائبریری میں دیواروں تک اُٹھی ہوئی تھیں انوکھی دُنیا میں اور اُس کا باپ اُن میں گھرا بھی صرف اپنی

زندگی جیتا تھا ۔ اپنی خوشیوں پر ہلکورے لیتا تھا ـــــ شکار کے جانور کو ذبح کرتے ہوئے اُس کے چہرے کی چمک بڑھ جاتی۔ بُھنا گوشت کھاتے ہوئے اُس کی زبان بار بار باہر کو لپکتی ـــــ اور پھر وہ مردانے میں جاتے ہوئے ماں کو خواہ مخواہ ایک لات ضرور جماتا ۔ شاید یہ اُس کی مردانگی کا آخری جھونکا تھا جس کے بعد وہ گہری نیند سو جاتا ـــــ بھائی اپنے کمرے کا دروازہ زور سے بند کر لیتا ـــــ پُھوپھو کا جسم ہولے سے کانپتا اور ماں کا سر گھٹنوں میں جُھک کر شرمندگی سے آنسو بہانے لگتا ۔ اور وہ خود پیار اور نفرت کے گرداب میں پھنس جاتی ۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا اُس کی آنکھ رات آہستہ سے کُھل جاتی تو ماں بستر پر نہ ہوتی ـــــ وہ دُور برگد کے سیاہ سائے تلے فرمان انکل کے پاس چُپ چاپ بیٹھی اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتی آہستہ آہستہ سسکتی رہتی ـــــ اور رابو پُھوپھو کے کمرے کی روشنی ہمیشہ اُس وقت بُجھتی جب ماں فرمان انکل کے ساتھ سیاہ سائے میں چپ چاپ بیٹھی ہوتی ۔

یہ ساری زندگی قابلِ نفرت تھی ۔ بیمار اور تعفن زدہ تھی ـــــ ماں بھیا۔ رابو پھوپھو اور وہ خود سیاہ آسمان برگد کا گھنا سیاہ سایہ ـــــ سب نفرت زدہ اور خوفناک لگنے لگتے ـــــ اُسے اپنے آپ سے بھی بدبو کا احساس ہونے لگتا ـــــ اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ حقیقتیں نہ ہوں دیواروں میں قید سائے ہوں ۔ اُسے لگتا جیسے اُس کا باپ آئینہ خانہ میں قید اپنی ہی پوجا میں مصروف ہو ۔ اُنہیں وہ دستک کبھی سنائی نہ دیتی جو اُس کی ماں کا زخمی وجود اور اَنا بار بار اُس کے بند دروازے پر دیتی ۔

"بڑے بھیا اپنے گنبد میں زندگی کے تمام احساسات سے محفوظ ہو کر بیٹھ جاتے ۔" رابو پُھوپھو نے ہمیشہ کی طرح اُس کے سوال کے جواب میں کہا تھا ۔

اُس کے گرد تنے رشتوں کے جال سارے کے سارے کس قدر بے معنی تھے ـــــ سائے اور سایوں میں بند آوازیں ۔ ہاں اُس کے باپ کی آواز اُسے چاروں طرف گونجتی لگتی جیسے کہہ رہی ہو ۔ مجھے دیکھو میں جو آدم ہوں ۔ میں ہی صرف چابک پکڑے تم سب کی برہنہ پشتوں کو داغدار کرنے کا حق رکھتا ہوں ـــــ۔ ہمیشہ کی طرح وہ اپنے اندر اور بھی سکڑ جاتی۔ تاریک کونے میں دُبک جاتی ۔ صرف باپ کی آنکھوں کا خوفناک سایہ اُس کے ذہن کی سکرین پر رقصاں رہتا ۔ شائد سارے آدم ایک جیسے ہوتے ہیں ـــــ اُسے باپ اور بھائی سے شدید نفرت ہونے لگتی ـــــ طاقتور اور خود غرض اُسے برے لگنے لگے ۔

وہ ماں سے کہتی ـــــ میں آپ کی جگہ ہوتی تو کب کی اِس گھر کو چھوڑ چکی ہوتی ـــــ آپ اس شخص کو کبھی معاف مت کیجئے گا جو بغیر وجہ آپ کو مارتا ہے ـــــ وہ راز کیا تھا جس نے اُس کے باپ کو ایک خونخوار درندہ بنا دیا تھا ـــــ لیکن پھوپھو بھی اُس راز کو کبھی نہ کھولتیں ـــــ اور ماں بھی چُپ رہتی ۔ شائد فرمان انکل ـــــ لیکن پھوپھو نے کہا تھا ۔ نہیں فرح بی بی ـــــ فرمان انکل تو وُہ دیوار ہیں جو تمہاری ماں کے گرتے وجود کو ہر بار تھام کر جینے کی راہ پر ڈالتی ہے ۔ یہ تو تمہارے باپ کے اندر کا ازلی مرد ہے جو عورت کے وجود کو رگیدتا بھنبھوڑتا اور پھر اپنی لپکتی زبان

سے اُس کا خون چاٹ کر پُر سکون ہو کر گہری نیند سو جاتا ہے ـــــ اُسے چاہنے اور چاہے جانے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ـــــ زندگی صرف اشتہا ہی اشتہا ہے ـــــ نہیں پھوپھو ـــــ صرف اتنی سی بات ـــــ وہ بے یقینی سے بولی ـــــ

نہیں بی بی یہ اتنی سی بات تو نہیں ـــــ یہ تو انسان کے اندر چُھپے درندے کی پُوری کہانی ہے اور تم اس کو اتنی سی بات کہتی ہو ـــــ زندگی کی تلخیاں ایسی سچائیاں ہیں جن کو جاننے کے لئے کرب چاہیے اور خدا کرے وہ وقت تم پر کبھی نہ آئے ـــــ

لیکن وہ تو اس ساری تلخ سچائیوں کے باوجود جو ماں کے آنسوؤں ـ پھوپھو کے خاموش احتجاج اور بھائی کی یخ لاتعلقی کے درمیان جینے کی کوشش کر رہی تھی ـ ان بدصورتیوں کو زور لگا کر اپنے دل سے پرے دھکیل دیتی ـ زندگی اتنی بدہیئت اور بدصورت نہیں ہو سکتی وہ تو ان سب کی محبت کی ڈور کو اپنے دل کے گرد لپیٹا ہوا پاتی تھی جس سے اُسے رہائی پانا اچھا نہیں لگتا تھا ـ اور پھوپھو نے ہمیشہ کی طرح کہا تھا ـ فرح بی بی میں نے بڑے بھیا کو معاف کر کے بڑا سکون پایا ہے ـ اور فرح کا دل ماں کے جسم کو سہلاتے ہوئے مامتا کی پھوار سے بھیگ بھیگ جاتا ـ وہ سوچتی پھوپھو ماں کو ورغلا کر باپ سے بدلہ لینے پر اکساتی ہیں ـ بے راہرو کرتی ہیں ـ اُس کا جی چاہتا وہ باپ کو سب کچھ بتا دے ـــــ یہ راز اُسے اپنی دِل کی طاقت سے بہت بڑا لگتا ـ لیکن پھر ماں کے آنسو اور اُس کے جسم کا درد ـــــ

پھوپھو اُس کی آنکھوں کو پڑھ کر تھوڑا سا مسکرائی ـ

فرح بی بی تمہاری آواز میں شک ہے ـ مجھے بھی کبھی کبھار اپنے آپ پر شک ہونے لگتا ہے ـ میرا اندر کا خود پسند انسان کبھی کبھار لمبے مراقبے سے چونک کر سر اٹھاتا ہے تو سب کچھ ویسا نہیں رہتا ـ میں پھر گزرے دور کے شدید احساس میں مبتلا ہو جاتی ہوں ـ لیکن بی بی میں نے کہا نا بدلے کا پاتال تو بڑا ہی گہرا ہے ـ پر روشنی سے تہی ـــــ لیکن میں نے سب کچھ سہار کر بھی پاتال میں کبھی نہیں جھانکا ـ اتنا بڑا دکھ بھول کر زندگی کی مکمل بربادی کو بھول کر" وہ زندگی کے سب رازوں کو جان لینا چاہتی تھی تاکہ اپنی آنے والی زندگی میں کبھی دھوکا نہ کھا سکے ـ

فرح بی بی قدرت نے ایک خاص وقت تک ساتھی کی پُکار کو اندر محبوس کر رکھا ہوتا ہے ـ اور جب وہ کوک اندر سے نکل کر جنگلوں جنگلوں گونجتی ہے صحراؤں کی گرم اور سرد ہواؤں کے ساتھ مل کر ریتلے ٹیلوں کے درمیان گھومتی ہے تو پُھولوں میں رنگ اور ہوا میں خوشبو بن جاتی ہے ـ یہ سب کچھ ازل سے دِل کے اندر ہوتا ہے بی بی اور پھر ـــــ ایک لمحہ جو ہاتھ کی پوروں سے پھسل جاتا ہے تو کہیں امان نہیں ملتی ـــــ

رابو پھوپھو شاید اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھیں ـ اُس کے ہاتھ میں رابو پُھوپھو کا سَرد ہاتھ کانپ رہا تھا لیکن چہرہ برسوں جھیلی اذیت اور اکیلے پن کے عذاب کے باوجود روشنیوں اور سایوں کی جھلملاہٹ میں ہمیشہ کی طرح جاذب نظر تھا ـ

رابو پھوپھو ـــ پھر ـــ پھر آپ نے اپنے آپ کو تج دیا ۔ جوگ لے لیا" لیکن اس وقت رابو پھوپھو یاد کے دوزخ میں دھڑ دھڑ جل رہی تھی ..." ہاں بی بی پھر اس لمحے کے بعد سب کچھ عمیق بربادی کے سیاہ گڑھے میں کھو گیا ۔ اُس کا جی چاہا وہ ماں کی طرح اُن کے جسم کو سہلائے اور ان کے سارے آنسو اپنے جسم میں بنتی دراڑوں میں چُپ چاپ اُتار لے اُن کے سارے کرب سمیٹ لے ۔

نہیں بی بی ـــ مجھے مار سے اتنا درد نہیں ہوتا تھا جتنا ماں اور میاں جی کے چُپ رہنے سے ہوتا تھا ـــ اُنہوں نے بھی مجھے اپنے دِل کے دروازوں سے باہر دھکیل دیا تھا ـــ وہ مجھ سے کچھ تو پوچھتے ۔ میرا سوال ان کہا رہ گیا ـــ ماں اور میاں جی بھی نہ رہے ۔

"پھوپھو آپ نے تو گناہ کیا ہی نہیں تھا ۔"

ہاں میری بچّی ۔ میں تو اُس روز سے اپنا گناہ جاننے کے لئے بار بار اپنے آپ سے پوچھتی رہی ہوں ۔ کہ میرا قصور کیا تھا ۔ میں نے کیا کیا تھا ۔ اور تمہاری ماں بھی مار کھا کر مجھ سے پوچھتی رہتی ہے کہ اُس نے کیا کیا ہے ۔ لیکن ہم دونوں بڑے بھیا سے سوال نہیں کر سکتے ۔ صرف خاموش رہ سکتے ہیں ۔

حالانکہ رابو پھوپھو زندگی کے سیاہ سمندر میں چند بے ضرر محبت بھرے بول کبھی کبھار جینے کی راہ بن جاتے ہیں ۔ اور اندھیروں میں جینا بڑا خوفناک ہوتا ہے ۔

"تو پھوپھو فرمان انکل بھی مانگا ہوا دیا ہی تو ہیں ۔ ماں کا دِل بھی اندھیرا ہی ہے"۔

"میری بچّی وہ صالحہ کے گھر کی روشنی نہیں بن سکتا ۔ لیکن اُسے جینے پر اُکساتا تو ہے ۔ اور میں چاہتی ہوں تمہاری ماں صالحہ تم لوگوں کے لئے جیتی رہے ۔ اُسے ہم سب کے لئے جینا چاہیے اور تُم اُسے معاف کر دینا ۔ اُس کے بارے میں کبھی بُرا نہ سوچنا ـــ اُنہیں وقتی طور پر خوش ہونے کا تھوڑا سا حق تو ہے ۔

رابو پھوپھو کی آواز میں رحم ہی رحم تھا ۔

وہ دونوں اُس روز اُسی برگد تلے اُسی جگہ بیٹھی تھیں جہاں اماں اور انکل فرمان بیٹھتے تھے ۔ شائد وہ اُن ویران لمحوں کو جو دِلوں پر بیتتے ہیں اپنے اندر سمو لینا چاہتی تھیں ۔ فرح کو لگا جیسے اُس کا وجود بھی اُس برگد تلے بیٹھا اپنے بطن سے اُوپر ہی اوپر اُٹھ رہا ہو ۔ رابو پھوپھو کا ہاتھ تھامے ہوئے ـــ لیکن ماں تو اُس کے دِل سے دُور ہٹتی جا رہی تھی ـــ "لیکن میں امّی کو کیسے بخش سکتی ہوں ۔ میں تو اُن سے چھوٹی ہوں ۔" "نہیں فرح بی بی تم ہمیشہ چھوٹی نہیں رہو گی ـــ جب مجھ پر یہ سب کچھ بیتا تو میں بھی چھوٹی تھی ۔ مجھے اپنے جذبوں کی کچھ بھی سمجھ نہیں تھی ۔ شائد اِس سے آگے زندگی میں کچھ ہو ۔ لیکن زندگی کا دروازہ میری دانِست پر ہمیشہ بند کر دیا گیا ۔ میں بھی اپنے اندر ہی بند ہو گئی ۔ بڑے بھیا کی مار کے باوجود میں نے شادی سے انکار کر دیا ۔ میرے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادی ہو گئی ۔ میں نے زندگی کی ساری ہستی اُس ایک ساعت میں گنوا دی ۔ اور اپنے دامن کو خالی کر لیا ۔ لیکن تم کبھی ایسا نہ

کرنا خوشیوں کو ڈھونڈنا ۔ انہیں پانے کی تگ و دو کرنا ہستی کو قائم رکھنا اور معاف کر دینے کے جذبے کو کبھی نہ بھولنا سب سے بڑا ثواب تو دوسروں کو سمجھنا اور اُن کے زخمی وجود کو درگذر کے ہاتھوں سے سہلانا ہے ۔"

پُھوپھو تیز تیز قدموں سے چلتیں اپنے کمرے میں چلی گئیں اور دروازہ بند کر لیا ۔

برگد چاند کی شاخوں میں چھپا شریر بچے کی طرح چمکتی زندگی سے بھرپور آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا ۔ لیکن کیا چاند دلوں پر بیتی آپ بیتیوں کو پڑھنے کی طاقت بھی رکھتا ہے ۔ نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتا ـــــ میں نے سوچا شائد یہ چاند بھی اُس روز پُھوپھو کے ساتھ دیوار کے اُوپر سے کامل کو جھانک رہا ہو ۔ شائد اس نے اِن کو بچپن میں ساتھ ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے دیکھا ہوگا ۔ رابو پھوپھو کے معصوم قہقہے سُنے ہوں گے ۔

اور کامل ـــــ کیسا ہوگا وہ انسان جو میری رابو پُھوپھو کی ساری خوشیاں نوچ کر بھاگ گیا ۔ اور میرا باپ ـــــ جو نہ جانے کب تک اُس ناکردہ گناہ کی سزا دیتا رہا ۔ یہاں تک کہ پُھوپھو نے زندگی سے جوگ لیا ۔ اُسے چاند پر غُصّہ آرہا تھا۔ اُسے ساری کائنات بہت چھوٹی اور حقیر لگ رہی تھی ۔ جس کے لئے جس کے اندر جی کر کیا کیا جاسکے گا ۔

کیا جینا ضروری ہے ۔ زخم کھانا ضروری ہے ۔ مرہم لگانا ضروری ہے ۔ کسی کی ذات کی نفی کر دینا ضروری ہے ۔ اور ماں نے اُس کے باپ کی ذات کی نفی کا اپنا ہی انداز اپنایا ۔ مار کھاکر کبھی اُس کی طرف نہیں دیکھا ـــــ اور وہ خود کیا تھی ۔ ایک معمولی لڑکی جو کتابوں کے سہارے بہت سی باتوں کو جاننے کی کوشش میں نڈھال ہو رہی تھی ۔ لیکن اُس کے اندر اپنی الگ دنیا آہستہ آہستہ بیج میں چھپے پودے کی طرح عیاں ہو رہی تھی ۔ شائد میں کبھی اِس پودے تلے بیٹھی سچّی خوشی سے مسکرا سکوں ۔ شائد میرا جسم مار کی ضربات سے بچ جائے ـــــ شائد کوئی ہاتھ آگے بڑھ کر مجھے تھام لے اور پھر میں مسکراتی رہوں" ـــــ شائد خوشیاں ہمیشہ جھانجریں پہنے میرے گرد ناچتی رہیں ـــــ اور میں اُن کے سنگیت میں کھو جاؤں ۔ رابو پُھوپھو نے بھی میری طرح خواب دیکھے ہوں گے ۔ میری طرح ... لیکن ... وہ اکیلے پن سے خوفزدہ ہو گئی ـــــ یہ کتنے عظیم دُکھ ہیں جو اکیلے ہی سہارنے پڑتے ہیں اور رابو پُھوپھو زمانوں سے اِس اکلاپے کے خوف میں مُبتلا جی رہی ہیں ۔

وُہ بھی شعور کے ساتھ آگاہ نہیں ہو پائی تھی ۔ ابھی تو اُس نے اُس تھَل کو صرف کتابوں کی راہ پر سے چننا تھا تجربات کے کانٹوں نے اُس کو آبلہ پا نہیں کیا تھا ... لیکن وہ نروان کی روشنی کی تلاش میں چل پڑنے کا تہیہ کر چکی تھی ... راہ کی کھوج بھی اُسے خود ہی کرنا تھی فیصلہ بھی وُہ خُود ہی کرے گی ۔

لوگ کہتے ہیں کہ فرح خلیل اپنے آپ کو سجا کر بیٹھی ہے ۔ وہ اپنے جسم اور پوزیشن کو کیش کرتی ہے ۔ لوگوں کو اپنے گرد دائرہ در دائرہ اکٹھا کر کے ان کو لبھانے کے لئے سو روپ دھارتی ہے ... وہ ان کے دکھ بانٹنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتی ہے ۔ وہ تو دین ہی دین ہے ۔ مانگتی کچھ بھی نہیں ۔ یہ وقت اور سوچ سے ہٹا ہوا تصور تھا ۔ اور لوگ اس کے گرد اکٹھا ہوتے ۔ اُس کی دین سے سیراب ہوتے اور جاتے جاتے اُس کی طرف گندے الفاظ کے پتھر

اُچھالنے لگتے ۰۰۰ نہ جانے وہ ان پتھروں سے زخمی بھی ہوتی تھی یا نہیں ۰۰۰ اُس کے چہرے پر سوچ کا ٹھہراؤ تھا ۔ اور یہ سوچ کا ٹھہراؤ اور دل کی وسعت اس نے ایک لمبے تجربے کے بعد سیکھی تھی ۔

رابو پھوپھو چہرے پر سکھ اور طمانیت کی دُھوپ پھیلائے اس کی زندگی میں ہمیشہ سے موجود رہی تھیں ۔ جب اُسے باتوں اور واقعات کا ادراک ہوا تو وہ رابو پُھوپھو کے حوالے سے دنیا والوں کی ذات اور ان کے دُکھوں سے بندھ گئی تھی اور وہ جان گئی تھی کہ دینے میں جو لذت ہے وہ لینے میں نہیں ۔ دنیا کے رشتوں میں یہ سب کچھ بھی ہوتا ہے ۔ اور پھوپھو ہی نے تو کہا تھا کہ دل کے ساتھ انتقام کا بوجھ انسان کو نیچے ہی نیچے ڈبونے لگتا ہے ۔ اور وہ جینا چاہتی تھی ۔ روشنی میں ۔ کُھل کر بہتے چشمے کی طرح رواں دواں ۔ لیکن مرضی سے جینا اور مسکرانا آسان نہیں تھا ۔ روح کی بالیدگی اور دل کی فراخدلی کے جنگل میں راہ بنانے کے لئے انسان کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے ۔ اور سرخ آنسوؤں کو ہتھیلیوں سے سمیٹنا پڑتا ہے ۔ اور تار تار لبادے میں ٹھٹھرتے وجود میں برداشت کی قوت پیدا کرنی پڑتی ہے ۔ معلوم نہیں اُس نے یہ سبق رابو پُھوپھو سے سیکھا تھا یا اُس میں بھی احساس اور ادراک کا ہی الاؤ دہکنے لگا تھا جس نے رابو پھوپھو کو فراخ دل بنا دیا تھا ۔ یا وہ صرف ایسا سوچتی تھی ۰۰۰ تھی نہیں ۔

لوگوں سے ملتے ۔ کالج سے آتے جاتے اور یونیورسٹی کے برآمدوں کے موڑوں پر خواہ مخواہ لوگوں سے ٹکراتے ۔ باپ کی سختیوں کو برداشت کرتے ۔ بھائی کی لاتعلق سرد مہری پر دل کو دکھاتے ۔ ماں کی مار اور چہرے کے گلنار رنگ کو دیکھتے دیکھتے وہ ہمیشہ کی طرح شک و شُبہ اور وسوسوں میں گِھر جاتی ۔ یہ مرد ۰۰۰ یہ عورت ۔ نفرت کا زہر تھا اُس کے اندر گُھلنے لگتا یہ سارا کچھ بڑا قابل نفرت تھا ۔ کچھ بھی اپنا نہیں تھا اور اپنی ذات بھی جو خود غیروں کے سائے تلے مٹ جاتی ۔ اس کے اندر کی جوت بجھنے لگتی ۔ وہ نفرت سے زمین پر تھوکتی ۔ کیا میں اپنی زندگی میں آئے اِن دو مردوں سے چھٹکارا نہیں پا سکتی ۔ یہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کے بارے میں سوچا جائے لوگوں کو پاؤں تلے روندنے کی شدید خواہش اُس کے اندر جاگنے لگتی ۔ وہ چاہتی وہ سب کو مٹا کر زمین پر ڈھیر کر دے اور پھر اُس پر کھڑی ہو کر زور زور سے قہقہے لگائے ابا کی طرح یہ سب کچھ ایک بڑے فریب کے پس پردہ چھپا ہوا ہے ۔ شائد رابو پُھوپھو کے چہرے کا خوبصورت حُزن بھی ایک فریب ہی ہو ۔ اور ماں جو پہلی ہی ضرب پر آنسو بہانے لگتی ہے ۔ ایک فریب ہی ہو تاکہ فرمان قریشی کے سامنے اپنی مظلومیت کا رونا رو سکے ۔ اور وہ خود بھی جو کبھی ساری نیکیوں کو اپنے دل کے اندر باہر اُمنڈتا محسوس کرنے لگتی ۔ اُن میں ڈوبنے لگتی ہے ۔ اُسے سارے چہرے گندے اور لتھڑے ہوئے لگتے ۔ وہ چاہتی وہ سب کے چہروں پر سجے نقابوں کو نوچ پھینکے ۔ اُن کے اندر کی برائیوں کو مشتہر کرے اور اُنہیں سچائی کے ساتھ جینا سکھا دے ۔ لیکن پھر اُس کا دل عجیب ٹھنڈے احساس سے بھر جاتا اُسے دُنیا کے ساتھ ساتھ اپنے بھائی اور باپ پر بڑا پیار آتا میرا بیچارا باپ جو اپنی مردانگی کی تکمیل کے لئے ایک عورت کے مظلوم جسم کا محتاج تھا ۔ اور اُس عورت نے اُس کی مردانگی کے سامنے اپنے جسم کو نہ جھکانے کی قسم کھائی ہے ۔ اور تنہائی کو اپنا مقدر بنا ڈالا تھا ۔ وہ

باپ اور رابو پُھوپھو کی مختلف شخصیتوں کے درمیان بھاگنے لگتی ۰۰۰ وہ دونوں اُسے پرکشش لگتے ۔ فرح کو یکایک اپنے باپ اور ماں کے تعلقات کی نوعیت اور تلخی کا احساس ہو گیا تھا ۔ برسوں کی بندھی گرہ خود بخود کھل گئی تھی ۔ حالانکہ رابو پُھوپھو نے اُسے کبھی کچھ نہیں بتایا تھا ۔ تو ماں احتجاج کرنا جانتی تھی اور برسوں سے اُس کے باپ کو جلا جلا کر راکھ کر رہی تھی ۔ اُس نے زور سے قہقہہ ۔ بے چارہ باپ ۰۰۰ اور یہ دو انسانوں کے تعلق کی نوعیت ۰۰۰ جو کانٹوں سے پٹ جانے تو تلوے آبلہ آبلہ ہو جاتے ہیں ۔ شائد اُس کا باپ بھی آبلہ پا تھا ۔ اور ماں تو برسوں سے کڑی دھوپ میں کھڑی اپنے آپ سے لڑ رہی ہے ۔ اور اُس کا بھائی جس کی ساری شخصیت اس کے باپ کے پاؤں تلے روندی گئی اور وہ نامکمل اور شکوک کے احساسات میں اُلجھتا رہتا ہے ۔ اور بے چاری رابو پُھوپھو جو اپنی کمزوری کو ایک برتر جذبے کا نام دے کر حُزن میں ڈوبی رہتی ہے تو زندگی بتانے کے لئے کسی نہ کسی جال کی ضرورت ہے تاکہ بے یقینی کی دلدل میں گر نہ پڑے یں وہ الجھ جاتی ۔ لیکن اُسے اِن ساری اذیتوں اور اُلجھنوں سے ایک راستہ بنانا ہے ۔ بڑا واضح اور صاف جس پر وہ اپنی خواہش اور مرضی سے چل سکے ۰۰۰ کوئی اُسے مجبور نہ کر سکے ۰۰۰ بلکہ وہ لوگوں کی مجبوری ہو ۰۰۰

وہ سوچ کی کھڑکی کھول کر سب کو جھانکتی اور تب سب کے لبادے آکر اُس کے سامنے ڈھیر ہو جاتے اور وہ محرومیوں ۔ ضرورتوں کے انبار میں اُس کے سامنے عریاں ہو جاتے ۔ اُس کے ذہن میں کوئی اوٹ نہ رہتی ۔ لوگ ناتمام خواہشوں کے الاؤ میں دھڑ دھڑ جل رہے ہوتے ۔

یہ اپنے چہروں کے یہ نقاب اُتار کیوں نہیں دیتے ۔ یہ محرومیوں کے خلاف کیوں نہیں لڑتے ۔ یہ سہارے کیوں ڈھونڈتے ہیں ۔ اُسے اُن پر پیار آنے لگتا ۔ وہ دُکھے دِل کے ساتھ اُن کے بے اختیار سلگتے وجودوں پر اپنی محبت اور توجہ کا مرہم لگانے لگتی ۔ وہ سوچتی اِنسان کے اندر اتنی گھٹن کیوں ہے ۔ اتنا فریب کیوں ہے ۔ وہ کھل کر کیوں نہیں جیتا۔ کیوں دوسروں کی نظروں کی زد میں آکر کونوں میں چھپ جاتا ہے ۔ انسان کی تکمیل کے لئے کیا دوسرا وجود ضروری ہے ۔ کیا انسانی تعلق ایک جال ہے جو اُلجھتا ہی جا رہا ہے ۔

"اور رابو پُھوپھو "آپ آج تک اس ٹوٹے جال کو جوڑنے کی کوشش میں جی رہی ہیں" ایک روز وہ طنز سے بولی ۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گی ۔ میں اپنی زندگی جیوں گی ۔ اپنی زندگی مروں گی ۔ اُس کی آواز میں فیصلہ تھا ۔

"ہاں بی بی ایسا ہی کرنا چاہیے اگر کر سکو تو ۔ اگر تم اپنے طرف آتے پتھروں کو سہار سکو تو ۔ اگر رشتوں کے آبگینوں کو بچا سکو تو"۔ اگر اپنی ذات کے شیش محل کو تعمیر کر سکو تو"

لیکن یہ تو انسان کے اندر کمزوری پیدا کرتا ہے ۔ مجھے کمزوریوں سے نفرت ہے ۔ سخت نفرت ۔

اور پھر اس نے نئے انداز سے جینے کے لئے نئی راہوں کی تلاش شروع کر دی ۔ اُسے جینے میں لذت آنے لگی ۔ اپنا آپ اونچا اور بلند محسوس ہونے لگا ۔ نئی راہیں تراشتے ہوئے میں دوسروں کے لئے سوچ سکتی ہوں ۔ میں دُکھی لوگوں کے لئے اپنے دل اور گھر کے دروازے وا کر دونگی ۔ وہ غیر مانوس چیزوں کے نزدیک ہونے کی کوشش کرتی ۔

ٹوٹے انسانوں کو جوڑنے کے لئے الفاظ کے مُلو استعمال کرتی ۔ دیا اور سخاوت سے بھری ہوئی ۔ اور پھر وہ لوگوں کی باتوں کا موضوع بن گئی ۔ لوگوں کی ملامت کے پتھر اُس کے وجود کو زخمی کرنے لگے ۔ باتیں پہنچانے والے اُس تک باتیں پہنچا دیتے ۔ اُس کا دل نفرت اور غصّے سے بھر جاتا۔ لیکن پھر وہ زور کا قہقہہ لگاتی ... اور اُس کے اندر رکا ہوا رحم اور دَیا کا دریا بہنے لگتا ۔ جو سب نفرتوں اور پتھروں کو بہا کر لے جاتا ۔ کوئی بات نہیں ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے ۔ میں میں ہوں اور دوسروں کو نظر آنے کے لئے مختلف ہونا ضروری ہے ۔ میں ماں اور پُھوپھو کی طرح اندھیروں کا سہارا نہیں لوں گی ... اپنے وجود کو زخمی نہیں ہونے دونگی ... وہ تہیہ کرتی ... "زخمی ہونے پر روؤں گی نہیں ۔" وہ ان پر اُسی طاقت سے پتھر پھینکتی ـــــ اور جب اُس نے خلیل کے بکھرے وجود کو ٹکڑا ٹکڑا جوڑ کر کھڑا کیا تو اُسے لگا اُس نے ایک نئے آدم کو تخلیق کیا ہے ... خلیل اُس کا کولیگ تھا جو ہر وقت اپنے زخموں کو اُجاگر کر کے اُس کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھتا تو فرح کو اپنا آپ بڑا بلند ۔ پاکیزہ اور اُونچا لگتا ۔ بے چارا خلیل احمد ... اُسے اپنے باپ کی زبردست شخصیت سے بھی خوف نہ آتا ... میرا باپ میرا کیا بگاڑے گا ... زیادہ سے زیادہ گھر سے نکال دے گا ... میں اپنا گھر خود تعمیر کر لوں گی ... وہ ماں کو کچھ نہ دے سکا ۔ مجھے کیا دے گا ... اور مجھے اُس سے کوئی سروکار بھی نہیں ... ابن آدم ـــــ

اُس روز اُس نے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بے خوفی سے کہا تھا "میں خلیل احمد سے شادی کر رہی ہوں ۔ بس آپ کو اطلاع دے رہی ہوں ۔ مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت نہیں" اور اُسے لگا جیسے اُس نے اپنے ساتھ کی گئی تمام عمر کی زیادتیوں کا بدلہ لے لیا ہو ۔ اور وہ گھر سے نکل آئی ـــــ وہ دونوں ہاتھ تھامے سڑکوں پر بے مقصد چلتے رہے ... خلیل احمد اب بھی رحم طلب نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا ...

اگر رابو پُھوپھو زندہ ہوتیں تو کہتیں فرح بی بی کسی سے کچھ مت مانگو بس دیتی جاؤ ۔ کیونکہ دینے سے دل طمانیت اور شکھ سے لبالب بھر جاتا ہے ۔ صالحہ خانم مانگتی رہی اور ناخوش رہی ۔ دیکھو ۔ میں نے کسی سے کبھی کچھ نہیں مانگا ...

لیکن یہ بات تو اُسے بعد میں معلوم ہوئی تھی کہ ایک دوسرے سے مانگنا پڑتا ہے ۔ اُس نے خلیل احمد سے کچھ نہیں مانگا تھا ۔ اُس نے بن مانگے اپنا آپ اُس کے حوالے کر دیا تھا اور اسے لگا تھا کہ وہ اندر باہر سے روشن ہو گئی ہے ۔ اُجلی ہو گئی ہے ۔ کتنی طمانیت بھری ہوئی تھی اُس کی سوچوں میں ۔ اُس کے وجود میں ۔ اُس کے اعتقاد میں ۔ اُس کی نامکمل شخصیت کو میری ہی ضرورت تھی ۔ اُس نے چھوٹے سے دو کمروں کے گھر میں بے رنگ پلنگ پر ململی سی چادر بڑے چاؤ سے بچھاتے ہوئے سوچا تھا۔

رواجوں کی پابندی ہی تو دُکھ کا باعث بنتی ہے ۔ اور میں نے زندگی کے بندھے رواج کو شکست دی ہے ۔ وہ تنگ سی گلی میں جھلنگ رہی تھی ۔ خوشی کے لئے ایک کونہ بھی میسر آجائے تو گھر بن سکتا ہے ۔ وہ گنگنا رہی تھی ۔

اُس کی روح کی بوسیدگی جو برسوں سے باپ کی سختی ۔ ماں کی دوہری زندگی اور رابو پُھوپھو کی بیچارگی تلے دبی پڑی تھی زندہ اور نکھر کی آزادی اور خُود مختاری کے رُوپ میں اُس کے سامنے کھڑی ہوگئی تھی ۔

اُس نے خلیل احمد کا ہاتھ پکڑ کر پورے اعتماد سے کہا تھا آؤ خلیل احمد ہم اپنی راہیں خود تخلیق کریں ۔ اپنی خوشیوں کے لئے پُر سکون گوشہ بنائیں ۔ ان کمروں کو جنت میں بدل دیں ۔ اُس نے اُس گھر کو اپنی محبت کی کھاد اور پانی سے سرسبز کر دیا ۔ خلیل احمد بھی اُس کے ساتھ ہاتھ بٹاتا ۔ لیکن اُس نے لین دین کا کبھی حساب نہ کیا ۔ اُن کے دوست مشترکہ تھے ۔ اُن کے دشمن مشترکہ تھے ... لیکن پھر خلیل احمد اکثر بیمار رہنے لگا ۔ اُس کی ضرورتیں بڑھ گئیں اُس کے مطالبے زیادہ ہو گئے ۔ اُس کی دوائیوں کا بوجھ بجٹ کو سارا اگڑبڑ کر دیتا ۔ اور پھر اُس کے دو بچے ۔ حامد اور نومینہ ... اُس کے ذات کے دو اور حصّے ـــ

اور وہ اکثر دل ہی دل میں دہراتی ۔ ہاں دینے میں ہی بڑائی ہے ۔ میں اور خلیل احمد کیا دو ہیں ـــ گھر وہ چلائے یا میں ۔ فرق کیا ہے ۔ ... خلیل احمد اُس کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا ۔

اُس نے ایک روز کھڑکیوں پر لٹکے رنگین پردوں کو اُٹھا کر باہر دیکھا تو اُس کی زندگی کی وہ لہر بیت چکی تھی ۔ وہ گھر اور دفتر کے کاموں میں بٹی ہوئی اکیلی ہی ساری تگ و دو کر رہی تھی ۔ اُس کا دِل اندر سے ایکدم ویران اور اکیلا ہوگیا ـــ

کیا میں اِس ساری جد وجُہد کو محبت کا نام دے سکتی ہوں ... کیا میں نے محبت کے ٹھنڈے میٹھے چشمے سے اپنی جی جان کو سیراب کیا ... کیا عورت مرد کا تعلق بس اتنا ہی ہے ۔ رابو پُھوپھو ہوتی تو بھی نہ بتا سکتیں ۔ اُنہیں اس رشتے کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا ۔

اُس کی ساڑھی کا پلو کھسک کر نیچے گِر گیا ... اور اُس کا برہنہ پیٹ اُسے ایسا سوکھا چمڑا لگا جسے نمک لگا کر بدبو دور کرنے کے لئے دھوپ میں ڈال دیا گیا ہو ۔ میں ہاروں گی نہیں تو میں صرف یہ ہوں ... اُسے یاد آیا کہ ایک روز اُس نے ساڑھی پہن کر رابو پُھوپھو کے سامنے اپنے پیٹ کو دیکھ کر کہا تھا ۔ یہ میرا جسم ہے اور اِس کے اظہار کا مجھے حق ہے ۔ بھائی اور بھیا میرے ذاتی معاملات میں کیونکر دخل دے سکتے ہیں ۔ میں ساڑھی نیچے باندھوں یا اوپر ۔ بلاؤز چھوٹا پہنوں یا لمبا وہ کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے ۔ رابو پھوپھو ہولے سے مسکرائی ۔ "فرح بی بی جینا صرف جسم نہیں ہوتا اس جسم کے اندر روح ہوتی ہے ۔ اور سارا دُکھ تو رُوح برداشت کرتی ہے ۔ ان دیکھے گھاؤ تو صرف اس پر لگتے ہیں ۔ خون تو اُس سے رستا ہے ۔ جسم تو صرف راہ ہے ـــ اور بس ـــ جسم اور رشتے ۔ روح اور تعلق ـــ جینا اور مرنا ۔ آزادی اور غلامی ۔ وہ وہاں کھڑے کھڑے بہت سے مفروضوں میں اُلجھ گئی تھی ۔ کیا میں خوش ہوں ـــ کیا میں رنجیدہ ہوں ـــ اُسے معلوم ہوا کہ زندگی کی ضروریات کو پُورا کرتے کرتے اُس کے ہاتھ نہ جانے کب سے خلیل احمد کے ہاتھوں سے جدا ہو چکے ہیں ۔ وہ خشمگیں نظروں سے ایک دوسرے کو گھورتے ہیں ۔ اور

دونوں کی لڑائی دونوں کو ہی زخمی کرتی ہے صرف ایک ہی نہیں کڑھتا ۔ نہیں میں ماں اور پُھوپھو کی طرح اپنی ذات کی دلدل میں نہیں اُتروں گی ۔ زندگی کے راستوں میں صرف ایک جگہ رُک کر روشنی کیوں کی جائے ۔ جگہ جگہ دیے جلائے جاسکتے ہیں ۔ اگر خوشی دینے ہی میں ہے تو میں دین ہی دین بن جاؤں گی ۔ بار بار پیچھے مُڑ کر کیوں دیکھوں ۔ وہ آگے بڑھنے کے لئے کوشاں تھی ۔ نئے نئے امتحانات ـــــ نئے نئے مفروضے ـــــ لیکن خلیل احمد شراب کو گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے سگریٹ کے گاڑھے دھوئیں کے مرغولے بناتا ہوا اُس کی خوشیوں اور غمیوں سے لاتعلق اُس کے گھر میں موجود تھا ۔ لیکن اُس نے اُسے دِل سے دھکیل کر باہر نکال دیا تھا۔

اُس کا دِل چاہا وہ زور زور سے چیختے ہوئے قہقہے لگائے اور کہے تو تم میرے مجازی خدا ہو ۔ اور تمہارے آگے جھکنا میرا فرض ہے ۔ لیکن نہیں ۔ اُس کے اندر کی باغی عورت ایسا نہیں سوچتی تھی ـــــ اُس نے خلیل احمد کے ہاتھ کو پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے کہا تھا ۔ خلیل احمد اگر یہ گھر تمہارا بھی ہے تو تمہیں اِس کے لئے کچھ کرنا پڑے گا ۔" ـــــ

خلیل احمد نے اُس کے چہرے پر سارا اندر کا دُھواں چھوڑتے ہوئے کہا تھا "چلاؤ مت ۔ تُم اور تمہاری اولاد میرے بغیر کچھ بھی نہیں ۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ اِس سارے معاشرے میں میرے سوائے تمہارے نام اور عزت کی کون حفاظت کرے گا ۔" خلیل احمد نے اُس کا ہاتھ زور سے جھٹک کر لاپروائی سے کہا اور گلاس کا آخری گھونٹ اپنے اندر انڈیل کر اُس کی موجودگی سے لاتعلق ہو کر پھر بیٹھ گیا ۔

تو رابو پھوپھو رُوح پر گھاؤ کا مطلب یہ ہوتا ہے ۔ اُس نے وہاں کھڑے کھڑے سوچا ۔ لیکن میں اِس زمانے کی عورت ہوں ـــــ کسی جبر کو برداشت نہیں کروں گی ۔ میں جینا جانتی ہوں ۔ میں ماں کی طرح دوہری زندگی بسر نہیں کروں گی ۔ پھوپھو کی طرح سُلگوں گی نہیں ۔ اُس نے کہا ۔ سُنو خلیل احمد یہ نیا گھر میرے پیسوں سے بنا ہے ۔ یہاں کی ہر چیز میری خریدی ہوئی ہے ۔ تم یہاں سے چلے جاؤ ۔ ہم اکٹھے نہیں رہ سکتے ۔ میں تمہارے بغیر جی کر دِکھاؤں گی تمہاری اولاد کی پرورش کر کے دِکھاؤں گی ۔ اور وہ لاپروائی سے کھڑی کھڑکی سے نظر آتے آسمان کو بڑی طمانیت سے دیکھنے لگی حالانکہ اُس کے اندر سب کچھ تہہ و بالا ہو رہا تھا ـــــ لیکن وہ جانتی تھی وہ ماں اور پُھوپھو سے الگ اور جدید وقت کی عورت ہے جسے مات دینا آسان نہیں ـــــ خلیل احمد کی آنکھیں حیرانی سے پھیل گئیں ـــــ اُس نے بے یقینی سے سامنے کھڑی عورت کو دیکھا جو برسوں سے بغیر احتجاج کئے اُس کے پاس تھی ـــــ جس کا وہ مالک تھا ۔ "کیا کہا تم میرے ساتھ نہیں رہو گی ـــــ میں چلا جاؤں ۔" خلیل کی آواز میں اچانک دھچکا کھا کر گر جانے والی بے یقینی تھی ۔

ہاں ۔ اُس نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا ۔ حالانکہ اُس کی زندگی کی ساری تعمیر اُس کے اندر ریزہ ریزہ ڈھے گئی تھی ۔ وہ درد کا احساس جو اُسے سب کے لئے بے چین کر دیتا تھا ۔ ایکدم اتھاہ تاریکی میں ڈوب گیا ۔ اُس کا سارا

وجود برسوں کی جدوجہد سے چُورا چُورا ہو گیا ۔ لیکن پھر بھی وہ ایک ستون کی طرح بلند اور خاموش کھڑی رہی ۔ بے حس اور سخت جان ـــــ

خلیل احمد اور میں ـــــ ہماری رفاقت کا تو کوئی مقصد ہی نہیں ۔ میں تو برسوں سے اکیلی ہی جی رہی ہوں اور اکیلے جینا آسان تو نہیں ۔ ماں اور رابو پُھوپھو تو زمانے کی دہلیز میں گڑی ہوئی سیخیں تھیں ـــــ جو وقت کے الاؤ میں مسلسل تپ تپ کر سیاہ ہو رہی تھیں نروان کس میں ہے ۔ گیان کب حاصل ہوتا ہے ۔ کون میرے زخم زخم وجود پر مرہم لگا کر پھاہے رکھے گا ۔ کوئی بھی نہیں ـــــ وقت گذر گیا ـــــ نہیں میں وقت کو گذرنے نہیں دونگی ۔ اُسے تھام لوں گی روک لوں گی ـــــ اُس کا جی چاہا اپنی برسوں کی محنت اور سوچوں پر استہزا آمیز قہقہہ لگائے ـــــ تو فرح بی بی ـــــ وقت کے ہاتھ یوں گھاؤ لگتے ہیں ۔ یوں آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوتی ہیں ۔ اگر دنیا میں نروان ہے تو مجھے خوش ہونا چاہیے تھا ۔ لیکن میں خوش نہیں ہوں ۔ لیکن میں خوش رہنا سیکھ جاؤں گی ۔ مجھے اپنے آپ سے اور وقت سے لڑنا آتا ہے۔ میں نروان کے لمحے کی کھوج لگا لوں گی ۔ بڑا وقت پڑا ہے ـــــ بلکہ نروان کا لمحہ مجھ تک خود پہنچے گا ـــــ

اُس نے بچوں کو بازوؤں میں سمیٹ کر گیس کے آتشدان کے سامنے بیٹھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تھا ۔ مصنوعی سیاہ کوئلوں سے شعلے اُٹھ رہے تھے آتشدان کے اُوپر رکھی اُس کی اور خلیل احمد کی تصویر بڑی طمانیت سے مسلسل مسکرائے جا رہی تھی ۔

اُس کا جی چاہا وہ تصویر والی مسکراہٹ ہمیشہ کے لئے اپنے ہونٹوں پر آویزاں کرے ۔ لیکن پھر تنہائی کا یخ احساس اُس کے اندر سَر سَر کرنے لگا ۔ شاید یہی زندگی ہو ۔ زندگی کا چیلنج ہو ۔ مجھے مقابلہ تو کرنا ہی پڑے گا ۔ مجھے اپنے جذبوں کے نقاب کو اُلٹ کر حقیقتوں کا برہنہ صورت میں تجزیہ کرنا ہو گا ۔" اُس نے آتشدان کے شعلوں کو آہستہ کرتے ہوئے رابو پُھوپھو کے بارے میں سوچا ۔

رابو پُھوپھو نے آخری وقت میں اُس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا ۔ تمہاری آنکھیں کئی بار مجھے اپنی آنکھوں کا عکس لگتی ہیں ۔ میں تو لڑنا اور جینا نہیں جانتی تھی صرف احتجاج کر سکتی تھی ۔ لیکن تم ـــــ

اُس نے کہا تھا ۔ ہاں رابو پُھوپھو میں نے زخموں پر مرہم لگانا نہیں سیکھا تھا ۔ میں نے تو چاہا تھا زخم ہی نہ ہوں ۔ اور میں نے خلیل احمد کے بکھرے وجود کے تنکوں سے اپنا آشیانہ بنایا تھا ۔ اُس کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹا تھا ۔ لیکن جب میں نے ٹیک لگانا چاہی تو وہاں کوئی کندھا ہی نہیں تھا ۔ میں کیا کرتی ۔ سفر تو جاری رکھنا ہی پڑتا ہے راہیں کشادہ اور فراخ ہیں ۔

"تم اُسے معاف کر سکتی ہو ۔ اُسے تمہاری ضرورت ہے ۔ شائد تمہارے بچے اس کے بغیر اُداس ہوں ادھورے رہ جائیں ۔ "خلیل احمد دیوانہ ہو صرف لینا ہو" ـــــ اور رابو پُھوپھو کی بے جان آنکھیں اُس پر گڑ گئیں ۔

جیسے کہہ رہی ہوں ۔ معاف کر دینا ہی سب سے بڑا علم ہے جو دُکھ کی دلدل سے نکالتا ہے ۔ اُوپر ہی اُوپر ـــــ بلند سے بلند تر ـــــ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا ـــــ جب خلیل احمد واپس آیا تو اُن کے تعلق کی ڈور جڑنہ پائی وہ جان گئی تھی خلیل احمد نے برسوں اُسے اپنی سہولت اور آرام کے لئے استعمال کیا ہے ۔ لیکن وہ اُسے معاف کر چکی تھی ـــــ یا معاف کرنے کا ارادہ کرتی تھی ـــــ یا انتقام لینے کا سوچتی تھی ـــــ

نروان کے لمحے کی راہ پر چلنے پر کانٹے تو چبھتے ہی ہیں ۔ وہ خود کیا تھی ـــــ وہ اپنے آپ سے سوال نہ کرتی ـــــ اُس نے اپنے آپ کو اپنی سوچ کی اندھیری کوٹھری میں کہیں دفن کر دیا تھا ۔ رابو پھوپھی ۔ باپ اور ماں تو ماضی کے قصّے تھے جو بُھلائے جا سکتے تھے ـــــ وہ ان سب کو معاف کر چکی تھی جو اپنی ضرورتوں کے کشکول لئے اُس کے گرد چکّر لگاتے تھے ۔ اُس کی توجہ کے طالب تھے ۔ یہ سب چھوٹی بڑی ضرورتوں سے بندھے حقیر انسان تھے جن کی زنجیر پکڑ کر وہ اُن کی بے بسی پر رحم کھا کر اُن کی زنجیر ہلاتی ـــــ کھینچتی اور پھر اُنہیں ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیتی ـــــ اُس کے اندر سے اُنہیں پکارنے کی خواہش نہ اُٹھتی ۔ احسان جتانے کا جذبہ نہ اُبھرتا ۔ اُسے تو عجیب لذّت کا احساس ہوتا تھا۔ اُسے خلیل احمد کی بے بسی پر رحم آتا ۔ تب اُس کا جی چاہتا وہ زور کا قہقہہ لگائے اور کہے ۔

میری آنکھوں میں کسی بے بسی کو مت ڈھونڈو ـــــ میں اپنے اندر سے طاقتور اور مضبوط ہوں ـــــ میں رابو پُھپھو کی طرح آنکھوں میں حُزن کے رنگ نہیں سجاؤں گی ـــــ ماں کی طرح جُھوٹ کا سہارا نہیں لوں گی ـــــ شائد اُتم نروان یہی ہو ـــــ یا شائد یہ منفی گیان کے لمحے تھے جو اُس کو جکڑ لیتے تھے ـــــ لیکن سب سے بڑا نروان تو زخموں کو سہلانا اور اُن پر مرہم لگانا ہے ۔ زخمی روح اور زخمی وجود اگر مسلسل رِستے رہیں تو ناسور بن جاتے ہیں ۔ اور اُن سے تعفن اُٹھنے لگتا ہے ۔

لیکن کبھی کبھی اُسے لگتا جیسے وہ خُود تحفظی ۔ خود فریبی اور زندہ رہنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہو ۔ حالانکہ وہ تو نروان کی تلاش میں تھی ـــــ زندگی تو گویا کا جنگل تھی ـــــ لیکن کیا کبھی وہ وہاں تک پہنچ پائے گی ـــــ کبھی کبھار اُسے لگتا وہ بے حد تھک چکی ہے ۔ وہ خلیل احمد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کسی دوسراتھ کا احساس نہ کر پاتی ۔ وہ اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو دیکھتی اور پھر بیٹھی بیٹھی اُسے ماں اور پُھوپھو یاد آنے لگتیں ۔ نہ جانے وہ پُھوپھو تھی یا ماں ـــــ یا وہ الگ کوئی ہستی تھی ـــــ اُن سے اونچی اور بلند لیکن پھر بھی محرومی کا دُکھ دینے والا ہاتھ اُس کے اندر گھس کر سب خلط ملط کر دیتا ۔ اُس کے باپ کی طرح وہ بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے دیکھنے لگتی ۔ شائد میرے اندر کے نامکمل جذبے کو مَن کی دوسراتھ ہی پورا کرے شائد جب میں اپنی خواہش کا کشکول اِس کے سامنے رکھوں تو اِس میں اپنی ذات سمیت سما جائے ۔ سب محرومیاں بھلا دے ۔

اگر رابو پُھوپھو زندہ ہوتیں تو اُسے سرزنش کرتیں ـــــ فرح بی بی کسی سے کچھ مت مانگو ۔ بس دیتی جاؤ ـــــ وہ آنکھوں میں آنسو لئے مسکرانے لگتی ـــــ اور دِل ہی دِل میں کہتی ـــــ "رابو پُھوپھو اس طرح جینا تو

بڑا مشکل ہے ۔ نہ جانے آپ کیسے جی لیں ۔ جینے کو صرف ماں ہی جی پائی" ۔ وہ خود جو بظاہر کامیاب عورت تھی نامکمل اور بوسیدہ ہو چکی تھی ۔

اُس نے اپنی بیٹی کو وداع کرتے ہوئے اسی طرح کے الفاظ کہنے چاہے تھے ۔ لیکن پھر اُس نے سوچا ۔ اُسے بھی میری طرح خود اپنی راہیں کھوجنی ہیں ---- دوسرے کے بتائے ہوئے سبق ہمیشہ غلط اور کٹھن ہوتے ہیں ۔ بھٹک کر ہی راہیں ملتی ہیں اور شائد کبھی نہیں بھی ملتیں ۔ نروان نہ جانے بے حسی میں ہے یا احساس میں رشتوں کو بُھولنا ہی پڑتا ہے یا اُنہیں نبھانا بڑی اُتم بات ہے ۔

اُس کی بیٹی نے وداع کے وقت اُس کے ساتھ لگتے ہوئے کہا تھا ۔ "ماں تمہاری باتیں کبھی مجھے پوری سمجھ نہیں آئیں لیکن میں اُن پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی ۔

وہ ہمیشہ کی طرح زور سے ہنسی ۔ بیٹی میرے سبق میرے اپنے تھے ۔ تم اپنی راہیں خود ڈھونڈو ---- لیکن اپنے آپ کو کبھی نہ بھولنا نہیں تو انسان گم ہو جاتا ہے ۔ کھو جاتا ہے ---- اور دوسرا کوئی ہاتھ کوئی قدم تمہاری تلاش میں تمہاری کھوج میں پیچھے نہیں آئے گا ----

اُس نے خالی صحن میں خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھا ---- دُور تک سڑک بھی خالی تھی ۔

لیکن راہیں ہمیشہ کہیں نا کہیں رواں رہتی ہیں ---- اور میں بھی نہیں رکوں گی ۔ کیا فائدہ گئی باتوں پر ماتم کرنے کا ۔ گزری واردات کا نوحہ لکھنے کا ----

اب اُس کا گھر لوگوں سے بھرا رہتا ۔ غمزدہ محبت کے ٹھکرائے ہوئے لوگ ۔ ناکامیوں سے مایوس ادیب ۔ وین گاگ اور پکاسو کی طرح بننے کے خواب دیکھنے والے مصوّر ۔ دِل کی بیتیاں لکھنے والے شاعر ۔ سیاسی جبر کے خلاف آوازیں بلند کرنے والے شاعر ۔ اور ادیب بننے کا شوق رکھنے والے فلمی اداکار ---- شراب کے نشے میں بدمسّت ہو کر محرومیوں پر آنسو بہانے والے نوجوان صحافی ۔

اور جب اُس کے بیٹے حبیب احمد نے اُسے بتائے بغیر اپنی من چاہی عورت سے شادی کر لی تو اُس کا دِل پتھر کی طرح سرد اور بے حس ہو گیا ---- اُسے لگا جیسے ازل سے وہ برہنہ پا سنگریزوں پر چلتی رہی ہو ۔ بغیر رشتوں کے بغیر بندھنوں کے ۔ شائد یہی نروان کا لمحہ ہے جس کی اُسے کھوج تھی ---- اُس نے ہمیشہ سے بلند قہقہہ لگایا ۔ لیکن وہ قہقہہ اُس کے اندر ہی کہیں دَم توڑ گیا ۔ وہ زمانوں سے اپنے آپ کو اپنی ہستی کے بُھولنے کا یقین دلاتی آئی تھی ۔ اندر سے خوفزدہ ہو گئی ---- میں کیوں رابو پُھوپھو کی طرح خُود کو بُھول نہیں پائی ۔ شائد میں نے پُوری طرح لوگوں کو معاف کرنا نہیں سیکھا ۔ شائد میں خود بھی ایک دھوکا ہوں اور دھوکے کو ہی جنم دے سکتی ہوں ۔ اس نے اپنے اندر کو ٹٹولتے ہوئے خود سے پوچھا ۔ لیکن اُس کے اندر گہرا سناٹا تھا ۔ وہ بھی ماں کی طرح کچھ دے کر مسکراہٹیں خرید سکتی تھی ۔ لیکن اُسے تو جھوٹ سے نفرت تھی ۔ وہ کوئی شہزادی نہیں تھی جسے شہزادے جنگلوں جنگلوں خاک چھانتے

ڈھونڈتے ۔

رابو پُھوپھو نے تو کہا تھا خواہ مخواہ اندھیروں میں گُھسنا نہیں چاہیے ۔ لیکن اُس کے پاس اپنی ذات کے سوا کوئی اور روشنی نہیں تھی جو اُس کے اندر کے کونے کونے کو اُجلا دے ۔ اور دوسروں کا ہونا کتنا ضروری ہے ۔ کسی اور فرمان انکل کا کسی گھنے برگد کا جس کے اندھیرے تلے چھپ کر آنسو بہائے جاسکیں ۔ دِل کی بات کی جاسکے ——— درد کو سہا جا سکے ——— اُس نے پُھوپھو کی طرح سجدوں میں خُود کو بھولنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ آج پھر ایک دوراہے پر کھڑی تھی ——— فیصلہ تو اُس نے زمانوں پہلے کر لیا تھا کہ اُسے سب کی نفی کر کے جینا ہے ۔ لیکن اب اُس کے قہقہے صرف اُس کے گلے سے نکلتے تھے ۔ اُس کے چاروں طرف فرمان انکل تھے ——— اُس کی طرف بڑھتے لیکن مانگتے ہوئے اور وہ تھک چکی تھی ——— لیکن پھر بھی وہ کسی کو مایوس نہیں کر پاتی تھی ——— وہ بزدل تھی یا دیا لُو اُسے سمجھ نہ آتا ۔ ایک دن اُس نے رابو پھوپھو سے پُوچھا تھا ۔ یہ ماں انکل فرمان سے کہتی تو کچھ بھی نہیں ۔ جیسے زندہ ہی نہ ہوں ——— سایہ ہوں یا اپنی ذات کا بھوت ہوں ۔ تو رابو پھوپھو نے ہمیشہ کی طرح اس کی تسلی کرتے ہوئے جواب دیا تھا ۔ "فرح بی بی جب گھر کے رکھوالے دروازے کُھلے چھوڑ جائیں تو بُھوت اُن میں بسیرا کر لیتے ہیں ۔ بڑے بھیا بھی تو گھر کو اکیلا چھوڑ جاتے ہیں ۔"

تو کیا میرے اندر بھی بُھوت اُتر آئیں گے ۔ فرمان انکل جیسے بُھوت ——— وہ تو ہمیشہ سے اُسے گھیرے رہتے ہیں ۔ تاریکی میں دیا تو جلانا ہی پڑتا ہے ۔ اور پھر اُس نے اپنے گرد قہقہوں کی مالائیں لٹکالیں ——— اُسے اکیلے پن سے ڈر آنے لگا تھا ——— وہ تو ہمیشہ سے ہجوم میں زندہ رہی تھی اور اب تو اس کے گھر کے دروازے بھی کُھلے تھے ۔ خلیل احمد کے مرنے کا اُسے دکھ نہیں تھا ۔ صرف برسوں کی اپنے اندر جنگ تھم گئی تھی ۔ خواہشوں کی جنگ ——— اور وُہ اندر باہر سے خالی ہو گئی تھی ———

پھر یہ قہقہوں کی مالائیں شہر میں اُجالا کرنے لگیں ——— وہ ڈاکٹر شبیر حسین کے گالوں پر بوسہ دیتے ہوئے کہتی ۔ "ڈاکٹر تم کتنے عظیم ہو ۔ اور اداکار راحیل اکیلے گھر میں اُس کے پاس بیٹھا اُسے اپنی باہوں میں سمیٹتے ہوئے کہتا "فرح خانم تم آج بھی کسی فلمی ہیروئن کی طرح جاذب نظر اور جوان لگتی ہو عورت کا چہرہ نہیں ہوتا صرف جسم ہوتا ہے اور میں نے کبھی کسی عورت کے چہرے کو غور سے نہیں دیکھا ۔ اپنی فلم کی ہیروئن کو بھی نہیں" اور اُس نے ہمیشہ کی طرح قہقہہ لگا کر اُسے دُور دھکیلتے ہوئے کہا "اچھا بکواس مت کرو ——— تم زیادہ ہی پی گئے ہو ۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے " ——— اور ہر رات لوگ اُس کے خوبصورت گھر میں جمع ہوتے وہ مرد بھی جو شراب پی کر اپنے گھر کا راستہ بھول جاتے بڑے بڑے ایگزیکٹو ۔ کئی محکموں کے سیکرٹری جو اس کے دوست تھے ——— مایوس شاعر جو شاعری اور محبت دونوں میں ناکام ہو کر خود کشی کی باتیں کرتے ——— کسی دوسرے محکمے سے کام کروانے والے حضرات جو کسی اور کی انگلی پکڑے اُس کی دہلیز کے اندر آتے اور ایک طرف کونے میں چُپ چاپ بیٹھے رہتے ۔ اُسے سراہتے اُس

کے کردار کا تجزیہ کرتے ۔ اُس کو دل ہی دِل میں گندی گندی گالیاں دیتے لیکن اُس سے گفتگو کرنے پر گھگھیانے لگتے عاجزی سے جھک جاتے اُس کی ذات کی تعریف کرنے میں مبالغے کی حدود بھی پار کر جاتے ۔

وہ اُن سب کے درمیان سب کی توجہ کا مرکز بن کر بیٹھ جاتی ۔ گفتگو ۔ قہقہے ۔ سفارشی فون کالیں ۔ محبت بھری ڈانٹیں ——— آہیں اور آنسو ——— اُس کے گھر کی دُنیا عجیب دُنیا کا روپ دھار لیتی ۔ وہ سب کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیتی ۔ اور اُن کی انگلیاں پکڑے ان کو مختلف راہوں پر ڈال دیتی ۔ وہ سحر زدہ وہی کچھ کرتے جو وہ کہتی ———

کبھی اُسے لگتا شائد وہ بھی اپنی ماں کی طرح ہی خلیل احمد سے بدلہ لے رہی ہو ——— لوگ کہتے وہ بیتی کہانی کو بار بار دہرا رہی ہے ۔ وہ اپنا بھاؤ لگاتی ہے ——— اپنی طاقتوں کو جانچتی ہے ——— اپنے حُسن کا خراج وصول کرتی ہے ——— اپنی عمر اور عہدے کو بُھول کر جوان لگنے کے بھاؤ بتاتی ——— انداز دکھاتی اور سب مردوں کو لبھانے کی کوشش کرتی ہے ———

لوگوں کی راؤں کے الزامات کے لئے اُس نے بھی اپنے ہاتھ میں بے صبری اور لاپروائی کا پتھر پکڑ رکھا تھا ۔ وہ سب کے الزمات کو چکنا چور کر دیتی اور زور سے قہقہہ لگاتی ——— وہ ان کے اندر کے کمسن پن پر تھوکتی ۔ لیکن اُنہیں کبھی دھتکار کر دروازوں سے باہر نہ دھکیلتی ۔ یہ سب اُس کی انا کا کھیل تھا ۔

ابا کی شخصیت کے بت کو توڑنے کے لئے اماں نے بھی تو انکار کا پتھر ہی تھاما تھا ——— وہ سوچتی اور دوسروں کے بت توڑنے میں بڑا مزہ ہے ——— وہ جو اُس تک پہنچتے بے خبری میں ہی اُس کی زد میں آجاتے ——— جیسے ہی کوئی پیٹھ موڑ کر دروازے سے باہر نکلتا ——— فرح بیگم کا قہقہہ دور تک اُس کا تعاقب کرتا لگتا اور یہ قہقہہ ۔ پتھر کی طرح اُن کو زخمی کر دیتا ——— وہ جو اپنے آپ میں اہم تھے ۔ جن کا استقبال اُس نے کُرسی سے اُٹھ کر کیا تھا ۔ اور اُن سے گفتگو کی تھی ——— اپنے ہاتھ سے چائے کی پیالی پکڑائی تھی ——— شرمندہ ہو جاتے ——— لیکن پھر پلٹ کر اُس کی محفل میں آجاتے ——— وہ دل ہی دل میں اُن پر ہنستی ——— اُن کی ہستی کی نفی کر کے مسکراتی اور مسکرا کر پھر نفی کر دیتی ——— اُونچی بلند سب کی شخصیتوں پر سایہ کیے اپنے باپ کی طرح ۔

رابو پھوپھو انسانوں کا ایک دوسرے میں مدغم ہونا ناممکن ہی تو ہے ——— اگر ایسا ہو پاتا تو میں کیوں ذہنی اکیلے پن کا شکار ہوتی ——— جب رات اُس کے خالی کمروں میں اُترتی ۔ مہمانوں کے جانے کے بعد اُس کی کُرسیوں پر دھرنا دے کر بیٹھ جاتی اُس کے صوفوں کی درزوں میں گھسنے لگتی تو اُس کا جی چاہتا وہ رابو پھوپھو کو آواز دے کر پوچھے ۔
"پھوپھو میرے اندر باہر کی ساری آوازوں کو کیا ہوا ۔ میری ساری سوچوں کے چراغ کیوں بُجھ گئے ۔ وہ جو ابھی ابھی میرے گرد دائرہ لگائے بیٹھے تھے اُسے اکیلا چھوڑ کر کیوں چلے گے ۔ اور کیا وہ نروان کا لمحہ مجھ پر نہیں اُترے گا جب میں آپ کی طرح اُجلی ہو جاؤں گی کسی سے کچھ نہیں مانگوں گی اُس کے اکیلے پن کا آکٹوپس اُس کے جسم کے ساتھ بندھا پاتال میں گھسیٹنے لگتا ہے ۔ اُس نے ہمیشہ تہیہ کیا تھا کہ وہ کوئی نقاب نہیں اوڑھے گی۔ لیکن اُس کی ذات پر تو دبیز پردہ

تنتا جا رہا ہے ـــــ جس کے اندر وہ اپنے آپ کو بھی پہچان نہیں پائی ۔ وہ تو لوگوں کے چہروں سے نقاب نوچتے ہوئے انوکھی طمانیت محسوس کرتی تھی ـــــ مسرت محسوس کرتی ـــــ سوچوں میں رنگ بھرتی تھی ۔

لیکن اُس نے اپنے چہرے کو تہہ در تہہ لوگوں سے چُھپا لیا ہے ـــــ لوگوں کی زبانیں اُس کی طرف لپکتی ہیں ـــــ لوگ ہنستے ہوئے اُسے کوٹھے والی کہتے ہیں ۔ شائد ہر رات ایک نیا مرد اس کا ساتھی بنتا ہے ـــــ اکثر وہ بن مانگے دیا کرنے لگتی ہے ۔ افواہیں ہی افواہیں ۔ لیکن اُسے ان افواہوں کی ذرہ برابر پروا نہیں ـــــ وہ اپنی ذات کو بھی اپنے ہاتھ میں پکڑے پتھر سے توڑنے لگتی ہے ۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں لوگوں کے سامنے بڑی لاپروائی سے بیٹھی ساڑھی کے ڈھلکے پلّو اور چھوٹے سے بلاؤز سے عُریاں ہوتے جسم کی پروا کئے بغیر اپنی ٹانگ کو آدھی سے زیادہ عُریاں کر کے کُھجلانے لگتی ہے ۔ اور صفائی کرنے والی کی شکائت کرنے لگتی ہے جو ڈھنگ سے صفائی نہیں کرتی ۔ نہ جانے کیسے کیڑے مکوڑے لباس میں گُھس جاتے ہیں ۔ اور وہ زور سے قہقہہ لگاتی ہے ۔ ہمیشہ کی طرح ۔

تَب سارے مرد جو اُس کے گِرد قمقموں کی جُھولتی مالاؤں میں بیٹھ کر اُسے سراہتے ہیں دِل ہی دِل میں زور کا قہقہہ لگاتے ہیں ۔

حرافہ ـــــ رنڈی ـــــ جھوٹ بولتی ہے ۔ جانتی ہے کہ اُس کی عُمر کے سائے اُس کے وجود پر سایہ کرنے لگے ہیں ـــــ وہ ٹوٹ رہی ہے وہ جانتے ہیں اب وہ اُس کی ضرورت ہیں ـــــ اور وہ بھی اب اپنا آپ کیش کرنے لگتے ہیں ـــــ

اور رات اُس کے گھر کی دیواروں پر اپنی خوفناک آنکھیں کھولے اُسے ڈراتی ہے ۔ اور وہ رابو پُھوپھو کے تصور کے ساتھ چمٹ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہتی ہے ۔ رابو پُھوپھو مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے ۔

اور رابو پُھوپھو کا غیر مرئی وجود اُس کی پکار کا جواب دیتا ہے ۔ لیکن اُسے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی ۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ اپنے آپ پر بھی زور کا قہقہہ لگائے ۔ اِس اندھیرے اور اکلاپے کے حصار کو توڑ ڈالے لیکن یہ قہقہہ اُس کے لبوں تک نہیں آتا صرف اُس کے بوسیدہ ہوتے وجود کے اندر گردش کرنے لگتا ہے ۔ اور وہ اِس گردش کے دائرے میں گُھومتی پاتال میں ڈوبتی جاتی ہے ۔ اور نروان کا لمحہ اُس پاتال کی منڈیر پر کھڑا اُسے گُھورتا ہوا قہقہے لگانے لگتا ہے ۔

بیگانگی کی تخ

منیرالدین احمد

اس روز ریستوران خلاف معمول آدھا خالی تھا ۔ اکثر میزوں پر اکیلے دکیلے لوگ بیٹھے ہوئے تھے ۔ ان میں ایک بے حد موہنی صورت والی لڑکی بھی شامل تھی ، جو یوں بیٹھی ہوئی تھی ، جیسے آرڈر دیئے جانے کے بعد مال کی وصولی کے لئے گاہک نہ آیا ہو ۔ اُس نے لڑکی کو سلام کرنے کے بعد اخلاقاً پوچھا کہ آیا اس کے میز کی کوئی کُرسی خالی تھی اور کیا اُسے اُس پر بیٹھنے کی اجازت تھی ۔ لڑکی نے بڑی معصومانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ اسکی اپنی کرسی کے سوا باقی کی تینوں کرسیاں خالی تھیں ، اس کے ساتھ ہی اُس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا ، جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ اسپر بیٹھ سکتا ہے ۔ اس رسم کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دو اجنبیوں کے درمیان چپ کی برف ٹوٹ جاتی ہے ۔ اس کے از سر نو جمنے سے قبل اُس نے لڑکی سے کہا کہ وہ یقیناً مینو کا مطالعہ کر چکی ہو گی اور اُسے مشورہ دے سکے گی کہ اُسے کیا آرڈر دینا چاہئیے ۔ دراصل اُسے کسی مشورے کی ضرورت نہ تھی ، کیونکہ وہ سال بھر سے ہر اتوار کے روز اس ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھانے آیا کرتا تھا اور باری باری مینو کے کھانے اول سے آخر اور آخر سے اول تک چکھ چکا تھا ۔ اس ریستوران میں مچھلی کی پچیس تیس قسمیں پکائی جاتی تھیں ۔ مگر اُس نے یہ بات لڑکی کو نہ بتائی ۔ تاہم جب ویٹرس آرڈر لینے کیلئے آئی ، تو لڑکی نے نوٹ کیا کہ اُس نے اُس کے ہم میز کو پرانے واقف کاروں کی طرح سلام کیا ۔ جس سے اُسے بھاری ٹپ ملنے کی توقع ہو ۔ پھر آرڈر لینے سے پہلے اُس نے میز پوش کو بدل دیا ، جسپر ایک دھبہ پڑا ہوا تھا ۔ یہ دھبہ اس وقت بھی موجود تھا ، جب لڑکی وہاں پر آن کر بیٹھی تھی اور ویٹرس نے آرڈر لیتے وقت نظر بچا کر دھبے والی جگہ پر ایش ٹرے کو رکھ دیا تھا ۔ نوجوان نے بیٹھتے ہی ایش ٹرے کو اس جگہ سے ہٹا دیا تھا ۔ وہ جگہ عین اسکی ٹھوڑی کے نیچے تھی ، اور اُسے دونوں بازوؤں کو میز پر ٹیک کر بیٹھنے کی عادت تھی ۔

یہ چوبیس دسمبر کی بات ہے ۔ وہ اتوار کا روز نہ تھا ، اگرچہ اس کا تعلق بھی ایک تہوار کے ساتھ ہے ۔ جرمنی میں دنیا جہان سے انوکھا دستور رائج ہے کہ کرسمس کے تحفے تحائف چوبیس دسمبر کی شام کو دیئے جاتے ہیں ۔ جب کہ اصل تہوار اس سے اگلے روز منایا جاتا ہے ۔ چوبیس دسمبر کو صبح سے لے کر دوپہر تک دکانیں کھلتی ہیں ۔ اس روز وہی لوگ خریداری کے لئے شہر میں آتے ہیں ، جو ہر کام کو آخری لمحے پر اٹھا رکھنے کے عادی ہوتے ہیں ۔ اُس نے گمان کیا کہ لڑکی بھی اس روز آخری منٹ پر تحفے خریدنے کیلئے نکلی ہو گی ۔ مگر اُس نے دیکھا کہ وہ خالی ہاتھ تھی ۔ پہلے اسکا خیال تھا کہ کرسمس کے تحفوں کے بارے میں گفتگو خوب رہے گی ، مگر ایک تنگے دھڑنگے شخص کے سامنے انسان کیوں کر کپڑوں کی باتیں کر سکتا ہے ۔ پھر اس بات کا امکان موجود تھا کہ لڑکی بھی اس کی طرح تحفے تحائف دینے کے

دھندے سے بیزار ہو ۔ پھر اُس نے سوچا کہ موسم پر بات کی جائے ۔ مگر یہ موضوع اس قدر پٹا ہوا ہے کہ اس میں کوئی انوکھا پن پیدا نہیں کیا جا سکتا ۔ اُس روز اگر برف باری ہو رہی ہوتی تو بات دوسری تھی ۔ مگر اس روز تو بارش بھی نہیں گر رہی تھی ۔

اس نے سیدھے سیدھے کہہ دیا کہ وہ کوئی موضوع ڈھونڈ رہا تھا جس کے بارے میں بات کی جا سکے ۔ مگر اُسے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی ۔ یہ سُن کر لڑکی کھلکھلا کر ہنس دی اور اس کے حسن کو چار چاند لگ گئے ۔ لڑکی نے کہا کہ بات تو کسی بھی چیز کے بارے میں کی جا سکتی تھی ۔ مثلاً اس روز خلاف معمول بارش نہ ہونے کے بارے میں ۔ یا اس بارے میں کہ لوگوں نے دکانوں میں کوئی کام کی چیز نہیں چھوڑی تھی اور سب کچھ خرید خرا کر گھروں کو ڈھو کر لے گئے تھے ۔ پھر اُس نے کہا کہ وہ اُس روز کچھ خریدنے کیلئے نہیں نکلی تھی ، اُسے کسی کو تحفہ نہیں دینا تھا اور نہ ہی وہ تحفے وصول کرنے کے موڈ میں تھی ۔ وہ دراصل کرسمس اور سالگرہ کے چکروں کو بھول جانا چاہتی تھی ۔ مگر اس نے بتایا کہ اس روز اسکی سالگرہ تھی اور اس کا اس اجنبی شہر میں کوئی دوست یار نہیں تھا ، جس کے ساتھ مل کر وہ اپنا جنم دن منا سکتی ۔

اسکی بات درست تھی ، باتیں کرنے کیلئے موضوعات کی کوئی کمی نہ تھی ۔ بات سے بات نکلتی چلی گئی ۔ ریستوران سے اٹھ کر وہ ایک کیفے ہاؤس میں جا بیٹھے ، اور جب شام کے وقت وہاں پر بھی کرسیوں کو میزوں پر اوندھے منہ رکھا جانے لگا ، تو باہر نکل کر دونوں پہلو بہ پہلو چلتے رہے ، بغیر ایک دوسرے کے ساتھ یہ طے کرنے کے کہ ان کی منزل کیا تھی ۔ جوں جوں اندھیرا پڑتا گیا ، توں توں سڑکیں اجاڑ ہوتی گئیں بسیں اور ٹرامیں تک چلنی بند ہو گئیں اور سڑکوں پر اکا دکا ٹیکسیاں رہ گئیں ۔ گھروں میں کرسمس کے درختوں پر موم بتیاں جلا دی گئی تھیں ، اس زمانے میں ابھی بجلی کے قمقموں سے درختوں کو سجانے کا رواج نہ تھا ۔ فلیٹوں کی کھڑکیوں میں سے وہ لوگوں کو تحفے دیتے ہوئے گلے ملتے ہوئے ، چومتے ہوئے ، ناچتے ہوئے ، گاتے ہوئے دیکھ سکتے تھے ۔ گاہے گاہے وہ کسی ایسے نظارے سے محظوظ ہونے کیلئے رک جاتے تھے اور ایک دوسرے کو اشاروں سے کوئی انوکھی چیز دکھاتے تھے ۔ منہ کی جگہ ہاتھوں نے لے لی تھی ۔ کبھی کبھی ان کے ہاتھ آپس میں مس ہو جاتے تھے ۔ اُس نے ایک بار جب کہ وہ پہلو بہ پہلو ایک جیولری کی دکان کے سامنے کھڑے شوکیس میں دیکھ رہے تھے ، اپنا ہاتھ لڑکی کے کندھے پر رکھ دیا اور اُسے ایک نیکلس دِکھانے کیلئے اپنی طرف کھینچا ۔ بیلکا ، یہ اس لڑکی کا نام تھا ، دھیرے سے گھوم کر اسکی گرفت سے نکل کر ساتھ کی دکان کی طرف بڑھ گئی اور اشارے سے ادھر آنے اور ایک چیز دیکھنے کو کہنے لگی ۔ جب اگلی بار اُس نے لمبے وقفے کے بعد بیلکا کے کندھے پر ہاتھ رکھا ، تو اُس نے کوئی مزاحمت نہ کی ۔ اس نے اس وقت بھی کچھ نہ کہا ، جب اُس نے اُس کے گالوں کو چوما ۔

شام کے کھانے کیلئے وہ ریلوے اسٹیشن کے ریستوراں میں گئے ، جہاں پر شہر بھر کے بے گھر لوگ جمع تھے ۔

عورتیں ان میں کم کم ہی تھیں، باقی کے سب مرد تھے جو بیلکا کی طرف ایسی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے، جیسے اُسے آنکھوں کے رستے نگل جائیں گے۔ اُسے یہ ماحول بالکل پسند نہ آیا۔ مگر مجبوراً رکنا پڑا، کیونکہ کرسمس کی شام کو انسان اور کسی جگہ پر کھانا کھانے کیلئے نہ جا سکتا تھا۔ بیلکا کو جیسے ان ساری باتوں کی پرواہ نہ تھی لگتا تھا کہ اُس روز کوئی چیز بھی اسکا موڈ خراب نہ کر سکتی تھی۔ انہیں میز بھی الگ نہ مل سکا اور ان کے ہم میز مردوں نے بھونڈے انداز میں بیلکا کو شراب پینے کی دعوت دی، جسے اُس نے بے پروائی سے رد کر دیا۔ دوسرے میزوں پر سے بیلکا کی صحت پر جام پینے جانے لگے، جس کے جواب میں بیلکا نے ایک نظر غلط بھی اُدھر نہ ڈالی۔ دونوں اپنی نظروں کو مینو کارڈ پر جھکائے ہوئے کھانے کا انتخاب کرنے میں مصروف تھے۔ اُس نے بیلکا سے سرگوشی میں کہا کہ اگر اُسے کوئی اعتراض نہ ہو، تو وہ فوراً اٹھ کر اُس کے فلیٹ میں جا سکتے ہیں۔ جہاں پر کھانے پینے کا سارا سامان موجود ہے بیلکا نے اسکا ہاتھ دباتے ہوئے کہا کہ وہ کھانے کے بعد اس کے فلیٹ میں جائیں گے۔ کچھ کھائے پئے بغیر ریستوران سے اٹھ جانا اُسے پسند نہ تھا۔ رہے وہ مرد تو ان کی طرف وہ بالکل کوئی توجہ نہ دے۔ اس کے نزدیک وہ لوگ ہوا ہیں جیسے ہوا نظر نہیں آتی، ویسے ہی وہ مرد اس کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اُس نے کہا کہ شاید وہ بھی بیلکا کو نظر نہ آتا ہو۔ کیونکہ آخر وہ بھی اوپرا مرد ٹھہرا۔ بیلکا نے اسکی طنز کو سمجھتے ہوئے دانت کچکچائے، جیسے کہہ رہی ہو کہ تمہیں تو میں کچا کھا جانا چاہتی ہوں۔ اُس نے کہا کہ اس بات کا فیصلہ بعد پر چھوڑ دیا جائے کہ کون کسے کھائے گا، فوری طور پر وہ کھانا کھا لیا جائے، جو ان کے سامنے اس عرصے میں چنا جا چکا تھا۔ قرب و جوار کے میزوں سے مردوں نے انہیں کھانے کی جان نوشی کی خواہشات سے نوازا، اور ان کے منہ میں پڑنے والے ایک ایک لقمے کا ساتھ دینے لگے۔ کھانا توقع کے برخلاف مزیدار تھا۔ دونوں نے اتنی بے شمار امتحان کرنے والی اور گھورتی ہوئی نظروں کے تحت کھانے کے تمام آداب و قواعد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کھانے کو ختم کیا۔ بیلکا نے کہا اُسے کم از کم اس امتحان کو پاس کرنے کی سند ملنی چاہئیے۔ اس نے گھر چل کے سند بنا کر دینے کا وعدہ کیا۔

جب رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ کھانا کھانے کا امتحان پاس کر کے ریستوراں سے نکلے، تو طے پایا کہ پہلے چرچ میں چلا جائے، جہاں پر کرسمس کی رات میں نصف شب کو سروس ہوتی ہے۔ سینٹ نکولائی چرچ اُس رات اپنی وسعت کے باوجود لوگوں کے اژدہام کے سبب تنگ ہو چکا تھا۔ اسکے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ کرسمس کی رات نصف شب کی سروس میں اس قدر لوگ شرکت کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ کرسیاں ساری بھری ہوئی تھیں اور دائیں بائیں کی دیواروں کے ساتھ اور کرسیوں کے پیچھے خالی جگہ پر ہر طرف لوگ کھڑے تھے۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گئے اور آہستہ آہستہ آگے کی طرف کھسکتے گئے۔ بیلکا کو ہجوم میں سے راستہ بنانے کا فن آتا تھا۔ جہاں کہیں تھوڑا سا خلا نظر آتا۔ وہ جھٹ سے وہاں جا نکلتی تھی اور اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی دائیں اور بائیں کھڑے لوگوں سے معذرت چاہتا ہوا گھسٹتا جاتا تھا۔ سروس شروع ہو چکی تھی اور لوگ بڑے انہماک کے ساتھ اس میں حصہ لے

رہے تھے ۔ بیلگا اُس سے دو تین قدم آگے تھی اور انکے درمیان فاصلہ پیدا ہو چکا تھا ۔ بیلگا کو کرسیوں کی قطاروں میں کہیں بہت آگے ایک خالی کُرسی دکھائی دی ۔ اُس نے اشارے سے اُسے بتایا اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہہ سکتا ، بیلگا چھپاک سے کرسیوں کی درمیانی روے گزرتی ہوئی خالی کرسی پر جا بیٹھی ۔ جہاں پر وہ کھڑا تھا ، وہاں سے وہ جگہ جہاں پر بیلگا کی کرسی پائی جاتی تھی یہی کوئی چالیس پچاس میٹر دور تھی سروس کے دوران اُس نے بیلگا کو اپنی نظروں میں رکھا ۔ مگر جب سروس ختم ہوئی اور لوگوں کا ہجوم باہر کی طرف حرکت کرنے لگا ، تو اسکے لئے اپنی جگہ کھڑا رہنا ممکن نہ رہا ۔ بیلگا اپنے چھوٹے قد کے سبب لوگوں کے ریلے میں گم ہو چکی تھی ۔ چرچ کے گیٹ پر پہنچ کر وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا اور بیلگا کی راہ تکنے لگا یہاں تک کہ سارا چرچ خالی ہو گیا ۔ بیلگا کب چرچ سے باہر نکلی تھی ، اس بارے میں اُسے کوئی خبر نہ ہوئی ۔ شاید وہ کسی دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی تھی اور وہاں پر کھڑی اسکا انتظار کر رہی تھی وہ باری باری سارے گیٹوں پر گیا ، پھر سارے چرچ کے ارد گرد گھوما ۔ قریب کی ساری گلیاں چھان ماریں ۔ نزدیکی انڈر گراونڈ اسٹیشن پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک گیا ۔ مگر بیلگا کہیں پر نظر نہ آئی ۔ اس دوران میں آخری گاڑی کے چھوٹنے کا وقت آ گیا اور اُسے بھاری دل کے ساتھ اپنے گھر کا رُخ کرنا پڑا۔

رستے میں اُسے شدت کے ساتھ یہ احساس ہونا شروع ہوا کہ اُس نے کیسا ہیرا پا کر گنوا دیا تھا ۔ اُسے بیلگا کا فیملی نام تک معلوم نہ تھا ، نہ ہی اُس نے یہ پوچھا تھا کہ وہ شہر کے کس حصے میں رہتی تھی اور اسکا فون نمبر کیا تھا ۔ اُسے صرف اتنا پتہ تھا کہ وہ دو سالوں سے وہاں پر رہتی تھی ، کام کسی اخبار کے دفتر میں کرتی تھی اور اکیلی رہتی تھی ۔ بیلگا نے بھی اسکا فون نمبر یا پتہ نہ مانگا تھا ۔ اسکے نام یا اسکے کام کی نوعیت سے بھی وہ واقف نہ تھی ۔ سو اگر وہ چاہتی بھی تو اُسے نہ ڈھونڈ سکتی تھی ۔ اُس نے دو تین اخباروں کے دفتروں میں فون کیا ، تو پتہ چلا کہ ہر دفتر میں بیلگا نام کی عورتوں کی بھرمار تھی اور جب تک فیملی نام کا پتہ نہ ہو ، ٹیلیفون پر کسی سے رابطہ نہ کیا جا سکتا تھا ۔

اب صرف ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ اخبار میں اعلان کروایا جائے شہر کے ایک اخبار میں ہر سنیچر کے روز ذاتی اعلانات چھپتے ہیں ، جو دو تین سطروں کے ہوتے ہیں اور جن کے ذریعہ لوگ ایک دوسرے سے رابطہ پیدا کرتے ، اپنی گمشدہ چیزوں کو تلاش کرتے یا کسی اور خواہش کا اظہار کرتے ہیں ۔ اسکے اشتہار کا مضمون یہ تھا کہ اُسے اس لڑکی سے دوبارہ ملنے کا شوق تھا ، جسکا ساتھ کرسمس کی رات سینٹ نیکولائی چرچ کی نصف شب والی سروس کے دوران اُس سے چھوٹ گیا تھا ۔

منگل کے روز اخبار کے دفتر میں ایک خط اسکے حوالے کیا گیا ، جو اس کے اشتہار کے جواب میں آیا تھا ۔ اس میں لکھا تھا کہ وہ بھی اُس سے دوبارہ ملنے کی خواہش رکھتی تھی اور تجویز پیش کرتی تھی کہ وہ بدھ کے روز چھ بجے شام سینٹ نیکولائی چرچ کے بڑے گیٹ پر ملیں لکھنے والی نے اپنا نام و پتہ یا ٹیلی فون نمبر نہیں دیا تھا ۔

وہ بدھ کے روز وقت سے بہت پہلے سینٹ نیکولائی کے بڑے دروازے پر پہنچ گیا ، جو اس وقت بند تھا ۔

اُس نے دروازے کے سامنے ٹہلنا شروع کر دیا اور ہر آنے جانے والی لڑکی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا ۔ اُسے یقین تھا کہ وہ بیلکا کو پہلی ہی نظر میں پہچان جائے گا ۔ لیکن اگر وہ اُس روز والے کپڑے پہن کر نہ آئی ، سر ڈھانپے ہوئے ہوئی اور کسی اور رنگ کا اوور کوٹ پہنے ہوئے ہوئی ، تو واضح ہے کہ پہچاننا مشکل ہو گا ۔ اُس روز برفباری ہو رہی تھی اور ٹریفک بالکل جام ہو کر رہ گیا تھا ۔ اس لئے خطرہ تھا کہ شاید بیلکا وقت مقررہ پر نہ آسکے گی ۔

عین چھ بجے ایک لڑکی گیٹ پر پہنچ گئی جس کی بیلکا کے ساتھ قطعاً کوئی مشابہت نہ تھی ۔ وہ اس سے قد میں اور شاید عمر میں بھی بڑی تھی ۔ وہ اسکی طرف بڑھی اور پوچھا کہ کیا وہ اسکا انتظار کر رہا تھا ؟ واضح تھا کہ خط اُس نے لکھا تھا ۔ اس لئے انکار کرنے میں کوئی تک نہ تھی ۔ بیلکا نے شاید اسکا اشتہار نہیں دیکھا تھا اور اگر دیکھا تھا تو اُس نے جواب دینا پسند نہ کیا تھا ۔

لڑکی نے اپنا ہاتھ مصافحہ کیلئے بڑھایا اور اپنا نام انگے بتایا ۔ اُس نے کسی نزدیکی کیفے میں چلنے کی تجویز پیش کی ، جہاں پر بیٹھ کر بات کی جا سکے ۔ عین اس وقت برفباری تیز ہو گئی ۔ اُس نے چھتری کھول کر تان لی ۔ انگے بھی اس کے نیچے آگئی اور اُس نے اسکے بازو کے اندر اپنا بازو ڈال کر اُسے تھام لیا ، اسکی اس بے تکلفی میں کوئی اوپرا پن نہ تھا ، یوں لگتا تھا جیسے وہ عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں ۔ یہی انداز اِنگے کے بات کرنے میں نمایاں تھا ۔ جب اُس نے پوچھا کہ اُس نے اسکے اشتہار کے جواب میں کیوں لکھا تھا ، تو اِنگے نے قہقہہ لگا کر کہا کہ وہ سچ مچ کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھا جو کھو گئی تھی ؟ گویا اس کے نزدیک اسکا اشتہار بھی محض ایک بہانہ تھا کسی لڑکی سے ملنے کا ۔ اُس نے کہا کہ انکی دوستی کی بنیاد کچی پر رکھی جا رہی تھی ۔ اسپر اِنگے نے جواب دیا کہ یہی دنیا کا دستور ہے اور یہ کہ اُسے پھلوں سے غرض رکھنی چاہئیے نہ کہ درختوں کی گنتی سے ۔ یوں بھی ہر چیز کا انحصار اتفاق پر ہے ۔ اگر اُس نے اتفاقیہ طور پر اسکا اشتہار نہ پڑھا ہوتا ، تو وہ اس وقت پہلو بہ پہلو نہ چل رہے ہوتے ۔ وہ جان گیا کہ ان کی دوستی بہت دنوں تک نہ چل سکے گی ۔

کیفے میں اوور کوٹ ، ٹوپیاں ، مفلر اور دستانے اتار کر جب وہ آمنے سامنے بیٹھے ، تو اُس نے پہلی بار انگے کی نیلی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا ۔ اُسے ان میں عیاری کی جھلک دکھائی نہ دی جسکی وہ توقع کر رہا تھا ۔ اِنگے نے کسی ڈری ہوئی ہرنی کی طرح اسکی طرف دیکھا ، جیسے کہہ رہی ہو کہ میں نے حیلہ کیا ہے ، کوئی جُرم نہیں کیا ۔ وہ اس عرصے میں اس بات کو نظر انداز کر چکا تھا اور کبھی کا انگے کے حق میں فیصلہ دے چکا تھا ۔ بیلکا ایک نوخیز کلی کی طرح تھی ، جب کہ اِنگے ایک کھلا ہوا پھول تھی جسکی خوشبو اس کے دل و دماغ پر چھا رہی تھی ۔ وہ دل ہی دل میں اسکی جرأت کی داد دے رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا ، کہ اسطرح انکی ملاقات کا بہانہ پیدا ہوا تھا ۔ اِنگے کا باتیں کرنے کا انداز جداگانہ تھا ۔ اسکا ہر فقرہ بظاہر بے ساختہ مگر در حقیقت ایک سوچی سمجھی سکیم کا حصّہ ہوتا تھا ۔ اس نے جلد ہی جان لیا کہ اِنگے کسی شطرنج کے کھلاڑی کی طرح تھی ، جو کسی مہرے کو حرکت دینے سے پہلے اپنے مدِ مقابل کی ساری ممکنہ چالوں کا جائزہ لیتی تھی ۔

اس لئے اس بات پر ذرہ بھر حیرت نہ ہوئی ، جب اِنگے نے کہا کہ دونوں کو یہ طے کر لینا چاہئیے کہ وہ ایک دوسرے کے سوالات کا جواب دینا چاہیں تو دیں وگرنہ انکار کر دیں ۔ اسے یہ جانتے کا شوق نہیں تھا کہ ہیلگا کون تھی اور اسکی ملاقات اس کے ساتھ کہاں پر اور کن حالات میں ہوئی تھی ۔

البتہ وہ اِنگے کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا تھا ، جسکی کلاسیکل موسیقی میں دلچسپی کا اظہار گھر سے ہو چکا تھا کہ وہ اس شام کو کھیلے جانے والے اوپیرا "ڈون جوانی" کیلئے دو ٹکٹ ریزرو کروا کے آئی تھی ۔ اس لئے دوسری باتوں میں پڑنے سے قبل انہیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کیا وہ اوپیرا ہاؤس میں جانے کا ارادہ رکھتے تھے ۔ اگر ایسا تھا تو انہیں فوراً روانہ ہو جانا چاہئیے ۔ باتیں کرنے کے لیے اور ایک دوسرے کو جانتے کیلئے بہت وقت پڑا تھا ۔ رستے میں انگے نے بتایا کہ وہ ہر ہفتے میں ایک دو بار موسیقی کے کسی پروگرام میں ضرور جاتی تھی ۔ تو کیا وہ خود بھی موسیقی میں دسترس رکھتی تھی اور کسی آلہ موسیقی کو بجانے کی مہارت رکھتی تھی ؟ واضح ہے کہ اس کے مثبت جواب کا یہ مطلب تھا کہ اِنگے کا تعلق کسی علم و ثقافت میں دلچسپی رکھنے والے گھرانے سے تھا وائیلن بجانے کی تربیت اس نے ایک پرائیوٹ مؤدب سے حاصل کی تھی ۔ مگر اس بات پر بہت وقت گزر چکا تھا ۔ ان دنوں میں وہ ایک جمنازیم کی طالبہ تھی ۔ پھر تو اُس نے جمنازیم کو پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی کی تعلیم بھی حاصل کی ہوگی ، بلکہ ہو سکتا ہے کہ موسیقی کی طالبہ رہی ہو ؟ یونیورسٹی میں اُس نے موسیقی کی نہیں ، بلکہ مصوری کی تعلیم حاصل کی تھی ۔ تو کیا وہ مصورہ تھی اور اپنی روزی تصویریں بیچ کر کماتی تھی ؟ ہاں وہ مصورہ ضرور تھی ، مگر اپنی روزی تصویریں بیچ کر نہیں بلکہ ایک دوسرے کاروبار کے ذریعے کماتی تھی ۔ اُسے پتہ تھا کہ کاروبار کی نوعیت کے بارے میں سوال کا جواب نہیں دیا جائے گا ۔ اس لئے اُس نے سلسلہ سوالات کو روک دیا ۔

اوپیرا ہاؤس میں اِنگے ہر کسی کو جانتی تھی ۔ وارڈروب والی عورت سے لے کر ٹکٹ چیک کرنے والے مرد اور وقفے کے دوران ریفریشمنٹ بیچنے والے تک ہر کسی نے اسکا نام لے کر استقبال کیا ۔ وہ اس بات سے بے حد مرعوب ہوا ۔ کیوں کہ اس کے لئے اوپیرا ہاؤس ثقافتی معبد خانے سے کم نہ تھا ۔ مگر جب اِنگے نے اسکا تعارف اپنے واقف کاروں سے کروانا شروع کیا ، جو معلوم ہوتا تھا اس کی طرح اوپیرا کے مستقل تماشائیوں میں سے تھے تو اس کے دل میں شکوک پیدا ہونے لگے ، جن کا تعلق اِنگے کی ذات سے تھا ۔ اگر مرد لوگوں میں مقبول ہو ، تو اس بات کو اسکی کامیابی کی دلیل سمجھا جاتا ہے ، جب کہ عورت کی مقبولیت کو اس کے کردار کی کمزوری کی نشانی قرار دیا جاتا ہے ۔ اور اِنگے کے واقف کاروں میں عورتیں کم اور مرد زیادہ تھے ۔ اس کے دل میں یہ سوال اٹھنے لگا کہ اتنے مردوں کے ہوتے ہوئے اِنگے کو اس کے ساتھ واقفیت پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی ۔ اُسے پتہ تھا کہ وہ اس سوال کو اِنگے کے سامنے نہیں رکھ سکتا تھا ۔

اوپیرا کے بعد وہ ایک وائن ہاؤس میں جا کر بیٹھے بیرا آرڈر لے کر گیا ، مگر مینجر خود مشروبات لے کر آیا اور اِنگے

کے ایک عرصے کے بعد اسکی دکان میں آنے پر خوش آمدید کہہ کر گیا ۔ ان باتوں سے اُس نے جان لیا کہ اِنگے عام قسم کی عورت نہ تھی ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بہت مشہور یا بہت امیر ہو ۔ بہر صورت وہ اسکی فکر کا آدمی نہ تھا ، مالی طور پر نہیں اور معاشرتی حیثیت کے اعتبار سے نہیں ۔ اس کے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے کہ شاید اسکو کسی سکیم کے تحت پھانسا جا رہا تھا ، کسی غیر قانونی کارروائی کی خاطر ۔ آخر اخباروں میں آئے دن انسان خبریں دیکھتا ہے کہ کس طرح لوگوں کو بے خبری میں کسی معاملے میں ملوث کر لیا جاتا ہے ۔ اُس نے سوچا کہ اسکو بے حد محتاط ہونا چاہئیے اور کسی صورت میں اپنا نام یا پتہ نہیں دینا چاہئیے ۔ اس لئے جب نصف شب کو وائن ہاؤس سے نکلے تو اُس نے اِنگے سے رخصت چاہی ، جو اُسے اپنے ساتھ گھر لے جانے کا ارادہ رکھتی تھی ۔ اُس نے نہ تو اپنا فون نمبر دیا اور نہ ہی اِنگے کا نوٹ کیا ، بلکہ جلدی سے یہ کہہ کر چل دیا کہ مزید رابطہ کرنا ہوا ، تو اُسی اخبار میں سنیچر کے روز اشتہار دے کر کیا جا سکتا تھا ۔ انگے اس کے اس اقدام پر اسی طرح حیران ہوئی جیسے وہ اس وقت حیران ہوا تھا ۔ جب ہیلگا کی جگہ پر اِنگے سینٹ نکولائی چرچ کے گیٹ پر نمودار ہوئی تھی ۔

دو ہفتوں کے وقفے کے بعد ، جس کے دوران نہ اسکی طرف سے اور نہ ہی انگے کی طرف سے اخبار میں اشتہار ، چھپوایا گیا تھا ، ہیلگا کا اشتہار چھپا ، جس میں سینٹ نیکولائی چرچ میں کرسمس کی رات کو نصف شب سروس کے بعد بچھڑنے کا حوالہ دے کر رابطہ قائم کرنے کی درخواست کی گئی تھی ۔ اُسے شبہ ہوا کہ وہ اشتہار اِنگے کی طرف سے ہو سکتا تھا ، جس سے نہ ملنے کا وہ تہیہ کر چکا تھا ۔ لیکن اگر اشتہار سچ مچ ہیلگا کی طرف سے ہوا ، تو ایک زریں موقعہ اس سے ملاقات کا ہاتھ سے جاتا رہے گا ۔ یہ سوچ کر اُس نے اخبار کی معرفت ہیلگا کے نام خط لکھا اور اُسے اس ریستوراں میں اگلے اتوار کو آنے کو کہا ، جہاں پر ان کی ملاقات ۲۴ دسمبر کے روز ہوئی تھی ۔ چونکہ اس ریستوران کے بارے میں اُس نے انگے کو نہیں بتایا تھا ، اس لئے اگر اشتہار اسکی طرف سے ہوا ، تو وہ مقررہ جگہ پر نہ پہنچ سکے گی ، البتہ اشتہار ہیلگا کا ہوا ، تو وہ فوراً جان جائیگی کہ وہ اسکو کہاں پر مل سکتی تھی ۔

اتوار کے روز وہ مقررہ وقت سے تھوڑا پہلے ریستوراں میں پہنچ گیا اور عین اُسی میز پر جا کر بیٹھ گیا ، جسپر وہ اور ہیلگا چوبیس دسمبر کے روز ایک دوسرے کو ملے تھے ۔ مگر ہیلگا کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ اس گھڑی اسکا وہاں پر انتظار ہو رہا تھا ، کیونکہ اشتہار اِنگے نے چھپوایا تھا ۔ اور اِنگے وہاں پر نہ آ سکتی تھی ، کیونکہ وہ ریستوراں سے ناواقف تھی ، ایسے وقتوں میں بسا اوقات حُسن اتفاق آڑے آجاتا ہے ، اور کہانی کو وقت سے پہلے ختم ہونے سے بچا لیتا ہے ۔ اس روز بھی یہی ہوا اور ایک لڑکی آن نکلی ، جو اپنے قد بُت کے لحاظ سے ہیلگا کی ہمزاد لگتی تھی ، مگر اس سے کہیں زیادہ پُر اعتماد تھی ۔ اُس نے اسے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور اس امر پر قدرے حیران بھی ہوا کہ وہ سیدھی اس میز کے پاس آن کر رُکی ۔ جہاں پر وہ بیٹھا ہوا تھا ۔ لڑکی نے اُسے سلام کیا اور پوچھا کہ آیا اس میز کی کوئی کُرسی خالی تھی اور کیا اُسے اُس پر بیٹھنے کی اجازت تھی ۔ اُس نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ اسکی اپنی کرسی کے

سوا باقی کی تینوں کرسیاں خالی تھیں ۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا ، جیسے کہہ رہا ہو کہ وہ اسپر بیٹھ سکتی تھی ۔ لڑکی نے بیٹھتے ہی کہاکہ وہ یقیناً مینو کا مطالعہ کرچکا ہو گا اور اُسے مشورہ دے سکے گا کہ اُسے کیا آرڈر دینا چاہئیے ۔

اُس نے بہت ضبط کرنے کی کوشش کی ، مگر اسکی ہنسی نکل گئی ۔ اس نے کہاکہ اگر محترمہ کا نام اب ہیلگا نکل آیا ، تو غضب ہو جائے گا ۔ لڑکی نے اس کا سبب جاننا چاہا اور بتایاکہ اسکا نام کرستینا تھا ۔ اس نے سارا ماجرا سنایا اور بتایاکہ وہ اُس روز وہاں پر ہیلگا سے ملنے کی توقع لے کر آیا تھا ۔ کرستینا بھی اس اتفاق پر حیران ہوئی اور سنانے لگی کہ کئی سال پہلے اسی ریستوران میں اسکی ملاقات اپنے بعد میں ہونے والے شوہر کے ساتھ ہوئی تھی ۔ وہ اتوار کا دن تھا اور اُسے خوب یاد تھاکہ اُس روز بندرگاہ کی سات سو پچھترویں سالگرہ منائی جارہی تھی ۔ شہر میں اور بالخصوص بندرگاہ کے علاقے میں موسیقی ، سائیکل ریسنگ اور کشتیوں کی ریگاٹا کے پروگرام ہو رہے تھے ، جن کو دیکھنے کے لئے لاکھوں تماشائی دُور و نزدیک سے آئے ہوئے تھے ۔ اُسے اس شہر میں رہتے ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا تھا اور کسی لڑکے کے ساتھ اسکی دوستی نہ تھی ، جسکی معیت میں وہ ان پروگراموں کو دیکھنے کیلئے جاتی ۔ اس لئے اُسے بے حد خوشی ہوئی تھی ، جب اس ریستوران میں ایک نوجوان اسکی میز پر بیٹھنے کا خواہشمند ہوا ، اور بتانے لگاکہ وہ بندرگاہ کے جشن کے پروگراموں میں حصہ لینے کے لیے شہر میں آیا تھا ۔ پھر اس نے خود ہی تجویز پیش کر دی کہ اگر وہ چاہے تو وہ اسکی ہمراہی کیلئے تیار تھا ۔ پھر یہ ہمراہی اتنے لمبے عرصے تک قائم رہی کہ دوستی میں بدلی اور بالآخر ان کی شادی پر منتج ہوئی ۔

کھانے کے دوران کرستینا نے بتایاکہ وہ اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کر رہی تھی اور اس روز ایک فلیٹ کرائے پر لینے کیلئے دیکھنے جارہی تھی ۔ اس نے کرستینا سے ہمدردی کا اظہار کیا اور معذرت کرتے ہوئے کہ وہ اس کے ذاتی معاملے میں دخل اندازی کا مرتکب ہو رہا تھا ، اسکی اپنے خاوند سے علیحدگی کا سبب جاننے کا خواہشمند ہوا ۔ کرستینا نے کہاکہ اُسے اس بارہ میں کچھ بتانے پر اعتراض نہ تھا ۔ البتہ اُسے یقین نہیں تھاکہ کوئی غیر متعلقہ شخص ان وجوہات کو پوری طرح سمجھ سکتا تھا اس کے خاوند کا سلوک اس کے ساتھ قطعاً غیر منصفانہ نہ تھا ، نہ ہی مالی مشکلات اسکا سبب تھیں ، میاں بیوی کے درمیان کبھی لڑائی جھگڑا تک نہ ہوا تھا اس کے باوجود وہ اپنے خاوند سے علیحدگی چاہتی تھی ۔

اُس نے پوچھاکہ کیا کرستینا کے خاوند نے کسی دوسری عورت کی طرف رجوع کر لیا تھا ، یا شاید خود کرستینا کو کوئی اور مرد مل گیا تھا ؟ کرستینا نے بتایاکہ اس کے دونوں مفروضے درست نہ تھے اس کا خاوند اس سے اسقدر محبت کرتا تھاکہ کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھاکر دیکھتا تک نہ تھا ، اور خود اس نے اتنے سالوں کے دوران اپنے خاوند سے بے وفائی نہ کی تھی ۔ دراصل اسکے خاوند کی بے انت محبت نے اسکو بیس کر رکھ دیا تھا ۔ دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے گرد گھومتی تھی ، جس میں کسی تیسرے کیلئے حتیٰ کہ ایک بچے تک کیلئے کوئی جگہ نہ تھی ۔ انہوں نے شروع سے آپس میں یہ طے کر لیا تھاکہ وہ بچہ پیدا نہیں ہونے دیں گے تاکہ وہ اپنی محبت کو ایک دوسرے پر مرتکز کر سکیں ۔

اس کا خیال تھا کہ ان کے مسئلہ کا حل آسان تھا ۔ جس چیز کی کمی ان کے باہمی تعلقات میں تھی وہ ایک بچے کا وجود تھا ۔ دونوں جوان اور تندرست تھے اور بچہ پیدا ہونے میں اگر کوئی طبی روک نہ تھی ، تو انہیں اس نسخے پر عمل کرنا چاہئیے ۔ کرستینا نے بتایا کہ انہوں نے اس عرصے میں ماہرین نفسیات سے بھی مشورہ کیا تھا ، اور آخر کار اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ ان کے مسئلے کا کوئی اور حل سوائے علیحدگی کے نہ پایا جاتا تھا ۔ کرستینا اندرونی طور پر اپنے خاوند سے اس حد تک دُور جا چکی تھی کہ وہ اس کے بدنی قرب کو برداشت نہ کر سکتی تھی ۔

اس شام وہ کرستینا کے ہمراہ فلیٹ دیکھنے کیلئے گیا ، جو دونوں کو پسند آیا اور اُسے کرائے پر لے لیا گیا ۔ چونکہ کرستینا کا اس شہر میں اور کوئی ٹھکانہ نہ تھا ، اسلئے وہ اسکے کہنے پر ہوٹل سے اسکے ہاں اٹھ آئی ، مگر اس شرط کے ساتھ کہ جونہی اسکا سامان نئے فلیٹ میں منتقل ہو جائے گا ، وہ وہاں پر چلی جائے گی ۔ اسطرح انہیں ایک پورا ہفتہ اکٹھے رہنے اور ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ۔ دونوں کی عادات میں بہت نمایاں فرق تھا ۔ مثلاً کرستینا سگریٹ پیتی تھی ، جب کہ وہ تمباکو کا دھواں برداشت نہیں کر سکتا تھا ۔ اُسے رات کو دیر سے سونے اور صبح دیر سے جاگنے کی عادت تھی ۔ اس کے برعکس کرستینا کی آنکھیں شام کو نو دس بجے بند ہونے لگتی تھیں اور وہ صبح سویرے مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ بیدار ہو جاتی تھی ۔ اُسے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اور ٹیلی ویژن کو صرف خبریں دیکھنے کیلئے لگاتا تھا ۔ کرستینا ہر کاؤبوائے فلم کو دیکھنا چاہتی تھی ۔ وہ فرانسیسی شانساؤں گیت سُننے کا رسیّا تھا ، اور کرستینا کے ٹیپ ریکارڈ سے دن رات سستے فلمی اور دوسرے گیت بجتے رہتے تھے ۔ جب ایک ہفتے کے بعد کرستینا اپنے فلیٹ میں منتقل ہوئی ، تو دونوں نے اطمینان کا سانس لیا ۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے ایک دوسرے سے ملنا بھی چھوڑ دیا ۔ وہ ہفتے میں ایک دو بار مِل بیٹھتے تھے ۔ کسی اچھے سے ریستوراں میں جا کر کھانا کھاتے تھے ، کبھی کبھار فلم دیکھنے جاتے تھے ۔ اور گاہے گاہے تھیٹر یا اوپیرا میں چلے جاتے تھے اسکی توقع کے برعکس اسکا سامنا اوپیرا یا میوزک ہال میں کبھی اِنگے کے ساتھ نہیں ہوا ، جسے کرستینا کم از کم ایک بار دیکھنے کی خواہش رکھتی تھی ۔ اُسے آہستہ آہستہ یہ خیال پیدا ہونے لگا تھا کہ اِنگے اور ہیلگا کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا تھا اور ساری کہانی اسکے دماغ کی ایجاد تھی ۔ دراصل کرستینا کو اندر ہی اندر اس سے محبت ہو چکی تھی ، مگر وہ اس کا اظہار کرنے سے کتراتی تھی کیونکہ اُسے پتہ تھا کہ وہ آگ اور پانی کی طرح ایک دوسرے سے مختلف تھے اور محض اتفاق کی بدولت ایک دوسرے کے اسقدر قریب آ گئے تھے ۔

انہی دنوں میں کرستینا کے بچپن کی سہیلی ایلکے کہیں سے آن نکلی ۔ وہ خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی ۔ نکلتا ہوا قد ، متناسب ہاتھ پاؤں ، ترشے ہوئے خد و خال ، لگتا تھا کہ قدرت نے اسکی تخلیق پہ خاص توجہ برتی تھی ۔ پہلی ہی ملاقات میں ایلکے کا حُسن اس پر جادو کر گیا ۔ پھر یہ جان کر اُسے خوشی ہوئی کہ کرستینا نے ایلکے کو اپنے فلیٹ میں رہنے کی دعوت دی تھی ۔ بہت جلد وہ وہاں پر منتقل ہو گئی ، جس کے بعد تینوں اپنے فراغت کے اوقات کو مل کر گزارنے

لگے ۔ کرستینا کوئی کام کل پر اٹھا کر رکھنے کی قائل نہ تھی اور عملی کاموں میں بے حد مستعد تھی ۔ جب کہ ایلکے کے اندر چیزوں کو جانتے اور ان کے پس منظر میں دیکھنے کا جذبہ جنون کی حد تک پایا جاتا تھا ۔ اُس نے سالہا سال کی محنت و مشقت کے نتیجے میں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے ضروری امتحانات پرائیوٹ طور پر پاس کر لئے تھے ۔ اسکی مثال کی پیروی کرتے ہوئے کہ کرستینا نے بھی وہی رستہ اختیار کر لیا ۔ اور بالآخر دونوں کو یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا ۔

اس عرصے میں کرستینا نے اپنے خاوند روبرٹ سے طلاق حاصل کر لی تھی ۔ مگر ان کے باہمی دوستانہ تعلقات بدستور قائم رہے اور ان کا آپس میں باقاعدگی کے ساتھ ملنا ہوتا تھا ۔ دونوں نے اپنی شادی کے دوران ایک مکان تعمیر کیا تھا جس میں طلاق کے بعد روبرٹ اکیلا رہ گیا تھا ، اگرچہ مکان کی نصف ملکیت کرستینا کی تھی ، اور وہ گاہے بگاہے وہاں پر جا کر ٹھہرتی تھی ، تاکہ اسکے حق ملکیت کو چیلنج نہ کیا جا سکے ۔ کرستینا اپنے ساتھ اکثر ایلکے کو لے جایا کرتی تھی ۔ بالآخر تینوں نے آپس میں یہ طے کر لیا کہ کرستینا اور ایلکے اپنا کرائے کا فلیٹ چھوڑ کر روبرٹ کے مکان میں منتقل ہو جائیں ۔ روبرٹ اس کے لئے ایک بالکل اجنبی تھا ، جس کے ساتھ اسکی کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی ۔ جو کچھ اُسے روبرٹ کے بارے میں پتہ تھا وہ کرستینا اور ایلکے کا بتایا ہوا تھا دونوں نے اسکی نیک سیرت کے متعلق اتنے قصیدے گائے تھے کہ اُس نے روبرٹ کو "سینٹ" کا لقب دے دیا تھا ، جسے اس دنیا سے اور اسکے ارضی لوازمات میں کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ دونوں عورتوں نے اسے باور کرانے کی کوشش کی تھی ، کہ روبرٹ ان کے لئے محض ایک دوست تھا ، جسکا مرد ہونا بس ایک اتفاقی حادثہ تھا ۔

کرستینا اور ایلکے کے ساتھ اسکی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا تھا ۔ وہ ہفتے میں ایک دو بار ملتے تھے اور گھنٹوں تک مشترکہ دلچسپی کے موضوعات پر گفتگو کرتے تھے ۔ ثقافتی پروگراموں میں شامل ہوتے تھے ، سیمیناروں اور لیکچروں میں اکٹھے جاتے تھے ۔ اور تینوں کو یہ احساس تھا کہ وہ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے ۔ البتہ کرستینا نے پہلے سے بڑھ کر اس کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا ۔ جب کہ اس کے دل میں ایلکے کیلئے پیار کا ایک سمندر موجزن تھا ۔ مگر ایلکے کی طرف سے دوستی کے عام جذبے سے بڑھ کر کوئی رد عمل نہ ہوتا تھا ۔

ایلکے ایک عجیب و غریب لڑکی تھی ۔ اُس نے اپنے ارد گرد ایک غیر مرئی دیوار بنا رکھی تھی ۔ جو اس تک رسائی کے رستے میں بہت مضبوط رکاوٹ تھی ۔ وہ اپنے اندر رونے کی کوئی خبر باہر نہ نکلنے دیتی تھی ۔ اسکے دلی جذبات کو جاننے کے لئے انسان کا زلزلے کی پیش گوئی کرنے والے آلے کی طرح حساس ہونا ضروری تھا ۔ بعض اوقات ایک بالکل غیر متعلقہ چیز کے بارے میں کہی جانے والی بات انسان کے اندرونی احساسات کو سمجھنے میں بے حد مد ہو سکتی ہے ۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے ایلکے کے ذاتی ذخیرۂ الفاظ اور اس کے استعمال کے موقعہ و محل کا اس حد تک احاطہ کر لیا تھا کہ وہ اسکی مدد سے ایلکے کی اُن باتوں کو بھی سمجھنے لگ گیا تھا ، جن کے بارے میں ایک لفظ بھی اس کے لبوں پر نہ آتا تھا ۔

وہ یہ امر جان گیا کہ ایلکے کو روبرٹ سے پیار تھا ، جس کا اظہار کرنے سے وہ کتراتی تھی ، شاید اس امر کا اظہار کر ہی نہ سکتی تھی ۔ ایک وجہ اسکی یہ بھی تھی کہ روبرٹ بدستور کرستینا پر عاشق تھا ، جو کسی طور پر اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا ، اگرچہ کرستینا کی طرف سے اُسے کوئی امید افزا جواب نہ مل رہا تھا۔ روبرٹ اپنے پیار کی بھٹی میں جل رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اس سے کیسے نجات پائے ۔ چاروں ایک شیطانی چکر میں جکڑے ہوئے تھے ۔ کسی تھرڈ کلاس سوپ اوپیرا کی طرح ان میں سے ہر کوئی غلط عورت یا غلط مرد سے پیار کرتا تھا ۔ کرستینا اُسے چاہتی تھی ، وہ ایلکے سے پیار کرتا تھا ، ایلکے روبرٹ کی دیوانی تھی اور روبرٹ کرستینا کو نہ بھول سکتا تھا ۔

پچھلے ہفتے چوبیس دسمبر کے روز وہ ایلکے اور کرستینا کے لئے کرسمس کے تحفے خریدنے کی خاطر ایک کتب خانے میں گیا ، جہاں پر اسکی طرح آخری منٹ پر تحفے خریدنے والوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی ۔ اچانک اسکی نظر ہیلگا پر پڑی ، جو ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی ہیلگا نے نظر اٹھا کر اسکی طرف دیکھا ۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور انہوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا ۔ مگر ایک دوسرے کے بازوؤں میں گرنے کی بجائے دونوں نے اپنی اپنی نظریں جھکا لیں ۔ ان کے درمیان بیگانگی کی یخ جم چکی تھی ۔

(کُمرفیلڈ ۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۰)

صُوفی عطا محمدؐ !

عرفان علی شاد

صوفی کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور مخمور تھیں ، بالکل قاتل کی آنکھیں لگتی تھیں ، رنگ گندمی تھا ، چہرہ لمبوترا اور اُس پر چھدری داڑھی تھی جس پر مجھے بارانی علاقے کے کھیت کا گمان ہوتا تھا ---- اُس کا پورا نام صوفی عطا محمد تھا ، بلّے کے ہوٹل میں ملازمت اختیار کرنے سے پہلے وہ لنڈا بازار میں ایک پٹھان کی دُکان پر ملازم تھا ، مگر کسی بات پر پٹھان سے اُس کا جھگڑا ہو گیا اور اُس کے بعد سے وہ بلّے کے ہوٹل میں ویٹر کے طور پر کام کرنے لگا ۔ اور اب وہ کئی سال سے انتہائی محنت اور ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض پورے کر رہا تھا ۔ عموماً وہ بڑا بے نیاز سا آدمی تھا ، بولتا بھی بہت کم تھا ، ایسا لگتا تھا جیسے اُسے زندگی سے کوئی دلچسپی نہ ہو ، بس اپنی دُھن میں مگن رہتا تھا مگر کبھی کبھی وہ اچانک بارودی سرنگ کی طرح پھٹ پڑتا اور اتنا بولتا کہ اُسے خاموش کرانا مشکل ہو جاتا ---- اُس کے یوں بولنے میں اُسکی زندگی کے واقعات کے کچھ ٹکڑے بھی ہوتے تھے ، بالکل ٹوٹے ہوئے بسکٹوں کی طرح جنہیں کوئی بھی بیکری والا دوبارہ جوڑ نہیں سکتا تھا ، مثلاً پٹھان نے اُس کی دو مہینوں کی تنخواہ روک رکھی تھی اور وہ دو دن کا بھوکا تھا ، چنانچہ اُس نے پٹھان کی واسکٹ سے دس روپئے چرا لیے ، یا اسکا باپ منڈی میں بوریاں ڈھوتے ڈھوتے خون تھوکنے لگا اور اُس نے اسکا علاج کروانا چاہا تو ڈاکٹر نے بہت فیس مانگی ، جس پر اُسے غصہ آیا اور اُس نے ڈاکٹر کے اسٹیتھو سکوپ توڑ کر چار ٹکڑے کر دیا ---- یا پھر لڑکپن کے دو تین ٹوٹے پھوٹے عشق اور ناکامی ---- اور بسکٹوں کے یہ ٹکڑے جب ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے تب صوفی عطا محمد اس طرح خاموش ہو جاتا جیسے کبھی بولا ہی نہ ہو اور اس کی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھیں اور بھی مخمور نظر آنے لگتیں ، اس پر شدید جھنجھلاہٹ اور غم و غصّے کی کیفیت اتنی بری طرح طاری ہو جاتی کہ میں خوفزدہ ہو جاتا اور مجھے لگتا کہ جیسے وہ اچانک بجلی کی سی پُھرتی کے ساتھ ایک خاراشگاف چاقو ہوٹل میں بیٹھے ہوئے کسی آدمی کے پیٹ میں اُتار کر فرار ہو جائے گا ---- لیکن یہ محض میرا وہم تھا ، ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا ---- بلکہ اب صوفی پر گہری خاموشی چھا جاتی اور وہ کسی مصری ممی کی طرح چپ چاپ اپنا کام کیے جاتا ۔ بعض اوقات مُجھے اس پر بڑی حیرت ہوتی تھی اور اس کی شخصیت کے اِس تضاد کو سمجھنے کے لیے میں بہت ہاتھ پاؤں بھی مارتا مگر بے سود ---- اُس کی شخصیت میرے ذہن میں بدستور کنڈل مارے بیٹھی رہتی ---- !

یہاں آپ یہ نہ سمجھ لیجیئے گا کہ صوفی سے میرا کوئی یارانہ تھا یا بہت پرانی جان پہچان تھی ---- ایسا کچھ نہیں تھا ۔ بلکہ مجھے تو یہ بلّے کا ہوٹل بھی سخت ناپسند تھا ، بالکل واہیات قسم کا ہوٹل تھا ، ہوٹل کم اور کباڑ خانہ زیادہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ بلّے کو صفائی یا آرائش سے کوئی سروکار نہیں تھا ، اس پر ستم یہ کہ یہ ہوٹل بالکل تہ خانے میں تھا ، پوری ایک

منزل نیچے اترنا پڑتا تھا، اور جب اس کی کھٹملوں سے بھری تھرڈ کلاس کرسی پر بیٹھ کر مجھے چائے پینا پڑتی تھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی قبر میں چائے پی رہا ہوں ۔ مگر میں اپنے دوست بادشاہ حسین کی خوشی کی خاطر اُس اندھیری قبر میں بھی اکثر و بیشتر اتر جاتا تھا کیونکہ دوستی بہر حال نبھانا پڑتی ہے اور بادشاہ حسین جیسا مُخلص دوست ملنا بہت مشکل ہوتا ہے ۔ خاص کر اس دور میں جب کاروں ، کوٹھیوں ، کمپیوٹروں ، فاسٹ فوڈ ، کانوں کے پردے پھاڑنے والی میوزک ، وڈیو اور مار دھاڑ سے بھرپور فلموں کا دور دورہ ہو اور آدمی آدمی کو ترس رہا ہو اور انسانیت چوراہوں پر ننگی ہو رہی ہو اور زندگی سے زندگی کھسک چکی ہو اور لطیف جذبات کہیں راستے ہی میں خاک پھانکتے رہ گئے ہوں تو بادشاہ حسین جیسا آدمی مل جانا کسی آیۂ رحمت سے کم نہیں ہوتا ۔ چنانچہ میں نے بادشاہ حسین کو چوم چاٹ کر دل میں سینت کر رکھ لیا ـــــ اب وہ ان پڑھ ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں اسکی موچی دروازے میں پتنگوں کی سب سے بڑی دُکان ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں ، وہ موچی دروازے میں میرے مکان کے پچھواڑے رہتا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں اور گلی میں آمنا سامنا ہونے پر اگر وہ مجھے گھسیٹتا ہوا بلّے کے ہوٹل میں لے جاتا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ ـــــ اسکے خلوص کے آگے بے بس ہوں ، مجبور ہوں ـــــ !

اسی لیے مجھے صوفی کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے ـــــ اور صوفی کے مدقوق اور پراسرار وجود کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے ، پھر وہ اپنی دائیں ران ہمیشہ کھجاتا رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ بعض اوقات مجھے بالکل خارش زدہ کتا لگتا ہے ، اس کے علاوہ اس کے پاس سے پھٹے ہوئے دودھ اور سڑے ہوئے سالن کی ملی جلی بو آتی رہتی ہے ۔ وہ شاید نہاتا بھی بہت کم ہے ـــــ البتہ رمضان کے مہینے میں وہ اپنی کینچلی اتار دیتا اور بہت صاف ستھرا دکھائی دیتا ، پورے روزے رکھتا ، پانچوں وقت کی نماز پڑھتا اور کام کے دوران بھی کھٹاکھٹ تسبیح پھیرتا رہتا مگر اس کے باوجود مجھے اس کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں سے ڈر لگتا رہتا جو بالکل قاتل کی آنکھیں لگتی تھیں ـــــ !

ایک بار بادشاہ حسین سے جب میں نے صوفی کی آنکھوں کا تذکرہ کیا تو اُس نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگا "یہ تمہارا وہم ہے صوفی عطا محمد جیسے لوگ قتل کیا نہیں کرتے قتل ہوا کرتے ہیں ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اعتراف پہلے کرتے ہیں اور گناہ بہت بعد میں جا کرتے ہیں یا سرے سے کرتے ہی نہیں ۔ صوفی کو تم سے زیادہ میں جانتا ہوں ۔ لو چائے پیو کب سے ٹھنڈی ہو رہی ہے ۔"

اور میں نے گھبرا کر چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگالی ۔ چائے بالکل ٹھنڈی تھی اور باہر سردیوں کی دھواں دھار بارش ہو رہی تھی اس لیے آج بلے کے ہوٹل کے فرش پر ایک عجیب گاڑھی سی کیچڑ پھیلی ہوئی تھی جو میرے تین سالہ پرانے جوتوں کے ساتھ چپک کر مجھے اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھی ۔ اسکے علاوہ ٹوٹی پھوٹی کرسیوں میزوں کے نیچے موٹے موٹے چوہے بھی آزادی سے اپنا رزق تلاش کرتے ہوئے بار بار پیروں سے ٹکرا رہے تھے ، عجیب طرح کا حبس تھا ، میرا دم گھٹ رہا تھا اندھیرے کی وجہ سے مجھے کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا حتیٰ کہ کھٹملوں سے بھری ہوئی

کرسیوں پر بیٹھے ہوئے اپنے ہی محلّے کے لوگ مجھے تہ خانے کے کیڑے معلوم ہو رہے تھے ۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اُٹھ کر بھاگ جاؤں مگر باہر بارش ہو رہی تھی ۔ میری طبیعت کے تکدر کو محسوس کر کے بادشاہ حسین نے گرما گرم چائے منگوا لی اور میرے ہونٹوں میں گولڈ لیف کا سگریٹ ٹھونس کر سلگا دیا اور کہنے لگا ——— "تم فکر نہ کرو صوفی عطا محمد کسی کو قتل نہیں کرے گا کیونکہ وہ مڈل پاس ہے ۔"

"کیوں مڈل پاس کیا قتل نہیں کر سکتے؟" میں نے جھلا کر پوچھا ۔

"نہیں کر سکتے پڑھے لکھے لوگ کچھ نہیں کر سکتے ، بزدل ہوتے ہیں صرف ہوائی قلعے بنا سکتے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ ان میں جراتِ گناہ نہیں ہوتی ، اسی لیے یہ لوگ ساری عمر شرمندگی کی حالت میں گذارتے ہیں اور اسی حالت میں ——— خیر چھوڑو چائے پیو !"

بادشاہ حسین جب اس قسم کی باتیں کرتا ہے تو مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ ان پڑھ ہے ، اسی طرح جب بِلّا اپنے نوکروں کو سڑی سڑی گالیاں دیتا ہے تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ گالیاں ہیں ——— یا پیلے بلب کی مرگلی روشنی میں جب صوفی ریز گاری گننے میں مصروف ہوتا ہے تو مجھے بالکل یقین نہیں آتا کہ وہ صوفی عطا محمد ہے ——— اسی طرح جب ہوٹل کے ملازموں میں سے کوئی جوا کھیلنے ، چرس پینے یا ہیرا منڈی کے کسی کوٹھے پر رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے تب بھی میں یقین نہیں کر پاتا کہ یہ وہی چھوکرے ہیں جو دن بھر گاہکوں کی آوازوں پر بڑی پھرتی سے دوڑتے پھرتے ہیں ۔ اور جب بِلّا کاؤنٹر سے اُٹھ کر مفلر گلے میں ڈالتا ہے اور تھانے والوں کو گالیاں دیتا ہوا انہی چھوکروں کی ضمانت کروانے جا رہا ہوتا ہے تب بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی ہے   بس یوں لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ کسی چغد کا خواب ہو ——— ایسے میں بادشاہ میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے پوچھتا ہے ——— "پھر سوچ میں پڑ گئے؟"

اس بار میں کوئی جواب نہیں دیتا بس کھوئی کھوئی آنکھوں سے اُسے حیرت سے دیکھے جاتا ہوں ——— دیکھے ہی جاتا ہوں ——— میرا دل نہیں مانتا کہ بادشاہ حسین جو موچی دروازے کی ایک اندھیری دکان میں بیٹھ کر دن بھر پتنگیں بناتا ہے ایسی فلسفیانہ باتیں بھی کر سکتا ہے ——— !

ایک شام میں اسی طرح کے وسوسوں میں پھنسا بیٹھا تھا کہ بادشاہ حسین کہنے لگا ——— "یار تم تعلیم یافتہ لوگ کڑھتے بہت ہو ——— ایسے کڑھ کڑھ کر جینے سے کیا فائدہ ؟ ——— پھر اس نے میری پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا ——— "میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ انسان کو زندگی سے زندگی اس طرح نچوڑ لینا چاہیئے جیسے میں چائے دانی سے چائے کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتا ہوں ——— آدمی کو چاہیے کہ چاہے وہ سگریٹ پیے ، پیار کرے ، نان کباب کھائے ، شیو بنائے یا ہیرا منڈی میں جھک مارے ——— بس ہر چیز سے لُطف اٹھائے ——— اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ موت ہے ، گناہ ہے ، جرم ہے ——— یار تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ زندگی بے وفا ہے ، کسی وقت بھی چھوڑ کے جا سکتی ہے ، پھر اس کے لیے پریشان ہوتے رہنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ ——— اس لیے یہ جو بھی ہے ، جیسی بھی ہے ———

بس اسے گھول کے پی جاؤ ـــــ لاش کی طرح مت جیو ـــــ ایسے جینے میں کیا پڑا ہے ؟ بولو ؟ ـــــ بولو ـــ ؟"

"کیا بولوں بادشاہ حسین تم تو جانتے ہی ہو کہ میری بیوی نے مجھ سے صرف اس لیے طلاق لے لی کہ میں کوئی کام نہیں کرتا ـــــ صرف کہانیاں لکھتا ہوں اور کہانیوں سے آٹے کا کنستر نہیں بھرا جا سکتا ـــــ چنانچہ اُس نے آٹے کے کنستر سے شادی کر لی ۔ بیشتر عورتیں یہی کرتی ہیں ـــــ اُس نے بھی یہی کیا ؟ میں اُسے کیا دے سکتا تھا؟

"اسی لیے پریشان ہو؟"

"نہیں ، پریشان تو اس لیے ہوں کہ خدا جنہیں حُسن کی پرکھ عطا کرتا ہے انہیں آٹے کا کنستر نہیں دیتا اور جنہیں آٹے کا کنستر دیتا ہے ۔ انہیں حُسن کی قدر و قیمت سمجھنے کی صلاحیت سے محروم رکھتا ہے ـــــ اس کے باوجود خوبصورت عورتیں آٹے کے کنستروں سے شادی کرنے کو ترجیح دیتی ہیں اور موٹروں میں اُڑی پھرتی ہیں ، اور مجھ جیسے دل پھینک اور حُسن پر مر مٹنے والے محض جھک مارتے ہیں جیسے میں تمہارے سامنے بیٹھا جھک مار رہا ہوں اور اپنی بے تکی بکواس سے تم کو بور کر رہا ہوں ، مگر یہ میری مجبوری ہے ، تم برا نہ ماننا ـــــ !

"تو تم کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کر لیتے ۔" بادشاہ حسین نے دیا سلائی سے اپنا کان صاف کرتے ہوئے کہا ۔

"کیسے کر لوں ـــــ جبکہ خدا نے مجھے صرف کہانیاں لکھنے کے لیے پیدا کیا ہے ـــــ میں تم سے سچ کہتا ہوں بادشاہ حسین ـــــ کہ میں نے پانچ چھ نوکریاں کیں مگر کسی نوکری میں دل نہیں لگا ـــــ ہر نوکری سے طبیعت اکھڑ گئی ـــــ کیوں اکھڑ گئی اس کا جواب میرے پاس خود بھی نہیں ہے ـــــ شاید خدا انسان کو تخلیق کرتے وقت اسے ایک مخصوص شکنجے میں کس دیتا ہے جس سے وہ باہر نہیں نکل سکتا ـــــ جیسے پرندے صرف اُڑ کر ، مچھلیاں تیر کر ، کیڑے مکوڑے رینگ کر ہی جی سکتے ہیں اور چونکہ قانون قدرت اٹل ہے ۔ اس لیے میں صرف کہانیاں لکھ کر ہی زندہ رہ سکتا ہوں ۔ میں اور کچھ نہیں کر سکتا ـــــ یہ میری مجبوری ہے بادشاہ حسین ـــــ کہانی خود مجھے سوچتی ہے اور اپنے آپ کو زبردستی لکھواتی ہے ـــــ اس میں میں کیا کر سکتا ہوں؟ تم سمجھ رہے ہو نا؟"

"ہاں ہاں بولتے جاؤ ۔" بادشاہ حسین نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا ۔

مگر اس سے پہلے کہ میں آگے کچھ کہتا بلّا اپنے چرسی نوکروں پر گالیاں برساتا ہوا تھانے سے آ گیا ۔ اُس نے اُن دونوں کی گردنیں اس طرح پکڑ رکھی تھیں جیسے وہ انسان نہ ہوں قربانی کے بکرے ہوں ۔ ہماری میز کے پاس پہنچ کر اُس نے انہیں چھوڑ دیا ـــــ پھر بولا : بڑی مشکل سے ضمانت ہوئی ہے ، تھانیدار مانتا ہی نہیں تھا ، مگر یہ ہیں کہ باز نہیں آتے ، پکے حرامزادے ہیں ، خود بھی ذلیل ہوتے ہیں مجھے بھی ذلیل کراتے ہیں ـــــ حرام خور !" لیکن میں نے محسوس کیا کہ اِن گالیوں کے پیچھے ایک پُر خلوص موج بھی لہرا رہی تھی جسکی وجہ سے ان گالیوں میں پیار کی ایک ایسی بھینگ تھی جو ساون کی بارشوں میں بھی نہیں ہوتی ، پھر اُس نے صوفی عطا محمد سے ایک گلاس پانی منگا کر پیا ـــــ

صوفی کو دیکھ کر پتا نہیں کیوں مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کچھ پریشان پریشان سا ہے ـــــ آج اسکی آنکھیں بھی کچھ بجھی بجھی سی تھیں اور چال میں بھی عجیب سی لڑکھڑاہٹ تھی جیسے زندگی کی سڑک پر چلتے چلتے اسکی گاڑی کا ٹائی راڈ ٹوٹ گیا ہو ، خدا جانے وہ کس چکر میں پڑ گیا تھا ، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ، حالانکہ اسکی زندگی بظاہر بالکل پاک صاف تھی اور وہ کوئی کام بغیر استخارے کے نہیں کرتا تھا ، اس کے دماغ میں بھی کوئی فتور نہیں تھا ، لیکن اسکے باوجود مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ صوفی عطا محمد نہ ہو بلکہ محض اسکا فوٹو ہو جو ڈارک روم کی ڈش میں پانی پر تیر رہا ہو ۔ جب میں نے بلّے سے صوفی کے بارے میں استفسار کیا تو اُس نے قہقہہ لگا کر کہا ـــــ "کچھ نہیں شاہ صاحب یہ آپ کا وہم ہے بھلا صوفی جیسے نیک اور عبادت گزار آدمی کو کیا الجھن ہو سکتی ہے ؟"

لیکن اسکے اگلے ہی دن جب صوفی اچانک لاپتا ہو گیا تو بلّے کا دعویٰ غلط ثابت ہو گیا اور وہ سخت حیران ہوا ـــــ اسکی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر ماجرا کیا ہے وہ مجھ سے بھی شرمندہ ہو گیا تین چار دن متواتر وہ بھاگ دوڑ کرتا رہا مگر بے سود ـــــ صوفی کا کچھ پتا نہیں چلا ۔ وہ صوفی کے گاؤں اسکی ماں اور بہن کے پاس بھی پہنچا مگر وہ وہاں بھی نہیں ملا ۔ اُسے تو جیسے زمین کھا گئی تھی اور آسمان نگل گیا تھا ۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا کہ اُسکی گمشدگی کا اشتہار اخبار میں دے دوں میں نے اشتہار بھی دے دیا مگر صوفی پھر بھی واپس نہیں آیا ـــــ بلّے نے بتایا کہ پچھلے بارہ سال میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ صوفی اُسے بتائے بغیر غائب ہو گیا ہے ـــــ سامان وہ ہوٹل کی کوٹھری ہی میں چھوڑ گیا تھا ـــــ نہ تنخواہ لے کر گیا تھا ـــــ بادشاہ حسین اور بلّے کے ساتھ جب میں نے صوفی کی کوٹھری دیکھی تو وہاں اسکی صندوقچی ، دری ، ایک میلا سا تکیہ ، تسبیح ، جانماز ، دنداسا ، ازاربند ، میلے کپڑے اور جوتے اور ٹوپی تک موجود تھی ـــــ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی واپس آ جائے گا ۔ البتہ جانماز اور ٹوپی دیکھ کر مجھے ایک دھچکا سا لگا کیونکہ صوفی اگر ایک دن کو بھی جاتا تھا تو ٹوپی اور جانماز ساتھ لے کر جاتا تھا ـــــ تو کیا اُس نے عبادت سے رشتہ توڑ دیا؟ ـــــ کیا اب وہ کبھی نماز نہیں پڑھے گا ؟ ـــــ کیا وہ؟ کیا وہ؟ ـــــ عجیب عجیب بے تکے سوال ذہن میں گڈمڈ ہو گئے اور میں گھبرا کر اسکی کوٹھری سے باہر آ گیا ۔

اگلے دن بلّے نے تھانے میں اسکی گمشدگی کا پرچہ کٹا دیا ، پولیس نے بھی اسے بہتیرا تلاش کیا مگر وہ نہ ملنا تھا نہ ملا ـــــ پھر اس واقع کو کئی مہینے گذر گئے اور بلّے نے صوفی کی جگہ دوسرا ملازم رکھ لیا اور صوفی کا سامان ایک گٹھری میں باندھ کر اوپر مچان پر ڈال دیا ـــــ !

کبھی کبھی جب بادشاہ حسین کی نظر مچان پر پڑتی تو وہ ٹھنڈی آہ بھر کے کہتا ـــــ "پتا نہیں کہاں گیا کمبخت ، ہوٹل ہی سونا کر گیا ۔"

اسکے برعکس میری نظر جب بھی اُس میلی گٹھری پر پڑتی تھی مجھے لگتا تھا جیسے اس میں سے صوفی کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھیں جھانک رہی ہوں جو بالکل قاتل کی آنکھیں لگتی تھیں اور میں گھبرا کر سگریٹ جلانے پر مجبور ہو جاتا

تھا ـــ !

ایک رات کوئی ڈھائی بجے کے قریب کسی نے میرے کمرے کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا ـــ دسمبر کی یخ بستہ رات میں بستر سے نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے مگر مجھے اُٹھنا پڑا کیونکہ باہر سے بادشاہ حسین مجھے زور زور سے پکار رہا تھا "شاہ صاحب ! ـــ شاہ صاحب ـــ !"

میں نے کہا ـــ "آتا ہوں !" اور کمبل اوڑھ کر جب میں نے دروازہ کھولا تو بادشاہ حسین بہت گھبرایا ہوا میرے سامنے کھڑا تھا ۔

میں نے پوچھا ـــ "کیا ہوا؟"

وہ رونے لگا اور بغیر کچھ بتائے مجھے تقریباً کھینچتا ہوا بلّے کے ہوٹل کی طرف لے چلا ۔ میں نے دیکھا اُسکے ہوٹل کے سامنے بہت بھیڑ تھی ، بہت شور تھا ۔ درمیان میں پولیس کی گاڑی کھڑی تھی ، میرا دل دھک دھک کرنے لگا ، بہت سے سوال ذہن میں بجلی کی طرح کوند گئے ، میں نے تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے کئی بار سوچا کہ بادشاہ حسین سے پوچھوں کہ آخر ہوا کیا ہے مگر وہ مسلسل روئے جا رہا تھا اور اس کے ہاتھ جو میرے ہاتھوں میں تھے بالکل ٹھنڈے تھے اور کانپ رہے تھے ۔ میری اپنی ٹانگیں بھی لرز رہی تھیں ۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ حقیقت ہے یا محض خواب ہے ـــ !

جائے واردات پر پہنچ کر پتا چلا کہ صوفی عطا محمد نے رات کے ایک بجے دریائے راوی میں ڈوب کر خودکشی کر لی ۔ اب پولیس اسکی لاش شناخت کے لیے لائی تھی کیونکہ ڈوبنے سے پہلے اس نے اپنی ہوائی چپلوں کے نیچے جو خط چھوڑا تھا اسکے لفافے پر بلّے کے ہوٹل کا پتا درج تھا ـــ خط تفصیلی تھا جس میں اُس نے لکھا تھا ـــ "بلّے ! میں تمہارا گنہگار ہوں ، میری لاش پر جوتے برساؤ ، تھوکو ، لعنت بھیجو کیونکہ میں تم لوگوں کے درمیان جس روپ میں رہا وہ میرا اصلی روپ نہیں تھا بلکہ ایک خول تھا ـــ در اصل میں ہیرا منڈی کا دلال تھا اور رات گئے چھپ چھپا کر تمہارے ہوٹل سے نکل جاتا تھا اور یہ کام پوری ایمانداری کے ساتھ کرتا تھا یعنی میں کبھی کسی گاہک سے غلط بیانی نہیں کرتا تھا ۔

"مال" کے متعلق تمام تفصیل گاہک کو صاف صاف بتا دیتا تھا اور جب سودا پٹ جاتا تو صرف اتنا ہی کمیشن لیتا تھا جو میرا حق بنتا تھا ـــ نہ کم نہ زیادہ ـــ یہ کام یقیناً گھناؤنا اور رکیک تھا مگر مجھے پیسوں کی اشد ضرورت تھی اور مجھے اپنی بہن کی شادی دھوم دھام سے کرنا تھی ـــ یعنی میری نیت نیک تھی ، اِس میں کوئی کھوٹ نہیں تھا ـــ مگر ایک رات اتفاقیہ طور پر میری آنکھ ایک بیسوا سے لڑ گئی اور میں دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا ـــ اُسی رات میں تمہارے ہوٹل سے غائب ہو کر مستقل طور پر گلناز کے کوٹھے پر چڑھ گیا ـــ اُس کا یہی نام تھا ـــ پھر ایک روز موقعہ پا کر میں اُسے کراچی بھگا لے گیا اور اُس سے نکاح پڑھوا کے شرافت کی زندگی گزارنے لگا ـــ مگر بیسوا بیسوا ہی

ہوتی ہے ـــــ چنانچہ تین مہینے میرے ساتھ رہنے کے بعد وہ ایک سندھی وڈیرے کے ساتھ بھاگ گئی ـــــ دو مہینے کی سخت جدوجہد اور تلاش کے بعد بالآخر میں نے اُسے ڈھونڈ لیا ـــــ اُسے دیکھ کر میری آنکھوں میں یکایک خون اتر آیا اور میں نے وہ خنجر جو میں نے خاص اسی مقصد کے لیے خریدا تھا اسکے سینے میں اتار دیا اور وہاں سے فرار ہو گیا ـــــ مہینوں پولیس سے چھپتا پھرا ـــــ مگر میں نے یہ قتل پوری دیانت داری سے کیا تھا اس لیے میرے ضمیر پر اس جرم کا قطعی کوئی بوجھ نہیں تھا ـــــ مگر آج رات وہ بہت یاد آئی ـــــ میں چار پانچ گھنٹے پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا اور جب میں نے خودکشی کا مصمم ارادہ کر لیا تو یہ خط تم کو لکھا اور ٹھیک ساڑھے بارہ بجے رات کو میں اپنے خفیہ ٹھکانے سے نکل کر راوی کی طرف چل پڑا ـــــ نتیجہ تمہارے سامنے ہے ۔ اب تم چاہو تو میری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو ـــــ میں تمہارا مجرم ہوں ـــــ میں یہ اعتراف پوری سچائی کے ساتھ کر رہا ہوں ـــــ آگے تمہاری مرضی ـــــ"

میں نے اس کی لاش کو دیکھا جو بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی ۔ اسکی چھدری داڑھی کیچڑ میں لت پت تھی ۔ گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے ۔ بھیگی ہوئی شلوار قمیص جسم سے چپکی ہوئی تھی ۔ ہاتھ خالی تھے اور پھیلے ہوئے تھے ۔ سر کے بال چکنی مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے ـــــ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو مجھے ہمیشہ قاتل کی آنکھیں لگتی تھیں اس وقت بہت معصوم اور بہت بھولی بھالی محسوس ہو رہی تھیں ـــــ اور اب میرے آنسو میرے اختیار سے باہر ہو گئے ـــــ !!

مہالکشمی کے پُل کے نیچے

وحید انور

(کرشن چندر کی رُوح کے نام)

کرشن چندر نے ایک کہانی لکھی تھی "مہا لکشمی کا پُل" ۔ اس پُل کے جنگلے پر ہر وقت ساڑھیاں لٹکتی نظر آتی ہیں ۔ در اصل یہ لہراتی ہوئی ساڑھیاں ان غریب عورتوں کی ہیں جن کے شوہر مِلوں میں مزدوری کرتے ہیں اور جو یہاں چالوں میں رہتی ہیں ۔

مہا لکشمی کا جغرافیہ وہی ہے جو کرشن جی نے بیان کیا ہے لیکن میں ذرا تفصیل میں جانا چاہتا ہوں ۔ پُل کے داہنی طرف ریس کورس کا میدان ہے ۔ دوسری طرف ایک بہت بڑی بد رو ہے ۔ ان دونوں کے بیچ میں ہے "مہا لکشمی کا پُل" ۔

ریس کورس میں لاکھوں کا ہیر پھیر ہوتا ہے۔ ریس کھیلنے والے اپنے من پسند گھوڑوں پر ہزاروں لاکھوں روپے لگاتے ہیں جو جیتتے کم ہیں اور ہارتے زیادہ ہیں ۔ ان میں زیادہ تر لوگ نمبر دو کی کمائی والے ہوتے ہیں یا سیٹھ ساہو کار یا پھر فلم پروڈیوسر ۔ اس سے آگے بیچ سمندر میں حاجی علی کی مشہور درگاہ ہے جہاں مختلف مذہبوں کے ماننے والے اس عظیم بزرگ کی زیارت کے لئے آتے ہیں ۔ اور بڑی عقیدت سے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور پھولوں کی چادر چڑھاتے ہیں ۔ اس سے آگے جائیے تو مہا لکشمی کا مندر ہے ۔ یہاں غریب لوگ ہی نہیں کالا بازاری کرنے والے موٹے موٹے سیٹھ بھی آتے ہیں تاکہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکیں ۔

پُل کے داہنی طرف بد رو یعنی دھوبی گھاٹ ہے جہاں گندے اور میلے کچیلے کپڑوں کی غلاظت دھوئی جاتی ہے ۔ اس سے آگے سات رستہ ہے ۔ اس کا نام سات رستہ اس لئے پڑا کہ یہاں سات رستے آکر ملتے ہیں ۔

یہ تو ہوا مہا لکشمی کا جغرافیہ ۔ اب میں آپ کو پُل کے نیچے سٹیشن پر لے چلتا ہوں ۔ ریل کی پٹریوں کے داہنی طرف ایک بہت بڑا شیڈ ہے جہاں مجبور اور بے سہارا لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح کلبلاتے ہوئے گندگی میں زندگی گذار رہے ہیں ۔

یہاں دُنیا بھر کا کباڑ جمع ہے ۔ اس کباڑ میں زندگی گُھٹ رہی ہے ۔ سِسک رہی ہے ۔ جیسے زندگی نے ان مجبور اور بے سہارا لوگوں کو دُھتکار دیا ہے ۔ انہیں بد دُعا دیدی ہے ۔ اور اُٹھا کر انہیں اس جہنم میں پھینک دیا ہے ۔

نہ جانے انہیں کس جرم کی سزا مل رہی ہے ؟ ۔ کونسے کرموں کا پھل مل رہا ہے ؟

ہر روز لوکل ٹرین میں چرچ گیٹ جاتے ہوئے میری نظر اکثر ان کچلے ہوئے انسانوں پر پڑ جاتی ہے جب ٹرین دو

منٹ کے لئے سٹیشن پر رُکتی ہے ۔

پُل کے نیچے بھاری لوہے کے ستونوں کے درمیان رسیّاں یا پلاسٹک کی ڈوریاں بندھی ہوئی ہیں جن پر یا تو میلے کپڑے پڑے ہیں یا کپڑوں کو دھو کر سوکھنے کے لئے لٹکا دیا گیا ہے ۔ نیچے ٹین کی پیٹیاں ، کارڈ بورڈ کے ڈبّے ، پلاسٹک کی بالٹیاں ، ٹین کے کنستر ، پانی سے بھرے ہوئے ڈرم ، ایلومنیم کے برتن ہر طرف بکھرے ہوئے ۔ دیوار سے لگی جھونپڑیاں جن پر ٹاٹ کے پردے پڑے ہوئے ہیں ۔ پاس ہی سٹو جل رہے ہیں ۔ کھانا پک رہا ہے ۔ پٹریوں کے بیچ میں کھیلتے ہوئے کالے کلوٹے ننگے دھڑنگے بچّے ۔ کوئی عورت اپنی لڑکی یا کسی دوسری عورت کے سر سے جوئیں نکال کے مار رہی ہے ۔ یہیں عورتیں اور بچّے نہار ہے ہیں ۔ اور کپڑے دھو رہے ہیں ۔ یہیں مُرغیاں دانہ چگتی نظر آتی ہیں ۔ یہیں سامنے بان سے کسے ہوئے کھاٹ پڑے ہوئے ہیں جن پر لوگ پڑے سو رہے ہیں ۔ یہ مِلوں میں کام کرنے والے مزدور ہیں جو رات پالی کر کے آئے ہیں ۔ یا پھر کُولی ہیں جو بمبئی سنٹرل سٹیشن سے رات دیر گئے مسافروں کا سامان اُٹھا کے لوٹے ہیں ۔

ٹرین سے گذرتے ہوئے اکثر لوگوں کی نظر راجہ پر ضرور پڑ جاتی ہے ۔ راجہ ایک کالا سا کُتّا ہے ۔ یہ واچ ڈاگ کا کام کرتا ہے ۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ لال رہتی ہیں جیسے وہ غُصّے میں ہو ۔ کہنے کو تو راجہ آنکھیں بند کئے لیٹا یا بیٹھا ہوا نظر آئیگا ۔ لیکن اُس کی نظر ٹرین میں ہر آنے اور جانے والے پر ہوتی ہے ۔ اُس کی آنکھیں ہر آدمی کو پہچانتی ہیں ۔ وہ جانتا ہے اِن میں کون پاکٹ مار ہے ؟ ۔ کون چور اور کون ڈاکو ہے ؟ ۔ کون کالا بازاری ہے ؟ کون خونی اور قاتل ہے ؟ ۔ وہ سب کو اچھّی طرح جانتا اور پہچانتا ہے !

راجہ چھوٹا سا پِلّا تھا جب وہ یہاں آیا تھا ۔ ایک دن بابو (اس کی کہانی بعد میں سُناؤں گا) صبح سویرے چوپاٹی پر یوں ہی گھوم رہا تھا ۔ اس نے دیکھا کہ ایک ننّھا سا پِلّا سمندر میں دور نکل گیا ہے اور وہاں لہروں میں پھنس گیا ہے ۔ بابو نے فوراً کپڑے اُتار کے پھینکے اور سمندر میں چھلانگ لگا دی ۔ اس پلّے کو لہروں سے نکال کے باہر لایا ۔ اسے نرم ریت پر لٹایا ۔ پھر مساج کر کے اسے گرمی پہنچائی ۔ پِلّا کوں کوں کرنے لگا تو بابو نے اسے گود میں اُٹھا لیا ۔ اُسے تھپتھپا کے نیچے چھوڑ دیا ۔ اور جب وہ چلنے لگا تو پِلّا بھی اُس کے پیچھے ہو لیا ۔ اور بابو کے ساتھ مہا لکشمی سٹیشن پہنچ گیا ۔

راجہ اسی پُل کے نیچے پل کر بڑا ہوا ۔ راجہ بہت عقلمند ہے ۔ نہ جانے اس جانور میں اتنی عقل کہاں سے آگئی ہے ۔ پہلی نظر میں اسے دیکھئے تو اس کی لال لال آنکھیں بڑی ڈراؤنی لگتی ہیں ۔ لیکن ہے یہ بڑا نرم دِل اور وفادار ۔ یہ پیار کا بھوکا ہے ۔ ہر روز شام کو جب بابو لوٹ کے آتا ہے تو راجہ کوں کوں کر کے اس کے پیروں سے لپٹ جاتا ہے ۔ نہ جانے اُس بے زبان جانور میں اتنا پیار کہاں سے آگیا ہے ؟ آجکل کے زمانے میں تو لوگوں میں ڈھونڈے سے پیار نہیں ملتا ۔ عجیب بات ہے کُتّے انسان بن گئے ہیں اور انسان کُتّے ۔ بھونکنے اور کاٹنے والے کُتّے ! ۔ کُتّے جو

اپنے ہی جیسے انسانوں کو کاٹ کھانے کے لئے دوڑتے ہیں ۔

اب بابو کی سُنیے ۔ بابو بمبئی کے فٹ پاتھ پر پیدا ہوا ۔ وہ بڑے فخر سے کہتا ہے ۔ "میں فُٹ پاتھ پر پیدا ہوا ہوں ۔ میں حرامی ہوں ۔"

دراصل وہ حرامی نہیں تھا ۔ اُس کے ماں باپ "حرامی تھے" ۔ وہ ان کی ہوس کا نتیجہ تھا ۔ اُنہوں نے اپنی ہوس بُجھا کر اس ننھی سی جان کو اُٹھا کے گندے گٹر میں پھینک دیا تھا ۔ وہ تو بھلا ہو سینٹ میری چرچ کے فادر کا جس نے اسے گٹر سے اُٹھا کے یتیم خانے میں ڈال دیا تھا ۔ مشنری والے ایسے کتنے ہی بے سہارا بچوں کو فٹ پاتھ سے اُٹھا لیتے ہیں ۔ انہیں پالتے پوستے ہیں اور انہیں تعلیم و تربیت دیتے ہیں جنہیں کچرے کی کنڈیوں یا فُٹ پاتھ پر پھینک دیا جاتا ہے ۔

بابو فادر جوزف کا احسان مند تھا ۔ اگر وہ نہ ہوتے تو شاید وہ کبھی کا مر کھپ گیا ہوتا ۔ اُسے اپنے ماں باپ سے نفرت تھی ۔ اس سماج سے نفرت تھی جس نے اس پر پیار و محبت کے سارے دروازے بند کر دیئے تھے ۔ کسی نے بھی اُس سے پیار کے دو بول نہیں بولے تھے ۔ اُس سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا ۔ بس ایک فادر جوزف ہی تھے جنہوں نے اُسے ماں باپ کا پیار دیا تھا ۔ اُس سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا ۔ اسی لئے وہ ان کو اپنا سب کچھ سمجھتا تھا ۔

آٹھ سال تک بابو مشن کے یتیم خانے میں رہا ۔ پھر پتہ نہیں ایک دن اُس کے دِل میں کیا دُھن سمائی کہ وہ وہاں سے بھاگ نکلا ۔ سیدھا مہا لکشمی کے پُل کے نیچے آکر اپنا بوریا بستر بچھا لیا ۔ اور ورلی کے ایک ساؤتھ انڈین ہوٹل میں بوائے کا کام کرنے لگا ۔ یہیں اس کی دوستی مہادیو سے ہوگئی جو اس کے ساتھ ہی ہوٹل میں کام کرتا تھا ۔ مہادیو اگرچہ عمر میں بابو سے تقریباً آٹھ سال بڑا تھا لیکن ایک ساتھ کام کرنے کی وجہ سے دونوں میں دوستی ہوگئی تھی ۔ اور پھر دونوں ایک ساتھ اسی مہا لکشمی کے پُل کے نیچے رہنے لگے تھے ۔

زندگی بھی بعض وقت انسان پر کتنا بڑا ظلم کرتی ہے ۔ مہادیو کے ساتھ بھی زندگی نے ایسا ہی ظلم کیا تھا ۔ ایک دن وہ ورلی کے ناکے پر سڑک پار کر رہا تھا کہ سامنے سے ایک تیز رفتار موٹر آرہی تھی ۔ یکایک اُس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا ۔ موٹر نے اس بھیانک طریقے سے اُسے ٹکر ماری کہ فضا میں ایک زبردست چیخ بلند ہوئی ۔ دوسرے ہی لمحے مہادیو خون میں لت پت پڑا تھا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر لوگوں کا مجمع لگ گیا ۔ دو ایک آدمیوں نے ایک ٹیکسی میں اسے ڈالا اور قریب کے ایک ہسپتال میں اُسے پہنچا دیا ۔

گھنٹوں وہ ہسپتال میں بے ہوش پڑا رہا ۔ اس کی ایک ٹانگ بالکل چُور چُور ہوگئی تھی ۔ جب وہ ہوش میں آیا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی وہ ٹانگ کٹ چکی ہے ۔ ٹانگ کا کٹنا ضروری تھا کیونکہ اسی صورت میں اس کی زندگی بچ سکتی تھی ۔

اب وہ ایک ٹانگ سے محروم ہو چکا تھا ۔ وہ بہت چلایا ۔ رویا ۔ لیکن سب بے سود ۔

سولہ سترہ سال کا مہادیو جو کتنے ہی سُنہرے خواب دیکھ کے بمبئی آیا تھا ۔ آج وہی مہادیو ایک اپاہج بن کر مہا لکشمی سٹیشن کے پلیٹ فارم پر بیٹھا بوٹ پالش کرتا ہے ۔ اور دس پندرہ روپے روز کما لیتا ہے ۔

مہادیو کی شادی بچپن ہی میں ہو گئی تھی ۔ بس رخصتی باقی تھی ۔ مہینہ میں ایک خط وہ پندرہ پورا اپنی ماں کو ضرور لکھتا ۔ اُس کی خیریت پوچھتا اور کچھ پیسے منی آرڈر کر دیتا ۔ ہر بار اُس کی ماں اُسے جلد گاؤں آنے کو لکھتی اور یہ کہ رخصتی ہو جائے ۔ ہر بار مہادیو ٹال جاتا ۔ مسلسل تین سال سے وہ ٹال رہا تھا ۔ اُس نے اپنی ماں کو یہ تک نہیں بتایا کہ حادثے میں اُس کی ایک ٹانگ کٹ گئی ہے ۔ وہ سوچتا گاؤں جائے تو وہ کس منہ سے جائے ۔ اس کی کٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھ کے اُس کی ماں کو کتنا دُکھ ہو گا ۔ کتنا صدمہ پہنچے گا اسے ۔ اور پھر اس حالت میں کون لڑکی اس سے شادی کرنا پسند کرے گی ۔ اس لئے ہر بار وہ ماں کو خط لکھ دیتا کہ آؤں گا ۔ بس تھوڑا سا روپیہ اکٹھا کر لوں ۔

مہادیو کے دُکھ کو یا تو بابو سمجھتا تھا یا پھر رحمت ۔

رحمت بمبئی سنٹرل سٹیشن پر کوئی سات آٹھ سال سے قُلی ہے ۔ یہ کونکن کے علاقے سے آیا تھا ۔ ہٹا کٹا ۔ اونچا پورا اور طاقتور نوجوان ۔ اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں ہمیشہ تھرکتی رہتی تھیں اور اس میں اتنی طاقت تھی کہ وہ وزنی سے وزنی ٹرنک یا سوٹ کیس آسانی سے اُٹھا لیتا تھا ۔

رحمت کی شادی ہو چکی تھی ۔ بیوی گاؤں میں اپنے بوڑھے ماں باپ کے پاس رہتی تھی ۔ ہر مہینہ وہ بیوی کو سو روپے منی آرڈر بھیج دیا کرتا تھا ۔ کئی سال سے اُس کی بیوی خاتون اکیلی رہتے رہتے تنگ آ چکی تھی ۔ ظاہر ہے ہر عورت اپنے خاوند کے ساتھ لگی رہنا چاہتی ہے ۔ خاتون بھی اپنے شوہر کی قربت چاہتی تھی ۔ اور پھر وہ چاہتی تھی کہ اُس کا اپنا الگ سا گھر ہو اور اس کے پیارے پیارے بچے ہوں ۔ اسی لئے وہ ہر بار رحمت کو خط لکھتی "مجھے فوراً بُلا لو ۔ میں اکیلی یہاں نہیں رہ سکتی" ۔ اور جواب میں رحمت لکھتا دیتا ۔ "میں جلد ہی گھر لینے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ مل جائے تو فوراً بُلا لوں گا ۔"

لیکن بمبئی میں گھر کہاں ملتا ہے ؟ اور پھر ہزاروں کی پگڑی کوئی کیسے دے سکتا ہے ؟ ہر روز ہزاروں نوجوان یہی خواب لے کر بمبئی آتے ہیں کہ وہ یہاں اپنا گھر بنائیںگے لیکن ان میں سے بہت کم کے خواب پورے ہوتے ہیں ۔ ان میں سے کسی کسی کو ہی گھر نصیب ہوتا ہے اس شہر میں روزگار مل جاتا ہے ۔ عورت مل جاتی ہے ۔ مطلب یہ کہ بیوی بھی ۔ لیکن گھر نہیں ملتا ۔ گھر کا خواب دیکھتے دیکھتے لوگ مر جاتے ہیں ۔

بمبئی جیسے دھیرے دھیرے ایک جہنم میں تبدیل ہو رہا ہے ۔ خود مجھے یہاں آئے ہوئے بائیس سال ہو گئے ہیں ۔ عمر چالیس سے اوپر ہو گئی ہے ۔ کنپٹی پر سفید بال آ گئے ہیں ۔ بڑھاپے نے دستک دیدی ہے ۔ لیکن آج تک گھر نہ بنا سکا ۔ نہ کوئی چار دیواری ہی کھڑی کر سکا ۔ جب گھر ہی نہیں تو بیوی کہاں سے آئے ؟ شادی کیسے ہو ؟ جب کبھی جو ہو بیچ Beech پر سمندر کے کنارے جوڑوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ۔ ہنستے کھلکھلاتے اور پانی پوری کھاتے ہوئے

دیکھتا ہوں تو میرے دِل میں بھی حسرت جاگتی ہے کہ کاش میری بھی کوئی بیوی ہوتی یا محبوبہ۔ لیکن اب تو یہ خواب ہی خواب رہ گئے ہیں ۔ ہر روز میں یہی خواب دیکھا کرتا ہوں ۔ اگر یہ خواب بھی نہ دیکھوں تو شاید مر جاؤں ۔ مانا کہ گھر کا حق نہیں مل سکا ۔ لیکن خواب دیکھنے کا تو حق مجھے حاصل ہے ۔

جذبات کی رو میں بہہ کر میں کہاں سے کہاں چلا گیا ؟ سُنانے چلا تھا مہا لکشمی کے پُل کے نیچے رہنے والے باسیوں کی کہانی اور لے بیٹھا اپنا دُکھڑا ۔

ہاں تو میں اِن حقیر بے بس اور مجبور انسانوں کے بارے میں بتا رہا تھا جو صدیوں سے چُپ چاپ گری پڑی جانوروں کی سی زندگی گذارتے چلے آ رہے ہیں ۔

اس شہر میں دو طرح کے لوگ نظر آتے ہیں ۔ ایک وہ جن کے پاس سب کچھ ہے اور دوسرے وہ جن کے پاس سب کچھ نہیں ہے لگتا ہے چند موٹے موٹے اور بڑی بڑی توندوں والے سیٹھوں اور ساہو کاروں نے مِل کر ساری بمبئی کو خرید لیا ہے اور آپس میں بانٹ لیا ہے ۔ اور ان غریب انسانوں کو اُٹھا کے فُٹ پاتھ پہ پھینک دیا ہے ۔ جب کبھی میری نظر شہر کے شاندار بنگلوں اور فلیٹوں کی طرف جاتی ہے تو میرے دِل میں یہ خیال آتا ہے کہ کب ان فلیٹوں اور بنگلوں کی دیواروں میں سے کوئی دروازہ یا کھڑکی ہم جیسے نادار غریبوں کے لئے کُھل جائے گی ۔ اور ہم چُپ چاپ اس میں داخل ہو جائینگے ۔

پھر میں جذبات کی رو میں بہ گیا ہوں ۔ ذکر ہو رہا تھا خاتون کا۔ خاتون جب رحمت کو چٹھیاں لِکھ لکھ کے تنگ آ گئی اور اُسے نہیں بُلایا تو ایک دن وہ خود ہی بمبئی سنٹرل سٹیشن پہنچ گئی ۔ رحمت کا پتہ اُسے آسانی سے مِل گیا تھا ۔

خاتون جب اچانک آ دھمکی تو رحمت ہکّا بکّا اور حیران پریشان رہ گیا ۔ "یہ اچانک یہاں کیسے ٹپک پڑی"

"خاتون !" رحمت کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ۔ "تُو یہاں کیسے آگئی ؟"

خاتون کچھ دیر خاموش اسی طرح کھڑی رہی ۔ پھر منہ پھیر کر بولی۔ "میں اب ایک دن بھی تیرے بغیر نہیں رہنے کی ۔ تُو مجھے اپنے پاس رکھ لے یا پھر مجھے جان سے مار دے ۔"

پھر اچانک خاتون کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔ جیسے وہ ابھی پھوٹ پڑنے والی ہو ۔

رحمت موقع کی نزاکت کو سمجھ گیا کیونکہ آس پاس لوگ جمع ہو رہے تھے ۔ اور دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔ محض اس ڈر سے کہ کہیں کوئی لفڑا کھڑا نہ ہو جائے ۔ وہ چُپ چاپ خاتون کو مہا لکشمی کے پُل کے نیچے لے آیا ۔ اپنی جھونپڑی میں ۔

اُس رات خاتون اپنے شوہر کو پا کے بہت خوش تھی ۔ وہ سارے شکوے شکائتیں بھول گئی تھی ۔ حالانکہ وہ راستے بھر سوچتی آئی تھی کہ رحمت سے خوب خوب لڑے گی لیکن رحمت کے سینے سے لگ کے وہ سب کچھ بُھول گئی ۔ اس جھونپڑی میں اُسے کتنا سُکھ میسّر آیا تھا!

اب وہ ہر روز رحمت کو اپنے ہاتھوں سے پکائی ہوئی روٹی کھلاتی ۔ رحمت کی زندگی میں بھی جیسے خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی ۔ ہر روز خاتون صبح سویرے چار بجے اُٹھ جاتی ۔ سٹیشن پر ٹی سٹال کے نل سے بھر بھر کے پانی کی بالٹیاں لے آتی ۔ رحمت نہا دھو کے صبح سویرے بمبئی سنٹرل پہنچ جاتا کیونکہ ٹرینوں کا آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا ۔

ان ہی دنوں پلیٹ فارم پر ایک نیم پاگل سی عورت گھومتی پھرتی تھی ۔ اُس کا بڑا سا پیٹ نکل آیا تھا ۔ نہ جانے کس شیطان نے اُس کے ساتھ یہ حرکت کی تھی ۔ یہ نیم پاگل عورت اکثر خاتون کے پاس آ کے بیٹھ جاتی ۔ خاتون اُسے کھانے کے لئے ہر روز کچھ نہ کچھ دے دیا کرتی تھی ۔ کبھی کبھی اُسے نہلا دھلا کے اپنے کپڑے پہنا دیتی ۔ اُس کے بالوں میں کنگھی کرتی ۔

ایک دن اچانک آدھی رات کو پگلی کے پیٹ میں درد اُٹھا ۔ خاتون سمجھ گئی کہ اب اسے بچّہ ہونے والا ہے ۔ فوراً وہ اسے اپنے جھونپڑے کے اندر لے گئی ۔ پگلی درد سے مسلسل تڑپ رہی تھی ۔ خاتون نے فوراً ہی جان کو نائر ہسپتال دوڑایا جہاں جان کی ایک پہچان کی کرسچین دایہ کام کرتی تھی ۔ اچانک پگلی کے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلی ۔ اور پھر ہلکی ہلکی کراہیں اور سسکیاں ۔

دایہ کے آتے آتے پگلی نے بچے کو جنم دیدیا تھا ۔ خاتون کے جھونپڑے کے اطراف لوگ جمع ہو گئے تھے یہ جاننے کے لئے کہ پگلی کے کیا ہوتا ہے لڑکا یا لڑکی !

تھوڑی دیر میں خاتون جھونپڑے سے باہر نکل آئی ۔ وہ مسلسل ہنسے جا رہی تھی ۔

"کیا ہوا ؟ لوگوں میں سے کسی نے پوچھا ۔

"چھوکرا ہوا ہے پگلی کے ۔" خاتون نے ہنستے ہوئے کہا ۔

پتہ نہیں جان کو پگلی سے اس قدر اُنس کیوں ہو گیا تھا ۔ وہ ہر روز اُسے دودھ کی بوتل اور پھل وغیرہ لا کے دیتا ۔

جان گوا کا رہنے والا تھا ۔ وہ بہت کم عمر تھا ۔ جب وہ بمبئی آیا تھا گھر سے بھاگ کے ۔ شاید اُسے اپنا بچپن یاد آ گیا تھا ۔ وہ اُس وقت چھوٹا سا تھا ۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب اُس کی ماں کو بچّہ ہوتا تو کس طرح اُس کا باپ اُس کی ماں کو پھل اور دوسری طاقت کی چیزیں کھانے کے لئے لا کے دیتا تھا ۔

جان مراٹھا مندر سینما میں ٹکٹوں کا بلیک کرتا تھا ۔ یہ دھندا وہ کئی سال سے کر رہا تھا ۔ اس کے لئے وہ پولیس کو ہفتہ بھرتا تھا ۔ جب کوئی نئی پیکچر تھیٹر میں لگتی تو اُس کی چاندی ہو جاتی ۔ اچھی خاصی کمائی ہو جاتی تھی اپنی کمائی کا زیادہ حصّہ وہ پینے پلانے کی نذر کر دیتا ۔ ہوٹلوں میں کھاتا اور رات کو یہیں مہا لکشمی کے پُل کے نیچے خاتون کی جھونپڑی کے برابر اپنی کھاٹ ڈال کے رات پڑا رہتا تھا ۔

جان خاتون سے بہت ڈرتا تھا ۔ وہ اسے بھابی کہتا ۔ جب بھی وہ نشے میں دُھت آتا تو خاتون اُسے بُری طرح ڈانٹتی ۔ جواب میں اُس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا ۔ لیکن جب وہ اسے دھمکی دیتی تو کہہ دیتا "بہن ۔ مجھے معاف کردو ۔ اس بار پھر نہیں پیوں گا ۔ لیکن اگلی بار وہ پھر پی کے آتا ۔ یہ ڈرامہ ہر روز کا تھا ۔ اکثر رات دیر گئے وہ لوٹتا جب خاتون سو جاتی ۔

ایک رات عجیب واقعہ ہوا ۔ جان تار دیو سے آرہا تھا ۔ حاجی علی پہنچ کر وہ اس سڑک پر ہولیا جو ریس کورس کے ساتھ ساتھ مہا لکشمی سٹیشن کی طرف جاتی ہے ۔ کچھ دور پہنچ کر اُس نے دیکھا دو غنڈے قریب کی جھونپڑ پٹی سے ایک لڑکی کو اُٹھا کر گھسیٹتے ہوئے لے جارہے ہیں ۔ لڑکی ساؤتھ انڈین لگتی تھی ۔ وہ چلارہی تھی ۔ "چھوڑ دو ۔ مجھے چھوڑ دو ۔"

اُس وقت رات کے دس بجے ہونگے ۔ سڑک بالکل سنسان تھی ۔ جان نے دونوں آدمیوں کو للکارا ۔ دونوں کو باری باری سے جم کے مُکے لگائے ۔ اور پھر اُس نے چاقو نکال لیا ۔ دونوں غنڈے ڈر کے فرار ہو گئے ۔

لڑکی سہمی ہوئی ڈری ڈری سی کانپ رہی تھی ۔

جان خاموش کھڑا کچھ دیر لڑکی کو دیکھتا رہا ۔ لڑکی کی آنکھوں سے بے بسی چھلکتی تھی ۔ اُس کی آنکھوں میں ایک التجا تھی جیسے وہ آنکھیں اُس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں ۔

"اے ۔ بتا ۔ کیا لفڑا ہے ؟" جان نے لڑکی سے پوچھا ۔

"یہ گنگو بائی کے آدمی ہیں ۔ مجھ سے زبردستی پیشہ کرانا چاہتے ہیں ۔" پھر وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپائے رونے لگی ۔ "میں ابھاگن ہوں ۔ میری قسمت پھوٹ گئی ہے ۔" جان کو اس لڑکی پر ترس آگیا ۔ قدرے توقف کے بعد اُس نے پوچھا ۔ "کیا نام ہے تیرا ۔ کہاں سے آئی تُو ؟"

میرا نام سروجا ہے ۔ آندھرا میں دجے واڑہ ایک شہر ہے وہیں کی رہنے والی ہوں ایک لڑکے نے مجھ سے جھوٹا پیار جتا کے ، مجھے بھگا کے بمبئی لایا ۔ کچھ دن میرے ساتھ خوب مزے مارا اور پھر ایک دن مجھے اکیلا چھوڑ کے بھاگ گیا ۔ میں بہت پریشان ہو گئی ۔ بھوکی پیاسی اِدھر اُدھر بھٹکتی رہی ۔ ایک دن مجھے اپنے ہی گاؤں کی ایک عورت مل گئی وہ مجھے اپنے جھونپڑے میں لے آئی میں اس کے ساتھ رہنے لگی پڑوس میں ایک آدمی رہتا تھا وہ مجھ سے بہت ہمدردی سے بات کرتا تھا ایک دن وہ مجھے کام دلانے کے بہانے فارس روڈ کے چکلے میں لے آیا اور ایک دلالہ کے ہاتھوں دو ہزار روپے میں مجھے بیچ ڈالا ۔ وہ مجھ سے زبردستی پیشہ کرنے کو کہتی ۔ میں انکار کرتی تو غنڈوں سے مجھے خوب پٹواتی ۔ وہ بدمعاش مجھے اسقدر مارتے کہ میرے جسم پر لال لال نشان پڑ جاتے اور میرا سارا جسم درد سے چُور ہو جاتا ۔

ہر روز آوارہ لوگ پی کے میرے پاس آتے اور میرے جسم کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالتے ۔ میں ان کے ہاتھ جوڑتی ۔ ان کے پیر پڑتی ۔ کہتی ۔ میں بُری عورت نہیں ہوں ۔ مجھ پر دیا کرو ۔ مجھے معاف کردو ۔ لیکن وہ بھیڑیئے میری

ایک نہ سُنتے ۔ رات رات بھر میرے جسم کا گوشت نوچ نوچ کے کھاتے ۔

ایک دِن موقع دیکھ کے میں وہاں سے بھاگ نکلی ۔ نائکہ نے غنڈوں کو میرے پیچھے دوڑادیا ۔ اور اُنھوں نے مجھے یہاں آدبوچا ۔ اور مجھے واپس چلنے کو کہا ۔ پھر اسی جہنم میں ۔"

اتنا کہہ کہ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی ۔ جان لڑکی کی کہانی سُن کے بہت متاثر ہوا ۔ کچھ دیر تو وہ خاموش کھڑا سوچتا رہا ۔ پھر بولا ۔ "اچھا" اب میری سُن ۔ دیکھ میں شریف آدمی ہوں ۔ اگرچہ دھندا کھوٹا کرتا ہوں ۔ اس شہر میں میں بھی اکیلا ہوں ۔ میرا بھی کوئی نہیں ہے ۔ کیا تُو میرا دکھ درد بانٹے گی ۔ میرے ساتھ رہیگی ۔ میں تیرے سے شادی بناؤں گا ۔

سروجا چُپ چاپ گردن جُھکائے کھڑی رہی ۔ جان نے آہستہ سے لڑکی کے چہرے کو اوپر اُٹھایا ۔ ایک بار دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں ۔ جان لڑکی کی اُداس آنکھوں میں اترتا گیا۔ ڈوبتا گیا ۔ پھر اُس نے ہلکے سے سروجا کے گال تھپتھپائے۔ "بول مجھ سے شادی بنائیگی ۔

قدرے توقف کے بعد سروجا بولی ۔ "ہاں شادی بناؤں گی تیرے ساتھ ۔" "ٹیکسی !" جان نے ٹیکسی کو آواز دی ۔ ٹیکسی فوراً رُک گئی ۔

اور پھر جان نے سروجا کو ٹیکسی میں بٹھایا ۔ "مہا لکشمی سٹیشن۔" اُس نے ٹیکسی والے سے کہا ۔

ٹیکسی چند ہی منٹوں میں مہا لکشمی سٹیشن پہنچ گئی ۔ جان نے ٹیکسی والے کو پیسے دیئے اور وہ سروجا کو لے کر پُل کے نیچے آیا ۔ سب لوگ سو چکے تھے ۔ صرف راجہ بیٹھا جاگ رہا تھا ۔

جان نے سروجا کو اپنی جھونپڑی کے اندر جا کے سوجانے کو کہا اور خود ایک دری اور چادر لے کے باہر آگیا ۔ دیر تک وہ راجہ سے باتیں کرتا رہا ۔ اُسے پچکارتا رہا ۔ سہلاتا رہا ۔ تھوڑی دیر بعد اُسے نیند آگئی اور وہ راجہ کو اپنے بازو میں لے کے سو گیا ۔

صبح ہوئی تو جان نے اپنے اس نئے مہمان کا سب لوگوں سے تعارف کرایا ۔ پھر اُس نے سروجا کی دردناک کہانی سُنائی خاتون نے سروجا کو گلے سے لگالیا ۔ اُس کا ماتھا چوم لیا ۔ "بہن اب تو یہاں ہمارے ساتھ رہیگی ۔ کوئی فکر کی بات نہیں ۔ ہم سب تیری دیکھ بھال کرینگے ۔"

جان نے خاتون سے کہدیا کہ وہ سروجا کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے ۔ خاتون نے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں ۔

اُس دن سب خوش تھے۔ سروجا کو خاتون نے اچھی طرح سنوارا، اُس کے ہاتھوں میں مہندی لگائی۔ بالوں کا جُوڑا بنا کے اس میں پھولوں کا گجرا یعنی وینی لگائی جیسے مرہٹہ عورتیں لگاتی ہیں ۔ اُسے خوبصورت سی سُرخ ساڑھی پہنائی اُس کی مانگ میں سیندور بھرا ۔ ماتھے پر سُرخ بندیا لگائی ۔ اُسے خوب خوب سجایا ۔

سروجا کا چہرہ جیسے خوشی سے کھل اُٹھا تھا ۔ اک عرصہ بعد اُسے خوشی ملی تھی ۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ۔ وہ شرمائی جارہی تھی ۔ جیسے آج واقعی اس کی سہاگ رات تھی ۔

بابو نے جان کے جھونپڑے کو اچھی طرح سجادیا تھا ۔ خاتون نے کھانا بنانے کا سارا انتظام اپنے ذمّے لے لیا تھا ۔

سروجا ایک کونے میں بیٹھی شاید جان کے بارے میں کچھ سوچ رہی تھی ۔ اُس نے جان کو اپنے من مندر کا دیوتا مان لیا تھا ۔ اُس نے ہی تو اسے تباہی کے غار سے نکالا تھا ۔ جان گوا کا کرسچین تھا ۔ سروجا آندھرا کی ہندو تھی ۔ دونوں کے مذہب الگ تھے ۔ لیکن آج اُنہوں نے مذہب کی دیوار کو توڑ دیا تھا ۔ ایک دوسرے کو اپنا ساتھی مان کے جھوٹے رسم و رواج کو توڑ دیا تھا ۔

آج مہا لکشمی کے پُل کے نیچے ہندو ، مسلمان اور کرسچین سب اکٹھے ہو کے شادی کا جشن منا رہے تھے ۔ کھا پی رہے تھے ۔

اور پھر رات دیر گئے شادی کا جشن ختم ہو گیا ۔

اُس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے ۔ پتہ نہیں پگلی کہاں چلی گئی تھی ۔ وہ اب تک نہیں لوٹی تھی ۔ خاتون پریشان تھی ۔ آج تو بچّہ بھی بہت رو رہا تھا ۔ خاتون کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی ۔ لیکن وہ پگلی کے بچے کو ہی اپنا ہی بچّہ سمجھنے لگی تھی ۔ بچّے کے لئے خاتون نے کتنی دعائیں مانگی تھیں ۔ درگاہ پر جا کے منتیں کی تھیں ۔ آخر ایک دن اُس کی مُراد پوری ہو گئی تھی ۔ یہ بچّہ اگر اُس کی اپنی کوکھ سے پیدا نہیں ہوا تو کیا ہوا؟ وہ تو اس بچے کو ماں کا پورا اور بھرپور پیار دے رہی تھی ۔ اُس کی سوئی ہوئی ممتا پوری طرح جاگ اُٹھی تھی ۔ اب وہ پہلے سے زیادہ خوش تھی ۔

خاتون پگلی کے لئے سخت بے چین تھی ۔ پریشان تھی ۔ لیکن اُس کا پتہ نہیں تھا ۔ اُس کے دل میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے ۔ وسوسے جاگ رہے تھے ۔ اتنے میں راجہ بھونکتا ہوا بھاگ کے آیا ۔ اُس نے رحمت کا دامن پکڑ لیا ۔ اُسے کھینچنے لگا ۔ بابو سمجھ گیا کوئی بات ضرور ہو گئی ہے ۔ راجہ آگے آگے دوڑ رہا تھا ۔ اس کے پیچھے بابو اور رحمت تیز تیز چل رہے تھے تینوں ریلوے کی پٹریوں کو پھلانگتے بمبئی سنٹرل سٹیشن کی طرف بھاگے جا رہے تھے راجہ مہا لکشمی اور بمبئی سنٹرل سٹیشن کے درمیان پہنچ کے رُک گیا ۔ اور چرچ گیٹ سے آنے والی ٹرین کی پٹریوں کی طرف منہ اُٹھا کے بھونکنے لگا ۔ رحمت اور بابو اُس طرف دوڑ پڑے ۔ کچھ ہی دور پہنچے ہونگے کہ مدھم روشنی میں انہیں ایک لاش پڑی دکھائی دی ۔ قریب آ کے دیکھا تو اُن پر سکتہ ساطاری ہو گیا ۔ یہ پگلی کی لاش تھی جو پوری طرح کٹ چکی تھی اور جس کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے ۔ رحمت نے اپنے سر پر بندھی ہوئی لُنگی کو کھولا ۔ اور پگلی کے کٹے ہوئے جسم پر ڈال دیا ۔ بابو کو دوڑایا کہ فوراً جان کو بُلا کے لائے اور ساتھ ایک بڑی سی چادر بھی لے آئے ۔

رحمت لاش کے پاس خاموش بیٹھا رہا ۔ ٹرینوں کی آمد و رفت بند ہو چکی تھی ۔ راجہ کی نظریں مہا لکشمی سٹیشن کی طرف لگی ہوئی تھیں ۔ وہ بابو اور جان کی آمد کا انتظار کر رہا تھا ۔

وہ تو اچھا ہوا کہ ریلوے پولیس کی نظر لاش پر نہیں پڑی ورنہ وہ فوراً لاش کو مردہ خانے پہنچا دیتے ۔

بابو نے جب پگلی کی دردناک موت کی خبر سنائی تو سب کے دِل دہل گئے ۔ اُس وقت جان سروجا کے ساتھ بیٹھا شاید پیار کی باتیں کر رہا تھا پگلی کی موت کی خبر سُن کے وہ فوراً اپنے جھونپڑے سے باہر نکل آیا ۔ اور بابو کے ساتھ اُس طرف کو چل پڑا جہاں یہ حادثہ ہوا تھا۔

جان نے دیکھا رحمت اور راجہ لاش کے پاس، بیٹھے ہوئے ہیں ۔ اُس نے چادر رحمت کو دیدی ۔ رحمت نے چادر کو پھیلا کے زمین پر بچھا دیا ۔ پھر دونوں نے کمبھی میں لپٹی ہوئی لاش کو اُٹھا کے چادر میں باندھ دیا ۔ جان نے لاش کو اپنے کندھے پر رکھ لیا ۔ اور پھر وہ سب چُپ چاپ مہا لکشمی کی طرف چلنے لگے ۔

وہاں پہلے ہی سے سب لوگ اکٹھا ہو گئے تھے ۔

جان نے لاش کو کندھے سے اُتارا اور ایک کھاٹ (cot) پر رکھ دیا ۔

پگلی کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ کون تھی ؟ ۔ کہاں سے آئی تھی ؟ اُس کا اس دُنیا میں کوئی بھی تو نہیں تھا ۔ جو اُس پر آنسو بہاتا! لیکن نہیں ۔ اُس کی ایک ہمدرد ۔ ایک غمخوار ۔ اور اُس کے دُکھ کو سمجھنے والی ضرور تھی اور وہ تھی خاتون ۔

خاتون جو ایک کونے میں چُپ چاپ بیٹھی رو رہی تھی ۔ پگلی سے اُس کا کوئی رشتہ نہیں تھا ۔ وہ اُس کی کوئی نہیں لگتی تھی لیکن پھر بھی وہ ایک ایسے رشتے میں بندھی ہوئی تھی جو دُنیا کے سارے رشتے ناتوں سے بلند و بالا اور افضل ہے ۔ اور وہ ہے ممتا کا رشتہ ۔ وہ پگلی کے بچے کی ماں تھی ۔

سارے لوگ آن کی آن میں اکٹھا ہو گئے تھے ۔ بابو ، جان اور رحمت کریا کرم کے بارے میں سوچ رہے تھے ۔ لاش کے قریب مہادیو اور راجہ اُداس بیٹھے تھے ۔ "پتہ نہیں پگلی ہندو تھی یا مسلمان! سوال یہ ہے کہ اُسے جلایا جائے یا دفنایا جائے ؟"

سب لوگ شش و پنج میں پڑ گئے ۔ کچھ دیر خاموشی رہی ۔ بالآخر خاتون نے اس خاموشی کو توڑا ۔ "میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں ۔ میں نے اُس کے ہاتھ پر کملا گندھا ہوا دیکھا ہے ۔ وہ ہندو تھی ۔"

طے پایا کہ اُس کی لاش کو شمشان گھاٹ لے جایا جائے ۔

"ہمیں لاش کو جلد سے جلد اُٹھا کے یہاں سے لے جانا چاہیئے ۔ پولیس کو پتہ چل گیا تو لفڑا ہو جائیگا ۔ وہ لاش کو اپنے قبضے میں لے لینگے اور پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال لے جائینگے ۔" رحمت نے سب کو آگاہ کر دیا ۔

"پھر تو ہمیں وقت بالکل ضائع نہیں کرنا چاہیئے لاش کو فوراً ہی شمشان گھاٹ لے جانا ہوگا ۔" جان نے کہا ۔

اور پھر وہ فوراً ہی سات رستہ کی طرف چل پڑا ۔ وہاں اُس کی پہچان کا ایک ٹھیلے والا رہتا تھا ۔ اُس سے ہاتھ گاڑی مانگ لی ۔ پاس ہی پھولوں کی دُوکان تھی ۔ پھول والا دُوکان ہی میں سوتا تھا ۔ جان نے اُسے جگا کے پھولوں کے ہار

لئے ۔ اور پھر جلد ہی مہا لکشمی لوٹ آیا ۔

جان کے آتے ہی رحمت نے بجلی کی لاش کو ہاتھ گاڑی پر رکھا ۔ ارتھی پر پھولوں کے ہار رکھ دیئے ۔ اور پھر سب لوگ مہا لکشمی کے شمشان گھاٹ کی طرف چل پڑے ۔ شمشان پہنچے تو وہاں کے انچارج نے انہیں روک دیا ۔

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ لاؤ ۔" اُس نے کہا ۔

"وہ تو ہمارے پاس نہیں ہے ۔" رحمت نے جواب دیا ۔

"تو پھر ارتھی کو سرٹیفیکیٹ کے بغیر نہیں لے جا سکتے ۔" انچارج نے اپنا فیصلہ سُنا دیا ۔ سب کے سب سوچ میں پڑ گئے ۔ "اب کریں تو کیا کریں ۔" کچھ لمحات گذر گئے ۔ جان نے رحمت سے کانا پھوسی کی ۔ پھر سب لوگوں نے اپنی اپنی جیبوں کو ٹٹولا ۔ پچاس ساٹھ روپے جمع ہو گئے ۔ رحمت نے پیسے انچارج کے ہاتھ میں دیدیئے ۔ اُس نے چُپ چاپ پیسے لے لئے ۔

ارتھی کو شمشان کے اندر لے جایا گیا ۔ رحمت اور جان نے ارتھی کو اُٹھا کے اُس جگہ رکھ دیا ۔ جہاں چِتا کو جلایا جاتا ہے ۔ چتا کو نذرِ آتش کر دیا گیا ۔ آن کی آن میں اس سے شُعلے بلند ہونے لگے اور چتا جل کر راکھ ہو گئی ۔

شمشان گھاٹ سے نکل کے جب وہ لوگ باہر آئے تو سب کے سب بے حد اُداس تھے ۔ رنجیدہ تھے ۔ ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں ۔ اب وہ اس سڑک پر نکل آئے تھے جو مہا لکشمی سٹیشن کی طرف جاتی ہے ۔

سڑک پر اُن کے قدم آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے ۔ سب چُپ چاپ چلے جا رہے تھے ۔ آگے آگے راجہ تھا ۔ اس کے پیچھے رحمت ، جان ، بابو ، مہادیو اور دوسرے لوگ ۔ وہ بوجھل قدموں سے چل رہے تھے ۔ اُن کے پاؤں جیسے کئی من وزنی ہو گئے تھے ۔ سڑک پر ٹیکسیاں کم کم ہی چل رہی تھیں ۔ آدمی بھی کوئی کوئی دِکھائی پڑتا تھا ۔ اُس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے ۔

اب وہ گردن جُھکائے خاموش اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے ۔ وہ چلے جا رہے تھے ایک شمشان سے نکل کر دوسرے شمشان کی طرف !

رقصِ مرگ

بزرگ علوی (ایران)

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

کل صبح اسے لے گئے ۔ دوسرا دن ہے کہ اسے لے گئے ہیں ۔ کل صبح سے لے کر اب تک "رقصِ مرگ" کے تال میرے کانوں میں گونج رہے ہیں ۔ مرتضیٰ آدھی رات کے وقت رجب علی رجبوف کا ہاتھ پکڑے قبر سے باہر آتا ہے ۔ ایک اور مردہ ایک لڑکی کے پنجے سے ایک نوجوان کی کھوپڑی پر "رقصِ مرگ" کی ہیبت ناک دھنیں بجا رہا ہے ۔ قبروں کے منہ کھل جاتے ہیں ، ہڈیوں کے ڈھانچے قبروں سے باہر نکل آتے اور باہم مل کر موت کا نغمہ الاپتے اور ناچتے ہیں ۔ مارگریٹا اپنے پُردرد چہرے کے ساتھ ، لیکن زندہ ، یہ منظر دیکھ رہی ہے ۔ وہ صرف مرتضیٰ کو اس اجتماعی قبر سے باہر نکالنا چاہتی ہے ۔

کل اسے لے گئے ۔ اسے ہمارے درمیان سے لے گئے ۔ اس شخص کو ، جس کے ساتھ ہم پورے تین ماہ شب و روز اکٹھے رہے ، جس کے ساتھ مل کر ہم کھانا کھاتے ، اس شخص کو ، جو ہمارے ساتھ الجھتا ، بعد میں صلح کر لیتا ، اس شخص کو ، جس کی ہم توہین کرتے اور پھر اس سے معذرت کر لیتے ، اس شخص کو جو ہمارے سامنے روتا اور ہمیں ہنساتا ، اس شخص کو ، جو کسی مصیبت کے وقت ہمارا شریک درد ہوتا ، اور عالم ناامیدی میں ہماری ڈھارس بندھاتا ، اس قیدی کو ہم قیدیوں میں سے لے گئے اور ہمیں اتنا بھی نہ بتایا گیا کہ اسے آخر کہاں لے گئے ہیں ، خیر مجھے معلوم ہے کہ اسے کہاں لے گئے ۔ اسے لے گئے ہیں تاکہ اسے مار ڈالیں ۔ کیونکہ اسے موت کی سزا سنائی گئی تھی ۔

اب مرتضیٰ نہیں ہے ۔ مرتضیٰ تو مردوں کے رقص میں ، جو ہر شب آدھی رات سے صبح مرغ کی بانگ تک قبرستانوں میں اُدھم برپا رکھتا ہے ، شرکت کرتا ہے ۔ قید سے باہر اس کی زندگی کی آخری ساعت میری آنکھوں کے آگے گھوم رہی ہے ۔ میں اسے بخوبی دیکھ رہا ہوں ۔ میں اس کی آواز سن رہا ہوں ۔ وہ بلند آواز میں کہہ رہا ہے:

مارگریٹا ، مارگریٹا ، کسی سے نہ کہنا ، کسی سے ۔۔۔۔

میں نے قید خانے کی اس چند سالہ زندگی میں —— زندگی نہیں ، زندہ بگوری —— میں نے اس چند سالہ قبر کی زندگی میں موت کے لئے نامزد کئی آدمیوں کو دیکھا ہے ۔ میں نے دیکھا ہے کہ عدالت کا فیصلہ پہنچنے پر ایسے آدمیوں کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے ، گھٹنے سست پڑ جاتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی اور اسی جگہ ان کی روح پرواز کر جائے گی لیکن یہ حالت ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہتی اور جلد ہی اس کی جگہ امید لے لیتی ہے ، امید حکم عدولی کی ، معافی کی ؛ امید ، محض ان لوگوں کی خاطر دنیا کے تلپٹ ہونے ، امید ، کسی معجزے کی بنا پر ، نہ صرف امید بلکہ

انتہائی گھٹیا سوچوں پر ایمان اور اس امر کا تصور کہ ممکن ہے بادشاہ کے دل میں رحم آجائے اور وہ انہیں بری کر دے ۔

میں نے پھانسی کے ایک ایسے ہی مجرم کو دیکھا ہے جو پھانسی کا حکم ملنے سے ایک رات پہلے ہی مر گیا تھا ۔

میں اسی قسم کے ایک اور شخص کو جانتا ہوں جس نے گولیوں کی باڑ کے آگے کھڑے ہونے سے پہلے شیو کی ، خوبصورت لباس زیب تن کیا ، دوستوں کو خدا حافظ کہا اور مردانہ وار موت کے منہ میں چلا گیا ۔

میں موت کا حکم پانے والے ایک اور آدمی کو جانتا ہوں ، جس کی زبان پر ، مرتے وقت "زندہ باد ایران" کے الفاظ تھے ۔

میں ایسے بہت سے قیدیوں سے واقف ہوں جن کا ترانہ ، گولیوں کے برسٹ کے آگے کھڑے ہونے سے بہت پہلے گونجا تھا:

"اٹھو ، اے نفرت کی زخم خوردہ ، ننگوں اور بھوکوں کی دنیا"۔

لیکن ان سب میں سے کسی کو بھی اتنا قریب سے نہیں جانتا تھا ، ان میں سے بہت سوں کو میں نے دیکھا تھا ۔ کسی کو بھی ہم میں سے نہیں لے جایا گیا تھا ، اس طرح جیسے کسی بھیڑ بکری کو ریوڑ سے نکال کر مذبح لے جا رہے ہوں ۔

کل صبح ساڑھے سات بجے اُسے آواز دی گئی ۔ اُسی بوڑھے داروغے نے گھمبیر آواز میں پکارا ہے ۔ وہ ناک اوپر چڑھا کر آواز لگاتا ہے ۔ "مرتضیٰ بیٹا جواد کا ، آجاؤ بھئی۔" وہ آخری لفظ کو کچھ دیر تک کھینچ کر ادا کرتا ہے ، اس کے لئے یہ قطعاً کوئی مسئلہ نہیں کہ اس مرتضیٰ فرزند جواد کو ، جو ایک اٹھارہ سالہ لڑکی مارگریٹا کا محبوب ہے ، قید تنہائی میں لے جایا جا رہا ہے تاکہ گھٹ گھٹ کے مر جائے ، اسے رخصت دی جا رہی ہے ، اسے چابک مارنا چاہتے ہیں ، اسے تنبیہ کے لئے لے جا رہے ہیں ، اسے معاف کر رہے ہیں ، اسے دیس نکالا دے رہے ہیں ، اسے تختہ دار پر لے جا رہے ہیں یا گولیوں سے بھون رہے ہیں ، اسے کیا ، اس کی بلا سے ، وہ تو صرف آواز لگاتا ہے "مرتضیٰ بیٹا جواد کا ، آجاؤ بھئی" ، اس کے فوراً بعد کئی دوسرے افراد ، جن میں وارڈ نمبر ٦ کا وارڈن اور اس وارڈ کے داروغے اور ان کے ماتحت عملہ کے افراد شامل ہیں ، آواز لگاتے ہیں: "مرتضیٰ بیٹا جواد کا"

لیکن ہمارا دل پاش پاش ہو گیا

بعض نے اس کا ساز و سامان جمع کرنا شروع کر دیا ۔

چند لمحوں کے بعد کسی نے ہم سے پوچھا "سامان کے ساتھ ؟"

اس وقت جواب دیا گیا ۔ نہیں عدالت لے جانے کے لئے ۔

وہ مرنے جا رہا تھا ۔ یقیناً اسے تختہ دار پر لٹکا دیں گے ۔ غالباً جیل کے دروازے پر مارگریٹا کھڑی ہے ، ا یوں مرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کو دیکھ لیں گے ۔ یقیناً جیل کے اس دروازے پر وہ اس سے کہے گا ارگریٹا کسی سے نہ کہنا! کسی سے ـــــ

مرتضیٰ کو عدالت کے لئے نہیں لے جا رہے ، جھوٹ بولتے ہیں ، موت کی سزا پانے والے کسی بھی قیدی کو ، مرنے سے ایک لمحہ پہلے یہ نہیں کہا جاتا کہ ہم تمہیں پھانسی پر لٹکانے کے لئے لے جا رہے ہیں ، جھوٹ موٹ اسے ادھر ادھر لگائے رکھتے ہیں ۔

جس وقت مرتضیٰ ہمارے کمرے سے باہر نکل رہا تھا ، تو دروازے پر پہنچ کر مڑا اور بولا:

موسم بارانی ہے ، تم میں سے کوئی مجھے اپنی ٹوپی دے دو ۔

چند قیدیوں نے اپنی ٹوپیاں اسے پیش کیں لیکن اس نے میری ٹوپی لے لی ۔

کیا سادہ آدمی ہے؟ موت کی سزا پانے والے سبھی سادہ ہو جاتے ہیں ۔ یہ تصور کتنا اذیت ناک ہے کہ یہ جسم اپنی اس شکل و صورت اور اس قد کاٹھ کے ساتھ ، یا یہ سوچ کہ اس تمام امید و آرزو کے باوجود ، مارگریٹا کے ساتھ اس قدر محبت و وابستگی کے باوصف ، تھوڑی دیر کے بعد ٹوٹ پھوٹ کے رہ جائے گا اور اس کا کچھ بھی باقی نہ رہے گا اذیت ناک ہے ۔

وہ مرنے کے لئے جا رہا تھا، ڈر رہا تھا کہ بارش میں کہیں اس کا سر نہ بھیگ جائے ۔ شاید وہ خود باختہ ہو چکا تھا، شاید وہ موت کو اہمیت نہیں دے رہا تھا ۔

عام طور پر جب کسی کو پھانسی کے لئے لے جاتے ہیں تو کہتے ہیں "سامان کے ساتھ" ۔ اس وقت اس سے اس کا بستر اس کی چارپائی ، سامان اور لباس وغیرہ لے لیا جاتا ہے اور جیل کے دفتر میں رکھ دیا جاتا ہے ۔ اگر اس کے کوئی اہل خانہ ہوں تو یہ اشیا ان لوگوں کو دے دی جاتی ہیں ، اور اگر کوئی خاندان نہ ہو ، تو معلوم نہیں اس سامان کا کیا کرتے ہیں ۔ بہر حال یہ کہ اسے کسی شے کے بغیر لے گئے تھے ، ہم سب کے لئے اس میں امید کی کرن روشن ہو گئی تھی ۔

کیا یہ ممکن ہے کہ اسے پھانسی کے لئے نہ لے گئے ہوں ؟

میرے کانوں میں اب بھی اس کی آواز گونج رہی تھی ۔

"مارگریٹا! مارگریٹا! کسی سے نہ کہنا ، کسی سے ـــــ"

ممکن ہے مارگریٹا نے کسی سے کچھ کہا ہو ؟ کیا یہ ممکن ہے ؟ اس صورت میں تو مرتضیٰ کا مر جانا ہی اچھا ہے ۔ لیکن نہیں یہ خیالات ٹھیک نہیں ، یہ خیالات ٹھیک نہیں ہیں ۔ مرتضیٰ نے گزشتہ شب مُردوں کے رقص میں ، آدھی رات کے وقت ، شرکت کی ۔ وہاں اس نے رجب علی رجبوف کا ہاتھ پکڑا اور دونوں نے آزادانہ رقص کیا ہے ۔ رقصِ مرگ کی یہ وحشتناک صدائیں میرے جسم پر کپکپی طاری کر رہی ہیں ۔ میں مُردوں کے ڈھانچوں کا رقص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں ۔

میں نے خود اس سے متعلق حکم پڑھا ہے ۔ ضلعی عدالت کے فیصلے کے مطابق مرتضیٰ فرزند جواد پر حاجی رجب بادکوبہ ای ، سکنہ تہران کے قتل عمد کا جرم ثابت ہو گیا ہے" اور چند جملوں کے بعد ، جو مجھے اب یاد نہیں رہے ، یہ

فیصلہ کچھ ان الفاظ میں تھا ۔ "پولیس رپورٹ اور ٹھوس عدالتی تحقیقات کے پیش نظر نیز جج کے روبرو ملزم کے واضح اقرار کے نتیجے میں ، اس کا جرم ثابت و مسلم ہو گیا ہے ۔ اس کے بعد پھر چند جملے تھے اور آخر ان الفاظ پر اس کا اختتام تھا "اس بنا پر فلاں دفعہ کی رو سے سب کو سزائے موت کا حکم دیا جاتا ہے"۔

اس نے فیصلے کو بڑی بے نیازی سے پڑھا ، الٹا یوں لگا جیسے وہ خوف اور پریشانی کے عالم سے نکل آیا ہو ۔ اس نے اس فیصلے کے خلاف اپیل نہ کی ۔

اب کیا ایسا ممکن ہے کہ وہ پھر بھی زندہ ہو ، ممکن ہے اسے تختہ دار پر لٹکایا ہی نہ گیا ہو ۔ کل صبح اسے لے گئے ۔ اس کی لاش شاید مارگریٹا کے حوالے کر دی گئی ہو ، اس نے اپنے محبوب کی لاش سے کیا کیا ہے ؟ کیا تہران میں اس کا کوئی اور نہ تھا ۔ جیل والوں کے لئے تو کام بہت آسان ہو گیا ۔ وہ مارگریٹا کو ٹیلیفون کریں گے ۔ ہم تمہارے محبوب کی لاش خانقاہ عبد اللہ میں لے گئے ہیں ۔ اگر تم چاہتی ہو تو خود ہی وہاں جا کر قبر کھد والو ۔

تو پھر دوسرے لوگ اب کس لئے شک کر رہے ہیں ؟ اُسے مارنے کے لئے لے گئے ہیں نظری اختلاف کے باوجود جو ہمارے کمرے میں اس موضوع پر ہے۔ میرے لئے اس بات میں ذرا سا بھی شبہہ نہیں کہ مرتضیٰ اب اس دنیا میں نہیں ہے ۔ یا شاید یہ کہ ــــــ شاید یہ کہ موت سے بھی بد تر زندگی اس کا مقدر بنی ہو ۔ ایسی صورت میں میری یہ آرزو ہوتی کہ وہ مر ہی جاتا اور کہیں نہ ہوتا ۔

جب اسے عدالت کا فیصلہ جیل میں پہنچایا گیا اور اس نے اس سلسلے میں کسی قسم کی انصاف طلبی سے اجتناب برتا یعنی اپیل نہ کی تو اس کے ہمارے مابین پہلی مخلصانہ گفتگو شروع ہوئی :

تو اپیل کیوں نہیں کرتا ؟

کس لئے اپیل کروں ؟

اس فیصلے کے خلاف جو عدالت نے تیرے بارے میں صادر کیا ہے ، تعجب ہے ، تو سمجھتا کیوں نہیں ؟ تجھے موت کی سزا سنائی گئی ہے ۔

وہ شاید صحیح طور پر نہیں سمجھ پایا تھا کہ اس فیصلے کی اہمیت کیا ہے ۔

وارڈ نمبر ۶ کے کمرہ نمبر ۳ میں ہم اکیس افراد قید ہیں اور ان میں میں واحد شخص ہوں جو ان کے شبہے کی بنا پر سیاسی قیدی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب قلعے کے قید خانے میں ایک صاحب منصب نگران سے میری تو تکار ہوئی تو مجھے عارضی جیل میں بھیج دیا گیا جس میں چور اچکے اور قاتل قید ہیں ۔

راتوں کو ۹ بجے کے بعد جب سب سونے پر مجبور ہوتے ہیں ، میں چپکے سے اپنی کتاب نکالتا ہوں، تھوڑی سی چائے اپنے نگران کو پلاتا ہوں تاکہ وہ مجھے تنگ نہ کرے۔ پھر میں بڑے مزے سے کتاب پڑھنا شروع کرتا ہوں؛ اگر کوئی افسر ، ڈائریکٹر یا جیلر اس طرف آتا ہے تو نگران مجھے خبر دار کر دیتا ہے۔

جس رات مرتضیٰ کو موت کی سزا کا فیصلہ پہنچایا گیا میں نے دیکھا کہ اس کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ چونکہ مجھے علم تھا کہ وہ فرانسیسی زبان جانتا ہے اس لیے میں نے کتاب کو درمیان سے دو ٹکڑے کیا اور اس کا نصف اول اسے دے دیا۔ اس نے بڑے ہی اشتیاق سے وہ کتاب لی اور یہی بات ہماری دوستی کا سبب بن گئی۔ جس وقت اسے عدالت کا فیصلہ پہنچایا گیا، اس کے نیچے اس نے لکھ دیا: 'دیکھ لیا گیا"۔

ہم سب بھونچکارہ گئے، اس لیے کہ اس سے پہلے ہم اس نگران سے، جو اسے عدالت میں لے گیا تھا، عدالت کی تھوڑی بہت کارروائی سُن چکے تھے اور اس کے مطابق ہم یہ جان چکے تھے کہ عدالت کے پاس اس کے خلاف کسی قسم کا ثبوت یا دلیل نہیں ہے، سوائے اس کے اپنے واضح اقرار کے ، جس میں اس نے کہا تھا:

میں نے قتل کیا ہے۔

اس نے کہا تھا کہ رجب علی رجبوف کو میں نے قتل کیا ہے۔

دوسری اور پھر تیسری مرتبہ بھی جب میں نے باصرار اس سے استفسار کیا تھا:

= تو اس فیصلے پر اعتراض کیوں نہیں کرتا، تو اپیل کیوں نہیں کرتا؟

= میرے جواب میں اس نے کہا تھا: کیا فائدہ ہے؟

= یہ کیا بات ہوئی کیا فائدہ ہے؟ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ممکن ہے تو بری ہو جائے اور تجھے پھانسی نہ دی جائے۔

= میں نے جرم کیا ہے اور اس کی سزا مجھے ملنا چاہیئے۔

= تو نے کونسا جرم کیا ہے؟

= میں نے آدمی کو قتل کیا ہے۔

= تو نے؟

میں اس قدر پریشان اور حواس باختہ ہو گیا تھا کہ اس کی یہ بے توجہی و بردباری مجھے متاثر نہیں کر سکتی تھی۔ آخر کار جو کچھ میں نے اندازہ کیا اور ادھر ادھر سے سنا تھا، اور یہ سب کچھ میرے دل میں تھا، میں اسے بچا نہ سکا اور کہہ اٹھا:

مجھے تو قطعاً یقین نہیں کہ تو نے کوئی قتل کیا ہو گا ، تو ایسا کام نہیں کر سکتا؛ یہ درست ہے کہ تو مضبوط جسم والا ہے لیکن عدالت کے پاس تیرے خلاف کوئی ثبوت نہیں اور اگر تو خود اقرار نہ کرتا تو تجھے کسی بھی صورت یہ سزا نہ دی جاتی۔

میں نے قتل کیا ہے ۔

قریب تھا کہ میرا حوصلہ جواب دے دیتا ۔ اکثر اس کی یہ بے اطمینانی مجھے پریشان حال کر دیتی ۔

دیکھ میرے دوست ، میں ایک پرانا سیاسی قیدی ہوں ۔ اب کچھ اوپر چار سال بلکہ ساڑھے چار سال ہو چلے ہیں

میں قید خانے میں زندگی بسر کر رہا ہوں ، تو مجھ پر بھروسا کر سکتا ہے ۔ کوئی بات ضرور ہے جس نے تجھے یوں جکڑ رکھا ہے ۔ میں نے کئی قیدی ایسے دیکھے ہیں جنہوں نے دوسروں کا جرم اپنے سر لے لیا اور جیل میں آ گئے ۔ بعض مرتبہ پُر اسرار باتیں انسان کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں ، ایسے موقعوں پر ان باتوں کا انکشاف کر دینا چاہئیے ۔ بہر حال اگر تو نے یہ ارادہ ہی کر لیا ہے کہ تو موت کے منہ میں چلا جائے اور اپنی نجات موت ہی میں سمجھتا ہے تو بھی تو سکون سے مر سکتا ہے ۔ اگر تو وہ بات مجھ سے کہہ دے جو تجھے مارے دے رہی ہے تو ممکن ہے تجھے سکون میسر آ جائے ، شاید کوئی راہ نکل آئے ۔ آج سے جب تجھے یہ فیصلہ پہنچایا گیا ہے تیرے پاس دس دن ہیں ۔ ممکن ہے کوئی بات بن جائے ۔ ابھی تو نوجوان ہے ، تیرے مرنے کے دن نہیں ہیں ۔ اگر تجھے کسی عورت سے یا کسی سے محبت ہے ، تو ٹھیک ہے ، اس کے خیال میں ہی ڈوبارہ ۔ اس کے لئے بھی زندگی ، اس صورت میں کہ تو مر جائے ، بیکار ہوگی ، تو کوئی ایسا بھی بے یار و مددگار نہیں ہے ۔ کوئی تیری ملاقات کے لئے نہیں آتا تو اکثر تیرے لئے خوراک اور پوشاک تو آتی رہتی ہے ۔

میں نے یہ جان لیا کہ میرے ترکش کا واحد تیر عورت کا موضوع ہے اور اس تیر سے میں نے خاصا کام لیا ۔ میں نے جیل کے قاتلوں کے بارے میں بہت سی معلومات اکٹھی کی تھیں ۔ ان میں سے بیشتر دہقان تھے جو پانی کے تنازعہ یا دوسرے دہقانوں کے ساتھ زمینداروں کی فریب کاریوں کے نتیجے میں باہم الجھے تھے اور انجام کار ان میں سے کوئی ایک قتل ہو گیا تھا ۔ یا وہ لوگ تھے جنہوں نے کسی عورت کے چکر میں اپنے رقیب کو مار ڈالا ۔ تیسرا گروہ ان قاتلوں کا تھا جو کمسنی (۵ یا ۶ برس کی) میں قید ہوئے ۔ جیل میں انہوں نے دوسرے چوروں سے چوری اور جیب تراشی سیکھی تھی اور آخر کار پندرہ برس تک چوری اور آوارہ گردی کے بعد وہ آخری مرتبہ اسلحے کے ساتھ چوری کے لئے نکلے تھے کہ کسی ایک کو قتل کر بیٹھے ۔ یہ گروہ جسے معاشرہ اپنی ذات میں قاتل کا نام دیتا ہے ، وہی لوگ ہیں جنہیں خود سماج جیل میں چوری اور جرم کے ڈھنگ سکھاتا ہے ۔

مجھے قرائن سے پتا چلا کہ مرتضیٰ کی سرنوشت میں کسی عورت کا کردار ہو گا ، اور اس عورت کا نام ، جیسا کہ اس کے ساتھ عدالت میں جانے والے نگرانوں سے میں نے سنا تھا ، پھر جیل کے رجسٹر پر بھی جس کے مطابق ہمارے عزیزوں سے خوراک اور پوشاک لے کر ہمارے حوالے کی جاتی ہے ، مارگریٹا درج تھا ۔ اب میں نے آخری حربہ آزمایا :

"ہم فرض کر لیتے ہیں کہ تو نے کسی کو قتل کیا ہے ، تو وہ آخر کسی عورت ہی کی خاطر تھا ، کیا ایسا نہیں ہے ۔

کیا فائدہ کہ ہم اس موضوع پر بات کریں ۔

اس کا فائدہ یہ ہے کہ تو زندہ رہے گا اور خوشبختی تیرا مقدر ہو سکتی ہے ۔

اس نے بات ٹالنا چاہی اور جواب سے پہلو تہی کی ، لیکن میں اس سے پیچھے نہ ہٹا ۔

اگر وہ عورت اب تجھ سے محبت نہیں کرتی تو پھر تو کیوں مرنا چاہتا ہے ۔

آہ! معاملہ یوں نہیں ہے ۔ تجھے علم نہیں کہ تو اپنی ان باتوں سے کس طرح میرا دل جلا رہا ہے ۔

تو کیا وہ تجھ سے محبت کرتی ہے ۔ پھر تجھے مرنا کیا لازم ؟ آسائش کوئی زیادہ دور تو نہیں ۔

میرے لئے اب کوئی مسرت و آسائش نہیں ہے ۔

کیونکر نہیں ہے ؟ ممکن ہے فیصلہ ، عکس ہوا ہو ، شاید دوسری عدالت تشکیل ہوئی ہو ، ذرا سوچ ۔ شاید تو نے کوئی قتل ہی نہ کیا ہو ۔ ثابت کر کہ تو قاتل نہیں ہے ۔ شاید تو قاتل کو پہچانتا ہے ؟ تو مجبور نہیں ہے کہ اس کا نام ظاہر کرے ۔ اگر تو نہیں چاہتا تو شاید تجھے عمر قید کی سزا ہو جائے ۔ خدا جانے کل کیا صورت حال ہو؟ ممکن ہے تجھے بری کر دیا جائے ۔ اس قسم کے ہزاروں دوسرے شاید ، ہیں ۔

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا ۔ نہ یہ ہے ۔ نہ وہ ۔ میں اس پُرجمود زندگی سے تنگ آچکا ہوں ۔ جس قسم کی زندگی میں نے بسر کی ہے وہ میری تدریجی موت تھی ۔ میرے لئے سزائے موت حقیقت میں ان اذیتوں سے نجات ہے جنہیں برداشت کرنا کسی کے بھی بس کی بات نہیں ۔ میرے لئے زندگی اب کوئی حقیقت نہیں رکھتی ۔ میرے لئے زندگی ہر قسم کی پیش رفت اور بہبودی سے عاری ہے ۔

یہ کوئی صحیح بات نہیں ۔ دنیا رو بہ ترقی ہے ۔ رو بہ بہبودی ہے ۔ اس ظلم و استبداد اور وحشی پن کی موجوں سے ، جو آج دنیا میں ہنگامہ آرا ہیں ، چشم پوشی کر ۔ آخر ار تقادر کار ہے ۔ تیرا کیا شغل ہے ۔ کس طرح تیرے لئے بہتر ہو گا ۔

میں سکول ٹیچر تھا ۔

اور یوں میں نے اسے کچھ اگلنے کے لئے آمادہ کر لیا ۔

وہ بلند قد اور قوی جثہ تھا ۔ خون اس کے چہرے سے جیسے ٹپکا پڑ رہا تھا ۔ اس کا باپ تحریک جمہوریت کی نذر ہو گیا تھا ۔ ماں کے بارے میں اسے کچھ بھی یاد نہ تھا ۔ اس کی بہن کسی دوسرے شہر میں گھریلو زندگی بسر کر رہی تھی اور خود وہ باپ کے گھر میں رہتا تھا ۔ والدین کی طرف سے جو کچھ اسے ملا وہ اس کی تعلیم پر اٹھ گیا تھا اور اب وہ تہران کے سکولوں میں پڑھاتا تھا ۔ اس کا زیادہ تر وقت مطالعے میں گزرتا ۔ کتاب سے اسے لگاؤ تھا ۔ چونکہ شرمیلا اور کم آمیز تھا اور محفلوں میں بات کرنے سے جھجکتا تھا اس لئے کتاب ہی میں اسے لطف آتا ۔ کتاب اور پھر فلم اور ریڈیو اس کے نزدیک لطف و دلچسپی کا بہت بڑا ذریعہ تھے ۔ روسی ادیب دوستووسکی کا تو وہ عاشق تھا ۔ صرف اس کی کتابیں پڑھنے کی خاطر وہ روسی زبان سیکھنا چاہتا تھا ۔ فرانسیسی زبان میں تو اسے خاصی دسترس تھی ۔ روسی زبان سے بھی کسی حد تک آشنا تھا ۔ اس کے علاوہ وہ کبھی کبھی تہران کے ہوٹلوں میں نظر آجاتا جہاں وہ دوسروں کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتا ۔ سینما کی وجہ سے انگلش میوزک کا بھی اسے کچھ چسکا پڑ گیا تھا ۔ گھر میں اس کے پاس ریڈیو تھا ، اور یہ ریڈیو بھی

اپنی جگہ اس کی ایک نئی مصروفیت اور دل لگی کا باعث بن گیا تھا ۔اس حد تک کہ وہ لوگوں سے مل بیٹھنے سے بے نیاز ہو گیا تھا ۔ سکولوں سے اسے ڈیڑھ سو تومان تنخواہ ملتی تھی ، علاوہ ازیں سال میں ایک مرتبہ تین سو سے پانچ سو تک تومان اس جائیداد سے حصے کی صورت میں اسے مل جاتے تھے جس میں اس کی بہن اور رچیرے بھائی ساجھی تھے ۔ اس کی زندگی پُرسکون ، ایک ہی ڈگر پر اور کسی دردِ سر کے بغیر بسر ہو رہی تھی ۔ جاہ طلب نہ تھا بلکہ الٹا اس قسم کی ہوس رانیوں کو (کسی حد تک) بہ نظر تحقیر دیکھتا ۔

اس کی بہن جو اس سے چند برس بڑی تھی ، اس کی شادی کر دینا چاہتی تھی تاکہ اس طرح وہ اسے اس قسم کی بور زندگی سے چھٹکارا دلا دے ۔ بیوی بچوں کا جھنجھٹ ، گھر بار کا خرچ ، تنخواہ میں اضافے کی سوچ ، گھر والوں کی آسائش کا دھیان ، یہ سب باتیں انسان کو اس امر سے باز رکھتی ہیں کہ وہ خود کو طوفان کے حوالے کر دے ۔ سمندر کے کنارے ہی سے ہاتھوں میں عصا تھامے لوٹ جانا چاہئیے ۔ سمندر ہے ، شاید انسان کو گہرائی میں کھینچ لے جائے ۔ خود اسے اپنی زندگی کی راہ معلوم نہ تھی ۔ اسے سمندر سے ، طوفان سے ایک لگاؤ تھا ، تاہم کنارے پر بھی ایک سکون تھا ۔ فقط کبھی کبھار وہ بھی اکثر ایسے اوقات میں جب وہ تنہا ہوتا ، ایسا ممکن تھا کہ کتاب یا سینما یا موسیقی یا دوسروں کے دکھ درد یا پھر ذوق و شوق اسے اس مدار سے باہر کھینچ لے جائے ، اس میں ایک ہیجان کی کیفیت پیدا کر دے ، اسے سرکشی پر آمادہ کر دے ، شیفتہ و فریفتہ کر دے ؛ اس طور کہ چند لمحوں کے بعد وہ اپنے اس عمل پر پشیمان ہو جو شوریدگی کے نتیجے میں اس سے سرزد ہوا تھا ۔ ایسے موقع پر وہ خود کو پھر سے سنبھالتا سمیٹتا اور پھر سے خود کو ہر روز کی زندگی کی شاہراہ جمود پر پاتا ۔ کمرے میں ایک عدد کرسی ضروری ہے ، اس مرتبہ بجلی کا بل کچھ زیادہ آیا ہے ۔ اس کی بجائے کہ ساڑھے تین سو تومان کا ایک قالین خرید لے ، شاید یہ بہتر ہو کہ وہ یہ رقم منافع پر قرض دے دے ، مہینے میں سات تومان اور سال میں چوراسی تومان ، اچھا ہے ، کچھ بھی سہی ایک اضافہ تو ہے ــــــ

وہ خود کہتا کہ میں ایک ایسی ٹم ٹم پر سوار تھا جو ٹپ ٹپ کرتی ایک سرائے سے دوسری سرائے تک کھینچ لے جاتی اور آخر مجھے منزل پر پہنچا دیتی ۔ مختصر یہ کہ ٹم ٹم کا ٹٹو اَڑ اَڑ کے چلتا اور اکثر اس کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ مجھے سڑک سے باہر گرا دے ، اور آخر کار اس نے سڑک سے باہر گرا ہی دیا ۔

یہ بور زندگی ایک مرتبہ کچھ اور ہی صورت اختیار کر گئی ۔

مارگریٹا !

مارگریٹا کے ساتھ اس کی زندگی کا دوسرا باب شروع ہوتا ہے ۔

(ایک فرانسیسی ضرب المثل کے مطابق) اشخاص کی رمزِ زندگی کی چابی عورتوں کے ہاتھ میں ہے ۔

اس عورت کا نام مارگریٹا تھا ۔

میں نے قیدیوں کا رجسٹر رقوم ، میں خود یہ نام پڑھا ۔ ہر ہفتے ہم پندرہ ریال لے سکتے تھے ۔ ہمارے اقربا

ہمارے نام پر جس قدر بھی روپیہ پیسہ چاہیں جیل کے دفتر جمع کرا سکتے ہیں ۔ اس کے مطابق ہمارے نام پر رسید جاری ہو جاتی ہے ۔ یہ رسیدیں ہمیں دی جاتی ہیں اور اس رجسٹر میں ہم ان رسیدوں کی وصولی پر دستخط کر دیتے ہیں ، جس میں وصول کنندگان کے نام درج ہوتے ہیں ۔

مرتضیٰ کی رسید پر اس چھپی ہوئی عبارت "رقم لانے والے کا نام ، خاندانی نام اور ایڈریس" کے سامنے "بانو مارگریٹا" کا نام درج تھا ۔

شروع شروع میں جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ مارگریٹا کون ہے ؟ وہ یہی جواب دیتا کہ میں اسے نہیں جانتا ۔

تاہم مارگریٹا اکثر جیل کے دروازے پر آتی رہتی اور اس کے لئے کھانا وغیرہ لاتی ۔ اس کے لئے نیا لباس خریدتی ۔ اس کے لئے رقم جمع کراتی ۔ کھانوں سے یہ پتا چلتا تھا کہ کوئی باسلیقہ خاتون بھجوا رہی ہے ۔ ایک مرتبہ اس کے لئے ایک سلیپنگ سوٹ لایا گیا ۔ اس پر لاطینی حروف میں لکھا تھا : MF، مرتضیٰ ف ۔ وہ گھنٹوں بیٹھا رہتا اور استری کئے ہوئے دستی رومالوں کو ادھر ادھر رکھتا اور لطف اندوز ہوتا رہتا ۔ اگر کوئی غور سے مرتضیٰ کی آنکھوں کو دیکھتا تو وہ انہیں کسی حد تک بھیگی ہوئی پاتا ۔ یہ سرور و وجد کے باعث تھا ۔ گلدانوں کے اندر پھول رکھے گئے ہوتے ۔ اس کے باوجود کہ جیل کے ملازمین بڑی خشونت سے اس (خاتون) کے ڈبوں سے مٹھائی نکال لیتے اور نگرانوں کے ناک صاف کرنے والے رومالوں میں ڈال کر ہمارے لئے لاتے ، تو بھی اس حالت میں مرتضیٰ کے ہاتھوں میں پہنچی ہوئی مٹھائی سے وہ خود بھی اور ہم بھی یہ محسوس کرتے کہ کوئی باوفا مخلص خاتون باہر اس کے انتظار میں کھڑی ہے ۔

"مارگریٹا" کسی سے نہ کہنا ، کسی ۔۔۔

ابھی تک یہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے ۔

شاید آج صبح جب اسے پھانسی پر لٹکانے کے لئے لے جا رہے تھے ، جیل کے دروازے پر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ہو !

شاید آج دوپہر کے بعد پولیس والوں نے مارگریٹا کو فون کیا ہو :

"آ کر اپنے رشتہ دار کی لاش لے جائیے"

مرتضیٰ کو اس لڑکی سے رجبوف ہی نے متعارف کرایا تھا یعنی وہی مقتول رجب علی رجب زادہ

اس تمام بُردباری ، تحمل ، شرمیلے پن اور انکسار کے باوصف ، جو مجھے مرتضیٰ میں دکھائی دیا ، تعجب اس بات پر ہے کہ جب بھی وہ رجبوف کے بارے میں بات کرتا تو پھر قطعاً اسے پہچان نہ پاتا تھا ۔

اس کی موٹی موٹی اور گول آنکھیں ، چہرہ اس کا سرخ ہو جاتا ، ہونٹ کانپنے لگتے ، دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے لہرانے لگتا ؛ تیز ، کپکپاتے اور الٹے سیدھے لہجے میں لفظ اس کی زبان سے نکلتے ، یہاں تک کہ کبھی کبھی تو بے سدھ سا

ہو جاتا ۔ رجبوف کے بارے میں وہ یوں بتاتا :

"رجبوف ایک ایسا شخص تھا جو کیفے میں بیٹھ کر شراب پانی پینے والے گلاس میں انڈیلتا ، مولی وغیرہ کا آرڈر دیتا : پھر غٹاغٹ پی جاتا اور دُھت ہو جاتا ۔ شراب ، پانی پینے والے گلاس میں وہ اس لئے ڈالتا تاکہ لوگوں کو اس کا پتا نہ چل سکے ، اس لئے کہ وہ مسلمان تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ بازار میں اس کی ساکھ کو کوئی نقصان پہنچے۔"

یا پھر یہ کہتا کہ : "رجبوف کچھ لوگوں کے ساتھ ہمیشہ مخالفت پر تُلا رہتا اور کچھ کے ساتھ ہمیشہ موافقت رکھے رہتا ۔ جن لوگوں کے ساتھ اسے کوئی واسطہ اور کام نہ ہوتا اور جن سے اسے کسی بھی موقع پر کسی فائدے کی توقع نہ ہوتی ، ان کا وہ مخالف ہی رہتا ، جب کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بحث و مجادلہ میں متضاد ، الٹی سیدھی اور بے ربط باتیں ، دلائل کی صورت میں ، ہانکتا ۔"

بہر حال رجبوف اکثر آدمیوں کی طرح ایک آدمی تھا ۔

مارگریٹا کے باپ کے ساتھ ، جسے وہ اپنے دوستوں میں شمار کرتا تھا ، اس نے ہمیشہ موافقت رکھی ۔ ایک مرتبہ ایک دعوت میں ، مارگریٹا کے گہرے سرخ رنگ کے فراک پر شراب گر گئی ، فراک خوبصورت تھا اور مجھے بہت بھاتا تھا ۔ خود اسے بھی وہ فراک پسند تھا اور وہ اکثر ، اس دھبے کے باوجود جو اب کسی حد تک دور ہو چکا تھا ، وہی فراک پہنتی تھی ۔ ایک مرتبہ رجبوف نے وہ دھبا دیکھ لیا : اس سے پوچھنے لگا : تم نے فراک کو دھبا کیوں لگا لیا ؟

مارگریٹا باپ سے مخاطب ہو کر بولی : ابو ! دیکھا ؟ آپ تو کہتے تھے کہ دھبا مٹ گیا ہے ، دیکھیں ، کہاں مٹا ہے ؟ اس کے باپ نے رجبوف سے کہا : تمھیں کوئی دھبا کیونکر نظر آ رہا ہے ؟ رجبوف نے یوں جواب دیا ۔ دھبا نہیں نہیں اچھا مجھے ذرا دیکھنے دیں ۔ نہیں نہیں کچھ بھی تو نظر نہیں آ رہا ۔ نہ ، نہ ، ہاں تو ایسی کوئی چیز نہیں ۔ میں اس روز سے اسے سمجھ گیا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے ۔

مارگریٹا سے مرتضیٰ کی شناسائی اس طرح ہوئی ۔ مرتضیٰ روسی زبان سیکھنا چاہتا تھا اور کسی روسی استاد کی ٹوہ میں تھا ۔ اس کے ایک واقف کار نے اسے رجبوف سے جو روسی زبان جانتا تھا ، ملایا کہ شاید وہ ایسے معلم کا کھوج لگا دے جو روسی زبان کا درس دے سکے ۔ کچھ عرصے کے بعد رجبوف نے اس سے یوں کہا :

"بہت خوب چونکہ تم سے ارادت ہو گئی ہے اور مجھے علم ہے کہ تم ایک شریف نوجوان اور گھر بار والے ہو ، اس لئے میں تمہاری کوئی خدمت کرنا چاہتا ہوں ۔ میرا ایک دوست ہے جو بڑا پیارا انسان ہے ۔ اس کی ایک لڑکی ہے جو روسی زبان خوب جانتی ہے اگر تم چاہو تو اسے تم فارسی زبان سکھا دو وہ تمہیں روسی زبان سکھا دے گی ۔"

مرتضیٰ چونکہ شرمالو قسم کا تھا اسلئے اس نے یہ تجویز قبول نہ کی اور کہا :

"بہت بہت شکریہ ! میرا دل چاہتا تھا کہ معلم آدمی ہو ، پھر یہ کہ وہ فیس لے کر مجھے پڑھائے ۔ مجھے خدشہ ہے کہ میں یہ کام نبھا نہ سکوں گا ۔"

"تمہاری مرضی ، لیکن یہ جان لو کہ اس طرح تم بہتر طور پر سیکھ سکو گے ، اور میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ میری یہ تجویز قبول کر لو ۔ اگر تم دیکھو کہ کامیاب نہیں ہو رہے تو پھر میں کوشش کروں گا کہ تمہارے لئے کوئی اور آدمی تلاش کروں ، نو پرابلم ۔ میرے دوست کے اہل خانہ بہت اچھے لوگ ہیں اور تم پشیمان نہ ہو گے ۔ مس مارگریٹا بڑی ذی شعور لڑکی ہے ۔ روسی زبان خوب جانتی ہے ، اس سے ہٹ کر وہ فرانسیسی زبان سیکھنے کی خواہاں ہے ۔ بڑے اچھے لوگ ہیں ۔"

مرتضیٰ پھر بھی اس کام پر آمادہ ہونا نہیں چاہتا تھا اور قطعی جواب دینے سے بھی گریزاں تھا ۔ رجبوف نے اسے رضامند جانا اور بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا :

"کل دوپہر میں وہاں ہوں گا ۔ میں چاہتا ہوں کہ مدرسے سے فارغ ہوتے ہی سیدھے اس طرف آ جاؤ ۔" اور دوسرے دن کچھ اوپر بارہ بجے مرتضیٰ وہاں پہنچ گیا ۔

(۲)

عارضی جیل میں میرا روم میٹ مارگریٹا کے ساتھ اس پہلی ملاقات کو بہت اہمیت دیتا تھا ۔ اس اولین دیدار کو جس نے اسے روزانہ کی پُر جمود زندگی سے نکال کر متحرک بنا دیا تھا اور اس آخری ملاقات کو جس کے طفیل زندگی اس کے لئے بامقصد ہو گئی تھی ۔ آخری بار جب اس نے اسے پکارا تھا "مارگریٹا ! مارگریٹا ! کسی سے نہ کہنا ، کسی سے ---" وہ شاید اس روز کا آخری دیدار نہ تھا ؛ شاید کل صبح بھی ، جب وہ جیل کے دروازے سے باہر نکلا ہے ، جیل کے دروازے کے قریب ، وہی جگہ جہاں گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں اور پہرے دار قیدیوں کے ملاقاتیوں کو دور ہٹاتے رہتے ہیں تاکہ وہ کہیں ان سے بات نہ کر لیں ، شاید جیل کے دروازے کے قریب اس نے اسے دیکھا ہو ۔

مرتضیٰ اس آخری ملاقات کے بارے میں اب کچھ بتا نہیں سکتا ۔ لیکن پہلی ملاقات سے متعلق اس نے خود مجھے بتایا ۔

ان تمام احساسات اور لذتوں کی بات جو اسے میسر آئیں ، اس اضطراب اور تپش دل کا ذکر جس سے وہ دوچار ہوا ، سب کچھ اس نے مجھے کہہ سنایا ۔ کاش میں اس کی وہ تمام باتیں یہاں حرف بحرف دہرا سکتا ۔ شاید وہی تاثیر جس نے مجھے اپنی گرفت میں لیا یا کم از کم اس کا کچھ سایہ ہی یہاں پڑ جائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ زندگی ، مصائب زندگی اور دردو

آلام کس طرح آدمی کو شاعر اور فنکار بنا دیتے ہیں ۔ مرتضیٰ ایک سیدھا سادا آدمی تھا ، شرمیلا تھا ، لیکن زندگی نے اسے شاعر بنا دیا تھا ۔ کیا فرق پڑتا ہے ۔ یہی سٹرانڈ کا مارا چور جو اس وقت میرے پاؤں کے نزدیک سویا ہوا اور خراٹے لے رہا ہے ۔ مرتضیٰ ۔ ف بھی ، موت کی سزا پانے والا قیدی جو اب ہم میں نہیں ہے ، مارگریٹا بھی جو اندر ہی اندر درد و اذیت میں لوٹ رہی اور دم نہیں مارتی تھی ، میں بھی کہ اس آدھی رات کے وقت چوری چھپے یہ یادداشتیں کاغذ پر قلمبند کر رہا ہوں اور ہر لمحہ گوش بر آواز ہوں کہ وارڈ نمبر ۶ کے فرش پر چلنے والے فل بوٹوں کا کھڑاک کہیں ہمارے کمرے کے نزدیک نہ پہنچ جائے اور ٹکٹکیوں کے کل بردار کی چابیوں کے کھڑکنے کی آواز کہیں کسی صاحب منصب یا کسی انسپکٹر کی آمد کی اطلاع نہ دے دے ، کیا فرق پڑتا ہے ؟ ہم سبھی جب زندگی کی اذیتوں کے شکنجے میں جکڑے جاتے ہیں تو مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں ماریں ، فریاد کریں ، ہمارے جذبات و احساسات کے اظہار کا بس یہی ایک وسیلہ ہے ، یہی ہمارے خون کے چھوٹے چھوٹے لوتھڑے ہیں جو جگر سے گرتے ہیں ، یہی ہماری روح کے پارے ہیں جو اس صورت میں جلوہ نما ہوتے ہیں ۔ مطلب یہ کہ ہم اپنے مصائب و آلام اور خوشیوں مسرتوں کا اظہار جس طور بھی ممکن ہو کر ڈالیں ۔ تاہم غم کا مارا دوسروں کے غم کو بہتر سمجھتا ہے ۔

جب میں یہ سوچتا ہوں کہ چار سال سے میں چاندنی کو سوراخوں میں سے دیکھ رہا ہوں ، میں نے مہتاب کا نظارہ آہنی سلاخوں میں سے کیا ہے ، جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہ چور جو ہر پل اور ہر خراٹے میں فضا کو کسی حد تک بدبودار کر دیتا ہے ، ایران کے مزدوروں اور محنت کشوں کے دس ہزار ، بیس ہزار یا پچاس ہزار یا ایک لاکھ تومان چرانے کے باوجود چند روز تک سزا پوری کر کے یا معافی ملنے پر یہاں سے چلا جائے گا ، اور مجھے ابھی مزید کئی سال تک اس سوراخ دار چاندنی کو دیکھنا ہو گا ، اسی خرخر اور بدبو سے ، چابیوں کی اسی کھنک اور فل بوٹوں کے اسی "کھڑاک" سے میرا سابقہ رہے گا ، بلکہ بعض بدترین مواقع پر تو چابک کھانا اور گالیاں بھی سننا پڑیں گی اور اس کے بعد شہر بدر بھی ہونا پڑے گا ، تو یہ ایک قدرتی امر ہے کہ اس وقت مرتضیٰ کے "وحشت آور رقص" کی تشریح کی تاثیر ، ہر چند اس کے کلمات ٹوٹے پھوٹے اور غیر شاعرانہ سہی ، مجھ میں زیادہ ہو گی ، اور ایسے موقع پر میرے تند و شدید احساسات اور میری آتشیں خُو تمام دنیا ، کم از کم میری دنیا کو مُردوں کے ڈھانچوں کی صورت میں رقص کرتے ہوئے دیکھے گی ۔ آہ ! میں مُردوں سے عقیدت رکھتا ہوں ، مجھے ان سے محبت ہے ۔ میں نے یونہی یہ موضوعات چھیڑ دیئے ۔ مرتضیٰ مجھ سے بہتر بیان کرتا ہے :

میں مدرسے سے نکل کر تانگے میں سوار ہوا اور کوئی پندرہ منٹوں میں ان کے گھر پہنچ گیا ۔ ان کا گھر نادری روڈ پر تھا ، صحن میں داخل ہوں تو بائیں جانب سیڑھیاں دالان پر جا کر ختم ہوتی تھیں اور وہاں سے ایک ایسے کمرے میں داخل ہونا پڑتا جس کی کھڑکیاں دالان کی طرف کھلتی تھیں ۔ خادمہ گھر والوں کو میری آمد کی اطلاع دیئے بغیر مجھے ایک چھوٹے کمرے میں لے گئی ۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑا گول میز رکھا تھا جس پر کھانا چُنا ہوا تھا ۔ میز پر ایک مرد ، ایک جوان

لڑکی اور میرا واقف رجبوف بیٹھے ہوئے تھے ۔ میرے داخل ہوتے ہی رجبوف بول اٹھا :

لیجیے ! یہ ہیں مسٹر مرتضیٰ ۔ ف ۔ آئیے آئیے اندر تشریف لے آئیے ۔

اس انداز کی پذیرائی میری توقع کے سراسر برعکس تھی ۔ میرا خیال تھا کہ میں کسی ایرانی کے گھر داخل ہو رہا ہوں ، وہ مجھے ڈرائینگ روم میں لے جائیں گے اور پھر کوئی شخص آکر مجھ سے باتیں کرنے لگے گا ، یا یہ کہ باہر مردانے میں مجھے انتظار کرنا ہو گا ۔ بہر حال مجھے یہ قطعاً خیال نہ تھا کہ مجھے سیدھا کھانے کی میز پر لے جایا جائے گا ۔ مارگریٹا کے والد کے چہرے سے یہ ٹپک رہا تھا کہ ایسے موقع پر اسے میری آمد کی کوئی خبر نہ تھی ؛ یعنی شاید وہ بھول بیٹھا تھا کہ اس قسم کے آدمی کے ساتھ یہ طے پا چکا ہے کہ وہ یہاں آئے گا اور اس کی بیٹی کو پڑھائے گا ۔ وہ جیسے سوچ رہا تھا کہ میں کون ہوں ! وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے ۔ اسی اثنا میں مارگریٹا کی کھنکتی آواز بلند ہوئی جیسے کسی نے دیپک کی تان اڑائی ہو :

ابا جان ! یہ وہی صاحب ہیں جو مجھ سے روسی زبان سیکھیں گے ۔

مارگریٹا نے چند سیکنڈ مجھ پر نگاہ ڈالی ، پھر اپنی جگہ سے اٹھی اور ہنس دی ۔ اس کی ہنسی اس سورج کی مانند تھی جو بادلوں سے سر نکال رہا ہو اور یوں دنیا کو شاد و خرم کر دے ۔ اس کے بالوں کے چند تار ، زر اندود ریشم کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے ۔ اس کا پتلی کمر والا قد کاٹھ جو کمر پر بندھی چوڑی پٹی کی وجہ سے لمبا نظر آ رہا تھا ، متناسب اعضا کی صورت میں ایک معجزہ تھا ۔ کیا سحر زا ہنسی تھی ، میرا تمسخر نہیں اڑا رہی تھی ، نہیں ، اس نے میرا مذاق نہیں اڑایا ۔ وہ میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لے رہی تھی ۔ میں نے چمڑے کے دستانے اور بیگ ایک ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے ۔ اپنی ٹوپی اور اوورکوٹ میں نے باہر دالان میں ایک بینچ پر رکھ چھوڑا تھا ۔ میرا دایاں ہاتھ شیک ہینڈ کے لئے خالی تھا اور مارگریٹا کا یوں کھلکھلا اٹھنا شاید میرے اس زرد رنگ کے بڑے سے چرمی بیگ کی ہیئت کذائی کے باعث تھا جس کی اسے توقع نہ تھی ۔

میں اسے زیادہ دیکھنے سے بھی ڈر رہا تھا ۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کی آتشِ حسن مجھے جلا نہ ڈالے ۔ میں نے اپنی نظریں دیوار پر لگی ہوئی ایک بڑی سی تصویر پر گاڑ رکھی تھیں ، اس لئے کہ میں شرم محسوس کر رہا اور سوچ رہا تھا کہ کس طرح خود کو گومگو کی اس کیفیت سے نکالوں جس میں بُری طرح پھنس چکا ہوں ۔

صرف یہ جملہ مجھے سوجھا :

معاف کیجئیے ۔ میں یقیناً بے وقت آیا ہوں ۔ میں چلتا ہوں ، کسی دوسرے وقت آ جاؤں گا ، معاف کیجئیے ۔

سردیوں کے آخری دن تھے ۔ میز پر مالٹے رکھے ہوئے تھے ۔ میں نے اتنا کہا اور انتظار نہ کیا ۔

فقط اسوقت ، جب میں سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا ۔ میں نے مارگریٹا کے باپ کو یہ کہتے سنا :

بیٹھیئے ، تشریف رکھیئے ، کوئی بات نہیں ، آپ تشریف تو رکھیئے ، کم از کم ایک مالٹا تو کھاتے جائیے ۔

میں صحن میں داخل ہوا ۔ خادمہ دروازے کے قریب کھڑی تھی ۔ اس نے دروازہ کھولا تاکہ میں باہر نکل سکوں ۔ اتنے میں مارگریٹا بجلی کی تیزی سے نیچے دوڑی اور دروازے کے قریب اس نے مجھے آلیا ، بولی :

آپ کب تشریف لائیں گے ، ہم ذرا باتیں کریں گے ؟

اس کی آواز میں بلاکی موہ لینے والی کھنک تھی ۔ اس کی گھنی دراز زلفیں کندھوں تک لٹک رہی تھیں اور کانوں کے دو طرف سے دو پیچ در پیچ چوٹیوں کی مانند بل کھا رہی تھیں ۔ اس کی گہری آنکھیں بلی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں ۔ میں نے زندگی بھر ایسی حسین لڑکی نہ دیکھی تھی ۔ اس کا منہ گل لالہ کی بند کلی کے منہ کی صورت تھا جو ابھی ابھی کھلی ہو ۔ اس نے خوشبو نہیں لگا رکھی تھی ، کوئی میک اپ نہ کیا ہوا تھا ، اس کے ہونٹ سرخ ، گال بڑے تروتازہ ۔ اس کی جلد مخمل کی طرح تھی اور جو خوشبو اس سے ٹپک رہی تھی اس نے مجھے لٹو کر دیا تھا ۔ میں پسینے میں نہا گیا ۔ میری زبان جیسے گنگ ہو گئی ، میں مبہوت ہو کر رہ گیا :

میں روسی زبان کا سبق لینے آیا تھا ۔

مجھے معلوم ہے پھر کب آئیں گے ، ذرا باتیں کریں گے ۔

میں آیا تھا تاکہ وقت طے کر لیں ۔

تو پھر بھاگ کیوں رہے ہیں ۔ آئیے اوپر چل کر طے کر لیتے ہیں ۔

میں سرخ ہو گیا ۔ وہ سمجھ گئی کہ میں اب دوبارہ اوپر جانے میں شرم محسوس کر رہا ہوں ، بولی :

آپ کو فرصت کب ہوتی ہے ۔

مجھے فرصت ہی فرصت ہے ۔

اس کی لے بھری آواز ، موسیقی کی مانند مجھ میں افسانوی دنیاؤں کو جلوہ گر کرتی رہی ۔

آج شب سات بجے تشریف لے آئیے ۔

اس کے بعد اس نے میرا ہاتھ پکڑا ، زور سے ہنسی اور میں گھر سے باہر نکل گیا ۔ جب میں مدہوشی کے عالم میں گلی میں داخل ہوا تو میں اپنا انگوٹھا اور انگشت شہادت باہم مَل کر یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ آیا اس کی شفاف اور نازک ہتھیلی کی گرمی ابھی تک محسوس کر رہا ہوں یا نہیں ؟ میں دروازہ کے قریب اس منظر کو بھلا نہ پاؤں گا ، کبھی فراموش نہ ہو گا ، شاید چند روز مزید ـــــ

مرتضیٰ جب بھی مارگریٹا کی شخصیت کی بات کرتا ، خود کو جیل اور وارڈ نمبر ۶ میں نہ پاتا ، مجھے آن دیکھا سمجھ لیتا ، جیسے اپنی خاطر وہ پرانی یادوں کو دہرا رہا ہو ۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ جب وہ مارگریٹا کے بارے میں باتیں کرتا تو واقعی اس کی زرانداز زلفوں کا لمس محسوس کر رہا ہوتا ۔ کبھی کبھی تو وہ چند منٹوں تک کوئی بات نہ کرتا ۔ اگر اس وقت وہ ابھی خود کو عالم خیال میں پاتا تو اس طرح کھویا کھویا رہتا یا پھر یہ کہہ بول اٹھتا ، کیا فائدہ ؟ زندگی کس قدر شیریں اور کس قدر

تلخ ہے ، کس قدر تلخ ہے ۔ ہوتی رہے ، میں پھر کسی وقت تمہیں سناؤں گا ۔

چنانچہ میں موقعہ کی تلاش میں رہتا ۔

سردیوں میں ہمیں ساڑھے چار بجے کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا ۔ ہمیں روزانہ پانچ گھنٹے باہر ہواخوری کی اجازت تھی ۔ وہاں ، اس حالت میں کوئی جوئیں مار رہا ہے ۔ کسی نے اپنا جانگیا کھڑکی پر لٹکا رکھا ہے تو کوئی انگڑائیاں لے رہا ہے ۔ کسی نے کوئی دھن چھیڑ رکھی ہے تو کوئی اپنی جرابوں کو پیوند لگا رہا ہے ۔ میں جرات نہیں کرتا تھا کہ اس سے کہوں وہ اپنے بہترین احساسات سے مجھے آگاہ کرے اور میں منتظر رہتا کہ پھر ہواخوری کے دوران میں ، اگر ہماری ٹوہ نہ لگائی جاتی ہو ، اگر قیدی کا سازو سامان بلائے جانے کے نتیجے میں اٹھنے والی گرد اور مٹی اجازت دے دے ، اگر ایک نیا پہرے دار چاہئے کے ایک سیٹ کے لئے ہماری ناک کا بال نہ بن جائے تو ایسا کوئی موقع ہاتھ لگ جائے اور اس میں بھی اس کا حوصلہ ہو کہ وہ مجھے اپنی بدبختی کی داستان سنا سکے ۔

اس شب میں ، بجے وہاں پہنچ گیا ۔ اس روز خدا معلوم میں کس طرح پانچ بجے گھر پہنچ گیا حالانکہ مجھے کئی کام تھے ۔ گھر پہنچ کر میں نے کسی دعوت میں جانے والے بچوں کی طرح خود کو تیار کیا ۔ ہر چند میں نے صبح شیو کر لی تھی ۔ لیکن سہ پہر کو ایک مرتبہ پھر کر لی ۔ عمدہ سلا ہوا خاکی لباس زیب تن کیا ۔ خاکی رنگ کی سرخ دھبوں والی ٹائی لگائی ۔ اس وقت کے فیشن کے مطابق چُست اوورکوٹ پہنا اور بگھی میں سوار ہو گیا ۔ سارے راستے میرے دل کی دھڑکن تیز رہی ۔ ہزاروں قسم کے حسین خیالات مجھے گھیرے رہے ۔ میں ایک روشن مستقبل اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا ، لیکن خود مجھے اس کا یقین نہیں آ رہا تھا ۔ کبھی تو میں مارگریٹا کے جسم کی دل کشی اور جلد کی لطافت میں کھو جاتا ، اس وقت کہتا : نہیں غیر ممکن ہے ، کبھی اس کی ہنسی یاد آنے اور اس کی گونج دار آواز مجھے سنائی دینے لگتی ، اس وقت میں کہتا 'وہ میرا مذاق اڑا رہی تھی' وہ کس لئے اس بات پر مصر تھی کہ میں آج ہی وہاں پہنچوں ؟ کس لئے ؟ اس خاطر کہ وہ مجھ سے فرانسیسی زبان سیکھنا چاہتی ہے ؟ خود مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں ، بہر حال ان تمام خیالات میں ایک خاص چاشنی تھی ۔

سات بجے سے کچھ منٹ پہلے میں دروازے کے قریب بگھی سے اترا ۔ اسی وقت میرا دل دھک دھک کرنے لگا ۔ میں نے سوچا کہ وہ لوگ یقیناً یہ خیال کریں گے کہ محض ان کے پاس آنے کی خاطر میں نے خود کو یوں "ٹیپ ٹاپ" کیا ہے ۔ رومال سے میں نے چہرے کا پوڈر صاف کیا ۔ بالوں کو ہاتھ سے کسی قدر پریشان کر دیا تاکہ یہ معلوم نہ ہو کہ میں نے ابھی ابھی کنگھی کی ہے ۔ اچھی بات نہ ہو گی کہ وہ جانیں کہ میں نے ان سے ملاقات کی خاطر خود کو خاص طور پر تیار کیا ہے ۔ میں چاہتا تھا کہ جوتوں پر بھی ذرا مٹی مل لوں کہ ایک دم کسی گھر کا دروازہ کھلا ۔ اس خیال سے کہ یہ ان کا گھر ہے ، میرا رنگ اڑ گیا ۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ ہمسایوں کے گھر کا دروازہ تھا ۔ میں نے بیل دی ۔ ان کی نوکرانی نے دروازہ کھولا ۔ جیسے ہی میں صحن میں داخل ہوا ۔ اس کا باپ جو دالان میں کھڑا تھا ۔ سیڑھیوں سے نیچے اترا اور مجھ سے

بولا :

آئیے اوپر تشریف لائیے ، میری بیٹی سے کچھ باتیں کیجیئے ۔ ابھی شام کا کھانا لگنے والا ہے ، اس کا لہجہ تُرکی اور گھمبیر تھا ۔ میں نے کہا :

شکریہ ! میں نے شام کا کھانا کھا لیا ہے ۔

آئیے اوپر تشریف لائیے ۔ ہمارے گھر جو بھی آتا ہے وہ شام کا کھانا یہاں ضرور کھاتا ہے ۔ آپ کو شام کا کھانا کھا کر نہ آنا چاہئیے تھا ۔ یہ کہکر اس نے مجھے آگے بھیج دیا ۔ میں کمرے میں داخل ہوا ۔ بڑی میز اس کے وسط میں تھی ، چھت سے لٹکے ہوئے بجلی کے قمقموں کی روشنی سیدھی میز پر پڑ رہی تھی ۔ گھنگروؤں اور پھندنوں وغیرہ سے آراستہ گہرے عنابی رنگ کا شیڈ اسے احاطہ کیے ہوئے تھا ۔ کمرے میں روشنی مدہم تھی ۔ صحن کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں پر دبیز اور وزنی پردے لٹکائے گئے تھے ، بائیں کونے میں ، دالان سے دور ، ایک بڑا سا پیانو دھرا تھا اور اس کے ایک جانب گراموفون اور دوسری جانب ریڈیو سیٹ پڑا تھا ۔

مارگریٹا نے آرائش دار بڑے کالر والا ہلکے نیلے رنگ کا لباس جس کے وسط میں ، اس کے سینے کے اوپر تتلی کی شکل کی ایک عنابی پٹی گرہ گیر تھی ، پہن رکھا تھا ۔ معلوم نہیں کہ یہ بجلی کی روشنی کے سبب تھا ، یا عنابی شیڈ کا اثر تھا ، یا آتش دان کی سرخ تپش کا یا وزنی پردوں کا ، یا پیانو کے سیاہ رنگ کا کہ مجھے مارگریٹا کا رنگ اڑا اڑا سا لگا ۔ یہ نہیں کہ اس کے گال سرخ نہ تھے ، بلکہ میری نظروں میں تو یہ مارگریٹا جیسے دوپہر والی مارگریٹا سے ہزار مرتبہ حسین تر تھی ۔

پیانو کے اس طرف مارفینکا کھڑی تھی ۔ وہ مارگریٹا کی سہیلی تھی ۔ یہ دونوں روسی زبان میں بات چیت کر رہی تھیں ۔ مارفینکا کسی روسی کی بیٹی تھی جو ایران میں پیدا ہوا تھا ۔ اس کا باپ مر چکا تھا ۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ رہ رہی تھی جس نے ایک ایرانی سے شادی کر رکھی تھی ۔

جس وقت میں کمرے میں داخل ہوا مارگریٹا نے پیانو کا ایک موسیقی نوٹ کرسی سے اٹھا کر پیانو کے ایک طرف رکھی ہوئی چھوٹی میز پر رکھ دیا ۔ "خوب ! آپ بروقت آئے ۔ میری سہیلی کو نہیں جانتے ؟ مِس مارفینکا ۔۔۔۔"

پہلے خود اس نے میرا ہاتھ دبایا ، بعد میں میں نے مارفینکا سے ہاتھ ملایا ۔ اسی وقت مارفینکا خدا حافظ کہہ کر چل دی اور اب میں اور مارگریٹا کمرے میں تنہا رہ گئے ۔

پہلے ہم ڈنر کریں گے ، اس کے بعد اپنے کام کے بارے میں گفتگو کریں گے ۔

میں ڈنر کر چکا ہوں ۔

پھر کیا ہوا ، تھوڑا سا ہمارا ہاتھ بٹا دیں ۔ ڈنر پر مسٹر رجبوف کی آمد کا بھی انتظار ہے ۔ پہلے وہ کچھ باتیں کر لیتی پھر بڑی سادگی سے مجھ پر نگاہ ڈالتی اور میرے جواب کی منتظر رہتی ۔

ہمیشہ دیر سے آتا ہے ۔ خیر !

وہ بات کرتی پھر ہنس دیتی ۔ اس کی آواز میں ہی دراصل ہنسی تھی ۔ ساز کے تاروں سے نکلنے والے سروں کی مانند دیر تک ہوا میں مرتعش رہتی ۔ وہ بات کرتی جاتی اور میرے جواب کا قطعاً انتظار نہ کرتی ۔ "آپ اس قدر شرمیلے کیوں ہیں ؟ ابا جان بڑے پیارے آدمی ہیں ، آپ ان کے ساتھ دوستی کر سکتے ہیں ۔ ان کی عمر پچاس سے زیادہ نہیں ہے لیکن ان کی روح جوان ہے ۔ بیچارے ہمیشہ بیمار ہی رہتے ہیں اور اس سبب کچھ زود رنج ہیں ۔ مجھے ان کے ہاتھ میں موٹا عصا اچھا نہیں لگتا ۔ آپ کی عمر کیا ہے ؟

وہ میرے جواب کی منتظر تھی اور مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ اسے کس طور خطاب کروں ۔ اگر اس کا نام ایرانی ہوتا تو بآسانی پکارا جا سکتا تھا ۔ اختر خانم اور پروانہ خانم وغیرہ ؛ لیکن مارگریٹا خانم کانوں پر گراں گزر رہا تھا پھر مِس کا لفظ بھی کچھ فِٹ نہیں بیٹھ رہا تھا ، اس لئے کہ ہم فارسی میں گفتگو کر رہے تھے ۔ خیر ! پھر بھی گزارا ہو رہا تھا ۔ میں پچیس برس کا ہوں ۔ ماد ۔ ۔ ۔ ماد موازل (مِس)

مجھے ماد موازل نہ کہیئے ، یہ تو بہت رسمی سا لفظ ہے ، ہاں جس وقت میں نے فرانسیسی سیکھ لی ، میں آپ کے ساتھ فرانسیسی میں بات کیا کروں گی ، پھر آپ مجھے made moiselle کہہ سکتے ہیں ۔ میں نے ٹھیک تلفظ کیا ہے نا ؟ میں نے تھوڑی سے فرانسیسی خود ہی پڑھی ہے ، لیکن اب آپ مجھے اچھی طرح سکھائیں گے ۔ مجھے روسی زبان اچھی طرح آتی ہے ۔ میری والدہ روسی تھی ، یعنی اب بھی ہے ۔

پھر وہ کمرے کے ایک کونے کی طرف گئی ، میز کی دراز سے ایک البم نکال لائی اور بولی : یہ دیکھیئے ۔ میں آپ کو اس کی تصویر دکھاتی ہوں ، ذرا دیکھیئے کس قدر خوبصورت ہے ۔ معلوم نہیں وہ اب کہاں ہے ۔ ایران میں نہیں ہے ، بہر حال مجھے اس سے بہت محبت ہے ۔ میرے سونے کے کمرے میں اس کی بڑی سی تصویر ہے ، افسوس کہ میں اس کے پاس نہیں ہوں ۔

میں نے تصویر اس سے لے لی اور اسے دیکھنے لگا ۔ وہ صحیح کہہ رہی تھی ۔ بہت خوبصورت عورت تھی ۔ لیکن میں کچھ ڈر سا گیا کہ کہیں مجھے اپنے سونے کا کمرہ دکھانے نہ لے جائے ۔ میں نے کہا :۔

اس تصویر سے بھی ظاہر ہے کہ وہ ایک بہت خوبصورت عورت ہے ۔

اب بھی کبھی کبھار وہ مجھے خط لکھتی رہتی ہے ۔ اسے میرے باپ سے بڑی محبت رہی ہے ۔ ہمیشہ مجھے تلقین کرتی ہے کہ میں باپ کا دھیان رکھوں ۔

میرے جی میں آئی کہ اس سے پوچھوں کہ ان میں جدائی کا سبب کیا ہے ، لیکن مجھے حوصلہ نہ ہوا ۔ مارگریٹا نے اپنی بات جاری رکھی ۔

تاہم آپ یہ نہ سمجھیئے گا کہ مجھے روسی زبان بھول گئی ہے ۔ میں ہر روز دو ایک گھنٹے روسی میں بات چیت کرتی ہوں ۔

میں نے پوچھا کس سے !

مارفینکا سے ۔ ہم دونوں گہری سہیلیاں ہیں ۔ ہم مل کر ساز بجاتی ہیں ۔ پیانو ہم چار ہاتھوں سے بجاتی ہیں ۔ اگر آپ پسند کریں تو ایک شام میں اسے یہاں مدعو کروں اور باہم مل کر آپ کو میوزک سنائیں ۔ بہت ہی اچھی لڑکی ہے ۔

وہ بات کرتی جاتی اور ہنستی جاتی اور کبھی میری طرف بھی دیکھتی ۔ کبھی کوئی بات میرے بارے میں کہتی اور مجھ سے پوچھتی :

آپ کتاب پڑھنا پسند کرتے ہیں یا یہ کہ ، روسی ادیبوں میں سے آپ کس کو زیادہ پسند کرتے ہیں یا یہ کہ ، میں تو پشکن کی عاشق ہوں ۔ انسانی ضروریات اور دکھوں کو دوسروں کی نسبت اس نے زیادہ سمجھا ہے ۔

مجھے اس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ یہ لڑکی بایں حسن و زیبائی، دکھوں دردوں اور حاجتوں کا نام کیوں لے رہی ہے ۔ وہ پھر بات کرتی اور ہنستی جاتی ، جیسے سوچے سمجھے بغیر بول رہی ہو ۔

آپ کو گرمی تو نہیں لگ رہی ۔ اگر کہیں تو ہیٹر کی لو ذرا کم کر دوں ؟

مجھے گرمی نہیں لگ رہی تھی ۔

یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ کو میوزک پسند ہے یا نہیں ؟

بلاشبہ مجھے میوزک سے دلچسپی تھی ۔

اگر آپ کہیں تو میں آپ کو سناتی ہوں ، لیکن ٹھہر جائیں ، شام کے کھانے کے بعد ۔ رجبوف کو تو میوزک پسند ہی نہیں ۔ میرے باپ کے ساتھ شطرنج کھیلتا رہتا ہے ۔ اگر اس نے شراب نہ پی رکھی تو پھر میں آپ کو پیانو سناؤں گی ۔ آپ کس قسم کا میوزک پسند کرتے ہیں ؟

بہر حال وہ کبھی کبھی تو میرے جواب کا بھی انتظار نہ کرتی ، ہنستی جاتی اور بولتی جاتی ۔

میں اس سحر میں ڈوب چکا تھا جو اس کی شعاعوں کی صورت میں مجھ پر پڑ رہا تھا ۔ میں اس کے نازک اور پتلے ہونٹوں کی جنبش کا نظارہ کر رہا تھا ۔ میں اس سرمستی و زیبائی کی فراوانی میں غرق تھا ۔ میں اس کے الفاظ کی پُر طلاحت لے کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا ۔ میں اس کی جلد سے ٹپکنے والی گرمی و نرمی کو سونگھ رہا تھا ۔ میں حسن و دل کشی سے لذت اندوز ہو رہا تھا ۔ خود میں سرمستی ، فراوانی ، وارفتگی اور توڑ پھوڑ محسوس کر رہا تھا ۔

میں ایک نئی دنیا میں وارد ہو چکا تھا ، سب کی دنیا سے باہر ، اپنی دنیا سے باہر ، روزانہ کی اور ایک ہی ڈگر کی زندگی سے باہر ۔ اس دنیا میں امید و آرزو کا وجود تھا ۔ اس دنیا میں انسان کو یہ علم نہیں تھا کہ کل کیا ہونے والا ہے ، اس دنیا میں آدمی حسرت سے دوچار تھا ، اس دنیا میں آدمی اس امید پر دکھ سہتا تھا کہ اس کے بعد لذت ہے ۔ مارگریٹا ہنستی کیوں تھی ؟ میرا تمسخر اڑاتی تھی ؟ شاید تمسخر نہیں ۔ شاید میں اسے اچھا لگا ہوں ۔ شاید ہم دونوں باہم دوست بن

جائیں گے ؛ شاید کسی دن اسے مجھ سے تھوڑی سی ، ذرا سی محبت ہو جائے گی ۔ اس وقت میری ساری زندگی اس کا مال ، میری ساری ہستی اس پر فدا ۔ کس قدر پیاری باتیں کرتی تھی ۔ مجھ میں حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ اس سے کوئی بات پوچھ لوں ، لیکن اپنے دل میں یہ سوچتا تھا کہ "مارگریٹا تو میرے بارے میں کیا سوچتی ہے؟" زندگی کا سارا حسن اس لاعلمی میں ہے ، اس امید میں کہ کل بہتر ہو جائے گا ، دنیا پُر سکون اور زیبا تر ہو جائے گی ۔

اسی اثنا میں اس کا باپ آگیا ۔

مسٹر ف ؛ کوئی بات نہیں کر رہے ، ساری باتیں تو میں نے ہی کی ہیں ۔

اچھا ! تو ماری ! تو نے زیادہ باتیں کیوں کیں ، تو ذرا رکتی تو مسٹر ف بھی کوئی بات کرتے ۔

پھر اس کا باپ مجھ سے مخاطب ہوا ۔

آپ سکول ماسٹر ہیں ؟

جی ۔

کب سے پڑھا رہے ہیں ؟

اور ہم دونوں نے باہم اس طرح بات کی جس طرح دو آدمی باہم گفتگو کرتے ہیں ۔ اتنے میں رجبوف آگیا اور ہم نے کھانے پر اور بعد میں بھی باتیں کیں ۔ میرے کام کے بارے میں ، میرے مستقبل اور دنیا کی صورت حال کے متعلق ، ان دنوں تازہ تازہ عہد نامہ میونخ طے پایا تھا ۔ جنگ کے بارے میں ، اور یہ کہ جرمنی نے ایک ایسی چیز ایجاد کی ہے کہ اگر ساری دنیا بھی اس کے خلاف متحد ہو جائے وہ سب کو مغلوب کر لے گا، اور یہ کہ جنگ نہ ہو گی۔

رجبوف خاص طور پر اس بات کو اہمیت دے رہا تھا کہ روسی حکومت کو بہر صورت تلپٹ ہو جانا چاہیئے ۔ انہوں (روسیوں) نے اس سے کارخانے کیوں چھین لئے ہیں ۔ بادکوبہ میں واقع اس کے پانچ گھر کیوں اسے واپس نہیں کیے جا رہے ؟ انہوں نے اس سے گھر لے لئے ہیں اور انہیں مدرسہ بنا لیا ہے ، اس کے باپ کا باغ آج بچوں کی تربیت گاہ میں بدل دیا ہے ، جب تک دنیا ، دنیا ہے مالک اور نوکر ، امیر اور غریب رہے ہیں اور رہیں گے ۔ اس سے ہٹ کر اور سب سے بد تر یہ کہ تجارت نہیں رہی ۔ ایک ملک تجارت کے بغیر ، اس کا فائدہ ۔ کسی ملک کی خوشحالی و ترقی اس کے تاجروں کی امارت سے وابستہ ہے ۔ روس کا کوئی ایک تاجر مجھے دکھائیں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں ۔

اس موقع پر مارگریٹا نے مداخلت کی :

ابو ! آپ لوگ سیاست پر کس قدر باتیں کر رہے ہیں ؟ میں ذرا مسٹر ف کو پیانو سنانا چاہتی تھی ۔ اگر آپ سننا نہیں چاہتے تو شطرنج کھیل لیجئیے ۔

ہم ساتھ والے کمرے میں چلے گئے ، کیونکہ پیانو وہاں پڑا تھا ، وہ کمرہ جہاں ہم نے کھانا کھایا ، یہ وہی کمرہ تھا جہاں میں نے مارگریٹا کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا ۔ بہر حال ان دونوں کمروں کے درمیان والا دروازہ کچھ اس طرح کھلا تھا کہ اگر کوئی

میز پر کھڑا ہو تو وہ کھانے کے کمرے میں موجود لوگوں سے بآسانی بات کر سکتا تھا ۔ مارگریتا نے مجھ سے پوچھا :

آپ کو کیا پسند ہے ہلکا پھلکا میوزک یا کلاسیکی ؟

مجھے یہ کہتے ہوئے کچھ شرم سی محسوس ہوئی کہ میں ان دونوں میں فرق سے واقف نہیں ہوں ، اور میرا خیال تھا کہ مارگریتا حسب معمول جواب کا انتظار نہ کرے گی ، لیکن وہ کہ دھنوں کے کتابچے کی ورق گردانی کر رہی تھی ، ذرا رک کر بولی :

آخر آپ کچھ تو بتائیے نا ۔

جو آپ کا دل چاہے ۔

شاید آپ کو میوزک پسند نہیں ہے ۔

کیوں نہیں ، بہت ــــــ

اس کا باپ بولا : کچھ اچھی سی دھن چھیڑو : خوشی کی غم انگیز نہ ہو ۔

رجبوف بولا : اگر تم پسند کرو تو Danse macabre کی دھن بجاؤ ۔ میں بھاگ جاتا ہوں ۔

مارگریتا نے پوچھا :

واقعی مسٹر ف ، macabre یعنی چہ ؟

میں سٹپٹا گیا ۔ گویا وہ اپنی ہنسی کے ساتھ مجھے آزمانا چاہتی ہے ۔ macabre یعنی شوم ، یعنی وحشتناک ، یعنی ــــ یعنی ایسی حالت جو مُردہ خانوں میں ، قبرستانوں میں حکم فرما ہے ، میں اس لفظ کا کوئی اچھا سا متبادل پیش نہیں کر سکتا ۔

مارگریتا بولی : ہوہ یہ تو آدمی کو خوفزدہ کر دیتی ہے ۔ اس کا میوزک اسی طور ہے ۔

رجبوف بولا : میں نے بھی تو یہی بات کی ہے ۔

مارگریتا نے درشتی سے جواب دیا ۔ نہیں تم نے تو اس طرح نہیں بتایا ۔ تم نے تو کہا ایک طرح کی ، اور پھر اپنے ہاتھوں سے بتایا جسے میں نہ سمجھی ۔

رجبوف کی کھوپڑی میں تو جیسے چلو بھر خون دوڑ گیا ۔ ظاہر ہے کہ میری موجودگی میں اسے اس قسم کے حملے کی توقع نہ تھی ۔ مجھ پر یہ کھل گیا کہ مارگریتا اسے پسند نہیں کرتی ۔ اس حقیقت کے انکشاف سے میرے لئے جیسے تسلی کا سامان ہو گیا ۔

اب مارگریتا پیانو کے قریب گئی اور کافی دیر تک اسے بجاتی رہی ۔ ایک خوشگوار اور محبت بھری حالت مجھ پر طاری ہو گئی ۔ میرا دل چاہتا تھا کہ ساری دنیا میری مانند مسرت و شادمانی سے سرشار ہو جائے ، اور ان لطیف ہاتھوں سے لطف اندوز ہو جو اس وقار کے ساتھ اس پُراسرار ساز سے یہ سحر انگیں دھنیں نکال رہے ہیں ۔ میرا دل چاہتا تھا کہ

میں مارگریٹا کی آنکھوں میں اس سے مخفی اسرار پڑھ لیتا ۔ وہ کیا بجا رہی تھی اس کی تو مجھے خبر نہیں ، ہاں اتنا ضرور ہے کہ دھنیں مجھے جلائے جا رہی تھیں ، میرے دل میں شعلے اٹھا رہی تھیں ۔ میرا خون جوش مار رہا تھا اور میں خود کو دنیا کا خوش بخت ترین انسان سمجھ رہا تھا ۔

میں اس رات وہاں کتنی دیر رہا ، کچھ یاد نہیں ۔ بہر حال خاصا وقت وہاں گزرا ۔ رجبوف ، مارگریٹا کے والد کے ساتھ ملحقہ کمرے میں بیٹھا تھا ۔ آخر جب وہ مجھے الوداع کہنے آیا تو میں سمجھا کہ اب مجھے اٹھنا چاہئیے ۔

طے یہ پایا کہ میں ہفتے میں چھ مرتبہ شام کے وقت وہاں جایا کروں گا ۔ ایک شام میں روسی زبان سیکھا کروں گا اور ایک شام وہ مجھ سے فرانسیسی زبان سیکھا کرے گی ۔ مارگریٹا کے ساتھ یہ میری پہلی ملاقات تھی ، اس کے بعد سے تو میں ہمیشہ ، یعنی ہر شب دس دس ، گیارہ گیارہ بجے تک اور بعض شبہائے جمعہ اس کے ساتھ رہا ۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اب میری زندگی کو ایک نیا روپ مل گیا تھا ۔ میری ساری سوچ صرف یہ ہوتی کہ : میں کونسا ایسا کام یا بات کروں جو مارگریٹا کو پسند آئے ۔ ایک مرتبہ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے ہلکا نیلا رنگ بھلا لگتا ہے ۔ اس کے بعد سے میں صرف ہلکے نیلے رنگ کا لباس پہننے لگا ۔ ایک مرتبہ اس نے مجھ سے کہا ۔ میرے خیال میں تمہارے سیاہ اور گھنگرالے بالوں اور گندمی رنگ کے ساتھ ڈارک براؤن سجے گا ۔ اب میں نے گہرے براؤن رنگ کا لباس پہننا شروع کر دیا ۔ ایک مرتبہ انہی شروع کے دنوں میں ، اس نے میری ٹائی کی بے ترتیب ناٹ کو درست کیا ۔ میں پھر ہمیشہ اس طرف متوجہ رہا ۔

اسے بلند میوزک پسند تھا ، جب کہ میری اس معاملے میں کسی قسم کی تربیت نہ ہوئی تھی ، لیکن میں اپنے ذوق کی تربیت میں مصروف رہا ۔ میں گراموفون ریکارڈ خریدتا رہا ، پھر میں نے موسیقی سے متعلق کتابیں خریدیں اور پڑھیں ، یہاں تک کہ مجھے اس میں بھی باک نہ رہا کہ خود مارگریٹا سے بھی بعض وضاحتیں چاہوں ۔

وہ رجبوف کو پسند نہیں کرتی تھی ۔ اس بنا پر مجھے بھی وہ اب بُرا لگنے لگا تھا ۔ میں جس قدر مارگریٹا کا فریفتہ اور دل باختہ ہوتا چلا گیا اسی قدر مجھے رجبوف سے نفرت ہوتی چلی گئی ۔ ایک شب جب ہمارا سبق ختم ہو گیا تو اس نے مارگریٹا سے درخواست کی کہ وہ ذرا پیانو بجائے ۔ مارگریٹا نے میری طرف دیکھا ۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ رات خوش بخت ترین رات تھی جو میں نے زندگی میں آزادی کے ساتھ بسر کی ۔ اس نگاہ کے معنی نہ تھے ۔ مجھ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ میں تھک چکی ہوں ، لیکن اگر تو چاہے تو میں تیار ہوں ۔ محض تیری خاطر ، اس لئے کہ مجھے تجھ سے محبت ہے ، پیانو بجاتی ہوں اور اگر تو نہ چاہے تو میں یہاں تک تیار ہوں کہ اس شرابی رجبوف کی درخواست رد کر دوں ۔ نہیں ، معاملہ یوں نہ تھا ۔ میں نے اس کی نگاہ سے ایسا اخذ کیا ۔ آہ ۔ نہیں ، یہ مالیخولیا تھا جس میں میں گرفتار تھا ۔ میرا خیال تھا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں ۔ میں نے اس کی ان نگاہوں کے اپنے حسب خواہش معنی لئے ۔ کئی دن اور کئی راتیں میری سوچ انہی نگاہوں کے گرد گھومتی رہی ۔ میں نے بھی اس پر نگاہ ڈالی ، لیکن مجھ میں طاقت نہ تھی ،

میری بھوؤں کے درمیانی اعصاب ایک دم اوپر کو چڑھ گئے ۔ شاید میں یہ تمام دنیا اپنے سامنے تصور کر رہا تھا ۔ مارگریٹا تھک چکی تھی یا یہ کہ اس کی خواہش پوری کرنا نہیں چاہتی تھی ۔ مارگریٹا جواب میں بولی : میں تھک چکی ہوں ۔ تمہارا کہا سر آنکھوں پر ، پھر کسی وقت سنادوں گی ۔

اس نے پھر اصرار کیا ۔ اس حد تک کہ قریب تھا کہ رجبوف رنجیدہ خاطر ہو جاتا ۔ اس موقع پر مارگریٹا کا باپ مداخلت پر مجبور ہوا ۔ اس نے اسے مجبور کیا کہ وہ پیانو بجائے ۔

مجھے گرمی سی آگئی ، لیکن پھر مجھے تعجب ہوا کہ رجبوف کو موسیقی سے ایک دم یہ تعلق خاطر کیسا ہو گیا ۔ تاآنکہ مجھے یہ خیال ہوا کہ اسے واقعی موسیقی کی ضرورت ہے ۔ میں اس وقت کس قدر بیزار ہوا جب میں نے دیکھا کہ اسی لمحے جب مارگریٹا بدحواسی اور غصے کے عالم میں پیانو پر ٹک ٹک انگلیاں چلا رہی تھی ، اس نے ۲۳ مرتبہ جماہی لی ، ۹ مرتبہ منہ پر ہاتھ رکھنا بھول گیا اور تقریباً گیارہ مرتبہ اس کی آنکھوں سے پانی بہ نکلا ۔

جب مارگریٹا پیانو بجا چکی تو بولی : معاف کیجئیے گا ، ٹھیک سے نہیں بجایا ۔

پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئی ۔ شاید آدھ گھنٹہ گزر گیا جب کہیں وہ اپنا اوورکوٹ پہن کر مجھے رخصت کرنے کے لئے آئی ۔ جمعہ کا دن تھا اور اس کی خواہش تھی کہ "مارفینکا" کے ساتھ سینما جائے ۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور ہم اکٹھے گھر سے باہر نکلے ۔ مارفینکا صحن میں کھڑی تھی میں سینما تک ان کے ساتھ گیا۔ راستے میں اس نے مجھ سے کہا۔

آج شب میں نے بے سُرا بجایا ۔ میں جب مجبور ہو جاتی ہوں تو پھر اچھا نہیں بجا سکتی ۔

میں دیکھ رہا تھا کہ آپ نروس ہو رہی ہیں ۔

میں جب مجبور ہو جاتی ہوں تو پھر اچھا نہیں بجا سکتی ۔ اس کے برعکس اگلے جمعے مارفینکا سہ پہر کو ہمارے گھر آ رہی ہے ۔ میں نے اپنے باپ سے بھی کہہ دیا ہے ، اسے کوئی اعتراض نہیں ۔ ہم دونوں مل کر آپ کو پیانو پر **Danse macabre** کی دُھن سنائیں گی ۔

مجھے فوراً یاد آگیا کہ رجبوف پھر وہاں موجود ہو گا اور پھر جماہیاں لے گا اور پھر مجھے نروس کرے گا ۔ میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ اب ایسا کام کروں گا جو اس سے پہلے میں نے نہیں کیا ۔

معاف کیجئیے اس جمعہ میں مصروف ہوں گا ، آنہ سکوں گا ۔

کیونکر ؟ کیسی مصروفیت ہے ؟

مارگریٹا کو حیرانی ہوئی ۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ میں نے اس کی بات نہ مانی ۔

بہت خوب اس سے اگلے جمعے ہی ۔

اگلا جمعہ آئے گا تو اس وقت دیکھ لیں گے ۔

مارگریٹا نے اندازہ لگایا کہ میرا کوئی مقصد ہے ۔ اس روز ہم نے باقی وقت خاموشی میں گزارا ۔ چند روز بعد ہم

پھر تنہا تھے ۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگی :

اس رات آپ نے میری دعوت کیوں رد کر دی ؟

تمہیں نہیں معلوم کیوں ؟ اس شب جب تم پیانو بجانے میں مصروف تھیں ، تم نے رجبوف کا چہرہ نہ دیکھا ۔ تم ان دھنوں سے میری زندگی کو ایک نیا روپ ایک نئی صورت دے رہی ہو ۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسی خوشبختی کو یونہی ہاتھ سے دے دوں ۔ ایک مدت سے میری یہ خواہش تھی کہ تم سے Dansemacabre سنانے کو کہوں ۔

تو پھر میری درخواست کیوں رد کر دی ؟

اس شرط پر کہ مسٹر رجبوف موجود نہ ہو ۔

میرے خیال میں تمہیں حسد آتا ہے ۔

میں تمتما اٹھا اور قریب تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ، لیکن میں نے خود پر قابو پایا ۔ یہ باتیں سبق کے دوران میں ہوئیں ۔ میں چونکہ فرانسیسی میں باتیں کر رہا تھا اس لئے زیادہ حوصلے سے بول رہا تھا ۔ مارگریٹا سے بھی جس قدر ہو سکتا تھا فرانسیسی میں ہی بولتی اور باقی فارسی میں بیان کرتی رہی ۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ مارگریٹا نے اگرچہ مذاق کے طور پر ہی سہی ، میرے احساسات کی طرف اشارہ کیا تھا ۔

نہیں حسد وسد کچھ نہیں ؛ ہاں ! جس وقت تم پیانو بجاتی ہو میں اس کی جماہیاں برداشت نہیں کر سکتا ۔ مطمئن رہئے ہیں بھی اس مردوے سے بیزار ہوں ، لیکن یہ شرط قبول کرنا میرے لئے دشوار ہے ۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ کی خواہش کے مطابق چلوں ۔ ہمارے مابین کچھ ایسے معاملات ہیں جن سے آپ پوری طرح آگاہ نہیں ہیں ۔ ایسا کوئی لازم بھی نہیں ، میں موقع کی تلاش میں ہوں ۔

لیکن یہ موقع ایک مدت تک ہاتھ نہ آیا۔ حتٰی کہ ایک رات جب ہم مارگریٹا اور اس کے باپ کے ساتھ سینما میں تھے، مارفینکا اور اس کی ماں سے ہماری ملاقات ہو گئی ۔ ہم سب کیفے اسٹریا گئے ـــ۔ اس رات پھر میری خواہش کی طرف اشارہ ہوا ۔ میں نے پھر اپنی شرط دہرا دی ۔

سچی بات یہ ہے کہ میری خواہش تھی کہ میں مارگریٹا کو ایک مرتبہ آزاد دیکھوں ۔ میں اسے رجبوف کے اثر اور دباؤ میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا ۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مارگریٹا جب اپنے احساسات میں گرفتار ہوتی ہے تو اس وقت وہ کیسی لگتی ہے ۔ اسی بناء پر یہ جانتے ہوئے کہ "ڈانس مکابر" کی دھن نے اس کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے ، میری یہ خواہش تھی کہ وہ موسیقی کے اس ٹکڑے کے دباؤ میں رہے ۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ حقیقی مارگریٹا محسوس کس طرح کرتی ہے ـــ۔

میں یہاں اپنے عام رویے کے برخلاف مرتضیٰ کی بات کاٹنے پر مجبور ہوا ۔ میں نے اس سے پوچھا :

میں صرف ایک بات اچھی طرح نہیں سمجھ پا رہا ۔ تمہارے اس تمام ذوق و شوق اور شیفتگی کے جواب میں مارگریٹا کس قسم کا ردعمل ، کوئی نشانی ، کوئی بات ، مختصر یہ کہ کسی قسم کا تعلق خاطر یا کوئی بے تعلقی یا دوری ظاہر نہیں کرتی تھی ؟

اس بات میں تو کوئی شبہہ نہیں کہ تجھے اس سے محبت تھی اور کسی نہ کسی صورت تیری تمام حرکات و رفتار سے تیری یہ محبت ظاہر ہوتی تھی ۔

مجھے اس سے محبت تھی اور آج بھی اس سے محبت کرتا ہوں ۔ اسی وجہ سے اب مجھے موت سے لگاؤ ہے ۔ تو یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ میرا مقصد کیا تھا ؟ میں کیا چاہتا تھا ؟ کیا اسے بھی مجھ سے محبت تھی ؟ نہیں : اس نے کبھی اظہار نہ کیا ، کسی قسم کا کوئی اشارہ کنایہ مجھ پہ ظاہر نہ ہونے دیا ۔ ہم آپس میں دو دوستوں کی مانند تھے ، تاہم ہمارا یہ ربط اس سطح سے بلند نہ ہوا ۔ تو جلدی نہ کر ۔ میں تیرے اس سوال کا جواب دوں گا ۔ تم لوگوں کو یہ خبر نہیں ہے کہ آدمی کے لئے کس قدر شیریں ہے کہ جب وہ قربانی دے سکتا ہو ، ایثار و جاں نثاری کر سکتا ہو ۔ کسی خیال کی خاطر ، کسی آرزو ، ایمان اور عقیدے کی خاطر ، ہر اس چیز کی خاطر جو زندگی ہاتھ سے دے دینے کے لائق ہو ۔ میری اس پُر ملال اور بور زندگی کی وقعت ہی کیا تھی ، موت کے لئے آمادہ رہنا زندگی کو پُر لطف بنا دیتا ہے ۔ بہر حال مارگریٹا کا کیا ردعمل تھا ؟ وہ میں ابھی بتاتا ہوں ۔ روسی زبان کے سبق کے دوران میں ، ہم کچھ کچھ روسی ادب کی کتابوں کو بھی دیکھنے لگے تھے ۔ میری یہ خواہش تھی کہ میں پشکین کی "وگینا انگین" کے بعض حصے مارگریٹا سے پڑھوں اور اس نے مان لیا ، ہر چند ان کا سمجھنا میرے لئے مشکل تھا ، لیکن چونکہ میں نے اس کا فرانسیسی ترجمہ پڑھ رکھا تھا اس لئے میں بآسانی اس کے مطالب کی تہ تک پہنچ سکتا تھا ۔ جب ہم "تاتیانا" کے مراسلے پر پہنچے تو اس سے میں کچھ اس حد تک متاثر ہوا کہ میں بخوبی کہہ سکتا ہوں کہ میں بے قابو سا ہو گیا ۔ مارگریٹا تاڑ گئی کہ اس مراسلے نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے ، بولی :

میں تاتیانا کو پسند کرتی ہوں اور میری خواہش تھی میں اس جیسی ہوتی ۔

میں بولا :

تم ہرگز تاتیانا نہیں ہو سکتیں ۔ تاتیانا کی مانند کون جان نثاری کر سکتا اور اس طرح اپنے آپ سے گزر جانے کی ہمت دکھا سکتا ہے ۔ اس آدمی کے سامنے ، جس سے وہ محبت کرتی ہے ، وہ واضح الفاظ میں اقرار و اعتراف کرتی ہے کہ میں تجھ سے محبت کرتی ہوں ۔ تاتیانا اندازہ لگا لیتی ہے کہ یہ شخص اس کے احساسات کا جواب نہ دے سکے گا ، یا دینا نہیں چاہتا ، پھر بھی وہ ایسے آدمی کو کہتی اور لکھتی ہے کہ میں تجھ سے محبت کرتی ہوں اور میری تمام ہستی و نیستی ، وہ تمام راز جن سے میری زندگی وابستہ ہے ، تیرے پاؤں میں ڈالتی ہوں کہ تو میرا محبوب ہے ۔

میں مناسب لفظ کی تلاش میں تھا اور وہ مجھے مل نہیں رہا تھا ۔ "اس قسم کا ایثار و قربانی مجھے تم میں نظر نہیں آتا۔"

مارگریٹا ہنس دی ۔ وہ مجھے مذاق کرنا چاہتی تھی ، یا یہ کہ معمول کے مطابق وہ چاہتی تھی کہ خوشیاں بانٹے اور جہاں کہیں ہے مسرتیں لٹائے اور میری غمزدگی کو تہس نہس کر دے یا پھر وہ اس لئے ہنس رہی تھی کہ اس نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا ۔

نہیں میں اس تاتیانا کی بات نہیں کر رہی ۔ میں تو دراصل اس موقع کی بات کر رہی ہوں ۔ جب تاتیانا ایک جرنیل کی بیوی بن جاتی ہے ۔ تم نے ابھی تک نہیں پڑھا اس لئے تمہیں علم نہیں ۔

نہیں تم غلط سمجھ رہی ہو ۔ میں نے پڑھ رکھا ہے ۔ تم وہ تاتیانا بھی نہیں بن سکتیں ۔ اب جب کہ وہ جرنیل کی بیوی بن گئی ہے ۔ اس جرنیل کی بیوی جو اسے پسند نہیں کرتا ، پھر بھی اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا کہ اس کا سابقہ محبوب اس کے پاس آئے ، وہ محبوب جس نے کبھی اس کی محبت اور خود اسے ٹھکرا دیا تھا اور اب پشیمان و نادم ہے اور اس سے محبت کرتا ہے ، تاتیانا ، جرنیل کی بیوی بظاہر میں باعظمت و باافتخار اور باطن میں دل شکستہ و مضطرب ، پھر بھی تاتیانا اچھا نہیں سمجھتی کہ اس محبوب کے ساتھ جا رہے اور اپنے شوہر کو جواب دے دے ۔ تم کسی ایسی قربانی پر قادر نہیں ہو ۔

وہ پھر ہنس دی لیکن اس ہنسی میں وہ ایک ایسی بات کہہ گئی جس نے مجھے سوچ میں ڈال دیا ۔ اس روز میں اس کے ان الفاظ کی اہمیت کو پا نہ سکا۔ اس روز میں نے خیال کیا کہ چونکہ میرا خون جوش میں آ گیا ہے اس لئے میرے سکون کی خاطر اس نے یہ جملہ کہا ہے ۔ مجھ سے کہنے لگی :

کیسے معلوم ہوا ؟ میں تو بلکہ اس سے بھی بڑی قربانی دینے والی ہوں ۔ ہر چیز تو بتائی نہیں جا سکتی ۔ چلو چھوڑو یہ صفحہ مکمل کر لیں ۔۔۔"

آخر وہ موقع آ ہی گیا ۔ ایک جمعہ کی سہ پہر کو میں مارگریٹا اور اس کے باپ کا مہمان ہوا ۔ مارفینکا بھی موجود تھی ۔

اس روز صبح کا سارا وقت میں نے گھر میں گزارا ۔ ہوا ٹھنڈی اور برف جمانے والی تھی ۔ میں نے صرف چند منٹ تک دن میں شائع ہونے والے اخبارات پڑھے جن میں جنگ کی خبریں تھیں ۔ اس کے بعد سارا دن "ڈانس مکابر" کا ریکارڈ سنتا رہا جو میں نے بہت پہلے خرید رکھا تھا ۔ نقاشی کی کتابوں میں وہ تصویر دیکھتا رہا جس میں بلبائن نے قرون وسطیٰ کے اس تصور کو مجسم کر دیا ہے ۔

کوئی اڑھائی بجے میں گھر سے نکلا۔ مارگریٹا کے گھر کی طرف پیادہ چلا ۔ سرد ہوا چل رہی تھی ۔ موسم میں خشکی اور یخ بستگی کی کیفیت تھی ۔ سہ پہر کے تین بجے تھے اور اس کے باوجود کہ موسم آفتابی تھا ، برف پاؤں کے نیچے کرچ کرچ کی آواز دے رہی تھی ۔ لوگ سردی کی شدت کے سبب بازاروں میں دوڑ رہے تھے ۔ میں اپنے آپ میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ اس طرف قطعاً توجہ ہی نہیں دے رہا تھا ۔ میں تو صرف مارگریٹا کے خیال میں گم تھا اور دل میں

یہ سوچ رہا تھا کہ آخر "ڈانس مکابر" نے اسے اس قدر کیوں متاثر کیا ہے ۔ وہ جہاں بھی ہے وہاں خوشی و رونق ہے ، سکون و شادمانی ، خندہ و راحت جاں ہے، اسے بھلا موت سے کیا کام ۔ ڈانس مکابر ، مُردوں کا رقص ، رقص مرگ اس پر کیا تاثیر کر سکتا ہے ۔ آدمی زندگی سے اس حد تک بھی بیزار ہو جاتا ہے کہ وہ رقصِ مرگ سے ، مُردوں کے ڈھانچوں کے رقص سے لطف اندوز ہونے لگے ۔ اور اس کی آرزو کرتا ہو ۔ میں کس لئے پریشان تھا ۔ میں سارا سارا دن ، ہفتوں ، مہینوں سے اس سرشاری میں رہ رہا تھا کہ کسی روز سہ پہر کے وقت میں مارگریٹا کے پاس ہوں اور رجبوف اس موقع پر موجود نہ ہو ۔ یقیناً رجبوف سے جھوٹ کہا گیا ہے کہ "آج ہم گھر پر نہ ہوں گے" اور یوں اسے بھگا دیا ہے ، لیکن اس کے باوجود رجبوف اگر آ جائے تو پھر کیا ہو گا ؟ میرے اضطراب کا سبب کیا تھا ؟ ابھی سُننے بغیر ہی میرا دل کانپ رہا تھا ۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ مارگریٹا بھی مغموم ہے ۔ یہ نہیں کہ وہ ہنس نہیں رہی تھی ۔ اونچی اور سکے کی کھنک کی طرح اس کی آواز ترنم ریز ہو رہی تھی ۔ کیا اچھا ہوا تم جلدی آ گئے میری سہیلی ابھی تک نہیں آئی۔ مارفینکا آتی ہی ہوگی ۔ میں تو بالکل تنہا تھی میرے والد بیمار ہیں۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں ۔ ہمارے پاس نہیں آ رہے ۔ میں تو صبح سے اب تک مصروف تھی ۔ بہر حال اب ان کی حالت بہتر ہے ۔ ممکن ہے کچھ دیر بعد آ جائیں ۔ تمہیں سردی لگ رہی ہے ؟ انگیٹھی کے پاس آ جاؤ ۔

اگر تمہارے والد بیمار ہیں تو پھر مجھے اجازت دو کہ میں چلا جاؤں ۔

ہرگز نہیں ، ٹھہرو ، مجھے بیحد مسرت ہے کہ تم آ گئے ہو ۔

وہ بولے جا رہی تھی ، کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتی ، کبھی مجھ سے پوچھتی ۔ ہم مات و مبہوت تھے ۔ کیسا اچھا موقع ہے ۔ اچھی فرصت ملی ہے کہ میں اس سے پوچھوں تو میرے لئے کیا ہے ۔ میری زندگی میں تو نے کیا مقام پیدا کیا ہے ؟ میں اُسے بتاؤں کہ میری زندگی اب تک فقط کار آسان تھی، ایک ہی ڈگر پر رواں، لیکن درد سر سے پُر ۔ اسے بتاؤں کہ میری زندگی محض دکھ درد ، زحمت ، اندیشوں سے پُر ، اور سب سے بدتر یہ کہ حرکت و تغیر سے ناآشنا تھی ۔ اسے بتاؤں کہ میں اب تک زندگی کے صرف مصائب ، لوگوں کی بھوک ، بیکسوں کی اذیتیں ، قتل و غارت اور ظلم و جبر ہی دیکھ رہا تھا ۔ اسے بتاؤں کہ ہر روز نیند سے بیدار ہونا ، زندگی میں کوئی مقصد و ہدف نہ رکھنا ، ہاتھوں پر ہاتھ دھرے رہنا ، بس چاول اور گھی ہی کو مصرف میں لانا ، یہ سب مجھے ہلاک کئے دے رہے تھے ؛ اور اب جب کہ میری تجھ سے شناسائی ہوئی ہے ایک نئی دنیا میری آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہو گئی ہے ۔ اسے بتاؤں کہ اب زندگی موسیقی اور فن ہے ۔ اسے بتاؤں کہ میری زندگی اب تک ہنر سے خالی تھی اور اگر کوئی ہنر تھا بھی تو وہ زندگی سے عاری تھا ، بے جان تھا ۔ اسے بتاؤں کہ تو نے مجھے حقیقی زندگی کی راہ دکھائی ۔ اسے بتاؤں کہ تو نے میری زندگی کو جینے کے قابل بنا دیا ۔ اسے بتاؤں کہ تیری دوستی مجھے امید و آرزو سے سرشار کرتی ہے ۔ آہ ! کون کون سی اور کتنی باتیں تھیں جو میں اسے کہنا چاہتا تھا ۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ مجھے تجھ سے محبت ہے ۔ میری زبان گنگ ہو چکی تھی اور صرف نگاہوں ہی

نگاہوں میں میں یہ سب کچھ اس پر واضح کرنا چاہتا تھا ۔

مارگریٹا ہمیشہ میری چمکتی نظروں سے ڈرا کرتی تھی ، تاہم ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی ؛ لیکن آج کا دن تو ہر روز سے بد تر تھا ۔ وہ صرف باتیں کیے جا رہی تھی ، ایک سیکنڈ بھی چپ نہیں رہ رہی تھی ۔ خاموشی سے جیسے اسے ڈر لگ رہا تھا ، یا پھر وہ اپنی روح کو مجھ سے چھپانا چاہتی تھی ، اپنی جان کو وہ الفاظ سے ڈھانپنا چاہتی تھی ۔۔۔

اسی اثنا میں مارفینکا آ گئی ۔ دونوں روبسی میں باتیں کرنے لگیں ۔ اب میں بھی کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا ۔ چائے اور مٹھائی آ گئی ۔ پھر دونوں پیانو کے پاس جا بیٹھیں ۔ پیانو کے موسیقی نوٹ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا : ڈانس مکابر ، یعنی رقص مردگان ، یعنی رقصِ مرگ ۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی ۔ صرف موسیقی نوٹ کے صفحات کے باہم ٹکرانے سے پیدا ہونے والی خش خش کی آواز سنائی دے رہی تھی ۔

چند سیکنڈ بالکل خاموشی رہی ۔

میں میز پر کہنی ٹکائے ان کو دیکھنے میں محو تھا ۔

پہلی دھنوں نے مجھ میں وحشت پیدا کر دی ، یہ مکابر تھیں ۔ فارسی زبان میں کوئی بھی لفظ اس کا متبادل نہیں ، منحوس تھیں ۔ میں ان دھنوں میں سے جان کلام بخوبی سُن رہا تھا ۔

گھڑی بارہ بجا رہی ہے ۔ اس لمحے سے صبح تک مردے آزاد ہیں ، آزاد ، آزاد ۔

آدھی رات ہے !

کس قدر وحشتناک رات ہے ۔

ہر رات اس طرح خوفناک ہے ۔ اس لئے کہ ہماری زندگی ہی وحشت آور اور جانسوز ہے ۔ اب ان میں کوئی جان نہیں ہے جو جلے ، مُردوں میں جان نہیں ہے ۔

اس لئے کہ ہم تو ہم مثل نہیں ہیں لیکن مُردے ہم مثل ہیں ۔

آدھی رات سے صبح مرغ کی بانگ تک مُردے جشن مناتے ہیں ، جشن آزادی ، زندگی کے دکھوں سے رہائی کا جشن ۔

سبھی ایک جیسے ہیں ۔

ان میں نہ کوئی بادشاہ ہے نہ کوئی گدا ، نہ بوڑھا ہے ، نہ جوان ، نہ لڑکی ہے نہ لڑکا ، نہ عورت ہے نہ مرد ، سبھی مردہ ہیں ، سبھی ہڈیوں کا ڈھانچا ہیں ۔

کسی کے سر پر کوئی تاج نہیں ہے ۔ کوئی بھی پھٹا پرانا لباس نہیں پہنے ہوئے ۔ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے رقص کر رہے ہیں ۔ موت ، جو ان سب میں مشترک ہے ، ان کے کل کا ایک جزو ، ان کی اپنی ، موت نے ان ڈھانچوں کو نچایا ہے ۔۔۔ جیسے ہی بارہ بجتے ہیں مُردوں کے ڈھانچے قبر کے سوراخوں سے باہر نکلتے اور رقص

کرتے ہیں ۔۔۔

وہ کہ جس کے چہرے کی ہڈیوں پر ابھی تک نیش خند دکھائی دے رہا ہے ۔ زندگی میں قاضی تھا اور سزا پانے والوں کے دکھوں اور شکایتوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹیں بکھیرتا تھا ۔ بہر حال اسے مرے کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا ۔ جلد ہی اس کی کھوپڑی سے یہ اثر زائل ہو جائے گا ۔ اس کی ٹھوڑی اور گالوں میں یہ اثر باقی نہیں رہے گا ، اس لئے کہ اب وہ مر چکا ہے اور آزاد ہے ۔

نہ ہنسی ہے نہ گریہ ، نہ خوشی ، نہ غم ، نہ خوف اور ڈر ، نہ امید ، نہ افادہ ہے اور نہ تحقیر ، نہ ظلم ہے اور نہ عاجزی و خوشامد ، نہ بھوک ہے اور نہ شکم سیری ۔

کوئی چیز نہیں ہے ۔ بجز مرگ اور آزادی کے ۔

کیا یہ موت اس سے بہتر نہیں ہے کہ قاضی سزا پانے والے کا تمسخر اڑائے ۔

کیا یہ موت اس سے بہتر نہیں ہے کہ محتاج کمر جھکائے ۔

کیا یہ موت اس سے بہتر نہیں ہے کہ آدمی قید میں رہے ۔

یہی وجہ ہے کہ وہ جشن منا رہے ہیں ۔

ناچ رہے ہیں کیونکہ وہ آزاد ہیں

افسوس کہ یہ آزادی بھی محدود ہے ۔

مرغ صبح ہونے پر بانگ دے رہا ہے ۔

تمام مُردے ، ڈھانچے بکھر جاتے ہیں ۔۔۔

مارگریٹا اور مارفینکا جو دھنیں بجا رہی تھیں ۔ میں ان میں یہ منظر دیکھ رہا تھا ۔

جب وہ پیانو بجا چکیں تو دونوں کے رنگ اڑے ہوئے تھے ۔ میں مبہوت و بیخود ہو چکا تھا ۔۔۔

مرتضیٰ نے طویل اور گہرا سانس لیا ۔ آخری حصے وہ بے تامل سنائے جا رہا تھا ۔ اسے اب اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ کوئی اسے سن رہا ہے یا نہیں ۔ اس میں شک نہ تھا کہ وہ ابھی تک اس دن کے کھنچاؤ ، تناؤ اور دباؤ میں تھا ۔۔۔

اب مجھے کچھ یاد نہیں کہ اس روز کیا پیش آیا ۔ اتنا علم ہے کہ میں اس رات مُردے کی طرح صبح تک سویا رہا اور اس کے باوصف اگلی صبح بھی میں مضطرب اور نروس تھا ۔ صرف یہ یاد آتا ہے کہ اگلے دن مارگریٹا ، گانا مکمل کرنے کے بعد ، اڑے ہوئے رنگ والا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے متواتر گھومتا رہا ۔

مجھے یقین ہو گیا کہ مارگریٹا وہ ہنستی مسکراتی اور فرح بخش لڑکی نہیں ہے جو میں اب تک تصور کیے ہوئے تھا ۔ اور ان ہنستے مسکراتے گالوں اور ہونٹوں کے نیچے کوئی بھید پوشیدہ ہے ۔ میں اس بات پر پریشان کہ میں اب تک اسے کیوں نہ سمجھ سکا ۔

دوسرے دن شام کے کوئی چھ بجے میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور ایک مرتبہ پھر ڈانس مکابر کا ریکارڈ سن رہا تھا، ایک چھوٹے سے ہاتھ سے، جو دستانہ پہنے ہوئے تھا، ہلا۔ اس ہاتھ نے کئی مرتبہ شیشے پر ٹِک ٹِک کی اور بعد میں کمرے میں داخل ہوگیا۔ مارفینکا میرے کمرے میں کھڑی تھی۔

اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی نیا حادثہ وقوع پذیر ہوا ہے۔ وہ فارسی سے بخوبی آشنا نہ تھی اور میں نے روسی زبان ابھی اتنی نہ سیکھی تھی جو میں اس سے بات کر سکتا۔ بہر حال اتنا میں سمجھ گیا کہ وہ، جس زبان سے بھی ممکن ہو سکے، مجھے اس بات پر آمادہ کرنا چاہتی ہے کہ میں جلد از جلد مارگریٹا کی مدد کو دوڑوں؛ لیکن کیا واقعہ پیش آیا، کیا ہوا، میں کس قسم کی مدد کر سکتا ہوں، مجھے کچھ سمجھ نہ آیا، اور میں پوری تیزی سے گھر سے باہر بھاگا۔ چونکہ مجھے بازار سے کوئی بگھی یا ٹیکسی نہ ملی۔ شدید سردی کے سبب بگھیاں بیکار ہوگئی تھیں — اور مارفینکا اپنی اونچی ایڑی والی جوتی کے ساتھ یخ بستہ زمین پر دوڑ نہیں سکتی تھی، اس لئے میں نے اس سے کہا :

میں جا رہا ہوں، تم خود ہی اکیلی چلی آؤ۔

آدھے سے زیادہ راستہ میں نے دوڑ کر طے کیا۔ اور آخر ایک بس میں سوار ہوگیا۔ اس کے بعد بگھی مل گئی۔ بگھی میں بیٹھ کر مجھے یاد آیا کہ مارفینکا جو روسی لفظ بار بار بول رہی تھی اور مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ فارسی میں اس کا متبادل خودکشی ہے۔ مارگریٹا خودکشی کرنا چاہتی تھی۔ میں اسے روک سکتا ہوں؟ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے خود پر قابو پایا۔ کوچوان سے زور دے کر کہا کہ وہ تیز چلائے۔ وہ بولا میرے گھوڑے برف پر پھسل رہے ہیں۔ میں اس سے زیادہ تیز نہیں چلا سکتا،

تھوڑا سا تیز، بس اتنا کہ میں جلد تر پہنچ جاؤں۔

نادری روڈ پر میں بگھی سے اتر گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ میری طرف متوجہ ہوں۔

سات بجے کے قریب میں ان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ فضا تاریک تھی۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ میں صحن میں داخل ہوگیا۔ سیڑھیوں سے میں جیسے ہی نیچے اترا مجھے وحشت نے آلیا۔ میں نے یہ خیال کیا کہ میں پاگل ہوگیا ہوں۔ رجبوف صحن کے وسط میں زمین پر پڑا اور اس کے سر سے خون بہ رہا تھا۔ فضا میں تاریکی کے باوجود مجھے خون کا پتا چل گیا۔

مارگریٹا بجھی بجھی آنکھوں، اترے ہوئے چہرے کے ساتھ اور ہاتھ پیچھے کی طرف رکھے چیخ رہی تھی۔ اس کا باپ سلیپنگ سوٹ پہنے سیڑھی کا پایا تھامے ہوئے تھا، وہ نیچے آنا چاہتا تھا۔

مارگریٹا کی زبان بند ہو چکی تھی : میں ـ ـ ـ میں،

میں نے اسے پہلو میں لیا، کمرے میں لے گیا۔ وہ بید کی طرح کانپ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا :

تو۔ تُم نے ؟ ـ ـ ـ تو۔ تُم نے مارا۔

میں ---- میں ---

مارگریٹا کے باپ کو میں کمرے میں لے گیا ۔

کوئی بات نہیں ، آپ اطمینان سے رہئیے ، میں اسے اسی وقت ہسپتال لے جاتا ہوں ۔

پھر میں مارگریٹا کی طرف متوجہ ہوا :

مارگریٹا ! اب تو کسی کو یہ بات نہ بتانا ، کسی بھی وقت ، مجھ سے وعدہ کرکہ تو یہ بات دہرائے گی نہیں ، مارگریٹا اگر تجھے مجھ سے ذرا بھی محبت ہے تو وعدہ کرکہ تو کسی سے نہ کہے گی ۔ اگر تیرے باپ کو پتا نہیں چلا تو چلنے بھی نہ دینا۔ جا آرام کر ۔

میں نے مارگریٹا کو بغل میں لے لیا اس کے ہاتھوں اور چہرے کو چوما اور پھر بولا :

مارگریٹا میں اسے ہسپتال لے جارہا ہوں ، کوئی فکر کی بات نہیں، ٹھیک ہو جائے گا ۔

میں باہر کی طرف بھاگا ۔ بگھی کی تلاش میں تھا کہ مارفینکا آتی دکھائی دی ۔

تم نہ جاؤ اس کی حالت ٹھیک نہیں ، سونے گئی ہے ۔

مجھے کوئی بگھی نہ ملی ، میں واپس صحن میں آیا اور پکارا :

مارگریٹا ! مارگریٹا ! کسی سے نہ کہنا --- کسی سے ---

رجبوف کے نیم جان جسم کو میں نے کندھوں پر اٹھایا اور گھر سے باہر لے گیا ، میں کیا کرنا چاہتا تھا ، کچھ علم نہیں ۔

مجھے صرف اس وقت خبر ہوئی جب میں نے لوگوں کو اپنے اردگرد کھڑے پایا، اور یہ کہ سپاہی مجھے کہیں لے جارہا ہے۔ مجھ سے جتنی مرتبہ بھی پوچھا گیا ۔ میں نے کہا ۔ میں نے مار ڈالا ہے ۔

اور اب بھی میں کہتا ہوں ۔ میں نے کیا ۔

اور کسی کا گناہ اپنے سر لے لینا کتنا شیریں ہے ، اور کس قدر شیریں ہے آخر کار زندگی میں کوئی مقصد و ہدف رکھنا ۔

مرتضیٰ ۔ ف ۔ اب باتیں نہیں کر رہا تھا ، عالم خواب میں تھا ۔ جیسے یہ سب کچھ اسے خواب دکھائی دے رہا تھا ۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ کیوں ذوق و شوق کے ساتھ موت کے آگے آگے جارہا ہے ۔ اپنی بیکار قسم کی زندگی میں اسے ایک ہدف مل گیا تھا ۔

(۳)

کل صبح مرتضیٰ کو ہمارے درمیان سے لے گئے ، بالکل اسی طرح جس طرح کسی بھیڑ کو ریوڑ سے مذبح میں لے جایا جارہا ہو ۔ میں شاید اکیلا تھا جسے خوشی سی ہو رہی تھی ۔ اس لئے کہ میں دل میں کہتا تھا ۔ مجھے سکون مل گیا ہے ۔ آج

رات وہ ۱۲ بجے رقصِ مُردگان میں شرکت کرے گا ۔ رجبوف کا ہاتھ پکڑے گا ۔ مل کر جشن آزادی منائیں گے ۔ بغض اور کینے کے بغیر ، حرص اور طمع کے بغیر ، تاہم آزاد ، آزاد ۔

نہیں ، ایسا نہیں ہے ۔

آج صبح جیل والے آئے اور اس کا سامان لے گئے ۔ ہمیں یقین تھا کہ اسے پھانسی دے دی گئی ہے ۔ جس وقت میں سامان جمع کر رہا تھا ، چند کاغذ میرے ہاتھ لگے ۔ میں نے چوری چوری انہیں پڑھا تاکہ اگر ضروری ہوں تو انہیں سامان ہی کے ساتھ بھجوا دیا جائے اور جیل والے وہ سامان اس کے گھر والوں کو پہنچا دیں ، یا اگر غیر قانونی طور پر وہ کاغذ اس کے ہاتھ لگے ہیں تو میں جس طرح بھی ممکن ہو ، مارگریٹا یا اس کی بہن کو پہنچا دوں ۔

بہرحال وہ خط مرتضیٰ کے ہاتھ کا لکھا نہ تھا ۔

اس خط کی عبارت ملاحظہ ہو :

"میرے محبوب ، میرے واحد دوست ، تیرے خیال میں میں ہر وقت ایک یونہی بے فکر سی لڑکی تھی ۔ میں ہنستی رہتی تھی ، بولتی رہتی تھی ، تو نے مجھے کم ہی غمگین دیکھا ہو گا ۔ اصل یوں نہیں ہے ؛ ایک مرتبہ باتوں کے دوران تو نے کہا تھا کہ میں قربانی نہیں دے سکتی ۔ کبھی میرے چہرے کا اڑا ہوا رنگ تجھے میرے دل کے رازہائے پنہانی کی طرف متوجہ کر دیتا ، لیکن جلد ہی میرے بلند قہقہے تیرے خیالات کو ہوا میں اڑا دیتے ۔ واقعہ یوں نہیں ہے ۔ شاید بعض اوقات تو نے دل میں سوچا ہو کہ میں تجھ سے مذاق کر رہی ہوں ۔ اور تیرا اور تیرے جذبات کا تمسخر اڑا رہی ہوں ۔ ایسا نہیں ہے ۔ تجھے غلط فہمی تھی ۔ تجھے علم ہے کہ دوسروں کے دکھوں دردوں کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ ان مصائب و آلام کا ذکر ہی کیا ، جن میں میں گرفتار رہی ہوں اور آج بھی جرأت کے ساتھ انہیں جھیلنے پر آمادہ ہوں ۔ میری زندگی سراپا ایثار و قربانی تھی ۔ میرے محبوب ! میری والدہ نے اپنے آخری خط میں مجھے لکھا تھا کہ میں اپنے باپ کا خیال رکھوں ۔ میرے والدین کو ایک دوسرے کے ساتھ بڑی محبت تھی ، اب بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں ۔ انقلاب زمانہ نے انہیں ایک دوسرے سے جدا ہونے پر مجبور کر دیا ۔ میں نے اکثر دیکھا کہ میرا باپ گھنٹوں میری ماں کی تصویر کے سامنے بیٹھا سوچوں میں ڈوبا رہتا ، جب سے میں بڑی ہوئی ہوں میری ماں مجھے یہی تاکید کرتی رہی کہ میں باپ کا دھیان رکھوں اور اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے دوں ۔

میرے باپ کو مجھ سے بہت محبت تھی ۔ اس نے زندگی کے تمام مصائب میری خاطر جھیلے ۔ میرا باپ کسی سے اتنا بیزار نہ تھا جتنا رجبوف سے تھا ۔ لیکن چونکہ اسے مجھ سے محبت تھی اس لئے زندگی کے سارے دکھ ، رجبوف کے ہمارے گھر آنے جانے کے علاوہ خوشی خوشی سہ رہا تھا ۔ رجبوف نے اپنے مفاد کی خاطر میرے باپ کو خطرناک معاملات میں شریک کر رکھا تھا ، اس طرح اس نے ہماری زندگی برباد کر دی ۔ شروع شروع میں رجبوف نے ، اپنے مفاد کی خاطر ، میرے باپ کے کاموں میں اس کی مدد کی ۔ میرا باپ رجبوف کو روس سے جانتا تھا ۔ جہاں وہ (رجبوف) دلالی کا

کام کرتا تھا ۔ لیکن چونکہ ان دنوں وہ مجھ پر حریصانہ نظریں جمائے ہوئے تھا ، اس لئے اب اس کی مدد کے بغیر زندگی گزارنا ہمارے لئے غیر ممکن تھا ۔ اس دوران میں وہ اپنا مفاد حاصل کرتا رہا ۔ میرے مظلوم باپ پر کیسے کیسے سختی کے دن نہیں گزرے ہوں گے ۔ اگر ایک طرف محض اس خاطر کہ میری زندگی بکھیڑوں ، جنجالوں سے دور رہے وہ رجبوف کو برداشت کیے ہوئے تھا تو دوسری طرف مجھے اس کے سپرد کرنے پر بھی تیار نہ تھا ۔ اس گیرودار میں تو سامنے آگیا۔ میرے محبوب ! کاش تو نہ آتا ، میری زندگی میں امید کی کرن پھوٹ پڑی ۔ اس پوشیدہ محبت نے ، اس محبت نے جس سے مارفینکا تک بھی بے خبر تھی ، اس محبت نے جو پگھلا دینے والی ہر آگ سے کہیں زیادہ سوزاں ہے ، مجھے پُرامید بنا دیا تھا ۔ میں اب اس بات پر آمادہ ہو چکی تھی کہ میں بھی تاتیاناکی طرح اپنی ساری زندگی تیرے قدموں میں نچھاور کر دوں اور مجھے یقین تھا کہ تو اسے رد نہیں کرے گا ، ایسا نہیں ہے ؟ بالآخر میں نے باپ کے سکون و راحت کی خاطر ایک حل تلاش کر لیا ۔ ایک روز میں نے اس سے کہا کہ میں دلی طور پر رجبوف سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں ۔ میرا باپ رجبوف کے اصرار کے باوجود ہمیشہ اس کام میں ٹال مٹول سے کام لیتا رہا ، اس لئے کہ وہ مطمئن نہ تھا ۔ اس جمعہ کو ہم نے رجبوف سے کہا تھا کہ ہم گھر پر نہ ہوں گے ، باپ کے ایک دوست کے یہاں ہماری دعوت ہے ، لیکن جس وقت تو ہمارے گھر سے نکل رہا تھا ، اس نے تجھے دیکھ لیا تھا ۔ اسی شب ، اس کے باوجود کہ میرا باپ بیمار تھا ، اس نے میرے بارے میں اس سے بات کی اور اس بات پر زور دیا کہ چند ہفتوں کے اندر اندر کم از کم ہماری منگنی کا سب میں اعلان کر دیا جائے اور ایک جشن بھی برپا ہو۔ اسی شب میرے باپ پر سکتہ طاری ہو گیا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ اس مرض سے اب وہ زندہ نہ بچ سکے گا یا پھر مدت تک یونہی صاحب فراش رہے گا۔

میں اس سوچ میں تھی کہ اس کی اس اذیت کا سدباب کروں اور خود ہی اپنے باپ کو مار ڈالوں ۔ اس کے لئے میں نے اسی ہفتے کے روز تمام وسائل فراہم کر لئے تھے ۔ میں چاہتی تھی کہ "ڈانس مکابر" کا ریکارڈ لگاؤں اور ہم دونوں مر جائیں ۔ میں ابتدائی انتظامات میں مصروف تھی کہ اچانک رجبوف آگیا۔ ایسے موقعے پر میرے لئے اس کے چہرے کو برداشت کرنا غیر ممکن تھا ۔ میں نے اس سے درخواست کی اور پھر حکم دیا کہ وہ ہمارے گھر سے نکل جائے ۔ اس پر اس نے تیرے اور میرے درمیان تعلقات پر طنز آمیز اشارے کیے ۔ اس نے میری توہین کی ، پھر مجھ سے لڑا جھگڑا ، حتیٰ کہ اس نے میری عزت لوٹنے کا بھی ارادہ کیا ۔ مستی میں تھا ۔ میں نے باپ کے موٹے ڈنڈے سے اس کی تنبیہ کی اور پھر کمرے سے نکال دیا ۔ جب وہ دالان میں پہنچا تو میں نے سیڑھیوں سے اسے نیچے دھکا دے دیا ۔ اس کا پاؤں پھسلا اور اس کا سر ایک پلنگ کی نکڑ سے ٹکرا گیا۔ میرے محبوب باقی واقعے کا تجھے علم ہے ۔ میں نے بُرا کیا ۔ بہتر یہ تھا کہ میں تجھے آگاہ کر دیتی ۔ ایسا نہیں ہے ؟ میرا باپ مر گیا ، لیکن میں اب سمجھتی ہوں کہ میری قربانی و فداکاری کا وقت ابھی نہیں گزرا ۔ ابھی تک مجھے حوصلہ نہیں ہوا کہ اپنی ماں کو اپنے باپ کی موت کا لکھوں ۔ یہ کام تیرے سپرد ۔ میرے بارے میں جو کچھ تجھے معلوم ہے میری ماں کو لکھ دے ۔ اسے لکھ کہ میں اس کی شایستہ بیٹی ہوں اور میں بھی

قربانی دینے سے آگاہ ہوں ۔ میں نے تمہیں یہ خط اس خاطر لکھا ہے کہ : میں برداشت نہیں کر سکتی کہ تو قید میں رہے یا مر جائے اور میں زندگی کسی مقصد و ہدف کے بغیر بسر کروں ۔ ممکن ہے عدالت کو اگر میری صحیح صورت حال معلوم ہو جائے تو وہ مجھے موت کی سزا نہ دے اور یوں میں دس یا گیارہ سال بعد جیل سے باہر آجاؤنگی ۔ اس وقت میں ایک خوش بخت عورت ہوں گی ۔ تجھ سے محبت کروں گی اور تیری محبت کے ساتھ زندگی گزاروں گی ۔ اگر میں مر گئی تو بھی خوش بخت ہونگی ۔ میرا ارادہ یہ ہے ۔ آج ہی میں خود کو پولیس کے حوالے کرتی ہوں ۔

مارگریٹا

چند روز بعد اسی چپڑاسی نے ، جو سب کا نام اونچی پکارتا ہے اور جس نے مرتضیٰ فرزندِ جواد کو آواز دی اور رخصت کیا تھا ، میرا نام پکارا اور کسی قدر کھانا اور ٹوپی میرے لئے لایا ۔ جس رجسٹر پر میں نے وصولی کے دستخط کیے اس پر لانے والے کا نام "مرتضیٰ ۔ ف ۔" لکھا تھا ۔

پھر چند روز بعد قیدیوں کے لئے پھر رقمیں لائی گئیں ۔ جس وقت میرا ایک ساتھی اپنی رسید تلاش کرنے کے لئے رسیدوں کو الٹ پلٹ کر رہا تھا ، اس کی نظر ایک رسید پر پڑی جس کا تعلق عورتوں کی جیل سے تھا اور اس پر لکھا تھا :

"رقم وصول کرنے والی کا نام ________ مارگریٹا"

زندانِ قصر ________

سمجھوتہ

محمد سعید شیخ

جلوس شروع ہوا تو زیادہ تر ان لوگوں پر مشتمل تھا جنہوں نے یہ واقعہ دیکھا تھا۔ گلیوں بازاروں سے گزر کر یہ جلوس سڑک پر پہنچا تو دیکھنے سننے والوں کے علاوہ بھی بہت سے لوگ اس میں شامل ہو گئے تھے اور یہ قصبے کی تاریخ کا سب سے بڑا جلوس بن گیا تھا۔

بنیادی طور پر تو یہ صبح کے واقعہ کے خلاف احتجاج تھا مگر اب اس میں ہر قسم کے لوگ شامل ہو گئے تھے وہ بھی جنہیں اصل واقعہ کا علم تک نہ تھا مگر ان کے پاس احتجاج کے لیے اپنا اپنا جواز تھا اپنی اپنی توجیہ تھی۔

اس قصبے میں پہلے بھی جلوس نکلتے تھے۔ مذہبی اور قومی نوعیت کے تہواروں پر مگر ظلم اور ناانصافی کے خلاف نکلنے والا یہ اپنی نوعیت کا پہلا جلوس تھا پہلا احتجاج تھا۔ یوں نہیں تھا کہ پہلے یہاں ناانصافی نہیں تھی ظلم نہیں تھا۔ ایسے واقعات پہلے بھی ہوئے تھے۔ نوراں کو اسی بازار سے چند نقاب پوش دن دیہاڑے اغوا کر کے لے گئے تھے اور اس کا باپ آج تک کہتا پھرتا تھا کہ اس کی بیٹی ساتھ والے گاؤں کے بڑے چودھری کی حویلی میں موجود ہے مگر اسے آج تک بازیاب نہ کیا جا سکا اور اب اس کے باپ کا گلا بیٹھ گیا تھا (نوراں کا باپ آج اس جلوس میں شامل تھا اور ریلوے کے پھاٹک کو سب سے پہلا پتھر اسی نے مارا تھا)

غلام رسول کی جوان بیوہ آج بھی زندہ تھی اور جلوس کے ساتھ تھی اور اس ہسپتال کو قہر بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی جہاں اس کے بچوں کا باپ بروقت علاج اور دوا نہ ملنے سے برآمدے میں سسک سسک کر مر گیا تھا۔

جس چوک میں کھڑے ہو کر لوگوں نے سب سے زیادہ نعرے لگائے تھے وہاں چند دن قبل فاطمہ چیوڑی کا جوان بیٹا تیز رفتار ٹریکٹر ٹرالی کے نیچے کچلا گیا تھا اور ڈرائیور کے باپ نے اس سے تھانے میں کاغذوں پر انگوٹھا لگوا کر سو روپے کا نوٹ اس کی مٹھی میں تھما دیا تھا۔ اور اس جلوس میں جمال دین مزارع بھی شامل تھا جس کی زمین زمیندار نے چھین کر اس کے تین جوان بچوں پر مقدمہ بنوا دیا تھا۔ اور دِتّا نائی بھی جس کی خوبصورت بیوی کو اس کا ہمسایہ بھگا لے گیا تھا اور آج تک مقدمہ درج نہیں ہوا تھا۔

ایسے کئی واقعات پہلے بھی ہوئے تھے مگر جلوس پہلی دفعہ نکلا تھا۔ لوگوں نے پہلی دفعہ مجموعی ردِّعمل کا اظہار کیا تھا۔

قصبے میں اس بیداری کی وجہ شاید یہ تھی کہ ملک میں بڑی مدت کے بعد پہلی دفعہ انتخابات ہو رہے تھے اور لوگوں کو اپنے بھولے ہوئے دکھ یاد آ رہے تھے حالانکہ قصبے کی تاریخ بننے کے پہلے دن سے ہی لوگ ناانصافیوں کو اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کرتے آ رہے تھے۔ جامع مسجد کے مولوی عبدالقدوس کے وعظ میں بڑی تاثیر تھی۔ ان کی آواز لحن داؤدی

تھی اور وہ بڑے ترنم سے اقبال کے شعر بھی پڑھتے تھے۔
وہ کہا کرتے تھے۔

مصیبت اور مشکل اللہ کی طرف سے بندے کا امتحان ہوتا ہے اور جو اس آزمائش میں پورا اترتا ہے وہی اصل مسلمان اور اقبال کا مردِ مومن ہے بے شک! اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
پھر وہ کہتے

ہم مقدر سے لڑ نہیں سکتے۔ مشیت ایزدی کو تسلیم کر لینے سے طبیعت کا بوجھ ہلکا رہتا ہے اور کڑی سے کڑی آزمائش بھی آسان ہو جاتی ہے تاریخ ہمیں بتاتی ہے اور حکیم الامت علامہ اقبال فرماتے ہیں۔۔۔" اور مولوی صاحب بڑی رِقت سے علامہ اقبال کے شعر پڑھنے لگتے۔

مگر آج کے جلوس کے انداز کچھ ایسے تھے جیسے لوگ اپنے فیصلے خود کرنا چاہتے ہوں اس جلوس کا کوئی لیڈر نہیں تھا۔ ہر کوئی اپنی مرضی سے جو چاہے نعرہ لگا لیتا تھا بڑی سڑک پر پہنچ کر لوگوں نے نعرے لگانا شروع کر دئے "غنڈہ گردی بند کرو" "غنڈہ گردی بند کرو" ناانصافی بند کرو" دونوں طرف سے ٹریفک بند ہو گئی "شیدے کو پھانسی دو! شیدے کو پھانسی دو"

اور کناروں پر کھڑی بسوں ویگنوں میں بھری مخلوق سر نکال نکال کر اس منظر کو دیکھنے لگی۔ جلوس نے ٹریفک کی بتیوں پر چاند ماری شروع کر دی اور کچھ نے سڑک پر ٹائر رکھ کر آگ لگا دی۔ دھواں اٹھنے لگا جس کے بادل دور سے بھی نظر آتے تھے۔ پھر پولیس آگئی انہوں نے لاٹھی چارج سے لوگوں کو منتشر کرنا شروع کر دیا اور ٹریفک بحال کر دی گئی۔

اس جلوس میں زینب کا باپ بھی شامل تھا۔ زینب جس کے ساتھ صبح کا واقعہ پیش آیا تھا۔ جلوس بکھرا تو وہ اکیلا ہو کر سڑک کے ساتھ بہنے والی چھوٹی سی نہر کے کنارے غلاظت کے ایک ڈھیر پر کھڑا ہو گیا اور بکھرتے لوگوں اٹھتے دھوئیں اور پھنسی ہوئی ٹریفک کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔

بابے برکت نے غلاظت کے اس ڈھیر پر کھڑے کھڑے سوچا کہ کب اس نے زینب کی تعلیم کے لئے خواب دیکھنے شروع کئے تھے۔ پانچ سات بیگھہ زمین کا معمولی مالک تھا مگر پتا نہیں کب اور کہاں سے یہ بات اُس کے کان میں پڑی کہ تعلیم ہی انسان اور حیوان میں فرق پیدا کرتی ہے اور وہ جانتا تھا کہ اُس نے اب تک جو زندگی گزاری تھی وہ بس حیوانوں کی سطح تک ہی تھی کہ اُس کے علاقے کے چوہدریوں کے کتوں کو بھی بہتر زندگی حاصل تھی۔ اس لئے اُس نے سوچ لیا تھا کہ اپنی اکیلی بیٹی کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرے گا زینب کی ماں نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

"ہا! ہائے! نہ بھلا کبھی لڑکیوں کو بھی تعلیم دیتے ہیں۔ زینب کی سہیلیوں کی تو شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور تو برکت! اسے سکول بھیج رہا ہے نہ تو نے اسے استانی بنانا ہے بھلا؟"

اور برکت اُس کی بات پر مسکرا دیا تھا۔ "نادان ہے ———— عورت ہے نا اور وہ بھی ان پڑھ اسے کیا پتا ئے نس

کتنی ترقی کر گئی ہے"

برکت نے ماسٹر محمد دین کے ڈیرہ پر کسی کو سے نس کی ترقی کی بات کرتے سنا تھا "اب تو لڑکی چاند تک پہنچ گئی ہے ——— اور ہماری عورتیں ابھی تک گو موت دھونے سے فارغ نہیں ہوئیں ۔ اور جس قوم کی عورتیں ان پڑھ ہوں وہاں ترقی نہیں ہو سکتی" ماسٹر محمد دین نے فیصلہ دیا تھا اور ماسٹر محمد دین کی بات برکت کے نزدیک پتھر پر لکیر ہوتی تھی۔ اور پھر برکت نے خود جو بغیر سکول کے تعلیم و عقل حاصل کی تھی وہ ماسٹر محمد دین کی باتوں کی مرہونِ منت تھی اور اب اُس کی یہ جاہل بیوی کیا سمجھتی کہ ماسٹر محمد دین کیا کہتا تھا۔

اس لئے برکت نے زینب کو میٹرک تک تعلیم دلوائی اور آگے اُسے بڑے قصبے میں اُستانی بنانے والے سکول میں داخل کرا دیا۔ اس کی بیوی نے ایک دفعہ پھر واویلا کیا۔

وہ جوان ہو گئی ہے برکت! اسے بیاہ دے! یہی بڑا کام ہو گا اُس کی ہمجولیاں تو گود میں دو دو تین تین بچے لئے پھر رہی ہیں۔ اسے اُستانی بنا کر کیا کرے گا——— ؟"

اور برکت کے کان میں جیسے اس کی بیوی کی تیز آواز پڑی تو وہ چونک اُٹھا۔ سارا جلوس مُنتشر ہو گیا تھا ——— ٹریفک یوں بحال ہو گئی تھی جیسے کسی کو کسی کی پروانہ ہو ——— چلتے ہوئے ٹائیر اب سڑک کے کنارے سلگ رہے تھے۔ اور برکت جیسے اپنے قدموں کو اُٹھاتا گنتا گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر میں اُسے پتا تھا اس کی بیوی اب تک بپھری بیٹھی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ زینب کے ساتھ جو کچھ ہوا اُس کا ذمہ دار وہ تھا۔ وہ جو اُس کو تعلیم دلا رہا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو وہاں خاموشی تھی۔ قبرستان کی سی جہاں ابھی ابھی کسی کو دفنایا گیا ہو ——— زینب پچھلے کمرے میں سسکیاں لیتے لیتے سو گئی تھی اور اس کی ماں کھلے صحن میں پڑی چارپائی پر اوندھی لیٹی تھی۔ اُس نے گھر کو اندر سے کنڈی چڑھا رکھی تھی کہ پوچھنے والی ہمدردی کرنے والیاں اب انہیں مزید تنگ نہ کر سکیں۔

زینب جو صبح تک خود کو جیسے پوری کائنات کی مالک سمجھتی تھی اب منہ چھپاتی پھر رہی تھی وہ تو سمجھا کرتی تھی جیسے زندگی کی ساری رونقیں بس اُسی کے دم سے ہیں ۔ ہوائیں صرف اس کا بدن سہلانے اور اُس کے بالوں اور کپڑوں کو چھیڑنے کے لیے چلتی ہیں پھولوں کے سب رنگ اس کے اپنے خیال کے رنگ ہیں اور بادل محض اس کی خاطر اُمڈتے ہیں پرندے اس کے لیے چہچہاتے اور شور مچاتے ہیں اور آسمان اتنا وسیع اتنا نیلا محض اس کے دیکھنے کے لئے ہے۔ وہ گرمیوں کی شام کو کچے کوٹھے کی منڈیر کے ساتھ کھڑی ہو کر دُور سے آبادی سے پرے کھیتوں کی ہریالی اور اُن سے بھی پرے آسمان تک بلند ہوتے پہاڑوں کو دیکھتی رہتی اور پھر اپنے پورے بازو پھیلا دیتی اور اس کا جی چاہتا کہ اس پوری کائنات کو اپنی بانہوں میں بھر لے اور رات کو جب وہ اپنی ماں کے ساتھ سوتی تو کبھی کبھی اُسے اپنی بانہوں میں زور سے بھینچ لیتی اور اُس کی ماں شور مچا دیتی

"نی کُڑئے! کیوں میرا ساہ کُٹ لگی ایں ——— میری ہڈیوں میں اب اتنا زور نہیں" اور اگلے دن وہ برکت سے

کہتی "زینب کی جلدی سے شادی کر دے اُس سے اپنی جوانی سنبھالی نہیں جاتی"

اور اس کا باپ ہنس دیتا ——— "ابھی تو وہ اُستانی لگی ہے ——— اُسے پڑھانے دے بچوں کو — ماسٹر محمد دین کہتا ہے تعلیم دینا سب سے بڑی عبادت ہے"

اور جب وہ سکول جاتی تو یوں چلتی جیسے وہ ستاروں پر قدم رکھ رہی ہو ماں باپ نے اُسے برقعہ پہنا دیا تھا کہ اُسے بازار کی رونق سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ زینب کی راہ میں شیدے کا گھر آتا تھا اور شیدا روز اس کے سکول کے وقت پر تیار ہو کر دروازے پر کھڑا ہو جاتا اور زینب کی نگاہ میں آنے کی کوشش کرتا اور اسی کوشش میں وہ کئی دفعہ اس کے راستے تک آیا بھی اور متعدد بار اُس نے کھنگورے مارے اور گنگنایا بھی مگر زینب کو تو جیسے اپنے سوا دُنیا میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ شیدا تو اُس کے لیے موجود ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی طرف توجہ کیسے دیتی۔ اور شیدے کے دوست اُس کا مذاق اُڑاتے

یار! یہ لڑکی تو تمہیں بالکل گھاس نہیں ڈالتی — "یار جولاہے کی لڑکی بھی تجھے کچھ نہیں سمجھتی؟

یار! اُسے تو تمہاری پرواہی نہیں — بڑے جوان بنے پھرتے ہو کیا فائدہ ہر روز اچھے اچھے کپڑے پہننے اور تیز خوشبو لگانے کا" اور شیدا اکٹ جاتا۔ شرمندہ ہو جاتا۔

یار تب مزہ ہے اگر تو برکت جولاہے کی اس لڑکی کا چہرہ بھرے بازار دیکھو۔

اور شیدے کی مردانگی جیسے داؤ پر لگ گئی۔ ایک آدھ دن وہ زینب کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آگے تک نکل گیا۔ اگلے دن اُس نے ہلکی سی آواز میں کہہ بھی دیا۔

"اگر تم نے نقاب نہیں اُٹھایا تو دیکھنا ———"

مگر زینب نے بالکل نہ دیکھا ——— اُس نے شیدے کی پرواہی نہیں کی۔ جتنی احتیاط راستے میں پڑی گندی نالی کو پھلانگنے کے لئے وہ کرتی تھی اتنی احتیاط بھی اُس نے شیدے سے نہ کی۔

اُسے اپنے باپ کے الفاظ یاد آتے جو اُس کے باپ نے ماسٹر محمد دین سے سنے تھے۔

"جب تعلیم پاس ہو تو کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا"

اور پھر وقوعہ کے روز شیدا اُس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

"میں کہتا ہوں مجھے اپنا چہرہ دکھا دو ——— میں نے اپنے دوستوں سے شرط لگائی ہے ———" اور زینب کو لگا کوئی بھکاری ہو جو اس کے ساتھ ساتھ چلتا بھیک مانگ رہا ہو اور پھر شیدا آگے بڑھا ——— بھرے بازار کے چوک میں اُس نے زینب کو بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

"تو مجھے اپنا چہرہ نہیں دکھا سکتی؟

کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو؟ دیکھ! لے دیکھ!!"

اور شیدے نے اُس کے سر سے برقعے کا پلو کھینچ لیا۔ زینب کا چہرہ ننگا ہوگیا۔ بال بکھر گئے بالوں کی چڑیاں گر گئیں

شیدے نے غور سے اُس کا چہرہ دیکھا اور غصے سے برقعے کا پلو زمین پر پھینک کر ایک زور کا تھپڑ اُس کے چہرے پر لگایا اور بغیر کچھ کہے وہاں سے چلا گیا۔

جتنی دیر میں یہ سارا واقعہ ہوا لوگ مشکل سے صورتِ حال کو سمجھے۔ خود زینب کو پتا نہیں چلا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ اس کے کال میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ زبان پر اپنے خون کا ذائقہ اتر آیا کسی نے آگے بڑھ کر اُس کے سر پر پلو ڈال دیا۔ اور پھر اُسے کچھ یاد نہیں رہا کہ کون اُسے گھر تک لایا۔ اور اسی چوک سے پھر احتجاج کے لئے جلوس نکلا۔

لوگوں کے احتجاج کا نتیجہ تھا کہ شام تک شیدے کے خلاف مقدمہ درج ہوا اور وہ گرفتار ہوگیا۔ مقامی عدالت میں پیشی ہوئی۔ اور ضمانت کی درخواست مسترد ہوگئی۔ مقدمہ کی تفصیلات کے ساتھ ہی زینب بھی جیسے سارے قصبے میں بکھر گئی۔ ہر زبان پر اُس کی کہانی آگئی۔ باہر اُس کا جتنا ذکر تھا وہ اتنی ہی گھر میں اور پھر اپنے آپ میں قید ہوگئی۔ اُس کے رنگ بکھر گئے۔ گہرے رنگوں کے بادل اُڑ گئے دھوپ چھا گئی اور وہ باہر نکلنے سے ڈرنے لگی۔

شیدے کی ضمانت جب بڑی عدالت سے بھی نہ ہوئی تو اُس کے ماں باپ اور دوستوں کو فکر ہوئی اب شیدے کو جیل کی سلاخیں اور ہاتھوں کی ہتھ کڑیاں دکھنے لگیں۔

اور پھر ایک شام شیدے کے ماں باپ اور بہت سے دوسرے وفد سا بنا کر برکت کے گھر آئے۔

برکت نے انہیں بادل نخواستہ صحن میں بٹھا دیا کہ ان میں شیدے کے ماں باپ کے علاوہ برکت کے اپنے کئی جاننے والے یہاں تک کہ مولوی عبدالقدوس اور ماسٹر محمد دین بھی شامل تھے۔

گفتگو کا آغاز شیدے کے باپ اللہ داد نے کیا

'برکت بھائی! ہم شیدے کے کئے پر شرمندہ ہیں۔ ویسے وہ اتنا بُرا لڑکا نہیں ہے بس تھوڑا اتھرا ہے۔ ہم اُس کی طرف سے معافی مانگنے آئے ہیں۔

اصل شرارت تو اُس کے دوستوں کی تھی ـــ انہوں نے ہی اُسے بہکایا تھا۔ بہر حال ہمیں افسوس ہے۔ زینب جیسی آپ کی بیٹی ویسی ہماری"

برکت اور اس کی بیوی چپ تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کہیں۔

"آپ بھی بہن جی! میرے بچے کو معاف کر دیں بے چارا مہینہ بھر سے جیل کی چکی پیس رہا ہے ـ۔ "شیدے کی ماں نے زینب کی ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہماری بیٹی کا بھی تو حال دیکھیں ـــ روشنی تک سے گھبرانے لگی ہے۔ کہیں نکلنے جوگی نہیں رہی۔ اس کا تو مستقبل ہی برباد ہوگیا" زینب کی ماں آبدیدہ ہوگئی ـــ

"ہمیں آپ کے دکھ کا اندازہ ہے بہن جی ! ہم بھی بیٹیوں والے ہیں۔ اسی لئے جہاں ہم معافی مانگنے آئے ہیں وہاں یہ درخواست بھی لائے ہیں کہ آپ زینب کو ہماری بیٹی ہی بنا دیں۔"

اور شیدے کے باپ کی اس تجویز سے برکت اور اس کی بیوی حیرت کے مارے جیسے سُن ہو گئے۔

ان کی اس حالت کا اندازہ کر کے برکت کا ایک دوست فقیر محمد جو دودھ دہی کی دکان کرتا تھا کہنے لگا

"بھائی برکت! اب اگر قسمت نے زینب اور شیدے کا نام اکٹھا لکھ ہی دیا ہے تو ہم اسے اللہ کی مرضی سمجھ کر قبول کر لیں تو اسی میں ہماری عزت ہے کیوں مولوی جی!"

"جی ہاں! فقیر محمد درست کہتا ہے۔ اللہ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے ہم تقدیر سے نہیں لڑ سکتے —— پھر معاف کر دینا بھی بہت بڑی عظمت ہے اللہ معاف کرنے والے کو بہت پسند کرتا ہے اور پھر علامہ اقبال نے بھی تو کہا ہے ——"

اور برکت سے نہ رہا گیا —— اُس نے مولوی صاحب کی بات کاٹ دی۔

مگر مولوی صاحب، ہم تو کسی جگہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے "اسی لئے تو یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے برکت بھائی اس مقدمے سے جو جگ ہنسائی ہو گی اس میں زیادہ بے عزتی تو لڑکی والوں کی ہی ہوتی ہے۔ شیدے کو سزا ہو بھی جائے تو کیا آپ کی عزت واپس آجائے گی اور پھر جو زینب کو عدالت میں پیشیاں بھگتنا پڑیں گی وکیلوں کی جرح ۔ بحث اور یہ سب کچھ — اس سے آپ کو کیا ملے گا ۔ لڑکا تو پھر لڑکا ہے اُسے کیا فرق پڑتا ہے —— آپ کی لڑکی کا نام ہی اُچھلے گا"

قصبے کے چیئرمین کی بات میں دلیل بھی تھی اور وزن بھی —— برکت جواب تلاش کرنے لگا۔ وہ دونوں میاں بیوی سوچ میں پڑ گئے۔ شیدے کی ماں نے ایک دفعہ پھر زینب کی ماں کی منت کرتے ہوئے کہا

سوچ لو بہن شیدا بُرا لڑکا نہیں ہے۔ ماشاءاللہ کھاتا پیتا جوان ہے باپ کی زمین میں حصے دار ہے اور پھر اُسے زینب پسند بھی ہے جبھی تو جوش میں آکر اُس نے یہ حرکت کی۔

پھر آج کل لڑکیوں کے رشتے کہاں ملتے ہیں اور زینب کے لئے تو آپ کو اور بھی مشکل ہو جائے گی"

اور جس صحن میں یہ سب لوگ باتیں کر رہے تھے اس کے ساتھ ہی ایک بند کمرے میں زینب تھی جو تھکے ہارے ماؤف سے دماغ کے ساتھ ان سب باتوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُسے کم از کم یہ پتا لگ رہا تھا کہ اُس کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں —— کہیں زمین پر یا آسمانوں میں یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

"مگر لوگ کیا کہیں گے؟"

برکت کے منہ سے یہ سوال چیخ بن کر نکلا جس کا درد اس کے اندر ہی کہیں رہ گیا۔

"لوگوں کو چھوڑیئے برکت بھائی! وہ تو اب بھی بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ آپ نے نہیں سنا اور اگر نہیں سنا تو اچھا ہے۔

لوگوں کا منہ بھی کوئی بند کر سکا ہے۔ اور پھر ابھی تو یہ واقعہ تازہ ہے ہمارے لوگ بھول جائیں گے سب کچھ۔ ویسے بھی شیدے کے ہوتے ہوئے کون بات کر سکے گا۔ جس عزت کو اس نے اُچھالا ہے اُسے سنبھالے گا بھی وہ خود ہی"

برکت کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا ـــــ وہ سوچنا چاہتا تھا ـــــ اچھے بھلے کی تمیز کرنا چاہتا تھا ـــــ مگر ان باتوں سے سب کچھ جیسے اس کی نظروں میں دھندلاتا جارہا تھا

وہ میاں بیوی تو پہلے ہی بہت پریشان تھے۔ ان کا کھانا پینا تک حرام ہو چکا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی بات کوئی نہ کوئی آدمی کوئی نہ کوئی عورت سُناجاتی تھی۔ ان کے کان پک گئے تھے۔ اور زینب الگ پریشان تھی۔ ہزار افسانے ہزار کہانیاں بکھری تھیں اور ابھی مقدمہ سر پر تھا۔

زینب اور شیدے کا نام کچہری کے کاغذوں میں ہی نہیں لوگوں کی زبانوں پر بھی اکٹھا آتا تھا۔ وہ دونوں ایک ایسے رشتے میں بندھ گئے تھے جسے اگر وہ توڑنا بھی چاہتے تو لوگ شاید انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے لوگوں کی زبانوں نے زینب کے ہاتھوں میں جیسے شیدے کے نام کی لکیریں کھود دی تھیں۔ زینب کو شیدے نے پوری دنیا میں قید کر دیا تھا۔ وہ اب شیدے سے بھاگ نہیں سکتی تھی اگر وہ بھاگنے کی کوشش بھی کرتی تو لوگ اُسے ڈھونڈھ ڈھانڈ کے شیدے کے آگے ڈال دیتے۔ وہ شیدے سے اٹوٹ رشتے میں منسلک ہو چکی تھی۔

اور یہ سب سوچتے ہوئے برکت چپ تھا ماسٹر محمد دین بھی چپ تھا خاموش تھا "بولیں ماسٹر جی! آپ بھی ان سب کے ساتھ آئے ہیں آپ نے ابھی تک کچھ نہیں کہا؟ آپ کی کیا مرضی ہے؟"

ماسٹر جی نے اپنی آنکھیں اُٹھائیں جو بھیگی ہوئی تھیں

"برکت! جھلیا اب تک جو کچھ یہاں ہوتا آیا ہے کیا وہ تیری اور میری مرضی سے ہُوا ہے جواب بھی ہم اپنی مرضی کی بات کریں۔ بس تو بھی سر ہلا دے یہی سب سے آسان عمل ہے"

اور کسی کو پتا چلا ہو یا نہ چلا ہو۔ برکت ماسٹر جی کی بات سمجھ گیا تھا میں سمجھتا تھا ماسٹر جی تُسی مختلف بات کرو گے۔ پر آپ بھی ماسٹر جی عام انسان ہی نکلے!" برکت نے جیسے بڑی مایوسی سے کہا۔

"ہاں! میں بھی عام انسان ہوں ـــــ میں مختلف نہیں ہو سکتا برکت! یہاں کوئی مختلف نہیں ہو سکتا ـــــ یہاں کون ہے جو سُولی پر چڑھے کون ہر وقت مصلوب ہونے پر تیار ہو!"

اور برکت نے اس پریا کی بات مان لی۔ جس طرح مقدمہ کو واپس لینے والے کاغذات پر زینب نے انگوٹھا لگایا تھا اُسی طرح اُس نے نکاح والے فارم پر بھی انگوٹھا ثبت کیا تھا کہ ان دونوں صورتوں میں دستخط سے انگوٹھا زیادہ معتبر تھا۔ تعلیم تو صرف پڑھنے پڑھانے کے کام آتی ہے۔

شہر آشوب

نذر الحسن صدیقی

سورج کے بلند ہوتے ہوتے اس سنسان فٹ پاتھ کے ارد گرد اچھی خاصی ہماہمی اور چہل پہل شروع ہو جاتی۔ چھوٹے سے قد والا منحنی بنگالی ایک بھد میلی بنیان، گھٹنوں سے اونچا پرانا تہبند نما کپڑا کمر کے گرد لپیٹے گنے کی مشین میں بڑی تیزی اور مستعدی سے گنا پیلتا، رس ایک بڑے تام چینی کے جگ میں جمع ہو جاتا، پھر وہ رس کو گلاس میں انڈیل کر گاہکوں کو تھماتا جاتا اور یہ سب کچھ ماشینی طور پر ڈھلے ڈھلائے انداز میں ہوتا رہتا۔ گرمیوں بھر بنگالی کے ٹھنڈے ٹھنڈے رس کے گلاس خوب چلتے، مگر جاڑا شروع ہوتے ہی کام کا مندا ہو جاتا تو بنگالی مونگ پھلی اور ریوڑیوں کا ٹھیلا سنبھال لیتا۔ اور اس سے تھوڑی ہی دور پر دلی والے کے چاٹ کے ٹھیلے سے اٹھتی ہوئی گرم گرم چٹ پٹی بھاپ سونٹھ کے بتاشوں کی خوشبو فضا میں تیرتی ہوتی اور دوسری طرف مارواڑی کے چھوٹے سے ہوٹل سے آتی ہوئی گرم گرم چائے، ڈبل روٹی، بند بسکٹوں اور پاپوں کی مہک تمام فضا کو بہ یک وقت مختلف النوع خوشبوؤں سے بھر دیتے۔

اور میرے پیٹ میں ان ملی جلی خوشبوؤں نے ابھی ایک عجیب احساس بیدار ہی کیا ہوتا کہ سامنے سے مولوی صاحب اپنی مخصوص چال چلتے فٹ پاتھ کی جانب بڑھتے نظر آتے اور ان کو دیکھتے ہی مجھ پر تو کیفیت ہی دوسری طاری ہو جاتی۔ نورانی سرخ و سپید چہرے پر بھرا ہوا خط، بلند پیشانی گٹھا ہوا بدن، میانہ قد، گرمی ہے تو وایل یا ململ کا سفید براق کرتا۔ ٹانگوں میں علی گڑھ کٹ چھوٹی موری کا پاجامہ، پاؤں میں سلیم شاہی جوتی۔ اور اگر جاڑے ہیں تو موٹے کپڑے کا کرتا اور اس پر روئی کی تگی ہوئی مرزئی اور سر پر کالی رام پوری ٹوپی تو ہر موسم میں نظر آتی جس کے نیچے نماز کا گٹا پیشانی پر دور سے ہی نظر آتا۔ ان کو دیکھتے ہی میں فٹ پاتھ پر پھیلے ہوئے اخباروں کے پاس سے اٹھ کر تعظیماً کھڑا ہو جاتا۔ ادب سے سلام کرتا، وہ بڑے پیار اور شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے، کمر بند سے چابی کا گچھا کھولتے، فٹ پاتھ سے ملحق اپنی چھوٹی سے دکان کے تختے پر چڑھ کر تالے میں چابی لگاتے، دکان میں جاکر دو ایک اگربتیاں سلگاتے اور تختے پر ایک صاف ستھرا کپڑا بچھا کر زور سے بسم اللہ کہہ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلتا تختے پر جاکر ان کے سامنے ادب سے دوزانو بیٹھ جاتا۔ بغدادی قاعدہ کھولتا، وہ ہاتھ کے اشارے سے رکنے کا اشارہ کرتے، اتنے میں مولوی صاحب کو دیکھتے ہی مارواڑی کے ہوٹل میں کام کرنے والا لڑکا نہ جانے کیسے اپنے ہاتھوں میں چائے کے دو گلاس، ایک بڑا بند اور ایک پاپا سنبھالے دکان پر پہنچ جاتا اور 'سلام مولوی صاحب' کہہ کر چائے کا بڑا گلاس اور بند مولوی صاحب کے سامنے رکھ دیتا اور پاپا اور چھوٹا گلاس میرے آگے۔ وہ اشارے سے مجھے چائے پینے اور پاپا کھانے کو کہتے۔

اور یہ روز کا معمول تھا۔ شروع شروع میں ہچکچاہٹ اور تکلف فطری اور لازمی امر تھا۔ مگر کچھ ہی دن میں کچھ تو بابا کے سمجھانے بجھانے اور بہت کچھ مولوی صاحب کی بے پناہ شفقت اور محبت نے ان کے قرب کا ایک ایسا عجیب انوکھا لطیف احساس پیدا کر دیا تھا، جس کو میں اس وقت تو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا، مگر رفتہ رفتہ ایک نیا جذبہ، انس و محبت، عقیدت و احترام کی ملی جلی کیفیات سے پروان چڑھتا رہا۔ چائے میں ڈبو ڈبو کر میں پاپا کھاتا جاتا، بیچ بیچ میں گرم گرم چائے کے گھونٹ لیتا، اور میرے سامنے بیٹھے مولوی صاحب بھی چائے اور بند کے ساتھ یہ ہی شغل کرتے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں ہی اپنے صبح کے ناشتے سے فارغ ہو کر ساو دھان ہو چکے تھے۔

اور اب میں اپنا بغدادی قاعدہ کھول کر پہلے کل کا آموختہ دہراتا، پھر مولوی صاحب نیا سبق پڑھاتے اور ابھی میں نیا سبق یاد ہی کر رہا ہوتا کہ بابا پہنچ جاتے، وہ منہ اندھیرے کے نکلے گھر گھر اخبار ڈال کر واپس پلٹ چکے ہوتے اور ذرا کی ذرا دکان پر مولوی صاحب سے سلام و دعا کے تبادلے کے بعد ٹیکی لیتے اور پھر مجھے ساتھ لے کر چل پڑتے، کیونکہ انہیں دفتر پہنچنے کی جلدی ہوتی۔ مگر اتوار کے اتوار یہ ٹیکی لمبی نشستوں میں بدل جاتی۔ مولوی صاحب کے ساتھ دکھ درد کی ہوتی۔ ماضی کی یادوں، بیتے دنوں کی باتوں میں دونوں کھو کھو جاتے۔ اور ان دونوں کی باتوں کو سن سن کر ہی میں بہت کچھ مولوی صاحب کے بارے میں خصوصاً ان کی ہجرت سے پہلے کی زندگی کی بابت جان گیا تھا اور بابا تو تھے ہی میرے اپنے بابا، پھر بھی ان دونوں کی گفتگو سے کچھ نہ کچھ کوئی نہ کوئی نئی بات بابا کی پچھلی زندگی کے بارے میں بھی کان میں پڑ جاتی۔

مولوی صاحب گڑھ مکتیشر کے اصلی نسلی نجیب الطرفین پٹھان تھے۔ گڑھ مکتیشر میں ان کے والد تاجر عطر تھے۔ کاروبار بہت بڑا اور وسیع نہ تھا، ایسا ہی جیسے چھوٹے شہروں میں معمولی نوعیت اور درمیانہ درجے کا ہوتا ہے۔ تاہم انہیں خوشبوؤں کے طفیل گھر میں خوش حالی کی مہک تیرتی رہتی۔ اور فارغ البالی کی سوگندھ رچی بسی رہتی۔ قنوج اور سہسوان کی تمام مشہور زمانہ خوشبوئیں۔ اصغر علی محمد علی تاجران عطر لکھنؤ، اور اقتدا خان مقتدا خان کے تیار کردہ اعلیٰ درجے کے عطریات، شمامہ، شمامتہ العنبر، حنا، کستوری، مشک، خس، عطر کیوڑہ وغیرہ، موسم کی مناسبت سے خوشبوؤں کا استعمال ہوتا اور اسی حساب سے خرید و فروخت بھی ہوتی۔ جاڑوں میں شمامہ، شمامتہ العنبر، حنا وغیرہ، گرمیوں میں خس اور برسات میں عطر کیوڑہ جیسی خوشبوئیں۔ مولوی صاحب کے والد ولایت علی خان خوشبوؤں کی بڑی اچھی پرکھ اور پہچان رکھتے تھے، ان کے یہاں یہ کاروبار کئی پشتوں سے ہوتا چلا آیا اور یہ پرکھ اور پہچان توریثی انداز میں منتقل ہوتی رہی تھی، پھر اس میں خاندانی شوق کا بھی بڑا عمل دخل تھا، خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد، ہر دور میں خوشبوؤں میں خلقی طور پر دلچسپی لیتا رہا تھا، اور یوں شوق اور خاندانی تجربہ معاملہ ایک اور ایک گیارہ کی میزان پر ہی لگتا رہا۔ اور مولوی صاحب کو بھی یہ شوق ورثے میں ملا تھا، وہ بچپن ہی سے اپنی دکان پر بیٹھتے چلے آئے۔ پڑھائی لکھائی سے جو وقت بچتا، وہ دکان ہی پر گزرتا اور یوں عمر گزرنے کے ساتھ خوشبوؤں کی پرکھ پہچان پیدا ہوتی چلی گئی، بھلا مچھلی کا بچہ بھی کسی سے تیرنا سیکھتا ہے۔

مولوی صاحب نے ابتدائی تعلیم مکتب میں عربی اور فارسی کے عالم سید باقر علی سے حاصل کی تھی۔ اس زمانے کی مکتب کی تعلیم کے بڑے گہرے اور کارگر اثرات مرتب ہوتے تھے اور اگر استاد سید باقر علی جیسا مل جائے تو تعلیم کے ساتھ تربیت بھی جلا پاتی رہتی ہے اور شخصیت اور کردار کا سونا نکھر نکھر کر کندن بنتا رہتا ہے اور ہمارے مولوی صاحب عنایت علی خان، سید باقر علی کے شاگرد اس کی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی تصویر اور مکتب کی تعلیم کا زندہ منہ بولتا ثبوت تھے۔ محبت، ایثار، اخلاص کے پیکر، ہمدرد، نیک دل و نیک طینت، شفیق و مہربان دوسرے کے دکھ کا مداوا کرنے اور درد بانٹنے والے۔ انہوں نے خود بھی ہجرت کے کرب کے علاوہ بڑے دکھ اور غم جھیلے تھے، وہ بتایا کرتے کہ ان کی شادی نوجوانی کی دہلیز پر پہلا قدم رکھتے ہی ہو گئی تھی، مگر ابھی گھر میں شادی کی خوشیاں اور گہما گہمی ماند نہ پڑنے پائی تھیں کہ والد صاحب کی اچانک وفات نے ہنستے کھیلتے گھر میں صف ماتم بچھادی۔ بائیں جانب فالج کا اچانک حملہ جان لیوا ثابت ہوا، چند دن کی ہی علالت کے بعد سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

اور والد صاحب کے جاتے ہی گھر کا بار، دکان کی ذمہ داری بڑا اور اکلوتا بیٹا ہونے کی سعادت کے باعث مولوی صاحب کے نوخیز کاندھوں پر آپڑا۔ مگر یہ کاندھے ناتواں ثابت نہ ہوئے۔ دکان پر ویسے تو باپ کے زمانے ہی سے بیٹھے چلے آئے تھے مگر ایسے ہی جیسے عموماً باپ کی زندگی میں بیٹے بالخصوص اس عمر میں دلچسپی لیتے ہیں۔ مگر یہاں پر بھی سید باقر علی کی تربیت جس نے مولوی صاحب کی شخصیت کی تربیت و تشکیل میں بڑا قوی اور مثبت کردار ادا کیا تھا، حالات کی اس اچانک تبدیلی میں ان کا سہارا بن گئی۔ سید صاحب کی تربیت نے ان کی شخصیت میں عالی حوصلگی اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا عزم ودیعت کر دیا تھا۔ چنانچہ باپ کی موت کے بعد معاشی اعتبار سے تو کسی قسم کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ دکان اور گھر کے تمام تر معمولات اسی ڈھچر پر چلتے رہے، جیسے باپ کی زندگی میں چلتے رہے تھے۔ ہاں تعلیم کا سلسلہ ضرور منقطع ہو گیا، مگر پڑھنے کی لگن کم نہ ہوئی۔ مطالعے کا شوق فزوں تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ مولوی صاحب نے اپنا چھوٹا سا ذاتی کتب خانہ بنا لیا۔ اور اس میں انہوں نے بڑی تگ و دو اور کاوش کے بعد کچھ نادر کتابیں اور چند نایاب مخطوطات بھی جمع کئے تھے اور جب انہوں نے یہ کتابیں اور مخطوطات اپنے استاد سید باقر علی کو دکھائی تھیں تو انہوں نے ان کو دیکھ کر جس خوشی اور مسرت کا اظہار کیا تھا اس کو بیان کرتے وقت مولوی صاحب پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ان کی بات بات اور حرکات سکنات سے خوشی اور مسرت ٹپکتی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں خوشی و مسرت کا یہ اظہار کرب و غم کا روپ دھار لیتا، جب وہ ۱۹۴۷ء کے خون آشام دور کا تذکرہ کرتے۔ آواز گلوگیر ہو جاتی، گلا رندھ سا جاتا اور وہ کوئی اور ہی شخصیت دکھائی دیتے، وہ بتاتے۔

"ان دنوں انسانی خون اور جانوں کی بڑی ارزانی تھی۔ گلی گلی انسانی خون پانی کی طرح بہتا۔ درندے انسانوں کے روپ میں بستیوں میں دندناتے پھرتے اور اس درندگی کے ریلے میں میرا محلہ بھی آگیا۔ اتفاق کہیں، یا قسمت اور مقدر کی خرابی، میں ان دنوں گھر پر بھی نہ تھا۔ عطریات کی خریداری کے لیے قنوج گیا ہوا تھا، واپسی پر اسی کام کے لیے

لکھنؤ بھی رکنا تھا مگر لکھنؤ پہنچتے ہی وہ خبر جب پڑھی تو ہوش و حواس ہی گم ہو گئے۔ اپنے شہر میں بلوے فساد کی خبر تھی اور خبر میں خاص طور پر میرے ہی محلے کی قتل و غارت گری کا تذکرہ تھا۔ ہوش و حواس تو تھے ہی گم، ویسا کا ویسا ہی پلٹ آیا۔ دل دماغ طرح طرح کے وسوسوں کی آماج گاہ، ہول سا کھاتا جب گھر پہنچا تو دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ گھر پر تھا ہی کون، ایک بیوہ ماں، چھوٹی بہن، اور میری نوبیاہتا بیوی۔ گھر کی جلی ہوئی سیاہ دیواروں پر خون کے چھینٹے اور دھبے تھے۔ میرا اپنا خون میرے اپنے ہی گھر کی دیواروں اور آنگن میں بٹا ہوا تھا۔ عورتوں نے سر فروشی سے لڑتے ہوئے اور جان دے کر شاید اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کی تھی۔ گھر جل گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اور سب کچھ بھی بھسم ہو گیا تھا۔ کاغذات راکھ کے ڈھیر تھے اور کاغذات بھی کیسے اور کون سے؟ نادر کتابیں، نایاب مخطوطات کی تحریریں، سب کچھ چند مٹھی راکھ بن گیا تھا۔ اقبال کی شاعری جلی تھی، غالب و میر اور ولی کی غزل جلی تھی، ذوق اور سودا کے قصائد جلے تھے، مثنوی مولانا روم، دیوان حافظ راکھ ہوئے تھے، میرزا رسوا، میر امن جلے تھے، امیر خسرو، رحیم اور کبیر راکھ ہوئے تھے۔ شیخ سعدی کی حکایتیں جلی تھیں، انیس و دبیر کے مرثیے اس المناکی پر نوحہ کناں تھے، غرضیکہ کیا بتاؤں، کیا کیا اور کون کون جلا تھا۔ ایک میں ہی بد قسمت تھا کہ ان سب کے ساتھ جلنے کی سعادت حاصل نہ کر سکا تھا"۔ اور یہاں مولوی صاحب کی آواز شدت و جذبات سے تھر تھرانے لگتی۔

بابا ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپاتے، تسلی دیتے۔ مولوی صاحب آنکھوں میں تیرتی ہوئی نمی کو خشک کرتے متغیر چہرے کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے۔ تھوڑی دیر کے لیے ماحول بڑا ہی بوجھل اور اداس سا ہو جاتا۔ چند ثانیے پژمردہ پژمردہ خاموشی سی طاری رہتی۔ صرف ہم تینوں کی تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں کی آواز دکان میں چھائے سکوت کو توڑتی یا پھر ہمیں اپنے ہی دل کی دھڑکنیں اپنے کانوں میں بازگشت سی بنی سنائی دیتیں۔ پھر مولوی صاحب اِک پہلو سا بدل کر منہ پر ہاتھ پھیرتے، چہرے پر اک ذرا سکون اور بشرے پر قدرے اطمینان کی نشانیاں ابھرتیں اور جیسے اندر سے کوئی قوت انہیں سنبھال لیتی، وہ دوبارہ سلسلۂ کلام شروع کرتے، مگر آواز دھیمی دھیمی سی لہجہ میں بھی ایک عجیب سی ملائمت۔

"پھر بھلا شیخ صاحب، وہاں ٹھہرتا ہی کیوں اور کیسے؟ ——— سب کچھ جل جلا ہی گیا تھا، سو آج یہ چھوٹی سی دکان کل سرمایہ اور کائنات ہے، ایک پرانے شناسا نے بڑی مدد کی اور اس بے سرو سامانی اور بے یار و مددگاری میں بڑا سہارا دیا، ان کی چھت تلے ان کے کوارٹر میں پڑا رہتا ہوں۔ ان کے بچوں اور آپ کے بیٹے کو تھوڑا بہت پڑھا دیتا ہوں، تو ہمہ وقت استاد محترم سید صاحب مجھے سامنے بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ایک بار پھر مولوی صاحب کا چہرہ عجیب سی خوشی سے دمکنے لگتا۔

بابا ایک بار پھر ان کے کاندھوں کو تھپتھپاتے اور پھر دکان کے تختے سے اتر کر دل گرفتگی کے عالم میں بوجھل بوجھل قدموں سے گھر کی جانب چل دیتے، چھٹی کا دن ہوتا، دن خاصا چڑھ جانے کے باوجود سڑکوں پر اور دنوں کی طرح

ابھی زیادہ ہما ہمی نہ شروع ہوئی ہوتی۔ مولوی صاحب نہ جانے کیوں اپنی یہ کہانی بار بار دہرایا کرتے، مہینے ڈیڑھ مہینے پیچھے کسی نہ کسی پہلو الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اسی کہانی کا اعادہ ہوتا اور ہر مرتبہ مولوی صاحب اسی شدید جذباتی کیفیت سے گزرتے اور ہم دونوں باپ بیٹے بھی ہر دفعہ اسی انداز سے متاثر ہوتے۔ اور کبھی کبھار کسی اتوار کو بابا کا ماضی بھی اپنی کہانی دہرا دیتا۔"

یوں تو یہ مجھے معلوم تھا کہ ہم لوگ پاکستان بننے سے پہلے ضلع پیلی بھیت کے ایک قصبے کے رہنے والے تھے۔ بابا کے والد اور میرے دادا شیخ نیاز احمد اس قصبے کے چھوٹی حیثیت کے مگر خوش حال زمیندار تھے۔ مگر یہ بابا اور مولوی صاحب کے درمیان ہونے والے دکھ درد سے ہی پتا چلا تھا کہ یہ چھوٹی سے زمینداری بھی مقدمے بازی کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ دادا کے ایک رشتے کے بھائی تھے ان سے پرانی خاندانی چشمک اور لاگ ڈانٹ چلی آتی تھی، ایک قطعہ اراضی پر ان سے مقدمے بازی چھڑ گئی، اور نوبت ہائی کورٹ تک پہنچی۔ اتنی طویل اور اس اونچے پیمانے کی مقدمے بازی کی دادا کی مالی استطاعت اور حیثیت نہ تھی۔ چنانچہ کھیت، باغات بکنے سے لے کر نوبت بنئے سے قرض لینے تک جا پہنچی۔ پرانے زمانے کے زمیندار تھے، گو چھوٹی حیثیت کے سہی، آن پر مر مٹنے والے۔ سب کچھ داؤ پر لگا بیٹھے، مگر اپنی پوری حیثیت مٹا کر بھی ہاتھ کچھ نہ آیا، بابا کہتے۔

"نتیجہ تو مولوی صاحب وہی نکلا، جو ایسی مقدمے بازیوں کا نکلتا ہے، زمینداری کا بیشتر حصہ تو بک ہی گیا تھا، رہی سہی کسر بنئے کی قرض کی رقم نے پوری کر دی جو سود در سود چڑھتی ہوئی، والد صاحب کے حواس پر ہمہ وقت طاری رہتی۔ میں ان دنوں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، مجھے پڑھانے کا والد صاحب کو بڑا شوق تھا، مگر اب گھر میں معاشی پریشانیوں کا دور دورہ تھا" مقدمہ ہارنے اور پیروی کے طویل بڑے خرچے میں زمینداری کا بڑا حصہ نکل جانے نے ان کی کمر توڑ دی تھی، جو ایک آدھ کھیت سیر خود کاشت کے رہ گئے تھے اس پر خود کھیتی باڑی کرنے کے لیے، زمیندار ہونے کے باوجود خود ہل کی مٹھیا پکڑ لی اور جو باغ بچ رہا تھا اس کی دیکھ بھال پر بھی خود ہی خصوصی توجہ دی، اور کھیتی تو محنت اور دیکھ بھال چاہتی ہے، مٹی سے کچھ پیدا کرنے کے لیے خود مٹی میں ملنا پڑتا ہے۔ باپ کی مدد کے لیے مولوی صاحب مجھ کو تعلیم چھوڑنا پڑی، ان کے اکیلے دم کا یہ بوتا نہ تھا۔ باپ کے کندھے سے کندھا ملائے بغیر بات بھی تو نہ بنتی اور اسی محنت نے کسی کا دست نگر ہونے سے بچا لیا، وہ زمینداری والی بات تو ظاہر ہے ہو ہی نہ سکی تھی جب چاروں کھونٹ گھر بھرا ہی رہتا۔ مگر والد صاحب نے شاید یہ صدمے اپنے دل پر لیے تھے، کسی سے کچھ کہتے تو نہ تھے، کام میں خود کو مصروف رکھتے ہاں میری اسکول کی کتابیں دیکھ کر ان کے چہرے پر اندرونی کرب و دکھ ابھر آتا۔ مجھے ان کے دکھ کا خوب اندازہ تھا، مگر شاید ہم دونوں ہی مجبور تھے۔ اور یہ الفاظ ادا کرتے وقت بابا میری طرف کچھ عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے۔ میں اس وقت ان کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی اس دبی ہوئی تمنا اور آرزو پڑھنے سے قاصر رہتا جو نہ معلوم کب سے ان کے وجود میں پل بڑھ رہی تھی۔ پھر وہ اپنی گفتگو جاری رکھتے۔ "اور پھر مولوی صاحب معاشی تنگی تو شروع ہی ہو

چکی تھی، جب یہ فسادات وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوا تو قدم بالکل ہی اکھڑ گئے، اس رات جب وہ سرزمین چھوڑی، جو ہمارے اجداد کا نہ معلوم کب سے مسکن تھی تو بڑی بے سروسامانی کا عالم تھا۔ فضا میں غضب کی ہیبت اور دھشت تھی، ابھی نصف رات ہی گزری تھی کہ برابر کے گاؤں سے دو تین کوس کے فاصلے پر جو مسلمان اکثریت کا گاؤں تھا، وہاں سے متواتر اور چیخوں کی مسلسل آوازوں نے نہ صرف رات کے سناٹے کا پردہ تار تار کر دیا تھا، بلکہ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں نے جیسے رات کے تاریک پردے پر ہر چیز منعکس کر دی تھی۔ یہ حملے جگہ جگہ دن رات کا معمول تھے، مسلمان ہراس کا شکار تھے، اور قریب کے گاؤں پر حملے نے تو کل مسلم آبادی کو اپنی مکمل گرفت میں لے لیا، ان پر زمین تنگ سے تنگ ہوتی جا رہی تھی، نماز فجر سے پہلے پہلے کل گاؤں خالی ہو چکا تھا۔ مگر وہ جو کہتے ہیں موت کہاں پیچھا چھوڑتی ہے اور جس کو جب اور جہاں جیسے آنی ہے آ کر رہتی ہے" مولوی صاحب تیز رفتار اسپیشل کے تعاقب میں بھی موت بھاگی اور اس کے ہر کاروں نے ایک سنسان بیابان میں اس کو جا لیا۔ مگر شاید ابھی ہمارے لیے موت کے فرشتے کو حکم نہ ملا تھا، سو ہم سب اس کی قدرت سے بچ گئے۔ جس ڈبے میں ہم تھے وہ مہاجرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور جب تلواروں، تیروں، بھالوں اور نیزوں سے مسلح موت کے ہرکارے جھپٹے تھے تو میں بیوی بچے سیٹ کے نیچے دبک گئے تھے۔ کیا بتاؤں مولوی صاحب ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا اور کیسے دیکھ لیا، بس یہ سمجھ لیں کہ ہم لاشوں کے انبار تلے دبے اور خون کے تالاب میں ڈوبے ہوئے تھے، جو چند خوش قسمت نہ معلوم معجزانہ طور پر کیسے بچ گئے تھے ان میں ہم بھی تھے، مگر والد صاحب اس انسانی کاٹ چھانٹ کی بھینٹ چڑھ گئے تھے"... اور اس کے بعد بابا کی آواز بھی مولوی صاحب کی آواز کی طرح شدت جذبات سے کانپنے لگتی، گلا رندھ جاتا۔ ایک مرتبہ ماحول پھر بڑا ہی بوجھل اور سوگوار سا ہو جاتا۔

یہ باتیں جب کی ہیں جب میرا یہ شہر اتنا پھیلا اور بڑھا نہ تھا، فاصلے اتنے نہ تھے۔ دوریاں نہ تھیں قربتیں تھیں چھوٹا سا صاف ستھرا شہر۔ مگر بڑا وسیع القلب۔ آدمیوں کے ہجوم ایسے کہ جن کی سمائی بڑے سے بڑے شہر میں نہ ہوتی بڑی محبت سے اپنی بانہیں پھیلائے اپنے قلب میں سب کو سموتا رہا اور یہ وسیع القلبی بڑھتی ہی گئی۔ ہم ان دنوں جیکب لائین اور جٹ لینڈ لائین کے خط اتصال پر پیچ در پیچ پیلُون کی شکل میں پونٹری ہوئی جھگیوں میں سے ایک جھگی میں رہتے۔ بابا کو ایک سرکاری دفتر میں دفتری کی آسامی پر ملازمت مل گئی تھی۔ آٹھویں درجے تک کی معمولی تعلیم روزی کا ذریعہ بن گئی تھی۔ مگر نوکری کی ماہانہ آمدنی اتنی قلیل تھی کہ پورنہ پڑتی۔ پھر بابا پر ایک اور بار آ پڑا، بابا کے ایک رشتے کی بہن اور ان کی دو چھوٹی بچیاں لٹی پٹی اپنے شوہر اور دو جوان بیٹوں کی جانوں کا نذرانہ دے کر جب پاکستان کی سرزمین پر پہنچیں تو یہاں ان کا کوئی سہارا نہ تھا، سوائے بابا کے اور ان دنوں تو ہر ایک کا دل بڑا وسیع تھا، گھر اور جھگی میں تو سمائی نہ ہوتی مگر دل کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رہتے اور یہ وسیع القلبی ہی ان دنوں نفسا نفسی اور کسمپرسی میں ایک دوسرے کے لیے بڑا سہارا تھی۔ ہر ایک کا درد مشترک تھا اور اس درد کی ٹیس لوگ اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرتے۔ جھگی تنگ تھی، دل تو تنگ نہ تھا۔ آمدنی ہی تو قلیل تھی، مگر طبیعت میں تو کشادگی اور

فراخی تھی۔ بابا جھگی میں جگہ کی تنگی کے باعث رات کو مسجد میں سوتے اور نماز فجر کے بعد اول وقت گھر آجاتے اور منہ اندھیرے ہی نکل پڑتے۔ دفتر کی نوکری کے ساتھ ساتھ انہوں نے صبح میں گھر گھر اخبار ڈالنے کا کام بھی سنبھال لیا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیتے۔ اخباروں کو علیحدہ کرنے میں، میں ان کا ہاتھ بٹاتا۔ ان دنوں اخبار بھی تو چند ایک ہی تھے، اور گھر پر لینے والے بھی محدود ہی تھے۔ جنگ، انجام، ڈان وغیرہ۔ کچھ اخباروں کو میں مولوی صاحب کی دکان کے سامنے فٹ پاتھ پر دن چڑھے تک لے کر بیٹھا رہتا اور یوں بھی کچھ پلے پڑ جاتا۔

دفتر میں بھی بابا کا کام اخباروں ہی سے متعلق تھا، دن بھر بقول شخصے اخبار و رسائل سے دست و گریباں رہتے۔ میں نے دفتر میں، ہمیشہ انہیں اخباروں کے ڈھیروں کے ساتھ کام کرتے دیکھا۔ ہاتھ میں ایک بڑی سی قینچی لیے وہ ڈھیر میں سے ایک ایک اخبار اٹھاتے جاتے، اس کو الٹ پلٹ کر دیکھتے اور اخبار میں جہاں جہاں نشانات لگے ہوتے اس حصے کو کاٹ کر ایک کاغذ پر لیئی سے چسپاں کرتے۔ تمام دن انگلیاں قینچی چلاتیں اور ہاتھ تراشوں کو کاغذ پر چسپاں کرتے اور پھر ان کاغذوں کی وہ ترتیب و سلیقے کے ساتھ الگ ڈھیریاں بناتے جاتے اور پھر یہ ڈھیریاں متعلقہ افسروں کی میزوں پر منتقل ہو جاتیں۔ یوں بابا کی اخبار اور اخبار سے متعلق کام سے دلچسپی بڑھتی گئی۔ پڑھے لکھے تو واجبی ہی تھے، مگر کام کی نوعیت ایسی تھی کہ ہمہ وقت پڑھائی لکھائی ہی سے واسطے میں رہتے۔ کچھ عرصے بعد شام کے بھی ایک دو اخبار نکلنے لگے اور بابا دفتر سے نکل شام کو سیدھے صدر پہنچتے اور اخباروں کے بنڈل ہاتھ میں لیے آواز س لگاتے اخبارات کی سرخیوں کو زور زور سے پکارتے ادھر ادھر چکر لگاتے، یہاں تک کہ دن ڈھلنے لگتا۔ ڈوبتے سورج کی پیلی پیلی دھوپ پر شام کا ملگجا جھٹپٹا غالب آنے لگتا، تو وہ دن بھر کے تھکے ماندے منہ اندھیرے کے نکلے دن مندنے کے بعد بتیاں جلے، اپنی محنت اور مشقت کی اجرت اور اکل حلال کا مختصر سرمایہ اپنے دامن میں سمیٹے گھر پلٹتے۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھاتے، فرش پر پڑی چٹائی پر لیٹ کر اِک ذرا کمر سیدھی کرتے کہ اتنے میں عشاء کی اذان ہو جاتی اور وہ مسجد کی راہ لیتے اور پھر فجر پڑھ کر ہی صبح کو گھر پلٹتے۔

وقت کی رفتار مسلسل اور پیہم ہے، یہ نہ رک سکتا ہے، نہ تھم سکتا ہے، یہ رفتار پل ، سیکنڈ ، منٹ اور گھنٹوں سے گزرتی ہوئی سالوں اور صدیوں سے جا ملتی ہے، یہ سلسلہ جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ وقت کی رفتار یوں ہی قائم رہے گی، وقت نہ ٹھہرتا ہے اور نہ تھکتا ہے اور ہماری اس کائنات کی ہر شے بھی اسی انداز میں منہمک ہے اور اسی حرکت میں زندگی ہے کہ جامد اور ٹھہری ہر شے کو بے جان تصور کیا جاتا ہے۔ وقت کی آغوش میں حالات اور ماحول بدلتے رہتے ہیں، بڑے بڑے انقلاب جنم لیتے ہیں، تہذیبیں عروج پاتی ہیں، معاشرے زوال پذیر ہوتے ہیں اور صرف تاریخ کے صفحات میں زندہ رہ جاتے ہیں۔ حال ماضی بنتا ہے اور مستقبل حال اور پھر یہ حال بھی ماضی کی گود میں آسودہ ہو جاتا ہے۔ عمریں بڑھتی ہیں، یا گھٹتی ہیں، معلوم نہیں؟ شاید نوجوانی میں ہم عمر کو بڑھتا محسوس کرتے ہیں اور پھر عمر کا ڈھلاؤ عمر گھٹنے کا احساس دلانے لگتا ہے اور وقت کی بڑھتی ہوئی رفتار عمر کو تھوڑا اور اپنی لپیٹ میں لیتی ہے تو

پھر 'چاپ' سنائی دینے لگتی ہے اور پھر یہ چاپ ہر چیز پر غالب آجاتی ہے۔ وقت کڑی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح چلتے ہوؤں کو آہستہ خرامی پر مجبور کرتا ہے۔ تناور درخت کی طرح کھڑے ہوؤں کی کمریں جھکی اور خمیدہ نظر آتی ہیں وقت سروں پر برف جماتا ہے، گلاب کی طرح کھلے شاداب شگفتہ چہروں پر جھریاں ڈالتا ہے، گرم سنسناتا خون سرد ہوتا اور پھر یہی وقت نوخیزوں میں چلوؤں گرم گرم خون اچھال اچھال کر ان کو نوجوانی، جوانی کی دہلیز پر کھڑا کر کے اینڈا اینڈا کر چلنا سکھاتا ہے۔ حرارت اور تندی سے زندگی عبارت ہوتی ہے اور زندگی پھیلتی پھولتی ہے، نسلیں پروان چڑھتی ہیں ایک نسل کی جگہ دوسری نسل لیتی ہے، یہ سلسلہ نہ معلوم کب سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ وقت نے مولوی صاحب کی کمر کو خمیدہ کیا، بابا کی کنپٹیوں پر برف اتر آئی، میرے لڑکپن پر جوانی چڑھ آئی، میں مولوی صاحب کے مکتب سے اٹھ کر اسکول پہنچا اور وہاں سے کالج اور یونیورسٹی۔ گھر کے حالات کو بھی وقت نے بدلا، ایک طویل عرصہ تنگ جھگی میں گزارنے کے بعد بابا ایک مختصر سے مگر پکے 'جی' ٹائپ کوارٹر کے الاٹمنٹ کے مستحق ٹھہرے، اخباروں اور رسالوں کا کام بھی بڑھا اور مستقل ہمہ وقت صبح شام حرکت میں رہنے والے ان کے پیروں کو سائیکل کے پیڈلوں اور پہیوؤں کا سہارا نصیب ہوا۔ اور میری تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو اپنا خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آنے لگا۔ پھر میرا یہ شہر بھی پھیلتا بڑھتا گیا، ویرانے آباد ہوتے گئے، تازہ بستیاں آباد ہوتی گئیں، مشرق و مغرب ، شمال و جنوب ہر چہار سمت ایک بڑے کیکڑے کی طرح اس نے اپنے پنجے جمالیے، گہرے اور بہت گہرے۔ شہر کیا انسانوں کا جنگل سا بن گیا، اور اس پھیلتی بڑھتی آبادی، انسانوں کے اس جنگل میں ہر چیز مٹتی گئی، پرانی ہر شے معدوم ہوتی گئی، یہاں تک کہ ان کی شناخت اور پہچان بھی مشکل ہو گئی۔ مگر کچھ لوگ اور ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو نہ وقت بدل پاتا ہے اور نہ بدلتے ماحول اور حالات، وہ کسی چیز کے تابع نہیں ہوتے ہر چیز پر ان کا کردار اور شخصیت غالب رہتی ہے۔

مولوی صاحب ایسی ہی ایک شخصیت تھی، تیزی سے بدلتے حالات ماحول نے ان کے کردار اور شخصیت کو قطعاً متاثر نہ کیا حتیٰ کہ ان کے روزمرہ کے معمولات اور رہن سہن میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ وہی لباس، وہی اطوار، وہی رکھ رکھاؤ، ویسی ہی محبت اور شفقت، ہاں وقت نے قویٰ میں اضمحلال ضرور پیدا کر دیا تھا، بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے مگر جب تک تھوڑی سی بھی سکت رہی دکان پر برابر آتے رہے اسی انداز سے صبح سویرے پہنچ جاتے، چھوٹی سی دکان بھی ویسی کی ویسی تھی، حالانکہ گردوپیش کا حلیہ ہی بدل گیا تھا، ماضی کی کوئی چیز بھی تو اپنی اصلی حالت میں نہ رہی تھی، مگر مولوی صاحب کی دکان اپنے ماضی کے تشخص کو ہر دور میں سنبھالے رہی تھی۔ جب نقاہت اور کمزوری زیادہ بڑھ گئی تو مولوی صاحب نے دکان پر بیٹھنا کم کر دیا۔ صبح کو آتے اور دوپہر سے پہلے پہلے چلے جاتے، دوپہر تک میں کالج سے پہنچ جاتا اور پھر شام کو بابا دیکھ بھال کرتے، مولوی صاحب کی ضروریات ہی کیا تھیں، دکان سے جو کچھ آمدنی ہوتی گزر بسر کے لیے بہت کافی تھی، وہ اب تک اسی کوارٹر میں قیام پذیر تھے جہاں ہجرت کے بعد ان کے ایک شناسا نے انہیں سر چھپانے کے لیے جگہ دی تھی وہ تو نہ معلوم کہاں گئے، مگر مولوی صاحب نے وہ کمرہ نہ چھوڑا،

دوسرے صاحب جو الاٹی آئے، وہ بھی فقط میاں بیوی دو دم تھے، ان کو بھی دوسرا یت تھی اور ایک بزرگ کا سہارا، پھر مولوی صاحب نے حسب توفیق ان کو کمرے کے کرائے کی ادائیگی بھی کی۔ میں نے دکان میں کچھ کتابیں اور رسائل بھی رکھنا شروع کر دئے اور جب مولوی صاحب سے اس کا ذکر کیا تو ان کے کمزور اور نحیف چہرے پر خوشی کی سرخی پھوٹ پڑی، اس دن کچھ علیل بھی تھے، مگر میرے اور بابا کے منع کرنے کے باوجود ترنگ میں بھر کر اٹھ کھڑے ہوئے، دکان تک آئے اور کتابوں رسالوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، پھر ایک مدت کے بعد اپنے کتب خانے کا تذکرہ بھی کیا اور تادیر اسی کی باتیں کیا کئے، مجھے ہدایت کی کہ کتابوں اور رسالوں کی تعداد اور بڑھاؤں۔ یہ مولوی صاحب کی دکان پر آخری آمد تھی۔ روبہ انحطاط صحت روز بروز گرتی ہی چلی گئی، میرا اور بابا کا زیادہ تر وقت اب ان کے پاس ہی گزرتا، میں تو رات گئے تک ان کے ساتھ رہتا۔ اور صبح سویرے پھر پہنچ جاتا اور جب بابا آجاتے تو وہاں سے ہٹتا۔ ہمارے پیچھے کوارٹر کے مالک اکرام صاحب اور ان کی بیگم بھی مولوی صاحب کا خیال رکھتیں۔

اور اس روز تو سہ پہر سے ہی طبیعت بگڑنا شروع ہو گئی تھی، تنفس میں غیر معمولی تیزی تھی، آواز میں نمایاں نقاہت اور کمزوری تھی، میں دکان سے حسب معمول پہنچا تو ان کی متغیر حالت دیکھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا، طبیعت ہول سا کھانے لگی بابا ان کے سرہانے بیٹھے تھے مجھے ان کے چہرے پر ہراس اور پریشانی کی پرچھائیاں تیرتی نظر آئیں، برابر ہی اکرام صاحب بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے الگ لے جا کر بتلایا "ڈاکٹر ابھی دیکھ کر گیا ہے اور حالت تشویشناک بتائی ہے، ہسپتال میں داخل کرانے کو کہتا تھا مگر مولوی صاحب "کسی صورت راضی ہی نہیں ہوتے، تم کہہ کر دیکھو، تمہاری بات مان جائیں گے"۔

میں بڑھ کر مولوی صاحب کی پٹی تک گیا، ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرا ہاتھ اپنے نحیف و نزار ہاتھوں میں بھینچ لیا۔ نیم وا آنکھیں کھول دیں، میرے چہرے پر ایک ٹکٹکی باندھے دیکھا کئے، ان کی دھندلی دھندلی آنکھوں میں ثانیہ بھر کے لیے عجیب سی جوت چمک اٹھی میں نے کہا

"مولوی صاحب ہسپتال چلیں، ڈاکٹر کہہ کر گیا ہے"۔ انہوں نے پھر ایک نظر مجھے دیکھا اور سر سے نفی کا اشارہ کیا اور اپنی انگشت شہادت کو اوپر کی طرف اٹھا دیا، نہ معلوم کس بات کی گواہی اور کس چیز کی شہادت دے رہے تھے، شاید موت کے اٹل حقیقت کی مالک حقیقی کے بلاوے کی ـ ـ ـ مجھے تیزی سے دھڑکتا ہوا دل حلق میں پھنستا ہوا محسوس ہوا۔ مولوی صاحب نے میرے چہرے سے میری اندرونی کیفیت کا اندازہ کر لیا، پھر مجھے ایک صندوق کی طرف اشارہ کیا جو اس مختصر سے کمرے میں رکھی ہوئی چند چیزوں میں سے ایک تھا، مولوی صاحب کی چارپائی کے علاوہ، ایک نماز کی چوکی، دو بید کے مونڈھے تھے، نماز کی چوکی پر ایک مصلیٰ ایک جانب، تہہ کیا ہوا رکھا تھا، اور دوسری طرف رحل پر قرآن پاک تھا، میں نے مولوی صاحب کا اشارہ سمجھ کر صندوق کھولا، مولوی صاحب نے گردن نیوڑا کر آہستہ سے کہا

"کپڑوں کے نیچے ایک کاغذ ہے اس کو نکالو، اور ایک بٹوہ بھی ہے وہ بھی"۔ مولوی صاحب کے چند جوڑے

کپڑے بڑے سلیقے سے تہہ کئے رکھے تھے اور اس کے نیچے ایک اسٹامپ پیپر اور ایک بٹوہ نظر آیا۔ میں نے دونوں چیزیں لاکر مولوی صاحب کو دیں۔ انھوں نے اشارے سے مجھے اسٹامپ پیپر پڑھنے کو کہا۔ میں نے اسٹامپ پیپر کے مندرجات پڑھے۔ یہ مولوی صاحب کی دکان کے مالکانہ حقوق کی میرے نام باقاعدہ قانونی طور پر منتقلی تھی۔ مجھے اپنے وجود میں لرزش خفی کا احساس ہوا۔ مولوی صاحب نے میری داخلی کیفیت کا اندازہ کر کے مجھے اور قریب بلا کر ایک بار پھر میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیا اور ان ہاتھوں کی نرم و گداز گرمی میرے ٹوٹتے بکھرتے وجود میں یوں جذب ہوتی گئی جیسے کسی نیم جان جسم میں زندگی کی نئی لہریں نفوذ کرتی ہیں۔ میری آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ پھر مولوی صاحب نے مجھ سے بٹوہ کھولنے کو کہا، اس میں چند سو روپے تھے۔ مولوی صاحب نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور آہستہ سے نحیف آواز میں کہا۔

"بس بیٹا۔۔۔ اس سے میری آخری رسوم ادا کر دینا"۔۔۔

ایک صندوق، ایک چارپائی، دو بید کے مونڈھے، نماز کی ایک چوکی، ایک رحل قرآن پاک، چند جوڑے کپڑے اس درویش کا کل اثاث البیت تھا اور بقدر اپنے کفن کے چند سو روپے زندگی بھر کا اندوختہ، ایک دکان کل جائیداد جو اپنی زندگی کی ایک طویل مدت کرائے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں گزار کر اسی کمرے سے اپنے آخری سفر کی روانگی کے لیے اپنے اللہ کے حکم کا منتظر تھا۔

بڑھتی ہوئی رات ڈھلنے لگی۔ رات کا اندھیرا صبح کے سپیدے میں گم ہو جانے کے لیے سحر کے اجالے میں دم توڑنے کے لیے آہستہ آہستہ اپنے ناگزیر انجام کی طرف بڑھتا رہا۔ اور اس چھوٹے سے کمرے میں جوں جوں رات ڈھلی مولوی صاحب بھی اپنی آخری منزل سے قریب ہوتے گئے۔ یٰسین شریف کی تلاوت کرتے ہوئے میری آواز آپوں آپ بلند ہوتی گئی۔ بابا اور اکرام صاحب بھی مولوی صاحب کی پٹی سے لگے کلام پاک پڑھ رہے تھے۔ ہم تینوں نے سر اٹھا کر بیک وقت ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ میری نظر کھڑکی سے باہر دم توڑتے اندھیرے میں تیر گئی جس پر سپیدۂ سحر غالب آرہا تھا اور پھر چند ثانیے میں پوری فضا میں سرخی پھوٹ پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے کل کائنات نور سے معمور ہو گئی، میں نے پلٹ کر دیکھا مولوی صاحب کا چہرہ نور ہی نور تھا۔ وہ بڑے دلآویز انداز میں مسکرا رہے تھے اور مسکراتے ہی مسکراتے انہیں ایک ہلکی سی ہچکی آئی اور پھر آنکھیں مند گئیں، ہمیشہ کے لیے۔ وہ ابدی نیند سو گئے۔

مولوی صاحب کیا گئے اپنے ساتھ ایک عہد لے گئے۔ اس دور کے لوگ اب ہمیں اپنے درمیان خال ہی نظر آتے ہیں اور وہ بھی یوں کہ ان کے وجود ان کی شخصیت کو ہی لوگ درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ اب وہ تہذیب ہی اٹھ گئی، وہ اقدار روایات ہی نہ رہیں جن کے یہ بزرگ امین تھے۔ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد کافی دن تک تو دکان کی جانب میرے پاؤں ہی نہ اٹھ سکے اور جب غم کے اثرات کا وقت کے مرہم نے تھوڑا بہت اندمال کر بھی دیا، تب بھی دل گرفتگی کے عالم میں دکان پر پہنچا۔ دکان گرد میں اٹی بے ترتیب سی پڑی تھی۔ یہ سوچ کر کہ کل دکان کو آکر ٹھیک کروں گا، میں

فٹ پاتھ پر آکھڑا ہوا۔ فٹ پاتھ وہی تھا جہاں میرے بچپن نے مولوی صاحب سے درس علم لینا شروع کیا تھا۔ جہاں اخبارات بیچ کر میں معاش اور کسب معاش کے مطلب سے آشنا ہوا تھا جس نے میری زندگی پر بڑے گہرے نقوش مرتسم کئے تھے۔ بیتے دنوں کی دھندلی دھندلی سی فلم آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ تادیر اطراف اور ماحول سے بے خبر یہ فلم دیکھا کیا کہ مسجد سے اذان کی آواز نے ماضی کی اس عکس بندی کا سلسلہ توڑ دیا۔ مسجد میں جا کر نماز مغرب ادا کی تب طبیعت ہلکی اور مائل بہ سکون ہوئی۔

دکان کو میں نے نئے سرے سے جمانا اور ترتیب دینا شروع کیا، نہ معلوم مجھے یہ احساس کیوں ہمہ وقت رہتا کہ یہ دکان ہی زندگی بھر اب روزی کا ذریعہ رہے گی، حالانکہ تعلیم کا سلسلہ بڑے ذوق و شوق سے جاری تھا اور اچھی نوکری کے لیے ساتھ ہی ساتھ تگ و دو بھی کہ اچھی نوکری کی آرزو میرے بابا کے بوڑھے وجود میں جوانی نوجوانی سے پل بڑھ رہی تھی۔ مگر ایم ۔ اے میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کرنے کے باوجود بھی تمام کوششیں سعی لاحاصل ثابت ہوتی چلی گئیں تو مایوس ہو کر چپ بیٹھ رہا۔ جب دوسرا ایم۔ اے کرنے کے بعد بھی ہر دروازے سے ناکام و نامراد لوٹنا پڑا بابا کے وجود میں برسوں سے پلتی بڑھتی آرزو بھی سرد سی پڑ گئی، ان کو بھی صبر ہی کرتے بن پڑی۔ فٹ پاتھ پر اخبارات بیچنے والا بچہ اچک کر مولوی صاحب کی محبت کے طفیل دکان کے تختے پر جا پہنچا اور وہاں جا براجمان ہوا۔ جہاں اس کا درویش صفت مالک بیٹھتا تھا اور یہ شاید مولوی صاحب اور ان کی دکان سے ہی وابستگی کا نتیجہ تھا کہ دکان صرف کتابوں اور رسائل کی دکان میں بدلتی گئی۔ اخبارات کی ایجنسیاں بابا کے پرانے اثر و رسوخ کے باعث مل گئیں اور اب میرا رشتہ کتاب و علم سے یوں جڑ گیا کہ وہ میری روزی کا بھی واحد ذریعہ بن گیا۔ صبح سویرے جب اخبار فروش اخبارات لینے میری ایجنسی پر آتے تو ان میں نوعمر لڑکے بھی شامل ہوتے جو روزانہ مجھے اپنا ماضی یاد دلاتے رہتے۔

دکان کے اطراف میں تبدیلی تو مولوی صاحب کی زندگی ہی میں شروع ہو گئی تھی مگر اب تو یہ جگہ جیسے پہچان ہی میں نہ آتی۔ مارواڑی کے چھوٹے سے ہوٹل کی جگہ ایک ماڈرن ریستوران نے لے لی تھی۔ کالج کی لمبی چوڑی عمارت اور اس کے ساتھ ساتھ کئی کثیر المنزلہ عمارات کو دیکھ کر گمان بھی نہ ہوتا کہ یہ وہی جگہ ہے جس کا نقشہ میری ماضی کی یادوں کے ساتھ میرے دماغ و ذہن پر ثبت ہے اور اسی جگہ پر کیا منحصر میرا یہ شہر ہی ایسا بدلا تھا کہ پچھلی باتیں محض خواب و خیال ہی معلوم ہوتیں، یقین ہی نہ آتا کہ ہم اسی شہر میں رہتے بستے ہیں۔ اب اس شہر میں تیسری نسل پروان چڑھ رہی تھی، مولوی صاحب اور بابا کی تیسری نسل، وہ جس نے یہاں جنم لیا، پلی بڑھی، یہ شہر جس کی جنم بھوم ہے، جو اس کی مادر گیتی ہے۔ وہ نسل اب جوان ہو چکی اور دفتروں، کارخانوں میں سرگرم عمل ہے اور کالجوں یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم بھی، اسی نسل کے گروہ کے گروہ میں کالج کی عمارت اور تمام علاقے میں گھومتے پھرتے دیکھتا۔ ان میں سے کچھ وہ کہ جن کو کتابوں رسالوں سے دلچسپی تھی میری دکان پر بھی آنے جانے لگے تھے، مگر چند ہی سنجیدہ ادب میں دلچسپی لیتے، بیشتر سنسنی خیز کہانیوں اور ڈائجسٹوں کے دلدادہ تھے۔ ان میں فیصل اور سہیل بھی تھے، یہ دونوں دوست ذرا بے تکلف

قسم کے لڑکے تھے۔ بے جھجک ہو کر بات کرتے، اچھی خاصی محفلیں رفتہ رفتہ جمنے لگیں، بحث و مباحثے ہوتے، سیاست پر بات ہوتی، مگر بات زیادہ تر مقامی سیاست اور وہ بھی گروہی اور طلبہ تنظیموں سے متعلق رہتی۔ ان لوگوں کی بات چیت اور مباحث سے مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اس نسل میں اب تلخی سی رچتی بستی جارہی ہے۔ ایک گونا بیزاری کا احساس جس میں سے کبھی کبھی تنفر بھی جھلک جھلک پڑتا، ہر چیز سے نفرت، حتیٰ کہ اپنے ملک تک سے احساس تنفر میں مبتلا اور یہ بڑا ہی المیہ تھا، جس میں یہ پوری نسل مبتلا معلوم ہوتی اور میں کبھی کبھی تنہائی میں اس کے محرکات پر غور کرتا تو ان عوامل کے کسی منطقی نتیجہ پر نہ پہنچ پاتا۔ بابا اور مولوی صاحب کی نسل کا تو خیر سوال ہی نہیں میری نسل بھی جو یہاں پل بڑھ کر جوان ہوئی اس میں بھی کبھی ایسے احساسات نہ پیدا ہوئے، ایک رشتہ تھا، عجیب و غریب رشتہ، ایک غیر محسوس اور غیر مرئی طاقت تھی جو ربط باہمی کا باعث تھی اور وہ غیر محسوس اور غیر مرئی قوت، غیر محسوس طریقے سے ہی معدوم ہوتی چلی گئی، ایک ربط تھا جو مولوی صاحب اور بابا کی نسل اٹھ جانے کے باعث رخصت ہوتا گیا، رشتے ٹوٹتے گئے اور تمام تار و پود بکھرتا چلا گیا، اور اب فیصل اور سہیل کی نسل ٹوٹی اور بکھری ہوئی ہے، خانوں میں بٹی، احساس محرومیوں میں دبی، تلخ، نفرتوں کے آتش فشاں دہانوں پر کھڑی، پھر میں یہ بھی سوچتا کہ احساس محرومی سے کون ہے جو دوچار نہ رہا خود میری مثال میرے سامنے تھی اور مجھ جیسے نہ معلوم کتنے اور تھے، مگر ایسے احساسات تو کبھی نہ پیدا ہوئے اور اس کا جواب ٹٹولتے ٹٹولتے میں ماضی، حال اور مستقبل میں گم ہو جاتا مگر سرا نہ پکڑ سکتا، شاید سرا ہی گم ہو گیا تھا، مگر اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ دوسرا سوال تھا اور دونوں سوال مل کر ایک گتھی بنا رہے تھے جو سلجھتی نہ معلوم ہوتی۔

اور پھر تمام کی تمام فضا میں زہر گھلتا گیا، نفرتوں کا زہر، بارود کا زہر، زہر اور صرف زہر ہی زہر۔ محبتوں کے میرے اس شہر پر آگ و خون کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ روشنیاں بجھا دی گئیں، تاریکیوں نے ڈیرا جما لیا۔ اندھیروں کے پر ہول سائے دن کے اجالوں پر بھی غالب آتے چلے گئے۔ دن سنسان اور ویران اور راتیں مہیب اور ہیبت ناک ہوتی گئیں۔ انسانی خون پانی کی طرح گلی کوچوں میں بہتا، شہر بھر میں چنگاریاں چیختیں آگ کے شعلے بھڑکتے۔ شہر کیا جنگل سا بن گیا، درندوں اور حیوانوں کا مسکن جنگل۔ اور جنگل میں تو جنگل کا ہی قانون چلتا ہے اور اس جنگل کا کوئی نہ کوئی خونی واقعہ روزانہ اخبارات کی زینت بنتا۔ آتشزنی لوٹ مار، اغوا، تشدد اور قتل کی خبروں سے اخبارات کے صفحات بھرے ہوتے۔ بستیوں اور محلوں میں کہرام مچا رہتا اور ایسے میں افواہوں کا زہر فضا میں مزید زہر گھولتا۔

صبح کو اخبار دھڑکتے دل اور ایک ہمہ وقتی مسلسل جاگزیں خوف کے تحت اٹھاتا، ریڈیو اور ٹی وی کی خبروں کے برعکس خبریں ملتیں، صبح کو شہر کی صحیح صورت حال کا علم ہوتا۔ کئی روز سے گھر میں بند پڑا تھا۔ کرفیو لگاتار کئی دن کے بعد کھلتا بھی تو بس سودا سلف لینے جاتا اور پھر گھر میں مقید ہو جاتا۔ کرفیو کے وقفے کے دوران دکان کھولتا بھی تو کس لیے ایسے میں بھلا کون رسالے کتابیں خریدنے آتا، لوگوں کو دو وقت کا چولہا گرم کرنے کی ہی فکر رہتی۔

اس روز بھی رات، اہل محلہ نے جاگ کر گزاری تھی اور یہ تو کئی ماہ سے شہر بھر میں محلے محلے کا معمول تھا، فجر کی نماز

کے بعد سونے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی، دماغ بوجھل ہو رہا تھا اور دل تو ہمہ وقت نت نئے اندیشوں اور وسوسوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔ صبح صادق کے آثار نمایاں ہو چلے تھے، میں چھت پر چلا گیا کہ شاید صبح کی تازہ ہوا سے طبیعت کچھ بہتر ہو۔ ملگجا جھٹپٹا چھٹ رہا تھا اور صبح کا اجالا اپنا مکمل تسلط جمانے والا تھا، میں چند منٹ چھت پر ٹہلا کیا، ہوا کے تازہ جھونکوں سے طبیعت میں قدرے فرحت اور تازگی پیدا ہوئی۔ مشرق کی جانب نظر کی تو سورج کا آتشیں گولا بلند ہو رہا تھا، دھندلی دھندلی سی نظر آنے والی چیزیں صاف اور واضح نظر آنے لگیں، میں نے سڑکوں پر نظر ڈالی، سڑکیں ویران اور سنسان تھیں، کبھی کبھار کوئی پولیس وین یا فوجی ٹرک گزرتا تو سناٹا ٹوٹتا رات بھر جاگنے والا شہر اب تک سویا ہوا تھا۔ چند لمحوں ہی میں مشرق میں سرخی پھوٹ پڑی، لتھڑا لتھڑا سا خونی سورج طلوع ہوا، چاروں طرف فضا سرخ ہی سرخ ہو گئی جیسے آسمان سے خون کی بارش ہو رہی ہو۔ میں گھبرا کے نیچے اتر آیا، اخبار برآمدے میں پڑا ہوا تھا۔ کھول کر دیکھا تو وہی سرخیاں تھیں جن سے میرے شہر کے باسیوں کی نظریں نہ معلوم کب سے عادی ہو چکی تھیں۔ مگر ایک خبر کی سرخی نے میرے وجود میں دوڑتے خون کی لہروں کو تیز کر دیا۔ جہاں میری دکان تھی وہاں کئی کثیر المنزلہ عمارتوں کے جلنے کی خبر تھی، اخبار نے لکھا تھا کہ ان عمارات کے جلنے سے کروڑوں روپے کا نقصان ہوا ہے۔ میری طبیعت ہول سا کھانے لگی، کرفیو کھلنے کے اوقات پر نظر ڈالی، دو گھنٹے بعد کرفیو میں ایک گھنٹہ کا وقفہ تھا۔

اور کرفیو کھلتے ہی میں نکل کھڑا ہوا، شہر کی سڑکوں پر ہجوم تھا، ایسا ہجوم کہ چلنا دوبھر، میرے شہر کی سڑکیں تو ہمیشہ ہی پر ہجوم رہتیں، مگر یہ ہجوم وہ ہجوم نہ تھا، اس میں فوجی ٹرک شامل تھے، پولیس کی گاڑیاں تھیں وہ کہ جن پر جوان مشین گن تانے کھڑے تھے، لوگوں کے چہروں پر خوف تھا، پریشانی تھی، کھانے پینے کی دکانوں پر بڑا رش تھا پیٹ کی آگ کو تو ہر صورت بجھانا ہی پڑتا ہے۔ میں ماحول اور اطراف سے لاپروا بڑھتا رہا، فضا میں دھوئیں، آگ، خون اور بارود کی بو تھی اور اب اس شہر کی آلودہ فضا کو ان نئی آلودگیوں نے اور زیادہ آلودہ بنا دیا تھا، میں جوں جوں دکان کی طرف بڑھتا رہا، میرے دل میں پلتے بڑھتے خوف میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور جب دکان کے قریب پہنچا تو چلنا دوبھر ہو گیا، قدم ہی نہ اٹھتے۔ چاروں طرف عمارتیں جلی ہوئی تھیں۔ کالے دبیز دھوئیں میں اٹی ہوئی۔ ملبوں کا ڈھیر اور چاروں طرف دھوئیں اور سیاہی کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں کے سامنے بھی تاریکی چھانے لگی۔ دل پر جبر کر کے دکان کی طرف دیکھا، مگر وہاں تو اب کچھ بھی نہ تھا۔ تاریکی تھی اندھیرا تھا بس! اور تاریکی کی اس چادر کو چیرتا میں فٹ پاتھ کے دوسرے کنارے جا کھڑا ہوا۔ نہ معلوم کیسے، جیسے ایک انجانی قوت مجھے کشاں کشاں کھینچ کر وہاں لے گئی جس جگہ سے بچپن، لڑکپن، نوجوانی، جوانی ہر دور کی یادیں وابستہ تھیں۔ جو مولوی صاحب اور بابا سے وابستہ یادوں کا گہوارہ تھی، مگر وہ جگہ اب راکھ اور ملبے کا ڈھیر تھی اور میں اپنی اس خاکستر کائنات پر یوں کھڑا تھا جیسے کوئی اپنے ہمدم دیرینہ اور پیارے کی میت پر اور اس المیے پر میرا پورا وجود نوحہ کناں تھا۔ دلدوز چیخیں تھیں کہ میرے اندر سے پیہم اٹھ رہی تھیں مگر میرا حلق تو بند سا تھا، نطق جواب دے چکا تھا، اندر ہی اندر سب کچھ لاوے کی طرح پک رہا تھا جو میرے بدن کو ہی جھلسائے

دے رہا تھا۔

اور میں اپنے جلتے بجھتے وجود کو سنبھالے، دکان کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا، جلے ہوئے صفحات کے ڈھیروں کو اپنے قدموں تلے روندنے سے بچاتا کہ میرے نزدیک تو جلے ہوئے لفظوں کی بھی حرمت تھی۔ دوکان کے اردگرد آسمان کی ہمسری کرتی ہوئی بڑی بڑی عمارات زمین بوس ہوگئی تھیں وہ کہ جن کے جلنے اور کروڑوں کے نقصان کی خبر صبح اخبارات میں چھپ چکی تھی، مگر یہ تو ایسا نقصان عظیم تھا جس کا اندازہ روپے پیسے کی مالیت میں لگانا ممکن نہ تھا۔ موپساں، چیخوف، جیمس جوائس، بارڈی ہیمگنوے اور نہ معلوم کس کس کی کیسی کیسی کہانیاں جل کر بھسم ہوئی تھیں۔ غالب ،میر، اقبال، فیض و جگر، شیلے، کیٹس کی شاعری جلی تھی۔ کرشن کا "ان داتا" اپنے ان داتا کے چرنوں میں گراگڑگڑا گڑگڑاکر فریاد کر رہا تھا۔ شہاب کا "یا خدا" اپنے خدا کے سامنے دونوں ہاتھ جانب آسمان اٹھائے اپنے وجود کی راکھ کو دونوں ہتھیلیوں سے فضا میں اڑا اڑا کر اپنے مالک ارض و سماء کے سامنے گریہ کناں تھا۔ ہیزلٹ، ورجینیا وولف، روزمیکالے کے Essay راکھ کے ڈھیر تھے برٹینڈرسل کی فکر و دانش خاک ہوئی تھی ۔ شیکسپیئر کا ایک ایک کردار حتیٰ کہ Tall Staff بھی اس تباہی و بربادی پر اشکبار تھا۔ ادب اور ادب کی ہر صنف جل چکی تھی ۔۔۔

اور میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ ہیں سفید ریش، نورانی چہرہ اور وہ ملبے پر بیٹھے اس خاکستر کو کریدتے ہیں۔ جلے ہوئے صفحات راکھ کے ڈھیر سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نکالتے ہیں۔ چہرے پر بڑا ہی ملال اور آنکھوں میں کرب ہی کرب، بڑی حسرت و یاس سے ایک ایک جلے ہوئے صفحے کو دیکھتے ہیں، کرب انگیز آنکھوں میں آنسو چھلک چھلک آتے ہیں اور پھر مایوسی کے عالم میں اس کو ملبے میں ڈال دیتے ہیں۔ میں عالم بے خودی میں، بڑے والہانہ انداز میں ان کی جانب بڑھتا ہوں وہ کشش، شخصیت کا وہ سحر جو میرے بچپن سے لے کر ان کے تادم واپیس مجھ پر طاری رہا، مجھے ان کی جانب کھینچتا ہے۔ اور جب میں بڑھ کر وہاں پہنچا تو وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ ہاں ایک تصویر نظر آئی جو ملبے پر جلے ہوئے کاغذات کے ڈھیر پر پڑی تھی۔ ایک مشہور پرانے اخبار کے پہلے صفحے پر چھپی ایک عجیب اور انوکھی تصویر، جس کو میں نے نہ معلوم کیوں اور کس جذبے کے تحت محفوظ کر لیا تھا۔ اخبار کا وہ صفحہ تو پورا چاروں طرف سے جل گیا تھا، مگر تصویر پوری کی پوری صحیح سلامت تھی جیسے کسی نے اخبار سے تراش کر فریم کرانے کے لیے رکھ دی ہو۔

اور پھر میں نے اس انوکھی تصویر کو فریم کرا کے اپنی خاکسترِ کائنات کے اوپر ٹانگ دیا، اس امیدِ موہوم پر کہ میرے شہر کے باسی اپنے ہی شہر کے ایک شہر خموشاں کی تصویر سے کچھ درس لے سکیں۔

تصویر جو پکار پکار چیخ چیخ کر میرے شہر کے زندہ چلتے پھرتے لوگوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہی تھی۔۔۔

"اے نطق کی غلام اولاد آدم دیکھو اس شہر خموشاں" کی تصویر کو کہ جہاں دو ازلی و ابدی دشمن ساتھ ساتھ رہتے اور جب ان میں سے ایک نئی نسل نو جنم دینے کے بعد چل بسا تو دوسرے نے اس کی نئی نسل کو اپنی نسل کے ساتھ پروان چڑھانے کا بیڑا اٹھالیا۔ دیکھو اس خونخوار جانور کتیا کو جو اپنی جبلت کے خلاف اپنے بچوں کے ساتھ اس شہر خموشاں کی

باسی بلّی کے بچوں کو بھی دودھ پلاتی ہے، جن کی ماں ان کو جنم دے کر چل بسی ہے۔ آؤ اور دیکھو کہ کس طرح یہ کتیا اپنے وجود سے زندگی نچوڑ نچوڑ کر اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ حیات بیز قطرات ننھے ننھے آنکھیں موندے بلّی کے بچوں کے منہ میں بھی ٹپکا رہی ہے"۔

اور میں نے دیکھا کہ آدمیت اور انسانیت کے داعی جوق در جوق آتے ہیں، اس تصویر کو دیکھتے ہیں اور سر جھکا کر سوچ میں گم چلے جاتے ہیں ۔۔۔ نہ معلوم کس سوچ میں گم؟ ۔۔

کھنڈر

شمشاد احمد

صبح کے آٹھ بج رہے تھے لیکن ابھی تک بارش کی وجہ سے ہر چیز پو پھٹنے کے اندھیرے اجالے میں لپٹی ہوئی تھی ۔ بڑے بڑے قطرے لال رنگ کے فرش پر گر گر پھٹتے تو یوں لگتا جیسے ہزاروں پریاں سفید گھنگریاں پہنے ناچ رہی ہیں ۔

پروفیسر اجمل رات بہت دیر سے سوئے تھے وہ ایک ناول پڑھ رہے تھے ۔ ناول بڑا رومانوی تھا ذہن کی صحرا وادیوں میں بانجھ یادوں کے جھکڑ چلتے رہے ۔ ناول ختم ہوا تو صبح کے دو بج رہے تھے ۔ "کوئی بات نہیں ۔ کونسا صبح کالج جانا ہے" انہوں نے سوچا ۔

پھر وہ غسلخانے میں آ گئے ۔ لال لال سوجھی آنکھوں کے پپوٹے ہٹا ہٹا کر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارے ۔ واپس آ کر میز پر چشمہ ٹٹولا ۔ موٹے موٹے آتشی شیشوں کو کرتے کے دامن سے صاف کیا پھر اسے میز پر سجایا ۔ لائٹ بجھائی اور اپنی ناکام محبت کی سیڑھیوں پر قدم قدم اوپر چڑھتے ہوئے کہکشاں کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے ۔

نجانے کس وقت نیند میں انہیں ایک ہلکے ہلکے بھرپور شور کا احساس ہوا جیسے ساری فضا شہد کی مکھیوں سے اٹ گئی ہے اور یہ مکھیاں ہر طرف شہد برسا رہی ہیں ۔

بہت دیر بعد اچانک بجلی چمکی پھر ایک زور دار لڑھکتا ہوا کڑاکا ہوا ۔ بارش کھل کر برسنے لگی ۔ پروفیسر کو سوتے میں محسوس ہوا جیسے اسکے جسم کے سارے کے سارے جوڑ ایک ساتھ چیخ اٹھے ہیں اور اس دھماکے نے پروفیسر کے حسین جزیروں پر لرزتے ، کھانستے بڑھاپے کی دھند پھیلا دی ہے اور واپس زندگی کے غلیظ گاڑھے اور بدبودار کیچڑ میں آن گرے ہیں ۔

چشمہ ڈھونڈتے ہوئے ان کے کانوں میں بارش کی مسحور کن موسیقی برسنے لگی ۔ پھر ایک ٹھنڈا تازہ ، زندگی سے بھرپور گستاخ ہوا کا جھونکا نم رسیدہ پنکھے کے منہ پر ایک زور دار طمانچہ مار گیا ۔

پروفیسر کو موسم گرما کی بارش سے بڑا خوف آتا تھا ۔ ننھی ننھی بوندیاں اسکے دل کو گدگدانے لگتی تھیں ۔ عرصہ سے گہری نیند سویا ہوا جسم بغاوت پر اُتر آتا تھا اور اسکی رگ رگ میں انجھی انجھی میٹھی کھجلی ہونے لگتی تھی ۔ چپکے سے ، چھپتے چھپاتے ایک شریر انگڑائی آگے بڑھی اور پروفیسر پر انجانے میں حملہ کر دیا ۔ پروفیسر حیران رہ گیا ۔ اتنی بھرپور انگڑائی لئے اسے ایک زمانہ گزر گیا تھا ۔ بائیں کندھے کے اوپر گردن کی جڑ میں چبھن دار درد کا سوچ کر وہ اکثر انگڑائیوں کو نامکمل چھوڑنے کے عادی ہو چکے تھے ۔

اس انگڑائی کے عذاب سے وہ سہم گئے ۔

وہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے جوانی کی سخت کھردری چٹانی کو اچھی طرح لپیٹ کر ایک کونے میں کھڑا کر دیا ہے ۔ اور اچانک آج یہ لپٹی ہوئی چٹانی دھم سے زمین پر گری اور ظالم ایک ہی لمحے میں پوری کی پوری کھل گئی ہے پروفیسر اجمل پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی جیسے میدان جنگ میں دشمن کی فوجیں بڑھی چلی آ رہی ہیں اور دم بھر میں وہ انہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیں گی ۔

انکی انگشت شہادت فضا میں لہرانے لگی جیسے وہ اس فوج کو آگے بڑھنے سے روک رہے ہوں پڑوس کی چھت پر چہلیں کرتے بچے انہیں دیکھ کر تالیاں بجاتے ہوئے قہقہے لگانے لگے ۔ پروفیسر کے چہرے پر کھچاؤ آ گیا اور منہ پر دم بھر کو جو تازگی نے دستک دی تھی ۔۔۔ریوں کے تاریک جال میں گم ہو گئی ۔ انہوں نے سختی سے سر کو ایک جھٹکا دیا پھر ایک تھکی تھکی ، بوجھل مسکراہٹ نے انہیں گھیر لیا ۔ انہوں نے اپنے چشمے کو رگڑتے ہوئے سوچا ۔

"ابھی دھوپ نکل آئے گی — سب ٹھیک ہو جائے گا" ۔

لیکن کڑکڑاتی دھوپ نہ نکلی ۔ ساری فضا مسلسل ایک حیات بخش ، منچلے اندھیرے اجالے سے مرکب رہی ۔

پروفیسر نے بے بسی سے چاروں اطراف کا جائزہ لیا اور پھر دونوں ہاتھوں میں سر تھامے اپنے کمرے کی طرف لوٹ آئے ۔

"ابھی ناشتا تیار کرنا چاہئیے" ۔

پھر بے ساختہ ایک آواز ان کے دل کے کواڑوں پر دستک دے گئی ۔

موسم کتنا خوشگوار ہے!

پروفیسر کو محسوس ہوا ۔ جیسے اس نے خود اپنے آپ کو ڈس لیا ہے ۔ اسے اپنے آپ سے شدید نفرت ہونے لگی ۔ وہ ایک کینچوا ہے جو مٹی چاٹ رہا ہے ۔

انہوں نے جلدی سے ہیٹر آن کیا ۔ کیتلی اٹھائی لیکن کیتلی ان کے ہاتھ سے گر کر فرش پر لڑھکنیاں کھانے لگی ۔

پروفیسر جھک کر اسے اٹھانے لگے تو ان کی نظریں پلنگ کے نیچے پڑے ہولڈ آل پر جا رکیں ۔

وہ لپک کر ہولڈ آل پر جھپٹے ۔ اسکارپ ایک جھٹکے سے کھولا جلدی جلدی ہاتھ چلا کر کچھ تلاش کرنے لگے ۔

ان کے ہاتھ میں خطوط کا ایک پلندہ تھا ۔ انہوں نے بے صبری سے ریشمی دھاگے کی گرہ کھولی ۔ چمکتا ہوا گہرے گلابی رنگ کا کور (cover) اتار کر ایک طرف رکھا ۔ خوش بو کا ایک سیلاب لڈ پڑا اور سارا کمرہ اس خوشبو میں ڈوب گیا ۔

پروفیسر کو اس دوران ہمیشہ محسوس ہوتا تھا جیسے ان کا یہ کمرہ ایک مقدس خانقاہ ہے اور وہ اسکے راہب — وہ برسوں سے یہاں بیٹھے ہیں ۔ انکے چاروں طرف خوشبودار دیئے جل رہے ہیں ۔ پورے کمرے کی فضا بوجھل بوجھل خوشبو بن گئی ہے ۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میز کے قریب آئے ۔ خط میز پر سجائے اور خود کرسی پر مؤدب بیٹھ گئے ۔

ہر خط میں جیتی جاگتی رضیہ بول رہی تھی پروفیسر خلاف آنکھوں میں ڈبکیاں کھا رہا تھا ۔ تیز تیز نیم گرم گیلے گیلے سانسوں کو اپنے چہرے پر چومتا محسوس کر رہا تھا ۔ کنوارے مچلتے جسم سے اٹھتی ہوئی بیباک مہک سے اپنا جسم سہلا رہا تھا ۔

رضیہ ان کی پہلی اور آخری محبت تھی ۔

پروفیسر دراصل لڑکی کو اپنی طرف راغب کرنے کے نفیس فن سے قطعی طور پر ناآشنا تھا ۔ جب کبھی کسی لڑکی کی نگاہیں ان کی طرف اٹھتیں تو ان کے سر سے پاؤں تک پورے 440 وولٹ کی کرنٹ گزر جاتی ۔ جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا پٹھے ستار کے تاروں کی طرح رقص کرنے لگتے ۔ آنکھیں زمین میں سوراخ کرنے لگتیں ۔

پروفیسر پر جوانی اچھی خاصی آئی تھی ۔ کئی لڑکیاں ان کی طرف متوجہ بھی ہوئیں ۔ پروفیسر کے دل میں بھی دہکتے ہوئے انگاروں سے چنگاریاں اٹھیں لیکن وہ پیاسے صحرا کی طرح بارش کے ایک آدھ قطرے کی آس لئے بس سلگتا رہا ۔

وہ نیا نیا لیکچرار ہوا تھا ۔ مصیبت یہ ہوئی کہ جہاں اسکی پہلی تقرری ہوئی وہ مخلوط تعلیمی ادارہ تھا ۔ پروفیسر کے دل میں تو پھلجھڑیاں چھوٹیں لیکن ساتھ ہی بے شمار خدشات نے بھی سر اٹھایا ۔ وہ سامنے بیٹھی جوانیوں کے سامنے بولے گا کیسے !

پروفیسر نے اسکا حل نکال لیا ۔

وہ ناک کی سیدھ میں ، سامنے کی دیوار پر لکھے ہوئے اوٹ پٹانگ جملوں پر نظر جمائے ، خوبصورت شعروں کو کھدیڑتا رہا ۔ کبھی کبھار اسکی نگاہیں بھٹک بھی جاتیں اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے قدرت کے خزانوں کی لپٹیں ان کے کانوں کو سہلانے لگتیں ۔

ایک دن وہ کلاس سے باہر آئے تو ایک آواز نے انکا تعاقب کیا ۔ کمزور سی ڈری ڈری جیسے فطرت کے سامنے کھڑی معاشرے کی خار دار باڑ کے پیچھے سے آ رہی ہو ۔

"سر مجھے اس شعر کی سمجھ نہیں آئی" حوا نے روایتی سیب آدم کو پیش کیا ۔

آدم نے مشیت ایزدی سمجھے بغیر سیب کھا لیا ۔

رضیہ سامنے کھڑی تھی ۔ عام سی سوکھی دبلی لڑکی جیسے لڑکیاں عمر کے اس دور میں ہوتی ہیں ۔ بے بُور ۔ بے پھل ٹہنیاں دہکتی ہوئی آنکھیں اپنے اندر تخلیق کی ساری امنگ لئے ہوئے ۔

پروفیسر نے کھڑے کھڑے اس شعر کا بے ربط ترجمہ کر دیا ۔

لڑکی چلی گئی لیکن جاتے ہوئے اسکے نیم وا ہونٹوں پر سرگوشی کرتی ہوئی مسکراہٹ نے پروفیسر کے دل میں چھپے سینکڑوں آتش فشاں پہاڑوں کے منہ کھول دیئے ۔

پروفیسر کا دل کھلا سمندر تھا — شدت سے کسی کشتی کا منتظر — اس نے اکثر دور سے بادبانوں کا نظارہ کیا تھا ۔ کشتی قریب آنے پر وہ اپنے آپ کو سمندر کی لہروں میں چھپا لیا کرتا تھا اور کشتی بھی اپنا رخ پلٹ لیا کرتی تھی ۔

لیکن یہ کشتی انکا مقدر بن گئی ۔ جوانی کے تند و تیز طوفانوں کے زور پر پروفیسر کے سینے تک آپہنچی ۔

دونوں طرف سے خطوط کا تبادلہ ہوتا رہا ۔ روائیتوں نے جوانیوں کو کھل کھیلنے کا موقع نہ دیا ۔ لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں صدیوں پر محیط ملاقاتیں ہوتی رہیں اور پھر گرمیوں کی تعطیلات آگئیں ۔ دلوں کے کھلے دریچے بند ہو گئے اور ان سے آنے والی تازگی بخش ہوائیں تھم گئیں ۔

رضیہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ تعطیلات کے دوران ہر جمعرات کو لائبیریری آ جایا کریگی اور اسطرح ملاقات ہو جایا کریگی ۔

پہلی جمعرات ایک ہفتہ بعد — کروڑوں ، اربوں لمحوں کے بعد آئی ۔ پروفیسر خوابوں اور خیالوں کی حسین مہکتی ہوئی روشوں پر چہل قدمی کرتے ہوئے صبح ہی صبح کالج پہنچ گئے ۔

ایک ایک حرکت پر ایک ایک آہٹ پر پروفیسر کے ذہن میں ہزاروں جھٹکے لگے اور اس کا دل خون کے دباؤ سے پھٹنے لگا ۔ سورج سوا نیزے پر آکر رکا رہا ۔ پھر اس نے تھک کر سر جھکا دیا ۔ لائبیریری کی کھڑکیاں بند ہونے لگیں ۔

پروفیسر باہر آگئے ۔

لو کے تھپیڑوں نے انکا استقبال کیا ۔ لیکن انکے اندر — ایک ایک خلیہ سو سو بار جہنم کی آگ میں پہلو بدل رہا تھا ۔ ان کے گوشت کا ایک ایک ریشہ سلگ رہا تھا ۔

پھر ان کے اندر کا پروگرام شدہ کمپیوٹر ایک دھماکے سے پھٹ گیا اور وہ خود مختار ہو گئے ۔ معاشرے کے جبر کی بھاری زنجیریں پگھل گئیں ۔

وہ رضیہ کے دروازے پر کھڑے تھے ۔

رضیہ کا چھوٹا بھائی باہر آیا ۔ انہوں نے ایک کتاب اسکی طرف بڑھائی ۔ میں رضیہ کے کالج میں پڑھاتا ہوں ۔ اُن کی یہ کتاب میرے پاس رہ گئی تھی ۔

"کتاب پروفیسر کے ہاتھ سے گر پڑی ۔ ان کے رگ و ریشوں سے زندگی جیسے نچڑ گئی ۔ وہ زمین پر بیٹھ گئے لڑکا اشک بار آنکھوں سے انہیں گھورنے لگا ۔

رضیہ کو رخصت ہوئے آج تیسرا دن تھا ۔

تیسری دنیا کے ملکوں کے حصے میں اور دکھوں کے علاوہ بیماریوں کے تحفے بھی کچھ زیادہ ہی آتے ہیں دوپہر کو ٹھیک ٹھاک کھانا کھایا سہ پہر کو طبیعت بگڑی ۔ دہکتی ہوئی جوانی ۔ مستقبل کی امین زندگی — شام گہری ہوتے ہوتے مٹی ہو گئی اور دوسری صبح اس بیکار مٹی کو مٹی کے سپرد کر دیا گیا ۔

پروفیسر سارا دن ساری رات بس چلتا رہا — اسے محض اتنا احساس تھا کہ اسکے پاؤں زمین کو چھو رہے ہیں اور اسکا جسم حرکت میں ہے۔

صبح روشنی پھیلنے لگی لیکن پروفیسر موت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔

بھوک، تھکن اور کمزوری اسے گھر کی دہلیز تک لے آئیں لیکن پروفیسر ہفتوں بستر سے نہ اٹھ پایا۔ اسکے اندر مہکتی ہوئی اگربتی بجھ گئی۔ اس نے جوانی کی تنی ہوئی سخت چٹائی کو لپیٹ کر کمرے کے ایک کونے میں کھڑا کر دیا تھا۔ کبھی کبھی فطرت کے تقاضے اس چٹائی کو ہلکے سے کہنی مار دیتے اور چٹائی زمین پر گر کر پوری کی پوری کھل جاتی۔ لیکن پروفیسر جھٹ سے اسے اٹھاتا اور محبت کی ڈوریوں سے باندھ لیتا۔ لیکن آج۔ بارش۔ "ٹھک۔ ٹھک۔ ٹھک" دروازہ بے رحم دستک سے بلبلا اٹھا۔

صبح سویرے جب یہ دستک ہوتی تھی تو پروفیسر کی جان نکل جاتی تھی۔ اسکے اندر بجھی ہوئی اگربتی جھپاکے سے آگ پکڑ لیتی تھی اور اسکے پورے دماغی نظام کا تار پود بکھرنے لگتا تھا۔

پروفیسر سہمے سہمے دروازے کی طرف بڑھتے اور چٹخنی کھول کر ایک طرف ہو گئے تاکہ غلاظت کا یہ ریلا گزر جائے اور وہ محفوظ رہ سکے۔ لیکن غلاظت کا یہ ریلا حسب معمول وہیں رک گیا۔

یہ بالی تھی۔ تیس پنتیس ۳۵ سال کے پیٹے میں جب عورت سخت کیری کی بجائے پکا ہوا، شہد بھرا آم بن جاتی ہے۔

بالی محلے بھر کے اوپر کے کام کرتی تھی۔ عرصہ ہوا اسکا مفقود شوہر اپنی عزت کا ٹوکرا سر پر اٹھا کر ایسا روپوش ہوا کہ پھر خبر ہی نہ ملی۔

محلے کے منچلے اس پر اکثر آوازیں کستے۔ عورتیں اسے چلتا پھرتا ڈائنامائٹ سمجھ کر کھا جانے والی نظروں سے گھورتیں۔ لیکن بالی کبھی جواب نہ دیتی۔ وہ صرف مسکراتی رہتی۔

اسے اکثر گھر بیبیوں پر ترس آتا تھا۔ ایک ہی تھالی خواہ وہ سونے ہی کی کیوں نہ ہو اور اس میں من و سلویٰ ملتا ہو — انسان اکتا جاتا ہے۔

اُڑتی اُڑتی یہ خبریں پروفیسر تک بھی پہنچیں اور انہوں نے کئی بار سوچا کہ اسے نکال باہر کریں اور کوئی ملازمہ رکھ لیں — لیکن پروفیسر کے دل کا چور بڑا زور آور تھا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔

بالی آتی رہی اور پروفیسر اس سے خوف کھاتا رہا۔ اپنے کو سہارا دینے کے لئے رضیہ کے خوشبودار خطوط پڑھتا رہا۔ لیکن بالی زندگی تھی — جب تک وہ اسکا وجود تھا وہ موت کی شکست تھی۔ پروفیسر نہ چاہتے ہوئے بھی کچھے چلے آتے اور ڈانٹ لگاتے۔

"بالی برتن ٹھیک سے صاف کیا کرو۔"

جواب میں بالی کے ہونٹوں سے شروع ہونے والی مسکراہٹ اسکے سارے جسم پر محیط ہو جاتی اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں زندگی کے سارے خزانے پیش کر دیتی ۔ پروفیسر جلدی سے پلٹ جاتا اور رضیہ کے خطوط کی مٹی چاٹنے لگتا ۔

بالی کچن میں مصروف تھی ۔ پروفیسر سے نہ رہا گیا ۔ وہ لرزتے قدموں اور اچھلتے دل سے دروازے تک آیا ۔ بالی پھیل کر بیٹھی تھی ۔ اسکا دوپٹہ ایک طرف پڑا تھا ۔ اسکی کھلے پائینچوں کی شلوار پنڈلیوں سے اوپر اٹھی ہوئی تھی — اور ظالم بوندیوں نے اپنا ستار پھر سے اٹھا لیا تھا ۔

پروفیسر نے زندگی کی یہ بھرپور نمائش اتنے قریب سے پہلی بار دیکھی تھی ۔ اسکی آنکھوں میں نئی بینائی عود کر آئی ۔ اسکا ذہن اس تپش سے سلگنے لگا اور اسکا دل چاند مانگنے والے بچے کی طرح آسمان کی طرف لپکا ۔

زندگی جیت گئی ۔ پروفیسر ہار گئے ۔"

وہ شرمندہ شرمندہ ، بوجھل ٹانگوں کو دھکیلتا ہوا کمرے میں آیا ۔ کھلے خطوط پر ایک نظر ڈالی اور پھر انہیں ایک ایک کر کے پھاڑنے لگا ۔ تھوڑی دیر میں خالی ٹوکری بھر گئی ۔

بالی خاموشی سے آئی اور ٹوکری اٹھا کر باہر کوڑے کے ڈھیر پر خالی کر لائی ۔ اس نے ایک نظر پروفیسر پر ڈالی اور مسکراتی ہوئی کل پھر آنے کے لئے چلی گئی ۔

پروفیسر نے کھلی کھڑکی سے باہر جھانکا ۔

آسمان کا چہرہ ابھی تک گہرے بادلوں میں چھپا ہوا تھا ۔ ننھی ننھی بوندیوں پر جوانی آنے لگی تھی ۔ زندگی بخشنے اور پھر اسے پروان چڑھانے والی بھرپور بارش پھر شروع ہو گئی تھی ۔



علّامہ اقبال کے ایک نئے مکتوب الیہ

سید مظفر حسین برنی

کلیات مکاتیب اقبال کی تدوین و ترتیب میں بڑے عجیب و غریب انکشافات ہوئے ۔ ان میں سے چند اتنے ہی پراسرار ہیں جتنے فراعنۂ مصر کے پوشیدہ دفینوں کی دریافت ۔ ایک دوست نے بتایا کہ ایک مدراسی (جنوبی ہند کے ہر باشندے کو یہاں اب تک مدراسی ہی کہا جاتا ہے) آئی ۔ سی ۔ ایس ، آفیسر (ریٹائرڈ) کی تحویل میں علامہ اقبال کے چند غیر مطبوعہ خطوط محفوظ ہیں ۔ چنانچہ ان سے رابطہ قائم کیا ۔ یہ سردار امراؤ سنگھ کے داماد ہیں جو علامہ کے نہایت بے تکلف اور دیرینہ دوست تھے ۔ ان کا نام کے ۔ وی ۔ کے سندرم (K.V.K. Sundram) ہے ۔ یہ سابق چیف الیکشن کمشنر تھے ۔ سردار امراؤ سنگھ کی دو بیٹیاں تھیں ۔ ایک اندرا اور دوسری امرتا ۔ جس نے امرتا شیر گل کے نام سے فن مصوری میں لافانی شہرت حاصل کی ۔ اندرا کی شادی سندرم صاحب سے ہوئی تھی ۔ عرصہ ہوا اس خاتون کا انتقال ہوگیا ہے ۔ سندرم صاحب کے پاس علامہ کے چار انگریزی خطوط بنام سردار امراؤ سنگھ محفوظ ہیں ۔ علامہ کے جتنے مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں ان میں سے کسی میں بھی علامہ کا کوئی خط بنام امراؤ سنگھ شامل نہیں ہے ۔

سردار امراؤ سنگھ (۱) مجیٹھیا (1954-1870) کے مورث اعلیٰ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں جنرل تھے ۔ انگریزوں نے راجہ کا خطاب دیا اور گورکھپور ، (یو ۔ پی بھارت) میں جائیداد عطا کی ۔ امراؤ سنگھ کے بھائی سردار سریندر سنگھ مجیٹھیا کو سر کا خطاب ملا اور انہوں نے پنجاب کی سیاست میں سرگرم حصہ لیا ۔

امراؤ سنگھ نے دوسری شادی 1912 ء میں ہنگری کی ایک خاتون گوٹسمین ارد باکتے (Gottesmann Erdobakteg) معروف بہ این توانیت (Antonviete) سے کی ۔ ان ہی کے مذکورہ بالا دو لڑکیاں پیدا ہوئیں ۔

سردار امراؤ سنگھ کو سنسکرت ، فارسی اور اردو ادب سے گہرا شغف تھا ۔ عمر خیام اور سرمد کی رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے تھے ۔ ہندوستانی سنگیت اور فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے ۔ فلسفیات اور فلسفہ سے بھی لگاؤ تھا ۔ فوٹوگرافی اور خطاطی کا بھی شوق تھا ۔ صوفی منش اور درویش صفت آدمی تھے ۔

ان کے علامہ سے دوستانہ مراسم تھے ۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں (1933-1873) نے جب اقبال پر انگریزی میں پہلی کتاب (A Voice from the East) 1923 ء میں لکھی تو اس میں شامل اشعار کا ترجمہ سردار امراؤ سنگھ ہی نے کیا تھا ۔

1932 ء میں گول میز کانفرنس سے واپس آتے ہوئے اقبال نے پیرس میں ان کے ہاں قیام کیا تھا ۔ کچھ عرصہ ہوا انہوں نے انگریزی ماہنامہ "EAST-WEST" کی بھی ادارت کی ۔

---

۱ ۔ سید مظفر حسین برنی ۔ کلیات مکاتیب اقبال ۔ جلد اول ۔ ص ۔ ۱۳۰

سردار امراؤ سنگھ سے علامہ کے ذاتی تعلقات کا علم ان کی ہنگریرین بیوی کی اس آٹوگراف بک سے ہوتا ہے جس میں علامہ نے بدست خود وہ نظم تحریر کی ہے جو بانگ درا میں "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ آٹوگراف بک میں اس کا عنوان "مس گوشمین سے پھول ملنے پر" ہے۔ اس کے پہلے دو مشہور شعر درج ذیل ہیں۔

وہ مست ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے
کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے
الہیٰ پھولوں میں وہ انتخاب مجھکو کرے
کلی سے ایک گل آفتاب مجھکو کرے

آٹوگراف بک کے سرورق اور نظم بخط اقبال کا عکس بھی پیش کیا جارہا ہے۔
یہ چار مکاتیب جو سندرم صاحب سے حاصل ہوئے ہیں
1935ء، 1936ء اور 1937ء میں لکھے گئے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ پہلا خط یکم جولائی 1935ء کا ہے۔ علامہ کی بیوی کی وفات پر تعزیت نامہ کا جواب ہے۔ علامہ کی بیوی سردار بیگم (والدہ جاوید اقبال) کی وفات 23 مئی 1935ء کو بوقت شام ساڑھے پانچ بجے 37 سال کی عمر میں ہوئی۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ پر اس سانحہ کا بڑا اثر ہوا۔ لیکن رضائے ایزدی پر مستحکم ایمان تھا۔ اس خط سے موصوفہ کی ایک نمایاں خصوصیت پہلی بار اجاگر ہوتی ہے کہ علامہ ان کو جتنا روپیہ دیتے تھے وہ سب غربا پر صرف کر دیتی تھیں۔ یہ بات خود علامہ کو ان کی وفات کے بعد معلوم ہوئی۔ بارہ سال علامہ اپنے پرانے مکان میں رہے۔ (بیوی کا انتقال نئے مکان میں ہوا) اور اس دوران اس خاتون نے کم ازکم بارہ غریب لڑکیوں کو قرآن پاک پڑھایا اور ان میں سے چار کی شادیاں بھی اپنے صرفہ پر کیں۔ یہ سب خاکروب کی بیٹیاں تھیں جو مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔

۲۔ دوسرا خط مورخہ 31 جنوری 1936ء ہے۔ اس زمانے میں علامہ کی بینائی کم ہو رہی تھی۔ علامہ سے سردار صاحب کی قربت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کے لاہور نہ آنے کا خصوصاً بہار کے خوشگوار موسم کی آمد کے بعد ملال ہے۔ سردار صاحب کو کسی نظم کی تلاش تھی جو علامہ کو یاد نہ آئی اور اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔

ضربِ کلیم کی اشاعت کی نوید بھی اس خط سے ملتی ہے۔

لیکن اس خط کا آخری پیراگراف نہایت اہم ہے۔ اس میں برادران وطن کے اس گلے کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ ان کی شاعری صرف مسلمانوں کے لئے ہے۔ انہوں نے لکھا کہ میں نے اپنی چند تازہ فارسی نگارشات میں عزیزان وطن کے لئے قدیم ہندو رشیوں اور منیوں کی حقیقی تعلیمات کو تازہ کر دیا ہے۔ علامہ کو بجا شکایت ہے کہ

عزیزان وطن اس امر کو نظر انداز کر جاتے ہیں چونکہ انہوں نے ان تعلیمات کو اسلامی تصوف اور دین اسلام کی اصطلاحات میں پیش کیا ہے ۔

بہر کیف علامہ پر ان کے اعتراضات اور عدم توجہی کا کوئی اثر نہیں ہوا ۔ ان کا مسلک ہے کہ ان کے نزدیک جو صداقت ہے اس کو بلا خوف و خطر بیان کرتے رہیں گے ۔ ان کے کلام میں اس خصوصیت کا جابجا ذکر ہے ۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اپنی شاعری کے صرف دور اول میں وہ وطن عزیز اور عزیزان وطن کی جانب متوجہ ہوئے اور اس کے بعد اسلام اور دنیائے اسلام کے ہو رہے ۔ یہ بے بنیاد مفروضہ ہے ۔

۳ ۔ تیسرا خط 24 مارچ 1936ء کا ہے ۔ پریس میں جن غلط فہمیوں سے ان کے احباب کو تردّد (پیدا) ہوا اس کا اس ہنگامہ سے تعلق ہے جو علامہ کی تردید احمدیت پر بپا ہوا تھا ۔ 1935ء (۱) کے آغاز کی بات ہے کہ علامہ نے احمدیت کے خلاف ایک بیان بعنوان "قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان" انگریزی میں دیا ۔ یہ بیان ملک کے مختلف انگریزی اخباروں میں شائع ہوا ۔ اردو اخباروں میں اس کا ترجمہ چھپا ۔ احمدی اخباروں نے اس پر اعتراضات کئے ۔

14 مئی 1935ء کو انگریزی روزنامہ "اسٹیٹسمین" نے اس پر لیڈنگ آرٹیکل لکھا ۔ علامہ نے اس کا جواب اسٹیٹسمین کے شمارہ 10 جون 1935ء کو تحریر کیا ۔ علاوہ ازیں احمدیوں کے رہنما مرزا بشیر الدین محمود کے خطبہ جمعہ کے جواب میں علامہ نے ایک اور بیان 22 جون 1935ء "اسلام" میں شائع کرایا ہے ۔ اس دوران احمدیوں کی حمایت میں پنڈت جواہر لال نہرو کے بھی تین انگریزی مضامین بعنوان "اتحاد اسلام" کلکتہ کے رسالہ "ماڈرن ریویو" نومبر 1935ء میں شائع ہوئے ۔ علامہ نے ان کا مدلل جواب بعنوان "اسلام اور احمدیت" تحریر کیا جو "اسلام" مورخہ 22 جنوری 1936ء میں شائع ہوا ۔

۴ ۔ چوتھا خط 14 اپریل 1937ء کا ہے ۔ اس میں سیاحت نامہ ابراہیم (۲) بیگ کا ذکر ہے ۔ یہ زین العابدین مراغہ کی تصنیف ہے ۔ جو ایران سے باہر (خارج) پرورش پاتا ہے اور وطن کی کشش میں لوٹتا ہے تو اپنے وطن کی پسماندگی اور زوال پذیر معاشرہ کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے ۔ اس میں قاچاری بادشاہوں سے [illegible] اور عوام کے رنج و برداشت کی داستان ہے ۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مشروطیت سے قبل مظفر الدین شاہ قاچار کے عہد کی ستم رانیوں کے قصے قلم بند کئے گئے ہیں ۔ جن کو سفرنامہ کی شکل میں "ابراہیم" کے فرضی نام سے بیان کیا ہے ۔

اس کی زبان سادہ اور رواں ہے ۔ مصر اور ترکی میں مقیم ایرانیوں میں متداول اصطلاحات کو بہت ہی عمدہ طریقہ سے استعمال کیا گیا ہے ۔

اس کا سال اشاعت 1321 ہجری ہے اور مقصد ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنا تھا ۔ بطور نمونہ "در شرح اقامت

---

۱ ۔ جاوید اقبال ۔ زندہ رود ۔ حصہ سوم ۔ ص ۔ 551-554

۲ ۔ کریم کشاورز ۔ ہزار سال نثر پارسی ۔ جلد پنجم ، سازمان کتابہا جیبی 1376ء ص 71-120 ۔

در اردہیل" پیش ہے ۔

"روز چہارم بود ۔ دیدم از ہر طرف مردم بہ جب و راست می دوند و از ہر سوی صدا بلند است کہ "بابا جہاد است" با خود گفتم دیگر این بازی تازہ چیست و جہاد با کیست ؟ برخاستم تا ببینم چہ ہنگامہ است ۔ یوسف عمو بہ دامنم آویخت کہ نمی گذارم بیرون روبی ۔ مبادا در آں میان آسیبی ہم بتو برسد"

ترجمہ :

چوتھا روز تھا ۔ دیکھا کہ لوگ دائیں بائیں دوڑ رہے ہیں اور ہر طرف سے یہ آوازیں آ رہی ہیں کہ جہاد ہو گیا ۔ دل میں کہا کہ یہ نیا کھیل کیا ہے اور جہاد کس کے خلاف ہے ؟ اٹھا تاکہ دیکھوں کہ کیا ہنگامہ ہے ۔ یوسف چچا نے میرا دامن کھینچا کہ باہر نہ جانے دیں کہ کہیں اسی دوران مجھ پر کوئی بلا نازل نہ ہو جائے ۔

علامہ نے محمد مارماڈیوک پکتھال (1875-1936ء) کے انگریزی ترجمہ قرآن کی تعریف کی ہے ۔ ایک قابل غور نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ توحید کی تعلیم آفاقی ہے اور ہر ملک میں ازل سے یہ تعلیم دی گئی ہے اور یہ کسی ایک صحیفہ آسمانی تک مختص نہیں ہے ۔ اس میں بھی اس نقطہ نظر کی تائید ہوتی ہے جو مذکورہ بالا مکتوب محررہ 31 جنوری 1936ء کے تحت واضح کیا گیا ہے ۔ مزید بر آں دونوں خط مذہبی معاملات میں علامہ کی وسیع المشربی ، فراغ دلی اور رواداری کے آئینہ دار ہیں ۔ یہ کہنا کہ اقبال صرف مسلمانوں یا اسلام کا شاعر ہے سراسر بے بنیاد ہے ۔

اس خط میں یہ ذکر بھی ہے کہ شہزادی (مراد شہزادی بمبا دلیپ سنگھ سے ہے) چند روز ہوئے ان سے ملنے آئی تھیں اور خوبصورت گلاب کے پھولوں کا گلدستہ پیش کیا تھا ۔ وہ یورپ کے سفر پر جا رہی تھیں اور چند دن سردار امراؤ سنگھ کے ساتھ قیام کرنا چاہتی تھیں ۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ایک زمانے میں یہ سردار امراؤ سنگھ سے شادی کرنا چاہتی تھیں ۔

شہزادی دلیپ سنگھ بمبا (1869-1957ء)

29 ستمبر 1869 کو لندن میں پیدا ہوئیں ۔ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی تھیں ۔ لندن کے قیام کے بعد لاہور آ کر رہنے لگیں ۔

کنگ ایڈورڈ کالج کے انگریز پرنسپل اور مشہور سرجن سدرلینڈ (Dr . Suderland) سے شادی کر لی اور اس کے ساتھ انگلستان چلی گئیں ۔ پھر واپس آ کر زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں گذارا ۔ یہیں 10 مارچ 1957ء کو انتقال کیا ۔

شہزادی بمبا فنون لطیفہ کی بے حد دلدادہ اور قدردان تھیں ۔ 1911ء میں سردار جوگندر سنگھ کے توسط سے علامہ اقبال سے ان کی ملاقات ہوئی ۔ ایک بار شہزادی نے اپنی ایک آسٹریلین شہزادی سے اقبال کی شالامار باغ میں ملاقات

سید مظفر حسین برنی ۔ کلیات مکاتیب اقبال ۔ جلد اول ۔ ص ۔ 888

کرائی ۔ وہاں مس گو تسمین بھی موجود تھیں ۔ انہوں نے اقبال کو ایک پھول پیش کیا ۔ دوسری خاتون اپنی گود میں خوبصورت بلی لئے بیٹھی تھیں ۔ اقبال کی دو نظمیں "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر" اور "۔۔۔کی گود میں بلی دیکھ کر" اس ملاقات کی یادگار ہیں ۔

علامہ کے چاروں مکاتیب بنام سردار امراؤ سنگھ کے انگریزی متن ، عکسی نقول اور ترجمے پیش کئے جا رہے ہیں ۔

امراؤ سنگھ کے نام

لاہور
یکم جولائی 1935

مائی ڈیر یو ایس (۱)

آپ کے اظہار ہمدردی کا شکریہ ۔ اہلیہ کی وفات کا سانحہ میرے لیے سوہان روح ہے ۔ لیکن خدا پر میرا ایمان اور تقدیر انسانی پر اعتقاد آج بھی اتنا ہی پختہ اور مستحکم ہے جتنا ہمیشہ رہا ہے ۔ اس کا (اہلیہ کا) ایک متوسط گھرانے سے تعلق تھا لیکن اس کے انتقال کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ جو رقم میں اسے دیا کرتا تھا وہ سب غرباء کی امداد میں صرف کر دیا کرتی تھی ۔ قدیم مکان میں بارہ سال کے قیام کے دوران اس نے بیس غریب بچیوں کو وردِ قرآن سکھایا اور ان میں سے چار کی شادیاں اپنے صرفہ سے کیں ۔ یہ خاکروب لڑکیاں تھیں جو مشرف بہ اسلام ہوئیں ۔

میں نے مسٹر تنکن کو کتاب بھیجدی ہے ۔

ہمیشہ آپ کا
محمد اقبال

۱۔ امراؤ سنگھ کا مخفف ۔

امراؤ سنگھ کے نام

لاہور

31 جنوری 1936

ڈیر یو ایس

آپ کے خط کا بہت بہت شکریہ ۔ جو اس قدر باریک ٹائپ کیا ہوا تھا کہ میں نے بڑی دشواری سے پڑھا کہ مبادا کوئی لفظ یا سطر چھوڑ جاؤں ۔ اگر اسے آپ نے خود ٹائپ کیا تھا تو میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنی کمزوری بینائی کا گلہ نہیں ہونا چاہئے ۔

افسوس کہ اس سال آپ یہاں نہیں آرہے ہیں ۔

ماہ فروری کل سے شروع ہو رہا ہے اور ہمیں لاہور میں نہایت عمدہ موسم کی امید ہے ۔

جس نظم کا آپ نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے وہ مجھے یاد نہیں آرہی ہے ۔ بہرکیف میں اپنے کسی دوست سے پوچھوں گا اور اگر انہیں یاد ہوئی تو آپ کو مطلع کروں گا۔ اردو کا نیا مجموعہ کلام "ضربِ کلیم" مہینہ بھر میں پریس کو چلا جائے گا اور مجھے اس کا ایک نسخہ آپ کو پیش کر کے خوشی ہوگی ۔

میں نے اپنی چند فارسی نظموں میں اپنے ہندو ہموطنوں کو قدیم ہندو رشیوں کی اصلی تعلیمات یاد دلائی ہیں ۔ وہ اسے نظرانداز کرتے ہیں ۔ چونکہ میں نے اپنے کلام میں ان کو دین اسلام اور اسلامی تصوف کی اصطلاحات میں پیش کیا ہے ۔ بہرحال مجھے اس کی کوئی پروا نہیں اور میں وہی کہوں گا جسے میں حق سمجھتا ہوں ۔

سردارنی صاحبہ کو آداب اور بچوں کو دعائیں ۔

ہمیشہ آپ کا

محمد اقبال

امراؤ سنگھ کے نام

لاہور

24 مارچ 1936

مائی ڈیر یو ایس

آپ کے خط کا بہت بہت شکریہ جو مجھے چند لمحے پہلے ملا ہے ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں ۔ میری صحت کافی بہتر ہو گئی ہے اور آواز بھی آہستہ آہستہ بہتر ہو رہی ہے ۔ پریس کو کچھ غلط فہمی ہوئی جس کی وجہ سے میرے دوستوں کو بے حد تردد ہوا ۔ بہرحال میں اچھا ہوں ۔ اردو کا نیا مجموعہ "ضرب کلیم" دو ایک ماہ میں شائع ہو جائے گا ۔ یہ ابھی پریس میں ہے ۔

نیک خواہشات کے ساتھ ۔

ہمیشہ آپ کا

محمد اقبال

امراؤ سنگھ کے نام

لاہور

14اپریل 1937

مائی ڈیر یو ایس

آپ کے خطوط کا بہت شکریہ ۔ جو مجھے اس دوران موصول ہوئے۔ بد قسمتی سے میں خطوط کی جواب دہی میں بہت زیادہ تساہل برتنے لگا ہوں ۔ امید ہے کہ جواب میں تاخیر کے لئے مجھے معاف فرمائیں گے ۔

میں "سفر نامہ ابراہیم بیگ" سے واقف ہوں اور عرصہ ہوا میں نے اسے پڑھا بھی تھا ۔ مارماڈیوک پکتھال کا قرآن پاک کا ترجمہ دیگر تراجم سے بہتر ہے ۔ اس میں کسی قسم کے حواشی نہیں ہیں ۔ قرآن کے مطابق توحید کا تصور آفاقی ہے اور ابتدائے کائنات سے ہر ملک میں اس کی تعلیم دی گئی ہے ۔ یہ کسی خاص صحیفۂ آسمانی تک مختص نہیں ۔

شہزادی صاحبہ (۱) چند روز ہوئے مجھ سے ملنے آئیں تھیں۔

یہ ان کی بڑی کرم فرمائی ہے کہ وہ تشریف لائیں اور میرے لئے خوبصورت گلاب کے حسین پھول بطور تحفہ لے کر آئیں ۔ انہوں نے بتایا کہ وہ یورپ جارہی ہیں لیکن ہندوستان سے روانگی سے قبل وہ چند روز آپ کے ہاں قیام کریں گی ۔ اپنی اہلیہ اور لڑکی کو دعائیں۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہونگے ۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M.A., Ph.D., LL.D.
Barrister-at-Law

Lahore
Dated———————— 193
Ist July 1935

My dear U.S.

Thank you for your kind expression of sympathy. The event of my wife's death has deeply affected me; but my faith in God and the destiny of man is as strong as ever. She was the daughter of a family of moderate means; but I discovered it only after her death that all the money that I gave her she gave away to the poor. During the 12 years of our stay in that old house she taught the Quran's virdh to at least 20 girls of extremely poor families and spent money on the marriage of four of them. These are daughters of sweepers-turned Muslims.

I have sent the book to Mr. Nikitine.

Yours ever
Mohammad Iqbal

نوٹ ۔ یہ خط علامہ اقبال نے کسی سے لکھوایا ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب آنکھ میں موتیا بند اتر آنے کی وجہ سے لکھنا پڑھنا ترک کر چکے تھے ۔

۱ ۔ شہزادی دلیپ سنگھ بمبا مراد ہے ۔

Dear U.S.

Lahore
31st Jan., 1936

Thank you so much for your closely typed letter which I read with some difficulty for fear of missing your words or lines. If you have typed it yourself I think you need not complain of your eye-sight.

What a pity. You are not coming this year? Feb. is beginning tomorrow and we hope to have some excellent weather in Lahore.

I cannot think of the poem you refer to in your letter. I shall however ask some index of mine and if he happens to remember it I shall let you know. The new Urdu Collection called ضرب کلیم. will go to press in about a month's time. And I shall be glad to send you a copy when it is published.

In some of my Persian writings, I have reminded my Hindu countrymen of the real teaching of ancient Hindu sages. They ignore it because I have expressed myself in terms of Islam on Islamic Sufism. However, I do not mind and will say what I believe to be the truth.

Do remember me to Sardarni Sahiba and your children.

Yours ever
Mohammad Iqbal

My dear U.S.

Lahore
24th Mar., 1936

Thank you so much for your letter which I received a moment ago. I am quite-alright. My health has very much improved and the voice too is slowly improving. There was some misunderstanding in the Press which caused a great deal of anxiety to my friends. However, I am getting on well. The new Urdu Collection called ضرب کلیم will be published in a month or two. It is in the Press.

With best wishes

Yours ever
Mohammad Iqbal

My Dear U.S.

Lahore
14.4.37

Thanks for your letters which reached me in due course. Unfortunately, I am becoming more and more lazy in attending to my letters, and I do hope that you will excuse me for the delay in replying your letters.

I know and read it long ago. The translation of the Quran by Marmduke Pickthall is perhaps better than many of the translations. It has no notes of any kind. According to the Quran the idea of Tauhid is universal, and has been taught in every country from the very beginning of the world. It is not confined to any particular revealed book.

The Princess came to see me a few days ago. It was very nice of her to come and bring a present of beautiful roses. She told me that she was going away to Europe, but that before leaving India, she said, she would be staying with you for a few days. Please

remember me to your wife and daughter. Hoping you are well.

Yours sincerely,
Mohammad Iqbal

Note: Dictated by the poet.

The corect name is "Marmaduke Pickthall".

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M.A. Ph. D. LL.D.
Barrister-at-Law

Lahore

Dated ______________ 193

1st July 1935

My dear W.S.

Thank you for your kind expression of sympathy. The event of my wife's death has deeply affected me; but my faith in God & the destiny of man is as strong as ever. She was the daughter of a family of moderate means; but I discovered it only after her death that all the money that I gave her she gave away to the poor. During the 12 years ~~that~~ of our stay in that old house she taught the Quran & Urdu to at least 20 girls of extremely poor families & spent money on the marriage of four of them. These are daughters of sweepers – turned Muslims –

I have sent the note to Mr. Nikitine.

Yours sincerely
Mohammad Iqbal

Lahore
31st Jan. 1936

Dear U.S.

Thank you so much for your clearly typed letter which I read with some difficulty for fear of missing your words or lines. If you have typed it yourself I think you need not complain of your eyesight.
What a pity you are not coming this year? Feb. is beginning tomorrow & we hope to have some excellent weather in Lahore.
I cannot think of the poem you refer to in your letter. I shall however ask some friends of mine & if one happens to remember it I shall let you know. The new Urdu collection called ضرب کلیم will go to press in about a months time. And I shall be glad to send you a copy when it is published.

In some of my Persian writings I have reminded my Hindu countrymen of the real teaching of ancient Hindu sages. They ignore it because I have expressed myself in terms of Islam or Islamic Sufism. However I do not mind & will do what

I believe this to be the truth.
Do remember me to Sardarni Sahiba
& your children

Yours ever
Muhammad Iqbal

Lahore
24th. Apr. 1936

My dear N.S.

Thank you so much for your letter which I recd. a moment ago. I am quite alright. My health has very much improved & the voice too is slowly improving. There was some misunderstanding in the Press which caused a great deal of anxiety to my friends. However I am getting on well. The new Urdu collection called ضرب کلیم will be published in a month or two. It is in the Press.

With best wishes

Yours ever
Muhammad Iqbal

Lahore
14·4·37

My Dear U. S.

Thanks for your letters which reached me in due course. Unfortunately I am becoming more and more lazy in attending to my letters, and I do hope that you will excuse me for the delay in replying your letters.

I know [illegible] and read it long ago. The translation of the Quran by Marmaduke Pickthall is perhaps better than many of the translations. It has no notes of any kind. According to the Quran the idea of Tauhid is universal, and has been taught in every country from the very beginning of the world. It is not confined to any particular revealed book.

The Princess came to see me a few days ago. It was very nice of her to come and bring a present of beautiful roses. She told me that she was going away to Europe, but that before leaving India, she said, she would be staying with you for a few days. Please remember me to your wife and daughter. Hoping you are well.

Yours sincerely,
Mohamad Iqbal.

AUTOGRAPH
BOOK of
(MICI)
ANTOINETTE
Gottesmann Erdobaktay
(SHER-GIL)

U.S.G.

Umrao

مس گالمرناز سے پھول ملنے پر

وہ مست ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے — کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے

"الٰہی پھولوں میں وہ انتخاب مجھکو کرے — کلی سے رشک گل آفتاب مجھکو کرے"

ہجوم بلبل میں پسند نگاہ ناز ہوا
ترانہ ریز تری زندگی کا ساز ہوا

کسی کے ہاتھ سے ٹوٹا زہے نصیب ترے ! — تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب ترے

اٹھا کے صدمۂ فرقت وصال تک پہنچا — تری حیات کا جوہر کمال تک پہنچا

کلی مری کہ جسے جوتے ہیں اہل نظر — مرے شباب کے گلشن کو ناز ہے جس پر

کبھی تیرا وہ ہم آغوش مدعا نہ ہوا — کسی کے دامن رنگیں سے آشنا نہ ہوا

شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اسے
فسردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اسے

[illegible] بہار ہے تو

[illegible] جدائی نے بے قرار ہے تو

فسردگی کا [illegible] غم ہے

[illegible] کی شبنم ہے

محمد اقبال لاہور ۱۱ ستمبر ۱۹۱۱ء



Painted in Lahore 1911 from a old painting in the Fakir's house.

"علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط"

ارشد میر

علامہ اقبالؒ کو ہم سے جدا ہوئے تقریباً ترپن برس ہونے کو ہیں۔ اب تک ان کی شخصیت و فن پر ہی لاتعداد کتب شائع نہیں ہوئیں۔ بلکہ غیر مطبوعہ خطوط کے بھی کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ اور ہنوز یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

زیر نظر مضمون بھی علامہ اقبالؒ کے ایک غیر مطبوعہ خط سے ہی متعلق ہے۔ جو انہوں نے آج سے تقریباً ساٹھ برس قبل ۲۵ ستمبر ۱۹۳۰ء کو تحریر کیا تھا۔ یہ خط علامہ اقبال نے اپنے پرنٹڈ پیڈ جس پر انگریزی حروف میں ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔ ایل۔ سی بار ایٹ لاء لکھا ہوا ہے۔ تحریر کیا تھا۔ خط کا متن انگریزی میں ہے۔ اصل خط کا متن اور اس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے۔

Dear Azar,

Mr. Jafari tells me that you have sent your vote per registered letter to me. I am afraid I have recd no registered letter from you. I wish you could vote for Nawab Sahib if you have not already done so. But Mr. Jafari tells me that you have not yet voted. Please do send the vote to me or hand over to the bearer of this letter.

Yours Sincerely

Mohammad Iqbal

ڈیر آزر!

مسٹر جعفری نے مجھے بتایا ہے۔ کہ آپ نے اپنا ووٹ ایک رجسٹرڈ خط کے ذریعے مجھے ارسال کیا ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ مجھے آپ کا کوئی رجسٹرڈ خط نہیں ملا۔ میری خواہش ہے۔ کہ آپ نواب صاحب کو ووٹ دیتے۔ اگر آپ نے ابھی تک نہیں دیا۔ لیکن مسٹر جعفری مجھے بتاتے ہیں۔ کہ آپ نے ابھی تک ووٹ نہیں دیا۔ مہربانی کرکے اپنا ووٹ مجھے دیں۔ یا حامل ہذا کو دے دیں۔ کہ مجھے مل جائے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

اس خط کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ خط مسٹر آزر کے نام مسٹر جعفری کو دیا گیا ہے۔ اور آزر صاحب کو نواب صاحب کو ووٹ دینے کی درخواست کی گئی ہے۔

مسٹر جعفری سے مُراد سید حسن جعفری ایڈووکیٹ ہیں۔ جو اسلامیہ کالج لاہور کے سب سے پہلے پرنسپل بابا محمد علی جعفری کے پسر کلاں اور برصغیر کے نامور طنزیہ مزاحیہ شاعر سید محمد جعفری کے بڑے بھائی تھے۔ علامہ اقبالؒ کے سید حسن جعفری کے والد گرامی سے دوستانہ تعلقات تھے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور میں وہ اور علامہ اقبال ایک ہی گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ علامہ اُن کی علمی و ادبی قابلیت اور ذہانت و فطانت کے دلی معترف تھے۔ اپنے والد کی وجہ سے سید حسن جعفری کا علامہ کے ہاں اکثر آنا جانا تھا۔ وہ اس زمانے میں ملک برکت علی مرحوم ایڈووکیٹ کے ہمراہ پیشہ وکالت سے منسلک تھے۔ سید حسن جعفری خود بھی علم و ادب سے خاصہ شغف رکھتے تھے۔ انہیں انگریزی، اُردو، فارسی، عربی پر خاصی دسترس تھی۔ میٹرک سے پہلے مولوی فاضل، منشی فاضل کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کیے۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کی۔ اور ایم۔اے عربی اورنٹیل کالج لاہور سے اور ایل ایل۔ بی یونیورسٹی لاء کالج لاہور سے پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج کے میگزین "راوی" کے مدیر رہے۔ "نیرنگ خیال" اور "رومان" میں باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ بلکہ رُومان کے نگارندگان میں ان کا اور جوش ملیح آبادی کا نام سرورق پر شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے لاہور ریڈیو سے بھی کئی تقاریر کیں۔ انگریزی اخبارات میں بھی اکثر مضامین لکھتے رہے۔

علامہ اقبال سے ان کے تعلقات کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ انہوں نے علامہ اور ایران کے مجتہد آقائے عبدالکریم زنجانی کی "وحی والہام" اور برھانِ امامت پر فارسی میں جو گفتگو ہوئی۔ اسے قلمبند کیا۔ اور اس کا اردو ترجمہ کر کے ۱۹۳۵ء میں کتاب "وحی والہام" اور "بُرھان امامت" کے عنوان سے نواب پیلس سے نواب نثار علی خاں کی فرمائش پر شائع کی۔ سید حسن جعفری بعد ازاں وکیل سرکار ہو گئے۔ اور ریٹائرمنٹ کے بعد گوجرانوالہ میں طویل عرصہ تک وکالت کرنے کے بعد ۱۲ جون ۱۹۸۹ء کو سروسز ہسپتال (Services Hospital) لاہور میں وفات پا گئے۔

نواب صاحب سے مُراد نواب نثار علی خاں ہیں جو برصغیر کے مشہور سیاسی و سماجی رہنما نواب سر فتح علی خاں کے صاحبزادے اور شیعہ کالج لکھنؤ کے نگران تھے۔ نواب نثار علی خاں بھی اپنے دور کی معروف سیاسی اور سماجی شخصیت تھے۔ سابق وزیر اعلیٰ پنجاب نواب مظفر علی خاں قزلباش ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ نواب صاحب مذکور کی فرمائش پر سید حسن جعفری مرحوم نے ایک اور کتاب واقعۂ کربلا کے تاریخی اسباب و نتائج بھی تحریر کی تھی۔ نواب نثار علی خاں کا انتقال ۱۹۴۴ء میں ہوا۔ اُردو زبان کے ممتاز اور قادر الکلام شاعر صفی لکھنوی نے انکا قطعۂ تاریخ وفات لکھا۔ جو حسب ذیل ہے۔

روزِ دہم زماہِ ربیع دوم صفیؔ — چوں سوئے خُلد سرورِ زریں کلاہ رفت
از تلغرافم ایں خبرِ جانگزا رسید — و زسوزِ غم ز دل بسرم دُودِ آہ رفت

پور مہین فتح علی خاں، مکینِ خلد ... ناکتخدا بجانب فردوس راہ رفت
سیہ سال بر چہل چو گزشت از سنین عمر ... ناشاد و نامراد ازیں سیر گاہ رفت
گیتی بچشم ماتمیاں ہمچو شب سیاہ ... روشن چراغ خانہ دم صبحگاہ رفت
رخشندہ گوہرے و درخشندہ اخترے ... ایوا ، فرو بزیرِ زمین ہمچو ماہ رفت

ہست ایں فغاں بلند زہر گوشۂ مکاں
نوآب مانثار علی صدر جاہ رفت"
۱۹۴۴ء

آزر سے مراد پروفیسر سراج الدین آزر ہیں کیونکہ یہ خط جس لفافے میں ڈالا گیا ۔ اس پر علامہ اقبال نے اپنے قلم سے پروفیسر سراج الدین آزر پسرور کے الفاظ رقم کئے ہوئے ہیں ۔ پروفیسر سراج الدین آزر ۱۸۹۲ء میں فیروز پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے ۔ جنھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور جیسی شہرہ آفاق درسگاہ سے انگریزی اور فارسی کے امتحانات پاس کئے ۔ اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے ۔ کچھ عرصہ اسلامیہ کالج لاہور میں لیکچرار رہے ۔ بعد ازاں سرکاری ملازمت اختیار کی ۔ اور ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۷ء تک گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج پسرور میں انگریزی کے پروفیسر تعینات رہے ۔ آزر صاحب عمدہ علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے بالخصوص انہیں نادر کتب اور قلمی مخطوطے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا ۔ چنانچہ ان کے ذاتی کتب خانے میں تقریباً چالیس ہزار کتب اور لاتعداد قلمی نسخے تھے ۔ ان کے قلمی نسخوں کو اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ کر لیا گیا ہے ۔ بلکہ گنجینہ آزر کے عنوان سے ان کی فہرست بھی کتابی شکل میں موجود ہے ۔ آزر صاحب بعد ازاں گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل بھی رہے ۔ ان کا انتقال ۲۶ اگست ۱۹۴۷ء کو دہلی میں ہوا ۔

مرحوم سراج الدین آزر کے علامہ اقبال سے بڑے نیازمندانہ مراسم تھے ۔ اور علامہ بھی ان کے علمی و ادبی ذوق و شوق کی بنا پر ان سے بے حد اُنس و محبت کا اظہار کیا کرتے تھے ۔ سید حسن جعفری مرحوم ان تعلقات سے بخوبی واقف تھے ۔ اس لئے جب ۱۹۳۵ء میں انڈیا کی کاؤنسل آف سٹیٹ کی رکنیت کے الیکشن کا مرحلہ آیا ۔ جس میں نواب نثار علی خان قزلباش امیدوار تھے ۔ اور ان کے مقابل خان بہادر نواب چودھری محمد دین سابق وزیر مال ریاست مالیر کوٹلہ تھے ۔ تو جعفری صاحب نے اس سلسلہ میں پہلے خود آزر صاحب سے رابطہ قائم کیا ۔ تو انہوں نے کہا میں اپنا ووٹ علامہ اقبال کو بھیج چکا ہوں ۔ کہ وہ ان کا ووٹ جس امیدوار کو چاہیں دے دیں اور نشان لگا دیں ۔ کیونکہ اس الیکشن میں ووٹنگ کا ایک طریق یہ بھی تھا کہ ووٹر جو محدود اور مخصوص اہلیت کے حامل تھے ۔ اپنا بیلٹ پیپر جو ان کو ڈاک کے پتے پر بھیجا جاتا تھا اس پر اپنی پسند کے امیدوار کے سامنے معینہ نشان لگا کر اپنے دستخط ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کے روبرو پیش کر کے اس کی تصدیق کے دستخط اور مہر ثبت کرانے کے بعد بذریعہ ڈاک الیکشن کمشنر کو روانہ کر دیں ۔ یا اسے کسی شخص کے ذریعے جمع کروا دیں ۔

سید حسن جعفری مرحوم کے نواب نثار علی خان سے خاندانی مراسم تھے ۔ اور وہ ان کے حلقے کے ووٹروں سے ووٹ لے کر لاہور لارہے تھے ۔ پسرور میں جب آزر صاحب نے اپنے ووٹ کی بابت بتادیا ۔ تو پھر جعفری صاحب علامہ اقبال مرحوم کے پاس گئے ۔ اور نواب صاحب کے لئے ووٹ مانگا ۔ جس پر علامہ نے فرمایا ۔ کہ ابھی تک میرے پاس پروفیسر سراج الدین آزر کا بیلٹ پیپر نہیں پہنچا ہے ۔ بہتر یہ ہے کہ جعفری صاحب علامہ اقبال کا خط لے کر خود جائیں یا کسی کو دے دیں تاکہ وہ دستی جاکر بیلٹ پیپر لے آئے ۔ جعفری صاحب زیر نظر خط خود ہی لے کر پسرور گئے ۔ وہاں گرمیوں کی تعطیلات کی وجہ سے کالج بند تھااور پروفیسر آزر بھی موجود نہ تھے ۔ جس پر وہ اس گاڑی سے جو سیالکوٹ سے براستہ پسرور لاہور آتی ہے میں سوار ہوئے ۔ اور اگلی روئیداد سید حسن جعفری مرحوم نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں یوں بیان کی کہ ”میں انٹر کلاس کے ایک خالی ڈبے میں لیٹا ہوا نیم خوابی کے عالم میں تھا کہ نارنگ کے اسٹیشن سے تین معتبر زمیندار سوار ہوئے ۔ اور الیکشن کی باتیں کرنے لگے ۔ نواب نثار علی خان کا نام بھی میرے کانوں میں پڑا ۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔ اور معلوم ہوا کہ فریقِ مخالف کے کارکن ہیں ۔ علامہ صاحب کا یہ خط میری قمیص کی بیرونی جیب میں سے چمک رہا تھا ۔ انہوں نے سمجھا یہ بیلٹ پیپر ہے ۔ اور بے تکلفی سے کہا ۔ یہ کوئی ووٹ ہے ۔ میں نے حواس درست رکھے ۔ اور بے پروائی کے انداز میں کہا یہ پرائیویٹ خط ہے ان لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ لفافہ سرکاری نہیں ۔ ورنہ بیلٹ پیپر کے لفافے پر آن ہز میجسٹی سروس **OnhisMajestyService** چھپا ہوتا ہے ۔ جو اس لفافے پر نہ تھا ۔ لفافہ جو میری جیب سے اُچک لیا تھا ۔ مجھے واپس کر دیا اور اس طرح یہ خط دشمن کے ہاتھوں سے نکل کر آج تک محفوظ ہے ۔“

اس خط سے اور باتوں کے علاوہ یہ بات بھی کُھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس دور کے احباب علم و دانش کی ہی علامہ اقبالؒ سے بے پایاں محبت و عقیدت نہ تھی بلکہ وہ بھی اپنے بہی خواہوں اور محسنوں کے لئے سفارشی خطوط تک لکھنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے ۔

DR. SIR MUHAMMAD IQBAL,
M. L. C.
BARRISTER-AT-LAW.

LAHORE.

....19

25th Sep. 1930

Dear Azar,

Dr. Zafar tells me that you have sent your vols. per registered letter to me. I am afraid I have recd. no registered letter from you. I wish you would send vols. for reviews which if you have not already done so. But Mr. Zafar tells me that you have not yet noted. Please do send the vols. to me by hand if one or to the bearer of this letter.

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

Prof. Sirajuddin Azar
Peshawar

ماخذ

۱۔ فہرست نسخہ ہای خطی فارسی

کتابخانہ دانشگاہ پنجاب لاہور ــــ

تالیفِ گنجینہ آزر سید خضر عباسی نوشاہی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔

۲۔ تاریخ پسرور تالیف ڈاکٹر سید سلطان محمد حسین صاحب سنگ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار لاہور ۔

۳۔ روزنامہ جنگ لاہور جریدہ ادب شمارہ ۲۶ جولائی ۱۹۸۹ء

۴۔ (۱) وحی و الہام (۲) برہانِ امامت

مرتبہ سید حسن جعفری ایم ۔ اے ۔ ایم ۔ او ۔ ایل ایل ۔ ایل ۔ بی وکیل لاہور

نواب پیلس ایمپرس روڈ لاہور ۔

۵۔ واقعۂ کربلا کے تاریخی اسباب و نتائج

مرتبہ سید حسن جعفری ایم ۔ اے ۔ ایم ۔ او ۔ ایل ایل ۔ ایل ۔ بی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور

پنجاب شعبہ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن لاہور ۔

علامہ اقبال اور رشید احمد صدیقی

م۔ ندیم (علیگ) علی گڑھ

علامہ اقبال کو سر سید سے جو عقیدت تھی اور علی گڑھ سے جو تعلق تھا اس کے مفصل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (۱) اقبال علی گڑھ کئی بار تشریف لائے۔ پہلی بار ۱۹۱۱ء میں اور آخری بار ۱۹۳۴ء میں۔ ہر بار اُن کی آمد پر اُن کا پُر جوش استقبال ہوا۔ انہوں نے پُر مغز مقالات پڑھے۔ طلبہ نے ان کو یونین کا تاحیات رکن منتخب کیا اور سپاسنامہ پیش کیا!

۱۹۳۴ء میں اقبال کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی گئی تھی اور خصوصی کانووکیشن منعقد کیا گیا تھا اس میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ اس وقت سید راس مسعود کارگزار وائس چانسلر تھے۔

اقبال، یونیورسٹی کے اُردو، فارسی اور فلسفہ کے شعبوں کے اکسٹرنل ممبر تھے، نیز آخر حیات تک مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی رہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی (م ۱۹۷۷ء) کو علامہ اقبال سے جو گہری عقیدت تھی اور تعلق تھا اس کا اظہار رشید صاحب کے ان مقالات سے بخوبی ہوتا ہے جو انہوں نے اقبال کی شخصیت اور فن پر تحریر کیے ہیں (۲) اقبال سے رشید صاحب کی مراسلت تھی اور ملاقات بھی رشید صاحب ۱۹۲۴ء میں اقبال سے ملنے لاہور گئے تھے۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ کے ۳ دسمبر ۱۹۲۴ء میں ایک خبر شائع ہوئی تھی۔

> "مسلم یونیورسٹی کی انجمن اُردوئے معلیٰ کے سیکریٹری مولوی رشید احمد صدیقی ایم۔اے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شاعری پر ایک مبسوط تبصرہ لکھ رہے ہیں۔ جس کے ضمن میں انہیں ڈاکٹر صاحب سے ملنا اور بعض متعلقہ امور کی نسبت استفسار کرنا ضروری تھا، چنانچہ مولوی صاحب موصوف لاہور گئے، اور ڈاکٹر صاحب سے ملے۔ قیام لاہور کے زمانے میں وہاں کے اسلامیہ کالج کے منتظمین کی خواہش پر ۲۵ نومبر ۱۹۲۴ء کو زبان اُردو پر لیکچر دیا۔ واپسی میں ۲۷/ نومبر ۱۹۲۴ء کو دہلی یونیورسٹی میں اُردو زبان کے متعلق جو کچھ ہو رہا ہے اس کو اور یہاں کی انجمن اُردوئے معلیٰ کے لائحہ عمل کو واضح کیا۔ یہ دونوں لیکچر دلچسپی سے سنے گئے۔"

شعبۂ اُردو علی گڑھ میں ریڈرشپ کی تقرری کے لیے پیش کیے گئے۔ Bio-data میں، جو خاصا طویل ہے، رشید صاحب نے تحریر کیا تھا کہ ۱۹۲۴ء میں سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں انہوں نے اقبال کا پیام، کے عنوان سے لیکچر بھی دیا تھا۔ اسی عنوان سے ان کا ایک مضمون رسالہ سہیل اپریل ۱۹۲۶ء میں بھی شائع ہوا تھا۔ رسالہ سہیل ایک سہ ماہی

رسالہ تھا۔ جو اپنے دور کا منفرد ادبی رسالہ تھا۔ علمی حلقے میں اس رسالہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس میں علامہ اقبال کا تازہ کلام بھی شائع ہوتا تھا۔

رشید صاحب کی علامہ اقبال سے خط وکتابت تھی، علامہ سے اپنی پہلی ملاقات اور مراسلت کا بیان رشید صاحب نے اپنے مضمون "ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم" (۳) میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے لیکن رشید صاحب کے نام علامہ اقبال کے خطوط نہیں ملتے سوائے ایک خط کے جو حافظ کے ایک شعر کی وضاحت کے بارے میں ہے۔

اب تک رشید صاحب کے خطوط کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور چار زیر ترتیب ہیں اور جلد ہی شائع ہوں گے ۔ شائع شدہ مجموعوں میں رشید صاحب کی ہم عصر شخصیات اُن کے قریبی اعزہ اور احباب کے نام کے خطوط نہیں ملتے۔ مثلاً ذاکر صاحب ، سید سلیمان ندوی، اصغر گونڈوی حفیظ جالندھری ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولوی الطاف حسین ہیڈ ماسٹر اسلامیہ کالج اٹاوہ وغیرہ چند نام بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ذاکر صاحب کے نام تحریر کیا گیا اب تک کوئی خط شائع نہیں ہوا ہے حالانکہ مجھے ذاتی طور پر اس کا علم ہے کہ رشید صاحب ذاکر صاحب کو طویل خطوط تحریر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ رشید صاحب کے نام تحریر کئے گئے خطوط بھی دستیاب نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رشید صاحب خطوط کو حفاظت سے رکھنے کے سرے سے قائل ہی نہیں تھے۔ اُن کے تحریر کردہ خطوط میں اس امر کی تاکید ملتی ہے کہ اُن کے خطوط پڑھنے کے بعد تلف کر دیے جائیں اور کسی صورت میں شائع نہ کئے جائیں۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ مشاہیر کے آئے ہوئے خطوط رشید صاحب حفاظت سے نہ رکھ سکے اور تلف ہو گئے۔!

۱۹۲۴ء میں رشید صاحب لاہور گئے۔ وہاں علامہ اقبال سے اپنی پہلی ملاقات کا حال تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے ۔

> "غالباً دن کے دس بجے ہوں گے۔ میں مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا، کپڑے پہن کر کسی مقدمے کی پیروی میں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ سیاہ عقدہ (بو) باندھے کالر درست کرتے ہوئے برآمد ہوئے۔ گٹھا ہوا جسم ، چوڑی چکلی ہڈیاں، مردانہ انداز، آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کسی قدر تورانیوں جیسی، سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا، مسکرانے میں آنکھوں کے گوشوں میں جھریاں پڑتی تھیں جن سے ذکاوت و ملاطفت کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لیے رہے۔ بھاری بھر کم لہجے میں بولے 'آپ ہیں جی صدیقی صاحب'۔
>
> ...... تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں آبیٹھے۔ علی گڑھ کا حال دریافت فرماتے رہے ۔"

اسی مضمون میں علامہ کے ساتھ خط وکتابت کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ خطوط کا جواب جلد سے جلد دیتے اور جب تک بینائی نے ساتھ دیا ہر خط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجتے۔ ان خطوط میں رسمی تکلفات کو بالکل دخل نہ ہوتا اور ہر بات کا جواب نہایت واضح اور جامع ہوتا۔ وہ مشکل سے مُشکل اور نازک سے نازک مسئلے میں بھی بڑی صاف گوئی سے کام لیتے۔"(۴)

رشید صاحب کی بھی یہ عادت تھی کہ وہ خط کا جواب فوراً بلکہ ہمروزہ دینے کی کوشش کرتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد رشید صاحب کا واحد مشغلہ خطوط لکھنا اور آئے ہوئے خطوط کا جواب دینا تھا۔ روزانہ چار پانچ خطوط لکھتے تھے اُن کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ کی یہ بہت بڑی مہربانی رہی تھی کہ آخر وقت تک اُن کی نظر اور انگلیوں نے اُن کا ساتھ دیا۔ وہ ہمیشہ اپنے قلم سے جواب لکھنے اور خط کا جواب فوراً ہی دینا اپنا فرض ہی نہیں اپنے پر قرض تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے ایک خط مرقومہ ۳ نومبر ۷۳ء بنام پروفیسر سید بشیر الدین (مرحوم) میں تحریر کیا ہے۔

"... جواب میں تاخیر ہو گئی ورنہ خطوط کا جواب عموماً ہمروزہ دیتا ہوں، اپنے اوپر کسی قسم کا بقایا نہیں رکھنا چاہتا ، معلوم نہیں کب کیا ہو جائے تو کوئی یہ نہ کہے مجھ پر اُس کا کچھ واجب الادا تھا۔"

اب تک رشید صاحب کے نام علامہ اقبال کا صرف ایک ہی خط دستیاب ہو سکا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔ مذکورہ بالا خط مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔

لاہور

۷ دسمبر ۱۹۲۹ء

جناب صدیقی صاحب السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔

میری ناقص رائے میں خواجہ حافظ کے شعر میں لفظ 'بادیہ پیمائی' ہے۔ پہلے مصرع میں 'ایں جا' سے مراد ، دریں بادیہ، ہے۔ مفہوم شعر کا یہ ہے کہ اس دشت میں سیکڑوں ہوائیں بے سلسلہ (یعنی بے زنجیر آزادانہ) رقص کر رہی ہیں اور یہی ہوائیں اے دل تیری رفیق (حریف بہ معنی رفیق) ہیں ۔ جب تک تو بادیہ پیما ہے۔ یا ان کا رقص اس غرض سے ہے کہ تو آسانی اور اطمینان سے اس صحرا کو طے کر لے۔

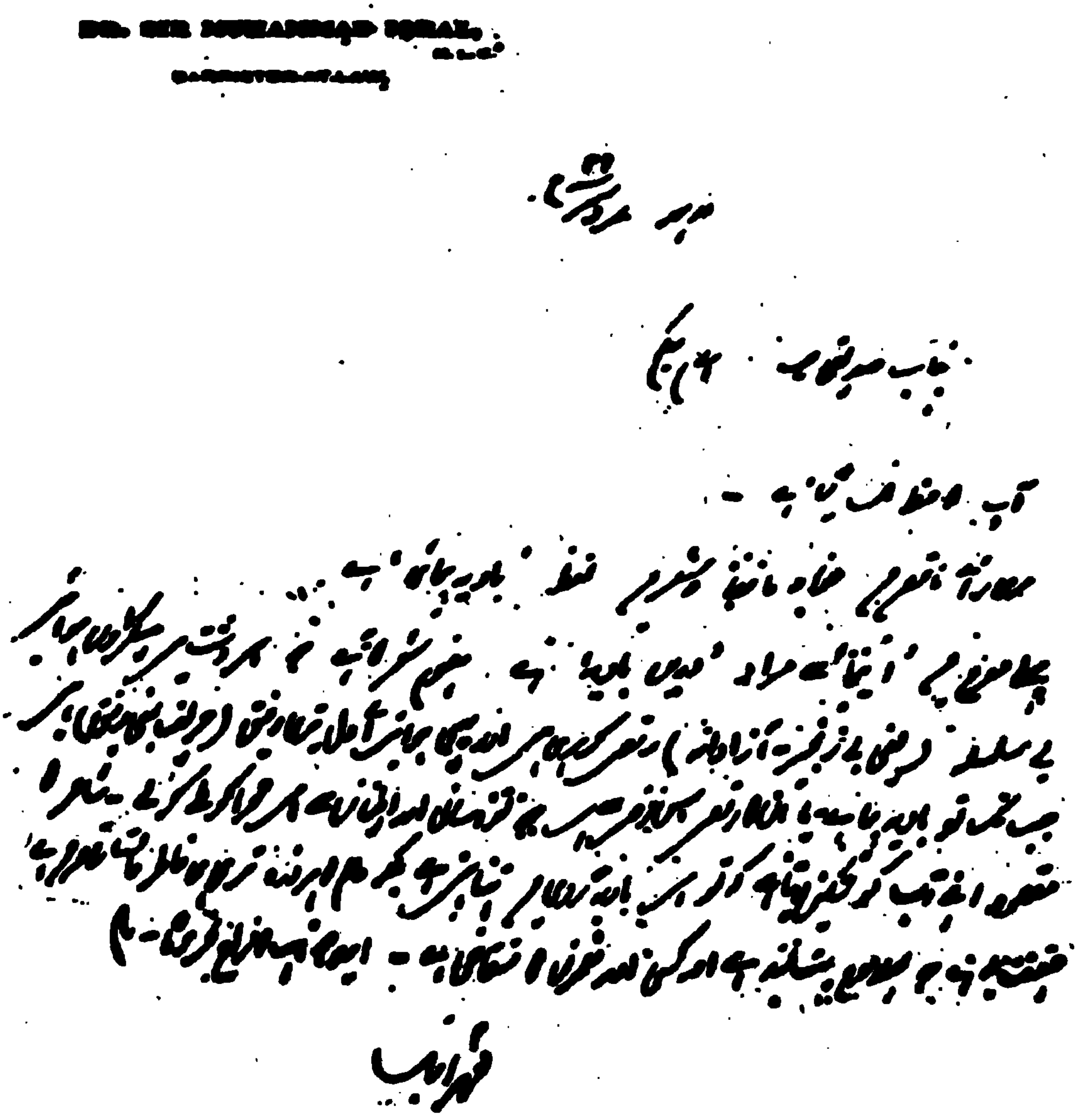
شاعر کا مقصود اپنے آپ کو تسکین دینا ہے کہ تو ہی بادیہ گردی میں تنہا نہیں ہے بلکہ عالم کا ہر ذرّہ تیری ہی خاطر حالت رقص میں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پہلا مصرع بہت بلند ہے اور کسی اور مضمون کا متقاضی ہے۔

امید کہ آپ کا مزاج بہ خیر ہو گا۔ والسلام

محمد اقبال

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے نام علامہ اقبال کے ایک خط کا عکس


DR. SIR MUHAMMAD IQBAL,
M.A., Ph.D.
BARRISTER-AT-LAW.

محمد اقبال

حاشیہ ۴ اصل شعر اس طرح سے ہے:

ہمہ باد صبا آنچہ بہ سلسلہ میر قصند
اینست حریف اے دل تا بادیہ پیمائی

علامہ اقبال ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ میں لیکچر دینے تشریف لائے تو ملاقات کرنے رشید صاحب کے مکان پر تشریف لائے۔ رشید صاحب ان دنوں بیمار تھے۔

"میں بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر صاحب اُنہی دنوں، یاد نہیں آتا کس سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ ایک دن صبح مکان تشریف لائے۔ اُس روز مجھے خاص طور پر بڑی تکلیف تھی۔ مُشکل سے باہر آیا۔ میں نے بڑی مایوسی کے ساتھ رُک رُک کر کہا، ڈاکٹر صاحب کاش میں اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ ہائے وہ اُن کا چونک کر لیکن فوراً ہی مسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے مخصوص لہجے میں فرمانا نہیں جی صدیقی صاحب کوئی بات نہیں اللہ اپنا فضل کرے گا۔ اچھے ہو جاؤ گے۔ پھر لاہور آنا۔ مایوس کیوں ہوتے ہو، مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے۔"

... اس کے بعد دیر تک اس انداز سے گفتگو کرتے رہے کہ میں ان کی موجودگی میں یہ بھی بھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔" (۵)

رشید صاحب کے منفرد اسلوب کے بارے میں علامہ اقبال کی کیا رائے تھی اس کا اظہار رشید صاحب کو دی گئی ایک تحریر سے ہوتا ہے جس میں رشید صاحب کے مزاح کو اُردو ادب میں ایک تازہ عنصر سے تعبیر کیا ہے۔

Dr. Sir Muhammad Iqbal, M.L.C.
Barrister-at-Law, Lahore.

Lahore.

7th February, 1929.

I am glad to be able to say that Mr. Rashid Ahmad Siddiqi of the Muslim University Aligarh is one of the most promising Urdu writers of the younger generation. His writings reveal an acute observation of men and manners, and his quiet humour is a fresh

element in our literature. I can safely predict that he is likely to develop a form of style which may become a living force in shaping the character of our modern Urdu prose.

(Sd. Mohammad Iqbal.)

Dr. Sir Muhammad Iqbal, M.L.C.
Barrister-at-Law-Lahore.

Lahore.
7th February, 1929

I am glad to be able to say that Mr. Rashid Ahmad Siddiqi of the Muslim University Aligarh is one of the most promising Urdu writers of the younger generation. His writings reveal an acute observation of men and manners, and his quiet honour is a fresh element in our literature. I can safely predict that he is likely to develop a form of style which may become a living force in shaping the character of our modern Urdu prose.

(Sd. Mohammad Iqbal)

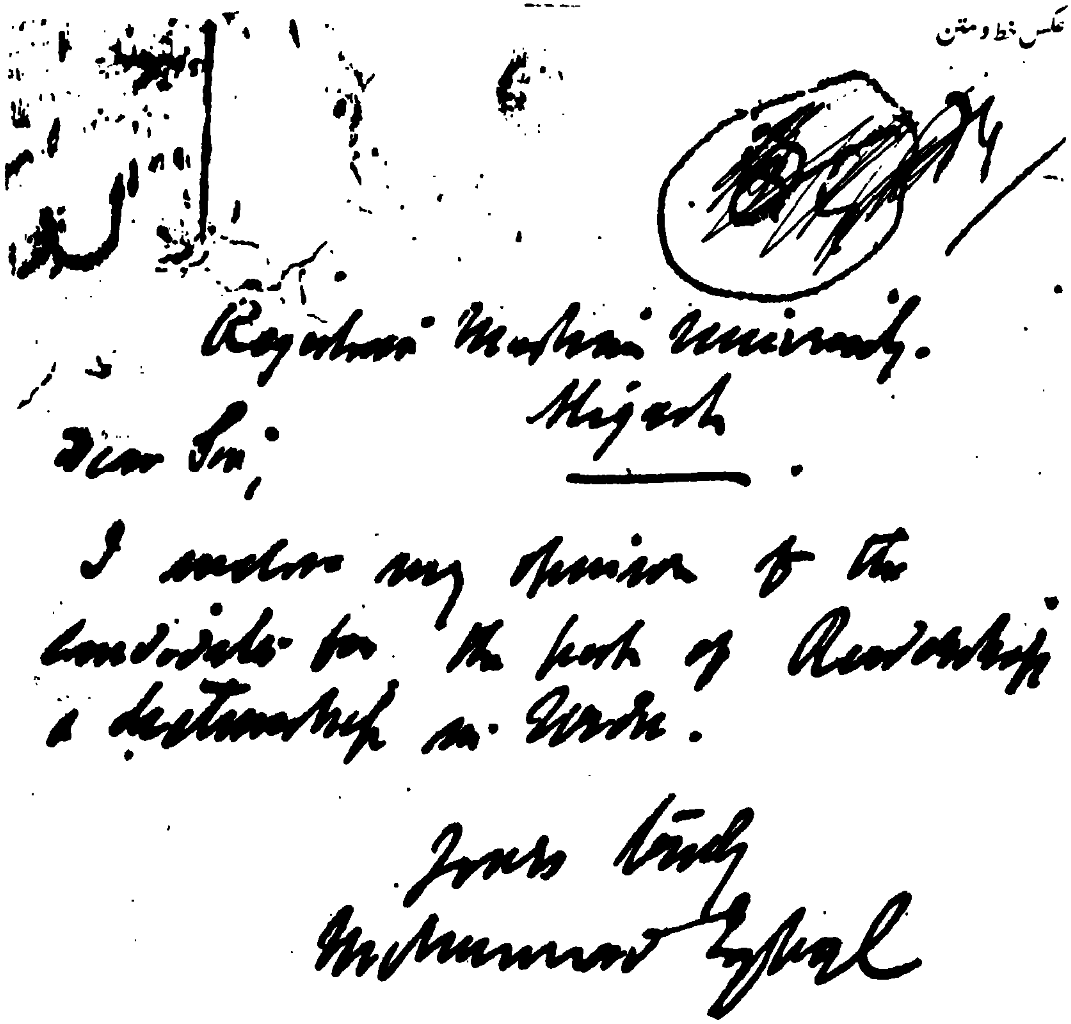
۱۹۳۵ء میں شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر شپ کے اُمیدواروں میں رشید صاحب کے علاوہ مولانا اقبال سہیل، محمد یحییٰ تنہا جلیل احمد قدوائی، سید طالب علی، سید علی احسن مارہروی اور سید حامد حسن بلگرامی بھی تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور سید سلیمان ندوی صاحبان سلیکشن کمیٹی کے ممبر تھے، ذاکر صاحب نے شرکت سے معذوری کرلی تھی کیونکہ بقول ان کے بعض امیدواروں سے اُن کے ذاتی تعلقات تھے!

علامہ اقبال سے ریڈر شپ کے لیے اُمیدواروں کا Bio-data بھیج کر رائے مانگی گئی تھی۔ علامہ نے تمام اُمیدواروں کی صلاحیتوں کو دیکھ کر ریڈر شپ کے لیے صرف رشید صاحب کے نام کی سفارش کی تھی کہ میری رائے میں کوئی دوسرا اُمیدوار رشید احمد صدیقی کی قابلیت اور معیار کا نہیں ہے۔ اس طرح رشید صاحب کا تقرر علامہ اقبال کی رائے پر ہوا تھا!

ریڈر شپ کے علاوہ لیکچر رشپ کے لئے بھی بعض اُمیدواروں نے درخواست دی تھی۔ علامہ نے لیکچر شپ کی تقرری کے لیے بھی اپنی رائے دی تھی ۔ علامہ کے خط کا عکس قارئین کے لیے پیش ہے:

علامہ اقبال کے اپنے ہاتھ کی تحریر جس میں رشید صاحب کے ریڈر شپ کی تقرری کی سفارش کی گئی ہے۔

عکس خط و متن



Registrar Muslim University
Aligarh.

Dear Sir,

I enclose my opinion of the candidates for the post of readership and Lecturership in Urdu.

Yours Truely
Mohammad Iqbal

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M.A., Ph.D. L.L.
Barrister-at-Law
Lahore
Dated..........

Opinion

A. Readership

For Readership I unhesitatingly vote for Rashid Ahmad Siddiqi (No. 34 in your list). He has always struck me as a prose writer & critic of great promise. His prose has a kind of quiet humour & freshness which I hardly find in his contemporaries of the younger school. This judgement is based on my personal knowledge of himself & his writings. In my opinion no other candidate comes up to R. Ahmad.

Lectureship

For Lectureship only four names should be considered i.e. (No. 6, 16, 20, 26 in your list). I am personally inclined to choose Sajjad Ali Ahsan (No. 16). He is now 57 having given the best part of his life to the study of Urdu. I think he has proved a success as a lecturer in Urdu. It is a pity that he has no knowledge of English; and I fear other members of the committee may not

agree with me. If they cannot see their way to agree with me then, in my opinion, the choice lies between three persons — Jalil Ahmad Qidwai, Muhammad Yahya Tanha & Agha Muhammad Ashraf, i.e. no. 6, 20, 26 in your list. Agha Muhammad Ashraf seems promising but he is too young yet for a post of this kind. Of the remaining two I prefer Jalil Ahmad Qidwai.

Muhammad Iqbal
7th Aug. 1934

Dr. Sir Mohammad Iqbal
M.A. Ph.D. London
Barrister at Law

Lahore

Dated

Opinion

A. Readership

For Readership I unhesitatingly vote for Rashid Ahmad Siddiqi (no. 34 in your list) He has always struck me as a prose writer and critic of great promise. His prose has a kind of quiet humour and freshness which I hardly find in his contemporaries of the younger school. This judgement is based on my personal knowledge of himself and his writings. In my opinion no other candidate comes up to R. Ahmad.

Lecturership

For Lecturership only four names should be considered i.e. (no. 6, 16, 20, 26 in your list) I am personally inclined to choose Sayyid Ali Ahasn (no.16) He is now 57 having given the best part of his life to the study of Urdu. I think he has proved a success as a lecturer in Urdu. It is a pity that he has no knowledge of English. and I fear other members of the committee may not agree with me. If they cannot see their why to agree with me then, in my opinion, the choice lies between three persons ---Jalil Ahmad Qidwai Muhammad Yahya Tasha and i.e. no. 6,20,26 in your list. Agha Mohammad Ashraf seems promising but he is too young fit for a post of this kind . Of the remaining two I prefer Jalil Ahmad Kidwai.

Mohammad Iqbal
7th Aug. 1934

رشید صاحب اس مسئلہ سے متعلق یوں تحریر کرتے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب نے جاوید اور بانو کی تربیت و نگہداشت کے لیے ایک شریف جرمن خاتون کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ یہ خاتون میرے ایک عزیز دوست کی رشتہ دار ہیں اور کچھ عرصہ سے میری بیوی بچوں کے ساتھ گھر کے ایک عزیز رکن کی حیثیت سے رہ چکی تھیں۔ میں نے ہی ڈاکٹر صاحب سے تحریک کی تھی کہ یہ خاتون بچوں کی نگرانی و تربیت و تہذیب میں بہت مفید ثابت ہوں گی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب سے کچھ عرصہ تک خط و کتابت ہوتی رہی میں نہیں بتا سکتا کہ مرحوم اِن بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے کتنے فکر مند تھے۔ ان کو معاوضہ کی کمی و بیشی پر مطلق اصرار نہ تھا۔ لیکن وہ خاتون کی سیرت و عقائد کی چھان بین میں اس درجے کاوش کرتے تھے کہ بالآخر میں نے تھک کر لکھ دیا کہ آپ کا نقطۂ نظر میں پورے طور سے سمجھ چکا ہوں مزید گفتگو سے بہتر ہوگا کہ آپ امتحاناً انہیں دو ایک ہفتہ کے لیے اپنے ہاں بلا لیں اور ان کے انداز و اطوار کو نظر میں رکھیں۔ اس کے بعد فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ ان کا رکھا جانا مناسب ہے یا نہیں ۔

ڈاکٹر صاحب اس تجویز کو مان گئے اور جرمن خاتون جن کو ہمارے ہاں چھوٹے بڑے سب آپا جان کہا کرتے تھے لاہور پہنچ گئیں۔ ان کے پہنچنے کے بعد مرحوم کے جو خطوط آتے ان میں ہر ایک میں ان خاتون کی شرافت و قابلیت ، دیانت و امانت ، محبت و مروت کا ذکر ہوتا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو ان پر اتنا اطمینان و بھروسا ہوا کہ رحلت کے وقت مرحوم نے ان دونوں بچوں اور سارے گھر بار کو خاص طور پر ان کے سپرد کیا ڈاکٹر صاحب کی وفات پر بہت سے لوگوں نے ان جرمن خاتون کا بڑے اچھے الفاظ میں اپنے مضامین اور بیانات میں تذکرہ کیا۔ (٦)

رشید صاحب نے علامہ اقبال کی تحریک پر جاوید اور منیرہ کی نگہداشت کے لیے علی گڑھ سے ایک جرمن خاتون (جو آپا جان کہلاتی تھیں) کو لاہور بھیجا تھا۔ علامہ دونوں بچوں کی تربیت کی طرف سے بہت فکر مند تھے۔ ان خاتون کے آ جانے سے اقبال کیسے مطمئن اور مسرور تھے اس کا اظہار اپنے ایک مکتوب میں اس طرح کرتے ہیں:

"جاوید اور مُنیرہ کی نگہداشت کے لیے اور گھر کے عام انتظامات کے لیے جو ایک مدت سے بگڑا ہوا ہے میں نے فی الحال آزمائشی طور پر علی گڑھ سے ایک جرمن خاتون کو جو اسلامی معاشرت سے واقف ہے اور اُردو بول سکتی ہے بلوا لیا ہے۔ پروفیسر رشید صدیقی اور دیگر احباب نے اس کی شرافت کی بہت تعریف کی ہے۔ اگر وہ اپنے فرائض ادا کرنے میں کامیاب ہوگی تو مجھے بے فکری ہو جائیگی جاوید کی عمر اس وقت تقریباً ۱۳ سال ہے اور مُنیرہ کی تقریباً سات سال ۔ ماں کی موت سے ان کی تربیت میں بہت نقص رہ گئے ہیں اسی واسطے میں نے مذکورہ بالا انتظام کیا ہے۔ (٧)

مکتوب بنام سر راس مسعود

۸/جون ۱۹۳۷ء

یہ جرمن خاتون (آپا جان) رشید صاحب کے ایک عزیز ترین دوست ڈاکٹر اصغر علی حیدر ، جو کہ شعبۂ نباتیات (Botany) میں استاد تھے، اور لکھنؤ کے باشندہ تھے، ان کی سالی تھیں، آپا جان کا اصل نام ڈورا ۔ لینڈویر (Dora Landweir) تھا ڈاکٹر اصغر علی کا انتقال ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء میں ہوا۔ وہ ایک فرض شناس استاد، بہترین دوست اور اعلیٰ اقدار کے حامل انسان تھے۔ رشید صاحب کی تحریروں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

آپا جان نے بعد میں شادی کر لی تھی۔ وہ اکثر ہندوستان آتی رہتی تھیں ۔ ۱۹۹۰ء کے آخر تک بقید حیات تھی۔ خدا کرے کہ وہ اب بھی سلامت ہوں۔

علامہ اقبال کو سید راس مسعود سے جو شیفتگی تھی اور بھوپال کے دوران قیام کے حالات اور سر راس مسعود و لیڈی مسعود کی بیٹی نادرہ مسعود کی ولادت (۱۹۳۷ء) کا حال رشید صاحب نے تفصیل سے بیان کیا ہے:

"اس کے بعد نادرہ پیدا ہوئی تو ڈاکٹر اقبال بھوپال میں تھے اور لیڈی مسعود اندور میں ۔ نادرہ کی ولادت سے اقبال بے انتہا مسرور تھے اور اس کو دیکھنے کے بے حد مشتاق ۔ تھوڑے ہی دنوں بعد لیڈی مسعود اطلاع دیے بغیر بھوپال آگئیں۔ اتفاق سے سر راس مسعود اور اقبال دونوں یکجا تھے۔ سر راس مسعود نے فرطِ اشتیاق سے آگے بڑھ کر بچی کو آغوش میں لینا چاہا۔ اقبال نے آواز دی ، نہیں۔ پہلا حق شاعر کو پہنچتا ہے ۔ چنانچہ ماں نے نادرہ کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں دے دیا۔"

اور یہی نادرہ (۹) بعد میں رشید صاحب کے صاحبزادے پروفیسر احسان رشید صاحب کی شریکِ حیات ہوئیں۔

حواشی

١ ۔ اس موضوع پر حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جو قابل مطالعہ ہے دیکھئے "سر سید ، اقبال اور علی گڑھ" از ڈاکٹر اصغر عباس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۔ ٦٤ صفحات ۔

٢۔ دیکھیے اقبال فن اور شخصیت ١٩٧٢ء

٣ ۔ بشمول نقد و نظر (علی گڑھ) رشید احمد صدیقی نمبر

٤ ۔ ایضاً ، حوالہ سابق

٥ ۔ ایضاً ، حوالہ سابق

٦ ۔ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم۔ فکر و نظر (علی گڑھ) رشید احمد صدیقی نمبر ۔

٧ ۔ ماہ نو ۔ ٣٠ سالہ انتخاب نمبر

اقبال نمبر ستمبر ١٩٧٧ء ص ٣٠١

٨۔ (مرحوم)۔



ادا جعفری
سوانحی اور مزاجی خاکہ

ترتیب و تشکیل : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

"۔۔۔۔۔ عورت ایک مہلتِ حیات میں کتنی نیون جھیلتی ہے، قلم ہاتھ میں تھام لے تو جھمیلے کچھ اور بڑھ جاتے ہیں۔۔۔۔۔"

——— ادا جعفری

اِسے حُسنِ اتفاق کہہ لیجئے ، "نظریۂ ضرورت" کا نتیجہ یا ایک ایسا چارۂ کار، جس میں میرے انتخاب یا فرار کو کوئی دخل نہیں رہ گیا تھا کہ سال کے آخری سرد ایام میں جب خلیج کی جنگ لہو کو گرم اور اعصاب کو شل کیے دے رہی تھی، مجھے ادا جعفری کی سیرت و شخصیت اور اُن کی شاعری کی تلاش و جستجو میں لگنا پڑا ——— اگلے صفحات اِسی کوشش اور کاوش کا حاصل ہیں ۔ یہ مُطالعہ ، ادا جعفری کی سوانح ، اُن کی اُفتادِ مزاج ، اُن کے تجربات ، اُن کی کامرانیوں اور اُن کی سلسلے وار تہذیبی مصروفیات کے خاکے پر مبنی ہے۔ اُن اجزا کی ترتیب و تشکیل میں ، ۱۹۴۴ء سے ۱۹۹۰ء تک ، کوئی پینتالیس چھیالیس برسوں پر پھیلے ہوئے درج ذیل مآخذ میرے پیش نظر رہے۔

کتابیں:

۱۔ تذکرۂ شاعراتِ اُردو ، محمد جمیل احمد بریلوی ، قومی کتب خانہ ، بریلی ، ۱۹۴۴ء

۲۔ یہ صورت گر کچھ خوابوں کے ، طاہر مسعود مکتبہ تخلیقِ ادب ، کراچی ، ۱۹۸۵ء

۳۔ مَیں ساز ڈھونڈتی رہی ، ادا جعفری ، طبع سوم مقبول اکیڈمی لاہور اگست ۱۹۸۸ء

۴۔ شہرِ درد ، ادا جعفری ، طبع سوم ، ایضاً

۵۔ غزالاں تم تو واقف ہو ، ادا جعفری ، طبع سوم ، ایضاً

۶۔ سازِ سخن بہانہ ہے ، ادا جعفری ، طبع سوم ، ایضاً

۷۔ سازِ سخن (چاروں شعری مجموعوں کا انتخاب) ادا جعفری ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، نئی دہلی ، مئی ۱۹۸۶ء

مکاتیب:

۱۔ خط جناب نورالحسن جعفری ، بنام : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ۱۶ مارچ ، ۲۳ مارچ ۱۹۹۰ء

۲۔ خط محترمہ ادا جعفری ، بنام : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ۱۰۔ جنوری ۱۹۹۱ء

رسائل:

۱۔۴۔ افکار ، کراچی، اپریل ۱۹۸۹ء تا جولائی ۱۹۸۹ء (چار شمارے) ۔

۵۔۸۔ افکار ، کراچی ستمبر ۱۹۸۹ء تا دسمبر ۱۹۸۹ء (چار شمارے)۔

۹۔۱۹۔ افکار ، کراچی ، جنوری ۱۹۹۰ء تا نومبر ۱۹۹۰ء

۸۔ غزل نما، مرتبہ: ادا جعفری

- انجمن ترقی اُردو، کراچی ۱۹۸۷ء
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی مئی ۱۹۸۸ء

متن میں مآخذ کا مختصر حوالہ ہر جگہ دے دیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کوشش پسندیدہ ٹھہرے گی اور ادا جعفری کو جاننے اور اُن کے شعری محرکات اور پس منظر کو سمجھنے کے سلسلے میں مُعین اور مفید ہو گی۔

(گیارہ شمارے)

۲۰۔ نقوش، لاہور، ستمبر ۱۹۶۵ء

۲۱۔ نقوش، لاہور غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء

۲۲۔ ۳۱۔ نقوش، لاہور، شمارہ ۱۲۹ تا ۱۳۸ (۱۹۸۲ء تا ۱۹۹۰ء) دس شمارے۔

۳۲۔ قومی زبان، کراچی، دسمبر ۱۹۸۳ء

۳۳۔ قومی زبان، کراچی، اپریل ۱۹۸۴ء

۳۴۔ دائرے، کراچی، ستمبر ۱۹۹۰ء

ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن

شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لاہور

"مڑ کر دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ بدلتے موسموں کی دل داری اور دل آزاری دونوں پر یقین کرنے کے لیے کبھی کبھی بھولی بسری یادوں کو چھو لینا بھی اچھا ہے ——— میرے پاس ایک حیلہ یہ بھی تو ہے کہ لوگ میری ذاتی زندگی کے بارے میں پوچھتے ہی رہتے ہیں ———"

[ادا جعفری، افکار، اپریل ۱۹۸۹ء، ص ۱۷]

نام: عزیز جہاں بیگم (۱)

تاریخِ ولادت: (۲) ۲۲ — اگست ۱۹۲۴ء

جائے ولادت: (بڑی حویلی) بدایون (۳) یو۔ پی، انڈیا

بدایون میں قیام: مارچ ۱۹۴۸ء تک (۴)

والد: مولوی بدرالحسن (۵)، وفات: بدایون، ۱۹۲۹ء

امّی: امّی بہت کم عمری میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ اندازاً تیس پینتیس سال کی عمر میں۔ مالی پریشانی نہیں تھی لیکن بیوگی کا بوجھ اُٹھانے کے ساتھ ساتھ اُنہیں ایک نومولود بیٹے اور تین کم سن بیٹیوں کی پرورش، پرداخت اور تربیت کرنا تھی۔ باپ کے سائے سے محروم بچوں کو اپنی زندگی، اپنی ہی دھوپ اور اپنی ہی چھاؤں میں بسر کرنا سکھانا تھا۔ یہ سب مراحل بڑے حوصلے اور مستقل مزاجی کے ساتھ اُنہوں نے طے کیے ... میری عبادت گزار، کم گو، اور صابر ماں غم کی آگ میں تپ کر کندن ہو گئی تھیں۔ پورے خاندان کے لیے اُن کا وجود ایک رحمت تھا۔ ہم نے ہمیشہ اُنہیں مصروف دیکھا، افسردہ یا اُداس نہیں دیکھا... انتقال سے چند دن پہلے (۱۹۲۹ء) میں میرے والد نے اُن سے کہا تھا:

"میری تینوں بیٹیاں اپنا اپنا نصیب لے کر آئی ہیں۔ تم ان کے لئے پریشان نہ ہونا۔۔۔ اور مَیں اُسے نہیں دیکھ سکوں گا لیکن تم اپنے بیٹے کی بہت خوشیاں دیکھو گی۔۔۔"

(ادا جعفری ، افکار ، نومبر ۱۹۸۹ء ص ۳۱—۳۲)

بھائی : طیّب (۶) حسن صدّیقی ۔

"والد کی وفات (۱۹۲۹ء) کے تین ماہ بعد میرا اکلوتا بھائی پیدا ہوا۔ خُدا سلامت رکھے"

(افکار ، اپریل ۱۹۸۹ء ص ۲۴)

بھاوج : سعیدہ (۷)

بھتیجے ، بھتیجیاں : فوزیہ ، فراز ، شاداب اور آسماء (۸)

بڑی بہن : بلقیس ۔ (افکار ، کراچی ، جون ، ۱۹۸۹ء ، ص ۲۱)

بہنوئی : "ایک انقلاب آفریں فیصلہ امّی نے باجی کی شادی کے موقع پر کیا۔ خاندان میں میری بڑی بہن پہلی لڑکی تھیں جن کی شادی غیر خاندان میں ہوئی۔ میرے بہنوئی ڈاکٹر مقبول الحق ، جنرل عتیق الرحمٰن کے چچازاد بھائی تھے (جب شادی طے پائی تو وہ) بنارس میں میڈیکل آفیسر تھے۔ باجی شادی کے بعد بنارس جاکر رہیں۔"

(افکار ، نومبر ۱۹۸۹ء ، ص ۳۵)

بھانجے : (بلقیس باجی کے) دو بیٹے ہیں: ڈاکٹر نعیم الحق ، جو کراچی میں ہیں اور اسلم حق جو انجنیئر ہیں اور امریکہ میں مقیم ہیں۔ دونوں ماشاءاللہ صاحبِ اولاد ہیں۔

(افکار ، نومبر ۱۹۸۹ء ، ص ۳۵)

منجھلی بہن : شمسہ (افکار ، مارچ ۱۹۹۰ء ، ص ۱۷، ۱۸)۔

بہنوئی : "میری منجھلی بہن شمسہ کے شوہر جمال احمد رضوی کو میرے ذوقِ شعری کی پرداخت میں بڑا دخل رہا۔ انٹرنیشنل لیبر آفس (I.L.O) میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ جنیوا اور پھر ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لندن میں اقامت رہی۔ جمال بھائی کا انتقال (۱۹۸۰ء میں) لندن میں ہوا۔

(ادا جعفری ، افکار ، دسمبر ۱۹۸۹ء ص ۳۸۔۳۹)

بھانجی اور بھانجا : "(شمسہ باجی) کی بیٹی نُزہت پروین امریکہ میں ڈاکٹر ہے۔ لڑکا انور جمال ، لندن میں اپنے کاروبار سے مُنسلک ہے۔۔۔"

(افکار ، دسمبر ۱۹۸۹ء ، ص ۳۹)

نانی : "سادگی ، نیکی اور خیر کو اگر کوئی شخص انسانی پیکر میں دیکھ سکتا ہے تو وہ میں نے اپنی نانی کو دیکھا ، ہر شخص کی ، ہر قسم کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار۔۔۔ وہ اناج ہی نہیں محبتیں بھی جھولیاں بھر بھر بانٹنا جانتی تھیں۔ نئی اور جوان

ہوتی ہوئی نسل کو انسانیت کا درس لینے کے لئے ، کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی ... جس آواز سے ہر صبح ہماری آنکھ کھلتی وہ اُن کی تلاوتِ کلام پاک کی خوش لحن ، مدھم ، شیریں آواز تھی ... اُن کی یاد ، بدایون کی میری چند محبوب یادوں میں سے ایک ہے ..."

(افکار ، جون ، ۱۹۸۹ء ، ص ۲۱)

نانا : "نانا کی شفقتیں اور محبتیں لاانتہا تھیں۔ ہماری ہر خوشی اُنہیں عزیز تھی ... میں جب نانا کہتی ہوں تو میری مراد اپنی نانی کے بھائی مولوی ظہور حسن سے ہوتی ہے ... میرے جو حقیقی نانا تھے انہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ میری پیدائش سے بہت پہلے انہوں نے دوسری شادی کرلی تھی ... اس کے بعد وہ کبھی گھر میں نہیں آئے اور نہ ہی میرے علم میں کبھی کسی نے ان کے بارے میں گفتگو کی۔

(افکار ، مئی ۱۹۸۹ء ، ص ۲۰۔ ۲۱)

"ہمارے گھر اور خاندان کے سربراہ نانا مولوی ظہور حسن تھے، روشن خیال اور ساتھ ہی بے حد غنی طبیعت کے مالک ، اس وجہ سے ہمارے لیے رفتہ رفتہ بہت سی پابندیاں ختم ہوتی جارہی تھیں ... روایات اور رسوم سے اٹے ہوئے ماحول کو ان کے مہربان وجود نے خوشگوار بنا دیا تھا۔"

(افکار ، جولائی ۱۹۸۹ء ص ۱۷۔ ۱۸)

"میری یاد میں ۱۹۴۵ء ، ۱۹۴۴ء کا زمانہ ہے جب ملک کی سیاست اور تحریک آزادی سے الگ تھلگ رہنے والا (ہمارا) تغیر نا آشنا خاندان جس کے مزاج میں روایت پرستی رچی ہوئی تھی (اور جسے صرف اپنے ہی نقش قدم پر چلنے کی عادت تھی) ایک سیاسی جماعت مسلم لیگ سے جذباتی اور عملی دونوں لحاظ سے وابستہ ہو چکا تھا ... نانا کے احباب میں غیر مسلم (اصحاب) بھی تھے ... نانا کو بہت زیادہ پریشان ہم نے ان دنوں دیکھا جب ان کے ہندو منشی نے بغیر کسی وجہ کے اور بغیر اطلاع دیے ہوئے ملازمت ترک کی ... ان کا برتاؤ ملازمین کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ رہا تھا۔ ایک محنتی اور وفادار ملازم کا یہ طرز عمل گویا عمومی طور پر لوگوں کی بدلتی ہوئی سوچ کا پیمانہ تھا۔ نانا کا انتقال اسی زمانے میں ہوا ..."

(افکار ، فروری ۱۹۹۰ء ، ص ۲۵۔ ۲۴)

بڑے تایا : "میری امی کے تایا مولوی وزیر حسن بدایون کے پہلے گریجوایٹ تھے۔"

ماموں : مولوی محمد مسعود ، جائیداد کے نگران

مولوی خلیل احمد ، وکیل

مولوی عبدالرؤف ، وکیل

منجھلے ماموں مولوی خلیل احمد ، ہم بھائی بہنوں کے لئے باپ کی جگہ تھے۔ انہوں نے تمام عمر شادی نہیں کی۔

جائیداد اور آمدنی کی رحمتوں اور زحمتوں دونوں سے وہ آگاہ تھے، اس لیے اپنی تمام خوشیاں اور محبتیں صرف بیوہ بہن اور ان کے چاروں بچوں کے لیے وقف کر دیں۔ مالک حقیقی ان کے درجات بلند فرمائے ، آمین۔

(افکار ، اگست ۱۹۹۰ء ، ص ۱۷)

خالہ : "میری حقیقی خالہ ایک ہی تھیں ۔ ان کا نام صفیہ تھا۔ شادی نہیں ہوئی تھی۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن ان کا شمار لڑکیوں میں ہوتا ۔ ہم لوگ بھی انہیں سہیلیوں کا درجہ ہی دیتے تھے۔

(افکار ، جون ، ۱۹۸۹ء ، ص ۲۱)

تعلیم : "میرے ہوش سنبھالنے تک بدایون شہر میں قابل فہم تبدیلیاں آچکی تھیں اب یہ برداشت کر لیا گیا تھا کہ لڑکے علی گڑھ کالج جا کر انگریزی تعلیم حاصل کریں... لڑکیوں کے لیے اسکول ، کالج کے تمام دروازے بند تھے خواتین قرآن مجید کے بعد اردو پڑھنا لکھنا سیکھ لیتی تھیں اور ان کے لیے حصول تعلیم کے تمام مراحل طے ہو جاتے تھے۔

(افکار ۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء ، ص ۱۹)

"امی نے اپنی اولاد کے لیے جو فیصلے کیے وہ بڑے دوررس نتائج کے حامل تھے... سب سے پہلا اہم فیصلہ انہوں نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں کیا، اگرچہ قدم قدم پر پابندیوں کی وجہ سے بہت سی آرزوئیں نہ ہماری پوری ہو سکیں، نہ ان کی لیکن رکاوٹوں کا مقابلہ تو انہوں نے کیا۔ جہاں لڑکیوں کے لیے مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے تمام دروازے بند تھے. وہاں امی نے سب سے پہلے میری بڑی بہن کو ایک عمر رسیدہ اُستاد سے پردے کے مکمل اور شدید انتظام کے ساتھ فارسی پڑھوائی اور ساتھ ہی ایک ہندو ٹیوٹر سے انگریزی بھی... ٹیوشن کا سلسلہ پردے کے مکمل انتظام کے ساتھ شروع کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود خاندان کے کئی بزرگ خفا ہوئے، مخالفت زیادہ تر خواتین ہی کی جانب سے شدید تھی..."

(افکار ، نومبر ۱۹۸۹ء ، ص ۳۲)

میٹرک (انٹرنس) (۹) : ۱۹۴۰ء

"میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پرائیویٹ طور پر دینے کی تیاری کر رہی تھی... یہ ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے..."

(افکار ، اکتوبر ۱۹۸۹ء ، ص ۲۲)

"بدایون میں اُس زمانے میں لڑکیوں کا کوئی کالج نہیں تھا۔ پرائیویٹ طالبہ کی حیثیت سے میں امتحانات میں شریک بھی ہوئی لیکن مجھے باقاعدہ کالج میں داخل ہو کر تعلیم حاصل نہ کر سکنے کا دکھ بہت رہا اور بہت دنوں رہا..."

(افکار ، نومبر ۱۹۸۹ء ، ص ۳۲)

اَساتذہ : "میرے فارسی کے اُستاد ، عبدالستار صاحب ، غالباً لڑکوں کے اسکول یا کالج میں مدرس تھے۔ اثر لکھنوی کی ایک رباعی کے معنی پر اختلاف تھا۔ رباعی اردو کی تھی۔ ایک مصرعے میں جو ترکیب استعمال کی گئی تھی، اس کی

وضاحت کے لئے ان سے رجوع کیا تھا اور پھر ان کی تشریح کو ماننے سے انکار کر دیا، اب سوچتی ہوں کہ اختلاف رائے کے باوجود احتراماً خاموش بھی رہ سکتی تھی، شاید وقت کے اپنے ہی تقاضے ہوتے ہیں... ماسٹر عبد الستار نے تدریس کا سلسلہ آگے جاری رکھنے سے انکار کر دیا اور میں نے ایک بار پھر براہِ راست کتابوں سے اپنا تدریسی سلسلہ جوڑ لیا۔ بعد میں یہی واقعہ اثر لکھنوی سے میرے تعارف کا وسیلہ بنا... بقیہ نصاب کے لیے ہندو اُستاد تھے۔ پہلے بابو رام اور پھر سدرشن لال، جن سے اپنے نصابی مضامین کے علاوہ میں نے ہندی پڑھی اور کچھ عرصہ سنسکرت بھی، رامائن شروع کی تھی لیکن خالص ہندی زبان جتنی موہنی ہے، سنسکرت کے الفاظ اتنے ہی ثقالت زدہ ملے۔ تلفظ قطعی غیر شاعرانہ، دل نہیں لگا..."

(افکار، نومبر ١٩٨٩ء، ص ٣٤)

شادی: برّصغیر میں ٤٦، ١٩٤٧ء نہایت اہم انقلابی فیصلوں اور تبدیلیوں کے سال تھے۔ انہیں دو برسوں کے اندر ایک اور خاموش انقلاب تھا جو میری زندگی سے تعلق رکھتا تھا...

یہ رشتہ نور کی خواہش پر اُن کی پھوپھی زاد بہن طیّبہ جعفری اور شمسہ باجی کی مشترکہ دلچسپی سے طے ہوا تھا۔ دونوں اِس زمانے میں سیتاپور میں تھیں اور آپس میں بہت گہری دوستی تھی۔ میں کبھی کبھی شمسہ باجی کے گھر جاتی رہتی تھی، وہیں آپا طیّبہ جعفری سے ملاقات ہوئی تھی جنھوں نے میری فکرِ سخن کی حکایت بھی سُنی تھی... جنوری ١٩٤٧ء میں ہماری شادی ہو گئی... شادی لکھنؤ میں ہوئی۔ بدایون میں خون ریزی نہیں ہوئی تھی لیکن ہر آن خدشہ موجود تھا۔ میری بہن اور نور کی پھوپھی دونوں لکھنؤ میں مقیم تھیں۔ فساد وہاں بھی کوئی نہیں ہوا تھا۔ پر آشوب زمانہ تھا اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ دونوں خاندان لکھنؤ پہنچ جائیں۔ نور کا تقرّر آگرے میں تھا۔ آگرے کے سفر کی ابتدا میرے لئے خاصی مشکل تھی، بغیر برقع یا چادر کے اسٹیشن تک کا سفر نہ جانے کتنا طویل ہو گیا تھا کہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ شادی کے بعد چند دن کے لئے سب کے ساتھ ہم دونوں آلٰہ آباد گئے۔ ویسے کے بعد میں بدایون پہنچا دی گئی۔ نور، واپس آگرہ چلے گئے اور وہاں سے بدایون آئے... آگرہ میں ہمارا مختصر سا گھر خاصا خوش نما تھا۔ گنجائش ہماری ضروریات سے زیادہ ہی تھی۔ چھوٹا سا لان تھا۔ کیاریوں میں پھول تھے...

(افکار، مارچ ١٩٩٠ء، ص ١٧-١٩)

شوہر: نورالحسن جعفری: اعلیٰ ملازمتوں کے امتحان میں کامیابی کے بعد اکاؤنٹس سروس سے وابستہ ہوئے۔ شادی کے وقت آگرہ میں تقرّر تھا۔ پاکستان آکر ملٹری اکاؤنٹس میں اسسٹنٹ کنٹرولر مقرر ہوئے ECONOMIC POOL میں آئے بہت اہم اور حسّاس عہدوں پر فائز رہے۔ جون ١٩٨٣ء میں لگ بھگ چالیس سالہ ملازمت کے بعد وفاق کے سیکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہونے کے بعد ستمبر ١٩٨٣ء سے جمیل الدین عالی کی دعوت پر انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی کے ناظمِ اعزازی کی ذمہ داری سنبھالی۔ قُدرت اللہ شہاب کے انتقال کے بعد اکتوبر ١٩٨٦ء سے "انجمن" کے صدر رہیں۔ ان کے کچھ خودنوشت حالات کے لئے دیکھئے:

(ماہنامہ دائرے ، کراچی ، ستمبر ۱۹۹۰ء ، ص ۴۴۔۵۰)

"ادب یا تحقیق سے میرا (براہِ راست) کوئی واسطہ نہیں رہا۔ مَیں علمی آدمی نہیں ہوں۔ میرا سرمایہ ، صرف انتظامی تجربہ ہے۰۰۰ میں اپنے بارے میں کوئی مغالطہ نہیں رکھتا۰۰۰ بہت بڑے بڑے منصوبوں میں ہاتھ نہیں ڈالتا ، کیوں کہ میں اُن کو پورا کرنے کی اہلیت پاتا ہوں اور نہ ہمت ۰۰۰ ہاں، چھوٹے موٹے کام دل جمعی کے ساتھ کر لیتا ہوں اور تھوڑی سی لگن رکھتا ہوں ۰۰۰ اپنی بساط صرف اتنی ہے ۰۰۰"

(نورالحسن جعفری ، قومی زبان ، کراچی ، اپریل ۱۹۸۴ء ، ص ۷)

"نور کے مزاج میں درد مندی ہے، ولداری اور دلنوازی کے تمام رنگ کھلے ہوئے ہیں۔ دو سال کی عمر تھی جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا۔ وہ خالق حقیقی سے صرف انیس سال کی مہلت حیات لے کر آئی تھیں ۰۰۰ نور کی پرورش ان کی پھوپھی نے اپنے بچوں کے ساتھ اور اپنے بچوں ہی کی طرح پیار اور محبت سے کی لیکن وہ ایک محبت جو ہر بچے کا حق ہوتی ہے، اس سے محرومی اپنی جگہ تھی ۰۰۰ نور ، شاید اس دو سال کے بچے کو آج بھی بھولنا نہیں چاہتے جسے محبت اور توجہ ، احسان کی طرح ملی تھی۔ یہ ایک ایسا قرض ہے جسے وہ بڑی چاہت کے ساتھ اپنوں اور غیروں سب کو ادا کرتے رہتے ہیں۔ اجنبی لوگوں کو بھی مقدور بھر موسموں کی شدت سے محفوظ رکھنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں اور دوستوں کے خلوص کا قدردان ، نور جیسا کوئی مشکل سے ملے گا۔ نور کے وجود میں بہ یک وقت دو بڑی دل آویز شخصیتیں سانس لیتی ہیں ۰۰۰ ایک حفاظت اور امان کی علامت وہ چھتنار گھنا سایہ جسے باپ کہتے ہیں اور ایک وہ بچہ ، جو دو سال کی عمر میں اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا، میلے میں کھویا ہوا ایک اکیلا بچہ :

ہم نے سونپ دی جس کو کائنات جان اپنی
وہ خدا نہ تھا، لیکن کس قدر اکیلا تھا

(افکار ، مارچ ۱۹۹۰ء ص ۲۲۔۲۳)

بیٹی : ڈاکٹر صبیحہ اقبال : میری لینڈ یونیورسٹی ، امریکہ سے (اکنامکس میں) پی ۔ ایچ ۔ ڈی (۱۰)

داماد : زبیر اقبال : آئی ، ایم ، ایف امریکہ میں ایک اہم عہدے پر فائز ہیں۔ (۱۱)

نواسی / نواسا : صباح اقبال اور یوسف اقبال

بڑا بیٹا : انجنیئر ، عزمی مُجتبیٰ جعفری ، مقیم ایمرسٹ ، میناچیوسٹس ، امریکہ ۔ (۱۲)

بہو : شعاع : ایمرسٹ ، میساچیوسٹس ، امریکہ میں اکنامکس میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی کر رہی ہیں۔ (۱۳)

چھوٹا بیٹا : ڈاکٹر عامر مُصطفےٰ جعفری (۱۴)

"جون ۱۹۶۹ء میں ۰۰۰ سرکاری عہدیداروں کے احتساب کا اعلان ہو چکا تھا، جسے تطہیر کہا جا رہا تھا۔ ان کی اہلیت کے ساتھ ان کی دیانت اور کردار کو بھی خود ساختہ میزان پر رکھا گیا تھا ۰۰۰ چند افراد کی ذاتی مصلحت اور ترجیحات نے

محنتی اور ایماندار چھوٹے بڑے ملازمت پیشہ لوگوں کو (بڑا) ذہنی اور ذاتی صدمہ اور نقصان پہنچایا۰۰۰ اسی زمانے میں ہم دونوں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی تھی کہ وہ ہمارے بچوں کو سرکاری ملازمت سے محفوظ رکھے۰۰۰ شکر ہے کہ اس نے ہمارے داماد زبیر اقبال کو بھی اس طوق سے مامون رکھا۔ زبیر کی ذہانت اور نیک طینتی سے متاثر ہونے والوں کا حلقہ خاصا وسیع ہے اور انہیں اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں بھی نیک نامی حاصل ہے۰۰۰"

(افکار، اگست ۱۹۹۰ء ص ۲۱، ۲۰)

"۰۰۰ صبیحہ اور زُبیر کے پاس علمی اور ادبی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔ عصری لٹریچر کے علاوہ عربی فارسی کلاسیکی ادب کے انگریزی تراجم بھی اور خصوصاً اقبالیات کے سلسلے کی تصانیف، زبیر، کلام اقبال کے عاشق بھی ہیں، حافظ بھی۰۰۰ ہمیں کتابوں کی کمی ان کے گھر میں کبھی نہیں ہوئی۰۰۰ میرا انجنیئر بیٹا عزمی، ایرسٹ (مینا چیوسٹس)، امریکہ میں، اپنی فرصت کے لمحات رنگوں اور لفظوں کی دنیا میں بسر کرتا ہے۰۰۰ مصوری کا شوق ہے۔ زبان غیر میں شعر بھی کہتا ہے۔ افسانے لکھتا ہے۔ یہ تحریریں وہاں کے جرائد میں شائع بھی ہو جاتی ہیں۔ انگریزی اور اردو ادب کی کتابوں کا بڑا خوبصورت انتخاب، گھر میں موجود ہے۔"

(افکار، جون ۱۹۹۰ء، ص ۳۱۔۳۰)

شعری پس منظر:

"شعر و ادب کا ذوق خاندان میں کم نہیں تھا۔ نانا کے پاس ادبی رسائل بھی آتے تھے اور مردانہ کوٹھی میں اہل علم اور اہل سخن کی دعوتیں بھی ہوتیں۔ دوسرے شہر سے جو شعرا بدایون آتے، ان کی پذیرائی بھی بہت عزت و تکریم سے کی جاتی مجھے یاد ہے کہ نانا کی کوٹھی میں ساغر نظامی یا جگر مراد آبادی کے ترنم کی لہریں سامعہ نواز ہوتیں تو بیبیاں بند دروازوں کے پیچھے اشعار سننے کے لئے اکٹھی ہو جاتیں۔"

(افکار، اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۱۹)

پہلا شعر:

"(۱۹۳۳ء میں) نو سال کی عمر میں سب سے چُھپ کر پہلا شعر کہا تھا اور جب ڈرتے ڈرتے اپنی امی کو سُنایا تھا تو اُن کی آنکھوں سے شفقت کی پھوار برسی تھی۰۰۰"

(افکار، اپریل ۱۹۸۹ء، ص ۱۹)

شعر گوئی کا آغاز اور تخلص:

"(شاعری سے پہلی ملاقات جب ہوئی) جب لڑکیوں کو شاعری سے مُلاقات کرنے کی اجازت نہ تھی اور اُن کا شعر کہنا تو سخت معیوب اور قابلِ اعتراض عمل مُتصوّر ہوتا تھا۰۰۰ میری عمر نو، دس سال کی تھی، تب ہی سے میں نے شعر کہنے کی ابتدا کی۰۰۰ یہ سب کچھ خود بخود ہوا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس کے لیے شعوری کوشش کی ہو۔ یہاں تک کہ مجھے یہ بھی سوچنے کا موقع نہ ملا کہ میں شعر کیوں کہہ رہی ہوں۰۰۰

والد کا انتقال میرے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ میں یہی کوئی تین برس کی رہی ہوں گی۰۰۰ والدہ نے ایک بھائی اور ہم تین بہنوں کو بدایون جیسے شہر کے ماحول میں جس حد تک تعلیم دلاسکتی تھیں، دلائی۰۰۰ اور وہی تھیں جنہوں نے

ہر قدم پر ، ہر موڑ پر میری شاعری کی حوصلہ افزائی کی ۔ ۔ ۔

(ادا جعفری ، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص ۱۷۱)

"بہت دنوں (برسوں) کی بات ہے، نو سال کی ایک بچی نے کچھ شعر کہے اور بڑے فخر سے گھر والوں کو سنائے ۔ سننے والوں نے خوب خوب مذاق اڑایا۔ ایک دن اس نے چپکے سے یہ شعر ایک رسالے "رومان" کو بھیج دیے اور ۔ ۔ ۔ وہ اس رسالے میں چھپ گئے ۔ ۔ ۔ اس نے تخلص ادا اختیار کیا۔ وہ بھی مجبوری تھی کہ مقطع میں یہی لفظ سمو سکی تھی ۔ ۔ ۔"

(ادا جعفری ، پس منظر ، شہرِ درد ، طبع سوم ، ص ۲۰۳)

"قافیہ پیمائی کے بجائے میری شاعری کی ابتدا نظم گوئی سے ہوئی ۔ ۔ ۔"

(افکار ، مئی ۱۹۸۹ء ، ص ۲۰)

"ابتداً میں زیادہ تر نظم لکھتی تھی۔ نظم ، اپنی تخلیق کے مرحلے میں نہ کسی اور سے مخاطب ہوتی ہے، نہ کسی اور کا مخاطب ہونا گوارا کرتی ہے ۔ ۔ ۔"

(افکار ، دسمبر ۱۹۸۹ء ، ص ۳۹)

شعر گوئی کے اوّلین مربّی :

"شعر گوئی کی اجازت امی سے مل گئی تھی لیکن میرے اِس ذوق کی اصل پذیرائی اور پرداخت میرے بہنوئی جمال احمد رضوی نے کی ۔ ۔ ۔ وہ میری منجھلی بہن (شمسہ) کے شوہر تھے۔ شاعری کے فنی تقاضوں سے آگاہ نہیں تھے لیکن شعر کی کیفیت کے مزاج دان تھے۔ جمال بھائی وکیل تھے۔ لکھیم پور (یو ۔ پی انڈیا) سے ان کا تعلق تھا ۔ ۔ ۔ ان کا انتقال نو سال قبل (۱۹۸۰ء) میں ہوا۔ وہیں ان کی آخری آرامگاہ ہے۔ میری تقدیر کہ جس قلم کی انہوں نے پرورش کی تھی ، اسی نے ان کا کتبہ لکھا ۔ ۔ ۔

جمال بھائی نے میرے ذوق شعر گوئی کے پنپنے کے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کی۔ وہ شاعر نہیں تھے لیکن میری شاعری انہیں محبوب تھی۔ جمال بھائی نے میرے مطالعے بلکہ تربیت ذوق کے لیے کتابوں کے ڈھیر لگا دیے۔ کلاسیکی ادب سے مجھے انہوں نے ہی آشنا کیا۔ انہیں کی رہنمائی میں، میں نے اردو ، فارسی اور انگریزی ادب کا مطالعہ کیا۔

(افکار ، دسمبر ۱۹۸۹ء ص ۳۸ ـ ۳۹)

مشورۂ سخن :

"جمال بھائی کے ذریعے اثر لکھنوی سے میرا تعارف ہوا۔ اُس وقت (۱۹۳۶ء ـ ۱۹۳۷ء) تک میں فنِ عروض کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی اور جس راہ پر چل پڑی تھی ، اُس کے نشیب و فراز سے آگاہ ہونا بھی ضروری تھا ۔ ۔ ۔ میں نے جمال بھائی سے اثر صاحب کا پتا معلوم کر کے انہیں خط لکھا جس کا انہوں نے بڑا حوصلہ افزا جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے چند نظمیں انہیں اصلاح اور مشورے کے لیے ارسال کیں۔ انہوں نے کچھ الفاظ کے ردّوبدل کے بعد واپس بھیجیں تو مجھے وہ مصرعے ہی پرائے پرائے لگے اور جب یہ نظمیں شائع ہونے کے لئے

روانہ کیں تو اپنے ہی سوچے اور لکھے ہوئے الفاظ ۔۔۔ رہنے دیے۔ رسالے اثر صاحب کی نظر سے گزرے تو میری یہ جسارت انہیں ناگوار گزری لیکن اُس زمانے کے بُزرگ درگزر کرنا جانتے تھے۔ اُنہوں نے آئندہ مشورے کے لیے چیزیں بھیجنے کی تو ممانعت کر دی مگر میری درخواست پر علمِ عروض سے متعلق عربی سے اُردو ترجمہ کی ہوئی کچھ کتابیں مجھے بھیجیں اور اپنا مجموعۂ کلام "بہاراں" بھی ۔۔۔ اشعار پر اُن کی اصلاح قبول نہ کرنے کے باوجود میں اُن کی شفقت بھری توجہ کی ممنون ہوں ۔۔۔ اثر لکھنوی کو پہلی بار میں نے لاہور میں ۱۹۴۹ء میں دیکھا ۔۔۔"

(افکار، دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۴۱)

(ناسپاسی) ہو گی اگر میں جناب اثر لکھنوی کا تذکرہ نہ کروں۔ یہ ضرور ہے کہ اُن کی مصروفیات اور میری بارہ تیرہ سال کی عمر (۱۹۳۶ء ـ ۱۹۳۷) کی بغاوت اور خودسری نے یہ سلسلہ زیادہ عرصے نہیں چلنے دیا اور میری صرف پانچ چھ چیزوں کو ہی اُن کی نظرِ اصلاح سے گزرنے کا شرف حاصل ہو سکا۔ لیکن میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے، انہی سے حاصل کیا ہے اور اگر میرے اشعار میں میرے قاری کو الفاظ کے برتنے کا سلیقہ (نظر) آجائے تو وہ جناب اثر لکھنوی کا ہی فیضان ہو گا"

(اداجعفری، پس منظر، "شہر درد" طبع سوم، ص ۲۰۵)

"۔۔۔ میں نے ابتدائی زمانے میں چند نظموں پر جناب اثر لکھنوی سے اصلاح لی تھی۔ آج بھی ان کی شکرگزار ہوں، مگر بارہ تیرہ سال کی عمر اس زمانے میں بھی بغاوت کی عمر ہوا کرتی تھی اس لیے یہ سلسلہ بہت مختصر رہا۔ ان کے سوا کسی اور سے "مشورہ" نہیں کیا ۔۔۔ اس کے بعد کچھ میں نے زندگی سے سیکھا اور کچھ میری زندگی نے مجھ سے سیکھا ۔۔۔"

(اداجعفری چند باتیں، سازِ سخن بہانہ ہے، اگست ۱۹۸۸ء، ص ۱۳)

ابتدائی شاعری:

"دس بارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تو ۔۔۔ رات کو سرہانے کاپی اور پنسل ہوتی ۔۔۔ میری شاعری نے مجھے بڑا سہارا دیا ۔۔۔ زیادہ تر نظمیں اور کبھی کبھی غزل بھی لکھتی ۔ سویرا، ایشیا، ادب لطیف، افکار اور شاہکار وغیرہ اس وقت کے تمام قابلِ ذکر جرائد میں اشعار شائع ہوئے ۔۔۔"

(افکار، مئی ۱۹۸۹ء، ص ۲۴)

لکھنے پڑھنے اور شعر کہنے کا لمحہ اور اسلوب:

گھر میں (میں نے) شعر لکھنے کے لیے ایک گوشہ ڈھونڈ لیا تھا۔ یہ سامان کا کمرہ تھا۔ جہاں ایک کے اوپر ایک کئی صندوق اور سوٹ کیس دیواروں کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی ایک نیچی سی بلندی پر بڑے اطمینان سے بیٹھ جاتی اور کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتی میں زیادہ تر اپنی اس اخفا کی کوشش میں کامیاب رہتی ـ کبھی کبھی ہار جاتی۔ گرد آلود صندوق پہ بیٹھنے کا نشان تو بنتا ہی تھا۔ یہ نشان نظر آجاتا تو مجھ سے پوچھا جاتا "آج تو نے شعر کہا ہے؟"

(افکار، دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۳۹)

"ہمارے گھروں میں گنجائش کے باوجود لڑکیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ کمرہ نہیں ہوتا تھا۔ میری پوری سلطنت میرا پلنگ تھا اور اب جو والدہ کی مہربانی سے کتابوں تک رسائی ہوئی تو اس بستر کے ایک کونے میں خود ہوتی ، بقیہ ہر طرف کتابیں بکھری رہتیں۔ میں آج تک میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر لکھنے کے اسلوب سے آگاہ نہیں ہو سکی۔ آج بھی وہی پلنگ کا ایک کونا یا میری لائبریری کے فرش کا ایک مخصوص گوشہ ، چاروں طرف بکھری ہوئی کتابیں۔ ہاتھ میں قلم اور سامنے کاغذ ۔ یہی میری مسند ہے اور یہی میری جاگیر ۔۔۔"

(افکار ، نومبر ۱۹۸۹ء ص ۳۵)

"۔۔۔ میں یہ بتا سکتی ہوں کہ میں شعر کس طرح کہتی ہوں ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی ایسی چیز ہے جو مجھے چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ کوئی جذبہ ، کوئی خیال، کوئی کرن جو تاریکی میں اچانک سجھائی دے جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا تو خاموشی ہوتی ہے، انتظار کا لمحہ ہوتا ہے جو بسا اوقات طویل سے طویل تر ہوتا جاتا ہے۔ محض شعر لکھنے کی خاطر قلم لے کر بیٹھوں تو بھی نتیجہ صفر نکلتا ہے کہ شعر تو وہی ہے جو اپنے آپ کو کہلوائے ۔۔۔"

(ادا جعفری ، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص ۱۷۲)

"بے شک امی کے فیصلوں میں اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل رہا ۔۔۔ ان کے اختیار میں جو کچھ تھا، انہوں نے اس سے بہت زیادہ ہمارے لئے کیا ۔۔۔ اس روایت پرست خاندان میں مجھے انہوں نے نہ صرف شعر کہنے بلکہ چھپوانے کی بھی اجازت دی۔ صبر ، جرأت اور رہنمائی کے جتنے موسم ہیں، وہ سب میں نے اس ہستی میں دیکھے جو آج دنیا میں نہیں، مگر اجالے کے استعارے کی طرح اپنی اولاد کے ذہن اور دل میں سکونت رکھتی ہے ۔۔۔"

(افکار نومبر ۱۹۸۹ء، ص ۳۰)

شعر شناس شوہر :

"(میرے) میاں اچھے اشعار پر سر دھنتے ہیں۔ انہوں نے ایک شاعرہ سے شادی کی تھی اور جب اس شاعرہ نے جس چاؤ سے قلم ہاتھ میں اٹھایا تھا، اسی پیار سے باورچی خانے میں جا کر کفگیر سنبھال لیا تو انہوں نے ایک دن بڑے خلوص سے یہ تجویز تک پیش کی کہ : "دیکھو بھئی ، میں نے تو شادی شاعرہ سے کی تھی اور تم نے قلم کو تج ہی دیا ہے۔ سنتے یہ آئے ہیں کہ جب شاعر کے دل پر چوٹ لگتی ہے تو وہ شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے، سو اگر تمہاری رائے ہو تو میں تمہاری خاطر یہ کوشش بھی کر دیکھوں!"

(ادا جعفری ، پس منظر ، شہر درد ص ۲۰۴)

شاعری اور گرہستی :

"(ایک شاعرہ اور گھریلو خاتون) ان دونوں شخصیتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ان میں لڑائی بھی نہیں ہوتی۔ میں گھر کا کام کرتے ہوئے شعر سوچتی ہوں ، ظاہر ہے گھر کا کام ہاتھ سے کرتے ہیں۔ زیادہ تر اشعار رات گئے آتے ہیں۔ میں سوتے وقت پنسل اور کتاب سرہانے رکھ لیتی ہوں، اُس خیال سے کہ جعفری صاحب کی نیند

خراب نہ ہو، اندھیرے میں ہی ڈائری میں شعر لکھ لیتی ہوں۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی لائن پر چار پانچ مصرعے لکھ گئی، پھر انہیں صبح اٹھ کر الگ کرتی ہوں، انہیں سنوارتی ہوں۔ میری شعری اور گھریلو مصروفیتوں میں باہم کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ کیونکہ میرے شوہر نے ہمیشہ مجھ سے تعاون کیا ہے۔ جن دنوں مجھ پر شعر کہنے کا زیادہ موڈ طاری ہوتا ہے، وہ دعوتیں نہیں کرتے۔۔۔" (ادا جعفری، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص ۱۷۵)

معاصر شعر گو خواتین:

"جب میری شاعری کی ابتدا ہوئی، اسی زمانے میں چند خواتین کا کلام رسائل میں شائع ہو رہا تھا۔ تین نام مجھے یاد ہیں۔ حیا لکھنوی، صفیہ شمیم ملیح آبادی اور (سلمیٰ) تصدق حسین، اور بھی کئی نام ہوں گے جنہیں بھول گئی ہوں یا جن کا کلام میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ صفیہ شمیم سے قیام پاکستان کے بعد راولپنڈی میں گاہے گاہے ملاقات ہوئی۔ یہاں اہمیت صرف ناموں کی نہیں۔۔۔ اہم بات تو یہ ہے کہ بند لبوں نے جرأت سخن کی۔۔۔ میں اپنی شاعری کو اس ماحول اور اس عمر سے بغاوت کہنا تو چاہتی ہوں مگر کہہ نہیں سکتی۔ بغاوت اجازت کی تابع نہیں ہوا کرتی۔ مجھے اپنی ماں کی اجازت حاصل تھی۔ شاید یہی احساس ممنونیت تھا کہ میں آج تک تھکی نہیں۔۔۔" (افکار، اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۲۲)

میں اور میری شاعری:

زندگی کے میلے میں شرکت کا احساس مجھے ترقی پسند ادب نے عطا کیا۔۔۔" (افکار جنوری ۱۹۹۰ء، ص ۱۵)

میرے لیے آزاد اور معریٰ نظم لکھنا۔۔۔ لگے بندھے اور گلے پڑے ہوئے ضوابط اور روایات سے بغاوت کے اعلان کی طرح تھا۔۔۔" (افکار، جنوری ۱۹۹۰ء، ص ۱۵)

یہ معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے اور مرد نے عورت کو زنجیریں پہنا دی ہیں۔ میں نے مردوں کی عائد کردہ پابندیوں کو قبول نہیں کیا بلکہ میں نے ان پابندیوں کو قبول کیا، جو میرے دین نے مجھ پر عائد کی ہیں۔۔۔

(ادا جعفری، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص ۱۷۴)

میری شاعری کا مرکزی موضوع یا بنیادی مسئلہ آج کی ہم سب کی زندگی ہے اجتماعی نا آسودگیاں، ذاتی کوتاہیاں اور خامیاں میرا موضوع ہیں۔۔۔" (ایضاً، ص ۱۷۵)

"دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والے دماغ کے لئے کائنات کے چپے چپے میں بے شمار موضوع بکھرے پڑے ہیں۔ مظاہر فطرت، صبح و شام، پھول پتے، کانٹے، سمندر، پہاڑ اور جنگل اور پھر ان سب پر حکمرانی کرنے والے انسان کی زندگی کے ان گنت پہلو ایک حساس شاعر کے لیے ہر لمحہ دعوت فکر و نظر پیش کرتے رہتے ہیں۔۔۔"

(ادا جعفری، نقوش، لاہور ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۵)

"انسانی خوشی اور انسانی دکھ یہ دو پہلو ہی اس قدر ہمہ گیر، وسیع اور گوناگوں حسیات و جذبات کے حامل ہیں کہ اگر اور موضوعات کو چھوڑ دیا جائے اور صرف انہیں دو کو موضوع بنا لیا جائے، تب بھی اگر شاعر کی نگاہ میں گہرائی اور اس کے انداز فکر میں وسعت ہے تو یہ مضامین اور یہ موضوع کبھی فرسودہ اور پامال نظر نہیں آ سکتے۔۔۔" (ایضاً، ص ۵)

"شاعر جس کا دماغ متجسس، روح پریشان اور نگاہ نگران ہے اور جو کائنات میں "صبا" کی طرح "دلِ ناصبور" لے کر آیا ہے، کسی ایک ہی موضوع پر قناعت کر کے، دوسرے موضوعات سے منہ نہیں موڑ سکتا۔۔۔"

(ایضاً، ص ۵)

"موضوعات کی فراوانی اور بے پایانی کے ساتھ ساتھ ہر شاعر کا اپنا انداز نگاہ اور انداز تفکر ہے، جو اس کے موضوع سخن کو ایک جدت اور تازگی بخشتا ہے اور جو اس کے کلام کو بیان سے ممیز کرتا ہے اور اسی سے صاحب فکر کی انفرادیت کا قیام اور دوام ہے۔۔۔"

(ایضاً، ص ۶)

"مظاہرِ فطرت ہوں یا انسانی جذبات و حسیات کے مرقع دنیا میں نہ مسحور کر لینے والے مناظر کی کمی ہے اور نہ تڑپا دینے والے واقعات کی۔ بس دیکھنے والی آنکھ اور دیکھ کر بے چین ہو جانے والا دل چاہیے۔۔۔"

(ایضاً، ص ۶)

"اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ یا ایک نظارہ ہزار بار شاعر کے سامنے آتا ہے اور وہ ہر بار اس سے بے اعتنائی برت کر گزر جاتا ہے اور ایک دن اچانک اسی ہزار بار کے دیکھے ہوئے منظر سے متاثر ہو کر ٹھٹھک جاتا ہے کہ یہ تو میری نظم کا موضوع ہے اور جب تک یہ نظم مکمل نہیں ہو جاتی، شاعر کے دل کو قرار نہیں آتا۔۔۔"

(ایضاً، ص ۶)

"ایک شاعر کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب وہ بڑے بڑے طوفانوں سے بچ کر نکل جاتا ہے اور محض چند قطرے اس کے دامن کو تر کر دیتے ہیں۔ زندگی کے سنگین اور دلگداز حقائق وقتی طور پر اس کو متاثر کرنے سے معذور رہ جاتے ہیں اور ایک چھوٹا سا واقعہ اس کی روح کی جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔۔۔"

(ایضاً، ص ۹)

"میں شاعری میں نسائیت کی دکان سجانا پسند نہیں کرتی۔ شاعری کے اندر شخصیت ضرور آتی ہے لیکن بنیادی اور اہم بات یہ ہے کہ جو شعر کہا گیا ہے اس میں شعریت ہے یا نہیں؟

(ایضاً، ص ۱۷۴)

"اچھی شاعری مقبول ہوتی ہے لیکن وہ شاعری جو اچھی ہے اور آفاقی بھی، وقت پر مقبول نہیں ہوتی، اس کی نمایاں مثال غالب ہیں۔۔۔"

(ایضاً ص ۱۶۴)

"اچھی شاعری وقت پر مقبول ہوتی ہے لیکن اگر مقبول نہ ہو تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اچھی شاعری نہیں۔۔۔"

(ایضاً، ص ۱۷۴)

"شاعری محض فن نہیں ہوتی، صرف موزوں الفاظ کا مجموعہ بھی نہیں ہوتی، ماورائے حرف و صوت بھی ہوتی ہے اور بہت کچھ ہوتی ہے۔۔۔"

(افکار، نومبر ۱۹۸۹ء، ص ۲۵)

"شاعری نہ صرف قدرت کلام کا نام ہے اور نہ تخیل کی اونچی اڑان کا۔ حد یہ ہے کہ شاعری کا حق صرف شدت احساس اور خلوص جذبات سے بھی ادا نہیں ہوتا ایک اچھے شعر میں بے شک یہ تمام صفات ہوں گی لیکن ان سب سے ماوراء ایک اور شے بھی چاہیے۔ ورنہ اپنے وقت کے اچھے سے اچھے شعر کو بھی وہ زندگی ودیعت نہیں ہوگی جو صدیوں کے سفر کو جھیل کر بھی توانا رہے۔۔۔ شعر کی گہرائی کے اس سرچشمے کو انداز بیاں کی دلکشی یا لہجے سے تعبیر کیا (گیا) ہے۔۔۔"

(ادا جعفری، نقوش لاہور، شمارہ ۱۱۶ ص ۲۹)

ـــــــ غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء

"شاعری، ٹھہرا ہوا پانی نہیں، بہتا ہوا دریا ہوتی ہے۔ ہر منظر حیات کے لیے شفاف آئینہ۔۔۔"

(غزل نما، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱)

"پہلا شاعر، پہلے انسان کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔ انسان، جو اسماء کا علم رکھتا تھا، کیسے ممکن ہے کہ جذبوں کے نام سے نا آشنا رہا ہو۔ اس بولتی ہوئی تنہائی سے آخر اس نے کچھ تو کہا ہو گا؟۔۔۔ اور وہ نامعلوم سی کیفیت انتظار جس کا ذائقہ بھی پہلے پہل آدم نے ہی چکھا تھا، تخلیق شعر کا اولین لمحہ شاید وہی ہو ممکن ہے شاعر ہی شجر ممنوعہ ہو۔۔۔"

(غزل نما۔ ایضاً، ص ۹)

"شاعری کا نصیب بہر حال سوز و گداز اضطراب ہے، فردوس بریں اس کا مناسب مقام نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔"

(غزل نما، ایضاً، ص ۹)

"سچا شاعر اور سچا شعر حدود وقت سے ماوراء ہوتا ہے۔ گردش ماہ و سال کا غبار اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔۔۔"

(غزل نما، ایضاً، ص ۱۲)

"اس عالم فانی میں انسان کی طہارت قلب نے شاعری کو عبادت کے درجے تک پہنچا دیا"

(غزل نما، ایضاً، ص ۹-۱۰)

"شاعر پیغمبر تو نہیں ہوتا، لیکن پیغام بر ضرور ہوتا ہے۔۔۔"

(ادا جعفری، نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱۶، ۱۹۷۱ء، ص ۲۹)

"میں ادیب و شاعر کی حسّاسیت لے کر پیدا ہوئی ، اظہار کی صلاحیت مولا نے عطا کی . . ."

(ادا جعفری ، "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" ، ص ١٧٢)

"میں نے شاعری کو نہیں ، شاعری نے مجھے اختیار کیا . . ."

(ایضاً ، ص ١٧٢)

"میری آواز ، اپنی آواز ہے ، میں کسی آواز کی گونج نہیں ہوں"

(ایضاً ، ص ١٧٣)

"شاعرات میں پہلی آواز میری تھی۔ تاریخ میں ڈھونڈنے سے کئی شاعرات کے نام مل جائیں گے۔ لیکن خواتین کی شاعری کا اعتبار مجھ ہی سے شروع ہوتا ہے . . ."

(ایضاً ، ص ١٧٣)

"ادب کے اندر میرا کنٹری بیوشن ہے اور اردو ادب کی تاریخ میں میرا نام نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

(ایضاً ، ص ١٧٣)

"میرے لئے سب سے بڑی آسودگی (اور) میری سب سے بڑی مسرت شعر کہنا ہے۔ میں نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے:

نزولِ شعر کی ساعت ، جمالِ خواب کی لَو
کہ جیسے سلطنتِ جاوداں ملے ہے مُجھے

(ایضاً ، ص ١٧٣-١٧٤)

"ن - م - راشد ، میرا جی اور فیض تینوں رُجحان ساز شاعر تھے ، کسی نہ کسی حد تک ایک پوری نسل ان تینوں سے متأثر رہی ہے . . ."

(افکار ، جنوری ١٩٩٠ء ، ص ١٨)

"شاعری کے تنقید نگار سچ نہیں بولتے . . ."

(ادا جعفری ، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے ، ص ١٧٤)

"رمز و کنائے (کا اپنا ایک) حسن ہے ، بات کو بین السطور کہنا زیادہ مناسب ہے . . ."

(ایضاً ، ص ١٧٤)

"نئے لکھنے والے لڑکے لڑکیاں جو اشعار لکھ رہے ہیں ، ان میں شگفتگی کی لَو ہے"۔

(ایضاً ، ص ١٧٤)

"میں پروز پوئم کو نظمیہ کہنا زیادہ پسند کرتی ہوں ممکن ہے اس کا کوئی مستقبل ہو لیکن یہ مجھے اپیل نہیں کرتی . . ."

(ایضاً ، ص ١٧٤)

"میں ماں ہوں ۔۔۔ میں کسی نئی چیز سے مایوس نہیں ہوں ۔ کیونکہ جہاں ہمارے نقشِ قدم ختم ہوتے ہیں ، وہاں سے ہمارے بچوں کے نقشِ قدم شروع ہو جاتے ہیں"

(ایضاً ، ص ۱۷۶)

قلم کے کچھ ناقابلِ شکست رشتے دار اور دوست:

"زندگی کے مروانِ حشر میں مجھے اپنی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود دوستوں بلکہ شناساؤں کا بھی بیکراں خلوص شجر سایہ دار کی طرح ملا ہے ۔۔۔"

(افکار ، ستمبر ۱۹۸۹ء ، ص ۲۳)

دوستوں کے سلسلے میں "میں بہت خوش نصیب رہی ہوں ۔

(افکار ، اپریل ۱۹۹۰ء ص ـ ۲۳)

"اسلام آباد میں "سلسلے" کا منشور میں نے جمیل نشتر کے گھر بیٹھ کر لکھا ۔ اس کی پہلی محفل جنوری ۱۹۷۸ء میں میرے گھر (اسلام آباد) میں منعقد ہوئی ۔۔۔"

(افکار ، ستمبر ۱۹۹۰ء ، ص ۲۰)

"شعر و ادب کی محفلوں میں جمیل نشتر کی موجودگی اجالا بکھیر دیتی تھی ۔۔۔ پھولوں سے محبت اور خوشبو کی نگہبانی کرنے والے اس شخص میں بڑی خوبیاں تھیں ۔ دوستوں کے دلوں اور خلوص کے رشتوں کا اتنا اور ایسا خیال رکھتے تھے جیسے برگ گل کو چھو رہے ہوں ۔۔۔"

(افکار ، ستمبر ۱۹۹۰ء ، ص ۲۰)

"جمیل نشتر ہماری یادوں ہی میں نہیں ، ہمارے دلوں میں بھی زندہ ہیں ۔ نہ جانے انہیں منزل یقین پر پہنچنے کی اتنی جلدی کیوں تھی ۔۔۔ ابھی تو حیات بے اعتبار کی راہیں منور بھی تھیں اور گل پوش بھی ۔۔۔"

(افکار ، ستمبر ۱۹۹۰ء ، ص ۲۰)

"برسوں کے میل جول کے عرصے میں ہم قدرت اللہ شہاب صاحب کی ایک کرامت پر ایمان لائے ۔۔۔ اور وہ یہ تھی کہ وہ نہایت پاک طینت انسان تھے ۔ ان کی شخصیت میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جس کا احترام کرنے کو جی چاہتا تھا ۔ (افسوس) اب وہ ہمارے یقین و گُمان کی پگڈنڈیوں سے بہت آگے جا چکے ہیں ۔۔۔"

(افکار ، ستمبر ۱۹۹۰ء ، ص ۱۸)

عزیز بھی ، شفیق بھی:

جمیل الدین عالی ، طیّبہ عالی ، نثار عزیز بٹ ، عذرا مختار مسعود ، مختار مسعود ، حجاب امتیاز علی ، مختار زمن ، سلمیٰ زمن ، ابنِ سعید (حسن عسکری) ، ابن الحسن ، ڈاکٹر آفتاب احمد ، عرفانہ عزیز ، جسٹس انوار الحق ، نجمہ انوار الحق ، یوسف ظفر ، مختار صدیقی ، نسیم الظفر ، عبدالعزیز فطرت ، محمد طفیل (محمد نقوش) ، اختر جمال ، احسن علی خاں ، جیلانی بانو ، خدیجہ مستور ، شوکت صدیقی ، اختر حسین رائے پوری ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، احمد ندیم قاسمی ، بریگیڈیر گلزار احمد ، ضمیر جعفری اور مُشتاق یوسفی ۔

کچھ "خاصانِ سلسلہ":

ضیا جالندھری ، شفقت ضیا ، آغا ناصر ، صفیہ ، مسعود مفتی ، کرنل محمد خان ، ممتاز مفتی ، بشریٰ مفتی ، جنرل شفیق الرحمٰن ، مشفق خواجہ ، آمنہ مشفق ، شان الحق حقی ، سلمیٰ حقی ، افتخار احمد مدنی ، ھاجرہ مسرور، احمد علی خان ، رضیہ فصیح احمد ، انور عنایت اللہ ، سحاب قزلباش ، ڈاکٹر جمیل جالبی اور نسیم جالبی...

"دوستوں کے معاملے میں ، میں اور نور دونوں اللہ کے فضل و کرم سے بہت خوش قسمت رہے ہیں۔"

(ادا جعفری ، افکار ، ستمبر ۱۹۸۹ء ص ۲۳)

"... جنہیں قریب سے جانتی ہوں، اُن میں صرف عالی جی ایسے ہیں ، جن سے میرا قلم کا رشتہ ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور میں انہیں بہت اچھا شاعر بھی مانتی ہوں اور بڑا شاعر بھی... بات یہ ہے کہ وہ نور کے واسطے سے میرے دیور ہیں اور یہ ناتا مجھے بہت عزیز ہے۔ نور ان کی اتنی ناز برداری کرتے ہیں کہ میرے لئے رشک اور حسد دونوں کی گنجائش موجود ہے... حیرت ہے کہ میں عالی جی سے جلتی ابھی تک نہیں... ہاں، ان کی کسی بات کو دل سے مانتے ہوئے بھی ان سے بحث مباحثے پر ہمیشہ آمادہ رہتی ہوں۔ اور جب انہیں خفا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہوں تو وہ کچھ دنوں مجھے "بھابی بیگم" کہتے ہیں..."

(افکار ، جولائی ۱۹۹۰ء ، ص ۱۷)

اُفتادِ مزاج ، تجربات ،

عادات ، اعترافات:

"... میں عام طور سے مُشاعروں اور جلسوں میں شرکت نہیں کرتی"

(افکار ، اکتوبر ۱۹۹۰ء ص ۲۳)

"(۱۹۴۹ تک) میں نے کبھی کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی تھی، مشاعرہ دیکھا بھی نہیں تھا، صرف ریڈیو پر سُنا تھا..." (۱۹۴۹ء کی ایک شام) سول سروس اکیڈمی لاہور میں پاک و ہند مشاعرہ تھا جس کی صدارت کے لئے اثر لکھنوی ، لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا ، پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ اثر صاحب کسی بات پر آزردہ خاطر ہو کر کھڑے ہو گئے ۔ کہنے لگے میں جا رہا ہوں، ساتھ ہی مشاعرے کی صدارت کے لئے میرے نام کا اعلان کر دیا۔ ہوش آیا تو میں مسند صدارت پر تھی اور مشاعرہ جاری تھا... مجید مفتی ان دنوں سول سروس اکیڈمی کے تربیتی کورس میں شریک تھے۔ وہ اس مشاعرے کا آنکھوں دیکھا حال مجھے اب تک سناتے ہیں کہ جس پہلے مشاعرے میں شرکت کی ، اُس کی صدارت بھی میں نے ہی کی تھی۔

(افکار ، دسمبر ۱۹۸۹ء ، ص ۴۱)

"ترقی پسند تحریک کے جلسوں یا کسی بھی مشاعرے میں شریک ہونا میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ میں (۱۹۴۷ء سے قبل تک) شعر و ادب کے بڑے ناموں کو صرف حرف و قلم کے ذریعے ہی جانتی پہچانتی تھی... یہ محرومی ایسی

تھی جو ایک عرصے تک میرے ساتھ رہی۔ کئی محترم شخصیات جن سے ملاقات کی خواہش رہی انہیں کبھی دیکھا بھی نہیں روبرو سنا بھی نہیں۔ جن میں پہلا نام فراق گورکھپوری کا ہے اور یہ فہرست طویل ہے۔۔۔"

(افکار، جنوری ۱۹۹۰ء، ص ۲۰ — ۲۱)

"مشاہیر سے میری ملاقات زیادہ تر لکھے ہوئے لفظ کے وسیلے سے ہی ہو سکی ہے۔

(افکار جنوری ۱۹۹۰ء، ص ۱۹)

"لفظ کو سانس لیتے دیکھنا کتنی بڑی نعمت ہے:
وہ سارے الفاظ جو ابھی تک
کسی زمین پر
کسی زبان میں لکھے گئے ہوں
ہمارے خوابوں کے سلسلے ہیں"

(افکار، ستمبر ۱۹۹۰ء، ص ۲۲)

"بچپن میں کتابوں نے میرے ساتھ مسیحائی کا کام کیا۔ میں نے حرف کی سرگوشیاں سنیں۔ لفظ کو اپنے بھید بتائے۔ میں نے کتاب کو انسان کے مقابلے میں حیات سے قریب تر دیکھا۔"

(افکار، مئی ۱۹۸۹ء، ص ۲۱)

"بارہ تیرہ برس کی عمر میں کتابوں کے علاوہ جو دوسری کرن میری زندگی میں داخل ہوئی، وہ ننھے منے بچے تھے کسی کے بھی ہوں۔ میں نے گھر کی مہترانی کے بچے بھی نہلا دھلا کر صاف کپڑے پہنا کر گود میں کھلائے ہیں۔۔۔"

(افکار، مئی ۱۹۸۹ء، ص ۲۳)

"آسمانوں سے دل پر اُترتے ہوئے حرف اور مُسکراتے ننھے بچّے میں مجھے (بہت) مشابہت نظر آتی ہے، دونوں کس قدر معصوم اور سچے ہوتے ہیں۔۔۔"

(افکار، مئی ۱۹۸۹ء، ص ۲۳)

"میں اپنی یادوں اور کاغذات کے سلسلے میں (بڑی) بے پرواہوں۔۔۔"

(افکار، اپریل ۱۹۸۹ء، ص ۱۹)

میرا عقیدہ یہ ہے کہ خط لکھنا گویا دوری کا اعتراف کر لینا ہے ۔

(افکار، ستمبر ۱۹۸۹ء ص ـ ۲۲)

"مجھ میں دوسروں کی تلاش و جستجو کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ یہ کام وقت کا ایثار چاہتا ہے۔ اس کے لئے بڑا علم چاہیے اور بے انتہا محنت۔۔۔"

(غزل نما، ص ۹)

"۔۔۔کتابوں اور مُصنّفوں کی رونمائی میرے نزدیک بدعت ہے۔

(افکار، نومبر ۱۹۸۹ء، ص ۳۵)

"۔۔۔جوان ہوتی ہوئی لڑکی کو امید و بیم کے دوراہے پر کھڑا کر دیا جائے، وہاں سے اس عمر میں اگر آگے جانے کی راہ نہ ملے تو واپسی کا بھی کوئی راستہ نہیں رہتا۔۔۔"

(افکار، اکتوبر ۱۹۸۹ء)

"طاق میں رکھے ہوئے دیے کو اپنے ہی اجالے کے لیے کسی اور ہاتھ کا منتظر رہنا پڑتا ہے کہ جب چاہا جلالیا جس کو چاہا بجھادیا۔۔۔"

(افکار، اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۱۸)

بجھے ہوئے چراغ کی بساط ہی کیا ہوتی ہے۔

(افکار، اکتوبر ۱۹۸۹ء ص ـ ۱۸)

"وہ آنسو جو آنکھ سے دل میں ٹپکا، کس نے دیکھا ہے۔۔۔"

(افکار، اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۱۸)

"مدتوں عورت، احساسِ محرومی سے بھی محروم رہی۔۔۔"

(افکار، نومبر ۱۹۸۹ء، ص ۳۰)

"بیوگی کی سفید چادر، کلفتوں اور ظلمتوں سے بنی ہوئی ہوتی ہے۔۔۔"

(افکار، نومبر ۱۹۸۹ء ص ۳۱)

غم اور غصہ، اچھے اور بُرے اور نیک و بد کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔"

(افکار، فروری ۱۹۹۰ء، ص ۲۵)

"بے بسی کی انتہا یہ ہے کہ حرفِ دُعا بھی بے معنی ہو جائے۔"

(افکار، فروری ۱۹۹۰ء، ص ۳۶)

"صرف دیکھے بھالے شام و سحر، جانے بوجھے اندھیرے اجالے ہی نہیں، اپنی روایتیں اور پُرانی رفاقتیں بھی تج دینا سہل نہیں۔۔۔"

(افکار، فروری ۱۹۹۰ء، ص ۲۷)

"رفیق تو وہ در و دیوار بھی ہوتے ہیں جنہوں نے محبت کی پہلی پہلی سرگوشیاں سُنی ہوں، جنہوں نے بچپن کی لاابالیاں، نادانیاں دیکھی ہوں"

(افکار، فروری ۱۹۹۰ء، ص ۲۷)

"... مردوں کے لیے روایت شعار اور خود اپنا ظرف دار ہونا کچھ ایسا مشکل نہیں ہوتا ، اس کی قیمت تو ہمیشہ عورت نے ادا کی ہے ..."

(افکار، اگست ۱۹۸۹ء، ص ۱۷)

طلب اور آرزو کے تانے بانے سے ہی زندگی کی قبا بنی جاتی ہے۔

(افکار ، جون ۱۹۸۹ء ص ـ ۲۰)

"جہاں جانیداد ، وہاں مقدمے بازیاں ... جن میں ، ہارنے کے اندیشے اور جیتنے کی زبردست خواہشیں بھی یقینی ہیں ..."

(افکار ، جون ۱۹۸۹ء ، ص ۲۰)

"اس خاکدان میں ہر آنے والی روح اپنے حصے کا جادو بھی ساتھ لے کر آتی ہے۔"

(افکار ، ستمبر ۱۹۸۹ء ، ص ۲۰)

"جہاں (شخصیت کا) طلسم ساتھ چھوڑ جائے وہیں آدمی دم توڑ دیتا ہے، عمر چاہے کتنی ہی پائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ..."

(افکار ، ستمبر ۱۹۸۹ء ، ص ۲۰)

"اثر پذیری کے مدارج الگ الگ ہیں اور اپنے اپنے ..."

(افکار ، ستمبر ۱۹۸۹ء ص ۲۰)

"جس کی روزی کا وسیلہ ، اللہ تعالیٰ کی رضا سے صرف سرکاری ملازمت ہو ، اُس کے پاس انکار یا انتخاب کا کوئی حق نہیں ہوتا ...."

(افکار ، ستمبر ۱۹۸۹ء ، ص ۲۲)

"زندگی کے احکامات کو کچھ مدت کے لئے ٹالا جاسکتا ہے لیکن قطعی مسترد کر دینا ممکن ہی نہیں ..."

(افکار ، اکتوبر ۱۹۸۹ء ، ص ۲۰)

"وقت کی بلند آہنگ دستک ، بندی خانوں تک پہنچ جاتی ہے ..."

(افکار، اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۲۰)

"میں اپنے گھر کا (بہت) دھیان رکھتی ہوں ..."

(افکار ، اپریل ۱۹۸۹ء ، ص ۱۹)

"آسودہ نگاہ اور آسودگی پناہ دیار میں جو ہمارا گھر تھا، وہ لکڑی کا گھروندا بھی اپنی وسعتوں میں محل ، دو محلوں سے کم نہیں تھا..."

(افکار ، اپریل ۱۹۹۰ء ، ص ۱۸)

"کسی مکان کو گھر بناتے بناتے وقت لگتا ہے، پھر اس کو چھوڑتے دکھ بھی ہوتا ہے۔۔۔۔"

(افکار، ستمبر ۱۹۹۰ء، ص ۱۹)

"خوشیوں کے تو ریزے ہی چننا پڑتے ہیں، وہ تو پریشانیاں اور نومیدیاں ہوتی ہیں جو آندھی اندھیاری کی طرح مقابل آتی ہیں۔۔۔"

(افکار، ستمبر ۱۹۹۰ء ص ۱۹)

"پہلا قدم۔۔۔ راہ سفر کا تعین کرتا ہے۔۔۔"

(افکار، نومبر ۱۹۸۹ء، ص ۳۲)

"انسان بھید لینے کی خواہش سے اتنا مغلوب نہ ہوتا تو یہ ہدایت کیوں کی جاتی کہ کسی کی ٹوہ میں نہ رہو۔۔۔"

(افکار، ستمبر ۱۹۹۰ء، ص ۱۸)

حاصل کی ہوئی چیزوں کو تو بچہ خود رکھ کر بھول جاتا ہے ۔ لیکن محرومی اپنا احساس بار بار دلاتی ہے ۔ خاموشی یادوں کو بار بار دہراتی ہے ۔

(افکار، اپریل ۱۹۸۹ء ص ۔ ۲۳)

"(قبرستان میں) زندگی پر موت کی فتح کے تمام آثار اپنی تمام دل آزاریوں کے ساتھ آنکھوں کے آگے موجود ہوتے ہیں۔۔۔"

(افکار، اپریل ۱۹۸۹ء، ص ۲۴)

"جب تک ہر سفر سے اگلے سفر کی بشارت ملتی رہے ، انسان خستہ و درماندہ نہیں ہوتا۔۔۔ بے یقینی بھی پاس نہیں پھٹکتی۔۔۔"

(افکار، دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۳۸)

"مقصودِ نگاہ مقدر ہو نہ ہو ، مژگان اٹھانے کی آرزو بھی کچھ کم محترم نہیں ہوتی"

(افکار، دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۳۸)

"ایک لکھا ہوا ضابطہ فکر ، ہر تخلیقی ذہن کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔۔"

(افکار، جنوری ۱۹۹۰ء، ص ۱۷)

"کوئی بھی حساس انسان رجعت پسند ہو ہی نہیں سکتا ۔"

(افکار، جنوری ۱۹۹۰ء، ص ۔ ۱۷)

کارواں میں ہر مسافر ایک ہی قد و قامت کا نہیں ہوتا (ہو سکتا بھی نہیں)"

(افکار، جنوری ۱۹۹۰ء ص ۱۷)

"گیلی مٹی کو سانتے گوندھتے ہاتھ بے شکل کو، شکل دیتے دیتے اپنی عمر بھی انہیں لگا جاتے ہیں..."

(افکار، فروری ۱۹۹۰ء، ص۲۳)

"دھوپ میں سوکھتے کچے کوزے جب پزاوے کی پوری تمازت جھیل جائیں تب ہی ان کی ساکھ بنتی ہے، تب ہی ان کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔"

(افکار، فروری ۱۹۹۰ء، ص۲۳)

"ظلمتوں کی کوکھ سے ہی دمکتا ہوا آفتاب جنم لیتا ہے..."

(افکار، نومبر ۱۹۸۹ء، ص۳۳)

"اجالا باغ و راغ کو نہیں دیکھتا..."

(افکار، نومبر ۱۹۸۹ء، ص۳۳)

"درختوں اور پودوں سے میرا رشتہ محبت (رہا ہے) اور صرف پھول ہی نہیں میں نے کانٹوں سے بھی گفتگو کی ہے..."

(افکار، جولائی ۱۹۹۰ء، ص۱۸)

"پودوں اور پیڑوں سے آدمی کا ایک ان کہا، ان جانا رشتہ ہوتا ہے..."

(افکار، مئی ۱۹۸۹ء، ص۲۴)

"(ایک زمانے میں) ہوا اور بادل سے میرا بڑی یگانگت کا رشتہ تھا... ہوا نے میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا..."

(افکار، اپریل ۱۹۸۹ء، ص۲۳)

"آواز کی لہریں مجھے اجنبی جزیروں تک پہنچا دیتی ہیں. کیسے کیسے جادو جگاتی ہیں... بچھڑے ہوئے دوست کی آواز (کتنی اور کیسی بڑی نعمت ہے) کہاں سننے کو ملتی ہے..."

(افکار، ستمبر ۱۹۸۹ء، ص۱۹)

"بدلتے موسموں کی دلداری اور دل آزاری دونوں پر یقین کرنے کے لئے کبھی کبھی بھولی بسری یادوں کو چھو لینا بھی اچھا ہے..."

(افکار، اپریل ۱۹۸۹ء، ص۱۷)

"مَیں عُمر کے اس مرحلے میں ہوں جب شخصیت تنقید و تنقیص سے بلند ہو جاتی ہے"

(ادا جعفری، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ایضاً، ص۱۷۳)

"تخلیقی ادب، عورت سے کچھ زیادہ ہی خراج طلب کر لیتا ہے، کبھی کبھی ناقابلِ برداشت حد تک بھی..."

(افکار، ستمبر ۱۹۸۹ء، ص۲۰)

سیر و سیاحت:

سیر و سیاحت کے اتنے مواقع ملے ہیں کہ کرۂ ارض کے گرد ایک چکر پورا کر چکی ہوں ۰۰۰ ۱۹۷۸ء میں ایک ادبی وفد کے ساتھ "جشن پشکن" کے موقع پر روس بھی گئی ... ستمبر ۱۹۸۲ء میں ٹورانٹو (کینیڈا) میں پہلی اردو کانفرنس میں شرکت کی۔

(طاہر مسعود ، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے۔ کراچی ۱۹۸۵ء ص ۱۷۰)

"اپنے دیس میں سوات کے آس پاس کی وادیاں اور کاغان سے آگے سلسلۂ کہسار میں لالہ زار اور جھیل سیف الملوک اور پھر گلگت اور چترال ، ہنزہ وغیرہ دستِ قُدرت کی فیّاضیوں کے مظاہر کہاں نہیں ہیں ... ہر خطّۂ زمین کا اپنا مزاج ، اپنی دھج اور اپنا حُسن ہے ..."

"میرے اوپر میرے مولا کے بڑے احسانات ہیں ۔ میں جو میکے کے گھر سے مٹھی بھر آسمان ساتھ لے کر چلی تھی، اس نے زمین و آسمان کی وسعتوں اور رنگینیوں کے کئی دل کش اور دل ربا خزینوں تک میری آرزومند نگاہوں کو رسائی عطا کی ..."

(افکار ، نومبر ۱۹۹۰ء ص ۱۷)

"عالمی بنک کی جانب سے اکنامک ڈیویلپمنٹ انسٹیٹیوٹ (آئی ۔ ڈی ۔ آئی) کا چھ مہینے کا کورس ہوتا تھا جس کے لیے دس پندرہ ترقی پذیر ممالک سے نمائندے بلائے جاتے تھے۔ عالمی بنک سے الاؤنس وغیرہ کے علاوہ بیویوں کا سفر خرچ بھی ملتا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں ، نور پاکستان کے ایک مندوب تھے ... ہم لوگ اگست کے آخر میں اسلام آباد سے روانہ ہوئے اور راستے میں مختلف ممالک دیکھتے چھوتے ہوئے چار ہفتے بعد واشنگٹن پہنچے۔ عالمی بنک کی طرف سے جو کرایہ ملا تھا، اس میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے ہم نے اسلام آباد سے واشنگٹن کے راست سفر کو عالمی سفر میں تبدیل کروا لیا تھا ... یہ پروگرام بھی طے کر لیا گیا تھا کہ نور کا کورس ختم ہونے کے بعد لندن میں بچے ہمارے پاس آجائیں گے اور پھر ان کے ساتھ یورپ کا سفر اور عمرے کی سعادت حاصل کرتے ہوئے وطن واپسی ... نور نے تین ماہ کی چھٹی پہلے ہی حاصل کر لی تھی۔ ایک مہینہ کورس سے پہلے مشرق بعید کی دید ، اور واپسی کے سفر میں دو مہینے بچوں کے ساتھ یورپ کی سیر و سیاحت کے لیے ... اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا یہ پروگرام ، ہماری خواہش کے مطابق پورا ہوا ..."

(افکار ، نومبر ۱۹۹۰ء ، ص ۱۸)

"ڈھاکہ سے ہمارا بیرونِ ملک پہلا پڑاؤ بنکاک تھا ... ہم پانچ دن بنکاک میں رہے ... ہمارا اگلا قیام ہانگ کانگ میں تھا، صرف ڈیڑھ دن کے لیے کیوں کہ وہاں دیکھنے کے لیے کوئی خاص جگہ نہیں تھی ... ٹوکیو میں ہم لوگ ایک ہفتہ رہے۔ اگر پیسوں میں گنجائش ہوتی تو اور بھی ٹھہرتے ... ٹوکیو سے ہماری اگلی منزل ہوائی کا جزیرہ تھا ..."

(افکار ، نومبر ۱۹۹۰ء ، ص ۱۹-۲۴)

"... میں نے اب تک جتنی امریکی ریاستیں دیکھی ہیں ، اُن میں نیویارک ، واشنگٹن ، میری لینڈ ، کولمبیا ، میساچیوسٹس ، کینسس ، کیلی فورنیا ، فلوریڈا ، نیو جرسی ، وایومنگ ، منی سوٹا ، کینک ٹیکٹ ، ڈیلاویر ، اوہایو ، ورجینا ، پنسلوینیا ، ورمانٹ اور ہوائی شامل ہیں..."

(افکار ، نومبر ۱۹۹۰ء ، ص ۱۸)

"واشنگٹن شہر اور اس کے آس پاس کے مشہور قابلِ دید مقامات جو سیاحوں کے لیے کشش رکھتے ہیں، میں نے ۱۹۶۹ء سے اَب (جون ۱۹۹۰ء) تک کئی بار دیکھے ہیں اور اب وہ میرے لیے اپنی کشش کھو چکے ہیں... اب تو اپنے بچّوں اور اُن کے بچّوں کو دیکھنے کی خاطر عموماً ہر دو سال کے بعد امریکہ جانا ہوتا ہے..."

(ادا جعفری ، افکار ، جون ۱۹۹۰ء ، ص ۲۹)

شعری مجموعے:

۱۔ میں ساز ڈھونڈتی رہی: طبع اوّل ۱۹۵۰ء

■ طبع سوم ، لاہور اگست ۱۹۸۸ء ، ص ۱۶۰

۲۔ شہرِ درد (آدم جی انعام یافتہ): طبع اوّل ۱۹۶۷ء

■ طبع سوم ، لاہور ، اگست ۱۹۸۸ء ، ص ۲۰۸

۳۔ غزالاں تم تو واقف ہو: طبع اوّل ۱۹۷۴ء

■ طبع سوم ، لاہور اگست ۱۹۸۸ء ص ۱۷۶

۴۔ سازِ سُخن بہانہ ہے: طبع اوّل ۱۹۸۲ء

■ طبع سوم ، لاہور ، اگست ۱۹۸۸ء ، ص ۱۶۰

۵۔ سازِ سُخن (چاروں شعری مجموعوں کا انتخاب):

■ طبع اوّل ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ، مئی ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۲

کلاسیکی شاعری کا انتخاب: غزل نُما: قُلی قُطب شاہ سے میاں داد خان سیاح تک، ۳۷ شعراء کا تعارف اور انتخابِ کلام:

■ طبع اوّل ، انجمن ترقّی اُردو پاکستان ، کراچی ۱۹۸۷ء ص ۲۷۸

■ پہلا ہندوستانی ایڈیشن ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، دہلی مئی ۱۹۸۸ء ص ۸۷

خود نوشت (آپ بیتی):

ماہنامہ افکار کراچی (ناتمام ، اُنیس قسطیں):

■ اپریل ۱۹۸۹ء تا جولائی ۱۹۸۹ء

■ ستمبر ۱۹۸۹ء تا نومبر ۱۹۹۰ء

زیرِ ترتیب کتابیں:

■ نیا (پانچواں) شعری مجموعہ (ہائیکو اسمیں شامل ہوں گے)۔ (۱۵)

■ کلیات (۱۶) اور:

■ آپ بیتی (کتابی صورت میں): اواخر ۱۹۹۱ء یا اوائل ۱۹۹۲ء تک (۱۷)

انعام اور اعزاز:

■ "شہرِ درد" پر آدم جی ایوارڈ، ۱۹۶۷ء

■ تمغۂ امتیاز، حکومتِ پاکستان، ۱۹۸۱ء

کچھ ذمہ داریاں:

■ جج "نقوش" صدارتی انعام برائے ادب، ۱۹۸۲ء تاحال

■ رکن ادارۂ تحریر، ماہنامہ "قومی زبان" کراچی دسمبر ۱۹۸۳ء تاحال

اختر شیرانی سے ادا جعفری کے تلمذ کا مسئلہ

(ایک غلط فہمی کا ازالہ)

ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن

"——— (میرا شعری "پس منظر") نامکمل رہے گا اگر میں جناب اثر لکھنوی کا تذکرہ نہ کروں——— یہ ضرور ہے کہ اُن کی مصروفیات اور میری بارہ تیرہ سال کی عمر کی بغاوت اور خودسری نے یہ سلسلہ زیادہ عرصے نہیں چلنے دیا اور میری صرف پانچ یا چھ چیزوں کو ہی اُن کی نظرِ اصلاح سے گزرنے کا شرف حاصل ہو سکا لیکن میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے، اُنہی سے حاصل کیا، اور اگر میرے اشعار میں میرے قاری کو الفاظ کو برتنے کا سلیقہ (نظر) آجائے تو وہ جناب اثر لکھنوی کا ہی فیضان ہو گا (۱۸) ..."

[ادا جعفری، ۱۲۔ مئی ۱۹۶۷ء]

●●●●●

"——— ایک بار پھر یہ وضاحت ضروری ہے کہ میں نے ابتدائی زمانے میں چند نظموں پر اثر لکھنوی سے اصلاح لی تھی۔ آج بھی اُن کی شکر گزار ہوں، مگر بارہ تیرہ سال کی عمر اُس زمانے میں بھی بغاوت کی عمر ہوا کرتی تھی——— اس لیے یہ سلسلہ بہت مختصر رہا، اُن کے سوا کسی اور سے "مشورہ" نہیں کیا۔ (۱۹)

[ادا جعفری، ۲۹۔ مارچ ۱۹۸۲ء]

"——— میں نے چند نظمیں (اثر لکھنوی کو) اصلاح اور مشورے کے لیے ارسال کیں، انہوں نے کچھ الفاظ کے ردّوبدل کے بعد واپس بھیجیں تو مجھے وہ مصرعے ہی پرائے پرائے لگے اور جب یہ نظمیں شائع ہونے کے لیے روانہ کیں تو اپنے ہی سوچے اور لکھے ہوئے الفاظ موجود رہنے دیے۔ رسالے اثر صاحب کی نگاہ سے گزرے تو میری یہ جسارت اُنہیں ناگوار گزری ، لیکن اُس زمانے کے بزرگ درگزر کرنا جانتے تھے۔ اُنہوں نے آئندہ مشورے کے لیے چیزیں بھیجنے کی تو ممانعت کر دی مگر میری درخواست پر علمِ عروض سے متعلق عربی سے اُردو میں ترجمہ کی ہوئی کچھ کتابیں مجھے بھیجیں اور اپنا مجموعہ کلام "بہاراں" بھی ——— اشعار پر اُن کی اصلاح قبول نہ کرنے کے باوجود ، میں اُن کی شفقت بھری توجہ کی ممنون ہوں" (۲۰) [ادا جعفری ، دسمبر ۱۹۸۹ء]

ادا جعفری کے ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۹ء تک کے بیس بائیس برس پر پھیلے ہوئے اِن بیانات سے بہت قدیم ، مجھے ۱۹۴۴ء کے شاعراتِ اُردو کے ایک تذکرے میں یہ حوالہ ملا کہ اثر لکھنوی سے پہلے ادا نے اختر شیرانی سے بھی اصلاح لی اور استفادہ کیا:

"——— ادا بدایونی: اُردو کی اس ممتاز اور گرامی قدر شاعرہ کے حالات جو آپ کی بڑی بہن مسز بی۔ حق (۲۱) نے ارسال فرمائے ، حسبِ ذیل ہیں:

"عزیز جہاں بیگم نام ، اور ادا تخلص ۔ شاعری کی عمر پانچ سال ہے۔ ۱۹۳۸ء تک جناب اختر شیرانی سے استفادہ کیا۔ پھر حضرت جعفر علی خان اثر لکھنوی سے اصلاح لی اور اُن کے کشمیر چلے جانے کے بعد بھی اُن کا دامن نہ چھوڑا ، بالآخر ۱۹۴۱ء میں اثر صاحب نے فرمایا: "بیٹی! اب اصلاح کی ضرورت نہیں (۲۲) ———" (مسز بی۔ حق)

میں نے اس حوالے سے ، ۳۱۔ دسمبر ۱۹۹۰ء کے ایک خط میں ادا جعفری سے پوچھا کہ: "... اختر شیرانی سے استفادہ کی صورت کیا تھی؟ آپ کے ابتدائی اشعار اختر شیرانی کے رسالے "رومان" (لاہور) میں شائع ہوئے... لیکن صرف اسے "استفادہ" تو نہیں کہا جائے گا؟..." میرے اس استفسار کے جواب میں ادا جعفری نے ۱۰۔ جنوری ۱۹۹۱ء کے گرامی نامے میں فرمایا کہ: "... تذکرہ "شاعراتِ اُردو"، میں میری اصلاح سخن کے بارے میں جو لکھا ہے، وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ میں نہیں جانتی یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی؟... جو نام (مسز بی۔ حق)، آپ نے تحریر فرمایا ہے، اُس کے الفاظ میری بڑی بہن کے نام کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی ۔ ممکن ہے اُنہوں نے لکھا ہو ، لیکن میرے علم کے بغیر (میری عمر بھی کم تھی اور اُس ماحول اور اُس گھرانے میں یہ رویّہ حیرت انگیز بھی نہیں)، ورنہ یہ غلط فہمی وجود میں

نہیں آتی۔ وجہ یہی ہو سکتی ہے جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ میرے ابتدائی اشعار رسالہ ''رُومان'' میں شائع ہوئے اور اِسی کو استفادہ مان لیا گیا... میرے گھر میں کسی کو شعر و شاعری سے کوئی خاص نسبت نہیں رہی۔ شاید کسی اُستاد کی موجودگی ضروری سمجھی گئی ہو... یہ حقیقت ہے کہ میں نے اختر شیرانی کو اپنی کوئی نظم یا غزل اصلاح کے لیے نہیں بھیجی ——— اگر اصلاح لی ہوتی تو اِس سے انکار کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اثر لکھنوی سے بے شک میں نے مشورۂ سخن کی فرمائش کی تھی چار پانچ نظمیں اُنہیں بھیجیں لیکن اُن کی اصلاح قبول نہیں کی۔ کیونکہ اصلاح کے بعد مجھے اپنے شعر پرائے لگے، لیکن اُنہوں نے عروض کے بارے میں کتابیں مجھے بھیجی تھیں، اس لیے میں آج بھی انہیں اپنا محسن اور اسی لحاظ سے رہ نُما مانتی ہوں۔

مضمون کا جو حصّہ آپ نے نقل فرمایا ہے، اُس میں یہ جملہ کہ ''اُن کے کشمیر چلے جانے کے بعد بھی اُن کا دامن نہ چھوڑا...'' میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ لکھنؤ میں تھے یا کشمیر میں، میرے لیے خط کے وسیلے سے فاصلہ برابر تھا۔ اثر صاحب سے میری ملاقات، پہلی بار قیامِ پاکستان کے بعد لاہور میں ''۴۹۔۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔ میں نے اس ملاقات کا حال خودنوشت میں تحریر کیا ہے (۳۳) میں نے اُن کی اصلاح قبول نہیں کی تو اُنہیں ناگوار تو گزرا لیکن اگلے وقتوں کے بزرگ درگزر کرنا جانتے تھے، اس کے بعد ہی میری درخواست پر اُنہوں نے چند کتابیں مجھے بھجوائی تھیں...''

اِس وضاحت کے بعد اختر شیرانی سے ادا جعفری کے تلمّذ کی روایت پر گفتگو کا دروازہ بند سمجھنا چاہیئے۔

حواشی

۱۔ تذکرہ شاعراتِ اُردو، محمد جمیل احمد بریلوی، قومی کتب خانہ بریلی، ۱۹۴۴ء ص ۲۳۱

۲۔ ''ادا کی تاریخِ ولادت ۲۲۔ اگست ۱۹۲۴ء صحیح ہے، کہیں آپ کو ۱۹۲۶ء بھی مل جائے گی، وہ غلط ہے...'' [مکتوب: نورالحسن جعفری، بنام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ۱۶۔ مارچ، ۲۳۔ مارچ ۱۹۹۰ء]

۳۔ ''بڑی حویلی، بدایون، جہاں میں پیدا ہوئی... ایک چھوٹا سا شہر تھا (جسے) بدھ نام کے ایک راجہ نے بسایا تھا جو بعد میں مُسلمان سلاطین کے زمانے میں بدایون ہوا...''

(ادا جعفری، افکار، کراچی، اپریل، ۱۹۸۹ء، ص ۱۹)

بدایون، دل والوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ وہاں کے صوفیاء اور علماء کے تذکرے موجود ہیں۔ شاعری تو بدایون کی مٹی میں گندھی تھی۔ اِس شہر کے ناخواندہ لوگ بھی شعر کی تاثیر سے آشنا تھے۔ شہر میں عام مشاعرے بھی منعقد ہوتے رہتے تھے۔

(ادا جعفری، افکار، اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۱۹)

۴۔ میں ۱۹۴۰ء (۱۹۴۱ء) تک بدایون میں رہی۔۔۔" (اداجعفری ، افکار ، جولائی ۱۹۸۹ء ، ص ۱۹)

"بڑی حویلی سے میں جنوری ۱۹۴۷ء میں رخصت ہوئی اور بدایون سے مارچ ۱۹۴۹ء میں۔۔۔

(اداجعفری ، افکار ، اگست ۱۹۸۹ء ، ص ۳۲)

۵۔ "میرے والد مولوی بدرالحسن (مرحوم) نے کانپور میں ملازمت اختیار کی۔۔۔ (وہ) نہایت متقی پرہیزگار انسان تھے۔ عالم باعمل۔ امی کہتی تھیں کہ بعض اوقات اُن کے ملاقاتی بڑے عجیب و غریب قسم کے لوگ ہوتے۔ یہ سب مردانے میں بیٹھ کر "ذکر" کرتے۔ کبھی قوالی کی محفلیں ہوتیں، کبھی کسی کو "حال" آجاتا۔۔۔" (اداجعفری ، افکار اپریل ، ۱۹۸۹ء ، ص ۳۲)

"والد صاحب کا انتقال میرے بچپن ہی میں ہوگیا تھا، میں یہی کوئی تین برس کی رہی ہوں گی۔

(اداجعفری ، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے ، ص ۱۷۱)

"میرے والد کی ٹانگ میں چوٹ لگ گئی تھی علاج ہوتا رہا اور زخم بڑھتا رہا، یہاں تک کہ اس نے ایک ناسور کی شکل اختیار کر لی۔"

(افکار ، اپریل ، ۱۹۸۹ء ، ص ۳۳)

"اداقاضی بدرالحسن مرحوم (سپرنٹنڈنٹ محکمہ زراعت) کی تیسری صاحبزادی ہیں۔" (شاعراتِ اُردو ، ص ۲۳۱)

۶۔۸ "طیب ، والد کی وفات (۱۹۲۹ء) کے تین مہینے بعد پیدا ہوتے تھے۔ امی نے طویل عمر پائی۔ طیب کے ساتھ ہی رہیں۔ میری بھاوجہ سیدہ نے اُن سے بیٹیوں سے زیادہ محبت کی۔ اُن کے بچے (فوزیہ ، فراز ، شاداب اور اسماء ، امی کی زندگی بھر کی محرومیوں کے صلے کی طرح اُن کے پاس رہے۔ آخری بیماری میں اُن کی خدمت کی سعادت بھی سیدہ کے حصے میں آئی۔۔۔ اس زمانے ، اس ماحول اور اس گھر کے لحاظ سے امی یقیناً ایک غیر معمولی خاتون تھیں۔۔۔"

(افکار ، نومبر ۱۹۸۹ء ص ۳۱)

۹۔ ماں کی قابل تربیت نے گھر پر تعلیم دلاکر ۱۹۴۰ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کروایا، اُردو کے مضمون میں امتیازِ خصوصی حاصل کیا۔ آج کل فارسی اور ہندی سے شوق ہے۔"

[خواہر گرامی مسز بی۔ حق ، (تذکرہ) شاعراتِ اُردو ، ۱۹۴۳ء، ص ۲۳۱]

۱۰۔ افکار ، نومبر ۱۹۸۹ء ، ص ۳۳

۱۱۔ افکار ، اگست ۱۹۹۰ء ، ص ۲۰

۱۲۔ افکار ، جون ۱۹۹۰ء ، ص ۳۰

۱۳۔ افکار ، اپریل ۱۹۹۰ء ، ص ۳۲

۱۴۔ افکار ، ستمبر ۱۹۹۰ء ، ص ۱۹

۱۵۔ مکتوب ، نورالحسن جعفری بنام: ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن ، ۱۶۔ مارچ ۱۹۹۰ء

۱۶۔۱۷۔ مکتوب ، اداجعفری ، بنام: ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن ، ۱۰۔ جنوری ۱۹۹۱ء

۱۹۔ شہرِ درد ، طبع سوم ، ص ۲۰۵۔۲۰۶

۱۹۔ سازِ سخن بہانہ ہے، طبع سوم، ص۱۳

۲۰۔ سازِ سخن (انتخاب) دہلی، مئی ۱۹۸۸ء، ص۱۵

۲۱۔ ادا جعفری کی سب سے بڑی بہن مسز بلقیس حق (بیگم ڈاکٹر مقبول الحق)۔ تفصیل کے لیے دیکھئے:

(i) افکار، کراچی، جون ۱۹۸۹ء ص۲۱

(ii) افکار، کراچی، نومبر ۱۹۸۹ء، ص۳۵

۲۲۔ تذکرہ شاعراتِ اُردو، مرتبہ: محمد جمیل احمد بریلوی، قومی کتب خانہ بریلی، ۱۹۴۳ء ص۲۳۰۔۲۳۱

۲۳۔ دیکھیے: رسالہ افکار، کراچی، دسمبر ۱۹۸۹ء، ص۲۱

اَدا جعفری کا شعری سرمایہ

تحقیق اَور تلاش کی روشنی میں

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

ان سردیوں کا ایک بڑا حصہ بوجوہ ادا جعفری کے شعر و ادب کو دیکھتے بھالتے گزرا — ان ایام میں "فکرِ جمیل" (خلیج کی صورتِ حال کے باعث) "خوابِ پریشاں" بھی تھی — ایسے میں کیسی غزل خوانی اور کہاں کی تحقیق — بایں ہمہ جو کچھ ہو سکا، اُس سے شرمندہ نہیں ہوں، اگرچہ "حاصل" سے اطمینان بھی نہیں ہے!

اَدا جعفری کے چار شعری مجموعے چھپ چکے ہیں: میں ساز ڈھونڈتی رہی (۱۹۵۰ء)، شہر درد (۱۹۶۷ء)، غزالاں تم تو واقف ہو (۱۹۷۴ء)، سازِ سخن بہانہ ہے (۱۹۸۲ء) ۔ اگلے صفحات میں ابتدائی شعری متن اور مآخذ کے حوالے سے ان شعری مجموعوں کے مشمولات کے بارے میں سلسلے وار اشارات پیش کیے جا رہے ہیں ۔ اَدا جعفری کے چاروں شعری مجموعوں کا ایک مختصر انتخاب "سازِ سخن" کے نام سے نئی دہلی سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا — "غزل نما" سترھویں، اٹھارھویں اور اُنیسویں صدی کے معروف اور غیر معروف شعرا کے کلام کا انتخاب ہے جو ۱۹۸۷ء میں کراچی اور پھر ۱۹۸۸ء میں دہلی سے کتابی صورت میں شائع ہوا — اَدا جعفری کے ان انتخابات کا مختصر سا تعارف بھی دیا جا رہا ہے ۔

ایک محدود مدّت میں ایک متعین ہدف کی پابندی نہ ہوتی تو شاید یہ کام بہت بہتر ہو سکتا تھا — یا شاید بالکل ہی نہ ہو پاتا!

"میں ساز ڈھونڈتی رہی" کا جائزہ

(۱)

"میں ساز ڈھونڈتی رہی" ادا کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۴۶ء میں مُرتب ہوا، اور ۱۹۵۰ء میں پہلی بار کتابی صورت میں شائع ہوا۔ کتاب کا تیسرا ایڈیشن (مقبول اکیڈمی، لاہور، اگست ۱۹۸۸ء) میرے پیشِ نظر ہے ۔ ۱۹۴۴ء میں "شاعراتِ اُردو" کا ایک تذکرہ محمد جمیل احمد، ایم ۔ اے، بریلی نے قومی کُتب خانہ، بریلی سے شائع کیا جس میں مولف کے بقول "آغاز سے موجودہ دور (۱۹۴۴ء) تک کی عفت مآب شاعرہ خواتین کا تذکرہ مع انتخابِ کلام و تبصرہ —— شامل ہے ۔

"شاعراتِ اُردو" میں اَدا کا تذکرہ اور انتخابِ کلام شامل ہے۔

(۲۳۰ — ۲۵۷)

مولف نے ابتدا میں لکھا ہے کہ :

"ـــــ اُردو کی اِس مُمتاز اور گرامی قدر شاعرہ (ادا) نے بدایون کی اَدب پرور فضاؤں میں آنکھ کھولی ہے ۔ آپ کے حالات جو آپ کی بڑی بہن مسز بی ۔ حق نے اِرسال فرمائے ہیں ، وہ حسبِ ذیل ہیں ـــــ"

اِس کے بعد صفحہ ۲۳۱ پر مسز بی ۔ حق کی فراہم کردہ معلومات درج کی گئی ہیں ۔ اپنے تبصرۂ کلام کے بعد مولف نے (صفحہ ۲۳۳ تا ۲۵۷) ادا کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے ۔ اس انتخاب میں شامل ایک غزل اور درج ذیل آٹھ منظومات کے بارے میں مولف نے بتایا ہے کہ یہ "خود محترمہ ادا کا انتخاب ہے جو انہوں نے اس کتاب کے لیے عنایت فرمایا ہے ـــــ ص (۲۳۳) :

غزل : جوش کہاں ، تڑپ کہاں ، لذتِ جستجو کہاں

منظومات : خیر مقدم ، یادِ ماضی ، پروین کے نام ، احساسِ اوّلین ، بہار کا پہلا پھول ، جھیل ، تعمیرِ نو اور کربِ شب تاب ۔

غزل اور ایک نظم ، کربِ شب تاب ۔ ادا کے شعری مجموعے "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں شامل نہیں ہیں ـــ ادا کا کچھ اور کلام بھی اس انتخاب میں ایسا ہے جو ان کے شعری مجموعے میں بار نہیں پا سکا ـــ یا ترمیم اور تبدیلی کی زد میں آیا ہے ـــــ اِس طرح ادا کی غزلوں یا نظموں کے ابتدائی متن کے حوالے سے تذکرہ "شاعراتِ اُردو" کی ایک خاص اہمیت ہے ـــــ اِس سے ادا کے ذہنی ارتقاء اور اظہارِ بیان اور اُسلوب کے بارے میں اُن کے روّیوں کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے ۔

(۲)

"شاعراتِ اُردو" (تذکرے) میں نظم "احساسِ اوّلین" (ص ۲۳۹) شامل ہے ۔ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" (مجموعے) میں اِس نظم کا ترقی یافتہ متن ملتا ہے (ص ۲۹ ـــ ۳۰) دو شعر حذف کر دیئے گئے ، دو شعروں کا اضافہ ہوا ہے اور بعض مصرعوں میں لفظی ترمیم سے معنوی یا صوری حُسن بڑھ گیا ہے :

"تذکرے میں ایک مصرعہ یہ تھا : دل ہے ناشاد اور جی ہے نڈھال

شعری مجموعے میں اس کی یہ شکل ہو گئی ہے : آپ ہی آپ جی ہوا نڈھال

تذکرے میں ایک شعر یہ تھا :

سینے میں اک چبھن سی ہوتی ہے
آنکھوں میں اک جلن سی ہوتی ہے

دوسرے مصرعے میں لفظ "اک" کو "کیوں" سے بدل دیا گیا ہے ۔

تذکرے میں ایک شعر کی شکل یہ ہے :

کیوں یہ حالت ہے بے قراری کی
سانس لی یا کسی نے چٹکی لی

شعری مجموعے میں دوسرے مصرعے کی یہ صورت ضبط میں آئی ہے :

سانس بھی کھل کے آ نہیں سکتی

(۳)

نظم "عیدِ نظارہ" (ص ۳۸ — ۴۱) میں ایک شعر بڑھایا ہے اور یہ تفصیل ذیل تین مصرعوں میں ترمیم کی ہے :

اِبتدائی متن (ص ۳۴۵ — ۳۴۶)	موجودہ صورت (ص ۳۸ — ۴۰)
سو طرح غمکدے کو بھی اپنے سجاؤں میں	کس کس طرح نہ غمکدہ اپنا سجاؤں میں
قوس قزح کے رنگ سے محفل رچاؤں میں	قوس قزح کا رنگِ عروسی رچاؤں میں
ظلمت میں ہو نہ نور فشاں ماہِ نیم ماہ	ظلمت میں ہو گا نور فشاں ماہِ نیم ماہ

(۴)

نظم ، جوہی کی کلیاں (ص ۴۳ — ۴۵) کا ابتدائی متن (ص ۲۴۷) سے تقابل کیا جائے تو بڑی دل چسپ صورت سامنے آتی ہے ۔ شعری مجموعے (میں ساز ڈھونڈتی رہی) میں دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی سرے سے کتابت ہونے سے ہی رہ گیا ہے ، یہ گم شدہ مصرعہ تذکرے (شاعراتِ اُردو) سے ہاتھ آتا ہے :

ہوائے مست ہے بہکی ہوئی سی　　فضائے عنبریں مہکی ہوئی سی

تین شعر حذف کر دیئے ہیں ، تین نئے شعر داخل ہوئے ہیں ، کچھ ترمیمات ہوئی ہیں :

ابتدائی متن (ص ۲۴۷)	موجودہ صورت (ص ۴۳ — ۴۴)
ہوائے نرم و نازک جیسے آہیں	ہوا کے نرم جھونکے ہیں کہ آہیں
کہ خوابِ ناز کی بے ربط سانسیں	کہ بکھری بکھری نادیدہ نگاہیں
ستارے آسماں سے گر پڑے ہیں	سرِ مژگاں ستارے کانپتے ہیں

(۵)

نظم بہار کا پہلا پھول (ص ۴۶ — ۴۷) کا ابتدائی متن تذکرے میں شامل ہے (۲۴۰ — ۲۴۱) تین اشعار کے متن میں تبدیلی ہوئی ہے :

ابتدائی متن (ص ۲۴۱)	موجودہ صورت (ص ۴۷)
یا آرزوئے عشق نہفتہ کی قلب میں	یا آرزوئے اول و مبہم کی قلب میں

پہلی تڑپ ، جراحتِ مژگاں کہیں جسے	پہلی تڑپ ، جراحتِ مژگاں کہیں جسے
یا جستجوئے جلوۂ رنگینِ دوست میں	یا رہگزارِ ناز میں مصروفِ جستجو
وہ چشمِ انتظار کہ حیراں کہیں جسے	وہ چشمِ انتظار کہ حیراں کہیں جسے
یا اولیں سرشکِ محبت سرِ مژہ	یا اوّلیں سرشکِ محبت سرِ مژہ
محرومیٔ نشاط کا عنواں کہیں جسے	محرومیٔ نشاط کا پیماں کہیں جسے

(٦)

نظم "جھیل" (٥١—٥٣) کے ابتدائی متن کے کچھ آثار تذکرے (ص ٢٤١ — ٢٤٣) میں تلاش کئے جا سکتے ہیں ۔ تذکرے میں یہ نظم انیس اشعار پر مشتمل ہے ، "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں یہ نظم تیرہ اشعار پر مبنی ہے اور اِن تیرہ اشعار میں صرف ایک (دسواں) شعر ، اس نظم کی پہلی قرأت کے مُطابق ہے ۔ پانچ شعر ایسے ہیں جو لفظی ترمیم کے بعد باقی رکھے گئے ہیں جبکہ سات شعر بالکل نئے اور مختلف ہیں ۔ باقی رہ جانے والے اشعار کی ابتدائی ، اور ترمیمات کے بعد موجودہ شکل یہ ہے :

ابتدائی متن (ص ٢٤١—٢٤٢)	موجودہ صورت (ص ٥١—٥٣)
آغوش میں زمین کے یہ جھیل سو رہی ہے	وادی کی گود میں یوں اک جھیل سو رہی ہے
یا چاندنی سمٹ کر آغوش ہو گئی ہے	خود چاندنی سمٹ کر آغوش ہو گئی ہے
(پہلا شعر)	(دوسرا شعر)
محوِ خرامِ دل کش دوشیزہ صبا ہے	محوِ خرامِ نازک دوشیزۂ صبا ہے
سبزے کی جنبشوں میں اک دل دھڑک رہا ہے	سبزے کی جنبشوں میں اک دل دھڑک رہا ہے ،
(ساتواں شعر)	(نواں شعر)
لرزاں ہے کس لیے یوں ، ہے کیوں شکن جبیں پر	لرزاں ہے کس لیے یوں؟ ہے کیوں شکن جبیں پر؟
کیا یاد آ رہا ہے؟ کیوں ہو رہی ہے مضطر	کیوں یاد آ رہا ہے؟ کیوں ہو رہی ہے مضطر
سوئے فلک نگاہِ حسرت شعار کیوں ہے ؟	سوئے فلک نگاہِ حیرت شعار کیوں ہے؟
(بارھواں شعر)	(گیارھواں شعر)
کیوں دل دھڑک رہا ہے ، یوں بے قرار کیوں ہے؟	کیوں دل دھڑک رہا ہے؟ یوں بے قرار کیون ہے؟
(تیرھواں شعر)	(بارھواں شعر)
امید کے محل کو پل میں گرا دیا ہے	امید کا گھروندا پل میں گرا دیا ہے!

تُجھ کو بھی کیا کسی نے دل سے بھلا دیا ہے	تُجھ کو بھی کیا کسی نے دل سے بھلا دیا ہے ؟
(انیسواں شعر)	(تیرھواں شعر)

(۷)

"میں ساز ڈھونڈتی رہی" کی نظم "پروین کے نام" (ص ۶۹ــــ ۷۰) تذکرے میں شامل ہے (ص ۲۳۸) ـــــ شعری مجموعے میں ، اس نظم کے صرف دو مصرعوں میں مثبت لفظی تبدیلی ہوئی ہے :

کسی کے دل کو دُکھانے سے احتراز رہے	ہمیشہ دل کے دکھانے سے احتراز رہے
(تذکرہ ص ۲۳۸)	(ص ۷۰)
عطا ترے دلِ نازک کو ہو وہ سوزِ حیات	عطا ترے دلِ نازک کو ہو وہ سوز و گداز
(تذکرہ ص ۲۳۸)	(ص ۷۰)

(۸)

نظم "یادِ ماضی" (ص ۷۶ ــــ ۷۷) بھی تذکرے میں ملتی ہے (ص ۲۳۵ــــ ۲۳۷) اِس نظم کے ابتدائی متن میں تین شعر ایسے ہیں جو "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں شامل نہیں کئے گئے ۔ نظم کا ایک شعر نیا ہے اور تین مصرعوں میں ردّوبدل ہوا ہے :

پہلا متن	موجودہ صورت
تاروں بھرا آکاش ہے یا نیند کی دیوی	تاروں بھرا آکاش ہے یا رات کی دیوی
(ص ۲۳۵)	(ص ۷۶)
وہ دن جو کبھی دوست کے پہلو میں گزارے	وہ لمحے جو فردوسِ محبت میں گُزارے
(ص ۲۳۶)	(ص ۷۷)
کیا یاد انہیں اب نہیں گنگا کے کنارے	کیا یاد انہیں اب نہیں جمنا کے کنارے
(ص ۲۳۶)	(ص ۷۷)

(۹)

نظم "خیر مقدم" (ص ۸۶ ــــ ۸۷) کا ابتدائی متن تذکرے میں موجود ہے (ص ۲۳۵ ــــ ۲۳۶) ۔ اس کی مدد سے نظم کے دو اشعار میں کاتب کے ایک سہو کی اصلاح ہوتی ہے ۔ شعری مجموعے "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں اس نظم کے پانچویں اور چھٹے شعر کے مصرعوں میں تقدیم و تاخیر ہو گئی ہے :

ابتدائی اور صحیح شکل	سہو کتابت کے ساتھ موجودہ صورت
سکونِ دل کی راحتوں کو آج اُن سے مانگ لوں	سکونِ دل کی راحتوں کو آج اُن سے مانگ لوں
سکونِ دل کی راحتوں کو بے کراں کیے ہوئے	حدیثِ آہِ نیم شب سُناؤں گی سُناؤں گی

حدیثِ آہِ نیم شب سُناؤں گی	سکونِ دل کی راحتوں کو بے کراں کیے ہوئے
زبانِ شبنم و گہر کو ترجماں کیے ہوئے	زبانِ شبنم و گہر کو ترجماں کیے ہوئے
(ص ۲۳۳)	(ص ۸۷)

اِبتداً اس نظم کا ایک مصرعہ تھا: وہ جائیں گے تو جائیں گے تباہیاں کیے ہوئے

اِس مصرعے میں لفظ "تباہیاں" کو "خرابیاں" سے بدل دیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ نظم میں اور کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔

(۱۰)

نظم "تعمیرِ نو" (ص ۹۱۔۹۲) ، تذکرے میں شامل ہے (ص ۲۴۴) مطلع کے مصرعوں میں تقدم اور تاخر اور ایک آدھ جگہ لفظی ترمیم کے علاوہ نظم کو ابتدائی صورت ہی میں برقرار رکھا گیا ہے ۔

(۱۱)

تذکرہ "شاعراتِ اُردو" میں شامل آزاد نظم "بیزاری" (ص ۲۴۸ — ۲۵۷) ، کسی تبدیلی کے بغیر "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں موجود ہے (ص ۹۷ — ۹۹) ۔

(۱۲)

"میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں ایک نظم کا عنوان ہے "یہ جیون یونہی بیتے گا" (ص ۱۱۷ — ۱۱۸) — یہ نظم جنرل سیکریٹری انجمن ترقّی پسند مُصنّفین ، پان دریبہ ، لکھنؤ ، پرشوتم سنگھ سیٹھی کی مرتب کردہ ، جدید نظموں کی ایک چھوٹی سی کتاب "نئی امنگیں" میں شامل ہے (۱۵) ۔ یہ کتابچہ پہلے پہل ۱۹۴۴ء میں ، مکتبہ رضیہ آگرہ دہلی کی فرمائش پر نیا کتاب گھر ، دہلی سے شائع ہوا ۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس نایاب کتابچے کو رسالہ نگارِ پاکستان ، کراچی کی اشاعت اکتوبر ۱۹۸۶ء میں شامل کیا ، یہی عکسی اشاعت میرے پیش نظر ہے ۔ تین مصرعوں میں ترمیم ہوئی ہے اور ایک مصرع ، شعری مجموعے "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں کتابت کا شکار ہوا تھا ، اِس کی صحیح شکل ہاتھ آتی ہے:

"نئی اُمنگیں" (۱۹۴۴ء)	"میں ساز ڈھونڈتی رہی"
میرے بکھرے ہوئے سپنوں کو چُرا لایا ہے	میرے بکھرے ہوئے خوابوں کو چُرا لایا ہے
(ص ۱۵)	(ص ۱۱۷)
ذہن پر جس طرح بیتے ہوئے لمحوں کے نقوش	ذہن پر جیسے ہوں بیتے ہوئے لمحوں کے نقوش
(ص ۱۵)	(ص ۱۱۸)
ہولے ہولے کبھی وہ وقت بھی آجاتا ہے	دھیرے دھیرے کبھی وہ وقت بھی آجاتا ہے
(ص ۱۶)	(ص ۱۱۸)

اور یہ آنسو ہے کہ پلکوں سے ڈھلکتا بھی نہیں!
(ص ۱۶)

اور یہ آنسو کہ پلکوں سے ڈھلکتا بھی نہیں
(ص ۱۱۸)

(۱۳)

فریب کاریٔ تخیل پر جو اِترائے
اَب ایسے سرکش و ناداں کو کون سمجھائے

چھ (۶) اشعار پر مشتمل یہ غزل "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں شامل ہے (ص ۱۲۸ — ۱۲۹) ۔

یہ غزل رسالہ نقوش ، لاہور ، غزل نمبر مئی جون ۱۹۵۴ء (ص ۴۴۵) اور پھر "نقوش" ہی کے غزل نمبر فروری ۱۹۶۰ء میں صفحہ ۴۶۲ پر موجود ہے ۔

اس غزل کا پانچواں شعر یہ ہے :

تری نگاہ کی حیرانیوں کے افسانے
مری نگاہ کی نادانیوں نے سمجھائے

نقوش ، غزل نمبر فروری ۱۹۶۰ء (ص ۴۶۲) میں اس شعر کے دوسرے مصرعے کی صورت یہ ہے :

مری نگاہ کی نادانیوں نے سُلجھائے

یعنی "سُلجھائے" ، بجائے : سمجھائے —— اِس غزل کا مقطع :

تمہیں تو حُسن کی ژولیدگی سے شکوہ تھا
ادا یہ کس نے نگاہوں کے راز سُلجھائے

"نقوش" (فروری ۱۹۶۰ء) سے محذوف ۔

(۱۴)

"میں ساز ڈھونڈتی رہی" کا گیت "نُقرئی دھند لکے" (ص ۱۵۰ — ۱۵۱) ، رسالہ نقوش ، لاہور ، غزل نمبر ، مئی جون ۱۹۵۴ء ، ص ۴۴۵ اور "نقوش" ہی کے غزل نمبر فروری ۱۹۶۰ء (ص ۴۶۲) میں شامل ہے —— شعری مجموعے میں ایک شعر سہو کتابت کی زد میں آیا ہے :

غم نے اُٹھائے سینکڑوں طوفاں
دل نے اُٹھائے لاکھ محلّے
(ص ۱۵۱)

دوسرے مصرعے میں "اٹھائے" کی جگہ "بسائے" چاہیے ، "نقوش" میں یہی صورت ضبط میں آئی ہے ۔

(۱۵)

"میں ساز ڈھونڈتی رہی" (صفحہ ۱۵۲ — ۱۵۴) میں ، ایک گیت کا عنوان ہے "دو نین کمل" (ص ۱۵۲) — یہ

کتابت کی غلطی ہے ۔ اِسے "دو نین کنول" ہونا چاہیئے ۔

"شہر درد" کا مطالعہ

"شہر درد" اَدا جعفری کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو ١٩٦٧ء میں پہلی بار شائع ہوا ۔ ادبی حلقوں میں اس کا پُرجوش خیر مقدم ہوا اور اس پر آدم جی ادبی انعام دیا گیا — کتاب کا تیسرا ایڈیشن (مقبول اکیڈمی ، لاہور ، اگست ١٩٨٨ء) — اس وقت میرے پیشِ نظر ہے :

(١)

توفیق سے کب کوئی سرکار چلے ہے
دُنیا میں فقط طالع بیدار چلے ہے

نو (٩) اشعار کی یہ غزل جو "شہر درد" میں شامل ہے (ص ١٩ — ٢٠) ، رسالہ نقوش ، لاہور ، شمارہ ١٠٨ ، ستمبر ١٩٦٧ء (ص ٥٧٦ ، نیز رسالہ فنون ، لاہور جدید غزل نمبر (جلد دوم) ، جنوری ١٩٦٩ء میں بھی موجود ہے (ص ٦٦٢) ۔

(٢)

شکوہ بھی کیجئے تو کہاں ہے روا ہمیں
سب کچھ ملا ہے ایک خوشی کے سوا ہمیں

گیارہ (١١) اشعار کی یہ غزل (شہر درد ، ص ٣٩ — ٤١) ، نقوش ، لاہور ، شمارہ ١٠٧ ، مئی ١٩٦٧ء میں شامل ہے (ص ١٥٥) ۔ "شہر درد" میں اس غزل کے دو مصرعوں میں تبدیلی ہوئی ہے :

نقوش : ہو گئی کوئی تو بات جو ہم اُن کے ہو رہے
شہر درد : کوئی تو ہو گی بات جو ہم اُن کے ہو رہے

نقوش : ہونٹوں کو مسکرانے کی عادت سی ہو گئی
شہر درد : ہونٹوں کو مسکرانے کی عادت سی پڑ گئی

(٣)

شوق آشفتہ سراں ، دیدۂ تر مانگے ہے
ہو وہ کافر جو شبِ غم کی سحر مانگے ہے

"شہر درد" کی یہ آٹھ (٨) شعری غزل (٥٦ — ٥٧) ، ایک شعر کے اضافے ، ترتیبِ اشعار کے فرق اور کسی قدر اختلافِ متن کے ساتھ رسالہ فنون ، لاہور ، فروری مارچ ١٩٦٦ء میں ملتی ہے (ص ٢٧٩) ۔

شہرِ درد : مصرع ١ ، : شوقِ آشفتہ سراں ، دیدۂ تر مانگے ہے
فنون : ١ : دلِ آشفتہ سراں ، دیدۂ تر مانگے ہے

شہرِ درد : ۳ : دل کو اندازِ تغافل کے بھی سانے تھے بہت

فنون : ۳ : دل کو بس ایک تڑپ، ایک لگن کافی ہے

شہرِ درد : ۴ : پھر بھی نادان ترا سایۂ در مانگے ہے

فنون : ۴ : تجھ کو مانگا کہ ترا سایۂ در مانگے ہے

شہرِ درد : ۶ : کوئی دیوانہ وہی شام و سحر مانگے ہے

فنون : ۶ : شوق دیوانہ وہی شام و سحر مانگے ہے

"فنون" میں شامل اس غزل کا چوتھا شعر، "شہرِ درد" میں موجود نہیں ہے۔

ترتیب اشعار کا فرق یہ ہے :

شہرِ درد : شعر ۴ : فنون میں شعر نمبر ۶

شہرِ درد : شعر ۶ : فنون میں شعر نمبر ۷

شہرِ درد : شعر ۷ : فنون میں شعر نمبر ۸

شہرِ درد : شعر ۸ : فنون میں شعر نمبر ۹

(۴)

راہزن ہے نہ کوئی سنگِ گراں

راستہ بھول گیا ہے انساں

"شہرِ درد" میں اس غزل کے گیارہ (۱۱) شعر ہیں (ص ۶۳—۶۵)۔ رسالہ نقوش، لاہور، شمارہ ۱۰۵، جلد ۲، اپریل جون ۱۹۶۶ء (ص ۳۸۶) میں یہ غزل دو شعروں کے اضافے کے ساتھ موجود ہے (نقوش میں اس غزل کا شعر نمبر ۳ اور ۴ "شہرِ درد" میں شامل نہیں)۔ غزل کے اشعار کی ترتیب یکساں ہے —— اِس غزل کا ایک مصرع ہے :

وضع داری کا ہمیں پاس رہا

"نقوش" میں اس مصرعے کی یہ شکل ضبط میں آئی ہے : ہم کو بھی پاسِ وضعداری ہے۔

(۵)

دل اپنا جلایا ہے کسی نے بھی خوشی سے

بن جاتی ہے جی پر تو گزر جاتے ہیں جی سے

"شہرِ درد" کی یہ غزل (ص ۶۶—۶۸) کسی تبدیلی یا کمی کے بغیر رسالہ نقوش، لاہور شمارہ ۱۰۳ ستمبر ۱۹۶۵ء (ص ۱۱) میں موجود ہے۔

(۶)

"شہر درد" کی یہ غزل (ص ۷۳ — ۷۴) رسالہ نقوش لاہور میں چھپی ہے (شمارہ ۱۰۵ ، جلد ۲ ، اپریل جون ۱۹۶۶ء ، ص ۳۸۳) —— "شہر درد" کا یہ شعر ، نقوش میں موجود نہیں :

رنگ و بو کی جگہ دھول ہے خاک ہے
پھول ، گلزار سے خار کھاتے رہے

ایک مصرعے میں لفظی ترمیم ہوئی ہے ۔ "نقوش" میں مصرعے کی شکل یہ تھی :

تم بجھاتے رہے ہم جلاتے رہے

"شہر درد" میں مصرعے کی صورت یہ ہو گئی ہے :

خود جلاتے رہے ، خود بجھاتے رہے

(۷)

داستانِ لب و رخسار سے آگے نہ بڑھو
حکم ہے کہ کوچۂ دلدار سے آگے نہ بڑھو

"شہر درد" (ص ۷۹ — ۸۱) کی یہ غزل ، نقوش (شمارہ ۱۰۵ ، جلد ۲ ، اپریل جون ۱۹۶۶ء ، ص ۳۸۴) پر دیکھی جا سکتی ہے ۔ نقوش کے مقابلے میں "شہر درد" کی اس غزل میں یہ شعر زائد ہے :

امتحانِ رسن و دار پہ آمادہ ہو
اشتیاقِ رسن و دار سے آگے نہ بڑھو

(۸)

"شہر درد" کی نظم "سانجھ بھئی پردیس" (ص ۸۲ - ۸۵) نقوش (متذکرہ) ، اپریل جون ۱۹۶۶ء میں چھپی ہے (ص ۳۸۷) ، ایک ترمیم کے ساتھ :

"شہر درد" (ص ۸۴) : اک پارۂ بلور
"نقوش" میں اس کی صورت : اک بلور کی گولی

(۹)

یہی آئینِ وفا ہے اب کے
دل دھڑکنا بھی خطا ہے اب کے

"شہر درد" (ص ۸۶ — ۸۷) کی یہ غزل آٹھ اشعار پر مشتمل ہے ۔ رسالہ فنون ، لاہور ، فروری مارچ ۱۹۶۶ء میں یہ غزل دو اشعار کے اضافے اور ترتیبِ اشعار کے کسی قدر فرق کے ساتھ موجود ہے ۔ "شہر درد" کے شعر ۱ ، ۲ ، ۳ ، ۴ ، ۵ ، ۶ ، ۷ ، اور ۸ "فنون" میں اس ترتیب سے چھپی ہیں : شعر ۱ ، ۴ ، ۶ ، ۷ ، ۵ ، ۸ ، ۹ اور ۱۰ (فنون میں شامل

شعر نمبر ۲ اور ۳ ، "شہر درد" سے محذوف) ۔

(۱۰)

ذوق تقصیر کہو ، حیلۂ تعزیر کہو
اور جو چاہو کہو ، عشق کو تقدیر کہو

"شہر درد" کی یہ غزل (ص ۹۰ — ۹۱) ، نقوش (شمارہ ۱۰۳) ، ستمبر ۱۹۶۵ء (ص ۱۲) میں ایک شعر کے اضافے کے ساتھ ملتی ہے ۔ (نقوش میں شامل غزل کا تیسرا شعر ، "شہر درد" سے محذوف) اس فرق کے علاوہ اشعار کی ترتیب اور قرأت میں کوئی فرق نہیں ۔

(۱۱)

نظم "چشمۂ حیوان" (شہر درد ، ص ۹۲ — ۹۶) ۔ نقوش شمارہ ۱۰۷ ، مئی ۱۹۶۷ء ص ۱۵۳ — ۱۵۴ میں چھپی ہے ۔ "نقوش" کے دو مصرعوں میں کتابت کی غلطیاں راہ پاگئی تھیں ، "شہر درد" میں انہیں درست کر دیا گیا ہے ۔

(۱۲)

کیا جانیے کس بات پہ مغرور رہی ہوں
کہنے کو تو جس راہ چلایا ہے چلی ہوں

"شہر درد" (ص ۱۰۰ — ۱۰۱) کی یہ غزل رسالہ فنون ، لاہور ، جولائی اگست ۱۹۶۶ء (ص ۳۶۷) میں چھپی اور پھر فنون ، کے جدید غزل نمبر جلد دوم ، جنوری ۱۹۶۹ء میں شامل ہوئی (ص ۶۵۹) —— غزل نمبر میں اس کا متن "شہر درد" کے عین مطابق ہے —— فنون (جولائی اگست ۱۹۶۶ء) کا پانچواں شعر "شہر درد" میں شامل نہیں ہوا —— نیز غزل کا ایک مصرعہ بدلا گیا ہے ، ایک میں ترمیم ہوئی ہے :

فنون (جولائی اگست ۱۹۶۶ء) : اِس راہ پہ ٹکرایا ہے کس کس نے جبیں کو

"شہر درد" میں ، اس کی جگہ مصرعے کی صورت یہ ہوگئی ہے :

دل کو تو یہ کہتے ہیں کہ بس قطرۂ خوں ہے

فنون (جولائی اگست ۱۹۶۶ء) : میں شعلہ صفت تھی ، سو بہر حال جلی ہوں

"شہر درد" میں ترمیم کے بعد : دل شعلہ طلب تھا ، سو بہر حال جلی ہوں

(۱۳)

دل زدوں کے بس میں کیا تھا بے بسی بڑھتی گئی
بے رخی بڑھتی رہی ، وابستگی بڑھتی گئی

"شہر درد" کی یہ غزل (ص ۱۰۷ — ۱۰۹) ، رسالہ نقوش ، لاہور ، شمارہ ۱۰۴ ، جنوری ۱۹۶۶ء میں دیکھی جا سکتی ہے (ص ۳۲۹) ، دوسرے شعر کے مصرع اولیٰ میں لفظی ترمیم ہوئی ہے :

نقوش (جنوری ۱۹۶۶ء) : دل کے چھالے ہیں ، نہیں ہیں پاؤں کے یہ آبلے

"شہر درد" : دل کے چھالے پھوٹ جائیں ، مندمل ہوتے نہیں

"نقوش" (متذکرہ) میں مقطع کی شکل یہ تھی :

چند ہی لمحے تھے لیکن کیا گراں گزرے ادا
اور وہ سمجھے لذتِ بے چارگی بڑھتی گئی

ترمیم کے بعد "شہر درد" میں مقطع کی صورت یہ ہو گئی ہے :

چند لمحوں کے لیے ہم دل کو بھولے تھے ادا
کیا کہیں پھر لذتِ بے چارگی بڑھتی گئی

(۱۴)

"تالیف غم" (مشمولہ شہر درد ، ص ۱۱۱) رسالہ نقوش ، شمارہ ۱۰۸ ، ستمبر ۱۹۶۷ء ، ص ۵۷۷ میں پہلی بار چھپی ۔

(۱۵)

وہی شعلہ ، وہی شعلے کی لپک ہے کہ نہیں
اب نگاہوں میں غم کی تپک ہے کہ نہیں

"شہر درد" (ص ۱۱۲ — ۱۱۳) کی اس غزل کی ابتدائی قرأت ، نقوش ، شمارہ ۱۰۳ ، ستمبر ۱۹۶۵ء میں ملتی ہے (ص ۱۴) — نقوش کی غزل کا ایک شعر "شہر درد" میں نہیں لیا گیا ۔ اشعار کی ترتیب بدل گئی ہے اور بعض مصرعوں میں ترمیم ہوئی ہے :

نقوش : احتیاط اب بھی روا ہے ؟ وہ جھجک ہے کہ نہیں

شہر درد : شہرِ دل ! تیرے مسافر کو جھجک ہے کہ نہیں

نقوش : وہی تقصیر کہ گردن زدنی ہیں جس پر

شہر درد : ہاں وہ تقصیر کہ گردن زدنی ہیں جس پر

نقوش : تیرے پھولوں میں وہ پہلی سی لہک ہے کہ نہیں

شہر درد : میرے دل کی ترے پھولوں میں جھلک ہے کہ نہیں

"نقوش" کے شعر ۳ اور ۴ کو "شہر درد" میں باہم مقدم اور مؤخر کر دیا گیا ہے اور شعر نمبر ۶ "شہر درد" سے محذوف ہے ۔

(۱۶)

انعام وفا ہے کہ جفاؤں کے صلے ہیں
ہر وقت یہ احساس ابھی تم سے ملے ہیں

"شہر درد" کی یہ غزل (ص ۱۱۶ — ۱۱۷) ، نقوش ، شمارہ ۱۰۳ ، ستمبر ۱۹۶۵ ، (ص ۱۵) میں من و عن موجود ہے ۔

(۱۷)

گھبرا کے ترا غم بھی ہمیں چھوڑ نہ جائے
اِس راہ میں بن جاتے ہیں اپنے بھی پرائے

"شہر درد" کی یہ غزل (ص ۱۱۸ — ۱۱۹) ، رسالہ فنون ، لاہور فروری مارچ ۱۹۶۶ء میں پہلے پہل چھپی ۔
"شہر درد" میں ایک مصرعہ سہو کتابت کا شکار ہوا ہے ، مصرعے کی صحیح شکل یہ ہے :

ہم بھی کبھی شائستہ آدابِ وفا تھے

(۱۸)

نظم "دل کو شیشہ کہنے والو" (شہر درد ، ص ۱۲۸ — ۱۳۰) اول اول ، نقوش ، شمارہ ۱۰۸ ، ستمبر ۱۹۶۷ء (ص ۵۷۸) میں شائع ہوئی ۔

(۱۹)

شاید ابھی ہے راکھ میں کوئی شرار بھی
کیوں ورنہ انتظار بھی ہے ، اضطرار بھی

"شہر درد" کی یہ غزل (ص ۱۴۵ — ۱۴۶) ، فنون ، کے جدید غزل نمبر جلد دوم ، جنوری ۱۹۶۹ء میں شامل ہوئی (ص ۶۵۹) —— "شہر درد" میں ایک مصرعہ کتابت کی زد میں آگیا ہے ، اِس کی صحیح صورت یہ ہے :

دھیان آ گیا تھا مرگِ دلِ نامراد کا

(۲۰)

نظم " رہ یک گام " (شہر درد ، ص ۱۷۶ — ۱۷۷) ، فنون ، فروری مارچ ۱۹۶۶ء میں پہلی بار چھپی (ص ۲۷۶) —— ایک مصرعہ بدلا گیا ہے :

فنون : نشان مٹ جائے گا دُنیا سے کفرِ کینہ پرور کا
شہر درد : پناہیں ڈھونڈتی ہوں گی ، اندھیروں کے لقیبوں کو

(۲۱)

نظم "خاکِ وطن کو سلام" (شہر درد ، ص ۱۷۸ — ۱۸۱) ، کا ابتدائی متن ، فنون ، لاہور ، فروری مارچ ۱۹۶۶ء میں چھپا (ص ۲۷۴) ۔ اِس نظم کے پانچ شعر "شہر درد" سے محذوف ہیں ۔ ایک شعر میں لفظی تبدیلی کی گئی ہے ۔ "فنون" میں ایک شعر تھا :

نفس نفس میں بسائے نگار کی خوشبو
نظر نظر میں رچائے نگار کی خوشبو

"شہرِ درد" میں پہلے مصرعے میں "نگار" کو "بہار" سے بدل دیا گیا ہے ۔

(۲۲)

نظم "امتحانِ وفا" (شہر درد ، ص ۱۸۲ — ۱۸۴) پہلے پہل رسالہ فنون میں چھپی (فروری مارچ ۱۹۶۶ء ، ص ۲۷۵) ——— ، "فنون" میں ایک شعر کی شکل یہ تھی :

کس کس کے نام نامۂ الفت ہے دوستو
کس کا نصیب تاجِ شہادت ہے دوستو

"شہرِ درد" میں مصرعوں کو باہم مقدم اور مؤخر کر دیا گیا ہے ۔

(۲۳)

نظم "سترہ دن" (شہر درد ، ص ۱۸۵ — ۱۹۰) کا ابتدائی متن نقوش ، شمارہ ۱۰۵ ، اپریل مئی جون ۱۹۶۶ء ص ۱۱۸۹ — ۱۱۹۰ میں دیکھا جا سکتا ہے ۔

(۲۴)

نظم "میرے شہید" (شہرِ درد ، ص ۱۹۱) پہلے پہل فنون (فروری مارچ ۱۹۶۶ ، ص ۲۷۶) میں شائع ہوئی ۔

(۲۵)

نظم "داستان ختم ہوئی" (شہر درد ، ص ۱۹۲ — ۱۹۴) کی پہلی اشاعت کے لئے دیکھیے : رسالہ نقوش ، شمارہ ۱۰۵ ، اپریل مئی ، جون، ۱۹۶۶ء ، ص ۱۹۱۱ ۔

(۲۶)

"شہرِ درد" کی نظم "معذرت" (ص ۲۰۰ — ۲۰۱) پہلی بار رسالہ نقوش (شمارہ ۱۰۷ ، مئی ۱۹۶۷ء میں چھپی (ص ۱۵۶) ۔

(۲۷)

ہونٹوں پہ کبھی اُن کے مرا نام ہی آئے
آئے تو سہی ، برسرِ الزام ہی آئے

"شہرِ درد" کی یہ غزل (ص ۱ — ۲۷) ، ریڈیو اور پاکستان ٹیلی ویژن سے اُستاد امانت علی خان مرحوم کی آواز میں برسوں سے پیش کی جا رہی ہے ۔

"غزالاں تم تو واقف ہو" کے مآخذ

ادا جعفری کا تیسرا شعری مجموعہ "غزالاں تم تو واقف ہو" ۱۹۷۴ء میں پہلی بار شائع ہوا. اس کے مشمولات کا مآخذاتی جائزے لیتے ہوئے ، کتاب کی تیسری اشاعت (مقبول اکیڈمی لاہور ، اگست ۱۹۸۸ء) میرے سامنے ہے :

(۱)

آگے حریمِ غم سے کوئی راستہ نہ تھا
اچھا ہوا کہ ساتھ کسی کو لیا نہ تھا

"غزالاں تم تو واقف ہو" (ص ۲۵ - ۲٦) کی یہ غزل ، "فنون" جنوری ١٩٦٩ء جدید غزل نمبر ، حصہ دوم میں شامل ہے ۔ (ص ٦۵٠) —— اِس شعری مجموعے میں غزل کے اشعار کی ترتیب بدل گئی ہے ۔ دو مصرعوں میں ترمیم و تنسیخ ہوئی ہے اور چار شعر حذف ہوئے ہیں ۔ مصرعوں میں ترمیم اور تبدیلی کی صورت یہ ہے:

فنون : ورنہ نگاہ و دل میں کوئی فاصلہ نہ تھا

غزالاں تم تو : دل کا جو رنگ تھا ، وہ نظر سے چھپا نہ تھا

فنون : اُن سے تو روحِ عصر ، ہمیں کچھ گلہ نہ تھا

غزالاں تم تو : اپنے سوا تو ہمیں کسی سے گلہ نہ تھا

(۲)

پھول صحراؤں میں کھلتے ہوں گے
آ کے بچھڑے ہوئے ملتے ہوں گے

"غزالاں تم تو واقف ہو" کی یہ غزل (ص ۳۴ — ۳۵) فنون ، (جنوری ١٩٦٩ء) جدید غزل نمبر حصہ دوم میں موجود ہے (ص ٦٦۲) —— شعری مجموعے میں شامل کرتے ہوئے ، اِس غزل کا مطلع ترمیم کی زد میں آیا ہے ، اشعار کی ترتیب بدلی ہے اور تین شعر حذف کر دیئے گئے ہیں ۔ مطلع کی ابتدائی شکل ("فنون" متذکرہ میں) یہ تھی:

چاکِ دل بھی کبھی سلتے ہوں گے
لوگ بچھڑے ہوئے ملتے ہوں گے

(۳)

وہ اعتمادِ خُوئے ستم بھی بہانہ ساز
یہ افتخارِ کرب و الم بھی بہانہ ساز

"غزالاں تم تو واقف ہو" (ص ۴١ — ۴۲) کی اس غزل کا ابتدائی متن ، فنون (جنوری ١٩٦٩ء) ، جدید غزل نمبر حصہ دوم (ص ٦٦٠) میں دیکھا جا سکتا ہے —— مجموعے میں یہ غزل ایک شعر کو حذف کرنے اور تین اشعار میں لفظی ترمیم اور ترقی کے بعد شامل کی گئی ہے ۔ ترمیم کی صورت یہ ہے:

مطلع جو اوپر درج ہے ، "فنون" میں اِس شکل میں چھپا تھا:

یگانگیٔ طرزِ ستم بھی بہانہ ساز
بے چارگیٔ کرب و الم بھی بہانہ ساز

اس غزل کا تیسرا شعر یہ ہے:

خود اپنے راستوں میں جلاتے رہے چراغ
عذرِ وفا و دیدۂ نم بھی بہانہ ساز

'فنون' میں اِس شعر کی پہلی شکل یہ تھی:

عذرِ وفا کے ساتھ جلاتے رہے چراغ
کھلتا ہے اب کہ دیدۂ نم بھی بہانہ ساز

اب اِس غزل کا ایک مصرعہ ہے:

وہ بھی حصار ذات میں تنہا تھا آج تک

'فنون' میں اِس مصرعے کی صورت یہ تھی:

ہر لمحہ حیات کا تنہا رہا وجود

(۴)

کہتے ہیں کہ اَب ہم سے خطا کار بہت ہیں
اک رسمِ وفا تھی سو وفادار بہت ہیں

"غزالاں تم تو واقف ہو" کی یہ غزل (ص ۴۳ — ۴۴)، "فنون" (جنوری ۱۹۶۹ء) جدید غزل نمبر حصہ دوم (ص ٦٦۰) میں چھپی ہے۔ "فنون" میں اِس غزل کے آٹھ شعر تھے، مجموعے میں صرف تین شعر لیے گئے ہیں، پانچ حذف کر دیئے گئے ہیں اور دو شعر نئے موزوں ہوئے ہیں۔ مجموعے میں شامل اِس غزل کا تیسرا اور پانچواں شعر نیا ہے۔

(۵)

نظم "سوادِ شب" "نقوش" شمارہ ۱۱۲، اگست ۱۹٦۹ء (ص ۱۸۵ — ۱۸٦) میں چھپی ہے۔ "غزالاں تم تو واقف ہو" میں شامل کرتے ہوئے اِس نظم (ص ۴۹ — ۵۲) پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ کچھ شعر بڑھائے اور کچھ کم کر دیئے ہیں۔ اشعار میں لفظی ترمیم بھی دکھائی دیتی ہے۔

(٦)

جی نے چاہا اُسے بھلانے کو
اِک گھروندا رہا ہے ڈھانے کو

"غزالاں تم تو واقف ہو" کی یہ غزل (ص ۵۳ — ۵۴)، فنون (جنوری ۱۹٦۹ء ص ٦٦۱) جدید غزل نمبر حصہ دوم میں شامل ہے۔ مجموعے میں اِس غزل کو لیتے ہوئے لفظی ترمیمات ہوئی ہیں اور "فنون" کے مقابلے میں، اس مجموعے میں سات شعر حذف بھی کیے گئے ہیں۔ ترمیمات کی صورت یہ ہے:

موجودہ قرأت: جی نے چاہا اُسے بھلانے کو "فنون": یاداتنی بھی سخت جاں تو نہیں

موجودہ مقطع :

سانس کی بات ہو کہ آس ادا
سب کھلونے تھے ٹوٹ جانے کو !

"فنون" میں مقطع کی صورت :

آس کی بات ہو کہ سانس ، ادا
یہ کھلونے تھے ٹوٹ جانے کو !

(۷)

نظم "تضادِ رنگ" (مشمولہ "غزالاں تم تو واقف ہو" ص ۶۶ — ۶۸) ، "نقوش" شمارہ ۱۱۲ ، اگست ۱۹۶۹ء (ص ۱۶۴) میں موجود ہے ۔

شعری مجموعے میں یہ نظم جزوی ترمیم اور اضافے کے بعد شامل ہوئی ہے ۔

(۸)

اوراق ، لاہور ، شمارہ خاص ۲ ، ۱۹۶۸ء (ص ۹۷) میں شامل ، ادا جعفری کی نظم "آج بھی" ادا کے شعری مجموعے "غزالاں تم تو واقف ہو" میں موجود ہے (ص ۲۷ — ۲۸) ۔

(۹)

نگاہ اوٹ رہوں ، کاسۂ خبر میں رہوں
میں بجھتے بجھتے بھی ، پیراہنِ شرر میں رہوں

"غزالاں تم تو واقف ہو" کی یہ غزل (ص ۱۶۹ — ۱۷۰) ، ایک شعری انتخاب میں لی گئی ، دیکھیے :

سہ سیدین ، پنڈی ، پاکستانی ادب ، تیسری جلد ، اکتوبر ۱۹۸۱ء ص ۲۰۹ ۔

کچھ "سازِ سخن بہانہ ہے" کے بارے میں

"سازِ سخن بہانہ ہے" ادا جعفری کے چوتھے اور اب تک کے آخری شعری مجموعے کا خوبصورت نام ہے ۔ یہ مجموعہ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا ، اس کی تیسری اشاعت (مقبول اکیڈمی ، لاہور اگست ۱۹۸۸ء) میرے سامنے ہے :

(۱)

"۔۔۔ اِس مجموعے میں ایک بہت پُرانی نظم بھی شریک ہے ۔ یہ میری پہلی کتاب میں شامل اشاعت نہیں ہے ۔ یہ نظم غالباً ۴۸ء یا ۴۹ء میں کہی تھی کسی رسالے میں (جس کا نام اب مجھے یاد نہیں) شائع ہوئی تھی ——— اور پھر میں اس کو بھول گئی ——— پچھلے دنوں لوگوں نے ایک سے زیادہ بار اِس کا ذکر کیا تو یہی مناسب معلوم ہوا کہ تلاش کر کے ، اس کو اِس کتاب میں شریکِ اشاعت کر لیا جائے ———"

(ادا جعفری ، چند باتیں ، "سازِ سخن بہانہ ہے" ، ص ۱۳)

"سازِ سخن بہانہ ہے" میں یہ نظم "اجنبی دیس میں" کے زیرِ عنوان ص ۱۳۲ تا ۱۳۶ دیکھی جا سکتی ہے ۔ نظم کے آخر میں (بر صفحہ ۱۳۶) یہ مختصر نوٹ درج ہے : "ایک بہت پُرانی نظم"

یہ نظم جس کا اوّلین حوالۂ اشاعت ، شاعر کے حافظے سے محو ہو گیا ہے ، رسالہ ، نقوش میں شائع ہوئی تھی ۔ دیکھیے : نقوش ، لاہور ، شمارہ ۴ ، جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء ، ص ۱۰۱ ــ ۱۰۲ ـــــ (جسٹس ریٹائرڈ) جاوید اقبال کے ایک مضمون "نصبُ العین کا مسئلہ" کی دو اقساط میں ادا جعفری کی اِس نظم کا حوالہ آیا ہے ، دیکھیے : روزنامہ امروز ، لاہور ، ادبی ایڈیشن ۲۸ دسمبر ۱۹۴۸ء اور ۱۷ ـ جنوری ۱۹۴۹ء ـــــ ادا جعفری نے اپنی اس نظم کا کسی قدر تفصیل اور کرب کے ساتھ اپنی خود نوشت میں کیا ہے ۔ دیکھیے : افکار ، کراچی ، مارچ ۱۹۹۰ء ص ۲۱ ــ ۲۲

(۲)

ہر گام سنبھل سنبھل رہی تھی
یادوں کے بھنور میں چل رہی تھی

"سازِ سخن بہانہ ہے" کی اِس غزل (ص ۲۷ ــ ۲۸) کے پانچ شعر تخلیقی ادب (۱) ، عصری مطبوعات ، کراچی ۱۹۸۰ء ، ص ۱۲۹ میں شامل ہیں ، "تخلیقی ادب" کا ایک شعر ترک کر دیا گیا ہے اور دو شعروں کا یہاں اضافہ ہوا ہے ۔

(۳)

"سازِ سخن بہانہ ہے" کی نظم "سنو" (ص ۲۹ ــ ۳۰) کی پہلی اشاعت کے لیے دیکھیے : تخلیقی اَدب (۱) ، عصری مطبوعات ، کراچی ۱۹۸۰ء ، ص ۱۲۳ ۔

(۴)

اندھیری راہ میں مُسافر کہیں نہ بھٹکا تھا
کسی منڈیر پر جب تک چراغ جلتا تھا

"سازِ سخن بہانہ ہے" کی یہ غزل (ص ۳۴ ــ ۳۵) ، "نقوش" ، لاہور کے عصری ادب نمبر (شمارہ ۱۲۹) ، ستمبر ۱۹۸۲ء میں پہلی بار چھپی ۔ (ص ۳۹۲) ، "نقوش" میں شامل غزل کا پانچواں شعر ، اس مجموعے میں نہیں لیا گیا ۔

(۵)

"سازِ سخن بہانہ ہے" کی نظم "اُس کو نزدیک آنے نہ دو" (ص ۴۶ ــ ۴۹) پہلے پہل تخلیقی اَدب (۱) ، کراچی ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی (۱۲۶ ــ ۱۲۷) ـــــ زیرِ نظر مجموعے میں اِس نظم کو کاتب اور کاپی جوڑنے والے نے بڑی بدمذاقی سے چار صفحات پر پھیلا دیا ہے ــ

(۶)

حال کھلتا نہیں جبینوں سے
رنج اٹھائے ہیں کن قرینوں سے

"سازِ سخن بہانہ ہے" کی یہ غزل (ص ۵۵ ــ ۵۶) "نقوش" شمارہ ۱۲۰ ، جنوری ۱۹۷۶ء (ص ۲۷۷) میں پہلی بار

چھپی اور کسی کمی بیشی کے بغیر مجموعے میں لے لی گئی ہے ۔

(۷)

عالم ہی اور تھا جو شناسائیوں میں تھا
جو دیپ تھا نگاہ کی پرچھائیوں میں تھا

"سازِ سخن بہانہ ہے" کی یہ غزل (ص۵۷ — ۵۸)، پہلے پہل نقوش ، شمارہ ۱۲۹ ، ستمبر ۱۹۸۲ء (ص ۳۹۱) میں چھپی —— مطلع کے مصرعہ ثانی کی "نقوش" میں یہ قرأت ملتی ہے :

جو دیپ تھا وہ اپنی ہی پرچھائیوں میں تھا

اس ترمیم کے علاوہ ، غزل میں اور کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔

(۸)

"سازِ سخن بہانہ ہے" کی نظم اس تضاد روز و شب میں (ص ۶۷ — ۷۰) نامعلوم وجوہات کی بنا پر چار صفحات پر پھیلا دیا گیا ہے، یہ نظم تخلیقی ادب (۱) کراچی ۱۹۸۰ء (ص ۱۲۴ — ۱۲۵) میں پہلی بار چھپی ۔

(۹)

نظم "دستک" "نقوش" شمارہ ۱۲۹ ، ستمبر ۱۹۸۲ء میں اوّل اوّل چھپی ۔ (ص ۳۹۰) اور "سازِ سخن بہانہ ہے" میں بغیر کسی ترمیم کے شامل ہوئی (ص ۸۵ — ۸۶)

(۱۰)

گھر کا رستہ بھی ملا تھا شاید
راہ میں سنگ وفا تھا شاید

"سازِ سخن بہانہ ہے" کی اس غزل (ص ۸۷ — ۸۸) کا ابتدائی متن ، "نقوش" شمارہ ۱۲۰ ، جنوری ۱۹۷۶ء (ص ۳۷۷) میں ملتا ہے ۔ "نقوش" میں شامل غزل کے چار شعر ، ترک کر دیئے گئے ہیں ، دو نئے شعر بڑھائے گئے ہیں اور شعروں کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر ہوئی ہے ۔

(۱۱)

اب خلقت مجھ سے پوچھے ہے تمہیں کیسے ساری بات ملی
کس اسم کا تم نے ورد کیا ، جب تم کو بیٹھلی رات ملی

"سازِ سخن بہانہ ہے" کی یہ غزل (ص ۱۱۹ — ۱۲۰)، تخلیقی ادب (۱)، کراچی ۱۹۸۰ء میں ملتی ہے (ص ۱۳۰) ۔ مقطع میں ترمیم ہوئی ہے :

کہیں پھول بھی ہیں کشکول ادا کہیں کانٹا جی کو لگ جائے
وہ دینے والا جانے ہے یا کس کو کیا اوقات ملی

"تخلیقی ادب" (متذکرہ) میں مصرعہ اولیٰ کی یہ صورت ضبط میں آئی ہے :

حیران رہیں بے کار ادا کشکول جو اُن کے ہاتھ میں تھے

(۱۲)

ہر اک دریچہ کرن کرن ہے جہاں گزرے جدھر گئے ہیں

ہم اک دیا آرزو کا لے کر بطرزِ شمس و قمر گئے ہیں

"سازِ سخن بہانہ ہے" کی یہ غزل (۱۳۹ — ۱۴۰) رسالہ ماہِ نو ، مئی ۱۹۷۷ء میں چھپی اور پھر ماہِ نو (لاہور) کے چالیس سالہ مخزن ، شمارہ اگست ۱۹۸۷ء (ص ۴۷۵) میں انتخاب ہوئی ـــ مجموعے میں شامل کرتے ہوئے تین چار شعر لفظی ترمیم اور ترقی کی منزل سے گزرے ہیں ۔

"سازِ سخن" (انتخاب)

"سازِ سخن" ادا جعفری کے چاروں شعری مجموعوں کے انتخاب پر مشتمل ہے ، جسے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے مئی ۱۹۸۸ء میں شائع کیا (ضخامت ۱۵۲ صفحات) — کتاب کا "تعارف" حمایت علی شاعر نے لکھا ہے :

> "۔۔۔ مکتبہ جامعہ کے جنرل مینجر شاہد علی خان کی یہ کاوش قابلِ داد ہے کہ اُنہوں نے اِس انتخاب کو شائع کر کے ہندوستان کے اَدبی حلقوں کو ادا جعفری کے کلام کے مُطالعے کا موقع فراہم کیا ـــ" (ص ۱۰)

یہ کتاب ابھی پاکستان میں نہیں چھپی ـــ "سازِ سخن" کے آخر میں ادا جعفری کی چار ایسی غزلیں بھی شامل ہیں ، جو اُن کے شعری مجموعوں میں موجود نہیں (۱۴۳ — ۱۴۶) ـــ ادا جعفری کے کچھ "ھائیکو" بھی (ص ۱۴۷ — ۱۵۲) شاملِ انتخاب ہیں ۔

"غزل نما"

طبع اول : انجمن ترقی اردو پاکستان ، کراچی ، ۱۹۸۷ء

۱۸ × ۸/۲۲ سائز ، ص ۴۷۷

پہلا ہندوستانی ایڈیشن : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، نئی دہلی ، مئی ۱۹۸۸ء

۲۰ × ۱۶/۳۰ سائز ، ص ۴۷۷

محمد قُلی قطب شاہ (۱۵۶۵ء — ۱۶۱۱ء) سے میاں داد خان سیاح (۱۸۲۹ء — ۱۹۰۷ء) تک سینتیس (۳۷) غزل گو کلاسیکی شعرا کے مختصر حالات اور انتخابِ کلام پر مبنی یہ کتاب ، ابتداً انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی کے علمی اور اَدبی رسالے ماھنامہ "قومی زبان" میں دسمبر ۱۹۸۳ء سے فروری ۱۹۸۶ء تک قسط وار چھپی ـــ "غزل نما" کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی تحریک قُدرت اللہ شہاب نے کی ۔

کتابی صورت میں "غزل نما" کو پیش کرتے ہوئے ادا جعفری نے شعراء کے حالات اور انتخابِ اشعار پر نظرِ ثانی کی ہے اور زمانی ترتیب کو بھی ملحوظ رکھا ہے ، یعنی شُعراء کی تقدیم و تاخیر ، اُن کی تاریخِ وفات کے حساب سے قائم کی گئی ہے ۔

کتاب کے "پیش لفظ" میں ادا جعفری لکھتی ہیں کہ :

"غزل نما" میرے لیے کئی لحاظ سے پُرکشش رہا ۔۔۔

اِن اشعار کے جھروکوں سے مَیں نے تسلسل کے ساتھ کئی صدیوں کا نظارہ کیا ۔ زبان کے ارتقائی مدارج اور اس معاشرے کے خدوخال سامنے آئے ۔۔۔ اہلِ سخن کے اِس کارواں میں کچھ ایسے آبلہ پا بھی شریک سفر تھے جنہیں بہت جلد فراموش کر دیا گیا (وجوہ کئی تھیں) ۔۔۔ اِن خاموش (اور فراموش) آوازوں کی اہمیت سے (بہر حال) انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ ابتدائی دور کے کم معروف اور غیر معروف شعراء کے کلام میں اُردو لفظ کو آنکھ کھولتے ہوئے اور اُردو زبان کو پہلی بار سانس لیتے ہوئے دیکھنے کا بھی احساس ہوا ۔۔۔ سب سے اہم بات یہ کہ "غزل نما" اپنی سوچ کو حرف کا پیکر عطا کرنے والوں کے سفر کی روداد ہے ۔ ان اشعار کا تقابلی مُطالعہ ، شاعری کے اعلیٰ فن پاروں سے جائزہ نہیں ـــــ سفر کے مرحلے پر کس کی سانس ٹوٹ گئی اور کس نے منزل کو جا لیا ، اِس کا فیصلہ انفرادی صلاحیت پر بھی تھا اور حالات اور وقت کے ہاتھ میں بھی ـــــ"

(غزل نما ، ص ۱۰ ـــ ۱۳)

"غزل نما" کے بارے میں جمیل الدین عالی کا احساس یہ ہے کہ :

یہ کئی لحاظ سے ایک نادر اشاعت ہے ، جسے انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان نہایت فخر و انبساط کے ساتھ پیش کر رہی ہے ۔۔۔ زیر نظر انتخاب کی سب سے بڑی خصوصیت جو محترمہ ادا جعفری نے بیان نہیں کی وہ یہ ہے کہ یہ انتخاب خود ایک شاعر نے کیا ہے ۔ غیر شاعر نقادوں اور اہل انتخاب میں بعض بڑے معتبر نام شامل رہے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ شعر کی اصل پرکھ وہ اہلِ اَدب ہی کر سکتے ہیں ، جو خود بھی شاعر ہوں ـــــ محترمہ ادا جعفری ہندوستان پاکستان میں ایک شاعر کے طور پر کبھی سے ایک بڑی حیثیت رکھتی ہیں ـــــ کلاسیکی مشاہیر و غیر مشاہیر سے ادا جعفری کا انتخاب ایک نادر خصوصیت کا حامل ہے ـــــ"

(حرفے چند ، غزل نُما ، ص ۶ ـــ ۸)

"غزل نما" کتابی صورت میں ۱۹۸۷ء میں سامنے (۱) آئی ـــــ ادا جعفری نے اس کے بعد بھی رسالہ "قومی زبان" (کراچی) میں غزل نُما کا سلسلہ جاری رکھا ـــــ اِس سلسلے کی نئی اقساط کی کچھ تفصیل یہ ہے :

۱ ـ نواب فقیر محمد خان گویا ، قومی زبان ، کراچی ، مارچ ۱۹۸۷ء ، ص ۳۵ ـــ ۳۹

۲ ـ نظیر اکبر آبادی ، ایضاً ، اپریل ۱۹۸۷ء ، ص ۴۱ ـــ ۴۵

۳ ـ رضا عظیم آبادی ، ایضاً ، مئی ۱۹۸۷ء ، ص ۴۱ — ۴۵
۴ ـ قلندر بخش جرأت ، ایضاً ، جون ۱۹۸۷ء ، ص ۳۷ — ۴۱
۵ ـ مرزا محمد علی فدوی ، ایضاً ، جولائی ۱۹۸۷ء ، ص ۳۹ — ۴۱
۶ ـ حکیم قلق میرٹھی ، ایضاً ، ستمبر ۱۹۸۷ء ، ص ۵۵ — ۵۹
۷ ـ قدر بلگرامی ، ایضاً ، نومبر ۱۹۸۷ء ، ص ۳۹ — ۴۳
۸ ـ مہدی بخش تسلیم ، ایضاً ، دسمبر ۱۹۸۷ء ، ص ۲۷ — ۳۰
۹ ـ میر وزیر علی صبا ، ایضاً ، فروری ۱۹۸۸ء ، ص ۳۵ — ۳۸
۱۰ ـ حفیظ جونپوری ، ایضاً ، مارچ ۱۹۸۸ء ، ص ۲۰ — ۳۱
۱۱ ـ شاہ تراب ، ایضاً ، اپریل ۱۹۸۸ء ، ص ۵۷ — ۶۲
۱۲ ـ مرزا اشرف علی خان فغاں ، ایضاً ، جون ۱۹۸۸ء ، ص ۳۵ — ۳۹
۱۳ ـ شیر محمد خان ایمان ، ایضاً ، اگست ۱۹۸۸ء ص ۶۱ — ۶۵
۱۴ ـ بہرام (۱۸۲۸ء — ۱۸۹۵ء) ، ایضاً ، اکتوبر ۱۹۸۸ء ، ص ۹۷ — ۱۰۱
۱۵ ـ میر باقر علی مخلص مرشد آبادی ، ایضاً ، دسمبر ۱۹۸۸ء ، ص ۳۳ — ۳۶
۱۶ ـ نواب محمد یوسف علی خان ناظم ، ایضاً ، جنوری ۱۹۸۹ء ، ص ۳۹ — ۴۳
۱۷ ـ ظہیر الدین ظہیر دہلوی ، ایضاً ، اپریل ۱۹۸۹ء ، ص ۲۷ — ۳۲
۱۸ ـ سید انور دہلوی ، ایضاً ، جون ۱۹۸۹ء ، ص ۳۵ — ۳۸
۱۹ ـ مرزا محمد قادر بخش صابر دہلوی ، ایضاً ، اگست ۱۹۸۹ء ، ص ۵۱ — ۵۴
۲۰ ـ شیخ مہدی علی ذکی ، ایضاً ، نومبر ۱۹۸۹ء ، ص ۳۵ — ۳۸
۲۱ ـ اسماعیل میرٹھی ، ایضاً ، جنوری ۱۹۹۰ء ، ص ۲۱ — ۳۶
۲۲ ـ راسخ دہلوی ، ایضاً ، اپریل ۱۹۹۰ء ، ص ۵۳ — ۵۶
۲۳ ـ مائل دہلوی ، ایضاً ، اگست ۱۹۹۰ء ، ص ۲۳ — ۲۸
۲۴ ـ مہاراجہ چندو لعل شاداں ، قومی زبان ، کراچی ، دسمبر ۱۹۹۰ء ، ص ۳۷ — ۴۱
۲۵ ـ مہ لقابائی چندا ، قومی زبان ، کراچی ، جنوری ۱۹۹۱ء ، ص ۵۱ — ۵۵

" —— میرے لئے طمانیت کا باعث ہے کہ "غزل نما" کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی ۔ پاکستان اور ہندوستان کے اہلِ علم اور عاری قاری نے بھی اِس سلسلے کو پسند فرمایا — میں ان سب کی ممنون ہوں ۔ اِنشاء اللہ آئندہ بھی یہ سلسلہ "قومی زبان" میں جاری رکھنے کی کوشش

کروں گی مجھے تو ان اشعار کا انتخاب کرتے ہوئے کچھ ایسا احساس بھی رہا کہ یہ میرا ، اور آج بیسویں صدی کے اواخر تک ، سانس لینے والے ہر شاعر کا شجرۂ نسب ہے ——"

(ادا جعفری ، پیش لفظ ، غزل نُما ، ص ۱۴ — ۱۵)

قطرے پہ گہر ہونے تک

(ادا جعفری کے بعض اشعار کی شانِ نزول)

"غالب نے کہا تھا :

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک !

نوائے سروش سے صریرِ خامہ تک کتنی کٹھن منزلیں اور مرحلے ہیں ۔ شاعر کو متأثر کرنے کے لئے ایک معمولی سا واقعہ ، ایک غلط انداز نگاہ اور ایک چھوٹا سا لفظ بھی کافی ہوتا ہے ، لیکن اثر پذیری کا اظہار اتنا آسان نہیں —— خیال ذہن میں رچ بس اور الفاظ کا جامہ پہن کر صریر خامہ تک کیوں کر پہنچتا ہے ، یہ بجائے خود ایک دل چسپ داستان ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گی کہ کسی فن پارے کو سمجھنے اور اس سے پوری طرح لُطف اندوز ہونے کے لئے ، اُس پس منظر کو دیکھنا اور سمجھنا بھی ضروری ہے جس میں وہ تخلیق ہوتا ہے —— ہر شعر ایک خاص ماحول ، وقت اور رجحان کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اگر سُننے والا بھی اُس لمحے سے متعارف ہو جائے جس نے شاعر کی روح کو چھیڑا تھا اور جِس کی کہانی شعر کے اندر مستور ہوتی ہے تو شعر کی اثر انگیزی اور اثر آفرینی دوبالا ہو جاتی ہے ۔

(ادا جعفری ، نقوش ، لاہور ، شمارہ ۱۰۳ ، ستمبر ۱۹۶۵ء ، ص ۵)

(۱)

نظم : "زندگی تیرے لیے خواب سہی ، گیت سہی"

مشمولہ : "میں ساز ڈھونڈتی رہی" (صفحہ ۲۵ ۔ ۲۶) کی شانِ نزول کے لئے دیکھیے :

(رسالہ : نقوش ، لاہور ۔ شمارہ ۱۰۳ ۔ ستمبر ۱۹۶۵ء ص ۹ ۔ ۱۰)

(۲)

ادا جعفری کے پہلے شعری مجموعے "میں ساز ڈھونڈتی رہی" (۱۹۵۰ء) میں ایک نظم ہے "بیزاری" (ص ۹۷ — ۹۹) یہ کس عقب میں لکھی گئی ؟ اس کی تفصیل جاننے کے لیے دیکھیے :

(افکار ، کراچی ، اکتوبر ۱۹۸۹ء ، ص ۲۰ — ۲۲)

(۳)

"میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں شامل نظم "اُفق کے پار" (۱۲۱ — ۱۲۳) کے پس منظر کے لیے دیکھیے :

(افکار ، کراچی ، نومبر ۱۹۸۹ء ، ص ۳۳ — ۳۴)

(۴)

شعری مجموعے "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں اسی عنوان کی ایک نظم ہے (ص ۱۴۰ — ۱۴۳) ۔ یہ نظم کس دور میں ، کن حالات میں اور کن محسوسات کے ساتھ لکھی گئی ، دیکھیے :

(افکار ، کراچی ، جنوری ۱۹۹۰ء ، ص ۱۵ — ۱۶)

(۵)

نظم : "دو نین کنول"

مشمولہ : "میں ساز ڈھونڈتی رہی" (ص ۱۵۲ ... ۱۵۴) ۔

اس خوبصورت گیت کے خوب صورت تر پس منظر کے لیے رجوع کیجئے :

(رسالہ افکار ، کراچی ، خود نوشت ادا جعفری ، قسط ۱۱ مارچ ۱۹۹۰ء ، ص ۱۷ — ۱۱)

(۶)

نظم : "شگوفے"

مشمولہ : "میں ساز ڈھونڈتی رہی" (ص ۱۵۵ — ۱۵۶)

ادا جعفری اسے اپنی پہلی نظم بتاتی ہیں ۔ اس نظم کی تصنیف کا حال احوال جاننے کے لیے دیکھیے :

۱ ۔ رسالہ : نقوش ، لاہور ، شمارہ ۱۰۳ ، ستمبر ۱۹۶۵ ، ص ۵ — ۸

۲ ۔ رسالہ : افکار ، کراچی ، جون ۱۹۸۹ء

(۷)

ادا جعفری کے چوتھے شعری مجموعے "ساز سخن بہانہ ہے" (۱۹۸۲ء) کی ایک نظم "رہائی" (ص ۶۱ — ۶۳) کے چند مصرعے ہیں :

میں اکثر ہواؤں کے بے تاب جھونکوں میں تھی
کہ تسکین جاں کے لیے
قرب محبوب کے لمس سے آشنا ہو سکوں
اور کبھی وحشت دل کی خاطر
چٹانوں اور کہساروں سے باتیں کروں

اس نظم کے حوالے سے ایک جگہ خود ادا نے اپنے شاعرانہ رویوں کا تجزیہ کیا ہے ، دیکھیے : افکار ، کراچی ، مئی ۱۹۸۹ء ، ص ۲۳ — ۲۴

(۱)

"ساز سخن بہانہ ہے" میں ایک نظم ہے "شجر نازاں" (ص ۵۰ — ۵۴)

یہ نظم ادا نے اپنے بیٹے عامر کے نام لکھی ہے ۔ اس نظم کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے دیکھیے: (افکار ، کراچی ، نومبر ۱۹۸۹ء ، ص ۳۵ — ۳۶)

(۹)

"ساز سخن بہانہ ہے" میں شامل ، ایک نظم کا عنوان ہے "اجنبی دیس میں" (ص ۱۳۳ — ۱۳۶) یہ نظم پہلی بار رسالہ "نقوش" لاہور ، جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء میں چھپی ۔ یہ نظم کن حالات اور کن ایام میں تخلیق ہوئی اور اس نظم کی اشاعت کو کس نقطۂ نظر سے دیکھا گیا اور اس رویے سے شاعر کے حساس اور حزین قلب پر کیا بیت گئی اسے جاننے کے لئے ادا جعفری کی خود نوشت کا وہ حصہ دیکھیے جو رسالہ افکار ، کراچی ، شمارہ مارچ ۱۹۹۰ء ، ص ۲۱—۲۲ میں چھپا ہے ۔

(۱۰) اور (۱۱)

"ساز سخن بہانہ ہے" کے چند حمدیہ اشعار (ص ۱۵ اور ص ۱۰) کا حوالہ ادا جعفری کی خود نوشت میں ایک موقع پر آیا ہے ، دیکھیے :

(افکار ، کراچی ، اگست ۱۹۹۰ء ، ص ۲۴)

اسی طرح "ساز سخن بہانہ ہے" میں شامل نظم "اِس تضاد شب و روز" (۶۷ — ۷۰) کے چند مصرعے خود نوشت میں ایک خاص سیاق و سباق میں آئے ہیں ، دیکھیے : (افکار، کراچی، ستمبر ۱۹۹۰ء، ص ۱۷)

(۱۲)

ادا جعفری کے دوسرے شعری مجموعے "شہر درد" (۱۹۶۷ء) کی نظم "پہلی کرن" (۱۵۳—۱۵۴) کے پس منظر کے لیے دیکھیے :

(افکار ، کراچی ، اپریل ۱۹۹۰ء ، ص ۲۰—۲۱

(۱۳)

"شہر درد" کی نظم "میرے شہید" (ص ۱۹۱) کے موضوع اور زمانہ تخلیق کو جاننے کے لیے رجوع کیجیے :

(افکار ، کراچی ، اپریل ۱۹۹۰ء ، ص ۲۰)

(۱۴)

ادا جعفری کے تیسرے شعری مجموعے "غزالاں تم تو واقف ہو" (۱۹۷۰ء) میں شامل نظم "صنم کدوں کی سرزمین" (ص ۶۱—۶۲) رنگ اور روشنی کے شہر بنکاک کے نام ہے ۔ تفصیل کے لئے دیکھیے :

(افکار ، کراچی ، نومبر ۱۹۹۰ء ، ص ۱۹ — ۲۰)

(۱۵)

"غزالاں تم تو واقف ہو" میں ایک نظم ہے "تعارف" (ص ۶۳—۶۵)

——— یہ نظم بہاراں بہاراں نگر "ٹوکیو" کے سفر اور ٹوکیو میں ادا جعفری کے ایک ہفتے کے قیام کی یادگار ہے ۔ اس سفر کی تفصیل انہوں نے اپنی خود نوشت میں بیان کی ہے :

(افکار ، کراچی ، نومبر ۱۹۹۰ء ، ص ۲۰—۲۴)

(۱۶) اور (۱۷)

"غزالاں تم تو واقف ہو" کی نظم "کوئی آئینہ" (ص ۴۵—۴۸) کے چند مصرعے، ادا جعفری کی خود نوشت میں درج ہوئے ہیں، دیکھیے :

(افکار، کراچی، اگست ۱۹۹۰ء، ص ۱۸)

اِس مجموعے کی ایک غزل (ص ۱۱۵) کا ایک شعر بھی خود نوشت میں اقتباس ہوا ہے، دیکھیے :

(افکار، کراچی، مارچ ۱۹۹۰ء، ص ۲۳)

اداجعفری کا کچھ نظری اور نظرانداز کلام

(۱۹۴۴ء تا ۱۹۸۰ء)

اداجعفری کے چار شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں ــ پہلا ۱۹۵۰ء میں اور اب تک کا آخری شعری مجموعہ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا ۱۹۵۰ء یا اس سے پہلے اور ۱۹۸۲ء تک کی حدِّ زمانی میں کہا گیا ان کا کچھ ایسا کلام بھی ادبی رسائل یا انتخابات میں ملتا ہے جو ان کے مرتب کردہ کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں ـــــ یہ اشعار شعری مجموعے ترتیب دیتے ہوئے ان کی نظر سے رہ گئے اور کچھ اشعار عمداً ترک ہوئے اور نظری قرار پائے ـــــ سبب کچھ بھی رہا ہو، شاعر کو سمجھنے کے لیئے اِس کلام کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ــ اگلے صفحات میں اِس نوع کا کچھ کلام پیش کیا جا رہا ہے ـــــ جو ۱۹۴۴ء سے ۱۹۸۰ء تک کے درمیان چھپا ـ لیکن اِس زمانے کے مرتب کردہ ان کے کسی شعری مجموعے میں جگہ نہیں پا سکا :

○

نظموں کے نظری اشعار :

"میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں شامل نظم "احساسِ اوّلین" (ص ۲۹ ـ ۳۰) میں یہ دو شعر موجود نہیں ہیں ـ

رنج ، سیرِ چمن سے ہوتا ہے
خفقان ، انجمن سے ہوتا ہے
گھٹ کے روتے ہیں، صدمے سہتے ہیں
کیا محبت اِسی کو کہتے ہیں[1]

[1] تذکرہ شاعراتِ اُردو ، محمد جمیل احمد ، بریلی ۱۹۴۴ء ، ص ۲۳۹

نظم "جوہی کی کلیاں" مشمولہ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" (ص ۴۳ ـ ۴۵) سے یہ شعر خارج کردیئے گئے ہیں ـ

سپہرِ نیلگوں اور دورِ اختر
کہ اوڑھی ہے حسیں ، فطرت نے چادر
فلک سے مہ کی بے تابانہ کرنیں
دفورِ شوق سے مستانہ کرنیں
(برائے سیرِ گل آئی ہوئی ہیں!
زمیں تا آسماں چھائی ہوئی ہیں)
برائے نذرِ شاعر ، خونِ دل سے
یہ گلدستہ بنایا ہے زمیں نے[1] !

نظم "یادِ ماضی" مشمولہ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" (ص ۷۶ ـ ۷۸) میں اِس نظم کے یہ اشعار حذف ہوئے ہیں ـ

اظہارِ محبت میں بھی اک طرزِ تغافل
پھر طرزِ تغافل میں توجہ کے اشارے
دیدار میسّر ہو جو نظروں کو دوبارہ
روشن کروں سینے میں تمنا کے اشارے
میرے مہِ تاباں سے ادا کون یہ پوچھے
تنہا کوئی کب تک شبِ مہتاب گزارے[2] !

"میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں اداجعفری کی نظم "جھیل" شامل ہے ـ (ص ۵۱ ـ ۵۳) لیکن اس نظم کے درج ذیل اشعار ، اب نظم کا حصہ نہیں ہیں ـ

آغوش میں زمیں کے یہ جھیل سو رہی ہے
یا چاندنی سمٹ کر آغوش ہو گئی ہے
صحرا کی نازنیں کا یا یہ دلِ حسیں ہے
دنیا کے جھنجھٹوں سے جو آشنا نہیں ہے
دیدار کو تھی مضطر ماہِ فلک نشیں کے
آنسو ٹھہر گیا ہے رخسار پر زمیں کے

[1] تذکرہ شاعراتِ اردو ، محمد جمیل احمد ، بریلی ۱۹۴۴ء ، ص ۲۴۷
[2] تذکرہ شاعراتِ اُردو ، ۱۹۴۴ء ، ص ۲۳۶ ـ ۲۳۷

مسحور ہیں فضائیں، کتنی خموش ہے یہ
جنت کی حور کوئی مینا بدوش ہے یہ
کیفِ شراب میں ہے ڈوبا ہوا نظارا
سویا ہوا نظارا، کھویا ہوا نظارا
پتوں کی آڑ لے کر مہتاب جھانکتا ہے
یا نو عروسِ شب نے گھونگٹ اُلٹ دیا ہے
ہو ہو کے مست و بیخود نذریں چڑھا رہی ہے
شبنم کی شاہزادی موتی لٹا رہی ہے
تاروں کا عکسِ دلکش ہے سطحِ مرمریں پر
افشاں چُنی ہوئی ہے پیشانیٔ حسین پر
مضطر ہوں اس لئے میں ناساز ہے سکوں اب
تقدیر کا ہے منشا بے چین ہی رہوں اب
تارہ سمجھ کے ایک اک ذرّے کو چومتی ہوں
کچھ پا کے کھو دیا ہے اب اسکو ڈھونڈتی ہوں
تکتی ہوں میں فلک کو حیران ہو رہی ہوں
ارمان و آرزو کی لاشوں پہ رو رہی ہوں
عہدِ نشاط گزرا وہ دل نہ سرخوشی ہے
پھر لوٹ آئے شاید بس آس یہ لگی ہے
لیکن تو اے حسینہ! یوں غم نواز کیوں ہے
پُرنم سرشکِ خوں سے یہ چشمِ ناز کیوں ہے [1]

نظم "خاکِ وطن کو سلام"، "شہرِ درد" میں شامل ہے (ص ۱۷۸ - ۱۸۱) لیکن اس نظم کے درج ذیل اشعار "شہرِ درد" سے حذف ہوئے ہیں:

اُٹھے تو کوہِ گراں کا وقار بن کے اُٹھے
بڑھے تو تُندیٔ برق و شرار بن کے بڑھے
جو ڈٹ گئے تو ہواؤں کا رُخ بھی موڑ دیا
بپھر گئے تو آفاق کو جھنجھوڑ دیا
عدو کا پنجۂ ظُلم و ستم مروڑ دیا
غرور اور سرِ پُر غرور توڑ دیا

[1] ماخوذ تذکرہ: شاعراتِ اردو از: محمد جمیل احمد، ص ۲۴۱ - ۲۴۳، مطبوعہ قومی کتب خانہ، بریلی، ۱۹۴۳ء

قدم نہ پیچھے ہٹے، جسم و جاں پہ جو بھی بنی
سوا خُدا کے کسی در پہ یہ جبیں نہ جُھکی
کہیں بھی رہ میں اندھیرا نہیں ہے ان کے لیے
ہیں ان کے ہاتھ میں ایمان و آگہی کے دیے [1]

واشنگٹن سے متعلق "تضادِ رنگ" کے عنوان سے ایک نظم "غزالاں تم تو واقف ہو" (ص ۶۶ — ۶۸) میں یہ شعر موجود نہیں:

وہی ہے مرگ شام کی گھُٹی گھُٹی صدا
وہی رولتے شب کی زرد زرد گوٹ ہے [2]

نظم: "سوادِ شب"، ادا جعفری کے شعری مجموعے "غزالاں تم تو واقف ہو" میں شامل ہے (ص ۴۹ — ۵۲) درج ذیل اشعار اس نظم سے حذف کر دیے گئے ہیں:

وہ جو سب اپنے ہی ہاتھوں میں لیے بیٹھے ہیں
کتنے سادہ ہیں کھلونوں سے بہل جاتے ہیں
سرخیٔ عارض و لب کی کوئی نکلے صورت
اپنے خوابوں کا لہو چہرے پہ مل لیتے ہیں
قصۂ حسرتِ ناکام کا کچھ نام تو ہو
داغِ دل داغِ جگر اور ذرا عام تو ہو
(میں وہ نادان کہ جینے کے بہلتے ڈھونڈوں
ایک غنچہ نظر آئے تو گلستاں سمجھوں)
ایک اک گام کو منزل کا سہارا جانوں
اک ستارے کو اُجالوں کا اشارا جانوں
ایک انداز میں کھلتے ہوئے خوابوں کے گلاب
ایک آواز میں سوئے ہوئے گیتوں کی پھوار
ایک بچے کی نگاہوں میں تبسم کا نکھار
مجھ کو انساں کے تقدس کا دلاتے ہیں یقیں
زندگی دستِ تمنا سے ابھی دُور نہیں
پونچھ ڈالی ہے لرزتے ہوئے اشکوں کی قطار

[1] فنون، لاہور، فروری مارچ ۱۹۶۶ء، ص ۲۷۳
[2] نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱۲، اگست ۱۹۶۹ء، ص ۱۸۴

رہگذاروں میں فقط وصول نہیں ہے لوگو
خود کو آسودۂ آزار کہو یا نہ کہو
وقت کو جابر و قہار کہو یا نہ کہو
ٹھہرنا وقت کا معمول نہیں ہے لوگو![1]

○

نظر انداز نظمیں:

یہ قطعہ اداجعفری کے کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں۔

کرمکِ شب تاب

(قطعہ)

شبِ سیاہ میں روشن ہے شمع جگنو کی
دیا غریب کا جس طرح ٹمٹماتا ہوا
ہوا کے دوش پہ رقصاں ہے پنکھڑی گل کی
رُکا ہوا سرِ مژگاں ہے قطرہ آنسو کا
فضائے ساکن و تیرہ میں جس طرح کوئی
لرز رہا ہو فلک سے گرا ہوا تارا
سزا کے خوف سے یا ایک لمحہ کو جیسے
گناہ گار کے دِل میں خیال رحمت کا[2]

یہ نظم، اداجعفری کے کسی شعری مجموعے میں بار نہیں پا سکی:

تنہا مجھے رہنے دے!

دِل میں غمِ الفت کو مستور ہی رہنے دے مجبورِ محبت کو مجبور ہی رہنے دے
اُمید کی دُنیا کو بے نور ہی رہنے دے معصومِ محبت کو مسحور ہی رہنے دے
جس حال میں بھی میں ہوں، تنہا مجھے رہنے دے

دِل پھولوں کی جنت ہے مُرجھا کے نہ رہ جائے آغوشِ تمنا میں لہرا کے نہ رہ جائے
ڈرہے نگہِ حیراں شرما کے نہ رہ جائے ترسا کے نہ رہ جائے تڑپا کے نہ رہ جائے
جس حال میں بھی میں ہوں، تنہا مجھے رہنے دے
محدود ہی رہنے دے معصوم کی دُنیا کو ناشاد ہی رہنے دے مغموم کی دُنیا کو
برباد ہی رہنے دے مظلوم کی دُنیا کو پامال ہی رہنے دے محروم کی دُنیا کو
جس حال میں بھی میں ہوں، تنہا مجھے رہنے دے
اک پریم پجارن کو سنسار سے کیا مطلب مدہوشِ محبت کو ہشیار سے کیا مطلب
بیگانۂ دُنیا کو آزار سے کیا مطلب دیوانۂ فطرت کو افکار سے کیا مطلب
جس حال میں بھی میں ہوں، تنہا مجھے رہنے دے
ایوانِ محبت میں رہزن کا گزر کیوں ہو؟ تقدیس کی جنت پر ظلمت کا اثر کیوں ہو؟
اک طائرِ بیکس کو صیاد کا ڈر کیوں ہو؟ ناداں گلِ صحرا پہ گلچیں کی نظر کیوں ہو؟
جس حال میں بھی میں ہوں، تنہا مجھے رہنے دے
اُمید کے خرمن کو آہوں سے جلانا کیا شمعِ رہِ منزل کو اشکوں سے بجھانا کیا
خوابیدہ تمنا کو نالوں سے جگانا کیا معیارِ محبت کو نظروں سے گرانا کیا
جس حال میں بھی میں ہوں، تنہا مجھے رہنے دے[1]

یہ نظم اداجعفری کے کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں:

ہم سفر

رات اندھیری ہے نہ گھبراؤ رفیقِ منزل
میں نے کرنوں کو نگاہوں میں چھپا رکھا ہے
موجِ در موج بگولوں کی تمھیں کیا پروا
میں نے نغموں کو کلیجے سے لگا رکھا ہے
آنکھ بھی مجھ سے ملانے کی نہیں تاب جنھیں
آج پھر تاک میں بیٹھے ہیں کمیں گاہوں میں
دیکھ لیں میرے شہیدوں کا لہو ہے اس میں
ہے تو پیالہ ہی مگر جامِ مئے ناب نہیں
میرے سُورج کو چرالیں یہ مجال ان کی کہاں
یہ مرا دل ہے کوئی گوہرِ شب تاب نہیں

---

[1] نقوش لاہور، شمارہ ۱۱۲، اگست ۱۹۶۹ء، (ص ۱۸۵ - ۱۸۶)
[2] ماخوذ تذکرہ:۔ "شاعراتِ اُردو" از: محمد جمیل احمد، ص ۲۴۱
مطبوعہ:۔ قومی کتب خانہ بریلی، ۱۹۴۴ء

[1] ماخوذ تذکرہ "شاعراتِ اُردو" مرتبہ: محمد جمیل احمد ایم۔ اے بریلوی، قومی کتاب خانہ، بریلی، ۱۹۴۴ء، (ص ۲۴۴ - ۲۴۵)

رُت بدلنے کو فقط دِل کی لگن کافی ہے
پھُول ہر رنگ کے مہکیں تو بہار آتی ہے

ہم محبت کے پیامی ہیں ہمیں ڈر کس کا
قتل گاہوں میں محبّت کا علَم لے کے چلو
غیر کیا شے ہے مقدر سے بھی ٹکر لے لیں
راہ میں آئے جو پتھّر اسے ٹھکراتے چلو
گھر پہنچ کر نہ مُسافر کہیں لُٹنے پائے
ہاتھ میں ہاتھ رہے ہاتھ نہ چھُٹنے پائے ؏۱

یہ نظم بھی اداجعفری کے کسی مجموعے میں مجھے دکھائی نہیں دی۔

مگر مجھے بتاؤ کیوں

مجھے یہ آئینہ دکھاؤ کیوں
ازل کے دِن سے آج تک
مری تمام زندگی بس ایک حرفِ آرزو
مرا غبار چار سُو
تمھارے پاس کیا نہیں
تمھارے پاس کیا نہ تھا
جو مَیں نہ تھی تو کیا ہُوا

تمھاری بزمِ ناز میں جمال بھی جلال بھی
جو التفاتِ جاوداں تو اجتنابِ بیکراں
تمام آفتابِ جاں
وہ روشنی وہ خیرگی
کہ تم کہاں
تمھاری بزمِ دلبری میں اپنی سمت دیکھ لوں
نہیں مری مجال بھی
کہ لڑکھڑا کے رہ گیا مرا ہر اک سوال بھی
مرا ہر اک خیال بھی
تو پھر مجھے بلاؤ کیوں
محبّتوں کی آڑ میں
جنوں کو آزماؤ

مَیں بے قرار و خستہ تن
بس اک شرارِ عشق میرا پیرہن
مرا وجود اک نگاہِ مضطرب
نگاہ جس کے پاؤں میں ہیں بیڑیاں پڑی ہوئی
کہ باوجودِ سرخوشی
میں نا تمام داستاں
جو دلربا نہیں تو پھر
یہ داستاں سناؤ کیوں
میں بے نوا میں نارسا
مگر مجھے بتاؤ کیوں !! ؏۱

○

غزلوں کے نظری اشعار

ذیل میں اداجعفری کی بعض غزلوں کے وہ متفرق اشعار دیئے جا رہے ہیں جو ابتداً اُن کی غزلوں کا حصّہ تھے لیکن جب یہ غزلیں، ان کے شعری مجموعوں کا حصّہ بنیں تو یہ اشعار قلمزد ہوئے :

ہم تو الزامِ وفا سے بھی بَری ہیں اب کے
کس کے سر جائے گا یہ نالۂ شب گیر کہو ؏۲

○

دِل خوں ہو لیکن نہیں تو ہیں گوارا
تُم رک کے بڑھے ہو تو کئی گام ہٹی ہوں ؏۳

○

؏۱ نقوش، لاہور ۔ شمارہ نمبر ۱۰۶ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۶ء، ص ۲۵۲

؏۱ نقوش، لاہور ۔ شمارہ ۱۲۰ ۔ جنوری ۱۹۷۶ء، ص ۳۷۶
؏۲ نقوش، لاہور ۔ شمارہ ۱۰۳، ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۱۲
؏۳ فنون، لاہور، جولائی، اگست ۱۹۶۶ء، ص ۳۶۷

اَب تو مدّت ہوئی آدابِ گلستاں سیکھے
کیوں گُو اِ خار میں اگلی سی کھٹک ہے کہ نہیں ع۱

○

جب دل کی رہگذر پہ ترا نقشِ پا نہ تھا
جینے کی آرزو تھی مگر حوصلہ نہ تھا

جلتے رہے خیال ، برستی رہی گھٹا
ہاں نازِ آگہی تجھے کیا کچھ روانہ تھا

سنسان دوپہر ہے ، بڑا جی اُداس ہے
کہنے کو ساتھ ساتھ ہمارے زمانہ تھا

ہر آرزو کا نام نہیں آبروئے جاں
ہر تشنہ لب جمالِ رُخِ کربلا نہ تھا ع۲

○

آخری ٹھیس آزمانے کو
جی تو چاہا تھا مُسکرانے کو

سنگریزوں میں ڈھل گئے آنسو
لوگ ہنستے رہے دکھانے کو

زخمِ نغمہ بھی لَو دیتا ہے
اک دیا رہ گیا جلانے کو

جلنے والے تو جل بُجھے آخر
کون دیتا خبر زمانے کو

کتنے مجبور ہو گئے ہوں گے
اَن کہی بات مُنہ پہ لانے کو

کُھل کے ہنسنا تو سب کو آتا ہے
لوگ ترسے ہیں اک بہانے کو

حسرتوں کی پناہ گاہوں میں
کیا ٹھکانے ہیں سر چھپانے کو ع۳

ع۱ نقوش ، لاہور ۔ شمارہ ۱۰۳ ، ستمبر ۱۹۶۵ء ، ص ۱۲
ع۲ فنون ، لاہور ۔ جدید غزل نمبر ۲ ، جنوری ۱۹۶۹ء ، ص ۶۵۷
ع۳ فنون ، لاہور ، جدید غزل نمبر ۲ ، جنوری ۱۹۶۹ء ، ص ۶۶۱

سَب کچھ تھا اِسی فسون سرا میں
تائیدِ نگاہ کھل رہی تھی ع۱

○

چراغ ہاتھ میں تھامے ہوئے تھا اک لمحہ
مرے قریب اندھیرا بھی اُجلا اُجلا تھا ع۲

○

زندگی اتنی دِل آویز کہاں تھی گردوں
تو نے دیکھا ہے کوئی بار دگر مانگے ہے ع۳

○

قسمتِ خار کہ گُل کے ارمان
کچھ تو ہے جس پہ ہے شبنم گریاں

طفلِ ناداں کی یہ بے باک ہنسی
قصۂ جبر کا دلکش عُنوان ع۴

○

کون آیا تھا گلستاں بکنار
دِل بہاروں سے خفا ہے اب کے

پھانس چبھتی ہے کلیجے کے قریب
سانس لینا بھی بُرا ہے اَب کے ع۵

○

روز و شب کے انہی ویرانوں میں
خواب کے پھُول تو کھلتے ہوں گے

نازِ پروردۂ تبسّم سے کہیں
سلسلے درد کے ملتے تو ہوں گے

ع۱ تخلیقی ادب (۱) ، کراچی ۱۹۸۰ء ، ص ۱۲۹
ع۲ نقوش ، لاہور ، عصری ادب نمبر ، شمارہ ۱۲۹ ، ستمبر ۱۹۸۲ء (ص ۳۹۲)
ع۳ فنون ، لاہور ، فروری ۔ مارچ ۱۹۶۶ء ، ص ۲۷۹
ع۴ نقوش ، لاہور شمارہ ۱۰۵ ، اپریل جون ۱۹۶۶ء ، ص ۳۸۶
ع۵ فنون ، لاہور ، فروری ۔ مارچ ۱۹۶۶ ، ص ۲۷۸

اجنبی شہر کی گلیوں میں اداؔ
دِل کہاں ، لوگ ہی ملتے ہوں گے [1]

○

پابندیٔ رسُومِ دفا بھی بہانہ خو
ترکِ وفا د شیوۂ رم بھی بہسانہ ساز [2]

○

لہجے کی کھنک ہو کہ نگاہوں کی صداقت
یوسف کیلئے مصر کے بازار بہت ہیں
کُچھ زخم کہ زحمت میں گُلِ تر کے قریں تھے
کُچھ نقش کہ ہیں نقش بہ دیوار بہت ہیں
اِک خواب کا احساس بھی اُٹھلئے نہیں اُٹھتا
کیا کہیے کہ آسودۂ آزار بہت ہیں
ہر جذبۂ بے تاب کے احکام ہزاروں
ہر لمحۂ بے خواب کے اصرار بہت ہیں
پلکوں تک آ پہنچے نہ کرنوں کی تمازت
اَب تک تو اداؔ آئینہ بردار بہت ہیں [3]

○

زباں کو حکم ، نگاہِ کرم کو پہچانے
نگہ کا جُرم ، غبارِ الم کو پہچانے
وہ ایک جام کہاں ہر کِسی کی قسمت میں
وہ ایک ظرف کہ اعجازِ سم کو پہچانے
وہ دل جو خاک ہوئے ، آج تک دھڑکتے ہیں
رہِ وفا ، ترے معجز رقم کو پہچانے
سحر سے پہلے یہاں آفتاب اُبھرے ہیں
خلوصِ بندگی چشمِ نم کو پہچانے

کبھی خیال کا سایہ ، کبھی اُمید کی دھوپ
کوئی تو آئے کہ دِل کیف و کم کو پہچانے
جو ہم سفر بھی رہے ہیں ، شریکِ منزل بھی
تجھے اجنبی تو نہ تھے ، پھر بھی کم کو پہچانے [4]

○

اک ہتھیلی پہ دیا ہے اب تک
ایک سُورج نہ بجُھا تھا شاید
موجۂ رنگ بیاباں سے چلا
یا کوئی آبلہ پا تھا شاید
رُت کا ہر آن بدلتا لہجہ
ہم سے کچھ پوچھ رہا تھا شاید
کیوں اداؔ کوئی گریزاں لمحہ
شعر سُننے کو رُکا تھا شاید [5]

○

نظر انداز غزلیں :

اگلے صفحات میں ۱۹۴۴ء سے ۱۹۸۰ء کے مابین چھپنے والی ادا جعفری کی ایسی آٹھ غزلیں پیش کی جارہی ہیں جو ۱۹۸۲ء تک منصۂ شہود پر آنیوالے اُنکے کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں ہوسکیں۔

جوش کہاں ، تڑپ کہاں ، لذّتِ جستجو کہاں
ملنے کو وہ تو مل گئے ان کی اب آرزو کہاں ؟
ہجر تھا سوزِ زندگی ، نغمۂ سازِ زندگی
اَب نہ رہے وہ ولولے ، وصل میں آرزو کہاں ؟
پردے میں تھے تو رَت نئے راز و نیاز رہتے تھے
اَب ہیں نظر کے سامنے ، عشرتِ گفتگو کہاں ؟
سامنے وہ نہ آئیں تو سامنا ان کا ہو سکے
تابِ نظارہ عشق کو حُسن کے روبرو کہاں ؟

---

[1] فنون ، لاہور ، جدید غزل نمبر ۲ ، جنوری ۱۹۶۹ء ، ص ۶۶۲
[2] فنون ، لاہور ، جدید غزل نمبر ۲ ، جنوری ۱۹۶۹ء ، ص ۶۶۰
[3] فنون ، لاہور ، جدید غزل نمبر ۲ ، جنوری ۱۹۶۹ء ، ص ۶۶۰

فنون ، لاہور ، جدید غزل نمبر ۲ ، جنوری ۱۹۶۹ء ، ص ۶۶۱
نقوش ، لاہور ، شمارہ ۱۲۰ ، جنوری ۱۹۷۴ء ، ص ۳۷۷

شمع پہ مر مٹا پتنگ ، مدعیٔ وفا نہ تھا
محفلِ جذب و سوز میں رخصتِ ہائے وہو کہاں!

گوہرِ آبدار یہ نوکِ مژہ پہ خوب ہے
خاک میں مل گیا تو پھر اشک کی آبرو کہاں!

میری ہی چشمِ شوق نے آئینہ ان کو دے دیا
رحم نگاہِ ناشکیب! ڈھونڈھنے کو بکو کہاں!

دل تھا تو لاکھ جلوے تھے ، دل جو نہیں تو کچھ نہیں
آنے کو آنے کو بہار ، دعوتِ رنگ و بو کہاں!

دامنِ گل ہے عنبریں اس میں تو شک نہیں ادا
نکہتِ رائیگاں کہاں ، گیسوئے مشکبو کہاں [1]

○

جب تیرگی تو اجاگر نقوشِ شام کرو
پلک پلک پہ چراغاں کا انتظام کرو

شگفتِ لالہ و گل ہے کہ زخمِ قلب و جگر
مناؤ جشن بہاروں کا اہتمام کرو

ابھی ہری ہے غمِ آرزو کی ہر کونپل
گلوں سے کہہ دو ابھی اور کچھ قیام کرو

انھیں کے چاک گریباں پہ ہے اساسِ بہار
کلی کلی کا گلستاں میں احترام کرو

بجا کہ آج خلاؤں میں ہیں نقوشِ قدم
جو ہو سکے تو خلوصِ نگاہ عام کرو

نہ باز آئیں گے سوزِ جگر کے دیوانے
غمِ حیات کی تلخی کچھ اور عام کرو

فسانے اور ابھی ناتمام باقی ہیں!
ادا حکایتِ قلب و نظر تمام کرو [2]

○

کیا پوچھتے ہو لالہ عذاروں کی داستاں
لکھی ہے خونِ دل سے بہاروں کی داستاں

جس راہ سے چلے ہیں وہی کہکشاں بنی
پوچھو زمیں سے میرے ستاروں کی داستاں

سمٹی تو ایک آہِ دلِ نامراد تھی
پھیلی تو بے کراں ہے چناروں کی داستاں

صحنِ چمن سے کنجِ قفس تک کا فاصلہ
کیا مختصر ہے بخت کے ماروں کی داستاں

تکلیفِ التفات نہ فرمایئے کہ آپ
سُن پائیں گے نہ سینہ فگاروں کی داستاں

کیا کیجیے دلِ فریبِ وفا سے گزر چکا
تھی ورنہ دل فریب سہاروں کی داستاں

اتنا ہی دل کو پاسِ مروّت ہے ورنہ ہم
بھولے نہیں ہیں وعدہ شعاروں کی داستاں

افسانۂ حیات کا عنواں ہے جذبِ دل
نظروں کی بات ہو کہ نظاروں کی داستاں

طوفاں سے کھیلتے ہیں جو ساحل نصیب ہیں
تنکوں سے پوچھتے ہو کناروں کی داستاں

کیا قہر ہے کہ آج گلوں کی زباں پہ ہے
شعلوں کی واردات شراروں کی داستاں

کہنا پڑی ہے امن کی خاطر کبھی کبھی
نیزوں کی برچھیوں کی کٹاروں کی داستاں [1]

○

رہنے کو تو ہم تجھ سے بھی آزردہ رہے ہیں
صد شکر کسی لمحہ پشیماں نہ رہے ہیں

اک پھول بھی کھلتا تو مہک جاتے دل و جاں
بے مائگیٔ شوق پہ آزردہ رہے ہیں

---

[1] ماخوذ تذکرہ "شاعراتِ اردو"، تالیف : محمد جمیل احمد ایم اے بریلوی
قومی کتب خانہ، بریلی، ۱۹۴۳ء ص ۲۳۷ - ۲۳۸

[2] فنون، لاہور - اشاعتِ خاص : ۴ ، فروری ، مارچ ۱۹۶۶ء
ص ۲۷۹ -

[1] نقوش، لاہور - شمارہ ۱۰۵ ، حصہ ۲ ، اپریل جون ۱۹۶۶ء ، ص ۳۸۵

پھولوں کی طرح چاکِ گریباں نہیں شیوہ
غنچے کی صفت بزم میں لب بستہ رہے ہیں

اک لمحۂ ناچیز دگریزاں کے فسانے
تاریخ کے اوراق پہ تابندہ رہے ہیں

لکھے گئے حالاتِ جنوں روزِ ازل سے
حالاتِ جنوں آج بھی ناگفتہ رہے ہیں

کیونکر کہیں ہم پر نہ تھے الطافِ محبت
الطافِ محبت تھے کہ افسردہ رہے ہیں

کھلایا ہے اک پھول تو آنچ آئی ہے دل پر
کس جذبۂ بے نام سے وابستہ رہے ہیں

ہم قطرۂ نیساں نہ گہر پارۂ شبنم
کیوں تشنگیٔ خار پہ شرمندہ رہے ہیں

لمحات پہ بس اپنا ادا اتنا چلا ہے
لمحات کی تقدیر پہ لرزیدہ رہے ہیں عہ

○

تھا دل کو انتظارِ بہاراں نہ سو سکے
اب کیا گلہ بہارِ گریزاں نہ سو سکے
تھی زندگی کی رات کڑی بھی، طویل بھی
شب بھر منایا جشنِ چراغاں نہ سو سکے
کس خوابِ دلپذیر کی آنکھوں کو تھی لگن
با وصفِ اہتمامِ فراواں نہ سو سکے
خونابۂ جگر سے گہر ڈھلتے رہے
ہم بھی مثالِ شمعِ شبستاں نہ سو سکے
اک لفظ کہہ سکے تھے سرِ گفتگو کبھی
تا زندگی رہے ہیں پشیماں نہ سو سکے
کیا کیا نہ حشر جھیل گئے انتظار میں
اے اہتمامِ جنبشِ مژگاں نہ سو سکے

عہ نقوش، لاہور۔ شمارہ ۱۰۵، حصہ ۲، اپریل جون ۱۹۶۶ء، ص ۳۸۲

دھند لا چکی ہے اب تو ہر اک آس کی کرن
کیوں جستجوئے صبحِ درخشاں نہ سو سکے
چونکے ہیں جس صدا پہ، وہ آوازِ پا نہ تھی
اپنا ہی دل تھا حشر بداماں نہ سو سکے
کس کو نصیب دولتِ غم ہو سکی ادا
اک ہم تھے جو رہے ہیں نگہباں نہ سو سکے عہ

○

وہ لمحہ کہ خاموشیٔ شب نغمہ سرا تھی
کانوں پہ گراں دل کے دھڑکنے کی صدا تھی

جس موڑ پہ چھوڑی ہے سہاروں کی تمنا
کہتے ہیں، بڑا قہر وہی لغزشِ پا تھی

کیوں آج دھواں بنکے افق تا بہ افق ہے
اس سانس میں کلیوں کے چٹکنے کی صدا تھی

ہر لمحۂ بے تاب نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
گو نجی تھی خموشی، تری آواز تو کیا تھی

ہر دن کے صحیفے پہ ترا نام لکھا ہے
ہر شب کی جبیں تیرا نشانِ کفِ پا تھی

کیا کہیے کہ ہونٹوں پہ بس اک حرفِ وفا تھا
کیا کیجئے ہر سانس جو تعزیرِ وفا تھی

اٹھتے ہوئے دیکھا ہے دھواں آتشِ گل سے
کیا نکہتِ برباد جلے دل کی دعا تھی

کیا جانیئے، مرنا بھی روا ہے کہ نہیں ہے
تکوین کے لب پر مرے جینے کی دعا تھی

نقوش، لاہور۔ شمارہ ۱۰۳۔ ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۱۳
فنون، لاہور۔ جدید غزل نمبر ۲ جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۶۵۸

راستہ روک رہی ہو جیسے
یاد راہوں میں کھڑی ہو جیسے

نکہتِ موجۂ گل یوں آئے
بھید سا کھول رہی ہو جیسے

اُٹھتے اُٹھتے کوئی محبوب نگہ
اپنے سائے سے ڈری ہو جیسے

یا کسی خواب نے آنکھیں کھولیں
یا عبادت کی گھڑی ہو جیسے

گھر کے آنگن میں نہ اُترے سُورج
رات گھبرا سی گئی ہو جیسے

وہ جو دیوار میں چنوائی گئی
کوئے جاناں کو چلی ہو جیسے

وہ جو گیتوں کی دھڑکتی لَو تھی
شعلۂ جاں میں ڈھلی ہو جیسے

قرض تھا حرفِ تمنا کس پر
زندگی پُوچھ رہی ہو جیسے

ہم جسے سنگِ گراں سمجھے تھے
اپنی ہی سادہ دلی ہو جیسے

پھر شرارہ کوئی ارزاں ہو گا
راکھ پلکوں پہ جمی ہو جیسے

مہرباں چشمِ گہربار ادا
اور کسی شے کی کمی ہو جیسے ؎

؎ نقوش، لاہور۔ شمارہ ۱۲۰، جنوری ۱۹۷۶ء، ص ۳۷۵

کسے خبر کہ وہ احوال و حال کس کا تھا
جو سُن رہا تھا وہ اپنا فسانہ سمجھا تھا

وہ شاخ شاخ نمو تھی مگر اُنھوں نے کہا
کہ اُس پہ صرف بہاروں کا رنگ کھِلتا تھا

یہی خطا کہ پجارن تھی اور نہ دیوی تھی
بڑی خطا تھی کہ خود کو بھی اُس نے چاہا تھا

جو اِذن ہو تو میں کچھ دیر اپنے ساتھ رہوں
کہا نہیں تھا یہ بس یوں ہی اُس نے سوچا تھا

نہ آستاں نہ کوئی بام و در ہی جی کو لگے
چلن سدا سے یہی سرپھری ہوا کا تھا

جو رُت بھی آئے کرشمے ہزار رکھتی ہے
لبوں پہ کس کے گئے موسموں کا چرچا تھا

میں آئنے پہ بھلا کیسے اعتبار کروں
مجھے تو صرف اُسی کی نگہ نے دیکھا تھا

قریب اتنا کہ سوچو تو خود کو کھو بیٹھو
مگر یہ دِل کہ اُسے سَو طرح پکارا تھا

سفر تمام ہوا اور حیرتیں نہ گئیں
جو قربتیں تھیں وہاں فاصلہ بلا کا تھا

پھر اس کے بعد ادا سیلِ رنگ راہ میں ہے
بس ایک نام بیاضِ سحر میں لکھا تھا ؎

تخلیقِ ادب (۱)، کراچی ۱۹۸۰ء، ص ۱۲۸

ادا جعفری کی
غیر مدّون نظمیں اَور غزلیں

(۱۹۸۳ء تا ۱۹۹۰ء)

ادا جعفری کا مرتّب کردہ، اُن کا اَب تک کا آخری شعری مجموعہ "سازِ سخن بہانہ ہے" ۱۹۸۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اگلے صفحات میں اُن کا ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۰ء تک کا کچھ غیر مدّون کلام، مآخذ کے حوالے کے ساتھ یک جا کیا جا رہا ہے۔ جو مجھے یقین ہے کہ اُن کے نئے شعری مجموعے کی اساس بن سکے گا۔

یہ غیر مدّون کلام، ادا جعفری کی ایک نعت، دو نظموں اور اُن کی اُنیس غزلوں پر مبنی ہے۔ آخری غزل غیر مطبوعہ اور یہ اس حصّہ شعری کا ایک اور امتیاز ہے۔

○

نظمیں :

نعت :— میں اُنکو سوچ لوں مجھے منزل دکھائی دے

اک اور خبر :— وہ جو خوشبو سا تھا

وصال و ہجر کے موسم :— طلسمِ خود پذیرائی کے موسم میں۔

○

غزلیں :

کتنے طویل شامِ تمنا کے سائے ہیں

ابتداء رنج کی کہاں سے ہوئی

نہ دُعا کا جواب آوے ہے۔

جو مُشت خاک ہے، مَولا اُسے خُدائی نہ دے۔

یا دِل میں ملال آگیا ہے۔

مرے درد کی تب و تاب میں مجھے دیکھنا

اَب کے مژگاں پہ لکھی ہم نے کہانی اور ہے

ہتھیلیوں پہ دُعا کو سنبھال کر رکھنا

غُبارِ ہجر چھٹ گیا، شبِ فراق تھک گئی

یہ حال تھا کہ دِل کو اسمِ آرزو ملا نہیں۔

آج تک اچھوتا ہے زندگی کا پیراہن

بَس اک چراغ کہ ہے شعلہ نوا ٹھہرے

خوشبو سے جیسے راہِ سفر کا شگوں لیا

یہی بہت ہے کہ اُس پہ مجُھے یقیں آیا۔

گناہ، طرزِ نگہ تھا مُعاف کیا ہوتا

نہ کرامتیں کسی خواب کی، نہ کسی یقیں کا گُماں

نہ آنکھ میں کوئی منظر، نہ ہم سفر کوئی

○

تازہ غزلیں :

ہم ہیں گرفتہ دِل ابھی، ہم سے صبا بھی کیوں کھلے

کوئی تڑپ، کوئی منظر ہی آنکھ بھر، رکھنا

○

نعت

طوفاں میں جیسے دُور سے ساحل دکھائی دے
میں اُن کو سوچ لُوں، مجھے منزل دکھائی دے
یہ اور راستے ہیں حُدی خواں! سنبھل کے چل
طیبہ کا ذرّہ ذرّہ مجھے دل دکھائی دے
گُم ہو نہ جاؤں راہ میں اے صاحبِ کرم!
اک بار پھر وہ جادۂ منزل دکھائی دے
طرزِ دُعا بھی سونپ رہی ہُوں نگاہ کو
کیوں حرفِ التجاؤں میں حائل دکھائی دے
وہ لمحۂ گریز قدم میری کائنات
جب آئینہ سا دِل کے مقابل دکھائی دے
وہ راہرو نہیں ہے اُسے کارواں کہو
اُس دَر کی آرزُو میں جو شامل دکھائی دے
مِل جائیں گے وہیں سے اجالے، جہاں اَدا
تنویرِ مہر و ماہ بھی سائل دکھائی دے عہ

○

اک اَور خبر

وہ جو خوشبو سا تھا
نو دمیدہ شگوفوں کی آواز سا
بس گلی تک گیا تھا۔
وہ معصوم و ناداں
گھڑی دو گھڑی کو گلی میں گیا تھا۔
تو ماں کو کئی کام یاد آ گئے تھے۔
ادھورے کئی کام
جو شام ہونے سے پہلے
اسے ختم کرنا ہی تھے
اور تھکن دھیان میں کیسے آتی
کہ آتے ہوئے موسموں کے کئی دلربا راز
ممتا کی آنکھوں میں تھے۔
اور وہ طائرِ دل تیلیوں کے تعاقب میں
جانے کہاں تک گیا
گھر میں واپس نہ آیا
خبر آ گئی
لوریاں سننے والا
دھماکوں کی آواز سُن کر
لہو کی گلابی ردا اوڑھ کر سو گیا
نفرتوں کو ہدف دیکھ لینے کی مہلت نہ تھی
غضب کو نشانہ ضروری نہیں
صرف اک رقصِ وحشت
فقط دہشتِ بے اماں
ٹوٹتی چوڑیاں
خاک ہوتے ہُوئے سائباں
صرف بکھرے ہوئے
آئینے کرچیاں کرچیاں
جاں کا زنگِ یقیں دل کا حُسنِ بیان

اور وہ
وہ جو کچے گھرَوندے کا مہتاب پارہ تھا
سب کا مقدر لکھا جا چکا
کتنی آنکھیں تھیں جو راستہ دیکھتی رہ گئیں
اَور اگلی سحر ایک سرخی تھی اخبار میں
کہ حالات معمول ہی کے مُطابق رہے
شہر میں! عہ

عہ نقوش، لاہور۔ شمارہ ۱۳۳، ستمبر ۱۹۸۶ء، ص ۳۱۷

عہ ماہِ نو، لاہور۔ اگست ۱۹۸۸ء، ص ۴۴

وصال و ہجر کے موسم

طلسمِ خود پذیرائی کے موسم میں
وصال و ہجر آساں تھے
اُسی نادان دانائی کے موسم میں
ہوا کے ہاتھ سے
بادل کے ٹکڑے جوڑ کر میں نے
کبھی اک گھر بنایا تھا۔
وہیں پر نیل ساگر کے کنارے
تم کو پہلی بار دیکھا تھا
پھر اس کے بعد صدیوں تک
تمھاری راہ دیکھی تھی
پھر اس کے بعد کتنے مہرباں ملے
صبا کے ہم سفر ہم نے گزارے ہیں
اور اکثر بے وفا دن بھی بہ حکمِ زندگانی
آندھیوں کے ساتھ کاٹے ہیں
تمھارے ساتھ اندھیروں سے بھی تنویریں تراشی ہیں
چٹانوں سے دُعا چہروں کی تصویریں تراشی ہیں
تمھارا ہاتھ تھامے
آج اچانک دھیان آیا ہے۔
کہ تم سے پُوچھ ہی لیتی
مری آنکھیں تو ہیں گروی
مگر ان دلرُبا اُجلے دھندلکوں میں
کبھی تم نے مجھے دیکھا؟
مجھے تم نے کبھی دیکھا؟! [1]

○

بے سائباں جو دن تھے وہ سب یاد آئے ہیں
کتنے طویل شامِ تمنا کے سائے ہیں
گل بھی کھلے، صبا بھی چلی، رات بھی ڈھلی
دل تک نہ آسکے ہیں یہ کیسے کنائے ہیں
اتنے تکلفات میں گزری ہے زندگی،
کچھ یوں لگا کہ آنکھ میں آنسو پرائے ہیں
آنگن میں پاؤں جلنے لگے، رنگ بجھ گئے
بچوں نے ایک نسل کے قرضے چکائے ہیں
شاید کسی کو حرفِ سخن یاد ہی نہ ہو
خاموشیوں کے ناز کچھ اتنے اٹھائے ہیں
کانٹا چبھے، گلاب کھلے، واقعہ تو ہو
یہ دل کی بستیاں ہیں کہ ویراں سرائے ہیں
اندر سے بوئے گل کی طرح ناشکیب ہیں
ہم جو ہتھیلیوں پہ چٹانیں اُٹھائے ہیں
مولا تری عطا ہے مری کیا مجال تھی
کوتاہ دامنوں میں جواہر لُٹائے ہیں [1]

○

خامشی سے ہوئی، فغاں سے ہوئی — ابتدا رنج کی کہاں سے ہوئی
کوئی طائر اِدھر نہیں آتا — کیسی تقصیر اس مکاں سے ہوئی
موسموں پر یقین کیوں چھوٹا — بدگمانی تو سائباں سے ہوئی
بے نہایت سمندروں کا سفر — گفتگو صرف بادباں سے ہوئی
یہ جو اُلجھی ہوئی کہانی ہے — معتبر حرفِ رائگاں سے ہوئی
دل کی آبادیوں کو پوچھو ہو — روشنی برقِ بے اماں سے ہوئی
تشنگی، بے بسی، لبِ دریا — میری پہچان ہی وہاں سے ہوئی
اتنی اُجلی نہ تھی یہ راہگزر
نقشِ پائے بلاکشاں سے ہوئی [2]

---

[1] فنون، لاہور۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۸

[1] اوراق، لاہور، مئی۔ جون ۱۹۸۳ء، ص ۱۹۳

[2] نقوش، لاہور۔ شمارہ ۱۳۲، جون ۱۹۸۵ء، ص ۴۷۱

○

نذرِ شاہ حاتم

صبر آیا ، نہ تاب آوے ہے
نہ دُعا کا جواب آوے ہے

اب خدائی ہے تیرے بندوں کی
روز ، یومِ حساب آوے ہے

جب سے پتھر ہوئے شجر میرے
شاخِ مژگاں گلاب آوے ہے

دشتِ ہجراں سے دشتِ ہجراں تک
دل کو سارا نصاب آوے ہے

میں اندھیروں کو اوڑھ بھی لیتی
راہ میں ماہتاب آوے ہے

دِل انھیں راستوں سے گزرے ہے
جن پہ نسدن عذاب آوے ہے

سوچنا ، دیکھنا کہاں مُمکن
زندگانی شتاب آوے ہے

اس کو اِذنِ سخن نہیں ہوتا
جس کو طرزِ خطاب آوے ہے

اس کے ہوتے بھی دِل دُکھا ہے بہت
اس سے کہتے حجاب آوے ہے [1]

○

طلب کی آنچ سے دِل کو کبھی جُدائی نہ دے
جو مشتِ خاک ہے ، مولا اُسے خدائی نہ دے

اُمید و بیم کا عالم ، تمام زنجیریں
لہولہان بدن ہے ، مگر رہائی نہ دے

اُتر نہ جائیں دِل و جاں میں اتنے سناٹے
کہ پھر مجھے تری آواز تک سنائی نہ دے

لہو میں کتنے چراغوں کی لَو دھڑکتی ہے
میں نارسا سہی ، احساسِ نارسائی نہ دے

کبھی تو دِن کے اُجالے میں تو بھی دیکھ انھیں
نہیں تو پھر مرے خوابوں کو دلربائی نہ دے

مجھے تو حرف کی حرمت کا پاس کرنے دے
نوا کو چھین ، مگر داغ کم نوائی نہ دے

نشیب میں ہو ذرا سی بُلندیوں پہ چلو
یہاں سے شہر کا منظر ، ہمیں دکھائی نہ دے

کہے تو کون کہے سرپھری ہوا سے اَدا
ہری ہے شاخ ، اے موسمِ جُدائی نہ دے [1]

○

ویسے ہی خیال آ گیا ہے
یا دِل میں ملال آ گیا ہے

آنسو جو رُکا ، وہ کشتِ جاں میں
بارش کی مثال آ گیا ہے

غم کو نہ زیاں کہو کہ دِل میں
اک صاحبِ حال آ گیا ہے

جگنو ہی سہی فصیلِ شب میں
آئینہ خصال آ گیا ہے

آ دیکھ ، کہ میرے آنسوؤں میں
یہ کِس کا جمال آ گیا ہے

مدت ہوئی کچھ نہ دیکھنے کا
آنکھوں کا کمال آ گیا ہے

میں کتنے حصار توڑ آئی
جینا تھا محال ، آ گیا ہے [2]

---

[1] نقوش ، لاہور ۔ شمارہ ۱۳۲ ۔ جون ۱۹۸۵ء ، ص ۴۷۲

[1] نقوش ، لاہور ۔ شمارہ ۱۳۲ ۔ جون ۱۹۸۵ء ، ص ۴۷۳
[2] نقوش ، لاہور ۔ شمارہ ۱۳۲ ۔ جون ۱۹۸۵ء ، ص ۴۷۴

○

نہ غبار میں نہ گلاب میں مجھے دیکھنا
مرے درد کی تب و تاب میں مجھے دیکھنا

کسی وقت شامِ ملال میں مجھے سوچنا
کبھی اپنے دِل کی کتاب میں مجھے دیکھنا

کسی دھن میں تم بھی جو بستیوں کو تیاگ دو
اسی راہِ خانہ خراب میں مجھے دیکھنا

کسی رات ماہ و نجوم سے مجھے پوچھنا
کبھی اپنی چشمِ پُرآب میں مجھے دیکھنا

میں جو رات بھر غمِ آفتابِ سحر میں تھی
اسی شعلہ رُو کے عتاب میں مجھے دیکھنا

اسی دِل سے ہو کے گزر گئے کئی کارواں
کئی ہجرتوں کے عذاب میں مجھے دیکھنا

میں نہ مِل سکوں بھی تو کیا ہوا کہ فسانہ ہوں
نئی داستاں نئے باب میں مجھے دیکھنا

مرے خار خار سوال میں مجھے ڈھونڈنا
مرے گیت میں مرے خواب میں مجھے دیکھنا

مرے آنسوؤں نے بجھائی تھی مری تشنگی
اسی برگزیدہ سحاب میں مجھے دیکھنا

وہی ایک لمحۂ دید تھا کہ رُکا رہا
مرے روز و شب کے حساب میں مجھے دیکھنا

جو تڑپ تمھیں کسی آئنے میں نہ مل سکے
تو پھر آئنے کے جواب میں مجھے دیکھنا [۱]

---

[۱] تخلیقی ادب (۴)، کراچی، جولائی ۱۹۸۵ء، ص ۱۱۵

○

جو بیاں ہوتی ہے اشکوں کی زبانی اور ہے
اب کے مژگاں پر لکھی ہم نے کہانی اور ہے
موجِ مضطر چھو کے جب گزری تو عالم اور تھا
دور سے دیکھو تو دریا کی روانی اور ہے
بے نہایت موسموں پر نام اپنا لکھ گیا
اُس کی یہ نامہرباں سی مہربانی اور ہے
دھڑکنوں کی لَو کبھی جلتی کبھی بجھتی رہی
زخم تو گہرا نہ تھا یہ گلفشانی اور ہے
ہاں یقیں آتا نہیں، لیکن یقیں آتا رہا
لوگ جو کچھ بھی کہیں وہ خوش بیانی اور ہے
صرف میرا مسئلہ تھا شدتوں کے درمیاں
شہر میں اُن کے طلسمِ بے زبانی اور ہے
عین ممکن ہے کہ اس نے اس طرح سوچا نہ ہو
زندہ رہنا اور کچھ ہے زندگانی اور ہے
دِل کی باتیں اور سکوتِ بیکراں کے دور میں
مجھ سے مت کہیو حیاتِ جاودانی اور ہے
خوفِ زنداں ہی نہیں خوفِ رہائی بھی رہا
اَب کے ہر صحرا گزیدہ کی نشانی اور ہے [۲]

○

ہوا کی چال پہ ممکن نہیں نظر رکھنا
ہتھیلیوں پہ دُعا کو سنبھال کر رکھنا
کوئی صدا کوئی آواز پا نہیں، نہ سہی
نگاہ پھر بھی اُسی رہ گزار پر رکھنا
نہیں ہے سہل اجالوں سے رابطہ ہونا
بنامِ دل سرِ داماں کوئی شرر رکھنا
خبر نہیں کہ کہاں تک ہے دشتِ تنہائی
مگر وجود کی پرچھائیوں کو گھر رکھنا
بس ایک خواب، جسے ایک خواب کہہ نہ سکوں
نہ جانے کیا ہے جسے دل میں عمر بھر رکھنا
قدیم ہے یہ روایت مرے قبیلے کی
کہ وہ جو دور ہے اُس کو قریب تر رکھنا
نگہ کے اپنے ہی موسم ہیں اپنی ہی دھن ہے
ادا نگہ پہ بھروسا نہ اِس قدر رکھنا [۳]

---

[۲] تخلیقی ادب (۴)، کراچی، جولائی ۱۹۸۵ء، ص ۱۱۶
[۳] تخلیقی ادب (۴)، کراچی، جولائی ۱۹۸۵ء، ص ۱۱۷

○

میں اک نگری روشنی میں اتنی دور تک گئی — غبارِ ہجر چھٹ گیا، شبِ فراق تھک گئی
ستارۂ سفر کو دیکھنے کا ہوش ہی نہ تھا — وہ آنچ ہی کچھ اور تھی جو شہرِ جاں تلک گئی
تمام عمر گفتگو رہی ہمارے درمیاں — جو اِک کرن تھی آ گئی جو اِک کلی چٹک گئی
اٹی ہوئی تھی دھوپ سے جو رہگزر تھی سامنے — دیارِ دل میں کون تھا کہ چاندنی چھٹک گئی
وہ خواب رُت وہ دیپ لَو نہیں کبھی بجھی نہیں — نئے غموں کی آنکھ سے وہ روشنی چھلک گئی
جو میری ہم سفر رہی وہ میری زندگی نہ تھی — وہ میری بے بسی نہ تھی جو راہ میں ٹھٹک گئی
حیاتِ آفریں! مری حیات تجھ پہ قرض ہے — میں آرزو تھی اور دشتِ ہول میں بھٹک گئی
سنا ہے راس آ گئیں ہوائیں زخم زخم کو — سنا ہے اب کے موسموں دلوں سے ہر کسک گئی

کچھ اِس خلوص سے فریبِ زندگی کمائے ہیں
کہ اپنے سامنے اداؔ نگہ جھپک جھپک گئی [1]

○

یہی نہیں کہ زخمِ جاں کو چارہ جُو ملا نہیں
یہ حال تھا کہ دل کو اسمِ آرزو ملا نہیں
ابھی تلک جو خواب تھے چراغ تھے گلاب تھے
وہ رہگزر کوئی نہ تھی کہ جس پہ تُو ملا نہیں
تمام عمر کی مسافتوں کے بعد ہی کھُلا
کبھی کبھی وہ پاس تھا جو چار سُو ملا نہیں
وہ جیسے اک خیال تھا جو زندگی پہ چھا گیا
رفاقتیں تھیں اور یوں کہ روبرو ملا نہیں
تمام آئنوں میں عکس تھے مری نگاہ کے
بھرے نگر میں ایک بھی مجھے عدد ملا نہیں
وراثتوں کے ہاتھ میں جو اک کتاب تھی ملی
کتاب میں جو حرف ہے ستارہ جُو ملا نہیں
وہ کیسی آس تھی اداؔ جو کو بکو لیے پھری
وہ کچھ تو تھا جو دِل کو آج تک کبھو ملا نہیں [2]

○

درد ہی شہرِ ساماں، درد ہی کا پیراہن
آج تک اچھوتا ہے زندگی کا پیراہن

تھا درونِ دل برپا ایک حشرِ بے پایاں
راس کس طرح آتا بے خودی کا پیراہن

سانس ٹوٹ جاتی ہے اَن گنت سوالوں سے
آدمی یہ سمجھا ہے خواب ہی کا پیراہن

دِل اُداس تھا اِتنا، سب دیے بُجھا کر بھی
ملگجا نظر آیا چاندنی کا پیراہن

غم کی اپنی خوشبو ہے، انگ انگ سے پھوٹے
معتبر نہیں ہوگا خامشی کا پیراہن

خود ہی سوچ لو، آخر کب تلک چھپائے گا
خوف کے تعفن کو بندگی کا پیراہن

رقصِ والہانہ کو اِک دیے کی لو کافی
انکشاف کا لمحہ، روشنی کا پیراہن

ہم خرید لیتے ہیں ہم سے پوچھ تو دیکھو
ہر خوشی کی قیمت پر اک خوشی کا پیراہن

اپنے اپنے عالم کا سحر ہے اداؔ ورنہ
بے پناہ ہو جاتا تشنگی کا پیراہن [3]

---

[1] تحقیق ادب (۵)، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۵ء، ص ۲۲۴
[2] تحقیق ادب (۵)، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۵ء، ص ۲۲۵
[3] فنون، لاہور - جون، جولائی ۱۹۸۶ء، ص ۳۶۳

○

ہوا کے سامنے ہر رنگِ کم ادا ٹھہرے
بس اک چراغ کہ بے شعلۂ نوا ٹھہرے

وہ روز و شب بھی کہ جن سے شکایتیں تھیں بہت
اَب اتنی دور سے دیکھا تو دلکشا ٹھہرے

عجیب آئنہ خانہ ہیں گھر کی دیواریں
کہ دل دُکھے بھی تو اپنا ہی سامنا ٹھہرے

کہ جیسے وقت نے وعدہ کوئی لیا ہی نہ تھا
اُسی کو یاد کیا جس کو بھولنا ٹھہرے

کڑی تھی دُھوپ، ہواؤں کی سانس رُکتی تھی
تری گلی تھی جو تیرے برہنہ پا ٹھہرے [1]

○

بے آس ساعتوں میں ترا نام یُوں لیا
خوشبو سے جیسے راہِ سفر کا شگُوں لیا

آنکھوں پہ دُھوپ آئی تو خوابوں کو تج دیا
پھر خواب ہی سے وعدۂ شہرِ فسوں لیا

اک خشمگیں سحر سے انا کا سبق پڑھا
اِک بے چراغ رات سے حُسنِ دروں لیا

اُس روز کائنات کی وسعت بھی کم لگی
حیراں نگاہیوں نے جب اِذنِ جنوں لیا

بھیگی رُتوں، پہاڑ سی راتوں کا سب حساب
میرا تو تھا نصیب، مگر اُس نے کیوں لیا

میں حرفِ زیرِ لب تھی، اُسی نے سُنا مجھے
احوالِ جاں کہا ہے، نہ درسِ سکوں لیا

کِس نے سکھا دئے تھے یہ آدابِ تشنگی
جس ہاتھ نے ایاغ لیا، واژگوں لیا [2]

[1] ماہِ نو، لاہور۔ اگست ۱۹۸۶ء، ص ۸۷
[2] نقوش، لاہور، شمارہ ۱۳۳، ستمبر ۱۹۸۶ء، ص ۳۲۲

○

مری زمیں پہ جو موسم کبھی نہیں آیا
یہی بہت ہے کہ اُس پر مجھے یقیں آیا

میں خود ہی ہجر کا موسم، میں خود وصال کا دِن
مرے لیے مرا روزِ جزا یہیں آیا

تسلیوں سے کہاں بارِ زندگی اُٹھتا
یقیں تو اپنی وفاؤں پہ بھی نہیں آیا

ان آنسوؤں کا سفر بھی ہے بادلوں جیسا
برس گیا ہے کہیں، اور نظر کہیں آیا

ابھی تو قرضِ جمالِ حیات باقی ہے!
تو یہ قرار سا کیوں درد کے تئیں آیا!

رچاؤ، درد سا، بھیگا ہوا دعاؤں سا
کہاں سے ہو کے یہ جھونکا مرے قریں آیا

ہم اہلِ ہجر ستارہ شناس بھی تو نہیں
حسیں تھے خواب سو ہر خواب پہ یقیں آیا [1]

○

گِنے ہوئے تھے قدم، انحراف کیا ہوتا
گناہ، طرزِ نگہ، تھا مُعاف کیا ہوتا

جُھکی ہوئی مری آنکھیں، سِلے ہوئے مرے لب
اب اس سے بڑھ کے ترا اعتراف کیا ہوتا

خود اپنی وحشتِ جاں سے وفا نہ کی ہم نے
زمانہ اور ہمارے خلاف کیا ہوتا

دیے تو اَب بھی دیے ہیں وہ بزم ہو کہ حرم
بجھے ہوئے دل و جاں سے طواف کیا ہوتا

ستارہ تھا بھی تو آنسو کا استعارہ تھا
کسی فلک کا یہاں انکشاف کیا ہوتا

لپکتے شعلوں کو بارش بجھا گئی، لیکن
دُھواں جو گھٹتا رہا ہے وُہ صاف کیا ہوتا

وہی غبارِ تمنّا، وہی شمیمِ دُعا
تو روز و شب میں مرے اختلاف کیا ہوتا [2]

○

نہ کرامتیں کسی خواب کی، نہ کسی یقین کا سائباں
مرے روز و شب میں کہیں نہیں سحر و روز و شب کی گواہیاں

انھیں پڑھ سکو تو کتاب میں یہ جو ریزہ ریزہ ہیں سسکیاں
انہیں چھو سکو تو گلاب میں یہ جو خار خار ہیں انگلیاں

مرا غم بھی تُو ہے خوشی بھی تو، تو سبھی رہِ آخری سمت میں
یہ بتا کہ کیوں مرے قد سے کم ہے مری زمیں مرا آسماں

کہیں کُنجِ دل میں ابھی تلک انھیں نکہتوں کا خرام ہے
کسی ایک لمحۂ درد نے جنہیں لکھ دیا سرِ داستاں

یہ جو انتظار کے رنگ ہیں یہ سبھی بہار کے رنگ ہیں
دلِ بے ہنر کے نصیب میں یہ لکھا گیا ہے کبھی زیاں

یہ جہانِ دانش و آگہی، یہاں کون دِل کے قریں ملے
مگر آج بھی کوئی چشمِ نم، کسی چشمِ نم کی ہے راز داں

لبِ زخم سے جو ادا ہوئیں وہ حکایتیں ہی کچھ اور تھیں
یہ کہانیاں ہیں کچھ اور ہی جو سُنا گیا مرا قصہ خواں [3]

[1] سازِ سخن، نئی دہلی۔ مئی ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۴
[2] سازِ سخن، نئی دہلی، مئی ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۶
[3] اوراق، لاہور۔ جون، جولائی ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۰

○

دیارِ شب میں نہ ہو ہم سا بے خبر کوئی
نہ آنکھ میں کوئی منظر، نہ ہم سفر کوئی

تھکے نہیں ہیں، مگر راہ بھی نہیں کٹتی
پکارتا ہی نہیں جیسے بام و دَر کوئی

خبر کی دُھن میں گھروندے جلا دیے اپنے
دکھوں کو مِل نہیں پایا تھا نامہ بر کوئی

دھواں اٹھا مگر آنکھوں تلک نہیں پہنچا
بِلا نہ شہرِ حزیں، تجھ کو نوحہ گر کوئی

چراغِ درد جلا، یا بجھا، خبر ہی نہیں
کہ ایک عمر سے آیا نہ اپنے گھر کوئی

ہَوا کے دوش پہ رکھا تھا ہاتھ ایک پہر
پھر ایک سانس کو ترسا ہے عمر بھر کوئی

دیا نہیں تھا تو خوشبو کا ہاتھ تھاما تھا
کِھلا ہوا تھا مگر پھول شاخ پر کوئی

سبھی کواڑ کھلے ہیں ہوا کی دستک پر
کہ جیسے خواب ہی آیا ہو لوٹ کر کوئی

اسے رسُولِ تب و تابِ زندگی کہنا
ملے جو قریۂ ویراں میں کوزہ گر کوئی

کِسی یقیں کا اجالا، کسی گماں کی کرن
اداؔ تلاش کرو حرفِ معتبر کوئی [1]

تازہ غزلیں :-

○

آس نہیں، تڑپ نہیں، بابِ عطا بھی کیوں کُھلے
ہم ہیں گرفتۂ دِل ابھی، ہم سے صبا بھی کیوں کُھلے

دِل کا کوئی زیاں نہیں، جاں کا مُعاملہ نہیں
ہاتھ میں اک دیا نہیں، تند ہوا بھی کیوں کُھلے

اب یہ اُداس دِن، ہمیں ساتھ لیے لیے پھرے
خواب تجھے تو کیا رہا، کالی گھٹا بھی کیوں کُھلے

ہاں کسی رہ گزر پہ کچھ نقشِ قدم پڑے رہے
قاصدِ خوش خبر نہیں، شہرِ سبا بھی کیوں کُھلے

عمر تمام کاٹ دی، حسرتِ کاخ و کو لیے
میرے تمہارے سامنے ارض و سما بھی کیوں کُھلے

کوزہ بہ کوزہ بٹ گئیں جتنی بھی تھیں صداقتیں
خالی ہتھیلیوں پہ اب حرفِ دعا بھی کیوں کُھلے

شدتِ رقصِ آرزو اپنا جواز آپ تھی
میری نگاہ پر اداؔ میری خطا بھی کیوں کُھلے

○

کوئی چراغ تو روشن تم اپنے گھر رکھنا
کوئی تڑپ، کوئی منظر ہی آنکھ بھر رکھنا

ہوا کے سامنے شاخِ گلاب جیسی ہو
جھکو تو سر کو اُٹھانے کا بھی ہنر رکھنا

عجیب فیصلہ تھا یہ مرے قبیلے کا
شجر دُعاؤں کے ہوتے بھی بے ثمر رکھنا

تمام شہر دھوئیں سے اَٹا ہوا ہے ابھی
امانتوں کی طرح دِل میں بام و در رکھنا

برس رہے ہیں جو شعلے وہ دِل تک آئیں گے
یہاں بس آئینۂ جاں سنبھال کر رکھنا

ہوائیں ساتھ کوئی کربلا نہ لے آئیں
سو اپنے زخمِ دل و جاں کو راہبر رکھنا

یہیں کہیں تو سحر راستے میں پڑتی ہے
کسی جنوں کو اداؔ اپنا ہم سفر رکھنا

---

[1] فنون، لاہور۔ نومبر دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۰

اداجعفری کے ہائیکو کا اِنتخاب

"——— ہمارے یہاں پہلے پہل ۱۹۴۳ء میں "ہائیکو" کا نام سُنا گیا، جب "اُردو شاعری پر ایک نظر" (کلیم الدین) شائع ہوئی ——— محمد امین کا مجموعہ "ہائیکو" ۱۹۸۱ء کے اوائل میں شائع ہُوا تو اس کی دیکھا دیکھی بہت سے شعراء نے ہائیکو کہنا شروع کر دیئے ——— اِن چار پانچ برسوں میں اُردو میں حیدر گردیزی اور اداجعفری کے ہائیکو بھی مجموعوں کی صورت میں شائع ہُوئے "

(حسین سحر، ماہنامہ اُردو ادب، راولپنڈی، اگست ۱۹۸۵ء، ص ۸۳)

——— اور باتوں سے قطع نظر، یہ بہرحال دُرست نہیں کہ اداجعفری کے ہائیکو کا کوئی مجموعہ شائع ہوا ہو۔ اداجعفری کا پانچواں شعری مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔ اُس میں ہائیکو بھی شامل ہوں گے۔ اداجعفری کے غیر مرتب ہائیکو کی ایک بڑی تعداد، اگلے صفحات میں محفوظ اور پیش کی جا رہی ہے۔

(ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)

زادِ راہ[1]:

یہ دِل آرزو آشنا اور میں
راستوں میں مرے رات کالک بھری ایک دیوار سی
زادِ راہ سفر اِک دیا اور میں

فاصلے :

فاصلے بیکراں
اک کنول رُوپ ہے خواب کی جھیل میں
میں کہاں تو کہاں

وہ لمحہ :

اُسے تو ہوش ہی نہ تھا
کھلی ہتھیلیوں پہ جو نصاب ہجر لکھ گیا
کہ وقت کیسے تھم گیا

کہ پھر سحر نہ ہو سکی :

اُسے خبر نہ ہو سکی
ستارۂ فراق نے ستارۂ سحر سے کیا کہا
کہ پھر سحر نہ ہو سکی

آس :

دیپک بھی جلا رکھنا
شاید کوئی پردیسی گھر لوٹ کے آجائے۔
مجرا بھی بنا رکھنا

اثبات :

نظر اٹھا کے دیکھ لے
کہ دِل نہیں بہانہ خو، کہ گھر میں آج بھی ہے تو۔
کبھی تو آ کے دیکھ لے

---

[1] "زادِ راہ"، سے "بازارِ سود و زیاں میں" تک کے ہائیکو "تخلیقی ادب" شمارہ ۳، کراچی۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۸۳ء سے ماخوذ ہیں

مَیں اور تو :

میں اتنا ہی جانوں
ایک تو میرے من کا آنچل دوجا تیرا رنگ
اور کِسے پہچانوں

تو اور مَیں :۔

میں بے بہرہ میں انجان
تو اور تیرا تیکھا گہرا سچا اجلا رنگ
اور یہ رنگ مری پہچان

ایک آنسو ہی تھا :

ایک آنسو ہی تھا
رات کی جھیل میں اِک ستارہ گرا
کس سے کیا کہہ سکا۔

نارسائی :

مرا حصّہ بس اِک محدود جلوہ ہے۔
یہ آنکھیں وسعتِ افلاک کی رعنائیوں کو داد کیسے دیں۔
کہ مَیں نے آسماں کو روزنِ زنداں سے دیکھا ہے

التماس :

نہیں رکو نہیں
یہ سارے خواب تتلیوں سے ہیں
انھیں چھوڑ نہیں

قبیلۂ فراق میں :

جو دِل میں ہے نہ کہہ سکیں
کہ اختیار کا رواج ہی نہیں
قبیلۂ فراق میں

مجبور :

حدودِ اذن میں رہو
گئی رتوں کا ذکر کیا نئی رُتوں کی فکر کیوں
جو سب کہیں سو تم کہو

اعتراف :

مولا! میری تقصیریں ہیں
دِل میں سچے اُجلے حرف ہیں لب پر اندھی گونگی خاموشی ہے
میں ہوں میری زنجیریں ہیں

اَے دِلِ بے ہُنر :

پھُول کی پتّیاں نوچ کر
آندھیوں کی گلی میں بچھا دی گئیں
اے دِلِ بے ہُنر!

سوغاتیں :

اک وحشی رات کی باتیں ہیں
کچھ گہنے مجرے خوشیوں کے کچھ روپک دیپک زخموں کے
سب من مانی سوغاتیں ہیں

انتظار کیوں :

نہ آ سکا قرار کیوں
چراغ موجِ آب کے سپرد کر چکی ہو تم
تو اب یہ انتظار کیوں

مشورہ :

دل کو سہج سہج سمجھاؤ
گیلی شاخ دھواں دیتی ہے
غم کو دھیرے دھیرے برتو

اندیشے :

بس آج رُو بَرُو نہ ہو۔
شکستہ آئنوں کے زخم زخم عکس میں
خدا کرے کہ تو نہ ہو

حادثہ :

شہر کا شہر کجلا گیا
ابر سا چھا گیا کس نے آنسو پیے
کیا کوئی دِل دُکھا

اُس دِن

اس دِن آنچل دھانی تھا
اب ریت کے تانے بانے سے اِک چادر بُن کر اوڑھی ہے۔
وہ پہلا رُوپ کہانی تھا۔

بارشوں کے موسم میں :

ریت سی برستی ہے
ایک بوند پانی کو بارشوں کے موسم میں
آنکھ کیوں ترستی ہے

کبھو نہ ہو :

یہ سانحہ کبھو نہ ہو
کہ میں نمازِ ہجر پڑھ سکوں
اور آنکھ باوضو نہ ہو

بے پناہ :

کچھ اور سوچنا گناہ تھا
زمانِ ہجر میں دعا کا حرف تک نہ یاد آسکا
غم اتنا بے پناہ تھا۔

مجبوریاں :

بے سبب بھی ہوتا ہے برملا بھی ہوتا ہے
بھولنا جسے چاہیں بار بار یاد آئے، سوئے درنگہ جائے
دِل شکن بھی ہوتا ہے دِل رُبا بھی ہوتا ہے۔

خراج :

نہیں ہے جرأت حرفِ تکلم بھی
کہ دُنیا میں قدم دھرتے ہی گردی رکھ چکی ہوں میں
غموں کی شام بھی صُبحِ تبسم بھی

ورثہ :

نہیں جیون کی ریکھا اس ہتھیلی میں
ترا ورثہ فصیلِ بے بسی، کربِ تمنا، رنجِ تنہائی
کہ تو پیدا ہوئی اُونچی حویلی میں

صدیوں کا سفر :

ابھی تک دعا کی گھڑی ہے
ہزاروں برس سے ہتھیلی پہ حرفِ تمنا اٹھائے
وہ لڑکی ابھی تک کھڑی ہے۔

آخری ہدیہ :

بس ایک قرض اور ہے
کہ اپنی ذات اپنے خواب کی نفی پہ دستخط کروں
یہ ایک قرض اور ہے۔

ممنوع :

کہنے والا کہوے
تو تو خود نینوں کا سپنا
تو کیوں سپنے دیکھے

مہرباں قاصد :

شمیمِ گل کوئی پیغام سا لائی
کہ جیسے حلقۂ زنجیرِ ہجراں ٹوٹتا جائے
ہوا کیا اُس کو چھو کر میرے پاس آئی

شہرِ جاں :

مُسافر لمحہ چوکھٹ پر کھڑا ہے
مَیں اتنا تو جبینِ وقت پر تحریر کر جاؤں
عناصر سے ابھی انساں بڑا ہے

خواب آفریں :

تم بھی میرے ساتھ ہی سہنا
آنکھوں سے خوابوں کی ہجرت کا موسم ہے
مولا ! میرے پاس ہی رہنا

بن باس :

سندیسہ ہواؤں کا ملنے سے پہلے
لکھا ہے کہ آنکھوں کو صدیوں کا بن باس بھی کاٹنا ہے
نئے پھول کھلنے سے پہلے

خالی گھر :

سبھی سہمے ہوئے ہیں کس سے کہتے ہیں
دلوں میں اتنے ہیبتناک سناٹے کبھی پہلے نہیں دیکھے
کہ اب آسیب خالی گھر میں رہتے ہیں

برہا :

کیا اوس کی آہٹ ملتی ہے
مَیں سج دھج دیکھوں محلوں کی کوئی اتنا آ کے بتا دیتا
کیا اب بھی جوہی کھلتی ہے۔

آئینے :

یا صبحِ ازل ہی اب تک ہے
یا پھول کے اُجلے آنچل میں اک حرفِ دعا سا سوتی ہے
یا ماں کی گود میں بالک ہے

حرفِ دُعا :

دیارِ گل کی سیر ہو
اور اس طرح کہ دِل کی ہر کلی کھلی ملے
مری زمیں کی خیر ہو

مُسافتیں :

جو دل ستارہ خو نہ ہو
نہ بادباں کھلے کبھی نہ سائباں ملے کہیں
پناہ چار سو نہ ہو۔

بازارِ سود و زیاں میں :

دل سخی تھا اور ایسا سخی تھا
کہ لوگوں کے دامانِ کوتاہ دیکھے نہیں
اور لعل و جواہر لٹاتا رہا

○

مشہور جاپانی شاعر باشو (۱۶۴۴ء - ۱۶۹۴ء) کی ہائیکو کے اختیاری تراجم

نیلا ساگر، نیلی لہریں
نیل گگن میں اُترا ماہ تمام
ہاتھ میں جیسے جام!

چاندنی چھٹکی ہوئی
پیڑ کو دیمک مگر کھاتی رہی
ایسے میں بھی!

بدلی گھر کر آئی تھی
واپس اپنے گھر تک آ پہنچا درویش
چھتری ہاتھ میں تھی! ع۱

○

جلا وطن :

مہکی تھی پُروا ایک دن
جلتا ہُوا یہ دھوپ بن ایسے میں اب کہنا بھی کیا
گوندھا تھا گجرا ایک دن ع۲

○

ہوا زرد ہے
آؤ اگلی رُتوں کی دُعا اوڑھ لیں
شہرِ دل کی فضا سرد ہے

کلس تک آ گئے سائے
پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف چلے
مرے بچے کب آئیں گے ع۳

ع۱ چھٹے ہائیکو مشاعرے (باہتمام ثقافتی مرکز، قونصل خانہ جاپان، کراچی، منعقدہ ۱۴ جنوری ۱۹۸۸ء میں پیش کی گئیں۔

ع۲ مہک گل داؤدی کی، جاپانی ثقافتی مرکز، کراچی: ۱۹۸۹ء، ص ۲۷

ع۳ سازِ سخن، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، نئی دہلی۔ مئی ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۲

ع۴ اُردو ادب، راولپنڈی، ہائیکو نمبر، اگست ۱۹۸۵ء، ص ۳۶

ہائیکو کیوں؟

ادا جعفری

"ہائیکو کیا ہے؟ عام ذہن میں ہائیکو کے بارے میں جو اوّلین سوال تھا وہ یہی تھا ۔ اس سوال کا جواب گزشتہ چار پانچ سال کی مدت میں بڑی تفصیل سے اور بار بار دیا گیا ہے ۔ یہ بات اب پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ خوبصورت جاپانی صنفِ سخن ہم پاکستانیوں کے لیے اب اجنبی نہیں رہی ہے —

ہائیکو کیوں؟ یہ سوال ان چار پانچ سال کے عرصے میں مجھ سے بڑے تواتر کے ساتھ کیا گیا ہے ۔ استفسار کے طور پر بھی اور بحث کے پیرائے میں بھی ۔

جاپان کی مقبول ترین صنفِ سخن ہائیکو میں میرے لیے دل پذیری اور کشش کی وجہ کیا تھی ، میں بہ حیثیت اُردو ہائیکو نگار اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گی ۔

بے شک صنفِ غزل کی شکل میں ہمارے شاعروں کے پاس ایک جیتا جاگتا ہزار شیوہ محبوب موجود ہے ۔ ہماری جذباتی ، سماجی ، معاشی اور سیاسی زندگی کا کوئی پہلو سوچ کی کوئی لہر اور تجربہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے اظہار پر ہماری غزل کا ایک شعر ، صرف دو مصرعے مکمل طور پر حاوی نہ ہوں ۔ قدرت نہ رکھتے ہوں اور شاعری کے تمام تر حُسن و دلبری کے ساتھ ۔ ابلاغ کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ۔ سوال یہ تھا کہ غزل کی موجودگی میں ہائیکو کیوں؟ اس کا ایک آسان جواب تو یہ کہ ہائیکو میں مجھے کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی بلکہ بیک وقت اُردو غزل ، نظم اور گیت کا آہنگ ملا ۔ ان تینوں اصنافِ سخن سے علٰیحدہ بھی اور ان تینوں کا بلیغ استعارہ بھی ۔ اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہائیکو میرے لیے اپنی ایک جانی پہچانی لیکن گم شدہ دنیا کی بازیافت بھی ہے ۔ مجھے یوں لگا جیسے ہائیکو کے دریچے سے ہماری شاعری ایک بار پھر حُسنِ فطرت سے ہمکلامی کا شرف حاصل کر رہی ہے —

ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے شعر و ادب نے مغربی طرزِ فکر اور طرزِ اظہار کا نمایاں اثر قبول کیا ہے ۔ نثری ادب میں مختصر افسانہ اور شاعری میں نظمِ مُعرّیٰ ، سانیٹ اور آزاد نظم وغیرہ مغربی ہواؤں کے لائے ہوئے تحفے ہیں ۔ ہائیکو ہماری شاعری میں مشرق کی جانب سے آنے والا پہلا عنبر بیز جھونکا ہے ۔ "

بے شک مناظرِ فطرت کی تصویر کشی اُردو نظموں ، مثنویوں بلکہ مرثیوں تک میں ہوئی ہے ۔ ہمارے قدیم گیتوں میں فطرت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ سانس لیتی ہوئی ملتی ہے جہاں برسات کی پہلی پھوار گجرے پروتی اور بارش کی جھڑی اندیشوں کو جنم دیتی ۔ جہاں کاگا سندیسہ لے کر جاتا ہے ۔ پپیہا ترجمان بنتا ہے اور کوئل رازداں ٹھہرتی ہے ، اور پھر بارہ ماسہ ، جس میں ساری بات ہی موسموں کے حوالے سے ہوتی ہے ۔

یہ بھی نہیں ہے کہ ہم شاعروں نے جان بوجھ کر فطرت کی رعنائیوں اور دلربائیوں سے اغماض برتا ہو ۔ اس کی سحر کاری سے انکار ممکن ہی نہیں ہے ۔ ہماری جدید شاعری میں مظاہر فطرت استعارہ بن جاتے ہیں ۔ اور جذبہ اپنی

رونمائی کا بہانہ بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔ ہوا کل بھی نامہ بر تھی اور آج بھی ہے ۔ یہ تو ایک نامعلوم اور نامحسوس طریقے پر ہوا کہ انسان مناظرِ قدرت سے خوشی اور تسکین حاصل کرنا بھول گیا ۔

آج کے دَور میں جب عام آدمی مادّی اقدار کی میزان پر نفع و نقصان کا سودا چکا رہا ہے ہمارے شاعروں کے لیے ہائیکو کے وسیلے فطرت سے ہم آہنگی کا رجحان نہایت پُرکشش ثابت ہوا ۔

یہ کہنا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے ہائیکو کا تقابل غزل کے شعر سے مناسب نہیں ہے ۔ ہائیکو میں شاعری کے حوالے سے کسی ایک لمحے کی منظر کشی ہوتی ہے جب کہ غزل کے شعر میں کسی لمحے کے حوالے سے جذبے کی صورت گری غزل کے شعر اور ہائیکو میں حُسنِ مشترک اس کا ایجاز و اختصار اور ایمائیت اور رمزیت ہے ۔ ہائیکو منظر نمائی کا ایک والہانہ انداز ہے ۔ جب کہ غزل خود اپنے ہزار رنگ رکھتی ہے ۔ اس طرح خود شاعری کا جمالیاتی رویّہ ہائیکو اور اُردو شاعری کے درمیان ایک رابطہ بن رہا ہے ۔ اختصار اور اجمال ہائیکو کی خصوصیت ہے ۔ اس لیے غزل کے شعر کی طرح ہائیکو سے بھی سرسری برتاؤ نہیں کیا جا سکتا اور نہیں کرنا چاہیئے ۔ بہ حیثیت اُردو ہائیکو نگار شاید مجھے یہ حق پہنچتا ہے ـــــ اور کبھی کبھی حق خود حاصل کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہوتا ـــــ کہ اُردو ہائیکو نگاری کے بارے میں اپنی ترجیحات بیان کروں ـــ

جب ہم ایک نئی صنفِ سخن کو اپناتے ہیں تو اس کے ساتھ انصاف کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور اپنی شاعری میں اس کو ایک پائیدار اور مستقل مقام دینے کے لیے کچھ پابندیاں بھی قبول کرنا ہوتی ہیں ۔ ہر صنفِ سخن اپنی ایک شناخت ایک پہچان رکھتی ہے اور اس کی مخصوص ہیئت اور ساخت کے ساتھ اُس کو اختیار کرنا ہوتا ہے جس کی مثالیں ، اردو شاعری میں موجود ہیں ۔

اُردو ہائیکو نگاری کے لیے بھی اُردو شعر و سخن کے حُسن و جمال ، تقاضوں ، اور رویوں کا التزام اور احترام کرتے ہوئے جاپانی ہائیکو کے مزاج سے ہم آہنگی ضروری ہے جس کی اوّلین شرط ہیئت کی پابندی ہے ۔ ہم ایک نئی صنفِ سخن کو اُردو میں متعارف کر رہے ہیں تو اُسے ایک مکمل اور منفرد صنفِ سخن کی حیثیت سے ہی برتنا اور پیش کرنا ہو گا ۔ موضوعات کی پابندی اب جدید جاپانی ہائیکو میں بھی لازمی نہیں رہی ہے ۔ لیکن نظم کے تینوں مصرعوں کی ساخت کا جو انداز ہائیکو کی شناخت اور خصوصیت ہے اس کو اختیار کیے بغیر ہائیکو بحیثیت ایک علیحدہ صنفِ سخن اُردو شاعری میں کوئی مقام یا نام حاصل نہیں کر سکتی ۔ تین ہم وزن مصرعے ہائیکو نہیں ہوتے کیونکہ ہماری شاعری میں مثلث ، ثلاثی اور ماہیا موجود ہے ، صرف اختصار یا کفایتِ لفظی بھی ہائیکو کی شناخت قرار نہیں دی جا سکتی ۔ اُردو میں ایک مصرعہ کی نظم کے نمونے بھی مل جائیں گے ۔

ہائیکو کی انفرادیت اور پہچان ہی یہ ہے کہ اُس کا پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم وزن اور درمیانی مصرعہ نسبتاً طویل ہوتا ہے ۔ ایک یا دو یا چند ارکان زیادہ ۔ اگر ہم پابندی کو ملحوظ نہیں رکھیں گے تو اس کو مثلث یا ثلاثی کہنے میں کیا امر مانع

ہے ، بلکہ اس کا امکان بھی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اُردو شاعری میں تین مصرعوں کی نظم تو باقی رہے لیکن ہائیکو کا وجود بہ حیثیت ایک صنف سخن اپنی معنویت سے محروم ہو جائے ۔

ہائیکو کے لیے کسی ایک بحر کی پابندی غیر ضروری ہے ۔ ہمیں اپنی اردو شاعری کے مزاج کو بھی مدِ نظر رکھنا ہے ۔ ہمارا تجربہ ہے کہ رباعی صرف اوزان اور بحر کی پابندی کی وجہ سے رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی ہے ۔

پاکستانی شاعروں کی ہائیکو سے انفرادی دل چسپی کا سُراغ تو بہت دُور تک ملتا ہے لیکن ہمارے شعرا کے حلقے میں جاپان کی اس مقبول ترین صنفِ سخن کو جو غیر معمولی اور اجتماعی پذیرائی حاصل ہوئی اُس میں جاپان کلچرل سینٹر کے منعقدہ مشاعروں نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے ۔

دوست ممالک سے جو رشتے ہوتے ہیں وہ ہمیشہ حکومتی اور سیاسی سطح پر ہوتے ہیں ۔ جاپان کونسلیٹ کے ان سالانہ مشاعروں نے عوام سے عوام ذہنی ہم آہنگی کا ایک نیا اور روشن سلسلہ بھی قائم کیا ہے ـــــ"

[قومی زبان ، کراچی ، جولائی ۱۹۸۸ء ص ۲۹ــ۳۱]



بشیر منذر

غیر مطبوعہ مجموعۂ نعت
نیاز
سے انتخاب

○

سرمایۂ جاں ہیں شہِ ابرار کی باتیں
کس درجہ سکوں دیتی ہیں سرکارؐ کی باتیں

کرتے ہیں کرم سب پہ کہ عادت ہے یہ اُنکی
سنتے ہیں وفادار و خطاکار کی باتیں

ہاں کیسے ہیں وہ کوچہ و بازار وہ گلیاں
کچھ اور کرو شہرِ پُر انوار کی باتیں

ہاں کیسے برستا ہے وہاں نُور کا بادل
کچھ اور کرو گنبدِ ضو بار کی باتیں

ہاں کیسے وہاں چلتی ہیں قسم قسم کے ہوائیں
کچھ اور ہوں رُکتی ہوئی مہکار کی باتیں

ہاں کیسے وہاں لُٹتی ہے الطاف کی دولت
کچھ اور کرو دہر کے مختار کی باتیں

جی چاہے ہے کہ ہر آن سُنوں ذکرِ پیمبرؐ
ہر آن ہوں کونین کے سردار کی باتیں

۶ر مارچ ۱۹۸۸ء

○

درِ اکرام وا ہونے لگا ہے
مجھے اِذنِ ثنا ہونے لگا ہے

عنایت کی نظر مجھ بے ہنر پر
میں حیراں ہوں یہ کیا ہونے لگا ہے

ہوئی یادِ آپؐ کی دِل میں فروزاں
یہ گھر اب خوشنما ہونے لگا ہے

دُکھی دِل پر کرم کا ابر برسا
یہ بُوٹا بھی ہرا ہونے لگا ہے

عجب شے ہے خیالِ چشمِ سرکارؐ
کہ غم بھی دلربا ہونے لگا ہے

ملی ناچیز منذر کو بُلندی
یہ ذرہ خاکِ پا ہونے لگا ہے

۱۳ر فروری ۱۹۸۴ء

○

پُر نور ہیں خواب کیسے کیسے
دیکھے مہتاب کیسے کیسے

سیرت کی کتاب پڑھ رہا ہوں
کھُلنے لگے باب کیسے کیسے

رحمت کی گھٹا برس رہی ہے
چھائے ہیں سحاب کیسے کیسے

جب آپؐ سے کوئی لو لگائے
مِلتے ہیں خطاب کیسے کیسے

جب دِل میں اترتی ہے تجلی
اُٹھتے ہیں حجاب کیسے کیسے

دامانِ حضورؐ تھام منذر
دیتے ہیں حساب کیسے کیسے

۲۲ر جنوری ۸۸ء جمعۃ المبارک

○

سبز گنبد کی زیارت میری قسمت میں بھی ہو — حاضری کی کوئی صورت میری قسمت میں بھی ہو
جگمگاتی ان فضاؤں میں پہنچ جاؤں کبھی — اُن گلی کوچوں کی نکہت میری قسمت میں بھی ہو
اُس حرم کے پاس ڈھونڈوں میں بھی تھوڑی سی جگہ — کیا عجب وہ چشمِ رحمت میری قسمت میں بھی ہو
کھنچ کے آجائیں سبھی جلوے نظر کے سامنے — ایسا لمحہ، ایسی ساعت میری قسمت میں بھی ہو
خود خدا جس کی ثنا خوانی میں ہے رطب اللسان — اس شہِ عالمؐ کی مدحت میری قسمت میں بھی ہو

لے کے جاؤں گا بھلا مُنذرؔ میں کیا اُنکے حضور
کوئی تو اشکِ ندامت میری قسمت میں بھی ہو

فروری ۱۹۸۴ء
۲۸، نومبر ۱۹۸۸ء

○

آؤ چل کر اِس درِ عالی کی دربانی کریں — رات دِن حُسنِ دوعالم کی ثناخوانی کریں
کیا خبر کب پھیل جائے سات رنگوں کی دھنک — کیا خبر کِس دِن وہ کیسی جلوہ سامانی کریں
کب نگاہیں دیکھ لیں رنگِ تبسم کی جھلک — کب وہ کملی کو جھٹک کر عنبر افشانی کریں
دھر کے اُن قدموں پہ سر کر لیں نصیبوں کو بلند — بن کے اِس شہ کے گدا دُنیا کی سُلطانی کریں
حالِ دِل اُن پر عیاں ہے روزِ روشن کی طرح — بے طلب ہی، کیا خبر، کیا کیا وہ ارزانی کریں

آج وہ نوریں بدن مُنذرؔ! ہُوا جلوہ نما
آنکھیں اپنی کیوں نہ حاصل عکسِ نورانی کریں

۳، جولائی ۱۹۷۸ء معراج شریف

○

کریں مجھ پر کرم خیرالانامؐ اے کاش ایسا ہو — بنا لیں مجھ کو بھی اپنا غلام اے کاش ایسا ہو
کئی طیبہ سے ہو آئے کئی تیار بیٹھے ہیں — مرے بھی نام آجائے پیام اے کاش ایسا ہو
زہے قسمت دُرودوں کو حضوری کا شرف بخشیں — قبول آقاؐ کریں میرا سلام اے کاش ایسا ہو
مری آنکھوں میں بس جائیں رُخِ پرنور کی کرنیں — لبوں پر نام ہو ان کا مدام اے کاش ایسا ہو
جو دل دھڑکے تو پھوٹیں دھڑکنوں سے نعت کے نغمے — ہو شامل میرا لحنوں میں نام اے کاش ایسا ہو

بگاڑا میں نے خود اپنا مقدر اپنے ہاتھوں سے
سنواریں کام وہ میرے تمام اے کاش ایسا ہو

۲۱، فروری ۱۹۸۸ء

○

تخلیق کے عمل کا سرآغاز آپؐ ہیں
خلاقِ کائنات کے ہمراز آپؐ ہیں

جس نے دیا پیام کہ اللہ ایک ہے
کوہِ صفا سے جس نے دی آواز آپؐ ہیں

انسان کے دُکھ کی آپؐ سے بڑھ کر کسے خبر
ہر بے کس و یتیم کے دمساز آپؐ ہیں

اِنسان کو خیر و شر کی تمیز آپؐ سے مِلی
جس نے سکھائے جینے کے انداز آپؐ ہیں

جاہ و حشم پہ ناز ہے سارے جہان کو
مُنذرؔ کا ناز آپؐ ہیں، اعزاز آپؐ ہیں

۲۴۔جنوری ۱۹۸۸ء

○

تمہارے ہم ہیں غلام آقاؐ
قبول کر لو سلام آقاؐ
ہم اُمتی ہیں تمہارے مولاؐ
تم انبیاء کے امام آقاؐ
تمہاری عالی ہے شانِ شاہا
تمہارا اعلیٰ مقام آقاؐ
تمہاری آمد کی برکتوں سے
بدل گئے صُبح و شام آقاؐ
سکون دیتا ہے جان و دِل کو
تمہارا محبوب نام آقاؐ
مثال ہے آج بھی جہاں میں
تمہارا حُسنِ کلام آقاؐ
کبھی تو آؤ ہمارے گھر میں
کرو تو اِک شب قیام آقاؐ

۲۵، دسمبر ۱۹۸۵ء

○

مَیں خطاکار و گنہ گار کرم ہو مجھ پر
میرے آقاؐ مری سرکارؐ کرم ہو مجھ پر

آپؐ انوار کا چشمہ ہیں زمانوں کے لیے
آپؐ رحمت کی ہوا سارے جہانوں کے لیے
دہر ہے درپئے آزار کرم ہو مجھ پر
میرے آقاؐ مری سرکار کرم ہو مجھ پر

یا نبیؐ روگ مرے جی کو لگے ہیں کیا کیا
درد و غم، رنج والم میں نے سہے ہیں کیا کیا
میں کرم کا ہوں سزاوار کرم ہو مجھ پر
میرے آقاؐ مری سرکارؐ کرم ہو مجھ پر

○

ویکھو رب دا ماہی آیا، ماہی ویکھن والا اے
شکل نورانی، چال شہانہ، مٹھڑا بولن والا اے
کیہہ عیسیٰ تے کیہہ نا عیسیٰ سبھ اوسے دل تکدے نیں
اوہو حشر دیہاڑے سبھ دیاں شرماں رکھن والا اے
اُتے ذکر کریندے پنچھی، تھلے گلاں اوس دیاں
ایہہ دُکھ وڈن والا اے نا اوہ دُکھ وڈن والا اے
اوسے دل لگیاں ہونیاں نیں نظراں کُل مخلوق دیاں
سُن کے جیہڑا مندڑے بول دعاواں دیون والا اے
جس دا ہتھ سنیہا گھل کے میں کجھ عرض گزاری سی
سنیا اے اوہ کرماں والا جھونکا پرتن والا اے
اوہو گرمی سردی اندر دردی سبھ مسکیناں دا
اوہو روز یتیماں اندر خوشیاں ونڈن والا اے
کوئی اسماناں تے مَنذر عطر چھلیل ترونک گیا
تارے اک دوجے نوں پُچھن کون اج لنگھن والا اے

۱۱؍ جون ۱۹۸۴ء

○

گنبدِ بے دَر کُھلا کِس کے لیے
منتظر تھا خود خدا کِس کے لیے

نَو بنو منظر جگائے رات نے
راہ میں جلوے بچھائے رات نے
رنگ تھے نغمہ سرا کِس کے لیے
گنبدِ بے دَر کُھلا کِس کے لیے

کِس لیے مہتاب کی چادر تنی
کِس کی خاطر کہکشاں رستہ بنی
تھا براقِ باد پا کِس کے لیے
گنبدِ بے دَر کُھلا کِس کے لیے

کِس کی خاطر نبضِ دوراں رُک گئی
کیوں اَدب سے چشمِ فطرت جھک گئی
کون تھا مہماں، چلا کِس کے لیے
گنبدِ بے در کُھلا کِس کے لیے

سج گئے کِس کے لیے ہفت آسماں
خیر مقدم کِس کا تھا تا لامکاں
بولے قدسی مرحبا کِس کے لیے
گنبدِ بے در کُھلا کِس کے لیے

۲۱؍ اکتوبر ۱۹۸۹ء

بشیر منذر

گیت

شام سے پہلے آجانا
کالی رات سے ڈر لگتا ہے
تجھ بِن سُونا گھر لگتا ہے

○

ابھی تو گھر کا کھُلا ہوا یہ دروازہ ہے
ابھی تو ہر اک پھُول بھی گجروں کا تازہ ہے
ابھی تو میرے آنگن میں ہے سماں سہانا
شام سے پہلے آ جانا

○

دھیان کی لہریں آہٹ پر ہیں کان لگائے
آنکھ کی تِتلی رستہ دیکھے پَر پھیلائے
کب سے کھڑی ہوں لے کے محبت کا نذرانہ
شام سے پہلے آ جانا

○

شام ڈھلے تو پنچھی بھی گھر کو لوٹ آئیں
تو بھی آ کہ آس کی نبضیں ڈوب نہ جائیں
ساتھی مست ہوا کا جھونکا بن کر آنا
شام سے پہلے آ جانا

○

۱۳ مئی ۱۹۸۲ء

سوچ رہا ہوں اِک دِن تجُھ سے
دِل کی باتیں کہہ ہی ڈالوں

○

چُپکے چُپکے میں نے تجُھ سے پیار کیا ہے
خوشیاں دے کر اک انجانا درد لیا ہے
کتنی بار یہ چاہا تجُھ سے تجھے چُرا لوں
سوچ رہا ہوں اِک دِن تجُھ سے
دِل کی باتیں کہہ ہی ڈالوں

○

چُپکے چُپکے تیری ہنسی کے پھُول چُنے ہیں
لے کے تری آواز کا ریشم گیت بُنے ہیں
کتنی بار یہ چاہا تجھے گیتوں میں سجا لوں
سوچ رہا ہوں اک دِن تجھ سے
دِل کی باتیں کہہ ہی ڈالوں

○

چُپکے چُپکے تیرا ہوا پر نام لکھا ہے
تیرے نام محبت کا پیغام لکھا ہے
کتنی بار یہ چاہا تجھے یہ نام دکھا لوں
سوچ رہا ہوں اک دِن تجھ سے
دِل کی باتیں کہہ ہی ڈالوں

○

۱۸ اگست ۱۹۸۱ء

کُھل گیا سُورج کا دروازہ
چلیں ہوائیں تازہ تازہ

○

راگ اور رنگ نے لی انگڑائی
لہروں نے چھیڑی شہنائی
ٹوٹا خاموشی کا جادو، بکھرا نیندوں کا شیرازہ
کُھل گیا سُورج کا دروازہ

○

پنچھی جاگے، کلیاں جاگیں
بستی کی سب گلیاں جاگیں
جاگے خوشبوؤں کے جھونکے سُن کر فطرت کا آوازہ
کُھل گیا سُورج کا دروازہ

○

کرنوں نے گھونگھٹ سرکایا
پُروا نے آنچل لہرایا
چھم چھم آئی صبح کی رانی، آنکھ میں کاجل، مُکھ پہ غازہ
کُھل گیا سُورج کا دروازہ

○

۲۱ اکتوبر ۱۹۸۰ء

آس کی نیّا ہے پاس ہمارے
اُتریں گے جیون کے پار
ساتھی
ہاتھوں میں لے پتوار

○

یہ کالی گھنگھور گھٹائیں یہ طوفانی لہریں
اپنا راستہ روک سکیں نہ، دریا، پربت، نہریں
ہمت ہو تو گر جاتی ہے رہ کی ہر دیوار
ساتھی
ہاتھوں میں لے پتوار

○

آندھی آئے، بجلی چمکے، محنت کام ہمارا
کیا پانی، کیا مٹی سب پر لکھا نام ہمارا
اپنے دم سے جگ کی رونق، ہم جگ کے معمار
ساتھی
ہاتھوں میں لے پتوار

○

جو کرنا ہے آج کریں گے کل دیکھا ہے کس نے
سکھ کا لمحہ مِلا اسی کو محنت کی ہے جس نے
آ کہ بدل سکتے ہیں ہم بھی جینے کے معیار
ساتھی
ہاتھوں میں لے پتوار

○

۶ مئی ۱۹۷۷ء

نیل گگن کی پیشانی پر چاند کا جھومر لہرایا
کوئی مجھ کو یاد آیا

○

رات نے اپنا گھونگھٹ کھولا، رنگوں کی برسات آئی
تاروں کے جھرمٹ سے نکل کر، کرنوں کی بارات آئی
جانے رُت نے کس کی خاطر روپ کا ساگر چھلکایا
کوئی مجھ کو یاد آیا

○

چلنے لگیں مخمور ہوائیں، خاموشی کا ساز لئے
ناچ اُٹھیں متوالی موجیں، چھن چھن کی آواز لئے
لگتا ہے فطرت نے اپنی پائل کو ہے چھنکایا
کوئی مجھ کو یاد آیا

○

اُڑنے لگے آوارہ بادل، کوئی کہیں اور کوئی کہیں
ملنا بچھڑنا اک دھبے سے دور بھی ہیں اور دور نہیں
کیسے کیسے منظر دیکھے، جو دیکھا دل کو بھایا
کوئی مجھ کو یاد آیا

○

یکم مئی ۱۹۸۲ء

سنور سنور کے نہ آؤ مرے خیالوں میں
میں جانتا ہوں کہ مجھ سے تمہیں محبت ہے

○

کچھ اَور دیر زمانے میں تم رہو تنہا
کچھ اَور دیر محبت کے دُکھ سہو تنہا
کچھ اَور دیر مرے دِل کو چھوڑ دو تنہا

○

جنوں کے ساتھ خرد کے مقام بھی تو ہیں
مری نگاہ میں یہ صبح و شام بھی تو ہیں
مجھے زمانے میں کچھ اور کام بھی تو ہیں

○

مرے وطن میں نئے دور کی مہورت ہے
مرا وطن کہ محبت سے خوبصورت ہے
مرے وطن کو مری جاں مری ضرورت ہے

○

سنور سنور کے نہ آؤ مرے خیالوں میں
میں جانتا ہوں کہ مجھ سے تمہیں محبت ہے

○

دسمبر ۱۹۷۱ء

بشیر منذر

غیر مطبوعہ مجموعۂ غزلیات و نغمات

شاخ در شاخ

سے انتخاب

○

ہر نئے درد کا عنواں ہیں ہم
شاخ در شاخ غزل خواں ہیں ہم

اپنے چہرے پہ سجائے کوئی
صورتِ زلفِ پریشاں ہیں ہم

کِس طرح قُرب ترا حاصل ہو
کوئی دامن نہ گریباں ہیں ہم

کون اپنائے گا محفل میں ہمیں
کوئی ٹوٹا ہوا پیماں ہیں ہم

ایک بھی اشک نہیں آنکھوں میں
کسقدر بے سر و ساماں ہیں ہم

نت نیا زخم دیا ہے تُو نے
اے زمانے ترے قرباں ہیں ہم

زندگی کیسے کٹے گی منذر
بس اسی سوچ میں غلطاں ہیں ہم

—— ۱۹۔ فروری ۱۹۵۵ء

○

اچھے کبھی بُرے ہیں حالات آدمی کے
پیچھے لگے ہوئے ہیں دن رات آدمی کے

رخصت ہوئے تو جانا سب کام تھے ادھورے
کیا کیا کریں جہاں میں دو ہاتھ آدمی کے

مٹی سے ہی بنا ہے مٹی میں جا ملے گا
اُڑتے پھریں گے اک دِن ذرّات آدمی کے

اک حسرتوں کا صحرا ، سوچوں کا اِک الاؤ
کتنے وبال یارب! ہیں ساتھ آدمی کے

اِس دورِ ارتقاء میں منذر قدم قدم پر
پامال ہو رہے ہیں جذبات آدمی کے

—— ۳۰ جنوری ۱۹۶۸ء

○

زخم کھا کے خنداں ہیں پیرہن دریدہ ہم
زندگی کا نوحہ ہم وقت کا قصیدہ ہم

جانے طبع کے ہاتھوں کون گھاٹ اتریں گے
شہر سے گریزاں ہم، دشت سے رمیدہ ہم

زندگی کی آنکھوں میں رات دِن کھٹکتے ہیں
خس جو ہیں تو لاثانی، خار ہیں تو چیدہ ہم

برگ برگ تازہ ہے ، زخم زخم رِستا ہے
موسمِ بہاراں میں شاخ شاخ نوبریدہ ہم

بزمِ رنگ و نکہت میں کون ملتفت ہو گا
آہِ ناکشیدہ ہم ، حرفِ ناشنیدہ ہم

—— ۲۳ مارچ ۱۹۸۲ء

○

سر پہ اک سائباں تو رہنے دے
جل گیا گھر دھواں تو رہنے دے

سوچتا ہوں کہ میں بھی زندہ ہوں
مجھ کو اتنا گماں تو رہنے دے

رُخ ہوا کا بدل ہی جائے گا
بادباں پُرفشاں تو رہنے دے

گرد اتنی اڑا نہ راہوں میں
پاؤں کے کچھ نشاں تو رہنے دے

آنکھ سے چھن گئے سبھی منظر
لب پہ اِک داستاں تو رہنے دے

منزلوں کا پتا ملے نہ ملے
شاملِ کارواں تو رہنے دے

○

سوئے ہوئے جذبوں کو جگا کر پھر وہ شام نہ آئی
سنگ ترے بس اک دِن آ کر پھر وہ شام نہ آئی

تیری باتوں کی خوشبو سے مہکی وادی وادی
پھولوں کے انبار لگا کر پھر وُہ شام نہ آئی

ندی کنارے کا وہ منظر تکنے کو جی چاہے
کُونجوں کی اک ڈار اڑا کر پھر وہ شام نہ آئی

بیٹھے بیٹھے جل اُٹھتی ہیں بھیگی بھیگی آنکھیں
آبِ رواں میں آگ لگا کر پھر وہ شام نہ آئی

روز ہی سُورج نکلے منذرؔ، روز ہی سُورج ڈوبے
میں جس کی راہ دیکھوں، جا کر، پھر وُہ شام نہ آئی

○

شام سے تا بہ صبحدم لکھیں
کب تلک داستانِ غم لکھیں

اوس ٹپکے تو پھول کھلتے ہیں
جو بھی لکھیں بچشمِ نم لکھیں

کوئی تو بات مُشترک ہوگی
لوگ پتھر کو بھی صنم لکھیں

شاخ در شاخ داستاں اپنی
کر کے ہم ہاتھ کو قلم لکھیں

دِل ہے اپنا لہو لہو منذرؔ
زخمِ آشوب کیوں نہ ہم لکھیں

○

زندگی کے راستے میں اپنا سایہ ہی ملے
کوئی تو ساتھی نہ ملے، کوئی تو ہمراہی ملے

دیکھتا پھرتا ہوں ہر چہرے کو کتنے غور سے
شاید اُس انبوہ میں کوئی شناسا ہی ملے

چاند تو اونچے گھروں تک ہی چمک کر رہ گیا
کوئی جگنو ہی سہی، کوئی شرارا ہی ملے

شب بسر کرنے کا آخر کچھ تو ساماں چاہیئے
نالۂ شبگیر ہو، آہِ سحر گاہی ملے

ہوتے ہوتے منزلیں منذرؔ قریب آنے لگیں
رفتہ رفتہ کارواں سے ہم تو جا ہی ملے

○

ہر دور میں ، ہر حال میں خورسند رہے ہیں
ہم یوں بھی زمانے سے گلہ مند رہے ہیں

پامال نہ کر دے کہیں بے درد زمانہ
یہ سوچ کے ہم خاک سے پیوند رہے ہیں

چپ چاپ گزر جاتے ہیں ہر ایک گلی سے
ہم رسم و رہِ شہر کے پابند رہے ہیں

اک وقت ہے ہر شخص کی نظروں سے گرے ہیں
اک دَور تھا مہ پاروں کی سوگند رہے ہیں

کچھ قید کسی گیسوئے پیچاں کی تھی منذر
کچھ اپنے خیالوں میں نظربند رہے ہیں

○

تجھ کو دیکھوں تو نگاہیں نہ ہٹانا چاہوں
ایک لمحے پہ ٹھہر جاتے زمانہ چاہوں

تجھ سے اک ربطِ خیالی ہی سہی ربط تو ہے
مَیں تو اک سہل سا جینے کا بہانہ چاہوں

درد اُٹھے تو اُسے وہم سے تعبیر کروں
مَیں بہر طور ترا نام چھپانا چاہوں

دن گزاروں تری یادوں کی حسیں وادی میں
رات آئے تو یہی خواب سہانا چاہوں

بدلی بدلی سی ہیں اخلاص کی قدریں منذر
میں محبت کا وہی روگ پرانا چاہوں

○

کونپلیں اگاتی ہیں کس کی ذات کھیتوں میں
آؤ گھوم کر دیکھیں ساتھ ساتھ کھیتوں میں

دلفریب کیسا تھا دن کا دھوپ منظر بھی
کیسی خوبصورت ہے چاندرات کھیتوں میں

برگ و گُل کی رگ رگ میں کتنا خونِ آدم ہے
زخم زخم ہوتے ہیں کتنے ہاتھ کھیتوں میں

بالیاں لہکتی ہیں سرخوشی کے عالم میں
آکے جب کہے پُروا دِل کی بات کھیتوں میں

کیا ہے خواہشِ انساں ، کیا ہے سینۂ حیواں
سوچتا ہے صدیوں سے پات پات کھیتوں میں

چاند جب کبھی منذر بادلوں میں چھپ جائے
لے کے مشعلیں جگنو آئیں رات کھیتوں میں

○

کیا بچھڑ کر رہ گیا جانے بھری برسات میں
ایک کوئل کوکتی ہے آم کے باغات میں

سوچ میں گُم فاختہ بیٹھی ہوئی ہے شاخ پر
باز ہے اوپر تو نیچے اک شکاری گھات میں

وقت کے پنچھی کر اُڑنا تھا بالآخر اُڑ گیا
آڑی ترچھی کچھ لکیریں ہیں فقط اب ہاتھ میں

کوئی جیتا ہے جئے گر کوئی مرتا ہے مرے
آج کے انساں کو دلچسپی ہے اپنی ذات میں

اک تعلق ، اک محبت ہے مجھے اس شہر سے
میرے بچپن کا بڑا حصہ کٹا گجرات میں

جل رہی تھی رات میری، تپ رہا تھا میرا دن
کیا جئے منذر کوئی ایسے کٹھن حالات میں

ےؔ ماخوذ از میاں محمدؒ

○

ہم بیابانوں میں گھومے، شہر کی سڑکوں پہ ٹہلے
جاں کسی صورت تو سنبھلے، دِل کسی صورت تو بہلے

زندگی کے راستے میں، ساتھ ہے دو چار پَل کا
اپنے من کی میں بھی کہہ لوں، اپنے دِل کی تو بھی کہہ لے

زندگی کرنا بھی تو اک جرم تیرے شہر میں تھا
ہم تھے ہر دھڑکن پہ لرزے، ہم تھے ہر آہٹ پہ دہلے

اَب تو تا حدِ نظر ویرانیاں ویرانیاں ہیں
گھر کا یہ بے در خرابہ، تھا کبھی آباد پہلے

وقت ایسا آ گیا ہے خامشی بہتر ہے مُنذرؔ
لوگ جو کہتے ہیں سُن لے، چوٹ جو لگتی ہے سہہ لے

۱۶، نومبر ۱۹۶۷ء

○

ہر روز ہی دن بھر کے جھمیلوں سے نمٹ کے
رو لیتے ہیں ہم رات کے آنچل سے لپٹ کے

ہم کون ہیں کیوں بیٹھے ہیں یوں رہگذر پر
پوچھا نہ کسی ایک مُسافر نے پلٹ کے

کیا کیا تھے دِل و جاں کے صحیفے میں مضامین
دیکھا نہ کسی نے بھی ورق کوئی الٹ کے

پھرتے رہے آوارہ خیالات کی صورت
کیا چیز تھی ہم جس کے لئے دہر میں بھٹکے

شب کروٹیں لیتے ہُوئے گذرے گی نہ مُنذرؔ
سو جاؤ میاں درد کی باہوں میں سمٹ کے

۳۱، جنوری ۱۹۶۷ء

○

چاند کی طرح جدھر جائیں گے
روشنی روشنی کر جائیں گے

غول در غول اڑے ہیں پنچھی
شام کا وقت ہے گھر جائیں گے

موت لے جائے گی مہ پاروں کو
ہائے یہ لوگ بھی مر جائیں گے

رات کی رات چکا چوند ہے یہ
صبح تک رنگ بکھر جائیں گے

درِ میخانہ ذرا وا کر دو
صورتِ دور گذر جائیں گے

دِل بیتاب! کوئی بات نہیں
یہ زمانے ہیں گزر جائیں گے

۱۹، فروری ۱۹۵۵ء

○

مثلِ نمرود ہر اک شخص خدائی مانگے
دِل وہ پاگل ہے کہ خلقت کی بھلائی مانگے

کتنی سرکش ہے تمنا کہ حضوری چاہے
کتنا بے باک ہے نالہ کہ رسائی مانگے

شوق چاہے کہ ابھی اور بگولے اُٹھیں
وسعتِ دشت، مری آبلہ پائی مانگے

خون کچھ اَور اُسے چاہیئے سُرخی کیلئے
رنگ کچھ اَور ابھی دستِ حنائی مانگے

کوئی تمکیں، کوئی تسکیں، کوئی تحسین چاہے
ایک مُنذر ہے کہ آشفتہ نوائی مانگے

○

نہ سیم و زر کی طلب ہے نہ کیمیا مانگوں
رہِ حیات میں بس تیرا نقشِ پا مانگوں

نہیں ہے وسعتِ عالم میں اتنی گنجائش
خدا سے مانگ کے تجھ کو میں اور کیا مانگوں

مرے وجود کو لاحق ہیں عارضے کیا کیا
تری نگاہ کا میں نسخۂ شفا مانگوں

جلن ہے جاں میں بہت سوزِ جانفزا چاہوں
گھٹن ہے دِل میں بڑی دردِ دلکشا مانگوں

ق

حضورؐ تلخیٔ ایام بڑھتی جاتی ہے
حضورؐ آپ سے شیرینیٔ نوا مانگوں

حضورؐ چاروں طرف دھوپ ہے غموں کی دھوپ
حضورؐ آپ سے الطاف کی ردا مانگوں

○

حُسنِ فطرت میں چمک آئی کہاں سے آئی
گلشنِ حق میں مہک آئی کہاں سے آئی

کِس کی تخلیق ہے تخلیق جہاں کا موجب
نبضِ دوراں میں دھمک آئی کہاں سے آئی

چہچہے چڑیوں کے ہیں کِس کے لیے دُنیا میں
شاخِ طوبےٰ میں لہک آئی کہاں سے آئی

موجۂ تارِ نفس کِس کی نظر سے جُنباں
پارۂ جاں میں تھرک آئی کہاں سے آئی

عزمِ انساں کو عطا، جوششِ عمل، کِس نے کیا
جذبۂ دِل میں تپک آئی کہاں سے آئی

نغمۂ زنگ کو دیں کِس نے سُروں کی لہریں
شعلۂ گُل میں لپک آئی کہاں سے آئی

مہر و مہ کِس کی تجلّی کا ہیں پر تو مُنذر
لعل و گوہر میں دمک آئی کہاں سے آئی

۱۷۔جون ۱۹۷۸ء

○

ربّ دی یاری

جیہڑے ربّ نال یاری لا لیندے
بِن منگیوں سبھ کجھ پا لیندے

○

اوہ حیرت وِچ گم رہندے نیں
اوہ موتھوں کجھ نہ کہندے نیں
دِل اندر جوت جگا لیندے
جیہڑے ربّ نال یاری لا لیندے

○

اوہ کر دے پیار لوکائی نوں
اوہ دُکھ نہ دین خدائی نوں
غم سبھ دا سِر تے چا لیندے
جیہڑے رَبّ نال یاری لا لیندے

○

اوہ ذرّے وِچ صحرا ویکھن
اوہ قطرے وِچ دریا ویکھن
وحدت دا بھیت اوہ پا لیندے
جیہڑے ربّ نال یاری لا لیندے

۳۱۔ دسمبر ۱۹۸۹ء

بشیر منذر

غیر مطبوعہ مجموعۂ منظوماتِ پنجابی

قلم گلاب دی

سے اِنتخاب

○

دھرتی اپنی دھرتی

خیال بیجے تے خواب اُگے
مَیں خواب بیجے گلاب اُگے
گلاب وی بے حساب اُگے

ہوا نے خشبو کھلار دِتی
روِش روِش نوں بہار دِتی
چمن دی رنگت نکھار دِتی

مِلی نویں آن بان مینوں
مِلی اے اپنی پچھان مینوں
مِلی اے کِنتی اُچان مینوں

میں اپنی دھرتی دا اک کھاری
میں پیار بیجاں گا کیاری کیاری
دن رات آبیاری

○

تپدیاں ریتاں دے وچ برف کھلار دیہو
یاں اک بنھ سُورج دے اگے مار دیہو
اپچی ٹیشی والیو! اسیں گواہنڈی ساں
بُھل بھلیکھے واج کدی تے مار دیہو
راتیں مینوں اپنے خواب ڈراندے نیں
دِن نکلے تے کہناواں اخبار دیہو
سجنو! میرا اندر کوئی شے لُوہ چلّی
مینوں دو گھٹ پانی ٹھنڈا ٹھار دیہو
انھیاں نوں اکھیاں دے کے خوش پھردے او
میں منتاں جے گونگیاں نوں گفتار دیہو
پہلوں سوچ کے گلے گلاویں پانے سن
منذر صاحب! ہُن کیوں چیکاں مار دے او

○

وچوں کنگلے اتوں شان گمان بڑے
نقلی پھلاں دے دیکھے گلدان بڑے
توں دھرتی توں اچا ہو کے دیکھ ذرا
اُڈن والیاں لئی ایتھے اسمان بڑے
دُکھیا دل نوں روز نویں دُکھ بل جاندے
وسدے گھر وچ آوندے نیں مہمان بڑے
توں وی ہوراں وانگوں اکھیاں بھر لیاں
تیرے تے سن سجنا سانوں مان بڑے
دِل دا ٹُٹنا تے معمولی شے سمجھو
زندیاں لئی نیں مرنے دے سامان بڑے
گھر دی بربادی دا منظر بُھلدا نئیں
اندر ویہڑے اُڈ دے نیں گکھ کان بڑے
منذر اج دی رات وی دل پیا ڈُبدا اے
اج دی رات وی تارے ٹُٹ ٹُٹ جان بڑے

○

گوہڑے یار دی سالاں اندر اک ادھ واری بلدے
انج لگے جیوں دُنیا والے دُنیا چاری بلدے
اک کاں دی کاں کاں نوں سُن کے سبھ کٹھے ہو جاون
پنچھی پنکھے، بھیڑے ویلے مار اڈاری بلدے
شوق سلامت ہوئے جنہاں دا روکے کون اوہناں نوں
قطرے اک دوجے نوں شوہ وچ لا کے تاری بلدے
مکڑی نے کھیتاں دے سرتے تان لئے نیں تنبو
کالیاں مونہاں والے بھورے کیاری کیاری بلدے
شعر لکھن نوں منجھی پیڑھی ٹھوکن دا کم بھجن
فن نوں سوکھا جانن والے بہت لکھاری بلدے
ہیں آداں تے کلیاں مہکن اک دو گھڑیاں منذر
رنگ برنگے موسم مینوں جاندی واری بلدے

○

اج لنگھیا تے لوکی کل نوں ترسن گے
ہوش آئی تے اک اک پل نوں ترسن گے
بنگلے اُتے بنگلہ پیندا جاندا اے
اُوٹھاں والے اک دن تھل نوں ترسن گے
سُنج مسنجے رستے چپ چپ روون گے
سکھ مسکینے نین پُنل نوں ترسن گے
طوفاں نے لہراں توں رُس جانا ایں
کنڈھے ساگر دی اک چھل نوں ترسن گے
ساری دُنیا دانی ہوندی جاندی اے
گلیاں دے پتھر پاگل نوں ترسن گے
باگاں دے مالک میوے لے جاون گے
بوٹے لاون والے پھل نوں ترسن گے
منذر شعر سبھے سنے کھروے کر دتے
لوکی سوہل ملوک غزل نوں ترسن گے

○

اوہ مُنڈا

اوہ مُنڈا ساڈے گھر دا اے
اجے تت بت گلاں کردا اے

میری جھولی دے وچ بہندا اے
مینوں آپاں آپاں کہندا اے

میرے ننکے ویر دا ہانی اے
اجے رو کے منگدا پانی اے

اکھاں نوں پیارا لگدا اے
پر دِل نوں بھارا لگدا اے

ماں پیو کیہہ لوہڑا پا دتا
لڑ کس دے مینوں لا دتا

ایہہ بوٹا کدوں اُتاں ہوسی
کد سر تے اِسدی چھاں ہوسی

بشیر منذر کی یاد میں

انورؔ مسعود

(۱)

بشیر منذر مرحوم نے اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں تقریباً تمام معروف انواعِ شعر میں طبع آزمائی کی ہے۔ وُہ زندگی کے آخری دنوں میں اُردو اور پنجابی نعتوں کا مجموعہ 'نیاز' مکمل کر رہے تھے۔

اُردو غزلوں، نظموں اور گیتوں کا مجموعہ شاخ در شاخ اور پنجابی غزلوں نظموں کا دوسرا مجموعہ 'قلم گلاب دی' وُہ پہلے ہی ترتیب دے چکے تھے۔ 'نقوش' کے غزل نمبر میں آخری غزل اُنہی کی تھی۔ فنون کے جدید غزل نمبر میں بھی اُن کی غزلیں شامل ہیں۔ اُن کی پنجابی منظومات کا مجموعہ 'کلاڑکھ' کے نام سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ بچوں کے لئے اُن کی اُردو نظمیں 'ابو مجھے بتائیں' اور پنجابی نظمیں 'الھڑ بلھڑ باوے دا' کے نام سے شائع ہوئیں۔

گیت کی صنف میں بھی بشیر منذر کا Contribution بڑا منفرد اور گراں قدر ہے اُردو اور پنجابی گیت نگاری میں اُس نے یکساں مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ پنجابی فلم 'یار بادشاہ' کے سارے گیت بشیر منذر کے لکھے ہوئے ہیں مسرّت نذیر کا گایا ہوا مقبولِ عام گیت "آون گے کاں اُڈا جان گے سانوں نواں پواڑا پا جان گے" بھی منذر مرحوم کا لکھا ہوا ہے اُس نے پنجابی کی لوک اصناف سخن میں بھی بڑے خوبصورت تجربے کئے ہیں۔ وہ ابھی پانچویں جماعت کا طالب علم تھا کہ اُس نے پنجابی میں ایک سی حرفی لکھی۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اُس نے گجرات کے معروف ہفت روزہ 'محبِ کسان' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ منذر مرحوم نے ایک عرصہ تک مُلک کے ممتاز روزناموں میں سیاسی اور سماجی موضوعات پر اعلیٰ درجے کے طنزیہ اور مزاحیہ اُردو قطعات بھی لکھے۔ یہ قطعات جمع ہو جائیں تو ایک الگ کتاب شائع ہو سکتی ہے۔ اس مقام پر مجھے اُس کا ایک شعر بہت یاد آ رہا ہے۔

رخصت ہوئے تو جانا سب کام تھے ادھورے
کیا کیا کریں جہاں میں دو ہاتھ آدمی کے

یہ بات بھی ناگفتہ نہیں رہنی چاہئیے کہ منذر مرحوم کے تینوں مجموعہ ہائے کلام 'کلاڑکھ' 'ابو مجھے بتائیں' اور 'الھڑ بلھڑ باوے دا' رائٹرز گلڈ کے انعام یافتہ ہیں۔

بشیر منذر سے میرا تعارف حفیظ تائب کے توسط سے سن ستر کی دہائی کے آغاز میں ایبک روڈ کے مینار آرٹ پریس پر ہوا۔ شاعروں اور ادیبوں کے ایک جھرمٹ کے درمیان وہ اپنے حقے کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پریس بھی چل رہا تھا، لطیفے بھی، گفتگو بھی چائے کا دور بھی اور حُقہ بھی، دکھ سکھ اور دلداریوں کا سلسلہ اظہار بھی جاری تھا اور شاعر غزلوغزلی بھی ہو رہے تھے۔

مجھے 'جی آیاں نوں' کہتے ہوئے اُس کے ہونٹوں پر جو پُرخلوص مسکراہٹ پھیل گئی تھی، وہ میری یادوں کا بہت قیمتی اثاثہ ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا بشیر منذر اہلِ قلم کے اس بھرے میلے کو Disturb ہوتے نہیں دیکھ سکتا ۔ اس دوران میں اگر کوئی گاہک آن ٹپکتا تو بشیر منذر اُس سے شتابی سے فارغ ہونے کی ہر ممکن اور معقول تدبیر کرگزرتا تھا۔

مجھے اُس مینار آرٹ پریس پر سجنے والی بزمِ منذر کے طفیل ، میرزا ادیب، گوہر ہوشیارپوری، روحی کنجاہی، اسلم کمال، جلیل عالی، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، خالد احمد اور کئی دوسرے نامور ادیبوں سے بھرپور ملاقاتیں میسّر آئیں۔ حفیظ تائب کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ اُنھوں نے مجھے بشیر منذر سے متعارف کرایا۔ اس محفل اور اس کے مرد خلیق پر محفل میں اتنی کشش تھی کہ میں صرف اس محفل کا لطف اُٹھانے کے لئے راولپنڈی سے لاہور جانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔ لاہور اور مینار آرٹ پریس میرے لئے مترادف ہو گئے تھے۔ کوئی مجھے پوچھے تو ایک روڈ کی دو ہی تاریخی شخصیتیں ہیں۔ ایک۔ مسند دہلی کا لکھ داتا۔ قطب الدین اور دوسرا اشاعتی ادارہ 'کتب مینار' اور مینار آرٹ پریس والا بشیر منذر نفسیاتی نقطۂ نظر سے کسی شخص کی ایک معمولی سی حرکت سے بھی اُس کی شخصیّت کا بھرپور اندازہ ہو جاتا ہے۔ بشیر منذر کا حقہ پینے کا انداز اُس کی شخصیت کا پورا مظہر تھا۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جذباتی، غُصیلے اور جلد باز لوگ فرصت یک دو کش پاتے ہی حقے کی ٹوپی کو دھواں دھواں کر دیتے ہیں۔ 'آؤن گے آکے دھکا جان گے سانوں نواں پواڑا پاجان گے' اس کے برعکس بشیر منذر کی حقہ نوشی کے دوران میں نے حُقّے کی ٹوپی کو ہمیشہ پُرسکون اور بے دُود پایا ہے۔ وہ بڑے نرم، ملائم اور دھیمے انداز میں کش لگاتے تھے اور حقّے سے بھی بڑا بیبا سلوک روا رکھتے تھے۔ یہی نرمی اور دھیماپن اُن کی شخصیّت کا امتیازی وصف تھا ۔

بشیر منذر کی سادگی کے بارے میں حفیظ تائب کا تبصرہ دیدنی ہے اور یہ معمولی اور طائرانہ تبصرہ نہیں، چوالیس سالہ پُرخلوص رفاقت کے تجربے کی گواہی ہے۔ تائب صاحب، 'کلارکھ' کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"اوہ سِدھا سادا تے نیک دل انسان اے۔ ہر اک نال خلوص نال پیش آؤندا ئے۔ سدھا اوہ ایڈا
اے کہ ہر کوئی ہر ویلے اوہنوں دھوکھا دے سکدا اے۔ پر اوہنوں دھوکھا دین لئی کسے دا دل گھٹ
ای راضی ہو سکدا ئے ۔ سادا تے لائی لگ ایڈا اے کہ اوہنوں جدھر مرضی لالئیے ۔"

وہ بھولپن اور معصومیت کا ایک عجیب پیکر تھا۔ عمر کے آخری حصے تک اُس کی یہ صفت اُس سے جدا نہیں ہوئی۔ میں نے بارہا دیکھا کہ وہ معمولی باتوں پر بھی غیر معمولی حیرت کا اظہار کرتا تھا۔ وہ بہت کم گو تھا۔ گفتگو میں کبھی شریک ہوتا بھی تو ہیں جی! اور ہلا جی! کے تحیّر آمیز الفاظ کہہ کر چپ ہو جاتا تھا۔ اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے تجربے اور واقعات اس طرح سناتا جیسے کوئی بڑی راز کی باتیں سنا رہا ہے۔

اُس سے میری آخری ملاقات، اُس کی رحلت سے تقریباً دو ہفتے پہلے لاہور میں پروفیسر ارشاد صدیقی کے گھر پر ہوئی۔ میں نے اُس سے خیریت پوچھی تو اپنی عادت کے برعکس اُس نے اپنی بیماری اور علاج کے بارے میں تفصیل

سے بتایا اور آدھ گھنٹے تک اس موضوع پر بولتا رہا۔ ان دنوں وہ ایک ہومیوپیتھ کے زیر علاج تھا اور معالج تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پروفیسر ارشاد صدیقی اُن دنوں بنگلہ دیش سے ہو کر تازہ تازہ واپس آئے تھے۔ اُنہوں نے بنگلہ دیش کے حالات تفصیل سے بیان کرنے شروع کر دیئے۔ اُنہوں نے بتلایا کہ بنگالی بھائیوں کو ہم سے جو نفرت تھی وہ اب کئی گنا زیادہ ہو کر ہندوستان کی طرف منتقل ہو چکی ہے اور اب وہ پاکستان اور پاکستانیوں سے بڑی محبّت کا اظہار کرتے ہیں۔ بشیر منذر بڑی حیرت کے ساتھ ارشاد صدیقی پر سوالات پر سوالات کرتا رہا۔ ارشاد صدیقی چونکہ جماعت اسلامی کے بڑے سرگرم متفقین میں سے ہیں بشیر منذر نے ان سے بنگلہ دیش میں جماعتِ اسلامی کی حیثیت کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ ارشاد صدیقی نے بتایا کہ وہاں کی جماعت نے صحیح لائنوں پر کام کرنا شروع کر دیا ہے اور اب وہاں اُس کی جدوجہد عوام کی معاشی اور مالی بدحالی کا تدارک کرنے کے لئے وقف ہو گئی ہے اور اُس نے دیہاتوں میں بڑا رسوخ حاصل کر لیا ہے۔

بشیر منذر بڑی دلچسپی کے ساتھ یہ سارے واقعات سُنتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بنگلہ دیش کے سارے حالات جان لینے کا متمنی ہے۔ تقریباً دو گھنٹے تک یہ گفتگو ہوتی رہی۔ اور اس گفتگو میں وہ اپنے لفظوں اور اظہارِ حیرت کے ساتھ پوری طرح شریک رہا۔

کاش میں اُس کی اس خلافِ معمول پُرگوئی سے اندازہ کر سکتا کہ میرے ساتھ اُس کی یہ آخری ملاقات ہے۔ ارشاد صدیقی کے گھر پر وہ چند لیٹر پیڈز کے پیکٹ لے کر آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ یہ جلیل عالی صاحب اور یوسف حسن صاحب کو پہنچا دیجئے۔ اُن کی یہ امانت میرے پاس پڑی ہوئی ہے۔ وہ اس درجے کا دیانتدار تھا کہ لاہور میں محکمہ بحالیات کے ملازم کی حیثیت سے اُس نے بعض معروف لوگوں کو کوٹھیاں اور مکان الاٹ کروا کے دئے لیکن اس بہتی گنگا میں وہ اپنے ہونٹ تر کرنے سے گریزاں رہا اور حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ رائٹرز گلڈ کی جانب سے اُسے پلاٹ الاٹ ہوا اور اُس پر اُس نے مکان تعمیر کیا بھی تو اسے بیچنے پر مجبور ہو گیا۔ سب سے بڑا حالات کا دھچکا بشیر منذر کو یہ لگا کہ اُسے یاروں کا تکیہ اور اپنا پریس بھی بیچنا پڑا۔ پریس کے بکنے کے بعد اُس کا احساس تنہائی بہت شدّت اختیار کر گیا اور وہ کسمپرسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ کو پیارا ہو گیا۔ بشیر منذر کی دوستی بے لوث تھی۔ حرص اور حسد کا کوئی دھبہ اُس کی روح پر نہیں تھا۔

میرزا ادیب کا کہنا ہے کہ اپنی دوستی کے پینتیس سالہ دور میں کم از کم میں نے کبھی بشیر منذر کی زبان سے کسی کے لئے کوئی سخت اور تند لفظ نہیں سنا۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں پر کبھی Impose نہیں کرتا تھا۔ اُس کی شخصیت میں کوئی بناوٹ اور کوئی تصنع نہیں تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جنہیں انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ They are Themselves اُس کی شخصیت کا مجموعی تاثر یہی بنتا ہے کہ وہ ایک مخلص، نرم خو، نیکدل، سادہ اور سیدھا انسان تھا۔

مجھے فارسی کے ایک جدید شاعر کے مجموعے کا نام 'تکدرخت' یعنی 'تنہا پیڑ' بہت پسند آیا۔ میرا جی چاہا کہ اُردو یا پنجابی میں بھی کوئی مجموعہ کلام اس نام کا ہم معنی ہونا چاہیے میری خواہش اپنے دوستوں کے مجموعہ ہائے کلام کے ناموں

کی شکل میں پوری ہوئی۔ خورشید رضوی کا مجموعہ 'شاخِ تنہا' اور بشیر منذر کا 'کلّا رُکھ'۔
بشیر منذر کے بارے میں حفیظ تائب لکھتے ہیں کہ

"اوہ ماپیاں دا اکلا کارا پُتر اے ایس واسطے اکلاپے دا احساس اوہدا سب توں وڈا احساس اے۔
ایس لحاظ نال اوہدی اپنی ذات وی اک کلّا رُکھ اے"

اُس کا دوسرا بڑا المیہ یہ ہے کہ شہر بھی اُس کو راس نہ آیا اور گراں بھی چُھوٹ گیا تعلیم اور شہری زندگی نے اُسے ایسا بنا دیا کہ اب گاؤں کے رسم و رواج بھی اُسے کھلنے اور کھٹکنے لگے۔ اور موجودہ شہری زندگی کی ساری اقدار بھی اُس کے نزدیک شائستۂ اعتبار نہیں۔ اُسے اپنا کوئی محرم نہ شہر میں ملتا ہے اور نہ گاؤں میں۔ اس کی نظموں میں اسی احساس تنہائی کی ناآسودگی سرایت کئے ہوئے ہے۔ کلّا رُکھ' اُس کی ایک نظم کا نام ہے لیکن اُس نے اسی نام کو پوری کتاب کا نام قرار دے دیا ہے۔ اس لیے کہ یہ نام بشیر منذر کی اپنی ذات کا المیہ ہے۔ ناموافق معاشرے میں ناقدری اور ناشناسی کے دکھ نے اُسے اتنا حساس بنا دیا ہے کہ اُسے معاشرتی صورت حالات کے پس پردہ جھانکنے کی توفیق حاصل ہو گئی ہے۔ سماجی ناہمواریوں اور انسانی روابط کی زِشتیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے اُس نے حرف سادہ میں گرہیں ڈالے بغیر بڑا دلآویز لہجہ اختیار کیا ہے جس میں اختصار بھی ہے اور تاثیر بھی۔ بات ادھوری مگر اثر دُونا۔

"کلّا رکھ" کی نظموں کے بارے میں جناب احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں۔

"جیہڑا آدمی سارے شعراں نوں سادے معنی پہناندا اے اوس تے بشیر منذر دیاں نظماں ہسدیاں ہون گیاں کہ ایہ پڑھن والا اوچارا کِناں سادا اے، اینہاں نظماں دے پچھے جیہڑی اک دنیا کرلاندی تے کوکدی اے اوس تک صرف اوہو پڑھن والا پہنچ سکدا اے۔ جیہڑا جاندا ہووے کہ سادگی دی مٹھاس دیاں تہواں ہیٹھاں کنیاں گُجھیاں گُجھیاں ستاں تے کوڑیاں کوڑیاں حقیقتاں چُھپیاں ہندیاں نیں۔"

عارف عبد المتین، بشیر منذر کی شاعری کو جاگتی آنکھ کا معجزہ قرار دیتے ہیں، اُن کا خیال یہ ہے کہ وہ اُن خال خال انسانوں میں سے ہے جن کی اندر کی اور باہر کی آنکھ بھی ہمیشہ جاگتی رہتی ہے۔ اُس نے اپنے سماجی مشاہدات پر جس ردِ عمل کا اظہار کیا ہے اُس کی بدولت ہمارے ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔

کلّا رکھ کی پہلی نظم 'نیں جیون دی' اپنے اختصار اور گہری معنویت کے لحاظ سے کوزے میں دریا کی مثال ہے۔ اس مختصر سی نظم میں ایک متحرک علامت سے زندگی کی کشمکش، اُس کی پسپائیوں پیشقدمیوں، کامرانیوں اور شکستوں کو بڑے بلیغ اشاروں میں بیان کیا گیا ہے اور پھر ایک جزوی حقیقت کلّی حقیقت کا رُوپ دھار کر عرفان کی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔

نیں جیون دی وگدی جاوے
ڈبدا سورج، چڑھدا سورج
اک دن جاوے، اک دن آوے
پلاں دی کن من کتھوں وتے
کوئی نہ سمجھے، کوئی نہ جانے
دور پیا کوئی کھڑکھڑ ھتّے
کیڑبے شوہ دریا وچ پیندی
گھٹدی ودھدی، ودھدی گھٹدی
رُڑدی رُڑدی، ڈگدی ڈھیندی
پل پل جندڑی مکدی جاوے
چڑھدا سورج، ڈُبدا سورج
نیں جیون دی سکدی جاوے

اُس کی نظم 'مہاندرا' کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے کہ بڑی بے حیا ہوں گی وہ آنکھیں جو اس نظم کو پڑھ کر نم آلود نہیں ہوتیں۔ بات تو صرف اتنی ہے کہ بچّے کا ناک نقشہ اپنے باپ سے ملتا ہے لیکن اس حوالے سے بشیر منذر نے معاشرتی جبر کی پیدا کردہ قباحتوں، محرومیوں اور ناانصافیوں کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ پڑھنے والے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

اس کی نظم 'سکھنی کُتھلی' اس المیے کی روداد ہے کہ معاشرتی حیثیتوں کا تعین صرف پیسے کے پیمانے سے ہوتا ہے۔ یہ نظم بے زری اور زرداری کے موازنے کی ایک بے نظیر مثال ہے۔

اُچی گردن دھنواناں دی
جیوں دیوے دی جوتی
نردھن ایتھے بن کے رہندے
جنے کھنے دی کھوتی
سکھنی کُتھلی بھوئیں اُتے
لمّی پے پے جاوے
جس کُتھلی وچ مایا ہووے
رہندی کھلی کھلوتی

دسمبر ۱۹۷۳ء کے فنون میں 'کلارکھ' پر پروفیسر جلیل عالی کا ایک جامع تبصرہ شائع ہوا تھا۔ جلیل عالی نے اس تبصرے کو ان الفاظ میں Sum up کیا ہے۔

"مختصر یہ کہ بشیر منذر کی شاعری کا تاروپود جس احساس تنہائی سے تیار ہوا ہے وہ احساس تنہائی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہمارے معاشرے کے حاشیائی فرد Marginal Man کی نفسیات سے اُبھرنے والا احساس تنہائی ہے اور یہ کہ گاؤں اور شہر کے معاشرتی بُعد (Social Distance) سے جنم لینے والی ثقافتی خلیج نے ہی بشیر منذر کو ایک حاشیائی فرد بنایا ہے"۔

بشیر منذر کی نظموں میں افسانے کا سا انداز، گیت کا سا اختصار اور غزل کی سی اشاریت ہے اُس کی بیشتر نظموں کے آخری مصرعے یا آخری لفظ یکدم چونکا دیتے ہیں ۔ اُس کا لہجہ مجھے شریف کنجاہی صاحب کے اُسلوب کے بہت قریب محسوس ہوا ہے۔ شاید اس لئے کہ دونوں کے مزاج میں دھیما پن ہے اور دونوں کے ہاں کنجاہ کی پنجابی کی مٹھاس رچی ہوئی ہے۔ دونوں کے ہاں دھیرے دھیرے کُڑھنے اور سلگنے کی کیفیت بھی ایک قدر مشترک ہے۔

تر لکڑی کی مانند سلگتا ہوں شب و روز
کیا آگ ہے منذر کہ جلے ہے نہ بجھے دل

بشیر منذر کی ان نظموں میں اُس کی نصف صدی کی فنی مہارت صاف دکھائی دیتی ہے زبان اور بیان پر اُس کی قدرت ہر مصرعے سے پھوٹی پڑتی ہے ۔ یہ سب نظمیں سچی واردات اور سچے جذبے کی پیداوار ہیں وہ اپنے احساس کی تصویروں میں اپنے لہو کا رنگ بھرتا ہے اُس کا انداز سادہ، نویکلا اور نرالا ہے جو سیدھا دل میں اُتر جاتا ہے۔

بچوں کے لئے اُردو نظمیں لکھنے والے شعرا میں اسمٰعیل میرٹھی حفیظ جالندھری، چراغ حسن حسرت صوفی تبسم اور قیوم نظر کے بعد نمایاں ترین نام بشیر منذر کا ہے۔ منذر کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اُس نے پنجابی میں بھی بچوں کے لیے بڑی پیاری پیاری نظمیں لکھی ہیں۔ اُردو کی ان نظموں کے مجموعے 'ابو مجھے بتائیں' کے حوالے سے حفیظ تائب لکھتے ہیں۔

"بشیر منذر کو طالب علم رہنے کا بہت شوق ہے۔ یہی شوق شاید اُس بچے کا دوسرا نام ہے جو ابھی تک بشیر منذر کی روح کے کسی گوشے میں چھپا بیٹھا ہے۔ جس کی معصومیت اور مختلف حرکتوں سے بشیر منذر کو بے پایاں محبت ہے اور شاید یہی بچہ اپنے ساتھیوں کے لئے بشیر منذر کے نام سے نظمیں لکھتا ہے۔ اگر یہ بچہ ابھی تک بشیر منذر کے اندر زندہ نہ ہوتا تو وہ اس پیرانہ سالی میں 'ابو مجھے بتائیں' جیسی خوبصورت نظموں والی کتاب کیسے لکھتا؟"

اس کتاب کی بہت سی نظمیں اور گیت ریڈیو پر اور ٹیلی ویژن پروگرام 'ہم کلیاں ہم تارے' میں گائے جا چکے ہیں۔

بچوں کی شاعری کے لئے محبت، پیار اور شفقت کے جذبات اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ 'الھڑ بلھڑ باوے دا' میں اُس نے اُس روح تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جو ماں کی ممتا سے عبارت ہے۔ اور یہی روح اُس کی اُردو نظموں میں بھی رواں دواں محسوس ہوتی ہے۔

اُردو کی ان نظموں میں بشیر منذر نے بچوں کی نفسیات سے کامل آگاہی کا ثبوت دیا ہے اُن کی خواہشات اور میلانات اور خوئے استفسار کو ایسے حسین اور خوش آہنگ پیرائے میں بیان کیا ہے جس سے دیکھی بھالی چیزوں سے بچوں کے نتے رابطے قائم ہوتے ہیں اور اُنہیں تازہ مسرتیں حاصل ہوتیں ہیں۔ اخلاقی نکات کو اُس نے واعظانہ نہیں بلکہ انتہائی فنکارانہ اُسلوب کے ساتھ بچوں کے ذہنوں اور دلوں میں اتار دیا ہے ۔ اُسے معلوم ہے کہ باہر کی دنیا میں بچوں کی دلچسپی کا سامان کیا ہے اور اُن کے اندر کی دنیا میں کونسی خواہشیں اُچھلتی کودتی رہتی ہیں۔ اُس نے بچوں کے اجتماعی حافظے پر دستک دی ہے۔ تھے تھے مقبول عام محاوروں اور ضرب الامثال کو کہانیوں کی شکل دے کر بڑی خوبصورت نظموں میں ڈھال دیا ہے بچوں کے لئے نظمیں لکھتے ہوئے جو شاعرانہ گنجائشیں اُس نے پیدا کی ہیں اس سے پہلے کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ ریل گاڑی پر اُس کی نظم دیکھیے:

آئے گاڑی جائے گاڑی   کیا کیا سیر کرائے گاڑی
اندر اُس کے لگے ہیں میلے   باہر اُس کے جنگل بیلے
کتنے رنگ دکھائے گاڑی   آئے گاڑی جائے گاڑی
وقت کی ہے یہ تیز سواری   اس کا سفر دن رات ہے جاری
تھکنے کبھی نہ پائے گاڑی   آئے گاڑی جائے گاڑی
پیچھے جو بھی رہ جائے گا   ہاتھ ملے گا پچھتائے گا
سب کو یہ سمجھائے گاڑی   آئے گاڑی جائے گاڑی

بشیر منذر کی انفرادیت اور اُس کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اُس کی ہر نظم بڑی خیال انگیز ہے اور بچوں کو دعوت فکر دیتی ہے اس اعتبار سے اُس کی نظم 'ابو مجھے بتائیں' ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے بسا اوقات ننھے اذہان ایسے گھمبیر سوال پوچھ بیٹھتے ہیں کہ بڑے بڑے فلسفیوں سے اُن کا جواب نہیں بن پڑتا ۔

ابو مجھے بتائیں ۔ جگنو دن بھر سوئیں۔ راتوں کو کیوں جاگیں؟۔ مشعل لے کر بھاگیں
ابو مجھے بتائیں۔ مُرغی کے انڈے میں چوزہ کہاں سے آئے؟۔ دانہ کون کھلائے؟
ابو مجھے بتائیں دنیا کیوں لڑتی ہے جنگیں کیوں ہوتی ہیں؟ مائیں کیوں روتی ہیں؟

میں سمجھتا ہوں کہ بچوں کے لئے اتنی خوبصورت ترنم اور فکر انگیز شاعری کی اُردو زبان میں اور کوئی مثال نہیں۔ حفیظ تائب نے بہت درست کہا ہے کہ 'یہ نظمیں بچوں اور بڑوں کو یکساں متاثر کرتی ہیں ان میں بڑی شاعری کے تمام

جوہر موجود ہیں بشیر منذر نے بچوں کی شاعری کو نئے اُفق اور نئی راہیں دکھائی ہیں۔'

جن دنوں بشیر منذر کی کتاب 'الھڑ بلھڑ باوے دا' شائع ہونے والی تھی اس نے مجھ سے بھی اس کا فلیپ لکھنے کی فرمائش کی اُس کی یہ کتاب پڑھ کر اُس وقت میں نے جو کچھ محسوس کیا اور لکھا اُس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

"بچپن وچ ذہن دی تختی تے جیہڑے نقش پے جاندے نیں اوہناں دے اثرات بڑے دیرپا ہوندے نیں ۔ اے اک بڑی وڈی نفسیاتی حقیقت اے ۔ شاید ایسے لئی مسلماناں نوں ایہہ حکم دتا گیا اے کہ ہر نومولود نوں سب توں پہلاں اذان دا ترانہ سنایا جاوے ۔ ایہہ نفسیاتی سچائی نظر وچ ہووے تے آپے سمجھ آ جاندی اے کہ بچیاں لئی ادب تخلیق کرنا کوئی بچیاں دی کھیڈ نئیں ۔ بشیر منذر نے بچیاں واسطے جیہڑیاں نظماں لکھیاں نیں ایس کامل آگاہی نال لکھیاں نیں کہ پہلی اٹ ونگی رکھ دتی جائے تے کندھ اسماناں توڑی ڈنگی ٹر جاندی ہے ۔ ایناں نظماں وچ اوپرے پن دا احساس نہیں ہوندا ایسے لگے کہ بشیر منذر نے اپنے وطن دے معصوم لوک ورثے نوں گواچن نیں دتا بلکہ اوہنوں اپنے تہذیبی ورثے وچ گنھ کے اک نویں صورت وچ پیش کیتا اے ۔ اک ایسی صورت جیہڑی بچیاں دے دلاں وچ انسانیت دیاں بلندیاں ول سفر کرن دا اُدم پیدا کر دی اے ۔"

ایناں نظماں دی سب توں وڈی خوبی اے وے جیہڑے بچے انہاں نوں پڑھن گے تے جیوں جیوں وڈے ہندے جان گے اوہناں دے ذہناں وچ انہاں نظماں دیاں کلیاں وی پُھل بندیاں جان گیاں ۔ تے فیر اوہناں نوں پتہ لگے گا بشیر منذر چڑیاں طوطیاں راہیں زندگی دیاں بڑیاں ڈوہنگیاں رمزاں سمجھا گیا اے ۔

بشیر منذر دے شفیق لہجے وچ بچیاں نوں ٹافیاں دا سواد آوے گا ۔ بچیاں لئی پنجابی وچ نظماں دی ایہہ ... کتاب اے ۔ ایس فصل دی پنیری بشیر منذر نے لائی اے ۔'

بشیر منذر کی اُردو غزل ایک الگ موضوع ہے 'کلارکھ' کی اشاعت کے ساتھ ہی 'شاخ در شاخ' کے نام سے منذر صاحب نے اس کے زیر طبع ہونے کا اعلان کر دیا تھا ۔ لیکن اُن کی زندگی میں اشاعت پذیر نہ ہو سکی کاش رائٹرز گلڈ ، اکادمی ادبیات یا کوئی ادارہ اس کی اشاعت کا اہتمام کرے تاکہ بشیر منذر کی شاعری کا ایک بڑا حصہ باقاعدہ صورت میں منظر عام پر آ جائے ۔ اُس کی غزل کے چند شعر سُنا کر اجازت چاہتا ہوں میرا مختصر تاثر یہ ہے کہ اُس کی غزل ایک ایسا دریا ہے جس میں مختلف سوچوں اور کیفیتوں کے سفینے تیرتے رہتے ہیں ۔ کبھی کبھی کسی بھنور کی زد میں اور بیشتر ساحلوں کے آس پاس ایک درویشانہ سے آہنگ میں حسرت بھری فریاد کی ایک دھیمی سی لے سنائی دیتی ہے اور 'آپے دِل بالیا تے آپے بہہ کے سیکیا' والی کیفیت محسوس ہوتی ہے ۔

ملاحظہ فرمائیے :

اچھے بھی برے ہیں حالات آدمی کے
پیچھے پڑے ہوئے ہیں دن رات آدمی کے

سر پہ اک سائباں تو رہنے دے
جل گیا گھر دھواں تو رہنے دے

درد اٹھے تو اُسے وہم سے تعبیر کروں
میں بہر طور ترا نام چھپانا چاہوں

ہر روز ہی دن بھر کے جھمیلوں سے نمٹ کے
رو لیتے ہیں ہم رات کے آنچل سے لپٹ کے

زیست کی ناؤ نہ جانے کس کنارے جا لگے
ملگجی سی دُھند ہے اس پار بھی اُس پار بھی

شوق چاہے کہ ابھی اور بگولے اٹھیں
وسعت دشت میری آبلہ پائی مانگے۔

رات دن رسوا سر بازار ناکامی رہے
ہم باین گوشہ نشینی کس قدر نامی رہے
مستقل خطرات بام و در پہ منڈلاتے رہے
دل کی بستی کے سدا حالات ہنگامی رہے
بیٹھے بیٹھے جل اٹھتی ہیں بھیگی بھیگی آنکھیں
پانی میں اک آگ لگا کر پھر وہ شام نہ آئی

اور آخر میں اُس کا وہ معروف شعر ہے پڑھتے ہی وہ خود شدت سے یاد آنے لگتا ہے۔

موت لے جانے کی مہ پاروں کو
ہائے یہ لوگ بھی مر جائیں گے



ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن

ولادت : پٹیالہ (بھارت) ، ۵ نومبر ۱۹۳۲ء

محبوب شخصیات اور موضوعات : غالب ، عبدالحق ،
یلدرم ، رشید احمد صدیقی ، وقار عظیم اور محمد طفیل ۔

اعزاز اور انعام : داؤد ادبی انعام ۱۹۷۴ء
لاہور تعلیمی بورڈ انعام ۱۹۷۴ء
لاہور تعلیمی بورڈ انعام ۱۹۷۵ء
سرگودھا تعلیمی بورڈ انعام ۱۹۷۸ء
سرگودھا تعلیمی بورڈ انعام ۱۹۸۰ء

موجودہ مصروفیت : پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو ۔
گورنمنٹ کالج ۔ لاہور

نقوش [illegible] تحقیق [illegible]



ڈاکٹر انور سدید

ولادت : میانی ، ضلع سرگودھا ، ۴ دسمبر ۱۹۲۸ء

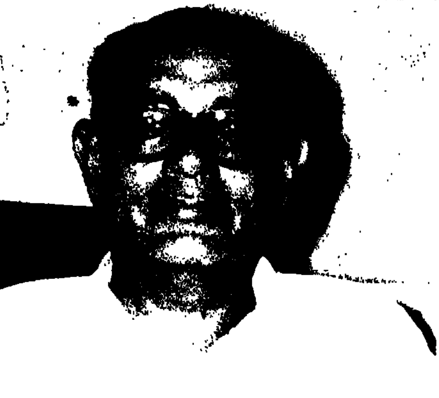
تعلیم : اے ایم آئی ای (پنجاب)
ایم ۔ اے (اُردو) ، پی ایچ ڈی (پنجاب)

تصنیفات و تالیفات : چالیس کے قریب

اعزاز : بابائے اُردو ایوارڈ ، ۱۴۰۵ ہجری

موجودہ مصروفیت : مدیر قومی ڈائجسٹ لاہور

نقوش ایوارڈ برائے تحقیق و تنقید ۱۹۸۸ء



پروفیسر محمد اسلم

ولادت : کو پھلور (ضلع جالندھر) ۲۸ نومبر ۱۹۳۲ء

تعلیم : ایم ۔ اے (تاریخ) پنجاب یونیورسٹی ۔
ڈرہم ، مانچسٹر اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں سے عربی ، فارسی
اور علومِ شرقیہ میں اعلیٰ اسناد حاصل کیں۔

تصنیفات : ۱۱ کتب ، پونے دو صد کے قریب تحقیقی مقالے
برعظیم پاک و ہند کے جراید میں شائع ہو چکے ہیں جبکہ ایک
کتاب زیرِ طبع ہے۔

موجودہ مصروفیت : صدر شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی ۔

نقوش ایوارڈ برائے تحقیق ۱۹۸۹ء

عروس البلاد

منظور الٰہی

قرطبہ اشبیلیہ اور غرناطہ کے گلی کوچوں میں گھومے بغیر اُس اجنبی تہذیب کو آواز دینا ممکن نہیں جو صدیوں تلک اس جزیرہ نما میں پھلی پھولی اور جس کے اثرات آج تک جاری و ساری ہیں، اُندلس کا معطّر جھٹپٹا مشامِ جاں کو تازگی بخشتا ہے، ٹائیلوں سے مرصّع مکانوں کی شہ نشینوں سے خوش رنگ پھولوں کی ٹوکریاں آویزاں ہیں، عروج و زوال اور شکست و ریخت کے نشیب و فراز میں مسلم تمدّن اور علم و دانش کا مرکز پہلے قرطبہ رہا پھر اشبیلیہ اور بالآخر غرناطہ، آج بھی دُکھ درد میں وہاں لوگ ایک دوسرے کو یوں تسلی دیتے ہیں۔ "میرے عزیز! آخر سقوطِ غرناطہ تو اس سے بڑا المیہ تھا!" جیسے وہ اُن موروں کے روحانی وارث ہوں جو وہاں سے بنوک شمشیر نکالے گئے یا ادارۂ احتساب کی سنگدلی کا شکار ہوئے، جیسے آنے والی نسلیں سقوط غرناطہ پر ماتم کناں ہوں،

سیاسی مدّوجزر کے باوجود الاندلس علمی اور روحانی مرکز رہا، شمالی افریقہ کے المرابطون اور الموحد کی آمد سے بھی روح اُندلس مجروح نہ ہوئی، امتدادِ وقت کے ساتھ نئے فرمانروا رام ہو گئے، اُندلس نے نوواردوں کی متعدد لہریں سینے پر سہہ کر اُنہیں ایک حرکی اور تخلیقی جہت عطا کی، یہ اُس کی بے پایاں قوتِ انجذاب کا ثبوت تھا مگر اُندلس پر عربی زبان اور ثقافت کی گہری چھاپ باقی رہی۔

اُندلس کی روح اُس کے تین شہروں میں کھِچ آئی ہے جو قدرِ مشترک کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

دل لُبھانے والا پُرسکون قرطبہ جس کے مہکتے ہوئے گلی کوچوں کی پُراسرار خامشی اور بازاروں کی رونق موروں کے "سُوق" کی یاد دلاتی ہے۔

پُررونق اشبیلیہ نے معتمد کی جلاوطنی اور الموحد کا عروج دیکھا۔

نصری سلاطین کا غرناطہ اپنے الحمرا پر نازاں۔

عیسائی مؤرخین معترف ہیں کہ مشرقی فاتحین نے اُندلس کو اپنا وطن سمجھ کے سنوارا اور اُسے ایک نئی شان عطا کی، آبپاشی کا جال بچھایا، زراعت کو ترقی دی، مشرق سے بیج منگوا کر انواع و اقسام کی فصلیں کاشت کیں اور ایسے پھلدار درخت لگائے جن سے یورپ کے لوگ ناآشنا تھے۔

سیرا مورینا سلسلۂ کوہ اور وادی الکبیر کے درمیان یہ شہر ایسی جگہ آباد ہے جہاں دریا بل کھاتا ہے، سقوطِ غرناطہ کے ساتھ ہی قرطبہ میں یہودیوں کا محلہ خالی کروالیا گیا تھا، اب وہاں اہلِ حرفہ کی رہائش ہے البتہ قرطبہ کے عظیم فرزند سینیکا کا بُت موجود ہے، رومن ٹوگا پہنے ہوئے ایک سنجیدہ، باوقار شخص، اُبھرا جسم، تیکھے نقش، متجسس آنکھیں، اُس ایذا رسانی سے بے پروا جو ظالم نیرو نے اُس کے حق میں روا رکھی تھی، رومی فصیل اور پہاڑیوں کے اُس پار اُس کی اُچٹتی ہوئی

نگاہیں اپنی جائے پیدائش ڈھونڈ رہی ہیں، سینیکا کی نگارشات میں مسئلہ جبر و قدر پہ مباحثے ہیں، وہ جھوٹی نمود و نمائش سے احتراز کا سبق دیتا ہے۔ "جب انسان کی پرکھ دولت سے ہونے لگے تو اصل اقدار طاق نسیاں کی زینت ہو جاتی ہیں" "دنیا پیشہ ور تیغ زنوں کی تربیت گاہ ہے جہاں لوگ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں" "نامساعد حالات میں صبر کرو، دورِ ابتلا میں متانت کا دامن نہ چھوڑو، اظہار جذبات سے گریز کرو، خوشی اور غم سے بے نیاز ہو کر ناخوش ہائے دنیائے دنی صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کرو۔"

زندگی در گردنم اُفتاد بیدل چارہ نیست

شاد باید زیستن ، ناشاد باید زیستن

فلسفی مضمون نگار، مقرّر ، ڈرامہ نویس اور شاعر سینیکا کمسن نیرو کا اتالیق تھا، پھر اُس کا مشیر بنا اور اُسے حد اعتدال سے تجاوز نہ کرنے کی تلقین کرتا رہا، سینیکا نے اپنے اصولوں کی خاطر جان دی، جب نیرو نے اُسے خود کشی کرنے کا حکم دیا تو اُس نے اُسی عالی ظرفی اور رواقیت کا مظاہرہ کیا جس کی تلقین وہ دوسروں کو کرتا تھا۔

مور عہد کی عکاسی میں کوئی شہر قرطبہ کا ہم پلّہ نہیں ، جابجا بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی شیرازہ بندی کر کے اُس عظیم الشان تہذیب کا تصور ممکن ہے جس کی خیرہ کن چمک سے تاریخ کے اوراق منور ہیں۔ قرطبہ کا افسانہ الف لیلیٰ کا ایک باب ہے جہاں ناممکنات ممکن ہو جاتے ہیں، اُس کے سینے پر دیو قامت شخصیتوں کی پرچھائیاں پڑ رہی ہیں اور اُن کے محیر العقول کارناموں کی مہر ثبت ہے، اس غیر معمولی کہانی کا نقطۂ آغاز وہ زمانہ ہے جب شکست خوردہ وسی گاتھ دستے شمال کی جانب پسپائی اختیار کر رہے تھے اور اُن کا حسین شہر نوواردوں کے رحم و کرم پر تھا، فاتح مور اُس کا سرسبز میدان تھا اور بل کھاتا ہوا دریا مسرت و حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھ رہے تھے، تاریخ کا ایک رومانوی ڈرامہ جنم پا رہا تھا۔

قرطبہ آج بھی دامنِ دل کھینچتا ہے اور زایر کو مسحور کر لیتا ہے۔ قدیم حصہ مور شہر کی آب و تاب لیے وادی الکبیر کی آغوش میں محوِ خواب ہے۔ مسجد کے نواح میں پیچ و خم کھاتے ہوئے صاف ستھرے تنگ مگر پُر سکون گلی کوچے مُنھ سے چوک پہ جا ختم ہوتے ہیں ، چوک کے وسط میں بیلوں اور پھولوں سے ڈھکا ہوا فوارہ جیسے مور ابھی ابھی شہر کا یہ حصہ چھوڑ کے گئے ہوں، پختہ اینٹوں اور گارے کے بنے ہوئے مکانات کوچے کی جانب کُھلتے ہیں، جابجا یاسمین کے گچھوں سے لدے پھندے چوک ہیں جہاں فضا ایک نشیلی خوشبو سے مہکی ہوئی ہے، سنہری دھوپ میں ہر شہہ نشین سے پُھوٹتا ہوا رنگ و نکہت کا فشار چکا چوند کر دینے والی سپیدی پہ بہہ نکلتا ہے ۔ سفیدی شدہ دیواروں پر معمولی تزین بھی ایک خاص جاذبیت رکھتی ہے، جگہ جگہ معبدوں کے مینار ہیں جہاں سے کبھی موذّن کی صدا بلند ہوتی تھی، لوگوں میں سنجیدگی کا عنصر غالب ہے، سوچ میں ڈوبے ہوئے راہگیر خاموشی سے آجا رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قرطبہ کی زندگی پر اُس المیے کی چھاپ ہے جب اُس کی ٹمٹماتی ہوئی شمع گل کر دی گئی تھی ۔

قرطبہ کی ایک خاص پہچان ہے، دو شاعروں نے اُس کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی ایک نے اسے "باوقار اور خلوت پسند" کہا اور دوسرے نے "خاموش قرطبہ، نیم رومی نیم مور" اہلِ قرطبہ اپنے مور اجداد کی نسبت پہ نازاں ہیں، دوسری جگہوں کی طرح اس شہر کا حُسن عام نہیں، متجسس آنکھ ہی اس کی مستور رعنائیوں سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔ ایک نظر دیکھنے سے گماں تک نہیں ہوتا کہ مسجد سے ملحق کوچۂ سمن زار میں کیا حُسن پوشیدہ ہے۔ جگہ جگہ اہلِ ثروت کی حویلیاں ہیں، نارنگی ، گلاب اور حنا کی خوشبو سے مہکے ہوئے دالان اور سہ دریاں ، جالی کی اوٹ میں بیک وقت مستور اور عریاں، طرفہ تماشا یہ کہ پائیں باغ محض گھر کی ملکیت نہیں بلکہ لُڑھکتے ہوئے کوچے تک آن پہنچے ہیں، سر شام مطرب اور نے نواز کی صدا نامانوس کانوں کو عجیب معلوم ہوتی ہے، اُندلس یورپ کا حِصّہ ہے مگر یہاں ماحول مشرقی ہے، سفید دیواروں کے پس منظر میں نیلگوں گملوں کی بہتات ہے، گہرا نیلا رنگ جو اسلامی مشرقِ وسطیٰ میں نظر آتا ہے۔ پھولوں کی نمائش موروں کی وراثت ہے جو فنِ باغبانی میں ماہر تھے۔ ہسپانیہ میں ایسے پائیں باغ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتے۔

قرطبہ پانچ سو برس تک اسلام کا علمی اور ثقافتی مرکز رہا مگر عظیم مسجد کے علاوہ اُس زمانے کے آثار ناپید ہیں، سقوطِ قرطبہ کے اڑھائی سو برس بعد تک مور ہسپانیہ میں رہے مگر طلیطلہ اور سلمانکا ایسے شہروں میں بھی بہت کم نشان ملتے ہیں جن سے ظاہر ہو کہ وہاں کبھی اسلام کا دَور دَورہ تھا بلکہ اسلامی آثار کی بجائے رومی کھنڈرات زیادہ نظر آتے ہیں، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ہسپانیہ کے طول و عرض میں ایسے آثار بیدردی سے مسمار کر دیے گئے۔

اُموی دَور میں اُندلس کی علمی اور ادبی زندگی اپنے شباب پر تھی، قرطبہ کے اہلِ ثروت مہذّب ، متمدّن اور جویائے علم تھے، دورِ خلافت کے ادبی کارنامے ایک عظیم سرمایہ ہیں، لکھنے والوں میں شاعر اور مورّخ بھی ہیں۔ جغرافیہ دان، فلسفی ، طبیب، مہندس اور صوفی بھی، جہاں جہاں عربی زبان کا چرچا ہے اُن کے نام جانے پہچانے ہیں۔

ادریسی لکھتا ہے: "قرطبہ پانچ متصل شہروں پر مشتمل ہے، ہر حصّے کی جُداگانہ حیثیت ہے اور اُس کے گرد دیوار کھچی ہوئی ہے، ہر شہر کا اپنا سُوق ہے جہاں پیشے کے مطابق علیحدہ بازار ہیں، اسی طرح ہر شہر کی اپنی سرائے ، حمام اور رہائشی علاقے ہیں، قرطبہ کے رہنے والے علم و تقویٰ میں پیش پیش ، عقیدے میں راسخ الاعتقاد لین دین میں ایماندار اور لباس اور سواری کے سامان میں نفاست پسند ہیں۔ اہلِ قرطبہ اظہار جذبات میں یکتا ہیں، وہ اکل و مشروب میں شُستہ مذاق رکھتے ہیں۔ خوش اطوار اور اچھے اخلاق کے مالک ہیں۔"

جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اُندلسی
خوش دل و گرم اختلاط ، سادہ و روشن جبیں

اُمیہ عہد میں قرطبہ موجودہ شہر کی نسبت بہت وسیع تھا، وادی الحسن اور فردوس برس ایسے مضافات دور دور تک چلے گئے تھے، وادی الکبیر کے کنارے میلوں تک پھل دار درختوں کی قطاریں تھیں، مُلک مُلک کے سیاح ، سوداگر

اور نصرانی راہب قرطبہ میں گھومتے پھرتے نظر آتے تھے، خوبصورتی اور رعنائی میں صرف بازنطینی قسطنطنیہ اُس کا مدِ مقابل تھا۔

قرطبہ ، اشبیلیہ اور غرناطہ میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے تھے جہاں اسلامی علوم کے علاوہ ادب ، فلسفہ، طب، ریاضی، تاریخ ، جغرافیہ اور علمِ فلکیات میں تعلیم دی جاتی تھی، کتابوں کی دُکانیں جویائے علم کے لیے مقناطیسی کشش رکھتی تھیں۔ وہاں دُنیا بھر کے مخطوطات بکنے کے لئے آتے تھے۔ ذاتی کتبخانے نہ صرف اعلیٰ ذوق کا نشان تھے بلکہ امارت کا جزو تصور ہوتے تھے، علما مشرق سے کھچے آتے تھے ۔ مسجد نہ صرف جائے عبادت تھی بلکہ ابتدائی تعلیم و تدریس بھی وہیں ہوتی تھی، اساتذہ کی تنخواہ خزانۂ عامرہ سے ادا کی جاتی تھی، نتیجہ یہ تھا کہ ایک کثیر تعداد پڑھ لکھ سکتی تھی، ازمنۂ وسطیٰ کی ریاستوں کی طرح اکثریت دیہی علاقوں میں رہتی تھی اور اُن کا انحصار زراعت پر تھا مگر تاریخ نے دمکتے ہوئے شہروں کی تفصیل ایک زریں باب کے تحت رقم کی ہے، ایک اطالوی راہبہ نے اپنے خط میں قرطبہ کو درخشندہ ہیرا کہا ۔ تنظیم کے لحاظ سے قابل رشک مغربی یورپ کا مدینۃ الاوّل جہاں دسویں صدی میں مدنی زندگی کی سہولتیں میسّر تھیں، گلی کوچے پختہ تھے جہاں رات کے وقت روشنی کا انتظام ہوتا تھا، مکانات اور عمارات کی لامتناہی قطاروں سے گزرتے ہوئے کوئی بھی شخص دس میل تک سفر کر سکتا تھا، قرطبہ کے گردونواح میں تین ہزار گاؤں اور قصبے تھے جہاں کے کشت زار شہر کی منڈیوں کو خوراک اور پھل بہم پہنچاتے تھے۔ القیصریہ کی شاہی منڈی میں بازاروں کی تقسیم پیشہ وارانہ صلاحیتوں کے مطابق تھی، کتب فروش، پارچہ فروش، قصاب اور ماہی فروش، زین ساز، پاپوش ساز اور چٹائی بُننے والوں کے علیحدہ بازار تھے، درزی، بافندے ، جوہری، اسلحہ ساز، لوہار اور رنگریز بازار میں کام کرتے تھے البتہ ظروف سازی اور چمڑے کی رنگائی شہر سے باہر ہوتی تھی، ایسے کام کے لیے وسیع پیمانے پر بھٹے بنانے اور گڑھے کھودنے کی ضرورت تھی۔ عرب اور خوشحال مولدین کو نفیس چیزیں خریدنے کا شوق تھا، دکانیں سازوسامان سے پُر تھیں، اعلیٰ قسم کے کپڑے المریہ اور مالقہ سے ، ریشم بلنیہ اور غرناطہ سے، سامانِ حرب طلیطلہ سے آتا، قالین بافی اور چمڑے کے کام کے لیے قرطبہ کی شہرت دور دور تک تھی۔ مشرقی ممالک کے علاوہ جرمنی اور شمالی ملکوں سے بھی سامانِ تعیش درآمد ہوتا تھا، یہودی سوداگر دُور دراز ملکوں کا سفر طے کر کے گراں اور نایاب اشیاء لاتے تھے۔

رمضان المبارک میں غروب کے بعد شہر جشن کا سماں پیش کرتا تھا ، دن بھر کے اجتناب کے بعد سرشام شادمانی کا اظہار ہوتا، بازار میں پھل سستے داموں دستیاب ہوتے۔ مٹھائیاں اور بُھنا ہوا گوشت فروخت ہوتا، لڑکے قندی بیچتے جو اہلِ قرطبہ کا من بھاتا کھاجا تھا ، پیٹھ پر چرمی مشکیزے اُٹھائے سقّے ٹھنڈا پانی پلاتے ، داستان گو ، مداری اور بازی گر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے، عید کے موقع پر سیلانیوں کی کشتیاں سینۂ دریا پر تیرتی نظر آتیں۔

مدنی زندگی میں قرطبہ کی ترقی قابلِ رشک تھی، شہر کی صفائی ، پانی کی بہم رسانی، مکانات کی کشادگی، راستوں کی پختگی، حمام اور کتبخانے، قرطبہ کے عام گھر یورپ میں بہترین تھے، وہ ایسے ہی گھر تھے جیسے آج بھی جنوبی ہسپانیہ اور

پر تمکال میں نظر آتے ہیں۔ بے رنگ بیرونی درو دیوار، باہر سے پتہ نہ چلتا تھا کہ آنگن میں سیماب بار فوارہ اور پھولوں سے گھری ہوئی آرام دہ نشست گاہ مہمان کی منتظر ہے۔ اخفا، رقابت کی حد تک اخفا مورگھر کا خاصہ تھا۔ اسی لیے وہ مستطیل آسا ہوتا اور ساری توجہ اندرونی صحن پہ مرکوز ہوتی، گھر کیا ایک سربستہ راز تھا جس کے پوشیدہ امکانات اہلِ خانہ ہی کے لیے تھے۔

شہر نشاط باغات اور نزہت گاہوں کے لیے مشہور تھا، کھلے دنوں میں چمن میں محفل سجانے کا شوق عام تھا، اس کے لیے کوئی بھی عذر کافی ہوتا گو تہوار بہترین موقع فراہم کرتے تھے، یگانگت کا یہ عالم تھا کہ مسلمان اور نصرانی مل کر مذہبی تہوار مناتے تھے، ہر خوشحال خاندان کے پاس پُر فضا دیہی علاقے میں تفریح کے لیے ایک منیّہ ہوتا، قرطبہ اور سیرا مورینا کی پہاڑیوں کے درمیان سارا میدان نزہت گاہوں سے پٹا پڑا تھا، عبدالرحمٰن الداخل نے اس کی بناالرصافہ ، بنا کے ڈالی تھی۔ کھنڈروں میں کسی رومانوی داستان کا سُراغ لگانے کی بجائے یہ لوگ گرما کے طویل دن اور مختصر راتیں باغات میں گزارتے۔ خنکی کی وجہ سے اُنہیں بلند و بالا پہاڑیوں سے رغبت نہیں تھی۔ ہموار میدان میں آراستہ پیراستہ چمن اُنہیں پسند تھے جہاں جُوئے آب رواں کے گرد خشت پختہ کی روشیں تھیں: اِبنِ حزم نے اس بہشت ارضی کا نقشہ کھینچا ہے۔

> "وسیع میدان میں پھولوں کے تختے جس سے روح کو بالیدگی حاصل ہو۔ سیمیں تلواروں کی طرح ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی تھی مُنھی نہریں، نغمہ سنج طیور، شاخوں سے آویزاں ثمر رسیدہ، خوش رنگ پھولوں کے درمیان اٹھکیلیاں کرتی ہوئی بادِ نسیم ، موسمِ بہار کا ایک دن جب سورج کی تمازت گوارا ہو اور خورشید دُھند کا باریک آنچل اوڑھ لے۔۔۔ ایک شرمیلی دوشیزہ کی طرح جو کبھی اپنا سراپا گستاخ نگاہوں سے چُھپالے، کبھی عاشق کے لیے ہمہ تن شوق ہو۔"

کیا عجب کہ جُھلسا دینے والے گرم علاقے کے باسی ایسے معتدل 'بہشت' کی تمنّا کرتے ہوں' ہومر اور ازمنۂ عتیق کی اساطیر کے مطابق ہرکولیس جس جنت ارضی کی تلاش میں سرگرداں تھا اُس کے خدوخال اُندلس سے مماثل ہیں۔

بچپن سے سن بلوغت تک بچّی ماں کی تحویل میں رہتی تھی۔ شہر کے مغربی مضافات میں ۱۷۰ عورتیں مخطوطات نقل کر کے روزی کماتی تھیں، تعلیم و تدریس کے پیشے کے علاوہ الحکم دوم کی لائبریرین لُبنیٰ کی مانند اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں مدیر اور دارالمطالعہ کی منتظم بن جاتی تھیں، عورتوں اور مردوں کے باہمی اختلاط کے مواقع محدود تھے، اُن کا تنہا گھومنا پھرنا یا قبرستان جانا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر مشرقی عالمِ اسلام کے مقابلے میں عورتوں کو زیادہ آزادی حاصل تھی۔ بالعموم مرد اور عورت کے دائرہ کار مختلف تھے، باہر کی دُنیا مرد سے مُتعلق تھی تو عورت چراغ خانہ ، گو وہ محبت اور شیوہ گری کا محور بھی تھی کوچہ و بازار میں جاتے وقت عورتیں نقاب پہن لیتی تھیں ، زیادہ عرصہ نہیں گزرا طریفہ کے مواضعات میں یہ رواج عام تھا۔ عورتوں کی سوانح اور شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شعر و شاعری اور موسیقی کی محفلوں

میں شریک ہوتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وفورِ جذبات سے مجبور ہو کر حوّا کی بیٹیاں رسم و رواج کے بندھن توڑ ڈالتیں اور ہم ذوق مردوں کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھاتیں، حسن و جمال میں یکتا خلیفہ المستکفی کی بیٹی شہزادی ولیدہ نے ایسی آزادانہ روش اختیار کی تھی ، وہ ایک ممتاز شاعرہ تھی اور گیارہویں صدی کی مجالس ادبیہ میں بے حجابانہ شرکت کرتی تھی۔

مسجد سے کچھ فاصلے پر پھولوں سے لدے پھندے ایک کنج میں دھات کے دو ہاتھ ایک مرد کا اور ایک نسوانی ـــــ ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے ہیں مگر ع

اُن ہاتھوں سے مَس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہاتھ

کی حسرت دل میں رہتی ہے، نیچے کندہ ہے "ابنِ زیدوں اور شہزادی ولیدہ کے ہاتھ" محکمہ اسلامک سٹڈیز کی طرف سے قرطبہ کے گلزاروں میں معروف شاعر ابنِ زیدوں کے ساتھ شہزادی کی ہم نشینی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی، ابنِ زیدوں نے ایک اور دوشیزہ سے راہ و رسم بڑھائی تو ولیدہ اپنی برافروختگی چھپانہ سکی اور اشعار میں اُس کی زجر و توبیخ کی ، اُس کے بعد ابن زیدوں نے ولیدہ کو منانے کی ہزار کوشش کی ، اپنی پرانی محبت کا واسطہ دیا، غصے میں ولیدہ کے نئے آشنا کی بدحالی کا نقشہ کھینچا مگر یہ نالہ و شیون بے سود تھا، ولیدہ کا دل نہ پسیجا، وہ ابنِ زیدوں کو اُس کی بے وفائی کا مزہ چکھانا چاہتی تھی، ہاتھوں کا درمیانی فاصلہ اُس کرب کا غماز ہے جو ابنِ زیدوں نے مسلسل بے اعتنائی اور بے رُخی کی وجہ سے محسوس کیا تھا، وہ مجنونانہ حالت میں الزہرا کے کھنڈروں میں سرگرداں رہا، اُس زمانے میں شاعر نے اپنی حالتِ زار اور مرحوم محبت کا ذکر چالیس اشعار پہ مشتمل اُس قصیدے میں کیا جس کی ردیف نُون ہے، یہ قصیدہ عشقیہ شاعری کا شاہکار ہے، آخر میں وہ بادِ صبا سے التجا کرتا ہے کہ اُس کی فریاد محبوب تک پہنچادے۔

در آرزوئے خاکِ درِدوست سوختیم
یاد آور اے صبا کہ نہ کر دی عنایتے

عبدالرحمٰن الناصر کا عہد عروس البلاد اور خلافت کا نصف النہار تھا۔

دسویں صدی کے آغاز میں اُندلس شدید انتشار کی لپیٹ میں تھا۔ حکومت واجبات وصول کرنے سے قاصر تھی، شاہی خزانہ خالی ہو چکا تھا، مختلف قومیتیں ایک دوسرے سے دست و گریباں تھیں، شمال میں نصرانیوں نے کافی علاقے فتح کر لیے تھے۔ طارق کے ورود سے اب تک ایسی آزمائش پیش نہیں آئی تھی، ان مخدوش حالات میں اکیس برس کا نوجوان عبدالرحمٰن سریر آرائے سلطنت ہوا، تاریخ تمدن اور خوشحالی کا باب رقم کرنے کو تھی، عبدالرحمٰن ـــــ اُندلس کا روشن ستارہ، دودمان اُمیہ کی اہم ترین شخصیت ، اُس کے اشعار میں خود اعتمادی اور فخر و مباہات کی جھلک ہے۔

کیا ہم آلِ مردان سے نہیں؟
نیرنگیِ زمانہ ہمارے ساتھ جو کھیل کھیلے

اور جو بھی ہماری حالت اس دور میں ہو
جب ہمارے نوزائیدہ بچّے شاہزادوں کا لقب پاتے ہیں
تو اس اعلان سے منبر تھر تھراتے ہیں
اور کرۂ ارض خوشی سے معمور ہو جاتا ہے

عبدالرحمٰن کا دورِ حکومت مسلسل کشمکش اور جدوجہد سے بھرپُور ہے۔ اُندلس کی مخلوط آبادی عرب، بربر، نومسلم مولّدون، نصرانیوں اور یہودیوں پر مشتمل تھی، ایسے مختلف النوع عناصر پہ حکومت کرنا آسان نہ تھا، اُندلس نسلی اور قبائلی عصبیت کا شکار تھا، لیون کی نصرانی ریاست شمال مغربی حِصّے پر قابض تھی شمالی ثغور کا بنو قیسی مولّد خاندان سر قسطہ کو خاندانی وراثت سمجھتا تھا، جب قرطبہ کی گرفت ڈھیلی پڑتی وہ اپنے آپ کو حکمران تصوّر کرتے، اشبیلیہ میں مرکز گریز رجحانات تھے، وہاں کا امیر مرکز کا جوا اُتار پھینکنے کی فکر میں تھا، موجودہ تیونس میں مہدیہ کو مرکز بنا کر بنو فاطمیہ شمالی افریقہ فتح کر چکے تھے۔ اُن کی للچائی ہوئی نظریں اَلاندلس پر پڑ رہی تھیں، فاطمیہ کی نئی خلافت عباسیہ اور اُمیہ کی رقیب تھی۔ عبدالرحمٰن نے اُن کی پیشقدمی روکی گاہے حکمتِ عملی سے، گاہے ناقابلِ تسخیر قوتِ ارادہ سے بگڑی ہوئی صورتِ حال کو سنبھالا اور بغاوتیں فرو کیں، اشبیلیہ کے بنو حجاج کو مطیع کیا، دیرینہ حریف ابنِ حفصوں کے جانشین کو شکست دے کر اُس کا "عقابی نشیمن" مسمار کیا اور بوسترو پہ اُمّیہ کا سفید جھنڈا نصب کیا، پھر روایتی باغی طلیطلہ کی باری آئی، بالائی ثغور میں والئ سر قسطہ نے شاہِ لیون کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اُسے تابع کرنے کے لیے جنگ کرنا پڑی، جب عبدالرحمٰن شر پسند عناصر کو زیر کر چکا تو وہ عیسائی ریاستوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے نصرانی حملوں کی حوصلہ شکنی کی اور توازن برقرار رکھنے کے لیے ہمسائیوں کے ساتھ عہدنامے کیے۔ سرحدوں پر غنیم کے قلعے مسمار کیے گئے یا مسلمانوں کے حوالے کر دیے گئے۔ ۹۵۰ء سے لے کر صدی کے اواخر تک انتہائی شمال کے سوا مسلمان تمام آبنائے ہسپانیہ پہ قابض ہو چکے تھے۔ اُنہیں ایسا عروج کبھی پہلے نصیب ہوا تھا نہ بعد میں ہوا، برشلونہ سے ساحل اوقیانوس تک اور کوہ پیرنیز سے بحیرہ روم تک عبدالرحمٰن کا سکّہ رواں تھا، مور ہسپانیہ ایک متحد ملک بن کے اُبھرا، ایک ایسا پودا جو عبدالرحمٰن کے عہد میں برگ و بار لایا۔

مغربی مؤرّخین لکھتے ہیں کہ اس قلیل وقفے میں عبدالرحمٰن اور المنصور کو واضح عسکری فوقیت حاصل تھی، مگر مسلمانوں نے ملک کی مکمل تسخیر کا نادر موقع گنوا دیا۔ عرب مدنی زندگی کے عادی ہو چکے تھے، اُنہیں سرد علاقے ناپسند تھے، ایک کُلیے کے مطابق عرب ایسی جگہ خوش رہتے تھے جہاں زیتون کی کاشت ممکن ہو۔ اسی لیے وہ شمالی حصے کی آبادکاری سے گریزاں رہے، اس کے نتائج دور رس تھے، شمال مغرب پہ دباؤ نہ رکھنا مہلک ثابت ہوا، گیارہویں صدی سے دریا مختلف سمت میں بہنے لگا عرب اور مور کی توسیع پسندی اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی تھی اور نصرانی بازیافت کا آغاز ہو رہا تھا۔

خلافت کے عروج کی صدی میں ایک خاص معاشرہ پروان چڑھ رہا تھا، متنوع ، جاذب ، رنگا رنگ کے اس معاشرے میں اہل مشرق بھی تھے ہسپانوی بھی، مردانِ حُر اور غلام تھے ، پیشہ ور سپاہی اور تاجر تھے۔ یہودی اساتذہ اور نصرانی ممالک کے سیاح تھے بحیرہ بالٹک سے زر خرید کنیزیں تھیں اور مختلف لوگوں کا لاؤ لشکر ، شروع سے ہسپانوی آبادی پر مشرقی طرز زندگی کی چھاپ تھی، وہ شوخ رنگ کے کپڑے پہننے لگے تھے۔ سر پہ ٹوپی یا عمامہ ہوتا اور پاؤں میں سن کے تلے والے چپل جو آج بھی جنوبی ہسپانیہ میں نظر آتے ہیں۔ اُندلس میں خوشحالی اور مادی ترقی کا دَور دَورہ تھا۔ دوسری ریاستیں عبدالرحمٰن کی ہیبت سے مرعوب تھیں، الحکم کے انتقال تک اُمیہ کا ستارہ اوج پر رہا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ۱۰۰۰ء کے بعد یہ جگمگاتی ہوئی مملکت زوال آشنا ہوگی۔

قرطبہ ! عالم نو کا جگمگاتا ہوا ہیرا ! اُس کی خیرہ کُن چمک سے نووارد کی آنکھیں چندھیا جاتی تھیں، ایک ایسی تہذیب پنپ رہی تھی جس کے سامنے وائی کنگ کا شمالی علاقہ ، فرانس اور انگلستان ازمنۂ قدیم کی یادگاریں معلوم ہوتی تھیں آبادی ، ثقافت اور صنعت کے لحاظ سے اندلس یورپ بھر میں صف اوّل میں تھا، عربوں کے لیے یہ سرزمین موعودہ دوسرا وطن تھی جہاں اُن کی تہذیب کو وہ فروغ حاصل ہوا جو بغداد اور صقلیہ میں ہوا تھا، ایسی شان و شوکت پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھی نہ ایسے مُدبّر حکمران اُندلس کو پھر کبھی نصیب ہوئے۔

مغربی یورپ کی ریاستیں اپنی سفارتیں قرطبہ بھجوا رہی تھیں، عبدالرحمٰن کے لیے باعثِ فخر لمحہ وہ تھا جب بازنطین نے اپنی سفارت بھیجنے کا فیصلہ کیا، صدیوں سے بازنطین یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کی عظیم طاقت رہا تھا، مغرب میں صقالیہ سے بحیرہ کیسپین تک اُس کی حکومت تھی، قدیم یونان کی زبان اور سرزمین اُسے ورثے میں ملی تھی، روما کا ستارا غروب ہونے پر اُس کی شان و شوکت بھی بازنطین کے حصے میں آئی ، اُس کے گنبد دار کلیساؤں کی تزئین و آرائش میں دینِ عیسیٰؑ سے والہانہ شیفتگی جھلکتی تھی، حکمرانوں کو فخر تھا کہ وہ ایک عظیم تہذیب کے امین ہیں مگر اس مرحلے پر وہ اسلام کے عروج سے خائف تھے، بازنطینی حکمرانوں کا اضطراب قابلِ فہم تھا، مسلم افواج نے مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے سرحدی صوبے بڑی سُرعت کے ساتھ فتح کئے تھے، بیشتر آبنائے ہسپانیہ پہ اُن کا قبضہ تھا، بحیرہ روم بازنطینی سمندر نہیں رہا تھا، یہ محض عسکری فتوحات نہیں تھیں، پریشان کن بات یہ تھی کہ لوگ تیزی سے نئے مذہب کی طرف راغب ہو رہے تھے۔ شام ، عراق، فلسطین اور مصر میں عالم، تاجر اور کاریگر جوق در جوق کھچے آ رہے تھے، وہ عربی زبان سیکھنے کے خواہاں تھے تاکہ فاتحین کے ساتھ تعاون کر سکیں بازنطینی حکمرانوں نے عالم اسلام کی سرحدوں پر شورش برپا کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس سیل پر بند باندھنے سے قاصر رہے۔

دو سو برس تک بنو اُمیہ کے حکمران محض امیر کہلائے مگر دو سو برس سے اُندلس ایک آزاد اور خود مختار مملکت تھی جو غیر ممالک کے ساتھ آزادانہ تجارت کرتی تھی اور جنگ اور امن کا فیصلہ کرنے کی مجاز تھی خلیفہ کا لقب عالم اسلام کے خلیفہ کے لیے مخصوص تھا جس کا پایۂ تخت کبھی اسلام کا قلعہ تھا، یہ لقب اختیار کرنے میں خلفائے عباسیہ کا حجاب مانع تھا

مگر وہ خلافت زوال پذیر تھی، عباسی خلیفہ ترک غلاموں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا۔ ۹۳۹ء میں عبد الرحمٰن نے خلیفہ اور امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔ ایک لحاظ سے یہ خود اعتمادی کا اظہار تھا، اس وقت بلاشبہ اندلس مغربی یورپ کی عظیم ترین ریاست تھی اسی سال بازنطینی حکمران نے قرطبہ کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک دیرینہ غنیم کی طرف سے ایسا اقدام عبد الرحمٰن کے لیے باعث فخر تھا، اُس نے بازنطینی سفارت کو متاثر کرنے کا فیصلہ کیا اور اُس کی پیشوائی کے لیے معزز اراکین سلطنت کو بندرگاہ پر بھیجا جو خلیفہ کے گھڑ سوار حفاظتی دستے کی معیت میں قرطبہ پہنچے۔ سفارت کی پذیرائی القیصر کے ایوان السفراء میں ہوئی فرش بیش قیمت قالینوں سے ڈھانپا گیا، دروازوں اور محرابوں پر کمخواب کے پردے آویزاں کئے گئے، خلیفہ سونے کے تخت پر بیٹھا تھا جس میں جواہر جڑے تھے، دائیں طرف اُس کے بیٹے تھے بائیں طرف چچا، اُس کے بعد منصب کے لحاظ سے وزراء اعیانِ سلطنت اور کارپردازان تھے، متعارف ہونے والے سفیر خلیفہ کی صولت سے مرعوب ہوتے، اُنہیں عزت و اکرام سے بٹھایا گیا تاکہ اپنے شہنشاہ کا مراسلہ پیش کر سکیں۔

عبد الرحمٰن کے طویل عہد حکومت میں کیا ہمسایہ ممالک کیا دُور افتادہ حکمران سبھی اس کی خیر سگالی کے جویا تھے۔ عبد الرحمٰن کے انتقال سے دو برس پہلے ایک سفارت قیطلونیہ سے آئی جس کی تفصیل شیخ اکبر محی الدین ابن العربی نے لکھی ہے، اسے خود اعتمادی کہیے یا استغنا کی رمق عبد الرحمٰن نے اس کا استقبال مختلف طریق سے کیا۔

'قرطبہ سے قصر الزہرا تک تین میل کا فاصلہ تھا جس پہ پوشش بچھ رہی تھی، راہگزار کے دونوں طرف سپاہیوں نے سفیروں کے سر پر تیغوں کی قوس بنا رکھی تھی، محل کے دروازے پر اُن کی ملاقات عمائدین سلطنت سے ہوئی جو ریشم میں ملبوس تھے، یہ سمجھ کر کہ ان میں سے ایک خلیفہ ہو گا وہ آداب بجا لائے مگر اشارہ پا کر آگے بڑھے، محل کے صدر دروازے سے استقبالیہ تک راستہ کمخواب سے ڈھانپا گیا تھا، خلعت ہائے فاخرہ پہنے اُمراء جگہ جگہ کھڑے تھے، اُن کو دیکھ کر سفیر کورنش بجالاتے مگر وہ کہنے لگے ہم تو خلیفہ کے غلاموں کے غلام ہیں، بالآخر وہ ایک دالان میں داخل ہوئے جہاں فرش پر ریت بچھی ہوئی تھی اور درویشانہ طرز زندگی کے مطابق خلیفہ نے معمولی لباس پہن رکھا تھا جس کی قیمت چار درہم ہو گی۔

وُہ سر جھکائے زمین پر بیٹھا تھا۔ سامنے قُرآنِ کریم دھرا تھا، ایک طرف تلوار تھی اور دوسری طرف انگیٹھی۔ جیسے سفارت کے لیے پیغام ہو کہ گفت و شنید کے پس منظر میں طبلِ جنگ موجود ہے اور قرآن کو ماننے والے شر پسند دشمن کے ساتھ جہاد کرکے اُسے جہنّم واصل کر دیں گے، چوبدار نے اشارہ کیا کہ یہ خلیفہ ہیں، سفیر تعظیم کے لیے جُھکے۔ اُنہوں نے بے چُون و چرا اُس کی شرائط مان لیں اور صلحنامے پر دستخط کر دیے، دوسرے نصرانی حکمرانوں کے لیے یہ ایک سبق تھا، نوارے کے حکمران نے بھی جلد اطاعت قبول کر لی، قیطیلیہ کے نواب نے صلح کی درخواست کی شاہ لیون

اور بارسیلونا کے سرداروں نے عبدالرحمٰن کی بالادستی قبول کی اور اُسے خراج دینا منظور کیا۔

اپنے طویل عہدِ حکومت کے آخری دَور میں عبدالرحمٰن کو سب مقتدر حکمران تسلیم کرتے تھے۔ قسطنطنیہ سے لے کر ساحلِ اوقیانوس تک معاصر حکمران اُس کی دوستی کے خواہاں تھے۔ شمال میں عیسائی بادشاہوں کے خاندانی نزاعات میں اُسے ثالث کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی، یہ وہ وقت تھا جب ایک سفارت کے بعد دوسری قرطبہ کا رُخ کرتی اور استقبال کے آداب کی سختی سے پابندی ہونے لگی تھی۔ مگر بھلے وقتوں میں بھی حکمران فوج کی وفاداری پر بھروسا نہیں کر سکتے تھے، وہ جانتے تھے کہ اُن کے خلاف سازشیں ہوتی رہیں گی، ذاتی حفاظت اور محلات کی پاسبانی کے لیے اُنہوں نے صقالبہ کے دستے بھرتی کیے، عربی اور رومانش سے نابلد ہونے کی وجہ سے یہ نصرانی غلام عجمی کہلاتے تھے، یہودی اُنہیں بحیرہ اسود، اور بحیرہ روم کی بندرگاہوں سے لاتے یا شمالی ہسپانیہ ، پولینڈ، فرانس اور جرمنی سے، ہسپانیہ میں اُنہیں ایک خاص قسم کی تربیت دی جاتی تھی، خواجہ سراؤں کی بجائے وہ محل کے منتظم اور پاسبان تھے، عسکری لحاظ سے بھی اُن کی تربیت اور تنظیم بہتر تھی، وہ لوگوں سے علیحدہ رہتے تھے، صقالبہ کی یہ جماعت عرب، بربر اور ہسپانویوں کے لیے قابلِ نفرین تھی، الناصر کے عہد میں صقالبہ کی تعداد چودہ ہزار تھی۔

الناصر بیدار مغز، فراخ دل، عزم صمیم کا مالک اور راسخ الاعتقاد تھا، اُس کی حکومت روشن خیالی اور رواداری پر مبنی تھی، سخاوت اور خوش خلقی اُس کے جوہر تھے، دُشمن بھی اُس کی خوبیوں کے معترف تھے، وہ مذہبی تعصب سے پاک تھا، اُس نے نصرانیوں اور یہودیوں کے ساتھ نہ صرف رواداری کا برتاؤ کیا بلکہ ہر طور اُن کی حوصلہ افزائی کی اور اُنہیں اعلیٰ عہدوں سے نوازا وہ مختلف مذاہب کے لوگوں کو مجلس مشاورت میں مدعو کرتا تھا، ایک یہودی HASDAY BEN SHARPUT عبدالرحمٰن کا وزیر خزانہ تھا۔ اُسے نوارے کی ملکہ کے پاس علاج کے لیے بھیجا تھا۔ پھر سفیر بنا کر لیون بھیجا ، بازنطین اور جرمنی سے سفیر آتے تو خلیفہ اُس کی قابلیت پر تکیہ کرتا تھا۔

دسویں صدی کے دوسرے حصے میں جزیرہ نما پہ مسلمانوں کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی اور اُنہیں مکمل اختیار حاصل ہو گیا تھا، یہ مسلم اقتدار کا نقطۂ عروج تھا۔ اس کا پُر شکوہ اظہار مدینۃ الزہرا کی صورت میں ہوا جو بیک وقت دارالخلافہ اور قصرِ سلطان تھا، قرطبہ سے تین میل کے فاصلے پر سیرا موریناکے دامن میں یہ سلسلۂ تعمیرات تین تختوں پر پھیلا ہوا تھا، بالائی حصے میں خلیفہ کی رہائش تھی، دوسرے میں سایہ دار باغات اور نباتیات کی تجربہ گاہ جہاں ملکوں ملکوں سے جڑی بوٹیاں درخت اور پھولدار پودے جمع کیے گئے تھے۔ وہیں ایک حصّہ جنگلی جانوروں اور پرندوں کے لیے مخصوص تھا، نچلے تختے میں اربابِ دولت اور خدام کی رہائش تھی۔ یہیں خلیفہ کا استقبالیہ تھا، پہاڑی سے محل تک پانی لانے کے لیے گیارہ میل لمبا آب رساں تھا جو قرطبہ کو بھی پانی فراہم کرتا تھا، سرسبز باغات کے درمیان قصر سپید ایک حیران کُن منظر پیش کرتا تھا، سارا سلسلہ کنگرہ دار فصیل میں محصور تھا جس سے قلعہ کا دھوکا ہوتا تھا، فصیل کی باقیات آج بھی موجود ہیں گو ایک وسیع رقبہ زیرِ کاشت ہے اور وہاں ٹریکٹر کام کر رہے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق خلیفہ کی ایک کنیز نے اپنی وصیت میں جنگی قیدیوں کی رہائی کے لیے ایک کثیر رقم چھوڑی تھی مگر یہ فتوحات کا زمانہ تھا اور ایسے قیدی ناپید تھے، چنانچہ اس کنیز کے نام پر نیا شہر مدینۃ الزہرا کہلایا اور وہ اثاثہ تعمیر کی شروعات پر صرف ہوا۔

عرب مؤرخین مدینۃ الزہرا کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور اُس کی شان و شوکت کا ذکر فخریہ لہجے میں کرتے ہیں، ایک بیان کے مطابق محل میں چار ہزار ستون اور پانچ سو منقش دروازے تھے، رہائشی حصہ پندرہ برس میں مکمل ہو گیا تھا مگر مدینہ کی تکمیل میں چالیس برس صرف ہوئے، سالانہ آمدنی کا ایک تہائی حصہ تعمیرات کے لیے مختص تھا، معماروں کے علاوہ ہزاروں مزدور، خچر اور اُونٹ کام پہ مامور تھے۔

شہر صفحۂ ہستی سے مٹ گئے، عبدالرحمٰن کا جگمگاتا ہوا الزہرا زمانے کے تند و تیز جھکڑ نے نگل لیا۔ ایک عرصے تک اہلِ مغرب مدینۃ الزہرا کی توصیف مشرقی مبالغہ آمیزی پر محمول کرتے رہے مگر پچاس ساٹھ برس اِدھر ایک حِصّے کی کھدائی سے ستون، فرش کے حِصّے، ظروف اور آرائشی اشیا کے ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں جن سے مؤرخین کے بیان کو تقویت ملتی ہے۔

کینز برا اور براز یلا کی طرح الزہرا اور الزہرا ایسے محلات بیک وقت دارالسلطنت اور مدنی زندگی کی ضروریات سے آراستہ تھے، ابنِ حیّان نے مدینۃ الزہرا کی تفصیل بیان کی ہے، "کام ۹۳۹ء میں شروع ہوا، اُس کی تکمیل چالیس برس میں ہوئی۔ پیازی اور سبز مرمر کے ستون قرطاجنہ اور تیونس سے درآمد کیے گئے۔ سپید مرمریں ستونوں کے لیے سنگِ مرمر طراغونہ اور المریہ کی کانوں سے حاصل کیا گیا۔ دروازوں کی آہنی سطح پر صیقل شدہ کانسی اور سونے کا جھول تھا، دو فوارے سنگتراشی اور مجسّمہ سازی کا نادر نمونہ تھے، بڑا فوارہ قسطنطنیہ سے تحفتہً بھیجا گیا تھا۔ سبز رنگ کا چھوٹا فوارہ شام سے لایا گیا تھا، اُس کے گرد شیر، ہرن، مگرمچھ اور پرندوں کے مجسمے تھے جن میں موتی اور جواہر ٹکے ہوئے تھے، یہ مرصّع مجسّمے قرطبہ کے ہُنرمندوں نے تیار کیے تھے اور اُن کے مُنہ سے پانی کے دھارے پُھوٹتے تھے۔"

مدینۃ الزہرا کا ایک اور عجوبہ بیت الخلفا تھا جس کی چھت اور دیوار یں رنگارنگ کی شفاف مرمریں سیلوں سے بنی تھیں، اُن پہ سونے کا پانی پھرا ہوا تھا، ہال کمرے میں ایک بیش بہا بڑا موتی آویزاں جو شہنشاہ قسطنطنیہ لیون نے بطور تحفہ بھیجا تھا۔

ایک مصری فرعون کو بے خوابی کا عارضہ تھا۔ بستر کو لرزاں رکھنے کے لیے وہ پارے کے حوض پر استراحت کرتا تھا۔ ملاقاتیوں کو مرعوب کرنے کے لیے عبدالرحمٰن نے ایک انوکھا طریقہ ڈھونڈا بیت الخلفاء کے وسط میں سیماب سے لبریز سنگ سماق کا حوض تھا، کمرے کے گرد آٹھ دروازے آبنوس اور ہاتھی دانت کے تھے جن میں سونے کی ٹکڑیاں اور جواہرات ٹکے تھے، اشارہ پاتے ہی خدام سیماب کو جنبش دیتے، سورج کی کرنیں چھت اور دیواروں سے منعکس ہو کر پارے میں ہلچل مچا دیتی تھیں جس سے ماحول میں دوامی حرکت کا تاثر ملتا تھا۔ مرتعش موجیں آنے والوں کے لیے

باعث حیرت ہوتیں جب تک پارہ جنبش کناں ہوتا رنگ برنگ کا طلسماتی منظر آنکھوں کو خیرہ کرتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے کمرہ اپنے محور کے گرد گردش کر رہا ہے۔

بیت الخلامیں صفائی کے لیے رواں پانی کا استعمال ایک اور اختراع تھی جس سے یورپ صدیوں تلک ناآشنا رہا، مرمریں پنہوترے سے باغات کا جانفزا نظارہ میسّر تھا۔ طلائی بال کمرے کی شاندار تزئین، مدّور بارہ دری، شفاف پانی کی مصنوعی جھیل، بلاشبہ الزہرا ایک ایسا محل تھا جو انسان کو کبھی خواب میں نظر آئے۔ ایک خوشگوار صبح تھی، پہلے پہل کی طلائی کرنوں میں راحت بخش آسودگی تھی، شہ نشین پر ٹہلتے ہوئے خلیفہ اور اُس کا وزیر خزانہ اور دوست Hasday Ben Sherput ایک مرمریں کٹہرے پر رُک گئے۔ محل کے اُس پار وسیع کھیتوں کی ہریالی تھی، بادام کے درختوں میں بھور آنے سے میدان سمن زار کا نقشہ پیش کر رہا تھا، آغاز بہار کے اس سمے میں قرطبہ جانے والی سڑک صاف نظر آرہی تھی، خچروں اور گدھوں کی طویل قطار اہالیان مدینہ کے لیے رسد لا رہی تھی، اس میں ادرک، کالی مرچ ، دار چینی اور مطبخ میں استعمال ہونے والے دوسرے مصالحے شامل تھے، اس کے علاوہ طبیبوں کے لیے کافور اور جڑی بوٹیاں ، خوشبو کے لیے عطر گلاب اور بنفشہ ، ریشمی دھاگے کے گچھے اور کپاس کی گانٹھیں تھیں، رنگریزوں کے لیے حنا ، نیل اور زعفران، صاحبان ذوق کے عمدہ کپڑے بُننے کے لیے خام مال اور سونا، چاندی ، ہاتھی دانت، نایاب لکڑی اور زیورات میں جڑنے کے لیے قیمتی پتھر ۔۔۔

عبدالرحمٰن کی چال ڈھال پر شاہانہ وقار ابھی باقی تھا، مہندی رنگی سُرخ ڈاڑھی شفاف نیلگوں آنکھیں، سامنے پھلوں پھولوں کے تہ در تہ قطعات تھے اور اُن کے درمیان پختہ روشیں، رنگیں پھولوں کی کثرت تھی، رنگترے اور کرنا کی خوشبو چار سُو رچی تھی، عبدالرحمٰن اپنے خیالات میں گم تھا، وہ سوچ رہا تھا۔

"میں نے پچاس برس شان و شوکت کے ساتھ حکمرانی کی، یورپ کے حکمران بلکہ بازنطین کا عظیم فرمانروا میری دوستی کے طلب گار تھے۔ میں نے دارالخلافت میں خوبصورت عمارتیں تعمیر کیں، مسجد قرطبہ کی تجدید و توسیع کی اور اللہ کے اس گھر میں ایک نیا مینار تعمیر کروایا، میرے عہد میں قرطبہ ایک پر حشم شہر بن گیا، اس زریں عہد کی یاد نغموں اور اساطیر میں محفوظ رہے گی مگر اِس طویل عہد میں مجھے دلی مسرت کے صرف چودہ روز میسّر آئے، قلعہ بوسٹرو کی فتح کا دن جب وہاں اُمیہ کا جھنڈا لہرایا، ابنِ حفصوں کا مسکن جس نے پچاس برس میرے پیشروؤں کے دانت کھٹے کیے تھے۔ وہ دن جب میں نے خلیفہ بننے کا اعلان کیا اور ہاں وہ دن جب میں نے بازنطینی سفارت کو شرف باریابی بخشا ، جس روز میرا پہلا بیٹا پیدا ہوا اور کنیز زہرا کو حاصل کرنے کا دن جس کی یاد میں میں نے مدینۃ الزہرا کی بُنیاد رکھی تھی، ایسے چند روز اور ۔۔۔ جدوجہد سے بھرپور اس حیات مستعار میں کدورت سے پاک، بیغش مسرت کے صرف چودہ روز!

ہارون الرشید نے مرتے وقت کہا تھا: "اے وہ جس کی سلطنت کو زوال نہیں اس پہ رحم فرما جس کی سلطنت کا سورج غروب ہو رہا ہے۔" تمام تعریفیں اُسی کو سزاوار ہیں جس کی شان کو زوال نہیں اور جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔

لا اله الا الله و هوالحی القیوم

مدینۃ الزہرا کی زندگی مختصر تھی، ایک موقع پر قاضی منزر بن سعید نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ زہرا (۱) جلد نہ کملا جائے، یہ خدشہ صحیح ثابت ہو کے رہا، عبدالرحمٰن کے علاوہ صرف الحکم کو وہاں رہنا نصیب ہوا پچاس برس کے اندر فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اُٹھی اور قرطبہ کا سہاگ اُجڑ گیا لوٹ کھسوٹ سے باغیوں کی آتش انتقام سرد نہ ہوئی۔ اُنہوں نے اس خوبصورت تعمیر کا نام و نشان مٹانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور قصر خلافت کو دیا سلائی دکھلا دی ، دیدہ زیب قصور کی بجائے بربر اپنے جلو میں سلگتے ہوئے کھنڈر چھوڑ گئے، شعلوں کی زبان نے خوبصورت مرمریں فرش چاٹا ، آج بھی پگھلا دینے والی تپش کے سیاہ نشانات اُس بربریت پر ماتم کُناں ہیں۔ خوش قسمتی سے گرتے ہوئے ملبے نے کہیں کہیں عمارت کا زیریں حصہ ڈھانپ لیا تھا اور یوں شوکت رفتہ کی یاد دلانے کے لیے کچھ حصہ محفوظ ہو گیا۔ مدینۃ الزہرا کو نذر آتش ہوئے گیارہ سو برس ہونے کو آئے، وہاں خون کی ہولی کھیلی گئی اور اُس کی عظمت قصہ پارینہ ہو گئی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہاں کھنڈرات کے سوا کچھ نہیں مدینہ کی کشش ہمیں وہیں لے جا رہی تھی، قرطبہ کے تنگ کُوچے اور پیلے گرجے پیچھے رہ گئے تھے اور اہلِ قرطبہ کے سفیدی شدہ مکان ، جالی دار دروازے اور تھے خنک صحنچے بھی ہمارا رہبر قرطبہ کا ٹیپیکل باسی تھا، خود دار متفخر ، کشیدہ قامت ، جذبات سے عاری، ماضی کی روایات میں گُم، مکانوں کی سرخ اور بُھوری ٹائیل والی چھتیں نظر سے اوجھل ہوتی گئیں۔ یکایک دیہی منظر ایک بڑے پنکھے کی طرح کُھل گیا، پہاڑیاں شہر کو ہالے میں لیے تھیں، دو رویہ چنار اور سفیدے کے درخت تھے، خشک پتّوں کی خوشبو سے ہوا گراں بار تھی، ٹریکٹر نظر آئے تو رہبر نے کہا:

"اشبیلیہ اور غرناطہ تک اب ٹریکٹر ہی نظر آتے ہیں ۔ زرعی زمین پر کام کرنے والے بیکار ہو گئے ہیں، اُندلس کی زمین بڑی بڑی زمینداریوں میں بٹی ہوئی ہے، وہی سماں ہے جو پانچ سو برس پہلے تھا، ہمارے لیے زندگی اُسی ڈگر پر چل رہی ہے جیسے فرڈینیڈ اور ازابیلا کے دَور میں تھی"

ہم فراز پر تھے، بائیں جانب قرطبہ کی وادی دھوپ میں نہا گئی تھی، پتھریلے کھیتوں میں انسان اور تاریخ کا امتزاج بنہاں تھا ، اردگرد گول گول پہاڑیاں تھیں اور دُور وادی الکبیر کے کنارے ایک دمکتا ہوا شہر، عبدالرحمٰن الناصر، ابن رشد، ابن حیموں، المنصور اور جانے کس کس کا شہر! اور ہمارے قدموں میں عبدالرحمٰن کا بسایا ہوا مدینۃ الزہرا ۔ ۔

نکھری ہوئی روشن فضا میں چند لمحے ہم پہاڑی کے سرے پر کھڑے رہے، نیچے شکستہ ایوانوں کا ملبہ تھا، حشرات الارض کے لامتناہی راگ سے فضا میں ارتعاش تھا، اُجڑے ہوئے ویران محل کی دیواریں جا بجا ٹوٹی ہوئی تھیں، ٹیلے پر کنکریوں اور خس و خاشاک کے ڈھیر تھے، پتھروں اور گھاس پات کی تہ میں بیش بہا آثار ضربِ تیشہ کے منتظر تھے۔ یوان السفراء کو بحال کرنے کا کام سست رفتاری سے جاری تھا۔ قصر کی دیرینہ آب و تاب اُجاگر کرنے کی کوشش ہو

۔ بمعنی پھول

رہی تھی۔ شکستہ ٹکڑیاں بالترتیب جوڑ کر ایک خوبصورت شے کی تشکیل ممکن ہے مگر شکستہ قوسیں پرانی زیبائی کھو بیٹھی تھیں، انہیں سنگ مرمر کے چونے سے جوڑنے کی کوشش عبث تھی اور اس عظیم محل کو اصلی رنگ رُوپ میں پیش کرنے کی کوشش بھی، قصر زہرا کی از سرِ نو تجسیم ممکن نہیں۔ انسانی لمس سے بے نیاز موجودہ دَور کے رنگ روغن سے بے نیاز پُر ہیبت کھنڈروں کی اپنی عظمت ہے۔ تاریخ کی انفرادی تعبیر سے اُس عہد کو آواز دینا ممکن ہے۔ یہاں زائر کو احساس ہوتا ہے کہ اُس کا رشتہ بنی نوع انسان کی وسیع برادری سے اُستوار ہے اور اُس کی جڑیں ماضی کے پاتال میں گم ہیں۔

عظمت رفتہ کی تلاش میں ہم پہاڑی سے زینہ بہ زینہ نیچے اُترے نیلگوں چنبیلی کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی، صدر دروازے کے دائیں بائیں چھوٹے دروازوں کی قوسیں نمایاں تھیں، درمیان میں ایک بلند و بالا ایوان کی قوس زمانے کی دستبرد سے بچ گئی تھی، اغلباً خلیفہ یہاں اجلاس کرتا ہوگا۔ بدقسمتی سے بہت کم آثار محفوظ ہیں۔ بہرکیف وہ اس امر کے شاہد ہیں کہ یہ محل مور فن کے عظیم ترین شاہکاروں میں سے تھا۔ کھنڈروں میں ٹہلتے ہوئے چشم تصوّر نے محل کی دیرینہ عظمت و سطوت کا احاطہ کیا۔ سالخوردہ دیواروں کی قطاریں کہیں کہیں شکست و ریخت سے بچا ہوا سنگ مرمر کا فرش، جا بجا سنگ مرمر کے ستون، دیواروں پر کُھدائی کا دیدہ زیب کام، سنگتراشی میں پھولوں کے ڈیزائن، اشبیلیہ اور غرناطہ کے محلوں کی طرح دیواروں پر منقش بیل بُوٹے پسے ہوئے مرمر سے نہیں کاڑھے گئے بلکہ ٹھوس مرمر کی سلوں میں پیچ در پیچ کندہ کاری کی گئی ہے۔ دیواروں پہ سیسے کے خول اس امر کے شاہد تھے کہ جگہ جگہ نفیس پتھر جڑے ہوئے تھے، فن تعمیر کے لحاظ سے جامعہ قرطبہ اور مدینۃ الزہرا ایک مرکب اسلوب کی نشاندہی کرتے ہیں جو صرف اندلس کا خاصہ ہے۔

اسلام میں ذی روح کی صورت گری ممنوع ہے، اس لیے مسلم فن کاروں نے شبیہہ اور جسم بنانے سے احتراز کیا، اس کے باوجود آرائش میں مور کی پرواز تخیّل قابل داد ہے اور اس صنف میں اُن کی اختراعات حیران کُن ہیں۔ اہلِ ہُنر نے دیدہ ریزی سے جیومٹری کی اشکال فن میں سمو کر بسبک عربی بیل بُوٹے دار نقاشی کی، ستونوں سے آویزاں انگور کی بیلیں کمال سنگتراشی کا نمونہ ہیں، اس کے علاوہ روغنی اور چینی ظروف کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ سفید زمین پر سبز رنگ کے نقش و نگار تھے جبکہ مالقہ کے مُلدانوں کی طرح حاشیے گہرے بُھورے رنگ کے تھے۔ دھات کی مصنوعات اور اُن پر منقش تحریریں کانسی میں پتھر کا جڑاؤ کام کچھ سالم حالت میں اور کچھ شکستہ ٹکڑیوں کی شکل میں موجود تھا۔ مٹی میں مدفون ہونے کی وجہ سے قصر کا ایک حصہ زمانے کی دستبرد اور نئی تہذیب کی شکست و ریخت سے محفوظ رہا، سیّاح اور مورّخ دونوں شکر گزار ہیں کہ یوں اُس تہذیب کا ایک نادر نمونہ محفوظ رہ سکا جو تیزی سے بامِ عروج تک پہنچی اور پھر اُسی تیزی کے ساتھ قعرِ گمنامی میں غروب ہو گئی۔

شیخ اکبر محی الدین ابن العربی لکھتے ہیں کہ جب عالیشان قصر زہرا اُجڑ کر پرندوں اور وحشی جانوروں کا مسکن بن گیا

تو میں نے چند اشعار کہے ۔

تفریح گاہوں کے آس پاس کچھ گھر صاف نظر آتے ہیں

اس حال میں کہ اُن میں کوئی رہنے والا نہیں اور وہ ویران ہیں

ہر طرف سے پرندے اُن پر نوحہ کرتے ہیں

ایک پرندے سے میں نے پوچھا "تو کس چیز پر نوحہ اور شکوہ کر رہا ہے؟"

اس نے کہا۔ "اُس زمانے پر جو گذر گیا اور اب واپس نہیں آئے گا۔"

اے سارباں منزلِ مکن جُزدر دیار یارِمن　　تایکزماں زاری کنم بر ربع و اطال و دمن

ربع از دل پُرخوں کنم، خاکِ دمن گلگوں کنم　　اطلال راجیحوں کنم از آبِ چشمِ خویشتن

اقبالؒ نے قصر زہرا کو دیووں کا کارنامہ قرار دیا، مسجد قرطبہ کو مہذب دیووں کا اور الحمرا کو محض انسانوں کا ، قصر زہرا جلالی شان کا مظہر تھا، مسجد کے دالانوں پر جلال و جمال کا امتزاج تھا اور الحمرا ایک مرقع جمال ، ایک بدیع اور دلکش فن پارے میں ہمیشگی کا عنصر ضرور ہوتا ہے۔ ایک عظیم تہذیب ہی جامعہ قرطبہ ایسا شاہکار تخلیق کر سکتی ہے، ایک معجزہ فن ہی اُس تمدّن کا احاطہ کرنے میں مد ہوتا ہے بلکہ اس کے اثبات کی دلیل بھی ہے۔

وادی الکبیر کے پُل اور شاہراہ آگسٹا کے سنگم پر رومیوں کا معبد تھا جہاں دیوتا "جینس" (۱) کی پرستش ہوتی تھی، نصرانیوں نے یہیں سینٹ ونسنٹ کا گرجا تعمیر کیا تھا، عبادت گاہ کے لیے یہ جگہ ہر لحاظ سے موزوں تھی، مسلمانوں نے یہ کلیسا مسخ یا برباد نہیں کیا، نہ ہی اُسے جبراً استعمال میں لائے، فتح قرطبہ کے بعد مسلمانوں نے گرجا کا آدھا حصّہ نماز ادا کرنے کے لیے خرید لیا جبکہ آدھا حِصہ بدستور نصرانیوں کے تصرف میں رہا، یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے مگر چالیس برس تک نصرانی اور مسلمان ایک عمارت میں ہی عبادت کرتے رہے، بیچ میں محض ایک دیوار حائل تھی، مسلمانوں کی تعداد بڑھ جانے سے دقت پیش آنے لگی اور مسجد کی توسیع ناگزیر ہو گئی، معاہدے کی رُو سے نصرانیوں کو ایک لاکھ طلائی سکوں کا معاوضہ دے کر عبدالرحمٰن نے بقیہ عمارت خرید لی اور کلیسا بنانے کے لیے متبادل جگہ دے دی، اُنہیں پرانے کلیسا مرمت کرنے اور عبادت کے وقت گھنٹے بجانے کی پوری آزادی تھی۔

مسجد کی بنا ۷۵۵ء میں رکھی گئی، بمرورِ ایام اس میں متعدد اضافے کیے گئے، ابو فراس ہمدانی نے کہا تھا:

صنائع　فاق　صانعُہا　ففاقت

و　غرس　طاب　غارسہا　فطابا

"جن صنائع کا صانع فائق ہو وہ صنائع بھی فائق ہوتی ہیں ، جس پودے کو سینچنے والا پاک ہو وہ پودا بھی پاک ہوتا ہے۔"

اس عظیم الشان مسجد کی پہلی اینٹ عبد الرحمٰن الداخل نے رکھی۔

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہُنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات !
اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کُہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

مگر ایک لمحۂ گریزاں میں اقبالؒ نے فنا سے بقا کی طرف سفر کیا تھا، حال کا غم آشنا لمحہ وقت کی پہنائیوں میں گُم تھا، اذانِ سحر کے لیے ترسی ہوئی مسجد میں شاعر نے بیک وقت درخشاں ماضی کی جھلک دیکھی اور تابناک مستقبل کی نوید سُنی۔

"مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچادیا جو پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔"

وفات سے دو برس قبل عبد الرحمٰن نے مسجد کی تعمیر شروع کی تھی، اندلس میں حالات ساز گار تھے، بغاوتیں فرو ہو چکی تھیں، سپہر بے ملال تھا، اس مقدس عمارت کی تعمیر خدائے بزرگ و برتر کے حضور جذبۂ تشکر کا اظہار بھی تھا کہ سب کامرانیاں اس کا عطیہ تھیں، تکمیل اس کے نیک دل ، عدل پرور فرزند ہشام کے ہاتھوں ہوئی جو خود مزدوروں کے دوش بدوش تعمیر میں حصہ لیتا تھا۔ بنی اُمیہ کے حکمران مسجد کی توسیع ، تزئین و آرائش مذہبی فریضہ سمجھتے تھے، کوہ مورینا کی چٹانوں کو کاٹ کر الحکم نے ایک سڑک بنوائی جس کے ذریعے مسجد کے چار بڑے حوض پُر کرنے کے لیے تازہ پانی مہیا کیا جاتا تھا، رعایا کے لیے پانی کی فراہمی سلطان کا ایک اشرف تحفہ شمار ہوتا تھا، وسعت اور زیبائی کے لحاظ سے عبد الرحمٰن الناصر الحکم دوم اور ہمہ مقتدر حاجب المنصور نے گرانقدر اضافے کیے ، الحکم کے عہد میں مرصع قوسیں ایزاد کی گئیں اور محراب کی آراستگی ہوئی، حاجب المنصور کے دَور میں مسجد کی شان عروج پر تھی، درودیوار پر خوشبودار چوبی الواح نصب تھیں جن کی تزئین ہاتھی دانت، سونا، چاندی اور تانبے سے کی گئی تھی، چراغ جلتے تو اُن میں سیکڑوں بتیاں منعکس ہو کر آتشیں پھولوں کا رُوپ دھار لیتیں، ایک وقائع نویس نے لکھا: "چھت سے سونا آگ کی مانند دمکتا ہے جیسے بجلی کی خیرہ کُن چمک بسرعت بادلوں میں لہرا جائے" زبرجد، سنگ سماق، سنگ یشب اور سنگ مرمر کے ستون تیرہ سو سے کچھ کم تھے، سپید، سُرخ، سیاہ اور نیلگوں ستون، چھت کو سہارا دینے کے لیے دوہری محرابیں تھیں اور اُن کے اوپر نعل آسا قوسوں کے شاخچے ، ہسپانوی عربوں کی یہ اختراع ایک ایسی جدت تھی جو بعد میں نصرانی فن تعمیر پر اثر انداز ہوئی، ایک وسیع رقبے پر چھت ڈالنے کا مسئلہ درپیش تھا، رومی کھنڈروں سے ستون بکثرت دستیاب تھے مگر یہ اونچائی میں کم تھے، چھت نیچی ہونے سے وسعت اور کشادگی کا تاثر مفقود ہو جاتا، کمان کی طرح ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی دُہری قوسوں سے بلندی اور فراخی کا تاثر دینا مقصود تھا، ستونوں اور قوسوں کی اکائی جھٹپٹے کا وہ سماں پیدا نہ کر سکتی جو دُہری محرابوں کے فشار سے ہوتا ہے نہ بیکراں فراخی کا احساس ہوتا ، ان کی کثرت مل جُل کر ایک عجیب کیفیت کو جنم دیتی

ہے، مسجد کی حد یں ملگجے میں گم ہو جاتی ہیں۔ جیسے کوئی شے رواں دواں ہو، بے ثغور اور فراخ، ہر جانب پھیلے ہوئے دالان بیک وقت پُر سکون اور پُر اسرار ہیں، غیر متوقع گوشوں سے دھیمی خنک روشنی کا نفوذ ، قوسوں پر پیازی اور زرد رنگ دھاریاں، لرزاں، رقص کناں دھاریاں، نتیجتہً نگاہ لمحہ بہ لمحہ بھٹکتی ہے اور ایک نُقطے پر مرتکز نہیں ہو پاتی۔

قرطبہ کی چُندھیا دینے والی دھوپ میں سے مسجد میں داخل ہوں تو محسوس ہوتا ہے جیسے موروں کی اوّلیں صدیاں لوٹ آئی ہوں، متناسب ستون قطار اندر قطار اور اُن پہ محرابوں کا ماہی جال جیسے کسی دلفریب نخلستان میں صدہا سرو قد نخیل ایستادہ ہوں، اُن کی ژولیدہ شاخیں کسی سحر کے تحت منجمد ہو گئی ہوں اور چوڑے چکلے پتّوں سے روشنی چھن چھن کے آرہی ہو۔

مسجد کا دھندلکا خاموش تفکر اور روح پرور مراقبے کی دعوت دیتا ہے، اس طرز تعمیر سے صعود اور ترفع کا احساس ہوتا ہے جیسے عمارت ہاتھ پھیلائے مائل پرواز ہو، یہ اسلوب ٹھوس، اہرام آسا کلاسیکی طرز تعمیر سے بہت مختلف ہے، بنانے والے جو وُسعت اور فراخی کا یہ تصور رکھتے تھے خود کتنے عظیم ہوں گے، کیا اُن کی چشم بصیرت دیکھ رہی تھی کہ تیرہ سو برس گزر جانے پر بھی اُن کے عشق کی تجسیم زندہ و تابندہ ہوگی۔

ستونوں اور محرابوں کا پھیلاؤ کسی عظیم گاتھک کلیسا کے مقابلے میں منتشر معلوم ہوتا ہے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ صاحب ایمان کے لیے مسجد کا کوئی خاص حصہ عبادت کے لیے وقف نہ تھا بلکہ وہ تو کہیں بھی نماز ادا کر سکتا تھا۔ مسجد کا درمیانی حصہ عدالت اور مدرسے کے طور پر استعمال ہوتا تھا، اسلام میں دین اور روزمرہ کی زندگی میں بُعد نہیں، یہاں علم و فضل کے باب کھلتے تھے۔ یورپ بھر سے تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھانے آتے تھے۔ ایک گوشے میں قاضی مسلمانوں کے مابین قضیے چکاتا تھا، منصب کے لحاظ سے قرطبہ کا قاضی پورے طور پر خود مختار تھا۔ اُس کے فیصلے قرآن و حدیث کی روشنی میں ہوتے تھے۔ اس عہدہ جلیلہ سے سلطان وقت بھی خم کھاتا تھا، قاضی کی عدالت میں امیر و وزیر اور ایک عام شخص کے حقوق مساوی تھے۔ جب مینار سے اذان کی صدا بلند ہوتی عدالت اور مدرسے کا کام عارضی طور پر رُک جاتا، جامعہ قرطبہ اسلام اور قدامت پسند مذہبی رُجحانات کی محافظ رہی، مسلم ہسپانیہ میں حکمران کو ہمیشہ فقہاء سے واسطہ پڑتا تھا، فلسفہ ، سائنس ، شاعری اور قدامت پسندی میں بسااوقات چپقلش بھی ہوتی، مگر علوم و فنون میں حیرت انگیز ترقی جاری رہی حتیٰ کہ یورپ مسلم ہسپانیہ سے اکتساب کرنے لگا۔"

۱۲۳۵ء میں سپین کا فرمانروا فرڈینڈ قرطبہ پر قابض ہو گیا اور مسلمانوں کے لیے مسجد کا وجود ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، سقوط کے بعد اس کی حیثیت ایک کلیسا کی ہے گو شہر کے لوگ اسے آج بھی مسجد (۱) کہتے ہیں، سب سے پہلا گرجا سقوط قرطبہ کے فوراً بعد بنایا گیا، کلیسا کی تعمیر کے لیے مرصّع چھت جگہ جگہ سے اکھاڑی گئی اور جالیاں توڑ دی گئیں ، ستونوں کی چند قطاریں منہدم کر کے ایک چھوٹا کلیسا بنایا گیا مگر ہیئت کے لحاظ سے ایک وسیع رقبہ اب بھی مسجد کے

مماثل تھا، بربریت کا بدترین مظاہرہ سولہویں صدی میں کارلوس کی تخت نشینی پر ہوا، خداوندانِ کلیسا کو ایک ایسا موقع ہاتھ آیا جس کے وہ مُدّت سے منتظر تھے، ایک پُرجوش اسقف اعظم نے عین درمیان میں ایک بڑا کلیسا تعمیر کرنے کی اجازت مانگی جہاں سرود خواں (۱) طائفے کے لیے وافر جگہ ہو۔ یہ سُن کر مقامی کونسل کے ارکان سخت برہم ہوئے اور انہوں نے متفقہ طور پر اعلان کیا کہ شہر کی محبوب عمارت کو مسخ کرنے والا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا، کارلوس جنوب کے حالات سے قطعاً بے خبر تھا۔ شہریوں کی شدید مخالفت کے باوجود اُس نے کلیسا بنانے کی اجازت دے دی، مسجد کے وسط سے تریسٹھ ستون اُکھاڑ دیے گئے، معمار تیزی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور مسجد کے عین درمیان میں ایک عمارت کھڑی کر دی۔ عبدالرحمٰن الناصر کے بنائے ہوئے مینار کی چوٹی پر شنت رافیل کا بُت نصب کیا گیا، پھر گرجا کے گھنٹے لٹکانے کے لیے ایک درجہ ایزاد کیا گیا، اتنا غیر متناسب جیسے دوگنا بنا کر دونوں طرف سے پچکا دیا گیا ہو، یہ نہ تو گاتھک کلیسا کا حِصّہ معلوم ہوتا ہے نہ ہی اس میں مینارِ مسجد کی رعنائی ہے۔ جب کارلوس کا گزر قرطبہ سے ہوا اور پہلی بار اسے دیکھنے کا موقع ملا کہ اُس کے ایماء پر کیا حرکت کی گئی ہے تو اُسے اپنے کیے پر ندامت ہوئی اور اس نے کہا: ”جو چیز تم نے یہاں بنائی ہے وہ اور جگہ بھی موجود تھی مگر جو چیز تباہ کر دی وہ اور کہیں نہیں ملے گی۔“

کلیسا ایک بدنما عمارت ہے، ایک لحاظ سے یہ متوقع تھا۔ مسلمانوں کے انخلاء کے بعد نصرانیوں نے جو کچھ بنایا وہ کم تر اور بدتر تھا۔ کلیسا کی تعمیر سے ہیکل سجانے کا جواز نکل آیا۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ اینٹوں کی چُنائی کر کے افسردہ اُطاق بنا دیے گئے۔ یہ تجاوزات حسِ لطیف کو مجروح کرتی ہیں، قربان گاہوں کی تعمیر سے کھلی فضا مسدود ہو کے رہ گئی ہے۔ اصل حالت میں فرزندانِ توحید ہر سمت سے مسجد میں داخل ہو سکتے تھے۔ اندر داخل ہو کر ستونوں کے خیابان سے اُن کی اچٹتی ہوئی نظریں اُندلس کے نیلگوں آسمان کی بے پایاں وسعتوں پہ پڑتی ہوں گی، اپنے تخیل کے مانند آزاد،

ایک مغربی مؤرخ رقمطراز ہے: ”بلاشبہ جو ہوا قابلِ افسوس ہے مگر دیکھا جائے تو مطرانی کلیسا کی بے جا مداخلت اتنا بڑا المیہ نہ تھا، سرسری نگاہ ڈالنے سے نظر ہوا دار، فراخ دالانوں میں یُوں گم ہو جاتی ہے کہ کلیسا کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا، ممکن ہے اس تعمیر سے ایک فن پارہ محفوظ ہو گیا ہو، کون کہہ سکتا ہے کہ اصل حالت میں یہ شاہکار غارت گروں کی دست بُرد سے محفوظ بھی رہ سکتا۔“

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے موروں پر غلبہ پا کر بھی نصرانی عنصر مطمئن نہ ہوا ہو اور مزید دباؤ ڈالنے کا خواہاں ہو، جیسے اسلام کی رُوح ماضی کے غرفوں میں سے جھانک کر اسے پریشان کر رہی ہو، یہ ایک نصرانی ملک ہے جہاں مسلم اثرات کو شعوری طور پر دبایا گیا ہے مگر جو جا بجا ظاہر ہو کر اس دَور کی یاد دلاتے ہیں، یہ ایک فاتح قوم ہے جس نے دلِ انسان کے سوا شکست خوردہ موروں کو ہر جگہ سے نکال باہر کیا ایک ایسی سرزمین جس نے موروں کی یاد محو کرنے کی پوری کوشش کی جو اُن کی شوکت رفتہ پہ ماتم کناں بھی رہی، ایک ایسی تہذیب جسے یقین تھا کہ آخری معرکہ جیت لینے کے بعد وہ مور پہ

غالب آگئی ہے مگر جو جانتی ہے کہ فنونِ لطیفہ، فلسفہ، طب، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ اور زراعت میں میدان موروں کے ہاتھ رہا۔

زایر زیارت کی دہلیز پر تھا، یہی وہ جگہ ہے جہاں قرطبہ کا مشرقی طلسم رہ نوردانِ شوق کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ مسجد پر ایک ہزار برس کا تہ در تہ غازہ تھا۔

کعبے سے اِن بُتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کہہ کر غالب نے اُن بتوں کا ذکر کیا تھا جو طلوعِ اسلام کے ساتھ وہاں سے نکالے گئے مگر حرمِ قرطبہ میں معاملہ برعکس تھا، چوک میں بُت، الناصر کے بنائے ہوئے مینار کی چوٹی پر شنت رافیل کا بُت، بیرونی دیوار کے ساتھ مجسّمے، مسجد کے اندر بُت۔

صنم کدہ ہے جہاں لاالٰہ الااللہ

گہرے نیلے آسماں کی بے پایاں وُسعتوں میں کنگرے دار شعلہ ساں فصیل سر اُٹھائے کھڑی تھی، وقفوں کے بعد چوپہل پشتیبان تھے جیسے ایک قلعہ ہو، فرزندانِ توحید کے لیے یہ ایک قلعہ ہی تو تھا، حیاتِ ملی کا محور، علم و دین کا مرکز، ایک مہذب معاشرے کا نقطۂ ارتکاز، دارالاسلام کا دل، زمانے کے تغیر و تبدل اور جنگ و جدل کے باوجود نارنجی شگوفوں کی وہی خوشبو۔ فضا میں رچی بسی تھی جیسے صدیوں پہلے ہوگی، صرف باب توبہ کُھلا تھا، موروں کے خلاف جنگ پر جاتے ہوئے نصرانی دستے اس دروازے سے گزرتے تھے اور پادری قرطبہ کے جھنڈے کو اسیس دیتا تھا۔

بوجھل سینے کے ساتھ میں مسجد میں داخل ہوا، سورج غروب ہو رہا تھا، اندر ایک اذیت ناک خاموشی تھی جس سے روح و دل پر اضمحلال چھا گیا، مَیں یہاں پہلے بھی آیا تھا مگر اس بار اہتزاز کی بجائے اضطراری کیفیت طاری ہو گئی، دورِ خلافت میں جگہ جگہ چاندی اور پیتل کے جھاڑ اور نقرئی فانوس آویزاں تھے، چہل چراغوں میں سیکڑوں روشنیاں جگمگ جگمگ کرتی تھیں جن سے مسجد بُقعۂ نور ہوتی تھی بے آب دیواروں پر منقش و مجلّا چرمی پردے جھلملاتے تھے، اب صرف کلیسا اور محراب روشن تھے، رات دبے پاؤں بڑھ رہی تھی، شکستہ و درماندہ مسجد تاریکی میں ڈُوبنے لگی جیسے مجبوری و محکومی کی صدیاں انمٹ نقوش چھوڑ گئی ہوں، مُطلّا کلیسا ایک طلائی خنجر کی طرح مسجد کے سینے میں پیوست تھا، سنگ سپید کا وہ فرش جہاں ایک جلیل القدر قوم صدیوں سجدہ ریز رہی جگہ جگہ سے اُکھڑا ہوا تھا، چھت پے در پے زخموں سے گھائل تھی، اُدھڑے ہوئے در و دیوار پر بھونڈے طریق سے پیوند کاری کی گئی تھی، اس حال میں بھی قطار در قطار اُبھرتے ہوئے ٹھوس مدور ستون رب ذوالجلال کی وحدت کا اعلان کر رہے تھے، ابن ابی عامر کے زمانے میں ساٹھ خدّام مسجد کی دیکھ بھال کرتے تھے، اب ساری توجہ کلیسا کی طرف تھی۔ مسجد کی نگہداشت اُن نیم خوابیدہ پاسبانوں کے سپرد تھی جو ڈھیلی ڈھالی پتلونیں پہنے داخلے کے ٹکٹ کی ریزگاری سمیٹ رہے تھے، اُن کی حجامت بڑھی ہوئی تھی اور چہروں سے بیدلی کے آثار نمایاں تھے جیسے مسجد کی خستہ حالی سے اُنہیں کوئی سروکار نہ ہو، سنہرے حروف میں قرآنی آیات

دلپذیر خطاطی کا نمونہ تھیں، عجب نہ تھا کہ وہ بھی ستمگری کا نشانہ بن کر مٹادی جاتیں ، خوبی قسمت سے اُنہیں ڈھانپ لیا گیا تھا، صدیوں بعد مسجد اہلِ کلیسا سے لے کر محکمہ آثارِ قدیمہ کی تحویل میں دے دی گئی، اُس وقت پلستر صاف کرنے سے آیات مبارکہ پوری آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوئی ہیں، حصولِ ثواب کے لیے نصرانی اُمرانے اندرونی دیوار کے سہارے قربان گاہیں اور ہیکل بنا کر مسجد اور کھلی فضا کے درمیان سدّ سکندری کی طرح ایک دیوار حائل کر دی ، گزرے ہوئے زمانے میں صحنِ نارنج میں فوارے رواں ہوتے، نارنگی کے درختوں کی بہار ہوتی، آفتاب اور آب سنگ اور سائے یکجا ہوتے، نماز کے اوقات میں دروازے کھلے رہتے ستونوں کی صفیں نارنج کی قطاروں میں مدغم ہو جاتیں اور یوں انسانی صناعی حسن فطرت سے ہم آہنگ ہو جاتی، افسوس، نصرانیوں نے سب کچھ بدل دیا، اندر آنے کے لیے صرف بابِ تخیل رہنے دیا، کتنے بد ذوق تھے وہ لوگ جنہوں نے مسجد کے شمال مغرب میں اینٹوں کی چنائی کرکے مور معماروں کا فطرتی تاثر برباد کر دیا، مور ستونوں کے درمیان کلیسا کی جبر آمد اخلت دیکھ کر ہر زائر کے دل پر چوٹ لگتی ہے، تقابل سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں مذاہب کا ذوق اور فن تعمیر کا تصوّر کس درجہ مختلف تھا، جفا سے توبہ کرنے والے کارلوس نے تسلیم کیا تھا کہ مسجد کو تہ و بالا کرنا ایک ایسا ظلم تھا جس کی تلافی ممکن نہیں تھی، پادریوں کا بس چلتا تو مسجد کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکتے مگر اس کی جڑیں پاتال میں ہیں ، اُس کے در و بام پر وادی ایمن کا نور ہے اور اُس کا مینار بلند جلوہ گہ جبرئیل ، مسجد سطوتِ توحید کی امین ہے، رسولؐ خدا کے پیغام کی نقیب ، سنگ خارا میں قران کی تفسیر، محراب کے قریب دودھیا، سپید اور پیازی رنگ کے ستونوں کی رعنائی کچھ سوا تھی۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

محراب کا اسلوب بے نظیر ہے جس کی مثال کسی اسلامی ملک میں نہیں ملتی ، کبھی آبنوس ، صندل ، حدنگ اور شوحط ایسی قیمتی لکڑیوں اور ہاتھی دانت کا منبر محراب کی زینت تھا جس میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے، اسے تیار کرنے میں اعلیٰ پائے کے صنّاعوں نے برسوں محنت کی تھی، سولہویں صدی تک تو یہ بیش بہا منبر کلیسا میں دیکھا گیا، پھر پارہ پارہ کرکے فروخت کر دیا گیا، مسجد نے پتھر کا کلیجہ کرکے فرزندانِ تثلیث کی چیرہ دستیاں سہی ہیں البتہ سرخ، سبز ، نیلگوں اور طلائی نگینوں سے آراستہ ہشت پہلو محراب میں جلتے بجھتے ستارے پرانی آب و تاب کی یاد دلاتے تھے، صدیوں کا گرد و غبار اس معجزۂ فن کی رعنائی نہیں چھین سکا تھا مگر نصرانی یورپ میں اسلامی شکوہ کا یہ منظر اجنبی تھا، مؤذن کی اذان کی طرح اجنبی ۔۔۔

گزرے ہوئے واقعات دل پر ہجوم کر آئے ، المیہ کا ایک ایک باب نظر کے سامنے تھا، یہ سب صفحۂ ہستی سے کیونکر مٹ گیا؟ یہ انسان کی بے تدبیری تھی یا تقدیر ربّی؟ اُس کی مشیت کیا تھی؟ عمل کی آگ سرد ہوئی، اندلسی مسلمانوں نے اپنی تقدیر اغیار کے حوالے کر دی، انجام معلوم تھا، جس روز تلوار نیام میں چلی گئی اس پاک گھر کی حرمت ختم ہو گئی۔ حیف اُس قوم پہ جو سوزِ دروں سے محروم ہو کر اپنا نصب العین کھو بیٹھے ، جو خون دے کر اُس کی حفاظت نہ

کر سکے، زندہ قومیں لحظہ بہ لحظہ انقلاب سے دو چار ہیں سوزِ آرزو سے ان کی رگ رگ نبض تپاں ہے۔

فطرت لہو ترنگ ہے ظالم نہ جلترنگ

رنگدار دھاریوں میں لپٹی ہوئی محرابیں جامد و ساکت تھیں، مسجد خاموش تھی اور فضا دم بخود، دل گرفتگی کے عالم میں حرفِ دُعالب پہ آیا ہی تھا کہ یکایک کلیسا کے گھنٹے بجنے لگے، مسند روح القدس سے انجیل کا خطبہ دیا جارہا تھا، وہ اذان کہاں تھی جس کے ترنم سے لاکھوں دل بیک وقت دھڑکتے تھے، جس کی مقناطیسی کشش سے موحدین صبح و مسا کھچے آتے تھے، حرم قرطبہ کے بلند و بالا دالانوں میں اُس تکبیرِ مسلسل کی گونج باقی ہے جس سے مردانِ حُر کے سینے فروزاں تھے، وہ مردانِ خود آگاہ جو فقیہہ حرم تھے اور امیر جنود بھی "خلقِ عظیم" کے امین تھے اور عہد نو کے نقیب بھی، مسجد کے چپے چپے پر اُن کے نشان مرتسم ہیں، پھر کلیسا کے گھنٹے کیسے؟

رازہے ، راز ہے تقدیر جہانِ تگ و تاز

پھر مرورِ ایام کے حجاب اُٹھ گئے، جذبات کا ریلا بہا کر کہیں اور لے گیا، شہر کے ہنگاموں اور شور و شغب سے دور سُرخ رنگ کی بھاری بھرکم دیواروں کے پیچھے مسجد کی وسیع آغوش میں ایک پُرسکوں گہوارہ تھا، مسجد کی خنک سلوں پہ برہنہ پا مُتحرک سائے وضو کے لیے حوض کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اہلِ ایماں جس طرح جنّت میں گردِ سلسبیل

تہ در تہ دالانوں کی دل فروز فضامیں صلوٰۃ و درود کے پاک کلمات منجمد ہو کے رہ گئے تھے، ہوامیں قرأت کی نغمگی موجزن تھی، عود و عنبر سے فضا معطر تھی، تسبیح و تحلیل سے دل گداز تھے، ارواح قدسیہ اُس مصحف پاک کی متلاشی تھیں جو منبر پہ دھرا رہتا تھا، جس کے اوراق پر حضرت عثمانؓ کے خون کی افشاں تھی، سیکڑوں عبادت گزار اُس یگانہ و یکتا کے حضور سر بسجود ہونے کی تڑپ دل میں لیے منتظر تھے جو حی بھی قیوم بھی، المھیمن بھی ہے المنتقم بھی، خلافت کا عہدِ صالح کہیں منعکس ہوتا ہے تو یہاں!

اگلی صبح اور ہی منظر تھا ، تماش بینوں کی نظر میں میری زیارت گاہ کی حیثیت ایک کہنہ تعمیر سے بیش نہ تھی ، پانچ سو برس تک مسجد کی زمیں اہلِ ایماں کے سجدے سمیٹتی رہی اور یوں دیدہ انجم میں آسماں جاہ ہوئی ، وہی زمین اب سیاحوں کے جوتوں تلے روندی جارہی تھی ، سقوطِ قرطبہ کی جانگداز ساعت سے لے کر آج تک یہی ہوتا چلا آیا ہے ، پانسہ کب کا پلٹ چکا ، ایک قوم فاتح ہے دوسری مفتوح ، ایک غالب ہے دوسری مغلوب ، شوکتِ رفتہ کا ایک نشان باقی ہے ، اللہ بس باقی ہوس آج بھی سیاح پوچھتے ہیں:

کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر ؟

مسجد کی آخری توسیع الحکم دوم کے زمانے میں ہوئی ، خانۂ خدا کی تزئین و آرائش اُس کا عظیم کارنامہ ہے ، قرطبہ کے ہُنر مندوں کو پچی کاری سکھلانے کے لئے بازنطینی شہنشاہ نے فنکار بھیجے تھے ، محراب مسجد میں رنگین

شیشوں کی جھلک اور گہرے نیلے رنگ کے پس منظر میں قرآنی آیات کے طلائی حروف اس زمانے کی یادگار ہیں۔

سائنس اور فنون کا مربی الحکم عبدالرحمن کا جانشین تھا ، اُس نے ایک خوشحال سلطنت ورثے میں پائی تھی ، اُندلس میں ثقافت کی بہار اُس کے نام کے ساتھ منسوب ہے ۔

مسجدِ قرطبہ کی تزئینِ آرائش اُس کا عظیم کارنامہ ہے، قرطبہ کے ہنرمندوں کو پچی کاری سکھلانے کے لئے بازنطینی شہنشاہ نے فنکار بھیجے تھے، محرابِ مسجد میں رنگین شیشوں کی جھلک اور گہرے نیلے رنگ کے پس منظر میں قرآنی آیات کے طلائی حروف عرب ہسپانوی فن کا شاہکار ہیں۔

علم دوست الحکم علم کی جستجو میں مدام سرگرم رہتا تھا ، اُسے فقیہوں اور عالموں کی مصاحبت عزیز تھی وہ مشرق اور مغرب کے مصنفین اور شعرا کو قیمتی تحائف سے نوازتا اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتا ، الحکم نے مشرق کے ابوالفرج الاصفہانی کو ایک خطیر رقم پیش کی تاکہ اُس کی "کتاب الاغنی" کا پہلا نسخہ اُس کے کتب خانے کی زینت ہو ، اُس کی سرپرستی میں مالکی فقہ پہ اہم کتابوں کے علاوہ علم ہیئت ، ریاضی ، تاریخ اور سوانحمری پہ کتابیں لکھی گئیں ایک اندازے کے مطابق اُس کی لائبریری میں چار لاکھ کتابیں اور مخطوطات تھے ، الحکم نے مصنفین اور اُن کی کتابوں کی فہرست تیار کروائی تھی اور بہت سی کتابوں کے حاشیے میں نفسِ مضمون اور مصنفین کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ، عالم اسلام میں اُس کی لائبریری عظیم ترین تھی ، اُس دور میں مشرق سے سائنس اور ادب کے نسخوں کی ترسیل بڑھی اور اُندلس ادبی تحلیقات کا ایک اہم مرکز بن گیا جہاں ہر ملک کی کتابیں فروخت ہوتی تھیں ، اہل قرطبہ کو کتابوں سے بڑا شغف تھا ، اُمرا اور ارکان سلطنت بیش قیمت نسخے جمع کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے ، ایک چھوٹی سی ریاست کے وزیر کی لائبریری میں دو لاکھ نسخے تھے جبکہ نصرانی قیطلونیہ (۱) کی مشہور خانقاہ میں صرف ۱۹۲ جلدیں دستیاب تھیں، کتابوں کی مانگ اس قدر بڑھ گئی کہ کاغذ بنانے والے ، جلد ساز اور خوشنویس ہر وقت مصروف رہنے لگے الحکم نے بڑی تعداد میں مکتب قائم کیے اور یوں ہر کس و ناکس کے لئے تعلیم حاصل کرنا ممکن ہوگیا ابن ابی عامر المنصور کے دورِ اقتدار میں آزادیِ افکار پر پابندی تھی اس کے باوجود علوم کی آبیاری جاری رہی ۔

دسویں صدی کے اواخر میں الاندلس کی اسٹیج پر نپولین جیسا آمر نمودار ہوا ایک باتدبیر منتظم ، شاطر سیاستدان، ایک جرّی جرنیل، ایک سیاسی اور عسکری نابغہ جس نے بڑھتی ہوئی نصرانی طاقت پر ضرب کاری لگائی ابن ابی عامر کا تعلق ایک قدیم یمنی خانوادے سے تھا اڑھائی سو برس پیشتر اُس کے جدِ امجد فاتحین کے ساتھ ہسپانیہ کے ساحل پر اُترے تھے ابنِ ابی عامر قانون اور ادب کا طالبعلم تھا وہ کاتب کی حیثیت سے ملازم ہوا اور انتظامی قابلیت کے بل بوتے پر ترقی کر کے قاضی بنا پھر شاہی جائیداد کا منتظم اور افسرِ خزانہ بنا ۔ خدمت گزاری اور تحائف پیش کرکے ہشام کی والدہ سفید فام باسق "اُم ولد" صبح ایسی مدبر اور دُور اندیش خاتون کا منظورِ نظر بنا ، ابی عامر میں کام کرنے کی لگن تھی اور دل میں بڑے

Catalonia —1

عزائم تھے ترقی کا زینہ تیزی سے طے کرتے ہوئے اُس نے طاقتور حریفوں کو مات دی صقالبہ کا اثر زائل کیا بربریوں کا زور کم کرنے کے لئے شمالی افریقہ سے تازہ دم بربر بھرتی کیئے جن کی وفاداری کا مرکز اُس کی ذات تھی میدانِ جنگ میں مسلسل فتوحات حاصل کرکے جرنیل غالب نے بڑا نام پیدا کیا تھا ، ابنِ عامر نے حاجب مصحفی کو ساتھ ملاکر راستے کا یہ کانٹا دور کیا پھر مصحفی کے خلاف غداری کا مقدمہ چلاکر اُسے قید خانے میں ڈال دیا جہاں سات برس بعد اُس کا وہیں انتقال ہوا اب مسند اقتدار پر قبضہ کرنے میں کوئی امر مانع نہیں تھا ۔ اُس نے آہستہ آہستہ خلیفہ کے اختیارات سلب کر لیئے اور حاجب کے رُوپ میں سیاہ سپید کا مالک بن بیٹھا جاپان میں شوگن سرداروں نے بھی شہنشاہ کے اختیارات سلب کئے تھے محل کے سنہرے پنجرے میں مقید وہ لوگوں کے آداب بجالانے پر قانع رہا تھا ، ہشام کو یہ بھی میسر نہیں تھا کبھی باہر نکلنے کی اجازت ہوتی تو خدام ایسا لباس پہنا دیتے کہ تمیز بھی نہ ہو سکتی ۔ خلیفہ عملی طور پر محل میں نظر بند ہو کے رہ گیا جہاں اُسے بچگانہ مشاغل میں مشغول رکھا جاتا تھا اموی شہزادے جلاوطن کر دیئے گئے ، کچھ تہی دست منصور کی فیاضیوں کے دست نگر تھے ۔

قصرِ خلافت کے اثرات سے دور بلاشرکت غیرے حکومت کرنے کے لئے ابی عامر نے ایک خوبصورت شہر تعمیر کیا جہاں باغات مساجد اور بازار تھے اُسے مدینۃ الزہرا کا نام دیا اور حکومت کے دفاتر وہاں منتقل کر دیئے ۔ عمائدین سلطنت اور عسکری سرداروں کو محلات تعمیر کرنے کے لئے زمین دی وہاں سے وہ ایک عظیم الشان سلطنت پر حکومت کرتا تھا جو وسعت میں الناصر کی سلطنت سے بڑھ کے تھی جنوب میں خلافت کی حد بربریوں کے ساحل تک تھی شمال میں اُس کا پھیلاؤ لیون (۱) تک تھا۔

حکومت پر قابض ہو کر اُس نے انحطاط پذیر مسلم صوبوں کو ایک لڑی میں پرویا اور عیسائیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا شمال اور مغرب میں اُس نے نصرانیوں کے خلاف ستاون جنگیں لڑیں اور کبھی شکست نہیں کھائی مبارزت طلب قسطانوی بہادروں نے بار بار زِک اٹھائی ، اُس کے سریع الحرکت دستوں سے نصرانی حکمران لرزہ براندام تھے ، اُس کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ سرحد سے ابی عامر کی فوج دور رکھنے کے لئے لیون اور نوارے کے حکمرانوں نے اپنی بیٹیاں اُسے عقد میں دے دیں ، مہمات کا طویل سلسلہ شمال میں جلیقیہ کے آخری سرے پر کمپو سٹیلا کی تسخیر پر منتج ہوا جہاں شنت یاقب (۲) کا مزار نصرانیوں کی مقدس ترین زیارت گاہ تھی ، دشوار گزار اور پُر خطر راستے کی وجہ سے کسی مسلمان حکمران نے اتنی دُور جانے کی جرأت نہیں کی تھی ابی عامر جولائی ۹۷۷ء میں قرطبہ سے روانہ ہوا اور گھڑسواروں کی سرکردگی میں **OPORTO** کی طرف بڑھا ، فوج میں چند دستے لیون کے نصرانی اُمرا کے تھے جو اُس کی سیادت تسلیم کرتے تھے ، اس سے قبل سامانِ رسد اور پیادہ فوج سمندر کے راستے سے روانہ ہو چکی تھی ، بالاخر ابی عامر کی قیادت میں گھڑسوار اور

Leon–1

Saint Jacob. –2

فوجی کمپوسٹیلا تک جا پہنچے پمپلونا کی طرح یہاں کے باسی بھی خوف کے مارے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے ، شہر زمیں بوس کر دیا گیا البتہ مزار کی حفاظت کے لئے چند سپاہی متعین کر دیئے ، فوج کثیر مالِ غنیمت لے کر قرطبہ لَوٹی ، ایک روایت کے مطابق نصرانی جنگی قیدی کلیسا کے دروازے اور گھنٹے اُٹھائے ہوئے قرطبہ کے کوچوں میں سے گزرے ، نفیس کام سے مزّین دروازے مسجد قرطبہ کی زینت ہوئے اور گھنٹے شمعدانوں میں ڈھالے گئے؟ اِس فتح کے بعد ابن ابی عامر نے المنصور کا لقب اختیار کیا ۔ اس فتح کا ارتعاش جزیرہ نما کی سرحدوں کے پار دور دور تک محسوس کیا گیا ۔

پہلے فوج کی تنظیم فیوڈل طرز پر ہوتی تھی جس کی اساس جُند پر تھی۔ ہر قبیلے کا جُدا دستہ تھا، قبیلے کے سردار سے توقع کی جاتی تھی کہ جاگیر کے معاوضے میں جنگ کے موقع پر وہ اپنا دستہ لائے گا، یہ طریقِ کار نظم و ضبط کے منافی تھا، قبائل کی وفاداری اپنے سردار کے ساتھ ہوتی نہ کہ حکمران کے ساتھ، کبھی مشکل مرحلے پر سردار میدان چھوڑ جاتے۔

المنصور نے فوج کو از سرِ نو منظم کیا، قبائل کے انتساب کو ممنوع قرار دیا اور فوجیوں کے تبادلے کر کے قبائلی نظام ختم کیا جو اس کے پیشروؤں کے لیے بسا اوقات دردِ سر بنا تھا، اس کی تنخواہ دار فوج نظم و ضبط کے لیے مشہور تھی، پیریڈ کا میدان ہو یا میدانِ جنگ اُس کے سپاہی ثابت قدم رہتے، کسی لغزش کی سزا فوری اور سخت تھی، مشہور تھا کہ اُس کے رُعب سے گھوڑے ہنہنانے سے باز رہتے ہیں۔

محاصرے عموماً طویل ہوتے تھے، آخر میں فیصلہ کن امر یہ ہوتا کہ سامان رسد نہ ملنے کی صورت میں کون سا فریق بھوک پیاس کا مقابلہ کر سکتا ہے ۔ ابی عامر نے سالانہ جہاد کا احیا کیا، خوشحالی کے زمانے میں المنصور مکئی اور دیگر اشیائے خوردنی جمع کر لیتا تھا مبادا فصل خراب ہونے کی صورت میں جنگ میں التوا ہو، جنگ کے لیے شمالی افریقہ سے بڑی تعداد میں قبائلی بربر منگوائے جو میدانِ وغا میں اپنے جوہر دکھانے کے دلدادہ تھے۔

جہاد میں مسلسل کامیابی ہو رہی تھی، ہسپانیہ میں اسلام کا دائرہ شمال تک پھیل چکا تھا، قریباً سبھی آبنائے حاجب کی آہنی گرفت میں تھا، پر رونق مساجد اور حمام، بازار میں لوگوں کا ہجوم، میلوں پختہ کوچے، راہزنوں کا خوف نہ رہا، چوری چکاری اور لُوٹ مار کے خوف سے آزاد لوگ رات کے وقت آزادی سے گلی کُوچوں میں گھوم پھر سکتے تھے، ابی عامر مرکزی مقامات پر گندم کے ذخائر جمع کرتا رہا ، اُس کی پیش بینی کے باعث قحط کا خطرہ نہ رہا، ایک دفعہ ٹڈی دل نے فصل تباہ کر دی تو یہ دور اندیشی کام آئی، اُندلس اتنا خوشحال کبھی نہ تھا، ہمہ مقتدر حاجب نے حکم جاری کیا کہ جمعہ کے خطبے میں خلیفہ کے بعد اُس کا نام المنصور باللہ ایزاد کیا جائے، البتہ کتابوں کی آتشزدگی ابی عامر کی شخصیت پر ایک بدنما داغ ہے، الحکم کی لائبریری میں سے سائنس ، علوم فلکیات اور فلسفہ کی کتابیں تعصب کا شکار ہوئیں، مسند اقتدار پہ منصور کا قبضہ غاصبانہ تھا، اُسے اپنی آمریت کا جواز درکار تھا، اہلِ قرطبہ کی دلجوئی اور مالکی فقہا کی خوشنودی کے لیے ایسی بیش بہا کتابیں سرِ عام نذرِ آتش کی گئیں جن میں (اُن کی نظر میں) الحاد کا شائبہ بھی تھا۔ ابنِ رُشد نے الحکم کی بے نظیر لائبریری کی بربادی پر ان الفاظ میں نوحہ کیا "مذہبی جنوں کی وجہ سے ایسے ظُلم ڈھائے گئے ہیں جن کی مثال رُوئے زمین پر نہیں

ملتی۔"

المنصور نے اپنے ہاتھ سے قرآنِ کریم کا ایک نسخہ نقل کیا تھا جو غزوات میں ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا، عیسائیوں کے خلاف غزوات کی گرد کپڑے میں محفوظ کر لیتا تاکہ وہ اُس کے ساتھ دفنائی جاسکے اور شفاعت کا موجب ہو، اس کی تمنا تھی کہ وہ کافروں کے ساتھ جنگ کرتا ہوا شہید ہو، ۱۰۰۲ء میں المنصور آخری مہم سے واپسی پر سخت بیمار ہوا اور ایک چھوٹے شہر مدینتہ السالم میں جان جان آفرین کے سپرد کی، اپنی وصیت کے مطابق المنصور وہیں دفن ہوا۔ لوحِ مزار پر یہ اشعار کندہ تھے (۱) سو برس بعد مور حاکم سرقسطہ کی سفارت کو باریابی دینے کے لیے قسطیلیہ کے الفانسو ششم نے المنصور کی قبر پر اپنا تخت بچھایا، اپنی انا کی تسکین کے لیے لوگ کیا کیا بہانے ڈھونڈتے ہیں۔

المنصور کی بے پناہ صلاحیتیں اور عملی کارنامے تاریخ کا حصہ ہیں مگر وہ تاریخ کا دھارا موڑنے میں ناکام رہا، اُس کی حکمت عملی نے قصر خلافت کی بُنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ شیکسپیر نے کہا تھا:

"خوبیاں مرنے والے کے ساتھ دفن ہو جاتی ہیں، افعال شنیع کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔ المنصور کے حق میں یہ قول صادق آتا تھا، "شنت یاقب" کی مہم کے پانچ برس بعد عظیم دور کا انتقال ہو گیا اور چند برس میں اُس کے پُرشکوہ دارالحکومت اور خلافت کا تار و پود تارِ عنکبوت کی طرح بکھر گیا، اُس کے مرنے کے سو برس بعد تک لاقانونیت اور عدم استحکام کا دور دورہ رہا، المنصور کے بعد کسی میں نصرانی پیشقدمی روکنے کی سکت نہیں تھی، خلیفہ کی شخصیت مرکزیت کی ضامن تھی مگر وہ ادارہ آخری ہچکی لے رہا تھا، ایک مستعد حکمران کے اُٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوا اُسے پُر کرنا کسی کے بس میں نہ تھا، الاندلس کی مرکزیت ہمیشہ کے لیے تباہ ہو گئی۔

المنصور کی موت کے وقت کوئی پیشگوئی نہیں کر سکتا تھا کہ خلافت کا خاتمہ اتنا قریب ہے، آخر المنصور نے عیسائی ہمسائیوں کو پے در پے شکستیں دی تھیں اور "شنت یاقب" تک یلغار کی تھی، وہ شہر مور کے خلاف ہسپانوی مُدافعت کی علامت تھا، مسلسل فتوحات، وافر مالِ غنیمت اور جنگی قیدیوں کی کثیر تعداد سے یہ تاثر ملتا تھا کہ اسلام کے دشمنوں کا قلع قمع ہو گیا ہے مگر حالات رُو بہ تغیّر تھے، نصرانی فوجیں جوابی حملے کے لیے تیار کھڑی تھیں، خلافت کا ستارہ غروب ہونے کو تھا۔

عبدالرحمٰن الناصر کا پوتا ہشام اپنے حاجب کے ہاتھوں عضو معطل ہو کے رہ گیا تھا جس سے المنصور کی آمریت کا راستہ ہموار ہوا۔ المنصور کے دوسرے بیٹے کی نااہلی سے اقتدار کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی۔ کمزور حکمرانوں کے دَور

۱۔ "جو آثار اُس نے چھوڑے شہادت دیں گے کہ وہ کون تھا

جیسے تم اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو

خدا کی قسم آئندہ نسلیں اُس کا ثانی پیدا کرنے سے قاصر ہوں گی

نہ ہی ایسا جیالا ہماری سرحدوں کا محافظ ہو گا۔

میں آبادی کے متنوع عناصر کی یکجہتی ختم ہو گئی اور طالع آزما ملک کے حصے بخرے کرنے لگے۔

"اس میں شک نہیں کہ بالآخر سیماب صفت جنگجو بربر قبائل اور صقالبہ کے محافظ دستوں کی موجودگی اور اُن کی تعداد میں روز افزوں اضافہ خلافت کے لیے مہلک ثابت ہوا، بربر قبائل کی اکثریت اُمیّہ کی حلیف تھی مگر مراکو کے صحرائی خانہ بدوش حمودی اور زیری بھی بڑی تعداد میں موجود تھے، وہ ایسے ملک میں لُوٹ مار کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے جہاں وہ نووارد تھے۔ صقالبہ کا آپس میں اتحاد تھا، عربوں اور بربر کو مات دینے کے لیے حکمران اُنہیں شہہ دیتے تھے، جب خلافت متزلزل ہوئی صقالبہ باغیوں کے حاشیہ بردار بن گئے اور قرطبہ میں قتل و غارت کا بازار گرم کرنے میں برابر کا حصہ لیا، ۱۰۱۰ء میں وحشی بربر اور صقالبہ نے وہ لوٹ مار اور آتشزدگی شروع کی کہ الامان والحفیظ! الحکم کی عظیم لائبریری لُوٹی گئی، فہرست مخطوطات کی متعدد جلدیں "فتنہ" کی نظر ہوئیں، بہت سی کتابیں بِک کر دوسرے شہروں میں پہنچ گئیں، انمول مخطوطات کو دیا سلائی دکھلا دی گئی۔ لائبریریاں اور دوسری یادگاریں بیدردی سے برباد کر دی گئیں، محل زمیں بوس ہو کر جلے ہوئے کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے، باغات اُجاڑ دیے گئے، اُندلس خونی میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرتا تھا، دور و نزدیک تباہی کا ایسا منظر دیکھنے میں نہیں آیا تھا، یہ تھا اڑھائی سو برس کی کاوش کا اندوہناک انجام!

اپنے اوصاف و استطاعت کے باوجود اُمیّہ نے نااہل حکمرانوں کی صورت میں کاروبارِ سلطنت سنبھالنے کا متبادل انتظام نہیں کیا تھا، نہ ہی کسی ایسے ادارے کا قیام عمل میں آیا جو ریاستؐ کی بقا کا ضامن ہو، مسلم ہسپانیہ کا نصف النہار گزر چکا تھا، مضمحل سہ پہر پانچ صدیوں پر محیط تھی، غروب سے پیشتر اُس کی کرنیں دور اُفتادہ گوشوں کو منور کرتی رہیں مگر رات کی آمد سے پہلے شام کے تاریک سائے طویل ہوتے گئے۔

شاعر نے قرطبہ کا نوحہ لکھا:

"آؤ قرطبہ کی عظمت رفتہ پر آنسو بہائیں
تباہی نے اُس کو آن لیا ہے
قسمت نے اُسے ارفع مقام عطا کیا تھا
باقی سب اُس کے دست نگر تھے
زندگی میں آسودگی اور نفاست تھی
ہائے سب کچھ برباد ہو گیا
قرطبہ کے گلی کوچوں میں آج دو شخص بھی خوش نہیں
اُسے الوداع کہو اور خاموشی سے مِٹ جانے دو
کہ مٹ جانا اُس کا مقدر ہو چکا ہے۔"

قرطبہ کی اہمیت بہت کم ہو گئی، جب دو سو برس بعد "سینٹ" فرڈیننڈ نے شہر فتح کیا تو یہ ایک مہذّب ریاست کا خوشحال دارالسلطنت نہیں تھا بلکہ اُس کی حیثیت ایک منہدم ذیلی شہر کی تھی، ہسپانیہ میں مسلم ثقافت کا مرکز اب اشبیلیہ تھا۔

خدوخال

آغا بابر

ہم گھر میں آقاجان کہتے یہ ان کا پیار کا نام تھا جو والدہ کی زبان سے نکلا اور ہم نے تبرک سمجھ کر نوکِ زبان کی مسند پر بٹھالیا ۔ جب ماں کی زبان پر یہ لفظ آیا ۔ ایجاب و قبول کی گھڑی تھی ۔ ایسا آقا بنا کہ سارے کا سارا گھر عاشق ۔ آپا امیر فدا آپا وزیر کلمہ گو ذوالقرنین بھائی کی آنکھ کا تارہ اباجی کا قرار جاں ۔ چھ کے چھ بھائیوں میں سب سے خوبصورت یہی ۔

جو گھر میں لکھنے کی شمع کافوری جلی تو انہیں سے جلی ۔ وہ لکھنے والے بھائیوں کے میر قافلہ تھے ۔ وہ نہ لکھتے تو ہم بھی نہ لکھتے ۔ آگ تو ہم خود اپنی لائے تھے مگر انہوں نے ایسی شعلہ فشانی سے داغا کہ واہ وا ۔ اسپِ تازی کی وفاداری عمر بھر ان کے آگے آگے دوڑا کی ۔

پلس فور (Plus four) انگریزی لباس ہوتا تھا ۔ تھوڑی سی مختلف سلائی کے ساتھ کوٹ پتلون کی طرح گرم سوٹ ۔ مگر گھٹنوں تک پتلون کے اوپر لمبی جراب چڑھالی جاتی ۔ کوٹ پتلون ہوئے دو عدد اور دو عدد ہوئیں خاص قسم کی جرابیں ۔ کل چار عدد پارچہ جات ۔ اس لئے اس لباس کو پلس فور کہا جاتا ۔

میں نے پلس فور دو شخصوں پر سجتا دیکھا ۔ ایک عاشق حسین بٹالوی دوسرے سابق ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان رشید احمد ۔ اللہ اللہ اب تو وہ بھی عمیرٹ ہو چکے ۔

آقاجان لأ کالج میں پڑھتے تھے کہ ماسٹر سراج دین سے جو دھنی رام سٹریٹ انار کلی کا بڑا گراں درزی تھا پلس فور سلوایا ۔ بدن پر ایسا سجا کہ دیدنی ۔ اس حسن خداداد کے پیچھے طبیعت ایسی غصیلی کہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے ۔ اپنا ہو یا پرایا کسی کی نہ سہہ سکتے ۔ ایک شخص کچھ اپنا تھا کچھ پرایا ۔ اس نے ان کے خلاف کچھ کہہ دیا ۔ یہ پچھلے دالان سے اباجی کی تلوار (کِرچ) اٹھا کر اس کو مارنے کو دوڑے کہ ہاتھ بڑھا کر بڑے بھائی نے چھین لی ۔ اللہ غنی کس گرم فیکٹری کے بنے تھے معلوم نہ ہو پایا ۔ عرب کا سارا تکبر اور عجم کی ساری نزاکت ان کے اندر کہاں سے آن چھپی یہ بھی معلوم نہ ہو پایا ۔ ان کا مدمقابل صرف ایک تھا وہ خنجر بدست سامنے آن کھڑا ہوتا اِن کے گھٹنے جھک جاتے ۔ اس پدے سے کنجشک سے بھی چھوٹے مدمقابل کا نام داناؤں نے شعر رکھا تھا ۔ پھول کی پتی سے ہم نے ہیرے کا جگر کٹتے دیکھا ۔ نازک نازک نرم نرم پھول کی ایک پنکھڑی سنگ خارا کا سینہ چیر دیتی ۔

لمحۂ فورسند میں جب وہ شعر کو لہک کر گاتے تو آواز ایسی گریہ کرتی کہ والدہ ہنستی "آقا شعر کو گاتا ہے کہ روتا ہے" پتلی تار کا گز گلے پر پھر جائے تو سارنگی کا گریہ کتنا شنیدنی ہو جاتا ہے ۔

آقاجان ذوالقرنین بھائی کی طبیعت کے ٹھہراؤ سبھاؤ کو دیکھتے تو اندر ہی اندر حیران ہو کر رہ جاتے کہ کس ٹھنڈی مٹی سے وہ بنے تھے ۔ آپا امیر کے شوہر میاں محمد عبداللہ کی متحمل طبیعت کو دیکھ کر مزید حیرت میں پڑ جاتے کہ کبھی بھی تو

ان کے ماتھے پر کسی نے شکن نہ دیکھی ۔ پوچھتے ۔ "ہاں تو بھائی جی پھر وہ بہادر شاہ ظفر کیا کہتا ہے۔"

بھائی عبداللہ گول گول دھیمے دھیمے لہجے میں کہتے ۔

ظفر آدمی نہ اس کو جانیئے گا ۔ ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا ۔ جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا ۔

یہ معلمانہ شعر سن کر آقا جان داد دینے کو باہر سے پکارتے "ہائے" مگر اندر سے شاید سوچتے کہ ان کے طیش کا سورج سوا نیزے پر کیوں اتر آتا ہے ۔ شاید نفی کی کل یوں بھی چل پڑتی ہو کہ قلعہ معلیٰ کی یا حیدر آباد آصفی کی کیا بادشاہی شاعری تھی کہ پہلا مصرعہ بادشاہ نے لکھ بھیجا دوسرا ذوق کا ہو گیا یا الٹ دوسرا مصرعہ بادشاہ کا تھا پہلا ذوق نے موزوں کیا ۔ پرچیوں سے بھرا لفافہ ذوق کے پاس بادشاہ کی طرف سے پہنچتا ۔ ہر پرچی پر ایک مصرعہ دھرا ہوتا ۔ استاد ذوق لخت لخت خیال کی کترنیں جوڑتا ۔ ستاروں کو ٹانکتا ۔ غزل مکمل کرتا ۔

بہادر شاہ ظفر کے اس بھولے بھالے شعر کا سیدھا سادا پیغام نہ جانے کہاں تک پہنچتا تھا مگر بھائی عبداللہ کی زبان سے سن کر لطف ہم سب کو آتا ۔ آقا جان جبھی تو موج میں پکارتے "ہاں بھائی جی تو پھر بہادر شاہ ظفر کیا کہتا ہے ۔ ظفر آدمی نہ اس کو جانئے"

مجھ سے ایک دن (lovy dovy) لوّی ڈوّی باتیں ہو رہی تھیں ۔ کہنے لگے ۔ "میں دو آدمیوں کے سامنے سجدہ کر سکتا ہوں"

میں نے تعجب سے پوچھا "کون"؟

بولے "بھائی ذوالقرنین اور بھائی عبداللہ"

حضرت عمرؓ نے بڑی غصیلی طبیعت پائی تھی۔ وہ خلیفہ ہوئے تو صحابی سوچنے لگے ۔ یہ غصہ ان کا گل نہ کھلائے ۔ ایک صحابی نے مشورہ دیا "جب وہ غصے میں آئیں قرآن کی کوئی آیت پڑھ دیا کرو" ۔ "اگر زبان پر آیت موقع کی آجاتی تو کیا کہنا ۔ نہ بھی ہوتی تو حضرت عمرؓ کی مشتعل طبیعت آیت کو سن کر دھیمی پڑ جاتی ۔ حضرت عمرؓ کا سارا جلال جمال میں بدل جاتا ۔ ان کے نہال اشتعال اور شجر جلال کی شاخوں میں سے کتاب کی حکمت و بلاغت کے باعث نرم نرم پتیاں نوید بہار بن کر پھوٹنے لگتیں ۔

آقا جان کے اشتعال کی ڈھال عرب کے تکبر کی فیکٹری سے بن کر آئی تھی جس کو شعر کے حسن میں ڈھلی ہوئی شمشیر ہی کاٹ کر دو کر سکتی تھی ۔ کہتے ہیں مرزا داغ جب رامپور میں تھے ۔ مشاعرے میں غزل پڑھتے تو رامپور کے پٹھان یوں داد دیتے ۔ "مار دیا حرامزادے مار دیا" داغ یہ داد لے کر مسکرا کر آداب کرتے اور جی میں سوچتے 'لو اتر گیا تیر لٹھ مار کے سینے میں" دوسرا شعر پڑھتے تو دوسرا رامپوری کہتا "ہائے مار دیا خبیث تو نے پھر مار دیا"

آقا جان کے جی میں کوئی شعر اتر جاتا تو اس کو اس لے میں گاتے پھرتے کہ اس میں گانا کم رونا زیادہ ہوتا ۔ ان کی آواز میں گریہ آجاتا ۔ شاید اس خیال سے کہ ہم مار کھانے والے کہاں تھے ۔ ظالم مار دیا تو نے ۔ اُن کا

حافظہ شعر کا بے حساب تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا اور پختہ ہوتا چلا گیا۔ عرب اسلام سے پہلے کا ہوا یا بعد کا ہوا جو کہہ دیا پتھر پر لکیر ۔ اپنی بات سے ایک انچ نہ ہٹے ۔ آپ لاکھ سر پٹخیں کہ نہیں یہ غلط ہے ۔ وہ کہے گا ٹھیک ہے اور دھکے دے کر آپ کو باہر نکال دے گا۔ اگر کہہ دیا یہ غلط ہے آپ لاکھ کہیں۔ نہیں یہ ٹھیک ہے۔ وہ ہرگز نہ مانے۔ مستند ہے میرا فرمایا ہوا ۔ عرب کا دستور کلام آج بھی یہی ہے ۔ عرب کے کردار کی شناخت آج بھی یہی ہے ۔ ہمارے رسولؐ مقبول کا یہ کرشمہ سخن اور محبت کلام تھی کہ ان عربوں کے ساتھ پورا ٹپا اور دلائل و براہین سے ان کے دلوں میں اتر گیا ۔ آقا جان کے کردار کی شناخت بھی عربوں کی طرح کی ہی تھی کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا ۔

میر تقی میر یکے میں بیٹھا میلوں سفر کرتا رہا مگر بد دماغی کا یہ عالم کہ کسی سے ہمکلام نہ ہوا ۔ یہی حال آقا جان کا تھا ۔ ناجنس سے بات نہ کرتے اور اگر کوئی ہم خیال مل گیا تو پھر گفتگو کی پہاڑیوں سے موجیں مارتا گنگا کا دریا بہہ نکلتا ۔

قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر مگریاں پھیرتے اور پھر چیسٹ ایکس پینڈر سے ورزش کرتے ۔ ایف سی کالج لاہور کے ہوسٹل ایونگ ہال میں رہے جس کی خوشنما عمارت آج بھی نیلے گنبد کے چوک میں واقع ہے۔ مشن کالج ان دنوں ایونگ ہال کے پچھواڑے میں ہوتا تھا اب بہت برسوں سے نیو کیمپس میں نہر سے پار منتقل ہو چکا ہے ۔

ایونگ ہال میں رہنا نہایت مہنگا پڑا اور اوپر سے جب بھائی خادم بھی مشن کالج میں فرسٹ ایئر میں آن داخل ہوئے تو یہ دونوں بھائی گوالمنڈی میں کرایہ کے مکان میں اٹھ آئے ۔ حسینا ملازم کھانا پکاتا ۔ گھی اور اناج کبھی ختم نہ ہوتا ۔ یہ جنس گھر سے آتی جو بھائی ذوالقرنین بہم پہنچاتے جو اسوقت خانقاہ ڈوگراں میں تھانیدار تھے ۔ یہ دونوں بھائی امیر زادوں کی طرح رہنے لگے ۔ آیا گیا یہیں ٹھہرتا ۔ گرمی کی چھٹیوں میں میں اور الطاف بٹالہ سے لاہور جاتے تو وہیں ٹھہرتے ۔ گوالمنڈی کا علاقہ ان دنوں لاہور کا بڑا صاف ستھرا علاقہ ہوتا تھا ۔ بھائی ذوالقرنین نے گوالمنڈی تھانے کے ایس ایچ او سے بھی کہہ دیا کہ ان کے بھائیوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے ۔ ہندو مسلمان اور سکھ ایک ہی محلے میں بڑی یاری دوستی اور محبت کے ساتھ رہتے ۔

بابو نورالدین کی دو بیویاں تھیں ایک مسلمان ایک ہندو ۔ ہندو بھی مسلمان کہ مسلمان قوم کی طرح مرغ پلاؤ قورمہ بریانی مچھلی شامی کباب کھاتی ۔ صرف مسلمان بیوی سے دو بیٹے ہوئے ۔ محمد سلطان کیف بڑا بیٹا عبدالرحمن مغل چھوٹا ۔ دونوں میٹرک تک پڑھ سکے اور اسکے بعد امیر زادوں کی طرح بیکار پھرنے لگے ۔ محمد سلطان کیف عارضی طور پر کسی اردو اخبار میں کام کرنے کو جاتا مگر عبدالرحمن یوں لگتا جیسے بھائی خادم کا کالج میں ہم جماعت ہو ۔ بھائی خادم کی طرح پتلا دبلا پھرتیلا بدن تیز طرار باتمیز اور مہذب ۔ بھائی ذوالقرنین اور اباجی کے سامنے ہماری طرح بالکل مؤدب اور تمیز دار ۔ بھائی ذوالقرنین آتے تو عبدالرحمن کے گھر مچھلی تلی جاتی ۔ چولہے پر پلاؤ کے لئے مرغ کی یخنی چڑھا دی جاتی ۔ گاجر کا حلوہ بننے لگتا ۔ اباجی آتے تو ان کے گھر حلیم کی دیگ چڑھ جاتی ۔ چائے کے ساتھ سو چیزیں رکھی

جاتیں ۔

پکوان پکانے کے بہانے تلاش کرنے والا ایک ایسا مسلمان گھرانہ جس کا ہر دکاندار کے ساتھ مرزا غالب کی طرح ہو بہو ادھار چلتا تھا ۔ شام کے وقت عبدالرحمن ہم کو رس گلے اور گلاب جامن کھلاتا اور کہتا ، "شام لال میرے حساب میں لکھ لو"

لکھ لیا مہاراج ۔

بابو نورالدین جوانی میں خوب رو تھے اور ریلوے میں گارڈ تھے ۔ مغل زادے بھی عجیب ہوتے ہیں ۔ ٹرین پر کہیں برہمن زادی سے ملاقات ہوئی ایسی ہوئی کہ مسلمان گارڈ نے عمر بھر کے لئے اپنی گارڈ میں لے لیا ۔ ہندو بن کر سر پر ہندوؤں والی ٹوپی پہن کر بیاہنے کو گئے ۔ پھر وضعداری سے ساری عمر ہندوؤں والی ٹوپی پہنے رہے اگرچہ سسرال کو معلوم ہو گیا تھا یہ مغل بچہ بھی اکبر بادشاہ کی طرح ماتھے پر تلک لگا کر ہماری لڑکی بیاہ کر لے گیا ۔ نوکری چھوٹ گئی تو کارنیوال کا کام سنبھال لیا ۔ لاکھوں کمایا ۔ کسی شہر کے میلے ٹھیلے میں کنگ کارنیوال لگتا ۔ ولائتی قماربازی کی سٹالیں جمتیں ۔ انڈر سیون اوور سیون والی میز سجتی ۔ جھولے ہنڈولے لگتے ۔ ایسی کمائی ہوتی کہ چوٹی سے پیر تک کا سارا قرض ادھار اتر جاتا ۔ دُھل کر نئے نکور ہو جاتے ۔ عبدالرحمن اور محمد سلطان نئے کپڑے سلواتے ۔ بزاز گھر پر آتا ۔ کیا کیا ضیافتیں ہوتیں ۔ دسترخوان مزید وسیع ہو جاتا ۔ رونقیں عید شبرات کی ان کی انگنائی میں گلے مل کر اتر آتیں ۔ پولیس کے افسروں کے گھروں میں کیا کیا ڈالیاں جاتیں ۔ گھر باہر ایکٹیوٹی سے کلبلا اٹھتا ۔ آقاجان کی وجہ سے محمد سلطان اور عبدالرحمن کی واقفیتیں بھی بڑھیں ۔ عبدالرحمن کے سبب سے آقاجان اور بھائی خادم کی واقفیت انور داؤدی سے ہوئی ۔ یہ دھیما دھیما انسان باہر سے حجاب آمیزی کے شیرے سے بنا ہوا مگر اندر سے مشقت پسند اور جنگجو ۔ طبیعت میں ایک طرف تجسس پسندی ، سنجیدگی اور متانت اور دوسری طرف اچھے لطیفے اور اچھی ضلع جگت پر سنجیدگی کا "شہر سمرقند" اور متانت کا "بخارا" بخش دینے والا مرد سخاوت پسند (۱)

ایک اور صاحب ماسٹر محمد دین تھے ۔ وہ ان دنوں طالب علم تھے ۔ ان کے والد مشہور جراح تھے ۔ جلد کی بیماریوں کے علاج کے لئے بڑا نام پایا ۔ تعلیم سے فارغ ہو کر محمد دین سکول ماسٹر ہو گئے تھے ۔ عبدالرحمن مغل بات پر بات مارتا کہ کمال کرتا ۔ پھکڑ بازی کی محفل جو جمتی تو کیا کیا لطیفے ہوتے ۔ دور کی لائی جاتی ۔ جوانی کا خون گھر بار سے فراغت ہنسی ٹھٹھولی پھبتی اور ظرافت کے سائبان تنے رہتے ۔

چھٹی جماعت اور چوتھی جماعت کے دو طالب علم میر اور الطاف گرمی کی چھٹیوں میں لاہور گئے تو گوالمنڈی والے مکان میں ٹھہرے ۔ آقاجان کے دوست ڈاکٹر رشید کو یہاں دیکھا ۔ وہ ہفتے میں دو روز شام کے وقت بائیسکل پر چیف کالج ٹیوشن پڑھانے کو جاتے ۔ دن کو چند گھنٹے سید سلامت علی شاہ کی آکشن مارٹ میں کام کرتے ۔ سلامت

۱۔ آج کل فیروز سنز لاہور کے شعبہ مطبوعات میں ملازم ہیں۔

علی شاہ آقا جان اور ڈاکٹر رشید کے مشترک دوست تھے ۔ سید سلامت علی شاہ کھدر پہنتے تھے ۔ انہوں نے کانگرس کی تحریک ترک موالات سے متاثر ہو کر کالج کو خیر باد کہہ دیا تھا ۔ آقا جان کے ایک اور دوست رؤف(۱) ملک تھے ۔ انہوں نے بھی سلامت علی شاہ کی طرح کالج کی تعلیم کو ترک کیا اور آزادی ہند کی تحریک میں کود پڑے ۔ جرمنی چلے گئے ۔ دوسری جنگ عظیم میں برلن ریڈیو سے اردو میں خبریں سناتے اور اردو پروگرام نشر کرتے تھے۔ برلن فتح ہونے پر روسی فوج نے انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا ۔

جب ترک موالات کی تحریک چلی تو بھائی عاشق بھی ترک موالات کی تسبیح کرنے لگے ۔ اباجی نے کچھ سمجھایا ۔ بات انکی سمجھ میں کچھ کچھ آئی مگر پھر بھی بھائی ذوالقرنین سے بے ادائی سے کہا "میں انگریز کی نوکری نہیں کروں گا" "انگریز کی نوکری نہ کرنا عقلمندی سہی پر تعلیم کو ترک کر دینا تو عقلمندی نہیں ہے۔"

کئی باپ بڑے تنک مزاج ہوتے ہیں ۔ ڈاکٹر خداداد جو رشید احمد کے والد تھے بڑے تنک مزاج تھے ۔ رشید احمد کو ناراض ہو کر گھر سے نکال دیا کہ اس کا جی پڑھائی میں نہیں لگتا تھا اور وہ الٹی سیدھی حرکتیں کرتا تھا ۔ دوستوں نے باپ کے ڈاکٹر ہونے کے سبب سے رشید احمد کو ڈاکٹر رشید کہنا شروع کر دیا تھا ۔ جب پرائیویٹ تیاری سے انگریزی ادبیات میں ڈاکٹر رشید نے ایم ۔ اے کر لیا تو باپ سے صلح ہو گئی ۔ آقا جان کے ایک اور کلاس فیلو دوست محمد عظیم خان تھے جو خان بہادر ڈاکٹر محمد رحیم خان کے پوتے تھے جن کی حویلی انار کلی کے قریب دھنی رام سٹریٹ میں واقع تھی ۔ ڈاکٹر رحیم خان اپنی جراحی کے کمال کی بدولت وائسرائے کے آنریری سرجن بھی ہوتے تھے ۔ عبدالرحمن مغل کی ان سب سے آقا جان کی وجہ سے دوستی ہو گئی ۔ جب وہ بات پر بات مارتا تو یہ سب احباب لطف اٹھاتے ۔ عبدالرحمن جب بٹالے آتا تو تتا تن گپیں ٹھکتیں اور ہنسی کی ہوا دما دم چلتی ۔ اس کے جانے کے بعد بیٹھک کی دھوم دھامی اداس سی ہو جاتی ۔

ہمارے قیام کے دوران لاہور میں کلکتہ تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی جس نے بھاٹی دروازے سے باہر منڈوا باندھا تھا ۔ طفل بنگال نینو رام رات کو لڑکی بن کر اسٹیج پر آیا تو پنجاب آکشن مارٹ کے مالک سید امداد علی شاہ کے دل میں سما گیا ۔ دوسری شب شاہ صاحب پھر ناٹک دیکھنے پہنچے ۔ نینو رام اور پیارا لگا ۔ تیسری شب شاہ صاحب نے اسٹیج کے سامنے اول صف میں اپنی نشست ریزرو کرالی اور کمپنی کے مالک بابو چندن کمار بوس سے کہدیا کہ جب تک کمپنی لاہور میں قیام کرے ہر روز ان کی نشست پہلی صف میں ریزرو کی جایا کرے ۔

۱۹۲۲ء میں پنجاب آکشن مارٹ (لاہور کا مشہور نیلام گھر) کسی اینگلو انڈین انگریز نے شروع کیا تھا ۔ دو سال بعد سید امداد علی شاہ کے پاس فروخت کر دیا گیا ۔ یہ آکشن مارٹ میکلوڈ روڈ پر ۱۹۵۷ء تک موجود رہا ۔ سید امداد علی شاہ گورے چٹے بلند قامت بڑی مضبوط کاٹھی کے آدمی تھے ۔ عبدالرب نشتر کی طرح سیاہ بھور مونچھیں تھیں جن کو تاؤ

۱۔ عبدالرؤف ملک ۔ عبدالقیوم ملک بیرسٹر ایٹ لا سابق پرنسپل لا کالج لاہور کے بھائی تھے۔

دے کر رکھتے ۔ شخصیت ایسی پُر کشش کہ آدمی پوچھنے پر مجبور ہو جاتا کہ یہ کون صاحب ہیں ۔

تھیٹر کے مینجر اور مالک چندن کمار بوس ہر شب شاہ صاحب سے مصافحہ کرتے ان کو جا کر ان کی نشست پر بٹھاتے ۔ چند منٹ ان کے ساتھ باتیں کرتے ۔ پھر اجازت لے کر چلے جاتے ۔

سید امداد علی شاہ کے مینجر سید سلامت اللہ شاہ تھے جو اپنی محنت اور دیانتداری سے نیلام گھر کے مختار کل بن چکے تھے ۔ بس یہ سمجھئے کہ امداد علی شاہ نے سب کچھ سلامت اللہ پر چھوڑ رکھا تھا ۔ سید سلامت اللہ شاہ خود سامان لیتے رسید دیتے ۔ اتوار کے دن خود کرسی پر کھڑے ہو کر نیلام کی بولی لگواتے ۔ ان کو کسی کام سے عار نہ تھا ۔ شیریں گفتاری ملنساری فقرہ بازی ان پر ختم تھی ۔ ان کی واقفیت لاہور کے ہر شخص سے تھی ۔ ایک روز امداد علی شاہ ان کو بھی اپنے ساتھ تھیٹر لے گئے اور اعتماد میں لے کر بتایا کہ وہ ہر روز نینو رام کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں جس پر وہ فدا ہو چکے ہیں ۔ سید سلامت اللہ کو معلوم تھا کہ امداد علی شاہ بڑے دل پھینک تھے ۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ امداد علی شاہ نینو رام سے فقط ہمکلامی اور گفتگو کے متمنی تھے ۔ تدبیر نکالی جائے تو کیسے ۔

سلامت اللہ شاہ بڑے طباع تھے ۔ انہوں نے رشید احمد اور عاشق حسین بٹالوی کو اپنے ساتھ ملا کر راتوں رات بزم نشاط پنجاب کے نام سے انجمن بنا ڈالی ۔ جس کا صدر سید امداد علی شاہ کو بنایا گیا ۔ لیٹر پیڈ چھپوا کر اس پر کمپنی کے مالک بابو چندن کمار بوس کو خط لکھا گیا کہ بزم نشاط پنجاب نینو رام ، شیخ تیکھا مل ، رام گوپال ، ماسٹر غلام قادر(۱) ، سلطان محمود ، غلام محمد(۲) ، رفعت خان ، بانکے میاں اور بسنت کماری کو ان کی اعلیٰ کارکردگی پر تمغے اور خطابات دینا چاہتی ہے ۔ کوئی مناسب تاریخ مقرر کی جائے ۔ پبلک لیزاں (Liasion) کا کام سید سلامت اللہ کے سپرد تھا جو کمال کے کارکن تھے ۔ مکتوب کیا لے کر گئے تاریخ لے کر آئے ۔ بابو چندن کمار کو ملنے کے بعد سارے ایکٹروں سے ملے اور مٹھائی کی بڑی ٹوکری جو اپنے ساتھ لے کر گئے تھے چندن کمار کے سامنے رکھ کر بولے "بابو جی ہماری بزم کی طرف سے اپنے اداکاروں کا منہ میٹھا کرا دیجیئے"

"سید امداد علی شاہ خوش ہو کر سلامت اللہ سے پوچھنے لگے ۔ "نینو رام کیسا لگ رہا تھا"

"کیا کہوں شاہ جی ۔ بڑا خوش جمال لڑکا ہے ۔"

مقررہ تاریخ پر تھیٹر کے وقفے سے پہلے ناٹک روک کر بزم نشاط پنجاب کی طرف سے تمغے اور خطابات دینے کا اعلان کیا گیا ۔ اسٹیج پر لا کر میز کرسی رکھی گئی جس پر سید امداد علی شاہ بیٹھے۔ اسٹیج سیکرٹری کے فرائض رشید احمد نے انجام دیئے ۔ سب سے پہلے رشید احمد نے عمدہ خطاطی میں لکھا ہوا فریم میں لگا وہ سرٹیفکیٹ اٹھایا جس میں نینو رام کو خطاب

۱۔ ماسٹر غلام قادر خاص لاہور کے رہنے والے تھے ۔ تکیہ سادھواں میں ان کا آبائی مکان تھا ۔ محلے کے لوگ انہیں کلماں جنتی والا کہتے تھے ۔ بہت اچھے ایکٹر تھے ۔

۲۔ غلام محمد بھی لاہور کے رہنے والے تھے ۔ بلند آواز تھے ۔ گاتے بہت اچھا تھے ۔ لوگ انہیں کلما جنونی کہتے تھے ۔

دینے کے سلسلہ میں عبارت درج تھی جسے انہوں نے پڑھ کر سنایا "نینو رام کی خوبصورت اور بے عیب اداکاری سے متاثر ہو کر آج بزم نشاط پنجاب نینو رام کو سلطنت اداکاری کے ماہ کنعان کا خطاب دیتی ہے"

نینو رام ونگ میں سے زنانہ لباس میں نمودار ہوا ۔ سید امداد علی شاہ سے سرٹیفکیٹ لیا پھر انہوں نے نینو رام کے گلے میں تمغہ ڈالا جس پر کندہ تھا "سلطنت اداکاری کا ماہ کنعان" یہ سن کر منڈوا تالیوں کی گونج سے بھر گیا ۔ نینو رام نے سید امداد علی شاہ سے ہاتھ ملایا ۔

پھر بھائی عاشق نے مختصر الفاظ میں بتایا کہ نینو رام کن کن ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا چکا ہے ۔ چندن کمار بوس کی تعریف کرتے ہوئے کہا ان کی تھیٹریکل کمپنی اپنے باکمال ایکٹروں کی اداکاری سے پورے ہندوستان میں اپنا لوہا منوا چکی ہے ۔ لاہور کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان باکمال ایکٹروں میں دو اداکار ماسٹر غلام قادر اور غلام محمد لاہور کے رہنے والے ہیں ۔ منڈوا پھر تالیوں کی گونج سے بھر گیا ۔ پھر مناسب عبارتوں کے ساتھ شیخ تیکھا مل کو محسن اداکاری ماسٹر غلام محمد کو غالب اداکاری رام گوپال کو جمال اداکاری غلام قادر کو سلطان اداکاری سلطان محمود کو باغبان رقص و موسیقی رفعت خان کو گل نو بہار بانکے میاں کو شہریار بہار اور بسنت کماری کو بلبل ہزار داستان کے خطابات سے نوازا گیا ۔ کمپنی کے مالک بابو چندن کمار بوس کے گلے میں "مالک گلستان بہار و طرب" کا تمغہ ڈالا گیا ۔

مارچ کا آخر تھا ۔ میلہ چراغاں سر پر کھڑا تھا ۔ لاہور میں اس کو شالامار باغ کا میلہ بھی کہا جاتا ہے ۔ یہ میلہ مارچ کے آخری اتوار کو مادھو لال حسین کے مزار پر ہونے والا تھا ۔ اس زریں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سید امداد علی شاہ نے ساری کاسٹ کو میلے کے روز شالامار باغ میں کھانے کی دعوت پر مدعو کر لیا ۔ باغ کے ایک تختے پر قرینے کی جگہ ڈھونڈ کر دریاں بچھائی گئیں ۔ ان پر جاجم بچھی ۔ دیگیں چڑھیں دیگی کفگیر چلنے لگا ۔ مسالہ بھننے لگا ۔ اتنے میں تھیٹر کے بیس بائیس اداکار تشریف لائے ۔ سید امداد علی شاہ نے بڑھکر سب سے ہاتھ ملایا ۔ میں نے نینو رام کو قریب سے دیکھا ۔ بنگالیوں کا سا نمکین سانولا رنگ لمبے لمبے بال معمولی سا چہرہ ۔ ہمیں تو کوئی خاص بات دکھائی نہ دی ۔ میں چھٹی جماعت کا طالب علم ۔ نابالغ کندۂ ناتراش ۔ دکھائی بھی کیا دیتا ۔ جب ہوش سنبھالا سوچ بیدار ہوئی تب معلوم ہوا ۔ بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست (حسینوں کے کئی شیوے کئی ادائیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی نام نہیں رکھا گیا نہ رکھا جا سکتا ہے) ۔

یہ کیا اسرار ہستی ہے کہ دل کی بستی عجیب بستی ہے لوٹنے والے کو ترستی ہے ۔ لاہور کا شاہ حسین ایک ہندو لڑکے مادھو لال پر مرمٹا ۔ مادھو کا نام لال حسین پڑ گیا ۔ مولانا رومی بالکل نارمل تھا ۔ کہیں سے شمس تبریز ٹپک پڑا ۔ رومی کے کورے دل میں عشق کا پانی بھر کر خود غائب ہو گیا ۔ رومی فراق میں تڑپ تڑپ کر غزلیں کہتا پھرا ۔ پھر غضب ہوا کہ مثنوی کا سمندر بہہ نکلا ۔ نظام الدین اولیاؒ کی ترچھی ٹوپی کی طرف دیکھ کر امیر خسرو نے کہہ ڈالا ۔ من قبلہ راست کردم بطرف کج کلاہے ۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر گانے لگتا ۔ کج کلہا ستمگرا تنگ قبائے کیستی ؟ سرمد شہید

ایک ہندو لڑکے ابھے چند کو دیکھکر اپنے آپ میں جذب ہو گیا ۔ یہ کیوں ہوتا ہے ۔ میر تقی میر کون ہوتا ہے یہ کہنے والا ۔

گلی میں اس کی گیا سو گیا نہ بولا پھر
میں میر میر کہہ اس کو بہت پکار رہا

کلکتہ تھیٹریکل کمپنی لاہور سے کیا گئی ۔ سید امداد علی شاہ کا دل اوور گیا ۔ ایک گانے والی جو تھوڑی سی نینو رام کی ہمشکل تھی بہت دیر اس کے ہاں سید امداد علی شاہ گانا سننے کو جاتے رہے پھر ایک دم ان کے جی میں کیا آئی کہ آکشن مارٹ سید سلامت علی شاہ کے ہاتھ اونے پونے بیچ بنارس کی طرف کو نکل گئے جہاں دہلی آگرہ بمبئی سے ہوتی ہوئی کلکتہ تھیٹریکل کمپنی پہنچ چکی تھی ۔

سُن اے مومن یہ ایماں ہے ہمارا
نہ کہنا کفر پھر عشق بتاں کو

ابا جی کو عزیزداری رشتہ داروں کی ہمیشہ عزیز رہی ۔ جب فیروزالدین نے بیٹی کے لئے رشتہ آقا جان کا مانگا ابا جی نے ہاں کر دی ۔ امی جی نے کہا "مجھ سے مشورہ کر لیا ہوتا"

بولے ۔ دانا لوگ کہتے ہیں کنیا کے آنے کو دروازہ کھلا رکھنا چاہیئے" ۔

"سو لاڈوں پلی ایک ایک بیٹی ماں باپ کی بھرے پُرے گھر میں گزارہ کر لے گی"

سُننے کی بات ہے ۔ میں عربی کے لفظ بنت سے کیونکر آشنا ہوا ۔ اس کے معنی میں نے کیسے جانے ؟ آقا جان بی ۔ اے میں تھے ۔ موسم گرما کی چھٹیوں میں بٹالہ آئے ہوئے تھے ۔ کبھی یہاں کاغذ کا پرزہ جیب سے نکال کر پڑھتے کبھی وہاں ۔ کبھی جنگلے میں کبھی پلنگ پر لیٹ کر ۔ اتنے ذوق شوق سے معمولی سے کاغذ کو پڑھنا عجیب سا لگا۔ کتابوں کی الماری کی ایک کتاب میں چھپا کر گئے۔ میں نے نکال کر پڑھ لیا۔ ان کی منگیتر امتیاز کا خط تھا۔ نجانے جواب کیا لکھا ۔ البتہ لفافہ کا سرنامہ پڑھا ۔ لکھا تھا بنت فیروزالدین صاحب ۔ لفظ بنت میرے لئے نیا تھا ۔ اپنے استاد سے پوچھا اُسنے بتایا "دختر کو کہتے ہیں"

اُن کی شادی پر ابا جی نے لاہور سے استاد جانوں خاں کو بلوایا تھا ۔ آقا جان کے دوستوں میں سے صرف ڈاکٹر رشید احمد آئے ۔ میں کمرے میں شربت کا جگ ان کے لئے لے کر گیا ۔ جہاں یہ دونوں کوئی ڈیڑھ گھنٹہ استاد سے کلاسیکل موسیقی سناکئے ۔

ان دنوں مرزا محمد سعید کا ناول "خواب ہستی" چھپ کر بازار میں آیا تھا جس کی تعریف کرتے آقا جان نہ تھکتے ۔ خواب ہستی کے کردار اس دور کے ہر ذہین نوجوان کو اپنے جانے پہچانے معلوم ہوتے تھے ۔ ایک دن بھائی خادم سے کہنے لگے اس ناول کو پڑھ کر امتحان کے لئے تیار ہو جاؤ ۔ میں اس ناول میں سے تمہارا امتحان لوں گا ۔

خاوند کو جو چیز اچھی لگے بیوی اس کو ضرور چاہے ۔ بیوی کو جو چیز اچھی لگے خاوند چاہنے لگے آقا جان کی بیوی

امتیاز کو فرصت ملتی "خواب ہستی" پڑھنے کو لے بیٹھتی ۔ میں ادنیٰ جماعت کا لڑکا میری سمجھ سے "خواب ہستی" کا لفظ بالاتر تھا ۔ خواب تو خواب ہوا مگر ہستی کیا؟ آج تک سمجھ میں نہیں آئی ۔ بازار میں ایک کو دوسرے سے یہ کہتے سنا تو سمجھتا کیا ہے تیری ہستی کیا ہے ۔ یہ ہستی کن جزیات سے مرکب ہوتی ہے ۔ آپ ہی بتائیں تو بتائیں ۔ ہمیں آج تک نہ معلوم ہو پایا ۔

امتیاز بڑی خوشخط ۔ املا عمدہ مگر الٹا مجھ سے کہتی میرا خط اچھا ہے ۔ صورت شکل کی اتنی حسین و جمیل وہ اور آقا جان چاند اور سورج کی جوڑی لگتے ۔ پیار اتنا سارا کہ بس مٹے جا رہے ہیں ۔ بیٹھک میں گلبیاں (۱) ڈالے بیٹھے ہیں ۔ یوں بے تحاشا چومتے کہ میرے اندر شرم کی بانسری بجنے لگتی ۔ کمرے سے باہر نکل آتا یا کتاب کے پیچھے منہ چھپا لیتا ۔ کیسا نامعقول معصوم لڑکپن تھا ۔

وہ اپنے گھر کی راج دلاری ۔ لاڈوں پلی ۔ یہ اپنے گھر کے راج کمار ۔ غصے کی تختی پر نام لکھا ہوا رتی میں تولہ رتی میں ماشہ ۔ میں راجہ تو رانی کون بھرے کا پانی ۔ یہی ہوا ۔ آقا جان بدمزہ سامنہ بنائے پھرتے ۔ بعض دفعہ بڑی کرخت بات کرتے ۔ امتیاز کبھی روٹھ کر میکے چلی جاتی ۔ آپا وزیر اور آپا امیر منانے کو جاتیں ۔ پلّاں کی گلی میں سے چھوٹا راستہ کاٹتیں تو بیرسٹر مختار احمد کی دونوں بیٹیاں خورشید اور حبیب کھڑکیوں میں سے منہ نکال کر کہتیں ۔ "ہمیں معلوم ہو گیا تھا وزیر اور امیر گزر رہی ہیں ۔ گلی خوشبو سے مہک جاتی ہے ۔ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے"

آپا وزیر جواب دیتی "امیر ہی لکھنؤ سے عطر اقتدا مقتدا خان کا لاتی ہے ۔ اسی سے پوچھیئے" روٹھی ہوئی امتیاز تین چار پھیروں کے بعد من کر آ جاتی ۔ اس کو بھائی عاشق سے بہت پیار تھا ۔ مگر خاک پڑے ایسے پیار کو جو دونوں طرف تلواریں کھنچی رہیں ۔ اب گئی تو چھ مہینے نہ آئی ۔ آقا جان کی شادی بی اے پاس کرنے کے بعد ہوئی تھی ۔ انہوں نے بی اے فرسٹ ڈویژن میں کیا ۔ وہ ایل ایل بی کے پہلے سال میں تھے ۔ لائق فائق بیٹا ابا جی کا فیل ہو جائے ۔ یہ سب ناچاقی کی پریشانیوں کا کیا دھرا تھا ۔ سسرال کا تقاضا کہ عاشق خود لینے کو آئے ۔ اور عاشق سب عشق و محبت چھوڑ چھاڑ ضد کے اس گھوڑے پر سوار جو ٹس سے مس نہ ہو ۔ آپا امیر ان سے چھوٹی تھی ۔ دونوں ایک ساتھ ہنستے کھیلتے پلے بڑھے تھے ۔ صرف اس کی بات سنتے تھے ۔ مشکلوں سے منایا ۔ آخر گئے ۔ امتیاز آ گئی ۔ گھر میں سب خوش ہو گئے ۔ بھائی ذوالقرنین نے لکھا چند دنوں کے لئے دونوں کو میرے پاس نارووال بھیج دو ۔ میری سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آئی کہ مجھے ان کے ساتھ کیوں نتھی کر دیا گیا تھا ۔ ان دنوں تھرڈ کلاس کے ڈبے میں سفر کرنے کا رواج ہوتا تھا ۔ ہم انٹر کلاس کے ڈبے میں بیٹھے ۔ مسافر کوئی کیوں آتا آج کے دن تو بچے کی تباہی کا سامان مقدر رہوا تھا ۔ میرے پاس کتاب بھی نہ تھی کہ میں اس کے پیچھے منہ چھپا لیتا ۔ بس نارووال تک میری جان پر بنی رہی ۔ اگر بزرگوں کی یہ دانش تھی کہ چھوٹے بچے کی فعالیت یہ جان سکے کہ نر اور مادہ کا کیا رشتہ ہوتا ہے تو میری فعالیت تو کبھی کی بالغ ہو چکی تھی ۔ دھت پڑا،

۱۔ محمد حسین آزاد کا محاورہ ہے ۔ گلے میں باہیں ڈالے جیسے پھولوں کی شاخیں لپٹی رہتی ہیں ۔

سویا ہوتا کہ انجانی ان دیکھی عورت خواب میں آکر ملتی ۔ اوپر اوپر سے میں بھولا بھالا معلوم ہوتا تھا اندر اندر سے باوا آدم کا پکا چچا بن چکا تھا جو خدا سے کہہ رہا ہو ایک حوا ہمیں بھی دلوا ۔ بچے کی بساط عالم بازیچہ اطفال نہیں ہوتی اور صرف دو آنکھیں بچے کو پہچاننے کو کافی بھی نہیں ۔ تیسری آنکھ چاہیئے کیونکہ بچے کے شجر باطن کی پیچ در پیچ شاخوں پر ایک ایسا گھونسلہ پڑ رہا ہوتا ہے جس کے تنکے اور پھوس پھانس باہر کی دنیا سے ایک دبیز کھمبیر تا چُن رہی ہوتی ہے ۔ آپ کو کیا معلوم اس گھونسلے میں کیا کیا خس و خاشاک اور کس کس اوٹ پٹانگ جنگل کی میل خوری گھاس جمع ہوتی رہتی ہے ۔

جو میرے افسانوں میں جنس کا ذکر منٹو کی طرح نوع بہ نوع آتا رہا تو ایک روز کراچی میں چودھری خلیق الزمان کی بیوی نے میری بیوی سے کہا "مجھے بابر صاحب کے افسانے کا انتظار رہتا ہے ۔ میں ان کے ہر افسانے کو شوق سے پڑھتی ہوں ۔ تُو ان کی جسمانی بیوی ہے ۔ میں ان کی اپنے کو روحانی بیوی سمجھتی ہوں ۔

ایک روز میرے بھائی اعجاز حسین بٹالوی نے میری بیوی سے کہا ۔ "ہر پھر کر بھائی بابر کے افسانوں میں جنس کا ذکر کیوں آتا ہے ۔ کیا ان کی جنسی آسودگی نا آسودہ رہی ہے"

میری بیوی بولیں "چھ بچے میں ان کو دے چکی ہوں ۔ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے یہ سوال تو ان سے پوچھ"

لے بٹالوی میں آج جواب دیئے دیتا ہوں ۔ آقا جان چونکہ موجود نہیں ہیں جن کے اپنی بیوی کے ساتھ کھلے ڈھلے بوس و کنار سے متاثر ہو کر میں چھوٹی عمر میں بے حد بالغ ہو گیا تھا ۔ آگ کی طرح یہ بلوغت میرے بدن میں پھیلتی چلی گئی اور میرے باطن میں لقمے دیتی اتر گئی ۔

تو جانتا ہے آقا جان کے مزاج میں شدت ہمیشہ سے تھی ۔ طبیعت سے پیدائشی عاشق تھے ۔ کچھ نام کا اثر بھی ہو گا ۔ مگر شیوہ عاشقی تو یہ ہے کہ معشوق روٹھے عاشق منائے لیکن ان کے ہاں حساب الٹا ۔ طبیعت جھلی والی اور دل وحشی ۔ کبھی امتیاز نے مزاج ساختہ نہ دیکھے بگڑے دیکھے ۔ الجھے سلجھے دیکھے ۔ وہ مناتی یہ روٹھے رہتے ۔

چھوٹے بھائی کی انفرادیت پرستی اور بد دماغی کا علم بھائی ذوالقرنین کو نہ ہوتا تو کس کو ہوتا ۔ ان کو معلوم تھا بھائی کا دماغ علمی رجحان رکھنے والا دماغ تھا ۔ ایک دن کچھ بات چیت میرے کانوں نے سنی ۔ بڑے بھائی انہیں لاُ کالج لاہور میں پھر سے داخلہ لینے کو کہہ رہے تھے لیکن وہ لاُ کالج دہلی میں جانے کو مصر تھے ۔ بڑے بھائی نے ہار کر دہلی کے اخراجات اپنے ذمے لے لئے ۔ بات کو جو مانے وہی پیارا ۔ بڑے بھائی کے سامنے ایسے تو سجدہ کرنے کو تیار نہ تھے ۔ لا کالج دہلی میں سٹوڈنٹ کے لئے کرکٹ یا ٹینس کھیلنا ضروری تھا ۔ آقا جان ٹینس کھیلتے رہے ۔ ان کی عمدہ کپڑے اور عمدہ سلائی کی نیوی بلیو نیکر میں اپنے کالج میں بہت دنوں پہنا کیا ۔

ایف اے ایل کرنے کے بعد بھی طبیعت کا غصہ دل کا حاکم بنا رہا اور تلون ہی مزاج پر بادشاہت کرتا رہا ۔ بارود کا بھرا تستور بنے رہے ۔ طبیعت کے خلاف یہ بات ہوئی غصے سے وہ منہ بنا ۔ گھر کے لوگ آقا جان آقا جی کہتے پھرتے اور وہ

اپنے پاؤں تنے ہوئے رسے پر رکھے رہتے ۔ ان کی کیمسٹری سمجھ میں آنے والی چیز نہ تھی ۔ نرم ہوئے تو ریشم سخت ہوئے تو فولاد ۔ بیوی کا ڈولا مزاج کی اسی وحشت سرا میں اترا تھا ۔ والدین شادی خانہ آبادی کو کرتے ہیں ۔ مگر ان کی نردیں کچی پڑیں ۔ راہ دونوں کی کھوٹی ہو گئی ۔

اگر آپ نے بھی شادی کو کومٹ منٹ نہ سمجھا تو آپ کے ساتھ بھی یہی ہو گا ۔ ایک دوسرے کے دل میں غصے کا رنج بیٹھے گا جو ان کے دل میں بیٹھا ۔ امتیاز نے ساری محبتیں بالائے طاق رکھیں ۔ روٹھ کر میکے چلی گئی ۔ تنے ہوئے رسے پر چوبیس گھنٹے کون چل سکتا تھا ۔ سرکس والے کو بھی بیس گھنٹے تنے رسے پر چلنا پڑے سرکس کا تمام گلیمر چھوڑ چھاڑ گریبان کو چاک کر کے ویرانے کی طرف کو بھاگ نکلے ۔

ان کو اس واقعے نے دوراہے پر لا کھڑا کیا ۔ صاعقہ مزاج ضدی عرب کا تکبر جھک جائے ۔ عجم کا عاشقانہ نرم لہجہ آستانہ راز و نیاز پر جبیں سائی کرے ۔ جدھر کو بھی ہوا لے جائے کوئے یار یا سوئے دار ۔

میرا بھائی کھلی دھوپ کا مسافر تھا ۔ اس کا دل تباہ ۔ اس راہ پر چل کھڑا ہوا جس پر ہولے ہولے اندھیرا جھکا چلا آ رہا تھا ۔ پھر آندھی ایسی اٹھی ، مٹی نے سر کھول دیا ۔ زندگی کے استعارے کو اگر آگے لے جایا جائے تو دونوں کے دروازوں پر سوختہ سلمانی نے دستک دی ۔ ہمارے تمہارے سب کے خواب ہوتے ہیں ۔ لڑکی کے کچھ زیادہ کہ اس کی سائیکی ہم سے مختلف ہے ۔ اگر آقا جان کی زندگی تہ و بالا ہوئی تو امتیاز کے خواب بھی بکھرے ۔ میرے افسانوں میں سہ وسعتی عورت لاکھ آنکھ مٹکائے لڑائے کچھ بھی گل کھلائے مگر یہ بتاتا جاؤں کہ احترام عورت نے زندگی بھر میرا راستہ روکے رکھا ۔

ہماری گلی کے آخر میں امتیاز کے کسی رشتہ دار کا گھر تھا جس نے کہیں اتنا کہہ دیا عاشق اگر طلاق نہیں دے گا تو امتیاز عیسائی ہو جائے گی پھر وہ کیا کرنے کا ۔

بھائی ذوالقرنین اور خادم کو لے کر اس کے مکان پر جا دھمکے اور دروازے پر کھڑے ہو کر وہ فحش گالیاں دیں وہ ایسی کی تیسی پھیری کہ بھائی جان کہتے رہے "بی ہیو عاشق بی ہیو" مگر عاشق کس کی سنے ۔ عاشق کے پاور ہاؤس میں تنور دہک رہے تھے ۔

بھائی عبداللہ کی پلٹن فیض آباد چھاؤنی میں تھی ۔ بھائی ذوالقرنین نے کہا دو ایک مہینے کے لئے وہاں چلے جاؤ ۔ ابا جی بولے ۔ اچھا خیال ہے ۔ اکبر شاہ خان نجیب آبادی سے بھی مل آؤ ۔ روز بلاتا ہے ۔ گویا بالکل ہی راہداری مل گئی ۔

بھائی عبداللہ اور آپا امیر نے بہت سیریں کرائیں ۔ اُجدھیا میں ہندوؤں کے تاریخی مندر دکھائے ۔ بابری مسجد دکھائی ۔ فوجی گوروں کے ہمراہ ہاتھی پر سوار ہو کر بھائی عبداللہ نے پوربی ہانکے کے ساتھ جنگل میں شکار کھلایا ۔ فوجی افسروں کو اردو پڑھانے والے میر منشیوں سے ملوایا ۔ جن میں سب سے زیادہ تیز طباع اور ملنسار (۱) میر

۱ ۔ دوسری عالمگیر جنگ میں شرافت علی وائی کیڈٹ ہو کر فوج سے منسلک ہو گئے ۔ ۱۹۵۲ء میں میجر شرافت علی ملیر چھاؤنی کراچی میں ایڈمن آفیسر تھے ۔

شرافت علی تھا ۔ ایک طرف بھائی عبداللہ کو مغربی انداز میں حد درجہ کالی چائے میں دودھ کی ایک بوند ڈال کر سارجنٹ میجر ٹی کے مزے اڑاتے دیکھا دوسری طرف مشرقی انداز میں سفید چاندنی پر گاؤ تکیہ کی ٹیک لگائے پیچوان پیتے دیکھا ۔ پھر وہاں سے اٹھکر کتے کی پیٹھ تھپکتے جو مالک کے پیار میں آکر بار بار دم ہلاتا اور خوشی سے اچھلتا ۔ ایک خاص پوربیا کتے کی دیکھ بھال کو مقرر تھا ۔ پھر وہ کتے کو چھوا ہوا ہاتھ دھوتے ۔ وضو کرتے نماز پڑھتے ۔ پھر انگریزوں کی طرح عین چار بجے ٹرے میں لگی چائے آجاتی ۔ بوٹ بوائے اسی وقت کے آگے پیچھے آجاتا جوتے پالش کرتا چمکاتا اور خانساماں کی طرف نگاہ رکھتا جو آخر کار چائے سے بھرا لبالب تام چینی کا مگ لاکر دیتا جس کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے بوٹ بوائے ماتھے پر ہاتھ رکھکر بڑے میاں کو احسانمندی سے سلام کرتا ۔

شام کو رجمنٹل کو توال ملنے کو آتا ۔ بھائی عبداللہ کے آگے پیچھے پلٹن کے ٹھیکیدار پھرتے ۔ اکبر الہ آبادی نے ایک شعر میں کہا تھا ۔ لے لیا اکبر نے کمسٹریٹ میں ٹھیکہ دودھ کا ۔ یہ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ فوج کا محکمہ کمسٹریٹ کیا بلا ہوتی ہے اور کتنی اہم ہوتی ہے ۔

Army moves on its stomach ۔ گورا فوج کے لئے کھانے پینے کا ذخیرہ اسقدر وافر رکھا جاتا کہ کیا کہنا ۔ گوشت کا ٹھیکیدار دمچی لاتا ۔ انڈر کٹ لاتا ۔ ہنٹر بیف لاتا ۔ پلٹن کی زندگی کس قدر متنوع اور دلچسپ تھی ۔

آقا جان کو "خواب ہستی" کے کردار ریڈر ئن اور بھائی عبداللہ میں بڑی مماثلت دکھائی دینے لگی ۔ ناول میں عثمان اپنی بیوی حسن افروز کو بے حد چاہتا ہے ۔ حسن افروز آناً فاناً مر جاتی ہے ۔ عثمان اس کی جدائی کے غم میں نیم دیوانہ ہو جاتا ہے ۔ ریڈر ئن اور اس کی بیوی مارگریٹ جو عقیدے سے عیسائی ہوتے ہیں عثمان کو دوسرے شہر اپنے ہاں لے جاتے ہیں جہاں ان کی مغموم و مضطرب روح کو بڑا سکون ملتا ہے ۔ رفاقت کے اس رچاؤ بساؤ والے گھر میں عثمان کا دل لگ جاتا ہے کہ ایک روز کوٹھی کے لان میں جب وہ اکیلا بیٹھا ہوتا ہے حُسن افروز اس کے سامنے کھڑی کہہ رہی ہے تو جان کو ہلکان نہ کر جو تھا ہو گیا جو ہونا ہے ہو رہے گا ۔

بھائی عبداللہ کھڑے ہارمونیم کی پیٹی کے سامنے کرسی پر بیٹھکر تسبیح پھیرنے والی انگلیوں سے جب باجے کی سُروں کو چھیڑتے اور اپنی بھولی بھالی سادہ سی آواز میں گاتے کہ واہ وا ۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

تو آقا جان کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ۔ کہتے "بھائی جی آپ کو بھی مان گیا مان گیا"

۔ آقا جان پوربیوں کو کام کرتے دیکھتے تو کہتے "بھائی جان یہ وہ پوربئے ہیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں "غدر" مچایا تھا جنہوں نے انگریز فوج سے ٹکر لی تھی ۔ آج انگریز نے گھسیارہ بنا دیا ۔ سائیس بنا دیا کوچوان بنا دیا ۔ یہ بوٹ بوائے بنا ۔ گھوسی بنا ۔ ہانکا بنا ۔ اب یہ دمڑی کا بھی نہیں ۔ انگریز کے اس کتے کو بہکانے مُتانے کو لے جاتا ہے جس کا نام

انگریز نے ٹیپو رکھا ۔

بچپن یا شباب عورت یا مرد ہم کسی سے بھی اثر قبول کر سکتے ہیں ۔ یہ شرارہ لمحہ بھر کا ہوتا ہے ۔ مگر ایسا شرارہ جو زندگی کو نوحۂ غم یا نغمۂ شادی بنا ڈالے ۔ آدمی کو بیابانِ جنوں میں لئے لئے پھرے ۔ کوئی لمحہ بھر کا واقعہ ہوا کوئی لمحہ بھر کی شخصیت ہوئی باطن میں اتر کر ایسا امیج بنا لیتی ہے کہ باوصف سو کوششوں کے عمر بھر ہم اس امیج سے چھٹکارہ نہ پا سکیں ۔ جن بڑے آدمیوں سے ملنے کا آقاجان کو موقع ملا ان میں مورّخ اسلام مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کو ایک بلند مقام حاصل تھا ۔ ان کے ساتھ دہرا رشتہ تھا ۔ یہ تعلق استاد اور شاگرد کی حیثیت سے سکول میں شروع ہوا بعد میں دوستی کی صورت اختیار کر گیا ۔ اسقدر دوستی بڑھی کہ مولانا جب تک حیات رہے خط و کتابت ہوا کی ۔ مولانا کا انتقال ۱۹۲۸ء کو جوالاپور میں ہوا مگر دفن نجیب آباد میں ہوئے ۔

آقاجان فیض آباد سے دو چار دن کے لئے نجیب آباد آگئے ۔ دیکھا مولانا کا کمرہ کتابوں سے اٹا پڑا ہے ۔ مولانا ریسرچ کا بادشاہ تھا ۔ نجیب آباد کا یہ مشہور و معروف مؤرّخ اور تاریخ دان سنگلاخ زمینیں کھود کھود کر ہیرے سونے کی ایسی کانیں دریافت کرتا کہ آدمی دنگ رہ جاتا ۔ آقاجان نے نجیب آباد میں مولانا کو جو قریب سے کام کرتے دیکھا تو ان کے کام کرنے کا دیوانہ پن جی کو اچھا لگا ۔ ایک لمحہ کی کوئی پرچھائی دل میں اتر گئی جو بڑے ہی دھیمے پن سے ہڈیوں میں سرائت کر گئی ۔ خون میں اترتی چلی گئی اور باطن میں جا بیٹھی ۔ وقت آیا یہ پرچھائی کالی گھٹا بن کر امڈی اور پھر اس طرح سے برسی خارستان حیات کو گلزار کر گئی ۔

نجیب آباد سے فیض آباد واپس آئے تو مولوی عبدالکریم خان سے ملاقات ہوئی جو میرٹھ کے بوچڑ تھے ۔ لمبا قد چھوٹی چھوٹی داڑھی بھرا بھرا بدن بڑے زندہ دل اور خوش رہنے والے ۔ کہنے لگے " آپ نجیب آباد گئے تھے ۔ ہم میرٹھ ۔ واپسی پر آپ کا معلوم ہوا تو آپ سے ملاقات کا شوق بڑھا"

آپ کا میرٹھ اکثر جانا ہوتا ہے ؟ آقاجان نے پوچھا

"میرے بھائی کا وہاں میٹ کا کانٹریکٹ ہے ۔ مجھے کچھ مال بھی لانا تھا"

پھر بھائی عبداللہ کی طرف رخ کر کے بولے "بابو جی آپ کے لئے ہنٹر بیف (Hunter Beef) تیار کروا رہا ہوں کہ کیا کرنل ٹامسن نے کھایا ہوگا"

بھائی عبداللہ نے کہا "عاشق صاحب کو میرٹھ دیکھنے کا بہت شوق ہے"

آقاجان بولے "سب سے پہلے جو بغاوت ہوئی تھی ۱۸۵۷ء میں وہ میرٹھ چھاؤنی کے سپاہیوں نے کی تھی ۔ یونہی دیکھنا چاہتا ہوں کوئی خاص بات نہیں ۔ پھر یہ کہ مرزا غالب کی ولائتی شراب میرٹھ چھاؤنی سے آیا کرتی تھی"

کریم خان بولے "اجی آجکل تو میرٹھ کو دو گانے والیوں نے وبال کر رکھا ہے ۔ دہلی سے آئی ہیں ۔ ایک کا نام دوفنی اور دوسری کا نام چونی ۔ کیا مجرا سجاتی ہیں بابو جی ۔ ہم تو آپ کے بھائی صاحب کو یہ دکھائیں گے "

آقاجان مسکرائے "مولوی عبدالکریم صاحب آپ کے نام کے ساتھ یہ مولوی کا لفظ ۔۔۔"

ابی چھوڑئیے ۔ حاجی کا بیٹا پاجی ۔ ہم بچپن میں بڑے مولوی تھے ۔ ہمارے والد مولوی تھے ۔ بس یہ لفظ ہمارے ساتھ چل پڑا ۔ اب یہ اپنے ساتھ ہے ۔ ہم اپنے ساتھ ہیں ۔ چل رہے ہیں ساتھ ساتھ ۔ کبھی وہ ہماری بات مان لیوے اسے ۔ کبھی ہم اس کی بات مان لیوے ہیں"

لم دھڑنگ اچکن پہنے مولوی عبدالکریم خان ساتھ اس کے دو شخص ولائتی سوٹ پہنے کمرے میں داخل ہوئے تو دوّنی نے اٹھکر آداب کیا ۔ گاؤ تکیے کے قریب میں بیٹھی خوشنما آنکھوں والی خالہ نے ماتھے پر ہاتھ رکھکر سلام کیا اور خوشنمائی کے ساتھ چھالیہ کاٹنے میں لگ گئی ۔

دوّنی نے کہا "بہت دنوں بعد آئے سرکار"

وہ خالہ کی طرف رخ کرکے بولا ۔ "ابھی پچھلے ہفتے تو آئیا تھا"

خالہ نے کہا ہائے خانصاحب ایک ہفتہ ہمارے لئے تو چھ مہینے کا ہے گا ۔

"فیض آباد سے آرئیا ہوں کیا سمجھی" پھر وہ دوّنی سے خطاب کرکے بولا "یہ ہمارے بابو جی ہیں ہمارے افسر جن کا لیا دیا ہم کھاتے ہیں اور یہ ان کے بھائی صاحب ملک پنجاب سے آئے ہیں ۔ بڑے لائق فائق پڑھے لکھے ہیں گے ۔ گانا سناؤ کہ بس ۔ یادگار رہ جائے"

خالہ کے ہاتھ سے بنے پان کے بیڑے پیش کرتے وقت دوّنی جھک گئی اور مزید جھکتی چلی گئی کہ مہمان کی نگاہیں گردن کے نچلے حصے سے اسطرح سے مرغوب و مرعوب ہو پائیں کہ یہ گدگداتا لمحہ یادگار رہ جائے اور پھر جھلمل روشنی میں پان کا پتا دانتوں تلے آکر بس روح میں تحلیل ہوتا چلا جائے ۔ گانا تو جب ہو گا تب ہو گا ہی ۔ بہلاوا اسوقت تک کا یہیں تک کا ہے ۔

مولوی عبدالکریم خان نے کہا" ذرا ساتھ والے کمرے میں جاء نماز بچھا دیجیو ۔ ہمارے بابو جی عشا کی نماز نہیں ادا کر پائے"

یہ سن کر خالہ ایک شوق وافر اور نوید مسرت کے ساتھ وابستہ ہو کر اسطرح سے اٹھی جیسے نماز کا سارا ثواب اپنی تقدیر کی جھولی میں ڈال لے جائے گی ۔ اس نے زہے نصیب کہا تو نہیں مگر خطرناک تجربے سے بھری ہوئی اس کی آنکھیں اپنی بے زبانی سے زہے نصیب ہی کہہ رہی تھیں ۔

دوّنی نے کچھ باتیں کیں پھر اک ادا کے ساتھ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی کہ مہمان اس کی کمر کی لچک اور چال کا خرام دیکھ سکیں ۔ وہ کولہے کے پاس سے اپنے کندھے یوں ہلاتی گزر گئی جیسے موج آب لہریں لے رہی ہو ۔ خالہ نے کچھ باتیں کیں ۔ مولوی عبدالکریم خان نے اپنے ولائتی سگریٹ کے ڈبے سے جو اسوقت کے اونچے لوگ ہاتھ میں رکھا کرتے تھے دو چار سگریٹ نکال کر سازندوں کو دیئے ۔ انہوں نے اٹھکر لئے اور آداب کہکر اپنے قریب فرش پر رکھ لئے ۔

نماز پڑھ کر بھائی عبداللہ آئے تو پذیرائی کو مولوی عبدالکریم خان اور آقا جان اٹھ کر کھڑے ہو گئے ۔ دوّنی نے پشواز کو ٹھیک کیا ۔ پینترا بدل کر بیٹھ گئی کہ دوسرے کمرے سے چوّنی برآمد ہوئی اس نے سب کو جھک کر آداب کیا اور اپنی بہن کے قریب جا بیٹھی ۔

مولوی عبدالکریم خان نے روپے روپے کے نوٹوں کی ایک ایک گڈی بھائی عبداللہ اور آقا جان کے قریب اور ایک اپنے قریب رکھ لی ۔ دوّنی کی زمزمہ آثار آواز خوشبو زلف رسا کی طرح کمرے میں پھیلتی چلی گئی ۔ سر چھپاتی تو بدن کھلتا ۔ بتاوا دکھاتی تو بدن کی شاخیں سمٹتی پھیلتیں ۔ لفظوں کو ایک ایک ادا کے ساتھ اسطرح سے بیان کرتی کہ لفظ اس کی اداؤں سے اجازت لے کر بیان و معنی کے بازو کھولتے اور اپنی سرخوشی و مستی پر ناز کرتے کمرے کی فضا کو منور کرتے چلے جاتے ۔

زندگی کے امکانات بہاراں کی کس قدر وسعت اللہ اللہ اک لمحۂ فروزاں و ساعتِ دیدار بھی ہوتی ہے کہ اس جوئے بہاراں میں برگِ تمنا کی حیثیت معلوم ۔ سب غم سب فکر سب اندیشے کوٹھے کی فضا میں کیوں بھول جاتے ہیں ۔ یہ خود کار مشین ازل سے غموں فکروں کو پھٹک چھٹک رہی ہے ۔ دوّنی نے دو قدم لئے ۔ آنکھوں میں ایک آرزوئے بے بدل پیدا کی پھر بے بدل آرزو دکھا کر اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھے غزل شروع کی "جو نظام دل نہ بدل سکا"

دونوں ہاتھ کی کلائیاں جوڑ کر قینچی بنائی اور پھر دونوں بازو بادبان تہی دست کی طرح یوں کھول دئے کہ سارے جہان کو اپنے زیر اثر لے لیا اور گایا "تو نظام دہر کا ہے گیا گلہ" پھر دو قدم پیچھے کو ہٹی ۔ آنکھوں کو سحرانہ دلربائی سے مٹکایا اور کہا "وہی لذتیں ہیں گناہ میں" اور جب یہ بول اٹھایا "وہی تلخیاں ہیں ثواب میں" تو ثواب کے لفظ پر کہنیوں تک پانی سے وضو کرنے کا بتاوہ دکھایا اور عبداللہ صاحب کو جتایا کہ اس طرح وضو کر کے آپ نے ہم جیسوں کے غریب خانے پر نماز پڑھی ہے ۔

اس نے ایک ادا کے ساتھ بن کر دو قدم آگے کو لئے اور پورا مصرعہ گایا ۔ "وہی لذتیں ہیں گناہ میں وہی تلخیاں ہیں ثواب میں" تو بھائی عبداللہ نے نوٹوں کی گڈی کی طرف اشارہ کر کے کہا "سب اٹھا لو"

سو سو سلام کرتی جھکی اور اٹھا کر لے گئی ۔

آقا جان نے آہستہ سے کہا "مان گیا بھائی جی"

بھائی جی شوقین مزاج نہ تھے ۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند وظائف و اوراد کے دلدادہ مگر اپنے چند بڑوں کو انہوں نے ایسی محفلوں میں اٹھتے بیٹھتے دیکھا تھا ۔ ایک ایک روپے کی بیل دینا ان کے لئے عامیانہ تھا ۔ عبدالکریم کمسرٹیٹ کے ٹھیکیدار کے لئے ٹھیک تھا ۔ مگر وہ تو وہاں ایک افسرانہ حیثیت سے بیٹھے تھے اور شخصیت وہ زاہدانہ کہ عشا کی نماز بھی رنڈی کے کوٹھے پر قضا نہ ہونے دی تھی ۔

چوّنی نے گھنگھرو باندھے ۔ گوٹا لچکا لگی پشواز کو ذرا سا ٹھیک کیا پھر اپنی خاص تراش کی واسکٹ کی طرف دیکھا جس

کی جیبوں میں کچھ نہ تھا مگر ساری بغاوت جیبوں سے باہر تھی ۔ وہ اٹھ کر کھڑی کیا ہوئی کہ مہر عالمتاب کا منظر کُھلا ۔ اس نے پاؤں سے فرش پر ٹھسکا دے کر گھنگھروؤں کی چھنچھناہٹ کی آزمائش کی جس میں وہ خود سر سے پاؤں تک کو تھر تھرا گئی ۔ ماتھے پر کا جھومر اور کانوں پر کا زیور "مگر" نمایاں سے ہو گئے ۔ مہندی لگے پاؤں چاندنی پر چمک چمک گئے ۔ دزدیدہ نگاہی سے سب کو دیکھا ۔ پھر طبلے کی تھاپ کے ساتھ دو ایسے ٹھمکے لگائے کہ بدن کی قوسیں اور واسکٹ کا لب و لہجہ تیکھا ہو گیا ۔ یہ اعلان جنگ تھا ۔ مجرے کی شروعات تھیں ۔ Appetiser تھا ۔ مولوی عبد الکریم خان کی طرف دیکھ کر بھائی عاشق بولے "اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی"

چوّنی کے لبوں پر ادھر ہلکی سی مسکراہٹ کی کلی نمودار ہوئی ادھر سارنگی کی تاروں میں سے نازک نغمے کا لہریا پھوٹ کر بہہ نکلا جس کے ساتھ ہی ساتھ طبلے نے نرم سی گھمک دکھائی ۔ چوّنی نے کچھ کسلمندی کچھ تکان اور کچھ خواب سے بیداری کا ایسا عالم دکھایا کہ بزم نشاط پنجاب کی وہ رات آقا جان کو یاد آ گئی جب بانکے میاں اور بسنت کماری کو ان کی اعلیٰ اداکاری پر سید امداد علی شاہ نے خطابات دیئے تھے ۔ ذرا سی حیرت ضرور ہوئی کہ مجرے کا آغاز تکان اور کسلمندی سے ہو تو چکے کیسے ۔ چوّنی نے دیکھتے ہی دیکھتے کلائی سے کلائی ملائی اور اک ادا کے ساتھ بازوؤں کی وسعت کو بادبانوں کی طرح کھولا اور اپنے چہرے کے گرد ہالہ بنا ڈالا ۔ بول اٹھائے ۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ   دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

اس کا مسکرانا اوئی اللہ کا مجسمہ ۔ اس کا مسکرانا شرارت ، اس کا مسکرانا فتنہ خیز ، انگڑائی کبھی کچی کبھی پکی کبھی آدھی کبھی پوری ۔ مسکراہٹ کبھی آدھی کبھی پوری ۔ ہاتھوں کو کبھی سمٹانا کبھی گرانا ۔ بُتِ فتنہ پا نے تنگی قبا میں روشنی بھرنے کے کیا کیا حیلے کئے ۔ جوبن کے دکھاوے کے کیا کیا بتاوے رجھائے ۔ کیا بھنبھیری آواز تھی اور کس طرح شاخ گل کی طرح کمر لچکا کر وہ گھوم جاتی ۔

بے اختیار ہو کے جو میں پاؤں میں گرا
ٹھوڑی کے نیچے اس نے دھرا مسکرا کے ہاتھ

اس کا بے اختیار ہو کر گرنا لاجواب ۔ جو میں پاؤں میں گرا کہا تو طبلے کی دھمک کی دھما دھم کے ساتھ چار ٹھسکے اوپر تلے اسطرح لگائے اور اس طرح توڑے لئے کہ زمین اور آسمان کے درمیان کی فضا تھر تھرا اٹھی ۔

ٹھوڑی کے نیچے اس نے دھرا مسکرا کے ہاتھ یہ مصرعہ جو اس نے گایا تو لہجہ اتنا دھیما رکھا کہ عاشق مضطر کا طوفان اضطراب جیسے گزر گیا اور معشوقہ حسن افزا کے تحیّر و حیرت کا لمحہ آن لگا ۔

اب مسکرا کے اس نے جو ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دھرا تو الٰہی یہ مسکرانا ہی اور تھا ۔ ہاتھ چرانے سے دل چرانے تک کے سارے رمز و کنائے آنکھوں ہی آنکھوں میں بیان کر گئی ۔ مولوی عبد الکریم نے بیل کا ہاتھ بڑھایا۔ پانی کی موجوں کی طرح چکر کاٹ کر چونی نے بیل اٹھالی ۔

یہ بھی نیا ستم ہے حنا تو لگائیں غیر
اور اس کی داد چاہیں وہ مجھ کو دکھا کے ہاتھ

حنا لگانے کی نزاکت اور غیر کا بتاوا مشکل تھا ۔ اس نے حنا تو لگائیں غیر گایا اور گاتے ہوئے غیر کے لفظ پر بھائی عبداللہ کی طرف اشارہ کیا ۔ جب وہ اس مصرعہ پر آئی اور اس کی داد چاہیں وہ مجھ کو دکھا کے ہاتھ تو اپنا حنا والا ہاتھ کلفِ گلفروش کی طرح عبدالکریم کے سامنے کھول دیا ۔ عبدالکریم نے آقا جان سے کہا ۔ کیا حسن طلب ہے اور مسکرا کر نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھدیا وہ چکری لے کر دو قدم پیچھے کو ہٹی ۔ شعر کو دوبارہ ادا کیا اور ایک انداز سے غیر کے لفظ پر آکر آقا جان کی طرف کو اشارہ کیا اور داد چاہنے کو حنا والا ہاتھ بھائی عبداللہ کے سامنے کھول کر داد چاہنے لگی جب بھائی عبداللہ نے آدھی گڈی اس کے ہاتھ پر رکھدی تو سب مسکرائے ۔ مجال ہے جو سازندے مسکرائیں ۔ وہ ٹھیکہ لگا رہا ہے ۔ وہ سارنگی بجا رہا ہے ۔ چونی نے اپنی کمر کو شاخ گل کی طرح لچکایا اور پھر سے شعر اٹھایا ۔ غیر کا اشارہ عبدالکریم کی طرف کر کے حنا والا ہاتھ آقا جان کو دکھایا جنہوں نے بھائی عبداللہ کی نقل کرتے ہوئے آدھی گڈی کفِ گلفروش پر دھر دی ۔ سو سو سلام جھکاتی خم کھاتی لچکتی بنتی سنورتی گاتی نغماتی موج ہوا کی طرح گزر گئی ۔

دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام
منہ پھیر کر اُدھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

ساغر مے کی ادائیگی پر اسکا چہرہ ابریشمی پرتو سے جگمگا اٹھا ۔ نرم نرم اور خوابیدہ خوابیدہ آنکھوں میں گھلاوٹ اور کیف و سرمستی اتر آئی ۔ اس نے ادھر کو کس ادا اور نزاکت کے ساتھ ساغر بڑھایا اور اُدھر کو منہ پھیر لیا ۔ توبہ اللمان ۔

واپسی پر مولوی عبدالکریم خان نے پوچھا "بابو جی کیا مجرا جنت میں ہو گا ۔ اس پر جو وہاں مانگیں گے وہ ملے گا ۔ یہی کہتے ہیں نا"

بھائی عبداللہ نے کہا ۔ اگر آپ جنت میں ہوئے ۔ آپ نے چاہا کہ ہو تو ہو سکتا ہے ۔ کیوں عاشق بھیا"

آقا جان نے کہا ۔ کیا پتہ کریم صاحب جنت میں چلتے پھرتے آپ کو ایک روز چونی مل جائے ۔ اس کی کوئی بات خدا کو ایسی اچھی لگ جائے ۔ جنت پر کسی کا اجارہ تو نہیں نا ۔"

"کیا اچھی بات کہی آپنے ۔ میں پوچھوں ہوں پنجاب کی رنڈی بھی کیا ایسی ہی ادائیں دکھاوے ہے" عبدالکریم بولا ۔

آقا جان نے کہا "سبھی جگہوں پر انہیں ہوش ربا اداؤں سے کام چلتا ہے کریم صاحب ۔ ایک کتاب کا نام طلسم ہوش ربا ہے ۔ اس میں زلفِ بنگال اور چشم پنجاب کی تعریف دہلی کی کمر اور لکھنؤ کے ٹھسکے کی تعریف کچھ اس طرح سے کی گئی ہے:

بال بنگالے کے طول شب ہجر عشاق — صورت پاک بنارس کی زمانہ مشتاق
لکھنؤ کا وہ غضب ٹھسکا پری رُو رقاق — حسنِ کشمیر تھا مشہور میانِ رفاق

چشم پنجاب کمر دہلی کی شملے کی گھات　　　جسم لاہور کا اور قامت و قد گجرات

عبدالکریم نے حیرت سے کہا "اچھاجی"

آقاجان بولے "شیخ سعدی ایران کا بہت بڑا شاعر تھا ۔ اس نے ایک قطعہ میں ہندوستان کی عورت کے عشوہ و ناز و ادا کی بہت تعریف کی ہے ۔ جب انگریز یہاں نیا نیا آیا اور نوابوں کے ساتھ ملنا جلنا شروع ہوا تو وہ نوابوں کے ساتھ طوائف کے کوٹھے پر جانے لگا"

عبدالکریم تعجب سے بولا "گانا سننے کو؟"

بات کو آقاجان نے آگے بڑھاتے ہوئے کہا "گانا سنتا تھا، پیچوان پیتا تھا ۔ پان الائچی چباتا، عورتوں کو محبت نامے لکھتا ۔ شاعری کرتا ۔ مشاعروں میں جاتا تھا ۔ گاؤ تکیہ لگا کر فرش پر بیٹھتا ۔ کئیوں نے ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کر کے یہاں کے حکمرانوں کے طور طریقے اختیار کر لئے تھے ۔ یہ لوگ نیل کی تجارت کرتے اور اپنے آپ کو نباب کہلاتے تھے اور نباب کہلا کر خوش ہوتے تھے ۔ انگلستان کا ایک لفنگا بازاری آدمی کلائیو جو بعد میں لارڈ کلائیو بنا کمپنی میں کلرک بھرتی ہو کر آیا تھا ۔ بڑا بدمعاش تھا نواب میر جعفر کی بیگم کا منہ بولا بھائی بن گیا تاکہ محلسرائے کے اندر کی راز کی خبریں کمپنی تک پہنچا سکے"۔

عبدالکریم بھائی عبداللہ کی طرف دیکھکر کہنے لگا "بابوجی آپ کے بھائی صاحب بڑے قابل آدمی ہیں گے ۔ ہم نے تو کتاب کھول کر نہ دیکھی گائے کا تیا پانچا کیا ۔ اس کے اندر باہر سے پارچے بنا کر دام لگائے ۔ گاؤ ماتا کو خدا سلامت رکھے ۔ اسی نے نہال کر دیا"

ایک روز آقاجان نے بھائی عبداللہ سے پوچھا "فرض کیجیئے آپ کی پلٹن کا دشمن محاصرہ کر لیتا ہے ۔ پلٹن کو رسد کا توڑہ پڑتا ہے ۔ دشمن ایک انگریز افسر کو یرغمال بھی بنا لیتا ہے اور اس کی رہائی کے لئے ایک کثیر رقم مانگتا ہے جو پلٹن کے پاس نہیں ہے ۔ آپ کیا کریں گے؟"۔

بھائی عبداللہ نے جواب دیا "رسد کا توڑہ تو پڑ نہیں سکتا ۔ محاصرے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کون کرے گا محاصرہ ۔ ہاں سرحد کے علاقہ میں البتہ قبائلی پٹھان کر سکتے ہیں ۔ گورے افسر کو یرغمال بھی بنا سکتے ہیں ۔ رقم بھی مانگ سکتے ہیں ۔ اگر پلٹن کے پاس رقم نہیں ہے تو بنیا اس کا انتظام کرے گا ۔"

آقاجان نے پوچھا ۔ بنیا کون ۔

بولے "ہر پلٹن کے ساتھ ایک Money Lender ہوتا ہے ۔ ویرانہ جنگل چھاؤنی جہاں فوج کوچ کرے بنیا ساتھ ساتھ رہتا ہے جس کا کام مالی مشکل کے وقت پلٹن کی مدد کرنا ہے ۔ وہ رقم کہیں سے بھی منگا سکتا ہے ۔ اس کی ہنڈی دوسرے شہر میں بھی چلتی ہے"

شاید آقاجان کے خیالات میں کوئی تموج آیا ۔ گردش تقدیر اگر محاصرہ کر لے تو ایک بنیا موجود ہونا چاہیئے جس کی

ہنڈی قبول کی جاسکے ۔ علم کی ہنڈی تو ہر جگہ ترائی جاسکتی ہے ۔ لفظ خدا کا نام ہے لفظ کی ہنڈی کہاں نہیں چلتی ۔

انہوں نے نجیب آباد میں رہ کر اس درویش صفت انسان کو بہت قریب سے دیکھا تھا جس کے توکل کی مثال نہ تھی ۔ ساری عمر جس نے تنگ دستی میں بسر کی لیکن اہل دول کے آستانوں کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا ۔ عام دنیاداروں کا رنگ ڈھنگ اکبر شاہ خان نجیب آبادی کو چھو کر بھی نہیں گیا تھا ۔ وہ صحیح معنوں میں فنافی العلم اور انتہا درجہ کے غیور تھے ۔ جو تصانیف انہوں نے یادگار چھوڑیں ان کے مسودے انہوں نے روشنائی سے نہیں خونِ جگر سے لکھے تھے ۔

آقاجان کو انگریز کی نوکری سے نفور تھا جو ہمیشہ رہا ۔ کٹڑی کا کچھ کرایہ آئے کچھ زمین سے اناج کی بوریاں آئیں ۔ بھرا پُرا گھر رہے اور وہ صرف علم کتاب کی نوکری کریں ۔ ہاں انداز مولانا نجیب آبادی کا سا ہو مگر سہ پہر کی چائے عین چار بجے ٹرے میں رکھکر بھائی عبداللہ کے خانساماں کی طرح کوئی ملازم حاضر ہو جائے ۔ نوابی ٹھاٹھ ۔ غیور پن کی لاج اور علم کی دنیا میں مستند ہے میرا فرمایا ہوا ۔ لیکن بجوگ یہ پڑا ۔ کٹڑی کہاں جس کا کرایہ آئے ۔ زمین کہاں جہاں سے اناج کی بوریاں آئیں ۔ گھرانہ ہمارا ملازم پیشہ ۔ مگر جس نے یہ محاورہ بنایا تھا کہ شکر خورے کو خدا شکر دیتا ہے اس کو خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ۔ بڑے بڑے شکر خوروں کی شکر پروری کرگیا ۔ بہتوں کو گھی شکر چکھا گیا ۔ آقا جان کو عمر بھر مٹھائی پسند رہی ۔ میسو، برفی، قلاقند، گلاب جامن، رس گلے، بالوشاہی موتی چور ۔ منہ بھر بھر کھائے ۔ طبیعت کی تلخی اور کڑواہٹ نہ چھٹی ۔

والدہ پوچھتی آقاجان کیا پکے گا ۔ جو وہ کہتے پکتا ۔ کریلوں میں قیمہ بھرتے دھاگا لپیٹ کر تلے جاتے ۔ ادھر نیچے تیسری منزل میں تنور تپتا ۔ آپا وزیر پیڑے بنارہی ہیں ۔ امی جان روٹیاں لگارہی ہیں ۔ آقاجان چھتری تانے کھڑے ہیں کہ والدہ کو دھوپ نہ لگے ۔ الطاف تازہ گھی سے گرم گرم روٹیوں کو چپڑتا ہے ۔ میں اور اباجان خربوزوں کی قاشیں کاٹ رہے ہیں ۔ جونہی میری قاش بے شکل ہو جاتی ۔ اباجی ٹوکتے ۔ "میوے کا ناس مار رہے ہو"

"چھری ٹیڑھی ہو گئی تھی"

"چھری سیدھی رکھو ۔ چھری کا بچہ"

یہ اباجی کی ڈانٹ نہ ہوتی تھی ۔ یہ پیار کے خطابات تھے جو ہمیں ایسے موقعوں پر ملتے رہتے تھے اور ہم اس راز سے آگاہ تھے کہ ان لفظوں کی تہ میں محبتوں کا ٹھاٹھیں مارتا ایک بحر بیکراں چھپا ہوا ہے جو ہمیں نظر نہیں آتا تھا محسوس ہوتا تھا ۔

تیسری منزل کا نچلا حصہ گرمیوں کی دوپہر کاٹنے کو ایک طرح سے تہ خانہ ہوتا ۔ وہیں دوپہر گزاری جاتی ۔ اوپر والے منگہ کی سلاخوں پر کمبل ڈال کر دھوپ کی کرنوں تک کو روک دیا جاتا ۔ بھائی خادم کی بیٹی پروین ملازم کے ساتھ فرش پر کمبل بچھا کر اس پر دستر خوان بچھاتی ۔ نمکین لسی کی ولٹوئی قریب رکھ دی جاتی ۔ تنور کی گرم گرم چپڑی روٹی کے

ساتھ شکم پُرے کریلے کھائے جاتے ۔ فصل کے میوے خربوزوں کے ساتھ منہ میٹھا کرتے ۔ کریلوں کی پیاس نمکین لسی بجھاتی ۔ پھر نرم نرم اندھیرے والے دالانوں اور کوٹھڑیوں میں بچھی چارپائیوں پر گھنٹے بھر کو ایسی بھول جانے والی نیند آتی کہ:

واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تیری انجمن میں تھی

(۳)

جب آقا جان نے ایل ایل بی کر لیا تو "اکبر منزل" کے اسی تہ خانے میں ایک روز کھانا کھانے کے بعد اباجی نے کہا "عاشق اب تم بٹالہ میں پریکٹس شروع کرو ۔ میز کرسیاں کوچ الماریاں جو جو کچھ تمہیں دفتر کے لئے چاہیئے لے جاؤ ۔ یہاں سے پھر گورداسپور لاہور جہاں تمہاری مرضی چلے جانا"

تاریخ بتاتی ہے شہنشاہ اکبر اعظم کے اپنے خواب تھے ۔ شہزادہ سلیم کے اپنے ۔ اس میں کیا شک کہ تمہارے ہمارے ہاں سب کے کچھ خواب ہوتے ہیں ۔ کچھ ہمیں لوح محفوظ بھی دیکھتی ہے ۔ کبھی کوچۂ جاناں کبھی دشتِ جنوں ۔ بیٹے کی زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے غلام اکبر خان کے اپنے خواب تھے ۔ عاشق حسین بٹالوی کے اپنے ۔ ابا جی کی یہ بات ان کو ڈراؤنی لگی ۔ کچھ ہندو مہاشے کچھ سکھ کچھ مسلمان بد ذوق ۔ وکیلوں میں میر تقی میر و کالت کرنے کو کرسی بچھا کچہری سے باہر جا بیٹھے جیسے رنڈیوں نے گاہک پھانسنے کو دلال رکھے ہوتے ہیں ۔ کیسا ڈراؤنا لینڈ سکیپ آنکھوں کے سامنے آیا ۔ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی کو خط لکھ کر اپنی خلفشار کا ذکر کیا ۔ مولانا نے جواب میں لکھا"۔

اخوی مکرمی السلام علیکم ۔

کل آپ کے محبت نامے نے ورود ہو کر میری مسرت اور راحت روحانی میں حیرت آمیز طور پر اضافہ کیا ۔ آپ کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ آپکے محبت انتما خطوط مجھ کو کس قدر تقویت پہنچا سکتے ہیں تو آپ مجھ کو جلد جلد خطوط لکھنا ثواب عظیم سمجھ کر کبھی اس معاملہ میں کوتاہی نہ فرمائیں ۔ محمد اسماعیل خان صاحب کل مراد آباد چلے گئے تھے آج واپس آجائیں گے باقی احباب کو بھی ان کے آنے پر ایک ہی مجلس میں آپ کا خط سنایا جائے گا اور آج ہی شام کو شاید ایسا موقع مل جائے ۔ رات بھی سب احباب جمع تھے مگر میں نے اسماعیل صاحب کے نہ ہونے کی وجہ سے آپ کا خط نہیں سنایا ۔ آپ کا ذکر کئی مرتبہ مجمع احباب میں آچکا ہے آپ کا یہ خط پڑھ کر یقیناً سب کے سب بہت ہی خوش ہوں گے ۔ حکیم مبشر علی صاحب آج صبح ہی آپ کا ذکر محبت کے ساتھ کرتے رہے ۔ اور دسمبر کے مہینے میں آپ کے بلوانے اور شکار کھلوانے کے سب سے زیادہ خواہشمند پائے گئے ۔

آپ نے اپنے متعلق مجھ سے کچھ استفسار فرمایا ہے اور آئندہ اصول کار کے لئے استمزاج کیا ہے ۔ یہ زمانہ جو آپ پر گزر رہا ہے سعادتِ انسانی اور مقصود حیات انسانی کے حصول کی سعی کا بہترین زمانہ ہے ۔ اس قلیل و عسیر مدت میں آپ کو اپنے مستقبل کی نسبت دستور العمل تیار کرنا ہے ۔ اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کام میں آپ کی مدد کرنا بہت

بڑے ثواب کا کام ہے ۔ اور اسی لئے عرض کرتا ہوں کہ آپ سب کی باتیں سنیں اور عقلمندوں سے مشورہ لیں ۔ پھر جو اپنی سمجھ میں آئے یعنی جس طرف کو طبیعت زیادہ راغب ہو جائے قوت اور ہمت کے ساتھ اس پر عامل ہو جائیں ۔ میرا یا کسی کا بھی یہ حق نہیں ہے کہ آپ کو مجبور کر سکے ۔ ہاں یہ سب کا فرض ہے کہ آپ کے سامنے نیک مشورے اور بہترین تجاویز پیش کریں چنانچہ اسی صورت سے اپنی رائے عرض کرتا ہوں ۔ میرے خیالات میں کوئی ترتیب نہیں ۔ آپ ان پریشان باتوں کو خود مناسب ترتیب کے ساتھ ذہن نشین کر لیں ۔

۱۔ جس طرح آج کے اعمال کل کی راحت کا موجب ہوتے ہیں اسی طرح دنیوی ناپائیدار زندگی حیات جاوید اور اُخروی و عوامی زندگی کی راحت کا سلمان ہو سکتی ہے ۔ پس آپ اپنے لئے کوئی ایسا کام یا طرزِ عمل اختیار نہ کریں جس میں آپ کو دینی اور روحانی ترقی کا موقع نہ مل سکے ۔

۲۔ دنیا میں والدین آپ کے سب سے بڑے محسن ہیں ۔ ان کے احسانات کو فراموش کر دینا یا ان کو ناراض کرنا خدا و رسولؐ اور دنیا والوں کی نگاہ میں بھی اپنے آپ کو ملزم اور مجرم قرار دینا ہے ۔ لہٰذا والدین کے منشا کو پورا کرنا بھی آپ کا اولین فرض ہونا چاہیئے ۔ لیکن اگر خدانخواستہ والدین کی خواہش آپ کی راحت اخروی اور حیاتِ جاودانی کے منافی واقع ہو تو پھر آپ کو بڑی دقت پیش آئےگی اور آپ کا کام بے حد دشوار ہو جائے گا ۔ اس صورت میں آپ خود بھی والدین کو اپنے حسب منشا رضامند کرنے کی کوشش کریں ۔ اور ان کے احباب اور دوسرے عزیزوں سے امداد طلب کریں کہ وہ آپ کے والدین کو صحیح اور مفید اصول کار پر رضامند کر سکیں ۔ انکارِ محض اور خودسری کا اظہار آپ کی طرف سے ہرگز نہیں ہونا چاہیئے ۔

۳۔ لاہور میں رہنا آپ کی دماغی نشوونما کے لئے زیادہ موزوں ہو سکتا ہے۔ لاہور میں ہر قسم کی صحبت آپ کو میسر رہ سکتی ہے ۔ اپنا ملک ہے اپنی معاشرت ہے اپنی قوم ہے اپنا مذہب ہے ۔ یہاں کی ترقیاں آپ کے اور آپ کے خاندان والوں کے لئے نہایت خوشگوار اور پسندیدہ نیز توقع کے موافق رہ سکتی ہیں ۔ اگر آپ یورپ کے کسی ملک میں چلے گئے تو وہاں یہ تمام چیزیں آپ کے لئے ناپید ہوں گی ۔ آپ کتنے ہی بڑے پختہ خیال کے آدمی کیوں نہ ہوں لیکن اثرات ماحول اور وہاں کی معاشرت و مادیت سے متاثر نہ ہونا آپ کے اختیار کی بات نہیں ۔ ممکن ہے اور بہت زیادہ ممکن ہے کہ آپ کے یورپ بھیجنے سے جو امیدیں آپ کے والدین کی وابستہ ہوں ان میں سے ایک بھی پوری نہ ہو۔ اور آپ وہاں سے کچھ اور ہی بن کر آئیں ۔ یہ محض امکانات ہی نہیں ہیں بلکہ ۹۰ فیصدی سے بھی زیادہ نوجوان جو یورپ سے تعلیم پاکر آتے ہیں اپنے عزیزوں اور ملک والوں کے لئے غیر مفید ثابت ہوتے ہیں جس کا بڑا سبب یہی ہے کہ وہاں کی معاشرت اور صحبتوں پر تنہا ایک ایشیائی طالبعلم کا غالب آنا معلوم!

۴۔ اگر آپ روپیہ کمانا چاہتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی شہرت و عزت کی بھی آپ کو خواہش ہونی چاہیئے کیونکہ تنہا روپے کا زیادہ ہونا ہرگز انسانی شرافت کا نشان نہیں ۔ آپ خود ہی غور فرمالیں کہ آپ کے گردوپیش کیسے کیسے مالدار

لوگ مل سکتے ہیں جن کو آپ ہر گز اپنے سے بہتر نہیں سمجھتے ۔ حالانکہ آپ کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے ۔ پس روپیہ اگر کمانا چاہتے ہیں تو لوہار بڑھئی اور موچی بن کر نہ کمائیں بلکہ ایک عالم فاضل اور محبوب خلائق بن کر کمائیں ۔ محض مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میں نے ملک کے کم سے کم بیس پچیس مشہور صاحب نظر لوگوں سے دریافت کیا ہے اور سب نے اس ضرورت کو تسلیم کیا ہے کہ انگریزی زبان میں جس قدر علم و فنون موجود ہیں ان کو اردو جامہ پہنانے کی سخت ضرورت ہے اور تمام ملک میں انگریزی کتابوں کے ترجموں کی پیاس موجود ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ آج تک کسی ایک شخص نے بھی اپنی زندگی کو اس کام کے لئے وقف نہیں کیا اور یہ کام سو حصوں میں ایک حصہ بھی نہیں ہوا ۔ حالانکہ جو شخص اس طرف متوجہ ہو گا وہ ایک ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ سے زیادہ پیسہ یقیناً کما سکے گا اسی طرح اور سینکڑوں باعزت اور مفید ملک و قوم نیز بلاضرر مشاغل ایک ذہین آدمی تلاش کر سکتا ہے ۔

نوکری خواہ کیسی ہو میرے نزدیک آپکی امید گاہ نہیں ہونی چاہیئے ۔ نوکری اور غلامی ایک ہی چیز کا نام ہے ۔ جب تک اور جہاں تک آپ کو موقع ملے تحصیل علم (۱) میں کوشاں رہیں ۔

اگر مجھ کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ اپنے متعلق لاہور رہ کر کچھ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو پھر میرے لئے نجیب آباد چھوڑ کر لاہور چند سال کے لئے آ جانے کا مسئلہ قابل غور ہو جائے گا اور بہت زیادہ ممکن ہے کہ مع رسالہ "عبرت" لاہور چلا آؤں ۔ میں اس بات سے واقف ہوں کہ میرے لاہور آکر قیام کرنے کی صورتیں با آسانی پیدا ہو سکتی ہیں اور میں وہاں خوش باش زندگی بسر کر سکتا ہوں ۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے اب تک ایسا نہیں چاہا تھا اور نہ مجھ کو نجیب آباد چھوڑنے کی ضرورت لاحق ہے مگر میں یہ ثابت ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ آپ سے جو تعلق خاطر ہے وہ اسقدر زبردست ہے کہ میں اس کام پر بھی آمادہ ہو سکتا ہوں ۔ میں نے اپنے دوستوں کے لئے اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اس قسم کی اور اس سے بھی زیادہ اہم تبدیلیاں اپنی زندگی میں پیدا کر لی ہیں ۔

ڈاکٹر (۲) اقبال صاحب سے اگر آپ ملے ہوں تو اس ملاقات کی کیفیت اور مکمل روئداد سے مجھ کو ضرور مطلع فرمائیں ان سے اتوار کے دن یا کسی تعطیل کے دن آپ ملیں تو زیادہ اچھا ہے ۔ ایک مرتبہ وہ نہ ملیں تو ان کے آدمی سے ملاقات کا موزوں وقت معلوم کر کے دوسری مرتبہ جائیں اور پھر ان ہی سے صحیح اوقات ملاقات معلوم کر لیں ۔ اگر ضرورت ہو گی تو میں اور بھی کوئی عریضہ ان کو لکھدوں گا ورنہ پھر خود لاہور پہنچوں گا ۔

والد صاحب کی خدمت میں سلام و نیاز ۔ بھائی ذوالقرنین صاحب کو آداب ۔ مجھ کو ڈاکٹر سید محمود صاحب سابق سیکرٹری مرکزی کانگریس کمیٹی حال اسیر فرنگ نے بکسر جیل سے خط لکھا ہے ۔ وہ ۹ اکتوبر کو رہا ہوں گے ۔ ان کی خواہش ہے کہ میں ۸ یا ۹ اکتوبر کو پٹنہ پہنچ جاؤں اور ان سے ملوں وہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے جیل میں

۱۔ جب تک اور جہاں تک اُن کو موقع ملا وہ تحصیل علم میں کوشاں رہے۔

۲۔ ڈاکٹر اقبال ان دنوں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہتے تھے۔

میرے مضمون ''آئینہ حقیقت نما'' کا ترجمہ کرتے رہے ہیں اور اس مضمون کو مجھ سے مکمل کروانا چاہتے ہیں ۔ میں اگر پٹنہ گیا تو آپ کو مطلع کروں گا اور آپ کے بھائی محمد عبداللہ صاحب سے بھی ملنے کی کوشش کروں گا جو آجکل دانا پور چھاؤنی میں ہیں ۔ ان کے پاس رسالہ ''عبرت'' بھیج دیا گیا ہے ۔ میرا پٹنے جانا ابھی یقینی نہیں ہے ۔

اکبر شاہ خان نجیب آبادی

مولانا کے اس خط سے آقاجان کی جولانی طبع کو جو خزاں زدہ درختوں میں گھری ہوئی تھی ایک آبجو مل گئی ۔ ان کو اپنے راہ عمل پر غور و تامل کا موقع ملا ۔ بچپن لڑکپن جوانی بھائی ذوالقرنین کے ساتھ گزاری تھی اس لئے بہت سانجھا تھا ۔ مولانا کا ذکر کر کے خط بھائی ذوالقرنین کو دیا انہوں نے اباجی کے پیش گزار کیا ۔

اس خط میں جو یورپ جانے کا ذکر ہے اس کا قصہ یوں ہے کہ انڈین کانگریس کی ترکِ موالات (Non-Cooperation Movement) سے متاثر ہو کر آقاجان کے چند دوستوں نے تعلیم کو خیر باد کہدیا تھا ۔ آقاجان کا کلاس فیلو عبدالرؤف ملک کالج کی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر افغانستان پہنچا ۔ وہاں سے جرمنی چلا گیا تھا ۔ ہندوستان کی سیاسی فضا بارود کے ڈھیر کی طرح بھک سے بھڑک اٹھی تھی ۔ اس تحریک کی زیادہ اور سب سے بڑی زد طلبہ اور وکلاء کے طبقے پر پڑی تھی ۔ بہت نوجوان طالب علم اس تحریک سے متاثر ہوئے ۔ ہندوستان کو آزاد کرانے کا جنوں اس طرح دل و دماغ پر چڑھ دوڑا کہ سر پر کفن باندھا گھروں سے اچانک بھاگے کوئی افغانستان کوئی روس اور کوئی جرمنی چلا گیا ۔

سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی لہریں اتار پر آکر سمندر کی طرف مڑ کر اس میں جذب ہو گئیں تو کیڑے کیکڑے بے جان سیپیاں ریت پر پڑی دکھائی دیں ۔ گھر سے بھاگے نوجوانوں کے دل ایسے ٹوٹے کہ آنکھیں کھل گئیں ۔ وہ جو سر پر کفن باندھے تھے الفی بن کر گلے میں ڈال لئے ۔ چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے پیٹ پالنے لگے ۔ وہیں کے ہو رہے ۔

آقاجان اپنے کالج کی میگزین کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر رہے تھے ۔ اسوقت تک زبان ان کی سو پانیوں دھل چکی تھی ۔ پنجاب کے سب سے نمایاں ادبی رسالے ''ہمایوں'' میں ان کے افسانے چھپتے تھے ۔ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کی خط و کتابت سے زبان نے اور جلا پائی ۔ مولانا کی حوصلہ افزائی سے ان کی ہمتوں حوصلوں کو بڑھاوا ملا ۔ بھائی ذوالقرنین اور آقاجان کے ایک مشترک دوست شاہ محمد جرمنی چلے گئے تھے ۔ وہ بھائی ذوالقرنین کو لکھتے عاشق کو جرمنی کیوں نہیں بھیج دیتے ۔ یہاں میرے پاس خوش رہے گا ۔ نئی جگہ نئی آب و ہوا میں اس کی پریشانیاں دور ہو جائیں گی ۔ ناکام شادی نے اس کی ذہانتوں کو ضائع کر دیا ہے ۔ بھائی عاشق پر ایک ایسی جگر چاک کیفیت تھی جو کسی کام میں نہ ہاتھ ڈالنے دیتی ۔ گھر والوں کو صرف ان کی دلداری منظور تھی ۔ لاہور میں امرت دھارا روڈ پر جو بڑی بارونق جگہ تھی کرایہ کا مکان لیا ۔ چادریں بستر دریاں کرسیاں میز گاؤ تکیے پلنگ چارپائیاں گھر سے آئیں ۔ اناج گھی ایندھن بھائی ذوالقرنین نے اپنے ذمہ لیا ۔ بھائی خادم جو بی اے کے آخری سال میں تھے بورڈنگ ہاؤس سے اٹھ کر اسی مکان میں آگئے ۔ مولانا کے کہنے کے مطابق کہ لاہور میں رہنا ان کی دماغی نشوونما کے لئے زیادہ موزوں ہو گا ۔ آقاجان نے لاہور کو اپنا مسکن بنا لیا ۔

رئیس زادوں کی طرح رہنے لگے ۔ ادیبوں شاعروں اخبار نویسوں سے ملاقاتیں بڑھنے لگیں ۔ جن میں میاں بشیر احمد منصور احمد حامد علی خان حمید احمد خان پنڈت ہری چند اختر ۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری مجید ملک مولانا تاجور نجیب آبادی مولانا ظفر علی خان سید عابد علی عابد حکیم احمد شجاع اختر شیرانی مولانا صلاح الدین احمد اور مہر و سالک جیسے یارانِ باصفا اور ناموران علم و ادب قابل ذکر ہیں ۔

(۱) عبدالمجید سالک بھائی ذوالقرنین کے ہم عصر تھے ۔ آقاجان سے عمر میں بڑے مگر ادبی محافل میں پھبتی اور ضلع جگت کا مزہ ساتھ ساتھ اٹھایا جاتا ۔ لاہور کی ان ادبی صحبتوں سے آقاجان کی گفتگو میں لطافت و جاذبیت آئی ۔ کتب بینی سے بے تفصیل بات کو تفصیل ملی ۔ جواں فکری کو سامانِ وجود ملا ۔

امرت دھارا روڈ والا یہ مکان بھی عبدالرحمن کے مکان سے دور نہ تھا ۔ ان دنوں ایک ایسا دلچسپ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر آقاجان نے اپنے ایک مضمون میں کیا جس کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے مضامین میں چند اصحاب نے یہ بتایا کہ علامہ اقبال کس طرح بڑے سے بڑا مسئلہ آسان فہم طریقے سے بتا کر آدمی کی تسلی کر دیا کرتے تھے ۔ آقاجان کا مضمون یوں شروع ہوتا ہے ۔

لاہور میں میونسپل کمیٹی کے انتخابات کی ہماہمی تھی ۔ میرے ایک دوست عبدالرحمن کے والد بابو نورالدین گوالمنڈی وارڈ کی طرف سے امیدوار کھڑے ہوئے تھے ۔ ان کا مقابلہ خواجہ دل محمد ایم ۔ اے سے تھا ۔ میں اتفاق سے ان دنوں عبدالرحمن کے پڑوس میں آ کر رہا تھا اور فرصت کا کچھ وقت نکال کر ان کے والد مکرم کی اس "انتخابی جنگ" میں حتی المقدور کچھ نہ کچھ مدد کر دیا کرتا تھا ۔ علامہ اقبال اس زمانے میں میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے اور ان کا دولت کدہ اسی وارڈ میں واقع تھا ۔ خواجہ صاحب اور بابو نورالدین دونوں اپنی اپنی جگہ اس کوشش میں مصروف تھے کہ کسی طرح حضرت علامہ کی تائید اور حمائت اپنے حق میں حاصل کر لیں ۔ چنانچہ اس غرض سے دونوں حضرات الگ الگ اوقات میں حضرت مرحوم کی خدمت میں حاضر ہو کر معروضات پیش کرتے تھے ۔ مجھے بھی چونکہ مرحوم و مغفور سے شرف نیاز حاصل تھا اس لئے الیکشن کے جھنجھٹ کے علاوہ یوں بھی میں ان کی خدمت میں گاہے گاہے حاضر ہوا کرتا تھا ۔ البتہ اس الیکشن کے سلسلے میں ہفتہ عشرہ تقریباً روزانہ حاضری کی سعادت حاصل ہوتی رہی ۔ سہ پہر سے لے کر غروب آفتاب تک حضرت علامہ کے مکان پر حسب معمول مختلف الخیال لوگوں کی ایک مجلس جمی رہتی تھی جہاں علم و ادب ، فلسفہ و تاریخ اور مذہب و سائنس کے متعدد پہلوؤں پر دلچسپ بحثیں ہوا کرتی تھیں ۔ میونسپلٹی کے الیکشن کا یہ فائدہ مجھے یقیناً پہنچا کہ ڈاکٹر صاحب کی صحبت سے مسلسل دو ہفتے فیضیاب ہوتا رہا ۔

اس دوران میں چراغاں کا میلہ آگیا ۔ جو ہر سال مارچ کے آخری ہفتہ اتوار کو لاہور کے شالامار باغ میں بڑی دھوم دھام سے لگتا ہے ۔ عبدالرحمن اور میں نے ارادہ کیا کہ میلہ ضرور دیکھیں گے ۔ پروگرام یہ طے ہوا کہ ہفتے کی شام کو شالامار پہنچیں اور رات کے دس گیارہ بجے تک وہاں دوستوں کی محفل میں ہنسی خوشی اور تفریح سے وقت گزارا جائے مجھے

۱ ۔ سالک صاحب کے ماموں مہرالدین تھے جن سے ابا جی کی بھانجی بیاہی گئی تھی ۔

اچھی طرح معلوم نہیں کہ کونسا واقعہ پیش آگیا تھا لیکن اتنا یاد ہے کہ ہم کسی خاص مجبوری سے میلے پر نہ جا سکے ۔ ہفتے کی شام کو ہم دونوں گھر سے کھانا کھا کر یوں ہی ٹہلنے کے لئے انار کلی کی طرف نکلے ۔ موسم بہت خوشگوار تھا اور راستے میں ہمیں سواریوں سے لدے ہوئے کئی تانگے ملے جو بڑی تیز رفتاری سے شالامار کی طرف بھاگے جا رہے تھے ۔ اندرون لاہور کے رہنے والے زندہ دل لوگ بوسکی کی قمیصیں پہنے ، رنگین دھوتیاں اور طلائی کنارے والی لنگیاں باندھے میلہ دیکھنے جا رہے تھے ۔ عبد الرحمٰن اور میں اس نظارے سے محظوظ ہوتے اور مزے سے باتیں کرتے آہستہ آہستہ جا رہے تھے ۔

جب ہم یونٹ ہال سے آگے نکل کر نیلے گنبد کے چوک کی طرف بڑھے تو میں نے دیکھا کہ سڑک کے اس پار ایک نوجوان کھڑا بڑے غور سے ہماری طرف دیکھ رہا ہے ۔ ہم بمشکل دس بیس قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ وہ نوجوان ڈرتا ڈرتا اور سہمتا سہمتا ہماری طرف آیا ۔ اس کی رفتار اور چہرے کی ہیئت سے معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کسی نامعلوم خوف سے الفاظ زبان تک نہیں آتے ۔ وہ ہمارے پاس آکر کھڑا ہو گیا ۔ میں نے کسی قدر متعجب ہو کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ ۔

ہم سے کچھ کہنا چاہتے ہو ؟

اس نے جھجکتے ہوئے خوفزدہ آواز میں کہا ۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ زندگی کا مقصد کیا ہے ؟

میں نے اور زیادہ حیران ہو کر کہا ۔ کیا؟

اس نے اٹک اٹک کر اور ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا ۔ میں ـــ صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ـــ انسان دنیا میں کیوں آیا ہے ؟

چراغاں کے میلے کا دن ہو ۔ لاہور کے شوقین مزاج لوگ بن ٹھن کر شالامار جا رہے ہوں ۔ ہر طرف ایک خاص قسم کی مسرت ۔ خاص قسم کی چہل پہل نظر آتی ہو ۔ مارچ کی خوشگوار شام نے انار کلی کی گہما گہمی اور رونق میں دوچند اضافہ کر دیا ہو ۔ اور عین اسوقت کہ آپ نیلے گنبد کے چوک میں کھڑے اس رونق سے لطف اندوز ہو رہے ہوں ۔ ایک دبلا پتلا نوجوان آکر آپ سے ایک دم یہ سوال کرے کہ انسان دنیا میں آیا کیوں ہے اور زندگی کا مقصد کیا ہے ؟ تو بتائیے آپ اس نوجوان کی ذہنی کیفیت کے متعلق سوائے اس کے اور کیا اندازہ کریں گے کہ وہ یاس و حرماں کا اس درجہ شکار ہو چکا ہے کہ دنیا کی بے ضرر اور معصوم دلچسپیاں بھی اس کی روح میں شگفتگی پیدا کرنے سے عاجز ہیں ۔

میں نے تعجب سے اس نوجوان کو سر سے پاؤں تک دیکھا ۔ وہ آنکھیں چار کرنے سے گھبراتا تھا ۔ اس کے بدن پر معمولی سے کپڑے تھے ۔ لٹھے کا پاجامہ ، قمیص ، کوٹ اور سر پر کشتی نما ٹوپی ۔ میں نے زور سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا ۔ اور اس کے بازو کو تیزی سے جھٹکا دے کر قدرے درشتی سے پوچھا ۔ "کیا تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟"

اس نوجوان کی تو گویا پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ جن میں معنویت کے کوئی آثار نہ تھے وہ میری طرف دیکھنے لگا میں نے پھر زور سے پوچھا ۔ بتاؤ خودکشی کرنا چاہتے ہو تم ؟"

مجھے یاد ہے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی پیدا ہو گئی تھی اور اس نے حد درجہ ندامت کے ساتھ رک رک کر صرف اتنا کہا "ہاں"

شاید وہ دل ہی دل میں پریشان ہو رہا تھا کہ اس کی چوری پکڑی گئی میں نے اپنے لہجے کو زیادہ درشت بنا کر تحکمانہ انداز میں کہا ۔ تم جانتے ہو خود کشی کا اقدام ایک جرم ہے ؟میں تمہیں ابھی قید خانے بھجوا سکتا ہوں ۔

ساتھ ہی میں نے عبدالرحمٰن سے کہا ۔ بلاؤ اس پہرے والے سنتری کو اور کہو کہ اس لڑکے کو تھانے لے جائے ۔

وہ نوجوان بالکل بے دست و پا ہو کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا ۔ آپ مجھ کو پولیس کے حوالے نہ کیجیئے میری بات تو سن لیجیئے ۔

میں نے اس کو محبت کے ساتھ اپنے سینے سے لگا لیا ۔ اور پھر تسلی دیتے ہوئے کہا ۔ "گھبراؤ مت ۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا ۔ مجھے اپنے دکھ درد کی کہانی ضرور سناؤ ۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم کرتے کیا ہو؟

اس نے کہا ۔ میں ڈی اے وی کالج میں پڑھتا ہوں ۔ اور مدت سے سخت پریشان اور غمگین ہوں ۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ہے راستہ دکھائی نہیں دیتا ۔

میں نے بہت سے سوال کئے ۔ تاکہ معلوم کروں کہ اس کی پریشانی کس نوعیت کی ہے ۔ میں نے پوچھا ماں باپ زندہ ہیں ؟ اس نے کہا زندہ ہیں ۔ میں نے پوچھا گھر سے پڑھائی کا خرچ آ جاتا ہے یا تنگدستی ہے ؟کہا گزارے کے لائق کافی روپے مل جاتے ہیں ۔ میں نے پوچھا کسی شرارت کی وجہ سے کالج میں جرمانہ ورمانہ تو نہیں ہوا ؟کہا بالکل نہیں ۔ میں بہت نیک نام طالب علم ہوں ۔ میں نے پوچھا کہیں عشق و عاشقی کا سودا تو نہیں مول لے بیٹھے ؟ کہا عشق و عاشقی کا مجھے ہوش ہی نہیں ۔ میں نے آخر کار حیرت زدہ ہو کر پوچھا ۔ بندۂ خدا ۔ پھر وہ کونسی لاعلاج مصیبت ہے جس کے ہاتھوں تنگ آکر تم اپنی جان پر کھیل جانا چاہتے ہو؟

اس نے کچھ اس قسم کی باتیں شروع کیں !"مجھے اس دنیا میں ہر طرف دکھ اور مصیبت ہی نظر آتی ہے ۔ زندگی کی غایت پر جتنا غور کرتا ہوں اتنی ہی پریشانی بڑھتی جا رہی ہے ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ قدرت نے انسان کو کیوں پیدا کیا ہے ۔ اور خدا اپنے کمزور بندوں کو ابتلا میں مبتلا کر کے کیوں خوش ہوتا ہے ۔ کیا وہ آزمائش چاہتا ہے ؟ خالق کو اپنی مخلوق کی آزمائش کی کیا ضرورت ہے ۔ یہ تو بالکل مہمل سی بات ہے"۔

اسی قسم کی اس نے بہت سی باتیں کیں پھر کہنے لگا ۔ یہ شکوک و شبہات ہر لمحہ بڑھتے جا رہے ہیں اور مجھے دنیا میں کہیں اطمینان نظر نہیں آتا ۔ میں نے بعض لوگوں سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا ہے لیکن کوئی شخص میری تشفی نہیں کر سکا ۔ میری رات کی نیند اور دن کا آرام تباہ ہو گیا ہے ۔ دل و دماغ سخت الجھن میں گرفتار ہیں ۔ میں کئی روز سے خودکشی کے مسئلہ پر غور کر رہا ہوں ۔ جان دینے کے کئی طریقے میرے دماغ میں گھوم رہے ہیں ۔ زہر پھانک

لوں ۔ دریامیں کود پڑوں ۔ ریل گاڑی کے نیچے سر رکھ دوں ۔ ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں کر سکا آج شام کو میں ہوسٹل سے پختہ ارادہ کر کے نکلا تھا کہ یا تو مطمئن و مسرور ہو کر واپس جاؤں گا ۔ یا اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں گا ۔ میں نے انار کلی میں دو ایک آدمیوں سے بات کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن لوگوں کے خوش باش ہنستے ہوئے چہرے دیکھ کر مجھے اپنے غم کے اظہار کی جرأت نہیں ہوئی ۔ اب آپ کو دیکھتے ہی خدا جانے کس جذبۂ بے اختیار کے تحت آپ کی طرف کھنچ کر آگیا ہوں ۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ میں نے اس کی داستانِ غم سن کر کیا جواب دیا لیکن اتنا معلوم ہے کہ ہمارے درمیان موت و زیست ، مشیتِ ایزدی ، انسانی فرائض اور رنج و مسرت کے فلسفے پر بحث شروع ہو گئی ۔ میں بول رہا تھا اور وہ چپ چاپ سنتا جا رہا تھا ۔ میں بہت ہمدردی سے باتیں کر رہا تھا لیکن میرا خیال ہے میں نے کوشش سے اپنی آواز میں کسی قدر تحکمانہ رنگ بھی پیدا کر لیا تھا ۔ پھر میں نے عبدالرحمن سے پوچھا ۔ کیا خیال ہے اس کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے چلیں ؟ ممکن ہے وہ صحیح رستہ بتادیں ؟

عبدالرحمٰن نے کہا ۔ ہاں ضرور لے چلئے ۔ بہت اچھا خیال ہے ۔

میں نے اس نوجوان سے پوچھا ۔ ہمارے ساتھ آپ چلنے کو تیار ہیں ؟

اس نے آمادگی ظاہر کی اور ہم وہاں سے پہلے گوالمنڈی پہنچے عبدالرحمٰن کو ان کے مکان پر چھوڑ کر میں نے سیدھا علامہ اقبال کے دولت کدے کا رخ کیا ۔ وہ نوجوان میرے ہمراہ تھا ۔ ڈاکٹر صاحب اکیلے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے ۔ میں سلام کر کے ادب سے ایک طرف بیٹھ گیا اور ایک کرسی پر اس نوجوان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا ۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ دیر سکوت کرنے کے بعد فرمایا ۔ کہو بھئی کیا تازہ خبر ہے آج کی ؟

میں نے مختصر الفاظ میں سارا قصہ عرض کر دیا ۔ ڈاکٹر صاحب حقے کی نے کو پرے ہٹا کر ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے اور پھر اس نوجوان کی طرف غور سے دیکھ کر فرمانے لگے ۔ کیوں بھئی! تمہارا ابھی ارادہ بدلا ہے یا نہیں ۔

وہ نوجوان چپ رہا ۔ ڈاکٹر صاحب پھر بولے ۔

لڑکے میں تم سے پوچھتا ہوں ۔ کیا تمہارا ابھی خودکشی کا ارادہ ہے ؟

نوجوان نے بہت دھیمی آواز میں جواب دیا ۔ جی ہاں ارادہ تو ہے ۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ایک لمبی "ہوں کے ساتھ کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اور حقے کے دو ایک لمبے لمبے کش لئے پھر کہنے لگے ۔ "تمہارا مذہب کیا ہے؟"

نوجوان نے مذہب سے بے اعتنائی کا اظہار کیا تو ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے ۔ "بھئی جب تک صاف صاف نہ بتاؤ گے کہ تمہارا مذہب کیا ہے میں تمہاری کس طرح مدد کر سکوں گا ۔ بتاؤ ہندو ہو مسلمان ہو ، عیسائی ہو ۔ کون ہو ؟

نوجوان نے بے دلی سے جواب دیا ۔ "میں ہندو ہوں"

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا ۔ تناسخ کے مسئلے پر اعتقاد رکھتے ہو کیا؟

اس لڑکے نے مری ہوئی آواز میں کہا ۔ "جی ہاں اعتقاد تو ہے ۔"

ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے ۔ بس معاملہ صاف ہوگیا ۔ اگر تم خودکشی کرلو تو مستقبل کے متعلق تین صورتیں ممکن ہیں ۔ ایک یہ کہ آئندہ زندگی موجودہ زندگی سے بہتر ہو ۔ دوسری یہ کہ آئندہ زندگی موجودہ زندگی جیسی ہو ۔ تیسری یہ کہ آئندہ زندگی موجودہ زندگی سے بدتر ہو ۔ ظاہر ہے تین میں سے دو امکان صریحاً تمہارے خلاف اور ایک امکان تمہارے حق میں ہے ۔ اس کے ساتھ اگر زہر پھانک کر، دریا میں ڈوب کر یا گاڑی کے نیچے سر رکھ کر مرنے کی اذیت کو بھی شامل کرلیا جائے تو یہ سودا سو فی صدی مہنگا ہے ۔

پھر ہنس کر کہنے لگے ۔ میں تو ایسا خسارے کا سودا کرنے پر کبھی تیار نہیں ہو سکتا ۔

اس کے بعد کوئی پندرہ بیس منٹ تک گفتگو جاری رہی نوجوان چُپ بیٹھا تھا ۔ جب ہم اجازت لے کر اٹھے تو کوٹھی کے احاطے سے باہر آکر اس نے پوچھا ۔ آپ کون بزرگ تھے ؟

میں نے کہا ۔ "آپ ہندوستان کے مشہور شاعر ڈاکٹر اقبال ہیں"

نوجوان نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر منت پذیرانہ انداز میں کہا ۔ مجھے شانتی ہو گئی ہے ۔

پھر مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ ہم کس جگہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے غالباً عبدالرحمٰن کے مکان پر پہنچ کر نوجوان مجھ سے علیحدہ ہوگیا تھا ۔ دوسرے روز میں نے عبدالرحمن کو ڈاکٹر صاحب کی ملاقات کی روئداد سنائی ۔ لیکن چونکہ عبدالرحمن بہت زندہ دل اور ہمیشہ زندگی کے روشن پہلو پر نگاہ رکھنے والے آدمی ہیں ۔ اس لئے انہیں گویا ایک چٹکلہ ہاتھ آگیا ۔ وہ کئی روز تک نیلے گنبد والے واقعہ کی تفصیل دوستوں کی محفل میں سنا سنا کر مزے لیتے رہے ۔ وہ ہنس ہنس کر مجھ سے یہی کہے جاتے تھے کہ آپ نے پولیس کی دھمکی دے کر اس بے چارے کو جو پہلے سے ادموا ہو رہا تھا ۔ بالکل ہی مار دیا ۔

اس واقعہ کو بمشکل ایک ہفتہ گزرا ہو گا کہ ہم نے اردو کے ایک روزانہ اخبار میں خبر پڑھی کہ ڈی اے وی کالج کا ایک طالب علم راوی میں ڈوب کر مرگیا ہے ۔ عبدالرحمن فوراً کہنے لگے ۔ یقیناً یہ وہی لڑکا ہے جو ہمیں نیلے گنبد کے چوک میں ملا تھا ۔

میں بھی حالات و کوائف کو دیکھ کر ان کا ہم خیال تھا ۔ چنانچہ افسوس و حسرت کے چند فقرے کہہ کر ہم چُپ ہو گئے ۔ دو چار برس تک میرے اور عبدالرحمن کے درمیان کبھی کبھار اس واقعہ کا ذکر ہو جاتا تھا ۔ لیکن اب مدت ہوئی ہم اسے بھول چکے تھے ۔

پورے چودہ سال کے بعد اب کی میں نے اور مولانا صلاح الدین احمد نے شالامار کا میلہ دیکھنے کا ارادہ کیا ۔ لیکن ہفتے کی شام کو مجھے کچھ حرارت ہو گئی اور ارادہ فسخ کرنا پڑا ۔ میرا بخار لمبا ہوگیا اور بہ کراہت آٹھ دس روز چارپائی پر بسر کرنا

پڑے ۔ ۲ اپریل کو ہمایوں کا تازہ پرچہ آیا تو میں نے بستر پر لیٹے لیٹے ورق گردانی کی ۔ ایک مضمون نظر سے گزرا ۔ "میری زندگی کا ایک ورق" جس پر مدیر ہمایوں نے چند سطریں بطور تمہید لکھی تھیں ۔ میں نے پہلے اسی کو پڑھنا شروع کیا ۔ جب مضمون ختم ہوا تو میری حیرت افزا مسرت کا یکایک یہ عالم تھا ۔ گویا ایک لعل گم شدہ مل گیا ہے ۔ نیلے گنبد والے واقعہ اور علامہ اقبال کی ملاقات کی روئداد اس مضمون میں درج تھی اور لکھنے والے کا نام تھا ۔ "دیوندر ستیارتھی"

معلوم ہوا کہ آج سے چودہ سال پہلے میلہ چراغاں کے روز مارچ کے آخری ہفتے کی خوشگوار شام کو کارکنان قضا و قدر نے نیلے گنبد کے چوک میں جس پریشان و آشفتہ حال نوجوان کو میری راہ میں لا ڈالا تھا اور جو اس شام ڈی اے وی کالج کے ہوسٹل سے خودکشی کا ارادہ کر کے نکلا تھا اور پھر جسے علامہ اقبال کی معجز نما گفتگو نے "شانتی" بخش کر نئی زندگی عطا کی تھی ۔ یہی دیوندر ستیارتھی تھے جو آج اپنے سر کے لمبے لمبے بالوں اور ٹیگور نما ڈاڑھی کے طفیل دورِ جدید کے مہذب سادھو بنے پھرتے ہیں ۔

ایک اور خط میں مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی بھائی عاشق سے یوں ہمکلام ہیں "آپ کی تحریر میری دلی مسرت اور انبساط روحانی کا سبب ہوتی ہے ۔ میں اپنی اس کامیابی پر خوش ہوں کہ میرے شکوہ آمیز فقرے جو میں نے آپ کی نسبت دوسروں کو لکھے تھے آپ سے ایسا پیارا اور دل میں بٹھا لینے اور سینے سے لگا لینے کے قابل خط لکھ سکے ۔ آپ کے ادائے بیان کی خوبی اور آپ کی رنگین نوائی کا مرتبہ اب اسقدر بلند ہو چکا ہے کہ میں بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ

فغاں کہ نیست مرا طاقتِ ثنا خوانی
بجائے خویش فرومانده ام زحیرانی

شعر لکھنا اور اچھا شعر لکھنا آسان ۔ مقفیٰ و مسجع نثر لکھنا آسان محاورات و کنایات و تلمیحات کو خوبی کے ساتھ استعمال کرنا آسان لیکن ایسا خط لکھنا جو اسوقت میرے سامنے ہے اور جس کو میں ابھی پڑھ چکا ہوں مشکل ہے اور نہائت مشکل ہے ۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے قلم برداشتہ لکھا ہے ۔ میں لاہور کے قریباً تمام انشا پردازوں ادیبوں شاعروں اور زباں دانی کے مدعیوں کو جانتا ہوں اور ہر ایک کی نسبت اندازہ ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے اور کن کن اسباب کی بنا پر کتنی کتنی شہرت کا مالک ہے ۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے مرتبے کو کوئی نہیں پہنچ سکتا ۔ اور مجھے تعجب ہے کہ آپ کو دنیائے ادب و اقلیم زبان دانی اور انشا پردازی کا بادشاہ اب تک کیوں نہیں مانا گیا اور مانا گیا ہے تو میں اب تک کیوں مطلع نہ ہوا آپ یقین رکھیئے کہ آپ کی اس ترقی و کامرانی سے خوش ہونے والا مجھ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور شخص نہیں ہو سکتا ۔ میں اسوقت کو یاد کرتا ہوں جب کہ میں نے پہلی مرتبہ آپ کو طالب علمی کی حالت میں دیکھا اور آپ کے صحیح ادبی ذوق کا اندازہ کر کے یہ خیال کیا کہ یہ جوہر قابل حالی و آزاد کی یاد تازہ کر سکتا ہے ۔ میری روح اسوقت آستانہ الٰہی پر سجداتِ شکر بجا لا رہی ہے کہ میرا خواب نہ صرف سچا ثابت ہوا بلکہ توقع سے بڑھ کر مثمر ثمراتِ خیر ہوا ۔

آپ سے زیادہ میرے خیالات و جذبات کا واقف دوسرا نہیں ہو سکتا ۔ آپ کو معلوم ہے کہ خوشامد اور سخن سازی میری عادات میں داخل نہیں ۔ آپ کے منہ پر آپ کی تعریف کرنا مجھ کو بالطبع گراں گزر رہا ہے ۔ لیکن آپ کو آپ کی طاقت سے آگاہ کرنا اور میدان مسابقت میں سب سے آگے بڑھ سکنے کی آپ کو سچی توقع دلانا بھی میرے نزدیک نہایت ضروری کام تھا اور اسی لئے مجھ کو وہ سب کچھ آپ سے کہنا پڑا جو دوسروں کو بتانا میرے لئے زیادہ مناسب تھا ۔

میں نے آپ کے خط کے ایک ایک فقرے پر غور کیا کہ آیا اس مضمون کو جس کا یہ فقرہ حامل ہے اس سے بہتر دوسرے فقرے میں ادا کیا جا سکتا ہے یا نہیں ۔ بلا تصنع عرض کرتا ہوں کہ جس قدر زیادہ غور کیا اسی قدر زیادہ آپ کی قادرالکلامی کی عظمت میرے دل پر طاری ہوتی چلی گئی ۔ میرا دل خوشی سے لبریز ہے ۔ میری زبان پر الحمدللہ جاری ہے اور میرے بازوؤں میں ایک نئی طاقت محسوس ہو رہی ہے جو کسی قوتِ بازو بھائی کی موجودگی میں ہو سکتی ہے ۔

حضرت والد صاحب قبلہ کی خدمت میں میرا اسلام و نیاز پہنچائیے ۔ اور ممکن ہو تو یہ عریضہ ہی ان کے ملاحظہ سے گزار دیجئے ۔ وہ یقیناً اس کو پڑھ کر خوش ہوں گے کہ یہ تحسین ناشناس نہیں ہے ۔

ایک اور خط میں مولانا لکھتے ہیں ۔ اس عریضے کے ہمراہ کتاب "نظامِ سلطنت" کا رجسٹرڈ پیکٹ خدمت مبارک میں روانہ کر رہا ہوں لیکن میں آپ کی کم فرصتی کا اندازہ کر لینے کے بعد بھی آپ سے فرمائش کرتا ہوں کہ آپ اس کتاب کو ملاحظہ فرما لینے کے بعد اس پر ایک ریویو لکھکر میرے پاس بھجوا دیں کہ میں خود اس کو کسی اخبار میں شائع کرانے کا بندوبست کروں گا ۔ اگر آپ کسی رسالے یا اخبار میں شائع کرا سکیں تو اس کا نام و تاریخ مجھے لکھ بھیجیں یا وہ نمبر میرے پاس بھجوا دیں ۔

اس کتاب کے پڑھنے سے آپ کو میرے حالات و خیالات و جذبات کے متعلق اس قدر صحیح اور وسیع واقفیت حاصل ہو جائے گی کہ شاید بہت سی ملاقاتوں کے بعد بھی حاصل نہ ہوتی ۔ آپ کے مضامین جب کسی رسالے یا اخبار میں اتفاقیہ طور پر میرے سامنے آ جاتے ہیں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ میں ان کو بغیر پڑھے چھوڑ دوں ۔ حالانکہ میں نے اخباروں اور رسالوں کو پڑھنا ترک کر دیا ہے ۔ پڑھنے کی مہلت و فرصت ہی نہیں ملتی ۔

مولانا مہر نے تو انقلاب میں اس کتاب پر کئی ہفتے ہوئے ریویو لکھدیا لیکن حیرت ہے "زمیندار" نے اب تک اس پر کچھ نہیں لکھا ۔

مجھے ایک معمولی اور غیر وثوق ذریعے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ میری کتاب "نظامِ سلطنت" کا ایک مضمون جس کا عنوان "اسلامی فقہ" ہے اور کتاب کے آخری حصے میں ہے بعض دقیانوسی مولویوں کو بے حد ناگوار گزرا ہے بالخصوص صفحہ نمبر ۳۰۱ کا آخری حصہ ۔ کس قدر حیرت اور حسرت کا مقام ہے کہ اس قابلِ شرم تقلید جامد کی گرفت کا ذرا بھی ڈھیلا ہونا بڑے بڑے روشن خیال مولویوں کو گوارا نہیں ۔

یو پی کے کسی مشہور علمی و مذہبی ادارے سے اس کتاب کے خلاف سنا ہے مسلم اخبارات کے نام چٹھیاں جاری

ہوئی ہیں کہ اس پر ریویو نہ کیا جائے یہ سب کچھ ابھی تک محض افواہ ہے اور غیر مصدقہ بات ہے ۔ میں خود بھی درپئے تحقیق ہوں ۔ آپ کے سوا میں نے ابھی تک کسی دوست سے اس کے مطلق تذکرہ نہیں کیا اور اس کا چرچا کرنا خود میرے لئے مضر ہے ۔ دعاگو اور دعاؤں کا محتاج اور آپ کی محبت کو محفوظ رکھنے والا ۔ اکبر شاہ خان نجیب آبادی ۔

مولانا کی طرح سخن سازی اور خوشامد آقا جان کی عادت نہ ہوئی ۔ ان کے مزاج میں اسد اللہ خان غالب کی مطلق العنانی اور اکبر شاہ نجیب آبادی کا لکھنے کا عنصر پوشیدہ تھا ۔ ان کو مولانا ہی کی طرح کی آزاد ادبی زندگی کی چاہت ہوئی تھی ۔ جب مولانا نے کمر ٹھونکی اور بازو پر تعویز باندھا تو ہندوستان کے اس مورخ والا شکوہ کے فیض سے آقا جان کا قلم چال میر کبک اور جلوے میں طاؤس بنتا چلا گیا ۔

ایک طرف تو یہ بوستانِ خیال یہ پایہ معنی ۔ دوسری طرف یہ ویرانیِ خیال یہ حیاتِ بے معنی کہ اقبال کی شادی۔ تانے میں کب بانا تھا ۔ ٹالسٹوائے عمر بھر رویا کیا ۔ لارڈ نیلسن واٹر لو جنگ کا فاتح خانہ آبادی کا ہیرو کب بنا ؟ وہ کتنے جری لوگ تھے جو اپنے دلِ تباہ کی سوختہ سامانیوں سے اتنی دنیائیں آباد کر گئے ۔

سینے کے داغ دیکھنے کو اگر جی چاہے تو کبھی کبھی قصۂ پارینہ کو دیکھ لینے میں کیا ہرج ہے ۔

قصہ ہائے پارینہ کبھی کبھی اس طرح یاد آتے ہیں کہ کیا کہنا اور کبھی یادوں کا ہجوم اس طرح سے ہو جاتا ہے دریا جس طرح سے طغیانی پر آجائے ۔ بارہ دری میں بیٹھے جیسے رم جھم ہونے لگے پھوہار پڑنے لگے اور پھر زندگی کی پرانی چھت میں سے یادوں کی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگیں ۔

نیویارک کی بارہ دری میں بیٹھے میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے ۔ خدوخال کا چراغ جل رہا ہے جس کی روشنی میں ایک ایک کر کے تحریر کے موتی ریشم کے دھاگوں میں پرو رہا ہوں ۔ حد یہ ہے کہ گلے میں ملازمت کا طوقِ رسوائی بھی ۔ دونوں کام ہیں تو از بس مشکل ۔ مشکل اور محال مگر مقامِ حیرت ۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساتھوں ساتھ چل رہے ہیں جیسے دیرینہ رفیق ہوں ۔ پرانے ساتھی ہوں ۔ اگر شمار عہدِ وفا کا کروں تو ملازمت کرتے کو آج برس ہونے کو ہیں اور اگر تسبیحِ روز و شب کا شمار کروں تو اسٹیج فلم ریڈیو پریس رسائل و جرائد کے لئے بہت کچھ لکھو ابھی بہت لکھنے کی آرزو ہے ۔

تنم بسوخت دلم سوخت استخواں ہم سوخت
تمام سوختم و آرزوئے سوختن باقیست

(تن جل گیا ۔ دل جل گیا ۔ ہڈیاں بھی جل گئیں ، سب کچھ جل گیا مگر جلنے کی آرزو ابھی تک باقی ہے) جب حسرت موہانی اسیر فرنگ ہو کر جیل میں چکی پیستا تھا اور ساتھوں ساتھ شعر بھی کہتا تھا تو اس پر ایک دن ایسا نایاب وارد ہوا کہ ایسے موقعوں کے لئے زندہ جاوید ہو گیا ۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طُرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

پاکستان سے آتے رہنے والے کیسٹوں کا میرے پاس کتنا عمدہ انتخاب اکٹھا ہو گیا ہے کہ دل و دماغ اقبال بانو کا گانا سنتا ہوں تو منور ہو ہو جاتا ہے ۔ مجھے تازہ دم تازہ دماغ کر دیتا ہے ۔ اقبال بانو کو غزل کی گائیکی میں جو کمال حاصل ہوا وہ کسی کو نہ ہو پایا ۔ کلاسیکی موسیقی میں تو بہلاوہ ہے ہی ۔ غزل میں کوئی بہلاوہ دے کر دکھائے تو جانوں ۔ اقبال بانو کے سوا غزل میں بہلاوہ دینا کسی کے بس کا نہیں ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ غزل کی گائیکی میں الف کی ادائیگی جیسی اس کے ہاں ہے کسی کے ہاں نہیں ہے ۔ جب اس کی آواز پر کھول کر الاپ لیتی ہے اور تان اڑاتی ہے تو آسمانوں کے ستاروں کو چھو کر دلوں میں آفتاب و مہتاب طلوع کرتی چلی جاتی ہے ۔ غزل میں تو آواز کو گوندھنا پڑتا ہے کہ آواز کی گھنداوٹ غزل کی واردات کو اٹھا سکے ۔ اقبال بانو اپنی آواز کو جس طرح غزل میں گوندھتی ہے اور جس گھنداوٹ کے ساتھ وہ واردات شعر کو بیان کرتی ہے وہ دوسروں کے ہاں مجھے نہیں ملتی ۔ اس نے ایک غزل گائی ہے ۔

رنجش ہی سہی دل ہی دُکھانے کے لئے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ
پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم و راہ دنیا ہی نبھانے کے لئے آ
کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ
کچھ تو مرے دلدار محبت کا بھرم رکھ
تم بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لئے آ
اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رلانے کے لئے آ
کب تک دل خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمع بھی بجھانے کے لئے آ

اگر غزل کی گائیکی میں الف کی ادائیگی دیکھنی ہے تو "آ" میں جس طرح وہ الف کو ادا کرتی ہے وہ تعریف و ستائش سے بالاتر ہے ۔ اس مسلسل غزل میں جو انتظار کا کرب اور فریاد کی لے ظاہر و پوشیدہ ہے وہ اقبال بانو کی زمزمہ آثار آواز کے جادو سے ایک مسلسل صدائے شکست دل بنتی چلی جاتی ہے اور اس فریاد و فغاں کے میدانِ کارزار میں کھیت ہو جاتا ہوں ۔ اس کی جادو اثر آواز جب یہ شعر اٹھاتی ہے۔

اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رُلانے کے لئے آ

تو لفظ راحتِ جاں پر میرا سر جھک جاتا ہے اور میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں کہ ان آنکھوں سے میں نے کیا کیا دیکھا ۔ میرے بھائی کا وثیقۂ حیات دو لفظوں پر منضبط تھا ۔ اک لذتِ پیدائی اک جذبۂ یکتائی ۔

تُو شاخ سے کیوں پُھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک لذتِ پیدائی اک جذبۂ یکتائی

یکتائی کی لذت اور خود افروزی کے شوق پر میرا بھائی اس طرح ٹوٹ کر گرا کہ امتیاز کے چہرہ زیبا اور پرتوِ حسن کی طرف پلٹ کر نہ دیکھا ۔

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لئے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ — توبہ کیجئے ناممکن
پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم و راہ دنیا ہی نبھانے کے لئے آ — ناممکن
کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ — نہ تب نہ اب
کچھ تو مرے دلدار محبت کا بھرم رکھ
تم بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لئے آ — تمہیں؟
اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رلانے کے لئے آ — ہرگز نہیں
کب تک دل خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمع بھی بجھانے کے لئے آ — نہ اب نہ تب

کوئی چق اٹھائے کوئی آئے ۔ خاموشی کو کان لگا کر امتیاز سنتی رہی ۔ محبت کے سونے میں کم فہمی کی ملاوٹ ملتی چلی گئی ۔ کسی نے آکر چق نہ اٹھائی ۔ کوئی نہ آیا ۔ کئی برس گزر گئے ۔ ناچاقی گہری ہوتی چلی گئی ۔ قصہ رونقِ بازار بنا ۔ آقا جان نے کسی کی بات نہ مانی ۔ ان کے دل میں خدا جانے کیا تھا ۔ انہوں نے کیا سوچا تھا ۔ تہہ دل کیا چھپا تھا ۔ اس موضوع پر بات ہی نہ کرتے ۔ ایسا ضد والا خود پسند شخص کیا دیکھا ہوگا ۔ شخصیت کی تاثر انگیزی مزاج کی خود داری تحریر کی قادرالکلامی زبان کی جادو بیانی اپنی جگہ برحق اور محقق ۔ ایک پلڑے میں یہ بلندی ، ناچاقی کی پستی دوسرے میں جو چمکتی شہرت کی روشنی میں بدنما دھبہ بنی ۔ مگر وہ شبِ تار ہوتے ہوئے بھی اس کی خبر میں رہتے تھے ۔ امرتسر کے وکیل عبدالرحیم نے اس کی والدہ سے کہا عاشق اگر طلاق دیدے تو و[illegible]ی کر لے گا ۔ ایک دن عبدالرحیم کی ایسی کی تیسی کرتے ہوئے بولے "جہاں میں پیشاب کروں وہاں دس ایسے و[illegible] پیدا ہوں"

بدگمانیوں کا ڈھیر کیوں لگتا ہے ۔ برہمی کا پہاڑ کس طرح بنتا ہے ۔ تلخیاں کس بات پر ہوتی ہیں ۔ توڑیں

پھوڑیں کھودیں اندر سے کیا نکلتا ہے ۔ کچھ بھی نہیں ۔

ذرا سی بات پہ ہر رسم توڑ آیا تھا
دلِ تباہ نے بھی کیا مزاج پایا تھا
معاف کر نہ سکی میری زندگی مجھ کو
وہ ایک لمحہ کہ میں تجھ سے تنگ آیا تھا

نشانِ زمزمہ کیا ہے ؟ بجز ہم آہنگی ۔ مہتاب و آفتاب کی ہم آہنگی ۔ روز و شب کی ہم آہنگی ، زمزمہ حیات کی ہم آہنگی ۔ چکی کے پاٹ رگڑ سے ہموار ہو جائیں تو ٹھیک ورنہ آٹے میں پتھر ۔ جو دانتوں تلے آوے ہی آوے ۔ سمندر کے پانیوں پر اگر چاند حکومت کر سکتا ہے تو انسان کی تقدیر کے ساتھ ستارے بھی کھیل سکتے ہیں ۔ لوح محفوظ کو کون دھکیلتا ہے ؟

ایک طرف بیوی سے آنکھ بند دوسری طرف ادب درد کا مسیحا بنتا ہے ۔ دیدۂ ملک و قلم فروزاں ۔ کارگہِ ادب میں نام باجنے لگا ۔ معلوم ہوا ان کے ناخنوں میں ہُنر چھپا تھا ۔ ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب ۔ انہی دنوں ان کے قلم سے دو شاہکار نکلے ۔ "س" کو دیکھکر اس کے بعد دوسرا شاہکار "ز" کو دیکھکر ۔ ایک قصیدہ حسن بہار ۔ دوسرا گلدستۂ تہذیب نیاز ۔ اور میں

A bad boy right from the word go

سکول میں پڑھنے والا بچہ ۔ سب طنز و کنایہ سب رمز و اشارہ جاننے والا جان گیا س کون اور ز کون ۔ علامہ اقبال جیسا نطقِ بے مثال اور شاعر لاجواب ایک نظم "۔۔۔ کی گود میں بلی دیکھ کر" لکھ سکتا تھا تو ادب کی غلام گردشوں کا ایک گم کردہ راہ مسافر "س" کو دیکھ کر اور "ز" کو دیکھ کر فریضۂ ادب کیوں نہیں سرانجام دے سکتا ۔ فہم و ادراک کی چیزیں تلاش و جستجو سے باہر ہوتی ہیں ۔ وجدان کہاں سے آتا ہے ۔ کیا دل کی کوئی طاقت خیالات کو وحی بھیجتی ہے ۔ وہ جو دفعتاً لطیف خیال دل میں آتا ہے کیوں آتا ہے ۔ کہاں سے آتا ہے ۔ افسوس حُسن کی تحریک سے تخلیق پائے ہوئے یہ شہپارے مجھے نہیں مل پائے ۔ ایسے مضمون صرف محبت کے مسافر کے پاؤں کی خاک سے جنم لیتے ہیں ۔ اگر مل پاتے آج میرے مضمون میں حسن نگارش کے پھول کھل جاتے ۔ حیرت ہوتی ہے تعجب اور بڑھ جاتا ہے کہ آقاجان کا دل بیوی کے سنگ تو جا پتھر بنا ۔ ادب کے سنگ ایسا آئینہ جا بنا کہ عکس دینے لگا ۔ فکر و کردار کی شوخی میں ایسی شگفتگی اور برجستگی تھی جو ان کے دشت دل و جاں کی زینت بن گئی ۔ ہنستے قہقہے لگاتے مگر جب ان کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جاتی تو خاموش موسموں کی چپ لگ جاتی اور سارے گھر میں بگڑا بگڑا منہ بنائے پھرتے ۔ یہ خانہ نژاد خانہ زاد منی چیوٹر وقت کے ساتھ ساتھ قد آدم نقش بنتا چلا گیا ۔ جی چاہا تو دنیا کے ساتھ بڑھا میل بڑھا ملاپ بڑھے خوش ۔ جی نہ چاہا تو دنیا سے ناخوش ۔

آگے اس متکبر کے ہم خدا خدا کیا کرتے تھے
کب موجود خدا کو وہ مغرور و خود آرا جانے تھا
(میر)

(۵)

بی اے کے بعد جب ڈھنگ کی ملازمت بھائی خادم کو نہ مل پائی تو اباجی نے وردی پہن کر سینے پر پینتیس برس کی ملازمت کے حسنِ کارکردگی کے تمغے لگائے ۔ ملازمت کی اعلیٰ کارکردگی کے سرٹیفکیٹوں کا پورٹ فولیو پکڑا ۔ انگریز کے سامنے جا کھڑے ہوئے ۔ تھانیدار بھرتی کرا کے لوٹے ۔ بھائی خادم چھ بھائیوں میں سب سے زیادہ ایسے کشیدہ قامت کہ چڑھدا گھوڑی تے لگدا تھانیدار نی مائے ۔

چھ فٹ سے اوپر قد ورزشی بدن پتلی کمر ہاکی کے سینٹر فارورڈ کھلاڑی ۔ ٹریننگ کے لئے پھلور پہنچے تو ڈرل کرانے والا ڈریلیا جس کا سخت مزاج ہونا ضروری ہوتا تھا اپنی لمبی گھمبیر اونچی آواز سے پکارتا "او میم کی کمر والے ۔ قدم ملا کر چل" شام کو جب ہاکی کھیلتے کسی کا قدم ان کے ساتھ نہ مل سکتا ۔ گیند کو گولی کی طرح بھگا لے جاتے ۔ ابھی یہاں تھے ابھی وہاں ۔

بھائی خادم کی ملازمت کے بعد "اکبر منزل" کا نام عامتہ الناس کی زبان میں تھانیداروں کی حویلی پڑ گیا ۔ میں سوچنے لگا کہ اگر اباجی نے مجھے بھی تھانیدار کرا دیا تو کیا ہو گا ۔ قید ہو جاؤں یا نکال، یا جاؤں گا ۔

ایک روز ممتاز مفتی نے (ابھی انہوں نے افسانے لکھنے شروع نہیں کئے تھے) بھائی خادم سے پوچھا ۔ "سُنا ہے تم ساری پنجاب پولیس میں اس لئے مشہور ہو کہ ایف آئی آر ایک صفحے پر لکھتے ہو"

بھائی خادم بولے "ٹھیک ہے ۔ دوسرے افسر تین تین چار چار صفحوں پر لکھتے ہیں ۔ اغوا ، ڈکیتی ، قتل کچھ بھی ہو میں عرق نکال کر ایک صفحے پر ڈال دیتا ہوں" ۔

"تم بھائی بھی کمال ہو ۔ اپنی ٹور اس طرح بنا لیتے ہو کہ پولیس میں گئے تو وہاں بھی ایک مقام ایک مثال" ۔ مفتی نے کہا ۔

جب بھائی خادم کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں تو گھر کی رونق اور ہمہمی دیکھ کر آقاجان کے ماتھے پر بل پڑ پڑ جاتے ۔ پوچھتے امی جی ۔ شادی میں اتنی جلدی کیا تھی "

امی جی نے کہا " دو سال سے ملازم ہے کھاتا کماتا ہے ۔ اب نہیں ہو گی تو کب ہو گی" ۔

بگڑا منہ بنا کر اٹھ بیٹھے ۔ کون یہ پوچھے اگر تمہاری شادی ناکام ہوئی تو کیا دنیا والے شادیاں کرنی چھوڑ دیں ۔

گھر میں سوائے ان کے سب نے عمدہ کپڑے پہنے ۔ بھائی ذوالقرنین بولے "سوٹ پہنو عاشق" "ٹھیک ہے بھائی جان"

امی جی نے کہا "آقا کپڑے نہیں بدلنے"

"ان میں کیا خرابی ہے"

اباجی سمجھ گئے عاشق احتجاج کر رہا ہے۔ عام عقیدے کے خلاف مارٹن لوتھر ڈٹ کر کھڑا ہے ۔ امرتسر برات کے ساتھ انہی میلے کپڑوں میں گئے ۔ ولیمے کی دعوت پر بھی بگڑا بگڑا منہ بنا رہا ۔

ان کے دل بے نشان کے بہم تقاضے سمجھ میں نہ آتے تھے ۔ سخن رس بھائی ذوالقرنین خان اور سخن رس باپ سب کج ادائیاں سہہ گئے کہ ان کے ہاتھوں رشتہ ازدواج غلط ہوا جس کا بھگتان ہو رہا تھا ۔ جس کا کفارہ ادا ہوتا رہا ۔

لاہور والا مکان چھوڑا جا چکا تھا ۔ قوت نمو کی آبیاری ہو چکی ۔ شوقِ خود افروزی ہو لیا ۔ ادب کا روح پرور اور عالمگیر وسیلۂ حیات ہاتھ آن لگا ۔ علم و ادب کی منور ہستیوں سے دوستیاں بڑھیں ۔ حیات آفرین اقدار کو پا لیا گیا ۔ جذباتی صداقتیں دھرم کانٹے پر تُل گئیں ۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب

اب ۔ اب کا جواب نہ آسمان دیتا نہ زمین ۔ اجالا کسی سمت سے نہ پھوٹتا ۔ کوئی سایہ ٹھنڈا نہ لگتا ۔ ہر سایہ گرم اور تپتا ہوا ۔ گرداب دار منظروں کا چادر اان کے کندھے پر پڑا تھا جو فروختنی تھا نہ سوختنی ۔

میکدوں کو جو کر گیا ویراں — یہ خرابی اُسی حسین کی تھی

(صحاب قزلباش)

جو طبیعت سے خود آرا اور انا پرست ہوں ان کے فکر کو سامان وجود ملے تو ان کے ہاں پھول کھلتے ہیں کچھ ان کی اپنی سوچیں کچھ اپنا درد کچھ اپنے سے آتش فشاں کی آگ ۔ شاعر اپنے شعروں میں اپنے کو دنیا بھر سے اونچا اعلیٰ و ارفع کہکر اپنے جذبات گرفتہ کا مداوا کرتا ہے ۔ اندر کے من باہر کے من کو اچھی ٹکور ملتی ہے ۔ تمام غصہ گلہ جاتا رہتا ہے ۔ طبیعت سکون پاتی ہے ۔ جذبات مرفع ہو جاتے ہیں ۔ یہ رعایت جو شاعر کے حصے میں آئی ہائے نثر نگار اس سے بُری طرح محروم رہا ۔

اقبال کا شعر ہے۔

از جہاں می روئد از کشتِ خیال ما چوں بود
یک جہان و عام ہم از خونِ تمنا ساختی

(جہان میں وہ چیز اُگتی ہے جو میرے خیال میں ہو ۔ میرے اختیارات کی وسعت اتنی زیادہ ہے ۔ میرے اختیار میں بھی تو کچھ تھا مگر افسوس تو نے اس عالم کو میری تمنا کا خون کر کے بنایا ہے) بقول علامہ اقبال جتنی تعلّی عرفی اپنے اس شعر میں برت گیا اس کی نظیر کسی شاعر کے ہاں نہیں ملتی ۔

سایۂ من ہمچوں من در ملک ہستی امتت
سایۂ تُو در عدم اے پیغمبر یکتائے من

غالب بھی حد ہے:۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا
غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللہ ام ہم اسد اللّٰہیم

مجھ جیسے بد آموز نے ایک روز اس پر تضمین کر ڈالی

آغا بابر نام آورم نام و نشانم مپرس
ما آغا بابرم وما آغا بابریم

خدا معلوم یہ فلائینگ کارپٹ تھا یا تخت سلیمانی کا ۔ سارا دن ہواؤں کے دوش پر اڑتا رہا ۔ ما آغا بابریم کی گونج چاروں طرف سنائی دیتی رہی ۔

آدمی کے اندر مکان ہوتے ہیں تو عمارتیں بھی ہوتی ہیں ۔ صنمخانے بھی ہوتے ہیں ۔ اباجی اور ذوالقرنین خان دونوں سخن رس اور دونوں دور رس ۔ ریٹائرڈ پولیس افسروں کی ایسوسی ایشن کے اباجی سیکرٹری تھے ۔ اس ناطے سے آئی جی پولیس یعنی انگریز انسپکٹر جنرل پولیس کے ساتھ خط وکتابت رہتی ۔ پنجاب پولیس کا کوئی میگزین نہ تھا ۔ اردو میں پولیس ریویو نکالنے کی اجازت مل گئی ۔ دفتر لاہور میں ہوگا ۔ یہ بات آقاجان کو اچھی لگی ۔ جرائم اور مقدمات سے متعلق مضامین حاصل کرنا اباجی نے اپنے ذمے لیا ۔ خود مسلسل مضامین لکھنے کا وعدہ کیا ۔ افسروں کو فرمائشی مراسلے لکھ دیئے گئے ۔

بھائی عبداللہ کی گورا پلٹن نارتھمبرلینڈ فزیلیئر داناپور سے تبدیل ہو کر لاہور چھاؤنی آگئی ۔ آقاجان ان کے پاس آ گئے اور کاغذ کی خریداری، پریس کا انتخاب دفتر ، دفتری کی تلاش کاتب کتابت سو کاموں میں جُت گئے ۔ صبح کو گھر سے نکلتے شام لوٹتے ۔ اپنی مدد کے لئے فتح دین کلرک ملازم رکھ لیا اور ایسے مکان کی تلاش شروع ہوئی جس میں رہائش اور دفتر دونوں ممکن ہو سکیں ۔

میری یادوں کی سیڑھیوں پر چراغ روشن ہیں چند پر دیئے جھلملا رہے ہیں ۔ ہاتھ میں ان کے کام جو آیا ۔ کام میں دھیان پڑا تو وہ موجِ ہوا کے ساتھ چلنے لگے ۔ اس محرم علم حرف کو پیش گاہ مکان کی ضرورت تھی (فارسی زبان میں مکان کی ڈیوڑھی کو پیش گاہ مکان کہتے ہیں ۔ پیش گاہ مکان کا لفظ میر تقی میر نے کئی جگہ استعمال کیا ہے) ۔

یہ اباجی کی دور رسی اور بھائی جان کی سخن رسی تھی جن کا تیر عین گلِ زری پر لگا دل کے غزال کو تو سارا رم وسعت صحرا سے ملتا ہے ۔ ایسا ہی تو ہوا ۔

ایک نئی توانائی نے غزال کے اندر کروٹ لی ۔ دلِ بے زر و دینار کو دولت ملی یا بہار لالہ فروش کا آفتاب طلوع ہوا ۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "سوزِ ناتمام" شائع ہو کر انہی دنوں منصۂ شہود پر آیا ۔ رسائل و جرائد میں کتاب کی بڑی

تعریف ہوئی ۔ بڑے اچھے ریویو چھپے ۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے لکھا ۔ اگر یہ "سوزِ ناتمام" ہے تو سوزِ تمام کیا ہو گا ۔

اور کمال کی بات ان دنوں یہ ہوئی کہ حکیم سید علی احمد نیر واسطی سے راہ و رسم بڑھی حکیم صاحب اور بھائی عبداللہ کی دوستی لکھنؤ میں ہوئی تھی ۔ بھائی عبداللہ کے لاہور آنے سے کچھ عرصے پہلے حکیم صاحب نقل مکانی کر کے پنجاب آ گئے ۔ لاہور کو مسکن بنایا ۔ اندرون شہر چونا منڈی چوک میں کرایہ کے مکان میں تیسری منزل پر رہائش رکھی اور نیچے کی دوسری منزل پر مطب جاری کیا ۔ سارا لاہور ۔ لاہور کا سارا مضافات حکیم صاحب کے علم طب پر عاشق ہو گیا ۔ مریضوں کا وہ ہجوم رہتا کہ حکیم صاحب تھک ٹوٹ کر دو ڈھائی بجے مطب سے اٹھتے ۔ لاہور والوں نے ایسا نباض نہ دیکھا ہو گا ۔ بھائی عاشق سے ملاقات کیا ہوئی دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کر لی ۔ حکیم صاحب ملاقات سے پہلے ان کی کتاب "سوزِ ناتمام" دیکھ چکے تھے ۔

بھائی عبداللہ نے تعارف جو کرایا تو حکیم صاحب اٹھ کر لپٹ گئے ۔ پھر اللہ دے اور بندہ لے ۔ عشق ہزار رنگوں کا اوتار حکیم صاحب شاعر طبیعت دار اہل دل اور آقا جان دلدادۂ شعر و ادب فن گفتگو کے مائل و قائل ۔ یہ زبان کے آفتاب وہ بیان کے مہتاب ۔ دونوں نے ایک دوسرے کے اندر والے کو پہچان لیا ۔ ان کی گفتگو میں ایسی ایسی راہِ حرف نکلتی کہ حکیم صاحب کو لگتا جیسے میر تقی میر سے ہمکلام ہیں ۔ وہی سا دماغ وہی سی انا وہی سا تکبر وہی سا پایۂ سخن ۔ دونوں ایک دوسرے کے ذوقِ نوا سنجی کے رہین و قتیل ہو گئے ۔ اس دوستی نے کمال یہ کیا کہ حکیم نیر واسطی ہمارے خاندان کے سب افراد کے نبض شناس ہو گئے ۔ وہ نسخہ پر لکھتے دس دن کی دوا حاضر خدمت کی جائے ۔ گویا ان الفاظ میں اپنے کارندوں کو اشارہ کیا جاتا کہ قیمت وصول نہیں کی جائے گی ۔

ان کے ہاتھوں شفایابی کا پہلا کرشمہ یہ ہوا کہ آپا امیر کی پرانی کھانسی کو آرام آیا ۔ سفوفِ الصدور کوئی ایسی دوا تھی جس نے سینے کی بیماریوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ۔

میں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا ۔ پولیس ریویو کا دفتر مکان کے نچلے کمرے میں تھا ۔ آقا جان کی رہائش مکان کی دوسری منزل پر تھی ۔ مکان برانڈرتھ روڈ اور ریلوے روڈ کے درمیان کی ایک کشادہ گلی مہر چند سٹریٹ میں واقع تھا ۔ مالک مکان ہندو تھا جو اس گلی میں رہتا ۔ دو مکانوں کے سوا سب مکانوں میں ہندو رہتے تھے ۔ گزرتے تو ایک دوسرے کو سلام پرنام کرتے ۔ چھوٹے کمرے کی تین بڑی کھڑکیاں گلی میں کھلتیں جہاں سے ہم گلی کی رونق دیکھتے ۔ بزاز کندھے پر کپڑے کی گٹھڑی لٹکائے ہاتھ میں لوہے کا گز پکڑے کپڑا بیچنے کو آتا ۔ آم بیچنے والا عجیب صدا لگاتا ۔

"آہو جی انبہ اے ۔ سہارنی اے"

خوانچے والا بھی آتا ۔ ڈیڑھ پسلی کے پوربئے کی یہ آواز بھی سنائی دیتی ۔

"سِل بٹہ رہالو" ۔ تانگہ چھکڑا اکا دکا سبھی گزرتے ۔ بڑی رواں دواں گلی تھی ۔

نچلے کمرے میں منشی فتح دین کی میز اور کاتب کا تخت پوش تھا ۔ الماری کے پیچھے اوجھل میں فتح دین کی کھاٹ ۔ کبھی کبھی وہ رات وہیں سو جاتا ۔ کمرے کے ساتھ میں سیڑھیوں کے نیچے ایک چھوٹی سے جُر میں پانی کا نل تھا ۔ یہ سیڑھیاں ادھر ایک مختصر سی پیش گاہ میں کھلتیں ۔ داخل ہونے کو ایک چھوٹا کمرہ تھا جو میرا کمرہ ہوتا تھا ۔ اس کمرے کے در دو فراخ دالانوں میں کھلتے ۔ ایک دالان کی تو باہر کے رخ کھلے کی طرف کو تین کھڑکیاں تھیں جن پر بانس کی پتلی خوبصورت چقیں پڑی رہتیں ۔ یہ کمرہ ڈرائینگ روم بھی تھا اور آقاجان کا دفتر بھی ہوتا ۔ ان کی چار درازوں والی میز تھی جس پر وہ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ۔ فرش پر دری اور کرسیاں ۔ ایک کونے میں چاندنی پر دو تین گاؤ تکیے پڑے رہتے ۔ اسی کمرے میں اختر شیرانی سے گپ شپ ہوتی ۔ اسی کمرے میں حکیم نیرّ واسطی اور اسدالہند سے لمبی لمبی ملاقاتیں ہوتیں اور لطفِ کلام کا مزہ لیا جاتا ۔

اسدالہند ڈیرہ غازی خان کی طرف کے رہنے والے تھے ۔ پاؤں میں چکر رہا ۔ سارا ہندوستان گھومے پھرے ۔ بہت دنوں علی گڑھ میں بھی رہے ۔ انہوں نے حکیم احمد شجاع کو ان کے عنفوانِ شباب میں دیکھا تھا جب وہ علی گڑھ میں پڑھتے تھے ۔ کہتے کہ حکیم احمد شجاع بے حد حسین و جمیل ہوتے تھے ۔ سر سید احمد کے صاحبزادے راس مسعود ان کے عاشق تھے اور مولانا اسد الہند بھی حکیم احمد شجاع کے عشق کا دم بھرتے رہے تھے ۔ کچھ دنوں دیوبند میں تعلیم حاصل کی پھر ایک برہمن زادے کا حُسن جی کو ایسا لگا کہ بقول ان کے :

بر شمع روئے یار چو پروانہ سوختیم   مستانہ آمدیم و خموشانہ سوختیم
وقتے کہ رفت آں صنم اندر حریم دل   بتخانہ سوختیم و حرمخانہ سوختیم

بڑے مزے کے ساتھ مولانا اسدالہند یہ شعر بھی پڑھتے ۔

اللہ اللہ اس بت کافر کا جوبن دیکھکر ــ مولوی سید سعید احمد برہمن ہوگیا ۔

مولانا اپنا نام بتاتے ۔ سید عبدالجبار اسدالہند و اسدالدہر ۔ کہتے اب ان کا منصب بڑھ گیا ہے ۔ اب وہ اسدالہند نہیں رہے ۔ اسدالدہر بھی ہیں ۔ نہایت مصفا اردو بولتے ۔ یہ سراغ نہ مل پاتا کہ وہ ڈیرہ غازیخان یا میانوالی کے رہنے والے ہیں ۔ آقاجان حکیم نیر واسطی اور اسدالہند تینوں کو شعر کا صحیح ذوق تھا ۔ چوتھا ان میں اختر شیرانی تھا ۔ اس کو میں قافلۂ خونی جگراں کہوں یا قافلۂ دیدہ وراں ۔

حکیم نیر واسطی کی غزلوں کا مجموعہ "میکدہ" کے نام سے چھپ کر آیا ۔ چند شعر یادداشت میں محفوظ ہیں ۔

وہ نقاب رخ زیبا جو اٹھا دیتے ہیں
دل کو آئینۂ انوار بنا دیتے ہیں
صبحدم صحنِ گلستاں میں صبا کے جھونکے
آتش درد محبت کو ہوا دیتے ہیں

روح کو سوز دیا داغ جگر کو بخشا
حضرتِ عشق عجب داد سخا دیتے ہیں
رات کو سینۂ دریا پہ چمک کر تارے
آگ بہتے ہوئے پانی میں لگا دیتے ہیں
نیرؔ زار کی قسمت بھی جگاتے جاتے
آپ سوئے ہوئے فتنے تو جگا دیتے ہیں

ایک شعر اور سنئے:

تجھ کو خود ڈھونڈے گی اے نیرؔ صراطِ مستقیم
دل گرفتارِ خمِ زلفِ دو تا ہونے تو دے

لکھنؤ سے انتقال مکانی کر کے حکیم صاحب لاہور جو آئے تو دور و نزدیک کے رشتے دار بھی ساتھ آئے مطب ایسا چلا کہ چند اوروں کو بھی بلوا لیا ۔ کوئی دوائیں کوٹ رہا ہے کوئی چھان رہا ہے ۔ کوئی نگرانی کر رہا ہے ۔ کوئی نسخہ باندھ رہا ہے کوئی قیمت وصول کرنے پر بیٹھا ہے ۔ کام روز بروز بڑھنے لگا ۔ ان کی شہرت سُن کر شیخوپورہ گوجرانوالہ پشاور ملتان سرگودھا خوشاب تک سے مریض آنے لگے ۔ حکیم صاحب خوشی میں آکر ان کے ساتھ بڑی بے ڈھب پنجابی بولتے جو دیہات سے آنے والوں کو اچھی لگتی ۔ وہ نبض دیکھ کر بیماری بوجھ لیتے ۔ مریض کچھ نہ کہتا مگر وہ جان جاتے کہ پیشاب کی بیماری ہے جس کا نام س سے شروع ہوتا ہے ۔

انہوں نے مطب تو بدستور اسی مکان میں رکھا مگر اوپر والی منزل میں جہاں رہائش تھی وہاں شیرا شربت بننے لگا ۔ معجون سفوف اور گولیاں تیار ہونے لگیں ۔ رہائش کے لئے قریب ہی دوسرا مکان کرایہ پر لے لیا جس کے نیچے پھاٹک کے ساتھ ڈیوڑھی تھی ۔ اوپر کی منزل پر رہائش کے لئے کمرے پہلے مکان کے مقابلے میں کچھ زیادہ تھے حکیم صاحب وہاں منتقل ہو گئے ۔ آقا جان نے بھائی ذوالقرنین سے کہا حکیم صاحب ہمارے گھر کے کسی فرد سے دوا کی قیمت وصول نہیں کرتے ۔ بڑا اچھا ہو ایک بھینس ان کے ہاں بھجوا دی جائے ۔ وہ لاہور کے نواحی تھانے برکی میں تھانیدار تھے ۔ کیا مشکل تھا ۔ کہنے کی دیر تھی کہ دودھ دینے والی بھینس حکیم صاحب کی ڈیوڑھی میں بندھ گئی ۔ ایک نوکر بھی جس کی دیکھ بھال کے لئے رکھ لیا گیا ۔ حکیم صاحب کے گھر میں بھینس آ جانا ۔ دودھ دوہا جانا جمانا بلویا جانا بڑے دنوں اکسائٹ منٹ رہی ۔

میرا چھوٹا بھائی الطاف حسین بھی بٹالہ سے میٹرک پاس کر کے لاہور آگیا ۔ اسے اسلامیہ کالج میں داخلہ ملا ۔ اس کا کالج ہمارے مکان کے پچھواڑے میں تھا ۔ ہیلی ہوسٹل کے صدر دروازے اور ہمارے مکان کی دیوار ایک تھی ۔ اس لئے کالج پہنچنے میں الطاف کو دس منٹ لگتے ۔ میرا ہم جماعت دوست محمد صادق خالصہ کالج امرتسر میں پڑھتا تھا ۔

جب لاہور آتا ۔ ہمارے ہاں ٹھہرتا ۔ میرے اور الطاف کے دوست مشترک بے تکلفی بھی مشترک ۔ ہم سب نیچے والے غسلخانے میں آکر نہاتے تھے ۔ اوپر والے نل میں پانی نہ ہونے کے برابر ہوتا ۔ ہمارا ایک دوست مقصود احمد بھی رات کو ہمارے ہاں ہی سویا تھا ۔ وہ غسلخانے میں نہا رہا تھا ۔ میں الطاف اور صادق دروازے کے سامنے گلی میں کھڑے باتیں کر رہے تھے ، غسل خانے کے خالی ہونے کا انتظار تھا ۔ چق کے پیچھے ایک عورت کھڑی صادق کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ صادق نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا ۔ وہ مسکرائی ۔ صادق نے گردن ہلا کر پوچھا آجاؤں ۔ عورت نے سر ہلا کر کہا آجاؤ ۔ صادق خوشی سے ٹاپتا بھاگتا چق اُٹھا اس عورت کی بیٹھک میں غائب ہو گیا ۔ یہ سب کچھ ایک ثانیہ میں ہوا ۔ کوئی دو ڈھائی منٹ بعد چق اٹھا کر کھلکھلاتا ہنستا بھاگتا ہمارے پاس آن پہنچا ۔

ہم نے پوچھا "کیا ہوا" ۔

کہنے لگی تم بڑے اچھے ہو ۔ بیٹھو ۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا ۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھ کر بولی ۔ چائے پیئو گے ۔ میں نے کہا پلادو ۔ کچھ برتنوں کو ادھر ادھر کرنے لگی پھر اُٹھ کھڑی ہوئی ٹنگے بیلنے کی طرف ہاتھ بڑھا کر بیلنا اٹھایا مجھے مارنے کو آئی اور بولی "میں پلاتی ہوں چائے" میں نے لگائی چھلانگ کود کر چق سے باہر ۔

بات ہنسی میں آئی گئی ہو گئی ۔ آقاجان بٹالے گئے امی جی سے کہنے لگے ۔ الطاف جتنا باہر سے نمازی اور پرہیزگار بنتا ہے اتنا ہے نہیں ۔ ہمارے محلے کے ایک ہندو پڑوسی نے شکایت کی ہے کہ آپ کا یہ جو چھوٹا بھائی ہے وہ ایک دن چق اٹھا کر ہماری ساتھ والی عورت کی بیٹھک میں جا پہنچا ۔۔۔

عید پر میں اور الطاف بٹالے جو گئے تو امی جی نے الطاف کو الگ سے آقاجان کی زبانی سنی ہوئی ساری شکائت سنا ڈالی ۔ الطاف روتا پیٹتا میرے پاس آیا ۔ کرے کوئی بھرے کوئی ۔ اس واقعہ کے کوئی پینتیس برس بعد صادق کی اس شرارت کا ذکر میں نے آقاجان سے کیا کہ کس طرح اس ہندو عورت کو شکلوں میں دھوکا ہوا اور ساری شرارت پر الطاف کا نام لگا ۔ امی جی سے خواہ مخواہ ڈانٹ پٹی ۔ آقاجان مسکرا کر سبھاؤ سے بولے "مجھے قطعاً یاد نہیں"

مقصود کی میرے سسرال سے رشتہ داری تھی ۔ میری منگنی ہو چکی تھی ۔ میں اور وہ بٹالے سے لاہور جا رہے تھے ۔ میری سالی فرخندہ کو بھی لاہور جانا تھا ۔ میری خوشدامن نے کہا ۔ تم اور مقصود کل لاہور جا رہے ہو ۔ فرخندہ کو بھی ساتھ لے جاؤ ۔ مقصود تم فرخندہ کو چچا اسلم کی طرف چھوڑ آنا ۔

مقصود بولا ٹھیک ہے آپا جی ۔

لاہور اسٹیشن آیا ۔ ہم نے اس کو ساتھ لیا ۔ پلیٹ فارم سے باہر نکل کر تانگوں کے اڈے کی طرف کو آرہے تھے کہ کہیں سے آقاجان نے دیکھ لیا ۔ ایک لڑکی سیاہ ترکی برقعہ پہنا ہوا ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی ہے ۔ کچھ نہیں جتایا مگر امی جان کو جا بتایا ۔ اب الطاف کے بعد میری باری ہوئی ۔ بٹالے جو جانا ہوا تو امی جی نے جواب طلبی کی ۔ "میں نے کہا

امی جی وہ تو فرخندہ تھی۔ آقا جان کو غلط فہمی ہوئی۔"

میں نے الطاف والا واقعہ کوئی پینتیس برس بعد ان کو بتایا مگر اپنانہ جتایا ۔ آرام سے کہہ دیتے مجھے یاد نہیں ۔ ان کو باریک سے باریک بات یاد رہتی تھی ۔

پولیس ریویو خوب چلا ۔ بھائی ذوالقرنین اور بھائی خادم کے تعلقات کی بنا پر نئے نئے خریدار بنتے چلے گئے ۔ پولیس ریویو کے دفتر میں کام کرنے والا منشی فتح دین "ادیب" کا امتحان پاس کر کے "ادیب عالم" کی تیاری کے لئے شام کی کلاسز میں جانے لگا ۔ اختر شیرانی نے رسالہ "رومان" نکالا ۔ آقا جان ایڈیٹر بنے ۔ بٹالہ سے امتیاز کے والدین لاہور آ گئے ۔ گمان غالب ہے کہ ان پر عبدالرحمن مغل جاسوسی کرتا تھا ۔

لاہور کی رونق دسمبر کے مہینے میں اپنے شباب پر ہوتی تھی ۔ سکول کالج ایک ہفتے کے لئے کرسمس کی تعطیلات پر بند ہو جاتے ۔ انگریزی سینماؤں میں اچھی اچھی فلمیں دکھائی جاتیں ۔ پٹیالہ گراؤنڈ میکلوڈ روڈ پر آل انڈیا نمائش لگتی جہاں سارے ہندوستان سے آکر سٹالیں لگتیں ۔ روز نو بجے رات کو ایک اینگلو انڈین کپڑوں کو آگ لگا کر بلندی سے نیچے پانی میں چھلانگ لگاتا جس کو دیکھنے کے لئے لوگوں کا ٹھٹھ لگا رہتا ۔

بھائی ذوالقرنین ایک آدھ روز کے لئے تھانہ برکی سے لاہور آتے ۔ برکی کا تھانہ لاہور سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ ماجھے کا یہ علاقہ ڈاکے اور قتل کے جرائم کے لئے پنجاب کا بدنام علاقہ تھا۔ جس پر نگاہ رکھنے کو باتدبیر سمجھدار شہرت والا تھانیدار مقرر کیا جاتا تھا ۔ ڈکیتی اور قتل کی واردات کے مجرم اکثر ماجھے کے سکھ ہوتے جن سے جرم بکوانا سخت مشکل ہوتا تھا ۔ کیونکہ اگر تھانیدار ملزم کو گالی دیوے وہی گالی ملزم اسکو لوٹا دیوے ۔ سپاہی پیٹے مارے چھترال کرے گالیاں بکے تو سکھ ملزم وہی گالیاں اسے سنائے۔ گالی بھائی ذوالقرنین کی زبان پر کبھی نہ آئی۔ چور ڈاکو قاتل پر غصہ کبھی بہت آیا تو کہا دیوس کا بچہ ۔ یہ بھی پولیس میں کوئی گالی ہوئی ۔ جرم نکلوانے کو وہ کیا تدبیر برتتے ہونگے اللہ جانے یا اس کے فرشتے جانیں مگر یہ ہم جانتے ہیں کہ کرسمس کے دنوں میں بھائی خادم بھی منٹگمری سے لاہور کا پھیرا کرتے ۔ عبدالرحمٰن مغل تو تقریب کے بہانے ڈھونڈتا تھا ۔ واللہ اعلم کیا موقعہ بنایا ملکہ پکھراج کا گانا ٹھہرایا ۔ اس نے منتیں کر کے بھائی ذوالقرنین کو اس محفل کے لئے روکا ۔ بھائی خادم بھی رک گئے ۔ سردیاں گزر چکی تھیں ۔ گلابی موسم تھا ۔ مغل کے مکان کے قریب ایک اونچا ٹیلہ تھا ۔ جسپر سائبان باندھا گیا ۔ فرش پر دری اور جاجم بچھی تخت پر قالین بچھا ۔ ملکہ کے آنے میں دیر ہوئی ۔ آقا جان نے پیسے دے کر مجھے گنڈیریاں لینے کو بھیجا ۔

کوئی دس دن پہلے ہمارے کالج میں پروکٹورئل سسٹم شروع ہوا تھا ۔ ہمارے گروپ کے پروکٹر مشہور و معروف پروفیسر بخاری تھے جو ہمیں ڈراما پڑھاتے تھے اور کمپوزیشن Essay کی کلاس لیتے تھے ۔ پروکٹوریل سسٹم کے ماتحت حکم تھا ۔ طالبات کو ہمیشہ کالج بلیزر پہن کر نکلو ۔ گھر سے اگر دس بجے کے بعد باہر نکلو تو تمہارے پاس گارڈین کا اجازت نامہ ہونا چاہیئے ۔ میں چھابے والے سے گنڈیریاں خرید رہا تھا کہ ایک چھوٹی کار آکر میرے پاس رکی ۔ دیکھا تو

پروفیسر بخاری تھے ۔ انگریزی میں بولے "یہاں کیا ہو رہا ہے"

میں نے گھبرا کر گنڈیری والے کی طرف کو اشارہ کیا ۔ بولے "دس بج چکے ۔ اجازت نامہ ؟" میں نے انگریزی میں کہا ۔ "میرے بھائی نے کہا تھا کہ ـ ـ ـ" ابھی بات میرے منہ میں تھی ۔ بولے "کل نو بجے ملو" یہ جا وہ جا ۔

اگلے روز آقا جان نے پرچہ لکھکر دیا کہ میری اجازت سے گیا تھا۔ میں نے دکھایا ۔ بولے ۔ "Ten Rupees fine"

دس روپے میری فیس ہوتی تھی ۔ سب کالجوں سے زیادہ گورنمنٹ کالج کی فیس تھی ۔ سوچتا ہوں اگر بتا دیتا حضور پروفیسر صاحب آپ بڑے پھنے خان بنے پھرتے ہیں ۔ میں ملکہ پکھراج کا گانا سننے کو آیا ہوں کر لو جو کچھ کرنا ہے تو ۔ تو وہ کالج سے بیک بینی و دوگوش نکال دیتے ۔ جو کچھ تھوڑا تو بہت میں نے اُن (۱) سے سیکھا ۔ کہاں سیکھ پاتا ۔ ڈنمارک کا یہ بے عزم باحیا شرمیلا شہزادہ زندگی کی تاریک راہ میں مارا جاتا ۔

آقا جان نے اختر شیرانی کے رسالہ "رومان" میں دو افسانہ نگاروں کو قارئین سے متعارف کرایا ۔ ایک سید شبیر حسین شاہ جو ملکہ پکھراج کا گانا سننے کو گئے ۔ پلٹ کر نہ آئے ۔

گلی میں اسکی گیا سو گیا نہ بولا پھر
میں میر میر کہہ اس کو بہت پکار رہا

اس طرح پکھراج پر مٹے کہ شادی کر لی ۔

دوسرے افسانہ نگار بٹالے کے سادات خاندان کے سید فیاض محمود تھے ۔ ان دونوں نے بہت کم لکھا ۔ جتنا لکھا خوب لکھا ۔ ادب آشنا لوگ کبھی نہیں مر سکتے ۔ ابھی پچھلے دنوں دہلی سے ریڈیو پر تقریر نشر کرتے ہوئے مقرر نے اردو کے سینئر افسانہ نگاروں کو سراہتے ہوئے عاشق حسین بٹالوی فیاض محمود اور سید شبیر حسین کا بڑی عقیدت کے ساتھ ذکر کیا ۔

یہ بات انہی دنوں کی ہے جب رسالہ "رومان" کا بڑا شہرہ تھا ۔ کسی شام کو آقا جان اس مکان کے سامنے سے گزرے جس میں امتیاز اور اس کے والدین رہتے تھے ۔ یاد کا ایسا جھونکا آیا کہ زخمِ دل کھل گیا ۔ ایک افسانہ لکھا "حیاتِ تازہ" جذب و احساس کی مقدس آگ میں لپٹا ہوا! ۔

اضطراب محبت کا شعلۂ جوّالہ ۔ شرارِ بے نشاں ۔ طرۂ پُر پیچ و خم ۔ "رومان" کی پرانی جلدیں مل جاتیں تو یہ افسانہ ہاتھ لگتا ۔ اگر مل جاتا تو دکھلاتا تجھے مصر کا بازار ۔

میرے کمرے کے اوپر تیسری منزل پر مکان کا صحن تھا جس کے ایک طرف باورچی خانہ تھا اور اس کے ساتھ میں

۱۔ اچھی سی مشرقیت پر اچھی سی مغربیت کا غلاف ۔ کوٹ پتلون اور سفید کالر سے محبت ۔ صاحب بہادری ۔ ڈرامے تھیٹر کے ساتھ عمر بھر کی وابستگی ۔ پڑھنے لکھنے کا شوق ۔ سب سے بڑھ کر تہذیبی پرورش جس کو گورنمنٹ کالج ٹچ کہتے ہیں ۔ یہ سب کچھ ان سے سیکھا اور اختیار کیا بلکہ خود ہی اختیار میں آگیا ۔

بڑا دالان جو برساتی کا کام دیتا تھا ۔ بوندا باندی اور بارش کے دنوں میں ہم اس برساتی میں سوتے جس کی کھڑکیوں میں سے بڑی ٹھنڈی ہوا آتی ۔ اس برساتی کے اوپر ایک ممٹی تھی جس پر چار پانچ چارپائیاں بچھ سکتی تھیں ۔ صحن کے ساتھ بڑے مزے کا شاہ نشین تھا جس پر بیٹھکر دُھر نیچے گلی تک دیکھا جاسکتا تھا ۔ سلامت اللہ شاہ کے آکشن مارٹ سے آقا جان ایک گول میز خرید لائے جو برساتی کے ایک کونے میں بڑا اچھا لگتا ۔ اس کے گرد چار کرسیاں بچھی رہتیں ۔ کھانا وہاں کھایا جاتا۔

گرمیوں کے موسم میں اباجی بٹالہ سے آئے ۔ دو چار روز ٹھہرے ۔ یاد نہیں حقے کا کہاں سے بندوبست کیا گیا ۔ چلم بھری گئی ۔ صحن میں ہم نے چھڑکاؤ کیا ۔ کرسیاں رکھی گئیں ۔ اباجی کے بارعب چہرے پر ایک خاص خوشی تھی اپنے آزاد و خودبین بیٹے کے دل کو کام میں لگا دیکھا تو جی خوش ہوا ۔ اپنے شاہ کج کلاہاں کے احساس ذمہ داری کو دیکھا تو بدن میں مسرت کی لہر دوڑی ۔ چھوٹے بیٹوں کو صبح صبح تیار ہو کر کالج جاتے دیکھا ۔ یہی چھوٹی چھوٹی مسرتیں ہوتی ہیں جن سے باپ کے دل کے باغ کی کلیاں کھلتی ہیں ۔

(٦)

گرم سرد چشیدہ گورا پلٹن بھائی عبداللہ کی جب راجع با انگلستان ہوئی تو اباجی نے کہا "جن گورے افسروں نے ہندوستان کا گوشہ گوشہ دیکھا ہے ۔ ان کے لئے ہندوستان کی یاد بڑی گہری یاد ہوگی ۔ زندگی بھر ان کے دامن سے نہ چھٹے گی ۔

نارتھمبر لینڈ فزیلئیر انگلستان کو روانہ ہوئی ۔ بھائی عبداللہ پنشن لے کر جالندھر چلے گئے ۔

منشی فتح دین کی ادیب عالم کی کتابوں نے مجھے اکسایا ۔ منشی فاضل کی کتابیں دیکھیں تو آسان نظر آئیں آقا جان نے حوصلہ بڑھایا "تو دے ڈالو امتحان"

پرائیویٹ طور پر دو مہینے کے لئے آقا بیدار بخت کے مدرسہ السنہ شرقیہ کی شام کی کلاسز میں جانا شروع کیا ۔ امتحان دے ڈالا ۔

ایک لڑکی سے اس طرح دل اٹکا کہ زلفِ رسا کی خوشبو پیچھا کرتی ۔ ملاقات ہوتی تو گردش ماہ و سال رک جاتی ۔ اس کے عشق میں مر جانے کو جی چاہتا ۔ یہ کون سے بیابان جنوں کی پو پھٹ رہی تھی ۔ عشق پوشیدہ کب تک رہے گا ۔ کچھ تو نذرانۂ جان اپنے ہونے کا نشان ہم بھی لائیں ۔ ہم نے نجانے کیا کیا بیہودہ نویسی کی تھی ۔ مگر بھائی ذوالقرنین کے نام جو میرا خط انہیں برکی میں ملا گلدستہ اظہار محبت اور تہذیب التجا تھا ۔ ان کی ٹھنڈی طبیعت فہم رسی اور بیکراں محبت کا کمال کہ مختصر خط آیا :

عزیزم دعائیں ۔ تمہارا خط ملا اچھا ہوا تم نے مجھے خط لکھا ۔ میں نے اباجی کو مطلع کر دیا ہے ۔ جس طرح تم چاہتے ہو ویسے ہی ہوگا ۔ اپنی طبیعت پڑھائی کی طرف مائل رکھو ۔

گرمی کی چھٹیوں میں منشی فاضل کا نتیجہ ہوا ۔ پنجاب یونیورسٹی بھی کیا گھامڑ تھی کہ ہم کو امتحان میں سرخرو کر دیا ۔ ہم کو نظیری قاآنی شیخ سعدی اور حافظ شیرازی نے سنبھالا ۔ اخلاقیاتِ جلالی علم منطق علم صرف و نحو نے کھنگالا یونیورسٹی نے تولا جھکولا حساب رتی ماشا برابر ۔ ہماری ٹور بن گئی ۔ کلدیپ سنگھ (۱) منظور احمد دھامی خادم محی الدین کی تعریفی نگاہوں سے مڈبھیڑ ہوئی ۔ چودھری بشیر سید طاہر شاہ اصغر حسین کی صحبت میں ہم نے اپنے کو اور زیادہ کارکشا محسوس کیا بڑا خوبصورت دن تھا ۔ مزید مسرت تب ہوئی جب فارسی کے دونوں پروفیسروں یعنی صوفی تبسم اور قاضی فضل حق نے پرشین سوسائٹی کا مجھے سیکرٹری مقرر کر دیا ۔

ایک جگہ سید عابد علی عابد اپنی اور قاضی فضل حق کی پروفیسر بخاری سے ملاقات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

بخاری صاحب کی بذلہ سنجی حاضر جوابی اور ظرافت کی یہ صورت تھی کہ یہ چیزیں فوارے کی طرح سے ان سے پھوٹی پڑتی تھیں ۔ جن دنوں وہ میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے ان کے خسر کا انتقال ہوا ۔ بہت سے لوگ پہنچے ۔ میں بھی حاضر ہوا ۔ قاضی فضل حق استاد فارسی میرے ساتھ موجود تھے میں نے ان سے پڑھا ہے اس لئے ان کے سامنے بربنائے احترام بخاری سے کھل کر باتیں نہیں کر سکتا تھا ۔ بخاری صاحب نے رمز شناسی سے کام لے کر اپنے چونچال پن کا اظہار شروع کیا ۔ یہ گفتگو جو میں نقل کرتا ہوں ۔ شاید روائت ورائت کے تمام اصولوں پر پوری نہ اترے کہ لفظوں میں ضرور ہیر پھیر ہو گا ۔ لیکن میرا حافظہ اچھا ہے اس لئے مجھے گمان ہے کہ تغیر لفظی بہت کم ہو گا ۔ اب گفتگو ملاحظہ ہو:

بخاری ۔ عابد صاحب آپ ان سے واقف ہیں ۔

عابد ۔ جی یہ میرے استاد ہیں ۔

بخاری ۔ خیر میرے رفیق کار ہیں

عابد ۔ ماشاءاللہ

بخاری ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ

عابد ۔ کیوں ؟

بخاری ۔ آپ کو پتہ ہے ان کا لڑکا ہمارے کالج میں پڑھتا ہے ۔

عابد ۔ جی ہاں

بخاری ۔ تو آپ مطلع ہو جائیے ۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا تو میں نے شفیق استادوں کی طرح پوچھا برخوردار کسی مضمون میں کمزور بھی ہو ۔ یعنی انگریزی کے سوا تو اسپر بولا ۔ جی فارسی میں کمزور ہوں ۔ اس پر میں نے کہا ۔ فارسی نہ

۱۔ کلدیپ سنگھ میٹرک کے امتحان میں سارے صوبہ پنجاب میں اول رہا تھا ۔ منظور دھامی کا پچھلے سال لاہور میں انتقال ہوا ۔ خادم محی الدین ہوائی حادثے میں مارا گیا ۔ چودھری بشیر نے پاکستان نیوی سے ریٹائر ہونے کے بعد لندن میں سکونت اختیار کر لی ۔ سید طاہر شاہ ریڈیو پاکستان سے ریٹائر ہو چکے ۔ میجر سید اصغر حسین کا انتقال ہو چکا ۔ میر اکرم محمود امرتسر کے مشہور ڈاکٹر میر ہدائت اللہ کے بیٹے تھے ۔ محکمہ پولیس سے ریٹائر ہو کر فرانس میں مقیم ہیں ۔

تمہارے باوا جان کو آئی نہ تمہیں آئے گی ۔ اور آپ کو معلوم ہے ۔ اس لڑکے نے کیا کیا ۔ جا کے باپ سے کہدیا کہ بخاری کہتا ہے آپ کو فارسی نہیں آتی ۔

عابد ۔ پھر

بخاری ۔ پھر کیا ۔ قاضی فضل حق صاحب میرے پاس آئے ۔ ان کو کہنا چاہیئے تھا کہ بیٹے کے سامنے باپ کی نالائقی کا بھانڈا نہیں پھوڑنا چاہیئے ۔ لیکن پتہ ہے انہوں نے کیا کہا ۔ فرمایا تم غلط کہتے ہو میں فارسی جانتا ہوں عابد صاحب یہ سن کر میں ہکا بکا رہ گیا ۔

قاضی فضل حق ۔ عابد صاحب سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ صرف داستان طرازی ہے ۔

بخاری ۔ لیکن یہ نہ بھولئے گا کہ اصل دعوے اسی طرح قائم ہے جو شخص ان سے پڑھ کر فارسی پڑھائے گا وہ کیا پڑھائے گا ؟

قاضی صاحب کا پڑھایا ہمیں کچھ یاد نہیں ہے۔ صوفی صاحب کا پڑھایا سب یاد۔ اب تک یاد ۔ قاضی صاحب ہوں گے جدید فارسی کے جاننے والے مگر ہمیں تو ان کے پڑھانے میں کوئی جدت دکھائی نہیں دیتی ایک تکیہ کلام ان کا ابھی تک ہماری یادوں کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ اس تکیہ کلام میں شاید آپ کو کوئی جدّت مل پائے۔ جب کوئی چیز سٹوڈنٹ کو بعد میں یاد آجاتی جس کا کوئی فائدہ نہ ہو سکتا تو ایسے موقع پر کہتے "اب کیا بوسہ بعد انزال" ہمیں کیا معلوم یہ کیا ہوتا ہے۔ ایک عرصے بعد معلوم ہوا یہ بوسے کی بہت کمتر قسم تھی جس کو ہمارے استاد نے تکیۂ کلام بنا کر اپنی مسند زبان پر سجا رکھا تھا۔

ہمارے دوست بوسٹن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر داؤد رہبر کے والد ہماری پرشئن آنرز کی کلاس لیتے تھے یعنی پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال ۔ یونیورسٹی بلڈنگ میں بیٹھتے ۔ بڑے ثقہ آدمی تھے ۔ ایک معمولی سی مٹتی مٹتی مسکراہٹ کے ساتھ منشی فاضل ہونے کی خبر سنی اور گنتی کی دو باتیں کیں ۔

دوسری رسوائی کا ذکر میرے دوست اصغر حسین نے یوں کیا کہ ہماری طرف تو کوئی لڑکی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی اور تو بٹالے کا ہیرو بنا پھرتا ہے ۔

کس نے بتایا ؟

بٹالہ کے سادات سے ہماری بھی رشتے داری ہے ۔ کسی نے بتایا ۔

امر تسر کے میر اکرم محمود نے مسکرا کر دیکھا تو ہم جو پہلے کارکشائی کے اعراف میں تھے اب دنیا کی حیات افروزی کی جنت میں جلوہ افروز ہوئے ۔

مگر کیسی حیات افروزی ۔ آقا جان کے کہنے پر حکیم نیر واسطی بڑے دالان سے اٹھکر میرے کمرے میں سمجھانے کو آن بیٹھے ۔ ان دنوں ان کو انگریزی لفظ استعمال کرنے کا بڑا چاؤ تھا ۔ ایک آدھ فقرے کے بعد ایک لفظ انگریزی کا بول دیتے ۔

ناصح بن کر کہنے لگے ۔ شادی ایک پہاڑ ہے جس کو آپ سر پر اٹھا رہے ہیں ۔ کیا میں wrong ہوں؟

جی نہیں ۔ آپ ٹھیک فرما رہے ہیں ۔

طالب علمی کے زمانے میں یہ پہاڑ اٹھانا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا ۔ خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا ہے ۔ دیکھیئے نا عاشق صاحب کے ساتھ شادی نے کیا کیا ۔ ہر گھر میں ایسی مثالیں موجود ملتی ہیں ۔ کیا میں کوئی wrong بات کہہ رہا ہوں ۔ اگر کہہ رہا ہوں تو آپ کہہ دیجیئے میں wrong ہوں میں معافی مانگ لوں گا ۔

توبہ توبہ آپ کیا کہہ رہے ہیں حکیم صاحب ۔

بولے "شادیاں wrong بھی ہوتی ہیں ۔ کامیاب اور Successful بھی ہوتی ہیں مگر بدیہی امر یہ ہے کہ اس پہاڑ کو اٹھانے کے لئے بڑا کس بل چاہیئے ۔ دیکھیئے نا آپ ابھی نوعمر ہیں ۔"

آپ صحیح کہہ رہے ہیں ۔ اس پہاڑ کو اٹھانے کے لئے شاید میرے اندر نئی معنویت پیدا ہو جائے ۔ یہ پہاڑ مجھے اٹھانا ہی اٹھانا ہے ۔ یہ میرا مقدر ہو چکا ہے ۔

عاشق صاحب کی طرح آپ بھی نہ پس جائیں ۔ زندگی میں کوئی mistake نہ ہو جائے ۔ تو پھر زندگی بھر اس کا ازالہ ختم نہیں ہو پاتا ۔

شاید یقین کی گرمی مجھے بچا لے ۔

ناصح نے کہا "تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ اعتماد کی دیوی بھی پاش پاش ہو جاتی ہے اور willpower کو بھی دیمک چاٹ جاتی ہے ۔ پھر ہسٹری اپنے آپ کو Repeat بھی تو کرتی ہے ۔ اس کا بھی خیال کر لینا اشد ضروری ہے"

افسوس میں یہ نہ کہہ پایا ۔ کاش کہتا حکیم صاحب کیا یہ آپ کا شعر ہے ۔

تجھ کو خود ڈھونڈے گی اے نیّر صراطِ مستقیم
دلِ گرفتارِ غمِ زلفِ دوتا ہونے تو دے

اسوقت تو کہا نہیں ۔ اب کیا بوسہ بعد انزال ۔ ہائے کیسے کیسے استاد تھے اور کیسے کیسے ناصح تھے ہمارے ۔ قاضی فضل حق ہیں نہ نیّر واسطی نہ آقاجان ۔ سب تاریکیوں میں چلے گئے ایک ایک کر کے ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے ۔

(۷)

مولانا اسد الہند جہاں مولویوں کی صحبت میں بیٹھا وہاں عیاروں کے ساتھ بھی وقت گزرا ۔ رندوں سے ملاقات بھی رہی ۔ گفتگو کا سلیقہ ادب آداب بڑوں سے سیکھا ۔ زندگی کا تجربہ سفر و حضر سے حاصل کیا ۔ طبیعت کے رس جس نے لفظ و معنی کی شمعوں سے اجالا پایا وہ حکیم نیّر واسطی اور آقاجان کی صحبت میں بیٹھ کر اپنے کو بہت شاداں اور پرشکوہ محسوس کرتا ۔ ایک روز گفتگو کے دوران اسد الہند نے کہا "ہر ایک کے کچھ اندرونی خواب ہوتے ہیں عاشق صاحب ۔ یہ

خواب پورے نہ ہوں تو بڑا جذباتی صدمہ باطن میں اتر جاتا ہے تو پھر خواب فقیروں کے کیا ہوئے خدا سے لو لگائیں ۔ خدا کو پائیں اس کو اپنائیں ۔ خدا کو پانے کے طریقے طرح طرح کے ہوئے ۔ خانقاہوں میں صبح صبح اٹھکر مور کے پروں سے مرشد کی قبر پر جھاڑو دو ۔ پھر کبوتروں کو دانہ ڈالو ۔ پیر کے پاؤں دابو ۔ جو بات کہے پلے باندھو ۔ اس کی طرف جب دیکھو محبت کی نگاہ سے دیکھو ۔ فقیر مکانکی اعتبار سے فقیر درویش صوفی مگر حکیم صاحب اندر تو وہی بکھیڑوں والا شکم ہے ۔ وہی بیماریاں آپ کو نبض دکھانے والی ۔ وہی گندم کا خمار ہے ۔ فتح اس پر کیونکر پائی جائے ۔ بوٹی بھی پی گئی ۔ بھنگ بھی گھٹی چرس کا سوٹا بھی لگا ۔ کوئی بھاگ بھری دیکھی دل کافر ہوا ۔ لڑکا خوش رنگ نظر میں آیا دل میں اتر گیا ۔ نیند حرام ۔ عشقِ مجازی سے عشق حقیقی کی طرف کو جانا ۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ۔ حکیم صاحب قبلہ ان لوگوں نے یہ کہکر اپنے اوپر بہت بڑی ذمہ داری لے لی تھی ۔ جب مجازی ذہن کے آئینے خانے میں عشق حقیقی نہ جگمگایا تو یہ بہت ہی گھبرائے بہت ہی سٹپٹائے ۔ اب راہیں دیکھیں تو سب بند ۔ اس ذمہ داری کے نیچے بہت لچے پسے ۔ تھے تو مذکر ۔ ردّعمل دیکھیئے ۔ اپنا مچھ مارنے کے لئے مذکر سے مونث بن گئے ۔ واویلا مچانے لگے ۔ عورت کی طرح بین فریاد نوحہ کرنے لگے ۔ ہائے میر یئے مائے میں دکھ اپنا کس کو سناؤں ۔ آکھے فقیر حسین نمانا مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا ہال ۔"

حکیم صاحب نے آقاجان سے پوچھا "نمانا کیا لفظ ہوا عاشق صاحب؟"

وہ بولے "جس کا درد بٹانے والی ماں مر چکی ہو، نہ ماں والا"

اسد الہند اپنا ولولۂ طبیعت جاری رکھتے ہوئے بولے "جب وہ مُنجیہ بھولنے سے نہ بھولا تو حسین نمانا شعر کہنے لگا ۔ جب بھاگ بھری شاہ صاحب کی ہمہ دانش پر چھائی رہی تو ہیر سامنے آگئی ۔ سب مجاز ہی مجاز تھا ۔ اسی گنبد میں سب بند ہوتے رہے حقیقت کے اسرار کہاں جلوہ گر ہوتے ہیں ۔ وہ تو ایک سربمہر لفافہ ہے جس پر کسی کا سرنامہ نہیں لکھا ہوتا ۔ فقیری دھری رہ گئی ۔ دماغ میں دھواں پھیلا ۔ دھواں ہی دھواں بیسیوں اشتباک سینکڑوں استفہام ۔ سوال پوچھا جائے اور پیر و مرشد کے پاس جواب نہ ہووے تو وہ کہے دیکھ دھواں میرے مرشد والا ۔ دھوئیں میں آپ کو کیا نظر آوے ۔ اور اندھیارا اور غبار اور گورکھ اور دھندا اور خلفشار ۔ جب فقیر مزید سوال پوچھے تو مرشد پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر ناچنے لگے کیونکہ گھنگھرو کے چھنکے میں بڑا مزہ ہے ۔

آقاجان بولے "پیر جانتا ہے کہ چھنچھناہٹ مرید کے سوال کو نگل جائے گی ۔"

اسد الہند نے کہا "عاشق صاحب فقیر کچھ بننے کی کوشش میں ہاتھ سے بہت کچھ دے بیٹھتا ہے ۔ بنتا بناتا کچھ نہیں ۔ اس کو بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ یہ شکست اس کو کھا جاتی ہے ۔ دھوبی کا کتا ۔ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا ۔

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن　　دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

بندۂ جاناں بھی ہوئے دل بھی دیا گیروے کپڑے بھی پہنے دنیا کے مہنے اور پیر کے یہ طعنے کہ تو اللہ کا فقیر ہے ان

باتوں سے تیرا کیا تعلق ۔ وہی مسیحی خانقاہوں والی بات سبز گوشوں میں چھپے مزار برف پوش پہاڑوں کی چوٹی میں چھپا مندر ۔ خدا کے نزدیک اور دنیا سے دور رہنے کی خواہش اور اگر وہاں کوئی دیوی آ جائے تو پھر نہ اپنی خیر اور نہ اس کی خیر ۔ یہ خیر کے راستے کس طرف کو جاتے ہیں حکیم صاحب ۔ اس پر فتح کس طرح سے پائی جاتی ہے ۔ مگر اوپر آسمان کی طرف دیکھیں تو وہاں جنت بنانے والا بھی غلمان بنا رہا ہے ۔ جنت میں یہ حور کے ساتھ غلمان کی مخلوق کیوں ہوگی ۔ فقیری کی راہ میں مارے جانے والے اس لئے نمانے ہیں کہ ڈانواں ڈول دنیا سے کٹے معشوق سے کٹے تو پھر اپنی شکست خوردگی کے جذبے کے ساتھ زندگی کی بے ثباتی دنیا کی بیوفائی کا رونا شعروں میں روتے ہیں ۔ ہم آہنگی ظاہر وباطن کی نہیں ہو پاتی ۔ سارا جھگڑا ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا ہی تو ہے ۔ سرمد شہید بلھے شاہ حسین نمانا سب لڑکوں پر عاشق ہوئے البتہ سید وارث شاہ سید زادہ کم دکھتا ہے مغل زادہ زیادہ معلوم ہوتا ہے کہ بھاگ بھری کو ملکہ ہانس کے گاؤں کی مسجد میں پانی بھرتے دیکھا تو ڈیرا مسجد میں ڈال دیا ۔ اسوقت تک بیٹھے رہے جبتک لوگوں نے مار کر نکالا نہیں ۔ بات دنیا کی اور گلے میں فقیری کی الفی ۔ ہر بات کے ذمہ دار خود ہیں ۔

مسیحی پادریوں اور ہندو سادھوؤں کی طرح مجرّد رہنے کی ذمہ داری ان کا اپنا فعل ہے ۔ ہیں تو بسم اللہ کے گنبد میں بند مگر عشق لڑکے سے بھاگ بھری سے ۔ یہ شاعری صوفیوں کی اور فقیروں کی مجھے تو کوئی راستہ نہیں دکھاتی ۔ دنیا کی بے ثباتی کا رونا نہیں ہے اپنی شکست کا ہے ۔ میرے ناچیز خیال میں غزل کا شاعر زیادہ باضمیر شاعر ہے ۔ وہ ڈنڈی نہیں مارتا ۔ کفر والحاد کی سیدھی بات کرتا ہے ۔ میں کہتا ہوں جب رانجھے نے کان پھڑوا کر مندریں پہنیں فقیر ہوا ۔ تو وہ خدا کا فقیر نہیں ہوا ۔ کشکول پکڑ کر ہیر کے در پر جا کھڑا ہوا ۔ ہیر جب رانجھے سے مل کر آتی ہے اور ہیر کی سہیلیاں اس کو کھلے ننگے فحش مذاق کر کر کے چھیڑتی ہیں جسطرح "بہشتی زیور" کا مصنف فحش باتیں لکھتا چلا جاتا ہے اور جو حرص پھر بھی پوری نہیں ہوتی تو اس کتاب کے آخر میں قوت مردمی کے نسخے لکھتا چلا جاتا ہے ۔ یہ کوئی خلوصِ فن تو نہ ہوا۔ ڈنڈی مارنے والی بات ہوئی ۔ دھوکا ہوا ۔ فراڈ ہوا ۔ اس لئے صوفیانہ شاعری کو میں بے خلوص بھٹکی ہوئی شاعری کہتا ہوں جس سے درگاہوں کی اگربتیوں کڑوے تیل اور مُشک کافور کی بُو آتی ہے ۔ قبر سے رشتہ زیادہ زندگی سے کم ہے ۔ زندگی سے کم اور قبر سے رشتہ زیادہ ہے"

حکیم نیر واسطی نے پوچھا "گویا یہ کہ صوفیانہ شاعری انسانوں کے لئے کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کرتی ۔"

اسد الہند نے جواب دیا "انسانوں کے لئے وہ شاعری کیا لائحہ عمل تیار کرے گی جس کی بنیاد فنا پرستی پر ہوگی ۔ زندگی سے رشتہ نہ جوڑو یہ اس کا پیغام ۔ جینے کی امنگ نہ رکھو یہ اس کی تاکید" ۔

آقا جان بولے "زندگی سے رشتہ جوڑو اقبال کا پیغام ۔ جینے کی امنگ سر سید کا پیغام ۔ قبر کے عذاب کی بات مت کرو ۔ دنیا میں رہنے کی بات کرو ۔ مولانا رومی کا پیغام ۔ وقت نے یہ تینوں ستون فنا پرستی کے خلاف پیدا کئے تھے ۔ ان تینوں نے بڑا کام کیا ۔ سر سید کی تحریک جینے کی امنگ اقبال کا فلسفہ حیات و خودی رومی کی تلقین باعمل زندگی

اور احترام آدمی"

میں نے ایک روز آقا جان سے پوچھا ۔ "یہ اسد الہند و اسد الدہر کیا کرتا ہے کہاں رہتا ہے" بولے لاہور کے قلعہ میں جہاں اس کے وطنی ڈیرہ غازیخان اور میانوالی کے سپاہی رہتے ہیں ۔ ان کو قرآن پڑھاتا ہے ۔ مسئلے مسائل سے آگاہ کرتا ہے ۔ کبھی کبھی دورے پر نکل جاتا ہے"

"وہ اس کی زبان سمجھتے ہیں"

"اردو کون نہیں سمجھتا"

اگر ہم عید پر بٹالے نہ جاتے تو عید کے روز حکیم صاحب کے ہاں ہمارا کھانا بدھا ہوتا ۔ عید کی نماز شاہی مسجد میں پڑھکر اسد الہند اور آقا جان میں اور الطاف حکیم صاحب کے ہاں پہنچتے ۔ ان کی دو بیٹیاں اعجاز واسطی اور عبیدہ واسطی آقا جان کو چچا کہتیں ۔

اب حکیم صاحب شام کو بھی دو گھنٹے مطب کرتے ۔ مسکرا کر کہتے "ذرا دو گھنٹے چکی پیس آؤں" ۔ میرے گمان کا پوچھیں تو اسد الہند نے کہا ہو گا "حکیم صاحب آپ دن بھر کے کام سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں ۔ آپ کی کوئی تفریح نہیں ہے ۔ دہلی کے چاوڑی میں حکیم اجمل خاں مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر انصاری رات کو گانا سنا کرتے تھے ۔ ہماری تہذیب مین دردسر کا یہی ایک قدیم نسخہ ہے" ۔

ہفتے کی شام کو اسد الہند کے ساتھ حکیم صاحب مہر چند سٹریٹ آجاتے ۔ تانگہ کھڑا رہتا ۔ آقا جان کے ساتھ گپ شپ ہوتی ۔ پھر بادشاہی مسجد کے قریب زینت کے کوٹھے پر جاتے ۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گانا سن کر واپس آجاتے ۔ اختر شیرانی کو اپنے ساتھ نہ لے جاتے ۔ وہ جاتا تو نشے کے سبب بے قابو ہو جاتا ۔ تینوں محتاط ہو کر جاتے کوئی پہچان نہ پائے ۔ ایک روز زینت نے کس تابداری سے غالب کی غزل چھیڑی کہ یہ تینوں اس طرح سے جھوم گئے کہ اُنکی ڈھئی دیواروں پر زندگی کی اچلاہٹ کھل اُٹھی ۔ جب اس نے یہ شعر گایا ۔

دِل سے مٹنا تیری انگشت حنائی کا خیال — ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

تو تینوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے ۔ ان کے جسم و جان میں روشنی کھلتی جا رہی تھی ۔ آقا جان نے کہا ۔ یہ شعر تین مرتبہ گائیے گا کہ اپنے اندر جذب کر لوں ۔ یہ سُن کر زینت کی بشاش و سربلند آواز جذبۂ سرخوشی سے سرشار موجۂ گل کی طرح دریچوں سے باہر جھانکنے لگی ۔ پھر اس نے بڑی ہم نشینی کے ساتھ تین انگلیاں اٹھائیں کہ تین مرتبہ گایا جا چکا ۔ اور غزل کے اگلے شعر پر پہنچی ۔

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفل ابجد — تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

آقا جان کے دل پر ایسی پڑی ۔ سر دائیں سے بائیں کو ہلا کر بے ساختگی سے بولے "وا"

وارداتِ شعر یوں کہ حسبِ حال ۔ گزران حسن و عشق یوں کہ زندگی پر محیط ۔ شعر یوں کہ خوردۂ دل ۔ آنکھوں

کے سامنے سے امتیاز کی یاد کے ستارے چمک گئے ۔ موسمِ ہجر ٹھہر جائے تو یہی ہوتا ہے ۔ زینت کی آواز نہائے ہوئے بدن کی طرح ڈھلتی چلی گئی ۔ اسد الہند کے چہرے پر بیابانی تھی ۔ تینوں حسن کے لُٹے مارے غیرتِ عشق سے سرنگوں بیٹھے تھے ۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب　　　　چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

اسد الہند نے نظر اٹھائی اندر کے تپاک سے بولا "کیا گلا ہے"

حکیم نیر واسطی بولے "عاشق صاحب زینت نے غالب کی غزل کو کس لذت سے گایا ہے کہ اوجِ ثریا تک لے گئی"

زینت نے آداب کیا ۔ وہ جان گئی تھی یہ علم و دانش والے لوگ تھے ۔ ڈھائی دو گھنٹے جم کر گانا سنتے ہیں ۔ پھر منہ میں گلوری رکھ کر اٹھ بیٹھیں گے ۔

انہی دنوں رسالہ "ادبی دنیا" میں آقاجان کا افسانہ "زینت" چھپا ۔ بعد میں ان کے مجموعے میں شائع ہوا ۔ حکیم صاحب نے اسی زمین میں غزل کہی ۔ مجھے جس طرح حفیظ ہوشیار پوری کا مصرعہ اب تک یاد ہے "زمانہ حشر تک ترسے گا تکمیلِ محبت کو" اُسی طرح حکیم صاحب کی اُس غزل کا صرف ایک مصرعہ ابھی تک یاد ہے ۔

"چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں گریاں ہونا"

ایک روز آقاجان نے کہا "کیا مسخرہ گیری ہے کہ نغمے کا سحر مسلط ہو جانے پر دل میں روشنی اترے ۔ روح کا موسم بدلے مگر سر نفی میں دائیں سے بائیں ہلے جو منفی علامت ہوئی ۔"

اسد الہند جھوم کے بولا ۔ عاشق صاحب عقل جنوں کا لباس نہیں پہن سکتی ۔ اگر پہن لے تو خود ناچنے لگے ۔ نغمے کی سحر انگیزی سے متاثر ہو کر جھومنا حقیقت اور جھومتے ہی جھومتے عقل کی خبرداری کا منفی سگنل موصول ہونا صداقت ۔ یہ سب منفی عوامل ہوتے ہوئے بھی یہ بہت بڑی حقیقت کہ دل میں کیف و سرور کا تھم گڑ گیا ۔ سارا لطفِ تمام دل کے حصے میں آیا ۔ کیوں حکیم صاحب میں نے صحیح عرض کیا"

حکیم صاحب بولے ۔ آپ درست فرما رہے ہیں ۔ سر میں عقل کا آشیانہ اور وحشت و جنوں کا گھر اُس کا دل ۔ قیل و قال کے گنبد میں عقل بند اور کیف و سرمستی کی دنیا میں جنوں آوارہ و دشت پیما"

مولانا بولے "خوش ہو کر بزرگ بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں کہ وہاں عقل رہتی ہے ۔ اس میں نکتہ یہی ہے کہ بزرگ کی برقیات یا برکات بچے کے سر میں منتقل ہو جائیں ۔ بچے کے سر میں عقل کا جو ذخیرہ ہے وہ بڑھے ۔"

عاشق صاحب مولانا آج راہ حرف میں موتی لٹا رہے ہیں ۔ حکیم نیر واسطی بولے ۔

اسد الہند کا سبھاؤ مسکرایا کہنے لگے "حکیم صاحب راہ عشق میں ہماری عقل لُٹی سہی مگر اتنی ہے کہ تلوار تیر ترکمان سے بات کر سکے ۔ اسوقت تو جذب و جنوں کے عاشق کا شعر یاد آ رہا ہے ۔

بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اقبال کے فصاحت شعر کی ساری بات "لیکن" کے لفظ میں ہے ۔

ایک شام میں بٹالے سے آیا کھانا ختم ہو چکا تھا ۔ روٹیاں تو تھیں سالن نہ تھا ۔ میری میز کے سامنے ایک کلفی میں سالن پڑا تھا ۔ میں کھا گیا ۔

بڑے کمرے میں آپ حکیم نیّر واسطی مولانا اسد الہند باتیں کر رہے تھے ۔ مجھے کیا معلوم وہ اسد الہند کی سحری تھی"

میں نے آقاجان سے کہا ۔

وہ بولے "ہاں وہ اُسکی سحری تھی جو روزہ رکھنے کے لئے اسے رات کو کھانی تھی"

میں نے کہا ۔

"اسکی پریشانی دیکھنے والی تھی ۔ اور میں الگ نادم کہ میں نے کیا کیا" .

آقاجان بولے

وہ اس لئے اور پریشان کہ حکیم صاحب اسے قلعے کے قریب چھوڑ کر تو چلے جائیں گے ۔ اُس کو آٹھ پہر کا روزہ رکھنا پڑے گا ۔ آٹھ پہر کا پہاڑ اسے دکھائی دے رہا تھا ۔ میں نے جی میں سوچا تعریفیں بڑی کرتا تھا ۔ کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔ اس سے تو ایک سحری تنہا نہیں چھوڑی"

شعر و ادب کی زبان میں کو توالِ شہر کو محتسب کہا جاتا ہے ۔ وحشتِ جنوں اور جرم و گناہ کی راہوں پر پہرہ بٹھانا اُسکا فرض ، عقل و دانش کی پاسبانی کرنا اس کا کام ۔ اور پھر اس سیاق و سباق میں فیض احمد فیض کا یہ شعر کیا خوب ہوا کہ

محتسب کی خیر ہو اونچا ہے جس کے فیض سے
رند کا ساقی کا پیمانے کا میخانے کا نام

کو توالِ شہر اس کو بنایا جاتا تھا جو ایک طرف پیشہ ورانہ قابلیت رکھتا ہو اور دوسری طرف سوسائٹی اور اعلیٰ و ادنیٰ طبقوں سے گفتگو کرنا جانتا ہو ۔ سوشل ہو ، بااخلاق اور خوش گفتار ہو ۔ انگریزی جانتا ہو ۔ حاکمانہ اطوار ہوں ۔ شہر کے امن و امان کا محافظ بن سکے ۔ شہر کے مضافات کے جرائم سے واقفیت رکھتا ہو ۔ شخصیت رعب اور دبدبے والی ہو ۔ نڈر اور بے خوف ہو ۔ کو توال کا عہدہ انسپکٹر پولیس کو دیا جاتا تھا ۔ بھائی ذوالقرنین نے لاہور کے نواحی تھانوں میں ابا جی کی طرح مثالی اور معیاری تھانیداری کی تھی ۔ اُن کو انسپکٹر پولیس بنا دیا گیا اور لاہور کے کو توال مقرر ہوئے ۔

بھائی ذوالقرنین جو گھر میں پاسبانِ عقل تھے ۔ اب شہر کے پاسبانِ عقل مقرر ہوئے ۔ سب کو ہوئی مگر ابا جی کو زیادہ خوشی ہوئی کہ گول باغ سے ملحق اُسی قدیم بنگلہ نما عمارت میں سکونت جس میں کبھی ابا جی بحیثیت کو توال رہا کئے ۔

اُن کے وقت قدیم طرز کے جو کمرے تھے اب نئی طرز کے بن چکے تھے ۔ میری والدہ کو لے کر اباجی لاہور آئے ۔ مکان میں اندر کی چھپی چھپی خوشی کے ساتھ گھومے پھرے ۔ یہاں کمرہ بچوں کا ہوتا تھا ۔ یہ کمرہ ذوالقرنین اور عاشق کا تھا ۔ یہاں بابر پیدا ہوا ۔ یہاں ہمیشہ تخت پوش بچھا رہتا تھا ۔ وہاں باورچی خانہ تھا ۔ بجلی کہاں تھی اس کمرے میں جھالروالا پنکھا کھینچا جاتا تھا ۔ مگر باہر کا گولائی والا برآمدہ ویسے ہی سرکنڈے کی چقوں سے ڈھکا چھپا جیسے برس ہا برس پہلے ہوا کیا ۔

امی جی کے بدن میں درد کی شکائت تھی ۔ حکیم نیر واسطی ان کو دیکھنے تشریف لائے ۔ دوا تجویز کی اور انہوں نے گرمیوں کے دو چار مہینے پہاڑ پر گزارنے کا مشورہ دیا ۔ بٹالہ دامنِ کوہ میں واقع تھا ۔ پانچ ریلوے سٹیشن ورے پٹھانکوٹ جہاں پر ریل کی پٹڑی ختم ہوتی تھی ۔ وہاں سے پہاڑی مقامات کی طرف بسیں چلتیں ۔ ڈلہوزی دھرم سالہ پالم پور جوگندر نگر صحت افزا مقامات تھے ۔ اسی سلسلہ کوہ پر کلو چنبہ (۱) اور کانگڑہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں زنجیر کی طرح ایک دوسرے سے ملحق تھیں ۔

امی جی کو لے کر آقاجان دھرم سالہ چلے گئے ۔ گرمی کی چھٹیوں میں کالج بند ہوئے ۔ چند روز بٹالے رہ کر میں اور الطاف دھرم سالہ پہنچے ۔ آقاجان لاہور آ گئے ۔

موچی دروازہ بھاٹی نولکھا مستی گیٹ تھانہ ٹبی تھانہ انار کلی تھانہ مزنگ شہر کے یہ سب تھانے کوتوال شہر کے ماتحت ۔ اُس کو اطلاع سب کی پہنچتی ۔ معلوم تھا کہاں کہاں کیا ہو رہا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں شہر کا دل دھڑکے اور وہ خود شہر کا دل بدن کی رگوں میں چلتا پھرتا خون جس کی دھڑکن سے شہر توانا و صحت مند رہے ۔

دل تب ساری دلّی کا کوتوالی سے اٹک گیا تھا جب کوتوالی میں بیٹھ کر نادر شاہ نے چبوترے پر ننگی تلوار رکھکر کہا تھا ۔ "جب تک نیام نہ ہوگی اُس کے سپاہی قتل کرتے رہیں گے" ۔

خون کی ندیاں بہہ گئیں ۔ ہاڑ ہاڑ مچ گئی ۔ کسی نے بھنگ پی کر بھنگڑ خانے میں کہہ دیا "ہائے قربان محمد شاہ دلارے کے ۔ پیتا کی فوج کا ایک سپاہی چار چار کے سر اڑا رہا ہے" خبر پھیل گئی ۔ پھر ایک سر نہ اڑا نادر کی فوج نے دس دس بیس بیس سر اڑائے ۔ نادر کی فوج کے ہاتھوں شہر کا بچہ بوڑھا عورت مرد امیر غریب جو گاجر مولی کی طرح کٹے ہیں شہر کی نالیوں میں خون بہنے لگا ۔ ہونج بہاری پھر گئی ۔

امریکہ کے یہودی جو ہالو کاسٹ کا شور مچاتے ہیں کبھی انہوں نے ہماری تاریخ پڑھی ہے ۔

لاہور کی بات لاہور سے ہو تو بہتر ۔ عطائے شما بہ لقائے شما ۔ اپنے ہاں کی بات یہ ہوئی کہ تصویر شام کی ساری فضا کاری جو تھی اُس میں تبدیلی آ گئی ۔ گانا ختم ۔ اندیشہ یہ لاحق ہوا کہ اگر خبر بھائی جان تک پہنچی تو محتسبِ شہر کا اتنا جتانا کہ مجھے اطلاع ملی ہے عقل کو پیامِ خبر اور خرد و دانش کو پاسبانی کی صدائے تاکید ہوگی ۔ اس محتسب شہر کے ہوتے

۱ ۔ کلوئے سیب مشہور تھے ۔ پنجابی شاعری میں چنبے کی کلی کا ذکر بار بار آتا ہے ۔ کانگڑہ سکول آف آرٹ ہندوستانی مصوری کا شہرت یافتہ اسلوب فن مانا جاتا ہے ۔

ہوئے ہم کوئی توقیرِ رسوائی نہیں لینا چاہتے ۔ مگر ہاں مولانا اسد الہند نے قلعہ میں البتہ اپنی ٹور یوں بنا ڈالی کہ ایک دن لمبے لمبے پٹے والے سپاہیوں کی ہمنشینی میں بیٹھا بڑے تپاک کے ساتھ بولا "خوشی کی بات یہ ہے آپ بھی تو خوش ہوں گے کہ شہر کے جو نئے کوتوال آئے ہیں میرے بڑے ملنے والے میری بڑی عزت کرنے والے ہیں"

مولانا کے سوشل ہونے کا سپاہیوں پر بہت رعب پڑا ۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ملتا ہے کہ فلاں بادشاہ کے مرجانے کے بعد فلاں بادشاہ تخت پر بیٹھا تھا ۔ بڑا پرہیز گار نماز روزے کا پابند رمضان المبارک کا خاص احترام کرتا ۔ اس کے زمانے میں لوگ صوم صلوٰۃ کے پابند ہو گئے۔ کل کا تذکرہ نویس جنرل محمد ضیاء الحق کے متعلق بھی یہی لکھے گا کہ حاکم ملک بڑا پرہیز گار تھا ، منکسر المزاج تھا ۔ نماز روزے کا پابند تھا ۔ رمضان المبارک میں کوتوال شہر کو حکم تھا کہ دن کے وقت سب کھانے پینے کے تنور نانبائیوں کی دکانیں ہوٹل ریسٹورنٹ بند رکھے جائیں ۔ جو شخص باہر کھلے میں کھاتا پیتا دیکھا جائے ۔ شرعی قانون کے ماتحت حوالات میں دے دیا جائے ۔ اس نے شراب پینے پر سخت پابندی لگادی تھی ۔ شراب کے نشے میں جو پایا جاتا شریعت کے ماتحت حوالات میں بند کر دیا جاتا تھا ۔ اس نے افیون کے سب ٹھیکے بند کر دیئے تھے ۔ نو ہزار پانچسو افیمی مر گئے ۔ اس نے کوئی پروانہ کی ۔ پھر اس کے عہد میں کوڑے مارنے کی سزا نے رواج پایا جس سے لوگوں نے بہت عبرت پکڑی ۔ لڑکے لڑکی کی دوستی ہوئی پتہ چل گیا ۔ دونوں پر پولیس نے زنا بالجبر کا الزام لگایا جیل میں ڈالا ۔ نہ داد نہ فریاد ۔ جیلیں کلبلانے لگیں ۔ شرعی حد لگائیں یا تعزیرات ۔ پولیس کے دوہرے عیش ہو گئے ۔ جنرل ضیا نے ہوائی اڈوں پر کموڈ تڑوا کر کُھڈیاں بنوائیں ۔ نماز پڑھنے کے لئے مصلّے بچھوائے ۔ غسل خانوں میں لوٹے رکھوائے ۔ اتنے نیکی کے کام کر کے جب رخصت ہوا تو بے مروت قوم نے جہاں اس کی قبر تھی اُسے جبڑے والا چوک کہنا شروع کر دیا ۔ میں نے خود دیکھا وہیں والے سوزوکی والے صدا لگاتے ہیں چل جبڑے والا چوک ، جبڑے والا چوک ۔ کہتے ہیں کہ طیارے کے حادثے میں کسی کا کچھ نہ بچا تھا ۔ صدر ضیاء الحق کی صرف مصنوعی بتیسی ملی تھی جس کو تابوت میں رکھ کر دفن کر دیا گیا ۔ اللمان ۔ موت کے عقب میں کیسے کیسے اسرار چھپے ہوتے ہیں ۔ مرگ بھی کیا پر اسرار ہوتی ہے ۔ خدا کے اور موت کے کیا کیا سرِ نہاں ہوتے ہیں ۔

جنرل ضیا نے کہا خط لکھنے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا کرو ۔ سب نے لکھنا شروع کر دیا ۔ میں اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جو گیا تو دیکھا کہ دو چار افغانی زمین پر دوپٹہ بچھا کر اوپر چھوٹے چھوٹے کڑائی کے طغرے بیچ رہے ہیں جن پر لکھا ہے۔ اللہ محمدؐ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔ حیرت ہوئی ۔ اللہ غنی یہ کیا اسرار مرگ و حیات ہے بسم اللہ الرحمن الرحیم جس خط پر لکھی ہوتی تھی سوچا کرتے اس کو پھاڑ کر کہاں پھینکیں ۔ زمین پر پھینکیں تو کس طرح سے پھینک سکیں کہ اس پر بسم اللہ شریف لکھی ہوئی ہے ۔ وہی بسم اللہ شریف زمین پر رکھی بک رہی تھی ۔ پی آئی اے کی پروازوں میں اناؤنسر پہلے سب کی خیریت کی دعا مانگتا ہے ۔ صدر پاکستان طیارے کے حادثے میں جاں بحق

ہوئے ۔ تذکرہ نویس یہ بھی لکھے گا ۔ درویش صفت صدر کی مولویوں کے ساتھ بڑی دوستی تھی ۔ زکوٰۃ کا سارا روپیہ وہ مولویوں کے اسلامی اداروں میں تقسیم کر دیتا تھا ۔

کمال اتاترک نے ترکوں کی بھاری بھر کم شلوار ترک کر کے انہیں سمارٹ کوٹ پتلون پہننے کا حکم دیا تھا ۔ ضیاء الحق نے کوٹ پتلون کی ممانعت کر کے ستھن کرتہ پہننے کا سرکاری حکم نافذ کر دیا ۔ کلرک جو لنڈے بازار سے امریکہ کی دس روپے کی پتلون خرید کر گزارہ کر لیتا تھا اس نے رشوت کے دام بڑھا دیئے تاکہ چھ سات سو روپے کا ستھن کرتہ خرید سکے ۔ تھانوں میں پہلے چوروں کے پاس اندھیری راتیں بیچ دی جایا کرتی تھیں اب تھانوں کے خود سے دام لگ گئے ۔ لاہور میں طوائفوں کے بازار کا تھانہ سات لاکھ روپے میں بکنے لگا ۔ رشوت روکنے کے لئے اس نے محتسب اعلیٰ کا عہدہ قائم کیا تھا ۔ ایک روز ٹبی کے تھانیدار کو اطلاع ملی کہ محتسبِ اعلیٰ کی گاڑی رنڈیوں کے بازار میں گھوم پھر رہی ہے ۔ تھانیدار اوٹ میں کھڑا ہو گیا ۔ بولا "اب آئے تو روکو" ۔

گاڑی آئی تو روکی گئی ۔ کار کے اندر ایک سوٹڈ بوٹڈ نوجوان بیٹھا تھا جس نے پی رکھی تھی ۔ تھانیدار نے پوچھا "یہ گاڑی محتسبِ اعلیٰ کی ہے ؟"

اندر بیٹھے شخص نے کہا "جی ہاں محتسبِ اعلیٰ کی ہے"

تھانیدار نے پوچھا "آپ کون ہیں ؟"

وہ بولا "میں ان سے بھی اعلیٰ"

ہر لطیفہ ہر خبر و نظر کو تو ال شہر تک پہنچتے ہی پہنچے ۔ یہ خبر بھی پہنچی ۔ اس نے کیا کارروائی کی ہو گی ۔ یہ لطیفہ سچا تھا یا جھوٹا تھا واللہ اعلم ۔ آخر قتل عام سے پہلے دلّی میں جو خبر اُڑی تھی وہ کہاں سچی تھی ۔ کسی نے بھنگڑ خانے میں اتنا کہہ دیا تھا "قربان جاؤں محمد شاہ دلارے کے ۔ پیا کی فوج کا ایک سپاہی چار چار کے سر اڑا رہا ہے" بس بات چھڑ گئی ۔

خواہ حاکم ملک ہو خواہ محتسبِ اعلیٰ ہو لاہور والے لطیفہ کہنے سے نہیں چوکتے ۔ کئی لطیفے ضیاء الحق کے ان لوگوں کی زبان پر رہتے تھے ۔ اہالیان لاہور طبعاً خوش دل خوش گزراں زندہ دل لوگ رہے ہیں ۔ اس خوشدلی کے ساتھ ساتھ ایمان پر جہاں آنچ آنے لگے تو یہ سر فروشی میں اپنی مثال آپ ہیں ۔

تو میں جن دنوں کی بات کر رہا ہوں ہمارے پروفائل میں اس سال بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ۔ پہلی تبدیلی یہ کہ حکیم صاحب چونے منڈی کے مکان سے اٹھ کر ٹکسالی دروازے سے باہر راوی روڈ پر ایک فلیٹ نما مکان میں آ گئے ۔ دوسری تبدیلی یہ کہ موٹر کار خرید لی ۔ تیسری اختر شیرانی کے ساتھ دوستی بڑھنے لگی ۔ دن رات اس کی شاعری کے گن گاتے ۔ پینے والے صرف اختر شیرانی ۔ نہ یہ خود پیئیں نہ آقا جان اور نہ اسد الہند ۔ مہر چند سٹریٹ میں حسب معمول دھونی رَمتی ۔ چوتھی تبدیلی یہ کہ ایک روز انگریز آئی جی پولیس (یعنی انسپکٹر جنرل پولیس) کا مراسلہ

بُری خبر لایا ۔ اس کو "پولیس ریویو" کی پالیسی سے اختلاف ہو چکا تھا ۔ اس لئے پولیس ریویو کی اشاعت کو فوری طور پر بند کر دینے کا حکم دیا گیا ۔ راوی کا چلتا پانی بند ہو گیا ۔ انگریز کی موذی حکومت سے آقا جان کو کب سے نفور تھا ۔ غصہ پی گئے ۔ ہم کرائے کا مکان چھوڑ بھائی جان کے فراخ سرکاری مکان میں آ گئے ۔ واللہ اعلم ان کے کہنے پر یا خود سے ایک وکیل دوست محمد ابراہیم اعوان کے ساتھ وکالت شروع کی ۔ اُس کے دفتر میں بیٹھتے اسکے ساتھ سول کورٹ جاتے ۔ اپنا دفتر نہ بورڈ ۔ راستہ آبجو نے نکالا تھا کہ تاریخ نے واقعاتی پن کے ساتھ پھر راستہ کاٹا ۔

(۸)

سکھوں کا ایک پنجابی شعر میر مُنو کے متعلق بڑا مشہور ہے ۔

میر مُنو ساڈی داتری ترسی مُنو دے سوئے

جیوں جیوں سانوں وڈدا اَسی دونے دونے ہوئے ۔

(میر منُو ہماری درانتی ہم سوئے کا ساگ ہیں جوں جوں ہمیں کاٹتا ہے توں توں ہم دوگنے ہوتے جا رہے ہیں)

بادشاہ فرخ سیر کے زمانے میں نواب میر معین الملک عرف میر منُو صوبہ لاہور کا نڈر اور بہادر گورنر ہو گزرا ہے ۔ جب پنجاب میں سکھوں نے اودھم مچایا تو بادشاہ کے حکم سے سکھوں کی سرکوبی کے لئے میر منُو نے جنگ و جدال کا سلسلہ شروع کیا ۔ سکھوں کو جگہ جگہ شکستیں دیں اور انہیں مارتا چلا گیا ۔ سکھ اس کو اپنا بہت بڑا دشمن سمجھنے لگے ۔

دورِ شاہجہانی میں لاہور کے کوتوال عبداللہ خان نے لنڈے بازار کے سرے پر تین مینار والی مسجد تعمیر کی جس کی وجہ سے کوتوالی کے عملے کو نماز کے لئے دور نہیں جانا پڑتا تھا ۔ مسجد اور کوتوالی کے بیچ میں باغیچہ تھا جہاں مجرموں کو سزا دی جاتی تھی ۔ میر منو نے بھی سکھوں کو یہیں سزائیں دی تھیں ۔

مغلوں کی حکومت جب زیادہ کمزور ہو گئی تو پنجاب میں سکھوں کے ہاتھوں بہت زیادہ تباہی مچی ۔ لاہور کے تین حصوں پر تین سکھوں نے قبضہ کر لیا ۔ میر منو کا مقبرہ مسجد کے قریب تھا ۔ اس کو ڈھا دیا گیا اور وہاں بھائی تارو سنگھ کی سمادھ بنا ڈالی کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں میر منُو نے تارو سنگھ کو قتل کرایا تھا ۔ مسجد پر قبضہ کر کے اس کا نام گردوارہ شہید گنج رکھا ۔

مولوی نور احمد چشتی اپنی تاریخی کتاب "تحقیقاتِ چشتی" میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۶۴ء میں اس مسجد پر گنڈا سنگھ اور گوردت سنگھ دو بھائی قابض تھے ۔ مسجد کی دکانوں کا کرایہ یہ دونوں وصول کرتے تھے ۔ مسجد کے صحن اور دالان میں انہوں نے لنگر خانہ بنا رکھا تھا ۔ لوہے کی ایک بہت بڑی بالٹی جسے سکھ لوگ باٹا کہتے تھے ہر وقت بھنگ سے لبالب بھری وہاں مسجد کے صحن میں رکھی رہتی تھی ۔ آنے جانے والے سکھ مسافر جی بھر کر پیتے رہتے تھے ۔

لاہور میں جب مسجد شہید گنج کا جھگڑا پیدا ہوا اسوقت سر ہربرٹ ایمرسن پنجاب کا گورنر تھا ۔ ڈپٹی کمشنر ایس پرتاب سکھ تھا ۔ آئی سی ایس (انڈین سول سروس) میں آنے سے پہلے اس کا نام پرتاب سنگھ تھا ۔ آئی سی ایس

ہونے کے بعد وہ داڑھی اور سر کے بال کٹوا کر مونا سکھ ہو گیا ۔ پرتاب سنگھ سے بدل کر نام ایس پرتاب رکھ لیا ۔ سکھوں نے مسجد گرا کر گوردوارہ وسیع کرنا چاہا تو لاہور میں کہرام مچ گیا ۔ مسلمانوں کا ایک وفد گورنر سے ملا ۔ اس نے بات آئیں بائیں کر دی ۔ وفد سکھ لیڈروں سے بات چیت کر رہا تھا کہ سکھوں نے مسجد گرانی شروع کر دی ۔ پنجاب پر مختلف علاقوں سے سکھوں کے جتھے آنا شروع ہو گئے ۔ پنجاب کے مسلمانوں کی طرف سے مزاحمت و مداخلت کا اندیشہ تھا ۔ چاروں طرف مسجد کے پولیس متعین کر دی گئی ۔ شہر کے مسلمان نعرے لگاتے مسجد کی طرف بڑھتے تو پولیس گرفتار کر لیتی ۔ اگلے روز گورا فوج آ گئی ۔ بڑھنے والوں کو روکا گیا وہ کفن باندھ کر آئے تھے کیسے رکتے ۔ فوج کو گولی چلانی پڑی ۔ چار آدمی شہید ہو گئے بہت زخمی ہوئے ۔

بھائی ذوالقرنین کو قوال شہر کی رہائش گاہ کے باہر والے برآمدے کی دیوار پر دو گولیاں لگیں جو پلستر اکھاڑ کر اندر دھنس گئیں ۔

حکومت نے مولانا ظفر علی خان ملک لال دین قیصر ملک لال خان سید سرور شاہ گیلانی سید حبیب سید محمد شاہ کے سے پُرجوش رہنماؤں کو نقص امن کے سلسلہ میں گرفتار کر کے مختلف جیلوں میں نظربند کر دیا ۔ کچھ لوگ بہادر دلیر ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ تاریخ میں گمنام رہتے ہیں ۔ ایسے پُرجوش لوگوں میں ایک ایسا شخص بھی ہو گزرا ہے جس کا ذکر کرنا ازبس ضروری ہے ۔ وہ شخص میاں فیروز الدین احمد تھا ۔ وہ بڑا طباع واقع ہوا تھا ۔ اس کو کمال کی سوجھتی تھی ۔ جب قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ میں نئی روح پھونکی اور پژمردہ دلوں میں روشنیاں جاگ اٹھیں تو یہ میاں فیروز الدین احمد تھا جس نے لکھنؤ کے اجلاس میں پہلی مرتبہ قائداعظم محمد علی جناح کا نعرہ لگایا جسے سب نے پسند کیا ۔ پھر جناح صاحب کی منظوری سے یہ خطاب ان کے نام کا جزو بن گیا ۔ بچپن سے وفات تک میاں فیروز الدین احمد صفِ اول کا پُرجوش کارکن رہا ۔ ابھی وہ بالغ بھی نہ ہوا تھا کہ تحریک خلافت کے زمانے میں کم عمر رضاکار کی حیثیت سے وہ علی برادران کے ساتھ میدانِ عمل میں کود پڑا ۔ علما نے جب فوج اور پولیس کی نوکری کو حرام قرار دیا تو میاں فیروز الدین احمد جو لاہور کی فوجی چھاؤنی میں فتوے تقسیم کر رہا تھا گرفتار ہوا اور بغاوت کے جرم میں قید کر دیا گیا۔

۱۹۲۱ء میں بالغ ہوا تو پنجاب خلافت کمیٹی کا سیکرٹری اور آل انڈیا خلافت ورکنگ کمیٹی کا رکن چن لیا گیا تھا ۔ بریڈلا ہال لاہور میں جب جمعیت العلمائے ہند کانفرنس ہوئی تو مولانا ابوالکلام آزاد نے اُس کو اعلیٰ کارکردگی کا تمغہ پہنایا ۔ علی برادران (مولانا محمد علی مولانا شوکت علی) نے ۱۹۲۸ء میں خلافت اور کانگرس کے مشترکہ اجلاس کلکتہ کو کامیاب بنانے کے لئے اس کو لاہور سے بلوایا ۔ جب نہرو رپورٹ کا وقت آیا تو فیروز الدین احمد نے نہرو رپورٹ کے خلاف لاہور میں شدت کے ساتھ چھپن فیصدی کا مطالبہ کیا ۔ لکھنؤ کے قیصر باغ کی آل انڈیا کانفرنس میں اس نے مولانا ظفر علی خان کے ساتھ پنجاب کی طرف سے شرکت کی تھی ۔ چنانچہ شہید گنج تحریک میں میاں فیروز الدین احمد پیش پیش تھا ۔ بیرون موچی دروازہ کے پبلک جلسوں میں گورنر پنجاب سر ہربرٹ ایمرسن کو اس کی سکھ دوستی کی وجہ سے اس نے

"سر امر سنگھ" کا خطاب جو دیا تو گرفتار کر کے اسے جیل بھیج دیا گیا ۔ چند دنوں میں پنجاب کے تمام مسلمان لیڈر نظر بند ہوئے ۔ اخبار کے آزاد غزالوں پر سخت پابندی کہ تحریک شہید گنج کی خبر نظر کسی اخبار میں نہ آنے پائے تاکہ ہندوستان کے لوگوں کو معلوم نہ ہو سکے کہ لاہور پر کیا گزری ۔ کوئی یہ بھی نہ پوچھ پائے ۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

پھر یوں ہوا کہ یہ تحریک ذمہ دار لیڈروں کے ہاتھوں سے نکل کر جذباتی نوجوانوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ۔ انہوں نے بادشاہی مسجد کو اپنا صدر مقام بنا کر سول نافرمانی شروع کر دی ۔ رضاکار دو اور چار چار کی ٹولیوں میں شاہی مسجد سے ایک جلوس کی صورت میں نکلتے تھے ۔ راستے میں لوگ ان گلفام نوجوانوں کو پھولوں سے لاد دیتے ۔ پھولوں سے لدے پھندے یہ رضاکار لنڈے بازار میں پہنچتے ۔ حد بندی کی طرف کو بڑھتے تھے کہ پولیس گرفتار کر لیتی ۔

نافرمانی کی اس تحریک میں سینکڑوں ہزاروں رضاکار جیل میں چلے گئے۔ دہلی دروازے سے شہید گنج تک کا علاقہ حصۂ دیار کرم نہ رہا کوئے رقیباں بن گیا ۔

حد بندی کے قریب خار دار جنگلے میں کوتوال کی میز ہوتی جس کے گرد چار دو کرسیاں رکھی رہتیں ۔ کبھی کارروائی دیکھنے کو کپتان پولیس آتا کبھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کبھی فوج کا کوئی افسر ۔ بس وقت جیسے ٹھٹھر کر جم گیا تھا اور مسلمانوں کی زندگی سہم کر رک گئی تھی ۔ ان کی زندہ دلی کی اڑانوں کے تمام پر کٹ کر نیچے آن گرے تھے ۔

وکیلوں کے بار روموں میں گفتگوئیں چھڑ جاتیں ۔ کیا ہو گا ۔ جذبات کی تانت پر کب تک تنے رہو گے ۔ کیا ہونا چاہیئے ۔ انصاف کی بات کون کرے ۔ منصف کون بنے ۔

انگریز حکومت کے خلاف کے جذبات وہ جو ۱۹۲۲ء کے سیاسی خلفشار میں دب کر رہ گئے تھے انہوں نے ہوا جو پائی تو چنگاری سلگی ۔ محمد ابراہیم اعوان کو آقا جان نے ہمخیال بنا کر شہید گنج لیگل ڈیفنس کمیٹی کا میمورنڈم تیار کیا ۔ ہائی کورٹ کے ایک مسلمان ریٹائرڈ جج جسٹس ظفر علی کو ڈیفینس کمیٹی کا پریذیڈنٹ بنایا خود سیکرٹری اور ایم اے اعوان جائینٹ سیکرٹری بنے ۔ جسٹس ظفر علی کے مشورے سے ملک برکت علی سے جا کر ملے جو لاہور میں چوٹی کے مسلمان وکیل تھے ۔ یہ آقا جان کی ملک برکت علی سے پہلی ملاقات تھی ۔ ایک کو دوسرے کے پہچانتے میں دیر نہ لگی ۔ ایک کا سنجیدہ رویہ دوسرے کے پُرجوش لہجہ سے شناخت ہوا ۔ ایک کی فکر دوسرے کا خیال شیر اور شکر ہوتے چلے گئے ۔ خوشا حرفے کہ یہی ملاقات آگے کی گہری دوستی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ۔

بحیثیت کوتوال بھائی ذوالقرنین صبح سے شام تک مصروف رہتے ۔ تاریخ کا یہ بہت بڑا واقعہ تھا جو لاہور کے سے تاریخی شہر میں رونما ہوا ۔ مستزاد کوتوال کے مکان پر آن کر دو گولیاں لگیں ۔ ان سے کوئی مارا بھی جا سکتا تھا ۔ زخمی بھی ہو سکتا تھا ۔ میں الطاف آقا جان یہیں رہ رہے تھے ۔ اپنے بیٹوں کو دیکھنے کے لئے اباجی بٹالے سے لاہور آئے ۔

پولیس افسر کی سی دلچسپی کے ساتھ گولیوں کے نشان دیکھ کر بولے "معلوم ہوتا ہے کہ گولی چلاتے وقت گورے کا ہاتھ کانپ گیا۔"

ہم سب ناشتے پر بیٹھے تھے آقا جان نے کہا "اباجی لاہور کا سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور نیک کو قوال کون تھا؟"

سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور نیک نام کو قوال لاہور کا خان بہادر چوہدری رحمت اللہ خان تھا۔ خان بہادر کا خطاب پایا۔ حسنِ اخلاق پاسِ آشنائی اخلاص میں بے مثال ہیں شاہ محمد غوثؒ کے قبرستان میں ۱۹۱۴ء میں دفن ہوا۔ اللہ کی عنائتِ خاص ہے کہ اسوقت تک چار افراد بٹالے کے لاہور کے کو قوال رہے ہیں۔ نُور الٰہی اس کے بعد میں میرے بعد ذوالقرنین چوتھا مسانیاں کا سید علی حسین شاہ"

پھر اس طرف کو دیکھ کر کہنے لگے "بس یہ گول بر آمدہ مردانے کا اور وہ تین کمرے پرانی عمارت کا نشان رہ گئے ہیں"

"یہ کونسی عمارت ہوگی اباجی"؟ بھائی ذوالقرنین نے پوچھا۔

وہ بولے "اکبری منڈی اور اکبری دروازہ اکبر کے زمانے کی یادگار ہے۔ غلّہ آئے گا۔ بیوپاری پڑاؤ کریں گے۔ گھوڑوں کے سوداگران اتریں گے۔ اس مقصد کو یہ سرائے بنی۔ دہلی دروازے سے قریب اور اکبری سے ذرا ہٹ کر کیوں؟ اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔"

آقا جان نے کہا "بھائی جان یہ وہ سرائے نہ ہو جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ کپلنگ بچپن میں صبح سویرے شہر کی سڑکوں پر گھوما پھرا کرتا دہلی دروازے کی سرائے میں اترے مسافروں کو دیکھتا، گھوڑے کے سوداگروں سے باتیں کرتا"

"ہو سکتا ہے بالکل ہو سکتا ہے" بھائی ذوالقرنین نے آقا جان کی بات بڑھائی۔

اباجی بولے "تھا تو انگریز بادشاہ پر ہندوستان کو دیکھ کر پاگل ہوگیا۔ کپلنگ تو پھر بچہ تھا۔ پاکپتن شریف میں ساتویں محرم کو سخت ہجوم میں بہشتی دروازہ کھلتا۔ پولیس کی جان کو بن جاتی۔ تنگ راستہ پر ہر ایک کو آگے بڑھنے کی جلدی کوئی مر نہ جائے۔ حادثہ نہ ہو جائے۔ کپتان پولیس مسٹر پرائس نیا نیا آیا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگا "ام نے سُنا ہے یہ بہت بڑا ڈرگاہ اے" میں جی میں ہنسا یہ ڈرگاہ بھی اس نے اچھا کہا۔ وہ جگہ جہاں سے ڈر آئے۔ پھر بولا "ام کو اس بابت کچ بتاؤ" میں نے بابا فریدؒ کا قصہ سنایا۔ حیرت حیرانی اس کی آنکھوں میں آگئی بولا "ام ڈیوان ساب کو جو بابا فریڈؒ کے کھان ڈان سے اے ملنا مانگتا۔"

میں نے کہا بہشتی (۱) دروازے کی رونق بھی دیکھیں دیوان صاحب سے بھی ملیں۔ اُس نے ڈپٹی کمشنر کے

۱۔ پاکپتن شریف میں بابا فریدؒ شکر گنج کے مزار پر محرم کے دنوں میں سالانہ عرس کا میلہ ہوتا ہے۔ ایک تنگ راستہ محرم کی ساتویں کو کھولا جاتا ہے جسے بہشتی دروازہ کہتے ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ بہشتی دروازے سے جو گزرے بہشتی ہو جائے گا۔ صبح سے شام تک ایک ہجوم عقیدتمندوں کا اس راہ سے گزرتا ہے۔ کئی بے صبر عقیدتمند زخمی ہو جاتے کئی جان سے ہلاک ہو جایا کرتے تھے۔ اس لئے پولیس کو بہشتی دروازہ سے گزرنے پر خاص انتظام کرنا پڑتا تھا۔

کان سے جب یہ بات نکالی کہ وہ درگاہ دیکھنے کا خواہشمند ہے تو ڈپٹی کمشنر نے کہا ۔ وہ بھی چلے گا ۔ ضلع کے دونوں حاکم ۔ انگریز ڈپٹی کمشنر انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس ۔ میں سرکل انسپیکٹر ہمارے ساتھ پاکپٹن کا تھانیدار انچارج ۔ وردیاں کسی ہوئیں ۔ لوگوں کی بھیڑ ۔ شامیانے کے نیچے تخت پوش جس پر دیوان صاحب بیٹھے ہوئے ہاتھ میں تسبیح چہرے پر خبرو نظر کی کیفیت آنکھوں میں نخوت تکبر عاجزی کمتری فروتنی اور برتری ۔ ڈپٹی کمشنر کا سر تسلیم کچھ زیادہ ہی جھک گیا کہ اُس کی گود میں جاگرا ، ڈپٹی کمشنر پر انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس اُس پر میں اور میرے اوپر تھانیدار ۔ اندازہ لگاؤ ضلع کی ایڈمنسٹریشن پوری انتظامیہ پاکپٹن کے دیوان کی گود میں دھری پڑی ہے ۔ اتنی ذہانت کے باوجود پاگل نہیں تھا انگریز تو کیا تھا ۔ ہمارے ملک کے سحر اور جادو سے یہ کپلنگ کا بچہ کہاں بچا ہو گا ۔ دیوانوں کی طرح گلی محلوں میں گھومتا پھرتا ہو گا ۔ یہاں بھی آیا ہو گا ۔"

(جاری)

نیلے پربت

غلام الثقلین نقوی

اج سے پچاس سال پہلے اُسے اپنے باپ سے ورثے میں ایک جوڑی بیل ، ایک راس بھینس ، ایک دو ہل ، کچھ درانتیاں کُھرپے کسیاں ، ایک کچا مکان اور چار بیگھے زمین ملی تھی ۔

آج جب وہ بسترِ مرگ پر لیٹا ہوا تھا ، گاؤں سے باہر کھیتوں میں اُس کا پکا اور ہوادار مکان تھا جس کی ایک کھڑکی پربت کی طرف کھلتی تھی ۔ چھت سے لگا ہوا پنکھا پُھر پُھر چل رہا تھا ۔ جہاں کبھی رہٹ رُوں رُوں کرتا تھا ، وہاں اب ٹیوب ویل پھک پھک کر رہا تھا ۔ ایک کھیت میں ٹریکٹر چل رہا تھا اور ایک کٹے ہوئے کھیت کے کونے پر وہیٹ تھریشر پڑا تھا جو ابھی ابھی منوں گندم بھوسے سے الگ کر کے فارغ ہوا تھا ۔ چار بیگھے زمین پھیل کر ایک مربعے کے سرسبز و شاداب فارم کی شکل پا چکی تھی ۔

پَر یہ سب کچھ اس کا اپنا نہیں تھا ، اُس کے بیٹے کا تھا جو جیٹھ ہاڑ کی دھوپ ، پوہ ماگھ کے جاڑے اور روکھی سوکھی روٹی سے بیزار ہو کر گاؤں سے نکل گیا تھا اور جب آٹھ دس سال بعد واپس آیا تو موجودہ ثروت بھی اپنے ساتھ لے کر آیا تھا ۔

اِس قلب ہیئت پر وہ خوش تھا ، نہ ناخوش ۔ اس تبدیلی کو اس نے قبول کیا تھا ، نہ رَد ۔ یوں یہ تبدیلی آئی بھی آہستہ آہستہ تھی ۔ ایسا نہیں ہوا تھا کہ اچانک اُس کا ہاتھ ہل کی ہتّھی سے اُٹھ گیا ہو اور گورے اور لاکھے سے اس کا رابطہ آناً فاناً ٹوٹ گیا ہو لیکن ایک دن ایسا آیا جب تھان پر گورا اور لاکھا موجود نہیں تھے ۔ صرف بُھوری بندھی ہوئی تھی ۔

تب ایک عجیب سی حسرت اس کے دل میں سما گئی تھی ، ایک خلا سا جسے کوئی آسائش پُر نہ کر سکی تھی ۔ وہ مصروف زندگی جس کا وہ عادی تھا اور وہ بندھا ٹکا معمول جو صدیوں سے وراثت میں چلا آ رہا تھا ، بدلا تو گویا زمانہ بدل گیا ۔ آرام و آسائش کی یہ زندگی بہر حال محنت و مشقّت کی اُس زندگی سے بہتر تھی جس میں اُس کی عمر کا بیشتر حصہ گزر گیا تھا ۔

تاہم وہ اِس زندگی سے مانوس نہ ہو سکا ۔

صبح خیزی کی عادت نہ گئی ۔ صاحبِ فراش ہونے سے قبل وہ سارے گھر والوں سے پہلے جاگتا تھا ۔ صبح صبح وہ سب سے پہلا نغمہ صبحِ صادق کی نقیب چڑیا کی آواز میں سنتا جس کے متعلق وارث شاہ کہتے ہیں :-

چڑی چُوکدی نال ٹرے پاندی ، پییّاں دودھاں وِچ مدھانیاں نے

اِسے لوگ کَل چڑی کہتے ۔ اس کی آواز میں خوبصورتی تھی ، نہ اس کی شکل میں ۔ آواز ایسی جیسے جست کے کسی

ٹکڑے پر پتھر سے ٹھوکر لگائی جا رہی ہو ۔ پتھر دھات کی ملی جلی آواز اور رنگ کوئلے کی طرح سیاہ ، دُم جسم کی مناسبت سے بہت لمبی اور نوک پر دوشاخہ ۔ کسی شاخ پر بیٹھتی تو دُم متواتر ہلتی رہتی ۔ اس کے رنگ میں کوئل کے رنگ کی چمک تھی ، نہ آواز میں گلدم کی آواز کا رس لیکن یہ سحر خیز تھی اور یہی صفت اسے دوسری چڑیوں سے ممتاز کرتی ۔

"زندگی بھی تو ایک سفر ہے اور کلچڑی ہر روز راہی کو اس کے سفر کے لئے جگاتی ہے ۔" وہ ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ لیتا اور گویا سفر کا آغاز ہو جاتا ۔ اب وہ صرف اس کی 'چُوک' سے لطف اٹھاتا ۔ پھر وضو کرتا اور جب گاؤں کی طرف سے اذان کی آواز آتی تو نماز پڑھتا ۔ اُس وقت تک سارے پرندے بیدار ہو جاتے ۔ گرمی ہو یا سردی وہ کھیتوں کی سیر کو ضرور جاتا ۔ کھیتوں ہی میں وہ چڑھتے سورج کا نظارہ دیکھتا ۔ جب وہ ہل چلایا کرتا تھا تو ان دنوں سورج کے نکلنے اور ڈوبنے میں اسے کوئی خاص بات نظر نہ آتی تھی ۔ بس صبح ہوتی اور شام ہوتی اور عمر گزرتی چلی جاتی ۔

جب سے وہ ہل پنجالی سے فارغ ہوا تھا ، اسے طلوع ہوتے اور غروب ہوتے سورج کا منظر بہت اچھا لگنے لگا تھا ۔ وہ اس سے محظوظ ہوتا اور کبھی کبھار اس میں کھو بھی جاتا ۔ شاید اس لئے کہ یہ زندگی کا ایک استعارہ ہے کہ انسان کے اجتماعی لاشعور کا جزوِ لاینفک بن چکا ہے لیکن اسے اس فلسفے سے آگاہی نہیں تھی ۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کا گاؤں پہاڑوں کی تلہٹی میں واقع تھا ۔ اگرچہ پہاڑ یہاں سے بہت دور تھے لیکن سارا دن نظر آتے تھے ، کبھی دھندلے کبھی واضح ۔ پہاڑوں کا رنگ نیلا تھا اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر برف بھی تھی اور اس کی سفیدی میں شفق صبح و شام آگ لگا دیتی تھی اور سُرخ کرنوں کے تیر اور نیزے ریشم کے پھندنے بن کر دل میں آ لگتے تھے ۔

یہ پہاڑ ایک نامکمل نعل کی صورت میں مشرقی افق کی ایک چوتھائی پر محیط تھے اور مغرب میں مُڑتے ہی نعل ٹوٹ جاتی تھی ۔ سورج ایک چھوٹی سی پہاڑی کے پیچھے سے طلوع ہوتا تھا ۔ یہ پہاڑی سیاہ رنگ کی ایک دیوار کی مانند تھی کہ جس کے اوپر سے کرنوں کے تیر پھوٹتے اور جب اجالا ہوتا تو پہاڑی کا رنگ نیلا ہو جاتا اور مغرب میں ڈوبتا ہوا سورج درختوں کے مدوّر حاشیے کے پیچھے ایک عرصے تک جھلملاتا رہتا اور ڈوبتا تو درخت شفق کے رنگ میں ڈوب جاتے ۔

پھر وہ آہستہ آہستہ سیاہ پڑتے اور ہیولے سے بن جاتے اور آخر اندھیرے میں ڈوب جاتے ۔

لیکن اُسے زیادہ لذتِ نظارہ شمال کے نیلے پہاڑوں سے ملتی اور ایک حسرت بھی ۔ حسرت اس بات کی کہ کاش وہ ایک پکھیرو ہوتا اور نیلے پہاڑوں کی بلندیوں کو طے کرتا ہوا برف پوش چوٹی کو چُھو سکتا اور دیکھتا کہ اُس سے پرے کیا ہے ۔

جب کبھی یہ آرزو اُس کے دل میں آتی تو اُسے لگتا کہ یہ تو صدیوں سے اس گھر میں موجود تھی ، پنجرے میں بند ایک پرندے کی طرح ...... بچپن ہی سے وہ اس آرزو کو اپنا قیدی بنا چکا تھا یا اس آرزو نے اُسے اسیر کر لیا تھا ......

اُس کے گاؤں میں پرائمری سکول تھا اور اس نے چار جماعتیں یہیں پڑھی تھیں ۔ یہ سکول گاؤں کے شمال میں تھا اور سکول کے دونوں کمروں کی کھڑکیاں پربت کی طرف کھلتی تھیں اور وہ ٹاٹ پر پربت کی طرف منہ کر کے بیٹھتے اور

جب تک سکول لگا رہتا نیلے پہاڑ کبھی دھندلے اور کبھی صاف نظر آتے رہتے ۔

اُس کے ایک ہندو ماسٹر نے بتایا تھا کہ وہ چوٹی جہاں برف نظر آتی ہے وہاں دیوی کا ایک مندر ہے اور اُسی کے نام پر اُس کا نام دیوی پربت ہے ۔ مندر میں دیوی کا بُت ہے ، دُور دُور سے یاتری آتے ہیں اور دیوی کے درشن کرتے ہیں ۔

"آپ بھی کبھی دیوی کے درشن کو گئے تھے ؟" اُس نے پوچھا تھا ۔

"ہاں ! دیوی نے ایک بار کرپا کی تھی اور مجھے اپنے مندر میں بُلایا تھا ۔" ماسٹر جی نے جواب دیا ۔

اُس نے حیران ہو کر پُوچھا ۔ "دیوی نے بلایا تھا ؟"

"جب کوئی مسلمان حج کے لئے مکے مدینے جاتا ہے ، تو وہ اپنے آپ تو نہیں جاتا ، اللہ کریم اسے بلاتے ہیں ۔" ماسٹر جی بولے ۔

ماسٹر جی کا یہ فلسفہ اسے کچھ مشکل محسوس ہوا تو اس نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا ۔ "ماسٹر جی ! آپ یہاں سے پہلے سید پور گئے تھے؟ پھر وہاں سے جموں والی توی پار کی اور تب دریائے چناب عبور کیا ؟ اور بجوات کے علاقے میں سے گزر کر آپ نے پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا ؟"

"نہیں تو پگلے ! پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچنے کے راستے اتنے سیدھے نہیں ہوتے ۔ ہم انسان ہیں کوئی پنکھ پکھیرو تو نہیں کہ اڑتے اڑتے سیدھے چوٹی پر جا پہنچے ـــــ میں پہلے شہر گیا ۔ وہاں سے تندہ بس سروس کی ایک لاری پر سوار ہوا اور جموں پہنچا ۔ وہاں سے آگے ایک سڑک دیوی کے پربت کی طرف جاتی ہے ۔ اس پر پیدل سفر کیا تھا ۔ راستے میں دو پڑاؤ بھی کئے تھے ۔ دیوی کے مندر تک پہنچتے پہنچتے جوتیوں کے تلوے گھس گئے تھے اور پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے ۔"

ماسٹر جی خاموش ہوئے تو اس کا جی اداس سا ہو گیا اور مایوس بھی ـــــ سکول کی مغربی دیوار سے لگ کر وہ کچی سڑک سامنے موجود تھی جو شہر سے آتی تھی اور سید پور جاتی تھی اور اس سے آگے تویاں اور ندی نالے اور دریائے چناب تھا اور بجوات کا سرسبز علاقہ تھا لیکن وہ اس سڑک کی ہمراہی میں نیلے پربت کی چوٹی پر نہیں پہنچ سکتا تھا ۔

"دیکھو بچو ! منزل تک پہنچنے کے لئے کوئی راستہ سیدھا اور سپاٹ نہیں ہوتا ۔ ہر راستے میں موڑ ہوتے ہیں اور بہت سے پیچ و خم ۔ بیسیوں رکاوٹیں ہوتی ہیں ۔ ندی نالے ، جنگل اور کانٹے اور گلِ مراد تو چوٹی پر پہنچ کر ملتا ہے ۔"

چوتھی جماعت میں جو منشی جی اسے پڑھایا کرتے تھے ، وہ کبھی کبھار اس قسم کی مشکل باتیں کرتے تھے ـــــ کچھ زیادہ ہی پڑھے لکھے تھے ـــــ گُلِ مراد کے معنی نہ اسے اس وقت آتے تھے ، نہ اب ـــــ البتہ پہاڑ کی چوٹی ہمیشہ اس کے خوابوں میں رچی بسی رہی ـــــ ممکن ہے کہ اس چوٹی پر 'گلِ مراد' بھی ہو ـــــ گُلِ بکاؤلی کا نام تو

اس نے سنا تھا ۔ وہ کسی جھیل کے عین درمیان میں ایک پری بکاؤلی کے محل میں محفوظ تھا ۔۔۔۔ یہ کہانی عام مشہور تھی اور میاں محمد بخشؒ نے جو سیف الملوک لکھی ہے ، اس کا ہر بیت جھیل سیف الملوک تک لے جاتا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ جھیل بھی ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے ۔۔۔۔ تو گل بکاؤلی اور گلِ مراد ایک ہی چیز ہیں کہ پہاڑ کی چوٹی پر ملتے ہیں ۔۔۔۔ میاں محمدؒ کی سیف الملوک کی لَے تو دل میں کُھب جاتی ہے کہ بندے کو مٹی میں مل کر مٹی نہیں بننے دیتی ۔۔۔۔ کبھی کبھار اُس کے پاؤں زمین سے اُکھڑ جاتے ہیں اور بندہ آسمان پر اُڑنے لگتا ہے ۔۔۔

جب اس نے چوتھی کا امتحان پاس کیا تو منشی جی نے کہا "محمد عالم ! چلو میں تمہیں چھاؤنی کے سکول میں داخل کرا آؤں ۔" چھاؤنی گاؤں سے دکھن کی طرف تھی ۔ چند قدموں کے فاصلے پر ۔ صرف نالہ پلکھو کو عبور کرنا پڑتا تھا جو برسات کے دنوں کے علاوہ سارا سال سوکھا رہتا تھا یا اس میں ٹخنوں تک پانی بہتا تھا ۔۔۔۔ اور چھاؤنی کی پہلی پکی سڑک صرف آدھ میل کے فاصلے پر تھی ۔ صاف ستھری سڑک کہ جس کے دورویہ سفیدے کے درخت تھے جیسے سنتری کھڑے ہوں ۔ سید پور سے آنے والی کچی سڑک یہاں آکر پکی ہو جاتی تھی ۔ یہ سڑک کچی ضرور تھی لیکن اس کے دونوں کناروں پر شیشم کے گھنی چھاؤں والے درخت تھے اور برسات میں سڑک پر سبز گھاس کا فرش بچھ جاتا تھا اور بہار کے موسم میں بھی ۔ تقریباً سارا سال گھاس سبز رہتی ۔ جیٹھ ہاڑ میں سوکھ جاتی لیکن جونہی بارش کا پہلا چھینٹا پڑتا تروتازہ ہو جاتی ۔ اُس زمانے میں پلکھو پر پُل تھا ، نہ سڑک پکی ہوئی تھی ۔ جونہی سڑک پر اینٹیں لگیں ، اس کے دورویہ درخت اور گھاس غائب ہو گئے ۔ اصل میں بات یہ ہوئی کہ گھاس کو اینٹوں نے دبالیا اور شیشم کے درختوں کو ڈسٹرکٹ بورڈ کے ایک چیرمین بلکہ چور مین کی ہوس کھا گئی ۔۔۔۔ شیشم کو بھی اور اس کے سائے کو بھی ۔۔۔۔ اور شیشم کے جو چند نوخیز پودے بچے ، انہیں گاؤں کے چھوٹے چور کھا گئے ۔۔۔۔ اب سڑک پکی ہے اور پلکھو پر پُل بھی ہے ۔ پر وہ ہریالی کہاں گئی جو زمین کا ننگ ڈھانپتی تھی اور تھکی تھکی آنکھوں پر ملائی کا پھاہا رکھتی تھی اور وہ سائے کہاں گئے جو نیند بن کر آنکھوں میں اُتر جاتے تھے ۔۔۔۔

پھر ہوس کی آری نے پلکھو کے دونوں کناروں کو بھی لُنج مُنج کر دیا ۔

وہ پلکھو پار کر کے چھاؤنی میں داخل نہ ہو سکا ۔

اُس کے باپ نے کہا "محمد عالم ! جن کے پاس چار بیگھے زمین ہو، وہ پلکھو سے اِدھر ہی رہتے ہیں ۔"

تب اس نے اپنی نظر دیوی کے پربت پر جمادی ۔ کیا پتہ اس پہاڑی کے اوپر بھی کوئی جھیل ہو کہ جہاں کوئی پری گُلِ مراد کی حفاظت کر رہی ہو ۔ اگرچہ ہل اور درانتی سے اس کا رابطہ کم سنی ہی سے تھا تاہم جب پڑھائی چھٹی تو ہل اور درانتی نے اسے دھرتی کا قیدی بنا دیا ۔ پاؤں دھرتی سے چمٹے رہے لیکن نظر آسمان کی طرف رہی کیونکہ وہ پربت کا آدمی تھا ۔

اور دکھن میں چھاؤنی سے آگے شہر تھا ۔ بڑا آباد شہر کہ جس کے بازاروں میں دنیا جہان کا مال تھا ۔ اس کے

گاؤں کے کھتری برج لال کی دکان میں بھی الّم غلّم بہت سامان بھرا ہوا تھا ، ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی ۔ جب کسان کا غلہ ختم ہو جاتا تو وہی غلہ برج لال کی دکان میں موجود ہوتا لیکن ! اسے خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسہ نہ ہوتا ۔ جب تک نئی فصل نہ آتی ۔ وہ برج لال سے ادھار غلہ لیتا اور پھر نئی فصل پر اسے ڈیڑھ گنا ادا کرنا پڑتا ۔ عجیب چکر تھا ! ہونا یہ چاہیئے تھا کہ اس کی نظر دکھن کی طرف ہوتی ۔ وہ چھاؤنی سے شہر پہنچتا ۔ وہاں سے ریل گاڑی یا لاری پر اس سے آگے بڑے بڑے شہروں میں جاتا ۔ کیا پتہ وہ برج لال کے ڈیڑھ گنا لالچ کے پنجے سے آزادی حاصل کر لیتا لیکن جن کی نظر پربت پر ہو ، وہ ہمیشہ برج لال کے پاس گروی رہتے ہیں اور برج لال کے جانے کے بعد کسی لال دین کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں ۔

اُس کے بیٹے محمد فاضل نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا ۔ اس نے ہمیشہ پربت کی طرف پشت رکھی اور دکھن کی طرف منہ ۔۔۔۔ پھر وہ چھاؤنی سے شہر پہنچا ۔۔۔۔ اس شہر سے اور بڑے شہر میں ۔۔۔۔ پھر اس سے بھی بڑے شہر میں اور وہاں سے وہ سمندر کی لہروں پر سوار ہوا اور ان ملکوں میں پہنچا جن کی ریت غلے کی بجائے دولت پیدا کرتی ہے ۔ بڑی زبردست مشقت کے لمبے دنوں اور راتوں کی یاد لے کر وہ گاؤں واپس آیا تو اسی ریت میں سے ڈھیروں دولت رول کر لایا تھا ۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی ماں جدائی کے ان لمبے سالوں کی بھینٹ چڑھ گئی تھی ۔

لیکن اب اس کے کھیت آباد ہیں ۔ اُن کی مینڈھوں پر پاپلر کے راست قد چھریرے پودوں کا سایہ ہے ۔۔۔۔ پاپلر کا سایہ بہت مختصر ہوتا ہے ۔ وہ شیشم ، برنے ، سرس بکائن ، نیم ، پیپل یا بڑ والی بات کہاں کہ سائے کے ٹھنڈے شامیانے تلے ایک دنیا آباد ہو جائے ۔۔۔۔ جب رہٹ چلتا تھا تو اس پر ایک سرس ، ایک برنے اور ایک نیم کا سایہ تھا ۔ ذرا فاصلے پر ایک جامن بھی تھا اور ایک کاٹھے آم کا درخت بھی ۔ گرمیوں کی دوپہریں ان کے نیچے بسر ہوتیں ۔ دوپہریں کیا تھیں ، موج میلہ تھیں ۔ کنویں پر اس کے بہت سے شریک تھے ۔ دوپہر کو میلہ لگ جاتا ۔ بڑی رونق ہوتی ۔ جھلنگا سی چارپائیاں بچھی ہوتیں یا پرال اور پھٹی پرانی چٹائییں کہ جن پر لیٹ کر دوپہر گزار لیتے ۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں ۔ چغلی بخیلی کا دور چلتا ۔ کبھی کبھی دوپہر کی لُو لہو کو گرم بھی کر دیتی اور گالی گلوچ بھی ہو جاتی لیکن ڈانگ سوٹے کی نوبت نہ آتی ۔ برسات میں جامن پکتے تو درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے ڈر لگتا کہ ابھی کوئی پکا ہوا جامن سر پر گر کر پھٹ جائے گا ۔ آم میں ٹپکا لگتا تو سبھی مل کر کھاتے ۔

پھر اس کا بیٹا جو دولت کما کر لایا ، وہ سارے سائے ، سارے رس بھرے جامن ، زرد زرد کاٹھے آم کھا گئی اور ان کے ساتھ رشتوں ناتوں کو بھی ۔ بیگھہ دو بیگھہ کی ملکیتیں بھی کیا ہوتی ہیں ۔ دولت کا جن انہیں ایک ایک کر کے ہڑپ کر گیا ۔۔۔۔ آہستہ آہستہ کنویں کی منڈی کو ڈنڈا لگ گیا ۔ ٹیوب ویل کا پانی کتنا ٹھنڈا ہوتا ہے لیکن اس کی دوپہر کتنی سونی اور سنسان ہوتی ہے ۔ اصل میں سایہ بہت غریب پرور ہوتا ہے ، سائے کو سر سے ہٹا دو تو دھوپ اور لُو ہی باقی رہ جاتی ہے ۔

پاپلر کا پودا دیکھنے میں اچھا لگتا ہے ، سیدھے قد کا چھریرا سا گھبرو ۔ چھیلا اور بانکا پر سایہ بہت خسیس ۔ اُس کے بیٹے نے جب برنے ، سرس ، آم ، جامن اور نیم کے درخت کاٹے تو اس نے کہا تھا "محمد فاضل ! یہ درخت جو تو نے کٹوا دیئے ہیں ، یہ تو جوگی اور درویش تھے ۔ دادا پڑدادا کے زمانے سے ہمیں سایہ اور پھل دے رہے تھے اور ان کا ہاتھ ہمارے سر پر تھا ۔ میں نے زندگی کی دو پہریں ان کے سائے میں گزاریں اور انہوں نے مجھے تسلی دی ، چپکے چپکے دعائیں پڑھ کر مجھ پر دم کیں اور میرے دُکھ درد دُور ہو گئے ۔۔۔۔ اور اب تو میں بے آسرا اور اکیلا ہو کر رہ گیا ہوں ۔"

"میں یہاں پاپلر لگاؤں گا ۔ دو تین سالوں میں چھل پہل ہو جائے گی ابا !" محمد فاضل بولا ۔

"لیکن جب تک وہ جوگی اور درویش کی عمر کو پہنچیں گے ، مری گرم دو پہریں کہاں گزریں گی ؟"

"ابا! پاپلر سائے کے لئے نہیں لگتا ، یہ نفع کے لئے لگتا ہے ۔ وہ زمانے گئے جب دادا ایک درخت لگاتا تھا اور پوتے اس کا پھل کھاتے تھے ۔ پاپلر پھل نہیں دیتا ، نوٹ دیتا ہے ۔" محمد فاضل نے کہا ۔

"پر میری گرم دو پہروں کا کیا بنے گا فاضل ؟"

"وہ کمرے میں پنکھے کے نیچے گزریں گی ۔" اس نے کہا تھا ۔

اور یہ بہت گرم دن تھا ۔ وہ ایک عرصے سے صاحبِ فراش تھا ۔ کمرہ گرم تھا ۔ پنکھا چل رہا تھا لیکن اس کی ہوا میں خنکی نہیں تھی ۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اسے ہلکا ہلکا بخار تھا اور اس کی تپش اندر ہی اندر سینے کو جلا رہی تھی ۔ ڈاکٹر نے جو دوائیاں دی تھیں وہ اور بھی زیادہ گرم تھیں ۔ کھڑکی کھلی تھی اور گرم چلچلاتی دھوپ کی گرد آلود فضا میں پہاڑوں کی نیلاہٹ بہت دھندلا گئی تھی ۔ ممکن ہے کہ اس کی آنکھ کا قصور بھی ہو ۔ نظر بھی تو کمزور ہو گئی تھی ۔ کبھی اس کی آنکھ اڑتے پرندے کے پر گن لیتی تھی اور اب وہ کوّے اور کوئل میں پہچان نہیں کر سکتی تھی ۔ جب آم اور جامن کے درخت سلامت تھے تو کوئل بھی گایا کرتی تھی ۔

اب تو برسات میں کہیں بہت دور سے اُس کی آواز آتی ہے ۔

پھر دل میں کئی بھولی بسری خواہشیں جاگ اُٹھتی ہیں ۔

اور سب سے بڑی خواہش تو اس نیلے پربت تک پرواز کی تھی کہ جس کی چوٹی پر صبح و شام برف کو آگ لگ جاتی ہے اور یہ خواہش پوری نہ ہو سکی ۔۔۔۔ محمد فاضل نے پوچھا "ابا ! تمہارے دل میں کوئی خواہش ہو تو کہو ۔ میں اب اس قابل ہوں کہ تمہاری بڑی سے بڑی خواہش پوری کر سکوں ۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا ۔ پھر اس نے کھلی کھڑکی سے نظر آنے والے دُھندلے نیلے پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا اور مسکرا کر کہا "کیا مجھے وہاں لے چلو گے ؟"

"کہاں ؟" محمد فاضل نے حیران ہو کر پوچھا ۔

"دیوی کے پربت پر ۔۔۔۔ جس کی چوٹی پر برف پڑتی ہے ۔۔۔۔ تم نے بھی دیکھی ہو گی؟" وہ بولا ۔

نہیں تو ۔۔۔۔" محمد فاضل نے جواب دیا ۔

"ٹھیک ہے ۔۔۔۔ تمہارا رخ دکھن کی طرف رہا ۔۔۔۔ اور میں ساری حیاتی پربت کی طرف دیکھتا رہا ۔۔۔۔ جو تم نے دیکھا، اسے میں نے نہ دیکھا اور جو میں نے دیکھا اسے تم نے نہ دیکھا،" وہ بولا اور نقاہت نے اس کی آواز کو اتنا ضعیف کر دیا کہ وہ سرگوشی میں بدل گئی ۔ محمد فاضل کو اس کی باتیں معمہ معلوم ہوئیں ۔ وہ دیر تک سوچتا رہا کہ ابا کی باتوں کا مطلب کیا ہے ۔ اچانک کھلی کھڑکی سے چلچلاتی دھوپ نے اندر جھانکا اور پنکھے نے گرم لُو کا ایک بھرپور سانس اس کے منہ پر پھینکا، تو اس کے ذہن میں ایک روشنی سی ہوئی ۔

"میں سمجھا ۔ تم پہاڑ پر جانا چاہتے ہو ابا! یہ تم نے مجھ سے پہلے کیوں نہ کہا ۔ میں نے سُنا ہے کہ مری کے قریب ایک ہسپتال ہے اور تمہارے جیسے مریضوں کا علاج وہاں ہوتا ہے ۔ میں آج ہی شہر جا کر پتہ لگاتا ہوں ۔"

شہر میں وہ اس ڈاکٹر سے ملا جو اس کے باپ کا علاج کر رہا تھا ۔ اس نے اپنے قیافے کا ذکر کیا تو ڈاکٹر بہت خوش ہوا ۔ کہنے لگا "چوہدری محمد فاضل! میں تمہیں رقعہ لکھ دوں گا ۔ میری سفارش سے تمہارے باپ کو سالمی سینی ٹوریم میں جگہ ضرور مل جائے گی ۔ اگر بابا تین مہینے گرمیوں کے وہاں گزار آئے تو اس کے بچنے کی بہت امید ہے ۔"

"وہاں کتنا خرچ آئے گا؟" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا ۔

ڈاکٹر نے رف سا تخمینہ لگا کر رقم بتلائی تو محمد فاضل کا چہرہ اتر گیا ۔۔۔۔ اتنی رقم! ۔۔۔۔ اس نے سوچا ۔۔۔۔ صرف تین مہینے کا قیام ۔۔۔۔ کیا ابا کو صحت حاصل ہو جائے گی ۔۔۔۔ اس کا کیا یقین ۔۔۔۔ یوں بھی ابا اپنی عمر پوری کر چکا ہے ۔۔۔۔ اتنی رقم اس کے پاس موجود تو ہے بلکہ دوگنی تگنی لیکن کنوئیں کے شراکت دار کے اُس کھیت کا کیا بنے گا جسے وہ بڑی مشکل سے بیچنے پر آمادہ ہوا ہے اور جس کے بغیر اس کا فارم مکمل نہیں ہوتا اور وہ بلا شرکت غیرے کنوئیں کی پوری زمین کا مالک نہیں بن سکتا ۔۔۔۔ میں اپنے اکلوتے بیٹے محمد اقبال کو ایک مکمل فارم وراثت میں دینا چاہتا ہوں ۔۔۔۔

میں اسی کمرے میں ابا کو کولر لگوا دوں گا تاکہ اس کی زندگی کے آخری دن آرام و سکون سے گزریں ۔۔۔۔ اس خیال سے اس کا ضمیر کچھ کچھ مطمئن سا ہو گیا اگرچہ ایک کانٹا سا پھر بھی چبھتا رہا ۔۔۔۔

ابھی وہ شہر میں ٹریکٹر کے لئے کچھ نئے پُرزے خرید رہا تھا کہ پہلے ہلکی سی اندھیری آئی، پھر بادل چھائے اور موسم میں خنکی پیدا ہو گئی ۔

دکاندار نے کہا "چوہدری! جب بھی تم شہر آتے ہو، ٹریکٹر کے لئے کوئی نہ کوئی نیا پُرزہ ضرور خریدتے ہو ۔"

"مستری جی! میری کوشش ہے کہ جہاں تک ہو سکے ٹریکٹر جوان رہے ۔ نئے پرزوں سے اُسے نئی زندگی مل جاتی ہے ۔"

"لیکن کب تک چوہدری؟ بڑھاپا آخر بڑھاپا ہوتا ہے ۔"

یکایک اسے کانٹے کی چبھن محسوس ہوئی ۔

اُس نے پوچھا "مستری جی ! کچھ معلوم ہے وہ کمرہ ٹھنڈا کرنے والا کُولر کہاں سے ملے گا ؟"

مستری نے اسے دکان کا پتہ بتایا ۔ پھر پوچھا "چوہدری ! کولر کس کے لئے لو گے ؟ ـ ـ ـ ـ اپنے لئے ؟ ـ ـ ـ ـ یاد رکھو اگر مستری اور کسان کُولروں کے عادی ہو گئے تو چلچلاتی دھوپ کا مقابلہ کون کرے گا ؟"

"نہیں مستری ! یہ کولر اپنے لئے نہیں ابا کے لئے خرید رہا ہوں ۔"

"شاباش چوہدری ! خدا ہر بیٹے کو تیرے جیسا بنائے !"

عین اس لمحے ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا آیا کہ جس میں ننھی ننھی بوندوں کی نمی بھی تھی ۔ وہ اس چوراہے میں رک گیا جہاں ایک طرف ٹانگوں کا اڈا تھا اور دوسری طرف کے بازار میں کولروں کی دکان تھی ۔ بوندوں میں کچھ تیزی آئی تو اس نے ایک دکان کے چھجے تلے پناہ لے لی ۔ پٹاک پٹاک بڑے بڑے چھینٹے پڑنے لگے ۔ تپتی سڑک پر قُرص سے بننے اور مٹنے لگے اور گرم گرم باس اُٹھنے لگی ۔ گاؤں میں یہی چھینٹے پڑتے تو مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی ۔ تب بادل پھٹ پڑا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی ۔ بازاروں میں گھٹنے گھٹنے پانی بہنے لگا ۔

"کھیتوں میں تو جل تھل ہو گیا ہو گا ۔" اس نے سوچا ۔ "واہ وا ! برسات شروع ہو گئی ! یہ تو ہاڑ کا پہل چھلا ہے ۔" جب بادل تھما تو اس کے پاؤں خود بخود اڈے کی طرف بڑھ گئے ۔ "برسات میں کُولر کی بھلا کیا ضرورت ہے ۔ حبس پیدا کرتا ہے ۔ پنکھا کافی رہے گا ۔ ہوا میں نمی ہو تو پنکھے کی ہوا ٹھنڈی لگتی ہے ۔" تانگے میں بیٹھے ہوئے یہی سوچ اس کے دل و دماغ پر حاوی رہی حتیٰ کہ پلکھو کا پُل آگیا ۔

گاؤں کی ہر چیز اُسے دُھلی دُھلی نظر آئی ۔ پیاس کے مارے کھیتوں نے جی بھر کر پانی پی لیا تھا ۔ شٹالے اور برسیم کے کھیتوں کی سبزی نکھر آئی تھی ۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور فضا میں خنکی تھی ورنہ زمین بھڑاس نکالتی تو روئیں روئیں سے پسینہ پُھوٹ بہتا ۔

اُس کی نگاہ چونکہ پربت کی طرف نہیں اُٹھتی تھی ، اس لئے وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ نیلم کی دیواریں دُھل کر گاؤں سے اور قریب آگئی ہیں اور وہ پہاڑ جس پر کسی دیوی کا مندر تھا ، اس کی چوٹی پر صدیوں سے جمی برف کی سفیدی بھی دھل سی گئی تھی اور اس سے اوپر آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا ۔

وہ اپنے فارم کی سیر کرتا ہوا گھر پہنچا تو بہت خوش تھا اور ضمیر میں جو کانٹا چبھا ہوا تھا ، اب اُس کی ذرہ بھر خلش باقی نہیں رہی تھی ۔

اُس نے بیوی سے پوچھا "ابا کا کیا حال ہے ؟"

"بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں ۔ ابھی ابھی محمد اقبال ان کے کمرے میں گیا تھا تو وہ پربت کی طرف کروٹ بدل کر آرام کر رہے تھے ۔"

"میں اُن کا آرام خراب نہیں کرنا چاہتا ۔" وہ بولا ۔

اُس نے اچھا کیا کہ پربت کی طرف دیکھنے والے کے آرام میں مخل نہ ہوا کیونکہ بچپن ہی سے جس آرزو کو اس نے قیدی بنالیا تھا یا جس آرزو نے اسے اسیر کر لیا تھا وہ قید سے چُھٹ کر ، اُسے بھی قید سے آزاد کر گئی تھی ۔۔۔ ڈھلے ڈھلے نیلے آسمان کے نیچے وہ ایک سبک پرواز پرندے کی طرح پرواز کر رہی تھی ۔۔۔ وہ کئی ندی نالوں ، تویوں اور ٹھنڈے یخ دریائے چناب کے اوپر سے اُڑ کر پربت کے دامن میں پہنچی اور پھر چوٹی کی طرف مائل پرواز ہو گئی اور نیلے پہاڑوں کی بلندیوں کو طے کرنے لگی اور برف پوش چوٹی کو چُھو کر نیچے کی سر سبز وادی میں اُترنے لگی جہاں دیو ہیکل درخت آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور قدم قدم پر چشمے اُبل رہے تھے اور چھوٹی چھوٹی ندیاں رواں دواں تھیں ۔ کہیں خنک سائے تھے اور کہیں نیم گرم دھوپ کی سفید چادریں بچھی تھیں اور ایک نیلی جھیل تھی کہ جس کے کنارے سرو کے درختوں کا حاشیہ تھا اور اِن میں چھپی سون چڑیاں اُس کے استقبال میں نغمہ خواں ہو گئی تھیں ۔۔۔ کیا ایک اور سیف الملوک نے منزل پر پہنچ کر گُلِ مراد پالیا تھا ؟ ۔۔۔ کون جانے ؟

کیونکہ آہستہ آہستہ بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے جھانکنے والا خواب اُس کے سوا کوئی بھی نہ دیکھ سکا تھا !

بیگم پورہ لاہور اور اس کے اطراف

پروفیسر محمد اسلم

گلابی باغ سے شالامار باغ کی سمت چلیں تو جرنیلی سڑک اور ویسٹ مین روڈ کے مقام اتصال پر سڑک کے درمیان ایک نئے تعمیر شدہ مقبرے کی عمارت نظر آتی ہے۔ جب ۱۹۷۶ء میں میاں محمد دین کلیم مرحوم نے مدینۃ الاولیاء کے عنوان سے لاہور کے بزرگوں کا ایک تذکرہ مرتب کیا تو اس وقت یہاں ایک چبوترے پر شکستہ سی قبر موجود تھی۔ چراغدان سے تیل گرنے کے سبب قبر کے سرہانے نصب کتبہ اس حد تک خراب ہو چکا تھا کہ وہ صاحبِ قبر کا سنِ وفات بھی نہ پڑھ سکے۔ راقم الحروف نے ۱۹۵۰ء سے قبل اس مزار کو متعدد بار دیکھا۔ مزار کی حالت اس وقت بھی قابل رحم تھی اور اس زمانے میں وہاں ایک تختی نصب تھی جس پر مزار کے متولی جمال الدین صدیقی (برادر علامہ علاء الدین صدیقی) کا نام درج تھا۔ باغبانپورہ سے دہلی دروازے کی طرف آتے جاتے وقت تانگہ بان چند سکے بطور نذر مزار پر پھینک جاتے تھے۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ مغلوں کے آخری دَور حکومت میں مزار اچھی حالت میں ہو گا اور اس پر گنبد بھی ہو گا۔ جب سکھوں کے دَور حکومت میں اس علاقے میں سردار گلاب سنگھ پاؤونڈیہ کی چھاؤنی مقرر ہوئی تو اس نے اس نواح میں موجود بہت سی عمارتوں کو گرا کر ان کی اینٹیں چھاؤنی کی تعمیر میں صرف کر لیں۔ اب دوبارہ ایک شاندار مقبرہ تعمیر ہو گیا ہے۔ صاحب مزار کا نام تذکروں میں سید عبدالکریمؒ مرقوم ہے اور موصوف سہروردی سلسلے کے بزرگ تھے۔ اس نواح میں اور بھی کئی بزرگوں کے مزارات ہیں جن کا تعلق سہروردی سلسلۂ تصوف کے ساتھ تھا۔

ویسٹ مین روڈ پر ریلوے ورکشاپس کی جانب چلیں تو ریلوے جنرل اسٹور اور لوکو ورکشاپ کے درمیان ایک سرنگ نما راستہ نظر آتا ہے۔ قریباً ایک فرلانگ فاصلہ طے کرنے کے بعد دو راستے ہو جاتے ہیں۔ اگر سیدھے چلتے جائیں تو امیر الامراء علی مردان خان کے مقبرے تک پہنچ جاتے ہیں اور بائیں جانب مُڑ جائیں تو حضرت حامد قاری سہروردیؒ کے مزار مبارک تک جا پہنچتے ہیں ۔ جب ۱۹۰۶ء میں انگریزوں نے جنرل اسٹور اور لوکو ورکشاپ تعمیر کئے تو ان مزارات تک جانے کے لئے راستہ بنا دیا۔

حضرت حامد قاریؒ کے مزار کے احاطے میں ان کے مزار پُرانوار کے علاوہ اُن کے مرید خاص اور جانشین حافظ جان محمد، حافظ رحمت اللہ، محمد بخش صحاف اور جمال الدین صدیقی کی بھی قبریں ہیں۔ محمد بخش صحاف علامہ علاءالدین صدیقی کے پرداد اور مؤرخ لاہور مولوی نور احمد چشتی کے نانا تھے اور کشمیری بازار میں ان کی کتابوں کی دکان تھی۔ ان کی دکان میں قرآن پاک کے نادر قلمی نسخے موجود تھے جن کی کتابت پر ہزاروں روپے صرف ہوئے تھے۔ چشتی نے ایک ایسے ہی نادر مخطوطے کا ذکر کیا ہے جس پر اُس سستے زمانے میں ساٹھ ہزار روپے لاگت آئی تھی۔

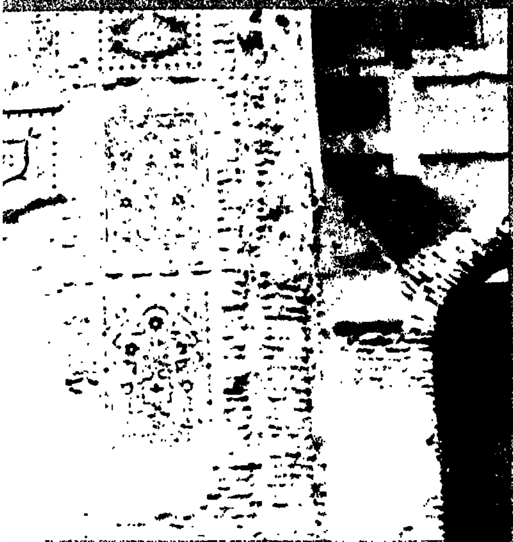
درگاہ کے احاطے میں قبروں کے علاوہ ایک مسجد، کنواں اور مجاوروں کے قیام کے لئے حجرے موجود ہیں ۔ کنوئیں کی مرمت موجودہ صدی کے آغاز میں علامہ موصوف کے والدِ بزرگوار مولوی فیروزالدین صدیقی نے کروائی تھی اور کنوئیں پر ایک پتھر نصب کروایا تھا۔ جس پر سنہ مرمت درج ہے۔ چند سال پہلے تک یہ مسجد بڑی شکستہ حالت میں تھی، اب اس کی مرمت کروادی گئی ہے اور ایک خادم بھی وہاں رہنے لگا ہے۔

حضرت حامد قاریؒ آخری مغل دَور میں ایک نامور قاری اور شیخ طریقت تھے۔ علامہ علاءالدین صدیقی کے جدّ امجد حافظ جان محمد ان کے مُرید خاص تھے۔ انہی کی اولاد حضرت حامد قاریؒ کے مزار کی متولی بنی۔ قاریؒ صاحب نے یہاں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جہاں قرآن پاک کی قرأت اور تجوید سکھائی جاتی تھی ۔ یہ محض حسن اتفاق نہیں کہ اسی نواح میں حضرت اسمعیل سہروردی المعروف بہ میاں وڈاؒ کا مدرسہ تھا جہاں قرآن پاک حفظ کروایا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ درس میاں وڈا میں آج بھی جاری ہے۔ حضرت حامد قاریؒ کے دو صد تلامذہ ابوالحسن تربتی کے مقبرے پر متعین تھے جہاں وہ رات دن باری باری تلاوت کرتے رہتے تھے اور یہ سلسلہ کسی وقت بھی منقطع نہ ہوتا تھا۔

حامد قاریؒ کی درگاہ سے جانب شمال ایک محلہ آباد تھا جو "تانگری محلہ" کہلاتا تھا۔ اب اس کا نام و نشان نہیں ملتا۔ شاید یہ وہی جگہ ہو جہاں اب ریلوے جنرل اسٹور اور اس کے باہر گندے پانی کا تالاب ہے جس کے قریب اب سبزی منڈی بن گئی ہے۔

جیسا میں نے پہلے عرض کیا اگر حضرت حامد قاریؒ کے مزار کی جانب سے مڑنے کی بجائے سیدھا راستہ اختیار کریں تو امیر الامرأ علی مردان خان کے مقبرے میں جا نکلتے ہیں۔ علی مردان خان نسلاً کرد اور وطناً ایرانی تھا۔ اس کے والد گنج علی خان نے شاہ عباس صفوی (م ۱۶۲۹ء) کی دل و جان کے ساتھ خدمت کرکے خان کا خطاب حاصل کیا۔ وہ تیس سال تک کرمان کا صوبیدار رہا۔ جہانگیر کے عہد میں جب شاہ عباس نے ۱۶۲۲ء میں قندھار پر قبضہ کیا تو گنج علی خان کو وہاں کا قلعدار مقرر کیا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے چھت سے گر کر وفات پائی تو شاہ نے اس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے فرزند علی مردان بیگ کو خان کا خطاب دے کر قندھار کا صوبیدار مقرر کیا۔

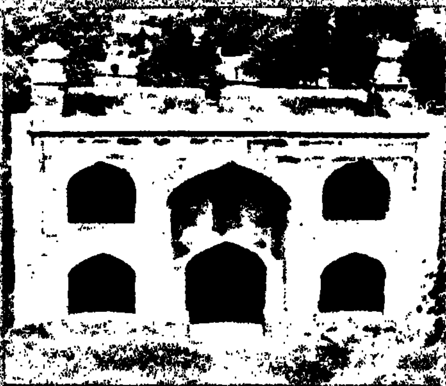
شاہ عباس نے اُسی زمانے میں کئی قدیم ملازموں کو ملازمت سے برطرف کر دیا تو علی مردان خان کو بھی خطرہ لاحق ہوا۔ اس نے شاہی عتاب سے بچنے کی غرض سے کابل کے مغل گورنر کے ذریعے شاہجہان سے رابطہ قائم کرکے قندھار مغلوں کے حوالے کر دیا اور خود لاہور جاکر شاہجہان سے ملا۔ قدر شناس بادشاہ نے اُسے شش ہزاری منصب عطا کرکے کشمیر کا صوبیدار مقرر کیا۔ کچھ عرصہ بعد اُسے امیر الامرأ کا خطاب ، پنجاب کی صوبیداری اور ہفت ہزاری منصب عطا کئے ۔ علی مردان خان نے بلخ و بدخشاں کے معرکوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ۔ علی مردان خان دہلی سے کشمیر جاتے ہوئے ۴ اپریل ۱۶۵۷ء کو دریائے ستلج کے مشہور پتن ماچھیواڑہ کے مقام پر فوت ہوگیا۔ حسبِ وصیت اس کی میّت لاہور لے جاکر اس کی والدہ کے پہلو میں دفن کر دی گئی ۔





مقبرہ علی مردان خان

مردان خان کے مقبرے کی اندرونی







علی مردان خان نے موجودہ ریلوے اسٹیشن کے قریب نولکھا باغ اور شہرہ آفاق شالامار باغ تعمیر کئے۔ ان باغات کو سیراب کرنے کے لئے اس نے دریائے راوی سے ایک نہر نکالی۔ مآثر الامرأ کا مصنف شاہنواز خان لکھتا ہے کہ اس نہر سے شہر کی رونق میں اضافہ ہو گیا۔ لاہور کے گرد و نواح میں میلوں تک مغل امرأ کے باغات کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اس نہر نے ان باغات کو نئی زندگی بخش دی۔

انگریزی عہد کے آغاز میں میاں محمد سلطان ٹھیکیدار نے اسی نہر میں سے مغل پورہ کے قریب ایک نہر نکالی جو ریلوے ورکشاپس کے پاس سے گزرتی ہوئی ریلوے انجن شیڈ کی حدود میں داخل ہو جاتی تھی۔ وہاں سے یہ نہر واشنگ لائن کے قریب ریلوے یارڈ کے نیچے سے بہتی ہوئی برٹ انسٹیٹیوٹ ، کارسن انسٹیٹیوٹ اور ڈی ایس آفس کے قریب سے گزرتی ہوئی ریلوے اسٹیشن کے چوک تک پہنچ جاتی تھی۔ وہاں جا کر یہ نہر زیر زمین ہو جاتی تھی اور پھر میلارام کے تالاب کے پاس، جہاں اب نوری مسجد، پارک وے ہوٹل اور ایشیا ہوٹل کی فلک بوس عمارتیں کھڑی ہیں ، ظاہر ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد آسٹریلین مسجد کے پاس سے گزرتی ہوئی رام گلی کے عقب سے ہوتی ہوئی سر کلر روڈ پر ، جہاں اب گڈز فارورڈنگ کمپنیوں کے اڈے ہیں، جا نکلتی تھی۔ سر کلر روڈ سے موچی دروازہ ، شاہ عالمی دروازہ ، لوہاری دروازہ، موری دروازہ ، بھاٹی دروازہ اور ٹکسالی دروازہ کے سامنے سے گزر کر منٹو پارک (موجودہ اقبال پارک) جا کر ختم ہو جاتی تھی ۔ اس کی ایک شاخ موجودہ کریم پارک کی جگہ کھیتوں کو سیراب کرتی تھی ۔ اس نہر کے دم قدم سے لاہور کے دروازوں کے باہر ہر طرف سایہ دار درخت اور سبزہ نظر آتا تھا ۔ شہر کی عورتیں کپڑے دھونے کے لیے نہر پر آجاتی تھیں۔ گرمیوں میں بچے سارا دن نہر میں نہاتے رہتے تھے۔ گوجر اپنے مویشیوں کو نہلانے کے لیے یہاں لاتے تھے۔ بڑے بوڑھے ناشتا کر کے گرمیوں کے طویل دن گزارنے کے لئے نہر کے کنارے درختوں کے سائے میں آ بیٹھتے تھے۔ بزرگوں کی ایک منڈلی میں اگر ہیر کے ٹپّے سنائے جاتے تھے تو دوسری منڈلی میں پہلوانوں کے دنگلوں کے آنکھوں دیکھے واقعات سنائے جاتے تھے۔ اگر ایک ٹولی تاش کھیلنے میں مگن ہے تو دوسری ٹولی چوسر یا شطرنج کی بساط جمائے بیٹھی ہے۔ اِدھر بٹیریں لڑائی جا رہی ہیں تو اُدھر مینڈھے لڑائے جا رہے ہیں۔ ایک جگہ نائی دری بچھائے بیٹھا ہے تو دوسری جگہ مالشیا اپنے کام میں جُتا ہوا ہے۔ اسی نہر کے کنارے بھدر کالی کا میلہ لگتا تھا اور یہیں ہندو منہ اندھیرے اشنان کیا کرتے تھے۔ غرضیکہ لاہور کی معاشرتی زندگی میں اس نہر کا بڑا کردار تھا۔ صدر ایوب خان کے دورِ حکومت میں یہ نہر بند کر دی گئی تو اس کے ساتھ ہی یہ رونق ختم ہو گئی۔

آمدم برسر مطلب ۔ بات علی مردان خان کے مقبرے کی ہو رہی تھی۔ مقبرے کی عمارت ہشت پہلو ہے اور اس کی کرسی سطح زمین سے پانچ فٹ اونچی ہے۔ شمال کی جانب کرسی پر چڑھنے کے لئے زینہ بنایا گیا ہے۔ کرسی کے چار اطراف میں تالاب بنے ہوئے ہیں۔ مقبرے کے اندر تین قبروں کے نشانات ہیں۔ اصل قبریں تہ خانے میں ہیں جس میں جانے کے لئے جنوبی محراب کے ساتھ زینہ تعمیر کیا گیا ہے۔ تہ خانے میں تازہ ہوا فراہم کرنے کے لئے آٹھ روشن

دان بنائے گئے ہیں۔ جنوبی محراب کے دوسری سمت اوپر جانے کے لئے خم دار زینہ بنایا گیا ہے۔

مقبرے کی چھت پر آٹھوں کونوں میں آٹھ برجیاں تھیں۔ اب ان میں سے صرف تین باقی رہ گئی ہیں۔ چھت پر چڑھ کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ گنبد کی گردن پندرہ سولہ فٹ اونچی ہے۔ گردن تک پہنچنے کے لیے پھر ایک زینہ بنایا گیا ہے اور اسی کے ذریعے گنبد کے اندر داخل ہو سکتے ہیں ۔ تیسری منزل پر بھی تین قبروں کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ علی مردان خان کے مقبرے کا گنبد تین منزلہ ہے۔ اور لاہور میں اتنا بڑا گنبد اور کہیں نہیں ہے۔ آصف جاہ کے مقبرے کا گنبد بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ گزشتہ صدی کے وسط میں جب نور احمد چشتی مقبرہ دیکھنے گیا تو وہاں وزیرا نامی ایک زمیندار نے بھوسہ ذخیرہ کیا ہوا تھا۔

مقبرے کا صدر دروازہ، جس پر گلابی باغ کی طرز پر کاشی کاری کی ہوئی ہے، شمال کی جانب ہے۔ یہاں اب چمگادڑوں کا بسیرا ہے اور کاشی کاری کے نادر نمونے زمین پر گرنا شروع ہو گئے ہیں۔ دروازہ ایک ڈیوڑھی کی شکل میں بنایا گیا ہے جس میں کئی کمرے ہیں۔ بھلے وقتوں میں یہاں مقبرے کے خدام رہتے ہوں گے۔ جب اس نواح میں سکھ فوج کی چھاؤنی قائم ہوئی تو ایک فوجی سردار گوردت سنگھ نے اس ڈیوڑھی میں رہائش اختیار کرلی۔ گلابی باغ اور علی مردان خان کے مقبرے کی ڈیوڑھی آمنے سامنے تعمیر ہوئی ہیں لیکن راستے میں عمارتیں بن جانے سے دیکھنے والا اس تقابل کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔ صدر دروازہ چونکہ ریلوے جنرل اسٹور کی جانب کھلتا ہے اس لئے ڈیوڑھی میں لوہے کا گیٹ اور اس کے باہر لوہے کا جنگلہ لگا کر اسے بند کر دیا گیا ہے ۔ بدیں وجہ مقبرے پر جانے والے زائرین ڈیوڑھی کا سامنے والا حصہ نہیں دیکھ سکتے ۔ راقم الحروف ایک بار اجازت لے کر اندر گیا تو معلوم ہوا کہ عمارت پر نقش و نگار بنے ہوئے ہیں لیکن کوئی عبارت درج نہیں ہے۔ لالہ کنہیا لعل (م ۱۸۸۸ء) اس بات کے گواہ ہیں کہ اس ڈیوڑھی جیسی ایک ڈیوڑھی اور بھی یہاں موجود تھی جسے سکھوں نے مسمار کر دیا ۔ اور اس کی اینٹیں سکھ فوج کا جرنیل گلاب سنگھ پاؤونڈیہ فوجیوں کے لئے بارکیں تعمیر کرنے کے لیے اٹھا لے گیا۔ مقبرے کی چار دیواری کشمیری خشت فروشوں نے اکھاڑ ڈالی اور مقبرے کے باہر جو سنگِ مرمر اور سنگِ ابری کی سلیں لگی ہوئی تھیں وہ سکھ اکھاڑ کر لے گئے ۔ اس لوٹ کھسوٹ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سنگ مرمر کی کانیں مکرانہ (راجستھان) میں تھیں ۔ اور سنگِ سرخ آگرہ اور متھرا میں ملتا تھا اور یہ دونوں جگہیں انگریزی قلمرو میں تھیں۔ رنجیت سنگھ اور اس کے جانشینوں نے جب لاہور اور امرتسر میں عمارتیں تعمیر کیں تو لاہور کی مساجد اور مقابر کا پتھر اکھاڑ کر ان عمارتوں میں لگا دیا۔

علی مردان خان کے مقبرے سے جانب شمال، ریلوے جنرل اسٹور کی دیوار کے ساتھ حضرت عبداللہ شاہ عرف روڑاں والے پیر کا مزار ہے ۔ یار لوگوں نے انہیں علی مردان خان کا مرشد مشہور کر دیا ہے ۔ یہ درست نہیں ہے۔ خان موصوف جس مذہبی فرقے سے تعلق رکھتا تھا اس میں پیری مریدی کا تصوّر نہیں ہے۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں پیر صاحب کے مزار پر گنبد موجود تھا لیکن جب اس علاقے میں سکھ فوج کی چھاؤنی قائم ہوئی تو وہ مزار کی اینٹیں اکھاڑ

کر لے گئے۔ اب وہاں معمولی سی قبر کا نشان باقی ہے۔ عوام الناس کا یہ اعتقاد ہے کہ جسے بخار آتا ہو وہ مزار سے ایک روڑا اٹھالائے اور کپڑے میں باندھ کر گلے میں لٹکالے۔ جب اس کا بخار جاتا رہے تو وہ روڑا وہیں رکھ آئے اور اس کے ساتھ حسبِ توفیق نذر و نیاز بھی مزار پر چڑھا آئے۔ اب یہ مزار آبادی میں گھر کر رہ گیا ہے۔ جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا، تو سید عبد الکریم سہروردی "کے مزار کی طرح یہ بھی جمال الدین صدیقی کی تولیت میں تھا۔

مقبرہ علی مردان خان اور گلابی باغ کے درمیان تین پڑاوے تیس سال پہلے تک موجود تھے۔ شاید ان عمارتوں میں تعمیر ہونے والی اینٹیں یہیں پکائی گئی تھیں۔ دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں ان پڑاووں پر سڑکیں تعمیر کی گئیں جہاں فوجی ٹرک ڈرائیور مشق کرنے آیا کرتے تھے۔ مشق مکمل ہونے پر انہیں پہاڑی علاقوں میں محاذ جنگ پر بھیجا جاتا تھا۔ راقم الحروف قیام پاکستان کے بعد ان سڑکوں پر سائیکل چلانے کی مشق کیا کرتا تھا ۔ اب ان پڑاووں کا نشان تک باقی نہیں رہا۔

علی مردان خان کے مقبرے سے عین جانبِ مغرب چنت گڑھ میں ریلوے انجن شیڈ کے قریب ۱۸۴۳ء تک خواجہ ابوالحسن تربتی کا مقبرہ موجود تھا۔ اس مقبرے کا شمار اس زمانے میں لاہور کے گِنے چُنے عظیم مقابر میں ہوتا تھا۔ اب اس مقبرے کی جگہ مارگریٹ اینڈرسن چائلڈ ویلفیئر سنٹر اور ریلوے ڈسپنسری کی عمارتیں بن گئی ہیں۔ اب سے تیس سال پہلے تک اس مقبرے سے ملحقہ کنواں موجود تھا جو اب کوڑا کرکٹ ڈال کر پاٹ دیا گیا ہے۔ نور احمد چشتی نے انیسویں صدی کے وسط میں اس کنوئیں کا ذکر اپنی مشہور تصنیف تحقیقاتِ چشتی میں کیا تھا۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ اس کنوئیں پر بیک وقت چھ چرسے چل سکتے تھے ۔ فاضل چشتی لکھتے ہیں کہ اس مقبرے کے جنوب میں یعنی جہاں اب ریلوے کوارٹرز اور پُل ہیں ، ایسا عمدہ باغ تھا کہ اُسے دیکھ کر بیساختہ زبان پر سبحان اللہ کا وِرد جاری ہو جاتا تھا ۔

خواجہ ابوالحسن تربتی الملقب بہ رکن السلطنت تربت حیدری کے رہنے والے تھے۔ یہ موضع قطب الدین حیدر کی طرف منسوب ہے جو حیدری سلسلے کے درویشوں کے پیشوا تھے۔ جب راقم الحروف نے ۱۹۶۷ء میں ایران کا دورہ کیا تو بطور خاص یہ جگہ دیکھنے گیا۔ تربت حیدری ، مشہد سے پچھتر میل جانب جنوب مشرق واقع ہے۔ خواجہ ابوالحسن جوانی میں ترک وطن کر کے اکبر کے عہد میں آگرہ چلے آئے ۔ انہوں نے کچھ عرصہ شہزادہ دانیال کی ملازمت کی اور پھر اکبر نے انہیں مظفر خان تربتی کے ماتحت محکمہ مالیات میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کیا جہاں انہوں نے بڑی لیاقت اور تندہی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کئے۔ موصوف ترقی کرتے کرتے جہانگیر کے عہد میں پہلے دیوان کُل اور پھر وزیر مقرر ہوئے ۔ مہابت خان کی شورش کے زمانے میں انہوں نے جہانگیر کا ساتھ دیا ۔ شاہجہان نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں شش ہزاری منصب عطا کیا۔ شاہجہان کے چھٹے سالِ جلوس میں خواجہ صاحب نے ۱۶۳۲ء میں ستّر سال کی عمر میں وفات پائی اور موضع چنت گڑھ میں ایک عالیشان مقبرے میں دفن ہوئے۔ اس نام کا موضع اب بھی آوہ بدھو کے عقب میں موجود ہے جس میں عموماً ریلوے ملازمین رہتے ہیں۔

خواجہ ابوالحسن تربتی کا بیٹا ظفر خاں احسن ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کا دیوان خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنہ میں محفوظ ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے شعر العجم میں ان کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے اور خاص طور سے اس شعر کی دل کھول کر داد دی ہے:

دلم بکوی تو اُمیدوار می آید نگاہ دار کہ رُوزی بکار می آید

ترجمہ : میرا دل تیری گلی میں اُمید لے کر آتا ہے دیکھ لینا یہ کسی روز اپنا کام نکال لے گا

جہاں تک ارباب فضل و کمال کی قدر دانی کا تعلق ہے ظفر خاں احسن اپنے عہد کا عبدالرحیم خانخاناں تھا۔ اس کی سرکار سے بہت سے شاعر وابستہ تھے۔ ان میں مرزا محمد علی صائب اصفہانی خاص طور پر لائق ذکر ہے۔ یہ وہی صائب ہے جس کے بارے میں علّامہ شبلی نے شعر العجم میں لکھا ہے کہ ایران کی شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور میرزا صائب پر ختم ہو گئی۔ صائب نے اپنے کلام میں کئی مواقع پر اپنے مربی کا ذکر کیا ہے۔ ظفر خان کی مدح میں اس کا یہ شعر تو دل میں رکھ لینے کے لائق ہے:

کلاہ گوشہ بخورشید ماہ می شکنم بہ این غرور کہ مدحت گر ظفر خانم

ترجمہ : میری ٹوپی سورج اور چاند سے جا ٹکراتی ہے کیونکہ مجھے اس پر ناز ہے کہ میں ظفر خان کا مداح ہوں

ظفر خان نے ایک البم تیار کروایا تھا جس میں وہ ایک صفحے پر کسی شاعر کے ہاتھ سے اس کا بہترین کلام لکھواتا اور اس کے مقابل صفحے پر کسی مصور سے اس شاعر کی تصویر بنواتا۔ یہ البم ابھی تک منصۂ شہود پر نہیں آیا۔ ظفر خان کابل اور کشمیر میں صوبیداری کے فرائض انجام دے چکا ہے۔ اس کی رفیقۂ حیات بزرگ خانم ملکہ ممتاز محل کی بھانجی اور دارا شکوہ اور عالمگیر اورنگ زیب کی خالہ زاد بہن تھی ۔ اسی بنا پر وہ شاہجہان کا منظور نظر تھا۔

ظفر خان احسن نے شاہجہان کے بیٹوں کے درمیان تخت نشینی کی جنگ میں اورنگ زیب کے خلاف دارا شکوہ کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد اس نے سیاست سے کنارہ کشی کر لی۔ قدر شناس بادشاہ نے خاندانی تعلقات اور سابقہ خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کی چالیس ہزار روپے سالانہ پنشن مقرر کر دی اور وہ لاہور میں گوشہ نشین ہو گیا۔ ظفر خان نے ۱۶۶۲ء میں لاہور میں وفات پائی اور والد کے مقبرے میں دفن ہوا۔

خواجہ ابوالحسن کی اہلیہ مخدومہ بیگم نے اپنے خاوند کے مقبرے کے قریب ہی اپنے لئے مربع طرز کا ایک مقبرہ بنوالیا تھا، جس کا اب نشان تک نہیں ملتا۔ اس نیک بخت خاتون نے بہت سی اراضی اور چاہات اپنے خاوند کے مقبرے کے اخراجات کے لئے وقف کئے تھے جس کی آمدنی سے ایک ہزار حفاظ قرآن مستفیض ہوتے تھے جو دن رات مقبرے پر تلاوت میں مصروف رہتے تھے۔

خواجہ ابوالحسن تربتی کا مقبرہ، علی مردان خان اور آصف جاہ کے مقبروں کی طرح بڑا شاندار مقبرہ تھا۔ اس کی ہشت پہلو عمارت کے آٹھوں کونوں پر خوشنما برجیاں بنی ہوئی تھیں اور درمیان میں گنبد تھا۔ مقبرے کے گرد ایک

وسیع باغ تھا جسے سیراب کرنے کے لئے ایک بڑا کنواں کھودا گیا تھا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

خواجہ ابوالحسن تربتی اور ظفر خان احسن کی قبریں اس زمانے کے دستور کے مطابق تہ خانے میں تھیں اور اُسے سرد رکھنے کے لئے ایک سرنگ تیار کی گئی تھی جو کنوئیں میں جا نکلتی تھی۔ جب تک کنواں موجود تھا اس سرنگ کا بالائی حصہ کنوئیں میں جھانکنے سے نظر آتا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مقبرہ کنوئیں سے جنوبی سمت میں واقع تھا۔ نور احمد چشتی (م ۱۸۶۵ء) نے اس سرنگ کو اندر سے دیکھا تھا۔ اس وقت اس میں خوش رنگ ٹائلیں لگی ہوئی تھیں۔

سکھوں کے عہد میں اس سے متعلقہ وقف، جس کی آمدنی سے قاریوں کو وظائف ملتے تھے، ضبط ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی مقبرے کی سابقہ رونق بھی جاتی رہی۔ یہ مقبرہ چونکہ سکھ فوج کی چھاؤنی کی حدود میں شامل تھا اس لئے سکھوں نے اسے بارود کا گودام بنا لیا۔ رنجیت سنگھ کے بیٹے شیر سنگھ کے دَور حکومت میں ۱۸۴۳ء میں برسات کے موسم میں مقبرے پر آسمانی بجلی گری جس سے گودام میں موجود بارُود کا ذخیرہ چشم زدن میں بھک سے اڑ گیا اور مقبرے کی عظیم الشان عمارت آنِ واحد میں زمین پر آ رہی۔ کشمیری خشت فروشوں نے اس کی اینٹیں نکال کر فروخت کر دیں اور یُوں مقبرے کا نشان تک مٹ گیا۔ جب ریلوے انجن شیڈ قائم ہوئی تو یہاں ریلوے ملازمین کے کوارٹر بن گئے۔ اب مقبرے کا محل وقوع بتانے والا بھی میرے سوا اور کوئی نہیں رہا۔

اسی مقبرے کی حدود میں بُدھو کا شوالہ تعمیر ہوا جہاں موسم بہار کے آغاز میں شوراتری کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس موقع پر پُوربیئے گتکا اور بنوٹ کے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ اسی شوالے کے صدر دروازے کے سامنے ریلوے کالونی میں میرا بچپن گزرا ہے اس لئے یہ سب باتیں اب تک ذہن میں محفوظ ہیں۔

ظفر خان احسن کا بیٹا محمد طاہر آشنا بھی پڑھا لکھا شخص تھا۔ شاہجہان نے قرابتداری کا خیال کرتے ہوئے اُسے عنایت خان کا خطاب اور ڈیڑھ ہزاری منصب عطا کر کے اپنے کتابخانے کا داروغہ مقرر کیا۔ اس نے شاہجہان کے درباری مؤرخ عبدالحمید لاہوری کے "بادشاہنامہ" کا ملخص تیار کیا تھا جس کے قلمی نسخے بعض کتابخانوں میں مل جاتے ہیں لیکن ہنوز کسی اسکالر نے اس کی تدوین وطباعت کی طرف توجہ نہیں دی۔ اسی طرح اس کا دیوان بھی اشاعت کا منتظر ہے۔

محمد طاہر آشنا نے شاہجہان کے بیٹوں کے درمیان تخت نشینی کی جنگ میں دارا شکوہ کی حمایت کی تھی اس لئے دارا شکوہ کی شکست کے بعد وہ کشمیر میں گوشہ نشین ہو گیا۔ اورنگ زیب نے شاہی خاندان سے قرابتداری اور خاندانی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا چوبیس ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس نے ۱۶۷۰ء میں کشمیر میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔

حضرت عبدالکریم سہروردیؒ کے مزار سے شالامار باغ کی جانب چلیں تو دائیں ہاتھ ایک قبرستان نظر آتا ہے۔ اب اس کے گرد ایک چاردیواری بن گئی ہے۔ اسی قبرستان کے عقب میں کراؤن بس کی ریپئر ورکشاپ ہوا کرتی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ اس سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ اس قبرستان کی مغربی دیوار کے ساتھ ایک مقبرہ نظر آتا ہے جس کی چھت

پر سبز رنگ کی ٹائلیں لگی ہوئی ہیں ۔ یہ میرزا جانی بیگ کی ابدی آرام گاہ ہے ۔ جانی بیگ پنجاب کے ناظم نواب عبدالصمد خان بہادر دلیر جنگ کا داماد اور دردانہ بیگم کا شوہر تھا ۔ میر معین الملک کی رفیقۂ حیات مغلانی بیگم ، جس نے ۱۷۵۳ء سے ۱۷۵۷ء تک پنجاب کی سیاست میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، اسی جانی بیگ کی بیٹی تھی۔ جانی بیگ کے مقبرے پر گنبد نہیں ہے بلکہ اس کی چھت حضرت میاں میرؒ کے مزار مبارک کی طرز پر بنائی گئی ہے ۔ جین مندر کے قریب پرانے ہیلی کالج آف کامرس سے متصل حضرت اسمٰعیل گیلانی کا مزار بھی اسی طرز پر تعمیر کیا گیا ہے اور اس پر بھی سبز رنگ کی ٹائلیں لگی ہوئی ہیں ۔ اس رنگ کی ٹائلیں لاہور میں بہت کم استعمال ہوئی ہیں، اس لئے ان عمارتوں کو محفوظ کر لینے کی اشد ضرورت ہے۔

جانی بیگ کے مقبرے سے آگے بڑھیں تو قبرستان میں لب سڑک ایک مسجد نظر آتی ہے جو تعمیر کے اعتبار سے بڑی سادہ ہے۔ اسی مسجد کے عقب سے گزر کر کراؤن بس کی ورکشاپ تک پہنچتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء سے قبل میرا ہر روز ادھر سے گزر ہوتا تھا۔ اس زمانے میں اس مسجد کی دیوار پر ایک بورڈ نصب تھا جس پر یہ عبارت مرقوم تھی "یہ قبرستان مسلمانوں کا ہے ۔ اس میں کسی مرزائی کو دفن کرنے کی اجازت نہیں۔" اب یہ بورڈ وہاں نظر نہیں آتا۔

اس مسجد سے آگے بڑھیں تو ایک فرلانگ کے فاصلے پر دائیں ہاتھ ایک گلی کے اندر ایک کھلے میدان میں ایک چبوترے پر ایک قبر شکستہ حالت میں نظر آتی ہے۔ یہ مہابت خان کی قبر ہے۔ پہلے یہ قبر ایک سرسبز و شاداب باغ میں تھی اور عوام الناس میں یہ باغ 'محبت خان کے باغ' کے نام سے مشہور تھا۔

مغلوں کے دَور حکومت میں مہابت خان نام کے دو امیر ہوئے ہیں اور یہ دونوں باپ بیٹا تھے۔ ان میں سے جو زیادہ مشہور ہوا ہے وہ مہابت خان سپہ سالار تھا جس کا اصل نام زمانہ بیگ تھا۔ اس کے بیٹے کا نام میرزا لہراسپ تھا۔ جسے دربار شاہی سے اپنے باپ کی وفات کے بعد مہابت خان کا خطاب عطا ہوا تھا۔ پشاور کی جامع مسجد مہابت خان کی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ میری ناقص رائے کے مطابق یہ مؤخر الذکر مہابت خان کی تعمیر کردہ ہے کیونکہ اول الذکر مہابت خان کے بارے میں مآثر الامرأ میں یہ مرقوم ہے کہ وہ آزاد منش انسان تھا اور اسے نماز و روزے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس لئے اسے مسجد کی تعمیر میں بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی

مہابت خان سپہ سالار کابل کا باشندہ اور صحیح النسب رضوی سید تھا۔ وہ جہانگیر کے دربار کا نامور امیر تھا جو اپنی بہادری کے لئے ضرب المثل تھا۔ اس نے باغی شہزادے شاہجہان کا دکن، اڑیسہ اور بنگال تک تعاقب کیا اور بالآخر اُسے بادشاہ کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ جہانگیر نے اُسے کابل کا صوبیدار مقرر کیا۔ انہی ایام میں وزیر اعظم آصف جاہ نے اُسے ستانا شروع کیا تو مہابت خان نے تنگ آکر راجپوت سپاہیوں کی مدد سے جہانگیر کو دریائے جہلم کے کنارے گرفتار کر لیا۔ آصف جاہ نے بھاگ کر قلعہ اٹک میں پناہ لی اور نورجہاں گرفتار ہوئی ۔ مہابت خان قریباً سو دن کے لئے تمام سیاہ و سپید کا مالک بن گیا۔ اس کے بعد نورجہاں نے ایسی چال چلی کہ مہابت خان کو اپنی جان بچانے کے

لئے راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ یوں جہانگیر کو آزادی ملی۔

یار لوگوں نے جہانگیر کی رہائی کے بارے میں بھی افسانہ تراش لیا ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ جہانگیر نے اپنے چودھویں سال جلوس میں مجدد الف ثانیؒ کو گرفتار کر لیا اور ان کی گرفتاری سے قبل ان کے حامی امرا کو دور دراز مقامات پر بھیج دیا۔ ان کی گرفتاری سے امرا کو بڑا رنج پہنچا اور انہوں نے باہمی خط و کتابت کے ذریعے مہابت خان کو اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ مہابت خان نے خطبے اور سکے سے جہانگیر کا نام حذف کر کے جہانگیر کو گرفتار کر لیا۔ جب حضرت مجدد الف ثانیؒ کو بادشاہ کی گرفتاری کی اطلاع ملی۔ تو انہوں نے گوالیار کے قید خانے سے مہابت خان کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ بادشاہ کی اطاعت قبول کر کے فتنہ و فساد کو ختم کرے۔ چنانچہ مجدد صاحبؒ کا پیغام ملتے ہی مہابت خان نے جہانگیر کو آزاد کر دیا۔ جب جہانگیر کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ حضرت مجددؒ کے خلوص سے بیحد متاثر ہوا اور اس نے ان کی رہائی کے احکام صادر کر دئے۔ تحقیق کا یہ نادر شاہکار ایک ایسے مقالے میں بھی شامل ہو گیا جس پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے محقق کو پی ایچ ڈی عطا کی ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ جہانگیر نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو اپنے چودھویں سال جلوس میں گرفتار کیا اور سولھویں سال جلوس میں رہا کر دیا۔ انیسویں سال جلوس میں حضرت مجددؒ انتقال فرما گئے اور اکیسویں سال جلوس میں مہابت خان نے جہانگیر کو گرفتار کیا اور سو دن بعد رہا کر دیا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ جہانگیر کی گرفتاری سے دو سال پہلے رحلت فرما گئے تھے اور فاضل محقق نے دو سال بعد انہیں ملکی سیاست میں حصہ لیتے ہوئے دکھا دیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے مہابت خان آزاد منش انسان تھا لیکن مرنے سے قبل اس نے اثنا عشری مذہب قبول کر لیا تھا۔ اس نے برہانپور کے نواح میں موہن نالہ کے قریب ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں وفات پائی تو کسی من چلے شاعر نے اس کے نام زمانہ بیگ کی رعائت سے ''زمانہ آرام گرفت'' سے تاریخ وفات (۱۰۴۴ھ) نکالی۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کی میت دہلی لے جا کر ''شاہ مرداں'' میں دفن کی گئی۔ متھرا کا ایک صاحب ذوق سیاح شیخ محمد ریاض الدین امجد جنگ آزادی کے جلد بعد ۱۸۶۱ء میں دہلی آیا تو اس نے ''سرو ریاض'' کے عنوان سے اپنا سفر نامہ مرتب کیا۔ مشہور محقق ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اسے مرتب کر کے رسالہ ''صبح'' دہلی میں شائع کروا دیا ہے۔ سرو ریاض میں مرقوم ہے کہ شاہ مرداں دہلی کا مشہور امام باڑہ ہے۔ جہاں عاشورے کے روز عزاداری ہوتی ہے۔ شیخ محمد ریاض الدین نے ۱۸۶۱ء میں وہاں پچاس تعزیئے شمار کئے تھے۔ مرزا سنگین بیگ صاحب سیر المنازل لکھتے ہیں کہ یہاں شہر سے تعزیئے ٹھنڈے کئے جاتے ہیں اور وہاں شیعہ اکابرین دفن ہوتے ہیں۔ اس نے کئی اصحاب کی قبروں کی نشاندہی بھی کی ہے لیکن مہابت خان کی قبر کا ذکر نہیں کیا۔ شاید سنگین بیگ کے زمانے تک اس کا نشان مٹ گیا ہو۔

مہابت خان سپہ سالار حسب وصیت شاہ مرداں دہلی میں دفن ہوا تھا اس لئے یقینی طور پر لاہور میں جو مہابت خان کی قبر ہے یہ اس کے فرزند میرزا لہراسپ المخاطب بہ مہابت خان کی ہے۔ اس نے شاہجہان کے عہد حکومت میں دکن

میں بڑی شائستہ خدمات انجام دیں اور عالمگیر اورنگ زیب کے عہد میں شش ہزاری منصب پر فائز ہوا۔ وہ گجرات اور کابل میں صوبیدار کے فرائض بھی انجام دے چکا ہے۔ اس کا انتقال اورنگ زیب کے عہد میں ۱۶۷۵ء میں ایمن آباد نزد گوجرانوالہ میں ہوا، اس لئے وہ یقینی طور پر لاہور میں دفن ہوا۔

مہابت خان کے باغ کی چاردیواری کے شمالی اور مغربی جانب نشانات باقی ہیں۔ جنوبی اور مشرقی جانب چاردیواری گرا کر لوگوں نے مکانات تعمیر کر لئے ہیں۔ شمالی جانب "واسا" نے ایک ٹیوب ویل نصب کر لیا ہے۔ باغ کی مغربی سمت مسجد تھی جس پر ایک شخص نے قبضہ کر کے وہاں تانگے بنانے کی فیکٹری قائم کرلی ہے۔ تصویر میں مسجد کا کچھ حصہ اور تانگے کھڑے نظر آ رہے ہیں۔ اگر بھارت میں ہندو کسی مسجد میں فیکٹری لگا لیتے تو وہاں ملک گیر فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو جاتے اور پاکستان بھر میں احتجاجی مظاہرے ہونے لگتے لیکن یہاں کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔

جس وقت راقم الحروف فوٹوگرافر کے ساتھ وہاں پہنچا تو چند لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ قبر کے قریب ایک لڑکا بلا تھامے کھڑا تھا اور وہ قبر کے تعویذ سے وکٹ کا کام لے رہا تھا۔ قبر کے چبوترے کے ساتھ ایک درخت کھڑا ہے جس کے سائے میں ایک کوچوان گھوڑا باندھتا ہے۔ گھوڑے کی سہولت کے لئے وہ چبوترے پر گھوڑے کو چارہ ڈال دیتا ہے تاکہ اُسے گردن زیادہ نہ جھکانی پڑے ۔ چبوترے کی مشرقی جانب ملبے کا ڈھیر نظر آ رہا ہے۔ قبر کا تعویذ بھی ہماری بے حسی پر نوحہ کناں ہے۔ قائداعظم نے اپنے مشہور چودہ نکات میں حکومت برطانیہ سے اسلامی تہذیب و ثقافت کو تحفظ فراہم کرنے کی جو ضمانت طلب کی تھی کیا قائداعظم کے جانشین وہ ضمانت فراہم نہیں کر سکتے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر محکمہ تحفظ آثار قدیمہ کو باقی رکھنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے؟ ہمارے ماہرین آثار قدیمہ کو تو زمانہ قبل از اسلام کے آثار تلاش کرنے کی فکر لگی رہتی ہے تاکہ عہد جاہلیت کی یادگاروں کو اسلامی آثار کے مقابلے میں اچھالا جا سکے۔

گزشتہ مضمون میں چلہ شاہ بدر دیوان کا ذکر آ چکا ہے۔ اس عمارت سے گھوڑے شاہ کے مزار کی جانب چلیں تو پہلے شاہ بلاولؒ کا مزار آتا ہے۔ گلی کے باہر لوہے کا ایک محرابی دروازہ نصب کر دیا گیا ہے جس کے اوپر حضرت کا نام نامی درج ہے۔ موصوف شاہجہان کے عہد میں قادریہ سلسلۂ تصوف کے نامور بزرگ ہوئے ہیں۔ بعض مستند روایات کے مطابق شہزادہ دارا شکوہ اور شہزادی جہاں آراء بیگم کے علاوہ شاہجہان بھی ان کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہے۔ پہلے حضرت کا مزار اس جگہ تھا جہاں اب کوٹ خواجہ سعید میں شیر سنگھ کی سمادھ اور بارہ دری ہیں۔ جب راوی نے اس طرف کاٹ شروع کی تو حضرت کا تابوت موجودہ جگہ منتقل کر دیا گیا۔ ان کے مزار پر ایک معمولی سی عمارت کھڑی ہے۔

حضرت شاہ بلاولؒ ، شاہ شمس الدین قادریؒ ، مدفون گاف روڈ کے خلیفہ تھے اور مؤخرالذکر بزرگ کو شاہ ابواسحق قادری مزنگویؒ نے جن کا مزار ٹمپل روڈ پر گوردوارہ "چھیویں پاتشاہی" کے عقب میں ہے، خرقہ خلافت عطا کیا تھا۔ شاہ ابواسحق اور شاہ ابوالمعالیؒ پیر بھائی تھے اور انہیں حضرت داؤد کرمانی شیر گڑھیؒ نے خلافت عطا کی تھی۔ اسی زمانے میں

لاہور میں حضرت میاں میر قادریؒ، حضرت ملاشاہ بدخشی قادریؒ اور خواجہ بہاریؒ قادری جیسے اساطین تصوف بھی موجود تھے۔ مغلوں کے عہد میں قادریہ سلسلہ تصوف کا عروج لائق تحقیق و مطالعہ ہے اور گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر میں اس پر تحقیق ہو رہی ہے۔

شاہ بلاولؒ کے مزار سے ذرا آگے بڑھیں تو دائیں ہاتھ راجہ دیناناتھ کے باغ کی ڈیوڑھی نظر آتی ہے، راجہ صاحب (م ۱۸۷۵ء) اپنے زمانے کے بااثر امیر تھے اور انہیں صوفیاء کرام کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ لاہور کے کئی مزاروں پر چراغ بتی کا خرچ وہ اپنی گرہ سے دیا کرتے تھے۔ راجہ صاحب ایک بلند پایہ شاعر تھے اور سوز تخلص کرتے تھے۔ راجہ صاحب نے دیوان کرپارام کے باغ کے نزدیک ایک باغ لگایا تھا جس میں شالامار باغ کی طرح نہریں، آبشاریں، فوارے اور روشیں تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد ہوشیارپور سے ایک مجذوبہ یہاں آکر مقیم ہوگئیں۔ راقم الحروف نے انہیں متعدد بار دیکھا ہے۔ وہ ایک بھاری بھرکم اور معمر خاتون تھیں۔ سر پر اُسترا پھرواتی اور گیروے رنگ کے کپڑے زیب تن کرتی تھیں۔ کبھی کبھی سبز رنگ کا لباس بھی پہن لیتی تھیں۔ ایک خادم ہر وقت انہیں پنکھا جھلتا رہتا تھا۔ زائرین ان کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ اجنبیوں کو دیکھتے ہی مغلظات سنانے لگتی تھیں جنہیں برداشت کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ راقم الحروف اس باغ میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان کی تیاری کے لئے جایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں باغ اپنی اصلی حالت میں موجود تھا جب میں ۱۹۶۷ء میں انگلستان سے واپس آیا تو اس باغ کی جگہ مہر یحییٰ کالونی آباد ہو چکی تھی اور ڈیوڑھی پر قالین دھونے والوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ چند سال قبل دہلی سے ہمدرد کے نائب متولی اور مدرسہ فتح پوری کے صدر مدرس مولانا قاضی سجاد حسین کرتپوری (م ۱۹۹۰ء) لاہور تشریف لائے۔ موصوف حکیم محمد سعید صاحب کے مہمان تھے۔ میں انہیں لاہور کے آثار قدیمہ دکھانے لے گیا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ راجہ دیناناتھ کا پڑپوتا دہلی یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہے۔ قاضی صاحب نے ایک آم کے پیڑ سے چند پتے اُتار کر اپنے ساتھ رکھ لئے اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے یہ پتے انہیں دے کر کہوں گا کہ ان کے پردادا کے باغ میں اب صرف ایک ہی پیڑ باقی رہ گیا ہے۔ یہ اس کی نشانی ہے۔

راجہ دیناناتھ کے باغ سے ذرا آگے بڑھیں تو بائیں ہاتھ گھوڑے شاہ کے مزار پر نظر پڑتی ہے۔ ان کے مزار پر مٹی کے ہزاروں گھوڑے پڑے رہتے ہیں۔ مزار کے احاطے میں لکڑی اور کاغذ کے عمدہ قسم کے گھوڑے بھی موجود رہتے ہیں۔ نور احمد چشتی کے زمانے میں چاندی سونا سستے تھے اس لئے بعض عقیدتمند چاندی سونے کے گھوڑے بھی بطور نذر پیش کر جاتے تھے۔ گھوڑے شاہ کا اصل نام محمد حفیظ تھا۔ لیکن وہ گھوڑے شاہ کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ اس کے بارے میں قدیم تذکروں میں کئی روایات ملتی ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ حضرت ایک روز ایک دیوار پر بیٹھے تھے اور انہوں نے اسے گھوڑے کی طرح ایڑ لگائی تو دیوار چل پڑی۔ دوسری روایت یوں ہے یہ بچوں کی طرح لاٹھی دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھ کر اور اسے گھوڑے کی طرح پچکارتے ہوئے دوڑا کرتے تھے۔ تیسری روایت جو قرین

قیاس ہے یہ ہے کہ انہیں گھوڑوں کے ساتھ بڑا پیار تھا اور جب کسی سے کوئی فرمائش کرتے تو گھوڑا طلب فرماتے۔ ان کے معتقدین ان کے مزار پر مٹی، لکڑی اور کاغذ کے گھوڑے بطور نذر چڑھاتے ہیں۔ مزار کے قریب گھوڑوں کی دکانیں لگی رہتی ہیں جہاں سے زائرین گھوڑے خرید کر مزار پر چڑھاتے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۷۲۳ء میں بعمر ۱۰۳ سال ہوا۔

ان کے مزار کے ساتھ عام قبرستان بھی ہے جس میں علّامہ علاءالدین صدیقی اور ان کے والد بزرگوار مولوی فیروزالدین صدیقی محوِ خواب ابدی ہیں۔ یہیں پنجابی زبان کے ایک معروف شاعر اشرف بٹ (م ۱۹۷۶ء) کی بھی قبر ہے۔

جہاں اب گھوڑے شاہ کا مزار ہے، گزشتہ صدی کے نصف اوّل میں یہ علاقہ "چوہٹہ سُوداں" کے نام سے موسوم تھا۔ نور احمد چشتی لکھتے ہیں کہ سُوداں ایک طوائف تھی اور یہ محلہ اُسی کے نام سے منسوب ہوگیا۔ پروفیسر محمد شجاع الدین مرحوم نے جو لاہور کے بارے میں چلتے پھرتے انسائیکلوپیڈیا تھے، ایک بار فرمایا کہ سُود ہندوؤں کی ایک گوت ہے اور یہ محلّہ انہی کا آباد کردہ تھا۔ اسی نواح میں محلہ "حاجی نالہ" بھی تھا۔ اس کا ذکر قدیم تذکروں میں ملتا ہے لیکن اب اس کا نشان تک باقی نہیں رہا۔

گھوڑے شاہ کے مزار سے قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر دائیں ہاتھ ایک مسجد ہے جو لال مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ ابھی حال ہی میں اس کی تعمیر نو مکمل ہوئی ہے۔ اس مسجد کی شمالی دیوار کے ساتھ گلی میں دو قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک قبر تحقیقات چشتی کے مصنف نور احمد چشتی کی ہے اور دوسری ان کے والد مولوی احمد بخش یکدل کی۔ یہ جگہ جہاں اب ان کی قبریں ہیں ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ بابا ڈورے شاہ کا تکیہ کہلاتی تھی۔ باباجی کا مزار بھی چشتی کی قبر سے جانب مشرق چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ بابا ڈورے شاہ کے مزار کا متولی جھمکے شاہ، مولوی نور احمد چشتی کا دوست تھا اور اس نے مولوی صاحب کو اس تکیے کا متولی بنا دیا۔ مولوی صاحب کا خاندانی قبرستان شاہ ابوالمعالیؒ کے جوار میں تھا۔ رنجیت سنگھ نے ۱۸۳۲ء میں اس قبرستان میں مُردے دفن کرنے کی ممانعت کر دی تو لوگ اپنے لواحقین کی میتیں میانی صاحب لے جانے لگے۔ چشتی کے خاندانی احاطۂ قبور میں مزید قبروں کے لئے گنجائش نہ تھی اس لئے وہ ۵ مارچ ۱۸۶۵ء کو وہاں سے اپنی والدہ، ہمشیرہ اور اہلیہ کے تابوت نکال کر تکیہ ڈورے شاہ میں لے آئے۔ اس واقعہ کے دو سال بعد وہ خود بھی راہیِ ملک بقا ہوئے اور ان کے والد احمد بخش یکدل کو بھی یہیں ابدی آرام گاہ ملی۔

اس وقت وہاں ڈورے شاہ کی قبر ایک برآمدہ نما کمرے میں موجود ہے۔ دو تین قبریں وہاں اور بھی ہیں جن پر کتبے نصب نہیں ہیں۔ جھمکے شاہ کی قبر بھی یہیں ہونی چاہئے۔ احمد بخش یکدل اور مولوی نور احمد چشتی کی قبریں موجود ہیں لیکن ان کے خاندان والوں کی قبروں کے نشان باقی نہیں رہے۔ وہاں اب مکانات بن چکے ہیں۔ احمد بخش یکدل کی قبر پر کتبہ موجود ہے جو ان کے فرزند محرم علی چشتی نے لگوایا تھا۔ نور احمد کی قبر پر کتبہ نہیں ہے۔ وہاں ایسے قرائن

موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کتبہ لگایا گیا تھا لیکن کسی سنگدل انسان نے اکھاڑ لیا ہے ۔ جب راقم الحروف وہاں پہنچا تو محلے کے بچے وہاں جمع ہو گئے انہوں نے بتایا کہ ان کی قبر کا کتبہ ہمسائے اکھاڑ کر لے گئے ہیں اور اسے مسالہ پیسنے کے لئے بطور سِل استعمال کرتے ہیں۔

احمد بخش یکدل صاحبِ ذوق انسان تھے۔ وہ بحیثیت شاعر سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے دربار میں باریاب ہوئے تھے۔ بادشاہ نے انہیں خلعت فاخرہ عطا کر کے ان کی عزت بڑھائی۔ ان کی بیاض ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے ذاتی مجموعۂ کتب میں محفوظ ہے۔ ان کے ایک فرزند نور احمد چشتی تو ان کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے لیکن دوسرے فرزند محرم علی چشتی کا انتقال ۱۹۳۱ء میں لاہور میں ہوا اور حسبِ وصیت ان کی میّت دہلی لے جا کر محلہ نبی کریمؐ (سابقہ قدم شریف) میں ان کے مرشد مستان شاہ کابلیؒ کی خانقاہ میں دفن کی گئی۔ راقم الحروف ۱۹۸۵ء میں ان کی قبر کی تلاش میں دہلی پہنچا تو وہاں جا کر ایک معمر خاتون سے، جو اسی محلے میں پیدا ہوئی اور وہیں بیاہی گئی، معلوم ہوا کہ مستان شاہ کابلیؒ اور محرم علی چشتی کی قبریں ایک تہ خانے میں تھیں اور اب اس کے اوپر ایک بے ادب سکھ نے مکان تعمیر کر لیا ہے۔ اس خاتون نے مجھے وہ مکان بھی دکھایا اور یہ بھی بتایا کہ چشتی کو اس کے سامنے "یہاں لٹایا گیا تھا۔"

محرم علی کے فرزند ابراہیم علی چشتی، انار کلی کے قریب پیسہ اخبار اسٹریٹ میں رہتے تھے اور ان کا شمار لاہور کے پڑھے لکھے لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کے پاس بہت سے علمی نوادرات تھے جو ان کے مرض الموت میں لوگ اٹھا لے گئے۔ ان کا انتقال ۱۹۶۸ء میں ہوا اور انہیں بادشاہی مسجد کے عقب میں صابر شاہ کی درگاہ کے احاطے میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ان کے ساتھ ہی اس خاندان کی علمی روایت بھی ختم ہو گئی:

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کس نماند

نور احمد چشتی نے لاہور کے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر ولیم کولڈ سٹریم کی فرمائش پر تحقیقات چشتی کے عنوان سے لاہور کے آثار قدیمہ پر ایک بلند پایہ کتاب لکھی تھی جس کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آخری ایڈیشن پنجابی ادبی اکادمی نے ۱۹۶۴ء میں لاہور سے ٹائپ میں شائع کیا تھا اور اس کا متن ۱۳۳۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر یہ کتاب منصۂ شہود پر نہ آتی تو ہمیں بہت سے مزارات و مساجد کا علم بھی نہ ہوتا۔

نور احمد چشتی کی اسی کتاب سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جہاں اب ان کی قبر ہے یہ جگہ کسی زمانے میں ریاست جموں و کشمیر کے مدار المہام دیوان کرپا رام مؤلف تاریخ کشمیر اور گلاب نامہ کے باغ کا حصہ تھی۔ دیوان صاحب اُردو اور فارسی کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ وہ راجہ دینا ناتھ کے چچازاد بھائی تھے۔ ان کا انتقال ۱۸۷۶ء میں ہوا۔ انہوں نے بھی راجہ دینا ناتھ کی طرح ان کے باغ کے قریب اپنے لئے ایک باغ لگوایا تھا۔ اس باغ کا بیشتر حصہ نور احمد چشتی کی قبر سے جانب جنوب تھا۔ ۱۹۵۳ء تک اس میں ایک بارہ دری موجود تھی اور قرائن بتاتے تھے کہ وہ کسی زمانے میں ایک وسیع و عریض تالاب کے وسط میں تعمیر کی گئی تھی۔ اب اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ کرپا رام کے باغ کی جگہ کوچہ محمدی اور سلطان

پورہ تعمیر ہو چکے ہیں ۔ نور احمد چشتی کی قبر سے جانب شمال چاہ میراں آباد ہے جو لاہور کی ایک قدیم آبادی ہے ۔ عوام الناس اُسے "میراں دی کھوئی" کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ یہاں حضرت میراں حسین زنجانیؒ نے رفاہ عامہ کی غرض سے ایک کنواں کھدوایا تھا اس لئے یہ آبادی اسی کی جانب منسوب ہو گئی۔ اس آبادی میں سب سے زیادہ مقدس مقام حضرت حسین زنجانیؒ کا روضۂ مبارک ہے۔ قیام پاکستان کے کئی سال بعد تک ان کی قبر ایک بے سقف خشتی چبوترے پر تھی اور اس کے اردگرد لکھوری اینٹوں کی چار دیواری تھی۔ چھت نہ ہونے کی وجہ سے گرمیوں کے موسم میں زائرین کو بڑی تکلیف پہنچتی تھی ۔ اب ان کی قبر سبز رنگ کے ایک خوشنما گنبد کے نیچے ہے اور زائرین کے لئے بھی ایک برآمدہ تعمیر کر دیا گیا ہے۔ عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ حضرت حسین زنجانیؒ اور حضرت علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ ایک ہی پیر (حضرت ابوالفضل ختلیؒ) کے مرید ہیں اور حضرت زنجانیؒ اپنے پیر روشن ضمیر کے حکم سے لاہور چلے آئے تھے۔ ایک روز حضرت ابوالفضلؒ نے حضرت علی ہجویریؒ سے کہا کہ وہ لاہور چلے جائیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ ان کے پیر بھائی جو وہاں موجود ہیں اس پر مرشد نے زور دے کر کہا کہ وہ فوراً لاہور چلے جائیں ۔ حضرت علی ہجویریؒ جب لاہور پہنچے تو رات ہو چکی تھی اور شہر کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ انہوں نے مجبوراً رات شہر کے باہر بسر کی اور اگلی صبح جب شہر کا دروازہ کھلا تو انہوں نے دیکھا کہ لوگ ایک جنازہ اٹھائے باہر آ رہے ہیں۔ حضرت علی ہجویریؒ کے دریافت کرنے پر لوگوں نے بتایا کہ وہ جنازہ حسین زنجانیؒ کا ہے۔ اس پر حضرت ہجویریؒ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ان کے مرشد بلاوجہ انہیں لاہور نہیں بھیج رہے تھے ۔ تاریخی اعتبار سے یہ روایت بے سروپا ہے۔

اس روایت میں حضرت زنجانیؒ اور حضرت ہجویریؒ دونوں کو ایک ہی پیر کا مرید ظاہر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ ہم عصر تھے ۔ جہاں تک تاریخی شواہد کا تعلق ہے حضرت زنجانیؒ اور خواجہ معین الدین اجمیریؒ ہم عصر تھے ۔ سیر العارفین کے فاضل مصنف شیخ جمالیؒ ، سلطان سکندر لودھی (م ۱۵۱۷ء) کے اُستاد تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور شیخ حسین زنجانیؒ کے درمیان بڑی محبت تھی۔ شاہجہان کے درباری مؤرخ محمد صالح کمبوہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کا ذکر خیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب کو لاہور میں حضرت حسین زنجانیؒ کی صحبت میسر آئی۔ شہزادہ داراشکوہ نے بھی سفینۃ الاولیاء میں حضرت اجمیریؒ اور حضرت زنجانیؒ کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویریؒ کا وصال ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء میں ہوا۔ آقائے حبیبی قندھاری نے ان کا سال وفات ۴۸۰ھ بتایا ہے۔ بعض حضرات اسے چند سال اور آگے تک لے گئے ہیں۔ لیکن عام روائت ۴۶۵ھ ہے۔ حضرت معین الدین اجمیریؒ ۱۲۳۵ء / ۶۳۳ھ میں راہی ملک بقاء ہوئے۔ حضرت زنجانیؒ بقول نور احمد چشتی ۵۵۷ھ میں لاہور تشریف لائے۔ اس وقت حضرت ہجویریؒ کی وفات کو ۹۲ سال گزر چکے تھے۔ حضرت زنجانیؒ لاہور میں طویل قیام کے بعد ۶۰۰ھ میں فوت ہوئے۔ ان حالات میں یہ کیسے ممکن ہے کہ ۴۶۵ھ میں فوت ہونے والے حضرت ہجویریؒ ۶۰۰ھ

میں فوت ہونے والے حضرت زنجانیؒ کے جنازے میں شرکت کرتے۔ اس لئے اس روائت کا سائنٹیفک طریقے سے از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے تاکہ آئندہ یہ روائت حضرت ہجویریؒ یا حضرت زنجانیؒ کے تذکروں میں شامل نہ ہو۔

حضرت حسین زنجانیؒ، حضرت یعقوب زنجانیؒ (مدفون ہسپتال روڈ)، حضرت علی الحقؒ سیالکوٹی اور خواجہ معین الدین اجمیریؒ ایک قافلے کے ساتھ اس ملک میں تشریف لائے تھے، یہ روائت شاہجہان کی سرکاری تاریخ عمل صالح میں محمد صالح کنبوہ نے نقل کی ہے ۔ حضرت زنجانیؒ پر ابھی ڈھنگ سے کام نہیں ہوا۔ ایک صاحب نے ان کا تذکرہ شائع کیا ہے جس میں زنجان تا لاہور تمام منازل سفر کا تعین کر کے ہر شہر اور قصبے میں ان کے قیام کے واقعات اور وہاں کے ارباب تصوف سے ان کی ملاقاتوں کی روئداد لکھ دی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس سفر کے تاریخی شواہد ہمارے پاس نہیں ہیں۔

چاہ میراں کی آبادی کے اختتام پر بائیں ہاتھ ایک دو منزلہ مقبرے کی عمارت دکھائی دیتی ہے۔ اگر راجہ دینا ناتھ کے باغ کی مغربی دیوار کے ساتھ چلیں تو بھی یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ عوام الناس میں یہ مقبرہ شہزادہ پرویز بن شہنشاہ جہانگیر کے نام سے موسوم ہے لیکن تاریخی شواہد اس کے خلاف ہیں۔ ڈاکٹر بینی پرشاد نے جہانگیر کے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس پر انہیں ڈاکٹریٹ ملی تھی۔ یہ مقالہ قیام پاکستان سے بہت پہلے طبع ہو گیا تھا اور اب اس کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ اس میں مرقوم ہے کہ شہزادہ پرویز ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۶ء کو اپنے والد جہانگیر کی حیات ہی میں ۳۸ سال کی عمر میں فوت ہو گیا تھا اور اُسے آگرہ میں دفن کیا گیا۔ اس لئے لاہور میں اس کے مقبرے کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کسی نیک دل ٹھیکیدار نے مقبرے کی مرمت کروائی اور قبر کے سرہانے ایک کتبہ نصب کروا دیا جس پر یہ مرقوم ہے کہ یہ شہزادہ دارا شکوہ کی قبر ہے جو شکار کھیلتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا۔ یہ عبارت بڑی گمراہ ہے کیونکہ دارا شکوہ کو اورنگ زیب نے دہلی میں بجرم زندقہ والحاد قتل کروا کے اس کی میّت ہمایوں کے مقبرے میں دفن کروا دی۔ ہمایوں کے مقبرے کو مغلوں کا ویسٹ منسٹر ایبے سمجھنا چاہئیے۔ وہاں ۱۵۲ شہزادے اور شہزادیاں محوِ خواب ابدی ہیں۔ وہاں سنگ مرمر کے ایک تعویذ پر شاہ شہید کے الفاظ کندہ ہیں اور اُسے دارا شکوہ کی قبر بتایا جاتا ہے۔ مرزا سنگین بیگ نے بھی سیر المنازل میں ہمایوں کے مقبرے میں دارا شکوہ اور اس کے فرزند سلیمان شکوہ کی قبروں کی نشاندہی کی ہے۔

چند سال ہوئے لاہور کے اخبارات میں ایک بحث چلی تھی اور ایک حکیم صاحب نے جن کا نام یاد نہیں رہا، یہ ثابت کیا تھا کہ یہ قبر شہزادہ پرویز کے بیٹے کی ہے۔ یہی قرین قیاس بھی ہے۔ یہ علاقہ گزشتہ صدی کے نصفِ اول میں "منڈوی پرویز آباد" کے نام سے مشہور تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبِ قبر کا شہزادہ پرویز کے ساتھ ضرور کوئی تعلق تھا۔

جب یہ مقبرہ تعمیر ہوا تو اس کی بیرونی دیواروں پر سنگ مرمر لگایا گیا تھا۔ رنجیت سنگھ اسے اکھاڑ کر لے گیا۔ مقبرے کے باہر چھوٹی اینٹوں کا فرش، جہاں کہیں محفوظ رہ گیا ہے، قابل دید ہے۔ اس میں جیومیٹری کے ڈیزائن

نائے گئے ہیں۔ معمار نے اینٹیں اس حساب سے لگائی ہیں کہ مثلث، مربع ، مخمس، مسدس اور مثمن ڈیزائن بنتے چلے گئے ہیں۔ جس وقت میں آخری بار اس مقبرے کو دیکھنے گیا تو وہاں تک پہنچنے کے لئے غلاظت کے ڈھیروں میں سے گزرنا پڑا۔

اس مقبرے سے قریب ہی احمد علی فیلبان کا مقبرہ ہے جو مستطیل وضع پر تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ بھی مغلیہ عہد کی عمارت ہے۔ مغل حکمرانوں کے ہاں جو ادب و آداب برتے جاتے تھے، ان میں بادشاہ کی طرف پیٹھ کرنا سخت بے ادبی سمجھی جاتی تھی۔ جب کبھی بادشاہ ہاتھی پر سوار ہوتے تو فیلبان کی پشت بادشاہ کی طرف ہونی لازمی تھی۔ اس لئے اس کا یہ حل تلاش کیا گیا کہ کسی سید کو فیلبان مقرر کیا جائے تاکہ اس کی پشت کے پیچھے بیٹھنے کو معیوب نہ سمجھا جائے۔ یہ مقبرہ پہلے دُور سے نظر آتا تھا، اب مکانوں میں گھر کر رہ گیا ہے۔

احمد علی فیلبان کے مقبرے سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر مہاراجہ شیر سنگھ کی بارہ دری ہے ۔ کسی زمانے میں یہ عمارت راوی کے کنارے کھڑی تھی اور اب دریا وہاں سے اندازاً دو کلومیٹر دُور ہو گا۔ شاہ بلاولؒ کی قدیم قبر کا نشان اب تک وہاں موجود ہے۔ وہاں شیر سنگھ ، اس کی رانی پرتاپ کور اور فرزند پرتاپ سنگھ کی سمادھیں بھی ہیں جن پر ایک عجیب وضع کے گنبد بنے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک بڑا دالان بھی ہے جس کی دیواروں پر نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ اس دالان میں قیام پاکستان سے قبل گرنتھ صاحب رکھا رہتا تھا۔ دالان کی بیرونی دیوار پر سنگ مرمر کی ایک لوح نصب ہے جس پر یہ مرقوم ہے کہ یہاں ۱۵ ستمبر ۱۸۴۳ء کو سرداران سندھانوالیہ نے مہاراجہ شیر سنگھ کو قتل کیا تھا۔ اس سانحہ کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ مہاراجہ شیر سنگھ یہاں بغرض معائنہ فوج آیا ہوا تھا۔ سرداران سندھانوالیہ نے اُسے قتل کرنے کی سازش تیار کی۔ اُسی زمانے میں انگلستان سے بڑی عُمدہ قسم کی بندوقیں لاہور پہنچی تھیں۔ سازشیوں نے ایک بندوق مہاراجہ کے معائنے کے لئے پیش کی ۔ جونہی اس نے بندوق تھامنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا تو اجیت سنگھ سندھانوالیہ نے کمالِ پھرتی کے ساتھ گھوڑا دبا دیا اور مہاراجہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ظالموں نے اس کے ولی عہد پرتاپ سنگھ کو بھی قتل کر دیا۔ شیر سنگھ اور پرتاپ سنگھ کو اسی مقام پر سپرد آتش کیا گیا۔ شیر سنگھ کی بیوہ پرتاپ کور اپنے خاوند کی چتا میں بیٹھ کر ستی ہو گئی۔

مہاراجہ شیر سنگھ کو قتل کرنے کے بعد سرداران سندھانوالیہ فوراً شہر کی جانب بھاگے اور پیشتر اس کے کہ کسی کو اس سانحہ کی خبر ہو، وہ قلعے پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے قلعے پر قبضہ کرنے کے دوران وزیر دھیان سنگھ کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ جونہی دھیان سنگھ کے فرزند ہیرا سنگھ (جس کی طرف ہیرا منڈی منسوب ہے) کو اپنے باپ کے قتل کی خبر ملی تو وہ پڑاوہ بدھو سے سکھ فوج کو انعام کا لالچ دے کر قلعے کی جانب روانہ ہوا۔ سندھانوالیہ سرداروں نے قلعے کے دروازے بند کر لئے ۔ ہیرا سنگھ نے قلعے کا محاصرہ کر کے بادشاہی مسجد کے میناروں سے قلعہ کے اندر گولہ باری کی اور ایک خونی جھڑپ کے بعد قلعے پر قابض ہو گیا ۔ سرداران سندھانوالیہ میں سے اجیت سنگھ اور لہنا سنگھ قتل ہوئے۔ نور احمد چشتی

نے ان کی بے سر لاشیں دیکھی تھیں جنہیں ڈوگرہ سپاہی گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے تھے۔

تاریخ دانوں کی یہ رائے ہے کہ اگر شیر سنگھ زندہ رہتا تو شاید اتنی جلدی سکھ حکومت کا خاتمہ نہ ہوتا۔ اس کے قتل کے بعد ہیرا سنگھ نے رنجیت سنگھ کے ایک کمسن بیٹے دلیپ سنگھ کو تخت پر بٹھایا اور خود اس کا وزیر بن گیا، لیکن جلد ہی وہ بھی ایک سازش کا شکار ہو گیا۔

بارہ دری شیر سنگھ کے قریب ہی کالو رام کا مندر ہے۔ پرانے مندر کے قریب ہندوؤں نے قیام پاکستان سے ذرا پہلے ایک نیا مندر تعمیر کر لیا تھا۔ جو مینار کی شکل کا تھا۔ ایک پیچدار زینے کے ذریعے اوپر چڑھتے تھے۔ مینار کے اوپر کرشن جی کی مورتی نصب تھی جسے قیام پاکستان کے وقت توڑ دیا گیا۔ ۱۹۴۸ء تک اس کے ٹکڑے وہاں موجود تھے۔

کالو رام کے مندر سے تھوڑے سے فاصلے پر بھگت حقیقت رائے کی سمادھی ہے۔ حقیقت رائے خان بہادر نواب زکریا خان کے عہد نظامت (۱۷۲۵ء۔ ۱۷۳۷ء) میں ایک مدرسے میں پڑھتا تھا۔ ایک روز مدرس کی عدم موجودگی میں اس کے ہم جماعت مسلمان طلبہ نے کسی دیوی کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کئے تو جواباً حقیقت رائے نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شان میں گستاخی کی ۔ اس کے خلاف سب و شتم کا مقدمہ قائم ہو گیا اور قاضی نے اُسے سزائے موت سنائی۔ اس کی میت کو اسجگہ دریا کے کنارے جلایا گیا جہاں اب اس کی سمادھی ہے۔ ہندوؤں نے اُسے بھگت کا درجہ دے دیا اور خوب واویلا کیا جس نے آگے بڑھ کر فتنہ و فساد کی شکل اختیار کر لی۔ خان بہادر زکریا خان نے بڑی مشکل سے اس شورش پر قابو پایا اور ہندوؤں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے قاضی کو دار پر چڑھا دیا۔

حقیقت رائے کی سمادھی ایک چوکور کمرے کی شکل میں تعمیر ہوئی ہے اور اگر اندر جھانک کر چھت پر نظر ڈالیں تو سورج دیوتا کی تصویر نظر آتی ہے۔ جب میں پروفیسر محمد جمیل کے ہمراہ وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ ایک شخص نے اس میں بھوسہ ذخیرہ کیا ہوا ہے۔

ہندوؤں کے ہاں یہ سمادھی بڑی قابل احترام تھی اور وہ حقیقت رائے کو ”شہید“ کا درجہ دیتے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل یہاں بسنت کا میلہ لگتا تھا جس میں بلا تفریق مذہب و ملّت لوگ پتنگ اڑایا کرتے تھے۔ راقم الحروف نے بھگت حقیقت رائے کی ایک سمادھی بٹالے میں بھی دیکھی ہے۔ ان دونوں میں سے اصلی سمادھی کونسی ہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

بھگت حقیقت رائے کی سمادھی سے قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر مہدی شاہ کے احاطۂ مزار میں لاہور کی سب سے قدیم عمارت اپنی اصلی حالت میں ایک محراب کی شکل میں کھڑی ہے۔ ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی اسے سید مبارک شاہ، سلطان دہلی کی تعمیر کردہ عید گاہ کا محراب بتاتے تھے اور خان محمد ولی اللہ خان اسے جنازگاہ کی محراب ثابت کرتے تھے۔ دونوں کے درمیان بہت دنوں تک اخبارات میں اس موضوع پر قلمی جنگ ہوتی رہی۔ ان کی جنگ کانٹے کی تول رہی ۔

سیدوں کے عہد حکومت میں کھوکھروں کے ہاتھوں لاہور کو بڑا نقصان پہنچا تو سید مبارک شاہ

(۱۴۳۴ء۔ ۱۴۲۱ء) بنفس نفیس لاہور آیا اور اس نے یہاں قلعہ اور شہر پناہ بنوائی۔ اس کا آباد کردہ شہر "مبارک پور" کے نام سے موسوم ہو گیا۔ یہ محراب اسی دَور کی نشانی ہے۔ خطاطی کے ذریعے اس محراب کی آرائش کی گئی ہے لیکن بے احتیاطی سے بار بار قلعی کرنے سے حروف پڑھنے کے قابل نہیں رہے۔ یہ اس وقت لاہور کی سب سے قدیم عمارت ہے اس لئے اسے محفوظ کرنا ضروری ہے۔



سیّد ضمیر جعفری

ولادت : جہلم ، جنوری ۱۹۱۸ء

تصانیف و تراجم : بیس کے قریب

اعزاز : تمغۂ حسنِ کارکردگی ۱۹۸۴ء

آدم جی ادبی انعام ۱۹۷۸ء

نقوش ایوارڈ برائے طنز و مزاح ، ۱۹۸۶ء



ڈاکٹر سلیم اختر

ولادت : انبالہ ، ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ء

تعلیم : ایم ۔ اے (اُردو) ، پی ایچ ڈی

تصنیفات و تالیفات : چالیس کے قریب

اعزاز اور انعام : داؤد ادبی انعام ، ۱۹۷۶ء

رائٹرز گلڈ انعام

موجودہ مصروفیت : اسسٹنٹ پروفیسر ،

شعبۂ اردو ، گورنمنٹ کالج ، لاہور

نقوش ایوارڈ برائے سفرنامہ ، ۱۹۸۹ء

اسلم کمال

پیدائش : جنوری ۱۹۳۹ء سیالکوٹ

تعلیم : بی اے (پنجاب)

امتیازات : (۱) دنیا کے تمام ممالک میں مصوری اور خطاطی کی اکیاون انفرادی نمائشیں ۔
(۲) ۱۸ ہزار سے زائد کتابوں اور رسالوں کے سرورق ڈیزائن
(۳) کلامِ اقبال اور کلامِ فیض کی مصوری

تصانیف : (۱) لاہور سے چین تک (سفر نامہ)
(۲) اسلم کمال اوسلو میں (سفر نامہ)
(۳) باغ بدر شہر بدر (کالم ۔ زیرِ طبع)



خطوطِ وحدانی میں جہانِ معنی

انور سدید

عارف عبدالمتین سے میرا پہلا تعارف ہوا تو وہ ترقی پسند تحریک کے ایک نامور شاعر کی حیثیت میں اپنا مقام مستحکم کر چکے تھے اور اب اردو ادب میں دوام فن حاصل کرنے کے لئے بڑی ثابت قدمی سے آگے بڑھ رہے تھے ۔ پھر بادِ حوادث چلی اور لوگ مفادات کے خوش نظر درخت سے کچے پکے پھل چننے لگے تو ان کے بیشتر ہم سفروں کے قدم ڈگمگا گئے اور وہ جلبِ زر میں ایسے مبتلا ہوئے کہ ان کی نظریاتی وفاداریاں بھی مشکوک نظر آنے لگیں ۔ یہ منظر قیامت کا تھا کہ حصول منزل کے بعد شر کائے جہد ہی منزل کے درپئے آزار ہو گئے اور اس کی بنیاد بس یوں تیزی سے کھوکھلی کرنے لگے کہ منزل کا وجود ہی مائل بہ خطر نظر آنے لگا ۔ عارف شاید واحد ترقی پسند شاعر ہے جس نے اس دور ابتلا میں بھی ثابت قدمی کا ثبوت دیا اور غریبی اور غیور مزاجی کا اعلان کئے بغیر اپنی نظریاتی اساس کو متزلزل نہ ہونے دیا ۔ یہ عارف کے فکر و نظر کی پختگی کا ہی نتیجہ تھا کہ اس کا فن متحارب سمتوں میں سفر کرنے کے بجائے نامیاتی انداز میں پَھلا پُھولا اور پھیلا اور آج جب "دیدہ و دل" سے "صلیب غم" تک اور "صلیب غم" سے "اکلاپے دامسافر" ، "سفر کی عطا" اور "یہ دھوپ کی چادر" تک اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس کے ہاں موضوعات کا تنوع ، اظہار کی گہرائی اور مشاہدے کی ندرت تو بے پایاں نظر آتی ہے لیکن اس ہمہ رنگ وسعت میں تضاد کی پوبلی کہیں بھی نظر نہیں آتی ۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی اپنے نظریے کے سامنے نادم نظر نہیں آتا بلکہ عارف کا جو منصب اسے ودیعت ہوا تھا اس سے کم تر مقام پر اُترنا اسے کبھی منظور نہیں ہوا۔ میرے نزدیک عارف کی غزل اس کے عوامی مزاج کی نمائندہ ہے اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے ایسی جاوداں قدروں کے مشاہدے کا موقعہ ملتا ہے جن کی درخشاں صداقت بہت عرصے سے عارف عبدالمتین پر منکشف ہو رہی ہے اور جسے عامۃ الناس تک پہنچانے کے لئے عارف نے شاعری کا اہم فریضہ قبول کر رکھا ہے ۔ میں نے بہت عرصہ پہلے عارف کی غزل مختلف رسائل میں ورق ورق پڑھی تھی پھر جب اس کی شیرازہ بندی ہوئی تو میں نے اس پر صرف ایک اچٹتی ہوئی نظر نہیں ڈالی بلکہ اس کے ساتھ عمر عزیز کے کئی قیمتی دن گزارے ۔ مطالعے کی اس معطر تنہائی میں عارف کی غزل نے اس کے فلسفہ فکر ، فلسفہ فن اور فلسفہ زندگی کے وہ تمام رازہائے گرانمایہ جو اس کے بطون میں پوشیدہ تھے نبات النعش گردوں کی طرح مجھ پر عریاں کر دیئے اور اب مجھ پر ایک نیا جہان معنی آشکار ہونے لگا ———

اس جہانِ معنی کی دریافت جسے عارف نے غزل کی خطوط وحدانیوں میں بند کر رکھا ہے میرے لئے تخلیق مکرر سے کم نہیں ۔ ۔ ۔ ۔

غزل کا ذکر آیا ہے تو ابتداً اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ اردو کی اس اہم ترین صنف ادب کے مزاج کی تشکیل میں اب تک دلّی اور لکھنؤ کے مقامی اثرات کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ ان کے تذکرے کے بغیر کسی بڑے شاعر پر تنقید لکھنا بظاہر مشکل نظر آتا ہے ۔ بات غزل کی چھڑے تو دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کا تذکرہ ، اور ان دونوں کے حوالے سے داخلیت اور خارجیت موضوعیت اور معروضیت ، عشقِ حقیقی اور عشق مجازی ، ذات اور غیر ذات ، گہرائی اور گیرائی کا ذکر اس افراط سے ہوتا ہے کہ موضوع بنے بنائے راستوں پر خود بخود لڑھکتا چلا جاتا ہے اور بالآخر شاعر کی انفرادیت کسی ایک دبستان کے ہجوم شعراء میں یوں گم ہو جاتی ہے کہ اس کا ذاتی چہرہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے ۔ سید عابد علی عابد زندہ تھے تو دبستانوں کے اس امتیازی وجود کو ماننے پر کبھی آمادہ نہ ہوتے ۔ بلکہ وہ تمام خصوصیات جو ایک دبستان کے شعراء کا مابہ الامتیاز قرار دی جاتی ہیں دوسرے دبستان کے شعرا میں تلاش کیں اور امتثال حقیقت کے طور پر پیش کر دیں ۔ غزل کے دبستانوں کی یہ تقسیم اس لئے بھی محلِ نظر معلوم ہوتی ہے کہ اردو کا دائرہ عمل صرف دلی اور لکھنؤ تک محدود نہیں بلکہ یہ نواح پشاور سے اکنافِ دکن تک اور ساحل کراچی سے ساحل چاٹگام تک پھیلا ہوا ہے ۔ چنانچہ غزل کے بے شمار شعرا ایسے ہیں جنہوں نے دلی اور لکھنؤ کے خیابانوں کی کبھی سیر نہیں کی اور ایک کتابی روایت کی تقلید کرنے کے بجائے غزل کے فروغ میں باندازِ نو اتنا حصہ لیا کہ اب ان کی انفرادیت ایک نئی روایت کا نقطہ آغاز شمار ہوتی ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ تقلید اور تتبع کے رجحان عام میں کھو جانے کے بجائے ان شعرا نے تخلیق کے وہبی وصف سے کام لیا اور زندگی کے متنوع مشاہدے ، نادر مطالعے اور بوقلموں تجربے کو یوں شعر کا پیکر عطا کیا کہ غزل کسی مخصوص چوکھٹے میں سمٹے رہنے کی بجائے نئے آفاق کی طرف سفر کرنے لگی ۔

اردو غزل کی تاریخ میں یہ واقعہ بے حد حیرت انگیز ہے کہ اس صنف ادب کے خلاف ایک منفی رویہ قریباً ہر زمانے میں موجود رہا ہے ۔ غالب جیسے سر برآوردہ شاعر نے اس کی تنگ دامانی کا اور حالی جیسے مجدد نے اس کی پامال خیالی کا شکوہ کیا ۔ کئی مرتبہ اس کی باضابطہ موت کا اعلان ہوا اور ایک دفعہ تو اسے بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لئے ایک باقاعدہ تحریک بھی برپا کی گئی ۔ غزل کی سخت جانی ملاحظہ ہو کہ عین اسوقت جب ارباب ادب اس کی تجہیز و تکفین کا سامان مہیا کر لیتے ہیں غزل ققنس کی طرح اپنے ہی خاکستر سے بیدار ہو جاتی ہے اور اپنے مختصر سے پیمانے میں ایسی نئی اور تیز شراب پیش کرتی ہے کہ اہل ذوق اسے بے ساختہ چھلکانے اور لبوں کے راستے دل میں اتارنے پر مائل ہو جاتے ہیں ۔ اس ضمن میں یہ حقیقت اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ جب دلی اور لکھنؤ میں غزل مخصوص تصورات ، پامال ترکیبات اور پیش پا افتادہ استعارات میں تکرار بے جا کا شکار ہو رہی تھی تو اسے نیا خون پنجاب نے مہیا کیا ۔ اور اقبال پیدا کیا جس نے غزل کی ہمہ رنگ وسعت میں نہ صرف نئے امکانات تلاش کئے بلکہ اس کے بنیادی رجحانات تک کو بدل ڈالا اردو غزل کی تاریخ میں اقبال وہ سنگِ میل ہے جس سے مستقبل کی بیشتر فنی راہیں کشادہ ہوتی ہیں ۔ چنانچہ آج غزل میں اسلوب اور معنی کی جو نئی بشارتیں طلوع ہو رہی ہیں ان میں سے کئی ایک کا ماخذ اقبال ہے ۔ اور ان بشارتوں کو حقیقی فنی قالب

میں ڈھالنے کے لئے تخلیق کے داخلی میدان عمل کی ضرورت پڑی تو یہ بھی پنجاب نے ہی مہیا کیا اور فیض احمد فیض ، ظہیر کاشمیری ، عبدالحمید عدم ، یوسف ظفر ۔ باقی صدیقی ۔ مجید امجد ۔ قیوم نظر ۔ وزیر آغا ۔ سیف الدین سیف ۔ صلاح الدین ندیم ۔ شہزاد احمد ۔ ظفر اقبال ۔ منیر نیازی اور عارف عبدالمتین جیسے قد آور شعرا پیدا کئے جنہوں نے نظم کے ساتھ غزل کا مزاج بدلنے میں بھی نمایاں خدمات سرانجام دیں ۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غزل کی تنقید میں جب ہم دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس بات کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ غزل کو سنوارنے میں اکناف ہند کے دوسرے مقامات نے بھی اہم حصہ لیا ہے اور اس کا مستقبل کسی جامد روایت کے ساتھ کبھی وابستہ نہیں ہوا ۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ صنفِ ادب کبھی کی غیر مؤثر ہو چکی ہوتی اور نظم کی بے پناہ یلغار میں اپنا وجود قائم نہ رکھ سکتی ۔ غزل چونکہ ہمارے عہد میں نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کے مزاج میں تبدیلی بھی آئی ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس ندی میں تازہ پانی کے دھارے مسلسل شامل ہوتے رہے ہیں جو اس کے سابقہ ذائقے کو تبدیل کرنے میں معاونت کر رہے ہیں ۔

اقبال سے غزل کی پرانی روایت نے اچانک ایک نیا موڑ کاٹ لیا اور اس روایت کی تقلید بھی بہت زیادہ ہوئی ۔ اس سلسلے میں اولین سطح پر وہ شعراء نظر آتے ہیں جنہوں نے اقبال کی ترکیبوں ، استعاروں اور تشبیہوں کے بنے بنائے سانچے بے دریغ استعمال کئے ۔ مصنوعی جلال و جمال پیدا کیا اور بالآخر اقبال کی صدائے بازگشت میں ہی کہیں گم ہو گئے ۔ اس قسم کے شعرا اب اپنے کتبوں کی خود ہی مجاوری کر رہے ہیں اس لئے چنداں قابل ذکر نہیں ۔ دوسری قسم کے شعرا نے اقبال کی جدیدیت کا تخلیقی انداز قبول کیا اور معنوی سطح پر اس روایت کے نئے قرینے دریافت کرنے کی کوشش کی ۔ یہ کام چونکہ اپنی الگ تخلیقی نوعیت رکھتا ہے اس لئے ان شعرا کے ہاں فکر و خیال کی نئی قندیلیں جگمگاتی ہیں اور ان سے جو روشنی پھیلتی ہے اس کا اجالا ذوق و نظر کو نئی تنویریں عطا کرتا ہے ۔

مؤخر الذکر شعرا کے ہاں کائنات اس لئے اہم ہے کہ یہ انہیں مطالعے ، مشاہدے اور تجربے کے لئے وسیع میدان فراہم کرتی ہے ۔ اور ابن آدم کی اہمیت یہ ہے کہ وہ زندگی اور شعور کی دولت سے نوازا گیا اور اب ان دونوں کے دانشورانہ استعمال سے کائنات کے تمام گوشوں کو منور کرنے کا اہتمام کر رہا ہے ۔ ان شعرا کی ایک خصوصیت یہ بھی نکھر کر سامنے آئی کہ وہ صرف خارج پر ہی نظر نہیں رکھتے بلکہ اپنی آنکھیں داخل کی طرف بھی وا کئے ہوئے ہیں اور یوں وہ صرف کائنات کے ازلی اور ابدی رشتوں کو ہی تلاش نہیں کرتے بلکہ اس دنیا کا کھوج لگانے کی کوشش بھی کرتے ہیں جو ان کے باطن میں آباد ہے اور جو حرکت میں آتی ہے تو اکثر اوقات خارج کو بھی متلاطم کر ڈالتی ہے ۔ اس معنوی جہت سے جن شعرا نے اردو غزل کو توانائی اور رفعت عطا کی ہے ان کی فہرست کچھ زیادہ طویل نہیں اور ان معدودے چند شعرا میں عارف عبدالمتین کو وقعت کا مقام حاصل ہے ۔

عارف کی زندگی میں شعور کی پہلی کرن بیدار ہوئی تو اسے گرد و پیش میں ہر طرف اندھیرا نظر آیا ۔ انسانیت

محبوس اور معاشرہ جبریت کا شکار تھا ۔ لرزیدہ خیالی اور ژولیدہ فکری نے زندگی پر سے ابن آدم کا اعتماد مجروح کر ڈالا تھا اور اب وہ جہد للبقا کے لئے نہ صرف ڈگر ڈگر ٹھوکریں کھا رہا تھا بلکہ اس کی شخصیت کے ظاہر اور باطن میں بھی ایک وسیع خلیج حائل ہو چکی تھی ۔ نتیجے کے طور پر وہ منافقت کی ایسی تیرہ و تار زندگی گزارنے پر مجبور تھا جس سے ضمیر زنگ آلود اور دل کی صادق آواز ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتی ہے ۔ عارف چونکہ دیدۂ بیدار اور دل درد آشنا لے کر پیدا ہوا تھا اس لئے اس نے اپنے دوسرے معاصرین کی طرح رو میں بہہ جانے اور ضرورت شعری کے لیے انسان کو عظیم قرار دینے کے بجائے اس آدم خاکی کو جو گناہ کا مرتکب ہوا تھا اور لغزش جس کی فطرت میں شامل تھی اسی کی جملہ خامیوں کے ساتھ قبول کر لیا ۔ عارف کا یہ اقدام اس لئے بھی خصوصی تذکرے کا مستحق ہے کہ اس کے بیشتر ہم سفروں نے صرف ''انسان'' کو جو آدم کی تجرید ہے اپنی تعریف و تحسین کا سزاوار سمجھا ۔ اسے پھول سہروں سے لادا اور ایک خوبصورت گھوڑے پر بٹھا کر دہر کا دولہا قرار دے دیا ۔ قطع نظر اس کے کہ بعض شعرا نے اس نظر فریب انسان کے لئے واحد متکلم کی ضمیر استعمال کی اور اس مثالی انسان کے آئینے میں اپنا پیکر منعکس کرنے کی کوشش کی تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس کوشش میں اس آدم خاکی کے اصل نقوش جس سے انجم سہمے جاتے تھے مٹی میں رُل گئے ۔ اور نتیجہ ایک جانکاہ احساس محرومی کے سوا اور کچھ نہ تھا ۔ عارف چونکہ کسی مریضانہ نرگسیت کا شکار نہیں اس لئے وہ آدم کے اس احساس محرومی کو زائل کرنے پر کمربستہ ہوا اور انسان کے بجائے زندگی کو اپنی توجہ کا محور بنایا ۔ چنانچہ اس نے انسان کی مفروضہ عظمت کے گیت گانے کے بجائے زندگی کو حسین و دلنشیں ۔ متنوع اور متحرک قرار دیا اور پھر اس کی اہمیت اجاگر کرنے میں مصروف ہو گیا، اس ضمن میں مندرجہ ذیل شعر عارف کے نظام فکر کی ایک اہم کڑی شمار ہوتا ہے ۔

حیات ہر رنگ میں حسیں ہے ، ہر اک ادا اس کی دل نشیں ہے
اڑے تو خوشبو ، گرے تو جھرنا ، بڑھے تو اک آہوانہ رم ہے

غزل کی شاعری میں بالعموم زندگی سے گریز ، جسم کے فطری تقاضوں سے فرار اور دکھ اور کرب کو حاصل حیات شمار کیا جاتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ہی ان نعمتوں سے جبری محرومی اختیار کر لیتا ہے جن سے فیض اٹھانا اس کا فطری حق ہے ۔ اس زاویے سے عارف کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے زندگی کو ایک خوبصورت حرکی حقیقت قرار دیا جس کا منظر اور پیش منظر ہر لحہ بدلتا چلا جاتا ہے اور وہ اس زندگی پر آدم خاکی کے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنے کا آرزومند نظر آتا ہے ۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ عارف نے زندگی کے حوالے سے انسان کو اثمار حیات سے بے تحاشا لذت کشید کرنے پر مائل کیا ہے یا وہ اپیی کیورین فلسفے کا حامی ہے ۔ سچ یہ ہے کہ عارف ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل و تعمیر کا داعی ہے ۔ وہ اخلاقی ضابطوں اور معاشرتی قدروں کی نامیاتی تبدیلی کو تو تسلیم کرتا ہے کہ ان سے تہذیبی رفعت اور ثقافتی درخشندگی پیدا ہوتی ہے لیکن ایسی شکست و ریخت جس سے معاشرہ انارکی کا شکار ہو جائے اسے کسی سطح پر بھی گوارا نہیں ۔ چنانچہ کائنات ، فرد اور زندگی کی تثلیث میں عارف نے بنیادی اہمیت تو زندگی

کو دی ہے ۔ لیکن فرد اور کائنات کو نظر انداز نہیں کیا ۔ وجہ یہ کہ زندگی صحت مند خطوط پر رواں دواں ہو تو انسان جو دراصل اس زندگی کا مرکز و محور ہے کے جسم اور روح میں کوئی فاصلہ نہیں رہتا اور وہ ہوا کی لہروں میں ہلکورے لینے لگتا ہے ۔ اور طمانیت کا یہ عالم ہو تو معاشرہ جملہ بیماریوں سے خود بخود نجات پالیتا ہے ۔ جسم اور روح کو سبکسار کرنے کا یہ زاویہ عارف کی غزل میں متعدد مرتبہ نمایاں ہوا ہے اور ہر دفعہ ایک ایسی آرزو میں ڈھل گیا ہے جس کی تکمیل کے لئے وہ دکھ جھیلتا اور بعض اوقات زندگی کا بلیدان بھی دے دینا گوارا کرتا ہے ۔

ہنستے ہوئے جینے کی تمنا میں مری ہے — وہ شمع کہ رستے میں ہواؤں کے جلی ہے
ہوں مثل صبا قافلۂ گل کے جلو میں — غنچے کی چٹک میرے لئے بانگِ درا ہے
مرنا بھی گوارا ہے مجھے جینے کی خاطر — یہ کرب قیامت مری ہستی کی عطا ہے
نشہ مجھے برسوں سے ہے خود اپنے لہو کا — لیکن میرا محسن ہے تیری آنکھ کا ساغر
اپنے بچوں کا تبسم دیکھ کر عارف بتا — گھر کی ویرانی کا تجھ کو شکوۂ بے جا نہ تھا

آپ نے دیکھا کہ عارف کس والہانہ سرگرمی سے زندگی کے لئے موت تک کو قبول کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے ۔ اس جرأت مندانہ اقدام کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عارف نے زندگی کو بارگراں تصور کرنے کی بجائے اسے مطلق انہماک سے دیکھا ہے اور اس مطالعے میں جو کسی بھی طرح عبادت سے کم نہیں ہے بنات النعش حیات نے اس پر اپنے سینے کے تمام راز ہائے گرانمایہ آشکار کر دیئے ہیں ۔ چنانچہ اسے حقیقت اولیٰ کی ایک جہت ذات سے باہر نظر آئی تو اس کی دوسری جہت ذات کے اندر بھی پھیلی ہوئی دکھائی دی ۔ ان اسرار کی پردہ کشائی ہرچند کچھ زیادہ مسرت افزا نہیں لیکن عارف کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے مخالف قوتوں کی یورش پر کسی منفی مریضانہ رویے کا اظہار نہیں کیا اور آمادۂ مفاہمت ہونے اور مادی زندگی کو آسائشوں کا تحفظ مہیا کرنے کے بجائے زخم کھانا اور ٹوٹ جانا اور تباہی سے ہم کنار ہو جانا قبول کر لیا ۔

میں اپنے خوں میں نہاتا رہا صدا عارف — یہ کائنات ملی مجھ کو کربلا کی طرح
میری عظمت کا نشاں میری تباہی کی دلیل — میں نے حالات کے سانچے میں نہ ڈھالا خود کو
میرا بازو کٹ گیا عارف مِری تلوار سے — یہ وہ منظر ہے جسے تاریخ کم دکھلائے گی
وقت اگر عارف مرے قدموں پہ دوزانو نہیں — وقت کے سانچے میں میں نے خود کو ڈھالا بھی نہیں

عارف عبدالمتین نے جب شاعری کی ابتدا کی تو ادب کی ترقی پسند تحریک اپنے پاؤں جما چکی تھی ۔ اور ترقی پسند شعرا نے فکر و خیال کے مستقیم اظہار کے لئے غزل کے چینٹے سانچے کو غیر موزوں قرار دے دیا تھا ۔ ہرچند اس زمانے میں نظم کو ترقی حاصل ہوئی اور موضوعات کے بیشتر نئے تجربے نظم میں ہی کئے گئے تاہم اس شعوری کاوش کے باوجود ترقی پسند شعرا بھی غزل کو کلیتاً نظر انداز نہ کر سکے ۔ اور یہ حقیقت اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ فیض احمد فیض نے غزل گوئی اختیار کی تو غالب کا وسیع مطالعہ ان کے بہت کام آیا ۔ چنانچہ غالب کے استعاروں نے جب فیض کی تخلیقی

شخصیت سے مس کیا تو نہ صرف ان استعاروں کی کایا ہی پلٹ گئی بلکہ انہیں ایک نئی معنویت بھی حاصل ہو گئی ۔ لیکن اس سے پہلے اقبال کی گھمبیر آواز پنجاب سے اٹھی اور خواص و عوام کی رگوں میں خون گرم دوڑا گئی ۔ اس آواز نے بہت سے شعرا کو متاثر کیا اور اس کے اثرات ان کی شاعری میں نمایاں ہوئے ۔

ترقی پسند غزل کے بے شمار شعرا میں سے عارف اور ظہیر کاشمیری کو اس لئے بھی اہمیت حاصل ہے کہ ان دو شعرا نے اپنی انفرادیت کے بل بوتے پر بقائے دوام کی منزل سر کی ہے اور ترقی پسند گروپ کی تنقیدی مشینری نے ان کے فن کو مناسب شہرت عطا کرنے میں کچھ حصہ نہیں لیا ۔ ظہیر کاشمیری کی منفرد عطا یہ ہے کہ انہوں نے غزل کو پنجاب کا مردانہ وقار اور گھمبیر لہجہ عطا کیا ۔ عارف کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے غزل کی نرم روی کو مجروح کئے بغیر اس صنف ادب میں اپنے داخلی اور خارجی جذبوں کا انضمام پیش کرنے کی سعی کی ۔ اور اب جبکہ اقبال کی وفات کو پچاس برس سے زائد ہو چکے ہیں اور اس تمام عرصے کے تغیرات کو غزل نے اپنے پیکر میں سمو لیا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ ترقی پسند غزل نے جو تین نمایاں اور منفرد آوازیں پیدا کیں ان میں فیض کی غزل کا ایک زاویہ ——— غالب کی تخلیقی توسیع ہے ۔ ظہیر کاشمیری اور عارف دونوں نے اقبال سے استفادہ کیا ۔ ظہیر کاشمیری نے اقبال کا خارجی اثر قبول کیا اور اس کے ہاں غزل کا جلالی روپ بلند بانگ لہجے ، گونجتے گرجتے الفاظ اور بھاری بھرکم تراکیب کی صورت میں نکھرا ۔ جب کہ عارف نے اقبال کی نظریاتی پختگی کو اہمیت دی اور ان کی غزل میں فکر کا عنصر شامل ہو گیا ۔ عارف کی شاعری میں الفاظ کا خارجی پیکر بے حد لطیف اور نرم و نازک ہے لیکن ان کے داخل میں ایک فکری آتش فشاں موجود نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عارف کی غزل کی موزوں تحسین کے لئے ہمیں الفاظ کی ظاہری پرت ہٹا کر ان کے بطون میں جھانکنے کی ضرورت پڑتی ہے ۔ الفاظ تو صرف پردہ ہیں اور اصلی عارف تو بس پردے کے پیچھے چھپا ہوا ہے ۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ عارف کی شاعری بنیادی طور پر محبت کی شاعری ہے ۔ وہ ظہیر کاشمیری کی طرح فرد کو کسی پیکار کے لئے تیار نہیں کرتا بلکہ بنی نوع آدم کو آپس میں یگانگت بڑھانے اور محبت کرنے کا مشورہ دیتا ہے ۔

بانٹ جی بھر کے اسے دہر کے محروموں میں — پیار دولت تو نہیں ہے کہ جو گھٹ جائے گی

اور اس معصوم اقدام میں اکثر اس کے پاؤں زخمی اور سینہ چھلنی ہو جاتا ہے ۔ عارف کی غزل میں صلیب کا استعارہ بار بار مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے تو اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ وہ دکھ تو اپنی ذات پر جھیلتا ہے لیکن زندگی کا پیار اور شیفتگی دوسروں پر نچھاور کر دیتا ہے ۔ چنانچہ عارف کے ہاں ذات کے خول سے نکلنے اور پھیل کر کائنات میں تحلیل ہو جانے کا جذبہ بے حد نمایاں نظر آتا ہے ۔

مہک اٹھے گی فضا، میرے تن کی خوشبو سے — میں عود ہوں کبھی آ کر کوئی جلائے مجھے
چراغ ہوں تو فقط طاق کیوں مقدر ہو — کوئی زمانے کے دریا میں بھی بہائے مجھے
میں مشت خاک ہوں ، صحرا مری تمنا ہے — ہوائے تیز کسی طور سے اڑائے مجھے

میں برگ گل میں مقیّد تھا صورتِ خوشبو | ہوا چلی ہے تو ہر سو بکھر گیا ہوں میں
نور تو مجھ سے فراواں ہوا محفل محفل | غم نہیں شمع صفت میں نے جلایا خود کو
یہ آرزو ہے کہ عارف غزل میں ڈھل جاؤں | اداس لمحوں میں شاید وہ گنگنائے مجھے

آپ نے دیکھا وسعت کی تمنا میں عارف نے کبھی عود، کبھی چراغ، کبھی خوشبو اور کبھی مشتِ خاک بننے کے لئے کس والہانہ سرگرمی کا اظہار کیا ہے۔ اور انتہا اس کی یہ ہے۔ کہ عارف نے اپنے جسم کو بھی اکائی کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ اس پر بہجت اور مسرت کی ایک عجیب سی کیفیت اس وقت طاری ہو گئی جب عارف نے اپنے وجود کو کتنے ہی رنگوں میں گھر کے آنگن میں بکھرا ہوا پایا

اپنے بچوں کی طرف غور سے جب بھی دیکھا | کتنے ہی رنگوں میں بکھرا ہوا پایا خود کو

جس طرح خدائے واحد کا جلوہ کائنات کے ہر بُنِ مو میں پھیلا ہوا ہے اسی طرح نیابت الٰہی کے حوالے سے عارف نے بھی کائنات میں اپنے آپ کو PERMEATE کرنا پسند کیا ہے اور اپنی ذات کو ہزاروں رنگوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ اس کا اظہار اردو ادب میں یوں ہوا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو کسی ایک صنف ادب تک محدود نہیں رکھا بلکہ غزل۔ نظم۔ قطعہ۔ رباعی اور فرویات کے علاوہ تنقید اور طویل نظموں میں کہانی بیان کرنے کا فریضہ بھی عارف نے سر انجام دیا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ عارف کھلی فضاؤں کا شاعر ہے۔ وہ فطرت کے ساتھ ہم کلام ہی نہیں ہوتا بلکہ فطرت کو اپنی ذات میں ضم بھی کر لیتا ہے۔ اور جب کبھی آزادی کی اس فضا پر شب خون پڑتا ہے اور فرد محبوس ہو جاتا ہے تو عارف پر جان کنی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور پھر اچانک اس کے ہاں "بند پانی" رکا ہوا دریا؛ بحرِ سکوت، گنبد بے در، ٹھہرا ہوا آسماں وغیرہ تراکیب میں اس کا بے انت دکھ نمایاں ہونے لگتا ہے۔

بند پانی کے بھنور میں کھو گئی کشتی مری | آنکھ جل تھل تھی، مگر آنسو کوئی ٹپکا نہ تھا
موج صدا اٹھا کوئی بحرِ سکوت سے | اس سنگ سے دکھا کوئی پیکر نکال کر
ایک انجانی سی دہشت ہے خیالوں پر محیط | وہ سماں ٹھہرا ہے آنکھوں میں کہ ٹلتا ہی نہیں
آنکھوں میں میرے کب سے ہے دریا رکا ہوا | ہوں ضبط کا حصار مگر ٹوٹتا ہوا

دلچسپ بات یہ ہے کہ عارف کے مزاج میں جو گہرا تہذیبی رچاؤ ہے وہ تو اسے زبان بندی کے جبر کے خلاف بھی اونچی آواز اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا، محولہ بالا اشعار میں عارف احساس کی ہلکی ہلکی آنچ میں سلگتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن وہ آہ و بکا بلند کرنے اور شور و غوغا اٹھانے کے بجائے ایک زیر لب تبسم خفی سے اپنے دل کا سارا درد و کرب قاری کے حوالے کر دیتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ جوالا تو عارف کے اندر سلگ رہی ہے اور اسے آہستہ آہستہ پگھلا بھی رہی ہے لیکن یہ سب کچھ اسے زہر خند یا تلخ اندیشانہ اظہار پر آمادہ نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو عارف کے ہاں بھی اونچی آواز ضرور

بلند ہوتی اور یوں وہ اپنے اعلیٰ تہذیبی مقام سے اتر کر ایک ارزاں مصلح قوم کا منصب اختیار کر لیتا ۔ عارف نے فرد کو چونکانے اور اسے ہنگامی طور پر متاثر کرنے کے بجائے اس کے داخل کو آہستہ روی سے منقلب کرنے کی سعی کی ہے اور اس کا دھیما نرم لہجہ دماغ پر کوئی گہری ضرب لگانے کے بجائے دل کو ہلکی سی کروٹ دینے پر ہی اکتفا کرتا ہے ۔ یہی رویہ عارف عبدالمتین کو ترقی پسند غزل کے اولین اہم شعرا میں مقام امتیاز عطا کر دیتا ہے ۔

برصغیر کی تقسیم کبیر نے معاشرہ ، فرد اور زندگی پر جو گہرے اثرات مرتب کئے ہیں ان کا تذکرہ اس لئے غم افزا ہے کہ آزادی اپنے جلو میں جن بے کراں مسرتوں کو لے کر آئی تھی عامۃ الناس کو ان سے پوری طرح فیضیاب ہونے کا موقعہ نہ دیا گیا ۔ چنانچہ وہ ٹوٹے ہوئے ستارے جو نئے آفاق میں پہنچ کر کہکشاں بننے کے لئے بے تاب تھے اب آوارہ شہاب ثاقبوں کی طرح بکھرنے لگے اور وہ ادغام ملّی جو افراد کو ایک صحت مند معاشرے میں تبدیل کر دیتا ہے عمل میں نہ آسکا ۔ شکست و ریخت کی اس فضا کا ایک فطری نتیجہ یہ ہوا کہ فرد تیزی سے بدلتے ہوئے حالات ، ٹوٹتی ہوئی قدروں اور شکستہ معیاروں کے خلاف صحت مند رد عمل کی قوت ہی کھو بیٹھا ۔ بے یقینی اور بداطمینانی کی اس فضا میں معاشرہ ایک ایسی ڈگر پر رواں دواں ہو گیا جس میں اپنی ذات کا تحفظ سب سے زیادہ ضروری سمجھا جانے لگا اور یوں بدی کی قوتوں کے ساتھ مفاہمت کی راہ ہموار ہوتی چلی گئی ۔ چنانچہ شاعر جو کبھی پیغمبری کے منصب پر فائز تھا اور عامۃ الناس کے کھردرے جذبات کو تہذیبی رفعت سے ہم کنار کرنے کا دعوے دار تھا ۔ اب اس مقام فضیلت سے دستبردار ہو گیا ۔ شاعری ذریعۂ روزگار بن گئی ۔ عشق خمار گندم قرار دیا گیا اور مال و دولت سے حاصل ہونے والی راحت جسم اور روح دونوں کو لو دینے لگی ۔ اردو غزل میں یہ رجحان در آیا تو وہ شئے لطیف جسے OTHERWORLDLINESS کہا جاتا ہے اور جو پیغمبروں ، صوفیوں اور ولیوں کے علاوہ شعرا کو بھی ودیعت ہوتی ہے ان سے چھن گئی اور شاعر ایک ایسے خود غرض منفعت پسند اور صداقت ناآشنا شخص کے روپ میں سامنے آیا جو اپنے ہی قلم سے خود غرضی کا پرچار کر رہا تھا اور ببانگ دہل کہہ رہا تھا ۔

اے دوست تری آنکھ جو نم ہے تو مجھے کیا — میں خوب ہنسوں گا ، تجھے غم ہے تو مجھے کیا
کیا میں نے کہا تھا کہ زمانے سے بھلا کر — اب تو بھی سزاوارِ ستم ہے تو مجھے کیا
بھولا تو نہ ہو گا تجھے سقراط کا انجام — ہاتھوں میں تیرے ساغر سم ہے تو مجھے کیا

کیا لینا اس گرگٹ جیسی دنیا سے — آئے رنگِ نظر جس کا ہر بار جدا

اس رجحان کا نتیجہ عیش کوشی ، مہم جوئی ، طلب شہرت اور حصول زر کی صورت میں سامنے آیا اور بے نیازی ، سیر چشمی اور استغنا کی دولت ضائع ہو گئی ۔ اردو غزل میں خود غرضی کا یہ زاویہ اس لئے قابل اعتنا نہیں کہ عارف عبدالمتین ، جیسے شعرا نے موجود حقیقتوں کو نظرانداز کئے بغیر معیاری قدروں کو زندہ رکھنے کی کوشش کی اور ان صداقتوں

کا علم بلند رکھا جنہیں مصلح بلاواسطہ طور پر اور شعرا بالواسطہ طور پر ترویج دیتے ہیں ۔ اہم بات یہ ہے کہ عارف کو اس بات کا پورا ادراک ہے کہ وہ زمانے کی تیز ہوا کے مخالف رخ چل رہا ہے اور اس نے اپنے عہد کا سقراط بننا قبول کیا تو زمانے نے عارف کی پہچان سے انکار کر دیا ۔

عہد میرا مجھے پہچان نہ پایا عارف　　میں کہ اترا تھا یہاں شعر کی تورات لئے
وقت اگر عارف مرے قدموں پہ دو زانو نہیں　　وقت کے سانچے میں میں نے خود کو ڈھالا بھی نہیں
عارف تُہی اس کرب سے دوچار نہیں ہے　　مصلوب ہے اس عہد میں ہر فن کا پیمبر

اس آگہی کے باوجود عارف نے خیر و شر کی آویزش میں خیر کی قدر کو اجاگر کرنے سے کبھی پہلو تہی نہیں کی اور تہہ داماں چراغ بے نوا بننے کے بجائے جھونکوں میں جلنے اور دور دور تک روشنی پھیلانے کا اولیائی فریضہ قبول کیا ۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے اپنے عہد کا "آؤٹ سائڈر" کہا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وزیر آغا نے عارف کے لئے ایک ایسا جامع لفظ دریافت کیا ہے جس میں اس کی شخصیت کے بیشتر پہلو سما گئے ہیں تاہم مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ عارف مہاتما بدھ جیسا آؤٹ سائڈر نہیں کہ بیوی بچوں پر چور نظر ڈالے اور پھر دنیا سے ہی منہ موڑ لے ۔ عارف نے تو قعرِ دریا میں زندگی بسر کی ہے لیکن اپنے دامن کو دریا کی آلودگی سے بچانے کے لئے اپنا پیمانہ حباب آسا نگوں رکھا ہے ۔ چنانچہ عارف اپنے ہم سفروں سے ان معنی میں بھی مختلف ہے کہ وہ جلبِ زر میں مبتلا نہیں جبکہ اس کے ہم سفروں کے کاسے مال و زر سے تو بھر چکے ہیں لیکن آنکھ دولت کی ہوس سے خالی نہیں ہوئی ۔

مرا مزاج سمندر ہی تھا مگر عارف　　میں سطحِ آب پہ بہتا ہوا حباب بھی تھا
یہ ہاتھ موتیوں سے تہی ہیں تو کیا یہ دیکھ　　آیا ہوں کتنے گہرے سمندر کھنگال کر

ایک "آؤٹ سائڈر" کے لئے سب سے زیادہ دکھ کا لمحہ اس وقت ظہور میں آتا ہے جب وہ اپنے عہد میں ہی اجنبی ہو جاتا ہے ۔ اس کی زبان سمجھی نہیں جاتی اور اس کی صداقت کے سکے کو اسکا عہد قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے ۔ اگر بات یہاں تک ہی محدود رہے تو شاید چنداں اہم نہ ہو لیکن زمانہ تو اپنی مقبول روش کے انحراف پر ناک بھوں چڑھانے کا عادی ہے اور ان لوگوں کو جو بدی کے اس تیز رفتار پہیئے کو روکنے اور خیر کی کانٹوں دار پگڈنڈی پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں سنگسار کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے ۔ عارف عبدالمتین زندگی کے بیشتر مقامات پر اس کرب سے بھی دوچار ہوا ہے ۔ چنانچہ اس کے ہاں اولیں سطح پر تنہائی کا احساس جاگا ۔

مری تخلیق مرے کام نہ آئی عارف　　میں بہ اندازِ خدا پاتا ہوں تنہا خود کو
میں قطرہ ہوں ، دریا کی روانی میں پڑا ہوں　　اے حدتِ خورشید مجھے لے جا اڑا کر
میں جہاں کی وسعتوں میں عمر بھر تنہا پھرا　　میں نہ تھا عارف خدا ، لیکن خدا بن کر جیا
غم کی دہلیز پہ بیٹھا ہوا یہ سوچتا ہوں　　میں اکیلا ہوں کہ تو بھی ہے مرے ساتھ یہاں

قریب و دور بجز عکس ذات کچھ بھی نہ تھا — میں اس جہاں میں اکیلا رہا خدا کی طرح

اسے اس بات کا احساس بھی ہوا کہ شاعری کا منصب سنبھال کر اس نے جن شاخوں کو پھولوں سے سجایا تھا اب وہی شاخیں کانٹا بن کر اس کے سینے میں زخم کاری لگا رہی ہیں ۔

میں نے جس شاخ کو پھولوں سے سجایا عارف — میرے سینے میں اسی شاخ کا کانٹا اترا
شمعِ تابندہ ہوں اور میرا مقدر ہے یہی — میں اجالا جسے بخشوں وہ جلاتا ہے مجھے
وہ زخم ہم سفروں سے مجھے نصیب ہوئے — کہ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگ گیا ہوں میں
دنیا کو میں گجروں سے سجانے کو اٹھا تھا — دنیا مرے سینہ پہ قدم رکھ کے بڑھی ہے
جن ہاتھوں کو خود میں نے تب و تاب عطا کی — ان ہاتھوں سے صد چاک مری اپنی قبا ہے
عود ہوں اور ازل سے مری قسمت ہے یہی — میری خوشبو کا پرستار جلاتا ہے مجھے!

عارف کی یہ صدائے درد دراصل اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ ہم عصروں کی روش سے بے خبر نہیں اور اس کے دوست جس کمین گاہ سے تیر برسا رہے ہیں عارف کی چشمِ نگراں اس کے محل وقوع اور حدود اربعہ سے پوری طرح واقف ہے ۔ خارج کی اس دلدوز آگہی نے عارف کو کسی مقام پر بھی مایوسی سے دوچار نہیں کیا بلکہ زمانے کی یہ منفی روش تو اسے ہمیشہ مہمیز لگاتی رہی ہے اور ایسے ہر مقام پر اس کی رجائیت اس کے عزم تازہ کو ایک ولولۂ نو کے ساتھ بیدار کر دیتی ہے ۔

اے سفینۂ ہستی کھول بادباں اپنا — چل پڑی ہوا اب تو ، جس پہ ہے گماں اپنا
حادثے میری پریشانی کا باعث کیوں ہوں — ان کی یلغار سے بگڑا ، تو سنور جاؤں گا
مانا کہ ہر اک گام پہ اندیشۂ جاں ہے — ہٹنا نہیں سیکھا ہے مگر اپنی ڈگر سے
غم نہ کر عارف اگر ہے بند ساحل کی ہوا — بادباں کو کھول ، کشتی کو کھلے پانی میں لا

عارف کی غزل جس کھلی فضا میں سفر کرتی ہے اس کا ایک بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے ہاں صحرا اور سمندر کی علامتیں وسعت ، پھیلاؤ اور کشادگی کی مظہر بن کر سامنے آئی ہیں ۔ ان کے برعکس شہر ایک محبوس ، قلعہ بند اور آسیبی فضا کا مظہر ہے ۔ اور عارف نے شہر کے خلاف اپنے ردّعمل کی شدت کو پوری طرح ظاہر کر دیا ہے ۔

جنگل ہے شہر اور شکاری ہیں ہر طرف — آیا ہوں گھر میں صورت آہو ڈرا ہوا
شہر کے زنداں نے پہنا دیں وہ زنجیریں مجھے — میری وحشت کو میسر دل کا صحرا بھی نہیں

صحرا میں حد نگاہ تک منظر صاف ہوتا ہے ۔ اور زندگی دھندلے خاکوں کے بجائے صاف ، روشن اور چمکتی ہوئی تصویروں کی صورت میں نظر آتی ہے ۔ سورج ، چاند اور ستارے اپنی روشنیاں بلا روک بکھیرتے ہیں اور دھوپ اور سائے زندگی کی تمام حقیقتوں کو عریاں کر ڈالتے ہیں ۔ صحرا کا دوسرا منظر وہ ہے جب آندھیاں چلتی ہیں ۔ منظر دھندلا

جاتا ہے اور زندگی بگولوں کی نذر ہونے لگتی ہے ۔ عارف نے صحرا کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا اس کے خلاف عارف کے ہاں نفرت کے بجائے محبت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے ۔ عارف نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ امرتسر اور لاہور جیسے شہروں میں بسر کیا ہے ۔ اور اس زاویے سے ان کی صحرا پسندی بظاہر بڑی عجیب نظر آتی ہے ۔ تاہم اگر ان کی جد وجہد حیات پر نظر رکھی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عارف کے فن میں صحرا آزادی اور آزادہ روی کی علامت ہے ۔ اس زندہ علامت کو پائندگی عطا کرنے کے لئے عارف نے صحرا کو اپنے دل میں بسا رکھا ہے ۔ چنانچہ اس کی غزل میں صحرا کے حوالے سے جتنی ترکیبیں جزو شعر بنی ہیں ان میں صحرائے جاں ، صحرائے تمنا ۔ ریگِ امید ۔ صحرائے انا ۔ وشت بے نہایت ، سرِ صحرائے فراق وغیرہ اس لئے بھی اہمیت رکھتی ہیں کہ یہ عارف کا جزوِ جاں معلوم ہوتی ہیں ۔ اہم بات یہ ہے کہ عارف نے بیشتر اپنی ذات کو ایک ذرے کی صورت میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور صحرا کو ایک ایسا کُل شمار کیا ہے جس کی وسعتوں پر یہ ذرہ یا تو چھا جانا چاہتا ہے یا پھر اپنے آپ کو پھیلا کر اس 'کُل' میں تحلیل کر دینے کا آرزو مند ہے ۔

عارف مجھے دشت کی طلب تھی — ذرّوں کی طرح بکھر گیا ہوں
صرصر تھی، گرد باد تھی، عارف کہ ذرّہ تھا — مجبوریوں کے دشت میں مختار کون تھا؟
میں ایک بگولا ہوں سر وسعت صحرا — تو ریت کا ذرّہ ہے تو باہنوں میں مری آ
اس ریت کو دیکھو نہ حقارت کی نظر سے — یہ ریت تو صحرا بھی اڑا لائے گی اک روز
میں بگولا ہوں مرے رقص کو حیرت سے نہ دیکھ — دشت میں آیا ہوں میں عشرت ذرات لئے

ایک اور بات یہ ہے کہ عارف نے صحرا کی وسعت کو محض موضوعی طور پر ہی قبول نہیں کیا بلکہ اس کی صعوبتوں کو اپنے اوپر معروضی طور پر وارد کیا اور ان سے نبرد آزما ہونے پر آمادہ بھی ہوا ۔ چنانچہ بے کراں فاصلوں اور بے نشاں منزلوں کے اس لامتناہی سفر میں اسے کڑی دھوپ اور بگولوں کا سامنا کرنا پڑا اور پیاس اور سراب کے الفاظ بے اختیار اس کی غزل میں ظہور کرنے لگے ۔ لیکن یہاں بھی اس نے امید کا دامن ہرگز نہیں چھوڑا بلکہ سرابوں کی شادابی سے ہی اپنی پیاس کو سیراب کیا ہے ۔

ریگ امید کے شاداب سرابوں کے طفیل — میں نے دیکھا ہے کبھی صورت صحرا خود کو
میں اپنی پیاس لئے گھر سے جب روانہ ہوا — مری نگاہ میں صحرا بھی تھا، سراب بھی تھا
صحرا کی کڑی دھوپ سے مانوس مسافر — کیا رشتہ بھی ہے کوئی ترا سبز شجر سے
میں بگولہ ہوں مگر صحرا مرے قدموں میں ہے — تنگ دامانی کا شکوہ ، لب پہ کیونکر لاؤں گا
سراب دیکھے ہیں کچھ اس قدر نگاہوں نے — میں تشنہ لب ہوں، مگر دل میں اب وہ پیاس نہیں

اور اب اس تفصیل سے جو کہانی مرتب ہوتی ہے اس کا مرکزی کردار خود عارف کی ذات ہے ۔ عارف ایک مخصوص آئیڈیل کی تلاش میں صحرا صحرا ، منزل منزل بگولہ بن کر گردش کر رہا ہے اور اس سفر میں ان لوگوں کو جو جمود کا

شکار ہو گئے ہیں مسلسل متحرک کرنے کی سعی کر رہا ہے ۔ کبھی یہ آئیڈیل ریت کے ذرے کی صورت میں اس کی گرفت میں آ جاتا ہے اور کبھی آئیڈیل کے شاداب سراب ریگ امید میں گم ہو جاتے ہیں اور عارف ایک نئی جد وجہد کے لئے جادہ پیما ہو جاتا ہے ۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ عارف کی غزل میں بکھرنے اور کائنات میں تقسیم ہو جانے کا عمل بار بار ظہور پذیر ہوتا ہے ۔ اس نے تنہائی کے حوالے سے بھی اپنی ذات کی طرف توجہ دی ہے تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ حقیقت اولیٰ اپنی تخلیق میں زیادہ تر بکھری ہوئی (PERMEATED) صورت میں ملتی ہے ۔ بسط کی یہ کیفیت ذات کبریا کی الوہی نشانات کی مظہر ہے ۔ لیکن فطرت محض ، بکھرتی ہی نہیں سمٹتی بھی ہے ۔ چنانچہ جب سمٹنے کا عمل ظہور میں آتا ہے تو صحرا ذرے میں اور گلشن پھول میں سما جاتا ہے ۔ اور بکھرا ہوا پیکر مجسم صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ عارف کی غزل میں محض بکھرنے کا عمل ہی نہیں ملتا بلکہ سمٹنے اور یکجا ہونے کا عمل بھی صحت مند اور زندگی افروز انداز میں ظاہر ہوا ہے ۔

یہ آرزو ہے کہ عارف غزل میں ڈھل جاؤں ۔۔۔۔۔ اداس لمحوں میں شاید وہ گنگنائے مجھے
اور کچھ لوگ مرے سائے تلے سستا لیں ۔۔۔۔۔ گرتی دیوار ہوں دیتا ہوں سہارا خود کو
بیکرانی کی تمنا میں سمندر بن گیا ۔۔۔۔۔ اور ساحل بن کے خود کو قید میں لایا بھی ہوں

اب تک میں نے عارف کو اس کی غزل کے فکری عناصر سے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس سے شاید یہ خیال کیا جائے کہ عارف کے ہاں جذبے کی لو نسبتاً مدھم ہے اور غزل کا ایک اساسی عنصر عشق شاید اس کے ہاں بالکل ناپید ہے ۔ اس خیال کا امکان اس لئے بھی زیادہ ہے کہ عارف اپنا فکری اور فنی سفر در حقیقت ایک آئیڈیل کی تلاش اور ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کے لئے طے کر رہا ہے ۔ اس لحاظ سے ان تمام عناصر کا پیدا ہونا جن سے آئیڈیل کا حصول ممکن نہیں رہتا ان کے نظریاتی مزاج کے خلاف نظر آتا ہے ۔ بیشتر ترقی پسند شعرا نے اس مشکل مرحلے کو یوں سر کیا ہے کہ انہوں نے آئیڈیل کو ہی اپنا محبوب قرار دے لیا اور پھر اس کے خدوخال کی آرائش میں سارا زور بیان صرف کرنے میں مصروف ہو گئے ۔ عارف کے ہاں بھی یہ آئیڈیل کبھی چاند اور کبھی سورج اور کبھی منزل کی صورت میں ظاہر ہوا ہے ۔ تاہم ایک صحت مند انسان کی طرح اس نے جسم کے فطری تقاضوں کو نظرانداز نہیں کیا ۔ اور ان کا محبوب کوئی خیالی پیکر نہیں بلکہ جسمانی وجود بھی رکھتا ہے ۔ یہ وجود وصل کی لذت سے آشنا ہے اور اس کے جذبے میں لہو کی حدت بھی موجود ہے ۔ عارف نے اس کے ذکر لطیف سے نہ تو گریز کیا ہے اور نہ ہی افلاطونی انداز میں اس کی بے جا پردہ پوشی کی ہے ۔ البتہ اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ عارف کے ہاں لہو کا سرگرم تقاضا ارزاں جنسی جذبے کی صورت میں کبھی نہیں ابھرا اور لذت ، لطافت اور کیفِ دوام کے نقطۂ عروج پر بھی اس نے جنسِ لطیف کی عظمت اور اپنی تہذیبی رفعت دونوں کا احترام قائم رکھا ہے ۔

صبحِ وصال ہونٹ ترے چپ رہے مگر ۔۔۔۔۔ دیکھا ہے میں نے جسم ترا بولتا ہوا

کس کے بدن سے رات مری گفتگو رہی　　تو چپ رہا تو پیکرِ اظہار کون تھا
میں نے سن لی تھی ترے قدموں کی آہٹ دور سے　　تو نہ آئے گا کبھی دل میں مرے دھڑکا نہ تھا
وہ آئینے کی طرح میرے سامنے آئے　　مجھے نہیں تو مرا عکس ہی دکھائے مجھے
بے رنگ پیرہن کا نہ اتنا خیال کر　　اپنے لہو کو دیکھ کبھی خود اچھال کر

اردو نظم میں عارف نے گھر کو سماج کی اساسی مگر اہم ترین اکائی تصور کیا ہے اور اس موضوع پر چند زندہ رہنے والی نظمیں کہی ہیں ۔ اور غزل کی عمومیت نے عارف کے اس محبوب موضوع کو واضح تفصیلات کے ساتھ جلوہ گر ہونے کی اجازت نہیں دی تاہم اس کی کچھ دلکش جھلکیاں اس کی غزل میں لاشعوری طور پر در آئی ہیں اور نظر آتا ہے کہ عارف کا مثالی محبوب اس کی بیوی ہے جس کا بالواسطہ تذکرہ اس کی غزل میں بھی موجود ہے ۔

آنگن میں کون ٹھہرا ہوا تھا مثالِ گل　　خوشبو کی طرح مائلِ رفتار کون تھا
تیرا پیکر ہے وہ آئینہ کہ جس کے دم سے　　میں نے سو روپ میں خود اپنا سراپا دیکھا
اپنے بچوں کی طرف غور سے جب بھی دیکھا　　کتنے ہی رنگوں میں بکھرا ہوا پایا خود کو

مجھے عارف عبدالمتین کی غزل میں دو قسم کے استعارے زیادہ نمایاں نظر آئے ہیں ۔ اوّلاً نور اور روشنی کے استعارے جن میں چاند ، سورج ، چراغ اور شمع وغیرہ شامل ہیں ۔ ثانیاً حرکت کے استعارے جن میں ہوا ، دریا اور آنسو وغیرہ شمار ہوتے ہیں ۔ عارف نے ہر دو اقسام کے استعاروں کو اپنے فکروفن کا وسیلہ بنایا ہے تو اس سے ایک بدیہی نتیجہ یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان سب کو عارف کی شخصیت کے اساسی پہلوؤں سے زیادہ تعلق ہے ۔ اول الذکر استعاروں کی اہمیت کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں اور یہ عارف کی شخصیت کے اس زاویے کے مظہر ہیں جس کے تحت عارف دہر پر چھائے ہوئے اندھیرے کو روشنی عطا کرنے کا متمنی ہے ۔ نور کے یہ سب ماخذ خود جلتے ہیں لیکن اپنی روشنی دوسروں پر نچھاور کر دیتے ہیں ۔

ثانی الذکر استعاروں کی اہمیت یہ ہے کہ عارف زندگی کو کسی ایک نقطے پر جامد دیکھنا گوارا نہیں کرتا ۔ اس کے نظامِ فکر میں زندگی کو صرف اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ وہ آگے کی طرف لپکتی چلی جاتی ہے اور ہمیشہ دریافت کی نئی منزلیں سر کرتی ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی غزل میں پیچھے مڑ کر دیکھنے اور اپنے شاندار ماضی سے مریضانہ محبت کرنے کا رجحان نہیں اور مستقبل اسے اس لئے عزیز ہے کہ اس میں زندگی کی ان دیکھی مسرتیں پنہاں ہیں جنہیں تلاش کرنے کے لئے فرد جستجو نے پیہم پر آمادہ ہوتا ہے یوں تگ و تازِ جاودانہ برقرار رکھ سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے حقیقت اولیٰ کو خدا کہنے کی بجائے زمانہ کہنے پر اصرار کیا ہے کہ زمانہ زندگی ہے ۔ زمانہ حرکت ہے ۔ اور یوں لاتسبّوا الدہر انا الدہر (زمانے کو برا مت کہو ۔ میں خود زمانہ ہوں) کی ایک عمدہ تفسیر پیش کر دی ہے ۔

برا نہ مان میں نے تجھے خدا نہ کہا　　یہ سوچ میں نے تجھے جب کہا زمانہ کہا

اہم بات یہ ہے کہ عارف نے روشنی کے جو استعارے غزل میں استعمال کئے ہیں ان کا منبع تو بظاہر جامد نظر آتا ہے لیکن داخلی طور پر یہ سب توانائی کے بنیادی ماخذ ہیں اور ان کی ہیئت ترکیبی کا اہم ترین عنصر ان کا تحرک اور تیز رفتاری ہے ۔ آنسو اور درد کے استعاروں میں روشنی تو یقیناً موجود نہیں لیکن حرکت کا عنصر ان استعاروں میں بھی موجود ہے اور یہ خارج کے بجائے داخل کو متحرک کرتے ہیں ۔ اس پہلو سے دیکھئے تو عارف کے سب استعاروں میں حرکت کی خاصیت قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے ۔ دوسری طرف اس حقیقت پر بھی نظر رکھیئے کہ عارف اپنی زندگی میں خاصہ سفر پسند واقع ہوا ہے ۔ وہ داخلی طور پر بھی اتنا توانا ہے کہ گزشتہ نصف صدی کی بیشتر ادبی تحریکوں میں اس کا نام شاید سب سے نمایاں نظر آتا ہے ۔ عارف کی منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی تحریک کے دورِ عروج میں اس کے ساتھ شامل نہیں ہوا بلکہ اکثر اوقات تحریک کے بانیوں میں شمار ہوا ہے ۔ اور جب ایک تحریک احتساب کی زد میں آگئی تو اس نے مشعل برداری کا فریضہ سر انجام دیا اور روشنی ماند پڑنے سے پہلے ایک اور نئی تحریک برپا کر دی ۔ دوسری طرف جب کبھی وابستگانِ تحریک جد وجہد کے ثمرات سمیٹنے میں مصروف ہو گئے تو عارف نے اس تحریک سے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی کہ مادی آسودگی انسان کے ظاہر کو تو اجلا کر دیتی ہے لیکن روح پر زنگ کی دبیز تہہ چڑھا دیتی ہے اور اس طرح روح نور کے اخراج کی قوت کھو بیٹھتی ہے ۔ شمع ۔ چاند اور سورج کی طرح عارف بھی اپنے داخل کو اجلا رکھتا ہے اور اس سے اپنی شاعری کی کرنیں بکھیرتا چلا جاتا ہے ۔

عارف کی تحرک پسندی اس کی شاعری میں سفر اور سفر کے تلازمات کی صورت میں بڑی عمدگی سے ظاہر ہوتی ہے ۔ عارف کے آباؤ اجداد کو فکرِ روزگار میں کشادہ میدانوں کی تلاش لاحق ہوئی تو انہوں نے جنت کشمیر کو خیر باد کہہ دیا اور فرازِ کوہ سے اتر کر نہروں سے سیراب ہونے والے سر سبز و زرخیز میدانوں میں آگئے ۔

عارف کے والد گرامی (خواجہ عبد المجید) سوئے کلکتہ روانہ ہو گئے اور وہاں پشمینے کا کاروبار کرنے لگے ۔ خود عارف نے جسمانی طور پر تو امرتسر اور کلکتے کے درمیان کبھی کوئی سفر نہ کیا ، البتہ ذہنی طور پر کلکتے کا تصور ہمیشہ اس کا تعاقب کرتا رہا ۔ پھر جب اس کے محترم خالو (ڈاکٹر ایم ضیاء الدین) ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی شانتی نکیتن یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہوئے تو اس کی اس ذہنی تگ و تاز کو ایک نیا تہذیبی رنگ فراہم ہوا ۔ اسے رابندر ناتھ ٹیگور اور گیتا نجلی کے مطالعہ کا موقعہ ملا ، اور اس کے ہاں عالمگیر اخوت ، بے تعصبی ، اور محبت کی داخلی قوتیں پروان چڑھیں ، جو اپنی مثبت ماہیت کے لحاظ سے دوسروں کو متحرک کرنے کی بے پناہ قوت رکھتی ہیں ۔

عارف نے ایک اور اہم سفر ۱۹۴۷ء میں کیا ۔ لیکن یہ تلاش روزگار کا سفر نہیں تھا ۔ یہ سفر تو اس نے ایک نئے وطن کی تخلیق اور اپنی نظریاتی سوچ کو عملی شکل میں ڈھالنے کے لئے اختیار کیا ۔ اس لحاظ سے عارف کا یہ سفر برصغیر کی تقسیم کبیر کی طرح اہم ہے ۔ اور اس میں عارف کے جسم اور روح داخل اور خارج ، دل اور دماغ سب متحرک نظر آتے ہیں ۔ عارف کی تحریک پسندی کا ایک زاویہ یہ بھی ہے کہ اس کی بیشتر تصنیفات کے نام جو کسی منصوبہ بندی کے بغیر

منتخب ہوئے ہیں لیکن ان سب میں سفر اور حرکت کا تصور ضرور موجود ہے ۔ مثال کے طور پر "آتش سیال" "موج در موج"، اکلاپے دا مسافر"، اور "سفر کی عطا" میں سفر کتاب کا خارجی عنوان بن کر ابھرا ہے ۔ "دیدہ و دل" اور "دھوپ کی چادر" میں بظاہر یہ عنصر دکھائی نہیں دیتا لیکن ذرا غور کیجیئے تو آنکھ متحرک روشنی کا ذخیرہ اور دل مسلسل حرکت کا نام ہے اور دھوپ مسلسل محو سفر ہے ۔ ان کے پہلے مجموعے میں بھی حرکت کا عنصر پوری شان سے در آیا تھا اور اب مجھے یہ استعارہ ان کے فکر و فن کی بنیادی کلید نظر آتا ہے ۔ جو غزل میں مسلسل جلوہ گر ہے ۔

عارف کو سفر اس لئے بھی مرغوب ہے کہ سفر کھلی فضاؤں اور نئی روشنیوں سے تعارف کراتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ عارف کی غزل میں سفر کی خواہش دراصل کھلی فضاؤں کی آرزو بن کر ابھری ہے ۔ وہ کبھی مشت خاک بن کر پورے صحرا کو اپنے محیط میں لینا چاہتا ہے ، کبھی چراغ بن کر زمانے کے دریا میں بہنا چاہتا ہے ، کبھی وہ موج دریا ہے اور چاند کا نور اس کے لئے مہمیز ثابت ہوتا ہے اور کبھی وہ چاہتا ہے کہ گھنے جنگلوں میں کراہتی ہوا کی طرح گھس جائے اور کہرام بپا کر دے ۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس ذہنی اور جسمانی سفر میں کسی دریوزہ گری پر کبھی آمادہ نہیں ہوا بلکہ اس نے منزلِ سفر کو اپنے تعین میں رکھنے کے لئے آسمان بھی اپنے ہی کندھوں پر اٹھایا ہوا ہے ۔

صحرا ہو کہ بحر بے کراں ہو ــــ چلتا ہوں کہ موجۂ ہوا ہوں
میں مشتِ خاک ہوں ، صحرا مری تمنا ہے ــــ ہوائے تیز کسی طور سے اڑائے مجھے
چراغ ہوں تو فقط طاق کیوں مقدر ہو ــــ کوئی زمانے کے دریا میں بھی بہائے مجھے
موج دریا ہوں روانی ہے مری فطرت میں ــــ چاند کا نور بھی مہمیز لگاتا ہے مجھے
بہت کٹھن ہے ، گھنے جنگلوں میں میرا سفر ــــ کراہتا ہوں درختوں میں میں ہوا کی طرح
سرحدِ نظر کیا ہے ، منزل سفر کیا ہے ــــ ساتھ لے کے نکلے ہیں ، ہم تو آسماں اپنا

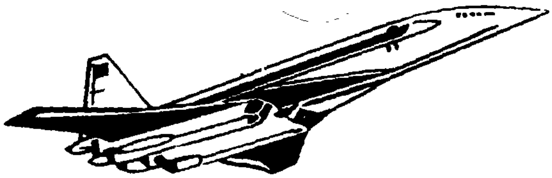
عارف عبد المتین کی اس تحرک پسندی کا ہی نتیجہ ہے کہ اس کی غزل میں کسی ایک مقام پر رک جانے اور جمود زدہ ہونے کی کیفیت نظر نہیں آتی ۔ چنانچہ اس نے غزل کی کتابی روایت کو قبول نہیں کیا ۔ عشق و عاشقی کے رسمی مضامین بھی اس کے تخلیقی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے ۔ اور اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے غزل کے سانچے کو بدلے بغیر اسے نئے فکری زاویوں سے تغیر آشنا کیا ۔ میری رائے میں اردو غزل کے اس مزاج کو جسے اقبال کی وفات کے بعد فروغ حاصل ہوا عارف کے منفرد اسلوب ، تازہ لہجے اور صداقت اظہار نے بھی ایک نئی جہت دی ہے ۔



اُردو کے ممتاز اور منفرد لہجے کے شاعر

پرتو روہیلہ کا سفرنامۂ امریکہ

بازگشت



ایک محبِ وطن پاکستانی کی سائیکی کا محضر نامہ

تیسری دُنیا کے ایک بالغ نظر انسان کی سوچ کا آئینہ

ایک حساس دِل کی آوازِ شکست

جدید طرزِ فکر کا عکاس

ابن بطوطہ کے سفرناموں کی طرح حیرت انگیز رسوم و رواج کی دستاویز

سفرناموں کی یلغار میں حقیقتاً نئی طرز کا علمبردار

سفرنامے کی صنف میں گراں قدر اضافہ

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

لاہور راولپنڈی کراچی

ISBN 969 0 01067 0

Rs. 200.00



شذرات

مُحمّد طفیل

اِن صفحات میں وہ کلمات
درج ہیں ۔ جنہیں میں نے سوچا
اور
وُہ کلمات بھی درج ہیں ۔ جنہیں
میں نے پسند کیا ۔

محمد طفیل

انسان کی ہر تمنا اگر دل کی خلش ہو کے رہ جائے تو وہی حاصلِ تمنا ہے ۔

■

بُرا آدمی زیادہ بُرا اُس وقت ہوتا ہے — جب وہ اچھوں کا بھیس لاد لیتا ہے ۔

■

ہمارا مخالف ہی ہمارا معاون ہے — وہ مشکلات پیدا کر کے ہمیں آسانیوں کا رستہ بتاتا ہے ۔

■

ہر دن ایک پوری زندگی ہے اور پوری زندگی ایک دن جو ہر صبح کو دہرایا جاتا ہے ۔

■

احمق خوشامد سے اُسی طرح پھولتا ہے — جیسے دھونکنی پھونک سے !

■

علم کے لازمی متعلقات تین ہیں --- طلبِ حق ، استدلال اور ایمان !

■

دنیا بغیر تمہارے بھی باقی رہے گی — تم اس کے سینے پر زور سے قدم رکھو یا آہستہ !

■

بے وقوفوں کی مہربانیاں بے موسم کی بارش ہیں — جو یکایک نازل ہونے لگتی ہیں اور یکایک غائب ہو جاتی ہیں ۔

■

بے عملی اور کاہلی کا آغاز مکڑی کے جالے کی طرح ہلکا ہوتا ہے ۔ لیکن اس کا انجام فولادی زنجیروں سے بھی زیادہ بھاری ہو جاتا ہے ۔

■

خیالات سے ارادے پیدا ہوتے ہیں ۔ ارادوں سے عمل ، عمل سے عادتیں ، عادتوں سے کردار ! اور کردار کا دوسرا نام قسمت ہے ۔

■

اس کے متعلق کہ کیا پڑھنا چاہئے اور کیا نہ پڑھنا چاہئے ۔ کوئی ضابطہ اور نہ ٹوٹنے والا قانون نہیں بنایا جا سکتا ۔ ہر بہ ۔ تہذیب کی تعمیر میں نصف سے زائد ان تعلیمات کا حصہ ہوتا ہے جو اپنے عہد میں ممنوع تھیں ۔

■

"یوں ہو گا تو کیا ہو گا" --- دماغ کو فکر ہوتی ہے ! اور کیا پرواہ ہے کچھ بھی ہو --- یہ دل کا ارادہ ہے ۔

انسان کا ایک سانس بھی ایسا نہیں جس کے ساتھ کسی نہ کسی فرض کا سرانجام ضروری نہ ہو — لیکن بہت سے سانس واپس چلے جاتے ہیں اور فرائض پیچھے رہ جاتے ہیں ۔

■

معصوم اور گنہگار میں صرف اتنا فرق ہے کہ — معصوم ماضی رکھتا ہے اور اس میں گم رہتا ہے ۔ گنہگار مستقبل رکھتا ہے اور اُسی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے ۔

■

کلال کے ہاتھ میں دودھ کے پیالے کو بھی لوگ شراب ہی سمجھتے ہیں ۔

■

مستقبل کے دامن تک خواہش کا ہاتھ نہیں پہنچتا ۔ مگر ایمان کا ہاتھ پہنچ جاتا ہے ۔

■

نیکی اور سچائی کو جاننا بھی اچھا ہے ۔ لیکن اس کو پسند کرنا زیادہ اچھا ہے اور اس پر عمل کرنا سب سے اچھا !

■

کتابیں نہیں پڑھ سکتے تو انسان کے چہرے پڑھو !

■

جو شخص صاف "نہیں" نہ کہہ سکتا ہو ۔ یقین کر لیجیئے کہ اس کی سیرت ناقص اور اُس کا خُلق ناتواں ہے ۔

■

جو لوگ بڑے کام نہیں کر سکتے اور چھوٹے کام کرنا خلافِ شان سمجھتے ہیں ۔ وہ کچھ بھی نہیں کرتے — صرف باتیں کرتے ہیں ۔

■

انسانوں کا خدا' انسانوں ہی کے ذریعے انسانیت کی سرپرستی کرتا ہے ۔

■

پتّی پھول بن جاتی ہے — جب محبّت کرتی ہے ۔ اور پھول پھل بن جاتا ہے — جب عبادت کرتا ہے ۔

■

فتح کی حلاوت بھی شکست کی تلخی سے خالی نہیں ہوتی !

■

فطرت کا نقیب دماغ سے زیادہ دل ہے !

■

کوئی بات جو عدل کے مطابق ہو ۔ دین کے خلاف نہیں ہو سکتی ۔ مذہب کے خلاف ہو تو یہ امرِ دیگر ہے ۔

موت سے کیا ڈرنا؟ زندگی سے خبردار رہو !

■

یہ سچ ہے کہ توپ کے گولے ، ہوائی جہازوں کے بم ، مشین گنوں کی گولیاں ، دنیا کی اخلاقی امداد اور ہمدردی سے رک نہیں سکتیں اور نہ سرد پڑ سکتی ہیں ۔ لیکن سر کٹانے والے کا جذبۂ تمام اس کا بھو کا ہی کب ہوتا ہے ۔ جذبے کا رسوخ ہی اصلی اور بڑی فتح ہے ۔ یہ نہ دیکھو کہ میدان میں کون جیتا اور کون ہارا ! یہ دیکھو کہ کس کی جاں بازی نے میدان کو لالہ زار بنایا ۔ اگر تم مادیت کا جواب مادیت سے نہ دے سکے تو کیا ہوا ۔ انہی میدانوں سے تمہارا خون اُٹھے گا اور مادیت کا جواب مادیت سے دے گا !

■

کوئی اندھا بھی اتنا اندھا نہیں ہوتا کہ دوسروں کی غلطیوں کو نہ دیکھ سکے !

■

غلطیوں کے ہجوم میں عقل اپنا سرمایہ جمع کرتی ہے !

■

زندگی کی ہر ساعت اپنا ایک دستور العمل لے کر آتی ہے اور گزر جاتی ہے — اس کے حروف تمہاری نظر میں نہ سمائیں تو یہ قصور تمہارا ہے ۔

■

ماضی میں اسقدر مصروف نہ رہو کہ مستقبل کو بھول جاؤ !

■

بہت سے سوالات ایسے ہوتے ہیں جو بہت جوش و خروش سے اُٹھائے جاتے ہیں اور وہ ہمیشہ سرو قد ہی رہتے ہیں ۔

■

کچھ لوگ واقعی مصروف رہتے ہیں اور بہت سے لوگ مصروفیت کے نام سے دھوکا دیتے ہیں — تاکہ ان کا تشخص نمایاں ہو ۔

■

انکسار اور بزدلی دو مختلف صفات ہیں ۔ انکسار ایک روحانی بلندی ہے اور بزدلی ایک اخلاقی پستی ہے ۔

■

ہمیں ماضی کی یاد عقل نہیں بخشتی بلکہ مستقبل کی ذمہ داریاں ہوشیار کرتی ہیں ۔

■

شہرت اور مقبولیت ایک نشہ ہے ۔ شراب سے زیادہ تیز و فتنہ انگیز ! اور حُسن سے زیادہ پُر فریب !

اتنا حسین کوئی چہرہ نہیں ہوتا جتنا کہ وہ دُور سے نظر آتا ہے ۔ اور اتنی دلکش کوئی آواز نہیں ہو سکتی جتنی کہ وہ دُور سے سُنی جاتی ہے —کیا حُسن کی حقیقت فاصلہ ہے؟

■

جو شخص اپنے نفس پر اقتدار نہ رکھے ۔ اس کے بازو ملک یا قوم کی آزادی کا عَلَم نہیں اُٹھا سکتے ۔

■

مہذب آدم زادوں کے لباس میں عموماً دو جیبیں ہوتی ہیں —ایک اندر ایک باہر —اندر کی جیب اپنے عیبوں کے لئے ہے اور باہر کی جیب دوسروں کے عیبوں کے لئے !

■

محبت وہ ہے کہ جس کی خاطر ماں باپ اور رشتے ناتے چھوڑ دیئے جا سکتے ہیں ۔ لیکن فرض وہ ہے جس کے لئے محبت کو بھی چھوڑنا پڑے ۔

■

ایک بات صرف اس بنا پر صحیح قرار نہیں دی جا سکتی کہ کسی نے اس کے لئے جان دے دی ہے —ہم کرتے ہیں غلطیاں اور اس کا نام رکھتے ہیں تجربہ !

■

جب قدم ڈگمگائیں تو یقین کر لیجئے کہ یہ دماغ کی لغزش ہے ۔

■

دروغ وہ سچائی ہے ۔ جس کے پہچانتے میں دیر کی گئی ہو —وہ فرض ہے جو وقت پر ادا نہ ہوا ہو

■

ظالم کے ظلم کی قوت اور احمق کی ناکامی کا بہانہ —اصطلاحی زبان میں اس کو کہتے ہیں مقدر !

■

نفسِ مطمئنہ کا دوسرا نام خود اعتمادی ہے —اگر وہ غیر مشروط اور کامل ہو ۔

■

کسی ایک فرض کے سرانجام کا انعام یہ ہے کہ دوسرے فرض کو انجام دینے کی طاقت حاصل ہو !

■

دنیا میں وسیع النظری اور رواداری کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے —مگر صرف اپنے عیبوں کے متعلق !

■

جس قدر ہم اپنے انسانی فرائض کو نظر انداز کرتے ہیں ۔ اُسی قدر حق کے تصور سے دُور ہو جاتے ہیں ۔

دنیا قانون اور مذہب سے زیادہ رائے عامہ کی پابند ہے — ہماری زندگی میں عدالت کے فیصلوں اور مفتی کے فتووں سے زیادہ سماج کے فیصلے اور فتوے مؤثر ہوتے ہیں !

■

ظلم وہ حوصلہ ہے جو کمزور ، زبردست کو عطا کرتا ہے ۔

■

عدل بغیر قوت کے مجہول ہوتا ہے اور قوت بغیر انصاف کے ظلم ہے ۔

■

آزادی کو وہ کیا جانے جس کا احساسِ خودی بیدار نہ ہو ۔

■

کوئی مصیبت دنیا میں ایسی نہیں جس کا مقابلہ ایمان نہ کر سکتا ہو ۔

■

ہر شخص جو چاہتا ہے کہ حق اس کی طرف ہو اس کو پہلے خود حق کی طرف ہونا چاہیئے ۔

■

گناہ کی عریانی پر زہد و اتقا کا لباس — شیطان کے دربار کا سب سے زیادہ بیش بہا خلعت ہے ۔

■

جھوٹ ایمان کا دشمن ہے اور دوسروں کے احسان و آبرو اور عقل کا دشمن' اور دولت کی دشمن نیت کی خرابی !

■

چار چیزوں کی محرومی سب سے زیادہ اندوہناک ہوتی ہے ۔ سر کی دماغ سے اور ذہن کی قوتِ فیصلہ سے ! دل کی ایمان سے اور جیب کی زر سے !

■

مآل اندیشی کا مبالغہ بُزدلی ہے — اور اسی طرح جواں مردی کا مبالغہ ستم کوشی — اور صاف گوئی کا مبالغہ بد تمیزی اور گستاخی !

■

ہم میں کتنے ہیں جو اُن امور سے واقفیت کے دعوے کرتے ہیں جن سے وہ ناواقف ہوتے ہیں اور کتنے ہیں جو اُن امور میں اپنی ناواقفیت کا اظہار کرتے ہیں جن سے وہ واقف ہوتے ہیں ۔

■

اس دنیا کا سربراہ وہ نہیں جس کے ہاتھ میں صرف ایک خوں ریز تلوار ہو — بلکہ وہ ہے جو اپنے سینے میں خلوص بھرا دل رکھتا ہو اور اپنے بازو میں بے لوث عمل کی قوت !

نوکر اپنے کان بند کر لیتا ہے تو آقا کو بھی کبھی کبھی اپنی آنکھ بند کر لینی چاہیئے ۔

■

سطحِ آب پر نقش و نگار بن سکتے ہیں لیکن ایک ضمیر فروش پر نصیحت کا اثر نہیں ہو سکتا ۔

■

دشمن ہمارے ضمیر کے لئے بیدار کرنے والا نقارہ ہے ۔

■

قوت کی افراط ضعف کی علامت ہے ۔

■

شہسوار جب پیادہ پائی کی زحمتوں سے بے خبر ہو تو اس کی زندگی آدھی رہ جاتی ہے ۔

■

تمہارے کمرے کی دیواریں جب تک گرم نہیں ہو جائیں گی تمہیں یقین نہ آئے گا کہ گھر میں آگ لگی ہے ۔

■

نفس انسانی کا جس قدر فریب تبسم کے اندر رہ سکتا ہے ۔ آنسو کے اندر جگہ نہیں پا سکتا ۔

■

اولاد اور پس ماندوں کے لئے بہترین ترکہ مال نہیں بلکہ ایسا ماحول چھوڑنا ہے جس میں وہ شریفوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں ۔

■

خوشامد کا کھوٹا سکہ خود بینی کی دنیا میں چلتا ہے ۔

■

انسانیت کی اصل' حرکت اور ترقی ہے — جمود ایک نفسیاتی کیفیت ہے ۔ حیوانیت سے [illegible] !

■

جب وہ غصہ کریں تم خاموش رہو — ان کا غصہ ان کو تھکا دے گا ۔ تمہاری خاموشی تمہیں طاقت بخشے گی ۔

■

اپنی حد سے گزر کر انسان اپنی موت کو خود بلاتا ہے ۔

■

شیطان کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا ۔ مگر سزا دی جا سکتی ہے ۔

■

چالاک اور ہوش مند' دو بالکل مختلف انسان ہوتے ہیں — چالاک ایک خود غرض اداکار ہوتا ہے اور ہوش مند ایک بے غرض مفکر !

ہمت اگر بلند ہوئی تو نظر بھی بلند ہوگی !

■

بے جبری خود اعتمادی کی کمی اور قوتِ ارادی کا ضعف ہے !

■

دوسروں کو دھوکا دینے سے زیادہ مکروہ خود اپنے نفس کو دھوکا دینا ہے — کہ یہی تو ضمیر انسان کی موت ہے ۔

■

بعض اوقات اقتدار و ثروت کا مظاہرہ اس قدر تمسخر انگیز ہوتا ہے ۔ جیسے نیرو کے گھوڑے کے سموں پر سونے کی نعل ۔

■

بُلند بانگ علم و فضل کا تجزیہ کیجئے تو اکثر الفاظ کے پردے میں خواہشوں کا چہرہ نظر آئے گا ۔

■

دولت انسانوں کی طبیعت کو نہیں بدل سکتی — مگر ان کے چہروں کا نقاب ہٹا دیتی ہے ۔

■

جس گھر میں تقویٰ کے ساتھ خود نمائی شامل ہو جاتی ہے اُس گھر میں شیطان بہت آسائش پاتا ہے ۔

■

حقیقی آرٹ اظہار ہے انسان کی مسرت 'کا خدا کے کاموں میں — وہ کام جو خود انسان کے کام نہیں ہیں ۔

■

دنیا میں بہت سے کوڑھی ایسے ہیں جو اپنے جسدِ معنوی کے داغوں پر زربفت کا غلاف چڑھا لیتے ہیں ۔

■

شیطان جھوٹوں سے محبت کرتا ہے ۔ اس لئے کہ وہ بہتر طریقے پر اس کی خدمت کرتے ہیں اور مزدوری کچھ نہیں مانگتے !

■

تخیل کی پرواز کتنی ہی بلند ہو مگر زندگی کی رفتار کا بدلنا آسان نہیں !

■

جو شخص کچھ نہیں جانتا اور ہر چیز کو جاننا چاہتا ہے ۔ وہ اتنا ہی اجیرن ہوتا ہے جتنا کہ وہ شخص جو کچھ نہیں جانتا اور سمجھتا ہے کہ سب کچھ جانتا ہوں ۔

کردار کی بے عملی خوبیوں سے باعمل شرارتیں زیادہ قیمت رکھتی ہیں ۔

■

کوئی فلسفہ اور کوئی آرٹ حقیقت سے اس قدر معمور نہیں ہو سکتا جس قدر خود تمہاری زندگی !

■

تیز زبان عموماً سست دماغ کی عزیز بہن ہوتی ہے ۔ اور یہ بہن بھائی کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے !

■

پرندوں کی تمنا ہے کہ بادل بن جائیں — مگر بادل کو یہ حسرت ہے کہ وہ پرندہ ہوتا ۔

■

صحیح اصول سے غلط نتائج نکالنا — یہ حماقت دیوانگی سے صرف ایک درجہ نیچے ہوتی ہے ۔

■

ایک دیو کے برابر قوت رکھنا بڑی اچھی بات ہے مگر دیو کی طرح اس کو استعمال کرنا ظلم و تعدی ہے !

■

بھیک مانگنے والا بھی بوسیدہ پُل پر گزرنا پسند نہیں کرتا — اور نہ کسی ڈوبتے جہاز پر چوہے ٹھہرتے ہیں ۔

■

سچی بات ایک ہی دفعہ کہی جاتی ہے لیکن جتنی مرتبہ زیادہ کہی جائے گی بقدر اس تکرار کے اس کی صحت کم زور ہوتی جائے گی ۔

■

آزادیاں بغیر جرأت کے محفوظ نہیں رہ سکتیں اور بغیر سبب کے برباد نہیں ہو سکتیں ۔

■

وہ خود غرضیاں سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہیں جو وطن پرستی کے لباس میں نمودار ہوں !

■

حق وہ ہے جس کے ساتھ دلیل و برہان ہو مگر عقائد دلائل سے زیادہ قیمت رکھتے ہیں ۔

■

وحشت اور انسانیت کے امتیازی فرق کا معیار انسان کی خواہشیں ہیں۔

■

بدنیتی خود انسان کی حیثیتِ عرفی کا ثبوت ہے ۔

شہرت دریا کا پاٹ ہے ۔ جو اپنے سرچشمے کے قریب بہت اُتھلا اور تنگ ہوتا ہے لیکن جس قدر اپنے راستے سے دور ہوتا ہے اتنا ہی گہرا اور وسیع ہوتا جاتا ہے ۔

■

دوزخ کیا ہے اگر گنہگار انسان کا ضمیر نہیں ۔

■

فکر اور نظر کے دھوکے بہت ہیں مگر سب سے بڑا دھوکا خود بینی ہے ۔

■

وعظ و نصیحت کے بہتر طریقے واعظ کے اعمالِ حسنہ ہیں — عامی انسان اپنے کانوں سے اتنا نہیں سیکھتا جتنا کہ اپنی آنکھوں سے !

■

جس طرح خواب سونے والوں کا واہمہ ہے اُسی طرح واہمہ جاگنے والوں کا خواب ہے !

■

خواہشوں کے ہجوم میں آزادی تلاش کرتے ہو ! — حقیقی آزادی صرف استغنا ہے ۔

■

زندگی کے حقائق ہی خدا کے اقتدار کی دلیلیں ہیں ۔ ان کو صحیح طور پر سمجھو اور غلط بیان نہ کرو ۔

■

گم کردہ راہ خواہشوں کی منزل مایوسی ہے ۔

■

مغرور عقل سے تاریک جہالت پھر بھی بہتر ہے ۔

■

دل کا منطقی اکثر دماغ کے منطقی کو ہرا دیتا ہے ۔

■

جب اعتدال ایمان پر حاوی ہو تو وہ کفر ہے ۔

■

پچھتاوا گم گشتہ نیکی کی آواز بازگشت ہے ۔

■

مذہب بہترین زرہ ہے مگر بہت ناقص نقاب !

بمقابلہ غلامی کی پارسائی کے، آزادی کی سیہ کاری میں اخلاق نہ ہو مگر عمل زیادہ ہے ۔

■

رغبتوں اور حرصوں کا مقابلہ کرنے کی اپنے اندر جرأت اور طاقت پیدا کرو ۔ یہی مضبوط ایمان کی علامت ہے ۔

■

وقت اپنا انتظام کر لیتا ہے ۔ تم اس کو ضائع کرتے ہو تو وہ تمہیں ضائع کر دیتا ہے ۔

■

حکومت کیا ہے اگر جرأت اور ہمّت کا ثمرہ نہیں اور ارادے کی وراثت نہیں !

■

سیاسی کمہاروں کا چاک کتنے ہی کچے برتن بناتا اور انہیں توڑ ڈالتا ہے ۔

■

جس طرح سانپ پتھروں کے نیچے چھپتا ہے۔ اُسی طرح جھوٹ دلائل کے پیچھے چھپنا چاہتا ہے۔

■

پتنگ جب ہوا میں بلند ہوتا ہے تو ہوا کے خلاف بڑھتا ہے — فضا کا سکون تلاش کرتے رہو گے تو کام کچھ نہیں کر سکتے۔

■

اُس شخص کی چکّی ہلکی چلتی ہے۔ جس کے پاس دولت ہو ایمان نہ ہو — اور شیطان ہلکی چکّی پیسنا پسند کرتا ہے۔

■

سیاسی مدبّر اُس وقت تقدیر کا نام لیتا ہے۔ جب وہ کوئی فاش غلطی کرتا ہے۔

■

بداعمالی اور حماقت کی نقاب دو چیزوں سے بنتی ہے — دولت اور میٹھے الفاظ !

■

پہاڑ کے خوفناک غار میں خوں خوار درندوں کے ساتھ رہنا اس سے بہتر ہے کہ بد طینت یا احمق کے ساتھ محلوں میں عیش و عشرت کے ساتھ رہنا پڑے !

■

بے کاری کی آسائشوں میں بے کاری بھی سب سے بڑا خطرہ ہے۔

■

یوں بھی ہوتا ہے کہ جو دنیا میں پانی پلاتے ہیں۔ وہی اکثر پیاسے مرتے ہیں !

بہانے کی چادر میں غلطی کے چہرے کو چھپائے رہو ۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ چہرے سے زیادہ میلی چادر ہے۔

■

غصہ ایک احساس ہے جو ضعیف پر بجلی کی طرح گرتا ہے اور قوی کے اندر صبر کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔

■

اپنے ہمسایوں کے متعلق بدگمانی زیادہ تر خود اپنے نفس کا میل ہوتا ہے۔

■

اس دنیا میں الم ناک صرف دو چیزیں ہوتی ہیں ۔ ایک یہ کہ طلب پوری نہ ہو سکے اور دوسری یہ کہ طلب پوری ہو جائے!

■

سیدھا راستہ چھوڑ کر گلیوں میں نہ جاؤ — گلیاں اکثر اندھی ہوتی ہیں۔

■

ہر زندگی میں ایک خلا ہوتا ہے۔ جس کو صرف تصوّرات ہی پُر کر سکتے ہیں۔

■

اِس تھکی ہوئی دنیا میں انسانی شخصیت کا معنوی حُسن گم ہو گیا ہے — ہر ظاہر پرست یہ سمجھتا ہے کہ اس کا ظاہری سب کچھ ہے۔

■

اُس دامن میں پھول جمع نہیں ہو سکتے ۔ جس میں کانٹے نہ اُلجھے ہوں۔

■

وقت سے پہلے اور بے محل بولنے کا شوق ایک دماغی بد ہضمی ہے۔

■

علم کا آغاز جہل مطلق ہے — اور اس کی انتہا بھی یہی ہے۔

■

ارادوں کے لئے تدبیر اتنی ضروری نہیں جتنے کہ تدبیر کے لئے ارادے ضروری ہیں۔

■

بارش سے پہلے ہوا کی رطوبت چڑیوں کو مٹی سے غسل کرنے پر مجبور کرتی ہے — مصیبت سے پہلے انسان کے دل میں بُرے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔

■

تعصب جیسے مذہب میں کیا جاتا ہے۔ اُسی طرح سائنس میں بھی — ہر زمانے میں سائنس کی پہلی ٹکر مذہب ہی سے ہوئی ہے۔

فطرت خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے — یہ غلط ہے ! فطرت بسا اوقات اجتماعی زندگی کی دشمن بن جاتی ہے۔

■

حق عالمِ ابتلا میں رونما ہوتا ہے — اس کو وقت اور زمانہ منکشف کرتا ہے نہ کہ انسان !

■

تصنّع کا لباس جسم کی کھال کو ڈھانپ تو لیتا ہے لیکن وہ لوگ کیا کریں جن کی عریاں رُوح کو لباس میسّر نہیں !

■

رسم و رواج کا دیوتا اتنا طاقتور ہے کہ وہ مذہب پر بھی کچھ اس طرح چھا جاتا ہے کہ اُن دونوں کے درمیان امتیاز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

■

نرم الفاظ کے مقابلے میں زبان و قلم کا تشدّد مؤثر نہیں ہو سکتا — جس طرح توپوں کے گرم گولے ریت میں دھنس کر بے اثر ہو جاتے ہیں۔

■

جہالت حق سے اس قدر دُور نہیں ہوتی جتنا کہ تعصب !

■

جسم کی قوت اگر ارادے سے محروم ہو تو وہ جسم ہاتھی کی لاش ہے۔

■

وہ شخص جو شخصی صداقت سے بیزار ہے۔ اُس شخص سے بھی بد تر ہے جو عمومی صداقت کا منکر ہو ۔

■

عقائد کا تشدّد جس طرح ان کے رسوخ کا ثبوت ہے اُسی طرح ان کی کمزوری کا بھی ثبوت ہے۔

■

قوت کے مظاہروں میں منطق اور عدل و دیانت کی گنجائش کہاں !

■

مفلسی زحمت ضرور ہے مگر ذلت نہیں !

■

رائے عامّہ دنیا میں سب سے زیادہ مفید اور سب سے زیادہ خطرناک مفروضہ ہے۔

■

شکست کے مکتب میں فتح کے سبق پڑھے جاتے ہیں۔

نفس کی سطح سے بلند ہو کر ادنیٰ خواہشوں سے بے پرواہو جانا — انسانی تہذیب شائستگی کی صحیح تعبیر یہی ہے !

■

آرٹ کی روح ایک حُسن دوست ذہنیت ہے جو کریہہ الصوت ساز میں بھی ایک نغمہ سنتی ہے۔ اور ایک ذوقِ نظر ہے جو بد ترین چہرے میں بھی حُسن کی جھلک ڈھونڈھ لیتا ہے۔

■

ایک مُغنّی اپنا راگ تمہارے سامنے گا اور بجا تو سکتا ہے مگر تم کو وُہ کان نہیں دے سکتا جو اس کے نغمے کو پہچانتے ہیں اور نہ وہ آواز دے سکتا ہے جو اس کے نغمے کو فضا میں بلند کرتی ہے۔

■

وہ آرٹ جو فطرتِ انسانی کی عکاسی کرتا ہے اس آرٹ سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے ۔ جو ایک خود ساختہ اخلاقی نتیجہ اخذ کرنے کے لئے اسے مسخ کر دیتا ہے۔

■

توہمات حقیقت کی بہکا دینے والی پرچھائیاں ہیں۔

■

جمہوریت اور عمومیت کے گھر کا دروازہ جب تعیّش کے لئے کھلتا ہے تب وہ مطلق العنان شہنشاہی کا چولا پہنتی ہے۔

■

ہوس کی غلامی سب سے بڑی غلامی ہے ۔ اور جو جتنا بڑا ہے ۔ اتنا ہی بڑا ہوس کا غلام ہے ۔

■

سنجیدہ فطرت کی علامت الفاظ کا سلیقہ ہے۔

■

تقلید کا مبالغہ تعصّب بن جاتا ہے۔

■

ظلم اور ناانصافی کی سربفلک عمارتوں میں اونچے اونچے مینار اور بڑی بڑی محرابیں تو ہوتی ہیں مگر روشن دان نہیں ہوتے !

■

شیطان میں اگر کوئی خوبی ہے تو یہی ہو سکتی ہے کہ وہ کاہل نہیں ہے اور ہمیشہ مصروف رہتا ہے۔

■

قومی مسائل میں شخصیت پر اتنا زور نہ دو کہ اجتماعیت کا تخیل ہی فنا ہو جائے ۔

اوسط درجے کے شہری میں واہ وا کہنے کی جرأت اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی ہوا باز نعرۂ تحسین بلند کرتا ہے ۔ لیکن ہمارا لیڈر اور واعظ اس نکتے کو خوب جانتا ہے۔

■

مدبر وہ ہے جو اپنی باری آنے تک صبر کے ساتھ انتظار کرنے کا طریقہ جانتا ہو ۔

■

ہمارے دیس کے بہت سے بوڑھوں کی جوانی کا زمانہ ان کا بڑھاپا ہوتا ہے ۔

■

آزادی کے ساتھ ذمہ داریاں بھی ہیں — اس لئے بہت سے لوگ آزادی کے نام سے ڈرتے ہیں۔

■

اشتعال جس قدر زیادہ ہو ۔ اعتدال کی ضرورت اُسی قدر زیادہ ہوتی ہے۔

■

جہالت تعصب کو عمرِ طویل عطا کرتی ہے اور غلطیوں کو اپنی گود میں پالتی ہے۔

■

اگر ترغیبات سے تم بچ سکو تو گناہوں سے خدا بچائے گا۔

■

عین اُس وقت جب فاتح اپنی فتح کے نشے میں سرشار ہوتا ہے۔ شکست اُس کی روح میں زہر ملاتی ہوتی ہے۔

■

قوت کے ساتھ ذمہ داریاں ہیں مگر جب قوت مغرور ہو تو وہ غیر ذمہ دار ہو جاتی ہے۔

■

غفلت کی نیند کا سمندر کس قدر گہرا ہے — اور خواہشوں کی دنیا میں احساسِ حقائق کی صبح کتنی دُور ہے۔

■

دولت کا محتاج وہ ہوتا ہے جس کا پیٹ بھرا ہو مگر ضمیر کا افلاس عمر بھر کی فاقہ کشی ہے۔

■

تصنّع اور سخن سازی — یہ اخلاقی افلاس کے چہرے کا نقاب ہے۔

■

غصّے اور ضد کی بنیاد پر جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں وہ پانی پر نمک کی دیواریں ہوتی ہیں۔

وہ بد ترین تعلیم جو ہماری نسلوں کو ذاتی قربانیوں کے لئے تیار کرتی ہے اُس بہترین تعلیم سے بہرحال بہتر ہے جو سوائے قربانی کے ہر کام سکھا دیتی ہے۔

■

جو زنجیریں زیادہ ہلکی معلوم ہوتی ہیں۔ اکثر وہی زیادہ مضبوط بھی ہوتی ہیں۔

■

باشوق انقلاب کا خیر مقدم کرو مگر پہلے یہ تو سمجھ لو کہ اس کی فطرت تخریبی ہے تعمیری نہیں !

■

غفلت بہت زیادہ گہری نیند ہے اور خواہشِ نفس بہت بڑا اقتدار رکھتی ہے۔ اگر غفلت کی نگرانی نہ ہو تو خواہش غلبہ نہیں پا سکتی ۔

■

ہر چند مسرت کی فطرت میں داخل ہے کہ اس کی حقیقی معرفت اس کے زائل ہونے کے بعد ہی محسوس ہوتی ہے۔

■

سچّی مسرت عدل میں ہے — وہ عدل جو تم اپنے اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ کرو ! اور وہ عدل جو تم اپنے اور حق کے درمیان کرو !

■

جب کسی ایسی منزل پر نظر نہیں ہوتی جو جان سے بھی زیادہ عزیز ہو، تو پھر کیا تعجب ہے اگر انسان اپنی زندگی سے اُکتا جائے۔

■

علم میں حق سے پہلے باطل کا درجہ ہے۔ باطل کو پہچانے بغیر حق سے آشنا ہونا بہت دشوار ہے۔

■

جس طرح بھوکا روٹی مانگتا ہے۔ لیڈر اقتدار مانگتا ہے۔ جلوس مانگتا ہے۔ نعرے اور ہار پھول مانگتا ہے — اور جس قدر زیادہ یہ سب اس کو ملتا ہے۔ اُسی قدر وہ اور مانگتا ہے۔

■

انسان اشیا کے نام مقرر کرتا ہے اور پھر ان چیزوں کو اپنی مخلوق سمجھ لیتا ہے۔

■

شاعر کے الفاظ سے ترنم پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کی روح کے ترنم سے الفاظ پیدا ہوتے ہیں۔

■

الفاظ کا ظلم ، اعمال کے تشدّد سے زیادہ آزادیٔ ضمیر کا دشمن ہے۔

احمقوں میں صاحبِ فہم اور صاحبانِ فہم میں احمق تلاش کرنے کا مشغلہ ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ کیونکہ حماقت اور زیرکی میں صرف ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے۔

■

قبر کے عالیشان گنبد کو نہ دیکھو، اس کی آواز کو کان لگا کر سنو۔

■

موجودہ مصائب برداشت کرنے کی طاقت کو مستقبل کے مفروضہ خطرات کی فکر میں ضائع نہ کرو۔"

■

مذہب کا نام لے کر سیاست کے گھوڑے جب دوڑتے ہیں تو وہ سب سے پہلے مذہب ہی کی لگام کو توڑ دیتے ہیں۔

■

تعصب کی آگ جاہل اور اَن پڑھ لوگوں کے سینوں میں دہکتی رہتی ہے جو شد و مد سے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔

■

انسان جو ماضی کی روایات کا وارث ہے۔ کتابوں ہی سے اپنی وراثت حاصل کرتا ہے کتابیں ہی اس کی وراثت کی دستاویز ہیں۔

■

سانپ جب ہرن کے جسم کے گرد لپٹ جاتا ہے تو پھر وہ یہ نہیں سوچتا کہ ہرن کی رائے اس کے طرزِ عمل کے بارے میں کیا ہے؟

■

جو کوئی حالات سے بے پروا ہو کے سوچتا ہے۔ وہ لیڈر نہیں بلکہ پیغمبر ہوتا ہے۔

■

بڑا آدمی صرف وہ ہے جس نے خود کو پہچانا اور جس نے اپنی حقیقت کو پہچانا اس نے کبھی اپنے کو بڑا نہ سمجھا۔

■

افراد کی طرح جماعتوں کی جوانی بھی جاتی ہے اور بڑھاپا آتا ہے — مگر افراد ہی کی طرح جماعتیں بھی خضاب لگا کر جوان بنے رہنے کی کوشش کیا کرتی ہیں — لیکن نہ افراد کا بڑھاپا چھپ سکتا ہے اور نہ جماعتوں کا!

■

مغرور اور صاحبِ اقتدار انسان — چند روزہ اقتدار کا خلعتِ زریں پہن کر وہ چالیں چلتا ہے کہ فرشتے اس کے حال پر روتے ہیں۔

■

جو شخص دوسروں کے عیبوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے وہ اس جدوجہد میں دوسروں کے اتنے عیبوں کا کھوج نہیں پاتا۔ جتنے عیب کہ خود اپنے عُریاں کر دیتا ہے۔

اس دنیا میں ہر چیز روپیہ دے کر نہیں خریدی جا سکتی — اس عجیب بازار میں بعض چیزیں ایسی بھی فروخت ہوتی ہیں جو مفت ملتی ہیں یا بالکل نہیں ملتیں۔

■

ارادے کی قوت کے بغیر ایمان ایک بوسیدہ ستون ہے جو زندگی کی عمارت کو سنبھال نہیں سکتا ۔

■

علم عمل کو آواز دیتا ہے — اگر عمل جواب دے تو وہ ٹھہر جاتا ہے۔ ورنہ کوچ کر جاتا ہے۔

■

جب طوفان میں اتنا زور ہو کہ تیرا مکان پل بھر میں بیٹھ جائے ، تو پھر دیوار کا سہارا لے کر کیوں کانپ رہا ہے — زندوں کی طرح جینا ہے تو سر کے اوپر طوفان کا سایہ رکھ اور قدموں کے نیچے موت کا دریا بہنے دے !

■

آزادی دو قسم کی ہوتی ہے — ایک وہ کہ ہر شخص جو چاہے کرے اور ایک وہ کہ ہر شخص صرف وہی کر سکے جو اس کو کرنا چاہیئے۔

■

نرم الفاظ دلوں پر جو نقش مرتسم کرتے ہیں۔ کسی تلوار کی نوک مرتسم نہیں کر سکتی ۔

■

ماضی سے بے تعلق مستقبل ایک نامعلوم اور ویران جزیرے کا تصوّر ہے جس تک کوئی جہاز نہیں پہنچتا۔

■

قوی بہ نسبت اپنی قوت کے ، ضعیف کے ضعف سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے اور ضعیف اپنے ضعف کی وجہ سے چوٹ کھاتا ہے نہ کہ قوی کی قوت کی وجہ سے !

■

قوم کا ہر فرد زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ یہ کڑی اپنے کو مضبوط رکھے تو آس پاس کی کڑیاں مستحکم رہیں — زنجیر کی کڑیوں کے اس باہمی تعلق میں انسانوں اور قوموں کی اجتماعیت کا راز مضمر ہے !

■

جواز و عدم جواز کی اخلاقی حیثیت کو جو شخص سیاسی دلائل سے ثابت کر سکتا ہو وہ بڑا چالاک لیڈر ہے۔

■

قوت کی زحمتوں کو دیکھنے کے لئے ان لوگوں کو دیکھو جو قوت رکھتے ہیں اور قوت کی راحتوں کو دیکھنے کے لئے ان کو دیکھو جو قوت تلاش کر رہے ہوں — قوت کی زحمتیں ناگزیر مگر اس کی راحتیں محض وہم و گمان ہیں۔

صاف دلی کے ساتھ بے جھجک گفتگو کرو — یہی شرافت اور یہی ایمان ہے۔

■

ہر شخص اپنے واہمے پر ایک لیبل لگا دیتا ہے۔ جبہ و عمامے کے لیبل الگ ہیں اور علوم و فنون کے لیبل الگ ! اُن کے خدا کو یہ نہیں مانتے اور اِن کے خدا کو وہ نہیں مانتے !

■

طوفان کے جھونکے زیادہ تیز آتے ہیں تو بڑے تناور درختوں کے لئے خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ گھاس اور پودوں کی نرم شاخوں کی لچک اور کمزوری ان کے تحفظ کی ضامن ہو جاتی ہے ۔ آنے والی آفتوں سے ڈرنا اُسی کو چاہیئے جو زیادہ طاقتور ہو !

■

دنیا کی عمارت کے چار ستون ہیں ۔ وہ علم جو فضلا کے سینے میں ہو — وہ عدل جو ارکانِ حکومت کے ارادوں میں پایا جائے — وہ دعا جو صالحوں کے دلوں سے نکلے ۔ وہ جلال جو بہادروں کے تیور سے ظاہر ہو ۔

■

بنی نوع انسان کا کوئی مسئلہ جبر واستبداد سے طے نہیں ہوا ۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بنی نوع انسان کے ہر مسئلے کو جبر واستبداد ہی کی مدد سے طے کرنے کی کوشش کی گئی۔

■

دنیا اس حقیقت سے نا آشنا نہیں ہے کہ اگر وطن کی حُرمت پر سر کٹانے کا جذبہ راسخ ہو تو مادی دنیا کے بہت سے نظریئے درہم برہم ہو جاتے ہیں۔

■

جہاں کوششیں اور خواہشیں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ وہاں بھی مستحکم ایمان کامران ہوتا ہے — عقیدے کی قوت دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے۔

■

نیکی وہی چیز ہے جس پر جی ٹھکانے لگ جائے۔ گناہ اور پاپ وہ ہے جس سے دل میں کھجلی پیدا ہو ۔ اور وہ پلٹ پلٹ کر تمہارے اندر آئے !

■

محبت ایک اشتہا ہے جو تسکین کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہے — جو شخص کسی مہ وش کی پُر مسرت زندگی بسر کرنی چاہتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو شراب کا گھونٹ منہ میں رکھ کر اس سے مسرور ہونا چاہتا ہے۔

عبودیت کا کمال آزادی میں ہوتا ہے اور آزادی اُس وقت پوری ہوتی ہے جب عبودیت میں کوئی نقص نہ رہے۔ آزادی اور عبودیت لازم و ملزوم ہیں۔ جب تک انسان آزاد نہ ہو احکام کی پابندی نہیں کر سکتا اور جب فرماں برداری انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو آزادی مکمل ہو جاتی ہے۔

■

خود قانون ایک بڑا ظلم ہے اگر وہ غلط استعمال کیا جائے !

■

خود فریب انسان کہتا ہے کہ دولت سمیٹو اور اس کی نمائش کرو ۔

فیاض منش کہتا ہے کہ دولت حاصل کرو اور بانٹو — مسرف کہتا ہے کہ دولت پاؤ اور لٹاؤ ! — مہاجن کہتا ہے کہ دولت سے دولت پیدا کرو — جواری کہتا ہے جوا کھیلو اور دولت ہارو ! — مگر جس کو خدا نے عقل دی ہے وہ کہتا ہے کہ دولت کماؤ اور استعمال کرو — اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی !

■

نفسِ انسانی ایسا ہے جیسے ایک مزروعہ کھیت — کہ اگر اس کی نگہداشت نہ کیجئے تو گیہوں کی جڑوں میں گھانس اور کانٹے اُگ آتے ہیں۔

■

فطرت کی کہانی سرور سے بھری ہے۔ لیکن ہماری دخل در معقولات کرنے والی عقل چیزوں کے سندر رُوپ کو بھونڈا بنا دیتی ہے — تشریح کے شوق میں ہم ارتکابِ قتل کرتے ہیں۔

■

اجتماعی زندگی کے لئے منضبط آزادی اتنی ہی ضروری ہے جس قدر کہ انفرادی جسم کے لئے صحت ! — بغیر صحت کے خود اپنی زندگی سے لطف اندوز ہونا بہرہ مند نہیں ہو سکتا اور بغیر منضبط آزادی کے معاشرہ سعادت سے محروم رہتا ہے ۔

■

زبان کی بے اعتدالی ، مزاج کا تلون ، جھوٹ اور حسد — انسانی فطرت کے یہ کیڑے — یہ سب ایک دوسرے کی گود میں پیدا ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ہی پرورش پاتے اور ایک کے بغیر دوسرا زندہ نہیں رہ سکتا!

■

خوابوں کی وسیع دنیا میں کتنے سُورما بستے ہیں جو ہر لمحہ بڑے بڑے کارنامے انجام دیتے ہیں — مگر جب آنکھ کُھلتی ہے تو اپنے کو کسی اصطبل میں بندھا پاتے ہیں۔

انسانوں کی برادری میں بہت سے سونے کے برتن ایسے ہیں جن میں زہر بھرا ہوتا ہے۔ کم نظر چمکتے ہوئے سونے کو دیکھتے ہیں۔ زہر کو نہیں دیکھتے۔

■

موذی تو بھول جاتا ہے مگر انسانوں کے دلوں پر اس کے ایذا کے نشان باقی رہتے ہیں۔ اور اس ایک سیاہ دھبّے سے دنیا میں کیسی کیسی قیامتیں آتی ہیں۔ اور کیسے کیسے انقلاب رونما ہوتے ہیں۔

■

علم و فضل کی کتنی عمارتوں کو صرف ایک لفظ مسمار کر دیتا ہے— ایمان !

■

تُو ہوا کو تولتا ہے اور آسمان کو ناپتا ہے — اس لئے کہ انسانی استدلال کمزوریوں کو تسلیم نہیں کرتا ۔

■

برق و باراں اور سیلاب و صرصر سے زیادہ سخت خدا کا وہ عذاب ہے جو قوموں پر محرومیٔ اصابتِ فکر کی صورت میں نازل ہوتا ہے۔

■

تاریخ ، جنگ اور خون ریزی کا ایک مسلسل افسانہ ہے۔ ہر جنگ ایک دوسری جنگ کا پیش خیمہ ہوتی ہے ۔ صلح اس زنجیر کی محض ایک کڑی ہے جو ایک فتنے کو دوسرے فتنے سے منسلک کرتی ہے۔

■

تصنعات کی اس دنیا میں جہاں علم صرف کتابوں کا نام ہے اور جہاں فضیلت صرف اسناد پر منحصر ہے ، آرٹ محض ایک پیشہ بن گیا ہے۔ حالانکہ وہ کچھ نہیں اگر "فطرت" نہیں ہے۔

■

یہ ضروری نہیں کہ بڑے سر میں خیالات بھی بڑے ہوں— اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سر جتنا بڑا اور اونچا نظر آتا ہے۔ خیالات اسی قدر چھوٹے اور پست ہوتے ہیں۔

■

کمزور اخلاق کی جھکی ہوئی کمر ، رسم و رواج کی لاٹھی کا سہارا لیتی ہے۔

■

تعصب کی زرہ پر دلیل کا وار اوچھا پڑتا ہے — جو چیز عقلِ سلیم پر مبنی نہیں ہوتی وہ منطق کے قابو میں نہیں آتی ۔

■

بزدلی اور غصّے کی انتہاؤں کا صحیح اوسط حقیقی مردانگی ہے۔

اُس فرض کو پہلے ادا کرو جو تم سے قریب تر ہو ۔ پہلا فرض ادا کر کے بعد کے فرائض کا سرانجام کس قدر آسان ہو جاتا ہے۔

■

ہمارے ملک میں تعلیم اور تپ دق دونوں کی ترقی ساتھ ساتھ جاری ہے۔ تعلیم کے ساتھ اگر تپ دق نہ ہوتی تو غور کیجئے کہ بے روزگاروں کی تعداد کتنی زیادہ ہوتی۔

■

غم رونما نہیں ہوتا ۔ جب تک محبّت کا تسلّط رہتا ہے ۔

■

قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کا سہارا ، قانون کی پابندی کرنے والوں کی بُزدلی ہوتی ہے۔

■

جھوٹی شہرت کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر انسان صداقت سے جنگ کرنے پر تُل جاتا ہے۔

■

ضعیفی ، ضعیفی کے لحاظ سے اِس قدر تکلیف دہ نہیں، جس قدر اس خیال سے کہ اس سے پہلے جوانی گزر چکی ہے۔

■

عقل پر تصورات کا تفوق کام کرنے کی قوت پیدا کرتا ہے — لیکن نتائج کا ضامن نہیں ہو سکتا ۔

■

چالاک آدمی آہستہ نہیں چل سکتا — وہ دوڑتا ہے اور گرتا ہے۔

■

آزادی ہی کا نام غلامی ہے — جب اس کی بھیک مانگی جائے ۔

■

بالوں کا رنگ ، عمر کا صحیح پیمانہ نہیں — دل کی عمر ، جسم کی عمر سے مختلف چیز ہے۔

■

حاسدوں کے حسد سے اہلِ کمال کا ہُنر جلا پاتا ہے۔ بے وقوف لڑکے بہتے ہوئے پانی کو روکنے کے لئے ریت کی جو دیواریں بناتے ہیں وہی دیواریں پانی کی قوّت میں اضافہ کرتی ہیں۔

■

بڑھاپا زندگی کی لذّتوں کو کم کر دیتا ہے مگر زندہ رہنے کی خواہش کو بڑھا دیتا ہے۔ — اور یہی زندگی کی سب سے بڑی لذّت ہے۔

انسانوں کی آدھی ناکامیوں کا سبب ، اولوالعزمی کا فقدان ہوتا ہے اور باقی آدھی کا باعث تحمل ، اور ضبط کی کمی ہوتی ہے۔

■

جو شخص اپنے مدِ مقابل کے لئے دلیل نہیں رکھتا وہ خفیہ سازشیں کیا کرتا ہے۔

■

کتنے آدمی ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ بلند آہنگ قہقہوں کی آخری آواز مایوسی کا ایک سانس ہوتا ہے۔

■

ایک پتھر سے دو پرندے مارنے کی کوشش بہت مفید ہے لیکن اس کو کیا کیجے کہ اکثر جب ایسا ارادہ کیا جاتا ہے تو دونوں پرند اُڑ جاتے ہیں۔

■

اپنی نظر کی روشنی میں آگے بڑھو ، جب تم دوسروں کی آنکھ سے اپنے لئے روشنی مانگو گے تو دوسروں ہی کا رستہ چلو گے!

■

زندگی کے طول کا حساب ، "روز و ماہ و سال" سے نہیں لگایا جاسکتا — بہت سے انسان صرف ایک ہی طلوع و غروب کے درمیان اپنی ساری جوانی ختم کر دیتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ سو برس کی عمر میں بھی ان کا آخری سانس گویا جوانی کا پہلا سانس ہوتا ہے — قویٰ کا ضعف یا جسم کی قوت معنوی زندگی کا معیار نہیں!

■

جلدی سیکھنے والا جلدی بھول جاتا ہے — اسی طرح جو شخص تیز قدمی سے چلتا ہے تیز قدمی سے واپس ہو جاتا ہے۔ گویا کبھی ملا ہی نہ تھا۔

■

کسی مقصد کے لئے جان دینا مشکل نہیں ، زیادہ مشکل یہ ہے کہ کس مقصد کے لئے زندہ رہا جائے ۔

■

دنیاداروں کی نظر میں اچھا آدمی صرف وہی ہوتا ہے۔ جو مر چکا ہو یا ابھی پیدا نہ ہوا ہو ۔

■

وہ کوئی بے دین تھا مگر بیوقوف نہ تھا۔ جس نے کہا تھا کہ جنت میں غلام بن کے رہنے سے دوزخ میں آزاد رہنا بہتر ہے۔

■

سمندر کی لہریں اور ہوا کی قوت اُسی ملاح کا ساتھ دیتی ہے۔ جو جہاز رانی کا فن جانتا ہو۔

اپنے ہیرو کے قریب نہ جاؤ — اس کی عظمت مداحوں کے قرب کو برداشت نہیں کرتی ۔

■

مرنے کے بعد بھی بڑے آدمی کے وجودِ معنوی کی چاندنی چاروں طرف پھیلتی رہتی ہے تاکہ دوسروں کے افکار کی تاریک راتوں کو روشن کرے۔

■

"لیکن" اور "مگر" — ان دو لفظوں کی چادر میں کمزور ارادے اپنا منہ چھپایا کرتے ہیں۔

■

اگر تمام انسان اپنے غموں کو یک جا کر کے رکھیں تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اُس کا غم سب سے کم ہے۔

■

چھوٹی چھوٹی باتوں اور کاموں کو چھوٹا نہ سمجھ ! — باریک سے باریک بال بھی اپنی پرچھائیں رکھتا ہے۔

■

شہرت ہے ۔ جس سے لوگ ہمیں یاد کرتے ہیں — سیرت ہے جس سے خدا اور فرشتے ہمیں جانتے ہیں — بڑے آدمی خدا کے شہر میں میناروں کی طرح کھڑے ہیں۔

■

انسانی اخلاق میں انکسار ، روح کی عظمت کا نشان ہے۔

■

مقاصدِ زندگی کے لئے ، انسانی کمزوریاں اکثر بہت ضروری ہوتی ہیں۔

■

غم ایک مقدس جذبہ ہے — محبّت سے بھی زیادہ مقدس !

■

اگر بادبان کمزور ہوں اور ہوا تیز ہو اور تم اپنی کشتی کو گہرے پانی کی طرف لے جاؤ — تو پھر تفکّر اور تدبّر کا دعویٰ نہ کرو !

■

صرف باتیں کرو ! — یہ بھی تو ایک کام ہے۔ ادنیٰ قسم ہی کا سہی !

■

ہر ملک کی قیمت ، اہلِ ملک کی انفرادی قیمتوں کی میزان ہوتی ہے۔

■

آج کر [illegible] کا [illegible] کرو [illegible] خود بخود سرسبز ہو جائیں گے۔

چراغ کا تیل ضائع کر کے آپ روشنی کہاں پائیں گے — باتوں میں قوت صرف کر کے ارادوں میں استحکام کیونکر پیدا ہو گا۔

■

اسلاف کی روایات پارینہ اور نسب کا غرورِ باطل ! — ہمیں ایسا ہونا چاہیئے کہ ہماری نسبت ہمارے خاندانوں کو پہچانیں ، نہ یہ کہ ہم اپنی تعریف کے لئے خاندانی شرافت کے محتاج ہوں۔

■

اعتدال کا قدم تیز نہ ہو مگر مضبوط زیادہ ہوتا ہے۔

■

ہم اپنی زندگی میں سوائے حقیقت کے کچھ نہیں جانتے — مگر جب وہ سامنے آتی ہے تو ہم اس کے علاوہ ہر چیز میں محو ہو جاتے ہیں — حقیقت کو ڈھونڈتے ہیں اور حقیقت سے کتراتے ہیں۔

■

بزرگی کا وقار صرف محبّت ، ہمدردی اور ایثار و شفقت ہی سے قائم رہ سکتا ہے— مگر جب ایک دروازے سے تنگ دلی داخل ہوتی ہے تو دوسرے دروازے سے بزرگی اور وقار بھاگ نکلتے ہیں۔

■

اپنی نیّت بخیر کا بار بار اعلان نہ کیجئے ۔ بار بار اعلان سے نیّتِ خیر تھک جایا کرتی ہے۔

■

انسانی حقوق سے بحث کرنے والی کتابیں — کاغذ پر نہیں لکھی جا سکتیں۔

■

مبالغہ آمیز انکسار بھی خود نمائی کا ایک نمایاں پہلو رکھتا ہے۔

■

ضمیر اور خواہش کی آواز بہت ملتی جلتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب خواہش اپنی آواز بدل کر بولتی ہے تو گنہ گار انسان آسانی کے ساتھ اس کو ضمیر کی آواز سمجھ کر دھوکا کھا جاتا ہے — فریبِ نفس کی یہ بد ترین صورت ہے۔

■

انسان کی غلطیاں تنکوں کی طرح ہیں۔ جو پانی کے اوپر نظر آتی ہیں — لیکن پانی کی تہہ میں کچھ موتی بھی ملتے ہیں، اگر غوطہ لگانے کی ہمّت ہو ۔

■

جذبہ بغیر عقل کے ایک شعلہ ہے جو ایسی آگ لگاتا ہے کہ سب کچھ جلا ڈالتا ہے— پس ایسا کرو کہ تم اپنی روح کو ان دونوں کے درمیان ثالث بناؤ ۔

تیز سے تیز شراب کے نشے میں وہ قوت نہیں ہوتی — نہ وہ غرور ہوتا ہے نہ وہ مکر و طنطنہ — جو اقتدار یافتہ انسانوں کی خود بینی میں نظر آتا ہے۔

■

مصیبت کے پرندوں کو تم اپنے سر پر منڈلانے سے تو روک نہیں سکتے مگر تم ان کو اپنے سر کے بالوں میں گھونسلا بنانے سے یقیناً روک سکتے ہو۔

■

عقل ہمارے دل کی آنکھ ہے! جس طرح چہرے کی آنکھ سورج سے روشنی لیتی ہے اُسی طرح دل کی آنکھ روح سے کسبِ نور کرتی ہے — لیکن اگر نور کا یہ خزانہ خالی ہو؟

■

دورِ حاضر کے مسلمات میں سے یہ امر بھی ہے کہ قوموں اور ملکوں کی طاقت کا اصل منبع نہ اخلاق ہے نہ انصاف نہ مذہب بلکہ صرف دولت ہے۔

■

جب دھواں آگ کی روشنی کو، اور میل آئینے کی آب کو چھپا لیتا ہے۔ اسی طرح خواہشیں اور ہوس "حق" کے نور پر پردے ڈال دیتی ہے۔

■

چہرے اور الفاظ کی ایک وہ سنجیدگی ہے جو صرف اعمالِ بد کے لئے پردہ بنائی جاتی ہے۔ یہ گنہگار کا اساسی فلسفہ ہے۔

■

غصہ یا تو ذہنی اور عصبی انتشار کا آئینہ ہوتا ہے یا ضعفِ یقین کا! — علم و فضل میں جب غصّہ شریک ہو تو وہ شیطان کی انگلی کا اشارہ ہے۔

■

دولت بدن کی خدمت کے لئے ہے اور بدن روح کی خدمت کے لئے! مگر انسان بدن سے دن رات اس قدر ناجائز کام لیتا ہے کہ اس کو روح کی خدمت کا موقع ہی نہیں ملتا۔

■

آزادی کا مستحق سب سے زیادہ وہ شخص ہے جو اپنے اُوپر اخلاق و اعمال کی سب سے زیادہ قیود عائد کر سکے۔

■

سکّہ چاہے وہ روپے کی صورت میں ہو یا کاغذ کی شکل میں، محض ایک اعتباری سمجھوتہ ہے۔ جس شخص نے اپنا اعتبار کھویا اس نے دولت کھوئی!

الفاظ کی کُنجی سے "علی بابا" کے خزانے کے علاوہ بھی زندگی کے اور بہت سے خزانے ہیں۔ جن کا دروازہ کھولا جا سکتا ہے۔

■

حق علم کی بنیاد ہے —مگر علم کے بغیر ہی حق کا احساس عینِ ایمان ہے۔

■

روح کی خدائی عظمت ، اس کی قوتِ برداشت میں مضمر ہوتی ہے۔

■

جہلا عموماً غیر معمولی قوتیں تلاش کرتے ہیں۔ اور عجائبات کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں— مگر عقلِ سلیم اپنے مطالعے کے لئے پیش پا افتادہ حقائق اتنے دیکھتی ہے کہ اس کو عجائبات پر حیران ہونے کی فرصت ہی نہیں ملتی !

■

قانون الہام نہیں ۔ — وہ انسانی معاشرے کی اولاد ہے اور اسی کی طرح ناقص اور حالات کا پابند بھی ہے۔

■

فصاحت و بلاغت کا دریا جس قدر زیادہ تیز بہتا ہے اُسی قدر کم اس دریا کی سیپیوں میں موتی نکلتے ہیں۔

■

حکومت ایک منظم بُت پرستی ہے — مکمل آزادی کا وجود ناممکن ہے ۔ امورِ مملکت کسی نہ کسی شرط سے مشروط ہوتے ہیں۔ اور آزادی ذمہ داریوں سے !

■

جب تم کو کسی شخص کے معائب کا علم ہو تو اس کی خوبیاں بھی تلاش کرو — کوئی شخص دنیا میں ایسا پیدا نہیں ہوتا کہ سراپا عیب ہو اور کوئی بھی خوبی نہ رکھتا ہو ۔

■

ہر روز ایک نئے ساحل کی طرف ، ہر روز ایک نئے جزیرے کے سامنے ، ہر روز ایک نئے طوفان کی آغوش میں ! —— یہ زندگی کا سمندر ہے ۔ جس میں کوئی لنگر ایک لمحہ بھی قائم نہیں رہ سکتا ۔

■

فصاحت اور بلاغت ، تجربے کا نعم البدل نہیں ہو سکتی — تجربہ نفسِ حیات ہے اور فصاحت و بلاغت محض ایک ظاہری آرائش !

■

بعض اوقات ہنسی ایک نقاب ہوتی ہے —غمگین فطرت کے چہرے پر !

سنجیدگی یا شدّت یا سرزنش کے ساتھ جو اہانت کی جائے وہ اس قدر مجروح نہیں کرتی جس قدر کہ وہ توہین جو مسکراتے ہوئے طنز اور متبسم مزاح کے پردے میں کی جاتی ہے۔

■

کہتے ہیں کہ سیاسی قبرستانوں میں کفن نہیں چرائے جاتے حالانکہ اکثر ہوتا ہے کہ ان قبروں کے مردے بھی چرالئے جاتے ہیں — لیڈروں کی تقریریں غور سے پڑھیئے!

■

انسان اعلیٰ سے اعلیٰ درجۂ کمال پر پہنچ کر بھی انسانی کمزوریوں سے پاک نہیں ہو سکتا —— اس کھلی حقیقت کو نہ بھولو کہ مٹّی اور خدائی روح ، دونوں کی کرشمہ کاریاں اس کی نہادِ فطرت میں جمع ہیں —— 'سافلین' کی پستیوں سے عرش کی بلندیوں تک اس کی جولاں گاہ ہے۔

■

اپنے نفس کی تحقیر وہ انتہائی پستی ہے جس کو غلط اندیش راہب روح کی بلندی سمجھتا ہے۔

■

ضرورت مند کی زندگی کا بڑا سرمایہ اس کی ضرورت ہے۔ ذوقِ طلب کے بغیر انسانی وجود ایک ایسا ساز ہے جس کے تار موسیقی سے محروم ہوں۔

■

آسائشِ جسم وہ چور ہے جو پہلے تمہارے گھروں میں مہمان بن کر آتا ہے پھر گھر کا مالک بن بیٹھتا ہے۔

■

قوم کے مستقبل میں انفرادی قوت شامل ہے۔ جہاں قوم کا مستقبل نہ ہو وہاں انفرادی مستقبل بھی ایک خواب و خیال ہے۔

■

عمل جب باندازۂ علم ہو گا تو علم باندازۂ عمل ترقی کرے گا!

■

خدا نے انسان کو موت کی آسائشوں سے اس لئے بے خبر رکھا ہے کہ وہ زندگی کی زحمتوں کو گوارا کر سکیں۔

■

جو لوگ اعلیٰ سیرت رکھتے ہیں ۔ وہ اپنے فرائض پر توجہ کرتے ہیں اور جو یہ نہیں رکھتے وہ صرف اپنے مطالبات کی فکر میں رہتے ہیں ۔

خدا سے مرادیں نہ مانگو — صرف عمل کی توفیق مانگو ، مرادیں عمل سے مربوط ہیں۔

■

فرشتوں کا لباس پہن کر ، شیطان کی خدمت بجالانا — یہ دنیا سازی کی جامع تعریف ہے۔

■

ہر دلعزیزی کی خواہش سب سے بڑا شیطان ہے جس کی ایک نگاہِ کرم کے ساتھ ہی استقامتوں کی بڑی بڑی چٹانیں پانی ہو کے بہہ جاتی ہیں۔

■

جدید دنیا کی الفاظ خیالات کا پردہ ہیں — یہ کس نے کہا کہ وہ اظہارِ خیال کا ذریعہ ہیں اب تو بیسویں صدی کا متمدن انسان زیادہ باتیں صرف اس لئے کرتا ہے کہ اس کے اعلیٰ خیالات ظاہر نہ ہوں۔

■

عالی مرتبہ احمق کی پہچان یہ ہے کہ جیسے پہاڑ کی چوٹی پر ایک تماشائی ! — ہر چیز اس کو چھوٹی نظر آتی ہے اور وہ ہر شخص کو چھوٹا نظر آتا ہے۔

■

زندگی اور عقل کے دو عمل ہیں۔ سیکھنا اور بھول جانا ، پھر سیکھنا اور پھر بھول جانا ، پھر سیکھنا اور پھر بھول جانا ! — حساب لگاؤ کہ زندگی کے ایک ہی مختصر دن میں کیا سیکھتے ہو اور کیا بھول جاتے ہو ۔

■

علم کا اصل مقصد دماغی ترقی ہے — دماغی ترقی کا صحیح استعمال اتنا ہی ہے کہ خود انسان حسبِ حیثیت ان ذمہ داریوں کو محسوس کرے جن کو پورا کرنے کے لئے قدرت نے اس کو پیدا کیا۔

■

بزدل کی نشہ باز روح ، بدگمانیوں سے غذا پاتی ہے۔ !

■

آسودگیٔ نفس تین چیزوں سے ضائع جاتی ہے۔ مال کے لالچ ، لوگوں سے اپنی توقیر کی خواہش اور دنیا کو شاد و کامراں دیکھ کر ناخوش کر دینے والا بغض و حسد !

■

انقلاب تمہارے ذہنوں کو کتنا ہی لبھائے مگر وہ لازماً ارتقا نہیں ہے — ارتقا ایک تدریجی عمل ہے جس سے فکر و عمل کا ایک مخصوص سانچا تشکیل پاتا ہے اور انقلاب محض بد نظمی ہے۔ جس سے بگاڑ تو پیدا ہوتا ہے بناؤ رونما نہیں ہوتا ۔

عہدِ جدید کی قیادت و سیادت کا بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ جب درپردہ شکست ہو رہی ہو ، تو سرِ بازار سینہ تان کے نقارے بجائے جائیں ــــ یعنی جب تک شکست کا تسلیم کرنا ناگزیر نہ ہو جائے۔ فتح کا ادعا قائم رہے ۔

■

تھکے ہوئے لوگ جو ہر وقت زندگی کے مصائب کا ذکر کرتے ہیں وہ اپنے سے زیادہ سننے والوں کو تھکا دیتے ہیں۔

■

خوف گناہ کا محصول ہے ۔ جو ضمیر کو ادا کیا جاتا ہے۔

■

ایک ہزار میل کا طویل سفر بھی جب شروع ہوتا ہے تو صرف ایک قدم سے !

■

محبت ، جس طرح موت ، زندگی کی تکمیل کا آخری نقطہ ہے۔

■

اشتہا پر اگر عقل نگراں نہ ہو تو معدہ دوا مانگتا ہے۔

■

خاموش دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے ــــ اس کی خاموشی کو تعصب نہ سمجھو ــــ البتہ باتونی دشمن اکثر ناتواں ہوتا ہے ۔

■

نظمِ حکومت بااقتدار انسان اپنے اقتدار کی حفاظت میں اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ اس کو ارتقا کے رستے بھی یاد نہیں رہتے !

■

نفس کی آزادی ضمیر اور ایمان دونوں کی ہلاکت ہے۔

■

مادی قوت کسی قوم کے ارادے پر کبھی کوئی فیصلہ کُن فتح حاصل نہیں کر سکتی ۔

■

سب سانپ زہریلے نہیں ہوتے اور نہ سب زہریلے کاٹتے ہیں ــــ زہر سے مرنا فطرت کا تقاضا ہے مگر لوگ صرف خوف سے مر جاتے ہیں۔ یہ بزدلی ہے۔

■

تدبر ارادوں کے مکروہ چہرے پر بھی الفاظ کا خوش نما نقاب ڈال دیتا ہے۔

شدید آواز جس طرح کانوں کو بہرا کر دیتی ہے اُسی طرح زیادہ تعیش انسانی سیرت کو مسخ کر دیتا ہے۔

■

انسان بھی کیا عجیب شے ہے ۔ کبھی وہ اپنے دل کی طرف دیکھتا ہے۔ کبھی وہ دوسروں کی جیب کی طرف ، بہرحال خریدار وہی مال خرید سکتا ہے۔ جو بِکنے والا ہو ۔

■

ہر شخص اپنے آپ کو دوسروں سے چھپاتا ہے مگر وہ اپنے آپ سے نہیں چھپ سکتا !

■

عموماً وہ شخص گھاٹے میں رہتا ہے۔ جو دوسروں کے کہے گئے الفاظ میں غوطہ نہیں لگا سکتا ۔

■

میری پریشانیاں ، میری اپنی ہیں ۔ سُکھ دغا دے جاتے ہیں۔ لیکن دُکھ دھوکا نہیں دیتے !

■

مشورے دینے والے اچھے لوگ ہوتے ہیں ۔ چاہے وہ کوئی بے درد ہی کیوں نہ ہو ۔

■

ہمارا کام تو ادب کے شیش محل میں، مزید نقش گری ہے ۔ نقشِ تسخیر کس کے حصّے میں آئے گا۔ یہ کل کی بات ہے۔

■

جہاں تحریر چُپ رہتی ہے۔ وہاں تحریر کلام بھی کرتی ہے۔

■

زندہ تحریروں کا دل بھی ہوتا ہے اور ضمیر بھی!

یادِ عزیزِ مہرباں

عبدالقوی دسنوی

تازہ نقوش (شمارہ ۱۳۸) آیا ہے ، اسی شان کے ساتھ جیسے پہلے آیا کرتا تھا ، اُردو رسائل کا شہزادہ بن کر ، ظاہری حسن میں پُر وقار ، باطنی رنگ میں بے مثال ، سادگی اور پرکاری کا مظہر ہے ، اُردو زبان و ادب کے لئے قابل فخر ، تحقیقی ، تنقیدی مضامین سے سجا ہوا ، زندگی کی کہانیوں سے آراستہ پیراستہ ، ایسی کہانیاں جو زندگی کو رونق بخشتی ہیں ۔ ایسی کہانیاں جو زندگی کو اجاگر کرتی ہیں ۔ ایسی کہانیاں جو زندگی سے باخبر کرتی ہیں ، ایسی کہانیاں جو زندگی کی چبھن سے مضطرب کرتی ہیں ، ایسی کہانیاں جو جینا سکھاتی ہیں ۔ نئی مطبوعات پر خوبصورت اور اچھے تبصرے بھی ہیں جو ان کتابوں کو مطالعہ کرنے کے لئے اکساتے ہیں ، سفر نامے بھی ھیں جو سفر کی لذت سے آشنا کرتے ہیں ، انشائیہ کا لطف بھی ہے ۔ لیکن یہ سب تو نثری قلمرو کی باتیں ہیں ، شعرستان نقوش کی سیر بھی کم کیف آور نہیں کم سرور کا باعث نہیں ۔ پڑھتے جائیے زندگی کا عرفان حاصل کرتے جائیے ، کبھی تڑپیے ، کبھی مچلیے ، کبھی سنجیدگی اختیار کیجئے کبھی ہوش و حواس کھو دیجیئے ، کبھی سرشار ہو جائیے کبھی بے خودی کے بحر بے کنار میں ڈوب جائیے ۔

میں محمد طفیل کے طفیل نقوش کا شیدائی بن گیا ھوں ، اس سے بڑا گہرا تعلق ہو گیا ہے ، میرے دل و دماغ پر اس کا گہرا اثر رہا ہے ۔ پہلے جب بھی اس کا نیا شمارہ آتا تھا ، تو کافی دنوں تک میری نظر کے سامنے رہتا تھا ۔ بار بار اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا تھا ، پھر پڑھنا شروع کرتا تھا اور لطف لے کر پڑھتا تھا ۔ اب بھی یہی حال ہے ۔ اس سے دلچسپی میں کمی پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ بڑھتی جا رہی ہے ۔

طفیل صاحب نے نقوش کو "محمد نقوش" بنا دیا ، ان کے نور چشم اسے جاوید اں بنا رہے ہیں طفیل صاحب کے نقوش اور جاوید کے نقوش میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ انداز فکر بھی دونوں کا ایک جیسا ہے ، مزاج بھی ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے ۔ آج بھی نقوش اٹھائیے تو اس کے ورق ورق پر طفیل مسکراتے ، ہنستے ، سنجیدہ ، فکر مند ، پر عزم ، پر وقار ، بلند کردار پختہ حوصلہ نظر آتے ہیں ۔

اس بار بھی یہی ہوا ، بار بار سامنے آئے اور ماضی کو حال کے آغوش کے حوالے کرتے گئے ۔ بیتی باتیں یاد آئیں اور حال میں سماتی گئیں ۔ یہ تازہ شمارہ جون کے آخری حصہ میں آیا ہے اور اب یہ جولائی کا آخری حصہ ہے ۔ پہلے یہ مہینہ اچھا لگتا تھا ۔ دو ماہ کی طویل تعطیل کے بعد کالج کھلتا تھا تو اپنے ساتھ نیا پن کا تحفہ لاتا تھا ، ایک خاص قسم کی تازگی لاتا تھا ، قہقہے اور چہچہے لاتا تھا حوصلہ پیدا کرتا تھا اور امنگ جگاتا تھا ۔ اب بھی لاتا ہے اور نیا پن کا سرور پیدا کرتا ہے ، سر مست بناتا ہے لیکن ان کیفیات کے باوجود دل مطمئن نظر نہیں آتا ، کبھی بے کیفی کا احساس جاگ اٹھتا ہے ۔ جولائی کی آمد کے ساتھ چار سال قبل کا جولائی بھی یاد آتا ہے وہ جولائی جس نے ہم سے "عزیز مہربان" چھین لیا ہے ۔ ایسی

صورت جب بھی پیدا ہوتی ہے تو میں نقوش کے پرانے شمارے یا خاص نمبر نکال کر دیکھتا ہوں، اور کھو جاتا ہوں، طفیل صاحب کی تصانیف کا مطالعہ کرتا ہوں ۔ آج بھی وہی عالم ہے ۔ نقوش کا محمد طفیل نمبر سامنے ہے جلد اول کی اوراق گردانی کر رہا ہوں مختلف مقالہ نگاروں کی تحریریں مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور مجھے محمد طفیل کی سلطنت میں داخل کر دیتی ہیں ۔ ورق گردانی میں تیزی آجاتی ہے ۔ دل کہتا ہے چلو محمد طفیل کے خطوط پڑھ لئے جائیں ۔ طفیل نمبر نے ان کے خطوط کا اچھا ذخیرہ محفوظ کر دیا ہے ۔

ادیبوں کے خطوط پڑھنے میں مجھے خاص لطف آتا ہے ۔ ان میں بڑی اپنائیت محسوس کرتا ہوں ۔ اُن کی باتیں سنتا ہوں ، اُن کے افکار سے آگاہ ہوتا ہوں ، اُن کے مسائل کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ، ان کی بے خبری سے باخبر ہوتا ہوں ، ان کی آرزوئیں سامنے آتی ہیں ، اُن کے ارادوں سے واقفیت ہوتی ہیں ، اُن کا خلوص اثر دکھاتا ہے ۔ اُن کی محبتیں مسکراتی ہیں ، اُن کی نفرتیں بے نقاب ہوتی ہیں ، اُن کی سچائیاں سامنے آتی ہیں ۔ اچھا خط آئینہ ہوتا ہے وہ مکتوب نگار کی اصلی صورت دکھاتا ہے ۔ اصلیت سے آگاہ کرتا ہے وہ سرگوشی میں بہت کچھ کہلواتا ہے ۔ راز کو راز نہیں رہنے دیتا ۔ سچ کو جھوٹ بننے نہیں دیتا ۔ وہ سچائی سے بے خبر نہیں رکھتا ۔

طفیل صاحب کے یہ خطوط سچے اور اچھے ہیں ۔ جو ان کے افکار و خیالات سے ، ان کے جذبات و احساسات سے ، ان کی پسند ناپسند سے ان کی محبت اور نفرت سے ، ان کی اچھائی اور برائی سے ، ان کے غم اور خوشی سے ، ان کی کامیابی اور ناکامی سے آگاہ کرتے ہیں ، ان کا پتا بتاتے ہیں ۔

میں طفیل صاحب کے خطوط پڑھنے لگتا ہوں ۔ یہ خطوط ۱۶۵ اشخاص کے نام ہیں جو ان کے دوست ہیں ، مخلص ہیں ، قدرداں ہیں ، محبت کرنے والے ہیں یا وہ ہیں جن کو خود طفیل صاحب عزیز رکھتے تھے ۔ یا جن سے تعلقات رکھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے ۔ ان میں ایسے بھی ہیں جنکا تعلق نقوش نے پیدا کیا ہے اور وہ "طفیلی" بن کر بارگاہ "طفیل" میں داخل ہوئے ہیں ۔ کچھ مخاطب خواتین بھی ہیں جن میں ان کی شریک حیات بھی ھیں ۔

یہ سارے خطوط بڑے دلچسپ اور پر مغز ہیں ۔ دلچسپ بنانے میں ان کی طبیعت کی شوخی نے رہنمائی کی ہے ۔ پر مغز بنانے میں ان کے ذہن کی رسائی اور مطالعہ کی گہرائی نے اپنا کام کیا ہے ۔ اور اثر و تاثیر پیدا کرنے میں ان کے جذبے کی سچائی نے اپنا فرض ادا کیا ہے ۔ ورنہ ان کی نثر بہت سادہ اور عام فہم رہی ہے یہی سادگی ان کے "طلوع" کی جان ہے اور یہی سادگی ان کے خطوط کی پہچان ہے ۔ الفاظ کے استعمال میں انھوں نے ہمیشہ بخل سے کام لیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے اختصار میں پھیلاؤ ہے ان کی سادگی میں ساحری ہے ۔ ان کی تحریروں کی یہ خاص خوبی ہے کہ پڑھتے جائیے اور لطف اندوز ہوتے جائیے ۔ مسلسل پڑھنے کے باوجود ، دلچسپی ساتھ نہیں چھوڑتی ، بے لطفی سر نہیں اٹھاتی ۔

یہ خطوط ۱۶ جنوری ۱۹۵۹ء سے ۲۴ جون ۱۹۸۶ تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ یہ زمانہ ۲۷ سال سوا چار ماہ پر محیط ہے اور عمر

کے پینتیسویں (۳۵) سال سے شروع ہوکر وفات سے دس گیارہ دن قبل تک پھیلا ہوا ہے ۔

اردو کے منفرد خط نگاروں میں مرزا غالب پہلے شخص ہیں جن کے خطوط کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہو کر مقبول ہوا اور شہرت عام اور بقائے دوام کی دولت سے مالامال ہوا ۔ انھوں نے اُردو میں خط نگاری کو فن کا درجہ عطا کیا اور ادب کا مرتبہ دلایا ۔ ان کے بعد بہت سے خطوط کے مجموعے چھپ کر بازار میں آئے اور پسند کئے گئے ۔ اس طرح کئی مکتوب نگاروں کے نام مشہور ہوئے ۔ سرسید ، شبلی ، حالی ، مہدی ، اقبال ، سید سلیمان ، پطرس ، محمد علی ردولوی ، فراق ، نیاز ، صفیہ اختر وغیرہ انھیں میں سے ہیں ۔ لیکن ان ناموں میں کوئی "محمد طفیل" نہیں ہے ۔ ہونا بھی نہیں چاہئیے تھا ۔ محمد طفیل کے مطبوعہ خطوط کِتنوں تک پہنچے ہیں؟ ابتک تو ان کے خطوط کا لطف؛ وہی لوگ اٹھا سکے ہیں جن کو ان کے مکتوب الیہ ہونے کا شرف حاصل ہے یا جن کو مکتوب الیہ سے قربت یا کسی اور وجہ سے خطوط طفیل پڑھنے کا موقع مل گیا ہے ۔ دوسرے ان کے خطوط کی لذت سے کس طرح آگاہ ہوسکتے ہیں اب نقوش کے طفیل نمبر نے اس کا موقع ایک وسیع حلقہ کو فراہم کر دیا ہے اب "خط نگار محمد طفیل" کی شخصیت اور اُن کی خط نگاری کا فن ابھر کر سامنے آئے گا اور ان کی اس میدان میں قدر و قیمت سے آگاہ کرایا جائیگا ۔ اور طفیل صاحب کو اردو خط نگاروں میں ایک مخصوص مقام دلائے گا ۔ اگرچہ یہ خطوط وہ تمام نہیں ہیں جو انھوں نے مختلف ضرورتوں سے مختلف احباب اور عزیز و اقارب کو لکھے ہیں بلکہ ان کے صرف وہ خطوط ہیں جو کسی وجہ سے محفوظ کر لئے گئے ہیں ۔ ان میں بیشتر خطوط نقوش کے مدیر محمد طفیل کے ہیں ۔ اس لئے ان خطوط میں وہ مدیرانہ شان سے سامنے آئے ہیں ۔ ایک کامیاب اور محترم مدیر کا روپ اختیار کر گئے ہیں ۔ ان خطوط کے مطالعہ سے نقوش کے سلسلے میں ان کے عزائم سے آگاہی ہوتی ہے ، ان کے منصوبوں سے واقفیت ہوتی ہے ۔ مقالے لکھوانے اور حاصل کرنے کے طریقوں کا علم ہوتا ہے ۔ نقوش کے سلسلے میں ان کی پریشانیوں اور الجھنوں کا اندازہ ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ جب بھی وہ مدیر کی میز سے اٹھ کر دوستوں اور عزیزوں کی میز پر آبیٹھتے ہیں تو وہ کچھ اور بن جاتے ہیں ، کبھی محبی ، کبھی محترمی ، کبھی عزیزی اور کبھی برادر عزیز سے مخاطب کرتے ہیں اور ایک عجیب اپنائیت کا ماحول پیدا کر دیتے ہیں ۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں ۔ مسکراتے ہیں ہنستے ہنساتے ہیں ۔ کبھی کھری کھری بھی سناتے ہیں ۔ لیکن تلخی آنے نہیں دیتے ۔ جھنجھلاہٹ پیدا ہونے نہیں دیتے ۔ پھر زبان اس قدر پاکیزہ ، رواں دواں اور سلیس استعمال کرتے ہیں کہ عام طور سے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ پنجاب سے تعلق رکھتے ھیں حالانکہ وہ اکثر روانی میں پنجاب کا حق ادا کر دیتے ہیں ۔

ان خطوط کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ مختصر ہیں ۔ اس کی وجہ ان کی عادت کہی جاسکتی ہے یا مصروفیت کی مجبوری ہو سکتی ہے لیکن اختصار کے باوجود وہ سب کچھ کہہ دیتے ہیں جو وہ کہنا چاہتے ہیں اس لئے کہ وہ کام کی بات زیادہ سلیقہ سے کہتے ہیں ۔ بے ضرورت طوالت کو پسند نہیں کرتے اور اس پر لطف کی بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھتے ہیں ، دل کی گہرائیوں سے لکھتے ہیں ، اس لئے یہ خطوط اپنا ایک خاص اثر چھوڑتے ہیں ، چند خطوط کے اقتباسات ملاحظہ کیجئیے ۔ مدیر نقوش کی

حیثیت سے وہ کیا کیا انداز اختیار کرتے ہیں اور کس کس طرح اور بہانے سے مضمون کا تقاضہ یا فرمایش کرتے ہیں ۔ قدرت اللہ شہاب کو لکھتے ہیں :

"۔۔۔۔۔ آج کل موسم بھی اچھا ہے آپ کا قلم بھی رواں ہے پھر افسانہ کیوں نہیں ملا"

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۷۹۱)

مولانا ضیا احمد بدایونی کے نام تحریر کردہ خط کا یہ اقتباس اسی سلسلے میں نہایت دلچسپ ہے :

"آپ نے مجھے جس محبت سے یاد کیا تھا اس کا تقاضہ تھا کہ کچھ اپنا بھی حق جتا سکوں ، سو میں نے وہ جتایا ۔

اگر کبھی مجھ سے اللہ میاں نے بھی اتنی اپنایت ظاہر کی تو ان سے بھی یہی درخواست کروں گا ۔ میرے پروردگار ایک مضمون" ۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۔ ۷۹۸)

مسعود مفتی سے معذرت کرتے ہوئے مدیرانہ فرض اس طرح انجام دیتے ہیں :

"واقعی آپ کا ایک افسانہ ایسا ہے جو میں چھاپ نہ سکا ۔ اس میں بھی میری بزدلی کو دخل کم تھا ، عقل کو زیادہ ۔ چلو یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ اُسے کسی وقت چھاپ دوں گا ۔ تھوڑا سا وقت کا انتظار ہے ۔ وقت کا انتظار تو رسول ؐ نے بھی کیا تھا" ۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۰۷)

خود میرے خط کا جواب دیتے ہوئے تاخیر سے خط لکھنے کی وجہ اپنی بے پناہ مصروفیت اور پریشانی اس طرح بتاتے ہیں کہ گلے شکوے دور ہو جاتے ہیں :

"اصل میں بات یہ ہے کہ پرچے کے آخری مراحل میں جب بھی کوئی خط آیا ، یا مضمون ، اس کا جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے رسید بھجوانا مسئلہ بن جاتا ہے حتٰی کہ ان دنوں کسی نہ کسی وقت کا کھانا بھی گول کرنا پڑ جاتا ہے ۔

اوروں کے لئے رسالہ چھاپنا آسان ہو گا ، میرے لئے تو سزا بن جاتا ہے ۔ عشق بھی کیا تو کس سے ؟ جو نہ اپنی کہہ سکے نہ میری سن سکے ۔ بہر حال میں اپنے آپ کو فریب دیئے چلا جا رہا ہوں ، کہ میں قابل ذکر کام کر رہا ہوں ۔ جس دن کام کی اصلیت مجھ پر واضح کر دی گئی وہ دن سزایابی کے بعد میری رہائی کا پہلا دن ہو گا" ۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۰۹)

مالک رام صاحب کے خط کے جواب میں اعتراف کرتے ہیں :

"اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی لکھا کہ "میں صرف ایڈیٹر ہوں"
یہ بات بھی غلط نہیں کہ مجھے اپنے اس کام سے عشق ہے ۔ اس عشق نے دوست چھڑائے اور ایک دن وہ بھی آئے گا کہ بیوی اور بچے بھی ساتھ چھوڑ دینگے ۔ مگر شاید میں نادم اس وقت بھی نہ ہوں گا ۔ میں تو سب سے کہتا ہوں کہ میری کوتاہیوں اور نالائقیوں سمیت مجھ سے محبت کر سکو تو کرو ۔ کچھ کو میری یہ گزارش قبول ہے کچھ کو نہیں ۔ جنھیں قبول ہے ان کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں ، جنھیں منظور نہیں ان سے نادم تو ہوں مگر شکوہ نہیں ۔
آپ نے لکھا "میں دوستی کے قابل نہیں" ۔ میں پریشان ہوا ۔ آپ نے لکھا "میں صرف ایڈیٹر ہوں" ۔ حیران ہوا ۔ تیسرا فقرہ آپ نے یہ لکھا "موجودہ صورت میں مجھے نقوش کی ضرورت نہیں" ۔ یہ ظلم مجھ پر نہ کرتے ، تو باقی سب ٹھیک تھا ، آپ بے شک مجھے بھلا دیں مگر میرے محبوب کے بارے میں کچھ نہ کہیں ۔ اس کی خاطر تو میں آپ کی نظروں سے گرا ہوں ۔ خدا کے لئے اس کے بارے میں کچھ نہ کہیں ۔ میں مر جاؤں گا" ۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۲۵)

راجہ مہدی علی خاں کو آپ بیتی نمبر کے سلسلے میں اپنی مصروفیت کا حال بیان کرتے ہیں اور جس کی وجہ سے اپنی کتابیں نہ بھیجنے پر اپنے کو قصوروار ٹھہراتے ہیں اور معافی چاہتے ہیں :

"آپ نے مجھے کتابوں کے لئے لکھا ۔ میں نے دانستہ حکم عدولی نہیں کی ۔ غالباً یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں آپ بیتی نمبر میں غرق تھا ۔ یقین جانیے اکیلی جان پر یہ بوجھ ناقابل برداشت تھا ۔ تن من کا کچھ ہوش نہ تھا اس عرصہ میں ، میں نے اپنے متعدد فرائض سے روگردانی کی ہوگی ۔ آپ کا بھی قصوروار ہوں معاف کر دیجئے ۔"

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۲۶)

شاہد دہلوی کو آپ بیتی نمبر کے لئے اس طرح مخاطب کرتے ہیں :

آپ بیتی نمبر کے لئے مضمون کو تہ ہی سے بھیج دیجئے گا ۔ خوب مزے مزے میں لکھئے گا ۔ موضوع جو لذیذ ہوا ۔ اس موضوع کو سبھی پسند کرتے ہیں ۔ کچھ ڈر رہے ہیں ۔ اس لئے کہ مہاتما گاندھی بننا آسان نہیں" ۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۳۶)

طفیل صاحب رسالہ نکالنا مشکل کام سمجھتے تھے ۔ اس سلسلے میں ان کی کچھ اس طرح سے رائے تھی:

پرچہ کیسا چل رہا ہے ؟ کچھ رینگا یا نہیں ؟ اس عشق میں بڑے بڑے امتحانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اُمید کہ بے خطر گزریں گے ۔ مگر بھائی پی ۔ ایچ ۔ ڈی کر لینا آسان ہے۔ پرچے کی آبرو بنانا اور پھر اسے قائم رکھنا زیادہ مشکل ہے ۔ خدا اسے بخشے جس نے پہلے پہل رسالہ نکالا تھا ۔ ہم ادب کو زندہ رکھنے کے لئے رسالہ نکالتے ہیں ۔ مگر ادب رسالوں کو زندہ نہیں رکھ سکتا ہے ۔ عجیب ٹریجیڈی ہے دیکھ لیجئے ۔ آپ کے باوا آدم منشی سجاد حسین کیا کیا نہ ایڑیاں رگڑ کر مرے ۔ یوں سوچیں تو آج ہی سارے ایڈیٹر خود کشی کر لیں ۔ مگر ہم لوگوں میں غیرت کا کچھ زیادہ ہی فقدان ہے ۔ واہ وا بھی بڑی بری چیز ہے ۔ جو اس کے چکر میں پڑا مارا گیا" ۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۴۰)

یہ ان کی بلند کرداری اور جرأت مندی تھی کہ وہ تخلیق کاروں سے ان کی تخلیق کے متعلق اپنی پسند اور ناپسند کا بھی اظہار نہایت بے باکی کے ساتھ کرتے تھے کرتار سنگھ دگل کو ایک خاص انداز سے ان کے افسانہ سے متعلق رائے دیتے ہیں :

"آپ کا افسانہ ملا ۔ اسی وقت پڑھا ۔ خوشی کے ساتھ ۔ افسانہ اپنی جگہ بڑا پیارا ہے ۔ مگر موضوع ایسا ہے کہ مجھے اس کے چھاپنے میں ہچکچاہٹ ہے ۔ یہاں بھی ایسے لوگ ہیں جنہیں صرف عجیب کہا جاسکتا ہے ۔ میں نے اپنی بری عادت کے مطابق کہیں کہیں افسانہ میں اپنا قلم لگا دیا ہے ۔ کوئی ترمیم پسند آئے تو رکھ لیجئے ۔ ورنہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہی مستند ہے ۔ یہ افسانہ اس شرط پر واپس ارسال ہے کہ آپ مجھے جلدی سے ایک اور افسانہ بھیجیں گے ۔"

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۴۴)

واجدہ تبسم سے افسانہ کے تقاضہ کا انداز ملاحظہ کیجئے :

"ادھر حیدر آباد میں بہت سے افسانے بکھرے پڑے ہیں ان میں سے کوئی بڑا ہی خوبصورت سا افسانہ چن کر مجھے جلد بھیج دیں۔"

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۵۵)

پروفیسر آل احمد سرور سے مضمون کی فرمائش میں اس طرح کا انداز اختیار کرتے ہیں :

"نہ جانے آپ کی مصروفیت کا عالم کیا ہے؟ میری یہ خواہش نہیں ہے کہ کہوں کہ آپ کسی نہ کسی طرح اتنے بیکار ہو جائیں کہ بیٹھے میرے ہی لئے مضمون لکھتے رہیں ۔ مگر یہ بھی کیا غضب ہے کہ آپ میرے لئے کچھ بھی نہ لکھیں آپ نے ایک نہیں بیسیوں وعدے کئے کہ مضمون لکھوں گا ۔ مضمون لکھ دوں گا ۔ آخری وعدہ طنز و مزاح پر لکھنے کا تھا ۔ وہ غریب بھی آپ کی سرپرستی کے

بغیر عالم وجود میں آگیا ۔ ہائے کیا کیا رونا روؤں ۔ یقین جانئیے آپ کی بے مہریوں سے دل پھٹا جا رہا ہے اس لئے قلم کو روکتا ہوں ۔ مبادا یہ گستاخی پہ اتر آئے ۔ گستاخی بھی اُن کی شان میں جن کا وجود اتنی بے التفاتیوں کے باوجود مجھے بڑا عزیز ہے بڑا ہی عزیز۔"

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۵۹)

اختر الایمان سے اُن کی بد خطی کی شکایت کر بیٹھتے ہیں لیکن شکایت کا ڈھنگ تو دیکھئے :

"آپ کا جب بھی کوئی خط یا نظم ملتی ہے تو یوں جان پڑتا ہے جیسے اسے آپ نے دو سو صفحے فی گھنٹہ کی رفتار سے لکھا ہو ۔ بعض اوقات الفاظ روٹھ جاتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو پڑھوانے سے انکار کر دیتے ہیں ۔ ہو سکے تو اپنی رفتار میں کمی کر دیں تاکہ میں بھی آپ کے ذہن کا ساتھ لفظ بہ لفظ دے سکوں"

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۶۲)

روش صدیقی کو باتوں باتوں میں لکھتے ہیں :

"اگر غزل سے توبہ نہ کی ہو تو ایک غزل مجھے بھی بھیج دیجئے گا"۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۶۳)

مولانا ابوالخیر مودودی سے مضمون کا تقاضہ یوں کرتے ہیں :

"میرا خیال ہے لوگوں کو اب کے پھر حیرت میں ڈالا جائے اور آپ کا ایک آدھ مضمون چھاپا جائے ۔ کیا خیال ہے؟"

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۶۴)

مجید امجد سے نظم کے لئے فرمائش کا انداز بھی خوب ہے :

"ہمارے پرچے کو کچھ پڑھے لکھے لوگ بھی پڑھتے ہیں ان کا مطالبہ ہے کہ مجید امجد کی نظم تازہ پرچے میں ضرور چھپے اب سوال یہ ہے کہ آپ بھیجیں تو لوگ بھی پڑھیں"

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۷۱)

مولانا امتیاز علی عرشی سے بھی مضمون کا تقاضہ کرتے ہیں لیکن ایک اور انوکھا طریقہ اختیار کرتے ہیں :

"آپ کتابوں کے جھرمٹ میں بیٹھے اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں ۔ کبھی ایک کتاب کو نکالا ، اُسی سے دوستی نبھائی ، کبھی دوسری کتاب سے اپنی یاری بڑھائی ۔ آپ کا یہ سلسلہ دن رات کا ہے مگر اُن لوگوں کی طرف بھی دیکھئے جو کتاب نہیں انسان ہیں ۔"

میرا خیال ہے میں ایسی باتیں نہ کروں ۔ اس لئے کہ ڈر یہ ہے کہ آپ کہیں مجھ سے اور "راضی" نہ ہو

جائیں ورنہ مضمون حاصل کرتے کرتے خطوں سے بھی جائیں ۔ ان سے اور کچھ فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے یہ تو ہو گا کہ میرے مرنے کے بعد مولوی امتیاز علی عرشی کے بھی خط گھر سے نکلیں گے جس میں لکھا ہو گا "ایسا مضمون آپ کو بھی بھیجا جاسکتا ہے"۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۸۱)

راجندر سنگھ بیدی سے افسانہ حاصل کرنے کے لئے جس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ خاصی دلچسپ ہیں :

"..... آپ کے افسانہ کی ادھر تو بڑی دھوم رہی ہے اُدھر بھی ہو گی۔ سب خوش ہو گئے کہ اچھا! ابھی بیدی جی کو لکھنا آتا ہے ، بھولے نہیں! یہ سوچنا بھی ٹھیک تھا ۔ اتنے عرصے میں تو قلم کو زنگ لگ ہی جاتا ہے ۔ یوں کسی نے سوچا تو برا کیا ۔

آپ سیر کو آئے ہوں گے ، سفر خوب رہا ہو گا ۔ نئی دنیا دیکھی ہو گی ۔ نئی معلومات ملی ہوں گی ۔ اس سے فن کے نکھار میں اور مدد ملے گی جو کچھ پہلے پڑھا جو کچھ اب دیکھا اس کا اظہار کسی افسانہ میں آیا ہو تو وہ مجھے بھی دکھائیں تاکہ میں اوروں کو دکھا سکوں"۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۸۸)

ڈاکٹر یوسف حسن خاں صاحب سے شرارت کرنے سے باز نہیں آتے ، نقوش کے لئے مقالہ لکھنے کی فرمائش کرتے ہوئے کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں :

"قبلہ ادب کی دنیا کی بھی خبر لیجئے ۔ یونیورسٹی کا منصب زندگی کے ساتھ ہے اور ادب سے وابستگی کا مطلب دائمی زندگی ۔ جب قدرت نے آپ کو اتنی صلاحیتیں دی ہیں کہ آپ ہمیشہ زندہ رہ سکیں تو پھر کیوں ادھر توجہ نہیں کرتے؟

میں آپ کی خدمت میں کبھی اتنا بے تکلف نہیں ہوا تھا مگر اب تو آپ کی خاموشی نے مجبور کر دیا کہ شرارت سے بھی کام لوں۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۹۰)

ان خطوط میں نقوش کی باتوں اور اس کے لئے رشحات قلم کے تقاضوں کے علاوہ بہت کچھ اور ملتا ہے ۔ ان میں طفیل صاحب کا خلوص ہے ، سچائی ہے ، لگن ہے ، شوخی ہے ، نکتہ کی باتیں ہیں ، تجربے ہیں ، خط کی فضا ہے طنز کی چبھن ہے مزاح کی مسکراہٹ ہے ، اپنائیت ہے ، ہمدردی ہے ، شرافت ہے ، سادگی ہے اور بہت سی وہ ساری چیزیں ملتی ہیں جن کے مجموعہ نے محمد طفیل کی صورت اختیار کر لی ہے ۔ ان کے خطوط میں اس طرح کی فکر انگیز باتیں بکھری پڑی ہیں جن کو پڑھ کر بہتر زندگی گزارنے کا سلیقہ اور طریقہ آتا ہے ۔ وہ اپنے تجربہ کی روشنی میں لکھتے ہیں :

"ہم اُمید پہ ہی جینے کے عادی ہو گئے ہیں ۔ اسی لئے مارے گئے ۔ اگر ہم میں کچھ عمل کا بھی چلن ہوتا تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا ۔"

(ص ۷۹۲)

"خلوص کا رشتہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں نہ کوئی جج ہوتا ہے اور نہ کوئی مدیر ، بلکہ دو انسانوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہوتا ہے جس پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں" ۔

(ص ۷۹۳)

"سائنس جتنی ترقی کر رہی ہے ، انسانیت اتنی ہی زیادہ گراہ رہی ہے انسان جتنا متمدن بنتا جارہا ہے اخلاقی اعتبار سے اتنا ہی گھٹیا ہوتا جارہا ہے"

(ص ۷۹۴)

"ساری دنیا اتنی خود غرض ہے کہ وہ صرف اپنے مفاد کی خاطر مری جارہی ہے کسی کو اتنا خیال نہیں کہ دوسرے کے لئے بھی سوچا جائے ۔ ذرا سا بھی سوچا جائے ۔ جب بھی کسی کو قریب سے دیکھا چھوٹا آدمی نکلا"

(ص ۸۳۱)

"میرے نزدیک بھی انسانیت ہی انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے ۔ مگر اس دور میں ہے وہی عنقا ۔ ماتم میں بھی کرتا ہوں ۔ ماتم آپ بھی کرتے ہیں"

(ص ۸۹۷)

ان خطوط میں یوں تو ہر جملہ ہر لفظ محمد طفیل کا تعارف کراتا ہے اور ان کی شخصیت میں رنگ بھرتا نظر آتا ہے لیکن بہت سے جملے اور ٹکڑے ایسے ہیں جن میں محمد طفیل نے واضح طور سے اپنی باتیں کہی ہیں جن کی مدد سے نہ صرف ان کی سوانح حیات کو ترتیب دینے میں اور ان کے رجحانات اور میلانات کو جانتے میں آسانی ہوتی ہے بلکہ وہ جن ناہمواریوں سے گزر رہے ہیں اور جسطرح انہیں ہموار بنانے کی کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں اور منزل پہ منزل اپنے پیچھے چھوڑتے گئے ہیں وہ سب منزلیں واضح طور سے سمجھ میں آتی ہیں اور ساتھ ہی اُن کے دل کی کیفیات اور اضطراب سے اچھی طرح باخبری ہوتی ہے ۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے :

"ادب کی خدمت کے بڑے ارمان تھے ۔ جو ان حالات میں پورے ہوتے نظر نہیں آتے کاغذ عنقا ہے ۔ قاری بھٹک رہا ہے ۔ پہلے شرفا کا اوڑھنا بچھاؤنا ادب تھا ۔ اب ادب نہیں رہا ۔ کلب ، ہوٹل اور عورت ہو گیا ۔ ایسے میں مَیں کیا کر سکوں گا ، ایسے میں کوئی کیا کر سکے گا ۔

کبھی جو باتیں ہمارے لئے وجہ سکون تھیں ۔ انھیں اب دماغ کا خلل کہا جارہا ہے ۔ کون دیوانہ ہے کون فرزانہ ، کسی بات کا پتا نہیں چل رہا جب کوئی قوم گومگو کی حالت میں ہوتی ہے تو وہ وقت اس کے لئے وقتِ دعا ہوتا ہے ۔

ہمارا مذہب ہمیں مایوسی سے روکتا ہے اس لئے جینے کی آرزو بھی ہے ورنہ اس قوم کے لچھن" ۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۷۹۳)

"میں آپ کے پاس جب بھی آیا ، اپنا بہت وقت حرج کر کے آیا ۔ اس لئے کہ میرے ہاں کارندے نہیں جو میرا کام کر دیں ۔ مجھے تو ہر کام خود ہی کرنا ہوتا ہے ۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بڑے سے بڑا کام بھی ۔ اس لئے میں بیک وقت بہت چھوٹا اور بہت بڑا آدمی ہوں مگر مجھے ناز اس بات پر ہے کہ میں چھوٹا آدمی ہوں — اور یہ بھی کہ — بڑوں پہ مجھے بہت ترس آتا ہے ۔"

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۷۹۹)

"آپ کابل گئیں تو اپنے بھائی کے لئے کیا لائیں ؟ کیا آپ نے لفظی بھائی بنایا ہے یا ماں جایا ایسا : آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ میری سگی بہن کوئی نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی خاتون مجھے بھائی کہہ کر پکارتی ہے تو مجھے قدرت سے شکایت کم ہو جاتی ہے "۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۰۰)

"آپ کے گرامی نامہ میں جو خلوص ہے اس کی بنا پر ایک بات آپ سے کہنے کو جی چاہتا ہے ۔ وہ یہ کہ کبھی کبھی آپ کے پرچے میں ندیم صاحب کے بارے میں چُبھتے ہوئے فقرے چھپتے ہیں ۔ اس سلسلے کو ختم ہونا چاہئیے اس لئے کہ ادبی کام کرنے والوں کو ایک دوسرے کی قوت بننا چاہئیے ۔ راہ کا روڑا نہیں بننا چاہئیے ۔ سوچا آپ کے خط کے جواب میں اس امر کی طرف اشارہ کر کے نیکی کما لوں ۔ پذیرائی کی صورت میں ممنون بھی ہوں گا"۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۰۳)

"آپ جیسا چاہیں گے ۔ مجھے ویسا ہی پائیں گے ۔ دشمن تو بے شک اچھا ثابت نہیں ہو سکتا ۔ مگر دوست اتنا برا نہیں ہوں"

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۰۵)

"جناب جب میری تحریر پسند ہے تو چند صفحے میری طرز نگارش پر لکھ بھی دیجئے میں نے شرفا سے سنا ہے کہ خوشیاں بانٹنے میں بخل سے کام نہیں لینا چاہئیے باقی آپ جانیں !

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۱۰)

"خطوط کے جواب برابر بھجواتا رہتا ہوں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو خط رجسٹری سے نہ بھیجا ۔ وہی آپ کو نہ ملا ۔ ایک دفعہ ڈاکخانے کے ایک کارندے نے مجھ سے کہا کہ آپ نے فلاں شخص کو اپنے خط میں یہ لکھا اور فلاں کو یہ تو میں بڑا حیران ہوا تھا ۔ پوچھا آپ کو کیسے معلوم ؟ اس کا جواب یہ تھا کہ "آپ کے خطوط مجھے اچھے لگتے ہیں ۔ اس لئے کھول کر پڑھتا رہتا ہوں"۔ اب بتائیے ؟

چلو آپ کے نام یا آپ ایسے کسی اور دوست کے نام اگر کوئی میرے خطوط پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں مگر میں ہر وقت درود شریف تو نہیں پڑھتا رہتا ۔ کسی وقت کسی کو یہ بھی لکھ سکتا ہوں کہ اس دن جو آپ نے کپڑے پہنے تھے وہ مجھے اچھے لگے"۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۱۰)

"اپنے بارے میں لکھے ہوئے مضمون کے بارے میں کیا رائے دوں ؟ تعریف خدا کو بھی پسند ہے ۔ تعریف مجھے بھی پسند ہے ۔ یوں تو سارے قرآن میں خدا کی وحدانیت اور ثنا کا ذکر ہے لیکن ایک سورۃ میں (سورۃ رحمٰن) میں غالباً ۳۱ بار "تم خدا کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ کہا گیا ہے ۔ چونکہ اس دنیا میں انسان خدا کا نائب ہے اس لئے میں بھی اپنی نحیف آواز میں کہہ سکتا تھا کہ "تم میری کس کس خوبی کو جھٹلاؤ گی ۔ "مگر میں یہ کچھ نہیں کہوں گا ۔ اس لئے کہ میں جتنا نوازا گیا ہوں اس کا حقدار نہ تھا"۔ (محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۳۵)

"میں لکھنے میں بڑی محنت کرتا ہوں شعروں کی طرح نثر کو احتیاط سے لکھتا ہوں ، وہ بھی سہل ممتنع میں ۔ جسے احباب ایک سانس میں پڑھ جاتے ہیں ۔ میں اسے لاکھوں کروڑوں سانسوں میں لکھتا ہوں ۔ وہ بھی قلمی سانس روک روک کر تب جا کر ۔ اس میں کچھ جان پڑتی ہے ۔ تب سائے میں بھی حجم اور وزن نظر آتا ہے"۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۳۷)

"میری زندگی کا پہلا دن (یا اہم دن) وہ تھا ۔ جب میں نے اپنے نہایت ہی پیارے دوست احمد ندیم قاسمی سے ایک ادبی معاملے میں اختلاف کیا تھا دن اور تاریخ یاد نہیں یہ واقعہ ۱۹۴۹ء کا ہے ۔ اُن دنوں ترقی پسند ادب کا طوطی بول رہا تھا ۔ "نقوش" کی ادبی پالیسی ڈانواں ڈول ہو رہی تھی امن نمبر قسم کے شمارے نکل رہے تھے ۔

ندیم بھائی تھے "ترقی پسند" میں تھا "قدامت پسند"! ہماری حد درجہ دلی قربت بھی ہمارے اس ذہنی فاصلے کو کم نہ کر سکی ۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اس جرم کی پاداش میں اس گھڑی سے لے کر

اس ساعت تک اپنی سوچوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں " ۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۴۶ ۔ ۸۴۷)

"میرا تو خیال ہے میرے مرنے کے بعد لوگ مجھے یاد کرینگے ۔ شاید یہ بھی میری خوش فہمی ہو ۔ ویسے میں نے اس دنیا میں آ کر بہت کچھ پا لیا ہے ۔ احباب کی محبت اور خلوص ۔ میرے لئے یہی بہت ہے ۔ باقی دنیا جائے بھاڑ میں ۔ مجھے زمانے سے بڑی شکائتیں ہیں ۔ مگر تذکرہ فضول ہے ۔ میں کام کر کر کے مر رہا ہوں تو مروں ۔ دنیا کو اس سے کیا"

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۷۶)

"بے شک نہ سوچو مگر سنو ضرور! کوئی کسی کو زندہ نہیں رکھ سکتا کوئی کسی کی پبلیسٹی نہیں کر سکتا ۔ کام زندہ رہتے ہیں ۔ تحریریں پبلیسٹی کرتی ہیں باقی آپ جانیں اپنا کام تو صرف ادبی مشقت ہے اور یہ پیشہ عرصہ ۳۶ برس سے اختیار کر رکھا ہے ۔ خوش ہوں ناخوش نہیں"۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۹۷)

مندرجہ بالا اقتباسات ان کے مطبوعہ خطوط میں سے کچھ ہی پیش کئے گئے ہیں ۔ اس طرح کے جملے اور عبارتیں ان میں ابھی کافی ملیں گے جن سے محمد طفیل کی زندگی اور شخصیت کے بہت سے ڈھکے چھپے گوشے اور انوکھے زاویے سامنے آتے ہیں اِن سے آگاہی کے بعد محمد طفیل اور زیادہ خوبیوں والے اور زیادہ محترم مدیر ، اور زیادہ قابل قدر اردو کے خدمت گزار اور زیادہ اچھے انسان بن کر ابھرتے ہیں اور قارئین کو اپنا طرفدار بناتے ہیں ۔ لیکن ان خطوط میں کچھ اس طرح کے خوبصورت جملے ، اچھے خیالات ، انوکھے تیور اور فکر انگیز باتیں بھی ملتی ہیں جن کے مطالعہ کے بعد قاری کچھ اور کیفیت میں اپنے آپ کو محصور پاتا ہے اور سرشار نظر آتا ہے کچھ حصے مزید پیش کئے جاتے ہیں :

"ہمارا مذہب ہمیں مایوسی سے روکتا ہے ۔ اسی لئے جینے کی آرزو بھی ہے ورنہ اس قوم کے لچھن —

ناحق میں نے آپ کو آزردہ کیا ۔ ایک کپ چائے منگوائیے اور غم کو غلط کیجئے" ۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۹۴۷)

"آپ کا عنایت فرمایا ہوا "مکتوبات" کا کوئی نسخہ مجھے نہیں ملا آخر محکمہ ڈاک والوں نے بھی تو عالم فاضل بننا ہے وہ یوں نہ کریں تو کیا کریں"۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۹۸۷)

"رونا صرف اتنا ہے کہ اس دور میں ادیب کے ضمیر کا سودا بہت سستا ہو گیا ہے اور کوئی دکھ نہیں!"

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۰۸)

"میں لاہور آگیا ۔ آپ کا اخلاق بھی میرے ساتھ چلا آیا ۔ اب اسے عمر بھر عزیز رکھنا ہو گا ۔ آپ نے میری ذمہ داریوں میں ایک ذمہ داری اور بڑھا دی ۔ "اس کے باوجود" یہ کہوں گا خدا آپ کو خوش رکھے" ۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۴۱)

"زندگی سے زیادہ پیار بھی ذہنی بیماری کی ایک علامت ہے ۔ آئی ہے تو آجائے بسم اللہ ، ڈر کاہے کا ۔ والدہ نے جس طرح موت کا استقبال کیا تھا اس نے مجھے بہادر بنادیا ہے ۔ انشاء اللہ میں بھی موت کا اس طرح استقبال کروں گا جس طرح کوئی اپنے پیارے کا کرتا ہے" ۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۴۲)

"آپ کا ادب اس لئے کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی ذات کو اس قوم کے لئے وقف کر رکھا ہے جو آپ کے خط ہی کی طرح دلچسپ ہے ۔ اس سے نعرے لگوا لیجئے ، اسے مذہب کے نام پر کٹوا دیجئے ۔ اسے ملک کے نام پر تنکا کر دیجئے ۔ یہ قوم اُف نہ کرے گی ۔
جب آپ اس قوم سے یہ کہیں گے کہ مذہب یہ کہتا ہے ، بھائی بھائی کا گلانہ کاٹئے ، ایک دوسرے کے کام آیئے ۔ اخلاق اور رواداری کا مظاہرہ کیجئے تو یہ قوم حیران ہو کر منہ تکے گی ۔ جیسے پوچھ رہی ہو ۔ آخر کیوں؟

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۵۷)

"میں بہت مزے میں ہوں ۔ اس لئے کہ میری پریشانیاں میری اپنی ہیں سُکھ دغا دے جاتے ہیں لیکن دکھ دھوکا نہیں دیتے" ۔

(محمد طفیل نمبر (نقوش) ص ۸۹۳)

اس طرح کے فکر انگیز خیالات ان کے خطوط میں بکھرے پڑے ہیں ۔ ان میں ان کے جذبات ہیں ، ان کے احساسات ہیں ، ان کے تجربات ہیں ، ان کی ذہنی رو ہے ، ان کا قلبی جھکاؤ ہے ، اُن کا مزاج ہے ، ان کے بزرگوں کی تربیت اور دعائیں ہیں ، ان کی خدا ترسی ہے ، اُن کی انسان دوستی ہے، ان کی نیکی کا تصور ہے، ان کا بدی سے خوف ہے ، ان کا مذہب سے لگاؤ ہے اور جانے کیا کیا ہے ۔ اِن خصوصیات نے ان کے خطوط میں بڑی جان پیدا کر دی ہے ، انہیں پُراثر بنا دیا ہے ، ان میں بڑی دل آویزی پیدا کر دی ہے ، انھیں پڑھتے جائیے اور لطف اندوز ہوتے جائیے ان میں ایک خاص دلچسپی محسوس ہوتی ہے تقریباً ہر خط زندگی آمیز ہے ، فکر خیز ہے لطف بداماں ہے ۔ ہر حصہ میں محمد طفیل سے ملاقات ہوتی ہے فکر مند ، سنجیدہ ، باحوصلہ ، کبھی ہنستے مسکراتے ، اچھی اچھی باتیں کرتے ، زندگی اور اس کے حقائق سے باخبر کرتے ، کبھی نقوش کے لیے فکر مند ، اس کے نمبروں کے منصوبوں میں غرق ۔ یہی ان

خطوط کی خوبی ہے کہ قاری کے سامنے مکتوب نگار کو لاکر نہ صرف کھڑا کر دیتے ہیں بلکہ اس کی باتیں سناتے ہیں ۔ اس کے سانس کی گرمی پہنچاتے ہیں ۔ اس کے دل کی دھڑکن سناتے ہیں ۔ اس کے جذبے کی تمازت سے باخبر رکھتے ہیں ۔ اور اس کی باتیں کبھی سنجیدہ بناتی ہیں ، کبھی رنجیدہ کرتی ہیں، کبھی ہنسنے مسکرانے پر مجبور کرتی ہیں ۔ کبھی غور و خوض کے سمندر میں ڈبو دیتی ہیں ۔

بلاشُبہ یہ خطوط اردو کے مکتوباتی ادب میں منفرد اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں جوں جوں زمانہ گزرتا جائیگا اُن کی اہمیت بڑھتی جائے گی اور ان کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائیگا ۔

لیکن ان خطوط کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ ہمیں محب محترم محمد طفیل کی اس جیتی جاگتی محفل میں پہنچا دیتے ہیں جہاں ان کے بہت سے دوستوں ، مخلصوں اور ساتھیوں کا تعارف ہوتا ہے اور خود محمد طفیل سے بھرپور ملاقات ہوتی ہے اسطرح ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ہماری محفل ان کی خوشبو سے مہک اُٹھتی ہے ۔ یہی ان خطوط کی سب سے بڑی اچھائی ہے ۔

بگاڑنے والا

احمد شریف

محمد طفیل نے مجھے کیوں چھاپا ! —— نہ جان نہ پہچان ، نہ میل نہ ملاقات ، نہ آنا نہ جانا ، وہ لاہور میں راولپنڈی —— اور افسانہ بھی وہ چھاپا جو عابد علی عابد نے ریجیکٹ کر دیا تھا ۔ میں نے عابد سے وجہ پوچھی تو کہنے لگا ۔

"منٹو کا ہوتا تو چھاپ دیتا ۔"

میں نے پوچھا ۔

"کیا مطلب ؟"

کہنے لگا ۔

"بورڈ والے اعتراض کرینگے ۔ نئے لکھنے والے کو بگاڑ رہا ہے"

اپنے افسانے کے ساتھ منٹو کا نام سن کر میں اپنے آپ میں نہ رہا ۔ میں نے وہ افسانہ محمد طفیل کو بھیج دیا ۔ ایک مدت تک نہ پہنچنے کی رسید آئی اور نہ چھاپنے کی خبر ملی ۔

مولوی غلام رسول میں کوئی فلسفہ ، کوئی انوکھی بات ، کوئی اہم مسئلہ نہیں ۔ ہمارے آس پاس کی سیدھی سادی سی کہانی ہے ۔ شاید بیان کرنے میں کوئی بات تو ہو ۔

وہ افسانہ چھپ گیا ۔

اس نے مجھے کیوں چھاپا ! ——اس لئے کہ وہ نڈر ہو کر بگاڑنا جانتا تھا ۔ نئے اور پرانے دونوں کو ۔ پھر میں نے اوپر تلے کئی افسانے لکھے ۔ اس نے ایک ایک کر کے سب چھاپ دیئے ۔ بگاڑنے کی پہلی اینٹ رکھ کر اس پر عمارت تعمیر کرتا گیا ۔

اس پر بھی ہماری دوستی نہ ہوئی ۔

میں لاہور آنے جانے لگا ۔ اس کے پاس خلوص ہی خلوص تھا ۔ ہر پھیرے وہ مجھے اپنی کوئی نہ کوئی کتاب واپسی پر پڑھنے کے لئے دیتا ۔

میرا خیال ہے ہر افسانہ نگار پورے کا پورا افسانہ لکھنے کے بعد بھی عنوان کے معاملے میں ٹلک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے ۔ میں نے ایک افسانہ بھیجا ۔ چھپ کر آیا تو اس کا نام اترن تھا جو کہ بے حد چست تھا ۔ میں نے پتہ نہیں کس عنوان سے بھیجا تھا ۔ یہ راز بعد میں کھلا کہ اسی نام سے اس کا ایک اور افسانہ نگار دوست مشورے کے بعد افسانہ لکھ رہا تھا ۔ ان کی دوستی کئی دنوں تک زوال میں رہی ۔

ایک دفعہ وہ ضخیم نمبر چھاپ رہا تھا ۔ وقت کم تھا ۔ میں ایک افسانہ اور ایک ناولٹ لے کر لاہور چلا گیا ۔ ملاقات ہوئی ۔ میں نے کہا ۔

"جو پسند آئے رکھ لیں" پھر تھوڑی دیر بعد دبی زبان سے کہا "کل واپس جاؤنگا"

اس نے دونوں چیزیں مسکرا کر سنبھال لیں ۔

اگلی صبح ملاقات ہوئی تو اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار باقی تھا ۔ چائے آگئی ۔ اس نے پیالی تسلی سے اپنے سامنے رکھی اور کہنے لگا ۔

"ساری رات ناولٹ پڑھتا رہا ۔ ناشتے پر افسانہ پڑھا ۔"

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور چائے پینے لگا ۔ میں دم روکے کانٹوں پر بیٹھا رہا ۔ اس نے چائے کی پیالی رکھی ۔ ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور کہنے لگا ۔

"دونوں چھاپونگا ۔"

اس نے ایک ایک کر کے دونوں چھاپ دیئے ۔

جس پرچے میں میرا ناولٹ چھپا اس میں راجندر سنگھ بیدی کا ناولٹ ایک چادر میلی سی بھی شامل تھا ۔ اس پرچے میں آغا بابر کا ایک افسانہ چٹھی رساں شائع ہوا تھا ۔ آغا بابر سے ملاقات ہوئی تو میرے ناولٹ کے بعد اس کے افسانے پر اظہار خیال کی باری آئی ۔ وہ افسانہ بہت اچھا ہے ۔ اردو کے چند گنے چنے افسانوں میں شمار کے قابل ہے ۔ ظاہر ہے میں نے اس افسانے کی دل کھول کر تعریف کی ۔ پھر دیر تک گپ ہانکتے رہے ۔ جب چلنے لگا تو میں نے دل کی بات برملا کہدی ۔ میں نے کہا ۔

"آغا جان ایک چادر میلی سی کے بعد نقوش کے سارے صفحے کورے ہوتے جب بھی اس کی اہمیت کم نہ ہوتی ۔"

محمد طفیل سے ملاقات ہوئی تو یہی بات میں نے اس سے کہہ دی ۔ اس کے ہونٹوں پر شرمائی شرمائی سی مسکراہٹ آئی اور غائب ہو گئی ۔

ہماری دوستی پھر بھی نہ ہوئی ۔

ایک بار میں نے اس سے کہا ۔

"میرے گھر آؤ ۔"

وہ بچوں کو لے کر ایک دن میرے گھر آگیا ۔ بچے بچوں سے مل کر شام تک دھما چوکڑی مچاتے رہے ۔ بھابیاں ایک دوسری کو رام کہانیاں سناتی رہیں ۔ ہم دونوں ساری رات ادب میں بے ادبی کی باتیں کرتے رہے ۔ اگلی صبح وہ بچوں کو لے کر چلا گیا ۔

ایک دن وہ بگولے کی طرح آیا ۔ میرے خستہ حال پریس پر ایک نگاہ ڈالی ۔ چائے کی سادہ پیالی پی اور کہنے لگا ۔

"چل میرے ساتھ ۔"

میں نے کہا۔

"چل ۔"

میں پریس کاریگروں کے حوالے کر کے اس کے ساتھ ہو لیا ۔ راستے میں آکر کہنے لگا ۔

"اسلام آباد چلنا ہے ۔"

مین نے دل میں کہا ۔

"چاہے جہنم میں چلو ۔"

اسلام آباد میرا ہفتے میں تین چار بار جانا ہوتا ہے ۔ پھر بھی وہ شہر اجنبی سا ہے ۔ نہ وہاں کوئی چوپال ہے نہ چھجو کا چوبارہ ۔ لے دے کر کچھ ہے تو آبپارہ ۔ ہم سپر مارکیٹ سے اگلے سٹاپ پر اتر کر تلاش کرتے کرتے ایک عالیشان بنگلے میں پہنچے ۔ وہ کسی اہم محکمے کے بڑے افسر کا دفتر تھا ۔ ہم بآسانی سیکرٹری سے ہو کر بڑے افسر تک پہنچ گئے ۔ محمد طفیل نے میرا تعارف کرانے کے بعد بڑے افسر کی طرف متوجہ ہو کر کہا ۔

"آپ مختار مسعود ہیں ۔"

ان دنوں میرے لئے مختار مسعود کا نام اجنبی تھا ۔ ٹھنڈا گرم ، چائے کافی کا پوچھنے کے بعد چائے آگئی ۔ وہ دونوں سر جوڑ کر باتیں کرنے لگے ۔ مجھے ویسے بھی کم سنائی دیتا ہے ۔ چائے ختم کر کے میں نے سگریٹ سلگائی اور ٹہلتا ٹہلتا سیکرٹری کے کمرے میں آگیا ۔ وہ نیم گرم کمرہ ہلکی ہلکی مہک سے لبالب بھرا ہوا تھا ۔

واپسی پر بہت کم باتیں ہوئیں ۔ لیاقت باغ آکر کہنے لگا ۔

"تو جا ۔ میں لاہور جا رہا ہوں ۔"

اور جلدی سے ویگن سے اتر گیا ۔

پریس پہنچا تو ایک لکھنے والا کرسی میں نیم دراز اونگھ رہا تھا ۔ میں نے اس کے لئے جلدی سے چائے منگوائی ۔ وہ چوکس ہو کر بیٹھ گیا ۔ پھر پوچھنے لگا ۔

"کہاں سے آئے ہو ؟"

میں نے کہا ۔

"اسلام آباد سے ۔"

پوچھنے لگا ۔

"طفیل کے ساتھ گئے تھے ؟"

ایسے لوگوں کے آنے جانے کی خبر پر لگا کر اڑتی ہے ۔ میں نے کہا ۔

"مختار مسعود سے کام تھا ۔"

وہ گریبان میں منہ ڈال کر ہنسا اور کہنے لگا ۔

"بہت کائیاں ہے ۔"

میں نے پوچھا ۔

"مختار ۔"

کہنے لگا ۔

"طفیل ۔"

اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے چائے کی پیالی میز پر رکھی ۔ آدھی چائے میز پر گر گئی ۔ وہ ایک انگلی گری ہوئی چائے میں ڈبو کر میز پر لکیریں کھینچنے لگا ۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولا ۔

"لمبا قرضہ سینکشن (Sanction) کرا رہا ہے ۔" پھر اس نے میری طرف بغور دیکھ کر آنکھ ماری اور کہنے لگا ۔" بغیر سود کے" ۔

میں نے چڑ کر پوچھا ۔

"گھریلو بنک ہے ؟"

اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے لڑکے کو آواز دے کر کہا۔

"پیالی اٹھا اور میز صاف کر ۔"

اس نے مروڑا سا کھایا اور اٹھ کر چلا گیا ۔

نقوش کے اگلے شمارے میں مختار مسعود کا مینار پاکستان کے حوالے سے دنیا کے قدیم و جدید معروف میناروں کا تذکرہ شامل تھا ۔ وہ تحریر کسی افسانے سے زیادہ خوبصورت اور دلچسپ تھی ۔ اسے پڑھ کر مختار مسعود سے مزید تعارف کی ضرورت باقی نہ رہی ۔

اس کا خزانے سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا ۔

اللہ کا بندہ محمد طفیل نقوش کے لئے اچھی تحریر کی خاطر کیسے کیسے بہتان سہہ لیتا تھا ـــــ دل بے چارہ ڈوب نہ جاتا تو کیا کرتا ۔

ہماری دوستی پھر بھی نہ ہوئی ۔

میں اپنے افسانوں کی کتاب "اگر کبھی چھپی" محمد طفیل کے نام کرنا چاہتا ہوں ۔ اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں کہ مجھے اس سے کوئی عقیدت ہے ۔ وہ مدیر تھا ۔ خاکہ نگار تھا ۔ افسانے بھی لکھتا تھا ۔ وہ سب اپنی جگہ ـــــ میں اس سے بدلہ لینا چاہتا ہوں ۔ وہ جیتے جی میرے افسانے چھاپ کر مجھے بگاڑتا رہا ۔ ایسا بگاڑا ، ایسا بگاڑا کہ کسی جوگا نہ رہنے دیا ۔

میں اس کے مرنے کے بعد ایسے افسانوں کی کتاب اس کے نام کرنا چاہتا ہوں جن میں نہ کوئی فلسفہ ہے نہ گہرائی —— س طرح اس کی شہرت کا طرہ کچھ تو نیچا ہو گا ۔ قبر میں بے چینی کی ایک آدھ کروٹ تو لیگا !

دیوانِ غالب بخطِ غالب

(رُو دادِ اشاعت)

جَاوید طفیل

غالباً جنوری 1989ء میں محترم لطیف الزمان خان ملتان سے لاہور تشریف لائے اور حسبِ سابق ہمارے ہاں ٹھہرے ، انہوں نے اپنے قیام کے دوران اپنا ایک مضمون "دیوانِ غالب بخطِ غالب" (روداد اشاعت) مجھے عنایت فرمایا تھا ۔ میں نے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد اِسکی اشاعت کے سلسلہ میں اپنی معذوری کا اظہار کر دیا تھا ۔ جناب لطیف الزمان خان کا وہی مضمون بعد میں "طلوع افکار" کراچی کی زینت بنا اور یوں سوال و جواب کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا ۔

اگرچہ یہ بات میرے لئے خوشگوار نہیں ہے کہ ایسے معاملات زیر بحث آئیں جو دوستوں کے درمیان رہے ہوں لیکن اب صورت حال کچھ ایسی ہے کہ ایک طرف جنابِ لطیف الزمان خان مورچہ زن ہیں اور دوسری طرف جناب نثار احمد فاروقی جوابات داغ رہے ہیں۔ مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ والدِ محترم کے دو دوست اِس فضول بحث میں اُلجھے ہوئے ہیں ۔ تحریری جنگ اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ مجھے اپنی خواہش کے برعکس خطوط کا وہ خزانہ کھنگالنا پڑا جو مجھے ورثہ میں ملا تھا ۔

جنابِ لطیف الزمان خان کے ارشادات سے متعلق اہم نکات میں نے اُن کے مضمون سے لئے ہیں جو "طلوع افکار" میں چھپا تھا ۔ میرا انتخاب صرف اُن نکات پر مبنی ہے جن کا تعلق "دیوانِ غالب بخطِ غالب" سے ہے ۔

جناب نثار احمد فاروقی صاحب کا مؤقف مضمون کی طوالت سے بچنے کے لئے پیش نہیں کیا جا رہا کیونکہ اُن خطوط کے چھپنے کے بعد جو اِس مضمون کا حصہ ہیں میرے خیال میں جناب نثار احمد فاروقی کا مؤقف چھاپنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی ۔

خطوط میں سے پہلا خط جناب نثار احمد فاروقی کا ہے جو والدِ محترم کے نام ہے اور بقیہ تمام خطوط وہ ہیں جو کہ جناب لطیف الزمان خان نے "دیوانِ غالب بخطِ غالب" کے سلسلہ میں جناب نثار احمد فاروقی کو لکھے تھے ۔ وہ تمام خطوط جن کا تعلق بیاض غالب سے ہے قارئین اور مستقبل کے مؤرخین کی نذر ہیں تاکہ وہ اِن کی روشنی میں اپنی درست رائے مرتب کر سکیں ۔ میں نے یہ ناخوشگوار کام اس لئے سرانجام دیا ہے تاکہ نقوش "دیوانِ غالب بخطِ غالب" سے متعلق معاملات کے سلسلہ میں ہم سچ تک پہنچ سکیں اور اِس طرح یہ ناخوشگوار بحث ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے ۔

دیوانِ غالب بخطِ غالب (رُودادِ اشاعت)

از لطیف الزمان خان

—● 5 اپریل 1969ء کو توفیق احمد قادری امروہوی نے بھوپال کے ایک کتب فروش شفیق الحسن سے بیاضِ غالب کو گیارہ روپے میں خریدا اور 7 اپریل 1969ء کو روزنامہ الجمیعت دھلی میں اشتہار دیا کہ اس کے پاس غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان موجود ہے اور اس کی قیمت چھ ہزار ہے ۔ 17 اپریل 1969ء کو ہندوستان میں شائع ہونے والے کئی زبانوں کے اخبارات میں بڑی تفصیل سے یہ خبر شائع ہوئی کہ غالب کے قلم سے لکھا ہوا مسودہ جس میں تقریباً ایک ہزار اُردو غزلیات ، 13 فارسی کی اور گیارہ رباعیات اردو کی موجود ہیں، دریافت ہوا ہے۔

—● میں نے اپنے ایک عزیز کو جو علی گڑھ میں مقیم تھے لکھا کہ وہ میرے لئے "دیوانِ غالب بخطِ غالب" خرید یں۔

—● میں ایک روز لاہور گیا میرا قیام طفیل مرحوم (مدیر نقوش) کے گھر ہوتا تھا ۔ اُس دن طفیل صاحب دن بھر مغموم رہے ۔ سہ پہر کو کہیں نہ گئے ۔ گھر پہنچے ۔ کھانا کھایا ۔ رات گزرتی رہی ۔ طفیل صاحب نے بات کرنے نہ دی ۔ جب رات کے دو بج گئے تو میں نے مرحوم سے کہا "قصور نہ بتائیے صرف معاف کر دیجئے" میرا خیال تھا نادانستگی میں مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ طفیل صاحب نے تکیہ کے نیچے سے ایک خط نکال کر دیا یہ اکبر علی خاں کا خط تھا ۔

—● میں نے خط پڑھ کر کہا "یار طفیل صاحب آپ کی خاموشی نے تو میرا دم ہی نکال دیا تھا ۔ صبح سے چپ سادھ رکھی ہے ۔ بول کر نہیں دیتے ۔ ہٹائیے اِس خط کو میں آپ کو یہ دیوان فراہم کر دوں گا ۔

—● جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میرے عزیز نے "دیوانِ غالب بخطِ غالب" نہیں خریدا تو میں نے انہیں نہایت سخت اور درشت لہجے میں خط لکھا ۔ وہ دلی گئے تین دن کی تلاشِ و جستجو کے بعد وہ اُس شخص کے پاس پہنچ گئے جس سے اکبر علی خاں نے دیوانِ غالب کے فوٹو سٹیٹ بنوائے تھے اور اُسے ایک پیسہ نہیں دیا تھا ۔ فوٹوگرافر کو اخبارات کے ذریعے یہ علم ہو گیا تھا کہ یہ قیمتی چیز ہے اُن صفحات کو میرے عزیز نے منہ مانگے داموں خریدا اور ایک بڑی بی کے ہمراہ مجھے بھیج دیا ۔

—● جب مجھے فوٹو اسٹیٹ ملے تو میں انہیں لے کر لاہور پہنچا لیکن طفیل صاحب کسی کام سے اسلام آباد گئے ہوئے تھے ۔ میں یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور سید باقر رضوی صاحب سے ملنے چلا گیا ۔ وہاں پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری بھی تشریف فرما تھے ۔ باقر صاحب نے مجھے دیکھتے ہی بلند آواز سے کہا ۔

—● فرمان بھائی ، یہ غالب کا دیوانہ ہے ۔ اِس کی اٹیچی کھولیے ضرور غالب پر کوئی تحریر ملے گی ۔ ہم تینوں دیر تک ہنستے رہے ۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اور فرمان صاحب اسٹیشن کے لئے تانگہ میں سوار ہوئے ۔ راستہ میں فرمان صاحب نے پوچھا "کیا باقر صاحب کا اندازہ ٹھیک ہے ۔ کیا اٹیچی میں غالب پر کوئی تحریر ہے؟" میں نے اٹیچی میں سے لفافہ نکالا اور "دیوانِ غالب بخطِ غالب" کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں دکھائیں ۔ وہ بہت حیرانی اور

استعجاب سے اِن اوراق کو دیکھتے رہے ۔ باقر صاحب کو داد دی اور پوچھا" اب کیاارادہ ہے ؟میں نے اُن سے کہاکہ میں نے طفیل صاحب سے وعدہ کیا ہے کہ میں یہ دیوان انہیں فراہم کروں گا وہی اسے شائع کریں گے ۔

—● میں نے دوسرے دن طفیل صاحب کو فون کیا اور اطلاع دی کہ جس چیز کی آپ کو تلاش تھی وہ آگئی ہے ۔

طفیل صاحب نے کہا "تم آتے ہو یا میں آؤں ؟"

میں نے عرض کیا" آپ ہی آئیے میں تو کل واپس آیا ہوں اور ہر روز چھٹی نہیں مل سکتی ۔"

—● طفیل صاحب تشریف لے آئے ۔ میں نے بعض احباب کو مدعو کیا کہ طفیل صاحب کے ساتھ وہ بھی کھانا تناول فرمائیں جو حضرات بی/ 149 گل گشت ملتان میں جمع ہوئے ۔

(1) پروفیسر نذیر احمد شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج ملتان

اب (سیکریٹری مقتدرہ قومی زبان —اسلام آباد)

(2) مسعود اشعر ریذیڈنٹ اڈیٹر امروز —ملتان

اب(13 ۔ رچنا بلاک اقبال ٹاؤن ۔ لاہور)

(3) سلطان صدیقی ایڈووکیٹ ملتان

(4) ایک یونیورسٹی کلرک

—● دوپہر کے کھانے کے بعد چاروں حضرات کی موجودگی میں وہ لفافہ طفیل صاحب کے سامنے رکھ دیا جس میں فوٹو اسٹیٹ تھے ۔

—● اب میں اور طفیل صاحب پھر باتیں کرنے لگے" خطِ شکست کو پڑھے گا کون ؟ طفیل صاحب نے پوچھا ۔

—● میں نے کہا اِس کو میں خوش خط لکھ دوں گا آپ لاہور پہنچ کر اِس کی اشاعت کا انتظام کیجیئے ۔

—● ایک دن طفیل صاحب کا فون آیا کہ وہ تلاش غالب میں شامل "دیوانِ غالب بخطِ غالب" کی دریافت کی کہانی نقوش کے اس شمارے میں چھاپنا چاہتے ہیں جس میں دیوانِ غالب شائع ہونے والا تھا ۔ ظاہر ہے نثار احمد فاروقی نے یہ مشورہ انہیں دیا ہو گا ورنہ طفیل صاحب کے علم میں یہ بات نہ تھی کہ "تلاش غالب" میں چھپوا رہا تھا اور یہ کہ دریافت کی کہانی فاروقی بھجوا چکے ہیں ۔

—● نثار احمد فاروقی کا مضمون "دیوان غالب: نسخہ امروہہ" میں نے پریس سے حاصل کر کے طفیل صاحب کو دیا۔ رات کو حسبِ معمول میں اور طفیل صاحب دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ تب معلوم ہوا کہ فاروقی صاحب نے یہ درخواست کی ہے کہ ان کا مضمون نقوش میں ضرور شامل کیا جائے ۔

—● طفیل صاحب نقوش غالب نمبر (حصہ دوم) معہ نو دریافت بیاضِ غالبؔ شمارہ نمبر ۱۱۳ اکتوبر 1969ء میں شائع کر چکے تھے کہ ایک روز نثار احمد فاروقی کے چچا ابرار احمد فاروقی صاحب کا خط پہنچا کہ لاہور آؤ ۔ یہ اکتوبر 1969ء کا آخری

ہفتہ تھا ۔ میں ان کے گھر 56 پرانی انار کلی لاہور پہنچا تو ابرار احمد فاروقی صاحب نے "دیوانِ غالب بخطِ غالب" کے فوٹو اسٹیٹ اور ایک فلاسک جس پر غالب کے اشعار مصور کئے گئے تھے اور جس کی نقل بعد میں لاہور میں کسی نے تیار کی ۔ دونوں چیزیں میرے سپرد کیں ۔

—● نقوش غالب نمبر (حصہ دوم) معہ نو دریافت بیاضِ غالب بخطِ غالب کا ایک نسخہ چھپنے کے بعد طفیل صاحب نے مجھے بھیجا اور پہلے صفحے پر لکھا تھا

برادرم لطیف الزمان خان صاحب کی خدمت میں

جن کا عشق

اِس نمبر کے چھاپنے میں بہت کام آیا

محمد طفیل

نثار احمد فاروقی بنام محمد طفیل

دہلی کالج ۔ اجمیری گیٹ ۔ دہلی —۶

۲۷ ستمبر ۱۹۶۹ء

برادرِ مکرم ۔ تسلیمات ۔ میں نے دو ماہ قبل آپ کو خط لکھا تھا کہ اگر آپ دہلی تشریف لا سکیں تو میں کوشش کروں گا کہ دیوان کا عکس آپ کو مل جائے اور اس کی مجھے امید تھی ۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو چیز میری اپنی نہیں ہے اس کے لیے میں قطعی وعدہ نہیں کر سکتا تھا ۔ آپ نے لکھا کہ میرا خط پا کر آپ ویزہ کے لیے درخواست بھیج چکے ہیں ۔ میں منتظر رہا کہ آپ آج آئیں ۔ کل آئیں — مگر آپ نے پھر خاموشی اختیار کر لی ۔ خدا جانے آپ نے کیا سوچا ہو گا ۔ اگر ذہن میں کوئی غلط فہمی ہے تو وہ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک آپ سے ملاقات نہ ہو اور اس دیوان کا قصہ اتنا طویل ہے کہ میں لکھ نہیں سکتا ۔ پورا دفتر درکار ہے ۔ یہ تو کبھی زبانی ہی سنایا جا سکتا ہے ۔ مختلف حضرات مالک کو بہکانے اور بیوقوف بنانے میں پوری طرح سرگرم عمل ہیں اور بعض نے تو سطحی اخلاق اور پست کرداری کا مظاہرہ کرنے میں بھی شرم محسوس نہیں کی ۔ میرا ابتدا سے یہ خیال تھا ، بلکہ خواہش تھی کہ کسی طرح اس کی نقل یا عکس آپ تک پہنچ جائے لیکن میں آپ کی ملاقات مالک سے کرانا ضروری خیال کرتا تھا ۔

بہر حال اب صورتِ حال یہ ہے کہ میں نے نقوش کے غالب نمبر حصہ دوم کے لیے وہ عکس حاصل کر لیا ہے ۔ میں تین ہفتے کے لیے حیدر آباد چلا گیا تھا اور ابھی ۲۴ کو واپس آیا ہوں ۔ اس سفر سے پہلے کوئی ایسا جانے والا نہیں ملا جس کے ہاتھ بھیج دیتا ۔ اب میرے ایک بزرگ عزیز یہاں سے پہلی تاریخ کو روانہ ہو کر دوسری کو لاہور پہنچیں گے ۔ انہیں میں نے عکس دے دیا ہے اور آپ کا پتا بھی بتا دیا ہے ۔ یہ میرے چچا ہیں ۔ آپ سے وہ گھر پر یا نقوش کے دفتر آ کر ملیں گے اور دیوان کا عکس آپ کو دے دیں گے ۔ اس کے صفحات کے نمبر ہر عکس کی پشت پر موجود ہیں آپ اُسی ترتیب سے اُسے جمع کر کے صرف عکس چھاپ دیجئے اور ابتدا میں ایک صفحہ پر "دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ" لکھ کر نیچے "عطیہ" اور میرا نام لکھوا دیجئے ۔ یہاں دو حضرات نے اس کا عکس اور حاصل کر لیا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ

آپ اسے غالب نمبر حصہ دوم میں پہلے چھاپ دیں ۔ کتابی صورت میں یہ بعد کو شائع ہو گا ۔ اشاعت کے بعد یہ تصاویر آپ لطیف الزمان خان صاحب کو دے دیں ۔ یہ دراصل انہی کے لیے ہیں ۔ جب یہ عکس آپ کے قبضے میں آجائیں تو آپ مجھے فوراً مطلع کریں اور یہ بھی ضرور بتائیں کہ غالب نمبر حصہ دوم کب تک مارکیٹ میں آجائے گا ۔

آج کل حکومتِ پاکستان نے کتابوں اور رسالوں کی بر آمد پر پابندی لگا دی ہے اس لیے پاکستان کا کوئی اخبار یا رسالہ یہاں دیکھنے کو نہیں مل رہا ہے ۔ آپ یہ پرچہ رجسٹری سے لطیف الزمان صاحب کو بھیج دیا کیجئے ۔ وہ محفوظ رکھیں گے اور جب یہ قانونی دشواریاں دور ہوں گی میرے پاس بھجوا دیں گے ۔

اس خط کے جواب کا سخت انتظار رہے گا ۔ چچا صاحب آپ سے دوسری یا تیسری اکتوبر کو ملیں گے ۔ جس دن وہ ملیں اسی دن خط لکھ دیجئے گا۔

والسلام

نثار احمد فاروقی

نوٹ :— براہ کرم غالب نمبر حصہ ۲ کی اشاعت سے پہلے عکس کے حصول یا نمبر میں شمول کا حال سختی سے صیغہ راز میں رکھیے گا ۔ وہاں کے ادبی حلقوں میں یہ پہلے سے معلوم نہ ہو ۔ اس کی بہت زیادہ تاکید ہے ۔

لطیف الزمان خان بنام نثار احمد فاروقی

لطیف الزمان خان
ام ۔ اے
لیکچرر شعبہ انگریزی
گورنمنٹ کالج ۔ ملتان

8 اکتوبر 1969ء دس بجے شب

محب گرامی ۔ سلام مسنون ۔ مدت سے آپ نے یاد نہیں فرمایا ۔ ہر لمحہ آپ کے کرمنامہ کا منتظر ہوں ۔ میں نے آپ کو ۱۸ اگست ، ۲۲ اگست ، ۳ ستمبر ، ۶ ستمبر اور ۸ ستمبر کو کراچی سے خطوط لکھے ۔ ۱۹ ستمبر کو یہاں سے ایک خط لکھا ۔ آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ خطوط آپ کو ملے یا گم ہو گئے ۔

۴ اکتوبر کو قبلہ چچا جان کا خط ملا کہ ۵ اکتوبر کو لاہور جا کر ان سے نیاز حاصل کروں ۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی اور وہاں گیا ۔ صبح کو ناشتہ ان کے ساتھ کیا ۔ مندرجہ ذیل کتب و رسائل انہوں نے عنایت فرمائیں :۔

(۱) شمع حیات (غالب نمبر) (۲) شگوفہ (غالب نمبر) (۳) شاعر ۔ (غالب نمبر) (۴) اعتمادیہ حصہ اول و دوم (غالب نمبر) (۵) اردو ادب (غالب نمبر) (۶) عیارِ غالب (۷) جامعہ (غالب نمبر) ایک فلیسک جس پر غالب کے اشعار ہیں اور عکس ۔

چچا جان کے ہاں سے واپس آیا تو دن بھر نہ کہیں گیا اور نہ کوئی کام کیا ۔ بس اس دولت کو دیکھتا رہا کہ جس کے مقابلہ میں قارون کے خزانہ کی بھی کوئی حیثیت نہیں ۔ شکریہ کا لفظ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ وہ میرے جذبات کی ترجمانی نہ

ہوگی ۔ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہی اس کا اجر آپ کو دے گا ۔

(۳) ولید میر صاحب سے ملا ۔ نگارشات سے علیحدہ ہونے کے بعد ان کی مالی حالت کچھ اچھی نہیں رہی ۔ پھر ان کی پانچ یا چھ کتابیں کمپوز ہو چکی ہیں مگر پیسہ کی کمی نے سارا کام روک دیا ہے ۔ سہیل صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ تلاش غالب کی اشاعت پر فوراً امداد دینگے ۔ اگر انہوں نے امداد نہ کی تو پھر میں اپنے پاس سے ولید صاحب کو پندرہ سو روپیہ دیدونگا کہ وہ کتاب کو فوراً شائع کر دیں ۔ قانونی سقم بھی نہیں رہا ۔ کیونکہ تلاشِ غالب اس قانون کے نافذ ہونے سے قبل کمپوز ہو چکی تھی ۔ بہر کیف اب زیادہ وقت نہ لگے گا ۔

(۴) سہیل صاحب دیوانِ غالب شائع کرنا تو چاہتے ہیں لیکن قطعیت کے ساتھ ابھی انہوں نے وعدہ نہیں کیا ۔ ان کے اندازہ کے مطابق جس قسم کا دیوان میں شائع کرانا چاہتا ہوں اس پر کم از کم چالیس پینتالیس ہزار روپے کی لاگت آئے گی ۔ کیونکہ غالب کا دیوان اگر شائع ہو گا تو نہایت شاندار ۔ طباعت کا ایسا نمونہ جس کو عرصہ تک لوگ نہیں بھول سکیں گے ۔

(۵) میں طفیل صاحب سے بھی ملا ۔ وہ نقوش کا ایک اور غالب نمبر شائع کر رہے ہیں ۔ یہ مصور ایڈیشن ہو گا ۔ اس نمبر میں غالب کی نایاب اور کمیاب تحریریں ہونگی ۔ گل رعنا کا اصل نسخہ لاہور میں ایک صاحب کے پاس ہے اور بارہ ہزار دینے والے موجود ہیں مگر وہ صاحب بیس ہزار مانگتے ہیں ۔ طفیل صاحب اس کا عکس حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور امید ہے کہ عکس مل جائے گا ۔ پھر وہ مقیش صفحات پر اسے شائع کریں گے ۔

طفیل صاحب نے نسخہ امروہہ کے عکس حاصل کرنے کے لئے پاسپورٹ اور ویزہ حاصل کر لیا تھا مگر چونکہ انہیں یقین نہ تھا کہ عکس ملیں گے یہ مسئلہ ملتوی کیا ، ویزا کا وقت نکل گیا ۔

دروغ مصلحت آمیز کے لئے پروردگار عالم مجھے معاف کرے ۔ میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ ہاں ایک بات یاد آئی کہ آپ نے میرے پیکٹ پر میرے نام کے بعد معرفت طفیل صاحب کیوں لکھا ۔ میرے پہنچنے میں اگر دیر ہو جاتی تو یقیناً چچا جان تمام چیزوں کے ساتھ عکس بھی طفیل صاحب کو دے آتے ۔ وہ کھولتے دیکھتے ۔ آپ کے بارے میں کیا خیال فرماتے اور میرے بارے میں کیا سوچتے ۔

بہر کیف اب آپ سے ایک بات ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ اجازت دیں تو عکس طفیل صاحب کو دوں تاکہ وہ نقوش کے غالب نمبر میں شامل کر لیں ۔ اگر آپ اجازت دیتے ہیں تو دو باتیں ذہن میں رہیں ایک تو یہ کہ عکس کی ذمہ داری میری رہی یعنی آپ سے طفیل صاحب شکایت نہ کر پائیں گے ۔ ہاں یہ لازمی ہو گا کہ اس کے حواشی یا مضمون آپ تحریر فرمائینگے ۔ مجھے چچا جان نے بتلایا کہ ۴ اکتوبر کو کوئی "بچہ" گیا ہے ۔ یہ صاحب جنہیں چچا جان بچہ کہتے ہیں ۔ جلد واپس آئینگے اور وہ حواشی و مضمون لیتے آئینگے ۔

مجھے آپ صاف صاف لکھیے کہ کیا آپ اجازت دینگے ۔ اگر آپ نے اجازت نہ دی تو پھر یہ اسوقت تک میرے پاس

محفوظ ہیں جب تک غالب کا دیوان شائع کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہو جاتا ۔

(٦) سہیل صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ دیوانِ غالب شائع کرینگے بشرطیکہ وہ انگلستان نہ چلے گئے ۔ وہ دو سال کے لئے انگلستان جانے کا ارادہ کر رہے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ میں ان کی واپسی کا انتظار نہیں کرونگا ۔ کہیں اور بات کرونگا ۔

(٧) سب رس حیدر آباد کا غالب نمبر شائع ہوا ہے ۔ یہ اطلاع ملی ہے ۔ اور ہاں وہیں سے ہی غالب پر مبنی مطبوعہ کتب کا حال ان اشتہارات سے معلوم ہوتا ہے جو رسائل میں ہیں ۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ جو صاحب اب گئے ہیں آپ ان کے ہمراہ حواشی کے ساتھ ساتھ رسائل و کتب بھی روانہ کر دیں ۔

(٨) نو آبجیکشن سر ٹیفکیٹ لینے خود گیا تھا ۔ وہاں ایک صاحب سے جن کی اہلیہ آپ کی شاگرد رہ چکی ہیں ۔ وہ صاحب کہتے تو تھے کہ جلد یہ سر ٹیفکیٹ مل جائے گا ۔ دیکھیئے کیا ہوتا ہے ۔ میں نے تو کتابیں جمع کرلی ہیں ۔

(٩) عبدالقدیر صاحب نے آپ کو کون سی کتابیں دی ہیں ۔ ان کے نام لکھیے ۔

بھابی جان کی خدمت میں آداب ۔ میں آپ کے خط کا سخت بے چینی سے منتظر ہوں ۔

کتابیں اور رسالوں کا بھی انتظار ہے اور اجازت کا بھی ۔

(١٠) ۱٦ اکتوبر کو چچا جان نے سلیمان احمد صاحب فاروقی کے مکان پر بڑی پُر تکلف دعوت دی ۔

(١١) واضح رہے کہ جلال الدین صاحب اور دیگر حضرات سے نسخہ امروہہ کا تمام کلام مکرم طفیل صاحب کو مل چکا ہے ۔ عکس چھاپنے کی اجازت آپ دے دیں تو اُسکا حُسن دوبالا ہو جائے گا ۔ جلال الدین صاحب کے مضمون پر طفیل صاحب بتلاتے تھے کہ بہت خطوط موصول ہوئے ہیں ۔ کیا حرج ہے اگر اصل بات معلوم ہو جائے ۔ آپ مضمون بھیجئے۔

فقط

احقر

لطیف الزماں خان

لطیف الزماں خان ۔ ام ۔ اے
لیکچرر شعبہ انگریزی
گورنمنٹ کالج ۔ ملتان

مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹٦۹ء
گیارہ بجے شب

برادرم ۔ السلام علیکم ۔ شدید انتظار کے عالم میں آپ کا ۲۷ ستمبر کا مکتوب مجھے کل سہ پہر ملا ۔ میں ۸ اکتوبر کو بھی ایک عریضہ روانہ کر چکا ہوں امید ہے ملا ہو گا ۔

جلال الدین صاحب اور مسلم ضیائی صاحب کے مضامین کے تراشے آپ کو نہ ملے یعنی میرے دو خط بھی آپ کو نہ ملے ان کا دستیاب ہونا اب مشکل ہے ۔ عام طور پر روزنامے کی کاپی مشکل سے ملتی ہے ۔ پرمٹ تو واقعی مل گیا لیکن ابھی سٹیٹ بنک سے No Objection Certificate نہیں ملا ہے ۔ یہ سرٹیفکیٹ کراچی سے ملے گا ۔ اصل پرمٹ بھیج دیا گیا ہے ۔ امید ہے ہفتہ عشرہ میں سارے معاملات طے ہو جائیں گے اور میں آپ کو کتب و رسائل روانہ کر سکوں گا ۔ میں یہ معلوم کروں گا کہ ادبی کتب و رسائل درآمد کرنے کے لئے پرمٹ مل سکتا ہے یا نہیں ۔ اگر یہ پرمٹ مل سکا تو آپ کو مطلع کرونگا ۔

میں گزشتہ خط میں تلاشِ غالب کے بارے میں لکھ چکا ہوں کہ ولید صاحب مالی طور پر ان دنوں کمزور ہیں ۔ میاں سہیل صاحب نے مالی اعانت کا وعدہ کیا تھا ۔ میں نے خود ۶ اکتوبر کی شام کو ان سے گفتگو کی ہے اور ۷ کو بھی ان سے اسی سلسلہ میں ملا تھا ۔ میں آج ہی ولید صاحب کو خط لکھ رہا ہوں کہ اگر سہیل صاحب مدد کرتے ہیں تو ٹھیک ورنہ میں خود اس کا انتظام کر دونگا۔ انشاءاللہ پندرہ بیس یوم میں کتاب بازار میں آجائے گی ۔ تلاشِ غالب کے لیے اجازت کی ضرورت پیش نہ آئے گی ۔ کیونکہ وہ قانون کے نافذ ہونے سے قبل چھپ چکی تھی ۔ اب تو صرف جلد ہونا باقی ہے ۔ اشاریہ البتہ اس ایڈیشن میں نہ ہو گا ۔

میں نے تو آپ کو پہلے ہی لکھا تھا کہ جلال الدین صاحب نے نسخۂ امروہہ کی دریافت کا سہرا خود باندھ لیا ہے ۔ مجھے یہ پڑھ کر خوشی ہے کہ آپ نے اس سطح پر آنا پسند نہ کیا ۔ یہ صحیح ہے کہ وہاں کے اخبارات اور رسائل اب یہاں نہیں آ رہے ہیں مگر یہ بات کلیتہً درست نہیں ہے ۔ آپ اگر طفیل صاحب کے پتہ پر کوئی رسالہ بھیجیں تو وہ پہنچ جائے گا ۔ اسی طرح کراچی کے لوگ بھی کسٹم آفیسر سے اجازت لیتے ہیں ۔ البتہ یہاں شائد رسائل نہ پہنچ سکیں ۔

وہاں آپ نے اور توفیق صاحب نے ہماری زبان میں صورت حال سے لوگوں کو واقف کرا دیا ۔ یہ اچھا ہوا لیکن یہ زمانہ تو پروپیگنڈے کا ہے اور جلال الدین صاحب اس سے واقف معلوم ہوتے ہیں ۔ آپ کم از کم یہ تو کر ہی سکتے ہیں کہ وہاں کے اخبار اور رسائل میں صحیح حالات سے لوگوں کو آگاہ کریں ۔ اگر آپ توفیق صاحب اور اپنا مضمون نقل کر کے (چھپا ہوا تو آئے گا نہیں) بھیج دیں تو پھر یہاں کے اخبارات و رسائل میں ان مضامین کو Reproduce کرایا جا سکتا ہے ۔

یہاں آج اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ اکبر علی خاں نے وہی کیا جس کا اندیشہ وزیر الحسن صاحب عابدی نے کیا تھا یعنی نسخہ کا عکس شائع کر دیا ہے ۔ یہاں ابھی کسی اور کے پاس عکس نہیں پہنچے ہیں ۔ لیکن آپ کا یہ فیصلہ مستحسن ہے کہ یہ نسخہ وہاں بھی شائع ہو اور یہاں بھی ۔ یہاں کا فکر آپ ہرگز نہ کیجئے ۔ یہاں انشاءاللہ یہ نسخہ اس شان سے شائع ہو گا کہ اکبر علی خاں دیکھتے ہی رہ جائینگے ۔ وہاں کا اہتمام آپ خود کیجئے ۔

میں چچا جان کا خط پا کر لاہور گیا تھا ۔ ۵ اکتوبر کو انہوں نے رسائل ، ایک کتاب دو عکس مجھے عنایت فرمائے ۔

تفصیل گزشتہ خط میں لکھ چکا ہوں۔ میں ۷ر اکتوبر کی شام کو لاہور سے روانہ ہوا ۔ طفیل صاحب کو اس وقت تک آپ کا خط نہیں ملا تھا ۔ آپ کا خط ملتے ہی پہلا کام میں نے یہ کیا کہ طفیل صاحب کو ٹرنک کال پر بتلایا کہ عکس پہنچ چکے ہیں ۔ اب وہ پرسوں یعنی ۱۱ر اکتوبر بروز اتوار تشریف لائینگے اور میں آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے عکس انہیں دے دوں گا ۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی عرض کرونگا کہ آپ جلد از جلد اس نسخہ کے بارے میں مضمون لکھ کر بھیجئے ۔ بات کچھ یوں ہو گی کہ عکس بھیجنے کی ذمہ داری اب بھی آپ پر نہیں آنی چاہیئے تاکہ توفیق صاحب کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملے ہاں یہ بے حد ضروری ہے کہ یہاں کے قاری کو صحیح صورتِ حال معلوم ہو جائے ۔ نقوش کا مصور ایڈیشن شائع ہو گا ۔ صادقین اور عبدالرحمٰن چغتائی کی نئی تصاویر سے مزین ہو گا اور ایک مستقل دستاویز ۔ روزناموں کے مقابلہ پر جو مضمون نقوش میں شائع ہو گا اس کی حیثیت مستقل ہو گی ۔ آپ مضمون قسط وار مجھے یا طفیل صاحب کو بھیج دیجئے ۔ یعنی اگر مکمل مضمون یکبارگی نہ ہو پائے تو خطوط کی شکل میں بھیجئے ۔ نقوش دسمبر میں شائع ہو گا ۔ اگر کوئی صاحب آنے والے ہوں تو مضمون آسانی سے لا سکیں گے ۔

اردو نامہ قومی زبان ، اردو اور نقوش کے شمارے آئیندہ میں جمع کرتا رہونگا ۔ جب موقع ملے گا بھیج دوں گا ۔ اگر مدیر صاحبان نے بھیج دیئے تو ٹھیک ہے ورنہ خرید لوں گا ۔ آپ خاطر جمع رکھئے ۔

سہیل صاحب واپس تشریف لے آئے ہیں ۔ وہ اگر انگلستان نہ گئے تو یقیناً دیوانِ غالب شائع کرینگے ۔ ورنہ طفیل صاحب شاید خود آمادہ ہو جائیں ۔ میں مجلس ترقی ادب اور دیگر اداروں سے بھی بات کروں گا ۔

یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ قدیر صاحب ماہِ نو نہیں لے گئے ۔ اگر آپ کے پاس زائد ہو تو بھیج دیجئے بلکہ اپنی کاپی ہی عبدالقوی صاحب کو بھیج دیجئے ۔ میں بہر صورت آپ کو ماہ نو بھیج دونگا ۔ عبدالقوی صاحب نہ جانے کیا سوچتے ہوں گے میں ان سے بڑا شرمندہ ہوں ۔

میرا یہ پیڈ طفیل صاحب نے چھاپا ہے ۔ وہ مجھے غالب کا طرفدار سمجھتے ہیں ۔ میرے خیال میں تصویر کا سائز چھوٹا ہوتا اور حروف بھی ایک جانب ہوتے اور چھوٹے تو یہ زیادہ اچھا معلوم ہوتا ۔ اب کاغذ اتنا اچھا ہے کہ اسے پھینکنے کو جی نہیں چاہتا اور جبکہ غالب کی تصویر بھی ہے ۔ بچوں کے لئے ٹکٹ اتنے ضروری نہیں ہیں ۔ دراصل مہ جبیں اور انیس آپ کا لفافہ پہچانتے ہیں اور شور مچا دیتے ہیں کہ ٹکٹ آئے ہوں گے ۔ کوئی جلدی نہیں اطمینان سے بھیجئے گا ۔

خدا کرے کہ آپ کی طبیعت اب ٹھیک ہو ۔ آپ کے خط کا آخری پیراگراف خاصہ پریشان کن ہے ۔ انسان کو جب تک سانس آتا ہے اکبر علی خان اور سید قدرت نقوی جیسے لوگ ملتے ہیں ۔ مگر آپ کیوں غم کریں لعنت بھیجئے ۔

چچا جان نے بتلایا تھا کہ کوئی عزیز ۴ر اکتوبر کو امروہہ گئے ہیں ۔ ان کے ہمراہ رسائل و کتب کے علاوہ اپنا اور توفیق صاحب کا مضمون مطبوعہ ہماری زبان — اور نقوش کے لئے مضمون جو عکس کے ساتھ شائع ہو سکے ضرور بھیجئے ۔ بار بار لکھتے ہوئے شرم دامن گیر ہوتی ہے کہ مطبوعہ کتب و رسائل کسی طرح بھیج دیجئے ۔ میں دو دن سے سخت زکام و کھانسی

میں مبتلا ہوں ۔

طفیل صاحب سے جو گفتگو ہوگی آپ کو مطلع کرونگا۔ بھابھی جان کو آداب ۔ بچے سلام عرض کرتے ہیں۔ اہلیہ آداب کہتی ہیں ۔

اگر آپ کا مضمون نہ آیا تو تلاش غالب میں نسخہ امروہہ سے متعلق جو مضمون ہیں اسے شامل کرا دونگا لیکن ضروری ہے کہ آپ توفیق صاحب کے حوالے سے دوسرا مضمون لکھیں تاکہ اصلیت معلوم ہو سکے ۔ جلال الدین اور اکبر علی خاں اگر جھوٹ بول سکتے ہیں تو کیا آپ سچ نہیں بول سکتے۔

احقر

لطیف الزمان خان

لطیف الزمان خان ام ۔ اے

لیکچرر شعبہ انگریزی

گورنمنٹ کالج ۔ ملتان

مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۹ء

برادرم ۔ السلام علیکم ۔ آپ کا ۲۷ر ستمبر کا لفافہ جو دہلی سے ۲۹ر ستمبر (ڈاکخانہ کی مہر ظاہر کرتی ہے) کو روانہ ہوا مجھے ۹ر اکتوبر کو ملا تھا میں نے دوسرے روز آپ کو جواب لکھ دیا تھا ۔

آپ کا ۳۰ر ستمبر کا کارڈ مجھے کل یعنی ۱۱ر اکتوبر کو ملا ۔ خدا جانے ڈاک اسقدر دیر سے کیوں آ رہی ہے ۔ میں آپ کو گزشتہ خط میں لکھ چکا ہوں کہ چچا جان کا خط جو انہوں نے ۲۷ ستمبر کو لکھا تھا مجھے ۴ر اکتوبر کو مل گیا تھا ۔ حکم یہ تھا کہ ۵ر کو لاہور پہنچوں اور تمام چیزیں حاصل کر لوں چنانچہ تعمیل حکم میں گیا اور سب چیزیں جن کا ذکر گزشتہ خط میں ہے لے آیا ۔

جب ۹ اکتوبر کو مجھے آپ کا خط ملا تو میں نے طفیل صاحب کو ٹیلیفون کیا اور وہ آج لاہور سے تشریف لے آئے ۔ آپ کے حکم کی تعمیل کی اور عکس انہیں دے دیئے ۔ طفیل صاحب کو آپ کا خط مل چکا ہے ۔ ان سے جو گفتگو ہوئی ہے اسے مختصراً ذیل میں درج کرتا ہوں ۔ خیال ان کا یہ تھا کہ نقوش کا غالب نمبر حصہ دوم دسمبر میں شائع کریں لیکن اب وہ نومبر ہی میں شائع کریں گے ۔ یہ مضمون توفیق صاحب کا اگر آپ بھیج دیں تو وہ بھی شامل کر لیا جائے گا ۔ آپ نے اگر نیا مضمون بھیج دیا تو ٹھیک ورنہ پھر "تلاش غالب" والا مضمون ہی شامل کر لیا جائے گا۔

طفیل صاحب چاہتے ہیں کہ میرا ذکر بھی آئے لیکن مجھے نام و نمود سے نفرت ہے میں نے انہیں سختی سے منع کیا ہے ۔ لیکن اگر وہ کسی مصلحت کی بنا پر میرا نام شامل کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اعتراض نہ ہو گا ۔ طفیل صاحب نے بھی یہی

فرمایا کہ عکس کی ذمہ داری آپ نہ لیجئے ۔ بس مضمون آپ کا اور عکس کی ذمہ داری میری یا کسی اور کی ۔ اس لیے ہو گا یہ کہ آپ کو توفیق صاحب کچھ کہہ نہ پائیں گے ۔ نیز آپ کہہ سکینگے کہ آپ نے صرف اپنی کتاب کے لئے مضمون لکھا تھا وہ شامل کر لیا گیا ہے ۔ یا اگر نیا مضمون بھی ہو گا تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ طفیل صاحب کی فرمائش پر لکھا ہے ۔

اگرچہ کہ جلال الدین صاحب نے یہاں آکر اخبارات و رسائل میں مضامین شائع کرائے ہیں لیکن جو تحریر نقوش میں ہوگی وہ صحیح تصور کی جائے گی نیز دیرپا بھی ہوگی ۔ مطلب یہ ہے کہ کوشش اس امر کی ہوگی کہ کم از کم یہاں کے قاری کو صحیح صورت حال کا علم ہو سکے ۔

آج طفیل صاحب آئے بھی اور واپس بھی چلے گئے ۔ میں نے دوپہر کو کچھ اور لوگوں کو بھی کھانے پر مدعو کیا تھا ۔ ان میں ایک صاحب مسعود اشعر صاحب بھی تھے ۔ مسعود اشعر صاحب عرشی صاحب کے عزیز ہوتے ہیں اور عرشی صاحب و اکبر علی خاں صاحب کو ہم لوگوں سے زیادہ بہتر جانتے ہیں ۔ مسعود صاحب نے بتلایا کہ اکبر علی خاں صاحب نے انہیں اپنا اور سرور صاحب کا وہ مقدمہ بھی بھیجا ہے کہ جو انہوں نے نسخہ امروہہ کے ساتھ شائع کیا ہے ۔ جنگ کراچی کو بھی یہ تحریر بھیجی ہیں ۔ مگر اب تک صرف خبر آئی ہے ۔ مقصد تو یہ ہے کہ پروپیگنڈا یہاں اور وہاں ہو تاکہ ان کو محقق اعظم تسلیم کر لیا جائے ۔ اب ضروری ہو گیا ہے کہ تمام اخبارات و رسائل کے ذریعہ غالب کے کلام نو دریافت سے متعلق صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے ۔

آج مجھے بار بار یہ خیال آتا رہا کہ جب توفیق صاحب چھ ہزار پر وہ مخطوطہ فروخت کر رہے تھے تو آپ نے خرید کیوں نہ لیا ۔ تاکہ اکبر علی خاں اور جلال الدین جیسے حضرات کو ہوا بھی نہ لگتی ۔ دیوانِ غالب کے نسخے اگر چچا جان کو فراہم کئے جا سکتے ہیں تو کیا آپ کو فراہم نہ کیے جاتے — افسوس کہ اُسوقت آپ نے اس پر غور نہیں فرمایا تھا اور اب صورتِ حال اسقدر خراب ہو گئی ہے کہ اکبر علی خاں صاحب نے توفیق صاحب کو راہ پر لگا لیا اور اپنے نام سے عکس شائع کر دیئے ۔

آپ اگر اس عرشی زادہ کی ایک کاپی رجسٹری سے طفیل صاحب کو بھیج دیں تو وہ پہنچ جائے گی ۔ ایک کتاب یا رسالہ آجاتا ہے ۔ طفیل صاحب نے بتایا تھا کہ کل ہی رجسٹری سے کوئی کتاب پہنچی ہے ۔

اگر وہ میرے لئے ہوگی تو میں لے لوں گا ۔ ورنہ آپ سلیمان احمد صاحب فاروقی کو بھیج دیجئے میں ان سے لے آؤنگا ۔

اگر ۱۸ اکتوبر تک ولید صاحب نے کوئی جواب نہ دیا تو میں اسی روز لاہور چلا جاؤنگا جس قدر مالی اعانت کی ضرورت ہے اس کا انتظام کرونگا اور کوشش کرونگا کہ ایک ہفتہ میں کتاب بازار میں آجائے ۔ نیز مضمون دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ والا مضمون لے کر طفیل صاحب کو دے دوں ۔

ایک نہایت ضروری کام یہ ہے کہ اگر آپ نے نئے نسخۂ کی کتابت کروالی ہے تو اس کی ایک نقل فوراً طفیل صاحب کو بھیج دیجئے کیونکہ ممکن ہے غالب کا لکھا کاتب صحیح نہ پڑھ سکے ۔ کیونکہ پروگرام تو یہی ہے کہ ایک جانب غالب کا

عکس اور دوسری جانب کتابت شدہ غزل ہوگی ۔ آپ نے اسے صحیح صحیح پڑھ لیا ہوگا اس لئے کتابت شدہ کاپی میں غلطی کا امکان نہ رہے گا اور طفیل صاحب کو آسانی ہو جائے گی ۔

آپ فوراً جواب لکھئے اور یہ بتلائیے

(۱) توفیق صاحب کا مضمون بھیج سکتے ہیں ؟

(۲) نیا مضمون آسکے گا ؟

(۳) جو عزیز امروہہ گئے ہیں وہ کب تک آئینگے کیا ان کے ہمراہ آپ یہ دونوں تحریریں نہیں بھیج سکتے ؟

بچے سلام کہتے ہیں ۔ اہلیہ آداب ۔

فقط احقر

لطیف الزمان خان

۱۴۹۔ بی گلگشت ملتان

(۶)

دہلی ۶، اجمیری گیٹ، ۲ ... ۶

۲۴ ستمبر ۱۹۶۹ء

برادرِ مکرم تسلیمات ۔ میں نے دو ماہ قبل آپ کو خط لکھا تھا کہ اگر آپ دہلی تشریف لائیں تو میں کوشش کروں گا کہ دیوان کا عکس آپ کو مل جائے اور اس کی کچھ امید تھی۔ لیکن کام پر ہے کہ جو چیز میری اپنی نہیں ہے اس کے لیے میں قطعی وعدہ نہیں کر سکتا تھا۔ آپ نے لکھا کہ میرا خط ملا کہ آپ دیرا کے لیے درخواست بھیج چکا ہوں۔ میں منتظر رہا کہ آپ آج آئیں، کل آئیں ۔۔ مگر آپ نے پھر خاموشی اختیار کر لی۔ خدا جانے آپ نے کیا سوچا ہوگا۔ اگر ذہن میں کوئی غلط فہمی ہے تو وہ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک کہ ملاقات نہ ہو۔ اور اس دیوان کا قصہ اتنا طویل ہے کہ میں لکھ نہیں سکتا پورا دفتر درکار ہے جو کبھی زبانی ہی سنایا جا سکتا ہے۔ مختلف حضرات مالک کو بہکانے اور بیوقوف بنانے میں پوری طرح سرگرم عمل ہیں اور بعض نے تو سطحی اخلاق اور پست کرداری کا مظاہرہ کرنے میں بھی شرم محسوس نہیں کی۔ میرا ابتدا سے خیال تھا، بلکہ خواہش تھی کہ کسی طرح اس کی نقل یا عکس آپ تک پہنچ جائے لیکن میں آپ کی ملاقات ایک ضروری خیال کرتا تھا۔

بہرحال اب صورتحال یہ ہے کہ میں نے نقوش کے غالب نمبر حصہ دوم کے لیے وہ عکس حاصل کر لیا ہے۔ میں تین ہفتے کے لیے حیدرآباد چلا گیا تھا اور ابھی ۲۴ کو واپس آیا ہوں اس سفر سے پہلے کوئی ایسا جانے والا نہیں ملا جس کے ہاتھ بھیج دیتا۔ اب میرے ایک بزرگ عزیز یہاں سے دہلی ۲۶ کو روانہ ہوں گے دو یکم کو لاہور پہنچیں گے انھیں میں نے عکس دے دیا ہے اور آپ کا پتا بھی بتا دیا ہے یہ میرے چچا ہیں۔ آپ سے وہ گھر پر یا نقوش کے دفتر میں آ کر ملیں گے اور دیوان کا عکس آپ کو دے دیں گے اس کے صفحات کے نمبر ہر عکس کی پشت پر موجود ہیں آپ اسی ترتیب سے اُسے جمع کر کے صرف عکس چھاپ دیجیے اور ابتدا میں ایک صفحہ پر "دیوان غالب نسخہ امروہہ" لکھ کر نیچے "حاصل کیا ہے: ... اور میرا نام لکھوا دیجیے۔ یہاں دو حضرات نے اس کا عکس اور حاصل کیا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ سے غالب نمبر حصہ دوم میں پہلا چھاپ دیں، کتابی صورت میں یہ بعد کو

شائع ہوں اشاعت کے بعد یہ تصاویر آپ لطیف الزماں خان صاحب کو دے دیں۔ یہ دراصل انہیں کے لیے ہیں۔ جب یہ عکس آپ کے قبضے میں آ جائیں تو آپ مجھے فوراً مطلع کریں اور یہ بھی ضرور بتائیں کہ غالب نمبر حصہ دوم کب تک مارکیٹ میں آ جائے گا۔

آج کل حکومت پاکستان نے کتابوں اور رسالوں کی برآمد پر پابندی لگا دی۔ اس لیے پاکستان کا کوئی اخبار یا رسالہ یہاں دیکھنے کو نہیں مل رہا ہے۔ آپ ہر چیز رجسٹری سے لطیف الزماں خان صاحب کو بھیج دیا کیجیے وہ محفوظ رکھیں گے اور یہ قانونی دشواریاں دور ہوں گی میرے پاس بھجوا دیں گے۔

اس خط کے جواب کا سخت انتظار رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب آپ کے دوسری اکتوبر کو ملیں گے۔ جس دن وہ ملیں اسی دن خط لکھ دیجیے گا۔

والسلام

نثار احمد فاروقی

نوٹ: براہ کرم غالب نمبر حصہ ۲ کی اشاعت سے پہلے عکس کے حصول یا نمبر میں شمول کا حال سختی سے صیغۂ راز میں رکھیے گا۔ وہاں کے ادبی حلقوں میں یہ پہلے سے معلوم نہ ہو۔ اس کی بہت زیادہ تاکید ہے۔



محبی گرامی۔ السلام مسنون۔ شکریہ کہ آپ نے یاد فرمایا۔
میں مجلہ آپ کے خط کا منتظر ہوں۔ میں نے آپ کو ۱۸ر اگست
۲۲ر اگست، ۳ ستمبر، ۲ ستمبر اور ۸ر ستمبر کو کراچی سے خط لکھے
۱۹ر ستمبر کو ملتان سے ایک خط لکھا۔ آج تک یہ نہیں معلوم ہوا
کہ یہ خطوط آپ کو ملے یا گم ہو گئے۔

(۲) ۴ر اکتوبر کو رجسٹرڈ پیکٹ ملا جس میں ... آپ کا
کرم ہے اور میں بہت ممنون ہوں۔ چنانچہ جس کی فہرست ... گیا۔ جس کو شمارہ ساتھ ہے۔ حسب ذیل تحفے رسائل
انہوں نے عنایت فرمائے:۔

(۱) شمع حیات (غالب نمبر) (۲) سنگ میل (غالب نمبر)
(۳) شاعر۔ (غالب نمبر) (۴) استادیہ حصہ اول و دوم (غالب نمبر) (۵) اردو ادب (غالب نمبر) (۶) صبا برغالب
(۷) جامعہ (غالب نمبر) ایک فلسفی شاعر غالب ارشاد میں ... ۔

چنانچہ کراچی سے واپس آیا تو دل بہت خوش ہوا اور ... کام کیا ہے اس کو دولت کو دیکھا یا ... مقامیر
ناموں کی خدمات کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ ... ان کی خدمات کی ترجمانی ہو گی
اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس کا اجر آپ کو دے گا۔

(۳) ولید صاحب سے ملا۔ ... سے علیحدہ ہونے کے بعد ان کی حالت کچھ اچھی نہیں رہی۔ ... کی
پانچ یا چھ کتابیں کمپوز ہو چکی ہیں ... کام رکا ہوا ہے۔ سید صاحب نے ... کر کے
خدمت غالب کی ... ذرا مدد کیجیے۔ اگر انہوں نے امداد کی تو پھر میں اپنے ... ولید صاحب کو
... شائع کر دیں۔ ... کیونکہ ...
جس ... کے ختم ہونے سے قبل کمپوز ہو چکی تھی۔ بہرکیف اب زیادہ وقت نہ لگے گا۔

(۴) سید صاحب دیوان غالب شائع کرنا چاہتے ہیں لیکن ... ان کے اندازے کے مطابق جس قسم کا دیوان میں شائع کرنا چاہتا ہوں اس پر کم از کم چالیس پچاس ہزار روپے کی لاگت آئے گی۔ کیونکہ غالب کا دیوان اگر شائع ہو گا تو نہایت شاندار۔ طباعت کا
ایسا نمونہ ... میں قبول ... ۔

(۵) میں لطیف صاحب سے ملا۔ وہ نقوش کا ایک اور غالب نمبر شائع کر رہے ہیں۔ یہ معلوم ... ہو گا
جس نمبر میں غالب کی نایاب اور کمیاب تحریریں ہوں گی۔ ... کا اصل نسخہ ... کے
پاس ہے اور بارہ ہزار ... موجود ہیں ... صاحب ... ہزار مانگتے ہیں۔ لطیف صاحب اس کو حاصل کرنے کی
کوشش کر رہے ہیں اور امید ہے کہ کامیاب ہو جائیں گے۔ پھر وہ ... صفحات پر اسے شائع کریں گے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] لطیف صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible] اگر آپ اجازت دیں تو [illegible]

[illegible] اگر آپ اجازت دیں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اجازت دیجئے۔ اگر آپ نے اجازت نہ دی تو [illegible]

[illegible] غالب [illegible] شائع [illegible]

(٢) [illegible] دیوان غالب شائع [illegible] انگلستان [illegible]

[illegible] انگلستان [illegible]

[illegible]

(٧) [illegible] حیدرآباد [illegible] غالب [illegible]

[illegible]

[illegible]

(٨) [illegible]

[illegible]

(٩) عبداللہ [illegible]

[illegible]

[illegible] فقط

احقر

(١٠) [illegible]

(١١) [illegible]

١٣٢ / بیگم [illegible]

[illegible]

[illegible]

لطیف الزماں خاں ایم-اے
لیکچرر شعبۂ انگریزی
گورنمنٹ کالج ملتان



مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء
عید سعید مبارک

//

برادرم! السلام علیکم۔ مشتبہ ذہنی انتشار کے عالم میں آپ کا ۲۰ ستمبر کا مکتوب مجھے کل سہ پہر ملا۔ میں ۸ اکتوبر کو ہی ایک عریضہ روانہ کر چکا ہوں امید ہے ملا ہوگا۔

جلال الدین صاحب اور مسلم ضیائی صاحب کے مضامین کے تراشے آپ کو دے لیکن [illegible] خدا ہی آپ کو ان کے انشا و ستیاب ہونا اب مشکل ہے۔ عام طور پر روزنامے کی کاپی مشکل سے ملتی ہے۔ پرمٹ تو واقعی مل گیا لیکن ابھی سنٹرل بنک سے No objection certificate نہیں ملا ہے یہ سرٹیفکیٹ کراچی سے ملے گا۔ اصل پرمٹ بھیج دیا گیا ہے۔ امید ہے ہفتہ عشرہ میں سارے معاملے طے ہو جائیں گے اور میں آپ کو قیمت روانہ کر سکوں گا۔ میرے معلوم ہو سکا۔ اور ان کتب و بیاض کی مقدار کہ سے کتنے پرمٹ مل سکتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ پرمٹ مل سکا تو آپ کو مطلع کروں گا۔

میری گذشتہ خط میں نسخۂ عرشی غالب کے بارے میں لکھ چکا ہوں کہ ولیہ صاحب کی طرف سے ان دونوں کتب کی [illegible] کی اجازت کا وعدہ کیا تھا میں خود ۷ اکتوبر کو شام کو ان سے گفتگو کا موقع ملا۔ اور کوئی ان سے ابھی مستعد نہیں ملا تھا میں آج ہی ولیدہ صاحب کو خط لکھ رہا ہوں کہ اگر سہیل صاحب مدد کر سکیں تو [illegible] ورنہ میں خود اس کا انتظام کر لوں گا۔ انشاء اللہ چند دنوں میں یہ کتاب بازار میں آ جائے گی۔ نسخۂ عرشی غالب کے لئے اجازت کی ضرورت پیش نہ آئے گی کیونکہ ان کا نسخہ [illegible] ہونے سے پہلے ہی چھپ گیا تھا۔ اب تو صرف جلد بندی باقی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی ایڈیشن بازار میں ہوگا۔

میں نے تو آپ کو پہلے ہی لکھا تھا کہ جلال الدین صاحب نے نسخۂ امروہہ کا دوبارہ [illegible] سے جیسا خود بیان کیا ہے۔ مجھے یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اس سلسلے میں قلم اٹھانا پسند نہ کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ولایت کی اخبارات اور رسائل اب پاکستان میں بغیر پابندی کے نہیں آتے ہیں۔ آپ اگر طفیل صاحب کو کوئی رسالہ بھیجیں تو وہ پہنچ جائے گا اس سلسلے میں کراچی کے کسٹم افسروں سے اجازت لینی ہے۔ البتہ ہندوستان سے رسالے پہنچ سکتے ہیں۔

ہاں آپ نے اور توفیق صاحب نے یہاں کی زبان میں صورت حال سے لوگوں کو واقف کرا دیا ہے یہ اچھی بات ہے۔ یہ تو ماننے والی بات ہے۔ اور جلال الدین صاحب کے اس بات سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ آپ جو ہم لکھیں یا توفیق صاحب کے ہیں دہلی کے اخبار اور رسالوں میں صحیح حالات سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ اگر آپ یا توفیق صاحب [illegible] نقل کر کے (چھپا ہوا تو اچھا نہیں) بھیج دیں تو یہاں کے اخبارات و رسائل میں ان مضامین کو Reproduce کرایا جا سکتا ہے۔

یہاں آج اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ڈاکٹر مختار الدین خان نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کا ایک اپنا نسخہ دیوان غالب بھی ہے جس کا متن بہت کچھ مختلف ہے۔ یہاں ابھی کسی اور نے ان کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ کیونکہ یہاں کے صحیح مستند نسخے شائع ہو چکے ہیں اور یہاں بھی۔ [illegible] ہے۔ بہر حال انشاء اللہ یہ نسخہ آپ کو بھیج دوں گا۔

[illegible]

[illegible]

شائع ہوگا۔ [illegible] — خود سمجھئے۔

میرے چچا جان کا خط آیا [illegible]

[illegible] حنیف صاحب [illegible]

[illegible] حنیف صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible]

آپ [illegible] توفیق صاحب [illegible]

[illegible] نقوش کا [illegible] ۔ [illegible] عبدالرحمٰن چغتائی [illegible]

[illegible] نقوش میں شائع ہوگا [illegible]

[illegible] حنیف صاحب [illegible]

[illegible] نقوش [illegible] شائع ہوگا [illegible]

[illegible]

اردو نامہ [illegible] اور نقوش [illegible]

[illegible]

[illegible] دیوانِ غالب [illegible]

حنیف صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible]

حنیف صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چچا جان نے [illegible]

[illegible] توفیق صاحب کا مضمون [illegible] اور نقوش [illegible]

[illegible]

[illegible]

حنیف صاحب [illegible]

[illegible] ۱۳۹ [illegible]



لطیف الزماں خاں ایم۔اے
لیکچرر شعبہ انگریزی
گورنمنٹ کالج ملتان

مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء

۷۸۶

برادرم۔ السلام علیکم۔ آپکا ۲۱ ستمبر کا لفافہ جو دیا ہے ۲۶ ستمبر (ڈاکخانہ لاہور کی مہر کے مطابق) کو روانہ ہوا مجھے ۹ اکتوبر کو ملا تھا میں نے دوسرے روز آپکو جواب لکھ دیا تھا۔

آپکا ۲۰ ستمبر کا کارڈ مجھے کل یعنی ۱۱ اکتوبر کو ملا۔ خدا جانے ڈاک اسقدر دیر سے کیوں آ رہی ہے۔ میں آپکو گذشتہ خط میں لکھ چکا ہوں کہ چھاپے کا خط جو انہوں نے ۱۷ ستمبر کو لکھا تھا مجھے ۴ اکتوبر کو ملا جس میں لکھا تھا کہ میں ۲۰ کو لاہور پہنچوں اور تمام چیزیں حاصل کروں چنانچہ طفیل صاحب گئے اور سب چیزیں جن کا ذکر گذشتہ خط میں کیا تھا جب ۹ اکتوبر کو آپکا خط ملا تو میں نے طفیل صاحب کو مضمون کہ وہ آج لاہور تشریف لے گئے۔ آپ کو کی تکمیل اور تکمیلِ اشاعت ہو گی۔ طفیل صاحب کو آپکا خط مل چکا ہے۔ ان سے جو گفتگو ہوئی ہے اس سے متعلق میرا خیال اور درج ذیل ہے خیال اشاعت کا تھا کہ "نقوش" کا غالب نمبر حصہ دوم دسمبر میں شائع کریں لیکن اب وہ نومبر ہی میں شائع کر رہے ہیں۔ مضمون طفیل صاحب کا اگر آپ بھیج دیں تو وہ بھی شامل کر لیا جائے گا۔ نیز اگر نیا مضمون بھیج دیا تو کتاب وغیرہ بھی "نقوش غالب" والا مضمون بھی شامل کر لیا جائے گا۔

طفیل صاحب چاہتے ہیں کہ میرا ذکر بھی آئے لیکن مجھے نام وغیرہ سے نفرت ہے میں نے اپنی سختی سے منع کیا ہے لیکن اگر وہ کسی مصلحت کی بنا پر میرا نام شامل کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اعتراض نہ ہوگا۔ طفیل صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ تکمیل کی ذمہ داری آپ نے بھیجا ہے اس مضمون کا یا دوسرے کسی کی ذمہ داری میری ہے بس اور کچھ نہیں۔ آپ یہ پتہ کر کے کہ نقوش صاحب کو کیا مل گئے میں آپ کو بھیج دیں گے کہ آپ نے جو مضمون لکھا تھا وہ شامل کر لیا جائے گا۔ یا اگر نیا مضمون بھی ہو گا تو آپ بھیج سکتے ہیں۔ طفیل صاحب کا فرمانا ہے کہ

آ گرم کو جلال الدین صاحب نے بتایا کہ اخبارات و رسائل میں مضامین شائع کرا رہے ہیں لیکن جو تحریر خوش ہی ہوگی وہ مجھ تک پہنچ جائے گی نیز دیر بھی ہوگی۔ مطلب یہ کہ کوشش اس امر کی ہوگی کہ کم از کم پتا کر لیا جائے کہ صحیح صورت حال کا علم ہو سکے۔

آج طفیل صاحب آئے تھے اور دو گھنٹے رہ کر چلے گئے۔ میں نے دوپہر کو کھانا کھلایا اور لوگوں کو بھی کھانے پر مدعو کیا تھا۔ ان میں آپکے صاحب مسعود رشتہ دار ہیں۔ مسعود اشرف صاحب مرشد صاحب کے عزیز ہوتے ہیں اور مرشد صاحب ڈاکٹر عبد الغنی صاحب کو ہم لوگوں سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ مسعود صاحب نے بتایا کہ اکبر علی خاں صاحب اپنی زبانی اسی روز کا واقعہ بھی بتا چکے کہ جو انہوں نے نسخہ امروہہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ تحقیق کرا رہی کہ یہ تحریریں بھیجی ہیں۔ غرض آپکے حروف خبط کی ہیں۔ مقصد تو یہ ہے کہ ہر چند تنہا چاہتا ہوں اور دوسروں کی ہو تاکہ ان کو محققانہ علم

قدیم رسالہ ہے۔ [illegible] نام [illegible] ذریعہ غالب کا کلام [illegible] سے متعلق کچھ [illegible] ہے۔
[illegible]

[illegible] توفیق صاحب [illegible] مشغول [illegible] تو اپنی تحریر [illegible]
[illegible] دیوان غالب کے نسخے اگر چھاپے جائیں تو [illegible]
[illegible] اس پر [illegible] تھا اور اب [illegible]
[illegible] توفیق صاحب کو [illegible] نام سے عکس شائع کر دیں گے —
[illegible] نقوش [illegible] صاحب کو بھیج [illegible] چھاپ [illegible]
[illegible] ہے۔
[illegible] سلیمان احمد صاحب [illegible] کو بھیج [illegible]

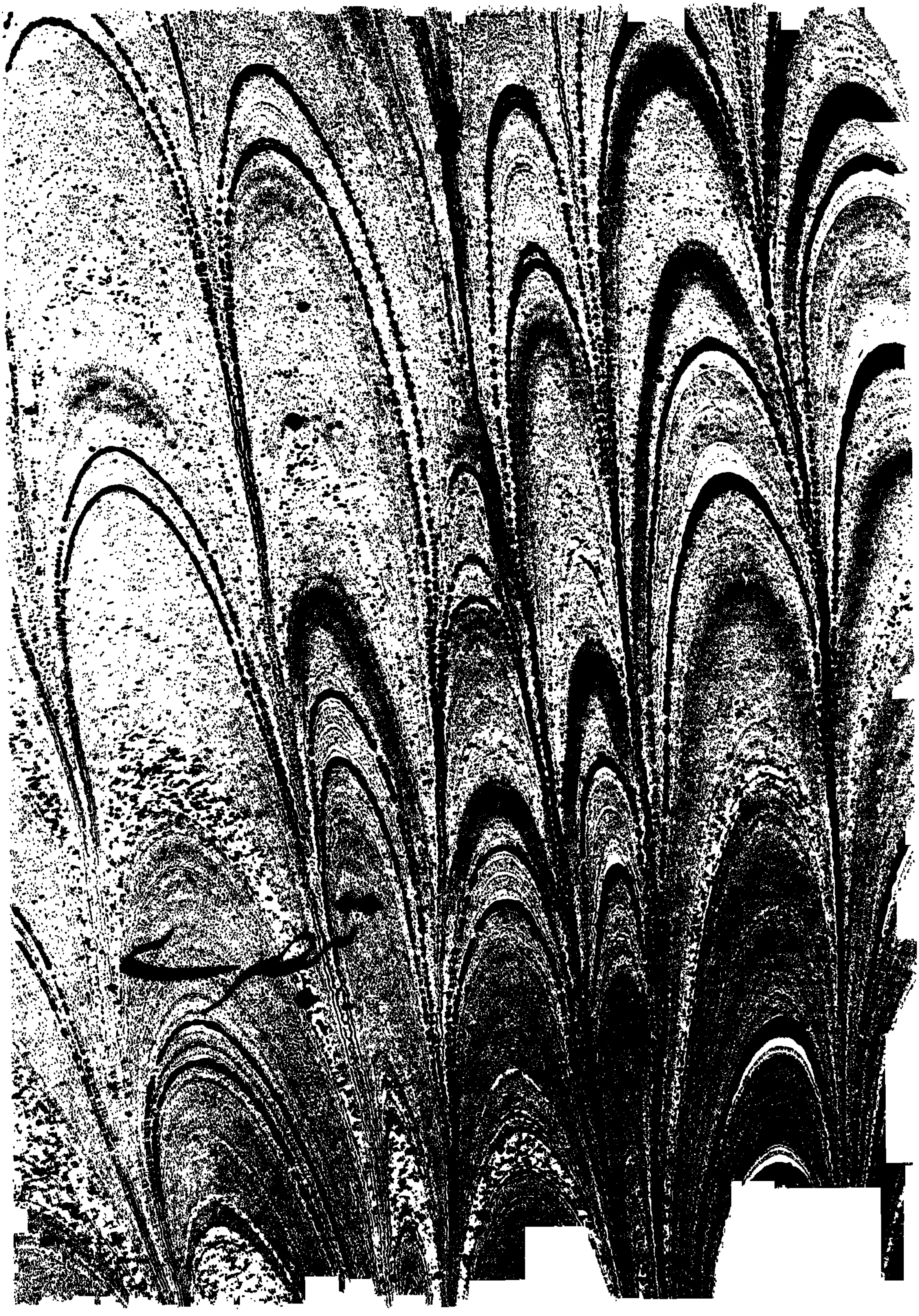
اگر [illegible] ولید صاحب نے کوئی جواب نہ دیا تو میں [illegible] لاہور چلا جاؤں گا [illegible]
[illegible] اور کوشش [illegible] مضمون [illegible] دیوان غالب
[illegible] وہ مضمون [illegible] بھیجوں۔

[illegible] فوراً [illegible] صاحب
بھیج [illegible] صحیح [illegible]
غالب کا عکس اور [illegible] غزل [illegible]
[illegible] صحیح [illegible]
[illegible] ہو جائے گی۔

آپ فوراً جواب لکھئے اور یہ بتلائیے
(۱) توفیق صاحب کا مضمون بھیج سکتے ہیں؟
(۲) کیا مضمون آ گیا؟
(۳) جو حزیں امروہوی [illegible] کا [illegible]
یہ دونوں تحریریں بھیج سکتے ہیں؟

بچوں کو بہت بہت [illegible]۔ مخلص
احقر
[illegible]

۱۴۹-بی [illegible] ملتان



سفر گشت
(ایک خاص نقطۂ نظر سے)

عاصی کرنالی

"میں اب پرتو روہیلہ نہیں ہوں۔"

"میں اب صرف ایک پاکستانی ہوں"

"بلکہ میں اب صرف اور صرف پاکستان ہوں۔"

— یہ الفاظ "سفر گشت" میں لکھے ہوئے نہیں ملتے۔ لیکن میرا یقین ہے کہ جب پرتو روہیلہ نے سرزمینِ امریکہ پر پہلا قدم رکھا ہوگا تو یہ خیالات اُن کے دل کی فضاؤں میں گونج رہے ہوں گے۔ وہ پاکستان کو اس طرح اپنے ساتھ لے کر چلے کہ پاکستان اُن کے دل میں دھڑکتا تھا۔ اُن کے جسم میں لہو بن کر گردش کرتا تھا اور اُن کی آنکھ سے جھلملاتا تھا!

ممتاز مفتی کو بچھیرے کی طرح اچھل کود کرنے والا، چٹکیاں بجانے والا اور غنڈی آنکھ سے امریکہ دیکھنے والا پرتو روہیلہ اچھا لگتا ہے۔ میں کہ مفتی کی خاکِ پا سے بھی کم تر ہوں، مجھے وہ پرتو بھاتا ہے جو مبصر ہو، مدبر ہو، مفکر اور متفکر ہو —— پرتو کے یہاں مزاح ہے، خالص مزاح اور پرتو بقول مفتی صاحب تنگی سے تنگی بات مزاح کے سموسے میں بھر دیتا ہے لیکن میں کیا کروں؟ جب میں پرتو کے اس مزاح کو نچوڑتا ہوں تو اُس میں سے خونِ جگر کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں——

مجھے سلیم رضا آصف نے کہا۔ "پرتو صاحب کے سفرِ امریکہ کو پڑھنا ہے اور اُس پر کچھ لکھنا ہے" —— میں نے کہا۔ "پچھلے دنوں میرے اور امریکہ کے تعلقات کے درمیان خلیج حائل ہو گئی ہے۔ تاہم مَیں پرتو روہیلہ کو پڑھوں گا اور اُس پر لکھوں گا اس لئے کہ اُس شخص نے جب امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو وہ دل سے آنکھ تک صرف اور صرف پاکستان تھا۔"

پرتو روہیلہ کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید پاکستان میں رہتے ہوئے اس نے امریکہ کو کبھی یاد نہ کیا ہو لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ امریکہ میں وہ کسی لمحے اپنے وطن کی مٹی، اس کے رنگ، خوشبو اور ذائقے سے بے تعلق ہوا ہو۔ وہ جب پانچ ماہ کے سفر گشت کے بعد وطن کی جانب لوٹتا ہے تو وہ بے ساختہ لکھتا ہے:

"مسافر گھر سے ۸ جون ۱۹۸۴ء کو نکلا اور ۲۲ نومبر ۸۴ء کو واپس جارہا تھا۔ اور سینکڑوں میل دور ہی سے وطن کی مٹی اور گھر کے آنگن کی خوشبو نے مَست کیا ہوا تھا۔"

امریکہ کے دورانِ قیام اور لمحاتِ سیر و سفر میں وہ قریب قریب ہر واقعے، ہر ماحول، ہر منظر کو پاکستان کے حوالے سے دیکھتا، جانچتا اور پرکھتا ہے۔ کبھی تقابل سے اور کبھی تضادات کو ابھار کر وہ بے لاگ تبصرہ کرتا چلا جاتا

ہے۔ اگر امریکہ کی کسی جھلک میں اُسے کوئی خوبی نظر آتی ہے تو اپنے دیس کی خامی کی نشان دہی سے نہیں چوکتا اور اگر امریکہ کے تقابلی مشاہدے میں اُسے اپنے وطن کے اوصاف نمایاں نظر آتے ہیں تو وہ فخر و مباہات کا برملا اظہار کرتا ہے۔ اُس کے یہاں پٹھانوں کے موروثی اور قبائلی اوصاف ، مثلاً سادہ طبعی ، صاف گوئی ، بے باکی اور ایک ایسے کھرّے پن کا احساس ہوتا ہے جو مغربی تہذیب و تمدن کی چکاچوند دیکھ کر سرنڈر نہیں کرتا! ۔ اُس نے اپنے قلم کی تیز دھار سے امریکہ کے پورے جسم کو ہمارے سامنے کھول کر ڈال دیا ہے اور اُس کے ظاہر و باطن کی ساری خوب صورتی اور ساری غلاظتیں ہمارے سامنے ڈھیر کر دی ہیں اور ہمیں بیک وقت خوشبو اور سڑاند کے مرکّب احساس کے حوالے کر دیا ہے!

پر تو روہیلہ "**Punks**" کے تناظر میں امریکہ کی معاشرتی زندگی کو کرید تا ہے وہ کہتا ہے:۔ "اس منفی تحریک میں شامل لڑکے اور لڑکیاں اپنی انفرادیت کا اظہار لباس کی کثیف اور غلیظ عجوبگی اور بالوں کے سٹائل سے کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے یہاں کے ملنگوں کے فلسفۂ حیات پر کاربند ہیں"۔ یہ مسئلہ بقول پر تو صاحب اُس وقت تک حل ہوتا نظر نہیں آتا ، جب تک اُن کے فلسفۂ حیات میں تبدیلی نہیں آتی۔

کتاب کے صفحہ ۹۷، پر ناسی ریمہ کی جادوئی رسومات کا ذکر ہے۔ یہ قبیلہ آج سے ۲۰ سال قبل پروفیسر لنٹن کے وسیلے سے دریافت ہوا تھا۔ یہ اپنے شب و روز کا بڑا حصّہ اپنے جسم کی ساخت پرداخت میں گزارتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ انسانی جسم انتہائی کریہہ المنظر اور راغب بہ امراض و ریخت ہے۔ چنانچہ وہ چند جادوئی رسومات کے ذریعے اپنے جسم کو بنانے سنوارنے میں لگے رہتے ہیں ۔ پر تو روہیلہ نے اس قبیلے کے آئینے میں امریکہ کی تنگی ۔ اور جسمانی نمائش میں مبتلا معاشرت کو دیکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"دراصل یہ مضمون امریکی سوسائٹی پر ایک بھرپور طنز ہی نہیں، اُن کے طرزِ معاشرت پر بھی ایک زوردار پھبتی ہے۔"

کرافورڈ نامی ایک امریکی ، جہاز کے سفر میں ہم نشیں ہے۔ وہ اچانک پوچھتا ہے۔ "آپ **Practising** مسلم ہیں؟" ـــــ تب یہ سادہ دل مسلمان خود احتسابی میں محو ہو جاتا ہے۔ "مختار علی خاں! کیا تم نے کبھی اپنے کسی غریب عزیز کے لئے اپنے ضروری اخراجات کو روک کر مالی امداد کی کوشش کی؟۔ تم نہ مسلم ہو ، نہ باعمل ہو ، تم منافقوں کی ایک بے ضمیر قوم کے بے ضمیر فرد ہو، ـــــ یہ پر تو کا ایک انفعالی احساس ہے، وہ پر تو جو سفر کے دوران میں سر سے پاؤں تک پاکستان تھا۔

شو بھانہ ، انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے سب لوگوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے امریکہ کی طرزِ معاشرت کا تعارف کراتی ہے۔" یہ معاشرہ بہت زیادہ قانون پرست ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں سرکاری افسر ایک خاص امتیازی سلوک کے عادی ہوتے ہیں لیکن یہاں کے معاشرے میں ہر فرد برابر ہے۔ چاہے امریکہ کا صدر ہی کیوں نہ ہو۔ وہ کوئی برتری نہیں رکھتا۔ وہ کہیں گاڑی پارک کرنے لگتا ہے تو کوئی دوسرا اُس کی لئے جگہ نہیں چھوڑتا" ـــــ اُس وقت پر تو روہیلہ

کا دل کہہ رہا تھا:۔ "یہ ساری خصوصیات تو اسلامی معاشرے کی ہیں۔ یہ سور کھانے والے ہمارے معاشرے کی قدریں چھین کر لے گئے۔"

والڈن بک شاپ پر جاتے ہیں۔ ایک شیلف کے قریب لوگوں کی لمبی قطاریں ، سامنے پلے بوائے، پلے گرل ، پینٹ ہاؤس ، تازہ ترین رسالوں کی قطار ، عریانی اور فحاشی کا جاذبِ نظر سیلاب، دل و نظر کے سفینے بہنا چاہتے تھے کہ بقول پر تو صاحب:۔ "ضمیر قریشی جو برسوں سے مردہ ہو چکے تھے، قبر میں کروٹ بدل کر ڈانٹتے ہیں کہ تیرا شیطان آج بھی زندہ ہے؟" —— ضمیر کی ملامت اس لئے تھی کہ ایک فرد پورا پاکستان اپنے دل اور آنکھ میں لئے گھوم رہا تھا!

پھل مارکیٹ میں گھستے ہیں۔ مدتوں کے ترسے ترسائے ، خوبانی اور آڑو خریدتے ہیں، کیا خوش رنگ ، کیسے تن و توش والے پھل ، —— کھاتے ہیں تو بے مزہ ، کسیلے ، —— وطن یاد آجاتا ہے۔ وطن کے پھلوں کی لذت ، شیرینی ، خوشبو ، ذائقہ ، رَس ، بے قرار کرتے ہیں۔ زبانِ قلم سے نکلتا ہے:۔ "اے مسافر! یہاں کی چیزوں کے رنگ روپ پر نہ جا۔ رس اور مٹھاس ہر مٹّی کی خاصیت نہیں ۔ یہ امریکہ ہے، یہاں زور صورت پر ہے ، سیرت پر نہیں" ——

امریکہ میں خوراک کا ضیاع بے تحاشا ہے۔ کام کرنے والی عورتیں کوڑے کے ٹینوں میں سیروں کے حساب سے غذائی اشیا پھینک دیتی ہیں۔ پر تو کا پاکستانی دل تڑپ اٹھتا ہے:۔

"اِس دنیا میں کتنے لاکھوں انسان ہیں جنہیں کئی کئی وقت کھانے کو نہیں ملتا۔ ایک یہ معاشرہ ہے جس کے خوش حال لوگ ٹنوں خوراک نالوں میں بہا دیتے ہیں ، سمندر میں غرق کر دیتے ہیں۔"

امریکہ کے نظم و ضبط کو دیکھ کر وطنِ عزیز کی بد نظمی پر پر تو کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ وہاں کی لائبریریاں حسنِ انتظام ، صفائی ، سلیقہ مندی اور اہلِ مطالعہ کی نفاست و اصول پسندی کا آئینہ ہیں۔ پر تو کہتے ہیں:۔

"ہم لوگ مسجدوں میں بھی وہ آداب نہیں برتتے جو میں نے یہاں لائبریری میں دیکھے۔"

ڈزنی لینڈ کے انتظامات کا ذکر کرتے ہیں۔ ہزاروں کاریں ایسے نظم و ترتیب سے پارک ہوتی ہیں کہ کوئی کار پھنستی نہیں۔ کوئی دھینگا مشتی نہیں کرتا۔ پر تو کہتے ہیں:۔

"حالانکہ اُن میں سے کوئی نماز نہیں پڑھتا لیکن نماز کی روح ان لوگوں نے لے لی ہے۔" ملتِ اسلام کے حوالے سے کہتے ہیں:۔

"جس قوم کو اسلام نے تنظیم نہیں دی، اس کو دنیا کا کوئی نظام ، چاہے خالصۃً سیاسی ہو یا کلیۃً فوجی ، تنظیم نہیں دے سکتا۔"

۴ر جولائی کی تقریبات دیکھنے جاتے ہیں۔ خلقت کا یہ عالم کہ کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ انسانوں کا سیلابِ عظیم ۔ لیکن اس انبوہ میں بھی تنظیم تھی۔ پھر اس تنظیم کی منظر کشی کے بعد وطنِ عزیز کی تقریبات سے تقابل کیا گیا

ہے ـــ اپنے ملک کی تقریب، پانچ چھ سو افراد۔ ـــ فرماتے ہیں۔ "جب کھانے کا اعلان ہوا تو اُس وقت اِس امّتِ مسلمہ کی، کہ ہزاروں سال سے پانچ وقت کی نماز پڑھ رہی ہے اور ایک ماہ کے روزے رکھ رہی ہے، بد نظمی دیکھنے کے لائق تھی" ـــ پھر دل کی تڑپ اُن سے یہ لکھواتی ہے: "اِس قوم کے مبلغوں اور پرچارکوں کو کہ جو بزعمِ خویش دنیا کو اخلاق و حیا کا درس دینے چلی ہے، سرِ عام بازاروں میں، سڑکوں پر بڑے دھڑلّے سے شلوار میں ہاتھ ڈالے، کمربند کو دانت سے دبائے استنجا کرتے دیکھا ہے۔"

مسٹر برنارڈشلز ۲۷ جولائی کو اپنا آخری لیکچر دیتے ہیں۔ بعد میں تمام طلبہ سے اُن کے ملکوں کے مسائل دریافت کرتے ہیں۔ حاضرین باری باری بات کر رہے ہیں۔ تائیوان کے مسٹر وو کہتے ہیں، جب سے ہم نے امریکہ سے دوستی کی ہے، ہمارے مسائل خود بخود حل ہو گئے ہیں۔ پرتو کی باری آئی تو دکھ بھرے لہجے میں کہا:۔

"پاکستان ایک نظریاتی مملکت خداداد ہے۔ اس کو خدا نے بنایا ہے۔ اس لئے ہم نے اِس مملکت کے مسائل بھی خدا پر چھوڑے ہوئے ہیں۔"

پاکستانی امریکہ میں کیسی زندگی گزارتے ہیں۔ وہاں کی بے حیا تہذیب کے اثرات مسلمانوں کی "امریکہ زاد" نسل پر کس طرح پڑ رہے ہیں۔ اِس دکھ کا مداوا اور اس پیچیدہ معاشرتی مسئلے کا حل کیا ہے؟۔ اِن تمام امور کا! ایک مدبر و مفکر پاکستانی کے انداز میں، پرتو نے تجزیہ کیا ہے اور اپنے دل و روح کے بہت سے زخموں کی نمائش کی ہے ـــ

امریکہ میں رہنے والے پاکستانیوں میں اجتماعیت اور یگانگت کا زبردست احساس ہے اور اس کے عملی مظاہر بہت اثر انگیز ہیں۔ پاکستان ہاؤس میں پاکستانی طلبہ میں جذبۂ یگانگت دیکھ کر پرتو کہتے ہیں:۔

"یہ بچے ہمارے ملک ہی کے نہیں، ہماری ثقافت اور ہمارے فلسفۂ حیات کے بھی سفیر تھے۔ انہوں نے یہاں ایک چھوٹا سا پاکستان قائم کر رکھا تھا۔"

آخر میں (بلاتبصرہ) پرتو روہیلہ کے ان جملوں پر مَیں اپنی گفتگو تمام کرتا ہوں:۔

"آرکسٹرا نے تقریباً پونے آٹھ بجے سب سے پہلا آئیٹم جو شروع کیا وہ امریکہ کا قومی ترانہ تھا۔ پچاس ہزار کے مجمع نے کھڑے ہو کر آرکسٹرا کی دھنوں کے ساتھ گانا شروع کر دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرے اردگرد ہر چیز میں ارتعاش پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے بھی اپنی پوری آواز سے پاکستان کا قومی ترانہ گانا شروع کر دیا۔ 'کشورِ حسین شاد باد' 'شاد باد منزلِ مراد'۔ جب ترانہ ختم ہوا تو ذکیہ نے مجھ سے پوچھا:

"مختار بھائی! آپ کو امریکی ترانہ آتا ہے؟'

میں نے جواب دیا۔ "نہیں"

[illegible] "تو آ[illegible] گا رہے تھے؟

جب میں نے کہا کہ مَیں پاکستانی ترانہ گا رہا تھا تو ذکیہ نے بھی ہنستے ہوئے بتایا کہ وہ بھی پاکستانی ترانہ ہی گا رہی تھیں۔"

(جناب پرتو روہیلہ کی سفر گشت کی تعارفی تقریب (ملتان) میں پڑھا گیا)۔

جلیل قدوائی اور خاکسترِ پروانہ

سعید بدر

جلیل قدوائی ہمارے ملک کے بزرگ ترین ادیبوں میں سے ہیں ۔ وہ ماشاء اللہ زندگی کی اسی سے زائد بہاریں دیکھ چکے ہیں ۔ وہ دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں ۔ لیکن اُن کی بے شمار تحریریں ایسی ہیں جو غیر مدون حالت میں ہیں اور ہمارے سامنے نہیں ۔ وہ ایک طرف تو نثر کی وادیوں میں محو خرام دکھائی دیتے ہیں لیکن دوسری طرف شاعری اور وہ بھی غزل کی سنگلاخ زمینوں میں بھی کوہکنی کرتے نظر آتے ہیں ۔ انہوں نے اپنے پیشۂ تحقیق کو بھی آزمانے سے دریغ نہیں کیا اس لئے حقائق کی تلاش و جستجو میں بھی سرگرم عمل رہے وہ تنقید ، افسانہ نگاری ، ڈراما ، شخصی خاکہ نگاری ، یاد نگاری ، مکتوب نویسی غرضیکہ ادب کی متعدد اصناف میں سرگرم رہے ہیں ۔ ان کی زندگی صحیح معانی میں جہد مسلسل سے عبارت ہے وہ علامہ اقبال کے اس مصرع کی تصویر نظر آتے ہیں کہ

زندگی جہد است و استحقاق نیست

ان کی علمی زندگی کا آغاز شعبہ اردو کے استاد کی حیثیت سے علی گڑھ سے ہوتا ہے اور اسرار الحق مجاز ، علی سردار جعفری ، سعادت حسن منٹو ، شان الحق حقی ، اور جان نثار اختر ان کے شاگردوں کی فہرست میں نمایاں نظر آتے ہیں ۔ وہ حکومت کے محکمۂ اطلاعات سے بھی وابستہ رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہو گئے ۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے "راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی" کے نام سے اپنا ادارہ بھی قائم کیا ۔ وہ اپنی طوالت عمری کے باوجود کئی علمی و ادبی منصوبوں میں آج بھی سرگرم ہیں ۔

قدوائی صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۱۹ء میں ہوا جب انہوں نے اپنا پہلا مضمون لکھا جو مشہور رسالے "صوفی" میں منڈی بہاء الدین سے شائع ہوا ۔ ان کی تنقیدی تحریروں کے دو مجموعے "تنقیدیں اور خاکے" اور "تبصرے اور تذکرے" شائع ہو چکے ہیں ۔ ان کا تنقیدی سرمایہ بیشتر شاعری سے تعلق رکھتا ہے ۔

ان کی تنقید کا خاص موضوع غالب ، حالی ، اکبر ، اقبال ، حسرت ، فانی ، عزیز اور اصغر ہیں یہاں ہم اُن کی تنقیدی سفر کی داستان بیان کرنے کی بجائے شاعری کی جانب آتے ہیں ۔ حال ہی میں "خاکستر پروانہ" کے نام سے ان کا شعری مجموعہ شائع ہوا ہے جس میں ان کا کلامِ سابق بھی شامل ہے ۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "نقش و نگار" اور بعد میں "رنگ و نُور" کے نام سے شائع ہوا ۔ یہ ۱۹۳۰ء میں علی گڑھ سے چھپا ۔ دوسرا مجموعہ "نوائے سینہ تاب" ۱۹۵۱ء میں کراچی سے منصۂ شہود پر آیا ۔

انہوں نے اپنے مجموعہ میں غزلیات اور متفرق اشعار کی ترتیب ردیف وار رکھی ہے جو اگرچہ پرانا طریقہ ہے لیکن اُنہیں کئی وجوہات کی بنا پر پسند ہے ۔ انہوں نے عصر جدید کے اپنے احباب کے اصرار کے باوجود غزلوں کو زمانی اعتبار

سے ترتیب دینا زیادہ مناسب نہیں سمجھا ۔ ان کے خیال کے مطابق غزل خالص مشرقی صنف ہے اور اہل مغرب اپنی مختلف موضوعاتی نظموں کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیتے ہیں اس لئے ہمارے شاعروں نے بھی ان کی تقلید شروع کر دی ہے حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ شاعر نے جو غزلیں ابتدائی دور میں کہی ہوں وہ کمزور ہوں اور جو آخری دور میں کہی ہوں وہ تجربے اور مشاہدے کی بناء پر زیادہ بہتر ہوں ۔ کہا جاتا ہے کہ ترتیب زمانی سے شاعر کے کلام کے تدریجی ارتقاء کا پتا چلتا ہے لیکن اُن کے خیال میں دراصل ایسا نہیں ہے کیونکہ غزل کا تعلق تمام تر جذبات و کیفیات سے ہے موڈ بہتر ہو تو غزل بہتر ہوگی ۔

"خاکستر پروانہ" کے آغاز میں مشفق خواجہ نے ایک طویل مقدمہ "حرفے چند" کے عنوان سے لکھا ہے جس میں حضرت جلیل احمد قدوائی کی شخصیت اور فن کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں ۔ اس مقدمہ میں انہوں نے قدوائی صاحب کی تمام اصناف سخن کے بارے میں خامہ فرسائی کی ہے ۔ شاعری کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ "جلیل قدوائی نام اول اول حسرت موہانی کے مقلد کی حیثیت سے سامنے آیا اور آج بھی یہ خصوصیت ان کے نام کے ساتھ وابستہ ہے" اس سلسلے میں نیاز فتح پوری نے کہا تھا ۔

> "جناب قدوائی تنہا ایسے شخص ہیں جو شروع سے آخر تک اس رنگ پر قائم رہے ۔" وہ مزید لکھتے ہیں کہ "تقلیدی شاعری آج بھی کی جا رہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے تقلید اعلانیہ ہوتی تھی اب اعلانیہ نہیں ہوتی ۔ اب تقلید کرنے والے دوسرے کے رنگ سخن کو خود اپنے رنگ سخن کے طور پر پیش کرتے ہیں ۔"

دراصل حسرت موہانی اور جلیل قدوائی کے مزاجوں میں جو مماثلت پائی جاتی ہے وہ شاعری میں بھی موجود ہے ۔ دونوں کو کلاسیکی شاعری سے بے حد دلچسپی ہے ۔ طبع حسرت ہی نے نہیں جلیل نے بھی ہر استاد سے فیض اُٹھایا ہے وہ خود کہتے ہیں کہ

میں نے کچھ فیض ہر استاد سے پایا ہے جلیل
تب کہیں جاکے میسر ہے سخن داں ہونا

جلیل قدوائی کو خود بھی احساس ہے کہ ان کی شاعری رنگِ حسرت سے مزین ہے

رنگ حسرت کا جہاں ذکر آتا ہے جلیل
اکثر احباب میرا نام لیا کرتے ہیں۔

آج تیرے سوا جلیل کوئی
رنگ حسرت میں کامیاب نہیں

جلیل قدوائی کو چونکہ رنگ حسرت سے فطری مناسبت تھی اس لئے اُنہیں جو کامیابی پیرویِ حسرت میں حاصل

ہوئی وہ کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہو سکی ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ رنگ حسرت کے اشعار کے پہلو بہ پہلو جلیل کے ہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں ان کی اپنی "انفرادیت" موجود ہے ۔

حسرت نے محبوب کو حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے اور حسرت کی اس جرأت نے اردو کی عشقیہ شاعری کو انقلابی موڑ تک پہنچادیا جس کی وجہ جلیل سمیت کئی شاعروں کو اظہار کی سہولتیں میسر آئیں جلیل کی شاعری میں ہمیں محبوب کی حضوری کا احساس ہوتا ہے بلکہ بعض مقامات پر محبوب کی شخصیت حاوی نظر آتی ہے ۔ مثال کے طور پر۔

اس تمکنت پسند سے کس کو تھی یہ اُمید
دل ہی تو ہے نوازشِ پیہم سے ڈر گیا
ان کے الطاف بھی جب موجبِ راحت نہ ہوئے
دل کی تسکین کا پھر کون قرینا ہو گا

لیکن رنگ حسرت کے باوجود قدوائی صاحب کے ہاں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جہاں رنگ غالب ، غالب نظر آتا ہے ۔

ڈالا ہے کس عذاب میں بندوں کو اے خدا
اس زندگی کا کوئی طلب گار تو نہیں
حرم کی خاک بھی ہم نے بہت اُڑا دیکھی
خدا تو خیر کوئی مرد با خدا نہ ملا

بعض مقامات پر ان کی اپنی انفرادیت عروج پر پہنچ جاتی ہے ۔

ہر طرف جلوۂ محبوب عیاں ہے پھر بھی
کون ایسا ہے جسے حسرت دیدار نہ ہو
حُسن کی کائنات میں ہے سکوں
عشق کے اضطراب پیہم سے

کوئی فن کار اپنے عہد اور اس کے مسائل سے بے تعلق نہیں رہ سکتا اس لئے جلیل قدوائی کے اشعار میں اپنے عہد کے مسائل ہیں اور اس کے اثرات کی جھلک بھی نمایاں دکھائی دیتی ہے ۔ یہاں یہ بات کہنا ضروری ہے کہ سچا شاعر اور سچا فنکار ضروری نہیں کہ سیاسی مسائل کے لئے سیاسی زبان ہی استعمال کرے وہ رموز و علائم سے کام چلاتا ہے اور شعری اسلوب کا زیادہ خیال رکھتا ہے ۔

جلیل قدوائی نے زیر نظر مجموعہ "خاکستر پروانہ" میں علامہ اقبال کے شعر کو عنوان بناتے ہوئے "بہ حضور سرورِ کونینؐ " کے عنوان سے سب سے پہلے اپنی نعتیں پیش کی ہیں ۔

کہتے ہیں

پہلا ہے یہی درس دبستان محمدؐ
اللہ کا عرفان ہے عرفان محمدؐ
چھائی رہی دنیا میں جہالت کی شب تار
جب تک نہ ہوئی صبحِ درخشان محمدؐ

مندرجہ ذیل شعر میں انہوں نے حضرت اصغر گونڈوی کے مصرع کو خوب استعمال کیا ہے ۔

دنیا کی مجھے فکر نہ عُقبیٰ کا ہے ہوش
بیخود ہوں تہِ سایۂ دامانِ محمدؐ

غزلیات سے قبل کتاب کے آغاز میں سوز و گداز سے معمور سات آٹھ نعتیں موجود ہیں ایک جگہ فرماتے ہیں ۔

زہے لطف و حُسنِ کلام محمدؐ
پیامِ خُدا ہے پیامِ محمدؐ
ہر وقت دعائیں ہیں ہر لحظہ مناجاتیں
اس شاہ سے ہوتی ہیں دن رات یونہی باتیں
ادنٰی سے اشارے میں تھے چاند کے دو ٹکڑے
اک خاک کے پُتلے میں اور ایسی کراماتیں

ایک سچے مسلمان کی طرح مدینہ منورہ جانے کی دُعا بھی کرتے ہیں

بُلوا لو مدینہ میں تم اپنے غلاموں کو
مدت سے تمنا ہے ہو جائیں ملاقاتیں

آخر ان کی یہ دعا قبول ہو جاتی ہے تو انہوں نے حرمین شریفین کے قیام کے دوران مکّہ معظمہ میں جو حمد اور نعت کہی ہے اس میں سوز و گداز کی کیفیت سب سے بڑھ کر ہے کیونکہ ان کی برسوں کی تمنا بر آئی ہے ۔

دنیا نہ اب کوئی غمِ دُنیا ہے سامنے
میں خانۂ خُدا میں ہوں کعبہ ہے سامنے
مجھ سے گدا کو دولتِ کونین مل گئی
حیراں ہیں جن کے دولت دُنیا ہے سامنے
کیوں کر نہ اس کے فیض کے قربان جائیے
مدت سے تھی جو دل میں تمنا ہے سامنے

اسی طرح مدینہ منورہ میں کہی گئی نعت کا مطلع ہے

بستی یہ دل پسند شہہ دو سرا کی ہے
آرام گاہِ خاص رسُولِ خدا کی ہے
احساس قرب سیّد والا تبار سے
حالت میں کیا کہوں جو دل مبتلا کی ہے
جو مانگتا ہے اس کو وہی ملتی ہے مراد
ہاں شرط بس وسیلۂ خیرالورا کی ہے
یہ اتصال عاشق و معشوق دیکھیئے
ذکر رسولؐ بھی تو عبادت خدا کی ہے

آخری شعر میں انہوں نے کس خوبصورتی سے اسوۂ حسنہؐ کی پیروی کو خدا کی عبادت قرار دیا ہے۔
"زائر مدینہ سے درخواست میں" وہ ایک سچے عاشق رسولؐ کی طرح فریاد کناں ہیں اُن کی تڑپ دیدنی ہے

زخمی اگر جگر ہے تو دل پاش پاش ہے
مرہم وہاں سے مانگ کے لانا نہ بھولنا

مولانا جامی نے فرمایا تھا

خدایا ایں کرم بارِ دگر کن

قدوائی صاحب کہتے ہیں

کہنا کہ ایک بار بلایا تھا اپنے پاس
اک بار اور اسی کو بُلانا نہ بھولنا

اس شعر میں عاشق کی وفاداری کو خوب نبھایا ہے

وہ ہمیں دل سے بھلا بیٹھے ہیں
ہم اُنہیں یاد کیا کرتے ہیں

محبوب کے بغیر زندگی بسر کرنا تو درکنار ایک پل بسر کرنا اُنہیں مشکل نظر آتا ہے فرماتے ہیں۔

ہجر کی شب کو وہ کیوں کر نہ قیامت سمجھے
بے ترے ایک بھی پل جس سے بسر ہو نہ سکے

لبِ یار پہ اپنا نام بُرائی کے بہانے ہی سہی آجانے کو کس قدر خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

اس بہانے سے لبِ یار پہ آتا تو ہے نام
کیا ہی اچھا ہے کہ وہ مجھ کو بُرا کہتے ہیں

اس مفہوم میں مشہور شعر ہے

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ محبوب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

فارسی میں اسی مفہوم و مطلب میں شعر موجود ہے

بدم گفتی و خورسندم جزاک اللہ نکو گفتی
جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعل شکر خارا

جلیل قدوائی نے عشق کی کیفیت بیان کرتے ہوئے جو انداز اختیار کیا ہے وہ دوسرے شعراء سے مختلف ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

اک بے نام سی روتن میں پڑی پھرتی ہے
کس کو کہتے ہیں محبت مجھے معلوم نہیں

شیفتہ نے اسی مفہوم کو یوں پیش کیا ہے

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

الطاف حسین حالی نے یوں بیان کیا ہے ۔

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

حکیم الامت علامہ اقبال اس کیفیت کا یوں نقشہ پیش کرتے ہیں ۔

اے جانِ گرفتارم ؟ دیدی کہ محبت چیست
در سینہ نیا سائی وز دیدہ بروں آئی
یک نگہ ، یک خندہ دُزدیدہ ، یک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبت نیست سو گندے دگر

جگر مراد آبادی عشق و محبت کی اسی کیفیت کو ایک اور ہی انداز سے بیان کرتے ہیں ۔

اک لفظ محبت کا ادنیٰ سا فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

جلیل قدوائی نے خوبصورت نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں بعض اُن کے اعزّہ و اقارب اور بعض احباب کی وفات کے متعلق ہیں ۔ پہلی نظم بابائے اردو کی رحلت پر ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

نہیں ویراں ہوئی اک انجمن ہی
کہ سونی ہو گئی ہے دنیائے اُردو

اس شعر کے پس منظر میں بابائے اردو مولانا عبدالحق کا یہ قول نظر آتا ہے کہ "مومن وہ ہے جسے اردو سے عشق ہو" انہوں نے محبِ وطن اور دردمند پاکستانی کی طرح ۱۹۶۵ کی جنگ کے بارے میں دو یادگار نظمیں بھی کہی ہیں جن میں سے ایک "کشمیر چلو" کے عنوان سے ہے اور دوسری "پاک بحریہ" کی شانِ جلال کو بیان کرتی ہے ۔

آخر میں "مختصرات" کے عنوان سے چھوٹی نظمیں یا قطعات وغیرہ ہیں ۔ ان میں پہلا فارسی قطعہ کا ترجمہ ہے ایک شعر ہے

جو انساں دہر میں پائندہ ہوتے
ابوالقاسم محمدؐ زندہ ہوتے

اصل فارسی میں یوں تھا ۔

بہ دنیا گرکسے پائندہ بودے
ابوالقاسم محمدؐ زندہ بودے

"دعائے فتح پاکستان" کے عنوان سے خوبصورت قطعہ موجود ہے ۔

بعض جگہ انہوں نے فارسی اشعار کا خوبصورت ترجمہ کیا ہے مثلاً حافظ کے شعر

آنا نکہ خاک رابہ نظر کیمیا کُنند
آیا بود کو گوشۂ چشمے بما کُنند

جلیل قدوائی نے کہا ہے

جو خاک کو نگاہ سے کرتے ہیں کیمیا
اے کاش ہم پہ بھی وہ کبھی اک نظر کریں

اُن کے ہاں ایسے متعدد اشعار ملتے ہیں جو فارسی کا براہِ راست ترجمہ ہیں معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین کے جو اشعار پسند آئے انہوں نے اُنہیں اردو کے قالب میں ڈھال دیا ۔

کتاب کے آخر میں انتخاب کلام سابق کے عنوان سے سابقہ کلام کا انتخاب پیش کیا ہے ۔

جلیل قدوائی کی غزل کے بارے میں اثر لکھنوی ، عبدالقادر سروری ، شان الحق حقی ، رئیس امروہوی ، شجاع احمد زیبا ، ابوالخیر کشفی ، جمیل نقوی جیسے ممتاز شعرا اور نقاد رطبُ اللّسان ہیں حتٰی کہ بابائے اُردو ۔ نیاز فتحپوری اور فراق گورکھپوری نے اُنہیں خراج تحسین پیش کیا ہے ۔ انہوں نے اپنی شاعری کا ہر شخص سے لوہا منوایا ہے ۔ بابائے اردو نے اُنہیں مشاق اور خوش گو شاعر قرار دیا ہے قائداعظم پر نہایت اعلٰی پائے کی نظم ہے جس کی ردیف "اے قائداعظم" ہے ۔ میاں بشیر احمد آف ھمایوں کی نظم جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قائداعظم کی موجودگی میں لاہور کے جلسہ عام میں انور غازی آبادی نے پڑھی تھی اس میں "محمد علی جناح" ردیف ہے ملت کا پاسبان ہے محمد علی جناح

پاکستان، پہاڑ اور کوہ پیمائی

تبصرہ نگار : ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار

نام مصنف ۔ جنرل قمر علی مرزا ۔ کاغذ ۔ آرٹ پیپر ، جلد پختہ ریکسین ۔ رنگین گرد پوش ۔
صفحات ۔ ۱۶۰ ، تصاویر ۸ رنگین اور ۱۳ سفید و سیاہ ۔ ناشر ۔ دید شنید پبلیکیشنز ، لاہور ، ۱۹۹۰ء ۔

یوں تو پاکستان کے تقریباً سبھی خطوں میں پہاڑ واقع ہیں جو اس خطۂ پاک کی خوبصورتی میں اضافہ اور تنوع پیدا کرتے ہیں ۔ لیکن اس سر زمین کے شمالی علاقہ جات میں واقع بلند و بالا پہاڑی سلسلے نہ صرف خود دنیا کے بلند ترین پہاڑی سلسلوں میں اہم مقام رکھتے ہیں بلکہ انہی کی وجہ سے دنیا بھر میں پاکستان ایک باوقار مقام حاصل کر چکا ہے ۔

پاکستان کے شمالی علاقہ جات اپنے اندر دلچسپی کے کئی عوامل رکھتے ہیں ۔ یہ علاقے دور دراز واقع ہیں ۔ یہاں بسنے والی اقوام غیر معروف ہیں اور ان علاقوں میں بولی جانے والی زبانیں اور بولیاں انتہائی قدیم ، پیچیدہ اور بہت سی گم شدہ کڑیوں کی حامل ہیں ۔ یہ ایک ایسا علاقہ ہے جہاں دنیا کی بلند ترین چوٹیوں کا سب سے بڑا ہجوم ہے ۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے خطوں سے باہر دنیا کے سب سے بڑے برف کے دریا یا گلیشیئرز اسی علاقہ میں واقع ہیں ۔ اس علاقہ کی ۲۳ تا ۲۵ فیصد سطح زمین سارا سال برف سے ڈھکی رہتی ہے ۔ اور یہاں ۲۰ ایسی چوٹیاں واقع ہیں جن کی سطح سمندر سے بلندی ۲۳۰۰۰ فٹ یا ۷۴۹۲ میٹرز سے بلند ہے ۔ دنیا میں کل چودہ ایسے پہاڑ ہیں جن کی بلندی ۸ ہزار میٹرز سے زیادہ ہے ۔ ان میں سے پانچ پہاڑ پاکستان میں ہیں ۔ جبکہ آٹھ نیپال میں اور صرف ایک چین میں ہے ۔ پاکستان میں کل ۴۰ پہاڑ ایسے ہیں جن کی بلندی ۷۳۰۰ اور ۸۶۱۱ میٹرز کے درمیان ہے ۔ دنیا کی دوسری بلند ترین پہاڑی چوٹی کے ۔ ٹو (K-2) اسی خوش نصیب خطۂ زمین کے حصہ میں آتی ہے ۔ اس خطہ کو یہ بھی ایک خصوصیت حاصل ہے کہ یہاں چین ، روس ، افغانستان اور بھارت کی حدود ایک دوسرے سے بہت قریب آ جاتی ہیں ۔ اس جغرافیائی خصوصیّت کی وجہ سے یہ خطہ ہمیشہ بین الاقوامی سیاسی قوتوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے ۔ یہ ماضی بعید اور ماضی قریب میں جہاں یہ علاقہ پاکستان اور وسطی ایشیا کے درمیان ایک سیاسی ، معاشرتی ، عسکری ، تمدنی اور قبائلی آمد و رفت کا ذریعہ ہے ۔ وہاں آج بھی دنیا کی بلند ترین مقام پر لڑی جانے والی جنگ اس علاقہ میں ہو رہی ہے ۔ اپنی عسکری اور جغرافیائی محل وقوع ، قدرتی مناظر کی بھرمار اور تاریخی آثار کی کثرت کی وجہ سے پچھلی چند دہائیوں سے دنیا بھر کے کوہ پیماؤں ، مؤرخوں ، ماہرین آثار قدیمہ ، ماہرین لسانیات اور قدرتی مناظر کے دلدادہ لوگوں نے اس علاقہ کو اپنی تحقیق اور مہم جوئی کا مرکز بنایا ہوا ہے ۔ حالیہ دہائیوں میں ہونے والی دریافتوں نے جہاں اس خطے کی قدامت اور تاریخ کو ایک درخشندگی دی ہے وہاں اس کی برف پوش چوٹیوں نے دنیا بھر کے کوہ پیماؤں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر رکھی ہے ۔ ان

کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ ۱۹۷۹ ـ ۱۹۸۸ء کی دھائی میں ۵۱۱ ملکی اور غیر ملکی مہمانوں کو شمالی علاقہ جات کے ۷۰ پہاڑوں پر کوہ پیمائی کی اجازت ملی ہے ـ وہ مہمان جنہیں ۸ ہزار میٹرز سے بلند پہاڑی پر جانے کی اجازت ملی ہے ـ ان کی تعداد بھی ۲۴۰ ہے ـ ان میں صرف جاپان سے ۹۶ ـ فرانس سے ۵۷ اور برطانیہ سے ۴۱ ٹیمیں آئیں ـ

اب تو آہستہ آہستہ پاکستانی مہم جو اور کوہ پیما بھی اس علاقے میں دلچسپی لینے لگے ہیں ـ اور اب یہ ہیبت ناک لیکن باوقار پہاڑوں کی چوٹیاں پاکستانی جیالے کوہ پیماؤں کی ایڑیوں کے نیچے روندی جانے لگی ہیں ـ نوخیز اور نو آموز نوجوان کوہ پیماؤں اور ان کے ساتھ جانے والے پورٹروں اور ھائی ایلٹی چیوڈ پورٹرون (High Altitude Porters) کی تربیت کے لئے الپائن کلب آف پاکستان کے ماتحت ایک تربیتی ادارہ بھی قائم ہو چکا ہے ـ اس علاقے میں سیر و تفریح اور کوہ پیمائی پر جانے سے پہلے ، اس علاقے کے متعلق تمام معلومات حاصل کرنا انتہائی ضروری ہے ـ بد قسمتی سے اب تک اس سلسلے میں مکمل ، تازہ ترین اور مصدقہ معلومات کا فقدان رہا ہے ـ اس کمی کو زیر تبصرہ کتاب : "پاکستان ـ پہاڑ اور کوہ پیمائی" نے کافی حد تک پورا کر دیا ہے ـ

"پاکستان ـ پہاڑ اور کوہ پیمائی" کے مصنف جنرل قمر علی مرزا ہیں جن کا شمار پاکستان میں کوہ پیمائی کی تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے ـ پاکستان میں کوہ پیمائی کی تاریخ میں جنرل (ریٹائرڈ) قمر علی مرزا کا نام صرف ایک جانی پہچانی چیز ہی نہیں ـ بلکہ ایک مستند نام اور اتھارٹی سمجھا جاتا ہے ـ پاکستان میں کوہ پیمائی کے حوالے سے ان کے بہت سے مضامین اخبارات و رسائل میں چھپ کر کوہ پیمائی کے دلدادہ لوگوں سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں ـ آپ الپائن کلب آف پاکستان کے بانی ممبران میں سے ہیں ـ آپ تیرہ سال تک (۱۹۷۶ ـ ۱۹۸۹ء) اس کلب کے صدر اور بین الاقوامی تنظیم برائے کوہ پیمائی کے نائب صدر بھی رہ چکے ہیں ـ ان دنوں کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں کے تحفظ کے بین الاقوامی ہمالین ایڈونچرسٹ کے گورنر ہیں ـ فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کو کوہ پیمائی کے فروغ کے لئے وقف کر رکھا ہے ـ آپ نے کوہ پیمائی پر یہ کتاب لکھ کر اپنے تجربات اور مشاہدات اور پاکستان میں کوہ پیمائی کی ضرورت ، اہمیت اور مسائل کو مجسم صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ـ

اس کتاب میں شائع شدہ معلومات تازہ ترین اور مستند ہیں ـ کتاب کو موضوع کے اعتبار سے ۲۸ مختلف ابواب یا حصوں میں بانٹا گیا ہے ـ پہلے ۱۷ حصے شمالی علاقہ جات میں واقع پہاڑوں سے متعلق عمومی معلومات کے علاوہ ۱۴ مشہور بلند ترین چوٹیوں کے متعلق تمام تر معلومات مہیا کر دی گئی ہیں ـ وہ چودہ چوٹیاں یہ ہیں : کے ـ ٹو ، نانگا پربت ، گیشر برم ۱ براڈ پیک ، گیشر برم ۲ ، گیشر برم ۴ ، راکا پوشی ، بتورا ۱ ، ترچمیر ، چھوگو یزا ، یکشن گردن سر ، سیاکا نگری او گرے ، پسو پیک ، پیرو پیک اور ٹرینگو ٹاور ـ ان میں سے ہر چوٹی کے متعلق بنیادی معلومات ، اس تک پہنچنے کے راستے ، اس کی دریافت کی تاریخ ، اس کو سر کرنے کی آج تک کی مہمات کی تفصیلات ، ان مہموں کی

کامیابیوں اور ناکامیوں کی داستان ، بیرون ممالک سے آنے والی ٹیموں اور ان کے سربراہان کا سن وار ذکر اور ان کے ساتھ تعاون کرنے والے پاکستانی کوہ پیماؤں کی کہانی وغیرہ وغیرہ سبھی کچھ درج ہے ۔

کتاب کے آخری گیارہ ابواب یا حصوں میں جہاں الپائن کلب آف پاکستان کی کارکردگی اور پاکستان میں کوہ پیمائی کے متعلق تمام ضروری معلومات درج ہیں ۔ وہاں چند ایسے دلچسپ ، مفید اور اہم موضوعات کا احاطہ بھی کیا گیا ہے ۔ جن کا جاننا اس علاقے میں کوہ پیمائی کرنے والوں کے لئے انتہائی ضروری ہے ۔ مثلاً کوہ پیمائی سے متعلق مخصوص بیماریاں ، پاکستان میں کوہ پیمائی کے لئے شرائط اور مراعات ، کوہ پیمائی کی ترقی کے لئے عملی اقدامات کی ضرورت ، پاکستانی فوج میں کوہ پیمائی ، سیاہ چین کی رزم گاہ اور کوہ پیمائی میں پیش آمدہ حادثات ، کے ۔ ٹو اور سائنس دان ، وغیرہ وغیرہ کتاب کے آخری باب "دلچسپ معلومات" میں نامور خواتین کوہ پیماؤں کے ذکر کے علاوہ ، کے ۔ ٹو کی چوٹی پر پہنچنے والے پاکستانی کوہ پیماؤں اور ۸۰۰۰ میٹرز سے بلند پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچنے والے خوش نصیب افراد کا تفصیلاً ذکر ہے ۔ ساتھ ہی پاکستان میں چالیس بلند ترین چوٹیوں کی فہرست بھی شامل ہے ۔ ان کے ناموں کے ساتھ ان کی بلندی میٹروں اور فٹوں میں درج ہے اور دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں ان کی اپنی ترتیبی حیثیت بنا دی گئی ہے ۔

المختصر "پاکستان ۔ پہاڑ اور کوہ پیمائی" ہر لحاظ سے ایک دلچسپ اور معلومات افزا کتاب ہے ۔ یہ کوہ پیمائی پر ایک دلچسپ مقالہ ہی نہیں بلکہ پاکستان کوہ پیمائی کی ایک مستند تاریخ بھی ہے ۔ یہ اس درویش صفت انسان کی آپ بیتی بھی ہے ۔ جس نے فوج کی آرام دہ اور پُرکشش جرنیلی چھوڑ کر پیرانہ سالی کے باوجود اپنے پیارے ملک کے سنگلاخ پہاڑوں کی کوہ نوردی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنایا ۔ یہ کتاب ان بے شمار نڈر ، باہمت ، اور مہم جو انسانوں کی کہانی بھی ہے ۔ جو ان سربلند چوٹیوں کو سر کرتے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کی یخ بستہ ٹھنڈی گود میں جا سوئے ۔ صرف نانگا پربت کی چوٹی کو سر کرتے ہوئے اب تک ۳۱ کوہ پیما ، فوجی افسران اور پہاڑی قلی اپنی قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں ۔ صرف ۱۹۸۶ء میں ۱۳ انسانی جانیں K-2 کی چوٹی سر کرتے ہوئے ضائع ہوئیں ۔ انسانی جانوں کے اس قدر ضیاع سے متعلق مصنف کا خیال ہے کہ یہ زیادہ خود اعتمادی ، ناتجربہ کاری اور غیر مقررہ راستوں کے استعمال کی وجہ سے واقع ہوئی ہیں ۔ مصنف لکھتا ہے : ۔

> "پہاڑ ایک زندہ اور جیتی جاگتی حقیقت ہے ۔ یہ قدرت کا عطیہ ہے جس میں بے شمار انعامات پوشیدہ ہیں ۔ یہ عزت و احترام اور احتیاط کا تقاضا کرتا ہے ۔ اور ناروا آزادی اور نامناسب برتاؤ برداشت نہیں کرتا ۔" (ص ۔ ۹۷) ۔

مصنف نے اس کتاب میں پاکستان میں کوہ پیمائی کو پیش آمدہ کئی سنجیدہ مسائل کا ذکر کھل کر کیا ہے ۔ اور ان مسائل کے حل کے لئے چند مفید تجاویز بھی دی ہیں ۔ یہ تجاویز پہاڑوں کو آرام دینے کے لئے ہر سال وہاں جانے

والے مہمات کی تعداد میں کمی اور چند سالوں بعد ایک سال کے لئے مکمل پابندی ، مہمات کی بھرمار کی وجہ سے پہاڑوں پر پھیلنے والی غلاظت اور کوڑا کرکٹ کی صفائی ، رائیلٹی کی رقم میں اضافہ اور اس کا تعین ڈالروں میں ، پہاڑوں اور پہاڑی علاقوں کے مستند نقشوں کی تیاری ، اندرون ملک نوجوانوں میں کوہ پیمائی سے دلچسپی پیدا کرنے کے پروگرام ، اور ان کی تربیت کے انتظامات ، ذرائع ابلاغ کے تعاون کی ضرورت اور الپائن کلب آف پاکستان کو مزید مؤثر بنانے کی ضرورت سے متعلق ہیں ۔ امید ہے حکومت پاکستان کی وزارت ثقافت کی ٹورازم ڈویژن میں صاحب اختیار لوگ پاکستان میں کوہ پیمائی کی آئندہ پالیسی وضع کرتے وقت ان مفید تجاویز کو ضرور پیش نظر رکھیں گے ۔

سفید آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی ۱۶۰ صفحات کی یہ کتاب نہایت دیدہ زیب اور اعلیٰ معیار طباعت کی حامل ہے ۔ ۸ رنگین اور ۱۳ سفید و سیاہ تصاویر کتاب کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتی ہیں ۔ اگر شمالی علاقہ جات کے چند اور بلند ترین پہاڑوں کی تصاویر بھی شامل کر لی جاتیں تو کتاب کی ظاہری خوبصورتی اور زیادہ ہو جاتی ۔ مصنف کا انداز بیاں بڑا سادہ سلیس اور پر اثر ہے ۔ شمالی علاقہ جات کے ان پر شکوہ مناظر اور باوقار پہاڑوں کے ساتھ مصنف کا دلی لگاؤ ، ان کی تحریر کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے ۔ وہ قدرت کی اس حسین تخلیق کو پاکستان کا ایک انمول اثاثہ تصور کرتا ہے ۔ اسے اپنی سرزمین سے بہت پیار ہے تبھی تو وہ لکھتا ہے :

> "یوں تو وطن عزیز کا چپہ چپہ قدرت کی خوبصورت لطافتوں کا مرقع ہے اور اس کی ان گنت نعمتوں کا مظہر ہے لیکن جیسے چترال کو خاص طور پر نوازا گیا ہے فرصت کے چند دن نکال کر اس حسین وادی کی سیر کو ضرور جائیں ۔ یقین ہے کیف و سرور اور فرحت بخش سکون آپ کا مقدر ہوں گے ۔"

کتاب العلم

عبد العزیز خالد

کتاب العلم ؛ عبد العزیز خالد

۱۰۳ ، نوازش علی روڈ ، لاہور

بار اول ، اپریل ۱۹۹۰ء

صفحات : ۸۰۰

قیمت : ۵۰۰

پیش نظر کتاب جناب عبد العزیز خالد صاحب کے تازہ ترین کارناموں میں ایک اہم کارنامہ ہے ۔ اسے علم کے موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیے ۔ اس کتاب کے دائرہ کار کی وسعت کا اندازہ کسی قدر اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آٹھ سو صفحات کی ضخامت کے ساتھ یہ تین فصلوں اور اڑتیس ابواب پر مشتمل ہے ۔ اس کے مندرجات کی ایک جھلک پیش کرنے کے لیے اس کی فصلوں اور بعض ابواب کے عنوانات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں ۔

پہلی فصل ۔ علم و حکمت کا بیاں قرآن میں / دوسری فصل ۔ بیان صحائف پیش میں علم و حکمت کا / تیسری فصل احادیث و اقوال وابیات دربارۂ علم و حکمت / پہلا باب ۔ ہر کسی پر فرض ہے تحصیل علم / دوسرا باب ۔ علم ہے میراث پیغمبروں کی / تیسرا باب ۔ احترام علماء / پندرہواں باب ۔ جو عالم و متعلم نہیں ، ہیں دوں مایہ / سولہواں باب ۔ ہے وہی علم کہ جو نافع ہو / سترہواں باب ۔ علم ہے خوف و خشیتِ یزداں / اکتیسواں باب ۔ نگہباں ہیں لوح و قلم علم کے / بتیسواں باب ۔ ادعا علم کا جہالت ہے / چھتیسواں باب ۔ شہادت ہے وفاتِ طالب علم / سینتیسواں باب ۔ مکالمہ بین خضر و موسیٰ / اڑتیسواں باب ۔ متفرق سخنِ نادر علم و حکمت ۔

علم کے موضوع پر عربی کی بعض کتابیں راقم الحروف کی نظر سے گزری ہیں ، لیکن معلومات کی کثرت و وسعت اور موضوع زیر بحث سے متعلق کلیات و جزئیات کی جامعیت ہر دو لحاظ سے یہ کتاب متقدمین کے مختصر رسالوں کے مقابلے میں بہت آگے نکل گئی ہے ۔ یہاں بے ساختہ عربی کا ایک شعر زبانِ قلم پر آجاتا ہے ، جو مصنف کی شخصیت پر پوری طرح صادق آتا ہے ۔ میں اسے یہاں قدرے ترمیم (ضمیر متکلم کو مخاطب سے بدلتے ہوئے) کے ساتھ پیش کرتا ہوں :

وإنک إن کنت الأخیر فرمان لأتٍ بما لاتستطہ الأوائل

(اگرچہ زمانے کے لحاظ سے آپ کا شمار متاخرین میں ہے ، لیکن آپ نے (وہ کارنامے سرانجام دیے ہیں جس سے متقدمین عہدہ برآنہ ہوسکے)

اس کتاب کا غالب حصہ عربی عبارات و اقتباسات پر مشتمل ہے ۔ بہ الفاظ دیگر ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب اصلاً عربی میں لکھی گئی ہے ۔ لیکن اپنی قوم اور ملک کے حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے اکثر و بیشتر ان کا ترجمہ بھی لکھ دیا گیا ہے ۔ تاکہ اس کی افادیت کا دائرہ وسیع تر ہوجائے ۔

اس کتاب کے مطالعہ سے مصنف کی شخصیت کے بارے میں بعض امور واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں ۔ سب سے پہلے تو یہ کہ مصنف غیر معمولی طور پر دیدہ ریزی اور جاں فشانی کا خوگر ہے ، اس لیے کہ اس نے ہر عنوان کے تحت جتنا کچھ اور جیسا کچھ مواد فراہم کر دیا ہے ، وہ عام حالات میں خواص سے بھی ممکن نہیں ۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

مصنف کا دوسرا وصف جو اس کتاب کے مطالعے سے سامنے آتا ہے ، وہ اس کی علوم اسلامیہ سے گہری واقفیت ، ژرف بینی اور نکتہ رسی ہے ۔ آیاتِ قرآنی کی تفسیر و توضیح کے لیے مصنف نے احادیث نبوی ، آثار صحابہ اور اقوال علمائے سلف سے جس طرح استفادہ کیا ہے اور پھر جس خوبی و ہنر مندی سے انہیں موقع بہ موقع پیش کیا ہے ، اس سے قاری پر ایک خوشگوار حیرت طاری ہو جاتی ہے ۔

معلومات کی کثرت و فراوانی کسی کتاب کو بالعموم خشک اور بوجھل بنا دیتی ہے ۔ لیکن "کتاب العلم" اس صورتِ حال سے بالکل محفوظ و مامون ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا مصنف محض عالم و علامہ نہیں بلکہ شاعر و ادیب بھی ہے اور شعری و ادبی ذوق قدم قدم پر اس کا رفیق و رہنما ہے ۔ اس کا اندازہ عربی عبارتوں اور اقتباسات کے ترجموں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ مصنف کی اصل شخصیت انہی تراجم میں جلوہ گر ہوئی ہے ۔ مصنف نے ایک عبارت کے ترجمے کے لیے بسا اوقات چھ چھ ، آٹھ آٹھ بلکہ دس دس پیرایۂ بیان اختیار کیے ہیں ۔ منظوم بھی منثور بھی ، اردو بھی فارسی بھی ، بلکہ ہندی اور پنجابی بھی ۔ ظاہر ہے کہ اس کا منشا ادبی ذوق کی تسکین ہے ۔ میں خوفِ طوالت کے باعث محض دو مختصر مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں ۔

(۱) واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما ۔ ۲۵ ۔ ۶۳

اور ان سے
بے سمجھ بات کریں جب تو کہیں ان سے : سلام
اور جاہل لوگ ان سے جب بھڑیں
(جاہلانہ جب کریں ان سے کلام)
تو کہیں صاحب سلام!
ہست باابلہ سخن گفتن جنوں
پس جواب او سکوت است و سکوں
پس جواب احمقاں آید سکوت
جواب جاہلاں باشد خموشی
جہل را چارہ سکوت است و سلام
لا نبتغی الجاھلین : ۲۸ ۔ ۵۵

نہیں آرزومند ہم جاہلوں کے
منہ لگاتے نہیں جاہلوں
ہم نہیں ہیں خواستگار جاہلاں
بے سمجھ لوگوں کے ہم لاگو نہیں

یہ نہایت عمدہ اور خوب صورت کتاب کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہو جاتی ، اگر اس کی ترتیب میں امور ذیل کا بھی لحاظ رکھا گیا ہوتا:

(۱) عربی عبارات و اقتباسات اور ابیات و اشعار کا جو معتد بہ حصہ ترجمے سے عاری رہ گیا ہے وہ ترجمے سے مزین ہوتا ۔
(۲) احادیث نبویہؐ کی جدید اصولوں کے مطابق تخریج کر دی گئی ہوتی۔
(۳) آثار و اقوال کے مآخذ و مصادر کی نشان دہی کر دی گئی ہوتی ۔
(۴) اصحابِ اقوال اور مآخذ کے جامع اشاریے شامل کتاب کر دیے گئے ہوتے ۔

ممکن ہے کہ مصنف نے ان امور کو دیدہ و دانستہ اس لیے نظر انداز کر دیا ہو تاکہ کوئی صاحبِ ذوق ان چیزوں کی تکمیل کرکے اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لے ۔

بہر حال ہم بارگاہِ رب العزت میں دست بہ دعا ہیں کہ وہ مصنف کی عمر اور قلم دونوں میں برکت عطا فرمائے ۔

(ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی۔ بنارس یونیورسٹی)

میر انیسؔ کی قلمرو

تبصرہ : صابر لودھی

ڈاکٹر انور سدید کی نئی کتاب "میر انیس کی قلمرو" میر انیس کے فن کا تفصیلی مطالعہ پیش کرتی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر انور سدید کے گیارہ مضامین شامل ہیں لیکن ڈاکٹر انور سدید کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مضامین کو جس ترتیب سے پیش کیا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "میر انیس کی قلمرو" مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مربوط اور منظم تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے جس میں میر انیس کی شاعری (اور اُن کے نقادوں) کا محاکمہ بھی کیا گیا ہے اور میر انیس کے نفسیاتی مطالعے پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

اس مقالے (کتاب) کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور یہ تقسیم بڑی فطری ہے۔ پہلے حصّے میں اصنافِ سخن کے حوالے سے میر انیس کے فن کو پرکھا گیا ہے اب مرثیہ ایک صنف کی صورت بھی اختیار کر گیا ہے اور تہذیبی اکائی بھی۔ ڈاکٹر انور سدید نے سب سے پہلے مرثیے کے اشعار میں میر انیس کے فن کو تلاش کیا ہے اور میر انیس کے شعری تجربے نے جس طرح مرثیے کی صنف کو جلال و جمال اور رزمیہ و المیہ عناصر کا مرقع بنایا۔ اُس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ ماحول، کردار، تہذیب، زبان اور آہنگ ——— سبھی پہلوؤں سے ڈاکٹر انور سدید نے میر انیس کے مرثیے کی اساسی خوبیوں کو نمایاں کیا ہے۔

اسی طرح رباعی، سلام اور غزل کے اصناف میں میر انیس نے اپنی قدرتِ کلام کے جو شعبدے دکھائے ہیں اُن کا مطالعہ ہر صنف کے حوالے سے الگ الگ مضامین میں پیش کیا ہے اور اُن تمام ممتاز شاعروں کے کلام کی بنیادی خصوصیات کا احاطہ بھی کیا ہے جو ان اصناف میں ملکہ رکھتے ہیں۔ اس طرح تقابلی مطالعے کی شان بھی پیدا ہو گئی ہے اور روایت سے آگہی بھی حاصل ہوتی ہے۔

عمومی سطح پر میر انیس کی مقبولیت میر اور غالب کے مقابلے میں کم ہے۔ مناظر فطرت کے مشاہدے کے لئے، ایک مضمون کو سو رنگ میں بندھا دیکھنے کے لئے یا حضرت علی مقام، امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اہلِ بیت کی محبت کو دل میں اتارنے اور کرب و بلا کے المیے کی یاد تازہ کرنے کے لیے میر انیس کے مرثیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور لطیف ترین زبان میں صنائع بدائع کے استعمال کی مثالیں تلاش کرنے کے لیے بھی میر انیس کے اشعار سے مدد لی جاتی ہے، میر انیس کے فن کا خصوصی مطالعہ نہیں کیا جاتا۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب کے دوسرے حصّے میں "میر انیس کی اخلاقیات" "میر انیس کا غم"۔ "میر انیس کا موت اور قبر سے پیار" اور "میر انیس کی تحریک پسندی" کے عنوان سے چار مضمون شامل کیے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے ڈاکٹر انور سدید کی محنت اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے

وسیع مطالعے کے بعد میر انیس کے فکروفن پر قلم اٹھایا ہے اور بڑی جامعیت کے ساتھ کئی پہلوؤں سے میر انیس کی شاعری کا خصوصی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں خصوصاً "میر انیس کا غم" کے مضمون میں جس طرح میر تقی میر، غالب اور میر انیس کے غم کے امتیازی محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے اُس سے اردو شاعری کی عظمت کا احساس بھی ابھر کر سامنے آتا ہے اور انسان کی بلند ہمتی کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کس طرح وہ غم کے حصار میں رہ کر بھی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی حفاظت کرتا ہے۔

کتاب کا تیسرا حِصّہ دو مضامین پر مشتمل ہے جس میں میر انیس کی "دہلویت" اور میر انیس کی "لکھنویت" پر بحث کی گئی ہے ۔ ان مضامین کے مطالعے سے میر انیس کی فکر اور اسلوب کے دونوں زاویے سامنے آجاتے ہیں۔ مضامین کے مجموعے کو مقالے کی شکل دینے کے لیے ان مضامین کا شامل ہونا ضروری تھا۔ ڈاکٹر انور سدید کا یہ جملہ قابل توجہ ہے کہ:

"میر انیس کی شاعری کی روح دہلوی ہے لیکن اُس کا جسم لکھنوی ہے۔ ان دونوں کے ادغام سے ایک ایسا کُل وجود میں آتا ہے جو بظاہر پا بہ گِل ہے لیکن جس میں آفاقی رفعت موجود ہے۔"

چنانچہ دہلویت اور لکھنویت کے مزاج کے حوالے سے جو بحث کی گئی ہے اُس سے میر انیس کی ظاہری اور باطنی صفات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

کتاب کا آخری حِصّہ صرف ایک مضمون "معرکۂ انیس و دبیر" پر مشتمل ہے۔ اس مضمون کے ذریعے ڈاکٹر انور سدید نے میر انیس اور میرزا دبیر کے عہد کو زندہ کیا ہے ۔ مجالس میں مرثیوں کی تاثیر بڑھانے کے لیے جو ڈرامائی کیفیت پیدا کی جاتی تھی اُس کی تصویر اس مضمون میں کھینچی گئی ہے۔ میر انیس اور میرزا دبیر کی نفسیات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے لیکن ضمناً شبلی نعمانی کی رزم آرائی کے عناصر بھی اس مضمون میں تلاش کیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں ڈاکٹر انور سدید نے اپنے مزاج اور اپنی تنقیدی روش کے مطابق اُن ناقدین کے مطالعے کا نچوڑ (حوالوں کے ذریعے) پیش کر دیا ہے جو مرثیہ ، سلام ، رباعی اور غزل کی تنقید میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ چنانچہ "میر انیس کی قلمرو" کے ذریعے ہماری رسائی محمد حسین آزاد ، خواجہ الطاف حسین حالی ، پروفیسر سیّد احتشام حسین ، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ، ڈاکٹر وزیر آغا پروفیسر آل احمد سرور ، ڈاکٹر نیّر مسعود ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور شہاب سرمدی کے افکار تک بھی ہو جاتی ہے ۔ اس صورت میں یہ کتاب اُن طالب علموں کے لیے بے حد مفید ہے جو میر انیس کی شخصیت ، عہد اور فن کا مطالعہ تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے کرنا چاہتے ہیں۔

"میر انیس کی قلمرو" کی ایک بنیادی خوبی اُس معنویت کی تلاش بھی ہے جو میر انیس کی شاعری کو آج کے عہد کی شاعری سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ میر انیس کے عہد کا غم ، آج کے عہد کے غم تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمیں میر انیس کے کلام سے روشنی ملتی ہے۔ عہد کو سمجھنے کا شعور ملتا ہے۔ زندگی سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔ انسانی رشتوں

سے بے لوث محبت کرنے کا سبق حاصل ہوتا ہے۔ مرثیے کے کرداروں کو سمجھنے سے دردمندی کے شائستہ ترین جذبات کو قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے "میر انیس کی قلمرو" میں اپنے عہد کے لیے اسی معنویت اور مقصدیت کو تلاش کیا ہے۔

مقبول اکیڈمی (شاہراہِ قائداعظم لاہور) نے اس کتاب کو بڑے سلیقے سے شائع کیا ہے اور قیمت بھی مواد کی اہمیت کے مقابلے میں خاصی کم ہے یعنی =/۷۰ ستر روپے ۔

موڑ

نام کتاب:	موڑ	قیمت:	پچاس روپے
مصنف:	ارشد میر	ملنے کا پتہ:	ادارہ فروغ اردو ، ایبک روڈ ، لاہور
ضخامت:	۱۱۲ صفحات		

زیرِ نظر کتاب مصنف کے ۱۲ انشائیوں کا مجموعہ ہے جسے ادارہ فروغ اردو نے نہایت آب و تاب سے شائع کیا ہے پیش لفظ ملک کے مشہور ادیب ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے لکھا ہے ۔ انشائیہ کیا ہے ؟ اس پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے ۔ مصنف کے چند انشائیوں دوپٹہ ، نعرہ اور دروازہ کو سراہا ہے مصنف کے طنز و مزاح کی جہاں تعریف کی ہے وہاں ان کے انشائیوں میں موضوع کے اعتبار سے ایسے نکتے بھی پیش کئے ہیں جن کا تعلق انشائیہ اور انشائی ادب سے ہے ۔

انشائیہ نثری ادب کی ایک خاص صورت ہے ۔ نثر میں مقالے ، داستانیں ، افسانے ، ڈرامے ، سوانحی خاکے ، غرضیکہ جو کچھ نثر میں لکھا جائے گا وہ نثر کہلائے گا اور وہ نثری ادب کا ایک حصہ ہو گا ۔ انشائیہ بھی چونکہ اصناف ادب کے احاطے میں آتا ہے اس لئے یہ بھی نثری ادب میں شمار ہو گا ۔ مثلاً مقالے کو لیں۔ مقالہ نگار معلم ادب ہوتا ہے وہ درس و تدریس کے راز سے آشنا ہوتا ہے ۔ وہ عالمانہ، محققانہ اور حکیمانہ باتیں سنجیدگی سے بیان کرتا ہے ۔ وہ جو جانتا ہے اسے ایک خوشگوار اسلوب میں ڈھال کر پیش کر دیتا ہے ۔ انشائیہ نگار کو تحقیق اور تدقیق سے غرض نہیں ہوتی ۔ وہ جتنا جانتا ہے ۔ اس سے کہیں زیادہ سناتا ہے ، لیکن اس کی باتیں پتے کی باتیں بتاتی ہیں جو عبث اور لاحاصل نہیں ہوتیں ۔ وہ ہمارے خیالات کو بے راہ روی سے بچاتی ہیں جو قاری کو زیادہ سوچنے اور زیادہ عملی قوت کو اکسانے کا باعث ہوتی ہیں ۔ اچھے مقالہ نگار کی شخصیت عالمانہ اور مزاج اکثر شاعرانہ ہوتا ہے ۔ وہ دوسروں کو سمجھانے کی اہلیت تامہ رکھتا ہے اور مشکلات کو سہل انداز میں پیش کرنے کا پورا پورا ملکہ وہ اپنے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دینے کی قدرت رکھتا ہے ۔ انشائیہ نگار کا دماغ شاعرانہ ، اس کی زبان شعری صلاحیتوں کو عام فہم زبان میں بیان کرنے کے فن سے آشنا ہوتی ہے ۔ انشائیہ نگار ہر عنوان پر لکھ سکتا ہے ۔ وہ کسی پالیسی کا اسیر نہیں ہوتا ۔ وہ ایک آزاد اور خود مختار قلم کو اپنے خیال کے مطابق جس طرح چاہتا ہے کام میں لاتا ہے ۔ اور اس کے لکھے ہوئے انشائیے سنسر کے احاطے میں بھی نہیں

آتے ۔ انشائیہ نگار کے لئے موضوع تک کی کوئی پابندی نہیں ۔ بغیر کسی روک ٹوک کے دل کی بات کہہ جاتا ہے ۔ اس کی باتیں ادق نہیں ہوتیں ۔ وہ گہرائی اور پُرگوئی کا مرد میدان نہیں۔ انشائیہ نگار کہانیاں نہیں سناتا ۔ قصہ گوئی سے بھی لاتعلق ہے غیر معمولی واقعہ یا دلچسپ روداد کا بیان بھی اس کے ذمہ نہیں ۔ شخصیت نگاری سے بھی اس کو کوئی تعلق نہیں ۔ اس صنف کا دامن بعض مزاح نگاری سے بھی جوڑتے ہیں ۔ مگر انشائیہ نگاری کو مزاح نگاری کا نام دینا کوئی صحیح بات نہیں ۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کی چاشنی کی بھی نشان کی جاتی ہے ۔ یہ اپنی اپنی سوچ ہے ۔ انشائیہ نگار نہ اپنی حماقتوں کو چھپاتا ہے اور نہ دوسروں کی کمزوریوں کو بخشتا ہے ۔ اچھے انشائیہ میں اصلی ہنسی اور کھسیانی ہنسی کا فرق معلوم ہو جاتا ہے ۔

جناب ارشد میر کئی کتابوں کے مصنف ہیں ۔ طنز و مزاح میں نام پیدا کیا ۔ اب انہوں نے انشائیہ کی وادی میں قدم رکھا ہے امید ہے ان کی یہ کوشش بارور ہوگی ۔ اور موڑ ایسی کئی دوسری تصانیف بھی رفتہ رفتہ ہمارے سامنے آئینگی ۔ اور انشائی ادب میں مزید اضافہ ہوگا ۔

(ک ۔ م)

تحقیق اور تلاش

مصنف : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن — تبصرہ و تجزیہ : انور سدید

آج کی اس مجلس میں مجھے ایک ایسی کتاب کا جائزہ پیش کرنا ہے جس کے مصنف درس و تدریس کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں اور جو اپنی عمرِ عزیز کا نہایت قیمتی اور زرخیز حصہ تصنیف و تالیف میں صرف کر رہے ہیں ۔ اس کتاب کا نام "تحقیق اور تلاش" ہے اور اس کے مصنف ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ہیں جو محکمہ تعلیم پنجاب میں گزشتہ پچیس برس سے علم کی روشنی اور ادب کا نور پھیلا رہے ہیں ۔ اس تمام عرصے میں انہوں نے صدہا طالب علموں اور متعدد اساتذۂ ادب سے اچھا استاد ہونے اور ان کے دلوں میں گھر بنا لینے کا وہ اعزاز حاصل کیا جو بعض استادوں کو ریٹائرمنٹ تک نصیب نہیں ہوتا ۔ میں ان کے اس اعزاز پر جتنا بھی رشک کروں کم ہے ۔ وجہ یہ کہ مجھے کبھی کسی کو شاگرد بنانے یا خود استاد بننے کی لذت نصیب نہیں ہوئی ، اس لیے میں مسرت کے اُس ذائقے سے محروم ہوں جو غبی طالب علم کے منہ سے "سر" ۔ "سر" سننے کے بعد دل میں مرتسم ہو جاتا ہے ۔ اگر یہ اعزاز ڈاکٹر صاحب کے پیشے کی عطا ہوتا تو میں شاید رشک کے متذکرہ جذبات کو زیادہ دیر تک نہ پالتا اور انہیں لاکھوں ہزاروں استادوں کے اس گروہِ عام میں کھڑا کر دیتا جو طلبہ کو تعلیم دینے کے بجائے خود تعلیم حاصل کرنے کے مستحق ہیں ۔ سرکاری خزانے سے معینہ مشاہرے پر تدریس کا فرضِ کفایہ ادا کرتے ہیں ۔ طلبہ کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں ، سٹاف روم کی گپ شپ کو اپنے وقت کا بہترین مصرف

سمجھتے ہیں ۔ اس کے بر عکس سیّد معین الرحمٰن نے یہ اعزاز عملی طور پر مشفق ، ہمدرد اور حقیقی استاد بن کر حاصل کیا ہے ۔ ان کی شفقت مطبوعہ نہیں ، ان کی ہمدردی غیر مشتہرہ ہے اور ان کی تدریس ایک مخصوص تہذیبی جہت رکھتی ہے ۔ لڑکے ان کا ذکر داخلی خلوص سے کرتے ہیں ، لڑکیاں ان کے کمرے ہی میں نہیں گھر میں بھی بے محابا چلی جاتی ہیں ، زہرہ معین انہیں چائے پلاتی ہیں ۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن انہیں سبق پڑھاتے درسی مشکلات دور کرتے ہیں اور کبھی چیں بہ جبیں نہیں ہوتے ۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی اپنی شفقت کو موضوعِ عامہ نہیں بننے دیتے ، اپنی عنایات کا اشتہار نہیں دیتے اور اپنی شرافت کو غیر مطبوعہ رکھنے میں ہی طمانیت محسوس کرتے ہیں ۔ مخلوط تعلیم کے کالجوں میں ربع صدی گزارنے کے باوجود ابھی تک کسی "سکینڈل" نے معین صاحب کا تعاقب نہیں کیا ، ان کی اچکن پشت سے سلامت ہے ، ان کی واسکٹ پر کسی نے سلوٹ نہیں ڈالی ۔ ان کا دامن بے داغ ہے ۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کی مندرجہ بالا خوبیوں کا سلیس اردو ترجمہ یہ ہے کہ وہ زندگی کو اپنے اسلوب میں گزارتے ہیں ، جان کاہ محنت ، اگلے وقتوں کی نایاب شائستگی اور نظم و ضبط اس اُسلوب کے عناصرِ اربعہ ہیں ، درس و تدریس ان کا پیشہ نہیں عبادت ہے تحقیقِ ادب ان کا شوق نہیں عشق ہے اور یہ ایسا کام ہے جو تیز روی اور زود عملی سے سرانجام نہیں پاتا ۔ اس کے لیے تادیر دل کو خون کرنا پڑتا ہے اور انجام کار مصرعۂ ترکی صورت نظر نہ آئے تو حوصلہ قائم رکھ کر دشتِ طلب میں مزید آبلہ پائی ضروری ہوتی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق اس شعبے سے ہے جس کی تنقید کو بقول ڈاکٹر ابوالخیر کشفی مدّرسانہ اور تحقیق کو معلّمانہ کہہ کر مذاق اڑایا جاتا ہے ۔ معین الرحمٰن ان معدودے چند محققوں میں سے ہیں جن کی محنت کسی خارجی شہادت کی محتاج نہیں ، ان کے جتنے کام اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں وہ خالصتاً محققانہ ہیں ، ان کی تلاش کا انداز دوسروں سے الگ ہے ، ان کی دریافت کا حاصل جداگانہ نوعیت کا ہے ۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے معاصرین ملائی کی تلاش میں ہیں جبکہ ڈاکٹر معین الرحمٰن زمینِ ادب کی نِلائی میں خون پسینہ ایک کر رہے ہیں ، اس نِلائی کے دوران کبھی انہیں حقیقت کا ایک شائبہ ہاتھ آجاتا ہے ۔ کبھی ساری کاہش و کاوش بے ثمر رہتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب حوصلہ نہیں ہارتے ، نشانِ راہ نہ بھی ملے تو منزل کی جستجو جاری رکھتے ہیں ، ان کی زیر نظر کتاب "تحقیق اور تلاش" بظاہر ان کے بیشتر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے لیکن ان مضامین کو موجودہ صورت میں پیش کرنے میں بھی انہیں بائیس برس لگے ہیں ۔ اور کوئی مقالہ ایسا نہیں جس میں اولین اشاعت کے بعد قیمتی اور نئے اضافے نہ ہوئے ہوں ۔ چنانچہ ان کی تحقیق ایک ایسا مسلسل عمل ہے جس میں نئی دریافتیں ہمیشہ اضافہ کرتی رہتی ہیں ۔ اور ڈاکٹر صاحب کسی موضوع پر اپنا تحقیقی کام ختم نہیں کرتے بلکہ نئی معلومات کے لیے موضوع کا جزدان کھلا رکھتے ہیں اور اس میں نئے خزینوں کو شامل کرتے جاتے ہیں ۔

ان کی تحقیق کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ کسی مخصوص موضوع ہی کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ موضوع کے گرد و پیش بھی نظر دوڑاتے ہیں اور بہت سے متعلقہ مسائل کا سیاق اور سباق اس طرح مقالے کی بُنت میں شامل کر دیتے ہیں کہ

مقالہ اضافی روشنیوں سے معمور ہو جاتا ہے اور پھر متعدد دوسری کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ موضوع زیر بحث کے بارے میں ابھرنے والے اندیشوں کو رفع کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ ایسی خوبی ہے جو متعدد دوسرے محققین میں کم کم نظر آتی ہے ۔

"تحقیق و تلاش" ڈاکٹر معین الرحمٰن کی نئی کتاب ہے جو تیرہ مضامین پر مشتمل ہے ۔ قارئینِ ادب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی بنیادی پہچان "تحقیقِ غالب" ہے ۔ اس موضوع کے ساتھ انہوں نے سابقہ تمام زندگی بسر کی ہے اور غالب کی معیّت ہی میں مستقبل کے کڑے کوس کاٹنے کے آرزومند نظر آتے ہیں ، زیرِ نظر کتاب میں بھی غالب حصّہ غالبیات کا ہی ہے ۔ اس حصّے میں چھ مضامین ہیں اور یہ سب غالب اور تصنیفاتِ غالب کے بعض نادر گوشوں کو نئی روشنی عطا کرتے ہیں ، مثلاً انہوں نے اپنے کتب خانے میں موجود غالب کے ایک ایسے دیوان کا تعارف کرایا ہے جس پر غالب نے اپنے قلم سے اصلاحیں درج کی ہیں ، اس دیوان کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ نواب ضیاء الدین خاں نیّر رخشاں یا کسی شہزادے کے ذخیرے کا گوہرِ گم گشتہ ہو گا جو ۱۸۵۷ء کی لوٹ مار میں کہیں غارت ہو گیا تھا ۔ اس مقام پر ڈاکٹر صاحب نے اس اطلاع کا پیغام بر بننے کی سعادت حاصل نہیں کی بلکہ وہ ہمیں اس ملال میں بھی شریک کرتے ہیں جو غالب نے قیمتی نسخوں کی گم شدگی پر محسوس کیا تھا ۔ اِس حزن و حسرت کے ماخذ غالب کے خطوط ہیں ، جن میں درج ہے کہ "حضرت! اس غریب کا مجموعۂ نظم و نثر غدر میں لُٹ گیا"

(نواب حکمت علی خان کے نام ۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۶ء کا مکتوب)

ڈاکٹر صاحب نے اس نسخۂ غالب کا موازنہ متعدد نادر خطی نسخوں سے کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالب کی کم از کم سات غزلوں ، ایک قصیدے ایک قطعے اور دو رباعیات کا زمانی تعین اس نسخے ہی سے ممکن ہے ۔

اسی قسم کی ایک تحقیقی کاوش "دستنبو" کے بارے میں ہے ۔ انہوں نے "دیوانِ غالب" کی معاصر اشاعتوں کے علاوہ "قادر نامۂ غالب" کی ابتدائی اشاعتوں کے بارے میں بھی قیمتی معلومات فراہم کی ہیں ، غالب اور مجروح کی نودریافت نگارشات پر محاکمہ معنی خیز اور نظر افروز ہے ۔

کتاب کا دوسرا حصہ ذیلی عنوان "ادبیات" کے تحت پیش کیا گیا ہے ۔ لیکن یہاں بھی آپ کو تلاش و جستجو کا عمل نمایاں نظر آئے گا ، اور کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دے گی جو راہ چلتے چلتے مل گئی ہو یا جس میں تحقیقی لگن مفقود ہو ۔ "عزیز لکھنوی کی تاریخِ ولادت و رحلت" کے بارے میں مضمون خالصتاً تحقیقی نوعیت کا ہے اور یہ اس امر کی نشاندہی بھی کرتا ہے کہ زمانۂ ماضی قریب کے ادبا کے حالاتِ حیات کی صحت اور حفاظت میں بھی کتنی کوتاہی برتی جا رہی ہے ۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ادبی شخصیت میں ان کی شاعرانہ حیثیت کی دریافت ایک نئی ادبی کرن کا درجہ رکھتی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے چند اوّلیتوں کا سراغ بھی لگایا ہے ۔ مثلاً انہوں نے "توبتہ النصوح" پر ولیم میور کے دیباچے کو اس کتاب پر پہلی تنقید قرار دیا ہے جو سرکاری مراسلاتی نوعیت کی ہے ، اردو کے پہلے افسانہ نگار کا مسئلہ بھی خاصا

متنازعہ ہے ، اس بحث میں انہوں نے پریم چند ، راشد الخیری اور یلدرم کی اوّلین افسانوی تحریریں ڈھونڈی ہیں اور اپنے شواہد کی روشنی میں اوّلیت کا تاجِ فضیلت یلدرم کے سر پر رکھا ہے — اس حصے کا سب سے اہم مقالہ مولوی خلیل الرحمٰن کا وہ مکتوب ہے جو انہوں نے ۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر محمد صادق کو مولانا آزاد کے بارے میں لکھا تھا اور جس سے ڈاکٹر صادق صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے میں بطور ایک مستند ماخذ کے استفادہ کیا تھا ۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے پہلی دفعہ اس کتاب میں مولوی خلیل الرحمٰن کا تعارف بھی پورا کرایا ہے اور اس خط کا پورا متن بخطِ مکتوب نگار پیش کر دیا ہے جو بعض چونکا دینے والے مشاہدات کا مظہر ہے ۔

مثال کے طور پر مولوی خلیل الرحمٰن کا یہ بیان آپ کو ضرور حیرت زدہ کر دے گا کہ "ریویو کے لیے آزاد کے پاس جو کتابیں آتی تھیں وہ سب ان کی صاحبزادی کو دے دی جاتی تھیں ، اور ان ہی کے ریویو آزاد کے نام سے چھپتے تھے ۔"

مولوی صاحب نے آزاد فرخ نہاد کا ایک دلچسپ لطیفہ یوں لکھا ہے ! "ایک مرتبہ میں اور مولوی ممتاز علی مرحوم ملنے گئے ۔ ان دنوں وہ امام باڑے میں رہتے تھے ۔ میں مولانا سے ڈرنے لگا تھا کیونکہ سخت سست کہہ بیٹھتے تھے ۔ صحن میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں ، ایک پر آزاد بیٹھے تھے ۔ مولوی ممتاز علی از راہِ ادب پائنتی بیٹھ گئے ۔ میں بھی دوسری چارپائی پر پائنتی بیٹھا ۔ مجھ سے مولانا نے کہا "میاں ! کس کے لیے وہاں بیٹھتے ہو ، سرہانے ہو بیٹھو" — میں نے فوراً تعمیل کی ۔ مولوی ممتاز علی سے بھی انہوں نے دو تین مرتبہ کہا کہ "آگے کو ہو بیٹھو" ۔ انہوں نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ اچھا بیٹھا ہوں ۔ آخر مولانا کو غصہ آگیا ۔ وہ کہنے لگے "بیوقوف ، گدھا ، احمق ، میری ادھوائین ٹوٹی جا رہی ہے ۔ یہ کہتا ہے کہ اچھا بیٹھا ہوں" — مولوی ممتاز علی جھٹ اوپر ہو بیٹھے ۔ مگر بہت شرمندہ"

یہ مکتوب مولانا آزاد کے بارے میں ان کی دیوانگی کے زمانے کی بہت سی نئی باتوں کو منظرِ عام پر لاتا ہے لیکن ان سے آزاد کے مقامِ فضیلت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ان کی انسانی زندگی کے گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے ۔ انہیں رحمتہ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا رہنے نہیں دیتا ۔

کتاب کے آخری دو مضامین "نادرات" کے تحت پیش کیے گئے ہیں ، ان میں سے ایک "موازنۂ انیس و دبیر" پر مولوی عبدالحق کی ایک ریڈیائی تقریر ہے ۔ دوسرا وہ لیکچر ہے جو سیّد وقار عظیم صاحب نے گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے طلبہ کو امتیاز علی تاج کے نصابی ڈرامے "انار کلی" پر دیا تھا ۔ دونوں تحریروں کا تحفظ اور اب اشاعت ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کے کریڈٹ میں قیمتی اضافہ ہے ۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ادبی تحقیق میں محنت اور خوش ذوقی دونوں عناصر موجود ہیں ۔ ان عناصر کے علاوہ ان کی شرافت نفس بھی ہمیں متاثر کرتی ہے" ۔ ڈاکٹر صاحب مولوی عبدالحق اور سیّد وقار عظیم کی روایات کے امین ہیں ۔ وہ الجھی ہوئی بات کو شائستگی سے سلجھاتے ہیں اور دلوں کے آبگینوں کو ٹھیس نہیں لگنے دیتے ، اس کتاب میں وہ کئی مشکل مقامات سے گزرے ہیں لیکن اپنی غیر مطبوعہ شرافت کی بدولت حسنِ حلاوت

سے سلامت نکل آئے ہیں ۔ سب سے آخری بات یہ ہے کہ مقبول اکادمی لاہور نے یہ کتاب دلکش کتابت ، نظرافروز طباعت اور جاذبِ نظر سفید کاغذ پر چھاپ کر اسے حصولِ علم کا ذریعہ ہی نہیں بنایا بلکہ ہمیں ایک ایسی تصنیف دی ہے جس کے ساتھ ہم دوستوں کی طرح باتیں کر سکتے ہیں ، کتاب کے سرورق پر جب نظر پڑتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تصویر آپ کی باتیں سُن رہی ہے ، وہ آپ سے شریکِ گفتگو ہیں ۔

سفرگشت

نام کتاب	سفرگشت		
مصنف	مختار علی خان (پرتو روہیلہ)	پبلشر	فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

جناب مختار علی خان (پرتو روہیلہ) کو ہم اچھے اور منفرد لہجے کے شاعر کی حیثیت ہی سے جانتے ہیں، لیکن آپ کے سفرنامہ امریکہ "سفرگشت" کے ذریعے ہم اُن کے ایک نئے روپ سے بھی آشنا ہوئے ہیں اور وہ روپ ایک مزاح نگار اور گہرا مشاہدہ رکھنے والے صاحبِ بصیرت نثر نگار کا ہے۔ آپ کے سفرنامہ میں جدت اور انفرادیت کی شان نمایاں ہے، لب و لہجہ کی شائستگی ، انداز بیاں کی ندرت طنز و مزاح کی آمیزش نے اِس سفرنامے کو ایک منفرد مقام بھی دیا ہے۔

"سفرگشت" سے چند منتخب اقتباس ہمارے قارئین کے لئے نہ صرف دلچسپی کا باعث ہوں گے بلکہ اِسطرح آپ کتاب پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال سکیں گے "سفرگشت" کے پیش گفتار میں جناب ممتاز مفتی نے جس طرح اِس کتاب کو دیکھا ہے اُن کی سوچ اور تحریر بہت اہم ہے۔ اس لئے ہم نے اُن کی رائے کے کچھ حصوں کو اِس تبصرہ کا حصہ بنایا ہے۔

جناب ممتاز مفتی کا خیال ہے کہ

> "مختار علی خان بہت بڑا صاحب طرز نثر نگار ہے۔ کتاب کی تمام تر لذت مزاح میں کیما فلاج کر رکھی ہے۔ تنکی سے تنکی بات مزاح کے سموسے میں ایسے بھرتا ہے کہ فحش ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور بات ایسے سرسری اور سنجیدہ انداز میں کرتا ہے جیسے بائی دی وے ہو قلم رکتا نہیں چلے جاتا ہے۔"

میرا خیال بھی مفتی صاحب سے مطابقت رکھتا ہے، ہر ایسی بات جس پر حدود کا اطلاق ہو سکے ایسے خوبصورت پیرائے میں لکھتے ہیں کہ بات واضح بھی ہو اور کہنے میں وقار اور سلیقہ بھی نظر آئے "سفرگشت" کے چند اقتباس پر آپ بھی نظر ڈالیں۔

● جو حوریں یہاں ساقی گری پر مامور تھیں اُن کے جامہ نورانی سے سپیدہ صبح کے ساتھ ساتھ داغ شب بھی نظر آتا تھا۔

● حسینانِ امریکہ نے یہاں بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر قبائے رسوائی چاک کر کے اور لبادہ ریا اتار کر حقیقت کو روز روشن کی

طرح آشکار کر دیا تھا اور بظاہر اتمام حجت کے طور پر تابناک اور روشن حقیقتوں پر تیل کی مالش شروع کر دی تھی۔

جناب ممتاز مفتی کے مطابق

"مختار علی خان کی آنکھ غنڈی ہے۔ غنڈی آنکھ سے دیکھتے ہوئے احوال کو پڑھتے ہوئے کون اکتائے گا۔ مُلا بھی لا حول پڑھنا بھول جائے گا۔

"مختار علی خان امریکہ میں مزاح کا اکتارہ بجاتا جگہ جگہ بڑی بے تکلفی سے گھومتا پھرتا ہے، ہر منظر پر پھبتی اڑاتا ہے، ہر سچویشن پر کومنٹ کی پھلجھڑی چلاتا ہے لیکن اِس کی پھبتی میں تمسخر نہیں ہوتا۔

جناب ممتاز مفتی کی اِس رائے کا جائزہ سفر گشت کے چند ٹکڑوں سے لیجیے۔

● دو سردارجی مختلف سمت میں جاتے ہوئے نظر آئے ایک پورے سردارجی تھے شلوار قمیص پہنے پگڑی لگائے۔ چال میں وہ استغنا گویا امرتسر میں گھوم رہے ہوں۔ جو کم سردارجی تھے وہ گردن تک سردارجی تھے نیچے سوٹ تھا۔

● آج نہ جانے کس طرح بات اُس کے خاندانی پس منظر سے شروع ہوئی تو کہنے لگا میں بہت غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ جب میں چھوٹا تھا اور اپنے باپ کے ساتھ کبھی یونیورسٹی سے گزرتا اور چاہتا کہ یونیورسٹی کے اندر بھی جاؤں تو میرا باپ مجھے روکتا اور کہتا نہ بیٹا اُدھر نہ جاؤ وہاں لکھ پتی رہتے ہیں۔ اب میں کیا بتاؤں ہم لوگ کتنے غریب تھے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم اپنے گھر میں کُتا بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ رات کو جب کبھی گھر کے اردگرد کوئی آہٹ ہوتی تو خود بھونکا کرتے تھے۔

مشین میں پیسے ڈالنے کے باوجود ٹرالی نہ ملنے پر مختار علی خان نے اِسطرح محسوس کیا۔

● ہم تیسری دُنیا کے لوگ آداب و وضعداری والے لوگ ہوتے ہیں، باظرف ہوتے ہیں، ہلکے پن کا اظہار تو ہمارا فقیر بھی نہیں کرتا۔ ہتھیلی پر آپ اِس کی روپیہ بھی رکھ دیجئے، ہتھیلی اِس طرح کھلی رکھے گا گویا اس کی ضرورت ہی نہیں۔ چادر پر پیسے پڑے ہوں گے تو پڑے ہوں گے ندیدوں کی طرح جھپٹ کر اٹھائے گا نہیں۔ تو میں نے کہا بی بی یہ ڈالر تو تھا ہی تمہارے لئے اِس کے پکڑنے میں اتنی مستعدی کی کیا ضرورت تھی اور ایسی مستعدی کی تیسری دنیا کا ایک انجان آدمی اپنے سارے سامان کے ساتھ اچھل پڑا۔ یہ رویہ آپ جیسوں کے شایانِ شان نہیں کہ لوگ کہیں گے کہ انہوں نے ڈالر دیکھا نہیں، کم ظرف ہیں، ندیدے ہیں وغیرہ وغیرہ ہم نے آپ کو بتا دیا کہ یہ طریقہ اشراف کا نہیں، آپ جانیں آپ کا کام، پر بی بی پر میری نصیحت کا اُلٹا اثر ہوا۔ بجائے اِس کے کہ مجھ سے خوش خلقی سے پیش آتیں یا یہ کہ غیر ملکی ہونے کے ناطے ایک کی بجائے دو ٹرالیاں آزاد کر دیتیں انہوں نے تو ڈالر کھینچ کر ٹرالی دینے سے ہی سراسر انکار کر دیا۔ میں نے کہا۔ بی بی چلو ایک ڈالر ہی تھا نا لے لیا تم نے پر تمہاری ذات تو پہچانی گئی نا۔ تم تو پھر بھی چھوٹی سی مختصر سی چیز ہو تمہارے بڑے بھی اِسی طرح جھوٹ بولتے اور دھوکے دیا کرتے تھے۔

● پھر جب انہوں نے ہوٹل، اُن کی قسمیں، وہاں جانے بیٹھنے کھانے پینے اور ٹپ کرنے کے آداب بھی بتانے

شروع کیے تو مجھے ایسا لگا کہ گویا بس ہمارے بب باندھ کر چوسنی دینے کی کسر باقی ہے۔

● امریکنوں کی نیت میں بڑا فتور ہے۔ یہ سارا ہنگامہ انہوں نے اِس لئے برپا کیا کہ میری جیب کے دو ڈالر ہتھیالیں۔

سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اور دورانِ سفر کے احساسات اور تجربات اچھوتے رنگ میں یوں بیان کرتے ہیں۔

● چنانچہ میں "ڈھاکہ سرنڈر" کے انداز میں کھڑا ہوگیا اور اے ۔ ایس ۔ ایف کے جوان متعلقہ نے میرے جسم کے سارے اعضائے رئیسہ و غریبہ پر ہاتھ پھیر کر ہی نہیں بلکہ آلہ کے ذریعے دیکھ کر یہ یقین کر لیا کہ پتلون میں سیسہ نہیں ہے۔

● اچھا تو یہ مستعدی اور خندہ روئی سے خدمت صرف فرسٹ کلاس میں ہی ملتی ہے۔ ہم خواہ مخواہ اکانومی کلاس میں اپنا حق سمجھ کر اِس کی توقع کرتے رہے اور اِس غلط فہمی میں کہ یہ مسکراہٹ ہمارا حق بھی ہے سینکڑوں اندرونی و بیرونی پروازوں پر اپنی رائے عالیہ بڑی خوش خطی سے لکھ کر اختتامِ سفر پر دیئے گئے لفافوں میں بند کرتے رہے ہیں لیکن یہ مسکراہٹ اکانومی کلاس کے کسی میزبان کے چہرے پر دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

● میری ننھی منی میزبان بڑے اصرار سے کھلانے کی کوششیں کرتی اور بار بار یہ کہتی سر اگر آپ اتنا کم کھائیں گے تو اِس قوم کے اہم امور کون چلائے گا اور اِس کے مسائل کون حل کرے گا اِس ملک کی گاڑی کیسے چلے گی۔ پر میں نے کہا۔ "نہیں بی بی ۔ جو کچھ میں پہلے کھا چکا ہوں وہ آٹھ دس قوموں کے سارے مسائل ، آسان اور مشکل دونوں یک جا کرنے کے لئے کافی تھا لیکن میں نے پچھلے کھائے کا حقِ نمک ادا نہیں کیا اور کھا کر کیا کروں گا۔

امریکہ جا کر بھی یہ ذہنی طور پر پاکستان ہی میں نظر آتے ہیں وہاں کے حالات اور واقعات کو پاکستان پر منطبق کرتے ہیں اور یوں ایک سچّا محبِ وطن پاکستانی اور مسلمان اپنے ہم وطنوں کی مہربانیوں پر تڑپتا نظر آتا ہے۔

● قومی شناخت یہ ہے کہ پاکستانی ہیں اپنے وطن کو وہاں رہتے ہوئے ہر وقت کوستے ہیں اور ایک ہفتہ وطن سے باہر ہو جائے تو وطن یاد آنے لگتا ہے۔

● میں نے کہا ۔ " بھائی میں خاموش اِس لئے ہوں کہ اپنا وطن یاد آنے لگا ہے اور وطن اِس لئے یاد آنے لگا ہے کہ ایسا نظم و ضبط مجھے اپنے وطن میں مسجدوں میں بھی نظر نہیں آتا جبکہ اِس نظم و ضبط پر بوجوہ دنیا کی تمام اقوام میں میرا حق مقدم ہے۔

● سینکڑوں لڑکے لڑکیاں دنیا و مافیہا سے بے خبر اِس طرح اِس علم کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے کہ ہم لوگ کبھی خدا کے سامنے سجدے میں بھی نہیں ہوتے بلکہ ہم لوگ اپنی مسجدوں میں بھی وہ آداب نہیں برتتے جو میں نے یہاں لائبریری میں دیکھے پھر صفائی ایسی کہ جی چاہتا تھا کہ ہر قدم پر نفل ادا کروں۔

● میری باری آئی تو میں نے کہا کہ پاکستان ایک مملکتِ خداداد ہے ہم نے اس کے مسائل بھی خُدا پر چھوڑے ہوئے ہیں وہ جب چاہے گا تو خود حل کر دے گا۔

مختصر یہ کہ "سفر گشت" ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے قاری پر گرفت بہت مضبوط رکھتی ہے، جب آپ اِس کو

پڑھنا شروع کریں گے تو آپ کی اولین خواہش یہی ہوگی کہ اِس کو ختم کر کے دم لیں۔

فَرد و فردِ فرید

نام کتاب:	فرد و فرد فرید ؒ		
مصنف:	ڈاکٹر اسلم فرخی	قیمت:	چالیس روپیہ
ضخامت:	۱۱۴ صفحات	ملنے کا پتہ:	احسن مطبوعات، ۵/۱۵۵، گلشن اقبال کراچی

شیخ فرید الدین مسعود ؒ اور شیخ نظام الدین اولیا ؒ کے روحانی سفر کی روداد جناب ڈاکٹر اسلم فرخی نے "فرد و فرد فرید ؒ" کے نام سے پیش کی ہے ۔ جناب شیخ فرید الدین مسعود ؒ اور شیخ نظام الدین اولیا ؒ پر مختلف اوقات میں ہر زبان میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ان دونوں بزرگوں کے حالات و کرامات کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے ۔ لکھنے والوں میں بڑے بڑے پائے کے عالمِ دین ، دانشور ، محقق ، مؤرّخ غرضیکہ ہر طرح کے لوگ شامل ہیں ۔ جن کا طرز تحریر اپنے اپنے رنگ میں نرالا ہے لیکن حال ہی میں "فرد و فرد فرید ؒ" ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کی ایک بیش بہا کتاب چھپی ہے جو اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے ۔ جس میں وہ سب کچھ ہے جس کی ہر قاری کو ضرورت پڑتی ہے ۔ دونوں بزرگوں کے از مہد تا لحد حالاتِ زندگی ہی نہیں دیئے ہوئے بلکہ مرحلہ وار واقعاتِ زندگی تاریخ اور روائت کو ساتھ ساتھ لے کر کچھ اس طرح منظم کیا ہے کہ پڑھنے والا ایک حکایت شیریں کے لطف سے محظوظ ہوتا ہے ۔ عوام اور خواص دونوں کے لئے یہ کتاب پُر کشش ہے ۔ کیونکہ یہ دونوں شخصیتیں بے مثل اور یگانہ ہیں اور بزرگانِ دین میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔

پہلے بزرگ شیخ فرید الدین ؒ گنج شکر اور دوسرے شیخ نظام الدین اولیا ؒ سلطان المشائخ ، محبوب الٰہی ہیں ۔ بابا فرید الدین گنج شکر ؒ ۵۶۹ھ میں کہتوال (قصور) جو ملتان میں واقع ہے پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم و تربیت والدین کی نگرانی میں ہوئی ۔ مسعود بچپن اور جوانی کے مراحل وقت کے ساتھ ساتھ طے کرتے جارہے تھے ۔ صوم و صلوٰۃ سے شغف ، نفس کشی ۔ فقیری ، درویشی ، خداپرستی ، خدمتِ خلق ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی ۔ چونکہ ان کے دادا اور والد قاضی شعیب اور قاضی جمال الدین سلیمان بن قاضی شعیب اپنے والد کے منصب پر متعین ہوئے ۔ اس نسبت سے ان کو اکثر لوگ "قاضی بچہ" کے نام سے پکارتے تھے ۔ حضرت فرید الدین کی محویت اور بے خودی میں اضافہ ہو رہا تھا ۔ زبانِ خلق اپنا کرشمہ دکھا رہی تھی ۔ شیخ جلال الدین تبریزی دلّی جاتے ہوئے کوٹھے والی سے گزرے تو چند لوگوں سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی درویش ہے ۔ لوگوں نے کہا کہ درویش تو نہیں ہاں ایک قاضی بچہ دیوانہ ضرور ہے ۔ مسجد جامع کے عقب میں عبادت اور ریاضت میں مصروف رہتا ہے ۔ شیخ ادھر چل پڑے ۔ شیخ کو ایک شخص نے انار نذر کیا ۔ جب ان کی قاضی بچہ دیوانہ سے ملاقات ہوئی تو وہی انار نوجوان کو دے دیا ۔ فرمایا اسے توڑو ۔ چونکہ فرید الدین روزے سے تھے شیخ کی خدمت میں پیش کیا شیخ نے انار کھالیا ۔ دعائیں دے کر رخصت ہو گئے ۔ اتفاق

سے ایک دانہ نیچے گر گیا ۔ فرید الدین مسعودؒ کی نگاہ پڑ گئی ۔ دانہ اٹھا لیا اور اس دانے سے روزہ افطار کیا ۔ دل میں روشنی محسوس ہوئی ۔ نعمتِ باطنی کا جو حصہ ملنا تھا مل گیا ۔ ان کے پیر و مرشد کا ارشاد تھا ۔ "مسعود پورا انار مل جاتا تو کیا ہوتا ہر انار میں ایک ہی دانہ کام کا ہوتا ہے ۔"

نوجوان فرید الدین مسعودؒ شیخ قطب الدین بختیارؒ کے ساتھ دلّی پہنچے ۔ صاحبانِ عرفان صاحبانِ سیف و قلم ، اہل نظر و اہل علم جوق در جوق پائے تخت میں اپنی قسمت آزمانے کے لئے آ رہے تھے ۔ اور اپنے اپنے علم سے مسلمانوں کی پوری پوری اعانت کر رہے تھے ۔ قطب الاقطاب شیخ قطب الدین بختیار نے دلّی کو اپنا مستقر بنایا ۔ قطب الاقطاب کی روحانی نظریں یہ دیکھ رہی تھیں کہ آنے والے وقت میں یہی معمورہ دلّی بائیس خواجہ کی چوکھٹ بننے کا افتخار حاصل کرنے والا ہے ۔ شیخ فرید الدین مسعودؒ قطب الاقطاب سے بیعت ہوئے اور ان کے حلقہ بگوش ہو گئے ۔ مسعود ایک چھوٹے سے حجرے میں رہنے لگے اور مرشد کی رہنمائی میں عبادت 'ریاضت' اور مجاہدوں میں بدل و جان مصروف ہو گئے ۔ قطب الاقطاب سے دو مرتبہ مہینے میں قدم بوسی کے لئے حاضری دیتے ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اصل چیز فیض نظر اور دلی لگن ہے ۔ ایک دفعہ قطب الاقطاب کے مرشد ہندولی خواجہ معین الدین حسن سنجریؒ دلّی تشریف لائے ۔ شیخ فرید الدینؒ کے مجاہدے ملاحظہ کئے یہ دیکھکر کہ شیخ فرید بہت کمزور اور لاغر ہو گئے ہیں ۔ قطب الاقطاب سے فرمایا ۔ بختیار اس نوجوان کو کب تک آزماؤ گے ۔ جواب دیا کہ آپ کے ہوتے میری کیا مجال ہے ۔ کہ اس پر عنایت کروں ۔ آخر دونوں اٹھ کھڑے ہوئے ۔ دائیں طرف خواجہ بزرگ ، بائیں طرف قطب الاقطاب اور درمیان شیخ فرید الدین مسعودؒ ۔ دونوں بزرگوں نے نظر عنایت فرمائی ۔ ایسی خوش نصیبی قدرت کی دین ہے ۔ مرشد کے مرشد کی عنایت ۔ ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی نہ قدما میں نہ متاخرین میں یہ سعادت شیخ شیوخ العالم شیخ کبیر فرید الدین مسعود ہی کے مقدر میں تھی ۔ قطب الاقطاب نے شیخ کبیر کو مجاہدوں کے سلسلے میں طے کے روزے کا حکم دیا ۔ یہ روزہ تین دن ہوتا تھا ۔ افطار کے وقت کے بعد ایک کوے کو کسی مردار کی آنتیں کھاتے دیکھا ۔ دیکھنا تھا کہ طبیعت مالش کرنے لگی فوراً قے ہو گئی ۔ مرشد سے ذکر کیا کہ جو کھایا تھا قے کے ذریعے خارج ہو گیا دوبارہ طے کے روزے کا حکم دیا تین دن کے بعد جو میسر آئے اس سے افطار کرو ۔ کمزوری بڑھ گئی شدت گرسنگی سے زمین کی طرف ہاتھ بڑھایا ۔ چند سنگریزے میسر آئے ۔ آخر انہیں کو منہ میں رکھ لیا ۔ خدا کی قدرت کہ یہ سنگریزے شکر کی طرح میٹھے ہو گئے ۔ مرشد سے جا کر سارا ماجرا بیان کیا ۔ انہوں نے کہا مسعود تم نے اچھا کیا کہ جو تمہیں غیب سے روزی میسر آئی وہ طیب و پاک ہے ۔ تم ہمیشہ شکر کی طرح شیریں رہو گے ۔ اس واقعہ کے بعد شیخ کبیر پیر شکر بار گنج شکر مشہور ہو گئے ۔ آخر قطب الاقطاب نے اپنی خلافت کے لئے شیخ کبیر کو مامور فرمایا ۔ جب خلقِ خدا شیخ کبیرؒ کی خدمت میں جوق در جوق آنا شروع ہوئی ۔ تو شیخ کی عبادت ، ریاضت میں فرق آنا فطری بات تھی ۔ مرشد کی اجازت سے قصبہ ہانسی چلے گئے تاکہ کسی گوشے میں بیٹھ کر عبادت کریں ۔ بیٹھے بیٹھے یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

ہر کہ دربند نام و آوازہ است
خانۂ او برون دروازہ است

لیکن مرتبہ شناس انہیں پہچانتے تھے ۔ ہانسی میں بھی خلقِ خدا کی بھیڑ لگی رہتی ۔ مرشد کی زندگی میں شیخ کبیر اکثر اوقات دلی آتے جاتے رہتے ۔ ایک دن مرشد کی خدمت میں ہانسی جانے کا ارادہ ظاہر کیا ۔ ارشاد ہوا کہ جاؤ "مقدر یہی ہے کہ ہمارے سفرِ آخرت کے وقت تم ہمارے پاس نہ ہو ۔" پھر حاضرین سے سورۃ الحمد اور سورۃ اخلاص کے تلاوت کرنے کو کہا پھر فرمانے لگے کہ "آؤ اس فقیر کی نعمت دنیا و دین اور فقر میں اضافے کے لئے دعا کرو۔" سب نے ہاتھ بلند کئے ۔ اسی وقت قطب الاقطاب نے مصلیٰ خاص اور عصا شیخ کبیر کو عطا کیا ۔ اور یہ بھی فرمایا کہ تمہاری امانتیں خرقہ و سجادہ ۔ دستار اور نعلین قاضی حمید الدین ناگوری کے حوالے کروں گا ۔ یہ پانچ دن کے بعد تمہیں پہنچا دیں گے ۔ یہ محفوظ رکھو کہ ہمارا مقام تمہارا مقام ہے ۔ آخر قطب الاقطاب کی وفات کے بعد یہ امانتیں قاضی حمید الدین ناگوری نے شیخ کبیر کے حوالے کر دیں ۔ شیخ کبیر نے مرشد کا جامہ زیب تن کیا اور ان کی جگہ متمکن ہو گئے ۔ علما و مشائخ کا اژدھام اور حاجت مندوں کا ہجوم رہنے لگا ۔ ہر وقت ایک میلے کا سماں رہتا ۔ شیخ کبیر اس مزاحمتِ خلق سے بچنے کے لئے ہانسی تشریف لے گئے ۔ لیکن یہاں بھی جب بھیڑ بھاڑ زیادہ ہو گئی تو یہاں سے کوٹھے والی چلے گئے ۔ ملتان وہاں سے قریب تھا ۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی اس علاقے میں متمکن تھے ۔ شیخ کبیر کوٹھے والی سے اجودھن پہنچے ۔ اجودھن جنگلی جانوروں ، درندوں اور سانپوں کا مسکن اور آبادی درشت مزاج انسانوں کی تھی ۔ جاہل اور توہمات میں ڈوبے ہوئے بے عقیدہ لوگ یہاں بستے تھے ۔ شیخ کبیرؒ نے ایک درخت کے سایہ میں قیام فرمایا اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے ۔ رفتہ رفتہ یہیں جماعت خانہ بن گیا اور اجودھن اہل دل اور جویانِ حق کے لئے ایک مرکز بن گیا ۔ یہاں بھی ان کو حاسدوں سے پالا پڑا لیکن امداد غیبی نے انہیں ہمیشہ سربلند رکھا ۔ شیخ کبیر مریدوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے ان کی لغزشوں کو درگزر فرماتے تھے ۔ سرزنش میں دلنوازی کا پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ۔ آنے جانے والے عقیدت مند جب کوئی نذرانہ پیش کرتے تو حاضرین میں تقسیم کر دیتے ۔ کسی کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتے ۔ خالی ہاتھ آنے والوں کی جھولیاں بھر دیتے ۔ یہ مساکین ہیں استطاعت نہیں رکھتے ان کا بھی حصہ دربارِ خداوندی میں مقرر ہے ان کو ملنا چاہیئے ۔ شیخ کبیر دلوں کو جوڑتے تھے ۔ ٹوٹے ہوئے دلوں پر مرہم رکھتے تھے ۔ جب کسی کے لئے دعا فرماتے تو کہتے کہ اللہ تعالیٰ تم کو درد عطا کرے ۔ کیونکہ دولتِ درد ہی سے انسان میں جذبہ محبت پیدا ہوتا ہے ۔ درد روح میں گداز پیدا کرتا ہے ۔ روح میں گہرائی بھی اسی کے دم سے آتی ہے ۔ شیخ کبیر اپنے عقیدت مندوں کی تربیت بھی فرماتے اور ہر ایک کو حسبِ رتبہ کچھ نہ کچھ بخشتے تھے ۔ ہر شخص کے ساتھ نیکی اور خلوص سے پیش آتے تھے ۔

شیخ کبیرؒ اپنی عمر کے آخری عشرے میں بہت ضعیف اور لاغر ہو گئے تھے ۔ عمر مبارک بڑھ رہی تھی ۔ صبحِ صادق نمودار ہوئی ۔ شیخ کبیرؒ کو بیدار ہوئے دیر ہو چکی تھی ۔ مؤذن نے اذان دی ۔ جماعت خانے کے درویش اُٹھ

کھڑے ہوئے چہل پہل ہو گئی ۔ نماز باجماعت ادا ہوئی شیخ کبیرؒ حجرے میں تشریف لے گئے یہ وقت عبادتِ خاص کا وقت تھا ۔ حجرے میں کوئی شخص آ جا نہ سکتا تھا ۔ تقریباً دو گھنٹے شیخ اس خصوصی عبادت میں محو رہے ۔ حجرے کا دروازہ کھلا تو شیخ نے دروازے کی طرف نظر دوڑائی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی کے آنے کا انتظار ہے ۔ سورج آہستہ آہستہ بلند ہونا شروع ہو گیا ۔ شیخ کبیرؒ حسبِ معمول روزے سے تھے ۔ خدمت میں حاضر رہنے والے یہ محسوس کر رہے تھے کہ شیخ بار بار دروازے کی طرف دیکھتے ہیں پھر کسی خیال میں محو ہو جاتے ہیں ۔ ناگاہ ایک نوجوان نظر آیا جس کے چہرے پر گہری سوچ اور عقیدت کے آثار نظر آ رہے تھے ۔ شیخ کبیر نے بڑے غور سے نوجوان کو دیکھا ۔ روئے مبارک پر محبت کی چھوٹ پڑ رہی تھی ۔ ہونٹوں پر ایک تبسم تھا ۔ آنے والا یا تو تیز تیز قدم اٹھائے آ رہا تھا یا حجرے کے پاس آ کر ٹھہر گیا ۔ گِن گِن کر قدم اٹھا رہا تھا جیسے جھجک رہا ہے ۔ بارگاہ کے اندر کیسے جائے یہ بڑی اعلیٰ وارفع بارگاہ ہے — نوجوان رُک گیا ۔ میں تو ایک غریب الدیار طالب علم ہوں میری بساط ہی کیا ۔ آخر جھجک پر اشتیاق نے غلبہ پا لیا ۔ حجرے میں داخل ہوئے ۔ دھیمے لہجے میں ادب سے سلام عرض کیا ۔ شیخ کبیرؒ نے سلام کا جواب دیا اور ایک نظر ڈالی ۔

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ
سیلابِ اشتیاقت جاں را خراب کردہ

اہلِ مجلس نے حیرت سے سُنا ایک اجنبی نوجوان کا یہ اعزاز و افتخار ۔ نوجوان کو بھی اس پذیرائی کا وہم و گماں نہ تھا ۔ نوجوان نے دستِ طلب بڑھایا ۔ شیخ کبیر نے دونوں ہاتھ دستِ مبارک میں لے لئے ۔ فاتحہ پڑھی نوجوان حلقۂ بیعت میں داخل ہو گیا ۔ نوجوان کے لئے چارپائی بچھانے کا حکم دیا حالانکہ درویش اور حاضر باش جماعت خانے کے کچے فرش پر سوتے تھے ۔ یہ تخصیص اور یہ اعزاز دیکھ کر سب کے سب حیران ہو گئے ۔

یہ نووارد جوان خواجہ محمد بن احمد بن علی البخاری تھے ۔ جنہیں ان کی والدہ محبت سے نظام الدین کہہ کر پکارتی تھیں اور خاص و عام میں سلطان جی کے نام سے یاد کئے جاتے تھے ۔ آپ کے بزرگ بخارا سے تشریف لائے تھے ۔ سلسلۂ نسب بہ اتفاقِ مورخین حضرت امام حسینؓ ابن امام علیؓ ابن ابی طالب تک پہنچتا ہے ۔ فرہنگِ آصفیہ کے مصنف نے ان کے بزرگوں کا غزنی سے بدایوں آنا ۶۳۲ھ لکھا ہے ۔ ان کی تاریخ ولادت ۶۳۴ھ یا ۶۳۵ھ بتائی ہے اور شارب صاحب نے دلی کے بائیس خواجہ میں ۲۷ صفر آخری چہار شنبہ اور طلوع آفتاب متعین کی ہے ۔ سنِ تمیز کو پہنچ کر علوم شرعی میں کمال حاصل کیا ۔ مباحثہ میں اپنے مقابلین کو ہمیشہ نیچا دکھاتے تھے ۔ جس سے آپ محفل شکن پکارے جانے لگے ۔ بدایوں کو اس زمانے میں قبۃ الاسلام کہتے تھے ۔ التمش اور بلبن اس شہر کے حاکم رہ چکے تھے ۔ بڑے بڑے عالم اور درویش یہاں موجود تھے ۔ درسیات کی تکمیل کی مشہور کتاب قدوری کی تکمیل کی ۔ مقری سے قرأت سیکھی ۔ مکتب ہی میں سلطان جی شیخ کبیر ، شیخ فرید الدین مسعود کے نامِ نامی اور اسم گرامی سے آشنا ہوئے ۔ بدایوں میں سلطان جی کی تعلیم مکمل ہوئی ۔ مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے دہلی کا رخ کیا ۔ شیخ کبیر برادرِ خورد خواجہ نجیب الدین

متوکل سے خواجہ فرید الدین مسعود کے متعلق بہت کچھ سُنا۔ دل میں اُن کے متعلق بے پایاں عقیدت و شیفتگی پیدا ہو گئی ۔ دہلی میں چار برس گزر گئے ۔ اب بیس برس کی عمر تھی ۔ شیخ نجیب الدین متوکل کی صحبت اور ان کی بزرگانہ شفقت نے سلطان جی کی کایا پلٹ دی ۔ ان کے دل میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ یہی سوچا کرتے اب کیا کروں ، کیا نہ کروں ۔ آخر تمام تفکرات سے یکسوئی حاصل کی اور اجودھن جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ۔ کہ اب جو درد دل میں ٹیس بن کر بیٹھ گیا ہے اس کا درماں وہیں ہے ۔ گھر سے نکلے اور روانہ ہو گئے آخر اجودھن پہنچ گئے ۔ یہاں پہنچے ۔ تو انہیں محسوس ہوا کہ انتظار ہو رہا تھا ۔ ماحول اور فضا ان کی منتظر تھی ۔ بیعت کی سعادت نصیب ہوئی ۔ جماعت خانے میں چارپائی پر سونے کی اجازت مل گئی ۔

حضرت نظام الدین اولیا جب حضرت بابا فرید گنج شکر سے بیعت ہو چکے تو عرض کی کہ "میں ایک طالب علم ہوں ۔ کیا سلسلۂ تعلیم جاری رکھوں یا چھوڑ کر وظائف ، اور مجادلوں میں لگ جاؤں" شیخ نے فرمایا کہ "میں کسی کو تحصیل علم سے باز نہیں رکھ سکتا ۔ میرا طریقہ یہ نہیں علم ضروری ہے ۔ تم دونوں شغل جاری رکھو پھر دیکھو ان میں کون غالب آتا ہے ۔" حضرت نظام الدین نے ایک زمانے کے بعد اپنی ایک مجلس میں فرمایا کہ میں نے ان دونوں میں سے کسی کو غالب دیکھا نہ مغلوب ۔ سلطان جی نے شیخ کبیر سے چھ سپارے پڑھے اور مرشد کے فیض سے قرأت کو سمجھا اور بیشتر رموز و نکات تک رسائی حاصل کی ۔ سلطان جی نے قرآن مجید کے علاوہ تین کتابیں بھی پڑھیں ۔ ایک کتاب شیخ کے سامنے پڑھی ۔ ابو شکور سالمی کی تمہید المبتدی اور شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کی عوارف المعارف پانچ باب شیخ کبیر کی تدریس اور بیان اپنا جواب آپ تھا ۔ فصاحت اور روانی بے مثل تھی ۔ سلطان جی بیان کی لذت میں اکثر کھو جایا کرتے تھے ۔ تعلیم ہو رہی تھی ۔ سلطان جی پر استغراق کا غلبہ تھا۔ تعلیم کے مدارج طے ہو رہے تھے۔ دعائیں اور اوراد سکھائے جا رہے تھے۔ ایک دن ارشاد ہوا یہ دعا ازبر کر لو ۔ سلطان جی نے دعا یاد کر لی۔ ورد کرنے لگے ۔ مرید نے سب کچھ پا لیا ۔ رخصت کے وقت سلطان جی کو شیخ نے خرقۂ چشتی عطا فرمایا یہ خرقہ گلیم سلطانی کے ساتھ تھا ۔

اجودھن سے واپسی پر پیران چشت کی مسند پر متمکن ہوئے اور خلق اللہ کی رشد و ہدایت میں مشغول رہے ۔ آپ تیس برس اپنے مرشد بابا فرید گنج شکرؒ کی حیات میں اجودھن حاضر ہوئے اور ان کی وفات کے بعد سات مرتبہ ان کے روضہ مبارک کی زیارت کی ۔ دہلی واپس آکر اپنے پیر و مرشد کے فرمان کے مطابق ریاضت و مجاہدہ میں وقت گزارا۔ دنیا کی تمام آرزوؤں اور مرادوں سے الگ تھلگ ہوئے یادِ الہیٰ میں مشغول رہنے لگے ۔ آپ ہمیشہ روزے رکھتے تھے ۔ آبادی میں رہنے سے عبادت میں خلل کا اندیشہ تھا ۔ اطمینانِ قلب کی دعائیں مانگتے تھے ۔ حوض رانی کے پاس ایک باغ میں فروکش ہوئے ۔ بعد ادائیگی نماز دعا کرتے تھے کہ مولا جہاں میری بہتری ہو وہاں مجھے رکھ ۔ بشارت ہوئی کہ تیری جگہ غیاث پور ہے ۔ باقی عمر پھر غیاث پور میں گزاری ۔ آخری عمر میں وقتِ رخصت آپ نے ایک مصلیٰ خاص ، دستار

اور پیرہن مولانا برہان الدین غریب کو دے دیا اور دکن جانے کی اجازت دی۔ ایک پیرہن دستار معلیٰ شیخ یعقوب کو عطا کیا اور گجرات کی طرف جانے کو کہا ۔ مولانا شمس الدین یحییٰ کو بھی آپ نے ایک دستارِ معلیٰ اور پیرہن عطا فرمایا ۔

حضرت نصیر الدین چراغ بھی اس روز حاضرِ خدمت تھے ۔ لیکن ان کو کچھ عطا نہ کیا سب کو تعجب تھا ۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے بدھ کے روز بعد نماز ظہر نصیر الدین چراغؒ کو طلب فرمایا اور عصا مصلیٰ تسبیح نعلینِ چوبین اور خرقہ حضرت بابا شکر گنجؒ کے دیگر تبرکات آپ کے سپرد فرمائے ۔ پھر حضرت نصیر الدین چراغ سے مخاطب ہو کر فرمایا :

تم کو دہلی میں رہ کر لوگوں کی جفا اٹھانی چاہیئے

آپ چار مہینے اور کچھ دن بیمار رہے اور اٹھارہ ربیع الثانی ۷۲۵ھ بروز بدھ بعد طلوع آفتاب جوارِ رحمت میں داخل ہوئے ۔ آپ کے جنازہ کی نماز شیخ الاسلام حضرت رکن الدین ملتانی نے پڑھائی جنازہ مبارک کو جب دفن کے واسطے لے جا رہے تھے تو قوال شیخ سعدی کی مشہور غزل گا رہے تھے ۔

اے تماشہ گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشہ مے روی

آپ کے خلفا سے حضرت شیخ نصیر الدین چراغ آپ کے خلیفۂ اور جانشین ہوئے ۔

فرد و فردِ فریدؒ جناب ڈاکٹر اسلم فرخی نے دونوں بزرگان دین شیخ کبیر فرید الدین مسعود گنج شکر اور شیخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کے روحانی سفر کی روداد بڑی محنت اور لگن سے مرتب کی ہے ۔ ان بزرگوں کی سیرت ۔ عبادات اور عظمتِ بزرگی اخلاقی و مذہبی تعلیمات ، خلق اللہ سے محبت و یگانگت ، دنیا سے نفرت فقر و فاقہ ، اصولِ تصوف ، ریاضیات و مجاہدات ، صبر و رضا ، توکل ، دعا ، اوراد تحمل سب کا ذکر اپنے اپنے مقام پر نہایت خوش اسلوبی سے کر دیا ہے جس سے قاری اپنی کمزوریوں سے آہستہ آہستہ تائب ہو جاتا ہے ۔ ان بزرگوں پر چند لکھی ہوئی کرامتیں بھی تصوف کی مختلف کتابوں میں درج ہیں جن پر مشکل سے یقین کیا جا سکتا ہے ۔ جناب ڈاکٹر فرخی نے ایسی کرامات کا ذکر نہیں کیا ۔ جس سے سُنی سُنائی ہوئی کو معجزہ کا نام دیا جا سکے ، ان کی اس تصنیف سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ بزرگانِ دین کے کردار اور ان کی معاشرتی ، اخلاقی زندگی کو مشعل راہ بنایا جائے اور ان کی خدمات جلیلہ کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے کہ کس طرح انہوں نے مذہبِ اسلام کی خدمت کی اور کس طرح جوق در جوق دُکھے ہوئے انسان ان کے وعظ سنتے اور حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے جاتے ۔ برسوں گزرنے پر بھی آج تک ان کی اخلاقی بزرگی کے تذکرے خاص و عام کی زبانوں پر ہیں ۔ ان بزرگوں کی زندگیاں سادہ تھیں ۔ مذہب اور اخلاق کی تعلیم ہر کس و ناکس سے محبت و اخلاص سے پیش آنا ۔ انسان دوستی غرضیکہ ان کی زندگی کے لیل و نہار ، قدم قدم پر ہماری رہنمائی کرتے ہیں ۔ اس ابتلائی دور میں ان کے کردار سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہونا چاہیئے ۔ آخرت کا یہ ایک انمول تحفہ ہے ۔

اردو میں بزرگانِ دین پر اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن فرد و فردِ فرید کا انداز بڑا دل لبھانے والا ہے ۔ امید ہے

کہ دوسرے بزرگوں پر بھی ایسی کتابیں لکھی جائیں گی ۔ اگر فردو فردِ فرید کی زبان کو تھوڑا آسان کر دیا جائے اور نرم لہجے میں بچوں کو سمجھایا جائے تو نئی نسل اس سے پوری طرح مستفیض ہو سکتی ہے ۔ ہم ڈاکٹر اسلم فرخی کو ایسی کتاب منظرِ عام پر لانے کی دلی مبارک باد دیتے ہیں ۔

(ک ۔ م)